ہماری ویب ڈیجیٹل بک

سلیم خان

SALIM KHAN

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

HAMARI WEB .com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Salim Khan"
at Hamariweb.com

کہ میرا صبر ترے جبر سے زیادہ ہے

لیبیا میں ناٹو کی فوجی کاروائی کا آغاز جس روز ہوا، اتفاق سے وہ عراق میں امریکی جارحیت کی آٹھویں سالگرہ بلکہ برسی کا دن تھا۔ اسی لئے شاید امریکی صدر اوبامہ نے اس حوالے سے اپنے بیان میں عراق کے ذکر سے دانستہ گریز کیا۔ اس تجاہل عارفانہ کی اپنی وجوہات ہیں ورنہ مغرب کا حال یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ناکامیوں اور کوتاہیوں کو خوشنما بنا کر پیش کرنے میں مہارت رکھتا ہے بلکہ دوسروں کی کامیابیوں کا سہرہ بھی اپنے سر باندھنے سے نہیں چوکتا۔ لیبیا کے معاملے میں امریکہ کا انتہائی محتاط رویہ دودھ کے جلے کا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پینے کے مترادف ہے ورنہ امریکی انتظامیہ اقوام متحدہ کے قرارداد کی پاسداری تو کجا اسکی منظوری کا انتظار بھی نہیں کرتا نیز کسی فوجی اقدام کی کمان دوسروں کے حوالے کرنا امریکہ بہادر کا شعار کبھی نہیں رہا۔ فوجی کمان ناٹو کے حوالے کرنے کا جواز پیش کرتے ہوئے امریکی صدر نے کہا "اس کمان کے منتقل ہو جانے سے امریکی ٹیکس دہندہ کے اخراجات وخطرات میں غیر معمولی کمی واقع ہوگی" صدر اوبامہ کو دو سال کے اندر دوبارہ انتخاب لڑنا ہے بشرطیکہ ان کی پارٹی انہیں دوبارہ اپنا امیدوار نامزد کردے۔ اس لئے ابھی سے اپنے رائے دہندگان کا خیال انہیں ستانے لگا ہے اوبامہ کو پتہ چل چکا ہے کہ اس دگرگوں معاشی صورتحال

میں عوام کو جنگ و جدال کے نشہ سے پھسلایا نہیں جاسکتا" اوبامہ نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا کہ "ہم دنیا بھر کے فوجداری نہیں کر سکتے الاّ یہ کہ ہمارے قومی مفادات پر آنچ آئے" امریکی فکر و عمل میں آنے والی حالیہ تبدیلی اس کا ایک ثبوت ہے کہ افغانستان اور عراق کے معرکہ میں پے در پے حاصل ہونے والی ناکامیوں نے مغرور و جابر حکمرانوں کا دماغ درست کر دیا ہے۔ کرنل قذافی کو بزور قوت اقتدار سے بے دخل کرنے میں اتحاد کے ریزہ ریزہ ہوجانے کے اندیشے کا اظہار امریکی صدر نے کیا۔لیبیا کے حریت پسندوں کو اسلحہ فراہم کرنے کے حوالے سے بھی اوبامہ تذبذب کا شکار نظر آئے "میں نہ تو اس کو خارج از امکان سمجھتا ہوں اور نہ ہی اس پر فیصلہ کر رہاہوں ہم اس بات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ قذافی کی افواج آگے چل کر کیا کرنے والی ہیں؟"

ان مدافعانہ کلمات کے پہلو بہ پہلو اوبامہ نے چند متضاد باتیں بھی کہیں مثلاً "کچھ اقوام دوسرے ممالک میں ہونے والے مظالم سے سے چشم پوشی کر سکتے ہیں لیکن امریکہ ان سے مختلف ہے۔ہم ایسی صورتحال میں خاموش تماشائی نہیں بن سکتے جبکہ کوئی ظالم اپنی ہی عوام سے یہ کہے کہ ان کے ساتھ رحم نہیں کیا جائیگا اور اس کی فوجیں معصوم مرد و خواتین کو اپنی درندگی کا نشانہ بنانے لگیں۔جب اپنی آزادی کی خاطر جد و جہد کرنے والے لوگ خود اپنی ہی حکومت کے ذریعہ ہلاک کئے جانے لگیں تو ہمیں ان کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا ہوگا "اوبامہ

تو کیا کسی بھی سربراہ مملکت کی زبان سے یہ باتیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں بشرطیکہ ان کا اطلاق بلا تفریق ظلم و جبر کیخلاف ہو لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس معاملہ میں بڑی جانبداری برتی جاتی ہے۔ تیونس اور مصر میں انقلاب سے پہلے کہی جانے والی بات بعد والے موقف سے مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح کی تنقید کا نشانہ قذافی کو بنایا جاتا ہے ویسی تنقید بحرین اور یمن کے حوالے سے نہیں ہوتی بلکہ خاموشی برتی جاتی ہے جبکہ فلسطین کے حوالے سے علی الاعلان صہیونیوں ظالموں کی پشت پناہی کی جاتی ہے۔
اس غیر مساویانہ رویہ نے مغرب کی منافقت کا پردہ چاک کرکے اسے لااعتبار بنا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ہر مثبت و منفی کاروائی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیبیا کے معاملے میں جب کرنل قذافی پر بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو خود امریکہ اسکی حمایت نہیں کرپاتا اس لئے کہ اس نے بین الاقوامی فوجداری عدالت کو ابھی تک تسلیم کرکے اپنے آپکو اس کا تابع نہیں شاید اسے اندیشہ ہے کہ اس کے اپنے فوجی جرائم کو بنیاد بنا کر اس پر مقدمہ نہ دائر کر دیا جائے۔
لیبیا میں ہونے والی تاخیر سے بہت سارے لوگ اس لئے پریشان ہیں کہ لیبیا کے زمینی حقائق سے خاطر خواہ واقفیت نہیں رکھتے۔ لیبیا کی صورتحال مصر اور تیونس سے مختلف ہے۔ تیونس اور مصر کے آمر دیگر عرب سربراہان مملکت اور مغرب

دونوں کے منظور نظر تھے ان کو نہ صرف ہمدردیاں حاصل تھیں بلکہ باہم مشترک مفادات بھی تھے ۔ اس لئے ابتدا میں یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ وہاں انقلاب آئے ۔اس کے برخلاف کرنل قذافی نے نہ صرف مغرب بلکہ عرب سربراہوں کو بھی ناراض کر رکھا ہےاور کسی کو اس سے ہمدردی نہیں ہے ۔ اس کے باوجود یہ لوگ کشادہ دلی کے ساتھ قذافی کی بے دخلی کے حامی نہیں ہیں جس کی اپنی وجوہات ہیں ۔ مثلاً عرب سربراہان کو اس بات کا خوف ہے کہ اگر لیبیا کی عوام نے فوج کا مقابلہ کرنے کے بعد کامیابی درج کروالی تو عوام کے دل سے ان کی خوف و دہشت کافور ہو جائیگی اور ان کے اپنے ملک کی عوام کو ایسا غیر معمولی حوصلہ حاصل ہو گا جس پر قابو پانا کسی کیلئے ممکن نہیں ہوگا۔اس لئے یہ لوگ بیک وقت قذافی کا انجام بد بھی دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے اقتدار میں بنے رہنے کے بھی خواہاں ہیں۔ بیک وقت یہ متضاد باتیں ناممکن ہیں۔ اسی کے ساتھ بین الاقوامی مداخلت کی حمایت بھی ان کے اپنے لئے مستقبل میں خطرے کی گھنٹی ہے عرب سربراہوں کی پریشانی کا یہ دوسرا سبب ہے لیکن اب جو زمانہ آرہا ہے اس کی بہترین ترجمانی مقبول عامر نے اپنے اس شعر میں کی ہے ۔

اب کے نہ کوئی قصر،نہ ایوان بچے گا
اب کے جو چلی ہے وہ ہوا تیز بہت ہے

مغرب کے اندیشے عربوں سے مختلف ہیں ۔اہل مغرب کو پتہ ہے کہ کرنل قذافی کو

اقتدار سے بے دخل کرنا اس لئے مشکل ہے کہ لیبیا میں اب بھی قبائلی نظام باقی ہے ۔فوج کی وفاداریاں چونکہ قبائلی عصبیت کے تحت منقسم ہیں اس لئے فوج مصر یا تیونس کی طرح کا کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔اس لئے مغرب کو لیبیا کے اندر پر امن اقتدار کی منتقلی ممکن نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ قذافی اور اس کا بیٹا سیف الاسلام علی الاعلان خانہ جنگی کی دھمکی دیتے ہیں ۔اس خانہ جنگی پیشگی تیاری کرنل معمر قذافی نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے۔ گزشتہ ۴۲ سالوں میں مختلف قبائل کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنے کے فن میں قذافی ماہر ہے اس لئے لیبیا کی مقدر کا فیصلہ عوامی مظاہرے سے آگے بڑھ کر میدان جنگ تک پہنچ گیا ہے اور اس صورتحال میں حریت پسندوں کو اسلحہ فراہم کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ لیبیا کے اندر حریت پسندوں اسلحہ فراہم کی تدارک امریکہ کی خارجہ سکریٹری ہیلری کلنٹن لندن میں منعقد ہونے والی چالیس ممالک کی کانفرنس میں کر چکی ہیں لیکن امریکی ایڈمرل جیمس سفٹافریڈس نے سینٹ کے سامنے خفیہ اطلاعات کا حوالہ سے یہ کہہ کر ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی کہ اس اسلحہ کے حزب اللہ اور القائدہ کے ہاتھ لگ جانے کا قوی امکان ہے۔ یہ فطری بات ہے کیونکہ مجاہدین آزادی آپس میں کسی غیر فطری تفریق کے قائل نہیں ہو سکتے ۔ایسے میں مغرب اسلحہ فراہم بھی کرنا چاہتا ہے اور نہیں بھی جو بیک وقت ناممکن ہے۔

لیبیا کی مزاحمت کے طول پکڑنے کا سبب وہاں کے قبائلی نظام میں مضمر ہے۔لیبیا کی مقامی آبادی ۵۰ لاکھ ہے نیز وہاں ۱۵ لاکھ غیر ملکی لوگ بستے ہیں اس طرح جملہ ٦۵ لاکھ۔مقامی آبادی کی اکثریت عربی بولتی ہے ویسے ایک جدید تحقیق کے مطابق ان میں سے ۹۰ فیصد وہ مقامی بربر ہیں جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد عربی زبان کو بھی اپنا لیا اور عرب کہلانے لگے۔لیبیا میں ویسے تو تقریباً کل ۱۴۰ قبائل ہیں لیکن ان میں سے اکثر کسی نہ کسی بڑے قبیلے کی شاخ ہیں اس طرح جملہ ۳۰ بڑے قبائل ہیں۔ملک کے مغربی علاقہ میں سب سے بڑا قبیلہ ورفلہ ہے جس کی آبادی ۱۰ لاکھ ہے اور جو ۵۲ ذیلی قبائل پر مشتمل ہے۔وسیع و عریض ضلع مصراتہ میں یہ لوگ آباد ہیں۔ان کا تعلق بنی ہلال سے ہے جس نے ۱۱ویں صدی عیسوی میں یہاں اسلام قائم کیا تھا۔ان کے علاوہ الزینتان، اولاد بوسیف، مصلعطہ، الرجبان اور مجرابہ وغیرہ وغیرہ دیگر قبائل بھی مغربی لیبیا میں آباد ہیں۔

کرنل قذافی کا تعلق وسطی لیبیا کے شہر صرط میں بسنے والے القذاقہ قبیلے سے ہے۔ معمر قزافی کے اقتدار میں آنے سے قبل اس قبیلے کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی بلکہ قذافی نے المغراعہ نامی بڑے قبیلے کے ساتھ مل کر شاہ سعید السنوسی کو ۴۲ سال قبل اقتدار سے بے دخل کیا تھا۔سابق وزیر اعظم عبدالسلام جلود اور لاکربی دھماکے کا ذمہ دار عبدالباسط المغراعی دونوں اسی باثر

قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ الریاح، الحربہ اور الزوائد اس علاقے کے دیگر بڑے قبائل ہیں فی الحال یہی علاقہ متحارب قوتوں کے درمیان میدان کارزار بنا ہوا ہے ۔ملک کا مشرقی حصہ میں جہاں آزادی کی لہر بڑے زور شور سے چل رہی ہے الزاویہ سب سے بااثر قبیلہ ہے جو بنغازی اور اجدابیہ کے آس پاس آباد ہے۔ ان کے علاوہ بنو سلیم ہے جو بنی ہلال کے ساتھ فاطمی دور حکومت میں آیا یہاں آیا تھا لیکن مغرب کے بجائے مشرق میں آ بسا۔ مصراتہ نام کا ایک قبیلہ بھی یہاں آباد ہے جو مغرب کے ضلع مصراتی میں نہیں پایا جاتا۔ اس کے علاوہ الوقیر، تواجیر، رملہ ، کرغلہ اور العبادیات اس علاقے کے دیگر قبائل ہیں۔ قذافی سے بغاوت کرکے حریت پسندوں سے مل جانے والے جنرل سلیمان محمود اور میجر عبدالفتاح یونس کا تعلق العبادی قبیلے سے ہے ۔ ایک اور قبیلہ فرجان ہے جو اجدابیہ کے اطراف میں آباد ہے اور اس نے موجودہ کشمکش میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ۔ان قبائل کے علاوہ خانہ بدوش بر بر قبیلے مثلاً طوارق جنوبی لیبیا میں آباد ہیں اور ہنوز قذافی کی حمایت کر رہے ہیں۔

کرنل معمر قذافی نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اس قبائلی عصبیت کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ پروان چڑھایا اور آپسی انتشار کے سائے میں اپنے اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا گیا۔ قذافی نے اس منتشر فوج کے ہوائی دستہ کو ہمیشہ ہی اپنے وفادار قبیلے کے پاس رکھا اسی لئے ساری دنیا نے دیکھا کہ لیبیائی

ہوائی فوج نے اپنے ہی نہتے عوام پر بے دریغ بمباری کی یہ دراصل قبائلی عصبیت کا شاخسانہ تھا نیز جیسے ہی نو فلائی زون کی تجویز منظور ہوئی اپنے لوگوں کو بچانے کی خاطر آناً فاناً قذافی نے جنگ بندی کا اعلان بھی اسی لئے کر دیا۔ سرکاری فوج کے علاوہ قذافی نے اپنی حفاظت کیلئے تین اور انتظامات کئے ایک تو عوامی ملیشیا کے نام پر ایک مسلح دستہ لیبیا میں موجود ہے جو ملک کی عوام کے بجائے قذافی خاندان کی وفاداری کا دم بھرتا ہے ۔ اس کے علاوہ قذافی کے بیٹے خمیس کی اپنی مسلح بریگیڈ ہے جو اس کے علاوہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے ۔ کرنل قذافی کا چھوٹا بیٹا تو غنڈوں کی فوج کا سرغنہ ہے لیکن اس کا بڑا بیٹا سیف الاسلام جس نے ٹیلی ویژن پر خانہ جنگی دھمکی تھی اور آخری گولی تک لڑنے کے عزم کا اظہار کیا تھا لندن کے مشہور و معروف اسکول آف اکنامکس سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکا ہے ویسے یہ حسن اتفاق ہے اسکی تھیس کا عنوان '' آمرانہ نظام حکومت میں جمہوریت کا فروغ'' تھا۔

اپنے اقتدار کی حفاظت کیلئے تیسرا انتظام قذافی نے یہ کیا تھا کہ غیر ملکی جنگجو بھی مہیا کر رکھے تھے جنھیں عام طور پر مرسینری کہا جاتا ہے۔اس دستہ میں بھرتی کا آغاز ویسے تو ۱۹۸۰ میں ہوا تھا لیکن مصر اور تیونس میں ہونے والی تبدیلیوں کے بعد اس کام بڑی تیزی آئی اور سیکڑوں غیر ملکی درندوں کو خود اپنی عوام کے خلاف استعال کی غرض سے درآمد کیا گیا۔ یہ لوگ چونکہ دولت

کی خاطر آئے ہیں اس لئے بلا کسی اخلاقی حدود و قیود کے سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن موجودہ صورتحال میں غیر قانونی باشندوں کی حیثیت یرغمال کی سی ہو گئی ہے۔جب قذافی کے ہاتھوں میں اقتدار کی ڈور کمزور ہو جائیگی اور ان کی تنخواہ بند ہو جائیگی تب یہ کہاں جائیں گے کوئی نہیں جانتا۔حریت پسندوں کا کہنا ہے کہ ان پر بین الاقوامی فوجداری عدالت میں مقدمہ چلایا جائیگا۔قذافی کی جانب سے کئے گئے ان تمام انتظامات کے باوجود لیبیا کی آزادی کے متوالے اس شعر کو گنگناتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں

اب اس کے بعد ترا اور کیا ارادہ ہے
کہ میرا صبر ترے جبر سے زیادہ ہے

لیبیا کی سرزمیں سے وہاں کی جہاد آزادی کا آغاز ہوا اور اب اسکی کمان ''قومی کونسل'' کے ہاتھوں میں ہے اس کا تعلق نہ امریکہ سے ہے اور نہ یورپ سے اس کے رہنما شلابی یا کرزئی کی طرح اوپر سے مسلط نہیں کئے گئے بلکہ عوام میں سے آگے آئے ہیں۔اس ۳۰ رکنی کونسل میں سے کسی کو غیر ملکیوں کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑنے کا شوق نہیں ہے۔ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اپنی آزادی کی جنگ خود لڑیں گے لیکن اس کیلئے یا تو عالمی برادری ہمیں اسلحہ سے لیس کرکے قذافی کی فوج کے ہم پلہ کر دے یا اسکی فوج کو تکنیکی اعتبار سے ہمارے برابر کر دے باقی کام خود کر لیں گے۔ویسے برطانیہ نے اس بات کا پتہ لگانے

کی خاطر کہ ان کو کس قدر مرعوب کیا جاسکتا ہے ان سے برطانوی خاتون پولس اہلکار ایوون فلیچر کی قتل کے ملزم عمر احمد سوڈانی کو حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا لیکن کونسل نے اسے ٹھکرا یہ جتلا دیا کہ کوئی ان کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس فیصلے سے کونسل کی خودداری اور عزم وحوصلہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے لیبیا سے متعلق جو رابطہ کمیٹی بنائی گئی ہے اس کا آئندہ اجلاس قطر میں ہونے جارہا ہے۔ اس کمیٹی میں اقوام متحدہ کے علاوہ افریقی اتحاد، عرب لیگ، رابطہ عالم اسلامی {او آئی سی} اور یورپین یونین شامل ہیں نیز اس بات کا بھی فیصلہ ہوا ہے کہ اس کی صدارت کسی ایک ادارے کے پاس نہیں ہوگی بلکہ مختلف اداروں کے درمیان گردش کرتی رہیگی۔ اس سارے عمل سے اگر بالواسطہ کسی کو دور رکھا گیا ہے تو وہ امریکہ ہے۔ یہ عظیم تبدیلی مجاہدین اسلام کی برسوں کی محنت کا ثمر ہے جس کے عالم اسلام پر دورس نتائج مرتب ہوں گے۔ بقول شاعر

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ دفعتاً نہیں ہوتا

محمود و ایاز

منحنی سا پر پیچ پہاڑی راستہ جب میدان کی وسیع و عریض چٹیل شاہراہ سے بغلگیر ہوا تو ایاز نے محمود سے پوچھا" سرکار! کیا میں یہ گھوڑا آج اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟"

شام کے سائے اس قدر طویل ہو چلے تھے کہ اندھیرا انہیں نگلنے لگا تھا ایسے میں محمود کو یہ سوال کچھ اٹپٹا سا لگا وہ بولا اتنی رات گئے تو گھوڑے پر سوار ہو کر کہاں جائیگا؟

میں! کہیں نہیں۔ میں تو اب اپنے گھر جاؤں گا بس

گھر؟ تیرا گھر تو شاہی محل سے چند فرلانگ پر واقع ہے؟

جی ہاں سرکار آپ نے درست فرمایا

تو پھر تجھے گھوڑے کی کیا ضرورت؟

وہ سرکار ایسا ہے کہ ایک دن میں گھوڑے پر بیٹھ کر گھر تک جانا چاہتا ہوں

ایاز کے اصرار نے محمود کو مزید حیرت زدہ کر دیا ایاز اس کا پشتینی غلام تھا اس کے آبا و اجدا میں سے کسی نے اس طرح کی بے تکی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بولا اس سے کیا فرق پڑتا ہے ایاز؟

فرق؟ بہت پڑتا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں میرے گھر والوں کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہو گی؟

ہو گی ضرور۔ ضرور ہو گی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

وہی تو فرق ہے سرکار کہ وہ سب لوگ حیرت زدہ رہ جائیں گے ورنہ میں روز ہی پا پیادہ گھر جاتا ہوں کسی کو تعجب نہیں ہوتا

محمود کو ایاز کی باتیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں کوئی اور غلام ہوتا تو محمود اسے ڈانٹ کر منع کر دیتا لیکن ایاز کی بات اور تھی۔ وہ اس کا چہیتا غلام جو تھا اور غلام سے زیادہ ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ تھا۔ بچپن میں وہ دونوں ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ اس وقت وہ دونوں نا سمجھ بچے تھے ان کو شعور نہیں تھا کہ آقا کیا ہوتا ہے اور غلام کس کو کہتے ہیں؟ محمود بولا ٹھیک ہے ایسی بات ہے تو تم گھوڑا اپنے گھر لے جاؤ اور کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد اسے واپس لا کر اصطبل میں باندھ دینا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تم بلا وجہ اپنے آپ کو زحمت میں ڈال رہے ہو۔

جی نہیں جناب اس میں زحمت کیسی؟ میں کل صبح اس گھوڑے کو اپنے ساتھ لے کر محل آ جاؤں گا

کل صبح؟ کیسی باتیں کرتے ہو ایاز کیا تمہارے پاس اصطبل ہے؟

جی نہیں لیکن اس کی کیا ضرورت؟ گرمیوں کی راتوں میں ویسے بھی ہم لوگ بھی باہر آنگن میں چارپائی بچھا کر سو جاتے وہیں یہ آپ کا گھوڑا بھی بندھا رہے گا

ایاز تم تو جانتے ہو یہ شاہی گھوڑا؟

جی ہاں سرکار میں جانتا ہوں۔ ایاز ادب احترام کے ساتھ گویا ہوا۔ لیکن جہاں شاہی غلام رہ سکتا ہے وہاں شاہی فرسان کیوں نہیں رہ سکتا؟

دیکھو ایاز ضد نہ کرو انسان کا کیا ہے وہ مصالحت کرنا جانتا ہے وہ اپنی طبیعت کو حالات کے ساتھ سازگار بنا لیتا ہے لیکن یہ بیچارہ گھوڑا اس فن سے واقف نہیں ہے۔

کوئی بات نہیں جناب میں کئی سالوں سے اس کے ساتھ ہوں اور میں نے اسے کئی ہنر سکھلا دئے ہیں آج رات یہ میرے ساتھ جینے کا ایک اور گر سیکھ جائے گا

ایاز کا اصرار اب محمود کو ناگوار گزرنے لگا تھا لیکن پھر بھی وہ بولا دیکھو ایاز تم بچپن ہی سے اس گھر میں قیام پذیر ہو اور وہاں رہنے کے عادی ہو گئے ہو اس لئے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس گھوڑے نے شاہی اصطبل میں آنکھ کھولی وہیں پلا بڑھا ہے اس لئے شاید اسے مشکل ہو گی۔

اس گھوڑے کی مشکلات کا اندازہ تو میں نہیں کر سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اپ کو اس سے بہت دقت ہو گی۔ سچ میں آپ نہایت دردمند انسان ہیں اپنے جانوروں کا بھی کس قدر خیال رکھتے ہیں

محمود نے بات کے بدلنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ایک بات بتاؤں ایاز تم نہایت بھولی بھالی طبیعت کے مالک ہو اس لئے تمہاری باتیں مجھ جیسے بے وقوف کی سمجھ میں بھی بڑی آسانی سے آ جاتی تھیں لیکن آج نہ جانے کیوں میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں؟

ایاز بولا اے میرے پیارے آقا جو آپ کو نا سمجھ سمجھے وہ دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف انسان ہے

اچھا تو تم نے بلا واسطہ مجھ ہی کو بے وقوف کہہ دیا محمود مسکرا کر بولا

آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں سرکار! میں ایسی گستاخی کی جرات کیونکر کر سکتا ہوں؟

کیوں تم نے یہ نہیں کہا کہ جو مجھے ۔۔۔۔۔

جی ہاں سرکار یہ تو میں نے کہا مگر۔۔۔۔۔

وہی تو! تمہاری باتیں سن کر میں خود اپنے آپ کو بے وقوف محسوس کر رہا ہوں تو گویا تمہاری منطق کے مطابق میں دنیا کا سب سے بڑا۔۔۔۔

جی نہیں جناب یہ آپ کی بندہ پرور ہے کہ آپ مجھ جیسے احمق غلام سے دل لگی کر رہے ہیں

اچھا! اس بندے سے بھلا مذاق کون کر سکتا ہے جو گھوڑے پر سوار ہو کر گھر جانا چاہتا ہو ویسے میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اگر تم رات میں واپس لا کر اصطبل میں باندھ جانے کیلئے تیار ہو تو اسے اپنے ساتھ لیکر جا سکتے ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے

جی نہیں جناب اگر ایسی بات ہے تو جانے دیجئے میں اسے یہیں چھوڑ جاتا ہوں وہ دونوں شاہی محل کے سامنے پہنچ چکے تھے

محمود نے مسکرا کر اللہ حافظ کہا اور دیوان خاص کی جانب مڑ گیا

دیوان میں موجود سارے لوگ محمود کو دیکھ کر احترام سے کھڑے ہو گئے۔ سوائے ایک فقیر کے جو عالم وجد میں جھوم جھوم کر گا رہا تھا

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ایاز گھوڑے کو اصطبل میں باندھتے ہوئے سوچ رہا تھا کاش وہ انسان نہیں فرسان ہوتا ۔شاہی فرسان اور شاہی غلام کے درمیان کا فرق آج اس کے سمجھ میں آگیا تھا۔گھر جاتے ہوئے ایاز کو اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔جب اس نے باپ اعجاز سے پوچھا تھا کہ آپ گھوڑا چلانا جانتے ہیں؟

اس کے باپ نے جواب دیا کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا تمہارا باپ کا شمار شہر کے سب سے اچھے شہ سواروں میں ہوتا ہے

اچھا تو آپ گھوڑے پر بیٹھ کر گھر کیوں نہیں آتے ؟

اپنے معصوم سے بیٹے کے منھ سے اس قدر تیکھا سوال سن کر اعجاز ششدر رہ گیا۔ وہ بولا بیٹے بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنے مالک کا گھوڑے پر سواری کرتا ہوں ۔اس لئے گھوڑے پر اسکی مرضی چلتی ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ گھوڑے کو شاہی اصطبل میں باندھ کر پیدل گھر جایا جائے

اپنے باپ اعجاز کا یہ جواب سن کر پھر اس نے پھر پوچھا۔گھوڑے کی حد تو ٹھیک ہے لیکن پر کس کی مرضی چلتی ہے؟

مجھ پر؟ مجھ پر بھی اپنے مالک کی مرضی چلتی ہے میں ان کا فرماں.بردار اور تابعدار جو ہوں

تو بابا آپ میں اور اس گھوڑے میں کوئی فرق بھی ہے یا نہیں؟ نہ جانے ایاز کو کہاں سے یہ سارے سوالات سوجھ رہے تھے۔

بیٹے! فرق تو ضرور ہے اور بہت.بڑا فرق ہے ہم دونوں کے اندر۔ دراصل وہ توصرف مالک کی مرضی پر چلتا ہے لیکن میں نہ صرف خود چلتا ہوں بلکہ اس کی مرضی چلاتا بھی ہوں

اچھا تو گویا آقا کی غلامی میں آپ گھوڑے کی نسبت بلند تر درجہ پر فائز ہیں

اس میں شک شبہ کی کون سی گنجائش ہے؟یہی تو ہماری عظیم ترین سعادت ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے والد کا سینہ پھولا گیا تھا لیکن آج ایاز کو احساس ہوا کہ اس کے والد شدید خوش فہمی کا شکار تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے نزدیک اپنی اور گھوڑے کی حیثیت جو کچھ ہے ان کے آقا کے نزدیک وہ نہیں۔ بادشاہ کے لئے گھوڑے کی قدر و قیمت غلام سے زیادہ ہے۔

فصلوں کی کٹائی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ ہر طرف جشن کا ماحول تھا کسانوں کے پاس فرصت بھی تھی اور خوشحالی بھی اس لئے وہ تفریح میں مشغول ہو گئے تھے۔ہر سال موسم بہار میں پورنیا کی رات کو شہر کے اندر ایک بہت.بڑے میلے

کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ دوکانیں سجتیں ۔ کھیل تماشے ،ناچ رنگ کی محفلیں آباد کی جاتیں دور دراز سے رشتہ دار اور دوست واحباب ملاقات کی غرض سے تشریف لاتے اوراس ہنگامے میں سب اہم تقریب گھڑ سواری کا مسابقہ ہوتا۔ بادشاہ کے مختلف غلام گھوڑوں کو دوڑاتے اور ان میں سے جو فتح حاصل کرتا اسے انعام واکرام سے نوازہ جاتا۔ایاز اور اس کے والد اعجاز نے کئی مرتبہ یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔اس مقابلے میں کامیابی کیلئے جہاں شہ سوار کی اہمیت تھی وہیں گھوڑا بھی غیر اہم نہیں تھا اس لئے کہ کمزور گھوڑے پر ماہر شہ سوار اور مضبوط گھوڑے پر بزدل سوار یکساں ناکامی کے حامل ہوتے تھے اسی باعث محمود نے سب سے پہلے ایاز کو اپنی پسند کا گھوڑا منتخب کرنے کا موقع دیا اور اصطبل کی جانب اشارہ کرکے پوچھا۔ تم اب کی باران میں سے کون سا گھوڑا دوڑاؤگے ایاز؟

ایاز بولا میں اس باران میں سے کوئی گھوڑا نہیں دوڑاؤں گا

محمود کو تعجب ہوا وہ بولا کیوں خیریت تو ہے؟

جی ہاں جناب بالکل خیریت ہے۔ ایاز بولا اور محمود نے چپ سادھ لی

مقابلے سے پہلے دن ایاز کا قریبی دوست معاذ اس سے ملنے آیا اور پوچھا کیوں بھائی خیریت تو ہے سنا ہے تم نے اس نے بار شہ سواری سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے؟

یہ تم سے کس نے کہا ایاز نے سوال کیا

معاذ بولا کس نے؟ مجھ سے بات یہ خود محمود نے کہی ہے

اچھا تو انہیں شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے

غلط فہمی اور آقا کو؟ کیسی باتیں کرتے ہو دوست یہ سب تو ہم غلاموں کی عیوب ہیں۔ انسانی عیوب کے جراثیم بھی بیماری کی طرح ہوتے ہیں اور وہ آقا و غلام کے درمیان فرق نہیں کر پاتے

تم کہیں اور نکل گئے ایاز میں تو تم سے ریس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کیا تمہاری محمود سے اس بابت کوئی بات نہیں ہوئی؟

ہوئی تھی انہوں نے اپنے اصطبل کی جانب اشارہ کرکے پوچھا تھا کہ ان میں سے کون سا گھوڑا دوڑاؤ گے؟ میں نے جواب دیا کوئی نہیں

تب تو انہوں نے صحیح سمجھا اگر تمہارے پاس گھوڑا نہیں ہوگا تو کیا خود دوڑو گے؟

ایاز ہنس کر بولا جیسا مالک ویسا گھوڑا کچھ نہیں تو تھوڑا تھوڑا

پہیلیاں نہ بجھواؤ سیدھے سیدھے جواب دو

بھئی میں نے تو صرف ان کے اصطبل کے گھوڑوں کے بارے میں یہ بات کہی تھی کیا اس سے باہر دنیا میں گھوڑے پائے ہی نہیں جاتے؟

کیوں نہیں ضرور پائے جاتے ہیں لیکن ان تک ہماری رسائی کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم غلاموں کی! ہمارے پاس تو آقاؤں کے گھوڑے ہوتے ہیں۔ گھوڑا دراصل سرداروں کی

سواری ہے غلاموں کی نہیں۔

لیکن گھوڑا تو نہیں جانتا کہ اس کا مالک غلام ہے یا آقا اسی لئے وہ ہمارے آقاؤں کی مانند ہمیں بھی اپنے اوپر سوار کر لیتا ہے۔

تمہاری بات درست ہے وہ بے وقوف جانور ہے جو آقا اور غلام کا فرق نہیں جانتا

اچھا تو ہم عقلمند ہیں جو اس فرق کو جانتے ہیں؟ ایاز نے ترکی بہ ترکی سوال کی اور معاذ لاجواب ہو گیا

بھئی کون عقلمند ہے اور کون بے وقوف اس کا فیصلہ کل ریس کے میدان میں ہو گا

کیا مطلب؟ایاز نے پوچھا

یہی کہ کل جو جیتے گا وہی گھوڑا بھی عقلمند ہو گا اور اس کا سوار بھی۔ وہ کون ہو گا یہ تو میں نہیں جانتا لیکن کون نہیں ہو گا یہ ضرور جانتا ہوں؟

اچھا وہ کیسے؟

بھئی جو مقابلے میں حصہ ہی نہیں لے گا اس کی کامیابی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا

تمہاری یہ بات بھی صحیح ہے تماشائیوں کے مقدر میں کبھی بھی کامیابی نہیں آتی

افسوس کہ اس بار تم نے خود اپنے آپ کو اپاہج تماشائی بنا لیا ہے

تم نے دوبارہ وہی بات کہہ دی جس کی میں تردید کر چکا ہوں

اچھا تو تم بغیر گھوڑے کے دوڑ میں حصہ لوگے ؟

جی نہیں میں گھوڑے سمیت مقابلہ کروں گا

اچھا تو گھوڑا کہاں سے لاؤ گے ؟

گھوڑا مجھے لانے کی کیا ضرورت وہ میرے گھر کے پاس بندھا ہوا ہے

تمہارے گھر کے پاس گھوڑا؟ میں کچھ سمجھا نہیں

اب کیا مجھے تم کو ترکی زبان میں یہ بتلانا پڑے گا کہ میرے گھر کے پاس گھوڑا بندھا ہوا ہے

دوست تمہاری بات تو میں سن رہا ہوں لیکن سمجھ نہیں پارہا اور یہ بات مجھے اسی وقت سمجھ میں آئیگی جب میں اس خیالی گھوڑے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں

اگر یہی بات ہے تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ؟ میرا گھر کون سا دور ہے چلو چائے پیتے ہیں

ایاز نے اپنی اہلیہ سے چائے بنانے کیلئے کہا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو وہ اپنے انوکھے انداز میں ہنہنایہ۔ معاذ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا وہ بولا یار کہاں سے اٹھا لائے اس حیوان کو؟

حیوان کہاں پائے جاتے ہیں ؟ کیا تم یہ نہیں جانتے

تو کیا تم اسے جنگل سے پکڑ لائے ؟

جی ہاں ایک روز میں نے اسے جنگل میں ٹہلتے ہوئے دیکھا اور اس کے پیچھے لگ گیا یقین کرو.بڑی مشکل سے قابو میں آیا ہے یہ وحشی۔ایاز نے.بڑے پیار سے

اپنے گھوڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا
تو کیا تم اس وحشی گھوڑے کو لے کر میدان میں اترو گے ؟
کیوں نہیں گھوڑا تو گھوڑا ہوتا ہے ،کیا وحشی اور کیا شہری ؟ویسے تمام ہی شاہی گھوڑوں کے آباواجدا کسی نہ کسی نسل میں جنگلی رہے ہوں گے
تمہاری منطق تو درست ہے لیکن دنیا اس پر عمل نہیں کرتی ،اگر کسی شخص کو کسی ملک کی شہریت حاصل ہوجائے تو اسکے حقوق کے حوالے سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس کے باپ دادا کون تھے اور کہاں سے آئے تھے ؟
مجھے تمہاری یہ دلیل معقول لگتی ہے معاذ اس لئے کہ ہمارے آباواجدا بھی تو کسی زمانے میں آزاد شہری رہے ہوں گے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہم غلام ہیں اور غلام رہیں گے
جی ہاں ایاز اسی لئے میرا سوال یہ ہے کہ کیا تم نے اس کیلئے اجازت حاصل کی ہے ؟
اجازت ! کیسی اجازت ؟ اگر میں کسی اور کا گھوڑا دوڑاؤں تو مجھے اس کے مالک سے اجازت لینی ہوگی لیکن اس کا مالک تو میں خود ہوں ۔اس بابت مجھے اجازت کی کیا حاجت ؟
وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا ہم لوگوں کو گھوڑا رکھنے کی اجازت ہے ؟ معاذ نے اندیشے کا اظہار کیا
ایاز ہنس کر بولا بھئی جن چیزوں کی اجازت ہے اسکی فہرست تو اس قدر طویل ہے

کہ اس کا مرتب کرنا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ایک کارِ دارد ہے اسی لئے جن پر پابندی ہوتی ہے ان کے بارے میں بتلا دیا جاتا ہے اور گھوڑا پالنا ممنوع ہے ایسا میں نے کبھی نہیں سنا

تمہاری بات درست ہے ایاز لیکن اس مقابلے کے بھی تو اصول و ضوابط ہو ں گے اس لئے اس بارے میں توثیق حاصل کر لینا بہتر ہے ورنہ بلا وجہ

ورنہ کیا؟ ایاز نے ہنس کر پوچھا مجھے مقابلے سے روک دیا جائیگا یہی نا؟

نہیں میرا مطلب ہے کہ احتیاط علاج سے بہتر ہے ویسے میں جانتا ہوں کہ تم محمود کے چہیتے ہو اس لئے تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ آسانی کے ساتھ نہیں کیا جاسکے گا

اگر یہی بات ہے تو میں اس اجازت کے بکھیڑے میں کیوں پڑوں؟ جو ہوگا دیکھا جائے گا اگر روک دیا گیا تو رک جائیں گے ۔ کھیل تو آخر کھیل ہے ویسے بھی کون جانتا ہے کہ مقابلے میں کامیابی ہی ہو ؟

جی ہاں ایاز کسی بھی مقابلے میں کامیابی اہم ہوتی ہے ورنہ ناکام رہنے والے اور حصہ نہ لینے والوں کا انجام یکساں ہی ہوتے ہیں

ایاز بولا مجھے نہیں لگتا کشمکش کے بعد ناکامی اور بغیر کسی کوشش کے شکست تسلیم کر لینا یکساں نہیں ہو سکتے

خیر تمہارے اور تمہاری اس نئی سواری کیلئے نیک خواہشات۔ معاذ نے اٹھتے ہوئے کہا

تمہارے لئے بھی ! اللہ حافظ

پورنیما کی رات میں گویا ساری کائنات مقابلے کے میدان میں امڈ پڑی تھی ایسا لگتا تھا گویا حق و باطل کا یہ سب سے بڑا معرکہ اور اس میں کامیاب ہو جانے والا فاتح عالم ہو گا۔ایک طرف شائقین کا جوش و خروش تھا اور دوسری جانب شہ سوار اپنے سجے سجائے گھوڑوں کے ساتھ صف بندی کر رہے تھے کہ ان کے درمیان ایاز اپنے جنگلی گھوڑے کے ساتھ نمودار ہوا اور سارے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ ایاز کے گھوڑے پر زین نہیں تھی ایک پھٹی پرانی شطرنجی سے اس نے گھوڑے کی پیٹھ کو ڈھانپ دیا تھا اور وہ خود شاہی وردی کے بجائے عمومی لباس زیب تن کئے ہوئے تھا اس لئے سب سے منفرد دکھلائی دے رہا تھا۔روایت یہ تھی کہ مقابلے سے قبل تمام ہی شرکاء سے محمود ملاقات کرتا تھا تاکہ انکی حوصلہ افزائی ہو یہ سلسلہ جاری تھا اور لوگوں میں طرح طرح کی چہ مے گوئیاں چل رہی تھیں

کسی نے کہااس ایاز کو دیکھو ایسا لگتا ہے غلام گھوڑے پر غلام سوار ہے۔

دوسرا بولا نہیں ایسا نہیں لگتا بلکہ یوں لگتا ہے کہ غلام گھوڑے کوئی بادشاہ سوار ہے اس لئے بادشاہ وردی کا پابند نہیں ہوتا۔

اگر ایسی بات ہے تو تیسرا بولا ایاز کے گھوڑے پر بھی شاہی وردی نہیں ہے اور نہ وہ شاہی اصطبل سے آیا ہے اس لئے اسے کیونکر غلام کہا جا سکتا ہے؟

لیکن اس کا لباس تو دیکھو اس کے پاس زین تک نہیں ہے ایک پھٹی پرانی دری ؟کیا یہ شاہانہ ٹھاٹ ہے ؟

جی ہاں وہ پھٹی پرانی ضرور ہے لیکن اسکی اپنی ہے ! وہ کسی سلطان کا عطا کردہ طوق نہیں ہے ؟

کیا آقاؤں کی عطا طوق ہوتی ہے ؟

کیا غلامی اور آزادی کی پہچان لباس سے ہوتی ہے ؟

گویا جتنے منھ اتنی باتیں اس بیچ محمود سبھی شرکائے مقابلہ سے ملتا ملاتا ایاز کے کے قریب پہنچ گیا۔ساری زبانیں بند ہو گئیں ہر کوئی محمود کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ محمود نے مسکرا کر ایاز کی جانب دیکھا تو ایاز نے حسبِ عادت سر کو جھکا دیا۔ محمود نے ہاتھ آگے.بڑھا کر حسب دستور مصافحہ کیا اور اضافی طور پر یہ کیا کہ ایاز کی پیشانی کا بوسہ لیا،اس مخصوص اعزاز کا مستحق صرف اور صرف ایاز تھا۔ایاز کے لئے یہ سعادت مقابلے میں کامیابی سے زیادہ قیمتی تھی ۔

مقابلے کا بگل بجا تو سارے گھوڑے دوڑ پڑے اس مقابلے میں گھڑ سوار گاؤں کے سات چکر لگاتے تھے اور جو سب سے پہلے اسے مکمل کرتا وہ کامیاب ہوتا پہلے دو چکر میں تو ایاز پیچھے رہ جانے والوں میں تھا لیکن تیسرے میں آگے والوں

کی صف میں شامل ہو گیا۔اس منظر نے سارے لوگوں کو چونکا دیا اور اس کے بعد محمود اور قاضی شہر کے درمیان گفت و شنید کا سلسلہ چھڑ گیا اور وہ دونوں اس بات کو بھول گئے کہ مقابلے میں کیا ہو رہا ہے ان کے درمیان ہونے والی بحث مقابلے سے زیادہ گرما گرم تھی اور اس بیچ زبردست شور بلند ہوا گویا شائقین نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔لوگ خوشی مارے پھولے نہیں سما رہے تھے ان کے گلے سے چیخ اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے یہ عجیب و غریب منظر تھا جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ محمود نے سر اٹھا کر پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟

سردار ایاز جیت گیا۔ آپ کا چہیتا غلام ایاز پھر ایک بار کامیاب ہو گیا سرکار۔ مبارک ہو !آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ محمود کا مصاحبِ خاص اسے مبارکباد دے رہا تھا کہ قاضی شہر نے کہا لیکن ایاز آج وہ ان کا غلام کب تھا ؟نہ شاہی وردی اور نہ شاہی گھوڑا؟ غلامی کی ساری علامتوں کو اس نے از خود نوچ کر پھینک دیا تھا۔ محمود نے غصہ سے قاضی کی جانب دیکھا تو وہ بولے گستاخی معاف جناب میں جذبات میں آگیا تھا مجھے ان الفاظ کا استعمال سرِ عام نہیں کرنا چاہئے تھا میں معذرت کا خواستگار ہوں۔

محمود مسکرایا اور بولا الفاظ کے استعمال سے حقیقتِ حال نہیں بدل جاتی آپ تقسیم اسناد کا خطبہ ارشاد فرمائیں

شور تھما تو اعلان ہوا اب ہماری روایات کے مطابق قاضی شہر فیصلے کا اعلان فرمائیں گے اور اپنا خطبہ پیش فرمائیں گے ہم ان سے مودبانہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ تشریف لائیں

شہر کا قاضی اس بستی کی سب سے بزرگ اور قابلِ احترام شخصیت تھی تمام تنازعات کو انہیں سے رجوع کیا جاتا تھا اور ان کے فیصلوں کو سارے لوگ بشمول سلطان و غلام بسر و چشم تسلیم کر لیتے تھے۔اپنے وسیع و عریض تجربہ کے باعث وہ بہت جلد مسائل کی تہہ پہنچ جاتے اور بڑے اعتماد سے فیصلہ سناتے لیکن آج ان کے قدموں میں لغزش تھی اور زبان لڑکھڑا رہی تھی ۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا دل دماغ سے ہم آہنگ نہیں ہے زبان کا رابطہ ذہن سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔

رسمیہ کلمات کے بعد قاضی شہر نے کہا خواتین و حضرات آپ سب لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ ہمارے ملک کا نظام صدیوں پرانے قبائلی دستور کے مطابق چلتا ہے اور اسی کے باعث یہاں امن وومان قائم ہے ، قانون کی حکمرانی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ سب نے کبھی بھی ان قبائلی روایات سے انحراف تو کجا ان پر اعتراض تک نہیں کیا اور اسکی مکمل پاسداری کی اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی یہی سلسلہ جاری رہیگا ورنہ مجھے ڈر ہے کہ یہ امن و امان کی فضا غارت ہو جائیگی۔

ایاز کو ان کے اس جملے سے دھمکی کی بو آ رہی تھی۔
خواتین و حضرات ہم اپنی روایات کے مقدس صحیفوں سے محض دو صورتوں میں رجوع کرتے ہیں ایک تو جب کوئی تنازعہ کھڑا ہو جائے اور دوسرے جب کوئی نئی صورتحال نمودار ہو جاتی ہے۔ جب سب کچھ حسبِ معمول چلتا رہا ہوتا ہے تو ہمیں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس لئے ہم انہیں بھول بھی جاتے ہیں ۔آج غالباً ہمارے شہر کی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ اس مقابلے میں کسی غیر شاہی گھوڑے نے حصہ لیا ہے۔ قربان جایئے ہمارے بزرگوں کی دور اندیشی پر کہ انہوں نے اس امکان کا ادراک بھی صدیوں قبل کر لیا تھا اور اس بارے میں بھی ہمارے لئے ہدایات درج فرما دی تھیں۔ اب آیئے میں آپ لوگوں کو ان ہدایات سے روشناس کرواوں:
دستور کی شق ۱۱۔ گھوڑا ایک شاہی جانور ہے اس لئے کسی آزاد شہری کو گھوڑا رکھنے کی اجازت نہیں ہے الا یہ کہ حکومت اسے خصوصی مراعات سے نوازے لیکن اس صورت میں بھی اس کے پاس حکومت کا عطا کردہ گھوڑا ہی ہوگا اور اسے کسی بھی وقت ضبط کرنے کا مکمل اختیار حکومت وقت کو حاصل ہوگا۔ اس بارے میں کسی وضاحت کی مطلق ضرورت نہیں ہوگی

دستور کی شق ۱۲۔اگر کوئی شہری اس قانون کی خلاف ورزی کرے تو اسے شہر بدر کر دیا جائیگا

دستور کی شق ۱۳۔بصورتِ دیگر اسے اپنے گھوڑے کو شاہی اصطبل میں جمع کرانا ہوگا۔ اس صورت میں وہ شہر میں رہ سکے گا

دستور کی شق ۱۴۔اگر کوئی اپنے ذاتی گھوڑے کے ساتھ مقابلے میں حصہ لے تو اسے انعام کا مستحق قرار نہیں دیا جائیگا الایہ کہ وہ اس گھوڑے سے دستبردار ہو کر اسے شاہی اصطبل میں جمع نہ کرا دے۔

دستور کی شق ۱۵۔اگر گھوڑا رکھنے کا جرم کسی غلام سے سرزد ہو جائے تو اس کا معاملہ مختلف ہے۔غلام چونکہ بذاتِ خود آقا کا بندہ ہوتا ہے وہ کسی شہ کا مالک نہیں ہو سکتا ہے گویا اسکی ملکیت میں جو بھی شہ ہوگی اس کا حقیقی مالک اس کا آقا ہی قرار پائے گا اور اگر وہ دستور کی خلاف ورزی پر اصرار کرتا ہے تو قابل گردن زدنی جرم کا مرتکب قرار دیا جائیگا

دستور کی ہدایات نہایت واضح ہیں اس کی روشنی میں اگر ایاز اپنا گھوڑا حکومت کے حوالے کر دے تو وہ انعام و اکرام کا مستحق ہوگا ورنہ

قاضی شہر کے ساتھ سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ اعلان ہوا۔آج کے مقابلے میں سب سے آگے رہنے والے ایاز آگے آئیں اور اپنی مرضی بتلائیں

محمود سمیت سارے لوگوں کو یقین تھا کہ ایاز گھوڑے سے دستبردار ہو جایئگا اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر گھر لوٹے گا لیکن ایاز کے ارادے مختلف تھے اس نے آگے آ کر اعلان کیا۔ میں ہماری روایات کی قدر کرتا ہوں اور قاضی شہر کا احترام کرتا ہوں میری مودبانہ گذارش یہ کہ آپ بصد شوق مجھ پر قانون نافذ فرمادیں میں بسر و چشم اسے قبول کرلوں گا مگر اپنے گھوڑے سے میں دستبردار نہیں ہوں گا۔ایاز کے لب ولہجہ میں بلا کا اعتماد تھا وہ مسکرا رہا تھا لیکن ساری کائنات بشمول قاضی شہر سوگوار ہو گئے تھے۔ اس شہر میں برسوں سے کسی نے دستور کی خلاف ورزی نہیں کی تھی موت کی سزا تو درکنار معمولی قسم کی سزا بھی کسی کو نہیں ہوئی تھی۔ یہ شہر مشہور ہی اس بات کیلئے تھا کہ یہاں جیل نہیں پائی جاتی اور ایسے شہر میں ایاز جیسے فرمانبردار اور تابعدار کو موت کی سزا؟ ناقابل فہم صورتحال تھی۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو لیکن سب کے سب بے بس تھے۔

محمود نے آگے بڑھ کر قاضی شہر کو مخاطب کرکے سوال کیا دستور میں اس بات کی

گنجائش ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں سلطان کوئی دخل اندازی کر سکے ؟ محمود کا سوال سن کر مجمع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ایاز کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

قاضی شہر بولے ہمارا دستور دیگر سزاؤں کے معاملے میں سلطان کو نہ صرف تخفیف بلکہ معافی کی بھی اجازت دیتا ہے لیکن موت کی سزا ایک استثنائی صورتحال ہے اس میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ موت کی خاموشی نے سارے عالم کو اپنے اندر نگل لیا تھا۔

محمود نے پھر سوال کیا۔ کیا مجھے اپنے غلام کو آزاد کرنے کا اختیار ہے؟

کیوں نہیں یہ اختیار تو اس ملک کے ہر کس و ناکس کو حاصل ہے۔ آپ تو سلطان ہیں

اگر میں ایاز کو آزاد کر دوں تو؟

اس صورت میں بھی اسے گھوڑا لوٹانا پڑے گا ورنہ اسے شہر بدر کر دیا جائیگا

محمود نے ایاز کی جانب دیکھا ایاز کی آنکھوں میں عقیدت و محبت کے آنسو تھے وہ بولا میں جان بخشی کیلئے اپنے آقا کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا اس لئے کہ میرے پاس اس کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ میں قاضی شہر سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ شہر بدری کے نفاذ میں کم از کم مدت کی رہنمائی فرمائیں

زیادہ سے زیادہ تین دن تم اس شہر میں قیام کر سکتے ہو ایاز۔ قاضی شہر یہ

کہہ کر اپنی سواری کی جانب چل دیئے شہر کی تاریخ میں پہلی بار اس دن انعام تقسیم نہیں ہوا۔

کوئی کہہ رہا تھا آج کے مقابلے میں سبھی لوگ ہار گئے۔ کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا

کوئی بولا نہیں ایسی بات نہیں آج کے مقابلے میں ایاز نے ایک ایسی کامیابی درج کروائی جو اس سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوئی

کسی نے کہا نہیں آج کے مقابلے میں سبھی لوگ ہار گئے سوائے محمود کے وہ ایاز کی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بڑی کامیابی ہے

خیر جتنے منہ اتنی باتیں

جراتِ انحراف

(یعقوب تصور کی کتاب انحراف پر تاثراتی اظہار خیال)

یعقوب تصور کون ہیں؟ وہ کیسے ہیں؟ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جیسے بھی ہیں ویسے کیوں ہیں؟ اگر آپ ان پیچیدہ سوالات کا جواب جاننا چاہتے ہیں تو آپ تصورِ خیال کو زحمت دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ تو بس یہ کریں کہ یعقوب تصور صاحب کے قطعات کا مجموعہ خریدیں اور اس کا مطالعہ کرلیں ساری تشنگی فی الفور کافور ہوجائیگی۔ میں نے لفظ "خریدیں" سہواً نہیں بلکہ قصداً استعمال کیا ہے اس لئے کہ اچھی کتابوں کی اشاعت کیلئے نہ صرف اچھے قلمکار کی بلکہ اچھے خریدار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔جب سے اردو قاری میں مفت خوری کی بیماری در آئی ہے اچھی کتابوں کا فقدان بڑھتا جارہا ہے۔اردو جیسی زرخیز زمین پر قحط سالی کا جو دور دورہ دکھلائی دیتا اور اسکا بنیادی سبب اچھے فنکاروں کی کمی نہیں بلکہ پروقار قاری کی غیر موجودگی ہے جس کا نتیجہ بقول غالب یہ ہے کہ

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل

وہ دوکان اپنی اٹھا گئے

تصور صاحب کے قطعات کا مجموعہ اس عمومی زبوں حالی سے خوشگوار انحراف ہے۔اگر یقین نہیں آتا ہو تو یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں

وفا کی نہج پہ خطرات جب نظر آئے
بہت سے چاہنے والوں نے انحراف کیا
بس اک چراغ شبِ امتحان گل کر کے
ہوا کی لہر نے کیا کیا نہ انکشاف کیا

ان چار مصرعوں میں کس قدر تنوع ہے کہ ابتدا رومانیت کے پیرائے میں ہوتی ہے اور دوسرے مصرعے میں بات انسانی نفسیات کی جانب گھوم جاتی ہے۔ تیسرا مصرعہ اسلامی تاریخ کا ایک ایسا لازوال واقعہ یاد دلاتا جو اپنے اندر حکمت و تواضع کی لاثانی مثال ہے لیکن آخری مصرعہ اس رویہ کو ماضی کے حصار سے نکال کر عمومیت عطا کر دیتا ہے اور ایک ایسی آفاقی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جو زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد ہے۔شاعر ہمیں ابن آدم کے اس رویہ سے روشناس کرواتا ہے کہ جس کا اظہار کل ہوا تھا آج پھر ہو سکتا ہے اور آنے والے کل میں بھی اس کا امکان بدستور موجود رہے گا۔اس کے انکشاف کی خاطر کسی بڑی آزمائش کے بجائے ہوا کا ایک جھونکا کافی ہے ۔آگے بڑھنے سے قبل ایک اور قطعہ دیکھتے چلیں یعقوب صاحب فرماتے ہیں

مہر آئے نہ ماہتاب آئے

کاش جگنو ہی وسطِ خواب آئے

خار آئے جو شاخِ ویراں پر

ہے اشارہ کہ بس گلاب آئے

یہ قطعہ شاعر کے اندرون کا تعارف کرواتا ہے اس کے اندر پائی جانے والی شانِ قلندری جو قناعت کی صفت پیدا کرتی ہے اسکی بدولت وہ مہروماہ کی توقع نہیں کرتا بلکہ جگنو پر اکتفا کرنے کیلیئے تیار ہو جاتا ہے۔اور پھر اگر حقیقی جگنو سے بھی محروم رہ جائے تب بھی مجازی جگنو کا خواب سجاتا ہے اس کے باوجود رجائیت کا یہ عالم کہ وہ پھول کے بجائے خار کے نمودار ہونے پر بھی کسی قسم کے حزن و ملال کا شکار نہیں ہوتا بلکہ پر امید ہو جاتا ہے کہ یہ کانٹا درحقیقت گلاب کے پھول کی آمد شاخسانہ ہے۔ میرے خیال میں یہ قطعہ یعقوب تصور کی معرفتِ ذات کا نمائندہ ہے جس میں حسن وجمال کے ساتھ ساتھ نیرنگئی خیال کی خوشبو اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ اسے پڑھ کر قاری کی طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔

معرفتِ ذات کوئی آسان کام نہیں ہے۔جس طرح چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے اسی طرح کا معاملہ انسان کا بھی ہے کہ وہ اپنے سر کی آنکھوں سے اپنے خارج کا جہاں تسخیر کرتا رہتا اپنے پرائے سبھی سے دست و گریباں ہوتا ہے لیکن اپنے آپ

سے دوبدو نہیں ہوتا۔زندگی بھر خواہشوں کے ہجوم میں کچھ ایسا کھویا رہتا ہے اسے خود اپنی ذات کیلئے فرصت ہی نہیں ملتی۔

زندگی کا یہ گھماؤ پھیرا اپنے آپ سے
لگ گیا ہے خواہشوں کا ڈھیر اپنے آپ سے
بس یہی حسرت کبھی اتنی تو تنہائی ملے
گفتگو کرلوں ذرا سی دیر اپنے آپ سے

ظاہر بینی کا گناہ بے لذت ناظر کو دوسروں کے متعلق کبھی غلط فہمی تو کبھی خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ویسے اگر غیروں کے بارے میں انسان حقیقت تک پہنچ بھی جائے تب بھی چونکہ ان پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اس لئے اس کی ساری سعی و جدوجہد تعلیم و تلقین کے دائرے میں محصور ہوتی ہے۔اس باب میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے سوائے اپنی ذات کے کسی اور کیلئے جوابدہ نہیں ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ حضرتِ انسان ان کی فکر زیادہ کرتا ہے جن کے بارے میں وہ مسؤل نہیں ہے اور خود اپنے آپ سے غافل رہتا ہے جس پر اسے اختیار عمل حاصل ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ہماری ہر حرکت میزانِ عمل میں رکھی جاتی ہے اور نہ صرف عبادات بلکہ معاملات کی بھی بازپرس ہونی ہے اس باب میں یعقوب تصور کی تذکیر ملاحظہ فرمائیں

ہر تخیل کو عمل بھی چاہئے

قصر بردوش ہوا بنتا نہیں
بندگی کی ہیں شرائط اور بھی
صرف سجدوں سے خدا ملتا نہیں

انسان اگر دنیا کی رنگ رلیوں میں کھو جائے اور خدا کی معرفت کو گنوا بیٹھے تو اسکے نتیجے میں خود فراموشی کے تاریک سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ گمراہی کے اس بحر ظلمات میں اسے خدا کے بجائے بندوں کا خوف ستانے لگتا ہے

یوں اندھیرے ہوئے جزوِ حیات
ہر بشر روشنی سے ڈرتا ہے
اب خدا سے نہ کوئی کھائے خوف
آدمی آدمی سے ڈرتا ہے

فرد بشر ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا اسے کرب خود آگاہی سے دوچار کر دیتا ہے۔ اوروں کی عیب جوئی انسان کیلئے جس قدر خوش کن مشغلہ ہے اپنی خود احتسابی و عیب شناسی اسی قدر تکلیف دہ تجربہ ہے اس لئے انسان اپنے من کی آنکھیں موند لیتا ہے اور مادی تشنگی کے تعاقب میں خوابوں کے سراب کا پیچھا کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ بے حسی اسے کس عذاب

میں گرفتار کر دیتی ہے اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیں

بے حسی کا عذاب دیکھے جا
بے عمل صرف خواب دیکھے جا
ریت میں فصل تشنگی کی اگا
پھل کی صورت سراب دیکھے جا

اعتراف ذات بجائے خود ایک مشکل مرحلہ ہے لیکن اظہار ذات کی منزل مشکل تر ہے ۔جہاں لوگ دوسروں کے بارے میں سچ بولنے کتراتے ہوں وہاں خود اپنے بارے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینا جوئے شیر لانے سے آسان نہیں ہوتا اس کیلئے فنکار کو فرہاد کا تیشہ درکار ہوتا ہے اپنے آپ کو بغیر کسی بناؤ سنگھار کے اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دینا اکثر لوگوں کیلئے خاصہ مشکل ہوتا ہے لیکن یعقوب تصور کا معاملہ ان سے برعکس ہے

دل جو روتا ہو تو چہرے پر سجالوں خوشیاں
درد سینے میں نہ ہو آنکھ میں آنسو پالوں
میں مثل تو نہیں ہوں کہ بہ رنگ تمثیل
اپنا کردار کہانی کے مطابق ڈھالوں

انسان چونکہ سماجی مخلوق ہے وہ اپنے خارج سے کسی صورت منقطع نہیں ہو سکتا۔

ہر فرد کے ساتھ پیش آنے والے حالات ایک دوسرے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر کسی کو غریب الوطنی کا درد نہیں سہنا پڑتا ویسے یہ اس خود ساختہ مصیبت میں انسان اپنے آپ کو برضا و رغبت مبتلا کر لیتا ہے بظاہر کوئی زور زبردستی نہیں ہوتی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو اس پر کیوں آمادہ کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب وہ نہیں دے سکتے کو وطن سے دوری کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتے بلکہ یعقوب تصور جیسے لوگ ہی دے سکتے ہیں جو اس امتحان سخت جاں سے گزر چکے ہوتے ہیں

ہوا کے دوش پہ آئے شجر کو چھوڑ دیا
فضائے غیر میں آئے نگر کو چھوڑ دیا
تلاش رزق و سکوں ،امن کی ضرورت نے
کیا کچھ ایسا پریشان گھر کو چھوڑ دیا

عام طور پر لوگ کن توقعات کے ساتھ کے یہاں آتے ہیں اور پھر اس صعوبت میں عمر عزیز کھپا دینے کے بعد کیا پاتے ہیں اس کا بھی نہایت خوبصورت بیان ملاحظہ فرمائیں

تلاش رزق کے ارماں نکالتے گزری
حیات ریت کے سکے ہی ڈھالتے گزری
مسافرت کی صعوبت میں عمر بیت گئی

بچی تو پاؤں سے کانٹے نکالتی گزری

یہ تو اس فرد کا حال ہے جو صحرہ نشینی کو اپنا مقدر بنالیتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ مساعی بالکل ہی رائیگاں جاتی ہوں

لمحہ لمحہ صرف فن تدبیر کیا

سامان تزئین رخ تدبیر کیا

صحراؤں میں عمر ہماری ریت ہوئی

گھر والوں نے تاج محل تعمیر کیا

یعقوب تصور جیسا رجائیت پسند شاعر اس صورتحال پر ملول و غمگین نہیں ہوتا بلکہ وہ مشیت لازدی کی اس کارفرمائی پر راضی بہ رضا نظر آتا ہے اور کہتا ہے

نصیب گردش ماہ منیر رکھتے ہیں

دلوں میں ہجر کے پیوست تیر رکھتے ہیں

ہم اس کئے ہوئے صحرا کی وسعتوں کے اسیر

ہتھیلیوں پہ سفر کی لکیر رکھتے ہیں

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مختلف لوگ جو یکساں حالات سے نبرد آزما ہوتے

ہیں یکساں اثرات قبول نہیں کرتے ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو مختلف افراد ایک ہی صورتحال سے متضاد نتائج اخذ کریں حالات و واقعات کے پس پردہ مختلف وجوہات و اسباب و کا گمان کرنے لگیں۔ ایسا ہونا عین قرینِ قیاس ہے اور اس کی وجہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے علحیدہ طرز فکر ہوتا ہے جو انہیں منفرد طرز زندگی سے ہمکنار کرتا ہے۔
زندگی کی معرفت اور اس سے منسلک آزمائش کا بیان انحراف میں یوں ہوتا ہے کہ

اس نے تو زندگی کا یہ معیار رکھ دیا
روشن دیا کیا سرِ دیوار رکھ دیا
بازی گہِ جہاں میں کی روشن شمعِ حیات
پھر سر پھری ہوا کا بھی کردار رکھ دیا

ہجرتِ مکانی کو لوگ اپنی ذات اور اپنے حالات کے آئینے میں دیکھتے ہیں لیکن یعقوب تصور اسے وسعت دے ایک ازلی واقعہ سے جوڑ دیتے ہیں جو ان کی وسعت فکر کی غمازی کرتا ہے

عرش سے فرش زمین تک کا سفر
عین فطرت تھا فسانہ بن گیا
اپنی منزل تو تصور تھی یہی
دانہ گندم بہانہ بن گیا

ہجرت اور اس کا فلسفہ جب تصور خیال سے نکل حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے تو اپنی مانوس دھرتی سے دور کسی اجنبی دیس میں آن بسنے والا اولاً کیسا محسوس کرتا اس کی منظر نگاری بھی دیکھیں۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس وہ تمام لوگ گزر چکے ہیں جنھوں نے ہجرت مکانی کی ہے لیکن کسی شہ کو محسوس کرنا اور بات ہے مگر اسے حسن و خوبی کے ساتھ بیان کر دینا جہانِ دیگر ہے

چہرہ چہرہ بھانپ رہے ہیں
خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں
اس جنگل میں آن بسے ہیں
جس میں صدیوں سانپ رہے ہیں

کسی نئے ملک میں آنے کے بعد انسان سب سے پہلے وہاں کے آداب واطوار سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ امن و سکون سے دن کاٹ سکے اور اس کوشش میں جو انکشافات اسے ہوتے ہیں سو یوں ہیں

الفاظ کو جذبات کا غماز نہ کرنا
اس شہر کا دستور ہے آواز نہ کرنا
جسکی نہ کوئی قدر ہو بازار طلب میں
سکہ کوئی بھی ایسا پس انداز نہ کرنا

ایک عام آدمی کیلئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ حالات سے مصالحت کرکے خودساختہ طور پر اپنے آپ کو دستورِ زباں بندی پر راضی کرلے اور ان قصیدہ خوانوں کی بھیڑ میں شامل ہو جائے جن پر یہ قطعہ صادق آتا ہے کہ

ہمہ تن گوش ہیں یہاں کے لوگ
پھر بھی خامش ہیں یہاں کے لوگ
گوش و چشم وزباں تو رکھتے ہیں
مصلحت کوش ہیں یہاں کے لوگ

شہرِ غریباں میں پائے جانے والے مصنوعی امن وامان کا قصیدہ پڑھنے والوں مصلحت پسندوں سے یعقوب تصور کیا خوب سوال کرتے ہیں بلکہ سوال بھی ایسا کہ جس میں جواب پنہاں ہو

چمن میں اپنی خوشی کا سماں رہے کیسے
حنوط ہوں جو پرندے تو چہچہے کیسے
نظام امن ہے ہر سمت کارفرما اگر
تو ہر درخت سے لپٹے ہیں اژدہے کیسے

اس قطعہ کو کہنے کیلئے ضروری تھا کہ یعقوب صاحب ابوظبی آتے اس لئے کہ

پاکستان میں رہ کر اس کا تصور محال تھا۔ یہ اژدہے اتنی دور تو سے کیا اپنے آس پاس بھی دکھلائی نہیں دیتے لیکن ہاں ان کی سرسراہٹ ہر کوئی محسوس کرتا ہے۔ اس احساس خوف نے شہر کی فضا میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی ہے

محبت ہی کسی رخ پر نہ بیزاری نظر آئے
عجب اک کیفیت انسان پر طاری نظر آئے
محض احکام کی تعمیل بے ردو قدح ہر دم
یہ سارا شہر ہی جذبات سے عاری نظر آئے

اس شہر میں رہنے والے سبھی حضرات کوان حالات سے سبھی کو سابقہ پیش آتا ہے لیکن کم لوگ ہوتے ہیں جو اس پر لب کشائی کی ہمت اپنے اندر پاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان حقائق کا پردہ فاش کرنے والوں کو اس کے ساتھ وابستہ خطرا تکا سامنا کرنے کیلئے تیار رہنا پڑتا ہے۔

یہ مانا جھوٹ سے بے زار بھی ہے
صداقت کا اسے اقرار بھی ہے
اگر وہ آئینہ بردار بھی ہے
تو کیا مرنے کو وہ تیار بھی ہے

حق گوئی کی جرات رندانہ شاعر کے اندر کردار کی یہ خوبی بھی پیدا کرتی ہے کہ

بلا خوف خطر اپنے انجام کی پرواہ کئے بغیر سچ بولتا چلا جاتا ہے۔ کسی کا جاہ و جلال اس کی آئینہ بر داری کو مرعوب نہیں کرپاتا

جرات کا تقاضہ ہے یہ کردار کی خوبی
اظہارِ صداقت میں نہ خاموش رہا جائے
پتھر نہ کہا جائے زر و سیم وگہر کو
خشت و خس و خاشاک کو سونا نہ کہا جائے

حق کیلیئے سر کٹانے سے پس و پیش نہ کرنا بلکہ اسے اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھنا یعقوب تصور کو اپنے ہم عصروں کے درمیان فائق و ممتاز کر دیتا ہے

حق و صفا کبھی باطل میں ضم نہیں کرتے
شکست وصدق کے ساماں بہم نہیں کرتے
ہمارا سلسلہ کرب و بلا سے ملتا ہے
سو ہم سروں کو کٹاتے ہیں خم نہیں کرتے

وطن عزیز سے دوری کے باوجود یعقوب تصور اپنی دھرتی سے قریب نظر آتا ہے۔ اپنی مٹی سے فاصلے بڑھ بھی جائیں تب بھی اسکی خوشبو انسان کے آس پاس رچی بسی رہتی ہے۔ وہ اپنے ملک کے حالات سے بے بہرہ نہیں ہو پاتا اسی لئے کہتا ہے۔

جیسے ہی باہر گیا گھبرا کے اندر آگیا
خوف کا طوفان کیسا یہ نگر میں آگیا
سمجھو اس کو مل گئی اک اور دن کی زندگی
جو پرندہ شام سے پہلے شجر میں آگیا

مندرجہ بالہ قطعہ میں جس بے یقینی کا اظہار کیا گیا ہے اس کا احساس کراچی میں نہایت سہل ہے لیکن یعقوب تصور اسے بڑی آسانی سے ابوظبی کے اندر محسوس کرتے ہیں۔
ملک وملت کی اس دگرگوں حالت کے اسباب اگر آپ یعقوب تصور سے جاننا چاہتے ہیں تو سنئے

طے مسافت زیست کی کرنا کڑی اک شرط ہے
حاصلِ منزل سفر تو ہے، سفر کیسے کریں
رہبروں میں راستے کے علم کا فقدان ہے
رہزنوں کو کارواں کا راہبر کیسے کریں

یعقوب صاحب جیسے لوگوں نے تو راہبر اور راہزن میں فرق کر کے اپنے آپ کو باز رکھا لیکن بھولی بھالی عوام اپنے تئیں یہ تفریق نہیں کر پاتی اور تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے ایسے میں ذرائع ابلاغ مونس و غمخوار بن کر آگے آتے ہیں اور جور و استبداد کو اس قدر خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں کہ عوام و خواص دونوں

اس طوقِ سلاسل کو اپنے گلے کا ہار سمجھنے لگتے ہیں۔

خبر ہوتی نہیں ہرگز کسی کو
یہ استبداد کا انداز کیا ہے
وہی جانے جو اس محشر سے گزرے
شکستِ قلب کی آواز کیا ہے

ملک و قوم کی رہنمائی اگر رہزنوں کے ہاتھ آجائے اور اگر یہ سلسلہ طویل ہو جائے تو اک گونہ بے حسی چہار جانب چھا جاتی ہے اور عوام مظالم کے اس قدر خوگر ہو جاتے ہیں کہ سماج سے ظالم و مظلوم کی تمیز مٹ جاتی ہے اور شاعر کو یہ کہنا پڑتا ہے

اب یہ معاشرہ کسی قابل نہیں رہا
منصف نہیں رہا کوئی عادل نہیں رہا
جو ظلم سہ رہا ہے وہ مظلوم اب نہیں
جو قتل کر رہا ہے وہ قاتل نہیں رہا

اس سنگین صورتحال کے باوجود انحراف کے قطعات میں نہ ہی خوف اور نہ مایوسی نظر آتی ہے بلکہ اس کے برعکس امید اور حوصلہ کا ٹھاٹیں مارتا ہو سمندر موجزن دکھلائی دیتا ہے۔اس لئے شاعر شکوہ شکایت کے چکر میں نہیں پڑتا۔ اس کے

پاس غم دنیا کا ماتم کرنے کیلئے فرصت نہیں پائی جاتی بلکہ وہ اپنے قاری کو فطرت کے مظاہر کی عکاسی کرکے روشن مستقبل کا یقین دلاتا ہے

آ کے ہر صبح یہ دیتا ہے دلاسے سورج
ہے اندھیروں کے تعاقب میں سدا سے سورج
روشنی ہوگی ہر اک سمت یقیں ہے لیکن
سر نکالے ذرا بادل کی ردا سے سورج

یہی مثبت سوچ اور رجائیت پسندی انحراف کی روح ہے جسے الفاظ کے نہایت خوشنما پیراہن میں یعقوب تصور صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ یہ ان کا اپنا حصہ بلکہ خاصہ ہے۔ میں امید کے ان روشن چراغوں کو سلام کرتا ہوں جو شریر ہوا کے جھونکوں سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور جب ہوا ان کی جانب ہاتھ بڑھاتی ہے تو روشنی تیزتر ہو جاتی ہے

آئینہ برسر حیات رکھا
عکس مخفی درونِ ذات رکھا
روشنی اور بڑھ گئی اس کی
جب ہوا نے دیئے پہ ہاتھ رکھا

ہم دعا کرتے ہیں کہ ان چراغوں کی روشنی سے ظلمات کے اندھیرے دور ہوں نیز

دربدر کی ٹھوکر کھانے والے انسانی قافلے کو اس کے ذریعہ راہِ ہدایت کا سراغ ملے۔
یعقوب تصور صاحب جس طرح اپنے آپ سے پر امید ہیں اسی طرح ہم بھی ان سے مستقبل میں اسی طرح کی بہترین امکانات کی توقع رکھتے ہیں

مصائب جھیلنے میں نہیں ڈرتا محبت میں
جوان عزم مصمم ہے بدن میں جان باقی ہے
بہت کچھ کر چکا ہوں میں تصور زندگانی میں
بہت کچھ کر گزرنے کا ابھی امکان باقی ہے

جمہوریت کی سفاک سیاست

اسامہ کی ہلاکت نے ۱۱ ستمبر کی شہرت کو مات دے دی ۔ انٹرنیٹ پر اس خبر کو اس طرح اچھالا گیا کہ اس سے متعلق چوبیس گھنٹوں میں ۱۵ کروڑ سے زائد مضامین ، اور تبصرے آن لائن ہو گئے جس میں ۷۰ ہزار سے زائد نیوز اسٹوریاں تھیں۔انٹرنیٹ پر موجود مواد میں پندرہ کروڑ دس لاکھ سے زائد مضامین اور خبریں اسامہ بن لادن کے متعلق ہیں ۔ ذرائع ابلاغ کے اس غبار نے ساری دنیا کی عوام کا دماغ ماؤف کر دیا ۔وقتی طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی لیکن اس غبارے کو سوئی لگانے کا کام بھی اس میں ہوا بھرنے والوں نے خود کردیا اور شکوک و شبہات کے دباؤ میں یہ اپنے آپ سکڑنے لگا۔ مطلع صاف ہو رہا ہے۔

مثل مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لئے وہ زیادہ دیر چل نہیں پاتا ۔جب دھکا لگنا بند ہوتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے اور اپنے تضاد کے باعث پکڑا جاتا ہے ۔اس نازک ترین معاملے میں قصر ابیض یعنی وہائٹ ہاؤس کی تضاد بیانی ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلا اختلاف تو اس بات پر رونما ہوگیا کہ یہ حملہ آور ہیلی کاپٹر اڑے کہاں سے تھے ؟اس کے بعد جو ہیلی کاپٹر تباہ ہوا اس کے بارے میں اول تو یہ خبر آئی کہ اسے مار گرایا گیا پھر پتہ چلا کیا وہ

میکانکی خرابی کے باعث گر گیا اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ حویلی کا درجہ حرارت برداشت نہ کر سکا اور پھٹ پڑا چونکہ یہ سارے بیانات ایک ہی انتظامیہ کے مختلف ترجمان دے رہے ہیں اس لئے کس کو تسلیم کریں اور کسے مسترد کر دیں یہ پیچیدہ سوال پیدا ہو جاتا

ہے۔ حویلی میں داخلے کے بعد کیا ہوا اسکے متعلق بھی تضاد بیانی دلچسپ ہے ایک صاحب کا کہنا ہے کہ نام نہاد اسامہ نہتا تھا تو دوسرے صاحب ٹیلی وژن پر فرماتے ہیں اس نے گولیاں چلائیں، کوئی نہتا تو اسی صورت گولی چلا سکتا ہے جبکہ وہ جادوگر ہو لیکن اس کی گولی سے کوئی نہیں مرتا۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ گرفتاری کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا بلکہ صرف قتل کے احکامات دیئے گئے تھے اس لئے دیکھتے ہی گولی چلا دی گئی دوسرے کے مطابق زندہ گرفتار کیا گیا پھر ہلاک کیا گیا۔ عربیہ چینل پر حویلی سے گرفتار ہونے والی لڑکی کا یہی بیان نشر ہوا ہے۔ اب اگر کوئی مجرم گرفتار ہو گیا تو اس پر مقدمہ چلا کر کیوں نہ اس پر الزام ثابت کیا جائے۔ انصاف اس کو نہیں کہتے کہ کسی نہتے آدمی کو اسکی بیوی بچوں کے سامنے گولیوں سے بھُون دیا جائے لیکن یہ سب مہذب دنیا کی باتیں ہیں جن کا اطلاق امریکی انتظامیہ پر نہیں ہوتا اور پھر جہاں نہ ملزم ہی حقیقی اور نہ الزام ہی سچا تو انصاف کا سوال ہی کیونکر پیدا ہوتا ہے ؟

ایک ترجمان نے ٹی وی پر بتلایا کہ اسامہ نے اپنی بیوی کو ڈھال بنایا اور اس

لئے وہ ہلاک ہو گئی دوسرے نے کہا ایسا نہیں ہوا اس کی بیوی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی ۔جو عورت ہلاک ہوئی وہ بیوی نہیں تھی اور کسی کو ڈھال نہیں بنایا گیا تھا۔ ہلاک ہونے والے بیٹے کا نام اول تو خالد بتلایا گیا پھر اس میں اصلاح ہوئی اور وہ حمزہ بن گیا۔اس پر دعویٰ کہ اوبامہ خود ٹیلی ویژن پر براہ راست ہر پل کے مناظر دیکھ رہے تھے لیکن ان کے پاس بیٹھے ہوئے پنٹاگون کے سربراہ نے کہا اندر جانے کے ۲۰ تا ۲۵ منٹ تک اندھیرا چھایا رہا اور ہمیں کچھ بھی پتہ نہ چلا۔کیمرہ سنا ہے فوجی کی ٹوپی میں لگا ہوا تھا لیکن تصویروں کو براہ راست نشر کرنے کیلئے کون سی تکنیک استعمال کی گئی اسکی تفصیل کوئی بھی بتلا نہ سکا۔اب جو تصویریں ظاہر کی گئی ہیں اسکو کارجین نے پرانا کہا ہے ان متضاد باتوں کو پڑھ کر عام قاری اگر کنفیوز ہو جائے تو کیا حیرت کہ وہائٹ ہاؤس کے ترجمان جئے کارنی نے بھی اپنے کنفیوز ہونے کا برملا اعتراف کر لیا۔اس خلط مبحث کا سبب یہ ہے کہ جب کئی لوگ بیک وقت جھوٹ بولتے ہیں تو انہیں پتہ نہیں چلتا کہ کون کیا کہہ رہا ہے بلکہ فرد واحد بھی یاد نہیں رکھ پاتا کہ اس نے پہلے کیا کذب بیانی کی تھی ۔اسی طرح جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے اور اس کا تضاد باہر آجاتا ہے

اس معاملے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جس وقت خبروں کی اس سونامی نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا ایک ویب سائٹ ایسی بھی تھی جس کو بزور

قوت بند کروا دیا گیا (گویا ہیک کر لیا گیا) اس سائٹ کا نام ہے" اصل میں کیا ہوا" (یعنی واٹ ریلی ہیپنڈ)۔یہ وقتی پابندی تھی جو دو دن بعد اٹھ گئی اور اب اس کی زیارت کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اسے معتوب کیوں کیا گیا۔اس سائٹ پر برسوں سے ایسا مواد جمع کرکے رکھا گیا جن کے مطابق شیخ اسامہ بن لادن کے فطری موت کی تصدیق ہوتی ہے۔ان خبروں میں امریکی فوجی افسران ،نامور اخبارات مثلاً گارجین اور معروف ٹیلی ویژن چینل جیسے فوکس اور بی بی سی پر نشر ہونے والی خبریں اور انٹرویو موجود ہیں۔ قابل ذکر لوگوں میں محترمہ بے نظیر بھٹو،حامد کرزئی اور پرویز مشرف کے بیانات بھی ہیں۔ مصر سے شائع ہونے والے اخبار کا عربی اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے۔ اگر مغرب کو لااعتبار اور سیاستدانوں کے بیانات کو ناقابلِ یقین قرار دے دیا جائے تب بھی پاکستان کے معتبر اور بے باک صحافی چودھری ذبیح اللہ بلگن کی بات کو کیسے مسترد کریں گے جنھیں ایک ٹی وی انٹرویو میں کرنل امام نے تین سال قبل بتلایا کہ وہ خود شیخ اسامہ بن لادن کے جنازے اور تدفین میں شریک ہو چکے ہیں ۔ اسامہ کو گردے کا عارضہ تھا وہ تمامتر علاج کے باوجود اس مرض سے صحت یاب نہ ہوسکے اور ان کا انتقال ہوگیا ۔ان کے جسد خاکی کو افغانستان کے ایک گاؤں میں سپرد خاک کر دیا گیا ۔اگر یہ بات سچ ہے تو پھر ایبٹ آباد میں مارا جانے والا شخص کون تھا ؟اور اوبامہ نے یہ ڈرامہ کیوں کیا ؟ یہ دو سوالات اہمیت کے حامل ہیں۔

جہاں تک پہلے سوال کی بات ہے جس سرعت کے ساتھ امریکیوں نے اس لاش کو سمندر برد کر دیا اس سے اسامہ بن لادن کے اس ہم شکل کی اصل شناخت تو ناممکن ہو گئی ہے ۔ امریکی انتظامیہ جس طرح اسامہ بن لادن پر مقدمہ چلا کر کوئی الزام عدالت میں ثابت نہ کر سکا اسی طرح اس لاش کو بھی کسی غیر جانبدار لیب میں بھجوا کر اس امر کی تصدیق نہیں کروا سکا کہ آخر وہ شخص تھا کون؟ نیز آئندہ کیلئے بھی تحقیق و تفتیش کے سارے امکانات کو ختم کر دیا گیا۔ چند گھنٹوں کے اندر لاش کے خلیات پاکستان سے امریکہ پہنچ گئے وہاں اسامہ بن لادن کی بہن کے خلیات سے ان کا موازنہ بھی ہو گیا اور پلک جھپکتے اوبامہ نے ٹیلی ویژن پر تصدیق کر دی اور ساری قوم خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس طرح کا چمتکار مسلم دنیا کے کسی پسماندہ ملک میں ہو تو مغرب کی جانب سے ہزار سوال اٹھائے جاتے ہیں لیکن اگر امریکہ میں ہو تو ساری دنیا آنکھ موند کر اسکی تائید و حمایت میں جٹ جاتی ہے اس لئے کہ بقول اوبامہ ہم جو بھی چاہیں جہاں بھی چاہیں کر سکتے ہیں ۔ لیکن اوبامہ کے اس جہان میں افغانستان شامل نہیں ہے اسی لئے ایبٹ آباد آنا پڑا۔ اوبامہ نے جو یہ شعبدہ بازی دکھلائی ہے ایسا امریکی انتظامیہ نے پہلی بار نہیں کیا بلکہ یہ ان کی قدیم روایتوں میں سے ایک ہے۔ اس سے پہلے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے وقت بھی بلا کسی تحقیق و تفتیش کے جارج بش پر ایک گھنٹے کے اندر انکشاف ہو گیا کہ اس حملے کا ماسٹر مائنڈ

اسامہ بن لادن ہے جو افغانستان میں بیٹھا ہوا ہے اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا ساری دنیا کے ممالک بے چوں چرا اسکی ہمنوائی کرنے لگے کسی نے نہیں پوچھا کہ آخر آپ کے پاس اس بے بنیاد دعویٰ کی دلیل کیا ہے ؟اس لئے وہ ہم شکل کون تھا جسے مار گرایا گیا اس پر وقت صرف کرنے کے بجائے یہ ڈرامہ کیوں رچایا گیا اس سوال پر توجہ ہونی چاہئے۔

اپنی ناکامیوں کی پردہ پوشی اور مقبولیت میں اضافہ اس مشکل سوال کا آسان جواب ہے۔ جارج بش نے بھی اپنی ناکامی کو چھپانے کیلئے نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی اور افغانستان پر چڑھائی کر دی لیکن جب دو سال تک اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تو اس کے امکانات بھی معدوم دکھلائی دیئے تو اس نے ایک نرم چارہ عراق کو نشانہ بنایا اور صدام پر عمومی تباہی کے اسلحہ رکھنے کا الزام لگا کر حملہ کر دیا یہ الزام آگے چل کر غلط ثابت ہوا لیکن تب تک وہ اپنا دوسری میقات کا انتخاب جیت چکا تھا۔ امریکی عوام کے گلے سے سربراہ کی ناکامی نہیں اترتی ۔وہ ناکام رہنما کو انتخاب میں نامراد کر دیتے ہیں انہیں بے وقوف بنانے کا سب سے آسان نسخہ ’’مہم سر ہو گئی‘‘ (مشن اکمپلشڈ) کا نعرہ ہے جسے سننے کے بعد امریکی عوام اپنے سارے دکھ درد بھول جاتے ہیں۔ یہ دراصل رائے دہندگان کا جذباتی استحصال ہے جو ہر انتخاب کے وقت مختلف انداز میں کیا جاتا ہے۔ حقیقی نہ سہی تو مجازی مہم

چھیڑ دی جاتی ہے اور پھر اسے سر کر لیا جاتا ہے۔ جارج بش نے صدام کو اقتدار سے دستبردار کرنے کے بعد یہی نعرہ لگایا تھا اور بڑے آرام سے انتخاب جیت گیا اوبامہ نے بھی اسی آزمودہ نسخے کو آزمایا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دو سال قبل جس صدر کی مقبولیت ۶۵ فیصد سے زیادہ تھی اور ناراضگی کا تناسب ۲۰ فی صد سے کم تھا اب وہ معاملہ الٹ پلٹ گیا ہے۔ اقتصادی میدان میں اپنی زبردست ناکامی کے باعث حالیہ ضمنی انتخاب میں ڈیموکریٹس کانگریس میں اپنی اکثریت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں ماہ اپریل میں اوبامہ کی مقبولیت گھٹ کر ۴۶ فیصد ہو گئی تھی اور ناراضگی بھی اس کو چھو رہی تھی۔ امریکہ میں صدر کو عوام سے پہلے اپنی پارٹی کے ممبران کی حمایت حاصل کرکے امیدواری حاصل کرنی پڑتی ہے تب جاکر عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی نوبت آتی ہے اور اگر موجود صدر کی مقبولیت میں خاصی کمی آجائے تو پارٹی دوسری میقات کیلئے کسی اور کو اپنا امیدوار نامزد کر دیتی ہے۔ یہی خطرہ اوبامہ کو لاحق ہو گیا تھا کہ مبادہ آئندہ انتخاب میں ہیلری کلنٹن ان سے آگے نہ نکل جائیں اس لئے اس نے یہ جوا کھیلا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مہم میں اوبامہ کی زبان سے " مجھے اطلاع موصول ہوئی تھی"۔" میں نے بذات خود نگرانی کی"۔" میں نے حکم دیا" اس طرح کے الفاظ بار بار سننے میں آئے حالانکہ اسامہ بن لادن کے سر پر ۲۵ کروڑ کا انعام تھا اس لئے اس میں صدر کو اس قدر

دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں تھی جو کوئی بھی ایسا کرتا وہ انعام کا حقدار ہوتا لیکن سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے صدر صاحب اس مہم میں جٹ گئے اور بلآخر مہم کے سر ہو جانے کا خوش کن اعلان فرما دیا۔

اوبامہ اپنی اس بازی میں کامیاب ہوگئے ان کی مقبولیت کچھ لوگوں کے مطابق اوسطاً ۵۷ فی صد تک جا پہنچی ہے ریپبلکنس کے خیمے میں ہلچل مچ گئی ہے اس لئے کہ ری پبلکن رائے دہندگان جو ان سے صرف ۹ فی صد راضی تھے اب ۲۴ فیصد تائید کرنے لگے ہیں گویا ۱۵ فیصد کا اضافہ دشمن کے کیمپ سے یہی وجہ ہے کہ کانگریس میں ریپبلکن لیڈر نے اس مہم میں اپنی پارٹی کا حصہ لگاتے ہوئے اعلان کر دیا کہ جس کام کو جارج بش نے شروع کیا تھا اسی کو اوبامہ نے پورا کیا۔ رمسفیلڈ نے بھی ہر ایک کو اس کا حصہ دینے کی بات کی بلکہ ان کے مقابلے انتخاب لڑنے کا ارادہ رکھنے والی بار برا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس واقعہ کے بعد وہ اوبامہ کے خلاف ریپبلکن پارٹی کی جانب سے انتخاب لڑنے کی غلطی نہیں کر سکتیں۔ عام رائے دہندگان کے اندر بھی ۱۱ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ویسے جمہوریت میں کسی موت سے فائدے کا ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ راجیو گاندھی کی غیر معمولی کامیابی اندرا گاندھی کے قتل اور اس کے باعث حاصل ہونے والی ہمدردی کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ اگر بینظیر زندہ ہوتیں تو آصف زرداری کیلئے صدارت کا خواب دیکھنا بھی محال تھا لیکن ان دو واقعات سے قطع نظر جہاں ہمدردی کے

ووٹ ملے تھے مودی نے مسلمانوں کے قتل عام کی بنیاد پر اپنا پہلا انتخاب جیتا۔ وہی بدلے کی بھاونا جس کا اظہار اوبامہ کرتے ہیں مودی بھی کر رہا تھا۔ بی جے پی کی پہلی ١٣ دنوں والی حکومت بھی بابری مسجد کی شہادت کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی ۔ رام مندر کی تحریک اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بے شمار مشابہت موجود ہے ۔جمہوریت کے کھیل میں یہ سب ہوتا رہتا ہے ۔

نام نہاد اسامہ بن لادن کی ہلاکت پر اوبامہ کا بیان صرف اور صرف سیاسی جعلسازی ہے جس کے پردے میں وہ افغانستان سے اپنے بے نیل و مرام واپسی کی ناکامی کو ڈھانپنے اور اپنی انتخابی مہم کو سہل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان و یوروپ کے سربراہان کے تبصرے ضمیر فروشی اور ابن الوقتی سے زیادہ کسی اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ سی این این پر اوبامہ کی تائیدی میں دم ہلاتے ہوئے امریکی صحافی پیٹر برجن نے اعلان کر دیا کہ ’’ یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اختتام ہے ‘‘ لیکن اس کے برخلاف فوجی تجزیہ کار اور امریکی بریگیڈئیر مارک کیمٹ کا کہنا ہے کہ یہ تحریک کا خاتمہ نہیں ہے، یہ دہشتگردی (نام نہاد) کا خاتمہ بھی نہیں ہے بلکہ ایک باب کا اختتام ہے۔ اسامہ بن لادن کی گرفتاری و قتل محض ایک علامت سے زیادہ کچھ نہیں۔اس لئے کہ وہ برسوں قبل تحریک کی عملی قیادت سے دستبردار ہو چکے تھے ۔القاعدہ تنظیم اسامہ بن لادن کی شخصیت سے کہیں زیادہ ہے گو کہ وہ اس کا تشخص اسامہ ہیں۔ مارک کا بیان

حقیقت پسندانہ ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تک بھی اسامہ حیات تھے کیا وہ ایثار ومزاحمت، صبر واستقامت اور جرأت وشجاعت کی علامت نہیں تھے؟ اگر تھے تو یہ اوصاف حمیدہ مغرب کو یا دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مغرب زدہ دانشوروں کو کیوں نظر نہیں آتے؟

اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ ایریل شیرون اور نتن یاہو جیسے ظالم جن کو امن کے پیغامبر دکھلائی دیتے ہیں۔ مصری مبارک اور یمنی صالح جیسے لوگ جن کے منظور نظر ہوں۔ ریمنڈ ڈیوس جیسا سفاک قاتل جن کا سفار تکار ہو اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی جیسی معصوم دوشیزہ جن کی نگاہ میں سنگین مجرم ہو تو ایسوں کو اسامہ اور نصراللہ اگر دہشت گرد نظر نہ آئیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں اور جو لوگ مغرب کی عینک لگا کر حالات کا تجزیہ کرتے ہیں انہیں بھی وہی سب نظر آتا جو مغرب انہیں باور کراتا ہے۔ ذہنی غلامی اسی کا نام ہے ورنہ اس بات کا دراک کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد خود امریکہ ہے جس کی عالمی دہشت گردی کا باقاعدہ آغاز ہیروشیما اور ناگاساکی کی ایٹمی بمباری سے ہوا تھا اور قریب ترین نمونہ عراق کی جارحیت ہے جہاں فوج کشی کا آغاز اس دعویٰ کے ساتھ کیا گیا تھا کہ وہاں عمومی تباہی کے اسلحہ (ویپنس آف ماس ڈیسٹرکشن) موجود ہے۔ اس نامعقول جنگ کے نتیجے میں اب تک تقریباً ۱۵ لاکھ معصوم عراقی جان بحق ہو چکے ہیں۔ ۷ ہزار کے

قریب اتحادی فوجی مارے جاچکے ہیں اور باالآخر بش نے یہ کہہ کر اپنا دامن جھٹک لیا کہ خفیہ ایجنسی کی اطلاعات غلط تھیں اور وہاں مذکورہ اسلحہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ جن لوگوں کو اپنی اس عظیم غلطی پر ذرہ برابر ملال نہ ہوا انہیں ہر دہشت گرد بھلاآدمی دکھلائی دیتا ہے اور مزاحمت کار انکی آنکھوں کا کانٹا بن جاتا ہے۔ بزدل اور کوتاہ بین لوگ عام طور سے ظلم کے بجائے اسکے خلاف ہونے والی بغاوت کو باعث فساد سمجھتے ہیں اسی لئے انہیں محمود عباس خوشنما اور حماس بدنما دکھلائی دیتی ہے لیکن مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے نہ کبھی مستکبرین کے جاہ وجلال کو خاطر میں لاتے ہیں اور نہ ان کے باجگزاروں کی جانب سے کی جانے والے لعنت ملامت کی پرواہ کرتے ہیں ۔ ان کا طرز حیات نہ تو مجبوری حالات طے کرتے ہیں اور نہ مادی مفادات ۔ وہ غیروں کے طفیل جینے کے بجائے خود اپنا جہان آباد کرتے ہیں اور دوسروں کیلئے روشنی کا مینار بن جاتے ہیں۔ اسامہ بن لادن بھی انہیں میں سے ایک تھے ۔

اپنی نوجوانی کے دن اسامہ نے شہزادے کے مانند گزارے ۔ وہ اگر چاہتے تو جدہ میں تعمیر ہونے والی ہزار میٹر اونچی عمارت کے بلند ترین منزل پر اپنا گھر بنا سکتے تھے لیکن جو اپنا گھر جنت میں بناتے ہیں ان کو دنیا کی بلندیاں حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ اسامہ بن لادن نے اقبال کے شاہین کی مصداق قصر سلطانی کے گنبد پر نشیمن بنانے کے بجائے پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرہ کیا۔ ۱۹۷۹ میں

افغانستان پر سوویت یونین کی جارحیت کی خبر انہوں نے ریڈیو پر سنی۔ ابتدا میں انہوں نے افغان مجاہدین کا مالی معاونت کیا مگر کچھ عرصے بعد وہ خود اپنی تمام دولت اور ثروت کو چھوڑ کر میدان کارزار کا رخ کیا۔ اسامہ بن لادن نے شیخ عبداللہ عظام اور دیگر مجاہدین کے ساتھ ملکر سوویت فوجیوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ جس وقت وہ روسیوں سے برسرپیکار تھے مغرب کی آنکھوں کا تارہ بنے ہوئے تھے لیکن جب انہوں نے مغرب کو چیلنج کیا تو وہ دہشت گرد کہلائے جانے لگے حالانکہ ہر دو صورت میں ان کی جنگ جارحیت کے خلاف تھی۔

افغانستان میں سوویت یونین کو شکست فاش سے دوچار کرنے کے بعد اسامہ وطن واپس لوٹ گئے۔ صدام حسین کے کویت پر حملہ کا فائدہ اٹھا کر امریکہ ایک طرف عراق پر حملہ کردیا تو دوسری طرف وہ سعودی عرب کی سلامتی کو لاحق خطرات کا بہانہ بنا کر مقدس سرزمین میں داخل ہوگیا۔ تاہم اس موقع پر اسامہ بن لادن نے سرزمین حجاز پر امریکی فوجیوں کی آمد کی مخالفت کی اور عراق کے خطرات سے نمٹنے کیلئے اسلامی فورس تشکیل دینے کی تجویز پیش کی یہیں سے اسامہ بن لادن کو امریکہ نے اپنا دشمن بنالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۹۲میں اسامہ کو اپنا ملک چھوڑ کر سوڈان جانا پڑا۔ اسامہ بن لادن نے سرزمین حرمین پر ناپاک امریکی وجود کے خلاف تحریک جاری رکھی اور آخر کار سعودی عرب سے امریکہ کو نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ اسامہ کی دوسری بڑی کامیابی تھی ۔جو لوگ امت

کی ساری تباہی کیلیئے اسامہ بن لادن کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں نہیں جانتے اگر امریکی فوج سعودی عرب کو اپنا مستقر نہیں بناتی تو یہ اختلاف ہی رونما نہ ہوتا اور اگر اسامہ اس کے خلاف آواز نہ اٹھاتے تو وہ انخلاء بھی عمل میں نہ آتا۔اس کے علاوہ عراق سے بھی اس قدر قلیل مدت کے اندر امریکی انخلا میں القائدہ کے کردار کا انکار ممکن نہیں ہے۔آئندہ ایک سال کے اندر امریکی وہاں سے نکل جائیں گے ورنہ امریکہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر مزاحمت نہ ہو تو اسکی فوجیں کبھی بھی واپس نہیں ہوتیں جاپان کے اندر دوسری جنگ عظیم کے قائم کردہ فوجی مستقر آج بھی موجود ہیں۔القائدہ کا یہ ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے وطن پرستی کے بت کو مسمار کرکے طاغوت کے مقابلے امت کو جسدِ واحد بنا دیا۔ افغانستان کے خود دار طالبان نے جن کے پاس اسامہ نے ۱۹۹۶ میں سیاسی پناہ حاصل کی تھی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا اور اب یہ جہاد ویتنام کی جنگ سے طویل ہو چکا ہے۔آج بھی افغنستان کے بڑے حصے پر طالبان کا قبضہ ہے۔ابھی حال میں ۵۰۰ طالبانی مجاہد جیل توڑ کر فرار ہو گئے اور ناٹو افواج ان کا بال بیکا نہ کر سکی۔ وسط جولائی سے امریکی فوجیوں کے انخلا کا آغاز ہونا ہے جو ۲۰۱۴ میں مکمل ہو جائیگا۔ اس سبکی پر پردہ ڈالنے کیلیئے جعلی اسامہ بن لادن کو ہلاک کرکے اپنی سیاسی

روٹی سینکنے کی ایک کامیاب کوشش اوبامہ نے ضرور کی ہے لیکن سوڈا واٹر کا یہ ابال کب تک رہیگا یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔ انتخاب کو ابھی ڈیڑھ سال کا وقفہ باقی ہے اس وقت تک یہ معاشی ابتری جاری رہی تو اوبامہ کو ایک نیا ناٹک رچانے کی ضرورت پیش آیگی۔ جارج بش جس اسامہ کا ہوا کھڑا کرکے اپنی عوام کو دہشت زدہ کرتے رہے اور ان کے ووٹ سمیٹتے رہے اوبامہ نے اس خیالی دشمن کو ختم کر دیا ہے۔ ڈیڑھ سال کے اندر اگر اوبامہ بی جے پی کے بابر کی طرح کوئی اور خونخوار دشمن ایجاد کرنے میں ناکام رہے تو امریکی عوام ان کے دشمن بن جائیں گے اور یہ ساری بازیگری کسی کام نہ آیگی ایسے میں جوش ملیح آبادی کا ایک شعر معمولی سی ترمیم کے ساتھ ان پر صادق آجایگا

سر کرنے پھر چلا تھا مہم انتخاب کی
ہر سانس میں شکست کی دنیا لئے ہوئے

روح امم کی ممات کشمکش انتخاب

ہندوستان میں منعقد ہونے والے حالیہ ریاستی و ضمنی انتخابات میں ہر سیاسی گروہ کیلئے کوئی نہ کوئی اطمینان کا پہلو موجود ہے اور وہ اس پر شادمان ہے۔ گویا کہ ایک ''فیل گڈ'' کی سی صورتحال ہے۔ اس لئے کہ انتخابی سیاست میں لوگ نہ صرف اپنی فتح سے خوش ہوتے ہیں بلکہ اپنے دشمن کی ناکامی پر بھی بغلیں بجاتے ہیں اس سے قطع نظر کہ اسے شکست سے کس نے دوچار کیا ہے۔ ان انتخابات میں چونکہ سب کچھ توقع کے مطابق ہوگیا اس لئے مبصرین کیلئے بھی کچھ زیادہ سمجھنے سمجھانے کا موقع نہیں رہا۔ بظاہر کانگریس پارٹی کو پانچ میں سے دو ریاستوں میں راست کامیابی ہوئی اور ایک میں اسکی حلیف ترنمول جیت گئی اس طرح کل ملا کر تین کامیابیاں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کانگریس پانچوں ریاستوں میں کامیاب ہو گئی ہے۔ پڈوچیری کے رنگا سوامی فروری تک کانگریس میں تھے اوراس سے قبل کانگریس کی بدولت کئی مرتبہ مختلف وزارتیں بشمول وزارت اعلیٰ پر براجمان رہ چکے ہیں دو سال قبل ان کو کانگریس نے ہٹایا اور دو ماہ قبل انہوں نے بغاوت کرکے اپنی علٰحیدہ پارٹی بنائی تاکہ کانگریس کو سبق سکھلایا جاسکے۔ کانگریس کو انہوں نے دھول چٹادی اورانتقام لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اب کانگریس والے ان سے

پھر پینگیں بڑھائیں گے اور جلد ہی وہ سسرال سے میکے لوٹ آئیں گے۔ جئے للیتا کے معاملے میں بھی یہی ہوگا۔ سب سے پہلے کانگریس پارٹی ڈی ایم کے سے خلع حاصل کریگی اور پھر اے آئی ڈی ایم کے سے بیاہ رچالے گی۔ یہ شادی خانہ آبادی دونوں کیلئے فائدے کا سودہ ہے۔ تمل ناڈو میں کانگریس کا اپنا تو یہ حال ہے کہ فلمی اداکار وجئے کانتا کی نو زائیدہ ڈی ایم ڈی کے نے بھی اس سے پانچ گنا زیادہ نشستیں حاصل کی ہیں ایسے میں کرونا ندھی کے خزاں رسیدہ درخت سے امر بیل کی مانند لپٹے رہنے بہتر ہے کہ اماں کی چھتر چھایا میں پناہ لی جائے۔ ویسے ملک کے وزیر داخلہ چدمبرم کی اپنی ریاست میں ان کی پارٹی کا یہ حال برسراقتدار جماعت کیلئے شرمناک ہے۔ لیکن سیاست کے گلشن میں شرم نام کی چڑیا پر نہیں مارتی۔

آئی پی ایل کرکٹ سرکس اور ہندوستانی سیاست میں بڑی زبردست مشابہت ہے۔ کرکٹ کے موسم کا آغاز کھلاڑیوں کی نیلامی سے ہوتا ہے۔ بولیاں لگتی ہیں اور اونچی قیمت پر اپنے آپ کو فروخت کرکے نامور کھلاڑی مختلف ٹیموں سے جڑ جاتے ہیں اور پھر ان ٹیموں کے درمیان جیت ہار کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی سیاست میں انتخاب سے قبل بولیاں لگتی ہیں ایمان بکتے ہیں اور مادی مفاد کی بنیاد پر نت نئے رشتے بنتے

اور بگڑتے ہیں۔ سیاسی اکھاڑے میں بھانت بھانت کی ٹیمیں خم ٹھونک کر اتر جاتی ہیں اور موسمی مینڈک کی مانند ٹرانے لگتی ہیں۔ ان سیاسی جماعتوں میں سر فہرست قدیم ترین فرقہ پرست کانگریس اور پھر دوسرے نمبر پر فسطائیت نواز بی جے پی۔ان دونوں کا دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ قومی جماعتیں ہیں لیکن اصل میں ان کی حیثیت بھی علاقائی ہو گئی ہے فرق صرف یہ ہے کہ دیگر علاقائی جماعتوں کے بالمقابل جن کا وجود کسی ایک ریاست تک محدود ہو یہ ایک سے زائد ریاستوں کی علاقائی جماعتیں ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے ایسی بھی کئی ریاستیں ہیں جن میں ان کی حیثیت علاقائی جماعت کے بغل بچہ کی سی ہے مثلاً تمل ناڈو، بہار یا بنگال۔ نظریاتی سطح پر ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہاں طریقہ کار کچھ تھوڑا سا مختلف ہے ایک اقلیتوں کے خلاف علیٰ اعلان تشدد کو بھڑکاتی ہے اور دوسری پس پردہ اس کو ہوا دیتی ہے گویا ایک گرم شعلوں سے جلاتی ہے اور دوسری ٹھنڈی آنچ سے جھلساتی ہے۔احساس کا فرق ضرور ہے لیکن نتائج یکساں برآمد ہوتے ہیں۔ بابری مسجد ہو مسلم نوجوانوں کا انکاؤنٹر ہر دوصورت میں بی جے پی اور کانگریس کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ایک ممبئی کے فسادات سے متعلق شری کرشنا کمیشن کی رپورٹ کو ڈنکے کی چوٹ پر کچرے کی ٹوکری میں پھینک دیتی ہے اور دوسری عدالت عالیہ میں اس کی خاطر خواہ پیروی سے صرفِ نظر کرکے اس پر عملدرآمد میں رکاوٹ پیدا کردیتی ہے

نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ نہ تو بابری مسجد کی اراضی مسلمانوں کو ملتی ہے اور نہ ہی ممبئی میں فساد برپا کرنے والے ہندوؤں کو سزا ہی ملتی ہے ہاں ممبئی بم بلاسٹ میں معصوموں کو برسوں تک جیل میں رکھنے پر دونوں کا اتفاق ہے اور اس معاملے میں وہ ایک دوسرے کا بھرپور تعاون کرتی ہیں۔

ان دو جماعتوں کے علاوہ مختلف علاقائی موقع پرست جماعتیں ہیں جن کا نظریہ حیات ہے چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی "ان کا کام کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کرنا یا اس" میں حصہ دار بن کر رہنا ہے۔اس لئے یہ کبھی بی جے پی تو کبھی کانگریس کے ساتھ ہو لیتی ہیں۔ اب اس امر کی پیشن گوئی کرنے کیلئے کسی نجومی کی ضرورت نہیں کہ آئندہ قومی انتخابات میں جے للیتا کانگریس اور کرونانِدھی بی جے پی کیساتھ ہوں گے اور اگر کانگریس الیکشن ہار جاتی ہے تو اماّں پھر پینترا بدل کر بی جے پی کی ہمنوا بن جائینگی بلکہ بنگال کی دیدی بھی ایسا کرنے سے گریز نہیں کرینگی۔ اشتراکیت پسند بظاہر اپنے آپ کو علاقائی جماعتوں سے مختلف گروہ قرار دیتے ہیں لیکن سوویت یونین کے خاتمہ اور چین کی سرمایہ داری نے ان بیچاروں کو بنیادیں ہلا کر رکھ دیں نیز بدھ دیو بھٹا چاریہ نے اس دعویٰ کی بھی نفی کر دی کہ 'ہم ان سے مختلف ہیں' اس لئے اب اس کا شمار بھی

علاقائی جماعت میں ہونا چاہئے جس کا اثر کیرالا بنگال اور تریپورہ پر محیط ہے۔ ان کے علاوہ مسلم جماعتیں بھی ہیں مثلاً مسلم لیگ، اتحاد ملت، یونائیٹڈ فرنٹ اور ایم ایم کے وغیرہ جو فسطائیت کے خلاف فرقہ پرستوں اور موقع پرستوں کے درمیان جھولتے رہتے ہیں۔ تو گویا ان چاروں اقسام کی جماعتوں کیلئے ان انتخابات کے نتائج میں مسرت کا کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہے۔

کانگریس کو سب سے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ وہ آسام میں وہ تیسری مرتبہ اپنا اقتدار قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئی لیکن آسام گن پریشد اور اسکی حلیف بی جے پی کی خستہ حالی کے پیش نظر توقع بھی یہی تھی۔ اے جی پی فی الحال پوری طرح کوما میں ہے اس کا نام انتخابات کے علاوہ کبھی بھی سننے میں نہیں آتا اور بی جے پی اس کی بیسا کھیوں پر سوار ہو کر انتخاب لڑنے کی کوشش کرتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا اجمل کی یونائیٹڈ فرنٹ اور بوڈو لینڈ پارٹی بھی اے جی پی سے زیادہ نشستوں پر کامیابی حاصل کر لی۔ ویسے یونائیٹڈ فرنٹ کو بیک وقت خوشی اور غم سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تو ضرور ہوا کہ پہلی مرتبہ اسے ریاست میں حزب اختلاف کی رہنمائی کا موقع ہاتھ آیا لیکن اے جی پی اور بی جے پی کی مایوس کن کارکردگی پر اسے افسوس ضرور ہوا ہوگا۔ اگر اس بار وہ

دونوں مزید بیس نشستوں پر کامیاب ہو جاتے تو کانگریس کو اکثریت حاصل کرنے کیلئے یونائیٹڈ فرنٹ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا اور اس صورت میں بھی حکومت تو بہر حال کانگریس ہی کی بنتی لیکن فرنٹ کے کچھ ممبرانِ اسمبلی کو وزیر بننے کا موقع بھی مل جاتا یہ سوئے اتفاق ہے کہ مسلمانوں کے دشمنوں کی ناکامی نے ایک مسلم سیاسی جماعت کو اقتدار میں حصہ داری سے محروم کر دیا۔ اب عقل عام کیا کہتی ہے یونائیٹڈ فرنٹ کو بی جے پی کی کمزوری کی دعا کرنی چاہئے یا اسے تقویت دینے کی کوشش کرنی چاہئے؟ ویسے کسی مسلم جماعت کے اپوزیشن کی سب پارٹی بن جانے کو بھی بھولا بھالا عام مسلمان اپنے لئے باعثِ سعادت ہی سمجھتا ہے۔

آسام کی محرومی کا ازالہ بڑی حد تک کیرالہ میں ہو گیا۔ وہاں مسلم لیگ متحدہ محاذ میں دوسرے نمبر کی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری اب اگر کانگریس کے ۳۷ ممبرانِ اسمبلی ہیں تو مسلم لیگ کے نصف سے زیادہ یعنی ۲۰ ہیں اس طرح صرف چار کے فرق سے اقتدار سنبھالنے والا متحدہ محاذ اگر مسلم لیگ کو نائب وزارت اعلیٰ کی کرسی نہ دے تو یہ یقیناً حیرت کی بات ہو گی۔ اس طرح کی صورتحال میں بے چارہ عام مسلمان جو انتخابی سیاست کے پیچ و خم سے واقف نہیں ہوتا یہ دیکھ کر پریشان ہوتا ہے کہ دو قطبی ماحول میں مسلم جماعتیں متحد ہو کر کسی ایک کا ساتھ دینے کے بجائے مخالف

خیموں میں ایک دوسرے سے بر سرپیکار ہو جاتی ہیں۔ اس غریب کی سمجھ میں یہ نہیں آتا انتخابی سیاست بھی تجارت کی مانند ہے جہاں ایک کمپنی بیک وقت دو حریف دوکانداروں کو اپنا ایجنٹ نہیں بنا سکتی اس لئے دونوں حریف ایجنٹوں کو حریف سرمایہ داروں کی ایجنسی لینی پڑتی ہے۔ اب اگر مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ ہے تو بھلا کسی اور مسلم سیاسی جماعت کو وہ کیوں منہ لگائے گی اور صورت میں اس جماعت کیلئے کانگریس کے حریف خیمے میں جانے کے علاوہ اور کوئی اور چارۂ کار کیونکر ہو گا اب اس مجبوری کے پیش نظر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی بدعنوان سے ہاتھ ملانا پڑے یا نظریاتی دشمن کی تائید کرنی پڑے اسی کو انتخابی مجبوری کہتے جسے لوگ از خود اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہیں۔ اس مجبوری کے تحت اکثر ملی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے لیکن انتخابی سیاست میں اپنی جماعت کا فائدہ قومی و ملی مفاد سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

اشتراکیوں کو اس بار دوہرہ زخم لگا لیکن یہ بھی توقع کے مطابق ہی تھا۔ کیرالہ میں ہر پانچ سال کے بعد اقتدار سے بے دخل ہونے کی روایت اس طرح قائم ہوئی ہے کہ اگر اس میں انحراف ہوتا تو وہ حیرت کی بات ہوتی۔ ویسے کمیونسٹوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وزیر اعلی اچھوت آنند انہیں جیت کا آنند نہیں دلا سکتے اس لئے انہیں انتخاب سے پہلے ہی اچھوت بنا

کر دور کر دیا گیا لیکن وہ پینترہ بھی کام نہ آیا اور کیرالہ کی روایت برقرار رہی۔ مغربی بنگال میں گذشتہ پارلیمانی انتخاب کے دوران ہی اس بات کا ندازہ ہو گیا تھا کہ سرخ سورج روبہ زوال ہے۔ دراصل بنگال کی ناکامی کو لوگ بدھا دیو کے سر منڈھ رہے اور کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے گوربا چیف کی طرح اشتراکی نظریات سے انحراف کیا اور اسکی سزا خود بھی پائی اور پارٹی کو بھی شکست سے دوچار کیا حالانکہ بدھا دیو نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جو اشتراکی روایات کے خلاف ہو ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جلد بازی کی ۔ اشتراکی طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے مزدوروں کو متحد کرکے ان کی طاقت کے بل بوتے پر انقلاب لاؤ اور پھر اپنے مخالفین کو انقلاب کا دشمن قرار دے کر ان کا قلع قمع کر دو۔ اس کے بعد سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر انہیں محنت کشوں کا استحصال کرو۔ یہی کچھ ان لوگوں نے سابقہ سوویت یونین میں اور پھر چین میں کیا۔ بدھا دیو نے یہ کام انقلاب سے قبل شروع کر دیا اور نندی گرام میں اپنے چہرے پر پڑی خوشنما نقاب خود اپنے ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دی نتیجہ یہ ہوا کہ خود اپنی سیٹ بھی نہیں بچا پائے ۔ اشتراکیوں نے دیہی علاقوں میں ایک زبردست مافیا قائم کر رکھی تھی جس کی کمر توڑنے کا عظیم کارنامہ ممتا بنرجی نے انجام دیا اس کیلئے وہ یقیناً مبارکباد کی مستحق ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اشتراکیوں کے چالیس فی صد ووٹ محفوظ ہیں اور وہ پر امید ہیں اگلی مرتبہ

جب لوگ ممتا سے مایوس ہوں گے تو پھر ان کے بھاگ کھلیں گے اور کیرالہ میں وہ ریاستی روایات کے چلتے پھر ایک بار اقتدار پر قابض ہو جائیں گے ویسے بھی عوام کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے ورنہ وہ دوبارہ جئے للیتا کو بدعنوانی کے مدعے پر اقتدار نہیں سونپتے۔ ممتا بنرجی نے جس طرح دل کھول کر مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا اسے دیکھ کر نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ مسلمان اس بات سے بھی بہت خوش ہیں کہ اس بار بنگال اسمبلی مسلم ممبران کی تعداد ۲۰ فی صد سے زیادہ ہوگی لیکن اس سے پہلے بھی یہ تعداد کم نہیں ہوتی تھی ۴۵ سے زیادہ وہ پہلے بھی تھے اور ریاست میں ایک نام نہاد مسلم نواز پارٹی نے ۳۴ سال حکومت کی اس کے باوجود سچر کمیشن نے یہ انکشاف کیا کہ مغربی بنگال کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب مودی کے گجرات سے کم ہے اس لئے اگر مسلمانوں اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ ان کے ممبران کی تعداد میں اضافہ یا ان کی نام نہاد ہمدرد حکومت سے ملت کا کوئی بھلا ہو جاتا ہے تو انہیں اپنی طرزِ فکر کی اصلاح کر لینی چاہئے۔

اس بار اتفاق سے جن ریاستوں میں انتخابات ہوئے ان میں ایسی ایک بھی ریاست نہیں تھی جہاں بی جے پی مضبوط ہو۔ اس لئے وہ حاشیے پر رہی یہ لیکن کرناٹک جہاں بی جے پی کی ریاستی حکومت کو اندر سے بغاوت کا سامنا

ہے۔اس کے ۱۱ ممبران اسمبلی کے پارٹی سے استعفیٰ دینے سے حکومت اقلیت میں آگئی ہے اس کے باوجود ضمنی انتخاب میں تینوں نشستوں پر اپنی زبردست کامیابی درج کروا کر بی جے پی نے ثابت کر دیا کہ اس کے اپنے گڑھ میں وہ اب بھی مضبوط ہے اور وزیر خارجہ کرشنن ملک سے باہر جو کچھ بھی کرلیں لیکن اپنی ریاست میں بری طرح ناکام و نامراد ہیں۔اس بار پڈوچیری کی طرح آندھرا پردیش میں وائی ایس آر کے بیٹے جگن موہن ریڈی نے کڑپا پارلیمانی حلقے سے کانگریس اور ٹی ڈی پی دونوں کے امیدواروں کی ضمانت ضبط کروا کر کانگریسی رہنماؤں کی نیند اڑادی ہے۔ جگن موہن نے اپنے باپ کی موت کے بعد وزارت اعلیٰ کی کرسی پر اپنی دعویداری پیش کی تھی جسے کانگریسی اعلیٰ کمان نے ٹھکرادیا لیکن اب پانچ لاکھ چالیس ہزار ووٹوں سے اپنی کامیابی درج کروا کر اس نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس کو یہ سودہ مہنگا پڑ سکتا ہے۔

ٹی وی کے پردے پر جب مختلف جماعتوں کے کارکنان کو ناچتے گاتے دکھلایا جارہا تھا اس وقت مرکز کے کانگریسی رہنما سرمایہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر ملک کی عوام کا اپنے خاص انداز میں شکریہ ادا کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب لوگوں پر سے کامیابی کا خمار اترا تو انہیں پتہ چلا کہ پٹرول کی قیمت میں پانچ روپے کا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ اضافہ اب اس قدر جلدی

جلدی ہونے لگا ہے کہ عام آدمی کیلئے گذشتہ ایک سال کے اندر ایندھن کے اخراجات دو گنا ہو چکے ہیں اور عوام یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کا اثر اشیاء خوردونوش کی قیمتوں پر بھی اس کا اثر یقیناً پڑے گا۔ ویسے اب بیچاری کانگریس بھی کرے تو کیا کرے؟ اسے ان سرمایہ داروں کو اپنا روپیہ وصول کرنے کا موقع تو دینا ہی ہے جنھوں نے پچھلے انتخابات میں چندہ دیا تھا بلکہ اگلے انتخابات تک کمانے کا موقع بھی دینا ہے تاکہ پھر دوبارہ چندہ لیا جاسکے ۔کانگریسی رہنما جگدمبیکا پال کے مطابق بین الاقوامی سطح پر تیل کی قیمت میں اضافے کے سبب صارفین پر یہ بوجھ ڈالنا پڑا لیکن بین الاقوامی بازار میں جب تیل کی قیمت کم ہوتی ہے تو اس وقت حکومت کو عوام کا خیال نہیں آتا۔ان کو راحت پہونچانے کے بجائے جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والے عوام نمائندے تیل کی قیمت میں کمی کو اپنے لئے رحمت جان بناکر اس منافع کو اپنے سوئیس بنک کھاتوں میں عوام کے نام پر جمع کردیتے ہیں تاکہ ان کی پشت در پشت اس پر عیش کرسکے۔ انتخابات کے بعد عوام الناس کا استحصال یہ پہلی مرتبہ نہیں ہورہا ہے بلکہ گذشتہ ۶۱ سالوں سے یہ عمل بدستور جاری ہے لیکن اس کے باوجود لوگ اس جنجال سے نکلنے کے بجائے اس میں پھنستے بلکہ دھنستے جارہے ہیں ۔ علامہ اقبال نے تو کہا تھا ’جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی‘ لیکن ہمارے آج کل کے دانشوروں نے انقلاب کو انتخاب سے بدل دیا ہے حالانکہ حقیقت تو یہ ہے

کہ جس طرح 'روح امم کی حیات کشمکش انقلاب' ہے اسی طرح 'روح امم کی ممات کشمکش انتخاب' ہے۔

شاخ نازک پہ آشیانہ

امریکی ذرائع ابلاغ میں اسامہ بن لادن کے بعد ایک افریقی مسلم مطلقہ محترمہ نفیسہ تاؤدیالو موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔گیانہ سے تعلق رکھنے والی یہ ۳۲ سالہ مہاجر خاتون اپنی جوان بیٹی کے ساتھ برونکس میں رہتی ہے اور نیویارک کے امیر ترین علاقے مین ہیٹن میں واقع سوفی ٹیل ہوٹل میں ملازمت کرتی ہے۔اس کا الزام ہے کہ ہوٹل کے ایک گاہک نے اس پر دست درازی کی۔ اگر وہ دست درازی کرنے والا شخص ایک عام آدمی ہوتا تو شاید یہ سرے سے کوئی خبر ہی نہیں بنتی اس لئے کہ جنس زدہ امریکی معاشرے میں عصمت دری ایک معمولی جرم ہے جو آئے دن سرزد ہوتا رہتا ہے قومی اعدادو شمار کے مطابق ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر منٹ کے اندر ۱.۳ خاتون کی عصمت دری ہوتی ہے گویا ہر گھنٹہ میں ۷۸ اور سالانہ ۶۸۳۲۸۹ خواتین کو اس اذیت ناک جرم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ سروے کے دوران یہ خوفناک حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ اس نام نہاد ترقی یافتہ ملک میں ہر تین میں سے ایک خاتون کو اپنی زندگی ایک بار اس طرح کی صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ہر چار میں سے ایک طالبہ یا تو اس ظلم کا شکار ہوتی ہے اس پر حملہ ہوتا ہے۔گو کہ نفیسہ کا تعلق نیگرو نسل سے ہے لیکن اعدادو شمار اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ عصمت دری کا شکار ہونے والوں میں ۸۱ فی صد گوری اور صرف ۱۸

فیصد کالی خواتین ہیں۔امریکہ اس معاملے میں جرمنی سے چار گنا اور برطانیہ سے ۲۰ گنا آگے ہے۔

نفیسہ کے معاملے میں چونکہ ملزم بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کا سربراہ ڈومنق سٹراس کاہن تھا جسے اب ذلیل و خوار کرکے اس کے عہدے سے سبکدوش کردیا گیا ہے۔اس لئے یہ عالمی سطح پر ایک بہت بڑی خبر بن گئی۔کاہن کو اول تو گرفتار کیا گیا اور پھر اسے ہتھکڑیوں سمیت میڈیا کے سامنے پیش کردیا گیا۔اس کے بعد اس کی دس لاکھ ڈالر کی درخواستِ ضمانت مسترد کرکے اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دیا گیا اس خیال سے کہ ۶۲ سالہ امیر کبیر، لحیم شحیم سرمایہ دار کہیں فرار ہوکر اپنے ملک فرانس نہ پہونچ جائے۔فرانس کے اندر کسی مجرم پر ہاتھ ڈالنا امریکہ کے بس کی بات نہیں ہے۔یہ تو صرف زرداری کی لاچاری کے چلتے پاکستان میں ہوسکتا ہے یا پھر مشرف جیسا بے ضمیر جنرل سینہ پھلا کر بڑے فخر سے اس طرح کی رسوائی کو برداشت کرسکتا ہے۔اب ناقدین کا یہ اعتراض ہے کہ امریکی انتظامیہ کو چاہئے تھا کہ اسامہ بن لادن کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلاتے جو گوناگوں وجوہات کی بناء پر وہ نہ کرکے تو اب کھسیانی بلی مانند اپنے عدلیہ کو مصروف رکھنے اور اپنے ملک قانون کی بالادستی کا ڈنکا بجانے کی خاطر کاہن کو بلی کا بکرہ بنایا جارہا ہے۔

اس موقع پر یہ سوال بھی کیا جارہا ہے کہ امریکی انتظامیہ نے جس چستی اور پھرتی کا مظاہرہ ڈومنسق کاہن کے معاملے میں کیا ویسا کچھ صدر بل کلنٹن کے ساتھ کیوں نہ ہوا ؟جبکہ وہ ان پر بھی اسی طرح کا لزام دورانِ صدارت نہ صرف لگا بلکہ ثابت بھی ہوگیا۔
معاشی میدان میں ابھی گزشتہ ہفتہ امریکی انتظامیہ نے وہاں کے پانچ بڑے بنکوں کو تقریباً ۳۰ بلین ڈالر کے گھپلے پایا لیکن ان کے سربراہان کے ساتھ بھی ایسا کوئی معاملہ نہیں ہوا۔ اس سے قبل امریکی شیئر بازار (وال اسٹریٹ) سے ایک ٹریلین ڈالر چرا کر امریکہ کو معاشی کساد بازاری کے شعلوں میں جھونکنے والے سرمایہ دار بھی اس طرح کے سلوک سے محفوظ و مامون رہے۔۔برٹش پٹرولیم کے سربراہ ٹونی ہیورڈ جو بحیرہ برازیل میں عظیم ماحولیاتی تباہی کے مجرم ہیں اس طرح کی رسوائی سے بچے رہے بلکہ جارج بش جو اپنی حماقت کے سبب دس لاکھ عراقیوں کی ہلاکت کا سبب بنا اس کی جانب بھی عدلیہ نے کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ تو ایک ایسا جنگی مجرم ہے جس پر نہ صرف امریکہ بلکہ ہیگ کی بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہئے۔
ایک اور اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عالمی بنک کا سربراہ رابرٹ ذوئلک جو امریکی شہری ہے اگر فرانس کے اندر اسی طرح کے الزام میں گرفتار ہوا ہوتا اور اسے میڈیا کے سامنے اس طرح رسوا کیا جاتا۔ اس کی ضمانت رد کرکے

اسے جیل بھیج دیا جاتا تو کیا یہ امریکی ذرائع ابلاغ جو کاہن کے خلاف تین دنوں میں مضامین لکھ کر اسے مجرم ٹھہرا چکا ہے۔ رابرٹ کی بھی اسی طرح کردار کشی کر ۳۰۰۰ رہا ہوتا ؟ یا اس کی فوری رہائی کی گہار لگا رہا ہوتا ؟ نیز فرانس کے اندر انسانی حقوق کی پامالی کا چرچا کر رہا ہوتا ؟ ذارئع ابلاغ کو چھوڑیں جس کی حیثیت فی الحال ڈگڈگی بجانے والے مداری کی سی ہو گئی ہے تصور کریں کہ اس فرضی صورتحال میں امریکی حکومت کا رد عمل کیا ہوتا ؟ جو انتظامیہ ریمنڈ ڈیوس جیسے سفاک کرائے کے قاتل کو چھڑانے کیلئے اپنی کانگریس کے تین تین وفد روانہ کر دیتا ہے وہ اپنے ملک کے اس قدر اہم سرمایہ دار کیلئے کیا کچھ نہیں کرتا ؟ صدر اوبامہ کا سرکوزی کو فون کتنے منٹ کے اندر موصول ہوجاتا؟ اور اس پر پتھر اور نہ جانے کس کس زمانے میں پہنچا دینے کی دھمکی دی جاتی ۔ ان گیدڑ بھپکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اگر نکولس سرکوزی اپنے موقف پر اڑا رہتا تو کتنی دیر میں ان کے ملک میں امریکی فوج داخل ہوجاتی اور پیرس کے آسمان سے ایف ۱۶ وڈرون کی بارش شروع ہو جاتی ؟ ایسے میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرانسیسی صدر سرکوزی نے ایک رسمی سا سہی احتجاج کیوں نہیں درج کروایا؟ کم از کم ایک فون کرکے یا اخباری بیان جاری کرکے کاہن کو اپنے ملک بھجوانے اور اس پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا ؟ یہ تو کم از کم اقدامات ہیں جنھیں فرانس جیسی ویٹو پاور رکھنے والی ایٹمی طاقت تو کجا ہندوستان جیسا مسکین ملک بھی کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ

ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور اس کی وجہ امریکہ کا خوف نہیں بلکہ فرانس کی داخلی جمہوری سیاست ہے۔

فرانس میں آئندہ سال انتخاب ہونے والے ہیں اور اباحیت پسند سرکوزی کو پھر ایک بار انتخاب میں کامیابی حاصل کرنی ہے۔ فسطائی ذہن کے مالک اس شخص نے برسوں تک مسلم دشمنی اور نسلی امتیاز کی بنیاد پر اپنی سیاسی دوکان چمکائی لیکن اب انتخابی شکست کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔اسی لئے اپنے بدمزاج رائے دہندگان کی دلجوئی کیلئے اس نے برقعہ کے خلاف ہوّا کھڑا کیا اور پھر حجاب مخالف قانون منظور کروا کر ان کی تسکین کا سامان کیا۔ اس کے بعد لیبیا میں ناٹو کے ساتھ پیش قدمی کرکے اپنے آپ کو نپولین کا حقیقی وارث ثابت کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ سرکوزی کی اس اٹھا پٹخ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جمہوریت میں اپنی عوام کو بے وقوف بنانے کیلئے سیاستدانوں کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشی ابتری اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔ایسے میں ان کی قدامت پرست یو ایم پی کے خلاف محاذ آرا سوشلسٹ پارٹی کا سب سے طاقتور امیدوار کوئی اور نہیں بلکہ ڈومنک سٹراس کاہن ہی تھا جو آئندہ ماہ سے اپنی پارٹی کی باقائدہ مہم کا آغاز کرنے والا تھا۔ بین الاقوامی مالی ادارے کا صدر اور سوشلسٹ پارٹی کا امیدوار یہ دونوں باتیں ان لوگوں کو متضاد ضرور لگیں گی جو اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ سیکولر

انتخابی سیاست میں اصول و نظریہ نام کی کوئی شہ پائی جاتی ہے۔کاہن ایک سوشلسٹ دانشور کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔فرانس کی سوشلسٹ پارٹی میں اس کا اعلیٰ و ارفع مقام ہے اور دنیا بھر کے سرمایہ داروں سے اس کے گہرے مراسم بھی ہیں جنکی وہ اپنے ادارے کے ذریعہ دامِ درہمِ سخنِ قدمِ مدد کرتا رہتا ہے تاکہ وہ سارے عالم کا استحصال جاری و ساری رکھ سکیں۔اس طرح گویا سرکوزی کو اپنے سب سے طاقتور حریف سے نجات حاصل ہو گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کاہن کی گرفتاری پر مضطرب و بے چین ہونے کے بجائے شاداں وفرحاں ہے۔اس واقعہ سے قبل سرکوزی مقبولیت محض ۲۱ فی صد تھی اور کاہن کی ۲۶٫۵ فی صد گویا ان دونوں کے درمیان ۵٫۵ فی صد کا فرق تھا لیکن اب جبکہ کاہن دوڑ سے باہر ہوچکا ہے اس کی جگہ لینے والے سوشلسٹ امیدوار فراکوس ہالنڈی کو صرف ایک فی صد کی سبقت حاصل ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ فی الحال سرزمین فرانس میں انتہا پسند لی پین سب زیادہ مقبول چل رہی ہیں لیکن مسلمانوں نے اندر انتہا پسندی کا شور مچانے والے مغرب کو ہندوستان کے اڈوانی اور فرانس کے لی پین سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

فرانس کے اندر کاہن کی گرفتاری کے حوالے سے مختلف قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں جن سے اس قوم کے فکری انحطاط و اخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ کاہن جیسا عیاش شخص ایک افریقی ملازمہ کیلئے اپنے

سیاسی مستقبل کو داؤں پر نہیں لگا سکتا اس لئے ممکن ہے وہ کسی خوبصورت امریکی طوائف کا انتظار کر رہا ہوگا اور ایسے میں غلطی سے وہ ملازمہ وہاں پہنچ گئی تیز کاہن اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ گویا غلطی کاہن کی نہیں ملازمہ کی ہے۔ کاہن کا کسی طوائف کا انتظار کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو کسی قدر افسوس کاہن کے انجام سے تو ہے لیکن افریقی ملازمہ سے انہیں کوئی ہمدردی نہیں اس لئے کہ یہ بیچارے کسی خاتون کو انسان ہی کب سمجھتے ہیں ؟ صنف نازک تو ان کیلئے نمائش و سامانِ تلذّذ سے زیادہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی اسی لئے وہ انہیں ہمیشہ بے حجاب رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سال کے اوائل میں خود کاہن کا اعتراف اس خیالِ خام کی تردید کرتا ہے ۔ کاہن نے پیرس سے شائع ہونے والے دائیں بازو کے روزنامہ لبریشن (حریت) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ صدارت کی دوڑ میں اس کے راستے کی تین کی رکاوٹیں ہیں دولت، عورت اور میرا یہودی ہونا''فرانس کے دیہی علاقوں میں آج بھی یہودیوں'' کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے اور انتہا پسند لی پین اس کا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ لیکن کاہن کی پیش گوئی اس حد تک سچ ثابت ہوئی کہ انتخاب سے قبل ہی اس کی زن پرستی نے اس کی لٹیا ڈبو دی اور اس کے دھن دولت کے خزانے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

فرانس کی عوام کے اندر سوشلزم کا حامی طبقہ قوم پرست فرانسیسی عوام سے دو

ہاتھ آ گیا ہے۔ان کے خیال میں نفیسہ سی آئی اے کی ایجنٹ ہے۔ چونکہ امریکی انتظامیہ صدر سرکوزی کا حامی ہے اس لئے اس نے جان بوجھ کر یہ سازش رچی اور کاہن کا سیاسی مستقبل تباہ و برباد کر دیا تاکہ ۲۰۱۲ کے انتخابات میں سرکوزی کی مشکلات کم کی جا سکیں اور وہ پھر ایک بار آسانی سے منتخب ہو جائے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے نیویارک کے بڑے ہوٹلوں میں صفائی کی خاطر کوئی ملازم تنہا کمرے میں نہیں جاتا بلکہ وہ کم از کم دو ہوتے ہیں اور خاص طور پر کاہن جیسی نہایت اہم شخصیت کے کمرے میں تو کوئی اکیلے جا ہی نہیں سکتا گویا یہ نام نہاد اہم ترین شخصیات انسان نہیں بلکہ خونخوار درندے ہیں۔ان کے مطابق پولس کی بیجا سختی اور میڈیا کی غیر معمولی دلچسپی بھی اس امر کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ نفیسہ کوئی 'ماتا ہاری' نہیں ہے جو حقیقت میں فرانس کی ایجنٹ تھی لیکن پہلی جنگ عظیم کے دوران جسے جرمنی کیلئے جاسوسی کرنے کا الزام لگا کر فرانسیسی فائرنگ اسکواڈ نے ۱۹۱۷ میں گولیوں سے بھون دیا گیا تھا اور بعد میں پتہ چلا کہ اس پر لگایا جانے والا الزام بے بنیاد تھا اور وہ معصوم تھی۔

ایک تازہ سروے کے مطابق فرانس کے ۷۰ فی صد سوشلسٹ رائے دہندگان کے خیال میں کاہن معصوم ہے اور ۵۴ فیصد عام ووٹرس بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ اس کو سیاسی سازش میں پھنسایا گیا ہے گویا ۳۰ گھنٹے جیل میں گزارنے کے بعد بھی فرانسیسی

رائے عامہ کاہن کے حق میں ہے۔یہ مغرب کے اس ملک کا حال جہاں سے کسی زمانے میں یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تھا۔جس نے مغرب کو حریت و جمہوریت سے نوازہ۔کاہن کے واقعہ نے اس حقیقت کھول کر سامنے رکھ دیا ہے کہ لادینیت کی شاخ نازک پر مغربی جمہوریت کا یہ ناپائیدار آشیانہ فی الحال آندھی کی زد میں ہے۔اس کے باوجود اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت اقتدار کی منتقلی کا مہذب ترین طریقہ ہے تو ایسے لوگوں کی مغرب زدگی پر ماتم کرنا صرف اور صرف اپنے وقت کا ضیاء ہے۔

سیاست کے علاوہ کاہن کی اپنی اقتصادی دنیاکے بھی بہت سے لوگ ان واقعات پر خوشی منا رہے ہیں۔ان لوگوں کا تعلق ابھرتی ہوئی معیشتوں سے مثلاً ہندوستان، جنوبی افریقہ اور ترکی وغیرہ۔کاہن کے جانشین کی طور پر ترکی کے کمال درویش کی دعویداری سب سے پہلے سامنے آئی اور اس کے بعد موٹیک سنگھ اہلو والیا کا نام بھی اچھالا جارہا ہے۔یہ ممالک دراصل بین الاقوامی مالی ادارے پر سے یوروپی تسلط کا خاتمہ چاہتے ہیں اور کاہن کا بے آبرو ہوکر کوچے سے نکالا جانا ان کیلئے نعمتِ غیر مرتقبہ بن کر سامنے آیا ہے ۔مشرق کی آپسی رقابت کا فائدہ مغرب اٹھاتا رہا ہے بلکہ وہ مختلف ممالک کے اندر اپنے مفاد کے پیشِ نظر مخاصمت بھی پیدا کرتا رہا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اب ہوا کا رخ بدلنے لگا ہے۔یوروپ وامریکہ کی معاشی ابتری نے کہیں انہیں قلاش کر

دیا ہے تو کہیں وہ قرض کے بوجھ تلے چرمرا رہے ہیں۔ اب دولت کے بازار ان کا وہ رعب داب خاصہ کم ہو گیا ہے۔ماضی کی تاریخ تو یہ ہے کہ گزشتہ ۳۳ سالوں میں سے سال آئی ایم ایف کی سربراہی فرانسیسیوں نے کی۔اس ادارے کے کل ۲۴ ۲۶ ڈائرکٹرس ان میں سے ۹ یوروپ سے آتے ہیں۔۔برازیل سے آنے والا ڈائرکٹر ۹ ممالک کی نمائندگی کرتا جبکہ اس کے ووٹ کی قیمت ۶۔۲ فی صد ہے اس کے بالمقابل امریکہ کے نمائندہ کا ووٹ اس سے چارگنا زیادہ قیمتی ہے لیکن ایسا کب تک چلے گا؟۔اب تو چین بھی اپنی کامیابی کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور یوروپی نمائندوں کی سازش کے باوجود اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ اس بار آئی ایم ایف کے اوپر سے یوروپ اجارہ دارہ ختم کر دی جائیگی۔اگر ایسا ہو گیا تو اس میں یقیناً نفیسہ کا حصہ قابلِ قدر ہو گا۔ ماضی میں اس بدمعاش کی درندگی کا شکار ہونے والی کئی خواتین کو اب ہمت بندھی ہے اور وہ ڈومنق کاہن کے خلاف بیانات دینے لگی ہیں۔ یہ سب اس نام نہاد اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی ترقی پسند خواتین ہیں جن کو آزاد و خود مختار سمجھا جاتا ہے لیکن ان میں سے کسی نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف منہ کھولنے کی جرأت نہیں کی اس میدان میں بھی الم بغاوت بلند کرنے کا شرف مظلوم و مقہور گردانی جانے والی مسلم خاتون نفیسہ کے حصہ میں آیا۔ یہ تلخ حقیقت یوروپ اور امریکہ کیلئے تازیانۂ عبرت ہے

۔

بی جے پی کی رامائن سے مہابھارت کی جانب رتھ یاترا

وکی لیکس کی مثال پنڈورا نامی اس صندوق کی سی ہے جس کے بطن سے سے آئے دن نت نئے آسیب نمودار ہوتے تھے اور یہ غیر یقینی مخلوق کب کس سے لپٹ جائے اسکی بھویشیہ وانی مہارشی ویاس کیلئے بھی ممکن نہیں ہو سکتی تھی حالانکہ سنا ہے ویاس جی انتریامی تھے ۔انھوں نے دواپر یگ میں بیٹھ کر تریتا اور ست یگ کے حالات معلوم کر لئے اور نہ صرف ویدوں کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ان کی تدوین جدید کا عظیم کارنامہ انجام دے ڈالا بلکہ ۱۸ پرانوں کی تصنیف کر گزرے جس میں لاکھوں اشلوک پائے جاتے ہیں وکی لیکس کے حالیہ انکشاف کے بعد جس میں ارون جیٹلی کے حوالے یہ کہا گیا تھا کہا انہوں نے ہندوتوا کو محض ایک سیاسی ابن الوقتی قرار دیا ارون جیٹلی سمیت سنگھ پریوار یہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات سراسر غلط ہے لیکن بی جے پی والوں یہ نہیں کہہ رہے کہ ہندوتوا گر سیاسی ڈھکوسلہ نہیں ہے ؟ توآخر کیا ہے؟ یہ مسئلہ نہ صرف اس نظریہ کے ساتھ ہے بلکہ اس دھرم کے ماننے والوں کے ساتھ بھی ہے۔ ہندوستان کا دستور تک اس ہندو کی تعریف بیان کرنے سے قاصر ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ جو مسلمان، عیسائی، جین ، بدھ یا سکھ نہیں ہے وہ ہندو ہے۔ سناتن دھرم کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی حقیقت حکایات میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ جس طرح یہ مذہب انسانوں کو چار طبقات میں ذات پات کی

بنیاد پر تقسیم کرتا ہے اسی طرح یہ انسانی تاریخ کو بھی چار ادوار میں بانٹتا ہے۔ ست یگ، تریتہ، دواپر اور کل یگ۔ تریتا یگ تک اس مذہب کی بنیاد ویدوں پر تھی جس پر یہ لوگ برہما کے اپنے الفاظ کی حیثیت سے ایمان رکھتے تھے لیکن دواپر یگ میں ویدوں کو چار عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا گیا اور اس طرح یجر وید، سام وید، اتھر وید اور رگ وید مرتب ہوئے۔ اس دوران ان تعلیمات میں کس قدر خلط ملط ہوا اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے بعد ویدوں کی تعلیمات کو آسان بنانے کی خاطر ہندو رشی منی ان کی تفسیر بیان کرنے میں جٹ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۰۸ اپنشد تصنیف کر ڈالے گئے لیکن اس کے باوجود ویدوں اور اپنشدوں کو عوام میں قبول عام حاصل نہ ہو سکا تو پھر قصے کہانیوں سے مدد لی گئی اور رزمیہ کتھاؤں پر مشتمل پرُان لکھے جانے لگے اس طرح ۸ اپُران عالمِ وجود میں آ گئے جن میں سے وشنوپُران سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ وشنوپُران کے اندر وشنو دیوتا کے دنیا کو ظلم سے پاک کرنے کی خاطر اور یہاں سے برائیوں کے خاتمے کی غرض سے اوتار بن کر آنے کا بیان پایا جاتا ہے لیکن ان کے تمثیلی و علامتی قصہ ہونے پر سارے ہندو علماء کا اجماع ہے۔

وشنوپُران ہندو عوام کے اندر خاصے مقبول ہو گئے جن میں وشنو کے آٹھ اوتار کا ذکر اور ایک کی پیشن گوئی ملتی ہے۔ ان کہانیوں کے اندر ایک خاص ارتقاء

اور تدریج کا عمل کارفرما دکھلائی دیتا ہے مثلاً پہلے چار اوتار ست یگ کے ہیں ان میں سے تین تو مکمل طور سے جانور کے بھیس میں اور چوتھا نصف انسان اور نصف شیر گویا آدھا جانوراور آدھا انسان ۔پہلی کہانی حضرت نوحؑ کے واقعہ سے متاثر ہے جس میں ساری کائنات کے عظیم سیلاب کی نذر ہوجانے کا اور وشنو کے مچھلی بن کر اسے بچانے کا قصہ ملتا ہے۔ دوسری میں وشنو کچھوا بن کر آتے ہیں اور اس کچھوے کی پیٹھ پر کھونٹہ گاڑ کر دیو اور دانو ارتھ (زمین کا) منتھن کرتے ہیں تاکہ اس میں سے امرت کشید کیا جاسکے ۔تیسری کہانی میں وشنو خنزیر کے بھیس میں تشریف لاتے ہیں اور ساری دنیا کو اپنے سونڈ نما منہ پر اٹھا کر سمندر کی طہ میں چلے جاتے ہیں اور چوتھی میں نرسمھا جو آدھا شیر اور آدھا انسان ہے اپنے دشمن کو پھاڑ کھاتا ہے۔ اب ظاہر ہے اس طرح کی کہانیوں کو مقبول ہونا ہی تھا سو ہوگیا۔

تریتا یگ کے تینوں اوتار اتفاق سے انسان ہیں سب سے پہلا پستہ قد بونا جس کا نام وامنا ہے اپنی چالبازی اور چمتکار کی بنیاد پر دشمن کو زیر کرلیتا ہے۔ وہ تین قدم زمین کا وردان مانگتا ہے اور اپنے قدموں کو پھیلا کر ساری دنیا کو اس کے احاطے میں لے لیتا ہے۔ یہاں کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوتا۔ دوسرا اوتار پرشورام اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے دشمن کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے یہاں تشدد تو ہے سیاست نہیں ہے۔ تیسری کہانی مشہورومعروف رام چندر جی کی

رامائن ہے جس میں سیاست اور اور جنگ دونوں ہے لیکن یہ ایک صاف ستھری داستان ہے جو جنسی زدگی سے پاک صاف ہے۔ اس میں راون کی بہن سپر نکھا لکشمن کو شادی کی پیش کش کرتی ہے اس کے باوجود وہ اس کی ناک کاٹ کر اس سے دور ہو جاتا ہے۔ راون جیسا ولن سیتا کا اغوا کرنے کے باوجود اس پر دست درازی کی جرأت نہیں کرتا لیکن کیکئی کی سیاست بہرحال رامائن کو اپنے پیش رو حکایات سے ممتاز کر دیتی ہے ۔

دواپر یگ میں رام لیلا کرشن لیلا میں تبدیل ہو جاتی ہے اور مہابھارت اس کو بیان کرتی ہے جو ان سب سے آگے نکلی ہوئی ہے۔ یہ جنگ و جدال، سیاسی چال اور جنس پرستی سے مالامال طلسمِ ہوشربا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رامانند ساگر کی رامائن کو بی آر چوپڑہ کی مہا بھارت نے مقبولیت میں مات دے دی اور اس کے بعد دوبارہ سنجے دت نے اسے بنایا اور وہ بھی خاصی کامیاب رہی گویا لوگ ایک ٹی وی ڈرامے میں جو کچھ دیکھنا چاہتے ہیں وہ سارا مسالہ اس میں موجود ہے۔ ویسے ادی شنکر اچاریہ نے بودھ مت کو نگلنے کی خاطر گوتم بدھ کو بھی وشنو کا اوتار قرار دے دیا اور اس طرح وشنو کا نواں اوتار کل یگ میں نمودار ہو گیا لیکن بہت سارے ہندو اب بھی اس کو صحیح نہیں مانتے اور بودھ تو اپنے دین کو ہندو مت سے بغاوت قرار دیتے ہیں جو صد فی صد حقیقت ہے۔

رامائن اور مہابھارت کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اولذکر کہانی میں دشمن غیر ہے اور مؤخر الذکر داستان میں ساری کشمکش اپنوں کے درمیان ہے۔ راون کی ذات برہمن ہے جبکہ رام شتری، رام ہندوستانی ہے راون سری لنکا کا باشندہ گویا ایک شمال تو دوسرا جنوب۔ اس کے برعکس مہابھارت میں ساری سیاست اور ساری جنگ وجدال ایک خاندان کے اندر برپا ہے۔ کورو اور پانڈو چچازاد بھائی ہیں اور ارجن و کرن تو ایک ہی ماں کنتی دو پتر یعنی آپس میں سگے بھائی اس کے باوجود ایک دوسرے سے برسرپیکار۔ کرشنا اپنے ماما کنس کو قتل کرتا ہے تو شکنی اپنی بہن کے سسرال والوں کو رسوا کرتا ہے گویا ایک خانہ جنگی ہے جو ہر سو برپا ہے۔ سنگھ پریوار کو اگر ہندو دھرم کے تناظر میں دیکھا جائے ایسا لگتا ہے کہ جن سنگھ کا زمانہ اس کا ست یگ تھا اس کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کے پہلی ربع صدی اس کا تریتہ یگ تھا جس میں بی جے پی کی پہلی نسل نے رام مندر کی تحریک چلائی اور اس کے بعد کا زمانہ یعنی ۲۰۰۵ کے آگے دواپر یگ جس میں آپسی سرپھٹول اب خانہ جنگی کی شکل اختیار کر گئی ہے اس مرحلے میں ضعیف اور دھرندر آرایس ایس گرو درونا چاریہ کی مانند کوروں کے ساتھ ہے کرشنا کا کردار نائیڈو اور نتیش کمار جیسے لوگ ادا کر رہے ہیں۔

تریتا یگ کی کیفیت اس سے یکسر مختلف تھی اس وقت پارٹی کی توجہ پوری طرح باہر کے راون یعنی کانگریس کو شکست دینے پر مرکوز تھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ

اس دوران بھی آر ایس ایس نے کیکئی کا کردار ادا کرتے ہوئے بڑے بیٹے اٹل بہاری واجپائی کو درمیان ہی میں بنباس پر روانہ کردیا اور اپنے منظورِ نظر اڈوانی کو پارٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ اقتدار حاصل کرنے کیلئے بی جے پی کو ہنومان اور اسکی وانر سینا کی حاجت ہوئی تو وی ایچ پی اور بجرنگ دل کو میدان میں اتارا گیا لیکن اس کے باوجود کانگریسی راون کو شکست دینے میں کامیابی نہیں ہوئی اور ۱۳ دن کی جنگ میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ اس ناکامی کے باوجود پارٹی کے حوصلے بلند تھے اب راون کے بھائی وبھیشن کو توڑ کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش شروع ہوئی اور جارج فرنانڈیس نے اس خدمت کیلئے اپنے آپ کو پیش کر دیا وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہ رام سینا کا حامی بن گئے لیکن یہ سودے بازی خاصی پیچیدہ تھی۔ راون کے ساتھی اپنی شرائط لیکر آئے تھے ۔راون کی لنکا کو خاکستر کرکے جب رام سینا ایودھیا نگری میں داخل ہوئی تو باہر والوں کے اصرار پر بھرت کو سنگھاسن سے ہٹا کر اصلی رام یعنی اٹل جی کو وزیر اعظم بنا دیا گیا ۔اس کے بعد جب دوبارہ انتخاب میں کامیابی درج کرنے کیلئے شری رام اپنے اشو میگھ پر سوار ہو کر نکلے تو نئی نسل کے مہاجن اور مودی نے لو اور کش کی مانند نادانستہ وجئے یاترا کو روک دیا۔ اس سارے مرحلے میں سازشوں کے جال تو بنے جاتے رہے لیکن کوئی بغاوت یا خانہ جنگی کی فضا پیدا نہیں ہوئی۔ گویا کل یگ کی رامائن کا ماحول بھی تریتا یگ کا سا تھا یعنی نی ست یگ اور نہ کل یگ بلکہ دونوں کے درمیان مگر ست یگ سے

قریب تر۔

رامائن کے بعد ہندوتوا کے اس قافلے کو مہابھارت سے دوچار ہونا تھا سو وہ بھی ہو گیا ۔اٹل جی کی بیماری اور اڈوانی جی کی پے در پے ناکامیوں نے بی جے پی کو تریتا سے دواپر یگ میں پہنچا دیا۔ ارون جیٹلی کی راسرٹ بلیک سے گفتگو اور سشما سوراج کا ریڈی برادران کو لے کر موجودہ تنازعہ اسی مہابھارت والی خانہ جنگی کا شاخسانہ ہے

۔مہابھارت ویسے تو نہایت دلچسپ رزمیہ داستان ہے مگر اس کا انجام بڑا دردناک ہے ۔اس لحاظ سے بھی یہ رامائن اور دیگر وشنوپُرانوں سے مختلف ہے۔ کروکشیتر میں لڑی جانے والے آخری معرکے میں سارے کورو مارے جاتے ہیں۔ اپنے بیٹوں کی بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر ان کی ماں گندھاری کرشن کو شاپ (بددعا) دیتی ہے اور اسے اس خون خرابے کیلئے ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔گندھاری کے مطابق کرشنا ایسی مابعد طبعی قوتوں کا مالک تھا کہ جنگ کو ٹال سکتا تھا لیکن اس نے اپنی ذمہ داری کو ادا نہیں کیا آج کل لال کرشن اڈوانی کا بھی یہی حال ہے کہ وہ پارٹی کے اندر برپا ہونے والے خلفشار کو ٹال سکتے ہیں لیکن گوں ناگوں وجوہات کی بنا پر اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر رہے ہیں۔ گندھاری کی بددعا ۳۶ سال بعد پوری ہوتی ہے اور کرشنا اپنے خاندان کو اسی طرح تباہ و تاراج ہوتا دیکھتے ہیں اور خود بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور کرشن کی دوارکا نگری سمندر میں غرق ہو جاتی ہے۔یادو نسل کی

بربادی کی خبر سن کر راجہ یدھشٹر کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہبانیت اختیار کرتے ہیں اور اپنا تخت و تاج چھوڑ کر ہمالیہ کی جانب کوچ کرتے ہیں اور کیلاش پربت کے راستے میں ایک ایک کرکے چار بھائی اور دروپدی راستے میں گر جاتے ہے۔ ان کے گرنے کی وجہ دھرتراشٹر یہ بتلاتے ہیں کہ انہیں اپنی طاقت ، فن یا حسن و جمال پر کبر غرور تھا ہاں دروپدی اپنے امتیازی سلوک کے باعث نجات سے محروم رہتی ہے۔ بی جے پی کی دوسری نسل کے رہنماؤں کے اندر بھی کبر و غرور کی برائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے انہیں چاہئے کہ مہابھارت کے انجام سے سبق لیں ۔یہ حسن اتفاق ہے کہ ارون جیٹلی نے بھی لیڈرشپ کے لئے پانچ دعویداروں کا ذکر کیا جن میں سے ایک خاتون یعنی سشما سوراج ہے۔ مہابھارت کے آخر میں صرف دھرت راشٹر کو موکش (نجات) پراپت ہوتا ہے جو اس جنگ اور خون خرابے کا سخت مخالف تھا ۔بی جے پی کے معاملے میں اگر کوئی کردار دھرتراشٹر سے مشابہ ہے تو وہ اٹل بہاری واجپائی ہے جو اپنی عمر اور مرتبے کے لحاظ سے بھی دھرتراشٹر کی مانند ہے۔ بی جے پی لمحہ بہ لمحہ مہابھارت کے مختلف مراحل سے گزر کر اپنے قرار واقعی انجام کی جانب رواں دواں ہے۔

اختلافات کے چکرویوہ میں نام نہاد مختلف پارٹی

وکی لیکس کی بدولت آئے دن سیاسی حلقوں میں ایک نہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے اس حقیقت کو جانچا اور پرکھا جائے۔ وکی لیکس کی حیثیت دراصل سفارتکاروں کے لکھے ہوئے ذاتی ملفوظات سے زیادہ کچھ بھی نہیں اور پھر یہ امریکی سفارتکار جن کے پیغامات منکشف ہوتے رہتے ہیں کوئی منکر نکیر تو ہیں نہیں کہ ان کو سب کچھ سچ سچ دکھلائی دیتا ہو اور وہ جو کچھ دیکھتے ہوں اسے من و عن لکھ ڈالتے ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ سفارتکار کچھ لوگوں سے گفتگو کرکے ان کا ذہن ٹٹولتے ہیں۔ اب جن سے بات چیت کی جاتی ان کو کچھ معلوم ہوتا ہے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس میں سے کچھ صحیح ہوتا ہے کچھ غلط ہوتا ہے۔ اپنی ناقص معلومات میں سے کچھ تو وہ لوگ بتلاتے ہیں اور کچھ چھپا لیتے ہیں۔ جو کچھ بتلاتے ہیں اس میں کچھ سچ ہوتا ہے اور کچھ جھوٹ ہوتا ہے۔ یہاں تک تو بولنے والے کا معاملہ ہوا۔ اب سننے والا کچھ سمجھتا ہے کچھ نہیں سمجھتا۔ جو سمجھتا اس میں سے کچھ صحیح سمجھتا ہے کچھ غلط سمجھتا ہے۔ جو صحیح سمجھتا ہے اس میں سے کچھ اسے یاد رہ جاتا اور کچھ وہ نوٹس لکھنے تک بھول جاتا ہے۔ جو کچھ لکھتا اس میں نہ جانے کیا کچھ اپنی طرف سے دانستہ اور غیر دانستہ طور پر ملا دیتا ہے۔ اس طرح وہ دستاویز عالمِ وجود میں آتی ہے

۔اس تصدیق کا کوئی اہتمام کسی بھی مرحلے میں نہیں کیا جاتا اور اس پر اکثر کوئی اقدام بھی نہیں کیا جاتا لیکن جب یہ وکی لیکس کے ویب سائٹ پر شائع ہو جاتی ہے تو اس پر ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس آسیب کا شکار ہوتے ہیں وہ تو اپنا دفاع کرنے کی غرض سے مندرجہ بالا منطق اور دلائل کا سہارا لیتے ہیں لیکن ان کے مخالفین وکی لیکس کے انکشافات کو الہام کا درجہ دے کر پھیلانے لگتے ہیں اور اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے میں جٹ جاتے ہیں۔

من موہن سنگھ کے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے حوالے سے وکی لیکس کے انکشافات سامنے آئے تھے تو بی جے پی والوں نے اسے خوب اچھالااور کانگریس پارٹی اپنے بچاؤ میں لگ گئی۔کانگریس نے اپنی سرکار کو گرنے سے بچانے کیلئے روپئے تقسیم کئے یہ ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے اس کیلئے کسی وکی لیکس کی چنداں ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ کانگریس نے ایسا نہ پہلی بار کیا ہے اور نہ یہ آخری بار ایسا ہوا ہے بلکہ کانگریس کیا بی جے پی والوں نے بھی اپنی سرکار بچانے کیلئے لکشمی دیوی کو سونے کا تلک لگایا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شری کرشنا نے کروکشیتر کے میدان میں جو گھوشنا کی تھی کل یگ میں اس کے معنی بدل چکے ہیں بھارتیہ جن تنتر میں جب جب اقتدار کو خطرہ لاحق ہوتا ہے دھن دولت کا مایا جال سدرشن چکر بن حرکت میں آجاتا ہے اور رن بھومی پر چھا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں غلاموں کے بازار لگتے تھے اور انہیں خریدا اور بیچا جاتا تھا آج کل ممبران پارلیمان کی منڈی لگتی ہے جہاں وہ بذاتِ خود اپنے ضمیر کا سودہ کرتے ہیں اپنی وفاداریاں درہم و دینار کے عوض نیلام کر دیتے ہیں آج کل یہ اس قدر معمولی بات ہو گئی ہے کہ ایسا کرنے سے نہ ہی بکنے والے کے اندر کوئی احساسِ ندامت ہوتا ہے اور نہ ہی ان رائے دہندگان کو جنھوں نے اپنا قیمتی ووٹ دے کر انہیں ایوان اقتدار میں بھیجا تھا اس پر شرم محسوس ہوتی ہے ورنہ وہ دوبارہ ایسوں کو اپنے حلقہ انتخاب سے کامیاب و کامران نہ کرتے۔

وکی لیکس کا آسیب گزشتہ ہفتے ارون جیٹلی سے چمٹ گیا ہے اور پتہ چلا کہ انہوں نے کسی زمانے میں امریکی سفیر رابرٹ بلیک سے یہ کہہ دیا تھا کہ ہندوتوکا نظریہ تو بی جے پی کیلئے بس ایک سیاسی موقع پرستی ہے گویا یہ ایک سیاسی ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔اب کانگریس والے اس نعمت غیر مرتقبہ پر بغلیں بجانے میں لگ گئے۔ سونیا گاندھی سے لے کر کپل سبل تک سبھی نے بی جے پی کی منافقت پر جم کر تنقید کی حالانکہ اس میں حیرت کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔کمیونسٹ پارٹی کیلئے اشتراکیت کی اور کانگریس کے نزدیک سیکولرزم کی جو وقعت ہے۔بی جے پی کیلئے ہندوتوا کی بعینہٖ وہی حیثیت ہے۔ وطنِ عزیز کی تمام سیاسی جماعتیں نظریہ کو ٹائلٹ پیپر سے زیادہ اہمیت نہیں

دیتیں اپنے جسم سے لگی غلاظت کو اس کے ذریعہ پونچھ کر اسے کوڑے دان میں پھینک دیتی ہیں

ارون جیٹلی چونکہ وکیل پہلے اور سیاستدان بعد میں ہیں اس لئے انہیں خوف ہے کہ مبادہ راسرٹ نے ان کے بیان کو ٹیپ کر رکھا ہو نیز تردید کی صورت میں ممکن ہے ان کی آواز ذرائع ابلاغ سے نشر ہونے لگے اس لئے انہوں نے مفہوم کے بجائے الفاظ کی تردید پر اکتفاکیا۔جس کے معنی یہ ہیں کہ اسی مفہوم کو ادا کرنے کیلئے انہوں نے دوسرے الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ارون جیٹلی کو ایسی متنازعہ گفتگو کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی ؟ اس سوال کا بلا واسطہ جواب اسی وکی لیکس کے کیبل میں درج ہے۔جیٹلی کا کہنا تھا کہ اڈوانی جی آئندہ دو تین سال سے زیادہ بی جے پی کی قیادت نہیں کر سکیں گے اور اس کے بعد نئی نسل کے پانچ میں سے کسی ایک کو لیڈرشپ کی ذمہ داری اٹھانی پڑیگی ۔یاد رہے یہ بات چیت ۲۰۰۵ کی ہے اور اس لحاظ سے اڈوانی جی کے دن کب کے لد چکے ہیں بی جے پی نے ایوان زیریں یعنی لوک سبھا میں پارٹی کی رہنمائی کے فرائض سشما سوراج اور ایوان بالا یعنی راجیہ سبھا میں پارٹی کی قیادت ارون جیٹلی کے حوالے کرکے اس کا عملی اعتراف کر لیا ہے۔

جیٹلی نے نئی نسل کے جن پانچ لوگوں کا ذکر کیا ہے اس میں سرفہرست خود ان کی نظر میں ان کے اپنے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا گویا انہیں اب پارٹی کی باگ ڈور سنبھالنے کیلئے اپنے چار حریفوں کا صفایا کرنا ضروری ہے اور وہ اس کام میں بڑی تندہی سے لگے ہوئے ہیں۔ گزشتہ مرتبہ انھوں نے پارٹی انتخاب سے قبل آسام میں پارٹی کے مشترک نگراں سدھانشو متل کا بونڈر کھڑا کرکے مجلس عاملہ کے اجلاس کا بائیکاٹ کرڈالا اور پارٹی کے صدر راج ناتھ سنگھ کیلئے مشکلات کھڑی کر دیں لیکن یہ باری الٹی پڑی آر ایس ایس نے راج ناتھ کو اناتھ کرکے ان کی جگہ نو سکھئے نتن گڈکری کو پارٹی کی ڈگدگی تھما دی تاکہ نیا صدر اپنے سنگھی آقاؤں کے اشارے پر تماشہ لگاتا رہے۔ ویسے ارون جیٹلی کیلئے بھی یہ کمزور صدر کسی قدر قابل قبول رہا ہوگا اسلئے کہ اگر مطمئن مودی یا سشما آجاتیں تو ان کو چیلنج کرنا ناممکن ہو جاتا بلکہ وہ لوگ سب سے پہلے ارون جیٹلی ہی کا ٹکٹ کاٹ کر انہیں بلا ٹکٹ آسام جیسی کسی ریاست میں بن باس پر روانہ کر دیتے۔ بی جے پی میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ان کے عظیم دانشور گووندا چاریہ عرصہ دراز سے شمال مشرق کی خال چھانتے چھانتے اب گمنامی کے اندھیرے میں غرق ہو چکے ہیں۔

ارون جیٹلی سے ترغیب حاصل کر ان کی حریفِ اول سشما نے اس بار بی جے پی کی مجلس عاملہ سے قبل اپنا سدرشن چکر چھوڑا اور کہہ دیا کہ کرناٹک کے کے ریڈی

برادران کی ترقی وخوشحالی میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے بلکہ جس وقت ان کو وزیر بنایا گیا اس وقت یدورپا وزیر اعلی تھے اور ارون جیٹلی ریاست میں نگراں کی ذمہ داری ادا کر رہے تھے اس لئے وہ دونوں لوگ اس کیلئے ذمہ دار قرار پاتے ہیں ان کا یہ کہنا تھا کہ ذرائع ابلاغ نے سشما اور ریڈی خاندان کی تصاویر شائع کرنا شروع کردیں حالانکہ سشما سوراج کی بات بالکل صحیح ہے۔ ریڈی برادران نے اپنی غیر قانونی کان کنی سے کروڑوں کا کالا دھن جمع کر رکھا ہے وہ اپنی ذاتی ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ ان کی خوشحالی میں سشما کا حصہ ہے سراسر غلط بات ہے بلکہ اگر ٹھیک سے تحقیقات کی جائیں تو ممکن ہے ایسے شواہد ہاتھ لگیں جن سے پتہ چلے سشما کی خوشحالی میں ریڈی برادران کا حصہ ہے۔

کرناٹک میں ہونے والی غیر قانونی کان کنی اور اس میں بی جے پی کے افراد کا ملوث ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اس کا اعتراف وزیر اعلی یدورپا کھلے عام کر چکے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سشما سوراج ریڈی برادران کو ۱۹۹۹ سے جانتی ہیں جب انہوں نے بیلاری سے سونیا گاندھی کے خلاف انتخاب لڑا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جبکہ اتر پردیش میں بی جے پی کا غلغلہ تھا اور کانگریس والوں کو رائے بریلی تک کی سیٹ محفوظ نہیں لگتی تھی اس لئے سونیا نے اپنی ساس اندرا گاندھی کے نقش قدم پر جنوب کا رخ کیا تھا اور ان کے خلاف بی جے پی نے دیسی

بھو کے طور پر سشما کو میدان میں اتارا تھا۔ فی الحال بی جے پی ریڈی برادران کے احسان تلے اس قدر دبی ہوئی ہے کہ سشما تو کیا اگر اڈوانی بھی مخالفت کریں تب بھی ان کو وزیر بننے سے نہیں روکا جاسکتا۔ ریڈی برادران نے اپنے علاقے کے ۳۰ میں سے ۲۳ نشستوں پر بی جے پی کو کامیابی دلائی اور آزاد امیدواروں کی وفاداری حاصل کرنے کیلئے کئی کروڑ روپئے خرچ کئے اور بدلے میں دو بھائی تو وزیر بن گئے اور تیسرے کو ایسے سرکاری ادارے کا سربراہ بنایا گیا جسے وزیر کی مراعات حاصل ہیں۔ اس لئے سشما کو ریڈی برادران کے عروج کیلئے کوئی بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس کے باوجود پارٹی میں اپنا قد بڑھانے اور ارون جیٹلی کو نیچا دکھلانے کی خاطر سشما سوراج نے یہ کیچڑ اچھالا۔ دلچسپ بات یہ ہیکہ اس موقع پر راج ناتھ جن کو ارون جیٹلی نے ٹھکانے لگایا تھا آگے آئے اور ریڈی برادران کو وزیر بنانے کی ذمہ داری ازخود قبول کرلی۔

بی جے پی کے اندرونی الحال جو مہابھارت چھڑی ہوئی ہے وہ اس وقت تک جاری رہیگی جب تک کہ ان پانچوں میں سے کوئی ایک اپنے تمام حریفوں کا مکمل خاتمہ کرکے خود بلا شرکت غیرے پارٹی کی باگ نہیں سنبھال لیتا۔ اس صورتحال کو سنبھالنے میں لال کرشن اڈوانی مہابھارت کے شری کرشن کا کردار ادا کرسکتے ہیں بشرطیکہ دوبارہ وزیر اعظم بننے کا خواب وہ ترک کردیں اور طالبعلموں کی صف سے اٹھ کر گروجی کی استھان پر براجمان ہو جائیں لیکن اپنے تمام تر

تحفظات و مجبوریوں کے باوجود وہ ہنوز امید سے ہیں کہ کبھی نہ کبھی ان کی گود ہری ہوگی اور وہ ہندوستان کے تخت طاؤس پر کسی نہ کسی طرح براجمان ہوں گے۔ اقتدار کی یہی حرص و ہوس نہ صرف اڈوانی جی بلکہ بی جے پی کا سب سے سنگین مسئلہ ہے۔

گووندا چاریہ جو کسی زمانے میں اڈوانی جی خاص مشیر ہوا کرتے تھے انہوں نے اسی سال ماہ مارچ کے اندر ایک انٹرویو میں اس صورتحال پر بڑا تفصیلی اور نہایت بے باک تبصرہ کیا تھا۔ اس انٹرویو میں ان لوگوں کیلئے بہت سامان عبرت ہے جو سنگھ پریوار کے نقوش پر اپنی سیاسی حکمتِ عملی وضع کرنے کے خواہش مند ہیں۔ گووندا چاریہ کے مطابق بی جے پی میں فی الحال زبردست کنفیوژن پایا جاتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ آپسی رسہ کشی نے اس مسئلے کو مزید الجھا دیا ہے۔ اڈوانی جی کالے دھن کے معاملے کو اہمیت دیتے ہیں اور جیٹلی اس مسئلے پر بیان دینے سے پارٹی ترجمان کو روک دیتے ہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ کوئی سنجیدہ مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اڈوانی جی کی حالت گھر میں موجود ضعیف و نحیف بزرگ کی سی ہو گئی ہے جس کا احترام تو سبھی کرتے ہیں لیکن کوئی ان کی بات سنتا نہیں ہے۔ ۲۰۰۴ اور ۲۰۰۹ کی ناکامیوں نے اڈوانی جی توڑ کر رکھ دیا ہے اب تو یہ حالت ہے کہ وہ پارٹی کے اندر کسی معقول آدمی کو اپنے درد میں بھی شریک نہیں کر سکتے اور گرومورتی جیسے لوگوں

کی باتوں میں آکر اپنے سمیت پارٹی کو رسوا کر بیٹھتے ہیں۔اس سنگین صورتحال کا بڑا دلچسپ حل گووندا چاریہ نے ۲۰۰۵ میں اڈوانی جی کو سجھایا تھا ان کا مشورہ یہ تھا کہ قیادت نوجوانوں کو سونپ دی جائے یا پارٹی کو ختم کردیا جائے جیسا کہ اٹل جی نے جن سنگھ کے ساتھ کیا تھا اور اگر جذباتی لگاؤ کے باعث ایسا ممکن نہیں ہے تو اسے واپس آر ایس ایس کے حوالے کرکے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا جائے۔انہیں یقین تھا کہ ان میں سے کسی مشورے پر عمل نہ ہوگا اور ویسا ہی ہوا۔

گووندا چاریہ نے اس جماعت کے حوالے سے جو کبھی ایک مختلف قسم کی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اس قدر سخت موقف کا اظہار کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب ان کے انٹرویو میں موجود ہے۔ان کا کہنا ہے کہ نظریاتی سطح پر بی جے پی نے اب بالکل ہی مخالف سمت کو اختیار کرلیا ہے۔کانگریس اور بی جے پی دونوں ہی امیروں کی حامی اور کارپوریٹ کی ہمنوا ہیں۔اسی کے ساتھ بازار کی قوتوں پر معیشت کے چلنے کی حمایت کرتی ہیں۔بدعنوانی کے معاملے میں بھی بی جے پی کانگریس سے الگ نہیں ہے اس طرح کانگریس اور اس کے درمیان کوئی خاص فرق باقی نہیں بچا ایسے میں زبردستی تیار کی جانے والی اس کاربن کاپی پر اصلی دستاویز کا فائق ہونا ایک فطری امر ہے۔

گووندا چاریہ کا کہنا یہ بھی ہے بی جے پی کے اندر کارکنان کا اپنے رہنماوں پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔پارٹی ایک انتخابی مشین میں تبدیل ہو گئی ہے جس کا ہدف صرف اور صرف اقتدار کا حصول بن گیا ہے۔ان کا مشاہدہ ہیکہ بی جے پی اب ایک مقصدِ عظیم کے حصول کی خاطر کام کرنے والے کارکنوں کی جماعت کے بجائے اقتدار کے حصول میں سرگرداں امیدواروں کی جماعت بن گئی ہے۔جس کے باعث نظریاتی معاملے میں سنجیدہ کارکنان کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔بی جے پی کے معاملے جو رابطے اور تنظیم کا کام آر ایس ایس کر سکتی ہے اس کا مظاہرہ پچھلے پانچ سالوں میں نظر نہیں آیا جس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ آر ایس ایس خود بے دست و پا ہو گئی ہے وہ اس مخمصے میں گرفتار ہے کہ آیا بی جے پی کے سرپرستی کی جائے یا اسے عاق کر دیا جائے۔گوندا چاریہ کے خیال میں آر ایس ایس بی جے پی محتاج نہیں ہے۔آر ایس ایس کو چاہئے کہ وہ کردار سازی اور قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دینے پر اپنی ساری قوت اور وسائل کو صرف کر دے۔یہ ایک مشکل کام ضرور ہے لیکن اسی کو کرنے میں اس کیلئے سکون و اطمینان ہے۔اس لئے کہ یہی آر ایس ایس کے کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔

رام لیلا میدان پر بابا رام دیو کی رام کتھا

بوفورس توپ کی بدعنوانی نے مسٹر کلین کہلانے والے راجیو گاندھی کو اقتدار سے بے دخل کر دیا تھا جن کے حامی ممبران ایوان کی تعداد ان کی ماں اور نانا سے زیادہ تھی لیکن پھر اس کے بعد ایسا لگنے لگا گویا ہندوستان کی سیاست میں بدعنوانی کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ عوام نے نہ صرف چارہ کھانے والے کو بلکہ کھاد نگل جانے والوں کو بھی کامیاب کیا۔ کمل کو ٹی وی کے پردے پر رشوت لیتے ہوئے دیکھا اور ہاتھی کو دولت کا انبار نگلتے ہوئے پایا اسکے باوجود دونوں کو اقتدار سے نوازہ لیکن بابا رام دیو نے یہ ثابت کر دیا کہ بدعنوانی کا مسئلہ ابھی بھی زندہ ہے بشرطیکہ اسے اٹھانے والا بدعنوان نہ ہو۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایک بدعنوان سیاسی جماعت دوسرے کی بدعنوانی کو اچھالتی تھی عوام جانتے تھے کہ اس معاملے میں مدعی اور مدعا الیہ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اس لئے وہ کسی کی بات پر کان نہ دھرتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس بار بدعنوانی کے خلاف دھرم یدھ چھیڑنے والا شخص نہ تو خود بدعنوان ہے اور نہ ہی اپنے کسی سیاسی مفاد کے پیش نظر اس معاملے کو اچھال رہا ہے تو اس کی پذیرائی مختلف انداز میں ہوئی اور سرکار کی چولیں ہل گئیں نیز اس کا اصلی گھناؤنا چہرہ ساری دنیا کے سامنے آگیا۔

زر خرید ذرائع ابلاغ اور اس سے متاثر مخلص افراد بابا رام دیو پر مندرجہ ذیل الزامات لگا رہے ہیں:

رام دیو کو اسی وقت یہ معاملہ اٹھانے کی کیوں سوجھی؟○

ان کی پشت پر سنگھ پریوار ہے○

وہ بی جے پی کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے○

ان کے پاس دولت کا انبار کیوں ہے؟○

بابا رام دیو نے یہ مسئلہ پہلی بار نہیں اٹھایا بلکہ وہ برسوں سے اس معاملے کو اٹھا رہے ہیں۔ وہ اپنے مختلف بیانات اور انٹرویو میں اس جانب توجہ مبذول کروا چکے ہیں لیکن ایک فرق ضرور واقع ہوا ہے۔ اس سے پہلے بات زبانی جمع خرچ تک محدود تھی اب انہوں نے عملاً تحریک چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ تحریک چلانے کا فیصلہ ابھی کیوں کیا؟ پہلے کیوں نہیں کیا؟ تو یہ ایک مہمل سوال ہے اس لئے کہ وہ جب بھی اس طرح کا فیصلہ کرتے یہ سوال رونما ہوجاتا اس لئے یہ سوال سرے کسی اہمیت کا حامل ہی نہیں ہے کہ یہ فیصلہ کب کیا گیا بلکہ سوال یہ ہونا چاہئے کہ کیا آیا یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ملک کی ہزاروں کروڑ کی دولت کو سوئیس بنکوں سے واپس ملک میں لایا جانا چاہئے تو اس کا یہ مطالبہ

جائز ہے یا نہیں ؟

یہ ایک نہایت شرمناک حقیقت ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اناج کے گودام بھرے پڑے ہیں اس کے باوجود ۱۵۰ ضلع کی عوام ہر سال بھکمری و فاقہ کشی کا شکار ہوتی ہے یہ بیان کسی حزب اختلاف یا رام دیو کا نہیں بلکہ عدالت عالیہ یعنی سپریم کورٹ کا ہے۔ سپریم کورٹ کے جج نے پچھلے دنوں حکومت سے زائد اناج مہیا کرنے کا تقاضہ کرتے ہوئے حکومت کی غربت کو ناپنے کی پیمائش کو بھی چیلنج کیا۔ دنیا کی ابھرتی ہوئی معیشت بھارت میں شہری علاقوں میں غریب وہ ہے جس کی آمدنی یومیہ ۲۰ روپئے ہے یا جو ۱۷ روپئے ہر روز خرچ کرتا ہے یا دیہات میں جس کی آمدوخرچ ۱۲ روپئے یومیہ ہے۔ آج کل کی مہنگائی کے پیش نظر یہ معیار ویسے ہی بہت پست ہے اس کے باوجود اس ملک میں ۳۶ فیصد عوام غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جسٹس بھنڈاری اور ورما کے مطابق یہ رقم کم از کم دوگنی ہونی چاہئے اگر ایسا کر دیا جاتا ہے غربت کی شرح میں کس قدر اضافہ ہو جائیگا اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کے باوجود سوئیس بنکوں میں ہندوستان کا کالا دھن سب سے زیادہ ہے اور اپنے قریب ترین حریف روس کا چار گنا ہے۔ ایک اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۰۹ء میں یہ ۲۱ لاکھ کروڑ تھی اور ہر سال اس میں ایک لاکھ کروڑ کا اضافہ ہوتا ہے۔ اگر ۲۰۰۸ء میں اسے لاکر ملک کی ۴۵ کروڑ عوام میں تقسیم کر دیا جاتا تو ہر ایک

کے حصے میں ایک لاکھ روپے اور غریبی کا خاتمہ ہو جاتا لیکن اگر حکومت یہ اقدام کر دیتی تو ان ۲۵ ہزار لوگوں کا کیا ہوتا جو سال بھر میں کئی بار سوئزر لینڈ اپنی دولت کی دیکھ بھال کیلئے آتے جاتے رہتے ہیں سرکار کیلئے وہ ان ۲۵ ہزار لوگوں کی اہمیت ۴۰ کروڑ رائے دہندگان سے زیادہ ہے ۔ایسے میں اگر کوئی اس لوٹ کے مال کو واپس ہندوستان کے خزانے میں لاکر غریبوں کی فلاح و بہبود کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تو اس میں کیا غلط ہے ؟

یہ بات بابا رام دیو نہیں کہہ رہے بلکہ اس سال جنوری میں سپریم کورٹ کے جج نے کہی جبکہ جرمنی کے لیشٹن سٹین بنک میں کثیر دولت کے جمع کرنے کا معاملہ سامنے آیا اور حکومت نے ۲۶ لٹیروں کا نام بند لفافے عدالت کو دیتے ہوئے کہا کہ ہم اسے ظاہر نہیں کر سکتے۔ عدالت نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا آخر اس میں کیا مشکل ہے ۔ جسٹس سدرشن اور نجار نے کہا یہ تو سیدھا اور صاف قومی دولت کی چوری کا معاملہ ہے ایسے میں حکومت مجرمین کی اس قدر پشت پناہی کیوں کر رہی ہے ۔ جن لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ حکومت نے رام دیو کے خلاف یہ احمقانہ اقدام کیوں کیا انہیں سپریم کورٹ کے بیان کو سامنے رکھنا چاہئے اس لئے کہ جو حکومت بدعنوانوں کی محافظ ہے وہ ان کے خلاف کام کرنے والوں پر اگر ظلم نہیں کرتی تو اور کر بھی کیا کر سکتی ہے ۔پہلے تو حکومت کو اندازہ تھا کہ یہ بھی ایک ڈرامہ ہوگا اور وہ بابا کو کچھ مراعات

وغیرہ دے کر منالیں گے اس لئے اس نے سودے بازی کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ یہ شخص تو سنجیدہ معلوم ہوتا ہے تو وہ خود ڈر گئی اور سرکاری دہشت گردی پر اتر آئی۔

رام دیو پر سنگھ پریوار کی پشت پناہی کا الزام اس لئے لگایا جاتا ہے ان کے اسٹیج پر اچانک سادھوی رتھمبرا نمودار ہو گئی لیکن کسی فسطائی خاتون کی حمایت کے نتیجے میں اس تحریک کو فسطائی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر رام دیو خود وشوا ہندو پریشد کے اسٹیج پر پہنچ جاتے یا سادھوی رتھمبرا کے پروچن میں جا دھمکتے تو بے شک یہ الزام حق بجانب ہوتا لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوا بلکہ اس پورے عرصے میں ان سے کوئی بھی فسطائی تو کجا فرقہ وارانہ بیان بھی منسوب نہیں کیا جا سکا۔ بی جے پی کی حمایت کو بھی مختلف معنی پہنائے جارہے ہیں حالانکہ یہ تو بی جے پی کی موقع پرستی ہے جو وہ اس تحریک کی آنچ میں اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے کی کوشش کر رہی ہے اگر اس وقت مرکز میں بی جے پی کی حکومت ہوتی تو کانگریس بھی بعینہٖ وہی سب کر رہی ہوتی جو اب بی جے پی والے کر رہے ہیں، ہندوستان کی مفاد پرست سیاسی جماعتوں کا یہی معمول ہے اور بابا رام دیو کی حمایت تو نہ صرف بی جے پی نے بلکہ کمیونسٹ، سماجوادی اور بہوجن سماج پارٹی نے بھی کی ہے بلکہ کئی غیر سیاسی تنظیموں اور رہنماؤں نے ان کے خلاف کی جانے والی سرکاری کاروائی کی مذمت کی ہے اور اب تو سپریم کورٹ

نے اس کے خلاف نوٹس جاری کر دیئے ہیں اس لئے بی جے پی کے ذریعہ کی جانے والی حمایت کے باعث کسی کو فسطائی کٹھ پتلی قرار دے دینا زیادتی معلوم ہوتا ہے۔ دگ وجئے اور آزاد جو بڑھ چڑھ بابا رام دیو کو سنگھی مکھوٹا قرار دے رہے اس بات کا جواب کیوں نہیں دیتے کہ کانگریس کے چار چار وزراء ان کا استقبال کرنے ہوئی اڈے پر کیوں گئے تھے اور پھر ہوٹل میں بیٹھ کر اس سنگھی مکھوٹے سے کون سی راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔

حکومت نے اس بہیمانہ کارروائی کیلئے جس وقت کا انتخاب کیا وہ نہایت دلچسپ ہے۔ رات کے ایک بجے نہتے عورتوں اور بچوں سمیت مظاہرین پر تشدد کا جواز کس قدر بھیانک ہے جو لوگ اس کارروائی کو جائز قرار ادے رہے ہیں وہ دو منٹ کیلئے تصور کریں کہ اگر ان کے اہل خانہ کسی مظاہرے میں شریک ہوتے جس کو اس رویہ کا شکار ہونا پڑتا تو انہیں کیسا لگتا؟ حکومت کی جانب سے پیش کیا جانے والا احمقانہ جواز بھی نہایت دلچسپ ہے مثلاً:

بابارام دیو کو یوگا کی اجازت دی گئی تھی۔○

رام دیو نے یوگا کو سیاسی رنگ دے دیا○

پانچ ہزار افراد کو جمع کرنے اجازت تھی○

بابا اپنے وعدے سے مکر گئے○

امن و سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا○

بابا رام دیو عرصۂ دراز سے دنیا بھر میں یوگا کے کیمپ لگاتے رہے ہیں لیکن اس مرتبہ ان کا ارادہ یوگا سکھلانے کا نہیں تھا بلکہ بدعنوانی کے خلاف مظاہرہ کرنے کا تھا اس حقیقت سے ملک کا بچہ بچہ واقف تھا اس کے باوجود انہیں صرف یوگا کرنے کی اجازت کیوں دی گئی یہ ایک بنیادی سوال ہے ؟ بابا رام دیو کا استقبال کرنے کیلئے جو وزراء کرام ہوائی اڈے پہونچے اور پھر انہیں اپنے ساتھ ہوٹل لے گئے تو کیا وہ وہاں یوگا کی تعلیم حاصل کر رہے تھے یا اس مظاہرے کے سلسلے میں گفت و شنید کر رہے تھے ؟ یوگا کو اگر کسی نیک مقصد کی خاطر سیاسی رنگ دیا جاتا ہے تو اس میں ہرج کیا ہے؟ مظاہرین کی تعداد طے کرنے کا اختیار کسے ہے؟ اجازت دینے والوں کو یا مظاہرہ کرنے والوں کو؟ وعدے سے مکرنے والی بات کم از کم کسی سیاسی جماعت کو توزیب نہیں دیتی جن کو نہ تو اپنے وعدہ کا کوئی پاس و لحاظ ہوتا ہے اور نہ عوام جن کے عہد کو کوئی اہمیت دیتی ہے۔ کانگریس نے دو سال قبل اپنے انتخابی منشور میں وعدہ کیا تھا کہ ۱۰۰ دنوں کے اندر ملک کی ساری دولت جو بیرونی ممالک میں پوشیدہ رکھی گئی ہے اسے واپس لائے گی لیکن ۷۰۰ سے زیادہ دن گزر چکے ہیں اگر کانگریس والے اپنے عہد کو پورا کر دیتے تو آج اس تحریک کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ حکومت سے جو مطالبہ کیا گیا تھا اس کو پورا کرنے بجائے حکومت اول تو اس مظاہرے سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی کوشش کی اور بدعنوانی ختم

کرنے کے بجائے مظاہرے کے خاتمے کی شرائط طے کرنے لگی ۔ اگر حکومت کی جانب سے اس معاملے میں لیپا پوتی کے بجائے ٹھوس اقدام کئے جاتے تو مظاہرہ اپنے آپ ختم ہو جاتا۔جہاں تک امن و سلامتی کو لاحق ہونے والے خطرے کا سوال ہے جس کانگریس پارٹی کی آستین سے اب بھی سکھوں کے قتل عام کی بو آتی ہے یہ الزام زیب نہیں دیتا جو لوگ جامعہ ملیہ میں اپنے شکاری کتوں کو بھیج کر دن دہاڑے معصوم نوجوانوں کو شہید کردیتے ہیں ان کا امن و سلامتی کے بہانے رام لیلا میدان میں بیٹھنے والے نہتے مظاہرین پر تشدد کرنا سے عین توقع کے مطابق ہے ۔

بابا رام دیو پر بے شمار دولت جمع کرنے کا الزام بھی ہے اور ان کی املاک کو بڑے زور و شور کے ساتھ ذرائع ابلاغ میں اچھالا جارہا ہے۔کیا دستور کی رو سے کسی سدھو سنیاسی کو دولت جمع کرنے پر کوئی روک ٹوک ہے ۔ کیا دولت صرف سیاسی رہنما جمع کر سکتے ہیں اور بے حیائی کے ساتھ اپنے کاغذاتِ نامزدگی میں اس کا اظہار کر سکتے ہیں جبکہ ان میں سے اکثر کا کوئی جائز ذریعہ آمدنی نہیں ہوتا۔بابا رام دیو اپنے ذاتی جہاز سے دہلی آئے تھے اس کے باوجود مرکزی وزراء ان سے ملنے کی خاطر ہوائی اڈے پر تشریف لے گئے حالانکہ غیر قانونی دولت جمع کرنے کے الزام میں انہیں جیل لے جانا چاہئے تھا۔ تو اس پر اس تحریک کے آغاز سے قبل حکومت کو سوامی رام دیو کی املاک پر دھاوا بولنے کا

مکمل

اختیار حاصل تھا۔ حکومت اس قدر طویل انتظار کیوں کیا؟ اور اب بھی اس دولت میں سے کیا کچھ جائز اور کتنا ناجائز ہے یہ بتانے کے بجائے دولت کس قدر ہے اور ایک سنیاسی کو اس کی کیا ضرورت ہے اس طرح کے بے جا سوالات کے ذریعہ شکوک و شبہات کیوں پیدا کئے جارہے ہیں ؟

اس بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کالے دھن کا واپس ملک میں آنا تو ناممکن ہے ہاں اس کوشش میں سرکار گر سکتی ہے ؟ جمہوریت کے اندر حکومت کا بننا بگڑنا ایک معمول کی بات ہے بغیر کسی معقول وجہ کے لوگ اقتدار سے محروم کردیئے جاتے ہیں اس لئے کسی اہم اور ضروری مقصد کے حصول کی خاطر اگر حکومت گر جاتی ہے تو گرے اپنی بلا سے حکومت کو گرنے سے بچانا عوام کی فلاح و بہبود سے زیادہ اہمیت کا حامل کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ کسی مقصد کا حصول ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ان لوگوں کو نہیں کرنا چاہئے جو خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں یا تحریک کی مخالفت کر رہے ہیں بلکہ ان پر چھوڑ دینا چاہئے جو اس تحریک کو چلارہے ہیں اور اس کیلئے مختلف قسم کی قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ ویسے کسی تحریک کو چلانے کیلئے اس کی کامیابی کے امکانات کا یقینی ہونا شرط ہر گز نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ بیشتر اوقات جو چیز ناممکن نظر آتی ہے وہ آگے چل کر ممکن ہو جاتی ہے بشرطیکہ اس کیلئے عزم و حوصلہ کے ساتھ جدوجہد کی جائے ۔انسانی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے ۔آج سے چند ماہ قبل کون سوچ سکتا

تھا کہ مصر میں ایسا بڑا عوامی انقلاب برپا ہو جائیگا لیکن وہ بات جو لوگوں کے خواب و خیال میں نہیں تھی دیکھتے دیکھتے سچ ہو گئی اسی لئے انقلابی تحریکیں انتخابی جماعتوں کی طرح بہت زیادہ حساب کتاب نہیں کرتیں۔ بابا رام دیو کی بدعنونی کے خلاف تحریک سے بالآخر کیا حاصل ہوگا یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا مگر ابھی تک یہ اس کے نتیجے میں دو بڑی غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں

پہلی تو یہ کہ موجودہ جمہوری نظام کے اندر ایک عظیم عوامی تحریک برپا کرنے کیلئے۰ انتخاب میں حصہ لینا ناگزیر ہے۔ بابا رام دیو کبھی بھی انتخاب کے بکھیڑے میں نہیں پڑے اس کے باوجود وہ ایک ایسی تحریک برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے جس سے سرکار کی نیند اڑ گئی اور اسے آدھی رات میں تشدد پر اترنا پڑا

دوم یہ کہ موجودہ حالات میں سیاست کو برائیوں سے پاک کرنے کیلئے پارلیمان کی۰ دہلیز پر قدم رکھنا لازمی ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے وہ جماعتیں جو اس انتخابی کھیل میں شامل ہیں بدعنوانی کو دور کرنے کے بجائے اس میں ملوث ہو گئی ہیں حالانکہ ان سب کو برپا کرنے والے لوگ نہایت اصول پسند اور انقلابی نظریات کے حامل رہے ہیں۔ گاندھی جی کانگریس کے روح رواں تھے اور رام منوہر لوہیا جنتا پریوار کے۔ پیریار نے ڈی کے تحریک کی بنیاد ڈالی جس بطن سے ڈی ایم کے نکلی اور کانشی رام نے بہوجن سماج کی ان میں سے کوئی بھی بدعنوان نہیں تھا بلکہ آر ایس ایس کے ہیڈگوار پر بھی بدعنوانی کا کوئی الزام کبھی

نہیں لگا لیکن ان شاگردوں کو ایوان کی رونق بنے ہوئے ہیں دیکھا جائے تو ہر ایک کا دامن دغدار نظر آتا ہے۔ ایسے میں ایک ایسا شخص جو کبھی بھی اقتدار کے گلیارے میں داخل نہیں ہوا بدعنوانی جیسی بڑی برائی کے خلاف ایک شمشیر بے نیام بن گیا اور عوام نے بھی کاروباری سیاستدانوں کے بجائے ایک یوگا گرو کو زیادہ قابلِ اعتبار سمجھا یہ حیرت انگیز حقیقت ہے۔

ہندوستان کے سارے بدعنوانوں کی آماجگاہ شہر دہلی ہے جہاں سے وہ ملک کی دولت لوٹ کروہ غیر ملکی بنکوں میں لے جاتے ہیں۔ دل والوں کی دلی ان کا دل کھول کر خیر مقدم کرتی ہے لیکن اگر کوئی اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف مہم چلانا چاہتا ہے تو اسے دہلی شہر میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ رام دیو اور ان کے ہمنواؤں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر وزیر اعظم کو افسوس ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ مایا وتی بھی مرکزی حکومت کی بدسلوکی کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں لیکن دونوں بابا رام دیو دہلی آنے کا راستہ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔کیا آزادی کے بلند بانگ دعویٰ کرنے والے ہندوستان کی پیشانی پر یہ ایک کلنک نہیں ہے ؟

گاندھی جی کی عینک - قسط اول

ہندوستان کی ریاست مہاراشٹر میں وردھا کے مقام پر ۱۹۳۶ میں گاندھی جی نے اپنا ایک گھر بنایا تھا جو آگے چل کر سیوا گرام نام کے آشرم میں تبدیل ہو گیا۔ جب گاندھی جی حیات تھے تو اس آشرم سے گاؤں والوں کی سیوا کی جاتی تھی اب گاندھی جی کی سیوا بھاونا (خدمتِ خلق کا جذبہ) کی مانند یہ آشرم بھی پرکھوں کی ایک یادگار بن چکا ہے جہاں ہر سال ۳ لاکھ زائرین گاندھی درشن کیلئے آتے ہیں اور ان کی نوادرات پر حیرت جتاتے ہیں۔ گاندھی آشرم میں ان کے استعمال اشیاء فی زمانہ نمائش کا سامان بنی ہوئی ہیں قوم کے نزدیک اس کی اہمیت اور ضرورت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سال سیوا گرام آشرم کے حکام اپنی ڈائمنڈ جوبلی کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اچانک موصوف کی عینک کے چوری ہونے کی خبر منظرِ عام پر آئی ہے اور ذرائع ابلاغ پر چھا گئی۔ چوری کی اس واردات کو چھ ماہ تک صیغہ راز میں رکھا گیا تھا ایسا کیوں ہوا؟ اس کی تحقیق و تفتیش کرکے ناظرین کو حقیقت سے واقف کرانے کی ذمہ داری 'تول کے بول' چینل نے مجھے سونپی اور اس کام کیلئے ہم سب سے پہلے معروف گاندھیائی مفکر اور دانشور شری سنکی لال اگروال کی خدمت میں جا پہنچے۔

گاندھی جی کے چشمے کی چوری کو اس قدر طویل عرصہ کیوں چھپایا گیا؟ یہ سوال جب ہم نے ایک سنگی لال اگروال سے پوچھا تو وہ کہنے لگا

لگتا ہے آپ گاندھیائی فلسفہ حیات کے بارے میں نہیں جانتے ورنہ یہ سوال نہیں کرتے؟

ہم نے اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا یہ بات درست ہے کہ ہم نہیں جانتے لیکن گاندھی جی کے اصول و نظریات کو اس دور میں کون جانتا ہے؟

وہ ناراض ہو کر بولے ہمارے ہوتے ہوئے آپ یہ بات کہہ رہے ہیں یہ تو ہماری توہین ہے

ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ہم نے شرمسار ہو کر معذرت طلب کی اور کہا کہ اچھا تو آپ ہی گاندھیائی فلسفہ حیات کی روشنی میں اس تاخیر کی وجہ بتلا دیں

وہ بولا گاندھی جی کی چوکی پر تین بندر رکھے ہوتے تھے اور آج تک انہیں کسی نے چرانے کی جرأت نہیں کی، وہی اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔

اچھا یہ چوکی کیا ہوتی ہے؟ ہم نے حیرت سے پوچھا

وہ ہمارے اس سوال پر چونک پڑے اور بولا آپ چوکی نہیں جانتے؟ ارے میز سمجھ لیں ایسی میز جس کے پیچھے کرسی نہ ہو؟

اچھا تو کیا انسان اس کے پیچھے کھڑا ہو کر کام کرتا ہے؟

ارے نہیں بیٹھ کر میرا مطلب زمین بیٹھ کر۔ گاندھی جی زمینی آدمی تھے اس

لئے زمین پر بیٹھ کر اپنے سارے کام کیا کرتے تھے ۔
گویا گاندھی جی انہیں آج کل کے سیاستدانوں کی طرح کرسی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی ؟
جی نہیں وہ تو بے غرض مہاتما تھے
لیکن آپ ان نے بندروں کے بارے میں بتلا رہے تھے ؟ کیا وہ اب بھی حیات ہیں ؟ ان کی عمر کیا ہوگی ؟ ہم نے سوال کیا
یہ سن کر شکی لال اگروال صاحب کا پارہ چڑھ گیا وہ بولے آپ تو بالکل جاہل اور کندۂ ناتراش معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ بندر کبھی بھی حیات نہیں تھے وہ تو ان کے مجسمے تھے جو نہ زندہ ہوتے ہیں اور نہ مرتے ہیں اسی لئے اب بھی موجود ہیں
اچھا تو وہ پتھر کے بت چشمے کی چوری کا راز فاش کریں گے ؟
ارے بھئی وہ بندر نہیں بولیں گے اور اگر بولیں بھی تو ہم ان کی زبان کیونکر سمجھ سکتے ہیں
تو پھر آخر اس سوال کا جواب کون دے گا ؟
میں دوں گا ۔
اور وہ بندر کیا کریں گے ؟
وہ ! وہ کچھ نہ کریں گے میں ان کی مدد سے جواب دوں گا ؟
اچھا تو آپ ان سے پوچھ کر جواب دیں گے ؟ لیکن ابھی تو آپ نے کہا کہ ان کی

زبان آپ نہیں سمجھتے

ارے بھئی مدد کا مطلب پوچھنا نہیں ہوتا یہ کہہ کر انھوں نے اپنے میز کی دراز سے تین بندروں کے مجسمے کو نکالا اسپر کافی گرد و غبار چڑھا ہوا تھا اسے صاف کیا اور پوچھا اچھا بتلاؤ کہ یہ کیا ہے ؟

یہ ! یہ تو وہی تین بندر ہیں جن کا ابھی آپ ذکر کر رہے تھے

اچھا یہ کیا کر رہے ہیں ؟

یہ سوال مشکل تھا ہم نے کہا یہ کچھ بھی نہیں کر رہے ۔ اصلی بندر ہوتے تو کچھ نہ کچھ کرتے ۔ یہ بے جان بندر کیا کر سکتے ہیں بھلا ؟

اصل میں تم صرف آنکھوں سے دیکھنے کا کام لیتے ہو دماغ سے سوچنے کا کام نہیں لیتے اسی لئے یہ جواب دے رہے ہو

مجھے ان کی بات پر غصہ آیا میں نے کہا صاحب میرا کام سوال کرنا ہے اور جواب دینا آپ کی ذمہ داری ہے ۔ آپ پچھلے نصف گھنٹے سے میرے ایک معمولی سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھے الجھائے ہوئے ہیں

تم کافی جلد باز اور بے صبر قسم کے انسان ہو مفکر نے متفکر ہو کر کہا ۔ یہ پوری قوم گزشتہ نصف صدی سے اس بھول بھلیاں میں الجھی ہوئی ہے اور مطمئن ہے جبکہ تم صرف آدھے گھنٹے کے اندر بے چین ہو گئے ۔

میں نے کہا صاحب اس سے پہلے کہ میں ان بندروں میں شامل ہو جاؤں آپ میرے سوال کا جواب دے دیں ورنہ یہ تین کے بجائے چار ہو جائیں گے

یہ تم نے پتہ کی بات کہی ۔ گاندھی جی یہی چاہتے تھے کہ ساری قوم ان کی مانند ہو جائے
ان بندروں کی مانند ؟ ہم نے حیرت سے پوچھا
جی تم نے ان بندروں کو کوئی معمولی چیز سمجھ رکھا ہے کیا ؟ اگر گاندھی جی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا تو آج کے سارے مسائل حل ہو چکے ہوتے بلکہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے ۔
لیکن جناب مجھے اس دور کے سارے مسائل سے کیا غرض میرا تو ایک آسان سا مسئلہ ہے۔ اس بات کا پتہ چلانا کہ آخر گاندھی جی کے چشمے کی چوری کی خبر کو اتنے دنوں تک صیغۂ راز میں کیوں رکھا گیا؟ کیا اس سوال کوئی جواب آپ کے یا گاندھی جی کے ان تین بندروں کے پاس موجود ہے ؟
کیوں نہیں ایسا کوئی سوال نہیں ہے جس کا جواب ہم چاروں نہیں جانتے ۔ دانشور صاحب نے بڑے فخر سے اپنے آپ کو ان بندروں کے ساتھ شامل فرما دیا
آپ لوگ تو سب جانتے ہی لیکن میں نہیں جانتا اس لئے برائے مہربانی مجھے بھی از خود یا ان کے توسط سے بتلا دیجئے
کاش کہ تم میں چھٹانک بھر عقل ہوتی اور تم اس کا استعمال کر کے خود بخود اپنے اس سوال کا جواب جان لیتے
یہ سن کر ہمارا پارہ چڑھ گیا اور ہم بولے ٹھیک ہے جناب ہم تو آپ جیسے دانشور پرشاد ہیں نہیں اور نہ ان بندروں جیسے عقلمند اس لئے اب اجازت دیجئے

ہم اس سوال کا جواب کسی اور سے معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب ہمیں آپ اجازت دیں

یہ سن کر سُکی لال اگروال صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یہاں سے سنتشٹ (مطمئن) ہوئے بغیر چلے جائیں اور ساری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹتے پھریں کہ ہم اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں یہ تو ہماری توہین ہے

لیکن حقیقت بھی ہے۔ہم نے سر جھکا کر کہا

جی نہیں یہ حقیقت نہیں ہے ہم ہر سوال کا جواب جانتے ہیں ہم نے گاندھیائی فلسفہ کی تحقیق میں اپنی عمر کھپا دی ہے

اچھا اگر آپ واقعی جانتے ہیں تو جواب کیوں نہیں دیتے؟

وہ بولے دیکھو یہ پہلا بندر کس حالت میں ہے ؟

ہم نے اسے غور سے دیکھا اور کہا یہ تو آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ اسے عینک کی کوئی ضرورت نہیں

وہ ڈانٹ کر بولے تم سے یہ کس نے پوچھا کہ اسے کس چیز کی ضرورت ہے اور کس کی نہیں جس قدر سوال کیا جائے اسی قدر جواب دو کیا سمجھے ؟

ہم نے کہا سرکار غلطی ہو گئی کاش کے ان میں سے کسی بندر نے سر پر بھی ہاتھ رکھا ہوتا؟

سر پر ؟ سر پر کیا ہے ؟

اوپر تو نہیں اندر دماغ ہوتا ہے۔ ہم اس کا استعمال نہیں کرتے اور فاضل جواب نہ دیتے
خیر کوئی بات نہیں یہ بتاؤ کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھنا کس بات کی علامت ہے ؟
ہم نے جواب دیا کچھ نہ دیکھنے کی علامت ہے صاحب۔ یہ بھی کوئی سوال ہے ؟
تمہارا جواب غلط ہے.برخوردار۔ اگر یہ تمہاری طرح معمولی بندر ہوتا تو تمہاری بات صحیح ہوتی لیکن یہ گاندھی جی کا تربیت یافتہ بندر ہے اس لئے اس پر یہ اصول صادق نہیں آتا
اچھا تو اس بندر کے آنکھوں پر پٹی رکھنے کے معنی کیا ہیں ؟ہم نے ایک بندرانہ سوال کیا
اس کے معنی ہیں.برامت دیکھو؟
ہمیں اس جواب پر حیرت ہوئی ہم نے پوچھا کہ صاحب اگر کسی نے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا تو اسے کیسے پتہ چلے گا کہ اس کے سامنے جو کچھ ہے وہ اچھا ہے یا.برا ہے؟
میرے اس سوال پر وہ ٹکی لال اگروال کچھ گھبرائے لیکن فوراًاپنے آپ کو سنبھال کر جواب دیا ارے بھئی اس بندر نے اپنی آنکھوں پر ہمیشہ سے ہاتھ نہیں رکھا ہوا ہے بلکہ جب کوئی.برائی اس کے سامنے آتی ہے تو وہ ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ اب تم ہی بتلاؤ گاندھی جی کی عینک کا چوری ہونا کوئی اچھی بات تھی یا.بری بات؟

وہ تو بہت بری بات تھی جناب اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس کے بارے بات کرنے کیلئے مجھے آپ تک کیوں بھیجا جاتا؟

تو کیا آپ کا چینل صرف بری باتوں کی اشاعت کیلئے قائم کیا گیا ہے ؟

یہ کس نے کہا؟آپ تو ہمارے چینل پر بیٹھ کر ہمارے ہی چینل پر دشنام طرازی کر رہے ہیں

اچھا تو کیا ایسا کرنے کیلئے میں کسی اور چینل پر جاؤں ؟ کیا آپ لوگ اس طرح کا مواد نشر نہیں کرتے ؟ انہوں نے معصومانہ سوال کیا

جی نہیں جناب ایسی بات نہیں آپ کو پوری آزادی ہے آپ تو بس یہ کریں کہ ہمارے چینل پر دوسروں پر من چاہے الزامات لگائیں ۔ بہتان ترازی فرمائیں ۔ ہم آپ کے اظہار رائے کی آزادی کا پورا احترام کریں گے لیکن اسی کے ساتھ وہ عینک والا معاملہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے انہیں یا دلایا

وہ بولے جی ہاں ! جب ہمارے آشرم کے ایک ملازم نے یہ برائی دیکھی تو اس نے اپنی آنکھیں موندلیں اور اس طرح دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ پھر اسے کچھ لوگوں نے ڈرایا کہ کہیں تجھ پر چوری کا الزام نہ دھر دیا جائے ۔ یہ جان کر وہ ڈر گیا اور اپنی ملازمت بچانے کیلئے یہ بات سربراہِ آشرم کے گوش گذار کر دی

اچھا تو وہ سربراہ چار ماہ تک کیوں خاموش رہا؟

ارے بھئی وہ بھی گاندھی وادی آدمی ہے اس نے دوسرے بندر کے اسوہ پر عمل کر

تے ہوئے اپنے کان بند کر دیئے۔ گاندھی جی نے بری بات کو سننے سے منع کر رکھا ہے

۔

اچھا تو پھر کیا ہوا؟

دو ماہ کا عرصہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور پھر آشرم کی ڈائمنڈ جوبلی منانے کی خاطر بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ میں یہ بات بتلا کر ڈائرکٹر صاحب اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے۔ اسلئے کہ وہ صرف اور صرف بورڈ کے سامنے جوابدہ ہیں۔

لیکن بورڈ نے اس سنگین واردات کو سننے کے بعد کیوں چپ سادھ لی ؟

سُکی لال اگروال صاحب مسکرائے اور بولے کاش کے تم نے تیسرے بندر کو غور سے دیکھا ہوتا تو یہ سوال نہیں کرتے

ہم نے چونک کر تیسرے بندر کی جانب دیکھا تو وہ منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوا تھا ہمیں بڑی شرمندگی ہوئی ہم بولے اچھا تو پھر یہ راز فاش کیسے ہوا ؟

انہوں نے کہا وہ تو آشرم میں کام کرنے والے ایک گائیڈ نے زائرین کے سامنے اپنی رٹی رٹائی تقریر کرتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ جو آپ لوگ سامنے دیکھ رہے ہیں یہ گاندھی جی کی عینک ہے۔ چونکہ عینک وہاں پر موجود نہیں تھی ایک برطانوی سیاح نے جن کے خلاف گاندھی جی نے آزادی کی تحریک چلائی تھی اسے بھانپ لیا وہ کم بخت تو تھا ہی گاندھی جی کے نظریہ کا دشمن ہے اس نے اخبار والوں کو یہ بات بتلا دی اور تم میرا وقت ضائع کرنے کیلئے چلے آئے

ہم نے کہا صاحب اس بات کا فیصلہ کرنا تو خاصہ مشکل ہے کہ کس نے کس کا وقت ضائع کیا ہے ؟خیر میں اس کیلئے بندروں سے رجوع کروں گا

وہ بولے مجھے امید ہے کہ تمہیں اپنے سارے سوالات کا جواب گاندھی جی کے فلسفہ کی روشنی میں مل گیا ہوگا ؟

ہم بولے جناب گاندھی جی تو کجاان کے بندر بھی صدفی صد حق بجانب ہیں لیکن آپ کے ایک استنباط سے مجھے اختلاف ہے

اچھا ! وہ کیا؟

آپ نے دورانِ گفتگو کہا تھا اگر قوم گاندھی جی کے ان بندروں کی طرح بن جاتی تو نہ مسائل پیدا ہوتے اور نہ ان کے حل کی ضرورت پیش آتی

جی ہاں میں اب بھی یہ کہتا ہوں ، سنکیشور جی خوش ہو کر بولے لیکن اس میں غلط کیا ہے ؟

میرا خیال یہ ہے آج کے سارے مسائل کی وجہ یہی ہے کہ ساری قوم گاندھی کے بندروں کی طرح بن گئی ہے وہ برائیوں کو دیکھتی ہے تو ان سے چشم پوشی کرتی ہے وہ بری بات کو سن کر اسے روکنے کے بجائے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہے اور اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتی منہ بھی بند ہی ہوتا ہے۔

ہماری اس بات کو سن کر ننکی لال اگروال صاحب نے اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر اور دوسرا منہ پر رکھ لیا۔ہم نے آگے بڑھ اپنے دونوں ہاتھ ان کے کانوں پر رکھ کر کہا ناظرین اس گفتگو کو اپنے ذہن سے محو کر دیں اور ٹی وی کے سامنے

اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے سماج میں پائی جانے والی برائیوں کے خلاف اقدام کریں

سُکی لال اگروال صاحب کے چہرے پر ایک خوش مگیں مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اس لئے کہ وہ نہ دیکھ رہے تھے ۔نہ سن رہے اور نہ بول رہے تھے

اس بابت ہماری اگلی ملاقات تھانیدار صاحب سے ہوئی ۔جس کا بیان آئندہ۔۔۔۔ انشا اللہ)

گاندھی جی کے بندر-قسط دوم

معروف گاندھیائی مفکراور دانشور شری سُکی لال اگروال کے دفتر سے جب ہم نکلے تو ان کی میز پر سے تینوں بندر غائب تھے ۔ہم وہاں سے نکل کر سیدھے وردھاکے سیوا گرام پولس تھانے پہنچ گئے ۔دروازے پر سپاہی عجیب سنگھ بیٹھا اونگھ رہا تھا وہ گویابیک وقت گاندھی جی کے تینوں بندروں کی ذمہ داری ادا کر رہا تھا۔نہ دیکھ رہا تھا نہ سن رہا تھا اور نہ ہی کچھ بول رہا تھا۔ ہم نے سوچا موقع غنیمت ہے ورنہ اس کی سیواکے بغیر اندر حاضری ممکن نہیں ہو سکتی تھی ۔ ویسے ہم لوگوں کو اپنے دفتر اس سرکاری افسران کی خدمت پر ایک محدود رقم خرچ کرنے کی پیشگی اجازت دے رکھی تھی اگر کوئی غیر معمولی مطالبہ کیا جاتا تو اس کی خصوصی اجازت لینی پڑتی تھی ۔ پہلے اس کی نوبت کم ہی آتی تھی لیکن اب یہ معمولی بات ہو گئی تھی ۔ قارئین کو یاد ہو گا ہم سیوا گرام آشرم سے گاندھی جی کی عینک کی چوری اور اس شکایت میں تاخیر کی تحقیق و تفتیش کی مہم نکلے ہوئے ہیں ۔

پولس تھانیدار کھڑک سنگھ کا دفتر ویران پڑا تھا۔ہم نے سوچا کہ تھانیدار صاحب بھی شاید اسی مہم پر کہیں باہر نکلے ہوئے ہیں اس خوش فہمی میں گرفتار ہم واپس لوٹے تو اچانک ہمیں آواز آئی ابے یہ تو اب بھی سو رہا ہے ؟ہم نے

چاروں طرف دیکھا ہمارے آس پاس نہ کوئی آدم نہ آدم زاد ! ایک سپاہی تھا جو سو رہا تھا پھر یہ آواز کیسی ؟اس سے پہلے کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچتے دوسری آواز آئی اوئے چپ کر ورنہ جاگ جائیگا تو مسئلہ ہو جائیگا۔اس بار ہم نے کان لگا کر آواز کو سننے کی کوشش کی تو ہمیں محسوس ہوا گویا یہ آوازیں ہمارے جھولے کے اندر سے آرہی ہیں۔ہمارے لئے یہ دلچسپ انکشاف تھا۔ہم نے ڈرتے ڈرتے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جھولے کے اندر وہ تینوں بندر براجمان تھے۔ہم نے ان میں سے ایک کو باہر نکالا تو وہ کمبخت اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ ہم نے کڑک کر پوچھا تم کون ہو؟

وہ بولا صاحب میں ۔ میں تان سین ہوں تان سین ۔

اور تمہارے ساتھ یہ دونوں کون ہیں ؟

ان میں سے ایک تو نین سکھ ہے اور دوسرا مونی بابا؟

اچھا تو یہ اندر باتیں کون کر رہا تھا ؟ وہ بولا صاحب یہ میں کیسے جان سکتا ہوں ؟آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں میرے دونوں کانوں میں انگلیاں گھسی ہوئی ہیں۔

ہم نے سوچا بندر کی بات درست ہے ہمیں اس سے یہ سوال ہی نہیں کرنا چاہئے تھا ۔اب ہم نے دوسرا ہاتھ جھولے میں ڈالا اور دوسرے بندر کو باہر نکال لیا اس نے اپنی آنکھوں کو ڈھانک رکھا تھا ہم سمجھ گئے یہ نین سکھ کے علاوہ کوئی

اور نہیں ہو سکتا ہم نے پوچھا کیوں تم نے ابھی ابھی کچھ کہا یا نہیں؟ وہ بولا صاحب آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں اس تان سین سے نہیں پوچھتے جو آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے؟ یہ الزام ہمارے لئے بڑا تضحیک آمیز تھا ہمیں بندر کی بات پر بہت غصہ آیا اور ہم اپنا بنیادی سوال بھول گئے۔ ہم نے پوچھا کیوں؟ بھلا یہ ہمیں کیوں کر بے وقوف بنا سکتا ہے ہم تو پہلے ہی سے اچھے خاصے احمق آدمی ہیں۔

نین سکھ بولا اچھا تو آپ اب بھی نہیں سمجھے اس کا مطلب ہے آپ نہ صرف بے وقوف بلکہ سچے آدمی بھی ہیں۔

ہم نے کہا ہو سکتا ہے لیکن یہ تو تم نے ہمیں دوسری بڑی گالی دے دی خیر یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے؟

کامن سینس صاحب کامن سینس! اگر یہ ہماری باتیں نہیں سن سکتا تو اس نے آپ کا سوال کیسے سن لیا؟ اور آپ کو جواب کیسے دے دیا؟

ایک معمولی سے بندر نے ہماری عقل کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے اور ہمیں

ڈارون کے فلسفے پر یقین آنے لگا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم سنبھلتے تان سین بول پڑا۔
صاحب یہ جھوٹا ہے اول درجے کا ریاکار آپ اس کی ایک نہ سنیں آپ تو نہایت عقلمند آدمی ہیں۔تان سین کی زبان سے اپنی تعریف سن کر ہم پسیج گئے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ اس کائنات کی سب سے عقلمند مخلوق ہستی اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ اس بندر کی ذات ہے جو ہمیں عقلمندی کا سپاس نامہ عطا کر رہی ہے ورنہ اس سے قبل ایسی غلطی کسی سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے مسکرا کر پہلے بندر کا شکریہ ادا کیا اور کہا تمہاری بات درست ہے لیکن آخر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے ؟
تان سین مسکرایا اور بولا آپ عقل کے اندھے تو نہیں ہیں لیکن آپ کی بینائی کے بارے میں میرے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ کہیں آپ گاندھی جی کی عینک خود اپنے لئے تو تلاش نہیں کر رہے ؟
اپنے چہیتے بندر کی اس بات نے ہمیں چونکا دیا ہم نے کہا گاندھی جی کی عینک استعمال کریں میرے دشمن۔ میری تو آنکھیں ابھی تک صحیح سلامت ہیں ماشا اللہ۔
سو تو میں دیکھ رہا ہوں۔۔بڑی خوبصورت غزال آنکھیں ہیں آپ کی لیکن میں اس

کے اندر پائی جانے والی قوت بصارت کی بات کر رہا تھا۔

اپنی آنکھوں کی اس تعریف کے بعد ہم یکسر شرما گئے اور لجاتے ہوئے اٹھلا کر بولے کیسی باتیں کرتے ہو؟ میری بصارت کو کیا ہوگیا ہے؟ اچھی بھلی تو ہے۔

اچھا اگر ایسا ہے تو آپ دیکھ نہیں رہے کہ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اب جس کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہو وہ بھلا کیسے دیکھ سکتا ہے کہ کون جھوٹا ہے اور کون سچا؟

نین سکھ بولا جھوٹ اور سچ بات کے درمیان تمیز کرنے کی خاطر آنکھوں کی نہیں کان کی ضرورت پڑتی ہے میری تو آنکھیں بند ہیں لیکن اس کاذب نے کانوں پر ہاتھ رکھا ہوا ہے ۔اس کے باوجود سب کچھ سن رہا ہے اور چڑ چڑ بول رہا ہے۔ نین سکھ کی بات نہایت معقول تھی لیکن چونکہ تان سین کے خلاف تھی جو ہماری تعریف اور توصیف بیان کرتا رہا تھا اس لئے اس کی دلیل کو تسلیم کرنا ہمارے لئے مشکل ہو گیا۔ آخر حقِ نمک بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے؟ ہم نے کہا کہ بھائیو میں تم دونوں کے دلائل سے خاصہ کنفیوز ہو چکا ہوں اور فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ کون حق پر ہے کون باطل۔

میری یہ بات سن کرتان سین باغ باغ ہوگیا گویا اکی من مراد پوری ہو گئی ہو۔ وہ بولا آپ واقعی نہایت حق پسند اور صاف گو صحافی ہیں ۔آپ خود اپنے خلاف بھی کسی حقیقت کا اعتراف کرنے سے نہیں کتراتے ۔ ہم نے پھر ایک مرتبہ اپنی پیٹھ تھپتھپائی اور دعا کی کہ کاش یہ بندر حکومت کی اعلیٰ سطحی کمیٹی میں موجود ہوتا جو صحافیوں کی تکریم کرتی ہے اور انہیں اعزاز سے نوازتی ہے ۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہمیں بھی صحافت کے میدان پدم بھوشن نہ صحیح تو پدم شری کا خطاب تو مل ہی جاتا ۔ہم نے شکر و احسان کے جذبات سے سرشار ہو کر اپنے پسندیدہ بندر کی جانب دیکھا اور اس کی زلفوں میں ہاتھ پھیرنے لگے۔

اس منظر کو دیکھ نین سکھ جس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا ہوا چراغ پا ہو گیا اور بولا جناب یہ آپکو اپنی باتوں میں الجھا رہا آپ کی بیجا تعریف بیان کرکے آپ کو بہلا پھسلا رہا ہے ۔

یہ تہمت ہمارے لئے نا قابلِ برداشت تھی ۔ہم بولے دیکھو تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ ڈارون نے تمہارے بارے میں جو بھی کہا ہو لیکن تم یہ نہ بھولو کہ تم آخر ایک بندر ہو بندر کیا سمجھے ۔

میری اس تضحیک آمیز جھڑکی پر تان سین پر گراں گزری ۔اس لئے کہ وہ جو بھی

تھا تو بالآخر ایک بندر ہی تو تھا اور یہ اسکی ساری برادری کی توہین تھی ۔اس نے رسوائی کے اس کڑوے گھونٹ کو کسی طرح زہر مار کیا اور بولا جناب آپ اس احمق کے باعث ہماری برادری کے بارے کوئی رائے قائم نہ کریں اگر اپنے کنفیوژن کو دور ہی کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے تیسرے بھائی مونی بابا کا تعاون لیں جو آپ کے جھولے سے ہنوز بند ہے ؟

نین سکھ نے اس تجویز پر زوردار قہقہہ لگا کر کہا لو اس کی سنو یہ اس مونی کو اپنے حق میں گواہ بنا رہا ہے جس نے ازخود اپنی زبان بند کر رکھی ہے ۔اس کے ایک منہ پر دو دو ہاتھ رکھے ہوئے ہیں ۔ یہ دلیل بھی معقول تھی۔ نین سکھ ویسے تو ساری باتیں معقول کرتا تھا لیکن اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف ہماری تعریف بیان کرنے سے احتراز کرتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً ہماری تذلیل بھی کر دیتا تھا ۔اس کے باعث ہمارے دل میں اس کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے تھے جو اسکی ہر معقول بات کو جلا کر بھسم کر دیتے تھے ۔

اس موقع پر تان سین پھر ہماری مدد کیلئے آگے آیا اور کہنے لگا اس عقل کے اندھے کو دیکھئے ۔کیا صحیح بات کو کہنے کیلئے بھلا زبان لازمی ہے ؟

ہمارے پاس اس سوال کا جو جواب تھا وہ اس نین سکھ کے حق میں تھا جو ہمارا

دشمن تھا اور تان سین کے خلاف تھا جو ہمارا دوست تھا اس لئے ہم نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔ لیکن نین سکھ اس موقع پر خاموش نہیں رہا بلکہ بولا جناب عالی آپ اس کے سوال پر خاموش کیوں ہیں بولتے کیوں نہیں ؟ کیا انسان زبان پر تالا لگا کر بات کہہ سکتا ہے ؟

اس سے قبل کہ ہم مجبور ہو کر اپنی من بھر بھاری زبان کو جنبش دیتے تان سین بول پڑا ۔ دراصل یہ احمق آج بھی اس پتھر کے زمانے میں جی رہا ہے جب اظہار رائے کیلئے زبان کی مجبوری تھی ، سائنسی ترقی سے بالکل بے بہرہ ہے بیچارہ۔

نین سکھ نے جب اپنے بارے میں بے بہرہ کا لقب سنا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور چیخ کر بولا بہرہ ہو گا تو اور تیرا باپ ۔ میری تو سماعت الحمداللہ سلامت ہے۔

تان سین مسکرایا اور بولا اس بیچارے کو اردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ بے بہرہ کسے کہتے ہیں اور بے بہرہ جو بھی ہو کم از کم بہرہ نہیں ہو سکتا۔ بے لگا دینے ہر لفظ اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً بے نقاب ، بے ایمان، بے ادب ، بے عقل، وغیرہ وغیرہ۔ ہم تان سین کی اس دلیل پر جھوم اٹھے اور کہا کیا بات کہی تم نے لاجواب دلیل ہے صاحب ۔

ہماری اس تعریف سے کھسیا کر نین سکھ بولا اچھا تو تمہارے اپنے بارے میں یعنی بے وقوف کے بارے میں کیا خیال ہے ؟

تان سین میری جانب دیکھ کر بولا دراصل بے وقوف کون ہے اور عقلمند کون ہے اس کا فیصلہ کرنے کے حقدار تو ہمارے صاحب ہیں لیکن چونکہ وہ ذرا کنفیوژ ہو گئے ہیں اس لئے میں ہمارے بھائی کی مدد لے رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھائی ہے یا قصائی ۔پہلے تو یہ آپ کی توہین کر رہا تھا اب اپنے بزرگ مونی بابا کا مذاق اڑا رہا ہے ۔

نین سکھ بولا اوئے چرب زبان بندر اپنی چاپلوس چونچ کو بند کر اور یہ بتلا کہ وہ جھولے کے اندر بند بیٹھا مونی کیسے اپنا فیصلہ سنائے گا ؟

تان سین بولا اب ہوئی نا کام کی بات اگر کوئی بات معلوم نہ ہو تو سمجھدار لوگوں سے پوچھا جاتا ہے ۔لیکن یہ کام ادب و تمیز کے ساتھ کیا جاتا خیر کوئی بات نہیں جب تو نے پوچھ ہی لیا تو سن۔ فیصلے نہ صرف سنائے جاتے ہیں بلکہ انہیں تحریری شکل میں تم جیسے ڈھیٹ لوگوں کے منہ پر لکھ کر دے مارا جاتا ہے اور ایسے میں منصف کو فیصلہ لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دینا پڑتا ہے ۔

ہم پھر ایک بار پہلے بندر کی شاندار دلیل پر جھوم اٹھے اور کہا کیا بات ہے ؟ کیا بات ہے میرے شیر ! تمہیں تو بندر کے بجائے لومڑی ہونا چاہئے تھا۔

نین سکھ بولا لومڑی کیوں ؟

اس لئے کہ اسی کو سب سے عقلمند جانور مانا جاتا ہے۔

تان سین کے چہرے پر میری اس تعریف سے پھر ایک بار ناگواری کے آثار نمودار ہو گئے وہ بولا صاحب ویسے آپ آدمی تو بہت نیک طبع ہیں لیکن بے جا مرعوبیت کا شکار ہیں ۔

ہم نے پوچھا ارے بھئی ہم نے ایسی کون سی بات کہہ دی جو تمہارے حسنِ طبع پر گراں گزری ؟

تان سین بولا بات دراصل یہ ہیکہ ہمارے آگے لومڑی اور شیر کس کھیت کی مولی ہیں ۔ اس سے پہلے تو ہم بس حضرت انسان کو اپنے سے اعلیٰ وارفع خیال کرتے تھے لیکن آپ سے ملنے کے بعد ہم اپنے اس خیال پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو

گئے ہیں۔

اپنے چہیتے بندر تان سین کی دیگر بہت سی باتوں کی طرح یہ بات بھی ہمارے سر کے اوپر سے نکل گئی لیکن ہم نے حسبِ عادت استفسار کرنے سے گریز کیا اور سوال کیا بھائی فیصلے تو عدالت میں یقیناً لکھے جاتے ہیں لیکن یہ تمہارا بھائی اپنا فیصلہ کیسے لکھے گا؟

یہ تو بڑا عجیب سوال آپ کر رہے ہیں ارے بھئی جیسے کوئی پڑھا لکھا انسان لکھتا ہے اسی طرح لکھے گا۔ ہمارے مونی بھی کوئی کم عالم فاضل تھوڑے ہی ہے وہ تو اس کی انکساری ہے جو انہوں نے اپنی تھیسس نہیں لکھی ورنہ انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینا آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی درسگاہوں کیلئے اعزاز کی بات ہوتی ۔

نین سکھ بولا یار اب تو تم کچھ زیادہ ہی بول گئے کیا کیمبرج وغیرہ کی ڈگری پیڑوں کی شاخوں پر لٹکی ہوئی ہوتی ہیں جو کوئی لنگور پھدک کر اچک لے؟

تان سین اس بات پر چراغ پا ہو گیا اور بولا تم جیسے احساسِ کمتری کا شکار لوگوں کی وجہ سے اس دنیا میں ہماری نسل عزت و توقیر سے محروم ہے ورنہ حقیقت

تو یہ ہے ساری دنیا کی درسگاہوں پر ہمارا بول بالا ہوتا۔
ان دونوں بندروں کی لڑائی میں ہمیں غور و فکر کرنے کا نادر موقع مل گیا۔ہم نے کہا تم کیسے گاندھی وادی بندر ہو جو عدم تشدد کا راستہ چھوڑ کر لڑائی جھگڑے پر تلے ہوئے ہو؟ہم نے بندر بانٹ کا پانسہ ڈالتے ہوئے کیا میں مانتا ہوں کہ تمہارا بھائی لکھنا پڑھنا جانتا ہے لیکن فی الحال میرے پاس قلم قرطاس بھی تو نہیں جو اس پر فیصلہ لکھوایا جاسکے۔
تان سینبولا یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی آج کل لوگ قلم دوات سے لکھتے ہی کب ہیں؟
نین سکھ نے حیرت سے پوچھا۔اچھا اگر قلم دوات سے نہیں تو کس چیز سے لکھتے ہیں بھلا؟
بھئی زمانہ بدل گیا تان سین اکڑ کر بولا آجکل تو لوگ کمپیوٹر یا فون کے 'کی بورڈ' سے لکھتے ہیں اور کاغذ کے بجائے مانیٹر پر اسے پڑھ لیتے ہیں۔
ہاں ہاں وہ تو مجھے پتہ ہے لیکن کیا تمہارے مونی بابا بھی کمپیوٹر چلانا

جاتا ہے ؟

آپ یہ کیسا سوال کر رہے ہیں کمپیوٹر تو کیا وہ ہوائی جہاز چلانا بھی جانتے ہیں لیکن چونکہ وہ اپنے منہ سے بولتے نہیں اسلئے کوئی انکی قدر نہیں کرتا۔

تان سین اور مونی بابا کے آگے ہمیں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا ہم نے کمرے میں ایک جانب اپنا لیپ ٹاپ نکال کر کھولا اور جھولے سے مونی بابا کو نکال کر اس کے سامنے بٹھا دیا۔ مونی بابا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لپک کر کمپیوٹر چلا دیا اور ایم ایس ورڈ کا صفحہ کھولا ۔کی بورڈ کی سیٹنگ کو بدل کر اسے اردو فونیٹک میں تبدیل کیا اور فیصلہ لکھنے کی ابتداء کر دی۔ سب سے اوپر درمیان میں لکھا شروع اللہ کے نام سے۔ پھر نیچے بائیں جانب کنارے لکھا تمہید لکھا اور اس کے آگے یوں لکھنے لگا۔ ہم سب ریا کار ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں۔ ہم سنتے ہیں مگر وہی جو ہم چاہتے ہیں اور ہم بولتے ہیں مگر وہ نہیں بولتے جو ہمیں بولنا چاہئے ۔اس بیچ پہرے پر بیٹھے ہوئے سپاہی کی آنکھ کھل گئی اس نے دیکھا سامنے ایک بندر کمپیوٹر پر کچھ لکھ رہا ہے اسے لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے بھیانک خواب گھبرا اس نے پھر اپنی آنکھیں موند لیں اور خوابِ خرگوش میں کھو گیا۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اردو زبان کا حال بھی عجیب ہے کہ پیدا تو دہلی میں ہوئی لیکن دہلی کے اجڑتے ہی یتیم سی ہو گئی ۔لڑکپن مشرق کی جانب کوچ کرکے لکھنؤ میں گزارا اور جوان ہوئی تو جنوب میں حیدرآباد اور مغرب میں لاہور کا رخ کیا اس وقت کسے پتہ تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب یہ زبان مہاراشٹر جیسی سنگلاخ زمین میں پھولے پھلے گی بہار میں اس پر پھر سے بہار کا موسم چھائے گا اور بنگال کے مختلف ضلعوں میں اسے دوسری ریاستی زبان کا درجہ حاصل ہو جائیگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عالمِ غیب کا حال عالم الغیب کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ مستقبل کے بارے میں انسانی قیاس آرائیاں ہمیشہ ہی غلط ثابت ہوتی رہی ہیں ۔گردش زمانہ کی زنبیل میں وہ کچھ موجود ہوتا ہے جس کا اندازہ لگانا حضرتِ انسان کے تخیل پرواز سے پرے ہے ورنہ کس کے خواب و خیال میں یہ بات تھی کہ جن مدرسوں کو کبھی آئی ایس آئی کے اڈے اور دہشت گردی کی آماجگاہ قرار دیا جارہا تھا ان کی اس طرح پذیرائی ہوگی کہ انہیں نہ صرف حکومت تسلیم کریگی بلکہ ان کی سرپرستی بھی کریگی اور ایسا کرنے والی سرکاروں میں فسطائی جماعت بی جے پی کا بھی شمار ہوگا۔ ان مدرسوں سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو طلباء وطالبات بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر نکلیں گے۔ ایک ایسے سنگین دور میں جبکہ خوشحال مسلمان

خود اپنے بچوں کو کانونٹ اسکولوں میں روانہ کرکے اردو کا چراغ اپنے ہی گھروں میں گل کرنے پر تلے ہوئے ہیں ان مدرسوں سے نکلنے والے مسلم و غیر مسلم نوجوان اردو زبان کی ترویج و ترقی کیلئے آگے آئیں گے۔ ہم لوگ خالق کائنات کی اس یقین دہانی سے مایوس ہو رہے تھے کہ ''بے شک ہر مشکل کے ساتھ اک آسانی بھی ہے'' (سورۃ الانشراح اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے ۹۴:۶) ایسے میں ۔چرخِ نیلی فام کا پھر رنگ بدلا اور ایسا لگنے لگا گویا

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

انتخابی سیاست میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کامیابی حاصل کرنے بعد رہنماؤں کو اپنے وعدے یاد رہتے ہوں لیکن کم از کم ممتا بنرجی کو ابھی تک اپنے وعدے یاد ہیں اور وہ انہیں نبھانے کی اپنی سی کوشش کر رہی ہیں۔انہوں نے مدرسہ عالیہ کا اصلی نام بحال کر دیا ہے اس مدرسے کے نام سے لفظ عالیہ کو یونیورسٹی کا درجہ عطا کرنے سے قبل حذف کر دیا گیا تھا اور یہ گھناؤنی کاروائی اپنے آپ کو سیکولرزم کا سرخیل قرار دینے والی کمیونسٹ پارٹی نے کیا تھا۔اردو زبان میں ترقی پسندی کی تحریک جس نظریہ کے حامیوں نے چلائی تھی اسی اشتراکیت کی علمبردار حکومت کا مسلمانوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک

حیرت انگیز تھا۔ اس کے علاوہ ممتا بنرجی نے ۶ ضلعوں میں اعلیٰ تعلیم کے مدرسے قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ ریاست بھر کے ۱۰۵۰۰ مدرسوں کو سرکاری منظوری دینے کے بعد ان کو مرکزی حکومت کی امداد کا مستحق بنانے کے قابل بنانے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور جن ضلعوں میں اردو داں افراد کی تعداد ۱۰ فی صد یا اس سے زیادہ ہے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ یاد رہے مغربی بنگال میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۲۷ فی صد ہے اور فی الحال ریاستی حکومت کے تعاون سے چلنے والے مدرسوں کی تعداد ۵۲۸ ہے۔

ممتا بنرجی کے ان فیصلوں کی مخالفت نہ تو کانگریس کے بس میں ہے اور نہ کمیونسٹ ایسا کر سکتے ہیں اس لئے بی جے پی حسبِ توقع خم ٹھونک کر میدان میں کود پڑی۔ بھاجپ کے ریاستی صدر راہل سنہا نے ان فیصلوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ مرکزی خفیہ ایجنسی کے مطابق بنگلہ دیش کی سرحد کے ساتھ پائے جانے والے مدرسے ہند مخالف ہیں اس کے باوجود مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ممتا بنرجی قومی مفاد سے کھلواڑ کر رہی ہیں۔

راہل سنہا کے مطابق مرکزی وزیر داخلہ نے اپنے حالیہ بیان میں الزام لگایا ہے کہ بنگلہ دیش سرحد سے متصل مدرسے حرکت المجاہدین کے ذریعہ چلائے جارہے

ہیں اور ان میں سے اکثر قوم دشمن ہیں ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ایک طرف تو کانگریس کی ہر بات پر شک ہوتا ہے اور دوسری جانب وہ کانگریس ہی کی ہر ایسی بات پر یقین کرلیتی ہے جو مسلمانوں کے خلاف ہوتی ہے ۔ایسا کیوں ؟وزیر داخلہ نے اگر یہ بات کہی ہے تو ان سے یہ پوچھا جانا چاہئے کہ انہیں ان مدرسوں کے خلاف کاروائی کرنے میں کیا چیز مانع ہے ؟ ویسے اگر بی جے پی کو مدرسوں کی سیاست سے پریشانی لاحق ہوئی ہے تو انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی اپنی پارٹی کے چشم و چراغ نریندر مودی نے دیوبند کے مہتمم مولانا وستانوی کو محض گجرات کے فسادات کو بھول جانے کا مشورہ دینے کے عوض یوم جمہوریہ کی سرکاری تقریب میں شرکت کی دعوت دے ڈالی تھی لیکن اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی مولانا کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے مودی کی دعوت کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی ۔

ہندوستان کی سب سے بڑی حزبِ اختلاف بی جے پی کا حال فی الحال بہت خراب ہے ایک تو وہ لوگ کچھ بولتے نہیں اور اگر کچھ بولتے بھی ہیں تو اس قدر اوٹ پٹانگ کہ کوئی اس پر کان نہیں دھرتا۔میڈیا ان کی سن کر بھی ان سنی کر دیتا ہے اور نشر و اشاعت کی زحمت گوارہ نہیں کرتا۔ ایسا ہی کچھ ہوا جب بھارتیہ جنتا پارٹی نے ممتا کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کے مدرسوں سے متعلق فیصلے پر برس پڑے حالانکہ وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ مغربی بنگال سے زیادہ

مدرسوں کی پذیرائی بہار میں کی جاتی ہے اور بہار کی ریاستی حکومت میں بی جے پی برابر کی شریک ہے۔ بہار میں تسلیم شدہ مدرسوں کی تعداد ۴۰۰۰ ہزار ہے جن میں سے ۱۱۱۸ کو ریاستی حکومت چلاتی ہے گویا یہ تعداد مغربی بنگال کے سرکاری مدرسوں سے دوگنی ہے ۔اس معاملے میں ایک دلچسپ اعداد و شماریہ بھی ہے کہ خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کا دم بھرنے والی سرکار صرف ۳۲ طالبات کے مدرسوں کا تعاون کرتی ہے جبکہ ملت اپنے تئیں ۵۷۶ طالبات کے مدرسوں کا (سرکاری امداد کے بغیر) اہتمام کرتی ہے ۔ویسے ایک حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہمدرد سمجھے جانے والے لالو یادو کو ان مدرسوں کو جدید سہولیات سے آراستہ کرنے کا خیال نہیں آیا بلکہ بی جے پی کی مدد سے لالو کو ہرانے والے نتیش کمار نے ۲۰۰۲ء سے اس کارِ خیر کا آغاز کیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنے شدت پسند حامیوں کو تو مسلمانوں کے مخالف بیان سے خوش کر دیا مگر ان احمقوں کو کون بتلائے کہ جن مدرسوں کی ان کے رہنما مخالفت کر رہے ہیں ان میں القاعدہ کا تو کہیں نام و نشان نہیں ہے ہاں مسلمانوں کے ہمراہ ہندو بچے ضرور تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بنگال میں اوسطاً مدرسوں کے اندر ۲۰ فی صد طلباء غیر مسلم ہیں لیکن چند ایک ایسے مدارس بھی موجود ہیں جن میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی اکثریت غیر مسلم ہے مثلاً اوروگرام گاؤں کا چاتوسپلی مدرسہ جہاں تعلیم حاصل کرنے والے ایک ہزار طلبہ

میں سے ۶۴ فی صد غیر مسلم ہیں اور جملہ اساتذہ کی تعداد ۱۲ ہے جن میں سے ۴ ہندو ہیں۔ غیر مسلمین کے اندر مدرسے کی مقبولیت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے صدر مدرس انور حسین فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں بھی وہی مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو دوسرے اسکولوں میں ہوتے ہیں۔ عربی اور اسلامیات کے علاوہ سائنس اور کمپیوٹر کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے ساتھ ہم تمام مذاہب کے طلباء کا یکساں خیال رکھتے ہیں۔ یہاں سے تعلیم ختم کرنے کے بعد طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے یا سرکاری و نجی ملازمت حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اس لحاظ سے دوسرے اسکولوں اور ہمارے مدرسے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انور حسین کے دعویٰ کی تائید یہاں پڑھنے والی ۱۲ سالہ شنجنی خاتون نے بھی کی جو ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور اسے یقین ہے کہ مدرسے کا معیارِ تعلیم اسے داخلے کے امتحان میں کامیابی سے ہمکنار کر دے گا۔

کولکتا (جو شہرۂ آفاق کلکتہ کا نیا نام ہے) میں زیرِ ملازمت ہمایوں کبیر کا کہنا ہے کہ انہوں ابتدائی تعلیم مدرسے حاصل کی پھر ایم بی بی ایس میں داخلہ لیا اور اب بچوں کے امراض کے ماہر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اوروگرام مدرسے کے ایک استاد نظام الدین احمد فنی و مادی فائدوں کے علاوہ سماجی و معاشرتی افادیت کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مدرسوں میں ہندو مسلم طلبا کا ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنا فرقہ وارانہ امن و

خیر سگالی کیلئے بھی معاون ثابت ہوتا ہے اور آپسی غلط فہمیوں اور عدم اعتماد کے ازالہ کا سبب بنتا ہے۔۱۶ سالہ تانو شری بسواس اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ان کے خیالات میں مدرسے کی تعلیم کے دوران زبردست فرق واقع ہوا۔ مغربی بنگال کے اندر ابھی حال میں انگریزی میڈیم کے مدرسوں کا رجحان بھی پروان چڑھ رہا ہے۔

بہار کے مدرسے نہ صرف دسویں جسے فوقانیہ کہا جاتا ہے بلکہ بارہویں یعنی مولوی کے درجے تک کی تعلیم فراہم کرتے ہیں اس سال بغیر کسی نقل کے مدرسوں کے نتائج ۹۰ فی صد رہے۔ وہاں امتحان کے نتائج کا اعلان ہندوؤں اور مسلمانوں کیلئے جدا جدا زمروں میں ہوتا ہے۔ اس سال فوقانیہ کے امتحان میں انجلی ۸۰۵ نمبر حاصل کرکے ہندو طالب علموں میں اول نمبر پر آئی جبکہ اسکے مقابلے ناصرہ خاتون کو اول آنے کیلئے ۸۹۶ نمبر حاصل کرنے پڑے۔ اسی طرح مولوی کے امتحان میں جہاں محمد ملک ۹۶۳ نمبر حاصل کرکے اول آیا وہیں سنجے نے ۸۹۳ اور بالا کرشنن نے ۸۸۴ نمبرات حاصل کئے ۔سنجے کا کہنا ہے کہ وہ دوسرے غیر مسلمین کو مدرسے میں آنے کی ترغیب دے گا اسلئے کہ یہاں تعلیم نہ صرف مفت ہے بلکہ معیاری ہے۔غیر مسلمین اپنے بچوں کو عربی فارسی اور اسلامی تہذیب سے اس لئے مانوس کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ خلیج کے ممالک، میں موجود مواقع سے استفادہ کرسکیں اور مسلم ممالک کے سفارتخانوں میں ملازمت حاصل کرسکیں

۔یہی وجہ ہے کہ مدرسوں کی جانب نہ صرف پسماندہ بلکہ خوشحال ہندوؤں کا بھی رجحان بڑھ رہا ہے۔ تیس غیر مسلم طلبا نے فوقانیہ میں ٹاپ کیا ہے جبکہ ۱۶ مولوی کے کورس میں اول پوزیشن پر آئے ہیں اور ان سب نے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ حقیقت بھی چونکانے والی ہے کہ سب سے زیادہ نمبرات حاصل کرنے والے ۱۲ غیر مسلم طالب علموں میں سے ۱۰ طالبات ہیں۔

ایک دلت طالبہ صنم کماری جس نے مولوی کے امتحان میں تیسرا نمبر حاصل کیا اردو ٹیچر بننا چاہتی ہے۔ حکومت کی تعلیم کے فروغ کی خاطر چلائی جانے والی مہم میں ہر ۴۰ طلبا پر ایک استاد اور ہر دس طالب علم پر ایک اردو ٹیچر کا اہتمام ہے جس کے باعث بہت ساری اسامیاں اساتذہ کی خاطر معرضِ وجود میں آئی ہیں ان میں سے ۱۰ فی صد اردو والوں کیلئے مختص ہے۔ گذشتہ دوسالوں کے اندر نتیش سرکار نے دو لاکھ اساتذہ کا تقرر کیا جس میں سے اچھی خاصی تعداد اردو اساتذہ کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب بی جے پی کی شریک کار حکومت کی جانب سے کیا جارہا ہے جس کے بنیادی عقائد میں سے ایک مسلمانوں کو دہشت گرد اور غدار وطن سمجھنا ہے اور جن کا واحد ہدف اسلام اور مسلمانوں کی ایذارسانی ہے۔

دہشت گردی کی بابت تو یوں ہوا کہ اس کو امریکہ اور اس کے حواریوں نے جن میں

ہندوستان بھی پیش پیش ہے اس قدر پھُلایا کہ وہ اپنے دباؤ سے آپ ہی پھٹ گیا اور اسکی ساری ہوا نکل گئی اب سرکار کی سرپرستی میں آئے دن برپا ہونے والی دہشت گردی عوام کے معمولات زندگی میں شامل ہو گئی ہے اور اس پر کسی کو حیرت نہیں ہوتی بلکہ جو حیرت کا اظہار کرتا ہے اسے لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں مدرسوں کے خلاف بڑے پیمانے پر محاذ آرائی کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو مرکز میں اقتدار حاصل ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ ۱۱ ستمبر کے بعد کا زمانہ تھا اور عالمی سطح پر امریکہ کی سربراہی میں مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ معاملہ محض بی جے پی تک محدود رہا بلکہ اس حمام میں کانگریس، کمیونسٹ اور ملائم سنگھ یادو تک بھی برہنہ پائے گئے اور ان سب کے زیر نگرانی میں چلنے والی ریاستی حکومتوں کی پولس نے مدرسوں پر چھاپہ بلکہ شب خون مارنے کی گھناؤنی کارروائی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

ممبئی میں مدرسہ دارالعلوم امدادیہ پر تیاگی کی قیادت میں پولس نے ۱۹۹۳ کے فسادات کے دوران ہلہ بول کر ۸ معصوم طلبا کو شہید کر دیا۔ اس وقت مرکز اور ریاست دونوں مقامات پر کانگریس کی حکومتیں تھیں اس کے باوجود آر ڈی تیاگی کی ترقی ہوتی رہی اور بالآخر اسے پولس کمشنر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ حکومت اس کی اور دیگر مجرم پولس اہلکاروں کی پشت پناہی کرتی رہی ان کے کے خلاف

مقدمات کو ہر عدالت میں کمزور کیا جاتا رہا یہاں تک کہ ۱۸ سال بعد وہ لوگ سپریم کورٹ سے بھی بری ہو گئے اور یہ سب کانگریس کے آشیر واد سے ہوا۔آندھرا پردیش میں مولانا عاقل حسامی کے زیر اہتمام چلائے جانے والے دارالعلوم پر حیدرآباد میں پولیس نے آدھی رات میں چھاپہ مارا۔ مسلمانوں کے زبردست احتجاج کے باوجود پولس نے اگلے ہی دن نہ صرف کشن باغ میں واقع دارالعلوم انوارالہدیٰ کو نشانہ بنایا بلکہ مصری گنج کے جامعہ عائشہ صدیقہ برائے طالبات پر بھی دہشت گردی کا لیبل چسپاں کر دیا اور یہ ساری کاروائی مسلم دوست سمجھے جانے والے کانگریسی وزیر اعلیٰ وائی ایس راج شیکھر ریڈی کے دورِ اقتدار میں ہوئی۔

مغربی بنگال جہاں مدرسوں کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ان کا جال پھیلا ہوا ہے امریکی سفارتخانے پر حملے کے بعد خود وزیر اعلیٰ بدھو دیو بھٹا چاریہ نے نہ صرف کلکتہ کے مدرسے پر چھاپہ مروایا بلکہ سنگھ پریوار کے لہجے میں مدرسوں کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا۔اس سلسلے کا سب سے حیرت انگیز چھاپہ پھلت ضلع مظفر نگر میں واقع جامعہ رحمانیہ پر اس وقت پڑا جب ملاّ ملائم کہلانے والے ملائم سنگھ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مقام پیدائش پر ان کے نام سے چلایا جانے والا یہ مدرسہ ہمیشہ ہی حکومت کا وفادار رہا اس کے باوجود اپنے آپ کو سرکاری عتاب سے نہیں بچا سکا۔ اس طرح کے

مظالم کا آغاز اترپردیش میں ویسے تو بی جے پی کی زیر سرپرستی ہوا جب ندوۃ العلوم کے چند طلبا ۱۹۹۴ میں رات گئے گرفتار کئے گئے۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ساتھ قائم ہونے والے سہارنپور کے مظاہر العلوم کے ایک استاذ مولانا اسرار کو دہلی میں گرفتار کرنے کے بعد مدرسے پر چھاپہ مارا گیا۔

سرزمینِ ہند کے مسلمانوں نے ایک ایسا پرآشوب دور بھی دیکھا کہ جب سنگھ پریوار والے چندرا چندرا کر یہ کہتے پھرتے تھے کہ "ہر مسلمان دہشت گرد تو نہیں مگر ہر دہشت گرد مسلمان ضرور ہے" لیکن آج حالت یہ ہے کہ آر ایس ایس کے بارے میں یار دوست کہنے لگے ہیں کہ "ہر ہندو سنگھی تو نہیں مگر ہر سنگھی [کسی نہ کسی درجے میں] دہشت گرد ضرور ہے" اس زمانے میں مندروں اور بازاروں میں تو کجا مسجدوں ،درگاہوں اور قبرستانوں میں ہونے والے دھماکوں کی بھی ذمہ داری بھی بلاچوں چرا مسلمان معصوم نوجوانوں کے سر منڈھ دی جاتی تھی اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب ممبئی دھماکے میں گرفتار کئے جانے والے سبھی مسلمان ملزم باعزت بری کر دیئے گئے سوائے اجمل قصاب کے جس کا تعلق پاکستان سے بتلایا جاتا ہے ویسے اس کا حقیقی تعلق کس سے ہے یہ پتہ لگانا ایک ایسی تحقیق کا موضوع ہے جس کی فرصت یا ضرورت کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ ہی کسی میں اس کی جسارت ہے کہ وہ امریکی ایجنٹ رچرڈ ہیڈلی کے دست راست کی تفصیل میں جائے۔ اس لئے کہ بقول غالب

داورِ حشر! میرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

دھماکوں کی سیاست اور معیشت کے دھماکے

ممبئی شہر ایک مرتبہ پھر ۳۱ ماہ کے بعد بم دھماکوں سے دہل گیا لیکن اس بار حکومت نے اپنی گوں ناگوں سیاسی مجبوریوں کے سبب بلا کے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ انتظامیہ نے ماضی کی روایات کے برخلاف جلد بازی اور بے احتیاطی سے گریز کیا اور ذرائع ابلاغ کو تلقین کردی گئی ہے کہ اس معاملے کو بیجا طول دینے کے بجائے ایک بھیانک خواب سمجھ کر جلد از جلد بھلادیا جائے۔ حکومت کی مجبوری اترپردیش کے انتخابات ہیں جس میں کانگریس کی توجہ خاص طور پر مسلمانوں کی جانب ہے۔ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہتی جس سے مسلمانوں پر بے سروپاالزام تراشی کرکے انہیں ناراض کیا جائے۔ اترپر دیش کے انتخابات کانگریس کیلئے اس زاویے سے بھی اہم ہیں کہ اس میں حاصل ہونے والی کامیابی کا سہرہ راہل گاندھی کے سر باندھ کر ان کیلئے وزارت عظمیٰ کا راستہ ہموار کرنا مقصود ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جب بھی اترپر دیش میں کانگریس کمزور ہوئی ہے گاندھی۔ نہرو خاندان کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا ہے گویا اس خاندان کے اقتدار کا راستہ رائے بریلی۔ امیٹھی اور الہ باد سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ وزیر داخلہ پی چدمبرم کے نہایت سلجھے ہوئے بیان کی کوئی اور وجہ بظاہر نظر نہیں آتی۔

یہ دھماکے کس نے کئے اس کے بارے سوائے کرنے اور کروانے والے کہ کوئی بھی وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسکی بنیاد یا تو قیاس آرائی ہے یا سیاسی ابن الوقتی اور اس کا مظاہرہ سب سے زیادہ مقامی سطح پر ہو رہا ہے مثلاً شیو سینا کا راہل گاندھی بیان پر پیچ وتاب کھانا جس میں انہوں نے کہا اس طرح کے دھماکے افغانستان، عراق اور امریکہ میں ہوتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ کہ راہل گاندھی کا یہ بیان ہنوز سیاست کے میدان میں ان کے طفل مکتب ہونے کا ثبوت ہے اگر یہ بات حقیقت بھی ہو تب بھی اس موقع پر اس کا اظہار غیر مناسب ہے۔ راج ٹھاکرے نے اپنی سیاسی روٹی سینکتے ہوئے دیگر ریاستوں سے آنے والے شہریوں کو بلاجواز موردِ الزام ٹھہرا دیا اس کے جواب میں بی ایس پی نے خود راج کو دہشت گرد قرار دے کر اپنی دوکان چمکانے کی کوشش کی۔ سب سے زیادہ غیر ذمہ داری کا ثبوت وزیر اعلیٰ چوہان نے اپنے اس نا عاقبت اندیش بیان سے دیا کہ این سی پی کو وزارتِ داخلہ کا قلمدان دینا ایک غلط فیصلہ تھا جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ چوہان صاحب شاید یہ بھول گئے کہ سب سے زیادہ نشستوں پر کامیابی حاصل کرنے کے باعث وزارتِ اعلیٰ کی کرسی کی اصل حقدار این سی پی ہے۔ اگر وہ خود اسے این سی پی کیلئے خالی کر دیں تو راشٹروادی بخوشی انہیں وزارتِ داخلہ کے قلمدان سے نواز دیں گے تاکہ ان کا دم خم دیکھ سکیں۔ جو وزیر اعلیٰ دھماکوں کے بعد ۱۵ منٹ تک اپنے پولس کمشنر سے رابطہ تک نہ قائم کر سکا ہو اسے اس طرح کی ابن الوقتی زیب نہیں دیتی وہ

بھی کیا کرے ایسا یہی کانگریس کا کلچر ہے۔

ان دھماکوں کے حوالے سے مقامی سیاست کے علاوہ ایک معاشی پہلو بھی روشنی میں آیا ہے۔ ممبئ میں اوپیرا ہاؤس اور دادر کے علاوہ تیسرا دھماکہ زویری بازار میں ہوا جہاں ہیروں کے تقریباً ۵۰۰۰ تا ۶۰۰۰ دوکانیں اور کارخانے ہیں حکومت نے ان کیلئے باندرا کرلا کامپلکس میں بھارت ڈائمنڈ بورس تعمیر کیا ہے لیکن ابھی تک صرف ۵۔۶ لوگوں نے ہی اس نئ سہولت کا رخ کیا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح کے دھماکوں سے بیوپاریوں میں خوف و دہشت پیدا کرکے انہیں قلبِ شہر سے نکال کر مضافات میں بھیجنا مقصود ہو اس لئے کہ زویری بازار کی زمین فی الحال بلڈر لابی کیلئے سونے کے انڈے دینے والی مرغی بن گئ ہے اور قانوناً وہاں پر بسنے والوں کا انخلا ممکن نہیں ہے ویسے مقامی بیوپاری اب بھی وہاں سے نکلنے کے بجائے پولس چوکی کا قیام اور غیر قانونی پارکنگ کی ممانعت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

جولائی کے دن جبکہ یہ دھماکے رونما ہوئے پڑوس کی ریاست گجرات میں فسادات ۱۳ کے حوالے ایک اہم ترین فیصلہ عدالت میں سنایا گیا۔ ویرمگام میں عمران بھٹی، جمعہ بھٹی اور حیدر بھٹی کو ۲۸ فروری ۲۰۰۲ کے دن فسادات کے دوران ہلاک کر دیا گیا تھا ۔نوسال بعد اس مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے احمد آباد کے

ٹرائیل کورٹ نے ۶ ملزمین کو سزا سنائی اور ۴ کو رہا کر دیا۔ان میں سے دو بھوپا بھارواڑ اور باچو جی رنچھوڑ جی کو عمر قید کی سزا سنائی گئی جبکہ وٹھل عرف کچھو کو ۱۰ سال قید اور وہالا گھیلا و مولا گھیلا کو پانچ سال کی سزا سنائی گئی ۔ یہ فیصلہ اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے قبل گودھرا ٹرین حادثے میں ۳۶ لوگوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جا چکا ہے اور دس کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی ہے۔ٹرین حادثے میں صرف ۵۹ کارسیوک مارے گئے تھے جبکہ اس کے بعد ہونے والے فسادات میں تقریباً ۲۰۰۰ معصوموں نے اپنی جان گنوائی تھی لیکن کسی مجرم کو ابھی تک کوئی سزا نہیں ہوئی تھی اور اسکی واحد وجہ نریندر مودی حکومت کا عدلیہ پر دباؤ رہا ہے ۔ مودی کے اس رویہ پر سپریم کورٹ پھٹکار سنا چکا ہے ۔بسٹ بیکری کا معاملہ گجرات سے ممبئی کی عدالت میں منتقل کیا جا چکا ہے۔

مودی کی دہشت اس قدر ہے کہ اوڈے گاؤں مقدمے کی سماعت کرنے والی خصوصی عدالت کی جج محترمہ ترویدی کو استعفیٰ دینے پر مجبور ہوئیں۔ گزشتہ سال اسی مقدمے کے سرکاری وکیل سی ایچ دیسائی کو بھی بھگایا گیا۔ اوڈے گاوں میں یکم مارچ کو ۲۰۰۲ بدقسمت مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ گجرات فسادات کی پیروی کرنے والے ۲۳ چار سرکاری وکلاء کو اب تک سبکدوش ہونے پر مجبور کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے ۷۲ سالہ معمر وکیل پی آر اگروال نے اپنے استعفیٰ میں

الزام لگایا کہ جج سری واستوان کی دلائل کو سنتے ہی نہیں ہیں اس لئے وہ اپنی ذمہ داری سے کنارہ کش ہو رہے ہیں ۔اگروال صاحب کو مقدمے کے آخری مراحل میں یہ اقدام کرنا پڑا جبکہ ۲۰۰ گواہ ۸۵ ملزمین جن میں سابق بی جے پی ایم ایل اے پرہلاد گوسا بھی شامل ہیں کے خلاف پیش ہو چکے ہیں ۔اس سے قبل گلبرگ سوسائٹی اور نروڈا پاٹیہ مقدمات کے سرکاری وکلاء آرکے شاہ اور نگم شکلا کو بھی مودی کے دباؤ نے چلتا کر دیا ۔ہر کوئی اس قدر دہشت زدہ کردیا جاتا ہے کہ ذاتی مجبوریوں کا بہانہ بنا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔گجرات میں سپریم کورٹ کی قائم کردہ خصوصی عدالت میں ۸ مقدمات زیرِ سماعت ہیں جس نے سنگھ پریوار کے ۳۳۰ ملزمین کی نیند اڑا رکھی ہے ایسے میں ویرم گام کے مقدمے کا فیصلہ یقیناً ذرائع ابلاغ پر چھا جاتا اور مودی کی دہشت گردی کو بے نقاب کر دیتا مجرمین اور مہلوکین کے افراد خانہ کو ٹیلی ویژن کے پردے پر دیکھ کر فسادات کی یاد تازہ ہو جاتی مگراسی دن ہونے والے دن دھماکے مقدمے کی خبر پر گھن بن کر نہیں چھا گئے ۔اور دھماکوں کے شور میں اس مقدمہ کی آواز گھٹ کر مر گئی۔نریندر مودی اپنی جانب سے توجہ ہٹانے خاطر اس طرح کے دھماکے کروانے میں ماہر ہے۔

قومی سطح پر اس کی وجوہات اور اثرات کو جاننے کیلئے وزیر داخلہ کا بیان نہایت معاون و مددگار ہے ۔پی چدمبرم نے ممبئی حملے پر اظہارِ تاسف کے ساتھ

یہ بھی کہا کہ دھماکے ہندوستان کی معاشی راجدھانی پر حملہ نہیں ہے شاید وہ کہنا چاہتے تھے کہ اس کا کوئی خاص اثر معیشت پر نہیں پڑے گا۔ ان کے مطابق یہ کسی چھوٹے گروہ کا کام ہو سکتا ہے لیکن وہ کوئی قیاس آرائی کرنا نہیں چاہتے انہوں نے پولس کو کسی روایتی مفروضہ کی بنیاد پر تحقیق کرنے کے بجائے ان تمام امکانی گروہوں کی چھان بین کا حکم دیا جو اس طرح کی کاروائی میں ملوث ہو سکتے ہیں۔انہوں نے جہاں اس بات کا اعتراف کیا کہ انڈین مجاہدین کے دو افراد کو پچھلے دنوں گرفتار کیا گیا وہیں یہ اعلان بھی کیا کہ ابھی حال میں نکسلوادیوں کو بھی ممبئ اور پونا سے گرفتار کیا جاچکا ہے گویا شک کی سوئی کسی ایک فرقہ یا گروہ کی جانب مرکوز کر دینا درست نہیں اس کے باوجود میڈیا میں انڈین مجاہدین کی دھوم ہے لوگ اس طرح سے بیان کر رہے ہیں کہ چند مبرم نے انڈین مجاہدین کا تک نام نہیں لیا اور پھر یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے اس سے پہلے کئے جانے والے سارے حملے ۱۳ یا ۲۶ تاریخوں کو ہوئے اور ان سب میں انڈین مجاہدین ملوث رہے ہیں حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انڈین مجاہدین صرف اور صرف ممبئ پولس کے ذہن کی افتراپردازی ہے جسے ان لوگوں نے اے ٹی ایس مہاراشٹر کی حریفائی میں ایجاد کیا تھا۔ ان دونوں اداروں کے درمیان پائی جانے والی مخاصمت اظہر من الشمس ہے۔ دہلی پولس جب جامع مسجد کے معاملے میں انڈین مجاہدین کی تحقیق کرنے کی غرض سے

ممبئی آئی تو کرائم برانچ نے ساری تفصیلات ذرائع ابلاغ میں لیک کرکے اسے رسوا کیا۔ ۲۰۰۸ کے دھماکوں میں اے ٹی ایس سے پہلے افضل عثمانی کو گرفتار کرکے اے ٹی ایس پر اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی جبکہ ۲۶ نومبر حملے کی تحقیقات کا اصل حقدار اے ٹی ایس تھی لیکن ریاستی حکومت نے یہ ذمہ داری بلاوجہ ممبئی پولس کو سونپی اس سے پہلے ۲۰۰۶ کے لوکل ٹرین دھماکوں میں انڈین مجاہدین کے ملوث ہونے کا اعلان کرکے ممبئی پولس نے اے ٹی ایس کی جانب سے گرفتار کئے جانے والے لوگوں کو غیر متعلق ثابت کردیا۔ہماری خفیہ ایجنسیوں کے درمیان کس قدر بے ربطگی پائی جاتی ہے اس کا ثبوت اس وقت سامنے آیا جبکہ وجیہ القمر خان کو سی بی آئی نے ۵۰ خطرناک ترین مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل کرکے اس کے خلاف انٹرپول سے ریڈ کارنر وارنٹ جاری کروادیا جبکہ بعد میں پتہ چلا کہ اسے اے ٹی ایس اور پھر ممبئی کرائم برانچ پہلے ہی گرفتار کر چکے ہیں اور وہ حراست میں ہے لیکن ان دونوں اداروں نے سی بی آئی کو اطلاع فراہم کرنے کی زحمت نہیں کی۔

ممبئی بم دھماکوں کے بین الاقوامی محرکات کو جاننے کیلئے مستقبل قریب میں ہونے والی ہندپاک بات چیت اورامریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے دورۂ ہند کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔یہ ایک نہایت خوش آئند بات ہے پاکستان کے صدر زرداری اور وزیراعظم گیلانی دونوں نے (جنہیں آئے دن کراچی میں ہونے

والی اموات پر کوئی غم وافسوس نہیں ہے) ممبئی بم بلاسٹ کی پرزور مذمت کی گویا بلاواسطہ یہ کہہ رہے ہوں کہ ہم گناہ گاروں کا اس حملے سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس کے جواب میں ہندوستان کے خارجہ سکریٹری آر کے سنگھ نے کہا ان دھماکوں سے ہند پاک بات چیت متاثر نہیں ہوں گی گویا ہندوستان نے بھی بلاواسطہ یہ تسلیم کر لیا کہ ہم آپ کو اس کیلئے ذمہ دار نہیں سمجھتے ورنہ یہ گفتگو اگر منسوخ نہیں تو کم از کم معطل تو ضرور ہی ہو جاتی۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی بہتری کو اگر امریکہ کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ پیش رفت اس کیلئے مفید نہیں بلکہ مضر ہے۔ ان دونوں ہم سایوں کے درمیان اپنا سائبان ڈال کر امریکہ بہادر جو سیاسی ومعاشی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے ان پر ہندوپاک کے بہتر تعلقات سے اسی طرح پانی پھر جاتا ہے جس طرح بارش نے ممبئی دھماکوں کے شواہد کو ملیا میٹ کر دیا۔ اگر یہ دونوں از خود دوست بن جائیں ہیلری کلنٹن کو آخر ثالث کون بنائے گا ؟اس لئے ہند پاک تعلقات اور امریکی خارجہ سکریٹری کے دورے سے قبل دھماکوں کی اپنی اہمیت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بار ہیلری کلنٹن کی آمد کی خبر کو ذرائع ابلاغ نے اہمیت ہی دھماکوں کے بعد دی ورنہ کون جانتا تھا کہ موصوفہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رنجا فرمانے والی ہیں۔ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات اوسامہ اور ریمنڈ ڈیوس کے واقعات کے بعد خاصے بگڑ چکے ہیں امریکہ نے اپنی ۳۰ ملین ڈالر کی مجوزہ مدد کو بند کر کے اسے اپنے گرگوں کے ویزا سے مشروط کر دیا ہے اور پاکستانی

حکمرانوں نے اس کے دباؤ میں آنے انکار کردیا ہے ایسے میں پاکستان کو گھیرنے اور اس
پر بلاواسطہ دباؤ ڈالنے کیلئے اس طرح کے دھماکے نہایت مفید حربہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

اگر ممبئی میں یہ دھماکے نہ ہوئے ہوتے تو بھلا اوبامہ کو ہندوستان سے اظہار یکجہتی
کرتے ہوئے یہ کہنے کا موقع کیسے ملتا کہ امریکی عوام ہر مشکل کی گھڑی میں ہندوستان کی
عوام کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے ہیں۔ہم اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو
قرار واقعی سزا دلوانے میں ہندوستان کا تعاون کریں گے جیسا کہ ۲۰۰۸ میں کر چکے ہیں
بظاہر یہ بیان کافی خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ سزا دلوانا تو درکنار ممبئی
بلاسٹ کے ملزم ڈیوڈ ہیڈلی سے ہندوستانی افسران کوملاقات کرنے کا موقع بھی امریکی
انتظامیہ نے نہیں دیا۔ مسز ہیلری کلنٹن نے اپنے بیان میں کہا کہ میں منصوبے کے مطابق
آئندہ ہفتہ اپنادورہ کروں گی۔ میرا ایمان ہے کہ اس وقت ہندوستان کا ساتھ دینا پہلے
سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ہم ہندوستان کے ہمراہ دہشت گردی کے خلاف اپنی مشترکہ
جدوجہد کا عزم کرتے ہیں۔ تصور کریں کہ اگران بیانات کے پس منظر سے دھماکوں کو
ہٹا دیا جائے تو یہ سب کس قدر بے محل معلوم ہوتے ہیں؟

ہیلری کلنٹن کے دورے کا مقصد نائب سکریٹری رابرٹ لیک نے ایک ویب کانفرنس

یوں واضح کیا: صدر اوبامہ اور سکریٹری کلنٹن دونوں ممالک کی عوام اور اکیسویں صدی میں عالمی تحفظ اور خوشحالی کے پیش نظر ہند امریکی تعلقات کو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔اس جملے میں ایک پوشیدہ اشارہ چین کے بڑھتے ہوئے عالمی اثرات پر لگام لگانے کی جانب ہے جو ہندوستان اور امریکہ کا مشترکہ رقیب ہے۔اس مقصد کیلئے سب سے پہلے تو ہندوستان پر اسلحہ سے متعلق لگائی گئی پابندیوں کو امریکہ نے ختم کردیا ہے اور پھر جوہری تکنیک کی فراہمی کا دروازہ کھولا گیا۔رابرٹ بلیک کے مطابق ۲۰۱۰ میں امریکہ اور ہندوستان کے درمیان تجارت میں پچھلے سال کی بنسبت ۳۰ فی صد اضافہ ہوا ہے اور فوجی لین دین دوگنا ہوگیا ہے۔اب توانائی کے علاوہ داخلی تحفظ ،دفاعی و دیگر امور پر گفتگو ہوگی ۔ایسے میں اگر پاکستان سے ہندوستان کے تعلقات استوار ہو جائیں اور دھماکے نہ ہوں تو داخلی تحفظ اور دفاعی امور کی ہوا اپنے آپ نکل جاتی ہے ۔

بلیک کے مطابق ہند امریکی تعلقات میں سب سے اہم مدعا دہشت گردی کیخلاف چلائی جانے والی مہم میں میں اشتراکِ عمل ہے اس کیلئے امریکی داخلی تحفظ کی سکریٹری جانیٹ ناپولیٹانو مئی میں دہلی کا نہایت کامیاب دورہ کرکے وزیر داخلہ چدمبرم سے ملاقات کر چکی ہیں اور اب ہم ہندوستان سے افغانستان اور دیگر وسط ایشیائی ممالک میں تعاون پر گفتگو کرنے جارہے ہیں۔ایک طرف تو امریکہ خود افغانستان سے بے آبرو ہو کر بھاگ رہا ہے اور جاتے جاتے اپنی

بلا ہندوستان کے گلے میں ڈال کر جانا چاہتا ہے۔ امر اجالا کے صحافی سنجے ابھیگیان نے اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا چونکہ ہندوستان کو اپنے غیر جانبدار ہونے پر فخر ہے اس لئے کیا وہ کبھی امریکہ کا دوست بمعنی ہو سکتا ہے اس کا چونکا دینے والا جواب بلیک کی جانب سے سامنے آیا اس نے کہا ہم ہندوستان کو غیر جانبدار ملک نہیں سمجھتے۔ ۱۱ ستمبر کے بعد ہندوستان نے واقعی یہ محسوس کیا کہ ہنداور امریکہ کے درمیان بہت سارے مشترکہ مفادات اور اقدار ہیں۔ رابرٹ بلیک نے بڑی صفائی سے اعتراف کیا کہ آئندہ چند سالوں میں ہندوستان اپنے دفاعی بجٹ پر ۳۰ بلین ڈالر صرف کرنے والا ہے اس لئے امریکہ کیلئے وہ کافی اہمیت کا حامل (گاہک) ہے۔ فی الحال امریکہ کی معیشت جس طرح چرمرا رہی ہے ایسے میں ہندوستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی اس کیلئے ایک نعمتِ غیر مرتقبہ ثابت ہوگی لیکن اس سے ہندوستان کی عوام کو کیا ملے گا؟ دھماکے، قتل وغارتگری اور گرفتاریاں نیز رہنماؤں کو حاصل ہوں گے ووٹ، اقتدار اور بے شمار بدعنوانی کی دولت جس کے بوجھ سے سوئزرلینڈ کے بنک بوجھل ہوئے جارہے ہیں اور ہزارے و رام دیو جیسے لوگ چلا رہے ہیں لیکن دھماکوں کے اس شور شرابے میں ان کی سننے والا کون ہے؟

ممبئی بم دھماکہ : خیال وخواب کے قصے سنائے جاتے ہیں

فیض عثمانی بم دھماکوں کی زد میں آنے سے بچ گیا تو اسے دہشت گردی کی نام پر ممبئی پولس نے ہلاک کردیا۔ ممبئی بم دھماکے کا ذمہ دار کون ہے اس کے سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا لیکن فیض عثمانی کا قاتل کون ہے اس بارے میں کسی شک شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پولیس ایک صحتمند آدمی کو جس کا بے گناہ بھائی تین سال سے احمد آباد میں قید و بند صعوبتیں برداشت کررہا ہے تفتیش کی غرض سے اپنے ساتھ تھانے لے گئی اور ایک گھنٹہ بعد اسے ہسپتال میں بھرتی کردیا گیا۔ اسکے دماغ کی رگیں پھٹ گئی تھیں اس کے باوجود نہ ہی اسے آئی سی یو کی سہولت فراہم کی گئی اور نہ ہی دوسرے دواخانے میں منتقل کیا گیا یہاں تک کہ وہ مظلوم اس دارِ فانی سے کوچ کرگیا۔ پولیس کا دعویٰ ہے کہ اسے کوئی جسمانی اذیت نہیں دی گئی ڈاکٹر لہانے کہتے ہیں کہ اس کے بدن پر کوئی زخم نہیں پایا گیا۔اس کے باوجود ڈی جی پی اجیت پرسنس نے مسلمانوں پر یہ احسان کیا کہ موت کی وجوہات کا پتہ لگانے کیلئے سی آئی ڈی جانچ کا اعلان کردیا گویا چوروں کا پتہ لگانے کی ذمہ داری ڈاکوؤں کو سونپ دی گئی ۔کیا پولس کے محکمہ سے کوئی مجنون شخص بھی یہ توقع کرسکتا ہے کہ یہ لوگ خود اپنے ہی لوگوں کے آستین پر لگے خون کے دھبے دیکھیں گے اور انہیں عیاں کرنے کی جرأت کریں گے ؟ ان احمقوں کو کون

سمجھائے کہ دماغ کی رگیں جسمانی تکلیف سے نہیں بلکہ ذہنی اذیت رسانی سے پھٹتی ہیں اور اسی جرم کا ارتکاب ممبئی پولس نے کیا ہے۔زبیدہ نام کی ایک بے کس خاتون کو بیوہ اور اس کے چھے معصوم بچوں کو یتیم کرنے کا گناہِ عظیم ان ظالموں کے سر پر ہے جس کی سزا ان کو مل کر رہے گی۔

دھماکوں کے جال میں مسلم عوام کو کس طرح پھنسایا جاتا ہے اسکی ایک زندہ مثال بذاتِ خود فیض عثمانی کا بھائی افضل ہے۔افضل عثمانی کو احمد آباد کے دھماکوں کا ذمہ دار قرار دے کر گرفتار کیا گیا لیکن جب اس کی فردِ جرم داخل کی گئی تو اس میں کئی قسم کے تضادات اور خامیاں سامنے آئیں دراصل جھوٹ خود اپنے خلاف گواہی دیتا ہے۔افضل پر سول ہسپتال اور ایل جی ہسپتال کے قریب ہونے والے دھماکوں کا الزام ہے۔سول ہسپتال والی چارج شیٹ ایک جگہ کہتی ہے کہ افضل نے دو عدد ویگن آر کار کی مدد سے دھماکے کئے دوسری جگہ اسی میں درج ہے کہ ایک گاڑی تو ویگن آر تھی مگر دوسری کار ماروتی ۸۰۰ تھی۔اس کے برعکس ایل جی ہسپتال والی چارج شیٹ کے مطابق دو ویگن آر اور ایک ماروتی کا استعمال دھماکوں کی خاطر کیا گیا۔ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں مقامات پر ایک ہی شخص بیک وقت کیونکر موجود تھا جبکہ دونوں دھماکے ایک ساتھ ہوئے؟اور اگر اس کام کو ایک سے زیادہ لوگوں نے کیا تو ان میں سے افضل کہاں تھا اور تھا بھی کہ نہیں تھا؟ان دھماکوں میں استعمال ہونے والے

اشتعال انگیز مادے کے بارے میں بھی تضاد بیانی پائی جاتی ہے۔
احمد آباد اور سورت میں ہونے والے دھماکوں کو بنیادی وجہ کیا تھی ؟اس سوال کا اطمینان بخش جواب دینے میں فردِ جرم بری طرح ناکام ہے۔اس چارج شیٹ میں ویسے تو انڈین مجاہدین کی جانب سے ایک ای میل کے ذریعہ دھماکوں کی ذمہ داری قبول کرنے کا ذکر ہے جس میں کہا گیا تھا کہ دھماکے گجرات فسادت کا بدلہ لینے کیلئے کروائے گئے لیکن چارج شیٹ کا دعویٰ اس سے مختلف یہ ہے کہ اسلامی حکومت کو قائم کرنے کیلئے یہ دھماکے برپا کئے گئے۔بم دھماکوں کی وجہ بدلے کی کاروائی تو کسی حد تک قرین قیاس ہے لیکن نظام حکومت کے قیام کی بات جس پر فردِ جرم میں اصرار کیا گیا ہے مسلمانوں کو تو کجا ہندو دانشوروں کے گلے سے بھی نہیں اتری۔ماہرین کی رائے ہے کہ اس فردِ جرم میں اصل وجوہات پر روشنی ڈالنے کے بجائے اشتعال انگیز تقاریر کرنا اور سی ڈی تقسیم کرنا جیسے الزامات کو بلاوجہ بار بار دوہرایا گیاہے۔
جولائی۲۰۰۸ میں احمد آباد بم دھماکوں کے ماسٹر مائنڈ کو سرکاری گواہ بنانے لینے کا دعویٰ گجرات پولس نے بڑے طمطراق سے کیا تو تہلکا جریدے کی رعنا ایوب نے کالج کے اس نوجوان طالبِ علم سے ملاقات کی اور اس گفتگو میں چند نا قابل یقین حقائق سامنے آئے جسے ہر کوئی تہلکہ کی ویب سائٹ پر پڑھ سکتا ہے

۔اس گواہ نے اعتراف کیا کہ وہ بم دھماکوں کی سازش اور تیاری میں شریک تھا۔اسے فسادات کی کیسٹ دکھلا کر اس کام کے لئے تیار کیا گیا تھا۔دھماکوں میں ان کے گروہ کا سرغنہ عالم زیب تھا جو ایک بیرونی خفیہ گروہ (جس کا احمد آباد سے کوئی واسطہ نہ تھا) کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔اس گروہ کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔وہ لوگ جدید طرز کا لباس پہنتے تھے اور خوب سگریٹ پیتے تھے۔عالم زیب نے اپنے تمام ساتھیوں کو سیمی سے خاص طور پر دور رہنے کی تاکید کر رکھی تھی اور اس گواہ کے مطابق اگر وہ سیمی کے سابقہ ارکان سے ملتے تو وہ انہیں اس کاروائی میں ملوث ہونے سے منع کرتے۔

ابتدا میں ان سے کہا گیا تھا کہ سنگھ پریوار کے دفاتر اور فسادات کے مجرمین مثلًا بجرنگی وغیرہ کو نشانہ بنایا جائیگا لیکن آخری دن اہداف کو تبدیل کر دیا گیااور بموں کو عام مقامات پر نصب کرنے کا حکم دیا گیا جس سے بدظن ہو کر اس گواہ نے اپنے آپ کو اس کاروائی سے الگ کر لیااس کے باوجود پولس نے اسے گرفتار کرکے بری طرح زدوکوب کیا اور جب وہ ٹوٹ گیا تو اسے سیمی کے سابق ممبران کی فہرست پکڑا دی گئی جن کو موردِ الزام ٹھہرا کر اس نے اپنی گردن چھڑائی۔اس نوجوان نے صاف کہا کہ انڈین مجاہدین جیسی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ایسے میں یہ سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ وہ کون لوگ تھے جن کے اشارے پر دھماکے کئے گئے اور جن کا بال بیکا نہیں ہوا۔پولس اور انتظامیہ

نے ان کی جانب سے پوری طرح صرفِ کرتے ہوئے ان مجرمین کے بجائے کبھی انڈین مجاہدین تو کبھی حزب الجاوہدین کے نام کا شور مچایا اور افضل و شہزاد جیسے لوگوں کو بلی کا بکرہ بنا کر گرفتار کر لیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ درمیان میں شہزاد کہاں سے آگیا؟

شہزاد گجرات پولس کے کا ایک تازہ شکار ہے جسے حال میں نہایت مضحکہ خیز انداز کے اندر گرفتار کرلیا گیا۔ ممبئی کے حالیہ بم دھماکوں کے دودن بعد احمد آباد پولس نے شہزاد رنگریز کو احمدآباد میں ڈانی لمڈا نامی مقام سے دس بموں کے ساتھ گرفتار کرنے کا دعویٰ کیا پولس کے مطابق اس نے یہ بم رتھ یاترا کے وقت دھماکہ کرنے کی غرض سے بنائے تھے لیکن سخت انتظامات کے باعث وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ممبئی کے بم دھماکوں نے اس کے حوصلوں کو بلند کر دیا تھا۔اس بار پھر دھماکوں کی کوئی معقول وجہ ندارد ہے۔نہ تو ممبئی پولس اور نہ ہی گجرات اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب دے پارہی ہے۔ اسکے باوجود ذرائع ابلاغ ان بے سر پیر کی خبروں کو زور شور سے اچھالنے میں لگا ہوا ہے۔

شہزاد کی گرفتاری کی کہانی بھی نہایت دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ شہزاد اپنی دوسری بیوی ریشماں کے پاس رات شراب پی کر آیا تو میاں بیوی کے درمیان لڑائی

ہو گئی ریشماں اپنے شوہر کی شکایت لے کر پولس تھانے پہنچی تو پولس نے شہزاد کو سبق سکھلانے کے عوض ریشماں کو شہہ دی کہ وہ شہزاد پر بم بنانے کا الزام تھوپ دے۔اپنے خصم سے ناراض ریشماں پولس کے جھانسے میں آ گئی اور رپورٹ درج کرائی کہ شہزاد نے اسے بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی اور اس طرح اسے پتہ چلا کہ شہزاد کے پاس بم ہے۔ پولس نے چھاپہ مار کر ایک بم اسی کمرے سے بر آمد کر لیا جس میں ریشماں رہتی لیکن اسے اس بم کے بارے میں لڑائی سے پہلے پتہ نہ تھا۔یہ ایک ایسی احمقانہ بات ہے کہ بالی ووڈ والے بھی اسے بتلانے کی جرأت نہیں کر سکتے لیکن ہندوستانی ذرائع ابلاغ میں سب کچھ کھپ جاتا ہے۔ پولس شہزاد نامی شرابی کو انڈین مجاہد قرار دے دیتی ہے اور اخبارات میں اسکی تصاویر چھپ جاتی ہیں۔ پولس کے مطابق اس کے گھر پر ایک اور چنڈولہ جھیل کے کنارے سات بم و دیگر ساز و سامان پکڑا گیا جن کی مدد سے شہزاد بم بناتا تھا۔دو دن بعد پولس نے یونس نامی ایک شخص کو گرفتار کیا اس پر الزام ہے کہ اس نے یہ بم شہزاد کو دیئے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بم کس نے بنائے یونس نے یا شہزاد نے؟ پولس نے ریشماں کی تعریف میں یہاں تک کہہ دیا اس نے چار سال قبل بھی ایک بنگلہ دیشی کی مدد سے شہزاد کے بم بنانے کی اطلاع پولس کو دی تھی اگر یہ صحیح ہے تو پولس نے شہزاد کی نگرانی کیوں نہیں کی اور اس کو دوبارہ بم بنانے سے قبل گرفتار کیوں نہیں کیا؟

دنیا بھر میں تو یہ ہوتا ہے کہ کئی دھماکوں کو ذمہ داری کسی ایک تنظیم کے سر تھوپ دی جاتی ہے ویسے اس صورتحال کو بالکل بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا کہ کوئی ایک تنظیم مختلف دہشت گردی کی کاروائیوں میں ملوث ہو مثلاً سی آئی اے یا موساد جنگی دہشت گردی کا شمار مشکل ہے لیکن ہندوستان کو اس سے برعکس یہ سعادت حاصل ہے کہ یہاں ایک ہی دھماکے کی ذمہ داری مختلف لوگوں کے سر تھوپ دی جاتی ہے اور ان حیرت انگیز واقعات پر کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔اس طرح کے واقعات کی ایک مشہور مثال تو ۲۰۰۶ میں ہونے والا وارانسی کا دھماکہ ہے جس کے الزام میں انتظامیہ نے پھولپور اعظم گڑھ کے ولی اللہ کو سرغنہ قرار دے کر اپریل ۲۰۰۶ میں گرفتار کرلیا۔اس واقعہ کے ایک ماہ بعد باغپت کے رہنے والے ابوزبیر کپوارہ میں ہلاک کرکے یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ وارانسی بم دھماکے کا اصل مجرم وہی تھا اور وہ فرار ہو کر پاکستان جارہا تھا کہ پولس مڈبھیڑ میں مارا گیا۔ان دونوں متضاد خبروں کو ذرائع ابلاغ بے دھڑک شائع کرتا رہا کسی نے رک پوچھنے کی زحمت نہیں کہ آخر سچ کیا ہے؟

ولی اللہ کے اہل خانہ ان کے معصوم ہونے کی دہائی دیتے رہے اور وکلاء نے ان کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی ۔ عدالتی دہشت گردی کا یہ عالم تھا کہ کسی وکیل کو ان کی پیروی کی اجازت نہیں تھی جو کوئی آگے آتا تو اسے دھمکی دی جاتی بلکہ ایک مرتبہ عدالت کے احاطے میں وکلاء نے ملزم پر حملہ بھی کر دیا۔

دوسری جانب فاسٹ ٹریک عدالت میں پولس انسپکٹر ترپاٹھی مسلسل آٹھ پیشیوں میں حاضر نہیں ہوئے یہاں تک کہ جج نے ولی اللہ کو رہا کرنے کی دھمکی دے دی تب جا کر مقدمہ آگے بڑھا ۲۰۰۸ میں ولی اللہ کو ملک سے بغاوت جیسے سنگین الزامات سے بری کر دیا گیا مگر غیر قانونی اسلحہ رکھنے اور سازش کرنے کا الزام لگا کر دس سال کی سزا پھر بھی سنائی گئی۔ اس مقدمے کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے مسلمانوں کے ساتھ پولس اور انتظامیہ کس طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ جن الزامات کا اعتراف ایسمانند کر چکا ہے آج بھی ان کے کیلئے انڈین مجاہدین اور حرکت الجہاد کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔اس سے زیادہ افسوسناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ کرنل پروہت اور سادھوی پرگیہ کے خلاف اس قدر شواہد کے موجود ہونے کے باوجود بے گناہ مسلم نوجوانوں کو ہنوز رہائی سے محروم ہیں۔

سیاسی جماعتیں اور انتظامیہ اپنی گوناگوں مفادات کے پیش نظر دھڑلے کے ساتھ اس طرح کا ظلم وزیادتی کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ عوام کی یادداشت پوری طرح غارت ہوچکی ہے انہیں ماضی کی کوئی بات یاد نہیں رہتی اور وہ ہر قسم کی کذب بیانی پر ایمان لانے کیلئے وہ ہر دم تیار بیٹھے ہیں ورنہ یہ نہ ہوتا کہ جس روز فیض عثمانی کا بہیمانہ قتل ہوا اس روز ممبئی کے سب سے بڑے اور معتبر سمجھے جانے والے اخبار ٹائمز کے ٹیلی ویژن چینل سے حرکت الجادکے جنوبی ہند کے نام نہاد کمانڈار محمد یوسف کا اقبالیہ بیان نشر ہو

رہا ہوتا۔ اس شخص کو ڈیڑھ سال قبل گرفتار کیا گیا اور ۲۰ جنوری ۲۰۱۰ کو یہ فلم ٹائمز ناؤ سے نشر ہو چکی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اقبالیہ بیان کی فلم ٹائمز کو ملی کیسے ؟ پولس نے اسے کیوں ذرائع ابلاغ کے حوالے کیا؟ اور اس فلم میں جس شخص کو دکھلایا گیا وہ کون ہے؟ اور گزشتہ ڈیڑھ سالوں کے درمیان اس کا مقدمہ کہاں تک پہنچا ؟ یہ سب بتلانے کے بجائے اسے اس طرح نشر کیا جارہا تھا گویا موجودہ دھماکوں میں اس شخص کو گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اچانک اس طویل عرصے کے بعد ٹائمز کو اس فلم کو نشر کرنے کا خیال اس موقع پر کیوں آیا نیز اس عرصے میں سنگھ پریوار کے جن دہشت گردوں نے جھوٹ پکڑنے والی مشین کے آگے بیانات دیئے ہیں پولس انہیں ذرائع ابلاغ کے حوالے کیوں نہیں کرتی اور ٹائمز والے ایسے مواقع پر سوامی ایسمانند کا اقبالیہ بیان کو کیونکر پوری طرح بھلا دیتے ہیں۔ اسے بھی نشر کرکے اپنے غیر جانبدار ہونے کا ثبوت کیوں پیش نہیں کیا جاتا ؟ یہ تمام سوالات اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ نام نہاد آزاد میڈیا دولت کی غلامی میں اندھا ہوچکا ہے اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ بقول شاعر

حادثہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

ٹائمز ناؤ کی ایک صحافی اس روز بہار کے کشن گنج ضلع میں پاؤ کھالی نام کے گاؤں میں بھی پہنچ گئی جہاں ریاض السرکار نامی بنگلہ دیشی کو بم دھماکوں میں ملوث ہونے کے شبہ میں پولس نے گرفتار کرلیا اس صحافی ریاض کے مکان مالک مہتاب عالم کا انٹرویو نشر کیا ۔ ریاض السرکار کے بارے میں بتلایا گیا کہ وہ حرکت الاہرد سے تعلق رکھتا ہے اور پولس اس کے انڈین مجاہدین اور سیمی سے تعلقات کا پتہ لگا رہی ہے ۔ ویسے ریاض اپنے آپ کو ہندوستانی بتلاتا ہے۔ اسے ہندی اور انگریزی کے علاوہ کنڑزبان پر بھی ملکہ حاصل ہے اور پولس کے مطابق اسکی ڈائری میں مراٹھی زبان کے اندراجات بھی پائے گئے ہیں۔ یہ کیسا بنگلہ دیشی ہے جو بنگلور اور ممبئی جیسے شہروں میں رہنے بعد کشن گنج میں جا بسا ہے؟ جبکہ اسکے نشانے پر یہی بڑے شہر ہیں ۔

رات گئے تک ٹائمز ناؤ کی یہ اوٹپٹانگ خبریں دیکھتے دیکھتے میری آنکھ لگ گئی تو خواب میں ۲۶ نومبر کو ممبئی شہر پر ہونے والے حملے کی فلم چل پڑی میں نے دیکھالیوپولڈ کیفے سے دہشت گرد بیئر کی کئی بوتلیں چڑھا کر باہر نکلے اور سی ایس ٹی ریلوے اسٹیشن پر آکر اندھا دھند گولیاں برسانے لگے اس کے بعد وہ باہر آکر ٹائمز کی عمارت میں گھس گئے اور ٹائمز ناؤ کے دفتر کو تہس نہس کر ڈالا ۔ میں خواب میں ٹیلی ویژن کا چینل بدل کر آج تک پر جا پہونچا جہاں شوخ او چنچل انامیکا ٹائمز کی تباہی پر افسوس کا اظہار کر رہی

تھی۔ ٹائمز والوں نے اس حملے کے بعد اپنی نشریات ہمیشہ کیلئے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اس خبر کو سناتے وقت انامیکا کا چہرہ خوشی سے تازہ گلاب کی مانند کھل گیا تھا۔ اس خبر پر تبصرے کی خاطر انامیکا نے فون سے آندھرا کے جنگلوں میں بیٹھے نکسلی رہنما تنگا راؤ سے رابطہ قائم کیا جن کی کردار کشی حال ہی میں ٹائمز ناؤچینل نے کی تھی ۔جب ان سے ٹائمز کے بند ہو جانے اپنی رائے کا اظہار دینے کیلئے کہا گیا تو تنگا راؤ بولے'' یہ تو گینگ وار ہے۔ کرائے کے صحافی جو مائک ہاتھ میں لے کر ہر روز عوام کو اپنی دہشت گردی کا شکار کرتے ہیں بالآخر وہ کرائے کے دہشت گردوں کے ہاتھ مارے گئے۔
معمولی سے توقف کے بعد تنگا راؤ نے آگے کہا بھئی میں تو پیپلس وار کا آدمی ہوں مجھے اس گینگ وار میں نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس پر کسی قسم کا افسوس ہے ۔اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا مجھے بھی کوئی افسوس نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ جب عوام کی آنکھ کھلے گی تو اسے بھی کوئی افسوس نہیں ہوگا۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے۔ قسط اول

اوسلو میں وزیر اعظم جینس اسٹو ٹنبرگ کی کوٹھی کے باہر جس وقت بم دھماکہ ہوا امریکی خفیہ ایجنسی ایف بی آئی کشمیری رہنما اور دانشور غلام نبی فائی کو پریشان کر رہی تھی اور ممبئی پولس انڈین مجاہدین کا پیچھا کر رہی تھی۔ جب اوسلو سے بیس میل کے فاصلے پر یوٹویا نامی جزیرے میں ایک وحشی درندہ حکمراں لیبر پارٹی کے نوجوانوں کی شاخ کے تربیتی اجتماع کے بے خطا شرکاء پر گولیاں برسا رہا تھا امریکی صدر براک اوبامہ نیوزی لینڈ کے وزیرِ اعظم سے ملاقات کررہے تھے۔ گولی باری کی اس دھماکہ خیز خبر پر بھلا امریکی صدر کیونکر چپ رہ سکتا تھا اس لئے اوبامہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے پیش رو جارج بش کی مانند بول پڑے ’’یہ بین الاقوامی برادری کیلئے ایک یاددہانی ہے کہ اس طرح کی دہشت کو روکنا انکی اولین ذمہ داری ہے اور ہمیں انٹلی جنس نیز حملوں کی روک تھام کے عملی اقدامات میں باہم تعاون کرنا چاہئے گویا اوبامہ نے ان واقعات کو بلاواسطہ اپنی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ سے جوڑ دیا۔ مثل مشہور ہے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے اس لئے نیوزی لینڈ کے وزیراعظم جان کیری نے اوبامہ کی تائید میں کہا اگر یہ عالمی دہشت گردی کا واقعہ ہے تو میرے خیال میں اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کوئی بڑا یا چھوٹا ملک ان خطرات سے

محفوظ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ نیوزی لینڈ افغانستان میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے تاکہ امریکہ اور دیگر ممالک کے تعاون سے دنیا کو محفوظ تر بنایا جاسکے۔ بیچارے جان کیی کا کوئی قصور نہیں اگر ان کی جگہ پاکستان کا صدر یا ہندوستان کا وزیر اعظم ہوتا تب بھی اپنے آقا کے آگے اسی طرح دُم ہلاتا۔ ویسے اگر ممبئی پولیس کے اردلی کی رائے طلب کی جاتی تو اس میں اور اوبامہ یا جان کیی کے بیان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اسے کہتے ہیں ذہنی ہم آہنگی اور باہم یکجہتی لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ لوگوں کا ہم جہت ہوجانا اور اس جہت کا حق بجانب ہونا یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ اکثر لوگوں کا آہنگ یکساں تو ہوجاتا ہے لیکن وہ آہنگ درست نہیں ہوتا مثلاً اس سے پہلے کہ ناروے کی پولیس اس خطرناک دہشت گرد کو گرفتار کرتی نیویارک ٹائمز نے امریکی ماہر محقق میک کینٹ کے حوالے یہ انکشاف کیا کہ انصار الجہاد العالمی یعنی جہاد اسلامی کے عالمی مددگار نامی ایک دہشت گرد گروہ نے دھماکے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔اس خیالی تنظیم اور انڈین مجاہدین میں نام کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں ہے۔

اوسلو" کی اس قابلِ مذمت واقعہ پر اگر امریکی صدر ’’گوسلو‘‘ کی پالیسی پر عمل پیرا" ہوتے تو بہتر تھا لیکن معیشت تو ویسے ہی دھیمے دھیمے اپنی اکھڑتی ہوئی سانسیں گن رہی ہے۔ری پبلکن کسی صورت قرض کی حد بڑھانے پر راضی نہیں

ہورہے امریکہ دن بدن تیزی کے ساتھ اپنے دیوالیہ پن کی جانب گامزن ایسے میں اوبامہ جیسا گھاگ سیاست دان اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے والے اس نادر موقع کو کیونکر گنوا سکتا تھا۔ دراصل امریکی حکام اور ان کے حواریوں نے سوچا کہ یہ ان کی ہی کسی پالتو تنظیم کا کام ہوگا جو کبھی سامنے نہیں آئیگی اور یہ لوگ اس کے پس پردہ اسلام کی مخالفت کے اپنے گھناؤنے ارادوں کو بروئے کار لائیں گے لیکن قدرت کو اس بار کچھ اور منظور تھا ۳۲ سالہ بریوک نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنی کارکردگی کا اعتراف کرلیا جسے وہ جرم نہیں سمجھتا۔ اس کے اپنے وہم و گمان کے مطابق وہ حالت جنگ میں ہے اور ایسی صورتحال میں چونکہ یہ ضروری ہوگیا تھا کہ معصوموں کی خونریزی کی جائے اس لئے یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ کار خیر ہے۔ یہ ہے نصرانی مغرب کا معیار اخلاق جس کو خوشنما پردوں میں چھپا کر ساری دنیا کے عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے ۔اس کام کو کس طرح انجام دیا جاتا ہے اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں امریکی خفیہ ایجنسی ایف بی آئی نے ۲۰۰۵ میں جب دہشت گردی کے متعلق اپنی تحقیقات کو شائع کیا تو ذرائع ابلاغ نے اعلان کیا سارے دہشت گرد مسلمان ہیں سوائے ۹۴ فیصد کے جی ہاں ۱۹۸۰ سے لیکر ۲۰۰۵ تک امریکی سرزمین پر ہونے والے دہشت گردی کے اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ ان میں سے ۶ فیصد کا تعلق مسلمانوں سے تھا ۴۲ فیصد لاطینی، ۲۴ فیصد انتہا پسند دایاں بازو جیسے ہندوستان کے نکسلوادی اور تو اور امریکیوں کے منظور نظر انتہا پسند یہودی بھی مسلمانوں سے آگے ہیں اور

ان کا حصہ ۷ فی صد تھا۔ عام دائیں بازو کی جماعتیں ۵ فیصد حملوں کیلئے ذمہ دار پائی گئیں اور دیگر لوگوں کا مجموعی حصہ ۱۲ فیصد تھا یاد رہے یہ ایف بی آئی کے سرکاری اعداوو شمار ہیں۔ یوروپول کے مطابق یوروپ میں ۲۰۰۷ سے ۲۰۰۹ کے دوران ۹۹،۶ دہشت گردی کی وارداتوں میں غیر مسلم ملوث پائے گئے۔ جن میں سے ۸۴،۸ فی صد علاحدگی پسند لوگوں کے حملے تھے اور باقی ۱۶ فیصد دائیں بازو کی جماعتوں کا کارنامہ تھا صرف ۰،۴ فی صد دہشت گردی میں یوروپین پولس نے مسلمانوں کو ملوث پایا۔ ۲۰۰۹ کے مقابلے ۲۰۱۰ میں دائیں بازو والوں کے حملے ۲۱ سے بڑھکر ۴۵ ہوگئے گویا ۱۰۰ فیصد سے زیادہ کا اضافہ اس کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کی نام نہاد جنگ نہ صرف ذرائع ابلاغ میں بلکہ میدان عمل میں زور و شور کے ساتھ چھڑی ہوئی ہے۔

ناروے میں ہونے والے واقعہ کے بعد شہر اوسلو ایک مسلمان کے بیان سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہم کس قدر کامیاب ہے۔ بی بی سی کے نامہ نگار سٹیفن اوناس کے مطابق اوسلو شہر میں علی نامی ایک شخص نے بتایا کہ ’’بہت سارے افراد کا شروع میں یہ خیال تھا کہ بم دھماکہ میں القاعدہ ملوث ہے۔ ناروے ایک ایسا ملک ہے جو ہر کسی کو قبول کرتا ہے اور ہر کسی کو خوش آمدید کہتا ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ ایک نارویجن نے یہ کام کیا ہے تو مجھے دھچکا لگا، وہ شخص نفرت سے لبریز تھا‘‘ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بغیر کسی

تحقیق و تفتیش کے بہت سارے لوگوں نے ایسا کیوں سوچا کہ اس میں القائدہ ملوث ہے۔ نیز جس طرح کا دھچکا علی اور اس جیسے لوگوں کو اس وقت کیوں لگا جبکہ انہیں پتہ چلا کہ اس میں ایک مقامی شخص انڈریو بیرنگ.بریوک ملوث ہے جو عیسائی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی دائیں بازو کی سوچ کے حامی بھی ہے۔کیا اس طرح کی حیرت کا اظہار اس وقت بھی کیا جاتا جبکہ انہیں بتایا جاتا کہ یہ حملہ القائدہ نے کیا ہے ؟یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب اس طرح کے حملوں کو مسلمانوں سے منسوب کیا جاتا ہے تو اس کی حمایت میں نقلی ویڈیو بنا کر ٹیلی ویژن سے نشر کی جاتی ہیں اور یو ٹیوب کے ذریعہ ان کی جی بھر کے تشہیر کی جاتی ہے اس کے.برعکس بیرنگ.بریوک کی ایک اصلی ویڈیو کو جس میں اس نے اپنے عزائم کا اظہار اور جرائم کا عتراف کیا تھا دوسرے ہی دن یو ٹیوب سے ہٹا لیا گیا۔ناروے کے ذرائع ابلاغ کے مطابق یہ وڈیو.بریوک نے بنائی تھی جس میں اسلام، مارکسزم اور کثیر الثقافتی معاشرے کے خلاف غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔

انرش بیرنگ.بریوک نے ایک ہزار پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک دستاویز مرتب کی جسے وہ خود ساختہ منشور کہتا ہےاوراسے یو ٹیوب پر موجود ایک ویڈیو کے ساتھ یورپ بھر میں ڈھائی سو افراد کو حملے سے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے قبل ای میل کیا۔ بیلجیم میں دائیں بازو کی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک رکن پارلیمان تانگوئے وِینز کو بھی اسی طرح کا ایک ای میل کیا گیا۔ تقریباً ایک چوتھائی

افراد جنہیں ای میل کیا گیا برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے علاوہ جرمنی، اٹلی، فرانس اور دیگر ممالک کے لوگ بھی ای میل وصول کرنے والوں میں شامل ہیں لیکن سب سے بڑی تعداد برطانیہ کی ہے۔انرش بریوک کا نام استعمال کرتے ہوئے بھیجے گئے ای میل اور اس میں موجود یوٹیوب کی ویڈیو کے لنک میں لکھا گیا ہے 'مغربی یورپ کے محب وطن' اور ایک جگہ لکھا گیا ہے 'یہ آپ کے لیے ایک تحفہ ہے۔۔۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اسے اپنے ہر جاننے والے کو بھیجیں۔تانگوئے وینر نے انرش کے اس عمل کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا انرش بریوک کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رہا ہے ۔کسی نے وینر کے بیان پر شکوک و شبہات کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے من و عن تسلیم کر لیا اس لئے اس کا تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے اور نہ ہی بریوک کے پس پردہ لوگوں کا سراغ لگانے کی خاطر کسی بین الاقوامی مہم کا آغاز کیا گیا بلکہ اس کے برخلاف ایک انٹرویو میں ناروے کی داخلی انٹیلی جنس کی سربراہ جین کرسٹیانسین نے کہا 'میں آپ کو بتا سکتی ہوں کہ اب تک ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں کوئی ایسا اشارہ ملا ہے کہ وہ کسی بڑی تحریک کا حصہ ہے یا پھر وہ دیگر تنظیموں سے رابطے میں ہے یا کوئی اور بھی حملے میں ملوث ہے ویسے انہوں نے اعتراف کیا کہ بریوک دیوانہ نہیں ہے جیسا کہ اس کے وکیل کا دعویٰ ہے بلکہ وہ شاطر، چالباز اور شہرت کا بھوکا ہے۔

انرش.بریوک پر بم دھماکے اور یوتھ کیمپ پر فائرنگ کے الزام میں دہشت گردی کی دفعات کے تحت باقاعدہ مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔پولیس کے مطابق دہشت گردی کے ان واقعات میں ایک اور شخص ملوث ہو سکتا ہے۔تادمِ تحریر کسی اور کو اس معاملے میں گرفتار تو درکنار کسی سے تفتیش تک نہیں کی گئی جو انتظامیہ کے ہمدردانہ رویہ کا واضح ثبوت ہے۔ حراست کے تیسرے دن بریوک کو عدالت میں پیش کرکے اس پر معاشرے اور حکومت کے ضروری امور کو تہہ و بالا کرنے کے الزامات لگائے گئے اوراعتراف کاس گیا کہ اس کی اس دہشت گردی سے عوام میں زبردست خوف وہراس پھیلاہے۔انرش.بریوک نے حملوں کی ذمہ داری تو قبول کرلی لیکن دہشت گردی کے الزامات کو مسترد کردیا، انرش جانتا ہے کہ دہشت گردی کے الزامات تو صرف اور صرف مسلمانوں کیلئے مختص ہیں کوئی بھوری آنکھوں اور سفید جلد کا حامل بھلا دہشت گرد کیونکر ہو سکتا ہے اس شخص کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی حرکت کو 'وحشیانہ' مگر ضروری' قرار دیان ہے۔جج کم ہیگر نے استغاثہ کی دلیل سے اتفاق کرتے ہوئے کہ' ملزم عدالت میں پیشی کو ایک سیاسی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کر سکتا ہے بند کمرے میں سماعت کا حکم دیا جس کے دوران ذرائع ابلاغ اور عوام کو عدالت کی کاروائی دیکھنے کی اجازت نہیں ہوگی حالانکہ انرش.بریوک کے وکیل کا کہنا تھا کہ ان کا مؤکل عوام کے سامنے بیان دینا چاہتا ہے۔بتیس سالہ انرش بیرنگ.بریوک کو ناروے کے موجودہ قانون کے تحت زیادہ سے زیادہ اکیس سال کی قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔سفاک مغرب کی

نظر میں پھانسی کا پھندا اور گولیوں سے بھون کر لاش کو دریا برد کر دینے کا مستحق مسلمانوں کے علاوہ اور کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

مغرب کی دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس نام نہاد دہشت گردی کی قیمت مسلمانوں سے کیسے زبردستی وصول کی گئی ہے اس کے اعداد و شمار ہوش ربا ہیں ۳۰ جنوری ۲۰۱۰ تک کی صورتحال یہ تھی کہ امریکہ کے حلیفِ اول پاکستان میں ۱۰۰۰۰ لوگ مارے جا چکے تھے جن میں سے ۷۰۰ افراد تو بالواسطہ امریکی ڈرون حملوں کا شکار ہوئے تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ سالوں کے اندر ان حملوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر اس مغربی دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی تعداد میں بھی دو سے تین گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ تحریک طالبان جس کا اصل طالبان سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ جو ہندوستان کی سرپرستی میں امریکہ کے اشارے پر دہشت گردی پھرتی ہے ہزاروں اموات کیلئے ذمہ دار ہے۔ ۲۰۰۸ میں شائع ہونے والی ایک برطانوی رپورٹ کے مطابق افغانستان میں ۵ لاکھ اور عراق میں ۱۲ لاکھ افراد امریکی جارحیت کے باعث ہلاک ہوئے ہیں۔ لیکن صورتحال یہ ہے کہ کرتا کوئی اور ہے اور بھرتا کوئی اور مسلمانوں کو انصاف اس لئے نہیں ملتا کہ بقول شاعر

میرا قاتل ہی میرا منصف ہے
کیا مرے حق میں فیصلہ دے گا

یوروپی انتہا پسندی و دہشت گردی - قسط دوم

انڈریو بیرنگ.بریوک بلا شبہ ایک عالمی اسلام مخالف فکر اور تحریک کا حصہ ہے اسی لئے وہ خود تو بائیں بازو کا انتہا پسند عیسائی ہے اس کے باوجود اسرائیل کے یہودی انتہا پسندوں کو اپنا عم زاد بھائی قرار دیتا ہے اور بھارت کے ہندو قوم پرستوں کا بہت.بڑا مداح ہے۔بھارت سے عقیدت کا اظہار اس کے اپنے 'منشور' میں ۱۰۲ مقامات پر کیا گیا ہے۔اس کے مطابق 'ہندو قوم پرست دنیا بھر میں جمہوری حکومتوں کا تختہ پلٹنے میں اس کے اہم اتحادی ہیں اور وہ بھارت سے مسلمانوں کو نکالنے میں ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔پندرہ سو صفحات کے اس منشور میں.بریوک نے اپنے عزائم کو بیان کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ کس طرح وہ 'تہذیبی مارکسی نظام' (جس میں مختلف نسلوں کے لوگ بغیر کسی فرق کے مل کر رہیں، یا ملٹی کلچرل ازم) کو ختم کرنے کے لیے وہ ایک مہم شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہےاور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر اس مہم کی ابتدا دہشت گردی کی کاروائیوں سے کرکے اسے ایک ایسی عالمی جنگ میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے جس میں وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کا بھی استعمال کیا جائے۔ سنگھ پریوار سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے.بریوک لکھتا ہے'ہندو قوم پرستوں کو انڈین کلچرل مارکسوادیوں کی جانب سے اسی طرح کی زیادتیوں کا سامنا ہے جیسا ان کے یورپین بھائیوں کو

ہے اور بھارت میں کانگریس کی قیادت کرنے والی یو پی اے حکومت ہر قیمت پر مسلمانوں کی خوش آمد میں مصروف ہے' ہندو دہشت گردوں کی جانب سے مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کو بھی ۔بریوک حق بجانب قرار دیتا ہے اور ان کے بھرپور تعریف وتائید کرتا ہے مگراس حکمت عملی کو فائدے کی بجائے نقصان دہ بتلاتا ہے۔دلچسپ اتفاق یہ ہے کہ بی جے پی سابق ایم پی، بی پی سنگھل یہی بات ۔بریوک کے بارے میں کہتے ہیں ان کے مطابق ۔بریوک کا مؤقف حق بجانب ہے لیکن اس کا طریقہ کار غلط ہے جس سے فائدے کے بجائے نقصان ہوا ہے۔

بیرنگ ۔بریوک سرزمین ہند پر پائے جانے والے اپنے ہمنوا بجرنگیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ مسلمانوں پر حملے کرنے کے بجائے بھارت میں غداروں کو نشانہ بنائیں اور عسکری سیل منظم کریں تاکہ کلچرل مارکسی حکومت کا تختہ پلٹا جاسکے۔ ۔بریوک کے الفاظ میں ہمیں ایک دوسرے سے (۔بریوک کی تنظیم اور ہندو قوم پرست) تعاون کرنا چاہیے'' اور سیکھنا چاہیے کیونکہ ہمارے مقاصد ایک جیسے ہیں''۔ویسے ۔بریوک کے اس زرین مشورے کے قبل ہی کرنل پروہت جیسے لوگوں نے سناتن پربھات اور اکھنڈ بھارت جیسی عسکری تنظیموں کے تحت مالیگاؤں، اجمیر، حیدرآباد اور نہ جانے کہاں کہاں اپنی دہشت گردی کا آغاز کر دیا ہے لیکن ان کی توجہ مارکسوادیوں کے بجائے مسلمانوں کی جانب ہے ۔۔بریوک کے منشور میں جہاں ایک طرف سنگھ پریوار کی ویب سائٹس کی لنک موجود ہیں وہیں سنگھی

دانشوروں کی کتابوں کے حوالے بھی پائے جاتے ہیں۔ اس نے اپنی تنظیم کا نشان امتیاز ہندوستان کے شہر بنارس سے بنوایا لیکن ایسا اسلیئے نہیں کیا گیا کہ بنارس ہندوؤں کا مقدس شہر ہے بلکہ روپیہ بچانے کی یہ ایک حکمت عملی تھی چونکہ دائیں بازو کے انتہا پسندوں کا سارا زور تارکین وطن کی یوروپ میں آمد کے خلاف ہے اس لئے وہ اپنے ہمنوا ہندو انتہا پسندوں کو بھی اس معاملے کسی قسم کی سہولت فراہم کرنے کا روادار نہیں ہے بلکہ صرف اس قدر احسان کرنا چاہتا ہے کہ انقلاب کے بعد بنگلہ دیش، پاکستان اور بھارت کے غیر مسلم باشندوں پر مشتمل ایک سرونٹ کلاس (نوکروں کا طبقہ) بنایا جائے گا اور یہ لوگ یورپ میں اپنے قیام کے دوران دن میں بارہ گھنٹے کام کریں، وہ ہر بڑے شہر کے باہر الگ آبادیوں میں رہیں گے اور ان کے کانٹریکٹ کی مدت چھ سے بارہ مہینے ہوگی جس کے بعد انہیں ان کے وطن واپس بھیج دیا جائے گا۔ بریوک کے ذہن میں یہ گھناؤنے خیالات یقیناً منوسمرتی کا مطالعہ کرنے کے بعد آئے ہوں گے۔ اس خواب کا بہترین پہلو یہ ہیکہ بریوک کی اس رسوائی کا شکار مسلمان نہیں ہوں گے اس لئے کہ وہ وہاں کا رخ ہی نہ کریں گے نیز ہزاروں سال تک شودروں کو اپنے آگے جھکانے والے براہمن ضرور اس ذلت کے آگے ماتھا ٹیک دیں گے۔

مثل مشہور ہے کند ہم جنس با ہم جنس پرواز اس لحاظ سے یہ کیسے ممکن ہے کہ

کوئی دہشت گرد ہنود کا مداح ہو اور اسکے یہود سے تعلقات نہ ہوں ؟.بریوک کا بھی یہی معاملہ ہے اس کا نہ صرف اسرائیل میں بی جے پی کی ہم پلہ یسرائیل بئٹیسنو نامہ جماعت سے بلکہ اسرائیل کے بدماغ وزیر خارجہ اویگور لئیبر من سے بھی گہرے مراسم ہیں ۔امریکہ میں موجود صہیونی دانشور مثلاً دانیال پائپس، رابرٹ سپانسر اور پامیلا گیلر جسکی زندگی کا واحد مقصد مساجد کی مخالفت ہے سے بھی وہ لگاؤ رکھتا اور فیض حاصل کرتا ہے۔اس نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جبکہ فلسطینیوں کو دی جانے والی احمقانہ حمایت کو بند کر دیا جائے اور اپنے تہذیبی عم زاد بھائی اسرائیل کی حمایت کی جائے ۔بریوک کی اس دھمکی سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ناروے ایک غیر جانبدار اور پر امن ملک ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ناروے ناٹو کا رکن ہے اور امریکی سامراجیت کا ہمنوا ہے۔ فی الحال افغانستان اور لیبیا میں امریکہ کے شانہ بشانہ برسر جنگ ہے۔ تمام ہی یوروپی ملکوں کی طرح ناروے میں بھی انتہا پسند بائیں بازو کی قدامت پرست جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ناروے کے دارالخلافہ کو امریکہ نے فلسطین کی سرزمین پر اسرائیلی قبضہ کا جواز فراہم کرنے والی مہم میں استعمال کیا تھا جو آگے چل کر اوسلو امن معاہدہ کی شکل اختیار کر گئی ۔

یوروپ کے اندر جدید قدامت پرستی کی آغاز.برطانیہ کی سابق وزیرِاعظم

مارگریٹ تھیچر نے ۱۹۷۸ میں کیا انہوں نے بیانگِ دہل اس اندیشے کا شکار کیا کہ برطانیہ مختلف تہزیبوں کے حامل افراد کے بہاؤ میں بہہ جائیگا اور اس سے بڑھکر ۱۹۸۹ میں تھیچر نے یہاں تک کہہ دیا کہ انسانی حقوق کا آغاز انقلابِ فرانس سے نہیں ہوا بلکہ اس کی حقیقی جڑیں یہودیت اور مسیحیت کے مرکب ہونے میں پائی جاتی ہیں۔یوروپ اور امریکہ میں بائیں بازو کی دہشت گردی کوئی نئی اور اجنبی شۓ نہیں ہے۔تیس سال قبل ۱۹۸۰ میں اس طرح کی ایک لہر نے یوروپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ماہِ اگست میں بولوگنا ریلوے اسٹیشن کے بم دھماکے میں ۸۴ افراد ہلاک اور ۱۸۹ ازخمی ہوئے تھے ۔ایک مہینے بعد میونخ میں ہونے والا دھماکہ ۱۱ لوگوں کی موت کا سبب بنا اور اکتوبر کے اندر پیرس کے ایک یہودی عبادتگاہ کے باہر ہونے والے دھماکے میں ۴ لوگوں نے اپنی جان گنوائی ۔امریکہ کے اوکلاہامہ شہر میں ۱۹۹۵ کے اندر ٹموتھی مک ویگ نے بریک کی طرح کھاد سے بم تیار کیا اور حکومت کی عمارت کو بم سے اڑا دیا جس میں ۱۶۸ لوگ ہلاک ہوئے لیکن اسی کے ساتھ یوروپ میں فسطائی سیاسی رجحانات کی حامل سیاسی جماعتوں نے بھی اپنا رسوخ بڑھایا ۱۹۹۰ میں جورگ حیدر کی لبرل پارٹی نے آسٹریا کے انتخابات میں ۲۲ فی صد ووٹ حاصل کئے اور اسی زمانے میں ناروے کے اندر کارل ایگار کی پروگریس پارٹی سب سے بڑی حزب اختلاف بن کر ابھری ناروے کی اس انتہا پسند جماعت نے ۲۰۰۹ میں پھر ایک بار ۲۳ فیصد ووٹ حاصل کئے اور سب سے بڑی حزب اختلاف بن کر ابھری ۔گیانو فرانکو فینی کے قومی محاذ ۱۵ کو اٹلی میں

فی صد ووٹ حاصل ہوئے۔ بیلجیم کے اندر ولام کے محاذ کو ۱۲٫۳ فی صد حاصل ہوئے اور فرانس کے اندر حزب اقتدار جماعت کو پانچ ریاستوں میں قومی محاذ کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ سویڈن میں گزشتہ سال مالمو کے ایک شخص کو ۱۲ افراد کے قتل میں گرفتار کیا گیا اور پہلی بار بائیں بازو کی انتہا پسند جماعت ۵٫۴ فیصد ووٹ حاصل کر کے پارلیمنٹ میں پہنچی۔ ڈنمارک جہاں اہانت رسول کے کارٹون بنائے جاتے رہے دائیں بازو کی ڈانش پیوپلس پارٹی کو ۱۷۸ میں سے ۲۵ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ نیدرلینڈ کا گیرٹ ویلڈر جو قرآن مجید کو ہٹلر کی کتاب مین کامف کا ہم پلہ قرار دیتا ہے نے ۱۵٫۵ فیصد ووٹ حاصل کئے اور یہ دونوں جماعتیں باہر سے اقلیتی حکومت کی حمایت کر کے اپنا رسوخ بڑھانے میں مصروف ہیں۔ اسی طرح کی کامیابی بی جے پی کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہونے والے انتخابات میں حاصل ہوئی تھی اور یہی کچھ مودی کے ساتھ گجرات میں ہوا گویا اس طرح کے تشدد نے ہمیشہ ہی بائیں بازو کو انتخابی فائدہ پہنچایا ہے لیکن اس کے باوجود وشواہندو پریشد کے بی ایل شرما اور اکھنڈ بھارت کے کرنل پروہت جیسے لوگ دہشت گردی پر اتر آتے ہیں انہیں میں سے ایک بریوک بھی ہے۔

عوام کے اندر انتہا پسند رجحانات کا فروغ دیگر رہنماؤں کو بھی اسکی تائید کیلئے مجبور کر رہا ہے مثلاً گزشتہ سال جرمنی کی چانسلر انجیلا مارکل نے

اعلان کیا کہ کثیر ثقافتی نظام ناکام ہو چکا ہے۔برطانوی صدر نے اعلان کیا کہ کثیر ثقافتی نظام نے مختلف تہذیبوں کے حامل افراد میں علٰحیدگی پسند طرز زندگی کو فروغ دیا ہے ۔نکولس سرکوزی نے تو صاف فرمادیا کہ کثیر ثقافتی نظام ناکام ہو گیا اس لئے کہ ہماری جمہوریت نے تارکین وطن کے تشخص پر مقامی لوگوں سے زیادہ توجہ دی یہ وہی لہجہ ہے جو ممبئی کی سڑکوں پر راج ٹھاکرے کے اندر دکھلائی دیتا ہے۔ سرکوزی نے انتہا پسندوں کو خوش کرنے کیلئے پہلے تعلیم گاہوں میں اسکارف پر پابندی لگائی پھر برقعے کو نشانہ بنایا اس کے باوجود فی الحال اسے مارین لی پین نامی انتہا پسند رہنما سے صدارتی انتخاب میں مقابلہ کرنا ہے جو مسلمانوں کے سڑکوں پر نماز پڑھنے کو ہٹلر کی جارحیت سے مماثل سمجھتی ہے یہی مسئلہ کسی زمانے میں شیوسینا نے ممبئی میں اپنی مقبولیت میں اضافے کی خاطر اٹھایا تھا۔بریوک جمہوری ذرائع کے بجائے اپنی تحریک نائٹ ٹمپلر کی مدد سے فوجی انقلاب کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہونے کا خواہشمند ہے اور اپنے مقصد میں کامیابی کی خاطر ۴۵۰۰۰ ہزار مارکسیوں کی ہلاکت اور دس ہلاک کے زخمی ہونے کی توقع کرتا ہے۔ وہ ۸۰۰۰ ہزار افراد سے رابطہ قائم کر رکھا ہے اور اپنی جان یہودی و مسیحی تہذیب کی بقاء کیلئے قربان کر دینا چاہتا ہے۔

انرش بیرنگ بریوک نے جو کہا سو کیا۔اس نے اپنے منشور کی تشہیر کیلئے ۹۳

معصوموں کے خون سے ہولی کھیلی اور اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب رہا اس لئے کہ اگر وہ کوئی پر امن ذریعہ اختیار کرتا تو اس قدر جلد ایسی زبردست مقبولیت نہیں حاصل کر پاتا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی مقصد میں کامیابی کیلئے معصوم لوگوں کی جانوں سے اس طرح کھیلا جاسکتا ہے ؟ مغربی دہشت گردوں کیلئے اس سوال کا جواب مثبت ہے اس لئے کہ وہ انسانیت سے خالی وحشی درندے ہوتے ہیں۔ بریوک کی ذاتی ڈائری اس حقیقت کی شاہد ہے کہ ۸۲ وہ دنوں تک اپنے منصوبے پر کام کرتا رہا۔ ۴۱ روز قبل جب وہ وسط میں پہونچا تو نہایت دلچسپ الفاظ اس نے صفحہ قرطاس پر ثبت کئے وہ لکھتا ہے۔ ''آج بڑے دنوں کے بعد میں نے پہلی بار عبادت کی، میں نے خدا کو سمجھایا اگر وہ نہیں چاہتا کہ مارکسی واسلامی محاذ یوروپ پر قابض ہو جائے تو اسے چاہئے کہ یوروپی عیسائیت کا تحفظ کرنے والے جنگجوؤں کی کامیابی کو یقینی بنائے'' اپنی اس جرأت رندانہ کے بعد آخری دن وہ کچھ یوں رقمطراز ہے۔ ''۲۰ دھماکوں کا بارود میرے پاس ہے مجھے اپنے طے شدہ مقامات پر دھماکوں کے سلسلے کی ابتدا کرنی ہے۔ اگر سب کچھ ناکام ہوگیا تو میں دوبارہ نجی تحفظ کے ادارے میں ملازمت اختیار کروں گا تاکہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کما کر قرض ادا کرسکوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میرا آخری اندراج ہے اس لئے کہ رات کے ۱۵ء۱۲ ہو چکے ہیں۔ آئندہ بہار میں پولیس افسر کا نیا لباس جب میں زیب تن کروں گا تو کیا خوب لگوں گا۔ اس کے بعد حاشئے میں لکھتا ہے تصور کریں کہ اگر کل اختامیہ کا

عملہ میرے پاس آئے اور اس غلط خیال کے ساتھ کہ میں دہشت گرد ہوں۔ گویا اسے یقین ہے کہ دوسروں کی نظر میں تو وہ دہشت گرد ہے لیکن خود اپنی نظر میں نہیں۔ آخری سطر اس طرح ہے نیک تمناؤں کے ساتھ انڈریو بریوک۔ جسٹیشئر نائٹ کمانڈر۔ نائٹس ٹمپلر یوروپ۔

اس ڈائری کو پڑھنے کے بعد یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے آخر اس انتہا پسندی کا محرک کیا ہے، وہ کون سی چیز ہے جو بریوک جیسے نوجوانوں کیلئے دہشت گردی کو مرغوب بناتی ہے۔ اس بنیادی سوال کا جواب اللہ کی کتاب قرآنِ مجید کچھ اس طرح دیتا ہے کہ ''اے ایمان والو خبردار غیروں کو اپنا راز دار نہ بنانا یہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے۔ یہ صرف تمہاری مشقت و مصیبت کے خواہش مند ہیں۔ ان کی عداوت زبان سے بھی ظاہر ہے اور جو دل میں چھپا رکھا ہے وہ تو بہت زیادہ ہے. ہم نے تمہارے لئے نشانیوں کو واضح کرکے بیان کردیا ہے اگر تم صاحبانِ عقل ہو (آل عمران ۱۱۸)

بھرت پور کی مہابھارت ۔ پہلی قسط

جگو کمہار کی آنکھ کھلی تو وہ اداس تھا اس کی آنکھیں چارپائی پر پڑے پڑے آسمان پر بادلوں کو تلاش کر رہی تھیں ۔ جگو کی چھت میں کئی ایسے چھوٹے بڑے سوراخ تھے جن کے اندر سے وہ وسیع و عریض فلک کا نظارہ کر سکتا تھا اکثر وہ آسمان پر تاروں کی مدد سے بننے والے نت نئے ڈیزائن دیکھتا اور انہیں اپنے برتنوں پر سجا دیتا۔ جگو کے برتن ان اچھوتے نقوش کے باعث سارے علاقے میں مشہور تھے لوگ انہیں اپنے گھروں میں آرائش وزیبائش کیلئے بھی استعمال کرتے تھے لیکن گزشتہ رات اس کے گدھے کی موت کے بعد یہ سارے مناظر بے معنی ہو چکے تھے ۔ اس کے گدھے نے پیاس سے دم توڑ دیا تھا۔ اس حادثے کے بعد وہ ایک گھڑا لے کر رات کے اندھیرے میں راج محل میں سارے حفاظتی عملے سے نظر چرا کر داخل ہو گیا تا کہ اپنے روتے بلکتے بچوں کے لئے پانی لا سکے لیکن جب وہ گھڑا بھر کر لوٹ رہا تھا تو ایک سپاہی نے اسے دیکھ لیا اور آواز لگائی اوئے کون ہے تو؟ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے ؟

جگو ڈر گیا۔ وہ ان بے معنی سوالات کا جواب دینے کے بجائے دروازے کی جانب تیز تیز چلنے لگا۔ پھر سے وہی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ۔ رک جا ورنہ میرا

تیر سینے میں پیوست ہو جائے گا۔ میں راج سرکشا کا اہلکار ہوں میرے لئے سات خون معاف ہیں مجھ سے آٹھویں کی وجہ پوچھی جاتی ہے اور میرے ہر جواز کو من و عن قبول کر لیا جاتا ہے۔جگو پر اس دھمکی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا اس کی نظریں محل کے صدر دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ جلد از جلد اسے پار کر لینا چاہتا تھا اسے یقین تھا یہ سرکاری پلّا محل کے باہر نہ بھونک سکتا ہے اور نہ کاٹ سکتا ہے۔ اس کے کانوں میں پھر ایکبار وہی آواز گونجی رک جا مورکھ [بے وقوف] یہ تیرے لئے آخری تنبیہ اور خوب جان لے کہ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا لیکن یہ آخری انتباہ بھی بے اثر ہو گیا جگو اپنی جان سے بے پرواہ چلا جارہا تھا اور جیسے ہی اس نے باہر کی دہلیز پر قدم رکھنے کیلئے پیر اٹھایا تیر کی سنسناہٹ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ نشانہ چوک گیا پانی کا گھڑا پھوٹ گیا۔جگو نے افسوس کے ساتھ اپنے آپ سے کہا کاش کہ یہ نشانہ خطا نہ ہوتا اور اپنے معصوم روتے بلکتے بچوں کو پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنے کے کرب سے بچ جاتا۔ سپاہی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی وہ پانی کے ایک گمنام چور کو اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب ہونے سے روکنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

جگو واپس آکر سو گیا تو اس نے خواب میں اس کہانی کو دیکھا جو اکی دادی نے اسے بچپن میں اس وقت سنایا تھا جب اس نے پوچھا تھا کہ اس کا نام جگت پرشاد

اپادھیائے کیوں ہے ؟ کمہاروں کے اس محلے میں کوئی بھی اس قدر لمبے چوڑے نام نہیں رکھتا۔ گاؤں والوں کی پرمپرا یہ تھی کہ جب کسی کے گھر کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ اسے لیکر مندر میں راج پروہت کے چرنوں میں لے جا کر رکھ دیتے راج پروہت اس بچے کا اسکی ذات.برادری کے لحاظ سے کوئی نام تجویز کر دیتا اور وہ اسے دکشنادے کر خوشی خوشی لوٹ جاتے لیکن جگوکے پریوار والے اس روایت کی اتباع نہیں کرتے تھے ۔وہ خود ہی اپنے بچوں کے نام رکھ لیتے تھے یہ اور بات ہے وقت کے ساتھ جگت پرساد جگو ہوجاتا اور بھگت پرساد کو لوگ بھگو کہہ کرپکارنے لگے تھے اس لئے کہ کمہاروں دھوبیوں اور موچیوں جیسے عام لوگوں کو طول طویل ناموں سے پکارنے کی نہ کسی کو. فرصت تھی اور نہ ضرورت۔

جگو نے خواب میں راج محل کو دیکھا تھا جہاں اس کے پر دادا کمل پرشاد اپادھیائے پر راج پروہت یہ الزام لگا رہا تھا کہ انہوں راج پردھان کو اسکی غلطی پر بہانگ دہل ٹوک کر سارے راج دربار کا اپمان کیا ہے؟

میں نے کسی کا اپمان نہیں کیا۔ میری راج پروہت مہودئے سے ونتی (گزارش) ہے کہ مجھے یہ بتلائیں کہ کیا راج پردھان نے اپنے محل کے وستار [توسیع] کیلئے بلا اجازت و بیچ منگلو کمہار کی زمین استعمال نہیں کی یا نہیں؟ منگلو کا الزام درست ہے یا نہیں ؟ دھرم شاستر کے انوسار وہ غلطی ہے یا نہیں جس پر

میں نے راج پردھان کو ٹوکا ہے؟

راج پردھان صحیح ہیں یا غلط اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا لیکن اس سے پہلے یہ تصفیہ ضروری ہے کہ تمہیں ان کو ٹوکنے کا ادھیکار پراپت (حاصل) ہے یا نہیں؟اور دھرم شاستر کا مارگ درشن یہ ہے کہ راج پردھان کو تم نہیں ٹوک سکتے۔

اگر وہ غلطی کرے تب بھی؟

جی ہاں ہمارا دھرم شاستر یہی کہتا ہے کہ اگر وہ غلطی کرے تب بھی کوئی راج درباری یا شہری ان پر انگشت نمائی نہیں کر سکتے۔

اگر ایسا ہے تو ان کی نا انصافیوں کی تدارک کیونکر ممکن ہے؟

راج پردھان کی اصلاح کا ادھیکار صرف راج گھرانے کے سدسیوں (ارکان) کو ہے۔

لیکن راج گھرانے کے سدسیہ اگر اس کی اصلاح کرنے میں سکشم (اہل) نہ ہوں تو؟

توآپ اپنی بات ان سے کہیں ممکن ہے وہ آپ کے مشورے سے اتفاق کریں گے تو

اقدام بھی کریں گے۔

لیکن اگر وہ نہیں ہوتے تب؟ کمل پرشاد سوال پر سوال کئے جا رہے تھے۔ راج درباریوں اور مہاراج کا پیمانۂ صبر لبریز ہوا جارہا تھا لیکن کسی میں یہ جرات نہیں تھی کہ راج پروہت کی بات کو کاٹے اس لئے سارے لوگ صبر کا دامن تھامے ہوئے تھے۔

تب پھر تمہیں راج گھرانے میں جنم لینا ہوگا اسکے بغیر تمہیں یہ ادھیکار پراپت [حاصل] نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہ تو اسمبھو ہے گرودیو۔ میں تو جنم لے چکا ہوں اب میں دوبارہ کیسے پیدا ہو سکتا ہوں؟

ہم لوگ پونر جنم میں وشواس کرنے والے لوگ ہیں۔ ممکن ہے تمہارا اگلا جنم شاہی خاندان کے اندر ہو۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ ہو؟ لیکن سوال یہ ہے کہ بھوشیہ [مستقبل] میں جو ہوگا سو ہوگا اس وقت تک میں کیا کروں؟ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہوں؟

تب تک تمہارے لئے صبر کر لینے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔راج پروہت نے کہا۔

اور اگر ایسا کرنا میرے لئے ممکن نہ ہو تو؟ کملپرشاد نے سوال کیا۔

نہ ہو تب بھی تم کر ہی کیا سکتے ہو؟ راج پروہت نے مسکرا کر کہا۔

کیا کر سکتا ہوں؟ عوام میں جا سکتا ہوں۔آندولن چلا سکتا ہوں۔

آندولن کا لفظ سارے دربار پر بجلی بن کر گرا۔ راج پروہت بھی اسے سننے کے بعد اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے انہوں نے چیخ کر کہا۔ کیسی بات کرتے ہو کمل پرشاد اپادھیائے۔ میں تو تمہیں پڑھا لکھا اور مہذب آدمی سمجھتا تھا۔ تمہارے مکھ پر یہ شبد شوبھا نہیں دیتے۔کیا تمہیں آندولن کا مطلب معلوم ہے؟

آندولن کا مطلب تو ایک جاہل گنوار بھی جانتا ہے گرودیو۔

کمل۔ آندولن کا مطلب تو سبھی جانتے ہیں لیکن جو اس کے انجام سے واقف ہوتے ہیں وہ اس لفظ کو سوچ سمجھ کر اپنی زبان پر لاتے ہیں۔

میں نہ تو آندولن کا انجام جانتا ہوں اور نہ ہی اس کی پرواہ کرتا ہوں۔ کمل پرشاد نے ڈھٹائی سے جواب دیا

ہمارے اس نظام میں آندولن چلانے کا مطلب بغاوت ہے بغاوت اور بغاوت کا انجام ۔ راج پروہت کی زبان گنگ ہو گئی اس لئے کمل پرشاد ان کا سب سے چہیتاششیہ۔ ۔ ۔ شاگرد] تھا۔]

کمل بولا گرو دیو آندولن سے آخر ہم لوگ اس قدر گھبراتے کیوں ہیں؟

اس لئے کہ اکی چنگاریاں اس سارے نظام کو خاکستر کر سکتی ہیں۔ اس سے اندیشہ ہے کہ سارا بنا بنایا نظام سلطنت بکھر کر رہ جائے۔

آپ کی بات درست ہے لیکن اس آندولن کیلئے بھی تو ہمیں اسی نظام کی ناکامی نے مجبور کیا ہے۔ اب جو نظام ناکام ہو گیا اس کے درہم برہم ہو جانے کون سا

انرتھ ہو جائیگا؟ ممکن اس کا انتم سنسکار [آخری رسومات] عوام کیلئے خوشیوں کا نیا پیغام لے کر آئے؟

اس نظام کے ختم ہو جانے سے عوام کو کیا ملے گا یہ تو ہم نہیں جانتے اور نہ جاننا چاہتے ہیں ۔ ہمیں تو اس بات کی چنتا ہے کہ اس کے ختم ہو جانے کے نتیجے میں ہمارا کیا ہوگا؟ ہمارے سارے مفادات؟ ساری ٹھاٹ باٹ جو اس پر منحصر ہے اس کیا ہوگا ؟ بدھیمان انسان وہ ہے جو دوسروں سے پہلے اپنی فکر کرے اور اس کے بعد دوسروں کی ۔ راج پروہت نے نصیحت کا انداز اختیار کیا۔

گرودیو اگر آپ آگیہ دیں تو ایک بات کہوں۔

میری آگیہ کے بغیر ہی تم بہت کچھ بول چکے ہو تو اب آگیہ کے انوسار بھی بول دو۔ راج پروہت نے ایک زہریلی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

میں اس کیلئے شما [معافی] چاہتا ہوں پرنتو یہ اوشیہ کہوں گا کہ ہماری اس عقلمندی نے ہی اس آندولن کی ضرورت پیدا کر دی ہے جس سے ہم لوگ تھر تھر کانپ رہے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ اب یہ حربہ زیادہ دنوں تک ہمارے کام نہیں آئے گا۔

راج دربار کو موت کی خاموشی نے نگل لیا تھا کہ مہاراج وکرم سنگھ کا پیمانہ صبر اس جملے کے ساتھ لبریز ہو گیا اور وہ بولے گرودیو یہ باغی اپنی حدوں کو پھلانگ چکا ہے۔ آپ راج دھرم کے انوسار مجھے آدیش دیں میں اس کا پالن کرنے میں کوئی سنکوچ نہیں کروں گا۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ تلوار پر رکھ دیا۔

راج پروہت نے صبر سے کام لیتے ہوئے جواب دیا یہ حرکت اگر کوئی شودر جاتی کا منوشیہ کرتا تو اس کے ساتھ منو شاستر کے انوسار وہی ویوہار ہوتا جو تم کرنا چاہتے ہو پر تو یہ نہ بھولو کہ یہ براہمن جاتی کا راج درباری ہے۔ اس سے پہلے کسی براہمن نے ایسی مور کھتا [حماقت] کا پردرشن نہیں کیا شاید یہ صورتحال منوجی کے خواب و خیال میں نہیں آئی تبھی اس لئے انہوں نے اس بابت ہماری کوئی رہنمائی نہیں کی اس لئے ہمیں خود کوئی اجتہاد کرنا ہوگا۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا اس وقت تک ہم اس باغی کو فساد پھیلانے کی خاطر کھلا چھوڑ دیں گے؟ راج پردھان نے راج پروہت سے سوال کیا۔

نہیں ہم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ اسے تین دن کی حراست میں رکھا جائے اس کے

بعد منو شاستر کی روشنی میں مناسب فیصلہ کرکے ہم اس پر نافذ کر دیں گے۔اس لئے کہ اس معاملے میں جلد بازی فائدے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔
پولیس کے سپاہی کمل پرشاد اپادھیائے کو اپنے ساتھ گرفتار کرکے جیل لے گئے مہاراج وکرم سنگھ نے راج پردھان کی جانب دیکھا اوراس نے ان کا اشارہ سمجھ کر تخلیہ کا اعلان کر دیا۔ سارے راج درباری اپنا اپنا فرشی سلام کرکے نکل گئے اور مہاراج کے ساتھ راج پروہت اور راج پردھان باقی رہ گئے۔
مہاراج وکرم سنگھ راٹھور کو اس روز بے حد صدمہ ہوا تھا وہ کمل پرشاد سے زیادہ راج پروہت سے ناراض تھے جس نے انہیں کمل کی گردن مارنے کی اجازت نہیں دی تھی۔
وکرم نے تخلیہ کے بعد جب اپنی دائیں جانب مڑ کر دیکھا تو وہاں بیٹھی اپسرائیں سارا مدھوشالہ لے حاضر ہو گئیں۔ بائیں جانب بیٹھے کنجر سمجھ گئے کہ اب ان کو بھی بازیابی کا شرف حاصل ہوگا ان کی توقعات بھی پوری ہوئیں اور رقص و سرود کی محفل میں جام پر جام لنڈھائے جانے لگے۔ راج پروہت نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھا کر اجازت طلب کی اور چل دیا لیکن حیرت انگیز طور پر راج پردھان نے بھی اس کی پیروی کی اور باہر نکل آیا۔ راج پردھان کا رتھ تیار کھڑا تھا لیکن وہ راج پروہت کی بگھی میں سوار ہو گیا تاکہ اس نئی

صورتحال پر گفت و شنید ہو سکے۔ راج پردھان جانتا تھا کہ اس چکرویوہ کے مرکز میں اسکی اپنی ذات ہے اور رقص و سرود میں اس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

راج پروہت اور راج پردھان راستے میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے لیکن گھر پہنچنے کے بعد اصل موضوع پر آ گئے۔ راج پردھان نے کہا گرودیو میرا خیال ہے کہ آپ نے کمل کے ساتھ کچھ زیادہ ہی نرمی کا مظاہرہ کیا۔ اس کو اس طرح چھوڑ دینے سے راج دربار میں موجود دوسرے ارکان کے حوصلے بھی بلند ہو جائیں گے اور بغاوتوں کا ایک سیلاب پھوٹ پڑے گا۔

راج پروہت نے کہا نہیں تمہارا اندیشہ غلط ہمارے دربار میں بیٹھنے والے بڑے ارمانوں سے یہاں آتے ہیں اور ان کے بے شمار مفادات ہم سے وابستہ ہو جاتے ہیں اس لئے مجھے ان میں سے کسی کی بغاوت کا کوئی خاص خدشہ نہیں ہے۔ اگر اکا دکا اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتا ہے تو ہم لوگ اس سے بڑی آسانی سے نبٹ سکتے ہیں لیکن اگر کمل کی سزا اسے عوام کے اندر ہیرو بنا دیتی ہے تو اس سے جو انقلاب آئیگا اس پر قابو پانا ہمارے لئے ناممکن ہے اسی لئے میں جلد بازی میں کوئی اقدام کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

راج پردھان نے راج پروہت کی تائید کی اور بولا آپ مہان ہیں گرو دیو ہم لوگ

وہاں تک نہیں پہنچ سکتے جہاں آپ کی سوچ جاتی ہے لیکن اب آپ اس سمسیہ کا کیا اپائے بجھاتے ہیں؟

میرا خیال ہے ہم کمل کو کوئی کڑی سزا نہ دیں بلکہ اسے دربار سے نااہل قرار دے کر ذات.برادری سے الگ کر دیا جائے۔ میرا خیال ہے راج درباریوں کو ڈرانے کیلئے یہ سزا کافی ہے اور ایسا کرنے سے عوام میں بھی کو کوئی خاص غم و غصہ پیدا نہیں ہوگا اس لئے ان کی نظروں میں ویسے ہی نہ تو راج دربار کی کوئی قدرومنزلت باقی ہے اور نہ ذات.برادری کی کوئی اہمیت ہے اس لئے انہیں یہ محسوس ہی نہ ہوگا کہ کمل کو کسی محرومیت کا شکار کیا گیا ہے یا اس پر کوئی ظلم ہوا ہے۔

اس کے بعد کچھ بھی نہ بدلا نہ کرانتی آئی اور نہ جنگلو کو اپنی زمین واپس ملی ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس دن کے بعد سے کمل پرشاد اپادھیائے کملو کمہار اور جگت پرشاد جگو بن گیا۔

[باقی آئندہ انشااللہ]

بھرت پور کی مہابھارت - دوسری قسط

بھرت پور میں فقر و فاقہ کا دور دورہ تھا۔اس علاقے کے بھولے بھالے باشندے امبر کو آسمانی باپ اور دھرتی کو ماتا کہہ کر پکارتے تھے اس لئے کہ آسمان پانی برساتا اور زمین اسے اپنے پاس جمع کرکے رکھتی تاکہ عوام اسے وقتِ ضرورت استعمال کرسکیں لیکن فی الحال یہ لوگ بھوک اور پیاس کی چکی میں بے دریغ پس رہے تھے۔آسمان اس قدر بے رحم ہوگیا تھا کہ وہ لوگوں کو روتا بلکتا دیکھتا لیکن اس کی آنکھ نم نہ ہوتی تھیں اس نے نہ جانے کیوں بارش برسانے کے کام کو ہی تج دیا تھا۔دھرتی کا حال یہ تھا کہ وہ پانی کو محفوظ کرکے تقسیم کرنے کے بجائے خود اسے جذب کرنے لگی تھی ہر روز نہ جانے کتنے ہزار لیٹر پانی وہ عوام کی نظروں میں دھول جھونک کر نگل جاتی اور اسے نہ جانے کس پاتال میں پہنچا دیتی جہاں تک کسی اور کی تو کجا خود اس کی اپنی رسائی بھی مشکل تھی۔بچا کچھا پانی ہر صبح آسمان پر نمودار ہونے والا سورج بھاپ بنا کر چوس لیتا اور بے یار و مددگار لوگ لوٹ کھسوٹ کے اس گرم بازار کو حسرت و یاس سے خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہتے تھے۔ایک ایک کرکے بستی کے سارے ندی نالے، تالاب اور چشمے خشک ہوگئے تھے محل کے اندر موجود راج تال کو اس معاملے میں استثناء حاصل تھا کہ اس کا پانی سوکھنے کا نام لیتا تھا۔

راج محل کے اندر بنے اس راج تال پر سخت پہرا لگا ہوا تھا درباریوں کے سوا کسی کو اس کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں تھی ۔راج درباریوں کے گھروں میں لگے ہوئے خودکار نلکوں سے راج تال کا پانی ان کی کوٹھیوں تک پہنچ جایا کرتا تھا وہ سارے قحط سالی کی اس مہاماری (وبا) کے باوجود خوشحال اور شادمان تھے ان کی عیش مستی پر اکال (قحط) کا کوئی منفی اثر نہیں پڑا تھا بلکہ لوگوں کو حیرت اس بات پر تھی کہ دن بدن ان کے نام نہاد نمائندوں کی ٹھاٹ باٹ میں بتدریج اضافہ نظر آتا تھا اس کے باوجود کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت کرے ۔جگو وہ پہلا شخص تھا جو اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر محل میں داخل ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بچوں کیلئے ایک گھڑا پانی تک حاصل نہ کر سکا تھا۔ محل سے ناکام و نامراد لوٹنے کے بعد جگو یوں تو سو گیا تھا لیکن پردادا نے خواب میں آکر اسے خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے حالات کا موازنہ پراچین کال (قدیم زمانے) سے کر رہا تھا۔

جگو کو لگا بظاہر تو سب کچھ بدل گیا ہے ۔ساری راجنیتک ویوستھا (سیاسی نظام) بدل گئی ہے ۔راج شاہی (بادشاہت) کی جگہ پر جا تنتر (جمہوریت) آگیا ہے ۔ لیکن زمینی حقائق نہیں بدلے۔راجہ کی جگہ راشٹر پتی (صدر مملکت) نے لے لی اور راج

پردھان کی پردھان منتری براجمان ہوگئے۔ راج پروہت کا کام بھی بند نہیں ہوا ان کا کردار پکش ادھیکش (ہائی کمانڈ) نے ادا کرنا شروع کردیا۔ پراچین کال (قدیم زمانے) میں یہ ہوتا تھا کہ ہر سال ایک بہت بڑی سرکاری تقریب کا اہتمام ہوتا اس سے قبل مختلف جاتیوں اور پرانتوں کے لوگ کلُ دیوتا بانگڑ بابا کی بھانت بھانت کے مختلف دیو ہیکل مجسمے بنواتے اور انہیں قلبِ شہر میں موجود بڑے سے میدان میں نسب کردیتے تھے۔ دس دنوں کی جترا میں ان کی پوجا پاٹ ہوتی چڑھاوے چڑھائے جاتے۔ ہر گروہ اپنی طاقت اور شان و شوکت کا مظاہرہ مختلف انداز میں کرتا۔ اس سیاسی اتھل پتھل میں کئی نئے رشتے عالمِ وجود میں آتے اور کئی پرانے ہمنوا ایک دوسرے سے بر سرِ پیکار ہوجاتے۔ ناچ رنگ کی محفلوں کی آڑ میں موقع پرستی اور ابن الوقتی کی بنیاد پر بولیاں لگتیں، سودے بازیاں ہوتیں گویا چہار جانب جشن کا ماحول ہوتا اور پھر دسویں دن گاؤں والے ان مورتیوں کو جلوس کی شکل میں اپنے اپنے رتھ میں سوار کرکے راج محل کی جانب ناچتے گاتے چل پڑتے۔ اس رتھ کی خصوصیت یہ ہوتی کہ اسے کھینچنے کیلئے از خود عوام اپنی خدمات پیش کرتے لیکن اس پر سواری کا شرف کل دیوتا اور سردار ہی کو پراپت (حاصل) ہوتا۔

سال میں ایک مرتبہ راج محل کے دروازے عوام کیلئے کھول دیئے جاتے اور جب مختلف راج رتھ راج تال کے کنارے پہنچ جاتے تو اس کے بعد راج پروہت مقدس کتاب

کے اشلوک پڑھنے لگتا اور لوگ خاموشی سے انہیں سننے لگتے لیکن جیسے ہی وہ خاموش ہوتا ہر ہر مہا دیو کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوجاتا اوراس شور شرابے میں راجہ کا پھرایکبار راج ابھیشیک (رسمِ تاجپوشی) عمل میں آجاتا راجہ کے سر پر سجے تاج کو دیکھ کر عوام خوشی سے پاگل ہو کر ناچنے گانے لگتے۔اس کے بعد راج پروہت کو یہ دیکھنا ہوتا تھاکہ میدان میں موجود کس رتھ کے ساتھ سب سے زیادہ لوگ ہیں۔اس موقع پراپنی تعداد.ڑھانے کی خاطر مختلف گروہ آپس میں اشتراک اور واتحاد بھی کر لیتے تھے۔اپنا معائنہ ختم کرنے کے بعد راج پروہت سب سے کثیر حامیوں والے رتھ پر چڑھ کراس پر سوار بت کوتالاب میں دھکیل دیتااوراس پر مسرت ماحول میں راجہ اپنی جگہ سے اٹھ کرایک چمچماتی ہوئی تلوار اس رتھ کے سردار کو تھما کراسے راج پردھان گھوشت اعلان) کر دیتااور جیسے ہی راج پردھان اس تلوار کو ہوا میں اوپر اٹھاتا لوگوں کاجوش و خروش آسمان سے باتیں کرنے لگتاانہیں ایسا محسوس ہوتا گویاان میں سے ہر ایک کو ایک تلوار سونپ دی گئی ہے۔یہ ایک ایسااحساس تھا جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ سچ تو یہ تھا جس تلوار کو دیکھ کرلوگ خوش ہو رہے ہوتے وہی تلوارسال بھران کے سروں پر لٹکتی رہتی اور وقت ضرورت جس کا سر چاہتی گردن سے الگ کر دیتی۔اس طرح کے واقعات سے لوگ وقتی طور پر غمگین ہوتے ضرور تھے لیکن پھر جب سالانہ جشن کا موقع آتا تو سارے گلے شکوے بھول کر رتھ یاترا کے شبھ (مقدس) کام میں جٹ جاتے۔

وہ سردار جو راج پردھان بننے سے محروم رہ جاتے ان کو راج دربار کی رکنیت سے نواز کر مختلف ذمہ داریاں سونپ دی جاتیں اور پھر آخر میں پوتراسنان (مقدس غسل) کی رسم ادا کی جاتی ۔سب سے پہلے راجہ کے ساتھ راج پروہت اور راج پردھان مقدس تالاب میں ڈبکی لگاتے اور اور پھر سارے راج درباریوں کو اس کا موقع ملتا کہ وہ اپنے سارے پاپ اس تالاب میں انڈیل کر پاک صاف ہو جائیں۔ عوام کو اس کی اجازت نہیں تھی اور نہ ضرورت ہی تھے ان بے چاروں سے ایسے بڑے گناہ کب سرزد ہوتے تھے کہ ان پر عظیم راج تال میں ڈبکی لگانے کی نوبت آئے ۔ عوام کا راج دھرم تو صرف یہ تھا کہ جب ان کا سردار تالاب میں اترے تو وہ نعرے لگائیں اور جب وہ واپس لوٹے تو تالیاں بجائیں ۔

جگو کمہار نے جب سنجیدگی کے ساتھ ان واقعات پر غور و فکر شروع کیا اس کے ذہن میں بے شمار سوالات سر ابھارنے لگے مثلاً:

راج تال میں ایسی کون سی خوبی تھی جس نے اسے مقدس بنا دیا تھا؟○

راج تال کے اندر ڈبکی لگا لینے سے آخر عوام اور ان کے سرداروں کو کون سے سرخاب کے پر لگ جاتے تھے؟

اس کے آبا و اجداد اس بت کو کیوں بناتے تھے جو ان کے کسی کام نہ آتا تھا؟○

بتوں کو بنانا بجائے خود ایک لایعنی فعل تھا لیکن اسے تالاب میں ڈوبا کر○

خوش ہونا کیا معنی رکھتا تھا؟ یہ اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا

عوام اس رتھ کو کیوں کھینچتے جن پر سوار ہونا ان کیلئے ناممکن تھا؟ یہ بات بھی اسکی○
سمجھ سے باہر تھی

تلوار و اختیار دوسروں کو سونپ کر اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھنے لینے کی منطق کو○
اس کی عقل قبول نہیں کر پارہی تھی

اس کے آبا و اجدا کافی پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ تھے آخر ان کی سمجھ میں یہ باتیں○
کیوں نہ آتی تھیں؟

وہ لوگ صدیوں تک اس فریب کا شکار کیوں رہے؟○

انھوں نے اس بے فائدہ نظام کا متبادل تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟○

ان لوگوں نے جو کیا سو کیا لیکن خود اس نے آج سے قبل ان بنیادی سوالات پر توجہ○
کیوں نہیں دی؟

آخری سوال سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا اس لئے کہ وہ اس کے اپنے متعلق تھا۔ سچ
تو یہ ہے اس سوال کا جواب سب سے آسان تھا اور اس نے سارے سوالات کی
دبیز چادر کو تار تار کر دیا تھا اور جواب یہ تھا کہ اس نے ابھی تک کبھی سنجیدگی کے ساتھ
ان پر غور کرنے کی زحمت ہی گوارہ نہ کی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے وہ بت بنانے، رتھ
کھینچنے اور تالیاں بجانے کے کام میں غیر شعوری طور پر جٹ گیا تھا شاید دیگر عوام بھی اپنی
عقل پر پٹی باندھ کران بیجا رسوم و

رواج میں منہمک ہو گئی تھی اور پہلے والوں کا بھی وہی حال تھا کہ وہ بھیڑ چال کا شکار ہو گئے تھے ۔جگو کمہار نے عزم کیا کہ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک ان معاملات کی طہ تک نہ پہونچ جاتا۔جگو کمہار کے دماغ کا چر کھا بڑی تیزی کے ساتھ گھومنے لگا تھاوہ کسی ایسی شخصیت سے ملنا چاہتا تھا جو اسکی رہنمائی کرکے ان گتھیوں کو سلجھاسکے اور جن سوالات کے مایا جال میں وہ ایک محصورِ محض ہو کر رہ گیا تھا انکی گرفت سے اسے آزاد کر سکے ۔اس نے اپنی رہائی کیلئے مختلف پرانتوں کے پرمکھوں کا جائزہ لیا تو اسے محسوس ہوا اترپرانت کا وشوانا تھ بڑا نیک آدمی ہے وہ برسوں تک راج دربار کی سیوا کر چکا ہے اور فی الحال سنیاسی کی سی زندگی گزار رہا ہے ۔اس نے راج دربار کا کوئی ناجائز فائدہ پہلے بھی نہیں اٹھایا تھا جبکہ وہ راج پردھان تھا اور اب تو اس اس سارے چکرویوہ سے اپنے آپ کو علٰحیدہ کر لیا ہے ۔جگو نے سوچا چونکہ اس کا کوئی ذاتی یا سیاسی مفاد اس نظام سے وابستہ نہیں ہے ۔اس نے اس راج تال کوئی توقع وابستہ نہیں کر رکھی ہیں اس لئے ممکن ہے وہ بلاخوف وخطر اپنے ضمیر کی آواز اور اپنے علم و تجربہ کی مدد سے اس کو مطمئن کر سکے ۔ویسے کسی پرپرانت کے پرمکھ سے ملاقات کرکے اس سے استفادہ کرنا مروجہ پرمپرا کے خلاف تھامگر فی الحال جگو کیلئے پرمپرا سے زیادہ اہمیت جواب حاصل کرنے کی تھی جو اس کا مقصدِ زندگی بن گئے تھے ۔

جگو جب وشوناتھ کے گھر پہونچا تو وہ کوئی کتاب لکھ رہا تھا۔بڑے دنوں کے بعد کوئی اجنبی اس سے ملنے آیا اسلئے وہ بہت خوش ہوا اس نے اپنا کاغذ قلم ایک طرف رکھا اور جگو کی جانب متوجہ ہو گیا۔وشوناتھ کی بیوی ان کے سامان چائے اور ناشتہ رکھ کر چلی گئی لیکن جگو اس قدر جوش میں اپنے سوالات رکھ رہا تھا اور وشوناتھ اسقدر انہماک سے انہیں سن رہا تھا کہ ان دونوں کو اس کا پتہ بھی نہ چلا۔جب جگو اپنی بات ختم کر چکا تو وشوناتھ نے کہا جگو اس پہلے کہ میں تمہارے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کروں ہم چائے پیتے ہیں اور دونوں کھانے پینے میں مصروف ہو گئے اس دوران انہوں نے ایک دوسرے کی خیریت معلوم کی اور جب وشوناتھ کو پتہ چلا کہ جگو کمل پرشاد اپادھیائے کا پوتا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور بولے جگو تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ میری اس کتاب کی ابتداء کمل جی کی اس گفتگو سے ہوتی جو انہوں نے آخری بار راج دربار میں کی تھی۔حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اس وقت کمل پرشاد کے بجائے راج پردھان کو سزا دی جاتی اور اس کمہار کی زمین لوٹا دی جاتی جس کیلئے انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی تھی تو آج تمہارے سوالات کی فہرست اس قدر طویل نہ ہوتی خیر جو ہوا سو ہوا۔ان کے خلاف سارے راج درباری اور راج پروہت اسی طرح متحد ہو گئے جس طرح کے میرے خلاف ہوئے اور ان لوگوں نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔

لیکن آپ لوگوں کا قصور کیا تھا؟ جگو نے سوال کیا

ہمارا قصور؟ ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔ہم نے بھی اسی طرح کے سوالات اٹھائے تھے جیسے کہ تم اٹھا رہے ہو۔ وشوناتھ نے جواب دیا

اچھا تو وہ لوگ ان کے جواب دینے کے بجائے چراغ پا کیوں ہو گئے؟

شاید اس لئے کہ ان کے پاس اس کا جواب نہیں تھا وشوانا تھ نے کہا

لیکن اگر جواب معلوم نہ ہو تو اس سے ناراضگی چہ معنی دارد؟ ہونا تو یہ چاہئے کہ اسے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ جگو نے اعتماد کے ساتھ کہا

جی ہاں جگو تمہاری منطق درست ہے۔شاید وہ لوگ اس کا جواب جانتے تھے لیکن وہ جواب دینا نہ چاہتے تھے

اچھا ایسا کیوں؟

اس لئے کہ وہ جوابات ان کے اپنے مفادات کے خلاف تھے ان سے اقتدار کو خطرہ

لاحق ہوتا تھا اور وہ کسی صورت اس سے دستبردار نہیں ہونے کیلئے تیار نہیں تھے ۔

[باقی آئندہ انشااللہ]

بھرت پور کی مہابھارت - تیسری قسط

وشوناتھ کی صحبت میں جگو کے عقل کی کھڑکیاں کھلنے لگی تھیں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن اندر داخل ہو چکی تھی جگو نے وشوناتھ سے پوچھا" اچھا یہ بتلائیں کہ آپ نے کیا اعتراض کیا تھا؟"

میں نے ! میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ کہ مجھے اس تالاب کا پانی کچھ گدلا نظر آنے لگا ہے

بس اتنی سی بات ؟اس میں تو برا لگنے والی کوئی بات ہی نہ تھی وہ کسی تجربہ گاہ سے اس کی تفتیش کرواکر حقیقت تک پہونچ سکتے تھے

وشوناتھ مسکرائے اور بولے تحقیق و تفتیش کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب حقائق پوشیدہ ہوں ۔ یہ تو ایک ایسا راز تھا جو سب پر عیاں تھا

اچھا تو انہوں نے کیا کہا؟ جگو نے سوال

وہ کیا کہتے ؟انہوں نے پہلے تو میرا تمسخر اڑانے کی کوشش کی اور کہا وشوناتھ کی نظر کمزور ہو گئی اس کو اپنی عینک بدل لینی چاہئے ۔

میں نے جواب دیا یہ اس قدر عیاں حقیقت ہے کہ اس کا مشاہدہ کرنے کیلئے کسی عینک کی چنداں ضرورت نہیں اس کا مشاہدہ تو معمولی سی بینائی والا شخص بھی کر سکتا ہے

اگر ایسا ہے تو یہ گدلا پن صرف تمہیں کو کیوں نظر آتا ہے ؟ ہمیں کیوں

دکھائی نہیں دیتا؟

یہ سوال تو آپ لوگوں کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے۔ ممکن ہے آپ لوگوں نے اپنی آنکھوں پر کوئی ایسی پٹی باندھ رکھی ہو جو اس مشاہدے میں مانع ہو رہی ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے جس کا علم مجھے نہیں ہے۔

میرے اس جواب پر ایک راج درباری آپے سے باہر ہو گیا اور کہنے لگا وشوناتھ تم اپنی حدود کو پھلانگ رہے ہو۔ تم راج پردھان بنا دیئے گئے اس کے معنی یہ تو نہیں ہوتے کہ ہمیں عقل کا اندھا کہو؟ کیا تم نے ہمیں بالکل ہی بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟ ہم اس طرح کی توہین ہرگز برداشت نہیں کریں گے؟

اس اوٹ پٹانگ الزام کے جواب میں میں نے مسکرا کر فیض کا یہ شعر پڑھ دیا

وہ بات سارے فسانے میں جس ذکر نہ تھا "

" وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

راج پروہت نے اس موقع پر مداخلت کی اور کہا پانی میں دراصل آسمان کا رنگ نظر آتا ہے اور آجکل افق پر کچھ نئے رنگ رونما ہو رہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی بھی دیکھے نہ گئے تھے۔ راج تال کا گدلاپن آسمان کا دھندلا سا عکس ہے۔

میں راج پروہت کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں اس حقیقت کو کم از کم تسلیم تو کر ہی لیا کہ راج تال فی الحال پہلے کی مانند صاف و شفاف نہیں ہے لیکن ان کی وجہ جواز سے اختلاف کرتے ہوئے کہا جناب راج تال کے اس گدلے پن کیلئے آسمان

کو موردِ الزام ٹھہرانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ آسمان سے برسنے والی برسات تو اسے کسی قدر بہتر بنا دیتی ہے۔ مجھے تو یہ زمین والوں کا کارنامہ لگتا ہے۔

زمین والوں سے تمہاری مراد کیا ہم لوگ ہیں؟ ایک اور درباری بولا وشوناتھ آج تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟

اس سے پہلے کہ میں اس کا جواب دیتا ایک معمر درباری رکن اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا آپ لوگ بار بار وشوناتھ کی باتوں کو اپنے اوپر کیوں اوڑھ لیتے ہوئے۔ اس سے بلا وجہ چور کی داڑھی میں تنکا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ راج تال ساری قوم کا ہے اور اس کی خوبی اور خرابی میں سارا ملک برابر کا شریک ہیں اس لئے میں اپنے فاضل دوست سے یہی کہوں گا

وفا کے نام پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے؟"

" تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

میں نے وضاحت طلب کی سب سے مراد کیا ہے؟ وہ لوگ جو یہاں دربار کے اندر بیٹھے ہیں یا عوام جو اس کے باہر رہتے ہیں۔

سوالات کا شکنجہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا اور راج پروہت کو اکی گھٹن محسوس ہو نے لگی تھی۔ اس نے کہا سب سے مراد تمام لوگ ہیں۔ وہ بھی جو اندر ہیں اور وہ لوگ بھی جو باہر ہیں۔ اس قوم کا ہر ہر فرد یکساں طور پر اس کیلئے ذمہ دار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ملک کے سارے تالاب جو بظاہر ایک دوسرے سے

جدا جدا نظر آتے ہیں اندر سے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔

اگر یہ بات درست بھی ہو تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے درمیان بہنے والے پانی کا رخ کس طرف ہے ؟وشوناتھ ایک نیا مسئلہ چھیڑ دیا

راجہ نے پہلی مرتبہ بحث میں شامل ہوتے ہوئے کہا یہ توبڑا معمولی سوال ہے۔ راج تال ہماراسب سے بڑاتالاب ہے اور یقیناً یہی سارے ندی نالوں اور تالابوں کو سیراب کرتا ہے۔

وشوناتھ بولا مہاراج ممکن ہے ایسا کسی زمانے میں رہا ہو لیکن آجکل مجھے لگتا ہے کہ صورتحال یکسر بدل گئی ہے

کیوں ؟ سب نے ایک زبان ہو کر سوال کیا

اگر پانی راج تال سے دوسروں کا جاتا ہوتا تو دوسروں سے قبل راج تال خالی ہو جاتا لیکن اس کے برعکس ہورہا ہے دوسرے ذخائرِ آب خالی ہوتے جارہے ہیں اور اس کے برخلاف راج تال کے سطحِ آب میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ جو کچھ آرہا ہے اس کے مقابلے بہت کم جارہا ہے۔

لیکن یہ جو پائپ لائن دکھلائی دیتی ہے اس کا کیا؟راج پروہت نے پوچھا

جی ہاں مہاراج پائپ لائن تو موجود ہے لیکن اس کا بھی اندرہی اندر گلا گھٹ چکا ہے۔ جو پائپ ہماری کوٹھیوں کو جاتی ہیں ان کی مرمت اور دیکھ بھال ہوتی رہتی ہے اس لئے ان کے اندر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے لیکن غریب بستیوں کو جانے والے پائپ میں پانی بہتا نہیں بلکہ رکا رہتا ہے بلکہ اب تو شاید سڑاند پیدا

کرنے لگا ہے۔

یہ سب تم تو کہہ رہے ہو اگر واقعی ایسا ہے تو شکایت عوام کی جانب سے آنی چاہئے وہ کیوں خاموش ہیں ؟ مجھے تو مدعی ست اور گواہ چست کی سی صورتحال دکھلائی دیتی ہے ۔ درباریوں میں سے ایک نے فقرہ کسا

ایسا نہیں ہے عوام کا ایک طبقہ نے اپنی تقدیر کو کوس کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ہے ۔اور باقی لوگ ہم سے مایوس ہو چلے ہیں یہ اچھی صورتحال نہیں ہے وشوناتھ نے کہا وشوناتھ کے انتباہ کا الٹا مطلب نکال کر ایک درباری اٹھا اور اس نے کہا اگر یہی بات ہے تو دیر کس بات کی ہے عوام کو پکڑ کر اس کام میں لگا دیا جائے وہ پہلے تالاب کو صاف کریں اور پھر اپنی پائپ لائن کی درستگی کا کام کریں۔

وشوناتھ کو اس پر غصہ آگیا بہت خوب وہ تالاب کو صاف کریں اور ہم اسے گدلا کرتے رہیں گے یہ خوب سوداگری ہے جس میں دینے والے کو کچھ نہیں ملتا کیوں کہ لینے والا کچھ بھی نہیں لوٹاتا۔ وشوناتھ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا وہ جو باہر ہیں ان کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے وہ تو نہ ہی اس تالاب سے استفادہ کرتے ہیں اور نہ ہی اسے زہر آلود کرتے ہیں اس لئے ان کو درمیان میں گھسیٹنا کسی پہلو سے درست نہیں ہے۔

اس بات پر دربار میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ہر کوئی بول رہا تھا کوئی

کسی کی سن نہیں رہا تھا۔لوگ وشوناتھ کو زندہ چبا جانا چاہتے تھے اس لئے کہ اس نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔اس صورتحال سے پریشان ہو کر راجہ نے راج پردھان کی جانب دیکھا تو راج پردھان نے مداخلت کی اور کہا آج یہ آپ سب کو کیا ہوگیا ہے ؟آپ لوگ تو سڑک پر چلنے والی گنوار جنتا سے بھی زیادہ بد نظمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ۔وشوناتھ نے ایک سوال کیا ہے ہمیں اس پر ہنگامہ کرنے کے بجائے اس کا جواب دینے کی کوشش کرنا چاہئے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس تالاب میں رونما ہونے والی آلودگی کیلئے اگرچہ بالواسطہ طور پر عوام ذمہ دار نہیں ہیں تب بھی بلاواسطہ اصل ذمہ داری انہیں کے سر جاتی ہے۔ہم لوگ یہاں پر جو کچھ بھی کرتے ہیں یہ انہیں کی توثیق سے ہو رہا ہے ۔ان لوگوں نے جن کو اپنی حمایت سے راج دربار میں روانہ کیا ان درباریوں کی حرکات کے لئے اگر وہ ذمہ دار نہیں ہیں تو آخر ذمہ دار کون ہے ؟

وشوناتھ نے کہا راج پروہت کی یہ دلیل اسی صورت میں درست ہوگی جبکہ عوام نے ہمیں اس تالاب کو گدلا کرنے کی غرض سے یہاں روانہ کیا ہو یا کم از کم ہم نے ان کے سامنے یہ واضح کردیا ہو کہ یہاں آنے کے بعد ہم یہ حرکت کرنے والے ہیں اور اس حقیقت کو جاننے کے باوجود انہوں نے ہماری حمایت کی ہو ۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ نہ ہی انہوں نے ہم کو یہ کام سونپا اور نہ ہی ہم نے انہیں یہ بتلایا کہ ہم کیا کرنے جارہے ہیں ایسے میں ان کو مجرم کے کٹھہرے میں کھڑا کرنا مجھے سراسر زیادتی معلوم ہوتا ہے ۔

راجہ نے کہا تمہاری دلیل درست ہے وشوناتھ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سالانہ جشن کے دن عوام درباریوں کا انتخاب کرنے کیلئے راج تال پر آتے ہیں اور چونکہ یہ سارا کھیل ان کی مرضی سے ہوتا ہے اس لئے ان کو مکمل طور پر بری الزمہ قرار نہیں دیا جاسکتا

وشوناتھ بولا جہاں پناہ اگر جان کی امان پاوں تو عرض کروں کہ وہ آتے کب ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ بیچارے لائے جاتے ہیں

کیا مطلب ؟ کیا ہم انہیں زبردستی کرکے یہاں لاتے ہیں؟ یہ تو بہتان ہے ہم پر۔ایک درباری بولا

ویسے باقائدہ زبردستی تو نہیں ہوتی لیکن جس طرح کا ماحول بنایا جاتا ہے۔ ان کے اندر جس قسم کی مختلف عصبیتوں کو بھڑکایا جاتا ہے۔ جو سبز باغ دکھلائے جاتے ہیں اگر وہ سب نہ کیا جائے تو کون آئے؟ مجھے یقین ہے کہ اگر اس سال لوگوں کو بتلا دیا جائے کہ آئندہ سال کی پہلی تاریخ کو انہیں راج تال پر آنا ہے اور جترا کا ہنگامہ نہ کھڑا کیا جائے تو شاید ہمارے قریبی اعزہ واقارب بھی ازخود یہاں نہ پھٹکیں

بات کافی پھیل گئی تھی اس لئے اسے سمیٹنے کیلئے ایک اور درباری نے مفاہمت کی صورت نکالتے ہوئے کہا کہ اب جو ہوا سو ہوا۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہ پتہ چلایا جائے کہ راج تال کی درگت کیلئے ذمہ دار کون ہے؟ بلکہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ اس کی کو پاک وصاف کرنے کیلئے کیا کیا جائے؟

دیگر درباریوں کے گلے سے یہ تجویز بھی نہیں اتری انہوں نے اعتراض کیا ہم آج یہ کون سا فضول کا دکھڑا لے کر بیٹھ گئے ؟کیا ہم لوگ راج دربار میں صاف صفائی کرنے کیلئے آتے ہیں کیا حکمرانوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی صفائی مہم میں جٹ جائیں ؟قوم کے عظیم تر مسائل پر گفت و شنید کرنے کے بجائے ہمیں اپنا قیمتی وقت اس فضول بحث میں نہیں صرف کرنا چاہئے

وشوناتھ نے کہا میں تو سمجھتا ہوں کہ ہم راج تال کے امانتدار ہیں قوم نے ہم پر اعتماد کیا ہے۔ اس لئے اب یہ ہمارے بنیادی فرائض میں شامل ہے کہ ہم اس کو پاک صاف رکھیں اور اگر ایسا کرنے میں ناکامی ہوتی ہے تو اسکی صفائی ستھرائی کا اہتمام کریں۔ اگر کسی صورت ہم خود اپنے اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ہمیں بلا جھجک عوام کا تعاون لے کر اس کام کو کرنا چاہئے۔

درباریوں کو محسوس ہوا کہ کسی طور یہ بلا اب ان کے سر سے ٹل رہی ہے اس لئے وشوناتھ کی اس تجویز پر انہوں نے چین کا سانس لیا لیکن راج پروہت نے اس سے اختلاف کیا اس نے کہا یہ نازک معاملہ ہے اس میں ہمیں احتیاط سے کام لیتے ہوئے سوچ سمجھ کر اقدام کرنا ہوگا ورنہ فائدے کے بجائے بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔

نقصان ؟ کیسا نقصان ؟؟

راج پروہت بولے دراصل یہ سارا نظام اس تالاب کے تقدس پر قائم ہے اگر کل کو

عوام کو یہ پتہ چل جائے کہ اس کا پانی ناپاک ہو چکا ہے تو اس کا تقدس پامال ہو جائے گا اور یہ نظام بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جائیگا جس کے نتیجے میں ہماری لٹیا اس تالاب کے گدلے پانی میں ڈوب جائیگی ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ ہمارے ستارے گردش میں آجائیں گے۔ جیسا کہ وشوناتھ نے پہلے کہا تھا عوام کا اعتماد ویسے ہی اس ناٹک سے دن بدن اٹھتا جارہا ہے۔ ہر سال جترا میں ان کی شمولیت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔اس کے باوجود کسی طرح انہیں بہلا پھسلا کر یہاں لانے میں ہم کامیاب ہو رہے ہیں لیکن اس حقیقت کے عیاں ہو جانے کے بعد تو یہ ناممکن ہو جائے گا۔

راج پروہت کے انتباہ پر ایک نوجوان راج درباری جس کا خاندان کئی نسلوں سے راج دربار میں موجود رہا تھا اور جس نے یہیں آنکھیں کھولیں تھی جوش میں اٹھا اور بولا اگر عوام کا اعتماد ختم ہوتا ہے تو ہو جائے اپنی بلا سے۔ اگر عوام ہماری حمایت نہیں کرتے تو نہ کریں ہمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہم اسی طرح راج درباری بنے رہیں گے اور راج پاٹ چلاتے رہیں گے ویسے مجھے تو اس جترا کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔

تمہارا دماغ خراب ہے راج پروہت نے چڑ کر کہا۔ اس ڈرامے سے عوام کا تو کوئی خاص فائدہ نہیں ہے لیکن ہمارا بڑا فائدہ ہے۔ چونکہ ہم ان کی حمایت سے یہاں آتے ہیں وہ بلا وجہ ہماری حرکات کیلئے خود کو موردِ الزام ٹھہرا کر احساس جرم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر جب ان کا غم و غصہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے

تو جنترا کی گھما گھمی امید کا ایسا چراغ روشن کر دیتی جس سے معاملہ اپنے آپ رفع دفع ہو جاتا ہے۔ اسی جنترا کی مدد سے عوامی بغاوت کو ٹالنے میں ہم کامیاب رہے ہیں ۔دراصل عوام کے استحصال کا اس سے زیادہ موثر نسخہ ہمارے پاس کوئی اور نہیں ہے۔

سارا دربار راج پروہت کے دلائل سے متفق ہو گیا اور چہار جانب خاموشی پھیل گئی۔

وشوناتھ نے پوچھا لیکن اب اس مسئلہ کو حل کیسے کیا جائے؟ اس لئے کہ اگر راج تال کی آلودگی میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو جلد یا بدیر وہ سارے لوگوں کو پتہ چل ہی جائیگا اور وہ اندیشے سچ ہو جائیں گے جن اظہار ابھی راج پروہت نے کیا ہے۔

راج پروہت نے کہا میری تجویز یہ ہے کہ ہم سب آئندہ تین دنوں تک اس پر غور وخوض کریں اور پھر راج دربار کے خصوصی اجلاس میں اس پر گفت و شنید ہو تاکہ مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جاسکے

راج پروہت کی تجویز سے سبھی نے اتفاق کیا اور راجہ نے آئندہ اجلاس کی تاریخ کا اعلان کر دیا

جگو بولا یہ تو نہایت معقول فیصلہ تھا تو پھر اس کے بعد کیا ہوا؟

وشوناتھ مسکرا کر بولے جگو میں نے بھی یہی سمجھا تھا جو تم سمجھ رہے ہو اور میں بھی اسی طرح خوش ہوا تھا جیسا کہ تم ہو رہے ہو لیکن افسوس کہ وہ میری خوش فہمی تھی

اچھا وہ کیسے ؟

دراصل راج پروہت نے میرے خلاف سازش کرنے کیلئے بڑی صفائی سے تین دن کا وقت حاصل کر لیا تھا ان تین دنوں میں اصل مسئلے پر کوئی کام نہ ہوا بلکہ سب سے پہلے تو جو پرپرانتی { خارجی } میری حمایت کر رہے تھے انہیں حاصل مراعات کے چھن جانے کا خوف دلا کر میرے خلاف کر دیا گیا اور پھر میری اپنی جاتی کے لوگوں کو دولت کا لالچ دے کر خرید لیا گیا۔ اگلے اجلاس میں کسی سنجیدہ گفتگو کے بجائے میرے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش کر کے اسے پاس کرا دیا گیا اور ایک ہنگامی جتراکے اہتمام کا اعلان ہوگیا۔اس کے بعد سب کچھ میری سمجھ میں آگیا اور بد دل ہو کر میں نے سیاست سے سنیاس لینے کا فیصلہ کر لیا اور میں اب بھی اس پر قائم ہوں

جگو نے پوچھا اگر گستاخی معاف ہو تو ایک سوال کروں ؟

جی ہاں کیوں نہیں بلا تکلف پوچھو وشوناتھ بولے

کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ یہ سنیاس ایک راہ فرار ہے ؟

شاید کہ ایسا ہی ہو۔ جب میرے سارے ساتھیوں نے ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میرے حوصلے پست ہوگئے تھے ۔ کاش کہ اس وقت مجھے تم جیسے مخلص اور بے غرض نوجوان میسر آتے لیکن ایسا نہ ہوا اور اب تو بیماری اور درازی عمر نے مجھے اس قدر نحیف و لاغر کر دیا ہے کہ اگر چاہوں بھی تو کچھ نہیں کر سکتا

لیکن میں تو صحتمند بھی ہوں اور میرا حوصلہ بلند ہے ایسے میں میرے لئے کیا

آدیش ہے
میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں اور میرا مشورہ یہ ہے تم جاکر ہری دوار کے یوگی بابا کا
ساتھ دو وہ فی الحال اس نام کو درست کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔
جگو نے کہا مجھے نہ جانے کیوں یوگیوں اور باباؤں سے الجھن ہوتی ہے اس لئے کیا کوئی
اور صورت ممکن نہیں ہے ؟
وشوناتھ نے مسکرا کر کہا اگر ایسا ہے تم جنوب میں وندیا چل کی جانب کوچ کرو۔وہاں
پر ایک انا ہزارے سرگرم عمل ہے اس کے ساتھ لگ جاو مجھے یقین ہے کہ تم کوئی بڑا
کام کروگے
جگو نے اٹھ کر احترام و عقیدت کے ساتھ وشوناتھ کے چرن چھوئے اور اپنی اگلی منزل
کی جانب نکل کھڑا ہوا
[باقی آئندہ انشاللہ]

بھرت پور کی مہابھارت - چوتھی قسط

وشوناتھ کا آشیرواد لے کر جگو سیدھے دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو وہاں عجیب ہنگامہ برپا تھا شمال کی جانب سے آنے والی اکثر گاڑیاں تاخیر سے چل رہی تھیں ویسے جگو کو جانا جنوب کی جانب سے تھا لیکن جب تک کہ شمال سے گاڑی آئیگی نہیں اس وقت تک جنوب میں جائیگی کیسے ؟ جگو کی سمجھ میں بادِ مخالف کی ضرورت اور حکمت اپنے آپ آگئی تھی ۔اسے دہرادون ایکسپریس سے ناسک جانا تھا جہاں سے بس کے ذریعہ رالے گن سدّھی یعنی آناجی کا گاؤں ۔ دہلی سے بنگر جانے والی ساری گاڑیاں چونکہ گجرات سے ہوکر جاتی تھیں اسلئے جگو کے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا۔ اچانک جبکہ وہ اس انتظار کی اذیتوں سے گزر تھا اس کے کانوں سے ایک نہایت مدھر آواز ٹکرائی ۔بابو جی یہ لیجئے پوڑی سبزی کھا لیجئے ۔یہ منگو حلوائی بول رہا تھا جگو نے اس کی جانب دیکھا تو اس نے بے طرح سے دانت نکال دئے اور مٹی کے کلہڑ میں تنک تھوڑی) سی سبزی اور اس پر رکھی تین پھولی ہوئی پوڑیاں جگو کی جانب بڑھا دیں ۔)
جگو کے منہ میں پانی بھر آیا لیکن پھر بھی اس نے کہا شکریہ مجھے نہیں چاہئے ۔

منگو بولا صاحب آپ کچھ زیادہ ہی پریشان لگتے ہیں ۔ یہ سرکاری گاڑی ہے اس کی اپنی مرضی؟ اسے تو جب آنا ہے تب آئے گی آپ کی چنتا سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

جی ہاں لیکن مجھے ابھی بھوک نہیں ہے ۔ اس لئے میں معذرت چاہتا ہوں

ارے صاحب بھوک تو اپنی ہے۔ابھی نہیں لگی تو کچھ دیر میں لگ جائیگی اس لئے آپ پیشگی کھا لیجئے

جگو کو منگو کے اصرار سے الجھن ہونے لگی وہ بولا آپ عجیب آدمی ہیں ۔ اپنی پوڑی بیچنے کی اس قدر فکر ہے آپ کو کہ آپ بلاضرورت اسے میرے گلے میں ٹھونسنا چاہتے ہیں ۔

منگو نے پہلے کی سی متانت سے جواب دیا صاحب آپ کو غلط فہمی ہو گئی اس کیلئے میں معذرت چاہتا ہوں لیکن بات دراصل یہ ہے کہ میں یہ سبزی پوڑی بیچ نہیں رہا اور مجھے لگتا ہے آپ کو بھوک لگی ہے ۔

تو کیا تم نے مجھے بھکاری سمجھ لیا ہے جو دان دھرم کرنے چلے آئے۔ جگو نے بگڑ کر کہا
منگو بولا صاحب بھکاری ہوں آپ کے دشمن ہم تو بھیک منگوں کو بھی بھکاری نہیں
سمجھتے ویسے آپ تو مجھے کمہار لگتے ہیں؟
کمہار؟ یہ تمہیں کیسے پتہ چل گیا؟
چلئے آپ نے تصدیق کر دی اس کا شکریہ اب بحث مباحثہ چھوڑ کر اس پوتر بھوجن کا سواد
مزہ) لیجئے۔)
لیکن آپ میرے کیا لگتے ہیں جو مجھے مفت میں یہ کھانا کھلا رہے ہیں؟
بھائی سچ تو یہ ہے کہ ساتھ ملکر کھانا کھانے کیلئے کچھ لگنا ضروری نہیں ہے۔ ویسے اگر آپ
اسے ضروری سمجھتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ میں آپ کا ججمان (میزبان) ہوں
لیکن میں تو آپ کا مہمان نہیں ہوں؟

منگو نے جملہ کاٹ دیا اور جھٹ سے بولا نہیں ہیں تو ہو جائیں گے۔ گاڑی کے آنے میں تاخیر ہو رہی ہے آپ یہ کر سکتے ہیں کہ اس کے آنے تک ہمارے پنڈال میں وشرام آرام) کرلیں)

تمہارا پنڈال؟ تم ہو کون اور کہاں ہے یہ پنڈال ؟

جی پنڈال میرا نہیں یوگی بابا کا ہے۔ میں تو ان کا ادنٰی سا بھکت ہوں اور پنڈال یہیں قریب کے رام لیلا گراؤنڈ پر ہے اور وہاں جانے کیلئے باہر مفت رکشا موجود ہے۔ میری ہی طرح سارے سائیکل رکشا والے بھی بابا کے بھکت ہیں وہ لوگ سواریوں کو رام لیلا میدان تک پہنچانے کی اجرت نہیں لیتے۔

جگو کا دل پسیج چکا تھا اس نے پوٹری کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا یار یہ تو زبردست سہولت ہے کھانا تو کھانا، آنا جانا بھی مفت۔

جی ہاں صاحب اور اسی ساتھ رہائش کا بھی بہترین انتظام

اور وہ بھی مفت؟ جگو اب بے تکلف ہو گیا تھا

جی ہاں صاحب یہ بابا کا دربار ہے کوئی سرکاری دربار تھوڑے ہی ہے جہاں ہر چیز کی قیمت پیشگی ادا کرنی ہوتی ہے

! جگو بولا سرکار دربار بھی تو مفت خوری کا اڈہ ہی ہے

جی ہاں صاحب لیکن یہ مفت خوری صرف درباریوں تک محدود ہے۔

یہ بھی صحیح ہے دکشنا کے بغیر عام آدمی کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے جگو نے کہا

آپ کی بات بالکل درست ہے اسی صورتحال کو بدلنے کیلئے ہی یوگی بابا نے اپنا دربار سجایا ہے

نادانستہ طور پر جگو یوگی بابا کے پنڈال کی جانب چل پڑا تھا منگو نے اسے رکشا میں بٹھانے کے بعد کہا آپ پرستھان کریں اور مجھے آگیہ دیں۔ میرے ذمے کچھ اور کام ہے۔ میں انہیں نبٹا کر دوپہر بعد باباجی کے درشن کیلئے پہنچ جاؤنگا ہماری ملاقات اسٹیج کی دائیں جانب چار بجے ہوگی۔ رکشا کے پہیے کے

: ساتھ جگو کے دماغ کی چکری بھی گھومنے لگی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا
یہ منگو بھی زبردست جادوگر ہے۔ اس نے جگو کے سفر کا رخ اس خوبی سے موڑ دیا تھا○
کہ خود اسے بھی پتہ نہ چلا۔ ایسا لگتا تھا گویا اس نے جگو کے دماغ کو اپنے قبضے میں کر لیا
تھا اور بغیر سوچے سمجھے جگو وہ تمام کام کرتا جا رہا تھا جو منگو چاہتا تھا
اور پھر منگو کو یہ کیسے پتہ چل گیا کہ وہ پریشان ہے؟○
اس کو لگی ہوئی بھوک کا اندازہ بھی منگو نے بڑی جلدی کر لیا○
اور تو اور سب سے بڑا چمتکار تو یہ انکشاف تھا کہ وہ کمہار ہے؟ جگو کے ماتھے پر تو یہ○
کھدا ہوا نہ تھا بلکہ اس کے چہرے مہرے سے بڑے بڑے قیافہ شناس دھوکہ کھا جاتے
تھے اور اسے سورن جاتی کا آدمی سمجھ لیتے تھے لیکن منگو نے اس کے پیشے کا بالکل صحیح پتہ لگا
لیا تھا
اس کے باوجود منگو اس کے ساتھ پنڈال تک نہیں آیا تھا گویا اسے یقین تھا کہ یہ پنچھی○
پوری طرح زیر دام آچکا ہے۔ اب یہ درمیان سے کسی اور جانب روانہ نہیں جا سکتا۔ جگو
کو منگو کی خود اعتمادی پر رشک آرہا تھا
وہ سوچ رہا آخر کس ذمہ داری نے منگو کو ریلوے اسٹیشن پر روک دیا اور اس کے ساتھ○
آنے نہ دیا؟
آخری سوال کے سوا کسی سوال کا جواب جگو کے پاس نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ

دوپہر تک اور کئی اجنبی لوگوں کو منگو رام لیلا میدان روانہ کر دے گا۔ اس کا جی چاہا کہ واپس جاکر منگو کی تپسیا میں شامل ہو جائے لیکن اسے لگا یہ کام اس قدر آسان نہیں ہے۔ یہ فی الحال اس سے نہ ہو سکے گا۔ اسے یوگی بابا کے ساتھ کچھ اور ابھیاس (ریاض) کرنا ہوگا تب جاکر وہ جگو سے منگو بن سکے گا۔ جگو نے فیصلہ کیا کہ وہ اگلے دن منگو کے ساتھ ریلوے اسٹیشن ضرور جائیگا لیکن اسی دن شام جب منگو سے ملاقات ہوگی تو اس سے اپنے سارے سوالات کے جواب پوچھے گا۔

جگو جیسے ہی رام لیلا میدان میں بنے شامیانے میں داخل ہوا اس کا چہار جانب سے استقبال ہونے لگا۔ کوئی مسکرا رہا تھا تو کوئی پرنام کر رہا تھا ایسا لگتا تھا گویا وہ اپنے پرانے جاننے والوں میں لوٹ آیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہر کوئی اسکی آمد سے خوش تھا بعد میں اسے پتہ چلا کہ اس خوشی کا تعلق اسکی اپنی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ یہاں ہر کسی کو ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوشی ہوتی تھی۔ ایسا کیوں ہوتا تھا اس کی وجہ کا علم اسے ابھی نہیں ہوا تھا لیکن سچ یہی تھا کہ وہ خود بھی ان لوگوں سے مل کر بے شمار مسرت موسیس کر رہا تھا۔ اس بیچ ایک کارکن نے اپنی گٹھڑی کو کھولا اور اسے کھانے کی دعوت دی۔ ویسے تو جگو کو بھوک نہیں تھی اس کے باوجود وہ اس پرخلوص دعوت کو ٹھکرا نہ سکا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ان کو ایسا کرتے دیکھ

ایک اور مندوب دوڑ کر دو پانی کے پیالے لے آیا اور ان کے سامنے رکھ دیئے۔اس اجنبی نے پانی لانے والے کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا۔اب ان کے سامنے پتے پر کچھ ستو تھا اور پانی۔ پانی لانے والے نے اپنی جیب سے گڑ کی چند ڈلیاں نکالیں اور ان کو ستو پر پھیلا دیا۔ کھان پان کے بعد ستو والے نے پوچھا بابا جی کا پروچن کب ہے ؟ پانی والا بولا ابھی سمے ہے ہم لوگ دو گھنٹہ وشرام کر سکتے ہیں۔ جگو بولا یہ بہت مناسب مشورہ ہے۔ ستو والا بولا جی ہاں یہ وقت کا بہترین استعمال ہے بابا جی کے پروچن سے پوری طرح مستفید ہونے کیلئے جسم و ذہن کا تروتازہ ہونا بہت ضروری ہے۔پانی والا اس بیچ اپنی دری بچھا چکا تھا تینوں اس ایک بڑی سی دری پر اغل بغل لیٹ گئے اور نہ جانے کب گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

بڑے دنوں کے بعد جگو نے خواب میں اپنے دادا کمل پرشاد اپادھیائے کو دیکھا وہ نہایت ہشاش بشاش نظر آرہے تھے ان کا چہرہ خوشی سی دمک رہا تھا۔ جگو نے آگے بڑھ کر ان کے چرن چھوئے تو انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر اپنے سینے سے لگا لیا۔ایسا پہلی بار ہوا تھا اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے مٹی میں بیٹھ گئے کمل پرشاد نے کہا بیٹے کیا تم جانتے ہو کہ آج میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ جی دادا جی ! میں نہیں جانتا اور مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں آپ کے درشن ہو گئے یہی میرا بہت بڑا سوبھاگیہ ہے۔جگو نے

ونمرتا سے کہا

سوتو ہے میں بھی جب تم کو دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے لیکن آج میری تم سے ملاقات کا ایک خاص کارن (وجہ) ہے

آگیہ دیں داداجی! آپ کی اِچھا (مرضی) ہی میرے لئے آدیش (حکم) ہے

بیٹے آج میں تمہیں نہ تو کوئی آدیش دوں گا اور نہ ہی اپدیش۔آج تو میں سیاست کی دنیا میں تمہارا سواگت کرنے کیلئے آیا ہوں۔ دیکھو بیٹے یہ ایک نہایت پوتر دھرم کاریہ مقدس دینی ذمہ داری) ہے جس کا لوگوں نے اس قدر دراپیوگ (غلط استعمال) کیا کہ) یہ ایک گالی بن گیا لیکن تم اسے دھرم سمجھ کر برتنا۔یاد رہے کل یگ کے سارے انیایہ اور شوشن کا سروت (ظلم اور استحصال کا سرچشمہ) یہی راجنیتی ہے اس لئے جو اسے سدھار دے گا وہ سب سے بڑا کام کرے گا پرنتو یہ نہ بھولنا کہ یہ پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا ہار ہے۔یہ کام آسان نہیں بہت مشکل ہے لیکن بہادر آدمی کی پہچان یہی ہے کہ وہ مشکل کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے بخیر و خوبی نبٹا دیتا ہے۔اس مہا یدھ (جنگِ عظیم) میں میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس رن بھومی میدانِ جنگ) سے تم کامیاب و کامران ہو کر لوٹوگے۔ جگو نے عقیدت کے ساتھ)

اپنی آنکھوں کو بند کرلیا تو اپنے کندھوں پر کسی ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اسکی آنکھ کھلی تو اس کے سامنے منگو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ منگو نے کہا اٹھو بھائی جگو شرام کا سمے سماپت ہو گیا ہے۔ جگو نے دیکھا کہ اسکے پاس سے پانی والا اور ستو والا دونوں غائب ہیں۔ جگو نے پوچھا کیا پروچن شروع ہونے والا ہے؟

منگو بولا ابھی بس اتنا وقت ہے کہ تم اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر منہ ہاتھ دھولو اس کے بعد ہم لوگ چائے پیتے ہیں تب تک یوگی بابا آجائیں گے۔

(باقی آئندہ انشا اللہ)

اک نئے عہد کی تعمیر کا موسم آیا۔ قسط اول

ستمبر 2001 امریکی تاریخ کا تاریک ترین مہینہ تھا اور ستمبر 2011 اسرائیل کے لئے منحوس ترین مہینہ بننے جارہا ہے ایسا لگتا ہے صہیونی ریاست پر چہار جانب سے مشیت نے اپنا شکنجہ کس لیا ہے۔اس شش جہت حملے میں اس کا دایاں ہاتھ ترکی مروڑ رہا ہے اور بائیں پنجے کو مصر کچل رہا ہے۔ یہ دونوں ہاتھ عرصہَ دراز سے اسرائیل کی وہ خدمت کر رہے تھے جو اس کے کسی اور حلیف کیلئے ممکن نہیں تھی ۔آگے سے محمود عباس آنکھیں دکھلا رہے ہیں اور پیچھے سے وزیر خارجہ اویگڈور لائبرہمن چھرا گھونپنے کی تیاری میں ہیں ۔ایکطرف سر سے امریکی سرپرستی کا سایہ اٹھتا جارہا ہے تو عوامی مظاہرے قدموں تلے کی زمین کھسکا رہے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کی سیاست پر نظر رکھنے والوں کیلئے یہ اشارات کافی ہیں لیکن چونکہ ہندوستانی ذرائع ابلاغ کو اپنے داخلی مسائل سے فرصت نہیں اس لئے تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اس سال 11 ستمبر کو قاہرہ کی عدالت میں ایک مقدمہ کی سماعت ہونے والی ہے جس میں نورہ الفرع نامی وکیل نے حکومت مصر سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ قاہرہ میں واقع اسرائیلی سفارتخانہ بند کردے۔ ایک اور مقدمے میں اسرائیلی فوج کے

ہاتھوں ہلاک ہونے مصری سپاہیوں کا قصاص پانچ بلین ڈالر طلب کیا گیا ہے۔ ایلاط کے سانحہ کے خلاف منعقد ہونے والے مظاہروں کے درج ذیل مطالبات بھی دورس نتائج کے حامل ہیں :

اسرائیل کی جانب سے معذرت کی درخواست○

حادثہ کی مشترکہ تفتیش○

اسرائیل کے سفیر ملک بدری○

مصری سفارتکاروں کی تل ابیب سے واپسی○

میں ہونے والے کیمپ ڈیوڈ معاہدے میں ترمیم 1979○

وسطِ اگست سے ایلاط کی سرحد پر اسرائیلی گولی باری میں ہلاک ہونے والے مصری اہلکاروں کے خلاف ہونے والے مظاہروں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔اس کے دوران ایک مرتبہ اسرائیلی ریڈیو کی ویب سائٹ کو اور اس کے بعد وزیراعظم نتن یاہو کی ویب سائٹ کو مصریوں نے اپنے قبضے میں لے لیا اور اس پر اسرائیل کے خلاف مواد اور تصاویر لگا دیں۔اس کے علاوہ اسرائیلی سفارتخانے کی ۲۲ منزلہ عمارت کی چھت پر ایک شخص تمام سفارتی انتظامات کو پھلانگ کر پہنچ گیا اور وہاں موجود اسرائیلی پرچم کو پھاڑ کر مصری جھنڈا لہرا دیا۔ پھٹا پرچم جب نیچے آیا تو اسے موجود مظاہرین نے جلادیا۔اس واقعہ نے راتوں رات احمد سہلات نامی نوجوان کو مصری اسپائیڈر مین کی حیثیت سے مقبولِ عام کر دیا۔ایلاط کے

مقام پر اسرائیلی فوجی بس پر مجاہدین نے گھات لگا حملہ کیا تھا جس میں ۸ یہودی فوجی ہلاک ہوئے اس کے جواب اسرائیلی فوج نے نہ صرف ۵ مصری حفاظتی اہلکاروں کو شہید کیا بلکہ ۱۵ شہریوں کو غزہ میں بمباری کرکے ہلاک کر دیا۔

ان بزدلانہ مظالم کے باوجود وزیر اعظم نتن یاہو نے غزہ پر فوجی کارروائی کی دھمکی دے دی دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ نتن یاہو کو حزب اختلاف قدیمہ کی رہنمازپی لیفنی کی تائید حاصل ہو گئی اور اس نے پارلیمنٹ میں قرارداد پیش کردی لیکن اس بار سخت گیر وزیراعظم اور ان کے بددماغ وزیر خارجہ بھی ۲۰۰۸ کی حماقت دوہرانے کی جرأت نہ کر سکے اور اس تجویز کو واضح اکثریت کے ساتھ نامنظور کر دیا گیا جس کی وجہ یہ بتلائی گئی کہ موجودہ صورتحال میں مصر کو مزید ناراض نہیں کیا جاسکتا۔ایسا کرنے کے نتیجے میں اسرائیل یکا و تنہا ہو جائیگااور ایک ایسی مشکل میں پھنس جائیگا جس سے وہ ہر صورت بچنا چاہتا ہے نیزاسرائیل کے پاس اس فوجی کاروائی کیلئے وافر جواز موجود نہیں ہے۔یہ کسی مبصر کے نہیں بلکہ وزیراعظم کے الفاظ ہیں جو اکی کمزوری کا ببانگِ دہل اعتراف کرتے ہیں۔مصر میں برپا ہونے والے عوامی انقلاب سے قبل اس بات کا تصور بھی محال تھا لیکن اب مصر حسنی مبارک کے اس نامبارک چنگل سے نکل چکا جس نے اسرائیلی حملے کے وقت غزہ کی سرحد کو بند کرکے خود کو عذابِ الٰہی کا

مستحق بنا لیا تھا۔

ایک زمانے تک مصر سے بھی زیادہ اسرائیل کا حامی ترکی ہوا کرتا تھا لیکن اسرائیل نے غزہ کی جانب آنے والی امدادی قافلہ فلوٹیلا پر حملہ کر کے ۸ ترکی باشندوں کے ساتھ ایک ترکی نژاد امریکی شہری کو شہید کر دیا جس سے دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی ۔اقوامِ متحدہ نے اس واقعہ کی تفتیش کر کے بالکل ویسی ہی رپورٹ تیار کر دی جیسی کہ بابری مسجد تنازعہ میں الہ باد ہائی کورٹ کا فیصلہ تھا اس میں عدل و انصاف کو بالائے طاق رکھ کر تمام فریقوں کو خوش کرنے کی کوشش میں سبھی کو ناراض کر دیا۔ نتن یاہو نے رپورٹ کو ملتوی کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔مذکورہ رپورٹ میں اعتراف کیا گیا کہ اسرائیل نے طاقت کا بیجا استعمال کیا مگر غزہ کے محاصرے کو جائز قرار دیا گیا جبکہ خود اقوام متحدہ کی دیگر قرار داد اس کے خلاف ہیں۔چونکہ یہ حملہ بین الاقوامی سمندر میں نہتے لوگوں پر کیا گیا اس لئے پوری طرح غیر قانونی تھا مگراس بابت مکمل خاموشی برتی گئی ۔ترکی حکومت نے اس رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے نہ صرف یہ مطالبہ کیا کہ اسرائیل اپنی اس حرکت کیلئے غیر مشروط معافی مانگے بلکہ شہید ہونے والوں کے ورثہ کو فی کس ۱۰ ہزار ڈالے قصاص ادا کرےاور اسی کے ساتھ غزہ کا

غیر انسانی محاصرہ بھی فی الفور ختم کرے۔ترکیوں نے اپنے مطالبے کے پیش نظر اسرائیلی سفیر کو واپس بھیج دیا اور اسرائیل کی سفارتی حیثیت کو کم کردیا نیز تمام فوجی معاہدوں کو منسوخ کرڈالا۔ اب ترکی حکومت اسرائیل کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے جارہی ہے اور ممکن ہے اس ستمبر میں وہ مقدمہ قائم ہوجائے۔ اس مقدمہ میں ترکیوں کو کامیاب کرنے کیلئے اقوام متحدہ کی رپورٹ میں کافی شواہد موجود ہیں جسے سیاستدانوں نے تو نظرانداز کردیا لیکن کسی عدالت کیلئے ایسا کرنا خاصہ مشکل ہے۔

اسرائیل کی حمایت جس طرح مصر اور ترکی کی حکومتیں کر رہی تھیں اسی طرح فلسطینیوں کے گھر کا بھیدی محمود عباس بھی کرتا رہاہے۔ محمود عباس کیلئے سب سے بڑا مسئلہ حماس ہے جس نے پی ایل او کی اجارہ داری نہ صرف ختم کردی بلکہ گزشتہ انتخابات میں اسے شکست فاش سے دوچار کردیا۔ خود محمود عباس کی صدارتی میقات ایک سال قبل ختم ہوچکی ہے اور وہ دوبارہ انتخاب لڑنے کی ہمت نہیں جٹا پارہے۔ اسرائیل کی دوستی نے ایکطرف ان کے اعتبار کو بری طرح متاثر کیا دوسری جانب اسرائیل کی بدعہدی نے ان کا بیڑا غرق کردیا۔ نوآبادیات کی توسیع بلاتوقف جاری رہی اور اس سے نام نہاد امن گفتگو ایک ایسے تعطل کا شکار ہوگئی کہ خود امریکہ بھی بے دست وپا ہوکر رہ گیا۔ اب ہر طرف سے مایوس ہوکر محمود عباس نے اسرائیل سے ناراضگی کی قیمت پر اپنی مقبولیت میں اضافے

کا داؤں رچایا اور اقوامِ متحدہ میں فلسطینی ریاست کی باقاعدہ رکنیت کیلئے جدو جہد میں لگ گئے ہیں، محمود عباس کے اس موقف سے اسرائیل و امریکہ دونوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔اب محمود عباس کو معاشی امداد کے منسوخ کرنے کی دھمکی دی جارہی ہے لیکن یہ اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھتا نظر نہیں آرہا۔

جلاوطن فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان تو پی ایل او نے ۱۹۸۸ میں کر دیا تھا کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے بعد فلسطینی نمائندے کو اقوامِ متحدہ میں مستقل مشاہد کی حیثیت سے شامل کیا گیا اور باقاعدہ ممبران کے بعد سب سے پہلے اسی کو بحث میں شامل کیا جانے لگا لیکن وہ ہنوز رائے دینے کے حق سے محروم ہے۔اس بیچ یہ ہوا کہ اقوام متحدہ کے ۱۹۳ ممبران میں سے ۱۳۰ نے فلسطین کی ریاست کو تسلیم کر لیا اور ان ممالک میں اپنے سفارتخانے قائم کردیئے۔اس بار باقاعدہ رکنیت کے لئے جنرل اسمبلی اور سیکیورٹی کاؤنسل کے دروازے کھٹکھٹائے جارہے ہیں۔ سیکیورٹی کاؤنسل میں یقیناً امریکہ اسے ویٹو کرسکتا ہے لیکن اگر جنرل اسمبلی کی دوتہائی اکثریت اس کے حق میں رائے دے دے تو امریکہ کچھ نہیں کر سکتا۔۱۲۵ ممالک نے تجویز کے پیش ہونے سے قبل ہی اپنی حمایت کا اعلان کردیا اور باقی لوگ تجویز کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔اس دوران ۲۳ ستمبر کو اقوامِ متحدہ کے ہونے والے اجلاس کے جاری شدہ پروگرام نے

ساری دنیا کو چونکا دیا ہے۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ۲۳ ستمبر جمعہ کا دن ہے جسے دینِ اسلام میں تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ عالم اسلام میں تمام احتجاجی مظاہروں کیلئے اسی مبارک دن کا انتخاب کیا جاتا رہا ہے۔ ویسے تو مصری مسلمانوں نے عیدالفطر کے دن بھی اسرائیل کے خلاف مظاہرہ کرکے یہ ثابت کردیا کہ مسلمان خوشی اور غم کے ہر موقع پر اپنی احتجاجی فرائض ادا کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں ۔اقوام متحدہ کے اس اجلاس میں محمود عباس کیلئے دوپہر ۱۲ بجے کا وقت مختص کیا گیا جو بڑے سربراہانِ مملکت کیلئے خاص ہوتا ہے اور اس وقت سارے ہی ممبران حاضر ہوتے ہیں۔اسرائیلی وزیراعظم کیلئے رات نو بجے کا وقت تجویز کیا گیا ہے جبکہ اکثر لوگ واپس جاچکے ہوتے ہیں۔ اسرائیل نے مذہبی بنیاد پر اسے یوم السبت میں کے باعث اعتراض کیا ہے ۔اس اجلاس میں شریک ہونے کیلئے امریکہ اور اور اسرائیل کی آنکھوں کا کانٹا سمجھے جانے والے ایرانی صدر احمدی نژاد بھی بنفسِ نفیس شریک ہورہے ہیں گویا اسرائیل کے زخموں پر نمک کے چھڑکاؤ کا انتظام زور شور سے ہورہا ہے ۔ گردشِ زمانہ نے اسرائیل کی وہی حالت پی ایل او کے سامنے کردی ہے جو کبھی اس کے آگے پی ایل او کی ہوا کرتی تھی کہ اسرائیل کا غلام بھی اسے آنکھیں دکھارہاہے۔

اسرائیلی حکومت کی پشت میں چھرا گھونپنے کی تیاری خود وزیرِ خارجہ اویگڈور لائبر من کر رہا ہے۔ یہ شخص چند سال قبل روس سے ہجرت کرکے اسرائیل میں آیا اور صدیوں سے وہاں بسنے والے مسلمانوں سے اسرائیلی حکومت کی وفاداری کا مطالبہ کرنے لگا اس کا کہنا ہے کہ اگر عرب اس کیلئے تیار نہیں ہوتے تو انکو شہریت کے حق سے محروم کردیا جانا چاہئے۔ وہ یہودی مہاجرین کے حقوق کا بھی بہت بڑا حامی ہے۔ پہلے یہ سرمایہ دار لکڈ پارٹی میں شامل تھا مگر بعد میں اس نے اپنی مادرِ وطن پارٹی بنالی اور گزشتہ انتخاب میں ۱۵ نشستوں پر کامیابی درج کرلی۔ بنجامن نتن یاہو کو چونکہ اس بار واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی اس لئے اس نے لائیبر من کی حمایت حاصل کرکے اسے وزیر خارجہ بنا دیا لیکن لائبر من پر دس سال قبل غبن کا الزام ہے اور ڈیڑھ سال قبل اس کو رشوت ستانی کے معاملے میں بھی ملوث پایا گیا ہے۔ پہلے تو وہ کہتا تھا کہ اگر میرے خلاف مقدمہ قائم ہوگیا تو میں استعفیٰ دے دوں گا لیکن اب وہ اپنے وعدے سے مکر گیا ہے مبصرین کا خیال ہے کہ اگر اسے استعفیٰ دینا پڑا تو نتن یاہو کی مخلوط حکومت کو خطرہ لاحق ہو جائیگا۔ اب اپنی حکومت کو بلیک میل کرکے اس پر دباؤ بنانے کیلئے اس نے نئی افواہ پھیلا دی ہے فلسطینی ایک بہت بڑے پر تشدد مظاہرے کی تیاری کر رہے ہیں اس لئے حکومت کو پی ایل او سے روابط توڑ لینے چاہئیں۔ یہ اس قدر بے بنیاد افواہ ہے کہ فلسطینی حکام کے علاوہ خود اسرائیلی خفیہ ایجنسی نے بھی اس کی تردید کردی ہے۔

لائبرمن کے اس مطالبے نے اسرائیلی حکومت کے لئے نئے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں ۔ایک طرف محمود عباس کو اقوامِ متحدہ میں قرار داد پیش کرنے سے روکنے کیلئے اسرائیل انہیں کسی صورت مذاکرات کی میز پر لانا چاہتا ہے اور دوسری جانب یہ احمق قومی مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے حکومت کو گرا کر دوبارہ انتخاب کروانا چاہتا ہے تاکہ اس کی سیاسی حیثیت مضبوط تر ہوسکے اور وہ متوقع ۱۰ سال کی سزا سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔اسرائیلی سیاستدانوں کے بارے میں جو غلط فہمی پائی جاتی تھی وہ اپنے ملک کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اسے وندے ماترم کا کلمہ پڑھنے والے لائبرمن نے دور کردیاہے۔

اسرائیل کی بقاء اور استحکام کی بنیادی وجہ اسکی داخلی قوت نہیں بلکہ بیرونی حمایت رہی ہے ۔اس کے قیام کی حمایت کیلئے دو ازلی دشمن امریکہ اور سوویت یونین یکجا ہوگئے تھے اور اس کے بعد سارا مغرب اسرائیل کا ہمنوا بنا رہا اور تو اور اب اسے ہندوستان کی بھی مددو نصرت حاصل ہو گئی ہے لیکن فی الحال امریکی ریاست اور امریکی صدر دونوں کی حالت بہت پتلی ہے اور وہ دونوں خود اپنی بقاء کی جنگ میں مصروف ہیں ۔اسرائیل کے لائبرمین اور زیپی لیونی کی طرح امریکہ کی حزبِ اختلاف جماعت بھی اوبامہ کا بیڑہ غرق کرنے کیلئے قومی

مفادات سے کھلواڑ کر رہی ہے۔اوبامہ اپنی مقبولیت میں اضافے کے پیش نظر عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں تاکہ آئندہ انتخاب میں کامیابی حاصل کی جائے لیکن ریپبلکن ان کو اپنے اس ہدف سے محروم کرنے کیلئے ان کاموں میں روڑا اٹکاتے ہیں تاکہ اوبامہ کی ناکامی کا سہارا لے کر خود اپنی سیاسی روٹیاں سینک سکیں۔اس رسہ کشی میں ری پبلکن پارٹی اپنی کانگریس (پارلیمان) کے اندر اکثریت کے باعث کامیاب ہو جاتی ہے۔ہاتھی اور گدھے کی اس لڑائی میں ایک طرف جمہوریت مضبوط ہو رہی ہے اور دوسری طرف عوام کا نقصان ہو رہا ہے۔سیاسی جماعتوں کی اس چکی میں عوام پس رہے ہیں۔

اسرائیل کے سر پر جو سب سے مضبوط سائبان امریکہ کا تھا اس میں ہر روز ایک نیا چھید ہو رہا ہے۔اس کے دست و بازو مفلوج ہو رہے ہیں۔یہودیوں نے اللہ کو چھوڑ کر جن کا سہارہ پکڑا تھا ان کی مثال مکڑی کے جال کی سی تھی جیسا فرمانِ خداوندی ہے ''جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دُوسرے سرپرست بنا لیے ہیں اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے کاش یہ لوگ علم رکھتے'' (۲۹:۴۱)تاریخ شاہد ہے کہ ایسے تمام لوگ جو کمزور سہاروں کی بنیاد پر اپنا گھر بناتے ہیں وہ بالآخر اس آیت کی زندہ تفسیر بنا دیئے جاتے ہیں جس میں فرمایا گیا آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا، پھر ان میں''

سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے" (۲۹:۴۰)۔

اس تباہی و بربادی کی فضا میں حق کا سراپا منتظر شاعر انتظار نعیم امید کی ایک نئی کرن دیکھ لیتا ہے اور کہتا ہے

اک نئے عہد کی تعمیر کا موسم آیا

قصرِ طاغوت ہواؤں میں بکھرتا دیکھوں

(اسرائیل میں حکومت و نظام کے خلاف ہونے والے عوامی مظاہروں کی وجوہات اور متوقع اثرات پر گفتگو انشا اللہ دوسری قسط میں ہوگی)

ستمبر: گرد چہرے پر جمی تھی آئینہ دھوتے رہے !!

سرد جنگ کے اختتام پذیر ہونے کے بعد اگر امریکہ جنگ و جدال کے طریقہ کار کو سرد بستہ میں ڈال کر مسلم دنیا سے امن و سلامتی کی بنیاد پر تعلقات استوار کرلیتا تو جارج بش کو ۱۴ ستمبر ۲۰۰۱ کے دن یہ اعلان کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ "یہ اکیسویں صدی کی پہلی جنگ ہے" ۔ قدرت نے سوویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکہ کو ایک نادر موقع عنایت فرمایا تھا۔ وہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھا نیز اس کے علاوہ دوسری عالمی اسلامی قوت امریکہ کے ساتھ تھی ۔ اگر اس وقت امریکی انتظامیہ جنگ و جدال کو سرد خانے میں ڈال کر اسلامی دنیا کی جانب امن و دوستی کا ہاتھ بڑھاتا تو یہ صدی ساری دنیا کیلئے بشمول امریکہ کے ایک سلامتی و خوشحالی کی صدی بن سکتی تھی لیکن اس نے یہ موقع گنوا دیا اور ایک دہائی کے اندر خود اپنی قبر تیار کر دی جس میں دن بدن زندہ درگور ہو رہا ہوتا جارہا ہے ۔

امریکہ فی الحال جس معاشی بحران کا شکار ہے اسکی سب سے بڑی وجہ جنگی اخراجات ہیں ۔ گزشتہ دس سالوں میں ۱۲۸۰ بلین ڈالر اس یکطرفہ جنگ پر خرچ کرچکا ہے ۲۰۲۱ تک اخراجات کا تخمینہ ۱۸۰۰ بلین ڈالر ہے۔اس خطیر رقم میں سے ۶۳

فی صد یعنی ۸۰۶ بلین ڈالر عراق پر خرچ ہوئے جس کا اس حملے سے کوئی تعلق نہیں تھا دیگر فوجی اڈوں پر ۲۹ بلین اور افغانستان پر صرف ۴۴۴ بلین یعنی ۳۵ فیصد خرچ ہوا جس کو زبردستی حملے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ٦ بلین کا کوئی حساب نہیں ملتا لیکن ان بلین ڈالر میں کس قدر رقم بلواسطہ یا بلاواسطہ سیاستدانوں اور ان کی حمایت ۱۲۸۰ کرنے والے سرمایہ داروں کی تجوری میں چلی گئی اس کا اندازہ لگانا نا ممکن ہے اس لئے کہ اس پر قومی سلامتی کی دبیز چادر پڑی ہوئی ہے۔ اس دولت کی ریل پیل کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس حکومت کے پاس اپنے بے روزگار نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کیلئے وسائل نہیں ہیں اپنے بزرگوں کی خاطر صحت کا بجٹ نہیں ہے ۔جس ملک کے خزانے کا رواں رواں قرض کے بوجھ تلے دب گیا ہے وہ آخر اس بے جواز جنگ کو کیوں جاری رکھے ہوئے ہے ؟

مالی خسارے کے علاوہ وہ جانی نقصان ہوا ہے اسکی تفصیل رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے۔ ۱۱ ستمبر کے حملے میں کل ۲۸۰۰ کے آس پاس لوگ مارے گئے ان کا بدلہ لینے کیلئے جو جنگ چھیڑی گئی اس میں خود امریکی اعتراف کے مطابق ٦۲۰۰ فوجی مارے گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر حکومت اپنے ہلاک شدہ فوجیوں کی تعداد گھٹا کر بیان کرتی ہے خود امریکہ کے اندر اس بارے میں زبردست رازداری برتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کی اس جنگ میں بے شمار ایسے بے روزگار جنگجو

نوجوان بھی شریک ہوئے ہیں جنھیں فوج میں باقائدہ شامل نہیں کیا گیا ان مرسی نری کیلئے سرکاری دہشت گرد کے علاوہ کوئی اور اصطلاح مناسب معلوم (mercenary) نہیں ہوتی ۔ان لوگوں کی موت وحیات کو ریکارڈ نہیں رکھا جاتا اور ان کی ہلاکت ۶۲۰۰ میں شامل نہیں ہے۔ امریکی انتظامیہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کے باقائدہ ۵۵ ہزار فوجی زخمی ہوئے ہیں اور جو نفسیاتی امراض کا شکار ہوئے وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں ۔ عراق میں ان ظالموں نے ۱۲ لاکھ اور افغانستان میں ۲۰ ہزار معصوموں کو شہید کیا۔ پاکستان اور صومالیہ وغیرہ میں ۶۵۰۰ افراد جان بحق ہوئے۔ہندوستان کے فاضل مبصرین بار بار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ۱۱ ستمبر کے بعد کوئی بڑا دہشت گردی کا واقعہ نہیں ہوا یہ بھی غلط ہے اس دوران ۱۳ بڑے حملے ہوئے جس میں ۱۰۰۰ افراد ہلاک ہوئے۔

اپنے آپ کو دنیا بھر کے مظلوموں کا نجات دہندہ کہنے والے امریکہ کا یہ حال ہے کہ وہ خود ۱۱ ستمبر کے حملے میں امدای کام کرنے والے رضا کاروں کے زخموں کا بھی مداوہ کرنے میں بری طرح ناکام رہا۔ایک حالیہ تحقیقی مطالعہ میں یہ انکشاف ہوا ہے جن ۵۰ ہزار لوگوں نے اس کار خیر میں حصہ لیا تھا۔دس سال بھی ان میں سے ڈپریشن یعنی مایوسی وبے حوصلگی کا شکار لوگوں کی تعداد ۲۸ فی صد ہے۔ذہنی دباؤ کا شکار ۳۲ فی صد ہیں اور ۲۱ فیصد لوگ دیگر صحت کے مسائل سے جوجھ رہے ہیں ۔ماؤنٹ سینائی اسکول ڈاکٹر جون کے مطابق ان رجاکاروں کی بڑی

تعداد مختلف بیماریوں میں مبتلا ہیں ۴۸ فیصد استھما اور ۴۳ فی صد دماغی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان رضاکاروں میں سفید فام لوگوں کا تناسب ۵۷ فی صد ہے ان کی اوسط عمر ۳۸ سال ہے۔

امریکی انتظامیہ نے اس جنگ کو دو محاذ پر لڑی ایک محاذ پر بندوق، بمبار طیارے اور ٹینک تھے تو دوسرے پر کیمرہ، مائک اور قلم تھا۔ ایک کا شکار بیرونی دنیا تھی اور دوسرے کا مخاطب امریکی عوام لیکن پہلے کی دوسرے محاذ پر انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پی ای ڈبلیو جو امریکہ کا نہایت معتبر ادارہ ہے اس کے جائزے کے مطابق رائے عامہ بدل رہی ہے۔ دس سال قبل جب لوگوں سے پوچھا گیا تھا کہ کیا حملہ اس لئے ہوا کہ ہم نے کوئی غلطی کی ۵۵ فی صد نے اس کا انکار کر دیا تھا لیکن اب ۴۳ فی صد اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس حملے کی وجہ امریکہ کی اپنی غلطیاں ہیں اور ۴۵ فی صد اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس میں بھی تقسیم پارٹی لائن پر ہے ڈیموکریٹ اور غیر جانبدار افراد اس کیلئے امریکی جرائم توری پبلکن اس کیلئے امریکہ کو ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ یہ وہی ہٹ دھرمی ہے جو ہندوستان کے سنگھیوں میں پائی جاتی جن آنکھوں پر عصبیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ پہلے ۵۵ فیصد یہ کہتے تھے حملے کے بعد امریکہ کا اقدام درست تھا اب ایسا سمجھنے والوں کی تعداد گھٹ کر ۴۰ فی صد تک جا پہنچی ہے خاص بات یہ ہے کہ نوجوان طبقے نے امریکی اقدام کو غلط

قرار دیا ہے۔اس سروے کے مطابق ۶۰ فی صد لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں ۱۱ ستمبر کے حملے نے امریکی طرز زندگی کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے گویا ڈھیرے حقائق سامنے آرہے ہیں اور شاعر کی بات سچ ہو رہی ہے۔

کس سلیقے سے متاعِ ہوش ہم کھوتے رہے
گرد چہرے پر جمی تھی آئینہ دھوتے رہے

اس تبدیلی سب سے بڑی قیمت مسلمانوں نے چکائی ان کو ہراساں کرنے کی بے شمار کوششیں کی گئیں۔ مختلف انداز میں انہیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم کیا گیا۔ اس سال عید کے بعد نیویارک ایک تفریحی پارک میں جب مسلمان خاندان پہنچے تو کئی مقامات پر ان کی خواتین سے حجاب ہٹانے کا مطالبہ کیا گیا اور انکار کرنے پر انہیں فیس واپس لے کر نکل جانے کیلئے کہا گیا۔ اس ناروا سلوک کے خلاف کچھ لوگوں نے احتجاج کیا تو ان میں سے ۱۵ کی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور پارک کو وقتی طور پر بند کر دینا پڑا۔ مسلمان امریکہ میں کس قدر رسوا کئے گئے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ۳۵ فی صد مسلمان اب امریکہ کو ترجیحی ممالک کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔ افغانستان میں سوویت یونین کے قبضے سے زیادہ سنگین معاملہ ارضِ فلسطین پر اسرائیل کا ناپاک وجود ہے۔اگر امریکہ اس مسئلے کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش

کرتا تو ۱۱ ستمبر کا حملہ کبھی بھی نہیں ہوتا لیکن اس نے اس معاملے میں دو رخی برتی۔ اسرائیل کی نہ صرف ہر طرح سے حمایت کی بلکہ اسکے جرائم میں بذاتِ خود شریک ہو گیا اور تو اور فلسطینیوں کے حامی مصر کو توڑ کر اپنے ساتھ کر لیا اور اسے اپنے بھائیوں کے بجائے اپنے دشمن کا ہمنوا بنا دیا۔ اس کے بعد فلسطینی آزادی کے رہنما یاسر عرفات کو اسرائیل کے ساتھ ہاتھ ملانے پر مجبور کر دیا اور انہیں ہر طرح سے رسوا کرکے ان کی جگہ اپنے زر خرید پٹھو محمود عباس کو بٹھا دیا۔ اس طرح فلسطینیوں کو چہار جانب سے گھیر لیا گیا اس کا ردِ عمل وہی ہوا جو اس بلی کا ہوتا ہے جسے مارنے سے پہلے نکاسی کے سارے راستے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں بلی حملہ آور کے ہاتھ پر نہیں بلکہ چہرے پر جھپٹ پڑتی ہے اور یہی ہوا ورلڈ ٹریڈ سنیٹر امریکہ کا تشخص تھا اس کی پیشانی پر چمکتا ہوا تارہ تھا جو دیکھتے دیکھتے ڈھیر کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ ایک اور سپر پاور کا سورج زوال پذیر ہو گیا۔

امریکہ کے تحقیق و تفتیش کے ادارے نے دس سال بعد ۱۱ ستمبر پر اپنی رپورٹ کا خلاصہ پیش کیا اس کے مطابق امریکہ کے نائب صدر ڈک چینی نے دوسرے جہاز کو مار گرانے کا حکم دیا تھا جسے ماننے سے فوج نے انکار کر دیا۔ اس رپورٹ میں اعتراف کیا گیا کہ حملے کے بعد ایک زبردست افراتفری کا ماحول تھا اور کسی

کو یہ پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے گویا اس طرح کے حملے کا مقابلہ کرنے کی کوئی تیاری تھی اور نہ ہی منصوبہ تھا۔ اس حملے کے بعد اس کا سیاسی فائدہ بڑی خوبی کے ساتھ اٹھایا گیا اور اس کے پس پردہ دنیا بھر میں جی بھر کے تباہی مچائی گئی ۔ بے وقوف آدمی کی پیشانی پر احمق نہیں کھدا ہوتا اس کے اعضاء وجوارح بھی عقلمند جیسے ہی ہوتے ہیں دونوں کے اندر عقل موجود ہوتی ہے لیکن فرق اس کے استعمال سے پڑتا ہے۔ عقلمند دوسروں کی غلطی سے عبرت حاصل کرکے خود کو سنبھال لیتا ہے۔امریکہ سوویت یونین کے انجام سے سبق سیکھ سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ معمولی بے وقوف اپنی حماقت سے ہوشیار ہو کر ہے اصلاح کی جانب مائل ہو جاتا ہے لیکن ۱۱ ستمبر کے حملے کے بعد وہ بھی نہ ہو سکا۔ مہا بے وقوف اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ وہ اپنی حماقت بیجا توجیہ کرتا ہے۔اس پر اصرار کرکے یکے بعد دیگرے حماقت کرتا چلا جاتا ہے۔امریکی حکومت نے گزشتہ دس سالوں میں یہی کیا اور بالآخر نشانِ عبرت بن گیا۔ ۱۱ ستمبر کا پیغام یہی ہے کہ جارج ڈبلیو بش نے دس سال قبل اس صدی کی جس جنگ کا اعلان کیا تھا اس میں امریکہ شکستِ فاش سے دوچار ہو چکا ہے۔

دہلی دھماکہ : تو روشنی کے واسطے جلا لیا گیا مجھے

دنیا بھر کے لوگوں نے ۱۱ ستمبر کو دس سال قبل ہونے والے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حملے کو یاد کیا اور اس کے سوگ میں ہم ہندوستانیوں نے پانچ روز قبل دہلی ہائی کورٹ کے باہر ہونے والے دھماکے کو فراموش کر دیا۔ ہندوستان کے لوگوں کی جس صفت کا اعتراف ساری دنیا کرتی ہے وہ ہمارا صبر و تحمل ہے جو اپنی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس معاملے میں استثناء اس وقت ہوتا ہے جب کسی کمزور کے خلاف ہمیں سرکاری تحفظ حاصل ہو جائے جیسا کہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد خود دہلی میں ہوا تھا یا گودھرا ٹرین حادثے بعد گجرات میں ہوا۔ ہمارے عفو و درگذر کا راز ہماری مجبوری میں پنہاں ہے جس کا جی بھر کے فائدہ ہماری حکومت اٹھاتی ہے اور یہی کچھ دہلی ہائی کورٹ کے دھماکے کے بعد بھی ہوا۔ ہم نے اس واقعہ کو اس قدر آسانی سے کیونکر بھلا دیا؟ اس سوال کا نہایت دلچسپ جائزہ مختلف ماہرین نفسیات نے پیش کیا ہے۔

معروف ماہر نفسیات اودھیش شرما کے مطابق اس طرح کے حملوں کی بار بار ہونے نے ہمیں ان کا عادی بنا دیا ہے۔ ہمارا ذہن ان حادثات کو درج تو کرتا ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کے اندر اس سے متعلقہ احساسات و جذبات پیدا نہیں

ہوتے۔ایک بہیمانہ قتلِ عام ہمارے لئے ایک خبر بن کر رہ جاتا ہے اور اموات کو ہم تعداد میں شمار کرتے ہیں۔ تحت الشعور میں ہم اس واقعہ کا موازنہ کسی فلمی منظر سے کرنے لگتے ہیں۔جب کوئی سیاستداں اسے بزدلانہ حملہ قرار دیتا ہے تو ہمیں لگتا ہے کوئی پرانی ریل دوہرائی جارہی ہے۔ ٹی وی کے پردے پر نظر آنے والے مناظر میں بھی بلا کی یکسانیت دکھائی دیتی ہے بالفاظِ دگر ضمیر کی موت نے احساس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔اس لئے کہ ہم سب جانتے ہیں جن سراغوں کا ابتدا میں بڑے طمطراق کے ساتھ دعویٰ کیا جاتا ہے وہ آگے چل کر ایک اندھی گلی میں دم توڑ دیتے ہیں۔ایراتریویدی یوں رقمطراز ہیں کہ یکے بعد دیگرے حادثات سے گذر جانے کے بعد ہماری بے حسی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جب کسی حادثے کی خبر ہمیں ملتی ہے تو سب سے پہلے ہم اپنے اعزہ واقارب کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب پتہ چلتا ہے کہ وہ سارے محفوظ و مامون ہیں تو پھر اپنے کام میں کولہو کے بیل کی مانند جٹ جاتے ہیں۔شرما کا کہنا ہے کہ آج کل ہمارے آس پاس اس قدر منفی واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ ہم ان حادثات کی جانب بالکل توجہ نہیں کرتے جو ہم پر براہ راست اثرانداز نہیں ہوتے۔اسی لئے ٹیلی ویژن کے پردے پر بکھری ہوئی لاشوں کے مناظر کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ مرکزی وزیر برائے سیاحت سبودھ کانت سہائے نے جو ممبئی بم دھماکے کے وقت فیشن شو سے محظوظ ہو رہے تھے دہلی دھماکے کے بعد اعلان کیا کہ دھماکے کہاں نہیں ہوتے؟دنیا بھر میں

ہوتے رہتے ہیں اور ہم نے تو دھماکوں کے بیچ جینا سیکھ لیا ہے۔ ان سے ہمارے معمولات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دہلی ہائی کورٹ کی کارروائی دھماکے کے باوجود جاری رہی۔ اس افسوس ناک صورتحال میں عوام کی حالتِ زار پر ساحر لدھیانوی کے یہ اشعار صادق آتے ہیں

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتہ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

شاعر کی طرح ماہرین نفسیات کی رائے بھی یقیناً مبنی بر حقیقت ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حملے بار بار ہوتے کیوں ہیں ؟جب تک اس سوال کا جواب ہم حاصل نہیں کرتے اس وقت ان حملوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور قوم کے چند افراد اس میں اپنی جانِ عزیز گنوائیں گے مگر من حیث القوم ہم ایک زندہ لاش میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دہلی ہائی کورٹ کے دھماکے پر تبصرہ کرتے ہوئے تمام ذرائع ابلاغ نے اس بات پر اشارہ کیا کہ یہ اسی سال ۲۵ مئی کو ہونے والے حملے کا اعادہ ہے۔ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ وہ ریہرسل تھا اور یہ اصل ہے لیکن یہ سراسر حماقت کی بات

ہے۔دہشت گردانہ حملوں کا ریہرسل نہیں کیا جاتا۔اس حقیقت کے باوجود اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حملوں کے اندر گہرا تعلق ہے چونکہ دونوں کا مقصد یکساں ہے اس لئے یقیناً دونوں کے حملہ آور کا ایک ہی ہونا فطری امر ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حملہ آور کون ہے؟اس کا پتہ لگانے کیلئے یہ دیکھنا ہوگا کہ دونوں ہی مرتبہ ان دھماکوں نے کس کا بھلا کیا؟اس سوال کا جواب جاننے کیلئے مئی کے آخری ہفتہ میں وقوع پذیر ہونے سیاسی حالات اور ماہِ ستمبر کے پہلے ہفتہ میں رونما ہونے والے واقعات کا موازنہ ضروری ہے۔ ۲۰ مئی کے دن جی ۲ بدعنوانی کے معاملے میں سی بی آئی کی رپورٹ شائع ہوئی اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوااور وہی زمانہ تھا جبکہ دولتِ مشترکہ کے کھیلوں میں ہونے والی بدعنوانی منظرِ عام آئی اور سریش کلماڑی سمیت کئی افسران گرفتار ہوئے۔ ستمبر کے آغاز میں نوٹ کے بدلے ووٹ کی کہانی بے نقاب ہوئی اور امر سنگھ کو جیل کی ہوا کھانی پڑی لیکن یہ تو ایک واقعہ تھا اس کے علاوہ آڈیٹر اور کمپٹرولر کی رپورٹ پارلیمان میں پیش ہوئی جس میں ایئر انڈیا کے ذریعہ جہازوں کی خریداری پر بے شمار سوالات اٹھائے گئے ریلائنس کے کرشنا گوداوری ٹھیکے کی بدعنوانیاں نمایاں کی گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب آدرش گھوٹالہ میں دو مرکزی وزراء ولاس راؤ دیشمکھ اور سشیل کمار شندے سے سی بی آئی نے پوچھ تاچھ کا آغاز کیا۔اس پس منظر میں مندرجہ ذیل سوالات پر غور کیا جائے تو عقدہ اپنے آپ کھل جاتا ہے:

ذرائع ابلاغ میں مندرجہ بالا خبروں پر پردہ ڈالنے کی ضرورت کیسے تھی ؟ ○

ان موضوعات پر اخبارات و ٹیلی ویژن پر بحث و مباحثے میں کس کا نقصان تھا ؟ ○

بدھ کے دن اگر دہلی ہائی کورٹ کا دھماکہ نہیں ہوتا تو کیا اس دن امر سنگھ کی ضمانت ○ کے رد ہونے کے باعث ہونے کے باعث کانگریس کے ساتھ ان کے امر پریم کی کہانی پردہ سیمیں پر زیرِ بحث نہیں آتی ؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کہانی کے ہیرو منموہن اپنے آپ کو کیسے بچاتے ؟

جمعرات کو جب ریلائنس اور ایئر انڈیا کے گھپلے سامنے آتے تو کیا امبانی اور پٹیل کو ○ منہ چھپانے کی کوئی جگہ میسر آتی ؟

انا ہزارے کی بھوک ہڑتال ختم کروانے والے ولاس راؤ جب سی بی آئی کے دفتر سے ○ اپنی آدرش صفائی پیش کرکے لوٹتے تو کیا ٹی وی والے انہیں بخش دیتے ؟

دہلی ہائی کورٹ کے دھماکے نے ان تمام سوالات کو معصوم عوام کے خون کی چادر سے ڈھانپ دیا گیا بقول قتیل شفائی

کبھی جو ان کے جشن میں سیاہیاں بکھر گئیں
تو روشنی کے واسطے جلا لیا گیا مجھے

آج کل ہمارے ملک میں بدعنوانیاں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ان کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے بم دھماکے کروانا بظاہر غیر منطقی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کوئی ان گھپلوں کی نوعیت اور کمیت پر غور کرے اور ہمارے سیاستدانوں کی خصلت وجرأت کو نظر میں رکھے تو اسے یہ حرکت نہایت معمولی دکھائی دے گی۔ دولتِ مشترکہ کے کھیلوں کی انتظامیہ کمیٹی کے سابقہ صدر سریش کلماڑی پرانے کانگریسی ہیں۔کانگریس پارٹی میں ان کی پذیرائی محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ شرد پوار کے ازلی دشمن ہیں اور اسی لئے انہیں کھانے کمانے کا موقع دینے کیلئے اس کمیٹی کی صدارت سے نوازہ گیا۔ انہوں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوتے ہوئے تمام اصول وضابطے کو بالائے طاق رکھ کر ایک سوئس کمپنی کو ٹھیکہ دے دیا جس سے سرکاری خزانے کا ۹۵ کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔ایسا کرنے کیلئے انہوں نے اپنے افسران تک کو کنارے لگا دیا۔ ان کے ایک دستِ راست سرجیت نے دعویٰ کیا تھا کہ وزارتِ کھیل نے سوئس ٹائمنگ کمپنی کو ایک ٹنڈر کی بنیاد پر ٹھیکہ دینے کی توثیق کی تھی جو سراسر غلط پایا گیا۔ ۲۵ مئی کے ملک بھر کے اخبارارت میں کلماڑی کے خلاف داخل ہونے والی چارج شیٹ سب سے بڑی خبر تھی۔ دوسری بڑی خبر ۲ جی گھپلے میں سی بی آئی کی جانب سے داخل کی جانے والی سابق وزیر مواصلات واطلاعات کے خلاف پیش ہونے والی چارج شیٹ کا ذکر تھا۔ سی بی آئی نے اس معاملے میں ۳۰۰۰۰ ہزار کروڑ کے گھپلے کا الزام لگایا تھا اور خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اس میں سے کچھ بھی سرکار کو

واپس نہیں ملے گا۔ان معاملات پر پردہ ڈالنے کیلئے دہلی ہائی کورٹ میں ایک ایسا دھماکہ کر دینا جس میں کوئی جانی و مالی نقصان نہ ہو کوئی مہنگا سودہ ہر گز نہیں تھا۔

اے راجہ کا قصور تو بس اتنا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو عوام کی دولت لوٹ کر اسم بالسمہ بنانے کی کوشش کی تھی اس کی جانب سب سے پہلے انگشت نمائی سی اے جی کی رپورٹ میں کی گئی اور الزام لگایا گیا ۱.۷۶ لاکھ کروڑ کی خرد برد ہوئی ہے۔ سی بی آئی نے اسے ہلکا بھی کیا تو بات ۳۰ ہزار کروڑ سے کم نہ ہو سکی۔اس میں دو سو کروڑ توڈی ایم کے پارٹی کے ٹی وی چینل کو دیئے گئے اور اس الزام میں کرونا ندھی کی بہو کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔اس کے علاوہ راجہ کے پاس بیرونی زر مبادلہ کی جو غیر قانونی رقم پائی گئی وہ ہزار کروڑ ہے۔ راجہ نے اپنی دولت کو اس ہوشیاری سے مختلف افراد اور نجی ٹرسٹوں میں پھیلا دیا ہے کہ سی بی آئی کیلئے جانتے بوجھتے ہوئے بھی اسے ثابت کرنے میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔راجہ کے اس کالے دھندے میں اس کا مکھوٹا صادق باشا ہوا کرتا تھا۔جب سی بی آئی نے اس کے اطراف شکنجہ تنگ کیا اور وہ تعاون کیلئے تیار ہو گیا تو اسے قتل کروا دیا گیا۔جو لوگ اپنے ہی خواہوں کو بلی کا بکرہ بنانے میں پس و پیش نہیں کرتے ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اجنبی معصوموں کا خونِ ناحق بہانے سے گریز کریں گے خام خیالی نہیں تو اور کیا ہے

؟ مواصلات کے شعبے میں ہونے والی اس زبردست بدعنوانی کا حزبِ اختلاف بی جے پی کوئی فائدہ نہیں اٹھا پا رہی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ کانگریس نے بڑی عیاری کے ساتھ سی بی آئی کی تفتیش کا دائرہ کار وسیع کردیا ہے اور اس میں این ڈی اے کے وزراء پرمود مہاجن ،رام ولاس پاسوان اور ارون شوری کو بھی شامل کرلیا ہے۔ان لوگوں نے سابقہ وزیرِ خزانہ جسونت سنگھ سے بھی پوچھ تاچھ شروع کرکے بی جے پی کی نیند اڑا دی ہے اس لئے یہ بیچارے انا ہزارے کی حمایت قناعت کرکے بیٹھے رہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے دھماکے کے بعد اڈوانی نے دہشت گردی کے بجائے بدعنوانی کے خلاف رتھ یاترا کا اعلان کردیا۔ اس سے پہلے جو نوجوان قیادت اڈوانی کی رتھ میں پیش پیش ہوتی تھی اب وہ سرد مہری دکھلا رہی ہے اس لئے کہ انہیں اس کے پہئیے تلے اپنے خواب کچلتے ہوئے دکھلائی دیتے ہیں۔

اس ماہ کے حالات مئی سے زیادہ سنگین تھے امر سنگھ کے علاوہ دو مرکزی وزراء دیشمکھ اور شندے پر آدرش گھوٹالے کے الزامات نیز ائیر انڈیا اور ریلائینس پر سی اے جی کی رپورٹ یہ ایک بڑے دھماکے کا تقاضہ کرتی تھی۔ سرکار جانتی تھی کہ امر سنگھ منگل کو گرفتار ہوں گے ان کی درخواستِ ضمانت بدھ کو نامنظور ہوگی اور جمعرات کو سی اے جی کی رپورٹ پارلیمان میں پیش ہوگی۔ حکومت کو یہ بھی پتہ تھا کہ اس رپورٹ میں کس قدر دھماکہ خیز انکشافات ہوں گے اس لئے بدھ کا دن دہلی ہائی کورٹ کے دھماکے کیلئے مختص کیا گیا اور سب

کچھ منصوبے کے مطابق ہوا۔ پرفل پٹیل نے تو خیر ٹی وی پر اپنی صفائی پیش کر دی لیکن ریلائنس کے دفتر تو ذرائع ابلاغ والے رپورٹ یا انٹرویو لانے کے بجائے صرف تحفے تحائف لے کر لوٹ آئے اور انہیں عوام کی نظروں سے چھپا دیا۔ پرفل پٹیل نے بجائے جہاز خریدنے کا جواز پیش کرنے کہ سی اے جی رپورٹ میں تضادات نکالنے شروع ااا کر دیئے۔ ایئر انڈیا نے ایک ایسے وقت میں جبکہ اس کا جہاز ڈوب رہا ہے ۴۰،۰۰۰ کروڑ کا سودہ بغیر بازار کی جانچ پڑتال کے کر دیا۔ ایسا کرنے کیلئے پہلے انڈین ایرلائنز کو اس میں ضم کیا گیا اس فیصلے پر بھی سی اے جی نے اعتراض کیا اور پھر بڑی جلد بازی میں ایک ایسی ضرورت پیش کی گئی جو نامعقول ہے فی الحال اس دم توڑتی کمپنی کے پاس اپنے ملازمین کو تنخواہ دینے کیلئے مالی وسائل نہیں ہیں اس لئے کہ یہ ۳۸۰۰۰ ہزار کروڑ خسارے میں ہے۔ اگر یہ احمقانہ سودہ نہیں کیا گیا ہوتا تو ایئر انڈیا خسارے کے بجائے منافع میں ہوتی۔ یہ کمپنی ایک جانب جہاز خرید رہی ہے اور دوسری طرف غیر ملکی ہوائی کمپنیوں کو ہندوستانی ہوائی اڈوں تک رسائی دی جارہی ہے اس خود کش حکمتِ عملی پر بھی سی اے جی نے اعتراض کیا ہے۔

کرشنا گوداوری کے ڈیلٹا میں ریلائنس کی جانب سے تیل کے ذخائر کا انکشاف اپنے آپ میں ایک حیرت انگیز خبر تھی اس لئے کہ یہ نوزائیدہ نجی کمپنی مغربی ہندوستان میں کام کرتی تھی اور سرکاری ادارہ او این جی سی برسوں سے

معدنی تیل کی تحقیق و تفتیش میں لگا ہوا تھا اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا او این جی سی کو اس کا پتہ چلتا خیر لکشمی دیوی کی کرپا سے وہ چمتکار ہو گیا۔ اس کے بعد ریلائنس نے حکومت سے معاہدہ کرکے وہ علاقہ اپنے قبضے میں کیا لیکن ٹھیکے میں اراضی کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی نہیں کی۔ اس لئے ایک کے بعد ایک دس اضافی ٹھیکے دیئے گئے اور یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ سی اے جی کے مطابق ڈائرکٹر جنرل ہائیڈروکاربن کو چاہئے تھا کہ وہ ریلائنس کو دوسرے مرحلے سے روک دیتے اس لئے اب ٹھیکے کے دس مرحلوں پر نظرثانی ہونی چاہئے اور ایسا کرنے کیلئے ڈائرکٹر صاحب اہل نہیں ہیں ۔ ریلائنس نے ۲۵ فی صد تیل سے مالامال علاقہ حکومت کو واپس کرنے کی شرط سے بھی روگردانی کی ہے۔ ریلائنس کی دھاندلی کی فہرست کافی طویل ہے ایک طرف اس نے پیداوار کی تقسیم میں چوری کی اور دوسری جانب جن کنوؤں سے تیل نکالا جاچکا انہیں قائدے سے بند کرنے کی ماحولیاتی ذمہ داری بھی ادا نہیں کی۔ چند سال قبل ہندوستان جیسے غریب ملک کے سرمایہ دار مکیش امبانی کو جب دنیا کے سب سے امیر آدمی ہونے اعزاز حاصل ہوا تو سب لوگ حیرت زدہ تھے لیکن اگر حکومتِ وقت اپنا قومی سرمایہ نجی لوگوں کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچنے لگے تو یہی ہوگا کہ عوام غریب سے غریب تر اور سرمایہ دار امیر سے امیر تر ہوتے چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ کے زیر سایہ ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے۔ منموہن جی نے جس وقت اقتدار سنبھالا تھا اس وقت لوگ انہیں نہایت صاف ستھرے کردار کا حامل سیاستداں

سمجھتے تھے لیکن اب حال یہ ہے کہ ان کی حکومت کو ہندوستانی تاریخ کی سب سے زیادہ بدعنوان حکومت ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے یہ اور بات ہے کانگریسی حضرات تو کجا بدعنوانی کے خلاف لڑنے والے دورِ حاضر کے عظیم سورما انا ہزارے بھی ان کی تعریف توصیف میں رطب اللسان ہیں گویا ایک طرف ملک دھماکوں کی زد میں اور دوسری جانب انشا جی کے نام کو منموہن سے بدل کر ان کے شعر کو یوں پڑھا جارہا ہے

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم منموہن کا نام نہ لو، کیا منموہن سودائی ہیں

بھرت پور کی مہابھارت - پانچوی قسط

جگو نے جیسے ہی گرم گرم چائے کی چسکی لی اسے اپنے پرانے سوالات یاد آگئے جنھیں وہ منگو سے پوچھنا چاہتا تھا۔ جگو نے کہا منگو بھیا اگر آپ برا نہ مانیں منگو بھیا تو مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے

نسنکوچ (بلاتکلف) پوچھو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے ؟

دراصل آپ نے ٹیلی پیتھی کا گیان سیکھا ہے کیا؟

ہومیوپیتھی اور ایلوپیتھی تو سنا ہے یہ لیکن ٹیلی پیتھی کیا ہوتا ہے ؟ کہیں بیمار ٹیلی ویژن کو صحت یاب کرنے کا کوئی نسخہ تو نہیں ہے؟

نہیں بھائی اس سے لوگ مخاطب کا ذہن پڑھ لیتے ہیں

ارے نہیں یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔ایسا کوئی گیان میں نہیں جانتا۔ منگو نے کہا

اچھا اگر ایسا ہے تو تمہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں ریلوے پلیٹ فارم پر پریشان تھا؟

اوہو میں سمجھ گیا۔ دیکھو بات دراصل یہ ہے کہ پلیٹ فارم پر ویسے تو ہر کوئی پریشان ہی ہوتا ہے۔

کیوں اسکی وجہ؟

وجہ صاف ہے ؟ پلیٹ فارم ہر انسان سفر میں ہوتا ہے اسے اپنی منزل پر بحفاظت جلد از جلد پہنچ جانے کی فکر لاحق ہوتی ہے اس لئے وہ پریشان ہوتا ہے۔

لیکن بھیاّ یہ جیون بھی تو ایک یاترا کے سمان ہے یہاں تو ہر کوئی چنتت (پریشان) نہیں ہوتا بلکہ بہت سارے لوگ نشچنت جیون ویتیت (اطمینان کی زندگی گزارتے) کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بھائی جگو تم نے بہت ہی گمبھیر پرشن کرلیا۔ دیکھو اس دنیا میں تین پرکار (قسم) کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک تو وہ لوگ جو اس جیون کو پرواس (سفر) نہیں بلکہ منزل سمجھ لیتے ہیں وہ دو انتہاؤں پر زندگی گزارتے ہیں ۔جب انہیں کچھ مل جاتا ہے تو وہ غفلت کا شکار ہو کر بے فکر ہو جاتے ہیں اور جب کچھ چھن جاتا ہے تو مایوسی کی اتھاہ سمندر میں غوطہ لگانے لگتے ہیں۔

جی ہاں ایسے بہت سارے لوگ میں نے بھی دیکھے ہیں شاید اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے؟

تم نے صحیح کہا اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اس جیون کو پرواس تو سمجھتے ہیں لیکن انہیں نہ ہی ایشور پر پورن وشواس (ایمانِ کامل) ہوتا ہے اور نہ اس کے مارگ کا گیان ہوتا ہے ایسے لوگ بہت زیادہ سنکوچ اور چنتا کا شکار ہوتے ہیں

یہ تو لازمی ہے ایسے لوگوں کی کوئی اور دشا (حالت) ہو ہی نہیں سکتی لیکن پھر تیسری قسم کون سی ہے ؟ جگو نے پوچھا

تیسرے پرکار کے لوگ دوسرے کے وپریت (ضد) ہوتے ہیں ان کو نہ صرف ایش گیا ن پراپت ہوتا ہے بلکہ ان کا ایشور پر پورن وشواس بھی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مطمئن تو ہوتے ہیں اور چونکہ وہ جیون کے اس سفر میں ہر سمے ایشور کو اپنے آس پاس محسوس کرتے ہیں اس لئے کبھی بھی خوف ومایوسی ان کے قریب نہیں پھٹکتی۔

بھئی آپ تو بڑے گیانی نکلے میں تو آپ کو حلوائی سمجھ بیٹھا تھا جگو نے مسکرا کر کہا

تم ٹھیک سمجھے تھے جگو میں پیشے سے حلوائی ہی ہوں لیکن یہ سب بابا جی کا کی سنگت کا وردان ہے منگو نے ونمرتا (انکساری) سے کہا

اچھا ہاں اب یہ بھی بتا دو کہ جو پوڑیاں تم نے مجھے کھلائیں وہ تم کس کے لئے بنا کر لائے تھے

تمہارے لئے اور کس کیلیۓ ؟منگو قہقہہ لگا کر بولا

میرے لئے ؟ تمہیں کیسے پتہ تھا کہ میں وہاں آنے والا ہوں اور تم سے میرا پریچے تعارف) بھی تو نہیں تھا)

اس سے کیا فرق پڑتا ہے ویسے بھی میں نے اسے اپنے کسی پریچت کیلیۓ بنایا کب تھا

تب پھر کس کیلیۓ بنایا تھا ؟یہی تو میرا پرشن ہے

بھئی دیکھو ہم حلوائی لوگ کھانے کا نام تو جانتے ہیں لیکن کھانے والے کا

نام نہیں جانتے اور ہمیں اسکی ضرورت بھی نہیں ہوتی

اچھاآپ نہیں جانتے تو کون جانتا ہے ؟

وہی جانتا ہے جو ہر دانے پر اس کے کھانے والے کا نام لکھ دیتا ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتانہ بنانے والا اور نہ کھلانے والا

منگو بھائی اپ نے میری بات کو گھما دیا اور یہ نہیں بتلایا کہ وہ پوڑی سبزی کس کیلئے تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگراس روز دہرہ دون ایکسپریس وقت پر آجاتی تو میں نکل چکا ہوتا۔ خیر اچھا ہی ہوا ورنہ اس ست سنگت سے محروم رہ جاتا۔

منگو بولا اس سے تو یہی سدھ (ثابت) ہوا کہ بھائی جیسے دانے دانے پر لکھا ہوتا ہے اس کے بنانے اور کھانے والے کا نام اسی طرح ہر شبد (لفظ) پر اسکے بولنے اور سننے والے کا نام بھی لکھا ہوتا ہے۔

وہ کیسے ؟

بابا جی کے سب زیادہ بھکت شمالی ہند میں پائے جاتے ہیں ہم لوگ وہاں سے آنے والے یاتریوں کا سواگت کرنے کیلئے اسٹیشن پہنچے تھے تو معلوم ہوا کہ سرکار نے اس اندولن کو ناکام کرنے کیلئے اس سمت سے آنے والی ساری گاڑیوں کو قصداً لیٹ کر دیا۔ پہلے تو ہمیں بہت غصہ آیا سوچا پردرشن (احتجاج) کیا جائے لیکن پھر ہمارے ایک متر نے سمجھاؤ دیا یہ بدمعاش سرکار ہے اس کے غنڈے ہمارے پردرشن میں شامل ہو کر لوٹ مار مچا دیں گے اور ذرائع ابلاغ ہمیں بدنام کرنے کی مہم میں جٹ جائے گا

یہ تو بڑی عقلمندی کا نرنیہ (فیصلہ) تھا

جی ہاں لیکن اس کے بعد جب میں نے یہ پوچھا کہ اب اس کھان پان کا کیا کیا جائے اسے سرکار کے منہ پر پھینک دیا جائے ؟تو ایک اور متر (دوست) بولا نہیں ہم ان موانع کو مواقع میں بدل دیں گے

سب نے ایک زبان ہو کر پوچھا وہ کیسے ؟

جواب ملا سرکار لاکھ رکاوٹ ڈالے جو لوگ اس عظیم کام کیلئے اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے ہیں وہ تو یہاں کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچیں گے ۔ کوئی بس سے تو کوئی پیدل لیکن ان گاڑیوں کے نہ آنے کی وجہ سے جو لوگ اسٹیشن پر پھنس گئے ہیں اور آگے نہیں جا پارہے ہیں کیوں نہ یہ پکوان انہیں کھلا دیا جائے اور یہاں آنے کی دعوت دی جائے۔

بس پھر کیا تھا ہم سب اس کام میں جٹ گئے اور اسی کوشش میں تم میرے ہتھے چڑھ گئے

جگو بولا بھئی واہ تمہارے سہیوگی تو بڑے سمجھدار لوگ ہیں لیکن تم بھی تو انتریامی ہو

نہیں بھائی میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے

اگر ایسا نہیں ہے تو یہ بتاؤ تمہیں کیوں کر پتہ چل گیا کہ میرا پیشہ مٹی کے برتن بنانا ہے ؟

منگو مسکرایا اور بولا وہ تو میرا اندازہ تھا جو خوش قسمتی سے درست نکل گیا

لیکن تم نے اندازہ لگایا کیسے ؟اسکی بھی تو کوئی وجہ ہوگی ؟
دراصل جب میں نے جب تمہیں پوڑی سبزی پیش کی تو دیکھا تمہارا دھیان کھان پان کے بجائے کلہڑ کی طرف ہے میں سمجھ گیا ہو نہ ہو تم کمہار ہو
اور اگر میں کمہار نہ ہوتا تو؟
تو کیا لوہار ہوتے یا کچھ اور۔ میں تم سے معذرت طلب کر لیتا۔ میرا مقصد تمہیں متاثر کرنا تو تھا نہیں تم سے گپ شپ کرنا تھا اور وہ حاصل ہو گیا۔
جی نہیں تمہارا مقصد مجھ سے بات چیت کرنا نہیں تھا بلکہ یہاں روانہ کرنا تھا اور تم اس میں کامیاب ہو گئے۔
منگو بولا بھائی ہمارا کام تو کوشش کرنا ہے کامیابی یا ناکامی ایشور کے ہاتھ میں ہے اس لئے ہم اپنے کام کی فکر کرتے ہیں باقی اس پر چھوڑ دیتے ہیں جو جس کا کام ہوتا ہے۔وہ دیکھو بابا جی کی آمد آمد ہے چلو اب ان کا پروچن سنتے ہیں
(باقی آئندہ انشا اللہ)

اسرائیل : شیشہ ہو کے موتی جام کہ در جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا - دوسری قسط

شیش محل میں رہنے والے دوسروں پر پتھر نہیں اٹھایا کرتے۔یہ اس دور کی بات ہے جب محلوں میں رہنے والوں کے اندر شیشے کی نزاکت کا شعور پایا جاتا تھا لیکن دورِ حاضر میں یہ احساس ختم ہو گیا لوگوں نے شیشے کی چادر کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار سمجھ لیا ہے ۔وہ اپنے محلوں سے توپ و تفنگ سے لیس ہو کر اکڑتے ہوئے نکلتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ بقول فیض شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

شیشہ ہو کے موتی جام کہ در جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

صہیونی فتنہ اور صلیبی طاغوت کے ظلم و ستم کی طغیانی نے جب عالمِ انسانیت کو بری طرح لہو لہان کر دیا تواسکے جواب میں معتوبوں نے اینٹ کے جواب میں پتھر اٹھانے کا فیصلہ کیا اور پھر کیا تھادیکھتے دیکھتے شیش محل میں دراڑیں پڑنے لگیں ۔پہلے اس ردعمل سے قدموں تلے ارتعاش پیدا ہوااور اب اس کی کرچیں شہ رگ کو کھرچنے لگی ہیں کبرو غرور کاآسمان میں اٹھا ہوا سر زمین کی جانب جھکنے لگا۔اس کا سب سے بڑا ثبوت گزشتہ ہفتہ ہونے والا کابل کے امریکی سفارتخانے اور ناٹو کے صدر دفتر پر طالبان کا حملہ ہے اور اسی کے ساتھ ترکی

کے وزیر اعظم طیب اردغان کا یہ اعلان کہ اب آئندہ غزہ کی جانب جانے والی امدادی کشتی کے ساتھ فوجی رسد بھی موجود ہوگی تاکہ اسرائیلی فوج کو منہ توڑ جواب دے سکے ۔یہ تو خیر بیرونی مسائل کی سونامی ہے جن سے اسرائیل جوجھ رہا ہے لیکن اس شیش محل کے اندر ہونے والی عوامی اتھل پتھل نے مسائل کی سنگینی میں بے انتہا اضافہ کر دیا ہے اور اس کے حکمرانوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ مسلم دنیا میں برپا ہونے والے انقلابات نے اسرائیل کے یہودیوں کو خوابِ خرگوش سے بیدار کر دیا ہے اور وہ بھی اپنی حکومت اور نظام کے خلاف سڑکوں پر اتر آئے ہیں یہ صدائے احتجاج اس مسلم بیداری کی مرہونِ منتّ ہے جس کا نقشہ انتظار نعیم کچھ اس طرح کھینچتے ہیں

ملکوں ملکوں شہروں شہروں ایک نئی بیداری ہے

جاء الحق وزھق الباطل سب کی زباں پر جاری ہے

تل ابیب سمیت مختلف شہروں میں ہونے والے ان مظاہروں میں لوگوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔جولائی کے اواخر میں یہ تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی تین ماہ کے اندر اس میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے۔تل ابیب کا ہیبما چوک اب تحریر چوک کے نام سے مشہور ہوتا جا رہا ہے۔ مظاہرین نعرے لگا رہے ہیں ''استعفیٰ دو مصر یہاں ہے'' ۔واجبی قیمت پر گھروں کی خاطر شروع ہونے والی تحریک اب ٹیکس کے نظام میں اصلاح اور فلاحی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہی ہے۔ مظاہرے

میں شامل طلبا رہنما شمولی کا کہنا ہے کہ ہم اپنے ملک کی خاطر جان لڑا سکتے ہیں لیکن وزیراعظم ہم آپ سے توقع کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اس ملک میں زندہ رہنے دیں گے ۔اس اعلان میں نوجوان نسل کی جانب سے یہ دھمکی پوشیدہ ہے کہ اگر حالات نہیں بدلے تو ہم ترکِ وطن کرکے باہر نکل جائیں گے ۔ جن لوگوں کیلئے فلسطینیوں کو بے وطن کیا گیا تھا اب وہی اپنی نام نہاد مملکتِ خداداد سے فرار کا منصوبہ بنا رہے ہیں ۔ سٹاف شافر جو اس تحریک کے بانیوں میں سے ایک ہے کہتا ہے کہ ''ہمارا مطالبہ وزیراعظم کی نہیں بلکہ نظام کی تبدیلی کا ہے ۔''

جس نظام کی تبدیلی کیلئے اسرائیلی عوام سڑکوں پر اترے ہیں وہ حسنی مبارک یا معمر قذافی کی مانند کوئی فوجی آمریت نہیں بلکہ مغربی جمہوریت ہے ۔ اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کی واحد جمہوریت ہونے کا شرف حاصل ہے ۔اسرائیل کو حاصل ہونے والی مغربی شفقت کی ایک وجہ یہی قدرِ مشترک ہے اور ہندوستان سے انسیت بھی اسی سبب سے ہے ۔ گوکہ اسرائیل مغرب کا حلیف ہے اس کے باوجود وہاں کے صہیونی نظام حکومت اور ہندوستانی برہمنی طرز سلطنت میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے۔اسرائیل میں برطانیہ کی طرح نہ تو کوئی ملکہ براجمان ہے اور نہ ہی امریکہ کی مانند صدارتی نظام رائج ہے بلکہ ہندوستان جیسی خالص پارلیمانی جمہوریت کا دور دورہ ہے بلکہ ہندوستان پر بھی اس معنیٰ میں

اسے فوقیت حاصل ہے کہ وہاں کسی نہرو خاندان کی اقتدار پر اجارہ داری نہیں پائی جاتی ۔اس سونے پر سہاگہ کا کام مسلم دشمنی ہے۔

اسرائیل میں انتخابات کا سلسلہ کبھی بھی نہیں رکا۔ ہندوستان ہی کی طرح اسرائیل میں بھی بے شمار سیاسی جماعتیں ہیں جو انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں ۔ ان میں لکڈ پارٹی کانگریس کی طرح ہے ۔ اس سے الگ ہو کر بننے والی قدیمہ کی حالت جنتا دل کی مانند ہے ۔لائیبر من کی مادرِ وطن پارٹی کے عزائم اور لب ولہجے میں بھارتیہ جنتا پارٹی سے شباہت صاف نظر آتی ہے اور لیبر پارٹی کا حال نظری و عملی سطح پر کمیونسٹوں جیسا ہے ۔یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ فی الحال ہندوستان ہی کی طرح وہاں بھی ہر جماعت واضح اکثریت سے محروم ہے اس لئے مخلوط حکومت کی مجبوریاں ہر دو مقام پر لاحق ہیں اور حکومت سازی سے قبل ہونے والی ابن الوقتی اور سودے بازیاں بالکل ایکدوسرے کی ہمزاد ہیں بلکہ اسرائیل کے اڈوانی لائیبر من کو اپنے سارے اختلافات بھلا کر لکڈ سے ہاتھ ملا لینے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی بشرطیکہ اسے وزارتِ خارجہ کا قلمدان تھما دیا جائے ۔ لیبر پارٹی جو انتخاب سے قبل حزبِ اختلاف قدیمہ کی حکومت میں شامل تھی اب بڑی بے حیائی کے ساتھ پالہ بدل کر جمہوریت کی بقاء کی خاطر لکڈ کے ساتھ آکر وزارتِ دفاع پر قبضہ جما لیتی ہے۔بدعنوانی کے الزامات میں سابق وزیر اعظم یہود اولمرٹ کو ملوث پایا جاتا ہے اور صدر مملکت اپنی سکریٹری

کے ساتھ دست درازی کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔انتخابی کرتب بازی بھی ملتی جلتی ہی ہے۔ یہاں کانگریس اپنے رائے دہندگان کو خوش کرنے کیلئے میرٹھ اور ملیانہ جیسے فرقہ وارانہ فسادات کرواتی ہے تو وہاں صابرہ اور شتیلہ کے مہاجرین کیمپوں کو بمباری کرکے لالہ زار کیا جاتا ہے۔بی جے پی کارگل کی جنگ اور گجرات کی نسل کشی کے نام پر ووٹ مانگتی ہے تو قدیمہ غزہ پر حملہ بول کر اپنی مقبولیت میں اضافہ کی کوشش کرتی ہے ۔دونوں ہی ممالک پر جمہوری دیو استبداد کا یکساں رنگ روپ ہے ۔

اسرائیل میں جمہوریت نوازوں نے فلسطینیوں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا ہے جس کا شکار کشمیر کے مسلمان ہیں ۔اور تو اور پنجاب کے سکھوں اور میزورم کے عیسائیوں کو بھی سرکاری جبر و ظلم کا اسی طرح نشانہ بنایا گیا جیسا کہ غزہ اور مغربی کنارے کے فلسطینیوں کو بنایا جاتا ہے۔خارجہ پالیسی کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جس طرح اسرائیل اپنے پڑوسی مصر اور شام سے برسرِ جنگ رہا ہے ویسی ہی جنگیں ہندوستان اور اس کے پڑوسی چین و پاکستان کے درمیان بھی ہو چکی ہیں ۔جس طرح اسرائیل نے لبنان میں عیسائی اقلیت کو مسلح کرکے وہاں خانہ جنگی پھیلائی ایسی ہی سازش ہندوستان نے مشرقی پاکستان کی مکتی باہنی اور سری لنکا کی تمل ٹائیگرس کی مدد سے کی ۔ جس طرح اسرائیل سے اس کے ہم سایہ ممالک نالاں ہے بالکل وہی صورتحال بھارت کی بھی ہے کہ بشمول

نیپال سارے ہی پڑوسی اس سے شاکی اور خوفزدہ ہیں۔ نئی عالمی سیاسی صورتحال نے ہند اور اسرائیل کے درمیان ایک اور خطرناک مماثلت پیدا کر دی ہے۔ جس طرح مسلم دنیا کے خلاف اسرائیل امریکہ کا آلۂ کار بنا ہوا ہے اسی طرح کا کردار ہندوستان کی حکومت امریکہ کیلئے چین کے خلاف ادا کرنے جارہی ہے۔ اسرائیل نے جس طرح حسنی مبارک سے تعلقات استوار کر رکھے تھے اسی طرح ہندوستان نے افغانستان کی بدعنوان اور کٹھ پتلی حکومت سے سانٹھ گانٹھ کر لی ہے۔ تبت کے دلائی لامہ جس طرح دلی کے منظورِ نظر ہیں اسی طرح محمود عباس کی تل ابیب میں پذیرائی کی جاتی رہی ہے۔

تہذیب و تمدن کی سطح پر ہندو برہمنیت اور یہودی صہیونیت کے درمیان مطابقت حیرت انگیز ہے۔ دونوں کا بنیاد نسلی تفاوت و امتیاز پر اٹھائی گئی ہے۔ دونوں کو اپنی قدامت کا زعم ہے۔ دونوں اپنے آپ کو مظلومیت کا شکار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ہندو دانشوروں کو بابر اور جناح سے وہی شناعت ہے جو یہودیوں کو ہٹلر سے ہے لیکن جمہوری نظام اس فتنہ پر اثر انداز ہونے کے بجائے اس سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو گیا ہے اور یہ گٹھ جوڑ ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہندوستان نے جس زمانے میں انگریزوں سے آزادی حاصل کی اسی دور میں اسرائیلی ریاست نے انگریزی سامراج کے بطن سے جنم لیا گویا دونوں مقامات پر اس فاسد نظام کی داغ بیل ایک ہی وقت میں پڑی۔ آمریت

کے آسیب کو اس کی جڑیں کھو کھلا کرنے کا موقع ان دونوں ممالک میں نصیب نہیں ہوا
اس لئے وقت کے ساتھ اس کی جڑیں زمین میں گہری اور شاخیں آسمان میں پھیلتی چلی
گئیں اور اب جبکہ اس کے پھلنے پھولنے کا وقت آیا ہے تو یہ یکساں پھل دے رہا ہے
۔نظام کوئی بھی ہو جب اس کا بیج زمین میں پڑتا ہے تو لوگوں کو اس سے کچھ امیدیں
وابستہ ہو جاتی ہیں ۔جب نازک سی کونپل بیج کے سخت خول سے باہر سر ابھارتی ہے
تو معصوم بچے کی مانند خوشنما لگتی ہے ۔جب وہ اپنے تنے پر کھڑی ہوتی ہے لوگوں کا دل
لبھاتی ہے ۔جب اس اکی شاخیں سایہ دار ہو جاتی ہیں تو عوام کو راحت محسوس ہوتی ہے
لیکن پھر جب اس درخت کو پھل لگتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ شجر طیب ہے یا خبیث ہے ۔
جمہوریت کا شجر خبیثہ فی الحال یوروپ ،امریکہ، ہندوستان اور اسرائیل سبھی کو یکساں
پھلوں سے نواز رہا ہے ، یوروپ کے ممالک یکے بعد دیگرے کنگال ہوتے جارہے ہیں
ایسے میں اٹلی کاقلاش صدر اپنا دامن پھیلانے کیلئے امریکہ کے بجائے چین کا رخ کرتا ہے
۔امریکہ میں غربت کی شرح گزشتہ پانچ دہائیوں میں سب سے زیادہ ہو گئی ہے ۔ ۱۵ فی
صد عوام غریبی کی سطح سے نیچے پہنچ گئے ہیں جن میں نوجوان ۲۲ فیصد ہیں ۔دنیا کی
ابھرتی ہوئی معیشت ہندوستان میں پٹرول کی قیمت میں اضافے کیخلاف ملک
گیر مظاہرے ہورہے ہیں اس لئے کہ پچھلے دس ماہ میں یہ دسواں اضافہ ہے ۔ مہنگائی کے
معاملے میں اسرائیل بھی ہندوستان کے شانہ

بشانہ کھڑا ہے ۔آٹے کا بھاؤ ۱۹ فی صد بڑھا ہے کھانے کے تیل میں ۲۳ فی صد اضافہ ہوا ہے شکر کی قیمتیں ۴۰ فیصد تو اچھے قسم کے گیہوں کی قیمت میں ۱۰۶ فیصد کی بڑھوتری دیکھنے کو آئی ہے ۔مظلوم فلسطینیوں کو بے گھر کرکے اپنی عوام کو رہائش فراہم کرنے کا دعویٰ کرنے والی صہیونی حکومت کا حال یہ ہے کہ ۹۳ فیصد زمین پر قابض ہونے کے باوجود وہ اس محاذ پر بری طرح ناکام ہے ۔ گزشتہ چند سالوں کے اندر گھروں کا کرایہ ۳۵ سے ۴۰ فی صد بڑھا ہے ۔دو یا تین آرامگاہ والے معمولی گھر کی قیمت ۶ لاکھ سے ۱۰ لاکھ امریکی ڈالر کے برابر ہے ۔ابتدا میں اسی پریشانی نے عوام کو راستوں پر خیمے لگا کر مظاہرہ کرنے پر مجبور کر دیا ۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل میں معاشی ترقی کی شرح دیگر صنعتی ممالک سے بہتر ہے لیکن اس ترقی کا فائدہ ہندوستان کی مانند ٹاٹا اور امبانی جیسے سرمایہ داروں کو تو ہو رہا ہے لیکن عام آدمی اس سے محروم ہے اور نتیجہ یہ ہے غربت کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے ۔اسرائیل میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ فی صد لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں ۔یہ بات قابلِ غور ہے کہ امریکہ میں ۲۲۰۰ ڈالر ماہانہ کمانے والا غریب کہلاتا ہے جبکہ اسرائیل میں ۹۰۰ ڈالر ماہانہ سے زیادہ کمانے والے خاندان کو غریب شمار نہیں کیا جاتا ۔ ۲۰۰۸ کے مقابلے اس شرح میں ۳ء۱ فی صد کا اضافہ ہوا ہے ۔اسرائیل میں ہر

تین میں سے ایک بچہ غریب ہے اور جن ملازمین کو کم از کم تنخواہ پر گزارہ کرنا پڑتا ہے ان میں خواتین کی تعداد ۷۰ فی صد ہے۔ ہٹلر کے مظالم کا شکار ہونے والے جو لوگ اسرائیل میں خوشحالی کے خواب سجا کر آئے تھے ان میں سے ۴۰ فیصد غربت کا شکار ہیں۔ ڈاکٹروں نے اپنی تنخواہ میں اضافے کی خاطر ہڑتال کر رکھی ہے۔

اسرائیل کی حکومت بجٹ کا بڑا حصہ قومی تحفظ پر خرچ کر دیتی ہے اس لئے سماجی فلاح و بہبود کے وسائل سکڑ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مظاہرین گھروں کی قیمتوں سے آگے بڑھکر پورے معاشی نظام اور معاشرے میں مکمل تبدیلی پر زور دے رہے ہیں۔ وہ ٹیکس کا نیا نظام چاہتے ہیں بجلی کی نرخ میں اضافے کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، مفت تعلیم و بچوں کی فلاح و بہبود پر زور دیتے ہیں سرکاری کمپنیوں کی نجکاری کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ اگر مصر اسرائیل کو سستے داموں ایندھن کی سپلائی بند کر دیتا ہے جس کا اشارہ مصری وزیر اعظم نے حال میں بلا واسطہ یہ کہہ کر دیا کہ کوئی معاہدہ مقدس نہیں ہے سبھی پر نظرِ ثانی ہو سکتی ہے تو اس کے نتیجے میں اسرائیلی معیشت کی کمر ٹوٹ سکتی ہے۔ اسرائیل کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً بیس سرمایہ دار خاندانوں نے سارے ملک کی معیشت کو اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ ان خاندانوں کی ملکیت میں ۲۵ سب سے بڑی کمپنیاں مثلاً بنک، سپر مارکیٹ، ٹیلی

فون، زمین جائداد، پٹرول پمپ اور دیگر ہیں اور ۵۰ فی صد اسٹاک مارکیٹ پر ان کا قبضہ ہے۔ سابق وزیر اعظم یہود اولمرٹ کے زمانے میں اعلیٰ ترین عہدے پر فائز افسر یورم ٹربووکز اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سرمایہ دار حکومت سے زیادہ طاقتور ہیں۔ مخلوط حکومت میں شامل مادِ وطن پارٹی ان سرمایہ داروں کی ایجنٹ ہے وہ حکومت کو عوام کی فلاح و بہبود کے کام کرنے روکتی ہے اور کبھی عربی کے خلاف تحریک چلانے لگتی ہے تو کبھی فلطینیوں کی حمایت کرنے والے یہودیوں کو غدارِ وطن ثابت کرکے ان کے خلاف قانون بنانے میں جٹ جاتی ہے۔ وزیر اعظم نتن یاہو کے ایک جانب اقتدار کی کرسی اور عوام کے مسائل ہیں اور دوسری جانب مادرِ وطن پارٹی اور سرمایہ دار ہیں ان دونوں کے درمیان جمہوری نظام کی چکی میں عوام پس رہے ہیں۔ یہ مسئلہ اسرائیل، امریکہ یا ہندوستان کا نہیں بلکہ ان ممالک میں رائج نظامِ سیاست کا ہے جو بذاتِ خود اپنے متبادل کا مطالبہ کرتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے ''اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اُس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے'' باطل نظام کی سب سے بڑی شناخت اس کی بے ثباتی ہوتی ہے جس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب بادِ مخالف سے اسکی جڑیں ہلنے لگتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ مغربی جمہوریت کے ساتھ شرق و غرب میں ہو رہا ہے۔ اس کا متبادل صرف اور صرف

اسلامی خلافت ہے جس کے بارے میں فرمایا "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ اِن سے سبق لیں"۔

اسرائیلی ریاست مغربی تحفظ کے بل بوتے مسلمانوں کی مخالفت کا مقابلہ کرتی رہی لیکن اب مغرب کے اپنے چل چلاؤ کا دور آن پہنچا ہے اور وہ خود اپنی بقاء کیلئے ہاتھ پیر مار رہا ہے ایسے میں بھلا کسی اور کی حفاظت اس کے بس کا روگ نہیں۔ نیز اسلامی تحریک جو کبھی ایک نازک سی کونپل تھی اب ایک تناور پھلدار درخت بن گئی ہے جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں اب باطل کیلئے ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس کا بال بیکا کر سکے۔ گردشِ زمانہ نے امریکہ اور اسرائیل کو جس طرح یکہ و تنہا کر دیا ہے اس پر غالب کا شعر (مع ترمیم) صادق آتا ہے

قیس انڈیا میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

انسان کے اندر چھپا ہوا بندر - قسط سوم

وردھا کے پولیس تھانے میں حوالدار عجیب سنگھ نے اپنی آنکھیں بند کیں تو ہم نے عافیت کی سانس لی اور اپنے چہیتے بندروں کی جانب دیکھا۔ نین سکھ بے تکان اپنا فیصلہ ٹائپ کر رہا تھا۔ہمیں لگا جلد ہی یہ قلم کے بجائے کمپیوٹر کو توڑ دے گا۔اب ہماری نگاہ نین سکھ کی جانب اٹھی تو دیکھا کہ وہ بھی انکھیوں میں فیصلے کو پڑھ رہا ہے اور تان سین کے لبوں پر حسبِ معمول مسکراہٹ رقص کر رہی ہے۔ ہم نے بھی مسکرا کر جواب دیا تو وہ بولا صاحب عجیب سنگھ کے دوبارہ سونے کو غنیمت جانیے اور یہاں سے بھاگ چلیے۔

کیوں کیا ہم کوئی چور ڈکیت ہیں جو تم ہمیں اس طرح سے ڈرا رہے ہو؟ نین سکھ بولا کیا تم نہیں جانتے کہ جب دو بڑے لوگ بات کر رہے ہوں تو درمیان میں ٹپک پڑنا بد اخلاقی میں شمار ہوتا ہے۔تان سین نے اپنی لن ترانی جاری رکھی

دیکھو تان سین میں نے ایک سیدھا سا سوال کیا تھا جس کا جواب دینے کے بجائے تم کچھ اور ہی بکواس کرنے لگے

یہ بکواس نہیں حقیقت ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ فی الحال ہم لوگ پولیس والوں کے نرغے میں ہیں۔ کسی بھی وقت کھڑک سنگھ وارد ہو سکتا ہے بلکہ دوبارہ

عجیب سنگھ بیدار بھی ہو سکتا ہے۔
ہوتا ہے تو ہو جائے اور آتا ہے تو آجائے ،ہمارے یہاں آنے مقصد ہی ان سے ملاقات کرنا ہے؟ہم نے جواب دیا

تان سین بولا صاحب ہمیں احتیاط و ہوشیاری سے کام لینا چاہئے

احتیاط کیسا احتیاط؟ہم لوگ پولیس تھانے میں ہیں یہاں کون سے خطرات ہو سکتے ہیں

اسی لئے تو احتیاط کی ضرورت ہے کہ ہم تھانے میں ہیں اس سے زیادہ خطرناک جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے ؟

کیا مطلب ہم نے حیرت سے پوچھا؟

تان سین بولا صاحب آپ صحافی ہیں اخبار لکھتے ضرور ہیں لیکن انہیں پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے ورنہ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔آپکو پتہ بھی ہے کہ یہ پولیس والے عوام کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟

انہیں نہیں پتہ تو میں بتلائے دیتا ہوں نین سکھ بولا حالانکہ نہ میں اخبار پڑھ سکتا اور نہ ہی ٹی وی دیکھ سکتا ہوں

اوہو تم تو بڑے انتریامی ہو گئے ؟تان سین نے فقرہ کسا

اس میں انتریامی ہونے کی کیا بات ہے اگر انسان اپنے کان کھلے رکھے تو یہی کافی سے زیادہ ہے۔ میں نے سنا ہے پچھلے دنوں پولیس والوں نے مدھیہ پردیش کے ضلع ستنا میں بیچ سڑک پر ایک نیم پاگل آدمی کو لاٹھیوں سے مار مار کر

ہلاک کر دیا

اچھا تو گویا پولیس والوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ شخص اگر نیم پاگل ہے تو وہ مکمل طور پر پاگل ہیں تان سین نے پھر چٹکی لی

نین سکھ بولا تم عجیب آدمی ہو ایک معصوم انسان کی جان گئی اور تم اس سے مزہ لے رہے ہو۔ تم بندر ہو کر بھی ان انسانوں سے گئے گزرے ہو گئے ہو جو وہاں تماش بین بن کر کھڑے ہوئے تھے

کون کہتا ہے کہ وہ خاموش تماش بین تھے ؟ میں نے تو سنا ہے اس ظلم کی ابتدا عوام ہی نے کی تھی پولیس نے تو صرف یہ کیا کہ اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ یہ بات مونی بابا نے اپنے فیصلے کے دوران سرخ رنگ میں لکھی اور ہمیں دکھلا کر مٹا دیا

تان سین بولا لیکن لوگ بیچارے کر ہی کیا سکتے تھے ؟

ہم نے کہا کیسی باتیں کرتے ہو تان سین ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ ایک آزاد ملک ہے وہاں انسانی جان و مال کو دستوری تحفظ حاصل ہے بلکہ یہاں جمہوری نظام رائج ہے جو عوام کا اپنا ہے عوام کے ذریعہ قائم ہوتا ہے اور عوام کی خاطر چلایا جاتا ہے۔

یہ آپ کس ملک اور کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ گزشتہ دنوں جب چار لوگ آندھرا پردیش کے ایس آر نگر میں ایک ایسے ہی قتل کی رپورٹ لکھوانے کیلئے تھانے پہونچے تو پولیس

والوں نے انہیں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا اب بھلا ایسے میں کون پولیس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

ہم نے کہا آپ یہ سب اس عظیم ملک کو بدنام کرنے کی خاطر اڑائی جانے والی بے بنیاد خبریں ہیں ۔ تم نہیں جانتے ہمارے ملک میں عوام کے سامنے بڑے۔بڑے رہنماؤں کو ہاتھ پسار کر آنا پڑتا ہے۔

یقیناً انتخاب سے پہلے ایسا ہوتا ہے لیکن اسکے بعد جب یہی عوام ہاتھ پسار کر اپنے حقوق کی خاطر میدان میں آتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ نین سکھ نے پوچھا

تان سین بولا اب تم ہی بتلاؤ کہ کیا ہوتا ہے؟

میں کیا بتلاؤں تم خود ہی یوٹیوب پر نالندہ میں خواتین مظاہرین پر ہونے والی پولیس والوں کی بہیمانہ لاٹھی چارج کا مشاہدہ کر لو

اچھا یہ تمہیں کیسے پتہ چل گیا تم بھی ان خواتین کے ساتھ زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے ؟تان سین نے فقرہ کسا

نین سکھ بولا تم بھی انسانوں کی چاپلوسی کرتے کرتے بالکل عقل سے پیدل ہو گئے ہو میں نے خود یوٹیوب پر اس فلم کو دیکھا، نہیں معاف کرنا سنا ہے

فلم دیکھی جاتی ہے سنی جاتی ہے ؟تان سین نے پوچھا

دونوں ہی باتیں ہوتی ہیں مجھ جیسے اندھے اسے سنتے ہیں اور تم جیسے بہرے اسے دیکھتے ہیں

یہ کون دیکھنے اور سننے کی باتیں کر رہا ہے؟ عجیب سنگھ نیند ہی میں منمنایا

تینوں بندر پھدک کر پھر جھولے میں پہنچ گئے اور بولے صاحب نکل چلئے اس سے پہلے کہ یہ ہمیں نیند میں خلل کے سبب دہشت گرد بنا کر پوٹا کے تحت گرفتار کرلے۔ اس کے بعد ہم دہشت گرد ہیں یا نہیں یہ ثابت کرنے کی ذمہ داری خود ہمارے ہی سر آن پڑے گی۔ آپکی مدد کیلئے تو صحافیوں کی یونین آجائیگی ہم بندروں کا کیا ہوگا ہمارے لئے تو اس کل یگ میں نہ بجرنگ بلی ہے اور نہ بجرنگی۔ یہ مونی بابا بول رہا تھا گھبراہٹ کے مارے اس نے اپنا مون برت توڑ دیا تھا۔

ہم بھی ان بندروں کے دلائل سے اچھے خاصے مرعوب بلکہ خوفزدہ ہو چکے تھے اس لئے پہلے تو باہر آئے پھر پوچھا اب جانا کہاں ہے ؟

تان سین بولا کیوں آپ کا کوئی گھر نہیں ہے کیا ؟ اگر نہیں تو گاندھی جی کی طرح کوئی آشرم بنالیجئے ورنہ وہیں چلئے۔

ہم نے جھولے کے اندر ہاتھ ڈال کر اندازے سے تان سین کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گھر آگئے۔

دوسرے دن صبح جب ہم اپنے مہمان خانے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بندر تو غائب ہیں ان کی جگہ ایک باریش سوامی بھگوا وستر دھارن کئے بیٹھے ہیں۔ سوامی جی کے بغل میں ایک مضحکہ خیز بزرگ سر پر گاندھی ٹوپی لگائے براجمان ہیں اور ایک کونے میں ایک شخص نصف آستین کا ڈیزائنر کرتا پہنے ہوئے اٹالین عینک میں فون پر گودھرا سے سالگرہ کی مبارکباد وصول کر رہا ہے۔ ہم نے سوچا

یہ کون لوگ ہیں جو بلااجازت ہمارے گھر میں گھس آئے اور انہوں نے ہمارے بندروں کو کہاں بھگا دیا؟ ہم نے انہیں پرنام کیا اور پوچھا۔آپ لوگ کب ، کیوں اور کہاں سے یہاں آن پہنچے ؟

عینک والے صاحب نے اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تم مجھے نہیں جانتے ۔ امریکی انتظامیہ نے مجھے ہندوستان کی وزارتِ عظمیٰ کیلئے مناسب ترین امیدوار قرار دیا ہے اور تم تو جانتے ہی ہو ہندوستانی عوام امریکہ سے کس قدر مرعوب ہے ۔اب تو بس انتخاب کا انتظار ہے جب وہ میرے نام پر مہر لگائیں گے اور میں ہندوستان کے تخت طاؤس کو برطانیہ سے واپس لاکر اس پر براجمان ہو جاؤں گا۔

عوام کو تو خیر بہلایا پھسلایا جاسکتا ہے لیکن تمہاری اپنی جماعت کے خواص کا کیا بنے گا؟ہم نے سوال کیا

بھئی دیگر خواص کی مانند ہمارے خواص بھی بکاؤ مال ہیں انہیں وزارت اور دولت کی قیمت پر خرید لیا جائے گا

وہ بھی ٹھیک ہے لیکن میرے وہ بندر کہاں چلے گئے ؟

حضور آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں ہی تو ہوں آپ کا چہیتا تان سین

اچھا اور یہ دونوں حضرات کون ہیں ؟

یہ مونی بابا ہیں جو یوگا کرنے میں مصروف ہیں اور یہ گاندھی ٹوپی اپنے نین سکھ نے سر پر سجا لی ہے اس لئے آپ اسے پہچان نہیں پارہے ہیں

لیکن راتوں رات میں یہ سب کیا ہوگیا۔ اس قدر انقلاباتِ زمانہ ایسی تیزی کے ساتھ پہلے تو برپا نہیں ہوتے تھے ؟ہم نے استفسار کیا

نین سکھ بولا آپ نے ٹھیک کہا زمانہ بدل گیا ہے۔ یہ کل یگ ہے کل یگ۔ پہلے جس کام کو کرنے کیلئے صدیاں درکار ہوتی تھیں اب وہ کام منٹوں میں ہو جاتے ہیں زمانہ جمل کے بجائے جیٹ کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن راتوں رات داڑھی وچوٹی کا اگ آنا اور دم کا غائب ہوجانا مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہو گیا ؟

ارے بھئی ڈارون نے اپنی مرگِ مفاجات کے فلسفے میں یہی تو کہا تھا کہ جس چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی وہ جھڑ جاتی ہے اور جس کی ضرورت پیدا ہوتی ہے وہ نمودار ہوجاتی ہے۔

یہ سب فلسفے کی باتیں ہیں ان کا حقیقت سے کیا تعلق ؟ہم نے اپنی بے یقینی پر اصرار کیا

تعلق کیوں نہیں ؟تان سین بولا پرانے لوگوں کو کتنے پہاڑے یاد ہوتے تھے اب کیلکولیٹر نے ان کی ضرورت کو اس طرح ختم کیا کہ پہاڑ جیسے پہاڑے روئی کے گالے بن کر اڑ گئے۔

نین سکھ نے پہلی مرتبہ تان سین کی تائید کی اور بولا جی ہاں اس میں کیا شک ہے آپ ہی بتلائیے کہ پہلے آپکو اپنے دفتر، گھر اور دوست واحباب کے تک کے ٹیلی فون نمبر زبانی یاد ہوتے تھے جبکہ اب آپ کو اپنے موبائل کا نمبر بھی

یاد نہیں رہتا جو آپ کا حقیقی شریکِ حیات بن گیا ہے۔ گویا یادداشت کی ضرورت کم ہوئی تو اسے مشینوں نے نگل لیا۔

بندروں کے دلائل کا قائل ہونے کے بعد ہم نے پوچھا لیکن یہ یوگی بابا تو بہت بولتے تھے اب انہیں کون سا سانپ سونگھ گیا جو مون برت رکھ لیا۔

تان سین بولا آپ نے صحیح کہا جب آدمی بہت زیادہ بولنے لگے تو اس کی بولتی بند کر دی جاتی ہے۔ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پہلے زمانے میں ہم لوگ بلیوں کو بانٹ کر اپنا کام چلاتے تھے لیکن آجکل ایک اطالوی بلی ہم لوگوں کو تگنی کا ناچ نچا رہی ہے۔ بابا ہندوستان کی سیاہ دولت کا شور مچاتے تھے جو بیرونِ ملک ہے۔ بلی نے یہ کیا کہ ان سے ان کی سفید دولت کا حساب مانگ لیا جو ملک کے اندر ہے۔ پھر کیا تھا ان کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے اور ایسے میں جب ان کا دستِ راست آگے آیا تو پتہ چلا کہ وہ نہ صرف نیپالی ہے بلکہ غیر قانونی طور پر ان کے آشرم میں عیش کر رہا ہے۔

تان سین کی باتیں سن کر مونی بابا کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ صبر کر گئے اور اپنے یوگ آسن سے باہر نہیں آئے سب کچھ چپ چاپ دیکھتے اور سنتے رہے لیکن کچھ نہیں بولے اب انہیں اس کی عادت ہو چکی تھی انہوں نے از خود اپنی زبان پر قفل لگا لیا تھا لیکن نین سکھ اسے برداشت نہ کر سکا اور بولا تان سین تم کیسے غدار بندر ہو انسانوں کو خوش کرنے کیلئے خود اپنی برادری کو بدنام کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے

شرم مجھ کو نہیں تم لوگوں کو ان کاموں پر آنی چاہئے جس کے عیاں ہونے سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے ۔تان سین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ تم خود باتیں تو بڑی بڑی کرتے ہو لیکن اپنی آنکھوں پر سے اس زعفرانی پٹی کو نہیں ہٹاتے جو تمہارے حامیوں نے باندھ رکھی ہے۔ وہ لوگ جو تم سے بولتے ہیں وہی تم لوگوں سے بولتے ہو۔

ان الزامات کو سن کر ہمارا دل دہل گیا اس لئے کہ ہم خود نین سکھ کے ساتھ پاکستان اور امریکہ جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ہم نے پوچھا میرے پیارے تان سین ویسے تو تمہاری ہر بات مجھے صحیح لگتی ہے لیکن پھر بھی ان سنگین الزامات کو میں بغیر ثبوت کے تسلیم نہیں کر سکتا۔

تان سین بولا دیکھئے تو ثبوت بے شمار ہیں لیکن میں دو مثالیں دیتا ہوں ۔ اس نین سکھ نے پہلے حقِ معلومات کی تحریک چلا کر اپنی شہرت بڑھائی اور پھر بد عنوانی کا محاذ کھول کر بیٹھ گیا۔اس دوران خود اس کے ساتھ بد عنوانی کے خلاف شور شرابا کرنے کے بجائے عملاً کام کرنے والی شہلا مسعود کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔اس بیچاری نے اسی کی شہ پر اپنی معلومات کا حق استعمال کرکے بد عنوانوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے شہلا کے بہیمانہ قتل پر اتنا بھی احتجاج نہیں کیا جتنا کہ کیجریوال پر لگے حقیقی الزامات کی حمایت میں کیا تھا۔اس لئے کہ شہلا مسعود کے قتل کی سوئی زعفرانی ریاستی سرکار اور سنگھی رہنماؤں کی جانب مڑتی تھی۔ اسے چد مبرم اور چوہان

کی ترنگی بدعنوانی دکھلائی دیتی ہے لیکن ریڈی اورامراسے نظر نہیں آتے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ صرف بولتا اور سنتا ہے مگر دیکھتا اور سوچتا نہیں ہے ۔ اپنے دماغ کا استعمال نہیں کرتا یہ تو بس بھوپوں ہے بھوپوں ۔

تان سین کی لمبی تان سن کر نین سکھ تو بیچارہ بے ہوش ہوگیا لیکن مونی بابا نے اپنا برت توڑ دیا اور بولے اوئے تان سین میں نے تجھ جیسا نمک حرام نہیں دیکھا تو جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں سوراخ کرتا ہے ۔ سب سے پہلے تو نے کیشو کے پیر چھوئے اور پھر اسی کے قدم اکھاڑ دئے ۔ اس کے بعد توگاڑیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اس کا گلا دبا دیا ۔ اپنے بچپن کے دوست پنڈیا تک کو موت کے گھاٹ اتارنے سے تو نہیں ہچکچایا ۔ اڈوانی کی رتھ کا مہار تھی بنا اور اب اسی کی ہوا نکال دی ۔ امیت شاہ کے ذریعہ ونجارہ سے فرضی انکاؤنٹر کرواتا رہا اور پھر دونوں کو بلی کا بکرہ بنا کر ٹھکانے لگا دیا ۔ تجھے مسلمانوں کا ووٹ بنک نظر آتا ہے لیکن عشرت جہاں اور سہراب الدین کے خون کے دھبے نہیں دکھلائی دیتے کل تک تو مسلمانوں کے قتل عام کو جائز قرار دے کر ہندوؤں کے ووٹ مانگتا رہا اور اب ان کی مسیحائی کا دم بھرنے لگا ہے ۔ شرم تو تجھے آنی چاہئے بلکہ چلو بھر پانی میں تجھے ڈوب مرنا چاہئے ۔ تو صرف اپنے مفادات کو دیکھتا ہے اور اس کیلئے بے تکان بولتا ہے ۔ تجھے نہ تو فساد زدگان کی آہ وبکا سنائی دیتی ہے اور نہ ہی سنجیو بھٹ جیسے پولس افسر کے ضمیر کی آواز ۔ تو سمجھتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی مدد سے عوام کی آنکھوں میں

دھول جھونک دے گا لیکن یہ سب اس قدر آسان نہیں جتنا کے تو سمجھتا ہے۔

یوگی بابا کی تقریر سن کر نین سکھ کی آنکھیں کھل گئیں انھوں نے اپنی آنکھوں پر لگی پٹی کو اتارا اور بولے یوگی بابا آپ نے میری آنکھ کھول دی دراصل ہم نے بنیادی غلطی یہ کی کہ ہم انسانوں سے مرعوب ہو گئے اور انسان بننے کی کوشش کرنے لگے یہی ہماری سب سے بڑی غلطی تھی یہ کہہ کر نین سکھ نے اپنی گاندھی ٹوپی کھڑکی سے باہر ہوا میں اچھال دی موٹی بابا نے کہا تم نے صحیح کہا نین سکھ یہ چوٹی اور یہ چولہ یہ سب کچھ پاکھنڈ منافقت) ہے۔ یہ ہمیں نہیں انسانوں ہی کو زیب دیتا ہے۔یوگی بابا نے جیسے ہی سر پر) ہاتھ پھیرا چوٹی غائب ہو گئی اور اندر سے وہی پرانا بندر نمودار ہو گیا جو چولے کی حاجت سے بے نیاز تھا۔تان سین نے دودیرینہ ساتھیوں کو اپنی پرانی حالت میں جاتے دیکھا تو اس صدمے کو برداشت نہ کرسکا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔

دوسرے دن گلی کے نکڑ پر جہاں تان سین کی لاش ملی تھی ہنومان چالیسا کا پاٹھ ہو رہا تھا ماروتی کے نئے مندر کا سنگِ بنیاد رکھا جاچکا تھا اور بے شمار نئے اور پرانے بندر جمع ہو کر جئے بجرنگ بلی کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔

بھٹ اور مودی : اقدار و اقتدار بر سر پیکار

الفاظ کا سحر الفاظ سے نہیں اقدام سے ٹوٹتا ہے۔نریندر مودی نے اپنی سالگرہ کے دن عوامی برت رکھنے سے قبل گجرات کی عوام کو ایک کھلا خط لکھا تھا۔اس ڈھکوسلے کے جواب میں سنجیو بھٹ نے ایک کھلاخط مودی کو لکھا لیکن مودی کے نقار خانے میں وہ طوطی کی آواز دب گئی۔بھٹ نے اپنے خط کا خاتمہ بھوشن سونم کی ایک نظم پر کیا تھا جس کا آزاد ترجمہ یوں ہے:

میرے پاس اقدار ہیں اور اقتدار نہیں ہے
تیرے پاس اقتدار ہے مگر اقدار ندارد ہیں
تو،توہے اور میں ، میں ہوں
مصالحت ممکن نہیں ہے
اس لئے ہوجائے آغازِ جنگ

ایک تماشے کا اہتمام کرکے مودی نے اپنے آپکو وزیر اعظم نہ سہی تو اس کا امیدوار ضرور بنا لیا۔اس کی آواز اس قدر بلند تھی کہ امریکہ تک میں اسکی بازگشت سنائی دی۔جب ساری دنیا مودی کے کفارے کا راگ الاپ رہی تھی اور اسکے سدبھاؤنا کے سیلاب میں بہی جارہی تھی تو سنجیو بھٹ نے آگے بڑھ کر ایک

نہایت دلیرانہ اقدام کر ڈالا اور ہرین پنڈیا کے قتل کے بارے میں اپنا حلف نامہ عدالت میں داخل کر دیا۔ اس سے پہلے وہ فسادات کے حوالے سے حلف نامہ عدالت میں داخل کر چکے تھے جس کی وجہ سے انہیں ملازمت سے معطل کر دیا گیا تھا۔ فسادات کے بارے میں انہوں نے انکشاف کیا کہ مودی نے بذاتِ خود نے ہندووں کو اپنا غصہ نکالنے کی مکمل آزادی دی اور افسران کو اس میں تعاون کے احکامات صادر کئے۔ ہرین پنڈیا کا جس وقت قتل ہوا اس وقت سنجیو بھٹ اسی سابرمتی جیل کے سپرانڈنٹ تھے جس میں فی الحال انہیں گرفتار کرکے رکھا گیا ہے۔ اس وقت انہوں نے ہرین پنڈیا کے قتل میں ملوث اہم شخصیات پر اپنی رپورٹ تیار کرکے وزیر داخلہ امیت شاہ کو روانہ کی تھی لیکن اس کو پسند کرنے کے بجائے شاہ اور مودی ان پر ناراض ہو گئے اور ان پر رپورٹ واپس لینے و شواہد مٹانے کیلئے دباؤ ڈالا جانے لگا اور چونکہ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اس لئے ڈھائی مہینے کیلئے ان کو سابرمتی جیل سے ہٹا کر بغیر کسی ذمہ داری کے خدمات سے محروم کر دیا گیا۔ سنجیو بھٹ کے مطابق جس وقت وہ سابرمتی جیل میں تھے اس وقت انہیں حیدرآباد سے پنڈیا کے قتل میں گرفتار شدہ اصغر علی نے بتلایا کہ ہرین پنڈیا کو دراصل سہراب الدین کے دستِ راست پرجاپتی نے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا اور اب پولیس نے سہراب الدین اور پرجاپتی کا انکاونٹر کرکے اس جرم کے سارے اہم ثبوت مٹادیئے ہیں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اصغر علی سمیت سارے ملزمین کو گزشتہ دنوں عدالت نے رہا کردیا جس کے بعد

پرس ایک بار ہرین پنڈیا کی اہلیہ نے اپنے خاوند کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی دہائی۔ وہ اس مقصد کے لئے مودی کے سدبھاؤنا میلے میں آنا چاہتی تھی لیکن اسے بزورِ قوت روک دیا جس سے مودی کی سدبھاؤنا کا پاکھنڈ عوام کے سامنے آگیا۔ جو شخص اپنے بچپن کے دوست کا قاتل ہو وہ بھلا غیروں کا خیر خواہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ سنجیو بھٹ کی جانب سے لگائے اس سنگین الزام نے مودی کے ہوش اڑادئے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی اور وہ بھٹ کی گرفتاری کیلئے مجبور ہو گیا۔ بھٹ پر لگایا جانے والا الزام اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ کوئی نیم پاگل انسان بھی اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ انتظامیہ کے مطابق سنجیو بھٹ نے اپنے ڈرائیور کے ڈی پنت کو ڈرا دھمکا کر مودی کے خلاف حلف نامے پر دستخط کروائے۔ وہ مودی جس کی آنکھوں کا تارہ اے ٹی ایس آفیسر ونجارہ قتل کے الزام میں جیل میں ہے جس کا وزیر داخلہ قتل کے الزام میں ضمانت پر ہے اور ملک سے باہر نہیں جا سکتا۔ جس کے ظلم کے چرچے ساری دنیا میں ہیں اس کے خلاف ایک پولیس آفیسر ڈرا دھمکا کر شکایت درج کروادے یہ بات کسی کی سمجھ میں آنے والی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ حلف نامے نے مودی کی دم پر پیر رکھ دیا وہ بلبلا اٹھا بوکھلاہٹ میں اس نے از خود اپنے چہرے پر پڑی ہوئی سدبھاؤنا کی نقاب کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ جس وقت مودی ٹی وی کیمرے کے سامنے اخوت و خیر سگالی کی میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا اس وقت بھوشن سونم کی نظم کا مندرجہ ذیل حصہ بے محل معلوم ہوتا تھا لیکن جب بھٹ کی

گرفتاری کے بعد پولیس نے ان گھر پر یکے بعد دیگرے چھاپے مارے تاکہ ہرین پنڈیا کے قتل کے شواہد کو مٹایا جاسکے اور سنجیو کی بیوی شویتا نے جب اپنے شوہر کی جان کو لاحق خطرے کا اظہار کیا تو گویا اس نظم میں جان پڑ گئی

میرے پاس صداقت ہے اور طاقت نہیں ہے

تیرے پاس طاقت ہے پر صداقت نہیں ہے

تو، تو ہے اور میں، میں ہوں

مصالحت ممکن نہیں ہے۔

اس لئے ہو جائے آغازِ جنگ

نریندر مودی نے اس آپریشن کیلئے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا جب سپریم کورٹ میں دس دنوں کی تعطیلات کا آغاز ہونا تھا تاکہ عدالتِ عالیہ میں سنوائی نہ ہوسکے اور سنجیو بھٹ کو پولیس حراست میں رکھ دہشت زدہ کیا جاسکے اتفاق سے اسی دوران بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں ہونا تھا لیکن مودی کیلئے دہلی کے اجلاس تو کیا دہلی کے تخت سے اہم یہ مسئلہ تھا جو اسے تختۂ دار تک پہونچا سکتا ہے اس لئے وہ بزدل گجرات ہی میں چھپا رہا ذرائع ابلاغ سے منہ چھپاتا اس آپریشن کی بذاتِ خود نگرانی کرتا رہا۔ بی جے پی کے اندر اور باہر مودی کے حامی و مخالف بے بنیاد افواہیں اڑاتے رہے۔ مخالفین نے کہا وہ اڈوانی کی یاترا سے اختلاف کے باعث نہیں آیا حالانکہ یاترا کا

اعلان سدبھاؤنا تماشے سے قبل ہو چکا تھا اور سب جانتے تھے کہ اگر یہ یاترا بہار سے نکلے
گی تو نتیش کمار ہی اس کو ہری جھنڈی دکھلائیں گے بلکہ یہ خبر بھی پہلے سے آچکی ہے کہ
اڈوانی جی اپنی یاترا کا آغاز گجرات میں کرم ساڈ سے کرنا چاہتے تھے جو ان کے چہیتے لوہ
پرش کانگریسی رہنما ولبھ بھائی پٹیل کی جنم بھومی ہے لیکن خود مودی نے ان کو لوک نایک
جئے پرکاش نارائن کے مقامِ پیدائش سارن ضلع میں واقع سیتابدیارہ گاؤں جانے کا مشورہ
دیا۔ اب اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے مودی نہیں جانتا کہ جئے پرکاش کس ریاست میں پیدا
ہوئے تھے اور بہار کا وزیرِ اعلیٰ اپنی گوں ناگوں مجبوریوں کے باعث بہار میں آنے نہیں
دیتا تو وہ مودی کو نہیں جانتا۔ اڈوانی نے اس مشورے کو اس لئے ہاتھوں ہاتھ لیا کہ
مودی کے ارادوں کے پیشِ نظر اب گاندھی نگر کا حلقہ انتخاب ان کیلئے محفوظ نہیں ہے۔
مستقبل میں ممکن ہے مودی کوئی ایسی چال چلے کہ پی ایم کی کرسی کا خواب دیکھنے والے
اڈوانی جی اپنی عمر کے آخری مرحلے میں ایم پی بھی نہ بن پائیں۔

بی جے پی کے اندر جہاں تک وزارت عظمیٰ کی دوڑ کا سوال ہے اس میں صرف مودی یا
اڈوانی نہیں ہیں بلکہ سشما اور جیٹلی بھی اس کے مضبوط دعویدار ہیں لیکن اس کے
باوجود وہ سبھی لوگ احمد آباد آئے تھے گویا اختلاف کے باوجود باہم مفاد کے پیشِ نظر یہ
لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے یہ

خبر اڑائی کہ مودی پارٹی صدر نتن گڈکری سے ناراض ہیں جو احمد آباد نہیں آئے تھے ۔سچ تو یہ ہے بی جے پی سارے بڑے رہنما ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھنے لگے ہیں اس لئے کہ ہر کوئی وزیراعظم بن جانا چاہتا ہے۔ دیوے گوڑہ کے وزیرِ اعظم بن جانے سے ایک نقصان تو یہ ہوا کہ سیاست کے گلیارے میں رہنے والا ہر زید وبکر اپنے آپ کو وزیراعظم بننے کا اہل سمجھنے لگا۔ بی جے پی کے رہنماؤں کا بھی یہی مسئلہ ہے وہ اس چکر میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا کوئی موقع نہیں گنواتے اس کے باوجود دہلی میں مودی کے علاوہ لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، سشما سوراج، ارون جیٹلی، اوما بھارتی اور خود نتن گڈکری موجود تھے اگر نہیں آئے تو یدورپا جو اپنی رسوائی کے زخموں سے ابھی تک ابھر نہیں پائے ہیں۔ مودی کے ساتھ وہ معاملہ ابھی تک تو نہیں ہوا ہے اس لئے اس کے نہ آنے کی وجہ وہ نہیں ہے جو بتلائی جارہی بلکہ اس بار تو مودی کے لئے دہلی میں اپنے آپکو چمکانے کا نادر موقع تھا لیکن جب گھر کے اندر آگ لگی ہوئی ہو تو کوئی احمق بھی دیوالی منانے کیلئے باہر نہیں جاتا۔

مودی کی غیر حاضری پر بی جے پی کا بیان نہایت مضحکہ خیز تھا مودی جگدمبا ماتا کا اپواس رکھتے ہیں اور نوراتری کے دوران باہر نہیں جاتے۔ اپواس کا بھلا کہیں آنے جانے سے کیا تعلق وہ تو کہیں بھی رکھا جاسکتا ہے اور اس میں کھانے پینے کی کافی کچھ گنجائش موجود ہوتی ہے ویسے بھی دہلی میں اپواس کے

وینجن { خورد ونوش کا سامان } احمد آباد سے زیادہ اقسام کے تھے ۔پارٹی کے اندر نریندر مودی کے ازلی دشمن سنیل جوشی کی بحالی کو جن احمقوں نے اچھالا وہ اس بات کو بھول گئے کہ سنیل جوشی کے ذکر سے ان کی جنسی ویڈیو کا معاملہ پھر تازہ ہوگیا ۔اس ویڈیو کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اسے مودی کے ایماء پر بنوایا گیا تھا تا کہ جوشی کا کانٹا نکالا جاسکے ۔

نریندر مودی جیسے لوگ جب ماتا کا اپواس رکھتے ہیں تو کیا کرتے ہیں اس کا نمونہ تو ساری دنیا نے دیکھ لیا لیکن مودی کی اس گھبراہٹ نے اگر سب سے زیادہ کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو وہ بی جے پی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بی جے پی کا نقصان خود مودی کا خسارہ ہے اس لئے کہ اگر کوئی جہاز ڈوب جائے تو اس کے مسافر اپنے آپ غرقاب ہو جاتے ہیں ۔اس بار کانگریس کے بے وقوفوں نے بی جے پی کی مجلس عاملہ سے قبل اس کے سامنے طلائی طشتری میں رکھ کر ایک ترشول پیش کردیا تھا کہ اسے لو ہمارا سینہ چاک کر دو۔ یہ ترشول تھا چدمبرم اور پرنب مکرجی کی مشترکہ پریس کانفرنس جس نے یہ ثابت کردیا کہ چور کی داڑھی میں وہ تنکا موجود ہے جو نہ صرف انفرادی طور پر اس چور کو بلکہ ڈاکوؤں کی اس پورے ٹولے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے ۔

کانگریس کا سب سے بڑا مسئلہ فی الحال سونیا گاندھی کے اندر پائی جانے والی

خود اعتمادی کی کمی ہے جس کی وجہ سے وہ راہل گاندھی کو اقتدار سے دور رکھے ہوئے ہیں۔ خود راہل بابا کا بچپنا ایسا ہے کہ وہ جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ایسے میں سونیا نے من موہن کو اقتدار کی باگ ڈور سونپ دی اور خود ریموٹ سے اسے چلانے لگیں لیکن من موہن بھی ایک عمر رسیدہ آدمی ہیں اس لئے کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے اور ان کے بعد بھی اگر راہل بابا اپنا لالی پاپ نہیں پھنکتے ج تو کون بنے گا پردھان منتری؟ یہ سوال پارٹی کے اندرونی حلقوں میں اچھلتا رہتا ہے۔ اول تو سونیا نے شیوراج پاٹل کو وزارتِ داخلہ کا قلمدان تھما کر من موہن کا ولی عہد بنایا تاکہ راہل کیلئے کوئی خطرہ نہ ہو لیکن وہ گھوڑا زیادہ دور نہ چل سکا ان کے جانے کے بعد پرنب دا چاہتے تھے کہ انہیں کم از کم ولی عہد بنا دیا جائے لیکن سونیا نے چدمبرم کو آگے بڑھا دیا۔ اسی کا غصہ پرنب مکرجی نے سونال کے بجائے چدمبرم پر نکالا اور نہ صرف ٹو جی معاملے میں باقاعدہ دفتری نوٹ لکھ کر چدمبرم کو پھنسایا بلکہ اس خط کو ایسے وقت میں منظر عام پر پہنچا دیا جبکہ چدمبرم کے خلاف سپریم کورٹ میں شکایت درج تھی۔ وہ تو بھلا ہو سی بی آئی کا جس نے ہاتھ اٹھا لئے ورنہ چدمبرم بھی تہاڑ جیل میں راجہ کے ساتھ اڈلی دوسا نوش فرما رہے ہوتے۔

پرنب مکرجی کی اس حرکت پر انہیں وزارت تو درکنار جماعت سے بھی نکال دیا جانا چاہئے تھا لیکن سونیا گاندھی کے اندر نہ ہی جرأت ہے اور نہ متبادل۔ چدمبرم

کی نااہلی تلنگانہ کے معاملے میں جگ ظاہر ہو چکی ہے۔اسی لئے دوسری بار ان کو اس قضیہ سے دور رکھ کر پرنب کو اس میں ملوث کیا گیا ہے۔انا ہزارے کی تحریک کے دوران بھی وزیر داخلہ کے بجائے پہلے سلمان خورشید کو آگے کیا گیا اور جب بات چیت نازک مرحلے میں پہنچی تو پرنب دا نمودار ہو گئے۔اس سے پہلے بابا رام دیو سے ملنے بھی پرنب کو بھیجا گیا تھا حالانکہ یہ سب وزیر دفاع کے نہیں بلکہ وزیر داخلہ کے کرنے کے کام ہیں۔ وزیر دفاع کا کام ملک و قوم کا دفاع کرنا ہوتا ہے نہ کہ حکومت اور پارٹی کا لیکن فی الحال کانگریس بھی بی جے پی کی مانند شدید قحط الرجال کا شکار ہے۔ایسے میں پرنب مکرجی اپنی اہمیت سمجھتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کے تحت نریندر مودی کی طرح اسی تھالی میں سوراخ کرنے سے باز نہیں آتے جس میں کھاتے ہیں۔ مودی کی غیر حاضری کے باعث کانگریس کی باہمی رسہ کشی اور وزیر داخلہ پر لگائے گئے بدعنوانی کے سنگین الزامات دب گئے گویا مودی نے نادانستہ طور پر اگر کسی کا بھلا کیا ہے تو وہ ان کی حریف کانگریس پارٹی ہے۔ لیکن مودی اب جس چکرویوہ میں پھنس چکا ہے اس میں سے اسے نہ ہی سدبھاؤنا برت بچا پائے گا اور نہ نوراتری کا اپواس۔ نہ ہی اس کا اقتدار اس کے کسی کام آسکے گا اور نہ ہی اس کی پارٹی۔ مودی کو اپنی تمام تر مکاریوں کے باوجود اس وقت شدید جھٹکا لگا جب گھاٹلوڈیہ پولس تھانے کے وکل پروین ترویدی کے اصرار کو جوڈیشیل مجسٹریٹ بی جی دوشی ٹھکراتے ہوئے سنجیو بھٹ کو پولس حراست میں دینے سے انکار کر دیا اور

سابرمتی جیل میں روانہ کردیا۔ امید ہے کہ پیر کے دن ان کی درخواستِ ضمانت منظور ہوجائیگی اور وہ رہا ہو جائیں گے۔ نچلی عدالت کا یہ فیصلہ اس بات کا ثبوت ہے کہ احمد آباد سے فرار ہو کر دہلی کے تخت پر بیٹھنے کا خواب دیکھنے والے مودی کی پکڑ ڈھیلی ہوتی جارہی ہے اور ہرین پنڈیا کیس میں اس کے گلے کا پھندا دن بدن تنگ ہوتا جارہا ہے۔ یہی وہ خوشخبری ہے جس کی پیشن گوئی بھوشن سونم کی مذکورہ نظم کے اختتامی بند میں کیا گیا ہے۔

تو میری گردن ماردے۔ میں لڑوں گا
تو میری ہڈیاں توڑ دے۔ میں لڑوں گا
تو مجھے زندہ گاڑدے۔ میں لڑوں گا
میرے سچ کے ساتھ۔ میں لڑوں گا
اپنی آخری سانس تک۔ میں لڑوں گا
میں لڑوں گا جب تک کہ
تیرے جھوٹ کا قلعہ مسمار نہ ہوجائے
جب تک کہ تیرا معبودِ باطل شیطانِ
حق کی میری پری کے آگے سپر نہ ڈال دے

بھرت پور کی مہابھارت - چھٹی قسط

باباجی کی آمد سے رام لیلا میدان میں زبردست گہما گہمی کا ماحول بن گیا ہر کوئی جوش میں آگیا یوگی بابا زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے ایسا لگتا تھا گویا دیس ایک وشال کرانتی کے کگار پر آ کھڑا ہوا ہے۔ لوگ یوگی باباکے پروچن کا انتظار کر رہے تھے اس بیچ جگو بھی ایک طرف آسن جما کر بیٹھ گیا جیسے ہی یوگی بابا اسٹیج پر پدھارے سارہ پنڈال جئے گرودیو کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ باباجی نے ہاتھ اٹھا کر سارے لوگوں کو پرنام کیا مسکرا کر لاکھوں کے اس مجمع کو دیکھا تو ان کا یہ ایک شاگرد آگے آیا اور بولا اب ہی اگر کسی کو شنکا ہے کہ یہ طوفان رک جائیگا تو وہ مورکھ ہے اور اس سونامی میں بہہ کر غرق ہوجانا اس کا مقدر ہے۔ دوسرے ششیہ نے مائک ہاتھ میں لے کر کہا اگر باباکے دربار کی چیتاونی سرکار دربار نے نہیں سنی تو یہ آندھی راج دربار کو اٹھا اپنے ساتھ لے جائیگی اور ایک ایسی جگہ پٹکے گی پھر لوگ بھول جائیں گے کہ راج دربار نام کی کوئی چیز بھی اس دنیا میں پائی جاتی تھی۔

یوگی بابا اپنے آسن پر براجمان ہو چکے تھے اور سب لوگ مل کر ایک آواز میں گاندھی جی کا مشہور بھجن ستیہ میو جیتے گا رہے تھے۔ جب بھجن ختم ہوا تو

پنڈال کو خاموشی نے نگل لیا ایک ایسی شانتی چاروں اور پھیل گئی مانو وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو لوگ سانس روک کر یوگی باباکے بولنے کی پرتکشا کر رہے تھے ۔ یوگی بابا حسبِ عادت مسکرائے اور بولے آج میں آپ لوگوں کو ست یگ کی ایک کتھا سنانے والا ہوں لیکن اس کتھاکے بعد میں آپ لوگوں سے کچھ پرشن کروں گا اگر آپ نے سارے
سوالات کے صحیح جواب دے دیئے تو آپ کی جان چھوٹ جائیگی اور سبھا سماپت ہو جائیگی لیکن اگر آپ لوگ صحیح اتر دینے میں سپھل نہیں ہوئے تو میں کتھا پھر سے سناؤں گا اور پھر باقی ماندہ سوالات کروں گا۔اس طرح یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مجھے سارے پرشنوں کے صحیح جواب نہیں مل جاتے اس لئے اگر آپ اس مصیبت سے جلد از جلد چھٹکارہ پانا چاہتے ہیں تو.برائے مہربانی کتھا کو غور سے سنئے اور پہلی ہی بار میں سارے سوالات کے صحیح جواب دے دیجئے اسی میں آپ کی اور میری دونوں کی بھلائی ہے ۔ باباجی کی اس ظرافت پر مجمع زعفران زار ہوگیا۔
ست یگ میں بھی ایک وقت ایسا آیا تھا جبکہ اس دنیا کی اقتدار خود.برہما دیوتاکے ہاتھ سے نکل آسروں (شیطانوں) کے ہاتھ میں چلا گیااور چہار جانب اسی طرح کی تنگی و قحط سالی پھیل گئی جیسی کہ آج کل ہے ۔ لوگ دانے دانے کو ترسنے لگنے گویاان سے ساری نعمتیں اور برکتیں چھن گئیں ایسے نازک وقت میں.برہما نے وشنو سے مدد طلب کی اور وشنو یہ تجویز رکھی کہ دیو اور دانو جو

ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں متحد ہو جائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر امرت منتھن کریں تاکہ زمین میں چھپے ہوئے خزانوں کو نکالا جاسکے۔ دھرتی کے پیٹ سے امرت (آبِ حیات) نکالنے کی پیش کش دانووں نے سنی تو وہ بہت خوش ہوگئے مندیرا نامی پہاڑ کو دودھ کے سمندر پر کھونٹے کی مانند گاڑ دیا گیا اور پاتال کے اندر سے سانپوں کے راجہ وسوطی اژدہے کو لا کر رسی کی مانند مندیرا کے گرد لپیٹ دیا گیا۔ وسوطی کو دم کی جانب سے دیووں نے پکڑا اور سر کی طرف دانووں نے تھاما تاکہ منتھن کی شروعات کی جاسکے۔

اس منتھن کے دوران سمندر اور دھرتی اپنی نعمتیں لٹاتی رہی جنہیں معاہدے کے مطابق دونوں گروہ آپس میں تقسیم کرتے رہے لیکن اس بیچ اچانک وسوطی نام کا اژدھا گرم ہو گیا اور اس نے اپنا زہر اگلنا شروع کر دیا۔ اگر یہ زہر سمندر میں مل جاتا تو سارا پانی زہریلا ہو جاتا لیکن ایسے میں وشنو نے بھولے شنکر کے آگے گہار لگائی شنکر نے آگے بڑھکر زہر کو نگل لیا لیکن ان کی بیوی پاروتی نے ان کا گلا دبا دیا تاکہ زہر پیٹ میں نہ اتر سکے نتیجہ یہ ہوا کہ سارا زہر گلے ہی میں رہ اور اسی وقت سے وہ نیل کنٹھ کہلائے۔ اس زہر کے باعث جو ان کے حلق میں ٹھہر گیا تھا ان کی گردن نیلی ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ امرت باہر آتا مندیرا پہاڑ سمندر کے اندر دھنسنے لگا یہ دیکھ کر وشنو نے کچھوے کا روپ دھار لیا اور سمندر کی طے میں جا کر مندیرا کو اپنی پیٹھ پر

سنبھال لیا منتھن جاری رہا یہاں تک کہ جب آسمانی طبیب دھنونتری امرت کا جگ لے کر نمودار ہوئے انہیں دیکھ کر دونوں گروہ باؤلے ہو گئے وہ اپنا عہد بھلا کر اس پر جھپٹے۔ دانووں نے اسے دیووں سے چھین لیا مگر پھر آپس میں اس بات پر لڑ پڑے کہ اسے کون پہلے پئے گا۔ اس بیچ وشنو نے ایک اور چالاکی دکھلائی اور موہنی نامی خوبصورت پری کا بھیس بدل کر سامنے آئے نیز اپنی ہاتھ چالاکی سے دانووں کو امرت کے بجائے دھوکہ دے کر شراب کی بوتل پکڑا دی۔ امرت جب دیوتاؤں کو ملا تو وہ بھی آپس میں لڑ پڑے اور اس کا فائدہ اٹھا کر برہما کا لڑکا ورون اسے لے اڑا اور پھر ایکبار برہما کا راج قائم ہوگیا۔

اس پراچین کتھا کو سنانے کے بعد بابا نے پوچھا سب سے پہلے تو آپ لوگ یہ بتاؤ کہ آج کے دور میں دیوتا کون ہیں ؟ اور دانو کون لوگ ہیں؟

لوگوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا:

عوام دیوتا ہیں اور خواص دانو۔o

اچھا اگر ایسا ہے تو اس کہانی میں اور آج کے حالات میں کیا مماثلت ہے ؟

:لوگوں نے جواب دینا شروع کیا

آج بھی آسروں کا راج ہے۔○

دیوتاؤں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔○

پھر ایکبار ان دونوں کے درمیان اتحاد قائم ہوگیا ہے اور ایک ایسا نظام قائم ہو گیا ہے○
جس میں دونوں ایک دوسرے کا تعاون واشتراک کر رہے ہیں۔

تم لوگ تو بڑے سمجھدار ہو گئے ہو اب یہ بھی بتلا دو کہ ان حالات میں فرق کیا ہے
:؟لوگ ایک کے بعد ایک فرق بتلانے لگے

پہلا فرق تو یہ ہے کہ کل یگ میں دیوتاؤں کے بجائے دانووں نے اشتراکِ عمل کی○
پیشکش کی ہے۔

اور اس یگ میں کوئی شیو نہیں ہے جو دیوتاؤں کی مدد کیلئے آئے اور موہنی کا روپ○
دھار کر دانووں کو بھکائے بلکہ دانووں نے دیوتاؤں کو ورغلانے کیلئے نہ جانے کتنی
مینکاؤں کو چھوڑ رکھا ہے۔

یوگی بابا نے پوچھا اور کوئی فرق تم لوگ ایک بہت بڑا فرق بھول گئے۔ وہ کیا لوگوں نے سوال کیا۔

کل یگ میں وسوطی نامی اژدہے نے جب اپنا زہر اگلا تو اسے نگلنے کیلئے کوئی نیل کنٹھ آگے نہیں آیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راج تال کا پانی زہریلا ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ منتھن کے باوجود ساری محنت رائیگاں ثابت ہوئی اور کوئی امرت کا فوارہ نہیں پھوٹا جو دیوتاؤں کو اقتدار سے سرفراز کرے۔

یوگی بابا کے اس جواب کے بعد لوگوں نے پھر سوال کیا گرو دیو جو ہوا سو ہوا لیکن اب کیا کیا جائے؟

بابا بولے راج تال کو پوتر کرنا اتی اوشیک (نہایت ضروری) ہے ورنہ یہ زہر سارے سماج کو نگل جائیگا

لیکن اسے پاک کرنے کیلئے کیا کرنا ہوگا؟

میں اس کیلئے گنگوتری یگیہ کروں گا۔ ہری دوار سے پوتر گنگا کی ایک شاخ کو راج تال تک لاؤں گا اور اس سے ساری سمسیا کا سمادھان ہو جائیگا۔

لیکن اس مہم میں ہمیں کیا کرنا ہوگا ؟

سب سے اہم کام تو تمہیں لوگوں کو کرنا ہے۔

وہ کیا ؟

تم سب کو مل کر سرکار سے اس کا پرزور مطالبہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ مجھے نہیں لگتا وہ لوگ اس کیلئے آسانی سے راضی ہو جائیں گے۔

لیکن کیوں ؟آپ تو اس راج تال کو پوتر کرنے جا رہے ہیں اس پر کس کو اور کیا اپتی اعتراض) ہو سکتی ہے؟)

کس کو اعتراض ہوگا اور کیا اعتراض ہوگا یہ تو وقت ہی بتلائے گا؟ فی الحال کافی ولمب ہو گیا اس لئے آپ لوگ بھوجن کرنے کے بعد وشرام کرو۔آگے کی یوجنا کل کے پروچن میں آپ سے سمکش رکھوں گا۔

[باقی آئندہ انشااللہ]

مردِ ناداں پر زبانِ نرم و نازک بے اثر

موسمِ بہار اکا دکا چیدہ چیدہ حادثات و واقعات کو نہیں کہتے بلکہ یہ ایک خوشگوار کیفیت کا نام ہے جو رب کائنات کے اذن سے ظاہر ہوتی ہے تو بس پھر چھا جاتی ہے اور ہر چیز کو اپنے آغوشِ رحمت میں لے لیتی ہے قرآنِ مجید میں اس کی منظر کشی ملاحظہ فرمائیں ارشادِ ربانی ہے " اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ اِن بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تُو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل سے ٹپکے چلے آتے ہیں یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے۔برساتا ہے "

یونیسکو میں فلسطین کو حاصل ہو جانے والی رکنیت اپنے آپ میں کوئی بہت بڑا انقلاب نہیں ہے جیسے ہواؤں کا چلنا یا بادل کا چھا جانا لیکن یہ اس بہار کی علامت ضرور ہے جس کی آمد آمد ہے۔وہ موسمِ گل جس کو دیکھنے کیلئے نہ جانے کب سے ہماری آنکھیں ترس رہی ہیں جسکی خاطر امت کے بزرگ رات کے آخری پہر آنسو بہاتے ہیں اور جس پر ملت کے نونہال صبح دم اپنے گرم لہو کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور اللہ کی مدد و نصرت کا اپنے آپ کو حقدار و سزاوار بناتے

” ہیں اور جب بشارتوں کا موسم آنے لگتا ہے تو فرمایا
یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے ” یہ آیت یقیناً ہمارے اندرون کی ترجمان ہے باوجود اس کے کہ مایوسی کفر ہے ہم ” میں سے بہت سے لوگ اس کے دہانے پر پہنچ چکے تھے ۔ ہم بھولنے لگے تھے کہ اللہ اپنی رحمت سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو کس طرح جِلا اٹھاتا ہے، یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ” فلسطین کیلئے اقوام متحدہ میں یونیسکو کی رکنیت مردہ زمین ایک ننھی سی کونپل کی مانند ہے ۔ گزشتہ ۷۰ سالوں سے عالمی استعمار نے اپنی مکاریوں اور چالبازیوں سے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ سرزمینِ فلسطین ظلم واستحصال کی آماجگاہ بن گئ لیکن افسوس کہ اس ظلم کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو نام نہاد امن و سلامتی کے علمبرداروں نے اپنے ویٹو کے زور سے دبا دیا ہے ۔ آج کے حالات میں یونیسکو کے امداد کا اگر کوئی سب سے زیادہ مستحق ہے تو فلسطین ہے
مگر افسوس کہ اگر کوئی اس ادارے کی رکنیت سے محروم ہے تو وہ بھی فلسطین ہی ہے ۔ اس سے پہلے کہ اقوام متحدہ میں فلسطین کا باقاعدہ ممبر بنایا جائے بین الاقوامی منظر نامے پر پنجہ آزمائی کی ایک مشق یونیسکو کی رکنیت کے حوالے سے ظاہر ہوئی ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس نمائشی رکنیت کے لئے امریکہ اور اسرائیل اپنی حمایت کی پیش کش کر کے سیاسی سودے بازی کی کوشش کرتے لیکن کبر غرور کے

نشے میں چور مغرب کے سرخیلوں سے یہ نہ ہو سکا اور اللہ تعالیٰ نے سر بازار ان لوگوں کو رسوا کر دیا جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے "جو کوئی عزت چاہتا ہو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے اُس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے، اور عمل صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے رہے وہ لوگ جو بیہودہ چال بازیاں کرتے ہیں، اُن کیلئے سخت عذاب ہے اور اُن کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے "۔

امریکہ ،اسرائیل اور اسکے مٹھی بھر ہمنواوں کو ان کے مکروفریب نے کس طرح غارت کیا اسکی منہ بولتی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہتا ہے تو یو ٹیوب پر روزنامہ ٹیلی گراف کے ذریعہ بنائی گئی انتخاب کی فلم دیکھ لے ۔یونسیکو میں فی الحال ۱۹۳ ارکان ہیں اور انتخاب کا طریقہ کار یہ ہے کہ ہر ملک کا نام پکارا جاتا ہے اور اس کا ترجمان علی الاعلان اثبات یا نفی کرتا ہے ۔ ہوتا یوں تھا کہ جب بھی کوئی ملک فلسطین کی تائید کرتا تھا سارا ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھتا تھا اور جیسے ہی کوئی مخالفت کا ووٹ پڑتا تھا خاموشی چھا جاتی تھی یہی کچھ اس وقت بھی ہوا جب امریکی نمائندے نے ''نہ ''کہا چہار جانب خاموشی چھائی رہی موت کی خاموشی لیکن اس سلسلے میں دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب اسرائیل نے اپنی مخالف رائے کا اظہار کیا اور اس پر لوگ ضبط نہ کر سکے اورانھوں نے قہقہہ لگا کر اس کا تمسخر اڑایا بالآخر ۱۰۷ کے مقابلے ۱۴ ووٹوں

سے فلسطین کو یونیسکو کی رکنیت حاصل ہو گئی۔ ۵۲ ممالک نے امریکی دہشت کے پیش نظر غائب رہنے میں عافیت سمجھی لیکن اب جبکہ یہ امریکیوں کی ہوا اکھڑ چکی ہے اگلی مرتبہ وہ بھی امریکہ و اسرائیل کی قبر کھودنے میں اپنا حصہ بٹائیں گے اس لئے کہ ان منافقین ۵۲ کا شیوہ ہے چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی اتفاق سے اس بار ان لوگوں میں برطانیہ اور اٹلی جیسے ممالک بھی شامل ہیں۔

انتخاب کے بعد جبکہ ساری دنیا میں خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی امریکہ میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی اوبامہ انتظامیہ اسے افسوسناک اور قبل ازوقت قرار دے رہا تھا۔ اسکی احمقانہ دلیل یہ تھی کہ اس سے مشرق وسطیٰ جامع پائیدار اور مبنی بر انصاف مشترکہ مقصد کمزور ہوا ہے۔ یہ مقصد صرف اور صرف امریکہ اور اسرائیل کے درمیان مشترک ہے اور فی الحال اسے ان دونوں کے علاوہ محض ایک درجن ممالک کی حمایت حاصل ہے۔ امریکی ردعمل جس میں یونیسکو کو دی جانے والی ۸۰ لاکھ ڈالر جس کا ۶۰ لاکھ نومبر میں ادا ہونا ہے کی منسوخی نے اس کے چہرے پر پڑی انسانیت و بھائی چارے کی نقاب کو بھی نوچ کر پھینک دیا اور ثابت کر دیا کہ وہ تعاون نہیں رشوت اور سودے بازی تھی جو اپنی بات منوانے کیلئے دی جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے امریکی کانگریس یعنی پارلیمان نے ایک قانون بنا رکھا ہے جس کی رو سے امریکہ اقوام متحدہ کے کسی بھی ایسے ادارے کی معاونت نہیں کرے گا جو فلسطین کو تسلیم کرتا ہو لیکن امریکیوں کو نہیں پتہ کہ اپنی

امداد روک لینے سے اس ادارے پر ان کے اثرات مزید سمٹ جائیں گے مبادہ اسے اس ادارے کی رکنیت سے بھی محروم کر دیا جائے اور اگر کل کو ایسی تجویز آتی ہے تو اسرائیل کے علاوہ ایک بھی ملک اس کی مخالفت نہیں کرے گا۔ جہاں تک امداد کی رقم کا سوال ہے یہ یونیسکو کے بجٹ کا ۲۰ فی صد ہے جسے بڑی آسانی سے چین اور سعودی عرب پورا کر دیں گے ویسے مشرق وسطیٰ کے علاوہ ایشیا میں ہندوستان، لاطینی امریکہ کا برازیل بھی اس موقع پر فلسطین کا حامی بنا ہوا ہے۔ اگر یہی روایت آگے بڑھتی ہے اور بین الاقوامی جوہری توانائی کی ایجنسی میں بھی فلسطین شامل ہو جاتا ہے تو وہاں سے بھی امریکہ کا پتہ صاف ہو جائے گا اسی کے ساتھ ایران پر امریکی دباو اپنے آپ ختم ہو جائیگا۔ امریکی انتظامیہ دراصل نہ تو خود چین سے بیٹھتے ہیں اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے ہیں گزشتہ دنوں سعودی عرب کو ایران سے لڑانے کی ناکام کوشش کے بعد اب اسرائیل کو اس کام کیلئے ورغلا رہا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اب اس کے چل چلاو کا وقت آگیا ہے بقول انشا

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

یونیسکو کے اندر امریکہ اور اسرائیل کی سبکی کا یہ دوسرا واقعہ ہے فروری ۲۰۱۰ میں اسرائیل نے امریکہ کی مدد سے یونیسکو کی بین الاقوامی رابطہ کے

نائب ڈائرکٹر جنرل کے منصب کی خاطر اپنا امیدواری ظاہر کی تھی اور اس مقصد کیلئے یونیسکو کی ڈائرکٹر جنرل بلغاریہ نژاد آئرینا بوکوا پر دباو ڈالنے کی درخواست امریکہ سے کی تھی جو انکی کی احسانمند ہیں۔اس لئے کہ بوکوا نے امریکی مدد سے مصر کے امیدوار فاروق حسنی کو شکست دے کر یہ منصب حاصل کیا تھا لیکن اسرائیل کو اپنے الگ تھلگ ہونے کی کیفیت کے خاتمے کی اس کوشش کو شدید جھٹکا اس وقت لگا جب آئرینا نے اپنے سارے نائبین کے تقرر میں کسی بھی اسرائیلی نمائندے کو شامل کرنے سے انکار کر دیا چونکہ وہ سارا معاملہ پس پردہ ہوا تھا اور وکی لیکس کے ذریعہ بہت بعد میں سامنے آیا اس لئے دنیا اس سے واقفیت حاصل نہ کر سکی۔اس کے برخلاف یونیسکو میں فلسطین کی شمولیت کا معاملہ علی اعلان ہوا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔آجکل تیونس سے لے فلسطین تک کی صورتحال پر یوں تبصرے ہو رہے ہیں کہ بہارِ عرب کی فصل اسلام پسند کاٹ رہے ہیں اس موقع پر امریکہ بے صبری اور اسرائیل کی بے شرمی دیکھ کر انشاء اللہ خان انشاء کی مشہور غزل کے یہ اشعار یاد آتے ہیں :

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

تیونس کا رخ کرنے سے پہلے کہ جہاں سے بادِ نسیم نے اس سال کی ابتداء میں گلشنِ اسلام کا رخ کیا تھا وہاں کے انتخاب سے قبل غزہ میں رونما ہونے والے ایک اہم واقعہ پر گفتگو مناسبِ حال معلوم ہوتی ہے۔پانچ سال کے طویل انتظار کے بعد اس ماہ اسرائیل کے اغواشدہ فوجی جلاد شالط کو رہائی نصیب ہوئی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ حماس نے اقتدار میں آنے سے قبل اسے گرفتار کیا تھااور اس دلیری وشجاعت کے عوض اللہ رب العزت نے اسے اقتدار سے نوازہ۔ جلاد شالط کے بدلے اسرائیلیوں کو ۱۰۲۷ فلسطینیوں کو رہا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اب بحث اس بات پر ہو رہی ہے کہ ایک کے مقابلے زیادہ ہیں یا ۴۰۰۰ فلسطینی قیدیوں کے بالمقابل جو اسرائیل کی جیلوں میں قید و بند ۱۰۲۷ کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں ۱۰۰۰ کم ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اس نفسیاتی جنگ میں اعدادوشمار کی اہمیت بہت زیادہ نہیں ہے۔یہ صلح حدیبیہ جیسی صورتحال ہے جس میں کیا کھویا اور کیا پایا کا تعین معاہدے میں لکھی شرائط کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ معاملہ اور معاہدہ کے درمیان فرق نہیں جانتے وہ اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔

معاملہ اپنے سے طاقتور اور کمزور دونوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن معاہدہ اپنے ہم پلہ کے ساتھ ممکن ہے۔دستورِزمانہ یہ ہے کہ جب کمزور سے معاملہ کیا جائے تواس پر اپنی شرائط اس پر تھوپ دی جائیں اور جب طاقتور سے پالہ پڑے تواس کے آگے سرِ تسلیم خم کر لیا جائے لیکن جب سابقہ کسی برابر والے سے پیش آئے تو باہم گفت وشنید سے ایسا معاہدہ کیا جائے جو

دونوں فریقوں کیلئے قابل قبول ہو۔

مشرکین مکہ مسلمانوں کو ایک باغی گروہ قرار دیتے تھے اور اس زعم میں گرفتار تھے کہ اپنے منہ کی پھونکوں سے اس چراغ کو گل کر دیں گے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ اسرائیل کا حماس کے ساتھ تھا وہ حماس کو دہشت گرد قرار دیتا تھا اور کسی بھی قسم کی گفتگو کو خارج ازامکان ٹھہراتا تھا۔ اسے بھی یہ غلط فہمی تھی کہ غزہ کا مقاطعہ کرکے، اس کے معصوموں پر بمباری کرکے اس کے رہنماؤں کو شہید کرکے وہ اس تحریک کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔ مشرکین مکہ نے اپنے ناپاک عزائم کو بروئے کار لانے کی غرض سے پہلے بدر پھر احد اور بالآخر احزب کے میدان میں مقابلہ آرائی کی اور پے در پے ناکامی کے بعد انہیں ادراک ہوا کہ اب یہ آندھی رکنے والی نہیں ہے اس لئے اس سے ہاتھ ملا لینے میں عافیت ہے۔ اسرائیل نے پہلے تو غزہ کی ناکہ بندی کر دی۔ اس سے بات نہیں بنی حماس کے فرشتہ صفت رہنما شیخ یٰسین اور شیر دل رنطیسی کو شہید کردیا اس سے بھی حوصلے پست نہ ہوئے تو باقائدہ حملہ کردیا لیکن اس کے باوجود جلاد کو رہا کرنے کیلئے حماس کو مجبور نہ کرسکے۔ فلوٹیلا کے قافلے پر ہلہ بولنے کے بعد اسرائیل کو دال آٹے کا بھاؤ معلوم ہوگیا اور وہ لوگ سمجھ گئے کہ اس سرفروش طاقت کو جھکانا ان کے بس کی بات نہیں ہے اور بات چیت کے بغیر اس مسئلہ کا حل ممکن نہیں ہے۔ جلاد شالط کے بدلے ۱۰۲۷ معصوموں کی رہائی دراصل

اس بات کا اعتراف ہے کہ حماس کو دہشت گرد ہے اور کمزور سمجھنے والے غلطی پر ہیں ۔اس معاہدے سے غزہ کی گھیرابندی کے دونوں جواز جلاد کا اغوا اور حماس کا دہشت گرد ہونا اپنے آپ ختم ہو گئے ہیں۔

قیدیوں کی رہائی کے اس عمل سے جہاں فلسطین میں خوشی کے رنگ بکھر گئے وہیں ۷۹ فیصد یہودیوں نے بھی اس اقدام کی تائید کی جس سے ظاہر ہوتا ہے اسرائیلی حکومت کی ترجیحات جو بھی ہوں عوام امن کو جنگ پر ترجیح دیتے ہیں ۔اس لئے اس سے سبق سیکھ کر کے غزہ کا معاشی مقطعہ فوراً ختم کر دیا جانا چاہئے ۔حزبِ اختلاف قدیمہ پارٹی کے رہنما ناشمن شائی نے یہی مطالبہ کیا کہ اسرائیلی حکومت کو اپنی حکمت عملی میں تبدیلی لا کر حماس اور فتح سے بات چیت کا آغاز کرنا چاہئے اور غزہ پر لگی پابندیوں کو ختم کر دینا چاہئے ۔اقوام متحدہ کے مہاجرین کی مدد کیلئے کام کرنے والے ادارے یونروا کے ترجمان کرس گنس نے بھی یہی بات کہی کہ اب وقت آگیا ہے کہ غزہ کی معاشی خوشحالی کا جامع منصوبہ بنا کر اس پر لگائی گئی پابندیوں کو فی الفور ختم کر دیا جائے ۔اس ظالمانہ پابندی نے غزہ کو ایک کھلی جیل میں تبدیل کر دیا ہے اور وہاں رہنے والے ۱۵ لاکھ لوگوں بالواسطہ قید و بند کی سی کیفیت میں مبتلا ہیں۔غزہ کے ۸۰ فیصد عوام اقوام متحدہ کی جانب سے دی جانے والی غذائی امداد پر گزربسر کرنے کیلئے مجبور کر دیئے گئے ہیں اور وہاں بیروزگاری کا تناسب ۶۵ فیصد ہے ۔جلاد شالط

کی رہائی کیلیۓ مگرمچھ کے آنسو بہانے والے اگر عصبیت کی عینک اتار کر دیکھیں تو یہ ظلم عظیم انہیں نظر آئے گا کہ یہاں کسی بھی وقت آسمان سے بلا جواز اسرائیلی دہشت گردی برسنے لگتی ہے اور معصوموں کا لہو بہنے لگتا ہے۔

رہائی سے قبل جلاد شالط سے شاہیرہ امین نامی صحافی نے پوچھاآپ جان چکے ہو کہ قید میں رہنا کیسا ہوتا ہے۔اسرائیل کی جیلوں جو ۴۰۰۰ فلسطینی قید ہیں کیاان کی رہائی کی مہم کا تم ساتھ دوگے؟جلاد نے ایک طویل خاموشی کے بعد جواب دیا اگران قیدیوں کو رہا کردیا جائے تاکہ وہ اپنے خاندان میں لوٹ جائیں تو مجھے خوشی ہوگی۔رائذ ابولبدیہ کو تیرا سال قبل اس وقت گرفتار کیا گیا تھاجب اسکی بیٹی مریم بطنِ مادر میں تھی اب جبکہ تیرہ سال بعد پہلی بار مریم اپنے والد سے ملی تو اس نے کہا مجھے ایسا لگ رہا گویا میں آج پیدا ہوئی ہوں۔ ۵۲ سالہ توفیق عبداللہ جنہیں ۲۶ سال بعد رہائی نصیب ہوئی کہتے ہیں میں بیم ورجا کی کیفیت میں مبتلا ہوں مجھے اپنی رہائی کی خوشی ہے مگر میرے جو بھائی ہنوز بند ہیں میں ان کے لئے غمگین ہوں۔

شالی جلیلی سے رہا ہونے والی ۲۷ سالہ خودکش حملہ آور بس کو بھی رہائی مل گئی جنہیں پاؤنڈ بارود کے ساتھ حملے سے قبل گرفتار کر لیا گیا تھا۔ان کا کہنا ہے کہ ۶ سال کی ۲۲ قیدو بند میں اگر مجھے افسوس ہے تو بس اس بات کا کہ

میں اپنے گرفتار کرنے والے والے فوجی سمیت اپنے آپ کو ہلاک نہ کر سکی ۔بس کے مطابق وہ اسرائیلی فوجیوں کو ہلاک کرنے والی اولین خاتون شہید کا اعزاز حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بچپن ہی سے انکی یہ خواہش تھی اسلئے کہ یہ نہایت مقدس فریضہ ہے انہیں دکھ ہے ان کا خوابِ شہادت منظورِ الٰہی نہ تھا۔انھوں نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا جب تک سرزمین فلسطین پر یہ غاصبانہ قبضہ رہے گا مجاہدین اپنی مزاحمت اور جہاد جاری رکھیں گے اور میں ان میں پیش پیش رہوں گی۔ میں صرف ایکبار نہیں بار بار خود کش حملہ کرکے جامِ شہادت نوش کرنا چاہتی ہوں ۔بس کی ماں سلمٰی کا کہنا ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کے عزائم کا علم نہیں تھا لیکن میں اسکی حوصلہ افزائی کرتی ہوں یہ جہاد ہے اور مجھے اپنی بیٹی پر ناز ہے ۔ ساری امت کو اس ماں بیٹی پر فخر ہے جنھوں نے ساری دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ جس قوم میں جذبہ جہاد و شہادت موجزن ہوتا ہے وہ کبھی بھی زیر نہیں ہو سکتی ۔

فلسطینی مجاہدین کی رہائی پر جشن منانے والے ایک لاکھ افراد کا ہجوم نعرے لگا رہا تھا ہمیں ایک اور جلاد چاہئے ایسے میں سعودی شہزدہ خالد طلال نے اعلان کیا کہ جو کوئی اسرائیلی فوجی کو اغوا کرے گا وہ اسے ایک لاکھ ڈالر کے انعام سے نوازیں گے۔اس طرح کے بیانات پر جن لوگوں کو بے چینی ہوتی ہے ان کا جواب یحیٰی الظھمر نامی استاذ نے یوں دیا کہ ہمیں پتہ ہے شالط کو.ٹری

مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہزاروں فلسطینی بھی تو اسرائیل کی قید میں ہیں اور اب ہمیں اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ اسرائیل صرف طاقت کی زبان سمجھتا۔ ہمارے پاس اغوا کرنے کے علاوہ کوئی متبادل موجود نہیں ہے اس لئے کہ ہم امن کی زبان کو آزما کر دیکھ چکے ہیں اسرائیل کے کانوں پر اس سے جوں نہیں رینگتی۔ اسی بات کو علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر زبانِ نرم و نازک بے اثر

تیونس : ترے ہاتھوں میں یہ پرچم بہت ہی خوب ہے لیکن - قسط دوم

اگست ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ سویڈن کے اسٹاک ہوم نامی شہر میں ایک مفرور قیدی نے چار بنک ملازمین کو یرغمال بنالیا اور ۱۳۱ گھنٹے اپنی قید میں رکھا۔اس کے بعد جب وہ وہ ملازمین رہا ہوئے تو انھوں نے کہا کہ انہیں اپنے اغوا کنندہ سے کوئی شکایت نہیں ہے اور نہ ہی ان کے اندر اس مجرم کے خلاف کسی قسم کے منفی جذبات پائے جاتے ہیں بلکہ انہیں زیادہ ڈر پولیس اہلکاروں سے لگتا ہے۔ ان احساسات کا اظہار اگر گجرات کی مودی پولس کے خلاف کیا گیا ہوتا تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی لیکن یہ تو اپنے آپ کو نہایت مہذب کہلانے والے یوروپی ملک سویڈن کی پولس کے بارے میں کہی گئی بات ہے۔جہاں مسجد کے میناروں پر پابندی لگائی گئی ہے تاکہ اسلامی شدت پسندی کو طرح نہ ملے۔

یرغمالیوں کی اس حیرت انگیز نفسیاتی کیفیت کو اسٹاک ہوم سنڈروم کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس میں انسان کو اپنی ناپسندیدہ چیز سے انسیت ہو جاتی ہے۔ایسا لگتا ہے شدید آزمائشوں کے دور سے گزرنے کے بعد امت کے دانشور بھی اسی ذہنیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کو اپنی ناکامیوں اور مایوسیوں سے اس قدر انس ہو گیا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اللہ کی نصرت و مدد کو دیکھ کر شکر

کے جذبات سے سرشار حمد بیان کرنے کے بجائے بلاوجہ کے اندیشوں میں گرفتار قنوطیت کے خودساختہ سمندر میں غوطہ زن رہتے ہیں اور اپنے آپ پر لعنت و ملامت کے شغل میں مصروف رکھتے ہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ تیونس کے انقلاب کے بعد اسلام پسندوں کی کامیابی اور اسی کے ساتھ غزہ میں مجلسِ قانون ساز کی رکن اور حماس کی قابلِ احترام خاتون رہنما کا دورۂ تیونس ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ حماس کا شمار آج بھی امریکہ کی نام نہاد دہشت گرد تنظیموں میں ہوتا ہے اور یوروپ کے بیشتر ممالک اسے تسلیم نہیں کرتے اس کے باوجود النہضہ نے انہیں اپنے ملک کا دورہ کرنے دعوت دی نیز ایک عوامی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے نامزد وزیر اعظم حمادی جبعلی نے اعلان کیا کہ یہ نئی ریاست کیلئے قدرت کی جانب سے عطا کردہ عظیم لمحہ ہے اور ساتھ امید کا اظہار کیا کہ یہ باذن اللہ چھٹی عالمی خلافت کا سنگِ میل ثابت ہوگا۔

خلافت کے نام سے مغرب اور اس کے حواریوں کے اندر جس طرح کی بے چینی اور سراسیمگی پلتی ہے اسے کون نہیں جانتا؟ امریکی پچاس ریاستوں کا اتحاد گوارہ ہے۔ یوروپی یونین کا قیام پسندیدہ ہے۔ عرب لیگ قابلِ برداشت ہے۔ لیکن اسلامی خلافت تو گویا قیامت ہے۔ یہ کسی طور ان کے گلے سے نہیں اترتی۔ حمادی کے اس اعلان کا رد عمل تو یہ ہوا کہ تابڑ توڑ دائیں بازو کی جماعت اتکتول نے (جس کے قانون ساز اسمبلی میں ۲۰ ارکان ہیں) النہضہ کے ساتھ جاری اپنی

گفتگو کو معطل کردیا اور پی ڈی پی کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

پی ڈی پی کا یہ حال ہے کہ انتخاب سے قبل اس نے راشد غنوشی کے اس بیان پر اعتراض کیا تھا کہ ''تیونس کی تاریخ میں سب سے زیادہ شہادت کی سعادت ہماری جماعت کے لوگوں کو حاصل ہوئی ہے''پی ڈی پی کے رہنما سواب نے اعتراف کیا اسّی اور نوے کی دہائی میں اسلام پسند سب سے زیادہ آزمائش کا شکار ہوئے لیکن ساتھ ہی یہ کہا شہادت پانے والوں میں اکثریت ان کی نہیں تھی کاش کہ سواب یہ بھی بتلاتے کہ کیا ان کی جماعت کے لوگ اس معاملے میں اکثریت تو کجا اقلیت میں بھی ہیں ۔ سواب نے راشد غنوشی کے بیان کو خطرناک قرار دیتے ہوئے اسے مذہب کا ناحق استعمال بتلایا جبکہ اس بیان میں کہیں مذہب کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ سواب نے انتخاب سے قبل پیشن گوئی کی کہ النہضہ کو ۲۰ فی صد ووٹ بھی نہیں ملیں گے جبکہ اسے ۴۱ فی صد ووٹ مل گئے ہاں یہ ضرور ہوا کہ خود انکی پی ڈی پی کو جو بن علی کے زمانے قربانیاں دینے کے بجائے اقتدار کے ساتھ نورہ کشتی اور بدلے میں ملائی کھانے کا کھیل کر رہی تھی ۲۰ فی صد ووٹ بھی نہیں ملے ۔

پی ڈی پی جیسے مغرب نواز اور مغربی دنیا نے چونکہ مذہبی آزادی کا مکھوٹا اپنے چہرے پر چڑھا رکھا ہے اسلئے وہ مذہبِ اسلام کی براہِ راست مخالفت نہیں

کر سکتے اس لئے شریعت کو تنقید و تنقیص بلکہ تحقیر کا نشانہ بناتے ہیں ۔انسانی حقوق اور خاص طور پر حقوقِ نسواں کی دہائی دیتے ہیں ۔اس یلغار کے جواب میں اکثر و بیشتر مسلم دانشور یا تو مدافعانہ رخ اختیار کرتے ہیں اور بلاوجہ کی صلح صفائی میں لگ جاتے ہیں یا جذباتی رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ان دونوں رویوں سے اسلام دشمنوں کا نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہوتا ہے ۔ مغرب کو مسلم خواتین کے حقوق کی بڑی فکر ستاتی ہے لیکن ان مگرمچھ کے آنسوؤں کی قلعی اس وقت کھلتی ہے جب ریمنڈ ڈیوس نامی ایک امریکی درندہ پاکستانی نوجوان فہیم کو بلاجواز سرِ عام بھرے بازار میں قتل کر دیتا ہے اور اس کی بیوی شمائلہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اس کے باوجود ان کے دل نہیں پسیجتے اور اوباما انتظامیہ ریمنڈ کو بچانے میں اپنی ساری توانائی جھونک کر اسے چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔اس پر نہ کوئی مقدمہ قائم ہوتا ہے اور نہ اسے کوئی سزا سنائی جاتی ہے۔

اس کے برعکس مسلم خواتین کے ان نامرد ہمدردوں کو معصوم ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے اندر خطرناک دہشت گرد نظر آتا ہے ۔وہ انہیں اغوا کرکے افغانستان لے جاتے ہیں اور بغیر کوئی مقدمہ چلائے اپنی جیل میں قید کر دیتے ہیں ۔آگے چل کر جب یہ راز افشا ہو جاتا ہے تو انہیں پاکستان میں لاکر دوبارہ گرفتار کر لیا جاتا ہے اور بے غیرت پرویز مشرف اپنے قوم کی بیٹی کو غیروں کے حوالے کر

دیتا ہے۔ امریکی عدالت میں اس کمزور اور لاغر خاتون پر پولیس کی پستول چھین کر اس پر حملہ کرنے کا بے بنیاد الزام لگا دیا جاتا ہے۔ امریکی عدالت انتظامیہ سے یہ نہیں پوچھتی کہ آخر آپ لوگ جس دہشت گردی کے الزام میں اسے پاکستان سے یہاں لائے ہو اس کے حق میں پہلے ثبوت پیش کرو اور یہ ثابت کرو کہ ان کی گرفتاری حق بجانب تھی بلکہ وہ پولیس پر حملے کے احمقانہ الزام میں عافیہ کو ۸۶ سال کی سزا سنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو جن کو حفاظتی اہلکاروں سے بندوق چھین کر ان پر حملہ کرنے کے الزام میں سزا دی گئی وہ کس قماش کے لوگ ہیں اس کا ایک ثبوت اسی ہفتہ امریکہ کے لوئیس میک کورڈ فوجی اڈے میں ہونے والے کورٹ مارشل میں سامنے آیا جبکہ سارجنٹ کیلون گبس کو اس کے اعتراف جرم پر سزا سنائی گئی۔ ۲۶ سالہ کیلون پر گزشتہ سال جنوری کے اندر ۳ شہریوں کو قندھار میں ہلاک کرنے کا الزام تھا یہ مقدمہ اس کے علاوہ ۱۲ فوجیوں پر قائم کیا گیا تھا جن میں سے دس بری ہو گئے مگر کیلون کے علاوہ مورلوک کو مجرم پایا گیا۔ کیلون کے خلاف خود اس کے ساتھی فوجیوں نے گواہی دی جس کے بعد کیلون نے تین میں سے ایک قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس کے ساتھیوں کا کہنا ہے چونکہ وہ وہاں بور ہو گیا تھا اس لئے تفریحاً اس نے یہ قتل و غارتگری کی۔ وائس آف امریکہ نے اسے شوقیہ قتل کا معاملہ قرار دیا ہے لیکن کیلون کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے تحت کام

کرنے والے فوجیوں پر اپنا رعب جمانے کی غرض سے یہ قتل کیا اس کے مطابق اگر وہ ایسا نہ کرتا تو دیگر فوجی اسے مخنث ہونے کا طعنہ دیتے۔ اس ظالم نے مہلوکین کی انگلیاں کاٹ کر اور دانت اکھاڑ کر اپنے پاس تمغوں کی مانند محفوظ کر لئے۔ اس سفاک مجرم کیلیئے امریکی عدالت کے پاس ۵ سال کی سزا ہے اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی کیلیئے جس کے ہاتھوں کوئی ہلاک تو کجا زخمی بھی نہیں ہوا ۸۶ سال کی سزا۔ یہ ہے خواتین کے حقوق پر ٹسوے بہانے والوں کا اصلی چہرہ۔

تیونس میں النہضہ کی کامیابی کے بعد ان نام نہاد آزادیٔ نسواں کے حامیوں کو مسلم خواتین کے حقوق کی فکر ستانے لگی ہے۔ گزشتہ ۲۵ سالوں سے جب اسلام پسندوں کو بلاوجہ جیل بھیج دیا جاتا۔ اس قید و بند کی صعوبت سے گزرنے کے لئے ان کا یہ جرم کافی ہوتا تھا کہ وہ فجر کی نماز میں نظر آگئے تو ان معصوموں کے اہل خانہ ان کی ماؤں بہنوں، بیووں اور بیٹیوں کی حق تلفی کسی کو دکھلائی نہ دیتی تھی بلکہ تیونس کو انسانی، حقوق کے حوالے سے نہایت ترقی پذیر ہونے کا اعزاز بخشا جاتا تھا۔ جب خواتین کو سرکاری دفتروں سے محض اسکارف اوڑھنے کے باعث ذلیل کر کے نکال دیا جاتا اور یہ دھمکی دی جاتی تھی کہ اگر آئندہ انہوں نے ایسی جرأت کی سزا دی جائیگی۔ اس قانون پر اس قدر سختی سے عملدرآمد ہوتا تھا کہ صرف زبانی انتباہ پر اکتفا کرنے کے بجائے تحریری معافی

نامہ لکھوایا جاتا تھا اس وقت یہ مغرب زدہ ہمدردانِ نسواں اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ جب پردہ نشین خواتین کو تعلیم یافتہ اور اہل ترین ہونے کے باوجود محض حجاب کے باعث ملازمت کے حق سے محروم کر دیا جاتا تھا اسوقت پی ڈی پی اور اٹکنتول والے خاموش تماشائی بنے رہتے تھے ان کو ان کے مغربی آقاؤں کو خواتین کے ساتھ ہونے والے اس امتیازی سلوک سے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ کہا جاتا تھا کہ تیونس کے اندر خواتین کی صورتحال دیگر مسلم ممالک سے بہتر ہے۔ ایک طرف حیادار خواتین کے حوصلوں کو پست کرنے کا کام کیا جاتا اور اسی کے ساتھ جو خواتین مغرب کے جھانسے میں آکر بے پردگی کا شکار ہو جاتیں انہیں اباحیت و فحاشی کے دلدل میں دھکیل دیا جاتا۔ ان کے حقوق کی پاسداری کیلئے انعام کے طور پر واحد ماؤں غیر شادی شدہ] کے حقوق طے کر دیئے گئے۔ ان حقوق کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی] ؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے جس پر غور وخوض ہونا ضروری ہے۔ ہوا یہ کہ اول تو مردوں نے دھوکہ دے کران خواتین کا جنسی استحصال کیا اور انہیں رشتہ ازدواج میں لینے کے بجائے ماورائے عقدِ نکاح اپنی اولاد کی ماں بنا دیا اس کے بعد اپنی پدری ذمہ داریوں سے دامن جھٹک کر ان کے ہاتھوں میں خالی خولی حقوق کی ڈگڈگی تھما دی۔ اب جبکہ ہوا کا رخ بدلا ہے ان ماؤں سے زیادہ ان کا استحصال کرنے والے دلالوں اور ان سے اپنی ہوس کو

سیراب کرنے والے سرپرستوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ اگر ان حقوق کے تنکے کا سہارہ بھی ڈوب جائے تو یہ کاغذ کی کشتی کیوں کر تیر سکے گی؟ ان حقوق کے سلب ہو جانے کے بعد یہ استحصال جاری و ساری نہ رہ سکے گا گویا حقیقی پریشانی عورتوں کے فلاح و بہبود کی نہیں بلکہ اپنے حرص وہوس اور استحصال پر منحصر کاروبار کی بند ہو جانے ہے۔ النہضہ کی نومنتخبہ رکن پارلیمان ڈاکٹر سعاد عبدالرحیم نے جب ایک ریڈیو انٹرویو میں ان واحد ماؤں کے وجود کو شرمناک بتلایا اور کہا کہ ان کے وجود کا کوئی جواز نہیں ہے تو گویا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا لیکن یہ احمق کس منہ سے اسلام پسندوں پر انگشت نمائی کر سکتے ہیں جبکہ النہضہ کے منتخب شدہ۹۱ میں ۴۷ اراکین پارلیمان خواتین ہیں ایسا کرنے کیلئے اس حزبِ اسلامی کو فرانس کی مانند قانونی پابندی سے مجبور نہیں ہونا پڑا بلکہ یہ انہوں نے یہ فیصلہ کسی بیرونی دباوکے بغیر برضا و رغبت کیا۔ یاد رہے فرانس کے اندر ہر پارٹی کو ۵۰ فی صد خواتین امیدوار لازمی انتخاب میں اتارنے پڑتے ہیں اور ایسا کرنے کیلئے انہیں بزورِ قوت مجبور کیا جاتا ہے جبکہ اسلام پسند النہضہ کو اس کی چنداں حاجت محسوس نہیں ہوئی۔ امریکہ جہاں فرانس جیسا قانون موجود نہیں ہے اس طرح کی صورتحال کا تصور بھی محال ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلم معاشرے میں بھی خواتین کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے لیکن مسلمانوں کی اس بے راہ روی کو دینِ اسلام سے منسوب کرکے ان کو اپنے مذہب سے بیزار کرنے سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھ جاتا ہے۔ان چیلنجس کا مقابلہ کرنے کیلئے مناسب حکمت عملی وہی ہے جو پاکستان کی حکومت نے حال میں اختیار کی ہے ۔ابھی اسی ہفتہ پاکستان میں خواتین کو شادی پر مجبور کرنے اور جائیداد سے اُنہیں محروم رکھنے کے لیے قرآن مجید سے شادی جیسی غیر اسلامی روایات کے خلاف قومی اسمبلی نے ایک نئے قانون کی اتفاق رائے سے منظوری دی ہے۔ایوان زیریں نے منگل کو ہونے والے اجلاس میں خواتین کے تحفظ کے حوالے سے اس قانون میں ان روایات کو قابل سزا قرار دیا گیا ہے۔اس نئے قانون کے تحت صلح کے لیے، ونی، جبری یا قران سے شادی کے جرم میں مرتکب افراد کو ۱۰ برس تک قید اور ۱۰ لاکھ روپے جرمانہ کیا جاسکے گا اور یہ جرائم نا قابل ضمانت ہوں گے۔

اس قانون میں خواتین کو دھوکہ دہی یا غیر قانونی ذرائع سے وراثت سے محروم رکھنے پر سزا کی حد ۵ سے ۱۰ سال اور ۱۰ لاکھ روپے جرمانہ تجویز کیا گیا ہے۔مزید برآں خواتین کو جائیداد سے محروم رکھنے کے لیے قرآن سے نکاح پڑھوانے کو بھی قابل جرم قراد دیا گیا ہے خواتین کو جائیداد سے محروم رکھنے کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں میں قرآن پر حلف لیا جاتا ہے کہ وہ آئندہ

تمام زندگی غیر شادی شدہ رہیں گی اور وراثت میں اپنا حصہ نہیں مانگے گی۔ یہ روایت اسلامی شریعت کے قطعی منافی ہے اس لئے نئے قانون میں اس ممانعت کی گئی ہے۔ اس جرم کے مرتکب افراد کے لیے سزا اور جرمانہ مقرر کیا گیا ہے۔ قومی اسمبلی سے منظوری کے بعد یہ بل ایوان بالا یعنی سینیٹ میں منظوری کئے پیش کیا جائے گا۔ دونوں ایوانوں سے منظوری کے بعد اسلام دشمن روایات کے خلاف بنایا گیا یہ قانون نافذ العمل ہو گا۔
یہ بات قابلِ غور ہے کہ پاکستان اسمبلی میں اچھی خاصی تعداد اسلام پسند موجود ہیں اس کے باجود اس قانون کو اتفاق رائے سے منظوری ملی اور کسی نے اعتراض نہیں کیا۔
النہضہ نے بھی اسی طرح کی غیر معمولی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر سعادہ اپنی طالبعلمی کے زمانے اشتراکیت سے متاثر تھیں اور بعد میں انہوں نے اسلام پسندوں اور اشتراکیوں کے درمیان اشتراک عمل پیدا کی سنجیدہ کوشش کی اس لئے کہ دونوں کا مشترک دشمن بن علی کا ظالمانہ اقتدار تھا۔ النہضہ پر پابندی کے دور میں بھی سعادہ نے خواتین کے حقوق کی جدو جہد کو جاری رکھا۔ ان کی کوششوں کو سراہتے ہوئے النہضہ نے اگست میں انہیں اپنا امیدوار بنا دیا اور کامیاب بھی ہو گئیں۔ النہضہ کے ۷۴ میں سے صرف وہ ایک ایسی واحد رکنِ اسمبلی ہیں جو اسکارف نہیں پہنتیں اس لئے مغرب زدہ جماعتیں ان سے بغاوت کی امید لگائے بیٹھی تھیں لیکن غیر شادی شدہ ماؤں

کے معاملے میں ان کے موقف نے سبھی کو چونکا دیا۔ النہضہ کی دعوت پر تیونس کے دورے پر آنے والی حماس خاتون رہنما ہوضہ کے بیان نے کہ "تیونس کا انقلاب آگے چل کربیت المقدس کی بازیابی کا سبب بنے گا" نے افق پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی جانب اشارہ اورنامزد وزیر اعظم حمادی جبعلی کی جانب خلافت کے قیام کامژدہ اسلام کے روشن مستقبل کا ترجمان ہے اس موقع پر بہن سعادہ کی خدمت میں مجاز لکھنوی کا مشہور شعر معمولی سی ترمیم کے ساتھ پیش ہے اس امید کے ساتھ کہ وہ اس پر غور کریں گی۔

ترے ہاتھوں میں یہ پرچم بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس پرچم سے اک آنچل بنالیتی تو اچھا تھا

(باقی آئندہ انشا اللہ)

مصر: ان نوحہ گروں کا جس نے ہمیں خود قتل کیا خود روتے ہیں

قاہرہ کا تحریر چوک پھر ایک بار ایمان افروز نعروں سے گونج اٹھا اور سنگینوں کی قہر آلود نگاہیں مظاہرین آس پاس منڈلانے لگیں۔ فوج کے ظلم و ستم کے خلاف لاکھوں کی تعداد میں آزادی کے متوالے منگل کے روز وہاں جمع ہو گئے۔ اس بیچ فوج کے ہاتھوں شہید ہونے والوں کے جنازے وہاں لائے گئے جس سے ماہِ فروری کے احتجاج کی یاد تازہ ہو گئی ۔انقلابی عوام کا جوش و خروش فیض کی نظم کا ترجمان بن گیا۔

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار
چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
محبتیں جو فنا ہو گئیں ہیں میرے ندیم !

عوام کو اس بار ان محبتوں کے فنا ہو جانے کا اندیشہ تحریر چوک پر لے آیا جس کے نتیجے میں اس سال فروری کے اندر حسنی مبارک کے ۳۳ سالہ قدیم اقتدار کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ مظاہرین نعرے لگا رہے تھے کہ ہم فیلڈ مارشل کو اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ مظاہرین کا کہنا تھا کہ یہ ملک مصری عوام کا ہے ۔ یہ

خطۂ ارض برائے فروخت نہیں ہے اس لئے ہمیں کسی نگرانِ کار کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مظاہرین یہ بھی مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمیں فوجی نہیں بلکہ عوامی حکومت چاہئے۔ یاد رہے کہ اعلیٰ ترین فوجی کاؤنسل کے سربراہ حسین طنطاوی دو دہائیوں تک وزیرِ دفاع کی حیثیت سے حسنی مبارک کی خدمت انجام دے چکے ہیں۔ اس بیچ حسین طنطاوی نے براہِ راست قوم سے خطاب کیا لیکن اس کا کوئی اثر احتجاج کرنے والوں پر نہیں پڑا۔ مظاہرین کے مطابق پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے ایسے میں طنطاوی کے خطاب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں خاصی تاخیر ہو چکی ہے اور فوجی کاؤنسل اب جو کچھ کہہ رہی وہ بالکل بے معنی ہے۔ عوام کا کہنا یہ ہے کہ ایک طرف یہ فوجی ہمیں ہلاک کرتے ہیں اور پھر ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ تحقیقات کریں گے۔ فوج بیک وقت جنگ کی ایک فریق اور ثالث کیونکر ہو سکتی ہے گویا ندا فاضلی والی بات کہ

میرا قاتل ہی میرا منصف ہے
کیا مرے حق میں فیصلہ دے گا

ماہِ فروری میں جب پہلی مرتبہ عوام نے حسنی مبارک کی آمریت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو اس وقت فوجی سربراہ اس بات سے واقف تھے کہ ان لوگوں نے گزشتہ پچاس سال میں سارے حکومتی اداروں اور عوامی تحریکات کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا ہے اس لئے حسنی مبارک سے نجات حاصل کر لینے کے بعد جو سیاسی

خلا پیدا ہو گا اسے فوراًپر کرنا ممکن نہیں ہوسکے گا ایسے میں جو بھی کار گزار حکومت وجود میں آئے گی، فوج کی مدد کے بغیر اس کی بقاء ناممکن ہو جائیگی اور اس صورتحال کا فائدہ اٹھا کر وہ بلاواسطہ اقتدار پر قابض ہو جائیں گے ۔ عوام کا جوش و خروش وقت کے ساتھ سرد ہو جائیگا اور اگر وہ دوبارہ سر اٹھاتے بھی ہیں تو طاقت کے بل بوتے پر انہیں روند دیا جائیگا۔اس حکمت عملی پر عمل درآمد کرتے ہوئے فوجی حکومت نے بہت جلد اپنے جوروظلم کا آغاز بھی کر دیا۔ ان فوجی سربراہوں کا حال یہ ہیکہ ایکطرف ہمدردی جتاتے ہیں اور دوسری جانب سفاکی دکھلاتے ہیں بقول احمد فراز جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کس کا جشن منایا جائے وہ؟ ۔

ان نوحہ گروں کا جس نے ہمیں خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہوئے، ایسے جلاد بھی ہوتے ہیں

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حال میں حکومت مخالف مظاہروں میں ۳۳ افراد جان بحق ہوگئے۔فوجی عدالت میں عام شہریوں کے خلاف مقدمات قائم کئے گئے اور ایک ایسی صورتحال پیدا کر دی گئی جس کو ایمنسٹی انٹر نیشنل و دیگرانسانی حقوق کے تحفظ کی خاطر سرگرم تنظیموں نے حسنی مبارک کے دور سے بھی ابتر قرار دیا۔اس خون خرابے کے خلاف فوج کی اعلیٰ کاؤنسل پر دباؤ ڈالنے کی خاطر عوام سڑکوں پر اتر آئے۔کارگزار وزیر اعظم عسام اشرف نے اپنی کابینہ سمیت

استعفیٰ دے دیا۔ عسام اشرف کا شمار ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جو سب سے پہلے تحریر چوک پر عوام سے آملے تھے۔ فوجی کاؤنسل نے وزیر اعظم کا استعفیٰ قبول نہیں کیا بلکہ متبادل کے اہتمام تک انہیں اپنی ذمہ داری ادا کرنے کیلئے کہااور محمد البرضائی سے رابطہ قائم کیا تاکہ وہ حکومت کی کمان سنبھالیں۔اس موقع پر البرضائی شش و پنج میں مبتلا ہیں اس لئے کہ انہیں اندیشہ ہے وزاراء کے تعین میں ان کو حسبِ ضرورت آزادی نہیں دی جائیگی۔

مصر کے اندر جو یہ طوفان وطلاتم لوٹ کر آیا ہے اس کی وجوہات کا پتہ لگانا بہت آسان ہے۔اس سال کی ابتدا میں جب وہاں عوامی بغاوت رونما ہوئی تو اس وقت فوج نے اپنا وقار بچانے کی خاطر اور اپنے مفادات کے پیشِ نظر حسنی مبارک کے بجائے عوام کا ساتھ دیا۔ اس لئے کہ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بار دریائے نیل میں جو شگاف واقع ہوا ہے اس کے اندر حسنی مبارک کو غرقاب ہونا ہی ہونا ہے ایسے میں اگر انہوں نے حسنی مبارک کا ساتھ دیا تو فرعون کی فوج کے انجام کی تمنا غالب کے اس شعر کی مصداق کریں گے ؂

ہوئے ہم جو مر کے رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کوئی مزار ہوتا

فوجی کاؤنسل نے گزشتہ ہفتہ ایک اور من مانی کر ڈالی۔ اس نے اپنی جانب سے

عوام پر ایک ایسے دستور کا مسودہ تھوپنے کی کوشش کی جس کی بنیاد پر مستقبل میں مصر حکومت کا چلائی جائیگی ۔اس حماقت نے عوام کے زخموں پر نمک کا کام کیا اور انقلاب کے ایندھن کو تیلی دکھلادی ۔ویسے جو مسودہ فوجی ٹولے نے پیش کیا ہے اس میں نمائشی طور پر کچھ اچھے اصول اور رہنمائی ضرور موجود ہے لیکن فوج کو ریاست اور تینوں شہری بازو یعنی مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ پر بالاتری حاصل ہے ۔یہی وہ طریقۂ کار تھا جس کی مدد سے فوجی آمریت نے برسوں تک مصری قوم کا استحصال کیا لیکن حالیہ بیداری کے بعد یہ حربہ ہرگز مصر میں چل نہیں سکتا۔ فوج ایکطرف تو قانون کی حکمرانی کا نعرہ لگاتی ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے یہ منافقانہ رویہ اب قابلِ عمل نہیں ہے ۔ موجودہ صورتحال کے تناظر میں یہ ناممکن ہے کہ فوج خود اپنا بجٹ بناکر عوام پر تھوپ دے اور قومی تحفظ کی آڑ میں اپنے مفادات کی حفاظت کرے ۔مصری عوام اس طرح کے کسی دستور کو قبول نہیں کریں گے بلکہ ان کا جاءز اور معقول مطالبہ یہ ہے ایک آزاد ادارے کے تحت پہلے صاف و شفاف انتخابات کا انعقاد ہو ۔اس کے بعد عوامی حکومت کا قیام عمل میں آئے جو دستور کی تدوین کی ذمہ داری کو ادا کرے ۔

مظاہروں کے دوران ایک چونکا دینے والی خبر یہ آئی کہ اخوان المسلمون اور اسکے سیاسی بازو حریت و انصاف پارٹی نے اپنے کارکنان کو تحریر چوک پر آنے

سے روک دیا ہے گویا فوجی حکام کے ساتھ مذاکرات میں شرکت کرنا فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دینے یا اس سے ہاتھ ملا لینے کے مترادف ہے حالانکہ یہ اس بے بنیاد بات کا حقیقتِ حال سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ فوج نے اس ماہ کے اوائل میں جب اس دستوری موشگافی کا اعلان کیا اسی وقت سے یہ افواہ گردش کرنے لگی جس کی باقاعدہ تردید اخوان رہنما ڈاکٹر سعد الکتانی نے کی۔ انہوں نے صاف کہا کہ حریت وانصاف پارٹی اس مسودے کو مکمل طور پر مسترد کرتی ہے۔ دستور کے یہ نام نہاد رہنما اصول ۲۵ جنوری کو برپا ہونے والے انقلاب کی روح کے سراسر منافی ہیں۔ حکام کو اس طرح عوام پر اپنی مرضی تھوپنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ انہیں عوام کے جذبات کا احترام کرنا چاہئے جنھوں نے بڑی قربانیاں دے کر ملک میں عظیم انقلاب برپا کیا۔ ڈاکٹر الکتانی نے واضح کیا کہ ان کی پارٹی فوجی پابندیوں کو تسلیم نہیں کرے گی اور خاموش تماشائی نہیں بنی رہے گی۔ اس موقف کو اخوان نے کل جماعتی اجتماع میں حکومت تک کے سامنے واضح انداز میں رکھ دیا اور اس موضوع پر گفتگو کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد سیاسی جماعتوں کی میٹنگ میں اس فوجی دستور کو متفقہ طور پر مسترد کیا گیا اخوان اس ۳۴ میں پیش پیش تھے نیز ۱۸ نومبر سے ہونے والے تحریر چوک کے احتجاج میں شرکت کا اعلان کیا گیا۔ یہ تمام تفصیلات ۱۷ نومبر سے اخوان کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ اس کے باوجود الجزیرہ نے اپنے نامہ نگار کے حوالے یہ بے بنیاد افواہ اڑائی جو ساری دنیا میں پھیل گئی۔

اخوان المسلمون کے ترجمان ڈاکٹر محمود غزلان نے شباب ٹیلی وژن کے نامہ نگار سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے موقف کی مزید وضاحت کی اور کہا اگر فوجی حکام اور نائب وزیر اعظم علی السلمی دستور کے ان رہنما اصولوں کو واپس نہیں لیتے تو ہم تحریر چوک پر ہونے والے احتجاج میں شریک ہوں گے ۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ انقلاب کے بعد سے اپنے مطالبات کو منوانے کیلئے عوام کے پاس دباؤ بنانے کے علاوہ کوئی اور متبادل موجود نہیں ہے اس لئے انہیں بار بار سڑکوں پر اتر کر آنے کیلئے مجبور ہونا پڑتا ہے جو پسندیدہ صورتحال نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے احتجاج کے دوران حالیہ تعطل کے خاتمے کی غرض سے جس میٹنگ میں شرکت کی آڑ میں یہ افواہ اڑائی گئی تھی اس میں اخوان کے علاوہ دوسری سیاسی جماعتیں بھی شریک تھیں لیکن صرف اخوان کے حوالے سے غلط فہمی پھیلائی گئی جبکہ فوجی ٹولے کے اقتدار کو جون تک منتقل کرنے پر راضی ہو جان حریت و انصاف پارٹی کے صدر ڈاکٹر محمود مورسی کی کوششوں کا ثمر ہے ورنہ کم از کم ۲۰۱۳ء تک اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

جس فوج نے حسنی مبارک کے زمانے میں اپنی عوام پر گولی چلانے سے انکار کردیا تھا اس سے یہ توقع کسی کو نہیں تھی کہ وہ شہید ہونے والوں کے لواحقین پر گولیاں برسائے گی اور دیکھتے دیکھتے دسیوں لاشیں گرادے گی۔ اس موقع پر فوجی

حکمرانوں کو چاہئے تھا کہ قرآنِ مجید کی اس ہدایت کو پیشِ نظر رکھتے جس میں ربِ کائنات کا ارشاد ہے کہ :زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے (قریب ہے (۷۔۵٦

فوجی حکمرانوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ مظاہرہ کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔اس لئے کہ وقتی طور پر سہی یہ جو اقتدار کی باگ ڈور ان کے ہاتھ آئی ہے اس کا سہرہ صرف اور مظاہرین کے سر ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ عمل نہ آتے تو حسن طنطاوی نہ جانے کب تک حسنی مبارک کے آگے دم ہلاتے رہتے اور آگے چل کر ان کے بیٹے جمال مبارک کے بندۂ بے دام بن جاتے جسے اقتدار سنبھالنے کیلئے اسی طرح تیار کیا جارہا ہے تھا جیسے کہ ہندوستان میں راہل گاندھی کی تاجپوشی کی تیاری چل رہی ہے۔احسانمندی کا تقاضہ تو یہ ہے فوج ان مظاہرین کی ممنون و مشکور ہو، جلد از جلد اپنی اس عارضی ذمہ داری کو ادا کرکے اقتدار عوام کے نمائندوں کے حوالے کردے اوراپنی چھاؤنی میں لوٹ جائے۔خود فوج کا اپنا وقار و احترام بھی اسی صورت محفوظ رہے گا۔لیکن جب فرعونیت دماغ میں گھس جاتی ہے تو انسان کی عقل ماری جاتی ہے لیک ایسے انسانوں کوفرحت عباس کا یہ شعر یاد رکھنا چاہئے

یہ تو وقت کے بس میں ،ہے کہ کتنی مہلت دے

ورنہ بخت ڈھلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

گزشتہ منگل کو ایک لاکھ لوگوں کے تحریر چوک پر جمع ہونے کا یہ دباو تو ضرور ہی پڑا کہ فیلڈ مارشل حسین طنطاوی کو پہلی بار عوام سے خطاب کرنے پر مجبور ہونا پڑا انہوں نے اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے پر صرف کر دیا کہ فوج کس قدر غیر جانبدار ہے۔ وہ کس خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر رہی ہے اور وہ انتخابات کی انعقاد میں کس قدر سنجیدہ ہے۔ وہ بار یہ کہتے رہے کہ فوج کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے انتخابات کون منعقد کرواتا ہے اور صدر کون بنتا ہے؟ انہوں نے عوام کو یقین دلایا کہ فوج اقتدار کی منتقلی کے حوالے سے سنجیدہ ہے اور اگر عوام یہ چاہتے ہیں کہ اقتدار سے مکمل طور پر دستبردار ہو کر فوج دوبارہ اپنے بیرک میں چلی جائے تو اس کا فیصلہ استصواب کے ذریعہ ہوگا۔ یہ خطرناک موقف ہے گویا انہیں تحریر چوک پر مظاہرین کے ٹھاٹیں مارتے ہوئے سمندر پر اعتبار نہیں ہے جو وہ استصواب کے خواب سجا رہے ہیں نیز اگر وہ استصواب فوج کے زیرِ نگرانی ہوتا ہے تو اس کے غیر جانبدار ہونے کا امکان کس قدر ہے؟ اس احتجاج کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ پہلی مرتبہ فوج کی جانب سے انتقالِ اقتدار کا واضح ٹائم ٹیبل سامنے آیا اور جو ۲۰۱۳ کی قیاس آرائی کی جارہی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ طنطاوی کے مطابق جون تک صدارتی انتخابات کی تکمیل ہو جائیگی اور جولائی ۲۰۱۲ میں اقتدار عوام کے نمائندوں

کے حوالے کر دیا جائیگا۔ مظاہرین پر اس خطاب کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا کیوں کہ فوجی حکمراں اقتدار کے معاملے میں اپنی وعدہ خلافی کیلئے مشہور ہیں۔ جب اقتدار کی کرسی ان کے ہاتھ آتی ہے تو وہ جونک کی مانند اس سے چمٹ جاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جان جائے مگر کرسی نہ جائے۔ حسن طنطاوی کو یاد رکھنا چاہئے کہ کرنل معمر قذافی ان سے کہیں زیادہ طاقتور تھا لیکن اس کے باوجود اس کا فوجی دبدبا اس کے کسی کام نہ آیا ۔جو بندوق اپنی عوام پر کھلتی اس کا رخ بالآخر چلانے والوں کی جان مڑتا ہی مڑتا ہے۔ اگر طنطاوی کو لگتا ہے کہ اسرائیل کے مفادات کے پیشِ نظر ناٹو کبھی بھی ان کی مخالفت نہیں کرے گی تب بھی انہیں پتہ ہونا چاہئے کہ مجاہدین اسلام کا کامل انحصار کسی بھی دنیاوی وسائل مثلاً ناٹو پر نہیں ہوتا وہ اللہ پر توکل کرکے جہاد کرتے ہیں جسکی زندہ مثال افغانستان ہے جہاں انہوں نے خود ناٹو تک کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کی مدد و نصرت جس کے شامل حال ہوتی ہے اسے کوئی فیصلہ کن اور آخری شکست سے دوچار نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ ارشادِ خداوندی ہے وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا { اللہ کا بول ہی بالا ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جو غالب و سربلند ہونے والا ہے }

کھلا ہے جھوٹ کا بازار، آؤ سچ بولیں

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان میں جس طرح تین موسم (سردی گرمی اور برسات) پائے جاتے ہیں اسی طرح پارلیمان کے تین اجلاس بھی ہوتے ہیں موسمِ سرما میں سرمائی موسمِ باراں میں بارانی اور موسمِ گرما میں بجٹ اجلاس۔ بجٹ اجلاس کو گرمائی اس لئے نہیں کہا جاتا کہ بجٹ کی گرمی موسم کی شدت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ممکن ہے بہت جلد موسم کو اجلاس کے نام سے موسوم کردیا جائے اور اسے موسمِ بجٹ کہہ کر پکارا جائے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کیا اس ارضِ جنت نشان میں بہار و خزاں کے موسم نہیں پائے جاتے؟ کیوں نہیں، لیکن ان کی نوعیت قدرتی موسم سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں موسم پر بھی جمہوریت کا رنگ غالب آگیا ہے اور وہ بھی عوام و خواص میں فرق کرنے لگے ہیں۔ حکمران طبقہ یہاں پر سال بھر بہار کا مزہ لوٹتا رہتا ہے۔ اسی لئے ہر کوئی چاہتا ہے کہ اس طبقے میں شامل ہو جائے اور جب کسی کو یہ سنہری موقع ہاتھ آجاتا ہے وہ کسی صورت اس سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا۔ اس کے برعکس محروم عوام ہیں جو صدا بہار خزاں سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خزاں بھی کوئی مزہ لینے کی چیز ہے؟ کیوں نہیں، انسان جب کسی چیز کا عادی ہو جائے تو وہ اس سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ شہ اچھی ہے یا بری؟ مضر ہے یا مفید؟ منشیات

کے عادی افراد اس امر کا ثبوت ہیں۔وہ بلا سوچے سمجھے نشے میں مست ہوتے ہیں۔
ویسے بقول خشونت سنگھ ہندوستان کی عوام کا سب سے بڑا نشہ انتخابی سیاست ہے کہ جب وہ جو سرچڑھ کر بولتا ہے اور اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دیتا ہے۔
اس سال بھی جب پارلیمان کا سرمائی اجلاس گرما گرم تصادم کا شکار ہوا تو قیاس لگایا جارہا تھا کہ یہ گزشتہ سال کا ریکارڈ توڑ دے گا جس میں صرف ٦ فی صد وقت کام میں صرف ہوا تھا بقیہ ضائع ہو گیا تھا لیکن اس بار نصف اجلاس کے خاتمے پر حکومت نے عقل کے ناخون لئے جس کے نتیجے میں کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔بھارت میں غیر ملکی کمپنیوں کو سُپر بازار کھولنے کی اجازت دیئے جانے کے سوال پر سرکار نے بالآخر گھٹنے ٹیک دیئے اور اس اقدام کو فی الحال معطل کرنے کا اعلان کردیا۔اس مسئلے پر جو سیاسی ہنگامہ آرائی اور تعطل پیدا ہوا تھا اس سے نکلنے کیلئے حکومت کے پاس مندرجہ ذیل چار متبادل موجود تھے :
اپنی اخلاقی شکست کو تسلیم کرکے سپر بازار میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے فیصلے کو معطل کردیا جائے○
بھارتیہ جنتا پارٹی کی جانب سے پیش کردہ تحریک التوا پر بحث اور پھر رائے شاری کا خطرہ مول لیا جائے○
اس مسئلے پر تحریک اعتماد پیش کرکے حامیوں کیلئے آزمائش پیدا کردی جائے نیز مخالفین کی ہوا نکال دی جائے○

پارلیمان کے سرمائی اجلاس کو ہنگاموں کی نذر کر دیا جائے۔
حکومت کے پیش نظر چونکہ اس سرمائی اجلاس میں لوک پال بل، زمین کو حکومتی استعمال میں لینے کا قانون، پنشن کا بل، ترقیاتی محکمہ کا قانون اور جوہری تحفظ کا بل پیش کرنا مقصود ہے اس لئے اس نے آخری متبادل سے گریز کیا۔ ترنمول اور ڈی ایم کے اڑیل رویہ کے چلتے حکومت ۲۰۰۸ کے نیوکلیائی بل کی مصداق سخت موقف نہیں اختیار کر سکی اور مجبوراً اسے پہلے متبادل پر راضی ہونا پڑا۔ وزیر اعظم اور وزیر تجارت آنند شرما علی الاعلان یہ کہہ چکے تھے کہ اس معاملے میں کسی قسم کی مصالحت نہیں ہوگی اس کے باوجود کانگریس پارٹی اور وزیر اعظم کو جھکنا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ بی جے پی اب بھی معطلی کے بجائے منسوخی پر اصرار کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اس سیاسی دھینگا مشتی کا سارا کریڈٹ تو کانگریس کی حلیف اور اشتراکیوں کی حریفِ اول ممتا کی جھولی میں چلا گیا اور حزب اختلاف کی دونوں بڑی جماعتیں جو خم ٹھونک کر میدان میں ایک ساتھ اتری تھیں ہاتھ ملتی رہ گئیں۔ اس لئے اب کھسیانی بلی کی مانند کھمبا نوچ رہی ہے جس کے نتیجے میں خود اس کے اپنے ناخون لہولہان ہو رہے ہیں۔
حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان جاری محاذ آرائی میں دلچسپ موڑ اس وقت آیا

جب متحدہ ترقی پسند محاذ میں شامل ترنمول کانگریس اور ڈی ایم کے نے اس مسئلے پر کانگریس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ ایک ایسی عجیب و غریب صورتحال تھی جس میں ایک دوسرے کے ازلی دشمن سمجھے جانے والے فسطائی اور اشتراکی ایک ساتھ ہو گئے تھے جبکہ حکومتِ وقت کی دائمی ہمنوا علاقائی موقع پرست جماعتوں نے سرکار کی مخالفت کا فیصلہ کیا تھا۔ کرونا ندھی کی بیٹی کنی موزی کو ٹوجی گھپلے میں جس طرح مرکزی حکومت نے انہیں خوار کیا ہے اس کے چلتے ڈی ایم کے اس رد عمل کی توقع تو تھی لیکن ممتا بنرجی کا رویہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔

ممتا جب تک اپوزیشن میں تھیں تو اس وقت مغربی بنگال کی اشتراکی حکومت پر بڑھ چڑھ کر تنقید کیا کرتی تھیں۔ انتخابی مہم کے دوران انہوں اپنے رائے دہندگان کو نہایت خوش آئند خواب دکھلائے لمبے چوڑے وعدے کئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے ان پر اعتماد کر کے اقتدار کی باگ ڈور ان کو سونپ دی۔ اب مسئلہ یہ ہے ان میں سے ایک ایک کر کے سب خواب ٹوٹ رہے ہیں۔ ممتا کی سمجھ میں آنے لگا ہے الزام لگانا اور وعدہ کرنا جس قدر سہل ہے ان کو نبھانا ایسا آسان نہیں ہے۔ اس لئے ممتا اب سیاسی بازیگری پر اتر آئی ہیں۔ پہلے انہوں نے پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف کڑہ رخ اپنایا اور پھر ریاستی خزانے کیلئے خطیر رقم حاصل کر کے خاموش ہو گئیں۔ اس بار انہوں نے سپر بازار کے معاملے میں غیر مصالحت کا رویہ اپنا کر اپنے آپکو غرباء و مساکین کا سب سے

بڑا حامی بنا کر پیش کر دیا جس کا یقینی فائدہ انہیں سی پی ایم کے خلاف آئندہ انتخابات میں ہوگا۔

وزیر خزانہ پرنب مکھرجی کا دعویٰ ہے کہ بعض جماعتوں کی جانب سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش اس مسئلے کے حل کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ان کے مطابق غیر ملکی کمپنیوں کی آمد سے ترقی کی رفتار بڑھے گی اور کسانوں و صارفین دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ان کے مطابق دیگر ممالک کے تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ سپُر بازار کھولنے سے بنیادی ڈھانچے میں بہتری آتی ہے۔ لیکن حزب اختلاف اور حکومت کی دو اتحادی جماعتوں کے مطابق اس فیصلے سے کسانوں کا استحصال ہوگا اور کرانے کے چھوٹے کاروبار تباہ ہو جائیں گے۔ جہاں تک اس کے پس پردہ کھیلی جانے والی سیاست کا سوال ہے وفاقی وزیر برائے ریلوے دنیش ترویدی جن کا تعلق ترنمول کانگریس سے ہے کہتے ہیں کہ ' ملک کا آئین کوئی روٹری یا لائنس کلب نہیں ہے، آئین سیاسی ہے، سب کچھ سیاسی ہے اور یہ فیصلہ بھی سیاسی مسئلہ ہے، جو لوگ تنگ نظریہ سے سوچتے ہیں وہ ہی اس فیصلے کی مخالفت کو سیاسی فائدہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ سپر بازار کے مسئلے پر ترویدی کا دوٹوک جواب اس شعر کی یاد دلاتا ہے

کھلا ہے جھوٹ کا بازار، آؤ سچ بولیں
نہ ہو بلا سے خریدار، آؤ سچ بولیں

ترنمول، ڈی ایم کے، اشتراکی یا فسطائی جو بھی کہیں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ سارا معاملہ سیاسی ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ۸ ہزار چھوٹے بڑے شہر ہیں۔ جن میں سے صرف ۵۳ کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے تو گویا غیر ملکی سپر بازاران ۵۳ شہروں میں آئیں گے بشرطیکہ وہاں کی ریاستی حکومتیں اس کی توثیق کریں۔ چونکہ فی الحال نصف سے زیادہ ہندوستان کی ریاستی حکومتوں پر حزب اختلاف یا علاقائی جماعتوں کا قبضہ ہے اس لئے کل ملا کر ۲۵ کے آس پاس ایسے سپر بازار کھل سکیں گے جن میں زیادہ سے زیادہ ۵۱ فیصد سرمایہ کاری بیرونی ہوگی اور ۴۹ فیصد سرمایہ داخلی ہوگا۔ ان دوکانوں میں بکنے والا کم از کم ۳۰ فیصد مال بھی ہندوستان کی اپنی پیداوار ہوگا اور کام کرنے والے ۱۰۰ فیصد ملازم دیسی ہوں گے۔ اس کے باوجود اس قدر شور شرابہ محض سیاست کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے جس کا اندازہ اس شعبے میں بیرونی سرمایہ کاری کی تاریخ سے لگایا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے خوردہ بازار میں بیرونی سرمائے کی آمد اس زمانے میں ہوئی جب وزیر اعظم منموہن سنگھ نرسمھا راؤ کے تحت وزیر خزانہ ہوا کرتے تھے۔ اس وقت انہوں نے محدود پیمانے پر ڈیری فارم نامی بین الاقوامی کمپنی کو ہندوستان میں سرمایہ کاری کا موقع دیا لیکن آگے چل کر وزیر خزانہ چدمبرم نے اس پالیسی

کوبدل دیا اس لئے کہ وہ سرکار اشتراکیوں کی حمایت پر قائم تھی۔ بی جے پی کے متحدہ قومی محاذ کو جب اقتدار حاصل ہوا تو اس نے بھی اس جانب پیش رفت کی اور اس کی مخالفت کرنے والے کوئی اور نہیں بلکہ کانگریسی تھے۔ یہ ۲۰۰۴ کی بات ہے جب کانگریس پارٹی کے سابق وزیر پریہ رنجن داس منشی نے پارلیمان کے اندر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ حکومت کو ہندوستان کے خوردہ تاجروں کو یقین دلانا چاہئے کہ ان کے کاروبار میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت نہیں کی جائیگی اس لئے کہ اس کے نتیجے میں وہ نہ صرف بیروزگار ہو جائیں گے بلکہ ان کی تجارت مکمل طور پر تباہ و برباد ہو کر رہ جائیگی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بین الاقوامی کمپنیاں انتظامیہ کی مدد سے حکومت پر دباؤ ڈال رہی ہیں۔ بیرونی سرمائے کے اس شعبہ میں آمد سے مقامی بیوپاریوں کو حاصل سارے مواقع چھن جائیں گے۔

آج کل کانگریسی خود اپنی اس مخالفت پر پردہ ڈال کر بی جے پی کو اس باب میں ان کے اقدامات کی یاد دلاتے ہیں اور بی جے پی کو ان کے منشور کے حوالے بتاتے ہیں تو بی جے پی یہ کہہ کر اپنا دامن جھٹک دیتی ہے کہ وہ ان کا نہیں متحدہ قومی محاذ کا منشور تھا اور اس ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے گویا بی جے پی کا این ڈی اے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ جس مرلی منوہر جوشی نے بی جے پی بنام این ڈی اے کا مذکورہ منشور لکھا انہیں کی قیادت میں پارلیمانی اسٹینڈنگ

کمیٹی بیرونی سرمایہ کاری کی مخالفت کر دیتی ہے اور بی جے پی ہی کے شانتا کمار کی قیادت میں قائم کردہ پینل اس سرمایہ کاری کا حامی نظر آتا ہے گویا جو بھی جماعت جب حزب اختلاف میں ہوتی ہے تو مخالفت ہوتی ہے تاکہ عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے صدائے احتجاج بلند کی جائے اور جب اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو پھر سرمایہ داروں کو خوش کرنے کیلئے یہ بل دوبارہ درآمد کر لیا جاتا ہے گویا وقت کے ساتھ سیاسی جماعتوں کا پینترا بدل جاتا ہے اسی کو کہتے ہیں اول درجہ کی منافقت ۔

کانگریس والے اس اقدام کو ایک انتظامی فیصلہ قرار دیتے ہیں جسے پارلیمان کی توثیق کی کوئی ضرورت نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حکومت کے کسی بھی فیصلے کے خلاف حزب اختلاف کو تحریک التواپیش کرنے کا حق حاصل ہے ۔ اس بار پارلیمانی اجلاس سے قبل بی جے پی اور کمیونسٹوں کے اندر اچھا خاصہ تال میل دیکھنے کو آیا تھا۔ شاید یہ مغربی بنگال میں شکست کا نتیجہ ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ یہ دوستی کم از کم بنگال اور کیرالہ کی حدتک سہی انتخابی مفاہمت میں بدل جائے ۔ یہ انتخابی سیاست ہے اس میں کچھ بھی ہوسکتا ہے اس لئے کہ یہاں دوستی اور دشمنی کا معیار اصول و ضابطہ پر نہیں بلکہ مفادپرستی ہوتی ہے۔ اس بار بی جے پی اور کمیونسٹ پارٹی نے آپس میں یہ طے کیا کہ وہ سرکار پر دوطرفہ حملہ کریں گے ایک مہنگائی کے مسئلے پر حکومت کو گھیرے گا تو

دوسرا کالے دھن کا راگ سنائے گا لیکن اس جگل بندی میں دونوں ایک دوسرے کی حمایت کریں گے۔

جس وقت اس حکمتِ عملی کو طے کیا جا رہا تھا کسی کے خواب و خیال میں بات نہیں تھی کہ کانگریس جیسی گھاگ پارٹی سر بازار کا یہ مدعا طلائی طشتری میں سجا کر ان کے سامنے رکھ دے گی۔ اسے کانگریس پارٹی کی ناعاقبت اندیشی کہیں یا بیجا خود اعتمادی جو اس نے پارلیمانی اجلاس کے دوران یہ فیصلہ کر دیا اور سارے لوگ سب کچھ بھول بھال کر اس کے پیچھے پڑ گئے نوبت یہاں تک آپہنچی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور بائیں بازو کی جماعتیں حکومت کے اس فیصلے پر التوا کی تحریک کے تحت بحث اور ووٹنگ اڑ گئیں۔ حکمراں اتحاد میں شامل ترنمول کانگریس اور ڈی ایم کے ان کے ساتھ ہو گئے۔ ان کی حمایت کے بغیر حکومت کو لوک سبھا میں اقلیت میں آگئی جو حکومت کے لیے ایک بڑا جھٹکا تھا۔ اس لیے حکومت ایسی شق کے تحت بحث کرانے کی کوشش میں لگی گئی جس میں ووٹنگ لازمی نہ ہو اور قرارداد کا متن ایسا نہ ہو جس کے منظور ہونے سے حکومت کی سرزنش ہوتی ہو۔ حکومت کی کمزوری نے حزب اختلاف کے حوصلے بلند کر دیئے ہیں اور وہ اب کل جماعتی میٹنگ کا مطالبہ کر رہا ہے تاکہ قرارداد کے الفاظ ان کی مرضی سے طے

ہو سکیں۔ اس کا اصرار ہے کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا تو احتجاج جاری رہے گا اور پارلیمان کو چلنے نہیں دیا جائیگا۔ حکومت نے اس مطالبے کو بھی تسلیم کر لیا ہے اور ۷ دسمبر کو یہ اجلاس طلب کر لیا گیا ہے۔ اس سیاسی اٹھا پٹخ کا نتیجہ جو بھی ہو لیکن اس میں شک نہیں کے سپر بازار کے اس معاملے میں سرکار اور وزیر اعظم کی عزت سرِ بازار نیلام ہوئی ہے اور اس مسئلے نے پارلیمان کو ایک مچھلی بازار میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ کانگریس پارٹی اور پرنب مکرجی نے وزیر اعظم منموہن سنگھ کی جو حالت کی ہے وہ مندرجہ ذیل شعر مصداق ہے۔

مجھ کو رسوا سرِ بازار نہ کروایا کرے
جس مصیبت نے گزرنا ہے گزر جایا کرے

ہمارے ملک میں بہت سارا کاروبار موسمی ہوتا ہے بازارِ سیاست کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے لیکن فطرت کے موسم اور پارلیمانی اجلاس میں ایک فرق مدتِ کار بھی ہوتا ہے۔ ہر موسم کم و بیش چار ماہ پر محیط ہوتا ہے گویا کل ملا کر تینوں موسم پورے ۳۶۵ دن کا احاطہ کرتے ہیں لیکن پارلیمانی اجلاس کی سال میں صرف ۸۳ نشستیں ہوتی ہیں۔ بجٹ پر بحث کرنے کیلئے سب سے زیادہ ۳۵ دنوں کی مدت کو مختص کیا گیا ہے جبکہ باقی ماندہ دو اجلاس کیلئے ۲۴ دنوں پر اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ ویسے یہ ۸۳ دن بھی ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے خاصے مہنگے پڑتے

ہیں۔ ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا میں اس ڈرامے کو رچانے کا خرچ بالترتیب ۶۵ء۷۴ ۳ اور ۳۳ء۱۷۲ کروڑ روپے ہے۔ وزارتِ پارلیمانی امور کو اس کے علاوہ ۷ ۴ء۷ کروڑ روپے مہیا کئے جاتے ہیں۔ کل تخمینہ ۴۵ء۵۲۷ کروڑ روپے ہے گویا ۳۵ء۶ کروڑ روپے یومیہ کا خرچ۔ اس سال کے سرمائی اجلاس کا نصف ہنگامہ آرائی کی نذر ہوگیا جس سے ۲۵ء۹۵ کروڑ روپے نذرِ آتش ہوگئے۔ عام آدمی کیلئے یقیناً یہ ایک خطیر رقم ہے لیکن جہاں ٹوجی، سی ڈبلیوجی اور مکانات کے تین گھپلوں پر تین لاکھ کروڑ خرد برد کر دیئے گئے وہاں سو کروڑ کی کیا بساط اس لئے کہ ان تین کے علاوہ اور نہ جانے کتنی بد عنوانیاں پارلیمان کے قبرستان میں دفن ہیں بقول غالب "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں"۔

سپریم کورٹ کے معروف ریٹائرڈ جسٹس کرشنا ایئر نے اس صورتحال پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ سیاستدان اس احساس سے بے بہرہ ہیں کہ ہر منٹ جو وہ پارلیمان میں ضائع کیا جاتا ہے اس پر عام آدمی کا قیمتی سرمایہ صرف ہوتا ہے۔ سیاستدانوں کی اس لاپرواہی کی وجہ یہ ہے کہ ان کی گذربسر ہی ٹیکس دہندگان کے استحصال شدہ دولت پر ہوتا۔ ایک چونکا دینے والے مطالعہ کے مطابق ۱۹۵۱ میں پارلیمان چلانے کیلئے فی منٹ خرچ صرف ۱۰۰ روپے تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب سیاست سوداگری نہیں ایمانداری پر چلتی تھی۔ بازارِ سیاست میں انسانی ضمیر کا سودہ نہیں ہوتا تھا۔ اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن پر یہ

ے شعر صادق آتا تھا

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

آزادی کے بعد گزشتہ ۶۰ سالوں میں سیاست بازارِ حسن بن گئی اور سیاستدانوں کی حالت متاع کوچہ و بازار کی سی ہو گئی ۔ فی الحال پارلیمانی اخراجات پر خرچ ۱۹۵۱ کے بالمقابل ۴۵ گنا بڑھکر ۴۴۹۰ روپے فی منٹ ہوگیا ہے۔ اس کے باوجود ہنگامہ آرائی اورضیائے وقت میں اضافہ ہی ہوا۔ ۱۹۹۶تا ۱۹۹۸ کی ۱۱ ویں لوک سبھا میں صرف ۲۸ء فی صد وقت ضائع ہوا تھا جبکہ ۱۹۹۹تا ۲۰۰۴ کے دوران یہ اعداد ۴ء ۲۲ تک پہنچ گئے ۵ اور فی الحال یہ ۳۸ فیصد کو چھو رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایوان زیریں کے بالمقابل ایوان بالا کا حال اور بھی برا ہے وہاں ۴۸ فیصد وقت ہنگامہ آرائی کی نذر ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے اگر ان اخراجات پر لگام لگائی جائے اور وقت کا صحیح استعمال کرکے مناسب منصوبہ بندی کی جائے تو فی زمانہ ہمیں کسی بیرونی سرمایہ کاری کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ بین الاقوامی سرمایہ کاری کے لاکھ فائدے سہی لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ان سرمایہ کاروں کی خصلت مردہ خور گدھ کی سی ہے جو لاشوں تک کو بھی چیر پھاڑ کرچٹ کر جاتے ہیں۔

انسانی حقوق اور سرکاری دہشت گردی

ہماری نسل کے لوگوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ویرپن کا نام نہ سنا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ رابن ہڈ کے اس دیسی اوتار کی حکومت ۶۰۰۰ مربع کلومیٹر کے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی ۔ اس سر پر پانچ کروڑ کا انعام تھا اس کے باوجود ۲۰ سال تک تین ریاستوں کی پولیس اسے گرفتار نہ کر سکی ۔ اس بیچ اس نے ۱۸۴ لوگوں کا قتل کیا جن میں سے اکثریت پولیس کی تھی ویسے کرناٹک سرکار کا ایک وزیر بھی اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ بالآخر اسے دھوکے سے زہر دے کر ہلاک کیا گیااور جب گاؤں والے اسے ہسپتال لے جارہے تھے دو درجن پولیس والوں نے اس کے تین محافظوں پر بزدلانہ حملہ بول دیا اور ان پر قابو پانے میں کئی گھنٹے لگے۔ یہ ویرپن کی زندگی کا انسانی پہلو ہے لیکن اس ایک معاشی رخ بھی ہے ۔اس نے ۲۰۰ ہاتھیوں کا شکار کرکے ان کے دانت اور کھال کی فروخت سے تقریباً ۱۳ کروڑ روپے کمائے ۔ اسی طرح ۱۱۳ کروڑ روپے کی صندل اسمگل کی ۔ کنڑ فلمی اداکار راجکمار کو اغوا کرکے ۱۰۹ دن اپنے پاس رکھا اور تین کروڑ کی پھروتی وصول کرنے کے بعد رہا کیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ساری عمر جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اسکی بیوی ایک ننھی سی کرانے کی دوکان چلاتی رہی وہ خود ایک ریڈیو کے علاوہ کسی جدید سامانِ تعیش سے استفادہ نہیں کر سکا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ

سارا دھن دولت کہاں چلا گیا جو اس نے جمع کیا تھا؟ اس بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ کسی غار میں پوشیدہ ہے جس کا علم کسی کو نہیں ہے۔ان ناقابلِ یقین واقعات کو اس ملک کے کروڑوں لوگ صحیح سمجھتے ہیں اس لئے کہ جو لوگ اس کے نام پر اپنی تجوریاں بھرتے رہے وہی اس کے محافظ تھے اور وہی اس کے متعلق نت نئی کہانیاں گھڑ کر مشہور کردیتے تھے اور سارے لوگ اس پر یقین کر لیتے تھے۔ ایسا صرف ہمارے عظیم ملک ہندوستان میں ممکن ہے۔ دنیا کے کسی اور حصہ میں اس طرح کا چمتکار رونما نہیں سکتا لیکن یہاں سب چلتا ہے۔

وہ پولیس جو ویرپن کی تلاش میں برسوں جنگلوں کی خاک چھانتی رہی وہ بہار کے پورنیہ ضلع میں کھتاہت گاؤں کے اندر ستر سالہ محمد ایوب کے مکان پر چھاپہ مار کر ان کے ۱۹ سالہ لڑکے آفتاب عالم کو گرفتار کرلیتی ہے۔آفتاب عالم حافظِ قرآن ہے۔ اس نے دوسال قبل بہار مدرسہ بورڈ سے فوقانیہ یعنی میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اپنے والد کی کرانے کی دوکان پر بیٹھ گیا تاکہ اپنا گھر چلا سکے۔ پولیس کا الزام ہے کہ آفتاب عالم نہ صرف دہلی، ممبئ بلکہ بنگلور کے بم بلاسٹ میں ملوث ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص اتنے بڑے شہروں میں بم دھماکے کرتا پھرتا ہے وہ آخر اپنے گاؤں کے اندر معمولی سی دوکان کیا صرف تفریح کیلئے چلاتا ہے جیسا کہ ویرپن کی بیوی چلاتی تھی اور اس نے بھی ان بم دھماکوں کے ذریعہ ہاتھ آنے والی دولت کو کسی غار میں چھپا رکھا ہے

اور اگر ایسا ہے کہ وہ دولت کااس کا استعمال ہی نہیں کر سکتا تو آخر اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر اسے کماتا کیوں ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر وہ خود یہ نہیں کرتا تو وہ کون ہے جو اس کے نام پر یہ سب کرتا ہے ؟ اور وہ گرفتار کیوں نہیں ہوتا ؟

بہار میں فی الحال مسلم دوست سمجھے جانے والے وزیر اعلیٰ نتیش کمار کی حکومت ہے لیکن اس کے باوجود آفتاب سے قبل ۵ نوجوانوں کو گرفتار کیا جاچکا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں سے دو کو مدھوبنی اور ایک کو سمتی پور سے گرفتار کیا گیا۔ دو نوجوان دہلی اور ایک چنئی سے گرفتار ہوا۔ دہلی پولیس کا الزام ہے کہ آفتاب بہار کے اندر انڈین مجاہدین کو قائم کرنے میں مصروف تھاجبکہ بچہ بچہ اس بات سے واقف ہے انڈین مجاہدین صرف اور صرف خفیہ ایجنسیوں کی افترا پردازی ہے ۔ اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔اسے سرکاری دہشت گردی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے انتظامیہ نے ایجاد کیا ہے ۔ اس کو قائم کرنے اور پھیلانے کا کام اگر کوئی کرتا ہے تو وہ صرف اور صرف پولیس کا محکمہ ہے ۔

اب آفتاب کا آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب راجستھان میں سامنے آیا جہاں عدالت نے جے پور دھماکے میں گرفتار ہونے والے ۱۴ میں سے ۱۱

ملزمین کو باعزت بری کر دیا۔ ان لوگوں کو ویسے تو بی جے پی کے دورِ اقتدار میں گرفتار کیا گیا تھا لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہاں اقتدار میں آنے والی کانگریسی سرکار نے انہیں انصاف مہیا کروایا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈھائی سال قبل کانگریسی وزیرِاعلیٰ اشوک گہلوت نے دہلی کے اندر داخلی تحفظ کے اجلاس میں بڑے طمطراق کے ساتھ اعلان کیا تھا جے پور میں ہونے والے بم دھماکے کی سازش کو طشت ازبام کر دیا گیا ہے۔ اس کارخیر کا کریڈٹ انہوں نے ریاستی اے ٹی ایس کو دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کارروائی میں دہلی اور اترپردیش کے نوجوان ملوث تھے نیز راجاتان کے ایسے لوگوں کو بھی ملزم پایا گیا ہے جن کا تعلق کالعدم سیمی سے تھا اور وہ اس تحریک کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ان تمام الزمات کی تردید کر دی کہ ان کا سیمی سے کوئی دور کا بھی واسطہ تھا۔ ڈسٹرکٹ جج نیپال سنگھ نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ یہ نوجوان پوری طرح معصوم ہیں۔ دہشت گردی تو درکنار ان کے اوپر لگائے گئے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزامات بھی بے بنیاد پائے گئے ہیں۔

اس مقدمے میں رہا ہونے والے سہیل مودی اور اعظم گجدھر نے اخبار نویسوں کو بتلایا کہ انہیں دوہری ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اول تو اے ٹی ایس والے خوار کرتے رہے اور اس کے بعد جیل خانے کے اہلکاروں نے بدسلوکی کی۔ ان کہنا ہے

کہ ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویہ میں حکومت کی تبدیلی سے ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی شکست کے بعد بڑے ارمانوں سے ان کے رشتہ داروں نے کانگریس رہنماؤں سے اس بے بنیاد کیس پر نظر ثانی کی گہار لگائی لیکن مایوسی کے علاوہ کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ لگا۔ اشوک گہلوت سے جب مطالبہ کیا گیا کہ وہ کم از کم بی جے پی کی جانب سے متعین کردہ اے ٹی ایس کے فرقہ پرست ممبران کو تبدیل کرکے اس کی تشکیل نو کریں تو اس معمولی سی گزارش کو بھی وزیر اعلیٰ نے ٹھکرا دیا۔ ایسے میں ملزمین کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام وزیر داخلہ چدمبرم نے جے پور کا دورہ کرکے کیا۔ انہوں نے ان معصوموں کے بٹلہ ہاؤس کے فرضی انکاؤنٹر سے جوڑ دیا۔ چدمبرم کی احمقانہ حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیدالفطر کی نماز دیگر قیدیوں کے ساتھ پڑھنے کے مطالبے پر جیل کے حکام نے انہیں زدوکوب کیا۔ جو مسلمان کانگریس پارٹی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں ان کیلئے اس واقعہ میں سامانِ عبرت ہے۔ ان نوجوان نے رہائی کے بعد خود ان کو اور ان کے اہل خانہ کو ہونے والی جسمانی اور ذہنی اذیت کیلئے وزیر اعلیٰ کی جانب سے غیر مشروط معافی کا مطالبہ کیا ہے۔

قدرت کا انتقام بھی بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ جس بی جے پی ان معصوموں پر جھوٹا الزام لگایا تھا آگے چل کر اسی کے سینئر رہنما اندریش کمار پر اجمیر بلاسٹ

کیس میں ملوث ہونے کا الزام لگا اور اندریش کے ذریعہ دھماکے کی منصوبہ بندی کی خاطر گجرات گیسٹ ہاؤس کو مختص کرانے کے شواہد سامنے آئے ۔ اس سے آگے بڑھ کر رہا ہونے والے ملزم سابق وزیر اعلیٰ وسندھرا راجے اور ان کے وزیر داخلہ گلاب چند کٹاریہ کے خلاف جھوٹے الزامات مں پھنسانے کا مقدمہ دائر کرنے جارہے ہں ۔ یہ ینگا حوصلہ افزا پیشفش رفت ہے ۔ اور تو اور جس پولیس افسر نے اعظم گبدھر کو گرفتار کرنے احکامات جاری کئے وہ خود ایک فرضی انکاونٹر میں جیل کی چکی پیس رہا ہے۔ جیل کے اندر جب اسکی ملاقات اعظم سے ہوئی تو اس نے اعتراف کیا کہ ریاستی حکومت کے ایماء پر کارکردگی اور نتائج دکھلانے کا زبردست دباؤ تھا جس کے چلتے اس نے انکاونٹر کیا اور خود پھنس گیا۔ یہی گجرات میں بھی ہوا مودی کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے گجرات اے ٹی ایس کے افسران نے عشرت جہاں ، سہراب الدین اور نہ جانے کتنے بے گناہوں مسلمانوں پر آئی ایس آئی اور انڈین مجاہدین سے متعلق ہونے کا الزام لگا کر ہلاک کر دیا ۔ ہر انکاونٹر کے بعد یہ دعویٰ کیا جاتا کہ یہ مودی کو ہلاک کرنے کی سازش تھی تاکہ ہندو رائے دہندگان کی نظروں میں نریندر مودی کا احترام بڑھایا جاسکے۔ اور مودی خوش ہو کر ان کی ترقی کرے اور انہیں انعام و اکرام سے نوازے۔ اس میں شک نہیں کے مودی نے ان سفاک قاتلوں کی ایک وقت خوب پذیرائی بھی کی لیکن جب وہ ایک ایک کرکے پھنسنے لگے تو مودی نے اپنی چشمِ طوطی آنکھیں پھرلیں اور انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دیا۔

راجستھان مسلم فورم کی جانب سے ان نوجوانوں میں سے ہر ایک کو ۲۵ لاکھ روپے ہرجانہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔اس بات کا قوی امکان ہے کہ کانگریسی حکومت اس مطالبے کو پورا کرنے پر راضی ہو جائے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہرجانے کی رقم آخر کہاں سے آ ئیگی ؟اس بارے میں آندھراپردیش کی کانگریسی حکومت نے مکہ مسجد بم دھماکے کے مقدمے سے بری ہونے والے کی خاطر جو شرمناک طریقہ کاراختیار کیا ہے اس میں گہلوت کیلئے مشعل راہ ہے۔ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک منفرد واقعہ ہے جبکہ پولس کے مظالم کا شکار ہونے والے مظلومین کی خاطر حکومت نے ۷۰ لاکھ روپے ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ان نوجوانوں کو مکہ مسجد دھماکے کے لئے موردِالزام ٹھہرا کر گرفتار کیا گیا تھا جس کے ڈانڈے آگے چل کر ہندو دہشت گردوں سے جا ملے۔ وزیر اعلیٰ کرن کمار ریڈی کو اپنی حکومت بچانے کی خاطر مجلس اتحادالمسلمین کی حمایت درکار تھی سو انہوں نے اقلیتوں کے فلاحی ادارے کی جانب سے مذکورہ رقم کی ادائیگی کا اعلان کیا جو افراد کو دی جائیگی۔۲۰ لوگوں کو فرداً فرداً تین لاکھ اور بقیہ ۵۰ لوگوں کے حصے میں ۲۰ بیس ہزار فی فرد۔

اس ہرجانے کی ادائیگی کا مطالبہ اقلیتی کمیشن گزشتہ ایک سال سے کر رہا تھا۔ کمیشن نے یہ سفارش بھی کی تھی کہ رقم ان پولیس اہلکاروں کی تنخواہ میں ادا

کی جائیں جو اس ظلم وزیادتی کیلئے .براہِ راست ذمہ دار ہیں لیکن حکومت اس کے اپنے اشاروں پر کام کرنے والے اہلکاروں کی تنخواہ میں کٹوتی کی جرات کیسے کر سکتی ہے نیز وہ اسکی اپنی نظر میں اس فضول خرچی کیلئے سرکاری خزانے پر کیونکر بوجھ ڈال سکتی ہے اس لئے اربابِ حل و عقد نے ایک نادر ترکیب نکالی۔ اس رقم کی ادائیگی کیلئے مکہ مسجد اور شاہی مسجد کے باغات کی خاطر جو رقم مختص کی گئی تھی اس میں کٹوتی کر دی گئی ہے اور سرکاری حکم نامے میں اسے اعتماد بحالی کی سعی قرار دے دیا۔ گویا حکومت کا اعتماد مسلمانوں میں بحال کرنے کی قیمت خود مسلمانوں کی جیب سے ادا کی جارہی ہے۔

ریاست کے چیف سکریٹری ڈاکٹر محمد علی رفعت نے جو صفائی پیش کی اس نے کام اور خراب کر دیا۔ انہوں نے فرمایا یہ صرف ضابطے کی کارروائی ہے اور اسکی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے شعبے کے پاس کوئی رقم موجود ہی نہیں ہے گویا مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کیلئے ایک شعبہ قائم کر دیا گیا اور اس کو کوئی رقم فراہم نہیں کی گئی جس سے کوئی کام ہو سکے۔ کانگریس پارٹی کی منافقت کے بے شمار شواہد میں یہ ایک منفرد اضافہ ہے۔

یہ ایک تحقیق طلب موضوع ہے کہ کیا کانگریس پارٹی مسلمانوں کو احمق سمجھتی ہے یا خود بے وقوف ہے۔ ممکن ہے یہ دونوں باتیں صحیح ہوں لیکن ایک بات ضرور سچ ہے کہ مسلمان بے وقوف نہیں ہیں۔ فی الحال راہل گاندھی اترپردیش کی خاک

چھان رہے ہیں تاکہ وہاں کی خاک سے اپنے سر کا تاج بنائیں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس یوپی میں مسلمان ۱۸ فیصد سے زیادہ ہیں اس لئے وہ انہیں رجھانے کی خاطر ریزرویشن کا مدعا اچھال رہے ہیں۔ مسلمان جانتے ہیں کہ اس پارٹی اور حکومت کی نیت میں فتور ہے اس لئے وہ اس سے کوئی بڑی توقع نہیں کرتے لیکن وہ اپنے اوپر ہونے والی ظلم وزیادتی اور ناروا سلوک کو آسانی سے نہیں بھولتےاور جب ظالم کوسزا دینے پر آتے ہیں تو نہ اپنا فائدہ اور نہ نقصان دیکھتے ہیں۔ دراصل مسلم سیاسی رہنماوں میں اور مسلم عوام کی نفسیات میں بہت بڑا فرق ہے۔ اول الذکر مصلحت کوش طبقہ ہے جس نے اپنے مفادات کو اہلِ اقتدار سے وابستہ کر رکھا ہے اور موخر الذکر اس کمزوریوں سے مبرا ہے۔ اس لئے اگر سیاسی جماعتوں کے رہنما اپنے آس پاس پائے جانے والے سیاسی پیادوں پر عوام کا قیاس کرتے ہیں اور ان کو بھی ان مفادپرستوں سے مشابہ سمجھتے ہیں تو یہ ان کی فاش غلطی ہے۔ مسلم عوام اپنی بیدار مغزی کا مظاہرہ اس سے قبل کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔انہوں نے اپنے روایتی رہنماؤں سے کئی بار بغاوت کی ہے اور انہیں دھول چٹائی ہے۔

وطنِ عزیز میں فی الحال ریزرویشن سے اہم مسئلہ انسانی حقوق کی پامالی کا ہے جس کی سب سے اونچی قیمت ملک کی سب سے بڑی اقلیت چکاتی ہے۔ ابھی حال میں ہندوستان کے اندر حقوقِ انسانی کی صورتحال پر کام کرنے والے اقوام متحدہ کے

نامزد کردہ ایک گروپ نے اپنی مایوس کن رپورٹ جاری کی۔اقوامِ متحدہ کے اندر ہر ملک کی چار سالہ رپورٹ پیش کی جاتی ہے اور اس بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ ہندوستان پر رپورٹ مئی ۲۰۱۲ء میں پیش ہوگی۔اس گروپ کے کنوئیر میلون کوٹھاری کے مطابق ہندوستان کو حقوقِ انسانی کے حوالے سے اپنے قومی و بین الاقوامی عہدوپیان کو نبھانے کیلئے معاشی، تحفظ اور سماجی پالیسی میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ انسانی حقوق کے شعبے میں کام کرنے والی معروف قانون داں ورندا گرور نے متنبہ کیا کہ گزشتہ چار سالوں میں سماجی و معاشی شورش اور سیاسی اختلافات کا مقابلہ کرنے کیلئے سخت گیر قوانین وضع کئے گئے اور حفاظتی دستوں کی تعیناتی میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافے اب کشمیر یا شمال مشرق تک محدود نہیں رہے بلکہ وسطی ہندوستان کے کیر علاقے بھی اسکی زد میں آئے ہیں۔ ان تمام علاقوں میں انسانی حقوق کی پامالی سے نہ صرف صرفِ نظر کیا گیا بلکہ اسے حق بجانب ٹھہرایا گیا ہے جس کے باعث عوام الناس کا نظامِ انصاف اور انتظامیہ کے اوپر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔

محترمہ گروور کے خیال میں موجودہ کشمکش میں فوجی حکمت عملی ہندوستان کے اقوام متحدہ میں کے اندر اختیار کئے جانے والے اس موقف کے خلاف جس میں کہا گیا تھا کہ ہمیں کسی مسلح بغاوت کا سامنا نہیں ہے۔ گروور کا کہنا ہے

ترقیاتی منصوبوں کو بروئے کار لانے کیلئے فوجی طاقت کو استعمال حکمت عملی اختیار کی جارہی ہے۔ دولت مشترکہ کے ایماپر انسانی حقوق کیلئے کام کرنے والے ادارے کے سربراہ ماجا دار و والا کا کہنا ہے کہ ہمارے ادارے فی الحال مایوسی کا شکار ہیں اور عوام کی توقعات پر پورا اترنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ ہماری پولس کو اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ عدالت اور مختلف کمیشنوں کو زیادہ جوش و ولولہ، ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس درکار ہے۔ ہر موقع پر اصلاح کو ٹال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہزاروں حادثات رونما ہوتے ہیں اور انکی بنیاد پر ہم قوم کی تعمیر کا کام نہیں کر سکتے۔ جاما درو والا نے جس ادارہ جاتی خستہ حالی پر اپنی تشویش کا اس کی تصدیق کولکتہ میں نجی ہسپتال کے اندر لگنے والی آگ کی واردات سے ہوتی ہے۔ اس حادثے میں مرنے والوں کی تعداد ۱۰۰ کو چھورہی ہے۔ آگ پر قابو پانے میں پانچ گھنٹے لگے اور مریضوں کو بچانے کیلئے گھسیٹ کر باہر لانا پڑا۔

۱۲ دسمبر کو انسانی حقوق کا عالمی دن ساری دنیا میں منایا گیا اس موقع پر اقوام متحدہ کے ادارہ برائے انسانی حقوق کی کمشنر ناوی پلے نے 2011ء کو اس حوالے سے ایک غیر معمولی سال قرار دیا۔ اقوام متحدہ کے ادارے برائے انسانی حقوق کی کمشنر ناوی پلے کے بقول رواں سال کے دوران متعدد ملکوں میں عوام نے اپنے حقوق کی خاطر سڑکوں پر احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ دنیا کے متعدد

ممالک میں عوام کا جمہوریت کے لیے اٹھ کھڑا ہونا انسانی حقوق کی بحالی کی سمت ایک مثبت پیش رفت ہے۔ناوی پلے نے اس تناظر میں خاص طور پر شمالی افریقہ اور مشرقی وسطیٰ کا ذکر کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا مسلم دنیا کی ہوا بعد ازاں ایک مختلف انداز میں میڈرڈ، نیویارک، لندن اور دیگر شہروں میں بھی پہونچی اور وہاں بھی مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ گویا اس بار مسلم عوام نے اس باب میں باقی دنیا کی رہنمائی کی۔ پلے کہتی ہیں کہ عوام نے انسانی حقوق کی قرارداد کے مطابق خوف سے نجات اور ہنگامی صورتحال سے آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔

یہ قابل غور حقیقت ہے کہ محترمہ ناوی پلے کا تعلق ہندوستان سے ہے اور انہوں نے دنیا بھر کا جائزہ لیا لیکن ہندوستان کے بارے میں کسی بھی قسم کا مثبت یا منفی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ یہاں بابا رام دیو اور انا ہزارے کی تحریک کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ نکسلوادی رہنما کشن جی کو غیر قانونی طریقے سے ہلاک کرکے کس طرح اس کا جشن منایا گیا اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بھرت پور دیگر علاقوں میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں کس طرح مسلمان ہندو دہشت گردوں اور پولیس کے درمیان پس کر رہ گئے اس بارے میں بھی وہ خاموش رہیں سوائے ایک نہایت محتاط عمومی مشاہدے کے جس اطلاق بالواسطہ ہندوستان پر بھی ہوتا ہے۔ناوی کہتی ہیں "اس سال کے دوران بہت سے ممالک میں حقائق اندازوں کے برخلاف بھی نکلے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں اور حکومتی موقف میں زمین

آسمان کا فرق سامنے آیا ہے۔ اس صورتحال میں انسانی حقوق کی کونسل کے باعث ایسے ممالک کے سرکاری اہلکاروں پر دباؤ میں اضافہ ہوا ہے" ان ممالک کا نام بھی اگر لے لیا جاتا تو شاید ہندوستان کا نامِ نامی اس میں ضرور آتا۔

کے ہیں میری صبحِ عروج میں ابھی رنگ شامِ زوال کے

شام میں لیبیا کی کہانی دوہرائی جارہی ہے۔ کرنل معمر قذافی کی ہلاکت کا جشن طرابلس کی مانند شام کے شہر حمص میں منایا گیا۔ لوگ جوش وخوش کے ساتھ سڑکوں پر نکل آئے وہ نعرے لگا رہے تھے ''آج ہمارے لئے مسرت وامید کا دن ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگلی باری بشار الاسد کی ہے''۔ شام کی قومی کونسل کے رہنما امر العزم نے کہا تھا جناب اسد کو ان لوگوں سے عبرت پکڑنا چاہئے جو ان سے پہلے جا چکے ہیں زین العابدین چونکہ تیونس سے بھاگ کھڑا ہوا اس لئے سعودی عرب میں حیات ہے۔ حسنی مبارک اس وقت تک مزاحمت کرتا رہا جب تک کہ فوج نے اسے اقتدار سے پرامن طریقے پر بے دخل نہیں کردیا نتیجہ یہ ہوا کہ جیل میں ہے اور عدالت میں اسپر مقدمہ زیرِ سماعت ہے۔ قذافی نے اسد کی مانند اپنی تمام تر قوت کے ساتھ بھڑ جانے کا فیصلہ کیا اس لئے ہلاک ہو گیا۔ العزم کے مطابق ''الاسد قذافی کے انجام سے بھی سبق نہیں سیکھیں گے۔ وہ قتل و غارتگری کرتے رہیں گے اس لئے کہ وہ اس کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں''۔

مذکورہ بالا بیان کی تصدیق کسی اور نے نہیں خود بشار الاسد نے کردی۔ اے بی سی چینل پر اپنے ایک انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو اپنے

لوگوں کے قتل پر کوئی احساسِ جرم ہوتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا میں کوئی قتل نہیں کر رہا ہوں۔ میں فوج کا کمانڈر نہیں ہوں ۔ ہم تو حفاظت کر رہے ہیں ۔اول تو یہ وہی دلیل ہے جو احمق لوگ واقعۂ کربلا میں یزید کے حوالے سے دیتے ہیں چونکہ یزید کربلا میں موجود نہیں تھا اسلئے ساری ذمہ داری کمانڈر شمر کے سر جاتی ہے۔ تقریباً پانچ ہزار لوگوں کی موت کے باوجود بشار الاسد کا دعویٰ کے ہم تو حفاظت کر رہے ہیں مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ مبادہ بشار کی مراد شامی عوام کے بجائے علاوی قبیلے سے ہو اس لئے کہ وہ شامی عوام کو اپنا سمجھتے کب ہیں؟ اور جہاں تک ان کے اپنے قبیلے کا سوال ہے اس کا قتل نہیں بلکہ تحفظ کیا جا رہا ہے اس لئے ندامت کی کیا حاجت؟

شام چونکہ سوویت خیمہ میں رہا اور اس نے گوں ناگوں مصلحت کی بنا پر امریکہ سے مصالحت نہیں کی اس لئے مغرب کے اکثر و بیشتر ممالک اس کے دشمن رہے ہیں اس کے باوجود اس کے بہت سارے ہمنوا بھی پائے جاتے تھے۔ پڑوسی ملکوں میں ترکی عراق اور ایران کی شام کے ساتھ گہری دوستی تھی ۔ لبنان میں جب تک اس کی فوج، موجود تھی وہاں کی حکومت کیلئے اسے ناراض کرنا مشکل تھا۔ حماس و حزب اللہ جیسی تحریکوں کی وہ حمایت کرتا تھا اور اسے ان تائید حاصل تھی ۔ عرب لیگ کے رکن کی حیثیت سے اسکے پاس ایک ڈھال موجود تھی ۔ اقوامِ متحدہ میں روس اور چین جیسی بڑی طاقتیں اس کی ہمنوا تھیں جو اس کے خلاف پیش ہونے والی

قرارداد کو ویٹو کرنے سے پس و پیش نہ کرتی تھیں۔غیر جانبدار ممالک نہ ہی بشار کی گرفت کرتے تھے اور نہ ہی تائید کرتے تھے لیکن رائے شماری کے وقت غیر حاضر ہو جاتے تھے ۔ مگراب صورتحال بدل رہی ہے ایک ایک کرکے یہ سارے مکڑی کے جال کی مانند بکھرتے جارہے ہیں اور ۴۱ سالہ خاندانی اقتدار کے ارد گرد مشیت کا شکنجہ تنگ ہوتا جارہا ہے۔قرآنِ حکیم میں خلقِ خدا کے اندر عدل و راستی کا حکم دینے کی خاطر اٹھنے والوں کے درپئے آزار ہوجانے والوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری کے ساتھ یہ منادی بھی سنادی گئی کہ ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ارشاد خداوندی ہے : جو لوگ اللہ کے احکام وہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں، جو خلق خدا میں عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنادو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے، اور ان کا مددگار کوئی نہیں ہے (3: 21-22)

شام میں جیسے ہی احتجاج کا آغاز ہوا مغرب نے اسے اپنے لئے نعمت غیر مترقبہ جانا جس کی مختلف وجوہات تھیں ۔ایران سے امریکہ کی پریشانی اور حزب اللہ وحماس سے اسرائیل کو خطرہ ان میں سب سے اہم تھا لیکن شام کے اپنے پڑوسیوں سے خوشگوار تعلقات مداخلت کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھے۔لبنان سے گوکہ شامی فوجوں

کی واپسی ہو چکی اس کے باوجود حزب اللہ کی موجودگی اور اس پر لبنانی حکومت کا انحصار کسی بھی کارروائی کو ناکام بنانے کیلئے کافی تھا۔ ایران نے آگے بڑھ کر کئے بعد دیگرے کئی فوجی اور معاشی معاہدے کرنے شروع کر دیئے تھے نیز اقوام متحدہ میں چین و روس دونوں نے شام کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا لیکن وقت کے ساتھ سب کچھ بدل گیا۔ عرب لیگ جس نے آگے بڑھ کر شام کے مسئلہ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا اور بیرونی مداخلت کے امکانات کو خارج کر دیا تھا تاکہ بشار الاسد کو اصلاح کا موقع دیا جائے اور پرامن عوام پر مظالم کا سلسلہ بند ہو۔ شامی حکام نے اس کے فیصلے کو تسلیم کیا مگر جور و ظلم جاری رکھا۔ یہاں تک لیگ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے اعلان کر دیا کہ ۲۱ دسمبر کو ہونے والی اپنی نشست میں وہ اس معاملے میں اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل سے رجوع کریں گے گویا بیرونی مداخلت کا راستہ ہموار ہو جائیگا۔ یہ افسوس ناک بات ہے بشار الاسد کی بہیمانہ رخ نے از خود اس دروازے کو بند کر دیا جو نکاسی کے باعزت راستے کی جانب کھلتا تھا۔

عرب لیگ کی اس اہم نشست سے قبل عراقی حکومت کے دفاعی مشیر فلاح الفیاض نے دمشق کا دورہ کیا۔ یہ وہی فیاض ہیں جنہوں نے ابھی حال میں وزیر اعظم نور المالکی کے ساتھ امریکہ کا دورہ کیا تھا جس مکمل انخلا پر مہر تصدیق کی گی۔ فلاح نے اپنے دورے کے اختتام پر بتلایا کہ میں مثبت گفتگو کر کے قاہرہ عرب

لیگ کی نشست میں جارہا ہوں۔ہم اپنا موقف واضح کر چکے ہیں ۔ہم موجودہ کشمکش کا ایک ایسا پرامن اختتام چاہتے ہیں جس میں شامی عوام کے جمہوری انقلاب کی خواہش کا احترام کیا جائے ۔اس تبدیلی میں نہ تو بیرونی مداخلت کا عمل دخل ہو اور نہ ہی اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ تصادم کو فروغ ملے ۔ نوری المالکی کے ایک اور مشیر علی الموسوی نے گزشتہ ہفتہ صاف طور پر یہ اعلان کیا کہ ان کی حکومت کئی ماہ قبل اسد کو استعفی دینے کیلئے کہہ چکی ہے ۔انہوں نے کہاکہ شامی عوام آزادی اور جمہوریت کا حق ہے ۔ہم یک جماعتی آمریت کے مخالف ہیں جس میں اظہار رائے کی آزادی نہیں پائی جاتی ۔ الموسوی کا یہ بیان حکومت عراق کے ماہِ اگست میں اختیار کئے جانے والے موقف کے خلاف ہے جبکہ امریکہ نے الاسد کو اقتدار چھوڑنے کے لئے کہا تھا۔ نورالمالکی نے اس وقت کہا تھاکہ ہمارے دشمن اس بات منتظر ہیں مسلم ممالک اندرونی خلفشار کا شکار ہو کر کمزور ہو جائیں اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ صہیونی اسرائیل کو ہوگا۔وزیراعظم نورالمالکی نے اس موقف کو مزید واضح کرتے ہوئے کہاکہ ہم حزب اختلاف اور دمشق حکومت کے درمیان گفتگو کا آغاز کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک ایسا حل نکالا جاسکے جو دونوں فریقوں کیلئے قابلِ قبول ہو ۔انہوں نے یہ بھی بتلایاکہ امریکہ اور یوروپ بشارالاسد کے بعد اقتدار پر قابض ہوجانے والوں کے بارے میں فکر مند ہیں اس لئے وہ عراق کی جانب سے کی جانے والی پیشقدمی کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔

موجودہ بیان میں دونوں میں متحارب فریقوں سے گفتگو کا ذکر اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ اب بشار الاسد کا یہ حامی بھی پالا بدل چکا ہے۔ عوام کی خواہشات کا پاس و لحاظ یقیناً بشار کے خلاف جاتا ہے اور جمہوری طریقے کا اشارہ بھی موجودہ اقتدار کی بیخ کنی کیلئے کافی ہے۔ مغرب کی فکرمندی بھی واجب ہے اس لئے کہ تیونس، مراقش اور لیبیا کے بعد اب مصر بھی اسلام پسندوں کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ عرب لیگ کی میٹنگ میں شام نے پھر ایک بار اپنے اڑیل رخ کو نرم کرتے ہوئے تفتیشی وفد کے معائنہ پر رضامندی ظاہر کر دی ہے لیکن اس سے مسئلہ حل ہونے کے بعد بجڑ جائیگا۔ اول تو احتجاجیوں کے حوصلے بلند ہوں گے اور ان کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگا۔ دوسرے شامی حکومت کا ان پر ہاتھ ڈالنا پہلے کی طرح آسان نہ ہوگا نیز جب وفد وہاں سے لوٹ واپس آئیگا تو اس کی رپورٹ یقیناً بشار کے خلاف ہوگی۔ اگر اس وقت تک بشار کو عقل آجائے تو وہ زین العابدین کی پیروی کرے گا ورنہ پھر قذافی کا انجام سے دوچار ہو جائیگا۔ دمشق کے اقتدار کی حالت فی الحال ایک چلتی پھرتی لاش کی سی ہے اور وہ کب تک اس حالت نزع میں مبتلا رہے گی یہ کہنا مشکل ہے لیکن اس میں شک نہیں کے نزع کے بعد یقیناً موت کا مرحلہ آتا ہے۔

قدرت کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ جس عراق کے اثرات کو زائل کرنے کی خاطر نو

سال قبل امریکہ نے فوج کشی اور اربوں ڈالر کے ساتھ ساتھ اپنی عزت و ناموس کو خاک میں ملا دیا۔ وہاں خود اس کے اپنے اعتراف کے مطابق کرائے کے فوجیوں کے علاوہ ۴۵۰۰ سے زیادہ باقاعدہ فوجی ہلاک ہوئے نیز تیس ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ دس لاکھ سے زیادہ فوجی ان نو سالوں میں عراق آئے گئے اس کے باوجود عراق دنیا کے حصہ میں ایک اہم ترین فریق بن کر سامنے آگیا۔ ۲۰۰۸ تک تو امریکی انتظامیہ عراق سے انخلاء کا ٹائم ٹیبل دینے کیلئے تیار نہیں تھا اور یہ کہتا پھرتا تھا کہ ہمارا قیام عراق میں تقریباً دائمی ہوگا۔ چار بڑی فوجی چھاؤنیوں پر ہمیشہ ہی ہمارا تسلط برقرار رہے گا اور ہمارے فوجیوں کو وہاں کے قانون میں ابدی امان حاصل رہیگی۔ یہ سارے دعویٰ وقت کے ساتھ غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ اپنی متعینہ مدت سے قبل آخری حملہ آور فوجی وہاں سے نکل چکا ہے اور مہم کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان ہوچکا ہے۔ ایک طرف بغداد میں تعمیر ہونے والا دنیا کا سب سے بڑا امریکی سفارتخانہ اپنی کم مائیگی پر رو رہا ہے دوسری جانب شام کے معاملے میں عراق سب سے بڑا ثالث بنا ہوا ہے۔ عراق کو دوسرے ممالک پر جو فوقیت حاصل ہوئی ہے اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں اول تو اس کے بیک وقت ایران اور اس کے سب سے بڑے دشمن امریکہ کے ساتھ تعلقات کا استوار ہیں دوسرے اس کے حکمراں شیعہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے باوجود وہ عرب لیگ کا اہم رکن ہے۔ گویا وہ تمام عناصر جن کی بنیاد پر امت میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں۔ عراق میں وہ تمام بیک وقت پائے جاتے

ہیں ۔ایسے میں مختلف لوگوں کو اعتماد میں لے پائیدار امن کی جانب پیش قدمی اس کیلئے سہل تر ہے ۔

شام کے معاملے میں پہلے کڑا رخ اختیار کرنے والے روس و چین کو مشترکہ طور پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایک قرارداد پیش کرنے پر تیار کر لیا گیا ہے ۔جس کا مسودہ پیش کیا جا چکا ہے ۔اس مسودے میں گو کہ فی الحال معاشی پابندیوں اور فوجی مداخلت کا ذکر نہیں ہے پھر بھی حقوقِ انسانی کی پامالی کو تسلیم کیا گیا ہے اور تشدد کو روک تھام کیلئے اقدامات پر زور دیا گیا ہے ۔روس کی جانب سے دکھلائی جانے والی یہ لچک ہوا کے رخ میں تبدیلی کا پتہ دیتی ہے ۔اب شام کے خلاف پیش کی جانے والی خود اسکی قرارداد کو ویٹو کرنے کا موقع روس و چین کے پاس موجود نہیں ہے ۔ویسے لیبیا کے معاملے میں ساری دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ کس طرح روسی حکام اپنا رخ بدلتے ہیں۔ روس کے شام میں اس قدر مفادات ہیں کہ اپنی تنصیبات کی حفاظت کیلئے اسے نئے حکمرانوں سے خوشگوار تعلقت رکھنے ہی ہوں گے ۔اقوام متحدہ میں روس کے نمائندے وٹالی چرکین نے یہ تو تسلیم کیا کہ شامی حکومت کی جانب سے قابلِ لحاظ زیادتی ہوئی ہے لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ انتہا پسندوں نے اس کا فائدہ اٹھایا ۔چرکین کے مطابق حکومت مخالفین کی خونریزی کا بھی ان کے مسودے میں ذکر ہے ۔ بہرحال تشدد کا خاتمہ، انسانی حقوق کی بحالی، دستوری و دیگر اصلاحات کے حق میں یہ

ایک مضبوط قرارداد ہوگی تاکہ اس کی مدد سے عرب لیگ تعمیری، مثبت و پرامن کردار ادا کرسکے۔

بشارالاسد کا سب سے مضبوط قلعہ آج بھی ایران کی حکومت ہے لیکن اب اس میں بھی شگاف پیدا ہوگیا ہے۔ایک خبر کے مطابق دمشق میں واقع حکومت مخالف قومی رابطہ کمیٹی سے ایرانی حکام دو مرتبہ ملاقات کرچکے ہیں۔ یہ کمیٹی بیرونی مداخلت کے بغیر اصلاحات کی علمبردار ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایران نے بشارالاسد کے سب سے بڑی مخالف جماعت شامی قومی کونسل سے بھی تیونس رہنما راشد غنوشی کے توسط سے رابطہ قائم کیا ہے۔ ویسے ابھی تک اس جانب کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی ہے بلکہ پیرس میں رہنے والے انقلابی رہنما برہان غالیون نے سی این این پر ایک ملاقات میں ایران کو انتباہ کرتے ہوئے کہا تھا ''مجھے امید ہے ایران شام کے ساتھ اپنے تعلقات کو ایک ایسے اقتدار کی حمایت کرکے خراب نہیں کرے گا جسے خود شام کی عوام نے مسترد کردیا ہے اور جو اپنی عوام پر مظالم ڈھا رہا ہے۔ یہ دسمبر کے اوائل کی بات ہے ایسا لگتا ہے وقت کے ساتھ ایرانی حکومت اپنی غلطی کا احساس ہوتا جارہا ہے۔ اس لئے کہ عراق کی موجودہ حکومت ایران کی تائید کے بغیر عراق کی بابت اس قدر کھل کر پیش قدمی نہیں کرسکتی۔

اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ حماس کا صدر دفتر دمشق میں واقع ہے لیکن فی الحال حماس نے بھی بشارالاسد سے فاصلہ بنالیا ہے ۱۹۹۹ کے بعد سے جب اردن نے انہیں ملک بدر ہونے پر مجبور کردیا تھا سیکڑوں فلسطینی دمشق میں رہتے بستے تھے لیکن اب وہ سب بکھر گئے ہیں اور اب صرف دس فیصد حماس کارکن صدر دفتر میں موجود ہیں۔ اس دوران حماس نے ترکی، قطر اور اردن میں اپنے دفاتر قائم کر لئے ہیں اور وہ اپنا صدر دفتر مصر لیجانے کی تیاری کر رہے ہیں جہاں اخوان الالمسلمون کو انتخابات میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ یہ اندازہ بھی لگایا جارہا ہے کہ مصر کی فوجی حکومت نے الفتح سے مفاہمت کی شرط پر انہیں اپنا دفتر قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ حماس کے ایک کارکن کے مطابق مارچ کے مہینے میں جب بشارالاسد نے حماس رہنما خالد مشعل پر حمایت کیلئے دباؤ ڈالا تو انہوں نے اس کا انکار کرکے دفتر کو منتقل کرنے پر رضامندی ظاہر کردی لیکن پھر بشار الاسد نے اپنا ارادہ بدل دیا اس لئے کہ اس میں اسکی اپنی ساکھ بگڑتی تھی۔ بشارالاسد کے اخوان پر مظالم اور حماس کی حمایت نیز ایک کٹر سیکولر اور سوشلسٹ نظریہ کا حامی ہونے کے باوجود اسلامی جمہوریہ سے دوستی ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس کا احاطہ اس مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ بشارالاسد کیلئے اس نازک گھڑی میں اگر کوئی سب سے اچھی نصیحت ہو سکتی ہے تو ترکی وزیر اعظم رجب طیب اردغان کی ہے جس میں انہوں فرمایا" ہماری خواہش یہ ہے کہ اسد حکومت جو تلوار کی دھار پر گامزن ہے اس پگڈنڈی پر نہ قدم

رکھے جو آگے چل کر معدوم ہو جاتی ہے اور جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی " انہوں نے یہ بھی کہا کہ " کوئی اقتدار دار و رسن کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ مظلوموں کے لہو پر مستقبل کی تعمیر ممکن نہیں ہے" اگر بشار الاسد اس عمدہ نصیحت پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس میں انہیں کا بھلا ہے ورنہ تاریخ کا کوڑہ دان اس جیسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔

شام: لہو جو بہتا ہے آخر وہ سرخ رو ہوگا - دوسری قسط

عرب لیگ کے وفد کا خیر مقدم کرنے کیلئے دمشق میں پہلی بار فوجی دفتر پر زبردست دھماکہ کیا گیا جس میں ۴۴ افراد ہلاک اور متعدد لوگ زخمی ہوئے۔ نائب وزیر خارجہ فیصل مقداد نے اسے القائدہ دہشت گردوں کا تحفہ قرار دیا۔ جس قدر جلدی بشار انتظامیہ نے یہ الزام لگایا اسے دیکھ کر جارج ڈبلیو بش کی یاد تازہ ہو گئی جسے آناً فاناً نہ جانے کیسے پتہ چل گیا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کس نے کیا اور ایک خیالی دشمن کا بہانہ بنا کر اس ظالم نے ساری دنیا کو قتل و غارتگری کی نذر کر دیا نیز اپنے سارے مظالم کا وجہِ جواز اس ایک حملے کو بناتا رہا۔ یہی حکمت عملی اپنے آپ کو امریکہ کے سب سے بڑے دشمن قرار دینے والے شامی انتظامیہ نے بھی اختیار کی۔ اس موقع پر شام میں عوامی انقلاب کی قیادت کرنے والی قومی کونسل نے حکومت کو اس دھماکے کیلئے براہِ راست موردِ الزام ٹھہرایا۔ اس کے مطابق حکومت دھماکے کے ذریعہ یہ غلط فہمی پھیلانا چاہتی ہے کہ شام کے اندر حریت و وقار کی بحالی کیلئے کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی جارہی ہے بلکہ بیرونی طاقتیں وہاں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ شام میں احتجاج و مزاحمت کا سلسلہ گزشتہ ۹ ماہ سے جاری ہے اور اس جدوجہد

میں پانچ ہزار افراد اپنی جان کر نذرانہ پیش کر چکے ہیں اس کے باوجود اس قسم کے دھماکے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے حالانکہ اگر احتجاجیوں کی یہ حکمت عملی ہوتی تو اس ردعمل کا اظہار بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس جب ان کے خلاف ہونے والے مظالم کی تفتیش کرنے والے عرب لیگ وفد کی تیاری و انتظامات کی خاطر ایک ٹیم دمشق پہنچنے والی ہے اسی رات مزاحمت کاروں کی جانب سے یہ حرکت ناقابل فہم ہے۔ایسے میں اگر وفد خوفزدہ ہو کر اپنی آمد کا ارادہ ترک کر دیتا ہے تو اس میں مجاہدین کا نقصان اور حکومت کا براہ راست فائدہ ہے اسلئے ان سے کسی ایسے اقدام کرنا محال ہے۔ شام کی حکومت چونکہ بیرونی مشاہدین کے خلاف رہی ہے اور شدید دباو کے تحت بادلِ ناخواستہ اس نے رضامندی ظاہر کی ہے اس لئے وہ ضرور یہ چاہتی ہے کہ یہ وفد نہ آئے اور اگر آئے بھی تو اپنی توجہات حکومت کے مظالم کے بجائے دھماکوں کی نذر کرکے لوٹ جائے۔اس امکان کی جانب ایک اشارہ سرکاری ٹیلی ویژن کے رویئے سے بھی ملتا ہے جس نے دھماکے کی خبر نشر کرنے کے ایک گھنٹے بعد تصاویر دکھلائیں جبکہ یہ دھماکے دمشق کے اندر ہوئے تھے۔

اس دوران ایک اور دلچسپ تماشہ رچایا گیا۔ اچانک نئی ویب سائٹ نمودار ہوئی اور اس پر شام کی اخوان المسلمون نے دھماکے کی ذمہ داری قبول کر لی ساتھ ہی اس ویب سائٹ پر کہا گیا کہ ہمارے مجاہدین آئندہ دس دنوں کے اندر ملک کے

مختلف شہروں بشمول دمشق اور الپو میں دھماکے کریں گے ۔آ ئندہ دس دنوں کے دوران ان شہروں میں دھماکے جہاں کا مشاہدین دورہ کرنے والے ہیں آستین پر لگے ہوئے لہو کی پکار ہے جو چیخ چیخ کر بتلا رہی ہے کہ " کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں " ۔ وہی معشوق یعنی شامی حکومت.براہ راست القاعٔدہ کی جانب انگشت نمائی کرتی ہے اور بالواسطہ اخوان پر الزم لگاتی ہے ۔ اخوان چونکہ حریت پسند شامی قومی کونسل کا اہم رکن ہے اس طرح گویا کونسل کو بھی گھیرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اخوانی رہنما زہیر سالم کے اس ویب سائٹ کو جعلی قرار دینے اور اسے حکومت کی افترا قرار دینے کے بعد جس نے دھماکہ کروایا مذکورہ ویب سائٹ ناقابل رسائی ہو گئی ہے ۔یہ حسن اتفاق ہے ممبئی بلاسٹ کی ذمہ داری قبول کرنے والی ویب سائٹ کو روس سے قائم کیا گیا تھا گویا لشکر اور جیش حملہ تو پاکستان میں بیٹھ کر کرواتے ہیں لیکن ویب سائٹ بنانے کیلئے انہیں روس جانا پڑتا ہے ۔ اس طرح کا تماشہ ہندوستان میں ہمیشہ دہرایا جاتا ہے اکثر وبیشتر دھماکوں میں ملوث دہشت گرد جیب میں اپنی جنم کنڈلی رکھ کر دھماکہ کرتا ہے۔ اس کا جسم چیتھڑوں کی مانند اڑ جاتا ہے لیکن ان کاغذات پر ایک دھبہ نہیں لگتا اور چند گھنٹوں کے اندر اس کی تصویر کا خاکہ ٹی وی پر تمام تفصیلات کے ساتھ جاری ہو جاتا ہے لیکن یہ حربے نہ ہندوستان کی حکومت کے کام آتے ہیں اور شامی انتظامیہ کے کام آئیں گے اس لئے کہ بقول انتظار نعیم

لہو لہو ہے کبھی رائیگاں نہیں جاتا
بھلے ہی دیر سے، وہ رنگ لاکے رہتا ہے
لہو جو ظلم سے سفاکیوں سے بہتا ہے

مسلم دنیا میں برپا ہونے والی شورش کے نتائج جیسے جیسے ظاہر ہو رہے ہیں۔ تیونس، مراقش، مصر و لیبیا ہر جگہ اخوان المسلمون بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ بہت سارے لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ تیونس کا سارا انقلاب ایک پھیری والے کی خودسوزی سے برپا ہوگیا۔ مصر کی عوام نے تحریر چوک پر جمع ہو کر حسنی مبارک سے نجات حاصل کر لی۔ ناٹو نے بلکہ ایک مضحکہ خیز انکشاف کے مطابق یہودیوں نے قذافی کو ٹھکانے لگا دیا اور شام میں چند نوجوانوں کی گرفتاری سے ہنگامہ برپا ہوگیا اور ان تمام مواقع پر اخوان کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا پھر بھی انتخاب کے بکس میں سے یہ جن کیسے نمودار ہوگیا؟ اس حیرت کی وجہ اخوان کی عظیم جدوجہد پر پڑا ہوا دبیز پردہ ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ اس وقت تک اخوانیوں سے صرفِ نظر کرتا ہے جب تک کہ ناگزیر نہ ہو جائے۔

مصر کے بعد اخوان کا قیام سب سے پہلے شام ہی میں ہوا یہ اس وقت کی بات ہے جب ملکِ شام فرانس کے زیر تسلط ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۴۰ کی دہائی میں شام کی مختلف اسلامی تنظیموں نے اخوان المسلمون کے جھنڈے تلے اپنے آپ کو منظم

کرنا شروع کیا اور اولین مرشدِ عام مصطفیٰ الصباعی کی قیادت میں اخوان ملک کے طول و عرض میں قائم ہو گئی ۔اپنے ابتدائی دور میں اخوان نے فرانسیسی سامراج کے خلاف ہونے والی مسلح جدو جہد میں حصہ لیا۔فرانس سے آزادی حاصل کرنے بعد اخوان ملک کے سیاسی عمل شامل ہو گئی پارلیمان میں اس کے منتخب ممبران کی تعداد ۱۹۴۹ میں تین تھی جو ۱۹۶۱ کے اندر دس تک پہنچ گئی گویا تحریک کی عوامی مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا لیکن ۱۹۶۳ء کے اندر سیکولر نظریات کی حامل بعث پارٹی نے جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر بزورِ قوت اقتدار پر قبضہ کرلیا اور وہیں سے ظلم و جبر کا آغاز ہو گیا ۔اس کے باوجود اخوان کے دوسرے مرشدِ عام عصام عطار نے صبر ضبط کا دامن نہیں چھوڑا اور بعث پارٹی کے خلاف سخت موقف اختیار کرنے سے گریز کیا جبکہ ابو غدا اور مروان حدید جیسے پر جوش رہنما بعث پارٹی کی زیادتی کے خلاف انتہائی اقدامات کا مطالبہ کر رہے تھے ۔

۱۹۶۶ء میں بعث پارٹی نے صلاح حدید کے حوالے اقتدار کیا اور اس نے سیکولرزم اور سوشلزم کو بزور قوت نافذ کرنا شروع کر دیا اور شعائرِ اسلام کو مٹانے کی ان کوششوں کا آغاز ہو گیا جو عرب دنیا کیلیئے بالکل نئی تھیں اس کے سبب بعث پارٹی کے خلاف عوام کے غم و غصہ میں اضافہ ہونے لگا۔اخوانی رہنما مروان حدید کی قیادت میں حماۃ کے اندر بعث حکومت کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا

جس کے جواب میں سخت اقدام کئے گئے اور شہر کی جامع مسجد شہید کر دی گئی، اس بیچ کے اندر اسرائیل کے ہاتھوں شام و مصر کی مشترکہ مہم ناکامی کا شکار ہو گئی۔ شام کو ۱۹۶۷ء کو گولان کی پہاڑیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جنگ کے بعد اخوانیوں نے حکومت کے خلاف دمشق میں مظاہرے کئے جنھیں کچل دیا گیا۔ اس دوران صلاح کی مقبولیت میں غیر معمولی کمی واقع ہو گئی تھی اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود اس کا وزیر دفاع حافظ الاسد بغاوت کرکے اقتدار پر قابض ہو گیا۔

حافظ الاسد نے اپنے ابتدائی ایام میں اسلام پسندوں کے تئیں نرم رخ اختیار کیا جس کا مثبت جواب اخوان کی جانب سے دیا گیا لیکن ۱۹۷۳ء میں اچانک حافظ الاسد نے دستور میں بنیادی قسم کی تبدیلیاں کر دیں جس کی رُو سے نہ ہی صدرِ مملکت کیلئے مسلمان ہونا لازمی تھا اور نہ ہی شریعت کی دستور پر برتری برقرار تھی۔ اس ترمیم کے خلاف اخوان اقتدار کو بدلنے کی خاطر سڑکوں پر اتر آئے۔ اس دوران ۱۹۷۹ء کے اندر الیو میں ایک فوجی چھاؤنی کے اندر دھماکہ ہوا جس سے ۳۲ فوجی ہلاک ہوئے چونکہ اس وقت تک حافظ الاسد نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو فوج کے اہم عہدوں پر فائز کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے مہلوکین میں اکثریت علوی قبیلے کے افراد کی تھی۔ ۱۹۸۰ء کے آتے آتے اخوانیوں نے کئی شہروں میں متوازی حکومت قائم کر لی تھی اور ایسا لگنے لگا تھا کہ اب بعث

پارٹی کا چل چلاؤ ہے لیکن ۲۶ جون کو حافظ نے یہ خبر اڑائی کہ اخوان اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنارہے تھے اور اس کا بہانہ بنا کر اخوان کے ارکان کیلئے سزائے موت کا قانون وضع کردیا۔اخوانیوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔اخوانی بھی مزاحمت کیلئے میدان میں اترے حمص شہر ان کے قبضے میں تھا لیکن ۱۹۸۲ء میں حکومت نے فوجی کارروائی کرکے اس شورش کو بڑی سفاکی سے کچل دیا۔اس دوران ہزاروں اخوانیوں کو شہید کیا گیا جن کی تعداد ۳۲ ہزار تک بتلائی جاتی ہے۔اس سانحہ کے بعد اخوان کی قوت شام کے اندر بکھر گئی اور اس کے رہنما مختلف ممالک کو کوچ کر گئے۔

اخوان المسلمون نے ۱۹۸۰ء کے بعد سے مختلف تحریکوں کے ساتھ الحاق کرکے جدوجہد کرنے کی حکمتِ عملی اپنائی تھی اور قومی محاذ برائے آزادی کے تحت سب کو یکجا کیا تھا لیکن قیادت کا منصب اخوان کے پاس تھا۔اسلام کو ریاست کے دین کی حیثیت سے سبھی فریقوں نے تسلیم کیا تھااور و شریعت کی بنیاد دستور سازی پر اتفاق رائے تھا حالانکہ بائیں بازو کی جماعتیں بھی اس الحاق میں شامل تھیں۔تمام تر آزمائشوں کے باوجود یہ جدوجہد جاری رہی ۱۹۹۰ء میں بننے والے قومی محاذ برائے آزادی میں اخوان شریک تھی بلکہ سابق نائب صدر عبدالحلیم خدام کی قیادت میں قائم ہونے والے شامی نجات دہندہ محاذ میں بھی اخوان کی شمولیت رہی اور ۲۰۰۶ء کے اندر شائع ہونے والے دمشق اعلامیہ پر اس

نے دستخط کئے جس میں بعث پارٹی کو اقتدار سے بے دخل کرنے کا عزم کیا گیا تھا۔ بشار الاسد نے ۲۰۰۱ء میں اخوان کی جانب نرم رخ اختیار کیا۔ محصور ارکان کو رہا کیا اور ملک بدر رہنماؤں کو واپس آنے اجازت دی لیکن سرگرمیوں کا آغاز پر راضی نہیں ہوا۔ اخوان المسلمون نے آگے چل کر محسوس کیا کہ بشارالاسد کی نیت ٹھیک نہیں ہے وہ جو کچھ کہتا ہے عمل اس کے خلاف کرتا ہے۔ اخوان المسلمون کے اس الزام کو بالآخر خود بشارالاسد نے سچ ثابت کر دیا۔ گزشتہ نو ماہ کے اندر اس نے اصلاحات کے حوالے نہ جانے کتنے وعدے کئے اور بعینہٖ اس کے خلاف کام کرتا رہا لیکن ایسا لگتا ہے کہ اب اس کی پینترے بازی چند دنوں کی مہمان ہے عرب لیگ کا وفد سوڈانی جنرل محمد الدابی کی قیادت میں دمشق پہنچ گیا ہے اور بشار چشم تصور سے دیکھ رہا ہے۔

لہو جو بہتا رہا، بہتا رہا، بہتا رہا
یہاں تلک کے وہ دریائے بے کنار بنا
مگر مشیت و نظم خدائے برتر ہے
اسی میں ڈوبنا فرعون کا مقدر ہے

انسان فطرتاً جلد باز ہے اس لئے وہ قبل از وقت مایوس ہونے لگتا ہے جبکہ مشیت اپنے دلچسپ مظاہر دکھلاتی رہتی ہے۔ افغانستان اور فلسطین کی جانب سے جو خبریں فی الحال آرہی ہیں وہ ہمارے تصور خیال میں بھی نہ آتی تھیں۔ مثلاً خلیجی

ریاست قطر کا طالبان کو دفتر کھولنے کی اجازت دینا۔ اس اقدام کے بعد اول تو افغانی حکومت نے احتجاج کے طور پر اپنے سفیر کو واپس بلایا اور اعلان کیا کہ افغانستان کے نزدیک طالبان کو آفس کھولنے کی اجازت دینے کا فیصلہ باغی تنظیم کو رعایت دینے کے مترادف ہے لیکن پھر افغان وزارت خارجہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے اعتراف کر لیا کہ کہ افغان حکومت اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ بون کانفرنس کے موقع پر قطر نے طالبان کو دفتر کھولنے کی اجازت دینے سے متعلق امریکا اور جرمنی سے بات چیت کی تھی۔
افغان حکومت نے امن کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے اس کی حمایت کی تھی لیکن چونکہ افغان حکومت کو ان مذاکرات میں شریک نہیں کیا گیا اس لئے سفیر کو واپس بلایا گیا۔ اس موقف میں مزید نرمی اس وقت دکھلائی پڑی کرزئی حکومت نے تسلیم کیا کہ اگر طالبان پر امن مذاکرات کرنا چاہتے ہیں تو وہ کسی بھی ملک میں دفتر کھول سکتے ہیں ۔کابل میں افغان صدر حامد کرزئی کی افغان رہنماوں سے ملاقات کے بعد صدارتی ترجمان کی جانب سے جاری بیان میں کہا گیا ہے کہ طالبان کے دفتر کے لیے اگر افغانستان میں مرکز کھولنا ممکن نہ ہو تو سعودی عرب یا ترکی بہتر متبادل ہیں گویا بلاواسطہ یہ عندیہ بھی دیا گیا کہ بہت جلد کابل میں طالبان کا دفتر کھل جائیگا۔
اقوام متحدہ کی تنظیم یونیسکو میں فلسطینی اتھارٹی کو مکمل رکنیت ملنے پر

امریکہ سے زیادہ اسرائیل کا چراغ پا ہونا فطری ہے۔ صہیونی فسطائیت اپنی اس سفارتی ناکامی پر شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے غرب اردن اور مشرقی یروشلم کے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں یہودی آبادکاروں کے لیے لگ بھگ دو ہزار رہائش گاہوں کی تعمیر کے عمل کو تیز کردیااور ایک ہزار مکانات کی تعمیر کا ٹینڈر جاری کر دیا۔اس طرح اس نے اپنے آپ کو مزید مبغوض کرنے کا اہتمام ازخود کردیا۔ سلامتی کونسل میں یورپی اتحاد، ناوابستہ ممالک کی تحریک، عرب ممالک کے گروپ اور ابھرتے ہوئے ممالک آئی بی ایس اے کے نمائندوں نے جم کراس اسرائیلی جارحیت کی مذمت کی ۔یورپی اتحاد کی جانب سے برطانوی سفیر مارک لائل گرانٹ نے کہاکہ 'اسرائیل کا مشرقی یروشلم سمیت مقبوضہ فسطینیک علاقے میں بستیوں کی تعمیر المناک اقدام ہے۔ سلامتی کونسل میں ویٹو کی طاقت رکھنے والے روس بھی اسرائیلی پالیسی کی مذمت کی ہے۔ویسے تو اسرائیل کا وجود ہی ناجائز ہے لیکن بین الاقوامی قانون کے تحت بھی مشرقی یروشلم سمیت غربِ اردن پر۱۹۶۷ء سے اسرائیل کا غاصبانہ وغیر قانونی قبضہ ہے جہاں فلسطینیوں کو بے خانماں کرکے پانچ لاکھ یہودیوں کو بسایا گیا ہے۔

تارِیخ کے اس نازک موڑ پر غزہ کے حکمران اور حماس کے وزیراعظم اسماعیل ہنئیہ مسلم ممالک کے دورے پر روانہ ہو گئے۔یہ خبر اس لحاظ سے بھی حیرت انگیز ہے کہ حماس کو امریکہ ایک دہشت گرد تنظیم شمار کرتا ہے اس کے باوجود

حماس رہنما بیانگ دہل مسلم دنیا کے ساتھ اپنی تنظیم کے تعلقات بہتر بنانے کے سلسلہ میں غیر ملکی دورہ کر رہے ہیں۔ان کے نائب محمد عود نے بتایا ہے کہ وہ مصر، سوڈان، قطر، بحرین، تیونس اور ترکی جائیں گے اوران ممالک کے لیڈروں کے ساتھ غزہ کی پٹی اور مقبوضہ مغربی کنارے میں ترقیاتی منصوبوں، حماس اور فتح کے درمیان مصالحت کے لیے کوششوں اور مقبوضہ بیت المقدس میں اسرائیل کی جانب سے یہودیوں کو بسانے کے لیے شروع کیے گئے تعمیراتی کاموں سے متعلق امور پر بات چیت کریں گے۔ محمد عود کے مطابق ''اس دورے کے ذریعے ہم فلسطین، عرب تعلقات کا ایک نیا باب وا کریں گے''۔ فی الحال اسماعیل ہنئیہ کا دورہ دو ہفتوں پر محیط ہے لیکن اگر مزید ممالک کی جانب سے بھی اہیںت دورے کی دعوت موصول ہوتی ہے تو اس میں توسیع بھی ممکن ہے۔

مصر میں حسنی مبارک کے بعد نئی فوجی حکومت اور عوامی انقلابی تحریک کے رہنما فلسطین کی حماس کی بھرپور حمایت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰۰۷ء کے بعد اسماعیل ہنئیہ کا یہ پہلا دورہ ممکن ہوا ہے۔ دمشق میں چونکہ فی الحال حماس کا صدر دفتر ہے اس لئے شام میں جاری شورش کے پیشِ نظر اس دورے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔جہاں ایک دروازہ وقتی طور پر بند ہو رہا ہے وہیں مشیت کئی دروازے کھولنے کا اہتمام کر رہی ہے ایسا لگتا ہے کہ اس جشن کی گھڑی قریب آن کھڑی ہوئی ہے جس کی بشارت افتار نعیم نے اس شعر میں دی ہے

لہو جو بہتا ہے آخر وہ سرخ رو ہوگا

خوشا اے اہل وطن جشن آرزو ہوگا

لوک پال کا جمع خرچ

لوک پال بل جدید ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے اس لئے اگر آج انشاء جی زندہ ہوتے تو اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف اردو کی آخری کتاب میں اس کا تذکرہ ضرور کرتے ۔ اردو کی پہلی کتاب تو بہت سوں نے لکھی لیکن آخری کتاب لکھنے کا شرف ابن انشاء کے حصے میں آیا۔ غزل کے مقطع میں اپنا تخلص تو سبھی استعمال کرتے ہیں لیکن مطلع کے اندر تخلص کو موتی طرح پرونے کا کمال غالباً انشاء جی نے پہلی اور آخری بار کیا اور انکی غزل'' انشا جی اٹھو اب کوچ کرو'' اردو ادب کا شاہکار کہلائی۔ اس شہرہ آفاق غزل کو کہنے کے بعد سنا ہے انشاء جی اٹھتے ہیں اور دار فانی سے کوچ کر جاتے ہیں ۔ راوی تو یہی لکھتا ہے کہ اس غزل کے بعد انشاء جی نے اس جگ سے زیادہ دن دل نہ لگایا اور ۵۱ سال کی نوعمری میں اپنے شیدائیوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔ اس واقعہ کو آپ اتفاق کے خانے میں ڈال سکتے ہیں لیکن سنا ہے استاد امانت علی نے جب اس غزل کو اپنی طلسمی آواز سے زندہ کیا تو ان کی بھی واپسی کا وقت آگیا اور وہ ۵۲ سال کی عمر میں وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے ۔ اسے بھی اتفاق کہہ لیجئے لیکن اس کا کیا کریں گے کہ امانت علی کے بیٹے استاد امجد علی نے کئی سال بعد ڈرتے ڈرتے اس غزل کو گانے کی جرأت کی تو ان کا بھی ۴۹ سال کی عمر میں چل چلاؤ ہو گیا اب

لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اتنے سارے اتفاقات یکے بعد دیگرے نہیں ہو سکتے اس غزل میں ضرور کوئی خاص بات ہے جو اچھے اچھوں کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ غزل میں کیا خاص ہے کوئی نہیں جانتا لیکن لوک پال بل کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے کہ اسے گزشتہ ۴۲ سالوں میں نو بار پیش کیا جاتا ہے اور ہر بار اژدھا صفت سیاستدان اسے نگل جاتے ہیں اور ایک تماشہ رچا کر اپنے اپنے بل میں لوٹ جاتے اتفاقات ایک دو تین بات تو ہو سکتے ہیں لیکن نو بار لگاتار ناممکن ہے گویا مسئلہ کوشش کا نہیں نیت کا ہے۔

نام نہاد آزاد ہندوستان میں اب تک تین خاندانوں نے حکومت کی ہے۔ نہرو خاندان، جنتا پریوار اور سنگھ پریوار اور ان تینوں نے موقع بموقع اس بل کے حوالے سے عوام کے جذبات سے کھلواڑ کیا لیکن کسی نے اسے پاس کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ماہرینِ سیاسیات کیلئے یہ ایک تحقیق طلب موضوع ہے کہ قوم کے خزانے سے کروڑوں کروڑ روپے ڈکار جانے والے آدم خور سیاستدان اس بے ضرر سی سے اس قدر خوف کیوں کھاتے ہیں ؟ اس کا نام آتے ہی ان کی سٹی پٹی کیوں گم ہو جاتی ہے اور وہ آئیں بائیں شائیں کس لئے بکنے لگتے ہیں ؟لوک پال بل کو سب سے زیادہ چار مرتبہ کانگریس پارٹی نے پیش کیا اس لئے کہ اسے سب زیادہ مدت تک حکومت کرنے کا موقع میسر آیا۔

ماں، بیٹے، بہو اور نواسے سب نے اس بہتی گنگا میں ڈبکی لگا کر اپنے پاپ دھوئے یہاں تک رام جی کی یہ گنگا میلی ہو گئی

۔ اس پر زور آزمائی کرنے والوں کی فہرست میں دوسرا نمبر جنتا پریوار کا ہے۔ مرار جی دیسائی سے لیکر دیوے گوڑہ تک بشمول وی پی سنگھ نے اس آگ پر اپنی سیاسی روٹیاں سینکیں۔ ایسے میں سنگھ پریوار کیونکر پیچھے رہتا اس نے بھی دوبار اپنی سی کوشش کی اور ہاتھ ملتے رہ گئے لیکن بل کو پاس نہ ہونا تھا سو نہ ہوا۔ ہر بار اس کے مقدر میں ناکامی ہی آئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس کے چلتے وزیراعظم اندرا گاندھی کو راج نارائن نے پارلیمان کے بجائے الہ باد ہائی کورٹ میں ہرایا۔ وہ کارنامہ بھی شانتی بھوشن کے سر جاتا ہے جن کا فرزند ارجمند پرشانت بھوشن فی الحال لوک پال کے مہا یدھ میں نہا دھو کر اترا ہوا ہے۔ مرار جی نے اس بل کو اپنے وزیر داخلہ چرن سنگھ سے پیش کروایا لیکن چرن سنگھ نے کانگریس کی مدد سے بل پاس کروانے کے بجائے مرار جی کو فیل کر دیا اور خود وزیراعظم بن بیٹھے۔ اٹل جی کی کوشش کو جے للیتا مار گئی اور دوسری کوشش قبل از وقت انتخاب کروا کر دوبارہ اقتدار سنبھالنے کی نذر ہو گئی۔ وی پی کی پیٹھ میں بل کے پاس ہونے سے پہلے چندر شیکھر نے چھرا گھونپ دیا تو دیوے گوڑا کو گجرال صاحب اقتدار سے بے دخل کر کے بل کو لے ڈوبے۔ گویا جو کوئی اس بل کو لاتا تھا وہ خود چلا جاتا تھا، ہو سکتا ہے اس بار منموہن بلی چڑھ جائیں اور راہل بابا ان کی جگہ سنبھال لیں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ اس بل کو دستوری درجہ دلانا انہیں کا خواب ہے جسے وہ اقتدار سنبھالنے کے بعد چکنا چور کریں گے۔ ماضی کی روایت تو یہی رہی ہے

ابن انشاء نے اپنی اردو کی آخری کتاب میں مختلف مایہ ناز ہستیوں کے ہمراہ مغل بادشاہ سلیم جہانگیر کا تذکرہ بھی کیا ہے لیکن بدقسمتی سے انشاء جی کو شورش کاشمیری کا ڈرامہ انارکلی اورکے آصف کی فلم مغلِ اعظم دیکھنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی تھی اس لئے انہوں نے غلطی سے جہانگیر کی بیوی کا نام انارکلی کے بجائے نورجہاں لکھ دیا۔ اب اس کا فیصلہ کرنا بڑا مشکل کام ہے کہ ان تینوں تاریخ ساز ہستیوں میں صحیح کون تھا؟ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب کے سب غلطی پر ہوں۔ اس کنفیوژن کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں نورجہاں کے کئی نام ملتے ہیں ممکن ہے ایک نام انارکلی بھی رہاہو جسے مورخ قصداًیا سہواًرقم کرنا بھول گیاہو۔ گمان غالب ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کی طرح جو موقع بموقع اپنی پارٹی کا نام بدلتے رہتے ہیں نورجہاں بھی مختلف سیاسی مجبوریوں کے تحت مختلف نام رکھ لیا کرتی تھی۔ سیاست کی دنیا میں نام چاہے جتنے بدلے جائیں کام نہیں بدلتا۔ اندراکانگریس اپنا نام بدل کر انڈین نیشنل کانگریس رکھ لے تب بھی اس کی آمرانہ فطرت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اگر جن سنگھ اپنا چولہ بدل کربی جے کا روپ دھارن کرلے تب اس میں وہی پرانی فسطائی روح کارفرما رہتی ہے۔ جتنا پریوار چاہے جس قدر بھیس بدلے اس پر موقع پرستی کا بھوت ہر صورت سوار رہتا ہے۔ ہندوستانی

سیاست میں جنتا پریوار نے جتنے رنگ بدلے ہیں اس کا شمار کرکے تو شاید گرگٹ بھی شرما جائے اگر ان تمام رنگوں کا ذکر مع اسباب کیا جائے تو یہ مضمون سیاست کی آخری کتاب بن جائے گا۔

تاریخ کے صفحات میں نورجہاں کی بڑی تعریف و توصیف ملتی ہے اس کے حسن و جمال کے چرچے تو امراؤجان سے زیادہ ہیں۔ ویسے بھی مغلیہ عہدِ سلطنت میں جبکہ ہندوستان سونے کی چڑیا ہوا کرتا تھا کس مؤرخ کے اندر یہ جرأت تھی ملکہ کو بدصورت کہتا؟ جس طرح ہمارے صحافی حضرات آج کل گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر اصحاب اقتدار کے گن گاتے ہیں یا خوف کھاتے ہیں اسی طرح کی آزادی و حریت کا ماحول مغلیہ دور میں بھی تھا اسی لئے راوی بہر صورت چین لکھتا تھا۔ ویسے تاریخی شواہد سے علی الرغم اگر علمِ قیاس سے بھی مدد لی جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا نورجہاں بے حد خوبصورت تھی ورنہ سلیم جہانگیر اپنے گورنر شیر افگن کا قتل کرواکر اس کی ۳۴ سالہ بیوہ سے نکاح کرنے کی غلطی کیوں کرتا؟

بے چاری انارکلی کی طرح نورجہاں رقاصہ نہیں بلکہ ماہر شکاری تھی۔ سنا ہے اندرا گاندھی کی مانند اس کا نشانہ کبھی بھی خطا نہ ہوتا تھا۔ اس کا پہلا شکار تو شیر افگن تھا جس نے شیر کے جبڑے میں ہاتھ ڈال کر ڈان کے بچن کی طرح اسے پھاڑ دیا تھا۔ شیر افگن کی اس دلیری سے متاثر ہو کر شہنشاہ اکبر نے اسے

اپنی ایک ریاست کا گورنر بنا دیا۔ اسکی بہادری کا یہ عالم تھا کہ جب جہانگیر نے دھوکے سے اسے اپنے سوتیلے بھائی قطب الدین کے ذریعہ بلوا بھیجا اور اپنے وفادار فوجیوں سے گھیر لیا تو وہ جاتے جاتے بھی قطب الدین کو اپنے ساتھ ملکِ عدم لے گیا۔ مگر تاریخ کے صفحات پر یہ بھی درج ہے کہ شیر دل شیر افگن اپنی زوجہ محترمہ نورجہاں جو اس وقت مہرالنساء کہلاتی تھی کے آگے بھیگی بلی بنا رہتا تھا اور کیوں نہ بنتا وہ اس کے دل کی ملکہ جو تھی ۔ خیر شیر افگن کی مہرالنساء نے جب جہانگیر کے محل کو منور کیا تو جہانگیر نے اسکو نور محل کے خطاب سے نوازہ لیکن جب نور محل کو پتہ چلا کہ اس کے شوہرِ نامدار کا لقب جہانگیر ہے تو اس نے بھی اپنے نام میں محل کو جہاں سے بدل دیا اور نور جہاں کہلانے لگی ۔ نور جہاں کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس نے اپنے شوہر کے آخری ایام میں اپنے نام کا سکہ تک جاری کر دیا تھا۔

نور جہاں کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے ایک مرتبہ چار گولیوں سے چھے عدد شیر ڈھیر کر دیئے ۔ یہ بھلا کیونکر ممکن ہے ؟ حکمرانوں کے بابت اس طرح کا حمقانہ سوال نہ اُس وقت کیا جاتا تھا اور نہ اب کیا جاتا ہے ۔ان شیروں میں سے ایک شیر سنگھ نام کا دھوبی بھی تھا جو اپنے کتے کے ساتھ عامر خان کی آئندہ فلم دھوبی گھاٹ کے سیٹ پر ایکسٹرا کا رول کرنے کیلئے جا رہا تھا جیسا کہ لوگ انا ہزارے کی بھوک ہڑتال میں وندے ماترم کا نعرہ لگانے کیلئے

آجاتے ہیں ۔ نورجہاں کا کوئی ارادہ دھوبی کو ہلاک کرنے نہیں تھا بلکہ اس نے غلطی سے دھوبی کے کتے کو بھی دور سے شیر سمجھ لیا تھا اور اس کی گولی جب کئی شیروں کے اندر سے گھستی نکلتی کتے کی جانب بڑھی تو کتے نے بڑی صفائی سے اسے جھانسہ دے دیا ۔ دراصل دھوبی کا کتا کرکٹ کا شوقین تھا اسے پتہ تھا کہ جب راولپنڈی ایکسپریس شعیب ملک باؤنسر پھینکتا ہے تو لٹل ماسٹر سچن تنڈولکر کس طرح اسے ڈک کر دیتا ہے ۔ کتے نے سر جھکا کر گولی کو ڈک کیا اور گولی ٹھک سے دھوبی کے بھیجے میں گھس گئی ۔ اس حادثے میں دھوبی کے علاوہ سارے لوگ بے قصور تھے ۔ دھوبی کا قصور یہ تھا وہ عوام کی طرح غافل تھا ۔ بے چاری نورجہاں کو تو نہ یہ پتہ تھا کہ وہ شیر نہیں بلکہ کتا ہے جس پر وہ نشانہ سادھ رہی ہے اور ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ کتا بلا کی پھرتی سے اروند کیجریوال کی مانند خود بچ کر نکل جائیگا اور دھوبی کو انا ہزارے کی طرح پونہ کے ہسپتال میں پہنچا دے گا۔

انا جی تو خیر خوش قسمت تھے جو وہ کیجریوال کی چالبازی کے باوجود بچ نکلے لیکن بیچارہ دھوبی سیٹ کے بجائے پرلوک سدھار گیا تاکہ لوک پال کے سامنے اپنی شکایت درج کرائے ۔ عامر خان نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دھوبی کے سوگ میں شوٹنگ کو منسوخ کرکے ٹی وی والوں کو بلوا بھیجا ۔ کس چینل والے کی مجال تھی کہ عامر خان کی دعوت کو ٹھکراتا سب کے سب اس کے سیٹ پر

تمام جھام کے ساتھ جا پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں عامر خان قیامت سے قیامت تک مگر مچھ کے آنسو بہارہا ہے۔ ایک طرف پارلیمان کے اندر لوک پال بل کا انتم سنسکار ہو رہا تھا سیاستدان اپنے اپنے انداز میں اسکی لاش پر ٹسوے بہا رہے تھے دوسری طرف دھوبی گھاٹ کے سیٹ پر دھوبی کی موت کا ماتم ہو رہا تھا۔ ٹی وی والے دونوں مناظر بدل بدل کر دکھلا رہے تھے اور ناظرین اپنے ٹی وی سے فیویکول لگا کر چپکے ہوئے تھے۔ مارنے والی نورجہاں اور بیچنے والا کتا دونوں پردے کے پیچھے مسکرا رہے تھے۔ سیاستدانوں کے ساتھ عامر خان کی فلم کے سپر ڈپر ہونے کا راستہ بھی ہموار ہو رہا تھا۔

یہ سارا ناٹک پہلے سے تیار شدہ منظر نامے کے مطابق چل رہا تھا کہ اچانک زور زور سے گھنٹی کی آواز گونجنے لگی۔ نورجہاں نے چونک کر پوچھا ارے یہ کیا؟ یہ کون لوک پال تک پہنچ گیا۔ ہمارے وہ سارے پہرے دار کہاں مر گئے جن کو اس خوبصورت انصاف کی گھنٹی کے آس پاس اس غرض سے تعینات کیا گیا تھا کہ وہاں کوئی انسان تو کجا پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔اس سنگین معاملے کو فوراً تحقیقات کی غرض سے پارلیمان کی سیلیکٹ کمیٹی کے حوالے کیا گیا اور اس نے تفتیش کر کے بتلایا کہ دھوبی کی بیوی کتے سے بھی زیادہ چالاک نکلی۔وہ فریادی کے بجائے انارکلی کی بہن چمپا چمیلی کا بھیس بدل کر محل کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں گھنٹی نصب تھی اور ”تیری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی

دیکھیں گے''کی تال پر رقص کرنے لگی۔ محافظوں کو اس پر ذرہ برابر شک نہ ہوا وہ بھی اس کے ساتھ جھوم جھوم کر ناچنے گانے لگے جیسا کہ سلمان خان کی فلموں میں ہوتا ہے پھر کیا تھا وہ جھومتے ناچتے گھنٹی کے قریب آگئی اوراچانک رقص چھوڑ کرزورزور سے گھنٹی بجانے لگی جس کا شور ٹیلی ویژن کے توسط سے ہر گھر میں پہنچ گیا۔ اس ناگہانی صورتحال میں نور جہاں کو لامحالا انصاف کاترازو نکالنے کا حکم دینا پڑا۔بڑی کھوج بین کے بعد اسے تلاش کیا گیا خوب محنت و مشقت سے اس پر لگے زنگ کو صاف کرکے چمکایا گیا اور بالآخر گھنٹی کی جگہ اس چمچماتے ہوئے ترازو کو لٹکا دیا گیا۔

اس کیف آگیں منظر کو دیکھ کر مرحوم سہراب مودی کے نام پر نریندر مودی نے رتن ٹاٹا کی مدد سے پکار ۲ بنانے کا اعلان کردیا۔ اس نے سوچا مسلمانوں کو لبھانے کا یہ نادر موقع ہے۔اسکے چمچوں نے چاپلوسی میں یہ دلیل پیش کی کہ اگر ڈان ۲ بن سکتی ہے تو عدلِ جہانگیری پر منحصر پکار ۲ کیوں نہیں بن سکتی۔ ویسے بھی اب لوگ رجنی کانت چھاپ اچھل کود سے بور ہونے لگے ہیں ورنہ شاہ رخ کی راون فلاپ کیوں ہوتی؟ پھر کیا تھا دیکھتے دیکھتے رام لیلا میدان پر ایک اور سیٹ لگ گیا لیکن اس بار چونکہ دہلی میں سردی بہت زیادہ تھی اور حکومت کی جانب سے بھی کافی سرد مہری کا مظاہرہ ہو رہا تھا اس لئے مغلِ اعظم انا ہزارے نے ممبئی کی مایا نگری کا رخ کیا۔ انہیں امید تھی کہ ممبئی کی عوام

اس کالو بالو کے بہورنگی تماشے کو دیکھنے کیلیئے جوق در جوق فلمستان اسٹوڈیو کے قریب ایم ایم آر ڈی اے کے میدان میں پہنچ جائیگی لیکن اسی موقع پر سونیا گاندھی نے کنگ خان کو دھمکی دے کر ڈان ۲ ریلزس کروا دی۔ عوام کے لئے دھرم سنکٹ کھڑا ہوگیا لیکن اسا پر عوام نے انا ہزارے پر شاہ رخ خان کو ترجیح دے دی۔ اس میں عوام کا بھی کیا قصور وہ بیچارے انا جی کی ایک سی تقریر سن سن کر اوب چکے تھے سچ تو یہ ہے پبلک کو انا کے بھاشن یاد ہو گئے تھے۔ سال کے آخر میں اپنی زبان کا ذائقہ بدلنے کی خاطر لوگ جاوید اختر کے مکالمے سننے کی خاطر ڈان کی جانب چل پڑے اور ایوان میں انصاف کا ترازو ہچکولے کھانے لگا۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بار کون سا پلہ بھاری ہو گا ؟ایکطرف ڈان ۲دوسری طرف پارلیمان ۹۔

پارلیمان کا پردہ جیسے ہی اٹھا نورجہاں کے لباس میں سونیا پر کیمرہ جاکر رک گیا ویسے جہانگیر کی طرح بیمار و لاغر منموہن بھی وہاں موجود تھے لیکن میڈیا کو اس بار نہ ہی ان میں اور نہ انا جی میں کوئی خاص دلچپی تھی ۔جب کیمرہ گھوم کر ترازو پر پہنچا تو وہاں سشما جی دھوبن کا لباس پہن کر براجمان تھیں اور انصاف کی دہائی دے رہی تھیں ، سونیا نے اپنے شاہانہ انداز میں انصاف کا یقین دلایا اور بحث کا آغاز ہوگیا۔ خوب شور شرابے کے

بعد آخر میں جب رائے شماری کا وقت آیا تو نورجہاں نے لاغر و مسکین جہانگیر کی جانب اشارہ کرکے کہا مظلوم دھوبن تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔ تمہارے خاوند کو اس بادشاہ کی ملکہ نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے اس لئے انصاف کا تقاضہ ہے کہ تم بھی اسی بندوق سے جس سے کہ دھوبی ہلاک ہوا ہے اس ملکہ کے مالک سلیم جہانگیر کو بھون دو انصاف کی دیوی کے آگے راجہ اور رنک برابر ہیں۔ نورجہاں کا یہ عدلِ جہانگیری دیکھ کر ملک بھر کے رائے دہندگان فرطِ مسرت سے جھوم اٹھے اور ''سونیا گاندھی زندہ باد ۔راہل گاندی آگے بڑھو ہم تمہارے ساتھ ہیں'' کے نعرے لگانے لگے۔

نورجہاں کے اس دھوبی پچھاڑ نے عامر خان کو بھی ششدر کر دیا اس نے اپنی فلم کا نام دھوبی گھاٹ سے بدل کر دھوبی پچھاڑ رکھ دیا۔ نورجہاں کے تیور دیکھ کر ڈان نے سوچا کاش کہ اس کی فلم میں بھی کوئی ایسا ٹوسٹ ہوتا۔ منموہن تو تھر تھر کانپ رہے تھے ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ سشما کیلئے نیا دھرم سنکٹ کھڑا ہوگیا تھا اس نے سوچا اگراس موقع پر منموہن کی بلی چڑھ جائے تو راہل بابا ان کی ارتھی پر اپنی سیاسی روٹیاں سینک کر اقتدار پر قابض جائیگا اور اپنے باپ سے زیادہ نشستیں پائے گا پھر اسے ہٹانا بہت مشکل ہوجائے گا۔ اس لئے سشما جی نے پینترا بدلہ اوراپنے دھوبی کا خون بہا لے کر لوک سبھا میں لوک پال کا قانون توپاس کروادیا لیکن اسے دستوری درجہ سے

محروم ہی رکھا اور ایوانِ بالا میں اس کا قلع قمع کرنے کی منصوبہ بندی میں لگ گئیں ۔
ایوانِ زیریں میں جیسے ہی لوک پال کا قانون بنا انصاف کا ترازو ہٹا دیا گیا اور اسکی جگہ دوبارہ گھنٹی نصب کر دی گئی جس پر جلی حروف میں لوک پال لکھا ہوا تھا۔ اس گھنٹی کے اطراف سخت پہرے کے علاوہ کیمرے بھی نصب کر دیئے گئے تھے تاکہ دوبارہ کسی فریادی کی فریاد رس گھنٹی تک رسائی ممکن نہ ہو سکے ۔ سیاست کی میزان پر یہ الٹ پھیر کیسے ہو جاتا ہے یہ جاننے کیلئے آپ کو تاریخ کی نہیں حساب کی کتاب پڑھنی ہو گی جس کا پہلا سبق خود انشا جی سے پڑھئے ماسٹر جی فرماتے ہیں ۔

حساب کے چار بڑے قاعدے ہیں

جمع، تفریق، ضرب، تقسیم

پہلا قاعدہ : جمع

جمع کے قاعدے پر عمل کرنا آسان نہیں

خصوصا مہنگائی کے دنوں میں سب کچھ خرچ ہو جاتا ہے

کچھ جمع نہیں ہو پاتا

جمع کا قاعدہ مختلف لوگوں کیلئے مختلف ہے

عام لوگوں کیلئے ۱+۱ = ۱

کیونکہ ۱/۲ (یعنی آدھا) انکم ٹیکس والے لے جاتے ہیں

تجارت کے قاعدے سے جمع کرائیں تو ۱+۱ کا مطلب ہے گیارہ

رشوت کے قاعدے سے حاصلِ جمع اور زیادہ ہو جاتا ہے

قاعدہ وہی اچھا جس میں حاصلِ جمع زیادہ آئے بشرطیکہ پولیس مانع نہ ہو

ایک قاعدہ زبانی جمع خرچ کا ہوتا ہے

یہ ملک کے مسائل حل کرنے کا کام آتا ہے

آزمودہ ہے

(نوٹ: لوک پال بل کی طرح اس مضمون کو بھی قارئین کی تفریحِ طبع کیلئے لکھا گیا ہے

۔اس کے سارے واقعات و کردار فرضی ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے)

بھنوری دیوی: اب عمر کی نقدی ختم ہوئی

جودھپور سے سو کلومیٹر دور جالودہ گاؤں سے سی بی آئی نے چند ہڈیوں کے ٹکڑے ایک ہار، انگوٹی اور گھڑی برآمد کر لی جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ یہ بھنوری دیوی کی آخری اثاث ہے۔ راجیو گاندھی نہر کے اندر سے چار ماہ بعد صحیح سلامت گھڑی اس وقت ملی جب بھنوری دیوی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اپنی کامیابی پر شاداں و فرحاں سی بی آئی کے افسران نے جے پور ہائی کورٹ میں پہنچ کر درخواست کی کہ بھنوری کو تلاش کرکے پیش کرنے کا مقدمہ جو اس کے شوہر نے داخل کیا ہے اسے بند کر دیا جائے۔ اس بات کا سراغ مل چکا ہے کہ اس کا قتل کر دیا گیا ہے چونکہ وہ پرلوک سدھار چکی ہے اس لئے اب لوٹ کر واپس نہیں آسکتی۔ بھنوری کی سانس کا تار ٹوٹ گیا اسکی نبض رک گئی لیکن گھڑی کی ٹک ٹک جاری ہے اس لئے کہ وقت نہیں رکتا اور یہ گھڑی بھنوری کی جانب سے گویا فریاد کر رہی ہے

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی،
اب ہم کو ادھار کی حاجت ہے
ہے کوئی جو ساہو کار بنے،
ہے کوئی جو دیون ہار بنے

سی بی آئی نے اس معاملے میں کمال کی پھرتی دکھلائی لیکن ہڈیوں اور اثاثوں سے قاتل کا پتہ نہیں لگتا۔ اس معاملے میں قتل کی ساری کڑیاں مل چکی ہیں۔ بھنوری کو کس نے کس کے اشارے پر کیسے قتل کیا اور کس طرح اس کی لاش کو ٹھکانے لگایا گیا یہ تمام تفصیلات ذرائع ابلاغ کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ سی بی آئی کے مطابق چونکہ بھنوری دیوی نے خود اپنی سی ڈی برطرف شدہ وزیر مہی پال مدیرنہ کے ساتھ تیار کروائی تھی اور اس کے ذریعہ مدیرنہ سمیت لونی کے کانگریسی ایم ایل اے ملکھان سنگھ کو بلیک میل کرتی تھی اس لئے ایک منصوبہ بند سازش کے تحت ان دونوں افراد نے مل کر اسے قتل کروایا اور اس منصوبے میں مدیرنہ کی بیوی لیلا، ملکھان کی بہن اندرا اور بھنوری کا شوہر امرچند سب کے سب شامل تھے۔ ملکھان سے بھنوری کے تعلقات بہت پرانے تھے اسی نے بھنوری کو مدیرنہ سے ملوایا تھا۔ ان تعلقات کے باعث بھنوری کا شوہر امرچند اس سے نالاں تھا۔

بھنوری کا دعویٰ تھا کہ اس کا بیٹا گنگن دراصل ملکھان سے ہے اس لئے اسے ملکھان کی جائیداد میں حصہ ملنا چاہئے۔ ملکھان کا ڈی این اے ٹیسٹ کروایا جارہا ہے حقیقت کا پتہ رپورٹ کے بعد ہی چلے گا۔ مدیرنہ سے بھنوری کو یہ شکایت تھی کہ وہ اسے خاطر خواہ عیش و عشرت فراہم نہیں کر رہا ہے اس لئے اس نے پانچ کروڑ روپے کا مطالبہ کیا بصورتِ دیگر ستمبر کو لگنے والے عوامی

میلے میں سی ڈی کو مشتہر کرنے کی دھمکی دے ڈالی اور یہی قدم اسے مہنگا پڑا۔ یکم ستمبر کی شب اسے اغوا کرکے قتل کر دیا گیا۔ ایک گینگ نے اسے قتل کرکے دوسرے کے حوالے کیا جس نے اس کی لاش کو جلا کر خاک نہر برد کر دی۔ امر چند کو خاموش رہنے کیلئے ۱۰ لاکھ کا وعدہ کیا گیا تھا اس نے پچاس ہزار وصول بھی کئے لیکن ۴ ستمبر کو نہ جانے کیوں شکایت لکھوانے پولیس تھانے پہنچ گیا۔ ممکن ہے ڈر گیا ہو یا اسے بقایا رقم نہ ملنے پر ناراض ہو گیا ہو۔ وجہ جو بھی ہو لیکن اس شکایت کے نتیجے میں سارا راز فاش ہو گیا اور فیض کے اشعار پھر سے زندہ ہو گئے ؂

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

بھنوری دیوی کا یہ عبرت ناک انجام ہمارے سماج کی جنسی بے راہ روی کی منہ بولتی تصویر ہے جس میں نہ صرف عوام بلکہ ان کے رہنما، نہ صرف افراد بلکہ ان کا پورا کا پورا خاندان بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ملوث ہو جاتا ہے۔ کسی کو اس میں کوئی عیب یا برائی نہیں دکھلائی دیتی۔ حرص و ہوس کے اس کھیل میں دولت کی لالچ اور عیش و عشرت کی چاہت ہر موڑ پر نظر آتی ہے۔ دولت کی

خاطر بھنوری نے سب سے پہلے اخلاقی حدود کو توڑا۔ اس کے شوہر امر چند نے دولت ہی کی خاطر اسے برداشت کیا۔ ملکھان اور مدیرنہ کے خاندان کی عورتوں تک نے اسے گوارہ کر لیا۔ لیکن جب بات وراثت کی تقسیم اور پانچ کروڑ کی پھروتی تک پہنچی تو قتل کا منصوبہ بنا اور قاتلوں نے بھی دولت کی خاطر اس کام کو انجام دیا۔ مادہ پرستی کس طرح انسانوں کو وحشی جانور بنا دیتی اس کی اعلیٰ مثال بھنوری دیوی کا معاملہ ہے۔ دینی و اخلاقی اقدار کی پامالی کس طرح انسان کو شتر بے مہار بنا دیتی ہے اور آخرت فراموشی کے نتائج اس دنیا میں بھی کس قدر بھیانک ہوتے ہیں؟ یہ سب اس حادثے میں عیاں ہے۔ ہندوستان کے مختلف ماہرین قانون بلکہ سیاستداں اور دانشور بھی بارہا اس حقیقت کا اعتراف کرتے رہے ہیں کہ جنسی اخلاقیات کے سخت ضابطوں کے بغیر خاندان اور سماج کا نظام درست نہیں رہ سکتا۔ اس معاملے سب سے بڑا فساد مغرب کی دوئی نے پیدا کی ہے۔ مغربی مفکرین نے جب دین اور دنیا میں تفریق پیدا کرکے مذہب کو عملی زندگی سے خارج کیا تو اسی کے ساتھ زِنا بالرضا اور زِنا بالجبر کو بھی الگ الگ کر دیا حالانکہ دونوں ایک ہی گناہ کی پوٹلی کے چٹے بٹے ہیں اس لئے ایک صحت مند سماج میں دونوں کی سزائیں یکساں طور پر سخت ہونی چاہئیں۔ اس حقیقت کا اعتراف نہ صرف اسلام بلکہ یہودیت ا ور ہندو مذہبی صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن جب مذہب کا دائرہ کار صرف روحانیت

ا

ورعبادات تک محدود کردیا جائے۔ سیاست میں رائے دہندگان کو بہلانے اور پھسلانے کی خاطر اس کا استحصال تو کیا جائے لیکن عدالت اور اجتماعی امور سے اس کا رشتہ کاٹ دیا جائے تو وہی کچھ ہوتا ہے جو بھنوری کے ساتھ ہوا۔ بھنوری کا قتل اس کے دشمنوں نے نہیں بلکہ ان دوستوں نے کیا ہے جو کل تک ابن انشا کی مانند یہ کہتے تھے ۔

تم سوہنی ہو، من موہنی ہو؛ تم جا کر پوری عمر جیو
جب عمر کا آخر آتا ہے، ہر دن صدیاں بن جاتا ہے
جینے کی ہوس ہی نرالی ہے، ہے کون جو اس سے خالی ہے
کیا موت سے پہلے مرنا ہے، تم کو تو بہت کچھ کرنا ہے

بھنوری دیوی تو اپنے سارے کام ادھورے چھوڑ کر چلی گئ ۔ سی بی آئی نے اپنا کام تمام کردیا لیکن اب عدالت کو بہت کچھ کرنا ہے ۔ یہ مقدمہ اب اپنے ابتدائی مراحل میں قدم رکھ چکاہے۔ہمارے ملک کا عدالتی نظام ہاتھی کی مانند بلند بانگ ضرور ہے مگر چیونٹی کی رفتار سے چلتا ہے ۔ اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت راجھستان ہی کی ایک اور بھنوری ہے جسے ہم لوگ بھول چکے ہیں ۔ تقریباً بیس سال قبل ۲۲ ستمبر ۱۹۹۲ء کو جے پور کے بھتیری گاوں کے گوجروں نے ایک کم سن بچی کی شادی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے نتیجے میں کمہارن بھنوری دیوی کی اجتماعی عصمت دری کی تھی ۔ بھنوری نے اس ظلم کے آگے سپر ڈالنے کے

بجائے علم بغاوت بلند کر دیااور ایسابونڈر مچایاکہ پورا ملک اس کے ساتھ ہو گیا یہاں تک کہ سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس وی آر کرشنا ئیر بھی بھنوری کو انصاف دلانے کی تحریک میں شامل ہو گئے لیکن اس کے باوجود اسے ابھی تک انصاف نہیں ملا۔ بھنوری کی تکذیب کی گئی ۔ اسے برا بھلا کہا گیا۔ اس پر دباوڈالا گیا۔ اسے دھمکیاں دی گئیں اور روپیوں کا لالچ بھی دیا گیا کہ لیکن وہ دلیر خاتون اپنے موقف پر ڈٹ کر قانونی جنگ لڑتی رہی ۔

تین سال کے عرصہ میں جے پور کی دیوانی عدالت کے پانچ ججوں کا تبادلہ ہوالیکن چھٹے نے آکر نہایت حیرت انگیز طور پر تمام ملزمین کو بری کر دیا۔ اس فیصلے میں کہا گیا کہ اعلیٰ ذات کا آدمی ایک دلت کی عصمت دری نہیں کر سکتا چونکہ ملزمین میں ایک چچا بھتیجا شامل ہیں وہ ایک دوسرے کے سامنے یہ حرکت نہیں کر سکتے ۔ بھنوری کا شوہر جو کہ ایک گواہ ہے وہ اپنی بیوی کی اجتماعی عصمت دری پر خاموش تماشائی نہیں بنا رہ سکتا نیز ۵۲ گھنٹے بعد ہونے والی طبی رپورٹ کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا اسلئے ممکن ہے کہ بھنوری بہتان لگا رہی ہو۔ اس شرمناک فیصلے کی حمایت میں برسر اقتدار بی جے پی کے ایک ایم ایل اے نے جے پور میں فتح کا جلوس نکالا جس میں درگا واہنی کی خواتین کارکنان نے بھی بھنوری کو جھوٹا اور کذاب کہا لیکن اس کے برعکس بھنوری کو حاصل ہونے والی ملک گیر حمایت کے آگے شیخاوت حکومت کو جھکنا پڑا اور اس نے اس فیصلے کو

ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ اس بات کو ۱۷ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اس بیچ صرف ایک سماعت کی نوبت آئی ہے دو اہم ترین ملزمین میں سے ایک کی موت واقع ہو گئی لیکن انصاف کا کہیں دور دور تک اتا پتہ نہیں ہے۔

عام آدمی کیلئے یہ حیرت کی بات ہو سکتی ہے لیکن عدالتی حلقہ میں اس پر کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ ہماری عدالتوں میں بیس بیس سال سے کئی مقدمات زیر التوا ہیں۔ عدالت کی روایت یہ ہے کہ جن مقدمات کے ملزمین جیل میں ہوتے ہیں، اُن کی سماعت پہلے ہوتی ہے اور بھنوری دیوی عصمت دری کیس کے تمام ملزمین ضمانت پر ہیں اس لیے مقدمے کی اگلی سماعت کب ہو گی کوئی نہیں جانتا؟ فی الحال وطن عزیز میں ایک کروڑ سے زائد مقدمات زیر التوا ہیں جن میں سے کئی ایک کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ اگر حکومت چاہتی تو اس مقدمہ کو فاسٹ ٹریک عدالت کو سونپ سکتی تھی لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ ریاکاری کے پیش نظر بھنوری پر انعام و اکرام کی بارش تو ہوتی رہی لیکن اسے انصاف سے محروم رکھا گیا۔ بھنوری کہتی ہیں کہ سرکار سے انہیں کوئی انصاف نہیں ملا لیکن بھگوان نے ان کی مدد کی۔ 'مجھے خوشی ہے کہ جو بیڑہ میں نے اٹھایا تھا اس میں کامیاب رہی ہوں۔ اب بہت تبدیلی آئی ہے، عورتوں میں حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ بچوں کی نو عمر میں شادیوں کے واقعات کم ہوئے ہیں، جہیز کے رواج میں بھی کمی آئی ہے۔ اب کوئی بھی ہمارے علاقے میں کھلے عام بچوں کی نو عمری میں شادی نہیں

کرا سکتا۔ لوگوں کو ڈر لگتا ہے کہ بھنوری کہیں شکایت نہ کر دے۔

بھنوری عورتوں کے لیے تبدیلی کا پیکر ہے اس جیسی خواتین کی جدوجہد کے باعث حالیہ برسوں میں راجستھان میں حقوق نسواں کی تحریک مضبوط ہوئی ہے۔ان پر عزم خواتین میں سے ایک جے پور ضلع کی ریکھا (نام تبدیل کردیا گیا ہے) جو اپنے ساتھ ہوئی مبینہ اجتماعی زیادتی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں اور قصورواروں کو سزا دلوا کر ہی مانیں۔ دیہاڑی پر مزدوری کرنے والی ریکھا ایک دلت عورت ہے۔ ان کے ساتھ چند سال قبل جب کہ وہ اپنے بیمار شوہر کے لیے دوا لینے جا رہی تھی اجتماعی زیادتی کا حادثہ پیش آیا تھا لیکن اس نے حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور عدالت میں گہار لگاتی رہی۔ جب عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ سنایا تو ریکھا نے کہا: 'قصورواروں کو ابھی دس- دس سال کی سزا ہوئی ہے اور مجھے اس پر تسلی ہوئی۔ کم سے کم آگے تو یہ کسی اور عورت کی آبرو پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔' ریکھا نے مزید بتایا 'وہ سبھی امیر کبیر لوگ تھے، مجھ پر دباؤ ڈالا گیا کہ سمجھوتہ کر لوں۔ لاکھوں روپوں کی پیشکش کی گئی یہاں تک کہ میری برادری کے لوگ اور رشتے دار بھی سمجھوتے کے لیے دباؤ ڈالنے لگے، پر میں جھکی نہیں۔'

ریکھا ہی کی مانند بھرت پور ضلع کے بیر گاؤں کی دلت خاتون موہنی ہے جو گزشتہ

دس سال سے گاؤں کے بارسوخ لوگوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔ جنہوں نے اس کے شوہر لکشمن کو اتنا پیٹا کہ ان کے دونوں پیر کاٹنے پڑے۔ موہنی اپنی تمام تر آزمائشوں کے باوجود جس میں گاؤں چھوڑ کر جے پور میں پناہ لینا شامل ہے اپنی جدو جہد جاری رکھے ہوئے ہے۔ موہنی اپنے پر عزم انداز میں کہتی ہیں کہ 'انصاف کی منزل ابھی بہت دور ہے، دلت کی کون سنتا ہے۔ مقدمہ اب بھی چل رہا ہے، گواہوں کے بیان تک مکمل نہیں ہوئے مگر ہم لڑیں گے یہ انصاف کی جنگ ہے'۔ دلتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والے پی ایل یمروتھ کا ماننا ہے کہ خواتین کے لیے زندگی مشکل ہے لیکن عورت اگر دلت ہو تو راہ اور بھی کٹھن ہو جاتی ہے۔ یمروتھ کے مطابق 'دلت عورت جنسی تشدد کا زیادہ شکار ہوتی ہے کیونکہ سماج کا ایک حصہ انہیں بہت نیچی نظر سے دیکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ماننا ہے کہ دلت عورت کو جنسی حوس کا نشانا بنانا کوئی بری بات نہیں ہے'

ہمارے ذرائع ابلاغ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ وہ انصاف کی خاطر لڑنے والی جے پور کی بھنوری کو بہت جلد بھلا دیتا ہے رکھا اور موہنی جیسی خواتین سے صرفِ نظر کرتا ہے اور جودھپور کی بھنوری دیوی کو اچھالتا رہتا ہے۔ اب سنا ہے پہلے والی بھنوری کی پر بنی فلم بونڈر کی طرح اس نئی بھنوری دیوی پر بھی فلم بننے والی ہے اور ممکن ہے وہ فلم باکس آفس پر کامیاب ہو جائے۔ اس بات

کا بھی امکان ہے آئندہ انتخابات میں یہ مسئلہ سیاسی بازیگری کا کھلونا بن جائے اور وسوندھرا راجے اس سیڑھی پر چڑھ کر اپنا کمل کھلانے کی کوشش کرے لیکن کیا اس قتل میں ملوث طاقتور سیاستدانوں کو سزا ملے گی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

شام: شانہ بھی میرا اور نشانہ بھی میں ہی تھا

شام کے صدر بشار الاسد نے گزشتہ ہفتے دمشق یونیورسٹی سے براہ راست نشر ہونے والے خطاب میں عالمی قوتوں پر شام کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کا الزام لگایا اور 'دہشت گردوں' کے خاتمے کا اعادہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ بیرونی قوتیں شام میں عدم استحکام پیدا کرنے کی سازش کر رہی ہیں۔ کئی ماہ بعد قوم سے براہ راست خطاب میں صدر اسد نے کہا کہ ملک میں جاری دہشت گردی کو آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔ ہم ایسے افراد سے بالکل نرم برتاؤ نہیں کریں گے جن کے تانے بانے بیرونی طاقتوں سے ملتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کی ترجیح لوگوں کے جان و مال کو تحفظ فراہم کرنا ہے جو کہ انہیں گزشتہ کئی دہائیوں سے حاصل ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دہشت گردی کا مقابلہ سختی سے کیا جائے۔ شام میں پچھلے چالیس سالوں سے ایمرجنسی نافذ ہے اور الاسد خاندان کی حکومت ہے۔ چار دہائیوں تک ظلم و استحصال کی چکی میں پسنے والی شامی عوام نے جب بشار سے اپنی جان و مال کے تحفظ کی دہائی سنی ہوگی تو یقیناً انہیں ڈاکٹر فریاد آزر کے یہ اشعار یاد آئے ہوں گے۔

اپنی تباہیوں کا بہانہ بھی میں ہی تھا
شانہ بھی میرا اور نشانہ بھی میں ہی تھا

مبصرین ابھی اس خطاب کے اسرار و رموز پر اپنا سر کھپا ہی رہے تھے کہ بشار نے پینترا بدل کر مظاہروں میں ملوث افراد کی معافی کا اعلان کر دیا۔ اس معافی کا اطلاق ان افراد پر ہوگا، جو پر امن انداز میں مظاہرے کرتے رہے ہیں اور جنوری کے اختتام سے قبل اپنے ہتھیار حکام کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس سے وہ منحرف فوجی بھی استفادہ کر سکیں گے جو ۳۱ جنوری سے قبل خود کو حکام کے حوالے کر دیں گے گویا ایک ہفتہ کے اندر آہنی پنجہ ڈھیلا ہو گیا یا کسی سازش کے تحت کر دیا گیا۔ بشار الاسد کی فریب کاریاں اب نئی نہیں ہیں دنیا اسے سمجھ چکی ہے۔ اس سے قبل صدر بشار الاسد کئی بار معافی دے چکے ہیں مگر حزب اختلاف کا کہنا ہے کہ تقریباً چودہ ہزار افراد اب بھی جیلوں میں بند ہیں، جہاں ممکنہ طور پر انہیں تشدد یا بد سلوکی کا سامنا ہے۔

بشار الاسد کو عام معافی کا اعلان اس لئے کرنا پڑا کہ یہ شامی حکومت کے عرب لیگ کے ساتھ طے پانے والے اس منصوبے کا حصہ ہے، جس کی دیگر شرائط میں خونریزی کا خاتمہ، فوج اور ٹینکوں کی شہری علاقوں سے واپسی اور مخالفین کے ساتھ سیاسی مذاکرات کا آغاز شامل ہیں۔ ابھی حال میں عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل نبیل العربی نے اعتراف کیا کہ الاسد حکومت یا تو عرب لیگ کے امن منصوبے کو یکسر نظر انداز کر رہی ہے یا پھر وہ اس پر جزوی طور پر عمل درآمد

کر رہی ہے حالانکہ اس نے مظاہرین کے خلاف تشدد کی کارروائیاں ختم کرنے کے لیے اس پر دستخط کر رکھے ہیں۔ شامی حکومت نے متعدد وعدے کیے تھے لیکن اس نے ان پر عمل درآمد نہیں کیا۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تو شام میں خانہ جنگی چھڑ سکتی ہے۔

ایران نے شام کی جانب سے عرب لیگ کی تجویز قبول کرنے کا خیر مقدم کیا ہے۔ دمشق میں اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر محمد رضا رؤف شیبانی نے شام کی نائب صدر نجاح العطار اور شام کی بعث پارٹی کے ڈپٹی سکریٹری جنرل محمد سعید بختیان سے الگ الگ ملاقاتوں میں کہا کہ شام کی حکومت کا قومی مذاکرات پر تیار ہونا موجودہ حساس مرحلے کو سر کرنے کی مناسب ترین راہ ہے۔ قطر ماضی میں شام کا ایک قریبی اتحادی ملک رہا ہے اور اب بھی اس کے ایران کے ساتھ بہترین تعلقات ہیں اس کے باوجود شامی صدر بشار الاسد کی جانب سے اپنے مخالفین کو دبانے کے لیے جاری تشدد کے باعث وہ اب بشار کا سخت ناقد بن چکا ہے۔ شیخ حمد بن خلیفہ نے سی بی ایس کے پروگرام ''۶۰ منٹ'' میں گفتگو کرتے ہوئے شام میں تشدد کو روکنے کے لیے فوجی مداخلت کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اس صورت حال میں ہلاکتوں کو روکنے کے لیے کچھ فوجیوں کو بھیجا جانا چاہیے''۔ اس کے برعکس تہران اب بھی اپنی پرانی روش پر قائم ہے اور اس نے ایرانی پاسداران انقلاب کے تحت القدس یونٹ کے کمانڈر جنرل قاسم سلیمانی کو دمشق کے دورے پر

روانہ کیا۔ جنرل سلیمانی کے دورۂ شام سے یہ قیاس آرائی تیز ہو گئی کہ دمشق کے لئے شامی امداد میں فوجی ساز و سامان بھی بھجوایا گیا ہوگا۔اس بات کا قوی امکان ہے کہ جنرل سلیمان نے اپنے اس دورے میں صدر بشار الاسد سمیت ملک کی دیگر اعلیٰ شخصیات سے ملاقات کی ہو نگی۔

ایران کے مذہبی پیشوا آیت اللہ علی خامنہ ای کی جانب سے متعدد نمائندوں نے شام کے مسئلہ پر گفت و شنید کی غرض سے مختلف خلیجی ممالک قطر، کویت، متحدہ عرب امارات اور سلطنت عمان کا مختصر دورہ کیا۔ ان مذاکرات میں صدر بشار الاسد کا متبادل تلاش کرنے پر تبادلہَ خیال ہوا جواس بات کا ثبوت ہے کہ ایران نے شام میں تبدیلی کو اب نوشتہ دیوار" سمجھ کر مستقبل کی پیش بندی تیز کر دی ہے۔ان دوروں میں غیر معمولی" اہمیت کا حامل ترکی کا دورہ ہے اس لئے کہ ترکی نہ صرف عالمِ اسلام کی ایک بہت بڑی طاقت ہے بلکہ اس کی سرحدیں شام سے ملتی ہیں اور ترکی حکومت نے ببانگِ دہل شامی عوام کے احتجاج کی حمایت کی ہے۔ ایران کے اسپیکر علی لاریجانی اور ترکی کے وزیر اعظم رجب طیب اردوغان نے شام کے بحران پر تبادلہ خیال کیا اور باہمی تعلقات ، علاقائی حالات و بین الاقوامی مسائل پر گفتگو کی۔ دونوں رہنماؤں نے دوطرفہ مذاکرات کو جاری رکھنے پر بھی زور دیا۔ اس سے قبل ایرانی اسپیکر نے ترکی کے وزیر خارجہ داؤد اوغلو اور ترکی کی پارلیمنٹ کے اسپیکر جمیل چیچک سے بھی ملاقات

کی۔ شام کے مسئلہ پر باتیں تو بہت ہو چکیں اب مبنی بر انصاف موقف اختیار کرنے کا وقت ہے بقول فیض ۔

مرجائے گی مخلوق تو انصاف کروگے

منصف ہو تو اب حشر بپا کیوں نہیں دیتے

اس دوران ایران کے نائب وزیر خارجہ حسین امیر عبداللھیان روس کے خصوصی دورے پر ماسکو پہنچے ۔ اس دورے کا مقصد بھی ماسکو میں حکام سے شام کی تازہ کشیدہ صورت حال بالخصوص صدر بشار الاسد کے متبادل کے بارے میں تبادلہ خیال تھا۔ گفتگو کا اہم موضوع شام می بشار الاسد کی حکومت کے بعد ایران اور روس کے مفادات کا تحفظ تھا۔ ماسکو کی ایک پریس کانفرنس سے خطاب میں ایرانی عہدیدار نے نہایت شرمناک انداز میں خارجی عناصر کو شام میں برپا شورش کیلئے ذمہ دار قرار دیا۔ انہوں نے کہاکہ شام میں داخلی سطح پر عوام کی طرف سے تبدیلی کا کوئی مطالبہ نہیں بلکہ شام میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ بیرونی ہاتھوں کا کھیل تماشا ہے۔ ان کے مطابق بعض خارجی ہاتھ شام میں اپنی مرضی کی تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ موجودہ پریشان کن حالات میں ایرانی حکومت قوم شام کو تنہا نہیں چھوڑے گی۔ اگر اب بھی حکومتِ ایران بشارالاسد کو شامی قوم کا مترادف سمجھتی ہے تو اس سے احمقانہ بات کوئی اور نہیں ہو سکتی ۔ ایک طرف تو موصوف نے عرب ممالک میں جاری عوامی انقلاب کی تحریکوں کو بتیس سال قبل ایرانی اسلامی

انقلاب کی تحریک کا حصہ قرار دیا اور ان تحریکوں کو تمام ظالم اور جابر حکمرانوں کے خلاف بتایا پھر بشار کی حمایت بھی کر دی۔ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ اس طرح کی تضادبیانی کامنظر عام پر آنا افسوس ناک ہے۔

عرب مبصرین کی شام میں موجودگی کے باوجود صدر اسد کی سکیورٹی فورسز نے حکومت مخالفین کو کچلنے کے لیے کریک ڈاؤن کارروائیاں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ اقوام متحدہ کے ایک اہلکار کے مطابق عرب لیگ کے مبصرین کی ۲۶ دسمبر کو دمشق میں آمد کے بعد سے شامی فورسز نے چار سو سے زیادہ افراد کو ہلاک کر دیا ہے جبکہ انسانی حقوق کے گروپوں کا کہنا ہے کہ اس دوران فوجی کارروائیوں میں پانچ سو کے لگ بھگ افراد مارے جا چکے ہیں اور شامی فوج کے ٹینک ابھی تک شہروں کے اندر موجود ہیں ان حقائق پر پردہ ڈالنے کیلئے بشار الاسد نے عام معافی کا ڈھونگ رچایا ہے گویا جو مظلوم عوام نشانے پر ہیں انہیں کو دانہ بنا کر عالمی برادری بشمول عرب لیگ کو گمراہ کرنے کی سازش رچائی جا رہی ہے۔

اس طرح سازشوں نے مجھے دام میں لیا
میں ہی حسیں پرندہ تھا، دانہ بھی میں ہی تھا

بعث پارٹی گزشتہ نصف صدی سے اس طرح کی شعبدہ بازی کے ذریعہ اپنے مظالم کے خلاف ہونے والی عوامی بغاوت کو کچلتی رہی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اب اس کا وقت ختم ہو چکا ہے سارے عالمِ اسلام میں بیداری کا ایک ایسا طوفان بپا ہے جس نے بے دین سیاسی نظریات کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ مراکش سے لے مصر تک ہر جگہ انہیں ناکامی کا سامنا ہے اس لئے شام میں بھی یہ تماشے اب کسی کام آنے والے نہیں ہیں۔ جو فرمانروا اقتدار کو اپنے لئے آزمائش سمجھنے کے بجائے اس کے ذریعہ دوسروں پر ابتلاء و آزمائش کا قہر برساتے ہیں وہ بالآخر مشیت کے ہاتھوں عبرتناک انجام سے دوچار ہو کر رہتے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے رسول اکرمؐ سے پوچھا ابراہیمؑ کے صحیفوں کیا تعلیمات تھیں تو آپؐ نے فرمایا صحیفہ ابراہیمؑ کی تعلیمات تمثیل کی زبان میں اس طرح پیش کی گئ تھیں:

اے فریب خوردہ بادشاہ، تجھ کو اقتدار دے کر آزمائش میں ڈالا گیا ہے، میں نے تجھ کو اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا کا مال جمع کرکے ڈھیر لگائے۔بلکہ میں نے تجھے اس لئے بادشاہ بنایا ہے تاکہ تو اپنے انصاف کے ذریعہ مظلوموں کی فریاد کو مجھ تک پہنچنے سے روکے -----کیونکہ مظلوم کی پکار میں رد نہیں کرتا اگرچہ کہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو

عدل کا قیام امت کے ہر خاص و عام کی مشترکہ ذمہ داری ہے لیکن حکمرانوں کا

یہ فرض منصبی ہے کہ وہ عدل و قسط کو قائم کریں قرآن مجید جہاں انصاف کو قائم کرنے کی براہِ راست تلقین کی گئ ہے ان دونوں مقامات پر اس راہ میں پیش آنے والی دو مختلف اور متضاد رکاوٹوں کی بھی نشاندہی کی گئ ہے۔ سورہ النساء میں فرمانِ خداوندی ہے:

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے‘‘

اس آیت ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے تئیں جذبۂ خیر خواہی کسی فرد یا حکومت کو عدل سے باز رکھ سکتا ہے۔اس میں سب اول تو خود اپنی ذات و خواہش نفس ہے اور پھر اقربا، غریب و امیر تفریق کی جانب اشارہ ہے۔ ایران کے لئے شام کے معاملے میں پہلی رکاوٹ یہی انسیت ہے۔ایران کو فلسطینیوں سے ہمدردی اس بناء پر ہے کہ وہ مظلوم ہیں۔شام بھی ان کا حامی ہے اس لئے لازم ہے کہ ایران اور شام کے تعلقات خوشگوار ہوں لیکن اب ضرورت اس امر کے

جائزے کی ہے کہ کہیں یہ انسیت و تعلق عدل و انصاف کی راہ کا روڑہ تو نہیں بن گیا اگر ایسا ہوتا ہے تو اسے عبور کرنا ہوگا اور لگی لپٹی باتیں کہنے کے بجائے ظالم و جابر بشارالاسد کے بجائے شام کی مظلوم عوام کا ساتھ دینا تقاضائے عدل ہے۔

اس معاملے میں دوسری آزمائش نفرت و عناد ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اسرائیل اور اس کا سرپرست امریکہ اسلام اور مسلمانوں کا کھلا دشمن ہے۔ ان لوگوں نے قبلۂ اول پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے نیز ہمارے فلسطینی بھائیوں کو خود اپنی ہی سرزمین پر غلام بنا رکھا ہے۔ اس لئے امریکہ اور اسرائیل سے دشمنی بالکل حق بجانب ہے اب چونکہ شام بھی اب دونوں کا دشمن ہے اس لئے شام اور ایران بلکہ شام اور حماس کے تعلقات کا بہتر ہونا بھی ایک فطری امر ہے لیکن جس طرح کسی مستضعف کی دوستی عدل میں رکاوٹ نہیں بن سکتی اسی طرح امریکہ و اسرائیل جیسے مستکبرین کی دشمنی بھی بشارالاسد جیسے ظالم کی حمایت کا جواز نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ سورہ المائدہ میں ارشاد ربانی ہے :

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ عدل کرو، یہ خداترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اللہ سے

ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس طرح کی نازک صورتحال میں جہاں ایک جانب آگ اور دوسری طرف کھائی ہو کامیابی کے ساتھ گزر جانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دوستی اور دشمنی کی بنیاد اللہ کی خشیت و محبت پر ہو سارا لین دین حق باری تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے ہو ورنہ عدل و انصاف کی پاسداری کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ حضور اکرمؐ نے ایمان کی تکمیل کو ان باتوں سے جوڑ دیا اور فرمایا جس نے اللہ کیلئے دوستی کی اور اللہ کیلئے دشمنی کی نیز جس نے اللہ کیلئے دیا اور اللہ کے لئے روکے رکھا اس نے اپنے ایمان کو مکمل کر لیا۔ اگر اس حدیث نبویؐ کی روشنی میں ایرانی رہنما اپنی خارجہ پالیسی بناتے ہیں تب انہیں شامی عوام کی مظلومیت اور بعث پارٹی کا ظلم نظر آئیگا ورنہ بشارالاسد کی یہ دوستی انہیں مہنگی پڑے گی اور وہ صورتحال پیدا ہو جائیگی جس کا ذکر سورۂ فرقان کی آیات ۲۸۔۲۹ میں اس طرح کیا گیا ہے:

ہائے افسوس، کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے تو ذکر کے آنے کے بعد بھی مجھے گمراہ کر دیا اور شیطان تو انسان کا رسوا کرنے والا ہے ہی (یعنی اس کی دوستی اور رفاقت نے مجھ کو قرآن کی پیروی سے محروم کرکے گمراہ کر دیا ہے)۔

یومِ جمہوریہ : سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

اس سال یوم جمہوریہ کے موقع پر ترنگا جھنڈا قومی دیہی صحت مشن کی بدعنوانی کے ڈنڈے پر لہرایا جائیگا۔ اترپردیش کے انتخاب میں کانگریس پارٹی اس لاٹھی سے اپنے تینوں حریفوں کی جم کر دھنائی کرے گی ۔کانگریس پارٹی پر بجا طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ایوانِ بالا میں جان بوجھ کر منصوبہ بند طریقے پر لوک پال بل کو پاس ہونے نہیں دیا اس طرح گویا بدعنوانی کے خلاف بننے والے قانون کو روک کر کرپشن کی حمایت کی ۔ اپنی جانب سے توجہ ہٹانے اور مایا وتی کو گھیرنے کی خاطر کانگریس پارٹی نے این ایچ آر ایم کی بدعنوانی سے متعلق کنٹرولر جنرل کی رپورٹ شائع کروادی جس کے مطابق پانچ ہزار سات سو پچاس کروڑ روپئے کا کوئی حساب کتاب نہیں پایا جاتا۔ مایا وتی نے اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر وزیرِ صحت بابو سنگھ خشواہا کو برخواست کردیا لیکن بی جے پی کی مت ماری گئی جو اس نے خشواہا کو اپنی پارٹی میں لے لیا اور اس حقیقت کو بھول گئے کہ یہ وہی صاحب ہیں جن کے خلاف ان کے ایم پی کیرٹ سومیا نے چند روز قبل ۱۵۰۰ صفحات پر مشتمل بدعنوانی کے الزامات لگائے تھے ۔اس خبر نے کانگریس کے وارے نیارے کر دیئے اس لئے کہ اپنی اس حماقت سے بی جے پی نے خود اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارنے کا کام کر دیا ۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ بی جے پی کی ریاستی شاخ نے یہ کارنامہ اسی دن کیا جب ان کے ممبران پارلیمان بدعنوانی اور لوک پال کا رونا لے کر کانگریس کے خلاف مگر مچھ کے آنسو بہانے کی خاطر ایوان صدارت پر دستک دے رہے تھے ۔اس ناٹک کے بعد راشٹر پتی بھون کے آنگن میں جب اخبار نویسوں نے بابو سنگھ خشواہا کے متعلق سوال کیا تو اڈوانی اور جیٹلی دونوں کو منہ چھپا کر بھاگنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ خیر اب کانگریس نے مزید طول دے کر سماجوادی پارٹی کو بھی اس معاملے میں گھسیٹ لیا ہے ۔اس پر بھی اپنے دور اقتدار میں ہزار کروڑ سے زیادہ کا معاملہ بنتا ہے گویا اب مایا اوما اور ملائم سب اسکی لپیٹ میں آگئے ہیں۔اس کے علاوہ مسلمانوں کیلئے سلمان خورشید، کے ذریعہ ریزرویشن کا گاجر ایسے وقت میں دکھلایا گیا کہ الکشن کمیشن اسے باآسانی چھین لیا گویا دیا بھی اور نہیں بھی ۔ فی الحال اتر پردیش کے اندر ١٩ فی صد مسلم آبادی کانگریس کیلئے امید کی ایک کرن بنی ہوئی ہے ۔اجیت سنگھ کو ساتھ لے کر مغربی یو پی کے جاٹوں کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا گیا ہے، ایک زمانہ تھا کہ جاٹ ووٹ کے کئی دعویدار ہوا کرتے تھے لیکن اب حالت یہ ہے کہ یوپی میں اجیت اور ہریانہ میں چوٹالہ کے سوا کسی کا نام ہی سنائی نہیں دیتا گویا اتر پردیش کے الکشن میں اس بار کانگریس نے اپنے پتے بڑی ہوشیاری کے ساتھ کھیلے ہیں ۔

کانگریس پارٹی کیلئے اتر پردیش اس قدر اہم نہیں ہے جتنا کہ نہرو گاندھی خاندان کیلئے ہے ۔ یہ حقیقت ہے الہ بادہائی کورٹ سے اندرا گاندھی کے مقدمے کا کالعدم قرار دیا جانا ہی ایمرجنسی کا اصلی سبب تھا جس کے باعث پہلی بار کانگریس اور اندرا جی کو اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا۔ اسی کے ساتھ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ جب سے وی پی سنگھ نے کانگریس کو یوپی سے دیس نکالا دیا کانگریس دوبارہ مرکز میں اقتدار پر تو آئی لیکن نہرو گاندھی خاندان کے حصے میں وزارتِ عظمیٰ کی کرسی نہیں آئی ۔ باوجود اس کے کہ رائے بریلی اور امیٹھی کے حلقۂ انتخاب سے یہ لوگ کامیاب ہوتے رہے لیکن دوسرے مقامات سے ان کا صفایا ہوتا رہا۔ ۲۰۰۷ء کے اسمبلی انتخابات میں جہاں بہوجن سماج پارٹی ۲۰۶ سیٹوں پر کامیاب ہو کر اول نمبر پر آئی وہیں سماجوادی کو اس سے تقریباً نصف ۹۷ سیٹوں پر اکتفا کرنا پڑا بی جے پی اس سے بھی نصف یعنی ۵۱ مقامات پر اپنی جیت درج کروا سکی اور تیسرے نمبر پر آئی ۔ کانگریس کی نشستیں گئی گزری بی جے پی سے بھی آدھی یعنی ۲۲ تھیں اور اجیت سنگھ اس سے نصف ۱۰ نشستوں پر کامیاب ہو سکے تھے ۔ گویا ہر دو جماعت کے درمیان لگ بھگ پچاس فی صد نشستوں کا فرق تھا۔ ان اعداو شمار نے سارے تجزیہ نگاروں کو حیرت زدہ کر دیا تھا لیکن کانگریس اور اجیت سنگھ کے نتائج بعینہٖ توقع کے مطابق تھے لیکن ۲۰۰۹ء کے پارلیمانی انتخاب میں ایک اور چمتکار ہو گیا چوتھے نمبر کی کانگریس

چھلانگ لگا کر اول نمبر کی سماجوادی کے برابر ہو گئی اور دونوں نے ۲۲ نشستوں پر کامیابی درج کروائی۔ تیسرے نمبر پر پی ایس پی تھی جسے تقریباً اتنی ہی یعنی ۲۰ سیٹیں ملی تھیں لیکن بی جے پی نے بڑی مشکل سے دہائی کے عدد میں قدم رکھا اور نصف یعنی دس نشسیں جیتیں اس سے نصف آر ایل ڈی تھی جسے پانچ کامیابیاں ملیں۔

اتفاق سے یہ انقلاب ایسے وقت میں آیا جب گاندھی خاندان کے چشم و چراغ راہل گاندھی سنِ رشد کو پہنچ گئے تھے گویا اگر اس بار یوپی کانگریس اپنے بل بوتے پر اقتدار میں نہ بھی آئے مگر سماجوادی یا بہوجن کی مخلوط حکومت میں شامل بھی ہوجائے تو اگلے انتخاب سے قبل وزیر اعظم منموہن کو ریٹائر ہونے کا نادر موقع ہاتھ آجائیگا اور وہ راہل کے سر پر تاج رکھ کر خود سنیاس آشرم میں چلے جائیں گے۔ آئے دن مرکزی وزراء کے خلاف لگنے والے بدعنوانی کے الزامات اور فوج کے ساتھ جاری ان بن کے چلتے منموہن کیلئے اپنا راستہ ناپنے کا اس سے زیادہ بہتر موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ فی الحال صورتحال یہ ہے کہ وزیر داخلہ کے ساتھ ساتھ وزیر خارجہ پر بھی بدعنوانی کے معاملات عدالت کی چوکھٹ پر دستک دے رہے ہیں۔ بیرونی سرمایہ کاری کے معاملے میں وزیر خزانہ کو رسوا ہونا پڑا تو کمانڈران چیف کے ریٹائرمنٹ پر وزیر دفاع بغلیں جھانک رہے ہیں لوک پال بل کے معاملے خود کانگریس اور اس کے حامیوں کی لوک سبھا سے غیر

حاضری نیز راجیہ سبھا میں رچائے گئے اوچھے ڈرامے کی سرپرستی اس وزیر اعظم کیلئے شرمناک ہے جس نے یوم آزادی کے موقع پر لال قلع کی دیوار پر کھڑے ہو کر قوم کو ایک طاقتور لوک پال بل دے کر بدعنوانی پر لگام لگانے کا وعدہ کیا تھا۔ یوم جمہوریہ کے موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وزیر اعظم کی اس تقریر کو یاد کر لیا جائے جس میں انہوں نے سب سے زیادہ وقت بدعنوانی پر صرف کیا تھا۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں علم معاشیات میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور وہ نہ صرف وزیر خزانہ بلکہ عالمی بنک کے گورنر بھی رہے ہیں اس لئے انہوں نے اس موضوع پر اپنی گفتگو کا آغاز بڑے عالمانہ انداز میں کیا اور قوم کی کامیابیوں کو بیان کرنے کے بعد بولے یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔آج دنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہم میں عالمی سطح ایک بڑی معاشی طاقت بننے کی صلاحیت موجود ہے لیکن اس تبدیلی میں بدعنوانی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ گزشتہ چند ماہ کے اندر بدعنوانی کے بڑے معاملات روشنی میں آئے ہیں جن کے اندر مرکز و ریاستی حکام ملوث ہیں ہم ان پر سخت ترین کارروائی کریں گے۔اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ مختلف بدعنوان لوگ جو یوم آزادی کے وقت تہاڑ جیل میں بند تھے ضمانت پر رہا کر دیئے گئے ہیں۔ چند مبرم کو سی بی آئی نے کلین چٹ دے دی اور کرشنا کے بارے میں بھی یہی

امکان ہے۔اس پر یہ اعتماد کے ہمیں دنیا کو کو یقین دلانا چاہئے کہ اس بدعنوانی کے آسیب کو ہم قابو میں کر سکتے ہیں مضحکہ خیز لگتا ہے۔وزیر اعظم نے اس کے بعد بدعنوانی کی کئی قسمیں بتلائیں جن میں سرِ فہرست عوامی فلاح و بہبود کی رقوم کا حکام کی جیب میں چلا جانا تھا اور اسکی واضح ترین مثال قومی دیہی صحت کمیشن گھوٹالہ ہے۔دیہات کے غریب لوگ طبّی سہولتوں کے بغیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہے ہیں اور ان کے نام نہاد نمائندے نہایت بے حیائی کے ساتھ جمہوریت کے نام پر ان کا جامِ صحت نوش فرما رہے ہیں۔

وزیر اعظم نے اعتراف کیا تھا کہ کسی ایک اقدام سے بدعنوانی کا خاتمہ ممکن نہیں ہے بلکہ اس کیلئے بیک وقت کئی محاذ پر متعدد اقدامات کرنے ہوں گے اور ان میں سے سب سے اہم نظام عدالت میں بہتری ہے۔اگر بدعنوان افسران کو پتہ چل جائے کہ ان کو جلد سزا ہو سکتی ہے تو وہ حرص و ہوس یا سارسی دباو کت تحت غلط کام کرنے سے قبل دوبار سوچیں گے۔اس گفتگو میں ساری توجہ سرکاری افسران کی بدعنوانی پر مرکوز رہی لیکن جو سیاستداں ان پر دباو ڈالتے ہیں یا انہیں تحفظ فراہم کرتے ہیں نیز خود سر سے پیر تک بدعنوانی میں ملوث ہیں ان کے بارے میں وزیر اعظم نے لب کشائی کی زحمت نہیں کی ۔انھوں نے یہ ضرور کہا کہ اعلیٰ مقامات کی بدعنوانی پر لگام لگانے کی خاطر ہم لوک پال بل لاچکے ہیں جس پر فیصلہ صرف پارلیمان کر سکتی ہے۔جو حضرات اس بل کی تفصیلات سے

اتفاق نہیں کرتے وہ اپنے اختلاف کا اظہار ایوان، سیاسی جماعتوں اور ذرائع ابلاغ میں کر سکتے ہیں لیکن انہیں بھوک ہڑتال نہیں کرنی چاہئے۔ اس موقع پر چند سوالات نہایت اہم ہیں:

وہ ایوان سیاست جس کے پاس الہامی معیارِ حق نہ ہو کیا کوئی ایسا قانون بنا سکتا ہے جس سے خود اس کی اپنی جڑیں کمزور ہوتی ہوں ؟ اس لئے کہ ایوان پارلیمان میں منتخب ہونے کیلئے جس دولت کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے اس کا بیشتر حصہ بدعنوانی کے راستے سے آتا ہے۔○

اگر ایوان پارلیمان کے ارکان کے دلوں میں اپنے سے زیادہ طاقتور خالق و مالک کے سامنے جوابدہی کا عقیدہ و احساس نہ ہو تو کیا ان کیلئے بدعنوانی سے اپنے آپ کو روکنا ممکن ہے ؟○

ایسے میں لوک پال کے قانون کا وہی حشر ہوگا جو گزشتہ پارلیمانی اجلاس میں ہوا نیز اگر خدانخواستہ کوئی لوک پال آ بھی جائے تو وہ کیا کر لے گا؟ ہندوستان میں الکشن کمشنر موجود ہے کیا وہ انتخابی بدعنوانی پر روک لگا سکا ہے؟ آڈیٹر جنرل آئے دن نت نئے گھوٹالوں کا انکشاف کرتے رہتے ہیں لیکن کیا اس سے یہ سلسلہ رک رہا ہے ؟○

وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں جو ممکن ہے لال قلعہ سے ان کی آخری تقریر ہو

بدعنوانی کے خاتمے کیلئے کئی قوانین بنانے کے اپنے عزم کو دوہرایا لیکن آج ہمارا مسئلہ قانون کی کمی کا نہیں ان پر عملدرآمد میں کوتاہی کا ہے جب تک اس پر توجہ نہیں کی جاتی قوانین بنتے رہیں گے اور ٹوٹتے رہیں گے بقول شاعر:

جامِ مئے توبہ شکن توبہ میری جام شکن
سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

اس باب وزیراعظم نے اعتراف کیا تھا کہ ہمارے پاس جادو کی کوئی چھڑی نہیں تمام سیاستدانوں کو اس کیلئے متحد ہونا پڑے گا سو تو ہوا سب نے مل جل کر لوک پال کو ٹھکانے لگا دیا انھوں نے بدعنوانی کے خلاف جنگ میں ہر شہری کو شامل ہونے کی دعوت دی لیکن یہ جنگ آخر عوام لڑیں گے کس کے خلاف؟ کیا یہ جہاد ان جمہوری بتوں کے خلاف ہوگا جو بدعنوانی کا سرچشمہ ہیں مگر اس کے باوجود جمہوری نظام سیاست نے انھیں تقدس کے ایسے مقام پر بٹھا دیا گیا ہے کہ ان کی جانب نگاہِ غلط انداز بھی گناہ کبیرہ سے کم نہیں ہے۔

سنا ہے مغلوں کے زمانے میں ہندوستان سونے کی چڑیا ہوا کرتے تھے پھر انگریزوں نے اپنے غلامی کے دام ہندوستانیوں کو ایسا پھنسایا کہ وہ میاں مٹھو بن گئے۔ اپنے آقا کی ہر بات پر ہاں جی ہاں جی کرنا اور سرخ امرود سے اپنی چونچ لال کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہوگیا۔ مگر جب اس طوطے نے دیکھا کہ جنگ عظیم

میں ہٹلر نے اس کے عظیم آقا کی حالت پتلی کردی ہے تو اول تو اس نے آنکھیں پھیر لیں اور آگے چل کر آنکھیں دکھلانے لگا۔ انگریز بھی جہاں بانی سے تنگ آ چکے تھے ان کا اپنا ملک ان سے سنبھل نہیں پارہا تھا اس لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ اس سونے کے انڈے کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ۔ اس انڈے کو ستائیس ماہ سینکنے کے بعد اس میں سے جمہوریت کا چوزہ برآمد ہوا تو یاد آیا کہ دوماہ بعد یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو لاہور میں کئے گئے مکمل انقلاب کی بیسویں سالگرہ ہے اس لئے فیصلہ کیا گیا نو مولود دستور کو مزید دوماہ کیلئے موقوف کر دیا جائے اور جس انگریز بادشاہ غلامی سو سال تک برداشت کر رہے ہیں اسے دو ماہ اور سہا جائے اس طرح ایک اور قومی تہوار ہندوستان کی عوام کو میسر آگیا۔ اب ان کے پاس آزادی و جمہوریت کے نام پر دو عدد قومی تعطیلات رہ گئیں باقی سب کچھ ان کے نمائندوں کی جانب منتقل ہو گیا۔

یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے سیاستدانوں نے بدعنوانی کا آغاز کرنے کیلئے دستور ہند کے نفاذ کا انتظار تک نہیں کیا اور ۱۹۴۸ء ہی میں فوج کی خاطر کئے گئے جیپ کے سودے میں بدعنوانی کے الزامات سامنے آ گئے ۔ برطانیہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر وی کرشنا مینن نے ۸۰ لاکھ کے اس سودے پر دستخط کرنے کیلئے سرکاری ضابطے کو پامال کیا میں اس کیس کو حکومت نے بند کردیا اور کرشنا مینن وزارت کا حلف اٹھا ۱۹۵۵ لیا۔ کرشنا مینن تو خیر بڑے آدمی تھے سزا

سے بھی بچے رہے اور وزیر بھی بن گئے لیکن وزارت صنعت و حرفت کے سکریٹری وینکٹ رمن نے ۱۹۵۱ میں سائیکل کی خرید میں رشوت لی اور انہیں سزا سنائی گئی گویا ابتدا ہی چھوٹے موٹے لوگوں کو پکڑو اور بڑے بڑوں کو چھوڑو کی روایت قائم ہو گئی جو اب ہنوز جاری و ساری ہے۔

ہمارے ملک میں بدعنوانی کے حوالے سے ظاہر ہونے والے اعداو شمار چونکا دینے والے ہیں ۔ ۱۹۹۲ میں جب سے نرسمھا راو نے آزاد معیشت کا نظریہ اپنایا بدعنوانیوں کا ایک ایسا سیلاب امڈ پڑا ہے کہ جس نے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ان دس سالوں میں بڑے بڑے گھوٹالوں مثلاً ٹوجی ، سی ڈبلیو جی اور آدرش وغیرہ کے علاوہ سامنے آنے والی بدعنوانیوں کی رقم ۷۳ لاکھ کروڑ بنتی ہے۔اس فہرست میں پانچ ہزار کروڑ کا گھپلہ کرنے والے رام لنگم راجو کا نام سرِفہرست ہے اور اسکے بعد چار ہزار کروڑ کے گھپلے باز ہرشد مہتا کا نام آتا ہے۔اس معاملے میں ستم ظریفی یہ ہے کہ جو جمہوری نظام اس کو پال پوس کر پروان چڑھاتا ہے اسی سے اس کے خاتمے کی توقع کی جاتی ہے ۔دراصل ہمارے ملک میں انتخابات کو بہت بڑی نعمت سمجھا جاتا ہے یہ عوام کیلئے تو نہیں لیکن سیاستدانوں کیلئے ضرور عظیم نعمت ہے اس لئے اس گنگا میں ان کے سارے پاپ دھل جاتے ہیں اور انتخاب جیتنے کے بعد بڑا سے بڑا بدعنوان سیاستدان پوتر ہو جاتا ہے اور اسے آگے کیلئے بدعنوانی کرنے کا لائسنس مل

جاتا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ جب تک اس نظام کو تبدیل نہیں کیا جاتا بدعنوانی کا خاتمہ نہ ہی لوک پال کے بنانے سے ہوگا اور نہ ہی یوم جمہوریہ کی تقریبات سے دل کو بہلانے سے۔

ممبئی بم دھماکہ: میرے دل سے غبار اٹھتا ہے

ممبئی میں گزشتہ سال ۱۳ جولائی کو ہونے والے بم دھماکوں میں ۲۷ لوگ جان بحق ہوئے لیکن ۲۳ جنوری کو ممبئی بلاسٹ کے متعلق جو بیان مہاراشٹر اے ٹی ایس کے سربراہ راکیش ماریہ نے دیا اس سے اے ٹی ایس کے اعتماد کی دھجیاں اڑ گئیں۔ ممبئی بم بلاسٹ کیلئے احمد ضرار باپاسدی عرف یٰسین بھٹکل عرف عمران ذمہ دار ہے یا نہیں اس کا پتہ تو اس وقت چلے گا جب وہ گرفتار ہوگا اور عدالت میں اس کے خلاف شواہد پیش کئے جائیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ راکیش ماریہ اور ان کا یونٹ یٰسین بھٹکل اور اس کے نام نہاد پاکستانی ساتھی تبریز اور وقار کو دھماکے بعد گرفتار کرنے میں ناکام رہے اور جب دہلی پولس نقی شیخ کی مدد سے انہیں گرفتار کرنے کے قریب پہنچ گئی تو مہاراشٹر اے ٹی ایس نے اپنے آپ کو ہزیمت سے بچانے کیلئے نقی شیخ کے ساتھ ندیم شیخ کو گرفتار کرکے خود کریڈٹ لینے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں بقول دہلی پولیس یٰسین اور اسکے ساتھی ہوشیار اور روپوش ہوگئے اور انکی گرفتاری کے امکانات معدوم ہوگئے۔ دہلی پولیس کا یہ الزام اگر صحیح ہے تو اسکی سزا راکیش ماریا کو ملنی چاہئے اور انہیں بھی گجرات کے سابق اے ٹی ایس چیف ڈی جی ونجارہ کی مانند جیل کی

سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہئے۔ دہلی پولیس نے راکیش ماریا کی سرزنش کرنے کا مطالبہ وزارتِ داخلہ سے کیا ہے اور ہوم سکریٹری آرپی سنگھ نے بھی ممبئی پولیس سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ بعد میں جب ذرائع ابلاغ نے اس مسئلہ پر حکومت کو گھیرنا شروع کیا سنگھ صاحب نے کہا کہ نقی بیک وقت مخبر اور دہشت گرد بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دہلی پولیس نے اپنے ساتھ لئے لئے پھرنے کے بجائے نقی کو گرفتار کرنے کی زحمت کیوں نہیں کی؟ اور یہ کام ممبئی پولیس کیلئے کیوں چھوڑ دیا؟ ایسے میں اگر نقی احمد دہشت گردوں کو پناہ دینے کے الزام میں دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے تو کیا دہلی پولس پر بھی دہشت گرد کو گرفتار کرنے کے بجائے اپنی پناہ میں رکھنے کا الزام عائد نہیں ہوتا ؟

اس سے پہلے سیاسی جماعتوں کی آپسی لڑائی کی قیمت مسلمان چکاتے تھے۔ بی جے پی والے ہندو فرقہ پرستوں کو خوش کرنے کیلئے فسادات کرواتے تھے اور کانگریس پارٹی اسے روکنے کے بجائے فساد کے بعد ووٹ کی خاطر آنسو پونچھ کر اپنی سیاسی روٹیاں سینکتی تھی ۔اس طرح مسلمانوں کے نقصان میں دونوں کا فائدہ ہوتا اب مختلف پولس دفاتر کے درمیان ہونے والی حریفائی کی قیمت مسلمان چکارہے ہیں۔ اس مسابقت کو راکیش ماریا نعمت قرار دیتے ہیں لیکن نقی احمد اور ندیم شیخ کیلئے جو دہلی اور ممبئی پولیس کی چکی میں پس رہے ہیں یہ ایک

بہت بڑی زحمت بن گئی ہے۔ ممبئی پولیس کو شکایت ہے کہ دہلی والے ان کو بتلائے بغیر رازدارانہ انداز میں ان کے کام میں مداخلت کرتے ہیں تاکہ اپنی برتری ثابت کی جا سکے۔ دہلی والوں کا کہنا یہ ہے ممبئی والوں نے ان کے مخبر کو ملزم بنا کر اصل ملزمین کو چوکنا کر دیا اور ان کی ساری محنت کو خاک میں ملا دیا۔ پہلی بات تو یہ کہنا غلط ہے کہ نقی احمد شیخ پولیس کا مخبر تھا اور پھر یہ کہنا کہ وہ بیک وقت مخبر اور دہشت گرد بھی تھا اس سے بڑی غلطی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دہلی پولیس نے ممبئی پولیس کو اعتماد میں لئے بغیر نقی احمد کی مدد سے ممبئی میں تفتیش کی۔ ممبئی پولیس نے دہلی پولیس کا غصہ نقی پر اتارا اور اس پر دھماکوں کا لزام دھر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل ملزم یٰسین بھٹکل اور اسکے ساتھیوں کا تو کوئی سراغ نہیں ملا ہاں ممبئی پولیس کا اقبال بلند ہوگیا۔ اگر ممبئی پولیس کو اپنا نام روشن کرنا ہی تھا تو اسے ایک نادر موقع اس وقت ملا تھا جب چند دہشت گرد تاج ہوٹل میں گھر گئے تھے اگر صبح تک دہلی سے اسپیشل فورس کی آمد کا انتظار کرنے کے بجائے رات ہی میں وہ ان کو مار گراتے تو یقیناً ان کی دلیری و بہادری کا لوہا تسلیم کر لیا جاتا۔

بم دھماکے کے حوالے سے اے ٹی ایس کے سربراہ نے قوم کے سامنے جو مضحکہ خیز تفصیلات بیان کی ہیں ان میں نقی اور ندیم دہشت گرد کم اور اسکوٹر چور زیادہ

نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق نقی احمد کو دہلی بلا کر دھماکہ کرنے کیلئے ڈیڑھ لاکھ روپے دیئے گئے۔ ڈیڑھ لاکھ میں تین دھماکے اتنے روپے میں تو ممبئی شہر کے اندر پان کی ایک دوکان بھی نہیں کھلتی۔ دہلی میں اسے گولہ بارود بھی دیا گیا لیکن یہ بارود دہلی تک کہاں سے آیا اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس آپریشن پر دس لاکھ خرچ ہوئے جو حوالہ کے ذریعہ موصول ہوئے اس میں سے تقریباً ایک لاکھ اگر گھر کا کرایہ تھا تو باقی نو لاکھ کہاں گئے؟ پرانی اسکوٹر تک خریدنے کیلئے رقم مہیا نہیں ہو سکی اور چوری کی نوبت آگئی یہ حیرت انگیز انکشاف ہے۔ اس کے علاوہ نقی احمد پر دو اور موٹر سائیکل کو چوری کا لزام ہے جسے وہ مستقبل کے دھماکوں کی خاطر دربھنگہ لے گیا۔ دھماکے کرنے کیلئے موٹر سائیکل چرا کر ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دور اپنے گاوں میں رکھنے والی منطق پولیس کے علاوہ کسی اور کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

نقی احمد شیخ کی معصومیت کا سب سے بڑا ثبوت اس کا بھائی تقی احمد ہے جو دہلی میں رہتا ہے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ پولیس ملزم کے اعزہ و قارب کو گرفتار کرکے لے جاتی ہے اور اس معاملے میں بزرگوں اور خواتین کو بھی نہیں بخشا جاتا لیکن تقی کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ تقی احمد شیخ گزشتہ دو ہفتوں سے اپنے بھائی کی تلاش میں دہلی کے اندر دربدر ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے اور ہر کس و ناکس کے آگے نقی احمد کی گرفتاری کی شکایت کر رہا ہے۔ ۱۸

جنوری کو تقی احمد نے انہد کی سربراہ شبنم ہاشمی کے ساتھ مل کر دہلی میں ایک پریس کانفرنس بلوائی۔ مہاراشٹر اے ٹی ایس کے انکشاف سے دو دن قبل اس نے اقلیتی کمیشن کے صدر وجاہت حبیب اللہ سے ملاقات کی جنھوں نے اسے کمیشن کے رکن کے این دارووالا کے پاس بھیجا جو مہاراشٹر کے معاملات دیکھتے ہیں۔ دارووالا نے ۲۲ جنوری کو مہاراشٹر اے ٹی ایس سے رابطے کی کوشش کی لیکن ان کو فون اور ایس ایم ایس تک کا جواب نہیں ملا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دہشت گرد کا بھائی اس طرح کھلے عام جدوجہد کرے؟ یہاں تک کہ تقی احمد نے ممبئ پولس سے براہِ راست رابطے کی بھی کوشش کی لیکن جواب میں اس کے ہاتھ ڈانٹ پھٹکار اور گالی گلوچ کے سوا کچھ اور نہیں آیا۔

اس سارے معاملے کی ابتداء ۹ دسمبر کو ہوئی جب ممبئ میں رہنے والا رضی احمد جو تقی اور نقی کا بڑا بھائی ہے ان سے ملنے دہلی آیا۔ رضی احمد جب اپنے بھائیوں سے مل کر آٹو رکشا سے لوٹنے لگا تو دو لوگ زبردستی اس کے آٹو میں دونوں جانب سے گھس گئے۔ انہوں نے بتلایا کہ وہ دہلی کی اسپیشل برانچ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے نام للت موہن نیگی اور ہردیہ بھوشن تھے۔ انہوں نے رضی سے نقی کو بلانے کیلئے کہا۔ نقی کو بلوا لیا گیا۔ پولس نے اس سے نومبر سے حراست میں موجود غیور جمالی کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا وہ اسے جانتا ہے؟ اور کیا اس نے غیور کو ممبئ کے اندر گھر دلانے میں مدد کی تھی؟ نقی نے

اس بات کو مان لیا اور کہا کہ وہ غیور کو بچپن سے جانتا ہے اس لئے وہ اسے گھر دلانے کی خاطر ایک ایجنٹ کے پاس لے گیا تھا لیکن غیور کی سرگرمیوں کا اسے کوئی علم نہیں ہے ۔پولیس نے تفتیش میں نقی احمد سے تعاون مانگا اور وہ اس پر راضی ہو گیا۔ کیا کسی شہری کی یہ حرکت اسے پولیس کا مخبر بنا دیتی ہے ؟ جس صورتحال میں نقی احمد تھا ایسے میں اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار بھی نہیں تھا اور پولس کا تعاون کرنا اس کی ذمہ داری تھی ۔
نقی احمد کو ۱۰ دسمبر کی صبح گو ائیر کے جہاز سے ممبئی لایا گیا تاکہ وہ اس مقام کی نشاندہی کرے جو اس نے کرائے پر لیا تھا بعد میں پتہ چلا کہ دہلی پولیس نے اس کے قریب نگرانی کی غرض سے ایک کمرہ پہلے ہی سے لے رکھا ہے۔ ۱۳ دسمبر کو واپسی ہو گئی لیکن نقی اور تقی کو ۷ جنوری تک دہلی پولیس مختلف مواقع پر اپنے دفتر میں بلواتی رہی یہاں تک کے نقی کو بتلایا گیا اس مکان کے کرایہ دار لوٹ چکے ہیں اور اب ان کی شناخت کیلئے پھر ایک بار اسے ممبئی چلنا ہوگا۔ اس طرح پھر ایک بار نقی کو ۸ جنوری کی شام راجدھانی سے ممبئی آنا پڑا۔ ۹ تاریخ کی شام میں نقی احمد نے فون کرکے تقی کو بتلایا کہ سارا کام ختم ہو چکا ہے اور اگلے دن وہ دہلی اپنے گھر لوٹ آئیگا لیکن بدقسمتی سے وہ اگلا دن نہیں آیا۔ نقی بیچارہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹک گیا دہلی پولیس کے بعد اسے ممبئی اے ٹی ایس نے اچک لیا۔ نقی کی حالت تو یوں ہو

گئی جیسے :

یہ کون پھر سے انہی راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی میں عذابِ سفر سے نکلا تھا

جنوری کی نصف شب کو مہاراشٹر اے ٹی ایس نی کے بڑے بھائی رفیع کے کارخانے پر ۹ چھاپہ مار کر اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ نقی احمد نے اس بابت دہلی پولیس کے ان اہلکاروں سے دریافت کیا جن کے ساتھ وہ ممبئی آیا تھا تو اسے بتلایا گیا کہ رفیع احمد کو مہاراشٹر اے ٹی ایس نے گرفتار کیا ہے اور وہ اس بارے میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتے ۔ دہلی پولیس نے نقی احمد کو اپنے پاس اس مکان میں بلوا لیا جو کہ انہوں نے نگرانی کی غرض سے کرائے پر لے رکھا تھا وہاں سے نقی نے اپنے بھائی کا احوال معلوم کرنے کیلئے کارخانے میں کام کرنے والے ایک ملازم ندیم شیخ سے رابطہ کیا۔ اس وقت تک ندیم شیخ بھی حراست میں لیا جا چکا تھا لیکن نقی کو اس کا علم نہیں تھا اور ندیم کے ذریعہ مہاراشٹر پولیس نے نقی کو ساگر ہوٹل پر ملنے کی خاطر بلایا اور اسے بھی گرفتار کر لیا۔ رفیع احمد کو پکڑنے اور چھوڑنے کا سلسلہ ۱۷ جنوری تک چلتا رہا اس بیچ ممبئی پولیس نے دربھنگہ میں نقی کے آبائی مکان پر چھاپہ مارا اور وہاں موجود موٹر سائیکل کو چوری کا مال قرار دے کر نقی پر یہ الزام دھر دیا۔ اس طرح گویا مہاراشٹر اے ٹی ایس نے بم دھماکے کا معاملہ بزعمِ خود سلجھا دیا.

لیکن حقیقت میں الجھا دیا۔

اس طرح کے واقعات جب بھی سامنے آتے ہیں ان میں ایک اہم کڑی ہمیشہ ہی آخری وقت میں غائب ہو جاتی ہے مثلاً غیور جمالی جو مہاراشٹر اے ٹی ایس کے ہتھے نہیں چڑھ سکا اور اب اس کا کوئی ذکر کہیں نہیں پایا جاتا۔ سب لوگ اس کے بارے میں خاموش ہیں وہ کون ہے ؟ کہاں ہے؟ یہ سب صیغۂ راز میں ہے۔ ساری کہانی نقی اور ندیم کے آس پاس گھوم رہی ہے۔ اکثر لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ دہشت گردی جیسے سنگین الزام کے تحت گرفتار ہونے والے لوگ عدالت سے رہا کیسے ہو جاتے ہیں؟ اب جن مقدمات کو اس طرح سے گھڑا جائے تو عدالت کے پاس رہائی کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہوتا۔ اسی یقین کا اظہار نقی کے بھائی شاہد نے کیا اور کہا کہ ان لوگوں نے نقی احمد کا مستقبل تباہ کردیا ہمیں برباد کردیا لیکن ایک دن نقی احمد کی بے گناہی ساری دنیا کے سامنے آجائیگی۔ شاہد کا اشارہ غالباً عدالت کی جانب تھا۔

جس وقت ذرائع ابلاغ کی توجہ ممبئی دھماکے کی جانب مرکوز تھی ایک اور دہشت گردی کا مقدمہ ممبئی مکوکا کورٹ سے ہائی کورٹ کی جانب منتقل ہو رہا تھا۔ یہ سادھوی پرگیہ ٹھاکر کا مقدمہ ہے جسے بھوپال کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ اتفاق سے مدھیہ پردیش میں فی الحال بی جے پی کی حکومت ہے شیوراج چوہان

وزیر اعلیٰ ہیں جن کی تصاویر سادھوی پرگیا کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ پرگیا کو بھوپال کی عدالت میں مسلمانوں کے خلاف کسی دھرم یدھ کے سلسلے میں نہیں بلکہ آر ایس ایس کے ایک پرچارک سنیل جوشی کے قتل کے الزام میں حاضر ہونا ہے۔ پولیس کی دائر کردہ چارج شیٹ کے مطابق سنیل جوشی پر سادھوی کا الزام ہے کہ اس نے روپیوں میں خرد برد کی۔ سنیل نے خود سادھوی کے ساتھ بد سلوکی کی اور سنیل کے ہاں پناہ لینے والے بسٹ بیکری کے قتل عام میں ملوث ہرشد، میہول، راکیش اور استاد کے ساتھ بھی اس کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ سنیل جوشی پر چونکہ سمجھوتی ایکسپریس میں بم دھماکہ کرنے کا الزام ہے اس لئے اس کے پکڑے جانے سے ساری سازش کے افشا ہو جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر سنیل جوشی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس قتل کے الزام میں سادھوی پرگیا ٹھاکر، آنند راکٹاریہ، ہرشد سولنکی، واسدیو پرمار اور رامچندر پٹیل پر دفع ۳۰۲ کے تحت مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ میہول اور راکیش ہنوز فرار ہیں۔ اب اس مقدمہ کی سنوائی کیلئے مالیگاؤں دھماکے میں گرفتار سادھوی جی بھوپال ہوائی جہاز یا سیکنڈ اے سی سے جانا چاہتی ہیں۔ وہ اپنے ساتھ اپنے مصاحبین یعنی پولس والوں کا بھی خرچ برداشت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ مکوکا عدالت نے اس درخواست کو مسترد کر دیا اور کہا پولس اپنے طے شدہ طریقے سے ہی انہیں بھوپال لے کر جائیگی اس فیصلے کے خلاف سادھوی نے ہائی کورٹ کے دروازے پر دستک دی ہے۔ بہتر ہوتا کہ میڈیا والے اس خبر کو بھی لوگوں تک پہنچاتے

اور بتلاتے کہ سنیل جوشی کیوں روپوش تھا؟ قتل کے بعد سادھوی پرگیا اس کے گھر سے جو سوٹ کیس لے کر گئی تھی اس میں کیا تھا تاکہ لوگوں کے سامنے دہشت گردی کا ہوا میں اڑنے والا اور اے سی میں چلنے والا چہرہ بھی آتا۔

دہلی کے اندر سپریم کورٹ میں بھی اس انکشاف کے دوسرے دن ایک دلچسپ مقدمہ دائر ہوا۔ اس مقدمہ کو گجرات کے سابق وزیر داخلہ اور نریندر مودی کے دست راست امیت شاہ نے داخل کیا۔ اس شخص کو گزشتہ ۱۶ ماہ سے عدالت نے ریاست بدر کر رکھا ہے۔ اس پر سہراب الدین اور پرجاپتی مرڈر کیس میں ملوث ہونے کا الزام ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اپنے خاندان سے دور ہونے کے باعث اسے بے شمار پریشانیوں کا سامنا ہے اس لئے اس پر سے یہ پابندی ختم کی جائے اور اسے اپنے شہر میں واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ امیت شاہ خوش قسمت ہے جو عدالت نے اسے جیل میں نہیں بھیجا۔ وہ اپنے اہل خانہ کو دہلی بلا سکتا ہے اس کے باوجود پریشان ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے امیت شاہ سے اخبار نویس ان لوگوں کے بارے میں پوچھتے جن بے گناہوں کو اس نے وزیر داخلہ کی حیثیت سے بلاوجہ جیل میں ٹھونس دیا اور برسوں بعد عدالت سے انہیں رہائی ملی اور جن کا اس نے اپنے افسران کی مدد سے انکاؤنٹر کروا دیا۔ گجرات وہ واحد ریاست ہے جہاں پندرہ پولیس افسر سنگین الزامات کے تحت جیل میں بند ہیں ۔ کوئی نہیں جانتا کہ جو مظلوم ان کی سفاکی کا شکار ہوئے ان کے لواحقین کو انصاف کب ملے گا۔ امیت

شاہ کی سب سے دلچسپ دلیل یہ ہے کہ وہ گجرات کے سب سے بڑے حلقہ انتخاب کی اسمبلی میں نمائندگی کرتا ہے اور چار مرتبہ وہاں کی عوام نے اسے کامیاب کیا ہے اس لئے اس کے رائے دہندگان بھی اسکی خدمات سے محروم ہیں۔ عدالتِ عالیہ کیلئے سارے دلائل کو ٹھکرانا تو آسان ہوگا لیکن کیا وہ اس آخری دلیل کو بھی ٹھکرا سکے گی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمیں ملک میں رائج نظامِ سیاست پر سوچنے کیلئے مجبور کر دیتا ہے اس طرح کے واقعات ہمیں متبادل کی جانب مائل تو کرتے ہیں لیکن پھر ہم اندیشوں کا شکار ہو کر اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتے ہیں۔ ضرورت اس بیم و رجا کی کیفیت سے نکل کر سوچنے کی ہے بقول شاعر

امید و بیم کے محور سے ہٹ کر دیکھتے ہیں
ذرا سی دیر کو دنیا سے کٹ کے دیکھتے ہیں

ٹوجی گھپلہ : غم ملے، حسرت ملے، رسوائی بے جا ملے

سرزمین ہند پر فی الحال ٹوجی کے بڑے چرچے ہیں ۔اول تو سوامی جی اور دوسرے چدمبرم جی ۔ ان دونوں سیاستدانوں کے درمیان بلا کی مشابہت ہے ۔ ان دونوں کا تعلق تمل ناڈو سے ہے ۔ دونوں وکالت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ دونوں کی بیویاں وکیل ہیں۔ دونوں نے ہارورڈ سے تعلیم حاصل کی ہے۔ دونوں وزیر تجارت رہے ہیں اور دونوں اشتراکیت سے متاثر ہیں لیکن اس کے باوجود یہ دونوں ایک دوسرے سے بر سرپیکار ہیں۔چدمبرم نے سوامی کو دیوانہ پاگل قرار دے رکھا ہے اور سوامی چدمبرم کو رشوت خور چور کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

ٹوجی گھوٹالہ ہندوستان کا سب سے بڑا گھپلہ ہے جس میں سابق وزیراے راجہ گزشتہ ایک سال سے قیدو بند کی سزا بھگت رہا ہے ۔ دسمبر ۲۰۱۰ میں سبرامنیم سوامی نے عدالت سے درخواست کی تھی کے انہیں راجہ کے خلاف سرکاری وکیل بنایا جائے جسے کورٹ نے خارج کردیااس کے جواب میں "لوک تنتر یا لوٹ تنتر "کے عنوان پر ہونے والے ایک مذاکرہ میں سوامی نے دعویٰ کیا کہ اگر ان کی درخواست قبول کر لی جاتی تووہ اس وقت کے وزیر مواصلات اے راجہ کو چار مہینے کے اندر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیۓ جاتے۔ لیکن قدرت کا کرنا یہ ہوا

کہ تین ماہ کے اندر ہی اے راجہ کو گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔ کانگریس کو اس بدعنوانی سے پیچھا چھڑانے کیلئے ایک بکرے کی ضرورت تھی سو راجہ جی کی بلی چڑھا دیا گیا اس کے بعد یہ سوچ لیا گیا کہ اب معاملہ رفع دفع ہوگیا ہے اور کانگریس کا دامن پاک صاف ہوگیا ہے۔ اس اتھل پتھل کا براہِ راست فائدہ کپلسبل کو جن کے زنغے میں وزارت مواصلات کی سونے کے انڈے دینے والی مرغی آگئی۔

اس بیچ ممبئی میں دہشت گردانہ حملہ ہوا اور اس کی بدنامی سے بچنے کیلئے کانگریس پارٹی کو اپنے شوبوائے وزیر داخلہ شیوراج پاٹل کی گردن مارنی پڑی اس سے پی چدمبرم کے بھاگ کھلے اور ان کو ترقی ملی وہ وزیر خزانہ سے وزیر داخلہ بنا دیئے گئے۔ پرنب مکرجی کا بھی فائدہ ہوا۔ وزارتِ دفاع کا قلمدان چھوڑ کر وہ وزیر خزانہ بن گئے گویا تیسرے نمبر پر آگئے۔ اب انہیں دوسرے نمبر پر آنے کیلئے چدمبرم کا کانٹا نکالنا تھا۔ اس کیلئے انہوں نے ٹوجی بدعنوانی کی آگ میں گھی ڈالنے کا کام کیا تاکہ اس کی لپیٹ میں آکر چدمبرم کا محل خاکستر ہو جائے۔ انہوں نے وزیر اعظم کو اپنے خط میں لکھ دیا کہ اگر وزیر خزانہ یعنی چدمبرم چاہتے اور مداخلت کرتے تو اس بدعنوانی پر لگام لگا سکتے تھے۔ ویسے تو دستخط کے ساتھ اس گیارہ صفحات پر مشتمل خط کا لکھا جانا ہی کوئی کم مصیبت نہیں تھا اس پر سے اس کے ذرائع ابلاغ تک پہنچ جانے سے ہنگامہ

کھڑا ہوگیا۔ سونیا اور منموہن میں اگر دم خم ہوتا تو پرنب کو ان کی اس حرکت پر بن باس پر بھیج دیا جاتا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ دونوں کی مشترکہ پریس کانفرنس ہوئی اور پھر ایک بار کانگریس نے سوچا معاملہ رفع دفع ہوگیا ہے لیکن موقع کی تاک میں بیٹھے سبرامنیم سوامی اس خط کو لے کر عدالت میں پہنچ گئے اور چدمبرم کو بھی ٹوجی بدعنوانی میں گھسیٹ لیا۔

عدالت میں سبرامنیم سوامی کی مخالفت سی بی آئی کر رہی تھی ۔ اس کا کہنا تھا کہ چدمبرم بے گناہ ہے سارا قصور صرف اور صرف وزیر مواصلات اے راجہ کا ہے جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں ۔ سی بی آئی کی یہ حرکت عین توقع کے مطابق تھی اس لئے کہ جو سی بی آئی وزارت داخلہ کے تحت کام کرتی ہو وہ بھلا اپنے آقا و مالک کے خلاف جانے کی جرأت کیسے کر سکتی ہے؟ لیکن عدالت عالیہ نے اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے سبرامنیم سوامی سے کہا کہ وہ اپنے شواہد سی بی آئی کی خصوصی عدالت میں پیش کرے نیز حکومت کو متعلقہ دستاویزات سوامی کو مہیا کرنے کی ہدایت کی تاکہ وہ اس کا مطالعہ کرکے اپنے شواہد تلاش کر سکیں ۔ ایک لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا جو سوامی کے حق میں ہوا تھا۔ اس طرح ٹوجی کا معاملہ بیک وقت عدالت عالیہ اور سی بی آئی کی خصوصی عدالت میں زیر سماعت تھا۔

عدالت عالیہ میں سبرامنیم سوامی کا ہائی کورٹ کے اس فیصلے کو چیلنج کر رہے

تھے جس کے مطابق کوئی شہری انفرادی طور پر وزیر اعظم کو خط لکھ کر تفتیش کا حکم دینے کی درخواست نہیں کر سکتا اور یہ کہ وزیر اعظم نے سی بی آئی کو تفتیش کا حکم دے رکھا ہے۔ اس معاملے میں عدالت عالیہ کا فیصلہ یکم فروری کو آیا اور اس نے اس معاملے کو پھیلا کر وزیر اعظم کے دفتر تک پہنچا دیا گویا جو چنگاری وزیر مواصلات کے دفتر سے نکلی تھی اب اس کی آنچ سے وزیر اعظم کا ایوان جھلس رہا تھا۔ عدالتِ عالیہ نے اپنے فیصلے میں کمال سیاست سے کام لیا۔ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کی مصداق وزیر اعظم کے دفتر حملہ بھی کیا اور انہیں بچانے کی بھی بھی کوشش کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اپنی آزادی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود ہنوز عدلیہ وزیرِ اعظم کو آنکھ دکھلانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ایسی جرأت راج نارائن کے مقدمے میں الٰہ باد ہائی کورٹ نے کی تھی لیکن اس سے وزیر اعظم اندرا گاندھی اس قدر چراغ پا ہوئیں کہ انہوں نے سارے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا اور پوری قوم کو بے دست پا کرنے کی جسارت کر ڈالی۔ شاید ہماری عدالتیں ابھی تک اس صدمے سے نکل نہیں پائی ہیں اور انہیں کسی افتخار چودھری کا انتظار ہے جو وزیر اعظم کو عدالت کٹہرے میں کھڑا کر سکے۔ شاید یہی وجہ ہے عدالت کا چکر لگانے والے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی ہندوستانی جمہوریت کی تعریف و توصیف کرتے نہیں تھکتے۔

یکم فروری کو سپریم کورٹ کا فیصلہ دراصل مقننہ پر عدلیہ کی زبردست برتری کا

کھلا ثبوت ہے۔ عدالت نے حکومت کو رائے مشورہ دینے کے بجائے اور پند و نصائح سے کام لینے کے بجائے آگے بڑھ کر ۱۲۲ کمپنیوں کے لائسنس منسوخ کر دیئے اور سرکار کو حکم دیا ہے کہ وہ نیلامی کے ذریعہ ان لائسنسوں کو جاری کرے۔ یہ اقدام بجائے خود اس بات کا اعتراف ہے کہ اس معاملے میں بدعنوانی ہوئی ہے ورنہ اس قدر انتہائی فیصلہ چہ معنی دارد۔ عدالت کا یہ فیصلہ ایک معنیٰ میں مقننہ کے حقوق پر کھلی دراندازی ہے۔ لائسنس دینا یا اسکے لئے مناسب پالیسی بنانا یہ عدالت کا نہیں بلکہ پارلیمان کا اختیار ہے لیکن بدعنوانی کے دلدل میں دھنسی ہوئی حکومت جب بری طرح مفلوج ولاغر ہو جائے تو ہر کوئی اس کو آنکھ دکھلاتا ہے اور عدالت عالیہ کا مذکورہ فیصلہ اس امر کا کھلا ثبوت ہے ۔

بات صرف کمزوری کی نہیں بلکہ یہاں معاملہ بے حیائی اور ڈھٹائی کا بھی ہے۔ ایک ایسے فیصلے کو جس نے بھرے بازار میں حکومت کے پر جوتا مارا ہو سرکار دربار کے لوگ اپنی کامیابی قرار دے رہے ہیں۔اس سے زیادہ شرم کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ کانگریس پارٹی کے رہنما یہ دعویٰ کرتے پھر رہے ہیں کہ اس مقدمہ میں وزیراعظم کے دفتر کو مجرم قرار دیا گیا ہے اور وزیراعظم کی جان بخش دی گئی ۔ کیا ملک کا وزیر اعظم اپنے دفتر میں ہونے والی سرگرمیوں اور کوتاہیوں کیلئے ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کے وزیر اعظم ہونے کا فائدہ ہی

کیا ہے ؟ اگر کوئی باوقار وزیر اعظم ہوتا تو اپنی اس توہین پر استعفیٰ دے کر باعزت طریقے پر گھر کا راستہ ناپتا لیکن جو وزیر اعظم اپنے وزیرِ دفاع کا احتساب نہیں کر سکتا۔ جس میں اپنے وزیر داخلہ کو ہٹانے کی ہمت نہیں ہے وہ اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا کر سکتا ہے۔

کانگریس پارٹی کی صدر سونیا گاندھی کو بھی نہ تو اپنی پارٹی اور اپنی ہی حکومت کی ساکھ کا کوئی خیال ہے اور نہ کسی جرأتمندانہ فیصلے کی ہمت ہے ورنہ وہ اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے نورِ نظر راہل گاندھی کو منموہن کی جگہ تخت بٹھا دیتیں اور اعلان کر دیتیں کہ اب مسٹر کلین کا بیٹا سپر کلین ہندوستان کی سیاست کو بدعنوانی سے پاک کرکے گنگا اسنان کروائے گا۔ ممکن ہے یو پی کے انتخاب میں گنگا گھاٹ پر اپنی پکڑ مضبوط کرنے کے بعد سونیا کی خود اعتمادی کسی قدر بحال ہو اور اس بے بس وزیر اعظم سے قوم کو چھٹکارہ دلوائے جسے کبھی بیرونی سرمایہ کاری کے معاملے جھکنا پڑتا ہے تو کبھی لوک پال کے معاملے میں منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے میں ہائی کورٹ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس کا یہ مفروضہ بالکل بے بنیاد تھا کہ وزیر اعظم نے سی بی آئی سے اس بدعنوانی کی تحقیقات کروائیں بلکہ یہ معاملہ تو سی وی سی کی رپورٹ میں طشت از بام ہوا۔

وزیر اعظم اور ان کے دفتر نے تو یہ کیا کہ اس سنگین معاملے پر ۱۶ ماہ تک سانپ بن کر بیٹھے رہے گویا اپنی اس مجرمانہ چشم پوشی سے انہوں نے بدعنوانوں کو تحفظ عطا کرنے کا غلیظ کام کیا عرف عام میں یہ حرکت وزیر اعظم کو اس جرم کا شریک کار بناتی ہے۔

عدالت نے اس بارے میں بھی مقننہ سے قانون بنانے کی درخواست کرنے کے بجائے انقلابی فیصلہ سنایا جس کے مطابق اس طرح کے معاملات میں خاموشی جرم ہے۔ تین ماہ کے اندر حکومت کی جانب سے فیصلہ سامنے آنا چاہیئے۔ اگر حکومت اٹارنی جنرل سے مشورہ کرنا چاہتی ہے تو اسے ایک مہینے کا مزید وقت مل سکتا ہے لیکن چار مہینے بعد بھی اگر حکومت کی جانب سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا تو اس کے معنی تفتیش کی اجازت دینے کے ہو جائیں گے۔ اس بارے میں ۱۹۹۸ میں دیئے ص گئے ونیت نارائن کے مقدمے کا حوالہ دیا گیا جس میں عدالت نے یہ مدت طے کی تھی۔

اس کوتاہی کیلئے وزیر اعظم کے دفتر کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا گیا کہ وزیر اعظم کے دفتری کارندوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ انہیں وہ الزامات کی سنگینی کے بارے میں مطلع کرتے تاکہ وہ اس بارے میں مناسب اقدام کر سکتے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وزیر اعظم کو شیر خوار بچہ ہے جسے اگر سنگینی کا احساس نہ دلایا جائے تو وہ خود اس قدر زبردست بدعنوانی کو محسوس نہیں کر سکتا ؟ اور عدالت کے مطابق اگر وزیر اعظم کے دفتر سے یہ کوتاہی

سرزد ہوئی ہے تو اسکی سزا کسے اور کیا دی جائیگی؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وزیراعظم کی مانند ان کے دفتری افسران کے بھی سات خون معاف ہیں اور ان کی بڑی سے بڑی سزا صرف معمولی سی پھٹکار ہے۔ عدالت نے وزیراعظم کے زخموں کو سہلاتے ہوئے کہا ہمیں یقین ہے کہ اگر وزیراعظم کو حقیقی اور قانونی صورتحال کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہوتیں تو وہ اس فیصلے کو ایک سال سے زیادہ مدت تک کیلئے التوا میں نہیں رکھتے۔ عدالت کو شاید یہ غلط فہمی ہے کہ وزیراعظم نے نادانستگی میں یہ صرفِ نظر کیا ہے جبکہ حقیقت اس سے متضاد ہے انہوں نے جانتے بوجھتے یہ سب کیا ہے اور اس دعویٰ کے حق میں شواہد موجود ہیں۔

اس بابت سب سے بڑا ثبوت تو وزارتِ خزانہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر پی جی الیس راؤ کا آفس میمورنڈم ہے جو وزیراعظم کے جوائنٹ سکریٹری ونی مہاجن کو روانہ کیا گیا۔ اس میں ٹوجی معاملے میں چدمبرم کے کردار پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس نوٹ میں صاف طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر وزارت خزانہ کی جانب سے نیلامی پر اصرار کیا جاتا تو وزارتِ مواصلات لائسنس کے معاہدے میں موجود دفعہ ۵۱ کی مدد سے ازخود لائسنس منسوخ کرنے کیلئے مجبور ہو جاتا اور اس طرح حالیہ رسوائی سے حکومت بچ جاتی لیکن وزیراعظم نے اس کا نوٹس لینے کے بجائے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے پرنسپل سکریٹری کو ہدایت کی کہ

وہ انہیں اس معاملے سے دور رکھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خط جس کی کاپی انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ جو ذرائع ابلاغ میں بحث کا موضوع بن گیا تھا اور جس نے این ڈی اے کے اندر بھونچال بپا کر دیا تھا وزیر اعظم کی نظروں سے اوجھل رہا ہو اور انہیں اس کی سنگینی کا احساس نہ ہوا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو وزیر اعظم کو نتن گڈکری کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بذاتِ خود سنیاس لے کر کیلاش پربت کا رخ کرنا چاہئے۔

منموہن سنگھ کی جانب سے دکھلائی جانے والی یہ کمزوری کوئی نہیں ہے۔ ٹوجی معاملے میں ابتدا ہی سے ان کا رویہ سب کچھ جاننے کے باوجود خاموش تماشائی بنے رہنے کی رہا ہے۔اس کی شروعات فروری ۲۰۰۶ میں ہوئی جب سابق وزیر مواصلات دیاندھی مارن نے ٹوجی کے معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار وزراء کی جمیعت سے چھین کر خود اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اسی رویہ پر اے راجہ کاربند رہے اور وزیر اعظم دونوں کو اس من مانی سے روک پانے میں ناکام رہے۔ ٹوجی لائسنس کے فروخت کی پالیسی بنانے کیلئے وزیر اعظم نے وزیر خزانہ، وزیر دفاع، وزیر پارلیمانی امور اور وزیر مواصلات پر مشتمل ایک گروپ تشکیل دیا تھا لیکن چند دنوں کے اندر وزیر اعظم کو اپنا فیصلہ بدل کر فیصلے کا مکمل اختیار مارن کو دینے کیلئے مجبور ہونا پڑا۔ اس امر کا سب سے بڑا ثبوت سابق وزیر مواصلات دیاندھی مارن کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۲۸ فروری ۲۰۰۶ کو وزیر اعظم کے نام

لکھا تھا۔اس میں وہ رقمطراز تھے "آپکو ہماری یکم فروری کی میٹنگ یاد ہوگی جس میں ہم نے ٹوجی کے لائسنس معاملے میں وزراء کے گروپ کے حوالے سے گفتگو کی تھی اور آپ نے یقین دلایا تھا کہ اس بابت ساری شرائط مکمل طور پر ہماری مرضی کے مطابق طے کی جائینگی لیکن ہمیں حیرت ہے کہ وزراء کے گروپ نے کافی وسیع شرائط تجویز کی ہیں جو ہمارے کام میں مداخلت کے مترادف ہے "۔

دیاندھی مارن نے صرف اعتراض جتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ مطالبہ بھی کیا کہ ہم آپ کے مشکور ہوں گے اگر آپ متعلقہ افراد کو احکامات جاری فرمائیں کہ وہ اس خط کے ساتھ منسلک شرائط کے مطابق ضروری تبدیلیاں کریں۔اس خط وکتابت سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ابتدا میں وزیر اعظم چاہتے تھے کہ تمام وزراء مل جل کر اس بارے میں فیصلہ کریں لیکن بعد میں ڈی ایم کے دباؤ میں انہوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور مارن کو تمام اختیارات سونپ دیئے ۔ وزیر اعظم کو اپنی غلطی کی اصلاح کا ایک اور نادر موقع اس وقت ہاتھ آیا جب مارن کو ہٹا دیا گیا اور اے راجہ کو مواصلات کا وزیر بنایا گیا۔اس وقت وزارتِ خزانہ کے سکریٹری دووری سباراو نے کئی مرتبہ لکھ کر اس جانب توجہ مبذول کروائی کہ ٹوجی کی قیمت مقرر کرنے کے معاملہ چونکہ سرکاری آمد سے متعلق ہے اس لئے اس فیصلے میں وزارتِ خزانہ کی شمولیت ضروری ہے لہٰذہ یہ معاملہ وزراء کے گروپ کو سونپا جائے اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو وہ

مروجہ سرکاری طریقہ کار کی خلاف ورزی ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وزیر اعظم جو خود مشہور ماہر معاشیات ہیں اور ماضی میں وزیر مالیات بھی رہ چکے ہیں سرکاری قوانین اور طریقہ کار سے واقف نہ ہوں اور ان کے ساتھ چدمبرم نے سبّاراوکے مشاہدات کو دیکھا نہ ہو۔

ٹوجی معاملے میں سپریم کورٹ کے فیصلے نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے باوجود اس کے کہ وزیر اعظم کو باقاعدہ مجرم نہیں ٹھہرایا گیا۔ اسی طرح سی بی آئی عدالت سے تکنیکی بنیادوں پر راحت پانے کے باوجود وزیر خزانہ چدمبرم اپنی اخلاقی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اب قوم کی اور ان کی اپنی بھلائی اس میں ہے اپنے آپ کو مزید رسوا کرنے کے بجائے موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنا راستہ ناپ لیں فی الحال کم از کم عدالت نے انہیں بے قصور ٹھہرایا ہے لیکن اگر سبرامنیم سوامی عدالتِ عالیہ میں جاتے ہیں جیسا کہ ان کا ارادہ ہے تو ممکن ہے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا فیصلہ ان کے خلاف آجائے اور انہیں وزیر سے فقیر بنا کر جیل کی سلاخوں پیچھے پہنچا دیا جائے اس دن کی رسوائی سے بچنے کا ایک اور موقع فی الحال موجود ہے اب دیکھنا یہ ہے یہ لوگ اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں یا اسے بھی گنوا دیتے ہیں۔ اس معاملے ایک دلچسپ اتفاق قابلِ غور ہے۔ ٹوجی کے مسئلے پر دیاندھی مارن کے ساتھ منموہن سنگھ کی میٹنگ یکم فروری ۲۰۰۶ء کو ہوئی۔ اے راجہ کی گرفتاری یکم فروری ۲۰۱۱ء

کو عمل میں آئی۔ ٹوجی کے لائسنس کی منسوخی یکم فروری ۲۰۱۲ کو ہوئی۔ ہو سکتا ہے یکم فروری ۲۰۱۳ کو آنے والا عدالت کا فیصلہ چدمبرم کو اے راجہ کے پاس تہاڑ جیل میں پہنچا دے۔ بقول شاعر

غم ملے، حسرت ملے، رسوائی بے جا ملے
کیا پتہ کب کون اپنا بن کے بیگانہ ملے

دہلی دھماکہ: دوستی جب کسی سے کی جائے

دہلی میں اسرائیلی سفارتکار کی گاڑی پر حملے کا الزام ایران پر لگایا جارہا ہے اور اسے تین سال قبل حزب اللہ کے نائب رہنما عماد مغنیہ کی چوتھی برسی سے جوڑا جارہا ہے جنھیں اسرائیل نے ببانگِ دہل دمشق میں شہید کردیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عماد پر ۲۰۰۱ سے قبل سب سے زیادہ امریکیوں کو قتل کرنے کا الزام تھا اور ان کا شمار سب سے زیادہ مطلوبہ دہشت گردوں میں ہوتا تھا۔ مغرب کے لوگ جب دہشت گردوں کی فہرست بناتے ہیں تو مرنے والوں میں یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ کسی کا شمار نہیں کرتے اسی ان فہرست میں شیرون اور بش تو کجا اڈوانی اور مودی جیسے ناموں سے بھی محروم ہوتی ہے۔ حزب اللہ کے ذریعہ ایران پر بلاواسطہ الزام لگایا جارہا ہے لیکن گزشتہ ماہ شہید ہونے والے ایرانی جوہری سائنس داں مصطفیٰ روشن سے جوڑ کر اس دھماکے کا لزام براہِ راست بھی ایران پر لگایا جارہا ہے۔ اگر ان بے بنیاد الزامات سچ مان لیا جائے تب بھی دھماکے ذمہ داری اسرائیل ہی پر آکر ٹک جاتی ہے۔ اگر اسرائیل دمشق میں جاکر عماد کو شہید کرسکتا ہے۔ اگر وہ تہران میں گھس کر روشن کی جان لے سکتا ہے تو کیا ایران اس کے جواب میں کچھ بھی نہیں کرسکتا حالانکہ اسرائیلی وزیر اعظم بن یامین نتن یاہو نے بدلہ لینے کی دھمکی ابھی ابھی دی ہے اور امریکہ اسے

حق بجانب ٹھہرا رہا ہے تو کیا بدلہ لینے کا یہ حق یکطرفہ ہے جس سے امریکہ اور اسرائیل کے علاوہ باقی دنیا محروم ہے ؟اور اگر ایسا ہے تو کیوں ہے ؟

دہشت گردی کے ان واقعات میں استعمال کی جانے والی حکمتِ عملی میں بلا کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ عماد کو شہید کرنے کیلئے کار کے اندر بم رکھا گیا تھا اور وہ اس قدر طاقتور تھا کہ راہ چلتے عماد کے چیتھڑے اڑ گئے۔ جارجیا کی اسرائیلی گاڑی میں اسی طرح بم رکھے گئے لیکن چونکہ اسے پھٹنا نہیں تھا اس لئے ایک چوکیدار نے اسے پکڑ لیا۔ مصطفیٰ روشن ایران کے پانچویں سائنسدان ہیں جنہیں شہید کیا گیا اور ان کی گاڑی کو بھی اسی طرح مقناطیسی بم سے اڑایا گیا تھا جیسا کہ دہلی میں کیا گیا گویا یہ اسرائیل کا آزمایا ہوا نسخہ ہے۔ پہلی مرتبہ اس تکنیک کا استعمال نومبر ۲۰۱۰ میں ایرانی جوہری توانائی کے سربراہ فریدون عباسی کے خلاف کیا گیا جس میں ان کی کار میں بم رکھنے کے بعد موٹر سائیکل پر سوار ایک شخص نے اسے مقناطیسی کنٹرول سے چلادیا تھا۔ یہ حسنِ اتفاق ہے عباسی بھی دفائی مشیر کی بیوی کی طرح زخمی تو ہوئے تھے لیکن ہلاک نہیں ہوئے لیکن ان کے ساتھ کام کرنے والے شہریاری اپنی کار کے دھماکے میں جان بحق ہوگئے۔ ان تمام واقعات سے اسرائیل اور امریکہ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا لیکن ایک مسکراہٹ کے ساتھ گویا زبان

تو جھوٹ بول رہی تھی لیکن چہرے کے تاثرات سچ کی چغلی کھا رہے تھے۔ موساد کی عالمی دہشت گردی پر ایک یہودی مبصر رونن برجمن کی کتاب ''موساد اور اسکی غارتگری'' اس دہشت گرد تنظیم کے بے شمار سربستہ راز فاش کرتی ہے۔ اس سے پہلے وہ ایران کے خلاف اسرائیل کی خفیہ جنگ نامی کتاب تصنیف کر چکے ہیں۔

دہلی اور جارجیا کے بعد بنکاک کی گنجان آبادی میں یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے اور اس کے قریب ایک مرنے والے کے کاغذات ملے جس سے یہ شک کیا جانے لگا کہ اس کے پیچھے ایران کا ہاتھ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص جس کے کاغذات ملے وہ دھماکہ کرنے والوں میں سے تھا یا اس کا شکار ہونے والوں میں سے؟ اگر دھماکہ کرنے والوں میں سے تھا تو اسے دھماکے کے وقت اپنا پاسپورٹ اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور وہ پاسپورٹ اس کا اپنا تھا یا کسی اور کا؟ نیز اگر کسی ملک کا کوئی باشندہ کوئی دھماکہ کرتا ہے تو کیا اس کیلئے اس ملک کی حکومت کو بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ ان سوالات کا جواب معلوم کرنے کیلئے امریکہ کے معروف ٹی وی چینل این بی سی سے نشر ہونے والی خبر کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔ امریکی انتظامیہ کے ایک نامعلوم افسر نے این بی سی کو بتلایا کہ اسرائیل ایران اشتراکی تنظیم مجاہدین خلق کو اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے ۱۹۹۷ سے مجاہدین خلق کا شمار امریکہ کی جاری کردہ دہشت گرد تنظیموں میں

ہوتا ہے اور اس پر امریکیوں کو قتل کرنے کا الزام ہے۔اسرائیل اس تنظیم کو نہ صرف تربیت بلکہ روپیہ اور اسلحہ بھی فراہم کرتا ہے اور مجاہدین خلق اسرائیل کے اشارے پر ایران کے اندر قتل و غارتگری کرتی پھرتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے اس کی دہشت گردی پر لگام لگانے ے بجائے فی الحال اسے بدنامِ زمانہ فہرست سے نکالنے کی وکالت ہورہی ہے۔ ایک دلیل تو یہ دی جارہی ہے کہ طویل عرصے اس نے کسی امریکی کو ہلاک نہیں کیا۔دوسرے یہ کہ وہ تشدد سے تائب ہوچکا ہیں اس سے مراد امریکہ کے خلاف کیا جانے والا تشدد ہے اور پھر وہ ایران میں اقتدار کی تبدیلی کے حامی ہیں گویا مجاہدینِ خلق کا یہ موٗقف ان کے سارے گناہوں کا کفارہ ٹھہرتا ہے۔کچھ لوگ یہ بھی کہنے سے نہیں چوکتے کہ اسرائیل کو اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر ایران کے خلاف تمام ذرائع استعمال کرنے کا حق ہے۔ڈینیل لارسن جیسے مفکرین کے نزدیک ایک نیک مقصد کی خاطر کی جانے والی یہ دہشت گردی بھی کارِ خیر ہے۔

ہندوستان کو شکایت ہے کہ اس کی سرزمین کو اس گھناؤنے کام کیلئے کیوں استعمال کیا گیا؟یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن امریکہ اور اسرائیل کب کسی سرحد کے تقدس قائل ہیں۔آئے دن امریکی پاکستانی سرحد میں داخل ہو کر ڈرون سے معصوموں کو ہلاک کرتے ہیں اور ہر مرنے والے کو طالبان یا القائدہ سے جوڑ دیتے ہیں لیکن ہندوستان نے پاکستان کا ہم سایہ ہونے کے باوجود کبھی اس

زیادتی کے خلاف زبان کو جنبش نہیں دی بلکہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں اپنے تمام تر تعاون کا یقین دلاتا رہا۔ اسرائیل کی عالمی دہشت گردی اور مغرب کی پشت پناہی کی ایک بڑی مثال حماس کے رہنما محمود المبحوہ کی دبئی میں کی جانے والی شہادت ہے ۔ انہیں شہید کرنے کیلئے یوروپ سے گیارہ ارکان کی ایک تربیت یافتہ ٹیم جعلی پاسپورٹ لے کر دبئی پہنچی۔ ان دہشت گردوں میں سے ۶ کے پاس برطانیہ اور ۳ کے پاس آئرش نیز ایک ایک کے پاس فرانس وجرمنی کے پاسپورٹ تھے ۔ ان میں ایک خاتون بھی تھی اور انھوں نے بوستان روٹانا نامی ہوٹل میں بجلی کا شاک دے کر محمود کو شہید کیا۔ حماس نے برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک سے ان قاتلوں کو سزا دینے کا مطالبہ کیا لیکن اس کی صدا بصحرا ثابت ہوئی ویسے قاتلوں کی عدالت میں کسی قاتل کو سزا چہ معنی دارد وہاں تو معصوموں کو سزائے موت سنائی جاتی ہے ۔

ہندوستان کے اندر صہیونی مفادات کو بلاواسطہ نقصان پہنچانے والی ایک اہم خبر دہلی دھماکے سے ایک دن قبل ذرائع ابلاغ کی زینت بنی ۔ قومی تفتیشی ادارے (این آئی اے) نے سمجھوتہ ایکسپریس میں بم دھماکہ کرنے والے ایک ملزم کمل چوہان کو اندور ضلع میں دیپال پور کے قریب مور کھیڑا گاؤں سے گرفتار کرلیا۔ جس نے دو دن بعد کیمرے کے سامنے خود اپنے ہاتھوں سے سمجھوتہ ایکسپریس کے اندر ۲۰۰۷ میں بم رکھنے کا اعتراف بھی کرلیا۔ اتفاق سے کمل اور ریاست کے

بھاجپائی وزیر اعلیٰ شیوراج چوہان کا خاندانی نام یکساں ہے۔ کمل چوہان دراصل سمجھوتہ بم دھماکے کے کلیدی ملزمین رام جی کالسنگارے اور سندیپ ڈانگے (جن کے سر پر دس ہلاکھ روپئے کا انعام ہے) کا قریبی معاون ہے۔ سادھوی پرگیا کا تعلق بھی راجپوتوں سے ہے اور اس کو آشیرواد دینے والے راج ناتھ سنگھ بھی راجپوت ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے ان ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف دھرم یدھ کرنے والا دگوجے سنگھ بھی اسی علاقے کا راجپوتوں میں سے ہے۔

اجمیر شریف دھماکے میں درگاہ قریب جو موبائل فون ملا تھا اور اسکی مدد سے این آئی اے نے تحقیقات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا بالآخر مفرور سوامی اسیمانند گرفتار ہوئے اور انہوں نے سمجھوتہ ایکسپریس کے دھماکے میں ملوث لوگوں کی نشاندہی کردی ساتھ ہی اپنے اقبالیہ بیان میں یہ اعتراف بھی کیا کہ یہی لوگ مکہ مسجد اور مالیگاؤں کے دھماکوں میں بھی ملوث تھے۔ مالیگاؤں کے دھماکوں میں ملوث کرنل پروہت کے اسرائیل سے تعلق جگ ظاہر ہیں ۔ اس نے تل ابیب میں جلاوطن ہندو راشٹر کے قیام کی کوشش بھی کی تھی ۔ اس دھماکے میں آر ایس ایس کے رہنما اندریش کمار کے ملوث ہونے کا بھی انکشاف ہوا ہے ۔ کمل چوہان کی گرفتاری پھر ایک بار صہیونی فتنہ کو زیرِ بحث لاسکتی تھی اس لئے اس کی جانب سے توجہ ہٹانا اسرائیل بہت بڑی ضرورت تھی جو اس دھماکے نے پوری کردی۔

دھماکے سے ایک ہفتہ قبل کیرالہ کے کوچین قلعے میں واقع ایک یہودی جوڑے شانیور ظلمان اور یفا شیسنوئی کو پولس نے گرفتار کرکے ملک بدر کر دیا۔ ان کا تعلق بدنام زمانہ شبد فرقے سے ہے۔ یہ لوگ ۳ مارچ ۲۰۱۰ سے یہاں مقیم ہیں۔ اس بیچ ایک مرتبہ ویزہ کی مدت ختم ہوجانے پر یہ دونوں واپس تو گئے لیکن دس دنوں کے بعد پھر لوٹ آئے۔ ممبئی میں ۲۶ نومبر کو شبد ہاؤس پر بھی حملہ ہوا تھا جس میں چھ یہودی ہلاک ہوئے تھے لیکن ایسے شواہد بھی سامنے آئے تھے کہ حملہ آوروں نے ابتدا میں وہیں قیام بھی کیا تھا۔ کوچین میں سولہویں صدی کے دوران پہلی مرتبہ یہودی آئے لیکن فی الحال پچاس لوگوں کے علاوہ باقی سب لوٹ چکے ہیں۔کچھ سیلانی یہاں سیر و تفریح کی خاطر آتے رہتے ہیں،اس کے باوجود ان پچاس یہودیوں اور کبھی کبھار آنے والوں کی خدمت کیلئے جو شبد ہاؤس قائم کیا گیا اس کا کرایہ پچاس ہزار روپئے ماہوار تھا۔ ممبئی حملے کے بعد مرکزی خفیہ ایجنسی کو یہودیوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی اس طرح یہ شبد ہاؤس بھی شک کے گھیرے میں آگیا تھا۔ یہاں ہونے والی رات گئے کے اجتماعات کی پولس نگرانی کرنے لگی تھی جس میں بڑی تعداد میں لوگ مشکوک انداز میں شریک ہوتے تھے۔ پولیس نے ان کے مالی معاملات کی بھی تفتیش کر رہی ہے۔ پولیس کو پتہ چلا ہے کہ ایسے کئی جوڑے ملک کے پچاس سے زیادہ شہروں میں رہائش پذیر ہیں جن کی خفیہ سرگرمیاں شکوک و شبہات کے دائرے میں

آتی ہیں ۔اگر دوسری ریاستوں کی پولیس بھی ایمانداری کے ساتھ ان شبد ہاؤس میں ہونے والی سرگرمیوں نیز یہاں آنے جانے والے لوگوں پر نظر رکھیں تو یقیناً بہت سارے دھماکوں کے سربستہ راز اپنے آپ طشت ازبام ہو جائیں گے ۔ہندوستان کی حکومت جو آجکل اسرائیل کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھارہی ہے اسے چاہئے کہ وہ راحت اندوری کا یہ شعر اپنے پیش نظر رکھے۔

دوستی جب کسی سے کی جائے
دشمنوں کی بھی رائے لی جائے

ان دھماکوں کے پسِ پشت نہ صرف سیاسی بلکہ معاشی وجوہات بھی کارفرما ہیں ۔ ماہِ فروری کے اواخر میں ہندوستان سے ایک اعلیٰ سطحی تجارتی وفد ایران کے دورے پر روانہ ہونے والا ہے ۔ ایران اور ہندوستان کے درمیان گزشتہ سال ۱۳٫۶۷ بلین ڈالر کی تجارت ہوئی ہے جس میں سے ۱۰٫۹۲ بلین ڈالر کی درآمد اور ۲٫۷۴ بلین ڈالر کی برآمد ہے ۔وزارت وصنعت وحرفت کے مطابق سالِ رواں کے اندر اس میں ۲٫۰۷ فی صد کا قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے ۔ہندوستان ایران کو پٹرولیم کی مصنوعات کے علاوہ مشینیں اور دیگر دھاتیں اور چاول برآمد کرتا ہے ۔اپنی ضرورت کا ۱۵ فیصد معدنی تیل ہندوستان ایران سے خریدتا ہے ۔دنیاکے سب سے زیادہ تیل استعمال کرنے والے ممالک میں ہندوستان فی الحال چوتھے نمبر پر ہے اور وہ ایران کا سب دوسرے نمبر کا سب سے بڑا گاہک ہے ۔ سارے

یوروپ کو ایران جس قدر تیل بیچتا تھا اتنی کھپت تو صرف ہندوستان میں ہے۔ اسی لئے ہندوستان نے اقوامِ متحدہ کی جانب سے لگائی جانے والی معاشی پابندیوں کے باوجود ایران سے معاشی رشتے برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔
ایران اور دیگر ممالک کے ساتھ تیل کی تجارت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اب ہندوستان اپنی درآمد کی ۴۵ فی صد ادائیگی ڈالر کے بجائے ہندوستانی روپے میں کرے گا ۔ یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جس سے تیل کے کاروبار میں امریکی اجارہ داری کی کمر ٹوٹتی ہے اور اس کے معاشی بائیکاٹ کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔ معاشی طور سے ہندوستان کیلئے یہ فیصلہ بے شمار فوائد کا حامل ہے ۔ اس کے ذریعہ سے ہندوستان سے ایران کی برآمد میں اضافہ ہوگا اور ہندوستان کا تجارتی خسارہ جو ۱۹ بلین ڈالر کو چھو رہا ہے کم ہو گا ۔ اس سے ہندوستان کسی حد تک ڈالر کے خریدنے کی زحمت سے بچ جائیگا جس سے ملک کے خارجی زرِ مبادلہ کے ذخائر میں اضافہ ہوگا۔ اس کے ذریعہ پہلی مرتبہ ہندوستانی کرنسی کو جنوب ایشیا کے باہر قبولیتِ عام حاصل ہوگا اور دوسرے ممالک کو بھی اس طرح کی تجارت میں دلچسپی پیدا ہوگی ۔ اسرائیل اگر یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بم دھماکے جیسی بچکانہ حرکات سے ہندوستان اور ایران کے درمیان تعلقات میں دراڑ ڈال دے گا تو یہ اس کی بہت بڑی غلط فہمی ہے ۔ ایران پر حملے کے نتیجے میں اگر خلیج فارس کا پر خطر ہو جاتا ہے تو ہندوستان کی جانب آنے والی ۱۰۰ فی صد گیس اور ایران کے علاوہ

دوسرے خلیجی ممالک سے ہونے والی تیل کی سپلائی بھی بری طرح متاثر ہو جائیگی۔ اگر جنگ کے نتیجے میں تیل کی قیمت ۲۰۰ ڈالر فی بیرل کو چھونے لگتی ہے تو ہندوستانی معیشت کو اس کی شدید قیمت چکانی پڑے گی اس لئے فی الحال اگر اسرائیل الٹا لٹک جائے تب بھی وہ ہندوستان کو ایران کے خلاف اپنا ہمنوا نہیں بنا سکتا اور اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہندوستان کی حماقت پر احمد فراز کا یہ شعر صادق آجائے گا۔

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن جلتے ہوئے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

عالمی ذرائع ابلاغ تو مغربی سرمایہ داروں کا زر خرید غلام ہیں مگر ہندوستانی ٹی وی چینلس کا حال تو مجرا کرنے والی رقاصہ کا سا ہوگیا ہے کہ اس پر جس قدر نوٹ اڑائے جاتے ہیں وہ اسی قدر جھوم جھوم کر ناچتی گاتی ہے۔ جیسے ہی یہ دھماکہ ہوا ہندوستانی ذرائع ابلاغ پر آندھی طوفان کی مانند چھا گیا حالانکہ اس میں صرف ایک خاتون زخمی ہوئی تھی اور وہ بھی سفارتکار نہیں بلکہ اس کی اہلیہ۔ اسرائیل نے ایران کا نام لیا تو یہ لوگ زور زور سے ایران کی مالا جپنے لگے اس نے حزب اللہ کی جانب انگشت نمائی کی تو حزب اللہ کا شدید خطرہ آن کی آن میں سارے ملک میں منڈلانے لگا جبکہ اس سے پہلے اس کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ دھماکہ دہلی میں

ہوا اور اس سے پہلے کہ ہماری خفیہ ایجنسیاں کسی نتیجے پر پہنچتیں اسرائیلی حکومت نے اس کی تفصیلات سے ہمارے حکام کو آگاہ کرنا شروع کردیا۔ موساد کا ایک وفد ہماری مدد کیلئے بن بلائے مہمان کی طرح دہلی کی جانب رختِ پرواز ہوگیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صہیونی حکومت کے قبضے میں علاؤالدین کا کوئی چراغ ہے جسے گھستے ہی ایک جن نمودار ہوتا ہے اور سارے شواہد کو بلاتوقف لاکر حاضر خدمت کردیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دھماکے کے مختلف گوں ناگوں پہلوؤں کا احاطہ کوئی انسان تو کیا جن بھی آسانی کے ساتھ نہیں کرسکتا۔

وہ دہشت گرد بن جاتے ہیں جن کے گھر نہیں رہتے

انسداد دہشت گردی کا قومی مرکز فی الحال کولکتہ کی کالی ماتا یعنی ممتا بنرجی کی دہشت کا شکار ہے۔ ممتا اور سونیا کے درمیان پائے جانے والے کھٹے میٹھے رشتوں کو ایک امیر کبیر ساس اور خودسر بہو کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا بھی نہیں چاہتیں اور ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی نہیں چاہتیں اس لئے تمام تر تو تو میں میں کے باوجود یہ سلسلہ وار ڈرامہ ناظرین کو اپنی جانب متوجہ رکھتا ہے۔ اگر ان کی آپسی چپقلش بند ہو جائے تو ناظرین کی دلچسپیوں کا خاتمہ ہو جائے اور وہ اس ترنگے چینل کو چھوڑ کر دیگر نارنگی یا سرخ چینلس کی جانب نکل جائیں لیکن اگر یہ ساس بہو جدا ہونے کا فیصلہ کرلیں تو سیریل ہی کا خاتمہ ہوجائے گویا ہر دو صورت فریقین کیلئے نقصان دہ ہے اسلئے نہ سانپ مرتا ہے اور نہ لاٹھی ٹوٹتی ہے۔ مداری کا کھیل چلتا رہتا ہے ووٹوں کی برسات ہوتی رہتی ہے نوٹوں کی تھیلیاں بھرتی رہتی ہیں۔ منظر نامہ اس طرح بُنا گیا ہے کہ گھر ساس کا ہے اس لئے اس میں مرضی تو اسی کی چلتی ہے لیکن بہو چونکہ خودسر ہے اس لئے وہ ساس کی مان نہیں سکتی اور سسرال کی عیش و عشرت سے استفادہ جاری رکھنے کیلئے گھر کو چھوڑتی بھی نہیں۔

معاشرتی سطح پر اس طرح کا انتشار ساس بہو اور بیٹے تینوں کیلئے نقصان دہ ہو سکتا ہے لیکن بھلا ہو جمہوری سیاست کا کہ جس کا بابا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں پر یہ آپا دھاپی تینوں کیلئے نہ صرف مفید بلکہ ان کے مشترکہ دشمنوں کیلئے سمِ قاتل بھی ہے۔ وی پی سنگھ نے ایک بار کہا تھا ہم کانگریس کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تاکہ عوام کے سامنے دوسرا متبادل بھی فسطائی نہیں بلکہ سیکولر ہو۔ وی پی سنگھ کے زمانے میں تو یہ نہ ہو سکا اس لئے کہ خود جنتا دل کو اس داخلی انتشار نے نگل لیا اور بی جے پی سب سے بڑا متبادل بن کر ابھر آئی لیکن اتفاق سے اب وہ صورتحال پیدا ہو گئی جس کا خواب برسوں قبل وی پی سنگھ نے دیکھا تھا۔ مہنگائی کا مسئلہ ہو یا بیرونی سرمایہ کاری کا، لوک پال بل ہو یا انسدادِ دہشت گردی کا مرکز ہر مسئلے میں کانگریس اور ترنمول کی نورہ کشتی چلتی رہتی ہیں اور باقی حزبِ اختلاف حاشیہ پر کھڑا نظر آتا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں فی الحال یہ ساس بہو اور سازش نامی ڈرامہ چھایا ہوا ہے اور دیگر سیاسی جماعتوں کیلئے ساس کے خلاف بہو کی حمایت میں زندہ باد و پائندہ باد کے نعرے لگانے کے علاوہ کچھ اور کام نہیں ہیں۔

ستمبر ۲۰۰۱ کے بعد عالمی سطح پر انسدادِ دہشت گردی کے نام بین الاقوامی دہشت گردی ۱۱ کاآغاز ہوا۔ جارج بش کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ اس بہانے سے ساری دنیا کو اپنی قیادت میں متحد کرنے میں کامیاب ہو جائیگا لیکن ہوا یہ

کہ ساری دنیا تو درکنار امریکی رائے عامہ نے بھی وقت کے ساتھ اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور وہ جاتے جاتے اپنی ری پبلکن پارٹی کی لٹیا ڈبو کر اقتدار گئے۔ ہندوستان میں ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ کو ممبئی پر دہشت گردانہ حملے کے بعد وزیر داخلہ چدمبرم نے انسدادِ دہشت گردی کا قومی مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب تین سال بعد یہ مرکز باقاعدہ قائم کر دیا گیا تو ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور مندرجہ ذیل تین طرح کے اعتراضات سامنے آئے :

اس طرح کے مرکز کا قیام ملک میں رائج دفاقی نظریہ کی خلاف ورزی ہے○

مرکزی حکومت اپنے مخالفین کے خلاف اس کا غیر واجبی استعمال کر سکتی ہے○

اس سے ریاستی حکومت کے حقوق و اختیارات میں دراندازی ہوتی ہے○

سب سے پہلا اعتراض بے حد اہم اس وجہ سے ہے کہ اکثر و بیشتر ہمیں یہ بات یاد ہی نہیں رہتی کہ دستور کی رُو سے مملکتِ ہند ایک دفاق ہے جس میں مختلف اقوام جنہیں ریاستی اکائیوں کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے شامل ہیں اور مرکز پر یہ لازم ہے کہ وہ ان کے تشخص اور حقوق کا احترام کرے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی تسلیم کی جانی چاہئے کہ اگر کوئی اکائی جو اس میں شامل ہوئی ہے کسی وجہ سے اپنے سابقہ فیصلے سے رجوع کرتی ہے اور الگ ہونا چاہتی ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے لیکن ہمارے ملک جیسے ہی اس طرح کی مطالبہ سامنے آتا ہے ہم لوگ جذباتی ہو جاتے ہیں پچھلے دنوں کشمیر سے متعلق پرشانت بھوشن کے نہایت

محتاط بیان کا جو حشر ہوا سب دیکھ چکے ہیں۔ ان پر ہونے والے تشدد کی مذمت کوئی نہ کر سکا۔ میزورم اور ناگا لینڈ میں جس بیدردی کے ساتھ ان مطالبات کو کچلا گیا وہ بھی سامنے ہے۔ اس معاملے میں علاقائی جماعتوں سے قطع نظر کانگریس اور بی جے پی کا رویہ نہایت غیر معقول ہوتا ہے۔ وہ لوگ اسے قوم کی غداری قرار دے کر باؤلے ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ مغربی قوم پرستی کی اتباع میں کیا جاتا ہے وگرنہ انڈونیشیا اور سوڈان کی مثالیں جگ ظاہر ہیں جہاں علحیدگی پسندوں کے ساتھ بھی نہایت حلم و بردباری کا سلوک کیا گیا۔ عوامی استصواب کے بعد بغیر کسی خون خرابے کے ملک تقسیم ہوا اور وہ ایک اچھے پڑوسی بن گئے۔ اس بار بی جے پی کے رہنما ارون جیٹلی نے بھی این ٹی سی ٹی کے باب میں دفاقی ڈھانچے کا حوالہ دیا ہے یہ ایک خوش آئند پیش رفت ہے۔

ارون جیٹلی کو اپنے خاص دوست نریندر مودی کے سر پر لٹکنے والی مرکزی حکومت کی تلوار نے شاید مذکورہ بیان کیلئے مجبور کیا ہو۔ نریندر مودی نے اپنے خلاف مرکزی اداروں کے استعمال کا واویلا پہلے ہی سے مچا رکھا ہے۔ اس کا الزام ہے کہ کانگریس پارٹی مرکزی حکومت کے تحت کام کرنے والے تمام تفتیشی اداروں کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کرتی ہے اور اگر وہ اس قدر توانائی اس کے بجائے پاکستان کے خلاف صرف کرے تو دہشت گردی کا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نریندر مودی نے بھی گجرات

کے ہر سرکاری ادارے کو اپنے مقاصد کی خاطر بے دھڑک استعمال کیا ہے ؟اس کا دست راست وزیر داخلہ قتل و غارتگری کے سنگین الزامات کے تحت ریاست بدر ہے ۔

پولیس فورس کو نریندر مودی نے انڈر ورلڈ مافیا بنا دیا اور خود اس کا ڈان بن بیٹھا۔ گجرات کے اندرایسے کئ پولیس افسران جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑ رہے جو مودی کے اشارے پر معصوموں کے جان و مال کے ساتھ کھلواڑ کیا کرتے تھے ۔ ان باوردی غنڈوں کی مدد سے مودی نے غیر تو غیر اپنے بچپن کے دوست ہرین پنڈیا کا بھی قتل کروا دیا۔ سنجے بھٹ جیسے باضمیر پولیس افسر کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی ۔ عدالت کو بسٹ بیکری کا مقدمہ ریاست سے باہر ممبئ منتقل کرنا پڑااس لئے گواہ اور سرکاری وکیل تو کجا جج صاحبان پر بھی بے شمار دباؤ ڈالا جاتا تھا۔جو شخص خود تمام سرکاری اداروں کے ساتھ کٹھ پتلی کا کھیل کھیلتا ہے وہ کس منہ سے دوسروں پر ان کے بیجا استعمال کا الزام لگا سکتا ہے۔اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نام نہاد پاکستانی دہشت گردی کے ہاتھوں ہونے والا جانی ومالی نقصان نریندر مودی سے بہت کم ہے ۔

ملک کے اندر فی الحال دہشت گردی سے مقابلہ کرنے والے کئ ادارے موجود ہیں مثلاً انٹلیجنس ریسرچ اور انالیسس ونگ جیسے رآ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

بیورو یعنی آئی بی، نیشنل انویسٹی گیشن ایجنسی (این آئی اے)، نیشنل سیکیورٹی گارڈس اور ایس آئی ٹی وغیرہ لیکن اس کے باوجود را کے سابق سربراہ وکرم سود نے اس نئے ادارے پر اعتراض جتایا ہے ان کے خیال میں اس کو دیگر اداروں پر یک گونہ فوقیت حاصل ہو جائیگی جس سے ان کی کارکردگی متاثر ہوگی۔ ریاستی حکومتوں کی مخالفت اس لئے ہے کہ وزیر داخلہ نے انہیں اعتماد میں لینے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی اور اس نئے ادارے کو تفتیش کے علاوہ گرفتاری کا بھی اختیار حاصل ہونے والا ہے۔ ریاستی حکومتیں بجا طور پر اسے اپنے حقوق میں مداخلت گردانتی ہیں اس لئے کہ امن وامان برقرار رکھنا بنیادی طور پر ریاستی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ مرکز کی جانب بین الریاستی ٹیم کا قیام صوبائی اختیار کو مکمل طور پر ختم کردیتا ہے۔

ایمرجنسی کے دوران جبکہ مرکزی ایجنسیوں کو اس یہ حق حاصل نہیں تھا اس کے باوجود اندراگاندھی نے اپنے مخالفین کے خلاف انہیں استعمال کیا جس کی تفصیلات شاہ کمیشن کی رپورٹ میں موجود ہے لیکن بہر حال وہ قانون کی خلاف ورزی تھی۔ این ٹی سی ٹی کو یہ اختیار دے دینے سے اس مداخلت کو دستوری جواز و تحفظ فراہم ہو جائیگا۔ یہ ایک ایسی زیادتی ہے کہ انگریزوں نے بھی اپنے سامراج میں اس کی جرأت نہیں کی تھی۔ آزادی کے بعد کسی مرکزی حکومت کو اس کا خیال نہیں آیا۔ اس طرح کا کالا قانون سب سے پہلے روس میں لینن اور

اسٹالن نے انقلاب کے خلاف اٹھنے والی آواز کو دبانے کیلئے بنایا جس نے آگے چل کر بدنام زمانہ کے جی بی کا روپ دھار لیا۔ اس لئے اس سے نہ صرف وفاقی ڈھانچہ بلکہ دستور کے ذریعہ تسلیم شدہ انسانی حقوق کی بھی بے دریغ پامالی امکان ہےاور آزادی وجمہوریت کو اس خطرات لاحق ہیں ۔ اس طرح کے اقدامات سے دہشت گردی کا خاتمہ نہیں بلکہ اس میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ یہ محض خیالی اندیشے نہیں ہیں بلکہ گزشتہ چند سالوں کے اندر عالمی سطح پر اس کے بے شمار مظاہر سامنے آچکے ہیں۔

انسانی حقوق کی نگرانی کرنے والے عالمی ادارے نے اکتوبر ۲۰۰۱ء یہ بات کہی تھی کہ بین الاقوامی دہشت گردی کا بہانہ بنا کر حکومتیں ایسے ظالمانہ اقدامات کرنے لگی ہیں جن سے انکے اپنے شہریوں کی اور مہاجرین کے حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔ حکومت کی یہ ذمہ داری ضرور ہے کہ عوام کو تحفظ فراہم کرے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی آڑ میں وہ انہیں بنیادی حقوق سے محروم کردے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن اقدامات پر غور کیا جارہا ہے وہ انسانی حقوق کو سلب کرتے ہیں اور اندرونی مخالفت کو دبانے کیلئے انہیں اختیار کیا جارہا ہے۔ ۲۰۰۳ء کے آتے آتے یہ اندیشے حقائق میں بدل گئے ایمنسٹی نے تسلیم کیا کہ دہشت گردی کے خلاف چھیڑی گئی جنگ دنیا کو ایک محفوظ تر مقام بنانے میں ناکام رہی بلکہ انسانی حقوق پر پابندیاں لگا کر

اور حکومتوں کو بین الاقوامی قوانین سے مبرّا کرکے اس نے دنیا کو مزید پرخطر بنا دیا ہے ۔اس نے مختلف عقائد اور نسلوں کے لوگوں کے درمیان تفریق کو گہرا کیا ہے، تنازعات کے بیج بوئے ہیں اوراس کے باعث خوشحال و نادار دونوں طبقات کے اندر بجا طور پر خوف پیدا ہوا ہے۔

ایمنسٹی انٹر نیشنل کی ۲۰۰۷ء کی رپورٹ ان حقائق کو مزید تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے ۔اس کے مطابق حکومت اور اسلحہ بردار گروہوں نے عالمی اقدار کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے اور عوام کے انسانی حقوق کو برباد کردیا ہے ۔اسلحہ بردار گروہوں کا تشدد اور حکومتوں کی روز افزوں پامالی سے گزشتہ پچاس سالوں کے اندر انسانی حقوق پر عالمی سطح پر یہ سب سے بڑا حملہ ہے ۔جس سے لوگوں کے اندر تفریق ،بے اعتمادی اور خوف کا اضافہ ہورہا ہے ۔حکومت خیالی عمومی تباہی کے اسلحہ کا بہانہ بنا کر حقیقی تباہی کے اسلحہ کا بے دریغ استعمال کر رہی ہے جس سے ناانصافی ،بغاوت، غربت ،امتیاز، اسلحے کی تجارت، خواتین اور بچوں پر ہونے والے مسائل کی جانب توجہ نہیں ہو پارہی ہے گویا دہشت گردی کے خلاف چھیڑی گئی یہ جنگ اب آزادی وحریت کے خلاف ہو رہی ہے۔

اس رپورٹ میں انسانیت کی دگر گوں حالت کی بنیادی ذمہ داری بالواسطہ امریکی حکومت پر ڈالی گئی ہے۔

اس موقع پر اگر امریکی حکام خود اپنے رہنما مارٹن لوتھر کنگ کی مندرجہ ذیل نصیحت کو یاد رکھیں تو وہ ان کے حق میں بہتر ہوگا۔ "تشدد کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے وہ اسی شۂ کو فروغ دیتی ہے جس کے خاتمے کیلئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ برائی کو مٹانے کے بجائے اس کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ تشدد کا استعمال کرکے آپ نفرت کرنے والے کا قتل تو کر سکتے ہو لیکن نفرت کا قتل نہیں کر سکتے۔ تشدد سے نفرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ نفرت کے جواب میں نفرت سے نفرت میں بے تحاشہ بڑھ جاتی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے ستاروں سے خالی رات میں مزید گہرے اندھیرے کو انڈیل دیا جائے۔ اندھیرا تاریکی کو دور نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لئے اجالا درکار ہوتا ہے۔ نفرت سے نفرت کو بھگایا نہیں جاسکتا اس کیلئے محبت کی ضرورت ہوتی ہے"۔ تشدد کے ہتھیار کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت افغانستان کا جہاد ہے۔ ۲۰۰۱ء میں طالبان کے اقتدار ایک محدود علاقے تک سمٹ گیا تھا۔ ناٹو کی افواج نے گزشتہ ۱۱ سالوں میں اپنے سارے حربے آزما لئے اور اب ۳۴ میں سے ۳۱ صوبے طالبان کے قبضے میں آچکے ہیں۔ لیکن افسوس کہ مارٹن لوتھر کنگ کا یہ نسخہ امریکی سیاستدانوں کو انتخاب میں کامیابی نہیں دلا سکتا اس کیلئے ان کے پاس نفرت پھیلانے کے سوا دوسرا چارۂ کار نہیں ہے اور ہندوستانی سیاستدانوں کی بھی یہی مجبوری ہے۔ اسی لئے وہ گاندھی جی کی مالا تو جپتے ہیں لیکن ان کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے۔

بدعنوانی کے بعد اب ملک بھر میں دہشت گردی کا بول بالا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جس قدر لوگ دہشت گردی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں جاتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ تعداد میں بچے خوراکی کمی کے سبب ہلاک ہوتے ہیں۔وطنِ عزیز میں روزانہ تین ہزار بچے اس کے باعث موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ جنوب ایشیاکے اوسط سے یہ تعداد ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔اس سنگین مسئلہ پر قابو پانے کیلئے فوڈ سیکورٹی بل لانے کا اعلان کیا جا چکا ہے جو لوک پال بل کی سیاست کا شکار ہو گیا۔۔اس بل کے تحت ۶۳ فیصد بھارتی باشندوں کو رعایتی نرخوں پر چاول اور آٹا فراہم کئے جانے کی تجویز ہے۔

آج ہندوستان ایشیا کی تیسری بڑی اقتصادی طاقت بن چکا ہے۔ ملک میں فی کس سالانہ آمدنی پچھلے بیس سالوں میں ۹۶ ڈالر سے بڑھ کر ۱۵۲۷ ڈالر تک پہنچ گئی ہے اور قومی معیشت کا حجم بھی کئی گنا بڑھا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے غریب عوام کی دگرگوں صورتحال کے باوجود سال ۲۰۰۹ء میں مجموعی قومی پیداوار کا محض ۱ء۲ فیصد حصہ صحت کے شعبے پر صرف ہوا۔ہندوستان کے ان قبائلی علاقوں کے عوام جو معدنیات کی دولت سے مالامال ہیں سب زیادہ مفلسی کا شکار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہاں نکسل تحریکوں کو مقبولیت حاصل ہے چونکہ وزیر اعظم نکسلیوں کے چیلنج کو سب سے بڑی دہشتگردی قرار دیتے ہیں اور وزیر داخلہ کے ان بین الاقوامی سرمایہ کاروں سے گہرے مراسم ہیں جو قبائلی زمینوں پر

اپنی نظریں جمائے ہوئے ہیں اس لئے ممکن ہے انسداد دہشتگردی کے اس مرکز کا اصل
نشانہ نکسل تحریکات اور ان کی حمایت کرنے والے مفلس لوگ ہوں ۔ اگر ایسا ہوا تو

حکام کو یاد رکھنا چاہیۓ کہ :

توکیوں بے دخل کرتا ہے مکانوں سے مکینوں کو
وہ دہشت گرد بن جاتے ہیں جن کے گھر نہیں رہتے

اترپردیش: مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اترپردیش انتخابات کے نتائج اگر کسی کی توقع کے خلاف ہیں تو اس میں نتائج کا نہیں اس کی توقعات کا قصور ہے۔کانگریس اوربی جے پی اپنے تمام تر بلند بانگ دعووں کے باوجود جانتے تھے کہ وہ پہلے نمبر تو کجا دوسرے نمبر پر بھی نہیں آ سکتے۔ان کی جنگ تیسرے مقام کیلئے تھی اوراقتدار میں حصہ داری کیلئے ان دونوں کے دروازے باقی دونوں کیلئے کھلے تھے۔ ویسے اگر ضرورت پڑتی توسماجوادی اور بہوجن سماج پارٹی دونوں مسلمانوں کی خوشامد کے پیش نظر کانگریس کی حمایت کو ترجیح دیتے لیکن حکومت سازی کیلئے اگر بی جے پی کی حمایت بھی ناگزیر ہو جاتی تو وہ اس سے بھی پس و پیش نہیں کیا جاتا۔اصل مقابلہ اول روز سے سماجوادی اور بہوجن سماج پارٹی کے درمیان تھااس کے باوجودان دونوں کو درمیان اس قدر بڑا تفاوت ہوگا اور ایس پی کو ایسی واضح اکثریت حاصل ہو جائیگی اس کا اندازہ تو شاید اکھیلیش یا ملائم سنگھ کو بھی نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ کانگریس کی جانب سے ہر اکساہٹ و تمسخر بلکہ تضحیک کا جواب دینے سے وہ دونوں گریز کرتے رہے تھے۔

اس بار کی انتخابی مہم میں کانگریس کی مخالفت کا ٹھیکہ بی جے پی کے پاس تھا۔ بی جے پی والے ایک ایسی پارٹی کے خلاف اپنی توانائی صرف کر رہے تھے جسے

اقتدار میں آنا نہ تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ بی جے پی نے از خود اپنی اوقات کیا طے کرلی تھی ؟بی جے پی کو اپنی اس غلطی کا احساس اپنے مقصد میں کامیابی یعنی کانگریس کو چوتھے نمبر پر پہونچانے کے بعد ہوا۔ اس کے کئی ممبران نے یہ تسلیم کیا کہ بہوجن سماج پارٹی کے خلاف غم و غصہ کو ہم اپنے حق میں بھنوانہ سکے اور اپنے آپ کو بی ایس پی کے متبادل کی حیثیت سے پیش کرنے میں ناکام رہے۔ راہل گاندھی نے اپنی توپ مایا اور ملائم کی جانب سادھ رکھی تھی لیکن عوام جانتے تھے کہ کیا "پدی کیا پدی کا شوربہ ؟"دلت بستیوں میں خالی ٹوکری سر پر رکھ کر چلنے اور اس کی فلم ٹی وی پر دکھلانے کا پول جب کھل گیا تو راہل گاندھی نے اپنے آپ کو "اینگری ینگ مین" کے طور پر پیش کرنا شروع کردیا۔ اس کی انتہا اس وقت ہوئی جب اس نے ایس پی کے وعدوں کی فہرست کو پھاڑ کر پھینکنے کا ڈرامہ کیا۔ اس ڈرامے سے لوگوں نے تفریح تو خوب لی لیکن بجا طور ووٹ نہیں دیا۔

لکھنو کے عوامی اجلاس میں راہل گاندھی نے کاغذ کے جس پرزے کو جھوٹ موٹ میں پھاڑا تھا اس کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ کانگریسی رہنماؤں کی فہرست تھی۔یقیناً وہ رائے بریلی اور امیٹھی کے کانگریسی امیدوار رہے ہوں گے جنھیں رائے دہندگان سچ مچ ہرا دیا۔ راہل تو تماشہ کر رہے تھے لیکن عوام نے اسے سنجیدگی سے لے لیا۔اس جلسہ میں راہل گاندھی بڑے طمطراق سے اعلان کیا تھا کہ

لوگ مختلف وعدے کر رہے ہیں ہم کوئی وعدہ نہیں کرتے ۔ عوام آج کل سیاستدانوں سے اس مصرع کی مصداق کہ "وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا" کسی اور چیز کی نہیں صرف وعدوں کی توقع کرتے ہیں ۔ راہل نے اس بارے میں بھی انہیں مایوس کر دیا ۔ ہندوستانی جمہوریت کی سلور جوبلی پر کیفی اعظمی نے صابر و قانع عوام کے جذبات کی اس طرح عکاسی کی تھی کہ :

سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا
وعدہ لپیٹ لیں گے لنگوٹی نہیں تو کیا

کاغذ کی اس چیر پھاڑ نے گاندھی خاندان کے وقار کے بھی چیتھڑے اڑا دیئے ۔اس اداکاری نے راہل گاندھی کیلئے سیاست کے میدان میں ناکام ہو جانے کی صورت میں بالی ووڈ کے امکانات روشن کر دیئے ہیں۔ وہ اگر بڑے پردے پر نہ سہی تو کم از کم ٹیلی ویژن کے چھوٹے پردے پر وہ ضرور کامیاب ہو جائیں گے اور عوام کو تفریح بہم پہنچائیں گے ۔راہل کی اس حرکت کا جواب اکھلیش نے امیٹھی میں دیا وہ بولے راہل کو فی الحال غصہ بہت آتا ہے۔ پہلے وہ انگلیاں مروڑتے تھے ۔ اب کاغذ پھاڑنے لگے ہیں کوئی بعید نہیں کہ کل کو وہ اسٹیج سے کود جائیں۔ امیٹھی کے رائے دہندگان نے بتلا دیا کہ راہل گاندھی کیلئے اب یہی مناسب ہے ۔ راہل کی بچکانی حرکات کو اگر ان کی انفرادی حماقتوں کے زمرے میں بھی اگر ڈال دیا جائے تو بینی پرساد ورما جیسے معمر رہنما کے بیان کا کیا جائے جنھوں نے ایس

پی کو غنڈوں کی پارٹی قرار دے کر بہوجن سماج پارٹی کو اس پر فوقیت دینے کا اعلان کر دیا۔ بنی پرساد ورماپرانے سماجوادی ہیں اس لئے سماجوادی پارٹی کو ان سے زیادہ کوئی اور نہیں جانتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ۱۹۹۷ء کے بعد جب وہ ایس پی سے الگ ہوئے مایا وتی نے سماجوادیوں کو غنڈہ گردی دکھلانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اگر ورماجی کو غنڈہ گردی سے ایسا ہی بیر تھا تو وہ اس وقت ایس پی سے کنارہ کشی کرتے جب وہ غنڈہ گردی میں ملوث تھی لیکن اقتدار کے لڈو بھلا آسانی سے کب چھوٹتے ہیں ۔ جب انگور نہیں ملتے تو اپنے آپ کھٹے ہو جاتے ہیں ۔ بنی پرساد ورمانے کانگریس کے معمر رہنما پی ایل پونیا کو پنجابی قرار دے کر اور مسلم ریزرویشن پر اپنا بھڑکیلا بیان دے کر بھی ہنگامہ کھڑا کیا لیکن وہ ہنگامہ آرائی بھی کسی کام نہ آئی۔

اس انتخابی مہم میں اترپردیش کے سابق صدر اور وزیر قانون سلمان خورشید بھی بلاوجہ آپے سے باہر ہوگئے۔ ایک سلجھے ہوئے وکیل اور ملک کے وزیر قانون کا الیکشن کمیشن سے بھڑ جانا نہایت مذموم حرکت تھی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان پر کمیشن کی جانب سے اقدام کیا جاتا لیکن اس نے منموہن سنگھ کو خط لکھنے پر اکتفا کیا اور منموہن نے بھی مسلمانوں کی خوشامد میں کوئی اقدام نہیں کیا لیکن اب مسلمان اس قدر احمق نہیں رہے کہ اس طرح کے باکنات سے جذباتیت کا شکار ہو کر اپنا ووٹ ضائع کردیں ۔ انہوں نے نہ صرف کانگریس کو چار نشستوں تک

مدسود کرکے یہ پیغام دیا بلکہ سلمان خورشید کی کی اہلیہ لوئیسہ کو شرمناک شکست سے دوچار کرکے یہ بتلا دیا کہ وہ دن لد گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ راہل گاندھی کی حماقتوں اور سلمان خورشید کی شرارتوں کا کوئی نقصان نہ مایا کو ہوااور نہ ملائم کوہاں بی جے پی کے کٹر ہندو ووٹرس نے ضرور اس کا فائدہ اٹھایا اور پارلیمانی انتخابات کے مقابلے میں جبکہ وہ چوتھے نمبر پر پہنچ گئے تھے اپنی پارٹی کو تیسرے نمبر پر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ اگر راہل نے اکھلیش جیسی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہوتااور سلمان خورشید نے ریزرویشن کے بجائے سچر کمیٹی اور رنگناتھ کمیٹی کے سفارشات کا وعدہ کیا ہوتا تو آج جہاں بی جے پی ہے وہاں کانگریس ہوتی اور جہاں کانگریس ہے وہاں بی جے پی لیکن اس ادلا بدلی کا ایس پی اور بی ایس پی پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوتا اس لئے کہ دس فی صد ووٹ کا فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہوتا ہے۔

مسلم عوام نے اس بار جس سیاسی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا وہ غیر معمولی ہےاور ان سیاسی جماعتوں کیلئے جواس بات کا دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ مسلم ووٹ کی طاقت کو بکھر کر ضائع ہونے سے روکنا چاہتی ہیں تازیانہ عبرت ہے۔ امت نے پھر ایک بار ثابت کردیا ہے کہ وہ اس معاملے میں خاصے سمجھدار ہیں اور کسی رہنمائی کے محتاج نہیں ہیں۔ اس کی کئی مثالیں سامنے آئیں ۔ مسلمانوں کی نمائندگی ۵۶

سے بڑھکر ۶۹ تک پہنچ گئی جو اتر پردیش کی تاریخ میں سب سے زیادہ ہے۔ آبادی کے تناسب سے یہ تعداد ۴۰ ہونی چاہئے گویا اس سے ۷۵ فی صد اضافہ۔ جماعتوں کے علاوہ ان کے کامیاب امیدواروں کو دیکھیں تو برسرِ اقتدار ایس پی کے ۴۳ تو بی ایس پی کے ۱۶ ۔اس لئے کہ اب بھی بی ایس پی اور ایس پی کے درمیان ووٹوں کا فرق صرف ۳ فی صد ہے اور اس کے دوبارہ انتخاب میں کامیابی کے امکانات موجود ہیں۔ کانگریس کے ۴ اور پیس پارٹی کے تین۔ قومی ایکتا کے دو اور اتحادملت کا ایک گویا سبھی کو ان کے حسب حال مسلمانوں نے نوازہ۔ نہ ان کی حیثیت سے کم نہ زیادہ۔ بٹلہ ہاوس جیسے واقعات تک اپنے آپ کو محدود کردینے والی علماء کاونسل کو مسلمانوں سے مکمل طور پر صرفِ نظر کر دیااوراعظم گڈھ کی ۱۰ میں سے ۹ سیٹوں پر ساجوادی اور ایک پر بہوجن سماج کو کامیاب کیا لیکن بی جے پی کو ووٹوں کی تقسیم کا فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ اتر پردیش وہ حلقہ انتخاب جن میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کم ازکم ۲۵ فیصد ہے۔ وہاں ۱۳۳ سے بی جے پی کے صرف ۲۲ امیدوار کامیاب ہوئے۔ کانگریس کو ۱۰ اور اسکی حلیف آر ایل ڈی کو ۳ نیز بی ایس پی کو ۳۰ کامیابیاں ملیں جبکہ سب سے زیادہ فائدہ ایس پی کا ہوااوراسے ۶۵ نشستیں حاصل ہوئیں۔ مسلمانوں نے اپنی بالغ نظری کے دو اور ثبوت دیئے انھوں نے نہ صرف راشد مسعود اور امام بخاری کے بیٹوں کو ہرایا بلکہ سلمان خورشید کی بیوی کو بھی شکستِ فاش دوچار کیا۔ آج کل جبکہ قومی اور علاقائی سطح پر موروثی سیاست کا بول بالا ہے مسلمانوں نے اس سے احتراز

کیا اور دیہی علاقوں کی ایس پی کے مسلم امیدوار کو لکھنو سے کامیاب کرکے ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔

اتر پردیش کا انتخاب ایک طرف مسلمانوں ذہانت کا ثبوت دیتا ہے تو دوسری طرف بی جے پی حماقت کا بھی غماز ہے۔ یہ پارٹی یکے بعد دیگرے غلطیاں کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارٹی کے ریاستی صدر سوریہ پرتاپ شاہی جنھوں نے دو دن قبل ۲۰۰ نشستوں پر کامیابی کا دعویٰ کیا تھا ایس پی کے مسلم امیدوار شاکر علی کے ہاتھوں شکست فاش سے دوچار ہوگئے۔ گوکہ بی جے پی والے کانگریس اور راہل کی ناکامی پر بغلیں بجا رہے ہیں لیکن ۱۹۹۷ء کے مقابلے نہ صرف ان کی نشستوں میں کمی واقع ہوئی بلکہ ان کے ووٹوں کا تناسب بھی کم ہوا ہے۔ بی جے پی کو سوریہ کے پرتاپ کا اندازہ غالباً پہلے ہی ہوگیا تھا اس لئے ان لوگوں نے پڑوسی ریاست سے شعلہ بیان سادھوی اوما بھارتی کو درآمد کیا لیکن آپسی کی رنجش کے تتب انہیں وزیر اعلیٰ کا امیدوار نہ بناسکے۔ کئی لوگ اوما بھارتی کو بی جے پی کی ناکامی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں لیکن یہ غلط ہے۔ اوما نے مدھیہ پردیش سے متصل بندیل کھنڈ کے علاقے میں جہاں لودھ ذات کا غلبہ ہے ۱۹ بی جے پی امیدواروں کو کامیابی دلوائی اور خود بھی جیت گئیں لیکن اتر پردیش کے دیگر علاقوں کے اور دیگر ذاتوں سے تعلق رکھنے والے رہنما اپنی ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہے۔ جس طرح راہل گاندھی نے اس

ریاستی انتخاب کو زبردستی اپنے اوپر اوڑھ لیا ویسی ہی غلطی بی جے پی کے صدر نتن گڈکری نے بھی کی اور اپنے آپ کو رسوا کر بیٹھے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کا کنفیوژن اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اڈوانی نے بدعنوانی کے خلاف جو یاترا نکالی اس میں ایودھیا کو شامل ہی نہیں کیا گویا ایک طرح سے رام مندر کے مسئلہ کو حاشیہ پر ڈال دیا لیکن جس روز اڈوانی جی یاترا سے فارغ ہو کر لوک پال بل کی شکایت کے ساتھ صدارتی محل پہنچے اور کانگریس پر بدعنوانی کے تحفظ کا الزام لگایا اسی روز یوپی میں بی جے پی نے بی ایس پی کے ذریعہ معطل شدہ بدعنوان وزیر بابو سنگھ خشواہا کو اپنی پارٹی میں شامل کر لیا۔ اس سے بی جے پی نے مایاوتی کی بدعنوانی کے خلاف اپنے دھرم یدھ کو ازخود ختم کر دیا اور وہ مایاوتی سے زیادہ بدعنوان دکھائی دینے لگی۔ اس لئے کہ بی جے پی کے کرٹ سومایا نے سیکڑوں صفحات پر مشتمل الزامات کا روزنامچہ جس خشواہا کے خلاف پیش کیا تھا۔ مایا نے تو اسے نکال دیا لیکن بی جے پی نے گلے لگا لیا۔ اس حماقت پر پردہ ڈالنے کیلئے بی جے پی کو پھر رام للا کی شرن میں جانا پڑا اور بی جے پی نے ایودھیا سے پھر ایک بار رتھ یاترا نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان متضاد حرکات نے عام رائے دہندگان کے ذہن میں اس پارٹی کے حوالے سے ابہام اور شکوک و شبہات پیدا کر دیئے۔ وہ تو بھلا ہو کانگریس کا جس نے مسلم ریزرویشن کا کارڈ کھیل کر اسے تیسرے نمبر پر

پہنچانے کی خدمت انجام دی۔
کانگریسیوں کو اپنی شکست کا احساس گنتی کے دن صبح ہی سے ہونے لگا تھا اس لئے ریتا بہوگنا سے لیکر دگ وجئے سنگھ سمیت سارے خوشامد پسندوں نے شکست کی ذمہ داری راہل کے بجائے اپنے سر لینی شروع کر دی تھی یہ گویا اعتراف شکست تھا لیکن شام ہوتے ہوتے راہل نے خود اعلان کر دیا کہ "مقابلہ تو دل ناتوں نے خوب کیا۔ - - - - مگر"۔ راہل گاندھی اپنے اعتراف میں جس طرح کی سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا اگر وہ انتخابی مہم کے دوران ایسا کرتے تو شاید انہیں اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی خیر اس اعترف پر جو تبصرہ اکھلیش سنگھ یادو نے کیا وہ اس اکھلیش کی راہل پر برتری کا ثبوت ہے ۔انہوں نے کہا انتخاب میں فتح وشکست تو ہوتی ہی رہتی ہے لیکن چونکہ انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا ہے اس لئے امید ہے آئندہ کامیاب ہوں گے" یہ بیان اس شخص کی اعلیٰ ظرفی اور ذہنی پختگی کا ثبوت ہے جس کے دماغ میں ابھی تک اقتدار کی ہوا بھری نہیں ہے۔اکھلیش نے جو مشورہ راہل کو دیا اس پر خود گزشتہ ڈیڑھ سال سے عمل کرر ہے ہیں۔
پارلیمانی انتخاب میں پچھلی بار اکھلیش نے دو مقامات سے کامیابی حاصل کی تھی اس لئے ایک حلقہ خالی کرنا پڑا۔ چونکہ وہ خود باپ کے بعد بیٹا والی

سیاست پر عملدرآمد کر رہاے تھے اور ان کے اپنے بچے ابھی اسکول میں ہیں اس لئے اپنی جگہ اپنی بیوی ڈمپل کو امیدوار بنا دیا گویا باپ بیٹا اور بہو سب کے سب اقتدار سے لطف اٹھائیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب امر سنگھ ملائم سنگھ کے دست راست ہوا کرتے تھے۔ امر سنگھ سمجھ گئے اب پارٹی میں ان کے دن زیادہ نہیں ہیں اس لئے انہوں نے راج ببر کی مدد سے فیروزآباد میں ڈمپل سنگھ کو بلاواسطہ ہروا دیا۔ اس شکست نے اکھلیش کی آنکھیں کھول دیں اور انہوں نے امر سنگھ کی بیساکھی کے بجائے خود اپنی امید کی سائیکل پر سواری شروع کر دی اور ڈیڑھ سال تک لگاتار محنت کرتے رہے اور عوام سے رابطہ میں رہے۔ اس عرصے میں ۸۰۰۰ جلسے اور ۱۰،۰۰۰ کلومیٹر کا سفر اس شخص نے کیا اور ایک ایسی پارٹی کو جو ٹکنالوجی کی دشمن سمجھی جاتی تھی کمپیوٹر کا دوست بنا دیا۔ پپو یادو کے معاملے میں کڑا رخ اختیار کرکے اکھلیش یادو یہ پیغام بھی پہنچا دیا کہ غنڈوں کی جماعت سمجھی جانے والی ایس پی میں اب چارج شیٹر کی کوئی جگہ نہیں ہے اور اس مسئلہ پر کوئی مصالحت ممکن نہیں ہے۔ امر سنگھ کے نکل جانے کے بعد اعظم خان کو پارٹی میں پھر اہمیت حاصل ہو گئی اور مایاوتی کا مقابلہ کرنے کیلئے یادو مسلم دوستی کا محاذ تیار ہو گیا جس نے اکھلیش کیلئے وزارت اعلیٰ کا دروازہ کھول دیا۔ راہل گاندھی کب وزیر اعظم بنیں گے یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن اکھلیش جلد ہی اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ بن جائیں گے یہ حقیقت نقش دیوار بن کر چمک رہی ہے۔

افغانستان: سرکتی جائے ہے رُخ سے نقاب آہستہ آہستہ

قندھار شہر سے ۲۲ میل دور پنجوائی نامی گاؤں میں رات کے دو بجے شراب کے نشے میں دھت ہنستے اور قہقہہ لگاتے ہوئے چند وحشی درندے داخل ہوتے ہیں اور نیند کی آغوش میں سوئے ہوئے بچوں اور عورتوں پر اندھا دھند فائرنگ شروع کردیتے ہیں۔ ان کی اس درندگی کا شکار ہو کر ۱۶ معصوم لوگ جان بحق ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد گولیوں سے چھلنی لاشوں پر کیمیکل ڈال کر انہیں جلا دیا جاتا ہے۔ لیکن اس اندوہناک واقعہ کا شمار دہشت گردی میں نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان مظلومین میں سے گیارہ کا تعلق حاجی عبدالصمد کے خاندان سے ہے۔ مقتولین کا تعلق مسلمانوں سے ہونا ہی اس واقعہ کو دہشت گردی کی فہرست سے خارج کرنے کیلئے کافی تھا لیکن اگر حملہ آوروں کے تن پر امریکی فوجی وردی ہو تب تو یہ بزدلانہ حرکت مقدس صلیبی جنگ بن جاتی ہے جس کو آج سے دس سال قبل جارج ڈبلیو بش نے عالم اسلام کے خلاف چھیڑا تھا اور جسے براک اوبامہ بڑے شدومد سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ افغانستان کی سر زمین پر ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں تاکہ افغانی عوام کے حریت پسند روح کو کچلا جاسکے لیکن صورتحال اس شعر کی مصداق بنی ہوئی ہے کہ۔

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

افغانستان کے بے غیرت صدر حامد کرزئی کا اس اندوہناک واقعہ پر ہونے والا ردعمل شرمناک ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ' دانستہ قتل' ہے اور اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کیا حکمراں کا کام اس بات کی صفائی دینا ہے کہ کس واقعہ کو معاف کیا جاسکتا ہے اور کس کو نہیں ؟ یا مجرمین کو سزا دینا انکی ذمہ داری ہے ؟ کرزئی نے اسے عمداً قتل کا واقعہ قرار دیتے ہوئے امریکہ سے وضاحت طلب کی اور کہا کہ ہم بارہا امریکیوں سے مطالبہ کر چکے ہیں کہ وہ افغانی شہریوں کا قتل عام بند کردے۔ یہ بیان ازخود اس حقیقت کا غماز ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ یہ سلسلہ عرصہ دراز سے جاری و ساری ہے نیز اس بات کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ انہوں نے اس دوران صرف مطالبات پر اکتفا کیا جو بے نتیجہ رہے۔ تو کیا وہ آئندہ بھی اسی رخصت کی روش کو جاری و ساری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں یا کوئی اقدام بھی کرنا چاہتے ہیں ؟ ماضی میں تو حامد کرزئی کا حال تو ایسا رہا ہے کہ۔

وہ بے دردی سے سر کاٹے امیر اور میں کہوں ان سے
حضور آہستہ آہستہ ، جناب آہستہ آہستہ

افغانستان کا المیہ یہ ہے کہ وہاں پر ایک ایسا وزیر دفاع مسلط ہے جو اس

واقعہ پر محض صدمہ اور افسوس کا اظہار کر کے بیٹھ رہتا ہے اور وزیر داخلہ صدیق صدیقی مذمت و تفتیش کا یقین دلا کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ گزشتہ سال ۲۰۱۱ افغانستان میں ۳۰21 معصوم لوگ مارے گئے اور ۴۵۰۷ زخمی ہوئے۔ کیا ان معصوموں کے خونِ ناحق کا کوئی قصاص نہیں لیا جائے گا؟ اور عوام کو وحشی درندوں کا اسی طرح شکار ہونے دیا جاتا رہے گا؟ اگر کسی صدر مملکت کا اختیار عمل صرف وضاحت کی طلبی تک محدود ہو اور اگر اس کے اندر اس سے زیادہ کچھ کرنے کی جرات و ہمت نہیں ہو تو کیا اسے اقتدار میں بنے رہنے کا حق حاصل ہے؟ اگر نہیں تو جو لوگ اسکے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کے خلاف برسرِ جنگ ہیں کیا وہ حق بجانب نہیں ہیں؟ یہ ایسے بنیادی سوالات ہیں جن کا جواب پانے کیلئے کسی کا مفکر یا دانشور ہونا ضروری نہیں ہے بس اس کا ضمیر زندہ ہو یہی کافی ہے۔

حامد کرزئی کے برخلاف طالبان نے اپنی ویب سائٹ پر اعلان کیا کہ نام نہاد امریکی امن کے علمبرداروں نے قندھار صوبے میں پھر ایک بار معصوموں کے خون سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ ای میل کے ذریعہ جاری کردہ بیان میں دعویٰ کیا گیا کہ ہم ان ہلاکتوں کا بدلہ لیں گے۔ جو بات طالبان نے کہی وہی مطالبہ مقتولین کے وارث عبدالصمد خان نے بھی دوہرایا۔ انہوں نے کہا یہ ایک غیر انسانی اور غیر اسلامی عمل ہے۔ دنیا بھر میں کوئی مذہب عورتوں اور بچوں کے

قتل کی اجازت کسی کو نہیں دیتا۔ عبدالصمد کا کہنا ہے کہ یا تو کرزئی قاتل کو سزا دیں یا ہم خود اس کا فیصلہ کریں گے ۔ ان کا مطالبہ ہے قاتل کو ان کے حوالے کیا جائے اور دنیا کا کون انصاف پسند شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جس کے خاندان کے گیارہ افراد کو ایک وحشی درندوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ قاتل کو وہ سزا دلوائے۔اس سے پہلے الکوزی گاؤں میں جب امریکیوں نے اپنی بہیمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چار لوگوں کو مار ڈالا تھا اس وقت وہاں کے لوگوں نے بھی بعینہ یہی مطالبہ کیا تھا۔اس گاؤں کی ایک خاتون نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ یہاں نہ طالبان تھے اور نہ کوئی جھڑپ ہو رہی تھی۔ اس نے کہا ہم نہیں جانتے یہ غیر ملکی فوجی کیوں ہمارے خاندان کے معصوم لوگوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ یہ قاتل یا تو شراب کے نشے میں تھا یا وہ شہریوں کے قتل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

افغان کے موجودہ تنازعہ میں تیسرے فریق نام نہاد آزاد دنیاکے سرخیل امریکی انتظامیہ کااس بارے میں رویہ بھی قابل توجہ ہے۔ امریکی صدر براک اوباما نے اسے ایک المناک اور دہلانے والا واقعہ قرار دیا ہے مگر یہ بتانے کے بجائے اس کے اسباب وعلل کیا ہیں اور وہ ان درندہ صفت مجرمین کو کس طرح اور کب کیفر کردار تک پہنچایا جائیگا اپنی صفائی میں لگ گئے اور کہا کہ امریکی فوجی کے ہاتھوں ہلاکتوں کا یہ واقعہ امریکی فوج یا امریکہ کی افغانیوں کے لیے عزت

وتوقیر کی نمائندگی نہیں کرتا ہے۔اگر ایسا ہے تو یہ کس بات نشاندہی کرتا ہے یہ بتانے کی زحمت انھوں نے گوارہ نہیں کی ۔ذرائع ابلاغ کے اندر یہ خبرابھی سے گردش کرنے لگی کہ وہ امریکی فوجی ذہنی طور پر پریشان تھا ساتھ اس قدر شریف بھی تھا کہ گولیاں چلانے کے بعد اس نے اپنے آپ کو امریکی حکام کے سپرد کردیا۔اس تبصرے کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے امریکی صدر سمیت ان کے سارے حواری نہ پریشان بلکہ ذہنی مریض ہیں اور یہ پریشانی اور ذہنی کشیدگی ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے جس سے وہ کسی صورت دستبردار ہونا نہیں چاہتے۔

امریکی فوج نے ایک بیان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انہیں اس 'قابل مذمت' واقعہ کا بے حد افسوس ہے۔تاہم نیٹو کا کہنا ہے کہ امریکہ اور افغانستان کے حکام اس تشویشناک سانحہ کی تفتیش کر رہے ہیں۔ اس نام نہاد تحقیق کا عالم یہ ہے کہ.بریگیڈیر جنرل یاکبسن اس واقعہ میں ہلاک وزخمی ہونے والے افغان شہریوں کی تعداد کی تصدیق تک نہیں کرسکے جبکہ اس سے ساری دنیا واقف ہو چکی ہے ۔اُن کے مطابق بعض زخمیوں کو اتحادی افواج کی تنصیب پر طبّی امداد فراہم کی جا رہی ہے لیکن وہ نہیں جانتے اس طرح کے واقعات کازخم جسم سے زیادہ دل پر لگتا ہے اور وہ اس وقت تک نہیں بھرتا جب تک کہ مجرم کو قرار واقعی سزا نہیں مل جاتی ۔امریکی انتظامیہ اس طرح کے درندوں کو پال پوس کر دنیا بھر میں بھیجتا ہے اور ہر طرح سے ان کی حفاظت کرتا ہے وہی آگے

چل کر اس پر ہونے والے حملوں کا بلاواسطہ سبب بنتے ہیں۔

نیٹو کے ترجمان نے بتایا کہ امریکی اہلکار کے اس اقدام کے محرکات تاحال واضح نہیں ہو سکے ہیں۔یہ سراسر کذب بیانی ہے گزشتہ دنوں امریکہ کے ایک صحافی نے اپنے مضمون میں امریکی فوج کے عراق جانے سے قبل ان کی تربیت کیلئے استعمال کی جانے والی ایک فلم کا ذکر کان تھا جس میں سپاہی دوڑتے ہوئے گا رہے تھے، "قتل کردو عورتوں کو! قتل کردو بچوں کو!" اور اس کے بعد انہیں سڑکوں پر عام شہریوں پر گولیاں برساتے ہوئے دکھلایا گیا تھا۔اس طرح کی تربیت کا نتیجہ اس طرح کی بہیمانہ قتل و غارتگری کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔افغانستان میں بین الاقوامی افواج کے کمانڈر جنرل جان ایلن نے اپنے تحریری بیان میں اس واقعہ پر صدمے اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے افغان عوام کو یقین دلایا ہے کہ ''تحقیقات جامع اور انتہائی تیزی سے کی جائیں گی'' لیکن اس پر کوئی یقین نہیں کرتا اس لئے کہ ماضی میں ایسی تصاویر تک منظر عام پر آچکی ہیں جس میں فوجیوں کو قتل کرکے مقتولین پر پیشاب کرتے ہوئے دکھلایا گیا لیکن ان پر کارروائی کی کوئی تفصیل آج تک سامنے نہیں آئی۔

امریکہ کی نیت کے کھوٹ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ جرم

افغانستان کی سرزمین پر ہوا ہے وہ ان مجرمین کو افغانیوں کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اپنی تحویل میں رکھتا ہے اور پھر یہ بھی کہتا ہے کہ اس واقعہ کے حقائق کا تعین کرنے میں افغان حکام کی مکمل مدد کی جائے گی۔ یہ وہی امریکہ ہے جس نے اسامہ بن لادن پر ۱۱ ستمبر کے حملہ کا بے بنیاد الزام لگایا اور انہیں حوالہ نہ کرنے کا بہانہ بنا کر افغانستان پر ہلہ بول دیا تھا۔ کیا اسی کا نام مساوات اور انصاف ہے ؟امریکہ کا یہ دعویٰ کہ ”یہ ہولناک واقعہ کسی بھی طرح اتحادی افواج کی اقدار کا آئینہ دار نہیں، اور نا ہی اس سے افغان سکیورٹی فورسز کے ساتھ نیٹو کے اشراک پر کوئی اثر پڑے گا“ محض اپنے آپ کو بہلانے کی ایک کوشش ہے۔ اس واقعہ سے قبل ہی امریکہ افغانستان رسوائی کی گہری کھائی کے اندر اتر چکا ہے اور اب اس کا واقعہ نے تو آگ میں تیل کا کام کر دیا ہے نیز امریکہ کی ذلیل و رسوا ہو کر افغانستان سے نکل بھاگنے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ اسی لئے نیٹو کے ترجمان یا کیبسن نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا”اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ واقعہ نیٹو کی کوششوں یا افغان سکیورٹی فورسز کو سلامتی کی ذمہ داریوں کی منتقلی کے عمل پر منفی اثرات تو مرتب نہیں کرے گا؟“

امریکی انتظامیہ کے مطابق اس کا قرآنی نسخوں کو جلائے جانے اور اس کے خلاف ہونے والے احتجاج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن کیا وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں

اس کے بعد پھر ایک بار عوامی احتجاج کا آغاز نہیں ہو گا ؟ گزشتہ ماہ سے قرآنی نسخے نذر آتش کیے جانے کے معاملے پر امریکی افواج اور افغانی باشندوں کے درمیان کشیدگی پائی جارہی ہے۔قرآن کی بے حرمتی پر متعدد اعلیٰ امریکی عہدیداروں کی جانب سے معذرت کے باوجود افغانستان میں احتجاجی مظاہروں اور حملوں کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا جس میں چھ امریکی فوجی اور کم از کم تیس افغان شہری ہلاک ہو گئے۔اور اب یہ فائرنگ کا تازہ واقعہ رونما ہوگیا جب کہ افغانستان میں امریکی فوجیوں کے مخالف جذبات ابھی سرد نہیں ہوئے ہیں اور افغان ایک خوددار قوم ہے جو اپنے دشمن کو کبھی نہیں بخشتی ۔

اس واقعہ کے اثرات کا اندازہ ریپبلکن پارٹی کے صدارتی امیدوار نیوٹ گنگرچ کے اعتراف شکست سے کیا جاسکتا ہے انہوں نے کہا کہ امریکہ کا افغانستان سے نکلنے کا وقت آچکا ہے ۔ہم وہاں پر بنیادی تبدیلی لانے کیلئے اپنے اندر ضروری سفاکی کا فقدان پاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ جس درندگی اور سفاکی کا مظاہرہ امریکیوں نے کیا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی لیکن اس کے باوجود وہ افغانیوں کو اپنا غلام بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے یہ اس دور کا معجزہ ہے ۔گنگرچ نے مزید کہا ہمیں اس پورے خطہ کی حکمت عملی کا پھر سے جائزہ لینا چاہئے اوراپنے مشن پر نظرِ ثانی کرنی چاہئے۔ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہئے کہ افغانستان جیسے ملک میں ہماری موجودگی بیجا ردعمل کو جنم دے رہی ہے ۔

ہم بزور قوت انہیں تبدیل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔جارج بش کی پارٹی کا رہنما دس سال بعد ٹی وی پر اس حقیقت کا اعتراف کرے گا یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی ۔امریکی تحفظ کے ماہر مارٹن کے مطابق کسی امریکی فوجی کا نہتے عوام پر سوتے میں گولیاں برسانا افغانیوں کی حفاظت کے نام نہاد امریکی دعویٰ کی دھجیاں اڑاتا ہے۔

ایک طرف امریکہ طالبان سے مصالحت کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت افغان حکام کا یہ بیان ہے کہ گوانتاناموبے کے امریکی قید خانے میں موجود پانچ طالبان قیدیوں نے قطر منتقل ہونے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے اور توقع ہے کہ اس اقدام سے افغانستان میں مصالحت کے لیے کی جانے والی کوشش کو تقویت ملے گی۔افغان صدر حامد کرزئی کے ترجمان ایمل فیضی نے اس قدم پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ’’ہمیں امید ہے کہ یہ اقدام امن کی کوششوں کی جانب مثبت قدم ثابت ہو گا‘‘وال سٹریٹ جرنل‘ کی رپورٹ کے مطابق امریکہ اور افغانستان کی حکومتوں نے طالبان کے ساتھ مذاکرات شروع کر دئے ہیں۔اس کا انکشاف خود افغان صدر حامد کرزئی نے اس اخبار کے ساتھ انٹرویو میں کیا ہے، جو اِس دس سالہ جنگ کو ختم کرنے کی کوششوں میں ایک اہم پیش رفت ہے۔لیکن اسی کے ساتھ مروبی ماہرین یہ اعتراف بھی کرنے لگے ہیں کہ صدر کرزئی نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے خود کو مشکل شراکت دار ثابت کیا ہے جو اکثر تعاون نہیں

کرتا۔ اس لئے اس بات کا بھی امکان ہے کہ امریکہ طالبان کے ساتھ براہ راست کوئی سمجھوتہ کرلے جیسا کہ ۱۹۷۳ میں جنوبی ویتنام کی حکومت کو نظر انداز کرتے ہوئے شمالی ویتنام کے ساتھ امریکیوں نے کرلیا تھا۔

امریکہ اپنے آپ کو افغانستان سے نکال کرلے جانے کیلئے کون سا راستہ اختیار کرتا ہے یہ تو کہنا مشکل ہے لیکن یہ بات طے ہے اس جنگ نے امریکی دلیری کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔ اس کے بہادر فوجیوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ چھوٹے بچوں کی مانند ڈائپر پہنے بغیر اپنی چھاونی سے نہیں نکلتے تاکہ اپنی حاجت کو پورا کرنے کیلئے بھی ٹینک سے باہر آنے کی ضرورت نہ پڑے لیکن یہ ضرور کرتے ہیں کہ آدھی رات میں اپنی بیرک سے چوروں کی مانند نکلیں اور سوتے ہوئے عورتوں اور بچوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنائیں سچ تو یہ ہے کہ افغانستان میں امریکیوں نے اپنے چہرے پر پڑی تہذیب و تمدن کی خوشنما نقاب کو اپنے ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دیا ہے اور اب اس کا استبدادی کریہہ چہرہ ''ساری دنیا کے سامنے آرہا ہے بقول شاعر ''سرکتی جائے ہے رُخ سے نقاب آہستہ آہستہ

جمہوریت کا دنگل : نفسانیت کا دلدل

ممتا بنرجی نے اس بار اپنی پارٹی کے وزیرِ ریلوے دنیش ترویدی کو لوک سبھا کے اسٹیشن پر بجٹ سیشن کے دوران چلتی ٹرین سے نیچے پھینک دیا۔ وہ اس بات کو بھول گئیں کہ دنیش ترویدی ان کے زر خرید غلام ہونے کے ساتھ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے وزیر ریلوے بھی ہیں وہ ریلوے جس کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ یہ دنیا بھر میں سب بڑا مواصلاتی نیٹ ورک ہے۔ اپنے رہنما کی اس اوٹ پٹانگ حرکت پر پہلے تو ترویدی خوب تلملائے اور کہا میں اپنا کام کر رہا ہوں اور اسے پورا کرکے رہوں گا۔ دہلی میں آنے کے بعد غالباً وہ اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو من موہن سنگھ کے تابع سمجھنے لگے تھے لیکن جب دیکھا کہ ممتا کے سامنے خود من موہن کی زبان گنگ ہے تو پھر نرم پڑتے ہوئے بولے مجھے ممتا سے بات کرنی ہے۔ جب اس پیشکش کا کوئی مثبت جواب نہیں ملا تو اس کے بعد اڑیل رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ جب تک تحریری طور پر مجھ سے گذارش نہیں کی جاتی اس وقت تک میں استعفیٰ نہیں دوں گا لیکن یہ داؤں بھی کارگر ثابت نہیں ہوا تو رسوا ہو کر اپنا استعفیٰ روانہ کر دیا اور کہا مجھے بندوپادھیائے کے بیان سے غلط فہمی ہو گئی تھی اور اب اس معاملے میں گھٹیا سیاست میں نہیں کرنا چاہتا۔ ترویدی جی نے جاتے جاتے اپنی سعادتمندی کا

مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں ممتا کا شکر گذار ہوں جو انہوں نے مجھے وزیر ریلوے بننے کا موقع عنایت فرمایا اور پھر اپنی پرانی حیثیت کا اعادہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ میں پارٹی کا ادنیٰ سپاہی ہوں۔

ترویدی کے اس بیان پر ممتا بنرجی کا دل ایک درد مند ماں کی مانند پسیج گیا اور انہوں نے اپنے غلام کے تمام قصور معاف کر دیئے اور سارے گلے شکوے دور ہو گئے۔ یہ تمام واقعات اگر خبروں کے چینل نہایت سنسنی خیز انداز میں نشر ہو رہے ہوں تو بھلا کس کی مجال ہو سکتی ہے کہ وہ تفریحی چینلس پر گھسے پٹے ڈرامے دیکھے۔ پھر اس کے بعد مشہورِ زمانہ سیریل 'ہم لوگ' کے دادا منی کی مانند بزرگ وزیر اعظم پردے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے ترویدی کا استعفیٰ ایوانِ صدارت میں بھیجتے ہیں اور ممتا کی جانب سے تجویز کردہ مکل رائے کو وزیر ریلوے کی حیثیت سے تسلیم کرکے اپنی حکومت کو پٹری سے اترنے سے بچا لیتے ہیں اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جاتا ہے اور سیاست کی گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ ممتا ویدی زندہ باد کی کوک دے کر رواں دواں ہو جاتی ہے۔

ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ترویدی جیسا چاپلوس سیاستداں اپنی پارٹی کے رہنما کی توثیق کے بغیر بجٹ جیسی اہم دستاویز ایوان میں پیش کرنے کا جرأت کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو ممتا نے ریلوے بجٹ کو پارلیمان میں پیش

ہونے سے قبل کیوں نہیں دیکھا؟اور دیکھا تو کیوں نہ اس کی اصلاح کر دی یا اسے روک دیا ؟ اور اگر یہ دونوں کام نہ ہو سکے تو کیوں نہ بجٹ کے پیش ہونے سے قبل ہی تردیدی کی چھٹی کر دی ؟ان تمام سوالات کا واحد جواب یہ ہے کہ اگر ان میں سے کچھ بھی ہو گیا ہوتا تو وہ تماشہ کیوں کر رونما ہوتا جو کئی دنوں تک ٹی وی پر چلتا رہا اور ممتا کے جاہ و جلال کے جلوے دکھلاتا رہا ؟ نیز عوام کو یہ کیسے پتہ چلتا کہ ممتا بنرجی ان کی اس قدر خیر خواہ اور ہمدرد ہیں کہ وہ عوامی فلاح و بہبود کے پیش نظر اپنے وزیر کو بھرے بازار میں ذلیل و رسوا کر سکتی ہیں؟ ممتا بنرجی نے اس نوٹنکی کے ذریعہ اپنی مقبولیت میں اچھا خاصہ اضافہ کر لیا اور یہی جمہوری ضرورت اس ڈرامے کا مقصد حقیقی تھی ۔

ممتا بنرجی کی ترنمل کانگریس مختلف علاقائی جماعتوں سے علی الرغم متحدہ ترقی پسند محاذ میں باقائدہ شامل ہے۔ اس کے باوجود وہ مرکزی حکومت کے تقریباً ہر اہم فیصلے کی مخالفت کرتی نظر آتی ہیں ۔ ان کی مخالفت ڈھکے چھپے انداز میں نہیں بلکہ برسر عام ہوتی ہے لیکن بغیر کسی بڑے نقصان کے ختم بھی ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے کانگریس پارٹی کا نہیں بلکہ حزب اختلاف خاص طور پر بی جے پی کا خسارہ ہو جاتا ہے ۔ پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف انھوں نے جنگ کیا چھیڑی کہ دیگر حزبِ اختلاف حاشیہ پر پہنچ گیا بالآخر

اضافہ تو نہیں ٹلا لیکن بنگال کی ریاستی حکومت مرکزی خزانے میں سے ایک خطیر رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ لوک پال کے وقت یہ ہوا کہ انہوں نے لوک آیوکت کی نامزدگی کا معاملہ اچھال کر میڈیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی اور حزب اختلاف کو اس سے محروم کر دیا۔ ابھی قومی انسدادِ دہشت گردی کے مرکز کو انہوں نے پوٹا اور ٹاڈا سے زیادہ خطرناک قرار دیا لیکن جب راجیہ سبھا یعنی ایوانِ بالا میں اس پر رائے شماری کا موقع آیا تو اس کے ارکان نے غیر حاضر ہو کر بلاواسطہ حکومت کی مدد کر دی اور اس کے خلاف بی جے پی کی ترمیم مسترد ہو گئی حالانکہ اس مسئلہ پر نہ صرف سماجوادی پارٹی بلکہ بہوجن سماج پارٹی نے بھی کانگریس کا ساتھ دیا ورنہ ۱۲۰ کے مقابلے ۸۵ ووٹوں سے حکومت کو شکست ہو سکتی تھی لیکن ترنمل نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

ممتا دیدی غالباً اس بات سے خوفزدہ ہے کہ اس کے حامی پالا بدل کر کانگریس میں واپس نہ چلے جائیں اس لئے کہ بہرحال کچھ عرصہ قبل تک وہ اسی پارٹی میں تھے۔ یا شاید انہیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں پارلیمانی انتخاب میں کانگریسی اقتدار کے خلاف چلنے والی لہر کا نقصان ان کی پارٹی کو نہ ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ پہلے ہی سے گز بھر کا فاصلہ رکھو اور وقت پڑنے پر غیر کانگریسی حکومت میں شامل ہو جاؤ۔ ویسے ترنمل کا یہ کھیل اب بہت زیادہ چلنے والا نہیں ہے۔ اس بات کے امکانات روشن ہو گئے ہیں کہ سماجوادی پارٹی متحدہ

ترقی پسند محاذ میں شامل ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو اس میں کانگریس اور ایس پی دونوں کا فائدہ ہے۔ ایس پی کو اپنے وعدوں کی بجاآوری کیلئے مرکز سے ضروری امداد مل جایا کرے گی اور کانگریس کو ترنمل کے روز روز کے ناٹک سے نجات مل جائیگی ورنہ اس کا تو یہ حال ہے بقول ندا فاضلی:

اچھا سا کوئی موسم، تنہا سا کوئی عالم
ہر روز کا رونا تو بیکار کا رونا ہے

بھارتیہ جنتا پارٹی اس رونے دھونے سے کے عمل سے بہت خوش ہوتی ہے بلکہ اس کا حال تو یہ ہے کہ آج کل اسے دن دہاڑے وسط مدتی انتخاب کے خواب دکھلائی دیتے ہیں اور یقیناً اس سے پہلے کہ اس سپنے کے کلائمکس میں لال قلعہ پر زعفرانی پرچم لہراتا ہوا نظر آئے انہیں کوئی نہ کوئی اندرونی خلفشار نیند سے بیدار کر دیتا ہے اور ان کا خوبصورت خواب پھر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس بار ریلوے بجٹ کو پٹری سے اترتا دیکھ یہ لوگ بغلیں بجا رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے آکر کرناٹک کے سابق وزیر اعلیٰ یدورپا نے کسی شریر بچے کی مانند دھوتی کھینچ لی۔ وہ بی جے پی کے ۱۲۰ میں سے ۷۰ ارکانِ اسمبلی کے ساتھ کسی ہالی ڈے ریسارٹ میں پہونچ گئے۔ اب یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ یہ حضرات وہاں کیا کر رہے ہوں گے۔ جو معزز عوامی نمائندے اسمبلی اجلاس کے دوران اپنے موبائل پر فحش فلمیں دیکھنے سے گریز نہیں کرتے ان کو بھلا ہالی ڈے ریسارٹ میں کیا

رکاوٹ ہو سکتی ہے ۔آر ایس ایس کی شاکھاوں میں جاکر جو مہان سنسکار ان لوگوں نے حاصل کئے ہیں اس کا عملی مظاہرہ مختلف انداز میں گجرات ، مدھیہ پر دیش ، جھارکھنڈاور کرناٹک میں ہوتا رہاہے ۔ کرناٹک میں بھی بجٹ مسئلہ بناہوا ہے ۔ ریلوے بجٹ پر تو پیشکش کے بعد.بریک لگا یہاں تو اسے اسٹارٹ سے قبل ہی سرخ سگنل مل گیااور ٹرافک جام ہو گیا۔

کرناٹک جنوبِ ہند کی وہ ریاست ہے جہاں پہلی اور آخری بار بی جے پی کو ریاستی سطح پر اقتدار حاصل ہوالیکن اس کیلئے یہ تجربہ خاصہ تلخ رہا۔ یدورپا کو کبھی بھی سکون کے ساتھ کام کرنے کا موقع بی جے پی والوں نے نہیں دیا۔آئے دن مختلف لوگ اپنے ہمنواوں کے ساتھ غائب ہو جاتے تھے اور اپنی من مانی شرائط کو قبول کرنے کیلئے وزیر اعلیٰ کو مجبور کرتے تھے اکثر ایسی صورتحال پیدا ہوجاتی تھی کہ ہائی کمانڈ بھی بے دست و پا نظرآنے لگتا تھا۔ کبھی ریڈی.برادران اپنی دولت کے سہارے ارکان اسمبلی کو خرید کر بی جے پی کو بلیک میل کرتے تھے تو کبھی خود ان کی بدعنوانی بی جے پی کیلئے عذابِ جان بن جاتی تھی ۔ کبھی حملہ سابق.براہمن مرکزی وزیر شانتا کمار کی جانب سے ہوتا تھا تو کبھی خود ان کی ذات لنگ آیت کے جگدیش شیطار جان کے دشمن بن جاتے ۔ یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ گزشتہ سال خود یدورپا کے خلاف لوک آیوکت نے بدعنوانی کے الزامات میں گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا جس کے نتیجے میں بی

جے پی کو انہیں ہٹانے پر مجبور ہونا پڑا لیکن بی جے پی نے ان الزامات کی تردید کی اور اعلان کیا کہ یدورپا عدالت سے رہا ہو جائیں گے اور اس وقت انہیں دوبارہ وزیر اعلیٰ کی کرسی سے نوازہ جائیگا۔

بی ایس یدورپا نے گرفتاری سے قبل تماشہ یہ کیا کہ روپوش ہو گئے جس سے ٹی وی والوں کو نت نئی کہانیاں بنانے کا موقع مل گیا اس کے بعد گرفتار ہو کر ایک رات جیل میں گزاری اور دوسری صبح دل کے عارضہ کا بہانہ بنا کر ہسپتال پہنچ گئے۔ تین ہفتوں کے بعد ضمانت پر رہائی کے ساتھ دل بہل گیا اور پھر وہ دورہ لوٹ کر نہیں آیا۔ یدورپا پر دو طرح کے الزامات ہیں ایک تو اپنے فائدے کی خاطر سرکاری زمینوں پر لگی پابندیوں کو اٹھا کر اسے اونے پونے دام اپنے رشتے داروں کو فروخت کروانا اور دوسرے غیر قانونی کان کنی میں ملوث ہونا۔ کرناٹک کی عدالت عالیہ نے انہیں کان کنی کے الزامات سے تکنیکی بنیادوں پر یہ کہہ کر راحت دی کہ لوک آیوکت نے ان کو اپنی صفائی کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس لئے گرفتاری کا عمل خلافِ قانون تھا لیکن کسی گرفتاری کا غلط ثابت ہو جانا بدعنوانی کے الزامات سے بری ہونے کے ہم معنی نہیں ہو سکتا۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ مرکزی حکومت کی کان کنی سے متعلق مجلِ اعلیٰ جلد ہی یدورپا کے خلاف سی بی آئی کے ذریعہ بدعنوانی کے الزامات کی تحقیق کروانے کی سفارش کر دے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے اور سی بی آئی ان کے خلاف چارج شیٹ

داخل کر دیتی ہے تو پھر ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جائیگا اس لئے بی جے پی ہائی کمانڈ انہیں دوبارہ وزیر اعلیٰ بنانے سے کترا رہا ہے لیکن یدورپا جلد از جلد وزیر اعلیٰ بن جانا چاہتے ہیں۔

یدورپا نہ صرف وزیر اعلیٰ بننا چاہتے ہیں بلکہ اس سال کا بجٹ بھی بذاتِ خود پیش کرنا چاہتے ہیں۔انہیں سابق وزیر خزانہ سدھا رمیہ کے پانچ بار بجٹ پیش کرنے کے ریکارڈ کو توڑنا ہے اور اپنے اس وعدے کو پورا کرنا ہے جو انہوں نے گزشتہ سال ۸۵ لاکھ کروڈ کا بجٹ پیش کرتے ہوئے کیا تھا۔اس بار انہیں ایک لاکھ کروڈ کا مہا بجٹ پیش کرنا ہے لیکن ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ وہ وزیر اعلیٰ ہے جسے انہوں نے اپنا سب سے وفادار سمجھ کر اقتدار کی کرسی پر اس امید میں بٹھایا تھا کہ جب وہ کہیں گے بلا چوں چرا اقتدار کی کرسی انہیں سونپ دی جائیگی۔یدورپا شاید بھول گئے کہ سیاست کے گندے تالاب میں کمل کا پھول تو کھل سکتا ہے لیکن اس میں وفاداری کی خوشبو نہیں سکتی ۔جب وہ خود اپنی پارٹی کے وفادار نہیں ہیں تو کوئی اور ان کا وفادار کیسے ہو سکتا ہے اس پر طرہ یہ کہ سدا ہنستے مسکراتے نظر آنے والے سدا آنند گوڑہ نے وزارت خزانہ کا قلمدان اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور وہ خود اس بار بجٹ پیش کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔گویا دہلی کی مانند بنگلورو میں بھی بجٹ ہی گلے کی ہڈی بنا ہوا ہے۔

سدانند نے جب اپنے سابق گرو یدورپا کی بات ماننے سے انکار کردیا تو یدورپا نے بھی وہی حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا جو ان کے خلاف استعمال ہوتا رہا تھا اور اپنے ۷۰ حامیوں کے ساتھ شہر سے باہر نکل گئے۔ کل ۱۲۰ میں ۷۰ لوگوں کا ساتھ چھوڑ دینا بھی سداآنند کے چہرے کی مسکراہٹ چھین نہ سکا۔ اسمبلی کے اجلاس میں پہلے دن زیادہ حزب اقتدار کی کرسیاں بی جے پی کی حالت زار پر ماتم زدہ تھیں لیکن سداآنند کا دعویٰ تھا کہ بجٹ وہی پیش کریں گے۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن کیا وہ بجٹ پاس بھی ہوگا یا اس کا بھی وہی حشر مرکزی ریلوے بجٹ کا سا ہوگا بقول شاعر :

ہورے، کنھیا کس کو کہے گا تو میّا

ایک نے تجھ کو جنم دیا اور ایک نے تجھ کو پالا

ایک نے تجھ کو دی ہیں یہ آنکھیں ایک نے دیا اجالا

بی جے پی ہائی کمانڈ کی ہر بات کو یدورپا جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ پارٹی کے صدر کی ناگپور میں آکر ملاقات کی پیش کش کو وہ ٹھکرا چکے ہیں۔ ان کے مطابق ۱۰ حامی ممبران پارلیمان مرکزی رہنماوں کے ساتھ گفت و شنید کیلئے کافی ہیں اور بوقتِ ضرورت وہ استعفیٰ بھی دے سکتے ہیں۔ یہ بی جے پی کیلئے بہت بڑی خطرے کی گھنٹی ہے اور اس صورتحال سے نبٹنے کیلئے بی جے پی کے پاس

اسمبلی کو برخواست کرواکر دوبارہ انتخاب کروانے کے علاوہ کوئی اور باوقار طریقہ کار نہیں ہے لیکن اس متبادل میں بھی گوں ناگوں مشکلات ہیں۔ کرناٹک کی سیاست پر دو ذاتوں کا قبضہ رہا ہے۔ایک ووکالیگا اور دوسرے لنگ آیت۔ یدورپا کی غیر موجودگی میں لنگ آیت برادری کسی صورت بی جے پی کو اقتدار میں آنے نہیں دے گی نیز اگر بی جے پی یدورپا کی بات مان لیتی ہے کہ اگرانہیں نہیں تو کم از کم ان کی برادری کے جگدیش شطار کو وزیر اعلیٰ یا کم از کم وزیر خزانہ بنایا جاتا ہے تاکہ وہ بجٹ پیش کرسکیں تو ووکالیگا برادری اسے اپنی توہین سمجھے گی اور بی جے کی حمایت سے انکار کردے گی اس لئے کہ سدانند کا تعلق ووکالیگا برادری سے ہے۔ ایسے میں بی جے پی کے دوبارہ انتخاب میں کامیاب ہونے کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں۔ خود لنگ آیت ہونے کے باوجود یدورپا نے نہ جانے کیا سوچ کر ووکالیگا سدآنند کو وزیر اعلیٰ بنایا تھا لیکن آج ان کا یہ اقدام بی جے پی کے گلے کی پھانس بن گیا ہے۔

بیچاری بی جے پی اور اس کے صدر نتن گڈکری کے ستارے آج کل کچھ زیادہ ہی گردش میں ہیں۔ ایسے میں جبکہ گڈکری آرایس ایس کا آشیر واد لے کر دوبارہ صدر بننے کی خاطر ناگپور پہنچے تو کرناٹک میں آتش فشاں پھٹ پڑا اور ابھی اس کا لاوہ اگلنا بند بھی نہیں ہوا تھا کہ راجیہ سبھا کی سیٹوں کو لے دہلی میں سارے بڑے رہنماؤں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ان ہنگامہ کرنے والوں

میں سابق صدور ایل کے اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی شامل ہیں اسی کے ساتھ لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں بی جے پی رہنما سشما سوراج اور یشونت سنہا بھی ہیں ان سب کا کہنا ہے کہ اگر راجیہ سبھا کی سیٹوں کا نیلام جاری رہا اور بدعنوان لوگوں کو منتخب کرکے ایوانِ بالا میں بھیجا گیا تو وہ اپنی ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر ہوں گے۔ جھارکھنڈ کے ۶ ممبرانِ اسمبلی نے پارٹی سے باہر کے ایک ہندی نژاد برطانوی سرمایہ دار انشومن مشرا کے کاغذاتِ نامزدگی پر دستخط کر دیئے ہیں۔ انشومن کا دعویٰ ہے کہ اس کے کئی بی جے پی رہنماوں سے قریبی تعلقات ہیں اور مہاراشٹر سے آدرش گھپلے میں ملوث بی جے پی مرکزی کمیٹی کے رکن اجئے سنشیطی کو نامزد کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اجئے بدعنوان ہے تو اسے پارٹی نے اپنی مرکزی کمیٹی سے کیوں نہیں نکالا۔ اسی کے ساتھ اس بار بی جے پی نے کانگریس کی پشت میں چھرا گھونپ کر بی جے پی میں آنے والے ایس ایس اہلووالیہ کی پیٹھ پر وار کرکے شتر بے مہار سمجھے جانے والے سردار کو ٹکٹ سے محروم کرکے نکیل لگا دی ہے۔ بی جے پی کی حالتِ زار کو دیکھ کر آر ایس ایس کے ہفت روزہ آرگنائزر کا اداریہ یاد آتا ہے جو اس نے اترپردیش انتخاب کے بعد لکھا تھا۔ اس کے مطابق 'بی جے پی میں کارکنان کم اور رہنما زیادہ ہوگئے ہیں' لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رہنماوں کی اس بے ہنگم بھیڑ میں ایک بھی ڈھنگ کا لیڈر دکھلائی نہیں دیتا۔ اس موقع پر سنگھ پریوار کو اپنے تربیتی نظام کا جائزہ لینا چاہئے کہ

اس طویل جدو جہد کے بعد آخر یہ قحط الرجال کس امر کی نشاندہی کرتا ہے۔
ان حقائق سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ سر پھٹول کا سبب فسطائیت ہے اور سیکولر کانگریس اس بیماری سے محفوظ ہے لیکن اگر اتراکھنڈ میں کانگریس کی حالتِ زار پر غور کیا جائے تو ایسا ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ اس بار انتخاب سے قبل بی جے پی کی حالت اس قدر خراب تھی کہ اسے آخری وقت میں وزیر اعلیٰ بدلنے پر مجبور ہونا پڑا اور نیا وزیر اعلیٰ بی جے پی کو تو درکنار خود اپنے آپ کو بھی شکستِ فاش سے نہیں بچا سکا۔ اس کے باوجود کانگریس معمولی اکثریت تک سے محروم رہی اور اسے بی جے پی سے صرف ایک نشست کی برتری حاصل ہوئی۔ اپنی اکثریت بنانے کی خاطر اسے نہ صرف بی ایس پی بلکہ خود اپنے باغیوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ تین تو ایسے باغی ہیں جو پارٹی کے خلاف انتخاب لڑ کر کامیاب ہو گئے لیکن ان کے علاوہ دس ایسے ہیں جو خود تو کامیاب نہ ہو سکے لیکن انہوں نے کانگریس کے امیدوار کو بلاواسطہ ہرا دیا۔ کئی باغیوں نے کانگریس کے نامزد کردہ امیدوار سے زیادہ ووٹ حاصل کئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ٹکٹوں کی تقسیم میں آپسی رنجش نے پارٹی کا بیڑہ غرق کیا۔ گڑھوال میں کانگریس کا امیدوار ۱۰۰۰ ووٹ سے ہارا جبکہ باغی امیدوار نے ۱۰۰۰۰ ہزار ووٹ حاصل کئے ۔سابق وزیر اعلیٰ پوکھریال کو ایک ہزار ووٹ سے کامیابی ملی جبکہ کانگریس کے باغی ایس پی سنگھ کو ۱۱۰۰۰ ووٹ ملے۔

سابق کانگریسی وزیر اعلیٰ کے بھتیجے منیش تیواری کو غدر پور میں صرف ۱۴۰۰۰ ہزار ووٹ ملے جبکہ باغی جرنیل سنگھ ۲۳۰۰۰ ہزار ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پرولا میں بھی باغی نے پارٹی امیدوار سے ۴۰۰۰ ووٹ زیادہ حاصل کئے۔ سماجوادی پارٹی کے سابق صدر امبریش کمار کو کانگریس نے پارٹی میں شامل تو کیا گیا لیکن ٹکٹ نہیں دیا گیا انہوں نے آزاد میدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور دوسرے نمبر پر آئے جبکہ کانگریسی امیدوار چوتھے نمبر پر رہا۔ اس خستہ حالی کے باوجود وزیر اعلیٰ کی کرسی کیلئے آپسی مہا بھارت چھڑ گئی۔ وجئے بہوگنا اور ہریش راوت نے ایک دوسرے خلاف تلواریں سونت لیں نتیجہ یہ ہوا کہ راوت کے ۱۴ حامیوں نے احتجاجاً رکن اسمبلی کی حیثیت سے حلف تک لینے سے احتراز کیا۔ دو متضاد نظریات کی حامل قومی جماعتوں اوران دونوں کے ساتھ اشتراک کرنے والی ایک علاقائی جماعت کا یکساں سیاسی رویہ اس بات کا غماز ہے کہ مسئلہ افراد یا جماعتوں کا نہیں بلکہ سیکولر جمہوری نظام کا ہے جو اس سے وابستہ سارے لوگوں کو بلا تفریق اپنے بسنتی رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کھلی نشانیوں کے باوجود لوگ اس فرسودہ نظامِ سیاست کو زحمت کے بجائے رحمت سمجھتے ہیں یا اگر نہیں بھی سمجھتے تو اس کے اظہار کی جرات اپنے اندر نہیں پاتے۔ ایسے لوگوں کیلئے حکیم الامت علامہ اقبال کی نصیحت درج ذیل ہے :

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا

ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندہ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہم نے خود جب گھر کو جلایا ساری کہانی ختم ہوئی

وطنِ عزیز ہندوستان میں جب بھی کوئی مجلس وزارت تشکیل دی جاتی ہے تو کسی نہ کسی مسلمان رہنما کو وزیرِ اوقاف بنا دیا جاتا ہے اور وہ بصد شوق اسے قبول کرلیتا ہے۔ یہ بات کچھ حیرت انگیز لگتی ہے کہ ان حریص سیاستدانوں کو بھلا وقف میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن کرناٹک میں اوقاف سے متعلق اقلیتی کمیشن کی حالیہ تفتیشی رپورٹ نے ساری غلط فہمی دور کردی اور ثابت کردیا یہ نہ صرف سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے بلکہ اس کا انڈا سب سے بڑا ہے۔ ہندوستان میں قومی سطح پر ہونے والے سب سے بڑے گھپلے ٹوجی کی لاگت ایک لاکھ ۷۶ ہزار کروڑ ہے جبکہ صرف ایک ریاست کرناٹک میں ہونے والی اوقاف کی بدعنوانی ۲ لاکھ ۳۵ ہزار کروڑ ہے۔ کیوں نہ ہو جب بنگلورو کے لال باغ علاقے میں ۹۰ ہزار مربع فٹ زمین جس کی قیمت ۹۰ کروڑ روپے بنتی ہے صرف ایک کروڑ میں فروخت ہو جائے۔ اسی شہر کی ایک پانچ ستارہ ہوٹل ونڈسر منور اپنے ۵۰۰ کروڑ کی لاگت کے ہوٹل کا کرایہ صرف ۱۲ ہزار روپے ماہوار ادا کرے جبکہ عدالت سے رجوع کرنے پر کرایہ ۶ لاکھ طے کیا جائے۔ ایک کروڑ اور ۹۰ کروڑ میں ۹۰ گنا کا فرق ہے نیز ۶ لاکھ اور ۱۲ ہزار میں ۵۰ گنا کا فرق۔ سوچنے والی بات ہے کہ آخر یہ فرق کس کی تجوری کا سانپ بنتا ہے؟ اور جہنم کے اندر جب وہ نمودار ہوگا تو اس کا زہر کس قدر

خطرناک ہوگا۔

مشہورِزمانہ سچر کمیٹی کی رپورٹ شاہد ہے کہ ہندی مسلمان بڑے پیانے پر غربت و افلاس کا شکار ہیں اور ان کی حالت صرف دلتوں سے کسی قدر بہتر ہے ۔اگر تقابل کیا جائے تو شہری آبادی میں جہاں نام نہاد اعلیٰ ذات کے لوگوں کا خرچ ۱۴۲۹ روپئے فی فرد ہے وہاں مسلمان صرف ۸۰۴ روپئے خرچ کرپاتا ہے لیکن یہ تو اوسط ہے حقیقت تو یہ ہے مسلمانوں کی کثیر آبادی ۲۰۰۸ء کے اعدادوشمار کے مطابق ۵۰۰ روپئے سے کم پر گذارہ کرنے کیلئے مجبور ہے ۔اس کے باوجود نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کا امیر ترین آدمی مکیش امبانی جب اپنا محل تعمیر کرنے کا خواب دیکھتا ہے اس کی نظر اس غریب ملت کی اوقاف پر جاکر ٹھہر جاتی ہے اور وہ الٹا ماؤنٹ روڈ پر ۲۷ منزلہ ذاتی گھر تعمیر کرنے کیلئے ۴۵ ہزار مربع فٹ کی زمین مہاراشٹر وقف بورڈ سے ۲۱ لاکھ روپئے میں خرید لیتا ہے جبکہ بازار بھاؤ کے مطابق اس کی قیمت ۵۰۰ کروڑ بنتی تھی ۔اس زمین پر جو شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے اس کی قیمت کا اندازہ بین الاقوامی تنظیم فوربس نے ۹۰۰۰ کروڑ روپیہ لگایا ہے ۔اس عمارت کی ٹھاٹ باٹ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۷ میں سے ۶ منزلیں صرف گاڑیوں کے وقوف کی خاطر مختص کی گئی ہیں ۔اگر کوئی مسلمان اس علاقے میں صرف ۴۵۰ مربع فٹ کا کمرہ بھی خریدنا چاہے تو اسے ۲۱۰ لاکھ سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑیگی۔

اس خطۂ اراضی کی تاریخ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ہندوستانی عوام جمہوریت کی نیلم پری سے نابلد تھے۔ ہر طرف نواب اور راجہ مہاراجہ حکومت کیا کرتے تھے۔ ان کے درمیان اقتدار کی خاطر جنگ و جدال بھی برپا رہتا تھا۔ اس باوجود گوالیار کے مہاراجہ مادھو راؤ شندے کو مسلم یتیم بچوں کا خیال آیا اور انہوں یہ زمین کریم بھائی یتیم خانہ تعمیر کرنے کی غرض سے خیرات کی۔ آگے چل کر ہندوستان میں سیکولر جمہوریت کا بول بالا ہو گیا۔ آئین سازی ہوئی جس کے ذریعہ اس مسلم مذہبی ٹرسٹ کو وقف بورڈ کے تحت کر دیا گیا اور یہ زمین ہمارے نام نہاد نمائندوں کے قبضہ قدرت میں آگئی۔ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے یہاں کانگریس پر بھرپور اعتماد کیا اور اسے اپنے لئے باعثِ رحمت سمجھا لیکن ان جمہوری حکمرانوں نے یتیموں کی زمین کو بھی ایک سرمایہ دار کا محل کی تعمیر کیلئے فروخت کر دیا اور اس کی قیمت ڈکار گئے۔ اس موقع پر امت کے ان دانشوروں اور اور مفکرین کو جو دن رات جمہوریت کی تسبیح و تحلیل میں غرق رہتے ہیں ایک لمحہ کیلئے ٹھہر کر ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا چاہئے کہ اس سیکولر جمہوری نظام نے گزشتہ ۶۵ سالوں میں مسلمانوں کو دیا کیا ہے اور ان سے چھینا کیا ہے؟

اس بارے میں دو وکلاء آشیش جوشی جو وزارتِ اقلیت میں منصوبہ بندی کے

ڈائرکٹر ہیں اور احمد خان پٹھان جو وقف بورڈ کے رکن ہیں نے عدالت سے رجوع کیا ہے۔اتفاق سے جس وقت یہ معاملہ اٹھا مہاراشٹر ہی کے عبدالرحمٰن انتولے وزیر برائے اقلیتی فلاح و بہبود ہوا کرتے تھے اس کے باوجود معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا۔اس بارے میں سید شہاب الدین جیسے جہاندیدہ سابق سرکاری افسر اور سیاستداں بھی بہت زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ان کہنا ہے کہ مسلمانوں کو امبانی اس کی صحیح قیمت ۳۰۰۰ کروڑ کا مطالبہ کرنے پر اکتفا کرلینا چاہئے لیکن ۳۰۰۰ کروڑ تو دور کی بات ہے، کیا وقف بورڈ امبانی سے ۳ کروڈ بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا؟ اور اگر ہو بھی گیا تو وہ سرمایہ عام مسلمان کے فلاح و بہبود کے کام آئیگا؟ اس بارے میں کسی کو خوش فہمی کا شکار مایوسی کا سبب بن سکتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مکیش امبانی کی اس بدعنوانی پر حکومتِ مہاراشٹر لگام لگاتی لیکن اتفاق سے اس وقت مہاراشٹر میں مسلمانوں کی نام نہاد ہمدرد کانگریس پارٹی کی حکومت تھی اور اس کے آدرش وزیر اعلیٰ ولاس راؤ دیشمکھ نے اورنگ آباد میں اوقاف کی ۱۴ ایکڑ زمین جس کی قیمت بازار میں ۶۰ کروڑ بنتی تھی اپنے بھائی دلیپ راؤ دیشمکھ کی نرمان بھارتی کو ۱۴ کروڑ میں بیچ دی۔اب بھلا وہ کس منہ سے مکیش کو منع کرتے بلکہ یقیناً مکیش امبانی ان کی زبان پر بھی ایک آدرش طلائی تالہ لگا دیا ہوگا۔جن رہنماؤں کے ضمیر کی کنجی سرمایہ داروں کی تجوری میں بند رہتی ہے ان سے کسی خیر کی توقع کرنا خود فریبی کے علاوہ اور کیا ہے؟

اوقاف کا مصرف کیا ہے ؟ اور اس سے امت کیلئے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے ؟ اس سے کانگریس پارٹی کے فاضل رہنما اچھی طرح واقف ہیں ۔ راجیہ سبھا نائب صدر رحمٰن خان فرماتے ہیں کہ اوقاف کے حوالے سے ایک مشترکہ پارلیمانی کمیٹی اپنی رپورٹ کافی گہرائی کے ساتھ تحقیق و تفتیش کے بعد مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر چکی ہے ۔ان کے مطابق اگر اوقاف کا صحیح استعمال ہوا ہوتا تو مسلمانوں کی تعلیم اور بیروزگاری کے مسائل حل ہوجاتے اور اس کے باعث پیدا ہونے والی غربت ییے اپنی موت آپ مر جاتی ۔ ان کے مطابق اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ۷۰ فیصد اوقاف ناجائز قبضے میں جاچکی ہیں تب بھی باقی ماندہ ۳۰ فی صد ایک خطیر سرمایہ ہے ۔انہوں نے وزیر اعظم منموہن سنگھ کو سفارش کی ہے قومی وقف بورڈ قائم کرکے اسے پیشہ ور افراد کے حوالے کیا جائے لیکن کیا پیشہ ور سرکاری افسران بدعنوان نہیں ہیں ۔اس اقدام سے بدعنوانی کیسے ختم ہو گی ؟ کرناٹک اقلیتی کمیشن کے چیرٗ من انور منیپاڈی کی رپورٹ کے مطابق اس لوٹ کھسوٹ میں جس قدر حصہ سیاستدانوں کا ہے اسی قدر آئی ای ایس، آئی پی ایس اور کے اے ایس کے اعلیٰ افسران بھی ملوث ہیں۔ ویسے جس فراخدلی کے ساتھ رحمٰن صاحب نے ۷۰ فی صد اوقاف کی زمین پر فاتحہ پڑھی ہے یہ شانِ قلندرانہ امت کیلئے سمِ قاتل ہے ۔اتفاق سے حالیہ بدعنوانی کی رپورٹ میں رحمٰن صاحب کا نامِ نامی بھی پایا جاتا ہے ۔

اوقاف میں بدعنوانی کا بیج بورڈ کی تشکیل کے وقت بویا جاتا ہے۔اول تو بورڈ بنایا ہی نہیں جاتا،اگر بنایا بھی جائے تو نااہل اور چاپلوس لوگوں کو اس میں بھرتی کر لیا جاتا ہے جو سیاسی سفارش نامہ اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اکثریت بدعنوان اور بدمعاش افراد کی ہوتی ہے۔آزادی کے بعد سرکاری مسلمانوں کی ایک ایسی فوج تیار ہو گئی ہے جو اقتدار وقت کا تعاون کرتی ہے اور بدلے میں مراعات حاصل کرتی ہے۔ وقف بورڈ اس عمل کا ایک ذریعہ ہے۔یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے وقف املاک کو لوٹتے ہیں اس لئے کہ انہیں سرکاری تحفظ حاصل ہوتا ہے۔کرناٹک میں ہونے والے حیرت انگیز انکشافات پر کانگریسی رہنماؤں کے بیانات اس امر کی چغلی کھاتے ہیں ۔قمرالاسلام صاحب کا کہنا ہے کہ سی بی آئی تحقیقات ہوں۔ وہ جانتے ہیں مرکز میں چونکہ کانگریس.بر سر اقتدار ہے سی بی آئی کی تفتیش میں وہ بچ نکلیں گے یا اسے اس قدر طول دیا جائیگا کہ اس پر اقدام ہونے تک سارے مجرم مر کھپ جائیں گے۔سید حارث صاحب کا دعویٰ ہے کہ انور منیپڈی کا ملت میں کوئی مقام نہیں ہے اور بی جے پی مسلمانوں کو بدنام کرنے کیلئے یہ سب کر رہی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن کا مقام ہے ان لوگوں نے ملت کی پشت زنی کیوں کی ؟اور اوقاف کی املاک کا بکنا بدنامی ہے یا اس کا منکشف ہونا؟انور منیپڈی کے مطابق انہیں پہلے تو ۲ کروڑ رشوت کا لالچ دیا گیا اور پھر جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی۔ایسا

کرنے والا وقف بورڈ کا سربراہ سید ریاض احمد فی الحال فرار ہے۔ ان مسلم سیاستدانوں پر جو حکومت سے ساز باز کرکے مسلم اوقاف کو نیلام کررہے ہیں احمد فراز کا شعر معمولی سی ترمیم کے ساتھ صادق آتا ہے :

کہ اقتدار ہے اوزار اس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے

اسلامی شریعت میں اوقاف کی حیثیت و اہمیت کا اندازہ کرنے کیلئے دور نبویؐ کا ایک واقعہ قابلِ توجہ ہے۔ مدینہ منورہ سے تقریبا ۶۰ میل شمال میں ایک درے کے درمیان خیبر نام کی ایک بستی آباد تھی۔ اس علاقے میں کھجور وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ خیبر کی فتح کے بعد مال غنیمت کے طور پر ان باغات کا ایک حصہ حضرت عمر فاروقؓ کو ملا تو وہ نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہؐ میں چاہتا ہوں کہ اس زمین کو اللہ تعالٰی کی رضا میں دیدوں اس لئے آپؐ مجھے حکم فرمایئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم یہی چاہتے ہو تو اصل زمین کو وقف کردو اور اس سے جو کچھ پیدا ہوا سے بطور صدقہ تقسیم کردو چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس زمین کو اس شرط کے ساتھ خدا کی راہ میں دیدیا یعنی وقف کردیا کہ اصل زمین کو نہ تو فروخت کیا جائے، نہ ہبہ کیا جائے اور نہ اسے کسی کی میراث قراردی جائے اور اس کی پیداوار سے بطور صدقہ فقیروں، قرابتداروں کو نفع پہنچایا جائے، غلاموں کی مدد کی جائے تاکہ وہ آزاد ہوجائے، اس زمین

کی پیداوار سے مکاتب کی اعانت کی جائے ،جہادِ فی سبیل اللہ اور حاجیوں پر خرچ کیا جائے، مسافروں کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور مہمانوں کی مہمان داری کی جائے۔ اس زمین کا متولی بقدر حاجت اس میں سے کھائے یا اپنے زیرِ کفالت اہل وعیال کو کھلائے تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے لیکن اس آمدنی سے مالدار نہ بنے بخاری ومسلم)۔)

یہ حدیث وقف کا مصرف بتلاتی ہے چنانچہ تمام مسلمانوں کا بالاتفاق یہ مسلک ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی جائیداد مثلاً زمین ومکان وغیرہ کسی نیک مقصد اور اچھے کام کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کی خاطر وقف کر دیتا ہے تو یہ جائز ہے اور وہ وقف کرنیوالا بیشماراجروثواب سے نوازا جاتا ہے نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وقف جائیداد نہ فروخت کی جاسکتی ہے اور نہ ہبہ ہوسکتی ہے اور نہ کسی کی میراث بن سکتی ہے۔ یہ حدیث وقف کی اہمیت بھی ظاہر کرتی ہے چونکہ وقف ایک صدقہ جاریہ ہے اس لئے اس کا ثواب وقف کرنیوالے کو برابر ملتا رہتا۔ لیکن اس بابت واضح تنبیہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ارشادِ ربانی ہے :اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقہ سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداًظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے (سورہ بقرہ ۱۸۸)۔

آشیش جوشی نے مکیش امبانی کے خلاف اپنی شکایت میں لکھا ہے کہ ''وقف جائیداد اللہ کے نام پر وقف ہوتی ہیں اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد کو مسلم سماج کے ضرورتمند اور مستحق افراد کے خیر و فلاح پر صرف ہونا چاہیئے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ اوقاف کے جس مصرف کو ہمارے سیاسی رہنماؤں نے اپنے گوں ناگوں مفادات کے پیشِ نظر بھلا دیا اسے ایک غیر مسلم ہمیں یاد دلا رہا ہے۔ یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ اوقاف کی املاک کو جو امت کے غریبوں کی امانت ہے ہمارے نام نہاد ہمدرد و بہی خواہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور ہماری دشمن سیاسی جماعت اپنے گوں ناگوں سیاسی مفاد کے پیش نظر انہیں بے نقاب کر رہی ہے۔ کرناٹک کی بی جے پی حکومت سے مشیت یہی کام لے رہی ہے۔ کرناٹک اقلیتی کمیشن کی جانب سے تیار کردہ اس ۷۰۰۰ صفحات پر مشتمل رپورٹ میں جو ٹھوس تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ رحمٰن خان کے بے جان مشوروں سے یکسر مختلف اور قابل توجہ ہیں:

○وقف بورڈ کو ایک سال کیلئے معطل کر کے لوک آیوکت کے ذریعہ بدعنوانی کی مکمل تحقیقات کروائی جائیں

○وقف املاک کو واپس لینے کیلئے ایک خصوصی ٹاسک فورس تشکیل دیا جائے۔آئی اے ایس افسر رجنیش گوئل کو ٹاسک فورس کا سربراہ مقرر کیا جائے۔

○بورڈ کی صاف و شفاف کارگذاری کی خاطر ضابطہ سازی کی غرض سے ایک اعلیٰ سطحی

کمیٹی قائم کی جائے

کمیٹی میں دو آئی ایس افسران، ایک وظیفہ یافتہ جج، دو غیر سرکاری تنظیموں کے افراد○ اور اقلیتی کمیشن کے تین ارکان شامل ہوں

دوسرے مرحلے کا سروے شروع کیا جائے۔ اراضی کا تازہ آڈٹ کیا جائے۔○

غصب شدہ زمینوں پر ناجائز قبضہ ختم کیا جائے ○

غاصبوں کو ۵ ۔ ۱۰ سال تک کی قید اور ان پر مقبوضہ زمین کی قیمت سے دوگنا جرمانہ○ لگایا جائے۔ وغیرہ۔۔

یہ تو کہنا مشکل ہے کہ ان سفارشات پر کس حد تک عمل ہوگا یا بلکہ سرے سے کچھ ہوگا بھی کہ نہیں؟ سدانند گوڑا یہ سب کرنے تک اقتدار میں بھی رہیں گے یا نہیں؟انہیں یدورپا اقتدار سے بے دخل کر دیں گے یا وسط مدتی انتخاب میں کانگریس اقتدار میں آ جائیگی؟اس لئے کہ کرناٹک کی غیر مستحکم سیاسی صورتحال میں کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن کسی سیاسی چمتکار کے چلتے اگر چند بڑی مچھلیوں کی جیب سے جرمانہ وصول ہو جائے نیز انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے روانہ کر دیا جائے تو اس لوٹ مار پر کسی نہ کسی حد تک لگام ضرور لگے گی اور اس کیلئے مسلمانانِ ہند اپنے ازلی دشمن بی جے پی کے ممنون و مشکور رہوں گے۔بقول شاعر :

تم ہی نہیں ہو دشمن اپنے ہم بھی ہیں کچھ ایسے ہی

ہم نے خود جب گھر کو جلایا ساری کہانی ختم ہوئی

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے - قسط اول

پاکستان کے صدر آصف علی زرداری نے جب اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر حاضری دینے کا اعلان کیا تو ہندوستان کے وزیر اعظم منموہن سنگھ نے نئی دہلی میں ان کے اعزاز میں ظہرانہ کا اہتمام کرڈالا۔ ایسے میں ان دونوں کا مشترک دوست نما دشمن امریکہ کیونکر خاموش رہ سکتا تھا سو اس نے کباب میں حافظ سعید کے نام پر ۱۰ ملین ڈالر کے انعام کا اعلان کرکے کباب میں ہڈی ڈال دی۔ امریکی انتظامیہ کو توقع تو یہ تھی دونوں ہم سایہ ممالک کباب کو بھول کر ہڈی کیلئے آپس میں لڑپڑیں گے لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس دونوں رہنماؤں نے ہڈی کو ایک طرف کیا اور کباب چٹ کر گئے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ حافظ سعید امریکا کے گلے کی ہڈی بن گئے ہیں۔ امریکہ کے اس اعلان کو پاکستانی سفیر کرامت اللہ غوری نے بے مقصد اور بے موقع قرار دیا جبکہ حافظ سعید نے الجزیرہ کے نمائندے سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہم غاروں میں چھپے ہوئے نہیں ہیں جو ہماری تلاش کیلئے انعام کا اعلان کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے خیال میں امریکہ ان کے ذریعہ سے ناٹو کی سپلائی لائن کو دوبارہ بحال کرنے خلاف اور ڈرون حملوں کی مذمت میں چلائے جانے والے ملک گیر احتجاج سے حواس باختہ ہو چکا ہے۔ حافظ سعید کے مطابق امریکہ کی معلومات بہت کم ہے اور اس نے ہندوستان کی جانب سے

فراہم کردہ اطلاعات کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہے۔اس اعلان کے بعد حافظ سعید نے روپوش ہونے کے بجائے جلوس نکالنے کا اعلان کر دیا اور آصف علی زرداری سے اپنا مجوزہ دورہ ہند منسوخ کرنے کا مطالبہ کر ڈالا۔سچ تو یہ ہے امریکہ کی اس حماقت نے حافظ سعید کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔

چائے سے گرم کیتلی امریکہ نے جب یہ دیکھا کہ ان کے اس داؤں کا کوئی اثر نہ حافظ سعید پر پڑا اور نہ ہی زرداری یا منموہن پر تو کھسیانی بلی کی مانند اپنے زخمی پنجوں سے نیا راگ الاپنے میں لگ گیا۔امریکی وزارتِ داخلہ کے ترجمان مارک ٹونر نے اعلان کیا کہ یہ انعام حافظ سعید کا محل و وقوع معلوم کرنے کیلئے نہیں ہے بلکہ ایسی معلومات کی فراہمی کیلئے ہے جن کی بنیاد پر ۲۰۰۸ء میں ہونے والے ممبئی حملوں کے سرغنہ کو عدالت کے ذریعہ سزا سنوائی جاسکے۔اس کے ذریعہ نہ تو امریکی فوجیوں کو انہیں نشانہ بنانے کا یاان پر ڈرون حملہ کرنے کا لائسنس ملتا ہے اور نہ امریکی غارتگروں کو انہیں گرفتار کرکے سیاہ ہیلی کاپٹر میں لے اڑنے کا پروانہ بلکہ اس کے مقصد پاکستانی حکمرانوں کو انہیں گرفتار کرنے کی ترغیب دینا ہے۔امریکی انتظامیہ کے اس بیان نے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔پہلی حماقت نے پاکستان کے اندر غم وغصے کی لہر دوڑا دی تھی دوسری نے ہندوستانی میڈیا کی خوشیوں پر اوس ڈال دیا۔ویسے ہندی ذرائع ابلاغ پر توفی الحال شوکت واسطی کا یہ شعر صادق

ے آتا ہے کہ

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے

بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے ہیں

میڈیا میں اس بات کے چرچے زوروں پر تھے کہ اس سے پاکستان پر زبردست دباؤ پڑے گا اور منموہن سنگھ خوب ڈٹ کر حافظ سعید کی گرفتاری بلکہ حوالگی کا مدعا اٹھائیں گے کہ یہ بیان آگیا جس نے پاکستانی موقف کی تصدیق کر دی۔ اس معاملے میں پاکستانی حکومت کا موقف یہ ہے کہ ان کے پاس حافظ سعید کے خلاف ایسے ثبوت موجود نہیں ہیں جن کی بنیاد پر ان پر کوئی قانونی چارہ جوئی کی جاسکے امریکی انتظامیہ نے بھی بلا واسطہ یہ تسلیم کر لیا کہ شواہد کا فقدان ہے اور ان کی فراہمی کے پیش نظر اس انعام کا اعلان کیا گیا ہے تاکہ مقدمہ میں جان ڈالی جاسکے۔ آگے بڑھنے سے قبل یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ آخر یہ انعام و اکرام کا چکر کیا ہے ؟اس کا نام انعام برائے انصاف ہے اور اسے بین الاقوامی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حکومتِ امریکہ کا ایک نہایت ہی قیمتی اثاثہ سمجھا جاتا ہے ، اس کا قیام ۱۹۸۴ء کے اندر قانون سازی کے ذریعہ عمل میں آیا اس وقت نہ ہی ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر کوئی حملہ ہوا تھا اور نہ ہی القائدہ کا کوئی وجود تھا اس کے باوجود فی الحال تقریباً تمام انعامات مسلمانوں کے سروں پر ہیں۔ تاحال اس کے تحت دس کروڑ ڈالر کے انعامات ۷۰

افراد کے اندر تقسیم ہو چکے ہیں اس کے باوجود کامیابی کے طور پر صرف تین نام گنوائے جاتے ہیں جن میں سے ایک رمزی یوسف ہے اور دو صدام حسین کے بیٹے جنھیں انعام کے اعلان کے محض ۱۸ دنوں کے اندر گرفتار کر لیا گیا تھا اس لئے ممکن ہے ان کی گرفتاری کے بعد اس انعام کا اعلان کرکے امریکیوں نے اپنے ہی خزانے پر ڈاکہ ڈالا ہو۔

اس انعام کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے اس سے ایسے شخص کو نوازہ جائے جو خفیہ معلومات کے ذریعہ کسی دہشت گرد کو گرفتار کروانے یا اس کو سزا دلوانے میں مدد کرے۔اس دہشت گرد بین الاقوامی سطح پر امریکی افراد یا املاک کے خلاف دہشت گردی کی منصوبہ بندی یا اس کے نفاذ میں ملوث ہو۔ حافظ سعید کے خلاف امریکی سرزمین پر کسی حملے کا کوئی الزام نہیں ہے۔ ممبئی حملے میں امریکہ کا صرف یہ نقصان ہوا کہ اس کے ۶ شہری مارے گئے لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ انہیں خاص طور پر نشانہ نہیں بنایا گیا تھا بلکہ وہ تو ہوٹل میں رہنے والے دیگر زائرین کے ساتھ حملے کی زد میں آگئے اس لئے اس کو امریکہ پر براہِ راست حملہ قرار دینے کا کوئی جواز نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ممبئی حملے میں ملوث افراد پر بھی اس کالے قانون کا سرے سے اطلاق ہی نہیں ہوتا کجا کہ محض وہم و گمان کی بناپر انعام کا اعلان کر دیا جائے۔حافظ سعید کے خلاف اس قانون کا استعمال سانپ کے بجائے رسی کو پیٹنے کی مصداق ہے جس سے حاصل تو

کچھ نہیں ہوتا ہاں لاٹھی ضرور ٹوٹ جاتی ہے۔اس معاملے میں امریکہ ہندوپاک دونوں کو ناراض کرکے اپنی ایسی حالت بنالی ہے گویا

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

ہندوپاک تعلقات کے درمیان امریکہ کا کردار بڑا عجیب سا ہے۔اس کی اپنی ایک مجبوری تو یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ خود اپنے دوستانہ تعلق رکھے اسی کے ساتھ اس کی دوسری مجبوری یہ ہے ان دونوں کے درمیان باہم دشمنی پیدا کرے۔جہاں تک پہلی مجبوری کا سوال ہے پاکستان کے ساتھ دوستی ماضی کی غلطیوں کے سبب ضروری ہے اور ہندوستان سے بہتر تعلقات مستقبل کے خطرات کے پیش نظر ضروری ہیں۔ جارج ڈبلیو بش نے ۱۱ ستمبر کے بعد ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہو کر افغانستان پر حملہ کرنے کی جو حماقت کی تھی اس کی قیمت امریکی ابھی تک چکا رہے ہیں۔افغانستان کے اندر اپنے فوجیوں کو اسلحہ اور غذائی رسد پہنچانے کا واحد بری راستہ پاکستان سے ہو کر جاتا ہے۔ اس کے باوجود براک اوبامہ نے افغانستان کے اندر اپنی ناکامیوں کی جانب سے توجہ ہٹانے کی خاطر پاکستان میں ڈرون حملوں کا آغاز کر دیا یہ ایسا ہی احمقانہ اقدام ہے جیسے کوئی لکڑہارا اسی شاخ کو کاٹنے لگ جائے جس پر کہ وہ بیٹھا ہوا ہے۔براک اوبامہ نے یہ اقدام ایک ایسے نازک وقت میں کیا جبکہ افغانستان سے فوجیوں کے انخلا کی

تاریخ قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ایسے وقت میں اپنے نکاسی کے راستوں کو غیر محفوظ کردینا کسی خودکشی سے کم نہیں ہے خیر یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک امریکہ کا ایک فوجی دستہ بھی افغانستان میں موجود ہے وہ پاکستان سے پنگا نہیں لے سکتا ۔اس کے باوجود پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت اس شعر کی مصداق ہے

دوستی دشمنی ایک ہی شخص سے ، وہ ہی دلدار ہے وہ ہی قاتل مرا
چشم بے تاب ہے، جسم بے خواب ہے، دل تو آگے ہی تھا نیم بسمل مرا

ہندوستان سے امریکی دوستی کی بنیادی وجہ چین کی تیزی سے بڑھتی ہوئی اقتصادی و فوجی طاقت ہے ۔آئی ایم ایف کے مطابق چین کے اقتصادی ذخائر امریکہ کے ۸۰ فیصد کے برابر ہیں اور ۲۰۱۶ء میں چین اقتصادی میدان کے اندر امریکہ سے آگے نکل جائیگا۔دیگر ذرائع سے جو اعدادو شمار سامنے آرہے ہیں ان کے مطابق کئی معاملات میں چین امریکہ کو پیچھے چھوڑ چکا ہے مثلاً گاڑیوں کی کھپت میں ۲۰۰۹ء کے اندر وہ دنیا کی سب سے بڑی مارکیٹ بن گیا۔ صنعتی پیداوار اور برآمدات میں وہ امریکہ سے بہت آگے نکل چکا ہے ۔چین میں فون اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد امریکہ سے دوگنا ہے ۔اس کچھ ماہرین کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ چینی معیشت فی الحال امریکہ سے ۲۰ فیصد بڑی ہے اور آئندہ دس سالوں میں امریکہ سے دوگنی ہو جائیگی ۔ایک طرف چین میں خوشحالی آرہی

ہے تو دوسری جانب امریکہ بدحال ہوتا چلا جارہا ہے۔ایک مطالعہ کی روشنی میں ۱۹۷۰ء
کے اندر امریکہ میں فی فرد آمدنی ۲۰ ڈالر فی گھنٹہ تھی جبکہ ۴۰ سال بعد وہ ۸.۵ ڈالر فی
گھنٹہ تک لڑھک گئی ہے گویا ۵۷ فی صد کی کمی واقع ہوئی ہے۔اس کے برعکس ۱۹۹۲ء
سے لے کر ۲۰۰۷ء سالوں کے درمیان ۴۰۰ امریکی خوشحال ترین لوگوں کے اثاثے میں
۷۰۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام منصوبہ بند
طریقے پر امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب ترین بنائے جارہا ہے۔ایسے میں امریکہ کے
سورج کا غروب ہونا طے ہو چکا ہے لیکن اسے محسوس نہیں کیا جارہا۔پہلی جنگ عظیم
کے بعد برطانیہ کا یہی حشر ہوا تھا لیکن ساری دنیا کو اس کے کھوکھلے پن کا احساس تقریباً
پچیس سال بعد ہوا۔اس صورتحال میں چین کا مقابلہ کرنے کیلئے ہندوستان کا ساتھ
امریکہ کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ ہندوستان کو بھی چین کے بڑھتے ہوئے فوجی بجٹ
سے تشویش لاحق ہے۔آئندہ سال کیلئے ہندوستان کا دفاعی بجٹ ۴۰ بلین ڈالر ہے جبکہ
چین نے ۱۰۶ بلین ڈالر کے بجٹ کا اعلان کرکے ساری دنیا کو چونکا دیا ہے۔ایسے میں
چین کا مقابلہ کرنے کیلئے امریکہ کو ساتھ لینا خود ہندوستان کی بھی ایک مجبوری ہے۔
امریکہ کیلئے چونکہ ہندوستان اور پاکستان کا ساتھ ناگزیر ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ
امریکہ ان دونوں ہم سایوں کے درمیان دوستی کو فروغ دینے کے

بجائے ان میں دشمنی کیوں لگاتا ہے ؟اس سوال کے جواب حاصل کرنے کیلئے ایران اور امریکہ کے درمیان جاری رسہ کشی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اسرائیل مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کا سب سے بڑا محافظ ہے اور اس کیلئے سب سے بڑا خطرہ ایران ہے اس لئے امریکا کی ایران سے مخاصمت ایک فطری امر ہے۔اسی لئے اسے گھیرنے کی اور الگ تھلگ کرنے کی کوشش میں امریکہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ ایران پر مختلف معاشی پابندیاں آئے دن لگتی رہتی ہیں لیکن اس سے ایران کا نقصان کم اور امریکا و مغرب کا زیادہ نقصان ہو جاتا ہے۔ایک تو خام تیل قیمتوں میں اضافہ سے ایران کے نقصان کی بھرپائی ہو جاتی ہے دوسرے ایران ڈالر کے بجائے مختلف ممالک سے ان کی اپنی کرنسی میں کاروبار کرنے کو ترجیح دیتا ہے جس سے برطانیہ اور امریکا کا کمیشن غرقاب ہو جاتا ہے۔ایران کے دو بڑے گاہک چین اور ہندوستان ہیں چین پر تو امریکا کی ایک نہیں چلتی ہاں ہندوستان پر دباؤ بنانے کی کوشش امریکہ کی جانب سے ہوتی رہتی ہے لیکن اب وہ بھی بارآور ثابت نہیں ہورہی ہیں اس لئے کہ حکومتِ ہند کیلئےاپنی عوام کی فلاح و بہبود بہر حال امریکی مفادات سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہندوستان اور ایران کے درمیان گیس پائپ لائن کا منصوبہ زور و شور سے آگے بڑھ رہاہے اور اسے روکنے کی ساری بالواسطہ امریکی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔چونکہ اس پائپ لائن کو پاکستان سے ہو کر آنا ہے اس لئے اسے بلاواسطہ روکنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو کشیدہ کرکے پائپ لائن کو

بند کروادیا جائے لیکن شاید اب یہ ممکن نہیں ہے اسی لئے کہ حافظ سعید کے شوشہ چھوڑنے کے باوجود دونوں سربراہانِ مملکت کی یہ مختصر سی ملاقات نہایت دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ آصف علی زرداری یا منموہن سنگھ نے پرانے زخموں کو ادھیڑنے کے بجائے باہمی مفادات اور تجارتی معاملات پر اپنی توجہات کو مرکوز رکھا اور اشتراک عمل کی راہوں پر غور کیا۔ اس لحاظ سے ایک غیر رسمی ملاقات کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس نے منموہن سنگھ کے پاکستانی دورے کی راہ ہموار کردی ہے۔

ہندوستان ٹائمز اخبار نے اس دورے کے بعد ایک سروے کیا اور منموہن سنگھ کے مجوزہ دورے سے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا ۶۲ فیصد لوگوں کے خیال میں دونوں ممالک کے درمیان اختلافات اس قدر شدید نوعیت کے ہیں اس سے زبانی جمع خرچ کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع نہیں ہے۔ اس کے برعکس ۳۴ فیصد لوگ پرامید ہیں اور ان کے خیال میں منموہن سنگھ کے پاکستانی دورے سے سنجیدہ اور مثبت پیش رفت ہوگی۔ ۴ فیصد نے کسی رائے کا اظہار کرنے سے گریز کیا۔ ہندپاک تعلقات میں ہوتا یہ رہا ہے کہ یہ دونوں جب بھی ایک دوسرے سے قریب آتے ہیں کوئی نہ کوئی دہشت گردانہ حملہ ہوجاتا ہے جس سے ساری محنت وکاوش پر یکسر پانی پھر جاتا ہے۔ جیسا کہ فراق فرماتے ہیں

بارہا برخلافِ ہر امید

دوستی دشمنی ہو گئی ہے

عوام کے اندر پائی جانے والی اس مایوسی کو ختم کرنے کا سب سے موثر طریقہ یہی ہے کہ ان لوگوں کو بے نقاب کرکے کیفرِ کردار تک نہیں پہنچایا جائے جو ہمسایوں کے درمیان دشمنی کی آگ لگا کر اس اپنی سیاسی و معاشی روٹیاں سینکتے ہیں جب تک یہ نہیں ہوتا اس وقت تک پائیدار امن کے امکانات معدوم ہی رہیں گے ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ غیروں کے مفاد کے بجائے اپنوں کا درد محسوس کیا جائے کہ یہی جذبہ اخوت دشمنی کو دوستی میں بدل سکتا ہے بقول بیخود دہلوی

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے

دوستی دشمنی نہ ہو جائے

جاری•••••

شہریار: امید سے کم چشم خریدار میں آئے

وقت اور حالات کے اثرات اشعار کے معنی اور مفہوم پر بھی ہوتے ہیں ۔ اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت مرحوم شہریار کئی چیدہ چیدہ اشعار پر ان کی موت کا اثر ہے مثلاً آج جب ہم ان کی مشہور غزل ''عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو'' کے یہ اشعار پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا انھوں نے بعد از مرگ کیفیات کا اظہار اپنے عرصۂ حیات میں کر دیا تھا

ہر ایک نقش تمنا کا ہو گیا دھندلا
ہر ایک زخم میرے دل کا بھر گیا یارو
بھٹک رہی تھی جو کشتی وہ غرقِ آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا یارو

ان اشعار کو اب پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے گویا غزل کے مطلع میں شاعر کا اپنا سایہ جس سے وہ رات ڈر گیا تھا ملک الموت تھا۔ اور پھر ایک ایسا عجیب سانحہ رونما ہوگیا جس نے تمام نقشِ تمنا کو دھندلا کر دیا اور شاعرِ سرمست کو ایک ایسی سکون کی نیند سلا گیا جس نے دل کے تمام زخموں کو یکسر بھر دیا۔ اس سانحے کے سبب دربدر بھٹکتی زندگی موت کے دریا میں ہمیشہ کیلئے غرقاب ہو

گئی۔ شہریار نامی صدفِ گہرمایہ کو اپنے سینے میں چھپا لینے کے بعد قضائے گیتی کا بیکل دریا پر سکون ہو گیا۔

پروفیسر شہریار جن کا اصل نام کنور اخلاق محمد خاں ہے 16 جون 1936 کو بریلی ضلع کے ایک گاؤں آنولہ میں بسے راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے، غالب کی مانند آپ کا خاندانی پیشہ تو سپہ گری تھا مگر شہریار نے شعر و سخن کی دنیا میں یاوری کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک اور حسنِ اتفاق ہے کہ ۱۹۶۹ میں شہریار نے جو ادبی ماہنامہ جاری کیا اس کا نام بھی غالب ہی تھا۔ بی اے اور ایم اے علی گڑھ سے کرنے کے بعد 1966 میں وہیں اردو کے لکچرر بن گئے اور 1996 میں وہ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی چھ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اسم اعظم، ساتواں در، خواب کا در بند ہے، ہجر کے موسم، اور نیند کی کرچیں کے علاوہ 'کلیاتِ شہریار' بھی شائع ہو چکی ہے جس میں ان کا مکمل کلام شامل ہے۔ 'خواب کا در بند ہے' کے لیے ان کو 1987 میں ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازہ گیا اور ۲۰۰۸ انھیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ۔ شہریار سے قبل اردو دنیا سے متعلق صرف تین ہستیاں فراق گورکھپوری، سردار جعفری اور قراۃالعین حیدر کے حصے میں یہ اعزاز آیا ہے۔ جدید شاعری کے روح رواں پروفیسر کنور اخلاق محمد خان شہریار کا انتقال طویل علالت کے بعد 74 سال کی عمر میں ہوا۔ ان کے پسماندگان میں بیوی، دو بیٹے

اور ایک بیٹی ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل اول الذکر غزل ''عجیب سانحہ'' کے آخری شعر میں اٹھائے گئے سوالات کے جواب میں پیش کی گئی ہے جس میں شہریار اپنے منفرد انداز میں کچھ یوں رقمطراز ہیں کہ

وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

شہریار کی اپنی شخصیت کی مانند یہ ایک ایسا صدا بہار شعر ہے جس کا آج کبھی کل میں نہیں بدلتا اور اسے پڑھنے کے بعد بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے گویا شہریار نے اپنا یہ مرثیہ بعد از موت از خود لکھ کر روانہ کر دیا ہو۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان اشعار سے یہ تاثر شاعر کے عرصۂ حیات کے دوران کبھی نہیں ملا کہ اس کی خاطر وادیٔ اجل کا بلاوہ لازم تھا۔ شہریار کو پتہ تھا کہ یہ حقیقت اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک زندگی کے خواب کا موت کی حقیقت سے تصادم نہ ہو جائے اور ایک بے نام منزل کی جانب سے فیصلہ کن بلاوہ نہ آجائے۔ شہریار نے نہایت لطیف انداز میں یہ حقیقت بھی بیان کر دی

پھر کہیں خواب و حقیقت کا تصادم ہوگا

پھر کوئی منزلِ بے نام بلاتی ہے ہمیں

جس منزل سے بلاوے آتے ہیں اس کو شاعر کوئی نام تو نہیں دیتا مگر اس کے متعلق تمام ترابہام کے باوجود وہ اس سے نہ حیران ہے اور نہ پریشان بلکہ اس کا منتظر ہے جس اعتراف اس انداز میں ہوتا ہے کہ

نہ جس کی شکل ہے کوئی، نہ جس کا نام ہے کوئی
اک ایسی شہ کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

شاعر کے نزدیک یہ انتظار کا عمل یکطرفہ نہیں ہے بلکہ بلانے والا بھی حیاتِ دنیا کی مہین سی چلمن کے پرے بلائے جانے والے سے وصال کیلئے کوشاں و بیقرار ہے۔ اس خیال کا اظہار شعر کے جامے میں کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ

بلا رہا ہے کیا کوئی، چلمنوں کے اس طرف
مرے لئے بھی کیا کوئی اداس و بیقرار ہے

حیات وممات کیلئے حساب وکتاب کی بندش لازم و ملزوم ہے اور وہ ایک ایسا مرحلہ ہے کہ جس کے حوالے سے بیجا خود اعتمادی کا شکار کوئی ہوشمند فردِ بشر نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا تصورِ خیال ہی نسیانِ مجسم حضرتِ انسان کو شرمسار کر دینے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ اخروی میزانِ عمل کا کیا کہنا کہ اس میں سے نہ ذرہ

برابر نیکی کے چھوٹ جانے کا کوئی امکان ہے اور نہ ذرہ برابر بدی کے ندارد ہونے کا۔

اسی کیفیت کا اعتراف شہریار کے اس شعر میں نظر آتا ہے

تمام عمر کا حساب مانگتی ہے زندگی

یہ میرا دل کہے تو کیا یہ خود سے شرمسار ہے

عاقبت میں ہونے والی شرمساری کا احساس اگر کسی شخص کو ہو جائے تو اس کا دل پکار اٹھتا ہے۔

اس نتیجے پہ پہونچتے ہیں سبھی آخر میں

حاصلِ سیر جہاں کچھ نہیں حیرانی ہے

اردو زبان کے چند شعراء کو اپنے دور کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا مثلاً میر، غالب اقبال اور فیض نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنی نسل کے ترجمان ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے بعد ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور انشا نے میر کے لب و لہجے میں غمِ روزگار اور شکستِ ذات کی ترسیل کو آفاقی مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جدید شاعری کے حوالے سے ظفر اقبال، بانی اور شہریار ن اسی راہ پر گامزن رہے اور جدید غزل کی علامت بن گئے۔ مثلاً شہریار کا یہ شعر

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے

اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

اس جدید اسلوب کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مسائل کے وجود اور ان کے پس پردہ عوامل کی موجودگی کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ان کا حل شاعر از خود تجویز نہیں کرتا بلکہ یہ ذمہ داری قاری پر ڈال دیتا ہے کہ وہ خود حل تلاش کرے۔اس طریقۂ کار کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ قاری سب سے پہلے شاعر کے الفاظ میں اپنے کرب کو محسوس کرکے اس کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور ان اشعار کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر ان سے محظوظ ہوتا ہے نیز چونکہ اسے اپنے سوالات کا کوئی بنا بنایا جواب نہیں ملتا وہ خود اپنی سعی و جدو جہد سے ان تک رسائی حاصل کرتا ہے۔اس دوران اس کے قلب کی بے یقینی یکسوئی میں بدل جاتی ہے اور اس کا اپنا تلاش کردہ حل بعینہٖ شاعر کی رائے کے مطابق بھی ہو تب بھی وہ اس کی اپنی دریافت ہوتی ہے اور وہ اس پر بڑے شرحِ صدر کے ساتھ عملدرآمد کرتا ہے۔اس اسلوبِ بیان کی ایک مثال شہریار کی مشہور غزل کا یہ شعر ہے

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے ؟
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے؟

اس غزل کا ہر شعر کسی نہ کسی انفرادی یا اجتماعی مسئلے کا ترجمان ہے۔اس میں اختیار کیا جانے والا استفہامیہ اندازِ سخن یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ ان خلافِ فطرت مسائل کے پسِ پردہ کچھ وجوہات ضرور ہیں لیکن کون سے عوامل اس

کیلئے ذمہ دار ہیں؟ اور ان سے کس طرح نبٹا جا سکتا ہے؟ اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ انہیں تلاش کریں نیز کسی غیر پر انحصار کرنے کے بجائے از خود اپنے مسائل سے نبرد آزما ہو جائیں؟

نادرِ روزگار گیان پیٹھ اعزاز حاصل کرنے کے بعد تقسیمِ اسناد کی تقریب میں سامعین سے خطاب کرتے ہوئے شہریار نے جو کچھ کہا وہ ایک فنکار کی حیثیت سے ان کے نظریۂ حیات کا ترجمان ہے۔ وہ بولے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے اور سانس لے رہے ہیں جہاں سبھی ایک دوسرے کے درد کو محسوس کرتے اور شریک غم رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے یکساں جذبات محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک فنکار کی ذمہ داری اپنے شاہکار سے دنیا کو خوبصورت اور دلفریب بنانا ہے اور میرا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے۔ میری دعا ہے کہ میں جب تک زندہ رہوں یہ فرض تندہی سے انجام دیتا رہوں۔ انہوں نے اس موقع پر اپنا ہی یہ شعر پڑھا

ایک ہی دھن ہے کہ اس رات کو ڈھلتا دیکھوں
اپنی ان آنکھوں سے سورج کو نکلتا دیکھوں

صبحِ نو کی دید کی دھن میں زندگی بسر کرنے والا شہریار اپنے سورج کو ہوسِ دنیا کی مضرتوں سے خبردار کرتے ہوئے ایک ایسا شعر کہہ جاتے ہیں جو استعارے

کی عظیم ترین بلندیوں پر سورج سے سرگوشی کرتا نظر آتا ہے

یہ آگ ہوس کی ہے جھلس دے گی اسے بھی
سورج سے کہو سایۂ دیوار میں آئے

ایک فنکار کی حیثیت سے شہریار نے اپنی ذمہ داری بخوبی نبھائی اور زندگی کو خوبصورت بنانے کی حتی الامکان سعی و کوشش کی لیکن اس کے ساتھ اس بابت نہ وہ خود کسی خوش فہمی کا شکار رہے اور نہ اپنے قاری کو کسی دھوکے میں رکھا۔ شہریار کی اس معرفتِ حافت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ زندگی کی حقیقتوں حالتِ خواب میں نہیں بلکہ کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے قائل تھے اور یہی تلقین وہ اپنے قاری کو بھی کرتے ہیں

جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھو دنیا کو
خوابوں کا کیا ہے، وہ ہر شب آتے ہیں

شاعر کا ایک کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ حال کی شبِ تاریک میں مستقبل کے حسین خواب سجائے ملک و قوم کے اندر سے حزن و یاس کا خاتمہ کرکے اس میں حوصلہ اور جذبہ عمل پیدا کرے لیکن اسی کے ساتھ اس کی اہم ترین ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عوام کو حقیقت پسند بنائے اور انہیں خوابِ خرگوش سے بیدار کرے اور شہریار کے کوچ کر جانے سے اس باب میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا

ترجمان خود انہیں کا یہ شعر ہے

کچھ بھی نہیں جو خواب کی طرح دکھائی دے
کوئی نہیں جو ہم کو جگائے جھنجھوڑ کر

اپنے اسی احساس پر میں اپنی گفتگو ختم کروں گا کہ ہمیں اپنی کم مائیگی کا نہایت ہی خوبصورت انداز میں احساس دلانے والے دنیائے سخن کا شہریار اب ہمارے درمیان نہیں ہے اس بے بدل فنکار کا کوئی متبادل بظاہر نہیں آتا اور اس کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائیگی

زندگی جیسی توقع تھی نہیں، کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس، کہیں کچھ کم ہے

بندروں کی واپسی

یوگی بابا کے چشم کشا پر وچن سے نین سکھ کی آنکھیں کھل چکی تھیں ۔اس نابینا گاندھی جی کے بندر نے جب اپنے آس پاس نظر دوڑا کر دیکھا تو اس کا سارا سکھ چین غارت ہوگیا ۔اس نے سوچا گاندھی جی کے دیس میں یہ کیا ہو رہا ہے ۔پہلے تو گاندھی جی کی تصویروں والے چند سکوں کے عوض ایوانِ زیریں کے انتخابات میں غریب رائے دہندگان کو خریدا جاتا تھا اب ایوانِ بالا کے انتخابات میں عوام کے نمائندوں کی نیلامی ہو رہی ہے اور سرِ عام ان کا ایمان کروڑوں روپیوں میں بک رہا ہے ۔ان روپیوں پر بھی گاندھی جی کی مسکراتی ہوئی تصویر چھپک رہی ہے ۔اس منظر کو دیکھ کر نین سکھ کے نین بھیگ گئے اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر نوٹ پر بنی گاندھی جی کی تصویر بھی مرجھا گئی ۔ان مناظر کو دیکھنے کے بعد نین سکھ کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا میں بنیادی فرق کیا ہے ۔جس ایوان کی رکنیت کیلئے غریب عوام رائے دیتے ہیں اسے ایوانِ زیریں ہی ہونا چاہیے اور جس میں منتخب ہونے والے ارکان کو عوام کے نمائندے یعنی بڑے لوگ اونچی قیمتوں کے عوض ووٹ دیتے ہوں اس کا ایوانِ بالا کہلانا حق بجانب ہے ۔

غمزدہ اور مایوس نین سکھ اپنے ساتھیوں مونی بابا اور تان سین کی جانب متوجہ ہوا اور ان سے سوال کیا یہ کیا ہو رہا ہے ؟ تم لوگ یہ سب بڑے آرام سے دیکھ رہے ہو تم کو اس پر نہ کوئی حیرت ہے اور نہ پریشانی ؟ گونگے مونی بابا تو خیر مون.برت رکھے ہوئے تھے اس لئے وہ اپنے ہاتھ منہ پر رکھے بدستور بیٹھے رہے لیکن بہرے تان سین نے نین سکھ کے لبوں کی حرکات سے اندازہ لگا لیا کہ یہ کیا پوچھ رہا ہے اور بولا ۔ دیکھو نین سکھ یہ سب تم پہلی بار اور چانک دیکھ رہے ہو اس لئے تمہیں حیرت بھی ہے اور پریشانی بھی ۔ ہم ان مناظر کو جستہ جستہ.برسوں سے دیکھ رہے ہیں ۔ہم تو اب اس کے عادی ہو گئے ہیں بلکہ اس پر راضی ہو گئے ہیں ۔ اب تو یہ حالت ہے کہ اگر اس کے علاوہ کچھ اور ہونے لگے تو ہمیں نہ صرف حیرت بلکہ پریشانی بھی ہو گی ۔

تان سین کا یہی وہ نادانستہ جواب تھا جس نے نین سکھ کو اس قدر قنوطیت کا شکار کر دیا تھا کہ اس نے گاندھی ٹوپی کو اپنے سر سے اتار کر کھڑکی سے باہر اچھال دی تھی اور خود بھی کود خودکشی کر لی تھی ۔ نین سکھ کی جائے وفات پر ماروتی مندر کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری و ساری تھا ۔پڑوس کی زمین ہتھیانے کا خواب دیکھنے والے بلڈر کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا چاہتا تھا ۔ اس نے چند پجاریوں کو کام پر لگا کر ہنومان چالیسا کا پاٹھ شروع کروا دیا ۔ عوام کا مجمع صبح شام لگنے لگا تھا ۔ ہر روز لاؤڈ اسپیکر پر ہنومان جی

کے بھجن بجتے رہتے تھے اور پون پتر ہنومان کی جۓ کے نعروں کی آڑ میں سیارام کالونی کی تعمیر کا کام زور وشور سے جاری تھا۔ویسے ابھی تک بلدیہ سے اس کے نقشوں کی توثیق اور دیگر اجازت نامے حاصل نہیں ہوئے تھے لیکن چونکہ مندر اور کالونی کا سنگِ بنیاد ریاست کے وزیر اعلیٰ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا تھا اس لئے کسی سرکاری افسر کی یہ مجال نہیں تھی کہ اس تعمیر میں کوئی رخنہ کھڑا کرنے کی جرأت کرے۔

عوام کا اس کام حصہ بس اس قدر تھا کہ صبح کام پر جاتے ہوئے.برکت کی توقع میں ماروتی کی مورتی کے سامنے جھک کرپرنام کر جاتے اور شام میں اپنی آتما کی شانتی کیلئے مندر کے صحن میں آ کر بیٹھ جاتے۔کچھ دیر بھجن کیرتن کرنے کے بعد ایک دوسرے سے گپ شپ کرتے اور پھر گھر جا کر سوجاتے ۔روز بروز عوام کی.بڑھتی ہوئی آستھا کے پیشِ نظر کائیاں پجاریوں نے مورتی کے پاس ایک خوبصورت سی دان پیٹی بھی نصب کروادی تھی جس سے ان کی اوپر کی آمدنی کا بندوبست ہوگیا تھا۔روز بروز کی.بڑھتی گرانی کے چلتے سنت مہنت اسے جائز اور ضروری سمجھتے تھے ۔اس کے اندر پولس کا ہفتہ باندھ دیا گیا تھا تاکہ انتظامیہ کا اعتماد بحال رہے اور آگے چل کر کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ سنیچر کی شام سب سے زیادہ دکشنا جمع ہوتی تھی ۔اتوار کی صبح اس کا حساب کتاب ہوتا اور پیر کی صبح محلے کے اندر رہنے والا حولدار اپنے تھانے کا حصہ وصول کرکے اپنے ساتھ

لے جاتا اور اسے تھانیدار چرنوں میں ارپن کر دیا کرتا۔

اس پونیہ کاریہ میں جنتا کا ایک اور یوگ دان یہ تھا کہ جب وہ کسی اور ہنومان مندر میں جاتے تو وہاں سے ایک آدھ بندر پکڑ کر اپنے ساتھ اس مندر کیلئے لے آتے۔اس طرح مندر کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ایک وانر سینا کے نرمان کا کام بھی نہایت فطری انداز میں ہو رہا تھا۔مختلف مقامات سے آنے والے یہ بھانت بھانت کے بندر اور گاندھی جی کے دو کھدر پوش بندروں کے درمیان ایک نمایاں فرق تھا۔انسانوں کے ساتھ رہتے رہتے گاندھی جی کے ان نام نہاد مہذب بندروں نے لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھ لیا تھا۔وہ اپنی قوم کے دیگر بندروں کو اپنے سے حقیر سمجھنے لگے تھے اور انہیں منہ نہ لگاتے تھے لیکن اس بیچ تان سین کو اپنی تنہائی کا شدید سے شدید تر احساس ہونے لگا۔جب تک نین سکھ زندہ تھا وہ اس کی جھک جھک بک بک کو سنتا بھی تھا اور جواب بھی دیتا تھا۔گو کہ تان سین نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے اوپر بہرہ پن طاری کئے ہوئے تھا۔وہ دوسروں کی آواز سننے سے قاصر تھا اس کے باوجود اس کو لوگوں کا اس کی بات کو سننا اور اس پر اپنے رد عمل کا اظہار کرنا بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ویسے وہ ان کے لبوں کی حرکات اور چہرے کے تاثرات سے بہت کچھ قیاس آرائی کر لیا کرتا جو بڑی حد تک صحیح ہوتی تھی۔لیکن مونی بابا کا معاملہ یہ تھا کہ وہ سنتے تو سب کچھ تھے مگر کچھ بولتے نہ تھے۔نہ ان کے ہونٹ ہلتے

اور نہ چہرہ بولتا کسی عظیم فلسفی کی مانند شب و روز نہ جانے کس جہان میں کھوئے رہتے تھے۔

تان سین کو ایسا لگتا تھا گویا نین سکھ کے غم میں انہوں نے بھی اس جگت سے ناطہ توڑ کر سنیاس لے لیا ہے۔ کبھی کبھار موڈ میں آتے تو اپنے کمپیوٹر پر ایک آدھ جملہ لکھ کر تان سین کے سامنے اپنے دل کی بات رکھ دیتے ۔ ایک دن تان سین نے دیکھا کہ مونی بابا چہرے سے بہت خوش نظر آرہے ہیں تو وہ پھدک کر ان کے قریب ہو گیا سوچا اپنی سمسیہ (مسائل) بتانے کا یہ اچھا موقع ہے نہ جانے پھر کبھی یہ بڑے میاں موڈ میں آئیں یا نہ آئیں یا اسی گمبھیر (اداس) مدرامیں پرلوک سدھار جائیں ۔ تان سین بولا مونی بابا کیا بات ہے ؟ آج آپ بڑے خوش نظر آرہے ہیں ؟

مونی بابا مسکرائے اور اپنے آئی پیڈ پر لکھا جی ہاں تمہارا اندازہ درست ہے آج واقعی میں خوش ہوں

اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ ؟ کیا انٹرنیٹ پر کوئی خاص چیز پڑھنے کیلئے مل گئی ؟

مونی بابا نے تائید میں سر ہلا کر لکھا یہی سمجھ لو

اچھا کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کیا پڑھ رہے تھے ؟

کیوں نہیں ؟ موٹی بابا کی انگلیاں آئی پیڈ پر کھیل رہی تھیں ۔ میں دراصل کلیاتِ اقبال پڑھ رہا تھا

تان سین کی سمجھ کے مطابق علامہ اقبال نہایت سنجیدہ شاعر تھے ۔ وہ خود بھی ملت کے حال پر روتے تھے اور سامعین کو بھی اپنی شاعری سنا کر رلاتے تھے لیکن یہ موٹی بابا بھی عجیب آدمی ہے کہ ان کی شاعری پڑھ کر خوش ہو رہا ہے ۔ وہ بولا میں نے تو سنا ہے علامہ اقبال نہایت سنجیدہ انسان تھے ۔ شاید کسی اور شاعر نے اپنامزاحیہ کلام مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر اقبال کے نام سے ویب سائٹ پر ڈال دیا ہو اور آپ اسے علامہ کا کلام سمجھ کر محظوظ ہو رہے ہوں ۔

موٹی بابا کو تان سین کے اس احمقانہ فقرے پر غصہ آگیا اس لئے کہ اس میں ان کا تمسخر اڑایا گیا تھا ۔ انہوں نے فونٹ کا رنگ سیاہ سے بدل کر سرخ کیا اور اب لکھنے لگے ۔ تمہارا دماغ خراب ہے ۔ تم جیسا کوئی چور شاعر اپنی مقبولیت کو بڑھانے کیلئے علامہ اقبال کی شاعری کا سرقہ تو کر سکتا ہے لیکن اگر وہ اپنا کلام ان کے نام سے شائع کرے تو لوگوں کو پتہ ہی کیسے چلے گا کہ یہ اس کا کلام ہے ؟

تان سین کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا وہ بولا جی ہاں لیکن علامہ اقبال کا کلام چرانا اس قدر آسان بھی نہیں ۔ ایک تو ان کے اشعار بے حد مشہور ہیں دوسرے ان کا آہنگ خود اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ شعر ان کے سوا کسی اور کا اور ہو ہی نہیں سکتا۔

مونی بابا مسکرائے اور لکھا جب تم یہ جانتے ہو کہ علامہ اقبال کے اشعار خود گواہی دیتے ہیں کہ ان کا خالق کون ہے تو مجھ سے یہ توقع کیوں کر کرتے ہو کہ میں کسی اور کا کلام ان کے نام پر پڑھ رہا ہوں ۔

جی ہاں وہ میری غلطی تھی میں معذرت چاہتا ہوں دراصل آپ کو خوش دیکھ کر مجھے مغالطہ ہو گیا تھا

مونی بابا نے لکھا اقبال ایک فطری شاعر تھا اس کے یہاں حسبِ ضرورت ظرافت بھی موجود ہے کیا تم نے ان کا ظریفانہ کلام نہیں پڑھا۔

تان سین نے سوچا گفتگو کسی اور رخ پر جارہی ہے اس لئے اسے سنبھالنا ضروری ہے ورنہ اس کا اپنا مسئلہ دھرا کا دھرا کا دھرا رہ جائیگا اور ملتِ اسلامیہ نیز عالم انسانیت کے مسائل زیرِ بحث آجائیں گے۔ وہ بولا دیکھئے مونی بابا ظریفانہ کلام تو پھر کبھی آپ کے آئی پیڈ پر پڑھ لیں گے فی الحال آپ میرے

مسئلہ کا حل بتلایئے

تمہارا مسئلہ ؟ تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ تم تو بندر ہو انسان نہیں ؟ مسائل تو انسانوں کے ہوتے ہیں ؟

تان سین حالانکہ بندر تھا اس کے باوجود اسے مونی بابا کے منہ سے اپنے لئے بندر کا لفظ پسند نہیں آیا لیکن اس نے درگذر کرکے بات آگے بڑھائی اور بولا آپ کی بات درست ہے بابا۔ جب تک ہم بندروں کے درمیان ایک آزاد اور فطری معاشرے میں رہتے تھے ہمارے مسائل نہیں تھے لیکن پھر گاندھی جی کی نظرِ انتخاب ہم پر پڑی ہم لوگ انسانوں کے ساتھ رہنے بسنے لگے ان کی مانند بولنے سننے لگے اور انہیں کی طرح سوچنے سمجھنے بھی لگے اس لئے اب ان کے سارے مسائل ہمارے اپنے مسائل بن گئے ہیں۔

مونی بابا اپنے آئی پیڈ پر مسکراتا چہرے والا کارٹون لائے اور لکھا کیا بات ہے تان سین آج تم باتیں تو بہت اونچی کہہ رہے ہو کیا پیڑ کسی اونچی ٹہنی کے پھل کھا کر آرہے ہو یا پرساد میں کسی ہنومان کے بھکت نے تمہیں بادام پستہ اور چلغوزہ سے بنی کوئی مٹھائی کھلا دی ہے۔

تان سین بولا گولی ماریئے بادام اور چلغوزے کو یہ تو آپ جیسے عالم فاضل

فلسفی کی صحبت کا فیضان ہے

یہ سن کر مونی بابا کا دل باغ باغ ہوگیا انہوں نے کسی ماہر طبیب کی مانند لکھنا شروع کیا اچھا اب یہ چکنی چپڑی باتیں چھوڑو اور اپنا مسئلہ بیان کرو۔

میرا مسئلہ ؟ تان سین چونک کر بولا ہاں ہاں میرا مسئلہ ۔ دراصل آجکل میں بہت پریشان ہوں ۔ نین سکھ کی موت کے بعد دل اس دنیا سے اچاٹ ہوگیا ہے۔ تنہائی کا شدید احساس نے میرے وجود کو اچک لیا ہے گویا کہ زندگی بالکل ہی بے رنگ ہو کر رہ گئ ہے

مونی بابا نے لکھا ہووووں ! ! ! تمہاری اس مشکل کا حل بھی حکیم الامت نے بتھایا ہے میری مشکل کا حل ہے۔ بھلا ان کو میری اس مشکل کا پتہ کیسے چل گیا ؟

مونی بابا پھر مسکرائے اور لکھا یہ اگر تمہارے اکیلے کا مسئلہ ہوتا تو انہیں یقیناً اس کا علم نہیں ہوتا لیکن یہ تو ایک عام مسئلہ ہے جو ہر دور میں انسانوں کے ساتھ رہا ہے۔اس لئے علامہ اقبال کا اس سے واقف ہونا فطرت کے عین موافق ہے۔

تان سین کے تجسّس میں اضافہ ہو رہا تھا ہو رہا تھا وہ بولا تو ٹھیک ہے آپ انہیں کا تجویز کردہ نسخہ بتلا دیجئے

مونی بابا نے ڈاؤن لوڈ کی ہوئی کلیات کو کھولا اور اس پر تلاش والی کھڑکی کو کھول کر زن'' ٹائپ کر دیا۔ پھر کیا تھا کمپیوٹر نے از خود وہ تمام اشعار تلاش کرنے شروع کر'' دیئے جن میں لفظ' زن' کا استعمال ہوا تھا اور چند سیکنڈ کے اندر یہ مصرع پردے پر جھلک ' رہا تھا' وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

تان سین سوچ رہا تھا کہ اس کیلئے کوئی مشورہ ہوگا یہ تو ایک آفاقی حقیقت کا بیان تھا جس کا بظاہر اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بولا مونی بابا آپ سے میں اس عقیدت کے ساتھ استفسار کر رہا ہوں اور آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے جس سے ہر کس و ناکس واقف ہے لیکن اس میں میرے مسئلے کا کوئی حل کہاں ہے ؟

مونی بابا نے لکھا حل تو ہے لیکن اس کیلئے عقل کا تھوڑا سا استعمال ضروری ہے۔

کیا مطلب ؟

مطلب یہ کہ بقول تان سین اس کی زندگی بے رنگ ہو گئی ہے ٹھیک ہے ؟

بالکل ٹھیک

اور اس کی اپنی زندگی ہی اس کی کل کائنات ہے ؟ درست ہے یا نہیں ؟

جی ہاں یہ بھی درست ہے

اب اقبال کا کہنا یہ ہے کائنات میں رنگ وجودِ زن سے ہے گویا اگر زن غیر موجود ہو تو کائنات بے رنگ ہو جاتی ہے۔ یہ بات سمجھ میں آئی ۔ اب ان سب کو جوڑ کر اپنا حل تلاش کر لو۔

جی ہاں اب میری سمجھ میں یہ منطق آگئی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میری زندگی وہ رنگ آئیگا کہاں سے ؟

وہ دیکھو مندر کے سامنے پیڑ پر اور چھجے پر ، نیچے صحن میں اور اوپر دیوار پر نہ جانے کتنے رنگ اچھل کود رہے ہیں ۔ جاؤ اور ان میں سے کسی کو اپنی زندگی میں لے آؤ۔

ان میں سے ؟آپ کیسی باتیں کرتے ہیں بابا۔ ہم نے ان کے ساتھ ایک خاص فاصلہ بنایا ہوا ہے۔ہم ان سے نہ ملتے جلتے بھی نہیں۔ ایسے میں بھلا ان میں سے کوئی ہمارے ساتھ کیسے آسکتا ہے ؟

مونی بابا نے استفہامیہ انداز میں تان سین کی جانب دیکھا اور اپنے آئی پیڈ پر لکھا۔ وہ ہماری اپنی برادری کے لوگ ہیں کیا انھوں نے تمہیں ملنے جلنے سے منع کیا ہے ؟

نہیں ایسی بات تو نہیں ہے۔ یہ تو ہمارا اپنا فیصلہ ہے جو ہم نے اپنے آپ کو ان سے دور کر رکھا ہے۔ ان کی جانب سے تو کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا۔ وہ سب آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بند ہیں صرف ہم سے نہیں ملتے۔

تم کی سوچتے ہو وہ ہم سے کیوں نہیں گھلتے ملتے؟

شاید اس لئے کہ ہم خود ان سے دور رہتے ہیں۔

اگر تم اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتے ہو تان سین تو تمہیں اس مشکل کو آسان کرنا پڑے گا ان کے ساتھ جاکر گھلنا ملنا پڑے گا۔ ممکن ہے ایسا کرنے سے تمہاری تنہائی کسی قدر کم ہو جائے نیز اگر ....

میں سمجھ گیا تان سین بولا ممکن ہے میری زندگی رنگین بھی ہو جائے۔

جی ہاں تان سین۔ ہمت کرکے آگے بڑھو مجھے یقین ہے کہ کامیابی تمہارا قدم چومے گی۔

یہ لکھنے کے بعد مونی بابا آئی پیڈ کے مانیٹر پر علامہ اقبال کا ایک اور شعر لے آئے۔

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی

شمشیریں

بھری عدالت میں بی جے پی کا فرضی انکاؤنٹر

تہلکہ کے فرضی ایجنٹ نے جب بنگارو لکشمن سے کہا کہ آپ ہندوستان کے پہلے دلت وزیر اعظم بن سکتے ہیں ایسا امکان ظاہر کیا جاتا ہے کہ تو بنگارو نے مسکرا کر اس کی تائید کی ۔ وہ بیچارہ کیا جانتا تھا کہ وزیر اعظم بننا تو درکنار جلد ہی پارٹی کی صدارت سے بھی استعفیٰ دینا پڑے گا اور ۱۱ سال بعد چار سال کی قید با مشقت سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ بنگارو لکشمن نے پہلی مرتبہ کے جو ریکارڈ بنائے ہیں انہیں سچن تنڈولکر کے علاوہ کوئی اور توڑ نہیں سکتا۔ پہلی بار بی جے پی کو اعتماد کا ووٹ کا حاصل کرنے کے بعد باقائدہ اقتدار سنبھالنے کا موقع ملا تو اس سنہری دور میں وہ پارٹی کے پہلی بار صدر بنے ۔ نام نہاد اعلیٰ ذات کی پارٹی کے وہ پہلے دلت صدر تھے اور جنوبی ریاست سے آنے والے کسی شخص پر پہلی بار بی جے پی نے اعتماد کیا تھا۔ کسی قومی جماعت کے وہ پہلے صدر ہیں جنھیں کیمرے کی آنکھ نے رشوت لیتے ہوئے دیکھا اور قید کر لیا۔ ان کے علاوہ جیا جیٹلی بھی جو ایک علاقائی جماعت کی صدر تھیں رشوت لیتی ہوئی نظر آئی تھیں مگر بنگارو لکشمن پہلے اور آخری صدر ہیں جنھیں بدعنوانی کے باعث استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا گوکہ اڈوانی جی کا نام بھی حوالہ ڈائری کے اندر بدعنوانی کے تحت ہی آیا تھا مگر انہوں نے پارٹی کی صدارت سے استعفیٰ دینے

کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی لیکن بنگارو لکشمن چونکہ بی جے پی کے پہلے صدر تھے جن کا انتخاب اڈوانی جی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا اسلئے ممکن ہے اڈوانی جی نے موقع غنیمت جان کر کانٹا نکال دیا ہو۔اڈوانی کے رشوت ستانی میں پکڑے جانے بلکہ قائد اعظم کی تعریف و توصیف کرنے پر بھی ان سے سنگھ پریوار نے اپنا پہلو جھاڑ کر یہ نہیں کہا کہ وہ بگڑے ہوئے سویم سیوک ہیں۔ یہ لقب پہلی بار آر ایس ایس کی جانب سے اپنے ایک ایسے سیوک کو دیا گیا جس نے بارہ سال کی عمر سے لے کر ۶۲ سال کی عمر تک پوری نصف صدی زعفرانی پرچم کو سلامی دی تھی۔ بالآخر ایک جعلی رشوت کے کیس میں لکشمن کو اصلی سزا سنائی گئی ایسا بھی غالباً ملک کی تاریخ میں پہلی ہی مرتبہ ہوا کہ کسی ۷۳ سالہ سیاسی رہنما کے حصے میں بدعنوانی میں ملوث ہونے کے سبب قید با مشقت کی سزا آئی ہو۔اس کی نظیر بنگارو سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ عوام کا دل جیتنے والے سی بی آئی عدالت کے جج کا نام کنول ہے جو بی جے پی کا انتخابی نشان ہے۔ تہلکہ نے یہ ویڈیو تیرہ تاریخ کو جاری کی تھی اور فیصلہ بھی تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ دہلی کی سی بی آئی عدالت کا فیصلہ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ کسی ہندی فلم کے مکالمے ہوں ممکن ہے عدالت میں پیش کرنے سے قبل انہوں نے اس کو نوک پلک درست کرنے کی خاطر جاوید اختر کے پاس بھیج دیا ہو۔ اگر یقین نہیں آتا تو فیصلے

: کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں

○کردار اور معیار بحران کے دوران پروان نہیں چڑھتے بلکہ ظاہر ہوتے ہیں۔خاص طور پر فرد کا اور عام طور سے معاشرے کا اخلاقی انحطاط اور قومی مفاد میں عدم دلچسپی نے بدعنوانی کو بڑے پیمانے پر فروغ دے رکھا ہے جس کے منفی اثرات ہماری قوم کے سماجی روحانی، سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی اقدار پر پڑ رہے ہیں۔

○آج کل کے حقائق اس مقولے کی تکذیب کرتے ہیں کہ "جرم کبھی بھی نفع بخش نہیں ہوتا"۔ہمارے ملک میں جرائم کی صورتحال سنگین اور پریشان کن ہے۔اس نے عوام و خواص دونوں کی اخلاقی اقدار پر قائم معاشرے کے تجدید واحیا کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

○بڑے پیمانے پر بدعنوانی کا مسئلہ ،خاص طور پر سیاسی بدعنوانی جسدِ سیاست کو کمزور کر رہی ہے نیز معاشرے میں آئین پر مبنی حکومت کی اہمیت کو نقصان پہنچا رہی ہے

○جرائم کی روک تھام کیلئے انصاف مہیا کرنا کا عدالت کی ذمہ داری ہے۔عدالتی کارروائی فیصلہ سنانے کے عمل میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔فیصلے کا مقصد صرف مجرم کو اس کی خلافِ قانون حرکت کی سزا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ عام معاشرہ اس رویہ مذمت کرتا ہے جس میں بدعنوان شخص ملوث ہے۔ایسا کرنا دیگرافراد کو اس طرح کے جرائم سے باز

رکھتا ہے۔

میرے خیال میں بدعنوانی عصمت فروشی سے قبیح تر ہے۔اس لئے کہ مؤخرالذکر○ سے انفرادی اخلاقیات کو خطرہ لاحق ہوتا ہے جبکہ اول الذکر پورے معاشرے کیلئے خطرناک ہے۔ یہ معاشرے کیلئے زہر ہے اور عوام کے اندر غیض و غضب پیدا کرتا ہے ۔لیکن اگر سماج عوامی سطح پر اس کی مخالفت کرے مگر انفرادی طور سے اس میں ملوث ہو تو ہمیں اپنے آپ سے سوال کرنا چاہئے کہ کیا ہم واقعی ایک بدعنوانی سے پاک معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں۔

ایسے میں عدالتوں کے کردار کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ عدالتوں کا وجود صرف کتابوں○ کی حد تک ایک خیالی قادر مطلق کی حیثیت سے نہیں ہونا چاہئے۔عدالت کو ایک سرگرم ادارے کی مانند کام کرنا چاہئے جو عوام کی امیدوں سے ہم آہنگ ہو۔اگر عدالت کی توپ اس وقت تک پر جوش نہ ہو جب تک کے غلطی کی اصلاح نہیں ہو جاتی تو اس صورت میں وہ ایک عملاً بے فائدہ شہ ہو کر رہ جائیگی۔

اس میں شک نہیں کہ ویسٹ اینڈ نامی کمپنی اور اس کی مصنوعات دونوں فرضی تھے○ لیکن اس کا علم صرف کمپنی کے اس نمائندے کو تھا جس نے جانبداری کی خاطر رجوع کیا تھا۔

مجرم بنگارو لکشمن نے اس فرضی کمپنی کے حق میں اپنے ذاتی اثرات کو نجی مفادات کے○ حصول کی خاطر غیر قانونی طریقے سے استعمال کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور اس نیت } اور یقین کے ساتھ کہ وہ سامان جس کو خریدا جانا ہے اصلی ہے

{ گویا فرضی مال کی اصلی نیت

بدعنوانی کے حوالے سے ہمارے " سب چلتا ہے " کے رویہ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ غیر قانونی خوشامد کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا

بدعنوانی بذاتِ خود بری چیز ہے مگر سپریم کورٹ کے الفاظ میں یہ معاشرے کا کینسر ہے۔ اگر اس کا ارتکاب وہ لوگ کریں جن کے پاس اختیار ہے اور اس کے ذریعہ ملک کے دفاعی نظام پر سیندھ لگائی جائے اور فوجی جوانوں کی جان سے کھیلا جائے تو اس کی شدت اور کمیت بے حد خطرناک اور تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔

عدالت کا یہ فیصلہ سنگھ پریوار کے گال پر ایک زبردست طمانچہ بھی ہے اور آئینہ بھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ خودساختہ دیش بھکتی کے نشے میں چور یہ فسطائی تنظیم ہوش میں آئے اور اس آئینے میں اپنا فرسودہ چہرہ دیکھے۔ اس بات کا جائزہ لے کہ وہ قوم پرستی کی شراب جو یہ لوگ برسوں تک پلا کر اپنے کارکنان کو مدہوش رکھتے ہیں اقتدار کا موقع ملتے ہی اس کا نشہ کیونکر ہوا ہو جاتا ہے۔ ان کی پارٹی کا صدر یہ جانے بغیر کے یہ اوزار معیاری ہیں یا نہیں رشوت کے مول بھاؤ میں کس طرح ملوث ہو جاتا ہے اور فوجیوں کی جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اور ان کا وزیرِ دفاع کارگل کی جنگ میں کام آنے والے فوجیوں کے تابوت میں سے رشوت کیوں ہضم کر جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اب وقت آگیا ہے کہ

اٹھتے بیٹھتے مسلمانوں سے وفاداری کا ثبوت مانگنے والے یہ زعفرانی سیاستدان نئے سرے سے اپنی وفاداری کا حلف اٹھائیں اور مستقبل میں بھی ان کی حرکات پر کڑی نگاہ رکھی جائے تاکہ آئندہ بھی یہ بگلا بھگت اپنے ذاتی مفاد کی خاطر قومی مفادات سے کھلواڑ نہ کر سکیں۔

یہ فیصلہ اپنے آپ میں اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ایک سیاسی رہنما کے خلاف ہے اور اس میں معاشرے کے اہم ترین مسائل کا نہ صرف تجزیہ کیا گیا ہے بلکہ حل پیش کیا گیا ہے اس کے باوجود اسے تاریخی نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ انسانی تاریخ میں جن فیصلوں کو اہمیت دی جاتی ہے وہ اقتدار وقت کے خلاف ہوتے ہیں۔مثلاً اندرا گاندھی کے خلاف الٰہ باد عدالت کا فیصلہ جس نے ہندوستانی سیاست میں ایسا زلزلہ برپا کر دیا تھا کہ عدالتیں تو کجا عام لوگ بھی اپنے بنیادی حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔اگر عدالتی فیصلے اقتدار کے مخالفین کے خلاف آتے ہیں تو ان کی افادیت بہر حال محدود ہوتی ہے۔اس لئے کہ جئے للیتا کے دورِ اقتدار میں کرونا ندھی کا گرفتار ہونا یا کرونا ندھی کی حکومت کے دوران جئے للیتا کا معتوب ہونا یہ انصاف کی ایک بھونڈی شکل ہے۔جس وقت تہلکہ والے اس فلم کو منظر پر لے کر آئے اس وقت یہ تو ہوا کہ لکشمن سے استعفیٰ لے لیا گیا حالانکہ وہ اس کے لئے راضی نہیں تھے بلکہ مجبور کئے گئے تھے اور اس بات کا اعلان بھی کیا گیا کہ مجرم کو قانون کے تحت کیفرِ کردار

تک پہنچایا جائیگا لیکن اس کے برعکس نہ صرف مجرم کو تحفظ فراہم کیا گیا بلکہ جس نے اس کا پردہ فاش کیا تھا اس کو بغیر کسی قانونی جواز کے معتوب کیا گیا۔ اگر یہ فیصلہ بی جے پی کے دورِ اقتدار میں سامنے آتا اور سریش کلماڈی کو اسی طرح کی سزا کیلئے بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے انتظار کی نوبت نہیں آتی تب تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ انصاف ہوا ہے۔ اس فیصلے کے حوالے سے سیاسی جماعتوں کا ردعمل بھی مایوس کن ہے۔ بی جے پی نے یہ کہہ کر اپنا پلو جھاڑ لیا کہ یہ ان کا اپنا ذاتی معاملہ تھا گویا بی جے پی کا صدر پارٹی کے دفتر میں بیٹھ کر اپنا نجی کاروبار چلاتا ہے اور کاروبار بھی اسلحہ کی دلالی کا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ پارٹی نے ان پر فوراً کارروائی کی اور صدارت سے ہٹایا لیکن وہ ابھی تک بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کے رکن ہیں اور اس کے اجلاس میں شریک ہوتے رہتے ہیں گویا صرف پارٹی کا صدر اگر رنگے ہاتھ پکڑا جائے تو اپنے عہدے پر نہیں رہ سکتا لیکن مجلس عاملہ میں رہ سکتا ہے اور اگر اس اعلیٰ سطحی مجلس میں رہ سکتا ہے تو پارٹی کے اندر رہنے میں کیا مشکل ہو سکتی ہے۔ بی جے پی کا ایک الزام یہ بھی ہے کہ کانگریس نے اپنی بوفورس اور ٹوجی بدعنوانیوں کی جانب سے توجہ ہٹانے کی خاطر بدلے کی کارروائی کی ہے لیکن یہ بیان بھی بذاتِ خود لکشمن کی جانب سے توجہ ہٹا کر جوابی حملہ ہے۔ بی جے پی کے مطابق لکشمن عدالتی نظام میں

حاصل مراعات کا استعمال کریں گے یعنی اپیل کریں گے ضمانت پر رہائی حاصل کریں اور وقت گزاری میں لگ جائیں گے۔

کانگریس نے کہا کہ ہمیں خوشی نہیں ہے لیکن یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اس نے بی جے پی کو اپنا احتساب کرنے کی دعوت دی لیکن کیا احتساب و جائزے کی ضرورت صرف بی جے پی کو ہے یا کانگریس بھی اس کی محتاج ہے؟ بلکہ کس کو اس کا احتیاج زیادہ ہے؟ کانگریسی ترجمان نے یہاں تک کہہ دیا کہ جن کے گھر شیشے کے ہوتے ہیں وہ دوسروں پر پتھر نہیں مارا کرتے۔ اس بیان میں کئی پیغامات پنہاں ہیں اول تو یہ کہ حزب اختلاف کی جانب سے آنے والی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا گیا ہے دوسرے یہ دھمکی بھی ہے کہ چپ چاپ بدعنوانی میں ملوث رہو مگر زیادہ شور شرابہ نہ کرو ورنہ تمہارے شیشوں کے مکانات پر اسی طرح سے پتھر چلتے رہیں گے۔ کمیونسٹ پارٹی کی ورندہ کرات نے عدالتی نظام کی دہائی دیتے ہوئے فرمایا اگر ایک لاکھ کی رشوت کے فیصلے کیلئے ۱۱ سال تو کروڑوں کی بدعنوانی کیلئے کتنے سال درکار ہوں گے۔ یہ نہایت احمقانہ دلیل ہے۔ اس طوالت کا رشوت کی کمیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو ایک علامتی سیاسی جنگ ہے۔ جس میں شہ اور مات کا سلسلہ جاری رہتا ہے کبھی کو سپاہی بادشاہ کے مقابلے کھڑا ہو جاتا ہے تو کبھی کوئی ہاتھی وزیر اعظم سے پنجہ آزمائی کرتا ہے لیکن سارا معاملہ شطرنج کی بساط تک محدود رہتا ہے۔ حقیقت حال پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تہلکہ کی ویڈیو میں ۳۴ لوگوں کو رشوت لیتے ہوئے دکھلایا گیا تھا جن میں لکشمن کے علاوہ تین اہم نام سمتا پارٹی کی سابقہ صدر جیا جیٹلی، سمتا پارٹی کے خازن آر کے جین اور آر کے گپتا نامی ایک سویم سیوک ہے۔ جیا جیٹلی نے وزیر دفاع جارج فرنانڈلیس کے گھر کے اندر بیٹھ کر رشوت لی۔ اس خاتون کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ جارج کی اہلیہ کو گھر سے بھگا کر پہلے گھر پر قبضہ کیا اور پھر پارٹی کو قبضے میں کیا۔ اسکے بعد بدعنوانی کا بازار گرم کر دیا۔ جین نہ صرف رشوت لیتے ہوئے بلکہ اس کی افادیت اور استعمال کا درس دیتے ہوئے ویڈیو میں نظر آتے ہیں۔ آر کے گپتا نے بڑے بڑے دفاعی سودوں میں ملوث ہونے کا اقرار کیا ہے اور آر ایس ایس کے دہلی میں واقع مرکز کو ۵۰ لاکھ کے خرچ سے بنانے کی بات بھی کہی ہے۔ اس شخص کو گرفتار کرکے اس سے سچ اگلوانا چاہئے تاکہ معاملہ ایک لاکھ سے آگے بڑھے۔

آر ایس ایس نے گپتا کے متعلق یہ صفائی پیش کی کہ وہ لاکھوں سویم سیوکوں میں سے ایک ہو سکتا ہے ہم ان کا ریکارڈ نہیں رکھتے۔ لیکن جب بھی تہلکہ والوں بنگارو لکشمن یا ان کے سکریٹری ستیہ مورتی کے سامنے گپتا کا ذکر کیا انہوں نے لاعلمی نہیں ظاہر کی اس سے معلوم ہوتا ہے وہ معروف شخص تھا۔ آر ایس ایس

کا کہنا ہے کہ وہ چیف ٹرسٹی نہیں ہو سکتا اس لئے آر ایس ایس ٹرسٹ نہیں ہے لیکن ویڈیو میں اس نے غیر ممالک میں بسنے والے ہندوستانیوں کی تنظیم فرینڈس آف انڈیا کے چیف ٹرسٹی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور یہ سنگھیوں کی حامی مشہور تنظیم ہے۔ آر ایس ایس کے ترجمان کا کہنا یہ ہے کہ دہلی کا دفتر صرف پانچ لاکھ میں تعمیر ہوا یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جو چغلی کھاتا ہے دال میں کالا ہے۔ روپیوں کی آمد کے بارے میں کہا گیا کہ یہ گرو دکشنا ہوتی ہے۔ اس کو کوئی حساب کتاب نہیں رکھا جاتا اور ایک تھال میں جمع کر کے سب ملا دیا جاتا ہے جس سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کس نے کیا دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس بات کا پتہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے کہ دولت لوٹ کی ہے رشوت ہے۔ سنگھ پریوار جو نظم و ضبط کے بلند بانگ دعویٰ کرتا ہے اگر خود نہ اپنے افراد کی ذمہ داری لینے کیلئے تیار ہے اور نہ دھن دولت کا حساب دینے کیلئے آمادہ تو اس کی بگڑی ہوئی اولاد بی جے پی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے اور اسے یہ کہنے کا کیا حق ہے بنگارو لکشمن ایک بگڑا ہوا سویم سیوک ہے۔

رامائن نامی رزمیہ داستان کا سب سے اہم موڑ وہ نہیں ہے جس میں کیکئی ایک سیاسی چال چل کر رام جی کو ایودھیا سے چلتا کر دیتی ہے اور اپنے لخت جگر بھرت کو اقتدار پر بٹھا دیتی ہے بلکہ وہ ہے جہاں روان کی بہن سوروپ نکھا لکشمن کو شادی کا پیغام دیتی ہے ۔ اس موقع پر ایک باعزت خاتون کی تجویز کو

پر وقار طریقے سے نامنظور کرنے کے بجائے لکشمن اس کی ناک کٹ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ اس حرکت کی بھاری قیمت رام اور سیتا دونوں کو چکانی پڑتی ہے ۔ست یگ کے لکشمن ہی کی مانند اپنی نادانی کا ثبوت بنگارو لکشمن نے بھی دیا اور اپنی پارٹی کی ناک کاٹ کر ہوا میں اچھال دی۔ اس حماقت کی بھاری قیمت بی جے پی اور آر ایس ایس دونوں کو ادا کرنی پڑی۔ دونوں کا عزت و وقار سربازار نیلام ہوگیا۔ست یگ میں تو قسمت اچھی تھی جو ہنومان مدد کیلئے آگئے لیکن کل یگ کے ہنومان تو اپنے مفادات کے پیشِ نظر راون یعنی کانگریس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اس لئے دوبارہ بی جے پی کے اقتدار حاصل کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ رام جی کے دور میں سری لنکا کے اندر قائم راون راج نے اسے سونے کی لنکا بنا دیا تھا لیکن لکشمن کی نادانی کے باعث وہ بھی جل کر خاک ہوئی ایسا ہی کچھ ہندوستانی سیاستدان کل یگ کے ہندوستان کے ساتھ اس کے دوبارہ سونے کی چڑیا بننے سے قبل ہی کر رہے ہیں وہاں تو ایک ہنومان کے دم میں آگ لگائی گئی تھی یہاں ہر ہنومان کی دم بدعنوانی شعلے اگل رہی ہے۔ بقول شاعر

.برباد گلستاں کرنے کو بس ایک ہی کچھمن کافی تھا
ہر شاخ پہ کچھمن بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

افغانستان میں امریکہ کا جمہوری تماشہ

کوئی شخص اگر کسی کے گھر میں رات ۱۰ بجے کے بعد چوری چھپے اچانک بلا بتلائے داخل ہو جائے اور کچھ پر اسرار حرکتیں کرنے کے بعد صبح چار بجے بھاگ کھڑا ہو تو اسے عام طور پر چور یا ڈاکو کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ شخص خاص ریاستہائے متحدہ امریکہ سے افغانستان جیسے کسی ملک میں وارد ہوا ہو تو اسے امریکہ بہادر کا صدر مملکت کہتے ہیں۔ اس امر کا ثبوت گزشتہ ہفتہ ہونے والا صدر اوبامہ کا کابل کا دورہ تھا۔امریکہ کا صدر جب کسی ملک کا دورہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو دورے سے کئی ماہ قبل اس کی تیاریوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔اس کی معمولی سے معمولی تفصیل نہ صرف طے ہو جاتی ہے بلکہ ان کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں ان پر قیاس آرائیاں شروع ہو جاتی ہیں اور اس کے مثبت و منفی اثرات پر بحث و مباحثہ شروع کر دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ ایک ایسا ماحول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے گویا یہ غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ ایسا تاثر دیا جاتا ہے کہ اس دورے سے امنِ عالم کا بول بالا اور دہشت گردی کا منہ کالا ہو جائیگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان دوروں کے حوالے سے جو خیالی پلاؤ بنائے جاتے ہیں ان

میں سے بہت کم حقیقت بن پاتے ہیں ورنہ دکھاوے کے کام مثلاً گارڈ آف آنر (توپوں کی سلامی) پارلیمانی خطاب، نام نہاد عوامی تقریبات میں شرکت (جن میں صرف کچھ مخصوص لوگوں کو شرکت کی سعادت فراہم کی جاتی ہے)، مشترکہ اخباری بیانات اور اعلامیہ کے علاوہ کوئی ٹھوس بات نہیں ہوتی۔ پس پردہ کچھ سازشیں اور سودے بازیاں ضرور ہوجاتی ہیں جنھیں گوں ناگوں وجوہات کی بنا پر صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سب ناٹک بازی ان ممالک میں ہوتی ہے جہاں امریکی افواج موجود نہیں ہوتیں۔ اس کے برخلاف ان ممالک میں جہاں ہزاروں کی تعداد امریکی فوجی موجود ہوتے ہیں نہ صدر صاحب کسی فوجی پریڈ کا معائنہ کرتے ہیں اور نہ توپوں کی سلامی لیتے ہیں یہاں تک کے دورے کا پیشگی اعلان تک کرنے کی جرأت نہیں دکھائی جاتی اور نہ ہی کوئی اور چونچلے بازی ہوتی ہے بلکہ اچانک کسی چور کی مانند امریکی صدر کبھی بغداد تو کبھی کابل پہونچ جاتا ہے اور واپس اپنے بل میں لوٹنے کے بعد چوہے کی مانند اکڑ کہتا ہے کہاں ہے بلی؟

اس معاملے میں تمام تر شخصی، نظریاتی اور جماعتی اختلاف کے باوجود جارج ڈبلیو بش اور براک اوبامہ کے رویے میں بلا کی یکسانیت پائی جاتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ریپبلکن گھوڑے اور ڈیموکریٹک گدھے میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ ان معاملات میں وہ دونوں خچر نظر آتے ہیں۔ جارج بش کے بغداد سے

جوتا کھا کر جانے کا یہ اثر تو ضرور ہوا کہ اپنے بول بچن کے لئے مشہور اوبامہ نے کابل میں رات کے اندھیرے میں بھی پریس کانفرنس تک کرنے کی جرأت نہیں کی ۔ پہلے تو ایک فرضی مصروفیت کا پروگرام بنا کر عوام و خواص کو دھوکے میں رکھا گیا اور پھر ایک ایسے جہاز میں جس کی تمام روشنیاں گل کر دی گئی تھیں چند مخصوص لوگوں کو جنھیں ساتھ لیا گیا تھا موبائل تک استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے امریکی صدر اپنے چنندہ افراد پر بھی کس قدر اعتماد کرتا ہے رات کے اندھیرے میں بگرام فوجی چھاؤنی میں لے جایا گیا۔ جہاز کے اترنے بعد مسافروں کو بتلایا گیا کہ وہ کہاں ہیں ۔

کابل پہنچنے کے بعد ایک فوجی ہیلی کاپٹر انہیں صدارتی محل میں لے آیا اور وہاں ایک معاہدے پر دستخط کئے گئے جسے تاریخی قرار دیا گیا حالانکہ دنیا بھر کی عوام تو کجا افغانی و امریکی عوام بھی نہیں جانتی کہ اس میں کیا لکھا ہے بلکہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں جو کچھ لکھا تھا اس سے خود حامد کرزئی یا.براک اوبامہ بھی واقف تھے یا نہیں بلکہ اس میں بھی شک ہے کہ جن کاغذات پر حامد کرزئی نے دستخط کئے اس پر کچھ لکھا ہوا بھی تھا یا اس مجبور غلام نے اپنے آقا کے حضور بلینک چیک پر اپنا انگوٹھا لگا کر پیش کر دیا۔اس عظیم کامیابی کا جشن.براک اوبامہ نے فوجی چھاؤنی کے اندر جا کر منایا اور امریکی مقاصد کی.برآوری کے بلند بانگ دعوے کئے جن کی قلعی

اوبامہ کے نکلنے کے صرف ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اسی فوجی چھاؤنی سے چند میل کے فاصلے پر کئے جانے والے لا قاعدہ کے حملے نے کھول کر رکھ دی ۔اس حملے کے بعد یقیناً ہر امریکی فوجی نے اپنے آپ سے اور ایک دوسرے سے یہ کہا ہوگا کہ اگر یہ احمق یہاں نہیں آتا تو اچھا تھا ممبئی کی زبان میں کہیں تو 'کھایا پیا کچھ نہیں گلاس پھوڑا بارہ آنا

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنی فوجوں کی موجودگی کے باوجود امریکی صدر کو اس طرح کے اچانک اور خفیہ دورے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے ؟اس سوال کا سہل ترین جواب یہ ہے امریکی صدر اپنی سیاسی ضرورت کے پیش نظر یہ سب کرتا ہے ۔امریکہ کے صدراتی انتخاب اب صرف ٦ ماہ کا قلیل فاصلے پر ہیں ۔ان انتخاب میں کامیابی کا منصوبہ .براک اوبامہ نے ایک سال قبل بنایا اور اسامہ بن لادن کے نام پر نہ جانے کس غریب کو ہلاک کر دیا۔ اس سے .براک اوبامہ نے دو فوائد حاصل کئے اول تو ڈرون حملوں کی مدد سے پاکستانی عوام پر کئے جانے والے سارے مظالم کا جواز فراہم ہو گیا اس اعلان کے ساتھ اسامہ پاکستان میں پناہ گزین تھا دوسرے جس کام کو ریپبلکن پارٹی اپنے دور اقتدار کے ٨ سالوں میں نہیں کر سکی اس کے کر گزرنے کا کریڈٹ بھی مل گیا۔ ریپبلکن اس کی تردید اس لئے نہیں کر سکتے تھے کہ خود ان لوگوں نے اسامہ بن لادن کی اصلی موت کی خبر پر پردہ ڈال کر برسوں ان کے نام سے امریکی عوام کو خوفزدہ کرکے اپنے سیاسی مفادات

حاصل کیے۔

دنیا بھر کی جمہوری سیاست میں بشمول امریکہ کے سنجیدہ مسائل سے صرفِ نظر کرکے جذبات کو ہوا دینے کا رجحان عام ہے اور ایسا رویہ خاص طور پر برسرِ اقتدار جماعت کی جانب سے اپنی ناکامیوں کی پردہ پوشی کے پیشِ نظر اختیار کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی دونوں بڑی جماعتیں اس معاملے میں یکساں مجرم ہیں۔ جارج ڈبلیو بش نے عراق کے شعلوں کو ہوا دے کر دوسری بار کامیابی حاصل کی حالانکہ اس وقت امریکی معیشت کے بحران کا آغاز ہو چکا تھا۔ بیروزگاری میں اضافہ ہونے لگا تھا اس کے باوجود اس نے غریبوں کو حاصل مراعات میں کٹوتی کی اور امیروں پر سہولیات کے ڈونگرے برسائے۔ اوبامہ نے جب میک کین کے خلاف اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو عوام کی فلاح و بہبود پر اپنی توجہ مرکوز کی اور عظیم تبدیلی کا وعدہ کیا۔ اوبامہ کا نعرہ تھا 'ہم یہ کر سکتے ہیں' پریشان حال عوام اس کے جھانسے میں آگئے اور ان کے دلوں میں امید کی ایک شمع روشن ہو گئی۔ لوگوں بڑھ چڑھ کر اوبامہ کی حمایت کی اور بڑے زور و شور کے ساتھ وہ اقتدار پر قابض ہو گئے لیکن اس کے باوجود نہ معاشی اصلاحات ہوئیں اور امریکہ کی غریب عوام کے دن نہیں بدلے بلکہ اعداد و شمار اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ صورتحال مزید سنگین ہو گئی ہے۔

امریکی حکومت کا خسارہ لگاتار چوتھے سال ایک لاکھ کروڑ ہے اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے میں اوبامہ پوری طرح ناکام رہے۔ سرکاری اخراجات جو گزشتہ سال کل قومی آمدنی کا ۲۰ فیصد تھے وہ اب بڑھ کر ۲۳٫۵ فیصد ہو گئے ہیں یہ تشویشناک ہے۔ اوبامہ قرض کا بوجھ تو ہلکا نہ کر سکے ہاں اس پر لگی پابندی کو بڑھانے میں کامیاب ہونے لگے ورنہ امریکہ کے دیوالیے پن کا باقاعدہ اعلان ہونے لگتا۔ وہ ٹیکس کی شرح میں اضافے کی خاطر بش کی پابندی کے خاتمے کا انتظار کر رہے ہیں لیکن ان کے مخالف مٹ رومنی بھی ان ان اصلاحات کے حامی ہیں اس لئے اس بابت انہیں کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے اور پارلیمان میں موجود ریپبلکن کی حمایت سے فیصلہ ہوا ہے اس لئے اس کا کریڈٹ لینے کا حق ریپبلکن پارٹی کو حاصل ہے۔ اس دوران امریکی معیشت کی ابتری کا ایک ثبوت ان دونوں جماعتوں کا آئندہ دس سال تک کے فوجی اخراجات میں ۴۸٫۷ لاکھ ڈالر کی کٹوتی پر بھی اتفاق ہے۔

ان اعداد و شمار کی روشنی میں اس بات فیصلہ کرنا کوئی مشکل کام نہی ہے کہ براک اوبامہ عوام کی امیدوں پر پورا نہیں اتر سکے۔ اس کا علم خود انہیں بھی ہے اس کے باوجود وہ ایک مرتبہ اور صدر بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انتخاب سے پورے دو سال قبل اوبامہ نے اپنی انتخابی حکمتِ عملی کو آخری شکل دے دی اور اسامہ بن لادن کے قتل کا ناٹک رچایا۔ ایک سال تک عوام کو یہ باور کرایا

گیا کہ یہ عظیم کارنامہ خود صدر صاحب کی نگرانی میں انجام دیا گیا ہے اور اس کے ذریعہ امریکی عوام کی سب سے بڑی خدمت انجام دی گئی ہے حالانکہ اوبامہ نے انتخابی مہم کے دوران جو حسین خواب دکھلائے تھے ان میں تو معیشت کا احیاء، طبّی سہولیات کی فراہمی ۔عوام کے ٹیکس میں کٹوتی جیسے وعدے سرفہرست تھے لیکن جب ان میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوسکا اس لئے کہ وہ ان لوگوں کے مفادات سے ٹکراتا تھا جن لوگوں نے انتخاب لڑنے کیلئے چندہ دیا تھا تو پھر شروع ہوگیا جذباتی استحصال کا پرانا کھیل ۔ فلمی انداز کا حملہ ۔ لاش کو دریا برد کیا جانا اور اب اس واقعہ کی سالگرہ کے موقع پر کابل کا دورہ۔ یہ سب سیاسی شعبدہ بازی نہیں تو اور کیا ہے کہ وابامہ نے اپنے خفیہ کابل کے دورے کیلئے اسی تاریخ کا انتخاب کیا اور اس کا پھر ایک بار کریڈٹ لینے کی کوشش کی حالانکہ وہ ایک قابلِ فخر نہیں بلکہ لائقِ شرم واقعہ تھا۔

فیڈل کاسٹرو نے کہا تھا کسی بھی نہتے شخص کو گرفتار کرنے کے بجائے اس کے اہل خاندان کے سامنے اسے ہلاک کر دینا کوئی دلیری نہیں ہے ۔ اس سے آگے بڑھ کر معروف یہودی مفکر نام چومسکی نے یہاں تک کہا تھا کہ ہمیں (یعنی امریکی عوام کو) یہ سوچنا چاہئے کہ اگر عراق سے کچھ حملہ آور آکر جارج بش کے کمپاؤنڈ پر دھاوا بول دیں اور اسے مار کر اس کی لاش کو سمندر میں پھینک دیں تو ہمیں کیسا لگے گا ؟ لیکن سچ تو یہ ہے کہ امریکی معاشرے نام چومسکی

جیسے لوگوں کی جانب توجہ دینے والے بہت کم ہیں اور براک اوبامہ جیسے بازیگروں کے بہکاوے میں آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ اس بات کو بھی نہیں سمجھتے کہ براک اوبامہ کے واپس لوٹتے ہی کابل پر طالبان کو جو زبردست حملہ ہوا ہے وہ کس بات کا ثبوت ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گیا یا کہ وہ بارہ سال بعد بھی پوری طرح ناکام و نامراد رہا ہے؟

اوبامہ کے مخالف مٹ رومنی نے ۲۰۰۷ء میں ایک سمجھداری بات کہی تھی کہ کسی ایک فرد کو گرفتار کرنے کی خاطر آکاش پاتال کو ایک کردینا اور کروڈہا کروڈ ڈالر خرچ کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ وہ قیمت چکائے گا اور اپنی موت مرے گا۔ فی الحال اوبامہ اور اس کے حواری اس بیان کی سیاست کھیل رہے ہیں۔ اوبامہ کا کہنا ہے کہ میں نے کہا تھا اگر مجھے اطلاعت موصول ہوں گی تو اقدام کر گزروں گا اور میں نے ایسا کیا لیکن جو لوگ کچھ کہتے تھے بتلائیں کے اب کیا کہتے ہیں۔ ان پارٹی اشتہار بازی کر رہی ہے کہ کیا کیا رومنی میں ایسا اقدام کرنے کی ہمت ہے؟ اس کے جواب میں ریپبلکن کا کہنا ہے کہ یہ تو کوئی بھی کرسکتا تھا۔ جمی کارٹر جیسا کمزور ڈیموکریٹ بھی اس معاملے میں پس وپیش نہیں کرتا۔ گویا اب انتخابی مہم کو جان بوجھ کر عوام کے اصلی مسائل سے دور لے جانے کی کوشش اوبامہ کی جانب سے کی جارہی ہے۔ سیاسی مبصرین کا

دعویٰ ہے کہ اوبامہ اور رومنی کی مقبولیت کے درمیان فرق نہایت معمولی ہے۔
اگر کامیابی و ناکامی کا درومدار اس بات پر ہے انتخاب میں مرکزیت کس مسئلے کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر اسامہ کا مسئلہ چل جاتا ہے تو اوبامہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور اگر معیشت پر انتخابات لڑے جاتے ہیں تو رومنی کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔
فرانس کے انتخابات نے یہ ثابت کردیا کہ سرکوزی بین الاقوامی سطح پر تین بڑی کامیابیوں کے باوجود عوام کو متاثر نہیں کرسکے اور داخلی محاذ پر ان کی ناکامی انہیں لے ڈوبی۔برطانیہ کے حالیہ مقامی انتخابات میں برسراقتدار جماعت کی ناکامی اور لیبر پارٹی کی کامیابی بھی اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ عوام اب اپنے بنیادی مسائل کی جانب سنجیدہ ہو رہے۔ معاشی بحران یوروپ کے ۱۱ سربراہاں کو نگل چکا ہے۔اس لئے اوبامہ کی حتی الامکان یہ کوشش ہے کہ عوام کو ورغلا کر ان سے دور رکھا جائے۔اس کے برعکس ریپبلکن امیدوار میٹ رومنی کی انتخابی مہم کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام مسائل جن کو گزشتہ انتخاب میں اوبامہ اٹھا رہے تھے وہ اب رومنی کی زبان پر ہیں۔
رومنی سوال کرتے ہیں کہ اوبامہ کو اسامہ کے بجائے یہ بتلانا چاہئے کہ وہ

بسترِ مرگ پر پڑی معیشت کی صحت بحال کرنے کیلئے کیا کریں گے ؟ یہ سوال اب پوری طرح بے معنی ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر رومنی اقتدار میں ہوتے تو وہ اسامہ کے قتل کے احکامات جاری کرتے یا نہیں ؟ ہزاروں کلومیٹر دور محفوظ مکانات میں بیٹھ کر کسی کمپاؤنڈ پر اپنے دہشت گردوں کے ذریعہ حملہ کروا دینا کو دلیری نہیں ہے ۔ لیکن اوبامہ کے پاس رومنی کے سوالات کا جواب نہیں ہے اس لئے وہ رومنی پر ذاتی قسم کے حملے کرنے لگ گئے ہیں ۔ ان کی دولت کس قدر ہے ؟ انہوں نے ٹیکس کس شرح سے ادا کیا ۔ ان کی وجہ سے کتنا کام دیگر ممالک میں گیا اوراس سے کس قدر بے روزگاری بڑھی وغیرہ وغیرہ۔امریکہ میں ہوتا یہ ہے کہ مسائل موجود رہتے ہیں لیکن غلط ہاتھوں میں جس کے پاس اقتدار نہیں ہوتا وہ ان کا شور مچا کر عوام کی ہمدردیاں جمع کرتا ہے تاکہ اقتدار حاصل کرلے اگر کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ان کو بھلا دیتا ہے اور اگر ناکام ہو جاتا ہے تو ان کی گردان جاری رکھتا ہے ۔ اوبامہ نے بھی یہی کیا اور رومنی بھی یہی کر رہا ہے ۔ انتخابات آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے عوام کے نمائندوں کے مسائل حل ہو تے رہیں گےان کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا رہے گا اور عوام کی بدحالی بڑھتی رہے گی ۔ ساتھ ہی جمہوریت کا بول بالا ہوتا رہے گا۔

اہل مغرب سے اگر دریافت کیا جائے کہ سیاست کی تعریف کیا ہے تو جواب ملے گا

یہ ایک ایسا عمل ہے۔جس سے قانون کے مطابق عوامی معاملات کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔مغرب میں زمانۂ تک قانون نام کی کسی چیز کا وجود نہیں تھا اور حکمرانِ وقت کی من مانی ہی دستور حیات ہوا کرتی تھی ۔اس زمانے کو مغربی دانشور تاریک دور کے نام سے منسوب کرتے ہیں ۔اس لئے بعد میں جب تہذیب و تمدن کی دھندلی سی روشنی آئی اور نظام سیاست کو وضع کیا گیا تو اس میں قانون اور دستور کی بالاتری پر زور بہت دیا گیا ۔سیاست کی یہ تعریف کسی خاص نظام حکومت کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق سبھی نظامہائے سیاست پر ہوتا ہے گویا فنِ حکمرانی ہی دراصل سیاست ہے۔اسی لئے امور مملکت کا نظم و نسق برقرار رکھنے والوں کو سیاستدان کہا جاتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ پولیٹکس کا پیشہ اختیار کرنے والوں کیلئے مغرب میوزیشین سے مشابہ پولیٹی شین کی اصطلاح وضع کی ۔ایسا لگتا ہے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سیاستداں بھی آگے چل کر موسیقاروں کی مانند نت نئے راگ الاپ کر عوام کی تفریح طبع کا سامان بہم پہنچائیں گے ۔

مغرب کے دانشوروں سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ تمام نظامہائے سیاست میں بہترین نظام کون سا ہے تو سب بیک زبان ہو کر یہ کہیں گے نظامِ جمہوریت۔شاید اس لئے کہ اس نظام کے تحت کام کرنے والے سب سے اعلیٰ اورارزاں تفریح فراہم کرتے ہیں لیکن اس حقیقت کا براہِ راست اعتراف کرنے کے بجائے یہ کہہ دیا

جاتا ہے جمہوریت ایک ایسا سیاسی طریقۂ کار ہے جس میں حکومتی فیصلے عوامی رائے عامہ کی روشنی میں عوام کے مفاد کی خاطر ان کے نمائندوں کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔ویسے تو یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ جمہوری عمل میں کامیاب ہونے والے نام نہاد نمائندوں کو عوام کی اکثریت کی نہیں بلکہ سب سے بڑی اقلیت کی حمایت حاصل ہوتی ہے جسے اکثریت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ وہ نمائندے کسی سرکاری فیصلے کو کرنے کیلئے عوام کی رائے لینا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اگر ہندوستانی جمہوریت ہو تو اپنے ہائی کمانڈ کے تابع و فرمانبردار ہوتے ہیں اور اگر امریکی ہو تو بڑے بڑے سرمایہ داروں کے احکامات کی تعمیل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جیسا کہ بش اور اوبامہ کے کردار سے واضح ہے ان دونوں کا عوام کے مفاد سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔دنیا بھر کے جمہوری اتھل پتھل کو دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا سیاستداں مداری بنے ہوئے ہیں اور پارٹی کے کارکنان کو انھوں نے اپنا جمہورا بنا رکھا ہے اور یہ دونوں مل کر عوام کو ہاتھ کی صفائی سے نظر بندی کے کھیل میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔نہ جانے کیسے کسی منچلے نے مداری کے نائب کو جمہورا کا نام دے دیا یقیناً وہ شخص جمہوری نظام کی اصلیت سے واقف رہا ہوگا۔

مغرب میں رائج جمہوری نظام کی بنیاد کا پتھر مشہور زمانہ میگنا کارٹا کو قرار دیا جاتا ہے جس کی داغ بیل ۱۲۱۵ء میں کچھ اسی طرح سے پڑی کہ برطانوی بادشاہ

جان کی اوٹ پٹانگ حرکات سے اس کی عوام تو کجا مصاحبین بھی پریشان تھے اور ایسے میں درباریوں نے اپنے آپ کو آئے دن ہونے والی زیادتی سے محفوظ رکھنے کی خاطر چند حقوق کو تسلیم کروایا جس سے حکمراں کے اختیارات میں کسی حد تک تحدید کی گئی۔ یہ سلسلہ جاری و ساری رہا آگے چل کر عام انسانوں کے بنیادی حقوق کا تعین پر منتج ہوا ۔یہی فرانس کے انقلاب کا سبب بنا اور پھر سیکولر جمہوری نظام کے تحت ایک دستور کو بالا دستی حاصل ہوئی۔ حالانکہ اس سے نصف صدی قبل مدینہ میں ایک ایسی ریاست عملاً قائم کر دی گئی تھی۔ جس میں نہ صرف خواص بلکہ عوام کے حقوق کو مکمل طور محفوظ کر دیا گیا تھا اور ایسا دائمی الہامی دستور نافذ کردیا گیا تھا جس میں ذرہ برابر کمی بیشی کی اجازت نہ تو عوام کو تھی اور نہ ان کے حکمرانوں کو۔ یوروپ کا جب اسلام سے سابقہ پیش آیا تو اس کے علماء اور دانشوروں نے مسلمانوں سیاست سیکھی اور ظلمات سے نور کی جانب سفر کا آغاز کیا لیکن درمیان میں بھٹک گئے لیکن جب مسلمانوں نے انگریزوں سے سیاست کا سبق یکھنا شروع کیا تو وہ اجالے سے اندھیروں کی جانب نکل گئے اور اب حال یہ ہے کہ ہم بھی ان کی مانند دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

"خواتینِ مغرب" ان کو آزاد کون کرتا ہے؟

امریکی انتظامیہ نے ابھی حال میں جن تیرہ لوگوں کو حریت کے قومی صدارتی اعزاز سے نوازنے کا فیصلہ کیا ان میں ایک میڈیلین البرائٹ بھی ہے۔ یہ وہی بدنامِ زمانہ خاتون ہے جس نے عراق پر معاشی پابندیوں کے حوالے سے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں یہ تسلیم کیا تھا کہ عراق پر پابندی لگانا ایک مشکل فیصلہ تھا (اس لئے کہ اس کے نتیجے میں پانچ لاکھ بچوں کو ادویات کی غیر فراہمی کے باعث جان گنوانی پڑی) اور ہم اسکی قیمت جانتے تھے لیکن اس قیمت کو ادا کرنا واجبی تھا "۔ البرائٹ اسٹیٹ سکریٹری کی حیثیت سے عراق پر معاشی پابندیاں عائد کرنے میں پیش پیش تھیں۔ اس سے قبل جب وہ اقوام متحدہ میں امریکی سفیر تھیں تو اس وقت انہوں نے اپنے ایک سفاکانہ بیان میں کہا تھا" آئندہ نسلوں کو جنگ سے بچانے کیلئے مخالفین کو زندہ رہنے کے تمام وسائل سے مرحوم کرنے کی ایک نئی حکمت عملی اپنائی جانی چاہئے ۔ ۱۹۹۳ء کے اندر جو کچھ اس نے کہا ۱۹۹ء کے بعد اس پر عملدرآمد کرکے دکھلادیا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ میڈیلین کو جنگ کے مصائب کا علم نہیں تھا۔ اس نے بچپن میں دوسری جنگِ عظیم کو دیکھا جبکہ نہ صرف اس کے وطن چیکوسلواکیہ پر بلکہ

اس کے اپنے گھر پر بھی جرمن قوم نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے سفارتکار والد کے ہمراہ برطانیہ میں مقیم تھی۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں پر بنی ایک دستاویزی فلم میں البرائٹ نے جنگ کے دوران بچوں کی حالتِ زار کو نہایت پر سوز انداز میں بیان کیا تھا لیکن آگے چل کر موصوفہ نہ صرف بچوں کی بلکہ ان ماوں کی بھی دشمن بن گئی جن کے بچے جان بچانے والی دوائیوں سے تک محروم کر دیے گئے۔ فی الحال میڈیلین اقوام متحدہ کے پسماندہ ممالک میں خواتین کو قانونی تحفظ عطا کرنے کی خاطر کام کرنے والے کمیشن کی مشترکہ چیرمین ہیں۔ جس عورت نے لاکھوں خاندانوں کو اجاڑا ہے کیا وہ اس عہدے کی مستحق ہے ؟ ایک انصاف پسند شخص اس سوال کا مثبت جواب کبھی بھی نہیں دے سکتا لیکن مغرب کا معیارِ حق عدل کے بجائے ظلم پر مبنی ہے، اسی لئے البرائٹ کو ۲۰۰۶ء میں یوروپ کا معروف مینشین ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ مغربی دنیا میں قومی اور عالمی اعزاز اسی طرح کے لوگوں کی خاطر مختص ہیں۔ یہ ایسے اقدامات ہیں جن کے ذریعہ اہلِ مغرب اپنے اصلی چہرے کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔

صدر اوبامہ نے میڈیلین کو اعزاز سے نوازنے کا جواز فراہم کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان کی مشرق وسطیٰ میں امن کی بحالی کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں کا اعتراف ہے وہ عرصہَ دراز تک جمہوریت اور انسانی حقوق کی علمبردار رہی ہیں۔ امریکی صدر کے مطابق انہوں نے دنیا کو رہنے کیلئے ایک بہتر مقام بنایا ہے

اور یہ ایک بڑی مہم تھی جسے البرائٹ نے سر کرتے ہوئے امن عالم کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک طرف میڈیلین کے جنگی جرائم ہیں اور دوسری جانب ان کی پذیرائی اس بات کی غماز ہے کہ امریکہ کے نزدیک آزادی و انسانی حقوق کے معنی کیا ہیں اور وہ امن عالم سے کیا مراد لیتے ہیں؟ میڈیلین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "جہنم میں ان خواتین کیلئے ایک خاص جگہ ہے جو دوسری خواتین کی مدد نہیں کرتیں" میڈیلین نے عراقی خواتین کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے اس کے باعث وہ کسی قومی اعزاز کی نہیں بلکہ جہنم کے مذکورہ گوشے میں خصوصی مقام کی مستحق قرار پاتی ہیں۔

امریکی انتظامیہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ساری دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کے چکر میں ان لوگوں نے خود اپنے ملک کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ خیالی دشمنوں کا مقابلہ کرتے کرتے وہ خود اپنے دشمن بن گئے ہیں امریکہ کی موجودہ صورتحال گویا خمار بارہ بنکوی کے اس شعر کی مصداق ہو گئی ہے

چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں

نیا ہے زمانہ، نئی روشنی ہے

اگر کسی کو مذکورہ دعویٰ پر یقین نہ آتا ہو تو وہ گزشتہ دنوں نیویارک کے روشسٹر نامی علاقے میں رونما ہونے والے ایک اندوہناک واقعہ کی تفصیل معلوم

کر لے۔ یہ ایک ایسی وحشیانہ سفاکی کا مظاہرہ تھا جس کا تصور کسی جنگل میں بھی نہیں کیا جاسکتا۔بوبی سگلر نامی ایک ۳۱ سالہ خاتون کو روشسٹر شہر کی عدالت میں پیش کیا گیا اس پر آگ زنی اور اپنے چار بچوں کو زندہ جلانے کا الزام ہے۔ یہ آگ دو منزلہ رہائش گاہ کی عمارت میں رات ایک بجے لگی اور آگ بجھانے والے دستے کے سر براہ جان کا فیلڈ کے مطابق یہ حادثاتی طور پر نہیں لگی بلکہ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ اس آگ میں بوبی کے چار بیٹے گیج ریوئے، کریگ سگلر، کنڈی سگلر، کیدن سگلر جن کی عمریں بالترتیب ۱۲، ۱۳، ۱۴ اور ۶ سال تھی جل کر ہلاک ہوگئے۔ان کے علاوہ آگ بجھانے والوں نے بوبی کے ۲ سالہ بیٹے ٹائرن جیکسن سمیت اسے بچالیا۔ان کا ایک خاندانی دوست اور دو نوجوان جو عمارت کی چھت پر سو رہے تھے کود کر بھاگ گئے۔

یہ واقعہ بذات، خود مرض نہیں بلکہ اس بیماری کی ایک علامت ہے جس سے آج امریکی معاشرہ دوچار ہے۔ پسماندہ ممالک میں غربت و افلاس سے دوچار والدہ کے اپنی اولاد کو ہلاک کرکے خود کشی کر لینے کے واقعات کبھی کبھار منظرِ عام پر آجاتے ہیں لیکن ۳۱ سالہ بوبی کا شاندار گھر اس کی خوشحالی کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔بوبی کے مسائل مالی نہیں بلکہ نفسیاتی نوعیت کے تھے۔ ۱۷ سال کی عمر میں وہ گیج کی ماں بن گئی اور نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ گیج کے باپ کا خاندانی نام ریوے تھا، سب سے چھوٹے بیٹے کے والد کا خاندانی نام جیکسن

ہے اور درمیان کے تین بچوں کے ساتھ خود بوبی کا اپنا خاندانی نام لگا ہوا ہے۔ ناموں پر غور کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ بوبی نے اپنی نصف عمر کن مشکلات میں گزاری ہوگی اور بالآخر وہ اپنے آپ سے اس قدر مایوس ہو گئی کہ اس نے اپنے تمام بیٹوں کو ہلاک کرکے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے ہاتھوں سے اپنا جہان اجاڑ دیا۔

کسی ایسے معاشرے میں جہاں ایک بڑی تعداد تنہا ماؤں کی پائی جاتی ہے۔ جہاں مرد خواتین کو اپنی خواہشاتِ نفس کا شکار بنا کر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں مرد اپنی پدرانہ ذمہ داریوں سے منہ چراتے ہیں وہاں اگر بوبی جیسی عورت اس طرح کی سفاکی کا اظہار کردے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن اس مایوسی اور سفاکی قیمت ان معصوم بچوں کو بھی چکانی پڑتی ہے جن کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ میڈلین البرائٹ اگر اقوامِ متحدہ میں بیٹھ کر ساری دنیا کی پسماندہ خواتین کو ان کے قانونی حقوق بحال کرنے کے بجائے خود اپنے ملک میں پھیلی ہوئی بے شمار بوبی جیسی خواتین کی جانب توجہ دیں تو یہ قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی اس لئے کہ یہ کوئی معمولی عذاب نہیں ہے جس میں ایک ماں اپنی اس اولاد کو اپنے ہاتھوں سے آگ کے الاؤ میں جھونک دے جن کی پرورش اس نے اپنے خونِ جگر سے کی ہو۔

ایک طرف امریکی معاشرت کے یہ سنگین مسائل ہیں اور دوسری جانب امریکی سیاست کی وہ مجبوریاں جنھوں نے صدر وابامہ کو ہم جنس شادی کا حامی بنا دیا ہے۔ امریکہ کی تاریخ میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ کسی صدر کی جانب سے اس غیر فطری حرکت کی بیانگِ دہل حمایت کی گئی ہو۔ براک اوبامہ نے کمال بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ ان کی بیٹیوں نے انہیں اس مسئلہ کو سمجھنے مدد کی۔ اس طرح کی غیر فطری فیصلے بوبی جیسی خواتین کے مسائل میں مزید اضافہ کا سبب بنیں گے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں تعدد ازدوج ممنوع ہے مرد کسی مرد سے بیاہ رچا کر اپنی ازدوجی ذمہ داریوں سے جان چھڑا لے گا۔ خواتین کو خواتین سے شادی رچانے کی ترغیب دی جائیگی لیکن چونکہ جنسی بے راہ روی کے نتیجے میں مردوزن کا اختلاط جاری رہے گا اس لئے حرام اولاد وجود میں آتی رہیں گی اور ان کی کفالت کی ساری ذمہ داری خواتین ہی کے سر منڈھتی رہیگی جس کے نتیجے میں بوبی کگلر جیسی خواتین خودکشی کرتی رہیں گی مگر میڈیلین البرائٹ جیسی خواتین کو قومی اعزاز سے نوازہ جاتا رہے گا۔

مغرب کے اخلاقی انحطاط کا ایک اور ثبوت فرانس میں کا معاشرہ ہے جہاں سابق صدر نکولس سرکوزی عرصۂ دراز تک خاتون اول کے ساتھ بغیر نکاح کئے زندگی گزارتا رہا اور اسے اپنے ساتھ غیر ملکی دوروں پر بھی لے جاتا رہا لیکن آگے چل کر اسے محسوس ہوا کہ شاید اس کا یہ رویہ انتخابات پر منفی نتائج مرتب

کرے گا اس لئے اس نے کیتھولک چرچ میں جا کر نکاح کر لیا۔ سرکوزی کے خلاف ابتداء میں ڈومنیق اسٹراس کاہن کا نام بڑے زور شور کے ساتھ سامنے آیا وہ آئی ایم ایف کا سربراہ تھا۔ اول تو اس شخص پر نیویارک کے ایک ہوٹل میں صفائی کرنے والی ملازمہ پر دست درازی کا الزام لگا اور پھر فرانس کی ایک مصنفہ ٹرسٹان بنون نے عصمت دری کا الزام لگایا۔ آگے چل کر اسے بردہ فروشی کے ایک بین الاقوامی ریکٹ میں ملوث پایا گیا ۔فرانس کے قانون میں عصمت فروشی کی قانوناً اجازت ہے اور ہر شخص اپنے

لئے دولت کے عوض جسم خرید سکتا ہے لیکن کسی اور کی خاطر یہ نہیں کر سکتا۔ایسا کرنے کی سزا ۲۰ سال قید اور بھاری جرمانہ۔ کاہن اس عجیب و غریب منافقانہ قانون کی زد میں آگیا۔ اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ جنسی بے راہ روی کا اعتراف کرتے ہوئے اسے صرف اخلاقی غلطی قرار دیتا ہے مگر کوئی جرم تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس نے امریکی ملازمہ پر ہتک عزت کا دعویٰ بھی کر دیا ہے۔

کاہن کے میدان سے ہٹ جانے پر سوشلسٹ پارٹی نے فرانسوا اولاند کو اپنا امیدوار بنایا جو بالآخر کامیاب بھی ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے سرکوزی کی ناکامی کو اس کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے فرانسیسیوں کی ناراضگی پر محمول کیا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ محض خوش فہمی تھی اس لئے کہ نو منتخبہ صدر بھی نکاح کے بغیر عرصہ تک معروف سوشلسٹ رہنما سیگولن رویال کے ساتھ بغیر نکاح

ے زندگی گزارتے رہے اور چار بچوں کی پیدائش کے بعد ان دونوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔ رویال نے فرانس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ صدرات کی امیدواری حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اولاند نے اسے ناکام کر دیا۔آج کل فرانسو اولاند ۴۲ سالہ فیلیری ٹرائیرولر کے ساتھ بغیر نکاح کے زندگی بسر کر رہے ہیں جن کی دو بار طلاق ہو چکی ہے اور وہ نوجوان بچوں کی ماں ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ اولاند نے اپنی کیبنٹ میں تو ۵۰ فیصد خواتین کو شامل کر لیا لیکن اپنے گھر کے اندر فیلیری کو شریک حیات بنانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔اس لئے فرانس کی خاتونِ اول ایک بیوی کو حاصل احترام و عزت سے محروم ہے۔

یہ برائی فرانس میں اس قدر عام ہے کہ ۵۰ فیصد سے زیادہ جوڑے رشتہ ازدواج کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں۔ مغرب میں خواتین کی حالتِ زار پر شہناز نبی کی نظم معصوم بھیڑیں' حرف بحرف صادق آتی ہے'

اک چراگاہ

سو چراگاہیں

کون ان ریوڑوں سے گھبرائے

پڑ گئیں کم زمینیں اپنی تو

کچھ سفر کچھ حضر کا شغل رہے

کچھ نئی بستیوں سے ربط بڑھے

ان کو آزاد کون کرتا ہے
یہ بہت مطمئن ہیں تھوڑے میں
اک ذرا سا گھما پھرا لاؤ
کچھ ادھر کچھ اُدھر چرا لاؤ
بھیڑیں معصوم
بے ضرر سی ہیں
جس طرف ہانک دو
چلی جائیں

مغربی تہذیب نے فی الحال اپنے آپ کو قانونِ فطرت کے خلاف ایک عجیب و غریب جنگ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ایک جانب وہاں ہم جنسوں کے ازدواجی حقوق پر ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ اس پر جی بھر کے سیاست کی جاتی جو عمل فطرت کے عین خلاف ہے اسے جائز قرار دیا جاتا ہے وہیں دوسری جانب زن و شو کے درمیان نکاح کا مقدس رشتہ کو بے معنی قرار دے کر اسے پامال کیا جاتا ہے۔ ایک طرف حجاب کی ملامت کی جاتی ہے اور دوسری جانب بے حیائی و عریانیت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اقوامِ مغرب فی زمانہ برضا و رغبت قومِ لوط پر برسنے والے عذاب کا انتظار کر رہی ہیں۔ جب ان سے حضرت لوطؑ کے الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ ”کیا تم آنکھوں دیکھتے بدکاری کرتے ہو؟ تو ان کا جواب ہوتا ہے

''نکال دو لوطؔ کے گھر والوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں''

بنگلہ دیش: کبھی یہ شہر میرا تھا، زمین میری تھی

انسانی تاریخ وہ مناظر دکھلاتی ہے جو کبھی کسی کے خواب و خیال میں نہیں ہوتے مثلاً کون سوچ سکتا تھا کہ جو امریکی بحری بیڑہ بنگلہ دیش کو عالمِ وجود میں آنے سے روکنے کیلئے چلا تھا وہ اکتالیس سال کے انتظارِ بسیار کے بعد بالآخر جب چٹاگانگ کے قریب مینگ جی نامی جزیرے پر پہنچے گا تو اس کا خیر مقدم کیا جائیگا اور بنگلہ دیش میں امریکہ کو فوجی اڈہ قائم کرنے کی اجازت حاصل ہو جائیگی۔ سقوطِ پاکستان یا بنگلہ دیش کی آزادی کے دن وہ ڈھاکہ سے ۱۷۰ کلومیٹر کے فاصلے پر خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ ساری دنیا حیرت زدہ تھی کہ آخر پاکستان کے اس حلیفِ اعظم نے آزمائش کی اس نازک گھڑی میں تاخیر کیوں کی؟ لیکن گزشتہ دنوں امریکی انتظامیہ نے جو محفوظ دستاویزات کو عوام کیلئے جاری کیا تو پتہ چلا کہ وہ وہ تاخیر سہواً نہیں بلکہ عمداً تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی بحری بیڑے کی نقل و حرکت کا مقصد سرے سے پاکستان کی مدد کرنا تھا ہی نہیں۔ وہ تو چین کی مدد کیلئے آیا تھا اتفاق سے اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی لیکن اب قدرت کا ایک اور کرشمہ دیکھئے کہ اس بار وہ بنگلہ دیش میں چین پر نگاہ رکھنے کیلئے یا اس خطے میں اس کے اثرات کو زائل کرنے کی غرض سے لنگر انداز ہوا ہے گویا حالات بالکل ہی 'یوٹرن' لے چکے ہیں۔ کل کے دوست آج کے دشمن ہو چکے ہیں۔ آج

نہ صرف چین بلکہ پاکستان کا بھی شمار امریکہ کے دشمنوں میں ہوتا ہے نیز ہندوستان اور بنگلہ دیش جنوب مشرق ایشیا میں امریکہ کے سب سے بڑے حلیف بنے ہوئے ہیں۔ آتش نے کیا خوب کہا تھا

زمینِ چمن گُل کھِلاتی ہے کیا کیا
'بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے'

سرد جنگ کے زمانے میں ۱۹۷۱ء غیر معمولی اہمیت کا سال تھا۔ اس سال ہندوستان نے سوویت یونین کے ساتھ ایک اہم ترین فوجی معاہدے پر دستخط کئے تھے جس نے چین اور پاکستان دونوں کو فکر مند کر دیا تھا۔ امریکہ بھی اس پیش رفت سے گھبرا گیا تھا۔ اس پیش رفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویت یونین کے اثرات کو زائل کرنے کی غرض سے امریکہ نے چین کے ساتھ پینگیں بڑھانی شروع کیں۔ اسی زمانے میں ہنری کسنجر نے چین کا خفیہ دورہ بھی کیا اور چو این لائی و ہنری کی جو گفتگو منظرِ عام پر آئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ چین کو خوف لاحق ہو گیا تھا کہ یہ جنگ پھیل کر اس کیلئے کوئی مصیبت نہ بن جائے۔ اس لئے انہوں نے امریکہ سے مدد مانگی اس کے جواب میں ساتویں بحری بیڑے نے بحر ہند کی جانب کوچ کیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ ۱۳ جون کو واشنگٹن میں امریکہ بھارت کے درمیان اعلیٰ سطحی مذاکرات کی تیاری زور و شور سے چل رہی ہے جس کی صدارت امریکی وزیر خارجہ ہلری کلنٹن اور بھارتی وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا مشترکہ

طور پر کریں گے۔

امریکہ اور بنگلہ دیش کی دوستی کا جواز پیش کرنے والے کالم نویس بنگلہ دیش کا موازنہ پاکستان سے کرتے ہوئے کہتے ہیں بنگالی عوام نے دو قومی نظریہ کو ٹھکرایا ہے۔وہ مزاجاً لامذہبیت کے قائل ہیں مراد اسلام کے دشمن ہیں۔ان کی حکومت نے اسلامی دہشت پسندی کے خلاف گزشتہ تین سالوں سے جہاد چھیڑ رکھا ہے۔ان کے ہندوستان سے نہایت خوشگوار تعلقات ہیں۔اس لئے وہ امریکہ کے فطری ہمنوا ہیں۔یہ احمق دانشور نہ ہی بنگالیوں کی تاریخ و نفسیات سے واقف ہیں اور نہ ہی وہاں کھیلی جانے والی سیاست کو جانتے ہیں۔اس لئے کہ بنگلہ دیش کی امریکہ سے دوستی اتنی حیرت انگیز نہیں ہے جتنا کہ اس کا پاکستان سے الگ ہو جانا ہے۔انگریزوں نے ہندوستانیوں کو آزادی کی شراب پلانے سے قبل ہی انتخابات کا چسکہ لگا دیا تھا اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ صرف بنگال میں اکثریت حاصل کرپائی تھی۔۱۹۴۵ء کے انتخابات میں بھی مسلم لیگ کو اکثریت صرف بنگال اور سندھ میں ملی تھی پاکستان کا دل اور دست و بازو سمجھے جانے والے پنجاب اور صوبہ سرحد سے نہیں۔بلوچستان تو خیر اس وقت اس عمل میں شامل ہی نہیں تھا اور تو اور پاکستان کے اولین وزیر اعظم لیاقت علی خان مشرقی پاکستان کے کوٹہ پر آئے تھے اور ڈاکٹر امبیڈکر کو پارلیمان کی رکنیت دلانے کا سہرہ بنگال کی مسلم

لیگ ہی کے سر ہے۔ تخلیق پاکستان سے قبل متحدہ بنگال کے وزیرِ اعلیٰ فضلِ حق تھے۔ اس زمانہ میں جب بہار کے اندر مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا تو فضلِ حق نے کہا تھا کہ اس کے رد عمل میں ہندوؤں کے خلاف بنگال کے اندر فساد ہو سکتا ہے۔ اس بیان کے بعد بہار میں فسادات کا سیلاب تھم گیا تھا گویا پاکستان بنانے میں بنگال کا حصہ پنجاب سے زیادہ تھا بقول احمد فراز ؂

کبھی یہ شہر میرا تھا، زمین میری تھی
مرے ہی لوگ تھے میرے ہی دست و بازو تھے
میں جس دیار میں بے یار و بے رفیق پھروں
یہاں کے سارے صنم میرے آشنا رو تھے

لیکن پھر ایوب خان کی سفاکیوں، یحییٰ خان کی حماقتوں اور ذوالفقار علی بھٹو کی شرارتوں کے سبب وہ وقت بھی آیا کہ سرزمینِ پاک دو نیم ہو گئی۔ سبز پرچم پر ہلالی خنجر کی جگہ سورج دیوتا نمودار ہو گیا جس کا رنگ سرخ تھا اور احمد فراز کو ڈھاکہ کے میوزیم میں وہ تصاویر دیکھنے پر مجبور ہونا پڑا جن کے بارے میں شاعر کہتا ہے ؂

کہیں مرے سپہ سالار کی جھکی گردن
عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا سماں
مرے خدا میرے بینائی چھین لے مجھ سے

میں کیسے دیکھ رہا ہوں ہزیمت یاراں

کسی زمانے میں بنگلہ دیش کو آزاد کروانے والے شیخ مجیب الرحمٰن کا سر اندرا جی کے آگے فرطِ عقیدت کے ساتھ خم تھا آج ان کی بیٹی حسینہ واجد کا سر امریکیوں کے آگے اسی طرح جھکا ہوا ہے جیسے کبھی جنرل نیازی کی گردن ہندوستانی فوج کے آگے جھکی ہوئی تھی ۔ یہ وہی بد عنوان حسینہ ہے جسے قومی خزانے کو لوٹنے سبب نہ صرف اقتدار سے محروم ہونا پڑا بلکہ جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی اور ایک سال کے بعد جب وہ ۲۰۰۸ء میں جیل سے پیرول پر رہا ہوئی تو لندن کے راستے امریکہ پہنچ گئی ۔ اس وقت تک بنگلہ دیش کی رائے عامہ امریکہ کے خلاف تھی ۔ امریکہ کی عراق فوج کشی کے خلاف زبردست عوامی مظاہرے ہوتے رہے تھے ۔ امریکیوں نے ۲۰۰۱ء میں خوفزدہ ہو کر بنگلہ دیش کو ایک خطرناک ملک قرار دے دیا تھا لیکن شیخ حسینہ واجد کے ساتھ جو عہد وپیان آج سے پانچ سال قبل امریکہ کی سرزمین پر ہوئے تھے، اقتدار پر قابض ہونے بعد بڑی سعادتمندی سے وہ انہیں نبھا رہی ہے ۔

امریکہ کو اس بات علم ہے اس کے استعماری عزائم کو اگر کوئی چیلنج کر سکتا ہے تو وہ اسلام پسند قوتیں ہیں۔اس لئے اس نے حسینہ واجد کو جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے خلاف لگا دیا۔ چالیس سال پرانے جنگی مقدمات کا دفتر کھول دیا

گیا اور اس کے ذریعہ امریکہ مخالف طاقتوں کو دہشت زدہ کر دیا گیا۔ اب صورتحال یہ ہے جماعت کے معصوم رہنما جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں اور امریکی بھیڑیئے دندناتے پھر رہے ہیں۔ ایک جزیرہ دشمن کو سونے کی طشتری پر رکھ فوجی اڈہ بنانے کیلئے دیا جارہا ہے لیکن نہ کوئی پوچھنے والا ہے اور نہ روکنے والا ہے۔

گزشتہ ماہ کے اوائل میں امریکی وزیر خارجہ ہلری کلنٹن نے بنگلہ دیش کا دورہ کیا اور عوام سے کہا کہ وہ اپنی اندرونی رنجشیں بھلا دیں، اس لئے کہ امریکہ بنگلہ دیش سے بہت سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہے۔ ہلری کلنٹن نے اپنے دورے کے پہلے دن ڈھاکہ میں وزیر اعظم شیخ حسینہ اور وزیر خارجہ دیپو مونی سے ملاقات کی، یہ وہی دیپو دیدی ہیں جن سے گزشتہ سال امریکی حکومت نے نیویارک میں جاری اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر کہا تھا کہ وہ طالبان کے خلاف جاری فوجی کارروائی میں حصہ لینے کیلئے اپنے فوجی افغانستان روانہ کرے۔ اس کے بعد بنگلہ دیشی وزرات خارجہ کی طرف سے جاری کردہ ایک بیان میں اعتراف کاک گیا تھا کہ ڈھاکہ حکومت امریکہ کی درخواست پر غور کر رہی ہے۔ ڈھاکہ حکومت کی طرف سے اس درخواست پر غور کرنے کے اعلان کے بعد ہی افغان طالبان نے بنگلہ دیش کی حکومت کو خبردار کیا تھا بنگلہ دیش افغانستان میں فوج بھیجنے کی تاریخی غلطی سے گریز کرے۔ امریکہ کی جانب سے کئے جانے والے اس

بیجا مطالبے پر غور کرنا خود اپنے آپ میں ایک شرمناک حرکت ہے۔

بنگلہ دیش دورے کے دوران امریکی وزیر خارجہ نے حسینہ واجد کے علاوہ حزب مخالف کی رہنما بیگم خالدہ ضیا سے بھی ملاقات کی اور مختلف اسٹریٹجک اور معاشی تعاون کے امور پر گفتگو کی۔بنگلہ دیش کے اندر امریکی سرمایہ کاری اور وہاں کی منڈیوں میں زیادہ سے زیادہ رسائی پر بھی غور ہوا لیکن ذرائع ابلاغ میں زیر بحث حزب مخالف کے رہنماؤں کی گمشدگیوں کے معاملہ پر مکمل خاموشی چھائی رہی۔ اس سال ۲۲ سیاسی رہنماوں کے غائب ہونے کو بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیموں نے تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی جانب سے قائم کردہ وہ بدنامِ زمانہ ٹریبونل ہے جس کی بابت نیویاک میں قائم انسانی حقوق کی تنظیم ہیومن رائٹس واچ کہہ چکی ہے کہ حکومت کی جانب سے قائم کردہ جنگی جرائم کے ٹریبونل کا قانونی طریقہ کار بین الاقوامی معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ اگر ملزموں کے ساتھ بین الاقوامی معیار کے مطابق انصاف کرنا ہے تو ٹریبونل کو اپنے طریقۂ کار میں تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ جنگی جرائم کے تحت گرفتار ہونے والوں میں نہ صرف جماعت اسلامی بنگلہ دیش بلکہ ملک کی سب سے بڑی اپوزیشن بنگلہ دیشی نیشنل پارٹی کے رہنما بھی شامل ہیں۔ تمام ملزمین نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ حکومت ان کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہی ہےاور اس نے اپنے سیاسی مخالفین کو نشانہ بنانے کے لیے مذکورہ ٹریبونل قائم

کر رکھا ہے۔لوگ یہ توقع کر رہے تھے کہ ہلری کلنٹن اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کریں گی لیکن انہوں نے بند کمرے میں فوجی اڈہ قائم کرنے کی تفصیل طے کرنے کے علاوہ جو کچھ کیا وہ محض ریاکاری تھی۔

سرد جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد امریکہ کو نظریاتی سطح پر سب سے بڑا چیلنج اسلام کی جانب سے ملا اور عسکری و معاشی سطح پر چین سے۔ یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ امریکی استعماریت کے سب سے بڑے دشمن چین اور ایران گوں ناگوں وجوہات کی بنیاد پر ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ اس لئے اب امریکہ کی توجہات یوروپ کے بجائے ایشیا کی جانب مرکوز ہو گئی ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف اسی ہفتہ امریکی وزیر دفاع لیون پنیٹا نے کیا وہ بولے ایشیا پر دھیان مرتکز کرنے کی ایک نئی حکمت عملی کے طور پر، آئندہ کئی برسوں تک امریکہ کے بحری جنگی بیڑوں کو کثیر تعداد میں ایشیا پیسفک کے خطے میں منتقل کیا جائے گا۔اِس وقت بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس میں امریکی بحری فوج تقریبا۵۰-۵۰ فی صد کے تناسب سے تعینات ہے، جسے اب بحر الکاہل میں ۶۰ فی صد اور بحر اوقیانوس میں ۴۰ فی صد کر دیا جائے گا اور یہ نئی تعیناتی ۲۰۲۰ تک مکمل ہو جائنگیں۔انوں نے بحر الکاہل میں امریکی فوجی مشقوں کو وسیع کرنے اور بحر ہند کی بندرگاہوں کے دورے کرنے کا یقین دلایا اور برملا اعتراف کیا کہ جنوبی سمندرِ چین کا خطہ جس کے تقریباً مکمل رقبے پر چین دعویدار ہے امریکہ کیلئے کلیدی اہمیت کا حامل

ہے۔پنیٹا نے ویسے تو یقین دلایا کہ بحری افواج کی نئے سرے سے منتقلی چین کے عزائم کو مدِ نظر رکھ کر نہیں کی جا رہی بلکہ وہ تو علاقائی تنازعات کو نبٹانے میں چین کی حمایت کے خواہاں ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ چین کے خلاف گھیرابندی کی یہ ایک سعی ہے چونکہ مائنمار کے کوکو جزیرے میں چین نے اپنا اڈہ قائم کر لیا ہے اس کا توڑ کرنے کی غرض سے امریکہ نے مائنمار کے پڑوسی بنگلہ دیش کا رخ کیا ہے۔

موجودہ عالمی صورتحال میں امریکہ کا ہندوستان کے بجائے بنگلہ دیش کو اپنا کلیدی شراکت دار قرار دینا اس کی حکمتِ عملی میں ایک بنیادی تبدیلی کا غماز ہے۔۱۱ ستمبر کے بعد چونکہ اسلام کے خلاف ہوا کھڑا کیا گیا تھا اور ہندوستان میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ دہشت گردی برپا کرکے اسے اسلام سے جوڑ دیا گیا تھا اس لئے امریکہ کو یہ توقع تھی کہ پاکستان اور اسلام کی دشمنی میں وہ ہندوستان کو ایران ،افغانستان اور چین کے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن مالیگاوں ،مکہ مسجد ، اجمیر شریف اور سمجھوتہ ایکسپریس کے دھماکوں میں جب ہندو انتہا پسند تحریکوں کے ملوث ہونے کا عقدہ کھلا اور ان کے اسرائیل اور امریکی انتہا پسند مذہبی تنظیموں کے ساتھ تعلقات ظاہر ہوئے تو امریکی منصوبے کو پہلا دھکا لگا۔ ممبئی میں تاج محل ہوٹل کے حملے میں ریمنڈ ڈیوس نے سارے معاملے کو مشکوک کر دیا اور جس طرح

امریکی انتظامیہ نے اس کو تحفظ فراہم کیا اس سے تعلقات کسی نہ کسی حد کشیدہ ضرور ہوئے گو کہ ذرائع ابلاغ میں اس پر لب کشائی سے احتراز کیا گیا۔ اس کے بعد ایران پر معاشی پابندیوں کے معاملے نے امریکہ کو ہندوستان نے پوری طرح مایوس کر دیا۔ ہندوستان کے داخلی صورتحال حکام کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ ایران گیس پائپ لائن منسوخ کردیں یا ایران سے تیل خریدنا بند کردیں جبکہ وہ سہولت پر سہولت دیئے جارہا ہے۔ اس لئے امریکہ نے سوچا کہ ہندوستان کے بجائے کسی اور انحصار مفید ترہے۔ اپریل میں بنگلہ دیش کے ساتھ سیکیورٹی کے مسئلہ پر خاص گفت و شنید۔ مئی میں وزیر خارجہ نے بنگلہ دیش کا دورہ کیا اور جون میں فوجی اڈے کی تیاری شروع ہو گئ ۔ یہ سب اسی ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں جو فی الحال امریکی انتظامیہ کے گلے کا طوق بنی ہوئی ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس مصیبت سے کیوں کر جان چھڑائی جائے۔

ظلم سہنے سے بھی ظالم کی مدد ہوتی ہے

فصیح محمود کی گرفتاری کا زخم ابھی رس ہی رہا تھا کہ قتیل صدیقی کے قتل کا سانحہ سامنے آ گیا۔ ان دونوں واقعات کو ملا کر دیکھا جائے ملت اسلامیہ کے تئیں حکومتِ ہند کی حکمتِ عملی سمجھ میں آتی ہے۔ اس ظالم حکومت کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی سردی زکام کا مریض علاج کیلئے آئے تو اسے ایڈز کا انجکشن لگا دو تا کہ وہ اپنی پہلی بیماری کو بھول جائے۔ فصیح محمود کے معاملے میں حکومت پے در پے غلطیاں کرتی جارہی تھی اور خود اپنے جال میں پھنستی جارہی تھی۔ امت کے اندر حکومت کے خلاف جو غم وغصہ بڑھ رہا تھا اس سے بچنے کا انتظامیہ نے یہ طریقہ نکالا کہ ملت کی تعذیب میں اضافہ کر دیا ۔حقیقت یہی ہے کہ قتیل صدیقی کی موت کیلئے صرف اور صرف حکومت ہند ذمہ دار ہے۔ جو حکومت اپنی ہائی سیکیورٹی جیل کے اندر اپنے باشندوں کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتی اسے حکومت کرنے کوئی حق نہیں ہے۔ دراصل اسے حفاظتی دستہ کی ناکامی کہنا ہی غلط ہے بلکہ یہ سب تو اس کا اپنا کیا دھرا ہے۔

قتیل کی موت کیلئے بظاہر دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے اقبالیہ بیان لکھوانے کی خاطر اس پر اس قدر زدوکوب کیا گیا ہو کہ وہ خواجہ یونس کی طرح

جان بحق ہو گیا یا فصیح محمود کی جانب سے نہ صرف توجہ ہٹانے بلکہ جو لوگ اس کی رہائی کیلئے جدو جہد کر رہے ان کو ڈرانے دھمکانے کی خاطر یہ سفاکانہ کارروائی کی گئی ہو ؟حکومت مؤخر الذکر دو میں سے ایک مقصد میں کامیاب ہو گئی ہے۔ قتیل کی موت کے بعد لوگ فصیح کو بھول گئے لیکن یہ ایک وقتی ردعمل ہے۔ امت نہ ہی قتیل صدیقی کے خونِ ناحق کو بھولے گی اور نہ ہی فصیح محمود کی گرفتاری کو فراموش کیا جائیگا۔ انتظامیہ کو جلد ہی پتہ چل جائیگا کہ وہ جن شعلوں سے کھیل رہے ہیں ان کی تپش کس قدر تیز ہے۔ ظلم و جبر کے خلاف جو آندھی اٹھے گی وہ ان اونچے مکانات کو خس و خاشاک کی مانند اڑا لے جائیگی جو اپنی بلندی کے زعم میں اکڑتے پھرتے ہیں۔

عرصہٗ دراز سے حکومتِ ہند کی یہ حکمتِ عملی رہی ہے کہ کسی ایک علاقے کے مسلمانوں کو دہشت گردی کے بے بنیاد مقدمات میں گرفتار کرکے ان کے توسط سے ملک بھر کے مسلمانوں کو احساسِ خوف میں مبتلا رکھو ان کے اندر عدم تحفظ کا اس قدر شدید احساس پیدا کردو کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور مسئلہ پر نہ غور کریں اور نہ توجہ دیں۔ حکومت کی جانب سے کی جانے والی ساری بے اعتنائی اور ناانصافی اس دہشت کے تلے دب کر دم توڑ دے۔ وہ کبھی بھی احتساب و جائزہ کرنے کا خیال اپنے دل میں نہ لائے۔ اسی لئے ہمیشہ ہی ان علاقوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے جہاں مسلمان مضبوط ہوتے ہں اور جہاں سے احتجاج و مزاحمت کی

توقع ہوتی ہے۔ اس فہرست میں کبھی ممبئی تو کبھی مالیگاوں، کبھی حیدرآباد تو کبھی بھٹکل اور کبھی اعظم گڑھ تو کبھی دربھنگہ کا نام جھلکنے لگتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ حکومت کمزور ہے اس لئے انتظامیہ میں موجود فسطائی عناصر اس کی مرضی کے خلاف جو چاہتے ہیں کرتے پھرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ یہ گھناؤنا کھیل حکومت کے اشارے پر اس کی نگرانی میں کھیلا جاتا ہے۔

فصیح محمود کے معاملے میں سرکاری گاڑی آگے چلتی ہے اور گھوڑا پیچھے چلتا ہے۔ فصیح محمود کی گرفتاری ۱۳ مئی کو سعودی عرب کے دیارِ غیر میں عمل میں آتی ہے۔ ۱۶ مئی کو ہندو اخبار اس خبر کو شائع کرتا ہے۔ ہندو اخبار کا نمائندہ سبرامنیہ نے مشرقی بنگلور کے جوائنٹ پولس کمشنر بی دیانند سے رابطہ قائم کیا جن کے زیر نگرانی چنا سوامی اسٹیڈیم کے باہر ہونے والے بم دھماکے کی تحقیقات ہو رہی ہیں۔ دیانند ہندو نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ فصیح محمود کے اس دھماکے میں ملوث ہونے کی کوئی معلومات ان کے پاس نہیں ہے۔ اسی وقت ہندو اخبار کا ایک اور صحافی دیویش پانڈے دہلی پولس سے رابطہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کیا فصیح کسی معاملے میں مطلوب ہے۔ اسے بھی مایوسی ہوتی ہے اور دہلی پولس یہ تصدیق کرتی ہے کہ ہنوز وہ کسی معاملے میں مطلوب نہیں۔ وزارتِ کارجہ کا ترجمان پانڈے کو بتلاتا ہے کہ اس کے پاس فصیح

محمود کے اوپر کسی مقدمہ کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے ان سب کے باوجود فصیح غیر قانونی حراست میں ہے۔

فصیح محمود کا تعلق چونکہ ایک بارسوخ گھرانے سے ہے۔ اس کے پردادا کا شمار مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے۔ دادا علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجوٹ تھے والد ڈاکٹر ہیں والدہ پرنسپل بھائی انجینئر خالہ ٹیچر اور اہلیہ بھی منیجمنٹ گریجوٹ ہے اس لئے اس معاملے نے طول پکڑ لیا تو انتظامیہ کی جانب سے ایک اور گھٹیا چال چلی گئی۔ ۱۹ مئی کو سعودی عرب کے ایک نمبر سے فصیح کی اپنی اہلیہ سے بات کروا کر یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ گویا وہ ہنوز سعودی میں ہے۔ حالانکہ کون نہیں جانتا کہ دنیا کے کسی بھی حصہ سے کہیں کا بھی نمبر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فصیح نے گھبراہٹ کے عالم میں یہ کہا کہ وہ معصوم ہے اور جلد ہی واپس لوٹے گا۔ اس جھوٹ کا پردہ اس وقت فاش ہوگیا جب سعودی حکام نے واضح کردیا کہ حکومت ہند کے ایما پر فصیح کو گرفتار کر کے اسی دن ملک بدر کردیا گیا تھا۔

فصیح کی اہلیہ نکہت پروین جب دہلی پہونچ گئیں اور یہ معاملہ ذرائع ابلاغ میں یہ بحث کا موضوع بن گیا۔ دربھنگہ کے عوام سڑک پر نکل آئے۔ ملت کے زعماء اس پر احتجاج میں شامل ہوگئے انسانی حقوق کی تنظیمیں اس میں دلچسپی

لینے لگیں اور سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانے پر غور ہونے لگا تو انتظامیہ ایک اور بدمعاشی پر اتر آیا۔ اس غیر قانونی گرفتاری کا جواز فراہم کرنے کیلئے اسی بنگلور پولس نے جو فصیح کے ملوث ہونے سے ایک ہفتہ قبل انکار کر چکی تھی سی بی آئی کے سامنے ایک دستاویز پیش کر دی جس میں فصیح کے نام ریڈ کارنر نوٹس جاری کرنے کی درخواست کی گئی تھی ۔ٹی اے جانسن نے انڈین ایکسپریس میں اس بات کو ببانگِ دہل لکھا کہ مقامی مجسٹریٹ کے ذریعہ حاصل کئے گئے وارنٹ کا مقصدایک مذموم حرکت کو جوازفراہم کرنا ہے ۔اس وارنٹ میں فصیح پر یاسین بھٹکل کا ساتھی ، انڈین مجاہدین کا رکن اور اسٹیڈیم کے دھماکے میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا۔ یہ حکومت کیلئے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ۱۳ مئی کو حراست میں لئے جانے والے شخص کے خلاف انٹرپول کا وارنٹ ۳۱ مئی کو نکلتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ شرم کی بات یہ ہے کہ سرکاری وکیل سپریم کورٹ میں کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے فصیح کا اتا پتہ معلوم ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ وزارتِ داخلہ اور خود وزیرِ داخلہ اس بات سے انکار کر دیتا ہے کہ فصیح ان کی حراست میں ہے۔ چدمبرم یہ کہتے ہیں وہ اب بھی سعودی عرب میں ہے۔ کسی سرکاری ایجنسی کی حراست میں نہیں ہے ۔ اگر ایسا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے اسے حراست میں کس نے لیا۔ اگر سعودیوں نے تو حکومت ہند اس کی رہائی کی کوشش

کرنے کے بجائے انٹر پول سے وارنٹ کیوں نکلوتی ہے۔ کیا حکومتِ ہند کو اپنے شہری تک رسائی کی خاطر ریڈ کارنر نوٹس کی محتاجی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وزیر داخلہ کسے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہے ہیں یا خود بے وقوف ہیں ؟ ریاض میں واقع ہندوستانی سفارتخانہ یہ کہہ کر تفصیل بتانے سے انکار کردیتا ہے کہ یہ سیکیورٹی کا معاملہ ہے ہم کچھ نہیں بول سکتے۔ وہ چدمبرم کی طرح ساف انکار کرنے سے کیوں کتراتا ہے ؟ اور وزارت خارجہ سعودی حکومت پر جواب دینے میں تاخیر کا بہانہ بنا کر اپنا دامن جھٹکنے کی کوشش کرتا ہے۔

سپریم کورٹ میں ایک دو نہیں تین سنوائیاں ہو جاتی ہیں لیکن فصیح محمود کا پتہ بتانے سے حکومت قاصر ہوتی ہے۔ عدالتِ عالیہ میں انتظامیہ کی جانب سے بہانے بازی اور جھوٹ کے علاوہ کچھ بھی سامنے نہیں آتا۔ عوام کی امیدیں سیاستدانوں اور انتظامیہ کے اوپر سے اٹھ کر جب عدالت سے وابستہ ہو جاتی ہیں تو مظلوم نکہت پروین کے وکیل نوشاد احمد خان کو ہراساں کرنے کی مذموم حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ مشتبہ افراد کے ذریعہ ان کا تعاقب کرایا جاتا ہے بلکہ تیسری پیشی سے قبل ٹوسرکل نامی ویب سائٹ کو وہ بتلاتے ہیں کہ ایک شخص بہت قریب سے موٹر سائیکل پر ان کا پیچھا کررہا تھا اس کی گاڑی پر پریس لکھا ہوا تھا۔ انھوں نے جب اپنی گاڑی کو شکارپور پولس اسٹیشن کی جانب موڑا تو وہ مشتبہ شخص فرار ہوگیا۔ نوشاد احمد نے عدالت میں اس کی شکایت کرنے اور تحفظ

طلب کرنے کی بات بھی کہی۔
فصیح محمود کو جس معاملے میں پھنسانے کی کوشش کی جارہی ہے اس میں کل آٹھ لوگ پہلے ہی سے گرفتار ہیں۔ ان میں سے ایک کفیل اختر کو کرناٹک پولس نے ۶ مئی کو دربھنگہ سے گرفتار کیا۔ وزیر اعلیٰ نتیش کمار کا اس گرفتاری پر اعتراض نہیں تھا بلکہ مقامی پولس کو اعتماد میں نہ لئے جانے کے باعث وہ ناراض تھے۔ ان گرفتار شدگان میں سرِ فہرست قتیل صدیقی کا نام تھا جنہیں گزشتہ نومبر میں دہلی پولس نے گرفتار کیا تھا اور ان سات مہینوں میں انتظامیہ ان محصورین کے خلاف عدالت میں چارج شیٹ تک داخل نہیں کر پایا۔ قتیل اور اس کے ساتھیوں پر الزامات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ دہلی گولی باری ہو یا بنگلور کا اسٹیڈیم دھماکہ، جرمن بیکری سے لیکر گنپتی مندر تک سارے دھماکوں کیلئے انہیں ذمہ دار قرار دیا جارہا ہے لیکن ثبوت کا خانہ خالی ہے۔ مسلم مجلس مشاورت کے صدر ظفرالاسلام کان نے بجا طور اس قتل کیلئے اے ٹی ایس چیف راکیش ماریہ۔این آئی اے کے سربراہ سرت چندر اور وزیر داخلہ چدمبرم کو ذاتی طور پر ذمہ دار قرار دیا ہے۔
قتیل صدیقی کی موت کو تو انتظامیہ نے انتہا پسند و دہشت گردوں کی حرکت بتا کر دامن جھٹک دیا لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اگر یہ دہشت گرد پولس کی

حراست کے اندر بھی قتل غارتگری کر سکتے ہیں تو باہر انہیں روکنے والا کون ہے ؟ جیلر کی برطرفی سی آئی ڈی کے ذریعہ کی جانے والی تفتیش بے معنی ہے اس لئے کہ کل کو جیلر کی ملازمت پھر سے بحال کردی گئی تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا بلکہ کوئی بعید نہیں کہ اس کو ترقی دے دی جائے اور سی آئی ڈی کسی قیمت پر خود اپنے محکمہ کے خلاف کو چ پیش نہیں کرے گی۔ پولس کی فرقہ پرستی اس وقت کھل کر سامنے آگئی جب اے ٹی ایس نے اول تو لاش واپس کرنے سے نکار کردیا اور پھر اس میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں یہاں تک کہ قتیل کے وکیل ایم ایس خان اور منیشہ سیٹھی کو دہلی سے پونہ آنا پڑا۔اس کے باوجود عدم تعاون جاری رہا۔لاش کی واپسی کے سارے انتظامات رشتہ داروں کو کرنے پڑے۔ کیا پسماندگان کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے؟ اور اسی کا نام انسانیت ہے ؟

مغربی جمہوریت میں حزب اختلاف حکومت کی زیادتیوں کو افشا کرکے اپنی سیاسی دوکان چمکاتی ہے لیکن ہندی جمہوریت میں اگر مظلوم مسلمان ہے تو یہ بھی نہیں ہوتا۔اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول تو کوئی بھی سیاسی جماعت مسلمانوں کی حمایت کرکے انتظامیہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتی اس لئے کہ یسا کرنے سے ان کے اپنے سیاسی مفادات پر آنچ آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ یہاں حزب اختلاف کی سب سے بڑی جماعت فسطائیت پسند ہے اور اس کا

نشانہ مسلمان ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اگر بے بنیاد الزامات میں پھنسایا جائے وہ اس کی مخالفت کرنے بجائے وہ اس کی حمایت کرتے ہیں ۔ ایا کرنے سے ایک تو ان کے وہ حامی خوش ہوتے ہیں جن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عناد پیدا کیا گیا ہے ۔ دوسرے بی جے پی اپنے رائے دہندگان کو یہ کہہ کر خوفزدہ کرتی ہے کہ اگر ہم نے تمہاری حفاظت نہیں کو تو یہ آسیب تمہیں نگل جائیگا ۔بی جے پی ان بیجا الزامات سے اپنے مخالفین کا بھی منہ بند کر دیتی ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے انہیں اپنے حق میں ایک دلیلِ روشن کے طور پر استعمال کرتی پھرتی ہے ۔ ڈاکٹر سید قاسم رسول نے ایک پریس کانفرنس میں قتیل صدیقی کے قتل پر اپنے غم و غصہ کا اظہار مظفر وارثی کے اس شعر کی مصداق ہے ۔

کچھ نہ کہنے سے بھی چھن جاتا ہے اعزازِ سخن
ظلم سہنے سے بھی ظالم کی مدد ہوتی ہے

الیاس صاحب نے فرمایاحکومت مسلمانوں کو مدافعت میں رکھنے کی خاطر یہ سب کر رہی ہے ۔اگر حکومت چاہے تو وہ اسے روک سکتی ہے ۔انہوں امت سے مطالبہ کیا کہ وہ کانگریس کی قیادت میں چلنے والی متحدہ ترقی پسند محاذ کی مرکزی حکومت کے خلاف تحریک عدم تعاون پیش کریں لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کیا ہوگا ؟ کیا یہ کسی جماعت و محاذ کا مسئلہ ہے یا نظام کا نقص ہے ۔ اس لئے

کہ جو بھی پارٹی اقتدار میں آتی ہے اس معاملہ کم و بیش یکساں رویہ اختیار کرتی ہے۔ ہندوستان میں فی الحال ترقی پذیر محاذ کا متبادل جمہوری محاذ ہے۔کیا اس کے آنے سے یہ سلسلہ رک جائیگا ؟ اگر نہیں تو ان جماعتوں کو ادلنے بدلنے کے بجائے اس نظام باطل کو صالح نظام سے تبدیل کرنے کے متبادل پر غور کرنا چاہئے۔ عدم اعتماد اس نظام کے خلاف ہو تو کوئی بات بن سکتی ہے ورنہ ہم لوگ اس نظام کے مایا جال میں کولہو کے بیل کی طرح گردش کرتے رہیں گے اور فصیح و قتیل جیسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے ۔

(تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم - (قسط اول

مصر کے صدارتی انتخاب میں ڈاکٹر محمد مورسی کی تاریخی فتح اور اس کے خلاف فوجی کونسل کی گھناؤنی سازشیں فرعون و کلیم کا معرکہ یاد دلاتی ہیں ۔ مصر کی قدیم تاریخ کے اس پہلو کا بیان قرآنِ عظیم میں کئی مقامات پر ہے۔ سورۂ اعراف کی آیات موجودہ حالات و واقعات پر اس طرح منطبق ہوتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ۔ حسنی مبارک ہنوز بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے جنرل طنطاوی اور اس کے حواری ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن اس سے عبرت نہیں پکڑتے ارشاد ربانی ہے :

کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔اور کیا اُن لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوتے ہیں، اِس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انہیں پکڑ سکتے ہیں؟ اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے (۹۹۔۱۰۰)

اس تمہید کے بعد قصہَ فرعون و کلیم بیان ہوتا ہے ۔ ان آیات کو پڑھتے وقت گزشتہ سال رونما ہونے والے واقعات کو اپنی نظروں کے سامنے رکھیے ۔ کس عزم و استقلال کا مظاہرہ مصر کی عوام نے کیا تھا۔ کس طرح وہ ظالم قوتوں کے آگے

سینہ سپر ہو گئے تھے۔ ان کی جانب سے کئے جانے والے کسی اکساوے میں نہ آتے تھے۔ دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ مبارک کی قومی جماعت کے غنڈوں سے نہ ڈرتے۔ پولس کی لاٹھیوں کا مقابلہ کرتے۔ گولیوں کو اپنے سینے پر سہتے اور ٹینکوں کے آگے سرنگوں نہیں ہوتے یہاں تک کہ ظالم و جابر کے نامبارک قدم اکھاڑ انہوں نے دم لیا۔ ساری دنیا نے اپنے ٹیلی ویژن کے پردے پر ان حیرت انگیز مناظر کو چشمِ زدن سے دیکھا۔ یہ دراصل اللہ کی نشانیاں تھیں جو سارے عالم کے سامنے حجت بن گئیں اسی طرح کی نشانیاں جیسی کی حضرتِ موسیٰ کوہِ طور سے لے کر آئے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

پھر اُن قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا مگر انہوں نے بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔ موسیٰ نے کہا ''اے فرعون، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے'' فرعون نے کہا ''اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر'' موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا (۱۰۳۔۱۰۸)

نشانیوں کا مطالبہ خود فرعون نے کیا تھا اور حضرتِ موسیٰؑ نے عقل کو عاجز کر دینے والے معجزات پیش فرمائے۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ فرعون ان کو بسر و چشم قبول کر لیتا۔اپنی خدائی کے دعویٰ سے دستبردار ہو جاتا اور کائنات کے مالک کے آگے جھک جاتا۔ اللہ رب العزت کی جانب سے مامور نبی کا ہمنوا بن جاتا یا کم از کم بنی اسرائیل کو حرتتِ موسیٰؑ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیوں نہیں ہوا اسکی وجہ قرآنِ مجید میں خود فرعون کی زبانی بیان ہوئی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ جس چیز نے فرعون اور اس کے سرداروں کو حق قبول کرنے سے روکا تھا وہی شہ مصر کے فوجی حکمرانوں کے پیروں کی زنجیر بنی ہوئی ہے :

اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ ''یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادو گر ہے۔ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، اب کہو کیا کہتے ہو؟'' (۱۰۹۔۱۱۰)

اقتدار کے اپنے ہاتھوں سے نکل جانے کا خوف رکاوٹ بن گیا۔برسوں سے عوام کا استحصال کرتے ہوئے عیش و عشرت کی زندگی کے خاتمہ کا خوف۔ عوام پر من مانے مظالم کرنے کے جو چھوٹ حاصل ہے اس سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ۔ دشمنوں کی پناہ میں شترِ بے مہار کی سی زندگی اور اپنے ہی بھائیوں کا ناحق خون بہانے کے

جو جرائم سرزد ہو چکے تھے اس لہو کے قصاص کا ڈر۔ کل کو عوام اگر احتساب مانگنے کے لئے کھڑی ہو جائے تو ان کے سامنے جوابدہی کا کھٹکا۔ یہی چیزیں ہیں جو حکمرانوں سے یہ کہلواتی ہیں کہ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کر دے گا۔ اقتدار سے محروم کر کے آسمان سے زمین پر لے آیگا۔

تحریر چوک پر گزشتہ سال جو مظاہرے ہوئے تھے وہ محض ایک فرد کے خلاف نہیں بلکہ اس پورے فوجی ٹولے کے خلاف تھے جو عرصہَ دراز سے مصر کے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کئے بیٹھا تھا۔ حسنی مبارک تو بس ان کا سرغنہ اور ایک علامت تھا لیکن مسلح افواج کے سربراہ اور ملک کی مقتدر عسکری کونسل کے چیف فیلڈ مارشل جنرل محمد حسین طنطاوی نے جب یہ دیکھا کہ اب عوام کسی صورت ماننے والی نہیں ہے تو موقع غنیمت جان کر اپنے ہی محسن و کرم فرما کے مخالف ہو گئے۔ بیس سال تک حسنی مبارک کی وزیر دفاع کی حیثیت سے چاکری کرنے والے اور اس ہر ظلم میں اس کے شانہ بشانہ شریک رہنے والا اچانک عوام کا ہمدرد بن گیا۔ جنرل طنطاوی کو پتہ تھا کہ حسنی مبارک اپنے بیٹے جمال مبارک اقتدار سونپنے کے چکر میں ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اقتدار کی باگ ڈور کبھی بھی انکے ہاتھ میں نہیں آیگی۔ اس لئے انہوں نے مگرمچھ کے آنسو بہانہ شروع کر دیئے۔ عوام کے خلاف طاقت کے استعمال سے انکار کر دیا اور انتخاب کروا کر عوام کے نمائندوں کو اقتدار سونپ دینے کا وعدہ کر دیا۔ بیچارے بھولے بھالے مظاہرین اس جعلساز کے جھانسے میں آ گئے۔

محمد حسین طنطاوی اور ان کے حواریوں کو پتہ تھا عرصہَ دراز کے بعد جب عوام کو اظہارِ رائے کی آزادی ملے گی تو بیسیوں جماعتیں اور افراد انتخابی میدان میں کود پڑیں گے۔ عوام اتحاد پارہ پارہ ہو جائیگا۔ پچاس فیصد نمائندوں کا تعلق کسی جماعت سے نہیں ہوگا اور انہیں آسانی سے خریدا جاسکے گا۔ اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر وہ اقتدار پر اپنی پکڑ مضبوط کرلینگے۔ اپنے کسی پٹھو کو وزیر اعظم بنوادیں گے جو ان کے اشارے پر اچھلتا کودتا رہیگا عوام بہل جائیں گے پر مراعات کی بوچھار کرکے خواص کو ہمنوا بنا لیا جائیگا۔ انقلاب کے سحر کو توڑنے کیلئے انتخاب کے جادو کو استعمال کرنے کا فرعونی منصوبہ فوجی حکمرانوں خود بنایا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے :

پھر اُن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے۔ کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں ۔ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے اُنھوں نے کہا ''اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟'' فرعون نے جواب دیا '' ہاں، اور تم مقرب بارگاہ ہوگے''۔ (۱۱۱۔ ۱۱۲)

عوام کے نمائندوں کو اپنا مقرب بنا کر ان کی آڑ میں اپنا اقتدار محفوظ کرنے کا یہ ناپاک منصوبہ تھا لیکن جب کھیل ختم ہوا تو بازی الٹ گئی اور وہ

نتائج سامنے آگئے جو فرعون کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھے ۔جس عوام کی مدد سے فوجی حکمراں انقلاب کی ہوا نکال دینا چاہتے تھے اسی عوام نے فوجیوں کی ہوا اکھاڑ دی ۔ عوام نے ایسے لوگوں کا انتخاب کے بھیج دیا کہ جو نہ بک سکتے تھے اور جھک سکتے تھے ۔پارلیمانی انتخاب کے بعد فوجی ٹولہ جس بد حواسی کا شکار ہوا وہ فرعون کو لاحق پریشانی جیسی ہی تھی :

پھر اُنھوں نے موسیٰ سے کہا ’’تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟‘‘ موسیٰ نے جواب دیا ’’تم ہی پھینکو‘‘ انھوں نے جو اپنے آنچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ اُنھوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔فرعون اور اس کے ساتھی میدان مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) الٹے ذلیل ہو گئے ۔اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔کہنے لگے ’’ہم نے مان لیا رب العالمین کواُس رب کو جسے موسیٰ اور ہارونؑ (مانتے ہیں‘‘ (۱۱۵۔ ۱۲۲

جادو کے مقابلہ کو منعقد کرنے کا فیصلہ کسی اور نے نہیں خود فرعون نے کیا تھا۔جادوگر فرعون کی ایماء پر بلائے گئے تھے ۔ کامیابی کی صورت میں انہیں اپنا

مقرب بنانے کا وعدہ فرعون کا تھا۔ اب اسے چاہئے تھا کہ اس کا جو بھی نتیجہ سامنے آتا اسے خندہ پیشانی سے قبول کرلیتا لیکن خود سر حکمراں آج سے چار ہزار سال پرانے ہوں یا چار سو دن پرانے انہوں نے کب اپنے عہد کی پاسداری کی ہے۔ اقتدار کی باگ ڈور اس کے حقداروں کو سونپنے کیلئے وہ نہ صدیوں پہلے آسانی سے راضی ہوتے تھے اور نہ اب ہوتے ہیں۔ وہی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی جس کا مظاہرہ کسی زمانے فرعون نے کیا تھا آج مصری حکمران کررہے ہیں یقین نہ آتا ہو تو آیات قرآنی دیکھئے :

فرعون نے کہا ''تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں؟ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کردو اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا'' (۱۲۳۔ ۱۲۴)

اس مرحلے میں فرعون اقتدار سے بے دخلی کا صاف اندیشہ ظاہر کرتا ہے اور دھونس دھمکی پر اتر آتا ہے۔ مصری فوجی ٹولے کو بھی گزشتہ سال کے پارلیمانی انتخابات سے قبل ہی اندیشہ لاحق ہوگیا تو انہوں نے دستوری ترمیمات کے ذریعہ بننے والی پارلیمان کے ہاتھ پیر دونوں سمتوں سے کاٹنے شروع کردیئے۔

پچھلے سال جون میں جو دستوری ترمیمات ہوئیں اور جن کے خلاف عوام کو دوبارہ تحریر چوک آنا پڑا۔ تمام سیاسی جماعتوں نے اس دراندازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ غیر سرکاری ادارے میدان عمل میں کود پڑے۔ عوام پھر ایک بار اپنے حقوق کیلئے سینہ سپر ہوگئے اور جنرل سالم کی پیش کردہ ترمیمات کو جن میں سارے اختیارات عوامی نمائندوں سے چھین کر فوجی کونسل کے حوالے کر دیئے گئے تھے مسترد کر دیا گیا۔

جادوگروں کا پائے استقلال اور سرفروش مصری عوام کے صبر استقامت میں بلا کی مشابہت نظر آتی ہے کلام ربانی ہے :

انہوں نے جواب دیا'' بہر حال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آ گئیں تو ہم نے انہیں مان لیا اے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اِس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں'' (۱۲۵۔۱۲۶)

پارلیمانی انتخاب کے بعد صدارتی انتخاب کا مرحلہ تھا۔ اخوان چونکہ اعلان کر چکی تھی کہ اسے اس عہدے میں دلچسپی نہیں ہے۔ اس لئے فوجیوں نے چین کا سانس لیا تھا۔ انہیں توقع تھی کہ جو بھی نرم چارہ صدر بنے گا وہ اسے کٹھ پتلی بنا کر وہ اپنی راس لیلا رچائیں گے لیکن جب اخوان کی سمجھ میں یہ چال

آگئی تو انہوں نے اپنے امیدوار کا اعلان کر دیا۔ اب کیا تھا جو لوگ اقتدار کو دانتوں سے پکڑے ہوئے تھے انہوں نے اخوان کو اقتدار کا حریص قرار دینا شروع کر دیا جن کی بد عہدیاں تمام حدود و قیود سے تجاوز کر رہی تھیں انہوں نے تحریک اسلامی پر بد عہدی کا الزام جڑ دیا۔ڈاکٹر محمد مورسی باطل کی آنکھ کا کانٹا بن گئے

دفعتۂ جس سے بدل جاتی ہے تقدیر امم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقل حکیم
ہر زمانے میں دگر گوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیر محمد ہے، کبھی چوب کلیم!

کیا خود اپنے بارے میں کئے گئے فیصلہ پر نظر ثانی کوئی جرم یا وعدہ خلافی ہے لیکن خیر صدارتی انتخاب کے پہلے مرحلے میں سب سے زیادہ رائے اخوانی رہنما محمد مورسی کے حق میں آگئیں اور اس بات کا امکان بڑھ گیا کہ وہ سیدھے مقابلے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے تو فوجی کونسل نے وہ کیا جو شاید فرعون بھی نہ کرتا۔ اس نے خود اپنے اجازت نامہ کے خلاف عدالت سے رجوع کر دیا اور زر خرید عدالت نے ایوانِ زیریں کو تحلیل کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ عدالت کا یہ فیصلہ فرعون کے سرداروں کے مندرجہ ذیل اعلان کی مانند تھا جس میں کہا گیا تھا :

فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا"کیا تو موسیٰ اور اُس کی قوم کو یونہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے ؟" فرعون نے جواب دیا"میں اُن کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے" (۷: ۱۲۷)

عدالت کے فیصلے نے پارلیمان کو تحلیل کرکے دستوری ترمیم کے سارے حقوق فوجی کونسل کو سونپ دیۓ اور جس نے منتخب ہونے والے صدر کے اختیارات پر اس طرح شب خون مارا کہ انتخابی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ صدر افواج کا مشترکہ سربراہ نہیں ہوگا، وزیر دفاع اس کی نہیں بلکہ فوج کی مرضی سے آئیگا۔ وہ فوجی کونسل کی توثیق کے بغیر کوئی فوجی کارروائی نہیں کرے گا۔ وہ عوامی مزاحمت کی خاطر فوج سے رجوع کرے گا۔ دستور سازی کا اختیار فوجی کونسل کو حاصل ہوگا، ججوں کا تقرر فوجی کونسل کریگی تاکہ جج صاحبان ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہ دیں اور تو اور بجٹ بھی فوجی کونسل بنائے گی۔ جب یہ سب کام فوج کرے گی تو آخر عوام اور اس کا منتخبہ صدر کیا کرے گا ؟ اس نازک صورتحال میں ڈاکٹر محمد موری کے کندھوں پر یہ عظیم ذمہ داری آن پڑی ہے اور حضرت موسیٰ کی مندرجہ ذیل نصیحت میں ان کیلئے بشارت بھی ہے ورہنمائی بھی۔

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ''اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری کامیابی متقیوں کیلئے ہے'' (اعراف ۱۲۸)

نو منتخبہ صدر کو عصائے موسیٰ سے محروم کرنے کے سارے حربے آزمائے جاچکے ہیں لیکن ایسا کرنے والے نہیں جانتے کہ یہ معجزہ جس ہستی کی جانب سے عطا ہوتا ہے اس کے آگے دنیا کی ساری طاقتیں عاجز و مجبور ہیں ۔ مصر کی مسندِ صدارت پرڈاکٹر محمد مورسی کی پر وقار آمد کا منظر علامہ اقبال کے اس بند میں ملاحظہ فرمایئے

فقر جنگاہ میں بے ساز ویراق آتا ہے
ضرب کاری ہے، اگر سینے میں ہے قلب سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون وکلیم

زوال ظلم کی بس ایک شام باقی ہے - قسط سوم

جاوید میاں داد نے آخری گیند پر چھکا مار کر اپنی ٹیم کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور کرکٹ کی تاریخ میں اپنا منفرد مقام بنا لیا۔ آخری گیند کھیلنے کا موقع ہر کھلاڑی کو نصیب نہیں ہوتا اور پھر ایسا موقع بھی شاذ و نادر ہی آتا ہے کہ ایک گیند باقی ہو اور چھے رن درکار ہوں لیکن ہر کھلاڑی کو جو میدان میں اترتا ہے پہلی گیند کھیلنے کا موقع ضرور ملتا ہے۔ ڈاکٹر محمد موری کو جب وہ موقع ملا تو انہوں نے پہلی ہی گیند پر چھکا اچھال دیا۔ شاٹ اس صفائی سے کھیلا گیا تھا کہ گیند نہ صرف باؤنڈری لائن بلکہ اسٹیڈیم کے باہر تحریر چوک میں جا کر گری۔ جاوید میاں داد کا چھکا اسکی مجبوری تھی اور اس کے پاس گنوانے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا ایسے میں خطرہ مول لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن موری کیلئے نہ صرف کوئی مجبوری نہیں تھی بلکہ گنوانے کیلئے کرسیٔ صدارت تھی اس کے باوجود انہوں نے اس خطرے کو انگیز کیا اور سرزمینِ مصر پر اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر سمجھنے والی فوجی کونسل کے چھکے چھڑا دیئے۔ پارلیمان کو بحال کرنے کا جرأتمندانہ فیصلہ یہ ثابت کرتا ہے کہ عظیم تبدیلیاں بڑے خطرات سے کھیلنے کی تقاضہ کرتی ہیں۔

سیاست کو شطرنج سے اس لئے تشبیہ دی جاتی ہے کہ نہ صرف اس میں شہ اور مات ہوتی ہے بلکہ چال ایسی چلی جاتی ہے جس سے دشمن نفسیاتی طور پر مغلوب ہو جائے۔ سیاست اور جنگ میں جو اقدام کرتا ہے اسکی فتح کے امکانات روشن ہوتے ہیں اور جو مدافعت کرتا ہے اس کیلئے اپنے آپ کو شکست سے بچا لینا ہے بھی فتح کے مترادف ہوتا ہے ۔اقدام کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ جب دشمن اپنی مدافعت کر رہا ہوتا ہے اس دوران نئے اقدامات کی منصوبہ بندی کا نادر موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ نیز ہر پیشقدمی نہ صرف براہ راست بلکہ بلا واسطہ بھی اپنے گوں ناگوں اثرات مرتب کرتی چلی جاتی ہے۔ فوجی کونسل نے صدارتی انتخاب کے دوسرے مرحلہ سے قبل ایک نہایت شاطرانہ پانسہ پھینکا اور پارلیمان کو شہ دے کر تحلیل کردیا۔اس ایک چال سے کئی فائدے مطلوب تھے ۔ مثلاً پارلیمنٹ کے سارے اختیارات کو اپنے قبضۂ قدرت میں لے لینا اور من مانی دستوری ترمیمات کرکے منتخب ہونے والے صدر کے پر کتر دینا لیکن سب سے بڑا مقصد تذبذب کا شکار رائے دہندگان کو بلا واسطہ یہ پیغام دینا تھا کہ اگر وہ اخوانی امیدوار کو کامیاب کرتے ہیں تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو پارلیمان کا ہوا ہے اس لئے بلاوجہ اس پر اپنی رائے کو ضائع کرنے کی غلطی نہ کی جائے۔

اس حکمتِ عملی کے ممکن ہے کچھ اثر انتخاب پر پڑا ہو لیکن اس کے باوجود یہ شجرِ فتنہ پرور بار آور نہ ہوسکا اور شہ مات میں بدل گئی۔ انتخاب میں

کامیابی کے بعد اخوان کی باری شہ دینے کی تھی اور صدر محمد موری نے فوجی کونسل کو ایسی شہ دی کہ وہ چاروں شانے چت ہو گئی۔ وقت کا انتخاب بالکل اسی طرح کا تھا۔ عدالت میں ایوان کی تحلیل پر سماعت پیر کے دن ہونی تھی اور حکم نامہ اتوار کی رات جاری ہو گیا تاکہ عدالت کو پہو چل جائے کہ اب اپنے قدیم آقاؤں سے خوفزدہ ہو کر ان کو خوش کرنے والے فیصلے کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اب ملک میں ایک ایسا مقبول اور جرأتمند سربراہ موجود ہے جو عدل و انصاف کا علمبردار اور حق پسندوں کا حامی و ناصر ہے۔ اسی لئے فوجی کونسل اور اعلیٰ آئینی عدالت ہنگامی اجلاس بلا کر غور و خوض کرنے اور عمومی قسم کے بیانات جاری کرنے سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکی۔
اتوار کی شب یہ حکم نامہ جاری ہوا اور پیر کو اعلیٰ آئینی عدالت نے ایک اجلاس کے بعد کہا کہ اس کے فیصلے اور فرمودات حتمی ہیں اور ان کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی۔ تمام ریاستی اداروں کے لیے ان کی پابندی لازمی ہے۔ اعلیٰ آئینی عدالت نے اپنے فیصلہ میں لکھا تھا کہ پارلیمانی انتخابات میں ایک تہائی اراکین غیر قانونی طور پر منتخب ہوئے تھے اور آزاد امیدواروں کے لیے مختص نشستوں پر سیاسی جماعتوں کے امیدواروں نے مقابلہ کیا اس لیے تمام پارلیمان کی ہئیت ترکیبی غیر قانونی ہے۔ اس فیصلے کے بعد اس وقت مصر کی حکمران مسلح افواج کی سپریم کونسل نے اپنے ایک انتظامی فیصلہ کے ذریعہ

ایوانِ زیریں کو تحلیل کر دیا۔ لیکن تیس جون کو صدر موری کو اختیارات سونپنے کے بعد جو انتظامی اختیارات فوجی کونسل نے زبردستی ہتھیا لئے تھے وہ صدرِ مملکت کو منتقل ہو گئے ہیں اور وہ ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ایک اور انتظامی فیصلہ نافذ کر نے کا حق رکھتے ہیں۔ صدرِ مملکت کے دفتر نے یہ واضح کیا کہ آئینی عدالت سے ان کا تصادم نہیں ہے بلکہ فوجی کونسل کے انتظامی فیصلے کو تبدیل کیا گیا ہے۔

ایوانِ زیریں کے اسپیکر سعد الکتاتنی نے اسمبلی کا منگل کو اجلاس بلایا لیا۔انوں نے کہا صدر موری کا فیصلہ قانون اور سرکاری اداروں کی بالادستی کے لیے قابل احترام ہے۔فوجی کونسل اور اعلیٰ آئینی عدالت کی ناراضگی کے باوجود ایوان کا اجلاس ہوا جس میں آئینی عدالت کافیصلہ نافذ کرنے کی خاطر انتظامی عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔جس عدالت میں یہ مقدمہ ۱۷ جولائی کو پیش ہوگا اس ایک سابق رکن احمد مکی نے گذشتہ ہفتے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ صدر موری کو آئینی عدالت کے فیصلے کو کالعدم قرار دینے کا آئینی حق حاصل ہے اور وہ ایسا کر سکتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ فوجی کونسل نے پارلیمان کو تحلیل کرا کے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا اور اس کی مصر کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی کیونکہ ان کے بہ قول صرف عوامی ریفرینڈم کے ذریعے ہی پارلیمان کو تحلیل کیا جاسکتا ہے۔آئینی عدالت نے ۱۹۸۳ء میں خود

ایک فیصلے میں اقرار دکیا تھا کہ منتخب پارلیمان کو صرف عوام ہی تحلیل کر سکتے ہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مصری آئینی عدالت کے نو منتخبہ صدر جسٹس ماہر بحیری نے الجزیرہ چینل سے گفتگو میں اعتراف کرلیا کہ صدر کا حکم نامہ پوری طرح جائز ہے اور وہ آئینی عدالت کے فیصلہ سے نہیں ٹکراتا بلکہ وہ تو فوجی کونسل کے ایوانِ زیریں کو تحلیل کرنے کے فیصلے کو مسترد کرتا ہے۔ مغرب کو اسلام پسندوں سے یہی پریشانی ہے کہ وہ اپنے دماغ سے سوچتے ہیں اور پھر بلاخوف وخطر جرأتمندانہ فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی وہ مومنانہ فراست ہے جس کی بابت حضور اکرم ﷺ کا فرمایا مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

اس اقدام کے دوررس اثرات انتظامیہ کے ساتھ ساتھ عوام پر بھی پڑے ہیں۔ مصر کی عوام میں گوں ناگوں وجوہات کی بنا پر آج بھی ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو نہ صرف اخوان بلکہ اسلام کو بھی ناپسند کرتی ہے۔ ایسے نام نہاد روشن خیال الحاد پسند لوگ اسلام کی مخالفت کرنے کی خاطر حریت ، جمہوریت اور انسانی حقوق کی دہائی دیتے ہیں۔ اب وہ بیچارے ایک عجیب و غریب دوراہے پر کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے ایک طرف اسلام پسند ہیں جو ان اصولوں کا تحفظ کر رہے ہیں اور دوسری جانب وہ فوجی ہیں جو ان اصولوں کو پامال کر رہے ہیں۔ اب ان کے سامنے دو ہی متبادل ہیں اول تو یہ کہ ان اصولوں سے دستبردار

ہو جائیں جن کا زور شور کے ساتھ دعویٰ کیا جاتا ہے یا پھر اسلام پسندوں کی حمایت کی جائے جو انہیں ناگوار ہے۔

اس فیصلہ نے سیکولر لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ پاکھنڈی لوگ جو محض عوام کو بے وقوف بنانے کیلئے اس طرح کے خوشنما نعرے لگا رہے تھے انھوں نے اسلام پسندوں کی مخالفت جاری رکھی اور عوام کے سامنے بے نقاب ہو گئے۔ لیکن وہ لوگ جو ان اقدار کے بارے میں مخلص تھے انوں نے بادلِ ناخواستہ اس صدارتی حکم نامہ کی حمایت کردی ہے۔ عوامی سطح پر یہ ایک عظیم کامیابی ہے اور اس کے باعث نہ صرف عوام و خواص اسلام کے خلاف ہونے والے بیجا پروپگنڈے نجات حاصل کر سکیں گے بلکہ اسلام کے حقیقی خدوخال کا مشاہدہ بھی کر سکیں گے۔اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے اس سے اسلام دشمنوں کا اصلی چہرہ بھی عوام کے سامنے کھل کر آگیا ہے۔ صدارتی حکم نامہ کی سب سے شدید مخالفت مصر معروف ماہر قانون سابق نائب حکمران یحیٰ الجمال کی جانب سے سامنے آئی جس نے اسے غیر قانونی اور غیر دستوری قرار دیتے ہوئے فوجی کونسل سے مطالبہ کیا کہ وہ ارکان پارلیمان کو ایون کی عمارت میں داخل ہونے سے بزور قوت روکے اس احمقانہ مشورے پر عملدرآمد کی غلطی فوجی کونسل نے نہیں کی ورنہ اسے دال آٹے کا بھاو معلوم ہو جاتا۔ آئینی عدالت کے سابق صدر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے عدالت کی توہین قرار دیا اور کہا کہ اگر یہ انتادمی فیصلہ ہے

تو اسے انتظامی عدالت مسترد کر سکتی ہے اگر ایسا ہے تو الجمال اس وقت تک صبر کیوں نہیں کر سکتے۔روشن خیال سیاسی مبصر عبدالمنعم سعید نے کہا ہم ایک دستوری بحران سے دوچار ہو گئے ہیں۔اس کے سیاسی و معاشی منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ لیکن جب فوجی کونسل دستور کی دھجیاں اڑا رہی تھی تو یہ کہاں تھے ؟وفد پارٹی کے سکریٹری جنرل نے کہا اب قانون کی بالادستی کے بجائے آمریت آگئی ہے۔ کئی صدارتی امیدواروں اور یونین لیڈروں نے اسے سیاسی شعبدہ بازی قرار دیتے ہوئے قوم کیلئے اسے مضر قرار دیا ۔ عبدالفتوح نے بھی کہا کہ اس سے قانون سے روگردانی کا دروازہ کھل جائیگا اور البرداعی نے تک کہہ دیا اب دستور کے بجائے فرد کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔

یہ ایسے لوگ ہیں جو اسلام پسندوں کو تنگ نظر اور اپنے آپ کو وسیع النظر کہتے ہیں۔ان کے نزدیک اسلامی تحریک ناروادار ہے لیکن ان کا اپنا معاملہ یہ ہے جمہوریت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود پارلیمان کی برخواستگی پر خاموش رہے۔ عدالت کے غیر معقول فیصلہ پر لب کشائی کی جرأت نہیں کی اور جب پارلیمان بحال ہو گئی تو دستور کا رونا لے کر بیٹھ گئے۔ اجلاس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اسلئے کہ وہاں اقلیت میں ہیں۔ ان لوگوں نے دستور ساز اسمبلی سے بھی استعفیٰ دے دیا اسلئے کہ وہاں یہ کم تعداد میں ہیں۔ مطلب یہ کہ جہاں ہم اکثریت میں ہوں گے وہاں جائیں گے اور اپنے من مانے فیصلے نافذ

کروائیں گے لیکن جب اقلیت میں ہوں گے پارلیمان کو برخواست کرنے والی فوج کی حمایت کریں گے۔ دستور سازی میں رکاوٹ کھڑی کریں گے۔ ان لوگوں کی اسی منافقت کے باعث عوام نے انہیں دھتکار دیا۔ جو رہی سہی غلط فہمی تھی وہ بھی اب ختم ہو گئی

ان کے برعکس انقلابی رہنما اعلیٰ الاسناوی نے اسے صحیح سمت میں پہلا قدم قرار دیا اور اپریل کی عوامی تحریک نے بھی اس کی حمایت کی حالانکہ یہ دونوں اسلام پسندوں ۲۴ میں شمار نہیں کئے جاتے۔اخوان المسلمون نے اس فیصلے کی حمایت میں دس لاکھ لوگوں کا جلوس نکالنے کا اعلان کر دیا ہے۔ نور پارٹی کے ترجمان یاسر حماد نے کہا کہ آئینی عدالت کا مصر کی سیاست کا نگراں بن جانا سبھی کیلئے نقصان دہ ہے۔ صدر عدالت کا اس وقت تک پابند نہیں ہے جب تک کہ قانون یا دستور کو پامال نہیں کرے اور ایسا کوئی اقدام موری نے نہیں کیا ہے۔معیشت و سیاست کے استاذ ڈاکٹر عبدالفتاح نے عوام کے نمائندہ ادارے کو بحال کرنے کی تائید کی۔ڈاکٹر ثروت بداوی کے مطابق جو قاہرہ یونیورسٹی میں دستوری قوانین کی تعلیم دیتے ہیں صدر مملکت کو فوجی کونسل کے غیر آئینی فیصلوں کو رد کرنے کا حق ہے۔ جسٹس محمود خدیری نے جو عدالت کے سابق نائب صدر ہیں موری کے ذریعہ اپنا دستوری حق استعمال کرتے ہوئے پارلیمان کے بحال کرنے کو سراہتے ہوئے کہا قوم کی اس نازک گھڑی میں پارلیمان کا بحال ہو جانا

نہایت خوش آئند ہے۔اس لئے کہ فوجی کونسل نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے پارلیمان کو تحلیل کیا تھا۔یہ تائید وحمایت خواجہ مسیح الدین کے اس شعر کی ترجمان ہے کہ ۔

زوال ظلم کی بس ایک شام باقی ہے

ہماری جیت کا اب ایک گام باقی ہے

ضمیر کی ان آوازوں کا محمد البرداعی جیسے لوگوں پر بھی اثر ہوااور انہوں نے اپنی رائے بدلتے ہوئے حسبِ ذیل بنیادی قسم کے مطالبات پیش کرڈالے :

○ دستور ساز اسمبلی کو قائم کیا جائے جو حقوق اور آزادی کا تعین کرے۔ یہ مطالبہ فوج کے پر کترتا ہے

○ انتظامی امور کا حق دستور ساز اسمبلی کو دیا جائے

○ صدر کی سربراہی میں قومی سلامتی کونسل کا قیام عمل میں لایا جائے۔

○ قومی سلامتی کونسل کے ہاتھ اندرون ملک یا بیرون ملک فوج کے استعمال کا حق منتقل کر دیا جائے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں صدر مورسی کو اس قدر جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے تھا وہ نہیں جانتے کہ اس طرح کے مطالبات کسی بڑے فیصلے کے بغیر پیش نہیں کئے جاتے اور اگر ان پر عملدرآمد ہو جاتا ہے تو اقتدار صحیح معنیٰ میں فوج

کے ہاتھوں سے عوام کے نمائندوں تک منتقل ہوگا ورنہ نہیں ۔ اس فیصلے سے اخوان کے مخالفین تو چراغ پا ہوئے ہی ہوئے لیکن محتاط قسم حامیوں کو بھی فکر لاحق ہو گئی لیکن جو لوگ اقتدار کو مقصد نہیں بلکہ ذریعہ سمجھتے ہیں ان کے اطمینان اور سکون پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا ایسی صورتحال اپنی کرسی کو بچانے کی خاطر لوگ غیر ملکی دورہ منسوخ کرکے وطن واپس آجاتے ہیں لیکن صدر موری اسی دوران اپنے پہلے غیر ملکی دورے پر روانہ ہو گئے ۔

سیاست کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے ۔اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اخوان کا سب سے بڑا دشمن حسنی مبارک تھا اور حسنی مبارک کا سب سے بڑا دوست سعودی عرب ۔ اس بات کے چرچے بھی تھے کہ مراقش کے علی کی طرح حسنی کے نامبارک قدم بھی حرمین شریفین کو ناپاک کرنے والے ہیں لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر محمد موری نے اپنے بین الاقوامی دورے کیلئے سعودی عرب کا انتخاب کر کے یہ پیغام دیا ہے کہ دشمن کو دوست بنایا جاسکتا ہے ۔ ڈاکٹر محمد موری کا جدہ کے ہوائی اڈے پر سعودی ولی عہد شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز، شہزادہ خالد الفیصل، امیر مکہ، دیگر شہزادوں اور وزراء کی بڑی تعداد نے ان کا استقبال کیا ہے۔ ہوائی اڈے سے ایک جلوس کی شکل میں مصری صدر کو السلام شاہی محل لایا گیا جہاں انہوں نے شاہ عبداللہ سے بھی ملاقات کی۔ اس ملاقات میں دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے، اقتصادی

تعاون بڑھانے، باہمی تعاون کے لیے سیاسی پہلوؤں پر ایک دوسرے سے مشاورت کرنے جیسے امور پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ اس کے علاوہ عرب ممالک بالخصوص شام کی موجودہ صورت حال اور عالمی اور علاقائی مسائل پر بات چیت ہوئی اور باہمی اعتماد سازی کو فروغ دینے پر بھی اتفاق کیا گیا۔ سعودی عرب میں فی الحال تقریباً ۱۵ لاکھ مصری برسرِ ملازمت ہیں ۔ ڈاکٹر محمد مورسی کی سعودی عرب آمد پر انہیں سرکاری سطح پر غیر معمولی پروٹوکول دیا گیا۔ ان کے اعزاز میں سعودی حکومت نے ایک عشائیہ بھی دیا ۔ جمعرات کو نماز فجر کے بعد ڈاکٹر محمد مورسی جدہ سے مکہ مکرمہ پہنچے اور عمرہ ادا کیا۔ اس اقدام کا فائدہ ان کو داخلی سطح پر بھی ہوگا اس لئے کہ مصر میں دوسرے نمبر کی سیاسی جماعت النور سلفی نظریات کی حامل ہے اور اسے سعودی حکمرانوں کی فکری و اخلاقی حمایت حاصل ہے ۔

مصر کی تازہ ترین صورتحال مجھے ماضی قریب کا ایک واقعہ یاد دلاتی ہے جب مورسی کے صدارتی انتخاب میں کامیابی کی خبر میں نے اپنے ایک دوست کو دی تو وہ بولا میں مصری نہیں بلکہ سوڈانی۔ میں نے جواب دیا مجھے پتہ ہے لیکن اس جیت کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام سے ہے اس پر وہ بولا کہ اگر ایسا ہے تو میں اس فتح سے خوش نہیں ہوں بلکہ ناراض ہوں ۔ میں نے وجہ دریافت کی تو وہ بولا محمد شفیق طاقتور ہے اور محمد مورسی کمزور ہیں

۔ مجھے اس پر بہت غصہ اور میں نے کہہ دیا یہ طاقت کس کیلئے ہے ؟ اپنی کمزور عوام پر ظلم ڈھانے کیلئے ؟اس لئے کہ اسرائیل اور امریکہ کے آگے تو یہ لوگ دم ہلاتے رہتے ہیں ۔ میرا دوست یہ دیکھ کر کہ میں ناراض ہو رہا ہوں مسکرا کر وہاں سے چلا گیا لیکن جب میں نے غور کیا کہ آخر یہ محمد شفیق کو طاقتور کیوں سمجھتا ہے ؟ اور محمد موری کو کمزور کیوں ؟ تو میری سمجھ میں یہ وجہ آئی چونکہ شفیق کا تعلق فوج سے تھا اور عرصہَ دراز تک وہ فوجی وردی رہا ہے اس لئے لوگ اسے بہادر سمجھنے لگے ہیں نیز موری اخوان سے متعلق رہے ہیں جو عرصہَ دراز سے مظالم کا شکار رہی ہے اس لئے لوگ انہیں.بزدل سمجھنے لگے ہیں لیکن محمد موری کے پارلیمان کو بحال کر دینے کے فیصلے نے ثابت کر دیا کہ شیر کی کھال اوڑھ لینے والا بھیڑیا شیر نہیں ہو جاتا اور اگر شیر کو بھیڑ کی کھال سے ڈھانپ دیا جائے تو وہ بھیڑ نہیں بن جاتا۔

برما: کہہ دو یہ مومنوں سے کہیں اور جا بسیں

.برما کے وزیر اعظم تھائی سین جب یہ کہتے ہیں کہ یہ روہنگیا مسلمان ہمارے باشندے نہیں بلکہ غیر ملکی ہیں۔ ان پر ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کوئی دوسرا ملک انہیں قبول کر لے یا اقوامِ متحدہ ان کی دیکھ بھال کرے تو وہاں کے مسلمانوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان مقامی لوگوں کے مطابق ۶۸۰ء میں ان کے جدّ امجد محمد ابن الحنفیہ نے اس علاقہ میں قدم رنجا فرمایا جن کا تعلق خانوادۂ حضرتِ علیؓ سے تھا۔ محمد ابن الحنفیہ کی مزار اب بھی مونگڈاو پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہے۔ اس کے بعد مسلمان ایئر وادی ندی کی ترائی میں نویں صدی میں آن بسے جبکہ .برما کی مشہور سلطنتِ بگان کا قیام ۱۰۵۵ء کے اندر عمل میں آیا۔ گویا نام نہاد قوم پرست .برمیوں سے قبل مسلمانوں نے اس سرزمین کو آباد کیا اس کے باوجود ان سے کہا جارہا ہے بقول بہادر شاہ ظفر (ترمیم کے ساتھ)۔

کہہ دو یہ مومنوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

.برما کے لوگوں کی جذباتی نفسیات کا ترجمان خود انہیں کی تاریخ کا ایک واقعہ

ہے ۔راجہ انوار تھا نے اپنے شہزادے ساولو کی تعلیم و تربیت کیلئے ایک عرب استاذ کا تقرر کیا۔اس کالڑکا رحمٰن خان اور شہزادہ ساؤلو بچپن کے دوست اور دودھ شریک بھائی تھے ۔ساؤلو جب تخت نشین ہوا تو اس نے رحمٰن خان کو باگو کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ایک مرتبہ شطرنج کھیلتے ہوئے جب رحمٰن خان جیت گیا تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔اس پر ساؤلو کو بہت غصہ آیا اس نے رحمٰن کو للکار کر کہا کہ اگر اس کے بازو میں دم ہے تو اپنے صوبہ باگو سمیت اعلانِ بغاوت کرکے اس سے دو دو ہاتھ کر لے ۔ رحمٰن نے یہ چیلنج قبول کرکے ساؤلو سے مقابلہ کیا اور اسے شکستِ فاش سے دوچار کردیا ساولو فوج سمیت بھاگ کھڑا ہوا گرفتار ہو کر مارا گیا۔آگے چل کر ساولو کے ایک تیز، انداز نے رحمٰن خان کو ہلاک کر دیا اس طرح ایک ہزار سال قبل یہ دوستی ایک عبرت ناک انجام کو پہنچی ۔ اس کے بعد سلطنت باگان کی باگ ڈور کیانزیٹا کے ہاتھوں میں آئی جس نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی خاطر ہندوستانیوں اپنی فوج میں شامل کیا اور وسطی.برما میں بسایا۔ اس دوران مسلمان شاہی مشیر اور فوجی سپہ سالار جیسی اہم ذمہ داریوں پر فائز ہوئے ۔

مسلمانوں کی.برما میں آمد اور ان کی تعذیب و آزمائش کی تاریخ دونوں ہی قدیم ہیں ۔ مون قبیلہ کا راجہ تھاٹون ۱۰۵۰ء میں اپنا شیش محل تعمیر کر رہا تھا اس وقت اس نے .بیطوی نامی ایک فرد کو اس لئے قتل کروا دیا کہ وہ مسلمان

تھا اور راجہ اسے اپنے لئے خطرہ سمجھتا تھا۔اس کے دونوں بیٹوں کو جب محل کی تعمیر میں
بندھوا مزدور کے طور پر کام کرنے کیلئے کہا گیا تو انھوں اپنی خودداری کے سبب انکار
کردیا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔برمی بودھوں اور بنگالی مسلمانوں
کے درمیان ۱۴۳۰ء میں دوستانہ تعلقات استوار ہوئے جبکہ راجہ نارامیخلا نے ۲۴ سالہ
جلاوطنی کی زندگی بنگال کے سلطان کے پاس گزاری اور اس کے بعد دوبارہ اراکان پر اپنی
حکومت قائم کی۔ نارامیخلا نے اپنا کچھ علاقہ سلطان کے حوالے کیا اور وہاں کے مسلمانوں
کو خودمختاری دی۔نارامیخلا کے سکوں میں ایک جانب برمی زبان اوردوسری طرف
فارسی میں لکھا ہوتا تھا لیکن سلطان جلال الدین شاہ کی موت کے بعد نارامیخلا کے
وارثین نے احسان فراموشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۱۴۳۳ء میں ریاستِ بنگال کے رامو
اور چٹاگانگ پر قبضہ کرلیا جو ۱۶۶۶ء تک جاری رہا۔۱۵۵۹ء کے بعد راجہ بائینٹاگ نے
اسلام کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا اور نہ صرف حلال ذبیحہ کو ممنوع قرار دے دیا
بلکہ عیدالاضحیٰ کی قربانی پر بھی پابندی لگا دی۔وہ مسلمانوں کو جبراً تبدیلیٔ مذہب پر مجبور
کرنے کی خاطر بودھ اشلوک سنواتا تھا۔

سترہویں صدی کے وسط میں شاہجہاں کا دوسرا بیٹا شاہ شجاع اپنے بھائی سے شکست کھانے
کے بعد اپنی فوج اور خاندان سمیت اراکان پہنچ گیا جہاں راجہ سندا

تھدامہ کی حکومت تھی۔ راجہ نے اول تو شجاع کا خیر مقدم کیا لیکن جب شجاع نے حج کی غرض سے جہاز خریدنے کی کوشش کی تو راجہ دولت کی حرص کا شکار ہو گیا اور بعد میں اس نے شجاع کی بیٹی سے شادی کی پیشکش کی۔ اس کے نتیجہ میں جنگ چھڑ گئی شجاع اور اس کے فوجی مارے گئے لیکن اس کا غصہ عام مسلمانوں پر اتارا گیا اور ہندوستان سے ہجرت کرکے آنے والے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا عورتوں کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں فاقہ کشی کا شکار ہو کر وہ ہلاک ہو گئیں۔ ۱۷۸۲ء میں تخت نشین ہونے والے بوداوپایا نامی راجہ نے چار معروف علماء کو خنزیر کا گوشت کھانے کیلئے کہا اور جب انہوں نے انکار کیا تو شہید کر دیا۔ اس تاریک دورِ ستم میں تقریبا ۳۵۰۰۰ مسلمان بنگال ہجرت کرنے کیلئے مجبور ہو گئے جہاں انگریزی سامراج قائم ہو چکا تھا۔ بعد میں انگریزوں نے اراکان کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

۱۸۴۲ء میں برطانوی سامراج نے سارے برما کو اپنا غلام بنا لیا اور شمالی اراکان کے علاقہ کو جزوی خود مختاری عطا کر دی۔ اس دوران بنگال اور اراکان میں لوگوں کا کافی آنا جانا رہا۔ برما کی حکومت اسی کا بہانہ بنا کر یہ کہتی ہے کہ یہ لوگ بنگلہ دیش سے آئے ہوئے ہیں اور برما کے شہری نہیں ہیں حالانکہ برمی دستور کے مطابق وہ تمام لوگ شہریت کے حقدار ہیں جو ۱۹۴۸ء میں وہاں موجود تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ء میں جاپان نے برما پر حملہ

کر دیا اور برطانوی فوج کو پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریزوں نے جاپانیوں کے خلاف مسلمانوں سے مدد طلب کی اور بدلے میں ان سے آزاد ریاست قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب برما آزاد ہوا تو انگریز اپنا عہد بھلا کر بھاگ کھڑے ہوئے اس کے بعد مسلمانوں نے اپنے طور پر آزادی کی جدوجہد کی مگر ناکام رہے لیکن اس کا نتیجہ میں برما کی حکومت اور اراکان کے مسلمانوں میں بے اعتمادی کا فضا پیدا ہو گئی۔

دوسری جنگِ عظیم سے قبل جنرل اونگ سان کی قیادت میں اینٹی فاشسٹ پیوپلس فریڈم پارٹی (اے ایف پی ایف ایل) نے آزادی کی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں مسلمانوں نے بھی اپنے آپ کو برما مسلم کانگریس (بی ایم سی) کے تحت منظم کر لیا تھا۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں یو رزاق بی ایم سی کے صدر منتخب ہوگئے۔ انہوں نے آگے چل کر اپنی جماعت کو اے ایف پی ایف ایل میں ضم کر دیا۔ اس کے بعد انہیں دستور ساز اسمبلی میں شامل کیا گیا اور جنرل اونگ سان کی قیادت والی حکومت میں وہ وزیر تعلیم اور منصوبہ بندی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد میں فوجی بغاوت کے نتیجہ میں جنرل اونگ سان سمیت یو رزاق بھی ہلاک کر دیئے گئے۔ یو نو نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد پہلے تو برما مسلم کانگریس کو حکمراں جماعت سے الگ کیا پھر اسے تحلیل کروایا اور بودھ مت کو قومی مذہب قرار دے دیا۔

جنرل نے وِن ۱۹۶۲ء نے اقتدار سنبھالنے کے بعد مسلمانوں پر مظالم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۷۸ء میں قومی رائے شماری سے قبل آپریشن ڈراگن کنگ کے نام سے ایک مہم چلائی تاکہ غیر ملکیوں کو الگ کرنے کا بہانہ بنا کر روہنگیا مسلمانوں کو اس ہراساں کیا جائے اس کے نتیجہ میں دو لاکھ لوگ ہجرت پر مجبور ہوئے۔اس دوران فوج کے ذریعہ قتل و غارتگری اور عصمت دری جیسے سارے ظالمانہ ہتھکنڈے اپنائے گئے۔اس سانحہ کے بعد بنگلہ دیش کی حکومت اور اقوامِ متحدہ کی جانب سے مہاجرین کو واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا جسے برما کی حکومت نے تسلیم کیا یہ اور بات ہے کہ اس پر عملدرآمد نہیں ہوا۔ حیرت کی بات یہ ہے نے ونگ کے ظالمانہ فوجی اقتدار نے جس حقیقت کو تسلیم کیا تھا موجودہ جمہوری حکومت کے وزیر اعظم تھائی سین اس سے صاف انکار کر رہے ہیں بلکہ خود اراکان کے اندر رہنے والے روہنگیا مسلمانوں کو شہری تسلیم کرنے کی روادار نہیں ہیں اور نہایت بے شرمی کے ساتھ اقوام متحدہ سے یہ کہتے ہیں اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ وہ کسی اور ملک میں ہجرت کر جائیں یا اقوام متحدہ ان کی ذمہ داری لے۔ روہنگیا رہنما محمد نور کے مطابق حقیقت یہی ہے کہ وہ برمی نہیں ہیں بلکہ آزاد ریاست اراکان کے رہنے والے ہیں ۔ روہنگیا نسل کا تعلق برما سے نہیں اراکان سے ہے۔۔برما کے لوگ ان کی سرزمین پر غیر ملکی ہیں انہوں اراکان پر جارحیت کی مدد سے غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے۔

روہنگیا مسلمان آج کل جس مصیبت میں گرفتار ہیں اسی طرح کی آزمائش سے ۱۹۹۱ء میں گزر چکے ہیں جب شمالی اراکان کی ریاست میں فوجیوں کی تعیناتی بڑھا دی گئی تھی۔ ان لوگوں کی گھیرا بندی کر دی گئی اور سڑکوں وغیرہ کی تعمیر کیلئے ان سے جبری مزدوری کا کام لیا گیا ان کی زمینوں پر قبضہ کیا گیا اور مساجد تک کو نشانہ بنایا گیا۔ عوام طرح طرح کی ایذا رسانیاں کا شکار ہوئے اور ان کی تمام مذہبی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ روہنگیا رہنماؤں کو خوفزدہ کیا گیا۔ اس وقت تقریباً ڈھائی لاکھ لوگوں نے ہجرت کی لیکن ان میں سے بڑی تعداد واپس اپنے وطن لوٹ گئی لیکن اس کے باوجود ان کے ساتھ کیا جانے والا امتیازی سلوک جاری رہا انہیں غیر ملکی قرار دے کر بنیادی حقوق سے محروم کیا جاتا رہا اور ان کی نقل و حرکت پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد رہیں۔

برما کی حکومت چونکہ تقریباً آٹھ لاکھ روہنگیا مسلمانوں کو اپنا شہری تسلیم نہیں کرتی اس لئے یہ لوگ خود اپنی ہی سرزمین پر بے وطن ہیں۔ بنگلہ دیش کے اندر تقریباً دو لاکھ مہاجر روہنگیا آباد ہیں جن میں سے صرف ۲۸ ہزار کا باقاعدہ طور پر مہاجر کیمپوں میں اندراج پایا جاتا ہے۔ تھائی لینڈ کی سرحد کے ساتھ واقع ۹ مہاجر کیمپوں میں تقریباً ایک لاکھ گیارہ ہزار

مسلمان کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ملیشیا میں پناہ گزین ۹۰ ہزار بے خانماں لوگوں میں ۹۱ فیصد کا تعلق برما سے ہے۔ ان میں مختلف قبائل کے مسلمان اور عیسائی بھی ہیں جو تھائی لینڈ سے ہو کر وہاں پہنچے ہیں۔ ان میں تقریباً ۳۰ ہزار روہنگیا مسلمان ہیں۔ ماضی کے اندر شاہ فیصل نے مشکل کے وقت میں روہنگیا مسلمانوں کا اپنے سعودی عرب میں خیر مقدم کیا تھا جس کے باعث ایک اندازے کے مطابق تقریباً پانچ لاکھ روہنگیا مسلمان سعودی عرب میں آباد ہیں جبکہ سرکاری اعداد و شمار سے صرف ایک لاکھ بیس ہزار کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ لوگ حجاز کے شہروں مکہ، مدینہ یا جدہ میں آباد ہیں۔ عرب ممالک میں ان کی کل آبادی سات لاکھ ہے۔

انسانی حقوق کی عالمی تنظیم "ایمنسٹی انٹرنیشنل" کے مطابق مغربی صوبہ اراکان میں مسلمان آبادی پر حملوں کے دوران سنگین نوعیت کے جنگی جرائم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ برمی انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں نے دہشت گردوں کو مسلمانوں کی محصور بستیوں پر حملوں کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ ان حملوں میں سیکڑوں مرد و خواتین، بچے اور بوڑھے نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کر دیے گئے۔ انسانی حقوق کی عالمی تنظیم نے برما کی حکومت اور انتظامیہ کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اسے قتل عام کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ برما کی حکومت کی طرف سے پیش کیے جانے والے قتل عام کے جواز کو مسترد کر دیا ہے۔

ایمنسٹی انٹر نیشنل کے ترجمان نے ایک بیان میں کہا ہے کہ برما کی ریاست اراکان میں سینکڑوں مسلمان حراست میں ہیں، انہیں کہاں رکھا جا رہا ہے، اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔

برما میں گزشتہ مہینے پھوٹنے والی تشدد کی اس لہر میں گو کہ اب کسی حد تک کمی واقع ہوئی ہے تاہم انسانی حقوق کے عالمی ادارے اب بھی یہ رپورٹس دے رہے ہیں کہ تشدد کا سلسلہ جاری ہے اور مسلمانوں کو اب بھی قتل کیا جا رہا ہے۔ برما کے بودھی قبائل مسلمانوں کے خون کے پیاسے معلوم ہوتے ہیں اور دہشت گرد گروپوں کی جانب سے مسلمانوں کی بستیوں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا جاتا ہے۔ ایمنسٹی انٹر نیشنل کی جانب سے جاری ایک رپورٹ کے مطابق انتظامیہ نے مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث عناصر کے خلاف نہ صرف کسی قسم کی کارروائی نہیں کی ہے بلکہ مسلمانوں کے تعاقب میں سرگرم عناصر کو روہینگیا شہر میں محصور مسلمان آبادی پر حملوں کی اجازت دے رکھی ہے۔ نہ جانے کیوں انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ کو جلا وطن کرنے کیلئے برما کا انتخاب کیا تھا لیکن ظفر نے وہاں جو اشعار اپنے بارے میں کہے تھے وہ اب عام مسلمانوں کی حالت پر صادق آتے ہیں مثلاً

کیا کس جرم پر تو نے مجھے قتل
ذرا تو، دل میں شرمایا تو ہوتا

ترکی کے محکمہ مذہبی امور کی جانب سے جاری ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حالیہ فسادات کے دوران .برما میں دو ہزار مسلمان بچوں، مرد، خواتین اور بوڑھوں کو شہید کیا گیا ہے جبکہ نوے ہزار افراد ہجرت پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ترک حکومت کی جانب سے جاری ایک بیان میں .برما میں مسلمانوں کے خلاف ماگ قبائل کی دہشت گردی پر اقوام متحدہ، اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) اور دنیا بھر کی انسانی حقوق کی تنظیموں کو بھی متوجہ کیا گیا ہے۔ بیان میں ان تمام عالمی اداروں سے کہا گیا ہے کہ وہ .برما میں مسلمانوں کے خلاف جاری تشدد بند کرانے کے لیے ٹھوس کردار ادا کریں۔

.برما میں مسلمانوں کے خلاف جاری بودھی دہشت گردی کے خلاف مسلم ممالک کی جانب سے سخت رد عمل سامنے آ رہا ہے۔ مصر کی سب سے .بڑی درسگاہ جامعہ الازہر نے بودھی قبائل کے ہاتھوں نہتے مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف دنیا بھر میں موجود .برمی سفارت خانوں کے گھیراؤ کا مطالبہ کیا ہے تاکہ .برمی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ جامعہ نے .برما میں مسلمانوں کے قتل عام کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اراکان صوبے میں مسلمان آبادی کو ہولناک تشدد کا سامنا ہے لیکن عالمی اور اسلامی سطح پر .برما کے مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کوئی قابل ذکر قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اس اعلان کے بعد قاہرہ میں واقع .برمی

سفارتخانہ کے سامنے مظاہرہ ہوا اور اس میں عہد کیا گیا کہ جب تک بین الاقوامی برادری توجہ نہیں دیتی احتجاج جاری رہے گا۔اسی کے ساتھ تیونس میں اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے مظاہرہ ہوا۔برما کی حکومت کے خلاف اقدام کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔اس مظاہرے میں ایک وزیر نے حکومت کی نمائندگی کی۔برما کے مظلوم مسلمانوں سے یکجہتی کا اعلان کرنے کی خاطر دنیا بھر کے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی جن میں خاص طور پر ہندوستان، پاکستان ،ایران ،ترکی ،غزہ ،انڈونیشیا، ملیشیا، تھائی لینڈ، جاپان اور برطانیہ قابلِ ذکر ہیں۔

برما کے مسلمانوں نے شہنشاہیت کے مظالم سہے۔انگریزوں کی دغابازی کا شکار ہوئے۔جمہوری حکومت کو دیکھا اور فوجی آمروں کو بھگتا لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود ان کی حالتِ زار میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی۔گزشتہ دنوں برما میں ہونے والے انتخابات میں آنگ سوچی کی جماعت کے بائیکاٹ کے نتیجے میں فوجی حکمرانوں کی حمایت یافتہ جماعت برسر اقتدار آ گئی۔انتخابات کے ۲ ہفتہ بعد اچانک سوچی کو ملکی اور عالمی دباؤ کے نتیجہ میں طویل نظر بندی سے رہا کر دیا گیا۔ ۶۵ سالہ سوچی مہاتما گاندھی اور نیلسن منڈیلا کے عدم تشدد کے فلسفہ پر یقین رکھتی ہیں اور دنیا بھر میں جمہوری جدوجہد کی علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہیں۔انہوں نے برما کے عوام کو "خوف سے آزادی" کا

نعرہ دیا ہے۔ لیکن ۲۱ سال قید و بند کی صعوبت اٹھانے والی سوچ نے بھی روہنگیا مسلمانوں کے خلاف ہونے والے تشدد کے حوالے سے گول مول بیان دے کر مسلمانوں کو مایوس کیا ہے۔ انہوں نے قانون کی حکمرانی کو پر زور دیا۔ امن کے قیام کی بات کی لیکن روہنگیا مسلمانوں کو برمی شہری تسلیم کرنے کے معاملہ ٹال گئیں۔ حقیقت تو یہ ہے امت کو خوف سے نکال کر آزادی کی نعمت سے سرفراز کرنے کا کام کوئی اور نہیں کرے گا۔ اگر اراکان کا علاقہ تیل کی دولت سے مالامال ہوتا یا اس سے مغرب کا کوئی سیاسی مفاد وابستہ ہوتا تو اس معاملہ میں خوب ہنگامہ آرائی ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے اس کیلئے امت مسلمہ کو خود اپنے بل بوتے پر کمر بستہ ہو کر اللہ کے نام پر جدو جہد کا آغاز کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ بقول حالی

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

فساد کی سیاست اور سیاست کا فساد

انجینئر فصیح محمود کا سعودی عرب سے اغوا، جامعہ الفلاح کے طلبا کی علی گڈھ ریلوے اسٹیشن سے غیر قانونی گرفتاری، معروف صحافی سید کاظمی کی بلاچارج شیٹ دہلی کے اندر قید و بند، معصوم قتیل صدیقی کی پونا جیل میں شہادت، ابوجندل کا اچانک وارد ہو جانا، اترپردیش میں یکے بعد دیگرے تین فسادات اور پھر آسام کا قتل عام۔ گزشتہ تین ماہ کے اندر پے درپے رونما ہونے والے ان واقعات کو اگر کوئی اتفاقی قرار دیتا ہے تو اس سے بڑا بھولا کوئی اور نہیں ہے اور اگر کوئی اس کیلئے سنگھ پریوار کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے تو اس سے بڑا احمق بھی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ سعودی عرب سے فصیح کو اغوا کرنا یا ابوجندل کو حاصل کرنا یہ صرف مرکزی حکومت کے بس کا روگ ہے۔ جامعہ کے طلبہ کو کشمیر کے اندر ان کے والدین کو پولس اسٹیشن میں بلا کر یوپی حکومت کے اہلکار رہا نہیں کر سکتے۔ دہلی کی ریاستی و مرکزی دونوں حکومتوں پر کانگریس کا قبضہ ہے۔ ریاستِ مہاراشٹر میں ہائی سیکیورٹی جیل کے اندر قتیل صدیقی کا قتل کروادینا فی الحال بی جے پی شیوسینا کے بس میں نہیں ہے اور یوپی کے اندر بی جے پی میں اس وقت وہ دم خم باقی نہیں رہا کہ فساد پر فساد کرواتی پھرے۔ آسام میں بی جے پی تو کجا اسکی مائی باپ اے جی پی بھی یوڈی ایف کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔ ایسا نہیں

ہے کہ بی جے پی یہ سب کرنا نہیں چاہتی لیکن موجودہ سیاسی صورتحال میں ان ریاستوں کے باہر جہاں وہ اقتدار پر فائز ہے یہ سب اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان واقعات کے پیچھے جو ہاتھ کارفرما ہے اس خونی پنجہ کا پتہ لگانا کوئی تحقیق طلب امر نہیں ہے بلکہ کانگریس پارٹی کی گھناؤنی سیاست سے ساری دنیا واقف ہے۔

ہندوستان کی عوام اور اس کے اندر پائی جانی والی سب سے بڑی اقلیت فی الحال بے شمار مسائل کا شکار ہے لیکن اس کے برعکس کانگریس کا سب سے بڑا مسئلہ جلد از جلد راہل گاندھی کو وزیر اعظم کی کرسی پر بٹھا دینا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نہرو گاندھی خاندان کے اقتدار اور اترپردیش میں کانگریس کی طاقت کے درمیان چولی دامن کا ساتھ رہا ہے ۔جب بھی کانگریس پارٹی یوپی میں کمزور ہوئی ہے گاندھی خاندان کو اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا ہے۔ کانگریسیوں کو اس بار اترپردیش کے ریاستی انتخابات سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں ۔ اسی لئے ان لوگوں انتخاب کی کمان راہل گاندھی کے حوالے کی تاکہ کامیابی کا سہرہ ان کے سر باندھ کر تاجپوشی کی رسم ادا کر دی جائے ۔ اترپردیش میں کانگریس کا اکثریت حاصل کر لینا تو کسی کے خواب و خیال میں نہیں تھا۔ملائم یا مایاوتی میں سے ایک کی کامیابی یقینی تھی لیکن کانگریس کا منصوبہ یہ تھا کہ ان دونوں کو واضح اکثریت سے محروم کر دیا جائے اور جو بھی جماعت پہلے نمبر پر

آتی ہے اس کی حمایت کرکے کم از کم یوپی کی سیاست میں اک اہم مقام حاصل کر لیا جائے تاکہ آئندہ کے پارلیمانی انتخابات میں برسر اقتدار جماعت کو بلیک میل کرکے اس سے مفاہمت کی جاسکے اور اس کی حمایت کا بھرپور فائدہ اٹھاکر اپنی پارٹی کے زیادہ سے زیادہ ممبرانِ پارلیمان کو کامیاب کیا جاسکے۔

اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے کانگریس نے مسلم ریزرویشن کا مسئلہ بڑے زور و شور کے ساتھ اٹھایااور سلمان خورشید جیسے سلجھے ہوئے وکیل الکشن کمیشن سے بھڑ گئے۔ مرکزی وزیر قانون کا اشتعال انگیز بیان دینا اور دستور کی خلاف ورزی کرنا نہایت شرمناک تھا لیکن کانگریس نے اس سے بھی پس وپیش نہیں کیا اس کے باوجود مسلمانوں نے ان کی اہلیہ سمیت کانگریس پارٹی کو دھول چٹادی۔ راہل اور پرینکا کا جادو خود امیٹھی اور رائے بریلی میں بھی نہیں چل سکا۔ مسلمانوں نے سوچا کانگریس کی حمایت کرکے بلاواسطہ ایس پی یا بی ایس پی کی حمایت سے بہتر بلواسطہ ان جماعتوں کی حمایت فائدے کا سودہ ہے۔ اس کے چلتے سماجوادی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہو گئی۔ کانگریس اور راہل گاندھی کے سارے خواب چکناچور ہوگئے اور وہیں سے اس پارٹی نے طوطا چشمی آنکھیں پھیر لیں اور شروع ہوگیا ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر مسلمانوں کو پریشان کرنے کا لامتناہی سلسلہ جو ہنوز جاری ہے۔ اس کی ابتدا ہندو دہشت گردوں کے ساتھ

ہوئی۔ ان کی ضمانتیں منظور ہونا شروع ہو گئیں اور پھر اسرائیلی سفارتخانے کی گاڑی پر حملہ کے بہانہ بناکر مسلمانوں کو دہشت گرد ٹھہرانے منصوبے بند کھیل کھیلا جانے لگا۔ اترپردیش انتخابات کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے تئیں حکومتِ ہند کے رویہ میں جو نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ۔اب کانگریس پارٹی کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ مسلمان اگر امن و سکون کی حالت میں ہوتے ہیں تو وہ ٹھنڈے دماغ سے کانگریس کے متبادل کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اس لئے اگر انہیں دہشت زدہ رکھا جائے تو وہ خوف کے مارے ہماری پناہ میں آجائیں گے ۔ ہندو رائے دہندگان مسلمانوں کی مصنوعی حمایت سے بھی ناراض ہوتے ہیں ۔اس کا اعتراف شنکر سنگھ واگھیلا نے کیا وہ بولے مسلمانوں کی حمایت کرنے کی قیمت کانگریس چکا رہی ہے اسلئے مسلمانوں کو بھی کھل کر کانگریس کی حمایت کرنی چاہئے۔ مگر جب اترپردیش اور بہار جیسی ریاستوں میں مسلمانوں نے کانگریس کے جھانسے میں آنے سے انکار کردیا تو دہشت کی حکمت عملی اپنائی گئی ۔ بہار میں بی جے پی سے مفاہمت کے باوجود نتیش کمار اپنی فلاحی اسکیموں کے باعث مسلمانوں کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اترپردیش میں ملائم سنگھ نے مسلمانوں کو خوش کردیا تو انہیں دو ریاستوں کو نشانہ بنایا گیا۔ فصیح اور قتیل کے ذریعہ

بہار کے مسلمانوں کو خصوصاً اور ملک بھر کے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا گیا کہ کانگریس کے علاوہ کوئی اور انہیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتا۔ علی گڑھ اور دہلی میں ہونے والی گرفتاریاں اور یوپی کے فسادات بھی اسی حکمتِ عملی کا حصہ تھے۔ اس سے ہندو ووٹرس کو بھی محسوس کرایا گیا کہ انکی پارٹی اب راہِ راست پر آگئی ہے۔

صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پرنب مکرجی نے اپنے اولین خطاب میں کہا دو عظیم جنگوں کے بعد برپا ہونے والی سرد جنگ تیسری عالمی جنگ تھی لیکن اس کے بعد دہشت گردی کے خلاف چوتھی عالمی جنگ کا آغاز ہوا ہے۔ یہ کہیں بھی سر اٹھا سکتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدرِ مملکت کیا آسام میں ہونے والے حالیہ قتل عام کو بھی دہشت گردی کی جنگ قرار دیں گے یا امریکہ کے سرٹیفکٹ کا انتظار کریں گے۔ انہوں نے کہا مجھے فخر ہے ہماری مسلح افواج نے سرحدوں کی حفاظت کی اور ہماری پولس نے اندرونِ ملک اس کا مقابلہ کیا اور ہندوستان کی عوام نے دہشت گردوں کی تمام تر اکساہٹ کو نظر انداز کر کے دہشت گردی کی جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ اگر یہ سچ ہے تو آسام میں ۴۵ لوگ دیکھتے دیکھتے کیوں ہلاک کر دیئے گئے؟ جس پولس کی تعریف صدر صاحب نے کی وہ کیوں خاموش تماشائی بنی رہی؟ وہاں پر تین لاکھ لوگوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر پناہ گزین کیمپوں میں کیوں آنا پڑا؟ کیا اس ظلم وسفاکی کیلئے کیا وہ نام

نہاد بالغ نظر عوام ذمہ دار نہیں ہیں جنھیں صدر صاحب نے دہشت گردی کی جنگ میں کامیابی کا تمغہ عطا کر دیا ؟ وزیر اعظم کو اسے کلنک قرار دے کر تین سو کروڑ کی امداد کا اعلان کیوں کرنا پڑا؟ اور منموہن سنگھ نے بھی اٹل بہاری واجپائی کی طرح گو گوئی کو ہٹانے کے بجائے محض زبانی جمع خرچ پر اکتفا کیوں کیا؟ دہشت پسندی کو صرف القاعدہ، لشکر طیبہ ،انڈین مجاہدین اور آئی ایس آئی سے منسوب کرنا دراصل ریاستی اور اکثریتی فرقہ کی دہشت گردی پر پردہ ڈالنے کی ایک سازش ہے۔

آسام کے حالیہ فسادات بوڈو لینڈ کے علاقہ میں ہوئے ہیں اس سے قبل ۱۹۹۳ سنہ، ۱۹۹۴ سنہ اور ۲۰۰۸ سنہ میں اس قسم کے فسادات ہو چکے ہیں ۱۹۹۶ سنہ میں بھی دولاکھ لوگ ۱۹۹۶ سنہ بے گھر ہوئے تھے اور ہلاکتوں کی تعداد ۲۰۰ تھی ۔بوڈو عوام کی ابتدائی جنگ حکومت ہند کے خلاف تھی۔ نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ آف بوڈو لینڈ نے آزادی کے حصول کی خاطر میں اپنی مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا لیکن ۲۰۰۳ سنہ میں بوڈو معاہدہ ہو گیا۔ اس ۱۹۸۸ سنہ سے قبل وہ بوڈو گوریلا فوج وقتاً فوقتاً اپنے مطالبات منوانے کیلئے نہتے مسلمانوں کو دہشت گردی کا شکار بناتے رہے۔آسو نے بھی یہی کیا بنگالی مسلمانوں کے نام پر نیلی میں قتل عام کیا ۳۳۰۰ مسلمانوں کو شہید کرنے کے بعد حکومت ہند سے معاہدہ کرکے اپنی سیاسی جماعت اے جے پی بنائی اور کانگریس کو اقتدار سے بے دخل کرکے اپنی ریاستی اقتدار

پر قابض ہوگئے گویا جس کسی کو مرکزی حکومت سے اپنے مطالبات منظور کروانے ہوں اور سیاسی مفادات حاصل کرنا ہو اس کیلئے ریاست کے مسلمان نرم چارہ ہیں ۔چونکہ ہر مرحلہ میں ظالموں کو حکومت اور عوام کے ذریعہ سزا کے بجائے انعام واکرام سے نوازہ گیا اس لئے یہ بربریت کا یہ ننگا ناچ جاری و ساری رہا۔

آسام میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو بڑی آسانی سے بنگلہ دیشیوں کے خلاف مقامی عوام کا غصہ قرارادے دیا جاتا ہے جو سراسر جھوٹ ہے۔ اسکی تازہ مثال سوکھن جھوراکے ریلیف کیمپ میں اجیت سین نامی صحافی کے سامنے ایک بوڈو عورت کا اعتراف ہے۔ اس نے کہا میں بالکل نہیں جانتی کہ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے ؟ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ امن وآشتی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی گزار رہے تھے اور میں نہیں چاہتی کہ یہ جو کچھ ہوا ہے ایسا پھر کبھی ہو۔ اسی طرح کی بات بونگائی گاؤں کے ریلیف کیمپ میں زاہدہ خاتون نامی مسلمان خاتون نے کہی۔ اس نے کہا جب فسادیوں نے میرے گھر کو آگ لگائی تو میں نے ندی میں کود کر اپنے آپ کو بچایا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے کپڑوں کا دوسرا جوڑا بھی نہیں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جلد از جلد امن بحال ہو جائے اور وہ اپنے گھر لوٹ جائے۔ یہ عام لوگوں کے جذبات ہیں لیکن سیاست داں اس مختلف سوچتے ہیں اور کرتے ہیں۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ فسادات خود وزیر اعلیٰ ترون گوگوئی نے اپنی ناکامی کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے کروائے ہوں۔ روایتی طور پر آسام کے معاشرے خواتین کا بڑا اہتمام پایا جاتا تھا۔ ایک زمانے تک وہاں قحبہ خانہ نام کی کسی شہ کا وجود نہیں تھا۔ کسی خاتون پر دست درازی کے جواب میں مجرم کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا رواج تھا اسی لئے دوسرے علاقوں سے وہاں ملازمت کیلئے منتقل ہو کر جانے والے شہری اور فوجی آسامی خواتین کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ لیکن گزشتہ چند سالوں میں یہ اقدار پامال ہوتی چلی گئیں۔ ۹ جولائی کو ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ سرِ عام بدسلوکی کا ۴۵ منٹ تک جاری رہنا اور عوام کا اس میں کوئی مداخلت نہیں کرنا یہ دہلی میں تو متوقع ہے لیکن آسام میں نہیں اس کے باوجود یہ افسوس ناک واقعہ راجدھانی کے اندر وقوع پذیر ہوا اور مجرم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ نہایت شرمناک بات تھی۔ اس کے خلاف تمام طبقات میں زبردست غم و غصہ تھا۔ لوگ اسے گوگوئی حکومت کی ناکامی قرار دے رہے تھے۔

شمالی آسام مسلم کلیان پریشد کے رہنما ایم آئی بورا کا کہنا تھا کہ آسام جیوموتی اور مولا گوبھورو جیسی عظیم خواتین کی سرزمین ہے۔ اس کے باوجود یہاں خواتین پر مظالم روزمرہ کی بات بن گئے ہیں۔ ۹ جولائی کے واقعہ نے

ہمیں شرمندہ اور مایوس کر دیا ہے۔ گوہاٹی میں ہونے والے اس واقعہ کے بعد سیوساگر میں ایک فوجی نے مقامی عورت کے ساتھ بد سلوکی کی۔ ہماری ریاست میں خواتین غیر محفوظ ہو گئی ہیں اور یہ حکومت کی ناکامی ہے۔ آل آسام شرمک کرشک کلیان پریشد کے سکریٹری جنرل پردیپ کلیٹا نے تو آگے بڑھ کر ریاستی حکومت کو برخواست کرکے صدارتی راج نافذ کرنے کا مطالبہ کر ڈالا اس لئے کہ حکوت عام لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے کی اپنی بنیادی ذمہ داری ادا کرنے میں ناکام ہو گئی ہے اور امن و قانون کی فضا کا مکمل خاتمہ ہوگیا ہے ایسے میں صدارتی حکومت ہی واحد حل ہے۔

آسام میں سب سے بڑی حزب مخالف آل انڈیا یونائیٹیڈ ڈیموکریٹک فرنٹ ہے۔ ١٩ جولائی کو اس کے ١٧ ممبرانِ اسمبلی نے راج بھون کے سامنے دھرنا دیا۔ گورنر دراصل صدر کا نمائندہ ہوتا ہے گویا یہ مظاہرہ ریاستی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار تھا۔ یہ مظاہرہ ریاست کی بگڑتی ہوئی امن و قانون کی صورتحال اور خواتین کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے خلاف احتجاج تھا۔ رکن اسمبلی سراج الدین اجمل نے اس موقع پر کہا ریاست میں عوام نہایت غیر محفوظ ہیں۔ ممبرانِ اسمبلی۔ سماجی کارکنان اور خواتین پر ہونے والے حملوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ امن و سلامتی کا کوئی نام ونشان نہیں ہے اور حکومت سو رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر عوام کے نمائندے تک غیر محفوظ ہوں تو

عوام کا کیا ؟ان کی پارٹی کے رکن اسمبلی طفیل احمد کو قتل کر دیا گیا جبکہ کانگریس کی خاتون رکن اسمبلی رومی ناتھ ہاتھا پائی کا شکار ہوئیں ۔ سماجی کارکن اکھل گوگوئی کو بدمعاشوں نے زخمی کر دیا۔ بی جے پی رکن اسمبلی پرشانت پھکن اور خود ان پر بھی ماہِ مئی میں غنڈوں نے حملہ کیا۔

ترون گوگوئی نے سوچا ہوگا کہ ان مظالم پر پردہ ڈالنے کیلئے اور اپنی کرسی کو محفوظ کرنے کیلئے کچھ ایسا کیا جائے کہ لوگ ان وارداتوں کو یکسر بھول جائیں ۔اس لئے مظاہرے کے دوسرے ہی دن بوڈو علاقوں میں آگ اور خون ہولی شروع ہو گئی ۔یو ڈی ایف کے صدر اور رکن پارلیمان بدرالدین اجمل کے مطابق اس فساد میں بوڈو پیوپلس فرنٹ کے سارے گیارہ ممبران اسمبلی ملوث ہیں اس لئے بوڈو سرحدی کونسل کو فی الفور برخواست کر دینا چاہئے۔ جن لوگوں کے پاس اب بھی اسلحہ ہے اسے واپس لینا چاہئے۔ مرنے والوں کو دس اور زخمیوں کو پانچ لاکھ معاوضہ دیا جانا چاہئے نیز وزیرِاعظم کو دیئے جانے والے میمورنڈم میں انہوں نے حالیہ تشدد کی مکمل ذمہ داری ریاستی وزیرِاعلیٰ پر ڈالی جن کے پاس وزارتِ داخلہ کا قلمدان بھی ہے ۔اس طرح کے مطالبات کوئی نئے نہیں ہیں ۔ جمیعت العلماء یہ سب اس زمانے میں بھی کرتی رہی ہے جب یوڈی ایف آسام کی سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی نہیں تھی۔ تشدد کے ان واقعات نے ان لوگوں کی خوش فہمی بھی دور کر دی ہے جو یہ سوچتے تھے کہ اگر مسلمان کوئی بڑی انتخابی کامیابی

حاصل کرلیں تو انہیں فسادات سے نجات حاصل ہو جائیگی۔آسام میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرنے کے باوجود اس طرح کے بھیانک فساد کا وقوع پذیر ہو جانا جمہوری نظام میں اقلیتوں کے عدم تحفظ کا شاخسانہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ماضی کے فرقہ وارانہ فسادات کا سب سے زیادہ فائدہ کانگریس پارٹی ہی نے اٹھایا ہے لیکن اسے یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ میرٹھ کے ہاشم پورہ قتلِ عام کے بعد گزشتہ پچیس سالوں میں اسے ایک بار بھی ریاست کے اندر اقتدار حاصل نہیں ہو سکا ہے۔کانگریسی وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کے زیر اثر پی اے سی نے ۴۲ مسلم نوجوانوں کو ماہِ رمضان کے اندر ہلاک کرکے ان کی لاشوں غازی آباد میں واقع مراد نگر کے ایک نالے میں پھینک دیا تھا۔ مئی ۲۰۰۰ء میں اس کے سولہ مجرم عدالت میں حاضر ہو گئے لیکن ان کو سزا دینے کے بجائے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔اس وقت وزیر داخلہ چدمبرم کے پاس وزارتِ داخلہ کے تحت داخلی تحفظ کا قلمدان تھا اور اس قتلِ عام سے قبل انہوں متاثرہ علاقہ کا دورہ کیا تھا اس لئے اس التوا میں پڑے اس مقدمہ کے ملزمین میں چدمبرم کو شامل کئے جانے کا مطالبہ سبرامنیم سوامی نے کیا ہے۔دراصل اس طرح کے فسادات کی روک تھام کیلئے ضروری ہے اس کیلئے ذمہ دار اعلیٰ سیاسی اور انتظامی حکام کو جتنی جلد ممکن ہو قرار واقعی سزا سنائی جائے۔دیکھنا یہ ہے دہلی کی تیس ہزاری عدالت اس بابت کا فیصلہ کرتی ہے۔

جمہوریت وخلافت: صلاحیت و صالحیت

ملوکیت کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں شاہی خاندان کے افراد کو اقتدار وراثت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اقتدار کے حصول میں ان کے اندر پائی جانے والی صلاحیتوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی نااہلی اس راہ میں حائل ہوتی ہے۔ جمہوریت کا دعویٰ ہے کہ اس کے یہاں یہ کمزوری نہیں پائی جاتی۔ نظری سطح پر اگر یہ بات درست بھی ہو تب بھی عملاً اس میں کس قدر سچائی ہے یہ تحقیق طلب موضوع ہے۔ مثلاً پاکستانی جمہوریت کے اندر بعد از انتخاب اکثریتی جماعت کا ایک بدنامِ زمانہ بدعنوان شخص محض اپنی رشتہ داری کے باعث صدارت کے عہدہ پر فائز ہوگیا۔اب اسے بچانے کی خاطر عوام کا ایک منتخب شدہ وزیر اعظم بلی کا بکرا بن گیا اور دوسرا مذبح خانے کی جانب ہانکا جارہا ہے لیکن اس بدعنوان صدر کے آگے جمہوری نظام بے دست و پا ہے۔ جمہوریت نواز یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کیا جانے جمہوریت کس چڑیا کا نام ہے؟ وہاں کا جمہوری نظام ناقص ہے اس لئے اس کی مثال دینا مناسب نہیں ہے۔ چلئے مان لیا ہندوستان تشریف لایئے جسے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے پر فخر ہے۔ سارے جہاں سے اچھے ہندوستان کے اندر ابھی حال میں صدارتی انتخاب کا انعقاد

ہوا جس میں حزب اختلاف کے کئی ارکان نے اپنے امیدوار پی اے سنگما کے خلاف پرنب مکرجی کو ووٹ دیا۔ اب اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ایسا ضمیر کی آواز پر کیا گیا تو اس بیچارے کو یہ نہیں پتہ کہ ہمارے سیاست دانوں کا ضمیر کب کا مر چکا ہے۔ اب جس چیز کا وجود ہی نہ ہو اس کی آواز اگر آئے بھی تو کیسے ؟ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ نظریاتی بنیادوں پر کیا جانے والا یہ انفرادی فیصلہ ہے تو وہ نہیں جانتا کہ نظریاتی حیثیت سے پرنب اور سنگما کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا نیز جن سیاستدانوں کو دولت کے علاوہ کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی ہو ان سے نظریات کی پاسداری چہ معنی دارد۔ ان دونوں متبادل کے بعد وہی ایک وجہ باقی رہ جاتی ہے جو کہ اصل حقیقت ہے۔ ان لوگوں نے اپنے ووٹ کو نوٹ کے بدلے فروخت کر دیا۔ جس ملک میں عوام کے نمائندے اپنی رائے بیچنے سے گریز نہیں کرتے وہاں عام آدمی اگر ایسا کرتا ہے تو اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ نیز جس رائے عامہ کو زر خرید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ بدل دیا جاتا ہو اور عوام و خواص کی حمایت کو روپیوں کے عوض خرید لیا جاتا ہو اسے سرمایہ داری تو کہا جاسکتا ہے لیکن جمہوریت نہیں یہ اور بات ہے کہ فی الحال ان دونوں نے مل جل کر اپنا گھر بسا لیا ہے۔

پرنب دا کے صدرِ مملکت بن جانے سے ان کا اپنا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ تمام بدعنوانی کے الزامات سے تحفظ حاصل ہو گیا اور اسی کے ساتھ جمہوری نظام کے

اندر موجود عدم مساوات کا راز بھی فاش ہوگیا اور تو اور انا ہزارے نے بھی جو بدعنوانی کے خلاف تاحیات بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہوئے ہیں پرنب مکرجی کو نہ صرف کلین چِٹ بلکہ مبارکباد کا پیغام بھی دے دیا۔ اگر پرنب یوپی اے اور این ڈی اے کے مشترکہ امیدوار ہوتے تو شاید یہ بات اروند کیجریوال کے گلے سے اتر جاتی لیکن چونکہ بی جے پی نے ان کے خلاف اپنا امیدوار کھڑا کر دیا تھا اس لئے یہ مسئلہ انا جی کی ٹیم کے اندر اختلاف کا سبب بن گیا۔ پرنب دا جب تک وزیر خزانہ رہے انہوں نے وزیراعظم کو لوک پال سے ماوراء رکھنے کی بھرپور وکالت کی اور جاتے جاتے مخالفین میں پھوٹ ڈالکر ان کا بھلا کر گئے۔

پرنب مکرجی کے صدر بن جانے کے بعد راہل گاندھی کے راستہ کی ایک رکاوٹ دور ہو گئی اور اب دگوجۓ سنگھ نے ان کو بڑی ذمہ داری دینے کی خبریں ذرائع ابلاغ میں پھیلا رہے ہیں۔ فی الحال کانگریس پارٹی کا سب سے بڑا بھوپوں سنگھ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ پرنب مکرجی ویسے تو ملک کے وزیر خزانہ تھے لیکن پارلیمان کے اندر حکومت کا دفاع اور باہر مخالفین سے پنجہ آزمائی ان کی اہم ذمہ داریاں تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں محاذ پر بڑی خوبی سے انہوں نے اپنے کام سرانجام دیا۔ وہ ایوان زیریں میں کانگریس کے رہنما کی حیثیت سے نااہل وزیر پارلیمانی امور اور باہر بدعنوان وزیر داخلہ کا متبادل بنے رہے۔ پرنب کی بہترین کارکردگی کے انعام میں انہیں ربر اسٹامپ بنادیا گیااوران

کے اہم ترین قلمدان کو جس انداز میں پُر کیا گیا اس سے جمہوریت کی جانب سے کئے جانے والے صلاحیت اور اہلیت کے بلند بانگ دعووں کی قلعی کھل گئی۔

شمالی و مشرقی ہند دنیا کے سب سے بڑا بجلی سانحہ کی زد میں تھا۔ ۲۲ ریاستوں کے ۳۳ کروڑ عوام کو اس نے پریشان کر رکھا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا جس وزیر توانائی کے زیر نگرانی یہ سنگین صورتحال رونما ہوئی اس سے فی الفور استعفیٰ طلب کر لیا جاتا بلکہ اس کی نااہلی کے باعث عوام کو ہونے والی دشواریوں کے پیش نظر اسے جیل بھیج دیا جاتا لیکن بدقسمتی سے سشیل کمار شندے کا شمار فی الحال گاندھی خاندان کے سب سے زیادہ وفادار لوگوں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق دلت ذات سے ہے اور کانگریس کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ دلت ووٹرس کو مایاوتی سے توڑ کانگریس کی جھولی میں لے آئیں گے اس لئے انہیں ترقی دے کر وزیر داخلہ بنا دیا گیا گویا حکومت میں دوسرے نمبر کی سب سے اہم ذمہ داری پر ایک ایسے شخص کو فائز کیا گیا جس کی نااہلی کا سورج بڑی شان سے چمک رہا تھا اور ملک کا بڑا حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وزارتِ توانائی میں ہوتے ہوئے جو شخص اجالا نہیں پھیلا سکا وہ وزیر داخلہ بن جانے کے بعد ملک میں کس قدر تاریکی پھیلائے گا اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کی ۱۲۰ کروڑ عوام میں ایک آدمی بھی شندے سے زیادہ اہل نہیں ہے اور اگر ہے تو یہ اہلیت کا دعویدار نظام اس کو کیوں نظر

انداز کرتا ہے؟

سیاست کی معمولی شد بد رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ وزیر داخلہ کا قلمدان وزیر خزانہ سے زیادہ اہم ہے۔اس کے باوجود آخر چدمبرم نے اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ پر اکتفا کیوں کیا؟ اگر یہ ان کی نااہلی کی سزا ہے تو بہت کم ہے۔آسام میں جس قدر حفاظتی دستوں کی ضرورت تھی اس کی عدم فراہمی کا اعتراف خود کانگریسی وزیر اعلیٰ ترون گوگوئی نے کیا ہے۔اس کوتاہی کیلئے براہِ راست وزیر داخلہ ذمہ دار ہے۔اسی لئے چدمبرم کے دورۂ آسام کے دوران مختلف کیمپوں میں ان کے خلاف نعرے بازی کی گئی۔یہ شیو راج پاٹل سے بڑی نااہلی تھی اس لئے انہیں بھی گھر بھیج دیا جانا چاہئے تھا۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آسام میں ۵۶ معصوموں کی ہلاکت اور ۴ لاکھ لوگوں کے امدادی کیمپوں میں پناہ گزین ہونے کا اعتراف جس روز چدمبرم نے کیا اسی روز قومی خزانے کی کنجیاں ان کے حوالے کر دی گئیں۔کیا یہی اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد ہر ذمہ داریوں کی تقسیم کا طریقۂ کار ہے؟

چدمبرم جیسا نااہل اور خر دماغ وزیر داخلہ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی اور نہیں گزرا ہوگا۔مسلمانوں کے ساتھ جس بے اعتنائی کا رویہ اس شخص نے اختیار کیا ایسا تو شاید اڈوانی نے بھی اپنے دورِ وزارت میں نہیں کیا ہوگا۔وہ

لوگ کم از کم دکھاوے کی خاطر مروت کا اظہار کر دیتے تھے لیکن یہ تو اپنے کبر و غرور کے نشہ میں کچھ سننے کا روادار نہیں تھا۔ خود اپنی جماعت کی جانب سے مدعو مسلم رہنماؤں کے وفد سے جو شخص یہ کہتا ہے آپ کس کی نمائندگی کرتے ہیں میں نہیں جانتا وہ عام مسلمانوں سے کیسا رویہ اختیار کرتا ہوگا اس کا نادزہ باآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ جو اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ تحفظ ہے اور معصوم مسلم نوجوانوں کو بیجا گرفتاریاں عمل میں آرہی ہیں وہ بھلا ان گرفتاریوں کو کیسے روکے گا اور ملت کو تحفظ کیونکر مہیا کرے گا؟ لیکن بہر حال مشیت نے اسے مجبور کیا کہ وہ از خود وزارت داخلہ کے اہم ترین قلمدان سے دستبردار ہو جائے۔

چدمبرم اگر چاہتے تو سونیا گاندھی سے کہہ کر اپنا قلمدان محفوظ رکھوا سکتے تھے۔ اس صورت میں سشیل کمار شندے کو وزیر خزانہ بنا دیا جاتا۔ شندے کیلئے وزارتِ خزانہ بھی فائدے ہی کا سودا تھا اور وہ اسے بخوشی قبول کر لیتے لیکن اپنے بدعنوانی کے معاملات پر قابو پانے کیلئے چدمبرم پرانے شعبہ میں واپس لوٹنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ چدمبرم پر لگنے والے بدعنوانی کے سارے بڑے الزامات اس دور کے ہیں جب وہ وزیر خزانہ ہوا کرتے تھے۔ وزارتِ خزانہ کی فائلوں میں ایسے بے شمار ثبوت دفن ہیں جن کی بنیاد پر چدمبرم کو اے راجہ کے ساتھ تہاڑ جیل میں چکی پیسنے کیلئے جانا پڑ سکتا ہے۔ کرپشن میں نہ صرف وہ

بلکہ ان کا لڑکا کارتنک بھی ملوث پایا گیا ہے۔ اپنے خلاف شواہد کو مٹانے کی خاطر
چدمبرم نے بادلِ ناخواستہ ایک پائیدان نیچے اترنے کی رسوائی گوارہ کرلی ہے۔

چدمبرم کے وزیر خزانہ بن جانے سے عوام میں کوئی جوش و خروش دکھلائی نہیں دیا اس
لئے کہ وہ حکومت کی جانب سے کسی بھی خیر و فلاح کی توقع نہیں رکھتے۔ لیکن صنعت و
حرفت کی دنیا میں خوشی کی لہر ضرور دوڑ گئی اس لئے کہ ان کا وہ پرانا دوست لوٹ آیا
جسے کھلا پلا کر قومی خزانے کو جی بھر کے لوٹا جاسکتا ہے۔چدمبرم اور ان کے بیٹے کارتنک
پر نہ صرف مواصلاتی گھپلوں میں بلکہ اسلحہ کی دلالی میں ملوث ہیں بلکہ سیواگنگا میں
اپنے آپ کو کامیاب کروانے کیلئے وزیر داخلہ کی حیثیت سے نتائج پر اثرانداز ہونے کی
انتخابی بدعنوانی کا بھی ان پر الزام ہے۔

ملک میں فی الحال لوک پال کے حوالے سے بدعنوانی کے خلاف ایک تحریک چلرہی ہے
ایسے میں انڈیا اگینسٹ کرپشن نامی تنظیم نے ایک دستاویز جاری کی ہے جس میں وزیر
اعظم منموہن سنگھ کی وزارت میں شامل ۱۵ وزراء کے خلاف سنگین بدعنوانی کے
معاملات کی تفصیل درج ہے۔ ان وزراء میں خود منموہن سنگھ اور پرنب مکرجی کا نام
بھی شامل ہے جواب صدرِ مملکت ہیں۔ یہ کوئی اناہزارے یا بابارام

دیو کا جذباتی بیان نہیں ہے بلکہ بڑی تفتیش و تحقیق کے بعد تیار کی گئی ایک ۷۹ صفحات پر مشتمل رپورٹ ہے جس میں ہر بات ٹھوس حوالہ جات کے ساتھ درج ہے۔ان میں اخباری تراشوں یا سیاسی بیان بازی کے بجائے سرکاری مراسلت کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ اس دستاویز میں سب سے زیادہ ۲۵ صفحات چدمبرم کیلئے مختص ہیں اور دوسرے نمبر پر سشیل کمار شندے ہیں جن کے الزامات ۱۲ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ۔اور انہیں دونوں کو اہم ترین وزارتوں سے نواز کر حکومت نہ صرف صلاحیت اور صالحیت کے بارے اپنا موقف واضح کردیا بلکہ بدعنوانی اس کے نزدیک کسقدر غیر اہم ہے یہ بھی جتا دیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر مختلف نظر آنے کے باوجود یہ سارے باطل نظامہائے سیاست مثلاً ملوکیت ،آمریت اور جمہوریت عملاً کیوں ایک جیسے ہو جاتے ہیں اور دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ وہ کون سی شہ ہے جو خلافت کو ان سے ممتاز کرتی ہے ؟اس بابت اگر علامہ اقبال سے رجوع کیا جائے جواب ملے گا فقر۔ عام طور پر فقر کو رہبانیت کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے لیکن بقول حکیم الامت ؎

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و راہبانی

سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طُغیانی

اقبال نے اپنی فارسی شاعری میں اس موضوع پر بڑا کلام کیا ہے ایک جگہ وہ کہتے ہیں کافر کا فقر جنگل اور بیابان میں نکل جانا یعنی رہبانیت ہے مگر مومن کا فقر بحر و بر پر لرزہ طاری کر دیتا ہے، مومن کا سکون جنگل میں نہیں ہے بلکہ اس کیلئے پر وقار شہادت کی موت زندگی کا دوسرا نام ہے،کافر ترک بدن کرکے خدا کو ڈھونڈتا ہے وہ خودی کو مارتا جلاتا ہے جبکہ مومن اپنی خودی کو حق کی سان پر چڑھا کر چراغ کی مانند روشن کرتا ہے ۔اقبال کی نظر یں مومن کا فقر کائنات کو مسخر کرنے کے ہم معنی ہے وہ فقرِ کافر اور فقرِ مومن میں اس طرح فرق کرتے ہیں کہ

اِک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اِک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہاں گیری

فقر و اقتدار ایک دوسرے کے متضاد نہیں بلکہ لازم و ملزوم ہیں اگر فقر کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے تو وہ رہبانیت بن جاتا ہے اور اگر اقتدار میں سے فقر کو کم کر دیا جائے تو وہ باطل نظامِ سیاست کی مختلف شکلوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لیتا ہے جن میں جمہوریت بھی شامل ہے لیکن اگر

اقتدار کے ساتھ فقر کو یکجا کر دیا جائے تو خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ سارے باطل سیاسی نظاموں کے اندر مشترک یہی فقر کا عدم وجود ہے جو ہوسِ دنیا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس کے برعکس خلافت کے دامن میں فقر کی موجودگی اسے دنیا سے بے نیاز کر کے اللہ کا نیاز مند بنا دیتی ہے بقول اقبال

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقام نظر، علم مقام خبر

رسول اکرمؐ نے فرمایا ''مال و متاع کی کثرت کا نام استغنا نہیں بلکہ استغنا کا مطلب نفس کا مستغنی ہونا ہے'' استغنا بھی دل میں ہوتا ہے اور فقر بھی دل ہی میں ہوتا ہے'' حضرت علیؓ کا قول ہے ''غنی وہ ہے جو قناعت کے باعث مستغنی ہو'' بد قسمتی سے دیگر نظامہائے باطل کی طرح جمہوری نظامِ سیاست بھی اس عنصر سے یکسر محروم ہے۔ اسی لئے اس نظام میں بھی عوام غریب سے غریب ترین اور ان کے نمائندے امیر سے امیر ترین ہوتے جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر امت مسلمہ اپنے آپ کو ذلت و رسوائی سے نکال کر عظمت و بلندی پر فائز کرنا چاہتی ہے تو یہ

مقصد جلیل کسی باطل نظامِ حیات کو اپنانے یا فروغ دینے سے حاصل نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کیلئے ہمیں اپنے بازو میں حیدر کا زور، دل میں ابوذر کا فقر اور زبان کو سلمان کے صدق سے متصف کرنا ہوگا اس لئے کہ یہی وہ صفات ہیں جو استبدادی قوتوں کے چنگل سے انسانوں کو آزاد کرا سکتی ہیں اور اسی سے حریت، اخوت اور مساوات پر مبنی عالمگیر معاشرہ کا قیام عمل میں آسکتا ہے

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے

وہ کیا تھا، زور حیدر، فقر بو ذر، صدق سلمانی

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب مصر نے ایران میں آنے والے اسلامی انقلاب اور ایران نے مصر و اسرائیل کے درمیان ہونے والے معاہدے کے باعث ایک دوسرے سے تعلقات توڑ لئے تھے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا دونوں واقعات ۱۹۷۹ء میں وقوع پذیر ہوئے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ غیر جانبدار ممالک کی تحریک کا حالیہ اجلاس تہران میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس کی صدارت ایران کر رہا ہے اور وہ کانفرنس کے بعد اپنے اس منصب کو آئندہ سال کیلئے مصر کے حوالے کرنے جا رہا ہے۔ اس کانفرنس کی تیاری کیلئے وزرائے خارجہ کا اجلاس مصر کے شہر شرم الشیخ کے اندر ماہِ مئی میں منعقد ہوا جس میں ایران کے وزیر خارجہ علی اکبر صالحہ شریک ہوئے۔ ایران کے نائب صدر محمد رضا رحیمی نے بنفسِ نفیس قاہرہ کا دورہ کرکے صدر محمد مورسی سے ملاقات کی اور انہیں کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ اعزاز غیر جانبدار ممالک کی تحریک کے ۱۲۰ ارکان ممالک اور ۲۱ مشاہدین میں سے صرف مصری صدر کیلئے مختص تھا۔ حالانکہ شام کے معاملے میں دونوں ممالک کا موقف مختلف ہے اور مورسی نے صدارتی عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا دورہ سعودی عرب کا کیا تھا اور اب پھر سے مصر اور سعودی عرب کے درمیان بحر احمر پر بنائے جانے والے رابطہ پل کی تعمیر کا کام شروع ہوا چاہتا ہے۔ مورسی اور رحیمی کی

۔ملاقات علامہ اقبال کے اس شعر کی مصداق تھی

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

مصر کے اندر گزشتہ سال انقلاب کے بعد حسنی مبارک سے اقتدار فوجی کاؤنسل نے ہتھیا لیا تھا۔ اس وقت کے نائب وزیر دفاع محمد مختار الملا تھا نے ایک مرتبہ صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلح افواج کی سپریم کونسل انتہا پسند دھڑوں کو مصر پر کنٹرول کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ انہوں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مصر پر کسی خمینی کی حکمرانی نہیں چلے گی۔ مصر کی حکمران فوجی کونسل ان کے ملک پر کسی اور خمینی کی حکومت قائم نہیں ہونے دے گی ۔ محمد مختار کا اشارہ اخوان کی جانب تھا۔ اکثر و بیشتر مغرب زدہ حکمرانوں کی مانند وہ بھی اسلام پسندوں کی روز افزوں کی پذیرائی سے پریشان تھے لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے اس عزم کا بھی اعادہ بھی کیا تھا کہ فوجی کونسل پارلیمانی اور صدارتی انتخابات کے بعد اقتدار سول حکومت کے حوالے کردے گی نیز اظہار رائے کی آزادی کا احترام کرے گی۔ بیچارے محمد مختار یہ نہیں جانتے تھے کہ مذکورہ دونوں شرائط بیک وقت پوری نہیں ہو سکتیں اگر غیر جانبدار انتخابات کا انعقاد ہوجاتا ہے تو یقیناً اقتدار انہیں لوگوں کے سپرد کرنا ہوگا جن سے وہ خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں اور یہی ہوا۔ انتخاب کے

بعد مختار صاحب بے اختیار ہو گئے۔بقول اقبال

دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل

موج مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

ایران و مصر کے درمیان ہونے والی پیش رفت کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلینا نہ ہی امریکہ کیلئے ممکن تھا اور نہ ہی اسرائیل ایسے موقع پر خاموش تماشائی بنا رہ سکتا تھا۔اس لئے اس دورے سے تین دن قبل رفح سرحد پر ایک ایسا غیر معمولی سانحہ برپا کیا گیا جس سے اخوان اور مورسی دونوں کے خلاف یکلخت فضا تیار ہو گئی۔ عین افطار کے وقت اسرائیل سے لگی ایک فوجی چوکی پر جنگوؤں نے حملہ کر دیا جس میں حفاظتی دستے کے ۱۶ اہلکار جاں بحق ہوگئے۔ پھر کیا تھا ذرائع ابلاغ نے اس حملہ کیلئے اخوان کو موردِ الزام ٹھہرادیا اور صدر کو فوجیوں کا قاتل بنا کر پیش کردیا۔ فضا اس قدر مکدر کر دی گئی کہ محمد مورسی کو جنازے میں شرکت سے احتراز کرنا پڑا نیز وزیر اعظم حشام قندیل کو جلوسِ جنازہ کے اندر احتجاج اور غم وغصہ کا سامنا کرنا پڑا۔ایسا لگنے لگا کہ کسی بھی لمحہ پھر ایک بار فوجی جنرل حرکت میں آئیں گے اور قومی سلامتی کا بہانہ بنا کر عوامی نمائندوں کو اقتدار سے محروم کر دیں گے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اسرائیل کے وارے نیارے ہو جاتے۔ وہ پھر ایک بار فلسطینیوں اور مصریوں کے درمیان اختلاف پیدا کرکے اپنا الو سیدھا کر لیتے۔لیکن وہ سب تو

۔ نہیں ہوا ہاں جو کچھ ہوا وہ علامہ اقبال کے اس شعر کی مصداق تھا

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گل چیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

مصر میں اخوان المسلمون کی کامیابی پر سابق صدر حسنی مبارک کے حامی ذرائع ابلاغ سیخ پا ہیں۔ ملک کے بیشتر اخبارات اور نشریاتی ادارے سابق دور کے پروردہ ہیں۔ اسی لئے وہ موجودہ حکومت کے خلاف مسلسل زہر افشانی کرتے رہے ش ہیں۔ انہی میں الفراعین ٹی وی چینل بھی شامل ہے، جو سابق صدر حسنی مبارک کی اندھی حمایت میں پیش پیش رہا ہے۔ ’’الفراعین‘‘ ٹی وی کے مالک توفیق عکاشہ نے صدر محمد موری پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ صدر کے ساتھ سیاہ وحشی موجود ہیں جو انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے اور صدر محمد موری کا منصب صدارت پر فائز ہونا صہیونیوں اور اسرائیلیوں کے لیے نیک شگون نہیں ہے۔ انہیں صدر محمد موری کی طرف سے لاحق خطرات سے آگاہ رہنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ توفیق عکاشہ نے صدر محمد موری کو ہلاک شدگان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کرنے کا مشورہ دیا اس لئے کہ فوجیوں کو تحفظ دلانے میں ناکامی پر عوام کے اندر صدر موری کے خلاف سخت غصہ ہے۔ اگر وہ مقتولین کے جنازوں میں شریک ہوئے تو ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو گا۔

یہ کوئی ہمدردانہ مشورہ نہیں تھا بلکہ اس سے عوام کو اکسانہ مقصود تھا ایک اور صحافی باقری نے بھی اسی طرح عوام کو اخوان کے خلاف اشتعال دلانے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں قاہرہ کے اندر اخوان کے دو دفاتر کو منصوبہ بند طریقہ پر دن دہاڑے نذر آتش کر دیا گیا۔ کسی بر سرِ اقتدار جماعت کے دفتر کو دارالخلافہ کے اندر جلانے کا یہ انوکھا واقعہ تھا۔ یہ لوگ قوم کی اس نازک گھڑی میں عوام کو بغاوت پر اکسا رہے تھے لیکن پھر حکومت حرکت میں آئی اور اس نے الفراعین کی نشریات پر ایک ماہ کے لیے پابندی عائد کر دی نیز ٹی وی کی انتظامیہ کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر انہوں نے حدود سے تجاوز کا سلسلہ جاری رکھا تو لائسنس منسوخ کر دیا جائے گا۔ جو لوگ اپنے مخالف کی شرافت کو اس کی کمزوری سمجھتے ہیں انہیں اسی طرح کے انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

مصری صدر نے اپنے پہلے صدارتی حکم نامہ کے بعد جس سے خاصہ ہنگامہ ہوا تھا اس صورتحال میں ایک اور حکم نامہ جاری کر دیا اور خفیہ ایجنسی کے چیف مراد موافی کو جبراً ریٹائر اور شمالی سیناء کے گورنر عبدالوہاب مبروک کو بر طرف کر دیا۔ نیز فوج اور خفیہ اداروں کی تنظیم نو کا حکم دے دیا ہے۔ محمد رافت عبدالواحد شہاتہ کو مراد موافی کی جگہ خفیہ ادارے جنرل انٹیلی جنس کا عبوری سربراہ مقرر کر دیا گیا اور وزیر دفاع فیلڈ مارشل محمد حسین طنطاوی کو ملٹری پولیس کا نیا سربراہ تلاش کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اس کے علاوہ ملٹری پولیس

کے سربراہ حامدی بدین کو شہید فوجیوں کے جنازے کو محفوظ بنانے میں ناکامی کے باعث تبدیل کیا گیا۔ میجر جنرل احمد محمد ذکی کو صدارتی حفاظتی دستہ کا سربراہ نامزد کیا گیا میجر جنرل اسامہ محمد الصغیر کو وزیر داخلہ کا نائب بنایا گیا۔اس طرح گویا صدر موری کو کمزور کرنے کا خواب دیکھنے والوں نے انہیں از خود تنظیم نو کا موقع دے دیا۔ انہوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھا کر سابقہ نااہل عہدہ داروں سے پیچھا چھڑا لیا اور قابلِ اعتماد لوگوں اہم قومی ذمہ داریوں پر فائز کر کے دشنوئس کا داؤں انہیں پر الٹ دیا۔اس کے ساتھ ساری دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اقتدار کی اصل باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے ؟
مصر کے ذرائع ابلاغ یہ خبر اچھالتے رہے ہیں کہ موری بہت ہی کمزور صدر ہیں اور انہوں نے اپنی ہی طرح ایک نامعلوم اور غیر تجربہ کار شخص کو وزیر اعظم بنا دیا ہے لیکن قوم کی اس نازک گھڑی میں صدر موری نے صحرائے سیناء کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کے لئے جاری آپریشن کی قیادت بنفس نفیس اپنے ہاتھ میں لے کر یہ غلط فہمی بھی دور کر دی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ یہ آپریشن سیکیورٹی کی صورتحال بہتر ہونے تک جاری رہے گا اور میں خود لحہ بہ لحہ اس کی نگرانی کروں گا۔ مصری روزنامے "الیوم السابع" سے ایک خصوصی گفتگو میں انہوں نے کہا کہ شہریوں، پولیس اور فوجی اہلکاروں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہئے۔ جس کسی نے اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کی، تو میں انہیں

ادب سکھانے کے لئے خود آؤں گا۔ سیکیورٹی امن کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ ہدف قانون کے مساویانہ نفاذ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ وطنِ عزیز میں کسی پر ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔

ان اقدامات کے بعد مورسی نے رفح کراسنگ کا دورہ کیا سرحد پر موجود فوجیوں کے ہمراہ ایک فوجی چوکی میں زمین پر بیٹھ کر افطار کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ان کا ملک، قومی شہیدوں کے خون کا قصاص لینے پر مصر ہے۔ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں بتایا کہ اہل سیناء اپنے علاقے کی ترقی کی خاطر زمین اور دیگر وسائل استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ غزہ کی پٹی کے ساتھ رفح بارڈر کراسنگ کو پھر سے کھول دیا گیا اور اس سرحدی گزرگاہ سے فلسطینیوں کو غزہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی ۔ صدر کے یہ اقدامات اور اعلانات اس شعر کے ترجمان بن گئے

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

اخوان المسلمون نے اپنے ایک بیان میں اس حملہ کو موساد کی حرکت قرار دیا اور کہا اسرائیل ہمیشہ سے حسنی مبارک کا حامی رہا ہے اور اب وہ اخوانی صدر کی حکومت کو عدم استحکام کا شکار کرنا چاہتا اسی لئے اس نے یہ حرکت کی ہو گی

۔ فلسطینی اسلامی تحریک مزاحمت ''حماس'' کے سیاسی شعبہ کے نائب صدر ڈاکٹر موسیٰ ابو مرزوق نے کہا کہ مصری فوجیوں پر قاتلانہ حملے میں کوئی فلسطینی یا غزہ کا شہری ملوث نہیں تھا۔ابو مرزوق سے جب پوچھا گیا کہ ان کے خیال میں رفح حملے میں کون ملوث ہو سکتا ہے؟ تو انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ اس حملے میں اسرائیل ملوث ہے کیونکہ مصری فوجیوں پر حملہ صرف اسرائیل کے مفاد میں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی جہادی تنظیم روزہ دار مسلمان بھائیوں پر اس وقت حملہ کر دے جب وہ افطاری کی تیاری کر رہے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اس حملے کے نتائج چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہوں تاہم فائدہ صرف اسرائیل کو پہنچنا تھا اور حملہ آور فرار بھی اسرائیل کی طرف ہو رہے تھے۔ڈاکٹر ابو مرزوق نے کہا کہ فوجیوں کے قتل پر جو دکھ مصری عوام کو پہنچا ہے، فلسطینیوں نے بھی اتنا ہی دکھ محسوس کیا ہے۔ حماس پر اس طرح کی کارروائیوں کا الزام شیطانی چال اور سازش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔اس طرح گویا فلسطینیوں اور مصریوں کے درمیان ناچاقی پیدا کرنے کی یہ ناپاک سازش دونوں فریقوں نے مل کر ناکام بنا دی ۔

ایران کے نائب صدر کی واپسی کے بعد قطر کے امیر حماد بن خلیفہ الثانی نے مصر کا دورہ کیا اور باہمی تعاون کے مسئلہ پر صدرِ مملکت سے تبادلۂ خیال کیا۔ اس نشست کے بعد قطر نے ۲۰۰ کروڑ ڈالر مصر کے خزانے میں جمع کرائے اس

طرح مصر کے اندر قطری سرمایہ کاری کا سال رواں میں ۴۷ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ویسے قطر کو ہمیشہ سے اخوان کا ہمدرد سمجھا جاتا ہے۔اسرائیل کے حکام ابھی اس حملہ کے ذریعہ اپنے مقاصد کی بازیابی میں ناکامی سے ابھر بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور اور بری خبر ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ سعودی عرب اور ایران کے درمیان پایا جانے والا اختلاف اور سعودی عرب کے ساتھ امریکہ کی دوستی سے اسرائیل کو بڑی امیدیں وابستہ رہتی ہیں لیکن اس بار یہ تشویشناک خبر سعودی عرب سے آئی تھی۔

یو پی آئی نیوز نے اسرائیلی روزنامہ یدیعوت احرنوت کے مطابق سعودی عرب نے اسرائیل کو خبردار کیا ہے کہ وہ اسے اپنی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دے گا اور اس سے گزر کر ایران پر حملہ کرنے کے لیے جانے والے اسرائیلی جنگی طیاروں کو مار گرائے گا۔اسرائیل عرصۂ دراز سے ایران کی جوہری تنصیبات پر حملہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ایسی خبریں بھی آرہی تھیں امریکی صدر براک اوبامہ نے اسرائیل کو انتخاب سے قبل حملہ کی اجازت دے دی ہے۔اسرائیل ایران کی جوہری تنصیبات پر حملے کے لیے تین فضائی راستوں میں سے کوئی ایک استعمال کرسکتا ہے۔اوّل شمالی روٹ ہے، جو ترکی اور شام کی فضائی حدود سے گزرتا ہے۔ دوسرا جنوبی راستہ ہے جو سعودی عرب کے اوپر سے گزرتا ہے اور تیسرا درمیانی ہے جو اردن اور عراق سے گزرتا ہے۔ ایک زمانے میں عراق ایران کا

دشمن تھا اور ترکی اسرائیل کا دوست تھا، سعودی عرب سے ایران کے تعلقات اس قدر کشیدہ تھے کہ وہ ایران کے خلاف خاموش تماشائی بن سکتا تھا لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ ترکی اور اسرائیل کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے ہیں، عراق میں ایران کی ہمدرد حکومت قائم ہو گئی ہے۔ شام ایران کی مدد کرنے پر مجبور ہے اور سعودی عرب نے اسرائیل کو اپنے فضائی حدود کے استعمال سے منع کر دیا ہے۔ چند سال قبل اس حیرت انگیز تبدیلی کا تصور بھی محال تھا اسی لئے کہنا پڑتا ہے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

غیر جانبدار ممالک کی کانفرنس کا تہران میں ایران کی سربراہی منعقد ہونا بجائے خود اسرائیل اور امریکہ کیلئے پریشانی کا سبب تھا اس پر اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون نے کا بذاتِ خود اس میں شریک ہونے کا اعلان ان دونوں شیطانوں کیلئے عذابِ جان بن گیا اسی لئے اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو نے بان کی مون کے دورہ ایران کو غلطی قرار دیتے ہوئے کہا کہ غیر جانبدار کانفرنس میں ان کی شرکت سے ایران کو حوصلہ ملے گا۔ اور اس عمل سے ایران کے جوہری پروگرام کو بڑھاوا ملے گا اور اسے ایران کے جوہری پروگرام کو اقوام متحدہ کی حمایت تصور کیا جائے گا جو کسی بھی وقت اسرائیلی دفاع کے لئے

خطرہ بن سکتا ہے لہٰذا بان کی مون کو اس دورے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس کانفرنس میں بھارت کے وزیراعظم من موہن سنگھ۔ پاکستان کے صدر آصف علی زرداری سمیت پچاس سے زائد ملکوں کے سربراہانِ مملکت نے شرکت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب سنا ہے امریکی حکومت سعودی عرب کے شاہ عبداللہ پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ وہ اس کانفرنس میں شریک نہ ہوں لیکن اگر شاہ عبداللہ، صدر محمد موری اور صدر احمدی نژاد ایک اسٹیج پر جمع ہو جاتے ہیں تو یہ تاریخی اتحاد اس شعر کی عملی تفسیر بن جائیگا ۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی

غیر وابستہ ممالک کی تحریک اقوام متحدہ کے بعد دنیا کی سب سے بڑی تنظیم ہے لیکن اسے یو این اوپر اس طرح فوقیت حاصل ہے کہ اس کی بنیاد امتیاز و تفریق پر نہیں بلکہ عدل و مساوات پر رکھی گئی۔ اس میں کسی ملک کو ویٹو کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس کے ارکان میں سے تین چوتھائی آزاد فلسطین کے حامی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے یہ تنظیم اپنا موثر کردار ادا کرنا شروع کرے اور اقوامِ متحدہ کا متبادل بن کر ابھرے۔ اس لئے کہ یوروپ کے ممالک ایک کرکے قلاش ہوتے جارہے ہیں اور امریکہ دن بدن اپنے بوجھ سے ٹوٹتا جارہا ہے۔ اگر یہ تحریک جس میں مسلم ممالک کا موثر کردار ہے فعال ہو جاتی ہے تو ممکن ہے

اقوام متحدہ کے توسط سے قائم یوروپ و امریکہ کی عالمی بالادستی کا خاتمہ ہو جائے اور کوئی بعید نہیں کہ اہلِ اسلام کی سربلندی کا راستہ ہموار ہو جائے اگر ایسا ہو جاتا ہے تو ۔

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

(یومِ آزادی : خالص اور ناقص تصورِ آزادی - (قسط اول

ہندوستان میں اس سال آزادی کا ۶۶واں جشن منایا جارہا ہے۔ ہم اس لئے بھی خوش ہیں کہ گزشتہ اولمپک کی بنسبت ہمارے تمغوں کی تعداد ۳ سے بڑھکر ۶ یعنی دوگنی ہوگئی ہے گویا سکسر کی ہٹ ٹرک ہوگئی اور ایسا ہمارے ملک میں نافذ جمہوری نظام کے باعث ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ بات باعثِ شرم نہیں ہے کہ ۱۲۰ کروڑ کی آبادی والا یہ عظیم ملک ایک بھی سونے کا تمغہ حاصل نہ کرسکا جبکہ براعظم افریقہ کا ایک پسماندہ ملک ایتھوپیا جس کی فی فرد اوسط آمدنی ہندوستان کے ۱۳۰۰ کے مقابلہ ۳۰۰ ڈالر ہے اور آبادی ہندوستان سے پندرہ گنا کم یعنی صرف آٹھ کروڑ ہے ۷ تمغے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ان سات میں سے تین طلائی تمغے بھی ہیں۔ اگر کسی کامیابی کا کریڈٹ اس ملک میں رائج نظام حکومت کو دیا جاسکتا ہے تو اس کی ناکامی کا ذمہ دار بھی وہی نظامِ سلطنت ہوگا ورنہ تو یہ کوئی انصاف نہ ہوا کہ ہم صرف اپنی فتوحات پر بغلیں بجائیں اور شکست سے آنکھیں چرائیں۔

دل کے بہلانے کو ہم ہندوستانی یہ ضرور کہتے ہیں کہ دنیا کا سب سے زیادہ سونا زیورات کی شکل میں ہمارے ہی ملک کے اندر موجود ہے اس لئے ہمیں سونے کے تمغوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن یہ بات اس لئے بھی غلط ہے کہ اگر

سونے میں دلچسپی نہیں ہے تو اس قدر سونا جمع کرکے رکھنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے ؟ حقیقت تو یہ ہے کہ سونے کے زیور اور طلائی تمغوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ زیور بازار سے خریدے جاتے ہیں اور تمغوں کو میدان میں جیتنا پڑتا ہے ۔ یہی فرق ناقص و خالص آزادی میں ہے کہ ایک بازار میں نیلام ہوتی ہے دوسری کو بڑے جتن حاصل کیا جاتا ہے ۔

آزادی کوئی ایسی شہ نہیں ہے جسے ناپا یا تولہ جاسکے اس لئے اسے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان غلامی کا مفہوم سمجھ جائے آزادی کا مطلب از خود اس کی سمجھ میں آجائیگا ۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے ۔ اس جلیل القدر نبی کی بعثت اس وقت ہوئی جبکہ ان کی قوم بنی اسرائیل کو فرعون نے غلام بنا رکھا تھا ۔ سورۂ شعراء میں اس واقعہ کا بیان کچھ یوں ہے ''اور (وہ واقعہ یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے موسیٰ علیہ السلام) کو ندا دی کہ تم ظالموں کی قوم کے پاس جاؤ، (یعنی) قوم فرعون کے) پاس، کیا وہ (اللہ سے) نہیں ڈرتے''۔ یہ حکم حضرت موسیٰؑ کو ایک ایسے وقت میں دیا گیا جب وہ ایک طویل جلا وطنی کی زندگی گزار کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ بے یارومدد گار مدین سے واپس لوٹ رہے تھے ۔ حضرت موسیٰؑ نے بارگاہِ خداوندی میں اپنی مجبوری وناسپاسی کا اظہار اس طرح کیا کہ '' اے رب ! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے، اور (ایسے ناسازگار ماحول میں) میرا سینہ تنگ

ہو جاتا ہے اور میری زبان (روانی سے) نہیں چلتی سو ہارون (علیہ السلام) کی طرف بھی جبرائیل علیہ السلام کو وحی کے ساتھ) بھیج دے (تاکہ وہ میرا معاون بن جائے)) اور ان کا میرے اوپر (قبطی کو مار ڈالنے کا) ایک الزام بھی ہے سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے"۔

موسیٰ کلیم اللہؑ کی دلگداز عرضداشت کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے: "ہرگز نہیں، پس تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ بیشک ہم تمہارے ساتھ (ہر بات) سننے والے ہیں، پس تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کہو: ہم سارے جہانوں کے پروردگار کے (بھیجے ہوئے) رسول ہیں، (ہمارا مدعا یہ ہے) کہ تو بنی اسرائیل کو (آزادی دے کر) ہمارے ساتھ بھیج دے" ۔ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لیجانے کا مطالبہ دراصل ان کی آزادی کا تازیانہ تھا۔اس کے جواب میں فرعون نے ایک تو یہ کیا کہ پہلے اپنے احسان گنائے اور پھر احساسِ جرم کا شکار کرکے ڈرانے دھمکانے کو کوشش کی ۔آج بھی عوام کو اپنا غلام بنانے کیلئے یہی دو حربے آزمائے جاتے ہیں۔

انتخابات کے دوران کیا ہوتا ہے؟ عوام کو احسانات یاد دلائے جاتے ہیں۔ان سے کہا جاتا ہے کہ ہم انگریزی سامراج سے جنگ کی ۔ ہم نے تمہیں آزادی دلائی ۔ہم نے تمہیں تحفظ فراہم کیا۔ ہمارے دم سے تم امن و سلامتی کی زندگی گزار

رہے ہو۔ تمہاری ساری خوشحالی کا سبب ہماری عنایات ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن محض ان غیر حقیقی احسانات کے اعادہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اسی کے ساتھ کبھی اپنے آپ سے تو کبھی مخالفین سے بلواسطہ اور بلا واسطہ خوفزدہ بھی کیا جاتا ہے۔ پس پردہ سازش کرکے فرقہ وارانہ فسادات کروائے جاتے ہیں اور پھر مظلوموں کے آنسو پونچھے جانے کا ناٹک کیا جاتا ہے۔ صدر مملکت اقلیتوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وزیر اعظم وجوہات کا پتہ لگانے کی یقین دہانی کراتے ہیں۔اس قدر عظیم سانحہ جس میں لوگ جان بحق ہوگئے اور ۴ لاکھ بے گھر کی وجوہات کا تک اگر وزیر اعظم کو ایک ۷۷ ماہ بعد تک پتہ نہ ہو تو انہیں لال قلعہ پر یوم آزادی کے پرچم کشائی اور بلند بانگ دعووں کا کوئی حق نہیں ہے۔حکومت کے ذریعہ ایک طرف کسانوں کو خودکشی پر مجبور کرنے والے سودی نظام کو فروغ دیا جاتا ہے اور پھر ان کی بازآبادکاری کیلئے سرکاری خزانہ سے امداد کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس منافقت کے علاوہ وعدوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بھی ہماری انتخابی سیاست کی اہم ترین شناخت ہے جنہیں اب کوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا اس لئے کہ وعدہ کرنے والے سیاسی رہنما اور رائے دہندگان دونوں جانتے ہیں کہ ان کو شاذونادر ہی پورا کیا جائیگا۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کرکے جو کہا تھا وہ یوں تھا: ”کیا ہم نے تمہیں اپنے یہاں بچپن کی حالت میں پالا نہیں تھا اور تم نے اپنی عمر کے

کتنے ہی سال ہمارے اندر بسر کیے تھے، اور (پھر) تم نے اپنا وہ کام کر ڈالا جو تم نے کیا تھا یعنی ایک قبطی کو قتل کر دیا) اور تم ناشکر گزاروں میں سے ہو (ہماری پرورش اور احسانات کو بھول گئے ہو)"۔اس طرح کی صورتحال میں ایک حریت پسند رہنما کو کیا موقف اختیار کرنا چاہئے اور کس جرأتمندی کے ساتھ اس کا اظہار کرنا چاہئے اس کی مثال حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں ہے انہوں نے فرمایا: "جب میں نے وہ کام کیا میں بے خبر تھا (کہ کیا ایک گھونسے سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے)، پھر میں (اس وقت) تمہارے (دائرہ اختیار) سے نکل گیا جب میں تمہارے (ارادوں) سے خوفزدہ ہوا پھر میرے رب نے مجھے حکمِ (نبوت) بخشا اور (بالآخر) مجھے رسولوں میں شامل فرما دیا، اور کیا وہ (کوئی) بھلائی ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے (اس کا سبب بھی یہ تھا) کہ تو نے (میری پوری قوم) بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا"۔

حضرت موسیٰؑ نے بات کا رخ پھر آزادی وغلامی کی جانب موڑ دیا اور ببانگِ دہل فرعون کے سامنے اعلان کیا کہ تمہارے دربار میں میری پرورش یہ کوئی پسندیدہ فیصلہ نہیں تھا بلکہ مجبوری تھی۔ اگر بنی اسرائیل کو غلام نہ بنایا گیا ہوتا اور ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا سلسلہ جاری نہ ہوتا تو کیوں میری ماں مجھے ایک ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل میں بہاتی؟ گویا اس پرورش کیلئے فرعون کا جبر اور بنی اسرائیل کی غلامی سزاوار ہے نیز قبطی کت قتل کیلئے

موسیٰ کو ذمہ دار ٹھہرانا ایسا ہی ہے جیسے تقسیم ہند کیلئے مسلمانوں کو قصور وار کہنا۔ کوئی ان وجوہات کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا جن میں جناح جیسے سیکولر رہنما نے الگ ہونے کا فیصلہ اور ان لوگوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا جنھوں وہ صورتحال پیدا کی اگر جسونت سنگھ ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ت وان کے اپنے پرائے سب دشمن بن جاتے ہیں۔ قبطی کا قتل اس لئے ہوا وہ کہ وہ بنی اسرائیل کے ایک شخص پر وہ ظلم وزیادتی کر رہا تھا جن کو زمین میں فرعون کے حکم سے غلام بنا کر رکھا گیا تھا۔ان کو مساوات و عدل جیسے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ان کے اوپر مظالم کرنے والے قبطیوں کی کوئی سرزنش حکومت یا عدالت کی جانب سے نہیں ہوتی تھی۔ قرآنِ عظیم میں اس کی تصدیق اس انداز میں کی گئی ہے کہ ”بیشک فرعون نے زمین میں غلبہ پایا تھا اور اس کے لوگوں کو اپنا تابع بنایا ان میں ایک گروہ کو کمزور دیکھتا، ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا بیشک وہ فسادی تھا“۔

اہل ایمان کے ساتھ دنیا کی مختلف نام نہاد جمہوریتوں مثلاً امریکہ، فرانس، اسرائیل ہندوستان اور برما میں یہ سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے۔غلامی کا کوئی لیبل نہیں، ہوتا کہ غلام قوم پر چسپاں کر دیا جائے بلکہ حکمرانوں کا کسی ایک طبقہ کے تئیں اختیار کیا جانے والا ایک خاص رویہ مثلاً

بنیادی حقوق سے محرومی یا امتیازی سلوک ہوتا ہے۔ جس سے تمام لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ کون غلام ہے اور کون آقا؟ انگریز اپنے سامراج کے اندر رہنے بسنے والے آزاد لوگوں کو برطانوی شہری اور غلام قوم کے باشندوں کو سبجیکٹ بائی برتھ یعنی پیدائشی ماتحت یا غلام لکھتے تھے جس سے اسے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ کون ہیں اور ان کی حیثیت کیا ہے؟ وہ اپنے خاص باغوں بلکہ ریل گاڑی کے فرسٹ کلاس میں تختی لگا دیتے تھے کہ ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔

آج کل کسی کے پاسپورٹ پر لکھا تو نہیں جاتا لیکن غلامانہ سلوک بہر حال کیا جاتا ہے اسی لئے جیل کی چہار دیواری کے قتیل صدیقی کو جو دہشت گرد ہلاک کر دیتے ہیں ان پر کوئی کارروائی نہیں ہوتی بلکہ اسی شہر پونے میں ہونے والے دھماکوں کیلئے قتیل کے قاتلوں کے بجائے قتیل کے رشتہ داروں پر شک کیا جاتا ہے۔ دیانند پاٹل جس کے ہاتھوں میں بم پھٹ گیا اس کے سیکڑوں ہندو دوستوں کو چھوڑ کر دو مسلم دوستوں کی تلاش میں پولس سیکڑوں میل کا سفر کرکے اس کے آبائی وطن پہنچ جاتی ہے۔ ممبئی میں مسلمانوں کے جلوس پر گولی چلانے کے بعد پولس مرنے والوں کے قتل کا الزام مظاہرین پر جڑ دیتی ہے۔ تیسری دنیا کے ملک ہندوستان ہی میں سب ہوتا ہے ایسا نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو انسانی حقوق کا سرخیل کہنے امریکہ میں ایک ایرانی خاتون شہرزاد کو محض اس لئے گرفتار

کر لیا جاتا ہے کہ اس کے سابق شوہر محمد سیف نے اندھیرے میں استعمال کئے جانے والی عینک آسٹریا سے ایران برآمد کئے تھے ۔ جڑواں بچوں کی یہ ماں پانچ سال جیل میں گزارنے کے بعد ابھی حال میں رہا ہوتی ہے ۔ اسے کہتے ہیں غلامی کا سلوک جو دنیا کی سب بڑی جمہوریت میں روا رکھا جاتا ۔ مگر ظلم کی یہ چکی ہمیشہ نہیں چلتی جب مشیت کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو بازی الٹ جاتی ہے اور جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنا کر رکھا گیا تھا انہیں رہنمائی کے منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے ۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کی بابت ارشاد ربانی ہے ’’اور ہم چاہتے تھے کہ ان کمزوروں پر احسان فرمائیں اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کے ملک و مال کا انہیں کو وارث بنائیں‘‘

حقیقی اسلامی آزادی کا اگر مصنوعی جمہوری آزادی سے موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مؤخر الذکر عوام کو بولنے کا حق تو دیتی ہے لیکن حکمران کیلئے ان کی بات ان سنی کر دینے کا حق بھی بحال رکھتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فصیح محمود کے اہل خانہ در بدر ٹھوکریں کھاتے تھک جاتے ہیں مگر نہ حکومت کی کان پر جوں رینگتی ہے اور نہ عدالت فریادرسی کرتی ہے۔ انا ٹیم چیختے چیختے تھک ہار کر بیٹھ جاتی ہے لیکن کوئی اس کے مطالبے پر کان نہیں دھرتا بابا رام دیو کوایک حد تک چیخنے چلّانے کی اجازت دی جاتی ہے اور پھر انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جاتا ہے ۔اس کے برعکس اسلام کی آزادی میں

خلیفہَ وقت عمر بن خطابؓ لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر میں غلطی کروں تو تم کیا کروگے ۔ایک بدو بھرے مجمع میں جواب دیتا ہے کہ ہم تمہیں اس تلوار سے درست کردیں گے اس پر وہ اللہ رب العزت کا شکرادا کرتے ہوئے کہتے ہیں جب تک اس جیسے لوگ ہمارے بیچ ہوں گے ہم راہِ راست پر رہیں گے اور یہ صرف کہنے سننے کی بات نہیں ہوتی بلکہ جب ایک بڑھیا مہر کی تحدید کے مسئلہ میں علی الاعلان یہ اعتراض کرتی ہے کہ اے عمرؓ جس چیز کو اللہ نے حرام نہیں کیا اس پر پابندی لگانے والے تم کون ہوتے ہو؟ تو حضرت عمرؓ اپنی رائے سے سب کے سامنے رجوع فرماتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ اس بڑھیا نے سچ کہا اور عمر نے غلطی کی ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا خلافت کے منصب کو سنبھالتے ہی اعلان فرمانا کہ اگر تم مجھے کسی معاملے میں خلافِ شریعت پاؤ تو میری اطاعت نہ کرنا ۔اسی حقیقی آزادی کا مظہر ہے جس میں صاحبِ اقتدار عوام کو اپنی اتباع کا پابند نہیں بناتا بلکہ اس کے برخلاف اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنے کی تلقین کرتا ۔اسلامی تصورِ آزادی میں معیارِ حق حکمران کی مرضی نہیں بلکہ کتاب و سنت ہے اور عام آدمی کی طرح صاحبِ اقتدار بھی اس کا پابند ہوتا ہے ۔غیر اسلامی نظامہائے سیاست میں حکمراں مختلف قسم کا جواز فراہم کرکے اپنی مرضی کو معیارِ حق بنا کر عوام پر اسے چلانے لگتے ہیں ۔ کوئی کہتا ہے ایسا کرنے

کا مجھے موروثی حق ہے، کوئی اپنی نسلی برتری کو قائم رکھنے کیلئے اسے جائز قرار دیتا ہے،
کسی کے نزدیک ایسا کرنا قومی و ملکی مفاد میں ہوتا ہے تو کوئی اپنے آپ کو جمہور کا
نمائندہ بنا کر اس حق کو حاصل کر لیتا ہے اور اپنی من مانی کرتا ہے لیکن صرف اور صرف
اسلامی نظام ایسے ہر جواز سے مبرا ہے جس سے حکمرانوں کی مرضی معیار حق بن جائے
اور یہی حقیقی آزادی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

یہی وہ جذبۂ حریت ہے جو محمد مورسی سے عہدۂ صدارت سنبھالنے کے بعد یہ اعلان
کرواتا ہے کہ ویسے تو سبھی کے حقوق برابر ہیں لیکن مجھ پر تو ذمہ داریاں ہی ذمہ
داریاں ہیں یعنی تم تو میری بات سے صرفِ نظر کرنے کا حق رکھتے ہو لیکن میں سربراہ
کی حیثیت سے ایسا نہیں کر سکتا ہے اس لئے کہ اسلام کی نظر میں حکمران قوم کا خادم ہوتا
ہے۔ وہ نہ صرف اپنے بلکہ اپنی رعایا کیلئے جوابدہ ہوتا ہے اور یہی حقیقی آزادی کا وہ
سرچشمہ ہے جس سے مصنوعی آزادی کے سارے نظریات یکسر محروم ہیں۔ بظاہر ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ دیگر نظامہائے سیاست میں حکمراں طاقتور اور رعایا کو کمزور بنا دیا گیا
اس کے برعکس اسلام میں قائد کو کمزور کر دیا گیا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں
چونکہ الوہیت اور ملوکیت اللہ رب العزت کیلئے ہے اس لئے اس کے آگے سب کے سب
بے بس ہیں لیکن آپس میں وہ ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ سب مل کر اسی ایک خالق
و مالک کی طاعت کرتے ہیں اسی کی بندگی بجالاتے ہیں اسی کی خوشنودی

چاہتے ہیں اور باہم ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔

اس نظامِ فکر کے ثمرات کو مصر کے اندر رونما ہونے والے حالیہ واقعات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اللہ کی رضاجوئی کی خاطر کام کرنے والا صاحبِ اقتدار صدر اپنے انجام سے بے پرواہ ہو کر عوام کے مفاد میں بے دھڑک انقلابی فیصلے کرتا چلا جاتا ہے۔ دستور کی ان ترمیمات کو جنہیں آخری وقت میں عوام کے نمائندے کے پر کترنے کیلئے منظور کیا گیا تھا بیک جنبش مسترد کردیتا ہے۔ اسی کے ساتھ فوجیوں کی ایک ایک کرکے بڑی حکمت کے ساتھ چھٹی کر دیتا ہے۔ اس فوجی کونسل کا عملاً خاتمہ کردیا جاتا ہے جو ایک کٹھ پتلی صدر بنا کر بلاواسطہ حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اگر ڈاکٹر محمد مورسی کو اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کی فکر ہوتی تو وہ ایسے جرأتمندانہ اقدامات کرنے کا خطرہ وہ کبھی بھی مول نہیں لیتے دنیا پرستوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ یا تو وہ اپنے جیسے انسانوں کو ڈراتے ہیں یا ان سے ڈرے سہمے رہتے ہیں لیکن جنھیں کرسی سے زیادہ مقصد عزیز ہوتا ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور وہی اس طرح کے دلیرانہ اقدامات کرنے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔

مملکت خداداد پاکستان کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں سیکولر نظریات کے حامل عوامی رہنما گزشتہ بارہا کوشش کے باوجود فوجی تسلط کا خاتمہ کرنے کی کوشش

کرنے میں ناکام رہے ہیں حالانکہ انہیں بارہا اس کا موقع ملا لیکن فوج کے خلاف بلند بانگ دعویٰ کرکے اقتدار میں آنے والے جمہوری نمائندوں نے اقتدار سنبھالتے ہی اپنی کرسی کی خاطر فوج سے مصالحت کرلی اور گزشتہ ساٹھ سالوں میں جس فوجی بالادستی کا خاتمہ پاکستان میں نہیں ہوسکا اسے ایک اسلام پسند رہنما نے مصر کے اندر ساٹھ دن سے کم کے عرصے میں کردیا حالانکہ مصر کی فوجی حکومت پاکستان سے زیادہ طویل اور مضبوط تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر رہنما خود نفس کا بندہ اور کرسی کا غلام ہو تو وہ بھلا اپنی عوام کو حقیقی آزادی سے کیونکر روشناس کرسکتا ہے؟ عوام تو صحیح معنوں میں آزادی سے اسی وقت سرفراز ہوتے ہیں جب ان کا حکمراں ہر طرح کی غلامی سے آزاد اور صرف رب کائنات کا بندہ اور غلام ہو۔ ایسا باطل ادیان کی ناقص آزادی میں نہیں بلکہ صرف اور صرف اسلام کی خالص آزادی میں ممکن ہے۔

رمضان کا انعام: آزادی کا پیغام (قسط دوم

اس سال یوم آزادی کا جشن ماہِ قرآن یعنی رمضان کے دوران منایا گیا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فرقانِ عظیم سے الہامی آزادی کے حقیقی تصور کی معرفت حاصل کی جائے لیکن سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر رمضان اور آزادی کے درمیان مشترک کیا ہے ؟ ماہِ رمضان کے اندر پیش آنے والے اہم واقعات پر اگر غور کیا جائے تو ان کا باہم تعلق بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ رمضان کے تین اہم ترین واقعات مثلاً آغازِ وحی، یوم الفرقان اور فتح مبین کا براہِ راست تعلق آزادی سے ہے۔ آزادی کی ہئیت اور استحکام کا دارومدار اس فکری بنیادوں پر ہوتا ہے۔ قرآن عظیم نے انسانی آزادی کی نہایت پائیدار بنیادیں فراہم کی ہیں۔ انسانی حقوق کو بے مثال انداز میں بیان کرنے کے بعد ان کے پاس و لحاظ کی خاطر ترغیب وتربیب کا لاثانی اسلوب اختیار کیا ہے ۔اسی کے ساتھ انسانی حقوق کی پامالی کے دنیوی واخروی انجام سے نہایت منفرد اور دلپزیر انداز میں خبردار بھی کیا ہے۔

آزادی کا تصور انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ بنی نوعِ انسانی پر اللہ رب العزت کی یہ سب سے بڑی عنایت ہے۔ اسی کے باعث انسان کو دیگر تمام مخلوقات

میں عزت و تکریم حاصل ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اس کا ذکر کچھ اس طرح ہے کہ
یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں ”
سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر
نمایاں فوقیت بخشی“ ۔یہی وہ فوقیت ہے جس پر ابلیس چراغ پا ہو گیا اور اس نے اعلان
بغاوت کرتے ہوئے کہا” دیکھ تو سہی، کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اِسے مجھ پر فضیلت
دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر
ڈالوں، بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے" ۔
آزادی کے اس شرف کا تعلق چونکہ انسان کے مقصد وجود سے ہے اس لئے ربِ کائنات
ارشاد فرماتا ہے” اس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم
میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے، اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا
بھی“انسانوں کی آزمائش کے اس مقصدِ جلیل کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ اسے اختیار و عمل
کی آزادی سے ہمکنار کیا جائے تاکہ اخروی فلاح و خسران کی مکمل ذمہ داری خود اس
پر ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ تکمیل بندگی کی اولین شرط یہ ہے کہ انسان سارے باطل خداؤں
کی غلامی سے مکمل طور پر آزاد ہو۔اللہ رب العزت خود انانی آزادی کی ضمانت دیتے
ہوئے فرماتا ہے”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور
اِس غرض کے

لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا'' اس کے فوراً بعد آزادی کے مضمرات سے بھی آگاہ فرما دیا جاتا ہے'' کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پئیں گے جن میں آب کافور '' کی آمیزش ہوگی

آیت الکرسی قرآنِ مجید کی سب سے طویل آیت ہے۔ اس میں اللہ رب العزت کی ذات و صفات اور جلال و جبروت کا بیان ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مالک الملک کے ہمہ گیر اقتدار کا بھی ذکر موجود ہے مذکورہ تفصیل بیان کرنے کے فوراً بعد والی آیت میں ارشاد قرآنی ہے'' دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے'' اس یقین دہانی کا سیاق و سباق اسکی اہمیت کا غماز ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے دین حنیف کے معاملے میں انسانوں کو مکمل آزادی دیتا ہے تو کسی انسانی نظریہ کی کیا بساط کہ وہ انسانوں پر زور زبردستی کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس آزادی سے دین اسلام انسانوں روشناس کرتا ہے کوئی اور دین یا نظریہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا اسلئے کہ ہر اقتدار کو

اپنی بساط کے الٹ جانے کا خطرہ بدستور لگا رہتا ہے سوائے خدائے واحد القہار کے کہ کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

انسان اپنی فطرت میں ودیعت کردہ الہامی جذبۂ حریت کے باعث کبھی بھی دیگر انسانوں کی غلامی برداشت نہیں کرتا اور غلامی کی ہر زنجیر کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کا ازلی دشمن شیطان بھی کبھی مایوس نہیں ہوتا وہ نت نئی خوشنما زنجیریں گھڑتا رہتا ہے۔ یہی وہ سراب ہے جسے انسان آبِ حیات سمجھ کر اس کے پیچھے سرپٹ بھاگتا رہتا ہے ۔طویل جدوجہد اور عظیم قربانیوں کے بعد جب اسے رسائی حاصل ہوتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اسی سورج کا عکس تھا جس سے بھاگ کر اپنی پیاس بجھانے کی خاطر وہ سرگرداں کار رہا تھا۔ ایسے میں خوابِ غفلت سے جب کوئی محکوم بیدار ہوتا تو اسے حکمراں کی سامری پھر سے سلا دیتی ہے۔ ابلیس لعین ناکام و نامراد انسانیت کو ایک نئے سراب کا خواب دکھلا کر اس کے پیچھے دوڑا دیتا ہے۔ علامہ اقبال کی مشہور نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ اس حقیقت کی بہترین ترجمان ہے۔ ابلیس کے فریب سے تو وہی بچ سکتا ہے کہ جس کا دل گواہی دیتا ہو ”بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں “۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر زمین اللہ کی ملکیت ہے تو اس پر قانون بھی اسی کا چلنا چاہئے۔ کسی انسان کو (وہ جمہور ہو یا ان کا نمائندہ) دیگر انسانوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا حق نہیں ہے۔ فکر و عمل کا یہ انقلاب

انسانی جبر واستبداد کے سارے جواز مسترد کردیتا ہے۔ یہی وہ الہامی تعلیم ہے کہ جس کے باعث نہ کوئی کسی کا آقا بن سکتا ہے اور نہ کسی کو غلام بنا سکتا ہے۔

سورۂ اعراف میں ارشادِ ربانی ہے" (پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جو اِس پیغمبر، نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر اُنہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے"۔اس کے بعد اللہ رب العزت نے نبی کریمؐ کا مشن بیان فرمایا ہے:

وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے ○،

ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے ○،

اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے ○

اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ○

لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں ○

اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے ○،

وہی فلاح پانے والے ہیں ○

نبی آخرالزماںؐ کی بعثت کے بعد اب تا قیامت امت محمدی کا بھی مقصدِ وجود یہی امر بالمعروف اور نہی ان المنکر ہے جس کا بیان قرآن عظیم میں مختلف

مقامات پر کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اضافی طور بوجھ اتارنے کا اور بندشیں کھولنے کا بھی ذکر ہے۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ رسوم و رواج کا بوجھ اور مختلف غلامی کی بندشیں ہیں۔امت مسلمہ کی ذمہ داری نہ صرف اپنے آپ کو ان جکڑ بندیوں سے آزاد کرنا ہے بلکہ ان تمام لوگوں کی نصرت و حمایت کرنا بھی اس کا فرض منصبی ہے جو آزادی کے حصول کی خاطر جدوجہد کر رہے ہوں۔ یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہماری کشمکش طاغوتی طریقہٗ کار سے علی الرغم قرآن کی روشنی میں ہونی چاہئے اور اس جدو جہد کا بدلہ فلاح دارین ہے۔اس پر نہ صرف امت کی دنیوی بلکہ اخروی کامیابی کا بھی دارومدار ہے۔اہل ایمان نے اپنی اس ذمہ داری کو کس شان کے ساتھ ادا کیا اس کی ایک نادر مثال رستم کے دربار میں حضرت ربعی بن عامرؓ نے پیش کی جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کے آنے کی غرض و غایت کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا؟" ہم کو اللہ نے اِسی لیے بھیجا ہے کہ جس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں داخل کر دیں اور دُنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں نیز مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلامی عدل کے سایہ تلے لے آئیں"۔

سیرۃ النبیؐ میں عام الحزن یعنی غم کا سال خود حضور اکرم ﷺ اور مسلمانوں کیلئے آزمائش کا سب سے سنگین دور تھا جبکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے انتقال

نے آپؐ کو ایک دیرینہ ہمدرد و غمگسار سے محروم کر دیا اور حضرت ابوطالب کے وفات نے سب سے بڑے دشمنِ حق کو بنو ہاشم کا سردار بنا دیا۔ اس طرح اندرونِ خانہ اور باہر کی دنیا دونوں مقامات پر آپؐ کی ذاتِ شریفہ تنہا و غیر محفوظ ہو گئی۔ باطل کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ اپنے خطرناک ارادوں کو عملی جامہ پہنانے پر غور کرنے لگے۔ اس صورتحال کا بیان قرآنِ عظیم میں اس طرح ہوا ہے کہ "اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اِس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں" اللہ رب العزت نے اس موقع پر ڈھارس کچھ اس طرح بندھائی کہ "لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہرا سکیں گے۔ یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو اُن سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا، اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤگے" اسی کے ساتھ نبی کریمؐ کو یہ دعا سکھلائی گئی "اور دعا کرو کہ پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے"

قبل از ہجرت نازک ترین حالات میں مومنین کو یہ نصیحت کی گئی کہ تمہارے لئے اہم یہ نہیں ہے کہ تم کس مقام پر رہتے ہو؟ بلکہ اہم یہ ہے کہ تم کیسے رہتے ہو؟ اسی لئے فرمایا کہ سچائی کا ساتھ اہم ترین ہے۔ مومن جہاں سے بھی نکلے

اور جہاں بھی جائے سچ کا ساتھ لازمی ہے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو کسی اور اقتدار کا مددگار ہونا تو درکنار خود اسے اقتدار حاصل ہو جائیگا۔اسی لئے ان نامسائد حالات میں حکم دیا گیا اور اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے" اس وقت" جن لوگوں نے اس اعلان کو سنا ہو گا ان کیلیئے اس کی حقیقت تک رسائی خاصی مشکل رہی ہو گی لیکن تاریخ گواہ ہے کہ آٹھ سال بعد جب مکہ فتح ہوا تو حضور اکرمؐ خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرتے جاتے تھے اور یہی آیت پڑھتے جاتے تھے کہ "حق آیا اور باطل مٹ گیا تو اور باطل کو تو مٹنا ہی ہے"۔ فتح مبین نے اس آیت کی معنویت ساری دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دی اور تاریخ انسانی گویا تفسیر قرآنی بن گئی۔ مظلومیت ایک تاریک ترین رات میں ہجرت کے سفر کا آغاز ہوا اور اسی کے ساتھ آزادی کی نئی صبح نمودار ہو گئی۔

مدینہ میں قائم ہونے والی آزاد اسلامی ریاست کا قیام باطل کیلیئے سوہانِ جان بن گیا اور طاغوت نے اس چراغ کو بجھانے کیلیئے ریشہ دوانیوں شروع کر دیں۔ابوسفیان کی قیادت میں ایک تجارتی قافلہ شام کی جانب اس مقصد کے تحت روانہ کیا گیا کہ اس سے حاصل ہونے والی ساری آمدنی کا استعمال مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ میں کیا جائیگا۔اس قافلہ کو روکنے کا منصوبہ مسلمانوں نے بنایا اور اور اسکے تحفظ کی خاطر کافروں کا لشکر جرار نفرت وعناد کے جذبات

سے سرشار مکہ سے نکل کھڑا ہوا۔ مسلمانوں کو قافلہ یا فوج ان دونوں میں سے کسی ایک پر غلبہ کی یقین دہانی اللہ العزت کی جانب سے حاصل ہو گئی تھی ایسے میں ہونا تو یہ چاہئے تھا عرب روایت کے مطابق مسلمان کفار مکہ سے بدلہ کو ترجیح دیتے لیکن جب حضور اکرمؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو ابتدائی رجحان قافلہ کی جانب سامنے آیا۔ ایسا اسلئے ہوا تھا کہ گوں ناگوں وجوہات کے باعث مسلمانوں کے ہاتھ تیرہ سال تک باندھ دیئے گئے تھے اور انہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت نہیں تھی۔ اس رویہ کا اثر اہل ایمان کی نفسیات پر یہ مرتب ہوا کہ انہوں نے مشکل کے بالمقابل آسانی کا انتخاب کیا۔ رہبر عالم ﷺ جانتے تھے کہ اب حالات بدل گئے ہیں اس لئے حکمت عملی بھی بدلنی چاہئے نیز نئی حکمت عملی پر عملدرآمد کیلئے طرز فکر میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ اس لئے آپ نے بار بار استفسار فرمایا صحابہؓ کرام آپؐ کا اشارہ سمجھ گئے۔ پہلے مہاجرین اور پھر اس کے بعد انصار نے لائحۂ عمل کے انتخاب کی ذمہ داری حضور اکرمؐ پر چھوڑ کر ہر دو صورت میں مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ نبی کریمؐ نے قافلہ پر فوج کو ترجیح دی اور اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود بدر کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا۔ اس لئے کہ نوزائیدہ اسلامی ریاست کی آزادی کا دفاع اسی طرح ممکن تھا اور ایسے میں جب کہ کامیابی کی بشارت موجود تھی اپنی مدافعت کا اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ

کے اس جرأتمندانہ فیصلے نے کفار کو مدینہ سے بہت دور میدانِ بدر میں پڑاؤ ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ کفارِ مکہ نے اپنی طاقت کے نشہ میں اس معرکہ کو از خود الفرقان قرار دے دیا اور اعلان کیا کہ حق و باطل کا فیصلہ اس جنگ کے انجام پر ہوگا؟ اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کرکے انہیں فرقانِ عظیم کا نظارہ کروا دیا کہ ''دیکھو اگرچہ دیدۂ عبرت نگاہ ہو''۔ غزوۂ بدر امت مسلمہ کی آزادی کا اولین دفاع تھا اور یہ واقعہ بھی ماہِ رمضان کی ۱۷ ویں تاریخ کو پیش آیا۔ کفار کے سارے بڑے سردار مارے گئے اور مسلمان کامیاب و کامران ہو کر واپس لوٹے گویا وحی الٰہی میں آزادی کی جو بشارت تھی اس کی مدافعت کا آغاز اسی ماہِ مبارک میں ہوا اور اس سے فتح و کامرانی کی بشارتوں کا دروازہ کھل گیا۔

میدانِ بدر سے واپسی کے بعد اہلِ ایمان کا قافلۂ سخت جان احد و خندق کے مختلف معرکوں سے گزرتا ہوا صلح حدیبیہ تک پہنچا لیکن ابھی وہ فیصلہ کن کامیابی جس کی بشارت فتح مبین کے طور پر دی گئی تھی ہنوز دور تھی۔ غزوۂ احزاب میں کافروں کے ناکام و نامراد لوٹ جانے کے بعد یہ خوشخبری تو ہادیٔ برحق ﷺ نے سنا دی تھی کہ اب وہ نہیں آئیں گے بلکہ تم جاؤگے لیکن وہ مبارک ساعت کب آئیگی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ دورِ مدافعت کب اقدام کے مرحلے میں قدم رکھے گا اس کا علم، عالم الغیب والشہادۃ ذاتِ باری تعالٰی کے علاوہ

کسی فردِ بشر کو نہیں تھا لیکن اس کی آمد کا یقین اور انتظار سارے اہل ایمان کر رہے تھے ۔مکہ کی جانب کوچ عالمِ عرب کو غلامی کی زنجیروں سے چھڑانے والا ایک انقلابی اقدام تھا۔ اس نے باطل خداؤں سے نجات دلا کر توحید کی بنیاد پر ساری انسانیت کو رہتی دنیا تک کیلئے امن و آزادی کے عالمی مرکز سے سرفراز کردیا۔ مشیت ایزدی نے اس مبارک ساعت کو بھی ماہِ رمضان کے صدف میں لعل و گہر کی مانند محفوظ کردیا تھا۔ گویا وحی الٰہی سے جو آزادی کا چراغ غار حرا میں روشن ہوا تھا اس کو ماہِ تمام بن کر سارے عالم پر چمکنے کا موقع بھی مالکِ کائنات نے اسی ماہِ مبارک میں فتح مبین کے ذریعہ عطا فرمایا۔ فتح مکہ کے بعد جب باطل سرنگوں ہوگیا اور حق غالب آگیا تو کہیں سے آواز آئی آج بدلے کا دن ہے کفارِ قریش بھی یہی توقع کر رہے تھے اس لئے کہ انہیں وہ سارے مظالم یاد تھے جو مہاجرین پر توڑے گئے تھے لیکن اس کے برعکس رحمت اللعالمینؐ نے منادی فرمادی کہ آج بدلہ کا نہیں بلکہ رحم کا دن ہے اور عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا جاؤ تم سب آزاد ہو۔ اپنی آزادی کیلئے ہر کوئی لڑتا ہے اور اپنوں کو آزادی سے نوازنے کی فکر ہر رہنما کو ہوتی ہے لیکن ان دشمنوں کو جو کبھی خون کے پیاسے تھے مکمل اختیار کے باوجود آزادی کی بیش بہا دولت سے مالا مال کر دینا حقیقی آزادی کی وہ معراج ہے جو صرف اور صرف اسلام کا طرۂ امتیاز ہے

۔ انسانی تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس میں آزادی کے ثمرات محض آزادی کیلئے عظیم قربانیاں دینے والے متوالوں تک محدود نہیں رہے بلکہ اس کے فیوض و برکات سے دشمنان حق تک کو نواز دیا گیا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حق کے آنے اور باطل کے مٹ جانے کی پیشن گوئی کسی زمان و مکان تک محدود نہیں بلکہ دور حاضر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حق کا چراغ ایران میں روشن ہوا تو اس انقلاب کے خوف سے شاہِ ایران اپنے سارے جاہ وجلال کے باوجود بھاگ کھڑا ہوا، باطل کو تو بہر حال جانا ہی تھا۔ سرزمینِ افغانستان پر اپنے وقت کی سپر پاور سوویت یونین نے نگاہ غلط ڈالی اور اس کے مقابلے میں جب حق کے علمبردار اٹھے تو اسے نہ صرف افغانستان سے نکل جانا پڑا بلکہ صفحۂ ہستی سے سوویت یونین نامی باطل طاقت ہمیشہ کیلئے مٹ گئی اور اس کے بعد امریکی طاغوت حق کے آگے سینہ سپر ہوا تو اب اس کے بھی چل چلاؤ کا وقت آگیا۔ امریکی انتظامیہ ایک طویل کشمکش میں ناکامی کے بعد از خود افغانستان سے بے آبرو ہو کر نکل بھاگنے کی تاریخ طے کرنے پر مجبور ہے اور خراماں خراماں اسی راہ پر گامزن ہے جن پر چل کر سوویت یونین بے نام ونشان ہو گیا تھا۔ عالمِ اسلام نہ صرف عالمی استعمار سے بلکہ اس کے باجگزاروں سے رفتہ رفتہ آزاد ہوتا جارہا ہے تیونس سے لے کر مصر تک برپا ہونے والی تبدیلیاں اور شام میں برپا کشمکش اسی حقیقت کی غماز ہے۔

حق و باطل کی یہ کشمکش ہر دور میں جاری و ساری رہتی ہے اور ہر بار فیصلہ کن فتح اہلِ حق کے حصہ میں آتی ہے اس لئے کہ ارشادِ ربانی ہے اللہ نے ایسے لوگوں سے وعدہ فرمایا ''جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہ ضرور انہی کو زمین میں خلافت (یعنی امانتِ اقتدار کا حق) عطا فرمائے گا جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو (حق) حکومت بخشا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لئے ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے (غلبہ و اقتدار کے ذریعہ) مضبوط و مستحکم فرما دے گا اور وہ ضرور اس تمکّن کے باعث) ان کے پچھلے خوف کو (جو ان کی سیاسی، معاشی اور سماجی کمزوری کی وجہ سے تھا) ان کے لئے امن و حفاظت کی حالت سے بدل دے گا، وہ (بے خوف ہو کر) میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے (یعنی صرف میرے حکم اور نظام کے تابع رہیں گے)، اور جس نے اس کے بعد ناشکری (یعنی میرے احکام سے انحراف و انکار) کو اختیار کیا تو وہی لوگ فاسق (و نافرمان) ہوں گے''۔ مسلم سربراہانِ مملکت کا ایک اہم اجلاس اس سال رمضان المبارک کے آخری عشرے میں مکہ المکرمہ کی پاک سرزمین میں منعقد ہو رہا ہے۔ جس میں سعودی عرب کے شاہ عبداللہ اور ایران کے صدر احمدی نژاد شانہ بشانہ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے نظر آرہے ہیں ۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اسلامی اتحاد کے اس عظیم مظاہرے کو استحکام عطا فرمائے اور غلبۂ دین اور تکمیلِ آزادی کا اپنا

وعدہ ہمارے حق میں پھر ایک بار پورا فرمائے۔

اروپ پٹنائک: مہا نائک یا کھل نائک

گیارہ اگست کو ممبئی میں وقوع پذیر ہونے والے سانحہ کی گرداب بیٹھنے لگی ہے لیکن اس کی طہ سے اٹھنے والے سیاسی مرغولے ہنوز فضا میں تیر رہے ہیں۔ پولس کمشنر اروپ پٹنائک کے کھل نائک بن جانے کے بعد اب نگاہیں وزیر داخلہ کی جانب مرکوز ہو گئ ہیں۔ قیاس کیا جارہا ہے کہ آر آر پاٹل پھر ایک بار آر پار کی جنگ میں مصروف ہیں اور ان کی نیا کا پار لگنا مشکل نظر آرہا ہے۔ یہ سانحہ گو کہ مقامی نوعیت کا ہے لیکن قومی و ملی سطح پر اس میں عبرت کا بہت سامان ہے اس لئے اس کا جائزہ لیا جانا اہم ہے۔ گیارہ اگست کا مظاہرہ برما اور آسام کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کیلئے اور اپنے مظلوم بھائیوں سے ہمدردی و یکجہتی ظاہر کرنے کیلئے تھا ۔ اس مقدس فرض منصبی کو ادا کرنے کا بنیادی حق ہر انسان کو حاصل ہے۔ ہندوستان کا دستور اسے تسلیم کرتا ہے۔ اس حق کا استعمال ماضی میں مختلف طبقات بشمول مسلمان کرتے رہے ہیں لیکن اس بار کے احتجاج کے ساتھ کچھ ایسے واقعات جڑ گئے جو پہلے کبھی رونما نہیں ہوئے تھے۔

عام طور پر قومی و عالمی مسائل پر مسلمان متحد ہو کر مشترکہ مظاہرہ کرتے ہیں

لیکن اب کی بار ایسا نہیں ہوا۔ بریلوی مکتب فکر کی تنظیموں نے اس کا اہتمام ہفتہ کے دن اور دیگر تنظیموں نے اسی مسئلہ پر ایک احتجاج کا اعلان پیر کے دن کر دیا۔ غالباً یہ رابطہ کی کمی کے باعث ہوا ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ اس بار بھی اشتراک عمل ہو جاتا لیکن اس بار ایک مثبت کام یہ ہوا کہ دو دن بعد ہونے والے احتجاج کو منسوخ کر دیا گیا اور ایسا نہیں ہے کہ اس کی خبر سانحہ کے بعد آئی اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو بہت ہی غلط سگنل جاتا اور لوگ یہ سوچتے کہ مسلمان خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ احتجاج کی منسوخی کا اعلان ہفتہ ہی کے دن اخبارات میں شائع ہوا۔ یہ بلاواسطہ اشارہ تھا کہ جو لوگ احتجاج .ںمک شریک ہونا چاہتے ہیں وہ پیر کے بجائے سنیچر کے مظاہرے میں شامل ہو جائیں۔ ویسے اس کا باقاعدہ اعلان ملت کے اندر اشتراک واتحاد کی جانب بہتر پیش رفت ہو سکتا تھا۔

ممبئی کی بیدار امت کی جانب سے ملکی اور اور عالمی مسائل پر احتجاج کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ ہو یا بابری مسجد، تحفظ شریعت ہو یا اہانت رسول کے بعد بش کی آمد مسلمانانِ ممبئی جب اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی خاطر سڑکوں پر آتے ہیں تو ساری دنیا حیرت سے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں فرزندانِ توحید اپنے غم وغصہ کا نہایت پر وقار انداز میں اظہار کرتے ہیں اور خاموشی کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ جلوس نکال

کر ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کرنا یہ امت کا نہیں بلکہ دیگر غیر مسلم تنظیموں کا شعار رہا ہے ۔جب شیوسینا یا نونرمان سینا کے جلوس کا اعلان ہوتا ہے تو عوام سراسیمہ ہوجاتے ہیں اور پولس کا بندوبست بڑھا دیا جاتا ہے اس لئے کہ ہنگامہ ہو نہ ہو تشدد کا قوی امکان بہرحال موجود رہتا ہے لیکن اس بار برعکس صورتحال رونما ہوگئی مسلمانوں کا احتجاج تشدد کی نذر ہوگیا اور راج ٹھاکرے نے بلا اجازت مگر پرامن کے ذریعہ پولس کمشنر ایس آر پٹنائک کو بلی کا بکرہ بنا کر اپنے سیاسی قد میں اضافہ کرلیا۔اس اقدام سے بظاہر کانگریس کی سبکی ہوئی لیکن بباطن سیاسی فائدہ ہی ہوا اس لئے کہ راج ٹھاکرے کے ووٹ بنک میں ہر اضافہ شیوسینا کی جھولی سے نکل کر آتا ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فی الحال مہاراشٹر کی سیاسی بساط پر راج ٹھاکرے کانگریس کا اسی طرح آلۂ کار جیسا کہ کسی زمانے میں شیوسینا ہوا کرتی تھی اور اپنی تمام تر مخالفت کے باوجود وہ کانگریس کا اسی طرح بھلا کرتا ہے جیسی کہ سماجوادی پارٹی شیوسینا کی کرتی ہے۔ایسا کوئی جان بوجھ کر نہیں کرتا لیکن موجودہ نظام کی سیاسی مجبوری اپنے آپ یہ سب کروا دیتی ہے ۔ایک خبر تو یہ بھی ہے کہ وزیرِ داخلہ آر آر پاٹل خود پٹنائک سے ناراض تھے اور ان سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے اس لئے کہ پٹنائک نے کئی معاملات میں ان کے احکامات پر سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے اپنی ذاتی رائے کو ترجیح دی تھی ۔ان

کے تبادلہ کا عمل ماہِ مئی سے شروع ہوگیا تھا۔گیارہ اگست کا سانحہ محض ایک بہانہ بن گیا ۔ وزیر اعلیٰ چوہان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بلاوجہ فیصلہ کرنے میں تاخیر کی اور وہ پٹنائک کیلئے مناسب عہدے کی تلاش میں غلطاں رہے۔ وہ راج ٹھاکرے کو ہونے والے سیاسی فائدے کو لے کر بھی ناراض تھے حالانکہ یہ سب قیاس بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ کون نہیں جانتا کہ راج ٹھاکرے کا فائدہ بلاواسطہ کانگریس کے اپنے سیاسی مفاد میں ہے ورنہ بلا اجازت ریلی کا اہتمام ناممکن تھا۔ شیوسینا اگر یہ کوشش کرتی تو اسے بزورِ قوت روک دیا جاتا۔ کانگریس نے راج ٹھاکرے کو جلوس نکال کر مطالبہ کرنے کا موقع دیا اور اسے فوراً تسلیم کرکے راج ٹھاکرے کو شیوسینا کی حامی پولس فورس اور دیگر ہندو انتہا پسند رائے دہندگان میں اپنی مقبولیت بڑھانے کی نادر سعادت سے نواز دیا۔اس طرح گویا پٹنایک کو کھل نایک بنا کر راج ٹھاکرے کو مہا نایک بنا دیا گیا ۔جس احتجاج کو بی جے پی نے شروع کیا تھا وہ اس کے کامیاب اختتام کے باوجود حاشیہ پر پہنچ گئی ادھو ٹھاکرے کو محض حمایت پر اکتفا کرنا پڑا۔

سیاست سے قطع نظر اگر ملی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس احتجاج میں چند عناصر کی شر پسندی نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ وہ شر پسند کون تھے ؟ کہاں سے آئے تھے ؟ اور کس کے آلۂ کار تھے ؟ اس بارے میں حتمی طور

پر کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن اس میں شک نہیں کے وہ جو بھی تھے اپنی نادانی اور حماقت کے سبب اسلام کی بیخ کنی کر رہے تھے۔۔برما کے مسلمان عرصہَ دراز سے مظالم کا شکار ہیں ۔اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ ہمدردی و یکجہتی کا اظہار ہماری ذمہ داری ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی ذرائع ابلاغ نے اس سے صرفِ نظر کیا ہے۔اسی وجہ سے غالباً جب اس حوالے سے ای میل مہم کا آغاز ہوا تو اس میں نہ صرف مبالغہ بلکہ کذب بیانی کا بھی سہارہ لیا گیا۔ ایسا شاید سوئے ہوئے انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کیلئے کیا گیا تھا لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دین اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔بلکہ بلا تحقیق کسی خبر کو پھیلانے کی بھی ممانعت کرتا ہے۔ ای میل کے ذریعہ موصول ہونے والی ہر پسندیدہ بات پر ایمان لے آنا اور بلا تحقیق اسے پھیلانے کا رجحان دنیا و آخرت دونوں جگہ رسوائی کا سبب بن سکتا ہے۔اس کے ذریعہ سے پیدا ہونے والا ہیجان اور مایوسی یہ دونوں امت کیلئے سمِ قاتل ہیں۔اس لئے احتیاط لازمی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی ہونے والی عمارت کو ڈھیر ہوتے دیر نہیں لگتی اورجب ایسا ہوتا ہے تو اس کے نیچے نہ صرف اس کا معمار بلکہ اس میں شامل سچ بھی دب کر مرجاتا ہے۔سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ اگر کسی فرد یا گروہ کا اعتماد مجروح ہو جائے تو پھر اس کا دوبارہ بحال ہونا اگر ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہوتا ہے۔

برما کی اس ای میل مہم میں وہاں کی حکومت سے زیادہ غصہ ذرائع ابلاغ کے خلاف تھا ۔ ذرائع ابلاغ کے بارے میں ہمیں حقیقت پسند ہونا چاہئے ۔ اس میں شک نہیں کہ گوں ناگوں وجوہات کی بنیاد پر عالمی ذرائع ابلاغ ہمارے خلاف ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے وہ جن لوگوں کی ملکیت ہے وہ اپنے مفادات یا لاعلمی کے باعث اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں ۔ ایسے میں ہمارے خلاف ذرائع ابلاغ میں بہت ساری غلط سلط باتیں آتی رہتی ہیں اور ان کی تردید کرنے کا ہمیں پورا حق حاصل ہے ۔ اس سلسلہ میں ہمیں چوکنا رہنا چاہئے اور اس حکمت کے ساتھ ان کا جواب دینا چاہئے کہ ہماری بات قابلِ اشاعت بھی ہو نیز دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بھی ہو جائے لیکن اس کے باوجود ہمارا موقف سامنے آہی جائے یہ ضروری نہیں ہے اس لئے کہ ہم کسی کو اسے شائع کرنے کیلئے مجبور نہیں کر سکتے ایسے میں پریس کونسل یا عدالت سے رجوع کرکے ان پر کارروائی ممکن ہے اس کے خلاف پرامن احتجاج بھی کیا جاسکتا ہے ۔ احتجاج کے پرامن ہونے کے نتیجہ میں یہ ممکن ہے کہ آپ جس کی مخالفت کررہے ہیں اس کا حریف اخبار یا چینل اپنے تجارتی مفاد کیلئے آپ کا ہمنوا بن جائے لیکن تشدد کی صورت میں سارے لوگ متحد ہو کر مخالفت پر اتر آئیں گے نیز مظلوم کو ظالم بنانے کا نادر موقع خود ہمارے توسط سے انہیں مل جائیگا۔

کسی فرد یا گروہ کا خوف ذرائع ابلاغ کو اس کے خلاف غلط بات کہنے سے روک

سکتا ہے مگر ایک خوف پر دوسرا خوف غالب بھی آسکتا ہے مثلاً مالی نقصان پر قید وبند کی ابتلا یا موت کا خوف ۔ اس لحاظ سے بے اقتدار امت حکومتِ وقت سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتی ۔برما کے معاملے میں ہمیں یہ شکایت نہیں تھی کہ وہ کوئی غلط بات کہہ رہا ہے بلکہ ہم اس لئے پریشان تھے کہ صحیح بات کیوں نہیں کہہ رہا۔ اگر کسی معاملے میں ذرائع ابلاغ جان بوجھ کر یہ رویہ اختیار کرتا ہے توہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غیر جانبداری کا اس کا دعویٰ محض ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی کو حق بات کہنے پر مجبور کرنا نہ ہمارے لئے ممکن ہے اور نہ ہم اس کے مکلّف ہیں ۔اس کیلئے ضروری یہ ہے کہ ہمارا اپنا میڈیا ہو اور ہمارے ذرائع ابلاغ وعظ و تلقین کے ساتھ ساتھ حق گوئی کی ذمہ داری کو بھی ادا کریں ۔اس میں شک نہیں کہ یہ راہ مناظروں سے زیادہ پر خطر ہے لیکن امت کی بہت بڑی ضرورت ہے اور اس بارے میں بھی ہم اللہ کے آگے جوابدہ ہیں ۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ برما کے تعلق سے آنے والے سارے میل ، تصاویر اور فلمی کلپ مل کر بھی عام مسلمانوں کو اس قدر ہیجان کا شکار کردیں کہ وہ روزے کی حالت میں ٹی وی والوں کی گاڑیوں کو آگ لگانے لگیں ۔ اگر پولس اس سے روکنے کی کوشش کرے تو اس سے بھڑ جائیں اور پولس گاڑیوں کو نذرِ آتش کرنے لگیں نیز امر جوان جیوتی کی توڑ پھوڑ میں لگ جائیں ۔ یہ سب ناممکن

لگتا ہے۔ایسا تو کوئی تربیت یافتہ شر پسند گروہ ہی کر سکتا ہے جو تیاری کے ساتھ وہاں آیا ہو وہی لوگ پولس والوں سے بندوق چھیننے کی جرأت کر سکتے ہیں اور خواتین پولس اہلکاروں سے بدسلوکی کا مرتکب ہو سکتے ہیں۔اس طرح کی حرکت مسلم عوام عام حالات میں بھی نہیں کر سکتے کجا یہ کہ وہ روزے کی حالت میں ہوں۔اس بات کی شہادت جلسہ گاہ میں موجود لوگوں نے دی ہے کہ جلسہ گاہ کے اندر نہ ہی کوئی ہنگامہ ہوا اور نہ کوئی اشتعال دلایا گیا جبکہ سابق اور موجودہ پولس اہلکار اسٹیج پر بھی موجود تھے۔یہ بات بھی سامنے آئی کہ جب ہنگامہ آرائی کا آغاز ہوا تو اسٹیج سے اسے روکنے کو کوشش کی گئی۔یہ کہنا چونکہ منتظمین اسے روکنے میں ناکام رہے اس لئے وہ تشدد کیلئے ذمہ دار ہیں نہایت نامعقول اور بودی دلیل ہے۔شر پسندوں کو روکنا پولس کی ذمہ داری تھی اور پولس کمشنر پٹنائک کی دلیری اور تحمل قابل ستائش ہے کہ ایک گھنٹہ کے اندر اسے قابو میں کر لیا گیا۔اس کے باوجود مالی نقصان،زخمیوں کی بڑی تعداد اور دو معصوم نوجوانوں کا جان بحق ہونا قابلِ مذمت ہے۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ گیارہ اگست کے سانحہ پر ہونے والے تشدد کی مذمت میں منتظمین سمیت ساری امت ایک زبان تھی نیز یہ بھی اہم ہے کہ نہ اس کی کوئی توجیہ کی گئی اور نہ اس کا کوئی جواز پیش کیا گیا جیسا کہ ہندو تنظیموں کی جانب سے ہوتا رہا ہے۔دہلی میں سکھوں کے قتل عام کے

بعد راجیو گاندھی کا یادگار جملہ کون بھول سکتا ہے کہ جب کوئی بڑا پیڑ گرتا ہے تو زمین ہلتی ہے۔ یہ دراصل اس قتل عام کو جائز قرار دینے کی ایک کوشش تھی۔ اڈوانی نے بابری کی شہادت کے دو دن بعد اخبار میں مضمون لکھ کر بابری مسجد کی شہادت پر افسوس کا اظہار کیا مگر اسے عوام کا جائز غصہ قرار دے کر اس کی توجیہ بھی کی۔ مگر مچھ کے یہ آنسو بھی بال ٹھاکرے برداشت نہ کرسکے اس لئے انہوں نے افسوس کے اظہار پر افسوس کا اظہار کیا اور اس ظلم عظیم کو حق بجانب ٹھہرایا۔ نریندر مودی سے لے کر اس کے مداح راج ٹھاکرے تک نے ہمیشہ اپنے کارکنان کے ذریعہ معصوم لوگوں پر کئے جانے والے تشدد پر پشیمانی کے بجائے فخر کا جتایا اس کے برعکس مسلم رہنماؤں نے کمال حکمت و دانائی کے ساتھ تشدد کی پرزور مذمت کی اور انتظامیہ کی جانب سے معصوم لوگوں کی پکڑ دھکڑ کے باوجود موقع کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کر کے ان کے غیض و غضب کو کم کیا ورنہ دشمن پھر ایک بار کامیاب ہو جاتے۔

انسانوں سے بڑا ہمارا دشمن شیطان ہے جو دلوں میں نفرت و عناد کے بیج بوتا ہے اور دماغ کے اندر سازشوں کے جال بنتا ہے۔ یہ ماہِ رمضان کی فیوض و برکات تھیں کہ اللہ نے اہل ایمان کو شیطان کے فتنہ سے محفوظ رکھا ورنہ یہ بہت آسان تھا کہ امت کا ایک طبقہ اسے ناعاقبت اندیشی اور عجلت پسندی قرار دے

کر دوسرے کواس کیلیۓ موردِ الزام ٹھہراتا اور دوسرا طبقہ اس کے جواب میں پہلے پر ہنگامہ آرائی کی تہمت جڑ دیتا اگر خدا نخواستہ یہ ہو جاتا تو اس سے بڑا کوئی اور نقصان نہیں ہو سکتا تھا۔امت ایک دوسرے کے تعاون و اشتراک سے اپنے دشمنوں کو توشکستِ فاش دے سکتی ہے لیکن اگر آپس میں دست و گریباں ہو جائے تو اسے ذلیل و رسوا کرنے کیلیۓ کسی دشمن کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور اس کی فتح و کامرانی کے سارے امکانات از خود مفقود ہو جاتے ہیں ۔امت کے رہنماؤں نے اس موقع پر جس بالغ نظری اور وسعتِ قلب کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک روشن مستقبل کی دلیل ہے ۔الحمدللہ اس اتحاد کا مظاہرہ ابھی پچھلے دنوں مکہ کانفرنس میں بھی ہوا جہاں ملک عبداللہ اور صدر احمدی نژاد ایک دوسرے کے شانہ بشانہ نظر آئے۔

گیارہ اگست سانحہ کے بعد گو کہ پولس کمشنر پٹنائک کو ترقی دے کر ہٹایا گیا اس کے باوجود شہر کی نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم مقتدر ہستیوں نے سابق کمشنر کے تبادلہ پر تنقید کی ۔سابق کمشنر جولیو ربیرو جو فسادات کے زمانے میں ممبئی پولس کے سربراہ رہے ہیں نے صاف طور پر کہا کہ اگر پٹنائک پولس کو قابو میں نہیں رکھتے تو ممبئی شہر پھر ایک بار خاک اور خون میں لت پت ہو جاتا۔ ربیرو نے انتظامیہ کے نقطۂ نظر سے کئی اہم سوال اٹھائے مثلاً گولی چلانے سے قبل لاٹھی یا آنسو گیس کا استعمال نہ کرنا۔ اسلحہ بردار عملہ کا لاٹھی

والوں کے عقب میں ہونا اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو رائفل کے چھننے کا واقعہ ممکن نہیں تھا۔ خواتین پولس کی نگرانی پر مرد افسران کا تعینات نہ ہونا اس صورت میں بھی بدسلوکی ناممکن تھی وغیرہ۔ انہوں اس طرح کی کئی کوتاہیوں کی جانب توجہ مبذول کروائی تاکہ اصلاح ممکن ہو سکے۔ جیوتی پنوانی نے اپنے ایک مضمون میں پٹنائک کو سراہتے ہوئے کہا ممبئی پولس برسوں سے جاری افطار پارٹیوں اور عید ملن کے پروگراموں سے مسلمانوں کا وہ اعتماد حاصل نہیں کر سکی جو پٹنائک نے ایک گھنٹہ کی اپنی کوشش سے حاصل کرلیا۔ ملت ہی کی طرح جیوتی کو بھی پٹنائک کے چلے جانے کا افسوس ہے لیکن اسی کے ساتھ مسلمانان ممبئی نئے پولس کمشنر ستیہ پال سنگھ سے توقع رکھتے ہیں کہ اس سانحہ کی وہ گرفتار شدہ معصوم نوجوانوں کی رہائی کو آسان بنا کر شہر کی سب سے بڑی اقلیت کی امیدوں پر پورا اتریں گے اور اعتماد و خیر سگالی کی جو مثبت فضا قائم ہوئی ہے اسے پروان چڑھائیں گے ۔

آبادیوں میں ہوتے ہیں برباد کتنے لوگ

ارشادِ ربانی ہے ''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو''
اس آیت میں جوڑے سے مراد نر و مادہ تو ہے ہی لیکن اسی کے ساتھ زمین و آسمان،
دن و رات،زندگی و موت،دنیا و آخرت ،جنت ودوزخ اور خوشی و غم وغیرہ بھی ہے۔
گزشتہ ایک ہفتہ کے اہم واقعات پر غور کیا جائے تو شی ت وان میں پہ در پہ خوشی و غم
کا پہلو بہت ہی نمایاں ہے مثلاً صباح الدین اور فہیم کی عدالتِ عالیہ سے رہائی، محمد حسین
کی رہائی پر اسی عدالت کے ذریعہ منسوخی ،مایا کندنانی اور بابو بجرنگی کی سزا
ئیں، کرناٹک میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاریاں،ارون گاؤلی کو جیل ،ثاقب ناچن کے
فرزند کی گرفتاری اور محمد احمد کاظمی کے خلاف ناقص چارج شیٹ ۔ان میں سے ہر
واقعہ مخلف نوعیت کا ہونے کے ساتھ ساتھ متضاد کیفیت کا حامل ہے۔
اجمل قصاب کی کی پھانسی پر قومی ذرائع ابلاغ نے جس قدر خوشی منائی گئ ۲۵ سالہ
صباح الدین اور ۳۶ سال کے فہیم کی رہائی کوافسوس کے ساتھ حکومت کی ناکامی قرار
دیا گیا لیکن امت مسلمہ اور ان کے اہل خانہ نے اس خبر پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ صباح الدین
کے والد شبیر احمد مدھوبنی سے قریب گندھوائر

گاؤں کی پنچایت سمیتی کے گزشتہ تین میقاتوں رکن منتخب ہوتے چلے آئے ہیں۔ صباح الدین نے بنگلور سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے دوران وہ ایک کال سینٹر میں جز وقتی ملازمت کرکے اپنے خاندان کا معاشی بوجھ ہلکا کر رہا تھا کہ پولس نے اسکو رامپور میں سی آر پی ایف کیمپ پر ہونے والے حملہ کے الزام میں گرفتار کر لیا پھر ممبئ حملہ کا الزام بھی اس پر جڑ دیا۔ صباح الدین پر انڈین انسٹی ٹیوٹ پر حملہ کا بھی الزام ہے۔ یہ مقدمہ ابھی شروع بھی نہیں ہو سکا ہے۔ صباح الدین ممبئ حملہ سے تو بری ہو چکا ہے لیکن وہ دوسرے فرضی مقدمات سے کب بری ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا زندہ دل اور نرم مزاج فہیم احمد پر الزام یہ تھا کہ اس نے ممبئ کا نقشہ نیپال کے اندر احمد کو دیا اور جو اجمل قصاب کے ساتھی ابو اسماعیل کی خون سے لت پت لاش کی جیب میں ملا۔ پولس نے اپنے اس بے بنیاد الزام کے حمایت میں جو نقشہ پیش کیا تھا اس پر خون کا کوئی دھبہ تو درکنار ایک سلوٹ بھی نہیں تھی۔ دورِ حاضر میں شہروں کے تفصیلی نقشے گوگل ارتھ پر دستیاب ہیں اور اس کیلئے کسی کو نیپال جاکر نقشہ پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ فہیم احمد پر بھی رامپور حملے کا لزام ہے لیکن دہشت گردی کی دفعہ ہنوز اس پر لگائی نہیں گئی ہے۔ابھی اس مقدمہ میں صرف گواہیاں مکمل ہوئی ہیں فیصلہ باقی ہے اور پھر اس کے خلاف اپیل در اپیل کا سلسلہ کب ختم ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا؟ فہیم احمد

دبئی میں رہ کر اپنا گھر چلاتا تھا۔ اب وہ جیل میں ہے، اس کے اہلِ خانہ کو اپنا مکان بیچنا پڑا ہےاور وہ کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برسوں بعد ہونے والی رہائی سے کیاان معاشی اور نفسیاتی مظالم کی بھرپائی ہو جائیگی اور جو لوگ اس ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں ان کو اپنے کیۓ کی کوئی سزا نہیں ملے گی؟

ان فیصلوں سے جہاں عدالتِ عالیہ پر عوام کا اعتماد بحال ہوا وہیں سپریم کورٹ نے محمد حسین کی رہائی کو منسوخ کرکے اپنے اعتماد ٹھیس پہنچانے کا کام از خود کر ڈالا۔ محمد حسین عرف ذولفقار علی پاکستانی باشندہ ہے اسے ۱۹۹۷ء کے دہلی دھماکہ میں گرفتار کیا گیا اور وہ ۱۴ سال سے جیل میں ہے۔ جسٹس دتو اور پرساد نے تسلیم کیا چونکہ ملزم کو وکیل کے حق سے محروم رکھا گیا اس لئے اسے سزا نہیں دی جا سکتی۔ ان دونوں ججوں کا مستقبل کے لائحۂ عمل پر اختلاف ہوگیا پرساد رہائی کے حق میں تھے اور دتو مقدمہ پھر سے چلانا چاہتے تھے۔ سپریم کورٹ نے رجوع کرنے پر کہا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ ملزم ۱۴ سال جیل میں گزار چکا ہے معاملے کی سنگینی کے باعث اسے رہا کرنے کے بجائے اس پر ازسرِ نو مقدمہ قائم کیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نیا مقدمہ کب تک چلے گا ؟اور اگر محمد حسین بالآخر بے قصور پایا گیا تو اس طویل سزا کی ذمہ داری کس پر آئیگی ؟

اجمل قصاب کی پھانسی پر خوشی منانے والے ہندو انتہا پسندوں کی امیدوں پر احمد آباد کی خصوصی عدالت نے مایا کندنانی اور بابو بجرنگی کو مجرم ٹھہرا کر پانی پھر دیا۔ گزشتہ دس سال سے ظلم کے خلاف لڑنے والے مظلومین کیلئے یقیناً یہ بڑی خوشی کی خبر تھی۔ گجرات بی جے پی کے ترجمان ویاس نے اس معاملے میں جو صفائی پیش کی وہ نہایت دلچسپ ہے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ جس وقت مایا کندنانی نے یہ جرم کیا اس وقت وہ وزیر نہیں تھیں اس لئے حکومت کو اس کیلئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ لیکن وہ بیچارے بھول گئے کہ مایا اگر وزیر نہیں بھی تھیں تو بی جے پی کی ایم ایل اے تو تھی ہی تھیں۔ اس لئے ان کی اپنی دلیل کے مطابق اگر مودی حکومت کو نہ سہی تو بی جے پی کو موردِ الزام ٹھہرایا ہی جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ اگر ایسا ہوا ہوتا کہ وہ اس حادثے سے قبل وزیر رہی ہوتی اور بعد میں اسے ہٹا دیا گیا ہوتا تب تو بات بن بھی سکتی تھی مگر اس کے برعکس پہلے وہ وزیر نہیں تھی ، اس ظلم کا ارتکاب کرنے کے بعد اسے انعام و اکرام سے نواز کر جس نے وزیر بنایا کیا وہ اس کے جرم میں شریک نہیں ٹھہرتا؟

عدالت نے مایا کے اس الزام کو کہ وہ سیاست کی شکار ہوئی ہے خارج کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے سیاسی رسوخ کے باعث الزامات بچتی رہی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جو خاتون عورتوں اور بچوں کی قاتل ہو اسے بچوں اور خواتین کی فلاح و بہبود کا

وزیر بنانا سفاکی کی انتہا ہے ۔جو خواتین کے امراض کی ماہر طبیبہ اپنی نگرانی میں مادرِ حمل سے بچے کو نکال کر اسے قتل کروادیتی ہے اس سے عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود کی توقع کی سنگھ پریوار ہی کر سکتا ہے۔ مودی یہ الزام لگاتا رہا ہے کہ اجمل قصاب چونکہ پاکستانی ہے اس لئے پاکستان دہشت گردوں کا سرپرست ہے اور اس نے حافظ سعید کو پناہ دے رکھی ہے اس لئے وہ جرم میں شریک ہے۔ اسی منطق کے مطابق مایا کی سرپرستی کرنے والا اور بجرنگی کو پناہ دینے والا مودی ازخود مجرم ٹھہرتا۔ مایا کے خلاف فیصلے کے بعد نئی دنیا میں ''اگر میں مجرم ہوں تو مجھے پھانسی چڑھادو'' کہنے والے مودی کی زبان گنگ ہو گئی ۔

اجمل نے اپنے ابو اسماعیل کے ساتھ ۵۹ لوگوں کو ہلاک کیا مایا نے بجرنگی کے ساتھ ۹۷ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔اس پر طرہ یہ کہ بجرنگی نے بڑے فخر سے اعتراف کیا کہ مہارانا پرتاب نے جو عظیم کارنامہ کیا تھا میں نے اس کا اعادہ کیا ہے اس کے باوجود وہ پھانسی سے بچ گیا اس بات کا افسوس بہرحال ہر انصاف پسند شہری کو ہوا ہوگا۔ بال ٹھاکرے جیسے لوگ جو اجمل کو فی الفور پھانسی دینے کا مطالبہ کررہے تھے اس بابت چپی سادھ لی ۔ ویسے ان ظالموں کے پاس اب بھی عدالتِ عالیہ سے رجوع کرنے کا حق ہے ۔ سجن کمار کا معاملہ سب کے سامنے ہے۔اس پر ۱۹۸۴ء میں سکھوں کے قتل عام کا الزام ہے سنہ ۲۰۱۰ء میں اس کے

خلاف سی بی آئی نے چارج شیٹ داخل کی اس کے باوجود معاملہ ہنوز گھسٹ رہا ہے۔ ابھی مقدمہ ٹرائل کورٹ سے ہائی کورٹ میں آیا ہے یہ کب سپریم کورٹ میں پہنچے گا۔ اس کے بارے میں کچھ بھی کہا نہیں جاسکتا۔ مایا اور بجرنگی بھی کب تک قانون سے کھلواڑ کریں گے یہ بھی وقت ہی بتائے گا۔

فہیم انصاری کے معاملے میں ان کے اہل خانہ اور ابو عاصم اعظمی نے پولس کو سزا دینے اور ہرجانہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس طرح کے مطالبات کا پولس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ورنہ کرناٹک میں ہونے والی تازہ گرفتاریوں کا سلسلہ پھیل کر مہاراشٹر تک نہیں پہنچتا۔ گرفتار شدگان میں قومی تجربہ گاہ ڈی آر ڈی او کے سائنسدان کے علاوہ ڈکن ہیرالڈ کا صحافہ مطیع الرحمٰن بھی شامل ہے۔ اس بار پاکستان کے بجائے سعودی عرب میں موجود کسی نا معلوم فرد کو ان کا سرغنہ بنایا جارہا ہے۔ یہ تازہ گرفتاریاں اس بات کا ثبوت ہے کہ انتظامیہ نے اپنی ماضی کی غلطیوں سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ انتظامیہ پر اس لئے بھی شک ہوتا ہے کہ ان تعلیم یافتہ نوجوانوں پر اس سے پہلے ایسا کوئی الزام نہیں تھا۔ پولس نے یہی کچھ دہلی کے آمر خان کے ساتھ بھی کیا جو حال ہی میں ۱۴ سال کی قید و بند کے بعد بے قصور رہا ہوا ہے۔ اس دوران اس کے والد کا حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا اور ماں پر فالج کا دورہ پڑ گیا۔ گاندھی کے عدم تشدد پر مضمون لکھ کر اول انعام پانے والے

آمر نے رہا ہونے کے چودہ سال بعد تاروں کو دیکھا تھا۔

ان اندوہناک خبروں کے درمیان ایک خوشخبری ممبئی سے آئی جس میں مولانا ضیاالدین بخاری کے قاتل ارون گاولی کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ارون گاؤلی انتخابات میں کامیابی حاصل کرکے ریاستی مجلسِ قانون ساز کا رکن بن گیا تھا اس کی بیوی میونسپل کاؤنسلر تھی۔ وہ داؤد اور چھوٹا راجن کو چیلنج کیا کرتا تھا کہ پردیس میں رہ کر غنڈہ گردی کرنا کون سی بڑی بات ہے اگر دم ہے تو یہاں آکر گینگ چلاؤ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب گاؤلی کو سینا بھاجپ کی سرپرستی حاصل تھی لیکن آگے چل کر اس پر شیوسینا کے رمیش مورے اور جینت جادھو کے قتل کا الزام لگا۔ بالآخر اسے سزا شیوسینک کارپوریٹر کملا کر کے قتل کی ملی۔ اسی غنڈے نے جیل میں بیٹھ کر اپنے ساتھی نرسالے کی مدد سے مولانا ضیاالدین کو جان بحق کرنے کی سازش رچی تھی۔ یہ افسوسناک بات ہے کہ بخاری جیسے مقبول و معروف رہنما کے قاتل ان کے سابق وزیر دفاع شرد پوار سے قریبی تعلقات کے باوجود اس وقت سزا سے بچ نکلے تھے۔

مہاراشٹر کی پولیس نے جہاں ارون گاؤلی کو سزا دلانے میں اہم کردار ادا کیا وہیں ان لوگوں نے اس ہفتہ ثاقب ناچن کے فرزند اور بھتیجے کو دہشت گردی کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا۔ شامل ناچن انجینئرنگ کا طالب علم ہے۔ خود

ثاقب ناچن کو بجرنگ دل کے وکیل منوج رائچا پر فائرنگ کے الزام میں اسی ماہ گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اس سے پہلے ۲۰۰۲ء میں وشو ہندو پریشد کے رہنما للت جین کے قتل کیس میں ایک فرضی مقدمہ بنا کر انہیں گرفتار کیا گیا تھا جس سے ۲۰۰۶ء میں وہ بری کر دیئے گئے اس بار محض الزام کی بنیاد پر نہ صرف ان کی بلکہ ان کے معصوم بچوں کی گرفتاری ظلم کی انتہا ہے۔ گزشتہ سالوں کے اندر ممبئی میں ہونے والے تمام ہی دھماکوں میں ثاقب ناچن کو ملوث کرنے کی کوشش ممبئی پولس کرتی رہی ہے لیکن کسی ایک میں بھی وہ انہیں سزا دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکی اس لئے کہ بلا ثبوت الزامات لگا کر کسی کو جیل میں لے جانا جس قدر آسان ہے عدالت میں ٹھوس شواہد فراہم کر کے اسے ثابت کرنا اتنا ہی مشکل کام ہے۔

اس طویل عرصہ میں ثاقب اپنی وکالت خود کرنے لگے ہیں اور پولس کے سارے الزامات کو غلط ثابت کر دیتے ہیں لیکن انتظامیہ اپنی غیر ذمہ دارانہ حرکات سے باز نہیں آتا۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہو چکا ہے کہ انکاؤنٹر اسپیشلسٹ پردیپ شرما اور سچن وزے انہیں گرفتار کرنے کا بہانہ کر کے پڑگھا پہنچ گئے لیکن گاؤں والوں نے پولس درندوں کے ناپاک رادوں کو ناکام بنا دیا۔ یہ وہی سچن وزے ہے جسے خواجہ یونس کے معاملہ میں تین پولس والوں کے ساتھ قتل کے الزام گرفتار کیا گیا تھا لیکن بعد میں پولس والوں نے وزے کو ضمانت پر رہا

کروا کر کیس کمزور کر دیا۔ گھاٹکوپر بلاسٹ کی تحقیقات کرنے والے پردیپ شرما اور سریدھر واگھل کو تیلگی کی مدد کرنے کے الزام میں معطل کر دیا گیا۔ گھاٹکوپر بلاسٹ کیس میں سرکاری وکیل روہنی سالیان نے اعتراف کیا تھا کہ پڑگھا کے کسی شخص کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا بعد میں اے ٹی ایس اور کرائم برانچ پر سیاسی رسہ کشی کا الزام لگا کر وہ مقدمہ سے الگ ہو گئیں۔

انتظامیہ پے درپے غلطیاں کرتا چلا جاتا مگر اپنی روش سے باز سے نہیں آتا اس لئے کہ اسے اپنے کئے کی کوئی سزا نہیں ملتی۔ اس امر کا ایک اور ثبوت اسی ہفتہ سید محمد احمد کاظمی کے خلاف داخل کی جانے والی ناقص چارج شیٹ ہے۔ یہ دستاویز انتظامیہ کے ۶ ماہ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کی عیوب قابلِ شرم ہیں۔ مثلاً ہوشنگ ایرانی نامی ملزم پر کاظمی کے رابطہ کا الزام ہے لیکن تاریخ اور مدت کی تفصیل چارج شیٹ میں درج نہیں ہے۔ چشم دید گواہ گوپال کرشنن کا بیان لال موٹر سائکلا کا ذکر کرتا ہے پولس نے کالی موٹر سائیکل کو قبضہ میں لے کر دھماکے میں اس کے استعمال کا الزام لگایا ہے۔ پولس نے پریس کانفرنس میں الزام لگایا تھا کہ کاظمی کو ۲۰۱۰ء میں حملہ کرنے کیلئے کہا گیا اور اس کیلئے ۲۱ لاکھ کی رقم باہر سے بھیجی گئی۔ چارج شیٹ کے مطابق ۷۰ ہزار کی رقم کا اندراج ملا جو کاظمی کے داماد نے ۲۰۰۹ء میں بھجوائی تھی۔ چارج شیٹ کے مطابق ہوٹل ہائی فائی میں ایرانی حملہ آور ۱۳ فروری تک ٹھہرے

ہوئے تھے اور پولس کو اس کا پتہ ۲۶ فروری کو چلا نیز ۱۳ مارچ ان کے کمرہ نمبر ۳۰۵ سے آتش گیر مادہ ملا قابلِ غور یہ ہے کہ اس دوران سارا ہوٹل مہمانوں سے پر تھا لیکن یہ کمرہ کسی کو نہیں دیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا یہ کوئی نہیں جانتا ؟ ایرانی حملہ آوروں کو اسرائیلی سفارتخانے تک لے جانے کا الزام تو پولس نے کاظمی پر لگا دیا لیکن ان کی ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکی ۔ اس لئے امید تو یہی ہے کہ ماضی کے واقعات کی طرح کاظمی رہا ہو جائیں گے لیکن جو لوگ اس طرح کے بے بنیاد الزامات لگا کر معصوم شہریوں کو پریشان کرتے ہیں کیا انہیں کوئی سزا کبھی نہیں ہو گی ؟ جب تک ایسا نہیں ہوگا یہ غیر ذمہ دارانہ سرگرمیاں جاری رہیں گی ۔

اس طرح کی صورتحال میں جبکہ یکے بعد دیگرے غم اور خوشی کی خبریں آرہی ہیں اہلِ ایمان کا رویہ کیا ہونا چاہئے اس جانب قرآنِ مجید کی یہ آیات ہماری رہنمائی کرتی ہے ’’کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہے) تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں‘‘ ضرورت اس بات کی ہے کہ

ان واقعات سے نہ ہی ہم دل شکستہ اور مایوس نہ پھول کر کپاّ ہو جائیں بلکہ صبر و شکر کی مومنانہ شان کے ساتھ انہیں انگیز کرتے چلے جائیں ۔اس لئے کہ بقول شاعر

یہ بھی خوب ہے تماشا، یہ بہار یہ خزاں کا
یہی موت کا ٹھکانہ، یہی باغ زندگی کا

کوئلہ گھوٹالہ : جماعتی خباثت کا بول بالا قومی سیاست کا منہ کالا

پارلیمان کا مانسون اجلاس کوئلہ کی بدعنوانی میں اسی طرح بہہ گیا جیسا کہ موسلا دھار بارش میں راجدھانی دہلی کی ساری غلاظت جمنا ندی میں بہہ گئی ۔قدرت کی اس کرم فرمائی سے دہلی تو پاک ہو گئی لیکن اس کی ناپاکی ملک کے ان تمام علاقوں میں پہنچ گئی جن کو یہ پوتر ندی سیراب کرتی ہے اور آگے جاکر گنگا میاّ سے اس کا سنگم بھی ہو جاتا اس کے بعد پھر یہ غلاظت ان علاقوں تک میں پہنچ گئی جہاں تک جمنا بائی کی رسائی نہیں تھی ۔ ہندو عقیدے کے مطابق کیلاش پربت سے ست یگ میں تین مقدس ندیاں نکلی تھیں لیکن کل یگ کے آتے آتے دنیا مادہ پرستی کے چنگل میں اس طرح گرفتار ہوئی کی شرم سے سرسوتی زیرِ زمین چلی گئی ۔ الہ باد کو ان تینوں ندیوں کا مہا سنگم بھی خیال کیا جاتا ہے ۔اس عقیدے کی حقیقت جو بھی ہو اس میں اور ملک میں رائج موجودہ سیاسی نظام میں بلا کی مشابہت ہے ۔یوں سمجھ لیجئے کہ ہندی سیاست کی گنگا اور جمنا کانگریس پارٹی اور بی جے پی ہے نیز تیسرا محاذ سرسوتی کی مانند زیرِ زمین ہے ۔جب بھی ان دونوں ندیوں میں زبردست قسم کی طغیانی آتی ہے سرسوتی عارضی طور نمودار ہو جاتی ہے اور جب یہ طوفان تھمتا ہے حالات معمول پر آتے ہیں تو وہ پھر سے زیرِ زمین چلی جاتی ہے ۔اس بار بھی یہی ہوا کہ جب کانگریس اور بی جے پی کے درمیان گھمسان کا رن

پڑا تو ملائم سنگھ یادو کے ساتھ ساتھ نتیش کمار نے بھی وزارتِ عظمیٰ کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ گویا اس ہنگامہ سے کانگریس کا بال بیکا نہ ہوا مگر بی جے پی دوکان خوب چمکی اور تیسرے محاذ کی امید کے چراغ روشن بھی ہوگئے۔ ان تینوں محاذوں متحدہ ترقی پسند محاذ، قومی جمہوری محاذ اور تیسرے محاذ نے اس بہتی گنگا میں نہ صرف اپنے ہاتھ دھولئے بلکہ چہرے پر لگی کوئلے کی کالک کو دھونے کی بھی بھرپور کوشش کی لیکن یہ کالک ایسی گہری تھی کہ گنگا جمنا سرسوتی تینوں کا رنگ سیاہ ہوگیا مگر کالک جوں کی توں باقی ہی رہی۔

کوئلہ ہنگامہ میں کس نے کیا کھویا اور کس نے کیا پایا اس کا تجزیہ نہایت دلچسپ نتائج کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ یقیناً اس سے سب سے زیادہ فائدہ حزبِ اختلاف بی جے پی کا ہوا۔ ایک عرصہ سے ملک کی سب بڑی اپوزیشن بی جے پی کو اشتراکی اتحاد اور ممتا بنرجی نے حاشیہ پر پہنچا دیا تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ وہ لوگ مسائل کو اٹھاتے تھے اور بی جے پی ان کی حمایت پر مجبور ہوتی۔ اس کے علاوہ رام دیو بابا اور انا ہزارے جیسے لوگ اخباروں اور ٹی وی چینلوں پر چھائے رہتے تھے۔ اگر بی جے پی کے حوالے سے کوئی خبر مشہور بھی ہوتی تو وہ دہلی کے بجائے احمد آباد سے آتی۔ مثلاً اگر میں قصوروار ہوں تو مجھے پھانسی چڑھا دو اور سدبھاؤنا برت وغیرہ۔ لوک سبھا اور راجیہ سبھا دونوں مقامات پر سشما جی اور ارون جیٹلی بے وزن ہوگئے تھے۔ وہ دونوں وزارتِ عظمیٰ

کے دعویدار ہیں اور ہر گز نہیں چاہتے نریندر مودی ان کے راستے کا کانٹا بنے لیکن سیاسی صورتحال کچھ ایسی تھی کہ دونوں بے دست و پا ہو گئے تھے۔ اس حالت کو بدلنے کیلئے ٹوجی معاملے میں وزیر داخلہ چدمبرم کے خلاف مہم چلائی گئی۔ پارلیمان کو چلنے نہیں دیا گیا اور اس حکمتِ عملی کا خاطر خواہ فائدہ ان دونوں رہنماؤں کو ہوا۔ اب انہیں نسخۂ کیمیا ہاتھ آگیا تھا اس بار چدمبرم کے بجائے سیدھے وزیر اعظم پر نشانہ سادھا گیا۔ بی جے پی والے جانتے تھے کہ یہ تیر خطا ہو کر رہے گا لیکن انہیں اس میں مطلق دلچسپی نہیں تھی انہوں نے استعفیٰ کا تنور گرم کرکے اپنی سیاسی روٹیاں سینکیں۔ سشما نے آٹا گوندھ کر اسے بیلنے کا کام کیا اور ارون جی اسے سینک سینک تنور سے نکالتے اور صحافیوں کے آگے پروستے رہے۔

ان روٹیوں کو ذرائع ابلاغ نے جی بھر کے نوش کیا اور سیر ہو گئے۔ کانگریس والے بھی اس لڑائی کو ذرائع ابلاغ میں لے آئے اور منموہن جی اپنا مدعا شعر کے پردے میں بیان کیا ''

ہزاروں جوابوں سے اچھی ہے میری خاموشی

نا جانے کتنے سوالوں کی آبرو رکھے

وزیر اعظم کا اشارہ بی جے پی کی جانب تھا کہ اگر اس راز پر سے پردہ اٹھے گا

تو اس میں بی جے پی کے پردہ نشینوں کے بھی نام آئیں گے لیکن بی جے پی فی الحال بدعنوانی کے معاملے میں شرم وحیا کی سارے حدود و قیود سے تجاوز کر چکی ہے اس لئے شعر کا ترکی بترکی جواب سشما سوراج نے شعر کو الٹ کر دے دیا کہ ''جن کو اپنے بے آبرو ہونے کا ڈر ہوتا ہے وہ خاموش رہتے ہیں ۔ اپنے اس فقرے پر وہ اس قدر خوش ہوئیں کہ انہوں نے کانگریس پارٹی پر کرناٹک کے ریڈی.برادران سے موٹا مال لینے کا الزام لگا دیا ۔ ایسا کرتا ہوئے سشما جی بھول گئیں کہ اگر یہ الزام سچ بھی ہو تب بھی وہ بی جے پی خلاف ہے ۔ اس لئے کہ کرناٹک ریڈی.برادران جن کی چوری اب طشت ازبام ہو چکی ہے کانگریس کے نہیں بلکہ بی جے پی کے ارکانِ اسمبلی اور وزراء تھے ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سشما جی خود کرناٹک میں ریڈی کے زیر اثر علاقہ سے پارلیمان میں جانے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ ارون جی کرناٹک بی جے پی نگرانِ کار تھے ۔ انٹرنیٹ پر سشما کی دونوں ریڈی.برادران کے سر پر ہاتھ رکھی ہوئی مسکراتی تصویر کس نے نہیں دیکھی اب جن سیاسی رہنماؤں کو سشما کا آشیرواد حاصل تھا اور انہوں نے موٹا مال دے کر جو مایا جال بنا اس میں ان کے سیاسی گرو کا حصہ نہ رکھا ہو کیا یہ ممکن ہے ؟ سشما کا داؤں خود انہیں کے خلاف پڑ گیا اس سے کانگریس پارٹی کے وارے نیارے ہو گئے۔اس نے بی جے پی مختلف وزرائے اعلیٰ کو لپیٹ میں لے لیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے سے تینوں فریقوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اگر کوئی خسارے میں رہا تو وہ ان سیاسی جماعتوں کے رائے دہندگان ہیں جن کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ بیچارے ٹی وی کے آگے بیٹھ کر بلا وجہ ہاتھ ملتے رہے۔ اس معاملہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دونوں فریقوں کا مؤقف بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے۔کانگریس کا یہ کہنا کہ حزب اختلاف پارلیمان کے وقار کا خیال کرے اور اس معاملے پر مباحثہ میں شریک ہو یہ نہایت موقفل تقاضہ ہے اس لئے کہ عوام نے اپنے نمائندوں کو اسی مقصد کے تحت منتخب کرکے بھیجا ہے۔ کانگریس اس معاملے میں بحث ومباحثہ کے بعد رائے دہندگی کیلئے بھی تیار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس مسئلہ پر پیش ہونے والی تحریک عدم اعتماد کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ حکومت اپنے آپ گر جائیگی۔ حزب اختلاف کا بلا بحث وزیر اعظم کا استعفیٰ طلب کرنا اور اس مطالبہ کو پارلیمان کے کام کاج سے مشروط کردینا سیاسی بلیک میلنگ کے مترادف ہے اس لئے کہ بلا تحقیق کسی کو سزا دینا قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے۔ کانگریس کی یہ دلیل بھی درست ہے کہ اگر حزبِ اختلاف کی بات کو تسلیم کرکے کوئلہ کے ٹھیکوں کو مسترد کردیا جائے تو عدالت میں یہ فیصلہ ٹک نہیں پائے گا اور اس کے خلاف آنے والے عدالتی احکامات حکومت کی سبکی کا سبب بنیں گے اور اس صورت میں پارلیمان کا وقار مجروح ہوگا۔

یہاں تک تو سب ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد کانگریس کا موقف خطرناک موڑ لے لیتا ہے ۔اس کا کہنا ہے کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل کی رپورٹ کو من و عن تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نہایت خطرناک طرزِ عمل ہے۔ کمپٹرولر اور آڈیٹر ایک دستوری ادارہ ہے۔اس کے اختیارات کو چیلنج کرنا اور اس کی کارکردگی پر شکوک و شبہات پیدا کرنا دستور کی سیدھی خلاف ورزی ہے جو برسرِ اقتدار جماعت کو زیب نہیں دیتی ۔ اگر اس کی سفارشات بے وقعت ہیں تو اسے معطل کر دیا جانا چاہئے اور اس پر خرچ ہونی رقم کا کوئی اور مفید استعمال ہونا چاہئے ۔ اسی کے ساتھ اگر سی اے جی رپورٹ حزبِ اختلاف کے خلاف ہوتی ہے تو اس کی صداقت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں لیکن اگر خود کانگریس کے اپنے خلاف ہو تو اسے جھوٹ کا پلندہ قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا اس سے بڑھ کر منافقت اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسی کے ساتھ کپلسبل کی یہ دلیل نہایت کمزور ہے کہ ترقی کی رفتار کو قائم رکھنے کیلئے ضابطہ کی خلاف ورزی ضروری تھی ۔ اس کیلئے لازمی ہے کہ پہلے ضابطہ کو بدلا جائے ۔ ایسا کرنے کا اختیار حکومت کو حاصل ہے لیکن ضابطہ کو تبدیل کئے بغیر اس کی خلاف ورزی کا کوئی جواز نہیں بنتا ۔ وزیر خزانہ چدمبرم کا یہ کہنا چونکہ ابھی کان کنی کا کام شروع نہیں ہوا ہے اس لئے نقصان کا الزام لگانا درست نہیں ہے نہایت بچکانہ منطق ہے ۔ یہ تو ایسا ہی

ہے کہ کوئی جان لیوا حملہ کرنے والا یہ کہے چونکہ ملزم ابھی مرا نہیں اس لئے وہ قاتل نہیں بے قصور ہے۔ کانگریس چونکہ اس پر اصرار کر رہی ہے کہ ان ٹھیکوں کو کالعدم قرار نہیں دے گی اس کا مطلب یہ ہے کہ آج نہیں تو کل نیلامی سے صرفِ نظر کرنے کا نقصان سرکاری خزانے کو ہو کر رہے گا ایسے میں وزیر خزانہ کا یہ کہنا ان کی اپنی ذمہ داری سے وشواس گھات ہے۔ اگر کان کنی ہو چکی ہوتی تو چدمبرم کہتے اب تو کوئلہ جل کر راکھ ہو گیا اب اس کو کریدنے سے کیا حاصل گویا چت بھی میری اور پٹ بھی میری والی یہ دلیل ہے۔ جس ملک کا وزیر خزانہ قومی وسائل کا دشمن بن جائے اس خزانے لٹتے دیر نہیں لگتی۔

اس کے برعکس بی جے پی کی بات میں بھی دم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بحث و مباحثہ بے سود ہے اس لئے کہ کانگریس نے مخالفین کو خریدنے کے فن میں مہارت حاصل کر لی ہے اور اگر معاملے میں تحریک عدم اعتماد ناکام ہو جاتی ہے جو یقینی ہے تو ساری مشق بیکار ہو جائیگی اور حکومت کا غلط مؤقف اکثریت کی بنیاد پر صحیح ہو جائیگا۔ کمپٹرولر و آڈیٹر جنرل ایک قابل احترام ادارہ ہے۔ اس کی تحقیق و تفتیش کو یکسر جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس لئے اس بے ضابطگی کا واحد حل یہ ہے کہ اسے درست کیا جائے اور سارے ٹھیکے منسوخ کر دیئے جائیں۔ دوبارہ ضابطہ کے مطابق نیلامی سے سرکاری خزانے کو ایک لاکھ

چھیاسی ہزار کروڑ سے زیادہ کا منافع ہوگا۔ سی اے جی اس معاملے میں ضروری تحقیق و تفتیش کر چکا ہے اس لئے مزید کسی بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں ہے اس لئے اس پر کارروائی کی درکار ہے اور اس کا بنیادی تقاضہ ٹھیکوں کو منسوخی ہے۔ چونکہ یہ بدعنوانی وزیر اعظم کے دستخط سے ہوئی ہے اس لئے انہیں اپنی اخلاقی ذمہ داری تسلیم کرکے استعفیٰ دے دینا چاہیے۔

ان نکات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سیاسی جماعتوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ سیاسی نظام کی مشکل ہے جو بیک وقت متضاد مؤقف کی تائید کرتا ہے اس لئے کوئی ایسا حل پیش کرنے سے قاصر ہے جو ساری جماعتوں کیلئے قابلِ قبول ہو اور پھر سیاسی جماعتیں بھی اپنے مفادات کے پیشِ نظر ان مسائل کو حل کرنے میں مخلص نہیں ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ یہ ہنڈیا پکتی رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے بی جے پی کا کمل صاف ستھرے پانی میں نہیں کھلتا اس کیلئے بدعنوانی یا فرقہ واریت کا دلدل ضروری ہے ۔کانگریس کا ہاتھ بھی اسی ماحول میں چلتا ہے اور تیسرے محاذ کی سائیکل کا بھی یہی حال ہے کہ وہ ملک کی بگڑتی سیاسی ڈھلان پر تو خوب تیزی سے دوڑتی ہے لیکن مسطح سڑک پر نہیں چل پاتی اور اگر اونچائی کا راستہ آجائے تو پنچر ہوجاتی ہے کمیونسٹ کوتا بھی بدعنوانی کی فصل کاٹنے میں خوب طاق ہے لیکن امن و سلامتی کی فضا میں اس کی دھار کند ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی نہیں ہے کہ کسی

ایک جماعت یا دوسری کو اس کیلئے موردِ الزام ٹھہرایا جائے۔ اس لئے کہ ہر کسی کی اپنی اپنی مجبوری ہے اور کوئی ایک بھی اس پر اپنے طور سے قابو نہیں پا سکتا اِلّا یہ کہ کوئی ایسا متبادل نظام برپا ہو جو عوام کے ساتھ ساتھ ان سیاسی جماعتوں کو بھی راہِ راست پر لے آئے۔

جمہوری روایات کا فروغ ہندوستان کی بنسبت پاکستان میں بہت کم ہوا ہے لیکن وہاں عدلیہ کا شعبہ ہندوستان سے زیادہ مؤثر نظر آتا ہے۔ جنرل پرویز مشرف جیسے آمر کے قدموں اکھاڑنے میں بحالیٔ عدالت کی تحریک نے بڑا رول ادا کیا۔ بدعنوانی کا مقدمہ نہ چلانے کی پاداش میں یوسف رضا گیلانی کو استعفیٰ دینا پڑا اور نئے وزیر اعظم پر بھی یہ تلوار لٹک رہی ہے۔ ہندوستان کی عدالتیں حزب اقتدار کے طاقتور وزراء کے خلاف ابھی تک اس طرح کے فیصلے نہیں کر پائی ہیں۔ اسی لئے چدمبرم آج بھی عیش کر رہے ہیں اور وزیر اعظم کے خلاف حزب اختلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی جرأت نہیں کر پا رہا ہے۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ عرصۂ دراز سے امریکہ کی آنکھوں کا تارہ رہے ہیں۔ صدر اوبامہ نے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے انہیں قصرِ ابیض کا مہمان بنایا لیکن جب سے انہوں نے ایران کے معاملے امریکہ کے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا اور ایران کے ساتھ اپنے تجارتی رشتوں کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ناوابستہ تحریک کی کانفرنس میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا، امریکی ذرائع

ابلاغ ان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ براہِ راست یہ تو نہیں کہتا کہ منموہن امریکہ کی بات کیوں نہیں مانتے بلکہ بلواسطہ ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا ہے۔

اس مہم کا آغاز جولائی میں ہوا جب معروف جریدہ ٹائم نے ایشیائی خصوصی شمارے کے سر ورق پر منموہن سنگھ کی تصویر شائع کی اور انہیں امیدوں پر کھرا نہیں اترنے والے شخص کے خطاب سے نوازہ۔ اسی کے ساتھ منموہن سنگھ کی قیادت پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے لکھا کہ 'بھارت کو جس نئی شروعات کی ضرورت ہے۔ کیا وزیر اعظم منموہن سنگھ اس کے اہل ہیں؟ مؤقر جریدے نے انہیں ایک ایسا کمزور رہنما بتایا ہے جو ان اصلاحات کو جاری رکھنے کے خواہش مند نہیں جس کے ذریعے ملک کو دوبارہ ترقی کی راہ پر ڈالا جا سکے۔ یو پی اے حکومت پر معاشی ترقی میں گراوٹ، زبردست مالی خسارے اور روپے کی گرتی قیمت کے علاوہ بدعنوانی کا لزام بھی لگایا گیا۔ ٹائم کے مطابق ملکی اور غیر ملکی صارفین میں اعتماد کی کمی آئی ہے، مہنگائی بڑھنے اور حکومت کے اعتماد کو نقصان پہنچانے والے تنازعات کے سبب عوام کے اعتماد میں بھی کمی آئی ہے۔ ٹائم کے بعد واشنگٹن پوسٹ نے اگست میں کوئلے کی کانوں کے الاٹمنٹ پر تنازعہ کے پس منظر میں لکھا کہ منموہن سنگھ شاذ و نادر ہی کسی مسئلہ پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں اور ان کی خاموشی اب ان کی کمزوری بن گئی ہے اخبار کے مطابق منموہن سنگھ کی شبیہ

اب پوری طرح بدل چکی ہے۔پہلے وہ ایک قابل احترام اور انتہائی سادگی میں یقین رکھنے والے دانشور منتظم مانے جاتے تھے لیکن اب وہ انتہائی بدعنوان حکومت کی سربراہی کرنے والے غیر مؤثر افسر شاہ نظر آتے ہیں گویا اب کوئلہ کی دلالی میں ہندوستانی سیاستدانوں کے ساتھ امریکی انتظامیہ بھی ذرائع ابلاغ کے توسط سے اپنے ہاتھ کالے کرنے میں جٹ گیا ہے بقول افتخار عارف

جس دن سے ہم بلند نشانوں میں آئے ہیں
ترکش کے سارے تیر کمانوں میں آئے ہیں

ستمبر کا نوحہ : پرندے کے پر اس کا تابوت بن گئے ۱۱

اس سال ۱۱ ستمبر کا ماتم زور و شور سے کیا جائیگا اس لئے کہ صدارتی انتخاب کا موسم ہے دو ماہ بعد ووٹ پڑنے ہیں۔ایک بار پھر ڈیموکریٹک گدھے کا مقابلہ ریپبلکن ہاتھی سے ہوگا اور ان میں سے کوئی ایک کامیاب اور دوسرا ناکام و نامراد ہو جائیگا۔ہندوستان میں سیاسی جماعتیں اپنے لئے ہاتھی یا شیر کا نشان پسند کرتی ہیں جبکہ امریکہ میں ہاتھی کے ساتھ گدھے پر اکتفا کیا جاتا ہے اس کے پسِ پشت ایک نظریاتی نفسیات کاربند دکھلائی دیتی ہے۔ ہندوتانی سیاستدان شتر بے مہار ہوتے ہیں اور جنگل کا راج چلاتے ہیں اس لئے شیر ان کے شایانِ شان انتخابی نشان ہے۔ اس کے برعکس امریکی سیاستداں سرمایہ داروں کے پالتو جانور ہوتے ہیں اور ان کے آگے ڈھینچو ڈھینچو کرتے رہتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں جمہوریت کے اندر امیروں کے ذریعہ، امیروں کے درمیان سے، امیروں کی خاطر صدر مملکت چنا جاتا ہے۔اسی لئے دونوں اہم سیاسی جماعتیں اپنا امیدوار نامزد کرنے سے قبل یہ ضرور دیکھتی ہیں کہ کون سب سے زیادہ چندہ جمع کر سکے گا ؟ کسے بڑے سرمایہ داروں کا سب سے زیادہ اعتماد حاصل ہے ؟اب ایسی جماعتوں کی مشابہت وفادار گدھے سے زیادہ اور کس جانور سے ہو سکتی ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ براک اوبامہ ایک غریب کے گھر میں پیدا ہوا تھا اس کے باوجود صدارت کی کرسی پر

فائز ہو گیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس وقت اسے امیدوار بنایا گیا اس وقت وہ اپنے باپ کی طرح نہ غریب تھا اور نہ مسلمان تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی اڑچن ہوتی تو بیچارے.براک اوبامہ کو صدارت تو کجا امیدواری بھی نصیب نہ ہوتی۔

امریکی جمہوریت کی ایک بہت.بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہاں دو میقات سے زیادہ کوئی صدر کے عہدے پر فائز نہیں ہو سکتا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے ان آٹھ سالوں میں امریکی صدر اس قدر عیش کر لیتا ہے کہ دوسرے ممالک کے سربراہ اسیّ سال میں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے نیز اپنی آنے والی آٹھ پشتوں تک کیلئے وہ خوشحالی کا اہتمام کر کے جاتا ہے۔ ویسے جارج بش نے تو اپنی اولاد کو اقتدار کا چسکا بھی لگا دیا۔ کلنٹن نے اپنی اہلیہ کیلئے یہی کوشش کی لیکن نمبر ایک کے بجائے دو پر اکتفا کرنا پڑا ۔ امریکی انتخاب داخلی اور خارجی دونوں محاذ پر لڑا جاتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ انتخاب پارٹی کے نظریہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ اقتدار یا اختلاف کی بنیاد پر ہوتا ہے ۔ حزب اختلاف جو اپنے حریف کو اقتدار سے بے دخل کر کے اقتدار پر قابض ہونا چاہتا رائے دہندگان کو رجھانے کی خاطر داخلی مسائل یعنی عوامی فلاح و بہبود کا راگ الاپتا ہے اور حزب اقتدار امورِ خارجہ میں اپنے کارہائے نمایاں بیان کر کے ووٹ مانگتا ہے۔

دونوں سیاسی جماعتوں کا مذکورہ طرز عمل ان کی پسند نہیں بلکہ مجبوری ہوتی ہے۔ مثلاً براک اوبامہ نے گزشتہ مرتبہ معیشت کو سدھارنے اور صحت عامہ کی بنیاد پر انتخاب لڑا اور کامیک کین عراق و افغانستان کا گانا گاتے رہے۔ براک اوبامہ نے معیشت کے میدان میں یہ کیا کہ قومی قرض میں کمی کرنے کے بجائے اس کی تحدید میں اضافہ کیا تاکہ زیادہ قرض حاصل کیا جاسکے۔ پہلے دو سال کے عرصہ میں جبکہ ان کی اپنی جماعت کو کانگریس یعنی پارلیمان میں اکثریت حاصل تھی صحت عامہ کا بل ہی نہیں پیش کیا اس کے بعد جب ریپبلکن کو اکثریت حاصل ہو گئی تو اسے پیش کر کے ناکام کروا دیا۔ اب وہ اس کا الزام ریپبلکن پر لگا چھوٹ جائے گا حالانکہ یہ بھی کہا جارہا ہے انشورنس کمپنیوں نے میک کین کو ۷ ملین ڈالر اوبامہ کی مخالفت کیلئے دیئے تھے لیکن جب وہ داؤں نہیں چلا تو اوبامہ کو ۲۱ ملین ڈالر دے کر خرید لیا گیا۔ اس طرح عوام بے چاری محروم کی محروم ہی رہی۔ اس بار معیشت اور عوامی فلاح و بہبود کے وعدے مٹ رومنی کریں گے اور اوبامہ اپنی دلیری ثابت کرنے کیلئے اسامہ بن لادن کے فرضی قتل کی دہائی دے کر عوام سے ووٹ مانگیں گے۔ یہی سلسلہ انتخاب در انتخاب چلتا رہے گا۔ عوام کا استحصال جاری رہے گا نیز دس فیصد سے کم بڑے سرمایہ داروں اور ان کے آلۂ کار سیاستدانوں کے وارے نیارے ہوتے رہیں گے۔

امریکہ کی معاشی صورتحال کا جائزہ حال میں ڈیوک یونیورسٹی کے ڈان اریلی اور

ہارورڈ یونیورسٹی مائکٹ نارٹن اس طرح لیا ہے کہ اگر اس عظیم جمہوریت کی آبادی تو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے۔۴۰ فیصد غریب، ۴۰ فیصد متوسط طبقہ اور ۲۰ فیصد امیر تو دولت کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہوتی ہے کہ ۲۰ فیصد امیروں کے پاس ملک کا ۸۴ فیصد سرمایہ ہے۔ متوسط طبقہ کی تعداد ان سے دوگنی ہے اس کے باوجود ان کو صرف ۷ء فیصد پر اکتفا کرنا پڑتا ہے اور ۴۰ فیصد غریبوں کے پاس صرف ۳ء۰ فیصد دولت ہے ۱۵ یعنی ایک فیصد کا ایک تہائی۔ یہ کس قدر شرمناک صورتحال ہے کہ بڑے ذوق و شوق سے ووٹ دے کر خوش ہونے والے عوام دن بدن کسمپرسی کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ امریکہ کا ایک مسئلہ یہ ہے وہاں مہنگائی کی شرح بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اگر کسی خاندان میں تین افراد ہوں اور ان کی سالانہ آمدنی ۱۹۰۰۰ ہزار ڈالر سے کم ہو تو اس کا شمار غریبوں میں کیا جاتا ہے۔ ماہرین کی رائے میں یہ اعدادو شمار نظرِثانی کے مستحق ہیں اس لئے اس میں ایک خاندان کا گزارہ یعنی گھر کا کرایہ، بجلی کا بل، غذا اور پانی کا بندوبست نہیں ہو پاتا۔ امریکہ میں ۲۵ فیصد لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایڈلمین کے مطابق امریکہ میں فی الحال دو کروڑ سے زیادہ لوگوں کی آمدنی ڈالر یعنی غریبی کی لکیر کے نصف سے بھی کم ہے۔ ساٹھ لاکھ امریکی بے گھر ہیں ۹۵۰۰ اور وہ فٹ پاتھ یا اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔ ان

کو حکومت کی جانب سے غذا فراہم کی جاتی ہے لکن مٹ رومنی علی الاعلان ان مجبوروں کو مفت خور قرار دے کر اس سہولت سے محروم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔
عوام کی اس ابتری کے مقابلے ان کے نمائندوں کی برتری بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اخبار دی ہل کے مطابق پارلیمان یعنی کانگریس کے ۱۷ ارکان کی دولت سو کروڑ روپیہ کے برابر ہو گئی ہے اور ۳۵ ارکان نے ۵۰ کروڑ روپیہ جمع کیا ہے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر ریپبلکن پارٹی کے مائیکل مکول ہیں جنھوں نے ۱۵۰ کروڑ روپیہ جمع کیا اس کے بعد ڈیموکریٹک پارٹی کے جان کیری کا نمبر آتا ہے جو ۱۰۰ کروڑ کے مالک بن گئے ہیں۔ اس میں سے ۲۵ کروڑ تو گزشتہ ایک سال کی آمدنی ہے۔ ویسے ان امیر عوامی نمائندوں میں اکثریت یعنی ۶۰ فیصد ریپبلکن پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اگر سب سے زیادہ دس امیر لوگوں کو الگ کیا جائے تو اس میں سات کا تعلق ڈیموکریٹک پارٹی سے ہے۔ اس کے معنی یہی ہوئے کہ اس معاشی بحران میں بھی جب کہ ملک دن بدن قرض کے بوجھ تلے دبا جارہا ہے۔ عوام نت نئی مشکلات کا شکار ہو رہے ہیں ان کے جمہوری نمائندوں کی عیش و عشرت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اس لوٹ مار میں نہ تو پارٹی سے کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ ہی اکثریت و اقلیت میں ہونے سے۔ اس لئے کہ ایک طرف جہاں صدر ڈیموکریٹک گدھا ہے وہیں پارلیمان اکثریت ریپبلکن ہاتھیوں کی ہے۔ اس طرح دونوں کو

کھانے کمانے کے یکساں مواقع حاصل ہیں اور وہ لوگ اس سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔

اس صورتحال کے نتیجے میں امریکہ کے اندر ایسے دانشوروں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے جو عوام کو انتخاب کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ان میں جے جی فائب بھی شامل ہیں جن کی ۸۶ ابواب پر مشتمل ضخیم کتاب ''جدید نشاۃ الثانیہ کا نسخۂ کیمیا'' کافی مقبول ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ دونوں جماعتیں ایک ہی سکہ کے دو پہلو ہیں۔ پارٹی کے رہنما بدل جاتے ہیں لیکن ان کے پس پشت کام کرنے والے پالیسی ساز دانشور اور ان کا سرمایہ داروں سے تعلق نہیں بدلتا اس لئے کسی ایک کے آنے اور دوسرے کے چلے جانے سے عوام کو کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا ہے۔ چہرے ضرور بدلتے ہیں لیکن حکمت عملی اور طریقۂ کار وہی رہتی ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ جب وہ لوگوں سے کہتے ہس کہ اپنی توانائی انتخاب پر صرف نہ کرو تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ میں انہیں اپنے مسائل کو حل کرنے سے روکتا ہوں اور بے عملی کی دعوت دیتا ہوں حالانکہ صورتحال اس کے برعکس ہے۔ عوام انتخاب میں ووٹ دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے اب انہیں کچھ اور کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ ان کے مسائل اب ان کے نمائندے حل کریں گے حالانکہ عوام جانتے بوجھتے اپنی رائے ان لوگوں کے حق میں دینے پر مجبور ہیں کہ جو

ان کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتے۔ جن کا نااہل ہونا نہ صرف ثابت ہو چکا ہے بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو اکثر وبیشتر مسائل کو حل کرنے کے بجائے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے حوالے اپنے مسائل کو کرکے مطمئن ہو جانا سراسر حماقت ہے۔

امریکی عوام کے اندر بے چینی اور مایوسی کا جو آتش فشاں پک رہا ہے وہ وقتاً فوقتاً پھٹتا رہتا ہے۔ اس سال اپریل سے اگست کے دوران چار ایسے واقعات رونما ہوئے جس میں کسی نہ کسی بندوق بردار سرپھرے نے عوام پر بلا وجہ گولی چلا دی۔ ان حادثات میں کل ۲۷ افراد ہلاک اور ۷۰ زخمی ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ابھی حال میں سابق فوجیوں پر مشتمل ایک ایسے گروہ کو حراست میں لیا گیا جس کا ارادہ نہ صرف حکومت کا تختہ الٹنا تھا بلکہ وہ صدر کو ہلاک بھی کرنا چاہتا تھا۔ بائیں بازو کے اس انتہا پسند گروہ کا نام ''صدا تیار ہمیشہ پائیدار'' ہے جس کا انگریزی مخفف خوف بنتا ہے۔ یہ سب مقامی دہشت گرد ہیں اور سیب کی فصل کو تباہ کرنے کے علاوہ ایک پانی کے بند کو بھی گرانے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ وہ لوگ فوجی چھاؤنی سٹیورٹ قلعہ پر حملہ کرکے اس میں موجود اسلحہ پر قابض ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس گروہ کا پتہ اتفاق سے چلا۔ ان لوگوں نے ایک سابق فوجی مائکل رورک اور اس کی محبوبہ ٹفنی کا محض اس لئے قتل کر دیا کہ اسے ان کے منصوبے کا پتہ چل گیا تھا۔ پولس نے مائیکل رورک کے قاتلوں کی تلاش میں ایک سابق فوجی مائیکل برنٹ کو گرفتار کرلیا اور

اس نے تمام راز افشا کرکے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ اس نے بتایا کہ سٹیورٹ قلعہ پر حملہ کرنے کی خاطر ۸۷۰۰۰ ہزار ڈالر کی بندوقیں اور آتش گیر مادہ خریدا گیا تھا۔ اس کیلئے رقم اگویوی نامی رکن کی بیوی کی موت سے حاصل ہونے والی انشورنس کے پانچ لاکھ ڈالر سے فراہم کی گئی تھی۔ اس معاملے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ بائیں بازو کے انتہا پسند امریکی حکومت کو صہیونیت کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔

ایک قیاس آرائی یہ بھی کی جارہی تھی کہ اوبامہ اپنی سیاسی دوکان کو چمکانے کی خاطر اسرائیل کو انتخاب سے قبل ایران پر حملہ کرنے کی اجازت مرحمت کردے گا لیکن اب جو خبریں آرہی ہیں وہ اس کے برعکس ہیں۔ سنا ہے امریکی انتظامیہ نے اسرائیل سے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ ایران پر حملہ کی صورت میں وہ اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اوبامہ انتظامیہ اپنے یوروپی حلیفوں کے توسط سے ایران کے ساتھ رابطے میں ہے اور اس یقین دہانی پر کہ وہ خلیج فارس میں اگر امریکی مفادات کو نقصان نہ پہنچانے کی ضمانت دے تو اس صورت میں اسرائیل کو حملہ سے باز رکھا جائیگا۔ اس موقف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ایران کی جوہری تنصیبات کو نقصان پہنچا تو اس سے نہ صرف ایرانی عوام بلکہ آس پاس کے خلیجی ممالک میں جوہری شعاوں کے اثرات کا اندیشہ ہے اور امریکہ اپنے ان عرب حلیفوں کو اسرائیل کی خاطر ناراض کرنے کا

خطرہ فی الحال مول لینا نہیں چاہتا۔

اس بیچ امریکہ سے اسرائیل کیلئے ایک اور اندوہناک خبر آئی ہے۔ امریکہ کی ۱۶ اہم ترین خفیہ ایجنسیوں کو ۷ ہزار کروڑ ڈالر کا بجٹ فراہم کرکے ایک تحقیق کا کام سونپا گیا اور اس کے نتیجے میں ۸۲ صفحات پر مشتمل رپورٹ کا مسودہ تیار ہو چکا ہے۔ اس رپورٹ کا موضوع ہے اسرائیل کے بعد مشرقِ وسطیٰ۔ اس رپورٹ کے مسودے میں ایسے چونکا دینے انکشافات کئے گئے ہیں جس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ اس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ اسرائیل کی دوستی امریکہ کے قومی مفادات کو لاحق سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسرائیل سے گہرے تعلقات کے باعث امریکہ مسلم ممالک سے تعلق استوار نہیں کر پا رہا ہے اور بین الاقوامی سطح پر الگ تھلگ پڑتا جا رہا ہے۔ عرب دنیا میں آنے والی سیاسی تبدیلیوں نے امریکہ کے مسائل میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے اور ایک ایسے ملک کی خاطر جو انسانی حقوق کی پامالی کیلئے ساری دنیا میں بدنام ہو چکا ہے ۵۷ مسلم ممالک سے تعلقات کو بگاڑ لینا گھاٹے کا سودہ ہے۔ اس رپورٹ میں یہودیوں کی امریکی امور میں دخل اندازی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور کہا گیا ہے امریکی رائے عامہ اب اسرائیل کے خلاف ہو چکی ہے ایسے میں (معاشی بحران کے چلتے ۱۹۶۷ء سے جاری اسرائیلی امداد جو تین لاکھ کروڑ ڈالر سے متجاوز ہے) اسے جاری رکھنا ناممکن ہے۔ اسرائیل کے بغیر مشرق وسطیٰ کا

امکان دراصل اسرائیل کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کے مترادف ہے اوراس پر ایران میں نہیں بلکہ امریکہ غور میں ہو رہا ہے۔ اس رپورٹ کا کیا حشر ہوگا کوئی نہیں جانتا لیکن اس میں موجود امکان یقیناً ایک دن حقیقت بنے گا اس میں شک شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

خارجی محاذ پر امریکہ کی حالت آج کل بہت پتلی ہے۔ افغانستان سے ۲۰۱۴ء میں نکل جانے سے قبل امریکی یہ چاہتے تھے کہ افغانی فوجیوں کی اس طور تربیت کرکے جائیں کہ چلے جانے کے بعد بھی ان کے کٹھ پتلی ان کے اشاروں پر ناچتے رہیں لیکن اب امریکی انتظامیہ نے اس کام کو بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے جن کی وہ تربیت کرتے ہیں وہ نوجوان اپنی تربیت کا فی الفور استعمال امریکیوں ہی کے خلاف کر دیتے ہیں۔ گزشتہ چند ماہ کے اندر اتحادی فوجیوں کے خلاف ہونے والے پے در پے حملوں سے تنگ آکر یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ امریکی حکام جن پر بھروسہ کرکے ان کی دعوت پر جاتے ہیں وہی انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ افغانستان میں اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر نرم چارہ پاکستان پر ڈرون حملوں کا سلسلہ جاری ہے لیکن اب وہ بھی زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کی جو حالت آج سے چند سال قبل تھی اس سے بری حالت فی الحال امریکہ کی ہے۔ کینیڈا اور فرانس اپنے فوجیوں کو واپس بلا چکے ہیں اور یہی صورتحال رہی تو امریکہ کا

نیا صدر ۲۰۱۴ء کا انتافر کرنے کے بجائے درمیان ہی میں افغانستان سے بھاگ کھڑا ہوگا جیسا کہ ان لوگوں نے عراق میں کیا تھا۔

ایران کے اندر منعقد ہونے والی ناوابستہ کانفرنس میں بڑے پیانے پر سربراہانِ مملکت کی شرکت نے امریکہ کی بین الاقوامی ساکھ پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ مصر کے صدر موری کو شرکت سے روکنے کیلئے امریکہ نے اپنی ۱۳۰ کروڑ ڈالر کی فوجی امداد بند کرنے کی دھمکی دی لیکن اس کے باوجود موری نے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا۔ مصر کو سعودی عرب نے ۳۰۰ کروڑ ڈالر اور آئی ایم ایف نے ۴۸۰ کروڑ دالر قرض کی فراہمی کا یقین دلایا ہے نیز چین نے بھی اپنا تعاون پیش کیا ہے۔ایسے میں ۱۱ ستمبر کے نوحہ خوانی میں امریکہ کے صدارتی امیدوار کیا کہتے ہیں یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا ۔امریکی انتظامیہ کی اس حالت کو دیکھ کر افتخار عارف کی آزاد نظم ''ستمبر کی یاد'' کا پرندا یاد آتا ہے جو بہت اونچی اڑان بھرنے چلا تھا مگر اس کے پر اس کا تابوت بن گئے۔

اور تو کچھ یاد نہیں بس اتنا یاد ہے
اس سال بہار ستمبر کے مہینے تک آ گئی تھی
پھر دھوپ ہی دھوپ میں اتنی برف پڑی کہ بہت اونچا
اُڑنے والے پرندے کے پر اس کا تابوت بن گئے

آسام: زمیں اللہ کی ہے سارے انساں بھائی ہیں

ریاستِ آسام سے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے بعداب مسلسل وہاں سے سیلاب کی خبریں آرہی ہیں۔ گزشتہ ہفتہ دریائے برہمپترا نے اس موسم باراں میں تیسری مرتبہ قہر برپا کیا۔ جس سے پچھلے ستائیس سالوں کی تباہی کے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ اب تک ریاست کے کل ۲۸ ضلعوں میں سے ۱۹ اضلاع زیر آب آچکے ہیں۔ مرنے والوں کی تعداد سو سے زیادہ ہو چکی ہے اور بے خانماں ہونے والوں کی کل تعداد ۳۵ لاکھ کو چھو رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسی نازک صورتحال میں بھی ریاست کا بے حس وزیر اعلیٰ ترون گوگوئی جاپان کے غیر ملکی دورے پر روانہ ہو جاتا ہے۔ نہتے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اور پھر آسمانی قہر خداوندی کو جب ایک ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو قرآن حکیم میں بیان ہونے والا باغ والوں کا واقعہ یاد آجاتا ہے:

ہم نے اِن کو اُسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا، جب اُنھوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے۔ اور وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے۔ رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی۔ اور اُس کا حال ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔

صبح اُن لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔ کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔ کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے ۔ صبح سویرے جلدی جلدی اِس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل توڑنے پر) قادر ہیں مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے ''ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ نہیں، بلکہ ہم محروم رہ گئے''اُن میں جو سب سے بہتر آدمی تھا اُس نے کہا ''میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟''۔ وہ پکار اٹھے پاک ہے ہمارا رب، واقعی ہم گناہ گار تھے ۔ پھر اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کو انہوں نے کہا ''افسوس ہمارے حال پر، بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں''۔ ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب اِس سے بھی بڑا ہے، کاش یہ لوگ اِس کو جانتے۔

ان باغ والوں کا اصل مسئلہ وہی تھا جو مشرکینِ مکہ کا تھا اور جو بوڈو قبائل کا ہے بلکہ یہی معاملہ سرحد کے اس پار برما کے بودھوں کا بھی ہے۔ان لوگوں نے کسی اور کے باغ سے پھل چرانے کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے باغوں کی جانب روانہ ہوئے تھے۔اس کے باوجود عذابِ الٰہی کے مستحق ٹھہرے۔ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے اللہ رب العزت کی جانب سے عطا کردہ نعمت کو امانت کے بجائے اپنی ملکیت سمجھ لیا تھا۔ کسی شہ کو امانت یا ملکیت سمجھ لینے سے اس چیز کی کیفیت یا کمیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لیکن اس کے حامل انسان میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوجاتا ہے۔ امانت سمجھنے والا شخص کسی صورت اپنے مالک کے سامنے جوابدہی کے احساس سے غافل نہیں ہوتا بلکہ ہر لمحہ چوکنا اور ہوشیار رہتا ہے۔وہ اس حقیقت کا معترف ہوتا ہے کہ جس ہستی نے یہ امانت اس کے سپرد کی ہے اس نے دوسرے انسانوں کا بھی اس میں حق رکھا ہے۔اپنے آپ کو خیانت کے ارتکاب سے محفوظ رکھنے کی خاطر امانتدار شخص وسائل کے تصرف میں اصل مالک کی مرضی کا از حد خیال رکھتا ہے۔

اس کے برعکس جو اپنے آپ کو امین کے بجائے مالک سمجھتا ہے وہ وسائل کے استعمال میں اپنی مرضی کا مختار ہوتا ہے۔جس کو چاہتا ہے دینا چاہتا ہے جسے چاہتا ہے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔نیز وسائل و اقتدار کے حصول میں اپنے

آپ کو کسی اصول و ضابطہ کا پابند نہیں سمجھتا۔ اسی فتنہ نے باغ والوں کو خسارے میں ڈالا اور اسی عذاب میں فی الحال آسام کے اربابِ اقتدار گرفتار ہیں ۔آسام کے چند لوگوں نے ازخود اس بات کا فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اس دھرتی کے مالک ہیں ۔ وہ اس بات کا فیصلہ بھی کرنے لگے ہیں کہ کسے وہاں رہنے کا اختیار ہے اور کسے نہیں ہے ؟آسام کے یہ ظالم لوگ وہاں رہنے اور بسنے والے کمزور لوگوں کو اپنے مادی و سیاسی مفاد کے پیشِ نظر بزورِ قوت ان علاقوں سے نکال باہر کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتے ہیں اور ببانگِ دہل اس کا اعلان کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شبنم سبحانی وہ اپنی حقیقت اور حیثیت سے غافل ہو چکے ہیں اس لئے بنی آدم میں تفریق ڈال رہے ہیں ۔

زمین اللہ کی ہے کون ہو تم روکنے والو؟
بنی آدم میں یہ تفریق کی دیوار کیسی ہے؟
تمہیں کیوں ہند کے پروردہ لوگوں سے یہ نفرت ہے؟
یہ کیوں آسام کی سرحد پہ لا کر ان دھکے دے رہے ہو تم
یہ انساں ہیں انہیں سمجھے ہو چوپایوں کا ریوڑ تم
یہ بادل بھی ہوا کے دوش پر بنگال کی کھاڑی سے آتے ہیں
انہیں بھی روک دوگے تم
یہ برہم پتر بھی دوش ہمالہ سے سرک آئی ہے یوں
جیسے کسی مہوش کا آنچل ہو

اسے بھی حکم دوگے تم کہ یہ آسام کی سرحد پہ رک جائے ؟

اپنی اس نظم میں میں ڈاکٹر صاحب نے بجا طور انسانوں کی خودغرضانہ منافقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ قدرت کی ان نعمتوں کو جو بادل اور دریا کی شکل میں باہر سے آتی ہیں ان کا استقبال کیا جاتا ہے لیکن اپنے جیسے انسان استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسا کرنے والے حیوان بھول جاتے ہیں کہ مشیت کو کسی نعمت کو زحمت بناتے دیر نہیں لگتی اور یہی منظر آسام کی سرزمین پر فی الحال نظر آرہا ہے۔آسمان کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور دریا کی طغیانی نے حدود و قیود کی پابندی کو روند ڈالا ہے۔اپنے حدود و قیود کی پامالی کرنے والے انسان اور یا ندی نالے دونوں ہی تباہی و بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ نعمت کا حصول اور اس سے محرومی دونوں بھی آزمائش ہیں ۔ اس آزمائش کا احساس غافلوں کو اس وقت نہیں ہوتا جبکہ انہیں نعمتوں سے سرفراز کیا جاتا بلکہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ اس سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔قرآنِ حکیم نہ صرف اس کیفیت کو بیان کرتا ہے بلکہ نعمتِ خداوندی سے محرومی کی وجوہات سے بھی آگاہ کرتا ہے :

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور

اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ہر گز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے ۔اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔

آسام کا مسئلہ سب سے پہلے ۱۹۶۰ء میں اٹھا۔اس وقت آسام کی سرکاری ملازمتوں پر بنگالی ہندووں کا قبضہ تھا اور آسام کی سیاست پر مٹھی بھر کانگریسی خوشحال لوگ قابض تھے ۔جب آسام کے متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے یہ صورتحال دیکھی تو انہیں سب سے پہلے بنگالیوں اور کانگریسیوں پر غصہ آیا۔ تحریک کا آغاز تو بنگالی سرکاری ملازمین کے خلاف ہوا لیکن بہت جلد تحریک چلانے والوں کو احساس ہو گیا کہ ان لوگوں کی پشت پر مرکزی حکومت ہے اس لئے ان سے لوہا لینا ناممکن ہے مگر کانگریس کو اقتدار سے ہٹانے کیلئے ایک منفی تحریک ضروری تھی اس لئے بنگالی زبان بولنے والے مسلمانوں کو بنگلہ دیشی قرار دے کر تحریک کا رخ ان کے خلاف موڑ دیا گیا ۔ایسا اسلئے کیا گیا کہ یہ غریب بے یارومددگار لوگ نرم چارہ تھے ۔

بنگلہ دیشیوں کو نکالنے کے بہانے آل آسام اسٹوڈنٹس یونین نے آسام کو آگ اور خون میں جھونک دیا گیا۔ ۱۹۸۳ء کے اندر کانگریس زیرِ اقتدار نیلی کا قتل عام ہوا جس میں لالنگ قبیلے کو نہتے مسلمانوں پر چھوڑ دیا گیا۔ ۳۰۰۰ لوگ اس قتل عام میں جان بحق ہوئے جن میں خواتین اور اور بچوں کی اکثریت تھی لیکن جمہوریت کی دیوی نے اس ظلم کا رتکاب کرنے والوں کو سولی پر چڑھانے کے بجائے اقتدار کے تاج سے نوازہ۔ یہ گجرات سے بڑا ظلم تھا اس لئے کہ اس کی نہ ہی کوئی انکوائری ہوئی اور نہ کسی کو اس کی سزا ملی۔ ۱۵ اگست ۱۹۸۵ء کو راجیو گاندھی نے آسو کے خونخوار درندوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور یہ طہ پایا کہ ۱۹۷۱ء کے بعد ریاست میں آنے والے غیر ملکیوں کی شناخت کرکے انہیں نکال باہر کیا جائیگا۔

اس معاہدے کے بعد آسام گن پریشد نے کانگریس پارٹی کو اقتدار سے محروم کرکے اپنی حکومت قائم کی۔ بی جے پی ریاستی سطح پر اس کی شریک کار رہی اور وہ بھی مرکز میں بی جے پی کے حامی رہے اس کے باوجود ۱۴۰۰ سے زیادہ لوگوں کو ریاست سے نہیں نکالا جاسکا جبکہ دعویٰ یہ کیا جاتا تھا بلکہ اب بھی کہا جاتا ہے کہ آسام کے بیشتر علاقوں میں بنگلہ دیشی داخل ہوگئے ہیں انہوں نے مقامی لوگوں کو ان کے وسائل سے محروم کر دیا ہے اور وہ اس قدر طاقتور ہو گئے ہیں کہ مقامی لوگوں کو ڈرانے دھمکانے لگے ہیں۔ یہی بات نہ صرف بوڈو

رہنما بلکہ اڈوانی جی اور عیسائی مشنری کے راجر گائیکواڈ بھی کہتے ہیں۔
بوڈو لوگ ابتداء میں آسو اور اے جی پی کے ساتھ شریک تھے لیکن جب ان لوگوں نے دیکھا کہ کانگریس اور اے جی پی میں کوئی فرق نہیں ہے تو یہ بغاوت پر آمادہ ہوگئے اور ہندوستان سے علٰحیدہ بوڈو لینڈ کے حصول کی مسلح جدوجہد شروع کردی۔ ایل ٹی ای کے طرز پر بوڈو لبریشن ٹائیگر نے بیرون ممالک سے ہتھیار حاصل کئے اور تخریبی کارروائیوں میں لگ گئے۔ حکومتِ ہند انہیں دہشت گرد قرار دیتی تھی اس کے باوجود حکومت نے ان سے بھی ۱۹۸۳ء میں معاہدہ کرلیا اور چار اضلاع پر مشتمل بوڈو خودمختار کاؤنسل کا قیام عمل میں آگیا۔ ان چار اضلاع میں گوکہ بوڈوآبادی صرف ۲۹ فیصد ہے اور ۷۱ فیصد غیر بوڈو آباد ہیں اس کے باوجود بارہ میں گیارہ اسمبلی حلقۂ انتخاب ان کیلئے مختص کردیئے گئے۔ اس طرح کل تک جو دہشت گرد تھے اب وہ قوم پرست ہوگئے اور انہوں نے ان علاقوں میں صدیوں سے آباد لوگوں کو غیر ملکی قرار دے کر بے دخل کرنا شروع کردیا۔
۲۰۰۶ء کے انتخاب میں بوڈو نیشنل فرنٹ نے ۱۱ نشستوں پر کامیابی حاصل کی کانگریس اکثریت سے محروم تھی اس لئے کانگریس نے ان کا سہارا لیا اور انہیں دو وزارتوں سے نوازہ۔ کانگریس نے اپنی سیاسی مجبوریوں کے باعث ان دہشت

گردوں کو غیر مسلح کرنے سے احتراز کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوڈو ٹائیگرس بندوقوں کے ساتھ گھومتے رہے اور مقامی اکثریت سے روپیہ وصول کرتے رہے انہیں ڈراتے دھمکاتے رہے ۲۰۱۰ء کے انتخاب میں کانگریس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی اور اس کا انحصار بوڈو نیشنل فرنٹ پر سے ختم ہوگیا۔اس کے باوجود اس نے بوڈو جماعت کو اپنی حکومت میں شامل رکھا لیکن وزارت دو کے بجائے ایک کر دی ۔اس انتخاب کے بعد بوڈو نیشنل فرنٹ کی سمجھ میں آگیا کہ آئندہ ایک بھی وزارت نہیں رہے گی اور اگر غیر بوڈو عوام نے کانگریسی بوڈو امیدوار کو ووٹ دینا شروع کر دیا تو ان کی سیاسی بساط الٹ جائیگی اس لئے غیر بوڈو لوگوں کو بنگلہ دیشی قرار دے کر ان اضلاع سے نکال باہر کرنے کی سازش رچی گئی ۔اس کا شکار بھی پھر ایک بار بنگالی زبان بولنے والے مسلمان ہو گئے ۔

آسام کے فتنہ کی جڑ غیر ملکیوں کے حوالے گھڑی کی گئی غلط فہمی میں ہے جسے اعداد و شمار کے الٹ پھیر سے ثابت کیا جاتا ہے ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آسام میں بنگالی بولنے والے مسلمان بستے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ بنگلہ دیشی ہیں؟ یہ مسلمان آسام میں چار سو سال قبل ۱۸۰۰ء کے آس پاس آئے ۔ انگریزوں نے آسام کو ہندوستان کے ساتھ ملحق کرنے کے بعد آسام کے بنجر علاقوں کی باز آبادکاری کی خاطر بنگالی مزدوروں کو یہاں بلایا ۔اس وقت بنگلہ دیش ہندوستان کا حصہ تھا بلکہ آسام کو ایک عرصہ تک انگریزوں نے

بنگال میں ضم کر رکھا تھا۔ اس طرح جس وقت یہ لوگ آسام میں آکر بسے اس وقت وہ نہ غیر ملکی تھے اور نہ غیر ریاستی۔ آزادی سے قبل کانگریس پارٹی نے اپنے کراچی اجلاس میں ایک قرارداد پاس کی تھی اور اس میں یہ کہا گیا تھا پورے ملک تمام شہریوں کو کسی بھی حصہ میں جاکر رہنے بسنے کا حق ہے جو آج بھی دستور ہند کا حصہ ہے۔

بنگلہ دیشی مسلمانوں کی آمد کو ہندوستانی حکومت کی جانب سے کی جانے والی رائے شماری کے اعداد و شمار بھی منہ چڑھاتے ہیں۔ بوڈو علاقہ کا ایک ضلع ڈھبری بنگلہ دیش کی سرحد پر ہے جبکہ میگھالیہ کے پانچ اضلاع سرحد پر واقع ہیں۔ اگر بنگلہ دیش سے مسلمان سرحد پار کرکے آتے تو ان کی آبادی میگھالیہ میں زیادہ ہوتی لیکن ایسا نہیں بلکہ وہاں مسلمان نہیں کے برابر ہیں ۱۹۵۱ سے ۱۹۷۱ تک ڈھبری میں آبادی کا اضافہ تقریباً ۴۴ فیصد تھا جو بعد میں صرف ۲۴ فیصد ہوگیا جبکہ ڈھیما جی اور کربی آنگ لانگ میں یہ اضافہ ۸۰ سے ۱۰۷ فیصد تک تھا۔ ان دونوں اضلاع میں مسلمانوں کا تناسب ۲ فیصد کے آس پاس ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں سرحد پار کرکے آنے والے مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم تھے۔ کوکرا جھار جہاں آج کل ہنگامہ برپا ہے آبادی کا اضافہ ۱۹۹۰ سے ۲۰۰۰ کے بیچ ۱۵ فیصد اور ۲۰۰۱ سے ۲۰۱۱ کے بیچ صرف ۵ فیصد ہے جو آسام کی اوسط شرح آبادی کے اضافہ ۲۱ اور ۱۸ سے کم ہے اس

کا مطلب یہ ہے کہ یہاں فطری اضافے کی بدولت بڑھنے والی آبادی دوسرے علاقوں کی جانب ہجرت کر گئی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈھبری جہاں ۷۴ فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے آسامی زبان بولنے ۷۰ فیصد سے زیادہ ہیں اس کا مطلب یہ ہے ان مسلمانوں کی زبان بنگالی نہیں آسامی ہے۔ بلکہ براک کی وادی جہاں آسامی بولنے والے ا فیصد سے کم ہیں وہاں کوئی شورش نہیں ہے۔ سب سے حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۹۱ کے بعد سے آسام کی آبادی کا اضافہ کا اگر ہندوستان کے اوسط اضافہ سے موازنہ کیا جائے تو وہ ایک فیصد کم ہے۔ اس لئے بنگلہ دیشیوں کی آمد کا جو جھوٹ گھڑا جاتا ہے اسے خود قومی رائے شماری کے اعداد و شمار جھٹلاتے ہیں۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب دیہاتوں میں بسنے والے غریب مسلمان سیلاب وغیرہ کے باعث شہروں کی جھگی جھونپڑی میں آکر بسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور وہاں تعمیری کام میں مزدوری کرنے لگتے ہیں یا پھل و سبزی بیچنے لگتے ہیں تو شہری لوگ انہیں بنگالی زبان اور حلیہ بشرے کے باعث بنگلہ دیشی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ بنگلہ دیش سے نہیں بلکہ آسام ہی کے دیہاتی علاقوں سے شہروں میں آنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ سیاسی لوگ ان کی بنیاد پر اپنی سیاست چمکانے لگتے ہیں۔ فرقہ پرست اپنا الو سیدھا کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے والے ناخلف لوگ قانونِ قدرت سے ٹکراتے ہیں۔ اول تو وہ دوسروں کیلئے عذابِ جان بن

جاتے ہیں اور بالآخر خود قدرتی آفات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کاش کہ یہ لوگ شاعر کی اس نصیحت کو سمجھتے۔

سنو اے ناخلف لوگو بشر بیزار انسانو!
زمیں اللہ کی ہے سارے انساں بھائی ہیں
بنایا ہے محاسب کس نے تم کو کون ہو تم پوچھنے والے
کہ کن ہاتھوں میں ہے آسام کی اسنادِ شہریت
جو قرنوں سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں وہ کیا غیر ملکی ہیں
بہاری ہو کہ بنگالی کہ پنجابی کہ مدراسی
یہ پودے ایک ہی مٹی سے برگ و بار لائے ہیں
انھیں تم لہلہانے مسکرانے گل کھلانے دو
یہی قانونِ قدرت ہے۔

اروند کیجریوال کا پونر جنم

سیاسی سردخانے میں بھیجی جانے والی لاشیں عام طور پر واپس نہیں آتیں لیکن کبھی کبھار حالات ایسا پلٹا کھاتے ہیں کہ چمتکار ہونے لگتا ہے۔ ایمر جنسی نے جئے پرکاش نارائن کو زندہ کردیا تھا اور اب اروند کیجریوال خودکشی کی ایک کامیاب کوشش کے بعد پھر سے زندہ ہوگئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے اس پونر جنم میں اروند نے ماضی غلطیوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔سب سے اولین سبق تو یہ ہے کہ کسی پر (بشمول انا ہزارے) بیجا انحصار نہ کیا جائے بلکہ اپنے بل بوتے پر تحریک چلائی جائے۔ سنگھ پریوار کی بے جا حمایت نہ کی جائے یعنی کانگریس کے ساتھ ساتھ بی جے پی کو بھی تنقید کانشانہ بنایا جائے اور تیسرے دانشوروں کے بجائے عام آدمی کو ساتھ لینے کی کوشش کی جائے سِول سوسائٹی پر اکتفا کرنے کے بجائے غیر مہذب عوام کو بھی اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی جائے۔

اس سے پہلے اروند کیجریوال نے ٹیم انا کے توسط سے بدعنوانی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور لوک پال بل کو اس حل بنا کر پیش کیا لیکن کانگریس و بی جے پی نے مل کر انہیں اس مقصد میں ناکامی کی گہری کھائی میں ڈھکیل دیا اور سیاسی اکھاڑے میں اتر کر مقابلہ آرائی کی دعوت دی۔ سیاسی جماعتوں کو یہ

توقع تھی کہ یا تو کیجریوال اس گندے تالاب میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں کریں گے اور اگر وہ آ گئے تو پھر آؤ دیکھے بغیر کود پڑے تو ڈوب مریں گے۔اروند کیجریوال نے اپنے مخالفین کو ان دونوں محاذ پر مایوس کیا۔وہ سیاسی میدان میں تو اترے لیکن اس بار انہوں نے اپنی ہانڈی پریشر کوکر کے بجائے ہلکی آنچ پر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جان گئے ہیں کہ لمبی ریس میں کامیابی کے لئے دھیمے دھیمے مگر مسلسل دوڑتے رہنا ضروری ہے۔ کوئلہ گھوٹالا، بجلی کے نرخ میں اضافہ، رابرٹ وڈرا، سلمان خورشید اور نتن گڈکری کے خلاف یکے بعد دیگر کھولے جانے والے محاذ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اب اروند کیجریوال کو کوئی جلدی نہیں ہے۔ان کی جدید تحریک ہندوستانی معاشرے کے سلگتے ہوئے مسائل مثلاً مہنگائی ، بدعنوانی اور اقرباپروری کے اطراف گردش کرتی ہے۔

مہنگائی وطنِ عزیز کا وہ مسئلہ ہے جس نے غریب عوام کے ساتھ ساتھ متوسط طبقہ کی بھی نیند حرام کردی ہے۔اس ماہ مہنگائی کی شرح میں اضافہ نے گزشتہ کئی سال کا ریکارڈ توڑ دیا۔ویسے چدمبرم کے دوبارہ وزیر مالیات بن جانے پر سرمایہ کاروں نے جس مسرت کا اظہار کیا تھا اس سے توقع یہی تھی کہ عوام کے استحصال میں اضافہ ہوگا جس کے نتیجہ میں مہنگائی بڑھے گی ۔ عوام بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مہنگائی کے بڑھنے کی ایک اہم وجہ بدعنوانی ہے اس لئے جب اروند کیجریوال یہ کہتے ہیں کہ عوام بجلی کا اضافی بل ادا کرنے سے انکار

کر دیں تو یہ عوام کو اپنے دل کی بات لگتی ہے۔ بی جے پی کو چند دنوں کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ انہیں بھی یہی بات دوہرانی چاہئے لیکن اس وقت تک کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے ۔ بدعنوانی کے خلاف جدو جہد میں جب تک بڑے نام نہ ہوں ذرائع ابلاغ اور عوام دونوں اس کی جانب توجہ نہیں دیتے ۔ مثلاً کوئلہ بدعنوانی میں وزیر اعظم کا ملوث ہونا یا ڈی ایل ایف کے ساتھ رابرٹ وڈرا کی سودے بازی ۔ اگر رابرٹ سونیاگاندھی کے بجائے ہریانہ کے وزیرِ محصول کے داماد ہوتے تو اس معاملہ کو اس قدر شہرت حاصل نہ ہوتی ۔اگر سلمان خورشید مرکزی حکومت میں وزیر قانون ہونے کے بجائے اترپردیش کانگریس کے صدر ہوتے تو ان کے خلاف ۷۱ لاکھ کی بدعنوانی کسی شمار قطار میں نہ آتی۔ مشہور و معروف لوگوں کی اقرباپروری مثلاًرابرٹ یا لوئیسہ کے خلاف کھولا جانے والا محاذ میڈیا میں کشش کا باعث بنتا ہےاور لوک پال کی ضرورت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ آخری دلیل یہی سامنے آتی ہے کہ سیاسی مجرموں کے سزا سے بچ نکلنے کی بنیادی وجہ غیر جانبدار تفتیشی ادارے کی غیر موجودگی ہے اور اسی خلاء کو پر کرنے کیلئے جن لوک پال ضرورت ہے ۔ اروند کیجریوال اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے شور شرابے سے نہ ہی بدعنوانی پر لگام لگے گی اور نہ جن لوک پال بل پاس ہو گا لیکن خبروں میں رہنے کیلئے بدعنوانیوں کا بھانڈا پھوڑتے رہنے سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے ۔اروند کیجریوال کسی مسئلہ کو اٹھا

کر اس کے انجام تک پہنچانے میں دلچسپی نہیں رکھتے اس لئے کہ وہ جانتے ہیں عوام کی دلچسپی کو زیادہ دنوں تک کسی ایک معاملے کے ساتھ منسلک رکھنا ناممکن ہے۔

ہندوستانی نفسیات میں مستقل مزاجی کی فقدان ہے۔ عام ہندوستانی جلد نتائج کا خواہش مند ہوتا ہے بصورتِ دیگر مایوس ہوجاتا ہے۔ اس لئے کسی معاملے کو وہ طول نہیں دیتے۔ کوئلہ گھوٹالہ میں وزیر اعظم کے استعفی کا مطالبہ کیا نہیں ملا تو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ رابرٹ وڈرا پر ہنگامہ ہوا جتنا کچھ شور ہو سکتا تھا کیا جب لوگ بور ہونے لگے تو سلمان پر نشانہ سادھا اور اس کے بعد نتن گڈکری کی جانب بڑھ گئے۔ چونکہ میڈیا تنوع چاہتا ہے لوگ تفریح کیلئے یہ سب دیکھتے ہیں اس لئے سابقہ ناکامی کو یاد نہیں رکھتے جاری کشمکش سے بہت اوب جاتے ہیں۔

سیاست کے بازار میں بھی جو دکھتا ہے وہ بکتا ہے کا اصول کارفرما ہوتا ہے خاص طور پر شہروں کے متوسط طبقہ میں جن کی سوچ ذات برادری کے بندھن سے کسی نا کسی حد تک آزاد ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد سے زراعت کا شعبہ روبہ زوال رہا جس کے باعث عوام کی شہروں کی جانب ہجرت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ۔گلوبلائزیشن کے بعد اس عمل میں تیزی آئی جس کے نتیجہ میں شہروں کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہوگیا۔ اروند کیجریوال کی نظر فی الحال اسی طبقہ پر ہے۔ بدقسمتی سے بھارتیہ جنتا پارٹی کا اثرورسوخ اسی شہری

طبقہ تک محدود ہے۔ دیہاتوں میں اس جماعت نے اپنے حلیفوں کی مدد سے یا جذباتی ایشوز جیسے رام مندر وغیرہ کے توسط سے جو اثرات قائم کئے وہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ بی جے پی کے سارے حلیف تیسرے محاذ کے بنتے ہی بغاوت پر اتر آتے ہیں اور اس لئے کہ علاقائی سطح پر بی جے پی ان کی محتاج ہے۔ اڑیسہ میں پٹنائک کے بعد بہار کے نتیش کمار کی نیت بھی فی الحال ڈانواڈول ہے۔ایسے میں اروند کیجریوال کا بی جے پی کے خلاف محاذ کھولنا دراصل سیدھے سیدھے اس کے ووٹ بنک پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔
نتن گڈکری کے خلاف جو الزامات لگائے گئے وہ اس لحاظ سے سنگین نوعیت کے ہیں نتن نہ صرف بی جے پی صدر ہیں بلکہ آر ایس ایس کے آشیرواد سے صدارت کی کرسی پر فائز ہوئے ہیں۔اس لئے سنگھ کے ترجمان رام مادھو نتن گڈکری کی حمایت میں کوئی تاخیر نہیں کی۔رابرٹ وڈرا کا کانگریس پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے میں کوئی اہم مقام نہیں ہے۔ سلمان کا استعفیٰ لے کر معاملہ ختم کیا جاسکتا ہے لیکن گڈکری کا معاملہ اس قدر آسانی کے ساتھ سلجھ نہیں سکتا۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب بی جے پی کی شناخت واجپائی اور اڈوانی سے تھی۔ اس وقت بنگارو لکشمن کے استعفیٰ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا لیکن فی الحال کوئی ایسا قدآور رہنمابی جے پی میں نہیں ہے۔ اڈوانی کے پر خود سنگھ پریوار نے کتر دیئے ہیں اور ان کی قوت پرواز ختم ہو چکی ہے۔ ایسے میں پارٹی کے صدر نتن

:گڈکری پر لگائے جانے والے الزامات کی اہمیت.ڑھ جاتی ہے جو اس طرح ہیں

نتن گڈکری ایک سیاستداں کم اور بیوپاری زیادہ ہیں ○

ان کی ذاتی ملکیت میں گزشتہ سالوں کے اندر بے شمار اضافہ ہوا ○

اپنی خوشحالی میں اضافہ کیلئے انھوں نے صدر کی حیثیت سے اپنے رسوخ کا استعمال کیا ○

ہے

گڈکری کے تجارتی مفادات کسانوں سے ٹکراتے ہیں ○

انھوں نے کسانوں کی ۱۰۰ ایکڑ زمین ہڑپ لی ہے ○

حکومتِ مہاراشٹر نے سینچائی کے منصوبے کی خاطر کسانوں سے زائد از ضروری زمین لی ○

اور

اور سنیچائی کا پانی کسانوں کو دینے کے بجائے گڈکری جیسے صنعتکاروں کو مہیا کیا ○

سرکاری مراعات کے حصول کی خاطر نتن گڈکری نے.بر سر اقتدار این سی پی کے ○

ساتھ سانٹھ گانٹھ کی

مہاراشٹر میں سینچائی منصوبوں میں ہونے والی بدعنوانی سے انکار ناممکن ہے اس لئے کہ ۷۰ ہزار کروڑ کے اس گھوٹالے سے خود شرد پوار بھی اپنے بھتیجے اجیت پوار کو نہ بچا سکے اور انہیں بے آبرو کرکے چھٹکارا حاصل کیا۔ اب ایکت پوار جیسے بدعنوان سیاستداں کے ساتھ جس کی سانٹھ گانٹھ ہو وہ بدعنوان نہ ہو

یہ کیونکر ممکن ہے۔ نتن گڈکری آرٹی آئی کارکن ڈاکٹرانجلی دامنیا کو عدالت میں جانے سے روکنے کی

کوشش کی اور ان کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ وہ شرد پوار کے بزنس پارٹنر ہیں۔

نتن گڈکری نے حسبِ توقع ان الزامات کو بے بنیاد قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ وہ ودربھ کے کسانوں کی فلاح بہبود کیلئے کام کررہے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے ان کی تمامتر کوششوں کے باوجود پچھلے دس سالوں اس علاقہ کے ہزاروں کسان خودکشی کرچکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔اس معاملے میں سب سے سنگین الزام یہ ہے کہ کسانوں کی بازآبادکاری کیلئے جو کثیر رقم مرکزی حکومت کی جانب سے فراہم کی جاتی ہے اسے بھی یہ سیاسی بچولئے آپس میں بانٹ کر کھاجاتے ہیں۔انڈیا اگینسٹ کرپشن کی اس مہم نے ایک جانب تو یہ ثابت کیا کہ کانگریس اور بی جے پی نہ صرف یکساں طور پر بدعنوان ہیں بلکہ لوٹ کھسوٹ کے اس گورکھ دھندے میں ایک دوسرے کے معاون ومددگار بھی ہیں۔ نتن گڈکری کا دفاع جس طرح سشما اور ارون جیٹلی نے کیا اس نے بھی کانگریسی ترجمانوں کی یاد تازہ کردی۔کل تک جو لوگ اروند کیجریوال کے الزامات کی بنیاد پر کانگریس کو کٹھہرے میں کھڑا کرتے تھے اب خود اروند کو کانگریس کا ایجنٹ قرار دے رہے ہیں۔

بی جے پی کے ترجمان نے پچھلے دنوں اروند کیجریوال کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا وہ ایک فیوزڈ بلب ہے لیکن جب کیجریوال نے نتن گڈکری کو نشانہ بنایا تو

بی جے پی لائٹ گل ہو گئی اور بی جے پی والوں کو دن میں تارے نظر آنے لگے ۔ یہ بیہ کہا گیا تھا کہ وہ ایک سماجی کارکن ہیں سیاسی رہنما نہیں ہیں اب نوبت یہ آئی کہ بی جے پی کے صدر کو اپنی صفائی میں یہ کہنا پڑا کہ میں ایک سیاسی کارکن ہوں جو عوام کی فلاح و بہبود کیلئے کام کر رہا ہوں ۔ کیجریوال پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ وہ ودیشی تعاون سے سودیشی تحریک چلا رہے ہیں لیکن سودیشی کسانوں کے منہ کا نوالہ چھین کر اپنا پیٹ پھلانے سے تو بہتر ہے کہ ان پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر ان کو استحصال سے بچانے کی جدو جہد کی جائے ۔

ارون جیٹلی چونکہ سلمان خورشید ہی کی مانند پیشہ سے وکیل ہیں اس لئے ان دونوں کے لب و لہجہ میں پائی جانے والی تلخی کے اندر غیر معمولی مشابہت دیکھنے کو ملی۔ اس طرح بی جے پی نے خود ثابت کر دیا کہ اس میں اور کانگریس میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے ۔ اب سوچنے والی بات یہ بھی ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں ہزار اختلاف کے باوجود وہ کون سی شہ مشترک ہے جس نے انہیں ایک دوسرے کا معاون اور مددگار بنا دیا ؟ اس سوال کا آسان ترین جواب ہے سیکولر جمہوریت۔ یہی وہ مشترک قدر ہے جس کی علمبردار یہ دونوں جماعتیں ہیں اور اس سیاسی نظام نے سبھی سیاسی جماعتوں کو بدعنوانی کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ اسی لئے الکشن کمیشن ہر سیاسی جماعت کے اندر یہ ضرور جانچ لیتا ہے کہ آیا

اس نے لامذہبیت کا کلمہ پڑھایا نہیں۔ دیگر معاملات میں مصالحت برداشت کی جاتی لیکن اگرکیا سیاسی جماعت اپنے دستور میں سیکولر جمہوریت پر یقین کا اظہار نہیں کیا تو انتخابی کمیشن کے رجسٹر میں اندراج نہیں ہو پاتا ہے۔

رابرٹ وڈرا کا معاملہ سلمان خورشید کی بنسبت خاصہ سنگین تھا اس کے باوجود جلد دب گیا اس کی وجہ یہ تھی کانگریسیوں نے جلد ہی اسے نظرانداز کرنا شروع کردیا وہ تو راجیش کھیمکا کے تبادلے نے اس میں نئی جان ڈال دی ورنہ وہ پوری طرح دم توڑ چکا تھا۔ سلما ن خورشید کے معاملے بنی پرساد ورما جیسے احمق حمایتی اور سلمان خورشید کی جذباتیت نے اسے رکھا۔ بنی پرساد ورما کا یہ کہنا اگر یہ ۷۰ کروڑ ہوتا تو ہم اسے قابلِ اعتناء سمجھتے کسی مرکزی وزیر کیلئے ۷۱ لاکھ بہت کم ہے نہایت شرمناک ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدعنوانی کی قباحت ہمارے سیاسی نظام میں بالکل ختم ہوچکی ہے۔ بنی پرساد ورما کا کیجریوال کو دیا جانے والا مخلصانہ مشورہ کہ روز روز کا بھونکنا نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ لوگ عادی ہو جاتے ہیں اس لئے بہتر ہے شیر کی طرح ایک بار گرجا جائے،اہمیت کا حامل ضرور ہے لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی عوام تمام گرج۔برس کو بہت جلد بھول جاتی ہے نیز اگر سُر بدل بدل کر بار بار بھونکا جائے تو وہ اس پر کان دھرتی ہے۔ بنی پرساد ورما اس گر سے واقف نہیں ہیں

مگر کیجریوال اسے خوب جانتے ہیں۔

سلمان خورشید کا بدعنوانی کے الزامات پر تیوری چڑھانا۔ ڈرانا دھمکانا اور بوکھلاہٹ کا شکار ہونا چور کی داڑھی میں تنکا کے مترادف ہے۔ایسا لگتا ہے کہ کانگریس نے اجیت پوار کی مانند ان کی بلی چڑھانے کا فیصلہ کرلیا ہے اس لئے ان کی حماقتوں میں روز بروز اضافہ ہورہاہے۔ سلمان خورشید کا ٹی وی کیمرے کے سامنے یہ کہنا کہ کیجریوال فیروز آباد آنے کی جرأت نہ کریں اور اگر وہ آتے ہیں تو واپس نہ جاسکیں گے کسی وزیر قانون تو کجا مافیا ڈان کے بھی شایانِ شان نہیں ہے لیکن جب انسان کا برا وقت آتا ہے تو اس کی عقل ماری جاتی ہے اور ایسا ہی کچھ فی الحال سلمان خورشید کے ساتھ ہو رہا ہے۔ سلمان خورشید نے برسوں کی محنت سے جو اپنی شریفانہ شبیہ بنائی تھی اسے وہ اپنی حماقتوں سے از خود سربازار نیلام کر رہے ہیں۔

سلمان خورشید کے معاملے میں سب فرضی ہے۔حکومت سے مدد حاصل کرنے کی خاطر کی جانے والی درخواست پر فرضی دستخط۔امدادی کیمپوں کی فہرست میں ایسے فرضی مقامات کے نام جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ معذوروں کی فہرست میں ایسے نام ہیں جن کا انتقال کیمپ کے انعقاد سے قبل ہو چکا ایسے بھی ہیں جو سرے سے معذور ہی نہیں ہیں اور ایسے معذوروں کے نام جومذکورہ آلات سے ہنوز محروم

ہیں ۔ وہ تو اچھا ہی ہے کہ بیچارے محروم ہیں ورنہ اس فرضی مایا جال میں جو نقلی آلات انہیں ملتے ان سے رہی سہی قوتِ سماعت یا بصارت بھی جاتی رہتی ۔ ایسا لگتا ہے اس فرضی فلاح و بہبود کے علمبردار جمہوری نظام نے عوام و خواص کی ساری بصارت اور بصیرت ان سے چھین لی ہے۔اس لئے وطنِ عزیز میں فی الحال کیا فرضی نہیں ہوتا۔فرضی دہشت گرد ایجاد کئے جاتے ہیں۔ فرضی دھماکے کرائے جاتے ہیں۔ فرضی ملزمین کو گرفتار کرکے ان کے خلاف فرضی چارج شیٹ داخل کی جاتی ہے ۔ ذرائع ابلاغ سے فرضی کہانیاں نشر ہوتی ہیں۔ فرضی گواہ پیش کئے جاتے ہیں اور فرضی انکاؤنٹر میں معصوم لوگوں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے ۔جہاں لوگوں کی جان سے فرضی بنیادوں پر کھیلا جاتا ہو وہاں فرضی گھوٹالوں کی بھلا کیا اہمیت ؟ کاش کے اروند کیجریوال فرضی بدعنوانیوں کے ساتھ فرضی انکاؤنٹر بھی نظر آتے لیکن اس میں بھلا کسی سیاسی جماعت کا بھلا کیا فائدہ ہے ؟

(بی جے پی: شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں (قسط اول

بھارتیہ جنتا پارٹی نے جب رام کے نام پر سارے ملک میں نفرت و عناد کا زہر گھول دیا تھا اور فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے تو کچھ لوگوں نے اس جماعت کا نام بھارتیہ جھگڑا پارٹی رکھ چھوڑا تھا بلکہ کچھ لوگ اسے بھارت جلاؤ پارٹی کہہ کر بھی پکارنے لگے تھے لیکن نتن گڈکری پر بدعنوانی کے پے درپے الزامات کے بعد پوری جماعت کا ان کی حمایت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانا اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ اب اس کا نام بدل کر بھرشٹ (بدعنوان) جنتا پارٹی رکھ دیا جائے۔ نتن گڈکری اپنے بول بچن کیلئے کافی مشہور ہیں انہوں نے کانگریس کو منیؔ سے زیادہ بدنام کہہ کر ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ سنگھ پریوار بھی ان کی بڑبڑ سے نالاں تھا۔ بدعنوانی کے تازہ الزامات کے بعد بڑبڑ کو ان کے نام میں شامل کرکے انہیں گڈکری کے بجائے گڑبڑ کری کے نام سے پکارنا زیادہ بہتر ہے۔ ویسے بی جے پی رہنماوں پر بدعنوانی کا الزام کوئی نیا نہیں ہے۔ اس جماعت کے سابق صدور اڈوانی اور بنگارو پر بدعنوانی کے الزامات لگ چکے ہیں۔ اس وقت وہ ازخود ہٹ گئے تھے یا پارٹی نے انہیں چلتا کر دیا تھا لیکن اس بار صورتحال مختلف ہے نہ گڈکری ہٹنے کا نام لے رہے ہیں اور نہ کوئی انہیں ہٹانے کی بات کر رہا ہے سوائے بی جے پی رکن پارلیمان رام جیٹھ ملانی کے لیکن

تنظیم میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس لئے انکی پذیرائی ذرائع ابلاغ تک محدود ہے۔
بھارتیہ جنتا پارٹی کی روحانی پیشوا آر ایس ایس کو بھی اب اپنے نام میں ترمیم کرکے بی ایس ایس یعنی بھرشٹا چار سیوک سنگھ کردینا چاہئے اس لئے کہ فی الحال وہ راشٹر کی خدمت کرنے کے بجائے بی جے پی کے بدعنوان رہنماوں کو کلین چٹ دینے میں مصروف ہے۔دسہرہ کے موقع ممبئی میں ہندوہردیہ سمراٹ بال ٹھاکرے نے کلین چٹس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ایسا لگتا ہے کہ یہ ملک ’’نیشن آف چیٹرس‘‘ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ویسے بال ٹھاکرے نے کانگریسیوں کو نشانہ بنایا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان چیٹرس میں زعفرانی اورترنگی برابر کے شریک ہیں بلکہ اب تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی آپس میں ملی بھگت ہو گئی ہے اور دونوں مل کر قومی خزانے کو لوٹ رہے ہیں۔ نتن گڈکری نے آرٹی آئی کارکن ڈاکٹر انجلی دامنیا کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ ہم چار کام ان کے کرتے ہیں اور وہ چار کام ہمارے کرتے ہیں اس لئے اس معاملے کو آگے نہ بڑھایا جائے۔
دیوالی کے بعد دسہرہ ہندووں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔آر ایس ایس کی جانب سے اس موقع پر ملک بھر میں جلسہ جلوس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ناگپور میں سر

سنگھ چالک قوم سے خطاب فرماتے ہیں لیکن اس بار رنگ میں بھنگ ڈالنے کا کام شری موہن بھاگوت کے منظورِ نظر نتن گڈکری نے کیا جو سفید قمیض ،خاکی نیکر اور کالی ٹوپی پہن کر جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ان کی موجودگی نے کانگریس کے خلاف چلنے والی بدعنوانی کی تلوار کو کند کردیا۔ موہن بھاگوت بدعنوانی کے خلاف گرجے برسے تو ضرور لیکن کسی کا نام نہ لے سکے بعد میں جب اخبار نویسوں نے نتن سے متعلق سوال کیا تو وہ بولے میں نے عمومی باتیں کہہ دی ہیں تفصیل کیلئے آپ لوگ سنگھ کے ترجمان منموہن ویدیہ سے رابطہ کریں۔ کسی نظریاتی تحریک کے سربراہ کا ایک ایسے سوال سے نظریں چرانا جس پر ساری قوم کی نظریں لگی ہوئی ہیں نہایت شرمناک بات ہے۔ یہ سنگھ پریوار کے داخلی کھوکھلے پن کا زندہ ثبوت ہے۔منموہن ویدیہ کا جواب بھی نہایت دلچسپ تھا انہوں نے کہا یہ بی جے پی کا داخلی معاملہ ہےاور نتن گڈکری اس بابت پارٹی کے اندر وضاحت کریں گے ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بدعنوانی بھی کسی سیاسی جماعت کا داخلی معاملہ ہوسکتی ہے ؟اور اگر یہ صحیح ہے تو اس جماعت کا کیا جس کا ظاہر و باطن بدعنوانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ نتن گڈکری خود ذرائع ابلاغ سے نظریں بچا کر بھاگنا اس بات کا غماز ہے کہ ہے اب ان میں عوام کے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہے۔ صحافیوں نے جب انہیں پکڑلیاتو وہ بگڑ کر بولے اب بہت ہوچکا میں اپنے موقف کی وضاحت کر چکا ہوں ۔

نتن گڈکری پر جب پہلی مرتبہ انجلی دامنیا اور اروند کیجریوال نے الزامات

لگائے گئے تھے تو بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ انہوں نے از خود پریس کانفرنس بلا کر اپنی صفائی پیش کی تھی اور اپنے آپ کو ہر طرح کی تفتیش کیلئے پیش کیا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی پوری طرح اپنے رہنما کے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی اور ان لوگوں ں نے اروند کیجریوال کو کانگریس کا ایجنٹ تک قرار دے دیا تھا۔ بی جے پی نے اس کے بعد ایک منفرد حکمتِ عملی اختیار کی۔ انہیں پتہ تھا کہ جب تک میڈیا کو کسی اور کام میں مصروف نہیں کیا جاتااس وقت کوئی صفائی کام نہیں آئے گی اور نتن کا معاملہ اچھلتا رہے گا اس لئے سابق آئی پی ایس افسر وائی پی سنگھ کو پریس کانفرنس لینے کیلئے میدان میں اتارا گیا جنہوں نے کانگریس کے بجائے اسکی حلیف جماعت این سی پی کے شرد پوار پر الزامات کی بھرمار کردی۔میڈیا کو اس میں الجھا کر نتن کی پردہ پوشی کی گئی۔

یہ حربہ دیر تک کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ ٹائمز آف انڈیا والے نتن گڈکری کے خلاف تحقیقات میں مصروف رہے اور ان لوگوں نے لرزہ خیز انکشافات کئے۔ نتن گڈکری کو آئی آر بی نامی کمپنی نے بلا ضمانت ۱۶۴ کروڑ کا قرض دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا سیاستدانوں پر اعتبار نہ بھی ہو تو سرمایہ داروں کا زبردست اعتماد انہیں حاصل ہے اور یہ اعتماد اقتدار سے محرومی کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔اس لئے کہ اگر کوئی سیاستداں بارسوخ ہو تو وہ سرمایہ داروں کے وارے نیارے کرتا رہتا ہے۔ یہی باہمی اشتراک و تعاون بدعنوانی کی اصل بنیاد

ہے ۔بی جے پی یہ کہہ رہی ہے کہ آئی آر بی نے نتن گڈکری کو اس زمانے میں قرض دیا جبکہ وہ وزیر نہیں تھے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب وہ عوامی تعمیراتی شعبہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ)کے وزیر تھے اس وقت انھوں نے آئی آر بی کو مختلف ٹھیکہ) دلوائے تھے ۔اب جو رقم اس نجی کمپنی نے نتن گڈکری کو قرض کے طور پر دی تھی وہ قرض تھی یا رشوت اس کا پتہ لگانا ضروری ہے اس لئے کہ قرض دیتے وقت آر بی آئی کی کل میراث بہت قلیل تھی ۔ اس کمپنی کے مالک کا بیان ہے کہ میں نے یہ رقم اپنے ذاتی خزانے سے دی ۔آئی آر بی کمپنی کا مالک دتاتریہ مھسکر کوئی پشتینی ساہوکار نہیں ہے بلکہ وہ ایک معمولی سیول انجنیر تھا۔اس نے نتن گڈکری کے آشیر واد سے اپنا تجارتی ادارہ شروع کیا تھا۔اس کی ذاتی تجوری میں اس قدر خطیر رقم کہاں سے آئی یہ سوال بحث کا موضوع بن گیا ہے ۔ تفتیش اس زاویہ سے بھی ہو رہی ہے کہ آیا وہ روپیہ مھسکر کا تھا یا خود نتن گڈکری کا کالا دھن تھا جس پر قرض کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔

موہن بھاگوت نے اپنی دسہرہ کی تقریر میں کہا کہ میڈیا صرف منفی باتوں پر توجہ دیتا ہے جبکہ ایک غلط کے مقابلہ دس صحیح کام ہوتے ہیں ۔ ذرائع ابلاغ جب تک بی جے پی کے علاوہ دیگر جماعتوں خاص طور پر کانگریس کے پول کھولتا رہا سنگھ پریوار کو اس کی اس کمزوری کا احساس نہیں ہوا بلکہ وہ اس سے فائدہ

اٹھاتا رہا لیکن جب توپ کا رخ بی جے پی کی جانب ہوا تو سر سنگھ چالک خواب سے بیدار ہوئے۔ رابرٹ وڈرا کانگریسی صدر سونیا گاندھی کے داماد ضرور ہیں مگران کا سیاست اور جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے باوجود اس کے خلاف لگائے جانے والے الزامات پر بی جے پی والے بلیوں کی مانند اچھل رہے تھے جبکہ اپنے صدر کی حمایت میں کہہ رہے ہیں کہ کسی شخص کو صفائی کا موقع دیئے بغیر موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں ہے۔ وطنِ عزیز میں مسلمانوں کو محض الزام کی بنیاد پر نہ صرف دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا جاتا اس وقت کوئی نہیں کہتا کہ محض الزامات کی بنیاد پر کسی کو مجرم قرار دینا غلط ہے۔

موہن بھاگوت نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ دولت کہاں سے آئی یہ دیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جانا چاہئے کہ اس کا استعمال کن کاموں میں ہوا ہے۔یعنی اگر کوئی رشوت کی دولت سے عوامی فلاح و بہبود کے کام کرے تو اس کی بدعنوانی کو ایک خوشنما چادر سے ڈھانپ دیا جائے گا۔ نتن گڈکری نے غالباً اسی خیال کے تحت ذرائع ابلاغ کے سامنے فخر یہ کہا تھا انہوں نے کسانوں کو اپنی آمدنی بڑھانے کیلئے اناج کے بجائے گنا پیدا کرنے کی تلقین کی۔انہیں کم قیمت پر اچھے بیج فراہم کئے۔ زمین چھن جانے کے باوجود کسانوں کا اپنی زمین پر زراعت کرنے کی اجازت دی۔ صنعتوں کو قائم کرکے روزگار کے

مواقع پیدا کئے نیز خوشحالی میں اضافہ کیا لیکن ان حسین دعووں کے پس پردہ جو گل کھلائے گئے اسے ٹائمز نے طشت از بام کر دیا۔

نتن گڈکری کی کمپنی کے ڈائرکٹرس میں ان کے ڈرائیور پنسے اور سریش اٹرام، بیکری ملازم راجیش خانزودے، سبزی فروش وشال کیداری، پیون سدھاکر مڈکے اور جیوتش وشنو شرما کا نام کس بات کی نشاندہی کرتا ہے ؟ کیا کوئی شخص کروڑوں کی کمپنی کا حصہ دار ہو اور پھر بھی ڈرائیور رکھنے کے بجائے خود دوسرے کی گاڑی چلانے پر قانع ہو یہ ممکن ہے ؟ اگر نہیں ہوتا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ اصلی حصہ دار ہے یا بس ان کا فرضی نام لکھ دیا گیا ہے اور اصلی مالک کوئی اور ہے ؟ نیز اصلی مالک نے ان لوگوں کا نام کیوں استعمال کیا ؟ اگر اس نے یہ سب اپنی کالی دولت کو چھپانے یا ٹیکس بچانے کیلئے کیا تو کیا یہ معاشی بدعنوانی کی بدترین شکل نہیں ہے ؟ اگرچہ کوئی عام سرمایہ دار اس جرم کا مرتکب ہو تو اسے جیل جانا ہوگا یہ اور بات ہے کہ وہ جیل میں بھی عیش کرے گا لیکن اگر وہ کوئی بڑا سیاستداں ہو تو اسے جیل جانے کی بھی زحمت نہیں کرنی پڑے گی بلکہ اس کے ارد گرد تحقیق و تفتیش کا ایک ایسا مایا جال بُنا جائیگا جو بالآخر اسے بدعنوانی کے سارے الزامات سے بچالے گا۔

نتن گڈکری یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ انہوں نے عام لوگوں کو اپنے ادارے

کا ڈائرکٹر بنا کر خوشحال بنا کر ان پر احسان کیا اس لئے کہ انہیں پتہ تک نہیں کہ کاغذ پر ان کی حیثیت کیا ہے ؟ وہ تو بیچارے وہی ہیں جو حقیقت میں ہیں ۔ مسئلہ صرف اس حد تک نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کے فرضی نام لکھ کر ان کے نام پر اپنی ناجائز دولت کو چھپایا گیا بلکہ ان لوگوں کے نام پر ملکیت بھی خریدی گئی ۔ انہیں فرضی قرض دیا گیا۔ پونے شہر کا ایک سبزی فروش جس کی ماہانہ آمدنی دس ہزار روپے ہے ممبئی میں ۶۰ لاکھ روپئے کا مکان خرید لیتا ہے اور اس کیلئے قرض دینے کا کام نتن گڈکری اور ان کے پارٹنر اجئے سنشیتی کرتے ہیں ۔ قرض بغیر کسی ضمانت کے دے دیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی جاتی ہے کہ قرض نہ ادا کرنے کی صورت میں مکان قرضدار کے حوالے کر دیا جائیگا ۔ اب ظاہر ہے یہ قرض ادا نہیں ہوگا اور مکان بہر صورت سرمایہ کار کا ہو جائیگا ۔ سدھا کر مڈکے اور سریش اڑام کو اس کارستانی کا پتہ اس وقت چلا جب آدرش گھوٹالا کی تفتیش میں انہیں طلب کیا گیا ۔

آدرش گھوٹالے کو لے کر بی جے پی نے اس قدر ہنگامہ کیا تھا کہ کانگریس کو اپنے وزیر اعلیٰ اشوک چوہان کو بے آبرو کرکے رخصت کرنا پڑا ۔ بی جے پی والے اس معاملے میں مرکزی وزیر ولاس راؤ دیشمکھ کو بھی پریشان کرتے رہے لیکن کانگریس نے کبھی پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ آدرش سوسائٹی میں بی جے پی صدر اور ان کے رکن پارلیمان کے بے نامی فلیٹ بھی ہیں ۔ کیا بی جے پی والوں

کا فوجیوں کی خاطر تعمیر کی جانے والی عمارت کے مکان خریدنا۔ کانگریس کو اس مسئلہ پر گھیرنا اور اس کے باوجود کانگریس کے ذریعہ بی جے پی کی بدعنوانی کی پردہ پوشی کرنا اس حقیقت کا غماز نہیں ہے کہ بدعنوانی کے معاملے میں کانگریس اور بی جے پی دونوں ایک دوسرے کے شریک کار ہیں۔ جب یہ مجبور ہوتے ہیں تو سیاسی مفادات حاصل کرنے کی غرض ایک دوسرے پر تنقید کرتے ضرور ہیں لیکن بالآخر اندر رہی اندر ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں۔

ہندوتواوادی جب مصیبت میں گھِر جاتے ہیں تو انہیں گاندھی جی کی یاد آتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب یہ لوگ غم واندوہ کے سمندر میں ڈوب گئے تو انہیں گاندھی جی کی بہت یاد آئی اور انھوں نے گاندھی جی کا قتل کرکے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ بھارتیہ جن سنگھ کو پہلی بار جنتا پارٹی کے زمانے میں اقتدار نصیب ہوا اور اس کے بعد دوہری رکنیت کے مسئلہ پر وہ چھن گیا تب بھی وہ بہت غمگین ہوئے اور بھارتیہ جنتا پارٹی قائم کی اس وقت بھی گاندھیائی سوشلزم کا نعرہ بلند کرکے گاندھی جی کو خراج عقیدے پیش کیا گیا اور اب جبکہ بتن گڈکری بدعنوانی میں گھر گئے تو گاندھی جی کے قاتلوں کی زبان پر پھر ایک بار گاندھی کا نام آیا۔

موہن بھاگوت نے اپنی حالیہ تقریر میں گاندھی جی کا نام لے کر اپنے رضاکاروں

کو چونکا دیا۔ گاندھی جی نے ۱۹۲۲ء میں اپنے جریدے ینگ انڈیا کے اندر سات گناہوں گناہوں کی نشاندہی کرکے ان سے اجتناب لازم قرار دیا تھا۔ اس میں سب سے اول نمبر پر اقدار سے خالی سیاست کو رکھا گیا تھا۔ فی الحال ساری بڑی سیاسی جماعتیں بشمول گاندھی جی کی کانگریس اور ان کی ازلی مخالف بی جے پی اقدار سے پوری طرح محروم ہو چکی ہیں ۔ نہ کوئی اصول ہے اور نہ کوئی نظریہ سیاست کی بنیاد صرف اور صرف موقع پرستی اور ابن الوقتی ہے۔ اس کے بعد بغیر مشقت کی دولت کا ذکر ہے۔ رشوت کے ذریعہ حاصل کی جانے دولت کیلئے اس سے اچھا کوئی اور نام نہیں ہو سکتا۔ اس دلدل منموہن سنگھ سے لے کر نتن گڈکری تک سارے رہنما ملوث ہیں ۔

ان کے علاوہ بے عمل علم ۔ بے اصول تجارت ۔ انسانیت سے عاری سائنس ۔ قربانی کے بغیر عبادت اور بلا شعور کا ذکر بھی سر سنگھ چالک نے اپنی تقریر میں کیا۔ یہ تمام گناہ فی الحال ہماری قومی سیاست میں کارِ ثواب بن گئے ہیں ۔ موہن بھاگوت نے بدعنوانی کے خاتمہ کی خاطر کردار سازی کو ناگزیر قرار دیا۔ ان کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کردار سازی ہوگی کیسے ؟کیا نتن گڈکری جیسے بد کردار اور بدعنوان سیاستداں کی حمایت کرنے سے اعلیٰ اقدار و کردار کا فروغ ہوگا یا خاتمہ ہوگا ؟ اس آسان سے سوال کا جواب ہر کوئی جانتا ہے۔ اس کیلئے کسی موہن بھاگوت کا پروچن سننے

کی ضرورت نہیں۔ نتن گڈکری نے پھر ایک بار یہ ثابت کردیا ہے کہ بی جے پی کا شیش محل بدعنوانی کی سنگ باری سے ریزہ ریزہ ہوچکا ہے اور اب موہن بھاگوت کی مسیحائی اس کے کسی کام نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ بقول فیض ۔

موتی ہو کہ شیشہ جام کہ در
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا
تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو
یہ ساغر شیشے لعل و گہر
سالم ہو تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں

(سنگھ پریوار کا دھرم سنکٹ (قسط دوم

آرایس ایس نے ابتدا سے اپنا مقصد ہندو سماج کی بیداری اور سناتن تہذیب کا احیاء قرار دیا اس لئے وہ اپنے آپ کو سیاسی کے بجائے ثقافتی تحریک کہلوانا پسند کرتا ہے۔آر ایس ایس نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی غرض سے اپنے کچھ پرچارکوں مثلاً بلراج مدھوک،اٹل بہاری واجپائی اور لال کرشن اڈوانی کی مدد سے ۱۹۵۱ء بھارتیہ جن سنگھ قائم کی اور ایک معروف سیاستداں شیاما پرساد مکھرجی کو اس کا صدر بنا دیا۔مکھرجی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس سے کیا پھر ہندو مہاسبھا میں چلے گئے۔گاندھی جی کے کہنے پر پنڈت نہرو کی کابینہ میں وزیرِ صنعت وفراہمی رہے۔گاندھی جی کے قتل کا الزام جب ہندو مہاسبھا پر لگا تو اسے خیرباد کہہ کر آرایس ایس صدر گرو گولوالکر کے ساتھ بھارتیہ جن سنگھ قائم کی۔کشمیر کے اندر پراسرار حالات میں ان کی موت ہوئی۔ان کی موت کے بعد یکے بعد دیگرے کئی لوگ اس پارٹی کے صدر ہوئے لیکن بلراج مدھوک نے صدر بننے کے بعد اٹل جی پر اندرا گاندھی سے میل جول کا الزام لگایا اور پارٹی سے نکال دیئے گئے۔گویا سیاست کے میدان میں اترنے والے اولین معروف پرچارک کو بھی سنگھ اپنے قابو میں نہ رکھ سکا۔بلراج مدھوک کی بغاوت نے آرایس ایس کو اپنے حدود و قیود کا احساس دلا کر حقیقت پسند بنا دیا۔

ایمرجنسی کے بعد حزب اختلاف کا ایک عظیم اتحاد عالم وجود میں آیا۔ جن سنگھ اس خیال سے جنتا پارٹی میں ضم ہو گئی کہ وہ اپنی تنظیمی قوت کی مدد سے جنتا پارٹی کو نگل جائیگی لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آر ایس ایس کی دوہری رکنیت کے مسئلہ پر سنگھ سیوکوں کو الگ ہونا پڑا جس کے نتیجہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اٹل جی صدر بنے اور انہوں نے سنگھ کے نظریہ سے بغاوت کرکے گاندھیائی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا جبکہ سنگھ پریوار گاندھی جی اور سوشلزم دونوں کا دشمن تھا۔ آر ایس ایس نے اس مکھی کو اس لئے نگل لیا کہ وزیر خارجہ کے منصب پر فائز ہو جانے کے بعد اٹل جی کا قد خاصہ بلند ہو چکا تھا اور ان کو قابو میں رکھنا اب سنگھ کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اٹل اور اڈوانی چونکہ سنگھ سے تعلق کی بنیاد پر اقتدار سے دستبردار ہوئے تھے اس لئے ان سے تعلق توڑ لینا بھی آر ایس ایس کیلئے بے حد مشکل تھا۔ اندرا گاندھی کی موت کے بعد چلنے والی ہمدردی کی لہر نے بی جے پی کا خیمہ اکھاڑ دیا۔ اڈوانی نے اس کا فائدہ اٹھا کر واجپائی کے ساتھ گاندھیائی سوشلزم کو دریا برد کر دیا اور دین دیال اپادھیائے کے فلسفہ کامل انسانیت کو اپنا کر سنگھ پریوار کے منظورِ نظر بن گئے۔ رام مندر کی تحریک چلا کر اڈوانی جی نے بی جے پی کو ملک کا سب سے بڑا حزب اختلاف تو بنا دیا اور حکومت بھی بن گئی لیکن وہی رام مندر بی جے پی اور اڈوانی کے پیروں کی زنجیر بن

گار۔ قومی جمہوری محاذ میں شامل دیگر علاقائی اور سوشلسٹ حامی جماعتوں نے وزیراعظم کے منصب کی خاطر واجپائی کواڈوانی پر ترجیح دی۔

اٹل جی اور اڈوانی جی کا جب تک بول بالا رہاآر ایس ایس اپنی مرضی بی جے پی پر تھوپ نہ سکی لیکن اڈوانی جی کے پاکستانی دورے پر جناح کی تعریف کے بعد جب ان کی ہوا اکھڑ گئی تو بی جے پی پر سنگھ اپنی مرضی کا صدر تھوپنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس جبر کو سرانجام دینے کا سہرہ موہن بھاگوت کے سر ہے جنھوں نے اپنے چہیتے نتن گڈکری کو پارٹی کا صدر بنوایا۔ اس فیصلے پر بی جے پی کے رہنماوں کا غم و غصہ سرد کرنے کیلئے بھاگوت نے کہا تھا اجتماعی زندگی میں کبھی کبھار اپنی مرضی کے خلاف فیصلے بھی ہوتے ہیں ان فیصلوں کو ہضم (برداشت) کرنے کی قوت بھی ہمارے اندر ہونی چاہیے لیکن جب نتن گڈکری کی ناؤ منجدھار میں ہچکولے کھانے لگی تو بھاگوت نے ہاتھ جھٹک کر کہا کہ سنگھ سیاست نہیں کرتا اس کے کچھ لوگ کرتے ہیں جو خود مختار ہوتے ہیں ان پر سنگھ کا کوئی زور نہیں چلتا۔ اس لئے بی جے پی کی حرکات کا جواب دینے کی ذمہ داری سنگھ پر نہیں ہے۔ سنگھ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد بی جے پی نے اپنے سب سے معمر رہنما لال کرشن اڈوانی کا تعاون طلب کیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی میں لال کرشن اڈوانی کی حیثیت مہابھارت کے دھرتراشٹر یا

کرکٹ کے سنیل گاوسکر کی سی ہے۔ انہیں میدان میں اتارتے ہوئے بی جے پی والے بھول گئے کہ دھرت راشٹر بینائی سے معذور تھے۔ سنیل گاوسکر اپنے زمانے میں ٹیسٹ میچ کھیلا کرتا تھا لیکن اب ٹوینٹی ٹوینٹی کا زمانہ ہے۔اڈوانی جی نے نتن گڈکری کی صفائی میں کہا یہ میڈیا ٹرائل ہے۔ گڈکری پر کمپنی ایکٹ کے تحت جو الزامات ہیں وہ بدعنوانی کے دائرے میں نہیں آتے اس لئے کہ انھوں نے اپنے سیاسی رسوخ کا استعمال نہیں کیا۔ یہ ایک ایسی احمقانہ دلیل ہے جسے وہی پیش کر سکتا ہے جو پوری طرح سٹھیا گیا ہو۔کیا معاشی میدان میں بدعنوانی نہیں ہوتی؟ سچ تو یہ ہے کوئی بدعنوانی غیر معاشی نہیں ہوتی؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر نتن گڈکری صوبائی وزیر نہ رہے ہوتے یا بی جے پی کے قومی صدر نہ ہوتے تو کیا انہیں اس طرح آسانی سے قرضہ جات سرکاری مراعات مل جاتیں۔ وہ سرکار کی مدد سے کسانوں کی زمین کے مالک بن جاتے؟ اڈوانی جی کا سب سے حماقت خیز دعویٰ یہ ہے کہ ''نتن گڈکری نے خود کو تفتیش کیلئے پیش کرکے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر دیا ہے''۔ کیا کوئی محض کسی مجبوری کے تحت اپنے آپ کو تحقیق کیلئے پیش کردے تو وہ گنگا نہا لیتا ہے؟ اس کے سارے پاپ دھل جاتے ہیں؟ اور اگر وہ بے گناہ ثابت ہو چکے ہیں تو تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ اپنے وسیع و عریض سیاسی تجربے کی بن سنگھ یاد پر اڈوانی جی کو یقین ہے کہ کانگریس کی تحقیق و تفتیش گڈکری کو بچا لے گی۔

سنیل گواسکر نے اپنے ریٹائرمنٹ سے قبل جب ون ڈے میچ کھیلنا شروع کیا تھا تو کرکٹ کے شائقین دعا کرتے تھے کہ وہ جلد آوٹ ہو جائے اس لئے کہ جس مقابلہ میں گواسکر کی سنچری ہوتی انڈیا وہ میچ ہار جاتا یہی کچھ اڈونی جی کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔وہ جب بھی کسی کا دفاع کرتے ہیں آگے چل کراس بیچارے کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔ بنگارو لکشمن کو واجپائی نے اڈوانی کی مرضی کے خلاف پارٹی کا صدر بنوایا تھااس لئے انہیں ٹھکانے لگانے کی خاطر غالباًاڈوانی جی نے انہیں رشوت کے جال میں پھنسایااور پھر دکھاوے کا دفاع کیا لیکن بنگارو کو نہ صرف صدارت سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ بدعنوانی کے الزام میں ملوث ہونے والے نتن گڈکری تنہا نہیں ہیں بلکہ وہ اس روایت کا حصہ ہیں جسے اڈوانی جی نے قائم کیا اورفروغ دیا۔ اڈوانی نے جب نرسمھاراوٗ کو ہرشد مہتا کی مدد سے گھیرنے کی کوشش کی توراوٗ نے انہیں جین حوالہ ڈائری میں پھنسا دیا۔بدعنوانی کے معالملے میں ملوث پائے جانے والے اڈوانی بی جے پی کے پہلے بڑے رہنما تھے لیکن اس وقت وہ کسی قدر ہوشیار سیاست داں تھے۔ عوام کو گمراہ کرنے کیلئے انہوں سیاست میں اعلیٰ اقدار کا نعرہ بلند کیا اور پارلیمانی رکنیت اور لیڈرشپ سے استعفیٰ دے دیا۔ انتخابات قریب تھے پارلیمان جلد ہی تحلیل ہونے والی تھی اس لئے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا لیکن انہوں نے پارٹی کی صدارت نہیں چھوڑی۔اڈوانی کی حمایت کرناٹک کے وزیر اعلیٰ یدورپا اور اتراکھنڈ کے پوکھریال کے بھی کسی کام نہ آسکی اور ان دونوں کو بھی

استعفیٰ دینا پڑا اس لئے نتن کیلئے ان کا دفاع کوئی نیک شگون نہیں ہے۔
بی جے پی نے ممبئی میں منعقد ہونے والے اپنے حالیہ قومی اجلاس میں نتن گڈکری کو دوبارہ صدر بنانے کی خاطر دستور میں ترمیم کی۔ ممبئی کے اجلاس میں نہ صرف دستور سے کھلواڑ کیا گیا بلکہ آر ایس ایس کی مرضی کے خلاف ایک مصالحت بھی کی گئی۔ سنگھ پریوار کے اندر سنجے جوشی کو نریندر مودی کا حریف سمجھا جاتا ہے۔ سنجے جوشی ایک زمانے میں گجرات بی جے پی کے نگراں تھے اور نریندر مودی کیلئے دردِ سر بنے ہوئے تھے لیکن پھر یہ ہوا کہ سنجے جوشی کی بی جے پی کے خاتون رکن کے ساتھ سیکس اسکینڈل میں ملوث ایک سی ڈی سامنے آئی اور سنجے جوشی کی چھٹی ہو گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سی ڈی نریندر مودی نے بنوائی تھی۔ نتن گڈکری جو اپنی بقاء کی خاطر ناگپور کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دیا کرتے تھے اس لئے صدر بن جانے کے بعد آر ایس ایس نے دباؤ ڈال کر سنجے جوشی کو بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ میں شامل کروا دیا۔ نریندر مودی نے اس فیصلے سے ناراض ہو کر دہلی میں منعقد ہونے والے اجلاس میں احتجاجاً شرکت نہیں کی۔ اس طرح گویا مودی نے آر ایس ایس کو بھی اپنی حیثیت دکھلا دی۔ اس سے پہلے وہ گجرات میں آر ایس ایس اور وی ایچ پی کو ناراض کر چکے تھے۔

ممبئ میں گڈکری کیلئے دستور میں ترمیم اور دوبارہ صدر بننے کی خاطر نریندر مودی کی حمایت ناگزیر تھی اس کا فائدہ اٹھاکر مودی نے سنجے جوشی کے اخراج کی شرط لگادی۔ سنجے جوشی کو پھر ایک بار ذلیل کرکے ہٹایا گیا۔ مودی نے اجلاس میں شرکت کی اور نتن گڈکری کا کام ہوگیا لیکن اس کے ساتھ مودی اور گڈکری کے اشتراک نے سنگھ پریوار کی اصول پرستی کو سرِ بازار نیلام کردیا۔ ابن الوقتی کی سیاست میں یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ بدعنوانی کا الزام لگنے کے بعد نتن گڈکری کی مخالفت سب سے پہلے بی جے پی رکنِ پارلیمان رام جیٹھ ملانی نے کی اور انہوں نریندر مودی کو وزیر اعظم کا سب سے موٗثر دعویدار بھی قرار دیا۔ نتن گڈکری کی موجودہ میقات دسمبر میں ختم ہو رہی ہے۔اب پارٹی کے اندر اس سوال پر از سرِ نو غور ہونے لگا ہے کہ نتن گڈکری کی صدارت میں بی جے پی کیلئے کانگریس کے خلاف بدعنوانی کے مسئلہ پر انتخاب لڑنا کیا ممکن ہے ؟ذرائع ابلاغ میں یہ قیاس آرائی کی جارہی ہے کہ عظیم تر مصالح کے پیشِ نظر گجرات اور ہماچل پردیش کے انتخابات تک تو گڈکری کو برداشت کیا جائیگا لیکن دسمبر کے اواخر میں وہ خود استعفیٰ دے کر نئے صدر کیلئے راہ ہموار کردیں گے۔

بی جے پی کا آئندہ صدر کون ہو اس سوال پر اتفاق رائے نہایت مشکل ہے اس لئے کہ سشما سے لے کر جیٹلی تک اور وینکیا سے لے کر راج ناتھ ہر کوئی صدارت کا

امیدوار ہے۔ اسی کے ساتھ اس منصب کا سب سے بڑا دعویدار مودی ہے۔ نریندر
مودی کے سامنے صدارت کی کرسی بھی ہے اور گجرات کا ریاستی انتخاب بھی اس لئے
گزشتہ دنوں اس نے ناگپور میں جاکر سر سنگھ چالک موہن بھاگوت سے تین گھنٹہ طویل
ملاقات کی۔ یہ ملاقات اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ کچھ عرصہ قبل سنگھ کا ایک اہم
اجلاس گجرات کے بڑودہ شہر میں ہوا تھا جس میں سنگھ کے بڑے رہنما شریک تھے۔ اس
وقت دونوں فریقوں میں سے کسی نے ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن نتن
گڈکری کے پھنستے ہی طاقت کا توازن بگڑ گیا مودی ناگپور پہنچ گئے بھاگوت نے بھی ان سے
ملاقات کیلئے وقت نکالا یہ تبدیلی سنگھ پریوار کا اندرونی خلفشار کا شاخسانہ ہے۔

گجرات کے ریاستی انتخاب میں نریندر مودی کی کامیابی کو یقینی سمجھا جارہا ہے لیکن اس بار
حالات کچھ مختلف ہیں۔ اس سے پہلے گجرات میں مودی کا مقابلہ صرف کانگریس سے
ہوتا تھا جس کی سربراہی بی جے پی ہی ایک باغی رہنما شنکر سنگھ واگھیلا کیا کرتے تھے۔
میں کیشو بھائی پٹیل نے مودی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو آر ایس ایس ؁۲۰۰
نے انہیں منع کر دیا لیکن اس بار جب کیشو بھائی نے اپنی گجرات پریورتن پارٹی قائم کی
تو آر ایس ایس نے انہیں نہیں روکا۔ کیشو بھائی کی حکمتِ عملی واگھیلا سے مختلف ہے۔
واگھیلا نے بغاوت کے بعد کانگریس کے ساتھ الحاق کرکے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا تھا

اور پھر اس میں شامل ہو گئے تھے ۔ اس طرح زعفرانی رائے دہندگان پر ان کی بغاوت کا کوئی اثر نہیں پڑا اس کے برعکس کیشو بھائی نے نہ کانگریس سے قربت اختیار کی اور نہ ہندوتوا کی مخالفت کی بلکہ انہوں نریندر مودی پر الزام لگایا کہ اس نے گاندھی نگر میں شہر کو خوشنما بنانے کی خاطر ۲۰۰ مندروں کو توڑا ہے اور گئو رکشا کی خاطر مختص کردہ زمین صنعتکاروں کو اونے پونے دام بیچ دی ہے۔ کیشو بھائی پٹیل کو گجرات کے اکثریتی پٹیل برادی کا فرد ہونے کا شرف حاصل ہے اور ان کے ساتھ سابق مرکزی وزیر کانشی رام رانا کا بیٹا بھی جس کا تعلق پسماندہ طبقات سے ہے ۔اس طرح گجرات میں اس بار نریندر مودی کے خلاف ہندوتوا وادی ووٹوں کا ایک اور دعویدار کیشو بھائی پٹیل کی گجرات پریورتن پارٹی کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا ہے ۔ یہ کس قدر تباہی مچائے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

نریندر مودی کے ناگپور سے واپس آنے کے بعد کیشو بھائی نے اس کے اثرات کو زائل کرنے کی خاطر آر ایس ایس کے صوبائی صدر دفتر ہیڈگوار بھون میں حاضری دی جہاں ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ کیشو بھائی پٹیل پہلے ہی سے مودی مخالف وی ایچ پی رہنماؤں کے رابطے میں ہیں ۔ نریندر مودی نے انتخابات میں کامیابی کیلئے جو حکمتِ عملی بنائی اس میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہر انتخاب میں اپنے موجودہ ارکانِ اسمبلی کی بڑی تعداد کو بدل دیتے ہیں اور اس کی یہ

مشرکانہ توجیہ کرتے ہیں کہ ہندو عوام مختلف تہواروں میں مختلف دیوی دیوتاوں کی عبادت کرتے ہیں اور انتخاب بھی ایک سیاسی تہوار ہے۔ اس طرح بی جے پی کے نااہل ارکان کے خلاف عوام کا جو غم و غصہ ہوتا ہے اس سے مودی کو نجات مل جاتی ہے۔ اس حکمتِ عملی کا فائدہ نریندر مودی اسمبلی کے علاوہ بلدیاتی انتخاب میں بھی اٹھایا ہے۔ اس بار مندرجہ بالاحکمتِ عملی پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے اس لئے کہ پہلے بی جے پی کے ٹکٹ سے محروم رہنما کانگریس میں نہیں جا پاتے تھے۔ وہاں کانگریس کے دعویدار پہلے سے موجود ہوتے جنھیں ناراض کرنا کانگریس کیلئے مشکل ہوتا تھا۔ بی جے پی پٹے ہوئے مہرے کو امیدوار بنانے سے کانگریس کو اپنے اقلیتی رائے دہندگان کی ناراضگی کا بھی خطرہ ہوتا تھا۔ کیشو بھائی کی گجرات پریورتن پارٹی کیلئے یہ مشکلات نہیں ہیں وہ نئی ہندوتواوادی پارٹی ہے جس میں بی جے پی کے باغیوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس کا ہدف انتہا پسند ہندو ووٹر ہے سیاسی موقف بی جے پی جیسا ہی ہے۔ بی جے پی سے نکل کر جی پی پی میں آنے والوں کیلئے اپنا بھگوا چولا بدلنے کی بھی ضرورت نہیں۔ انہیں تو صرف پھر ایک بار جئے شری رام کا نعرہ لگا کر اپنے سابق رائے دہندگان کو ورغلانا ہے۔ ایسی خبریں بھی آرہی ہیں کہ جن لوگوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ انہیں مودی ٹکٹ سے محروم کردے گا انھوں نے ابھی سے کیشو بھائی کے ساتھ رابطہ

قائم کرنا شروع کر دیا ہے۔اسی پریشانی نے غالباًنریندر مودی کوناگپوریاترا کرنے پر مجبور کیا لیکن ایسا لگتا ہے نریندر مودی کا جادو چل نہیں پایا ورنہ کیشو بھائی کا ہیڈگوار بھون میں خیر مقدم نہیں کیا جاتا۔ نریندر مودی کے سیاسی مستقبل کا سارا دارومدار گجرات کے انتخاب پر ہے اگر وہ اپنی ریاست میں ناکام ہو جاتا ہے تو سنگھ پریوار اسے سیاسی کوڑے دان میں پھینکنے کیلئے ایک لمحہ بھی پس و پیش نہیں کرے گالیکن اگر وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے ناز و انداز اٹھانے پر مجبور ہو جائیگا۔

سنگھ پریوار کا دھرم سنکٹ یہ ہے کہ وہ جمہوری سیاست میں آنا بھی نہیں چاہتا اور وہاں رہنا بھی چاہتا ہے۔ اسے اندیشہ ہے کہ انتخابی عمل کا جبر نہ صرف اس کے افکار و نظریات کو نگل جائیگا بلکہ اصول و کردار کا بھی بیڑہ غرق کر دے گا لیکن اسی کے ساتھ سنگھ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ جمہوریت کے گندے تالاب میں جب تک کمل کا پھول نہیں کھلتا اس وقت تک ہندوستان ہندوراشٹر نہیں بن سکتا۔اس لئے وہ لاکھ احتیاط کے باوجود آئے دن مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ ہندوستان میں اٹھنے والی دوسری بڑی نظریاتی تحریکیں مثلاًپیری یارکی دراوڈ کزگم،امبیڈکر اور کانشی رام کی بہوجن تحریک، لوہیا کا سماجواد اور اشتراکی نظریات کے علمبرداروں کے بالمقابل جن کی نظریاتی بنیاد کو انتخابی سیاست نے پوری طرح تباہ تاراج کر دیا ہے سنگھ پریوار اپنا توازن و امتیاز برقرار

رکھنے میں ابھی تک کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہے لیکن آگے یہ مشکل لگتا ہے۔

سنگھ پریوار نے ساٹھ سال قبل قومی چوراہے پر تین تین بلیوں کو کچھ فاصلے پر کھڑا کیا اوران کے درمیان ایک رسی کو باندھ دیا۔اس تماشہ کا نام بھارتیہ جن سنگھ رکھا گیا ۔سنگھ کے لوگ نیچے ڈھول بجاتے اور سنگھ پرچارک دونوں ہاتھوں میں لاٹھی کو تھامے رسی پر اپنا توازن قائم رکھ کر ہوا میں چلتے۔ وقت کے ساتھ یہ تماشہ مقبولِ عام ہوتا گیا اور پھر نہ جانے کب انقلابِ زمانہ نے رسی پر چلنے والوں کو ڈھول بجانے والا بنا دیا اور ڈھول بجانے والوں کے ہاتھ میں لاٹھی تھما کر انہیں رسی پر چڑھا دیا۔ لیکن اب یہ کھیل پرانا ہو چکا ہے۔ رسی ڈھیلی ہو چکی ہے اس پر چلنے والے مداری کمزور و لاغر ہو چکے ہیں ۔ڈھول کے شور میں بدعنوانی کھنک شامل ہو چکی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اب یہ کھیل کب تک چلے گا لیکن جب یہ مداری اپنا پیر پھسلنے سے یا رسی کے ٹوٹنے سے زمین پر آجائیگا تب بھی ڈھول تو بجتا رہے گا مگر ہندوتوا کے غلبہ کا ایک اور خواب چکنا چور ہو کر بکھر جائیگا۔

امریکی انتخاب: ایک گدھے کی واپسی

کرشن چندر کی شہرۂ آفاق ناول ایک گدھے کی سرگزشت کا جب پنجابی میں ترجمہ ہوا تو اس کا نام گدھے کی واپسی رکھا گیا اور یہی عنوان براک اوبامہ کی صدارتی انتخاب میں کامیابی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی ڈیموکریٹک پارٹی کا انتخابی نشان گدھا ہے۔ امریکہ میں گدھے کو وفادار اور محنت کش جانور سمجھا جاتا ہے اور ریپبلکن پارٹی کے نشان ہاتھی کو خوشحال اور منہ زور وحشی حالانکہ دنیا بھر کے لوگ امریکی گدھے کی منہ زوری سے بھی پریشان ہیں۔ براک اوبامہ اپنی پہلی میقات میں داخلی اور خارجی دونوں محاذ پر بری طرح ناکام رہے۔ تبدیلی کا جو حسین خواب انہوں نے عوام کو دکھلایا تھا وہ ایک بھیانک حقیقت میں تبدیل میں ہو گیا جس کا اعتراف خود انہوں نے اپنی انتخابی مہم کے دوران کیا اور کہا کہ تبدیلی کیلئے چار سال کی مدت ناکافی ہے اس لئے انہیں ایک مرتبہ اور موقع دیا جائے۔ وہ تو خیر امریکی دستور انہیں دو سے زیادہ مرتبہ انتخاب لڑنے کی اجازت نہیں دیتا ورنہ چالیس سال بھی وہ یہی کہتے کہ تبدیلی کیلئے یہ مدت ناکافی ہے انہیں ایک اور موقع درکار ہے اس لئے کہ آج تک تبدیلی لانے کے بجائے خود تبدیل ہو جانے والے بہروپے دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کیا۔

وڈی ایلن نے انتخاب سے قبل کے امریکی سماج کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا تھا کہ ''ہم آج ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ایک راستہ ناامیدی اور شدید مایوسی کی طرف جاتا ہے تو دوسرا کامل معدومیت کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ امید ہے کہ ہمیں درست فیصلہ کرنے کی دانائی حاصل ہوگی۔ امریکی عوام ویسے بھی مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں اس لئے انہوں مکمل طور پر فنا ہوجانے پر اپنی ناامیدی کی کیفیت کو ترجیح دیتے ہوئے اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان بیچاروں کے سامنے گہری کھائی یا آگ کا الاؤ کے سوا کوئی اور متبادل ہی نہیں تھا سو انہوں نے آگ کے مقابلے کھائی کو پسند کیا ۔معروف مفکر لن ڈن نے اس صورتحال کو یوں بیان کیا کہ امریکی جمہوریت ایک طعام گاہ کی مانند ہے جس کے مینو میں صرف دو پکوان ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کیا منگائیں گدھا یا ہاتھی۔آپ کے سامنے ایک خون آلود زہریلا کھانا پروس دیا جاتا ہے۔ اگر آپ اس سے مطمئن نہ ہوں تو آپ کے پاس مزید چار سال انتظار کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ویسے اس انتظار بسیار کے بعد بھی کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا ہے پھر ایک بار وہی زہریلی بدبودار غذا عوام کا مقدر بنتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا نعرہ یہ ہے کہ اس میں کسی کو مفت میں کھانا نہیں

ملتا۔ ہر شخص کو اپنی غذا کی قیمت چکانی ہوتی ہے اس سے قطع نظر کہ وہ غذا اس کیلئے مفید ہے یا مضر۔ اس انتخاب سے قبل بھی براک اوبامہ امریکہ کے صدر تھے اور اس کے بعد بھی وہی ہیں۔ اس سے ان کو کوئی فرق نہیں پڑا لیکن اپنی تاریخ کے شدید ترین معاشی بحران سے دوچار امریکی عوام نے اس جمہوری تماشے پر ۱۳ ہزار کروڑ روپے پھونک دیئے اور اس کی مدد سے عوام نے پھر ایکبار جنگی مجرمین اور بنکوں کے لٹیروں کو پناہ دینے والے سیاستدانوں کو اپنے اوپر مسلط کرلیا۔ امریکی تعلیم گاہوں میں فی الحال خوب جم کر فیس لی جاتی ہے۔ بنک اس کیلئے طلباء کو سود پر قرض فراہم کرتے ہیں اور پچاس فیصد سے کے قریب مقروض طلباء یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ملازمت کیلئے در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ اگر انتکابی مہم پر خرچ ہونے والی کثیر رقم تعلیم یا عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کی جاتی اور اس سے قرض کے دباؤ کا شکار نوجوان نسل کا بوجھ کو ہلکا کردیا جاتا تو شاید وہ اس قیمتی سرمائے کا بہتر استعمال ہوتا۔

امریکہ کے بیشتر مفکرین بڑے تجارتی اداروں کی جانب سے سیاسی جماعتوں کو دی جانے والی اعانت کو بلاواسطہ رشوت گردانتے ہیں۔ اس دنیا میں کون ایسا سرمایہ دار ہو سکتا ہے جو بلا کسی مفاد کے سیاستدانوں کو ہزاروں کروڑ روپے خیرات کرے اور انتخاب کے بعد اسے وصول نہ کرے ؟ کوئی سیاسی رہنما یا جماعت

اگر اپنے سرمایہ کاروں کو مایوس کردے تو اسے انتخابی پرچار کیلئے دوبارہ رقم حاصل ہی نہیں ہو گی نیز اگر کسی جماعت کے پاس ذرائع ابلاغ کا پیٹ بھرنے کیلئے سرمایہ نہ ہو تو وہ انتخاب میں کامیابی کا خواب بھی دیکھ سکتی۔ بڑے سرمایہ دار جس طرح سٹہ بازار (شیئر مارکٹ) میں روپیہ لگاتے ہیں اسی طرح سیاسی بساط پر بھی سکے اچھالتے ہیں۔ دوسرے کاروبار میں ان کو کبھی فائدہ تو کبھی کبھی نقصان بھی ہوتا ہے لیکن جمہوری انتخاب ایک ایسی منڈی ہے جس میں سرمایہ کار اور سیاستدان ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں اور عوام ہمیشہ ہی خسارے کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ سرمایہ دار جن امیدواروں پر روپیہ خرچ نہیں کرتے ان کا کیا حشر ہوتا ہے وہ بھی دنیا کے سامنے ہے۔ اس مرتبہ بھی لبریٹیرین پارٹی اور گرین پارٹی کے امیدواروں کو بالترتیب ایک فیصد اور ایک چوتھائی فیصد سے کم ووٹ ملے۔ اس لئے کہ ان کے پاس ذرائع ابلاغ پر خرچ کرنے کیلئے سرمایہ نہیں تھا اور اب وہی ذرائع ابلاغ جنھوں نے ان کے افکار و خیالات کی اشاعت نہیں کی یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ امریکی عوام نے انہیں مسترد کردیا۔

براک اوبامہ کامیاب ضرور ہو گئے ہیں لیکن اس کے باوجود امریکی پارلیمان (کانگریس) میں ان کی مخالف جماعت ریپبلکن کو اکثریت حاصل ہے اس لئے توقع کی جارہی ہے کہ انتخاب سے قبل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے والے اوبامہ

اور رومنی پھر ایک بار پردے کے پیچھے مل بیٹھیں گے اور ان کے درمیان اپنے سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے کی خاطر مصالحت ہو جائیگی۔اس سودے بازی کے نتیجے میں پھر ایک بار سرکاری اخراجات میں کمی کے نام پر عوامی فلاح بہبود مثلاً طبّی امداد اور سماجی تحفظ وغیرہ میں کٹوتی کر دی جائے گی۔ساتھ ہی بڑے تجارتی اداروں کو ٹیکس میں سہولت دے کر غریبوں کے منہ کا نوالا چھین کر امیروں کا پیٹ بھرا جائیگا۔ یہ سودے بازی دونوں جماعتوں کی یکساں ضرورت ہے اس لئے کہ دونوں ہی کو سرمایہ داروں کا احسان چکانا ہے۔

امریکہ کے اس انتخاب نے عوام کو دو قطبین پر جمع کر دیا۔ایک طرف رومنی کے ساتھ خوشحال، گورے مرد حضرات تھے تو دوسری جانب اوبامہ کے ہمراہ بدحال،کالے اور خواتین تھیں ۔مٹ رومنی خود بہت امیر کبیر سرمایہ دار ہیں اور انہیں شیلڈن ایڈلسن نامی ایک بڑے سرمایہ دار خاندان کی کھلی حمایت حاصل تھی ۔مٹ رومنی نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ٹیکس میں کٹوتی کا جو وعدہ کیا تھا اس سے ایڈلسن خاندان کو ۹ بلین ڈالر کا فائدہ ہو سکتا تھا اور خود مٹ رومنی کا نہ جانے کتنا؟ ایڈلسن ایک یہودی سرمایہ دار ہے جسے رومنی کی حمایت کرنے کا مشورہ اسرائیل کے وزیر اعظم بن یامین نتن یاہو نے دیا تھا۔ نتن یاہو کی رومنی کے ساتھ ۴۶ سال پرانی ملاقات ہے اور وہ بزعم خود اپنے آپ کو امریکی سیاست کا بہت بڑا ماہر سمجھتا ہے۔ نتن یاہو نے یہاں تک کہنے سے گریز نہیں

کیا کہ رومنی کو ووٹ دینا اسرائیل کے حق میں ووٹ دینے کے مترادف ہے۔
مسلمانوں کے اندر بہت سارے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا بھر میں بالعموم اور امریکہ میں بالخصوص جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ صرف اور صرف یہودیوں کے اشارے پر ہوتا ہے لیکن اس انتخاب نے اس مفروضہ کو غلط ثابت کردیا۔ نتن یاہو کا یہ دعویٰ کہ اسرائیل ایک قومی ریاست ہے۔ ساری دنیاکے یہودی اس کے شہری ہیں اس لئے وہ ساری دنیاکے یہودیوں کا نمائندہ ہے غلط ثابت ہو گیا اور فلوریڈا جیسی ریاست کے یہودیوں نے اس کے فتویٰ کو ماننے سے انکار کردیا اور یاہو کو یہ پیغام دیا کہ وہ اسرائیلی نہیں بلکہ امریکی ہیں۔ جنوری میں خود نتن یاہو کو انتخاب لڑنا ہے اور اس پر اوبامہ و امریکی انتظامیہ سے تعلقات بگاڑنے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل کا ناپاک وجود یوروپ اور امریکی کا مرہونِ منت ہے۔ جس دن وہ سہارہ ختم ہوگا یہ ناپاک شجر اپنے آپ سوکھ جائیگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اوبامہ اسرائیل کے انتخاب میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ اوبامہ انتقام کی روش اختیار کرے اس لئے کہ کیا پدیّ اور کیا پدیّ کا شوربہ؟ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اوبامہ کی موجودگی میں نتن یاہو کی قصرابیض کے اندر پہلے جیسی آو بھگت اب کبھی نہیں ہوگی۔

اسرائیلی سیاستداں آئندہ انتخاب میں ایران کے جوہری اسلحہ کا خوف دلا کر رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مٹ رومنی نے اس بابت اسرائیل پشت پناہی کا وعدہ تو کیا تھا لیکن انتخاب سے قبل عہد و پیمان کچھ اور ہوتے ہیں اور بعد میں فیصلے مختلف ہوتے ہیں۔ فی الحال امریکہ کے معاشی مسائل اور افغانستان میں نظر آنے والی شکست اسے ایران کے ساتھ محاذ آرائی کی اجازت نہیں دیتی۔ اوبامہ تو درکنار رومنی کیلئے بھی اس حماقت کی جرأت سے مشکل تھی لیکن اوبامہ کے برسرِ اقتدار آجانے کے سے ایران پر حملے کے امکانات ناپید ہوگئے ہیں۔ اگر اسرائیلی حکومت اپنی انتخابی ضرورت کے پیش نظر یہ اقدام کر گزرتی ہے تو ایران کے جوابی حملہ پر امریکہ کی حمایت زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھے گی۔ ویسے امریکہ اور اسرائیل کی قومی تشکیل میں زبردست مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں ممالک مہاجرین کے غاصبانہ قبضہ سے وجود میں آئے ہیں۔ دونوں مقامات پر مہاجرین نے سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقامی باشندوں پر بے تحاشہ ظلم و ستم توڑا ہے۔ دونوں کے اندر بلاوجہ کا احساسِ برتری پایا جاتا ہے۔ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے اور اپنی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی خصلت یہ دونوں اپنے اندر رکھتے ہیں۔

امریکہ کے معاشی بحران اور اس کے عالمی خلفشار کے پیچھے امریکی عوام کا

اخلاقی انحطاط کارفرما ہے۔ انتخابی عمل تو ایک چکی کی طرح ہے کہ اس میں گیہوں ڈالو تو آٹا باہر آئیگا اور چنا ڈالو تو بیسن۔امریکی رائے دہندگان جب اس چکی میں پستے ہیں اس میں سے اوبامہ اور رومنی جیسے لوگ باہر آتے ہیں جن کے افکار و نظریات نیز عادات واطوار میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ اس اخلاقی بحران کا سب سے بڑا ثبوت براک اوبامہ کے خاص معتمد اور سی آئی اے کے ڈائرکٹر ڈیوڈ پیٹریاس کا اپنے عہدے سے استعفیٰ ہے۔یہ حسن اتفاق ہے اس سے قبل لیون پینیٹا کو بھی اس عہدے سے صدر براک اوبامہ پر تنقید کے نتیجہ میں مستعفی ہونا پڑا تھا۔ پیٹریاس نے ۱۹۷۴ء میں اپنی فوجی تعلیم مکمل کی۔ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۰۸ء تک اسے بین الاقوامی فوج کا کمانڈر بنا کر عراق میں تعینات کیا گیا اور ۲۰۱۰ء سے لے کر ۲۰۱۱ء کے دوران اس کو سربراہ بنا کر افغانستان روانہ کیا گیا۔ سینٹ نے اسے اتفاق رائے سے اسے سی آئی اے کا سربراہی پر فائز کیا۔ قومی خفیہ ایجنسی کے سربراہ جیمس کلیپر کے مطابق گزشتہ پانچ دہائیوں میں انہوں نے جن فوجیوں کو دیکھا ہے ان میں پیٹریاس کو سب سے زیادہ ممتاز اور عظیم وفادارِ قوم پایا ۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سب بہتر کا یہ حال ہے تو سب سے کمتر کا کیا حال ہوگا ؟ اور جب ان درندوں کو لاکھوں کی تعداد میں نہتے عوام پر چھوڑ دیا جاتا ہوگا ان کی حالتِ زار کیسی ہوتی گی ؟

صدر اوباما نے ڈیوڈ پیٹریاس کی تعریف میں کہا کہ اس نے کئی دہائیوں تک امریکہ کی غیر معمولی خدمت کی ہے اور ملک کو محفوظ اور طاقتور بنایا ہے۔ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس کے شر سے خود اس کی آپ بیتی لکھنے والی شادی شدہ خاتون محفوظ نہ رہ سکی اس نے امریکہ کو کیسے محفوظ بنا دیا؟ جو شخص خود اس قدر کمزور ہے اپنی ۳۷ سالہ ازدواجی زندگی کے بد تجبھی اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا اور ذلیل و شرمسار ہو کر بھاگ کھڑا ہوا وہ ملک کو کیسے طاقتور بنا سکتا ہے؟ ڈیوڈ پیٹریاس نے استعفیٰ دے کو اپنے آپ کو نہایت پارسا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دراصل وہ ایک خونخوار جنگی مجرم ہے جس کے سر پر عراق اور افغانستان کے بے شمار مظلومین کے قتل الزام ہے۔ امریکی قانون کے لحاظ سے بھی اس کی پذیرائی نہیں بلکہ کورٹ مارشل ہونا چاہئے اس لئے جاسوسی کی دنیا میں جاسوسوں کی جاسوسی اکثر خواتین کی مدد سے کی جاتی ہے اس لئے ایک عام رنگروٹ کو بھی اس طرح کے معاملات میں کوتاہی برتنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

ایف بی آئی کی تحقیق کے مطابق مسز براڈویل فوجی اسکول سے تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور پیٹریاس کے ذاتی ای میلس تک ان کی رسائی تھی۔ وہ پیٹریاس کے ساتھ افغانستان کے اندر قیام پذیر تھیں اور ان کے پیٹریاس کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ملالہ پر مگرمچھ کے آنسو بہانے

والوں کو.براڈ ویل کی کسمپرسی پر کوئی ملال نہیں ہے جس کی عصمت وعفت کے ساتھ فوجی چھاونی کے اندر وردی.بردار نے کھلواڑ کیا۔ اس استعفیٰ کا ایک پہلو یہ بھی ہے آئندہ ہفتہ پیٹریاس کو پارلیمانی تحقیقاتی کمیشن کے سامنے بن غازی میں امریکی قونصل خانے پر ۱۱ ستمبر کو ہونے والے حملہ کی صفائی پیش کرنے کی خاطر حاضر ہونا تھا ممکن اس سے بچنے کیلئے ڈیوڈ پیٹریاس یہ بہانہ بنا کر راہِ فرار اختیار کی ہو ؟

امریکی رائے دہندگان پھر ایک بار اس خوش فہمی کا شکار ہوگئے ہیں کہ انہوں نے جن نمائندوں کو منتخب کیا ہے وہ ان کے مفادات کی حفاظت کریں گے لیکن یہ حقیقت ہر چارسال بعد سامنے آتی ہے کہ یہ عوامی نمائندے خود اپنا اور ان سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں جو ان پر روپیہ لگا کر انہیں کامیاب کرواتے ہیں۔ یہ سیاستداں جن بلند بانگ دعووں کے ساتھ انتخاب کے میدان میں اترتے ہیں ،کامیاب ہوتے ہی انہیں بھول جاتے ہیں ۔ عوام بھی وقت کے ساتھ ان عہد وپیان کو بھلا دیتے ہیں جو انتخابی مہم کے دوران ان سے باندھے گئے تھے ۔ انتخابات کا اعلان ہوتے ہی وہ پھر ایک بار جذبات میں آکر سیاستدانوں کو اپنے ووٹ دے کر دنیا بھر میں ظلم وبربریت ننگا ناچ کرنے کا نیز اندرونِ ملک بدعنوانی واستحصال کرنے کا پروانہ عطا کر دیتے ہیں ۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ عیش کوئی اور کرتا ہے اور ذمہ داری کسی اور پر آتی ہے

۔امریکی جمہوریت کے تماشے کو صدر اوبامہ کے دو نعروں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ .براک اوبامہ نے پہلی مرتبہ انتخاب جیتنے سے قبل کہا تھا ’’ہم یہ کر سکتے ہیں‘‘ اور دوسری مرتبہ کامیاب ہونے کے بعد کہا ’’ہم نے یہ کر دیا‘‘ ۔ایک امریکی صدر یہی کر سکتا ہے کہ ایک سے دو مرتبہ کامیاب ہو جائے اور رائے دہندگان یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے کامیاب کر دیا۔ اس سے زیادہ نہ کوئی کچھ کہہ سکتا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ اس تمام کہنے اور کرنے پر ہزاروں کروڑ روپے خرچ تو ضرور ہو جاتے ہیں لیکن اس سے آقا اور غلام کے درمیان کا فرق ختم تو کجا کم بھی نہیں ہوتا۔بقول امریکی مفکر ہربرٹ مارکیوز ’’آقاؤں کا آزادانہ انتخاب آقائی و غلامی (کے نظام) کا خاتمہ نہیں کرتا ‘‘ ۔

غزہ: سروں سے جبر کا موسم کبھی ٹلے تو سہی

محرم الحرام میں اس سال غزہ کے دلیر مسلمانوں نے عملاً شہدائے کربلا کی یاتازہ کردی ۔غزہ پھر ایک بار اسرائیلی بمباری کی زد میں ہے۔ ۲۰۰۸ء کے بعد یہ اسرائیل کا سب سے بڑا حملہ ہے لیکن ان چار سالوں میں مختلف سطح پر جو تبدیلی واقع ہوئی اس کا اندازہ اس دوران رونما ہونے والے مختلف واقعات سے لگایا جاسکتا ہے مثلاً بمباری کے پانچویں دن جبکہ ۶۵ مسلمان شہید ہوچکے ہیں اور ان میں اکثر نہتے شہری ہیں غزہ شہر کے اندر اپنے بچوں کی خاطر انڈے اور چاکلیٹ لے کر لوٹتے ہوئے ایک عام آدمی علی الاحمد سے جب اخبار نویس نے پوچھا کہ تمہیں کیسا لگتا ہے تو اس کا جواب تھا'' دہشت ناک،ایسا مجھے محسوس ہوتا ہے۔ لیکن سرحد کی دوسری جانب وہ لوگ بھی خوفزدہ ہیں '' اس نے اعتماد کے ساتھ کہا'' سچ تو یہ ہے کہ میں یہ سمجھنے لگا تھا حماس اسرائیل کے ساتھ جنگ وجدال بھول چکی ہے مگر وہ میری غلطی تھی''۔ بمباری کی گونج کے درمیان علی کے اس ردعمل کے ذریعہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے غزہ کا ماحول کیسا ہے اور عام لوگ کیا سوچتے ہیں ؟ علی آگے کہتا ہے کہ اگر اسرائیل نے حملہ کردیا تو سیکڑوں شہری مارے جائیں گے لیکن جن وہ واپس لوٹیں گے تو ہمارے راکٹ ان کا پیچھا کریں گے اس طرح بالآخر وہی ناکام ہوں گے۔

تلال اوکال ایک مصری دانشور ہیں جو ماضی میں حماس سے برگشتہ رہا کرتے تھے لیکن اب ان کا کہنا کہ ہم حماس کو سلام کرتے ہیں اس لئے کہ اس بار وہ منظم نظر آرہے ہیں ۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیابی کی قیمت چکانے کیلئے تیار ہیں اورآج ہر شخص ان کی ستائش کرنے پر مجبور ہے ۔ یہاں تک کہ محمود عباس نے جو حماس کے سیاسی حریف ہیں اور موقع بے موقع حماس پر برستے رہتے ہیں اس بار حماس کے رہنماوں سے رابطہ قائم کیا اور ان کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ فوری جنگ بندی کی بھرپور کوشش کریں گے ۔ حماس کے ترجمان سامی ابو زہری کے مطابق ہمیں اپنی مزاحمت اور اعلی درجہ کی صلاحیت پر ناز ہے جس نے دشمن کو مبہوت کردیا اوراندر گھس کر حملہ کیا۔اگر اسرائیل ۲۰۰۹ کی طرح فوج کشی کرتا ہے تو اس کا جواب دینے کیلئے حماس کے پاس ٹینک اور بکتر بند گاڑی نہیں لیکن اس اس کے پاس ٹینک شکن میزائل ضرور ہیں جو دشمن کو حیرت زدہ کردیں گے ۔ حماس کے مسلح بازو القسام بریگیڈ کے ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ ہم نے گزشتہ مرتبہ ۲۲ دنوں تک مزاحمت کی اس بار ہم اسے مزید طول دے سکتے ہیں مگر اسرائیلی فوجی دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ یہ صہیونیوں کے خلاف آخری لڑائی نہیں ہے ہم نے ان کے اس دعوے کو غلط ثابت کردیا ہے کہ وہ ہماری فوجی طاقت کو پوری طرح ختم کرچکے ہیں ۔

غزہ کے مجاہدین نے اس بار جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ غیر معمولی ہیں ۔ پہلے یروشلم اور پھر تل ابیب پر گولہ باری جس ایک گولہ امریکی سفارتخانے سے صرف ۲۰۰ میٹر دوری پر گرااور اسرائیل کے بلند بانگ دعووں کا بھید کھل گیا۔ اس کے بعد اسرائیل کے ایک ایف ۱۶،ایک اپاچی ہیلی کاپٹر اور دو ڈرونز بمباروں کا مار گرایا جانا اوراسرائیلی بحریہ کے ایک جنگی جہاز کو نشانہ بنانا ایسی باتیں ہیں جو اسرائیل اور اس کے سرپرست امریکہ ویوروپ کے خواب وخیال سے پرے ہیں ۔ حماس کے عسکری شعبہ عزالدین القسام کے ترجمان کا کہنا ہے کہ اس کے جنگجوؤں نے تل ابیب اور بیت المقدس سمیت اسرائیل کے مختلف شہروں پر ۹۰۰ حملے کئے۔ ترجمان ابوعبیدہ نے دعوی کیا کہ ان کے القسام ائر ڈیفنس یونٹ نے اسرائیلی لڑاکا طیارہ بھی مار گرایا جو غزہ سے متصل سمندر میں جا گرا۔ نیز دو اسرائیلی ڈرونز بھی مار گرانے کا دعوی کیا ہے۔ ابوعبیدہ کا کہنا ہے کہ ہم نے اسرائیل کے اہم اور حساس مقامات کو نشانہ بنایا ہے۔ ان میں بری اور فضائی فوج کی چھاونی اور ہیلی پیڈز شامل ہیں۔ ہمارے حملوں کے خوف سے پانچ ملین اسرائیلی شہری زیر زمین بنکروں اور محفوظ پناہ گاہوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ نیز القسام نے غوش عتصیون کے اہم فوجی مرکز پر بھی میزائل سے حملہ کیا۔ مجاہدین نے غزہ سے تین کلومیٹر دور ایک فوجی جیپ گھات لگا کر تباہ کی۔ حملے کے بعد اسرائیلی امدادی کمک کئی گھنٹے بعد جائے حادثہ پر پہنچ سکی۔

اس سے قبل ۲۰۰۸ء کی اسرائیلی جارحیت میں ۱۴۰۰ فلسطینی شہید ہوئے تھے اور صرف اسرائیلی مارے گئے تھے اس کے باوجود کئی مسلم ممالک نے الٹا حماس کی گولہ باری ۱۳ کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ مصر کے حسنی مبارک نے اسرائیل کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے رفاہ کی شاہراہ بند کر دی تھی لیکن اس بار دوران جنگ اسی شاہراہ پر سفر کرکے مصر کے وزیر اعظم ہشام قندیل نے غزہ کا دورہ کیا۔اس کے بعد تیونس اور مصر کے وزرائے خارجہ اور ان کے پیچھے ترکی کے وزیر خارجہ احمد دفغلو بھی غزہ کی جانب نکل کھڑے ہوئے ۔ عرب لیگ کا ایک وفد بہت جلد غزہ کا دورہ کرنے والا ہے اور تو اور سعودی عرب کے شاہ عبداللہ نے بھی اسرائیل کی سخت مذمت کی ۔ سعودی وزیرِ خارجہ ڈاکٹر نزار بن عبید مدنی نے قاہرہ میں عرب لیگ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل کی حالیہ دہشت گردی پر خاموش تماشائی رہنے کا کوئی جواز نہیں ۔ جارحیت کے مرتکب صہیونیوں کو اپنے جرائم کی سزا ملنی چاہیے۔ سعودی وزیر نے اسرائیل کو خبردار کیا کہ حملوں کا سلسلہ جاری رہا تو اس کے سنگین نتائج نکلیں گے اور ان کی تمام تر ذمہ داری صہیونی حکومت پر عائد ہو گی۔ یہ مثبت تبدیلی اس بات کی غماز ہے کہ جبر کا سورج کے ڈھلنے کا وقت قریب آگیا ہے بقول شاعر ؎

جو روشنی نہیں ہوتی نہ ہو بلا سے مگر
سروں سے جبر کا سورج کبھی ڈھلے تو سہی

مراکشی فرمانروا شاہ محمد ششم نے غزہ پر اسرائیلی حملوں کو نہایت المناک اور افسوسناک قرار دیتے ہوئے انہیں فوری طور پر رکوانے کا مطالبہ کیا ہےاور غزہ کے جنگ سے متاثرہ محصور عوام کی ہنگامی مدد کے لیے شہر میں فیلڈ اسپتال قائم کرنے کی ہدایت کی ہے۔

مراکشی فوج کے زیر انتظام مجوزہ ہسپتال میں زخمیوں کی فوری سرجری، ہنگامی علاج اور ابتدائی طبّی امداد سمیت عام مریضوں کو بھی علاج کی سہولت فراہم کی جائے گی۔اس کے علاوہ مصر سے ۵۵۰ رضاکاروں پر مشتمل ایک کل جماعتی یکجہتی وفد جس میں مختلف نظریات کی حامل جماعتوں کے لوگ شامل ہیں غزہ کے لوگوں کی مدد کیلئے پہنچ گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے مصر کی مختلف سیاسی جماعتیں اپنے اختلافات سے علی الرغم فلسطینیوں کی حامی ہیں لیکن ان پر مسلط غلام ذہنیت کے فرمانروا نے انہیں روک رکھا تھا اب جبکہ اسلام پسندوں اس جبر کو ختم کردیا امت محمدیہ کے اندر دبا ہوا جذبۂ اخوت و محبت ابل پڑا اور مسلمانوں ایک جسم کی طرح سرحد پار کے اپنے بھائیوں کا درد محسوس کیا اور اپنا دستِ تعاون دراز کیا بقول اقبال ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بناء ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

قاہرہ فی الحال سفارتی کوششوں مرکز بنا ہوا ہے۔ ابتدا عرب لیگ کا اجلاس سے

ہوی اس کے بعد رجب طیب اردغان قاہرہ پہنچ گئے جہاں انہوں نے اسرائیل کی مذمت کرتے ہوئے کہاکہ اسرائیل کو معصوم عوام کی ہلاکت کا خراج چکانا ہوگا۔ وزیر اعظم اردغان نے قاہرہ یونیورسٹی میں اپنے خطاب کے دوران اعلان کیا کہ فلسطینی نہ کبھی جھکے ہیں اور نہ جھکیں گے ۔ اس تقریر کو براہِ راست ٹیلی ویژن پر نشر کیا گیا۔ قاہرہ آتے ہوئے انہوں نے کہا تھا اسرائیل نے پہلے جنگ بندی کو پامال کیا اب اس کی دہائی دے رہا ہے ۔اس کے بعد غزہ کے دورے سے قبل ترکی وزیر خارجہ احمد دفغلو نے قاہرہ میں حماس کے رہنما خالد مشعل سے ملاقات کی ۔ اس بیچ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون بھی صدر محمد موسی سے ملاقات کی غرض سے قاہرہ پہنچ گئے ۔ دریں اثنا اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان غزہ کی پٹی میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کا جائزہ لینے کے لئے اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کا بند کمرے میں اجلاس میں اسرائیل اور فلسطینی نمائندے شریک ہوئے۔احمد دفغلو نے امریکہ کی خارجہ سکریٹری ہیلری کلنٹن سے بھی رابطہ قائم کیا تاکہ اس جارحیت پر روک لگائی جاسکے ۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ اسرائیل اپنی من مانی کرتا رہتا تھا اور ساری دنیا خوابِ غفلت میں پڑی رہتی تھی لیکن اس بار صورتحال مختلف ہے ۔ اس گفتگو میں اسرائیل کا مطالبہ ہے کہ جنگ بندی سے قبل حماس گولہ باری بند کرے لیکن حماس نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا چونکہ حملہ کی ابتدا اسرائیل نے کی تھی اس لئے پہلے وہ اپنی بمباری بند کرے اس کے بغیر گولہ باری بند نہیں ہوگی ۔

ایران کے صدر محمود احمدی نژاد نے اسرائیلی حملے کی مذمت کرتے ہوئے کہا وہ اپنے بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے مغرب نے عرصہ دراز تک اسرائیلی جارحیت کا دفاع کیا لیکن اب اسے چاہئے کہ وہ فلسطینیوں کو اپنی مقدر کا فیصلہ خود کرنے دے۔ایران کے نائب وزیر خارجہ حسین امیر عبدل لیہان نے ان کی تائید میں کہا کہ اگر اسرائیل اپنے فوجی حملے بند نہیں کرتا تو حماس سخت تر اقدامات کرے گا اور مجاہدین اسرائیل کا ناطقہ بند کر دیں گے۔تل ابیب پر حملے نے اسرائیل کے اندازوں کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اسلامی بیداری نے اس خطے کے حالات بدل کر رکھ دیئے ہیں۔حماس کے رہنما خالد مشعل نے قاہرہ آنے سے قبل سوڈان میں فرمایا اسرائیلی حملہ کا مقصد مصر اور دیگر مسلم ممالک کی نبض ٹٹولنا ہے۔وہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا اب بھی اس کیلئے ماضی کی طرح اپنی بات منوانا ممکن ہے یا نئے رہنماؤں کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ ویسے اسرائیل کی اس حماقت نے ساری دنیا پر یہ واضح کر دیا ہے کہ دنیا کس قدر بدل گئی ہے۔ خالد مشعل نے فلسطینی قیادت پر زور دیا ہے کہ وہ غزہ کی جنگ کا ہوشیاری اور دلیر دلی کے ساتھ سامنا کریں کیونکہ اسرائیل کے ساتھ مڈ بھیڑ طول پکڑ سکتی ہے۔ مشعل کے مطابق اسرائیلی مہم کے نتائج یہ ثابت کرتے ہیں کہ صہیونی اہالیاں غزہ کے حوصلے پست نہیں کر سکتے۔ کمزور دشمن غزہ کو زیر نگین نہیں کر سکتا۔ ہم انہیں مار بھگائیں گے کیونکہ غاصب اسرائیل فلسطین کے اصل وارثوں کو دھکا

نہیں سکتا۔ وہ دور لد گیا جب اسرائیل، فلسطینیوں پر مظالم سے انہیں رخت سفر باند ھنے پر مجبور کرتا تھا۔ جبری بے دخلی کا دور ختم ہو گیا۔ اب اسرائیل کے خاتمے کا وقت آن پہنچا ہے۔

حماس کے ترجمان سامی ابو زہری نے ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل، غزہ کے خلاف اپنی جارحیت کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ کھلی جنگ میں آہستہ آہستہ تیزی آئے گی۔ ہم قابض اسرائیلیوں کے دھوکے میں مزید نہیں آئیں گے کیونکہ موجودہ حالات میں جنگ بندی کا ذکر دراصل غزہ پر اسرائیلی چڑھائی کو جاری رکھنے میں ڈھال کا کام کرے گا۔ اس بیان میں اسرائیلی حکمرانوں پر اس حملے کو سیاسی مقاصد کیلیے استعمال کرنے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ خاصہ سنگین ہے۔ اس سے پہلے اسرائیلی حملہ عین انتخاب سے قبل ہوا تھا اور اس بار بھی یہی ہو رہا ہے۔ پہلے جلاد شالط کی رہائی کا بہانہ بنایا گیا تھا اب ان کو قبضہ میں رکھنے والے اور پھر ایک معاہدے کے تحت واپس کرنے والے احمد الجعبری کو شہید کیا گیا ہے۔ یہ دراصل امریکی انتخاب کی بھونڈی نقل ہے۔ جارج بش نے انتخاب جیتنے کی خاطر عراق پر حملہ کیا اور کامیاب ہو گیا لیکن یہود اولمرٹ نے یہی کیا اور ناکام ہو گیا۔ اوبامہ نے اسامہ کے ہم شکل کی ہلاکت کا ناٹک کیا وہ بھی کامیاب ہو گیا اب نتن یاہو احمد الجعبری کی شہادت کو انتخاب میں کامیابی

کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرے گا اور قوی امکان ہے کہ وہ بھی منھ کی کھائے گا۔
دراصل یہودیوں اور عیسائیوں میں ایک فرق یہ ہے کہ عیسائی بہت پہلے سوچتا ہے اس لئے کم سے کم نقصان سے بڑی سیاسی شعبدہ بازی دکھانے میں میں کامیاب ہو جاتا ہے اس کے برعکس یہودی آخری وقت میں ہاتھ پیر مارتا ہے اور بڑا نقصان کرکے بھی ناکام و نامراد ہو جاتا ہے۔ مغرب کا اب یہ وطیرہ بن گیا ہے کہ جب وہ سنگین داخلی مسائل میں گھر جاتے ہیں یا انہیں سیاسی و انتخابی فوائد حاصل کرنے ہوتے ہیں تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی نہ کسی بہانے سے جہاد چھیڑ دیتے ہیں بقول شاعر

کبھی جو ان کے جشن میں سیاہیاں بکھر گئیں
تو روشنی کے واسطے جلا لیا گیا مجھے

اسلامی تحریک مزاحمت حماس کا مطالبہ ہے کہ غزہ کے خلاف جارحیت کا آغاز تو اسرائیل نے کیا لیکن اب اس جنگ کو ختم کرنے کا فیصلہ تل ابیب کے اختیار میں نہیں رہا۔ فلسطینی قومی اتھارٹی اور اسرائیل کے درمیان سیکیورٹی کوارڈی نیشن فی الفور ختم کیا جائے۔ عرب اور اسلامی ممالک مصر کے نقش قدم پر چلیں۔ یاد رہے کہ القسام بریگیڈ کے کمانڈر احمد الجعبری کی اسرائیلی میزائل حملے میں شہادت کے بعد بطور احتجاج قاہرہ نے تل ابیب سے اپنے سفیر عاطف سالم کو

فوری طور پر واپس بلا لیا تھا۔ مصری صدر نے وزارت خارجہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ قاہرہ میں اسرائیلی سفیر کو دفتر خارجہ طلب کریں اور ان سے نہتے فلسطینیوں پر بلا اشتعال حملوں پر شدید احتجاج کریں۔ مصر نے غزہ پر اسرائیلی حملوں کی شدید مذمت کرتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ اگر صورتحال پر بروقت قابو نہ پایا گیا تو اس خطے کی سیکیورٹی کے لئے اس کے مضمرات اچھے نہیں ہوں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل کی جانب سے کی جانے والی اس طرح کی جارحانہ مہم کبھی بھی لمبے عرصے تک مؤثر نہیں رہی ہے۔ حماس کے بانی اور روحانی رہنماء شیخ احمد یاسین کی اسرائیل کے ہاتھوں شہادت اور اس کے فوراً بعد ڈاکٹر رنتیسی کے جامِ شہادت نوش فرمانے کے باوجود تنظیم نے ہتھیار نہیں ڈالے اور اب بھی حماس کی جانب سے اسرائیل پر اس وقت تک راکٹ داغے جائیں جب تک کہ جنگ بندی کے معاہدہ نہیں ہو جاتا۔

اسرائیل کی تازہ جارحیت کا آغاز حماس کے عسکری بازو القسام کے سربراہ احمد الجعبری پر اسرائیلی میزائل حملے سے ہوا۔ شہید احمد الجعبری ایک ہفتہ قبل حجاز سے مناسک حج ادا کر کے لوٹے تھے۔احمد شہید ۱۹۶۰ء میں مشرقی غزہ کی الشجاعیہ کالونی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے غزہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ باون سالہ القسام کمانڈر احمد الجعبری شہید کئی برس غزہ جیل کیمپ سے صہیونی فوج کے خلاف برسرپیکار رہے اس دوران ان کا اپنا خاندان الخلیل شہر

میں قیام پذیر تھا۔ فلسطین میں آج بھی دینی اور سیاسی اعتبار سے الجعبری خاندان اثر و نفوذ رکھنے والا گھرانہ مانا ہے۔ اس کے متعدد افراد حماس اور الفتح سے وابستہ ہیں۔ فلسطین میں ۲۰۰۰ء میں دوسری تحریک انتفاضہ کے آغاز میں احمد الجعبری نے حماس کے عسکری ونگ کے لیے ایک نہایت منظم فورس تشکیل دی، جس کے ذریعے اسرائیلی فوج پر حملے کیے گئے۔ احمد الجعبری کے چچازاد سمیر الجعبری مغربی کنارے میں فلسطینی پولیس میں کرنل کے عہدے پر تعینات ہیں۔ کرنل سمیر نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا بچپن ایک ساتھ گذرا، وہ بچپن ہی سے انقلابی سوچ رکھتا تھا۔ احمد ہمارے خاندان ہی نہیں بلکہ پوری قوم کا اثاثہ تھا۔ اس کی شہادت پوری قوم کے لیے ایک المناک واقعہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے لیکن ہمیں اس بات پر خوشی بھی ہے کہ اس نے شہادت کا مرتبہ حاصل کیا۔

احمد الجعبری اپنی عسکری کارروائیوں کی وجہ سے زیادہ تر میڈیا کی چکا چوند سے دور رہتے تھے۔ ان کا میڈیا سے پہلا رابطہ گزشتہ برس اس وقت ہوا جب وہ اسرائیلی سپاہی جلاد شالیط کو مصری خفیہ ایجنسی کے حوالے کرنے مصر گئے۔ احمد الجعبری کی شہادت کے بعد حماس کے جوابی حملہ سے صہیونی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی لیکن دوسری جانب شہید الجعبری کا قبیلہ نے اپنے مایہ ناز سپوت کی عظیم قربانی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے شیرنی تقسیم کی۔ مقبوضہ مغربی

کنارے کے شہر الخلیل میں شہید کمانڈر احمد الجعبری کے اہل خانہ اپنے بہادر بیٹے کی شہادت پر اہل علاقہ سے مبارکباد وصول کرتے رہے۔ پرسہ دینے والوں کی تواضع مٹھائی سے کی گئی۔ الجعبری کے بچھڑ جانے اور صہیونی دہشت گردی کا نشانہ بننے پر شہید کے عزیز واقارب مغموم ضرور تھے، البتہ انہیں الجعبری کے شہادت کے مرتبے پر فائز ہونے کی خوشی بھی تھی۔ یہی وہ جذبۂ شہادت ہے جس کا مظاہرہ امام حسینؓ نے کربلا میں کیا تھا اور احمس الجعبری نے پھر ایک بار اقوامِ عالم کے سامنے شہادت دی ہے کہ

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

فیض آباد: شہر کا شہر ہی آسیب زدہ ہو جیسے

ذرائع ابلاغ میں اکثر و بیشتر خبریں نامکمل معلومات پر منحصر ہوتی ہیں اور ان کی بنیاد پر کئے جانے والا تجزیہ و تبصرہ مفروضات و اندازوں کے حصار میں مقید ہوتا ہے اسی لئے قارئین کا ذہن صاف نہیں ہوتا بلکہ وہ کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ کالم نگار پہلے یہ طے کرلیتا ہے کہ کس نتیجہ پر پہنچنا ہے اور پھر حقائق کو توڑ مروڑ کر اس تک رسائی کا ذریعہ بناتا ہے۔ صحافت میں یہ رویہ حماقت نہیں بلکہ خیانت کے مترادف ہے۔ ہلال کمیٹی فیض آباد کے کنوینر خلیق احمد خاں صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے نہایت جانفشانی سے فیض آباد کے حالیہ فسادات پر ایک تفصیلی اور مکمل رپورٹ مرتب فرمائی۔ اس غیر جانبدار دستاویز نہ صرف پند و نصائح کی لفاظی سے پاک ہے بلکہ غیر ضروری شکوہ شکایت سے بھی خالی ہے۔ سات صفحات کی مختصر سی رپورٹ میں دن بدن رونما ہونے والے حالات اور پھر اس کے ساتھ ملت کے مطالبات کو دوٹوک انداز میں پیش کردیا گیا ہے۔ رپورٹ سے منسلک ۲۵ صفحات کا ضمیمہ ہے۔ جس میں نقصان کا تخمینہ، زخمیوں کے نام، گرفتار شدگان کی تفصیلات، مجرمین کی نشاندہی ،انتظامیہ کا کردار، سیاست دانوں کا رویہ اور حکومت کے اقدامات مع شواہد فراہم کئے گئے ہیں۔

اترپردیش میں سماجوادی پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد سے فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا ہے۔اس بارے میں عام غلط فہمی یہ پائی جاتی تھی کہ یہ سماجوادی پارٹی کو بدنام کرنے کی سازش ہے۔ مسلمان رائے دہندگان پہلے بہوجن سماج پارٹی اور سماجوادی پارٹی میں تقسیم ہوجاتے تھے۔اس بار کانگریس نے بھی انہیں ریزرویشن کی مدد سے رجھانے کی بھرپور کوشش کی تھی اس لئے اسے مسلم رائے دہندگان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر سماجوادی کا ساتھ دیا یہی وجہ ہے کہ اکھلیش یادو واضح اکثریت کے ساتھ وزارت اعلیٰ کے مسند پر براجمان ہوسکے۔ دور دراز کے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کیلئے انہوں نے سماجوادی کی حمایت کرکے ایک فاش غلطی کی ہے اور وہ محفوظ ہونے کے بجائے غیر محفوظ ہوگئے ہیں حزب اختلاف کی جانب سے وقتاً فوقتاً فسادات برپا کئے جارہے ہیں ۔ویسے متھرا کے فساد میں بہوجن سماج پارٹی کے ایک رہنما کا نام بڑے زور و شور کے ساتھ سامنے بھی آیا تھا جس نے اس خیال کو مزید تقویت پہنچائی لیکن فیض آباد کے فساد اس غلط فہمی کو دور کردیا۔

فیض آباد اور بھدرسا کے منصوبہ بند فساد میں ۲۴ اکتوبر کو جو لوگ جائے حادثہ پر بنفس نفیس موجود تھے ان میں سے ایک بھارتیہ جنتا پارٹی کے سابق

رکنِ اسمبلی للو سنگھ تھے۔ للو سنگھ کی موجودگی کسی حیرت کا سبب اس لئے نہیں ہے کہ بی جے پی سیاست کا سارا دارومدار ہی فرقہ واریت پر ہے۔ایسے میں فسادیوں کی سرپرستی کرنا بی جے پی کی مجبوری بھی ہے اس لئے کہ اکثر فسادی ذہن کے لوگ بی جے پی کے حامی ہوتے ہیں۔ اگر ایسے مواقع پر بی جے پی کے رہنما میدان میں اترنے سے گریز کریں تو اس بات کا امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ کوئی اور ان کو اپنا بنا کرلے اڑے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کانگریس پارٹی کے ریاستی صدر اور رکنِ پارلیمان نرمل کھتری بھی وہاں موجود تھے۔ نرمل کو بجا طور پر مسلمانوں سے شکایت ہے کہ انہوں نے کانگریس کو ملائم سنگھ کے ساتھ سودے بازی کے موقع سے محروم کردیا۔ مگر سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو سماجوادی پارٹی کے رکن اسمبلی پون پانڈے اور ان کے ہمراہ گریش کمار پانڈے کی موجودگی ہے۔ پون پانڈے وہ شخص ہے جس کو بڑے ارمانوں سے مسلمانوں نے کامیاب کیا اور اس سے بڑی توقعات وابستہ کیں لیکن افسوس کہ جن پہ تکیہ کیا گیا تھا انہیں پتوں نے آگ بجھانے کے بجائے شعلوں کو ہوا دی اور اس طرح مال واسباب کے ساتھ سماجوادی پارٹی پر مسلمانوں کا اعتماد بھی جل کر خاک ہوگیا۔ گریش پانڈے جو ڈمپل پانڈے کے نام سے مشہور ہے آئندہ قومی انتخاب سماجوادی کے ٹکٹ پر لڑنے کا خواہشمند ہے۔ شاید اسے یہ لگتا ہو کہ ایوانِ پارلیمان

میں رونق افروز ہونے کیلئے مسلمانوں اور یادووں کے ووٹ کافی نہیں ہیں اس لئے اپنی برادری کے براہمنوں کو ہمنوا بنانا ضروری ہے۔ ڈمپل کی یہ حماقت اسے نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کا مصداق بنا دے گی۔ جیسے ہی بی جے پی کا امیدوار جئے شری رام کا نعرہ لگائے گا براہمن دوڑ کر اس کی شرن میں پہنچ جائیں گے اور مسلمان بھی ٹھینگا دکھا دیں گے ایسے میں فیض آباد کا اگلا رکنِ پارلیمان جو بھی ہو کم از کم سماجوادی ڈمپل نہیں ہوگا۔ ایسی نازک صورتحال میں سیاسی رہنماؤں کو اپنے گھر کے اندر رہنے کے بجائے عوام کے درمیان آنا چاہئے بشرطیکہ وہ فساد کی آگ بجھانے والے شریف لوگ ہوں لیکن ہندوستان کی سیاست میں ایسے لوگ خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے سیاستدان تو جلتی پر تیل ڈال کر اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے کے قائل ہیں۔ فیض آباد فساد کے چشم دید گواہوں کے مطابق ان سیاسی رہنماؤں نے انتظامیہ کے کام میں دخل اندازی کی انہیں فساد روکنے کیلئے قوت کے استعمال میں مانع ہوئے اور وہی نریندر مودی ومایا کندنانی کا کردار ادا کیا۔

فیض آباد فساد کی بنیادی ذمہ داری درگا پوجا سمیتی کے سرجاتی اور اس تنظیم کے اکثر ارکان براہمن اور کشتری ان میں کسی کا تعلق پسماندہ ذاتوں سے نہیں ہے۔ اس تنظیم نے منصوبہ بند طریقہ پر یہ فساد کروایا۔ اس مکروہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں براہمن نوجوان پیش پیش تھے مثلاً امیش دبے

عرف سمیّ نے رکاب گنج میں فساد کی ابتدا کی۔ یہ شخص اس قدر پرجوش تھا کہ فساد کی آگ میں خود جھلس گیا اور فی الحال اپنے گھر میں زیرِ علاج ہے۔ اس کے علاوہ حیدر گنج کا گوونِد گپتا عرف منٹو وویکا نند ویل اور براہمن سماج یوا سبھا کا جنرل سکریٹری رتیش پانڈے جو درگا پوجا کے جلوس میں اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر بلا روک ٹوک پیغام رسانی کا کام کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ پورا قلندر کا رہنے والا چندر بھان پانڈے بھی فساد بھڑکانے میں سرگرم تھا۔ ان سب براہمن نوجوانوں کو سماجوادی رہنماؤں کا تحفظ حاصل ہے اور جب تک یہ قرار واقعی سزا نہیں پاتے جاتی مظلومین کے ساتھ انصاف بھی نہیں ہوگا اور مستقبل کے فسادات پر قابو پانا بھی نا ممکن ہوگا۔ ان فسادیوں کی مدد کیلئے آر ایس ایس نے اپنا دستِ تعاون دراز کیا اور بیکا پور علاقے کے اپنے سر سنگھ چالک (سربراہ) نیرج جیسوال کو روانہ کیا اس کے ساتھ آر ایس ایس کے مختلف کارکنان مثلاً انل سنگھ منگل سنگھ، سداشیو موریہ، بدھ ساگر موریہ، ارجن موریہ، اکھلیش سنگھ، دیپک گپتا اور ستیش جیسوال بھی اس کے ہمراہ تھے۔ ان تمام بدمعاشوں کو مقامی رکن پارلیمان نرمل کھتری کی حمایت حاصل ہے جن پر یہ شعر صادق آتا ہے

امن کا جو پیغام سنانے والا ہے
گلیوں گلیوں آگ لگانے والا ہے

نرمل کھتری اوپر سے کانگریسی اور اندر سے زعفرانی ہے۔وہ ۱۹۸۸ء سے رام جنم بھومی تحریک میں سرگرم رہا ہے اورشیلا نیاس میں شریک تھا۔۱۹۸۹ء اسے سی پی آئی کے مترا سین نے ایودھیا ہی میں شکست دے دی اور اس کا سیاسی مستقبل تاریک کر دیا لیکن گزشتہ انتخاب میں یہ بدمعاش اسی مترا سین کو ہرا کر رکن پارلیمان بن گیا۔اب اسے ۲۰۱۴ء میں ہونے والے پارلیمانی انتخاب میں دوبارہ کامیابی کی فکر ستا رہی ہے اور اسی لئے وہ اپنی ہی برادری کے زیر نگین چلائی جانے والی درگا سمیتی کے توسط سے فسادات کی آگ پھیلا کرا بھی سے اپنی ساکھ بڑھا رہا ہے۔براہمنوں کی کوتاہ اندیشی نے پہلے کانگریس کی لٹیا ڈبوئی۔جب وہ جہاز غرقاب ہونے لگا تو یہ لوگ کود کر بی جے پی میں چلے گئے۔ جب بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے امکانات مفقود ہو گئے تو یہ بہوجن سماج پارٹی کے ساتھ ہو لئے اور جب بہن جی کو عوام نے دھتکار دیا تو اب یہ ہاتھی سے کود سائیکل پر آگئے۔براہمن سماج اقتدار کے لالچ میں اپنی وفاداریاں بدلتا رہتا ہے لیکن جس کسی کے ساتھ جاتا ہے بہت جلد اس کا بیڑہ پار ہو جاتا ہے۔آج کل سماجوادی پارٹی براہمنوں کو خوش کرنے میں لگی ہوئی ہے۔براہمن سماج کا خصوصی اجتماع منعقد کیا جارہا ہے لیکن اگر ملائم سنگھ یادو نے اس طوطا چشمی برادری کے چکر میں مسلمانوں کو ناراض کر دیا تو وہ جو وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں اس کا تولد سے قبل اسقاط ہو جائیگا۔

فیض آباد میں فساد کے دوسرے دن انتظامیہ نے حسبِ عادت سب سے پہلے مظلوم مسلمانوں کو گرفتار کرنے کی غلیظ حرکت کو دوہرایا اور ابتدا میں جن دس لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان میں سے ۶ مسلمان تھے۔ ان کے علاوہ گرفتار شدہ چار ہندو نوجوانوں میں فسادیوں کا کوئی سرغنہ شامل نہیں تھا لیکن آگے چل کر یہ خوش آئند بات ہوئی کہ تصویروں اور ویڈیو کی بنیاد پر ۸۰ فسادیوں کی شناخت کرکے ان میں سے ۶۷ کے خلاف مقدمات قائم کئے گئے۔ اب تک ۵۴ فسادیوں پولس کی حراست میں آچکے ہیں اور بقیہ کی تلاش جاری ہے۔ ردولی میں جن ۲۰ فسادیوں کے خلاف مقدمات درج کئے گئے ہیں ان میں بی جے پی کے رکنِ اسمبلی رامچندر یادو اور اشوک کشودھن کا نام بھی شامل ہے۔ پورا قلندر پولس تھانے کے پولس افسر نے ان ۴۰ فسادیوں کے خلاف شکایت درج کرنے سے انکار کردیا جن کے خلاف مسلمان نام بنام نام شکایت درج کروانا چاہتے تھے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ فساد کے فوراً بعد بہت سارے فسادی گرفتار ہوتے ہیں لیکن آگے چل کر انتظامیہ سیاسی دباؤ کے تحت مقدمہ کمزور کردیتا ہے اور عدالت ان ظالموں کو رہا کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے جس سے فسادی بلاخوف پھر فسادات میں ملوث ہوجاتے ہیں اگر فسادیوں کو قرار واقعی سزا ملے تو نہ صرف وہ خود بلکہ دوسرے بھی اس سے عبرت پکڑیں گے اور فسادات کی روک تھام ہوسکے گی۔

انتظامیہ کے جانبدارانہ رویہ کو گونج ریاستی حکومت کے ایوان تک پہنچی تو

وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو کے ایماء پر پرنسپل سکریٹری (داخلہ) آر ایم شریواستو اور ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل پولس اے سی شرما نے انسپکٹر جنرل (خفیہ) او پی سنگھ کے ہمراہ فساد کے اگلے دن فیض آباد کا دورہ کیا۔ ڈی جی پی نے اعتراف کیا کہ تشدد بھڑکنے کی وجہ ضلع انتظامیہ کی کوتاہی تھی۔انہوں نے کہا کہ انتظامیہ کو فسادیوں پر پانی کی تیز بوچھار، ربر کی گولیاں اور آنسو گیس چھوڑ کر منتشر کرنے کے احکامات دیئے گئے تھے لیکن ان پر عملدرآمد نہیں ہوا۔ شراب کی دوکانیں بند کرنے کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی اسی لئے جلوس میں شریک لوگ نشے میں دھت پائے گئے۔ڈی جی پی نے خاطی افسران کے خلاف جو کارروائی کا یقین دلایا تھا اس کے تحت چار یادو افسران کو معطل کرکے ان کا تبادلہ کر دیا گیا جن میں ایس پی رام جی یادو، اے ڈی ایم سری کانت یادو، سٹی مجسٹریٹ تلک دھاری یادو اور کوتوال بھولر یادو شامل ہیں۔ان کے علاوہ ڈی ایم دیپک اگروال، ایس ایس پی رامجیت شرما اور سی او راجیش کمار اپنا عہدہ بچانے میں کامیاب ہوگئے حالانکہ ان پر بھی الزامات لگائے گئے تھے۔ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کسی بھی یادو افسر کی جگہ کو دوسرے یادو افسر سے پر نہیں کیا گیا۔ ویسے معطلی اور تبادلہ کوئی بہت سخت سزا نہیں جو ان افسران کو آگے چل کر اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے پر مجبور کرکے بلکہ فسادیوں کی مانند ان کو بھی سزا دی جانی چاہئے تاکہ دوسرے افسران اس سبق حاصل کریں۔

وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو قابلِ ستائش ہوتے اگر وہ ان اقدامات کو بروقت اٹھاتے اس لئے کہ اس صورت میں یہ فساد ہی رونما ہی نہیں ہوتا لیکن ان کی جانب سے ناقابلِ معافی تاخیر ہوئی۔ کسی بیدار رہنما کی یہ پہچان نہیں ہے کہ وہ آگ لگنے کا انتظار کرے اور پھر پانی لے کر دوڑے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ آگ اچانک حادثاتی طور پر لگ جاتی ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور متبادل نہیں ہوتا لیکن فیض آباد کے سلسلے میں یہ بات درست نہیں ہے۔وزیر اعلیٰ کو تین ماہ کا طویل عرصہ میسر آیا تھا جس میں ایک طرف فسادی اپنی تیاری کرتے رہے لیکن وزیر اعلیٰ چین کی نیند سوتے رہے۔فیض آباد میں فرقہ وارانہ فضا کو خراب کرنے کی غرض سے ۲۳ جولائی کو شہر کے باہر مرزہ پور گاؤں میں مسجد کے قریب ایک غیر قانونی مندر تعمیر کیا گیا۔ انتظامیہ نے وہاں بابری مسجد کی کہانی دوہراتے ہوئے غیر قانونی تعمیر پر روک لگانے کے بجائے مسجد کو مقفل کردیا۔ ۱۴ ستمبر کو مسلم علماء اور سادھو سنتوں نے اس مسئلہ کے حل کی خاطر انتظامیہ کو مشترکہ میمورنڈم دیا تاکہ فرقہ وارانہ صورتحال کو بگڑنے سے بچایا جاسکے لیکن ہنوز اس پر کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

ستمبر کی رات کو دیوکالی مندر سے تین مورتیاں چوری ہوگئیں۔ان کی حفاظت ۲۱

مندر کے پجاری کی ذمہ داری تھی اس لئے پولس کو چاہئے تھا کہ ان سے تفتیش کرتی لیکن وہ خاموش تماشائی بنا رہی اور ہندو فرقہ پرستوں کو اس کی آڑ میں عوامی سطح پر نفرت و عناد پھیلانے کا موقع دیا۔ اس دوران یوپی بنے گا گجرات اور ایودھیا سے ہوگی شروعات جیسے اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ گورکھ پور سے بی جے پی رکنِ پارلیمان یوگی ادیتیہ ناتھ نے فیض آباد کا دورہ کرکے عوام کو مشتعل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ۲۴ اکتوبر کو درگا کے جلوس پر حملہ کی افواہ اڑا کر فساد شروع کر دیا گیا اور جسے نہایت منظم انداز میں آس پاس کے علاقے میں پھیلایا گیا۔ انتظامیہ کے افسران جائے واردات پر موجود تھے لیکن وہ ظلم و آتشزنی کو روکنے کے بجائے اور فسادیوں کی بلاواسطہ کا ہمنوائی کر رہے تھے۔ جس کے نتیجہ میں خوف ہراس پھیلا اور فساد کے شعلوں نے فیض آباد اور اس کے گرد و نواح کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ایسا ماحول بنا کہ بقول شاعر ؎

اجنبی خوف فضاؤں میں بسا ہو جیسے
شہر کا شہر ہی آسیب زدہ ہو جیسے

تین ماہ کا عرصہ کوئی کم نہیں ہوتا اور اگر اکھلیش نا تجربہ کار تب بھی وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے اس لئے کہ اس طرح کے نازک مسائل میں سماجوادی پارٹی کے قومی صدر ملائم سنگھ کو براہِ راست مداخلت کرنی چاہئے اور حالات

کو قابو سے باہر جانے کی اجازت نہیں دینی چاہئے لیکن ایسا لگتا ہے ملائم سنگھ یا تو مسلمانوں کے حوالے سے یہ سوچ کر بے فکر ہوگئے ہیں کہ ان کے پاس کوئی متبادل نہیں ہے حالانکہ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو یہ ان کی غلط فہمی۔ مسلم رائے دہندگان اپنے ساتھ دغا کرنے والے کو سزا دینے کی خاطر اپنے دشمن کا بھلا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ۔اگرملائم سنگھ کو وزیر اعظم بن جانے کی فکر نے اپنے رائے دہندگان سے غافل کردیا ہے توآئندہ انتخاب میں اترپردیش کے مسلمان ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کردیں گے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہوچکی ہوگی ۔اس صورتحال کا فائدہ نہ صرف بی جے پی اور کانگریس کو بلکہ بہوجن سماج پارٹی کو بھی ہوگا۔

ریاستی حکومت اگراب بھی ہوش کے ناخن لیتی ہے اور اپنی اصلاح کی جانب مائل ہونا چاہتی ہے تواسے چاہئے کہ فیض آباد کے مسلمانوں کی جانب سے پیش کردہ میمورنڈم پر سنجیدگی سے توجہ دے۔ جن لوگوں کا نقصان ہواان کی بھرپائی فوراً ہو اور اس کیلئے فسادیوں سے ہرجانہ وصول کیا جائے۔ انتظامیہ اور مقامی سیاستدانوں کے درمیان جو ناجائز تعلق قائم ہوگیا ہے اس کو توڑا جائے ۔ان وجوہات کا پتہ لگانے کیلئے جو فساد کا سبب بنے تھے سی بی آئی کے ذریعہ جانچ کروائی جائے ۔اس غیر جانبدارانہ جانچ پڑتال کے نتیجہ میں جو لوگ ملزم پائے جائیں ان پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور انہیں کیفرِ

کردار تک پہنچایا جائے۔یہی انصاف کا تقاضہ ہے اور کامیابی کی ضمانت بھی ہے۔ ورنہ ایس پی کے حوالے سے اترپردیش کے مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی یہ شعر کرتا ہے

ہم حقیقت سمجھ رہے تھے جسے
رفتہ رفتہ سراب بنتا گیا

(غزہ: شکست و فتح مرا مسئلہ نہیں ہے فراز (دوسری قسط

اسرائیل اپنے آپ کو دنیا کی دسویں فوجی قوت سمجھتا ہے اور اس حیثیت سے اپنے ناقابل تسخیر ہونے کا گھمنڈ اس کے پراگندہ ذہن میں سمایا ہوا ہے لیکن فلسطینی میزائلوں نے آٹھ روزہ جنگ کے دوران صہیونی فوج کے اس دعوے کی قلعی کھول دی ۔ہوا یوں کہ اسرائیل کے مقبول عبرانی چینل ۲ کا ایک نامہ نگار.براہِ راست خبر رسانی کرتے ہوئے اپنے عقب میں نصب آئرن ڈوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی دفاعی صلاحیت کے گن گارہا تھا اسی دوران خطرے کے سائرن بج اٹھے اور اگلے لمحے آئرن ڈوم بیٹری سے راکٹ شکن میزائل فائر ہوا لیکن شومئی قسمت وہ فلسطینی راکٹ کو فضا میں روکنے کے بجائے زمین بوس ہو گیا اور یہ مناظر یکلخت سارے عالم میں ہوگئے۔ صہیونی نامہ نگار نے اس مضحکہ خیز صورتحال میں اپنی خجالت مٹانے کے لئے اس ناکامی کو تکنیکی خرابی کا نام دے دیا۔ جو کچھ آئرن ڈوم کے ساتھ اس وقت ہوا وہی معاملہ اسرائیل کی حالیہ مہم کے ساتھ بھی ہوا کہ گئے تو تھے نماز بخشوانے اوپر سے روزے گلے پڑ گئے۔

اسرائیل کی فوجی مہم کے تین مقاصد تھے ۔ اول تو اپنی فوجی.برتری کا سکہ جمانا جو آہنی گنبدکے بجائے روئی گالہ نظرآئی بلکہ اس کے برعکس حماس نے

تل ابیب اور یروشلم تک پہنچ کر اپنا بول بالا کر دیا۔ دوسرا مقصد تھا حماس کی حربی طاقت کا خاتمہ کرنا تھا جس میں وہ بھی وہ بری طرح ناکام رہا اس لئے کہ آخری دن بھی حماس نے ۴۰ راکٹ داغے اس سے قبل منگل کو ۲۰۰ گولے پھینکے اور اس میں سے صرف پچاس کو اسرائیل روکنے میں کامیاب ہو سکا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ کروڑوں کی لاگت سے تیار کئے جانے والے آہنی گنبد (آئرن ڈوم) میں اب بھی بے شمار سوراخ ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ پانچ یہودیوں کی ہلاکت کے علاوہ ۱۲۰ لوگ ان حملوں سے زخمی ہوئے اور جو مالی نقصان ہوا سو ہوا۔ جنگ سے قبل یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ کامیابی کی شرح ۹۰ فیصد ہے ابتدائے جنگ میں بتایا گیا صرف ۵۴ فیصد اور اواخر میں اعتراف کیا گیا کہ یہ صرف ۲۵ فیصد ہے گویا دشمنوں کی ہوا اکھاڑنے والوں کی اپنی ہوا اکھڑ گئی ۔ تیسرا مقصد فلسطینیوں کے حوصلے پست کرنا تھا لیکن جس پامردی اور استقامت کا مظاہرہ غزہ کے عوام نے کیا اس سے مغربی کنارے میں رہنے والے عافیت پسند فلسطینیوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے ہیں اور یہ ثابت ہو گیا کہ

یہ نفرتوں کی فصیلیں جہالتوں کے حصار
نہ ٹک سکیں گے ہماری صدا کے رستے میں

یہودی ساری دنیا میں اپنی زر پرستی اور کنجوسی کیلئے مشہور ہیں۔ غزہ پر اسرائیل کی جنگ کے باعث فلسطینیوں کا بے پناہ جانی اور مالی نقصان تو ہوا

لیکن یہ جنگ خود صہیونی ریاست کی معاشی تباہی کا بھی موجب بنی۔ اسرائیل کے سرکاری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ غزہ جنگ کی وجہ سے ملکی معیشت کو یومیہ چالیس کروڑ ڈالر کا نقصان ہوا۔ رپورٹس کے مطابق ان میں سے نصف رقم فلسطینیوں کے راکٹ حملوں کے دفاع کے لیے نصب کردہ میزائل شیلڈ پر خرچ ہوئی۔ مجموعی طور پر ان کی تنصیب میں ملین ڈالر خرچ ہوئے ہیں جبکہ القسام بریگیڈ کے مقامی سطح پر تیار کردہ راکٹوں پر ۲۰۰ تقریباً سو ڈالر کی لاگت آتی ہے۔ مزاحمت کاروں کے پاس سب سے مہنگا راکٹ گراڈ ہے جو تقریباً گیارہ سو ڈالر میں تیار ہوتا ہے جبکہ اسرائیل کو انہیں تباہ کرنے کے لیے
کروڑوں ڈالر خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ غزہ میں حماس کے خلاف تازہ جنگ میں اسرائیل نے چالیس ہزار ریزرو فوج طلب کر رکھی تھی جس پر یومیہ فوج کو سات لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر پھونکنا پڑ رہے تھے۔ اس کے علاوہ ڈرون دیگر جنگی جہاز پر فی گھنٹہ ۱۵۰۰ ڈالر کے اخراجات ہیں۔ اس درمیان مصر نے ترکی سے عنقا نامی دس ڈرون طیارے خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس بار ہمارا اسلحہ کسی دشمن کے کارخانے سے نہیں بلکہ اپنے بھائی کے گھر سے آئیگا اور کوئی بعید نہیں کہ اگلی جنگ میں اسرائیل کا الفجر کے ساتھ عنقا سے بھی پالا پڑے۔

حماس کا اولین مقصد اپنی فوج کو مجتمع رکھنا تھا تاکہ وہ حملوں کا سلسلہ جاری رکھ سکیں اور ایسا ہی ہوا گوکہ اسرائیل کی جانب سے ۱۵۰۰ حملے ہوئے

لیکن حماس نے بھی ۱۴۰۰ راکٹ داغے گئے۔ عوام کا حوصلہ بھی بلند رکھا گیا اور جنوبی اسرائیل سے جس طرح یہودی بھاگ کھڑے ہوئے ویسا منظر غزہ میں نظر نہیں آیا۔
اسرائیل کے بری حملے کی دھمکی کے باوجود لوگ اپنی جگہ جمے رہے انہوں نے ماضی کی طرح اس بار صحرائے سینا کی جانب کوچ کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ حماس نے جنگ بندی کی جو شرائط لگائی تھیں وہ سب کی سب تسلیم کی گئیں اول تو چونکہ جنگ کی ابتدا اسرائیل کی جانب سے ہوئی ہے اس لئے وہی جنگ بندی کی تعمیل شروع کرے۔ بمباری اور ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ بند ہو اور سب سے اہم غزہ کی ناکہ بندی کا خاتمہ ہو۔ صہیونی ریاست غزہ کے شہریوں کی دوسرے علاقوں میں آمد ورفت اور باہمی تجارتی سرگرمیوں پر پابندیاں ختم کرے۔ اسرائیل کو بالآخر اس شرط کے آگے بھی گھٹنے ٹیکنے پڑے اور یہی اس جنگ میں فلسطینیوں کی سب سے اہم کامیابی ہے۔ اس عظیم فتح کو حاصل کرنے کیلئے غزہ کے جیالوں نے ۱۶۴ شہداء کی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔
جنگ بندی کے بعد فلسطین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ حکومت نے جمعرات کو عوامی تعطیل کا اعلان کیا تاکہ لوگ فتح کا جشن اور شہیدوں کے گھر جاکر تعزیت کرسکیں۔ غزہ اور مغربی کنارے کی عوام نے جنگ بندی کو مجاہدین کی فتح قرار دیتے ہوئے مزاحمت کی کامیابی پر مبارکباد پیش کی۔ ادھر شکست خوردہ اسرائیلی وزیراعظم بن یامن نیتن یاہو نے بھی جنگ بندی کے معاہدے کو امریکی

صدر براک اوباما سے مشاورت کے بعد تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ ہم مصری سفارتکاری کو ایک اور موقع دے رہے ہیں۔ نتن یاہو کے انداز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کوئی زہر کا گھونٹ پی رہا ہے اس لئے کہ جن شرائط کو قبول کرنے پر وہ مجبور ہوا ہے اس کے چلتے آئندہ انتخاب میں اس کی کامیابی کے امکانات مفقود ہو گئے ہیں۔

کہاں تو ۶ کروڑ کی آبادی والے ایران سے جنگ کا خواب اور کہاں ۱۶ لاکھ کی آبادی والی محصور ریاست غزہ کے ذریعہ چٹائی گئی دھول ایسے ذلیل و خوار رہنما کو اسرائیلی دوبارہ منتخب کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ اسرائیل حزب اختلاف کے رہنما شاؤل مفاذ نے تسلیم کیا کہ اس موقع پر جنگ بندی میں حماس کا پلہ بھاری ہے۔ ان کی مزاحمت مضبوط ہوئی ہے اور ہم کمزور پڑے ہیں۔

جنگ بندی سے قبل نہایت دلچسپ حالات رونما ہو رہے تھے۔ دس اسلامی ممالک کے وزراء تمام ترخطرات کے باوجود غزہ کی عوام کے ساتھ اپنی یکجہتی کا اظہار کرنے کیلئے نکل کھڑے ہوئے تھے جبکہ اسرائیل کی جانب اس کی حلیفوں میں سے کسی نے رخ نہیں کیا تھا۔ یوروپی ممالک اسرائیل کو دفاع کا حق ہے کا نعرہ لگانے پر اکتفا کرنے کے بجائے غزہ میں شہری ہلاکتوں کی مذمت بھی کر رہے تھے۔ اس صورتحال میں جنگ بندی کی ساری تفصیلات طے ہو جانے کے بعد امریکی خارجہ سکریٹری ہیلری کلنٹن اپنے دیرینہ رفیق کو پرسہ دینے کی غرض سے تل ابیب

پہنچیں اور اپنی مکمل حمایت کا اعلان کیا۔ اس بیچ دو اور واقعات رونما ہوئے۔ جنگ بندی کے اعلان سے چند گھنٹے قبل تل ابیب کی ایک بس میں دھماکے کے نتیجے میں سترہ یہودی زخمی ہو گئے۔ ۲۰۰۶ء کے بعد اسرائیل کے اندر پہلا حملہ تھا۔ اسرائیل نے اسے عام شہریوں کے خلاف دہشت گردانہ حملہ قرار دیا لیکن اسرائیل جہاں فوجی تعلیم لازمی ہے اور کسی بھی شخص کو جنگ کیلئے طلب کیا جا سکتا ہے یہ حملہ نہتے شہریوں پر نہیں بلکہ متوقع فوجیوں پر تھا۔ اسرائیل کے اس الزام نے غزہ میں اس کی بمباری کو آپ سے آپ دہشت گردی کے زمرے میں ڈال دیا جہاں مہلوکین کی بڑی تعداد عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہے۔ اس کے رد عمل میں اسرائیل نے غزہ پر فضائی حملوں میں تیزی پیدا کر دی۔ تشدد کی اس لہر نے جنگ بندی کے امکانات بظاہر معدوم ہو گئے تھے لیکن بس پر یہ حملہ چونکہ ممکنہ طور پر مغربی کنارے سے ہوا تھا اس لئے صہیونی دہشت زدہ ہو کر لامحالہ جنگ بندی کیلئے آمادہ ہو گئے۔ حماس نے اس کی ذمہ داری تو قبول نہیں کی مگر اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ اسرائیلی بربریت کا فطری رد عمل ہے۔ چونکہ عالمی برادری اسرائیلی جارحیت کو روکنے میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر رہی ہے اس لئے فلسطینی تنظیمیں اپنے عوام کے تحفظ کی خاطر سارے ذرائع اختیار کریں گے۔ بقول مظفر حنفی

چاہتا یہ ہوں کہ دنیا ظلم کو پہچان جائے
خواہ اس کرب و بلا کے معرکے میں جان جائے

اس واقعہ سے قبل دارالحکومت تل ابیب میں ایک یہودی نے امریکی سفارت خانے کے ایک سکیورٹی محافظ کو چاقو گھونپ دیا ہے جبکہ دوسرے محافظوں کی فائرنگ کے بعد اس حملہ آور یہودی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس کی عمر اکتالیس ہے اور اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ مجرمانہ ریکارڈ کا حامل ہے۔ مشتبہ حملہ آور منگل کو دن گیارہ بجے کے قریب امریکی سفارت خانے کی جانب چاقو اور خنجر سے مسلح ہو کر آیا۔ اس نے ایک سکیورٹی گارڈ پر چاقو سے حملہ کر دیا اور اس کی ٹانگ پر زخم آئے ۔اس کے بعد محافظین نے حملہ آور پر فائرنگ کر دی۔ ترجمان کے مطابق وہ عرب نہیں ہے اور تل ابیب کے جنوب میں واقع قصبے بیت یام رہتا ہے۔ اس حملہ کی محرک بظاہر یہودیوں کا امریکہ سے وابستہ توقعات کو پورا نہ ہونا ہو سکتا ہے۔ پولیس نے حملہ آور کو حراست میں لے لیا اور تفتیش شروع کر دی جسے گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر ہنوز صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ ان واقعات نے جنگ بندی کے نفاذ میں یقیناً مثبت کردار ادا کیا ہے۔

ہیلری کلنٹن نے تل ابیب کے بعد راملا پہونچیں اور اپنے پٹھو محمود عباس سے ملاقات کی جسے ان حالات نے پوری طرح حاشیہ پر پہنچا دیا تھا۔ لوگ سلمان خورشید کی طرح جو ہندوستان کا ایک مسلم وزیر خارجہ ہے یہ بھول ہی گئے تھے کہ محمود عباس نام کا کوئی فلسطینی رہنما بھی پایا جاتا ہے اور نازک وقت میں

قوم کے کسی کام آسکتا ہے۔ ساری دنیا کی نگاہیں جلاوطن رہنما خالد مشعل پر لگی ہوئی تھیں جنھیں کل تک دہشت گرد قرار دیا جاتا تھا۔ راندۂ درگاہ محمود عباس سے ملاقات کرکے ہیلری نے انہیں اقوام متحدہ میں فلسطین کیلئے غیر رکن درجہ کی تجویز واپس لینے کیلئے کہا اور سمجھایا کہ ایسا کرنے سے امن کی پیش رفت رک جائیگی لیکن نام نہاد امن پسند محمود عباس نے اسے مسترد کردیا اس لئے کہ اب اپنی ڈوبتی ہوئی ساکھ کو بچانے کیلئے اس کے پاس یہی ایک سہارا ہے لیکن یہ محمود عباس کی غلط فہمی ہے کہ اس کے سہارے ان کی نیا پار لگ جائیگی۔ فلسطینی عوام یہ دیکھ چکے ہیں مغرب کے ان سہاروں کی حیثیت مکڑی کے جال سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک ہوا کا جھونکا اسے اکھاڑ پھینکنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔اسرائیلی اہلکار مغربی کنارے میں دندناتے پھرتے ہیں اور جب چاہتے ہیں جسے چاہتے ہیں گرفتار کرکے لے جاتے ہیں جبکہ اسرائیل کی فوج اپنے سارے لاؤلشکر کے ساتھ بھی غزہ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرسکی۔اس لئے اگر عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو حماس کی مانند دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مضبوط بنانا پڑے گا اور یہ عیش پسند بدعنوان الفتح کی قیادت کے بس کی بات نہیں ہے۔ حماس کی قیادت کو اس حقیقت کا ادراک ہے اس لئے خالد مشعل نے عرب ممالک سے فلسطینیوں کے فوجی معاونت کا مطالبہ کیا ہے۔ کتابِ الٰہی میں دشمنوں پر

اپنا رعب قائم رکھنے کی خاطر جنگی گھوڑوں کو تیار رکھنے کی تلقین کا یہی تقاضہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فلسطین میں اس وقت ایک ایسے قومی سیاسی پروگرام کی ضرورت ہے جو مزاحمت کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ گویا فلسطین کے مسئلہ کا حل فی الحال مصالحت میں نہیں بلکہ مزاحمت میں مضمر ہے۔ انہوں نے ذرائع ابلاغ کے سامنے اعتراف کیا کہ جنگ بندی معاہدے میں کامیاب ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فلسطینیوں کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے گئے ہیں بلکہ اسرائیل سے فائر بندی کے بعد اگلے مرحلے میں ہم قومی وحدت اور آپسی مصالحت کا سفر شروع کریں گے لیکن میم اتحاد اور مصالحت کی بنیاد مسلح مزاحمت پر ہونی ہوگی۔ یہی وہ مومنانہ فراست ہے جس سے باطل کے ایوانوں میں لرزہ طاری ہوتا ہے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ اسرائیل تمام تر جارحیت کے باوجود غزہ میں مزاحمتی انفراسٹرکچر کو تباہ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ صہیونی ریاست میں فلسطینیوں کی قوت مزاحمت کو کچلنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ آٹھ روزہ جارحیت کے بعد اسرائیل کا ہماری شرائط کو تسلیم کرنا دشمن کی شکست اور ہماری فتح ہے۔

اس اعلان کے وقت خالد مشعل کے ساتھ فلسطین کی عسکری تنظیم اسلامی جہاد کے مرکزی رہنما رمضان شلح بھی موجود تھے جنھوں نے اعلان کیا کہ وہ جنگ بندی سمجھوتے کی پابندی اسی وقت تک کریں گے جب تک اسرائیل اس کا پابند ہوگا۔ اسرائیل کی جانب سے معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں ہمیں جوابی کارروائی کا حق ہو گا۔ بقول فراز

جو حرفِ حق تھا وہی جا بجا کہا سو کہا
بلا سے شہر میں میرا لہو بہا سو بہا
شکست و فتح مرا مسئلہ نہیں ہے فراز
میں زندگی سے نبرد آزما رہا سو رہا

نتن یاہو نے ہیلری کلنٹن سے کہا کہ بینڈ ایڈ کے ذریعہ اگر مسئلہ حل کرنے کی کوشش جائیگی تو ایک نئے تشدد کا دور پھر شروع ہو جائیگا اس لئے طویل المدتی حل ضروری ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طویل المدتی حل کیا ہے ؟اس سوال کا جواب عرب لیگ کے سربراہ نبیل العربی نے غزہ کے اپنے یکجہتی دورے سے قبل دیا۔ انہوں نے کہا عرب اور اسلامی دنیا کا اصل مسئلہ نا جنگ معاہدہ یا کشت خون کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے سارے دوست ممالک کو چاہئے کہ اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے خاتمے پر توجہ دیں۔ یقیناً یہی اصل مسئلہ ہے اور اس پر حماس کے سربراہ خالد مشعل نے قطر کے امیر، ترکی کے وزیر اعظم اور مصر کے صدر کے درمیان چار فریقی مذاکرات بھی ضرور گفتگو کی ہو گی۔

ایک طرف جہاں مصر کے عوام اور دیگر مسلم وزرائے خارجہ اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے نظر آرہے تھے وہیں دوسری جانب امریکی یہودی اسرائیل سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ایک خبر کے مطابق امریکا نے بڑھتی

ہوئی فلسطین ۔ اسرائیل کشیدگی کے باعث اپنے شہریوں کو علاقے سے بہ حفاظت نکالنے کے لئے تین جنگی بحری جہاز اسرائیل روانہ کر دیے تھے۔ 'سی این این' نے وزارت دفاع پینٹاگون کے حوالے سے بتایا ہے کہ اسرائیل سے امریکی شہریوں کے فوری انخلاء کا امکان نہیں ہے البتہ بحری جہازوں کی روانگی احتیاطی نوعیت کی ہے۔پینٹاگون نے اس تاثر کو مسترد کیا کہ یہ جنگی جہاز کشیدگی میں اضافے کی صورت میں تل ابیب کو فوجی مدد دیں گے۔ اس کے مطابق ان بحری جہازوں کی روانگی کا مقصد صرف امریکی شہریوں کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔اسی کے ساتھ اسرائیل میں موجود امریکی باشندوں کو محتاط رہنے اور کشیدگی کی صورت میں ملک چھوڑنے کی ہدایات بھی جاری کی گئی تھیں۔اس خبر میں ایک تو اسرائیلی اور امریکی شہریوں کی تخصیص اور انہیں اسرائیل سے نکالنے کی تیاری قرآنِ مجید میں بیان کردہ یہودیوں کی موت سے خوف کھانے والی نفسیات کی غماز ہے اور مسلمانوں کا جذبہ جہاد غزوۂ احزاب کے اس منظر کی یاد دلاتا ہے کہ

اور سچے مومنوں (کا حال اُس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ ''یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات بالکل سچّی تھی'' اِس واقعہ نے اُن کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے انہوں نے

(اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (الاحزاب

مصر: مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی

میرے دوستوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو صدر محمد موری سے زیادہ ان کے بہی خواہ ہیں۔ انہیں میں سے ایک نے پچھلے دنوں مجھ سے پوچھا اس بار موری کیسے پھنس (trap) ہو گئے؟ میں نے مسکرا کر کہا تم بچے ہو نہیں سمجھو گے۔ خفا تو وہ پہلے ہی سے تھے میرے اس غیر سنجیدہ جواب نے انہیں آگ بگولا کر دیا اور وہ مجھ پر برس پڑے۔ انہوں نے کہا جب کسی کو جواب نہیں سوجھتا ہے تو وہ اس طرح مخاطب کا مذاق اڑاتا ہے۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا غالباً نادانستہ طور پر میں نے ان کی دل آزاری کر دی تھی۔ ان کا منہ کسی بچے کی طرح پھول گیا تھا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے ان کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ صد فیصد صحیح ہے اس کے باوجود اپنے معصوم دوست کی دلجوئی ضروری تھی اس لئے میں نے کہا بھائی ایک بات بتاو اگر کوئی بچہ بیمار ہو، وہ رونے کیلئے تو منھ کھولے مگر جب دوائی دینے وقت دانتوں پر دانت جمادے تو اس کی ماں کیا کرتی ہے ؟ انہوں نے جواب دیا وہ اس کی ناک دبا کر بند کر دیتی ہے۔ میں نے پوچھا اس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ بولے بچہ سانس لینے کی خاطر منھ کھولتا ہے۔ اچھا تو پھر اسکی ماں کیا کرتی ہے؟ وہ اس بچہ کے منھ میں دوا ڈال دیتی ہے۔اس کے فوراً بعد بچہ کیا کرتا ہے ؟ وہ خوب دہاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے۔ اور اس کے بعد اگر اس دوا

سے بچہ صحت یاب ہو جائے تو کیا ہوتا ہے ؟انھوں نے بالکل کسی بچے کی طرح کہا اس کی ناراضگی دور ہو جاتی ہے۔ میں نے پوچھا جیسے کہ آپ کی خفگی دور ہو گئی ؟ وہ ننھے سے بچے کی طرح ہنس پڑے اور اپنا سوال بھول گئے جیسا کے بچے بھول جاتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا خیر یہ تو اچھا ہوا کہ تمہاری ناراضگی دور ہو گئی لیکن یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں اپنے سوال کا جواب ملا؟ انھوں نے نفی میں سر ہلا کر کہا نا۔ چلئے ہم بچے ہی صحیح اب آپ جواب بھی دے دیں۔ میں نے کہا تمہارے سوال کا جواب اسی مثال میں پوشیدہ ہے۔ مصری عوام انقلاب سے قبل متعدد امراض کا شکار تھی اور ان سب بیماریوں کے جراثیم ایک دوسرے کے حامی و مددگار تھے۔ وہ سب مل کر پوری قوم کو گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔ عوام کے سامنے بجا طور پر ان تمام بیماریوں میں سے سب نمایاں حسنی مبارک کا نامبارک سیاسی اقتدار تھا۔ اس لئے اسکے خلاف بغاوت ہوئی اور لوگوں نے اسے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ کیا۔ اس کیلئے زبردست قربانیاں دیں اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اس دوران جو دوسری بیماریاں تھیں مثلاً فوج، عدلیہ اور ذرائع ابلاغ ان لوگوں نے اس میں اپنی عافیت سمجھی کہ عوام کی تائید کی جائے اور اس کی ہمدردیاں حاصل کر کے بلاواسطہ حسنی مبارک کے اقتدار کو اپنے قبضہ میں لے لیا جائے

۔

حسنی مبارک کے چلے جانے کے بعد فوجی قونصل نے اقتدار سنبھالا اور انتخاب کروا کر عوام کے نمائندوں کو اقتدار سونپنے کا وعدہ کیا۔ انہیں توقع تھی کہ ذرائع ابلاغ کی مدد سے وہ عوام کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور پھر ایک بار بھیڑ کی کھال پہن کر بھیڑیے انتخاب جیت جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ عوام نے پہلے نمبر پر اخوان المسلمون کے تقریباً ۵۰ فیصد نمائندوں کے حق میں رائے دے کر انہیں کامیاب کیا اس کے بعد دوسرے نمبر پر سلفی جماعت النور کو ۲۷ فیصد نمائندوں نے عوام کا اعتماد حاصل کیا اور سب نیچے ملے ساری سیکولر جماعتوں نے مجموعی طور پر ۲۵ فیصد سے کم کامیابی حاصل کی ۔ایک بیمار یسے مکمل افاقہ ابھی ہوا نہیں تھا کہ صدارتی انتخاب کی باری آئی تو اخوان کے امیدوار شاطر عدالت کی نظر میں نااہل اور حسنی مبارک کے وزیراعظم شفیق اہل تر ٹھہرے۔ اس کے باوجود جب مورسی کی کامیابی کے امکانات واضح ہو گئے تو فوجی قونصل نے راتوں رات دستور میں ترمیم کرکے سارے اختیارات کو ہڑپ کر لیا۔

دستوری عدالت میں ایک دعویٰ پارلیمانی انتخاب کے حوالے سے اور دوسرا دستور کے ساتھ کھلواڑ کے خلاف داخل ہوا۔ عدالت نے فوجی دھاندلی کو تو حق بجانب قرار دیا مگر عوامی انتخاب کو تکنیکی بنیاد پر کالعدم ٹھہرا دیا۔ یہ عجیب و

غریب صورتحال تھی جس میں عوام کی منتخبہ پارلیمان گھر بھیج دیا گیا تھا اور عوام کی مرضی سے منتخب ہونے والے صدر کو بے دست و پا کردیا گیا تھا۔ سیکولر جماعتوں نے عدالت کے ذریعہ کی جانے والی اس ناانصافی کی خاموش تائید کی اس لئے کہ اس سے ان کا سیاسی مفاد وابستہ تھا۔ وہ عوام کی عدالت میں حاصل ہونے والی اپنی شکست کو عدالت کی دھاندلی سے فتح میں بدلنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد مصر کی سرحد پر چند دہشت گردوں نے فوج کے اہلکاروں پر حملہ کیا اور اسرائیل کی جانب فرار ہوگئے۔ ذرائع ابلاغ نے صدر موسی کی کمزور قیادت کو اس حملے کیلئے موردِ الزام ٹھہرادیا اور فوج کی واپسی کے حق میں ہوا بنانے میں لگ گیا۔

صدر محمد موسی نے اس وقت نہایت جرأتمندی کا ماحصرہ کرتے ہوئے اپنا اولین صدارتی حکمنامہ جاری کیا جس میں دستور کی ان شقوں کو جسے فوج نے عوامی نمائندوں کے حقوق پر شب خون مارنے کیلئے وضع کیا تھا مسترد کردیا اور ایک ایک کرکے سارے اہم فوجی عہدیداروں کو سبکدوش کردیا۔ حزب اختلاف کے ساتھ ساتھ عدلیہ اورذرائع ابلاغ نے اس کے خلاف بھی شور مچایا اور مصر میں آمریت کی آمد کا خدشہ ظاہر کرنا شروع کردیا۔ اس موقع پر محمد موسی نے فوج سے اور عدالت سے مقابلہ آرائی کو ٹال دیا۔ عدلیہ سے انہوں نے کہا کہ وہ ایک انتظامی فیصلہ میں تبدیلی کررہے ہیں جس کا انہیں اختیار ہے اور فوجیوں کو

اعزاز و تکریم کے ساتھ رخصت کیا جس سے سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔ گویا دو بیماریوں کا علاج ہو گیا لیکن عدلیہ کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ صدر موری ان سے خائف ہیں۔

دستور سازی کیلئے ایک نمائندہ کمیٹی بنائی گئی تھی جس میں تمام مکاتبِ فکر کو نمائندگی دی گئی تھی لیکن اس میں سیکولر حضرات نے اڑیل رویہ اختیار کر لیا اور اسلام پسندوں کی دھاندلی کا شور مچا کر ایک کے بعد ایک مستعفی ہونے لگے۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ ہماری مانو ورنہ ہم چلتے ہیں۔ ایسا تو دنیا کسی اقلیت نے نہیں کیا ہوگا کہ ہم نہ بحث کریں گے۔ نہ اپنی بات سمجھائیں گے نہ آپ کی بات سمجھیں گے۔ بس اپنی بات منوائیں گے یا اٹھ کر چلے جائیں گے۔ ان کے اس رویہ کے پس پشت عدلیہ اور ذرائع ابلاغ کا اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا ان کی ہر دھاندلی کو ذرائع ابلاغ میں حق بجانب ٹھہرایا جائیگا۔ انہیں مظلوم اور عوام کے حقیقی نمائندوں کو ظالم بنا کر پیش کیا جائیگا نیز جب یہ دستور بن جائیگا تو اسے عدالت میں چیلنج کردیں گے اور عدالت اسے سابقہ دستور کی خلاف ورزی قرار دے کر مسترد کردے گی اس لئے کہ دستور کے مطابق اس دستوری کمیٹی میں سبھی کی نمائندگی ضروری تھی۔ عدالت کمیٹی کے ناقص ہونے اعلان تو کرے گی لیکن جو لوگ اس میں سے نکل کر چلے گئے ان سے نہیں پوچھے گی کہ تم نے فرار کی راہ کیوں اختیار کی۔ یہ سراسر بلیک میلنگ کا

طریقۂ کار تھا کہ ہماری مانو ورنہ دستور نافذ نہ ہوگا۔ اس طرح عوام پر انکے مسترد شدہ لوگوں نے اپنی مرضی تھوپنے کی سازش رچائی تھی۔

مصر کی حزب اختلاف نے عدلیہ کے ساتھ مل کر یہ حکمتِ عملی بنائی تھی کہ ہم آئندہ انتخاب تک اس حکومت اور صدر کچھ کرنے نہیں دیں گے اور اس کے بعد عوام میں یہ نعرہ لگا کر جائیں گے کہ یہ نااہل لوگ تھے ۔ تم نے اقتدار ان کے حوالے کرکے غلطی کی تھی اس لئے اپنی غلطی کا کفارہ اس طرح ادا کرو کے کہ ہمارے ہاتھ میں اقتدار سونپ دو۔ اس جھوٹ کو سچ بنانے کیلئے زرخرید ذرائع ابلاغ تو موجود ہی ہے لیکن ان کی اس چال کے برعکس اسلام پسند بلا مشتعل ہوئے دستور سازی کے اپنے کام میں لگے رہے اور جب یہ تیار ہوگیا تو پیش بندی کے طور پر محمد موری کو ایک اور حکم نامہ جاری کرنا پڑا۔ اس حکم نامہ میں حسنی مبارک کے ہمنواؤں پر جنھیں عدالت نے رہا کردیا تھا دوبارہ مقدمہ قائم کرنے کی بات کی گئی تھی ۔ اسی کے ساتھ صدارتی احکامات کو دستور کے نافذ ہونے تک عارضی طور پر چیلنج کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا اور دستور ساز کمیٹی سے نکل جانے والے ارکان کو نئے ارکان سے بدلنے اختیار صدر کو دیا گیا تھا۔

اس صدارتی فرمان کی تینوں شقوں نے مخالفین کی ساری چالوں کو یکلخت ملیا میٹ کردیا۔ اب مخالفین کیلئے دستور ساز کمیٹی سے فرار ہونے کا دروازہ بند ہوگیا اس لئے کہ بصورت دیگر ان کے مخالف کا اس کرسی پر بیٹھنا ممکن ہو گیا

۔ یہ اس قدر فطری بات ہے کہ اگر کوئی دستور ساز کمیٹی کا رکن اپنی ذمہ داری ادا کرنے سے انکار کردے تو اس کا بدلنا ضروری ہے اور ایسا کرنے کیلئے مناسب ترین شخص عوام کی رائے سے منتخب ہونے والا صدر ہی ہو سکتا ہے۔ حسنی مبارک کے ساتھیوں کے خلاف مقدمات کو قائم کرنے کا مطالبہ بہت سارے انقلابی کرتے چلے آئے تھے ان کیلئے اس حکمنامے کی اس شق کی مخالفت ناممکن ہو گئی۔ اس کے باعث مخالفین کے صفوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب برداعی جیسے لوگوں نے شفیق کو ساتھ لیا تو انقلابی نوجوان ان سے برگشتہ ہو گئے اور اسلام پسندوں کے خلاف قائم ہونے والا سیاسی اتحاد چرمرا گیا۔

تیسری شق کے بغیر دستور کا نافذالعمل ہونا ناممکن تھا اس لئے کہ عدالت تو اسے مسترد کرنے کیلئے تیار بیٹھی تھی۔ اس سے قبل اختیار کئے جانے والے رویہ سے اس نے اپنی جانبداری کے کئی شواہد پیش کر چکی تھی۔ اسی لئے ایک سمجھدار ماں کی طرح صدر موری اس بچے کی ناک دبائی تاکہ وہ اپنا منھ کھولے اور کسی طرح وہ دوائی اس کے گلے سے نیچے اترے۔ ابھی یہ لوگ شور مچا ہی رہے تھے کہ دستور کو عوام کے سامنے ریفرنڈم کیلئے پیش کر دیا گیا اور اسٹیفنی ٹائر سمجھے جانے والے موری نے مخالفین کے پہیے سے ہوا نکال دی۔ جو لوگ محمد موری کو ایک کمزور صدر کہتے تھے انہوں نے غزہ کے حالیہ بحران کے دوران دیکھ لیا کہ طاقتور سربراہ مملکت کیسا ہوتا ہے؟

حزب اختلاف کو اگر اس دستور سے اختلاف ہے تو اسے چاہئے کہ وہ عوام کو جا کر سمجھائے تاکہ وہ اس کے خلاف اپنی رائے دیں۔ اگر عوام اسے مسترد کر دیتے ہیں تو اپنے آپ وہ کام ہو جائیگا جو وہ چاہتے ہیں لیکن انہیں پتہ ہے ایسا نہیں ہوگا۔ جس دستور کے حق میں پہلے اور دوسرے نمبر کی جماعت ہو اسے تیسرے نمبر کا غیر متحد الحاق کیونکر ناکام بنا سکتا ہے اس لئے یہ لوگ عوام میں جانے کے بجائے ٹی وی کیمروں کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔استصواب کے اعلان نے حزب اختلاف کیلئے ایک بڑی مصیبت کھڑی کردی ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ وہ صدارتی فرمان واپس ہو جس سے صدر کو عدالت پر عارضی برتری حاصل ہو گئی ہے اس کیلئے یہ لوگ تحریک توچلاتے ہیں مگر ریفرنڈم سے گھبراتے ہیں جس کے بعد صدارتی اختیارات کاآپ سے آپ خاتمہ ہو جائے گا۔ ریفرنڈم کے بائیکاٹ سے دستور زیادہ اکثریت سے کامیاب ہوگا ورنہ کم اکثریت سے۔

ایک سوال یہ ہے کہ قدیم دستور سے دستوری عدالت کی محبت اور نئے دستور سے دشمنی کی وجہ کیا ہے؟مصر کاسب سے بنیادی مرض یہی دستور ہے جو حسنی مبارک کے دور کی آخری یادگار ہے جس کی مدد سے عدلیہ عوام اور ان کے نمائندوں کو ان کے حقوق سے محروم کرکے سیاہ و سفید کے مالک بن گیاہے۔جب یہ استحصالی دستور ہی نہیں رہے گا اور عوام کی مرضی سے ایک نیا دستور نافذالعمل ہو جائیگا تو

لامحالہ عدالتیں اس نئے دستور کے مطابق فیصلے کرنے پر مجبور ہو جائیں گی اور ان کے لئے عوام کے بنیادی حقوق کو سلب کرنا ناممکن ہو جائیگا۔ یہ ظالم یہی نہیں چاہتے اسی لئے ایک طرف عدالت نے ہڑتال کر رکھی ہے اور دوسری جانب ذرائع ابلاغ کے ایک حصہ نے اپنا کام بند کر رکھا ہے لیکن ایسا کرکے یہ لوگ خود اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے کا کام کر رہے ہیں۔

دنیا بھر میں یہ ہوتا ہے کہ عدالت اور ذرائع ابلاغ بڑی حد تک غیر جانبدار ہوتے ہیں یا کم از کم وہ اس کی اداکاری تو کرتے ہی ہیں۔ اس لئے کہ اگر ذرائع ابلاغ غیر جانبدار نہ ہو تو وہ حزبِ اقتدار اور اختلاف کی بات انصاف کے ساتھ لوگوں تک پہنچا نہیں سکتا اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو عوام کا اس پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ عوام جس ذرائع ابلاغ پر بھروسہ نہیں کرتے اس کی دوکان اپنے آپ بند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عدالت کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو اس کے بغیر وہ مخالف فریقوں کے درمیان انصاف نہیں کر سکتی۔ جب عدالتیں انصاف کے بجائے ناانصافی کی علمبردار بن جائیں تو لوگ ان سے رجوع کرنا بند کر دیتے ہیں اور ایسی عدالتوں کا عارضی طور کام بند کر دینا قوم کیلئے زحمت کے بجائے رحمت بن جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک وقتی چیخ پکار ہے جو بچہ دوائی کے کڑوے پن کی بناء پر کرتا ہے لیکن جب دوا اپنا کام کر جاتی ہے تو سب کچھ معمول پر آجاتا ہے۔ ویسے

اگر کوئی معصوم بچہ شور مچائے تو اسے نادان کہا جاتا ہے لیکن اگر کوئی بالغ جانتے بوجھتے ایسی حرکت کرے تو اسے بدمعاش کہتے ہیں۔ مصر عدالتیں اور حزب اختلاف کس قدر معصوم ہیں یا کتنے بدمعاش اس کا فیصلہ عوام ۱۵ دسمبر کے استصواب میں کر دیں گے۔
صدر محمد موری نے اسی قلم سے عدلیہ کا سر قلم کیا جسے اس نے صدر کا اس عوام کا سر قلم کرنے کیلئے سان پر چڑھا رکھا تھا جن کا وہ نمائندہ ہے اس قلم کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ

مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دوہرا نقاب رکھتا ہے
مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے

فلسطین: یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے (قسط اول)

ارضِ فلسطین سے آنے والی حالیہ دو خبروں کو اس دور کا مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکے گا ۔اول تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فلسطینی ریاست کی غیر رکنی مبصرانہ شرکت اور دوسرے پینتالیس سال کی طویل جلاوطنی کے بعد حماس کے رہنما خالد مشعل کی غزہ میں آمد۔ گزشتہ سال جب محمود عباس نے فلسطین کو اقوام متحدہ کا رکن ملک بنانے کی کوشش کی تھی تو اسے امریکہ نے ویٹو کرکے ناکام بنا دیا تھا۔اس کے بعد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فلسطین کو غیر رکن مبصر ریاست کا درجہ دینے کی درخواست دی گئی ۔اس قرارداد کی ۱۹۳ ممالک میں سے فرانس، روس، چین، جنوبی افریقہ اور بھارت سمیت ۱۳۸ ممالک نے حمایت کی اور اسرائیل کی مدد صرف امریکہ اور کینیڈا جیسے ۹ ممالک نے کی جبکہ برطانیہ سمیت ۴۱ ممالک نے غیر حاضر رہ کر اپنی منافقت کا اظہار کیا، اس طرح فلسطین کو زبردست اکثریت سے ویٹیکن کی مانند غیر رکن مبصر کا درجہ مل گیا۔

اس موقع پر قوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے صدر محمود عباس نے کہا" ۶۵ سال قبل آج ہی کے دن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے فلسطین کو ۲ حصوں میں تقسیم کیا تھا اور اسرائیل کو پیدائش کا

سرٹیفکیٹ دیا تھا، اب وقت آگیا ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کو پیدائش کا سرٹیفکیٹ جاری کرے'' اس قرارداد کی منظوری سے ریاستِ فلسطین کو''پیدائشی سرٹیفکیٹ'' تو یقیناً مل گیا ہے لیکن فلسطینی عوام اب بھی اپنے پیدائشی حق یعنی آزاد وخود مختار ریاست سے محروم ہیں۔جس بدن وہ آزادی کا سورج طلوع ہوگا فلسطین اقوام متحدہ کا رکن بن جائیگا۔ رائے دہی سے قبل اسرائیل کے چند اتحادیوں مثلاً امریکہ اور برطانیہ نے محمود عباس پر شدید دباؤ ڈالتے ہوئے قرارداد کے متن کو تبدیلی کرکے اسرائیل کے ساتھ غیر مشروط گفتگو اور اسرائیلی توثیق کے بغیر اقوام متحدہ کے دیگر اداروں کی رکنیت کیلئے درخواست نہ دینے کا مطالبہ کیا لیکن انہیں مسترد کردینے کے باوجود فلسطین کا غیر رکن مبصر ریاست کے درجہ پر فائز ہوجانا فلسطینی عوام کی عظیم سفارتی کامیابی اور امریکہ واسرائیل کی ذلت آمیز شکست ہے۔ اسی لئے امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے اسے بدبختی قرار دیا۔

صدر محمود عباس نے اپنی تقریر میں اسرائیل کی پیدائش کے بارے میں تو بتلایا لیکن اس آشنائی کا ذکر نہیں کیا جس کے نتیجے میں اسرائیل نامی ناجائز اولاد کا جنم ہوا۔ اتفاق سے اس کا پردہ فاش بھی کا ماہ نومبر میں ہوا تھا۔ یہ صہیونی یہودیوں اور برطانوی مسیحیوں کی درمیان پیدا ہونے والا ناجائز رشتہ تھا جواسرائیل کی پیدائش کا سبب بنا تھا۔ برطانوی سامراج کے صہیونیت نواز وزیر خارجہ آرتھر جیمز بالفور نے دونومبر ۱۹۱۷ء کو صہیونی لیڈر لارڈ روتھس

چائلڈ کو ایک خط میں صہیونی یہودیوں کی (اپنے قومی وطن سے متعلق) خواہشات سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور سرزمین فلسطین پر یہودیوں کے قومی گھر (نیشنل ہوم) کے قیام کا یقین دلایا۔ اس خط کو "بالفور اعلامیہ" کہا جاتا ہے اور یہودی اسے اسرائیل کے قیام کی بنیاد بتاتے ہیں۔ حالانکہ اس اعلامیے میں فلسطین کی غیر یہودی عوام کے شہری اور مذہبی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔

بالفور اعلامیے کا ایک مخصوص سیاسی پس منظر ہے جس نے ازلی دشمن عیسائیوں اور یہودیوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں فلسطین خلافت عثمانیہ کے زیر انتظام تھا اور مصر برطانوی سامراج کے زیر تسلط تھا۔ جرمنی و ترکی متحدہ طور پر برطانوی و امریکی اتحاد سے برسرپیکار تھے۔ جنوری ۱۹۱۵ء میں ترکی افواج نے مصر کے علاقے نہر سوئز اور وادئ سینا پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے بعد برطانیہ کو فلسطین کی اسٹریٹجک اہمیت کا اندازہ ہوا۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر صہیونی رہنما سر ہربرٹ سیموئیل نے برطانوی کابینہ کے سامنے فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کی تجویز پیش کی تاکہ مشرق وسطیٰ میں برطانوی مفادات کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ بعد میں یہ افواہ اڑائی گئی کہ جرمنی بھی صہیونی تحریک کو منانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے دباؤ میں آ کر برطانیہ کے صہیونیت نواز وزیر اعظم نے امریکی صدر ووڈرو

ولسن کے مشورے سے آرتھر بالفور کے خط کو عام کردیا۔ اس پر بعد میں فرانس اور اٹلی کی توثیق حاصل کی گئی اور پھر ۱۹۲۰ء کے معاہدہ سان ریمو میں اسے شامل کیا گیا۔ جولائی ۱۹۲۲ء میں اس وقت کی اقوام متحدہ یعنی لیگ آف نیشنز نے فلسطین مینڈیٹ کے نام پر تیس سال کیلئے فلسطین کا علاقہ برطانیہ کے حوالے کیا اور امریکی ایوان (کانگریس) نے ایک قرارداد منظور کرکے فلسطین میں یہودی نیشنل ہوم (قومی گھر) کے قیام کی حمایت کی۔ اسی کے ساتھ سر ہربرٹ سیموئیل کو اپنی تجویز پر عملدرآمد کرنے کی خاطر فلسطین میں برطانیہ کا سفیر بنا کر روانہ کردیا گیا۔

برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے ۱۹۲۲ء میں جاری کردہ قرطاس ابیض میں اس بات کی وضاحت کی کہ فلسطین میں یہودیوں کے قومی گھر سے مراد کوئی علیحدہ مملکت نہیں بلکہ ثقافتی اعتبار سے یہودیوں کی خود مختاری ہے۔ اس طرح گویا یہودیوں کی فلسطین کی جانب نقل مکانی کی راہ کھولی گئی۔ ۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت نے ایک اور قرطاس ابیض میں یہودیوں کے ذریعہ فلسطینی زمین خریدنے پر پابندی عائد کردی۔ بالفور اعلامیے کے وقت یہ بات یقینی تھی کہ فوری طور پر فلسطین کی عرب اکثریت پر یہودیوں کا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا لیکن وقت کے ساتھ فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت ہو جائیگی اور یہ اعلامیہ بالآخر یہودی ریاست پر منتج ہوگا گویا ایک منظم سازش کے تحت مغرب نے اپنے اور صہیونیوں کے

مشترکہ مفادات کے تحفظ کی غرض سے فلسطین میں یہودی ریاست کا ناپاک شجر لگایا۔
چونکہ اسرائیل کا ناپاک وجود بذاتِ خود مغربی و صہیونی استحصال کا سب سے موثر ہتھیار ہے اس لئے فلسطینیوں کے حقوق کی بحالی کیلئے اس شجر خبیثہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ناگزیر ہے۔

۱۹۱۷ء میں یہودیوں کے پاس فلسطین کی صرف ۲.۷ فیصد اور مسلمانوں کے پاس ۹۷.۵ فیصد زمین تھی۔ اس وقت فلسطین کی کل آبادی سات لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جن میں پانچ لاکھ چوہتر ہزار فلسطینی عرب مسلمان، ستر ہزار عرب عیسائی اور چھپن ہزار عرب یہودی شامل تھے ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک فلسطینیوں پر قتل عام اور ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اور بیدردی کے ساتھ انہیں اُن کی زمینوں سے بے دخل کرکے دنیا بھر سے یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسایا گیا اس کے باوجود برطانوی انتداب کے خاتمہ پر یہودیوں کی تعداد فلسطین کی کل آبادی کی ۳۳ فی صد سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود امریکہ و برطانیہ کے زیر اثر اقوام متحدہ نے فلسطین میں برطانوی انتداب (مینڈیٹ) ختم کرتے ہوئے ۶۵ برس قبل ۲ نومبر ۱۹۴۷ء کے دن فلسطین کو اسرائیل اور فلسطین کے نام سے دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کردیا اور فلسطین میں عربوں کی غیر معمولی اکثریت کو نظر انداز کرتے ہوئے مسلمانوں کو صرف ۴۴ فیصد علاقہ دیا جبکہ یہودیوں کو ۵۶ فیصد رقبہ عطا کردیا گیا۔ اقوام متحدہ کے یہودیوں کے حق میں اس غیر

منصفانہ فیصلے کو بھی اسرائیل نے قبول نہیں کیا اور برطانوی فوجوں کی واپسی کے بعد فلسطین کے بیشتر علاقوں پر بزورِ قوت قبضہ کر لیا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ نے اس توازن کو اس طرح بگاڑا کہ ۷۸ فیصد علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا اور صرف ۲۲ فیصد مسلمانوں کے پاس بچا لیکن اسرائیل کی توسیع پسندی اس کے بعد بھی جاری رہی ۱۹۹۵ء آنے تک یہ صورتحال بنی کہ یہودی ۹۰ فیصد علاقے پر قابض ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے پاس صرف ۱۰ فیصد علاقہ رہ گیا تھا۔ اوسلو معاہدے کے بعد ۳ فیصد واپس ہوا اس طرح مسلمانوں کے جزوی اقتدار میں فی الحال ۱۳ فیصد علاقہ تک محدود ہے۔

سرزمینِ فلسطین پر صہیونی ریاست کا قیام اور خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے منسلک سانحات ہیں۔ ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں جبکہ خلافت عثمانیہ بے حد کمزور ہو چکی تھی اور ترکی مالی طور نہایت خستہ حال و مقروض ہو چکا تھا، سلطان عبدالحمید سے یہودیوں کے ایک وفد نے ملاقات کر کے پیش کی کہ '' اگر آپ بیت المقدس اور فلسطین ہمیں دے دیں تو ہم خلافت عثمانیہ کا سارا قرضہ اتار دیں گے اور مزید کئی ٹن سونا بھی دیں گے '' اس گئے گزرے دور میں بھی خلیفہ عبدالحمید کی دینی حمیت نے اسے گوارہ نہیں کیا اور انھوں نے اپنے پاؤں کی انگلی سے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' اگر اپنی ساری دولت دے کر تم لوگ بیت المقدس کی ذرا سی مٹی بھی مانگو گے تو ہم

نہیں دیں گے'' اس وفد کا سربراہ ایک ترک نژاد یہودی قرہ صوہ آفندی تھا۔ اس واقعہ کے بعد خلافت عثمانیہ کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، چناں چہ چند برسوں بعد جو شخص مصطفیٰ کمال پاشا کی طرف سے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کا پروانہ لے کر خلیفہ عبدالحمید کے پاس گیا تھا وہ قرہ صوہ آفندی ہی تھا۔

خلیفہ سلطان عبدالحمید یہودیوں کی فطرت اور ان کے عزائم سے پوری طرح واقف تھے اسی لئے انہوں نے دگرگوں حالات میں بھی فلسطین کے اندر یہودیوں کی بازآبادکاری کے معاملے میں نہایت غیر لچکدار رویہ اختیار کیا اور اس بابت مصالحت کرنے کے بجائے اپنے اقتدارا کو قربان کردیا۔ اس امر کا شاہد مندرجہ ذیل مکتوب ہے جو انہوں نے اپنے مرشد شیخ آفندی کو لکھا تھا :

جناب والا! میں یہ بات صاف صاف بتانا چاہتا ہوں کہ میں امت مسلمہ کی خلافت'' کی ذمہ داریوں سے از خود دست بردار نہیں ہوا، بلکہ مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یونینسٹ پارٹی نے میرے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ مجھ پر بہت زیادہ اور ہر طرح کا دباؤ ڈالا گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں، مجھے دھمکیاں بھی دی گئیں اور سازشوں کے ذریعے مجھے خلافت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ یونینسٹ پارٹی نے پہلے تو مجھ پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالا کہ میں مقدس سرزمین فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت کے قیام سے اتفاق کرلوں۔ لیکن تمام دباؤ کے باوجود میں نے اس مطالبے کو ماننے سے صاف انکار کر

دیا۔ میرے اس انکار کے بعد ان لوگوں نے مجھے ایک سو پچاس ملین اسٹرلنگ پاؤنڈ کا سونا دینے کی پیش کش کی۔ میں نے اس پیش کش کو بھی یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ ایک سو پچاس ملین اسٹرلنگ پاؤنڈ تو ایک طرف، اگر تم یہ کرۂ ارض سونے سے بھر کر پیش کرو تو بھی میں اس گھناؤنی تجویز کو نہیں مان سکتا۔ ۳۰ سال سے زیادہ عرصے تک امت محمدیہ کی خدمت کرتا رہا ہوں۔ اس تمام عرصے میں، میں نے کبھی اس امت کی تاریخ کو داغ دار نہیں کیا۔ میرے آباواجداد اور خلافت عثمانیہ کے حکمرانوں نے بھی ملت اسلامیہ کی خدمت کی ہے، میرے صاف انکار کرنے کے بعد مجھے خلافت سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مجھے اس فیصلے کو قبول کرنا پڑا، کیوں کہ میں خلافت عثمانیہ او رملت اسلامیہ کے چہرے کو داغ دار نہیں کر سکتا تھا۔ دورِ خلافت میں فلسطین کے اندر یہودیوں کی قومی حکومت کا قیام ملت اسلامیہ کے لیے انتہائی شرم ناک حرکت ہوتی اور دائمی رسوائی کا سبب بنتی۔ خلافت ختم ہونے کے بعد جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ میں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہوں اور ہمیشہ اس کا شکر بجالاتا ہوں کہ اس رسوائی کا داغ میرے ہاتھوں پر نہیں لگا۔"

خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو جانے کے ۲۵ سال بعد فلسطین میں یہودی مملکت اسرائیل کا قیام عمل میں آیا اور جس ترکی "خلیفہ" نے ہر طرح کی لالچ اور دھمکیوں کے باوجود یہودیوں کو فلسطین کی رتی بھر زمین دینے سے انکار کر دیا تھا اسی

کے ہم وطن بے دین حکمرانوں نے اسرائیل کو تسلیم کرکے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے میں سارے مسلم ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس افسوس ناک صورتحال پر مظفر رزمی کا یہ شعر ہو بہو صادق آتا ہے

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا تاریخ کا جبر دم توڑ رہا ہے اور ایک صدی پر محیط سزا مکمل ہوا چاہتی ہے۔ جس ملک نے اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار کی تھی اسی نے سب سے پہلے اقوام متحدہ میں غیر رکن مبصر مملکت کی حیثیت حاصل کرنے کے بعد فلسطینی صدر محمود عباس کو اپنے ملک کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر محمود عباس نے ترکی قومی اسمبلی سے بھی خطاب کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ میں فلسطین کی بطور مبصر رکنیت قبول کروانے میں کی جانے والی ترکی کی کوششوں کا شکریہ ادا کیااور کہا کہ ہمارے آگے ایک طویل اور کٹھن راستہ ہے۔ ہم ایک آزاد اور خود مختار فلسطینی ریاست کے قیام کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطاب میں ترکی سمیت عالمِ اسلام سے غزہ کا محاصرہ ختم کروانے کے سلسلے میں مدد کی اپیل کی اور غزہ کی آزادی کیلئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے ترک اور فلسطینی شہداکے لیے دعائے مغفرت بھی کی۔

صدر عباس نے نئی یہودی بستیوں کی آبادکاری کو روکنے سمیت جیلوں میں بند فلسطینی

قیدیوں کو رہائی کا مطالبہ بھی کیا۔ ترکی کے صدر عبداللہ گل اور وزیر اعظم رجب طیب اردوان سے ملاقات کے دوران مشرق وسطیٰ میں امن کے حوالے سے بھی بات چیت ہوئی نیز ترکی اور فلسطین کے مابین باہمی تعاون کے امور پر غور کیا گیا۔ اقوام متحدہ میں قرار داد کی منظوری کے بعد اسرائیل کی انتقامی کاروائیاں بھی ان مذاکرات کے ایجنڈے میں شامل تھیں۔

اسرائیلی وزیر اعظم بن یامین نتن یاہو فی الحال انتخابات کے دہانے پر کھڑا ہوا ہے۔ ایسے میں اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے اس نے کہا کہ ''اقوامِ متحدہ میں ہونے والا فیصلہ، زمینی حقائق نہیں بدلے گا بلکہ اس سے فلسطینی انتظامیہ کی ترقی مزید تاخیر کا شکار ہو گی''۔ ان ناپاک عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اسرائیلی وزیر خزانہ نے اس سال فلسطینیوں کے لیے جو ٹیکس وصول کیا گیا ہے اسے واپس نہ کرنے کا فیصلہ سنا دیا جو سراسر ظلم اور بے ایمانی ہے۔ اسرائیلی حکمراں یہ بھول رہے ہیں کہ غیر رکن مبصر کی حیثیت حاصل کرنے کے بعد اب فلسطین بین الاقوامی عدالتِ انصاف میں اس حق تلفی کے خلاف مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ ان معاشی جرائم کے علاوہ اوسلو معاہدے کو پامال کرتے ہوئے اسرائیل کی حکومت نے مغربی کنارے کے مقبوضہ علاقوں میں یہودیوں کی خاطر مزید ۳۰۰۰ ہزار مکانات کی تعمیر کا اعلان کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بین الاقوامی سطح پر پہلے ہی سے الگ تھلگ پڑی ہوئی صہیونی ریاست کو اپنے

حلیفوں کی لعن طعن کا شکار ہونا پڑا۔

امریکہ کے علاوہ برطانیہ اور فرانس نے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں یہودی بستیوں کی تعمیر میں توسیع پر احتجاج کے لیے اپنے ملک میں موجود اسرائیلی سفراء کو طلب کیا۔ لندن میں اسرائیلی سفیر کی طلبی سے قبل برطانوی دفتر خارجہ نے ایک بیان میں کہا کہ اسرائیل کے یہودی بستیوں کی تعمیر میں توسیع کے منصوبے کے خلاف سخت رد عمل پر ''غور کیا جا رہا ہے'' بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ ''ہم اسرائیلی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ ہم نے اسرائیلی حکومت کو بتا دیا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد کیا تو اس کا سخت رد عمل ہو گا''۔ ساتھ ہی فرانس نے پیرس میں اسرائیلی سفیر کو طلب کرکے یہودی آبادکاروں کے لیے نئے مکانوں کی تعمیر کے منصوبے پر احتجاج کیا۔ یوروپی یونین کے علاوہ جرمنی کی چانسلر نے بھی اسرائیل کو اس مہم سے باز رہنے کی تلقین کی۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے ایک بیان میں خبردار کیا کہ اگر اسرائیل نے یہودی بستیوں میں توسیع کے منصوبے پر عمل درآمد کیا تو اس کے گہرے مضمرات ہوں گے۔ اسرائیل کے سابق وزیراعظم یہود اولمرٹ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ نئے مکانوں کی تعمیر کے اعلان نے اسرائیل کو غیر معمولی سفارتی تنہائی کا شکار کر دیا ہے۔ اولمرٹ کے مطابق جنرل اسمبلی میں زبردست تھپڑ کے

بعد اس اقدام کی اسرائیلی عوام کو بہت بڑی قیمت چکانی ہو گی۔ یہود اولمرٹ کی بات ممکن ہے نتن یاہو کی سمجھ میں نہ آئے لیکن گزشتہ انتخاب میں چونکہ اولمرٹ خود اس طرح کی حماقت کرکے اس کی قیمت چکا چکے ہیں اس لئے اس کی زبان پر گویا رزمی کی اسی غزل کا مطلع ہے

اس راز کو کیا جانیں ساحل کے تماشائی
ہم ڈوب کے سمجھے ہیں دریاؤں کی گہرائی

(خالد مشعل: فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے (قسط دوم

ملکِ فلسطین کے مشرق میں دریائے اردن بہتا ہے اس لئے اس سے متصل علاقہ غربِ اردن یا مغربی کنارہ کہلاتا ہے جبکہ مغرب کی جانب بحیرۂ روم کا ساحل ہے جس پر غزہ کی پٹی واقع ہے۔ یہودی سوچتے ہوں گے غربِ اردن کے لوگ میٹھے پانی کے پروردہ ہونے کے باعث شیریں زبان ہیں اور غزہ کے لوگوں کا سابقہ سمندر کے نمکین پانی سے پڑتا ہے اس لئے وہ مزاجاً ترش رو ہیں لیکن ان کی اس غلط فہمی کو خالد مشعل نے دور کردیا جن کی جائے پیدائش رام اللہ ہے۔ گزشتہ دنوں غزہ میں ان کا غیر معمولی خیر مقدم کیا گیا ان کے خطاب کو سننے کیلئے پانچ لاکھ افراد جمع ہوئے۔اس جمِ غفیر کو مخاطب کرتے ہوئے جب انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اسرائیل کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ فلسطین ہمارا ہے، دریا سے سمندر تک اور جنوب سے شمال تک۔ ہم اپنی اس سرزمین کے ایک انچ پر بھی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔آج غزہ کل رام اللہ اور پھر یروشلم اس کے بعد حیفہ اور جافا۔اس طرح گویا ارضِ فلسطین کو اسرائیل کے وجود سے پاک کرکے اس پر اپنی حکومت قائم کریں گے تو اسرائیلی حکام کو اس شعر کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

خالد مشعل کے اس بیان پر اسرائیلی وزیراعظم نے ساری دنیا کو برا بھلا کہا" حماس اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی بات کرتی ہے لیکن ہر طرف خاموشی ہے کوئی اس پر احتجاج نہیں کرتا۔ محمود عباس تو نہ صرف اس کی تائید کررہے ہیں بلکہ اس سے اتحاد کی جانب پیش قدمی کررہے ہیں"۔ نتن یاہو کا اندیشہ صحیح نکلا دو دن بعد مقبوضہ مغربی کنارے کے شہر نبلوس میں حماس نے سلور جوبلی جشن کا اہتمام کیا۔ ۲۰۰۷ء میں فتح سے اختلاف کے بعد یہ پہلی عظیم ریلی تھی جس میں ہزاروں فلسطینوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر حماس کے رہنما حسنی البرونی نے کہا ہمارا پیغام یہی ہے کہ حماس اس سرزمین اور یہاں کی عوام کے دلوں میں رچی بسی ہے۔ یوسف استقلال نامی نوجوان نے حماس کا پرچم لہراتے ہوئے کہا کہ یہ عظیم دن غزہ کی حالیہ کامیابی کے مرہونِ منت ہے۔ پانچ سال بعد پہلی مرتبہ فلسطینی انتظامیہ نے غربِ اردن میں حماس کو ریلی کرنے کی اجازت دی۔ اس ریلی سے ایک ہفتہ قبل فتح پارٹی کے نمائندے نے غزہ میں خالد مشعل کے ساتھ سلورجوبلی تقریبات میں شرکت کی تھی۔ نبلوس میں بھی فتح کی انقلابی کونسل کے سکریٹری جنرل امین مقبول شریک ہوئے اور حماس کی قربانیوں کو سراہتے ہوئے کہا حماس نے ہزاروں شہادتیں پیش کیں اور اس کے ہزاروں کارکن زخمی ہوئے نیز صہیونی جیل کے اندر قیدو بند کا شکار ہیں۔ انہوں یہ خوشخبری بھی سنائی کہ جلد ہی محمود عباس اور خالد مشعل بھی باہمی مفاہمت کی

غرض سے ملاقات کرنے والے ہیں اور وہ ایک تاریخی دن ہوگا۔

ایران کے رہنما مجتبیٰ فردوسی پور نے خالد مشعل کے دورۂ غزہ کو صہیونی ریاست کی توسیع پسندیوں کے مقابلے کے مقابل غزہ کے لوگوں کے استقامت اور اس کی کامیابی کی علامت قرار دیا۔انہوں نے کہا: ملت فلسطین کو ہر دور سے زیادہ آج واحد اور متحدہ قیادت کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ چنانچہ اگر حماس اور جہاد اسلامی تنظیموں سمیت تمام سیاسی دھڑوں کی شراکت سے قومی اتحاد کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ فلسطینی حکومت فوجی اور سیاسی شعبوں میں صہیونی فوج کی جارحیتوں کا زیادہ طاقت کے ساتھ مقابلہ کرسکے گی لہٰذا اختلافات کا خاتمہ فلسطین میں قومی اتحاد کی حکومت کی تشکیل پر منتج ہو سکتا ہے۔ یہی بات اسرائیل کے ساتھ جنگ بندی کے بعد خالد مشعل نے کہا تھا کہ اسرائیل سے فائر بندی کے بعد اگلے مرحلے میں ہم قومی وحدت اور مصالحت کا سفر شروع کریں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قومی اتحاد اور مصالحت کی بنیاد مسلح مزاحمت پر ہونی چاہیے۔ محمود عباس نے بھی اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ فتح اور حماس کے درمیان سیاسی اختلافات کی خلیج کم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔آج ہم اقوام متحدہ میں جا رہے ہیں۔پھر مفاہمت کی کوشش کی جائے گی اور اس کے بعد ہم اپنی ریاست کے قیام کے لیے کوشاں ہوں گے۔ اس طرح گویا مغربی کنارہ اور مشرقی ساحل ایک دوسرے کے ساتھ بغلگیر ہوا چاہتا ہے۔ حماس اور فتح علامہ

ےاقبال کی صدا پر لبیک کہہ رہے ہیں
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

غزہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا معنی مضبوط یا طاقتور کے ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم سے غزہ شمالی افریقہ، عرب ممالک اور یورپ کے درمیان اہم تجارتی شاہراہ رہا ہے۔ سکندر اعظم نے بھی پانچ سال تک غزہ کو اپنے قبضے میں رکھا۔ مصری اسے "انعامات کا شہر" کہتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم کی قبر مبارک بھی غزہ ہی میں ہے۔ اسی نسبت سے غزہ کو "غزہ ہاشم" بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں غزہ کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں غزہ میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر ہوئی جسے مسجد عمر کا نام دیا گیا۔ اموی اور عباسی دور میں بھی غزہ کو اسلامی سلطنت میں اہم انتظامی حیثیت حاصل رہی۔ فقہ شافی کے بانی حضرت محمد ابن ادریس الشافی غزہ میں ہی پیدا ہوئے صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں نے فاطمی حکمرانوں سے غزہ چھین لیا تھا۔ عیسائیوں نے اس عظیم مسجد کو چرچ بنا دیا مگر ۱۱۹۱ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کو عبرت ناک شکست دے کر غزہ کو فتح کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران ۱۹۱۷ء میں عثمانی ترکوں نے غزہ پر کو انگریزوں سے آزاد کرایا۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد لیگ آف نیشنز نے غزہ کو دوبارہ برطانوی حاکمیت میں دے دیا۔ ۱۹۴۸ء تک یہ علاقہ برطانوی علمداری میں رہا پھر اسے مصر کے حوالے کردیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے غزہ پر قبضہ کر لیا اور بارہ سال بعد اسرائیل اور مصر کے درمیان ایک معاہدے کے تحت اس علاقے کی محدود خود مختار حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۹۳ء کے اندر اوسلو معاہدے کے تحت اسے فلسطین کا حصہ بنا دیا گیا۔ ۲۰۰۵ء میں غزہ سے اسرائیلی فوجوں کا انخلاء عمل میں آیا اور ۲۰۰۶ء کے انتخابات میں حماس نے غزہ میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرکے طاغوتی طاقتوں کی نیند اڑا دی۔ عوام کی منتخبہ حکومت کو سازش کے ذریعہ الٹنے کی ایک ناکام کوشش کی گئی جسے اسلامی تحریک کی بیدار مغز قیادت نے ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد غزہ کو چہار جانب سے محصور کرکے اسے عملاً ایک جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہاں کی عوام پر طرح طرح کے ظلم توڑے گئے چار سال قبل حملہ کرکے اسرائیل نے ۱۶۰۰ لوگوں کو شہید کردیا اور گزشتہ ماہ ۱۷۰ لوگ اسرائیلی حملے میں جان بحق ہوئے۔ اس کے باوجود غزہ کے جیالے عوام نے ظلم کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کرکے یہ ثابت کردیا کہ

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

حماس کی سلور جوبلی تقریبات میں قطر، ترکی، مصر اور بحرین سے سرکاری وفود کی شرکت اس بات کی ایک علامت ہے کہ حماس کو بین الاقوامی سطح پر سندِ قبولیت حاصل ہو گئی ہے۔ حماس کے ترجمان ابوزہری کے مطابق خالد مشعل کے دورے کا مطلب یہ ہے کہ اب غزہ آزاد ہے اور اب اُس کی مرضی کے مہمان یہاں کا دورہ کر سکتے ہیں'۔ اسرائیلی وزارتِ خارجہ کے ترجمان یگال پالمور نے بھی اعتراف کیا کہ اسرائیل کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے کہ مصر کی جانب سے غزہ میں کون داخل ہوتا ہے؟ خالد مشعل نے غزہ میں تین روز تک قیام کیا اور وہ حماس کے بانی شیخ احمد یٰسین کے گھر بھی گئے۔

شیخ یٰسین نے ۱۹۸۷ء میں انتفادہِ اول یعنی پہلی فلسطینی مزاحمتی تحریک کا آغاز کیا جو بعد میں حماس کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسرائیل نے مارچ ۲۰۰۴ء میں شیخ احمد یٰسین کو اور ان کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن رنتیسی کو شہید کر دیا۔ ان نازک حالات میں حماس کی ذمہ داری خالد مشعل کے کندھوں پر آئی۔ چند ماہ قبل خالد مشعل نے قیادت سے دستبردار ہونے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ نئی مدت کے لیے اپنا دوبارہ انتخاب نہیں چاہتے اس وقت حماس نے خالد مشعل پر زور دیا تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں اور ان پر واضح کیا کہ تحریک کی قیادت کا فیصلہ کوئی ایک شخص حتیٰ کہ اس کا رہنما بھی اپنے تئیں نہیں کر سکتا بلکہ پوری جماعت اتفاق رائے مستقبل کے قائد کا منتخب

کرے گی۔ ایک طرف آزادی اور مساوات کا ڈھونگ رچانے والی جمہوریت نواز بے دین قیادت ہے جس نے اقتدار کو اپنے دانتوں سے پکڑ رکھا ہے۔ وہ کسی صورت اس سے دستبرداری کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے اور اسے جاری و ساری رکھنے کی خاطر دنیا بھر کی جوڑ توڑ کرتے رہتے ہیں اور دوسری جانب اسلامی تحریک عالم انسانیت کے لئے مشعلِ راہ بنی ہوئی ہے جس میں ایک ایسی جماعت کا قائد جسے اقتدار حاصل ہے از خود اقتدار سے دستبرداری کی پیش کش کرتا ہے

حماس جذبۂ شہادت سے سرشار ایک اسلامی تحریک ہے اسی لئے اس کے سربراہ نے اپنے بانی کے علاوہ شہید احمد الجعبری کے گھر کا دورہ بھی کیا۔ الجعبری کو اسرائیل نے گزشتہ ماہ نومبر میں حماس کے ساتھ آٹھ روزہ تنازعے کے دوران شہید کیا تھا۔ خالد مشعل اس فلسطینی خاندان کے گھر بھی گئے جس کے کل ۱۴ ارکان اسرائیلی جنگی طیاروں کی بمباری میں شہید ہوئے تھے۔ اسرائیل کے ساتھ جنگ کے دوران خالد مشعل نے عرب ممالک سے فلسطینیوں کے فوجی معاونت کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ فلسطین میں اس وقت ایک ایسے قومی سیاسی پروگرام کی ضرورت ہے جو مزاحمت کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ خالد مشعل نے صہیونیوں کے حملوں کے مقابلے میں غزہ کے باشندوں کی استقامت کی تعریف و توصیف کی اور کہا کہ سائنس و ٹیکنالوجی ترقی کا ایک عامل ضرور ہے، لیکن ملت فلسطین کے لئے سائنس و ٹیکنالوجی کے زمرے میں اسلحہ بھی شامل ہے۔

حماس کی سلور جوبلی کے جشن میں خالد مشعل نے ایک دلچسپ اعلان یہ کیا کہ طویل جلاوطنی کے بعد غزہ میں آمد میرا تیسرا جنم ہے۔ خالد مشعل کے دوسرے جنم کی داستان پہلے اور تیسرے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حماس کے اردنی شاخ کی باگ ڈور مشعل کے ہاتھوں میں تھی۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۹۷ء کی صبح اردن کے دارالخلافہ عمان میں واقع حماس دفتر میں جب وہ داخل ہو رہے تھے تو موساد کا ایک ایجنٹ ان کے قریب آیا اور ایک آلہ کے مدد سے نہایت ثرود اثر زہر لیفو فنٹانل انکے کان میں ڈالنے کی کوشش کی۔ مشعل کے ڈرائیور نے جاسوس کی اس مذموم حرکت کو بھانپ کر فوراً اپنے ہاتھ کے اخبار سے اسے جھٹک دیا لیکن اس کے باوجود زہر کا کچھ حصہ ان کے جسم میں چلا گیا۔ محافظوں نے جاسوس کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھی سمیت گرفتار کرکے قریب کے پولس تھانے میں جمع کرا دیا۔ یہ واقعات اس قدر دلچسپ ہیں کہ اس پر پال مک گیوغ نے بڑی تحقیق کے بعد" خالد کو قتل کرو (Kill Khaled)" نامی ناول لکھا جو حماس پر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۰۰۵ء میں اسرائیل کا اردن سے امن معاہدہ ہوا تھا اور ان ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات تھے۔اس معاہدے کو محفوظ رکھنے کی خاطر خالد مشعل کو شہید کرنے کی خاطر زہر دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا جس سے دو دن کے اندر دم

گھٹنے سے واقع ہونے والی موت بالکل فطری معلوم ہو لیکن قاتلوں کی گرفتاری نے ساری بازی الٹ دی۔ تحقیق و تفتیش سے پتہ چلا کہ پانچ جاسوس جن میں سے تین سفارتخانے میں روپوش ہیں کینیڈا کے پاسپورٹ پر بھیس بدل عمان آئے تھے اور انہیں اس مہم پر اسرائیلی وزیراعظم بن یامن نتن یاہو کے ایماء پر روانہ کیا گیا تھا۔ چند گھنٹوں بعد خالد مشعل بے ہوش ہو گئے اور اس خبر کے منظرِ عام پر آتے ہی سفارتخانے کو عوام نے گھیر لیا۔ اس کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا ساری دنیا میں اس قاتلانہ حملے کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا جاتا اور نتن یاہو کو اس گھناؤنے جرم میں گرفتار کرنے کی غرض سے انٹرپول کی جانب سے ریڈ کارنر وارنٹ جاری کیا جاتا تاکہ اس بین الاقوامی مجرم کو قرار واقعی سزا دی لیکن ہوا یہ کہ نتن یاہو نے موساد سربراہ کے ساتھ عمان کا دورہ کر کے اردن کے شاہ حسین سے معافی مانگی اور اپنے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کر ڈالا۔
بستر مرگ پر کینسر کے موذی مرض میں مبتلا شاہ حسین اس موقع پر کمال دلیری کا مظاہرہ کیا اور سب سے پہلے زہر کی تریاق کو حاصل کرکے خلد مشعل کی جان بچانے پر اصرار کیا۔ نتن یاہو نے اڑیل رویہ اختیار کرتے ہوئے ایسا کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اسکے جواب میں شاہ حسین نے کہا خالد کی موت کے ساتھ امن معاہدے کا جنازہ اٹھ جائیگا۔ عوام سفارتخانے پر دھاوا بول دیں گے اور کوئی

ایک بھی آدمی زندہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔ معاملہ طول پکڑ گیا یہاں تک کے امریکی صدر بل کلنٹن نے مداخلت کی اور نتن یاہو کو مجبور ہونا پڑا۔ اسرائیل سے موساد کے سربراہ ڈینی جاتوم خود زہر کا تریاق لے کر عمان آیا اور خالد مشعل کو ۱۰ گھنٹے بعد دوبارہ ہوش آیا۔

اس طرح ان کا تیسرا جنم ہوا۔ بقول شاعر ؎

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

خالد مشعل کی صحتیابی حماس تحریک کیلئے ایک نویدِ صبح بن کر طلوع ہوئی۔ یہودی جاسوسوں کے بدلے فلسطینی قیدیوں کی رہائی پر گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ اس بار پھر شاہ حسین کامیاب ہوئے اور حماس کے بانی و روحانی پیشوا شیخ احمد یسین سمیت ۶۱ فلسطینی اور ۹ اردنی قیدیوں کو رہائی نصیب ہوئی ۔ یہ گھناؤنی سازش نتن یاہو نے حق کا ایک چراغ کو بجھانے کی خاطر رچی تھی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چاند جو بادلوں میں چھپا دیا گیا تھا اپنی آب و تاب کے ساتھ پھر سے روشن ہوگیا اور اس کے نور سے تاریکی کے علمبرداروں کا منہ کالا ہوگیا۔ قرآن مجید میں یہی مثال ہے کہ اللہ مالک الملک ہے۔ وہی زندگی کو موت سے موت کو زندگی سے نکالتا ہے اندھیرے سے روشنی کو نکالتا ہے اور روشنی میں اندھیرے کو پروتا چلا جاتا ہے ۔ بنیامن نتن یاہو نے اس وقت

سوچا بھی نہیں ہوگا کہ خود اس کی وزارت اعظمٰی کے دور میں ایک ایسا وقت بھی آیگا جب خالد مشعل کا غزہ میں پر جوش استقبال کیا جایگا اور اس کے پاس خاموش تماشائی بنے رہنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔ اس وقت برطانوی جریدے تھرڈ وے میگزین کو اپنے ایک انٹرویو میں خالد مشعل نے یہ کہا تھا کہ اسرائیلی دہشت کے دو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس سے خوفزدہ ہوکر سہم جاتے ہیں اور کچھ دلیر اور بے جھجک ہو جاتے ہیں۔ میں مؤخر الذکر لوگوں میں سے ہوں۔ اس لئے کہ بقول شاعر

ظلم کے کالے بادل سے ڈرنا کیسا؟

یہ موسم تو آنے جانے والے ہیں

اپنے تاریخی دورے میں خالد مشعل نے اپنے تیسرے جنم کے ساتھ ساتھ چوتھے جنم کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ میرا چوتھا جنم اس وقت ہوگا جب فلسطین آزاد ہوگا۔ فلسطین کے حق میں بننے والی عالمی رائے عامہ اور حماس و فتح کے درمیان مفاہمت فلسطین کی آزادی کا پیغام سناتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اللہ کی نصرت اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی فتح قریب ہے۔

بنتِ حواہوں میں یہ مرا جرم ہے

حضرت علیؓ کا قول ہے یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے بلکہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے لیکن عصبیت و تنگ نظری کا شکار انسان یہ دیکھنے کے بجائے کہ کیا کہا جارہا ہے دیکھتا یہ ہے کہ کون کہہ رہا ہے۔اس کے نزدیک کسی بات کے حق یا ناحق ہونے کی کسوٹی کہنے والے کی ذات ہوتی ہے۔ وہ اپنے آدمی کی ہر بات کو کسی نہ کسی توجیہ کہ مدد سے تسلیم کر لیتا ہے اور اپنے مخالفین کے بیانات کو شکوک و شبہات کی بنیاد پر رد کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اپنے دشمن کے کسی بیان کی تائید بہر حال ایک مشکل کام ہے ۔آرایس ایس کے سر.براہ موہن بھاگوت نے دہلی عصمت دری کے معاملے میں ایک مبنی.بر انصاف موقف اختیار کرکے ہمارے سامنے یہی مشکل کھڑی کردی۔ موہن بھاگوت نے اس بابت دو بیانات دیئے۔ پہلی تقریر انہوں نے آسام کے سِلچر شہر میں کی اور کہاہندوستان کے شہروں میں خواتین کے خلاف ہونے والے جرائم قابلِ شرم ہیں۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ لیکن اس قسم کے جرائم بھارت یعنی دیہی علاقوں میں نہیں ہوتے ۔آپ ملک کے گاؤں اور جنگلوں میں چلے جائیں وہاں آپ کو جنسی جرائم اور اجتماعی عصمت دری کے واقعات نہیں ملیں گے ۔ موہن بھاگوت کے اس بیان کی اعداد و شمار کی مدد سے تردید بھی ممکن ہے نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دیہاتوں کے واقعات کی جانب ذرائع ابلاغ کی توجہ نہیں ہوتی

اس لئے وہ منظرِ عام پر نہیں آتے لیکن کانگریسی ترجمان کا یہ الزام نہایت بچکانہ ہے کہ وہ ہندوستان کو تقسیم کر رہے ہیں۔

موہن بھاگوت نے انڈیا اور بھارت کے درمیان پائے جانے والے فرق کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے واقعات اس وقت رونما ہوتے ہیں جب بھارت مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر انڈیا بن جاتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس توجیہ پر گفتگو ہو اور یہ پتہ لگانے کی کوشش کی جائے کہ آیا مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات خواتین کو تحفظ عطا کرتے ہیں یا غیر محفوظ بناتے ہیں ؟حقیقت یہی ہے کہ غیر جانبدار ہو کر کھلے ذہن کے ساتھ اگر اس سوال پر غور کیا جائے تو موہن بھاگوت کی بات کو تسلیم کئے بغیر کارۂ چار نہیں ہے۔ مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب نے جس طرح خواتین کا استحصال کیا اور انہیں نمائش و ضرورت کی ایک بے وقت شہ بنا کر رکھ دیا اس کے نتیجے میں نہ صرف خواتین کا عزت و وقار گرا ہے بلکہ وہ عدم تحفظ کا شکار بھی ہو گئی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی برنداکامت کا یہ کہنا کہ سنگھ سے اس کے سوا کسی اور شہ کی توقع نہیں کی جاسکتی یہ لوگ منوسمرتی میں یقین رکھتے ہیں اور اس کی بنیاد پر دستور میں ترمیم چاہتے ہیں ان کی اپنے ذہن و فکر کی غلامی کا غماز ہے۔

موہن بھاگوت نے اس مسئلہ کو جو حل بتلایا ہے اس سے بہر حال اتفاق نہیں کیا

جاسکتا ان کے مطابق سماج کے ہر شعبہ میں خالص ہندوستانی (ہندو) تہذیب و اقدار کا قیام ضروری ہے جس میں عورت کو ماں کا درجہ دیا گیا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دیومالائی مذہبی صحیفوں کی مشہور ترین خواتین مثلاً رامائن کی سیتا اور مہا بھارت کی درو پدی تک بھی ظلم وزیادتی کا شکار نظر آتی ہیں۔ تاریخ و تہذیب پر نظر ڈالیں تورانا سانگا کی بہو اور کرشنا کی بھکت میرا بائی بھی ہندو اقدار کے سائے تلے مختلف انداز میں ستائی جاتی رہی ہے اور آج بھی دیوداسی کی روایت نام نہاد انڈیا میں نہیں بلکہ بھارت کی پاون دھرتی پر زندہ وتابندہ ہے۔ سر سنگھ چالک کو اس معاملے میں محض مغرب کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بجائے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے تاکہ صحیح حل تک رسائی ممکن ہوسکے۔

سنگھ پریوار کے لوگ کل تک سینہ ٹھونک کر کہا کرتے تھے گو کہ سارے مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں لیکن سارے دہشت گرد مسلمان ضرور ہیں اب خواتین کے خلاف جرائم کے ملزمین کی فہرست دیکھ کر کہنا پڑتا ہے سارے ہندو مجرم تو نہیں ہیں لیکن ان جرائم کے سارے ملزم ہندو ضرور ہیں سر سنگھ چالک کو ٹھنڈے دل اس سوال پر غور کرنا چاہئے کہ ہندو سماج کی اصلاح کا جو کام سنگھ گذشتہ سات دہائیوں سے کر رہا ہے آخر وہ جدوجہد کیونکر بارآور نہیں ہو پارہی ہیں۔ سنجے جوشی جیسے برہما چاری کارکن اپنی ہی دستِ راست خاتون پر دست درازی کیوں کرتا ہے؟

اور اس مذموم حرکت کی سی ڈی کے منظرِ عام پر آجانے پر بھی اسے تنظیم کی اہم ذمہ داریوں پر کیوں فائز رکھا جاتا ہے ؟ کرناٹک بی جے پی کے ارکانِ اسمبلی اجلاس کے دوران ایوان کے اندر اپنے موبائیل پر فحش فلمیں دیکھتے ہوئے رنگے ہاتھ پکڑے جاتے ہیں ؟ اور اس غلیظ حرکت کے باوجود ان پر کوئی کارروائی کیوں نہیں ہوتی ؟ گجرات کے اندر بھی یہی معاملہ دوہرایا جاتا ہے پھر بھی کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ کیا سنگھ کے اندر بھی مغربی رجحانات جڑ پکڑ چکے ہیں اور وہ انہیں اکھاڑ پھینکنے سے قاصر ہے ؟ اگر ایسا ہے تو قوم کے اندر سے ان برائیوں کے خاتمے کا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے۔

موہن بھاگوت نے مشرقی ہندوستان میں جو کہا سو کہا لیکن وہاں سے واپس آنے کے بعد اندور میں سنگھ کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے وہ نہایت ہی معروضی انداز میں بولے ۔ خاوند اور بیوی ایک معاہدے کے پابند ہوتے ہیں جس کے تحت شوہر اپنی بیوی کو یہ یقین دلاتا ہے کہ تم میرے گھر کا خیال رکھو اور میں تمہاری ضروریات مہیا کروں گا نیز تمہیں محفوظ و ماموں رکھوں گا۔ شوہر اس معاہدے کی پاسداری کرتا ہے۔ جب تک کہ بیوی اسے نبھاتی ہے شوہر اس کے ساتھ رہتا ہے اور اگر بیوی اس کی خلاف ورزی کرتی ہے تو وہ اس سے دستبردار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر شوہر اپنی ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر ہو تو بیوی اس معاہدے کو توڑ سکتی ہے۔ موہن بھاگوت کی تقریر پر جب ہنگامہ کھڑا ہوا تو خود سنگھ

پریوار بھی مدافعت کی حالت میں آگیا حالانکہ اس کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔آر ایس ایس کے ترجمان رام مادھو نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ موہن بھاگوت نے مغرب کی معاشرتی نظام میں نکاح کو معاہدہ قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا کہ ہندوستان میں نکاح ایک نہایت مقدس ادارہ ہے۔اب بیچارے رام مادھو کو کون سمجھائے کہ دو افراد کے درمیان اخلاص کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ بھی مقدس ہو سکتا ہے نیز کسی مقدس معاہدے کی بنیاد پر قائم ہونے والا رشتہ بھی تقدس کا حامل ہو سکتا ہے۔اسی لئے دین اسلام عقدِ نکاح کو اللہ کے حکم کی بنیاد پر استوار کرکے مقدس بنا دیتا ہے۔رام مادھو کی گھبراہٹ بتلاتی ہے کہ اپنے تمام تربلند بانگ دعووں کے باوجود سنگھ کی فکری بنیادی کس قدر کھوکھلی ہیں۔

بی جے پی رہنما شیشادری چاری نے موہن بھاگوت کی وکالت کرتے ہوئے ایک اور اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا جس سے ذرائع ابلاغ صرفِ نظر کررہا تھا۔انہوں نے کہا مغربی تہذیب اور اشتہاروں کے اندر دکھلائی جانے والی عریانیت کا بھی خواتین پر جرائم کے اضافہ میں حصہ ہے۔اسی کے ساتھ شیشادری نے مردوخواتین دونوں کو اپنے حدود لکشمن ریکھا)کے اندر رہنے کی تاکید کی۔حقیقت یہی ہے کہ جب فطرت کے حدود) کو پامال کیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے آنے والی طغیانی کو روکنا ناممکن ہوجاتا ہے۔اتفاق سے جماعت اسلامی ہند نے بھی جسٹس جے ایس ورما کو جو تجاویز لکھیں ان میں اس پہلو کو تفصیل سے اجاگر کیا گیا ہے۔

اشتہار بازی میں عریانیت کو قابل سزا جرم قرار دیئے جانے کے علاوہ نکاح کے باہر مرد و زن کے جنسی تعلق کو غیر قانونی اور قابل تعزیر جرم قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ جہیز کا خاتمہ کرکے نکاح کو آسان بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ مخلوط تعلیم کے بجائے منفرد تعلیمی ادارے اور طالبات کے لئے پروقار لباس تجویز کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ خواتین کیلئے مخصوص سواریوں کی مانگ بھی کی گئی ہے تاکہ وہ چھیڑ چھاڑ سے محفوظ و مامون رہ سکیں۔ شراب چونکہ ام الخبائث ہے اور حالیہ واردات سے قبل بھی قاتل درندوں نے اس کا استعمال کیا تھا اس لئے اس پر بھی پابندی لگانے کیلئے کہا گیا ہے۔ جماعت نے مذکورہ بالا مطالبات کے علاوہ پولس محکمہ میں فوری اصلاحات کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ آج کل ہر خاص و عام موجودہ قانون میں ترمیم کرکے مجرمین کیلئے پھانسی کی سزا کا مطالبہ کررہا ہے اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے اس گھناؤنے جرم کا سب سے بڑا مجرم ہندوستانی دستور کے مطابق نابالغ ہے۔ ایک زناکار کو نابالغ قرار دینا بجائے خود مضحکہ خیز ہے اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ مسئلہ قانون سازی سے زیادہ اس کے نفاذ کا ہے اور یہ مقننہ یا عدلیہ کی نہیں بلکہ انتظامیہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ انتظامیہ کا حال یہ ہے کہ اول تو وہ وقت پر جائے حادثہ پر موجود نہیں ہوتا۔ راستوں میں لگے کیمروں کی جانب نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ سواریوں کو روک کر ان کی تفتیش

نہیں کرتا اور جائے واردات پر پہنچ اس مسئلہ میں الجھ جاتا ہے کہ یہ حادثہ کس پولس تھانے کے حدود میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد قانونی موشگافیوں اور کاغذی کارروائیوں میں الجھ کے مظلوم کو زحمت اور ملزم کو راحت پہنچاتا ہے۔ ان تمام مشکلات سے حالیہ واقعہ میں مظلوم لڑکی اور اس کے ساتھی کو گذرنا پڑا ہے۔ دہلی کے عوام جو جوق در جوق احتجاج کیلئے نکل آیا تھا وہ بھی کافی دیر تک مدد کی گہار لگانے والے برہنہ و زخمی نوجوانوں کو سڑک پر روتا اور سسکتا دیکھتا رہا لیکن مدد کیلئے آگے نہیں آیا۔ اس بے حسی کے پس پشت انتظامیہ کا خوف بھی کارفرما تھا جو گواہوں کے ناک میں دم کرکے رکھ دیتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے عوام کے دل اللہ اور اس کے بندوں کی محبت سے خالی ہوتے جارہے ہیں اور ان کے اندر سے قانون کا خوف یکسر ختم ہو گیا ہے ۔اس کی بنیادی وجہ آبرو ریزی جیسے سنگین جرائم کے ملزمین کا باں تعزیر آزاد گھومنا ہے۔ شہر دہلی کا حال یہ ہے اس سال جنوری سے نومبر تک عصمت دری کی ۶۳۵ شکایات درج کرائی گئیں ۷۵۴ ملزم گرفتار بھی ہوئے مگر صرف ایک کو سزا ہوئی اور دو رہا ہو گئے۔ ۴۰۳ کے خلاف مقدمہ زیرِ سماعت ہے اور ۳۴۸ ملزم ہنوز تفتیش کے منتظر ہیں۔ دہلی کا حال یہ کہ مسلسل کئی سالوں سے عصمت دری کے واقعات بتدریج اضافہ ہو رہا ہے ۲۰۱۱ء میں شکایات ۵۷۲

تھیں جبکہ ۲۰۱۰ء میں ۵۰۷ اور ۲۰۰۹ء میں صرف ۴۶۶ وارداتیں ہوئی تھیں۔اس طرح گزشتہ چار سالوں میں ۲۶ فیصدی کا غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اگر دسمبر کے اعداد شامل کرلئے جائیں تو یہ شرح اور بھی زیادہ ہو جائیگی اس لئے کہ تمام تر احتجاج کے باوجود خواتین کے خلاف ہونے والا تشدد رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے قومی اخراجات کی ترجیحات کو تبدیل کیا جائے۔ فی الحال ہندوستان میں ہر دس لاکھ کی آبادی پر صرف ۱۲ جج ہیں جبکہ ان کی تعداد ۶۰ ہونی چاہئے۔اب اگر کسی شعبہ میں انسانی وسائل کی مقدار پانچ گنا کم ہو تو اس سے حاصل ہونے والے فوائد بھی اسی شرح سے دھیمے ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا زیر سماعت مقدمات کا پہاڑ اس قدر اونچا ہو جائیگا کہ اس کے تلے دب کر انصاف کی دیوی دم توڑ دے گی ۔ مجرمین کے بری ہو جانے اور آزاد گھومنے کا ہی یہ اثر ہے کہ امانت کو اپنی ہوس کا شکار بنانے والے درندوں کے دل میں اسے نیم برہنہ حالت میں سڑک پر پھینکنے کے بعد بس سے کچل دینے کا خیال بھی آتا ہے۔اس سنگین جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد دوسرے دن وہ سب حسبِ معمول اپنے کام پر چلے جاتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ سفاک درندے اس بات کو بھول گئے کہ

تھرّاتے ہیں افلاک ، لرزا اٹھتی ہے دھرتی
جب بھی کوئی مظلوم کہیں آہ کرے ہے

دہلی شہر نے اس بار خواتین پر ہونے والے مظالم کے باب میں نہ صرف ہندوستان کے دیگر شہروں بلکہ دنیا بھر کو مثلاً نیویارک، لندن، پیرس اور بیجنگ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ بدنام فہرست اسلامی دنیا کے ذکر سے خالی ہے۔ نام نہاد ترقی یافتہ اور حقوقِ نسواں کے علمبردار ممالک اس معاملے میں پیش پیش ہیں۔ عصمت دری کی ابتدا چھیڑ خانی سے ہوتی اس بابت دہلی کی خواتین کا کہنا ہے کہ جب وہ پولس کے پاس شکایت لے کر جاتی ہیں تو انہیں جواب ملتا ہے چھیڑا ہی ہے کوئی آبروریزی تو نہیں کی۔ اس حوصلہ شکن رویہ کے باوجود گزشتہ ۱۱ ماہ میں دست درازی کی ۶۲۴ شکایات درج ہوئیں اور ۷۶۸ ملزم گرفتار بھی ہوئے لیکن سزا کا حقدار صرف ایک بنا۔ ۴۰۲ کے خلاف تفتیش کا کام جاری ہے اور ۳۵۶ کا معاملہ ہنوز معطل ہے۔ اس سے علی الرغم خواتین کو طاقتور (بااختیار) بنانے کا سیاسی تماشہ گزشتہ ۱۶ برسوں سے کھیلا جارہا ہے۔ دو سال قبل ایوانِ بالا میں خواتین کیلئے ۳۳ فیصد نشستیں مختص کرنے کا بل پاس بھی ہو گیا لیکن ایوانِ زیریں نے اس کی ابھی تک توثیق نہیں کی ہے۔ اس بابت حزب اقتدار کے مختلف دھڑوں کے اندر بھی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر سیاسی میدان میں خواتین فی الحال اہم ترین عہدوں پر فائض ہو چکی ہیں۔ اس سربلندی نے مٹھی بھر خواتین کو آسودہ حال ضرور کر دیا مگر یہ عام خواتین کے کسی کام نہیں آسکی۔

دہلی میں منموہن سنگھ وزیر اعظم ہیں لیکن سیاست کی ابجد سے واقف شخص بھی یہ جانتا ہے کہ مرکزی حکومت کی زمامِ کار اصلاً سونیا گاندھی کے ہاتھوں میں ہے۔ایوانِ زیریں میں حزب اختلاف کی رہنما محترمہ سشما سوراج ہیں۔ لوک سبھا اسپیکر کے مسند پر میرا کما ری براجمان ہیں اور ریاستِ دہلی کی وزیر اعلیٰ ایک عرصے سے شیلا دکشت ہیں۔ اس کے باوجود یہ سب مل کر دہلی کو عصمت دری کا دارالخلافہ بننے سے نہیں روک سکیں۔ تمل ناڈو کی وزیر اعلیٰ جئے للیتا نے پچھلے دنوں عصمت دری کے روک تھام کی خاطر ۱۳ تجاویز مرکز کے سامنے رکھیں لیکن اسی دوران آبرو ریزی کے چار واقعات ان کی اپنی ریاست میں منظرِ عام پر آگئے۔ جن میں ایک نابالغ لڑکی کی اسکول میں اور دوسری کی بس میں ہوس کا شکار بنایا گیا حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان جرائم میں ملوث دو ملزم نابالغ ہیں۔ مغربی بنگال میں جہاں ممتا بنرجی کی حکومت ہے گزشتہ دنوں پانچ سے دس سال کی عمر والی چار لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ سامنے آیا۔ اس سے قبل جب اس طرح کے واقعات ذرائع ابلاغ میں آئے تھے تو اس پر ممتا نے مظلومین سے ہمدردی جتانے کے بجائے ان واقعات کو اپنے خلاف اشتراکیوں کی سازش قرار دیا تھا۔ تین سال قبل جس وقت مایاوتی اترپردیش کی وزیر اعلیٰ تھیں ایک دلت لڑکی کی عصمت دری کا واقعہ رونما ہوا۔ مایا نے اس کی مدد کیلئے ۲۵۰۰۰ ہزار روپے پولس افسر کے ذریعہ بھجوائے تو یوپی کانگریس کی رہنما ریتا

بھوگنا جوشی نے مایا پر سخت تنقید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریتا کا گھر پھونک دیا گیا اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ خواتین سیاستدانوں کا اگر یہ حال ہے تو صدر مملکت پرنب مکرجی کے فرزند رکن پارلیمان ابھجیت مکرجی کا بیان کہ یہ احتجاج کرنے والی سجی سجائی خواتین طالبات نہیں ہیں کسی حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہئے۔

آج زانیوں کیلئے ہر کوئی موت کی سزا کا مطالبہ کر رہا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ گزشتہ سال ہندوستان کی خاتونِ اول صدرِ مملکت محترمہ پرتبھا پاٹل نے پانچ زانیوں کے ساتھ رحم کا معاملہ کرتے ہوئے عدالت کے ذریعہ انہیں سنائی گئی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا تھا۔ ان وارداتوں میں ایک پانچ سال کی لڑکی کی آبرو ریزی اور قتل کا معاملہ بھی تھا۔ سزا میں تخفیف کی سفارش وزارتِ داخلہ کی جانب سے کی گئی تھی۔ اس اقدام کی جرأت وزیرِ داخلہ نے سونیا گاندھی کی توثیق کے بغیر کی ہوگی یہ ناممکن ہے۔ اس پس منظر میں امانت کو انصاف دلانے کیلئے ہونے والے احتجاج میں مظاہرین کو مخاطب کرتے ہوئے سونیا گاندھی کی یقین دہانی کہ ہم اس جرم کو نہیں بھولیں گے اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر رہیں گے بالکل کھوکھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس افسوسناک صورتحال پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

اب کس پہ بھروسہ کریں، کس سمت کو جائیں

جب قافلہ سالار ہی گمراہ کرے ہے

ہندوستانی دستور عصمت دری کا شکار خاتون کا نام لینے کی اجازت ذرائع ابلاغ کو نہیں دیتا اس لئے نہ جانے کس نے اس مظلوم لڑکی کا فرضی نام امانت رکھ دیا۔ چند ناخلف نوجوانوں کے ذریعہ امانت میں خیانت نے قوم کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کر دیا لوگ بے ساختہ سڑکوں پر نکل آئے اور ایوانِ اقتدار میں لرزہ طاری ہو گیا۔ پہلے تو احتجاج کی آگ کو پانی کی توپ سے بجھانے کی کوشش کی گئی مگر جب یہ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو امانت کو جلاوطن کرکے پردیس روانہ کردیا گیا اور سیاسی بیان بازیوں کے ذریعہ زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی گئی اس کے بعد جب تمام حفاظتی تیاریاں پوری ہو گئیں تو اس کے بعد منصوبہ بند طریقہ پر امانت کی لاش کو آخرِ ہفتہ چھٹی کے دن ایوانِ اقتدار کی مکمل ناکہ بندی کے بعد واپس لا کر نذرِ آتش کر دیا گیا اور قوم کی امانت یہ کہتی ہوئی اس دنیا سے رخصت ہو گئی'' بنت حوا میں یہ مرا جرم ہے۔ یہ مرا جرم ہے۔ یہ مرا جرم••

افضل گرو: کل یگ کا سمبوکا

گاندھی جی کو ان کے دشمن ناتھورام گوڈسے نے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی صبح قتل کردیا ۔اس واردات کے ۶۵ سال اور دس دن بعد گاندھی جی کی نام لیوا کانگریس نے افضل گرو کو پھانسی دے دی۔ دونوں مواقع پر ہندو فسطائیت پسندوں نے مٹھائی تقسیم کی اور کانگریسیوں سیاسی فائدہ حاصل کیا۔ جدید ہندوستان کی تاریخ میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد دوسرا سب سے بڑا جرم افضل گرو کی پھانسی ہے۔ یہ جرائم گاندھی جی کے قتل سے بھی زیادہ اس لئے سنگین ہیں کہ گاندھی جی کا قتل ایک فرد اور ایک تنظیم کی مذموم حرکت تھی۔ حکمراں تریمورتی یعنی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ اس کے مقابلے سینہ سپر تھی۔ عوام میں بھی اس کے خلاف غم وغصہ تھا لیکن بابری مسجد اور افضل گرو کے معاملے میں ان تینوں سرکاری ادارے آپس میں ساز باز کرکے ظلم عظیم میں شریک کار ہوگئے اور عوام نے ذرائع ابلاغ کے جھانسے میں آکر اس پر اطمینان کا اظہار کیا۔

افضل گرو کی حقیقت جاننے کیلئے معروف صحافی ونود ے جوس کے ذریعہ لئے گئے افضل گرو کا انٹرویو کو دیکھا جا سکتا ہے جو انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ اس میں افضل کی ذاتی زندگی اوران تمام واقعات کی تفصیل موجود ہے جن کے ذریعہ اسے

سازش میں پھنسایا گیا۔ عدالتِ عالیہ کے اس غیر منصفانہ فیصلے میں موجود بے شمار اختلافات اور نقائص سے واقف ہونے کیلئے انگریزی جریدے آوٹ لوک کے ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۶ شمارے میں ارون دھتی رائے کا طویل مضمون مفید ہو سکتا ہے۔ یہ بھی انٹرنیٹ پر سے دستیاب ہے۔ یہ دونوں حق پسند نفوس نہ تو پاکستانی ہیں اور نہ مسلمان اس لئے ان پر جانبداری کا الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ افضل گرو پر لگائے گئے الزامات اور اسکے خلاف کئے گئے سپریم کورٹ کے فیصلے جو صریح اعتراضات کئے جاسکتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

I. ۱۳ دسمبر کو پارلیمنٹ پر ہونے والے حملے سے پہلے ہی حکومت اس اندیشے کا اظہار کر چکی تھی بلکہ حملے سے صرف ایک روز قبل بھی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے متنبہ کردیا تھا۔اس لئے لازماً حفاظتی انتظامات میں اضافہ کر دیا گیا ہوگا۔ ایے امیں بلااجازت یا توثیق آتش گیر مادے سے لدی ہوئی ایک گاڑی کا پارلیمان کے احاطے میں داخل ہونا ناممکن تھا۔

II. ابتدا ہی میں دہلی پولس کے خصوصی دستے نے جیش محمد اور لشکر طیبہ پر حملہ کا الزام لگایا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس حملے میں کابل لے جانے والے جہاز کا اغواکار محمد ملوث ہے ۔ یہ دونوں باتیں عدالت میں ثابت نہیں ہو سکیں۔

III. محمد وہی شخص تھا جسے کشمیر سے سیکیورٹی افسران نے افضل گرو کے ساتھ دہلی روانہ کیا تھا۔ افضل کا قصور اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ حکم کی

بجاآوری وہ اس شخص کے ساتھ دہلی آیا۔ حملے میں براہِ راست ملوث ہونے کا الزام افضل پر کسی نے نہیں لگایا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر افضل کی گرفتاری سے قبل پولس نے محمد کا نام ظاہر کر دیا تھا۔

IV. افضل نے محمد کے علاوہ اسپیشل ٹاسک فورس کے طارق نامی شخص بھی ذکر کیا ہے جس محمد کی اس نے دہلی میں ملاقات کرائی تھی۔ اس طارق کا پتہ لگانے کی کوشش دہلی پولس نے نہیں کی حالانکہ وہ سازش کی ایک اہم کڑی تھا۔

V. یہ حملہ ایوان کے آس پاس لگے ٹی وی کیمروں نے ریکارڈ کر لیا تھا اس کے باوجود ان کی مدد سے اصلی حملہ آوروں کا پتہ لگانے کی سعی نہیں کی گئی۔ افضل گروپ پر ساری توجہ مبذول کروا کر سازش رچانے والوں کو بچا لیا گیا اور حقیقی مجرمین کی پردہ پوشی کی گئی۔

VI. کانگریس کے رہنما کپیل سبل نے کلوز سرکٹ ٹی وی کی فلم ممبرانِ پارلیمان کو دکھلانے کا مطالبہ کیا۔ راجیہ سبھا کی صدر نجمہ ہپت اللہ (جو بی جے پی کی مدد سے منتخب ہوئی تھیں) نے بھی حملے سے متعلق کنفیوژن کو دور کرنے کیلئے فلم کو پیش کرنے کی حمایت کی لیکن ان سوالات کے سامنے آتے ہی پارلیمان کا اجلاس اچانک ختم کر دیا گیا۔

VII. اس فلم کو نہ ہی عدالت میں پیش کیا گیا اور نہ ہی عوام تک پہنچایا گیا جبکہ یہ حقیقت تک پہنچنے کا بہت بڑا ذریعہ تھی

VIII. ایوانِ پارلیمان میں کانگریسی رہنما اور وہپ پریہ رنجن داس منشی نے

کہا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے ٦ حملہ آوروں کو گاڑی سے اترتے دیکھا تھا لیکن پولس نے صرف پانچ لاشیں برآمد کیں اور چھٹے حملہ آور کا پتہ لگانے کی کوشش ہی نہیں کی

IX. افضل کے خلاف سب سے بڑا ثبوت اس کا اعترافِ جرم تھا حالانکہ عدالت میں افضل نے اس کا یہ کہہ کر انکار کردیا کہ زورزبردستی کا نتیجہ تھا۔ اس کے باوجود اس ناقابلِ تسلیم ثبوت کو بنیاد بنا کر موت کی سزا سنائی گئی

X. افضل نے ٹی وی چینلس کے سامنے جب کہا کہ پروفیسر گیلانی ملوث نہیں ہیں تو پولس افسر راجبیر سنگھ نے سب کے سامنے اسے ڈانٹا اور صحافیوں کو وہ جملہ حذف کرنے کا حکم دیا۔ اپنے آپ کو آزادی کا تمغہ بانٹنے والے ذرائع ابلاغ نے راجبیر کے آگے سر تسلیم خم کردیا اور پروفیسر گیلانی کے خلاف مضامین کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

XI. تین ماہ بعد بغیر ایڈٹ کے حقیقی فلم آجکل ٹی وی چینل پر حملے کا سوال دن نامی پروگرام میں اتفاقاً نشر ہوگئی۔ اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت نے اس کی بناپر پروفیسر گیلانی کو رہا کیا لیکن راجبیر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اور افضل گروپر اس کی دھونس دھمکی کو بھی تسلیم نہیں کیا

XII. پروفیسر گیلانی کو پولس نے اس سازش کا سرغنہ قرار دیا تھا۔ عدالت نے اس الزام کو مسترد کرکے گیلانی کو رہا کردیا لیکن اسی پولس کے الزام کی

بناپر اصل سرغنہ کا پتہ لگائے بغیر افضل کو سزا سنا دی۔

XIII. ایک گواہ نے افضل کو سم کارڈ فروخت کرنے کی جو تاریخ بتلائی، سم کارڈ کو اس کے پہلے سے استعمال میں پایا گیا

XIV. پولس کے مطابق افضل گرو کی نشاندہی پروفیسر گیلانی نے کی لیکن ان کی گرفتاری سے قبل سری نگر پولس کو افضل کی گرفتاری کے احکامات دے دیئے گئے اور ٹی وی والوں نے پولس کے حوالے سے افضل کی تلاش کی خبر نشر کردی۔

XV. افضل نے عسکریت پسندی سے تائب ہوکر ہتھیار ڈال دیئے تھے اور وہ حکومت کی نگرانی میں تھا۔ جو شخص ہر ہفتہ پولس تھانے میں حاضری دیتا ہو اور آئے دن گرفتاری کے عذاب سے گزرتا ہو پارلیمان پر حملے کی سازش نہیں کرسکتا تھا۔

XVI. پولس کی مسلسل نگرانی میں رہنے والے شخص کو لشکر یا جیش اپنی کسی اہم مہم میں استعمال کرنے کی غلطی نہیں کرسکتے تھے

XVII. دسمبر ۱۹ کو جب حملہ آوروں کی تصاویر شائع ہوئیں تو مہاراشٹر میں واقع تھانے پولس کمشنر شنگاری نے ان میں سے ایک کو لشکر کے محمد یاسین کی حیثیت سے پہچان لیا۔ اسے نومبر ۲۰۰۰ء میں ممبئی سے گرفتار کرکے جموں کشمیر پولس کے حوالے کیا گیا تھا ۔پولس کی حراست موجود ملزم کو پارلیمان پر حملہ کرنے کا موقع کس نے دیا؟ یہ اہم سوال ہے۔

افضل گرو کے فیصلے کا اگر کوئی مطالعہ کرے تو ایسے بے شمار نقائص اس کے

سامنے آجاتے ہیں لیکن اگر عدالت کا فیصلے عدل کی بحالی کے بجائے اجتماعی ضمیر کو مطمئن کرنے کیلئے دیئے جانے لگیں تو حقائق دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور انصاف کا خون ہو جاتا ہے۔ اس حادثے میں اور بابری مسجد کے سانحہ میں زبردست مشابہت پائی جاتی ہے دونوں فیصلے عقلی دلائل یا عملی شواہد کی بنیاد پر نہیں کئے گئے۔ بابری مسجد کو مذہبی عقیدے کا مسئلہ بنا کر انصاف کی دھجیاں اڑائی گئیں اور افضل گرو کو اجتماعی ضمیر کی سولی پر چڑھا دیا گیا سیکولر ہندوستان میں عدالت کے فیصلے عقیدے یا ضمیر کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔ عقیدہ اکثریتی فرقے کا اور اجتماعی ضمیر اقلیت کے خلاف ہوتا ہے۔اس نام نہاد جمہوری نظام میں نہ صرف بیلٹ باکس بلکہ عدالت میں انصاف کے ترازو پر بھی بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔

ان دونوں واقعات میں کانگریس اور بی جے پی کے درمیان زبردست تال میل نظر آتا ہے۔ بابری مسجد کے اندر مورتی فرقہ پرستوں نے رکھوائی تالا عدالت نے لگوایا۔اسے کھلوانے کے بعد کانگریس نے شیلا نیاس کروا کر بی جے پی سے وہ مسئلہ چھین لینے کی کوشش کی اور خود ہندو رائے دہندگان کی خوشامد کرنے لگی۔ جب بی جے پی والے مسجد کے انہدام کی خاطر ایودھیا میں جمع ہوگئے تو انہیں مسجد شہید کرنے کا موقع دیا اور اس کا سیاسی فائدہ اٹھا کر بی جے پی ریاستی حکومتیں برخواست کردیں۔ الہ باد عدالت سے فیصلہ کروا کر مسجد کی جگہ رام مندر کو دلوادی۔ پارلیمان پر حملے کا ڈرامہ بی جے پی نے کروایا کانگریس نے

افضل گرو کو اس کے الزام میں پھانسی دے کر پھر ایک بار ہندوؤں کو خوش کرنے کی کوشش کی اور بی جے پی کو ایک اہم انتخابی مدعا سے محروم کردیا۔

ان دونوں مواقع پر کانگریس اور بی جے پی میں مفاہمت کی ایک اور وجہ دونوں کا رام بھکت ہونا ہے۔ یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ گاندھی جی بھی ہندوستان میں رام راجیہ قائم کرنا چاہتے تھے اور راجیو گاندھینے بھی ایودھیا میں شیلا نیاس کے بعد رام راجیہ کا وچن دیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گاندھی جی کا رام راجیہ اڈوانی جی کے رام راجیہ سے مختلف تھا۔ وہ بیچارے یہی نہیں جانتے کہ رام راجیہ کیا تھا۔ اگرانہیں رام راجیہ کی حقیقت معلوم ہو جائے تو وہ ایسا بیان دینے کی غلطی کبھی نہیں کریں گے۔ جن لوگوں نے رامائن پڑھی ہے انہیں پتہ ہے کہ رام راجیہ دراصل رام جی کے بن باس کے بعد ہی قائم ہوا تھا۔ اس سے قبل ایودیا نگری پراول تو راجہ دشرتھ کی حکومت تھی اور بعد میں بھرت کی حکومت قائم ہو گئی۔ رام راجیہ کے قیام سے قبل لنکاکے اندر شری رام کا سیتا مائی کے ساتھ سلوک اور ایودھیا واپس آنے کے بعد سیتا جی پر ڈھائے جانے والے مظالم کا کودیکھنے کے بعدا قلیتوں کے ساتھ کانگریس اور بی جے پی کی بدسلوکی اپنے آپ سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس لئے کہ جمہوری نظام میں اقلیتیں اسی طرح کمزور اور بے بس ہوتی ہیں جیسی کی سیتاجی رام راجیہ کے اندر تھیں۔

بن باس کے دوران شکار پر جانے سے قبل رام نے ایک لکشمن ریکھا کھینچ کر سیتا کو اسے پار نہ کرنے کی ہدایت کی۔ اسی طرح کی ایک سرحد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بٹے ہوئے کشمیر کے درمیان ہے جسے پار کرنے کی اجازت کشمیریوں کو نہیں ہے۔ سیتا کی غلطی یہ تھی کہ وہ راون کو نہ پہچان سکی اور اسے بھکشو سمجھ کے ریکھا سے باہر نکل گئی ۔اس کے نتیجے ان کو اغو کرلیاگیا۔ افضل نے سرحد عبور کرکے پاکستان کی جانب کوچ کیا لیکن واپس آکر اپنی مرضی سے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے باوجود اس کے ساتھ حکومت کارویہ ویسا ہی تھا جیساکے سیتاکے ساتھ شری رام کا تھا۔
لنکا میں فتح حاصل کرنے کے بعد رام از خود سیتاکے پاس نہیں گئے اور جب وہ بیچاری ان کے پاس آئی تو اس سے کہا میں نے دشمن کو شکست دے کر جنگ کے انعام کے طور پر تمہیں حاصل کیا ہے۔ میں نے دشمن کو سزا دے کر اپنا وقار بحال کیا ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے کانگریس والے بی جے پی سے کہہ رہے ہوں ہم نے افضل کو سزا دے کر اپنا وقار بحال کیا ہے۔ میں تمہیں بچانے کیلئے نہیں بلکہ راون کا قتل کرنے اور اپنی ہزیمت مٹانے کیلئے یہاں آیا تھا۔ کانگریس نے آئندہ انتخاب میں اپنا وقار بحال کرنے کیلئے قصاب کے بعد افضل کو قتل کردیا۔ سیتاجی کو جس طرح اگنی پریکشا سے گزرنے پر مجبور ہوناپڑا ویسی ہی

آزمائشوں سے ہتھیار ڈالنے کے بعد افضل کو گزرنا پڑا لیکن اس کے باوجود دونوں پر اعتماد نہیں کیا گیا بلکہ مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا۔

مظلوم سیتا کو محل سے نکالنے کیلئے بھی اجتماعی ضمیر یا رائے عامہ کے پاس و لحاظ کا بہانہ بنایا گیا۔ اس زمانے کسی کے خلاف فضا بنانے کیلئے ذرائع ابلاغ نہیں تھا اس کے باوجود معاشرے میں گردش کرنے والی افواہوں کی بناء پر اپنے اقتدار کو بچانے کی خاطر سیتا کو ایک سازش کے ذریعہ بتلائے بغیر جنگل میں روانہ کر دیا گیا جیسا کہ افضل کے اہل خانہ کو بتلائے بغیر چوری سے پھانسی کے فیصلے پر عملدرآمد ہو گیا۔ رامائن کے اندر سیتا کا انجام دل دہلا دینے والا ہے۔ افضل گرو کی مانند بارہ سال کے بعد والمیکی سیتا کو لے کر مریادہ پرشوتم رام کے دربار میں آتے ہیں۔ سیتا سے اجتماعی ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر پھر ایک بار اگنی پریکشا کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر سیتا دعا کرتی ہے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دھنس جائے۔ ست یگ کے رام راجیہ میں زمین پھٹتی ہے لیکن اس میں ظالم کے بجائے مظلوم کو دھنسنا پڑتا ہے۔ رام راجیہ محفوظ و مامون رہتا ہے۔

رامائن میں سمبوکا نامی ایک شودر کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس غریب کا قصور یہ تھا کہ اس نے سورگ میں جانے کیلئے اپنے طور سے تپیا شروع کر دی تھی۔ جس کے

نتیجے میں ہزاروں میل دور ایودھیا میں ایک براہمن کا بچہ مر گیا۔ اس براہمن نے دربار کے آگے لاش کو رکھ کر مرن برت شروع کردیا۔ رام نے اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے درباریوں سے مشورہ کیا تو انہیں بتلایا گیا کہ کوئی شودر عبادت کر رہا ہے اور یہ دھرم کی بہت بڑی خلاف ورزی ہے۔ رام نے اس معصوم کو تلاش کرکے اسے قتل کردیا۔ براہمن بچہ زندہ ہوگیا سارے لوگوں نے رام کو اس سفاکی پر ویسے ہی مبارکباد دی جیسے کہ کانگریس کو افضل کی پھانسی پر دی گئی ۔ رام راجیہ میں سمبوکا نامی شودر کو بغیر کسی معقول وجہ کے براہمن بچے کی زندگی کیلئے موت کے گھاٹ اترنا پڑتا ہے۔ افضل گرو کی پھانسی اس بات پر شاہد ہے کہ رام راجیہ کے اندر عدل و انصاف کا بول بالا چونکہ ست یگ میں بھی نہیں تھا تو کل یگ میں کانگریسی اور بھاجپائی رام بھکتوں سے اس کی توقع کرنا صرف اور صرف خام خیالی ہے۔

فیض پہنچاتے رہو سب کو شجر کی صورت

بجٹ اجلاس سے چار روز قبل برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون کے ہندوستانی دورے کو اگر کوئی حسنِ اتفاق سمجھتا ہے تو وہ تجارت اور حکومت کے گہرے تعلق سے ناواقف ہے نیز اگر کسی کا خیال ہے کہ بجٹ اجلاس کی اولین رات کو حیدرآباد میں ہونے والے دھماکے محض اتفاق ہیں تو وہ بیچارا نہیں جانتا کہ سیاست اور دہشت کے درمیان کیا رشتہ ہے ؟ سچ تو یہ ہے کہ فی الحال تجارت ، حکومت، سیاست اور دہشت نے آپس میں ایک ایسی سانٹھ گانٹھ کر لی ہے کہ ان سب کے درمیان چولی، دامن ،پایل اور کاجل کو سا تعلق قائم ہو گیا ہے کہ یہ سب مل جل کر ایک دوسرے کے تعاون سے قہر برساتے ہیں۔

ڈیوڈ کیمرون نے ۱۰۰ افراد پر مشتمل وفد کے ساتھ اقتصادی دارالخلافہ ممبئی سے اپنے دورے کا آغاز کیا۔ اسی ہفتہ چونکہ برطانوی معیشت کا درجہ موڈی نامی بین الاقوامی اقتصادی تنظیم نے گھٹا دیا تھا اس لئے معیشت کی بابت ان کی فکرمندی بجا ہے ۔کیمرون کے وفد میں صرف ۱۳ سیاستداں اور بقیہ ۸۷ تاجر تھے۔ اس سے پہلے جب فرانس کا درجہ گھٹا تھا تو اس کے صدر نے بھی ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ یہ ستم ظریفی بھی خوب ہے کہ خستہ حال یوروپین ممالک

ہندوستان جیسے ماضی کے غلام کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو رہے ہیں۔۔برطانیہ کے اندر سب زیادہ زیر ملازمت افراد جگوار لینڈ کروزر میں ہیں جسے ٹاٹا نے خرید لیا ہے۔ لوہے کی برطانوی صنعت متل اسٹیل بھی ایک ہندوستانی کی ملکیت ہے۔ عالمی اقتصادی نقشے پر فی الحال برطانیہ کا چھٹا نمبر ہے اور ہندوستان کا دسواں ہے لیکن یہ قیاس آرائی کی جارہی ہے کہ جلد ہی ہندوستان اسے پیچھے چھوڑ دے گا اور ۲۰۵۰ء تک دنیا کی تیسری سب سے بڑی اقتصادی طاقت بن جائیگا اس لئے ہر کوئی اس کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔

ممبئی میں سرمایہ داروں کے ساتھ تجارت کرنے کے بعد کیمرون حکومت کے ساتھ سودے بازی کرنے کیلئے دہلی پہنچے ۔ وہاں ان کے پیش نظر دو کام تھے ایک تو برطانوی کمپنی وڈافون پر ۱۲۰۰۰ کروڑ کے ٹیکس میں سہولت حاصل کرنا اور فرانس کے ساتھ زیر غور رافلے فائٹر جیٹ کے سودے کو منسوخ کروا کر اپنے طیارے فروخت کرنا ۔۔برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان آئندہ دو سالوں میں ۱۵۰۰۰ کروڑ کی تجارت کا تخمینہ لگایا جارہا ہے۔ اگلے پانچ سالوں میں بھارت ۶۵ لاکھ کروڑ روپئے اپنے بنیادی ڈھانچے انفراسٹرکچر) کو بہتر بنانے پر خرچ کرنا چاہتا ہے اور برطانیہ کی نظر اس کے بڑے حصے) ہے۔ اسی لئے چڑھتے سورج کے پجاری کیمرون نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ ہندوستان اس صدی کی ابھرنے والی کامیاب ترین معیشت میں سے ایک ہوگا اور ہم چاہتے ہیں کہ اس ترقی اور کامیابی میں

برطانیہ اس کا سب سے بڑا ساجھی دار ہو۔ ہندوستان کے ساتھ اشتراک کیلئے جن خصوصی رشتوں کے الفاظ برطانوی وزیر اعظم نے استعمال کئے ہیں وہ اس سے قبل صرف امریکہ کیلئے مختص ہوا کرتے تھے۔

تجارت اور حکومت سے فارغ ہونے کے بعد کیمرون سیاست کرنے کیلئے امرتسر پہنچے۔ مئی ۲۰۱۵ء میں انہیں دوبارہ انتخاب لڑنا ہے اور برطانیہ میں پندرہ لاکھ ہندوستانی رائے دہندگان ہیں۔ ان کی خوشامد کیلئے کیمرون نے جلیان والا باغ کا دورہ کیا۔ وہاں ننگے پیر گئے گھٹنوں پر جھک کر گلہائے عقیدت نذر کے اور زائرین کی بیاض میں اسے برطانوی سامراج کا سب سے شرمناک واقعہ قرار دیتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ لوگ ان سے توقع کر رہے تھے وہ معافی مانگیں گے لیکن ایسا کرنے سے انہوں نے گریز کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر معافی مانگنی نہیں تھی تو وہاں گئے کیوں تھے ؟ اس سوال کا جواب ہے ہندوستانیوں اور سکھوں کو خوش کرنے کی خاطر۔ اور پھر معافی کیوں نہیں مانگی؟ تو اسکی وجہ اپنے گورے رائے دہندگان کو ناراض نہ کرنا ہے۔

انگریز حکمرانوں سے ان کے غلام سیاستدانوں نے یہ فن بہت اچھی طرح سیکھا ہے۔ اس کی بہترین مثال اسی ہفتہ وزیر داخلہ سشل کمار شندے نے پیش کی۔ جے پور میں انہوں نے مسلمانوں کو خوش کرنے اور بی جے پی کو مشکل میں ڈالنے کی خاطر

زعفرانی دہشت گردی سے قوم کو متنبہ کیا تھا۔ چونکہ جے پور اور اجمیر دھماکوں میں ہندو دہشت گردوں کا ملوث ہونا تقریباً ثابت ہوچکا ہے اس لئے وزیر داخلہ کا یہ بیان مبنی بر حقیقت تھا لیکن اس سے بی جے پی کو حکومت کی مخالفت کا ایک موقع ہاتھ آگیا۔ ان لوگوں نے وزیر داخلہ کے بائیکاٹ کا فیصلہ کرلیا۔ بجٹ اجلاس سے قبل بی جے پی کو منانے سمجھانے کی خاطر شندے نے بھی کیمرون کی مانند افسوس کا اظہار کیا۔ نہ تو بیان واپس لیا اور نہ معافی مانگی ۔ اس سے بی جے پی کی خوشامد بھی ہوگئی اسے اپنا احتجاج واپس لینے کا بہانہ بھی مل گیا اور جو ہندو ووٹر شندے کے بیان سے ناراض ہوگیا تھا وہ بھی مطمئن ہوگیا۔

ڈیوڈ کیمرون کو تو دوسال بعد مگر کانگریس کو تو آئندہ سال مئی میں انتخاب لڑنا ہے اس لئے اس کیلئے یہ بجٹ اجلاس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے ۔ اپنے سارے چندہ دہندگان کو خوش کرنے کا یہ آخری موقع ہے تاکہ اگلے الیکشن کیلئے ان سے مزید سرمایہ حاصل کیا جاسکے اور اس کام میں حزب اختلاف کا تعاون غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے ۔ بی جے پی کو بھی ساہوکاروں سے دولت حاصل کرنی ہے اس لئے وہ بھی ان کو ناراض کرنا نہیں چاہتی اس لئے دونوں کے اندر بڑی آسانی سے من مٹاو ہوگیا لیکن اس بار کے بجٹ میں کانگریس کو سنگین مسائل کا سامنا ہے ۔ ترقی کی شرح کم ہوکر ۲۰۰۳ء کی سطح پر پہنچ گئی ہے ۔ ایسے میں

معیشت کی مضبوطی کی خاطر کئے جانے والے اقدامات عوامی فلاح و بہبود کی جانب سے توجہات ہٹاتے ہیں۔ دن بدن مہنگائی اور بیروزگاری کی چکی میں پسنے والی عوام کیلئے یہ خطرے کی گھنٹی ہے۔

بجٹ اجلاس کے دہانے پر تمام مزدور یونینوں نے متحد ہو کر ایک بھارت بند کا اعلان کیا جسے غیر معمولی کامیابی ملی ۔ اس ملک گیر ہڑتال نے عوام کے ان بنیادی مسائل کو ابھارا جن سے حکومت اور سیاسی جماعتیں صرف نظر کر رہی تھیں ۔ان مسائل کا زعفرانی دہشت گردی اور اس پر کی جانے والی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے شندے کی معذرت کافی نہیں تھی سو دھماکہ ہو گیا۔ حیدرآباد کے دھماکے نے ذرائع ابلاغ کی ساری توجہعوام کے بنیادی مسائل اور ملک گیر ہڑتال ہٹا کر دہشت گردی کی جانب مبذول کروادی اور لوگ بھول گئے کہ احتجاج کیوں کیا جارہا تھا۔ وزیراعظم منموہن سنگھ نے بجٹ اجلاس سے ایک روز قبل سیاسی جماعتوں سے جس تعاون کا مطالبہ کیا تھا اور اتحاد و یکجہتی کی توقع کی تھی وہ انہیں باآسانی حاصل ہو گئی ۔ بجٹ اجلاس کے دوسرے دن ساری پارلیمان حیدرآباد ھماکے کے خلاف نہ صرف متحد بلکہ حکومت کے شانہ بشانہ کھڑی تھی۔

حزب اختلاف کی رہنما سشما سوراج نے وزیر داخلہ کی نا اہلی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کہا اطلاع ہونے باوجود یہ دھماکے کو کیوں نہیں روکا جاسکا؟اور

معصوم لوگوں کی جانیں کیوں ضائع ہوئیں ؟ہمیں دہشت گردی کے خلاف متحد ہونا چاہئے ؟ یہ تو گویا کانگریس کی من مراد تھی جو پوری ہو گئی ۔ سشما نے پہلی مرتبہ یہ تسلیم کیا کہ دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ نہ اسکی کوئی ذات اور نہ رنگ ہوتا ہے ۔جب تک ہندو دہشت گرد گرفتار نہیں ہوئے تھے یہ بات سنگھ پریوار کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ملائم سنگھ یادو جو کبھی کانگریس کے لئے سخت تو کبھی نرم ہوتے رہتے ہیں بولے سارا ملک اور ایوان حکومت کے ساتھ ہے ۔اس طرح کے واقعات سے ساری قوم متاثر ہوتی ہے اور خوف کے ماحول میں زندگی بسر کرتی ہے ۔اس طرح بجٹ اجلاس سے قبل حکومت نے ایک دھماکے کی مدد سے اپنے حلیفوں اور حریفوں دونوں کو دام فریب میں گرفتار کرلیا۔ اس کیلئے چند معصوموں کا خون کا نذرانہ اورکچھ بے گناہ نوجوانوں کو قیدو بند کسی بھی سفاک اقتدار کیلئے مہنگا سودہ نہیں ہے ۔

اس دھماکے سے وزیرداخلہ شندے نے گویا اپنے سارے گناہوں کا کفارہ ادا کردیا ۔اس لئے کہ دھماکے کے دوسرے دن انہوں نے اپنے اندیشے کااظہار کرتے ہوئے فرمایا یہ افضل گرو اور اجمل قصاب کی پھانسی کا ردعمل ہو سکتا ہے ۔ان کے مطابق وہ ان پھانسیوں کے ردعمل کی توقع کررہے تھے اور اسی لئے سارے ملک کی خفیہ ایجنسیوں کو چوکنا کردیا گیا تھا۔انہوں نے کولکتہ میں یہ اعلان کیا کہ کئی ریاستیں اس کی مخالفت کے باوجود اب انسدادِ دہشت گردی کا قومی مرکز

قائم کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ اس ایک دھماکے کی مدد سے شندے نے ہندو رائے دہندگان کو پھر ایک بار یاد دلایا کہ افضل گرو اور اجمل قصاب کو پھانسی دینے کا کارنامہ ان کی جماعت نے کیا ہے اس لئے انہیں بی جے پی کے بجائے کانگریس کا احسانمند ہونا چاہئے۔ انہوں نے دھماکوں کا تعلق افضل اور اجمل سے جوڑ کر شک کی سوئی کو مسلمانوں کی جانب موڑ دیا حالانکہ حیدرآباد میں اس سے قبل مکہ مسجد دھماکے کے ذمہ دار ہندو دہشت گرد پائے گئے تھے۔

شندے جو کچھ کہا اس میں کچھ بھی نیا نہیں تھا ان کی پولس دھماکے کے بعد تین تین گھنٹے کے اندر اس نتیجہ پر پہنچ گئی تھی ۔ وہ رات ۱۱ بجے سے قبل لشکر طیبہ، جیش محمد اور حزب المجاہدین کے ساتھ انڈین مجاہدین کے ملوث ہونے کا امکان ظاہر کرچکی تھی۔ اسی کے ساتھ ۲۴ گھنٹے کے اندر اس نے سید مقبول اور عمران خان کے نام ظاہر کردیئے جو اکتوبر سے پولس حراست میں ہیں ۔ یہ دلچسپ بات ہے جن لوگوں کو پولس گرفتار کرکے رکھے ہوئے ہے وہ دھماکہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ریاض بھٹکل کے اشارے پر ان دھماکوں کے ہونے کا الزام بھی ذرائع ابلاغ میں آگیا گویا ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر منڈھ دی گئی حالانکہ اس وقت تک فارنسک تجربہ گاہ کی رپورٹ بھی موصول نہیں ہوئی ۔ کانگریس نے اس دھماکے کی مدد سے اپنے قومی انسدادِ دہشت گردی کے مرکز کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے کی بھی سعی شروع کردی جس کی مدد سے مرکزی حکومت

کو ریاستی حکومت کے کام کاج میں دخل اندازی کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔
دھماکوں کی دھول میں ملک گیر ہڑتال کے ان مطالبات کو حکومت سمیت قوم نے یکسر بھلا دیا جن کا تعلق عام آدمی سے ہے۔ دور حاضر میں ذرائع ابلاغ پر جس طبقہ کو عام آدمی کا نام دیا جارہا ہے وہ دراصل متوسط طبقے کے لوگ ہیں جو امیروں کے مقابلے بدحال ضرور ہے لیکن غریب عوام سے بہت زیادہ خوشحال ہے اور سرکاری سہولتوں کا سب سے زیادہ مستفید ہورہے ہیں۔ اس بند میں اول تو مہنگائی کو روکنے کا مطالبہ کیا گیا تھا جس پر لگام لگانے میں حکومت پوری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ بیروزگاری کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی تھی گو کہ صدر مملکت نے آئندہ دس سالوں دس کروڑ نیا روزگار فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے مگر یہ دس سال کافی طویل مدت ہے ملک کے نوجوان جاننا چاہتے ہیں مستقبل قریب میں کیا ہوگا؟ ہندوستان میں محنت کشوں کیلئے بے شمار قوانین ہیں لیکن ان پر عملدرآمد نہیں ہوتا۔ اسلئے اس جانب بھی توجہ مبذول کروائی گئی
۔

حیرت کی بات یہ ہے بجٹ پر ہونے والے مباحث میں شاذ و نادر ہی ان مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ زیادہ تر گفتگو خسارے کو کم کرنے یا ٹیکس دہندگان کو سہولت فراہم کرنے کے بارے میں ہوتی ہے۔ حکومت کو اپنی ۳۴ نشستوں میں ۷۱ دستوری ترمیمات کو منظور کروانے کی فکر لاحق ہے اور اسی کے ساتھ قومی بجٹ کے ساتھ

ساتھ ریلوے بجٹ کا بھی مسئلہ ہے۔دستوری ترمیمات میں سے تین کا تعلق خواتین سے ہے اور دو دہلی عصمت دری کے واقعہ کے نتیجے میں سامنے آئی ہیں۔ جسٹس ورما کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی تعذیراتی قوانین میں تبدیلی، خواتین کے ساتھ بدسلوکی کا قانون اور خواتین کیلئے ایوان میں محفوظ نشستوں کا قانون۔اس کے علاوہ دلتوں کیلئے ریزرویشن کا معاملہ، شکایات درج کرانے کا قانون، لوک پال بل،لازمی تعلیم اور غذا کی یقین دہانی کا قانون اہم ہیں۔

اقتصادی میدان میں گزشتہ دہائی کو ہندوستان کا سنہرہ دور کہا جاتا ہے اس لئے کہ عالمی کساد بازاری کے باوجود جبکہ یوروپ اورامریکہ ایا ۲ فیصد کی شرح سے ترقی کررہے تھے ۔فرانس صفرپر خوش تھااور پولینڈ،اسپین۔اٹلی ویونان جیسے ممالک کا دیوالیہ پٹ رہا تھا ہندوستان کی ترقی شرح ۹ فیصدرتک پہنچ گئی تھی۔لیکن گزشتہ سال ہندوستان کی ترقی کی شرح ۵ سے کم ہوگئی اوراب انڈونیشیا ہندوستان سے آگے بڑھنے کی کوشش کررہا ہے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اس سنہری دور میں بھی غریبوں کی حالت زار میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ان کی آمدنی میں اضافہ مہنگائی کی شرح سے کم رہااور چین کے مقابلے یہ رفتار ۷ گنا کم تھی۔ ملک کے ۲۰ کروڈ لوگ بجلی سے محروم رہے اور ۶۰ کروڈ کی شامیں بجلی کی کٹوتی کے باعث تاریک رہیں۔

وزیر اعظم منموہن نے بھی یہ تسلیم کیا کہ بچوں کی ناقص غذائیت یا قلت کا باعثِ شرم ہونا تسلیم کیا لیکن اس جانب کوئی ٹھوس پیش رفت نہ ہو سکی۔ صحت عامہ پر چین نے اپنی مجموعی پیداوار کا ۲ء۷ فیصد خرچ کرکے عوام کیلئے صحت کی سہولت کو یقینی بنایا لیکن ہم نے صرف ۱ء۲ فیصد خرچ کرنے پر اکتفا کیا۔ اس دوران بدعنوانی میں بے شمار اضافہ ضرور ہوا اور سوئس بنکوں میں ہندوستانی کالا دھن سب سے زیادہ ہوگیا ایسے میں ایک خوش کن خبر عظیم پریم جی کی جانب سے اخبارات میں آئی جنھوں نے ۱۲ ہزار تین سو کروڑ روپئے اپنے خیراتی ادارے عظیم پریم جی فاونڈیشن میں اعانت کے طور پر جمع کرادیئے تاکہ اس کا استعمال عوام کی فلاح و بہبود کیلئے کیا جاسکے۔ اس سے قبل ۲۰۱۰ء میں وہ ایک خطیر رقم اس کارِ خیر کیلئے وقف کرچکے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک جانب ملک کے سیاسی رہنما عوام میں تفریق و عداوت کے بیج ڈال کر قومی خزانے لوٹ رہے ہیں دوسری جانب ایک بے لوث تاجر افتخار راغب کے اس شعر کی مصداق اپنی دولت غریب عوام پر لٹا رہا ہے

کوئی تفریق نہ مطلب نہ عداوت نہ حسد
فیض پہنچاتے رہو سب کو شجر کی صورت

بنگلہ دیش: ظلمت کے غضب سے نہیں ڈرتا کوئی سورج

ہندوستان میں صدر جمہوریہ کو عام طور پر کوئی ایسا کام کرنے کا موقع کم ہی ملتا ہے کہ وہ اس کی وجہ سے یاد کیا جائے لیکن ایسا لگتا ہے پرنب مکرجی کا دورِ صدارت سزائے موت کے نام سے جانا جائے گے۔ ان کے زیر صدارت اول تو اجمل قصاب کو پھانسی ہوئی اور اس کے بعد افضل گرو کو تختۂ دار کا منھ دیکھنا پڑا۔ان دونوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ویرپن کے چار ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوئے لیکن درمیان میں کوئی رکاوٹ پیش آئی تو انہوں نے اپنی سسرال یعنی بنگلہ دیش جانے کا فیصلہ کیا۔ صدرِ مملکت کی حیثیت سے یہ ان کا پہلا غیر ملکی دورہ ہے لیکن یہ دورہ بھی ایک ایسے موقعہ پر کیا گیا جبکہ بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے نائب امیر اور عالمی شہرت یافتہ عالمِ دین علامہ دلاور حسین سعیدی کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور اس کے خلاف احتجاج کا جو سلسلہ شروع ہوا تو حکومت نے اسے بزور قوت روکنے کی خاطر دو چار دنوں میں تقریباً سو لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب چونکہ ظالم حسینہ پرنب دا قوم کے سب سے بڑے اعزاز سے نواز رہی ہیں تو ان پر لازم ہوگیا کہ وہ اس کے ظلم و جبر سے آنکھیں پھیرلیں اور اس کی بیجا تعریف و توصیف کے پل باندھیں۔ حقیقت یہی ہے کہ پرنب دا اپنی تمام تر سیاسی مہارت کے باوجود حسینہ کے دام میں آگئے۔ اس نے اپنے

مظالم کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے انہیں اپنے ملک کا دورہ کرنے کی دعوت دی لیکن ہوا یہ پرنب کے دورے کے سبب وہ احتجاج جس کی جانب سے ہندوستانی ذرائع ابلاغ اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے تھے منظر عام پر آگیا۔ حسینہ واجد کے چہرے پر لگا منافقت کا غازہ ڈھل گیا اور کریہہ چہرہ ساری دنیا کے سامنے بھی آگیا۔ لگتا ہے صدارتی محل میں جانے کے بعد پرنب مکرجی سیاسی داؤں پیچ بھول گئے ورنہ اس موقع پر حسینہ واجد کے جھانسے میں آکر بنگلہ دیش کا دورہ ہرگز نہیں کرتے جبکہ امریکہ تک نے بنگلہ دیش کی مذمت کی ہے اور ساری دنیا میں احتجاج ہو رہے ہیں۔

پانچ سال قبل بنگلہ دیش میں سات سال کے بعد انتخابات کا انعقاد ہوا جس میں حسینہ واجد نے زبردست کامیابی درج کرائی لیکن اس عرصے میں عوام الناس کی فلاح و بہبود کا وہ کوئی ایسا کام نہ کرسکیں جس کے سبب لوگ انہیں دوبارہ اس سال کے اواخر میں منتخب کریں۔ اسی غرض سے انہوں نے ایک سال قبل سے جنگی مجرمین کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ فسطائی قومی جذبات کو بھڑکا کر دوبارہ انتخاب جیتنے کا منصوبہ بنایا اور بڑی صفائی سے اس پر عمل پیرا ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بنگلہ دیش کے اندر جماعتِ اسلامی سقوط پاکستان کے خلاف تھی لیکن یہ اس کا ایک سیاسی فیصلہ تھا اور اس نظریہ کی حامل اور بھی بہت ساری جماعتیں سابقہ بنگلہ دیش یعنی مشرقی پاکستان میں موجود تھیں مثلاً مسلم لیگ، جمیعت

العلماء پاکستان اور چین نواز کمیونسٹ پارٹی وغیرہ لیکن اس طرح کے نظریاتی اختلافات کو سیاسی دشمنی بنا کر عوام کو ورغلانا اور اپنی سیاست چمکانا کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ ہندوستان کی آزادی کے وقت کانگریس اور مسلم لیگ میں ملک کی تقسیم کے مسئلہ پر اختلاف تھا مگر تقسیم کے بعد بھی مسلم لیگ ہندوستانی سیاست میں سرگرم ہے بلکہ کیرالا کی حکومت میں شامل ہے۔ خان عبدلغفار خان کی عوامی نیشنل پارٹی پاکستان بنانے کے ویسے ہی خلاف تھی جیسی کہ جماعت اسلامی سقوطِ پاکستان کی مخالف تھی لیکن عوامی نیشنل پارٹی بھی پاکستان کی ایک اہم سیاسی جماعت ہے اور صوبہ سرحد میں فی الحال اسی کی صوبائی حکومت ہے۔ لیکن افسوس کہ بنگلہ دیشی وزیراعظم نے اس اختلاف میں بے بنیاد الزامات جوڑ کر اسے انتخابی کھلونا بنا دیا۔

بنگلہ دیش کی تاریخ کو مشرقی پاکستان سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ جنرل ایوب خان کی آمرانہ حکومت کے خلاف جماعت اسلامی نے کھل کر تحریک چلائی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جس طرح اب حسینہ واجد جماعت کے رہنماوں کی دشمن بنی ہوئی ہیں جنرل ایوب خان نے بھی قادیانیت کا بہانہ بنا کر مولانا ابواعلیٰ مودودی کو تختۂ دار تک پہنچانے کا اہتمام کردیا تھا لیکن مشیت ایزدی نے اسے اپنے ناپاک عزائم میں ناکام کردیا۔ ایوب خان کے خلاف پاکستانی جمہوری تحریک۔ حزب اختلاف کا متحدہ محاذ اور جمہوری ایکشن کمیٹی کے قیام میں

جماعت پیش پیش تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حسینہ کے والد شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی جماعت عوامی لیگ متحدہ محاذ اور ایکشن کمیٹی میں شامل تھیں۔ خیر یہ تو بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے کی بات ہے لیکن ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جمہوریت کی بحالی کی خاطر چلائی جانے والی تحریک میں بنگلہ دیش نیشنل پارٹی اور جماعت کے ساتھ عوامی لیگ بھی شریک تھی۔ ان تینوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام کیا تھا۔ اس وقت عوامی لیگ کو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ جنگی مجرمین کے ساتھ اشتراک کر رہے ہیں اور جنگی مجرمین ملک میں جمہوریت کے فروغ کا کام کر رہے ہیں۔ بنگلہ دیش کے دستور میں ترمیم کر کے غیر جانبدار اقتدار کے تحت انتخابات کے انعقاد کی تجویز جماعت اسلامی نے سب سے پہلے پیش کی اور جنرل ارشاد کی جاتیہ پارٹی کے علاوہ عوامی لیگ نے اس کا ساتھ دیا۔

حسینہ واجد کی جماعت عوامی لیگ کو اس سے پہلے بھی دو مرتبہ ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۵ء اور ۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۱ء اقتدار حاصل ہو چکا ہے۔ اس دوران باپ اور بیٹی دونوں کو کبھی بھی جماعت اسلامی کا جنگی جرائم میں ملوث ہونا یاد نہیں آیا لیکن ۲۰۱۰ء میں جا کر اچانک حسینہ واجد پر یہ انکشاف ہوا اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد سے جماعت اسلامی باقائدہ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے قومی انتخابات میں حصہ لیتی رہی ۱۹۹۱ء کے انتخابات میں جماعت کو پارلیمان کی ۱۸ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ اس وقت عوامی لیگ کے رہنما امیر حسین امو نے جماعت کو عوامی لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت تشکیل میں شمولیت کی دعوت دی

اور اس کے دو ارکان کو وزارت دینے کا بھی وعدہ کیا۔ تو کیا وہ جنگی مجرمین کو وزیر بنا رہے تھے؟ جماعت اسلامی نے اقتدار کی خاطر اپنے اصولوں کو قربان کرنے کے بجائے عوامی لیگ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اور اقتدار سے باہر رہ کر بنگلہ دیش نیشنل پارٹی کا تعاون کیا۔ ۲۰۰۱ء میں جماعت کو ۱۷ اسیٹوں پر کامیابی ملی اور بی این پی کے ساتھ مخلوط حکومت میں وہ شامل ہوئی۔ جماعت کے رہنماؤں مولانا مطیع الرحمٰن کو وزیر زراعت وصنعت اور علی احسن مجاہد کو سماجی فلاح و بہبود کا وزیر بنایا گیا۔ ان دونوں نے اپنی میقات مکمل کی اور غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا لیکن اب اچانک ان دونوں کا نام جنگی مجرمین کی فہرست میں شامل ہو گیا۔

عوامی لیگ کے لوگ جو تماشہ فی الحال کر رہے ہیں اسی طرح کی ایک گھناونی سازش وہ اس وقت بھی کر چکی ہے جب جماعت اقتدار میں شامل تھی۔ ۲۰۰۵ء کے اندر اچانک ملک میں بم دھماکوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ان دھماکوں میں نچلی عدالت کے دو جج بھی جاں بحق ہو گئے۔ چونکہ یہ دھماکے اسلام کے نام پر کئے جا رہے تھے اس لئے ذرائع ابلاغ نے ان کا تعلق جماعت اسلامی سے جوڑ دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب جماعت تشدد کے ذریعہ اقتدار کی راہیں ہموار کر رہی ہے۔ کسی نے کہا دہشت گردوں کو جماعت کی سرپرستی حاصل ہے، کوئی بولا ان کے حوصلے جماعت کی وجہ سے بلند ہوئے ہیں وغیرہ لیکن جماعت اسلامی نے نہ صرف ان

دھماکوں پر زور مذمت کی بلکہ ان کے خلاف ملک کو طول و عرض میں عوامی جلسوں کا اہتمام کیا جس سے رائے عامہ اس کے خلاف ہو گئی اور بہت جلد اقتدار کی مدد سے مجرمین کو گرفتار کر کیفرِ کردار تک پہنچا دیا گیا۔

جنگی جرائم کے مجرمین کا جہاں تک تعلق اس کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام کی جنگ عملاً پاکستانی فوج اور مکتی باہنی کے درمیان لڑی گئی جس میں عوامی لیگ کے لوگ شامل تھے۔ اس وقت پاکستانی حکومت انہیں علٰحیدگی پسند اور دہشت گرد کا نام دیتی تھی۔ ان کے تربیتی کیمپ سرزمینِ ہند پر اسی طرح قائم تھے جیسے آئی ایس آئی کے کیمپ پاکستان میں موجود ہیں اور ہماری حکومت جن پر بمباری کی بات کرتی ہے۔ مکتی باہنی کے نوجوان ہندوستان میں تربیت حاصل کرنے کے بعد اسلحہ سے لیس ہو کر بنگلہ دیش میں اسی طرح سرحد پار کرکے جاتے تھے جیسے کہ کشمیری نوجوان آتے ہیں۔ دونوں کے لبوں پر آزادی کا نعرہ ہوتا تھا۔ پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ ہندوستان نے باقائدہ پاکستان پر فوج کشی کردی اور پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے اور انہیں جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ یہی وہ احسانِ عظیم ہے جس کیلئے اندرا گاندھی کے بعد اب پرنب مکرجی کو بنگلہ دیش کے عظیم ترین قومی اعزاز سے نوازہ جارہا ہے۔ اس جنگ میں سب سے کم ہندوستانی یا پاکستانی فوجی مارے گئے اور ان سے کچھ زیادہ مکتی باہنی لوگ ہلاک ہوئے اس لئے کہ یہ سب ہتھیار بند تھے۔ سب سے زیادہ جانی نقصان

نہتے عوام کا ہوا۔ یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ اس نازک دور میں کئی ہندو خاندانوں کو جماعت کے لوگوں نے پناہ دی اور تحفظ فراہم کیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے دورِ اقتدار میں ۱۹۷۳ء کے اندر دستور میں ترمیم کرکے جنگی مجرمین کو بنیادی حقوق کے تحفظ سے محروم کیا گیا اور پارلیمان نے بین الاقوامی جرائم (ٹریبونل) ایکٹ پاس کیا تاکہ انہیں سزا دی جاسکے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت نے ۹۳ ہزار پاکستانی فوجیوں میں سے صرف ۱۹۵ پر جنگی جرائم کا لزام لگایا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اس وقت بنگلہ بندھو کو جماعت اسلامی کے اندر کو جنگی مجرم نہیں آیا۔ ۱۹۷۴ء میں شملہ معاہدے کی روشنی میں دہلی کے اندر بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے خارجہ نے ان ۱۹۵ جنگی مجرمین کو بھی مقدمہ چلائے بغیر پاکستان واپس بھیج دینے کے معاہدے پر دستخط کردیئے۔ اس معاہدے کے الفاظ درج ذیل ہیں:

اس بابت تینوں وزرائے خارجہ (کمال حسین: بنگلہ دیش، عزیز احمد: پاکستان اور ○ سورن سنگھ: بھارت) نے یہ محسوس کیا معاملات کو دوستی اور یگانگت کے زاویہ سے دیکھنا چاہئے۔ وزراء نے اس بات کو تسلیم کیا کہ پاکستانی وزیراعظم نے بنگلہ دیشی وزیراعظم کی دعوت پر بنگلہ دیش کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور بنگلہ دیش کی عوام سے ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر عفو ودرگزر کے ذریعہ تعلقات بحال کرنے کی اپیل کی ہے۔ بنگلہ دیشی وزیراعظم نے بھی اعلان کیا کہ

وہ چاہتے ہیں عوام ۱۹۷۱ء کے مظالم اور تباہ کاری کو بھلا کر ایک نئے دور کا آغاز کریں اور ظاہر کردیں کہ بنگلہ دیش کے عوام معاف کرنا بھی جانتے ہیں۔

آگے بڑھنے کی غرض سے اور خاص طور پر بنگلہ دیش کی عوام سے پاکستانی وزیر اعظم ○ کی درخواست پر کہ ماضی کی غلطیوں کو بھلا کر معافی تلافی سے کام لیا جائے، بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ نے کہا کہ بنگلہ دیش کی حکومت نے جذبۂ خیر سگالی کے تحت مقدمات کو نہیں چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ جنگی مجرمین کو بھی دیگر جنگی قیدیوں کے ساتھ واپس بھیج دیا جائیگا۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے ۱۹۷۳ء میں صدارتی حکمنامہ نمبر ۱۶ جاری کروا کر تنازعہ میں ملوث سارے لوگوں کیلئے عام معافی کا اعلان کردیا تھا اس طرح گویا جنگی مجرمین کا باب بند ہوگیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی خوش فہمی کہ بنگلہ دیشی معاف کرنا جانتے ہیں ان اپنی بیٹی حسینہ واجد نے دور کردی۔ باپ نے پاکستانی فوج کے مجرمین کو معاف کردیا لیکن بیٹی نے خود اپنے ہی ملک کے معصوم سیاسی مخالفین کو سوئے دار پہچانا شروع کردیا۔ ویسے شیخ مجیب الرحمٰن بھی اپنے سیاسی حریف اور جماعت اسلامی کے نہایت مقبول رہنما پروفیسر غلام اعظم کو فراخ دلی کے ساتھ معاف نہ کرسکے تھے۔پروفیسر غلام اعظم کو ۲۲ سالوں تک بنگلہ دیش کی شہریت سے محروم رکھا گیا اور بالآخر اپنا یہ بنیادی حق حاصل

کرنے کیلئے انہیں عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔ انہوں نے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں سرکار کے اس حکمنامے کو چیلنج کیا اور اپنے شہریت کو تسلیم کروایا۔ پروفیسر غلام اعظم پر بھی جنگ آزادی کے دوران مظالم کے ارتکاب کا الزام تھا مگر ہائی کورٹ کا وہ جج نے بھی جس نے انہیں شہری تسلیم نہیں کیا تھا اپنے فیصلے میں لکھا مدعا الیہ (غلام اعظم) کا پاکستانی فوج یا اس کے آلۂ کار رضاکار، البدر یا الشمس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا جنگ آزادی کے دوران ڈھائے جانے والے مظالم سے کو سروکار نہیں ہے۔ عدالت عالیہ کی شہادت کے باوجود شیخ حسینہ واجد کی حکومت نے پروفیسر غلام اعظم کو جنگی مجرم قرار دے رکھا ہے۔ بلکہ جج کے استفسار پر کہ غلام اعظم فوجیوں کو کیوں کر احکامات دے سکتے تھے جبکہ ان کے پاس کوئی سرکاری عہدہ نہیں تھا تو سرکاری وکیل کہتا ہے وہ تو اس زمانے میں ہٹلر کی مانند تھے اور ہٹلر کو کسی عہدے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب اس احمق کو کون بتائے کہ ہٹلر جنگ عظیم کے زمانے میں شیخ حسنہ واجد کی مانند دستوری سربراہِ مملکت تھا اور شیخ حسینہ وہی سب کر رہی ہے جو ہٹلر کیا کرتا تھا۔

جمہوریت کی دنیا میں امریکہ ساری دنیا کی رہنمائی کرتا ہے۔ صدر اوبامہ کو اپنے انتخاب سے ایک سال قبل ایک جعلی اسامہ بن لادن کو ہلاک کرکے اپنے آپ کو دلیر ثابت کرنا پڑا تب جاکر وہ انتخاب جیت سکا۔ منموہن سنگھ افضل گرو

کی پھانسی کے سہارے کانگریس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور حسینہ واجد چاہتی ہے کہ مولانا دلاور حسین سعیدی کو تختۂ دار پر چڑھا کر اقتدار پر اپنا قبضہ برقرار رکھے اسی لئے سرکاری وکیل رانا داس گپتا بڑی ڈھٹائی کے دعویٰ کرتا ہے ۲۰۱۲ء جنگی جرائم کے فیصلوں کا سال تھا اور ۲۰۱۳ء ان فیصلوں پر عملدرآمد کا سال ہے۔ لیکن اس دھمکی کے جواب میں علامہ سعیدی نے بھری عدالت میں کہا کہ اگر قرآن کی تبلیغ میرا جرم ہے تو میں اس کیلئے ہزار بار پھانسی کے تختے پر چڑھنے کیلئے تیار ہوں۔ مولانا کے حق میں ۱۶ شواہد کو طلب کیا گیا تھا لیکن ان کی پیشی کے بغیر ہی سزائے موت کا ظالمانہ فیصلہ سنا دیا گیا ۔ مولانا سعیدی نے مومنانہ شجاعت کے ساتھ جج کو مخاطب کرکے کہا کہ عدالت کے دو مرحلے ہیں۔آج میں بے کس اور معصوم مدعاالیہ ہوں اور آپ کو جج کی کرسی پر بٹھایا گیا ہے تاکہ سیاسی مفاد کی خاطر مجھ سے انتقام لیا جائے۔آج طاقتور لوگ معصوموں پر ظلم ڈھا رہے ہیں کل قیامت کے دن ساری کائنات کے مالک احکم الحاکمین کی عدالت میں یہ ظالم مجرم کے کٹھہرے میں کھڑے ہوں گے اور ہم مظلوم مدعی ہوں گے یہ کہہ کر مولانا نے ان لرزہ خیز آیات کی تلاوت کی : کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ (التین)۔جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے (الدخان)۔

افسوس کے بنگلہ دیش کے سرخ پرچم پر بنا سورج فی الحال روشنی کے بجائے

تاریکی پھیلا رہا ہے۔ حق و باطل کی جو کشمکش فی الحال سرزمینِ بنگلہ دیش میں برپا ہے کوئی نئی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ سے رہی ہے اور جاری رہے گی۔ اس کا مقام بدلتا رہتا ہے کبھی افغانستان کے کہسار تو کبھی صحرائے فلسطین۔ کبھی ایران کی گلیاں تو کبھی مصر کے بازار لیکن حق کے علمبردار نہ کبھی پسپا ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے بقول افتخار راغب

ہے نور کی ظلمات سے یہ جنگ پرانی
لڑتا ہے اندھیروں سے ہمیشہ کوئی سورج

کرناٹک: بھگواپرچم، خاکی نیکر، کالی ٹوپی ہوا ہوئی

جنوبی ہندوستان کی سیاست اس لحاظ سے منفرد تھی کہ وہاں ۲۰۰۸ء تک بھارتیہ جنتا پارٹی کو اپنے قدم جمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تمل ناڈو میں تو خیر کانگریس کی بھی دال نہیں گلتی ہے بلکہ ہر انتخاب کے بعد اسے اپنا پارٹنر بدلنے کی نوبت آجاتی ہے ۔ آندھرا پردیش میں کانگریس کامقابلہ تلگودیسم نامی علاقائی جماعت سے ہے جو سیکولر ہونے کے باوجود بھارتیہ جنتا پارٹی سے رشتہ رکھنا معیوب نہیں سمجھتی ہے اور کیرالا میں کانگریس پارٹی دائیں بازو کے اتحاد سے مقابلہ کرنے کی خاطر مسلم لیگ کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور ہے لیکن پانچ سال قبل اس صورتحال میں ایک زبردست تبدیلی آئی اور کرناٹک میں بی جے پی کو ۲۲۴ میں سے ۱۱۰ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوگئی اور اس نے اپنے بل بوتے پر حکومت قائم کرلی اس طرح گویا زعفرانی کمل جنوبی ہند میں کھل گیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی یوں تو ۲۰۰۴ء کے انتخاب میں کرناٹک کی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی لیکن وہ واضح اکثریت حاصل نہیں کرپائی تھی۔ کانگریس کو چاہئے تھا وہ جنتا دل ایس کی مدد سے بی جے پی کو اقتدار میں آنے دیتی اور خود عوام میں اپنا اثرورسوخ بڑھاتی تاکہ عوام اس کو ۲۰۰۸ء منتخب کرکے حکومت

کرنے کا پھر سے موقع دیتے یا پھر اپنی قدیم روایت کے مطابق اقتدار سے باہر رہ کر جنتا دل کی حکومت کی حمایت کرتی اور حالات کے سازگار ہوتے ہی سرکار کو گرا کر انتخاب میں کامیابی حاصل کرلیتی لیکن اقتدار کی ہوس میں کانگریس نے تیسرا راستہ اختیار کیا۔ جنتادل ایس کی مدد سے اپنی حکومت قائم کرلی اور بھیم سنگھ جیسے نااہل آدمی کو وزیراعلیٰ بنادیا جو پانچ سال بعد خود اپنے حلقۂ انتخاب بیدر سے ہار گیا۔

جنتادل ایس نے پہلے تو فسطائیت کے خلاف شور مچا کر عوام سے ووٹ مانگا پھر ہندوتوا کو اقتدار سے دور رکھنے کا بہانہ بنا کر کانگریس سے مفاہمت کی لیکن بالآخر اپنی ابن الوقتی کا چولا اوڑھ کربی جے پی سے ساز باز کرلی۔دیوے گوڑا کے فرزند کمار سوامی بی جے پی سے ساز باز کرکے وزیراعلیٰ بن گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب یدورپآ جیسے ترشول دھاری کو جنوبی ہند کی کسی ریاست میں نائب وزیراعلیٰ بننے کا موقع ملا تھا لیکن یہ اس کا حق تھا۔ سیکولر جنتا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے درمیان یہ معاہدہ طے ہوا کہ بیس ماہ بعد کمار سوامی اپنا عہدہ چھوڑ کر یدورپآ کو وزارت اعلیٰ کی کرسی سونپ دیں گے۔بی جے پی چاہتی تھی کہ انتخابات ان کی نگرانی میں ہوں لیکن کمار سوامی اپنے وعدے سے مکر گئے۔ان دونوں بلیوں کی لڑائی سے فائدہ اٹھا کر کانگریسی بندر نے صدر راج نافذ کردیا۔

کے انتخاب کے اس پس منظر کا جس کا بہترین استعمال یدورپاّ نے کیا۔ اس ۲۰۰۸ئ
نے کمار سوامی کی بدعہدی کو ذات برادری کے دھرم یدھ میں تبدیل کر دیا۔ کرناٹک
کی سیاست ویسے بھی لنگایت اور ووکالیگا برادری کے درمیان گردش کرتی ہے۔ یدورپاّ
نے کمار سوامی وعدہ خلافی کو ووکالیگا کے ذریعہ لنگایت سماج کی حق تلفی قرار دے کر
اپنے حق میں ہمدردی کی لہر چلا دی۔ یدورپاّ نے بڑی چالاکی سے والمیکی اور میڈیگا س
برادری کو بھی اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ ابن الوقتی اور موقع پرستی کے سبب کمار سوامی اپنی
ساکھ گنوا چکا تھا۔ جنتادل ایس کے ۵۶ میں سے ۴۰ ارکان اسمبلی نے پارٹی کو خیرباد
کردیا تھا لیکن اس موقع پر کانگریس نے اپنے بوڑھے گھوڑے ایس ایم کرشنا کو میدان
میں اتارا جس کی سانس چند قدم کے بعد پھولنے لگتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیپو سلطان کی
ریاست میں گرو گولوالکر کے چیلوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ اس ریاستی انتخاب سے قبل کمار سوامی کے زیرِ اقتدار بھی اسی طرح
شہری بلدیاتی انتخابات ہوئے تھے جیسا کہ اب ہوئے ہیں۔ ان انتخابات میں بھی سب
سے زیادہ نشستیں کانگریس کو حاصل ہوئی تھیں جیسے کہ اس وقت حاصل ہوئی ہیں۔
دوسرے نمبر پر جنتادل ایس تھی اور بی جے پی تیسرے مقام پر تھی لیکن ایک فرق یہ تھا
کہ اس وقت سبھی جماعتیں چاہتی تھیں کہ بلدیاتی انتخاب

کا انعقاد ہو اس کے برخلاف اس بار سبھی سیاسی جماعتوں نے انتخاب کی مخالفت کی اور الیکشن کمیشن کو روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن عدالتی مداخلت نے اس انتخاب کے عمل کو ممکن بنایا۔ سیاسی جماعتوں کی گھبراہٹ ان کے اندر پائے جانے والے اعتماد کی کمی کی چغلی کر رہا تھا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے فی الحال جو کانگریسی بغلیں بجا رہے ہیں خود انہیں بھی اس کامیابی کی توقع نہیں تھی نیز بی جے پی اور جنتا دل اندیشہ بجا تھا۔

کرناٹک کی جملہ آبادی کا ۸۰ فیصد حصہ دیہاتوں کے اندر رہتا ہے اس لئے ۱۸ء۴ کروڑ میں سے صرف ۸۰ لاکھ رائے دہندگان کو ان بلدیاتی انتخابات میں اپنی حصہ لینے کا موقع دستیاب تھا اوراس میں سے ۶۵ فیصد لوگوں نے اسے استعمال کیا۔ ان انتخابات کے نتائج نے یہ ظاہر کر دیا کہ سب سے بڑا خسارہ جنتا دل کا ہے جو ۱۵۰۲ سے اتر کر ۹۰۵ پر آگئی۔ اس سے کم خسارہ میں بی جے پی کا ہوا جس کے پہلے تو ۱۱۸۰ امیدوار کامیاب ہوئے تھے لیکن اس بار اسے ۹۰۵ پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔ کانگریس یقیناً فائدے میں رہی اس نے اپنی تعداد ۱۶۰۶ سے بڑھا کر ۱۹۶۰ تک پہنچا دی۔ یدورپا کی کے جی پی کوئی چمتکار نہ کر سکی اور ۲۷۴ پر سمٹ کر رہ گئی نیز ریڈی برادران کے ہمنوا رکن اسمبلی سریمالو کی نوزائیدہ جماعت بدوارہ شرامیکا رئیتارہ (بی ایس آر) کانگریس نے ۸۶ نشتوں پر کامیابی حاصل کرکے بی جے پی کے خیمے میں تباہی مچادی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے ان دونوں باغیوں نے اپنی سابق جماعت کو تو نقصان پہنچایا لیکن خود اس کا بڑا فائدہ نہ اٹھاسکے۔ ریڈی برادران کی دولت بیلاری ضلع میں سریمالو کا بھلا نہ کرسکی بلکہ کانگریس کو اس کا فائدہ ملا۔ اسی طرح یدورپا کا جادو ان کے اپنے علاقے شموگا میں نہیں چل سکا۔ اتفاق سے بی جے پی کی ریاستی شاخ کے صدر اور نائب وزیر اعلیٰ ایشورپا کا تعلق بھی شموگا سے ہے اور وہ بھی بی جے پی کو کراری شکست سے نہ بچاسکے۔ ان نتائج کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ ایشورپا کو ہٹا کر ان کی جگہ پرہلاد جوشی کو صدر بنادیا گیا لیکن نائب وزیر اعلیٰ کا کیا قصور خود وزیر اعلیٰ جگدیش شطار بھی ہبلی ۔ دھارواڑ میں اپنی جماعت کو فیصلہ کن فتح سے ہمکنار نہ کرسکے۔ بی جے پی اپنے ۱۷ وزراء کے حلقۂ انتخاب میں بری طرح ناکام رہی ۔ کانگریس کے ریاستی صدر پرمیشور بھی اپنے شہر کوٹرا گیٹ میں کانگریس کو شکست سے نہ بچاسکے۔ جنتا دل ایس اپنے صدر کمار سوامی کے شہر رام نگر میں شکست سے دوچار ہوئی اور یہی حال ان کے بھائی ریونا کے ہاسن میں ہوا

گویا ہر مقام پر رائے دہندگان نے نام نہاد بڑے رہنماؤں کو دھتکار دیا جوان سیاستدانوں کے خلاف ان کے اندر پائے جانے والے غم و غصہ کا اظہار ہے۔

اس انتخابات کی کچھ اور خصوصیات بھی تھیں مثلاً ویسے تو ۲۱۰۰۰ سے زیادہ

امیدواروں نے اپنی قسمت آزمائی کی لیکن چکا بلاپور نامی شہر کے ایک حلقۂ انتخاب سے کسی امیدوار نے اپنا پرچۂ نامزدگی داخل ہی نہیں کیا۔ ۸۵ حلقۂ انتخاب سے صرف ایک امیدوار نے پرچہ داخل کیا اور وہ بغیر انتخاب کے کامیاب ہوگیا۔ ۳۳ مقامات پر صرف ایک ووٹ کے فرق سے امیدوار کامیاب ہوگیا ان میں ۹ مسلم اکثریتی حلقے تھے۔ ۱۶۷ ایسے مقامات تھے جہاں فتح اور شکست کے درمیان ۱۰ یا اس کم ووٹ کا فرق تھا۔ حالیہ انتخاب میں سب زیادہ فائدہ آزاد امیدواروں کا ہوا جنھوں نے غیر معمولی کارکردگی کامظاہرہ کرتے ہوئے ۸۷۷ نشستوں پر اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ دوشہر چکوڑی اور گوکاک ایسے بھی تھے جہاں سے کامیاب ہونے والے سارے کے سارے امیدوار آزاد تھے۔

رائے دہندگان کے اندر انتشار کا یہ عالم تھا کہ ۷ شہروں میں ۴ کے کارپوریشن میں کوئی جماعت واضح اکثریت نہیں حاصل کر سکی۔ ۴۳ میں سے ۲۶ میونسپل کاؤنسل میں اور ۹۲ میں سے ۳۳ تعلقہ میونسپل کاؤنسل میں بھی معلق صورتحال ہے لیکن اس کے باوجود مسلم سیاسی جماعتوں کی کارکردگی مایوس کن رہی ۔ ہم لوگ ہمیشہ ہی ہندو اتحاد اور ملی انتشار کا رونا روتے ہیں لیکن اس بار نہ صرف ہندو سماج بلکہ ہندوتوا وادی بھی تقسیم در تقسیم کا شکار ہوگئے تھے اس کے باوجود ہم لوگ اس بات کا جشن منارہے ہیں کہ ایم آئی ایم نے پہلی مرتبہ ۲ مقامات پر اورایس ڈی پی آئی نے ۱۷ نشستوں پر کامیابی حاصل کرلی نیز ۱۸ مقامات پر

دوسرے نمبر پر رہی۔ اس خوشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ سیاسی جماعتیں افرادی قوت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کھاتہ تک کھولنے میں ناکام رہیں ایسے میں ایم آئی ایم اور ایس ڈی پی آئی کی کامیابی جیسی بھی ہے قابلِ قدر سمجھی جائیگی لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس قدر موافق صورتحال میں مسلم جماعتوں کا یہ حال ہے تو کل جب وہ متحد ہو جائیں گے تو ہم کہاں جائیں گے ؟

الیکشن کمیشن نے جیسے ہی ریاستی انتخاب کا بگل بجاکر اعلان کیا کہ ۵ مئی کو ووٹ ڈالیں جائیں گے ۸ مئی کو رائے شماری ہوگی تو سب سے پہلے بی جے پی نے میسور میں ''وجئے سنکلپ ساویش'' کے عنوان سے اپنی انتخابی مہم کا سنکھ پھونک دیا۔ اس جلسۂ عام میں وزیر اعلیٰ شیطار نے اپنی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بیان کیا کہ اس نے اپنی پانچ سال کی مدت پوری کی اور پھر ایک بار واضح اکثریت سے کامیاب ہونے جارہی ہے۔ جس جماعت نے پانچ سالوں میں تین وزیر اعلیٰ بدلے۔ ان میں سے ایک کو بدعنوانی کے الزام میں جیل جانا پڑا۔ دوسرے کو اس کی اپنی پارٹی کے بدعنوان سابق وزیر اعلیٰ کی منھ بھرائی کی خاطر بدلا گیا اور تب جاکر شطار وزیر اعلیٰ بننے کا موقع ملا۔ کیا ایسی حکومت کا پانچ سال مکمل کرنا کوئی قابلِ ذکر کامیابی ہے۔

وزیر اعلیٰ جگدیش شطار نے یہ بھی کہا کہ بی جے پی اصول و نظریات کی بنیاد

قائم ہونے والی ایک قومی جماعت ہے۔اس لئے اسے انتخاب میں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ جس حکومت کے ۷ وزراء کو بدعنوانی کے الزام میں بے آبرو کرکے ہٹایا گیا ہو اور جو جماعت کے ارکانِ اسمبلی اجلاس کے دوران فحش فلمیں دیکھنے سے گریز نہ کرتے ہوں ان کے اصول و نظریات کے بارے میں عوام کو فکر مند ہونا چاہئے۔آر ایس ایس نے گزشتہ بیس سالوں سے محنت ومشقت کرکے کرناٹک کے ساحلی علاقوں میں اپنی نظریاتی ساکھ پیدا کی لیکن پہلے تو رام سینا اور توگڑیا نے اس کا ستیاناس کیا اور اب وہاں بسنے والی اکثریتی بنت برادری بی جے پی کا ساتھ چھوڑ دیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے اندر ایک منفرد غیر بدعنوان شخصیت کے حامل شرینواس شیٹی، ناگراج شیٹی جیسے قدیم سنگھ پریوار کے حامیوں نے ناراض ہو کر بی جے پی کو خیر باد کر دیا۔ بلدیاتی انتخاب سے قبل آر ایس ایس کی معروف رہنما شکنتلا شیٹی نے بی جے پی کو چھوڑ کر کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔بڑے ارمانوں سے بی جے پی بنانے والے آر ایس ایس کے خاکی نیکر اور کالی ٹوپی پہننے والے تلک دھاری رہنما جب بدعنوان سیاستدانوں کے ہاتھوں اپنی تحریک کی یہ درگت دیکھتے ہوں گے تو ان کی زبان پر یہ شعر (یعقوب تصورؔ صاحب سے معذرت کے ساتھ) آجاتا ہوگا

نیکر دھاری عمر ہماری ریت ہوئی

بی جے پی نے شیش محل تعمیر کیا

بی جے پی سنکلپ ریلی میں سارا زور کانگریس یا جنتادل کے بجائے یدورپاّ پر صرف ہوا ۔پرہلاد جوشی نے انکشاف کیا کہ کے جے پی ے ۱۱۴ اسمبلی حلقوں میں اپنا کھاتہ بھی نہ کھول سکی ۔اسے صرف ۳۔۳ فیصدووٹ ملے اس لئے وہ کرناٹک کی سیاست میں قابلِ لحاظ جماعت نہیں ہے ۔سابق صدر ایشورپاّ بولے پہلے کانگریس والے یدورپاّ کو سب سے زیادہ بد عنوان وزیراعلیٰ کہتے تھے لیکن اب نہیں کہتے۔یہ کہتے ہوئے ایشورپاّ بھول گئے کہ زمانہ بدل گیا جس وقت کانگریسی یدورپاّ پر تنقید کیا کرتے تھے اس وقت وہ خود اپنے محسن یدورپاّ کے پاک صاف ہونے کی گواہی دیا کرتے تھے لیکن اب انہیں برا بھلا کہنے سے نہیں تھکتے ۔ایشورپاّ کے مطابق کانگریس چونکہ بی جے پی کا مقابلہ نہیں کرسکتی اس لئے ایسے گھٹیا حربے استعمال کررہی ہے جو کسی قومی جماعت کو زیب نہیں دیتے ۔ کانگریس نے یدورپاّ کو سی بی آئی چھاپے کی دھمکی دے کر رام کرلیا ہے اور ان دونوں نے درمیان خفیہ ساز باز کرلی ہے۔

یدورپاّ نے بی جے پی کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے اعلان کاہ کہ وہ وہ تمام ہی حلقۂ انتخاب پر اپنے امیدوار کھڑے کریں گے اس لئے کسی خفیہ سازش کا سوال ۲۲۴ ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ان کا کہنا تھا چونکہ عدالت نے مقدمہ

پر روک لگا دی ہے اس لئے چھاپے کا جواز ہی نہیں بنتا۔ یدورپاّ کے مطابق بی جے پی والے جھوٹ بولنے میں طاق ہیں اور چونکہ بھاجپ ایک ڈوبتا ہوا جہاز ہے اس لئے بہت جلد اس میں سے بڑے پیمانے پر لوگ نکل نکل کرکے جی پی شامل ہوجائیں گے۔ اب تک ۱۳ ارکانِ اسمبلی اور دووزراء کے جی پی میں داخل ہوچکے ہیں۔ یدورپاّ کا اندازہ درست ہے اس لئے کہ وہ تمام خواہشمند حضرات جنہیں بی جے پی ٹکٹ نہیں دے سکے گی بلاتوقف کے جی پی کارخ کریں گے۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ۴۰ سالوں تک جس ببول کے پیڑ کی آبیاری یدورپاّ نے کی اب اسی کی بیخ کنی کرنے پر تلے ہوئے ہے۔

ماہِ جنوری کے اندر اسمبلی انتخاب کے حوالے سے کرناٹک کے رائے دہندگان کا ایک جائزہ سی گروپ 'نامی ادارے نے لیا۔ اس کے مطابق آئندہ انتخابات کے اندر بی جے پی کے' ووٹوں کا تناسب گزشتہ کے ۳۴ فیصد سے کم ہوکر ۲۸ پر پہنچ جائیگا جس کے نتیجے میں اس کے ارکانِ اسمبلی تعداد ۱۱۰ کے بجائے ۶۳ ہوجائیگی۔ کانگریس کے ۳۵ فیصد رائے دہندگان میں صرف دو فیصد کا اضافہ ہوگا لیکن اس کے ارکان اسمبلی ۸۰ سے بڑھ کر ۱۳۳ ہوجائیں گے۔ جنتا دل کے رائے دہندگان کی تعداد میں صرف ۱ فیصد کمی ہوگی لیکن اس کے ارکان ۲۸ سے گھٹ ۱۹ رہ جائیں گے۔ یدورپاّ ۷ فیصد ووٹ حاصل کرکے صرف ۵ امیدوار کامیاب کرا سکیں گے۔ دیگر جماعتوں اور آزاد امیدواروں کے ووٹ کا تناسب ۲ فیصد کم ہوجائیگا اور صرف

دیگر امیدوار کامیاب ہو سکیں گے۔ انتخابی جائزے کئی مرتبہ غلط بھی نکلتے ہیں لیکن ۴ بلدیاتی انتخاب کے نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے اس بار کا سروے صحیح نکل جائے۔

خدا کی بستیوں میں درد اور دہشت کا موسم ہے

طلوعِ شمس اور غروبِ آفتاب کے مناظر کی تصاویر کو دیکھتے ہوئے یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کس میں روشنی پھیل رہی ہے اور کس میں سمٹ رہی ہے؟لیکن حقیقت کی نظر اگتے سورج کے شفق میں زندگی کی دھمک اور ڈوبنے والے کے افق میں موت کا سایہ دیکھ لیتی ہے۔ صدر براک وابامہ کے مشرق وسطیٰ کے گزشتہ اور حالیہ دوروں کے درمیان یہی فرق ہے ۔ ویسے تو صدر بننے کے بعد یہ ان اولین اسرائیلی دورہ ہے لیکن منصبِ صدارت کا انتخاب لڑنے سے قبل انہوں نے یہودی رائے دہندگان کی خوشامد کے پیشِ نظر اسرائیل کا دورہ ضرور کیا تھا۔وہ ان کی ایک سیاسی ضرورت تھی جس کو کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ صدر بن جانے کے بعد اپنی پہلی مدتِ کار میں انہوں نے پچاس سے زائد ممالک کے دورے کئے لیکن اسرائیل کی باری نہیں آئی۔ اور جب دوسری مدتِ کار کی ابتداء ہوئی تو سب سے پہلے اسرائیل کا نمبر آگیا۔ ایسا کیوں ہوا ؟

اوبامہ کے اپنے الفاظ میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میرے دوسری مدّتِ صدارت میں اسرائیل سے میرے غیر ملکی دوروں کا آغاز کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔اس خطے میں چلنے والی تبدیلی کی ہوائیں بشارت اور خطرات کی پیغامبر ہیں ۔ اس

لئے میں اس موقع پر ان دونوں ممالک کے درمیان نا قابلِ تنسیخ رشتے کی تصدیق کرنے کیلئے یہاں آیا ہوں ۔ اسرائیل کے تحفظ کی خاطر غیر متزلزل امریکی یقین دہانی کا میں اعادہ کرنا چاہتا ہوں اور براہ راست اسرائیلی عوام اور ان کے ہمسایوں سے خطاب کرنا چاہتا ہوں ۔ اسرائیل و امریکی مفادات کو عرب بہار سے لاحق تشویش اور خطرات کا برملا اعتراف سے بلی تھیلے سے باہر آگئی اور دورے کی ضرورت و اہمیت واضح ہو گئی ۔ اس کے باوجود اوبامہ نے اپنے دورے کے دوران کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے خطرات میں کسی قسم کی کمی واقع ہو۔

اسرائیل کے علاوہ اوبامہ ازراہِ تکلف مغربی کنارے میں رالملہ بھی گئے اور صدر محمود عباس سے ڈیڑھ گھنٹے تک بات چیت کی ۔ حضرت عیسیٰؑ کے جائے پیدائش بیت اللحم کی زیارت کا شرف حاصل کاااور اردن میں پیٹرا کی سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو کر واپس لوٹ آئے ۔ اس بیچ انھوں نے اسرائیل اور اردن دونوں میں سے ہرایک کو ۲۰ کروڈ ڈالر کی امداد کا اعلان کیا ۔اسرائیل کو دی جانے والی مدد فوج پر خرچ ہو گی اور اردن کو دی جانے والی اعانت شامی پناہ گزینوں پر صرف ہوگی ۔ غزہ کا دورہ کرنے کی جرأت صدر وابامہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔غزہ کی جانب سے یہ ضرور ہوا کہ دورے والے دن سدراۃ نامی شہر پر راکٹ ضرور داغے گئے تاکہ کروڑوں ڈالر کے خرچ سے اسرائیل کو فراہم کی جانے والی

نام نہاد آہنی گنبد کے ناقص ہونے کا احساس صدر اوباما کو کرایا جاسکے۔ اوباما نے
میں اسی شہر کا دورہ کیا تھا۔ ۲۰۰۸ء

عالمی ذرائع ابلاغ کے بارے میں بجا طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس پر یہودیوں کا غلبہ ہے اس کے باوجود میڈیا میں صدر اوباما کے حالیہ دورے کی پذیرائی ۲۰۰۹ء میں کئے جانے والے اولین مشرقی وسطی کے سفر کے بالمقابل عشرِ عشیر بھی نہیں تھی حالانکہ انہوں نے یہودیوں کو ناراض کرنے والی نہ کوئی بات کہی نہ کام کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اول تو یہ کے اسرائیل کی حیثیت براعظم امریکہ سے باہراور مشرق وسطی کے اندر موجود ایک امریکی ریاست کی ہے۔ اس لئے یہ دورہ غیر ملکی نہیں اندورن ملک سفر جیسا تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اوباما نے کہا' امریکہ اسرائیل کے ساتھ ہے کیونکہ یہ ہماری بنیادی سکیورٹی کے مفاد میں ہے کہ ہم اسرائیل کا ساتھ دیں۔ ہمارا اتحاد دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے۔' کسی غیر ملک کا ساتھ دینا امریکہ کے بنیادی تحفظ کے مفاد میں کیوں کر ہوسکتا ہے؟ اور اتحاد دائمی اس لئے ہے کہ اسرائیل کے وجود کا دوام امریکی سرپرستی پر منحصر ہے۔ جب وہ ختم ہوجائیگی تو اپنے آپ نہ دوست رہے گا ور نہ دوستی رہیگی۔

چار سال قبل براک اوباما کو ساری دنیا کے لوگوں نے مختلف وجوہات کی بناء

پر تبدیلی کی علامت سمجھا تھا مثلاً ان کے والد کا تعلق نہ صرف کینیا سے بلکہ مذہب اسلام تھا۔انہوں نے اپنی زندگی طویل عرصہ بیرونِ ملک گزارہ تھا لیکن وقت کے ساتھ ان سے وابستہ توقعات پر بیجا ثابت ہوئیں۔ اس لئے کہ امریکہ کا نظام جبر تبدیلی کی ہر کوشش کو بڑی سختی سے کچل دیتا تھا ان کے اندر خطرات سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں تھا اس لئے اوبامہ کو اپنے تمام تر بلند بانگ دعووں کے باوجود مصالحت کا راستہ اختیار کرنے مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے از خود قاہرہ خطاب کے نام سے اپنی شہرہ آفاق تقریر کو بھول گئے۔ گوکہ گزشتہ دورے کی ابتداء اسرائیل کے بجائے سعودی عرب سے ہوئی تھی لیکن سعودی عرب سے بھی امریکہ کا رشتہ دائمی اور اٹوٹ ہے۔ سعودی عرب کے بعد وہ مصر گئے تھے جہاں اس وقت امریکہ کے پٹھو حسنی مبارک کی حکومت جن کی حالت محمود عباس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ واپس ہوتے ہوئے اوبامہ نے یہودیوں کو بہلانے کی خاطر جرمنی میں ایک نازی کیمپ کا دورہ کیا تھا۔اس بار اردن کا دورہ کرکے مسلمانوں کے ساتھ اسی طرح کا مذاق کیا گیا حالانکہ یہ دونوں نمائشی اقدامات تھے۔

قاہرہ کے خطاب میں مظلوم فلسطینی مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں اسلامی دنیا کو یہودیوں کے غم سے روشناس کرانے پر زیادہ زور صرف کیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ اوبامہ نے بہت زور دے کر اسرائیل کو نئی تعمیرات

روکنے کی تلقین بھی کی تھی لیکن گزشتہ چار سالوں کے اندر نئی آبادیوں کی مقدار میں پہلے کی بنسبت تین گنا اضافہ ہو گیا اور اب یہ حال ہے کہ اوبامہ نے اسے کم اہم مسئلہ قرار دے دیا۔ اپنے اس دورے میں انہوں نے ترجیحات کا بیان کچھ اس طرح سے کیا کہ فی الحال بنیادی مسائل یہ ہیں فلسطینیوں کا حق خوارادیت کیسے بحال کی جائے اور اسرائیلی عوام کے تحفظ کو کیسے یقینی بنایا جائے؟اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نئی آبادیوں کے قیام کا مسئلہ اہم نہیں ہے بلکہ اگر مذکورہ دو مسائل حل ہو جائیں تو یہ مسئلہ از خود حل ہو جائیگا۔ گویا اب وہ اسرائیل کو اپنی اس جارحانہ کارروائی سے نہیں روکیں گے۔ اس شاطرانہ بیان میں اول تو فلسطینیوں کے عدم تحفظ سے پوری طرح صرفِ نظر کیا گیا ہے جب کہ یہودیوں کے مقابلے فلسطینی کہیں زیادہ غیر محفوظ ہیں۔ اوبامہ کے مطابق جن دو مسائل کے حل ہونے سے تیسرا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائیگا ان دونوں کا حل وہ نہیں جانتے اس لئے تیسرا مسئلہ کم از کم ان کے ذریعہ تو حل ہونے سے رہا۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے امریکی حکومت کے ترجمان کہا تھا کہ امریکی صدر اپنے ساتھ کوئی امن فارمولا لے کر نہیں جا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی صدر کو مسئلہ اور اس کے حل کا علم ہے لیکن بیرونی و اندرونی مفادات کے پیش نظر وہ اس پر عملدرآمد کرنا نہیں

چاہتے۔ نتن یاہو نے گزشتہ انتخاب میں ایران دشمنی کی بنیاد پر کامیابی حاصل کی۔ اوبامہ یہودیوں کے درمیان اپنی ۱۰ فیصد شہرت میں اضافے کی خاطر ایران کو دھمکی دیتے ہوئے کہا ہم کسی دہشت گرد کو جوہری اسلحہ حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے ۔حالانکہ امریکہ ہی وہ واحد ملک ہے جس نے بلاجواز ناگاساکی اور ہیروشیما میں جوہری اسلحہ کا استعمال کیا ہے۔ دوسری دہشت گرد ایٹمی طاقت اسرائیل ہے جس نے اپنے فلسطین کے ۷۰ فیصد علاقے پر غاصبانہ قبضہ کرکے مقامی آبادی کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر رہا ہے۔

اسرائیلی دورے کے دوران اپنے منافقانہ طرز فکر کا اظہار کرتے ہوئے براک اوبامہ نے سب سے پہلے یہ کہا اس مقدس سرزمین پر امن قائم ہونا چاہئے لیکن پھر اس کی شرائط یوں بیان کیں اسرائیلی کی سلامتی ایک فرض ہے، مشرقِ وسطیٰ میں پائیدار امن کے لیے ایک مضبوط اور محفوظ یہودی ریاست کا قیام ضروری ہے جس کے ساتھ ساتھ ایک خود مختار فلسطینی ریاست بھی موجود ہو۔ گویا امن کی اصل ضمانت یہودی ریاست کا قیام ہے۔ فلسطینی ریاست کا وجود ایک ضمیمے کے طور پر کیا تو گیا لیکن اسرائیل کے تحفظ کی دہائی دینے کے بعد فلسطین کے حفاظت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یہی وہ بنیاد کا پتھر ہے جس نے امن عالم کو غارت کر رکھا ہے۔اسی کے سبب امریکہ کو اپنے جڑواں ٹاور گنوانے پڑے۔ امن وآشتی کا قیام ظلم زیادتی کے نہیں عدل و انصاف کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگر امریکی حکام ظلم

کی بنیاد پر امن کی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کریں گے تو ایک دن اسرائیل سمیت خود اس کے تلے دفن ہو جائیں گے۔

اسرائیلی مظالم کا تازہ ثبوت اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کی کاؤنسل سے کا بائیکاٹ ہے۔ کاؤنسل نے اسرائیل کی غیر قانونی تعمیرات کے دوران حقوق کی پامالی کی تفتیش کا اعلان کیا تھا۔اس کے جواب میں اسرائیل نے اس تنظیم سے سارے رشتے توڑ لئے ہیں اس لئے وہ نہیں چاہتا اس کے مظالم کا پردہ کسی بین الاقوامی تنظیم کے ذریعہ فاش ہو۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں اسرائیل وہ پہلا ملک ہے جس ایسی مذموم حرکت کی ہے۔ اسرائیل کی اس حرکت پر کاونسل کے کے صدر ہنکرل نے ایک ایسی قراداد منظور کرنے پر زور دیا جس سے اسرائیل کو کاؤنسل کے ساتھ تعاون کیلئے مجبور کیا جاسکے۔ اس تجویز کے جواب میں مصر کے نمائندے نے کہا کاؤنسل کے سامنے حقیقت کو اجاگر کرنے والا لمحہ آگیا اور تنبیہ کی اس معاملے میں نرمی ان تمام لوگوں کیلئے ایک نذیر بن جائیگی جو انسانی حقوق کو پامال کرتے ہیں اور ان کے عدم تعاون کا دروازہ کھول دے گی۔ اس موقع پر امریکی سفار تکار ڈونا ہو نے اسرائیل کا نام لئے بغیر اس پر تنقید کی انسانی حقوق کی جائزے کے نظام کو موئثر بنانے مشترکہ زمین تلاش کرنے پر زور دیا۔ برطانوی ترجمان نے متوازن اور متناسب فیصلہ کرنے کی بات کہی اور آئرش رکن نے اتفاق رائے کی تلقین کی۔ ان مناظر دیکھ حیرت زدہ پاکستانی نمائندے نے

اسرائیل کی بھرپور تنقید کی اور کہا اگر اسی طرح کا عدم تعاون کسی ایسے ملک کی جانب سے سامنے آتا جس کے کسی عظیم طاقت (مراد امریکہ) سے قریبی تعلق نہ ہو تو کیا اس کے تئیں ابھی اسی طرح کے تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کیا جاتا۔ مغرب کا یہی دوغلا پن ہے جس کی وجہ سے اس نے ساری دنیا کا اعتماد گنوا دیا ہے۔

امریکی صدر براک اوباما کے اس دورے کا واحد امتیاز ترکی سے اسرائیل کا معافی مانگنا ہے۔اوبامہ نے اول تو اسرائیل کو تنبیہ کی کہ وہ ایک ایسے موڑ پر آ چکا ہے جہاں اسے عالمی تنہائی سے بچنے کے لیے اپنی پرانی نہج کو چھوڑنا ہوگااور اس کے بعد اپنی موجودگی میں بن یامن نتن یاہو کو مجبور کیا کہ وہ مئی ۲۰۱۰ء میں صہیونی کمانڈوز کے ذریعہ ترکی کے امدادی قافلے پر حملے کی معافی مانگے اور متاثرہ خاندانوں کو معاوضہ دے کر ترکی کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کرے۔ صہیونی وزیراعظم نے اس حکم کے آگے سر خم تسلیم کرتے ہوئے وزیراعظم رجب طیب ایردوآن سے ٹیلی فون پر فریڈم فلوٹیلا پر حملے کی معافی مانگی۔ صدر براک اوباما ٹیلی فون لائن پر ثالث کا کردار ادا کر رہے تھے۔نتن یاہو نے اپنی معافی میں اسرائیل کے بحری کمانڈوز کی ''آپریشنل غلطیوں'' کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ''واقعے کا المناک نتیجہ ارادی نہیں تھا اور اسرائیل کو انسانی زندگیوں کے ضیاع پر افسوس ہے''۔ نتن یاہو

نے غزہ سمیت تمام فلسطینی علاقوں میں روزمرہ استعمال کی اشیاء کے داخلے پر عائد پابندی ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اس واقعہ کو یہودی قوم پرستوں نے اپنی زبردست ہزیمت سے تعبیر کیا ہے جبکہ مبصرین نے اسے شام کے اندر جاری کشمکش میں امریہو کی ضرورت قرار دیا ہے۔

اس دورے کے دوران اوبامہ کی حالت نہ خدا ہی ملا اور نہ وصال صنم جیسی تھی کہ یہودیوں نے جوناتھن پولارڈ کی رہائی کی خاطر مظاہرہ کیا جو جاسوسی کے الزام میں ۱۹۸۷ء سے امریکہ کے اندر سزا کاٹ رہا ہے۔ فلسطینیوں نے بھی نہ صرف غزہ بلکہ مغربی کنارے میں بھی ان کے خلاف مظاہرہ کیا۔اوبامہ کو سب سے زیادہ خجالت کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب مغربی بیت المقدس میں ان کے خطاب کے دوران ربیع عید نامی فلسطینی نوجوان نے کھڑے ہو صدائے احتجاج بلند کردی۔ ربیع نے سوال کیا ''امن کے لے ک آپ نے کیا کیا؟ آپ فلسطینیوں کے قتل کے لئے اسرائیل کو مزید اسلحہ ہی فراہم کئے جارہے ہیں؟کیا آپ نے غرب اردن جاتے ہوئے اپنے راستے میں دیوار فاصل دیکھی؟'' ربیع عید عیلبون میں 'بلد' تحریک کے سرگرم کارکن ہیں۔ عید نے غصے میں چلاکر کہا ''ریچل کوری کو کس نے قتل کیا؟ ریچل آپ کی دولت اور اسلحے کی بھینٹ چڑھی''تیئس سالہ امریکی رضاکار دوشیزہ ریچل کوری کو سولہ مارچ ۲۰۰۳ء میں اس وقت ایک اسرائیلی بلڈوزر نے کچل ڈالا تھا کہ جب وہ غزہ کی پٹی کے علاقے رفح میں فلسطینی مہاجرین کیمپ میں

فلسطینیوں کے مکانات کی مسماری روکنے کے حق میں مظاہرہ کر رہی تھی۔

فلسطینی طالب علم کی صدائے احتجاج کو کچلنے کی خاطر متعدد صہیونی اہلکار اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کے ہاتھ کمر پر باندھ کر اسے گھسیٹے ہوئے ہال سے باہر لے گئے، تاہم موقع پر صحافیوں کی بڑی تعداد کو موجود دیکھ کر اسرائیلی حکام نے اسے واجبی پوچھ تاچھ کے بعد رہا کر دیا۔ فلسطینی طالب علم کی مداخلت کا حوالہ دیتے ہوئے صدر براک اوباما نے کہا کہ یہی وہ آزاد تبادلہ خیال ہے جس کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ اس پر حاضرین نے زوردار تالیوں سے ان کے اس نکتے پر انہیں خود داد دی۔ انہوں نے کہا کہ ہم وہ سب کرنے کو تیار ہیں جس کا ذکر نوجوان نے کیا ہے۔ اس واقعے کے بعد مجھے لگ رہا ہے کہ میں امریکا میں ہی ہوں۔ اگر یہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو شاید مجھے اتنا سکون نہ ملتا۔ اس منافقانہ موقف کے جواب میں دلیر فلسطینی طالب علم ربیع عید نے ہال سے باہر واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے صدر اوباما کی تقریر کا بائیکاٹ کرنے پر ندامت نہیں کیونکہ اپنے جذبات ان تک پہنچانے کا یہی واحد طریقہ بچا تھا۔

صدر اوبامہ فلمی انداز کا ڈائیلاگ مار کر خوب دادِ تحسین تو وصول کر لی اور یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی کہ امریکہ و اسرائیل میں اظہارِ رائے کی بڑی

آزادی ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اوبامہ کی تقریر سننے کے لئے اسرائیل کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجز سے طلبہ کا چناؤ انتہائی عیاری سے کیا گیا تھا۔ طلباء کو ڈرانے دھمکانے کی خاطر ہال میں موجود طلبہ کو باقاعدہ تحریری طور پر عہد پر دستخط کرنے کیلئے مجبور کیا گیا تاکہ وہ دورانِ تقریب وہ اپنی زبان پر قفل لگائے رہیں اور لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے رکھیں۔

اس مجمع میں ربیع عید نے کمال دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا احتجاج بلند کرکے اسرائیلی وامریکی بہیمیت کو بے نقاب کردیا اور فیض احمد فیض کی تیس سالہ پرانی نظم ”ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے“ کو زندہ کردیا۔

ہم جیتیں گے

حقّا ہم اک دن جیتیں گے

قد جاء الحق وزہق الباطل

فرمودہ ربِ اکبر

ہے جنت اپنے پاؤں تلے

اور سایہ رحمت سر پہ ہے

پھر کیا ڈر ہے؟

ہم جیتیں گے

حقّا ہم اک دن جیتیں گے
بلآخر اک دن جیتیں گے

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

اسلامی دنیاکے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری یہ ہے کہ ترکی کی حکومت اور کرد باغی تنظیم پی کے کے درمیان تین دہائیوں پر مشتمل لڑائی کے خاتمہ ہوگیااور امن معاہدہ اتفاق رائے سے طے پاگیا۔ ترکی وزیراعظم رجب طیب اردوان اور جیل میں مقید کرد تنظیم کے رہنما عبداللہ اوجلان کے درمیان مذاکرات نتیجہ خیز رہے اور کردستان ورکرز پارٹی نے ہتھیار ڈال دیئے۔اس طرح ۳۰سال سے جاری بغاوت کا اختتام کع پہنچی جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک ۴۵ ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ماہرین کا خیال ہے کہ ترکی میں ۲۵۰۰ پی کے کے باغی موجود ہیں اور بقیہ ہمسایہ شمالی عراق میں مقیم ہیں ۔ عبداللہ اوجلان جنوبی استنبول ایک جزیرے عمرعلی کی جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں ۔ یہ اقدام ایک پیکیج کا حصہ ہے جس کے تحت تعلیم اور انتظامیہ کے شعبوں میں کردوں کے حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں آئینی درجہ دیا جائے گا۔

ترکی وزیراعظم رجب طیب اروان کو یہ کامیابی طلائی طشتری میں رکھ کر نہیں مل گئی بلکہ گزشتہ چار سالوں میں اسے حاصل کرنے کیلئے انہیں مختلف سیاسی و فوجی مشکلات کا سامنا کرناپڑا۔ایک طرف ترکی میں کردوں کی سب سے بڑی سیاسی

جماعت بی ڈی پی تھی جس کے ایک رکنِ پارلیمان ارتغرال کرگکو نے وزیرِ اعظم کی قیامِ امن کی کوشش کا خیر مقدم بھی کیا اور ان پر زبردست عدم اعتماد کا الزام بھی لگا دیا تھا۔ ارتغل نے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا تھا کہ کیا وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر قائم رہیں گے؟ ان کے مطابق ''طیب اردوان کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ حکومت میں سب سے زیادہ نا قابلِ اعتبار فرد ہیں۔ اس وقت مملکتِ ترکی میں ان سے زیادہ نا قابلِ اعتبار شخص اور کوئی نہیں ہے۔'' اس کے علاوہ دائیں بازو کی ترکی نیشنلسٹ موومنٹ پارٹی دی ایم ایچ پی کے پارلیمانی لیڈر نے ہندوستان کی بی جے پی کی طرح امن کی مذاکرات کی مذمت کرتے ہوئے وزیرِ اعظم رجب طیب اردوان پر الزام لگایا تھا کہ انویں نے دہشت گردی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ لیکن ان نشیب و فراز سے اردوان کے پائے استقلال میں لرزش نہیں آئی اور ایک وقت آیا جب امن مذاکرات پر ایم ایچ پی اور ایک انتہائی دائیں بازو کی پارٹی کو چھوڑ کر، دنیائے سیاست کی تمام جماعتیں متفق ہو گئیں اور نا کھنے والے یعنی جنگ کی نام نہاد لابی، مختصر سے مختصر ہوتی چلی گئی۔

سیاست سے زیادہ سنگین مسئلہ آئے دن دونوں جانب سے ہونے والی فوجی جھڑپوں کا سلسلہ تھا جس سے یہ عمل پٹری سے اتر جاتا تھا۔ اس درمیان کرد باغیوں کی جانب سے ترک سیکیورٹی فورسز پر ایک حملہ ہوا جس سے اس پیش رفت کو شدید دھچکا

پہنچا۔ جنوب مشرقی شہر حکاری میں عراق کی سرحد کے ساتھ ایک جھڑپ میں ایک فوجی اور ۱۴ باغی ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہاکش باغی امن مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کیلئے ن مزید حملے کریں گے مگرار دوان نے کمال ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان حملوں کے حوالے سے بس اتنا کہا تھا کہ دہشت گرد اپنی پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی بھی طریقے سے امن عمل کی جانب پیش رفت کو روک دیا جائے۔ اس کے بعد عراق سرحد کے نزدیک ترک فوج کے فضائی حملے میں پینتیس افراد کی ہلاکت نے بعد کرد علاقوں میں بغاوت کے شعلوں کو بھڑکا دیا۔ اس حملے کے بعد پی کے کے کے مسلح ونگ سے تعلق رکھنے والے ایک عہدے دار بہوز ایردال نے جمعہ کو ایک بیان میں کہا ہے کہ ''ہم کردستان کے عوام پر زور دیتے ہیں کہ وہ اس قتل عام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور عوامی بغاوت کے ذریعے اپنے مسئلہ کو حل کرانے کی کوشش کریں''۔ اس نازک صورتحال کے جواب میں کسی اشتعال کا شکار ہوئے بغیر حکمراں جماعت انصاف اور ترقی پارٹی کے نائب صدر حسین چیلک نے حملے کو ایک بڑی غلطی قرار دیا اور تسلیم کرلیا کہ اس کے نتیجے میں کرد باغیوں کے بجائے عام شہری مارے گئے ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ مارے جانے والے لوگ اسمگلر تھے اور دہشت گرد نہیں تھے۔ فوج سے یہ ایک آپریشنل حادثہ ہوا ہے اور یہ غلطی نہیں، بلکہ بہت بڑی غلطی تھی۔ حالانکہ ترک فوج نے کہا تھا کہ اس نے ایک بغیر

پائیلٹ جاسوس طیارے کی جانب سے اطلاع ملنے کے بعد پی کے کے جنگجوؤں پر فضائی حملہ کیا تھا۔ فوج نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ جہاں یہ واقعہ رونما ہوا، یہ شمالی عراق میں صنات حاقنسین کا علاقہ ہے اور وہاں کوئی شہری آبادی نہیں بلکہ دہشت گرد تنظیم کے ٹھکانے ہیں لیکن حکومت اپنی ہی فوج کے اس موقف کو ٹھکرا دیا۔

ترک وزیر اعظم رجب طیب ایردوان نے ۲۰۰۹ء میں پی کے کے کی جانب امن کا ہاتھ بڑھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰۱۰ء کے اندر عراقی کردوں کا ایک امن وفد انقرہ آیا اور ترک حکومت کے ساتھ علاحدگی پسندوں سے مفاہمتی کوششوں کا حصہ بنا۔ امن مذاکرات کیلئے عراق میں مقیم ۳۴ ترک کرد باغیوں کا یہ وفد استنبول بھی گیا۔ یہ امن مشن ''کردستان لیبر پارٹی'' کے ۸ سرگرم ارکان کے علاوہ ۲۲ دیگر تنظیموں کے ہم خیال افراد پر مشتملا تھا۔ امن وفد نے فریقین میں مصالحت کے لئے آزادانہ طور پر رابطے کئے۔ فریقین کو قریب لانے کے لیے کی جانے والی یہ کوششیں آٹھ ماہ تک جاری رہیں لیکن پھر سیاست اس پر غالب آگئی اور ترکی میں بعض سیاسی جماعتوں نے الزام عائد کیا کہ امن مشن کے شرکاء نے باغیوں سے تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ ان الزامات کے تحت وفد میں شامل ۱۰ افراد کو گرفتار کرلیا گیا جس کے نتیجے اس کوشش نے دم توڑ دیا۔

امن مشن کے ترجمان نے واپس ہونے کے بعد اپنے بیان میں کہا کہ ''کردوں نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا لیکن اس کے بدلے ہم سے تعاون نہیں کیا گیا''۔ اس ناکامی کے جواب میں کسی مایوسی کا شکار ہوئے بغیر ترک وزیر انصاف سعداللہ ارجن نے کہا تھا '' ترک امن مشن کی عراق واپسی سے متعلق ان کے پاس ٹھوس معلومات نہیں ہے تاہم ہمیں اُمید ہے کہ امن وفد ترکی میں رہ کر قیام امن کی کوششوں میں حکومت کی مدد جاری رکھے گا''۔ اس طرح پے درپے ناکامیوں کے باوجود اسلام نواز حکمراں جماعت بددل نہیں ہوئی بلکہ اس نے اپنی سعی مسلسل کو جاری رکھتے ہوئے کرد رہنما عبداللہ اوجلان سے جیل کے اندر رابطے استوار کرکے بالآخر انہیں مفاہمت پر آمادہ کر ہی لیا اور علامہ اقبال کے اس شعر کی زندہ تفسیر بن گئے ۔

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

محبت کی اس شمشیر سے دشمنوں کا سرنگوں نہیں کیا جاتا بلکہ دوستوں کا دل جیتا جاتا ہے ۔ اس فتح کا اعلان خود مفتوح بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے جیسا کہ کرد رہنما عبداللہ اوجلان نے اپنے پیغام میں کیا جسے ترک ٹیلی ویژن چینل پر براہِ راست نشر کیا گیا۔ یہ بات بذاتِ خود قابلِ ذکر ہے کیوں کہ ترکی میں پی کے کے کسی بھی نشان کو دکھائے جانے پر پابندی ہے۔ اوجلان نے اپنے

پیغام میں کہا، ''ہم اس موڑ پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہتھیاروں کو خاموش ہونا اور خیالات و سیاست کو بولنا چاہیے۔ہم نے عشروں تک قربانیاں دی ہیں اور ان کی بھاری قیمت بھی ادا کی ہے۔ یہ قربانیاں اور یہ جدوجہد رائیگاں نہیں گئی، کردوں نے خودشناسی، تہذیبی تشخص اور شناخت حاصل کی ہے۔'' انوقس نے فرمایا ''ہماری جدوجہد کا نیا مرحلہ شروع ہو رہا ہے۔ اب ایک ایسے دور کا دروازہ کھل رہا ہے جہاں ہم مسلح مزاحمت سے سیاسی جدوجہد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے مسلح دستے سرحد پار کرلیں (اور شمالی عراق چلے جائیں)۔ انوھں نے ترک حکومت سے بھی کہا ہے کہ وہ کرد باغیوں کو علاقہ چھوڑنے کے محفوظ راستہ دے۔

دیاربکر شہر میں لاکھوں لوگ اوجلان کا پیغام سننے کے لیے موجود تھے۔ یہ پیغام پی کے کے اور ترکی حکومت کے درمیان مہینوں کے مذاکرات کا ثمر تھا۔ کرد نواز ارکان پارلیمان نے کالعدم کردستان ورکرز پارٹی (پی کے کے) کے لیڈر عبداللہ اوجلان کا ترک حکومت کے ساتھ جنگ بندی کا اعلان ترک اور کردی زبانوں میں پڑھ کر سنایا۔ اوجلان نے کردوں کے نئے سال نوروز کے آغاز پر اپنے پیغام میں مزید کہا کہ یہ جدوجہد سے دست بردار ی نہیں ہے، بلکہ ایک مختلف قسم کی جدوجہد کا آغاز ہے۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوچکا ہے جس میں سیاست ہوگی ،بندوق نہیں اوجلان کی جانب سے جنگ بندی کے اعلان کے بعد ترک

حکومت وسیع تر آئینی اصلاحات کرنے جارہی ہے تاکہ ڈیڑھ کروڑ کردوں کی زبان و تہذیب کے علاوہ دوسرے حقوق کو تسلیم کر لیا جائے۔

جیل میں بند کرد لیڈر نے اس بیان سے ایک ہفتے قبل ایک خط میں اس کا عندیہ دیتے ہوئے لکھا تھا ''میں بندوقوں کے ایشو کو عجلت میں حل کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی اور جان ضائع نہ ہو۔انواں نے ترک پارلیمان پر بھی زور دیا تھا کہ وہ امن عمل کو مستقل بنانے کے لیے اپنے حصے کا کردار ادا کرے اور آئندہ مہینوں میں ہزاروں کرد باغیوں کے ہتھیار ڈالنے اور ترکی سے ان کے انخلاء کے لیے ضروری اقدامات کرے۔چونسٹھ سالہ عبداللہ اوجلان کردوں میں ''آپو'' یا چچاکے نام سے جانے جاتے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے عوام کی بھلائی کے لیے امن چاہتے ہیں۔انوعں نے گذشتہ ماہ کرد نواز ارکان پارلیمان سے ملاقات میں کہا تھا کہ ''اگر یہ امن عمل ناکام ہوجاتا ہے تو ''آپو'' مرجائے گا، میں ختم ہوجاؤں گا''۔ پی کے کے کے فوجی سربراہ مراد قرائلان نے عبداللہ اوجلان کے اس اقدام کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''ترک، کرد اور دنیا اس بات کو سمجھے کہ ہم جنگ اور امن دونوں کے نے تیار ہیں''۔

ترکی کے وزیراعظم رجب طیب اردوان نے اسے ایک مثبت قدم قرار دیتے ہوئے جنگ بندی کے نفاذ کی اہمیت پر زور دیا اور یقینا دلایا کہ اگر عبداللہ اوجلان کے

مطالبے پر عمل ہوا تو ترک فوج کرد باغیوں کے خلاف نئی کارروائیاں نہیں کرے گی۔

ترک وزیراعظم رجب طیب ایردوان نے بذات خود کرد باغیوں سے امن مذاکرات میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ امن عمل کی قیمت پر اگر انھیں اپنا سیاسی مستقبل بھی داؤ پر لگانا پڑا تو وہ اس سے گریز نہیں کریں گے۔ واضح رہے کہ ان کی حکومت پر عبداللہ اوجلان جنہیں ترک ''دہشت گرد چیف'' اور ''بی بی قاتل'' قرار دیتے رہے ہیں کو رعایتیں دینے کے الزامات عائد کیے جاتے رہے ہیں لیکن گزشتہ ماہ فروری میں جبکہ امن کی جدوجہد شباب پر تھی ترک روزنامے حریت کے ایڈیٹرانچیف مراد یتکین نے لکھا تھا کہ '' جس طرح ابراہام لنکن کا نام امریکی تاریخ میں غلامی کے خاتمے میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے بالکل اسی طرح ترکی کے دیرینہ کرد مسئلے کے حل سے تاریخ میں ایردوان کا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے گا''۔

ترکی کے اندر جس طرح کردوں کا مسئلہ ہے اسی طرح کے مسائل دنیا کے مختلف ملکوں کے اندر ہیں مثلاً ہندوستان میں کشمیر، چین میں تبت، برطانیہ میں آئرلینڈ اور روس میں شیشان۔ اگرچہ ان ممالک کے رہنما ان تنازعات سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ان کیلئے ترکی نے عملی اور قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا ہے لیکن اس پر عملدرآمد سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اس طرح کے مسائل پیدا کیوں ہوتے ہیں ؟ ان کو کس طرح بگاڑا جاتا ہے؟ اس کے بعد ہی اصلاح کا

عمل سمجھ میں آسکتا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں مختلف تہذیب و تمدن کے ماننے والے بھانت بھانت کی زبانوں کے بولنے والے لوگ ایک عظیم چھتری کے نیچے مل جل کر امن و آشتی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے لیکن اسلامی خلافت کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ترکی حکمرانوں نے سیکولر قومی نظریہ کی بنیاد پر اپنے ملک کی تعمیر شروع کی اور اپنے ہمسایہ کردوں کو بھی اپنے ساتھ نہ رکھ سکے بلکہ انہیں بغاوت پر مجبور کر دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ سوال سب سے اہم ہے۔

خدا کا عقیدہ اس کے سارے بندوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے اور سارے انسان ایک خوبصورت ہار کی شکل میں ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔ لیکن سیکولرزم یا لادینیت عالمِ انسانیت کو اپنی اجتماعی زندگی میں سے خدا کے تصور سے محروم کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ دانے از خود بکھرنے لگتے ہیں۔ لیکن کسی بھی ملک کی تعمیر و ترقی کیلئے وہاں بسنے والے لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل ضروری ہے اس لئے انہیں جوڑنے کیلئے قومیت یعنی نیشنلزم کا ایک مصنوعی فلسفہ گھڑا جاتا ہے جو بہت سے لوگوں کو جوڑ تو دیتا ہے لیکن بہت سوں کو توڑ بھی دیتا ہے۔ قومیت کا فلسفہ اپنی سرزمین پر کسی اور تہذیب و زبان کے وجود کا روادار نہیں ہوتا۔ وہ اسے اپنے لئے خطرہ محسوس کرتا ہے اور نہ صرف اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ اسے مٹانے کی بھرپور جد و جہد

کرتا ہے۔ یہی ترکی میں کردوں کے ساتھ ہوا اور یہی دنیا بھر کے قومی تنازعات کی جڑ ہے۔

ظلم کے خلاف رد عمل کا اظہار فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ جب کسی تہذیبی اکائی کو تعذیب کا شکار کیا جاتا ہے تو مظلوم اول تو گھبرا جاتے ہیں جسے قوم پرست اپنی کامیابی سمجھ لیتے ہیں لیکن پھر جب خوف وہراس کے بادل چھٹنے لگتے ہیں تو وہ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں جسے بغاوت کا نام دے کر بزور کچلا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مظلوم ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوجاتا ہے اور مسلح کشمکش کا آغاز ہوجاتا ہے۔ قومی نظریات کے حامل اسے دہشت گردی قرار دے کر اپنے مظالم کو حق بجانب ٹھہرانے لگتے ہیں اور ظلم وزیادتی میں روزافزوں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس مرحلے میں سیاسی مفادات اور قومی منافرت بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ مظلومین کو ظالم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہی سب ترکی میں سیکولر جمہوری قومی نظریات کے حامل مصطفیٰ کمال اتاترک کے وارثوں نے کیا جنہیں مغرب کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

اس کے بالمقابل کردستان کے مظلوم عوام اشتراکیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ روس نے انہیں اپنے مفاد کے حصول کی خاطر اسلحہ فراہم کرنا شروع کردیا۔ اشتراکیت کی

بنیاد ہی جدلیاتی کشمکش یا عمل اور رد عمل کے نظریے پر ہے اس کے مطابق انسانی ارتقاء کیلئے یہ طبقاتی کشمکش لازم ہے۔ اس فلسفہ میں بورژوا اور پرولتاری طبقات کے لوگ ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں اور ان کے درمیان مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے یہ نہ کسی مفاہمت کی توقع کرتے ہیں اور اس کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خون خرابے کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ عبداللہ اوجلان اور ان کی جماعت کے ساتھ یہی ہوا۔ وہ غالی اشتراکی بن کر ابھرے اور اس طرح دو انتہا پسند نظریات ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو گئے۔ چین اور روس کی اشتراکی حکومتیں اپنے مخالفین کو بورژوا طبقے کا آلۂ کار قرار دے کر ان کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہیں جو ہندوستان اور برطانیہ کی حکومتیں اپنے نام نہاد باغیوں کے ساتھ روا رکھتی ہیں اور یہ تنازعات حل ہونے کا نام نہیں لیتے۔

ان دونوں نظریات کے برعکس اسلام کا عقیدہ ہے جو تہذیبوں کے درمیان فرق کو تسلیم کرتا ہے اور اشتراکِ عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اسی لئے ترکی میں جب تک اقتدار کی باگ ڈور سیکولر قوم پرستوں کے ہاتھوں میں تھی معاملہ بگڑتا چلا گیا لیکن جب اسلام پسند برسر اقتدار آئے تو حالات بدلنے لگے۔ اخلاص وایثار کے ساتھ امن مذاکرات کا آغاز ہوا۔ آپس میں جو شکوک و شبہات کی فضا کو ختم کیا گیا۔ درمیان میں پیدا ہونے والے مشکلات کو صبر و تحمل کے ساتھ

نبٹایا گیا۔ سیاسی مفادات کے بجائے عدل وانصاف کو بنیاد بنایا گیا تو اللہ کی مدد و نصرت شامل ہوئی اور پھر ایک بار کرد اور ترکی آپس میں شیر و شکر ہوگئے۔ دونوں نے اللہ کی رسی کو مل جل کر تھام لیا تو آپس میں بھائی بھائی ہوگئے۔ وہ آگ کے ایک گھڑے کے کنارے کھڑے تھے مگر اللہ نے انہیں اس سے بچالیا۔ کرد ترکی مصالحت کا سبق یہی ہے کہ عالم انسانیت جب تک باطل نظریات کی تفریق وتذلیل کے چنگل سے نکل کر اسلام کے دامنِ رحمت میں نہیں آجاتی اس وقت تک اس طرح کے مسائل کے پائیدار حل سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ بقول اقبال

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر

بوسٹن سے واشنگٹن تک میراتھن دوڑ - قسط اول

بوسٹن دھماکے کے دو دن بعد امریکی صدر براک اوبامہ نے واشنگٹن میں اس دھماکے کے بجائے امریکی سینیٹ میں اسلحے کی روک تھام کے قانون کی نامنظوری کو نہایت شرمناک قرار دیا حالانکہ ذرائع ابلاغ میں چہار جانب صرف اور بوسٹن کے چرچے تھے ۔ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ پچھلی دو دہائیوں میں پہلی مرتبہ امریکہ میں اسلحہ کی روک تھام اور پابندی کے لیے سرکاری سطح پر اتنا کام کیا گیا تھا۔ امریکہ میں اسلحے کی روک تھام کے بارے میں کیے گئے عوامی جائزے بتاتے ہیں کہ ۹۰ فیصد لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود قانون سازی ایوان میں عوام کے نمائندوں نے اس قانون کو نامنظور کرکے ظاہر کردیا کہ مغربی جمہوریت میں رائے عامہ کی برتری کا جو بلند بانگ دعویٰ کیا جاتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے ۔

امریکی ایوانِ اقتدار یعنی کانگریس میں اس قانون کی مخالفت جہاں ۹۰ فیصد حزب اختلاف نے تو کی وہیں ۱۰ فیصد حزبِ اقتدار کے ارکان نے بھی اس کے خلاف ووٹ دے کر اپنے رائے دہندگان کو ذلیل اور صدر کو رسوا کردیا۔ یہ لوگ اس قانون کی مخالفت انتخابی مہم میں اسلحہ سازوں کی جانب سے ملنے والی خطیر رشوت جسے اعانت کانام دیا جاتا ہے کے سبب کررہے تھے ۔ اس طرح کروڈوں ووٹ کے اوپر لاکھوں ڈالر کی رشوت غالب آگئی۔ امریکہ کے

اندر اسلحہ کی روک تھام کے قانون کی مثال ہندوستان کے لوک پال بل کی سی ہے کہ تمام تر حمایت اور لفاظی کے باوجود یہ قانون پاس ہو کر نہیں دیتا۔امریکی سرزمین پر جب بھی گولی باری کا کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوتا ہے اس طرح کا قانون وضع کرنے پر بحث و مباحثہ شروع ہو جاتا ہے۔ عوامی جلسوں میں ۔ ٹی وی کے پردے پر،بڑی بڑی باتیں کی جاتی ہیں اخبارات کے کالم سیاہ کئے جاتے ہیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ بالآخر اسلحہ کے تاجر عوامی نمائندوں کو خرید لیتے ہیں اور سب ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس بار بحث کی ابتداء گذشتہ برس دسمبر میں ریاست کنیٹی کٹ کے نیوٹاؤن اسکول میں فائرنگ کے واقعہ سے ہوئی جس میں ۲۶ افراد کو ہلاک کردیا گیا تھا اور اسی کے ساتھ اسلحہ کی روک تھام کے لیے باقاعدہ قانون سازی کی سنجیدہ کوشش کا آغاز ہوگیا۔ اس سفاکی کے مجرم ۲۰ سالہ آدم لانزہ نے سب سے پہلے اپنی ۵۲ سالہ ماں نینسی لانزہ کے سر میں چار گولیاں داغ کر اسے قتل کیا۔ اسی نینسی نے اپنے جگر گوشے کو بندوق چلانا سکھایا تھا۔ نینسی لانزہ گزشتہ چار سالوں سے مطلقہ کے طور پر زندگی گزار رہی تھیں ۔ اپنے اسابق شوہر سے انہیں ۲ لاکھ ڈالر سالانہ خرچ کیلئے ملتے ہیں ۔ نینسی کا بڑا بیٹا ریان لانزہ بھی اپنے باپ کی طرح بینک میں ملازمت کرتا ہے ۔ ریان کا دوسالوں سے اپنی ماں اور بھائی سے رابطہ منقطع ہے۔ آدم اپنے ماموں سے جو اسی شہر میں رہتے ہیں گزشتہ آٹھ سالوں میں ایک بار بھی نہیں ملا۔ آدم بیروزگار تھا، اسے اپنے گھر اور اسکول سے ناراضگی تھی اس کا بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ اپنی ماں کا بہیمانہ قتل

کرنے کے بعد گھر میں رکھی چاروں بندوقیں لے کر اسکول گیا وہاں ٦ سے ٧ سال کی عمروں کی ١٢ بچیوں، ٨ بچوں اور ٦ اساتذہ کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے بعد خودکشی کرلی۔ اس وقت ریاست کنیٹی کٹ کے ڈیموکریٹ سینیٹر کرس مرفی نے کہا تھا ''اگر ہم نے اس بارے میں کچھ نہ کیا تو یہ دوبارہ بھی ہوگا۔''

امریکی صدر براک اوبامہ نے جن کے چار سالہ دور صدارت میں یہ چوتھا بڑا واقعہ تھا نیوٹاؤن کے اجتماعی عبادت کی تقریب میں بذاتِ خود شرکت کی تھی اور نہایت جذباتی انداز میں پرنم آنکھوں کے ساتھ اعلان کیا تھا حالیہ دنوں میں ایک قوم کی حیثیت سے ہم نے اس طرح کے کئی اندوہناک حادثات کو جھیل چکے ہیں۔ اس صورتحال کو بدلنے کی خاطر انہوں نے اسلحہ کے قانون میں بامعنی تبدیلی لانے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن امریکی حکمراں طبقہ اس سنگین مسئلہ پر بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ اوبامہ جیسے لوگ اسلحہ پر پابندی لگانا چاہتے ہیں لیکن اسلحہ ساز سرمایہ داروں کے اشاروں پر کھیلنے والے مائیک لی جیسے رہنماؤں کی دلیل یہ ہے کہ امریکی آئین شہریوں کو اپنے دفاع کے لیے اسلحہ رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس بنیادی حق پر کوئی بھی قدغن یا پابندی ہمیں اپنی حفاظت کے لیے صرف حکومت کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ حکومت ہر وقت اور ہر جگہ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا عام شہریوں کو اس حق سے محروم کرنا درست نہیں ہے۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ایک طرف تو امریکہ بہادر ساری دنیا کے لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے کے نام پر فوج کشی تک کر گزرتا ہے اور دوسری جانب امریکی پارلیمان کا ایک

رکن یہ اعتراف کرتا پھرتا ہے کہ ان کی حکومت خود اپنی سرزمین پر بھی عوام کی حفاظت نہیں کرنے کی اہلیت اپنے اندر نہیں رکھتی ۔ سینیٹر کرس مرفی کے پاس مائیک لی جیسے لوگوں دلیل کا جواب ہے'' آزادی یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی پسند کا اسلحہ رکھیں۔ آزادی یہ بھی ہے کہ آپ کو پتہ ہو کہ آپ کہیں بھی اور کسی کے بھی تشدد کا نشانہ نہیں بنیں گے۔ ذرا سوچئے، کنیٹی کٹ اسکول کے ان بچوں کا کیا قصور تھا کہ انہیں ایک جنونی نے آکر گولیوں سے بھون ڈالا؟'' یہ منطق اسکول کے معصوم بچوں کی طرح ان تمام مظلومین پر صادق آتی ہے جو دنیا بھر میں امریکی مظالم سے دوچار ہیں ۔ جنہیں کہیں بھی کسی وقت اچانک بغیر کسی اطلاع کے بزدلانہ ڈرون حملوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ذرائع ابلاغ میں اسے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا نام پر جائز قرار دے دیا جاتا ہے ۔ اس دور کی یہ عجب ستم ظریفی ہے ایک طرف جہاں غریبوں کی جنگ دہشت گردی کہلاتی ہے وہیں دوسری جانب امیروں کی دہشت گردی کو مقدس صلیبی جنگ کہا جاتا ہے ۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اسلحہ پر پابندی کا قانون اور بوسٹن دھماکے کے درمیان بھلا کیا تعلق؟ سچ تو یہ بوسٹن دھماکے سے متعلق وہ کیسے ہوا؟ اسے کس نے کیا؟اس بابت تو ذرائع ابلاغ میں بہت کچھ آیا لیکن وہ کیوں کیا گیا؟ اس کے پس پشت کون سے عوامل کارفرما ہیں؟اور اس سے کس کا کیا فائدہ ہوا؟ اس بابت بہت کم لکھا گیا۔ دراصل یہ دھماکہ اس قانون کی نامنظوری کے صرف دو دن قبل رونما ہوااور ذرائع ابلاغ پراس طرح چھاگیا کہ اسلحہ کی پابندی پر ہونے والی ساری بحث پس منظر میں چلی گئی۔ عوام کے

نمائندوں کی اپنے رائے دہندگان کے ساتھ کی جانے والی دھوکہ دہی پر پردہ پڑ گیا۔ اسلحہ کے بازار میں ہونے والی عوامی رہنماؤں کی نیلامی کی جانب کسی توجہ ہی نہیں گئی ۔ سارے لوگ بوسٹن کی جانب متوجہ کرکے واشنگٹن میں اسلحہ کے بیوپاریوں نے اپنے وارے نیارے کرلیے۔ یہ اسی طرح کا معاملہ جیسے ممبئی میں تاج حملے کی آڑ میں ہیمنت کرکرے اور ان کے ساتھیوں کا بڑی صفائی سے کانٹا نکال دیا گیا اور عوام کو اس بہیمیت کا احساس تک نہ ہوسکا۔

صدر اوبامہ کو اپنی اس ذلت آمیز ناکامی کے بعد مخالفین کی بابت اعتراف کرنا پڑا کہ وہ لوگ (اسلحہ فروش) زیادہ منظم ہیں۔ان کے پاس دولت کی ریل پیل ہے ۔ وہ اس کی خاطر طویل عرصہ سے مصروفِ کار ہیں اور انتخابات کے دوران بھی وہ اس کی جانب پوری طرح متوجہ رہے ہیں (مراد ایسے نمائندوں کو اپنی دولت کے بل بوتے پر کامیاب کیا جو ان کی حمایت کریں)۔اوبامہ نے کہا یہی وجہ ہے کہ آپ اُس کام کو بھی عوامی نمائندوں کی مدد سے نہیں کرسکتے جو ملک کی عظیم اکثریت چاہتی ہے۔ صدر اوبامہ نے اپنے بیان میں لوگوں کو آگاہ کیا کہ اے امریکہ کے لوگو ! واشنگٹن کو بدلنے کی خاطر تمہیں اس بابت صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور جب موقع آئے صحیح لوگوں کو منتخب کرکے واشنگٹن میں بھیجنا ہوگا۔اس کیلئے قوت اور ثابت قدمی درکار ہے ۔ اس طرح گویا اوبامہ نے اپنی ذاتی اور قومی شکست کیلئے بلاواسطہ طور پر عوام ہی کو موردِ الزام ٹھہرا دیا کہ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے غلط لوگوں کا انتخاب کرکے ایوان حکومت میں

بھیجا ہے۔یہی جمہوریت کا کمال ہے کہ کرتا کوئی اور ہے اور بھرتا کوئی اور ہے۔
شکست خوردہ اوبامہ نے اعلان کیا میں مایوس ہوں مگر مفتوح نہیں ہوں۔یہ کوشش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔میں امریکی عوام کے سامنے یہ واضح کرتا چلوں کہ ہم اب بھی بندوق کی دہشت کے بارے میں معقول تبدیلیاں لا سکتے ہیں بشرطیکہ عوام اس جدجہد کو چھوڑ نہ بیٹھیں۔اول تو زیادہ تر نمائندے اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتا سکے کہ آخر ہم مجرم پیشہ لوگوں اور ذہنی مریضوں تک بندوق کی رسائی کو کیوں مشکل نہ بنائیں ۔پھراس کے بعد معروضیت پر سیاست غالب آگئی انہیں فکر لاحق ہو گئی کہ بندوق برداروں کی مضبوط اقلیت آئندہ انتخاب میں ان کیلئے مشکلات کھڑی کردے گی۔جمہوری نظام حکومت میں عوامی فلاح و بہبود پر سیاسی مفادپرستی کو کیسے غلبہ حاصل ہوجاتا ہے اس کا بہترین اعتراف اوبامہ کی اس تقریر میں موجود ہے۔
اوبامہ اور ان کے نائب بیڈن جس وقت اس قانون کو منظور کرانے میں اپنی ساری توانائی صرف کر رہے تھے سنیٹر رانڈ پال نے کہہ دیا کہ قصرابیض اپنی مرضی چلانے کیلئے نیو ٹاؤن کے مظلومین کو ڈھال کے طور استعال کر رہا ہے۔اس تبصرے پر اوبامہ چراغ پا ہوگئے اور کہا میں نے سنا ہے لوگ کہتے ہیں مہلوکین کے اہل خانہ کو قانون سازی میں مددگار کے طور پر استعال کیا جارہا ہے کوئی کہتا ہے ان کے ذریعہ جذباتی بلیک میل کیا جارہا ہے۔کیا یہ لوگ واقعی سنجیدہ ہیں؟کیا ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہزاروں

خاندان جن کی زندگی بندوق کے تشدد کی نذر ہو گئی اس معاملے میں بالکل بے وزن ہیں۔ اس مسئلہ پر جبکہ عوام اقدام چاہتے ہیں ہم کانگریس کو ٹال مٹول کی اجازت نہیں دیں گے ۔ ہم اگلے نیو ٹاؤن کا انتظار نہیں کر سکتے ۔ اوبامہ نے اپنی گفتگو اختتام اس عزم کے اظہار کے ساتھ کیا کہ ہم یہ کرکے رہیں گے ۔ جلد یا بدیر ہم اس مقصد حاصل کریں گے ۔ یہ خاتمہ نہیں التواء ہے۔ لیکن اوبامہ کے اس عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر مستقبل میں کوئی صدر اس کی جرأت کرے گا اس کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔

اوبامہ نے بوسٹن کے دھماکے پر اس قدر پریشان کن اور تفصیلی بیان نہیں دیا جتنا کہ اسلحہ کے قانون کی نامنظوری پر دیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے بندوق کے ذریعہ ہلاک ہونے والے معصوم لوگوں کی تعداد بوسٹن جیسے دھماکوں کے مہلوکین سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر جن لوگوں نے بوسٹن کا دھماکہ کروایا وہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عوام کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہوگئے کہ امریکی قوم کو لاحق سب سے بڑا خطرہ بوسٹن جیسے بم دھماکے سے ہے ۔ اصل مسئلہ اسلحہ پر پابندی نہیں بلکہ دہشت گردی کی نام نہاد جنگ ہے اور اس غلط فہمی کو پھیلانے والی لابی بے حد طاقتور ہے ۔ امریکہ کے اندر اسلحہ کی صنعت سے متعلق اعداد و شمار چونکا دینے والے ہیں ۔

امریکی اسلحہ سازی کی صنعت ۳۲۰ کروڑ ڈالر پر محیط ہے یعنی نائیجیریا جیسے ملک کے سالانہ بجٹ سے زیادہ۔ تمام تر اقتصادی بحران کے باوجود اس میں ۲۰۰۸ء سے لے کر اب تک

چار سالوں ڈیڑھ گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ میں بندوقوں کی ۵۱۰۰۰ ہزار دوکانیں ہیں یعنی یہ سمجھ لیں کہ اسٹاربکس یا مک ڈونالڈ جیسے ومعروف دوکانوں سے چار گنا زیادہ۔ بندوق بنانے والی سب سے بڑے ادارے سٹرن رگرائینڈ کمپنی کے حصص میں پچھلے پانچ سالوں کے اندر پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔اسمتھ ویسن نامی کمپنی کے شیرس گزشتہ ایک سال کے اندر ۷۵ فیصد مہنگے ہوئے ہیں ۲۰۱۰ کے اندر امریکہ میں ۵۵ لاکھ بندوقیں بنائی گئیں اور ۲۶ ہزار نئے افراد کو اس صنعت نے ذریعہ معاش فراہم کیا۔
دنیا کے سب امن پسند سمجھے جانے والے امریکیوں کا یہ حال ہے کہ ان کے پاس کل ۳۰ کروڑ بندوقیں ہیں جو دنیا بھر کے شہریوں کے پاس موجود بندوقوں کا نصف یعنی ۵۰ فیصد ہے ان میں سے ۱۰ فیصد بندوق بردار خواتین ہیں۔ ۵۰ میں سے ۴۲ ریاستوں میں اسلحہ کی خرید و فروخت پر کوئی ضابطہ بندی نہیں ہے۔ ۴۰ فیصد لوگوں کی بندوق خریداری سے قبل کوئی جانچ پڑتال نہیں ہوتی۔ گذشتہ ایک سال کے اندر آسٹریلیا میں ۳۵ اور اسپین میں ۶۰ افراد بندوق کی گولی سے مارے گئے جبکہ امریکہ میں یہ تعداد ۹۴۸۴ ہے۔ جی ہاں ۱۱ ستمبر کے حادثے سے ساڑھے تین گنا زیادہ اس کے باوجود ۱۱ ستمبر کے نام پر ساری دنیا میں خاک اور خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے مگر جب بندوقوں کے ذریعہ ہونے والی ہلاکتوں پر قدغن لگانے کی کوشش کی جاتی ہے تو انہیں ناکام بنادیا جاتا ہے اور بوسٹن جیسے دھماکے کرکے عوام کو توجہات کو دوسری جانب مرکوز کردیا جاتا ہے۔ یہی وہ جمہوری تماشہ ہے جس کے متعلق حکیم الامت علامہ اقبال نے فرمایا ۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

بوسٹن دھماکہ: غیر سے چھین کے اپنوں نے مجھے قتل کیا۔ قسط دوم

میراتھن دوڑ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تکمیل ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس میں اول آنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کو مکمل کرنے والے سارے شرکاء کو سرٹیفکٹ سے نوازہ جاتا ہے جس پر یہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کس نمبر پر آئے بلکہ یہ لکھا ہوتا ہے کہ کتنے وقت میں انہوں نے اسے پورا کیا۔ اس لئے میراتھن دوڑ میں بچہ بوڑھا، عورت مرد سب بلا تفریق حصہ لیتے ہیں۔ یہاں مسابقت کے بجائے جشن کا ماحول ہوتا
ہےاور خاتمے پر کوئی سنسنی نہیں ہوتی لیکن اس میں شک نہیں کہ بوسٹن میراتھن دھماکے کا اختتام نہایت ڈرامائی انداز میں ہوا۔ ابتداء اس ہنگامہ سے ہوئی کہ اوبامہ نے اس کیلئے دہشت گردی کی اصطلاح استعمال نہیں کی۔ انہوں نے کہا تھا کہ حملہ آور کون ہیں یہ ہم نہیں جانتےمگر وہ جو بھی ہیں انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا جائیگا۔ چونکہ اوبامہ کا ماننا ہے کہ ''ہم دہشت گردی نہیں کرتے'' اس لئے یہ قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ اس بار مجرم کوئی امریکی ہوگا۔
اس کے بعد تصویروں کے شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہوااور دونوں نوجوان سرخ و سفید نظر آئے لیکن اس بیچ اوبامہ نے اس کے دھماکے کو دہشت گردی قرار دے

دیا جس سے تجسس میں اضافہ ہوگیا۔آگے چل کر مطلع صاف ہواجب ایف بی آئی نے چیچن نژاد مسلم برادران ۲۶ سالہ تیمرلان سرنائیو کوہلاک اور اس کے چھوٹے بھائی ۱۹ سالہ جوہر کو حراست میں لے لیا۔امریکی تفتیشی حکام نے شبہ ظاہر کیا لیکن ذرائع ابلاغ نے یقین کرلیا کہ یہی دونوں اصلی حملہ آور ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں ملزم امریکی ہیں لیکن چونکہ عیسائی نہیں بلکہ مسلمان ہیں اسلئے دہشت گرد کہلانے سزاوار ٹھہرے۔ اس کے بعد بوسٹن دھماکے کا موازنہ ۱۱ ستمبر سے ہونے لگا نیز حملہ آوروں کو القائدہ سے جوڑا جانے لگا اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف ایک نیا محاذ کھول دیا گیا۔

اس بیچ فوکس ٹی وی پر سی آئی اے کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر فلپ مڈ نے اس تقابل کی تردید کردی۔ انھوں نے کہا جوہر سرنائیو پر دہشت گردی کے بجائے قتل کا الزام لگایا جانا چاہئے اس لئے کہ یہ جرم القائدہ کے منصوبہ بند حملے کی بنسبت ۱۹۹۹ میں کولاروڈو کے کولمبائن ہائی اسکول میں ہونے والے قتل عام سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے جس میں دو انتہا پسند نوجوان قتل و غارتگری پر اتر آئے تھے۔فلپ مڈ نے جس کولمبین قتل عام کی جانب اشارہ کیا ہے اگراس سے بوسٹن دھماکے کا موازنہ کیا جائے تو یہ ایک معمولی واقعہ لگتا ہے اس لئے کہ وہاں پر گولی باری کے علاوہ آتش گیر بموں کی تعداد ۹۹ تھی۔بارہ طلباء اور ایک استاد ہلاک ہوا تھا۔زخمی ہونے والوں کی تعداد ۲۴ تھی۔ اس جرم کا رتکاب

ایرک ہارٹ اور ڈاہلن کلے بولڈ نے کیا تھا۔ان دونوں عیسائی دہشت گردوں نے بعد میں خودکشی کرلی۔ ان کے پسماندہ دستاویز سے انکشاف ہوا کہ وہ اوکلا ہوما دھماکے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔

اوکلا ہوما شہر کے جس بم دھماکے سے ترغیب حاصل کرکے ان نوجوانوں نے تباہی مچائی وہ ۱۹۹۵ء میں پیش آیا تھا۔اس میں ایک سرکاری دفاقی دفتر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ جس میں بچوں سمیت ۱۶۸ افراد ہلاک ہوئے تھے اور زخمیوں کی تعداد ۶۸۰ تھی۔ اس ۱۹ دھماکے میں ۳۲۴ عمارتیں تباہ ہوئی تھیں یا انہیں نقصان پہنچا تھا اور ۸۶ گاڑیاں برباد ہو گئی تھیں اس طرح ۶۵ کروڑ ڈالر کا نقصان ہوا تھا۔ اس دھماکے کا مرتکب سابق فوجی ٹموتھی مک ویگ ۹۰ منٹ کے اندر اسلحہ سمیت گرفتار ہوگیا اور بہت جلد اس کے ساتھی ٹیری نکولس کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ یہ لوگ حکومت امریکہ کے طریقہ کار سے ناخوش تھے۔جون ۲۰۰۱ء میں مک ویگ کو زہر کا انجکشن دے کر سزائے موت دی گئی ٹیری نکولس کو عمر قید کی سزا دی گئی۔دیگر دو ہمنواؤں میں مائیکل کو بارہ سال کی سزا اور لوری کو وعدہ معاف گواہ بنا کر رہا کر دیا گیا۔بوسٹن دھماکے سے مشابہ ایک حملہ ۱۹۹۶ء میں اٹلانٹا کے اندر اولمپک پارک میں ہوا تھا۔ اس کیلئے اسقاط حمل کی مخالفت کرنے والے انتہا پسند ایرک روڈولف کو ذمہ دار پایا گیا تھا۔ اتفاق سے یہ سب سفید فام عیسائی تھے اس لئے ان کی یہ حرکت انفرادی کہلائی اور قوم و مذہب

سے اس کا کوئی تعلق نہیں جوڑا گیا۔

مذکورہ بالا واقعات میں جہاں دائیں بازو کے عیسائی دہشت گردوں کا ملوث ہونا مشترک ہے وہیں اپریل کے مہینے کا بھی خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ امریکہ کے مقامی دہشت گردی کی تاریخ میں ۱۹ اپریل کو بہت خاص اہمیت حاصل ہے اور وقفے وقفے سے اس کی برسی منائی جاتی رہی ہے۔ ۱۹ اپریل ۱۹۹۳ء کو ٹیکساس میں 'برانچ ڈیواڈئین' کا محاصرہ کیا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں لگنے والی آگ سے ایک انتہا پسند مذہبی فرقے کے ۷۰ سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ اسی تاریخ کو ۱۹۹۵ء میں اوکلاہوما سٹی میں مذکورہ بالا دہشت گردی کا حملہ ہوا تھا۔ اس کے بعد کولاریڈو اور اب بوسٹن یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان واقعات کی افسوسناک یادیں امریکیوں کی اجتماعی حافظے میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ امریکہ میں دائیں بازو کے انتہا پسند گروپوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے والے سدرن پاورٹی لا سینٹر کے مارک پوٹوک کے مطابق ۱۹ اپریل کا دن ایک طرح سے علامتی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ یہی وہ دن ہے جب ۱۷۷۵ء میں امریکی انقلاب کے لیے پہلی بار گولیاں چلائی گئی تھیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ۱۱ ستمبر کے پہلے کی باتیں ہیں ان کیلئے نیو امریکن فاؤنڈیشن کی جانب سے شائع کردہ اعداد و شمار دلچسپی کا سبب ہو سکتے

ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے بعد کل ۳۸۰ لوگوں پر سیاسی تشدد میں ملوث ہونے یا اس کی سازش کرنے کا الزام لگایا گیا جن میں ۷۷ لوگ بم بنانے کیلئے ضروری آتش گیر سامان حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان میں سے ۴۸ یعنی ۶۲ فیصد کا تعلق دائیں بازو کے عیسائی انتہا پسندوں سے تھا۔ ۲۳ یعنی ۳۰ فیصد القائدہ کے نظریئے سے متاثر تھے۔ پانچ انارکی پسند تھے اور ایک ماحولیاتی دہشت گرد تھا۔ ۲۰۱۱ء کے بعد امریکہ کی سرزمین پر صرف ایک بم دھماکہ ۲۰۰۸ء میں ہوا جس کیلئے ایک انگریز ڈینس موہن کو ذمہ دار پایا گیا۔ اس شخص نے ایک گھریلو ساخت کا بم اریزونا میں واقع افریقی امریکی شہری تنظیم کے ناظم ڈان لوگن کو بھیجا تھا جو ان کے ہاتھوں میں پھٹ پڑا۔

نسلی برتری کے ایک اور حامی کیون ہارفام نے ۲۰۱۰ء میں اسپوکین (واشنگٹن) کے اندر مارٹن لوتھر کنگ جونیر پریڈ کے راستے میں آتش گیر مادے سے بھرا تھیلا رکھ دیا تھا جسے اتفاق سے پولس نے پکڑ لیا اور بے اثر بنا دیا۔ تین سال قبل پولس نے الابامہ میں ایک فری ملیشیا نامی گروہ پر چھاپہ مارا جو ۱۳۰ گھریلو ساخت کے بم بنا چکا تھا۔ ستمبر ۲۰۱۰ء میں جیمس لی نامی شخص میری لینڈ میں واقع ڈسکوری چینل کے صدر دفتر میں آتش گیر مادے کا کمربند پہن کر داخل ہو گیا اور اس نے اپنی بندوق کی نال پر کئی لوگوں کو یرغمال بنا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماحولیاتی مسائل کی جانب توجہ مبذول کرائی جائے لیکن

بالآخر پولس کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔
سابق سرکاری وکیل ایثان گوبلمان کہتے ہیں کہ اوکلا ہوما سٹی دہشت گردی کا ملزم کوئی مسلمان جنونی نہیں تھا بلکہ امریکہ میں پلنے بڑھنے والا امریکی دہشت گرد تھا۔ عام لوگوں کے لیے یہ بڑی حیرت ناک بات تھی۔مارک پوٹوک کا کہنا ہے کہ دائیں بازو کے یہ گروہ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آخر میں مفقود ہو گئے تھے لیکن یہ اب پھر سر اٹھا رہے ہیں۔ ۲۰۰۹ء کے اندر براک اوباما کی انتخابی کامیابی کے فوراً بعد ان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ ۲۰۰۸ء میں ایسے گروپوں کی تعداد ۱۴۹ تھی لیکن گزشتہ سال یعنی ۲۰۱۲ء کے آخر تک، ان کی تعداد ۱۳۶۰ تک پہنچ گئی تھی۔ لہٰذا بوسٹن دہشت گردی کے اس تازہ ترین حملے کو پہلے پہل ۱۹ اپریل کی تاریخ سے جوڑ کر دیکھا گیا لیکن جیسے ہی ملزمین مسلمان نکلے سارا منظر بدل گیا لوگ اس ٹھوس تاریخی پس منظر کو یکسر بھول گئے اور اسلام و مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے۔
مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کی ابتداء کسی اور نے نہیں بلکہ امریکی پارلیمان میں انسدادِ دہشت گردی و سراغ رسانی کی سب کمیٹی کے چیرمین اور ریپبلکن رہنما پیٹے کنگ کی۔انہوں نے کہا پولس کو معاشرے کے اندر ہونا چاہئے۔پولس نے اس قدر ذرائع بنائے جتنے کہ وہ بنا سکتے ہیں اور انہیں پتہ چلا کہ

خطرہ مسلم سماج سے ہے اس لئے اس کی نگرانی میں اضافہ کیا گیا۔ہم سیاسی اصلاح (بمعنی خوشامد) کے تابع نہیں ہیں میرا خیال ہے جس سماج سے خطرہ ہو اس پر اضافی نگرانی کیلئے ہمیں زیادہ پولس کی ضرورت ہے۔اس کے بعد میراتھن دوڑ میں شریک ۲۰ سالہ سعودی کھلاڑی پر شک کیا گیا۔

مسلمانوں کے ایک ترجمان ظہیر علی کے مطابق ۱۱ ستمبر کے بعد امریکہ میں مسلمان دہشت کا شکار بھی ہیں اوراوپر سے مشکوک و مشتبہ بھی۔انسانی حقوق کیلئے کام کرنے والی سکھ کارکن کے مطابق اوک کریک کے اندر ایک نسل پرست.برتری پسند انگریز نے سکھ گردوارے میں گھس کر بے دریغ گولیاں.برسائیں جس سے کئی بے قصور لوگ ہلاک ہو گئے۔ لیکن اس وقت انگریزوں کی نگرانی کی بات کسی نے نہیں کی۔ کسی نے عیسائیت کی بدنامی کا ذکر تک نہیں کیا۔سیاہ فام پروفیسر مائیکل ایرک ڈائسن نے اس کی تائید میں کہا ہمارے ملک میں سیاہ فام اور مذہبی اقلیتوں کے ساتھ یہ کیا جاتا ہے کہ جو.برا کام ہم کرتے ہیں اسے ہماری شناخت بنا دیا جاتا ہے اور جو اچھے کام کرتے ہیں اسے استثنائی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ غیر معمولی کارنامے انجام دینے والوں کو ہمارا نمائندہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔اگر سفید فام لوگوں کی غلطی سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے اور اگر ہم سے سرزد ہو جائے تو ہمارا کام تمام کر دیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بوسٹن دھماکے کے ملزم مسلمان ہیں نیز شیشان سے تعلق نے ان کو القائدہ اور اسلام سے جوڑ دیا اس لئے کہ شیشان کے مسلمان روس سے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جو بھی مسلمان انگریزوں کی زیادتی کو چیلنج کرتا ہے اسے فی زمانہ القائدہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔اس بابت دائیں اور بائیں بازو والوں کے موقف میں کوئی فرق نہیں ہوتا اس لئے کہ دونوں غاصب ہیں اور اسلام پسندوں کو اس لئے اپنا دشمن سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی جارحیت کے آگے سرنگوں نہیں ہوتے ۔ جہاں تک سرنائیو خاندان کا تعلق ہے وہ ۱۹۹۴؁ کے اندر یعنی موجودہ کشمکش سے بہت پہلے شیشان سے کرغستان منتقل ہوچکا تھا۔۲۰۰۱؁ میں ایک سال سے کم عرصے کیلئے وہ لوگ داغستان گئے ضرور تھے مگر پھر امریکہ چلے آئے ۔ اس وقت تامرلین اور جوہر کی عمر بالترتیب ۱۵اور ۸ سال تھی۔ اس کے بعد سے یعنی گزشتہ ۱۱ سالوں سے وہ امریکی شہری ہیں ۔

ان دونوں بھائیوں کی تعلیم وتربیت نیز پرورش و نشو نما سرزمینِ امریکہ میں ہوئی۔ ان میں سے بڑے بھائی تامرلین نے جو پولس کی گولی سے ہلاک ہو چکا ہے امریکہ ہی میں ایک عیسائی لڑکی سے بیاہ رچایااور ایک بچے کا باپ تھا۔جوہر کا شیشان پر بحث کرنے والے چند انٹرنیٹ گروپس سے وابستہ ہونا کچھ بھی ثابت نہیں کرتا جبکہ امریکہ میں ہمدردانِ شیشان نامی تنظیم کام کرتی رہی ہے اور سی آئی اے سابق ڈائرکٹر جیمس ووسلی جیسے لوگ اس سے وابستہ رہے ہیں۔ اسی

لئے شیشانی رہنما رمضان قاضی روف نے کہا سرانیو برادران اگر مجرم ہیں تو ان کا شیشان سے تعلق جوڑنا بالکل بیجا ہے۔ وہ امریکہ میں پلے بڑھے اور ان کے خیالات و نظریات وہیں پروان چڑھے۔ اس لئے فتنے کی جڑ امریکہ کے اندر ہی تلاش کرنا چاہیئے۔ سرانیو برادران کے والدین مفلوک الحال ہیں۔ جوہر ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہے اور تامرلین ڈیلیوری بوائے کی معمولی ملازمت کرتا ہے اس کے باوجود یہ لوگ نہایت قیمتی لباس زیب تن کرتے تھے اور مرسیڈیز گاڑی پر چلتے تھے۔ اگر یہ ڈالرس شیشان کے القاعدہ سے آتے تھے تو کیا ایف بی آئی کو نظروں سے اوجھل تھے جبکہ تامرلین کے متعلق روس نے ایف بی آئی کو آگاہ کیا اور پولس نے تفتیش کے بعد اسے بے قصور پایا مگر وہ مسلسل پولس کی نگرانی میں رہا۔ ایف بی آئی کے لوگ روس کے علاقے داغستان کے شہر مخاشکالا میں ان کے والدین تک پہنچ گئے اور ان سے یہ تک کہہ دیا کہ تامرلین کیا کھاتا ہے، کیا کرتا ہے یہ سب ان کی نظر میں ہے۔ اس کڑی نگرانی کے باوجود تامرلین اپنے بھائی کے ساتھ یہ دھماکہ کرنے میں کیسے کامیاب ہوگیا جبکہ اس روز بوسٹن دوڑ کی آخری لائن کے آس پاس پولس کا زبردست پہرہ تھا وہ اپنے تربیت یافتہ کتوں کے ساتھ بڑی تعداد میں جائے حادثہ پر موجود تھی۔ یہ نہایت حیرت انگیز سوال ہے۔

اس پس منظر میں بوسٹن دھماکوں کے مشتبہ ملزم بھائیوں کی والدہ زبیدہ کا دعویٰ کہ ان کا ایک بیٹا گزشتہ تین سالوں سے امریکی تحقیقاتی ادارے 'ایف

بی آئی' کی زیرِ نگرانی تھا۔ انہیں یقین ہے کہ ان کے دونوں بیٹے بے گناہ ہیں اور انہیں پھنسایا گیا ہے مبنی بر حقیقت لگتا ہے۔ اپنے انٹرویو میں زبیدہ سرنا یئو کار کہ ان کے لیے یہ سب کچھ سننا بہت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ ایک ماں کی حیثیت سے وہ یقین کے ساتھ صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو اس معاملے میں سوچ سمجھ کر ملوث کیا جارہا ہے۔ جوہر کے والد کی بھی یہی رائے ہے انہوں نے کہا میرے سارے رابطوں کو منقطع کیا جاچکا ہے میں امریکا میں اپنے بھائی سے بات نہیں کرپارہا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میرے بیٹے کو ہلاک کر دیں گے۔

ایف بی آئی کا مسلم نوجوانوں کو اپنے خفیہ ایجنٹوں کے ذریعہ پھنسانا کوئی نئ بات نہیں ہے اس حکمت عملی کے تحت خود بوسٹن میں فردوس نامی طالب علم کو اپنے جال میں پھنسانے کا اعتراف ایف بی آئی ۲۰۱۱ء میں کرچکی ہے۔ جو خفیہ ادارہ اپنے جاسوس کے ذریعہ کسی نوجوان کو پھنسانے کیلئے اسے اسلحہ تک فراہم کرسکتا ہے کیا وہ ان سے بوقتِ ضرورت دھماکہ کیوں نہیں کرواسکتا؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کیلئے کسی کا شرلاک ہومز ہونا ضروری نہیں ہے۔ امریکہ کے اندر سرمایہ داروں اور سیاستدانوں نے باہمی اشتراکِ عمل سے عوامی استحصال کا جو کھیل چلا رکھا ہے اس کی قیمت نہ صرف دنیا بھر کے مسلمان بلکہ امریکہ میں بسنے والی دیگر اقوام بشمول عیسائی انگریز ادا کررہے ہیں۔

امریکی عوام

کے ساتھ کی جانے والی اس دھوکہ دہی اور ظلم پر حفیظ میرٹھی کا یہ شعر صادق آتا ہے

کہ

غیر سے چھین کے اپنوں نے مجھے قتل کیا
آپ ہی ڈھال بنے، آپ ہی تلوار بنے

سربجیت سنگھ : چمن میں سب کی زباں پر تھی میری مظلومی

سربجیت سنگھ کے ساتھ کوٹ لکھپت جیل میں جو کچھ ہوا وہ یقیناً قابل مذمت ہے اور اس کے اہل خانہ اس غم کی گھڑی میں انسانی ہمدردی کے مستحق ہیں لیکن اس سے علی الرغم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سربجیت سنگھ اس دنیا سے جاتے جاتے ہندوستانی سیاستدانوں کے چہرے پر پڑی دوغلے پن کی چادر کو تار تار کرگیا۔ سربجیت سنگھ کی زندگی مختلف مراحل میں چار مختلف افراد سے مماثل ہو جاتی ہے اور ہر مرحلے میں ہمارے ذرائع ابلاغ کی منافقت کو عیاں کر جاتی ہے۔ سربجیت سنگھ اپنی ۲۲ سالہ طویل حراست میں کبھی اجمل قصاب کی طرح دکھائی دیتا تھا تو کبھی اس کی حالت عبدالناصر مدنی جیسی ہو جاتی ہے۔ کبھی افضل گرو سے مماثل ہو جاتا ہے تو کبھی قتیل صدیقی سے مماثلت اختیار کرلیتا ہے۔

سربجیت کو موت کے بعد ذرائع ابلاغ نے جس طرح پیش کیا اس سے لوگ بھول ہی گئے کہ آخر وہ کون تھا ؟ اس پر کیا الزام لگا تھا؟ اسے کس جرم کی پاداش میں سزائے موت ہوئی تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے پس منظر کا اعادہ ضروری ہے۔ پاکستانی حکام کے مطابق سربجیت سنگھ پاکستان کے شہر فیصل آباد اور لاہور میں دہشت گردی کا مرتکب تھا۔ ان دھماکوں میں چودہ بے گناہ شہری ہلاک ہوئے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب طالبان موجود نہیں تھے اور ہر دھماکے کا

الزام ان کے سر منڈھ کر آنکھیں موند لینا ممکن نہیں تھا۔ پاک بھارت سرحد پر قصور میں اگست ۱۹۹۰ء کو سربجیت سنگھ گرفتار ہوا۔ اس پر جاسوس ہونے کا الزام لگایا گیا۔ پولس ۲۸ کی حراست میں سربجیت سنگھ نے لاہور کے بھاٹی گیٹ، پرانی انار کلی، فیصل آباد، ملتان اور ایک ٹرین میں دھماکوں کا اعتراف کیا۔ ۱۹۹۱ء میں انسدادِ دہشت گردی کی عدالت نے سربجیت سنگھ کو سزائے موت سنائی۔ اس کو لاہور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا لیکن سماعت کے بعد دونوں عدالتوں نے سزا کو برقرار رکھا۔

پاکستان کی سپریم کورٹ نے ۲۰۰۶ء میں سربجیت کی سزا کے خلاف نظرثانی کی اپیل مسترد کردی اور سربجیت سنگھ کی سزائے موت بحال رہی سربجیت سنگھ کی بیوی، دو بیٹیاں اور بہن دلبیر کور ۲۰۰۸ء میں پاکستان گئیں اور انہوں نے جیل میں سربجیت سنگھ سے ملاقات کی۔ دلبیر کور نے صدر پرویز مشرف سے رحم کی اپیل کی جو مسترد ہو گئی۔ اس کے بعد ہندوستان کے ایک ہزار دانشوروں کے دستخط سے صدر پاکستان کو رحم کی اپیل کی گئی۔ ۲۶ اپریل ۲۰۱۳ء کو کوٹ لکھپت جیل لاہور میں سربجیت سنگھ اپنے ساتھی قیدیوں مدثر اور عامر کے حملے میں شدید زخمی ہو گیا۔ سربجیت کو تشویش ناک حالت میں لاہور کے جناح اسپتال منتقل کیا گیا جہاں اسے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تاہم شدید زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے سربجیت سنگھ نے یکم مئی کی شب میں اسپتال کے

اندر دم توڑ دیا۔

سربجیت پر ویسے تو اجمل قصاب کی طرح دہشت گردی کا الزام تھا اور دونوں کو عدالت نے موت کی سزا سنائی لیکن اس کے باوجود سربجیت ۲۲ سال زندہ رہا۔ دوہزار آٹھ میں صدر کے ذریعہ معافی کی درخواست مسترد ہوجانے کے بعد بھی وہ پانچ سال حیات رہا لیکن اجمل قصاب کو پھانسی کے پھندے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا ؟ یہ سوال ہمارے رحم دلی کے دعوے پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے ۔ دہشت گردی کے الزام میں موت کی سزا کے باوجود سربجیت کے اہل خانہ کو اس سے ملاقات کی اجازت حکومتِ پاکستان نے دی ۔ کیا اجمل قصاب کے اہل خانہ کیلئے اس طرح کے اجازت نامے کا تصور بھی ممکن ہے؟ اور اگر کانگریس بڑی ہمت کرکے انہیں اجازت دے بھی دیتی تو بی جے پی اور اس کے ہمنوا اس پر کس قدر ہنگامہ آرائی کرتے اس کا تصور ہر گز مشکل نہیں ہے۔ پھر اگر وہ لوگ آ بھی جاتے تب بھی کیا عدم تشدد کے نام لیوا انہیں تشدد کا شکار کئے بغیر لوٹ کر واپس جانے دیتے یہ تحقیق طلب سوانہیں ہے۔اگر پاکستانی دانشوروں کی جانب سے اجمل قاب کیلئے معافی کی درخواست کی جاتی تو ہمارے ذرائع ابلاغ میں اس کا کیا ردعمل ہوتا ؟ اس کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ دوسروں پر شدت پسندی کا الزام لگانا اور اپنے آپ کو رواداری کا پیکر قرار دینا جس قدر سہل ہے ۔ اپنے عمل سے اس دعویٰ کی دلیل پیش کرنا اتنا ہی کٹھن ہے ۔

سربجیت سنگھ نے ایک زمانے میں حکمراں کانگریس پارٹی کی صدر سونیا گاندھی کو ایک خط لکھا تھا جس میں جیل کے اندر غیر صحتمند کھانا دیئے جانے کی شکایت کی گئی تھی اور اس کے سبب ہاتھ پاوں کے متاثر ہونے کے علاوہ جیل میں دوائیں نہ ملنے اور حکام کے ذریعہ طعنے مارنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ سربجیت کا یہ خط اس کے وکیل اویس شیخ نے سونیا گاندھی کو پہچایا اور تصدیق کی کہ ایک بار انہوں نے لکھپت جیل میں سربجیت سنگھ سے ملاقات کے دوران کھانا چکھا تھا جو بہت ہی خراب تھا۔ وکیل شیخ اپنے ساتھ سربجیت سنگھ کی بہن دلبیر کور اور بیٹی پونم کے لیے بھی خط لے کر آئے تھے۔ پاکتاعن سے کسی دہشت گرد کا خط لے کر ایک وکیل ہندوستان توآسکتا لیکن کیا یہاں سے بھی کوئی وکیل ایسا کرنے کی جرأت کرسکتا ہے؟ اس موقع پر وہ تمام واقعات نگاہوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جبکہ اجمل قصاب تو کجا بے گناہ ہندوستانی مسلم نوجوانوں کی پیروی کرنے والے وکلاء کو بھی دھمکیاں دی گئیں۔ انہیں مقدمہ سے الگ ہونے پر مجبور کیا گیا۔ ان کو عدالت کے احاطے میں نہ صرف رسوا بلکہ زدوکوب تک کیا گیا بلکہ شاہد اعظمی جیسے دلیر اور بیباک وکیل کو شہید تک کردیا گیا۔ ایسے میں کیا کوئی تصور کرسکتا ہے کہ ایک وکیل ہندوستان سے پاکستان کا سفر کرکے اجمل جیسے کسی مجرم کا خط پاکستانی سیاستدانوں تک پہنچائے گا۔ اس کے اہل خانہ سے ملاقات کرے گا اور اس پر ہونے والی زیادتی کی تصدیق کرے گا اور اگر کوئی ایسا کرنے کی جرأت کرہی دیتا ہے تو کیا اسے واپس ہندوستان میں داخل ہونے دیا جائیگا؟

اور اگر وہ پولس کے تحفظ میں داخل ہو بھی جاتا ہے تو اس بیچارے کا وہی حشر ہوگا جو کشمیر کی حمایت میں ایک جملہ بولنے والے پرشانت بھوشن کا ہوا تھا اور تو اور آزمائش کی اس نازک گھڑی میں طوطا چشمی انا ٹیم بھی اپنا دامن جھٹک کر ان سے دور ہو گئی تھی۔

اس موقع پر سربجیت کا موازنہ عبدالناصر مدنی سے کیا جانا چاہئے۔ سربجیت کے ساتھ جو سلوک لاہور جیل میں کیا جارہا تھا اس سے خراب سلوک پی ڈی پی کے رہنما عبدالناصر مدنی کے ساتھ بنگلور کی جیل میں کیا جارہا ہے اور ان صحت فی الحال بہت خراب ہو چکی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سربجیت کے برعکس عبدالناصر مدنی بذاتِ خود دہشت گردی کا شکار ہوئے ہیں۔ ان پر حملہ کرنے والے حملہ آور رگھوناتھن پلئی کی گواہی پر گرفتار ہونے والا آریس ایس لیڈر شاجی کمار آزاد گھوم رہا ہے اور مدنی کی ضمانت نہیں ہو رہی ہے۔ پچھلے دنوں مارکنڈے کاٹجو نے بھی اس پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہیل چیئر پر چلنے والے ملزم کی ضمانت سے بھلا کیا خطرہ ہو سکتا ہے ؟ عبدالناصر مدنی کو پھنسانے کیلئے جس رفیق کو گواہ بنایا گیا اس نے خود تہلکہ جریدے میں اعتراف کیا اسے اذیت دینے کیلئے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔ ایس آئی ٹی نے دھمکی دی کہ اگر اس نے مدنی کے خلاف گواہی نہیں دی تو دہشت گردی کا الزام لگا کر اسے تاعمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دیا جائیگا۔ بلکہ بی جے پی کے گواہ نے بھی کہا کہ وہ

خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔ ان حقائق کے باوجود سربجیت کی حالتِ زار پر ٹسوے بہانے والے سیکولر اور فرقہ پرست رہنما اور ذرائع ابلاغ عبدالناصر مدنی کے تئیں خاموش تماشائی بنا ہوا ہے۔ عبدالناصر مدنی اپنی گرتی ہوئی صحت کے ساتھ اب بھی کسی اویس شیخ کے منتظر ہیں۔

سربجیت پر جیل میں حملہ کو ایسی انہونی بنا کر پیش کیا گیا جیسے کہ ایسی کسی واردات کا سرزمینِ ہند پر تصور ہی ناممکن ہو حالانکہ ایک سال قبل قتیل صدیقی کو پونے کی جیل کے اندر قتل کردیا گیا۔ قتیل صدیقی کو دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ضرور کیا گیا تھا لیکن ان کا ثابت ہونا تو درکنار قتیل پر کوئی فردِ جرم تک داخل نہیں کی گئی تھی اور اس سے پہلے ہی انہیں جیل کے اندر قتل ہوگیا۔ خواجہ یونس کا پولس کے ذریعہ قتل عدالت میں ثابت ہو چکا ہے۔ سربجیت کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا مطالبہ بالکل بجا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ قتیل صدیقی کے قاتل کو سب لوگ بھول گئے۔ قتیل کے لواحقین جب بہار سے ان کی لاش لینے کی خاطر پونے پہنچے تو انہیں وہ سہولت فراہم نہیں کی گئی جو پاکستان نے سربجیت کی لاش کو ہندوستان لانے کیلئے دیں بلکہ انہیں ڈرایا دھمکایا گیا۔ اتفاق سے پنجاب ہی کی طرح سیاسی صورتحال بہار میں تھی جہاں ایک علاقائی جماعت بی جے پی کی مدد سے حکومت کررہی تھی لیکن قتیل کے اہلِ خانہ کو پرسہ دینے کیلئے نہ بی جے پی والے آئے اور نہ

نتیش کمار۔ مرکزی حکومت کے تو کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ ذرائع ابلاغ قتیل صدیقی پر ایس آئی ٹی کی جانب سے لگائے جانے والے بے بنیاد الزام کا ورد کرتا رہا۔

سربجیت جب زخمی ہونے کے بعد اسپتال میں موت سے جوجھ رہا تھا تو اس کے اہل خانہ کو خصوصی ویزا دے کر پاکستان آنے کی اجازت دی گئی۔ پاکستان میں فی الحال انتخاب ہو رہے ہیں اس کے باوجود سربجیت کی موت پر کسی جماعت نے سیاست نہیں کی اس کے برخلاف محض اکثریت کے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر تختۂ دار تک پہنچائے جانے والے بے قصور افضل گرو کی پھانسی کو جان بوجھ کر حکومت ہند نے اس کے اہل خانہ سے چھپانے کا جرم کیا۔ افضل کے اہل خانہ کو ان سے ملاقات کے بنیادی حق سے حکومت کے ایماء پر محروم کیا گیا۔ سربجیت کی لاش لاہور سے امرتسر ہوائی جہاز سے اور پھر ان کے گاؤں بھکونڈی ہیلی کوپٹر سے پہنچائی گئی لیکن افضل گرو کی تدفین جیل کے اندر عمل میں آئی۔ افضل کے اہل خانہ کی ساری التجا کہ وہ اسے اپنے یہاں لے جا کر آخری رسومات ادا کرنا چاہتے ہیں ٹھکرا دیا گیا حالانکہ افضل گرو پر وہی الزامات تھے جو سربجیت پر تھے مگر سربجیت حملہ دو افراد کی حرکت تھی جبکہ افضل گرو کے خلاف عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ تینوں نے آپس میں سانٹھ گانٹھ کر لی تھی۔

سربجیت کی موت کے بعد وزیراعظم منموہن سنگھ نے اسے ہندوستان کا لعل قرار دیا۔ مرکزی و ریاستی وزراء اس کی آخری رسومات ادا کرنے پہنچ گئے۔ وزیراعلیٰ پنجاب پرکاش سنگھ بادل کے علاوہ مستقبل کے وزیراعظم راہل گاندھی بھی بھکونڈی جا پہنچے۔ سربجیت کی لاش کو قومی پرچم میں لپیٹا گیا۔اکیس توپوں کی سلامی دی گئی اور قومی اعزاز کے ساتھ آخری رسومات ادا کی گئیں۔اگر یہی کچھ اجمل قصاب کے ساتھ ہوتا تو دہشت گردی کی سرکاری سرپرستی اور پاکستان کو دہشت گرد ریاست قرار دینے کا مطالبہ کس زور شور سے کیا جاتا اس کا اندازہ لگانا آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ایک طرف تو ہم اس بات پر غم و غصہ اظہار کرتے ہیں کہ حافظ سعید کو اجمل قصاب کو اکسانے کے الزام میں مقدمہ چلانے کیلئے ہمارے حوالے کیوں نہیں کیا جاتا اور دوسری جانب پاکستان میں جس پر اجمل قصاب کی طرح کا الزام ثابت ہوجاتا ہے اس کی ہم اعزاز و تکریم کرنے سے نہیں تھکتے کیا یہ رویہ مبنی برانصاف ہے؟

یہ کسی دل جلے مسلمان کا ردعمل نہیں ہے بلکہ ریاستِ پاج ب ہی کی ایک سیاسی جماعت دل خالصہ نے حکومت پیجاب کے رویہ پر اعتراض کرتے ہوئے اعتراض کیاکہ سربجیت کو شہید قرار دینا،آخری رسومات کو سرکاری اعزاز دے کر خزانے سے اس کے اہل خانہ کوایک کروڑ کی خطیر رقم دینے سے ایسا لگتا ہے گویا وہ کسی قومی مہم پر تھا اور اسے سرکاری ذمہ داری ادا کرنے کیلئے اسے پاکستان روانہ

کیا گیا تھا۔ دل خالصہ کے سربراہ ایچ ایس دھامی اور سکریٹری منجندر سنگھ نے سربجیت پر ہونے والے حملے کی مذمت کی اور ان کے اہل خانہ سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا مگر حکومت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اسے بے گناہ بتائے جانے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس سے قبل شرومنی اکالی دل اندراگاندھی کے قاتل بے انت سنگھ کی تکریم کرچکا ہے اور گولڈن ٹیمپل کا ایک حصہ جرنیل سنگھ بھنڈارن والا کے نام سے موسوم کرچکا ہے لیکن کسی کلدیپ نیر نے اس پر اعتاض کرتے ہوئے مرکزی حکومت کو انہیں غدار قرار دینے کی حمایت نہیں کی۔

سربجیت سنگھ پر تین طرح کے الزامات عائد کئے جاتے ہیں اول تو یہ کہ وہ دہشت گرد تھا دوم وہ شراب کا اسمگلر تھا اور سوم وہ شراب کے نشے میں نادنستہ طور پر سرحد عبور کرگیا تھا۔ اگر اس تیسرے اور سب سے ہلکے الزام کو بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی دل خالصہ کے نزدیک وزیر اعظم کا سربجیت کو قوم کا بہادر سپوت قرار دینا ناقابل فہم ہے اس کا سوال ہے کہ شراب پی کر بین الاقوامی سرحد کے پار نکل جانا کون سی دلیری کا کام ہے؟ اور اس سے قبل ملک کی سرحد پر اپنی جان نچھاور کرنے والوں کی حکومت پنجاب نے کوئی تعظیم وتکریم کیوں نہیں کی؟ دل خالصہ کے دلائل معروضی ہیں مگر ان کی جانب لوگ توجہ کیوں نہیں دیتے؟ اس پیچیدہ سوال کا نہایت سہل جواب یہ ہے کہ ایک عام ہندوستانی کے شانوں پر منکر نکیر کی طرح سیاستداں اور ذرائع ابلاغ سوار ہے۔ اس لئے ہم

لوگ وہی دیکھتے ہیں جو وہ دکھلانا چاہتے ہیں۔ وہی سنتے ہیں جو وہ سنانا چاہتے ہیں۔ وہی پڑھتے ہیں جو وہ پڑھانا چاہتے ہیں۔ وہی سمجھتے ہیں جو وہ سمجھانا چاہتے ہیں اور وہی سب بولتے ہیں جو وہ بولوانا چاہتے ہیں۔

حق و باطل کی تمیز سے عاری ہمارا قومی شعور اپنے سیاسی رہنماؤں کے پیچھے بگٹٹ دوڑا چلا جاتا ہے۔ ہم ایک بے اختیار مخلوق کی مانند ذرائع ابلاغ کے ہر جھوٹ اور سچ پر بلا توقف ایمان لے آتے ہیں۔ ہم نے اپنے قلب و ضمیر کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اسی لئے ہمارے اندر بیجا توقعات جنم لیتی ہیں اور اپنے متضاد رویے پر ہمیں نہ حیرت ہوتی ہے اور نہ اس کا احساس ہوتا ہے۔ سربجیت کے ناحق قتل کے جواب میں پاکستانی قیدی رانا ثنا اللہ پر جموں کشمیر کی کوٹ بھلوال جیل میں ایک ریٹائرڈ فوجی قیدی جان لیوا حملہ کردیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ کومہ میں چلا جاتا ہے۔ رانا فی الحال جموں کے میڈیکل کالج اسپتال میں موت سے لڑ رہا۔ اس پر بم دھماکے کا الزام تو ہے لیکن اس سے کوئی ہلاک نہیں ہوا ہے اس کے باوجود ذرائع ابلاغ نے اس کی جانب سے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں اور سوائے مارکنڈے کاٹجو کے کسی نے یہ نہیں کہا کہ انسانی بنیادوں پر اسے پاکستان بھیج دیا جانا چاہئے کوئی بعید نہیں کہ جناب کاٹجو کو اس انسانی ہمدردی کی قیمت جلد ہی چکانی پڑ جائے۔ بقول شاعر

حصارِ جبر میں زندہ بدن جلائے گئے

کسی نے دم نہیں مارا مگر دھواں بولا

نریندر مودی: اپنی گلی کا شیر

کرناٹک کا ایک اور ناٹک اختتام پذیر ہوا۔ اس کے ساتھ جنوبی ہندوستان کی واحد زعفرانی حکومت کا پردہ گر گیا اور کانگریس کا ہاتھ جگناتھ بن کر پھر ایک بار نمودار ہوگیا۔ پانچ سال قبل جب بھارتیہ جنتا پارٹی کو پہلی مرتبہ کرناٹک میں اقتدار حاصل ہوا تھا اس وقت سے وقفہ وقفہ کے ساتھ بی جے پی والے نت نئی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے رہے۔ اب خدا خدا کر کے ان مصائب سے جان چھوٹی۔ اس لئے کہ جس اقتدار کو بچانے کیلئے سارے پاپڑ بیلے جاتے تھے وہی داغِ مفارقت دے گیا لیکن جانے سے قبل وہ پارٹی کو سکرات کے عالم میں مبتلا کر گیا۔ خیر اب چونکہ آخری رسومات ادا ہو چکی ہیں اس لئے چند دنوں میں یہ لوگ رو دھو کر اسے بھول جائیں گے۔

کرناٹک کے نتائج کا سطحی مطالعہ بہت ساری غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے اس لئے ذرا گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ سب سے بڑی خوش فہمی تو مسلمانوں کو ہو سکتی ہے اس لئے کہ اس بار وہاں موجود مسلم تنظیموں کے وفاق مسلم محاذ نے شرح صدر کے ساتھ ۲۰۰ نشستوں میں کانگریس کی حمایت کا اعلان کیا تھا اس لئے یہ لوگ ایسا سوچ سکتے ہیں کانگریس کی کامیابی کا سہرہ انہیں کے سر بندھتا ہے لیکن اگر ووٹوں کے تناسب پر نظر ڈالی جائے تو یہ غلط فہمی

دور ہو جاتی ہے۔ اس بار بی جے پی نے اپنے ۱۴ فیصد ووٹ گنوائے اور ان کی تقسیم کے جی پی، کانگریس اور جنتا دل میں بالترتیب ۱۱، ۲ اور ا فیصد ہوئی ہے۔ کرناٹک میں اقتدار کی تبدیلی کا بنیادی سبب یہی تقسیم ہے اور یہ کون نہیں جانتا کہتقسیم شدہ ۱۴ فیصد ووٹ مسلمانوں کے نہیں تھے۔ اس لئے مسلمانوں کی جانب سے اس تبدیلی کا کریڈٹ لینا دل کو بہلانے کے ایک خیالِ خام ہے۔

کانگریس کو گزشتہ انتخاب میں بی جے پی سے ایک فیصد زیادہ یعنی ۳۵ فیصد ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ اس مرتبہ اس میں صرف دو فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ بھی مسلمانوں کے ووٹ نہیں ہیں جو جنتا دل (ایس) کے بٹوے سے نکل کر کانگریس جھولی میں جاگرے بلکہ جنتا دل (ایس) کے ووٹوں کا تناسب بھی ایک فیصد زیادہ ہوا ہے۔ سب سے بڑا فائدہ یدورپا کی کے جی پی کا ہوا جس نے ۱۱ فیصد ووٹ حاصل کئے۔ اس کے باوجود اسے صرف ۶ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی جبکہ کانگریس ۴۲ فیصد اضافے کے ساتھ اور جنتا دل (ایس) ۱۲ فیصد اضافے کے ساتھ ۴۰ ارکانِ اسمبلی کو کامیاب کرنے ۱۲۱ میں کامیاب ہو گئی۔ ایک حسنِ اتفاق یہ بھی ہے کہ فی الحال جنتادل (ایس) اور بی جے پی کے ووٹوں کا تناسب یکساں یعنی ۲۰ فیصد ہے اور دونوں کے ارکانِ اسمبلی کی تعداد ۴۰ ہے۔ عام طور سے ایسا نہیں ہوتا لیکن اس بار یہ ہوا ہے۔ آزاد امیدواروں کے ووٹ تناسب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود ان کی نشستیا ۱۲ فیصد بڑھ گئیں گویا

انہیں ووٹ کی تقسیم کا بلا واسطہ فائدہ ہوا۔
بی جے پی اس بار تین حصوں میں تقسیم ہوئی اور یدورپاّ نے اس کا بیڑہ غرق کیا یہ بات درست ہے لیکن یہ انکشاف بھی دلچسپ ہے کہ کے جے پی کے امیدواروں نے صرف دو مقامات پر بی جے پی رکنِ اسمبلی کو شکست دے کر کامیابی حاصل کی۔ ایک حلقۂ انتخاب میں انہوں جنتادل کے رکن اسمبلی کو بھی ہرایا لیکن تین مقامات پر کانگریس کے رکن اسمبلی کو شکست سے دے کر وہ اسمبلی میں پہنچے۔ اس طرح یدورپاّ نے کانگریس کا بلا واسطہ فائدہ تو کیا لیکن بلواسطہ نقصان بھی کیا۔ بی جے پی کے اور باغی گروہ بی ایس آر سی کو ۴ مقامات پر کامیابی حاصل ہوئی لیکن اس نے بھی جہاں دو مقامات پر بی جے پی کو ہرایا وہیں دو مقامات پر کانگریس سے اسمبلی کی رکنیت چھین لی۔ اس گئی گزری حالت میں بھی بی جے پی سات نئے مقامات پر کامیابی حاصل کی اور چار مقامات پر انہوں نے کانگریس کے تو تین مقامات کو جنتادل کے ارکانِ اسمبلی کو ہرایا۔ اس کے معنی یہ ہیں صرف ۳۳اا برسرِ اقتدار ارکان اسمبلی دوبارہ اسمبلی میں جاسکے ہیں بقیہ ۸۰ یا تو گھر پر ہیں یا بی جے پی کے خلاف کسی اور جماعت کا پرچم تھامے ہوئے ہیں۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ کرناٹک میں ریڈی برادران اور یدورپاّ کی بدولت بی

جے پی کو سب سے زیادہ بدعنوان ریاستی سرکار کا اعزاز حاصل ہوا لیکن عین انتخاب کے دوران مرکزی حکومت کے دو وزراء بدعنوانی کے دلدل میں دھنسے چلے گئے اور مرکزکی کانگریسی حکومت نے بھی اپنے آپ کو ملک کی تاریخ میں بدعنوان ترین حکومت ثابت کرنے کی اپنی کوشش جاری رکھی اس کے باوجود عوام نے کانگریس کو اکثریت سے نواز کر یہ ثابت کردیا بدعنوانی سے ان کو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کرپشن ایک عام ہندوستانی کے رگ وپے خون بن کر دوڑنے لگا ہے۔ وگرنہ ریڈی برادران کی جماعت کو ۴ اور یدورپا کو ۶، جنتادل ایس اور بی جے پی کو ۴۰،۴۰ نیز کانگریس کو ۱۲۱ نشستیں حاصل نہیں ہوتیں اس لئے کہ بدعنوانی کے حمام میں سب کے سب یکساں طور پر عریاں ہیں۔

انتخابی مہم کے دوران کانگریس نے بدعنوانی کے مسئلہ کو ضرور اچھالا لیکن نتائج پر ان کا تبصرہ دیکھنے کے بعد ایسا لگتا ہے سیاسی رہنماؤں کو بھی اس بابت کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ سونیا گاندھی نے نتائج پر خوشی کا اظہار کرنے کے بعد ایسا بڑا جھوٹ بولا جس پر ہندوستانی سیاست کی ابجد سے واقف طالب علم بھی یقین نہیں کرسکتا۔ انہوں نے فرمایا وزیر اعلیٰ کے نام کا فیصلہ منتخب ارکانِ اسمبلی کریں گے۔ یہ دراصل ہاتھی کے وہ دانت ہیں جو صرف دکھانے کیلئے ہوتے ہیں ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ کا انتخاب ہائی کمانڈ کی جانب سے ہوتا ہے ارکان اسمبلی کا کام تو صرف اس پر صاد کہنا

ہوتاہے اور جو ایسا کرنے سے گریز کرتا اول تو وہ وزارت سے محروم ہو جاتا ہے اور آخر میں یہ ہوتا ہے کہ آگے چل اس غدارِ جماعت کو انتخاب لڑنے کے لائق بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے اس دور میں سیاسی جماعتیں خاندانی کاروبار بن چکی ہیں دینِ سیاست کے اندر وفاداری بقدرِ استواری عین ایماں ہے۔ اس کے سب سے بڑے گواہ منموہن سنگھ نے راہل گاندھی کی قیادت اور محنت کو خوب سراہا۔ وزیراعلیٰ کی کرسی کے دعویدار سیدھا رمیاّ نے بھی راہل گاندھی کو دل کھول کر خراج عقیدت کو پیش کرکے ثابت کردیا کہ لیڈر کا انتخاب کون کرتا ہے؟

بھارتیہ جنتا پارٹیاس موقع پر عجیب و غریب تذبذب کا شکار ہو گئی۔ ان کے ترجمان پرکاش جاوڈیکر نے کہابی جے پی کو یدورپاّ نے نہیں بلکہ عوام نے کانگریس کو ووٹ دے کرہرایا جبکہ یہ سفید جھوٹ ہے بی جے پی کارسوائی کا سبب کانگریس کے ملنے والے ووٹ سے زیادہ بی جے پی کے ووٹ میں کمی ہے اور اس کیلئے یدورپا ذمہ دار ہے۔ جاوڈیکرکے بیان کی تردید آرایس ایس کے سابق ترجمان ویدیا نے کردی۔ ان کے مطابق یدورپاکا نکل جانابی جے پی کے شکست کی سب سے اہم وجہ بنا۔ اس بابت سابق وزیر اعلیٰ جگدیش شطار نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ عوام سے معافی طلب کی اور کہا جن لوگوں کے سبب پارٹی بدنام ہوئی وہ اب باہر جاچکے ہیں اس لئے رائے دہندگان پھر ایک باربی جے پی کو خدمت کا موقع دیں۔ بیچارے شطار بھول گئے کہ جانے والے نکالے نہیں گئے بلکہ

انتخاب سے قبل از خود گئے اس کے باوجود عوام نے باغیوں پر اعتماد کا اظہار کیا ہے اس لئے یہ معافی تلافی بے معنی ہے۔

کرناٹک کے انتخاب پر سب سے دلچسپ تبصرہ روی شنکر پرشاد نے کیا۔ انہوں نے کہا کے بعد سے جو بھی کرناٹک میں ناکام ہوا ہے اسے مرکز میں کامیابی ملی ہے اس ۱۹۸۹ء لئے آئندہ سال ہم پارلیمانی انتخاب جیتیں گے ۔اگر اس منطق کو تسلیم کرلیا جائے تو بی جے پی نریندر مودی کے بجائے یدورپا کو وزیر اعظم کا امیدوار بنا دینا چاہئے اس لئے کہ روی شنکر کے مطابق کرناٹک میں بی جے پی کو ہراکر مرکز میں اس کی کامیابی یقینی بنانے کا کارنامہ یدورپاّ نے کیا ہے ۔راجیو پرتاپ روڈی نے حیرت و رنج کا اظہار کرنے کے بعد کہا مودی کے پاس کوئی جادوئی چھڑی تو ہے نہیں اور پھر اس کا تعلق کرناٹک سے بھی نہیں ہے ۔ویسے تو ہندوستان کے تمام رہنماؤں کا تعلق کسی نہ کسی ریاست سے ہے تو کیا وہ ملک گیر سطح پر رائے دہندگان کو متوجہ نہیں کرسکیں گے ۔اس صورت میں بی جے پی کے پاس صرف اڈوانی جی کا متبادل رہ جاتا جن کا تعلق ہندوستان کی کسی ریاست سے نہیں بلکہ پاکستان سے ہے۔

کرناٹک کا انتخاب بی جے پی کے صدر راج ناتھ سنگھ یا بی جے پی کرناٹک کے نگرانِ کار وینکیا نائیڈو کے بجائے نریندر مودی کے کیلئے آزمائش بن کر

آیا۔ ہوا یہ کہ کانگریس والوں نے مودی کی دھنائی شروع کردی اور بی جے پی والے بلاوجہ مودی کی مدافعت میں لگ گئے۔ دگوجئے نے کہہ دیا کہ کرناٹک میں یہ ثابت ہوگیا کہ گجرات کے باہر مودی کو کوئی نہیں جانتا حالانکہ انہیں کہنا چاہئے تھا کہ نریندر مودی کو گجرات کے باہر لوگ جانتے تو ہیں لیکن اس کی مانتے نہیں ہیں۔۔نریندر مودی کی اس پریشانی کیلئے وزارتِ عظمیٰ کا خواب ذمہ دار ہے ورنہ کرناٹک سے متصل گوا کے بی جے پی وزیراعلیٰ نے بھی اپنی کھڑکی سے پرے جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ وزارئے اعلیٰ بھی اپنے اپنے گھر میں بیٹھے رہے لیکن نریندر مودی نے کبھی اتراکھنڈ میں جاکر اپنی پارٹی کو ہرایا تو کبھی ہماچل پردیش میں جاکر اپنی لٹیا ڈبو آئے۔ اب اس کا اگلا نشانہ بہار ہے جہاں اس نے وزیراعلیٰ نتیش کمار اور بی جے پی کی مقامی شاخ کے درمیان قائم ۱۷ سال پرانی دوستی میں دراڑ ڈال دی۔

بی جے پی کے اندر قحط الرّجال کا یہ عالم ہے کہ گجرات سے باہر ناکامیوں کے خراب ریکارڈ کے باوجود کرناٹک شاخ نے نریندر مودی کو سات دن کیلئے ریاست میں آکر پندرہ عوامی جلسوں سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔اس لئے کہ ۲۰۰۸ء کے اسمبلی انتخابات کے دوران مودی نے پانچ دنوں کا اور ۲۰۰۹ء کے پارلیمانی انتخاب میں تین دنوں کا دورہ کیا تھا۔اس بار پریشان حال بی جے پی کو مودی

کی ضرورت سب سے زیادہ تھی لیکن مودی ڈر گیا اور اس نے کہا کہ وہ صرف ایک دن کیلئے بنگلورو میں آکر ایک میٹنگ سے خطاب کرے گا۔ بنگلورو دراصل بی جے پی کا گڑھ سمجھا جاتا ہے اس لئے مودی کا خیال تھا کہ یہاں کامیابی یقینی ہے اور اس کا کریڈٹ بٹور لیا جائے لیکن مقامی رہنماؤں نے اسے تین میٹنگ کیلئے راضی کرلیااور بنگلورو کے علاوہ منگلور اور بیلگام جانے کا فیصلہ کیا اس لئے کیا گیا کہ ان علاقوں میں بھی بی جے پی کافی مضبوط سمجھی جاتی تھی لیکن وائے افسوس کہ اس بار ان علاقوں کی ۷۳ حلقۂ انتخاب میں بی جے پی کو کراری شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔

نریندر مودی کی پارلیمانی بورڈ میں شمولیت کو ذرائع ابلاغ نے خوب اچھالا تھا لیکن کرناٹک انتخاب کے بعد میڈیا سے روپوش مودی نے انتخابی نتائج کا جائزہ لینے والی میٹنگ سے بھی راہِ فرار اختیار کیا۔ اس سے قبل جب کرناٹک کے امیدواروں کا تعین کرنے کیلئے پارلیمانی بورڈ کی میٹنگ ہوئی تھی اس وقت بھی مودی نے شرکت نہیں کی تھی اور اس کی عدم شرکت کا جواز اس طرح پیش کیا گیا کہ کرناٹک کی سیاست سے چونکہ مودی کا کوئی تعلق نہیں اس لئے وہ کیوں جائے؟ اگر یہ بات ہے کہ مودی صرف گجرات کے مسائل میں دلچسپی ہے تو اس کو وزیر اعظم بنانے کا خواب دیکھنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے جبکہ لیکن ہندوستان کا جنگل راج چلانے کیلئے شیر کی ضرورت

ہوتی ہے اب چاہے وہ کتنا ہی خونخوار کیوں نہ ہو۔
نریندر مودی کو اس دوران یکے بعد دیگرے کئی جھٹکے لگے۔ گجرات کی عزت و فخر کے اس جعلی دعویدار کو سپریم کورٹ نے حکم دیا کہ وہ گیر جنگل کے شیروں کو مدھیہ پردیش بھیج دے۔ سوراشٹر کے لوگوں نے اسے اپنی بے عزتی قرار دیا اور کچھ منچلوں نے اس کے خلاف خودسوزی کا اعلان تک کر دیا۔ اس کے بعد بہار کے شیر نتیش کمار نے دہلی میں آکر دھمکی دی کہ اگر مودی کو وزیر اعظم کا امیدوار بنایا جاتا ہے تو وہ متحدہ قومی محاذ سے الگ ہو جائیں گے۔ اور آخر میں ریاستی خفیہ ایجنسی کی رپورٹ اور پولس کنٹرول روم کے گجرات فساد کے دوران کئے جانے والے پیغامات کے شواہد ذرائع ابلاغ میں آگئے۔ اس بنیاد پر احسان جعفری کی بیوہ ذکیہ جعفری نے مودی کو بے قصور ٹھہرائے جانے والے عدالتِ عالیہ کے فیصلے پر نظرِ ثانی کی درخواست داخل کر دی۔ نریندر مودی نے اس بدنامی کی جانب سے توجہ ہٹانے کی خاطر مایا کندنانی اور بابو بجرنگی کی عمر قید کو سزائے موت میں بدلنے کی ایس آئی ٹی کی سفارش پر صاد کہہ دیا۔ جس نے سنگھ پریوار کے چیتوں کو مودی کے پیچھے لگا دیا۔ مودی کا یہ اقدام اڈوانی کے ذریعہ قائدِ اعظم جناح کی تعریف کرنے جیسا ہے کہ جس تھالی میں کھاؤ اسی میں سوراخ کرو۔

کرناٹک انتخاب کا سب سے گھناؤنا پہلو مہم کے دوران ہونے والا بم دھماکہ تھا۔ سب سے پہلے ذرائع ابلاغ میں یہ خبر آئی چونکہ انتخاب کے باعث بی جے پی دفتر میں چھل پہل تھی اس لئے یہ دھماکہ کیا گیا یہ نہایت گمراہ کن اندیشہ تھا۔ جس دن یہ دھماکہ ہوا کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو ٹکٹ ملنا تھا مل چکا اب اسے پارٹی دفتر کے بجائے حلقۂ انتخاب میں کام کرنا ہے اور جسے نہیں ملا ہے اسے کسی اور دفتر کے دروازے پر دستک دینی ہے۔ اس لئے اس کا نشانہ بی جے پی کے دفتر میں آنے والے امیدوار تھے یہ سراسر بے بنیاد قیاس آرائی تھی لیکن اس میں شک نہیں کے یہ سیاسی دھماکہ تھا۔ اس پر سب سے پہلا ردعمل ڈاکٹر شکیل کی جانب سے سامنے آیا کہ دھماکے کا فائدہ کا فائدہ بی جے پی کو ہوگا۔ کانگریس کے مرکزی ترجمان نے اس سے اپنے آپ کو الگ کیا اور کہا جانچ ہوگی۔

بنگلورو میں بیٹھے کانگریسی رہنما سیدھا رمیا اس کا سیدھا الزام سنگھ پریوار پر لگایا کہ سیاسی مقاصد کیلئے دھماکہ ہے۔ میسور کے کانگریسی رکنِ پارلیمان وشوناتھ نے کہا کہ اس طرح کے دھماکے کرنا آر ایس ایس کی تاریخ ہے اور اس سے پہلے وہ لوگ مالیگاؤں میں دھماکے کر چکے ہیں۔ جنتا دل ایس کے رہنما کمار سوامی اور سی پی ایم نے دھماکے کا مقصد بی جے پی کے ذریعہ ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش قرار دیا۔ بی جے پی کے مرکزی رہنما اور دانشور بلبیر پونج

نے کہا کاش یہ ایک حادثہ ہو۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ دہشت گردی نہ ہو اس میں کوئی سیاسی کارکن ملوث نہ ہو۔ بلبیر پونج کو کن سیاسی کارکنان سے ہمدردی ہے جن کیلئے وہ دعا کرتے ہیں یہ سب جانتے ہیں۔ اس بیان سے بھی شک کی سوئی گھوم کے زعفرانی دہشت گردوں کی جانب مڑ جاتی ہے۔

سیاسی رہنماؤں کے اس اتفاق رائے کے باوجود وزارتِ داخلہ نے کہہ دیا کہ ان دھماکوں پر انڈین مجاہدین کی مہر ثبت ہے حالانکہ ہندو دہشت گردوں نے سائیکل اور اسکوٹر کا استعمال مالیگاؤں سے لے کر موڈاسا تک کئی شہروں میں بارہا کیا گوا میں ان کے کارکن اپنے ہی اسکوٹر کے دھماکے کا شکار بھی ہوئے۔ اس سے قبل ۲۰۱۱ء میں گوہاٹی کے اندر بی جے پی دفتر کے باہر جو دھماکہ ہوا تھا اس میں مسلمانوں کو نہیں بلکہ اُلفا کے پریش بروا گروہ کو ملوث پایا گیا تھا۔ اس کے باوجود خفیہ اداروں کو ان دھماکوں کے پیچھے صرف اور صرف مسلمان نظر آئے۔ اسکوٹر کی تلاش میں جو لوگ تمل ناڈو پہنچے تو پتہ چلا اس کا بیچنے والا، خریدنے والا اور دلال سب کے سب ہندو ہیں اس کے باوجود ایک مددگار مسلمان تلاش کر لیا گیا۔ ایک شخص جسے کوئمبتور دھماکے میں عدالت نے بے گناہ پا کر رہا کر دیا ہے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ ایک اور گروہ کیرالا پہنچ گیا اس کو وہاں بھی صرف مسلمانوں پر شک ہوا اور ان کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ این آئی اے والے دہلی سے دربھنگہ اور سمستی پور جا پہنچے اور وہاں سے مسلمان

نوجوانوں کو گرفتار کرلیا۔ ان خفیہ اداروں کے درمیان تمامتر اختلاف کے باوجود مسلمانوں کوہدف بنانے پر مکمل اتفاق تھا۔ آخر کوئی ان سے پوچھے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے ایک دھماکے ملزم مختلف ریاستوں میں موجود ہوں اوران کاآپس میں کوئی تعلق نہ ہو؟ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں ہے اسی لئے مختلف تفتیشی ادارے اوٹ پٹانگ کارروائی کے ذریعہ مسلم نوجوانوں کی زندگی سے کھلواڑ کرکے اپنی اپنا قد بڑھارہے ہیں ۔ انسانی نقطۂ نظر سے مودی اور کانگریس کے آنے جانے سے زیادہ اہم یہ مسئلہ ہے۔ انتخابی تماشہ اس ظلم وزیادتی کوفروغ تو دیتا ہے لیکن اس پر قدغن لگانے میں بری طرح ناکام ہے اس لئے کہ بقول شاعر ؎

سفینۂ عہد نو پہ چھایا ہوا ہے بہروپیوں کا لشکر
یہاں سبھی ناخدا نما ہیں مگر کوئی ناخدا نہیں ہے

افغانستان: مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ

اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے کہ غیور افغانیوں کا نام نہاد صدر ہندوستان سے فوجی مدد طلب کر رہا ہے۔ حامد کرزئی اس جری قوم کا بے ننگ و عار سربراہ ہے جس نے اپنی بہادری اور دلیری سے تاریخ کے اوراق پر انمٹ نشان چھوڑے ہیں۔ صدیوں پہلے ابرہیم لودھی کے اقتدار خلاف جب راجپوت بے دست و پا ہو گئے تو انہوں نے ایک افغانی شہزادے ظہیرالدین بابر سے امداد طلب کی تھی۔ بابر نے سرزمینِ ہند فتح کرکے سونے کی چڑیا بنا دیا۔ ایک ایسی وسیع و عریض مغلیہ سلطنت قائم کی جس کا خواب بھی ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں کوئی مہاراجہ یا سمراٹ نہیں دیکھ سکا تھا۔ پانی پت کی آخری جنگ میں بھی مراٹھوں کو شکست فاش سے دوچار کرنے کا سہرہ بھی ایک اور افغانی بادشاہ احمد شاہ ابدالی کے سر ہے۔

برطانیہ کے یونین جیک جب بشمول ہندوستان ساری دنیا پر لہرا رہا تھا تو اس وقت افغانیوں نے اس کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ سوویت یونین جس نے ویتنام کے جیالوں کی مدد سے امریکیوں کو ذلیل و رسوا کرکے مار بھگایا تھا اسے بھی افغانی مجاہدین نے سر پر پیر رکھ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ بیسویں صدی کے اواخر میں جس عالمی استماریت کا خواب بن رہا تھا اسے بھی

افغانیوں نے چکنا چور کردیا۔ ناٹو کی متحدہ طاقت تیرہ سال کے طویل کشمکش کے بعد بھی جس غیر تمند قوم کا بال بیکا نہ کر سکی اس کا سربراہ اگر کسی غیر کے آگے جھولی پھیلائے تو وہ غیر تمند قوم اس پروار نہیں تو کیا پیار کرے گی بقول حفیظ میرٹھی

میں یوں رہزن کے بدلے پاسباں پر دار کرتا ہوں
مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ

سچ تو یہ ہے کہ حامد کرزئی نے جانے سے قبل ازخود اپنے آپ کو رہبر کے بجائے رہزن ثابت کردیا ہے۔ جس ملک کے آگے کرزئی نے اپنا ہاتھ پھیلایا ہے اس کی فوجی صلاحیت کا راز گزشتہ ماہ اس وقت طشت ازبام ہوگیا جب ۱۵ اپریل ۲۰۱۳ء کو پچاس چینی فوجیوں نے ہندوستانی سرحد کے اندر دراندازی کرکے دولت بیگ اولڈی میں اپنی چوکی قائم کردی۔ اس کے جواب میں مزحمت یا احتجاج کے بجائے فلیگ میٹنگس پر اکتفا کیا گیا۔ ۳۰ اپریل تک یکے بعد دیگرے تین مرتبہ ناکامی ہوئی اس کے باوجود وزیراعظم منموہن سنگھ نے اسے ایک مقامی مسئلہ قرار دے کر نظر انداز کردیا اور وزیر خارجہ سلمان خورشید کے چینی دورے کی تیاریاں جاری رہیں۔ اس بیچ ہندوستان نے پانچ کلومیٹر چین کی سرحد کے اندر ایک چوکی قائم کی۔ ۴ مئی کی فلیگ میٹنگ میں چینیوں نے بلا شرط اسے ہٹانے کا مطالبہ کیا اور اس کے بعد ۱۵ اپریل کی اپنی پرانی پوزیشن پر واپس چلے گئے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی دیش بھکت پارٹی بی جے پی نے پارلیمان میں اس نازک معاملے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا بلکہ بدعنوانی کے معاملے میں وزیر اعظم سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتی رہی لیکن سابق وزیر دفاع ملائم سنگھ نے سلمان خورشید کے دورے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کی روش بزدلانہ ہے۔ چین کی درندازی ہندوستان پر حملہ ہے اور جنگ کا خطرہ مول لے کر بھی اس کا جواب دیا جانا چاہئے۔ ملائم سنگھ نے کہا چین ہندوستان کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ میں گزشتہ ۸ سالوں سے انتباہ کررہا ہوں کہ چین ہماری سرحدوں پر قبضہ کئے جارہا ہے لیکن حکومت اس کی جانب توجہ نہیں دیتی۔ ملائم سنگھ یادو کا یہ دعویٰ کسی دیوانے کی بڑ نہیں ہے اس لئے کہ سرکاری اعدادوشمار کے مطابق چین کی جانب سے ہر سال اس طرح کی دو سو سے زیادہ دراندازیاں ہوتی ہیں۔ حکومت کی جانب سے چین کی اس حرکت کو حدود سے تجاوز شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وزیر خارجہ کا دورہ ملتوی نہیں ہوتا اور چینی صدر کا زوروشور سے استقبال کیا جاتا ہے۔ جس ملک نے اپنے سے زیادہ طاقتور پڑوسی کے ساتھ یہ بزدلانہ رویہ اختیار کیا ہوا ہے اس کے آگے مسلم دنیا سے منھ پھیر کر حامد کرزئی کا کر دستِ سوال دراز کرنا یہ سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ

ایسا بھی انقلاب کیا، شیخ تمہیں یہ کیا ہوا؟

رخ تو ہے سوئے بتکدہ، پشت ہے جانب حرم

صدر کرزئی کے دورے سے قبل ان کے ترجمان ایمل فیضی نے کہا کہ کرزئی ان مذاکرات میں افغانستان کے فوجی اور سلامتی اداروں کو مستحکم کرنے کے لئے بھارت سے ہر قسم کی مدد مانگیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناٹو کے چلے جانے کے بعد ہندوستان کے تعاون سے مضبوط ہونے والی فوج کس سے لڑے گی؟ غیر ملکیوں سے لڑنا تو افغانیوں سے بہتر کوئی اور نہیں جانتا ہاں خود اپنے ہی داخلی مخالفین کو ٹھکانے لگانے کیلئے یا اپنے ملک میں موجود کمزور اقلیت کو نشانہ بنانے کی تربیت اگر حامد کرزئی حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ مہارت انہیں ہندوستانی انتظامیہ سے ضرور مل جائیگی۔ بھارت میں افغانستان کے سفیر نے کہا کہ افغانستان کو لڑائی میں سامان اور ہتھیاروں کے لئے بھارت کی مدد درکار ہے۔ شاید انہیں نہیں معلوم کہ بھارت خود ہر سال کروڑوں ڈالر کا اسلحہ برآمد کرتا ہے۔ جو ملک خود اپنی ضرورت کیلئے خود کفیل نہ ہو اس سے اسلحہ خریدنا چہ معنی دارد؟

ایسا لگتا ہے کہ بھارت سے ہر طرح کی مدد مانگنے والے حامد کرزئی تین ماہ قبل ۱۷ فروری کا اپنا بیان بھول گئے جبکہ انہوں نے ایک ایسا حکم نامہ جاری کرنے کا عہد کیا تھا جس کے تحت افغان حفاظتی دستے شہری علاقوں میں اپنی مدد کے لیے 'بیرونی' افواج سے فضائی مدد کے لیے نہیں کہہ سکیں گے۔ انہوں نے کہا

تھا کہ افغان شہری خوش ہیں کہ ناٹو افواج ملک سے جا رہی ہیں۔ ’ ہم ان کی امداد سے ابھی تک خوش ہیں لیکن ہمیں اپنے دفاع کے لیے بیرونی ممالک کی افواج کی ضرورت نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ افغانستان کی افواج اپنے ملک کا دفاع کریں۔‘ افغان صدر نے کہا تھا کہ افغانستان کی سکیورٹی فورسز نے ہلمند میں ’بیرونی‘ افواج سے فضائی مدد کا تقاضا کیا تھا۔ ’اگر یہ سچ ہے تو بہت ہی افسوناک اور شرمناک ہے۔ وہ کیسے اپنے گھروں پر بم برسانے کے لیے غیر ملکیوں سے مدد مانگ سکتے ہیں۔ اگر حفاظتی دستوں کا اس طرح کی مدد طلب کرنا غلط ہے تو سربراہِ مملکت کا یہی کرنا کیسے حق بجانب ہو سکتا ہے ؟ حامد کرزئی جیسے رہنما اس امر بیل کی طرح ہوتے ہیں جس کی اپنی جڑیں زمین میں نہیں ہوتیں بلکہ وہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی تناور درخت سے لپٹ کر پنپتی ہیں ۔ عرصہَ دراز تک وہ امریکہ بہادر کے سہارے افغانستان پر مسلط رہے اور جی بھر کے اپنی قوم کا استحصال کیا۔ اپنی عوام کے خلاف وہ دشمن کے دست بازو بنے رہے لیکن جب ناٹو ممالک اس جنگ سے بیزار اور مایوس ہو گئے تو انھوں نے ایک ایک کر کے امریکہ کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ امریکہ کا داخلی معاشی دباؤ بھی اس کے پیروں کی زنجیر بن گیا اور اس نے بے آبرو ہو کر افغانستان سے نکل بھاگنے کا ارادہ کیا۔ کرزئی نے پہلے تو امریکہ کو روکنے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ امریکہ کسی صورت رکنے کیلئے تیار نہیں بلکہ وہ جلد از جلد

دامن چھڑا کر نکل جانا چاہتا ہے تو حامد کرزئی کو ایک نئے سہارے کی ضرورت پیش آئی۔
اس صورتحال وہ اس خوش گمانی کا شکار ہیں کہ ہندوستان امریکہ کا نعم البدل ثابت
ہوجائیگا اور وہ اس کے بھروسے کچھ اور دن وہ اقتدار سے چپکے رہ سکیں گے۔
حامد کرزئی فی الحال اپنے سابقہ محسن امریکہ سے خاصے ناراض چل رہے ہیں۔ گزشتہ
دنوں انہوں نے افغانستان کے دورے پر آئے ہوئے امریکی وزیر دفاع چک ہیگل کے
ساتھ اپنی طے شدہ پریس کانفرنس کو منسوخ کردیا۔ایوان صدر نے پریس کانفرنس کی
منسوخی کی وجہ وقت کی قلت بتائی جبکہ امریکی حکام نے سیکوریٹی خدشات کو اس کا سبب
قرار دیا۔ یہ دونوں وجوہات خاصی مضحکہ خیز ہیں۔کیا یہ بات کسی کے وہم و گمان میں
ہوسکتی ہے کہ حامد کرزئی کے پاس ہندوستان کا دورہ کرنے کیلئے تو وقت ہو لیکن امریکی
وزیر خارجہ کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس کیلئے وقت نہ ہو۔ اسی طرح امریکہ کی ٦٥
ہزار فوج اگر اپنے وزیر خارجہ کی حفاظت نہیں کرسکتی تو اسے سرزمین افغانستان پر رہنے
کا کیا حق ہے؟ اس اخباری کانفرنس کی منسوخی کی بنیادی وجہ امریکہ اور طالبان کے
درمیان ہونے والی گفت و شنید سے ناراضگی کا اظہار تھا۔
چک ہیگل کے دورے سے قبل کابل اور خوست میں ہونے والے دو حملوں میں انیس

افغانی ہلاک ہوئے واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے حامد کرزئی نے اپنے دل کی بات کہہ دی انھوں نے قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا امریکہ اور طالبان دونوں افغانستان کے عوام کو یہ باور کرانے کی کوششوں میں لگے ہیں کہ دوہزار چودہ کے بعد وہاں کے حالات مزید خراب ہونگے۔ گزشتہ روز طالبان کے نام پر ہونے والے بم دھماکے غیر ملکیوں کے مفاد میں تھے اور افغانستان میں ان کے مزید قیام کے حق میں تھے جو کہ ہمیں دھمکا کرانہیں افغانستان میں روکنے کے لیے کیے گئے تھے۔ اس بیان میں اول تو دھماکوں کے الزام سے طالبان کو بلاواسطہ یہ کہہ کر بری کردیا گیا کہ طالبان کے نام ہونے والا حملہ گویا کوئی اور اس کام کو کررہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ طالبان کسی صورت امریکہ کا ناپاک وجود اپنی سرزمین پر برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور امریکہ کسی صورت وہاں رکنا نہیں چاہتا اس لئے ان دونوں کو دھماکوں کیلئے موردِ الزام ٹھہرانا حیرت انگیز تھا۔ اسی لئے اس احمقانہ بیان پر امریکی اور ناٹو افواج کے کمانڈر جنرل جوزف ڈنفورڈ نے کہا: 'ہم لوگوں نے گزشتہ بارہ سال کے دوران بڑی جانفشانی سے جنگ کی ہے، ہم لوگوں نے گزشتہ بارہ سالوں میں کافی خون بہایا ہے۔ کیا یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ تشدد اور عدم استحکام ہمارے مفاد میں ہوگا۔

سوال یہ کہ اگر یہ دھماکے نہ ناٹو نے کرائے اور نہ طالبان نے تو آخر وہ تیسرا فریق کون ہے جو ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

امریکی وزیر دفاع چک ہیگل نے وزارت دفاع کے عہدے پر فائز ہونے سے قبل کہا تھا کہ 'بھارت اپنے پرانے دشمن پاکستان کے خلاف افغانستان کو ایک محاذ کے طور پر استعمال کرتا ہے'۔ مبصرین کا خیال ہے کہ افغانستان صرف القاعدہ اور طالبان کے خلاف مغرب کی جنگ کا میدان نہیں ہے، بلکہ پاکستان اور بھارت کی ایک بلاواسطہ محاذآرائی کا میدان بھی ہے۔ گزشتہ برسوں میں بھارت نے افغانستان کے ساتھ کان کنی اور ترقیاتی منصوبوں کے معاہدے کیے ہیں اور اسے دو ارب ڈالر کی امداد دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ افغانستان کی ملنے والی عالمی امداد کا بہت بڑا حصہ عوام کی فلاح بہبود پر خرچ نہیں ہوتا بلکہ حکمرانوں کی اور خاص طور پر حامد کرزئی کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ حامد کرزئی کا یہ دورہ اپنی رشوت کو وصول کرنے کیلئے ہو اس لئے آئندہ سال سے اس آمدنی کا بند ہونا یقینی ہوگیا ہے۔ ایسے میں جبکہ شہید خالد مجاہد کے قبر کی مٹی ابھی نہیں سوکھی اور مسلمانانِ ہند آئے دن سرکاری مظالم کا شکار ہورہے ہیں حامد کرزئی کا حکومتِ ہند کو اپنا عظیم دوست کہنا ایسا ابن الوقتی ہے کہ اس پر حفیظ میرٹھی یہ شعر یاد آتا ہے

جب غرض باؤلی ہو تو کیا کیجیے
ایک جلّاد کو دیوتا کہہ دیا

حامد کرزئی جہاں ہندوستان کو اپنا عظیم دوست کہتے ہیں وہیں پاکستان کے جڑواں بھائی ہونے کا بھی دم بھرتے ہیں ۔ حامد کرزئی کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان رام بھکتوں کا دیس ہے ۔یہاں کا حکمراں طبقہ میں اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود رام راجیہ قائم کرنے پر صد فیصد متفق ہے۔ یہ لوگ مریادہ پرشوتم رام کو ایک مثالی بادشاہ اور دیوتا مانتے ہیں اور رامائن سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔اتفاق سے رامائن میں بھی جڑواں بھائیوں اور ان کے ایک عظیم دوست کا ذکر ملتا ہے ۔ حامد کرزئی نے سنا ہے اپنے کالج کی تعلیم ہندوستان ہی میں حاصل کی تھی اور اب تو انہیں ڈاکٹریٹ کی سند سے بھی نوازدیا گیا ہے اس لئے ممکن ہے کہ انہوں نے بھی رامائن ہی کی روشنی میں ہندوستان کو عظیم دوست اور پاکستان کو جڑواں بھائی کہا ہو۔اور ہندی حکمرانوں سے رام چندرجی جیسی دوستی کی توقع باندھے ہوئے ہوں ۔ لیکن رام جی کے ست یگ اور آج کل کے کالی یگ میں یہ فرق ہے کہ وہاں ہنومان ہوا کرتا تھا اور یہاں طالبان ہے اور مختلف پالے میں ہے۔طالبان اور ہنومان کافرق جاننا ہو تو یہ شعر دیکھئے

دل فروشوں کے لیے کوچہ و بازار بنے
اور جانبازوں کی خاطر رسن و دار بنے

رامائن کے اندر کشکندھا کے راجہ والی اوراس کے جڑواں بھائی سگریو کے ساتھ رام چندر جی کی عظیم دوستی کی داستانِ خونچکاں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب رام چندر جی اپنے بھائی لکشمن کے ساتھ بن باس کے دن گزار رہے تھے۔ان کی اہلیہ سیتا کو راون نے اغواء کرلیا تھا۔ راون ست یگ میں رام چندر جی کیلئے اسی طرح مصیبت بنا ہوا تھا جیسے آج کل چین کا سلوک ہندوستان کے ساتھ ہے۔ راون کے خلاف رام چندر جی کو ایک مددگار درکار تھا جیسے کہ رام بھکتوں کو فی الحال دوست کی ضرورت ہے۔ صحرا نوردی کے دوران رام لکشمن کی ملاقات سگریو اور اس کے دوست پون پتر ہنومان سے ہو گئی ۔ سگریو کی حالت ویسی ہی تھی جیسی کہ اقتدار سے محرومی کے بعد جلد ہی حامد کرزئی کی ہونے والی ہے۔ سگریو کو اس کے بھائی والی نے معزول کرکے بھگا دیا تھا۔ اقتدار سے بے دخلی سگریو کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں تھی بلکہ وہ اسی کا مستحق تھا جیسا کہ حامد کرزئی ہے۔

کشکندھا کے اقتدار پر والی اسی طرح فائز تھا جیسے کہ طالبان کسی زمانے میں افغانستان پر حکومت کر رہے تھے ۔اس بیچ مایاوی نامی راکشش نے اس پر حملہ کردیا جیسے کہ امریکہ نے کیا۔ والی نے مایاوی کو جب دوڑانا شروع کیا تو وہ ایک زمین کی تہہ کے اندر کسی سرنگ میں گھس گیا۔ والی نے سگریو سے کہا کہ وہ سرنگ کے دہانے پر انتظار کرے اور خود مایاوی کا پیچھا کرتے ہوئے زمین کے

اندر گہرے پاتال میں اتر گیا۔ کچھ دیر بعد سگریو نے دیکھا کہ سرنگ کے اندر سے خون کی پھوار باہر آرہی ہے۔ اس موقع پر سگریو کا رویہ عین کرزئی جیسا تھا۔ اس نے فوراً قیاس کر لیا کہ یہ اس کے بھائی والی کا لہو ہے جسے مایاوی نے ہلاک کر دیا ہے۔ اب اسے چاہئے تھا کہ وہ اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کیلئے اندر کا رخ کرتا لیکن ایسا کرنے کے بجائے وہ شاداں و فرحاں دارالخلافہ لوٹ آیا اور اقتدار کا مالک بن بیٹھا۔

رامائن کے مطابق حقیقت وہ نہیں تھی جو کرزئی نما سگریو سمجھ رہا تھا۔ دراصل تورہ بورہ کی جنگ میں اس کے بھائی طالبان نے امریکہ کو شکست فاش سے دوچار کر دیا تھا۔ جب والی باہر آیا اس نے دیکھا سگریو بادشاہ بنا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر والی حیرت زدہ رہ گیا۔ سگریو کو چاہئے تھا کہ اقتدار پر قابض ہونے سے قبل کم از کم اس بات کی تصدیق کرتا کہ کس کی جیت ہوئی اور کون ہار گیا لیکن اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ سگریو کی دوسری غلطی یہ تھی کہ اس نے والی کے بیٹے اور سلطنت کے جائز حقدار انگد کو تخت نشین کرنے کے بجائے خود اپنے سر پر تاج سجا لیا تھا۔ والی نے جب سگریو کو اقتدار سے بے دخل کر دیا تو سگریو معافی مانگنے کے بجائے دشمنی پر تل گیا۔

اس پس منظر میں سگریو اور ہنومان کی ملاقات رام اور لکشمن سے ہوتی۔ یہ ایک

ایسا وقت تھا جبکہ دونوں کو اپنے اپنے مقاصد کے تحت دوست کی ضرورت تھی ۔ ایک اقتدار پر دوبارہ قبضہ کرنا تھا اور دوسرے کوراون سے بدلہ لینا تھا۔ دوستوں کے درمیان مفاہمت ہو گئی رام چندر جی نے سگریو کا اقتدار بحال کرنے کی سازش رچی اور سگریو نے اپنی فوج کے ذریعہ لنکا پر حملہ ہونے کا یقین دلایا۔ اس معاہدے کے بعد والی اور سگریو کے درمیان کشتی کا انعقاد عمل میں آیا۔ دونوں جڑواں بھائی ایک دوسرے سے بے حد مشابہ تھے اس لئے سگریو کو اکھاڑے میں پھولوں کی مالا پہننے کا مشورہ دیا گیا۔ رام چندر جی تو بہترین تیرانداز تھے ہی انہوں نے پیڑ کے پیچھے چھپ کر دھوکے سے والی پر تیر چلا کر اسے ہلاک کردیا۔ سگریو کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ رامچندر جی کو ہنومان سپہ سالار کی حیثیت سے مل گیا اور اس کے ساتھ وانر سینا بھی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ہند افغان عظیم دوستی کل یگ میں رامائن کی تاریخ دوہرانا چاہتی ہے۔ پھر ایک بار جڑواں بھائیوں کے درمیان میدان کارزار گرم کرنے کی سازش رچی جارہی ۔ درخت کے پس پردہ تیر پھر ایک مرتبہ کمان میں سجایا جارہا ہے۔ حقدار کے مقابلے باطل پرست کی پشت پناہی کی جارہی ہے تاکہ اسے اپنے دشمن کے خلاف اسے آلۂ کار بنایا جاسکے۔ افغانستان اور ہندوستان کے درمیان پیدا ہونے والی حالیہ رفاقت اور رامائن کے ان واقعات میں کمال مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن کیا کل یگ میں بھی ست یگ کی کہانی دوہرائی جاسکے گی ؟ اس سوال کا جواب وہ تمام لوگ جانتے ہیں جو افغانی مجاہدین کی تاریخ سے واقف ہیں جن

ہے کے شعارِ زندگی کی ترجمانی مندرجہ ذیل شعر کرتا ہے

بدتر ہے موت سے بھی غلامی کی زندگی
مر جائیو مگر یہ گوارا نہ کیجیو

حفیظ میرٹھی: یہ کون سربلند ہوا؟ دیکھتے چلیں قسط اول

تاریخ کی کتابوں میں اکثر حکمرانوں کے قصے اور جنگ و جدال کی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہے۔ واقعات و سانحاتِ زمانہ موَرخ بیان تو کرتا ہے لیکن کچھ اس طرح کہ بقول حفیظ میرٹھی۔

مورخ ! تیری رنگ آمیزیاں تو خوب ہیں لیکن
کہیں تاریخ ہو جائے نہ افسانوں سے وابستہ

اس لئے اگر آپ کسی دور کے عوامی مسائل کا حقیقی ادراک کرنا چاہتے ہوں تو اس عہد کو شاعر کی نظر سے دیکھیں۔ اس کے دیوان میں آپ کو انسانی جذبات و احساسات کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر نظر آئیگا۔ بھیگی پلکوں کا منظر نظر آئیگا۔ گھر نظر آئیگا در نظر آئیگا۔ پھول کانٹوں کا آنگن نظر آئیگا۔ رنج و فرحت کا گلشن نظر آئیگا۔ یہ سب کیسے ہوگا اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو حفیظ میرٹھی کا یہ شعر دیکھیں۔

کبھی قفس سا کبھی آشیاں سا لگتا ہے
یہ میرا گھر مجھے ہندوستاں سا لگتا ہے

یہاں بات اشارے کنائے میں کہی گئی ہے لیکن آگے چل کر حفیظ میرٹھی یہ بھی بتلاتے ہیں کہ ہمارے قفس میں بسمل کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔جب وہ کہتے ہیں کہ

بے سہاروں کا انتظام کرو
یعنی اک اور قتلِ عام کرو

تو ہمیں عصرِ حاضر کا ایک اور منظر دکھائی دیتا ہے لیکن جب ہم ان کی زبانی یہ شعر سنتے ہیں کہ

حصارِ جبر میں زندہ بدن جلائے گئے
کسی نے دم نہیں مارا مگر دھواں بولا

تو ایسا لگتا ہے کہ گویا کوئی دلیر اور درد مند شاعر نہایت دل نشیں انداز میں اپنے دور کی عکاسی کر رہا ہے۔ حفیظ کے دل پذیر اندازِ سخن کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو

روشنی کب تھی اتنی مرے شہر میں
جل رہے ہیں مکاں مشعلوں کی طرح

داد دیجے کہ ہم جی رہے ہیں وہاں
ہیں محافظ جہاں قاتلوں کی طرح

ان دونوں اشعار میں موجود تمام تر کرب والم کے باوجود اس قدر شیرینی و نغمگی ہے کہ قاری جب انہیں تنہائی میں بھی پڑھتا ہے تو بے ساختہ ترنم میں گنگنانے لگتا ہے ۔ یہی حفیظ میرٹھی کا سب سے بڑا وصف ہے کہ ان کے اشعار کا مضمون ، اس کی گہرائی اور گیرائی شوخیٔ گفتار پر بار نہیں بنتی ۔ ان کا رنج و غم نہ شعر کو بوجھل کرتا ہے اور نہ مخاطب کو حزن و یاس کا شکار کرتا ہے ۔ حفیظ میرٹھی کے یہاں ظلم کی منظر کشی ضرور ہے لیکن اس پر نالہ وفریاد نہیں ہے ان دو اشعار کا بانکپن دیکھیں ۔

عجیب لوگ ہیں کیا خوب منصفی کی ہے
ہمارے قتل کو کہتے ہیں خود کشی کی ہے
یہ بانکپن ہے ہمارا کہ ظلم پر ہم نے
بجائے نالہ وفریاد شاعری کی ہے

حفیظ میرٹھی نے حالات کی مرثیہ خوانی کیوں نہیں کی ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندرون میں رجائیت کا ایک دریا موجزن تھا ۔ امید وبیم کی ایک شمع ان کے اپنے قلب میں روشن تھی ۔ جس نے اس سے یہ کہلوایا کہ ۔

آج کی بد حال دنیا کے بھی دن پھر جائیں گے
اے مورخ ہم اگر تاریخ دہرانے اٹھے

حفیظ میرٹھی کی رجائیت پسندی حقیقت شناس ہے۔ وہ احمقوں کی جنت میں شاعری نہیں کرتے بلکہ انقلابِ زمانہ کے مختلف مراحل سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔ موسمِ بہار سے قبل قفس کی وادیوں کی سیر کو لازم سمجھتے ہیں۔ اور اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں ؎

آئے گا پھر چمن پہ تصرت کا وقت بھی
پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

اردو ادب کی تاریخ میں ایسے واقعات بھی نظر آتے ہیں کہ قیدوبند کے مرحلے میں مشائخ شعراء نے سرزمینِ آزمائش کو خیر باد کہہ کر دور نکل جانے میں عافیت سمجھی اور پردیس میں جاکر دلیری کے نغمے گائے۔ حفیظ میرٹھی کو اس کا خاہل تک نہ گزرا۔ انہوں نے میدانِ کارزار سے فرار کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے قیدوبند کی صعوبتوں کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اور بے نیازی سے فرمایا ؎

دب کے رہنا ہمیں نہیں منظور
ظالمو جاؤ اپنا کام کرو

ایمرجنسی کے زمانے میں اندراجی کے طفیل حفیظ جیل گئے لیکن دل شکستہ نہیں

ہوئے بلکہ اس ماحول کی ترجمانی اس طرح کی۔

آج کچھ ایسا طے پایا ہے حق کے اجارہ داروں میں
جو ہم پر ایمان نہ لائے چنوادو دیواروں میں
ہر ظالم سے ٹکّر لی ہے سچے فنکاروں نے حفیظ
''ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہہ دیں ''ہم ہیں تابعداروں میں

اسی عزم و حوصلہ نے ستمگروں کے غرور کو پاش پاش کرڈالا اور جب زمانے نے ایک اور کروٹ لی تو شاعریوں گویا ہوا۔

بڑے ادب سے غرورِ ستمگراں بولا.
جب انقلاب کے لہجے میں بے زباں بولا

آزمائش کے اس کٹھن گھڑی میں حفیظ صاحب کا اکلوتا بیٹا داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر داغِ مفارقت دے گیا لیکن اس کے باوجود ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی۔ وہ صبر وسکون کا پیکر بنے مشیت کے ہر فیصلے سے راضی.برضا رہے۔اس حادثے کو حفیظ نے اپنی شاعری میں پیش بھی کیا تو کچھ ایسے کہ گویا فرمانِ رسول اکرم ﷺ ''غم میرا رفیق ہے''کے ترجمان بن گئے۔ غم واندوہ پر صبر تو ہر کوئی کرلیتا ہے لیکن شکر کرنے والے کم ہوتے ہیں۔

غم بھی اک احسان ہے اس کا، شرن کر اے دل شکوہ کیا؟

غم تو ہماری روح رواں ہے، ہم نہیں غم کے ماروں میں

حفیظ میرٹھی کی ذاتی زندگی میں رنج والم کے گہرے بادل پھر ایک اس وقت چھا گئے جب ان کی سبکدوشی کے فوراً بعد ان کی اہلیہ محترمہ کو ایک قریبی رشتہ دار نے قتل کر دیا ۔ اس صدمۂ جانکاہ کو بھی حفیظ اک شانِ بے نیازی سے سہتے ہوئے ایک ایسا شعر کہہ گئے کہ جو بیک وقت ان کے بیٹے، زوجہ اوران کی اپنی موت پر صادق آتا ہے ۔

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی

میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

اس شعر کے اندر شاعر کا سکون و چین اس کے قارئین کو خون کے آنسو رلاتا ہے ۔ حفیظ میرٹھی ایک عظیم فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے آپ کی طرح ایک انسان تھے ۔ ان کے اپنے احساسات وجذبات تھے جس کا اعتراف انہوں نے کچھ اس طرح کیا کہ ۔

کھوئے کھوئے حفیظؔ پائے گئے

امتحاں پھر ہے امتحاں لوگو

حفیظ صاحب نے اپنی ذاتی زندگی کے واقعات میں اپنے قارئین کو براہِ راست

شریک کرنے سے گریز کیا اور نہایت شگفتہ مزاجی کے ساتھ شعر و سخن کی خدمت میں لگے رہے۔انہوں نے ایسا اس لئے کیا کہ وہ لوازمِ انجمن سے وہ بخوبی واقف تھے اسی لئے فرمایا۔

ادا سیوں کو حفیظ ! آپ اپنے گھر رکھیں
کہ انجمن کو ضرورت شگفتگی کی ہے

یہ ایک مشکل کام ہے کہ فنکار اپنے داخلی احساسات کے اظہار سے اپنے آپ کو روک سکے لیکن حفیظ میرٹھی نے اندر پایا جانے والا تعمیرِ حیات کا بے پایاں حوصلہ ان کے کام آیا اور وہ اپنے رب کے سہارے اس آگ کے دریا سے پار نکل گئے۔ان کا مندرجہ ذیل دعائیہ شعر اس کیفیت کا غماز ہے۔

اب بھی یہ حوصلہ ہے کسی کام آسکوں
میں ٹوٹ تو گیا ہوں بکھرنے نہ دے مجھے

حفیظ صاحب نے ایک پر وقار قناعت پسندانہ زندگی بسر کی پہلے انہوں نے کلکٹریٹ میں ملازمت کی اور اس کے بعد فیضِ عام انٹر کالج سے وابستہ ہو گئے۔ جاہ و حشمت کی خواہش و طلب سے بے نیاز کسمپرسی کے عالم میں ممکن ہے کسی نے انہیں یہ مشورہ دیا ہو کہ

تم بھی دربار میں حاضری دو حفیظؔ

پھر رہے ہو کہاں مفلسوں کی طرح

حفیظ میرٹھی کی غیرت کو یہ گوارہ نہ تھا کہ وہ ازخود اس سمت کوئی پیش رفت کرتے مگر ان کی قلندرانہ زندگی میں بی جے پی کی فسطائی حکومت اس وقت ایک نئی آزمائش لے کر وارد ہوئی جب ریاستی وزیرِاعلیٰ کلیان سنگھ نے ان کی تعظیم و تکریم کا اعلان کردیا۔ ایک باضمیر مسلمان کیلئے بابری مسجد کو شہید کرنے والوں کے دستِ نامبارک سے انعام و اکرام، فخر وسعادت نہیں بلکہ باعثِ ننگ و عار تھا اس لئے اپنی منفرد شانِ بے نیازی کے ساتھ انہوں نے اس پیشکش کو ٹھکرادیا۔ اس لئے کہ بقول حفیظ صاحب

کروفر کی زندگی پر موت کو ترجیح دی

مجھ کو درباری قباؤں سے کفن اچھا لگا

شاعری اک در بھی ہے درد کا پیغام بھی

یہ تڑپنے اور تڑپانے کا فن اچھا لگا

حفیظ صاحب اقتدار کے حاشیہ بردار نہیں بلکہ تڑپنے اور تڑپانے والے فنکار تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے بڑے بڑے شعراء کہ جنھوں نے فسطائیت اور فرقہ پرستی کے خلاف شاعری کرکے خوب داد و شہرت حاصل کی تھی جب زعفرانی حکومت کی جانب سے پچکار کر بلائے گئے تو وہ دادِ عیش کے حصول کی خاطر سرکار دربار میں

بسر و چشم حاضر ہو گئے لیکن حفیظ صاحب جیسے لوگ اس فتنے سے اپنے آپ کو کیونکر محفوظ رکھ سکے ؟ اس سوال کا جواب ہے مقصدِ زندگی کا شعور اور اس سے بے پایاں عشق ۔ جس نے آسائشِ دنیا کو ان کی نگاہِ بلند میں بے وقعت کر کے رکھ دیا تھا اسی لئے فرماتے ہیں ۔

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیاں و گلستاں
آدمی ہوں عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

جہاں نو کی تعمیر کا عزم کرنے والے حوصلہ مند لوگ اپنے سفر کی ابتداء مشاہدے اور جائزے سے کرتے ہیں لیکن ان کی نظر اعداد و شمار یا اخبار تک محدود نہیں ہوتی ۔ وہ ترقی و ارتقاء کو صرف مادیت کے پیمانے میں نہیں تولتے بلکہ بہت جلد تہذیب و تمدن ، اخلاق و عادات اور انسانی اقدار کی شکست و ریخت ان کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور وہ کہتے ہیں ۔

تہذیبِ نو کے عہد میں انسانیت کے ساتھ
انساں نے کیا سلوک کیا ؟ دیکھتے چلیں

انسانی مشاہدہ سطحی بھی ہوتا ہے اور اس میں گہرائی و گیرائی بھی پائی جاتی ہے ۔ اول الذکر صرف ظاہر بینی تک محدود رہتا ہے اور یہ پتہ لگاتا ہے کہ ہمارے اطراف کیا کچھ رونما ہو رہا ہے لیکن اس کی رسائی پس منظر میں کارفرما

اسباب و علل تک نہیں ہوتی۔ حفیظ میرٹھی دورِ حاضر کے سطح بین سخنوروں سے اک گو نا شکایت رہی جس کا اعتراف انہوں نے اس طرح کیا کہ

کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی

حفیظ صاحب اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ گردشِ ایام کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ ایک فاسد نظام کی بدولت ہی چہار جانب غمناکی و نمناکی پھیلی ہوئی ہے۔ حقیقت کی اس معرفت کے بعد وہ کہتے ہیں

ہائے یہ کیا مقام ہے، ہائے یہ کیا نظام ہے
عشق کی آستیں بھی نم، حسن کی آستیں بھی نم

عشق و حسن کی آستین کو نمناک دیکھنے کے بعد حفیظ میرٹھی جیسے شاعر اس کے خلاف الم بغاوت بلند کرنے سے نہیں چوکتے۔ ان کا یہ قدم باطل کے ایوانوں میں کھلبلی مچا دیتا ہے۔ ظلمت کے پرستار سمجھ جاتے ہیں کہ اب ان کی عافیت صرف اور صرف راہِ فرار میں ہے۔ اس موقع پر حفیظ میرٹھی یہ مژدہ سناتے ہیں

طلسم ٹوٹ رہا ہے نظامِ باطل کا
اجالے آئے اندھیرے فرار ہوتے ہیں

کسی نظام کی تبدیلی کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ نظامِ باطل کو چیلنج کرنے کی خاطر ایک صالح اجتماعیت وہی برپا کر سکتا جو خود صاحبِ عمل ہو۔ حفیظ میرٹھی نے خود بھی تمام عمر اس کی پاسداری کی اور اپنے قول و عمل سے دوسروں کو ابھی اس کی ترغیب دیتے رہے۔ تقریر و تحریر پر کردار کی برتری کو واضح فرماتے ہوئے حفیظ میرٹھی فرماتے ہیں۔

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

اپنے آپ کو صاحب کردار ثابت کردینے کے بعد دوسروں کو بھی ظلم کے خلاف میدانِ عمل میں آنے کی دعوت حفیظ میرٹھی نے کس طرح دی اسے بھی ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

سمٹے بیٹھے ہو کیوں بزدلوں کی طرح
آؤ میدان میں غازیوں کی طرح

اس شعر میں بلواسطہ طرزِ تخاطب اختیار کیا گیا مگر حفیظ نے ایک اور شعر میں یہی بات نہایت لطیف علامت کی مدد سے ارشاد فرمائی۔ بے زبان بادباں کو شاعرنے قوت تکلم سے آراستہ کرکے گویا شعر میں جان ڈال دی۔

"تکوگے یونہی ہواؤں کا منہ بھلا کب تک ؟"

یہ ناخداؤں سے اک روز بادباں بولا

(جاری)

ترکی: ایسی ضرب لگی کہ میں تقسیم ہوگیا

دنیا بھر میں اتحاد کی علامات اور یادگاریں پائی جاتی ہیں لیکن ترکی کی سرزمین کو اپنی پیشانی پر تقسیم چوک سجانے کا اعزاز حاصل ہے۔ سلطان محمود اول نے پتھر کا ایک آبی ذخیرہ تعمیر کیا تھا جہاں شمال کی جانب سے آنے والا پانی جمع ہوتا اور پھر شہر کے مختلف حصوں میں تقسیم کردیا جاتا۔ اس طرح اس مقام کا نام تقسیم چوک پڑ گیا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے نہ جانے کیوں جمہوریت کی یادگار تعمیر کرنے کیلئے اسی مقام کا انتخاب کیا ترکی جمہوریہ کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر اس کا افتتاح کردیا۔ تقسیم چوک پر جمہوریت کی یادگار اپنے آپ میں ایک علامت ہے۔ دراصل جدید ترکی کی تعمیر اسلامی دنیا کی تقسیم کا شاخسانہ تھا۔ جس وقت دنیا بھر کے مسلمان خلافت عثمانیہ کے تحفظ کی خاطر اپنے اوپر مسلط ظالم و جابر حکمرانوں سے دست و گریباں تھے اس وقت ترک فرمانرواؤں نے خلافت کے خاتمہ کا اعلان کردیا جس کے نتیجے میں عالم اسلام کا شیرازہ اس طرح منتشر ہوا کہ اس تقسیم کے ۹۰ سال بعد بھی متحد نہ ہو سکا۔ فکری سطح پر ترکی کے اندر دین و سیاست کو دو الگ الگ خانوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا کہ اسلام پسندوں کو بھی سیکولرزم کی دہائی دینے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔خلافت کے بعد امت کا تیا پانچہ اس شعر کی مصداق

بن گیا ہے

ایسی ضرب لگی کہ میں تقسیم ہو گیا
جو کچھ جمع تھا ذات میں تفریق ہو گئی

ترکی کی نام نہاد آزادی بنام مغرب کی غلامی میں کا آغاز ہی انتہا پسندانہ جارحیت سے ہوا۔ مٹھی بھر مغرب زدہ حکمرانوں نے معاشرے سے مذہب کو بزور شمشیر نکال باہر کیا اور عوام پر لادینیت کو تھوپ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج جس طرز زندگی کی خاطر احتجاج کیا جارہا ہے وہ برضا و رغبت اختیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ ابن الوقتوں نے اسے زبردستی مسلط کیا تھا۔ تقریباً اسی سالوں تک ترکی پر سیکولر جمہوریت اور فوجی آمریت کے بزعم خود روشن خیال طبقے نے حکومت کی اور اسلام پسندوں پر ہر طرح کا ظلم و جور روا رکھا لیکن اسی کے ساتھ ان مادہ پرستوں ترکی معیشت کا جو حال کیا وہ بھی ملاحظہ فرمائیں ۔اس طویل افراتفری کے نتیجے میں ۱۹۹۴ء سے لے کر ۲۰۰۱ء کے دوران سات سالوں میں ترکی پانچ مرتبہ یکے بعد دیگرے شدید سے شدید تر معاشی بحران کا شکار ہوتا چلا گیا۔فروری ۲۰۰۱ء کے ایک دن میں ترکی کرنسی لیرا کی قوت خرید میں سو فیصد کی کمی واقع ہو گئی اس طرح وہ نصف ہو کر رہ گیا۔ایک رات کے اندر سود کی شرح میں ۷۵۰۰ فیصد کا اضافہ ہوگیا۔ چند دنوں کے اندر ملک سے ۷۰۰ کروڑ ڈالر غائب ہو گئے اور حصص بازار زمین بوس ہوگیا۔زرمبادلہ کم ترین لازمی مقدار سے

گھٹ گیا۔ مہنگائی میں اضافے کی شرح ۶۷ فیصد ہو گئی اور معاشی پیداوار نفی ۸.۵ فیصد پر پہنچ گئی۔ گویا معیشت کا پہیہ ترقی کے بجائے تنزل کی جانب گامزن ہوگیا۔ بجٹ کا خسارہ ۱۵ فیصد اور حکومتی قرضہ جات کی مقدار قومی پیداوار کے ۹۰ فیصد ہو گئی۔

لادینی جمہوریت اور فوجی آمریت کے درمیان قوم کی حالت ایسی تھی گویا ایک جانب آگ کا گھڑا ہو اور دوسری جانب گہری کھائی۔ اس نازک ترین مرحلے میں ترکی عوام نے اسلام کے دامن میں پناہ لی اور اسلام پسند تعمیر و انصاف پارٹی کے ہاتھوں میں اقتدار کی زمامِ کار سونپ دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کسی معجزے سے کم نہیں۔ ایک طرف یوروپ و امریکہ کساد بازاری کا شکار ہوئے اور دوسری جانب ان دس سالوں میں ترکی کی قومی پیداوار کی شرح میں پانچ گنا اضافہ ہوا وہ ۱۵ کروڑ ڈالر سے بڑھکر ۹۷ کروڑ ڈالر تک پہنچ گئی۔ اوسط فی کس آمدنی میں بھی ۴ گنا کا اضافہ ہوا جو ۴۰۰۰ ڈالر سالانہ سے بڑھکر ۱۱۰۰۰ ہزار تک جا پہنچی۔ مہنگائی کی شرح دس گنا گھٹ کر ۶.۵ تک آگئی اور سود کی حقیقی شرح صفر فیصد ہو گئی۔ برآمدات ۲۵۰۰ کروڑ ڈالر کے بجائے ۱۵۲۰۰ کروڑ ڈالر کو چھونے لگے۔ بیرونی سرمایہ کاری ۱۰۰ کروڑ سے ۱۴۰۰ کروڑ ہو گئی۔ فی الحال سالانہ ترقی کی شرح ۶ فیصد ہے۔ زرمبادلہ ۲۰۰۰ کروڑ سے بڑھکر ۱۲۵۰۰ کروڑ ڈالر ہو چکا ہے اور گزشتہ مئی میں سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ ترکی پر ۲۰۰۱ء میں آئی ایم ایف کا جو ۲۳۵۰ کروڑ ڈالر کا قرض تھا اس کی آخری قسط ادا کرکے

ترکی نے بین الاقوامی استعمار کے چنگل سے اپنے آپ کو آزاد کرلیا۔اس بات کی قیاس آرائی کی جارہی ہے کہ آئندہ سالوں میں ترکی کا شمار دنیا دس سب سے بڑی معاشی طاقتوں میں ہوگا۔

ترکی کے اندر برپا ہنگامہ آرائی کو اس پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ترکی کی جدید تاریخ میں تقسیم چوک پر پر تشدد مظاہرے کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔اسلام پسندوں کے اقتدار میں آنے سے بہت پہلے اسی مقام پر سیاہ اتوار ۱۶ فروری ۱۹۶۹ء کے دن بائیں بازو والے حملہ آوروں نے دائیں بازو ۱۵۰ مظاہرین کو زخمی کردیا تھا۔اسی تقسیم چوک پر یکم مئی کو مزدوروں کے دن احتجاج کرنے والے ۳۶ مظاہرین کسی نامعلوم حملہ آور کے ہاتھوں ۱۹۷۷ء میں ہلاک ہو گئے تھے۔۲۰۰۰ء میں فٹبال میچ کے دوران ۲ شائقین کو یہیں پر چھرا گھونپ کر ہلاک کردیا گیا تھا۔تعمیر و انصاف پارٹی کے دورِ اقتدار میں ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو کرد خود کش حملہ آور کے حملے میں ۱۵ پولس اہلکار اور ۱۷ شہری اس مقام پر زخمی ہوئے جس کے بعد یہاں مظاہروں پر پابندی لگا دی گئی۔

رجب طیب اروان کی سخت گیری یا خوداعتمادی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح کے ملک گیر مظاہرے ان کیلئے کوئی نئی بات نہیں ہیں۔۲۰۰۷ء میں ہونے انتخابات سے قبل بھی اسی طرح لاکھوں لوگ حکومت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے

تھے لیکن آگے چل کر یہ انکشاف ہوا کہ اس احتجاج کے پس پردہ ایرگینیکون نامی دہشت گرد گروہ کارفرما تھا۔ اس گروہ کو مفاد پرست سرمایہ داروں اور فوج کی پشت پناہی حاصل تھی۔ سیاسی مخالفین نے بھی اس احتجاج کی بھرپور حمایت کی تھی لیکن اس کے بعد نہ صرف تعمیر وانصاف پارٹی کا امیدوار صدارتی انتخاب میں کامیاب ہوا بلکہ ۲۰۰۲ء کے مقابلے اسلام پسندوں کے ووٹ کا تناسب ۳۴ فیصد سے بڑھکر ۴۷ فیصد تک پہنچ گیا ۔یہی وجہ ہے کہ اس بار حزب اختلاف نے کسی درجہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ وہ لوگ احتجاج میں شریک تو ہوئے مگر پارٹی کا پرچم لہرانے سے گریز کیا۔

ترکی کے اندر ہونے والے احتجاج کی سطحی وجہ تو تقسیم چوک باغ کے پیڑوں کی حفاظت ہے حالانکہ اس مطالبے میں کوئی خاص دم نہیں ہے۔ حکومت نے یہ بات واضح کردی ہے کہ اس نے گزشتہ چند سالوں کے اندر ۲۵ لاکھ نئے پیڑ لگائے ہیں اور اس کے بالمقابل کٹنے والے درختوں کی تعداد خاصی کم ہے لیکن کچھ لوگوں کا اعتراض ہے کہ اس سے ان پیڑوں کو کاٹنے کا جواز نہیں بنتا۔ یہ دراصل نہایت بچکانہ مطالبہ ہے۔ پیڑ کی اپنی عمر ہوتی ہے جس کے بعد وہ خود سوکھ جاتا ہے اور اس کی بھرپائی دوسرے نئے درخت لگانے سے کی جاتی ہے نیز ماحولیات کے حوالے سے یہ تسلیم شدہ طریقۂ کار ہے کہ اگر کسی پروجکٹ کے باعث پیڑ کٹتے ہیں تو ان کا متبادل دوسرے پیڑ لگا دیئے جاتے ہیں۔ اس پہلو سے منصوبے کا

مطالعہ کرنے کے بعد استنبول کی بلدیہ نے اس کو اجازت نامہ دیا ہے۔
وزیراعظم رجب طیب اردوان اگر حکمت و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے دور رکھتے اور میونسپلٹی کو مظاہرین سے نبٹنے دیتے تو شاید بات اس قدر آگے نہیں جاتی لیکن چونکہ پیڑوں کا تحفظ تو محض ایک بہانہ تھا اس لئے اس صورت میں بھی قیاس یہ ہے کہ معاملہ ضرور بگڑتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مخالفت کی جڑ درخت اور ماحولیات نہیں بلکہ افکار و نظریات ہیں جسے طرزِ زندگی کا نام دیا جارہا ہے اور یہ کہا جارہا ہے حکومت اپنے نظریہ حیات یعنی دینِ اسلام کو ہم پر تھوپ رہی ہے۔ شراب کی خرید و فروخت پر لگائی جانے والی پابندی کو اس بابت مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ حکومت نے ابھی تک شراب پر مکمل پابندی لگائی نہیں ہے بلکہ صرف اس کے خرید و فروخت کے اوقات کی تحدید کردی گئی ہے مثلاًاب رات دس بجے سے صبح چھے بجے تک شراب نہیں بکے گی۔ یا شراب کی دوکانیں عبادتگاہوں اور مدارس کے قریب نہیں ہوں گے یا شراب نابالغ لوگوں کو نہیں بیچی جائیگی اور اس پر مضر اثرات بوتل پر لکھے ہوئے ہوں گے ۔شراب پی کر گاڑی چلانے کی مقدار کم اور جرمانہ بڑھا دیا جائیگا۔ ان میں سے ایک بھی بات ایسی نہیں ہے جو یوروپ و امریکا تک میں اجنبی ہو۔ اسپین میں شراب کی دوکانیں سات بجے بند ہوجاتی ہیں اور اتوار کو اس کی فروخت پر مکمل پابندی ہوتی ہے۔ مدارس اور عبادتگاہوں کے قریب شراب کی دوکان کو

ہندوستان تک میں اچھا نہیں سمجھا جاتا اور سگریٹ کے پیکٹ پر اس کے برے اثرات جلی حروف میں لکھے ہوتے ہیں۔ تو گویا یہ بھی اصل بنیاد نہیں ہے بلکہ ایک اندیشہ ہے کہ آگے چل کر شراب پر مکمل پابندی لگ جائیگی یا محض ایک بہانہ ہے۔

مظاہرین ماحولیات کے علاوہ تہذیبی شناخت اور سیاحت کی صنعت و حرفت کا بھی حوالہ دیتے ہیں لیکن اصل پریشانی عثمانی دور کی یادگار تقسیم اسلحہ بیرک کی تعمیرِ نو پر ہے۔ یہ عمارت سنہ ۱۹۴۰ تک وہاں موجود تھی اور اس کا دوبار تعمیر ہونا یقیناً سیاحوں کی کشش کا ذریعہ بنے گا اس لئے کہ سیاح ہمیشہ ہی ماضی کی تہذیب و ثقافت کو جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ماضی کے اسرار و رموز سیاحوں کو دور دراز کے ویران مقامات تک لے جاتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ ایک جدید بازار (مال) موجود ہو تو اس سے سیاحتی تجارت میں یقیناً اضافہ ہوگا اور عوام میں خوشحالی آئیگی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تہذیب و ثقافت کے تحفظ کی خاطر ۷۰ سال قبل جب اس تاریخی عمارت کو مسمار کرکے اس کی جگہ تقسیم اسٹیڈیم تعمیر کیا جارہا تھا اور پھر اسے بھی توڑ کر باغ بنا دیا گیا تو ان اقدامات کے خلاف احتجاج کیا جاتا لیکن اس وقت کسی کی مجال نہیں تھی کہ حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف لب کشائی کرتا اس لئے سب خاموش رہے۔ اب آزادی ملی تو اس کا بیجا استعمال کیا جارہا ہے۔

اس منصوبے میں نہ صرف اسلام کے تابناک ماضی کی یادگار قائم کرنا پیش نظر ہے بلکہ اس کے تحت مصطفیٰ کمال اتاترک ثقافتی مرکز کو بھی مسمار ہونا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں اس وسیع و عریض عمارت کی تعمیر کیلئے بھی وہاں پیڑ کاٹے گئے ہوں لیکن چونکہ یہ جدید تہذیب کی ضرورت تھی اور آمرانہ حکومت تھی اس لئے کوئی احتجاج نہیں ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں اس کے اندر کھیل کے دوران آگ لگ گئی اور پھر ایک بار اس کی مرمت کی گئی لیکن گزشتہ نو سالوں سے یہ عمارت اپنی خستہ حالی کے باعث قابل استعمال نہیں ہے۔ اس سال اکتوبر میں قومی دن کے موقع پر اس کا افتتاح متوقع تھا۔ مظاہرین کے غم و غصہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے یہ عمارت بھی اس نئے منصوبے کی زد میں آگئی ہے۔ اس کے علاوہ آبنائے باسفورس پر بنائے جانے والے نئے پل کو سلطان محمود سے منسوب کرنا بھی مغرب زدہ لوگوں کے گلے سے نہیں اتر رہا ہے۔ اس کیلئے سلطان کے ذریعہ علوی طبقے کے لوگوں کا قتل کا بہانہ بنایا جارہا ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ فی الحال علوی فرقے سے تعلق رکھنے والا بشارالاسد ترکی کی سرحد پر واقع شام میں قتل و غارتگری کرنے میں مصروف ہے۔ قائمقام وزیر اعظم بلند آرنچ کے سامنے اپنے مطالبات میں مظاہرین کے رہنماؤں ان نکات کی جانب توجہ مبذول کرکے تمام اندیشوں کو حقیقت میں تبدیل کردیا ہے۔

ماحولیات کے پس پردہ کھیلی جانے والی سیاست کا فائدہ جہاں حزب اختلاف نے اٹھایا وہیں تعمیر و انصاف پارٹی بھی اس معاملے پیچھے نہیں رہی بلکہ اکثر مبصرین کا خیال ہے آئندہ سال منعقد ہونے والے انتخابات میں مظاہروں کا بلاواسطہ فائدہ حزب اقتدار کو ہی ہوگا۔ تعمیر و انصاف پارٹی کے حامیوں میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو اسلام پسند ہیں دوسرے ایسے لوگ ہیں جو نظریاتی اختلاف کے باوجود اہلیت و صلاحیت کے سبب حمایت کرتے ہیں۔ احتجاج جب شروع ہوا تو اس میں اے کے پی کے رائے دہندگان بھی شامل رہے ہوں گے۔ اس احتجاج کے خلاف جب رجب طیب اردوان نے سخت گیر موقف اختیار کیا تو اس کا رد عمل تشدد کی صورت میں سامنے آیا۔ اس موقع پر مظاہرے کو انتہا پسندوں نے اچک لیا اور وہ توڑ پھوڑ، آتشزنی پر اتر آئے۔ ایسا لگتا ہے طیب اردوان یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے انتظامیہ کو اسے سختی کے ساتھ کچلنے کا حکم دے کر تشدد کی آگ اور ہوا دے دی۔ اس کے نتیجے میں وہ لوگ اسلام پسندوں کے خلاف کھل کر سامنے آگئے۔ انہوں نے نہ صرف تعمیر و انصاف پارٹی کے دفتر کو آگ لگانے کی کوشش کی بلکہ اسکارف پہننے والی خواتین کے ساتھ بھی بدسلوکی کی۔

اس مرحلے میں امن پسند لوگ مظاہرے سے الگ ہوگئے۔ اسلام پسندوں کے نزدیک وزیراعظم کا موقف حق بجانب قرار پایا۔ اس کے بعد ذرائع ابلاغ میں مظاہرے کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کے اعداد و شمار نے عوام کو پریشان کیا اس کے

باوجود معتدل شہریوں کے دلوں میں طیب اردوان کے خلاف غم و غصہ موجود تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت اپنے شہریوں کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آئے۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھے اس کردار کو صدر مملکت عبداللہ گل نے ادا کیا۔ انہوں نے پہلے تو پولس کو تقسیم چوک سے ہٹوایا۔ لیکن اس کے بعد پھر وزیر اعظم نے ایک نہایت اشتعال انگیز انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں پچاس فیصد عوام کی حمایت حاصل ہے اس لئے ان مظاہرین سے اجازت نامہ درکار نہیں ہے۔ یہ شرابی، فسادی اور لٹیرے لوگ ہیں۔ اپنے حامیوں کو مظاہرین کے خلاف طلب کرنے کی ناعاقبت اندیش دھمکی دے کر وہ غیر ملکی دورے پر روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد پھر عبداللہ گل نے مظاہرین سے خطاب کرکے کہا ہمیں آپ لوگوں کا پیغام مل گیا ہے۔ ہم ضروری اقدامات کریں گے اس لئے اب آپ اپنا مظاہرہ ختم کردیں۔ عبداللہ گل نے احتجاج کو جمہوریت کا ضروری عنصر قرار دے کر مخالفین کا دل جیت لیا اور یہ کہہ کر کہ جمہوریت صرف انتخابی کامیابی نہیں ہے طیب اردوان کی بلاواسطہ تردید بھی کردی۔ اس کے بعد قائمقام وزیر اعظم بلند آرنچ نے معافی مانگی اور گفت و شنید کا آغاز کردیا۔ اس طرح گویا مخالفین کے ایک اور طبقہ کو ان لوگوں نے مل جل کر اپنا ہمنوا بنالیا۔ اگر یہ اتفاقی طور پر ہوا ہے کہ طیب اردوان سے چوک ہو گئی اور دوسروں نے اسے سنبھال لیا تب تو قابل درگذر ہے لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ منصوبہ بند تماشہ

تھا۔ اگر ایسا ہے تو یہ حرکت اسلام پسندوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ہم چونکہ عوام کے سامنے نہیں بلکہ اللہ کے سامنے جوابدہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور رب ذوالجلال دلوں کا حال جانتا ہے اس لئے انتخاب میں کامیابی یا ناکامی کے پیش نظر ایسی کسی بھی حرکت سے گریز کیا جانا چاہئے۔ تعمیر و انصاف پارٹی کو اتحاد و اتفاق کی جدوجہد کرنا چاہئے اور تقسیم سے احتراز کرنا چاہئے اس لئے کہ بقول احمد فراز

آج ایسا نہیں، ایسا نہیں ہونے دینا
اے مرے سوختہ جانو مرے پیارے لوگو
اب کے گر زلزلے آئے تو قیامت ہوگی
میرے دلگیر مرے درد کے مارے لوگو
کسی غاصب کسی ظالم کسی قاتل کے لیے
خود کو تقسیم نہ کرنا مرے سارے لوگو

حفیظ میرٹھی: محبت خامشی بھی، چیخ بھی، نغمہ بھی، نعرہ بھی- قسط دوم

حفیظ میرٹھی صاحب ایک تحریکی شاعر تھے اس لئے ان کچھ اشعار تو خاص طور پر ان لوگوں کیلیئے ہیں جو کسی نہ کسی اجتماعیت سے وابستہ ہو کر اپنا فرضِ منصبی ادا کرتے ہیں مثلاً

کارواں چاہے مختصر ہو جائے
کوئی رہزن نہ ہمسفر ہو جائے

یہ ایک ایسا راز جس کی معرفت سے وہی شخص ہمکنار ہوتا ہے جو شعوری طور پر تحریکی کارواں میں سرگرم سفر ہو۔ اپنے قافلے کا تابناک ماضی کا ذکر اور پیش آمدہ مسائل بیان بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گذر سے گذرے
راہ روکے ہوئے خود راہنما بیٹھے ہیں
اب کوئی قافلہ گذرے تو کدھر سے گذرے

حفیظ میرٹھی جہاں اپنے ہمراہ چلنے والوں کی خبر لیتے ہیں وہیں تحریکی سفر

میں ساتھ چھوڑ جانے والوں کی نفسیات و رویہ کا بھی نہایت ظریفانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں۔

اب اہلِ کارواں پہ لگاتا ہے تہمتیں
وہ ہمسفر جو حیلے بہانے میں رہ گیا
میدانِ کارزار میں آئے وہ قوم کیا
جس کا جوان آئینہ خانے میں رہ گیا

اس شعر میں عصرِ حاضر کے نوجوانوں پر زبردست تنقید کی گئی اس کے باوجود حفیظ صاحب نوجوانوں کے اندر بے حد مقبول رہے۔ جماعت کے علاوہ طلباء تنظیموں کا کوئی بڑا اجتماع ایسا نہ ہوتا جس میں انہیں دعوتِ سخن نہ دی جاتی تھی۔ میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ نوجوان جس قدر ان سے مل کر خوش ہوتے تھے اس سے زیادہ خوشی خود حفیظ صاحب کو نوجوانوں سے مل کر ہوا کرتی تھی۔ان کا یہ شعر تو الیس آئی ایم میں بچے بچے کی زبان پر تھا۔

نہ لے چل خانقاہوں کی طرف شیخ حرم مجھ کو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ
حفیظ میرٹھی کو کون پہچانے کہ بے چارہ
نہ ایوانوں سے وابستہ ،نہ دربانوں سے وابستہ

حفیظ میرٹھی نے اپنے دور کی ترجمانی ضرور کی لیکن اس کے سبب ان کے رنگِ تغزل پر آنچ نہیں آئی۔ انھوں نے نہ تو فن کو فکر کی بھینٹ چڑھنے دیا اور نہ فن کی رعایت میں فکر سے مصالحت.برداشت کی بلکہ فکر و فن کے درمیان بہترین توازن کو قائم رکھا۔ حفیظ صاحب کے خیال میں اسی وقت ممکن ہے کہ جب فکر و فن کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو پاٹ دیا جائے۔

بات جب ہے کہ فاصلہ نہ رہے
فکر اور فن کے درمیاں لوگو

فنکار جب اپنے شعور و شعر کے درمیان ایک حسنِ امتزاج پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے قلم سے بے مثال اشعار جنم لینے لگتے ہیں جو آگے چل کر ضرب المثال بن جاتے ہیں۔ حفیظ میرٹھی کے ساتھ یہی ہوا کہ زلف و رخسار کی گرفت سے آزاد ہونے کے باوجود اس ان کے بے شمار اشعار زبان زدِ عام ہو گئے مثلاً۔

کسی جبیں پر شکن نہیں ہے کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہے
بغور میرا پیام شاید ابھی جہاں نے ساگ نہیں ہے
سفینۂ عہدِ نو پہ چھایا ہوا ہے بہروپیوں کا لشکر
یہاں ہر اک ناخدا نما ہے مگر کوئی ناخدا نہیں ہے

اہلِ فن کو عام طور پر یہ شکایت ہوتی ہے کہ لوگوں نے ان کا کلام نہیں سمجھا اس لئے وہ پذیرائی سے محروم رہے۔ اس کے برعکس حفیظ اپنے پیام کے جواب میں پذیرائی سے علی الرغم شکن آلودہ پیشانی کی توقع کرتے ہیں۔ وہ اپنے سامعین سے وفا کے بجائے خفا ہونے کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں۔ موجودہ دور کے سیاستدانوں کیلئے بہروپیہ کا استعارہ اور پھر ناخدا نما کی اصطلاح نے ان اشعار کو زندہ وتابندہ کر دیا ہے۔ مذکورہ غزل کا ہر شعر لاجواب ہے۔ ملک کے انتخابی ماحول میں سیاستدانوں کو کبھی بہروپیہ تو کبھی سانپ سے تشبیہ دینا اور عوام کالعنام کیلئے آستین کی بے مثال تمثیل اس شعر میں دیکھیں کہ جہاں دو مصرعوں کے اندر ایک سمندر کو بند کر دیا گیا۔ فرماتے ہیں ۔

سانپ آپس میں کہہ رہے ہیں حفیظ
آستینوں کا انتظام کرو

حفیظ کو اپنی حق گوئی وبیباکی کے اثرات کا مکمل درک تھا وہ جانتے تھے کہ مصلحت پسند دنیا میں حقیقت بیانی کیا گل کھلاتی ہے اسی لئے کہتے ہیں ۔

ابھی سے ہوش اڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی میں بزم میں آیا ابھی کہاں بولا

اس شعر میں جو برجستگی ہے وہ تو صرف حفیظ صاحب کا حصہ ہے۔ حفیظ میرٹھی کی

آگ والی غزل اس قدر مقبول ہوئی کے اُس کے بعد اِس زمین پر کوئی اور شعر دل کو بھاتا ہی نہیں

ایسی آسانی سے قابو میں کہاں آتی ہے آگ
جب بھڑکتی ہے تو بھڑکے ہی چلی جاتی ہے آگ
حل ہوئے ہیں مسئلے شبنم مزاجی سے مگر
گتھیاں ایسی بھی ہیں کچھ جن کو سلجھاتی ہے آگ

آگ ہی کی طرح زنجیروں کی جھنکار بھی کچھ ایسی کھنکی کہ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی ملاحظہ ہو۔

آباد رہیں گے ویرانے ،شاداب رہیں گی زنجیریں
جب تک دیوانے زندہ ہیں پھولیں گی پھلیں گی زنجیریں
جب سب کے لب سل جائیں گے ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

یہ اشعار فیض کے قید وبند میں کہی ہوئی نظم ”زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے“ کی یاد دلاتے ہیں ۔اسی طویل بحر کی غزل کے بعد ایک نہایت آسان اور مختصر بحر کی غزل دیکھیں جو آگے چل کر حفیظ صاحب کا تشخص بن گئی۔

شیشہ ٹوٹے ،غل مچ جائے

دل ٹوٹے آواز نہ آئے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنی

گاتا جائے، روتا جائے

یہ شعر قرآن حکیم کے ساتھ حفیظ صاحب کے گہرے تعلق کا ترجمان ہے "گاتا جائے روتا جائے" کی منظر کشی لاجواب ہے۔ دار و رسن کے ساتھ غم و غصہ، حزن و ملال، ماتم و گریہ کو سبھی منسوب کرتے ہیں لیکن اس کا جو تعلق سربلندی سے ہے اس کی جانب توجہ نہیں جاتی۔ لفظِ سربلند کا بر موقع و برجستہ استعمال مندرجہ ذیل شعر کو اس قدر خوبصورت بنادیتا ہے کہ طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے اس شعر کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں دار و رسن جبر کے قہر کی علامت کے بجائے شوق شہادت کا حسنِ انتخاب نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے میں اسے حفیظ میرٹھی کا نمائندہ شعر سمجھتا ہوں ۔

دار و رسن کو کس نے چنا دیکھتے چلیں

یہ کون سربلند ہوا دیکھتے چلیں

عصر حاضر کا ایک بہت بڑا چیلنج مادہ پرستی اور معیار زندگی کو بلند سے بلند کرنے کی مسابقت ہے ۔اس کا اچھوتا بیان ملاحظہ فرمائیں ۔

بس یہی دوڑ ہے اس دور کے انسانوں کی

تیری دیوار سے اونچی مری دیوار بنے

چھین کر غیر سے اپنوں نے مجھے قتل کیا

آپ ہی ڈھال بنے ،آپ ہی تلوار بنے

یہ اشعار حفیظ میرٹھی کے خاص اسلوبِ سخن اور بانکپن کے ترجمان ہیں۔ ان اشعار کو پڑھتے وقت قاری کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ حفیظ میرٹھی کے علاوہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ ایسا لگتا ہے گویا ان اشعار پر حفیظ کی مہر ثبت ہو اس لئے کہ ان کے اندر حفیظ صاحب کا جیتا جاگتا دل دھڑک رہا ہے۔ اسے دیکھیں ۔

اے پرستارانِ نغمہ ! چھوڑ کر تارِ رباب

آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

یہ ایسے اشعار ہیں کہ جنہیں ایک مرتبہ کوئی ڈائری یا کیلنڈر پر بھی پڑھ لیتا ہے تو وہ اس کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں مثلاً

رات کو رات کہہ دیا میں نے

سنتے ہی بوکھلا گئی دنیا

کس نے سمجھا ہے میرے غم کو حفیظؔ

گدگدا کر رلا گئی دنیا

اس شعر میں گدگدا کر رلانے کی ترکیبِ معکوس کا کیا خوب استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح کا ایک شعر ان کی مشہور غزل زنجیریں میں آگیا ہے۔ عام طور پر کسی شہ کا ٹوٹنا بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جانا باعثِ افسوس ہوتا ہے لیکن اگر وہ چیز جبر وغلامی کا وسیلہ ہو تو اس کی تخریب کے بطن سے تعمیر کی کونپل پھوٹتی ہے اور وہ عمل باعثِ خیر و برکت ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی بندشِ الفاظ قاری کو چونکا دیتی ہے جس کے سبب نہ صرف وقتی طور پر تو قاری لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ اس طرح کے اشعار انسانی قلب وذہن پر تاحیات نقش رہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

آزادی کا دروازہ بھی، خود ہی کھولیں گی زنجراِیں
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی جب حد سے بڑھیں گی زنجریں

حفیظ میرٹھی کی غزلوں میں روانی اور نغمگی کے ساتھ ساتھ غم جاناں اور غم دوراں کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان دونوں کو شاعر نے ایک جان دو قالب کر دیا ہے۔ یقین نہ آتا ہو تو یہ اشعار دیکھیں جن رنگِ تغزل تو نہیں بدلتا لیکن مضمون تبدیل ہو کر کیا سے کیا ہو جاتا ہے

یہ بات نرالی دل خود دار کرے ہے
تڑپے ہے مگر درد سے انکار کرے ہے
تسلیم اسے کوئی بھی دل سے نہیں کرتا

وہ فیصلہ جو جبر کی تلوار کرے ہے

ایک غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ اصلاحی و تعمیری ادب خشک و بیرنگ ہوتا ہے بلکہ اسے ایسا ہی ہونا چاہیۓ۔ اس بت کو حفیظ میرٹھی نے اس طرح پاش پاش کردیا کہ اب نہ کوئی تعمیر پسند شاعر اصلاح کی آڑ میں اپنے عیوب کی پردہ پوشی کرسکتا ہے اور نہ تخریب پسند عناصر انہیں زاہدِ خشک کا طعنہ دے سکتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی جرأت کرتا بھی ہے تواس کیلئے حفیظ میرٹھی کا یہ ایک شعر کافی ہے۔

محبت خامشی بھی، چیخ بھی، نغمہ بھی، نعرہ بھی

یہ اک مضمون ہے کتنے ہی عنوانوں سے وابستہ

آخر میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اس مقالے کو طوالت کے پیشِ نظر حفیظ میرٹھی کی غزلوں تک محدود رکھا گیا اور دیگر اصنافِ سے استفادہ نہیں کیا جاسکا لیکن کلیاتِ حفیظ غزل کے علاوہ نعتوں، نظموں، منقبت، سلام، دعا اور دیگر اصناف سخن سے آراستہ ہے۔ وقت کے ساتھ حفیظ میرٹھی نے دنیائے ادب میں اپنی قادرالکلامی کا لوہا منوالیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ زمانہ قریب آگا ہے جب خود حفیظ میرٹھی کی اپنے متعلق کی گئی مندرجہ ذیل پیش گوئی سچ ہواچاہتی ہے۔

میری باتوں پہ ہنستی ہے دنیا ابھی
میں سنا جاؤں گا فیصلوں کی طرح

نتیش مودی: اور لے آئیں گے بازار سے جو ٹوٹ گیا

قومی جمہوی محاذ میں ایک اور دراڑ پڑ گئی اور وہ بھی ایسی کہ سربراہ شردیادو ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ نتیش کمار کے اعلانِ بغاوت پر گو کہ سشما سوراج نے افسوس کا اظہار کیا لیکن مختار عباس نقوی نے کہا اگر یہ اتحاد ایک کے بجائے دس مرتبہ بھی ٹوٹے تب بھی ہم نریندر مودی کو نہیں ہٹائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی وجہ ہے جس کے سبب نقوی کو اتحاد سے زیادہ مودی کی قیادت عزیز ہے؟ دراصل بی جے پی کو پتہ ہے کہ قومی جمہوری محاذ ہو یا متحدہ ترقی پذیر وفاق ان دونوں کی حیثیت جامِ جم کی نہیں جامِ سفال کی سی ہے۔ یہ تو صحرا میں نمودار ہونے والے ریت کے ٹیلے ہیں جو اقتدار کی ہوا کے ساتھ بنتے بکھرتے رہتے ہیں۔سیاسی رشتے داری میں پائیداری نہیں ہوتی۔ ابن الوقتی کی بنیاد پر یہ تعلق کل بنا تھا آج ٹوٹ گیا۔اقتدار کی جس ہوس نے اسے آج توڑا ہے کل وہی اسے پھر جوڑ دے گا۔اس لئے کہ سیاست کے اکھاڑے میں نہ تو دوستی ازلی ہوتی ہے اور نہ دشمنی ابدی۔ جمہوریت کا پہیہ اقتدار کے محور پر گھومتا ہے اور اس کی گردش کبھی اجنبی کو دوست بنا دیتی ہے تو کبھی رفیق کو فریق میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ہندوستانی سیاست میں یہ کھیل اتنی مرتبہ دوہرایا جاچکا ہے کہ اس پر اظہارِ حیرت اپنے آپ میں حیرت انگیز ہے۔ سیاستداں تو اس فریب خوردگی کا شکار رہتے ہیں کہ آسی ضیائی

۔سے معذرت کے ساتھ

الیکشن میں مجھے اندیشۂ سود وزیاں کیوں ہو

بنے جو شاخِ نازک پر وہ میرا آشیاں کیوں ہو

سیاسی افق پر نتیش کمار کا تشخص ۱۹۹۴؁ میں کی جانے والی بغاوت سے وابستہ ہے۔ اس وقت وہ بہار جنتا دل کے سکریٹری جنرل تھے لیکن لالو پرشاد یادو کا ڈنکا ایسے بجتا تھا کہ ان کے سوا بہار کے کسی لیڈر کوئی جانتا نہیں تھا۔ اس وقت جارج فرنانڈیس جیسے قدآور رہنما کا دامن پکڑ کر نتیش کمار جنتا دل سے الگ ہوگئے لیکن آگے چل کر نتیش کمار نے اپنے پیرو مرشد جارج فرنانڈیس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو فی الحال نریندر مودی اپنے دھرم گرو لال کرشن اڈوانی کے ساتھ کررہے ہیں ۔اس کے علاوہ بھی کئی لحاظ سے نتیش اور نریندر کے اندر مشابہت پائی جاتی ہے۔ جس طرح نتیش کمار نے اپنے پیش رو لالو پرشاد یادو کو کہیں کا نہیں چھوڑا اسی طرح نریندر مودی نے اپنے سابقہ وزیراعلیٰ کیشو بھائی پٹیل کا بیڑہ غرق کردیا۔ دونوں ترقی کا ڈھول بجاتے ہیں اور دونوں ہی ملک کا وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے ہیں ۔ ایسے میں بھلا ایک میان میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی تھیں اس لئے ان کو تو الگ ہونا ہی تھا۔ سو ہوگیا

۔

جنتا دل سے الگ ہونے کے بعد نتیش کمار نے سمتا پارٹی بنا کر بھارتیہ جنتا پارٹی سے رشتہ جوڑ لیا۔ یہ رشتہ لالو سے دشمنی کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور مودی سے دشمنی کے سبب ٹوٹ گیا لیکن دونوں مواقع پر اقتدار کا حصول پیشِ نظر رہا۔ قومی جمہوری محاذ کے قیام سے دو سال قبل ۱۹۹۶ء ہی میں سمتا اور بی جے پی ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے تھے۔ ۱۹۹۸ء کے اندر اس جب متحدہ جمہوری محاذ باقاعدہ عالمِ وجود میں آیا اس وقت اس اتحاد میں ۱۳ جماعتیں شامل تھیں۔ شرد یادو جنھوں نے ابھی استعفیٰ دیا ہے انہیں کو اس وقت این ڈی اے کا صدر بنایا گیا تھا۔ جب بی جے پی کو اقتدار حاصل ہوا تو اس اتحاد میں شامل چھوٹی بڑی جماعتوں کی تعداد بڑھ کر ۲۳ ہو گئی۔ لیکن بی جے پی کے ہاتھ سے جب اقتدار کی ڈور چھوٹی تو یکے بعد دیگرے ان جماعتوں کو پر لگتے چلے گئے اور اب حال یہ ہے کہ شیوسینا اور اکالی دل کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر جماعت اس اتحاد میں شامل نہیں ہے۔ ان میں سے بھی صرف اکالی دل کو نریندر مودی قابلِ قبول ہے شیوسینا اسے پسند نہیں کرتی۔ باقی گوا، میگھالیہ، ناگالینڈ اور آندھرا کی چھوٹی موٹی علاقائی جماعتیں ہیں جو قومی سطح پر اپنا کوئی اثر و رسوخ نہیں رکھتیں۔

ابن الوقتی کی بنیاد پر موقع پرست جماعتوں کی ہمنوائی اور مخالفت کو چند مثالوں کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جے للیتا کی انا ڈی ایم ۱۹۹۸ء میں بی جے

پی کے اقتدار میں حصہ دار بنی لیکن جب اس نے دیکھا کہ مرکزی حکومت انہیں بدعنوانی کے الزامات سے بری کروانے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے تو اپنی حمایت واپس لے لی۔ ۱۹۹۹ء میں اسی سبب سے اٹل جی پہلی سرکار گر گئی تھی۔ اس کے بعد ۲۰۰۴ء میں پھر ایک بار اقتدار کے لالچ میں وہ این ڈی اے میں شامل ہوئیں لیکن انتخاب میں ناکامی کے فوراً بعد اپنا دامن جھاڑ کر الگ ہو گئیں۔ ڈی ایم کے نے انا ڈی ایم کے کے الگ ہو جانے کے بعد این ڈی اے کا دامن تھام لیا اور ۲۰۰۲ء میں کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ممتا بنرجی ۱۹۹۸ء سے لے کر ۲۰۰۱ء تک اس محاذ میں شامل تھیں گو کہ ایک ریاستی انتخاب کے وقت وہ اپنے میکے کانگریس میں گئی تھیں لیکن پھر اپنے سسرال لوٹ آئیں۔ ۲۰۰۹ء کی ناکامی کے بعد جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب این ڈی اے کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے تو طلاق بائنہ دے کر پھر یو پی اے میں آن بسیں۔ مایاوتی نے بھی بی جے پی کے ساتھ جوڑ توڑ کا رشتہ قائم کیا۔ رام ولاس پاسوان اور اجیت سنگھ نے اتنی مرتبہ چولا بدلا کہ شمار مشکل ہے۔

بیجو جنتادل نے ۲۰۰۹ء میں انتخاب سے قبل بی جے پی کو دھتکار دیا اور اپنے بل بوتے پر کامیابی درج کروا کر بی جے پی کو اپنی حیثیت دکھلا دی۔ نتیش کمار اس وقت یہ جرأت نہ کر سکے لیکن اب نریندر مودی کا بہانہ بنا کر اپنے آپ کو سیکولرزم کا علمبردار ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ نتیش اس خوش گمانی کا

شکار ہیں کہ مودی کی مخالفت کے سبب مسلمان ان کے اسی طرح گرویدہ ہو جائیں گے جیسے کہ لالو پرشاد یادو پر اڈوانی کی رتھ یاترا روکنے پر فدا ہو گئے تھے۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ لالو کے یہاں فسطائیت کے حوالے سے گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر مستقل مزاجی پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس نتیش کمار گجرات فساد کے دوران این ڈی اے کے وزیر ریلوے تھے۔ اس وقت نہ صرف نتیش کمار نے استعفیٰ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ نریندر مودی کو بچانے کی خاطر ریلوے جانچ کا آغاز مؤخر کر دیا۔ وہ بہار میں مودی کو آنے سے ضرور روکتے رہے مگر دیگر ریاستوں میں اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھومتے رہے بلکہ آر ایس ایس سربراہ کی اپنے سرکاری مکان میں ضیافت کی ۔ان تمام حرکات کے باوجود اگر مسلم رائے دہندگان انہیں بی جے پی کا دشمن مان لیتے ہیں تو ان سے بڑا احمق کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ نتیش کمار کی چکنی چپڑی باتیں تو بقول شاعر اندیشوں کو جنم دیتی ہیں۔

مرے دل میں ہزاروں طرح کے اٹھتے ہیں اندیشے

عدو کو چھوڑ کر تم آج مجھ پر مہرباں کیوں ہو

اس میں شک نہیں کہ مدرسوں اور اردو کے حوالے سے نتیش کمار نے لالو سے زیادہ کام کیا کہ لیکن دہشت گردی کے جھوٹے مقدمات میں پھنسنے والے نوجوانوں کے بارے میں وہ خاموش تماشائی بنے رہے۔ قتیل صدیقی کی زیر حراست ہلاکت پر ان کے

کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ فصیح محمود کو خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں نے سعودی عرب سے اغواء کرکے اپنی غیر قانونی حراست میں رکھااور بنگلورو دھماکے میں بلاوجہ ملوث کرلیا۔ اس دوران فصیح کے والدین اور اہلیہ در بدر ٹھوکریں کھاتے رہے لیکن نتیش کمار کی زبان سے ہمدردی کے دو بول نہیں پھوٹے۔ فوربس گنج میں بی جے پی ایم ایل سی کے خلاف احتجاج کرنے والے مسلمانوں پر گولیاں برسائی گئیں۔ جس میں ۶ افراد ہلاک ہوئے پولس کی بہیمیت کا نظارہ مقامی ٹی وی چینل سے ہوتا ہوا ساری دنیا تک جا پہنچا لیکن وزیراعلیٰ اپنی آنکھیں موندے رہے۔ بہار کا مسلمان یہ سوال کرسکتا ہے کہ کیا سیکولرزم کا دفاع اور فسطائیت کے خلاف جنگ صرف نریندر مودی کو وزیراعظم بننے سے روکنا اور خود کو اس عہدے پر براجمان کرنے کے خواب دیکھنے تک محدود ہے۔

ہندوستانی سیاست کو ہر کوئی اپنے زاویے سے دیکھنے کو کوشش کرتا ہے اور یہ ایک ایسا بونڈر ہے کہ ہرزاویے سے مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کو نہ بی جے پی اچھی لگتی ہے اور نہ بی جے پی کا نریندر مودی کو وزیراعظم بنانے کی کوشش کرنا اچھا لگتا ہے حالانکہ جہاں تک بی جے پی کا تعلق ہے اس کا ہر رہنما موقع پڑنے پر گجرات جیسا فساد کرواسکتا ہے۔ بی جے پی ہی کیوں کانگریس نے اس سے بڑا فساد آسام میں برپا کیا یا کم از کم اقتدار میں کے باوجود اسے روکنے میں ناکام رہی۔ بوڈولینڈ میں ہونے والے مظالم سے کانگریس

نے اول تو چشم پوشی کی اور بعد میں اسکی پردہ پوشی بھی کی۔ دہلی میں مسلمانوں کے ساتھ نہ سہی تو سکھوں کے ساتھ گجرات والا سلوک کیا اسی لئے اکالی دل کو نریندر مودی سے زیادہ خطرناک سردار منموہن سنگھ نظر آتے ہیں۔ ہندوستانی سیاست پر فی الحال عزیز بگھروی مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے

فریاد لے کے جائیں بھی جائیں تو کس کے پاس
ہیں بے ضمیر مسندِ انصاف پر تمام

بی جے پی کو اس بات کا علم تھا کہ نریندر مودی کو وزیر اعظم کا امیدوار بنانے کی قیمت جنتادل (یو) کی جدائی کی صورت میں ادا کرنی پڑے گی اور دیگر علاقائی جماعتوں کو الیکشن سے قبل ساتھ لینا مشکل ہوجائیگا لیکن اسے یہ بھی پتہ ہے کہ الیکشن میں مودی کی مخالفت کرکے مسلمانوں کا ووٹ بٹورنے والی جماعتوں سے انتخاب کے بعد چند وزارتوں کے عوض حمایت حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بی جے پی جانتی ہے کہ گجرات کے باہر نریندر مودی کے اثرات بے حد محدود ہیں ۔ کرناٹک کے انتخابات نے حال ہی میں اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے لیکن اس کی مجبوری یہ ہے کہ اس کے اندر شدید قحط الرجال ہے۔ آر ایس ایس کا منظورِ نظر صدر نتن گڈکری بدعنوانی کے الزام میں رسوا ہو کر ہٹایا جاچکا ہے۔ اس کے بعد راجناتھ سنگھ، سشما سوراج اور ارون جیٹلی ان تینوں میں سے کوئی کسی اور کو اپنے سے بہتر تسلیم نہیں کرتا۔ اب لے دے کے اڈوانی جی بچتے ہیں۔

کانگریس کا امیدوار اگراس بار منموہن سنگھ ہوتے تب تواڈوانی جی کو پے درپے دو ناکامیوں کے بعد پھر سے آزمایا جاسکتا تھا لیکن راہل کو نائب صدر بنا کر کانگریس نے بلاواسطہ اپنا امیدوار بنادیا ہے ۔اب بھلا راہل گاندھی ابھرتی ہوئی قیادت کے سامنے اڈوانی جی کی ڈھلتی عمر کا کیا موازنہ ؟اس لئے تمام ترخامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بی جے پی کو نریندر مودی کی پناہ میں آنے پر مجبور ہونا پڑا۔ نریندر مودی اپنی فقرہ بازی کیلئے معروف ہے لیکن نتیش کمار کی علٰحیدگی پر اس نے پراسرار خاموشی اختیار کررکھی ہے۔شاید یہ صورتحال اس کی توقع کے خلاف ہے اس لئے اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا۔ اوراگر وہ شکوہ شکایت کرنا بھی چاہے تو کس سے کرے اس لئے کہ

شکوۂ ایام کیسا،آندھیوں سے کیا گلہ
ریت کی بنیاد پر تعمیر گھر کس نے کیا

کانگریس کے نقطۂ نظر سے نریندر مودی کا کمان سنبھالنا اس کیلئے خاصہ مفید رہا اس لئے کہ اب بدعنوانی کا مسئلہ پس پردہ چلا جائیگا ۔ انتخابات سیکولرزم بمقابلہ فسطائیت کی لڑے جائیں گے۔اس سے کانگریس کی مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ذریعہ مسلمانوں پر کئے جانے والے سارے مظالم پر پردہ پڑ جائیگا۔ مسلمان نریندر مودی کو وزیراعظم بننے سے روکنے کی خاطر جہاں جہاں

بھی ممکن ہوگا کانگریسی امیدوار کو کامیاب کریں گے نیز جہاں کہیں کسی اور کی جھولی میں اپنا ووٹ ڈالیں گے وہ انتخاب کے بعد کانگریس یا بی جے پی سے جاملے گا گویا مسلمانوں کا ووٹ بلواسطہ یا بلاواسطہ بڑی حدتک کانگریس یا خدانخواستہ بی جے پی کی کشکول میں چلا جائیگا۔

نتیش کمار کے الگ ہوتے ہی تیسرا محاذ پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس بار ایسا نہیں ہے کہ سارے سارے غیر کانگریسی و غیر بھاجپائی جماعتیں ایک ساتھ ہو سکیں گی اس لئے کہ اس تیسرے محاذ میں بھی ایک سے زیادہ متحارب دعویدار ہیں۔مثلاً تمل ناڈو میں ڈی ایم کے اور انا ڈی ایم کے، کرناٹک میں دیوے گوڑااور یدورپا،اترپردیش میں ملائم اور مایاوتی، بہار میں لالو اور نتیش، بنگال میں ترنمل اور کمیونسٹ۔اس لئے یا تو ایک چوتھا محاذ وجود میں آجائیگا یا ان میں سے کچھ لوگ کانگریس کے ساتھ الحاق کرلیں گے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ چند جماعتیں بی جے پی کے ساتھ خفیہ یا اعلانیہ سانٹھ گانٹھ کرلیں لیکن اس میں شک نہیں کہ نریندر مودی کے آگے آنے سے اور نتیش کمار کے اس کے خلاف میدان میں اترنے سے الیکشن کا بازار خاصہ گرم ہو گیا ہے۔

نریندر مودی گجرات سے نکل کر قومی اکھاڑے میں چھلانگ تو لگا دی ہے لیکن علاقائی اور قومی سطح کی سیاست میں ایک بنیادی فرق ہے۔ گجرات کے اندر اس کا

براہِ راست مقابلہ کانگریس کے ساتھ ہوا کرتا تھا اور کامیابی و ناکامی کا دارومدار اپنی جماعت پر ہوتا تھا۔ کسی اور کی مدد یا غیروں کو راضی کرکے اپنے ساتھ رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی اس لئے وہ اس کا تجربہ نہیں رکھتا۔ قومی سطح پر یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بی جے پی آئندہ پچاس سال میں بھی اپنے بل بوتے پر
اکثریت حاصل نہ کرسکے گی اور اگر اسے درمیان میں اقتدار نصیب ہو بھی جائے تو دیگر جماعتوں کی بیساکھی پر ہوگا۔ یہی مجبوری مودی کے دھرم گرو اڈوانی کو لے ڈوبی اور فی الحال مودی کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔
آج جس طرح اڈوانی سوچتے ہیں کہ کاش میں بابری مسجد کو شہید کرنے کے بجائے جنتا پارٹی کی طرز پر سیاست کر رہا ہوتا تو کانگریس کا متبادل بن کر ملک کا وزیر اعظم بن جاتا اسی طرح کل مودی سوچے گا کہ کاش میں سابرمتی ایکسپریس کے بہانے ہزاروں مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگنے بغیر ترقی و خوشحالی کی سیاست کرتا اور جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے۔ دس سالوں تک گجرات جیسی ریاست کو فرقہ وارانہ فساد سے پاک رکھتا جو حقیقت ہے تو بڑے آرام سے وزارتِ عظمیٰ کا دعویدار بن جاتا۔ لیکن بابری کا کلنک اڈوانی کو لے ڈوبا اور گجرات کے فسادات کا لہو مودی کی آستین سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔
اسی لہو میں تمھارا سفینہ ڈوبے گا

یہ قتل عام نہیں، تم نے خود کشی کی ہے

ہندوستان کی سیاست میں مشیت ایزدی نہایت دلچسپ انداز میں کارفرما نظر آتی ہے۔ مختلف نظریات کے حامل رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کی مثال لیں یا اٹل بہاری واجپائی اور لال کرشن اڈوانی کو سامنے رکھیں اسی طرح وی پی سنگھ اور جارج فرناڈیس کو دیکھیں ہر جگہ ایک خاص مشابہت دکھلائی دیتی ہے۔ نہرو، واجپائی اور سنگھ نے میانہ روی اختیار کی اور اپنے اصول و نظریات سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ تینوں اقتدار سے سرفراز بھی ہوئے اور احترام کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچے۔ اس کے برعکس اندرا،اڈوانی اور فرنانڈیس نے اپنے نظریات کو بالائے طاق رکھ کرانتہاپسندی کی راہ اختیار کی۔اندراجی نے غریبی ہٹاؤ کا نعرہ لگانے کے بعد ایمرجنسی نافذ کردی، اڈوانی جی نے رام رتھ یاترا نکالنے کے بعد قائد اعظم کی تعریف کردی اور فرنانڈیس نے اول تو دوہری رکنیت کی بنیاد پر جنتا پارٹی کی حکومت گرائی اور پھر بی جے پی سے مصالحت کرلی۔ اقتدار حاصل کرنے کے اس جنون نے ان تینوں کو رسواکن انجام سے دوچار کیا۔نریندر مودی اور نتیش کمار اسی تباہ کن راہ پر گامزن ہیں اور ان پر بھی ایک نہ ایک دن ڈاکٹر انور سدید کا یہ شعر صادق آکر رہے گا ؎

جو کل تک اڑ رہا تھا آسمانوں کی بلندی پر
زمیں پر چل رہا ہے آج وہ آہستہ آہستہ

مصر: چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

اقتدار کا معاملہ بھی رزق کی مانند ہوتا ہے کہ کب، کیسے اور کس قدر حاصل ہو اس کا حتمی علم رازق کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا۔ یہ ایک اضطراری عمل ہے لیکن جب اقتدار حاصل ہو جائے تو کیا رویہ اختیار کیا جائے اور جب چھن جائے تو وہ کس وقار کا مظاہر ہو یہ اختیاری عمل ہے۔ صدر محمد مورسی نے نہ تو کسی انسان سے ہاتھ پھیلا کر اقتدار طلب کیا اور نہ ہاتھ جوڑ کر اسے بچانے کی کوشش کی۔ وہ ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ کرسئ اقتدار پر فائز ہوئے اور اسی قلندرانہ شان کے ساتھ اقتدار سے بے دخل ہو گئے۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ فوج کے آگے گھٹنے ٹیک کر چپ چاپ سعودی عرب یا ترکی جانب نکل جاتے لیکن ان کا ایسا کرنا مومنانہ وقار کے خلاف تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک شجر پر بہار کی مانند فوج کی آندھی کے سامنے سینہ سپر ہونے کا انجام کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن بندۂ مومن کے نزدیک یہ حسابِ سود وزیاں بے معنیٰ مشق ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی اطاعتِ خداوندی میں بسر کرتا ہے اور انجام کی پرواہ کئے بغیر اقتدار پر اصول و نظریہ کو ترجیح دیتا چلا جاتا ہے کہ اقتدار تو موسم کی طرح ایک آنی جانی شہ ہے لیکن عقائد و نظریات کا معاملہ رگِ جاں کا سا ہے وہ جیتے جی جدا نہیں ہو سکتے۔

اس کارگہہ ہستی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ افراد واجتماعیت کو کبھی کبھار رب کائنات ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کردیتا ہے جہاں ایک جانب اصول اور دوسری جانب اقتدار ہوتا ہے۔ یہ کڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے جب اقتدار اوردین الگ ہو جائیں تو دین کا ساتھ دو۔ امریکہ کے جڑواں ٹاورس کی مسماری کے بعد افغانستان میں طالبان اسی صورتحال سے دوچار ہوئے تھے۔ ان سے دنیا کی سب سے بڑی نام نہاد طاقت نے اسامہ بن لادن کی سپردگی کا مطالبہ کیا۔ طالبان کا جواب تھا ان کے جرم کا کوئی ثبوت مانگا تاکہ مقدمہ دائر کیا جاسکے۔ اس معقول مطالبہ نے فرعونِ وقت جارج بش کو چراغ پا کردیا۔ اس نے یہ کہہ کرانکار کیا کہ تم جانبدار ہو۔ طالبان جواب تھا یہی بات تم پر صادق آتی ہےاس لئے ایسا کرتے ہیں کہ کسی غیر جانبدار سے رجوع کرتے ہیں جو حق کے ساتھ عدل کرسکے۔ امریکی کبر ونخوت نے اس معقول پیش کش کو بھی رد کردیااور بلا شرط اطاعت کا مطالبہ کرتے ہوئےاقتدار سے بے دخل کرنے کی دھمکی دے دی۔ اس نازک موقع پرطالبان نے اقتدار سے دستبردار ہونا گوارہ کرلیا لیکن اصولوں سے مصالحت نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ سال بعد ناٹو کی متحدہ فوج کے سربراہ کو اعتراف کرنا پڑا کہ جوگفت و شنید امریکہ فی الحال طالبان سے کررہا ہے یہی کچھ اسے ۲۰۰۲ء میں کرنا چاہئے تھا۔ اسے کہتے ہیں حق کی فتح اور باطل کی شکست۔ اگراس وقت اقتدار کو بچا لیا جاتا تو حق شکست کھا جاتا

اور باطل کو کامیاب ہوجاتا۔ آج سرزمین افغانستان میں طاغوت اپنی آخری سانسیں گن رہا ہے اور کابل اقتدار پھر ایک بار طالبان کے جھولی میں آنے کو ہے۔ مصر کی موجودہ صورتحال میں اقتدار اور اصول کی کشمکش سے ظاہر ہونے والے دیرپا نتائج کو واضح کرنے والی اس سے بہتر مثال کوئی اور نہیں ہوسکتی۔

ربِ ذوالجلال کی جانب سے دنیائے فانی میں انعام واکرام کے ساتھ آزمائشوں کا بھی سلسلہ جاری وساری رہتا ہے اور اکثر یہ سب غیر متوقع طریقے پر ہوتا ہے ورنہ کون سوچ سکتا تھا کہ مٹھی بھر مسلمان میدانِ بدر سے کامیاب وکامران لوٹیں گے اور کون جانتا تھا کہ اس سے محض ایک سال بعد احد کے وادی میں یہ عظیم فتح شکست میں بدل جائیگی لیکن فرمانِ خداوندی ہے '' یہ تو زمانہ کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں'' اللہ تعالیٰ غزوۂ احد کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''اِس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے'' یہاں پر بین السطور یہ بات موجود ہے کہ دیکھو تمہارے دشمن بھی تو اپنی ناکامی سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ مقابلے پر لوٹ آئے۔ اسی کے ساتھ ڈھارس بندھائی جاتی ہے کہ دل برداشتہ ہونے کی مطلق ضرورت نہیں '' دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو''۔ اور پھر یقین دہانی کہ بالآخر '' تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو''۔ تاریخ شاہد ہے کہ تمام تر غیر یقینی صورتحال کے باوجود

وحی الٰہی کا ایک ایک حرف صحیح ثابت ہوا اور چند سالوں کے اندر مکہ فتح ہو گیا۔

قصۂ خضر و موسیٰؑ اسی حقیقت کا غماز ہے کہ انسان اپنے اطمینان کی خاطر مشیت ایزدی کے اسباب و علل کی واقفیت چاہتا ہے۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کلامِ عالی مقام میں شکست وریخت کی وجہ اس طرح بیان فرماتے ہیں ’’تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں‘‘۔ شدید آزمائش کا پیش خیمہ اس چھان بین کا مقصدِ جلیل ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ’’اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا‘‘ گویا کافروں کی سرکوبی کا متبرک کام مخلص مومنین کے ذریعہ لیا جائیگا اس فریضہ کی ادائیگی سے قبل آزمائش کی چکی سے گزار کر منافقین کو مومنین سے الگ کر دیا جائیگا۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ رئیس المنافقین کا اصلی چہرہ پہلی مرتبہ غزوۂ احد سے قبل سامنے آیا جب وہ اس آزمائش سے قبل اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ باہر نکل کر جنگ کرنے کے کا فیصلہ ہمارے مشورے

کے بغیر یا ہماری مرضی کے خلاف کیوں کیا گیا۔ اس صورتحال کا مظاہرہ حالیہ کشمکش کے دوران بہت ہی واضح انداز میں قاہرہ کے اندر دیکھنے میں آیا۔ دیکھتے دیکھتے طوطا چشمی حامیوں نے رخ بدل کر دشمنوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مدینہ منورہ کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج نے ۱۲۰ سال آپس جنگ کرنے بعد صلح کر لی تھی اور عبداللہ بن ابی کو اپنا مشترک سردار بنانے کا فیصلہ کرکے تاجپوشی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اسی دوران حج کے موقع پر مدینہ کا ایک قافلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد بیعتِ عقبہ ثانیہ ہوئی جس میں مدینہ کی سعید روحوں نے حضورِ اکرمؐ کے ساتھ جینے اور مرنے کے عہد و پیمان کرکے یثرب آنے کی دعوت دی۔ عبداللہ بن ابی کا دیرینہ خواب چکنا چور ہونے لگا اور اس وقت ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا جب محمدِ مصطفیٰ ﷺ ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

حسنی مبارک کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے بعد مصر کے فوجی سربراہ بھی اقتدار پر قابض ہونے کا خواب سجانے لگے ۔ تحریر چوک پر جمع ہونے والے مظاہرے سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا جب ان کا جوش و خروش سرد ہو گا تو یہ ہمیں کو بلواسطہ یا بلا واسطہ اقتدار سونپ دیں گے ۔ ان کا یہ اندازہ صحیح تھا۔ حسنی مبارک کے دستِ راست اور سابق وزیراعظم محمد شفیق کو صدراتی انتخاب میں ملنے والے ووٹ فوجیوں کی خوش گمانی کی جانب اشارہ کرتے ہیں لیکن وہ اس

حقیقت کو بھول گئے تھے کہ مصر صرف قاہرہ کے آس پاس بسنے والے لوگوں کا ملک نہیں ہے۔ مصر کے طول و عرض کے اندر اخوان المسلمون کے تئیں پائی جانے والی ہمدردی کا اندازہ لگانے میں ان لوگوں نے غلطی کی لیکن ملک کے اولین آزادانہ و غیر جانبدار پارلیمانی انتخاب ان کی غلط فہمی دور کردی۔ اخوان کی سیاسی شاخ آزادی و انصاف پارٹی کو ۴۷ فیصد عوام کی حمایت حاصل ہوئی اور تو اور دوسرے نمبر پر بھی یہ سیکولر اور اشتراکی فکر کے لوگ نہ آسکے بلکہ سلفی جماعت نور کے حق میں ۲۷ فیصد لوگوں نے اپنی رائے دی۔ بقیہ ۲۶ فیصد رائے دیگر جماعتوں کے درمیان تقسیم ہوگئی اس طرح مصری عوام کی نمائندگی کا دم بھرنے والی سیکولر جماعتوں کے تمام دعویٰ پانی کے بلبلے ثابت ہوئے نیز دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا لیکن اس کے باوجود وہ چین سے نہیں بیٹھے بلکہ ڈیڑھ سال بعد جمہوریت اور حقوق انسانی کے ان نام نہاد علمبرداروں نے اپنی اقلیتی رائے کو ملک کی اکثریت پر تھوپ کر فوجی اقتدار کی راہ ہموار کردی۔ مصر کے اندر انقلاب کے مراحل اس طرح سے تھے کہ پہلے انتخاب کے ذریعہ ایک پارلیمان تشکیل پاتی اس کے بعد عوام کے نمائندوں پر مشتمل پارلیمانی دستور ساز کمیٹی فرسودہ دستور کو نئے دستور سے بدلتی۔ اس دوران نئے صدر کا انتخاب ہوتا جو اس نئے دستور کے مطابق ازسرِ نو انتخاب کرواتا اور پھر اقتدار کی

باگ ڈور عوام کے نمائندوں کو سونپ دی جاتی۔ اس بالآخر طرح اقتدار سے چمٹے ہوئے ماضی کے افسران اور فوجیوں سے سیاسی نظام کو پاک کر دیا جاتا۔ یہ ایک نہایت معقول لائحۂ عمل تھا لیکن پارلیمانی انتخاب میں اسلام پسندوں کی کامیابی نے سیکولر، بے دین اور اشتراکی فکر کے حاملین کو فکر مند کر دیا۔ انھوں نے اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے مثبت حزب اختلاف کا کردار ادا کرتے ہوئے آئندہ محنت کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کے بجائے سیاسی ریشہ دوانیوں کا آغاز کر دیااور چہار جانب سے یلغار کر دی۔اس میں ایک محاذ پر غیر سیاسی مظاہرین تھے تو دوسری جانب سیاسی جماعتیں۔ایک طرف فوج تھی تو دوسری طرف عدلیہ ۔ان سب کی غلامی پر ذرائع ابلاغ معمور تھا۔ یہ پانچوں دھڑے اسلام پسندوں سے خوفزدہ تھے اور پس پردہ اسلام کی مخالفت پر ایک دوسرے کی ہمنوائی کرتے تھے۔اس طرح گویا عوام کی خاموش اکثریت کے ساتھ اسلام پسند ایک جانب تھے اور دوسری جانب اس سے.برسرپیکار ہنگامہ خیز طاقتور اقلیت تھی۔

اس اقلیت نے سب سے پہلی رکاوٹ دستور ساز کمیٹی کے قیام میں ڈالی اور یہ الزام لگایا کہ یہ مصری معاشرے کی نمائندگی نہیں کرتی اس لئے کہ اس میں اسلام پسندوں کی بھرمار ہے۔ سوال یہ ہے یہ دستور جس عوام کی خاطر بنایا جارہا ہے اس نے جس تناسب سے اپنے نمائندوں کو منتخب کیا ہے اس کو پشت ڈال کر ایسے لوگوں کو اس کمیٹی میں شامل کر لیا جنھیں عوام نے دھتکار دیا کیا مبنی.بر انصاف مطالبہ تھا۔ اگر عوام اسلام پسندوں کو مسترد کر دیتے تو کیا

اس کمیٹی میں انہیں کوئی جگہ دینے کی رواداری کا مظاہرہ یہ نام نہاد جمہوریت کے علمبردار کرتے۔اس کے مقابلے اسلام پسندوں نے کشادگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۱۰۰ رکنی دستور ساز کمیٹی میں اخوان کے صرف ۳۲ افراد کو شامل کیا جو نمائندگی کے لحاظ سے ۱۵ فیصد کم تھے حالانکہ منتخب شدہ ارکانِ پارلیمان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ افراد آزادی اور انصاف پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن پھر ضد اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر ایک ایک کرکے سیکولر ارکان نے استعفیٰ دے دیا اور یہ اعلان کردیا کہ یہ دستور اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ اسے عوام کی حمایت یعنی ان کی حمایت حاصل نہیں ہے۔اس طرح گویا آئین سازی کے عمل کو سبوتاژ کیا گیا۔

صدارتی انتخاب میں اول تو اخوان نے دلچسپی نہیں لی تھی لیکن ایوانِ پارلیمان جمہوریت نوازوں کا اصلی چہرہ دیکھنے کے بعد وہ سمجھ گئے آگے چل کر ایوانِ صدارت کیا مسائل پیدا کرسکتا ہے اس لئے انہوں نے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اب صدارتی انتخاب میں روڑہ ڈالنے کی غرض سے مظاہرین پھر تحریر چوک میں جمع ہونے لگے بظاہر وہ آزادی و انصاف پارٹی کی مخالفت نہیں کررہے تھے لیکن ان کا مطالبہ تھا انتخاب سے قبل اقتدار کسی غیر فوجی کے حوالے کیا جائے۔ فوج نے آزادانہ پارلیمانی انتخاب کا انعقاد کرکے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ انتخابی عمل میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتی اس کے

باوجود یہ مظاہرے انتخابی عمل کو التواء میں ڈالنے کیلیئے کئے جا رہے تھے۔ سوال یہ تھا کہ جس غیر فوجی شہری کو اقتدار سونپا جائے اس کی بنیاد کیا ہو؟ تحریر چوک پر جمع ہونے والے مظاہرین کی مرضی مطابق کسی آدمی اقتدار سونے ن کے بجائے عوام کی رائے معلوم کرکے ان کے نمائندے کو صدر کیوں نہ بنایا جائے؟ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کل تک جو لوگ فوج کے تحت انتخاب کے روادار نہ تھے آج وہی لوگ اقتدار فوج کے حوالے ہو جانے پر بغلیں بجا رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں بے اصول ابن الوقتی اور موقع پرستی۔

صدارتی انتخاب کے پہلے دور میں صدر محمد موری اول نمبر پر اور سابق وزیر اعظم ریٹائرڈ جنرل محمد شفیق دوسرے نمبر آئے۔ مصری آئین کے مطابق چونکہ صدر کیلیئے ۵۰ فیصد رائے لازمی ہے اس لئے انتخاب کا دوسرا دور ہوا جس میں صرف دو امیدوار تھے اور اس مرتبہ صدر محمد موری کو ایک مہین اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی لیکن ایسا تو جارج بش کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ صدارتی انتخاب میں نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر سیکولر اور اشتراکی فکر کے حاملین نے جو اپنے آپ کو آمریت اور فوج کا مخالف گردانتے ہیں محمد موری کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا کر آمریت کے سابق فوجی آلۂ کار کو کامیاب کرنے کوشش کی لیکن ناکام و نامراد رہے اس کے باوجود ان لوگوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا۔ مصر کی عوام کو خوب پتہ تھا کہ آزادی و انصاف پارٹی کا تعلق اخوان

سے ہے اور وہ بار بار اس کی حمایت کر رہے تھے اس کے باوجود ان سیکولر لوگوں کا مطالبہ تھا کہ صدر اور پارلیمان اخوان کے بجائے ان سے رہنمائی طلب کرے جبکہ عوام نے انہیں پے درپے مسترد کر دیا تھا۔

پارلیمانی انتخاب سے قبل اچانک فوجی حکمرانوں کو اپنے غیر محفوظ ہونے کا اندیشہ لاحق ہو گیا اور انہوں نے دستور میں تبدیلی کرکے صدر مملکت کے بیشتر اختیارارت کو بلاواسطہ سلب کر لیا۔ اس دھاندلی کے خلاف سیکولر حضرات نے کوئی مظاہرہ اس لئے نہیں کیا کہ اس سے ان کے ازلی دشمن محمد موری کے حقوق پر گار پڑتی تھی۔ آگے چل کر کمال ہوشیاری سے صدر محمد موری نے فوجی کاؤنسل کے سربراہ حسین طنطاوی کو ان کے ساتھیوں سمیت سبکدوش کرکے سیاست کو فوج کے عمل دخل سے پاک کر دیا لیکن افسوس کہ حالیہ تبدیلی نے اس زبردست کامیابی پر پانی پھیر دیا اور پھر ایک بار فوج کو اقتدار کے گلیارے میں لے آئی۔

اس کے بعد عدلیہ نے حرکت میں آئی اس نے انتخابی قوانین کی خلاف ورزی کے نام پر ایوانِ پارلیمان کو معطل کر دیا۔ یہ اس قدر احمقانہ فیصلہ تھا جس کی کوئی حد نہیں۔ دستوری عدالت کے مطابق چند محفوظ حلقۂ انتخاب میں آئین کی خلاف ورزی ہوئی تھی اس لئے سارا انتخابی عمل باطل قرار دے دیا گیا حالانکہ اگر ایسا ہوا بھی تھا تو ساری پارلیمان کو معطل کرنے کے بجائے ان حلقوں میں

ضمنی انتخابات کروالئے جاتے لیکن یہ دراصل آئین سازی کو روکنے کی ایک گھناؤنی سازش تھی۔ چونکہ اس سے اسلام پسندوں کی اکثریت والی پارلیمان برخواست ہوتی تھی اس جمہوریت نواز سیکولر طبقے نے اس ظلم کی مخالفت کرنے کے بجائے اس کی جی بھر کے پذیرائی اور اسے عدلیہ کی برتری قرار دیا۔

صدر محمد موری نے اقتدار سنبھالنے کے بعد فوج کے ذریعہ کئے جانے والی دستوری ترمیمات کو صدارتی حکمنامے سے مسترد کرکے پارلیمان کو بحال کردیا۔ اس پر ہنگامہ کھڑا کردیا گیا۔ ان پر آمریت کا اور دستور کی پامالی کاالزام لگایا گیا۔ انہیں عدلیہ کا قاتل قراردیا گیا۔ عدلیہ نے اس حکم نامے کو غیر آئینی قرار دے دیا جس سے محمد موری نے بعد میں رجوع کرلیا۔ اس دوران فرسودہ فوجی آئین کو بدلنے کیلئے تیار کئے گئے نئے آئین کو پارلیمان میں پیش کیا گیا اور صدر محمد موری نے اس پر استصواب کرانے کا حکمنامہ جاری کردیا۔ اس پر پھر ایک بار ہنگامہ کھڑا ہوگیا کہ یہ پورے سماج کی نمائندگی نہیں کرتا۔ اس سے اسلامی شریعت کی بو آتی ہے۔ تحریر چوک پر پھر مظاہرے شروع ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ تحریر چوک پر ٹی وی کیمروں کے سامنے بڑی بڑی باتیں کرنے والے یہ لوگ اپنی عوام کو سمجھانے کیلئے کیوں نہیں گئے کہ یہ دستور ملک وقوم کیلئے نقصان دہ ہے اس لئے وہ استصواب میں اس کے خلاف رائے دیں؟ وہ لوگ اس مشقت طلب کام کو اس لئے بھی نہیں کرنا چاہتے

تھے اس میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس مرتبہ ۶۴ فیصد عوام کی اکثریت نے اس دستور کے حق میں رائے دی لیکن جمہوریت کے ان علمبرداروں نے عوام کی مرضی کو تسلیم کرنے سے پھر ایک بار انکار کردیا۔ اس طرح گویا چوتھی مرتبہ ان کی ہٹ دھرمی بنام جمہوریت پسندی عریاں ہو کر دنیا کے سامنے آگئی۔ بقول اقبال ؎

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

استصوابِ آئین کے بعد صدر موری نے نئے دستور کے تحت پارلیمانی انتخاب کا اعلان کیا ۔ یہ سب سے اہم مرحلہ تھااس لئے کہ اس کے بعد ہی اقتدار کی باگ ڈور سابق اہلکاروں اور فوجیوں سے نکل کر عوام کے نمائندوں کے ہاتھوں میں جانی تھی لیکن پے درپے پر تشدد احتجاج کے سبب انتخابات ملتوی ہوتے رہے اور وہ نوبت ہی نہیں آئی۔ اس التواء کے عمل میں مظاہرین اور عدلیہ نے سب سے اہم کردار ادا کیا اور ایک ایسے عوامی توثیق شدہ آئین کے تحت منعقد ہونے والے انتخاب کو ملتوی کرواتے رہے۔ حالیہ بغاوت (جس میں صدر موری کو بزورِ قوت معزول کرکے نظر بند کردیا گیا ہے) میں انہیں تینوں طبقات کا کردار نمایاں ہے۔ مظاہرین نے دباؤ بنایا فوج نے اقتدار پر قبضہ کرکے سابق آمریت کے اہلکار کو عدلیہ سے لاکر ملک کا کٹھ پتلی سربراہ بنا دیااور سب سے پہلا کام

یہ کیا کہ عوام کے منتخبہ صدر کے ساتھ ساتھ عوام کے توثیق شدہ دستور کو معطل کر دیا اس پر یہ اعلان کہ ۲۵ جنوری کو آنے والے انقلاب کی جانب یہ اہم ترین قدم ہے ۔سوال یہ ہے کہ کیا حسنی مبارک کو اس لئے اقتدار سے ہٹایا گیا تھا اس کی جگہ اسی کے ایک باجگزار جج کو فوج کٹھ پتلی سربراہ بنا کر قوم پر مسلط کر دے؟

تمرد نامی تحریک جس کے معنی باغی کے ہوتے ہیں اس تبدیلی میں پیش پیش رہی ۔اس کا دعویٰ ہے کہ صدر محمد موری کو ہٹا کر نیا انتخاب کروانے کے حق میں اس کے پاس دو کروڈ دس لاکھ دستخط ہیں جو موری کو حاصل ہونے والے ایک کروڈ تیرا لاکھ ووٹ سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے ۔اس کے جواب میں جب یہ تجویز آئی کہ کیوں نہ اس سوال پر استصواب کرا لیا جائے کہ کیا ابھی صدارتی انتخاب ضروری ہیں تو یہ لوگ خوفزدہ ہو گئے اور استعفیٰ کے مطالبے پر اڑ گئے بصورتِ دیگر سول نافرمانی پر اتر آئے۔ تاریخ انسانی میں یہ اولین مضحکہ خیز مطالبہ تھا جہاں دستخط کی بنیاد پر سربراہِ مملکت کا استعفیٰ طلب کیا جارہا تھا جبکہ دستخط تو ایک شخص دن بھر میں سو مرتبہ کر سکتا ہے لیکن ووٹ تو ایک ہی مرتبہ دے سکتاہے۔ اگر عوام کی اس قدر زبردست حمایت ان باغیوں کو حاصل تھی تو انہوں نے استصواب کی پیش کش کو کیوں قبول نہیں کیا؟ دو مراحل میں کام ہو جاتا پہلے میں فوراً انتخاب پر اتفاق ہوجاتا اور دوسرے میں ان کا اپنا

آدمی صدر بن جاتا لیکن کسی نے سچ کہا ہے جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لئے اسے منھ کے بل گرنے میں دیر نہیں لگتی۔ بقول شاعر

کتنے پانی میں ہوں میں جان گیا یہ پانی
اک جھجک نے ہی بھرم کھول دیا پانی پر

سوال یہ ہے چور دروازوں سے اقتدار کے مزے لوٹنے کا یہ کھیل آخر کب تک چلے گا؟ گزشتہ ڈیڑھ سال میں چار مرتبہ مصر کی عوام نے ببانگ دہل اس بات کا اعلان کیا کہ ان کی اکثریت سیکولرزم کے علمبرداروں کے ساتھ نہیں بلکہ اسلام پسندوں کے ساتھ ہے اور آئندہ جب بھی انہیں آزادانہ اظہار رائے کی آزادی ملے گی وہ اسی طرح اسلام کا پرچم بلند کریں گے۔ انقلاب کی راہ میں اس طرح کے نشیب وفراز آتے رہیں گے لیکن بالآخر فتح انہیں کی ہوگی۔ بقول حفیظ میرٹھی

ہر انقلاب کی تاریخ یہ بتاتی ہے
وہ منزلوں پہ نہ پایا جو رہگزر میں ملا

اے اہل مصر، دامن یوسف تو دیکھیے

تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی رہتی ہے لیکن اکثر واقعات ہو بہو رونما نہیں ہوتے ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ کبھی کبھار ان میں بلا کی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ امت محمدیہ کے اندر پہلی مسلح بغاوت کا ظہور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دوران رونما ہوا۔ اس وقت مدینہ منورہ کے علاوہ مسلمانوں کے طاقتور مراکز بصرہ، کوفہ، مصر اور دمشق ہوا کرتے تھے۔ اس مسلح بغاوت کے پس پردہ عبداللہ بن سبا کی ریشہ دوانیوں کا بڑا دخل تھا جس نے ان چاروں مقامات پر باغیوں کو منظم کرنے کی کوشش کرنے کے بعد آخر کار مصر میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اول الذکر تین مقامات پر اسے حواری میسر آگئے۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ مدینہ پر حملہ آور ہونے والے باغی دستے کی سب سے بڑی کمک مصر کے شہر بسطاس سے آئی تھی جو اب قاہرہ کا حصہ ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مصر کے گورنر عبداللہ ابی سرح جب اپنی فوج کے ساتھ خلیفتہ المسلمین حضرت عثمانؓ کی مدد کیلئے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے تو مصر میں محمد بن ابی حذیفہ نے بغاوت کرکے اپنی حکومت قائم کرلی گویا پہلی باغی حکومت بھی وہیں قائم ہوئی جس کا قلع قمع حضرت عمرو بن العاصؓ نے بعد میں کیا۔

حضرت عثمانؓ کے مسائل بھی محمد موری کی حکومت سے مشابہت رکھتے تھے مثلاً حضرت عثمانؓ کی حلم و بردباری انہیں مسلمانوں کے خلاف اقدام کرنے سے روکتی تھی۔ وہ اپنی جانب سے پہل کرکے مسلمانوں میں خون خرابے کے قائل نہیں تھے۔ یہ وہی رویہ تھا جو آدم کے بیٹے ہابیل نے اپنے ظالم بھائی قابیل کے مقابلے میں اختیار کیا تھا اور کہا تھا'' اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں''۔ مصر میں بھی یہی ہوا کہ اقتدار کے باوجود اخوان کے مختلف دفاتر بشمول قاہرہ کا مرکزی دفتر نذرِ آتش کردیا گیا لیکن اخوان نے جوابی کارروائی سے احتراز کیا۔ ذرائع ابلاغ میں جن واقعات کو موری کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان ٹکراؤ کا نام دیا جاتا رہا وہ دراصل اخوانی پرامن مظاہرین پر حملہ تھے اسی لئے اکثر و بیشتر شہید ہونے والے اخوانی کارکنان ہوا کرتے تھے۔ یہاں تک کے اخوانی رہنما خیراط الشاطر کے گھر پر بھی حملہ ہوا اور پولس اس میں شامل تھی۔ خیراط کی بیٹی خدیجہ کے مطابق ان کے گھر پر لگے کیمروں نے پولس حملہ آوروں کی تصاویر تک محفوظ کرلی ہیں۔ پیر کے دن پرامن مظاہرین پر شب خون مار کر ۳۴ کو شہید کردیا گیا۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلم حکومت مختلف سمتوں میں پھیل رہی تھی اور فوجوں کا ارتکاز دوردراز کے سرحدی علاقوں میں تھا۔ خفیہ بغاوت کے بعد فوجی دستوں کو پہنچنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔اخوان کا مسئلہ یہ تھا کہ ان حامی

مظاہرین دور دراز کے شہروں میں تھے۔ قاہرہ میں مخالفین زیادہ ہیں تیز جہاں تک فوج کا سوال ہے اس کی باگ ڈوران کے ہاتھ میں پہلے آئی ہی نہیں۔ مصر کی دستوری عدالت کا اصرار آج بھی منسوخ شدہ سابق فوجی آئین پر ہے۔ مصر میں عدلیہ کی بدولت ایوانِ پارلیمان معطل ہے اس لئے کسی عوامی نمائندے کو وزیر دفاع بنایا ہی نہ جاسکا مجبوراً فوجی کمانڈر وزیر دفاع بنا رہا جو موقع پاتے ہی باغیوں سے جا ملا۔ وزیر دفاع عبدالفتاح السیسی کو صدر موری نے غیر معمولی ترقی دے کر کمانڈر انچیف بنایا تھا اور اس نے بھی وہی کیا جو محمد بن حذیفہ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ کیا جبکہ اس کی پرورش حضرت عثمانؓ ہی نے کی تھی اس کے باوجود وہ باغیوں میں شامل ہو گیا تھا۔

فوج نے ویسے تو اعلان کیا کہ وہ کسی بھی فریق کی طرفداری نہیں کرے گی لیکن صدر محمد موری کو نظر بند کرنے کے بعد سب سے پہلے نہ صرف تمام اسلامی چینلس کو بند کروا دیا بلکہ الجزیرہ پر قفل بھی لگوادیا جسے آزادی و انصاف پارٹی کا ہمنوا سمجھا جاتا ہے جبکہ باغیوں کے تمام چینلس کو دن رات زہر اگلنے کی مکمل آزادی حاصل رہی۔ مخالفین میں سے جو گرفتار ہوئے تھے انہیں رہا کیا گیا جبکہ اخوانی رہنماؤں اور کارکنان کے خلاف نہ صرف وارنٹ نکالے گئے بلکہ ان میں سے کئی کو گھروں میں یا جیلوں میں نظر بند کردیا گیا جن میں مرشدِ عام بدعی اور شاطر شامل ہیں لیکن اخوان کیلئے یہ موسمِ جبر نیا نہیں ہے

انھوں نے اپنے اختیار کا استعمال کرتے ہوئے اس وادی میں قدم رکھا ہے بقول فیض

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

اس خلفشار کے دوران وزارتِ داخلہ کا رویہ بھی حیرت انگیز تھا۔ پولس پر تشدد باغیوں کا بال بیکا نہ ہونے دیتی تھی مگر اخوانیوں پر گولی چلانے سے بھی گریز نہیں کر رہی ہے۔ جو لوگ اسلام پسندوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ ناروادار ہیں یا تشدد میں یقین رکھتے ہیں انہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ شاید ایسا تاریخ میں پہلی بار ہوا ہو کہ حزب اقتدار جماعت کے دفاتر کو جلا کر راکھ کردیا گیا ہو اور پولس خاموش تماشائی بنی رہی ہو۔ قاہرہ یونیورسٹی کے احاطے میں جن آٹھ لوگوں کو شہید کیا گیا ان میں سے ایک کے بھائی کا بیان ہے کہ اس نے خود پولس کو اس کے بھائی کا سینہ چھلنی کرتے ہوئے دیکھا۔

ہندوستان میں تو یہ عام بات ہے مسلمان فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں کو گرفتار بھی کیا جاتا ہے لیکن اب مصر میں بھی یہی ہو رہا ہے کہ جن لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں پولس کا محکمہ ناکام رہا اب وہی ان کو گرفتار کرنے کے درپے ہے لیکن اگر یہ احمق ایسا سمجھتے ہیں کہ ان کی اس گیدڑ بھپکی سے اسلامی تحریک کمزور پڑ جائیگی تو یہ ان خوش گمانی ہے۔ اخوان تو

اس طرح کی آزمائش سے کندن بن کر نکلی ہے۔

مصر کی عدلیہ کو صدر محمد موری کا ہر فیصلہ دستور کے خلاف نظر آتا تھا لیکن اب سرے سے دستور ہی کا معطل ہو جانا درست نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرکے چیف جسٹس عدلی منصور کو ملک کا سربراہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ کس قدر دوہرا معیار ہے کہ اپنے نظریاتی حریف کا ہر قدم خلاف آئین اور خود اپنا دستور کو پامال بلکہ معطل کرکے سربراہ مملکت بن جانا بھی جائز۔ عدلی منصور ایوانِ زیریں تو پہلے ہی معطل کر چکے تھے نیا عہدہ سنبھالنے کے بعد انہوں نے منتخب شدہ شوریٰ کو برخواست کرکے اپنی جمہوریت نوازی کا ایک اور ثبوت پیش کر دیا۔ فوج کے ذریعہ سے صدر موری کو الٹی میٹم دیئے جانے کے بعد عدلیہ نے دو اہم فیصلے کئے ایک معطل شدہ پراسیکوٹر جنرل عبدالمقیط محمود کو بحال کرکے حسنی مبارک کی روح کو سکون پہنچایا اور پھر وزیر اعظم ہشام قندیل کو عدالت کا ایک فیصلہ نافذ نہ کرنے کے نتیجے میں ایک سال کی سزا سنا دی۔ وہ عدالت جو حسنی مبارک کے بے شمار بدعنوانیوں پر گزشتہ اٹھارہ ماہ میں کوئی ٹھوس اقدام نہ کر سکی اس نے بلا جھجک وزیر اعظم کو جیل بھیجنے کا فیصلہ کر ڈالا۔

عدلیہ کی دھاندلی کا سلسلہ ابھی تھما نہیں ہے بلکہ بحال شدہ پراسیکوٹر جنرل نے صدر موری اور دیگر اخوانی رہنماؤں کی تفتیش کے احکامات جاری کر دیئے

ہیں اور جو الزامات لگائے ہیں انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حسنی مبارک کا دور لوٹ آیا ہے۔ان حضرات پر ۲۰۱۱ء کے انقلاب میں تشدد بھڑکانے کا، پولس افسران کا قتل، مظاہرین کو قتل کرنے کیلئے حملہ آوروں کی فراہمی اور حسنی مبارک کی قومی جمہوری پارٹی کے دفتر کو نذر آتش کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ان پر حماس اور حزب اللہ کے ساتھ ساز باز کرنے کے بھی الزامات لگائے جارہے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اقتدار کے باوجود یہ سب نہیں کیا وہ اقتدار سے محرومی کے زمانے میں یہ سب کیسے کر سکتے تھے؟ نیز عدلیہ نے ان سنگین الزامات کو لگانے میں اس قدر تاخیر کیوں کی؟ صدر موری کے منتخب ہونے سے قبل بھی یہ کام ہو سکتا تھا۔ عدلیہ کے یہ الزامات سرزمینِ مصر پر حضرتِ یوسفؑ پر لگائے جانے والے بے سروپا الزامات کی یاد دلاتے ہیں جس کا بیان فیض احمد فیض اس طرح کرتے ہیں ۔

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر، وضعِ تکلف تو دیکھیے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامن یوسف تو دیکھیے

تحریر چوک کے مظاہرین نے نے ڈیڑھ سال قبل ملک سے آمریت کے خاتمے میں یقیناً ایک اہم کردار ادا کیا تھا مگر اب ان کی حالت سورہ نحل میں بیان

کردہ اس عورت کی سی ہو گئی جس نے رات بھر بڑی محنت سے سوت کاتا اور صبح آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یہ لوگ فوجی اقتدار کے دشمن تھے آج ان کی بدولت اقتدار بلاواسطہ فوج کے ہاتھ میں ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آمریت کے کل پرزوں کو اقتدار میں کوئی حصہ ملے لیکن فی الحال حسنی مبارک کے دست راست محمد شفیق کے حق میں فیصلہ کرکے اس کو صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کا موقع عطا کرنے والا جج سربراہ کی کرسی پر متمکن ہے۔ ویسے یہ مظاہرین محمد موری کے خلاف محمد شفیق کو کامیاب کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ گزشتہ اٹھارہ ماہ میں جمہوریت کی جانب پیش رفت کرتے ہوئے جو ایوان زیریں وایوانِ بالا وجود میں آئے تھے ان کا قلع قمع ہوگیا اور عوام کا تائید شدہ آئین برخواست کردیا گیا گویا ان باغیوں کی بدولت بات وہیں پہنچ گئی جہاں حسنی مبارک کے دور میں تھی۔

یہ مظاہرین اپنے آپ کو غیر سیاسی اور بنیادی انقلاب کا علمبردار کہتے ہیں۔ان لوگوں نے ازخود اپنے لئے باغی کی اصطلاح پسند کی ہے اور بزعمِ خود انسانی حقوق، آزادیٔ نسواں اور جمہوری اقدار کے پاسدار ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ السیسی کی تقریر سے نصف گھنٹہ قبل ان کے سب سے اہم رہنما مہا ابوبکر نے الاہرام اخبار کے نامہ نگار سے بات کرتے ہوئے اپنا سیاسی نقاب خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کردیا۔اس کے مطابق ان لوگوں نے مصری سوشیل

ڈیموکریٹک پارٹی کے بانی محمد غنیم کا نام وزیر اعظم کے طور پر تجویز کردیا ہے۔ اور دائیں بازو کے رہنما حسام عیسیٰ کو نائب وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور نائب وزیر اعظم اسلامی فکر کا حامل بھی ہوسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امید ظاہر کی صدر موری کے اقتدار سے بے دخل ہوجانے کے بعد ان تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جائیگا۔ یہ اعلان دراصل اس بات کا اعتراف ہے باغی مظاہرین غیر سیاسی نہیں ہیں۔ اور ساتھ اس بات کی چغلی بھی کھاتا ہے کہ باغی فوجی اور باغی مظاہرین کے درمیان اندرونی سانٹھ گانٹھ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رابطے میں ہیں اور اقتدار کا گاجر دکھلا کر جنرل عبدالفتاح السیسی نے ان کا استحصال کیا ہے۔ یہ احمق اس بات کو بھول گئے کہ انتخاب میں سیکولر فکر کی حامل ساری جماعتوں میں سے کسی ایک کو بھی ۸ فیصد سے زیادہ ووٹ نہیں ملے۔ ان میں بیچارے اشتراکی تو ۲ فیصد ووٹ بھی حاصل نہ کرسکے لیکن اب انہیں وزیر اعظم کے ساتھ ساتھ ایک نائب وزیر اعظم بھی چاہئے اور جن اسلام پسندوں نے ۷۱ فیصد ووٹ حاصل کئے ان کیلئے دو میں سے ایک نائب وزیر اعظم ۔ کیا اسی کا نام جمہوری اقدار کی پاسداری ہے؟

انسانی حقوق کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مظاہرین کی زبان سے پولس کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کی ہمدردی میں ایک لفظ نہ نکلا بلکہ انہوں نے پولس کارروائی کو جائز قرار دیتے ہوئے مہلوکین کو اپنی موت کا ذمہ دار قرار دے دیا اور اخوان

کے دفتر کا نذرِ آتش ہونا بھی جائز ٹھہرا دیا۔ اظہار رائے کی آزادی کیلئے گلا پھاڑنے والوں کے نزدیک چار چار ٹی وی چینلس کی نشریات کا بند کردیا جانا بھی قابلِ اعتراض نہیں تھا۔ اسلام پسندوں پر ان کا سب سے بڑا لزام یہ ہے کہ وہ آزادیٔ نسواں کے خلاف ہیں ۔ حقوق انسانی کی بین الاقوامی تنظیم نے اپنے انکشاف میں ان کی اس روشن خیالی پر بھی کالک پوت دی۔ ہیومن رائیٹس واچ کے مطابق ۳۰ جون سے شروع ہونے والے مظاہروں کے دوران تحریر چوک پر ۹۱ خواتین کے ساتھ بدسلوکی کے واقعات رونما ہوئے جن میں کچھ کی آبرو ریزی بھی ہوئی۔ اتفاق سے اس بار اسلام پسند تحریر چوک پر نہیں بلکہ نصر سٹی اور قاہرہ یونیورسٹی میں تھے ورنہ ان کو موردِ الزام ٹھہرا دیا جاتا۔
دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں بھی لاکھوں مظاہرین میں خواتین شامل تھیں لیکن ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا اس سے یہ ظاہر ہوگیا کہ آزادیٔ نسواں کے ان علمبرداروں کے قول وعمل میں کیسا تضاد ہے؟
صدر مورسی کی برطرفی پر جو بین الاقوامی ردعمل سامنے آیا وہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ مغرب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جمہوریت کا حامی اور فوجی آمریت کا مخالف ہے اسی کے ساتھ لادینیت کا علمبردار اور اسلام کا دشمن ہے۔اب اگر جمہوریت کی بقاء کیلئے مورسی کی حمایت کی جائے تو اسلام کی حمایت ہو جاتی ہے۔لادینیت کے فروغ کیلئے اسلام کی مخالفت کی جائے تو آمریت کی حمایت ہو

جاتی ہے۔اس لئے یوروپ اور امریکہ میں ذرائع ابلاغ نے تو اسے فوجی بغاوت کہا مگر حکومتوں نے بغاوت کے الفاظ استعمال کرنے سے گریز کیا۔امریکہ کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر مصری فوج کی امداد جاری رکھنا چاہتا ہے تاکہ اسرائیل کو اس سے کوئی خطرہ نہ ہو۔اب اگر فوج کی یہ حرکت تسلیم کرلی جائے تو فوجی امداد بند کرنی پڑ سکتی ہے اس لئے اوبامہ نے گول مول باتیں کرکے دنیا کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔

حیرت کی بات یہ ہے امریکہ کے سب سے بڑے دشمن ایران نے بھی یہی کیا۔ابتدا میں جاری ہونے والا ایرانی وزارت خارجہ کا بیان تو اس قدر مبہم تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کیا کہا گیا ہے۔جمعہ کے خطبوں میں ایران کے کئی جید علماء نے موری کے ہٹائے جانے کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے انہیں اسرائیل کا ہمنوا تک کہہ دیا۔ایسا کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آگئی کہ صدر موری نے شام کے مسئلے پر ایران سے اختلاف کیا تھا۔جس بشارالاسد کی خاطر ایران صدر موری سے ناراض ہے اس نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ یہ اعلان کردیا کہ یہ اسلامی سیاست کی ناکامی ہے اور اس کی بھی پرواہ نہیں کی اس کا اقتدار اسلامی سیاست کے علمبردار ایران کی حمایت پر قائم ہے۔شاید بشارالاسد اس حمایت کو ایران کی مجبوری سمجھنے لگا ہے۔بشار الاسد مصر میں ہونے والی تبدیلی کو محمد موری کی امریکہ نوازی پر محمول کرسکتا تھا لیکن اس نے اسے لائحہ

عمل کی غلطی بتلانے کے بجائے نظریاتی شکست قرار دے کر اپنی اسلام دشمنی کی شہادت دے دی۔ ایران کو چاہئے کہ وہ بشار الاسد کے اس بیان کی روشنی میں اپنے موقف پر نظر ثانی کرے اس لئے کہ کل کو اگر خدا نخواستہ ایسی صورتحال ایران میں پیدا ہو جائے جس کا کوئی امکان نہیں ہے تو بشار الاسد ایران پر بھی یہی تبصرہ چسپاں کردے گا کہ اسلامی سیاست کا بالآخر یہی انجام ہوتا ہے۔

صدر موری کی معزولی کے تیسرے دن ایرانی وزارت خارجہ کا وہ بیان سامنے آیا جس کی توقع کی جارہی تھی۔ ایران کے ترجمان عباس ارگاشی نے فوج کے ذریعہ عوام کے منتخب شدہ صدر کی معزولی کو غیر درست قرار دیا لیکن فوجی بغاوت کے الفاظ انہوں نے بھی استعمال نہیں کئے۔ انہوں نے کہا صدارت کا فیصلہ سڑکوں پر نہیں ہو سکتا۔ صدر موری کے حامیوں سے انہوں نے کہا کہ انہیں بحالی کی جدوجہد جاری رکھنی چاہئے۔ اسلام پسندوں اور انقلابیوں کو بددل نہیں ہونا چاہئے۔ عرب بہار کے ساتھ گرما و سرما کے موسم بھی آسکتے ہیں۔ اسی طرح تیونس کے راشد غنوشی نے کھل کر فوجی کارروائی کی پرزور تنقید کی اور صدر موری کی بحالی کا مطالبہ کیا۔

اسرائیل کے بارے میں مغرب کا دعویٰ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں حقیقی جمہوری ملک وہی ہے لیکن اس کے وزیر اعظم نے اپنے پڑوس میں ہونے والے جمہوریت کے قتل عام

پر چپی سادھ لی۔ وزیراعظم نتن یاہو کی قریبی رکن پارلیمان زاہی ہنیگبی نے جو دفاع و خارجہ امور کی پارلیمانی کمیٹی کے سربراہ ہیں صدر موری کی برخواستگی پر اطمینان و خوشی کا اظہار کیااور کہا موری کے دور میں ہونے والی پیش رفت ہمارے لئے تشویش کا سبب تھی لیکن اب سیکولر نظریات کی حامل فوج کا اقتدار پر قابض ہو جانا ہمارے لئے اچھی خبر ہے۔ مصر میں اسرائیل کے سابق سفیر اسحٰق لیفانوف نے بھی فوج کے اقدام کو مثبت قرار دیا۔ یہ بیانات صدر موری پر اسرائیل نوازی کے الزامات کی تردید کیلئے کافی ہیں لیکن مختلف اسلامی ممالک مثلاً سعودی عرب، کویت اور عراق نے آگےبڑھ کر نئے سربراہ کو مبارکباد کا پیغام روانہ کردیا جو بلاواسطہ فوج کی تائید تھی۔ ان سب کا ایسا کرنا حسب توقع تھا لیکن قطرکے نئے سربراہ نے بھی اس صف میں شامل ہو کر چونکا دیا اور واضح کردیا کہ اب ہوا کا رخ بدل رہا ہے۔ مسلم ممالک کے اندر پائی جانے والی تذبذب کی کیفیت غالب کے اس شعر کی مصداق ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسہ مرے آگے

اس موقع پر جبکہ مسلم ممالک کا یہ حال تھا کہ کوئی امریکہ کی دشمنی میں تو کوئی امریکہ کی دوستی میں حق گوئی سے کترا رہا تھا سب سے واضح موقف ترکی نے اختیار کیا۔پہلے تو ترکی وزارت خارجہ نے فوج پر تنقید کی ۔ پھراس کے بعد

ترکی پارلیمان نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کر کے فوج کے اقدام کو غلط قرار دیا اور مطالبہ کیا کہ آئین بحال کیا جائے نیز اقتدار عوام کے نمائندوں کو دوبارہ سونپ دیا جائے۔ ترکیوں کیلئے اس موقف کا اختیار کرنا اس لئے بھی آسان ہو گیا کہ وہ خود ان مصائب سے گزر چکے ہیں ۱۹۹۰ء میں اربکان کی آئینی حکومت کو فوج نے اسی طرح بے دخل کر دیا تھا لیکن آگے چل کر فوج کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ یوروپ، امریکہ اور اقوام متحدہ تو گومگوں کی کیفیت میں مبتلا رہے لیکن افریقی یونین نے نہایت جرأتمندانہ فیصلہ کرتے ہوئے مصر کی رکنیت کو معطل کر دیا۔ ان لوگوں نے کوئی سیاسی وجہ بتانے کے بجائے دستور کی منسوخی اور منتخبہ صدر کی بے دخلی کو اس کیلئے ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ جب تک دستور بحال نہیں ہو جاتا اور اقتدار عوام کے نمائندوں کو سونپا نہیں جاتا اس وقت مصر کی رکنیت بحال نہیں ہوگی۔ افریقی یونین کا یہ موقف ان تمام لوگوں کیلئے تازیانۂ عبرت ہے جو حق و انصاف پر اپنے قومی و نظریاتی مفاد کو فوقیت دیتے ہیں۔

اخوان کو فی الحال دشمنوں کے ساتھ دوستوں کی مخالفت کا سامنا ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اسی سرزمینِ مصر پر حضرت یوسفؑ کو نہ ان کے بھائیوں رقابت کوئی نقصان نہ پہنچا سکی اور نہ عزیز مصر کی زیادتی ۔۔برادرانِ یوسف نے انہیں یہ

سوچ کر اندھے کنوئیں میں ڈال دیا تھا کہ اب وہ اندھیرے کی نذر ہو جائیں گے یا کوئی دور دراز کا قافلہ انہیں غلام بنا کر لے جائیگا لیکن وہ بیچارے اس بات سے ناواقف تھے کہ ان یہی حرکات حضرت یوسفؑ کو مصر کے اقتدار پر فائز کرنے کی راہ ہموار کرے گی۔ عزیز مصر نے یہ سوچ کر انہیں پابندِ سلاسل کیا تھا کہ ایسا کرنے سے زلیخا کا گناہ چھپ جائیگا لیکن کون جانتا تھا کہ وہ جیل سے سیدھے دربار میں جائیں گے اور مصر کا اقتدار ان کے قدموں میں ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بقول حکیم الامت علامہ اقبال ؒ

ولایت ، پادشاہی ، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

"سرزمینِ مصر جہاں "نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

اس سال کا ۱۷ رمضان پھر ایک بار سرزمینِ مصر میں یوم الفرقان بن گیا اور ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ نمازِ عشق تلواروں کے سائے میں کس طرح ادا کی جاتی ہے۔ ۳ جون کو صدر محمد موری کی گرفتاری کے بعد احتجاج کا ہونا ایک فطری امر تھا۔ فوجی بغاوت کے خلاف پر امن مظاہرین کے خلاف جبر استبداد کی ابتداء ۵ جولائی کو ہوئی جب ۳۷ اخوانیوں کو شہید کر دیا گیا۔ اس وقت تک چونکہ اسلام دشمن مظاہرین بھی مصر کی سڑکوں پر جشنِ فتح منا رہے تھے اس لئے اس خون خرابے کو مخالف مظاہرین کی جھڑپ کا نام دیا گیا۔ فوجی حکمرانوں اور ان کے سیکولر واشتراکی حوارین کی جانب سے یہ اہل ایمان کو ڈرانے کی اولین کوشش تھی ۔ اخوان کے کارکنان اور رہنماؤں کو خوفزدہ کرنے کی خاطر ان حملوں کے پس پردہ یہ پیغام نشر ہو رہا تھا کہ اب تمہاری تعذیب و آزمائش کا دور پھر ایک بار شروع ہو چکا ہے بقول احمد فراز

میرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں میرے گرد لشکری اُس کے
فصیل شہر کے ہر برج، ہر مینارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

تو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کہ نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو، تو غیرت کو راہ میں رکھ دو

اخوان کے مظاہرین پر حملوں بنام جھڑپوں کے بعد انتظامیہ کا خیال تھا کہ وہ حزن و یاس کا شکار ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ ایک ہفتہ بعد ماہِ رمضان کی عبادتوں اور ریاضتوں میں یہ سیدھے سادے دیندار مصروف ہو جائیں گے اور سارا معاملہ رفع دفع ہو جائیگا لیکن ایسا نہ ہوا۔ سیکولر مظاہرین جو بغض معاویہ میں خود اپنے پیر پر کلہاڑی مار چکے تھے شاداں و فرحاں گھر لوٹ گئے مگر اخوانی قاہرہ کے دو مقامات احتجاجی دھرنا لگا کر بیٹھ گئے۔ سیکولر حضرات کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ حسنی مبارک کے بدعنوان اور ظالمانہ طرز حکومت سے بیزار تھے اور یہ سمجھتے تھے کے اس کے اقتدار سے بے دخل ہو جانے کی صورت میں استحصال کا خاتمہ ہو جائیگا نیز اقتدار کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آجائیگی ۔ اقتدار پر قابض ہونے کیلئے ان لوگوں کے سامنے انتخاب کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا اس لئے کہ بصورتِ دیگر حسنی مبارک کے بعد فوجی سربراہ طنطاوی اقتدار سنبھال چکے تھے اور حسنی مبارک کا ایک دست راست وزیر اعظم بنا ہوا تھا۔

غیر اسلامی جماعتیں اس حقیقت سے ناواقف تھیں کہ انتخاب کا مطالبہ کرنے اور اس کی خاطر بڑے بڑے مظاہرے کرنا اور بات ہے اور الکشن میں کامیابی حاصل کرنا کارِ دیگر است۔ انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے عوام کا اعتماد حاصل کرنا پڑتا ہے نیز عوام کو اپنے نظریات وخدمات سے مطمئن کئے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔ الّا یہ کہ انتخاب دولت جذباتیت یا ذات پات کی بنیاد پر لڑے جائیں ۔ایسا دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت، ہندوستان اورامریکہ میں تو ہوتا ہے لیکن گزشتہ سال مصر میں نہیں ہوسکا۔ مصر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ غیر جانبدار انتخابات کا انعقاد ہوا۔ اس حقیقت کو تمام بین الاقوامی مبصرین نے تسلیم کیا اور اس بار مصر کی عوام نے ان اسلام پسندوں کو اکثریت سے نوازدیا جنہیں گزشتہ ۸۰ سالوں سے تعذیب تشدد کا شکار کیا جاتا رہا تھا مگراس کے باوجودوہ عوام کی خدمت سے یکسر غافل نہیں ہوئے تھے۔

عوام کے فیصلے کو جمہوریت کے علمبردار نام نہاد روشن خیال لوگ کشادہ دلی کے ساتھ قبول نہ کرسکے اور پسِ پردہ سازشوں کا آغاز ہوگیا۔ عدالت نے انصاف کو سولی پر چڑھاتے ہوئے ایوانِ زیریں کو برخاست کردیا۔ سیکولر حضرات نے اس جبر واستبداد کی داد دی اس لئے کہ جس ایوان کو معطل کیا گیا تھا اس میں وہ اقلیت میں تھے۔اس کے بعد صدارتی انتخاب ہوئے اس میں سیکولر قوتوں نے اسلام پسندوں

کے خلاف حسنی مبارک کے دست راست سابق فوجی محمد شفیق کی حمایت کی اور اس کو کامیاب کرنے میں بھی ناکام رہے۔ یہ انتخاب دو مراحل میں ہوئے تھے اور دونوں مرتبہ سب سے زیادہ رائے اسلام پسندوں کے حق میں آئی۔ اس کے بعد دستور سازی کے عمل میں رکاوٹ پیدا کرنے کیلئے ان لوگوں نے استعفیٰ دے کر کنارہ کشی اختیار کی لیکن ان کے عدم تعاون کے باوجود جب دستور بن گیا اور اس پر استصواب رائے ہوا تو پھر ایک بار یہ لوگ اس کے خلاف میدان میں کود پڑے اور عوام نے ۶۵ کے مقابلے ۳۵ فیصد ووٹ سے انہیں شکستِ فاش سے دوچار کردیا۔

مصر کے خود سر اور خوشحال نام نہاد روشن خیال طبقہ اپنی یکے بعد دیگرے چوتھی ناکامی کے بعد جمہوری عمل اور عوام کے اعتماد سے مکمل طور پر مایوس ہوگیا۔ اب اس کے ایک جانب اخوان کی اونچی چوٹی تھی جس کو عبور کرنا ان کیلئے ناممکن تھا اور دوسری جانب فوجی سپہ سالاروں کی کھائی تھی ۔ ان لوگوں نے حب علی میں نہیں بلکہ بغض معاویہ میں اس گہری کھائی میں کود کر خودکشی کرنے کا احمقانہ فیصلہ کیا جس میں سے باہر آنے کیلئے قوم مصر کو ساٹھ سال کا عرصہ لگا تھا۔ اسلام کے خلاف اشتراکیوں نے امریکیوں کے ساتھ ساز باز کی اور خلیجی و امریکی دولت سے ذرائع ابلاغ کو خرید لیا۔ قبطی عیسائیوں اور مغرب زدہ مسلم عوام کو ایک نادیدہ خطرے سے دہشت گردہ کرکے ۳۰ جون کو احتجاج کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔ انٹرنیٹ پر اس دولت کی تمام تفصیلات موجود ہیں جو

بیرونِ مصر ممالک سے ایک منتخب شدہ جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے فراہم کی گئی۔ عوام کو احتجاج میں شامل کرنے کیلئے بھی دولت بے دریغ استعمال کیا گیا جس کے شواہد یو ٹیوب پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

عوامی احتجاج کا بہانہ بنا کر فوج اقتدار میں آگئی اور اس کے پر مسلم دنیا اور مغربی دنیا کے بیشتر ممالک نے اظہارِ اطمینان کیا۔ فوج نے عدالت کے چاپلوس ہمنواؤں اور انتخاب کی بساط پر پِٹے ہوئے مہروں کی مدد سے ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کردی اور ذرائع ابلاغ نے یہ بتانا شروع کردیا کہ آزادی و انصاف پارٹی کو پچاس فیصد سے کم ووٹ حاصل ہوئے گویا پچاس فیصد سے زیادہ لوگ اس کے مخالف تھے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اخوان کے علاوہ بھی سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی النور پارٹی ان کے حامی تھی۔ اس کے برعکس جن اشتراکیوں کو وزارتوں سے نوازہ گیا تھا وہ تو بیچارے مجموعی طور پر پانچ فیصد عوام کا اعتماد بھی حاصل نہ کرسکے تھے اس کے باوجود جمہوریت کی بحالی کے نام پر فوج کی مدد سے انہوں نے اقتدار پر ناجائز طریقے سے ہاتھ صاف کرلیا۔

شاعری کو نثر پر اس معاملے میں فوقیت حاصل ہے کہ وہ مختلف و متضاد حالات پر باآسانی چسپاں ہو جاتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے فوجی استبداد کے خلاف جو نظم احمد فراز نے کہی تھی ایک مصرعے کی ترمیم کے ساتھ کہ ’’تمام صوفی و سالک، سبھی شیوخ و امام‘‘ کی جگہ ’’جو کامریڈ تھے سرمایہ دار کے دشمن‘‘مصر کی موجودہ

ے صورتحال پر من و عن صادق آتی ہے

جو کامریڈ تھے سرمایہ دار کے دشمن
امیدِ لطف پہ ایوانِ کجکلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں
تم اہلِ حرف کے پندار کے ثنا گر تھے
وہ آسمانِ ہنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اس قدر تھا کہ دربار سے بلاوا تھا
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں
قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تمھارے ساتھ ہے کون؟ آس پاس تو دیکھو

اخوانیوں کو ڈرانے دھمکانے کی اولین کوشش جب ناکام ہو گئی تو مغرور حکمرانوں کا خون کھول گیا چونکہ وہ رمضان کی آمد سے قبل کسی طرح معاملے کو رفع دفع کردینا چاہتے تھے اس لئے ۸ جولائی کی صبح نمازِ فجر کے وقت حکوت کے غنڈوں نے پولس والوں کی مدد سے پرامن مظاہرین پر شب خون مارا اور ۵۲ اہلِ ایمان کو شہید کردیا جبکہ وہ نمازِ فجر میں راب کائنات کے آگے دست بستہ تھے ۔ اس کے بعد طرح طرح کے الزامات کا سلسلہ دراز کیا گیا۔ کسی نے کہا مظاہرین نے پولس

پر فائرنگ کی اور ۸ پولس اہلکار زخمی ہوئے لیکن اس کی کوئی تصدیق نہ ہو سکی۔ پھر کہا گیا مظاہرین نے عوام پر حملہ کیا لیکن اس وقت عوام اپنے گھروں میں سو رہی تھی جب مظاہرین کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ مظاہرین صدر مورسی کو رہا کرنے کیلئے پیشقدمی کر رہے تھے جب کہ ان کی رہائش ہنوز پردۂ راز میں ہے۔اس قتل عام کے بعد بھی بین الاقوامی سطح پر کوئی پراسرار خاموشی چھائی رہی لیکن یہ مذموم کوشش بھی خدائے واحد پر کامل بھروسہ اور توکل کرنے والے مظاہرین کے حوصلے پست کرنے میں ناکام رہی۔

ماہِ رمضان کا آغاز ہوا۔ اس ماہِ مبارک نے اخوانیوں کے جذبۂ شہادت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا اور احتجاج کا سلسلہ زور شور سے جاری و ساری رہا۔دن میں روزہ۔شام میں احتجاج اور رات میں قرآن، روح جہاد کی افزونی کا بہترین انتظام تھا۔ ساری دنیا نے دیکھ رہی تھی کہ ''دن کے شہسوار اور رات کے راہب کیسے ہوتے ہیں'' ۔ اخوانیوں کی دلیری دیکھ کر فوجی دہشت گرد ٹولہ خود دہشت زدہ ہوگیا۔نہ دھمکیاں کسی کام آ رہی تھیں اور نہ رہنماؤں کی گرفتاری کا ان پر کوئی اثر ہو رہا تھا۔ اخوانیوں کی غیر معمولی صبر و استقامت نے بالآخر اپنا رنگ جمانے لگی ۔ ایک جانب بین الاقوامی رائے عامہ ان کے حق میں ہموار ہونے لگی تو دوسری طرف مصری عوام کے دل میں دن بدن ان کے تئیں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ اس سال ۱۷ رمضان یعنی غزوۂ بدر کا دن اتفاق سے جمعہ

تھا۔ اخوان نے اس موقع پر ملک گیر سطح پر احتجاج کا اہتمام کیا جو نہایت کامیاب رہا۔
اخوان المسلمون کی جوانمردی کا نظارہ اگر احمد فراز کے لہجے میں بیان کیا جائے تو وہ کچھ اس طرح ہو۔

میرا قلم نہیں پرچم کسی ستمگر کا
جو دین حق کے مقابل بلند ہوتا ہے
میرا قلم نہیں کرتا کسی کو لال سلام
وہ ظلم و جبر کے دریا پہ بند ہوتا ہے
میرا قلم نہیں موقع پرست، ابن الوقت
میرا دہن نہیں وردی کے تلوے چاٹتا ہے
میرا قلم نہیں حرص و ہوس کا دلدادہ
جو بیج بوتا ہے نفرت کے رشتے کاٹتا ہے
(احمد فراز کی روح سے معذرت کے ساتھ)

ان مظاہروں نے حکمرانوں کی نیند حرام کردی اور ان لوگوں نے خودکشی کا فیصلہ کر ڈالا۔
رمضان کی صبح فجر سے قبل ایک دہشت گرد تنظیم بلیک بلاک کی مدد ۱۸

سے پر امن مظاہرین پر تہجد کے وقت حملہ بول دیا گیا۔ اس تنظیم کے یوسف علی نے حقوق انسانی کی اذیت رسانی پر نظر رکھنے والی تنظیم "آئی آن ٹارچر" کے سامنے اعتراف کیا ان کے لوگوں نے مظاہرین پر گولیاں برسائیں۔ اس حملے میں سو سے زیادہ اخوانیوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور ان قیاس آرائیوں کو غلط ثابت کر دیا کہ قتل وخون سے خوفزدہ ہو کر اخوانی راہِ فرار اختیار کرلیں گے۔ نصر شہر کے مناظر نے ٹیلی ویژن کے پردے پر اور اخبارات کے صفحات میں ناظرین کے دلوں کو دہلا دیا لیکن اخوان مظاہرین کے حوصلے پست نہ کرکے شہادت کے جیالے آرزومندوں نے ساری دنیا کو بتلا دیا کہ ان کے نعرے "شہادت ہماری آرزو ہے" مطلب کیا ہوتا ہے۔ اخوانیوں کی اس صفتِ عالیہ کا اظہار ان کے اقتدار سے محرومی کا متقاضی تھا اور ان لوگوں زبانِ حال سے یہ ثابت کردیا کہ

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

مجاہدین اسلام آزمائش کی ان نازک ترین گھڑیوں میں حم السجدۃ کی آیت کی زندہ تفسیر بن گئے جن میں رب کائنات اپنے مقرب بندوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے "جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ

ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اِس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہو گی۔ یہ ہے سامان ''ضیافت اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے

یقیناً کامیاب ہو گئے وہ لوگ جنھوں نے جانِ عزیز کا ندرانہ پیش کر کے اپنے رب کو راضی کر لیا اور جنت کے حقدار بن گئے لیکن ان کی اس قربانی کے ساتھ ہی رحمت خداوندی جوش میں آ گئی اور ہوا کا رخ بدلنے لگا۔

(جاری)

مصر: روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

۲۷ جولائی کی صبح قاہرہ کے نصر شہر میں ہونے والا قتل عام مصر کا ٹیٹانمن ثابت ہوا اوراس کی پرزور مذمت اندرون و بیرونِ مصر شروع ہو گئی۔ اقوامِ متحدہ نے اس کا نوٹس لیااوریوروپین یونین کی وزیر خارجہ نے مصر کا دورہ کیا۔ مصرکے اندر کام کرنے والی حقوق انسانی کی تنظیموں نے نہ صرف غیر جانبدارانہ تحقیق و تفتیش بلکہ بدمعاش وزیر داخلہ کو برخاست کرکے کیفرِ کردارتک پہنچانے کا مطالبہ کرڈالا۔ یہاں تک کہ اخوان کے کٹر مخالفین کو اس کی مذمت پر مجبور ہونا پڑالیکن اس کے باوجود مصری حکمرانوں کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ ان لوگوں نے اخوان کو بزورِ قوت کچلنے کی ایک نئی سازش رچی۔ اس کیلئے ایک طرف تو وزیر داخلہ نے دھمکیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ عوام کے اعتراض کا ہوآ کھڑا کیاگیا۔ عدم استحکام پھیلانے کا الزام لگایا گیا اورذرائع ابلاغ میں اخوانیوں کو دہشت گرد کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس لئے کہ دورِ حاضر میں کسی کا ناحق قتل کرنے کیلئے اس معصوم کو دہشت گرد ٹھہرا دینا کافی ہے۔

اس دوران صدر محمد مورسی کے خلاف طرح طرح کے مضحکہ خیز الزامات لگائے گئے جن میں سب سے اہم حماس کے ساتھ سازباز کرنے کا الزام تھا۔ اسے دہشت گردوں

کی پشت پناہی اور ان کی مدد سے مصر میں دہشت گردی کے فروغ کی سعی قرار دیا گیا حالانکہ نہ حماس دہشت گرد ہے اور نہ اس سے تعلقات کی بحالی کا دہشت گردی سے کوئی سروکار ہے بلکہ وہ تو اسرائیلی دہشت گردی کو لگام لگانے کی کوشش ہے۔ صدر موری پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ ۲۵ دسمبر کو برپا ہونے والے انقلاب کے وقت وہ جیل توڑ کر فرار ہوگئے تھے۔ دنیا بھر میں انقلاب سے قبل گرفتار ہونے والے کو ہیرو قرار دیا جاتا ہے اور اس کی تکمیل کیلئے جیل کی سلاخوں کو توڑ کر باہر آنے والوں کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے لیکن مصر میں اس کے برعکس ایسا کرنے والے سابق صدر قابلِ گردن زدنی ٹھہرا۔

اس طرح گویا موجودہ انتظامیہ نے حسنی مبارک کے تاریک دور میں موری جیسے قیدیوں کی گرفتاری کو جائز قرار دے دیا جو اپنے آپ میں حسنی مبارک کے نامبارک دور کے ابتداء کا بلاواسطہ اعلان تھا۔

صدر محمد موری پر اپنے زنداں کے ساتھیوں کو قتل کرنے کی سازش رچانے کا بھی الزام جڑ دیا گیا۔ اب بھلا ایک انقلابی اپنے دوسرے ہم نفس انقلابیوں کو کیوں ہلاک کرے گا؟ اس سوال کا جواب انتظامیہ کے پاس نہیں تھا۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے اسلام مخالف جماعتوں پر غیر آئینی راستوں سے باہر کی دولت سمیٹنے کے ثبوت تو ان کے اقتدار میں آنے سے قبل ہی سامنے آگئے لیکن صدر محمد موری پر بدعنوانی کا ایک جھوٹا الزام بھی نہیں لگایا جاسکا۔

دہشت گردی کی ہوا بنانے کے بعد وزیر دفاع اور نائب وزیر اعظم عبدالفتاح السیسی نے ایک ۲ اگست کے دن مظاہرے کا اعلان کیا تاکہ عوام اس اقدام کے ذریعہ دہشت گردی سے نبٹنے بمعنی اخوان کو کچلنے کی توثیق کرے۔ وزیر دفاع اور فوجی سربراہ کا کام بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور اس کام کیلئے اسے کسی توثیق کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اپنے فرض منصبی سے روگردانی کرتے ہوئے اس نے اندرونِ ملک پرامن مظاہرین کے خلاف کارروائی کرنے کیلئے عوام کی توثیق طلب کی جو اپنے آپ میں ایک دلچسپ سیاسی تماشہ فیصلہ تھا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے نائب صدور یا وزیراعظم خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے اور فوجی جنرل جلسے جلوس منعقد کروا رہا تھا۔ ذرائع ابلاغ میں پہلے اس طرح کی ہوا گرم کی گئی کہ ان مظاہروں میں شامل پولس اہلکار اخوانی مظاہرین پر حملہ بول دیں گے اور انہیں تتر بتر کردیں گے لیکن اخوان اس پرپگنڈے سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ انہوں اس کے خلاف اپنے مظاہروں کا اعلان کردیا اور السیسی کے مظاہرے والے دن قاہرہ شہر میں ۴۲ مقامات سے جلوس نکلے اس کے علاوہ ملک بھر میں اخوانیوں نے فوج کی دھاندلی کو بھرپور طریقے پر چیلنج کیا اور ستمگروں کی ہوا اکھاڑ دی۔ بقول شاعر ؎

بڑے ادب سے غرورِ ستمگراں بولا

جب انقلاب کے لہجے میں بے زباں بولا

قومی و بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے السیسی کے مظاہرے کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا جس میں ناچنے گانے والے لوگوں کی مدد سے عوام کو بلایا گیا تھا۔ اس تحریر چوک پر جہاں کل تک پولس اور فوج کے خلاف شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا ۲ اگست کو مظاہرین فوجیوں اور پولس والوں کے ساتھ تصویر کھنچوا رہے تھے۔ گویا کہہ رہے ہوں ہم ساتھ ساتھ ہیں۔ السیسی کی تصاویر والے پوسٹر اور بلّے مفت تقسیم کئے جارہے تھے۔ یہ اپنی مقبولیت کو مصنوعی طریقے سے بڑھانے کی ایک بھونڈی کوشش تھی۔ اس بیچ بے اختیار کارگذار صدر نے اپنے اختیارات پارلیمان کو سونپے اور پارلیمان نے وزیر داخلہ کو جو حسنی مبارک کے زمانے کی بدنام زمانہ پولس فورس کو بحال کرنے کا اعلان کرچکا تھا دہشت گردوں سے نبٹنے کا کام سونپا گیا لیکن اس وقت تک کافی دیر ہوچکی تھی۔

یوروپی یونین کی وزیر خارجہ کا دوسری مرتبہ مصر کا دورہ اور اس میں صدر موسی سے ملاقاتنے سیاسی منظر نامے کی تبدیلی کا اعلان کیا۔ اس کے بعد جرمنی کے وزیر خارجہ نے موسی سے ملاقات کی اجازت طلب کی جسے مصری حکمرانوں نے مسترد کردیا لیکن امریکی ارکانِ پارلیمان کو منع کرنے کا دم خم ان میں نہیں تھا۔ اس نئی صورتحال میں دھمکیوں کا سلسلہ اور دہشت گردی کا الزام

اپنے آپ پس پشت چلا گیا اس لئے کہ دہشت گردوں سے غیر ملکی وزراء کی ملاقات نہیں کرائی جاتی ۔ یوروپی وزیر خارجہ نے اخوانی رہنماؤں سے بھی ملاقات کی جن میں سابق وزیر اعظم ہشام قندیل بھی شامل تھے۔ اس طرح گویا اخوان کو سمجھانے منانے کی بین الاقوامی کوششوں کا آغاز ہوا۔ اس کے فوراً بعد افریقی یونین کے بزرگ رہنماؤں نے مصر کا دورہ کیا۔ یہی وہ تنظیم ہے جس نے فوجی بغاوت کے بعد مصر کی رکنیت کو معطل کردیا تھا۔ وہ لوگ چونکہ نئے غیر آئینی سربراہوں کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے اس لئے فطری طور پر صدر محمد مورسی سے ملاقات کی خاطر ان کے پاس گئے۔

امریکہ نے اس موقع پر کمال منافقت کا مظاہرہ کیا۔ امریکی صدر اسے بغاوت تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے اور دونوں فریقوں کو صبر و تحمل سے کام لے کر امن وامان قائم رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ظالم ومظلوم کے درمیان کا فرق سے پوری طرح ناآشنا ہیں۔ لیکن پاکستان کے اندران کے سکریٹری آف اسٹیٹ جان کیری نے مصری فوج کی حمایت کا اعلان کردیااور کہا کہ وہ جمہوریت کو بحال کرنے کی ذمہ داری بخیر وخوبی نبھا رہی ہے ۔ جان کیری فی الحال امریکہ میں اوبامہ کے بعد دوسرے نمبر کے رہنما ہیں اوران کی حیثیت وزیر اعظم ہے۔ اخوان نے اس بیان کی مذمت کرتے ہوئے سوال کیا کہ اگر عوامی مظاہروں کے پیش نظر امریکی وزیر دفاع چک ہیگل صدر اوبامہ کو گرفتار

کرکے پارلیمان تحلیل کردیں اور دستور کو منسوخ کردیں تو کیا وہ اسے امریکہ میں جمہوریت کی بحالی قرار دیں گے؟اس تمام عرصے میں اخوانیوں کے مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا اور عام لوگ ان مظاہروں میں شریک ہو کر شہداء کے پسماندگان کی تعزیت کرتے رہے۔

امریکی انتظامیہ نے بالآخر یہ محسوس کرلیا کہ یہ سیلاب اب رکنے والا نہیں ہے آج نہیں تو کل پھر مصری عوام جبر استبداد کے خلاف پھر کھڑے ہو جائیں گے اور جب دوبارہ انتخابات کا انعقاد ہوگا تو اخوان زبردست اکثریت کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار ہوں گے اس لئے کہ ان کے تئیں عوام کے اندر زبردست ہمدردی پیدا ہو گئی ہے نیز ان کے مخالفین کے چہروں پر پڑی جمہوریت اور عدل وانصاف کی نقاب تار تار ہو چکی ہے۔

امریکی دباؤ کا برملا اعتراف السیسی نے واشنگٹن پوسٹ کو دیئے گئے اپنے انٹرویو میں کیا اور کہا آپ لوگوں نے ہمیشہ ہی مصریوں سے دھوکہ کیا ہے کبھی مصری عوام کا ساتھ نہیں دیا اور اب بھی یہی کر رہے ہیں۔السیسی اس فوج کا سربراہ ہے جو ہر سال ۲۱۰ کروڑ ڈالر کی مدد امریکہ سے لیتی ہے اور جسے جاری رکھنے کیلئے امریکہ نے اس کے اقتدار پر قابض ہونے کو فوجی بغاوت نہیں کہا۔السیسی کے مطابق وہ روزانہ کی بنیاد پر امریکی وزیر خارجہ چک ہیگل کے رابطے میں ہے اس پس منظر میں السیسی کا مذکورہ بیان خود اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر طمانچہ مارنے جیسا ہے۔

اس نئی صورتحال میں جب اوبامہ نے محسوس کیا یوروپی یونین اور افریقی یونین کے اثرات میں مسلسل اضافہ ہورہاہے اور ان کی حیثیت ثانوی درجے کی ہو کررہ گئی ہے تو اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے کیلئے حزب اختلاف کے دواہم ارکان کواپنا نمائندہ بنا مصر کے دورے پر روانہ کیا۔ ان لوگوں اخوان کے معمر رہنماخیرط الشاطر سے بھی جیل میں ملاقات کی اور اخباری کانفرنس میں صاف طور السیسی کی حرکت کو فوجی بغاوت قرار دے دیا۔ اسی کے ساتھ جان میک کین نے علی الاعلان کہا انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے والے جیل میں ہیں اور جو لوگ قوم کی نمائندگی نہیں کرتے ایوانِ اقتدارپر فائز ہیں۔ میک کین اور اس کے ساتھی لنڈسے گراہم نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا جمہوریت میں بات چیت سے مسائل حل ہوتے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا جن سے بات کرنی ہو وہ جیل میں ہوں۔ گراہم نے یہ بھی کہاکہ امریکی پارلیمان کے بازارکان مصر سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں اور کچھ امداد بند کرنے کے حق میں ہیں۔ ہمیں باہمی تعلقات کی بابت ایماندار ہونا چاہئے اور ہم ایک ایسے مصر کی حمایت نہیں کرسکتے جو جمہوریت سے دور جارہا ہو۔ ویسے ان امریکہ کے ان بیانات کی اہمیت سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ اب وہ فوجی ٹولے کی صلاحیت سے مشکوک ہو گئے ہیں اور اس کی حمایت کو اپنے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ یہ دراصل گزشتہ ایک ماہ کے دوران اپنائی جانے والی ناقص حکمت عملی کی تبدیلی کا اعتراف ہے۔ اس میں

شک نہیں کہ امریکی استعمار کے اس شکست فاش کا سہرہ صرف اور صرف اسلام پسندوں کے صبر واستقامت کو جاتا ہے۔

نظریاتی تحریکات کے اندر انقلاب اور انتخاب کے حوالے سے ایک لامتناہی بحث جاری رہتی ہے جو حالات کے لحاظ سے مختلف ڈگر پر چل پڑتی ہے۔ مصر کی موجودہ صورتحال سے انقلابی وانتخابی جدوجہد کے درمیان پائے جانے والے تعلق کو سمجھا جاسکتا ہے۔انتخاب کے میدان میں دوطرح کی تحریکات.برسرِ عمل ہوتی ہیں ۔ایک وہ جنہیں نظام کو تبدیل کرنا ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو نظام کو تبدیل کرنے کے بجائے صرف قائم شدہ نظام کے تحت اقتدار میں حصہ دار بننا چاہتی ہیں ۔ ان دونوں قسم کی تحریکات کیلئے دعوت وخدمت نیز انتخابی عمل میں شرکت لازمی ہے لیکن جو تحریک نظام کو تبدیل کرنے کی خواہشمند ہوتی ہے اسے ایک اضافی مرحلے یعنی ابتلاء وآزمائش سے بھی ہو کر گزرناپڑتا ہے اس لئے جس نظام کو وہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں اس کے علمبردار آسانی سے اس کیلئے تیار نہیں ہوتے اور بھرپور مزاحمت کرتے ہیں چونکہ اقتدار کے مختلف ادارہ جات مثلاً فوج،انتظامیہ اور عدلیہ وغیرہ انقلاب کے خلاف ہوتے ہیں اس لئے ان سب کا مقابلہ کرناپڑتا ہے۔

انقلاب اور انتخاب کے تعلق کو طالبعلم کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ایک

طالبعلم سال بھر محنت کرکے علم حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد امتحان کے مرحلے سے گزرنے کے بعد وہ نتیجے سے ہمکنار ہوتا ہے۔ دعوت وخدمت کی مثال گویا علم کا حصول کی سی ہے کہ یہ سال بھر کرنے کا کام ہے۔ انتخاب کی مثال امتحان اور نتائج کی سی ہے جو سال بھر کی جانے والی محنت کا ثمر ہوتا ہے۔ انتخاب کے نتائج سے تو صرف یہ پتہ چلتا ہے تحریک نے کس قدر میدان سر کرلیا ہے اور مزید کتنا کام باقی ہے۔ انتخابی عمل گویا تبدیلی کا ذریعہ نہیں بلکہ اس میدان میں کامیابی و ناکامی کے جانچنے کا پیمانہ ہے۔ جو تحریک صرف انتخاب کو تبدیلی کا سرچشمہ سمجھتی ہے اس کی مثال ایک ایسے طالبعلم کی سی ہے جو امتحان کو علم کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے ایسے طالبعلم کے حصے میں ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں آسکتا۔

اخوان کی انتخابی کامیابی کا انحصار اس کی انتخابی مہم سے نہیں بلکہ اس کی دعوت وخدمت کی سرگرمیوں سے ہے۔ ان مراحل میں کامیابی درج کرلینے کے بعد اخوان فی الحال ایک اضافی مرحلے یعنی ابتلاء وآزمائش سے گزر رہے ہیں۔ اگر اخوان کے پیشِ نظر نظام کی تبدیلی کا کام نہیں ہوتا تو اس کو یہ مرحلہ پیش نہ آتا لیکن اس مرحلے میں میں استقامت وعزیمت کا رویہ اختیار کرنے کیلئے وہ تربیتی و تزکیہ کا نظام درکار ہے جس سے تحریک کے کارکنان گزارے گئے ہیں۔ جس کی بدولت ان کے اندر اپنے مقصد کا عشق اور جہاد و شہادت کا جذبہ پیدا ہوا

ہے۔اگر دعوت وخدمت میں کمی ہو تو عوام کا اعتماد حاصل نہیں ہو پاتا اور تربیت و تزکیہ کا نظام ناقص تو آزمائش کے مرحلے میں تحریک دم توڑ دیتی ہے۔ اخوان المسلمون نے اس رمضانِ مبارک کے اندر ساری دنیا کے سامنے اس حقیقت کا بھی مظاہرہ کر دیا کہ اگر کارکنانِ تحریک کی تربیت صحیح خطوط پر ہوئی ہو تو اور اس کے بعد ان پر آزمائش اس طرح آئے کہ جیسے غزوۂ احزاب کے وقت آئی تھی یعنی ”اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔جب وہ اُوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔اُس وقت ایمان لانے والے ”خوب آزمائے گئے اور بُری طرح ہلا مارے گئے

ان شدید ترین حالات میں بھی سچے اہلِ ایمان نے منافقین کا سا مظاہرہ نہیں کیا جن کے بارے میں کہا گیا کہ ”یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔جب اُن میں سے ایک گروہ نے کہا کہ ”اے یثرب کے لوگو، تمہارے لیے اب ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے

پلٹ چلو'' جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ ''ہمارے گھر خطرے میں ہیں،'' حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے، دراصل وہ (محاذ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے'' بلکہ ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ ''اور سچے مومنوں (کا حال اُس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ ''یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی'' اِس واقعہ نے اُن کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے''۔

ان آیات کی روشنی میں مصر کا سیاسی مستقبل کا کچھ اس طرح کا نظر آتا ہے کہ ''اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پلٹ گئے، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے''۔

انتخابی جائزوں کا معروضی جائزہ

ہندوستان کو ویسے تو دنیا کی سب وسیع ترین جمہوریت کہلانے کا اعزاز حاصل ہے اور جمہوریت میں بظاہر اکثریت یا اس کے نمائندے حکومت کرتے ہیں مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ گزشتہ پچیس سالوں میں ہونے والے یکے بعد دیگرے سات عدد انتخابات کسی ایک جماعت کو اکثریت سے نہیں نواز سکے۔اس طرح ہر مرتبہ کوئی ایک اقلیت کسی دوسری اقلیت کی مدد سے اقتدار پر قابض ہو گئی۔ قومی ترقی پسند محاذ کی اس میقات کا یہ آخری سال ہے یہی وجہ ہے کہ دن بدن سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ عوام الناس پر بھی انتخابی بخار چڑھنے لگا ہے۔

قومی ترقی پسند محاذ کو گزشتہ انتخاب میں غیر متوقع شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اڈوانی جی کے وزیر اعظم بننے کا خواب چکنا چور ہوگیا تھا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر آرایس ایس نے اپنے وفادار نتن گڈکری کو بی جے پی کا صدر بنا دیا۔ یہ ہندوستان کی حزب اختلاف کا تاریک ترین دور تھا جس نے بی جے پی کو سیاسی حاشیے پر پہنچا دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب یوپی اے میں شامل ترنمل کانگریس کا شور شرابہ بی جے پی سے زیادہ تھا اور یہ دائیں بازو کی جماعتیں حکومت کی مخالفت میں پیش پیش تھیں اور بی جے پی ان کا بغل بچہ نظر

آرہی تھی۔ انا ہزارے اور اروند کیجریوال ذرائع ابلاغ پر چھائے ہوئے تھے ایسے میں نتن گڈکری کی بدعنوانیوں کا پردہ فاش کرکے کانگریس نے نریندر مودی کی راہ ہموار کردی۔

کانگریس پارٹی ۲۰۱۴ء کی ابتداء میں حسبِ روایت زوروشور کے ساتھ بدعنوانیوں میں غرق تھی کہ ماہِ جنوری کے اندر انڈیا ٹوڈے نے اپنا انتخابی جائزہ شائع کردیا۔اس جائزے کے مطابق اگر اس وقت انتخابات منعقد ہوتے تو کانگریسی محاذ کو ۲۵۹ کے مقابلے صرف ۱۵۷ حلقۂ انتخاب پر کامیابی حاصل ہوتی اس لئے کہ اس کے تناسبِ ووٹ میں ۷ء۷ فیصد کی کمی واقع ہوچکی تھی۔ نتن گڈکری کے سبب بی جے پی چونکہ بحران سے گزررہی تھی اس لئے اسے صرف ۶ء۱ کا فائدہ ہوا تھا اور اس وقت تک قومی جمہوری محاذ کے ووٹ کا تناسب یو پی اے سے ۷ء۰ فیصد کم تھا لیکن اس کے باوجود اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ وہ ۲۰۳ نشستوں پر کامیاب ہو جائے گا۔ دیگر جماعتوں کے بھی ۱۲۵ سے تک پہنچ جانے کا امکان ظاہر کیا گیا تھا جبکہ ان کو حاصل ہونے والی ووٹ کا اندازہ ۱۸۳ ان دونوں سے کہیں زیادہ یعنی ۷ء۴۴ فیصد تھا۔

کانگریس کو چاہئے تھا کہ وہ اس سروے کو سنجیدگی سے لیتی اور اسے اپنے لئے خطرے کی گھنٹی سمجھتی اس لئے کہ اس میں پہلی بار وزیراعظم کی حیثیت سے

نریندر مودی کے حق میں ۳۶ فیصد لوگوں کی رائے سامنے آئی تھی جو اگست ۲۰۱۲ء کی بنسبت ۱۵ فیصد زیادہ تھی جبکہ راہل گاندھی کے حق میں ۲۲ فیصد رائے تھی جس میں پہلے کے مقابلے ۱۲ فیصد کا اضافہ تھا۔ جب رائے دہندگان سے دیگر امیدواروں کو ہٹا کر صرف مودی اور راہل کے درمیان انتخاب کرنے کو کہا گیا تو ۵۷ فیصد نے مودی کو پسند کیا اور ۴۱ فیصد رائے راہل کے حق میں آئی۔ واضح رہے کہ اس سروے کے بعد ہی کانگریس نے راہل گاندھی کو نائب صدر بنا کر بلاواسطہ اپنا وزیراعظم کا امیدوار بنایا اور بی جے پی نے مودی کو انتخابی مہم کا سربراہ بنا کر کانگریس کی پیروی کی۔

ان اعداد و شمار سے عبرت پکڑنے کے بجائے کانگریس بدستور بدعنوانی کی راہ پر گامزن رہی اور اپنی نااہلی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ اس دوران نریندر مودی کی مخالفت کر کرکے اسے ہیرو بنانے کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر کام اس نے نہیں کیا جبکہ بی جے پی نے راہل گاندھی سے صرفِ نظر کرکے اسے زیرو بنا دیا۔ نریندر مودی کی مقبولیت اضافے میں سب سے مؤثر کردار کانگریس کے ترجمان دگوجئے سنگھ نے اپنے اوٹ پٹانگ بیانات سے ادا کیا اور اسے خبروں میں بنائے رکھا۔ اس سروے کے دوران جب لوگوں سے پوچھا گیا کہ ان کے معیار زندگی پر حکومت کس طرح اثر انداز ہوئی تو عوام کا ردعمل چونکا دینے والا تھا ۵۵ فیصد کے مطابق کوئی خاص بہتری نہیں آئی ۲۳ فیصد نے بہتری کا اعتراف کیا لیکن ۲۲ فیصد نے ابتری کی

شکایت بھی کی۔ معاشی اصلاح کے علمبردار ترقی پسند محاذ نے اس انکشاف کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس جائزے میں کرناٹک سے متعلق جو پیش گوئی کی گئی تھی وہ تقریباً درست ثابت ہوئی اس لئے اسے باآسانی مسترد نہیں کیا جانا چاہئے تھا۔

اس سال ماہِ اپریل کے اندر ٹائمز چینل نے سی ووٹر کی مدد سے ایک اور انتخابی جائزہ لیا اور اس کے اعداد و شمار نے بھی ترقی پسند محاذ کے زوال پذیر ہونے کا مژدہ سنایا اور اس کا فائدہ بی جے پی کے بجائے دیگر علاقائی جماعتوں کی جھولی میں ڈالا۔ اس جائزے کے مطابق کانگریس کے پہلے کی بنسبت ۲۰۶ نشستوں کے مقابلے صرف ۱۱۳ پر سمٹ جانے کا اشارہ کیا گیا اور اس کے حامیوں کو مزید ۱۵ یعنی کانگریسی محاذ محض ۱۲۸ نشستوں پر کامیابی کا امکان ظاہر کیا گیا جبکہ بی جے پی کے محاذ کو صرف ۱۶۰ سیٹوں پر کامیاب قرار دیا گیا۔ اس طرح یہ دونوں محاذ تو ۲۷۲ کے نشان سے کوسوں دور تھے مگر بی جے پی کی نشستیں کانگریس کے ۱۱۳ کی مقابلے ۱۴۱ تھیں گویا اسے کانگریس پر ۲۸ سیٹوں کی سبقت حاصل ہو گئی۔

بی جے پی کا بڑا فائدہ دہلی و راجستھان میں دکھلایا گیا تھا جہاں پر کانگریس نے پچھلی بار زبردست کامیابی درج کرائی تھی۔ کانگریس کا بڑا نقصان

اترپردیش اور آندھراپردیش میں ہورہا تھا۔بی جے پی بہار اور کرناٹک میں خسارے میں تھی لیکن اس جائزے کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ دیگر جماعتوں کا تیسرامحاذ جس میں سماجوادی پارٹی (۳۵)،ترنمل اور اےآئی ڈی ایم کے (۲۷)،دایاں بازو اور بی ایس پی (۲۶)، جنتادل یو (۱۹)، بی جے ڈی (۱۳)،وائی ایس آر کانگریس (۱۲) کے سب سے زیادہ ۱۶۰ مقامات پر کامیابی کے روشن امکانات سامنے آئے تھے گوکہ یہ تعداد جنوری کے مقابلے قدرے کم تھی لیکن پھر بھی اس کی مقبولیت کی توثیق ضرور ہوئی تھی۔

ٹائمز کے مندرجہ بالا سروے کے ایک ماہ بعد جنوبی ہندوستان کے ایک معتبر جریدے دی ویک'' نے ایک انتخابی جائزہ لیااور بتایا کہ آئندہ انتخاب میں قومی جمہوری محاذ کو'' جبکہ متحدہ ترقی پسند محاذ کو ۱۸۴ نشستیں ملیں گی۔ تیسرے محاذ کو ۱۶۲ نشستوں پر ۱۹۷ قناعت کرنا ہوگا۔اس سروے کے مطابق گوکہ متحدہ محاذ کے ووٹ کا تناسب جمہوری محاذ سے ۵ فیصد زیادہ تھا اس کے باوجود انہیں کم نشستوں پر کامیابی کا امکان ظاہر کیا گیا تھا۔ ہندوستانی انتخاب میں یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے اس لئے کہ اس سے قبل کئی مرتبہ اس طرح کی صورتحال پیدا ہو چکی ہے۔ تیسرے محاذ کیلئے ان دونوں سے زیادہ فیصد ووٹ مگر سب سے کم نشستوں پر کامیابی کی قیاس آرائی کی گئی تھی ایسا پہلے بھی ۴۱ ہوچکا تھا۔

اول الذکر سروے کی طرح اس بار بھی نریندر مودی کو سب سے زیادہ مقبول (۳۲%) قرار دیا گیا جبکہ کانگریسی خیمے میں رائے کو منقسم بتایا گیا یعنی منموہن سنگھ کے حق میں ۱۵ تو راہل کے حق میں ۱۳%۔ لیکن جب لوگوں سے یہ سوال کیا گیا کہ بی جے پی کے اندر% سب سے زیادہ مقبول کون ہے تو ۵۶% کی رائے مودی کے حق میں تھی جبکہ کانگریسیوں کے درمیان انتخاب کے سوال پر راہل گاندھی کو ۲۵% لوگوں نے ترجیح دی تھی۔ تیسرے محاذ کے امیدواروں میں نتیش کمار ۱۸% رائے کے ساتھ سرِ فہرست تھے جبکہ ممتا اور مایا کے نام کی ۱۵% لوگوں نے توثیق کی تھی۔ اس جائزے میں عوام سے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ کن مسائل کو اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں ؟ اس کے جواب میں سب سے زیادہ ۲۱% لوگوں کا احساس تھا کہ غربت کا خاتمہ اہم ترین مسئلہ ہے جبکہ ۱۷% نے بجلی ، پانی اور سڑک کی فراہمی کو اہم قرار دیا۔ ۱۳% کے نزدیک مہنگائی میں اضافہ سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس جائزے یہ ظاہر ہوگیا کہ ملک کی عوام نے بدعنوانی اور فرقہ پرستی کے مسائل پر سپر ڈال دی ہے اور وہ اس بابت مایوسی کا شکار ہوگئے ہیں اس لئے کی ساری سیاسی جماعتیں اس حمام میں یکساں طور پر برہنگی کا شکار نظر آتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی سے ان کے خاتمے کی توقع نہیں کرتے۔

ماہِ جولائی کے اواخر میں دی ہندو اور سی این این آئی بی این چینل کا ایک

مشترکہ سروے سیڈی ایس سی کے تعاون سے منظر عام پر آیا۔اس تفصیلی جائزے میں کانگریس رائے دہندگان کی تعداد میں ایک فیصد کی کمی اور بی جے پی کے ووٹرس میں آٹھ فیصد کا اضافہ دکھلایا گیا تھا۔یوپی اے اور این ڈی اے کے ووٹ کا تناسب تو یکساں طور پر ۲۹ فیصد تھا مگر سیٹوں کی تعداد میں ۲۳ کا فرق این ڈی اے کے حق میں تھا۔اس سروے کے مطابق یو پی اے کو حکومت سازی کیلئے نہ صرف ڈی ایم کے، ایس پی ،جے ڈی یو،بی جے ڈی ،ٹی آر ایس اور جے ڈی ایس بلکہ وائی ایس آر کانگریس و بی ایس پی کو بھی ساتھ لینے کی ضرورت تھی جبکہ این ڈی اے کیلئے اے آئی ڈی ایم کے کے علاوہ بی جے ڈی،ٹی ایم سی،ٹی ڈی پی اور اے جی پی کا ساتھ لینا ناگزیر بتایا گیا تھا۔

انفرادی سطح پر اس سروے میں منموہن سنگھ کو سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے کم ناپسندیدہ سیاستداں قرار دیا گیا تھا جبکہ راہل کی مقبولیت مودی سے ۲% زیادہ بتلائی گئی تھی لیکن مودی کو ناپسند کرنے والے راہل سے ۲% کم تھے اس طرح حساب برابر ہو جاتا تھا۔صرف راہل کا مودی سے تقابل کرنے پر مودی کو راہل پر ۲%برتری حاصل ہو جاتی تھی نیز جنوبی ہندوستان میں راہل تو شمال میں مودی آگے نظر آتا تھا جبکہ ممتا اور نتیش کی مقبولیت تقریباً یکساں تھی ۔ان کے بعد مایاوتی اور سب سے کم ملائم سنگھ کو مقبول بتلایا گیا تھا۔اس طرح گویا تیسرے محاذ کے رہنما کے طور نتیش کمار کو دیگر رہنماؤں پر

فوقیت دلائی گئی تھی۔

ٹائمز چینل نے سی ووٹر کی مدد سے اسی اثناء میں ایک سروے کیا اور اس کے نتائج بھی مندرجہ بالا جائزے سے مشابہ نکلے۔ اس کے مطابق کانگریسی محاذ کو ۹۲ نشستوں سے ہاتھ دھونا ہوگا مگر ان میں سے صرف ۲۴ بی جے پی محاذ کے ہتھے چڑھیں گی اس طرح ان کی تعداد ۱۵۶ سے آگے نہیں بڑھ سکے گی لیکن ۱۳۱ سیٹوں پر اپنی کامیابی درج کرا کے بی جے پی کانگریس سے ۱۵ سیٹیں زیادہ حاصل کرلے گی۔ جے للیتا، جگن ریڈی اور تلنگانہ کے چندر شیکھر راؤ سب سے زیادہ فائدے میں رہیں گے۔ اس معاملے میں ملائم اور مایا بھی پیچھے نہیں ہوں گے۔ بی جے پی اور جے ڈی یو کی لڑائی کا فائدہ لالو کو ہوگا۔ ممتا اور نوین اپنا قلعہکی مدافعت میں کامیاب ہوجائیں گے۔

اس سلسلے کا آخری سروے پھر ایک بار انڈیا ٹوڈے اور سی ووٹر کی جانب سے ۱۵ اگست کو شائع ہوا جس نے اس سال انتخابی جائزوں کی ابتداء کی تھی۔ اس جائزے میں کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ ہوا اسی رخ پر بہہ رہی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یو پی اے اور این ڈی اے دونوں کو بالترتیب ۱۲۲ اور ۴ نشستوں کا خسارہ نیز تیسرا محاذ ۱۲۶ کے فائدے کے ساتھ اکثریت سے بالکل قریب ۲۵۱ پر پہنچ گیا تھا گویا اب اسے کانگریس یا بی جے پی کسی کی حمایت کی مطلق ضرورت

باقی نہیں رہی تھی۔ اس چمتکار کیلئے تیسرے محاذ کے رائے دہندگان میں صرف ۲ فیصد کا اضافہ ہوتا تھا لیکن ان کی کل تعداد ۴۰ فیصد پر پہنچ جاتی تھی جبکہ یو پی اے ۸ فیصد نقصان کے ساتھ ۲۸ فیصد پر اور این ڈی ۶ فیصد فائدے کے باوجود ۳۲ فیصد تک محدود تھی ۔

اس میں شک نہیں کہ ہر سروے ہمارے سامنے مختلف اعداد پیش کرتا ہے جس کی دو بنیادی وجوہات ہیں اول تو وقت کا فرق اور دوسرے ووٹ کے تناسب کو سیٹوں کی تعداد میں بدلنے کیلئے استعمال کئے جانے والے اعدد کا فرق جو یکساں نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود جو رجحان صاف نظر آتا ہے اس میں ایک خاص یکسانیت ہے۔ سبھی نے تیسرے محاذ کو سب سے زیادہ بلکہ ۴۰ فیصد کے قریب ووٹ کا حقدار قرار دیا۔ سبھی میں بی جے پی کو کانگریس سے زیادہ نشستوں پر کامیابی کی بشارت دی گئی۔ ایک کے علاوہ سبھی نے معلق پارلیمان کا مژدہ سنایا۔ واضح اکثریت سے کسی جماعت تو کجا محاذ کو بھی نہیں نوازہ گیا۔ یہ حقائق قابلِ توجہ ہیں اور انہیں بی جے پی یا سنگھ پریوار کی سازش قرار دے کر مسترد نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ جنوبی ہندوستان کا اخبار ہندو اور جریدہ ویک ہمیشہ ہی فسطائیت کے خلاف رہے ہیں اور آئی بی این، انڈیا ٹوڈے اور ٹائمز نے اپنے اعتدال کا خیال رکھا ہے۔ اس لئے کانگریس اور اس کے محاذ کے لئے اس میں جو خطرہ ظاہر کیا گیا ہے وہ سنجیدہ توجہ کا محتاج ہے۔ ممکن ہے یوم آزادی کے

موقع پر وزیراعظم کی مایوس کن تقریر اس سے متاثر ہوئی ہو۔

نریندر مودی کی مقبولیت بھی ان تمام سروے کا ایک مشترک جز ہے۔چونکہ ہندوستان میں صدارتی نہیں بلکہ پارلیمانی نظام رائج ہے اس لئے کسی فرد کی مقبولیت حکومت سازی میں کوئی نتیجہ خیز کردار ادا نہیں کرتی۔ کسی شخص کا اس کی جماعت کے اندر یا باہر مقبول ہونا یا نہ ہونا اپنے آپ غیر اہم ہوجاتا ہے۔مثلاً جب بی جے پی کو حکومت سازی کا موقع ملا تو پارٹی کے اندر اٹل جی کے مقابلے اڈوانی جی زیادہ مقبول تھے لیکن دیگر حامی جماعتوں کے سبب اٹل جی کو اقتدار سونپا گیا۔ اس وقت جو مسئلہ اڈوانی جی کا تھا وہی اب مودی کا ہے۔ اس بات کا امکان کم ہے کہ دیگر حامی جماعتوں کی اسے حمایت حاصل ہو جائے ایسے میں اقتدار کی خاطر جس بی جے پی اڈوانی کو کچرے کی ٹوکری میں ڈال دیا وہ مودی کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گی۔ غیر مقبول افراد کا اقتدار کی زمام کار سنبھال لینا بھی ایک عام سی بات ہے مثلاً دیوے گوڑا اور اندرا کمار گجرال کو وزیر اعظم بننے سے قبل کون جانتا تھا؟ کم و بیش یہی حالت نرسمھا راؤ اور منموہن سنگھ کی بھی تھی۔

مودی کی مقبولیت میں ۱۸ سے ۲۰ فیصد مسلمان بتلائے گئے ہیں۔جائزہ لینے والوں کو یہ مودی کے حامی مسلمان کہاں اور کیسے میسر آگئے؟ یہ ایک تحقیق طلب موضوع ہے۔

قومی انتخابات میں ابھی ۹ ماہ کا عرصہ باقی ہے اور سیاسی بساط پر مزید کئی چالیں چلی جانی ہیں۔ ہندوستانی رائے دہندگان چونکہ عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیتے ہیں اس لئے ان کو اپنے قابو میں کرنے کیلئے بنیادی مسائل مثلاً مہنگائی، بے
روزگاری، استحصال، بدعنوانی یا انسانی حقوق کی پامالی (جس میں مسلم نوجوانوں کے ساتھ کیا جانے والا ظالمانہ سلوک شامل ہے) کے بجائے ہنگامی مسائل میں الجھا دینا سہل تر ہوتا ہے۔ چونکہ تمام ہی قومی یا علاقائی جماعتوں کی کسی نہ کسی ریاست میں حکومت ہے نیز کانگریس کو مرکز میں بھی اقتدار حاصل ہے اور یہ جماعتیں ان امور میں مکمل طور پر ناکامی کا شکار ہیں۔ مودی نے اگر عشرت جہاں کے انکاؤنٹر کا سیاسی فائدہ اٹھایا تو مہاراشٹر کی کانگریسی حکومت بھی جیل کے اندر قتیل صدیقی کے قتل کی مرتکب ہوئی اور سماجوادی پارٹی نے خالد مجاہد کو شہید کروادیا۔
اس بات کا قوی امکان ہے کہ عوام کو رجھانے کی خاطر انتخاب سے قبل ممکن ہے کانگریس گولڈن ٹیمپل پر فوج کشی یا دہلی کے فسادات جیسا کوئی ہنگامہ کھڑا کردے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ بی جے پی رام مندر کی تحریک یا گودھرا جیسی آگ لگا کر اس پر اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے کی سعی کرے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے پوکھرن جیسا کوئی دھماکہ یا کارگل جیسی کوئی نوراجنگ چھیڑ دی جائے۔ کسی اسیما آنند یا ٹنڈا کو گرفتار کرکے اس کے ذریعہ نت نئی کہانیاں نشر کرائی جائیں۔

پارلیمان یا ممبئی کے تاج ہوٹل پر حملہ جیسا کوئی ڈرامہ کھیلا جائے اور رائے عامہ کا رخ یکسر موڑ دیا جائے۔ گاندھی جی کے دور میں ہندوستانی سیاست سبزی خور بکری کی مانند تھی جو گھاس کے ساتھ بادام پستہ بھی کھاتی تھی لیکن اندرا گاندھی کے زمانے تک وہ آدم خور چیتے میں تبدیل ہو گئی اور انسانی لہو اس کے منھ لگ گیا۔ اب یہ ایک خطرناک کھیل ہے جس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اقتدار کی اس جنگ میں سب کچھ جائز اور مباح ہے۔

قرآن مجید میں جا بجا "وقت" کی قدر و اہمیت کے روشن حوالے ملتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالی نے سورۃ الفجر میں وقتِ فجر اور عشرہ ذوالحجہ کی قسم کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا: فجر کے وقت کی قسم اور دس راتوں کی قسم۔" سورۃ الضحیٰ میں وقت چاشت کی قسم" کھاتے ہوئے فرمایا: "قسم ہے وقتِ چاشت کی اور قسم ہے رات کے وقت کی جب وہ چھا جائے۔" سورۃ العصر میں عصر کے وقت کی قسم کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا: "قسم ہے زمانے کی، انسان خسارے میں ہے۔" یہ حقیقت ہے کہ گزرا "وقت" واپس نہیں آتا مگر آنے والا ہر لمحہ اور ہر صبح، طلوع ہونے والے سورج کی کرنوں سے پھوٹنے والی روشنی "امید" کا پیغام ضرور دیتی ہے۔ انسان کے پاس سب سے نفیس ترین اور سب سے قیمتی چیز وقت ہی ہے۔ ہم اپنے عمل اور کوشش سے جو بھی حاصل کرنا چاہیں اس کی کامیابی کا راز وقت کے درست استعمال میں ہی پوشیدہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہے کہ وقت گزرتے ہوئے واقعات

کا ایک دریا ہے، اس کا بہاؤ تیز اور زبردست ہے، جونہی کوئی چیز اس کی زد میں آتی ہے اس کی لہریں اسے اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں۔ پھر اور کوئی شے اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ لیکن وہ بھی اسی طرح بہہ جاتی ہے، صدیاں ریت کے ذروں کی طرح گرتی جاتی ہیں۔

عربی کی مثال ہے "الوقت سیف قاطع" وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔ حکماء فرماتے ہیں کہ وقت سیال ہے، اسے کسی آن سکون نہیں۔ وقت ہمارے پاس اسی طرح آتا ہے جیسے کوئی دوست چپ چاپ بیش قیمت تحفہ جات اپنے ساتھ لاتا ہے لیکن اگر ہم ان سے فائدہ نہ اٹھائیں تو وہ اپنے تحائف سمیت چپکے سے واپس چلا جاتا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ کھوئی ہوئی دولت محنت اور کفایت شعاری سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کھویا ہوا علم مطالعہ کے ذریعے پا سکتے ہیں۔ کھوئی ہوئی تندرستی دوا سے مل سکتی ہے لیکن کھویا ہوا وقت لاکھ کوششوں کے باوجود بھی دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتا، بعد میں انسان کو یہ سبق حاصل ہوتا ہے "پن چکی" اس پانی سے نہیں چل سکتی جو بہہ گیا ہو۔ وقت گزر جانے پر افسوس بے نتیجہ ہے، پھر پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، وقت کے فوت ہونے پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک جگہ رقمطراز ہیں: "عرب کے فلسفی ابوالعلاء معری

نے زمانہ کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا ہے۔ کل جو گزچکا ہے، آج جو گزر رہا ہے، کل جو آنے والا ہے۔ لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم حال" کہتے ہیں وہ فی الحقیقت ہے ہی کہاں؟ یہاں وقت کا جو احساس بھی ہمیں میسر" ہے، وہ یا تو "ماضی" کی نوعیت رکھتا ہے یا "مستقبل" کی اور انہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے جسے ہم "حال" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ماضی اور مستقبل کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ لیکن وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکتے، ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں، لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا اور ادھر اس نے اپنی نوعیت بدل ڈالی، اب تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جاچکا، یا "مستقبل" ہے جو ابھی آیا ہی نہیں، لیکن خود حال" کا کوئی نام ونشان دکھائی نہیں دیتا، جس وقت ہم نے پیچھا کرنا چاہا تھا وہ" حال" تھا اور جو ہماری پکڑ میں آیا ہے، وہ "ماضی" ہے اور اگر حقیقت حال کو اور" زیادہ نزدیک ہو کر دیکھیں تو واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی پوری مدت ایک صبح شام سے زیادہ نہیں، صبح آنکھیں کھلیں، دوپہر امید وبیم میں گزری، رات آئی تو پھر آنکھیں بند۔

ہر طلوع ہونے والا دن پکار پکار کر کہتا ہے: "اے انسان! میں ایک نوپید مخلوق ہوں، ،میں تیرے عمل پر شاہد ہوں، مجھ سے کچھ حاصل کرنا ہے تو کرلے

میں تو اب قیامت تک لوٹ کر نہیں آؤں گا۔" حدیث میں ہے: "مومن کے لیے دو خوف ہیں، ایک عاجل، جو گزر چکا ہے، معلوم نہیں خدا اس کا کیا کرے گا اور ایک آجل جو ابھی باقی ہے، معلوم نہیں اللہ اس میں کیا فیصلہ صادر فرمائے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی طاقت سے اپنے نفس کے لیے دنیا سے آخرت کے لیے جوانی سے بڑھاپے کے لیے اور زندگی سے قبل از موت کچھ نفع حاصل کرلے۔" وقت سے کام لینے والے اس تھوڑی سی زندگی میں کیا سے کیا بن گئے، اس کے برخلاف جنھوں نے اپنا وقت ضائع کیا وہ ساری زندگی پچھتاتے رہے۔

الغرض وقت ایک ایسی دولت ہے جو ہر شخص کو یکساں عطا ہوئی ہے۔ جو لوگ اس سرمائے کو معقول طور سے اور مناسب موقع پر کام میں لاتے ہیں، جسمانی راحت اور روحانی مسرت انہیں کو نصیب ہوتی ہے۔ وقت ہی کے صحیح استعمال سے ایک وحشی مہذب بن جاتا ہے، جاہل عالم بنتا ہے، مفلس تونگر بنتا ہے، ناداں دانا بنتا ہے۔ وقت ضائع کرنا ایک طرح کی خودکشی ہے، فرق اتنا ہے کہ خودکشی ہمیشہ کے لیے زندگی سے محروم کردیتی ہے اور اوقات کا ضیاع ایک محدود زمانے تک زندہ کو مردہ بنادیتا ہے۔

مصر: ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور

انسانوں کے بارے خالقِ کائنات کا رشاد ہے کہ وہ جلد باز مخلوق ہے۔ اس کی جلد بازی کا اظہار اس طرح سے بھی ہوتا ہے کہ وہ حالات و واقعات سے نتائج کو اخذ کرنے میں جلدی کرتا ہے اور اپنی کوتاہ نظری کے سبب مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ مصر کے اندر اخوان پر ابتلاء وآزمائش کوئی نئی چیز نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ کامیابی کے بعد ہاتھ آنے والی ناکامی بہت زیادہ کھلتی ہے اور کبھی کبھار انسان اس سے بوکھلا بھی جاتا ہے۔ اہلِ ایمان مکہ مکرمہ میں یکے بعد دیگرے شدید سے شدید تر آزمائشوں سے گزرتے رہے لیکن ہجرت کے بعد کامیابیوں کا باب کھلا اور غزوۂ بدر کی فیصلہ کن کامیابی تک جاری رہا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس عظیم کامیابی کے محض ایک سال بعد اللہ رب العزت نے اہلِ ایمان کو میدان احد میں ناکامی سے دوچار کردیا گویا یہ بات واضح فرمادی گئی کہ شکست و ناکامی کا باب ہمیشہ کیلئے بند نہیں ہوا ہے بلکہ تا قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ سیرت نبویؐ کی روشنی میں حالات حاضرہ کا مشاہدہ حزن و یاس سے محفوظ رکھتا ہے۔ بقول امجد اسلام امجدؔ

محمد مصطفٰی صل علیٰ کے نام کی خوشبو\
دلِ وحشت زدہ کے ہاتھ پر یوں ہاتھ رکھتی ہے

تھکن کا کوہِ غم ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے

سفر کا راستہ کٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے

اس میں شک نہیں کہ احد میں ہاتھ آنے والی شکست سے اہل ایمان دل برداشتہ ہو گئے تھے ۔ اسی اللہ تبارک و تعالیٰ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں ''دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو'' اور محض اس یقین دہانی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے بعد والی آیت میں مزید ڈھارس بندھائی جاتی ہے ''اِس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں'' مندرجہ بالا آیت کی مصداق سرزمین مصر پر ایک سال کی پے درپے کامیابیوں کے بعد جب اسلام پسندوں پر ابتلا و آزمائش کا دور آیا تو ساری دنیا نے سچے اہل ایمان اور کچّے اہل اسلام کا فرق دیکھ لیا۔ ظلمات اور نور کا فرق واضح ہو گیا۔

اس دنیا میں دین اسلام کو غالب کرنے کی سعادت ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی

بلکہ غلبہَ دین سے قبل آزمائش سے گزار کر سمندری جھاگ کو الگ کردیا جاتاہے۔ غزوۂ احد کے حوالے جو اتفاق سے ماہِ شوال کی انہیں تاریخوں میں برپا ہوا تھا جن میں اخوان کے سیکڑوں مجاہدین کو شب خون مار کر شہید کردیا گیا ارشادِ ربانی ہے ’’اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کردینا چاہتا تھا‘‘ ۔

اس سال شوال کے اوئل میں جانباز اہل ایمان شدید ترین بربریت کے باوجود میدانِ ربیعہ میں ڈٹے رہے ان کے پائے استقلال میں قتل عام بھی کوئی لغزش پیدا نہ کرسکا ۔اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے واقف تھے جس جا اظہار یوں ہوا کہ ’’کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤگے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں‘‘ اہل ایمان نے یوم غضب اور رعمیس چوک پر ہیلی کاپٹر سے حملے کے بعد بھی جمعہ ۲۳ اگست کو مصر بھر میں مظاہرے کرکے یہ دکھلا دیا کہ نہ تو انہیں زبانی دھمکیوں سے ڈرایا جاسکتا اور نہ ہی بندوق کی گولیاں انہیں خوفزدہ کرسکتی ہیں۔ فوج کشی کے ذریعہ ان کے کیمپ کو تاراج تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے ان کے احتجاج کی روح کو پامال کرنا ممکن نہیں ہے۔

امتِ مسلمہ کے اندر ایک ایسا طبقہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے جو غلبہَ دین کی باتیں تو بہت کرتاہے لیکن چونکہ کوئی عملی کوئی اقدام نہیں کرتا اس لئے

کوئی قربانی بھی دیتا ہے۔ ایسے عافیت پسند لوگ نہ صرف ابتلا و آزمائش سے محفوظ و مامون رہتے ہیں بلکہ کبھی کبھار انعام و اکرام سے بھی نوازے جاتے ہیں۔ جب اہل عزیمت پر آزمائش آتی ہے تو رخصت کا خوگر یہ گروہ مصالحت کا راگ الاپنے لگتا ہے۔ انہیں فوراً صلح حدیبیہ یاد آجاتی ہے حالانکہ یہ بیچارے صلح اور جنگ کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ یہ نہیں جانتے کہ صلح کن حالات میں اور کن شرائط پر ہوتی ہے؟ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ معاہدہ کرنے کے بعد اسے پامال کردینے والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا ہے؟

غزوۂ احد کے فوراً بعد اہل ایمان نے مصالحت کی جھولی پسار کر اہل باطل کی خدمت حاضری نہیں دی بلکہ حضور اکرمؐ نے تو فوراً اپنے منتشر دستے کو مجتمع کرکے کفار قریش کا پیچھا کیا۔ واپس ہونے والے دشمن کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے فتح کے مزید فائدہ سمیٹنے کی غرض سے دوبارہ مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر اہل ایمان کا یہی تعاقب تھا جو ان کے قدموں کی زنجیر بن گیا اور وہ ایک سال بعد مقامِ بدر پر ملاقات کا وعدہ کرکے مکہ لوٹ گئے۔ اس کے بعد غزوۂ احزاب تک کے درمیان دو سال تک مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہے بلکہ غزوات اور سرایہ کا سلسلہ جاری رہا ۔ایک سال کی تکمیل کے بعد حسبِ وعدہ حضور اکرمؐ تو اپنی فوج کے ساتھ مقامِ بدر پر پہنچے مگر کفارانِ مکہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ یہی وہ مزاحمت تھی جس

نے شکست کے اثرات کو زائل کیا اور اسلام کو پھر ایک بار روبہ عروج قوت بنا کر کھڑا کر دیا۔

غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب کے درمیان اسلام کے دشمن بہت جری ہو گئے تھے جیسا کہ فی الحال مصری فوج اور اس کے حواریوں کا حال ہے۔ مختلف قبائل کی جانب سے بغاوت اور حملوں کے تیاری کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔ مسلمانوں کے دغا بازی کے واقعات بھی ہونے لگے تھے مثلاً عزل و قارہ کا اندوہناک حادثہ جس میں داعیان اسلام و حفاظ کرام کو دھوکے سے شہید کر دیا گیا تھا۔ لیکن بڑی پامردی کے ساتھ ان حالات کامقابلہ کیا گیا۔ یہود کی سازشوں کو بے نقاب کرکے انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا گیا۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام ایک ایسی طاقت بن کر ابھرا جس کا مقابلہ کرنے کی ہمت فرداً فرداً کسی بھی ایک قبیلے میں نہیں تھی۔ غزوۂ احزاب میں ساری اسلام دشمن قوتوں کا اتحاد اس بات کا اعتراف تھا کہ اب وہ اکیلے اکیلے اسلام کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔

ایے رمیں وہ لوگ جو عقائد کی سطح پر ایک دوسرے کے دشمن تھے مثلاً یہود اور کفارِ قریش اپنے باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اسلام کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔ یہ ایسا ہی معاملہ ہے جیسا کہ مصر میں وہ جماعتیں جو نظریاتی

اختلاف کے سبب ایک دوسرے کے خلاف بر سرِ پیکار رہی ہیں۔ انسانی حقوق کے تحفظ کی کاطر کام کرنے والے ایسے گروہ جو فوج کے اپنا اولین دشمن گردانتے رہے ہیں اسلام کے خلاف آپس میں شیر و شکر ہوگئے۔ اس لئے کہ ہر دو مواقع پر دشمنانِ اسلام نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ لیکن نہ تو ان کا مبینہ اتحاد ماضی میں اسلام کے چرغ کو اپنی پھونکوں سے گل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا اور نہ مستقبل میں ہوسکے گا۔ غزوۂ احد ۳ھ ہجری کا واقعہ ہے اور صلح حدیبیہ کا مرحلہ اس کے تین سال بعد غزوۂ احزاب کے گزر جانے پر آیا۔ وہ موقع بھی اس لئے آیا کہ حضور اکرمؐ کفار قریش کی جانب سے مکہ میں داخلے پر لگائی گئی خودساختہ پابندی کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا۔ نیز جب قاصدِ رسول حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر آئی تو اہل ایمان نے ان کے خون کا بدلہ لینے کی خاطر بیعتِ رضوان کی۔ رب ذوالجلال کا اس عظیم بیعت کے بارے میں ارشاد ہے "اے نبیؐ، جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا اب جو اس عہد کو توڑے گا اُس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا، اور جو اُس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا"۔ اس پرُ عزیمت اقدام کے اجر کی پہلی قسط صلح حدیبیہ تھی اور دوسری قسط فتح مکہ۔ اس مایوس کن صورتحال میں جبکہ

اہل ایمان اپنا عمرہ ایک سال کیلئے ملتوی کرکے واپس ہو رہے تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ غلبۂ اسلام کی راہ ہموار ہو رہی ہے لیکن رب کائنات وعدہ فرما رہا تھا ''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اِس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے''۔

صلح صفائی کے بابت اہلِ ایمان کو غزوۂ بدر کے بعد سورۂ انفال میں ہدایت دی جاچکی تھی مگر اس سے پہلے والی آیت میں فرمایا گیا ''اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دُوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔ اس سیاق وسباق میں حکم ہوا ''اور اے نبیؐ، اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، یقیناً وہی سننے اور جاننے والا ہے''۔اس آیت میں صلح و سلامتی کو دشمن کی آمادگی سے مشروط کردیا گیا۔اس لئے کہ اگر غالب فریق آمادۂ صلح نہ ہو تو فریقِ ثانی کا اس کیلئے راضی ہو جانا بے معنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ محمد میں اہل ایمان کو ہدایت

کی گئی ’’پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہر گز ضائع نہ کرے گا‘‘

ملت کے اندر ایسے بھولے بھالے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کا خیال ہے مصر کے فوجی حکمرانوں نے صلح کی پیشکش کی تھی جسے اخوان نے ٹھکرا دیا۔ مصر کے حکمرانوں نے اپنی ایک حکمت عملی بنائی اس کا اعلان کرنے کے بعد دھمکی بلکہ الٹی میٹم دینے لگے کہ فلاں وقت اسے تسلیم کرلو ورنہ خیر نہیں۔ صلح صفائی اس طرح سے نہیں ہوتی کہ اپنی طاقت کے نشے میں دھت ایک فریق بزور قوت اپنی شرائط منوانے پر تلا ہوا ہو اور فریقِ ثانی کی کوئی بات سننے سمجھنے کا روادار ہی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ صورتحال میں جن لوگوں نے فوجی حکمرانوں کی حمایت کی ان کی حالت یہ تھی ایک دن اتفاق اور دوسرے دن اختلاف ہوجاتا تھا۔ اس کے باوجود فوجی حکومت کو کسی اعتراض کی مطلق پرواہ نہیں تھی۔ محمد البرداعی نے اپنے استعفیٰ میں اعتراف کیا کہ میں انہیں صبر وضبط کی تلقین کرتا رہا لیکن وہ جلد بازی میں (مزاحمت کو) کچل دینے پر تلے ہوئے تھے۔ البرداعی پر مقدمے کے قائم ہوجانے سے ان کی حالت نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کی سی ہو گئی ہے۔ بین الاقوامی ثالثوں نے بھی یہ بات تسلیم کی کہ ۶ اگست کو صلح کی شرائط طے ہو گئی تھیں لیکن فوجی اقتدار نے اڑیل رویہ اختیار کرتے ہوئے مفاہمت کی کوششوں کی ناکامی کا اعلان کردیا اور ظلم وجور پر اتر

آئے۔

قرآن عظیم میں جہاں صلح صفائی کا حکم ہے وہیں اس کے ساتھ چند شرائط بھی لگائی گئی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے ''اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے'' لیکن افسوس کہ مسلم ممالک کی اکثریت نے اول تو فریقین کے درمیان صلح کرانے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور اس کے بعد زیادتی کرنے والے لڑنے کے بجائے ان کے حامی و مددگار بن کر اس ظلم عظیم میں برابر کے شریک کار بن گئے۔

مصر کے اندر برپا ہونے والے حالیہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بین الاقوامی سازش کے تحت احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد بزور قوت ایک آئینی صدر کو معزول کیا گیا۔ دستور معطل اور پارلیمان و شوریٰ تحلیل ہو گئی۔ مخالفین کے ذرائع ابلاغ پر پابندی لگا دی گئی۔ عوام کے بنیادی انسانی حقوق سلب کر دیئے گئے۔ ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ گرفتاریوں کا لامتناہی سلسلہ جاری کر کے مزاحمت کرنے والے پرامن نہتے احتجاجیوں پر

گولیاں برسائی گئیں۔ بین الاقوامی مصالحت کی کوششوں کو مسترد کرنے کے بعد اخوانیوں تو کجا محمد البردائی پر قوم سے غداری کا مقدمہ جڑ دیا گیا اس لئے کہ انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر ناحق خونریزی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس دوران بدنام زمانہ حسنی مبارک کی رہائی نے موجودہ حکمرانوں کو پوری طرح بے نقاب کردیا۔ جو لوگ یہ کہہ کر فوج کی پناہ میں گئے تھے کہ وہ ۲۵ جنوری کے انقلاب کا تحفظ کررہے ہیں ان سب کے ہوش اڑ گئے اور انہیں اپنی خودکشی کا احساس ہوگیا۔

سرعت کے ساتھ رونما ہونے والے ان واقعات کو دیکھ کر ساری دنیا کے مخالفینِ اسلام م جو اس انقلاب کو اسلام کی بہار کے بجائے عرب بہار کا نام دے رہے تھے پکار اٹھے کہ اب عرب بہار خزاں رسیدہ ہوگئی ہے۔ اس لئے کہ وہ مصر کے موجودہ حکمرانوں کے اندر قرآنِ مجید کی ان آیات کی تفسیر دیکھ رہے تھے جن میں فرمایا گیا ”انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے، جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے۔ جب اُسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، تو زمین میں اُس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے حالاں کہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے

کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو اپنے وقار کا خیال اُس کو گناہ پر جما دیتا ہے ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے''

بہار اور خزاں کے درمیان کا فرق عالمِ انسانیت کے سامنے اس لئے بھی واضح ہو گیا کہ گزشتہ ایک سالوں کے دوران وہ اسی سرزمینِ مصر پر تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ کر چکے تھے جس کی ترجمانی قرآن عظیم متصل آیت میں اس طرح کرتا ہے کہ ''دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے، جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے'' حقیقت تو یہ ہے کہ جس بہار کے خزاں رسیدہ ہونے کا ماتم کیا جارہا ہے وہ عرب بہار نہیں بلکہ اسلام کی بہار ہے۔ لوگ اس کا برملا اعتراف کرنے سے گریز ضرور کرتے تھے لیکن انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جب تک اسلام پسند اقتدار پر فائز رہے اس وقت ہر کوئی اس بادِ بہاری کے نغمے گاتا رہا اور جیسے ہی ان کو اقتدار سے ہٹایا گیا چمن کے خزاں رسیدہ ہونے کا سلسلہ چل نکلا۔

کیا یہ اس بات کا بین ثبوت نہیں ہے کہ عالم اسلام کی بہار دینِ اسلام سے وابستہ ہے۔ جب تک اسلام پسندوں کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ڈور ہو گی بہار کا موسم پھولے پھلے گا اور جب ان کو پابند و سلاسل کر دیا جائیگا خزاں کا بگولہ چمن کو خاکستر کر دے گا۔ لیکن اگر گہرائی میں جا کر دیکھا جائے یہ عقدہ بھی

کھلتا ہے کہ مسئلہ صرف عالم اسلام تک محدود نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کا بھی ہے۔ اقوامِ عالم اس وقت تک حقیقی بہار سے بہرہ ور نہیں ہو سکتیں جب تک کہ اسلام کے دامنِ رحمت کی پناہ میں نہ آجائے ورنہ ان کے پاس کاغذ کے چند پھولوں سے بہار کی خوش فہمی پر اکتفا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا۔ یہ ایسے کاغذ کے پھول ہیں جن میں مادی ترقی کا رنگ تو کسی قدر موجود ہے لیکن وہ اعلیٰ انسانی اقدار اور روحانی سکون کی دولت سے یکسر عاری ہیں۔ جلد یا بدیر ساری دنیا کو یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ فلاح انسانیت کا راز بہارِ اسلام ہی سے وابستہ ہے۔ علامہ اقبال تلقین فرماتے ہیں ''ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ

پیوستہ رہ شجر سے ، امید بہار رکھ ! ''

میں کربلا میں خوں سے اگاتا ہوں فصلِ نو

بلادِ شام کا سورج اس وقت طلوع ہوا جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے ۶۳۴ء میں دمشق فتح کرلیا اور اس کی شب تاریک کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۱۸ء میں ملکِ شام خلافت عثمانیہ سے ٹوٹ کر الگ ہوگیا۔ اس المناک داستان کی ابتداء اس طرح سے ہوئی کہ غیروں کی شہ پر مسلمان آپس میں دست و گریباں ہوگئے۔ امیر فیصل نے برطانوی فوجوں کی مدد سے دمشق پر قبضہ کیا اور خلافت عثمانیہ سے رشتہ توڑ لیا۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں قومی کانگریس نے امیر فیصل کو ترکی کے طارس پہاڑیوں سے لے کر مصر کے صحرائے سینائی تک پھیلی ہوئی مملکت کا بادشاہ بنادیا لیکن شاخ نازک پر بنا یہ آشیانہ پائیدار نہ ہوسکا صرف تین ماہ کے اندر فرانسیسیوں نے بلادِ شام کو تین حصوں میں تقسیم کردیا۔ ان میں سے شام اور لبنان پر اپنا تسلط قائم کیا اور فلسطین برطانیہ کے حوالے کردیا۔ امیر فیصل کو ملک بدر ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

بانٹو اور کاٹو کی حکمتِ عملی پر عمل کرتے ہوئے فرانس نے ۱۹۲۲ء شام کے مزید حصے بخرے کئے۔ جنوب کا علاقہ دروز فرقے کو اور ساحلی علاقہ علویوں کو سونپ دیا۔ ۱۹۲۵ء میں آزادی کے متوالوں پر فرانسیسی سامراج نے بمباری کی۔ یہ

حسنِ اتفاق ہے کہ آج جب کیمیاوی اسلحہ کے استعمال کا بہانہ بنا کر امریکہ دمشق پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور وہ اپنے سب سے بڑے حلیف برطانیہ کی حمایت و سلامتی کونسل کی تائید سے محروم ہے فرانس اس کے شانہ بشانہ کھڑا ہے۔ ۱۹۲۸؁ میں منتخب شدہ دستور ساز اسمبلی کے آئین کو فرانسیسیوں نے مسترد کردیا تھا اور اس کے خلاف آٹھ سالوں تک جدوجہد ہوئی بالآخر فوج اور معاشی برتری کے استثناء پر شام کو آزادی کا پروانہ ۱۹۳۶؁ میں ملا۔ فرانس کی موجودگی کے خلاف مزاحمت دس سال چلی اور اس طرح ۱۹۴۶؁ میں فرانس کا آخری فوجی کو بے آبرو ہو کر شام سے نکلنا پڑا۔

فرانس سے آزادی کے بعد مائیکل افلاک اور صلاح الدین جدید نے مل کر الحاد پرست عرب سوشلسٹ بعث پارٹی کی داغ بیل ڈالی ۔ اسی کے ساتھ احسان فراموشی و ابن الوقتی کا ایک لامتناہی سلسلہ اور شروع ہوگیا۔ ۱۹۴۹؁ میں فوجی افسر ادیب الشکشاکلی نے فوجی بغاوت کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کیا اور ۱۹۵۲؁ میں ساری سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ ۱۹۵۵؁ میں ایک اور فوجی بغاوت کے نتیجے میں الشکشاکلی کی جگہ شکری اقواتلی صدر منتخب ہوگئے۔ انہوں نے مصر کے ساتھ اتحاد قائم کیا اور ۱۹۵۸؁ میں جمال عبدالناصر شام و مصر کی متحدہ عرب ریاست کے سربراہ ہوگئے۔ ناصر نے اتحاد کی حامی بعث پارٹی پر پابندی لگا دی اس فیصلے کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں ۱۹۶۱؁ کے اندر یہ اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔

میں بعث پارٹی نے حکومت پر قبضہ کرلیا امین الحافظ صدر مملکت بن گئے ۱۹۶۶ء سنہ میں صلاح جدید نے بغاوت کرکے مائیکل افلاک اور امین الحافظ کو گرفتار کرلیا نیز حافظ الاسد کو وزیر دفاع بنایا جس نے ۱۹۷۰ء میں صلاح جدید کو جیل میں ڈال کر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔اس طرح گویا شام اسد خاندان کے ملحدانہ خونی شکنجے میں چلا گیا اور ظلم و جبر کا جو آغاز نصف صدی قبل ہوا تھا سو ہنوز جاری ہے۔

شام کی خون آشام تاریخ میں پانچ مرتبہ اسے اسرائیل کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی ۔اپنے ازلی دشمن کا تو وہ بال بیکا نہیں کرپایا لیکن دوستوں اور مسلم پڑوسیوں کی پیٹھ میں برابر چھرا گھونپتا رہا۔اسلامی انقلاب کے بعد اول تو ایران سے دشمنی لیکن ایران عراق جنگ کے موقع پر اپنے نظریاتی حلیف صدام حسین سے غداری اور ایران کی حمایت کی گئی۔ایران اور روس سے دوستی کے باوجود کویت پر حملے کے وقت امریکا کی ہمنوائی بھی اسد حکومت نے کی لیکن اسی کے ساتھ وقتاً فوقتاً اپنے ہی عوام پر ظلم و سفاکی کا بدترین مظاہرہ جاری رہا۔ ۱۹۸۰ء میں اخوان پر حافظ الاسد کے قتل کا الزام لگایا گیا اور پھر ۱۹۸۲ء میں فوج کشی کے ذریعہ حماۃ کے علاقے میں ہزاروں اخوانیوں کو شہید کردیا گیا۔۲۰۰۰ء میں حافظ الاسد کی موت کے بعد بشارالاسد نے اقتدار سنبھالا اور امریکہ سے تعلقات سدھارنے کی کوشش لیکن ان میں کوئی استحکام نہیں آیا یہ

رشتے بدستور بنتے بگڑتے رہے۔

عرب بہار نے شامی عوام کے حوصلوں اور امنگوں کو بلند کیا جس کے نتیجے میں مارچ ۲۰۱۱ کے اندر مزاحمت کی ابتدا ہوئی۔ بشار نے شروعات میں نرمی دکھلائی اور نام نہاد اصلاحات کا اعلان کیا لیکن جولائی میں فوجی کارروائی کا آغاز ہوگیا۔ بشار کے خلاف اکتوبر میں شامی قومی کونسل قائم ہوئی۔ اس کے تحت شامی حریت پسند فوج نے نومبر میں دمشق کے فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنایا۔ اس وقت اگر عالمی تعاون ملتا تو بشار کا تختہ الٹ سکتا تھا لیکن چین و روس شام کے خلاف سلامتی کونسل کی تجویز کو مسترد کردیا اور اس کے بعد وہ دو اور مرتبہ ایسا کرچکے ہیں ۔ عرب لیگ کے ذریعہ قیام امن کی کوششیں بھی بارآور نہ ہوسکیں ۔ مجاہدین آزادی کیلئے ۲۰۱۲ کئی کامیابیوں کو لے کرآیا شمال میں الیپو ان کے قبضے میں آگئے۔ اگست میں وزیراعظم ریاض حجاب نے بغاوت کردی اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بشارلاسد سے استعفیٰ کا مطالبہ کردیا۔ ستمبر میں جب دمشق کے فوجی صدر دفتر پر حملہ ہوا تو ایسا لگنے لگا گویا بشار کے دن لد گئے ہیں ۔ دسمبر کے اندر امریکہ برطانیہ فرانس ترکی اور خلیجی ممالک نے حزب اختلاف کے قومی محاذ کو شامی عوام کا نمائندہ تسلیم کرلیا اور غصان ہتو کو کارگذار وزیر اعظم منتخب ہو گئے ۔ بین الاقوامی سطح پر ڈیڑھ بلین ڈالر اعانت کی یقین دہانی بھی ہو گئی۔

اپریل ۲۰۱۳ء حزب اختلاف کے قومی سربراہ معاذ الخطیب نے یہ الزام لگا کر استعفیٰ دے دیا کہ بیرونی حامی آپس میں ساز باز کر رہے ہیں۔ ان کی جگہ ایک مشہور سوشلسٹ رہنما جارج صابرہ کو قائد بنایا گیا۔ جولائی میں سعودی عرب کی حمایت سے احمد جربا نے جارج صابرہ کی جگہ لی۔ اس بیچ کارگذار وزیر اعظم غصان ہتو نے آزاد شدہ علاقوں میں اپنی حکومت قائم کرنے میں ناکامی کا عذر پیش کر کے استعفیٰ دے دیا۔ گزشتہ سال نومبر سے لے کر اس سال اگست تک مزاحم گروہوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوا اس کا بھرپور فائدہ بشار نے اٹھایا اور بازی الٹ دی۔ مئی جون کے دوران اس نے لبنان اور حمص کے درمیان اہم مقام قصیر پر دوبارہ قابضہ جما لیا۔ مزاحمت کاروں کے مطابق ان کی پسپائی کی وجہ اسلام پسندوں کی موجودگی کے سبب بین الاقوامی حامیوں کی جانب سے اسلحہ کی فراہمی میں کمی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شام کے مجاہدین آزادی میں اسلام پسندوں کے ساتھ اچھی خاصی تعداد اشتراکیوں کی بھی ہے۔ مغربی سرمایہ دار ان سے تو خوش ہیں لیکن اسلام پسندوں کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔

اس سیاسی پس منظر میں امریکہ و یوروپ نے کیمیاوی اسلحہ کے استعمال کا ہنگامہ کھڑا کر دیا اور تفتیش کی غرض سے اقوام متحدہ کا وفد دمشق پہنچ گیا۔ تفتیش کا دائرۂ کار یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا کیمیاوی اسلحہ استعمال ہوا یا نہیں؟

لیکن یہ سرے سے کوئی تحقیق طلب موضوع ہی نہیں ہے اس لئے تمام فریق اس کے استعمال پر اتفاق کرتے ہیں۔ نزاع اس بات پر ہے کہ اس کا استعمال کس نے کیا؟ دونوں متحارب گروہ ایک دوسرے پر اس کے استعمال کا الزام عائد کررہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی تفتیشی ٹیم کی نہ تو یہ ذمہ داری ہے کہ وہ استعمال کرنے والے کا پتہ لگائے اور نہ یہ اس کیلئے ممکن ہے۔ یہ تو حملے کا جواز تلاش کرنے کی محض ایک شعبدہ بازی ہے جس سے فائق جیسا شاعر پناہ مانگتا ہے۔

فقط اک نام لکھ کر قرعہ اندازی نہیں کرتے
جو مخلص ہیں وہ ایسی شعبدہ بازی نہیں کرتے

امریکہ اور اس کے حواری چونکہ اخلاص سے عاری ہیں اس لئے ان لوگوں نے ٹیم کی رپورٹ سے قبل ہی اعلان کردیا ہے کہ بشار کے اہلکاروں نے کیمیاوی اسلحہ استعمال کیا لیکن امریکہ کے اس دعویٰ کی کوئی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ دس سال قبل بھی عراق میں عمومی تباہی کے اسلحہ کے بارے میں اس طرح کا دعویٰ کیا گیا تھا لیکن بھیانک تباہی و بربادی کے بعد اسے اپنے خفیہ اداروں کی غلطی کا بہانہ بناکر امریکی انتظامیہ اس سے مکر گیا۔ جارج بش نے ۲۰۰۳ء میں جو حماقت کی تھی اس کی ہمت اوبامہ فی الحال نہیں جٹا پارہا ہے۔ ویسے اوبامہ کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے اس لئے کہ جارج بش کو ۲۰۰۴ء میں دوبارہ انتخاب جیتنا تھا اور اس کیلئے صدام حسین کو بلی کا بکرہ بنایا گیا۔ اسامہ کا

ڈرامہ کرکے اوبامہ دوسرا انتخاب جیت چکا ہے اور اب تیسرے کا کوئی موقع نہیں ہے۔
امریکہ جانتا ہے کہ شام میں فوج اتارنا افغانستان اور عراق کے بعد ایک اور ہزیمت اٹھانے کے مترادف ہے۔شام کے اندر امریکی فوجوں کی موجودگی بشار کو کمزور نہیں بلکہ مضبوط کرے گی۔ ویسے بھی محدود پیمانے پر حملے کا شور کرکے امریکا بشار کا اچھا خاصہ بھلا کرچکا ہے۔اس موقع پر امریکی رائے عامہ کا اگر ۲۰۰۳ء سے موازنہ کیا جائے تو صورتحال میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے۔ صدام حسین کے وقت ۶۵ فیصد امریکی عراق پر حملے کے حق میں تھے جبکہ ۳۰ فیصد خلاف تھے اس کے برعکس اس بار ۵۰ فیصد خلاف ہیں اور صرف ۴۲ فیصد چاہتے ہیں حملہ کیا جائے۔ایک اور جائزے کے مطابق مخالفین کا تناسب ۶۰ اور حامی صرف ۹ فیصد ہیں۔یہ پوچھے جانے پر کہ کیا بشار کو ہٹانا امریکہ کی ترجیحات میں شامل ہے صرف ۱۶ فیصد کا جواب اثبات میں تھا۔ جہاں تک ممبران پارلیمان یعنی کانگریس کا سوال ہے ۵۳ ڈیموکریٹ اور ۱۴۰ ریپبلکن نے حملے پر تشویش ظاہر کی ہے۔
اسی لئے اوبامہ کا بیان کہ ہم عراق (کی حماقت) کو دوہرا کر کسی طویل تنازعہ میں پھنسنا نہیں چاہتے۔ مجھے پتہ ہے کہ اس بابت بہت سے لوگ فکر مند ہیں۔ اس بات کا غماز ہے کہ ماضی کے زخم ابھی بھرے نہیں ہیں۔ امریکی سفارتکاری کو ایک بڑا جھٹکا اس وقت لگا جبکہ اس کے سب سے بڑے حلیف برطانیہ کی پارلیمان

نے ۲۷ گھنٹوں کی طویل کے بعد ۲۷۲ کے مقابلے ۲۸۵ ووٹوں سے حملے میں شمولیت کی تجویز کو مسترد کردیا۔ وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون سے قبل اس طرح کی شکست کے بعد وزیراعظم کو استعفٰی دیناپڑا تھا لیکن اس کے پیچھے بھی رائے عامہ کا دخل ہے۔ برطانیہ کی فیصد عوام حملے کے خلاف ہیں حامیوں کی تعداد ۲۵ فیصد ہے اور باقی لوگوں کی کوئی ۵۰ رائے نہیں ہے۔

خطرناک اسلحہ کا استعمال عام طور پر مزاحمت کار نہیں بلکہ اقتدار کرتا ہے اس لئے شک کی سوئی بشار کی جانب ضرور جاتی ہے لیکن ایسے میں جب کہ اس کی حالت بہتر ہو رہی ہو وہ اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے کی کوشش کیوں کرے گا؟ یہ سوال اہم ہے۔اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے بشار اور اس کے اہلکاروں نے ممکن ہے مصر کے فوجی سربراہ عبدالفتاح السیسی سے ترغیب حاصل کرکے یہ غیر دانشمندانہ اقدام کیا ہو۔ مصر میں مجاہدین اسلام کا بے دریغ خون بہایا جارہا ہے اور بین الاقوامی قوتیں محض زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں جارہی ہیں بلکہ اب تو وہ منافقانہ اداکاری بھی بند ہو چکی ہے۔ایسے میں شک کی سوئی تیسری جانب گھوم جاتی ہے حالانکہ اپنے گوں ناگوں مفاد کے پیش نظر کوئی بھی اس کا ذکر نہیں کررہا ہے۔

مصر میں فوجی بغاوت کے بعد امریکہ اور یوروپ ایک آزمائش میں گرفتار ہوگئے۔ ایک طرف وہ جمہوری اصول و نظریات ہیں جن کے قیام کی خاطر وہ دیگر ممالک

میں فوج کشی تک کو جائز قرار دیتے ہیں اور دوسری جانب اسلام ہے جسے وہ اپنا حریفِ اول تسلیم کرتے ہیں۔ مصر میں کسی ایک کی مخالفت سے دوسرے کی حمایت ہو جاتی ہے ۔ جمہوریت کی حمایت اسلام کے حق میں چلی جاتی ہے نیز فوج کی حمایت اسرائیل کے تحفظ کی خاطر ضروری ہے۔ یوروپ اور امریکہ کو توقع تھی کہ مصر میں فوج کے آتے ہی سارا معاملہ رفع دفع ہو جائیگااور لوگ بہت جلد سب کچھ بھول بھال جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ مجاہدین اسلام اپنے سروں پر کفن باندھ کر میدان میں اترآئے اور فوجی حکمرانوں نے انہیں کچلنا شروع کر دیا لیکن اس کے باوجود مظاہروں کا تلاطم تھم نہیں پایا۔ ہزاروں لوگ شہید ہوئے ان کے کیمپ اور اسپتال تک کو آگ لگا دی گئی لیکن مظاہرے شہروں سے نکل کر گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھیل گئے۔ ۱۶ اگست کو یوم غضب کے بعد ۲۳ اگست اور ۳۰ اگست کو ملک گیر پیمانے پر احتجاج ہوا۔ان دونوں مواقع پر فوجی بربریت کا مظاہرہ بھی ہوا لیکن اس سے مظاہرین کا حوصلہ چنداں پست نہ ہوا اس لئے کہ بقول فائق

میں کربلا میں خوں سے اگاتا ہوں فصل نو
ملتی ہے جب فرات سے تشنہ لبی مجھے

امریکہ اور یوروپ نے ان مظالم کے خلاف لب کشائی کرنے کے بجائے درپردہ مصر کے ظالم حکمرانوں سے مفاہمت کرلی ہے۔ یوروپی یونین کا مصر کے ساتھ تعلقات پر

نظر ثانی کا اعلان اور امریکہ کی جانب سے فوجی امداد کے بند کرنے کا امکان ٹھنڈے بستے میں چلا گیا ہے۔ اس لئے قوی امکان ہے کہ اپنے اس جرم کی جانب سے توجہ ہٹانے کی خاطر خود مغرب کے ایجنٹ اسرائیل کا اس کیمیاوی حملے میں ہاتھ ہو۔ سچ تو یہ ہے جب سے یہ ہنگامہ کھڑا ہوا ہے مصر کی خبریں اپنے آپ پس پردہ چلی گئی ہیں۔ اس امکان کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ شام میں کیمیاوی استعمال کا پہلا الزام اس سال ماہِ اپریل میں سامنے آیا لیکن اس وقت اس کو اس قدر اچھال کر فوجی کارروائی کی بات نہیں کی گئی ۔نیز ظلم تو ظلم ہے اس کے طریقۂ کار سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر کوئی حکومت اپنے عوام کو گولیوں سے بھون دے تو اس کی جانب سے صرفِ نظر اور دوسری کیمیاوی اسلحہ استعمال کرے تو وہ قابلِ گردن زدنی یہ کہاں کا انصاف ہے؟ مصر کے اندر ماہِ اگست کے اندر شہید ہونے والوں کی تعداد شام کے مقابلے بہت زیادہ ہے لیکن السیسی کے خلاف کوئی اف نہیں کرتا جبکہ بشار کے پیچھے ہر کوئی پڑا ہوا ہے۔ اس کے معنی بشار کی جان بخشی کے نہیں بلکہ اس سے سخت تر سزا السیسی کیلئے تجویز کرنے کے ہیں ۔ اس لئے کہ فی الحال مصر کی حالتِ زار پر ابرار فائق کا یہ شعر صادق آتا ہے

مری بستی میں ہر پتھر کے نیچے
لہو آمیز منظر سو رہا ہے

شام فی الحال علاقائی اور بین الاقوامی طاقتوں کی زور آزمائی کا اکھاڑہ بن چکا ہے ۔ جس میں ایک جانب امریکہ اور یوروپ ہے تو دوسری جانب چین اور روس ہے۔ امریکہ اور روس دونوں کے بحری بیڑے شام کے سمندروں میں پہنچ چکے ہیں اور روس پھر ایک بار امریکہ پر اپنی برتری ثابت کرنے کا موقع تلاش کررہا ہے۔ اسی کے ساتھ ایران اور سعودی عرب بھی آمنے سامنے ہیں۔ سعودی عرب ایکطرف تو عبدالفتاح السیسی کی بھرپور حمایت کرتا ہے اور دوسری طرف اس کے ہم پلہ بشار الاسد کی مخالفت کرتا ہے ۔اسی طرح ایران السیسی کی مذمت کرتا ہے مگر اس کے ہمزاد بشار کو بھرپور تحفظ فراہم کرتا ہے۔ سعودی عرب بحرین کے مظاہرین کی آواز دبانے کیلئے اپنی فوج روانہ کرتا ہے تو ایرانی اسلحہ شامی مظاہرین کے خلاف استعمال ہوتا ہے ۔ اس باہمی رنجش کا سب سے بڑا فائدہ اسرائیل اور اس کے سرپرستوں کو ہورہا ہے ۔ یہ نہایت دلچسپ صورتحال ہے ایران و سعودی عرب دونوں کے حلیف امریکہ و روس مشترکہ طور پر اسرائیل کے محافظ ہیں۔

ان حالات میں ترکی کے وزیر اعظم رجب طیب اردوان کا موقف متوازن نظر آتا ہے۔ اگست کو یوم غضب پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا الفتح مسجد محاصرے میں ١٧ ہے۔ معصوم عبادتگزاروں پر ظلم توڑے جارہے ہیں۔ مصر و شام کی عبادتگاہوں کو نذرِ آتش کیا جارہا ہے۔بشار یا السیسی میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ ظلم کے

ساتھ کسی قسم کی مصالحت ممکن نہیں ہے۔ اخوانیوں نے بھی شام سے متعلق اسی طرح کا بیان دیا ہے۔ مصر کا محاذ آزادی جس میں اخوان بھی شامل ہے نے اپنے حالیہ بیان میں کہا وہ شام کے عوام اور ان کے انقلاب پر اقتدار کی جانب سے کئے جانے والے جرائم اور مظالم کی مذمت کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ محاذِ آزادی شام کے معاملات میں غیر ملکی مداخلت کی بھی مذمت کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ مداخلت علاقہ میں انتشار پیدا کرے گی اس سے دشمن قوموں کا فائدہ ہوگا اور اس سے مصر کی قومی سلامتی کو بھی خطرہ لاحق ہو جائیگا۔ اسے کہتے ہیں مبنی برانصاف حق گوئی اور مومنانہ بصیرت جس پر شدید ترین حالات بھی اثر انداز نہیں ہوتے۔

مودی کانٹا ہے تو کانٹے سے نکالا جائے - قسط اول

مودی بھی گڈکری کی راہوں پر گامزن ہے۔ کچھ لوگ سوچ رہے ہوں گے یہ گڈکری کون ہے؟ جو لوگ آج گڈکری کو نہیں جانتے وہ کل پوچھیں گے کہ مودی کون تھا؟ لوگ چاچا نہرو کو بھی بھول گئے۔ ایک جائزے کے مطابق نئی نسل میں اندراگاندھی کی مقبولیت پنڈت نہرو سے زیادہ ہے۔ سیاست کی دنیا میں عوام کی یادداشت کم ہوتی ہے ۔ نریندر مودی کی وزارتِ عظمیٰ کا خواب ایک غبارے کی مانند تھا جس میں ہر روز گرم ہوا بھری جاتی تھی ۔ اس کے سبب وہ فضا میں بلند سے بلند تر ہوتا جاتا اور ہندوتوا وادیوں کے دلوں کو لبھاتا تھا لیکن ونجارہ کے ترشول کی نوک سے غبارہ معمولی پھسپھساہٹ کے ساتھ پھوٹ گیا اور دہلی کی فضاوں سے احمدآباد کی نالیوں میں جا گرا۔ مودی کی ترجیحات بدل گئیں اور اسے اچانک یاد آگیا کہ گجرات کی عوام نے اس کو ۲۰۱۷ء تک حکومت کرنے کا ٹھیکہ دے رکھا ہے۔ اس نے خود اعتراف کرلیا کہ عوام کی خدمت کرنے کے علاوہ اس کی کوئی اور خواہش نہیں ہے ۔ عوام کی جو خدمت مودی نے اپنے دستِ راست امیت شاہ ساتھ کی ہے اس کو جاننے کیلئے ونجارہ کے استعفیٰ کا مطالعہ مفید ہے۔

دنیا بھر کی فلموں اور ڈراموں میں مکالمے لکھے جاتے ہیں ۔ سیاستدانوں کی

تقاریر لکھنے کیلئے افسران کے تقرر کا رواج عام ہے لیکن بھارت میں نہ صرف عدالتی فیصلے اقبالی بیان بلکہ اب استعفیٰ تک اہلِ قلم سے لکھوائے جانے لگے ہیں۔ اگر یقین نہ آتا ہو، بابری مسجد سے متعلق الہٰ باد ہائی کورٹ کا فیصلہ یا اسیمانند کا اقبالِ جرم اور اب ونجارہ کا استعفیٰ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہ درست ہے کہ ونجارہ کی گزشتہ ۶ سالوں کے دوران تین کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن گجراتی زبان میں شاعری کرنے میں اور فصیح و بلیغ انگریزی میں استعفیٰ لکھنے میں بڑا فرق ہے۔ گجراتیوں کی ایک بہت بڑی کمزوری انگریزی زبان ہے شاذ و نادر ہی کوئی گجراتی اچھی انگریزی جانتا ہے۔ دس صفحات پر مشتمل ونجارہ کے استعفیٰ کا ہر جملہ چیخ چیخ کر کہہ رہا کہ اس پردۂ زنگاری میں کوئی اور چھپا ہوا ہے۔ بی آر چوپڑہ اگر اپنی مہابھارت کیلئے راہی معصوم رضا کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں تو کانگریس والوں کے پاس قلمکاروں کی کون سی کمی ہے ؟ سیاست کے کھلے بازار میں جہاں ونجارہ کا دھرم بک سکتا ہے، قلم کی کیا بساط ؟

ونجارہ نے اپنے استعفیٰ کے میں اعتراف کیا ہے کہ اسے دیگر ملزمین کے ساتھ گزشتہ سال نومبر کے اندر سپریم کورٹ کی ہدایت پر مہاراشٹر کی تلوجہ جیل میں منتقل کر دیا گیا ۔اس کے باوجود استعفیٰ پر سابرمتی جیل احمد آباد کا پتہ کیوں درج ہے ؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ اگر یہ استعفیٰ اس وقت لکھا گیا

تھا جبکہ وہ سابرمتی جیل میں تھا تو اسے اتنے دنوں تک پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ جب اس کی تاریخ کو تبدیل کیا گیا تو پتہ بدلنے کی زحمت کیوں گوارہ نہیں کی گئی؟ یہ تمام سوالات غیر اہم ہونے کے باوجود دلچسپ ہیں۔ ویسے استعفیٰ کے اندر اس سال جون کے اندر وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا حوالہ ہے جو اس پر نظر ثانی اور ضروری اضافہ کا غماز ہے۔

اپنی ذاتی جنگ کو ونجارہ نے پولس افسران کا دھرم یدھ بنانے کی ناکام کوشش اسی طرح کی ہے جیسے کہ مودی اپنی لڑائی کو پانچ کروڑ گجراتیوں کی جنگ قرار دیتا ہے ۔ونجارہ کے بقول گجرات کے علاوہ ملک کی کسی ریاست میں ۳۲ پولس افسران کو اس قدر طویل عرصے کیلئے زیر حراست نہیں رکھا گیا اور سی بی آئی کی نئی فرد جرم مزید ۶ افسران کو سرکاری میزبان سے مہمان میں بدل دے گی ۔ ونجارہ کو افسوس ہے کہ اس قدر طویل عرصے تک انہیں حراست میں کیوں رکھا گیا جبکہ انصاف پسند عوام کو اس بات کا غم ہے کہ ابھی تک ان سفاک بھیڑیوں کو قرار واقعی سزا دے کر تختۂ دار پر کیوں نہیں لٹکایا گیا۔ ویسے پولس کے محکمے میں اس قدر بڑے پیمانے پر مجرمین کا پروان چڑھنا اور ان کو سزا سے محفوظ رکھا جانا مودی جی کے نام پر بٹہ ضرور ہے۔ ونجارہ کو اپنی زندگی کے ۶ قیمتی سال جیل کی کوٹھری میں گزارنے کا افسوس تو لیکن جن کا جعلی انکاؤنٹر کردیا گیا ان پر ذرہ برابر ندامت نہیں ہے۔ ونجارہ کو چاہئے کہ اپنے آپ کو

خوش قسمت سمجھے جو انصاف کے حصول کا یہ طویل موقع اسے میسر آیا اور ہنوز یہ دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ اسے ان معصوم لوگوں کے بارے میں سوچنا چاہئے جنہیں گرفتار کرکے عدالت میں حاضر کرنے کے بجائے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے جعلی انکاؤنٹر میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ونجارہ کے خیال میں ملزم پولس افسران حکومت (ریاستی) کے وفاشعار و فرمانبردار سپاہی تھے جو کسی دنیاوی لالچ کا شکار ہوئے بغیر پاکستانی دہشت گردی سے نہایت ایمانداری، سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ برسرپیکار تھے۔ اسی طرح کا دعویٰ ونجارہ کے دھرم گرو آسارام باپو کے بارے میں ان کے دیگر مقلدین بھی کررہے ہیں۔ ونجارہ کا کہنا ہے کہ اس نے مودی حکومت سے اپنے زنداں کے ساتھیوں کیلئے بارہا مدد طلب کی لیکن سارے زبانی وعدے کھوکھلے اور گمراہ کن ثابت ہوئے۔ ونجارہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حکومت انہیں جیل میں رکھ کر اپنی جان بچانا چاہتی ہے اور انکاؤنٹر کا ہوا کھڑا کرکے سیاسی مفادات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کاش کہ یہ انکشاف ونجارہ کو اس وقت ہوا ہوتا جب وہ اپنے آقاؤں کے ایماء پر بے دریغ معصوموں کا خون بہا رہا تھا لیکن اب پچھتائے کا ہوت جب چڑیا چگ گئی کھیت۔ پہلے ونجارہ زعفرانی چڑیا کو دانے ڈال رہا تھا اب ترنگے شکاری کے دام میں گرفتار ہوچکا ہے۔

ونجارہ کا الزام ہے کہ مودی حکومت نے امیت شاہ کو بچانے کیلئے ملک کے سب سے مہنگے وکیل رام جیٹھ ملانی کی خدمات حاصل کیں جبکہ پولس افسران کو ہر قسم کی عدالتی سہولیات سے محروم رکھا گیا تاکہ وہ جیل سے باہر آکر سی بی آئی کی تفتیش کا شکار نہ ہوں بلکہ نریندر امین اور دنیش کی ضمانت کو پہلی فرصت میں منسوخ کروا کر انہیں دوبارہ جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ امیت شاہ کے انتخاب کا راستہ صاف کرنے کی غرض سے مقدمہ گجرات سے ممبئی منتقل کروایا گیا۔ یہ سنگین الزام ونجارہ نے سپریم کورٹ پر لگایا ہے۔

اگر دس سال قبل کوئی مسلم نوجوان اس طرح کی بات کرتا تو شاید ونجارہ اسے پاکستانی دہشت گرد قرار دے کر اس کا انکاؤنٹر کر دیتا۔ ونجارہ کے مطابق امیت شاہ نہایت خود غرض ہے اور بے ضمیر انسان ہے وہ حکومت کے سیاسی مفادات کی خاطر پولس افسران کی زندگی سے کھلواڑ کر رہا ہے یقیناً یہ الزام درست ہے لیکن کیا یہ افسران حکومت کے سیاسی اور اپنے ذاتی مفادات کی خاطر عوام کی جان سے نہیں کھیل رہے تھے؟ اگر آج امیت شاہ کا ایسا کرنا غلط ہے تو کل ونجارہ کی یہ حرکت کیسے درست تھی؟ جیسی کرنی ویسی بھرنی بھی یہ محاورہ شاید ایسے ہی لوگوں کیلئے وضع کیا گیا ہے؟

اپنے تمام تر زور بیان کے باوجود ونجارہ کا استعفیٰ امیت شاہ کے خلاف جب اپنی توپ کا دہانہ کھولتا ہے تو خود اپنے خلاف ہو جاتا ہے۔ ونجارہ کے مطابق

سے امیت شاہ اپنی نااہلی اور بدانتظامی کے سبب پولس محکمہ کو نقصان پہنچا رہا ۲۰۰۲ ہے۔ اس نے افسران کو ایک دوسرے کے خلاف ورغلایا اور تقسیم کرکے حکومت کرنے کی برطانوی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ اس نے اہلکاروں کے اندر اپنے افسران کے احکام کی تعمیل کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ خود ونجارہ ہمیشہ ہی اپنے افسر کو نظر انداز کرکے اسی امیت شاہ سے براہِ راست احکامات لیتا رہا ہے بلکہ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اپنی کارروائیوں سے بھی اعلیٰ افسران کو آگاہ کرنے کی زحمت نہیں کیا کرتا تھا؟ ونجارہ کے یہ الزامات اگر درست ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ونجارہ اور اس کے ساتھیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کیا۔ وہ تمام جیل جانے تک امت شاہ کے آلۂ کار کیوں بنے رہے؟ امیت کے ذریعہ افسران کے درمیان پیدا ہونے والی چپقلش کا فائدہ اٹھا کر سی بی آئی نے جعلی انکاؤنٹر کے شواہد جمع کئے۔ اگر ایسا ہے تو امیت شاہ کی اس غیر شعوری حرکت نے مجرمین کے چہروں کو بے نقاب کرنے کا اچھا کام کیا ہے۔

جیل میں ۶ سال کی مدت گزارنے کے بعد ونجارہ کو گاندھی جی کا یہ مقولہ سمجھ میں آیا کہ ریاست ایک بے جان مشین ہے اور حکومت کا کوئی ضمیر نہیں ہوتا۔ اگر ونجارہ اپنے ماضی پر غور کرے تو اس پر یہ انکشاف ہوجائے گا کہ پولس فورس کا عقل و شعور سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا وہ ایک خونخوار بھیڑیے کی

مانند شیر کے اشارے پر معصوم جانوروں کی خونریزی کرتی رہتی ہے۔ ونجارہ کو شکایت ہے کہ اس کی پروقار خاموشی کی صفت کو کمزوری سمجھ کر نظرانداز کیا گیا اور اس کے ساتھ نہایت ترش روی سے پیش آیا گیا۔ حصولِ انصاف کے تمام بے سود رہے ان کے نتیجہ میں مایوسی اور بیزاری کے سوا کچھ ہاے ھ نہ آیا اس لئے نے اب سکھ گرو گوبند کا ہدایت پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ گرو گوبند سنگھ نے کہا تھا کہ جب انصاف حاصل کرنے کے تمام راستے اور دروازے بند ہو جائیں تو تلوار کا اٹھا لینا دھرم (یعنی مبنی برانصاف) ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اب وہ اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ انکاؤنٹر کے پس پشت اصل مجرمین کی نقاب کشائی کرے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردے۔ ونجارہ کے مطابق اس نے اس کے ساتھیوں نے حکومت کی سوچی سمجھی اعلان شدہ دہشت گردی کو برداشت نہ کرنے کی پالیسی پر عملدرآمد کرکے اپنے فرضِ منصبی کو ادا کیا ہے۔ ونجارہ کو اپنی تمام ترسفاکیوں پر اب بھی ناز ہے۔ ونجارہ تسلیم کرتا ہے کہ گودھرا کی آگ اور فسادات کے نتیجے میں گجرات کے اندر جہادی دہشت گردی کا اضافہ ہوا گویا اس خیالی دہشت گردی کیلئے بھی جس کی آگ پر گزشتہ ۱۱ سالوں سے گجرات میں سیاسی روٹیاں سینکی جارہی ہیں فرقہ وارانہ فساد ذمہ دار ہے۔ ونجارہ فسادات کی مذمت کرنے کے بعد کہتا ہے کہ اس کے جواب میں پاکستانی دہشت گردوں نے گجرات کو کشمیر بنانے کی کوشش کی۔ ونجارہ کا

یہ بیان نری کذب بیانی اور اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ وطن عزیز میں ونجارہ جیسے ہندوؤں کو دستور اور عدالت کی دھجیاں اڑانے کے بعد گرو گوبند سنگھ کی ہدایت کے مطابق تلوار اٹھانے کا حق تو حاصل ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اسطرح کا خیال بھی اپنے دل میں لائے تو ونجارہ جیسے لوگ اسے دہشت قرار دے کر انکاؤنٹر کردیتے ہیں ۔ کیا یہی انصاف ہے؟ کیا اس بابت گرو گوبند سے لے کر آسارام باپو نے کچھ نہیں کہا؟

ونجارہ کے استعفیٰ کی روح یہ ہے کہ جن لوگوں نے ملک کی سالمیت پر حملہ کیا تھا گجرات پولس نے اپنی جان پر کھیل کر ان کا مقابلہ کیااور ریاست کے اندر امن و سلامتی کو استحکام بخشا۔ پولس کا یہی کارنامہ حکومت کی نیک نامی کا سبب بنا۔ اسی سے ترقی کی راہ ہموار ہوئی اور گجرات ایک مثالی ریاست بن سکا گویا نریندر مودی جن چیزوں کا کریڈٹ حاصل کرتا ہے وہ سب پولس کی بدولت ہے۔ اس کے باوجود جن وفادار پولس افسران نے یہ کارنامہ انجام دیاوہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑ رہے ہیں۔ سی بی آئی فی الحال جن چار انکاؤنٹرس کی تحقیق کررہی ہے وہ سب کے سب سرکاری احکامات کی تعمیل اور مکمل نگرانی و رہنمائی میں ہوئے۔ اس منطق کے مطابق ریاستی حکومت کو گاندھی نگر کے بجائے سابرمتی یا تلوجہ جیل میں ہونا چاہئے۔ یہی وہ بات ہے جس کیلئے استعفیٰ اس موقع پر آیا ہے اور اس کے سبب نریندر مودی کی سیاسی چتا میں وہ آگ لگا دی

گئی جو آئندہ انتخابات تک اس کے خوابوں کو خاکستر کرتی رہے گی۔

ونجارہ کی دلیل یہ ہے کہ جو دھرم کا تحفظ کرتا ہے دھرم اس کی حفاظت کرتا ہے۔ جو پولس کی حفاظت کرتا ہے پولس اس کو تحفظ فراہم کرتی ہے یہ حکومت اور پولس کے درمیان باہم تحفظ کا دستور ہے۔ چونکہ حکومت پولس کی حفاظت میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے اس لئے پولس کی بھی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ مسندِ اقتدار میں بیٹھے ہوئے ان غداروں کی حفاظت کرے جنھوں نے اپنے وفادار افسران کو موت کے منھ میں جھونک دیا ہے۔ ونجارہ کے مطابق پولس اور حکومت ایک ہی کشتی میں سوار ہیں وہ ایک ساتھ تیریں گے ایک ساتھ ڈوبیں گے۔ کوئی کسی اور ڈوبا کر خود پار نہیں اتر سکتا۔ امیت شاہ فی الحال یہی کررہا ہے کہ اپنی جان بچانے کیلئے پولس کو غرقاب کررہا ہے اور اسے غیر فطری موت کے دہانے پر لے جارہا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ خود بھی ڈوب مرے گا۔

اس بحث کے اندر پولس اور حکومت کے تعلق پر اس طرح گفتگو ہوئی ہے کہ درمیان سے تیسرا سب سے اہم فریق یعنی عوام بالکل غائب ہوگیا۔ حقیقت تو یہ ہے عوام کے تحفظ کی خاطر پولس فورس کا قیام عمل میں آتا ہے اور عوام کے ٹیکس پر اس کا گزر بسر ہوتا ہے۔ لیکن ونجارہ کی ناقص منطق کے مطابق پولس والوں کا اپنے سیاسی آقاؤں کے اشارے پر بیکس عوام کو موت کے منھ میں جھونک دینا جائز ہے بشرطیکہ حکومت پولس کے مفادات کا تحفظ کرے۔ مظلوم عوام تو خود تحفظ کے محتاج

ہوتے ہیں وہ پولس کی حفاظت تو نہیں کر سکتے ہیں اس لئے پولس کی ذمہ داری یہ نہیں ہے انہیں تحفظ فراہم کیوں کرے؟ جس ملک میں اعلیٰ پولس افسران کی سوچ اس قدر فرسودہ ہو اور وہ اسے بیان کرنے پر فخر محسوس کریں وہاں کی عوام کس قدر غیر محفوظ ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

نریندر مودی کے معاملے میں یوں تو خاصہ احتیاط برتا گیا ہے تاکہ اسے سیاسی فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے اس کے باوجود ونجارہ کے استعفیٰ میں مودی کو براہِ راست مخاطب کرکے یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ مادر وطن کا قرض ادا کرنے بات تو بہت کرتا ہے مگر دہلی کی اپنی دوڑ میں ان افسران کو بھول گیا جنھوں نے دیگر وزرائے اعلیٰ پر سبقت حاصل کرنے میں اس کی مددگار رہی ہے۔ ونجارہ اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ وہ نریندر مودی کو دیوتا سمجھتا تھا لیکن افسوس کہ اس کا دیوتا امیت شاہ کے برے اثرات سے نہیں بچ سکا۔ امیت شاہ اس کی آنکھ اور کان بنا ہوا ہے۔ امیت شاہ گزشتہ بارہ برسوں سے مودی کو گمراہ کررہا ہےاور بکری کو کتا اور کتے کو بکری بنا کر پیش کررہا ہے۔ اس نے انتظامیہ کو اپنے قبضے میں لے رکھا ہےاور بلاواسطہ حکومت چلا رہا ہے۔ان ۳۲ پولس افسران کی جانب سے بے توجہی برتے جانے کیلئے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ امیت شاہ کے سبب جلد یا بدیر مودی کے اقتدار خاک میں مل جائیگا۔

امیت شاہ کے آگے نریندر مودی کو اس قدر بے دست و پا ثابت کرنے والے ونجارہ نے ایسا کرکے خود اپنی مٹی پلید کردی ہے۔ اس لئے کہ اس استعفیٰ کی روشنی میں اگر ونجارہ کے اندر تھوڑی سی بھی عقل ہوتی تو وہ کسی انسان کو دیوتا نہیں بناتا اور اگر ایسا کرنا ہی تھا تو وہ مودی کے بجائے امیت کے قدموں میں گر جاتا ۔ اس طرح گویا ونجارہ پہلی غلطی تو یہ کی کہ ایک تو انسان کو دیوتا بنالیا اور دوسرے غلط انسان کو دیوتا بنا بیٹھا۔ جس کے نتیجے میں اسے اپنی ۳۳ سالہ پولس کی ملازمت سے بے آبرو ہو کر سبکدوش ہونا پڑا۔ ونجارہ جب جیل سے باہر تھا اس وقت سیاسی بساط کا زعفرانی گھوڑا تھا اور اب کانگریس کا کالا ہاتھی بنا ہوا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اقتدار پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا تاج ہوتا ہے۔ یہاں کانٹے سے کانٹا نکالنے کی روایت بہت پرانی ہے ۔ اس فن کے ماہر کانگریسی فی الحال ونجارہ کی مدد سے مودی کا کانٹا نکالنے میں لگے ہوئے ہیں ۔ انہیں اپنے اس مقصد میں کس قدر کامیابی ہوگی یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ (•••جاری

مظفر نگر: ہر شاخ پہ مودی بیٹھا ہے؟

ملائم سنگھ کو بی جے پی والے ملّا ملائم سنگھ کے نام سے پکارتے رہے ہیں اور اس خطاب پر ملائم کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا لیکن مظفر نگر فساد کے بعد چودھری اجیت سنگھ نے ملائم سنگھ کو اتر پردیش کا مودی کہہ کر جو گالی دی ہے تو ملائم کا سر شرم سے جھک گیا۔

ملائم سنگھ نے آگرہ میں اجیت سنگھ کے الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا مظفر نگر کا گجرات کے گودھرا سے موازنہ کرنا درست نہیں ہے۔ گجرات میں فساد زدگان کو انصاف نہیں ملا مگر اتر پردیش میں ان کے ساتھ انصاف ہوگا اور مجرمین کو قرار واقعی سزا ملے گی ۔اس اعلان کے بعد ملائم سنگھ نے جو کچھ کہا اس پر موجودہ حالات میں یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وہ بولے میں نے کبھی بھی ذات پات یا مذہب کی سیاست نہیں کی۔ ہم متاثرین کی زیادہ سے زیادہ امداد کریں گے اور مجرمین کے خلاف ایسا اقدام کریں گے کہ وہ اس کا اعادہ کرنے کی جرأت نہ کرسکیں۔

ملائم سنگھ کے سیاسی مستقبل کا سارا انحصار اس یقین دہانی پر ہے اگر وہ اس عہد کی پابندی میں بھی اسی طرح ناکام ہوجاتے ہیں جیسا کہ فساد کو روکنے میں ناکام ہوگئے تو انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ یوپی کے مسلم رائے دہندگان کے پاس

فی الحال کئی متبادل موجود ہیں اس لئے ایس پی کو ووٹ دینا ان کی مجبوری نہیں ہے۔
اترپردیش کا موازنہ یقیناً مودی کے گجرات سے اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ گجرات میں مسلمانوں کی آبادی صرف پانچ فیصد ہے جبکہ یوپی میں وہ پانچ گنا سے زیادہ یعنی ۲۷ فیصد ہے۔ مظفر نگر جہاں اس بار خاک اور خون کی ہولی کھیلی گئی اس میں مسلمان ۴۷ فیصد ہیں۔ان کے علاوہ ۴۹ فیصد ہندو مختلف ذات برادری مثلاً جاٹ، اہیر، گوجر، راجپوت اور دلت میں منقسم ہیں۔ چودھری چرن سنگھ نے اول تو اہیر جاٹ، گوجر اور راجپوت کو جوڑ کر اجگر بنایا اور پھر اس میں مسلمانوں کو ملا مجگر نامی، سیاسی اتحاد قائم کیا۔ یہ اس قدر کامیاب تجربہ تھا کہ اس نے انہیں اترپردیش کا پہلا غیر کانگریسی وزیراعلیٰ بنادیا اور بعد میں وہ ملک کے وزیرداخلہ سے لے کر وزیر اعظم تک بنے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ اپنی موت سے قبل بیٹے کی تاجپوشی کیلئے چودھری چرن سنگھ نے جس مظفر نگر کا انتخاب کیا تھا آج وہی مظفر نگر جاٹ مسلم اتحاد کے جنازے پر خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ مغربی اترپردیش میں جاٹ مسلم اتحاد ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی کے زمانے سے قائم ہے اس خطے کے شہری علاقوں مثلاً علی گڈھ، مرادآباد اور میرٹھ میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے ہیں لیکن دیہات اس لعنت سے محفوظ رہے۔ مظفر نگر رام جنم بھومی کے دورِ پرفتن میں بھی امن و سلامتی کا گہوارہ بنا رہا لیکن اس بار اخوت و محبت کو یہ چادر بھی تارتار

ہو گئی اور شیر و شکر کی مانند مل جل کر رہنے والے جاٹ اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن بنا دیئے گئے۔

یہ تبدیلی راتوں رات واقع نہیں ہوئی۔چودھری چرن سنگھ کی روایت کو ان کا وارث اجیت سنگھ جاری نہ رکھ سکا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چودھری چرن سنگھ خود کاشتکار تھے وہ اپنی محنت سے آگے آئے تھے اس لئے عام کسان ان سے جو قربت ویگانگت محسوس کرتا تھا، یوروپ کی تعلیم سے آراستہ اجیت سنگھ اس سے محروم تھا۔اجیت سنگھ کے سامنے پہلا بڑا چیلنج خود جاٹ برادری میں برپا ہونے والی ایک بہت بڑی تحریک بھارتیہ کسان یونین تھی جس کی قیادت مہندر سنگھ ٹکیت کر رہے تھے۔ایک زمانہ میں مہندر سنگھ ٹکیت کو جاٹ چودھری چرن سنگھ کا ہمسر قرار دینے لگے تھے۔چونکہ ٹکیت انتخابی سیاست کو شعبدہ بازی قرار دیتے اس لئے اجیت سنگھ ان کی تنقید کا نشانہ بن جاتے تھے۔ مہندر سنگھ ٹکیت نے بھی گنگا جمنی تہذیب کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے مسلمانوں کو قریب رکھا۔ان کے احتجاج میں ہندووں کیلئے بھجن تو مسلمانوں کیلئے نماز کا باقاعدہ اہتمام ہوتا تھا۔اغوا شدہ مسلم دوشیزہ نعیمہ کی رہائی کیلئے ٹکیت نے ۴۰ دنوں تک احتجاج کیا تھا۔

اجیت سنگھ کیلئے دوسری مصیبت ملائم سنگھ یادو نے کھڑی کی اس لئے کہ وہ اپنے

یادو برادری یعنی اہیر رائے دہندگان کو لے کر الگ ہو گئے۔ جو اتحاد ذات پات کے تانوں بانوں سے بنتا ہے اس کا ذات پات کی بنیاد پر بکھر جانا فطری امر ہے۔ مسلم رائے دہندگان ابتداء میں چرن سنگھ کے علاوہ کانگریس کی جانب مائل تھے لیکن آگے چل کر اس ووٹ بنک کے مزید دو دعویدار ملائم سنگھ یادو اور مایاوتی کی شکل میں سامنے آگئے ۔جس کے سبب راشٹریہ لوک دل کا اثرو رسوخ سمٹتا چلا گیا۔چودھری چرن سنگھ نے کانگریس اور جن سنگھ سے الگ اپنی شناخت قائم کی تھی اور جنتا پارٹی میں بھی وہ سنگھ پریوار کے نفوذ کی مخالفت کرتے تھے اسی لئے دوہری رکنیت کے مسئلے پر انہوں نے سابق جن سنگھیوں سے لڑائی مول لے لی تھی۔ اجیت سنگھ یہ نہیں کر سکے انہوں نے پہلے تو کانگریس کے ساتھ الحاق کیا اور پھر بی جے پی کے ساتھ ہاتھ ملانے سے بھی نہیں چوکے۔ اجیت سنگھ کی اس ابن الوقتی نے ان کی سیاسی ساکھ خراب کردی جو انتخابی نتائج صورت میں ظاہر ہوتی رہی۔

قومی ذرائع ابلاغ نے یہ راگ الاپا کہ مظفر نگر کا فساد دراصل بی جے پی و سماجوادی پارٹی کی اندرونی سانٹھ گانٹھ کا نتیجہ ہیں اور اس کا مقصد اجیت سنگھ کے ووٹ بنک پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ مظفر نگر کی حدتک اگر گزشتہ دس سالوں کے انتخابی اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو اس تصدیق نہیں ہوتی۔ اس دوران دو پارلیمانی اور دو اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ بی جے پی کے اشوک کنسل کو ۲۰۰۲ء

کے صوبائی انتخاب میں ۳۲ فیصد ووٹ ملے اور وہ کامیاب ہوگیا دوسرے نمبر پر سماجوادی پارٹی کا میدوار چترنجن سوروپ تھا جسے ۲۶ فیصد ووٹ ملے۔ ۲۰۱۲ء کے اندر یہ ترتیب بدل گئی سماجوادی پارٹی کے اسی سوروپ کو ۳۵ فیصد ووٹ مل گئے اور بی جے پی کا کنسل ۲۵ فیصد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اور ۲۰۱۲ء کے اسمبلی انتخابات میں مظفر نگر سے بہوجن سماج پارٹی نے غیر مسلم ۲۰۰۷ء امیدواروں کو ٹکٹ دیا۔ دونوں مرتبہ اسے ۱۹ فیصد کے قریب ووٹ ملے گویا یہ مایاوتی کا اپنا دلت اور گوجر ووٹ تھا جس میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اجیت سنگھ اور کانگریس کے الحاق کو ۱۴اور ۵ء۱۲ فیصد پر اکتفا کرنا پڑا۔ ان اعداوشمار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مظفر نگر اسمبلی حلقہ میں اجیت سنگھ ویسے بھی بے وزن ہو چکے تھے اصل مقابلہ ایس پی اور بی جے پی کا تھا ایسے میں ایس پی اپنے مسلمان رائے دہندگان کو ناراض کرکے کسی بھی صورت میں اپنے راست حریف بی جے پی کو مضبوط کرنے کی غلطی نہیں کرسکتی۔ اجیت سنگھ کو کمزور کرنے کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ پہلے ہی چوتھے نمبر پر پہنچے ہوئے تھے۔

پارلیمانی انتخابات کے اعداد وشمار بھی دلچسپ ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں سماجوادی کے منور حسن نے ۳۵ فیصد ووٹ حاصل کرکے بی جے پی کے امرپال سنگھ کو شکست دی جسے

۲۷.۵ فیصد ووٹ ملے تھے۔ بہوجن سماج پارٹی ۲۱ فیصد ووٹ لے کر تیسرے اور کانگریس واجیت سنگھ کا الحاق چوتھے نمبر پر تھا۔ ۲۰۰۹ء کے اندر اجیت سنگھ نے بی جے پی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا جس کے نتیجے میں بی جے پی کے ووٹ کا تناسب بڑھ کر ۳۴ فیصد تک پہنچ گیا اس کے باوجود امرپال سنگھ کامیاب نہ ہوسکا۔ اس لئے کہ اس بار مایاوتی نے صورت سنگھ ورما کے بجائے قدیر رانا کو ٹکٹ دے دیا جس کی وجہ سے بی ایس پی کے ووٹ کا تناسب ۲۱ فیصد سے بڑھ کر ۳۷ فیصد تک پہنچ گیا۔ یہ ۱۶ فیصد مسلمان ووٹ تھے جو سماجوادی پارٹی کے ووٹ بنک سے نکل کر آئے تھے جس کے تناسب میں ۲۱ فیصد کی کمی واقع ہوئی تھی۔ سماجوادی کے پانچ فیصد ہندو ووٹ ممکن ہے کانگریس کی جھولی میں چلے گئے ہوں اس لئے اس نے سعیدالزماں کو ہٹا کر انورادھا چندرا کو ٹکٹ دیا تھا اور اجیت سنگھ کے دور ہوجانے کے باوجود اس کے ووٹ کی شرح صرف ۲ فیصد کم ہوئی تھی۔ مغربی یوپی میں ۲۰۰۹ء کے اندر اجیت سنگھ کو بی جے پی کی مدد سے ۵ نشستیں ملی تھیں۔ بی جے پی اور سماجوادی دونوں کو ۳ اور کانگریس کو ایک پر اکتفا کرنا پڑا تھا جبکہ سب سے زیادہ ۶ نشستیں بہوجن سماج کو حاصل ہوئی تھیں۔ بی ایس پی کو سماجوادی پارٹی اپنا بی جے پی سے بڑا حریف جانتی ہے اس لئے فساد کروا کر وہ مسلمانوں کو بی ایس پی کی جانب نہیں ڈھکیل سکتی۔ مظفر نگر کے پارلیمانی حلقے میں گزشتہ دونوں مرتبہ بی جے پی دوسرے نمبر پر رہی ایسے میں ایس پی اس کو طاقتور بنا کر پہلے نمبر لانے کی حماقت کیوں کرے گی یہ بھی سمجھنا محال ہے۔

اس لئے ان فسادات کے پس پشت سماجوادی پارٹی کے سیاسی مفاد کا مفروضہ کمزور معلوم ہوتا ہے۔

اس سیاسی صورتحال کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مظفر نگر میں بھیانک فساد رونما ہوا جس میں ۵۰ سے زیادہ جانیں تلف ہوئیں جمیت العلمائے ہند نے دورے کے بعد مہلوکین کی جو فہرست شائع کی ہے اس میں پچاس نام ہیں اور ایک کے سوا سب مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ غیر مسلم بھی مارے گئے مثلاً وہ گورو اور سچن جنہوں نے شاہنواز کو بھرے بازار میں مارڈالااور جنہیں مشتعل ہجوم نے ہلاک کر دیا۔ اس طرح گویا فساد کی ابتداء ہو گئی۔ ان کے علاوہ آئی بی این چینل کا ہلاک ہونے والا صحافی راجیش ورما۔ ضرورت اس بات کی ہے سطحی قیاسات کے بجائے فساد کی وجوہات کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ ہر فساد کو گجرات سے جوڑ دینا اور مودی کو ذمہ دار ٹھہرا دینا سادہ لوحی ہے۔ امیت شاہ کے اتر پردیش بی جے پی کی انتخابی مہم کا سربراہ بنائے جانے پر ان لوگوں کو حیرت ضرور ہو گی جو اس بات کو بھول گئے ہیں کہ گزشتہ سال اسمبلی کے انتخاب میں مدھیہ پردیش کی اوما بھارتی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہ سب تو اتر پردیش میں بی جے پی کی قحط الرجالی کے مظاہر ہیں۔

بی جے پی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ اس علاقے میں اجیت سنگھ کو ساتھ

لینے کے باوجود کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکی ۔اس مرتبہ اجیت سنگھ کانگریس کی حکومت وزیر ہوا بازی ہیں۔بی جے پی نے اجیت سنگھ کے جاٹ رائے دھندگان کی کمی کو پورا کرنے کیلئے مہندر سنگھ ٹکیت کے بیٹے نریندر سنگھ ٹکیت سے پینگیں بڑھائیں ۔ یہ الزام بھی ہے کہ نریندر سنگھ نے بی کے یو کو خاصہ ہندوتوا وادی بنا دیا ہے جس کے سبب مسلم کسان اس سے دور ہوگئے ہیں۔ جون کے مہینے میں بجرنگ دل کا ایک اجلاس اس علاقے میں ہوا جس میں مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کی گئی۔ اس پر جاٹ بزرگوں نے اعتراض بھی کیا لیکن کشیدگی کو بڑھانے کا عمل جاری رہا۔ لڑکی کی چھیڑ چھاڑ اور اس پر قتل در قتل کے بعد جاٹوں مہا پنچایت ماں بہنوں کی حفاظت کے نام پر بلائی گئی تھی لیکن پھر وہ اپنے آپ وہ ہندتوا کے تحفظ میں بدل گئی ۔ اس میں بی جے پی کے علاوہ کانگریسی رہنماؤں نے بھی خطاب کیا اور اسی سے فساد کی آگ پھیلی۔ بی جے پی کے رکن اسمبلیسنگیت سنگھ سوم نے فساد کی آگ میں تیل ڈالنے کیلئے ایک غیر متعلق فلم کو یوٹیوب سے نکال کر پھیلا کر اشتعال انگیز تیلی لگا دی ۔اس فساد سے گویا بی جے پی کا براہِ راست فائدہ یہ ہوا کہ ان کا ساتھ چھوڑنے والے اجیت سنگھ کے ووٹ ٹکیت کے ذریعہ ان کے پاس واپس آگئے لیکن مسلمانوں کے ووٹوں کی بی ایس پی اور سماجوادی کے درمیان تقسیم کا جو فائدہ اسے ہو سکتا تھا اس سے وہ محروم ہو گئی ۔ اس بار پھر مسلمان سماجوادی پارٹی کو اس کی نااہلی کی سزا دیں گے اور سارے ووٹ ہاتھی پر پڑیں گے۔ کانگریس کو اس سے

کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے سپا، بسپا اور آر یلڈی سارے کے سارے اس کے حلیف ہیں۔

فساد نے سب سے زیادہ نقصان اجیت سنگھ کیا۔ اس لئے کہ مظفر نگر کے اطراف و اکناف مغربی یوپی میں اب نہ جاٹ اس کے ساتھ ہیں، فسطائی ہندو اور نہ مسلمان اس لئے اب اس کا پانچ نشستوں پر کامیابی حاصل کرنا بھی مشکل ہو جائیگا۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ وزیر مملکت ہونے کے باوجود دو مرتبہ ریاستی انتظامیہ نے انہیں اپنے علاقے میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اس پر شکایت کرتے ہوئے ان کے بیٹے اور رکن پارلیمان جینت چودھری نے کہا کہ ریاستی حکومت اس مہاپنچایت کو تو روک نہ سکی جس کے سبب فساد پھیلا اور ہمیں روکتی ہے جبکہ ہم دونوں فرقوں کے درمیان قربت پیدا کر سکتے ہیں۔
مظفر نگر کے مفتی ذوالفقار علی سحر کی بھی یہی رائے ہے کہ مغربی یوپی میں اجیت سنگھ کا صفایہ ہوگیا ہے۔ وہ بی ایس پی کے قدیر رانا سے بھی ناراض ہیں جنہوں نے ۶ ستمبر کو مظفر نگر کے اندر مسلمانوں کے درمیان ایک اشتعال انگیز تقریر کی تھی اور اس کے سبب ان پر فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کا مقدمہ درج ہوگیا۔
مظفر نگر کے فرقہ وارانہ فساد کی بنیادی وجہ صرف اور صرف سماجوادی پارٹی کی نااہلی اور وزیراعلیٰ کی ناتجربہ کاری ہے۔ اگر اس موقع پر ریاستی حکومت

اسی سختی کا مظاہرہ کرتی جس کا ایودھیا میں وی ایچ پی کی ۸۴ کوسی یاترا کو روکنے میں کیا گیا اور جاٹ مہا پنچایت کے اہتمام کی اجازت نہ دیتی تو فساد کی آگ اس قدر تیزی کے ساتھ نہیں پھیلتی۔ انٹلی جنس بیورو اور محکمہ پولس جانتا تھا کہ کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ انسپکٹر جنرل کرائم اشیش گپتا نے اعتراف کیا کہ تیاری کے باوجود مقامی انتظامیہ کی سستی کے سبب تشدد پھوٹ پڑا۔ لیکن افسوس کہ اس مجرمانہ کاہلی کیلئے کسی اعلیٰ افسر کو سزا نہیں دی گئی محض دو ایس ایچ او کی معطلی کافی نہیں ہے۔ حکم امتناعی کے دوران مہا پنچایت کی اجازت ایس ایچ او نہیں دے سکتے۔ اس لئے جن لوگوں نے یہ فیصلہ کیا تھا ان کی سرزنش ہونی چاہئے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ درگا شکتی کے معاملے میں جو کڑا رخ حکومت نے اختیا کیا اس کی ضرورت مظفر نگر میں زیادہ تھی۔

جاٹ مہا پنچایت کے انعقاد کی سنگینی کا اندازہ لگانے میں ریاستی حکام بری طرح ناکام رہے۔ اس مہا پنچایت کے بلانے کا بنیادی سبب شاہنواز کی ہلاکت پر جن آٹھ لوگوں کے نام فرد جرم میں شامل کئے گئے ان کے اخراج کا مطالبہ تھا۔ بی کے یو کے اس مطالبے کو ابتداء میں تسلیم نہیں کیا گیا لیکن فساد ہو جانے کے بعد وہ نام نکال دیئے گئے۔ بی کے یو کے سربراہ راکیش ٹکیت کے مطابق اگر یہی اقدام پہلے ہو جاتا تو نہ صرف یہ کہ مہا پنچایت ٹل جاتی بلکہ تشدد بھی نہ پھیلتا لیکن اکھلیش کی بچپنا اور ملائم سنگھ کا بڑھاپا

مسلمانوں کو لے ڈوبا۔ وہ دونوں اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں پوری طرح ناکام رہے اور اس کی قیمت فی الحال مسلمانوں کو ادا کرنی پڑی لیکن آئندہ سال قومی انتخاب میں انہیں بھی دال آٹے کا بھاؤ معلوم ہو جائیگا۔

مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ فسادات اس بات کے غماز ہیں انتخابی سیاست سے بیجا توقعات انہیں تحفظات فراہم نہیں کر سکتے۔ جوڑ توڑ کی انتخابی سیاست پر تعمیر ہونے والے ہوا محل کو ہوا کا معمولی سا جھونکا زمین دوز کر دیتا ہے۔ جن کو دوست سمجھ کر ووٹ دیا جاتا وہ دشمنوں کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ گزشتہ دس سالوں سے مظفر نگر کے مسلمان کمال ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بی جے پی کو کامیاب ہونے سے روک رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اسمبلی میں ایس پی کو جتایا جس نے حکومت بنائی۔ پارلیمان میں بی ایس پی کو کامیاب کیا جو حزب اقتدار کی حلیف ہے اس کے باوجود بدترین قسم کے فساد سے دوچار ہوئے اور پچاس لوگوں کی شہادت کے ساتھ ہزاروں کو بے خانماں ہونا پڑا۔ اس لئے یہ سمجھ لینا کہ انتخابی کامیابی کو جادوئی کا چراغ ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آنے والا جن ہمارا تحفظ کرے گا ایک خام خیالی سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔ ملک کی فی الحال جو فرقہ وارانہ صورتحال ہے اس پر یہ مشہور شعر (ترمیم کے ساتھ) صادق آتا ہے کہ

برباد گلستاں کرنے کو بس ایک ملائم کافی تھا

ہر شاخ پہ مودی بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا

سنگھ پریوار: راہ زن کو قافلے کا رہنما کس نے کیا؟

امن و سلامتی کا قیام مرکزی حکومت کی اولین ذمہ داری ہے اس کیلئے وزیراعظم نے سونیا کے ساتھ فسادزدہ مظفر نگر کا دورہ کیا۔ مگرمچھ کے آنسو بہائے اور قومی یکجہتی کونسل کا اجلاسطلب کرلیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان نمائشی اقدامات سے فسادات رک سکتے ہیں ؟جبکہ وزیر داخلہ سوشیل کمار شندے اعتراف کر چکے ہیں جیسے جیسے انتخابات قریب آئیں گے ہم مزید فرقہ وارانہ تشدد دیکھ سکتے ہیں۔ ہم نے گیارہ ریاستوں کو چوکنا کردیا ہے ۔ تو کیا مرکزی حکومت کی ذمہ داری بس ریاستی حکومتوں کو خبردار کردینے تک محدود ہے ؟ کونسل کے اجلاس میں وزیر داخلہ نے کہا گزشتہ چند ماہ کے اندر (فرقہ وارانہ تشدد کے) واقعات میں ہونے والا اضافہ اس بات کا غماز ہے کہ اس کے پس پشت ناپاک ارادے کارفرما ہیں ۔ فرقہ وارانہ طاقتیں دلیر ہو گئی ہیں اور معاشرے میں فرقہ واریت کو بڑھا رہی ہیں۔

وزیر داخلہ نے یہ توبتلا دیا کہ فرقہ وارانہ قوتیں کیا کررہی ہیں لیکن یہ نہ بتاسکے کہ وہ خود کیا کررہے ہیں؟ اس لئے کہ کانگریس پارٹی فی الحال نہ صرف خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے بلکہ بلاواسطہ فرقہ پرستوں کا تعاون کررہی

ہے۔اس میں شک نہیں کہ موجودہ صورتحال میں فرقہ واریت کی لہر کا جس قدر فائدہ بی جے پی کو ہورہا ہے اس سے زیادہ کانگریس پارٹی اس سے مستفید ہورہی ہے۔
فسطائیت کے ہون کنڈ میں اس کی ساری نااہلی اور بدعنوانی جل کر راکھ ہوچکی ہے۔
مہنگائی کا آسیب کافور بن کر اڑ چکا ہے۔بی جے پی نے مودی کو وزیراعظم کا امیدوار بنا کر کانگریس کا کام آسان کردیا ہے۔اب اس کو یہ کرنا ہے کہ مسلمانوں کو خوف کی نفسیات میں مبتلا رکھ کر یرغمال بنائے رکھا جائے اوراعتدال پسند ہندوؤں کے سامنے مودی کے مجرمانہ کردار کو بے نقاب کردیا جائے۔
اس حکمت عملی کے پیش نظر کانگریس کے زیرِ اثر سی بی آئی نریندر مودی کو گھیرنے کیلئےایک طرف تو عشرت جہاں فرضی مڈبھیڑ کی تفتیش کررہی ہے تاکہ مسلمان خوش ہوجائیں اور دوسری جانب ہرین پنڈیا کا معاملہ طشت ازبام کرنے جارہی ہے تاکہ مودی کی ہندو دوستی بے نقاب ہوجائے۔ یہ کام نہایت صبر وسکون کے ساتھ دھیمی آنچ پر کیا جارہاہے تاکہ بدلے کی کارروائی کا گمان نہ گزرے۔اس حکمت عملی کا ایک پیادہ فی الحال ڈی جی ونجارہ ہے جس نے سابرمتی جیل میں ہرین پنڈیا کے قتل کو سیاسی سازش قراردے دیا۔ ہرین مرڈر کیس میں ونجارہ کو اس لئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ۲۶ مارچ ۲۰۰۳ کو جب ہرین پنڈیا کا قتل ہوا ونجارہ احمدآباد کرائم برانچ کا سربراہ تھا۔
دودن کی ابتدائی تفتیش کے

بعد یہ معاملہ سی بی آئی کے حوالے کیا گیا اور اس دوران شواہد کو جس طرح مٹایا گیا اس سے ونجارہ سے زیادہ کوئی اور واقف نہیں ہے۔ مرکز میں اس وقت چونکہ این ڈی اے کی حکومت تھی اس لئے اڈوانی جی کے تحت کام کرنے والی سی بی آئی نریندر مودی کی ہمنوا تھی۔ لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے اڈوانی اور سی بی آئی دونوں ہی مودی کے خلاف ہیں۔ گزشتہ ہفتہ پھر ایک بار ہرین پنڈیا کی بیوہ جاگرتی نے دہلی میں سی بی آئی سے رابطہ کرکے درخواست کی ہے ونجارہ کے ذریعہ از سر نو تفتیش کرکے اصل مجرم تک پہنچا جائے۔

عوام کی ایک بڑی اکثریت اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ نریندر مودی صرف مسلمانوں کیلئے خطرناک ہے یا کم از کم سنگھ پریوار کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس خوش فہمی کا شکار لوگوں کو چاہئے کہ وہ گجرات کے سابق وزیر داخلہ ہرین پنڈیا کا عبرتناک انجام دیکھ لیں۔ ہرین براہمن تھا اس کا گہرہ تعلق نہ صرف ہندو سماج بلکہ سنگھ پریوار سے تھا۔ وہ کیشو بھائی کی بی جے پی سرکار میں وزیر داخلہ رہ چکا تھا مگر نریندر مودی کی مخالفت اسے لے ڈوبی۔ ہرین پنڈیا چونکہ مودی کے لئے خطرہ بن گیا تھا اس لیے سویم سیوک ہونا اس کے کسی کام نہ آیا۔ نریندر مودی نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد ہرین پنڈیا کو وزارت سے محروم کرکے سب کو چونکا دیا تھا۔ سنگھ پریوار کے اور اعلیٰ کمان کے دباؤ میں توسیع کے وقت اسے وزیر محصول بنایا گیا۔

نریندر مودی نے اس سے قبل انتخاب نہیں لڑا تھا اس لئے اس کی نگاہِ بد ایلس برج کے حلقے پر پڑی جہاں سے ہرین پنڈیا نے مسلسل تین بار کامیابی حاصل کی تھی اور آخری مرتبہ ۵۵۰۰۰ ہزار کے فرق سے جیتا تھا۔ ہرین پنڈیا نے جب مودی کے حق میں دستبردار ہونے سے انکار کردیا تو ان کی ان بن کئی گنا بڑھ گئی۔ ہرین پنڈیا نے گودھرا ٹرین میں جلنے والے کارسیوکوں کی لاشوں کو احمد آباد لانے کی مخالفت اس بنیاد پر کی تھی کہ اس سے فرقہ وارانہ آگ پھیلے گی لیکن اسے ڈانٹ کر خاموش کردیا گیا۔ اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا گجرات فرقہ واریت کی آگ میں جھونک دیا گیا لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوئی سابق چیف جسٹس کرشنا ائیر کی سربراہی میں تفتیش کرنے والے آزاد عوامی ٹریبونل کے سامنے ہرین پنڈیا نے مودی انتظامیہ کو فساد کیلئے قصوروار ٹھہرادیا۔ اس بیان کی آڈیو کیسٹ سپریم کورٹ میں پیش کی جاچکی ہے۔

ہرین پنڈیا کی حق گوئی کا انعام اسے یہ ملا کہ پارٹی ہائی کمان کے دباؤ کے باوجود ایلس برج سے ہرین پنڈیا کے بجائے بھاوین شاہ کو ٹکٹ دیا گیا۔ بی جے پی کے اندر اس حوالے سے کافی بے چینی تھی۔ گجرات بی جے پی کا نگراں سنجیو جوشی ہرین نے ہرین کو قومی سکریٹری بنانے کی سفارش کی جو منظور ہوگئی مگر اس سے پہلے کہ ہرین پنڈیا اپنی نئی ذمہ داری کو سنبھالنے کیلئے دہلی جاتا

احمدآباد میں اس کو قتل کردیا گیا۔ ہرین پنڈیا قتل کی بابت سی بی آئی نے یہ جھوٹ گھڑا کہ اسے لاء گارڈنس کے باہر ماروتی گاڑی کے اندر جیش اور لشکر کے تربیت یافتہ دہشت گردوں نے ہلاک کردیا۔ اس پر عزیز بگھروی مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے

گمراہ کن ہیں سارے بیانات ان دنوں
خبریں فریب، جائزے نامعتبر تمام

اس گمراہ کن فریب کے خلاف کئی ثبوت موجود تھے مثلاً قتل سے ایک ہفتہ قبل احمدآباد میونسپلٹی کے ذریعہ پھیری والوں پر پابندی جسے بعد میں اٹھا لیا گیا۔ گاڑی کے اندر یا باہر خون کے نشان کا ندارد ہونا۔ آس پاس سے گولی کا چھرا برآمد نہ ہونا۔ پنڈیا کو ٹانگوں کے درمیان فوطے میں گولی ماری گئی تھی جو اوپر کی طرف چلتی چلی گئی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے فرد کو اس طرح نہیں مارا جاسکتا۔ گجرات ڈی جی پی شری کمار کی تصدیق کہ ہرین پنڈیا دہشت گردوں کی ہٹ لسٹ میں شامل ہی نہیں تھا۔ مودی کے پرنسپل سکریٹری پی کے مشرا کا ۷ جون ۲۰۰۲ء کو شری کمار سے پوچھنا کہ عوامی کمیشن کے سامنے کس وزیر نے بیان دیا۔ ۱۲ جون ۲۰۰۲ء کو شری کمار نے ہرین پنڈیا کا نام بتایا اس طرح گویا پنڈیا کا نام مودی کی ہٹ لسٹ میں چڑھ گیا۔ ان شواہد کے باوجود مودی کے دباؤ میں پوٹا عدالت نے فورنسک رپورٹ مسترد کرکے سی بی آئی کے جھوٹ کو تسلیم کرلیا۔

ہرین پنڈیا کے والد کا اسے سیاسی قتل قرار دیا لیکن مودی کے راج میں اس سویم سیوک کی حالتِ زار پر عزیز بگھروی کے اس شعر کے مصداق تھی ۔

فریاد لے کے جائیں بھی تو جائیں کس کے پاس ہیں بے ضمیر مسندِ انصاف پر تمام

مودی کا پنڈیا کے قتل میں ملوث ہونا اس وقت اس قدر عام بات تھی کہ جب مودی اسپتال پہنچا تو وہاں موجود بی جے پی کارکنان نے نریندر مودی ہائے ہائے کے نعرے لگائے اور ہرین کے والد اور بہن نے دھکے دے کر اسے بھگا دیا۔ ہرین کے جنازے میں عوام کی غیر معمولی تعداد نے شرکت کی مگر اس کے تیسرے دن جب تعزیت کے لئے لوگوں کا آنا تھا مودی نے ایک پارٹی میٹنگ رکھ کر لوگوں کو روکا۔ ہرین کا مجسمہ نصب کرنے کی مخالفت کی بلکہ اس کی صفائی کیلئے زینہ تک نہ دیا۔ ڈاکٹر یونس بھاونگری کے ذریعہ پنڈیا پر فساد میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا جسے پنڈیا کے والد نے مودی کی مذموم حرکت قرار دیتے ہوئے اس قتل میں مودی کے ملوث ہونے کا الزام دوہرایا اور کہا سی بی آئی عوام کو گمراہ کر رہی ہے اس کے باوجود سی بی آئی نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اور ایک مسجد کے امام سمیت ۱۲ افراد کو آندھرا پردیش سے گرفتار کرلیا۔

سی بی آئی کے افسر شرما نے اصغر علی کو اصل مجرم قرار دیا اور اعلان کیا کہ اس کے کشمیری دہشت گرد تنظیم سے تعلقات ہیں ۔ اس نے پاکستان میں تربیت حاصل

کی ہے اور پاکستان بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا کہ گرفتار کرلیا گیا۔اس کے پاس سے اسلحہ برآمد کرنے کا بھی دعویٰ کیا گیا۔ ۲۰۰۷ء کے اندر ایک مفرور ملزم جنید نے اپنے آپ کو پراسرار انداز میں پولس کے سپرد کیا جبکہ اسے ایک مرتبہ گرفتار کرکے رہا کیا جاچکا تھا۔ اس کی شہادت پر پوٹا عدالت نے فیصلہ دیا کہ یہ قتل ۲۰۰۲ء کے فسادات کا بدلہ لینے کی خاطر کیا گیا تھااس لئے بارہ میں سے نو کو عمر قید کی سزادو کو سات اور ایک کو پانچ سال کی سزا سنائی گئی۔ ۲۰۰۹ء میں عدالت نے ان میں سے تین کی ضمانت کردی اس لئے کہ ان پر صرف یہ الزام تھا کہ اصغر علی نے ان کے گھر پر قیام کیا تھا۔اس جرم کی سزا سات سال تھی جس میں پانچ سال وہ جیل میں گزار چکے ہیں انہیں ضمانت نہ دینا بلامقدمہ ے سزا دینے کے مترادف ہے۔

اگست ۲۰۱۱ء میں سب کے سب بارہ ملزمین کو گجرات ہائی کورٹ نے بری کردیا لیکن اس وقت تک ان میں سے کئی آٹھ سال کی سزا بھگت چکے تھے۔ عدالت کے مطابق سائنسی شواہداور عینی گواہوں کے درمیان تفاوت تھا۔ جسٹس واگھیلا اور اپادھیائے نے تفتیش کو لاپرواہی سے کی گئی پیوندکاری اور اندھیر نگری قرار دیا۔اس طرح کی تفتیش پر عوامی فنڈکے ضیاء کا الزام بھی لگایا لیکن جن بے گناہوں کی زندگی تباہ کردی گئی اس پر کسی افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ گجرات کی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس نے ایک سال بعد اس مقدمے سے رہا

ہونے والے اشرف ناگوری کو اسلحہ سمیت گرفتار کرنے کا دعویٰ کردیا۔ کیا کوئی ذی شعور انسان اس طرح کی غلطی کر سکتا ہے لیکن مودی کی بے شعور حکومت یہ کر گزری ۔بقول حفیظ الرحمٰن احسن رہزن کو رہنما بنانے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے

اس دورِ زیاں کار نے کیا کچھ نہ دکھایا
رہ زن تھے جو وہ راہنما ہو گئے کیسے ؟

حیرت کی بات یہ ہے ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف نہ صرف گجرات کی ریاستی حکومت بلکہ سی بی آئی نے بھی سپریم کورٹ سے رجوع کیا حالانکہ اب وہ کانگریس کے تحت تھی لیکن جب سپریم کورٹ نے سی بی آئی کو ناقص تفتیش پر پھٹکار لگائی تو اس نے ہرین پنڈیا کے معاملے پر از سر نو تفتیش کے لئے اپنے صدر دفتر سے اجازت طلب کی۔ اس معاملے میں سپریم کورٹ کے اندر معطل آئی پی ایس افسر سنجیو بھٹ کا حلفیہ بیان موجود ہے جس کے مطابق سہراب الدین کے ساتھی پرجاپتی تلسی رام نے پنڈیا پر گولی چلائی۔ ۲۰۰۳ء میں جب اصغر علی سابرمتی جیل میں تھا تو اس نے جیل سپرانٹینڈنٹ سنجیو بھٹ کو بتایا کہ سہراب الدین نے اس سے پنڈیا کے قتل کیلئے رابطہ کیا اور اجھے چڈ سامہ اسے قتل کیلئے پستول دینے والا تھا لیکن وہ خوفزدہ ہوگیا اور حیدرآباد واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اسے پتہ چلا کہ تلسی رام نے ہرین کا کام تمام کردیا۔ بھٹ نے

اس کی تحریری اطلاع امیت شاہ کو دی تو وہ گھبرا گیا اور اس نے بھٹ کو رازداری برتنے کی تاکید کی۔ آگے چل کر سنجیو بھٹ کا تبادلہ کر دیا گیا۔

سنجیو بھٹ کے بیان کی تصدیق ۲۰۱۰ء میں سہراب الدین کے ساتھی اعظم خان نے بھی کی۔ اعظم خان کا نام سی بی آئی کی فرد جرم میں چوتھے نمبر کے گواہ کی حیثیت موجود ہے۔ اعظم خان نے سی بی آئی کو بتایا کہ خود چڈسامہ نے اس سے کہا تھا کہ میں سہراب الدین کا بہت اچھا دوست تھا اور میں نے اس کو ہرین پنڈیا کے مرڈر کیس میں الجھنے سے اسے بچایا تھا۔ یہ بات چڈسامہ نے ۲۰۰۹ء میں ہمت نگر کے اندر ایک مشترک دوست احمد جابر کے گھر پر بتلائی تھی۔ اصغر علی، اعظم خان کے بیانات اور بھٹ و ونجارہ کی تصدیق بقول سابق وزیر قانون بھارت بھوشن آسمان میں اڑنے والے نریندر مودی کو زمین پر لانے کیلئے کافی ہیں۔ کانگریس نے اس چال کی مہارت سے کھیلا تو نریندر مودی کی حالت ڈاکٹر انور سدید کے اس شعر کی مانند ہو جائیگی ؂

جو کل تک اڑ رہا تھا آسمانوں کی بلندی پر
وہ چلتا ہے زمیں پر اب مگر آہستہ آہستہ

ہرین پنڈیا کے قتل کو اس کے والد ولبھ پنڈیا اور بیوی جاگرتی کے علاوہ سابق وزیر داخلہ گوردھن زڑاپیا و سابق وزیر اعلیٰ کیشو بھائی پٹیل نے بھی سیاسی

سازش قرار دیا ہے۔ ان سب کا تعلق سنگھ پریوار کے ساتھ ہے۔ مودی کے راج میں ایلس.برج سے منتخب ہونے والے ہرین پنڈیا کے دوست بھاوین شاہ پر بھی ۲۰۰۵ میں قاتلانہ حملہ ہوچکا ہے جس میں وہ بال بال بچ گیا۔ مودی کے مخالف سنجے جوشی کو ذلیل کرکے بن باس میں بھیج دیا گیاہے۔ اسے بھی جان سے مارنے دھمکیاں ملیں اور اس سویم سیوک کو کانگریس سرکار کے آگے تحفظ کی جھولی پھیلانے پر مجبور ہونا پڑا۔ مودی اپنے سنگھی مخالفین کے ساتھ اس طرح کا حسنِ سلوک روا رکھتا ہے۔

اڈوانی جی کیلئے اس میں پیامِ عبرت ہے کہ آئندہ پارلیمانی انتخاب کیلئے وہ کوئی محفوظ حلقہٗ انتخاب تلاش کرلیں ورنہ گاندھی نگر تو کجا گجرات کی کسی بھی سیٹ سے ان کی ناکامی مشکوک ہی نہیں بلکہ یقینی ہو جائیگی۔ آرایس ایس سرسنگھ چالک موہن بھاگوت کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مودی کے عتاب کا شکار ہونے والے مذکورہ بالا لوگ مسلمان نہیں بلکہ سنگھ پریوار کے ارکان ہیں ۔ جب تک ان لوگوں نے مودی کی حمایت کی وہ ان کی پشت پناہی کرتا رہا لیکن جب مخالف ہوئے تو وہ ان کی جان کا دشمن ہوگیا۔ اس لئے اگر مستقبل میں اگرانہوں نے اس عفریت کو آنکھ دکھانے کی جرأت کی تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو ہرین پنڈیا کا ہوا ہے لیکن اس صورتحال کیلئے وہ خود ذمہ دار ہوں گے لوگ ان سے سوال کریں گے ۔

لٹ کے راہِ آرزو میں دل سے کہتی ہے نظر
راہ زن کو قافلے کا رہنما کس نے کیا؟

لالو کی حراست: رشوت کی سیاست

ایک تیر سے کئی شکار کرنے کا فن اگر کوئی سیکھنا چاہتا ہے تو کانگریس پارٹی سے سیکھے۔سیاسی بساط پراستعمال کے بعد کوڑے دان کا عملی مظاہرہ اگر کوئی دیکھنا چاہتا ہے تو لالو جی کا حشر دیکھ لے۔لالو کو پھر ایک بارکیوں جیل جاناپڑا اگر یہ سوال مختلف لوگوں سے پوچھا جائے تو بھانت بھانت کے متضاد جوابات ملیں گے۔یادو کہے گا یہ اونچی ذات کے لوگوں کا نچلی ذات والوں کے خلاف بغض و عناد ہے لیکن جگناتھ مشرا جن کو لالو کے ساتھ موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔براہمن ہیں۔ مسلمان کہے گا چونکہ لالو نے اڈوانی کو گرفتار کروادیا تھا اس لئے یہ سنگھ پریوار کی دشمنی ہے لیکن سی بی آئی کی عدالت جس میں فیصلہ تو کانگریس کے زیرِ اثر ہے۔بی جے پی والے کہیں گے یہ رام رتھ یاترا کو روکنے کا پرکوپ (عذاب) ہے لیکن کارسیوکوں پر گولی چلانے والا ملائم سنگھ یادو تو یوپی میں حکومت کررہاہے۔کانگریسی کہیں گے یہ بدعنوانی کے بارے میں ہماری عدم مصالحت کا ثبوت ہے لیکن جب کانگریسی وزراء پر بدعنوانی کے سنگین الزامات لگتے ہیں تو لچک کہاں سے آجاتی ہے۔ملائم ،مایاوتی اور یدورپا کا بال بیکا کیوں نہیں ہوتا؟ درحقیقت یہ تمام خیال خامی صرف اور صرف خودفریبی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔لالو پرشاد یادو کے الفاظ ''جمہوریت

میں اقتدار دائمی نہیں ہوتا''اس کی اپنی ذات پر چسپاں ہو گئے ہیں۔ لالو یادو ہندوستانی سیاست کی بے ثباتی کا منھ بولتا نمونہ ہے اور ان تمام لوگوں کیلئے نشانِ عبرت ہے جو جوڑ توڑ کی سیاست میں یقین رکھتے ہیں۔

ایمرجنسی کے خلاف چلائی جانے والی جئے پرکاش نارائن کے مکمل انقلاب کی تحریک کا ایک تحفہ لالو پرشاد یادو بھی تھا جو ۲۹ سال کی عمر میں رکن پارلیمان بن گیا اور ۱۲ سال بعد ۱۹۸۹ء میں بہار اسمبلی میں حزب اختلاف کا لیڈر کی ذمہ داری پر فائز ہوگیا۔اس کے ایک سال بعد وی پی سنگھ بدعنوانی کے خلاف تحریک نے ۱۹۹۰ء میں اسے وزیراعلیٰ بنا دیا۔لالو پرشاد یادو کی ترقی کے پس پشت نسلی اور مذہبی امتیاز کارفرما تھے۔یادو اور دیگر پسماندہ سماج کے لوگوں کی بھومی ہاروں کے ناروا سلوک کے خلاف بغاوت اور بھاگلپور فساد کے بعد مسلمانوں کی کانگریس کے متبادل کی تلاش نے لالو کو بہار کا بے تاج بادشاہ بنا دیا۔یادو سماج کیلئے لالو کا وزیراعلیٰ کی کرسی پر براجمان ہو جانا ہی سب سے بڑا اعزاز تھا مگر مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کرنے کا نادر موقع لالو یادو کو لال کرشن اڈوانی نے دیا۔ لالو نے اڈوانی کی رام رتھ یاترا کو روک کر سمستی پور میں اسے گرفتار کرلیا اس لئے کہ بقول لالو ''میری ماں نے کہا تھا بھینس کو دم سے نہیں سینگ سے پکڑ قابو میں کیا کرتے ہیں''

لالو یادو ۱۹۹۵ء میں جب دوسری مرتبہ کامیابی حاصل کی تو اعلان کردیا ''جب تک رہے گا سموسے میں آلو تب تک رہے گا بہار میں لالو'' اور یہیں سے لالو کا زوال شروع ہوگیا ۱۹۹۶ء میں لالو کا نام چارہ گھوٹالہ کے اندر منظر عام پر آیا اور ایک سال بعد انہیں استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر لالو نے اپنی بیوی رابڑی دیوی کو سنگھاسن پر بٹھا کر جیل کے اندر سے حکومت کرنے کا منفرد تجربہ کیا۔ لالو کو عوام نے پھر ایک بار کامیاب کیا اور اسے تیسری مرتبہ بہار پر راج کرنے کا موقع دیا لیکن افسوس کہ لالو نے اس تیسرے موقع کو بھی گنوادیا۔ اس دوران لالو یادو خودسر اور خوشامد پسند ہوگیا تھا۔ ''بہار میں سڑک نہیں ہے تو گاڑی کی کیا ضرورت اور غریب لالٹین جلاتا ہے تو بجلی کا کیا کام'' اس طرح کے احمقانہ بیان دینے لگا۔ ہنومان چالیسا کے طرز پر لالو چالیسا تصنیف کیا گیا۔ اسکول کے امتحانات میں طلباء سے لالو کے متعلق تعریفی و توصیفی سوالات پوچھے جانے لگے۔ ریاست میں غنڈہ راج اور بدعنوانی کا بول بالا ہوگیا یہاں تک کہ بیزار عوام نے لالو مسترد کردیا۔ ۲۰۰۵ء کے اندر لالو کی آر جے ڈی کو صرف ۵۴ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی اور وہ بی جے پی کے بعد تیسرے نمبر پر آئی۔

لالو کو اپنی گرتی ہوئی ساکھ کا اندازہ ایک سال قبل ہوچکا تھا اس لئے اس نے ۲۰۰۴ء کے اندر کانگریس پارٹی کے ساتھ مل کر پارلیمانی انتخاب لڑا اور ۲۴

نشستوں پر کامیابی درج کرائی۔ لالو خوش نصیب تھا کہ اس وقت کانگریس پارٹی اکثریت حاصل نہ کر سکی اس لئے اس کو مرکز میں وزیر ریلوے بننے کا موقع مل گیا۔ دہلی آنے کے بعد لالو کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے ریلوے وزیر کی حیثیت سے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔ لالو کے بقول ''جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ میں مشکل حالات میں سے کیسے راہ نکالتا ہوں تو انہیں خود اپنی زندگی میں حوصلہ ملتا ہے''۔ لالو سے قبل ہندوستانی ریلوے ایک خسارے میں چلنے والی وزارت تھی لیکن اس نے ایک مرتبہ مال بردار ڈبوں کا معائنہ کرتے ہوئے پایا کہ بہت سارا مال بغیر کرائے کے ڈھویا جارہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈبے میں ایک خاص وزن سے زیادہ مال برداری کی تحدید تھی۔ اس لئے زائد مال کا کرایہ سرکاری خزانے کے بجائے اہلکاروں کی جیب میں چلا جاتا تھا۔

اس صورتحال میں لالو کو اپنی ماں کی ایک اور نصیحت یاد آئی ''اگر گائے کو پوری طرح نہ دوہا جائے تو وہ بیمار ہو جاتی ہے''۔ جب ڈبے اور پٹری زیادہ وزن ڈھو سکتے ہیں تو ان کو کم وزن اٹھانے کا پابند کیوں کیا جائے؟ لالو نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ مال ڈبے میں بوجھ کی مقدار پر لگی پابندی ہٹا دی اور پھر مال بردار گاڑی میں ڈبوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم کرچ پر زیادہ مال ڈھویا جانے لگا اور بدعنوانی پر بھی

روک لگ گئی ۔ اس کے بعد لالو نے ریلوے اصلاحات کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ نئی ریل گاڑیاں، کمپیوٹر، ریزرویشن کی نت نئی سہولیات وغیرہ۔ نتیجتاً لالو کے دور میں ریلوے نے ۲۵۰۰۰ کروڑ کا منافع کر کے دکھا دیا۔ امریکہ کے تجارتی کالجوں نے ہندوستانی ریلوے کی کامیابی کا سبق اپنے نصاب میں شامل کیا۔ وہاں کے طلباء ریلوے بھون میں تعلیمی سیاحت کے دوران تشریف لانے لگے۔ خود لالو یادو کو ہارورڈ اور وہارٹن جیسی یونیورسٹی میں خطاب کی دعوت دی گئی ۔ لالو یادو نے ۲۰۰۸ء کے بجٹ کی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ ہماری کارکردگی دنیا کی بہترین ۵۰۰ کمپنیوں سے بہتر ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس دوران لالو نے عام مسافروں پر بوجھ بڑھانے کے بجائے دیگر ذرائع سے آمدنی کی جانب توجہ کی ۔ اس دوران ریلوے گاڑیاں اشتہار بازی کا ذریعہ بن گئیں اور خوبصورت بھی نظر آنے لگیں۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لالو اپنی غیر معمولی کامیابی کا سیاسی فائدہ کیوں نہ اٹھا سکا؟ اس کی کئی وجوہات ہیں ۔ اول تو یہ کہ دہلی کی کامیابی و پذیرائی لالو کے اندر پائی جانے والی سادگی و خاکساری کو نگل گئی ۔ اس کے مزاج میں تکبر اور خودسری کے عناصر ظاہر ہونے لگے اس کی دو مثالیں ذرائع ابلاغ میں بھی آئیں۔ ایک مرتبہ لالو وزیر ریلوے کی حیثیت سے بہار کے کسی ریلوے اسٹیشن کا معائنہ کرنے کیلئے پہنچا۔ علاقے کے لوگوں کو جب اطلاع

ملی تو وہ اپنے رہنما کے درشن کیلئے اسٹیشن پہنچ گئے۔ لالو نے انہیں اہانت کے ساتھ دھتکار دیا اور کہا یہ لوگ بنا پلیٹ فارم ٹکٹ کے اندر آئے ہیں ان کا چالان کرو۔ اپنے مداحوں کے ساتھ ایسا اہانت آمیز سلوک ایسا سیاسی رہنما نہیں کرسکتا جس کو ان کے آگے ووٹ کی جھولی پھیلانی ہے۔ اسی طرح دہلی میں ایک مرتبہ لالو کی بیٹی نے ایک صحافی کو بھرے بازار میں طمانچہ رسید کردیا۔ لالو اپنی بیٹی کی ڈانٹنے کے بجائے اس کی ناروا حرکت کو حق بجانب ٹھہرا کر اپنی رعونت بے نقاب کردیا۔

لالو کے زوال کی دوسری وجہ خود اپنی ریاست بہار کے عوام اور سرکاری افسران کی ناقدری تھی۔ وہ اپنی کمزوری کیلئے دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگا تھا۔ جب لالو سے یہ سوال کیا گیا کہ جو کچھ اس نے دہلی میں کیا وہ پٹنہ میں کیوں نہ کرسکا؟ تو اس کا جواب تھا وزارت ریلوے کے افسران منظم اور باصلاحیت ہیں ان کو جو کام تفویض کیا جاتا ہے وہ توقعات پر پورے اترتے ہیں جبکہ بہار میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ لالو پرشاد یادو کی غلط فہمی تھی جو نتیش کمار نے اقتدار سنبھالنے کے بعد دور کردی۔ لالو جن سرکاری افسران کو ناکارہ قرار دیتا تھا وہی نتیش کے ساتھ کارآمد ہوگئے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لالو وزارت ریلوے کے اندر افسران کا موقف سنتا تھا۔ ان کی بات کو سمجھنے کو شش کرتا تھا اور انہیں اعتماد میں لے کر کام کرتا تھا جبکہ بہار کے اندر وہ

خوشامد کرنے والے وزراء اور اہلکاروں کے درمیان گھرا رہتا تھااور ٹھوس کارکردگی کے بجائے نمائشی اقدامات وجذباتی استحصال سے کام چلانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ کاغذ کی ناؤایک عرصے تک چلی لیکن پھر اپنے بوجھ سے ڈوب گئی۔

دہلی قیام کے دوران لالوپرشاد یادو عالمی سطح اپنی مقبولیت بڑھاتا رہا یہاں تک کہ اس نے پاکستان کا بھی نہایت کامیاب دورہ کیا مگر خود اپنی ریاست کے عوام سے اس کا رابطہ بتدریج کمزور ہوتا چلاگیا۔ مگر میڈیا کی چکاچوندھ میں وہ بھول گیا کہ دنیا بھر کے لوگ اس کے فقروں پر تالیاں تو بجا سکتے تھے مگر اس کی پارٹی کو ووٹ نہیں دے سکتے تھے اور یہ تلخ حقیقت کا ادراک نہ کرسکا کہ وزارتِ ریلوے میں حاصل کی جانے والی کامیابیوں کا براہِ راست فائدہ بہار کے رائے دہندگان کو نہیں مل ہو رہا ہے۔اس کے نتیجے میں خود اپنی ریاست کے اندر اس کا حلقۂ اثر سمٹتا چلاگیا۔ اس کی ایک مثال ۲۰۰۸ء میں کوسی ندی کے سیلاب کی غیر معمولی تباہی کے دوران سامنے آئی ۔ پہلے تو لالو نے اس کیلئے نتیش کی نااہلی وبدانتظامی کو موردالزام ٹھہرایا لیکن جب جے ڈی یو کے ارکانِ پارلیمان نے مرکز کے عدم تعاون پر استعفیٰ دے دیا تو لالو کی آنکھ کھلی اور اس نے ریلوے کے ذریعے امدادی سامان کی بڑی کھیپ بھجوا کر سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں بھی کریڈٹ حاصل کرنے کیلئے

انتظامیہ کا تعاون لینے کے بجائے تقسیم کاری کا کام اپنی پارٹی کے ذمے کردیا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام پریشان ہوتی رہی اور امدادی مال واسباب آر جے ڈی کے دفاتر میں سڑتا رہا۔ اس طرح کی حماقت نے لالو کی رہی سہی سیاسی ساکھ کو بھی ملیامیٹ کردیا۔ ریاست کی عوام اور اس کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کا اظہار ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء کے انتخابی نتائج میں ہوگیا اور لالو کی ریل پٹری سے اتر کر بالآخر جیل چلی گئی۔

لالو کے اس بار جیل جانے کی بنیادی وجہ بدعنوانی نہیں بلکہ سیاسی بے وزنی ہے اور کانگریس کی ابن الوقتی ہے۔ ۲۰۰۵ء کے ریاستی انتخابات میں لالو کی آر جے ڈی کو ۵۴ نشستیں ملی تھیں جو ۲۰۱۰ء کے اندر صرف ۲۲ پر سمٹ گئیں جبکہ جنتادل اور بی جے پی کے اتحاد کو ۲۴۳ میں سے ۲۰۶ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ ۲۰۰۴ء میں ایوانِ پارلیمان میں ۲۳ نشستوں پر کامیابی حاصل کرنے والی آر جے ڈی کو ۲۰۰۹ء میں صرف ۴ نشستوں پر اکتفا کرنا پڑا۔ لالو کو جیل لے جانے والے یہی اعداد و شمار ہیں۔ اگر یہ سب نہ ہوتا تو لالو کے اس مقدمے میں سی بی آئی نت نئے متضاد شواہد پیش کرکے ٹال مٹول کا سلسلہ جاری رکھتی اور لالو اقتدار کے گلیارے میں عیش کرتے رہتے۔ لالو کا ستارہ چمکانے میں جس طرح اڈوانی نے بلاواسطہ مدد کی اسی طرح اس کی لٹیا ڈبونے میں نریندر مودی نے ہاتھ بٹایا۔ اگر نتیش کمار مودی کا بہانہ بنا کر اپنا دامن بی جے پی سے

نہیں جھاڑتے تو کانگریس کو لالو ضرورت باقی رہتی اور وہ اسے سیاسی بن باس پر روانہ کرنے سے گریز کرتی لیکن نتیش کمار نے بی جے پی کو طلاق دے کر کانگریس کو نکاح کا پیغام دے دیا جس کے نتیجے میں کانگریس کو لالو سے خلع لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ لالو کے جیل چلے جانے کے بعد اس رشتے کے ٹوٹنے سے کانگریس کا نقصان بے حد کم ہوجائیگا۔ مسلمان ویسے ہی مودی کی مخالفت کے سبب نتیش کمار پر فدا ہیں۔ اب وہ لالو کے بجھتے ہوئے لالٹین میں تیل ڈالنے کے بجائے شرح صدر کے ساتھ جنتادل کا چراغ روشن کریں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ لالو یادو کو اپنی کمزوری کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ مئی ۲۰۱۳؁ء اپنی پارٹی کے تجدید واحیاء کیلئے انھوں نے پریورتن ریلی کا اہتمام کیا لیکن اسے بھی کوئی خاص پذیرائی نہیں ملی۔ اس کا اعتراف لالو نے اپنی پارٹی ورکرس کے سامنے حال میں اس طرح سے کیا کہ ’’میں اپنے لئے بہت نام کما چکا ہوں۔ میرے پاس کافی دھن دولت ہے۔ میں اپنے خاندان کو مستحکم کرچکا ہوں اور میرا مستقبل محفوظ ہے۔ اب آئندہ ریاستی انتخاب میں تمہیں خود اپنی فکر کرنی چاہئے‘‘ اس خطاب کے اندر جو مایوسی اور شکست خوردگی ہے اسے ہر کوئی محسوس کرسکتا ہے۔ اس سے پارٹی کے کارکنان کا حوصلہ کس قدر پست ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ جبکہ یہ وہی رہنما ہے جس نے ایک بار خود اپنے متعلق کہا تھا’’ میں ایک دن وزیراعظم بننے کے امکان سے انکار تو نہیں کرتا

مگر اس کیلئے ابھی وقت ہے''۔ کون جانتا تھا کہ لالو چالیسا کا اختتام اس قدر عبرت خیز ہوگا۔ رابڑی دیوی کے مطابق وہ اپنے بیٹوں تیجسوی اور تیج پرتاپ کی مدد سے پارٹی چلائیں گی۔ لالو پھر ایک بار وہ غلطی دوہرانے جارہا ہے جس نے نتیش کمار کو اس کا دشمن بنادیا تھا۔ اگر ۱۹۹۷ء میں اس نے رابڑی کے بجائے نتیش کو بہار کا وزیراعلیٰ بنایا ہوتا تو آر جے ڈی نہیں ٹوٹتی اور ممکن ہے آج بہار میں نتیش وزیراعلیٰ اور دہلی میں لالو کا بنی وزیر ہوتا لیکن اقرباپروری کے چلتے یہ کیونکر ممکن تھا؟

لالو کے جیل چلے جانے سے کچھ دانشوروں کو یہ خوش فہمی بھی ہے اس سے بدعنوانی کے عفریت پر لگام لگے گی لیکن لالو کی کیا بساط کہ وہ تو ایک سابق وزیر ریلوے ہے ۲۰۰۰ء کے اندر سابق وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ کو بھی نچلی عدالت نے جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے ارکانِ پارلیمان کو ۱۹۹۳ء میں رشوت دے کر اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے جرم میں موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ اس وقت نرسمہا راؤ بھی لالو کی مانند اقتدار سے محروم تھا۔ اس کی کانگریس پارٹی نے اسے بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا۔ دوسال بعد ہائی کورٹ نے فیصلہ بدل کر ۸۳ سالہ راؤ کو بری کردیا اور اس کے ایک سال بعد یکہ و تنہا راؤ کا انتقال ہوگیا لیکن اس واقعہ کے باوجود بدعنوانی کے اندر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ بے شمار اضافہ ہوا۔ منموہن سنگھ نے حزب اختلاف بی جے پی کے ارکان پارلیمان کو

خریدنے کی کوشش کرڈالی ۔اس لئے یہ سوچنا کہ اس طرح کے فیصلے بدعنوانی کو کم کریں گے محض خام خیالی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لالو کی گرفتاری کا بھرپور فائدہ کانگریس پارٹی اٹھائیگی اور عوام کو یہ گمراہ کن فریب دینے کی کوشش کرے گی کہ بدعنوانی کے خلاف وہ سنجیدہ ہے۔ اس بابت وہ اپنے حلیف بلکہ پارٹی ارکان کا بھی پاس و لحاظ بھی نہیں کرتی ۔اس حکمتِ عملی کا ادنیٰ سامظاہرہ راہل گاندھی نے پچھلے دنوں دہلی کے اندر کیا۔حکومت نے داغی ارکان پارلیمان کے تحفظ کی خاطر سیاسی جماعتوں کو اطلاع کے حق سے مبریٰ رکھنے کا قانون بنانے کوشش میں ناکامی کو دیکھتے ہوئے اسے اسٹینڈنگ کمیٹی کے حوالے کردیامگر پھر مجلسِ وزراء کے ذریعہ حکم نامہ تیار کرکے توثیق کیلئے صدر مملکت کے پاس روانہ کردیا۔ اس سارے عرصہ میں کانگریس کا نائب صدر راہل گاندھی غفلت کی نیند سویا رہالیکن جب پتہ چلا کہ صدر کو اعتراضات ہیں اور حزبِ اختلاف اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو اپنے آپ کو خجالت سے بچانے کیلئے ایک تماشہ کھڑا کردیا۔

ایک طرف کانگریس پارٹی کے مختلف ترجمان ذرائع ابلاغ میں اس حکمنامے کو حق بجانب ٹھہرارہے تھے۔ان کو اعتماد میں لے کر منع کئے بغیر راہل گاندھی پریس کلب آف انڈیا میں جاری اجئے ماکن کی پریس کانفرنس میں پہنچ

گیااوراپنی ذاتی رائے کااظہار کرتے ہوئے سرکاری حکمنامے کو مہمل اور بکواس قراردے دیا۔راہل نے کہاکہ اسے پھاڑ کر پھینک دیا جانا چاہئے۔خود میری پارٹی اسے سیاسی مجبوری قراردیتی ہے لیکن اب وقت آگیا ہے اس طرح کی بکواس کو روکا جائے۔اگر ہم بدعنوانی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تواس طرح کی مصالحت نہیں کرسکتے۔اس لئے اگر اس طرح چھوٹے چھوٹے سمجھوتے کرتے رہے توہر جگہ ہمیں یہی کرتے رہنا ہوگا۔جب راہل اٹھ کر جانے لگا توکسی نے سوال کیاکہ کیایہ حزب اختلاف کے خوف سے کیا جارہا ہے۔اس پر راہل نے آستین چڑھاکر جواب دیا مجھے حزب اختلاف سے غرض نہیں۔میں اپنی کانگریس پارٹی اور حکومت کے کام میں دلچسپی رکھتا ہوں اور میرے خیال میں جو کچھ ہماری حکومت نے کیا ہے وہ غلط ہے''۔

اس میں شک نہیں کہ راہل کا یہ ڈرامہ کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے والی بات ہے۔حزب اختلاف کو صدر کے انکار کا فائدہ اٹھانے سے محروم کرنے کیلئے خود اپنی حکومت اور اس کے سربراہ وزیراعظم کی پگڑی کو بھری محفل میں اچھال دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔اس وقت منموہن سنگھ اوبامہ سے ملاقات کی تیاری کررہے تھے۔اس غیر معمولی توہین کے باوجود کانگریس پارٹی راہل گاندھی کی پشت پناہی میں جٹ گئی۔سوائے وزیراعظم کے سابق میڈیا صلاح کار سنجے بروا کہ جنہوں نے راہل پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔بہت ہوچکا۔کب تک وہ اس طرح کی بکواس برداشت

کریں گے ؟وزیر اعظم کو اوبامہ سے ملاقات کے بعد اپنی ساری مصروفیات کو منسوخ کرکے واپس آجانا چاہئے اور استعفیٰ دے کر وسط مدتی انتخاب کا اعلان کر دینا چاہئے۔ کسی جماعت یا خاندان سے زیادہ اہم قوم کی خدمت ہے'' وزیر اعظم منموہن نے بنچے .بروا کے مشورے کو مسترد کرکے ثابت کردیا کہ ان کے نزدیک ملک و قوم سے زیادہ اہمیت کے حامل پارٹی اور خاندان ہے اس لئے کہ اقتدار کا سوتا وہیں سے پھوٹتا ہے۔ آئندہ انتخاب میں کانگریس پارٹی لالو کی گرفتاری اور راہل کے ناٹک کی مدد سے اپنی بدعنوانیوں کی پردہ پوشی کرے گی اور اپنے آپ کو دودھ کا دھلا ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اسے اپنی اس سعیَ لاحاصل میں کس حدتک کامیابی ملتی ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا؟

مودی، مدنی اور مسلمان

شاہ نواز حسین کی مودی نوازی تو اس لئے قابلِ فہم ہے کہ نمک خواری بھی دنیا میں کوئی چیز ہوتی ہے لیکن مولانا محمود مدنی کے ذریعہ نریندر مودی کی حمدو ثنا نے بہت سوں کو چونکہ دیا اس لئے کہ جمیعت العلماء کا ماضی کانگریس پارٹی کی حمایت سے عبارت ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جمہوری سیاست میں حمایت بھی ایک تجارت ہے اس میں تالی ایک ہاتھ سے نہیں بلکہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ان کیلئے مولانا کے بیان میں کوئی حیرت کا پہلو نہیں ہے۔ یہ ایک ایک تلخ حقیقت ہے کہ اپنی تمام تر وفاداریوں کے باوجود کانگریس نے انہیں کبھی بھی راجیہ سبھا کی کرسی سے نہیں نوازہ۔ جس وقت مولانا نے سیاست کے دلدل میں قدم رکھا کانگریس پارٹی بابری مسجد کی شہادت کیلئے بی جے پی کی شریک کار تھی اس لئے وہ سماجوادی پارٹی کی سائیکل پر سوار ہو کر میدانِ سیاست میں اترے لیکن پھر دل بدلو قبیلے کے سردار اجیت سنگھ کا دامن تھام لیا اور راشٹریہ لوک دل کے ٹکٹ پر راجیہ سبھا کے رکن بنے۔

اجیت سنگھ نے ۲۰۰۹ء کے انتخاب سے قبل بی جے پی کی این ڈی اے میں شمولیت

اختیار کرلی۔ مولانا محترم کو اجیت سنگھ کی دل بدلی سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اس طرح گویا وہ خود بھی این ڈی اے میں شامل ہو گئے۔ ۲۰۰۹ء کے پارلیمانی انتخاب میں انہوں نے آر ایل ڈی کے امیدواروں کیلئے خوب جم کر کام کیا یہ گویا بی جے پی کو اقتدار میں لانے کی ایک کوشش تھی لیکن یہ بدقسمتی سے یہ سعی بارآور نہ ہو سکی۔ ۲۰۱۲ء کے اسمبلی انتخاب سے قبل اجیت سنگھ نے پھر اپنی ابن الوقتی کو کام میں لاتے ہوئے پینترا بدلا اور یو پی اے میں شامل ہو کر مرکزی وزیر بن گئے۔ کانگریس نے اپنی مجبوری کے پیش نظر اجیت سنگھ کو تو معاف کردیا لیکن جب مولانا محمود مدنی کی مدت کار ختم ہوئی تو انہیں دوبارہ راجیہ سبھا کا رکن نہیں بنوایا۔ شاید اس لئے کہ گزشتہ اسمبلی انتخاب میں مولانا محمود مدنی اپنے حلقۂ اثر مغربی یو پی سے آر ایل ڈی کے ایک بھی مسلمان امیدوار کو کامیاب نہ کرا سکے تھے۔ لیکن جس بیچارے کی زبان کو اقتدار کا خون لگ چکا ہو اس کے احساسِ محرومی سے تو وہی واقف ہو سکتا ہے جو اس قبر میں کم از کم ایک بار پیر پسار کر سویا ہو ورنہ باہر والوں کو اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

چودھری اجیت سنگھ اور مولانا محمود مدنی کو جو لوگ مغربی یو پی کا بڑا رہنما سمجھتے ہیں انہیں گزشتہ اسمبلی کے انتخابی نتائج پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔ ۲۰۱۲ء سے قبل یو پی اسمبلی کے اندر لوک دل کے لیڈر کوکب حمید خان ہوا

کرتے تھے ۔ ان کو اس باغپت سے شکست خوار ہونا پڑا جو چودھری چرن سنگھ کا گڑھ مانا جاتا تھا اور جہاں سے جیت کر اجیت سنگھ رکن پارلیمان بنے تھے ۔ کوکب کے علاوہ حاجی یعقوب قریشی اور شاہنواز رانا کے ستارے بھی انتخاب سے قبل گردش میں آگئے ۔ ان دونوں نے بالترتیب میرٹھ اور بجنور سے آر ایل ڈی کے ٹکٹ پر قسمت آزمائی کی لیکن ناکام رہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات اس سے قبل بی ایس پی کے ٹکٹ پر کامیاب ہو چکے تھے لیکن عین انتخاب سے پہلے وہ لوگ مایا کے ہاتھی سے اتر کر اجیت سنگھ کا ہینڈ پمپ چلانے لگے ۔ان تمام کو کامیاب کرنے کیلئے مولانا نے بھرپور زور لگایا تھا لیکن چونکہ کنواں خشک تھا اس لئے سارے کے سارے پیاسے رہ گئے۔ اب اس خشک کنوئیں سے کون سا امرت نکال کر بی جے پی کے کمل کو سیراب کیا جائیگا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

بازارِ سیاست میں جس شہ کی بہتات ہو جائے وہ ارزاں ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے ۔ فی الحال کانگریس، سماجوادی اور بہوجن سماج جیسی پارٹیوں میں مسلمان سیاستدانوں کی اچھی خاصی بھیڑ لگی ہوئی ہے لیکن بی جے پی کے نزدیک شاہنواز یا عباس نقوی کے علاوہ کوئی نہیں پھٹکتا ۔ اس لئے مسلم سیاستداں کی قدر و قیمت اگر کہیں ہے تو وہ بی جے پی میں ہے ۔ نریندر مودی نے اس راستے کو مزید تنگ کر دیا ہے ۔ ایک عرصے تک وہ مسلمانوں کی پرواہ اس لئے نہیں کرتا تھا کہ گجرات کی حد تک اسے ان کی ضرورت نہیں تھی

اور گجرات کے ہندوؤں میں اس کی اثر و رسوخ اچھا ہے لیکن قومی سطح پر بہت ساری ریاستوں میں بی جے پی کا وجود ہی نہیں ہے نیز ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد مودی کے فسطائی چہرے سے گھن کھاتی ہے۔ مودی کی توجہات کا مرکز وہی اعتدال پسند ہندو طبقہ ہے جس کیلئے اسے کہنا پڑتا ہے اگرچہ میرا تشخص مجھے اجازت نہیں دیتا اس کے باوجود میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ پہلے شوچالیہ پھر دیوالیہ۔ یہ دراصل اپنی ترجیحات میں تبدیلی کا اعلان ہے۔

نریندر مودی کو اپنی اس مہم میں ایسے مسلمانوں کی ضرورت ہے جو اس کے ساتھ نظر آئیں۔ اس لئے اس کے جلسوں میں مسلمانوں کو خاص طور پر جمع کیا جاتا ہے۔ بھوپال میں کارکنان کے مہاکمبھ کے موقع پر بی جے پی اقلیتی شعبے کے ریاستی صدر ہدایت اللہ نے مسلمانوں کو روایتی لباس ٹوپی اور برقعہ پہن کر آنے کی ہدایت کی تاکہ یہ باور کرایا جائے کہ معاشرے کے تمام طبقات پارٹی کے ساتھ ہیں۔ یہ چور کی داڑھی میں تنکا والی بات ہے۔ اس درمیان دس ہزار برقعوں کا تنازعہ سامنے آیا اب ان کو کون پہننے والا تھا یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے اس لئے کہ ساری دنیا جانتی ہے ناتھو رام گوڈسے نے گاندھی جی کا قتل کرنے سے پہلے اپنے آپ کو مسلمانوں کے بہروپ میں ڈھال لیا تھا۔

کانپور ریلی کے وقت بھی یہی کوشش کی گئی۔ آٹھ لاکھ مسلم رائے دہندگان میں

سے کم از کم پانچ ہزار کا ہدف مقرر کیا گیاااور جب وہ بھی پورا نہیں ہوا تو ایک بی جے پی رہنما نے کہا ہم مسلمانوں سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ ہمارے ساتھ آئیں گے ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ کانگریس سے بھی نالاں ہوں ۔ اس بیان کے پس منظر میں اگر مولانا مدنی کا بیان دانستہ یا نادانستہ طور پر وہی ہے جو بی جے پی چاہتی ہے ۔ اس کے پس پشت امید کی ایک کرن یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید اس خدمت کے عوض راجیہ سبھا کی رکنیت مل جائے لیکن اگر کہیں نریندر مودی خدا نخواستہ وزیر اعظم بن جاتا ہے تو وہ مولانا کو نہ صرف راجیہ سبھا کا رکن بلکہ نجمہ ہیپت اللہ کی مانند صدر بنادے گا اس لئے کہ ان سے اچھا مکھوٹااسے کہاں نصیب ہوگا؟

مولانا محمود مدنی نے ٹائمز ناؤ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا سیکولر جماعتوں کو چاہئے کہ وہ کسی فرد واحد سے خوفزدہ کرکے منفی بنیادوں پر مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ہم کسی سے نہیں ڈرتے اس لئے ’’آجائیگا کھاجائیگا‘‘کی سیاست ترک کیا جائے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سیکولر جماعتیں یہ بتائیں کہ انہوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے کیا کیا ہے؟ اور مستقبل میں اقلیتوں کو انصاف و مساوات کیلئے ان کا کیا منصوبہ ہے؟ سیکولر جماعتوں کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ انتخابی منشور کا کس قدر پاس و لحاظ کیا گیا؟ اس کے دو دن بعد مولانا نے راجھستان کے وزیر اعلیٰ گہلوت کو بجا

طور پر آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا ''وزیر اعلیٰ نے مسلمانوں کو قتل کرانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ قاتل ولٹیرے آزاد ہیں اور مقتولوں کے اعزہ پر مقدمات قائم کردیئے گئے ہیں ۔ان بیانات بی جے پی کی باچھیں کھل گئیں گویا تیر نشانے پر بیٹھا اور مقصد حاصل ہوگیا ۔

مولانا محمود مدنی کا مودی سے عشق نیا نہیں ہے اس سال ماہِ فروری میں آج تک ٹی وی چینل پر سیدھی بات پروگرام میں وہ کہہ چکے ہیں کہ جمیت کے کارکنان نے انہیں بتایا گجرات کے اندر کئی اسمبلی حلقوں میں مسلمانوں نے مودی کو ووٹ دیا۔حالات بدل چکے ہیں اور قابل ذکر قلب کی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ دیگر نام نہاد سیکولر حکومتیں کے مقابلے گجرات کے مسلمان معاشی اعتبار سے زیادہ خوشحال ہیں۔ مولانا نے مزید کہا کہ مہاراشٹر میں گجرات سے زیادہ معصوم مسلمان جیلوں میں بند ہیں ۔انسانی حقوق کے حوالے سے سیکولر حکومتوں کا ریکارڈ بہت خراب ہے بنگال میں مسلمانوں کی معاشی حالت سنگین ہے۔ گجرات کے علاوہ بہار میں بھی مسلمانوں نے بی جے پی کو جنتا دل کے سبب ووٹ دیا۔اس لئے کہنا قبل از وقت ہے کہ بہار و گجرات کا تجربہ ۲۰۱۴ء کے اندر قومی سطح پر دوہرایا جائے۔ جہاں تک بہار کا سوال ہے نتیش کمار کے الگ ہوجانے سے وہ تجربہ تو ناکام ہوگیا لیکن ایک بات ضرور ثابت ہوگئی کہ گوں ناگوں وجوہات کے سبب نتیش کمار کو مسلمانوں کا خیال مولانا محمود مدنی سے زیادہ ہے۔

مودی کی امیدواری پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا مدنی نے فروری میں کہا تھا کہ ابھی تو بی جے پی نے ہی یہ طے نہیں کیا ہے جب فیصلہ ہو جائیگا تو ہم اپنا ردعمل ظاہر کریں گے۔ گویا مولانا کو مودی کے وزیراعظم کا امیدوار بن جانے پر اپنے چچا ارشد مدنی کی طرح کوئی اعتراض نہیں تھا جو مودی کو گودھرا کے فسادات کیلئے ذمہ دار فسطائی رہنما گردانتے ہیں اوران کے خیال میں اگر مودی وزیراعظم بن جائے تو ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات ہوں گے نیز مساجد شہید کی جائیں گی۔

ایسا لگتا ہے کہ مولانا محمود مدنی گجرات کی خوشحالی کے حوالے سے نریندر مودی کے سبز باغ سے مسحور ہیں لیکن نہیں جانتے کہ اس کی ہوا سی اے جی کی رپورٹ نے نکال دی ہے۔ نوزائیدہ بچوں کی اموات اور ان کے اندر غذائیت کی کمی کے چونکا دینے والے اعداد و شمار منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ۲۰۰۱ سے ۲۰۱۱ کے درمیان بیروزگاری میں اضافے کا بھی اعتراف کیا گیا ہے۔ جہاں تک غیر ملکی سرمایہ کاری کا شور ہے تو اس بابت ریزرو بنک کے مطابق اس دہائی میں گجرات کے اندر صرف ۲۰ ۷ کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری ہوئی جب کہ مہاراشٹر میں ۴۵۸۰ کروڑ اور دہلی میں ۲۶۰۰ کروڑ ڈالر کی۔ کرناٹک اور تمل ناڈو بھی اس معاملے میں گجرات سے آگے ہیں۔ مولانا محترم اپنے گجرات دورے

کے دوران جن مریدین سے ملاقات کرتے ہیں وہ ممکن ہے خوشحال ہوئے ہوں گے لیکن سرکاری اعداد و شمار گواہ ہیں کہ عام مسلمانوں کی حالتِ زار اس سے مختلف ہے۔ گجرات کے شہری علاقوں میں غربت کا تناسب ۱۸ فیصد ہے جبکہ قومی سطح پر یہ ۲۱ فیصد ہے لیکن پلاننگ کمیشن کے مطابق مسلمانوں کے اندر یہ تناسب ہندوؤں کی بنسبت دوگنا سے بھی زیادہ یعنی ۴۲٫۴ فیصد ہے جبکہ قومی سطح پر یہ اعداد ۳۳٫۹ فیصد ہے گویا گجرات کے شہری علاقوں میں مسلمان ہندوستان بھر کی بنسبت ۹٫۵ فیصد زیادہ غریب ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجوہات بھی مولانا کو معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ۲۰۰۷ء میں قومی منصوبے کے تحت ۱۵ فیصد رقوم کو مسلمانوں کی ترقی کیلئے مختص کرنے کی تجویز کی مودی نے مخالفت کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی تھی کہ اس سے سماجی تانہ بانہ بگڑ جائیگا۔ اس کے علاوہ ۵۳۰۰۰ مسلمان طلباء کو اسکالرشپ دینے کے منصوبے کی بھی مودی نے مخالفت کی۔ اس مسلم دشمنی کا اثر یہ ہوا کہ گجرات جہاں عمومی طور پر ۷۹ فیصد بچے اسکول میں داخلہ لیتے ۴۱ فیصد اپنی تعلیم مکمل کرتے ہیں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے ۷۵ فیصد بچے اسکول میں داخل ہوتے ہیں مگر صرف ۲۶ فیصد اپنی تعلیم مکمل کرپاتے ہیں بقیہ ۷۴ فیصد کو درمیان ہی سے تعلیم منقطع کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

نریندر مودی کے اپنے حلقہ انتخاب منی نگر میں ایک ملت نگر ہے جہاں ۲۰ہزار مسلمان یعنی ۸ فیصد ووٹر بستے ہیں۔ یہاں ۲۰۰۰ سے لے کر ۲۰۱۰ تک کسی بی جے پی کے رہنما نے بشمول مودی کے جھانکنے کی زحمت نہیں کی۔ اس محلے میں پانی اور بجلی کی سہولیات کابرسوں سے فقدان ہے۔ گزشتہ مرتبہ جو کانگریسی میونسپل کاؤنسلر وہاں سے منتخب ہوئے انہوں نے کچھ کام شروع کیا ہے مودی کے پے درپے تین کامیابیوں کے چرچے تو بہت ہیں لیکن اسے ان دس سالوں دس فیصد آبادی پر مشتمل مسلمانوں میں ایک ایسا شخص میسر نہ آسکا جسے ۱۸۲ حلقۂ انتخاب میں سے کسی ایک مقام پر کم از کم امیدوار بنایا جاسکے ۔ ابوصالح شریف جو قومی کاؤنسل برائے معاشی تحقیق کے ۱۵ سالوں تک سربراہ رہے ہیں کہتے ہیں کہ گجرات کے مسلمان غربت ،فاقہ، تعلیم اور تحفظ کے معاملات میں دگرگوں صورتحال کا شکار ہیں۔ ان کو سرکاری سطح پر ترقی پر پیٹے جانے والے ڈھنڈورے کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ ایسے میں ملت کے سامنے یہ سوال ہے کہ وہ ایک بے غرض محقق کی بات مانے یا ابن الوقت سیاستدان کی ؟

مولانا محمود مدنی اور نریندر مودی میں ایک اور شہ مشترک ہے کہ ان کے مخالفین کو جس جرم کی سزا ملتی ہیں انہیں اس پر انعام مل جاتا ہے ۔ مثلاً کانگریس کے جئے رام رمیش نے جب کہا کہ شوچالیہ مندر سے زیادہ پوتر ہے تو

اسے پارٹی کے اندر اور باہر تنقید کا نشانہ بنناپڑا لیکن مودی نے پہلے شوچالیہ اور پھر دیوالیہ کہہ کر اپنے آپ کو تعریف وتوصیف کا حقدار بنا لیا۔ اسی طرح دیوبند کے سابق مہتمم غلام محمد وستانوی نے مودی کی تعریف کرکے اپنی کرسی گنوائی تو مولانا مدنی نے مودی کی تعریف کرکے نیک نامی کمائی۔ مولانا وستانوی کا مہتمم کی ذمہ داری پر آنا اور سبکدوش کیا جانا دارالعلوم کی سیاست کا غماز ہے۔ اس کہانی کے تین اہم کردار مولانا ارشد مدنی، مولانا محمود مدنی اور جناب بدرالدین اجمل ہیں۔ وستانوی تو ایک معمولی سا مہرہ تھا جو بلاوجہ پٹ گیا۔

مولانا اسد مدنی کے بعد ان کے بھائی ارشد اور بیٹے محمود کے درمیان علمی و تنظیمی وراثت پر تنازعہ ہوگیا۔ اس دوران بدرالدین اجمل جمیت کی سب سے مضبوط شاخ آسام کے صدر تھے۔ انہوں نے وہاں یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ بنا کرا ے جی پی کے ساتھ مفاہمت کرلی۔ اس کے نتیجے میں کانگریس والے پریشان ہوگئے اور مولانا ارشد مدنی سے اپنے حق میں خط لے آئے اس طرح مولانا ارشد مدنی اور اجمل بدرالدین میں اختلافات ہوگئے اور اجمل کو جمیت سے نکال باہر کیا گیا۔ اجمل نے چچا بھتیجے کے اختلاف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وستانوی کو مہتمم منتخب کروادیا۔ اس کے بعد پاکستان سے آکر مولانا فضل الرحمٰن نے ان کے درمیان مفاہمت کروائی اور دارالعلوم چچا تو جمیت بھتیجے کے سونپ گئے۔ اس

ہندوستانوی نے گجرات کے فساد کو بھلا دینے کا بیان دیا اور مودی کی بلاواسطہ تعریف کردی جس کا فائدہ اٹھا کر وستانوی کی چھٹی کردی گئی۔ اب پھر صورتحال یہ ہے کہ چچا اور بھتیجا ایک دوسرے کے خلاف مختلف پالوں میں ہیں دیکھنا یہ ہے کہ اس بار اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ اور ایوان بالا کی رکنیت کا فال کس کے حق میں کھلتا ہے؟ مولانا محمود مدنی اور مودی رام باپو کا یہ میم مرلع کیا گل کھلائے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

لادینی سیاست کے کڑوے کسیلے پھل

مظفر نگر فساد کے بعد وہاں جانے کی توفیق نہ تو نریندر مودی کو ہوئی اور نہ مایا وتی کو ۔وزیر اعظم منموہن سنگھ، سونیا گاندھی اور ان کے فرزندِ ارجمند راہل گاندھی نے بڑے طمطراق کے ساتھ ۷ استمبر کو فسادزدہ علاقوں کا دورہ کیا اور جن متاثرین سے ملاقات کی ان میں سے ایک کتبہ کا رہنے والا جمیل احمد بھی تھا۔ جب جمیل احمد نے اپنی داستانِ الم سنائی کہ کس طرح رات کے آخری پہر انہیں جان بچا کر فرار ہونا پڑا تو راہل کی آنکھیں نمناک ہوگئیں ۔ یہ دیکھ کر بسی کلاں کے پناہ گزین کیمپ میں رہنے والے جمیل احمد اور اس کے ساتھیوں کے اندر امید کی کرن جاگی ۔ انہوں نے سوچا کہ شاید اب ان کی بازآبادکاری کیلئے کوئی ٹھوس اقدام کیا جائیگا۔ لیکن اس دورے کے چالیس دن بعد بھی کوئی مدد تو نہیں آئی لیکن ان بے یارو مددگار لوگوں کو جن کے پیٹ میں نہ دانہ ہے اور نہ سونے کیلئے بستر ذرائع ابلاغ سے فون آنے لگے اور دریافت کیا جانے لگا کہ کیا وہ پاکستانی آئی ایس آئی سے رابطے میں ہے ۔ مظلومین کے زخموں پر یہ نمک راہل گاندھی کا تحفہ تھا۔ وہ لوگ جن کیلئے فون کا کنکشن رکھنا مشکل ہے سوچنے لگے ہیں کہ آنے والے راہل گاندھی اور اخباری نمائندوں سے بہتر تو نہ آنے والے نریندر مودی اور

مایاوتی ہیں۔

راہل گاندھی نے اپنے بچکانہ بیان سے پھر ایک بار ثابت کردیا کہ اگر کل کو نریندر مودی خدانخواستہ اقتدار میں آجاتا ہے تو وہ چمتکار اس کی کسی قابلیت کے باعث نہیں بلکہ راہل بابا کی حماقتوں کے سبب ہوگا۔ نریندر مودی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ جب اس کی وزارتِ اعلیٰ کے دن بھرے تو اڈوانی جی اپنی سیاسی مدتِ عمر پوری کرکے کنارے ہوگئے نیز ان کے سامنے کانگریس نے نہایت ناتجربہ کار حریف کی صورت میں راہل گاندھی کو اتاردیا۔ نرسمھا راؤ کی شکست کے بعد سونیا گاندھی کو کانگریس پارٹی نہایت خستہ حالت میں ملی تھی لیکن سونیا نے جتنہ جتنہ اس کی حالت سدھار دی۔ ۲۰۰۴ء میں کانگریس کو مرتے پڑتے سب سے بڑی پارٹی بنادیا اور کسی طرح علاقائی جماعتوں کو راضی کرکے منوہن سنگھ کی قیادت میں متحدہ ترقی پذیر محاذ کی حکومت قائم کردی۔ پانچ سال بعد ۲۰۰۹ء جب کانگریس کو اچھی خاصی کامیابی مل گئی تو لوگوں کو توقع تھی کہ اب ایک مناسب شگون دیکھ کر راہل کی تاجپوشی کردی جائیگی لیکن سونیا سے زیادہ راہل کو کون جان سکتا تھا؟ اس لئے پورے پانچ سال گزر گئے لیکن وہ ایسی جرأت نہیں کرسکیں اور اب راہل آئے دن یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ ماں کے اندیشے صد فیصد درست تھے۔

راہل گاندھی کے ناعاقبت اندیش بیان کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ پہلی مرتبہ نریندر مودی کی زبان پر مظفر نگر کا نام آیا ورنہ تو یہ عالم تھا کہ شوچالیہ سے لے کر دیوالیہ تک سارے مسائل پر گفتگو کرنے والے مودی کی زبان اس بابت گنگ تھی ۔ کسی کو اس سے شکایت بھی نہیں تھی اس لئے کہ لوگ سوچ رہے تھے کہ اگر وہ بولے گا بھی تو اپنی سابقہ روایت کے مطابق یہی بولے گا کہ پناہ گزین کیمپوں کو بند کردیا جانا چاہئے اس لئے کہ وہ بچے پیدا کرنے والی صنعت بن گئے ہیں۔ لیکن راہل گاندھی نے اس قدر انوکھا بیان دیا کہ اسکے جواب میں نریندر مودی مسلمانوں کی حمایت میں کرنے کا نادر موقع ہاتھ آگیا۔ مودی کے مطابق راہل نے اس بیان کے ذریعہ مسلمانوں کی دل آزاری کی ہے۔ اس لئے یا تو وہ اپنے دعویٰ کا ثبوت پیش کرے یا معافی مانگے ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ساری دنیا سے پھٹکار سننے کے بعد جس شخص نے گجرات کے فساد کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے معافی نہیں مانگی وہ معافی کا مطالبہ کررہا ہے۔ ویسے کوئی بعید نہیں کہ راہل گاندھی بھی اسی طرح اپنے دکھ کا اظہار کردے جیسا کہ مودی نے ٹائم میگزین کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر نادانستہ طور پر بھی آپ کی گاڑی کے نیچے کوئی کتے کا پلاّ آجائے تو دکھ ہوتا ہی ہے ۔ احمقانہ سطح پر راہل گاندھی یقیناً نریندر مودی سے فائق ہے۔

راہل گاندھی کے اس بیان کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان سیاسی بساط کے مرکز

میں آگئے اور بازی کچھ اس طرح سے سجی کے ایک جانب ان کی مخالفت میں ایک دوسرے کے کٹر مخالف نریندر مودی اور اعظم خان تھے تو دوسری طرف ان کی حمایت میں ایک دوسرے کے ازلی دشمن آر ایس ایس اور مولانا ارشد مدنی۔ راہل کے اس بیان کو آر ایس ایس کے ترجمان نے نہ صرف سراہا بلکہ نریندر مودی کے رد عمل سے برأت کا اعلان بھی کیا۔ ایسے میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی تقریباً ۱۵ فیصد ہے جبکہ ایوان زیریں میں مسلم نمائندگی کا تناسب ۵ء۵ فیصد یعنی ۵۴۳ میں ۳۰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان سکھوں کی طرح کسی ایک بڑی ریاست کے اندر کثیر تعداد میں نہیں بستے بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں مختلف پھیلے ہوئے ہیں۔ جزیرہ لکشدیپ یا وادئ کشمیر کے علاوہ کسی بھی ریاست میں ان کی اکثریت نہیں ہے۔ کل آبادی سے موازنہ کیا جائے تو آسام میں ان کی آبادی سب سے زیادہ ۹ء۳۰ فیصد ہیں اس کے بعد بنگال میں ۲ء۲۵ فیصد، کیرالا ۷ء۲۴ فیصد، اترپردیش میں ۵ء۱۸ فیصد اور بہار میں ۵ء۱۶ فیصد مسلمان بستے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے چونکہ کشمیر اور آسام قلیل آبادی والی ریاستیں ہیں اسلئے کم تناسب کے باوجود سب سے زیادہ یعنی مسلمانوں کی اپنی آبادی کا ۲۲ فیصد صرف اترپردیش میں رہائش پذیر ہے پھر اس کے بعد بہار، بنگال اور مہاراشٹر کا نمبر آتا ہے جہاں پر ہر ایک صوبے میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔

صوبائی سطح سے اتر کر ضلعی سطح پر دیکھا جائے تو منظر نامہ کچھ اس طرح سے ہے کہ کل ضلعوں میں سے صرف ۲۰ کے اندر مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ۹ تو ایسے ہیں ۵۹۳ جہاں مسلم آبادی ۷۵ فیصد سے تجاوز کرتی ہے۔ان میں سے ۸ جموں کشمیر اور ایک لکش دیپ ہے۔باقی ۱۱ ضلعوں کے اندر آبادی ۵۰ سے ۷۵ فیصد کے درمیان ہے۔اس طرح کے ۶ اضلاع آسام میں دو جموں کشمیر میں اور ایک ایک بنگال، بہار اور کیرالا میں ہے۔ ایسے ضلع جہاں مسلمانوں کی آبادی ۲۵ سے ۵۰ فیصد کے بیچ ہے ۳۸ ہیں۔اترپردیش میں ان کی تعداد ۱۲، بنگال میں ۵ کیرالا میں ۵،آسام میں ۴، بہار میں ۳، جھارکھنڈ میں ۲، دہلی میں ۲ اور ایک ایک جموں کشمیر،اترانچل و پانڈیچری میں ہے۔ان کے علاوہ ۱۸۲ ضلعوں میں ۱۰ تا ۲۵ فیصد مسلم آبادی ہے اس طرح کل ۲۴۰ ضلعوں میں مسلم آبادی ۱۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کا ۸۲ فیصد ان علاقوں میں اضلاع میں گزر بسر کرتا ہے۔باقی ۱۸ فیصد مسلمان دیگر ۷۷ ضلعوں میں منتشر ہیں اور ۱۹۵ ضلع ایسے ہیں جہاں مسلمان نہیں کے برابر ہیں۔

انتخابی نقطۂ نظر سے لوک سبھا یعنی ایوانِ زیریں کی ۳۵ نشستیں ایسی ہیں جہاں مسلم رائے دہندگان ۳۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہیں۔ ۲۰ سے ۳۰ فیصد رائے دہندگان ۳۸ حلقۂ انتخاب میں ہیں اور ۱۱ تا ۲۰ فیصد ووٹرس ۱۴۵ نشستوں میں موجود ہیں اس طرح مجموعی طور پر ۲۱۸ انتخابی نتائج پر مسلمان اثرانداز

ہو سکتے ہیں۔ ماضی کا تجربہ یہ ہے مؤخرالذکر ۱۱تا۲۰ فیصد والے علاقوں سے ہی اکثر مسلم نمائندہ منتخب ہوتا اس لئے کہ کثیر آبادی والے علاقوں میں اکثر کئی مسلم امیدواروں کے درمیان ان کا ووٹ تقسیم ہوجاتا ہے اور بی جے پی تک کو کامیابی مل جاتی ہے۔ ان علاقوں میں ہندو رائے دہندگان کسی ایک امیدوار کے پیچھے متحد ہو کر اسے کامیاب کردیتے ہیں۔ اس طرح کے حلقہ ہائے انتخاب اترپردیش کے ۸۰ میں سے ہیں۔ بہار میں ۲۹ اور بنگال میں ۲۸، کرناٹک میں ۱۵، کیرالا میں ۱۴، مہاراشٹر ۵۴ میں ۱۳، آندھرا پردیش میں ۱۲، آسام میں ۹ نیز گجرات و راجھستان ہر ایک میں ۶ ہیں۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ اترپردیش میں سماجوادی، بہوجن سماج اور کانگریس پارٹیاں کیوں مسلمانوں کی خوشامد کرتی ہیں اور بہار میں نتیش نے کس لئے نریندر مودی سے ہاتھ ملانے کے بجائے بی جے پی سے تعلقات منقطع کرلئے۔ بی جے پی کی مرکز میں بننے والی دونوں حکومتیں اترپردیش اور بہار میں ان کس کو ملنے والی زبردست کامیابی کی بدولت تھیں۔

اترپردیش جہاں مسلمانوں کی سب سے کثیر آبادی ہے سیاسی صورتحال اس طرح سے ہے کہ تقریباً چوبیس حلقۂ انتخاب میں مسلمان رائے دہندگان ۲۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہیں۔ مغربی یوپی کے اندر بریلی، بدایوں، پیلی بھیت، رام پور، سنبھل، امروہہ، میرٹھ، سہارنپور، بجنور، مرادآباد اور فسادزدہ مظفرپور کا شماران

علاقوں میں ہوتا ہے۔ مشرق کی جانب نکل جائیں تو اعظم گڑھ، بہرائچ، گونڈہ، بستی، وارانسی، ڈومریا گنج اور بلرام پور میں مسلمان معتبدہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ کے اندر ان میں سے کچھ مثلاً اعظم گڑھ سے بی جے پی کا امیدوار کامیاب ہوگیا۔ ۲۰۰۹ء اس بار مسلمانوں سے کانگریس اور سماجوادی پارٹی نے توقعات باندھ رکھی ہیں لیکن مودی کی امیدواری نے مسلمانوں کو فکرمند کردیا ہے اور وہ اپنے ووٹ کی تقسیم کو لے کر پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہیں۔۔بریلی سے جہاں مسلمان ۳۴ فیصد ہیں ۱۹۹۱ء کے بعد بی جے پی نے لگاتار پانچ مرتبہ کامیابی درج کروائی لیکن ۲۰۰۹ء میں مسلمان اس کو ہرانے میں کامیاب ہوئے۔

اترپردیش کی حدتک انتخابی صورتحال مرکز سے مختلف ہے۔ یہاں پر ۲۰۰۹ء کے انتخابات میں مسلمانوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے حق رائے دہندگی کا استعمال کیا اور سماجوادی پارٹی کو غیر متوقع کامیابی سے نواز دیا۔ ایک اندازے کے مطابق ۸۰ فیصد مسلمانوں نے ملائم کی سائیکل پر مہر ثبت کی۔اترپردیش کے سیاسی افق پر مسلمانوں کی حالت بتدریج بہتری کی جانب گامزن رہی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی تعداد ۴۲۵ ممبران والی اسمبلی میں صرف ۲۵ تھی ۶ یعنی فیصد سے کم لیکن اب یہ تعداد ۴۰۹ میں ۶۸ تک پہنچ چکی ہے گویا ۱۷ فیصد جبکہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ریاست میں ان کی آبادی ۱۸ فیصد ہے۔ یہ اضافہ بتدریج ہوا ہے ۱۹۹۶ء میں مسلم نمائندگی ۳۳ پر

پہنچی اس کے بعد ۲۰۰۲ء میں ۴۷ اور ۲۰۰۶ء میں ۵۶ مسلمان انتخاب میں کامیابی حاصل کرکے ودھان سبھا میں براجمان ہوئے۔ موجودہ ۶۸ نمائندوں میں سے حزب اقتدار سماجوادی میں ان کی تعداد ۴۲ ہے۔ اس طرح گویا اقتدار میں وہ شریک ہیں۔ اس کے علاوہ حزب اختلاف کی جماعت بی ایس پی کے ۱۶ مسلمان ایم ایل اے ہیں۔ کانگریس اور پیس پارٹی کے بھی چار چار نمائندے ایوان میں تشریف رکھتے ہیں۔ قومی ایکتا دل اور اتحاد ملت کے دو دو ارکان اسمبلی میں موجود ہیں۔ اس غیر معمولی انتخابی کامیابی کے باوجود اترپردیش میں ایسا فساد رونما ہوا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اترپردیش میں فرقہ وارانہ فسادات تو ہوتے رہے لیکن تقسیم ہند کے وقت اور نہ اس کے بعد کبھی فسادات کے نتیجے میں بے گھر ہونے والوں کیلئے ایسے بڑے ریلیف کیمپ لگانے کی نوبت آئی اور نہ ان میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو پناہ گزین ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

امت میں ان لوگوں کیلئے جو انتخابی کامیابی کو امن و سلامتی کا ضامن سمجھتے ہیں ان انتخابی نتائج میں نشانِ عبرت ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی بہترین کارکردگی بھی خاطر خواہ نتائج برآمد کرنے میں ناکام رہی۔ اس موقع پر ایک دلیل یہ سامنے آسکتی ہے کہ مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر غیروں پر اعتبار کیا اور جو نااہل ثابت ہوئے یا ان لوگوں نے ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ لوگ یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ اس حالتِ زار کی اصل وجہ ہے

ہمارے نمائندوں کی اکثریت کا ان جماعتوں سے تعلق رکھتا ہے جن کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لیکن اس خوش فہمی کے خلاف آسام کے بوڈو فسادات گواہ بن کر کھڑے ہوئے ہیں ۔ وہاں مسلمانوں کی اپنی جماعت یونائیٹڈ ڈیمو کریٹک فرنٹ نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور سب سے بڑی حزب اختلاف جماعت بن کر ابھری اس کے باوجود مسلمان نہ صرف قتل وغارتگری کا شکار ہوئے بلکہ انہیں بھی بڑے پیمانے پر اپنے نقلِ مکانی کرکے پناہ گزین کیمپوں کا رخ کرنا پڑا۔ یہ واقعات نام نہاد جمہوری نظام کے چنگیزی چہرے کو بے نقاب کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس باطل نظامِ سیاست میں نہ اقلیتوں کی کثیر آبادی ان کے کسی کام آتی ہے اور نہ ان کی بہترین انتخابی حکمتِ عملی ان کو کوئی خاص فائدہ پہنچاتی ہے ۔ ایسے میں کچھ ترمیم کے ساتھ حفیظ میرٹھی کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ ۔

یہ بھی تو سوچیے کہ سیاست کے کھیل میں
دنیا نے ہم سے کیا لیا، دنیا نے کیا دیا

مذکورہ مسائل کا تعلق اسلامی سیاست سے نہیں بلکہ مسلم سیاست سے ہے۔ جب سے مسلمانوں کے اندر دین و دنیا کی تفریق نے راہ پائی ان کی سیاست بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ مسلم رہنماؤں اور عوام کا ایک بڑا طبقہ خود بھی اسلامی سیاست کے رموز و نکات سے ناواقف ہے مگر جو لوگ اس کا شعور رکھتے ہیں وہ بھی

بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہم سیاسی لوگوں کا نہیں بلکہ دینی تحریک کا کام ہے۔ ہم تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے سیاست کے میدان میں آئے ہیں۔ ایسا کہنا نہ صرف سہولت بلکہ مجبوری ہے۔ موجودہ نظام جمہوریت کا جبر کسی ایسی جماعت کو جو یہاں پر رائج لادینی سیاسی نظام کو بدلنے کا عزم لے کر میدانِ سیاست میں داخل ہو اس وقت تک دستار نہیں باندھتا جب تک کہ وہ سیکولرزم کا کلمہ نہ پڑھ لے۔ وہ سیاسی جماعتوں کے دستور میں سیکولرزم کی شق پہلے دیکھتا ہے اور رجسٹریشن اس کے بعد میں کرتا ہے اس طرح نظام کی تبدیلی کا بلند بانگ دعویٰ کرنے والوں کو پہلے ہی مرحلے میں بڑی آسانی سے بدل دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی فلاح بہبود کی خاطر جو سیاست گزشتہ ٦٥ سالوں میں کی گئی ہے اس کے نتائج بھی لرزہ خیز ہیں۔

ماہانہ اخراجات کو معیار زندگی کی کسوٹی مانا جاتا ہے۔ایک جائزے کے مطابق قومی سطح پر مسلمان روزآنہ اوسطاً ٣٢،٧ روپے خرچ کرتا ہے جبکہ ہندو ٣٧،٥ روپے، عیسائی ٤٥١، روپے اور سکھ ٥٥،٣روپے۔ اس طرح گویا ایک سکھ گھرانے کے اوسط ماہانہ اخراجات اگر ١٦٥٩ روپے ہیں تو مسلمان خاندان کے ٩٨٠ روپے۔ تعلیم کے شعبے میں اگر بنگال کی مثال لیں جہاں ایک چوتھائی آبادی مسلمان ہے تو شہروں کے اندر ١٠٠٠ ہندو طلباء میں سے ٣٠ پوسٹ گریجویشن کیلئے جاتے ہیں جبکہ طالبات ان سے دو زیادہ ہیں اس کے برعکس صرف ١٠ مسلم طلبہ اور

دو طالبات اعلیٰ تعلیم کیلئے یونیوسٹی میں پہنچ پاتی ہیں۔ دیہی علاقوں میں یہ فرق نہیں پایا جاتا ۱۰۰۰ میں سے پانچ مسلم وغیر مسلم طلباء اعلیٰ تعلیم حاصل کرپاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالصالح کے مطابق معاشی ابتری کی بنیادی وجہ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی جانبداری ہے۔ تعلیمی قابلیت کے مطابق انہیں ملازمت نہیں مل پاتی۔ ایسا نہ صرف شہروں میں ہوتا ہے بلکہ قومی دیہی لازمی روزگار یوجنا کے تحت بھی مسلمانوں کو ان کے جائز حق سے محروم کردیا جاتا ہے۔ اس صورتحال میں مسلمان نہ ہی اسلامی سیاسی نظام کو متبادل کے طور پیش کرتے ہیں اور نہ ملت کی فلاح و بہبود کا کوئی اہم ہدف حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرپاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انتخابی سیاست مسلمان رائے دہندگان کئی جماعتوں کو اقتدار سے ہمکنار اور کئی کو اقتدر سے محروم کردیتے ہیں لیکن خود انہیں کیا ملتا ہے؟ پناہ گزین کیمپوں میں ذرائع ابلاغ سے ایسے ٹیلی فون جن میں خیریت و عافیت کے بجائے یہ دریافت کیا جاتا ہو کہ کیا وہ آئی ایس آئی سے رابطے میں ہیں؟ کیا یہ سوال انتخابی لادینی سیاست سے وابستہ امت کی خوش فہمیوں کے ازالے کیلئے کافی نہیں ہے؟

انتخابی سیاست اور اشتراکی تحریک

قومی سطح پر فی الحال الیکشن کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔انتخابی کرشمہ سازیاں بامِ عروج پر ہیں۔اس بیچ پلاننگ کمیشن نے دعویٰ کردیا کہ ۲۰۰۴ سے لے کر ۲۰۱۲ کے درمیان غربت کی شرح ۳۷ فیصد سے گھٹ کر ۲۲ فیصد تک پہنچ گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ منموہن حکومت نے یہ بھی کہا کہ وہ ۶۷ فیصد عوام کو حقِ غذائی تحفظ کے تحت سستا اناج فراہم کرے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے جو لوگ غربت کے خط سے اوپر ہیں انہیں کم نرخ پر اناج کی فراہمی چہ معنی دارد؟ دراصل یہ بلاواسطہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مہنگائی کی شرح دوگنی ہوگئی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ گرانی میں دو سو فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ مگر انتخابی گہما گہمی نہ ہی مودی کو اجازت دیتی ہے کہ وہ غربت کے مسائل میں دلچسپی لے اور نہ راہل کو۔ لیکن پچھلے دنوں بنگال کے سابق وزیراعلیٰ بدھ دیو نے فرمایا کہ روزمرہ کے استعمال کی قیمتوں میں روزافزوں اضافہ منموہن سنگھ کو اقتدار سے محروم کردے گا۔اقتدار سے محرومی کے بعد بدھ دیو بدھیمانی (سمجھداری) کی باتیں کرنے لگے ہیں۔

اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بدھ دیو نے کہا لیکن اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ نریندر مودی ان کی جگہ لینے کی کوشش کررہا ہے۔بدھ و دیو کے اس

حقیقت پسندانہ بیان میں یہ اعتراف موجود ہے کہ فی الحال ملک کی عوام کے نزدیک کانگریس کا متبادل اشتراکیت نہیں بلکہ فسطائیت ہے حالانکہ ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک منعقد ہونے والے پانچ انتخابات میں سے چار میں کمیونسٹ پارٹی دوسرے نمبر اور ایک میں سوتنتر پارٹی دوسرے نمبر پر تھی۔ جن سنگھ اس کے مقابلے ایک چھوٹی سے جماعت تھی۔ کسی علاقائی پارٹی کو اس پر سبقت لے جانے کا موقع نہیں ملا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پچھلے چالیس سالوں میں ایسا کیا ہوگیا کہ اشتراکی تحریک ہندوستانی سیاست کے اندر کسی شمار یا قطار میں نہیں ہے۔

انتخابی جائزوں کو نتیش کمار اشتہار یا تفریح کا سامان قرار دیتے ہیں اس لئے کہ ان میں بی جے پی کو پہلے اور کانگریس کو دوسرے نمبر پر دکھلایا جارہا ہے لیکن وہ بھول جاتے ہیں ہر جائزے میں ان دونوں کی مجموعی نشستیں دو تہائی سے کم بنتی ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ غیر کانگریسی اور غیر بی جے پی کے کامیاب امیدواروں کی مجموعی تعداد ان دونوں جماعتوں سے زیادہ ہوگی۔اشتراکیوں نے اس صورتحال کے پیش نظر نریندر مودی کو اقتدار میں آنے سے روکنے کیلئے پھر ایک بار تیسرے محاذ کا بگل بجادیا ہے۔کانگریس اور بی جے پی کے پاس کوئی نیتی تو ہے نہیں ہاں دونوں نے اس بار نیا نیتا ضرور میدان میں اتارا ہے اس کے برعکس سیتارام یچوری کا نعرہ ہے ’’نیتا نہیں ، نیتی نئی‘‘۔ یہ نعرہ اپنی حریف جماعتوں کی ضد ضرور ہے لیکن یہ نئی نیتی یعنی

حکمت عملی کیا ہے اور کس طرح اپنے مخالفین سے مختلف یا منفرد ہے اس کی وضاحت عوام کے سامنے نہیں ہے۔

۲۰۰۹ء سے قبل کمیونسٹوں نے تیسرا محاذ بنانے کی پہل کبھی نہیں کی تھی بلکہ وہ باہر سے حمایت کرنے پر اکتفا کیا کرتے تھے۔ اُس وقت چونکہ مایاوتی اترپردیش کی وزیراعلیٰ تھیں اس لئے انہیں وزیراعظم کا امیدوار بنا کر پیش کر دیا گیا اور ان کے حریف ملائم سنگھ کو دور رکھا گیا جو کانگریس کے ساتھ چلے گئے۔ اس مرتبہ اترپردیش کا اقتدار ملائم کے پاس ہے اس لئے وہ بلااعلان وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار بن گئے ہیں۔ اس بار مایاوتی کو قریب پھٹکنے نہیں دیا جارہا اس لئے ممکن ہے وہ کانگریس کا پنجہ تھام لیں۔ اس طرح کی ابن الوقتی کے سبب تیسرا محاذ عوام کی نگاہوں میں اپنا اعتبار گنوا دیتا ہے۔

ملائم کے علاوہ نتیش کمار بھی وزارتِ عظمیٰ کے دعویداروں ہیں لیکن ان دونوں میں سے ایک بھی اشتراکی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہوا جبکہ ایک زمانے میں اشتراکی تحریکمیں ڈانگے، گوپالن، ہرین مکرجی، نمبودری پد اور جیوتی باسو جیسے قدآور قومی رہنما پائے جاتے تھے۱۹۹۶ء میں جیوتی باسو کو وزیراعظم بنانے پر تیسرے محاذ نے اتفاق بھی کرلیا تھا لیکن اب یہ حال ہے کہ موجودہ لیڈرشپ میں سے کسی کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا حالانکہملائم اور نتیش کا حلقۂ اثر صرف

ایک ریاست تک محدود ہے اس کے برعکس کمیونسٹ رائے دہندگان کی تعداد کم از کم تین ریاستوں میں قابلِ لحاظ ہیں۔اس قحط الرجال کی وجہ اشتراکی رہنماؤں کا نظریاتی دیوالیہ پن اوراعلیٰ معیارزندگی ہے جس نے ان کے اور دوسرے موقع پرست رہنماؤں کے درمیان کے تفاوت کو ختم کردیا ہے۔

سنہ ۲۰۱۴ کے انتخابی منظر نامے پر نگاہ ڈالیں تو اس کاقوی امکان نظرآتا ہے قومی سطح پر کوئی جماعت واضح اکثریت حاصل نہ کرسکے گی ۔ایسے میں انتخاب کے بعد جب کانگریس کو حمایت کی ضرورت پیش آئے گی تو سب سے پہلے ملائم اور نتیش ہی تیسرے محاذ کی لٹیا ڈبو کر کانگریس کے دریا میں کودجائیں گے اس لئے کہ لالو کی لالٹین کو گل کرکے کانگریس نے نتیش کے تیر کانشانہ سادھ لیا ہے۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اشتراکی بھی فسطائیت کوروکنے کا بہانہ بناکر کانگریس سے اشتراک کرلیں لیکن اس بار ممتاان کے راستے کی رکاوٹ بن سکتی ہے۔سیاسی جوڑتوڑکے ماحول میں موقع پرست جماعت کیلئے توابن الوقتی کا مظاہرہ سیاسی دانشمندی کہلاتا ہے لیکننظریاتی تحریک کیلئے وہ سمِ قاتل بن جاتا ہے۔

بدھ دیو نے اپنے مذکورہ بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ ممتااور مودی فی الحال پھولوں کا تبادلہ کررہے ہیں لیکن آگے چل کروہ ایک دوسرے کی گلپوشی

کریں گے۔ مغربی بنگال میں مسلمانوں کی قابلِ لحاظ آبادی ہے جو عرصۂ دراز تک کمیونسٹ پارٹی کے دست و بازو بنے رہے لیکن اس کے بدلے انہیں جو کچھ ملا اس کا بیان سچر کمیٹی کی رپورٹ میں درج ہے۔ مودی کا خوف دلانے والے بدھ دیو شاید نہیں جانتے کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب زعفرانی گجرات میں سرخ بنگال سے بہتر ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے سبب مالدہ اور کولکتہ میں کانگریس کی کچھ نشتیں نکل آتی تھیں لیکن اس کے یہ معنیٰ بھی نہیں کہ ریاست کے جن رائے دہندگان نے اپنی پارٹی کو ووٹ نہیں دیا اس سے انتقام لو اور انہیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم کردو۔ مغربی بنگال میں یہ بات اشتراکی دانشور بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہاں کی ریاستی حکومت عوام کے بجائے پارٹی کارکنان کی فلاح و بہبود پر سارے وسائل صرف کرتی تھی اور مخالفین سے معاندانہ سلوک کیا جاتا تھا۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کو فسطائیت کا خوف دلا کر اپنے ساتھ نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ وہاں بی جے پی بہت کمزور ہے اور مسلمانوں کے سامنے ترنمل اور کانگریس کا متبادل موجود ہے اس لئے اشتراکی اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ممتا کو بی جے پی سے جوڑ کر مسلمانوں کو اس سے بدظن کیا جائے مبادہ وہ دوبارہ درانتی اور ہتھوڑا تھام لیں۔ مسلمانوں نے چونکہ اشتراکی پرچم کو ہوڑا برج سے نیچے پھینک کر ترنمل کا جھنڈا اتھاما ہوا ہے اس

لئے ان کو رجھانے کی خاطر بدھ دیو وہی گھسا پٹا طریقہ استعمال کیا جو ہر موقع پرست سیاسی جماعت کا شیوہ بنا ہوا ہے۔ وہ مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کیلئے کیا کرنا چاہتے ہیں یہ بتانے کے بجائے ممتا نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا کا رونا لے کر بیٹھ گئے۔ بھٹا چاریہ کے مطابق ممتا کا دعویٰ بے بنیاد ہے کہ اس نے مسلمانوں سے کئے گئے ۹۰ فیصد وعدوں کو پورا کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ممتا بنرجی نے آئمہ کو وظیفہ دینے کے علاوہ کوئی اقدام نہیں کیا۔ جبکہ اسے پتہ تھا کہ اس غیر دستوری فیصلے کو عدالت مسترد کردے گی۔ اس ڈرامہ کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ رسوائی سے کچھ بھی نہیں آیا۔ اگر یہ بات درست بھی ہے تو مسلمانوں کیلئے نئی نہیں ہے آزادی کے بعد ہر سیاسی جماعت نے جس میں قومی فرقہ پرست جماعتیں مثلاً کانگریس اور علاقائی موقع پرست پارٹیاں مثلاً بی ایس پی اور ایس پی وغیرہ شامل ہیں نے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے کہ اپنی ضرورت کیلئے انہیں استعمال کیا اور پھر بے یارومددگار چھوڑ دیا۔

ترنمل اور بی جے پی کے درمیان خفیہ معاہدہ کا الزامات لگایا جاتا ہے لیکن ممتا تو بی جے پی کی حکومت میں شامل رہی ہے اور ان کے ساتھ پھر سے جاسکتی یہ بات پردۂ اخفاء میں نہیں اظہر من الشمس ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ابن الوقتی

کی اس سیاست میں ہر سیاسی جماعت اپنے مفادات کی خاطر بی جے پی کی براہِ راست یا بالواسطہ حمایت کر سکتی ہے۔ ماضی میں یہ ہوا ہے اور مستقبل میں پھر سے ہو سکتا ہے۔بدھ دیو کے ان تمام الزامات کی کوئی نظریاتی اثاث نہیں ہے جو اس حقیقت کا مظہر ہیں کہ فی الحال دیگر فکر و نظریہ سے عاری سیاسی جماعتوں اور سی پی آئی ایم کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ نظریاتی کتب مکتبوں کی زینت بن چکی ہیں اور عملی سیاست سے انہیں شہر بدر کر دیا گیا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی سے مغربی بنگال میں صرف مسلمانوں کو شکایت نہیں ہے بلکہ وہاں کے ہندو بھی ان سے نالاں ہیں۔اس لئے کہ ۳۴ سالوں تک مسندِ اقتدار پر فائز رہنے کے باوجود بایاں محاذ خوشحالی کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ کر سکا جس کے نغمے دنیا بھر میں گائے جاتے رہے۔ان کے دورِ حکومت میں محنت کشوں کی یہ جنت سالانہ اوسط پیداواری کے معیار پر ملک میں ۱۸ویں نمبر پر تھی۔ بنیادی سہولت کے باب میں ۲۰۰۵ء کے اندر بنگال کے صرف ۲۸ فیصد عوام کو صاف پینے کا پانی حاصل تھا جبکہ مہاراشٹر میں اور تمل ناڈو میں ۸۴ فیصد لوگ اس سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ دانشوروں کے ۷۸ زیر اقتدار اسکول سے تعلیم نامکمل چھوڑ کر نکلنے والے طلباء کا تناسب ۷۸ فیصد یعنی بہار سے بھی گیا گزرا تھا۔ بچوں کا اسکول جانے کے بجائے مزدوری کرنا معاشی بدحالی کی ایک علامت ہے اور یہ تعلیمی پسماندگی غربت و افلاس کی ضمانت بھی ہے۔

ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ناکامیوں کے باوجود کمیونسٹوں کو یکے بعد دیگرے انتخابات میں کامیابی کیوں کر حاصل ہوتی رہی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے زمینداری کا خاتمہ کرنے کے بعد زمین کی تقسیم سے ابتداء میں دائیں بازو کو عوام کے ایک طبقہ کی حمایت حاصل ہوئی لیکن آگے چل کر پارٹی مقامی سطح پر ایک مافیا میں تبدیل ہو گئی۔ غنڈہ عناصر اپنے تحفظ اور مفاد کی خاطر جماعت میں شامل ہو گئے۔ پارٹی ان کی دہشت کے سہارے انتخاب میں کامیابی حاصل کرتے تھے۔ وہ سماج دشمن عناصر پارٹی کی مدد سرکاری اثرورسوخ حاصل کرتے رہے اور عوام کا استحصال ہوتا رہا۔ یہ باہمی اشتراک دونوں کے مفاد میں تھا۔

جیوتی باسو کے بعد جب بدھ دیو بھٹا چاریہ نے اقتدار سنبھالا تو ان پر ریاست میں پروردہ پسماندگی کو ختم کرنے کیلئے دباؤ.بڑھنے لگا۔ نوجوانوں کے اندر روزافزوں.بڑھنے والی بیروزگاری سے وہ پریشان ہو گئے اور انہوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے نہ صرف قومی بلکہ عالمی سرمایہ داروں کے ساتھ ہاتھ ملا لیا۔ جن غریب کسانوں میں زمین کے ٹکڑے بانٹ کر.برسوں ان سے ووٹ لئے گئے تھے انہیں اپنی زمین سے بے دخل کیا جانے لگا۔ نندی گرام کے کاشتکاروں نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو پارٹی کے غنڈے پولس کے شانہ بشانہ غریب کسانوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس ساز باز کو ذرائع ابلاغ نے بے نقاب کردیا اور سارے ملک میں اس کے

خلاف غم و غصہ پھیل گیا۔ ریاستی حکومت کے خلاف ماؤوادی اور ترنمل دونوں میدانِ عمل میں کود پڑے اوپر سے ان کو مرکزی کانگریسی حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔

اس تبدیل شدہ صورتحال سے مقامی غنڈہ عناصر گھبرا گئے۔ ان کا اعتبار بائیں بازو کی حکومت سے اٹھ گیا۔ چونکہ پارٹی سے ان کا کوئی نظریاتی تعلق نہیں تھا اس لئے جو مفاد انہیں سرخ پرچم تلے لایا تھا وہی فائدہ ان لوگوں کو ممتا کے سبز جھنڈے کے سائے میں لے گیا۔ ان لوگوں کے پالا بدلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔ مغربی بنگال سیاسی افق تبدیل ہو گیا۔ ترنمل کے سبز پرچم پر بنے دو عدد پتوں نے اشتراکی سرخی کو نگل لیا اس لئے کہ درانتی کند ہو چکی تھی ،اس کے پیٹ میں موجود ہتھوڑا زم اور غلہ سوکھ گیا تھا۔ سونیا اور ممتا کی لڑائی میں دائیں بازو نے جن پتوں پر تکیہ کیا تھا انہیں پتوں نے ایسی ہوا دی کہ بالآخر سرخ سورج غروب ہو گیا۔ ترنمل کانگریس نے پارلیمان سے لے کر پنچایت تک ہر انتخاب میں اشتراکیوں کو دھول چٹادی ۔۲۰۰۶ء میں دائیں محاذ کے ارکانِ اسمبلی ۲۳۵ تھے جبکہ ۲۰۱۱ء میں یہ تعداد تقریباً ایک چوتھائی یعنی ۶۲ ہو گئی اس کا سہرہ انہیں غنڈہ عناصر کے سر ہے جو کبھی کمیونسٹ پارٹی کی ریڈھ کی ہڈی ہوا کرتے تھے۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب کہ سرزمینِ ہند پر مغربی بنگال کو وہی اہمیت حاصل

تھی جو عالمی نقشے پر سوویت یونین کی تھی۔ دونوں مقامات سرخ پرچم کچھ اس طرح لہراتا تھا گویا یہ کبھی بھی سرنگوں نہیں ہوگا لیکن پھر سوویت یونین میں میخائیل گورباچیف نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی اور آہنی دیوار کے اندر پریسٹوئیکا نامی ایک باریک دراڑ ڈال کر باہر کی دنیا میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن ہوا یہ کہ کھلی منڈی کا ایسا زوردار جھونکا اندر داخل ہوا جس سے اس دیوار کے پر خچے اڑ گئے۔ دھماکہ اس قدر تیز تھا کہ وہ اپنے ساتھ گورباچیف کو اٹھا کر امریکہ لے گیا۔ بدھ دیو بھٹاچاریہ مغربی بنگال کے گورباچیف ثابت ہوئے۔

اس موقع پر ایک سوال پیدا ہوتا کہ آخر ایک نظریاتی اور انقلابی تحریک کی آج یہ حالت کیوں ہو گئی کہ وہ ابن الوقت اور موقع پرست علاقائی جماعتوں کا بغل بچہ بن گئی ؟ اس انحطاط کی وجہ معلوم کرنے کیلئے ہندوستان میں اشتراکی تحریک کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ کمیونسٹ پارٹی کا قیام ہندوستان میں ۱۹۲۰ء کے اندر عمل میں آیا۔ اس وقت سے یہ تحریک گوناگوں وجوہات کی بناء پر خلطِ مبحث (کنفیوژن) کا شکار رہی۔ اول تو آزادی کی تحریک سے اس نے اپنے آپ کو دور رکھا لیکن پھر ۱۹۳۴ء میں اس نے تحریک آزادی کی تعریف توصیف شروع کردی۔ گویا نظریاتی سطح پر جنھیں سرمایہ دار اور استحصال کرنے والا کہا جاتا تھا ان کو عملاً قومی ہیرو کے طور پر تسلیم کرلیا گیا یہ فکری انتشار

کی ابتداء تھی۔

مسلم لیگ نے مذہبی بنیاد پر ۱۹۳۹ء میں جب پاکستان کا مطالبہ کیا تو اس لادینی تحریک نے اس کی تسلیم کرلیا اور حق خوداختیاری کی حمایت کردی۔ اس کے بعد جب کانگریس اور مسلم لیگ اس مسئلہ پر آمنے سامنے ہوگئے اور ملک کے عوام دو قطب پر جمع ہوگئے تو ان لوگوں نے کانگریس لیگ اتحاد کا فلک شگاف نعرہ بلند کردیا جس سے لوگوں کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ آخر یہ کہاں کھڑے ہیں؟ ۱۹۴۲ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران سارا ملک برطانوی سامراج کے خلاف کھڑا تھا مگر اشتراکی سبھاش چندر بوس جیسے انقلابیوں کو فسطائیت نواز قرار دے کر مخالفت کررہے تھے اور ان لوگوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ بدنامِ زمانہ جوشی میکسویل معاہدہ کرلیا جس سے عوام کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں قائم ہونے والا نظام کامل جاگیردارانہ یا نیم سرمایہ دارانہ ہے اس پر خوب بحث و مباحثہ ہوا۔ اس نظام کو بدلنے کیلئے استعمال کی جانے والی حکمت عملی مسلح ہو یا انتخابی یہ موضوع زیر بحث آیا۔ اس کو بدلنے کیلئے انقلاب کی ضرورت ہے یا انتخاب کی اس پر اختلاف ہوگیا۔ ہندوستان کیلئے سوویت یونین کو نمونہ بنایا جائے یا چین کو؟ اس سوال پر بھی

اتفاق نہ ہو سکا جس کے نتیجے میں پہلی پھوٹ پڑی اور ۱۹۶۴ء میں سی پی ایم الگ ہو گئی۔ مسلح جدوجہد کی بنیاد پر نکسلوادی تحریک کا جنم ہوا۔ آج صورت واقعہ یہ ہے نکسلی تحریک نہ صرف نظری حیثیت سے بلکہ اپنے قوت و تاثیر کے لحاظ سے بھی تمام انتخابی کمیونسٹ پارٹیوں پر سبقت رکھتی ہے۔ اس کے بارے لوگ اس لئے کم جانتے ہیں کہ وہ پسماندہ قبائلی علاقوں میں کام کرتی ہے اور سرمایہ داروں کے اشارے پر چلنے والا ذرائع ابلاغ یا تو ان سے صرفِ نظر کرتا ہے یا انہیں بدنام کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے۔

قومی شخصیتوں کے تعلق سے بھی اشتراکی تحریک کا اونٹ پہلو بدلتا رہا ہے۔ ولبھ بھائی پٹیل کی مخالفت میں ان لوگوں نے جب پنڈت نہرو کی حمایت کی تو ان کیلئے کانگریس کی سرمایہ دارانہ پالیسی کی مخالفت کرنا مشکل ہو گیا جسے پارٹی کی ساکھ کو نقصان پہنچا۔ جب کانگریس تقسیم ہوئی تو ان لوگوں نے اندرا گاندھی کے بنکوں کو قومیانے اور نوابوں اور راجاؤں کا جیب خرچ بند کر دیئے جانے سے خوش ہو کر ان کی حمایت کر دی حالانکہ وہ ایک ڈرامہ تھا لیکن یہ اس کے فریب میں آگئے۔ آگے چل کر جب اندرا جی نے ایمرجنسی نافذ کر دی تو ان لوگوں کو بھی صعوبتوں کا شکار ہونا پڑا۔

منموہن سنگھ بجا طور پر ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کے جنک کہلائے جاتے

ہیں۔ اس لئے کہ وزیر خزانہ کی حیثیت کھلے بازار کا دروزہ انہیں کے دستِ مبارک سے کھلا۔ وزیر اعظم بننے کے بعد انہوں نے نجکاری کی مدد سے سرمایہ دارانہ نظام کو ملک میں پوری طرح جاری و ساری کردیااس کے باوجود فسطائیت دشمنی کی آڑ میں اشتراکیوں نے ۲۰۰۴ء سے لے ۲۰۰۸ء تک منموہن کی بھرپور حمایت کی اس طرح گویا خود اپنے ہاتھوں سے اپنے نظریہ کو زندہ درگور کردیا۔ انتخاب سے قبل نیوکلیائی معاہدے کا بہانہ بناکر حمایت واپس لینا ان کے کام نہ آیا۔ عوام نے انہیں ابن الوقتی کی قرار واقعی سزا دی اور ممبران پارلیمان کی تعداد کو ۵۹ سے گھٹا کر ۲۴ پر پہنچا دیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انتخابی سیاست کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انتشار فکر نے نہ صرف اشتراکی بلکہ ہندوستان کی بیشتر نظریاتی تحریکوں کوان کے امتیازی شان سے محروم کرکے انہیں مفاد پرست سیاسی جماعتوں کے ہم پلہ کھڑا کردیا ہے۔ بظاہر سب کچھ روشن اور چمکدار نظر آتا ہے لیکن انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے دولت و طاقت کی روز افزوں ضرورت اورانتخابی کامیابی کو مفید تر بنانے کی خاطر کی اختیار کی جانے والی مصلحت و مصالحت انہیں اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کررہی ہے۔

لوگ تصویر سمجھتے ہیں میں آئینہ ہوں

شفیق حسین شفق کے آئینے میں عرفان صدیقی کی تصویر

ڈاکٹر شفیق حسین شفق سے میری ایک مختصر ملاقات سال بھر قبل لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ یقین کریں کہ اگر اس سے پہلے میں نے ان کی کتاب عرفان صدیقی: شخص اور شاعر دیکھ لی ہوتی تو میرے لئے یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ یہی وہ نوجوان ہے جو عرفان صدیقی پر ایسی تحقیقی تصنیف کا خالق ہے۔ عرفان صدیقی: شخص و شاعر کی بابت نیا ورق کے مدیر ساجد رشید کی رائے ہے ”زیر نظر کتاب کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اگر ان (مرحوم عرفان صدیقی) کی زندگی میں یہ کتاب شائع ہوتی تو وہ اپنے بے نیازانہ مزاج کے باوجود کتاب کے دقیق مواد کو دیکھ کر ضرور خوش ہوتے“ لیکن قربان جایئے ڈاکٹر شفق کے عجز و انکسار پر کہ وہ اپنی کتاب کے ابتدائیہ میں یوں رقمطراز ہیں ”میں ان سخن فہموں اور عرفان شناسوں کا شکرگزار ہوں کہ جنھوں نے میری کتاب کی توقع سے زیادہ تحسین و پذیرائی کی اور اسے عرفان شناسی کیلئے نشانِ راہ قرار دیا۔ ہر چند کہ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے سبب عرفان صدیقی کی شاعری کی کماحقہ تعبیر و تفہیم نہ کرسکا۔ (ص ۱۵)۔

چار سال کے مختصر عرصے میں کتاب کے اشاعتِ سوم کا منصۂ شہود پر آنا بجائے خود کامیابی کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ مختلف لوگوں کی توجہات کا عرفان صدیقی کے فن و شاعری کی جانب مبذول ہونا جس کی پیشن گوئی پروفیسر انیس اشفاق نے کی تھی ، نیا دور اور دیگر موقر جریدوں کا عرفان صدیقی پر خصوصی نمبر شائع کرنا ڈاکٹر شفیق حسین شفق کیلئے ثوابِ جاریہ سے کم نہیں ہے۔ مرزا صاحب ابھی نوجوان ہیں ان کی ذات پر غالب کا مصرعہ ''سب کہاں کچھ لالہ و گل'' صادق آتا ہے۔ اس مشتِ خاکی کے اندر بہت کچھ پنہاں ہے جس کا نمایاں ہونا ابھی باقی ہے۔ اردو زبان کا تابناک مستقبل ایسے ہی جواں سال ناقدین سے وابستہ ہے۔

مرزا شفیق حسین شفق نے قول کے بجائے اپنے عمل سے اس دور کی دو بڑی غلط فہیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ اول یہ کہ بڑے شہروں کے لوگ چھوٹے قصبوں کے لوگوں سے زیادہ ذہین و فطین ہوتے ہیں دوسرے کانونٹ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو دینی درسگاہوں میں پڑھنے والے طلباء پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ شفیق صاحب قصبہ سانکھنی بلند شہر کے اسلامی پرائمری مکتب سے ابتدائی تعلیم حاصل کرکے لکھنوآئے اور جامعہ سلطانیہ سے فارغ التحصیل ہو کر لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے جہاں ان کا سابقہ عصری تعلیم گاہوں سے نکل کر آنے

والے طلباء سے پڑا۔تاریخ شاہد ہے کہ شفیق حسین نے نہ صرف ہر امتحان میں امتیازی کامیابی درج کروائی بلکہ لکھنؤ یونیورسٹی کے بہترین طالبعلم کے اعزاز سے بھی نوازے گئے ۔ یہ حسن اخلاق ان دینی درسگاہوں کی مرہون منت تھا جہاں سے زانوئے ادب طے کرکے مرزا شفیق یونیورسٹی میں آئے تھے لیکن بقول اقبال یہ آدابِ فرزندی محض مکتب کی کرامت نہیں ہوتے بلکہ یہ تو کریم و شفیق والدین کا فیضانِ نظراور تذکیر و تربیت کا ثمر ہوتا ہے جو اولاد کے سیرت و کردار کی شجرکاری کرتا ہے۔

ہمارے دور کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ انسان زندگی مختلف معاملات میں بڑی آسانی سے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔کچھ لوگ اپنے بچپن کے خول سے زندگی بھر باہر نہیں آتے اور کچھ رسی تڑا کرایسے فرار ہوتے ہیں کہ پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے یہاں تک کہ ان کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ پھول آخر کھلا کس چمن میں تھا؟احساسِ کمتری کا شکار یہ محروم طبقہ اپنے رنگ و بو سے بیزار و بے نیاز کائناتِ ہستی میں تمام عمر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ لیکن ڈاکٹرشفیق حسین شفق نے اس معاملے میں کمال توازن قائم کر رکھا ہوا ہے۔ ان کی ادبی و صحافتی سرگرمیاں نہ تو دینی مجالس میں حائل ہوتی ہیں اور نہ فن خطابت کو قلم کا سایہ بوجھل یا مہمل بناتا ہے بلکہ ایک حسین امتزاج ہردو کیلئے سونے پر سہاگہ کا کام

کرتا ہے۔

عرفان صدیقی: شخص و شاعر میں ڈاکٹر شفیق حسین شفق نے جو بات صنفِ غزل کے بارے میں لکھی ہے وہ خود ان کے حسنِ سیرت پر صادق آتی ہے ملاحظہ فرمائیں : قلی

قطب شاہ سے لے کر آج تک کی اردو شاعری شاہد ہے کہ بنیادی روایات اور عصری تغیرات کا جتنا حسین امتزاج غزل میں پایا جاتا ہے اتنا کسی صنفِ سخن میں نظر نہیں آتا ۔ دراصل اسی امتزاج میں غزل کا حسن مضمر ہے۔ ایمان کی حدتک روایت پسندی اور ارتداد کی حدتک روایت شکنی، کورانہ تقلید اور باغیانہ انقطاع دونوں ہی اس کے ارتقاء میں مانع ہیں۔ (ص ۷۰)

ڈاکٹر شفیق حسین شفق کی مذکورہ کتاب دراصل ان کے ایم اے کا مقالہ ہے مگر مقالہ نگاری کے پسِ پشت ضرورت کے بجائے جذبۂ عقیدت و محبت کارفرما ہے۔ عرفان صدیقی کے قریبی دوست پروفیسر نیر مسعود کا بیان ہے کہ ''مرزا شفیق حسین شفق زندگی کے آخری دور میں عرفان صدیقی سے بہت قریب ہوگئے تھے ۔ ان کی بیماری کے زمانے میں مرزا شفیق نے ان کی بہت خدمت کی جس کا اعتراف عرفان صدیقی نے بارہا کیا''۔ جب کسی مصنف کی قلبی آمادگی اس کے ذہن سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو شاہد و مشہود کا فرق مٹ جاتا ہے اور ایسی تصنیف عالمِ وجود میں آتی ہے جس کے اندر قاری شفیق حسین شفق کے آئینے میں عرفان صدیقی کی

ے تصویر دیکھتا ہے نیز عرفان صدیقی کا یہ شعران کے مداح شفیق حسین پر چسپاں ہو جاتا ہے
اپنا ہی چہرہ انہیں مجھ میں دکھائی دے گا لوگ تصویر سمجھتے ہیں میں آئینہ ہوں
یہ مقالہ عرفان صدیقی کے ساتھ گہرے تعلق اوران کی شاعری سے شفیق حسین کے والہانہ عشق کاآئینہ دار ہے۔اس میں عرفان صدیقی کے فن اور شخصیت کے علاوہ جدید اردو شاعری اورواقعہ کربلاپر بھی علمی بحث کی گئی ہے ۔اس کتاب کا ایک اہم جز ڈاکٹر شفیق حسین شفق کے ذریعہ عرفان صدیقی کے چند مشکل اشعار کی نہایت سہل اور موثر تشریح و توضیح ہے۔اس طرح گویا اس مقالےکے دو پہلو تو عنوان میں شامل ہیں لیکن دیگر تین اجزاء جن کا اوپر ذکر کیاگیا کتاب کے سینے میں پوشیدہ ہیں۔یہ معاملہ بالکل مرزا صاحب کی شخصیت کی طرح ہے کہ ان سے ملنےپران کی جس قدر خوبیاں نمایاں ہوتی ہیں اس سے کہیں زیادہ سربستہ راز ظاہر نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر شفیق جستہ جستہ کھلتے ہیں ۔

مولانا شفیق حسین شفق ایک دلنواز شخصیت کے مالک ہیں۔جو ان سے ایک بار مل لیتا ہے پھر آسانی سے انہیں بھلا نہیں پاتا نیز دوبارہ ملاقات خواہش اس کے دل میں پروان چڑھتی رہتی ہے۔شفیق صاحب سے نصف ملاقات یعنی خط وکتابت کا

بھی اپنا مزہ ہے۔ اگر آپ کے ای میل بکس میں شفیق صاحب کا میل سیکڑوں خطوط کے درمیان بھی دبکا ہوا ہو تب بھی میرا دعویٰ ہے کہ آپ اس سے پہلے کوئی اور میل کھول نہیں سکتے۔ جب میں نے یہ سوال اپنے آپ سے کیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تو میرے اندرون سے آواز آئی یہ جذبۂ اخلاص و محبت ہے جو بقول غالب ''سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا'' کی مصداق سر چڑھ کر بولتا ہے۔ شفیق حسین شفق کے خطوط میں لفاظی نہیں ہوتی۔ ان سادہ خطوط سے میں نے یہی جانا ہے کہ بے لوث تعلق الفاظ و اظہار کا محتاج نہیں ہوتا۔ عرفان صدیقی پر شفیق حسین شفق کی تصنیف اسی طرح کے رشتۂ عقیدت و شفقت کی آئینہ دار ہے۔

عرفان صدیقی چونکہ اس دور کا شاعر ہے جب اپنے ہمعصروں کا ڈھنڈورہ پیٹنے والا ترقی پسند زمانہ گزر چکا تھا اس لئے ان کے بارے عوام کی معلومات قدرے کم ہے۔ کتاب کی ابتداء میں بجا طور پر اس جانب توجہ دی گئی اور عرفان صدیقی کے متعلق نہ صرف ذاتی معلومات بلکہ ان معاشرتی اور تہذیبی عوامل کو بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا جس نے عرفان کی شخصیت کو ایک مخصوص انداز میں ڈھالا اور ایک خاص بانکپن عطا کیا۔ عرفان صدیقی کی ایک نہایت قیمتی تحریر کا اقتباس شکیب جلالی کی کتاب 'روشنی اے روشنی' کے پیش لفظ سے نکال کر ہیرے کی مانند مرزا شفیق نے اپنی کتاب میں ٹانک دیا ہے۔ اس اقتباس کے ذریعہ عرفان صدیقی کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی تک رسائی ہو جاتی ہے۔

آج میں موسموں کی کتاب کے بیس یا بائیس ورق الٹتا ہوں تو کچھ دھندلے عکس اجاگر'' ہو کر بولتی تصویروں میں بدل جاتے ہیں اور کتنی ہی بھولی بسری یادیں مجسم ہو جاتی ہیں۔ چوتھائی صدی پہلے زندگی اتنی دلشکن معلوم نہ ہوتی تھی۔ نئ عصری حقیقتیں اس چھوٹی سی بستی کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں لیکن آنکھوں میں گزری ہوئی روایتوں کے عکس ابھی جاگ رہے تھے۔ جو نسل اس وقت بدایوں میں جوان ہو رہی تھی اس کے ہاتھوں میں ماضی کے دامن کی مہک باقی تھی اور آنکھوں میں آنے والے برسوں کے خواب جگمگا رہے تھے۔ادبی محفلیں، مباحثے، رسالوں کا اجراء، ڈرامے اورادبی و ثقافتی انجمنوں کا قیام، گہری خاموش بامعنی دوستیاں، دلنواز رقابتیں اور (بااصول وسیع القلب دشمنیاں، کچھ کر دکھانے کے حوصلے''۔ (ص ۳۰

اس کتاب میں شفیق حسین شفق نے عرفان صدیقی کے بہترین اشعار کو اس خوبی کے ساتھ یکجا کیا کہ جن لوگوں کے پاس عرفان صدیقی کی مختلف کتابوں کو دیکھنے کی فرصت نہ ہو وہ اس ننھی سی صاف شفاف نہر سے دریا کی تلاطم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہاں ایک آسانی یہ بھی ہے کہ اشعار موضوعات کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ان کا پس منظر اور خوبیاں بھی بیان ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے ان سہولیات کے نتیجے میں قاری کی طبیعت سیراب ہو جاتی ہو بلکہ اس کے اندر ایک

پیاس جنم لیتی ہے۔ یہ تشنگی اسے عرفان صدیقی کا دیوانہ بنا دیتی ہے اور پھر وہ شاعر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی کتابوں کو تلاش کرتا ہے۔ اس کے کلام سے مستفید بھی ہوتا ہے اور محظوظ بھی۔ اس لئے کہ دورِجدید کے قاری کو عرفان صدیقی کی شاعری میں ایک شجر سایہ دار میسر آتا ہے اور اس کی وجہ ڈاکٹر شفیق حسین شفق اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

عرفان صدیقی نے رموزِ تخلیق اور اسرارِ کائنات کو سمجھا ہے یہی وجہ ہے کہ افلاس، سامراجی استحصال اور جبر و استبداد کی گرم ہواؤں میں جھلستے ہوئے اور کراہتے ہوئے نیم جاں افراد کیلئے عرفان صدیقی کی شاعری شجرِ سایہ دار کی حیثیت رکھتی ہے۔ عرفان صدیقی کی انسان دوستی اور ان کے غنائی لہجہ کا ذکر اس مقام پر بے محل نہ ہوگا۔ عرفان صدیقی ظلم کے خلاف احتجاج اور مظلوم کی حمایت کا اعلان بہانگِ دہل کرتے ہیں لیکن اس اعلان میں وہ غزل کی حرمت کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ (ص ۱۱۴)

اس کتاب کا تیسرا اہم پہلو عرفان صدیقی کے منتخب اشعار کی تفہیم و تشریح ہے۔ ان میں سے کچھ متنازعہ اشعار ہیں اور کچھ مشکل۔ ان اشعار کو جس انداز میں شفیق حسین شفق نے سمجھا اور سمجھایا ہے وہ ان کے عرفان شناسی کی دلیل ہے۔ وہ الفاظ کے مختلف معنی، رنگ و آہنگ کے اشارے کنائے اور شعر کی تراکیب و اصطلاحات کو جب اجاگر کرنے لگتے ہیں تو قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا

شفیق حسین شفق اپنے محبوب شاعر عرفان صدیقی کے قلب و ذہن کا ترجمان بن گئے ہیں۔ اس کی تین مثالیں ملاحظہ فرمائیں عرفان صدیقی کے مشہور شعر

بہت کچھ دوستو بسمل کے چپ رہنے سے ہوتا ہے
فقط اک خنجرِ دست جفا سے کچھ نہیں ہوتا

گجرات کے المیہ کے پس منظر میں اس شعر کی معنویت ڈاکٹر شفق یوں بیان کرتے ہیں: ''ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں وہاں ظلم کا بول بالا ہے لیکن ہم میں ظلم کے خلاف محاذ کھولنے کی جرأت نہیں اس لئے ظلم کو پنپنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس شعر میں یہ مفہوم بھی پنہاں ہے کہ جتنا بڑا ظلم، ظلم کرنا ہے اتنا ہی بڑا ظلم، ظلم ہوتے ہوتے ہوئے دیکھنا اور اس پر خاموش رہنا ہے۔ (ص۱٦٦)۔ اسی طرح ایک اور شعر کی گجرات کے فسادات پر تطبیق فرماتے ہوئے ڈاکٹر شفق لکھتے ہیں کہ یہاں علامات کربلا کا سہارا لے کر موجودہ عہد کی عکاسی کی ہے۔۔۔ لہٰذہ تفہیم عرفان کے وقت اس کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ وہ کربلا کے الفاظ و علامات کے توسط سے معاصر عہد کی صورتحال کو ظاہر کرتے ہیں (ص۱۷۵)۔ عرفان صدیقی کے ایک متنازعہ شعر کی تشریح بھی ملاحظہ ہو ''معترضین نے دراصل اس شعر کو سمجھنے میں بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ اس کی تفہیم علاماتِ کربلا' کے آئینہ میں کی ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں عرفان صدیقی کے' یہاں صرف علامات کربلا ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے وہ تو ان

(کی شاعری کا صرف ایک پہلو ہے حالانکہ یہ شعر خالص عشقیہ شعر ہے۔(۱۳۱

اس کتاب میں جدید اردو شاعری کا جائزہ اس حوالے شامل کیا گیا کہ عرفان صدیقی اس کا نمائندہ شاعر تھا لیکن یہ محض رسمی حوالہ نہیں ہے بلکہ اس باب میں جدید اردو شاعری کا منظر اور پس منظر،اس کی ضرورت و اجزائے ترکیبی ، اس کے اندر پیدا ہونے والے رجحانات اور ان کے پس پردہ کارفرما وجوہات پر نہایت دلنشین انداز میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ نئی غزل کا تعارف شفیق حسین اس طرح کرواتے ہیں کہ '' نئی غزل در حقیقت معاصر انسان کی خارجی و داخلی شکست و ریخت کا اظہار ہے۔ نئی غزل کی تفہیم کیلئے اس دور کے انسان اور اس کے مسائل سے واقفیت ضروری ہے۔ مشینی زندگی، نیچر سے انسان کے ازلی وابستگی کے خاتمے،خدا کے تصور کے زوال نیز تمام اقدار کے مٹ جانے سے نیا انسان جن مسائل سے دوچار ہے اور نئے اقدار کی تلاش میں جس تخلیقی کرب سے گزر رہا ہے وہ خود رحمی کی سرحدوں کو چھو چکا ہے۔

آج کا انسان ماقبل کے انسان سے ذہنی طور پر مختلف ہے۔ وہ اب زمینی فاصلوں کے کم یا ختم ہوجانے سے بین الاقوامی سطح پر ایک عالمگیر قوم میں شامل ہوگیا ہے۔اس کا کرب اب محدود نوعیت کا نہیں رہا جبکہ پوری کائنات کے اسرار کی گرہیں کھل چکی ہیں اس کے کرب کی شدت میں اضافہ ہوا ہے۔نیا انسان خارجی

وسعتوں کے سامنے خود کو ہیچ پا کر اب اپنے وجود کو تلاش کرنے نکلا ہے۔اس کا سفر اب اپنے خارج سے باطن کی طرف ہے۔اس لئے وہ خود سے ہمکلام ہے۔ سوالات نئے اور پیچیدہ ہیں۔ وہ ان سب کا جواب چاہتا ہے۔اضطراب گہرا اور شدید ہے۔ اس کی آواز میں زوال خوردہ معاشرے کی چیخیں شامل ہیں۔ جو ہمیں نئی غزل میں صاف طور پر سنائی دیتی ہیں'' (ص ۷۶)

اس اقتباس کو پڑھتے وقت بالکل بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی دقیق تحقیق کی کتاب زیر مطالعہ ہے۔جدید و قدیم شاعری کا جائزہ لیتے وقت ڈاکٹر شفیق حسین شفق کی غیر جانبداری قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نہ تو کسی کی بیجا تعریف کی اور نہ کسی سے بغض و عناد کا اظہار کیا لیکن اسی کے ساتھ جہاں گرفت کی ضرورت محسوس کی پر وقار اور مہذب انداز میں اس سے گریز بھی نہیں کیا۔ یہ کام خاصہ مشکل ہے خاص طور پر ان چغادری ناقدین کیلئے جو اپنے خود ساختہ تشخص کے حصار میں مقید رہتے ہیں۔

واقعہ کربلا کے سلسلے میں بھی عام طور پر اعتدال و توازن قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر شفیق حسین شفق نے اپنی کتاب کے چوتھے باب میں نہایت سہل انداز میں اسے بیان فرمایا اور اس کی ہمہ گیر معنویت پر جس طرح روشنی ڈالی وہ اپنے آپ میں ایک جداگانہ تصنیف ہے۔ اس کتاب میں اس کا شامل ہونا اس لئے

ضروری قرار پایا کہ ان حقائق کی یاددہانی کے بغیر عرفان صدیقی کے بہت سارے اشعار کی مکمل تفہیم ممکن نہیں ہے۔اس مرحلے میں ڈاکٹر شفیق حسین شفق نے اپنے کام کو مزید وسعت دیتے ہوئے دیگر جدید اور معتبر شعراء کا کلام بھی پیش کر دیا ہے جس سے قاری کو یہ جاننے میں مدد ملتی ہے جدید لہجے میں قدیم اصطلاحات کی مدد سے عصرِ حاضر کے کرب و بلا کو کیسے بیان کیا جارہا ہے اور عرفان صدیقی نے اسے کیسے برتا ہے اس لئے کہ بقول ڈاکٹر شفیق حسین شفق :

ظلم کے خلاف سب سے پر قوت استعارہ کربلا ہے اسی وجہ سے عرفان صدیقی کے یہاں کربلا اور اس کے جزئیات کا ذکر بہت آتا ہے (ص۱۰۰)۔ ظلم و تشدد، جبر واستبداد کے خلاف خودی کا اثبات واقعات کربلا کا بہت بڑا استعارہ ہے اور یہی عرفان صدیقی کی شاعری کا اہم پہلو ہے بلکہ نقطۂ ارتکاز ہے۔ ان کی تمام شاعری اس کے گرد گھومتی ہے۔ ہمارے عہد کے انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس پر ظلم ہوتا ہے مگر وہ ظالم قوتوں کی شناخت نہیں کرپاتا ہے۔اس کیلئے یہ پتہ لگانا نہایت دشوار ہوگیا ہے کہ اس پر ظلم کس نے کیا ہے۔ چونکہ ظلم کے وسائل اس قدر وسیع ہوگئے ہیں کہ ان تک مظلوموں کی رسائی ناممکن ہے۔ نتیجہ میں مظلوم عدم اعتماد کا شکار ہو جاتا ہے۔ جبکہ ماضی میں ظلم کی شناخت آسان تھی کیونکہ ظلم کے وسائل محدود تھے لہٰذہ ظالم کا مقابلہ بھی (بآسانی کیا جاسکتا تھا (ص ۱۰۱

نقد و نظر کے میدان میں اترنے والے سپاہی کے اندر فہم و ادراک، گہرائی و گیرائی، زبان و بیان پر قدرت کے علاوہ خود اعتمادی و بے باکی کی فراوانی بھی لازم ہے ڈاکٹر شفیق حسین شفق کے اندر ان صفات کی موجودگی کا اظہار مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے ناقدین کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے" میرا خیال ہے کہ ناقدین کی زبان و بیان کے معاملہ میں اتنی زیادہ سخت گیری بھی مناسب نہیں ہے، زبان و بیان سے واقفیت شاعر کے لئے ضروری ہے۔اس کے بغیر شعر میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ قواعد کو نظر انداز کرنا زبان کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔لیکن قواعد کو زبان پر تھوپ دینا بھی زبان کی توسیع و اشاعت اور اس کے فروغ کی راہ میں میں روڑے اٹکانے کے برابر ہے۔ شعر گوئی کا فن بہت نازک اور لطیف فن ہے۔یہ اکثر قواعد کی جکڑبندیوں کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ شعر کہتے ہوئے شاعر پر الہامی کیفیت طاری ہوتی ہے۔وہ اپنے مخصوص وجدانی لمحات میں اکثر قواعد کی بیجا حدود و قیود کو توڑ دیتا ہے۔
(ص ۱۳۲)

ڈاکٹر شفیق حسین شفق اور ان تصنیف کے حوالے سے اپنے دل کی بات میں اسرار رحمانی کے الفاظ میں کہہ کر رخصت لیتا ہوں۔بقول رحمانی :"عرفان صدیقی : شخص اور شاعر نوجوان نقاد مرزا شفیق حسین شفق کی تنقید کا نقش اول ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایم اے کیلئے لکھا گیا یہ مقالہ اتنا جامع اور بھرپور ہے

کہ عرفان صدیقی کے شعری محاسن کو پوری طرح روشن کردیتا ہے۔ اس میں مرزا شفیق کی علمی، فکری، ادبی اور فنی صلاحتیں پوری طرح ظاہر ہورہی ہیں۔ اور ان کی یہی خوبیاں مستقبل کے اہم نقاد کی نشاندہی کررہی ہیں''۔

مستقبل کی اذان

بیسویں صدی کا مرثیہ کے خالق جناب عالم نقوی کے لہو چراغ سے پرامید مستقبل کی اذان

اخبار جسدِ کاغذ پر خبروں کے نقوش سے عالمِ وجود میں آتا ہے لیکن اس کی روح فکر و تجزیہ ہوتی ہے۔ غالب کے نقشِ فریادی کی مانند خبر اپنے کاغذی پیکر سمیت بہت جلد فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے اور اسی کے ساتھ اخباری تبصرے بھی موت کی نیند سو جاتے ہیں لیکن ہر خبر کے ساتھ مکافاتِ عمل کا سلوک یکساں نہیں ہوتا بلکہ کچھ واقعات و سانحات تاریخ کے صفحات پر انمٹ نشان چھوڑ جاتے ہیں اور ان پر لکھے جانے والے چند تجزیے بھی حیات جاودانی سے معمور ہو جاتے ہے۔ ان کی تازگی سدا بہار ہوتی ہے خزاں کا جھونکا انہیں چھو کر نہیں گزرتا اس لئے وہ نہ پرانے ہوتے ہیں اور نہ مرتے ہیں۔ وہ عالم صاحب کی کتاب مستقبل کی طرح ایک اہم تاریخی دستاویز بن جاتے ہیں۔ علامہ اقبال اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام\
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

محترم عالم نقوی چونکہ اپنے نغموں کی آبیاری خون جگر سے کرتے ہیں اس لئے وہ فصلِ گل و لالہ پابند نہیں ہوتا بلکہ سدا بہار رہتا ہے۔ تاریخ نویسی میں زمانہَ ماضی کے مختلف ادوار کا رخ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے مؤرخ کو ماضی کی قبر میں اتر کر گڑے مردے اکھاڑنے پڑتے ہیں۔ واقعات و سانحات کے چہرے پر پڑی گرداب کو صاف کر کے قرطاس و قلم کے حوالے کرنے سے قبل ان کی ضروری آرائش و زیبائش کا اہتمام بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ ایک خوشنما رخ زیبا کو قارئین کے لئے قابلِ قبول بنایا جا سکے۔ لیکن اس مرحلے میں کبھی کبھار دانستہ اور نادانستہ حقائق فسانے کا روپ دھارن کر لیتے ہیں۔ مؤرخ اپنے فکر و نظر کے مطابق واقعات کو ایسے تناظر میں پیش کرتا ہے کہ قاری کا زاویہَ نگاہ بدل جاتا ہے لیکن ایک دیانتدار صحافی کے قلم سے جستہ جستہ رقم ہونے والی تاریخ نویسی سے حفیظ میرٹھی کو یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ۔

مؤرخ ! تیری رنگ آمیزیاں تو خوب ہیں لیکن
کہیں تاریخ ہو جائے نہ افسانوں سے وابستہ

تاریخ نویسی چونکہ ماضی سے بحث کرتی ہے اس لئے اس میں کی جانے والی قیاس

آرائی بے جان ہوتی ہے مثلاً کسی مؤرخ کی رائے کہ اگر ایسا نہیں بلکہ ایسا ہوا ہوتا تو نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا اسی قبیل کی چیز ہے جیسے نریندر مودی کا بیان کہ اگر پنڈت نہرو کے بجائے سردار پٹیل ہندوستان کے وزیر اعظم ہوتے تو حالات کچھ اور ہی ہوتے۔ اس لئے کہ جو ہونا تھا سو ہو چکا اور اس پر نہ منموہن کو کوئی اختیار تھا اور نہ مودی کو ہے لیکن میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ بظاہر ان دونوں کے اختیارِ عمل میں ہے۔ اس لئے ۲۰۱۴ء کہ آئندہ قومی انتخاب ماضی کی داستاں پارینہ نہیں بلکہ مستقبل کا معمہ ہے۔ ان زندہ مسائل پر مؤرخ نہیں بلکہ مبصر یا صحافی اپنے قلم کو جنبش دیتا ہے۔ مبصر کی نگاہ ماضی پر کم اور حال پر زیادہ ہوتی ہے۔ قیاس کی خامیوں اور گمان کے عیوب سے مبرا صحافی حال کا رشتہ مستقبل سے جوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ عالم نقوی صاحب کی کتاب مستقبل کا مطالعہ اس تناظر میں کیا جانا چاہئے کہ یہ زندہ تاریخ ہے۔ عصرِ حاضر میں اس کا تعلق حال اور مستقبل سے ہے لیکن مستقبل میں یہ اس دور کی مستند تاریخ کہلائیگی۔

صحافی اور مؤرخ میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں حالاتِ زمانہ رقم کرتے ہیں لیکن ماضی کو انسان چشم بینا سے دیکھ نہیں سکتا لیکن صحافی اپنی قوت بصارت سے کام لے کر حالات حاضرہ کو قلمبند کرتا ہے۔ زورِ قلم کی دولت سے مالامال صحافی قیمتی معلومات کے ہیرے جواہرات کو زبان و بیان کی شیرینی کی لڑیوں

میں پرو کر خوبصورت ہار بنا دیتا ہے۔ یہ سب عملاً کس طرح رونما ہوتا ہے اس کے مشتاق قارئین کو مستقبل کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ عالم نقوی صاحب نے چونکہ نوکِ قلم کو خونِ جگر سے بھگو کر صفحۂ قرطاس کا سینہ چاک کیا ہے اس لئے ان کے دل کی بات سیدھے قارئین کے دل میں اترتی چلی گئی۔

اللہ رب العزت نے انسانوں کو بصارت و بصیرت کے علاوہ وجدان کی قوت سے بھی نوازہ ہے۔ کم لوگ ہیں جو ان عظیم نعمتوں سے کما حقہ استفادہ کرتے ہیں۔ ایک نامہ نگار صرف اپنی بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے جو کچھ دیکھتا ہے اسے من و عن بیان کر دیتا ہے لیکن ایک صحافی صرف کیا ہوا؟ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ کیوں ہوا؟ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور اپنی خداداد بصیرت سے مشاہدے کے پس پردہ کارفرما اسباب و عوامل کا پتہ لگا کر ان کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس طرح وہ تجزیہ عالمِ وجود میں آتا ہے جس سے قارئین کو یک گونہ سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے لیکن بہترین صحافت اس منزل سے نکل کر قیادت کی منصب پر فائز ہو جاتی ہے جہاں اخبار نویس اپنے وجدان کو کام میں لاتے ہوئے قارئین کی عملی رہنمائی کرنے لگتا ہے۔ اس سے اعلیٰ مقام پر چند گنے چنے مربی و مزکی ہوتے ہیں جو اپنے زورِ قلم سے قارئین کو ایسا صاحبِ نظر بنا دیتے ہیں کہ وہ حقیقت شناس ہو جاتا ہے اور کائنات کے اسرار و رموز از خود اس پر عیاں ہونے لگتے ہیں۔ عالم نقوی صاحب کی کتاب مستقبل اس معیارِ صحافت کا اعلیٰ

نمونہ ہے۔

ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ جب صحافت ایک مقدس خدمت ہوا کرتی تھی لیکن مادہ پرست دور نے اسے ایک صنعت میں بدل کر رکھ دیا ہے اس لئے آج کل خبریں بننے اور بکنے لگی ہیں ۔ جس طرح کسی زمانے میں غلاموں کے بازار لگا کرتے تھے فی زمانہ خبر رساں مزدوروں کے بازار سجتے ہیں فرق صرف یہ ہے اب بکنے والا اپنی قیمت خود طے کرتا ہے ۔ بھاؤ مول کرکے اپنی قیمت خود وصول کرتا ہے لیکن اس فرق کے باوجود اپنے آقا کی بندگی اسی طرح بجا لاتا ہے جیسے کہ ماضی کے غلام بجا لاتے تھے بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ فرمانبردار اور اطاعت گزار ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ خودساختہ غلامی بہرحال مسلط شدہ جبر کی بنسبت پسندیدہ شہ ہے۔ اگلے وقتوں میں غلام اپنی گردن چھڑانے کی سعی کیا کرتے تھے اور اپنی آزادی کا جشن منایا کرتے تھے لیکن آج کل غلامی کی زنجیر کو باعثِ سعادت سمجھا جاتاہے اور اس کے ٹوٹ جانے پر لوگ غمزدہ ہوجاتے ہیں ۔ اس دورِ پرفتن میں جن چیدہ چیدہ صحافیوں نے فکری و عملی آزادی کا علم بلند کر رکھا ہے ان میں ایک نمایاں نام جناب عالم نقوی کا ہے۔ ان کی تازہ ترین کتاب مستقبل کے مندرجہ ذیل شہ پارے اس دعویٰ کی دلیل ہیں :

فساد: سامراج نے زمین کو فساد سے بھر دینے کے سوا کچھ اور نہیں کیا۔ بنام ترقی جو کچھ بھی آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ ان کے پھیلائے ہوئے فساد فی الارض

کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔ فساد کیا ہے؟ راہِ حق سے روکنا فساد ہے۔ حکومت اور اختیار پا کر اللہ کے مقابلے میں خود مختاری اختیار کر لینا اور مخلوق کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچانا ہے۔ حق ظاہر ہو جانے کے بعد اس کو ماننے سے انکار کر دینا فساد ہے۔ ملک گیری کالونائزیشن) فساد ہے۔ مفتوح قوموں میں ذلیل و رذیل اخلاق پیدا کرنا فساد) ہے۔ رعایہ کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر دینا بعض کو اٹھانا اور بعض کو دبانا (یعنی ان پر ظلم کرنا) فساد ہے۔ ہر طرح کے ناروا ہتھکنڈوں سے ناجائز مقاصد پورے کرنا فساد ہے۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑنا فساد ہے۔ شتر بے مہار بن کر رہنا فساد ہے۔ ناپ تول میں کمی کرنا فساد ہے۔ دولت سمیٹنا اور اسے روک رکھنا فساد ہے۔ فواحش کا ارتکاب فساد ہے۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑنا فساد ہے۔ چاہے اس کا تعلق اخلاقیات سے ہو، معاشیات سے ہو یا سیاسیات سے۔ اور سامراجی عزائم فساد فی الارض پھیلانے یعنی دنیا کے تمام قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے اور تمام دنیا کو اپنا غلام بنانے کے سوا اور کیا (ہیں۔ (ص ۲۵

انقلاب: مغرب بھلے ہی اعتراف نہ کرے لیکن ہم جانتے ہیں کہ باب مدینہ العلم امام علیؑ نے چودہ سو سال پہلے دنیا کو بتا دیا تھا کہ من عرفہ نفسہ عرفہ ربہ، جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا یعنی جس نے اپنی خود شناسی و خود آگاہی کی اعلیٰ ترین منزل سر کر لی اس نے اپنے پروردگار کی معرفت بھی حاصل کر لی۔

یہی خودشناسی جب خوداعتمادی میں ڈھل کر خودفروزی بنتی ہے تو اسے انقلاب کہتے ہیں اور جب یہ انقلاب اصول، فطرت سے ہم آہنگ ہو تو وہ اسلامی انقلاب کہلاتا ہے (ص دینِ مبین کی قوت میں یقین پیدا ہوجانے سے مسلمانوں میں وہ خوداعتمادی آئی کہ (۳۴ (وہ جابر و قاہر وظالم حکمرانوں کے سامنے کوہِ استقامت بن گئے۔ (ص ۳۷

مسلک: ہم یہ بات پھر سے دوہراتے ہیں کہ قرآن و سنت کے سوا کوئی چیز حجت آخر نہیں۔ نہ کوئی ملک نہ کوئی مملکت نہ کوئی بادشاہت نہ کوئی شخصیت۔اتباع اور پیروی کا معیار صرف قرآن و سنت ہے اور بس۔ (ص۵۷) ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم قرآن و سنت کے خلاف کئے جانے والے کسی بھی فیصلے سے اعلانِ برأت کرتے ہیں (ص۵۸) اسلام اور جاہلیت میں تعاون نہیں ہوسکتا ہماری بقاصرف اس پر منحصر ہے کہ ہم طرف سے منہ موڑ کر من یکفر بالطاغوت ویومن باللہ کو اپنے عمل و کردار میں ڈھال لیں ص۵۹)۔ حق گوئی کیلئے سخت کوشی ، فقیری اور سادگی ضروری ہے۔ محلوں میں قیام) اور عیش و عشرت کا رہن سہن سب سے پہلے وہ صلاحیت ختم کرتا ہے جو حق گوئی وبیباکی (کیلئے ضروری ہے (ص۹۵

توکل: ایٹمی تحدید اسلحہ کی باتیں اس وقت تک بے سود ہیں جب تک کہ وہ فکر اور نظام کو جنم دیا ہے (ص ٦٣) ہم پوری شرح صدر کے ساتھ یہ WMDs موجود ہے جس نے بات

جانتے ہیں کہ شیطان کو شکست دینے کیلئے شیطانی ٹکنالوجی کا حصول ہر گز ضروری نہیں ہے۔ اس کیلئے صرف رحمٰن کا اشارہ اور اس کی مدد کافی ہے۔ اور اگر ہم مسلمان ہیں اور خلق خدا کے تعلق سے اپنی وہ ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں جو امتِ مسلمہ، خیرِ امت اور امتِ وسط کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتی ہیں تو پھر اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اور اس سے اچھا کوئی وکیل نہیں اور اس سے بڑھ کر کوئی مولیٰ ہے نہ اس سے بہتر کوئی مددگار۔ وھوالعزیزالجبار۔ (ص ۷۵)

اسباب و علل: قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تبارک و اتعالیٰ نے لے رکھا ہے لٰہذہ جب تک قرآن محفوظ ہے اسلام بھی محوظ ہے۔ اب مسلمان صرف اپنے تحفظ کی فکر کرے۔ اللہ کو کسی نافرمان قوم یا حد، اعتدال سے گزر جانے والی قوم سے کوئی ہر گز ہر گز کوئی دلچسپی نہیں (ص ۶۲) ڈیڑھ ارب مسلمان اور پچاس سے زائد مسلم ممالک متحد ہو جائیں تو اللہ کی مدد سے ہر وہ کام ممکن ہے جست مستکبرینِ مغرب اور جبارانِ صہیونیت ناممکن کہتے ہیں۔ وھن پیدا ہو جانے، قرآن کو چھوڑ دینے اور اسے مھجور بنا دینے کے باعث عالمِ اسلام سے توفیقِ اتحاد سلب کر لی گئی ہے اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس وقت کسی قوم کی حالت نہیں بدلی جاتی جب تک کہ وہ قوم اور اس کے افراد خود اپنی بدحالی سے نجات حاصل کرنے کیلئے عزمِ مصمم کے ساتھ جدوجہد شروع نہیں کر دیتے۔ اپنے نفسوں کی تبدیلی کا یہ عمل سر دست مفقود ہے۔ (ص ۹۴)

انتباہ: ہم نجومیوں کی نہیں روحانین کی باتوں پر ضرور اعتماد کرتے ہیں۔ جن کی گفتگو قرآن و حدیث کے حوالے سے ہوتی ہے اور ایسے لوگ جنہیں قرآنو حدیث کا تھوڑا سا بھی شعور ہے حتمی گفتگو سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں۔ کیونکہ حقیقی علیم و خبیر اور عالم الغیب والشہادۃ تو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ (ص۲۱۶) انصاف پر مبنی امن کا حامی دنیا کا ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ صہیونیت سے تعاون کرنا ایک ایسی سرنگ میں داخل ہونے کے مترادف ہے جس میں اپنی مرضی سے داخل تو ہوا جاسکتا ہے، اپنی مرضی سے صحیح سلامت باہر نکلا نہیں جاسکتا لیکن مشکل یہی ہے کہ جگایا تو اسے جاسکتا ہے جو سو رہا ہو! (ص۲۴۸) ابلیس کا سب سے خطرناک ہتھیار وہی ہے جو حق کے خلاف خود حق کو (کھڑا کرکے استعمال کیا جاتا ہے (ص ۱۸۴

اس کتاب کچھ مضامین ایسے ہیں کہ ان سے اقتباس نکالنا پورے مضمون کو تبصرے میں شامل کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے عنوانات کی نشاندہی کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے مثلاً: (۱) سن لو میری نوا (۲) آئینہ مستقبل (۳) گناہ کوئی کرے شرم ہم کو آتی ہے (۴) طاقت پرستی سے دانشورانہ دہشت گردی تک (۵) حق و باطل کی جنگ کا تسلسل (۶) عالم اسلام نشاۃ ثانیہ کی طرف! (۷) نہیں کچھ اور تری راہ کے سوا معلوم (۸) جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ وغیرہ

ایک زمانے میں عالم نقوی صاحب نے روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی میں دستاویز نام کا ایک کالم شروع کیا تھا لیکن چونکہ ان کے اکثر و بیشتر مضامین اس زمرے میں آتے ہیں اس لئے ممکن ہے دستاویز کالم میں شمولیت سے محروم رہنے والے مضامین کے احتجاج پر اسے بند کردیا گیا ہو۔اب یہ ہم جیسے قارئین کی خوش بختی ہے کہ ان مضامین کو کتابی دستاویز کا جامہ نصیب ہو رہا ہے۔ مستقبل ۲۰۱۳ء میں شائع ہونے والی جناب عالم نقوی کی تیسری کتاب ہے ۔ان کی پہلی کتاب لہو چراغ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد سات سالہ طویل انتظار کے بعد ۲۰۰۹ء میں ' امید ' منصۂ شہود پر آئی۔ اس کے تین سال بعد یکے بعد دیگرے تین کتابیں اذان، بیسویں صدی کا مرثیہ اور مستقبل شائع ہوگئیں تو ایسا محسوس ہوا گویا کسی پہاڑی ندی پر لگے بند کا دہانہ کھل گیا ہے اور برسوں سے جمع شدہ آبی ذخیرہ تشنہ کام صحراؤں اور میدانوں کو سیراب کرتا چلا جارہا ہے۔ ان دستاویزی کتب سے نہ صرف عصر حاضر کا قاری وقتاً فوقتاً استفادہ کرسکتا ہے بلکہ ان جھروکوں سے جب آنے والی نسلیں اپنے ماضی میں جھانک کر دیکھیں گی تو وہ انہیں اپنی تاریخ کا نہایت صاف و شفاف عکس بھی نظر آئیگا۔

اروند کیجریوال: اس پر ہی وشواس کرے ہے جس سے دھوکہ کھائے

انتخاب سے قبل عام آدمی پارٹی ایک خاص سیاسی جماعت تھی جس میں صرف آم ہی آم تھے لیکن حکومت سازی کیلئے اپنی ٹوکری میں کانگریسی امرود بھی شامل کر لینے کے بعد اب وہ ایک عام سیاسی پارٹی بن کر رہ گئی ہے۔ عام آدمی پارٹی جس کیلئے ''آپ'' کا مخفف استعمال کیا جاتا ہے کے اندر جو انقلاب برپا ہوا وہ نیا نہیں ہے بلکہ اس سے قبل کئی انقلابی تحریکوں کے ساتھ یہ عمل ہو چکا ہے۔ عام آدمی پارٹی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر تبدیلیاں غیر معمولی رفتار کے ساتھ وقوع پذیر ہوئیں۔ دو اکتوبر ۲۰۱۲ء کو دہلی کے جنتر منتر پر ایک بے نام پارٹی کا قیام عمل میں آیا ۲۹ اکتوبر کو اس کا نام رکھا گیا اور ایک سال بعد اس نے کانگریس کو اقتدار سے چھو منتر کر دیا لیکن اس کمال سے بڑا چمتکار یہ ہوا کہ جس کانگریس پارٹی کا سر کچلنے کیلئے اس نے جنم لیا تھا اسی کو حکومت سازی کی غرض سے آپ نے اپنی آستین میں پناہ دے دی۔

اروند کیجریوال نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے سے قبل عوامی رابطے کی ایک بہت بڑی نوٹنکی کھیلی جس سے ظاہر ہو گیا کہ انہوں نے عوام کو بے وقوف بنانے کے فن میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی ہے اور اب وہ کوئی عام سیاسی رہنما

نہیں رہے۔ انہوں نے اول تو عام لوگوں کے نام ایک نہایت دلچسپ خط لکھا اور پھر آخرِ ہفتہ میں خطاباتِ عام کا سلسلہ شروع کیا ہر مقام پر وہ اپنی تقریر کے اختتام پر عوام سے پوچھتے کہ کیا پارٹی کوکانگریس کی مدد سے سرکار بنانا چاہئے۔ عوام ہاتھ اٹھا کر تائید کرتے۔ اسے دیکھ کر ان کا سینہ پھول جاتا اور وہ اگلے جلسہَ عام کی جانب بڑھ جاتے ۔اس طرح ۲۸۰ جلسوں سے خطاب کرنے کے بعد انہوں نے حکومت سازی کا اعلان کردیا حالانکہ انتخابی نتائج کے فوراًبعد جب انہوں نے طنزیہ کہا تھا کہ بی جے پی اور کانگریس کو مل کر حکومت بنا لینا چاہئے اس لئے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو اسی وقت ان قریبی ساتھی منیش سودیہ نے کہہ دیا تھا کہ ہمارے سامنے سارے امکانات کھلے ہوئے ہیں ۔ اس طرح عوام و خواص کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔

بی جے پی چونکہ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی اس لئے اس کو سب سے پہلے گورنر جنرل نے حکومت سازی کی دعوت دی۔ بی جے پی نے بڑی چالاکی سے اپنی معذوری ظاہر کردی ۔ اس کے بعد عام آدمی پارٹی کو بلایا گیا۔ اس نے بھی اولتو صبر وضبط سے کام لیا لیکنبعد میں اروند کیجریوال کے اس بیان کے اندر کہ میں ذاتی طور سے حکومت سازی کے خلاف ہوں اس بات کا اعتراف تھا کہ پارٹی کے اندر اس پر اختلاف ہے۔بی جے پی کو اقتدار میں آنے سے روکنا کانگریس کی

مجبوری تھی اس لئے اس نے اپنی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر کے کیجریوال کی آزمائش میں مزید اضافہ کردیا۔ سچ تو یہ ہے کہ کانگریس کی شیلا دکشت کو شکستِ فاش سے دوچار کرنااروند کیلئے آسان تر تھا لیکن خود اپنے ہی منتخب شدہ ارکانِ اسمبلی کو قابو میں رکھنا ان کیلئے مشکل ہوگیا۔

ذرائع ابلاغ میں جب یہ پروپگنڈہ شروع ہوا کہ عام آدمی پارٹی نے اقتدار میں آنے کیلئے عوام سے ایسے وعدے کردیئے ہیں کہ جنہیں وہ پورا نہیں کرسکتی اس لئے وہ اپنی ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار کررہی ہے تو اروند کیجریوال کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں اب انہوں نے چور دروازے کی تلاش شروع کی اور سب سے پہلے دونوں سیاسی جماعتوں کو خط لکھ کر ان کے سامنے اپنی شرائط رکھیں۔ بی جے پی جس نے مسائل کی بنیادپر حمایت کا اعلان کیا تھا خط کا جواب دینے سے انکار کردیا بلکہ سوالات کے جواب میں سوالات کی بھرمار کردی۔ کانگریسیوں نے بڑی عیاری سے ایک منافقانہ جواب دے دیا۔ اس کا کہنا تھا ان اٹھارہ شرائط میں سے دو یعنی دہلی کو مکمل ریاستی درجہ یا لوک پال بل تو مرکزی حکومت کے دائرۂ کار میں آتے ہیں اس لئے ان کی حمایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا باقی کا تعلق انتظامی امور سے ہے اس میں حمایت ممکن ہے۔

سیاسی جماعتوں سے مایوس ہونے کے بعد اروند کیجریوال نے عوام کے نام مذکورہ

دلچسپ خط لکھا۔ اس خط کا مخاطب ویسے تو عوام ہیں لیکن اس کے لب ولہجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارکان اسمبلی سے خطاب فرمارہے ہیں۔ انہوں یاددہانی کے طور پر لکھا کہ ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ عام آدمی پارٹی کیوں وجود میں آئی ؟'' آپ'' کو کانگریس اور بی جے پی کے ذریعہ چلائی جانے والی بدعنوانی، جرائم اور فرقہ واریت کی سیاست کے خاتمے کی غرض سے قائم کیا گیا۔ '' آپ'' کو اقتدار حاصل کرنے کی خاطر نہیں بلکہ سیاسی منظر نامہ کو بدلنے کی خاطر بنایا گیا۔ جب ملک ان دونوں جماعتوں کی بدعنوانی سے چرمرا رہا تھا عام لوگوں نے عام آدمی پارٹی بنائی۔ ایسی صورتحال میں '' آپ''ان دونوں میں کسی بھی ایک پارٹی کی حمایت سے حکومت کیسے بنا سکتی ہے ؟ اروند کیجریوال نے ویسے تو اتمام حجت کے طور یہ بھی لکھا تھا کہ یہ تمام جماعتیں ہر جائزو ناجائز ہتھکنڈہ استعمال کرکے اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ہم عام لوگ ہیں۔ یہ پہلی بار ہورہا ہے کہ ایک پارٹی اقتدار کی خاطر نہیں بلکہ عوامی مسائل کی بنیاد پر حکومت بنانے جارہی ہے۔ یہ دعویٰ درست نہیں ہے حکومت سازی کے وقت اس طرح کا بلند بانگ دعویٰ ہر سیاسی جماعت کرتی ہے۔

کیجریوال نے بی جے پی کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے لکھا کہ بی جے پی نے خط کا جواب تک نہیں دیا جبکہ اس نے پہلے دہلی کی عوام کے فلاح و بہبود کی خاطر

حمایت کا اعلان کیا تھا لیکن اب یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ گندی سیاست کھیل رہی ہے۔اسے نہ ہی دہلی کے لوگوں کی بھلائی میں دلچسپی ہے اور نہ وہ عوامی مسائل پر حمایت کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا نزلہ کانگریس پر اتارتے ہوئے لکھا ہم اس جماعت کی حمایت سے کیوں کر حکومت بنا سکتے ہیں جس نے پورے ملک کو لوٹا ہے اور ہم حقیقی معنی میں جس کے خلاف ہیں؟ ہر کوئی جانتا ہے کہ اس نے چودھری چرن سنگھ اور چندر شیکھر کی حمایت کس طرح سے واپس لی۔اروند کیجریوال کی اس منطق نے ان کے ارکانِ اسمبلی اور رائے دہندگان دونوں میں سے کسی کو مطمئن نہیں کیا۔ان لوگوں نے عقل کے بجائے جذبات کی رو میں بہہ کر حکومت سازی کی پرزور حمایت کردی اور اروند کیجریوال کو اس کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑا۔ ان کی حالت پر فی الحال حفیظ میرٹھی کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

اس دیوانے دل کو دیکھو کیا شیوہ اپنائے ہے
اس پر ہی وشواس کرے ہے جس سے دھوکہ کھائے ہے

اروند کیجریوال کو غالباً اس کا اندازہ تھا اس لئے ان اصولی باتوں کے بعد انہوں نے پینترا بدل کر یہ بھی لکھ دیا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آئندہ قومی انتخاب کے پیش نظر کانگریس کی یہ مجبوری ہے کہ وہ ۶ ماہ تک کوئی شرارت نہ کرے اور عدم استحکام کی صورتحال پیدا نہ ہونے دے اس لئے ''آپ'' کو

حکومت بنا کر عوامی فلاح بہبود کے منصوبوں پر عملدرآمد کرنا چاہئے۔چند لوگ حکومت بنا کر عوام کو یہ دکھا دینا چاہتے ہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں ؟مگر کئی ارکان ان دونوں میں سے کسی جماعت کی حمایت نہ لینے میں یقین رکھتے ہیں۔اب ہم مخمصے میں ہیں‌اور آپ سے جاننا چاہتے ہیں کہ کیا کیا جائے ؟ دیگر جماعتوں کی مانند ہمارا فیصلہ بند دروازوں کے پیچھے نہیں ہوگا۔ خط کا یہ حصہ ظاہر کرتا ہے کہ حکومت سازی کے حامی اقلیت میں ہیں لیکن وہ اقلیت پارٹی کو بلیک میل کر رہی ہے ۔اس خط کے بعد کھیلے جانے والا ڈرامہ چغلی کھاتا ہے کہ درپردہ حکومت سازی کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اب اس پر عوام کی جانب سے مہر ثبت کرائی جارہی ہے۔ یہ دلچسپ صورتحال یہ ہے کہ نہ صرف آپ کے حامی بلکہ کانگریس اور بی جے پی بھی عام آدمی پارٹی کا کھوکھلا پن ظاہر کرنے کیلئے اس بات کے خواہشمند ہیں کہ کم ازکم ایک بار اس کی حکومت بنے اور اسے دال آٹے کا بھاؤ معلوم ہو۔

کیجریوال کے خط میں اس الزام کی تردید بھی کی گئی ہے کہ وہ ذمہ داریوں بھاگ رہے ہیں بی جے پی کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی جس نے گوا، ہماچل پردیش، چھتیس گڈھ اور اترپردیش میں حزب اختلاف کے ارکان کو توڑ کر اپنے ساتھ کرچکی ہے مگر دہلی میں ’’آپ‘‘ کی صاف شفاف سیاست سے ڈر کر وہ حکومت کا دعویٰ نہیں کرپارہی ہے اور اپنی ذمہ داری سے فرار اختیار کررہی ہے

۔ سچ تو یہ ہے اروند کیجریوال کا یہ دعویٰ سراسر بکواس ہے۔ اس لئے کہ بی جے پی کو کانگریس کی حمایت نہ حاصل ہے اور نہ ہو سکتی ہے دوسرے خوف بی جے پی کو نہیں بلکہ عام آدمی پارٹی کو ہے کہ اگر اس نے اقتدار کو سنبھالنے میں تاخیر کی تو ''آپ'' کے ۱۰ ارکان اسمبلی بی جے پی سے بیاہ رچا کر باپ بن جائیں گے۔ چونکہ ان کی تعداد ایک تہائی ہوگی وہ دل بدلی قانون کی زد میں بھی نہیں آئیں گے۔ اسی خطرے نے اروند کیجریوال کو مصلحت کے زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا ہے

ٹھٹک گئی ہے ہوس مصلحت کے پاس آکر
وفا گذر بھی گئی تخت و تاج ٹھکرا کر

انقلاب کی شاہراہ پر مصلحت پسندی سب سے بڑی رکاوٹ ہے جن لوگوں کو اروند کیجریوال سے اس بات کی توقع تھی کہ وہ خیرات کا تخت و تاج ٹھکرا آگے نکل جائیں گے وہ خاصے مایوس ہوئے ہیں۔ جمہوری سیاسی حکمت عملی کے لحاظ سے کیجریوال کی مصالحت پسندی صد فیصد درست ہے لیکن اصول و اخلاق کی میزان پر یہ سراسر غلط ہے۔ اس میں اروند کیجریوال سے زیادہ اس نظام کا قصور ہے جو اصول پسندی کے بجائے ابن الوقتی کو فروغ دیتا ہے۔ اروند کیجریوال اگر حکومت سازی نہ کرتے تو ان کے رائے دہندگان مایوسی کا شکار ہو کر دوبارہ کانگریس اور بی جے پی کی جانب نکل جاتے۔ ان کے ارکان اسمبلی دلبدل کر کمل

اور ہاتھ کے ساتھ ہو لیتے۔ غیر تربیت یافتہ رائے دہندگان اور بے صبرے ارکان جماعت کی مدد سے جلد بازی میں انقلاب لانے کی کوشش کرنے والوں کا انجام اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ کیجریوال نے سیاسی شعبدہ بازی سیکھ لی ہے۔ اب وہ کانگریس سے کشمکش برپا کرکے اسے مجبور کریں گے کہ وہ ان کی حکومت گرا دے۔

کانگریس کے حمایت واپس لے لینے کے بعد وہ مظلوم کی حیثیت سے عوام کے سامنے جائیں گے اور ان سے رحم کی گہار لگا کر پھر اقتدار میں آجائیں گے لیکن اس دوران کی زبان کا اعتبار ختم ہو چکا ہوگا۔ لوگ ان کی باتوں کو بھی اسی طرح سنیں گے جیسے دیگر سیاسی جماعتوں کی سنتے ہیں لیکن ان پر یقین کوئی نہیں کرے گا۔ عوام جب تک پوری طرح مایوس نہیں ہو جاتے اس وقت ان کو ووٹ دیتے رہیں گے اور جب بیزار ہو جائیں گے تو انہیں بھی کوڑے دان میں پھینک دیں گے ۔ اس کے بعد یا تو کیجریوال کانگریس یا بی جے پی میں باقاعدہ شامل ہو جائیں گے یا ان کے حاشیہ بردار بن جائیں گے ۔ پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے اور آگے بھی یہی ہوگا۔ ہاں وہ حسین خواب نہ ہوں گے جو ماضی میں کیجریوال خود دیکھتے اور عوام کو دکھلاتے رہے ہیں۔ مناسب معلومات ہوتا کہ ماضی کے دریچوں میں جھانک کر ان خوابوں کا نظارہ آج کرلیا جائے ورنہ کل دیر ہو چکی ہو گی۔

تقریباً دو سال قبل اتر پردیش میں انتخابات کا انعقاد ہوا۔ اس وقت نوئیڈا کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اروند کیجریوال نے عوام کو خبردار کیا تھا کہ ہمیں اتر پردیش کے انتخابات سے کسی تبدیلی کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ان انتخابات کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ سیاسی جماعتیں کامیاب ہو جائیں گی اور عوام شکست کھا جائیں گے۔ حسنِ اتفاق یہ ہے کہ دہلی کے حالیہ انتخاب پر اروند کیجریوال کا یہ جملہ ہو بہو چسپاں ہوگیا۔دہلی کی عوام نے کانگریس کو ہٹایا لیکن بالآخر کانگریس بادشاہ گر بن گئی اور اس نے اقتدار کا تاج اپنے ہاتھوں سے کیجریوال کے سر پر رکھ دیا۔ ہندوستانی تاریخ کا غالباً یہ پہلا انتخاب تھا جس میں تینوں سیاسی جماعتوں کا گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر اس امر پر اتفاق تھا کہ اقتدار کس کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے تھے اس طرح گویا ساری سیاسی جماعتیں اپنے گھناؤنے مقاصد میں کامیاب ہوگئیں اور عوام صحیح معنیٰ میں شکست کھا گئے۔

مذکورہ عوامی بیداری کے پروگرام میں اروند کیجریوال نے بڑے طمطراق کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ لوک پال بل لانے کیلئے جس جدوجہد کا آغاز کیا گیا تھا اب اسے نظام کی مکمل تبدیلی تک وسیع کردیا گیا ہے۔اس کے بعد جب جنتر منتر پر پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی تو''سوراج کا سنکلپ'' (جمہوریت کا تصور) نامی دستاویز کا اجراء کیا گیا جس میں کہا گیا تھا یہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں

بلکہ سیاسی انقلاب ہے۔ ملک میں دھرم یدھ (حق و باطل کی جنگ) کا آغاز ہوچکا ہے اور ہماری سیاست انقلاب کے عمل کو مضبوط کرے گی۔ اس نظام کو ہم اکھاڑ پھینکیں گے ۔ہمارے سیاست میں داخل ہونے کا مقصد انقلاب لانا ہے۔ خود اپنوں کے ہاتھوں مصالحت پر مجبور ہو کر کانگریس کی مدد سے حکومت بنانے والے اروند کیجریوال نے یہ ثابت کردیا کہ انقلاب لانے والے خود منقلب ہوچکے ہیں اس لئے اب وہ بیچارے حکومت تو کر سکتے ہیں لیکن انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔

اروند کیجریوال نے جنتر منتر پر اعلان کیا تھا کہ ملک میں جمہوریت نہیں ہے ۔ ہم براہِ راست عوام کی حکومت چاہتے ہیں ۔ ہمارے مطابق ہر پانچ سال میں ایک بار ہونے والا انتخاب قابلِ قبول نہیں ہے ۔ فیصلوں سے قبل عوام کی رائے لینا جمہوریت ہے۔ اروند کیجریوال یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت سازی کا فیصلہ کرنے کیلئے ہم پھر ایک بار عوام کے پاس گئے لیکن کیا وہ جمہوری طریقۂ کار تھا؟ عام آدمی پارٹی کے جلسوں میں جو لوگ آئے تھے وہ عوام کے نمائندہ نہیں تھے ۔ جن کو ''آپ'' کی حکومت سازی میں دلچسپی تھے وہ آئے بقیہ نہیں آئے۔ ہاتھ اٹھا کر لوگوں کی رائے لینا اور یہ کہہ دینا کہ ۷۵ فیصد لوگ حامی ہیں بلی کا آنکھ بند کرکے دودھ پینے جیسا ہے۔ اروند کیجریوال نے ونود کمار بنی کو جب وزارت کا قلمدان نہیں دیا تو منیش سسودیا نے اس کی وکالت کرتے ہوئے کہا یہ وزیر اعلیٰ کا اپنا اختیار ہے کہ کسے وزارت دی جائے اور کسے نہیں گویا

اہم فیصلے کیجریوال خود کریں گے اور غیر اہم کیلئے عوام کو زحمت دی جائیگی ؟ کیا یہی حقیقی جمہوریت ہے ؟

کیجریوال نے پارٹی کے قیام کے موقع پر یہ بھی کہا تھا کہ ہم ایک ایسی حکمت عملی پر کام کررہے ہیں کہ جس کے ذریعہ دہلی اسمبلی کا اقتدار سنبھالنے کے دس دنوں کے اندر اقتدار براہِ راست عوام کے پاس آجائے۔ ہم اقتدار میں آنے کے ۱۰ دنوں کے اندر جو بھی ضروری ہوگا کر گزریں گے ۔ انتخابی کامیابی کے بعد ۵ دنوں تو وہ تذبذب کا شکار رہے اور پھر دس دنوں کے اندر اپنے ازلی دشمن کو گلے لگا کر اس کے تعاون سے حکومت بنالی ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ دس دنوں میں وہ کیا کرتے ہیں؟ گمان غالب یہی ہے کہ یہ وقت ان ساتھیوں کو سمجھانے منانے میں صرف ہو جائیگا جو وزارت سے محروم رہے ہیں۔ جہاں تک دس دنوں کے اندر لوک پال بل لانے کا سوال تھا وہ سرے سے دہلی کی حکومت کے کرنے کا کام ہی نہیں تھا اور جس مرکزی حکومت کا یہ کام تھا اس نے کیجریوال کے اقتدار سنبھالنے سے قبل ہی وہ کام تمام کردیا ہے تاکہ کیجریوال اس کا کریڈٹ نہ لے سکیں۔

اروند کیجریوال نے ایک نہایت دلچسپ بات یہ کہی تھی کہ ملک میں فی الحال ہمارے سوا کوئی حزب اختلاف نہیں ہے ۔ سارے حکومت میں ہیں اب یہ ہوا کہ ان ساروں میں "آپ" بھی شامل ہو گئی ۔پارٹی کے قیام اس وقت کیوں ضروری

ہوگیا تھا اس کے بارے میں ان کی منطق یہ تھی کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں کچھ انتظار کرنا چاہئے تھا لیکن ایسے میں جبکہ ملک کو فروخت کیا جارہا ہے ہم کیونکر انتظار کرسکتے ہیں؟ کوئلہ، زمین، جنگل، پہاڑ اور چھتیس گڈھ میں تو دریا کو بھی بیچا جارہا ہے۔ اگر ہم نے تاخیر کردی تو اگلے پانچ چھے سالوں میں بھارت کا وجود مٹ جائے گا۔ آئندہ پانچ چھے سالوں میں بھارت کا کیا حشر ہوگا یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن عام آدمی پارٹی کی کیا گت بنے گی یہ سبھی جانتے ہیں۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر کمار وشواس کے بیان سے لگایا جاسکتا ہے جنھوں نے کہا تھا کہ وہ اس جماعت کی رکنیت اختیار نہیں کریں گے بلکہ غیر سیاسی رہنا پسند کریں گے تاکہ اگر کل کو یہ پارٹی بھی پٹری سے اتر جائے تو اس کی اصلاح کرنے والا کوئی موجود ہو لیکن اب کمار وشواس خود پٹری سے اتر چکے ہیں اور راہل کے خلاف انتخاب لڑنے کی تیاری کررہے ہیں۔

انا ہزارے ۲۰۱۱ء میں مشرقی دہلی کے جے پرکاش نارائن پارک میں بھوک ہڑتال کرنا چاہتے تھے کانگریس نے پہلے تو انہیں گرفتار کرکے تہاڑ جیل کی سیر کرائی۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس کا خوب چرچا کروایا اور پھر رہا کرکے رام لیلا میدان پہ لے آئے جہاں ہزارے کی گرفتاری کے دوران تمام تیاریاں مکمل کرلی گئیں القومی انتخاب سے قبل لوک پال بل پاس کرکے ان سے شکریہ بھی وصول کرلیا۔ اروند کیجریوال نے جنتر منتر سے اپنا انقلابی سفر شروع کیا کانگریس

ان کی بھی حلف برداری اسی رام لیلا میدان میں کروا کر کیجری وال کے پیروں میں احسان کی بیڑی ڈال دی۔ انتخابی سیاست ہندوستان میں نظریاتی و انقلابی تحریکوں کا قبرستان رہی ہے اوراس شمسان گھاٹ میں جدید ترین اضافہ عام آدمی پارٹی ہے۔ وہ انقلابی تحریک جو الہامی ہدایت سے عاری ہو۔ جس کے پاس نمونے کے طور پر خاتم الانبیاء کا اسوۂ حسنہ نہ ہو اور جو آخرت کی جوابدہی کے تصور سے محروم ہو وہ برضاو رغبت جمہوریت کے جھانسے آجاتی ہے مگر جو اسلامی تحریک سپرڈالنے سے انکار کردے ملحدانہ سفاک نظام سر کاٹ کراسے زندہ دفن کرنے سعی کرتا ہے۔ بنگلہ دیش اور مصر میں فی الحال یہی ہورہا ہے۔

انتخابی سیاست کے تالاب میں اترنے سے قبل کیجریوال نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''سوراج'' تھا۔ اس کتاب کے سرورق پر انا ہزارے کا ایک فقرہ درج ہے '' یہ کتاب نظام کی تبدیلی اور بدعنوانی کے خلاف ہماری تحریک کا منشور ہے اور ملک میں اصلی ''سوراج'' (یعنی جمہوریت) لانے کا موثر نمونہ بھی ہے ''۔ اس مختصر سے جملے میں گویا ایک سمندر سمایا ہوا ہے۔ سب سے پہلی اور اہم ترین بات نظام کی تبدیلی ہے اور دوسری بات اسے کسی پارٹی کا نہیں بلکہ ایک تحریک کا منشور قرار دیا گیا ہے۔ اب اروند کیجریوال سوراج کے اس سبق کو بھول چکے ہیں نیز تحریک سے نکل کر ایک سیاسی جماعت چلارہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ وہ جس نظام کو تبدیل کرنے کے دعویدار تھے اب اس کانہ

صرف کل پرزہ بلکہ محافظ بن گئے ہیں۔اس فقرے میں اصلی جمہوریت کو لانے کا ذکر اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ فی زمانہ ہمارے ملک میں موجود نہیں ہے۔ کیجریوال کی حقیقی جمہوریت کا نمونہ لوک راج نامی ویب سائٹ پر موجود ہے لیکن اسی کے ساتھ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس ویب سائٹ پر ۲۰۱۰ء کے بعد کسی سرگرمی کی رپورٹ موجود نہیں ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تین سال قبل اس کام کا آغاز کرنے کے بعد اسے معطل کردیا گیا ہے اور ان تین سالوں میں جو کچھ ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اروند کیجریوال جو کبھی ایک انقلاب کے نقیب تھے اب دہلی کے وزیر اعلیٰ بن گئے ہیں۔ وطنِ عزیز میں رائج سیاسی نظام کی یہ یقیناً بہت بڑی کامیابی ہے۔

اے نئے سال بتا تجھ میں نیا پن کیا ہے؟

فیض احمد فیض ویسے تو رجائیت پسند شاعر تھے مگر نہ جانے کیوں قنوطیت کا شکار ہو کر انہوں یہ کہا "اے نئے سال بتا تجھ میں نیا پن کیا ہے"۔ لیکن ۲۰۱۳ء جاتے جاتے یہ پیغام دے رہا ہے کہ "قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت" اور عالمِ گیتی پر ایک نیا دور دستک دے رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی یہ ایک روایت ہے کہ ہر عیسوی سال کے آخر میں گذرے ہوئے سال کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا جاتا ہے اور آنے والے سال سے متعلق قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں ۔ اس سال کے سارے اہم واقعات کے بجائے صرف ماہِ دسمبر میں رونما ہونے والے چند واقعات کا اگر گہرائی سے مطالعہ کر لیا جائے تو مطلع اپنے آپ صاف و شفاف ہو جاتا ہے۔ ایک واقعہ چین میں وقوع پذیر ہوا جس کا سورج ۲۰۱۴ء کی مانند طلوع ہونے کیلئے انگڑائیاں لے رہا ہے اور دوسرا امریکہ میں گھڑا جس کا سورج غروب ہونے سے قبل لڑیاں رگڑ رہا ہے۔ ایک اور ایسا معاملہ بھی اس دوران اخبارات کی زینت بنا جو دونوں کے درمیان مشترک ہے ۔ اس کے علاوہ ایک سانحہ چین کے ہمسایہ اور امریکہ کے ہمنوا ہندوستان کے ساتھ پیش آیا اور دوسرا سوڈان میں ۔

سب سے پہلے سنٹا کلاز امریکہ کا ذکر ہو جائے جہاں اس سال کے ابتداء میں براک

اوباما نے بڑے تزک واحتشام سے دوبارہ صدارت کا حلف لیا لیکن جولائی کے آتے امریکی تاریخ کا غیر معمولی واقعہ رونما ہوگیا۔ امریکہ کا ایک صنعتی شہر ڈیٹرائیٹ جو ساری دنیا میں امریکی گاڑیاں بنا کر برآمد کرنے کیلئے مشہور تھا اچانک قلاش ہوگیا۔ امریکہ میں کسی شہر کی میونسپلٹی کا ۱۸ تا ۲۰ بلین ڈالر خسارہ دکھلا کر دیوالیہ ہوجانے کا یہ اولین واقعہ تھا۔ اس کے تین ماہ بعد امریکی پارلیمان کے اندر حزب اقتدار اور اختلاف کی لڑائی آئندہ سال کے بجٹ کی توثیق میں آڑے آگئی اور یکم تا ۱۶ اکتوبر سارے حکومتی ادارے تعطل اور غیر یقینی کا شکار ہوگئے۔ اس طرح گویا ریپبلکن پارٹی نے صدر براک اوباما کو ساری دنیا کے سامنے رسوا کیا اور خود اپنی عوام کو شدید مصائب سے دوچار کیا۔

صدر براک اوباما ۱۴ دسمبر کو گذشتہ سال اسی دن رونما ہونے والے ایک الم ناک حادثے کا سوگ منانے کی خاطر کنکٹی کٹ کے نیوٹاؤن میں سینڈی ہک ابتدائی اسکول پہونچے جہاں آدم نامی وحشی حملہ آور نے خودکشی سے قبل ۲۰ بچوں سمیت ۲۶ افراد کو ہلاک کردیا تھا۔ مہلوکین میں اس کی اپنی ماں بھی شامل تھی۔ اس موقع پر ہلاک شدگان کی یاد میں موم بتی جلانے کے بعد اوباما نے کہا ہم نے اپنے ملک وقوم کو محفوظ تر بنانے کیلئے ضروری اقدامات نہیں کئے۔ ہمیں خطرناک لوگوں کو اس قدر آسانی سے بندوق حاصل کرنے سے روکنے کیلئے بہت کچھ

کرتا ہے۔ مگرمچھ کے آنسو بہانے والے اوبامہ پر اب حامد کرزئی تک اعتبار نہیں کرتا۔ کرزئی کو فی الحال طالبان کو اوبامہ سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتا ہے۔

ایک سال قبل براک اوبامہ نے اسی مقام ایک نہایت جذباتی تقریر کی تھی جس کے دوران وہ دو مرتبہ روپڑے تھے اور قوم سے وعدہ کیا تھا کہ اس طرح کا قتل عام روکنے کیلئے وہ بامعنی اقدامات کریں گے لیکن سال بھر میں ان کو اور نائب صدر جو بیڈن کو اسلحہ ساز سرمایہ داروں نے اپنے اشارے پر رقص کرنے والے سیاستدانوں کی مدد سے پوری طرح مفلوج کردیا۔ اوبامہ کے صدر بننے کے بعد چار سالوں میں گولی باری کے چار بڑے واقعات ہوئے جن میں سے ایک میں ممبر پارلیمان (کانگریس) بھی ہلاک ہوئیں لیکن قتل و غارتگری کا بازار بدستور گرم رہا۔ بندوقوں کی خرید وفروخت بلا روک ٹوک زور و شور سے جاری رہی۔ یہاں تک کہ اس سال بھی مذکورہ تقریب سے ایک روز قبل کولاریڈو میں ایک ۱۸ سالہ طالب علم نے اپنے ساتھ پڑھنے والی دوطالبات کو بری طرح زخمی کرنے کے بعد خودکشی کرلی ۔ ستمبر میں نیوی ہیڈ کوارٹر میں ۱۲ لوگ ہلاک کردیئے گئے۔

اوبامہ نے ایک سال قبل کہا تھا ہمارے بامعنی اقدام میں سیاست آڑے نہیں آئیگی لیکن چونکہ سیاست کی بنیاد ہی سرمایہ داری پر ہے وہ سرمایہ داروں سے

بغاوت کرنے کی جرأت نہ کرسکے۔ اس وقت جبکہ ۸۰ فیصد رائے عامہ اسلحہ پر پابندی کے حق میں تھی نیویارک کے میئر مائیکل بلومبرگ نے کہا تھا صدر اوبامہ نے بجا طور پسماندگان کو دلی تعزیت پیش کی ہے لیکن ملک ان سے تعزیری قوانین کی توقع کرتا ہے ۔ بامعنی نہیں بلکہ فوری اقدام ضروری ہے۔ ہم اس طرح کے جذباتی بیان بہت سن چکے ہیں لیکن افسوس کہ ہمیں پارلیمان کے ایوانوں میں قیادت کا فقدان نظر آتا ہے جس کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ بلومبرگ نے کہا ہمارے التواء اور کوتاہی کے سبب ہر روز اوسطاً ملک بھر میں ۳۴ بے قصور لوگ بندوق کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ نیویارک کے گورنر انڈریو کومو نے سارے معاشرے کو متحد ہوکر اسلحہ سازوں پر ہلہ بول دینے کا نعرہ لگایا تھالیکن اسلفاظی کے باوجود قانون میں سختی کے بجائے نرمی آئی اور سمتھ ویسن نامی بندوق بنانے والی کمپنی کی فروخت میں ۴۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔

قانون وضع کرنے کی اپنی بنیادی ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام و نامراد ہونے کے بعد حکومت نے انتظامی اصلاحات کی جانب نہایت مضحکہ خیز انداز میں پیش قدمی کی۔ اول تو بندوق کی فروخت کو روکنے کا معاملہ تھا پھر نفسیاتی مریضوں تک اسلحہ کی رسائی کو روکنے پر مصالحت ہوئی اور گفت و شنید نیز معلومات کا تبادلہ شروع ہوا۔ جس کے نتیجہ میں اساتذہ اور سماجی کارکنان کو یہ ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کیا گیا کہ وہ دماغی امراض کے شکار نوجوانوں

کی شناخت کریں اور ان کا علاج کروائیں۔ اس کام کیلئے وہائٹ ہاؤس نے ۱۳۰ ملین ڈالر کا بجٹ مانگا لیکن پھر سیاست نے رخنہ ڈال دیا اور کانگریس نے اس کی توثیق سے بھی انکار کردیا۔ اس کام کیلئے ۵۰ ملین صحت و خدمت خلق کے محکمہ اور ۵۰ ملین زراعت کے شعبے سے حاصل کئے گئے۔ ان حقائق سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ساری دنیا میں قتل و غارتگری مچانے والے امریکی حکمراں خود اپنے شہریوں کے تحفظ کے تئیں بھی کس قدر سفاک ولاپرواہ ہیں۔

جس وقت براک اوبامہ کنکٹی کٹ کے سینڈی ہُک اسکول کے اندر آنسو بہا رہے تھے چین کے اندر خلائی گاڑی کے چاند پر اترنے کی خوشی کا جشن منایا جارہا تھا۔ امریکہ اور روس کے بعد چین دنیا کا تیسرا ملک ہے جس کی خلائی گاڑی ''یوتو'' چاند پر کامیابی سے اتاری گئ ہے۔ اس خلائی گاڑی کا نام چین میں انٹرنیٹ پر ایک عوامی سروے کے بعد رکھا گیا تھا اور ۳۴ لاکھ چینی شہریوں کی غالب اکثریت نے چینی لوک کہانی کے چاند پر بسنے والے کردار خرگوش کے نام پر خلائی گاڑی کا نام رکھنے کا مشورہ دیا۔ ۳۷ برس بعد چاند پر اترنے والا ''یوتو'' ماضی کی خلائی گاڑیوں کے مقابلے جدید تر آلات سے لیس ہے۔

دس سال قبل ۲۰۰۳ء میں چین نے پہلی بار ایک خلاباز کو خلا میں بھیجا اور اس طرح امریکہ اور روس کے بعد وہ تیسرا ملک بن گیا جس نے بغیر کسی اور ملک کی

شراکت کے انسانوں کو کامیابی کے ساتھ خلائی سفر پر بھیجا تھا۔اس کے بعد وہ چاند کی جانب بڑھا اور ۲۰۰۷ء میں اس نے ایک خودکار خلائی جہاز چاند کے مدار میں بھیجا جس کو ۱۶ ماہ تک چاند کی گردش کرانے کے بعد چاند پر گرا دیا گیا۔اس سال جون میں تین چینی خلابازوں نے پندرہ دن زمین کے گرد مدار میں گزارے اور اپنے خلائی جہاز کو ایک تجرباتی خلائی تجربہ گاہ سے منسلک کر دیا۔واپس آنے سے قبل خلاباز وانگ یاپنگ نے خلاء سے زمین پر موجود طلبا سے خطاب کیا اور نائی ہائشنگ نے خلا میں سب زیادہ وقت گزارنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔چینی سائنسدانوں کے مطابق اس مشن کا مقصد جدید ٹیکنالوجی کی آزمائش، نئی سائنسی معلومات اور علمی مہارت حاصل کرنا ہے۔یہ مشن ایسی معدنیات کو بھی تلاش کرے گی جسے بعد میں کسی وقت نکالا جاسکے۔انسانی تاریخ میں پہلی بار خلائی جہاز 'یوتو' کے چاند پر اترنے کو چین کے سرکاری ٹیلی ویژن نے براہ راست نشر کرکے خلائی پروگرام میں امریکہ اور روس کی برتری کا خاتمہ کر دیا ہے۔

امریکہ و چین کے انفرادی واقعات کے بعد اب ان دونوں ممالک کا ایک مشترکہ واقعہ بھی دیکھ لیا جائے جو اتفاق سے اسی ماہِ دسمبر میں منظر عام پر آیا۔مشرقی چین کے ایک جزیرے کو لے کر جو جاپان کے قبضے میں ہے مشرق بعید کے حالات یسے ہی کشیدہ چل رہے تھے۔اس لئے کہ چین کی حکومت نے اس پر ہونے والی

آمدورفت کی تفصیل طلب کرکے بیک وقت جاپان، جنوبی کوریا اور امریکہ کو ناراض کردیا تھا۔ اس واقعہ نے دوسری جنگ عظیم کے دو دشمن امریکہ اور جاپان کو ایک دوسرے کا ہمنوا بنا دیا ہے۔ چین کی دشمنی میں امریکہ نے ۷۲ سال قبل پرل ہاربر کے مقام پر اپنے بحری بیڑے پر ہونے والے جاپانی حملے کو بھلا دیا ہے جس میں دو ہزار امریکی ہلاک اور ایک ہزار زخمی ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ جاپان بھی ہیروشیما اور ناگاساکی کی ایٹمی بمباری کو بھول گیا جس میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ لوگ امریکی دہشت گردی کا شکار ہوئے تھے۔

اس سال ۵ دسمبر کو پیش آنے والے واقعہ نے جاپانی اور امریکی اتحاد پر چین کی بحری برتری ثابت کردی۔ ہوا یہ کہ امریکی فوجی بیڑے کا سب سے بڑا دستہ کوپینس فلپائن میں امداد کے بہانے چین کے ہوائی جہاز بردار سمندری بیڑے لیاؤننگ کی نگرانی کررہا تھا۔ اس دوران ایک اور چینی جہاز نہایت خطرناک انداز میں کوپینس کی جانب بڑھا اور گھبرا کر امریکی بیڑے کو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جس وقت یہ محاذ آرائی ہوئی دونوں جہازوں کے درمیان کا فاصلہ صرف ۱۸۰ میٹر رہ گیا تھا۔ اگر امریکی بیڑہ فوراً پیچھے نہ ہٹتا تو نہایت خطرناک تصادم ہو سکتا تھا۔

امریکی ترجمان نے یہ پوچھے جانے پر کہ کیا چینی جہاز کی نیت جارحانہ تھی

اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم چین کے کے ساتھ مستحکم فوجی تعلقات بحال کرنے کے متمنی ہیں لیکن ایک اور افسر نے اعتراف کیا کہ وہ خاص طور پر جارحانہ انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ رینم یونیورسٹی میں بین الاقوامی امور کے ماہر پروفیسر جنکا ژونگ کے مطابق مستقبل کے اندر اس طرح کے تصادم اضافہ ہوگا اس لئے کہ جنوبی چین کے سمندر میں امریکی بیڑہ موجود ہے اور چین وہاں پر اپنی برتری قائم کرنے کوشش میں لگا ہوا ہے۔ جنکا کے مطابق دونوں ممالک کے رہنما تصادم نہیں چاہتے مگر اس کے باوجود محاذ پر موجود نوجوان فوجیوں کو قابو میں رکھنا مشکل ہے۔ حکومتِ چین نے اس واقعہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی۔

حکومتِ ہند کیلئے ان واقعات میں عبرت کا سامان ہے۔ امریکہ بہادر نے دیویانی کھوبرا گڑے کے معاملے میں تو اپنی منہ زوری دکھلاتے ہوئے نہ صرف معافی مانگنے سے بلکہ مقدمہ تک واپس لینے سے صاف انکار کردیا۔ دیویانی کو گرفتار ہونے سے بچانے کی خاطر انہیں اقوام متحدہ کے دفتر منتقل کیا گیا ہے تاکہ وہ سفارتی تحفظ سے بہرہ ور ہو جائیں لیکن جس دن ان کا تقرر ختم ہوگا اپنے آپ مذکورہ تحفظ بھی ختم ہو جائیگا اور امریکہ ہیں دیویانی کے خلاف وارنٹ نافذالعمل ہو جائیگا۔ اپنے نئے تقرر کے سبب اگر دیویانی جیل جانے سے بچ بھی جائیں تب بھی وہ تاحیات امریکہ کے مطلوبہ ملزمین کی فہرست

میں شامل رہیں گی۔

اس صورت میں جس طرح ان کی ملازمہ سنگیتا ہندوستان میں مفرور مجرم ہے ویسی ہی حالت دیویانی کی امریکہ میں ہوجائیگی لیکن ان دونوں خواتین کا حال پھر بھی یکساں نہیں ہے۔ امریکہ سنگیتا کے شوہر اور بچوں کو اپنے یہاں لے جاچکا ہے اور بہت ممکن ہے کہ سنگیتا کو بغض معاویہ میں نہ صرف سیاسی پناہ بلکہ شہریت سے نواز دیا جائے لیکن دیویانی کا شوہر ڈاکٹر آکاش راٹھور تو امریکی شہری ہے اس کا کیا ہوگا ؟ اگر دیویانی کسی طرح امریکہ سے نکل آتی ہیں تو دوبارہ لوٹ کر نہ جاسکیں گی ایسے میں آکاش کو یا تو اپنی بیوی سے دور ہونا پڑے گا یا اپنے وطن عزیز امریکہ کو خیرباد کرنا ہوگا۔ڈاکٹر آکاش جو ماہر شرابیات ہیں ان دونوں میں سے کس کا انتخاب کریں گے یہ جاننے کیلئے کسی غیب دان کی ضرورت نہیں ہے ؟ اس طرح گویا اپنی ملازمہ کے سبب دیویانی کی ازدواجی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

ہندوستان کی اس بے بسی میں ان تمام ممالک کیلئے عبرت کا سامان ہے جو امریکہ کو اپنا دوست سمجھتے ہیں یا اس سے دوستی کے خواہاں ہیں۔ اگر اس طرح کے واقعات کی یہ توجیہ پیش کی جائے کہ امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اس کا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا تو اس کی غلط فہمی کو دور کرنے والی خبر خانہ جنگی کا شکار جنوبی سوڈان سے آگئی ۔ جنوبی سوڈان میں صدر سلوا کیر کو نائب

صدر ریک مچھار نے معزول کر کے اپنے گھر میں نظر بند کر دیا ہے اور تیل پیدا کرنے والے علاقوں پر اپنے قبیلے کی مدد سے قابض ہو گیا ہے۔ اس دوران اپنے شہریوں کو نکالنے کے بہانے امریکہ نے معزول صدر کو رسد پہنچانے کی کوشش کی لیکن امریکی فوجی ہیلی کاپٹر پر باغیوں نے فائرنگ کر دی اور وہ گھبرا کر پڑوسی ملک یوگنڈا بھاگ کھڑا ہوا۔ اس طرح امریکی دخل اندازی ناکام بنا دیا گیا۔

امریکہ نے اپنی ہزیمت کی پردہ پوشی کیلیے دھمکی دی کہ اس طرح بزور قوت اقتدار پر قبضے کی کوشش برداشت نہیں کی جائیگی لیکن اسے جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے مچھار نے اپنے قبیلے کے ۲۵ ہزار جنگجو نوجوانوں کو دارالخلافہ میں داخل ہونے کا حکم دے دیا ۔اس طرح امریکہ سمیت سارا مغرب باغی نائب صدر کے سامنے بے بس و لاچار ہو گیا اور اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ چین اور سوڈان نے اپنی دلیری سے یہ ثابت کر دیا کہ امریکہ طاقت کی بولی سمجھتا ہے اور اس کے آگے سر جھکاتا ہے لیکن جو لوگ اس کا احترام کرنے کی غلطی کرتے ہیں ان کو اپنے قدموں تلے روندتا چلا جاتا ہے۔ان واقعات کی حیثیت مرغ باد نما کی سی ہے جو آئندہ سال کے سیاسی باد و باراں کا رخ ظاہر کرتا ہے اور اشارہ دیتا ہے۔

جہانِ نو ہو رہا پیدا عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

ادبی سفر نامہ: اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو

”جناب والا! ۲۰۱۳ میں اپنی زبان وادب کے حوالے سے کوئی بات کوئی واقعہ کوئی کتاب کوئی افسانہ کوئی نظم یا غزل یا کچھ اور جو آپ کے ذہن میں رہ گیا ہو اُسے ہمارے ادبی صفحے کے لئے لکھنے کی زحمت کریں۔۰۰۰۰۰۰ اُمید ہے کہ توجہ فرمائیں گے۔
۰۰۰۰۰۰۰۰ ندیم صدیقی۔“

یکم جنوری کو موصول ہونے والے درج بالا عنایت نامہ نے اچانک احساس دلایا کہ ہمارے کشکولِ حیات سے ایک اور سال کم ہو چکا ہے۔ اس خط نے پھر ایک بار ۲۰۱۳ء کے دریچہ میں جھانک کر دیکھنے پر مجبور کر دیا لیکن ایسا کرنے پر نہایت خوشگوار یادوں کے بے شمار لعل و گہر ہاتھ لگے ۔ایسے ساتھیوں سے بلا قصد ملاقات جن سے بچھڑے عرصہَ دراز گزر چکا تھا اور ملنے کے امکانات مفقود ہو چکے تھے ۔ ایسے لوگ کہ جن کی تحریر و تقریر کے سبب ملنے کا اشتیاق تو تھا مگر ملاقات کی نہ کوئی سبیل تھی اور نہ توقع۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں سے ملنے کا شرف کہ جن کو نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ جن کے بارے میں سنا تھا۔ مگر جب وہ ملے تو یادوں کے روشن چراغ بن گئے اور جب ان سے جدا ہوئے تو بے ساختہ زبان پر بشیر بدر کا یہ شعر ۲۰۱۳ء کی سوغات بن کر آگیا۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

سال گزشتہ کی ابتداء کچھ اس طرح ہوئی کہ مشہور محقق و شاعر اور ادارہ ادب اسلامی کے صدر ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی نیز سابق صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی ڈاکٹر حسن رضا کی دہلی سے دبئ میں آمد ہوئی اور پھر اس قافلے میں برطانیہ سے بزرگ شاعر و دانشور ڈاکٹر مختارالدین احمد بھی شامل ہو گئے۔ ان حضرات سے دبئ اور العین کے مشاعروں میں استفادہ کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ابوظبی کے مذاکرہ بعنوان ''قرآن مجید کے ادبی محاسن'' میں انہوں نے اپنے پر مغز مقالے بھی پیش کئے۔ اس کے بعد منعقد ہونے والے مشاعرے میں مقامی شعرائے کرام کے علاوہ پاکستان سے آنے والے شفیق سلیمی اور شاہ زمان کوثر نے بھی اپنا کلام سنایا۔ مؤخرالذکر دونوں حضرات عرصۂ دراز تک امارات میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد اپنے وطن لوٹ چکے ہیں۔ سلیمی صاحب کی دو کتابیں تمازت اور تپش شائع ہو چکی ہیں۔

اس ادبی سفر کے بعد شکاگو (امریکہ) سے اسلامی مفکر ڈاکٹر عرفان احمد صاحب دبئ تشریف لائے۔ آپ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتے تھے اس کے بعد شکاگو کی الیونس یونیورسٹی میں یہ سلسلہ جاری رہا اور سبکدوش ہونے کے بعد وہیں مقیم ہیں۔ قرآن فہمی کے حوالے سے ۸۲ سالہ عرفان صاحب کا جوش و

ولولہ قابلِ رشک ہے۔ امریکہ سے دبئی ۱۴ گھنٹوں کی فلائیٹ سے وہ رات ۹ بجے ابوظبی پہنچے ایک بجے رات تک محوِ گفتگو رہے اور صبح ۸ بجے دبئی چلنے کیلئے تیار تھے۔ علوم القرآن کے ماہر ڈاکٹر عرفان نے ویسے تو کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن انگریزی زبان ان کی ضخیم تفسیر (سورہ بقرہ) قرآن کا عکس ایک معرکتہ آراء تصنیف ہے۔اس سفر کے دوران پاکستان سے معروف مفکرِ قرآن جناب جاوید احمد غامدی بھی دبئی آپہنچے۔ غامدی صاحب اپنی ویب سائٹ المواردا اور پاکستان ٹی وی چینل جیو کے پروگراموں کے سبب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ قرآن مجید سے متعلق مختلف عنواین پر ان مشاہیر دین کی گفت و شنید میں ہم جیسے طالب علموں کیلئے سیکھنے کا بڑا سامان تھا۔

اس کے بعد قطر کے اندر بزمِ اردو قطر اور حلقہ ادب اسلامی قطر کے زیر اہتمام ہونے والے دو الگ الگ تقریبات میں شرکت کا موقع ملا جہاں نظم و نثر دونوں کا اہتمام تھا۔ قطر میں مقامی ادباء و شعراء مثلاً افتخار راغب، محمد رفیق شاد اکولوی، عتیق انظر، جلیل نظامی، محمد ممتاز راشد کے علاوہ سعودی عرب سے تشریف لانے والے، طاہر بلال، ابو نبیل مسیح دکنی اور امارات کے عامر اعظمی کے کلام سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ ان میں چند تو ایسے تھے جن سے ملاقات تھی لیکن اکثر پہلی بار ملے تھے۔ قطر کی ریتیلی زمین پر اردو کی آبیاری کے ضمن میں ان حضرات کی کوششوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اس

کے بعد برطانیہ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں پر اس سال بو کر ایوارڈ کیلئے نامزد کردہ اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب انتظار حسینا ور بی بی سی کے مشہور براڈ کاسٹر رضا علی عابدی کی ملاقات نے سفر کو یادگار بنا دیا۔

کالج کے زمانے سے میں انتظار حسین کی کہانیوں کا مداح ہوں لیکن ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ سنا تھا کہ کسی زمانے میں وہ ممبئ آئے تھے اور سریندر پرکاش کے مہمان تھے لیکن مجھے اس کی اطلاع نہیں مل سکی تھی اور میں محروم رہا تھا۔لندن قیام کے دوران جب پتہ چلا کہ برطانیہ کے لیڈس شہر میں انتظار حسین صاحب کے اعزاز میں ایک عصرانہ کا انعقاد ہو رہا ہے تو ۳۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ نہایت مختصر ہو گیا۔ پہلی مرتبہ اپنے چہیتے قلم کار کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون حاصل ہوا۔ان کے ساتھ کراچی سے مشہور افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر آصف فرخی بھی تشریف لائے تھے۔ اس تقریب کے ہفتہ بعد یارک شائر ادبی فورم کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ میں شرکت کا موقع ملا جس میں رضا علی عابدی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بی بی سی کی وہ جانی پہچانی آواز جو برسوں ہمارے کانوں میں رس گھولتی تھی ہم سے محو گفتگو تھی۔ یہ اک خواب تھا جو حقیقت بن گیا تھا۔ رضا علی عابدی اپنے مشہور و معروف سفر ناموں کے علاوہ افسانوں کے مجموعے، بچوں کی کہانیاں اور تنقید و تبصرے کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور روزنامہ جنگ میں ہفتہ وار کالم

لکھتے ہیں۔

یارک شائر ادبی فورم برطانیہ کا ایک نہایت فعال ادبی ادارہ ہے جس کے سرپرست اور روح رواں ڈاکٹر مختار الدین احمد ہیں ۔ ان تقریبات میں ادارے کے مختلف فعال ارکان و فنکاران مثلاً اشتیاق میر، ڈاکٹر اعظم امروہوی، پروفیسر تسنیم تبسم، جاوید اقبال ستار مدیر چندہ)، پروفیسر باصر کاظمی اور محترمہ غزل انصاری و دیگر خواتین و حضرات کی سعی) پیہم کو دیکھ کر یقین ہوگیا کہ اگر اردو برطانیہ کی سنگ لاخ زمین پر پھل پھول سکتی ہے تو ہندوپاک کی سرسبز و شاداب فضا میں مٹ نہیں سکتی ۔ اس مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ڈاکٹر فاطمہ حسن پاکستان سے تشریف لائی تھیں۔ فاطمہ حسن کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ، مضامین کی ایک تصنیف اور اور شاعری کی تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نیو پورٹس انسٹی ٹیوٹ میں ذرائع ابلاغ کی تعلیم وتدریس سے منسلک ہیں۔ان کا کلام سننے کے بعد احساس ہوا کہ مرد اچھی شاعری توضرور کر سکتے ہیں لیکن ویسی شاعری نہیں کر سکتے جیسی کہ فاطمہ حسن اوران جیسی دیگر خواتین شاعرات کرتی ہیں۔ منفرد آہنگ کے شاعرڈاکٹر عاصم واسطی سے ابوظبی میں ملاقات رہتی ہے لیکن برطانیہ میں وہ کچھ اور ہی نظر آئے شاید اس لئے کہ برطانیہ ان کا وطنِ ثانی ہے۔

برصغیر کا مسلمان برطانیہ جائے اور اسلامک فاؤنڈیشن (لیسٹر) نہ جائے یہ بہت مشکل ہے۔ پروفیسر خورشید احمد اور خرم جاہ مراد کا لگایا ہوا یہ پودا اب برگ و بار لانے لگا۔ اس کا وسیع و عریض کیمپس۔ شاندار لائبریری اور اس میں موجود مارک فیلڈ انسٹی ٹیوٹ نامی تحقیقی ادارہ اپنی نرالی شان کا حامل ہے۔ اس ادارے میں تیس سال بعد ڈاکٹر عطاء اللہ صدیقی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بین المذاہب تعلقات کے ماہر ڈاکٹر صدیقی نے ویسے تو تحقیق کے کئی اہم کام کئے لیکن یوروپ میں مقیم مسلمانوں کے مسائل سے متعلق انہیں ایک پروجکٹ برطانوی حکومت کی جانب سے تفویض کیا گیا اور ان کی رپورٹ پر پارلیمان کے اندر بحث ہوئی۔ اب یہ کتاب کی شکل میں شائع ہو چکی ہے اور حکومت کے علاوہ دیگر محققین کیلئے بھی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے علاوہ مارک فیلڈ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر زاہد پرویز سے بھی ملاقات ہوئی جو اتفاق سے یوکے اسلامک مشن کے سربراہ بھی ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد پاکستان سے نیروبی ہجرت کرکے چلے گئے تھے اور اس طرح ڈاکٹر صاحب کینیا سے برطانیہ میں آن بسے۔ ایک مقامی یونیورسٹی کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر ڈاکٹر زاہد اس نئی ذمہ داری کو سنبھالا ہے تاکہ اسلام اور مسلمانوں کی بہتر خدمت کی جائے۔

اس سال ممبئی آتے ہوئے دہلی جانے کا اتفاق ہوا جہاں نو منتخب صدر ادارہ ادب اسلامی ڈاکٹر حسن رضا صاحب میزبان تھے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر تابش مہدی، جناب

حسنین سائر اور جناب عبدالغفار صاحبان کی نئی پر جوش ٹیم کو دیکھ کر حوصلہ بندھا۔ امید ہے ان لوگوں کی سعی و پیہم سے پیش رفت ترقی کی نئی بلندیوں کو سر کرے گا۔ شرطِ وفا کے خالق جناب انتظار نعیم میرے پرانے کرم فرما ہیں ۔اس بار ان کے ساتھ بہت تفصیلی ملاقات رہی اور ادب کے حوالے سے ان کے طویل تجربات و مشاہدات سے استفادہ کا موقع ملا ۔ڈاکٹر احمد علی برقی کا کلام انٹرنیٹ پر پڑھا تھا لیکن جب ملاقات ہوئی تو ان کو کمال کا زود گو شاعر پایا ان کیلئے بقول خود نثر کے بجائے شعر میں بات کرنا سہل تر ہے ۔ڈاکٹر صاحب کی نئی کتاب روح سخن بھی نظر نواز ہوئی آپ آل انڈیا ریڈیو پر فارسی شعبہ کے سربراہ ہیں اور اردو کے علاوہ فارسی زبان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔

سابق صدرِ شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی ڈاکٹر معین الدین جیناٖبڑے فی الحال جواہر لال یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں صدر شعبہ ہیں ۔ان سے بھی ایک طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی ۔ڈاکٹر صاحب کے افسانوی مجموعہ تعبیر کا پاکستانی ایڈیشن دیکھ کر خوشی ہوئی ۔ان کے خوبصورت افسانوں کی مانند کتاب کا سرورق بھی نہایت دیدہ زیب ہے ۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی تنقید و تحقیق کی دو کتابیں جلد ہی منصۂ شہود پر آنے والی ہیں۔ دہلی قیام کے دوران ڈاکٹر شفیق حسین شفق کی کتاب عرفان صدیقی شخص و شاعر کی تلاش

میں جب میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس پہنچا تو یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ اردو کی ادبی کتابیں نہیں بکتی نہیں مفت میں تقسیم ہوتی ہیں اور یہ انکشاف ہوا کہ اگر اس مکتبہ کے مالک جناب مجتبیٰ خان صاحب جیسی متحرک شخصیت کسی ادارے کی سربراہ ہو تو نہ صرف کتابیں شائع ہوتی ہیں بلکہ دھڑلے سے فروخت بھی ہوتی ہیں۔ ای پی ایچ کے وسیع و عریض دفتر میں اردو کتابوں کا ایسا انبار ہے کہ چلنے کی جگہ نہیں۔ سابق مسٹر انڈیا مجتبیٰ خاں صاحب نے بتلایا کہ وہ جلد ہی کوچہ پنڈت سے نکل کسی کشادہ تر مقام پر منتقل ہونے والے ہیں۔

ممبئی میرا اپنا شہر ہے لیکن غریب الوطنی کے طفیل وہاں بھی مسافر کی طرح جانا ہوتا ہے ۔ اس بار ممبئی قیام کے دوران دہلی اردو بک ریویو کے نائب مدیر جناب ارشد سراج الدین کی تشریف آوری ہوئی اور ان کے ساتھ اپنے ایک قدیم بزرگ ڈاکٹر محمود الحسن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ عرصۂ دراز کے بعد ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو ویسا ہی تیز و تند پایا جیسے کہ وہ کئی سال قبل تھے۔ ان کی تازہ تصنف ادبیاتِ محمود جسے اس سال مہاراشٹر ساہتیہ اکادمی نے تحقیق و تنقید کے باب میں انعام سے بھی نوازہ ہے نظر نواز ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ عالم ہے کہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ ارشد صاحب کو جناب اسلم غازی صاحب سے ملنے کا بھی اشتیاق تھا۔ ارشد صاحب کی طرح اسلم صاحب بھی میرے چالیس سال پرانے دوست ہیں ۔ ہم تینوں نے بہت ہی

یادگار لمحات ساتھ گزارے اور مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو کی۔

شاذو نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ ممبئی قیام کے دوران اپنے بزرگ وکرم فرما انور قمر سے ملاقات نہ ہوتی ہو۔ان سے ملنے پر ادب کے حوالے سے معلومات میں کوئی نہ کوئی اہم اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ جریدہ تکمیل نے ان کے منتخب افسانوں پر جو خصوصی شمارہ نکالا ہے اسے بھی دیکھنے کا موقع ملا۔اس میں شامل کیے جانے والے ہر افسانے پر جناب مظہر سلیم نے ایک تنقیدی مضمون شائع کرکے اسے یادگار بنا دیا ہے۔انقلاب کے کالم نگار جناب شفیق احمد صدیقی بھی اس موقع پر موجود تھے ۔اس کے علاوہ روزنامہ صحافت کے م ناگ صاحب سے بھی ادب کے حوالے تفصیلی گفتگو کا موقع ملا اور وطن سے دوری کے سبب ادبی سرگرمیوں سے جو فاصلہ بن گیا تھا وہ کسی قدر کم ہوا۔

ممبئی قیام کے دوران اس بار اپنے پسندیدہ اخبار اردو ٹائمز کے دفتر جانے کا بھی موقع ملا جہاں مدیرِ محترم جناب عبدالرحمٰن صاحب کے علاوہ ندیم صدیقی، شکیل انصاری اور وصیل خان صاحبان سے ایک عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی اور پرانے تعلقات استوار کرنے کی سعادت ملی ۔اسی طرح کا معاملہ روزنامہ ہندوستان کے دفتر میں بھی ہوا جہاں عزیز دوست اور سدا بہار جناب سرفراز آرزو سے ملاقات ہوئی ۔ان سے مل کر ہمیشہ کی طرح جی خوش ہوا۔ مادرِ علمی

ممبئی یونیورسٹی کی ایک یادگار تقریب میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر صاحب علی کا نیاز حاصل ہوا۔ نہایت سادہ و متین شخصیت کے حامل ڈاکٹر صاحب سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ان کے ہمراہ اردو چینل کے قمر صدیقی، تحریر نو کے ظہیر انصاری، نیا ورق کے شاداب رشید،اردو ٹائمز کے ابھرتے ہوئے کالم نگار شہاب اعظم اور نوجوان مبصر احرار اعظمی سے بھی ملاقات ہوئی۔اسی نوجوان نسل سے اردو کا روشن مستقبل وابستہ ہے۔

امارات واپس آنے کے بعد ابوظبی میں جناب ظہورالاسلام جاوید ۔کے زیراہتمام ایک عالمی مشاعرے میں ندا فاضلی کو سننے کا موقع ملا اس تقریب میں ہندوپاک کے علاوہ امریکہ اور دیگر عرب ممالک کے شعراء بھی شریک تھے۔اس کے علاوہ پاکستان ایسوسی ایشن دبئی کے زیراہتمام مشہور شاعرامجد اسلام امجد اور پروفیسر انور مسعود کے اعزاز میں ایک محفل سجائی گئ جس میں سامعین نے خوب دل کھول کر ان دونوں سے استفادہ کیا امجد اسلام امجد کی نظمیں اور غزلیں نیز انور مسعود کے مزاحیہ و سنجیدہ کلام کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ۳۳ سال بعد مربی و محسن ڈاکٹر احمد اللہ صدیقی کے ساتھ دبئ میں ملاقات نے اس سال کو یادگار بنادیا۔آپ ویسٹرن الینوس یونیورسٹی امریکہ میں انگریزی اور ذرائع ابلاغ کے ڈائرکٹر ہیں ۔ امریکی معاشرے میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ اور دعوت اسلامی کی ترویج واشاعت کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب

ذرائع ابلاغ کی مدد سے جو بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں انہیں دیکھ کر رشک آتا ہے۔

سال کا اختتام اس طرح ہوا کہ امارات میں کراچی سے معروف بزرگ شاعر اعجاز رحمانی صاحب تشریف لائے۔ آپ کی ۱۶ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں کلیات غزل ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ منظوم سیرت کی کتاب بھی ۸۰۰ صفحات کی ہے۔ ۷۸ سالہ رحمانی صاحب مخصوص لب ولہجہ کی شاعر ہیں آپ کو اپنے اور دیگر اساتذہ مثلاً غالب، ذوق، انیس، قمر جلالوی وغیرہ کے سیکڑوں اشعار یاد ہیں۔ اعجاز رحمانی صاحب کی موجودگی میں دبئی کے اندر دو اور العین و ابوظبی میں ایک ایک مشاعرہ ہوا۔ اعجاز رحمانی صاحب کے دستِ مبارک سے جناب افتخار راغب کی تیسری کتاب غزل درخت اور انور آفاقی کی کتاب لمسوں کی خوشبو کا اجراء بھی عمل میں آیا اور اس طرح سال ۲۰۱۳ اپنے یادوں کی خوشبو بکھیر کر روانہ ہوگیا۔

منڈیلا اور شیرون: یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

موت وزیست کے درمیان ۸ سالوں تک لٹکا رہنے کے بعد بالآخر ایریئل شیرون نے ۱۱ جنوری کو دم توڑ دیا۔ اسرائیل کے ناجائز قیام کے بعد جب نوجوان شیرون کی ملاقات اولین وزیراعظم بین گورین سے ہوئی تو اس نے کہا تھا ''ایریئل ! ضرورت نہیں ہے کہ تم زیادہ پڑھو تم لوگوں کے قتل عام کے لیے مفید ہو ہمیں پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ قاتلوں کی ضرورت ہے'' ایریئل شیرون نے اپنی سفاکی و درندگی سے ثابت کردیا کہ اسرائیلی وزیراعظم نے اس کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ وابستہ کی جانے والی توقعات درست تھیں ۔ گورین کی امیدوں پر پورا اترتے ہوئے شیرون نے ۱۹۶۵ء میں جنرل اوزی مرحام سے کہا تھا ''میں اس چیز کے بارے میں جسے لوگ ''بین الاقوامی قوانین'' کہتے ہیں کچھ نہیں جانتا میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فلسطین کا جو بچہ پیدا ہو اسے زندہ جلادو۔ فلسطین کی عورتیں اور بچے ان کے مردوں سے زیادہ خطرناک ہیں اس لیے کہ فلسطین کا ایک بچہ یعنی فلسطینوں کی نسل کا دوام''۔ ملعون شیرون کی نسل کشی سے بچ نکلنے والے بچوں نے اس کی موت پر خوشی منائی اور اس کے جنازے کی جانب راکٹ چھوڑے جو آئرن ڈوم میزائیل شکن نظام کو توڑ کر ۴ کلومیٹر کے فاصلے پر گرے۔

اس کے برعکس گزشتہ ماہ ۵ دسمبر کو جوہانسبرگ میں نیلسن منڈیلا کا انتقال ہوا تھا۔ دنیا بھر سے ۵۰ ممالک کے سربراہ نیلسن منڈیلا کی آخری رسومات میں شرکت کیلئے آئے تھے جن اوبامہ کے علاوہ امریکہ دو سابق صدور بھی شامل تھے۔ نیلسن منڈیلا کو ملنے والے اس غیر معمولی خراج عقیدت کے پیچھے عالم انسانیت کیلئے ان کی بے لوث جدوجہد کا رفرما ہے۔ ۱۸ جولائی ۱۹۱۸ء کو جنوبی افریقہ کے علاقے ترانسکی میں کوسا زبان بولنے والے تھیمبو قبیلے میں پیدا ہونے اس بچے کا قبائلی نام رولیہلا ہلا تھا۔ اس کے اسکول کے استاد نے اس کا انگریزی نام 'نیلسن' رکھا مگر جنوبی افریقہ کے باشندے احترام سے انہیں خاندانی نام 'مادیبا' کہہ کر پکارتے تھے۔

نیلسن کی زندگی بڑے نشیب وفراز میں گزری۔ قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں منڈیلا نے افریقی نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کرکے نسل پرستی کے خلاف اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس وقتجنوبی افریقہ پر ہالینڈ نژاد سفید فام بوئیر سامراج کی ساڑھے تین سو سالہ حکومت قائم تھی۔ نوآبادیاتی نظام کے تحت سیاہ فام اکثریت کے ملک میں، سفید فام اقلیت کی حکمرانی تھی اور سیاہ فام عوام پر مظالم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے۔ انسانی بنیادی حقوق سے وہ یکسر محروم تھے۔ ۱۹۴۸ء میں جنوبی افریقہ کے اندر جمہوریت بحال ہو گئی لیکن انتخاب کے ذریعہ اقلیتی سفید فاموں کی نیشنل پارٹی

برسر

اقتدار آ گئی اور سرکاری طور پر نسل پرستانہ نظام کی بنیاد رکھ دی۔ منڈیلا سمت ۱۵۵ کارکنوں پر اس دھاندلی کے خلاف الم بغاوت بلند کرنے کے جرم میں ۱۹۵۶ء کے اندر غداری کا مقدمہ چار سال چلا اور اس کے بعد یہ الزامات خارج کر دیے گئے لیکن اس دوران نیلسن کی والدہ کا انتقال ہوا اور ان کا بڑا بیٹا کار حادثے میں ہلاک ہو گیا مگر انہیں آخری رسومات میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی۔

۱۹۶۳ء میں شارپ ویل کے مقام پر ۶۷ افریقیوں کے قتل کرنے کے بعد، نسل پرست حکومت نے ملک میں ایمرجنسی کے نافذ کر دی اور افریقی نیشنل کانگریس پر پابندی لگا دی۔ اس کے جواب میں پر امن طریقۂ کار کو خیر باد کہہ کر اے این سی نے مسلح جدوجہد شروع کر دی اور منڈیلا کو جنھوں نے الجزائر اور اتھیوپیا میں فوجی ٹریننگ حاصل کی تھی افریقی نیشنل کانگریس کی فوجی شاخ " نیزۂ ملت " کا قائد بنایا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں منڈیلا دوسری بار گرفتار ہوئے اور اس بار انہیں عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ پریٹوریا کی حکمراں نسل پرست حکومت کو عالمی سیاسی دباؤ کے تحت ۱۹۹۰ء میں نیلسن منڈیلا کو رہائی پر رضا مند ہونا پڑا۔

اس کے بعد مذاکرات کا آغاز ہوا دو سالہ گفت و شنید کے نتیجے میں سیاہ فاموں کے حق رائے دہی کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا اس طرح نیلسن منڈیلا ۱۰ مئی

کو جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر منتخب ہوئے۔ نیلسن منڈیلا کو جس چیز نے ۱۹۹۴ء
میدانِ سیاست میں جاوداں بنا دیا ہے، وہ عوام میں زبردست مقبولیت کے باوجود ۱۹۹۹ء
یں اپنے عہد کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرکے اقتدار
نوجوان نسل کے حوالے کردینے کا جرأتمندانہ اقدام تھا۔ ۲۰۰۴ء تک وہ مختلف سماجی
سرگرمیوں میں مصروفِ عمل رہے لیکن اس کے بعد عوامی زندگی کو خیرباد کہہ کر اپنے
اہل خانہ اور دوست واحباب تک محدود ہوگئے۔ اس کے باوجد ان کی مقبولیت کا یہ عالم
تھا کہ ۲۰۰۹ء کے انتخابات میں جب حکمراں پارٹی بے روزگاری، غربت اور بدعنوانی کے
سبب مشکلات سے دوچار تھی اور اس کے نامزد امیدوار جیکب زوما کی کامیابی کی امید کم
تھی منڈیلا کی حمایت سے زوما کیلئے اقتدار کا راستہ ہموار کردیا۔ ۱۹۹۳ء میں منڈیلا
کو امن کے نوبل انعام سے نوازہ گیا۔ منڈیلا اپنی موت کے بعد بھی جنوبی افریقہ میں سیاہ
فام و سفید فام اور ریڈ انڈین مہاجرین کے درمیان قومی آشتی اور پرامن بقائے باہمی
کیلئے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

نیلسن منڈیلا کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے دنیا بھر کے ۸۰ سے زیادہ سربراہانِ مملکت
حاضر ہوئے لیکن اسرائیل نے اس عظیم افریقی ہیرو کی آخری رسومات میں شرکت سے
اپنے وزیر اعظم کو خرچ کا بہانہ بنا کر روک دیا جبکہ نیتن یاہو نے نیلسن منڈیلا کی آخری
رسومات میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا۔ بعد

اراں جنوبی افریقہ کے سفری اور حفاظتی اخراجات کا تخمینہ بیس لاکھ ڈالر لگانے کے بعد نیتن یاہو کو منع کر دیا گیا۔ نتن یاہو کس قدر کفایت شعار اس کا اندازہ لگانے یہ جان لینا کافی ہے کہ پچھلے دنوں وزیر اعظم کے گھر میں بنے سوئمنگ پول میں صرف پانی بھرنے پر ۲۳۰۰۰ ڈالر خرچ کئے گئے تھے نیز پچھلے سال ان کے تین گھروں کے اخراجات دس لاکھ ڈالر کے قریب تھے ۔ اصل بات یہ ہے ایئریل شیرون جیسے سفاک لوگوں کے نقش قدم پر چلنے والا یاہو ایک حریت پسند اور نسلی امتیاز کی مخالف عالمی شخصیت کی آخری رسومات میں کیا منہ لے کر جاتا اس لیے اخراجات کو جواز بنا کر دورہ منسوخ کیا گیا۔

نیلسن منڈیلا کے برعکس ایئریل شیرون کا معاملہ ہے ۔ ۱۹۲۸ء میں جرمن پولش باپ اور روسی ماں کے یہاں جنم لینے والے اس جنگی مجرم کو صابرہ وشتیلا کے قصائی کے خطاب سے نوازہ گیا۔ قیامِ اسرائیل کے وقت ایریل شیرون الیگزینڈریا بریگیڈ میں پلاٹون کمانڈر کے طور پر کام کرتا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں اسے میجر بنا کر اسرائیلی اسپیشل فورسز کے یونٹ ۱۰۱ میں تعینات کر دیا گیا۔ اس یونٹ نے نہ صرف فلسطینیوں کے خلاف زبردست اور بے رحمانہ کارروائیاں کیں بلکہ پڑوسی ممالک مثلاً مصر اور اردن کے خلاف بھی جارحیت میں حصہ لیا۔ اس یونٹ کی سب سے زیادہ شر انگیز اور ظالمانہ کارروائی میں مغربی کنارے کے گاؤں قبیہ میں بسنے والے ۶۰ غیر مسلح فلسطینیوں کا قتل عام بھی شامل ہے۔ ۱۹۵۶ء کی سوئز جنگ کے

دوران اور بعد میں اس کے کئی ساتھیوں نے اس پر دشمن کے خلاف جنونی کارروائی کرنے کا الزام عائد کیا۔ متلا پوسٹ کا واقعہ جس میں ۴۰ یہودی فوجی ایریل شیرون کی حماقت سے ہلاک ہوئے اس کے باوجود ۱۹۶۲ء میں اسے چیف آف اسٹاف آئزک رابن نے میجر جنرل بنادیا۔

فوجی وردی اتارنے کے بعد ایریل شیرون نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور مختلف سیاسی جماعتوں میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم آئزک رابن کا سیکورٹی مشیر بن گیا۔ اس کے بعد ترقی کرتے ہوئے ۱۹۷۷ء میں وزیر زراعت اور ۱۹۸۱ء وزیر دفاع کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ ۱۹۸۲ء میں جب ایریل شیرون وزیر دفاع تھا تو اسکے ایماء پر صابرہ اور شتیلا کے فلسطینی مہاجر کیمپوں پر شب خون مارا گیا۔ صابرہ میں ۴۶۰ اور شتیلا میں تقریباً ۳۵۰۰ فلسطینی مہاجرین کو جن میں اکثریت خواتین اور بچوں کی تھی شیرون کی براہِ راست نگرانی میں لبنانی عیسائی ملیشیا نے شہید کردیا۔

صابرہ اور شتیلا کیمپوں میں قتل عام کی تحقیقات کرنے سے والے "کاہان" کمیشن نے اپنی تحقیقات کے اختتام پر طور پر وزیر دفاع ایریل شیرون کو برطرف کرنے کی سفارش کی۔ کمیشن کی رپورٹ میں درج تھا ''ہم نے یہی محسوس کیا کہ اس قتل عام کی ذمہ داری براہ راست اور ذاتی طور پر ایریل شیرون پر عائد ہوتی ہے۔ اس

سلسلے میں اسرائیلی وزیر اعظم کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ کابینہ کے اجلاس میں اس معاملہ کو اٹھائیں اور ایریل شیرون کو ان کے عہدے سے ہٹادیں'' اس واضح الزام کے بعد شیرون کو وزیر دفاع عہدے سے تو ہٹادیا گیا مگر اگلے دو سال وہ بغیر کسی قلمدان وزیر بنا عیش کرتا رہا اور اس کے بعد ۶ سالوں وزیر صنعت و تجارت اور ۲سال وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات کے طور پر اقتدار سے چپکا رہا۔ شیرون کے جارحانہ مظالم کا اسرائیلی عوام نے یہ انعام دیا کہ ۲۰۰۱ء کے انتخاب میں اسے کامیابی سے نواز کر اسرائیل کا وزیر اعظم بنا دیا۔ حالانکہ بیلجیم کے سپریم کورٹ میں صابرہ اور شتیلا کیمپوں پر حملے میں شیرون کے کردار کو ثابت کیا جاچکا تھا اور عدالت اسے جنگی جرائم کا ذمہ دار قرار دے چکی تھی ۔لندن کے میئر یونگ اسٹون نے اسے ویزا دینے سے انکار کردیا تھا۔ فرانس کے سابق صدر ژاک شیراک نے بھی شیرون کو مشورہ دیا کہ وہ جنگی جرائم کے الزامات کا سامنا کرے لیکن بھلا ہو جمہوریت کی دیوی کا جس نے اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔۔

ائیریل شیرون نے مارچ ۲۰۰۶ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر اچانک اپنے سخت گیر رویہ میں زبردست تبدیلی کرڈالی اور غزہ پٹی سے ۸ ہزار یہودیوں کو نکال کر یکطرفہ فوجی انخلا کا اعلان کردیا۔ اس طرح غزہ میں ۳۸ برس پرانے اسرائیلی تسلط کا خاتمہ ہوگیا۔ ائیریل شیرون کے اس لچکدار رویہ سے

پارٹی میں اختلافات ہوگئے۔ ایسے میں ایک اور پینترہ بازی دکھلاتے ہوئے اس نے سخت گیر لیکوڈ سے علیحدگی اختیار کرکے اعتدال پسند کادیمہ پارٹی بناڈالی اور پھر ایک بار وزیراعظم بننے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا ۴ جنوری ۲۰۰۶ء کو جبکہ شیرون کی سیاسی زندگی عروج پر تھی اس پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ کومہ میں چلا گیا جس سے بظاہر اس کی نوزائیدہ پارٹی کا اسقاطِ حمل ہوگیا۔ اس وقت تقریباً تمام ہی سیاسی مبصرین کا اس پر اتفاق تھا کہ اب کادیمہ اقتدار میں نہیں آسکتی لیکن سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ شیرون کے بجائے اس کا نائب یہود اولمرٹ انتخابات جیت کر لیبر پارٹی سے الحاق کرکے وزیراعظم بن گیا۔

یہود اولمرٹ نے ۲۰۱۱ء انتخاب جیتنے کی خاطر غزہ پر بمباری شروع کردی مگر وہ حربہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ اولمرٹ اسی نتن یاہو کے ہاتھوں رسوا کن شکست سے دوچار ہوا جسے ہرا کر شیرون وزیر اعظم بنا تھا۔ گردشِ زمانہ نے اپنے محور کا ایک چکر مکمل کرلیا لیکن اس سیاسی اتھل پتھل کے دوران بے حس و حرکت شیرون زندہ لاش بنا پڑا رہا۔ اسرائیلی حکومت ہر سال اس کے علاج پر ۴۴۰ ملین ڈالر خرچ کرتی رہی بالآخر ۸ سالوں تک نشانِ عبرت بنے رہنے کے بعد ایک اور فرعونِ وقت واصلِ جہنم ہوا۔ ایریل شیرون کی آخری رسومات میں شریک ہونے کیلئے امریکہ کے نائب صدر جو بائیڈن، جرمن وزیر خارجہ فرانک والٹر شٹائن مائر

اور برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلئیر کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر رہنما نہیں آیا۔ اس کے لئے بھیجے جانے والے چند تعزیتی پیغامات میں مغرب کے حکمرانوں نے صرف اور صرف غزہ سے فوجی انخلاء کا ذکر کیا اس لئے کہ اس کے علاوہ ساری زندگی اس نے خون خرابے کے علاوہ کیا ہی کیا تھا؟

سال قبل جب ایریل شیرون کومہ میں گیا تھا تو اس وقت فلسطینی وزیر اعظم احمد قریع ۸ نے اپنے ایک خط میں اسرائیلی حکام سے کہا تھا کہ اسرائیلی عوام شیرون کو تا دیر یاد رکھیں گے کیونکہ وہ ایک فیصلہ ساز شخصیت کا حامل تھا۔ فلسطینی مذاکرات کار صائب ارکات نے کہا تھا شیرون کی موت سے فلسطین کے ساتھ اسرائیلی مذکراتکے ضابطے اور نکات سب ہی تبدیل ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسرائیلی سیاست میں سب کچھ تہہ و بالا ہو جائے گا۔ لیکن بعد میں غزہ کے اندر حماس کے اقتدار میں آجانے سے الفتح کو بھی اپنا لب و لہجہ بدلنا پڑا۔ شیرون کی موت کے بعد ایک معمر فلسطینی اہلکار نے شیرون کو 'مجرم' قرار دیتے ہوئے ۲۰۰۴ء میں سابق فلسطینی رہنما یاسر عرفات کی پراسرار موت کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد کی۔ فلسطین کی فتح پارٹی کے ایک سینئر رکن جبریل رجوب کے بقول وہ شیرون کو بین الاقوامی فوجداری عدالت میں پیش ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ دریں اثناء غزہ پٹی سے حماس نے شیرون کے انتقال کو ایک تاریخی موقع قرار دیتے ہوئے کہا کہ سابق اسرائیلی وزیر اعظم کے ہاتھ

فلسطینیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

نیلسن منڈیلا اور ائیریل شیرون دونوں فوجی تربیت سے آراستہ سیاسی رہنما تھے۔ دونوں کو اقتدار حاصل ہوا لیکن چونکہ ان کے مقاصد، اہداف اور طریقۂ کار میں زمین آسمان کا فرق تھا اس لئے ایک کے حصے میں نیک نامی آئی اور دوسرا بدنامی کے گھڑے میں جاگرا۔ ایک نے خود بھی چین وسکون کی زندگی گزاری اور دوسروں کیلئے امن وآشتی کا پیغامبر بنا رہا اور دوسرے نے ظلم وطغیان کا راستہ اختیار کیا اس لئے خود بھی خوف ودہشت کا شکار رہا اور دوسروں کو بھی اپنی بربریت وسفاکی کا نشانہ بناتا رہا۔ان دونوں کی زندگی میں اقتدار سے وابستہ لوگوں میں عبرت کا پیغام ہے ان پر حکیم الامت علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل شعر صادق آتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ذرائع ابلاغ: کبھی راویانِ خبر زدہ پسِ واقعہ بھی تو دیکھئے

اس میں شک نہیں لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اور لوہا لکڑے کو بھی کاٹتا ہے مگر لکڑا لوہے کو نہیں کاٹ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سال کے دوسرے نصف میں نریندر مودی نے ذرائع ابلاغ میں راہل گاندھی کو مولی گاجر کی مانند کاٹنا شروع کردیااور یہ سلسلہ پانچ ریاستوں کے اندر ہونے والے انتخابات تک چلتا رہا۔ اگر دہلی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو ۳۱ کے بجائے ۳۶ نشستیں مل جاتیں اور ڈاکٹر ہرش وردھن وزیر اعلیٰ بن جاتے تو ممکن ہے وہ آگے بھی جاری و ساری رہتا لیکن ہوا یہ کہ بی جے پی سب سے زیادہ ووٹ اور نشستوں پر کامیابی حاصل کرنے کے باوجود اکثریت سے محروم رہ گئی۔ عام آدمی پارٹی کے جھاڑو نے اس کا صفایا کردیااوربی جے پی کو سیاست کے بازار میں ایسا بکاؤ مال بھی میسر نہیں آیا جس کو خرید کر وہ اپنی حکومت بنا پاتی۔ اسی کے ساتھ عامآدمیپارٹیکیکامیابینے ذرائع ابلاغ کو ایک متبادل سے نواز دیا اور اروند کیجریوال نام کی آندھی ایسی اٹھی کہ اس نے نریندر مودی کو میڈیا کے گلیارے سے خس و خاشاک کی مانند اڑا کر باہر پھینک دیا۔

اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ تین ریاستوں میں اپنی زبردست کامیابی کو بڑھا

چڑھا کر بیان کرنے بجائے کے خود نریندر مودی ان انتخابی نتائج سے حواس باختہ ہو کر دہلی سے منہ چھپا کر نکل بھاگا اوراس کے بعد میڈیا نے اس سے اپنی طوطا چشمی نگاہیں پھرلیں۔ وقت کے ساتھ نہ صرف مودی بلکہ اس کے آقا آر ایس ایس کو بھی اس تبدیلی کا احساس ہو چکا ہے اور ان لوگوں نے دوبارہ اپنے قدم جمانے کیلئے ہاتھ پیر مارنے شروع کردیئے ہیں۔ گوا میں نریندر مودی کی حالیہ تقریر اس کی جھنجلا بیان کررہی تھی ۔ اس نے کہا ٹیلی ویژن پر نظرآنے سے انتخابات نہیں جیتے جاتے لیکن بیچارہ مودی بھول گیا کہ کل تک وہ خود بھی اسی راستے سے انتخاب جیتنے کی کوشش کررہا تھا اب چونکہ انگور چھن گئے ہیں تو اس لئے کھٹے لگنے لگے ہیں۔ مودی نے اپنے آپ کو ٹی وی پر لانے کیلئے ابھی حال میں سلمان خان کو اپنے ساتھ پتنگ بازی دعوت دی تاکہ اس کے طفیل ٹیلی ویژن پر نظرآسکے۔ مودی کی ایسی محتاجی توزیر اعظم کا امیدوار بننے سے قبل بھینہیں تھی۔

گوا کے اندر مودی نے یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس ڈاکٹر پریکر جیسا پڑھا لکھا آدمی موجود ہے اگر دہلی میں ہوتا تو لوگ اسے جانتے۔ مودی کو اپنے چائے بیچنے پر فخر جتانے فرصت ملے تب تو وہ اپنے آپ کو کیجریوال کی طرح پڑھا لکھا ثابت کرے۔ مودی نے سابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا وہ اس قدر سادگی ہیں کہ ان کا اپنا گھرنہیں ہے لیکن اپنی شاہانہ زندگی

کے پیش نظر وہ خود مثال نہیں پیش کر سکا۔ کیجریوال کے خلاف آخری بات اس نے یہ کہی کہ ہمارے پاس تجربہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بی جے پی سے زیادہ سیاسی تجربہ کانگریس کے پاس ہے اس لئے اگر اسی بنیاد پر ووٹ دینا ہے تو کانگریس اس کی زیادہ مستحق ہے۔ مودی کا اس طرح صفائی پیش کرنا غمازی کرتا ہے کہ اروند کیجریوال کی سیاسی افق پر بنودار ہونے سے وہ اقدامی پوزیشن کے بجائے دفاعی حالت میں آگیا ہے۔ بی جے پی کے کارکنان کا حال یہ ہے کہ وہ مایوسی کے عالم میں کبھی عام آدمی پارٹی کے دفتر میں گھس کر توڑ پھوڑ مچاتے ہیں تو کبھی بے بنیاد الزامات لگاتے ہیں۔ مودی سے لے کر جیٹلی تک سارے بی جے پی رہنما ہذیانی کیفیت کا شکار ہیں لیکن یہ بیچارے عقل کے مارے نہیں سوچتے کہ بقول شاعر ؎

یہ دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے وہ جو آگ تھی ہو کہاں کی تھی
کبھی راویانِ خبر زدہ پسِ واقعہ بھی تو دیکھتے

ذرائع ابلاغ میں فی الحال ٹیلی ویژن کا ڈنکا بجتا ہے اور اس پر مختلف طرح کے چینل پائے جاتے ہیں جن میں سے کچھ سائنسی معلومات کے یا مذہبی چینلس ہیں جن پر لوگ تفریح کیلئے نہیں جاتے۔ اس کے علاوہ ڈراموں کے چینلس ہیں جن کے گھسے پٹے موضوعات سے لوگ اس قدر بیزار ہیں کہ اب وہی لوگ اُدھر کا رخ کرتے ہیں جو منشیات کی مانند ان کے عادی ہو چکے ہیں۔ صاف ستھری تفریح کے طالب فلموں

اور موسیقی کے چینلس سے بھی دور رہتے ہیں اس لئے ان پر دن رات عریانیت و فحاشی کا طوفانِ بدتمیزی برپا رہتا ہے۔ اب لے دے کر خبروں کے چینلس بچ جاتے ہیں اس لئے عوام کی بہت بڑی تعداد تفریح کی خاطر خبریں دیکھتی ہے۔ ویسے بھی ہندوستانی سیاست کی نوٹنکی کے آگے سارے ناٹک پانی بھرتے ہیں ۔ یہاں پر اینگری ینگ مین سے لے کر کامیڈین تک سارے جمع ہو جاتے ہیں ۔ ناظرین کے جمِ غفیر اسی لئے ان کی کشش محسوس کرتا ہے۔ خبروں کے چینلس پر دکھلائے جانے والے اشتہارات سے ان کی مقبولیت اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

تفریحی عنصر نے ہیجان انگیزی کو خبروں کے چینلس کی ایک بہت بڑی ضرورت بنا دیا ہے۔ اگر کوئی چینل خبر کو مرچ مصالحہ لگا کر پیش نہ کرے تو ناظرین کو مزہ نہیں آتا اور ان کے ہاتھوں میں پڑا ہوا ریموٹ کنٹرول حرکت میں آجاتا ہے جس کی مدد سے وہ دوسری دوکان پر چلے جاتے ہیں۔ ناظرین بھی بہت جلد کسی ایک خبر یا چہرے سے اوب جاتے ہیں اس لئے انہیں اپنی جانب متوجہ رکھنے کیلئے نت نئے چہروں کو خوب سجا سنوار کرلایا جاتا ہے اس کے باوجود چہروں کو بدلتے رہنا ذرائع ابلاغ کی مستقل مجبوری ہے ۔ میڈیا پر اس دباؤ کا اندازہ کھلاڑیوں کے ساتھ اس کے رویہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ جب تک کوئی کرکٹ کھلاڑی رنوں کا ڈھیر یا وکٹوں کا انبار لگاتا رہتا ہے اس کی تصاویر اور تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن جیسے ہی بلّہ رکتا ہے یا گیند تھمتی ہے میڈیا اس کو بھول کر اس کھلاڑی

کی جانب نکل جاتا ہے جس کا بلّہ چل رہا ہوتا ہے۔
فلمی ہستیوں کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے جب تک کسی اداکار کی فلمیں چلتی ہیں تو اس کے متعلق دنیا بھر کی افواہیں تک ذرائع ابلاغ کی زینت بنی رہتی ہیں اور عوام بھی ان سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی اس کا ستارہ گردش میں آتا ہے میڈیا اسے چھوڑ کر کسی ابھرتے ہوئے ستارے کی جانب دوڑ پڑتا ہے۔ یہ درست ہے کہ میڈیا میں دولت کے زور سے بھی بہت کچھ دکھلایا جاتا ہے لیکن اس کی بھی اپنی حدود و قیود ہیں ایک حد کے بعد وہ حربہ نہیں چل پاتا۔ چونکہ ذرائع ابلاغ کا تجارتی مفاد کسی فرد کی ناموری کے بجائے ناظرین کی تعداد سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے جب ناظرین کسی شخصیت سے بیزار ہو کر اس سے نظر پھیر لیتے ہیں تو میڈیا کو بھی لازماً اپنی وفاداری تبدیل کرنی پڑتی ہے۔
گزشتہ سال کے ابتداء میں یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آنے والے بدعنوانی کے واقعات میڈیا پر چھائے رہے جب ان کی یکسانیت سے لوگ بیزار ہوئے تو ذرائع ابلاغ پر انا ہزارے کے لوک پال نے قبضہ کرلیا۔ اس کی وجہ قومی میڈیا کی اس تحریک سے ہمدردی نہیں تھی اس لئے وہ نہ صرف بدعنوانی کے سرچشمہ تجارتی اداروں سے ساز باز کئے رہتا ہے بلکہ اس میں دن رات ڈبکی لگانے والے سیاستدانوں کا شراکت دار بنا رہتاہے۔ پچھلے سال اکتوبر میں رکن پارلیمان

نوین جندل سے کول گیٹ کی منفی رپورٹنگ نہ کرنے کیلئے زی ٹی وی کے مدیر سدھیر چودھری نے ۱۰۰ کروڈ کا مطالبہ کیا اوراعتراف کیا کہ ایسا صرف ہم نہیں کرتے بلکہ سارا میڈیا کرتا ہے۔ ہم تو صاف شفاف انداز میں اشتہار مانگتے ہیں دوسروں کی مانند روپیہ لے کر پہلے صفحے کی خبر نہیں بناتے۔ چودھری نے ٹائمز دکھلا کر جندل سے کہا اگر آپ نے اس اخبار کو اشتہار دینے بند کردیئے تو یہ آپ کے خلاف لکھنے لگے گا۔ چودھری کے مطابق دہلی ٹائمز اور ممبئی ٹائمز کی ساری تصاویر، انٹرویوز اور فلمی تبصرے روپیوں عوض شائع کئے جاتے ہیں۔ زی والوں کی مادہ پرستانہ حرکات پر میڈیا کے متعلق یہ شعر صادق آتا ہے کہ ۔

دہشتگرد کھو اب ہم کو، کل پھر کہہ لینا ہیرو
سوچ کا دریا سونا چاندی، سوچ کا دھارا اکٹھ پتلی

انا ہزارے کی تحریک کو ذرائع ابلاغ میں پذیرائی اس لئے ملی کہ اس کے سبب ناظرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ نہ صرف اشتہارات کمیت بلکہ نرخ بھی بڑھ جاتا تھا۔ دوچار ہفتوں کے بعد جب لوگ انا ہزارے سے بور ہونے لگے تو نریندر مودی کو وزیراعظم کا امیدوار بنا کر بی جے پی نے میڈیا کو اپنی دوکان چمکانے کا ایک اور نادر موقع عطا کردیا۔ اس طرح ایک نئی ڈگڈگی میڈیا کے ہاتھ آگئی۔ نتیش کمار کے ساتھ الحاق کا ختم ہونا ایک بہت بڑی خبر بن گیا چہار جانب سے قیاس آرائیوں کا بازار گرم کردیا گیا اور اسی

کے ساتھ نریندر مودی کو سپر اسٹار بنا دیا گیا۔
مودی کے پاس ذرائع ابلاغ پر لٹانے کیلئے بدعنوانی کے ذریعہ جمع کردہ دولت کا انبار تھا۔ اس نے اس کام کے کیلئے ایک امریکی کمپنی کی خدمات بھی حاصل کرر کھی تھیں اس لئے وہ بڑی آسانی کے ساتھ چھوٹے پردے کا بے تاج بادشاہ بن گیا۔اس کے بیانات، اس کے مکالمے، اس کے جلسے ، یہاں تک کہ اس کی حماقتوں تک کو خوب بنا سنوار کر پیش کیا جانے لگا۔ اس کی مخالفت کو اچھالا جاتا اور مخالفین کا تمسخر اڑایا جاتا۔ میڈیا کا یہ جادو اس طرح سر چڑھ کر بولا کہ لوگوں کو اور خود نریندر مودی کو ایسا لگنے لگا گویا وہ امیدوار نہیں بلکہ بھرا پورا وزیر اعظم ہے۔ میڈیا کا کمال یہ ہے کہ جسے ہیرو بنایا جاتا ہےاس پر تنقید کرنے والے کو ولن بنا دیا جاتا ہے اور مخالف کی مخالفت کرنے والوں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ہیرو ہو۔ ناظرین چند ماہ تک تواس تماشے سے محظوظ ہوتے رہے لیکن پھر مودی کی ندرت بھی ختم ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو دوہرانا شروع کردیا جس کے سبب لوگ بور ہونے لگے۔
یہ اسی طرح کی صورتحال تھی جس کا سامنا کسی زمانے ہیں مقبول ترین ٹی وی سیریل ’’کون بنے گا کروڑ پتی ‘‘کو کرنا پڑا تھا۔ اس کا ایسا غلغلہ تھا کہ لوگ اس میں شمولیت کی خاطر صبح چار بجے اٹھ کر فون کیا کرتے تھے لیکن پھر

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسے بند کرنا پڑا اور جب وہ دوبارہ شروع کیا گیا تو امیتابھ بچن کے بجائے چہرہ بدل کر شاہ رخ خان کو لانا پڑا۔ اب پھر شاہ رخ کو بچن سے بدل دیا گیا ہے اسی طرح جب میڈیا والے مودی کا متبادل ڈھونڈ رہے تھے اروند کیجریوال ان کے ہاتھ لگ گیا اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ پردۂ سیمیں پر چھا گیا۔ نریندر مودی کی حالت فی الحال کسی زمانے کے سپر اسٹار راجیش کھنہ کی سی ہو گئی ہے جس نے بڑے تکبر کے ساتھ نامہ نگاروں سے کہا تھا یہ اٹنؔ بٹنؔ تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن کاکا (بذاتِ خود) صدیوں میں آتا ہے۔ میڈیا میں یہ فقرہ بڑے طمطراق سے شائع بھی ہوا لیکن بعد میں جب امیتابھ بچن سپر اسٹار بن گیا تو ذرائع ابلاغ کو یاد بھی نہیں رہا کہ راجیش کھنہ کون تھا؟ بلکہ اس کی دن رات تعریف کرنے والے اس میں کیڑے نکالنے لگے۔

اروند کیجریوال کے بعد آج کل نریندر مودی کو کوئی پوچھ کر نہیں دیتا یہاں تک کہ بی جے پی کے وزرائے اعلیٰ نے مودی کو اپنے لئے نمونہ بنانے کے بجائے کیجریوال کی نقالی شروع کردی۔ راجستھان کی وزیر اعلیٰ وسندھرا راجے نے اپنے حفاظتی دستے کو کم کردیا سرکاری گاڑی اور وزیر اعلیٰ کے شاندار مکان میں منتقل ہونے کے بجائے اپنے پرانے ،

سرکاری مکان میں رہنا پسند کیا حالانکہ ایسا نہ انہوں نے اپنی گزشتہ میقات میں کیا تھا اور نہ مودی نے ابھی تک کیا ہے یہ کیجریوال کے نقشِ قدم ہیں۔ شیوراج سنگھ نے بھوپال میں سرکاری شراب کی

دوکان پر بدیسی شراب کی فروخت پر اسی طرح پابندی لگادی جیسے کہ عام آدمی پارٹی نے خوردہ بازار میں غیر ملکی کمپنیوں پر روک لگائی۔ گوا کے منوہر پاریکر نے کیجریوال کی مثال دے کر گندے انڈوں پارٹی سے نکال باہر کرنے کا مطالبہ کرکے ظاہر کردیا کہ وہ مودی بھکت نہیں بلکہ کیجریوال کے دلدادہ ہیں اور دہلی کے بی جے پی کارکنان نے پارٹی کے پروگرام میں ٹوپی پہن کر عام آدمی پارٹی کی پیروی کی۔

قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی وقت نریندر مودی نے منموہن سنگھ کو عمر کا طعنہ دیا تھا لیکن اب حال یہ ہے کہ اس سے کم عمر دو حریف اس کو منہ چڑھا رہے ہیں۔ نریندر مودی نے تبدیلی کا نعرہ لگایا تھا لیکن اب اس کے علاوہ دونوں امیدوار تبدیلی کے علمبردار ہیں۔ نریندر مودی نے اپنے آپ کو کانگریس کا واحد متبادل بنا کر پیش کیا تھا اب اس سے زیادہ تگڑا متبادل کیجریوال میدان میں موجود ہے۔ مودی اپنے آپ کو بہتر منتظم کہتا تھا فی الحال دہلی کی ریاستی حکومت کی برق رفتار کارکردگی اسے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مودی نے بدعنوانی کو ختم کرنے کا عزم کیا تھا لیکن یدورپاّ کو پارٹی میں دوبارہ شامل کرکے اس نے خود بدعنوانی کی کمان اپنے ہاتھوں سے توڑ دی ہے۔ اسی لئے جب منموہن نے کہا کہ مودی کا وزیراعظم بن جانا ملک کی تباہی کا شاخسانہ ہوگا تو اروند کیجریوال کا ردعمل تھا کانگریس اور بی جے پی دونوں کا اقتدار میں

آجانا ملک کو تباہ.برباد کردے گا۔ اب ملک کی عوام حقیقی متبادل کے طلبگار ہے۔

اروند کیجریوال کی مقبولیت سے کانگریس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اس سے حریفِ اول مودی کے غبارے کی ہوا نکل گئی لیکن کانگریس عام آدمی پارٹی کو منظم ہونے کیلئے بہت زیادہ وقت نہیں دینا چاہتی ہے۔کانگریس یہ ضرور چاہتی ہے کہ وہ تبدیلی کے حاملین کا ووٹ تو کاٹے مگر اس کا روایتی ووٹ کٹے یہ اسے گوارہ نہیں ہے۔اس لئے چار ماہکے اندرکانگریس نے انتخابکے انعقادکااعلانکردیا۔ اسی کے ساتھ منموہن سنگھ نے اپنی سبکدوشی کا اعلان کرکے راہل کی راہ ہموار کردی اور راہل نے اپنے آپ ہر ذمہ داری کیلئے پیش کرتے ہوئے نریندر مودی کے انداز میں کہا ایک پرانی جماعت گنجے کو کنگھی بیچ رہی ہے اور نئی جماعت اس کی حجامت بنا رہی ہے۔ اب اس احمق شہزادے سے کون پوچھے کہ ملک کی عوام کے سر سے خوبصورت گھنگریالے بال اڑا کر اسے گنجے پن کا شکار کس نے کیا ہے؟

اروند کیجریوال نے جمعہ کو کہا کہ کانگریس ان کی حمایت کرکے پچھتائے گی لیکن ایسا لگتا ہے کہ اروند کیجریوال خود پچھتا رہے ہیں۔ ان کو قومی انتخابات کے دوران کانگریس کی مدد سے دہلی کی کرسی پر.براجمان رہنے کے منفی نتائج کا احساس ہوگیا ہے۔اسی لئے انہوں نے تین پولس والوں کی برطرفی کا

بہانہ بنا کر احتجاج کا اعلان کرکے کانگریس پارٹی کے ساتھ تصادم کی راہ اختیار کرلی ہے۔ قومی انتخاب سے قبل اس حکومت کا گرنا عام آدمی پارٹی کے ساتھ ساتھ کانگریس کیلئے بھی بہت مفید ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکمتِ عملی یہ ہے عام آدمی پارٹی کو کانگریس کی بی ٹیم قرار دے کر اپنے رائے دہندگان کو اس کے قریب جانے سے روکا جائے نیز اقتدار کے خلاف پائے جانے والے غم و غصے کو اپنے دامن میں سمیٹا جائے۔اگر بی جے پی یہ حکمتِ عملی کامیاب ہوجائے تو اس سے نہ صرف اروند کیجریوال تبدیلی کے حامی رائے دہندگان سے محروم ہو جائیں گے بلکہ ان کے سبب کانگریس کا نقصان ہوگا لیکن اگر دہلی کی ریاستی حکومت گر جاتی ہے تو وہ کانگریس کی جم کر مخالفت کرسکیں گے اور بی جے پی کے ووٹ کاٹیں گے ۔کانگریس کا یہی مطمحِ نظر ہے کہ بی جے پی کا ووٹ تقسیم ہو اور اس کو اس کا فائدہ ملے ۔

اس صورتحال میں بی جے پی کو عام آدمی پارٹی پر یہ الزام لگانا پڑے گا کہ وہ ہنگامہ آرائی تو کرسکتی ہے لیکن حکومت نہیں کرسکتی ایسا کرنے کے نتیجے میں بی جے پی خود ہی کیجریوال کی مخالفت کرکے ان کو کانگریس کا مخالف بنادے گی اور اس کی توجہات بنٹ جائیں گی ۔ کانگریس عام آدمی پارٹی کو نظر انداز کرکے اپنی پوری طاقت بی جے پی کے خلاف جھونک دے گی بلکہ پس پردہ عام آدمی پارٹی کی حمایت بھی کرے گی اس لئے کوئی بعید نہیں کہ احتجاج کا یہ تماشہ ان

دونوں کے درمیان نورہ کشتی ہو۔ انتخاب کے بعد بہر صورت ان دونوں کو ایک دوسرے کا حلیف بن جانا ہے۔ ظاہر ہے ساری انتخابی اٹھا پٹخ کے نتیجے میں کل تین میں سے ایک منظر سامنے آئے گا۔ اول تو یہ کہ کانگریس یا بی جے پی میں سے کسی ایک کو واضح اکثریت حاصل ہو جائے یہ ناممکن ہے۔ دوسرا کانگریس یا بی جے پی میں سے کوئی ایک تیسرے محاذ کی مدد سے حکومت سازی کرکے اس کی بھی توقع کم ہے۔ تیسرا قوی امکان یہ ہے کہ غیر کانگریس و غیر بی جے پی محاذ حکومت بنائے۔ اس صورتحال میں اگر عام آدمی پارٹی کے ۳۰ تا ۴۰ امیدوار کامیاب ہوجاتے ہیں جس کا امکان بہت کم ہے تو ممکن ہے اروند کیجریوال دیگر جماعتوں اور کانگریس کے تعاون سے وزیراعظم بن جائیں لیکن ان کی دیوے گوڑا یا اندر کمار گجرال جیسی لولی لنگڑی حکومت کتنے دن چلے گی اور عام آدمی کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کرسکے گی یہ کہنا بہت مشکل ہے؟ بقول شاعر

نادیدہ مسیحا جو لکھیں شب کی کہانی
ظلمت کو لکھیں نور، نہاں آگ کو پانی

اروند کیجریوال: عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

شری اروند کیجریوال جی فی الحال بجا طور پر ہندی مسلمانوں کے سب سے زیادہ منظورِ نظر رہنما ہیں اور اس کی وجہ صاف ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بیک وقت کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے سگ گزیدہ ہیں اور کیجریوال نے ان دونوں کے خلاف جہاد چھیڑ رکھا ہے اس لئے مسلمانوں کا ان کو دل جان سے چاہنا فطری امر ہے۔ اتفاق سے ان عاشقانِ ''آپ'' (عام آدمی پارٹی کا مخفف) میں میرے قریبی رفقاء بھی شامل ہیں اس لئے کیجریوال کی بابت کسی حقیقت بیانی سے خوف محسوس ہوتا ہے مبادہ کسی کی دل آزاری نہ ہو جائے۔ ویسے مورخہ ۲۰ اور ۲۱ جنوری کو خود اروند جی نے اپنے طرزِ عمل سے جس ظرف کا مظاہرہ کیا اس کے بعد کوئی خاص تبصرے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کے سیماب صفت موقف کا اتار چڑھاؤ اور ان کے بیانات کا زیر و بم بہت کچھ طشت از بام کر گیا۔ بقول یاس یگانہ چنگیزی

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے

دہلی کے اندر برپا ہونے والی حالیہ ہنگامہ آرائی پر سب سے اچھا تبصرہ رام ولاس پاسوان نے کیا۔ انہوں نے کہا پانچ پولس افسران کی معطلی کیلئے

وزیراعلیٰ کا دھرنے پر بیٹھ جانا ایسا ہی ہے جیسے مچھر کو مارنے کیلئے توپ کا استعمال کرنا۔ سچ تو یہ کہ توپ داغنے کے باوجود پانچ میں سے چار مچھر تو صاف بچ نکلے ان کا بال بیکا نہ ہوا بقیہ ایک کا جنازہ تو درکنار پروں پر معمولی خراش تک نہیں آئی۔ چھٹی پر جانے والے پولس افسر کے بارے میں محکمۂ پولس کا یہ بیان کہ انہوں نے پہلے ہی سے چھٹی کی درخواست دے رکھی تھی پطرس بخاری کی پیروڈی یاد دلاتا ہے۔

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
جمشید کا پیارا ہے اسے توپ سے کھینچو

ہندوستان میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ تین خود مختار ادارے ہیں گو کہ سیاستدانوں کی بقیہ دونوں میں مداخلت ہوتی رہتی ہے لیکن اس کا اعتراف کوئی نہیں کرتا بلکہ اس سے انکار ہی کیا جاتا ہے۔ اروند جی ہندوستانی نظام کی اس منافقت سے ابھی واقف نہیں ہوئے ہیں ان کا خیال ہے چونکہ پولس کا محکمہ مرکز کے تحت ہے اس لئے ان کے وزیر کی نہیں سنتا اور اس کے کہنے پر کسی کو گرفتار نہیں کرتا حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک عام پولس جوان دستور کی رو سے مرکزی وزیر داخلہ کے احکامات کو ماننے کا بھی مجاز نہیں ہے۔ وہ تو دستور ہند کے تحت اپنے افسر کا ماتحت ہوتا ہے اور اصولی طور پر یہی ہونا چاہئے کہ اگر اس کا افسر بھی وارنٹ کے بغیر کسی کو گرفتار کرنے کا حکم دے تو اسے انکار

کردینا چاہئے۔ یہ بات عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ اس کے پاس سرکار چلانے کے علاوہ بہت سارے اہم کام ہیں جن سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ اس جھنجھٹ میں پڑے لیکن اگر یہی فرق عام آدمی کی سرکار کو بھی پتہ نہ ہو یا وہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کردے تو وہی طوفانِ بدتمیزی بر پا ہوتا ہے جس کا مظاہرہ دہلی میں ہوا۔ اروندجی نے اپنے رویہ سے یہ ثابت کردیا کہ جب تک ان کی سمجھ میں یہ بنیادی اصول نہیں آجاتا اس وقت تک پولس فورس کو ان کے حوالے کرنا مناسب نہیں ہے۔

نریندر مودی پر گجرات فساد کے علاوہ سب سے بڑاالزام یہ ہے کہ اس کے زیر سرپرستی اے ٹی ایس کے افسران نے قانون اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا وہ جسے چاہتے تھے مار گراتے تھے اور دہشت گرد قرار دے دیتے تھے ۔ ونجارہ جیسے افسران اپنی ان حرکات کی سزکے طور پر جیل میں چکی پیس رہے ہیں (بلکہ شاعری کررہے ہیں ویسے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے) ۔اب اگر دہلی کے وزراء کے اشارے پر پولس من مانے طریقے سے جس کو چاہے گرفتار کرنے لگے تو وہی ہوگا کہ پولس والے کے ساتھ وہ وزیر بھی جیل کی چکی پیسے گا۔ نیز اگر پولس فورس کو باقائدہ سیاستدانوں کے تابع کردیاجائے تو عوام کے عدم تحفظ میں غیر معمولی اضافہ ہو جائیگا اس لئے کہ ملک بھر میں عام آدمی پارٹی کے شریف اور سلیقہ مند وزراء تو ہیں نہیں۔ جب مرکز اور تمام ریاستوں میں سارے وزیر اس

پارٹی کے ہو جائیں گے تب اس تجویز پر غور کیا جاسکتا ہے۔
دہلی میں پولس فورس کا مرکزی حکومت کے تحت ہونا ایک اختلافی مسئلہ ہے۔کانگریسی وزرائے اعلیٰ تک اس کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے رہے ہیں ۔ اس کا ایک یہ حل بھی زیرِ بحث آچکاہے کہ نئی دہلی کے اس علاقے کو جہاں مرکزی حکومت کے دفاتر ہیں الگ کرکے ایک مخصوص پولس کے حوالے کردیا جائے اور بقیہ علاقوں کی دہلی پولس ریاستی حکومت کے تحت ہو لیکن اگرایسا ہوجائے تو مرکز و ریاستی حکومت کے درمیان تصادم کی صورت میں مرکزی حکومت اپنے دفاتر کی حد تک محصور ہو کر رہ جائیگی ۔ حالیہ تصادم سے ایک نذیر بھی قائم ہو گئی ہے اور مستقبل میں بھی اس کے امکانات کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔ سچ تو یہ ہے احتجاج کے ذریعہ شری کیجریوال نے نہ صرف خود اپنے پیر پر کلہاڑی مار لی ہے بلکہ آئندہ کیلئے بھی اس کا دروازہ بند کردیا ہے اس لئے کہ اب جو کوئی بھی اس طرح کا مطالبہ کرنے کی جرأتکرے گا اسے ’’آپ‘‘ کے احتجاج کی مثال دے کر خاموش کردیا جائیگا۔
دوسرا مسئلہ طریقۂ کار کا ہے ۔ دہلی کی پولس کوریاستی حکومت کے تحت لانے کیلئے دستور میں ترمیم لازمی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دستور میں ترمیم کیا اس طرح سے ممکن ہے کہ کچھ لوگ غیر معینہ احتجاج پر بیٹھ جائیں

اور یہ اصرار کریں کہ جب تک ان کا مطالبہ پورا نہیں ہوتا وہ نہیں جائیں گے۔ لوک پال بل کے معاملے شری کیجریوال کو یہ تجربہ ہو چکا ہے لاکھ شور و ہنگامہ کے باوجود احتجاج کے دوران یا اس کے فوراً بعد لوک پال بل نہیں بنا اور بعد میں بھی جو بل پاس کیا گیا اس سے بھی انا ہزارے تو مطمئن ہیں لیکن کیجریوال کو اطمینان نہیں ہے۔ انا ہزارے کے منع کرنے کے باوجود اروند کیجریوال کے سیاسی جماعت بنانے کی دلیل یہی تھی کہ اس نظام میں صرف احتجاج کے ذریعہ سے نہیں بلکہ انتخاب کے ذریعہ سے تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اس لئے وزیراعلیٰ کا یہ اصرار کہ جب تک پولس فورس ریاستی حکومت کے تحت نہیں آجاتی وہ دھرنے پر بیٹھے رہیں گے اور لاکھوں مظاہرین سے راج پتھ کو بھر دیں گے بصورتِ دیگر یوم جمہوریہ کی تقریب کو روک دیں گے ایک بچکانہ مطالبہ تھا ۔دراصل پیر کی صبح جب اروند کیجریوال احتجاج کی غرض سے اپنے ۶ وزراء کے ساتھ وزارت داخلہ کی جانب نکلے تو سیاست کے میدان میں گھاگ کانگریس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اب یہ صیاد از خود ہمارے دام میں آرہا ہے جیسا کہ مومن خاں مومن نے فرمایا ہے

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں

لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

اروند کیجریوال کی دہلی سرکار کا پاؤں ویسے ہی کانگریس کے زلف دراز میں

الجھا ہوا ہے۔ ممکن ہے اسے چھڑانے کیلئے وزیراعلیٰ نے مرکزی وزیر داخلہ سے ملاقات کرکے تین پولس والوں کو معطل کروانے کا ارادہ کیا ہویا اس کے ذریعہ سے غالباً وہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ دہلی میں جرائم کی دگرگوں صورتحال کیلئے ان کی ریاستی حکومت نہیں بلکہ مرکزی حکومت ذمہ دار ہے لیکن سشیل کمار شندے نے انہیں راستے میں ای دہلی کی پولس کے ذریعہ روک دیا جس پر وہ گرج برس رہے تھے۔ اس سے ان کی انا کو یقیناً ٹھیس پہنچی ہوگی اس لئے کہ اب وہ عام آدمی نہیں بلکہ دہلی کے وزیر اعلیٰ ہیں۔ اس کا اظہار شری کیجریوال کے اس ردعمل سے بھی ہوتا ہے کہ ”شندے یہ طے کرنے والے کون ہوتے ہیں کہ ہم احتجاج کیلئے کہاں بیٹھیں؟ میں دہلی کا وزیر اعلیٰ ہوں۔ اس طرح کے احمقانہ بیان کی توقع ایک سابق آئی ای ایس افسر سے کرنا مشکل ہے۔

کانگریس نے وزیراعلیٰ کو جس چکرویوہ میں پھنسا لیا تھا اس سے نکلنے کے ان کے سامنے دوہی راستے تھے ایک تو چپ چاپ واپس چلے جائیں لیکن اس سے آبرو جاتی تھی اس لئے کہ وہ ذرائع ابلاغ میں اعلان کرکے آرہے تھے اور ان کیلئے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ دوسرا راستہ اپنے پرانے اوتار میں لوٹ کر جانے کا تھا سو وہ دھرنے پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد سب کچھ کانگریس پارٹی توقعات کے مطابق ہونے لگا۔ انہوں نے اپنا پہلا بیان بدلا اور اپنے حامیوں کو جنہیں آنے سے پہلے منع کیا تھا احتجاج میں شامل ہونے کیلئے بلانے لگے اور یہ بے

بنیاد اعلان کر دیا کہ وہ دس دنوں تک دھرنا دینے کی تیاری سے آئے ہیں۔ جب دیکھا کہ حکومت دباؤ میں نہیں آرہی ہے تو اپنے بیان کو مزید وسعت دیتے ہوئے کہہ دیا کہ اگر حکومت کا یہی رویہ رہا تو احتجاج غیر معینہ مدت تک چلے گا۔

یوم جمہوریہ کی تقریبات میں خلل کو لے کر جب وزارتِ داخلہ کی بے چینی کے بارے دریافت کیا گیا تو ان کا جواب تھا اگر چہ ملک کے عوام غیر محفوظ ہوں تو وزیر داخلہ چین سے کیوں کر سو سکتا ہے؟ اس الزام کے جواب میں کہ وہ شہر میں انارکی پھیلا رہے ہیں انہوں نے اعتراف کر لیا کہ وہ انارکی پسند ہیں۔ اس طرح وہ ایک خطرناک جال میں پھنستے چلے گئے۔ اس احتجاج کو جاری رکھنے کیلئے محض خاطی پولس والوں (بزعمِ خود) کی برطرفی کا جواز کافی نہیں تھا اس لئے مطالبے میں توسیع کرکے پولس فورس کو ریاستی حکومت کے تحت کر دینے پر زور دیا گیا اور پولس کی بدعنوانی شور مچایا جانے لگا۔ اس کوشش میں شری کیجریوال اس قدر آگے نکل گئے کہ انہوں نے حال میں وزارتِ داخلہ میں ہوم سکریٹری کی حیثیت سے سبکدوش ہو کر بی جے پی میں داخل ہونے والے آر پی سنگھ کے الزامات کا حوالہ دینا شروع کر دیا جس میں کہا گیا تھا رشوت اوپر وزیر داخلہ تک پہنچتی ہے۔ اسی کے ساتھ خواتین رائے دہندگان کو رجھانے کی خاطر شہر دہلی کے اندر خواتین کے عدم تحفظ پر گفتگو شروع ہو گئی۔ اس بیچ اپنی حمایت میں

یوگنڈا سفارتخانے کا ایک خط کو پیش کرکے عوام کو گمراہ کرنے کی سعی کی گئی۔ متعلقہ سفیر کی تردید کے بعد صفائی دی گئی کہ وہ سفارتخانے کے کسی ملازم کی جانب سے لکھا گیا خط ہے۔

وزیر اعلیٰ کے ایک رات سڑک پر گزارنے کے بعد بھی جب مرکزی حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی اور وزیر اعلیٰ کے اس اعلان کے باوجود کہ لوگ ایک دن کی چھٹی لے کر منگل کو مظاہرے میں شامل ہوں نیز انہیں جہاں کہیں بھی روکا جائے وہیں مظاہرے پر بیٹھ جائیں جب عوام کا خاطر خواہ تعاون نہیں ملا اور بہت زیادہ لوگوں نے اس پر لبیک نہیں کہا تو آپ کے رہنماؤں کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ جو مظاہرین ریل بھون کے قریب آئے تھے وہ بے قابو ہو کر پولس سے لڑنے بھڑنے لگے یہاں تک کہ آپ کے رہنما سنجے سنگھ کو خود اپنے ہی کارکن کو تھپڑ رسید کرنا پڑا تب جا کر کیجریوال کی عقل ٹھکانے آئی اور وہ مفاہمت پر آمادہ ہوئے۔ گورنر جنرل نے اس کا فائدہ اٹھایو ھیندر یادو کو کھانے کی دعوت دی اور ان سے صاف کہہ دیا کہ مرکزی حکومت ان مطالبات کو کسی صورت تسلیم نہیں کرے گی۔

کانگریس پارٹی تو یہ چاہتی تھی کہ یہ تماشہ جاری رہے اسی لئے عدالتِ عالیہ میں اس کے خلاف داخل ہونے والی عرضداشت پر فوری سماعت کے بجائے تین بعد

یعنی ۲۴ تاریخ کا وقت طے کیا گیا۔ مرکزی حکومت کو پتہ تھا عدالتی فیصلہ کیا ہوگا اور اس کے بعد یہ احتجاج اپنے آپ ختم ہو جائیگا لیکن وہ اس وقت تک اروند کیجریوال کی خوب جم کر مٹی پلید کرنا چاہتی تھی اسی لئے وزیر داخلہ نے بے لچک اڑیل رخ اختیار کر رکھا تھا لیکن دیر آید درست آید کی مثل اروند جی نے عقلِ سلیم سے کام لیا اور اپنا احتجاج لیفٹننٹ گورنر کے خط کا بہانہ بنا کر ختم کر دیا۔ یہ احتجاج جس انداز میں ختم ہوا ہے اس سے میرا اپنا اندیشہ کہ یہ کانگریس اور ''آپ'' کی ملی بھگت ہے غلط ثابت ہو گیا لیکن اس کے باوجود یہ پیغام تو ملک کی عوام تک پہنچ ہی گیا کہ راہل کا اصل حریف مودی نہیں بلکہ کیجریوال ہے۔ اس پیغام کا جانا بہر حال کانگریس اور آپ دونوں کیلئے فائدہ بخش ہے اسی کے ساتھ بی جے پی کے اس الزام کی بھی دھجیاں اڑ گئیں کہ یہ کانگریس اور آپ کی نورہ کشتی ہے اور اروند کیجریوال کانگریس کا مہرہ ہے۔ کانگریس کیلئے اپنی حمایت کا ہاتھ کھینچ کر دہلی کی حکومت کو گرانے کا نادر موقع ہاتھ آیا تھا لیکن کانگریس نے اپنی حمایت کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر کے یہ پیغام دیا ہے کہ اروند کیجریوال سے اسے مزید حماقتوں کی توقعات وابستہ ہیں۔ شری اروند کیجریوال ان امیدوں پر کس قدر پورے اترتے ہیں یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔

شری کیجریوال نے اس احتجاج کو دہلی کی عوام کی کامیابی قرار دیا اور ہپتال

میں داخل ہوگئے۔ دراصل عام آدمی میں اور عام آدمی کے رہنما میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر تو ہر رات سڑک پر بڑے آرام سے گزار لیتا ہے لیکن ان کا لیڈر ایک رات میں ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔ آپ کے قدرے سلجھے ہوئے رہنما یوگیندر یادو نے تسلیم کیا انہیں جزوی کامیابی حاصل ہوئی اور مکمل کامیابی تو گاندھی جی کو بھی نہیں ملی تھی۔ کامیابی کے جز کا پتہ لگانے کیلئے اگر بنیادی مطالبات کو دیکھیں تو پانچ پولس افسران کی معطلی کے بجائے ایک چھٹی پر گیا دوسرے کے نائب کی چھٹی کردی گئی اور باقی چار کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ جس پولس کو اروند جی اپنا تابعدار بنانا چاہتے تھے اس نے ان کے ۳۳ گھنٹے چلنے والے احتجاج میں شامل ہونے والے مظاہرین کے خلاف بے نامی شکایت درج کروادی اوراب مختلف حلقوں سے وزیر قانون سومناتھ بھارتی کو معطل کرنے کی خاطر دباؤ بنایا جارہا ہے۔ ممبئی کی زبان میں گویا کھایا پیا کچھ نہیں گلاس پھوڑا بارہ آنہ والی بات۔ جاتے جاتے اروند جی کا یہ کہنا کہ اگر پھر دہلی میں کسی خاتون پر ظلم ہوا تو ہم خاموش نہیں بیٹھیں گے ساغر نظامی کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے کہ

اگرچہ ہم جارہے ہیں محفل سے نالۂ دل فگار بن کر
مگر یقیں ہے کہ لوٹ آئیں گے نغمۂ نو بہار بن کر

بنگلہ دیش: نیا جال لائے پرانے کھلاڑی

ہندوستان میں اگر کوئی ٹی وی چینل اپنے ناظرین سے سوال کرے کہ: پریش بروہ کو پھانسی کی سزا بحال کردی جائے یا نہیں؟ تو لوگ پلٹ کر سوال کریں گے آخر یہ صاحب ہیں کون ؟جب انہیں بتایا جائیگا کہ وہ ہندوستان کا سب بڑا دہشت گرد ہے تو ایک قہقہہ بلند ہوگا۔ لوگ اسے ماننے سے انکار کردیں گے اس لئے کہ بھارت ورش میں دہشت گردی کا ٹھیکہ مسلمانوں کے سر تھوپا جاچکا ہے۔ کوئی قصاب ہو یا ٹنڈا اس کا پہلا نام یقیناً مسلمانوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھار کسی سکھ کا نام بھی اس فہرست میں آجاتا ہے لیکن کوئی ہندو اور دہشت گرد یہ تو ناممکن ہے ۔ اسی لئے ہزارہا ثبوت کے باوجود کرنل پروہت اور سادھوی پرگیہ رہائی کیلئے پر تول رہے ہیں اور جس بجرنگی یا کوندنانی کو عدالت نے سزا سنادی ہے وہ بھی جیل کے اندر اپنی فطری موت کے انتظار میں عیش کررہے ہیں۔ یہاں تو صرف افضل گرو جیسے معصومین کو عوامی جذبات کے پیش نظر پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جاتا ہے ۔

پریش بروہ آسام کی علٰحیدگی پسند تنظیم اُلفاکے آزاد دھڑے کا رہنما ہے جو حکومتِ ہند کے ساتھ کسی مفاہمت کا قائل نہیں ۔ پرویش کو اس کی غیر موجودگی

میں بنگلہ دیش کی ایک نچلی عدالت نے پھانسی کی سزا سنادی ہے۔ ایسا اس لئے نہیں ہوا کہ وہ ہندو ہے بلکہ اس کے ساتھ ۱۳ مسلمانوں کو بھی سزائے موت سنائی گئی ہے۔

دراصل پرویش.بروہ سرزمین بنگلہ دیش پر کسی دہشت گردانہ کارروائی کا مرتکب نہیں ہوا بلکہ ہندوستان میں دہشت گردی کی خاطر اس نے جو اسلحہ چین سے منگوایا تھا اس کو بھی خالدہ ضیاء کی حکومت نے چھاپہ مار کر اپنے قبضہ میں کرلیا اور ہندوستان پہنچنے نہیں دیا۔ اس احسانمندی کا بدلہ بیگم خالدہ ضیاء کو یہ ملا کہ ہندوستان کی منظورِ نظر شیخ حسینہ نے اپنے سیاسی مفاد اور حکومت ہند کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے انہیں لوگوں کو اسلحہ اسمگلنگ کرنے اور رکھنے کے جرم میں سزائیں بحال کردیں جن لوگوں نے اس کو ضبط کرکے ہندوستان میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔

بیگم خالدہ کی مانند اُلفا کے ستارے بھی آج کل گردش میں ہیں۔آپسی چپقلش کے چلتے ان لوگوں نے اپنے معمر ساتھی پارتھا گوگوئی سمیت ۶ کارکنان کو چند ہفتوں قبل موت کے گھاٹ اتار دیا۔بروہ بنگلہ دیش میں اُلفا کو مضبوط کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا ظاہر سی بات ہے.بروہ کے چکر میں مسلم نوجوان تو آنہیں سکتے اس لئے وہ وہاں موجود ہندو نوجوانوں کو مسلح جدوجہد کیلئے تیار کررہا ہوگا۔۱۹۸۹ء سے لے کر ۲۰۱۰ء تک اُلفا نے بنگلہ دیش میں اپنی تنظیم کا زبردست جال پھیلا دیا ہے اور ذرائع ابلاغ سے لے کر حمل و نقل تک مختلف شعبہ

جات میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ لیکن اس عدالتی فیصلے نے پریش کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ اب وہ بنگلہ دیش کے بجائے چین میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ چین نے اگر دلائی لامہ کے جواب میں پریش بروہ کو شہ دی تو حکومتِ ہند کو شیخ حسینہ کا یہ تعاون مہنگا پڑے گا۔

پریش بروہ کو جس مقدمہ کے اندر سزا ہوئی ہے اس کے تانے بانے چین سے جڑے ہوئے ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں چٹاگانگ کے اندر دس ٹرکوں میں ۱۵۰۰ بکسوں کو پولس نے اپنے قبضے میں لیا جن میں ۴۰۰۰ ہزار بندوقیں اور ۱۵۰،۰۰۰ کارتوس، ۲۵۰۰۰ گرینیڈ، ۹۰۰ راکٹ اور ۱۵۰ راکٹ لانچر تھے۔ یہ ایک بین الاقوامی سازش کے تحت وہاں پہنچے تھے ۔ اس اسلحہ کو چین کی اسلحہ ساز کمپنی نورینکو نے بنایا تھا اور اس کی قیمت پاکستان کے خفیہ ادارے آئی ایس آئی نے ادا کی تھی۔ یہ اسلحہ ہانگ سے نکل کر سنگاپور ہوتا ہوا بنگلہ دیش پہنچا لیکن اس کی منزل آسام تھی۔ بنگلہ دیش کا حصہ تو صرف یہ تھا کہ اس کی سرزمین سے وہ گزر رہا تھا لیکن شومئی قسمت کہ نہ تو چین کا اور نہ پاکستان کا کچھ بگڑا، سنگاپور والوں سے بھی کسی کچھ نہ پوچھا مگر وہ بنگلہ دیشی اس طوفان کی زد میں آگئے جنھوں نے اسے نظر انداز کرنے کے بجائے چھاپہ مار دیا۔

۲۰۰۴ء میں جب یہ کارروائی ہوئی اس وقت بیگم خالدہ ضیاء کی قیادت میں چار

جماعتوں کا محاذ برسرِ اقتدار تھا۔ یکم اپریل کی رات چٹاگانگ کے کورنوفل پولس تھانے میں اس کی رپورٹ درج کرائی گئی اس کے بعد ۱۱ جون ۲۰۰۴ء اولین فرد جرم داخل کی گئی ۴۲ افراد کے خلاف مقدمہ کا آغاز ۶ جولائی ۲۰۰۵ء کو ہوا اور ۱۴ اگست ۲۰۰۷ء تک جاری رہا اور ۵۹ گواہوں نے اپنی شہادت پیش کی۔ اس بیچ بنگلہ دیش نیشنل پارٹی نے استعفیٰ دے کر اقتدار غیر جانبدار مشیر فخرالدین احمد کو سونپ دیا۔ ۲۰ نومبر ۲۰۰۷ء کو وکیل استغاثہ ہمایوں کبیر نے عدالت سے مزید تفتیش کی درخواست دی۔ فروری ۲۰۰۸ء میں عدالت نے اس کی اجازت دے دی مگر ۶ مرتبہ کی توسیع کے باوجود ایڈیشنل سپرانٹنڈنٹ پولس اسماعیل حسین اضافی فرد جرم داخل نہ کر سکے۔ دسمبر ۲۰۰۸ء میں شیخ حسینہ نے انتخاب میں کامیابی حاصل کرکے اقتدار سنبھالا اور جنوری ۲۰۰۹ء میں اپنے آدمی اے ایس پی منیر الزماں کو تفتیش کا کام سونپا۔ اس طرح جون ۲۰۱۱ء میں جو ترمیم شدہ فرد جرم داخل ہوئی اس میں ۱۱ نئے لوگوں پر الزامات لگائے گئے جن میں جماعتِ اسلامی کے سابق امیر مطیع الرحمٰن نظامی اور بی این پی کے سابق وزیر لطف الزماں کا نام تھا۔ ان کے علاوہ چند فوجی و سرکاری افسران کے علاوہ کھاد کی کمپنی کے مالک اور جنرل منیجر کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا گیا تھا۔ تاریخوں اور واقعات کی اس ترتیب و تواتر ظاہر ہے کہ یہ کھچڑی کس نے اور کب پکائی ہے؟ اگر اس میں ذرا بھی سچائی ہوتی تو کم از کم فخرالدین احمد کے غیر جانبدار دورِ اقتدار میں جبکہ خالدہ ضیاء کی حکومت پر بدعنوانی ۲۶۰ الزامات

لگے یہ الزام بھی لگ جاتا لیکن عدالتی فرمان کے باوجود ایسا نہیں ہوا۔

سازش کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ شیخ حسینہ کے اقتدار سنبھالنے کے تین ماہ بعد مارچ میں دو ملزمین حفیظ الرحمٰن اور دین محمد نے جو مزدوروں کو فراہمی کے ٹھیکیدار ۲۰۰۹؁ تھے الزام لگایا کہ اس معاملہ میں چند اعلیٰ افسران اور وزراء ملوث ہیں۔ ظاہر ہے ان کو وعدہ معاف گواہ بنانے کا سبز باغ دکھلا کر عوامی لیگ نے اپنے مفاد میں استعمال کیا لیکن ان میں سے ایک کے ساتھ بھی دغا بازی کرتے ہوئے حفیظ الرحمٰن کو موت کی سزا سنا دی۔ حفیظ الرحمٰن نے بتایا کہ اس سے ۲۰۰۱؁ میں کسی زمان نام کے شخص نے مال برداری کی خاطر رابطہ کیا قائم کیا تھا چھاپے کے بعد فروری ۲۰۰۲؁ میں اسے پتہ چلا کہ وہ شخص پریش بروہ ہے۔ اس بیانکی بنیاد پر ترمیم شدہ فرد جرم بیں۱۶ نام شامل کئے گئے۔ نئے سرے شروع ہونے والے مقدمے میں ۲۵۰ سے زیادہ گواہوں کے نام تھے لیکن صرف ۵۶ کو گواہی کیلئے بلایا گیا۔ ان میں سے نائب سیکیورٹی افسر مبین حسن خان نے بتایا کہ سابق سکریٹری شعبہ صنعت نورالامین کو اسمگلنگ کی پیشگی اطلاع دی گئی تھی۔ نورالامین فی الحال فرار ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کسی کو کسی بات کی اطلاع کا ہونا اسے سزائے موت کا مستحق بنا دیتا ہے؟

ایک اور اہم گواہ جنرل انٹلی جنس فورس کے ڈائرکٹر جنرل صادق حسن رومی نے

عدالت کو بتلایا کہ جب سابق وزیراعظم خالدہ ضیاء کو اس کی خبر دی گئی تو انہوں نے کہا ہم تفتیش کریں گے اور اس کمیٹی میں ڈی جی ایف آئی کا نمائندہ ہوگا۔ اس وقت انہیں کچھ بڑے لوگوں کے ملوث ہونے کا خدشہ ہوا۔ اس کے بعد لطف الزماں بابر نے اس کمیٹی میں جنرل رزاق حیدر کو نامزد کرنے کی تلقین کی۔ رومی کسی اور کو نامزد کرنا چاہتے تھے لیکن بابر نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ کیا کسی وزیر کا کسی افسر کی کسی تجویز کو مسترد کر دینا اس کو قابلِ گردن زدنی مجرم بنا دیتا ہے؟ ایک اور گواہ نے بتایا کہ بابر اس چھاپے کے بعد موقع واردات پر پہنچے اور انہوں وہاں سے گرفتار کئے جانے والے ۵ افراد کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر بابر کا یہ اقدام غلط تھا تو ان لوگوں کو دوسری فرد جرم میں شامل کر کے گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟ ممکن وہ ایسے غیر متعلق مزدور ہوں جنہیں پولس نے بلاوجہ گرفتار کر لیا ہو۔ بابر پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ انہوں نے اپنے دورے کے بعد افسران کو تلقین کی چونکہ یہ نازک معاملہ ہے اس لئے اس بابت ذرائع ابلاغ جانے سے گریز کریں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بین الاقوامی اہمیت کا حامل نازک معاملہ تھا اور اس سے متعلق احتیاط کی ہدایت میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس معاملے کی پردہ پوشی تو کی نہیں گئی۔ اسی وقت ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ساری دنیا کو اس کی اطلاع دے دی گئی۔

اس معاملے میں دو اہم گواہ سابق قومی سلامتی کے خفیہ ادارے کے ڈائرکٹر شہاب الدین اور ان کے ہم منصب عبدالرحیم ہیں جو دونوں جیل میں تھے۔ شہاب الدین کے مطابق سابق این ایس آئی ڈائرکٹر عبدالرحیم نے پاکستانی کمپنی اے آر وائی اور آئی ایس آئی کے ساتھ کئی نشستیں کیں لیکن حلفیہ بیان دیتے وقت انھوں نے آئی ایس آئی کا نام لینے کے بجائے صرف غیر ملکیوں سے ملاقات پر اکتفا کیا۔ عبدالرحیم نے اعتراف کیا کہ ان کی آئی ایس آئی کے احسان الحق سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی لیکن اس کا کوئی تعلق اسلحہ کی اسمگلنگ سے نہیں تھا عبدالرحیم کے مطابق خود شہاب الدین نے آئی ایس آئی سے ساز باز کر رکھی تھی ۔ عبدالرحیم نے یہ الزام بھی لگایا کہ شہاب الدین ان سے الفا رہنما انوپ شیٹیار کی بابت بات کی (جو جو بنگلہ دیش کی جیل میں ہے) اور الفا کی مدد پر اکسایا جس کے جواب میں عبدالرحیم نے بگڑ کر کہا کیا ہم بنگلہ دیش الفا کے حوالے کر دیں؟ شہاب الدین تفتیش کے دوران اعتراف کیا اس کی ملاقات ۳۰ مارچ ۲۰۰۴ء کی شب میں فوجی ہسپتال کے اندر ایک پاکستانی امیر بھائی سے ہوئی ۔ این ایس آئی کے ڈائرکٹر جنرل رزاق حیدر کے ساتھ بھی وہ شخص نظر آیا لیکن بعد میں اسے پتہ چلا کہ امیر بھائی کے بھیس میں ملنے والا آدمی کوئی اور نہیں بلکہ بریگیڈیئر وہ تھا۔ ان الزامات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں گواہ ناقابلِ اعتبار ہیں ۔ اتفاق سے ان دونوں کو بھی موت کی سزا سنائی گئی ہے ۔

ان تمام اہم گواہوں نے تو سرے سے سابق امیر جماعت مطیع الرحمٰن نظامی کا ذکر ہی نہیں کیا لیکن عدالت میں بتلایا گیا کہ سابق وزارتِ صنعت اور کار گزار حکومت کے مشیر شعیب احمد نے سابق وزیر صنعت مطیع الرحمٰن نظامی پر الزام تراشی کی ۔ اسکے علاوہ بی سی آئی سی کے سربراہ میجر جنرل (سبکدوش) امام الزماں نے نظامی صاحب کا نام لیا۔ ذرائع ابلاغ اس تفصیل سے خالی ہیں کہ الزام کیا تھا اور ذکر کس بابت کیا گیا تھا؟ غالباً الزام یہ تھا کہ جس نجی کھاد کے کارخانے کی بندرگاہ پر اسلحہ ضبط ہوا اس کو وزارت صنعت نے لائسنس دیا تھا اور اس چھاپے کے وقت مطیع الرحمٰن وزیر صنعت و حرفت ہوا کرتے تھے۔ اگر ہندوستان میں نریندر مودی کے بجائے بی جے پی والے شیخ حسینہ کو وزیر اعظم بنوادیں تو وہ وزیر دفاع اے کے انٹونی کو ممبئی حملے کے الزام میں پھانسی چڑھوادیں گی اس لئے کہ حملہ آوروں کو روکنا ہندوستان کے بحری بیڑے کی ذمہ داری تھی جو وزارتِ دفاع سے تنخواہ پاتا ہے۔

اس مقدمہ ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ بنگلہ دیش میں اسمگلنگ کی زیادہ سے زیادہ سزا عمر قید ہے لیکن مذکورہ عدالت نے اس حد سے تجاوز کرتے ہوئے موت کی سزا سنائی ہے نیز جس نچلی عدالت میں یہ سزا سنائی گئی اسے موت کی سزا دینے کا اختیار بھی نہیں ہے اس لئے فیصلے میں یہ کہنا پڑا کہ موت کی سزا

عدالتِ عالیہ کی توثیق کے بعد ہی بحال کی جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ عدالت عمر قید کی سزا بھی دے دیتی تو ملزم اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کرتے ہی کرتے اس لئے موت کی سزا دینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ لیکن ممکن ہے عدالت کے کٹھ پتلی جج نے سوچا ہو کہ فی الحال بنگلہ دیش میں عدلیہ کی حالتِ زار کے پیشِ نظر یہ ملزمین عدالتِ عالیہ کا رخ ہی نہ کریں۔ شہید عبدالقادر ملا کے معاملے میں بنگلہ دیش کی عدالت نے وہ کیا اس مثال دینے سے دنیا قاصر ہے۔ عام طور پر اونچی عدالت میں نچلی عدالت کا فیصلہ بحال رکھا جاتا ہے یا سزا میں تخفیف ہوتی ہے لیکن بنگلہ دیش میں عدالتِ عالیہ نے عمر قید کی سزا کو سزائے موت میں تبدیل کرکے فوراً اس پر عملدرآمد کروادیا اس لئے کہ اس کی مدد سے شیخ حسینہ کو انتخاب میں کامیابی حاصل کرنی تھی۔

شیخ حسینہ نے اس ظلم کی مدد سے انتخاب میں کامیابی تو حاصل کی لیکن اس کا جشن نہیں مناسکیں اس لئے کہ حزب اختلاف کے اتحاد نے انتخاب کا اس قدر موثر بائیکاٹ کیا کہ پارلیمان میں تین چوتھائی ارکان کی موجودگی کے باوجود حسینہ کہنا پڑا اگر بی این پی گفت و شنید کیلئے راضی ہوجائے تو دوبارہ انتخاب کسی بھی وقت ہو سکتے ہیں۔ اس بیان میں وہ اعتراف پوشیدہ ہے کہ ابھی حال میں جو کچھ ہوا ہے وہ انتخاب نہیں بلکہ کچھ اور ہی تھا۔ اسکے جواب سابق وزیر اعظم

خالد ہضیاء نے کہا وہ عملاً اپنے گھر میں نظر بند ہیں اور حزب اختلاف کو آئے دن مظالم کا شکار کیا جارہاہے۔ اس لئے حالات کی تبدیلی کے بغیر دوبارہ انتخابات کا انعقاد بے معنی ہے۔ بنگلہ دیش کے حالات بتدریج بگڑ رہے ہیں اس لئے حلف.برداری کے بعد بھی شیخ حسینہ کو اپنا منافقانہ بیان دوہرانے پر مجبور ہونا پڑا اور اس نے کہا وہ جمہوریت بقاء کیلئے سرگرم رہیں گی اور اتفاق رائے ہوجانے کے بعد کسی بھی اقدام سے پس و پیش نہیں کریں گی اس بیان میں بھی دوبارہ انتخاب کا اشارہ موجود ہے لیکن شیخ حسینہ کے اڑیل رویہ کے سبب جس اتفاق رائے کی وہ دہائی دے رہی ہیں وہ کب اور کیسے ہوگا یہ کہنا نہایت مشکل ہے؟ بقول شاعر

امید وصلنے دھوکے دیئے ہیں اسقدر حسرت

کہ اس کافر کی 'ہاں' بھی اب 'نہیں' معلومہوتی ہے

بنگلہ دیش کی عوام کو انتخاب کے عمل میں خاصی دلچسپی ہے۔ ۲۰۰۸ء میں ۸۳ فیصد رائے دہندگان نے اپنا حق استعمال کیا تھا۔ لیکن اس بار بائیکاٹ کے سبب آزاد ذرائع کے مطابق پولنگ صرف ۱۰ فیصد کے آس پاس تھی۔ ۱۵۳ حلقہ ہائے انتخاب میں بلا مقابلہ عوامی لیگ کا امیدوار جیت گیا بقیہ ۱۴۷ میں مقابلہ خود اس کے اپنے حلیفوں یا جعلی آزاد امیدواروں کے ساتھ تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایوان حکومت میں موجود ۳۰۰ میں سے ۲۳۲ ارکان پارلیمان کا تعلق عوامی لیگ سے

ہے۔ اس بار ہندوستان کے علاوہ کسی عالمی تنظیم مثلاً اقوام متحدہ، یوروپی یونین یا دولتِ مشترکہ تک نے اپنے مشاہد نہیں بھیجے اور ان انتخابات کو سراہنے والی بھی صرف بھارتی سرکار تھی۔ انتخاب کے دن ۲۰ مظاہرین کو پولس نے ہلاک کردیا اور اکتوبر کے بعد سے تقریباً ۲۰۰ لوگ ہلاک ہوئے۔

بنگلہ دیش کی تاریخ کا سب سے زیادہ پرتشدد سال رہا۔ اس میں شیخ حسینہ نے ۲۰۱۳ء معصوموں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ بے قصور عوام کا لہو سڑکوں پر بہتا رہا اور ۵۰۰ سربراہِ مملکت ۱۹۷۱ء کے زخموں کو تازہ کرکے بے گناہ لوگوں پر مقدمات چلاتی رہی۔ ان مقدمات پر ساری دنیا کے حقوق انسانی کی تنظیموں نے لعنت ملامت کی اقوام متحدہ کے علاوہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی عدالت کے طریقۂ کار پر اعتراض کیا۔ اس دوران ججوں سے ساز باز کے منظر عام پر آجانے سے بھی حکومت کی سبکی ہوئی لیکن ساری خواری سے بے نیاز حکومت بنگلہ دیش اپنے سیاسی مقاصد کے حصول میں سرگرم رہی اور اس نے عبدالقادر ملا کو تمام تر مخالفت کے باوجود شہید کردیا۔

شیخ حسینہ واجد کے مظالم کا شکار نہ صرف اسلام پسند لوگ رہے بلکہ حقوق انسانی کیلئے کام کرنے والی تنظیم ادھیکار کے دفتر کو خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں نے توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا۔ اس کے ذمہ داران عادل الرحمٰن اور

نصیرالدین اعلان کو گرفتار کرکے سائبر جرائم کی عدالت میں پیش کردیا گیا۔ حکومت پر تنقید کرنے والے صحافیوں کو ظلم و جبر کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ ایک بلاگر کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ حکومت کی سفاکی اس حد تک بڑھی کہ رانا پلازہ فیکٹری میں جو لوگ جل کر ہلاک ہوئے ان کے ورثاء تک کو ہرجانہ مانگنے کے جرم میں پولس ۱۱۰۰ گولیاں سے دوچار ہونا پڑا۔ بی این پی کے سکریٹری جنرل مرزہ فخرالاسلام عالمگیر نے حکومت پر الزام لگایا کہ اب اس نے ان لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائی شروع کردی ہے جنھوں نے انتخاب کا بائیکاٹ کیا تھا۔ عام لوگوں کو نہ صرف ستایا بلکہ ہلاک کیا جارہا ہے۔ سادے لباس میں پولس والے شب خون مارتے ہیں عوام کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور انہیں جھوٹے مقدمات میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ عالمگیر کے مطابق ۴۲ رجسٹرڈ سیاسی جماعتوں میں سے صرف ۱۲ نے حالیہ انتخاب میں حصہ لیا مرزہ فخرالاسلام نے الزام لگایا کہ عوامی لیگ ایک دہشت گرد جماعت ہے اور وہ دہشت گردی کی مدد سے اقتدار پر قابض رہنا چاہتی ہے۔ عوامی لیگ پر لگائے جانے والے ان الزامات کا سب سے بڑا ثبوت دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں بے قصور لوگوں کو سنائی جانے والی سزائے موت ہے لیکن شیخ حسینہ اور اس کے دیوانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اسیمانند: اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے (قسط اول

سوامی اسیمانند نے دو سال قبل اعتراف جرم کر کے مسلمانوں کو خوش کر دیا تھا اور مجھ جیسے لوگ بے ساختہ پکار اٹھے تھے " ببول کی شاخ پر گلاب کا پھول " لیکن اس طویل عرصے میں جبکہ نہ صرف خوشبو بلکہ ساری پنکھڑیاں اور پتے تک بکھر گئے اور چمن میں صرف خار ہی خار رہ گئے تو پھر ایک بار کارواں جریدے کی مدیر منتظم لینا گیتا رگھوناتھ کا ایک طویل مضمون بادِ نسیم بن کر نمودار کیا ہوا کہ مسلمانوں کی باچھیں کھل گئیں۔ اس مضمون کا عنوان "مومن" ہے۔ دین اسلام کا نہیں بلکہ ہندو دھرم کا شردھالو۔ اس نئے مضمون میں سوائے اسیمانند کی جانب سے ان دھماکوں کو حاصل سرسنگھ چالک موہن بھاگوت کے آشیرواد کے سوا کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ اس اعتراف کے سبب امت مسلمہ یکایک سکون کا سانس لیا اور اس کے ذریعہ کانگریس پارٹی کی تمام بے اعتنائیوں پر پردہ ساپڑ گیا۔ لوگوں کو ایسا لگنے لگا کہ دو سال سے سویا ہوا شیر بیدار ہوا چاہتا ہے اور اسی کے ساتھ انصاف کی توقعات روشن ہونے لگیں۔ اس دوران افضل گرو، اجمل قصاب اور مرزہ حمایت بیگ کیلئے پھانسی کی سزاؤں کا اعلان تو سننے میں آیا تھا مگر کسی پروہت، پرگیہ کندنانی یا بجرنگی کیلئے یہ الفاظ سننے کیلئے کان ترس گئے تھے۔

نام نہاد دانشورانِ ملت پر اس مثبت اشارے کا اثر یہ ہوا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگے لو سنگھ پریوار کا دہشت گرد ہونا ثابت ہوگیا۔ اس سے آگے بڑھ کر جو شسیاسی رہنما سر سنگھ چالک موہن بھاگوت کی گرفتاری کا بچکانہ مطالبہ کرنے میں جٹ گئے حالانکہ سنگھ پریوار پر دہشت گردی کا الزام ثابت کرنے کیلئے تو گاندھی جی کا قتل ہی کافی تھا اور سوچنے والی بات یہ ہے کہ جو کانگریسینامرد سرکار فرد جرم میں نامزد عاملہ کے رکن اندریش کمار کو قومی تفتیشی ایجنسی کے سامنے حاضر کرنے کی جرأت نہ کر سکی وہ بھلا آر ایس ایس کے سربراہ کو کیا گرفتار کرے گی؟ آزادی کے ۷۰ سال بعد بھی ہم جمہوری نظام کا یہبنیادینقطہنہیں سمجھسکے کہاس میں اقلیتوں کی خوشامد کا شور وغوغا تو بہت ہوتا ہے مگر اس کی آڑ میں صرف اور صرف اکثریتی طبقہ کی ہی دلجوئی کی جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس خبر کے باعث سنگھ کے اندر جو سراسیمگی پھیلی ہے اسی نے مسلمانانِ ہند کا پیمانۂ مسرت کو چھلکا دیا ہے۔

کارواں کے سرورق کی تحقیقی کہانی ویسے بالکل بے فائدہ بھی نہیں ہے۔ دو سال کے طویل عرصے میں گیتا نے جس صبر و تحمل کے ساتھ طرح سوامی اسیمانند کے ذہن کو کرید کرید کر اس کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اپنے طویل مقالے کو دیگر متعلقہ معلومات سے آراستہ کرکے جس خوبصورت انداز میں اس نے پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک شاہکار ہے۔ اس کے ذریعہ سے

مسلمان اپنے دشمن کے ذہن کے اندر جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی نفسیات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس کے طریقۂ کار کو جان سکتے ہیں۔اس کی کمزوریوں کا ادراک کرکے ان سے فائدہ اٹھانے کی سبیل کر سکتے ہیں اوراس کی خوبیوں کو معلوم کرکے ان کا توڑ ایجاد کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ملت کو درپیش سنگین مسائل کا حل محض شکوہ شکایات یا مطالبات و مناجات سے نہیں ہوگااور نہ جذباتی نعرے و انتخابی جوڑ توڑ کوئی خاص فائدہ پہنچائے گی بلکہ اس کیلئے دشمن کی حکمت عملی کا گہرائی سے مطالعہ کرکے دین حنیف کی روشنی میں اپنا لائحۂ عمل تیار کرنے اور اس پر اخلاص و ایثار کے ساتھ عمل پیرا ہونا ناگزیر ہے۔

نابا کمار عرف اسیمانند کا جنم ایک گاندھی بھگت و بھوتی بھوشن سرکار کے گھر میں ہوا۔ رام کرشن مشن کے مؤسس و مشہور ہندو مفکر رام کرشن پرمنس جن کا نعرہ تھا ”رستے الگ الگ ہیں ٹھکانہ تو ایک ہے“ کے گاؤں کمرپوکور کا یہ نونہال سب سے پہلے پرمنس کے شاگردِ رشید سوامی وویکانند سے متاثر ہوا۔ مشن کے آشرم میں بھکتی گیت سنتے گاتے جوان ہوا۔ یہ سارے عوامل سنگھی ذہنیت کے خلاف تھے اس کے والد کی بھی خواہش تھی کہ وہ مشن کے خدمتِ خلق کے کاموں میں اپنی زندگی کھپا دے مگراس سے علی الرغم اس نے سنگھ پریوار کیلئے اپنی زندگی وقف کردی اور اب موت کو گلے لگانے پر شاداں و فرحاں ہے؟ یہ انقلاب کیوں کر

برپا ہوا؟ اس پیچیدہ سوال کا جواب مذکورہ مقالے میں پنہاں ہے۔ ایمانند نے گیتا کو بتلایا کہ جب میرے والد کو پتہ چلا کہ میں اور میرا بھائی آرایس ایس کے نظریے سے متاثر ہیں تو انھوں نے ہمیں سمجھایا کہ دیکھو یہ تنظیم گاندھی جی کی قاتل ہے اس لئے میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس سے تمہیں خبردار کردوں۔

گاندھیائی باپ کی پندو نصائح بیٹوں پر اثرانداز نہ ہوسکیں۔آرایس ایس کے مقامی رہنماؤں سے متاثر ہو کر نابا کمار کا بڑا بھائی سنگھ کا ہمہ وقتی کارکن بن گیا۔آرایس ایس نے اپنا کام بڑھانے کی خاطر ایکناتھ راناڈے اور بنست کمار بھٹ کو ناگپور سے بنگال بھیجا تھا۔ بھٹ کی خوش اخلاقی اور راناڈے کی ذہانت نے ایک اجنبی صوبے میں نوجوانوں کا دل جیت لیا تھا۔ یہ سارے لوگ چونکہ سوامی وویکا نند کے مقلد تھے اس لئے ایکناتھ راناڈے نے ان نوجوانوں کو رجھانے کیلئے وویکا نند کی تعلیمات کا سہارا لیا۔ راناڈے سوامی وویکا نند کی تعلیمات و خطبات پر ایک کتاب تصنیف کی اور نوجوانوں کے یہ سمجھایا کہ وویکا نند نے ہندو قوم کو مخاطب کرکے یہ نعرہ لگایا تھا کہ اٹھو! بیدار ہوجاؤ! اوراس وقت تک نہ بیٹھوجب تک کہ مقصد حاصل نہ ہوجائے۔

راناڈے کے مطابق سوامی وویکانند سیکولر خیالات کے حامل نہیں تھے بلکہ رام کرشن مشن نے سرکاری فنڈ حاصل کرنے کیلئے ان کی تصویر کو مسخ کرکے انہیں سیکولر بنا دیا۔ رام کرشن مشن میں تمام مذاہب کے تئیں رواداری کا ماحول تھا۔ عید اور کرسمس کا تہوار بھی منایا جاتا تھا لیکن راناڈے نے سمجھایا کہ یہ روایت سوامی وویکانند کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وویکانند نے تو کہا تھا کہ ''کسی فرد کے ہندو مذہب ترک کردینے سے نہ صرف ایک آدمی کم ہوتا ہے بلکہ ایک دشمن کا اضافہ بھی ہوجاتا ہے''۔ اس انکشاف نے نابا کمار کو رام کرشن مشن سے پوری طرح بدظن کردیا۔ اس کی فکر و نظر میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اس نے پھر کبھی بھی مشن کا رخ نہیں کیا۔ اپنی ایم ایس سی کی پڑھائی چھوڑ کر وہ سنگھ کا ہمہ وقتی کارکن بن گیا۔ آرایس ایس کی اس حکمت عملی کا توڑ جب تک پیدا نہیں کیا جاتا اس وقت تک اسیمانند جیسے مخلص اور فعال نوجوانوں کو اس کے چنگل میں پھنسنے سے بچایا نہیں جاسکتا۔

اپنے نصب العین سے اسیمانند کے لگاؤ کا یہ عالم ہے کہ فی الحال اس پر سمجھوتہ ایکسپریس کے علاوہ حیدرآباد کی مکہ مسجد اور اجمیر کی درگاہ میں بم دھماکوں میں قتل، مجرمانہ سازش اور بغاوت کے الزامات ہیں۔ دہشت گردی کی ان وارداتوں میں کم از کم ۸۲ بے گناہ ہلاک ہوئے۔ اس کے علاوہ مالیگاؤں کے دونوں بم دھماکوں میں ملوث ہونے کا الزام بھی اس پر ہے لیکن اس کی باقاعدہ

فرد جرم میں اس کا نام شامل نہیں کیا گیا ہے لیکن اگر کل کو یہ بھی ہو جائے تو کل ملا کر ۱۱۹ لوگوں کے قتل میں وہ شریک رہا ہے اس لئے اس کو موت کی سزا سنائی جا سکتی ہے۔ ان دھماکوں کے علاوہ ڈانگ ضلع میں اس نے جو قتل غارتگری مچائی اور معصوم لوگوں کو تہ تیغ کیا اس کو تو سرے سے جرم ہی نہیں سمجھا گیا اس لئے کہ وہ سب دھرم کی رکشا کرنے کیلئے کیا گیا تھا۔

اسیمانند کو نہ تو قتل و غارتگری پر کوئی افسوس ہے اور اس کیلئے ملنے والی سزا پر حزن و ملال ہے۔ جس فاسد نظریئے کے مطابق اس نے زندگی گزاری اس پر اسے فخر و ناز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جیل کے لوگ یہ نہیں جانتے کہ میں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا؟ میں ان حملوں میں ملوث ہوں یا نہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ جو بھی اچھا ہی ہوا اور جس نے بھی کیا اچھا کام کیا۔ اسیمانند نے بلا کسی ندامت کے گیتا کو بتلایا اسی امبالہ جیل میں ناتھورام گوڈسے اور نارائن آپٹے کو موہن داس گاندھی کا قتل کرنے کے سبب پھانسی دی گئی اور یہیں ان آخری رسومات ادا کی گئیں۔ وہ سینہ پھلا کر کہتا ہے کہ جس کمرے میں مجھے رکھا گیا ہے وہیں ناتھورام کے بھائی گوپال گوڈسے نے ۱۸ سال کی سزا کاٹ چکا ہے۔ اپنے انجام سے متعلق اس کی پیشن گوئی یہ ہے کہ میرے ساتھ جو بھی ہو وہ ہندوؤں کیلئے باعثِ خیر و برکت ہوگا۔ لوگوں میں ہندوتوا کا جذبہ پیدا ہوگا۔

بظاہر اپنی گفتگو سے ایسمانند نے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے نہ کوئی افسوس ہے اور نہ وہ اپنی موت سے خوفزدہ ہے لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ گجرات کے شبری آشرم سے فرار ہو کر ہری دوار کے باہر ایک گمنام گاؤں میں فرضی نام سے روپوش نہ ہوا ہوتا بلکہ اندریش کمار کی مانند بے خوفی کے ساتھ دندناتا پھر رہا ہوتا۔ایسمانند کو جب ڈھائی سال قبل سی بی آئی کے اہلکاروں نے دھر دبوچا تو دسمبر ۲۰۱۰ء اور جنوری ۲۰۱۱ء کے اندر اس نے دہلی اور ہریانہ کی عدالتوں میں اپنے جرائم کے اعتراف کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت اسے ۲۴ گھنٹے تک عدالتی حراست میں رکھا گیا تھا تاکہ سوچ سمجھ کر بغیر کسی دباؤ کے اپنا بیان درج کرائے۔

ایسمانند نے اس وقت کسی وکیل کا تعاون لینے سے انکار کردیا تھا لیکن بعد میں اس بیان کے ذرائع ابلاغ میں آجانے سے وہ بدحواس ہوگیا اور ہندو دہشت گردی پر ذرائع ابلاغ میں چھڑنے والی بحث نے اسے بے چین کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوماہ بعد وہ دباؤ کا الزام لگا کر اپنے بیان سے مکر گیا۔ اب اس کے ساتھ سنگھ پریوار کی جانب سے مہیا کردہ وکلاء کی فوج تھی ۔ اس کے مطابق اس بیان کو فاش کرکے ہندتوا کو بدنام کرنے کی اور اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔گیتا کے ساتھ اپنی گفتگو میں ایسمانند نے تسلیم کیا کہ اس پر کوئی زورزبردستی نہیں کی گئی تھی ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے

کہ جب مکر جانا تھا تو آخر اس نے اعترافِ جرم کیا ہی کیوں ؟ اس کی دو وجوہات اس نے بیان کیں اول تو یہ کہ پولس کو سب کچھ پتہ چل چکا تھا۔ تمام ہی مشتبہ لوگ پولس کے چنگل میں آچکے ہیں اور میں اس زنجیر کی آخری کڑی ہوں اور مجھے بھی دھماکوں کے الزام میں گرفتار کر ہی لیا گیا ہے تو سوچا کہ سب کچھ بول دینے کا یہ اچھا موقع ہے۔ دوسری وجہ ایمانند نے یہ بتائی کہ مجھے پتہ تھا میں پھانسی پر لٹکا دیا جاؤں گا لیکن ویسے بھی بوڑھا ہو چکا ہوں۔

ان تفصیلات کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ تیسری سب سے اہم وجہ ایمانند نے چھپالی ہے۔ ممکن ہے اسے خفیہ ایجنسیوں نے وعدہ معاف گواہ بنانے کا لالچ دے کر اعتراف کرالیا ہو لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے بیان پر سیاست کی روٹیاں سینکی جارہی ہیں تو لامحالہ اسے اپنا بیان بدلنا پڑا اس لئے کہ اب اس کی حالت نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کی سی ہو گئی تھی۔ اس اعتراف جرم کو لے کر مکہ مسجد دھماکے میں گرفتار ایک نوجوان کلیم کا نام کافی زور شور سے گونجا تھا اور یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ کلیم کی خدمت نے ایمانند کا ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اس کا تغیرِ قلب ہو گیا جو آگے چل کر اس کے اعتراف کا سبب بنا۔ جب اس بابت ایمانند سے پوچھا گیا تو اس نے اس واقعہ سے صاف انکار کردیا۔ وہ بولا کلیم کو پتہ تھا کہ وہ بھی اسی جیل میں ہے لیکن ان دونوں کی

سرے سے ملاقات ہوئی ہی نہیں۔ پولس نے ایک جھوٹی کہانی اڑائی جو بہت بڑی خبر بن گئی ۔ ایسمانند نے شرارتاً مسکرا کر پوچھا کہ کیا وہ کسی مسلم نوجوان کے تعلق اس طرح کی بات کر سکتا ہے؟

ایسمانند کا دماغ کس قدر خراب ہے اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے اعترافِ جرم کے بعد صدرِ پاکستان کو لکھا۔ ایسمانند نے اس خط میں لکھا تھا اس سے پہلے عدالت مجھے پھانسی پر لٹکا دے میں حافظ سعید، ملا عمر، جہادی دہشت گرد رہنما اور پاکستان میں موجود جہادی دہشت گردوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں ۔ اس کیلئے یا تو آپ ان لوگوں کو میرے پاس روانہ کریں یا حکومتِ ہند سے کہہ کر مجھے اپنے پاس بلوائیں ۔ اس احمقانہ پیش کش سے قبل اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے ایک خط صدرِ مملکت کو بھی قلمبند کیا تھا۔ اگر ایسمانند اپنی پاکستان والی پیش کش ہندوستانی صدر کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مطالبہ کرتا کہ سنگھ پریوار کے سارے دہشت گردوں کو میری خدمت میں بھیجا جائے تاکہ میں ان کی اصلاح کرسکوں تو کوئی بات بھی ہوتی لیکن جو خود سراپا اصلاح کا محتاج ہے وہ بھلا دوسروں کی اصلاح کیا کرے گا؟ اب اس کی اور اس کے چیلوں کی اصلاح کا سامان سوائے پھانسی کے پھندے کے کوئی اور نہیں ہے۔

اسیمانند ویسے خوش قسمت ہے جو جیل کی چہار دیواری میں محفوظ ہے وگرنہ باہر کی دنیا میں سنیل جوشی جیسے ہندو یودھا کو قتل کردیا گیا ہے۔جب اسیمانند نے کرنل سری کانت پروہت سے اس کے متعلق دریافت کیا تو اسے بتایا گیا چونکہ اس نے ایک قبائلی رہنما اور ایک کانگریسی لیڈر کے بیٹے کا قتل کیا تھا اس لئے ممکن ہے اسے بدلے کی غرض سے قتل کردیا گیا ہو۔ یہ نہایت احمقانہ دلیل ہے جس سے اسیمانند نے اپنے آپ کو بہلا لیا۔
سنیل جوشی کے ساتھ رہنے والے گھنشیام ، استاد، میہول اور راج بھی اس کے قتل کی تاریخ سے لاپتہ ہیں۔آخرالذکر دونوں ملزمین پر بسٹ بیکری میں ۱۴ بے گناہوں کو زندہ جلا کر مار دینے کا الزام بھی ہے۔ ان کے علاوہ ڈانگے اور کالسنگارے جو سمجھوتہ دھماکے میں براہِ راست ملوث ہیں دس لاکھ روپے کے انعام کے باوجود کہیں نظر نہیں آرہے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ ان تمام لوگوں کو آرایس ایس نے اپنے لئے خطرہ جان کر سنیل جوشی کے پاس روانہ کردیا ہوگا۔ کل کو اگر اسیمانند جی بھی باہر آتے ہیں تو ان کا بھی ٹکٹ کٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اس لئے اسی کی بھلائی اس میں ہے کہ پاکستان کے بجائے اپنے پریوار کی چنتا کرے ورنہ اس گھر کو گھر کے ہی چراغ سے آگ لگ جائیگی اور اس میں اس کا پتا بھی اوم سواہا ہو جائیگا۔
(جاری)

ایمانند: داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ (قسط دوم)

ایمانند کی آپ بیتی میں دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کیلئے جو سامانِ عبرت ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو اس نے خود اپنے دھرم کی رکشا اور اس کی تبلیغ و ترویج کا کام کیسے کیا؟ دوسرے اس نے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت پر کس طرح قدغن لگائی؟ ملت میں چونکہ دعوت کا رحجان بڑھ رہا ہے اور ہمارا مخاطب بھی وہی معاشرہ ہے جس میں ایمانند جیسے لوگ کام کرتے ہیں اس لئے ضروری ہے ہمیں ان کے طریقۂ کار کا علم ہو۔ مشرق بعید کی ریاستوں میں عیسائی مشنریوں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے سنگھ پریوار پریشان تھا اس لئے قبائلی عوام میں کام کرنے کیلئے آر ایس ایس نے عیسائیوں کی طرز پر ونواسی وکاس آشرم نامی تنظیم قائم کی۔ یہ تنظیم بھی آدیباسی علاقوں میں اسکول، ہاسٹل، کھیل کا میدان اور امدادی دواخانہ بناتی تھی اور اس میں طلباء کو تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد و نظریات سے روشناس کراتی تھی۔ دراصل قبائلی لوگ نہ تو ہندو تھے اور نہ عیسائی انہیں جو بھی اس کے مذہب کی جانب بلاتا وہ نسبتاً آسانی سے اس کے ساتھ ہوجاتے۔ آر ایس ایس کا ہمہ وقتی کارکن بننے کے بعد ایمانند تقریباً دس سالوں تک پرولیا اور اس کے قرب وجوار کے قبائلی علاقوں میں سرگرم رہا۔

اسیمانند کی ملاقات ۱۹۸۸ء میں ونواسی آشرم کے سکریٹری بھاسکر راؤ سے ہوئی جس نے نوجوان نابا کمار کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اپنے صدر جگدیو رام اوریون کو مشورہ دیا کہ اسے دھرم جاگرن کی غرض سے انڈمان روانہ کیا جائے۔اس طرحا سیمانند کو پہلی بار اپنے جوہر دکھانے کا موقع انڈمان نکوبار کے جزیروں پر ملا جہاں ریاستِ چھتیس گڑھ سے ہجرت کرکے جانے والے اکثر قبائلیعیسائیت میں داخل ہو چکے تھے اور اسی بات نے سنگھ پریوار کو تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔اسیمانند نے وہاں جاکر دیکھا کہ جو قبائلی عیسائیت قبول کر چکے ہیں ان کے اندر ہنوز قدیم رسوم رواج کا چلن باقی ہے۔وہاں کے بزرگ نسل کا اپنی قدیم تہذیب سے ناطہ ابھی نہیں ٹوٹا ہے۔مجھ جیسا کوئی تند خوانسان ہوتا تو ان مرتدین سے بدظن ہو جاتااور ان پر لعنت ملامت کرکے واپس چلا آتا لیکن اسیمانند ان میں رل مل گیااور اسی ثقافتی سوراخ سے ان کے قلب و ذہن میں داخل ہوگیا۔

ہندومت کی جانب نو عیسائی قبائلیوں کوراغب کرنے کیلئے اسیمانند نے اس تہذیب و ثقافت کا سہارا لیا جس کے جراثیم ان کے اندر ہنوز موجود تھے۔اس نے ان بزرگوں سے کہا کہ مجھے چند نوجوان دیجئے جنہیں میں اپنے ساتھ لے جاکر قبائلی تہذیب (تہوار، رقص و سرود) سے آراستہ کرکے واپس لاؤں۔اس طرح ۶ نوجوان لڑکیوں کی ایک ٹیم تیار ہوئی جنہیں لے کر اول تو وہ کنیا کماری کے وویکانند مرکز میں لے گیا۔آر ایس ایس کے اس مرکز میں ان کو بھجن سکھائے

گئے اور ان کے دل سے حضرت مسیح کو نکال کر اس جگہ ہنومان کی مورت نصب کر دی گئی۔ اس کے بعد وہ انہیں جش پور کے قبائلی مرکز میں لے گیا جہاں تین ماہ تک ان کی تربیت کی گئی۔ انڈمان واپس آنے کے بعد وہ ان کی مدد سے جگہ جگہ پر ثقافتی و تفریحی ناٹک وغیرہ کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ یہ لڑکیاں جوان تھیں اس لئے سب سے پہلے ان کا نکاح کر دیا گیا۔ ان یاتراؤں اور روایتی رقص و سرود کے دوران چھوٹے بچوں کی ایک اور ٹیم تیار ہو گئی جنہیں لے کر اسیمانند پھر واپس آگیا اس طرح یہ کام پھیلنے لگا۔ اب اسیمانند نے گھر واپسی نام کی تحریک چلائی اور کثیر تعداد میں قبائلی لوگوں ہندومت کے اندر لانے میں کامیاب ہوگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ یہاں ہندوؤں کا کوئی مرکز نہیں ہے اس لئے اسیمانند نے پورٹ بلیر کے اندر پہلا مندر قائم کیا۔

پورٹ بلیئر مندر کمیٹی کی کرسیٔ صدارت پر خود براجمان ہونے کے بجائے اسیمانند نے اسے آر دامودرن نامی مقامی شخص کے حوالے کیا اور بشنو پدا رائے نامی بنگالی کو اس کا سکریٹری بنایا۔ اسیمانند نے کہا کرتا تھا مذہب کے ساتھ ساتھ سیاست بھی ہمارے کام کا ایک جز ہے ۱۹۹۰ء میں انڈمان سے ایک کانگریسی منورنجن بھکتر کن پارلیمان ہوا کرتا تھا۔ اسیمانند کی دعوتی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۹۹ء میں بشنو پدا رائے انڈمان کا پہلا بی جے پی رکن پارلیمان منتخب ہوا اور ۲۰۰۰ء میں دامودرن کو پورٹ بلیئر میونسپل

کاؤنسل کا متفقہ صدر منتخب کیا گیا گویا اس نے انڈمان میں سیاست سے دعوت کی فضا ہموار نہیں کی بلکہ دعوت سے سیاست کی ہوا بنائی۔

ہندو دھرم کی دعوت و تبلیغ کے طریقۂ کار عیسائیت کے بالکل برعکس تھا۔ اس کے اندر ہمدردی اور نرم خوئی کے بجائے سختی و سفاکی کے عناصر پائے جاتے تھے۔ ایمانند سونامی کے بعد ریلیف کے دوران رونما ہونے والا ایک واقعہ بڑے فخر سے بیان کرتا ہے کہ ایک عیسائی خاتون نے آکر ان کے کیمپ میں دودھ مانگا اس لئے کہ اس کا شیر خوار بچہ تین دن سے بھوکا تھا۔ سنگھی درندوں نے اس کی مدد کرنے سے انکار کردیا مگر وہ تقاضہ کرتی رہی تو اسے سوامی جی یعنی ایمانند کے پاس بھیج دیا گیا۔ ایمانند نے اس سے کہا میرے لوگوں کا رویہ درست ہے تجھے یہاں سے دودھ نہیں مل سکتا۔ اس سفاکی کے مظاہرے کی توضیح ایمانند کے ڈانگ میں دیئے گئے بیان سے یوں یوں ہوتی ہے کہ ہندوؤں کے دھرم پریورتن کو روکنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ مذہب کے حوالے سے انہیں کٹر (سخت گیر) بنا دیا جائے۔ باقی کام وہ خود کردیتے ہیں۔ اب ہمیں اپنا جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ ہماری کن حرکات سے ہندوؤں کے اندر اسلام کے تئیں کٹرپن میں اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے ہماری وہ ساری سرگرمیاں اپنے آپ ایمانند جیسے لوگوں کا بلا واسطہ تعاون بن جاتی ہیں۔

ہندوتوا کے نقطۂ نظر سے ایمانند نے دوسرا بڑا کارنامہ گجرات ضلع ڈانگ میں

انجام دیا جس کو ایک زمانے میں مغرب کا ناگالینڈ کہا جاتا تھا۔ ۱۹۹۱ء میں یہاں عیسائی آبادی کے اضافہ کی شرح بڑھ کر ۹ فیصد ہو گئی تھی۔ اسیمانند نے وہاں ۱۹۹۸ء میں قدم رکھا اور اسی سال عیسائیوں پر ۲۰ حملے ہوئے۔ اسیمانند بڑے فخر سے بیان کرتا ہے کہ ایک سال کے عرصے میں ہم نے ۳۰ چرچ مسمار کئے اور ۴۰ ہزار نو عیسائیوں کو ڈرا دھمکا کر ہندو بنا دیا۔ اس کامیابی کے پس پشت خوف و دہشت کے علاوہ اسیمانند کی سادگی، سخت کوشی اور قبائلی عوام کے ساتھ ملنے جلنے اور کھانے پینے کے عادات و اطوار کا بھی دخل تھا۔ اسیمانند کی محنت و مشقت اور یکسوئی جہاں اس میدان میں کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتی ہے وہیں ان واقعات بیں مدعوتدین

کاکامکرنے والوں کیلئے یہسبقہے کہاگر نوواردینکیتربیتکاانتظامٹھیکسے نہ کیا جائے تو معمولیسی آزمائش کے آجانے سے برسوں کے کئے کرائے پر منٹوں میں پانی پھر سکتا ہے جیسا کہ عیسائی مشنری کے ساتھ ہوا۔ دعوت دین کے نتیجے میں ایمان کے شجر کا قلب کے اندر راسخ ہونا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اسیمانند کی اس دہشت گردی کے خلاف سونیا گاندھی نے ڈانگ ضلع کا دورہ کرکے اس کی مذمت کی جس کے جواب میں آر ایس ایس نے اسیمانند کی حوصلہ افزائی کیلئے اسے گرو گولوالکر کے یاد میں دیئے جانے والے ''شری گروجی'' نامی تمغۂ امتیاز سے نوازہ۔ اس کے بعد نریندر مودی کی سرپرستی میں شبری کمبھ میلے کا

انعقاد کیا گیا جس میں اس وقت کے سر سنگھ چالک سدرشن ،ان کے سکریٹری موہن بھاگوت اوراندریش کمار سے لے کر پروین توگڑیا، اشوک سنگھل، شیوراج سنگھ چوہان ، مراری باپو، بدنام زمانہ آسارام باپوکے ساتھ سادھوی رتھمبرا وغیرہ نے شرکت کی۔ اس میلے کو کامیاب بنانے کیلئے مدھیہ پردیش سے قبائلی عوام کوٹرکوں میں بھر بھر کر لایا گیا تھا جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے پانچ لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ اسیمانند کی شہ پر گجرات کی مودی سرکار نے تبدیلیٔ مذہب کے خلاف قانون وضع کردیا اور سیر وسیاحت کے نام پر سرکاری خزانے سے کروڑوں روپے ڈانگ ضلع کے اندر مندروں ، سڑکوں اور پارکوں کی تعمیر پر صرف کئے جانے لگے ۔ویسے تو یہ اسیمانند عروج کا زمانہ تھا لیکن تبدیلیٔ مذہبکو روکنے کیلئے دہشت ،دولت اوردستور کا بیجا اور بے دریغ استعمال بلا واسطہ طورپر عیسائی مشنری کے بالمقابل شکست کا اعتراف بھی تھا۔

ڈانگ میں اپنے قیام کے دوران اسیمانند کا میل جول اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کی شعلہ بیان نوجوان سادھوی پرگیہ ٹھاکراوراندور ضلع کے آرایس ایس جنونی اور جوشیلے رہنما سنیل جوشی سے ہوئی۔ ان لوگوں کی توجہات کا مرکز عیسائی مشنری کے بجائے مسلمان تھے۔جب پرگیہ اور جوشی نے اسیمانند سے پوچھا مسلمانوں کے ذریعہ اکشر دھام اور دیگر مقامات پر کئے جانے والے بم دھماکوں کا علاج کیا ہے تو اسیمانند کا جواب تھا’’بم کا بدلہ بم‘‘یہیں سے ہواکا

رخ بدلا۔ دھرم رکشا کی جگہ دھرم یدھ نے لے لی اور دیکھتے دیکھتے ایک برہماچاری سادھو دانستہ یانادانستہ طور پر خطرناک دہشت گرد گروہ کا فرد بن گیا۔

اس دہشت گرد گروہ کو ۲۰۰۵ء میں سر سنگھ چالک موہن بھاگوت اور ان کے دستِ راست اندریش کمار نے ڈانگ ضلع کے ایک خفیہ خیمہ میں اپنے آشیرواد سے نوازہ۔

بھاگوت نے اس وقت اسیمانند سے کہا تھا تم سنیل جوشی کے ساتھ اس مہم میں حصہ لے سکتے ہو۔ ہم اس میں شامل نہیں ہو سکتے لیکن سمجھو کہ ہم کہ تمہارے ساتھ ہیں۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ یہ کریں گے تو اس میں ہماری رضامندی ہے اور کچھ بھی غلط نہیں ہے۔ کرمنلائزیشن نہیں ہوگا۔ اگر تم نے یہ کارروائی کی تو لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ یہ کوئی مجرمانہ حرکت ہے اس لئے کہ یہ نظریئے کی خاطر یہ بہت ضروری ہے۔ تم اس کام کو ضرور کرو ہمارا آشیرواد تمہارے ساتھ ہے''۔ اسی حکمتِ عملی کے پیش نظر ۲۰۰۶ء کے شبری کمبھ میلے میں روح رواں ہونے باوجود اسیمانند نے اپنے آپ کو اسٹیج سے دور رکھا۔

اس گروہ میں تین طرح کے لوگ شامل تھے۔ اول تو جوشی، پرگیہ، ڈانگے کالسنگارے، شرما، گپتا جیسے آر ایس ایس کے سابق ذمہ داران۔ ان کے علاوہ گجرات کے فسادات میں ملوث فراری مجرم مثلاً راج اور میہول وغیرہ جو بیسٹ

بیکری کی قتل و غارتگری میں مطلوب تھے۔ لیکن ان کے ساتھ کچھ نئے لوگ بھی شامل ہو گئے مثلاً کینیڈا سے آنے والا بھرت راٹیشور، ابھینو بھارت کے کرنل سری کانت پروہت اور سوامی دیانند پانڈے وغیرہ۔ ان میں سے کرنل پروہت توڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہے کہ وہ ڈبل ایجنٹ تھا اور اس کو افسران کی ہدایت پر اس کام میں لگایا گیا تھا۔ یہ بات قرینِ قیاس اس لئے بھی ہے فوجی تربیت گاہ کا استعمال بغیر اعلیٰ افسران کی ہدایت کے ناممکن ہے۔ وارانسی کا رہنے والے دیانند پانڈے جس کے تین نام ہیں ۲۰۰۳ء سے جموں کشمیر میں تعینات کرنل پروہت کے ساتھ رابطے میں تھا اور پولس ریکارڈ کے مطابق برابر وہاں آیا جایا کرتا تھا۔ اس ربط ضبط کے علاوہ دیانند پانڈے کا تمام منصوبوں کی تفصیلات کا ویڈیو ریکارڈنگ سمیت اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کرلینا شک کے دائرے کو اس کے گرد مزید تنگ کر دیتا ہے۔

اس گروہ کے ذریعہ کئے جانے والے یکے بعد دیگرے مختلف دھماکوں کا سلسلہ بالآخر پرگیہ، پانڈے، پروہت، راٹیشور اور اسیمانند کی گرفتاری پر منتج ہوا۔ ان گرفتار شدگان کے علاوہ باقی تمام ارکان گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہیں۔ اس پکڑ دھکڑ کے بعد نوساری کے اونائی مندر کو تو حکومت نے ۶۳،۳ کروڑ روپے خرچ کرکے تعمیر کردیا لیکن اس کے قریب موجود قدرتی گرم پانی کا چشمہ جو زائرین کی کشش کا بنیادی سبب تھا اچانک پہلی بار خشک ہو گیا۔ اسی کے ساتھ

اسیمانند کا شبریدھا مندر بھوپرانھو گیا۔ وہ آشرم جہاں اسیمانند رہا کرتا تھاڈھادیا گیا۔
اسیمانند کی گرفتاری کے بعد گجرات کے خوشحال بھکتوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار
کرلی اوراب یہ حال ہے کہ مہاراشٹر سے آنے والے غریب عقید تمندوں
کے چندے سے مندر کے پجاری کا گزارہ تک نہیں ہوتا۔ جب کارواں جریدے کی مدیرہ
گیتانے اسیمانند سے آشرم کی بربادی کا سبب دریافت کیا تو اس نے تسلیم کیا کہ ''وہ میری
غلطی تھی میں اسے ٹھیک سے تعمیر نہیں کرسکا تھا''۔ دراصل قصوروار تعمیر نہیں بلکہ
تخریب ہے۔ اسیمانند کی تخریب کاری نے اسکے آشرم کو کھنڈربنادیا۔ اسیمانند کو جیل کی
کوٹھری میں بیٹھ کر اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ حکومت اور اس کی خفیہ ایجنسیوں
نے کس طرح اس کو ساتھیوں سمیت اپنے مفاد میں استعمال کرکے اس کے سامراج کو
تتر بتر کردیا اور اگر ممکن ہوسکے تو اس کا اعتراف بھی کرنا چاہئے لیکن اسیمانند جیسے
بزدل سے اس کی امید کم ہے۔
کرنل پروہت اور پرگیہ سنگھ ٹھاکر کی گرفتاری کو تقریباً تین سال کا طویل عرصہ گزر چکا
ہے۔ اس کے بعد کئی اور گرفتار ہوئے لیکن کانگریس کی مرکزی حکومت ان میں سے کسی
کا بال بیکا نہ کرسکی۔ قومی تفتیشی ایجنسی کے وشال گرگ نے گیتا کو بتلایا کہ سپریم
کورٹ کی جانب سے قانونی موشگافیوں کا سہارا لے کر انہیں سنیل جوشی قتل کیس میں
پرگیہ اور پروہت کی تفتیش سے روک

دیا گیا ہے۔ یہ پوچھے جانے پر کہ وہ اندریش کمار سے تفتیش کیوں نہیں کرتے گرگ کا کہنا ہے کہ وہ داخلی معاملہ ہے میں اس بابت زبان نہیں کھول سکتا۔ اندریش کمار کو حکومت کی کمزوری نے اس قدر منہ زور بنا دیا ہے کہ وہ کہتا ہے اگر میرے خلاف شواہد موجود ہیں تو مجھے گرفتار کیوں نہیں کیا جاتا۔ خفیہ ایجنسی کے ایک افسر نے گیتا کو وزارتِ داخلہ کی رپورٹ دکھلائی جس میں سفارش کی گئی تھی کہ ان دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہونے کے سبب کیوں نہ آر ایس ایس پر پابندی لگانے کیلئے وجہ بتاؤ نوٹس دی جائے لیکن اس پر بھی وزیر داخلہ کے دفتر سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی اس لئے ان دھماکوں نے جہاں سنگھ پریوار کو بدنام کیا ہے وہیں کانگریس کے حصے میں بھی ان کے سبب کوئی نیک نامی نہیں آئی۔

ہندو انتہا پسندوں کے دل میں کانگریس کا خوف تو نہیں ہے مگر نریندر مودی سے ان لوگوں نے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں جس کا اظہار اسیمانند کے بھائی اور خود اس نے بھی کیا۔ اسیمانند نے پھولچند بہلو کو بتایا کہ ''وہ دن دور نہیں جب ہم رہا ہو جائیں گے اور سنیل جوشی و پرگیہ جیسے لوگوں کا آغاز کردہ کام پھر سے جاری و ساری ہو جائیگا۔ یہ ضرور ہوگا اور ہو کر رہے گا''۔ گیتا کی ملاقات جب اسیمانند کے بھائی سشانت سرکار سے ہوئی تو اس نے کہا چند ماہ انتظار کرو جب نریندر مودی وزیر اعظم بن جائیگا تو میں گاؤں کے مرکز اسٹیج

لگا کر ساری دنیا کو بتاؤں گا کہ میرے بھائی نے کون کون سے عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ نریندر مودی وزیر اعظم بن بھی جاتا ہے تو وہ ان دہشت گردوں کی توقعات پر پورا اترے گا یا اپنے پیش رو ہندو انتہا پسند وزیر داخلہ اڈوانی کی مانند اپنی کرسی بچانے کیلئے ہندوتواوادیوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دے گا یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔

'!جب انتظار نعیم کو 'لگا کہ جنت اتر گئی ہے میرے گھر میں

جنت چونکہ زماں و مکاں کی قید و بند سے ماوراء ہے اس لئے ممکن ہے وہاں کی فضا آزاد نظموں کیلئے زیادہ سازگار ہو ویسے نظم و ضبط کے پابندی محترم انتظار نعیم صاحب کی اجتماعی مجبوری نہیں بلکہ انفرادی صفت ہے جس سے سر موانحراف ان کیلئے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے آنجناب سے آزاد نظموں کی توقع مجھ جیسے کوتاہ بین انسان کیلئے بہت مشکل تھی لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ انسان کے اندر چھپا ہوا منفرد شاعر کسی اجتماعیت میں ضم نہیں ہو سکتا ہے۔ شاعری کی فطرت میں انفرادیت اور آزادی دونوں شامل ہیں۔ شاعر کا طبعی وجود تو حدود و قیود کا پابند ہو سکتا ہے لیکن اس کی روح آزادی کی متقاضی ہوتی ہے اور جب اس پر قدغن لگے تو صدائے احتجاج کچھ اس طرح بلند ہوتی ہے

جو آزادی مرا پیدائشی حق ہے
لگی تھی اس پہ کیوں قدغن؟
یہ کیا طرز سیاست تھا کہ پابندی ہوئی نافذ
زبانوں پر بیانوں پر
ستم توڑا گیا کیوں اہل حق کے خاندانوں پر ؟

یہی وجہ ہے کہ انتظار نعیم صاحب کی آزاد نظمیں مجھے ان کے روحانی کرب کا اظہار لگتی ہیں جو ان کی اپنی ذات سے نکل کر حالات سے ہوتا ہوا کلُ کائنات تک پھیل جاتا ہے۔ تخلیق کے کرب و فرحت سے آراستہ 'بنے ہیں خواب کچھ میں نے' کی پہلی نظمایک غیر مولود بیٹی کی التجا ہے مگر حرفِ آخر خود ان کا اپنی ماں سے والہانہ اظہارِ عقیدت ہے ۔

میں ڈرتا ہوں
تمہاری بیش قیمت یاد کی دولت
کروں ظاہر کسی پر تو
کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے چھن جائے

اس نظم میں ایک لطیف احساس کی جس بیش بہا دولت کا تذکرہ ہے وہی اولاد کو اپنی ماں کے نظروں میں ہمیشہ بچہ بنائے رکھتی ہے لیکن جب کوئی عورت اس جذبۂ شفقت سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی اولاد کیلئے زندگی کے بجائے موت کی سوداگر بن جاتی ہےاوراس کی اولاد اس طرح فریاد کناں ہوتی ہے کہ ۔

مری امی مجھے دنیا میں آنے دو
میں ننھی سی سہی
لیکن بنے ہیں خواب کچھ میں نے

انہیں تعبیر پانے دو

مجھے دنیا میں آنے دو

اس میں شک نہیں کہ عصرِ حاضر میں اکثر پہلا بیٹا اس سفاکی کا شکار نہیں ہوتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا پرست اور آرزومند خواتین پہلی اولاد کو بھی بلا تفریقِ جنس ضائع کردینے سے پس و پیش نہیں کرتیں۔ تیسرے یا چوتھے لڑکے کے ساتھ یہ معاملہ بے دریغ ہوتا ہے۔ایک ایسے سفاک معاشرے میں جہاں اپنی اولاد تک بے رحمی سے دوچار ہو غیروں سے رحم و کرم کی توقع کرنا دیوانے کا خواب نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ جو سماج ایک معصوم سی بچی کے اس دنیا میں آنے کا روادار نہیں اس میں مظلوم و مقہور خواتین کی حالت کا بیان ایک اور نظم میں ملاحظہ فرمائیں ؁

کہ اس افسردہ عورت کے

ابھی تک سامنے ایک ڈھیر پتھر ہے

!اور اس کو توڑتے رہنا ہی بس اس کا مقدر ہے

ہمارے مہان بھارت میں غیر انسانی سلوک محض نادار صنف نازک تک محدود نہیں ہے بلکہ دلت سماج کے کروڑوں مرد و خواتین جبر و ظلم کی اس صدیوں پرانی چکی میں ہنوز پس رہے ہیں۔ پسماندہ سماج کی فلاح و بہبود انتظار نعیم صاحب کا خاص

موضوع ہے اور اس پر انھوں نے ہندی اور اردو میں کتابیں بھی لکھی ہیں۔ یہ مجموعہ بھی اس موضوع پر مؤثر نظموں سے خالی نہیں ہے۔

دلت گھروں میں پیدا ہونا
اب بھی خطا ہے
چار ہزار برس پہلے وہ
جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا ہے!
جینا جیسے ایک سزا ہے!

عصر حاضر میں اس سنگین مسئلہ کا شعور واحساس نہ صرف مٹتا جارہا ہے بلکہ اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ غیر انسانی بے حسی کا ایک نہایت ہی کربناک منظر ہمیں نظم ’ایکسڈنٹ‘ میں نظر آتا ہے جس میں ایک نوجوان کے سڑک حادثے میں موت پر وہاں موجود لوگوں کے تاثرات ان کی سنگدلی کی عکاسی کرتے ہیں۔

سب کے چہرے پہ تھی ناگواری عیاں
تھے لبوں پر یہ الفاظ جیسے رواں:
”جب بھی دیکھو یہاں اک نیا حادثہ
ختم ہوتا نہیں ’جام‘ کا سلسلہ
وقت اکثر ہے برباد ہوتا یہاں!“
الغرض جتنے منہ اتنے ہی تبصرے

اس سے بے فکر زخمی بچے یا مرے

چوک تھا جیسے اک مظہر بے حسی

آدمیت سے عاری تھا ہر آدمی

اس بے حسی کے عالم میں جبکہ عام انسانوں کا لہو ارزاں ہو چکا ہے اور مسلمانوں کا خون ناحق تو وطنِ عزیز میں سب سے بڑا پونیہ کاریہ (کار خیر) ٹھہرا دیا گیا ہے شاہد اعظمی کے بہیمانہ قتل پر معروف صحافیا جیتا ساہی کے اظہار غم پر انتظار نعیم اپنے مخصوص انداز میں ۔حیرت کا اظہار کر کے معاشرے کو کچھ اس طرح آئینہ دکھاتے ہیں کہ

ساہی کل تم کیوں روئے ؟

شاہد تو اک مسلمان تھا

اور مسلم کے قتل پہ رونا

اشک بہانہ

! میرے دیس کی ریت نہیں ہے

پھر تم نے کیوں توڑی ریت ؟

جب شاہد کا ذکر ہوا تو

ساہی کل تم کیوں روئے ؟

بولو ساہی ! کیوں روئے ؟

مسلمانانِ ہند کے سلگتے مسائل مثلاً فسادات، شہادت بابری مسجد، دہشت گردی کے الزامات، کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک ہونے والے نت نئے مظالم اور حکومت کی ان میں شمولیت و چشم پوشی کی داستان 'بنے ہیں خواب کچھ میں نے' کی مختلف نظموں میں نہایت دلنشیں انداز میں بیان ہوئی ہے لیکن وہ اس کیلئے جہاں فسطائی جماعتوں اور سیکولر حکومت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں وہیں ملتِ اسلامیہ کی بھی اپنے فرضِ منصبی سے غفلت پر گرفت کرتے ہیں۔اس نازک فریضے کو ادا کرتے ہوئے ان کی اپنائیت اور دردمندی دیکھیں کہ اپنے آپ کو سب کے ساتھ شامل کرکے فرماتے ہیں ۔

خدا کا شکر ہے
میں بھی مسلماں ہوں
مگر مجھ کو صفا جیسی کسی چوٹی پہ چڑھنے سے تکلف ہے
تڑپ مجھ میں نہیں کوئی کہ کیسے روشنی پھیلے
نہ طائف سی کہیں بھی سنگ باری ہی ہوئی مجھ پر
نہ میں نے پیٹ پر پتھر کبھی باندھا
نہ میں نے فلسفہ بدر و احد کا اب تلک سمجھا
میں پھر بھی ہوں سرورِ فتح مکہ کا تمنائی

اس نظم میں درمیان سے کئی مصرعہ میں نے طوالت کے سبب حذف کردیئے جن میں سیرتِ حضور اکرمؐ کا بیان نہایت خوبصورت انداز میں ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اس آزاد نظم کی روانی کسی پابند نظم کے اشعار کی مانند باقی رہتی ہے یہی ان نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ویسے ' لائن آف کنٹرول 'نامی نظم میں یہ غنائیت شباب پر ہے جہاں ایک کے بعد ایک دلنشیں مصرعے اس روانی کے ساتھ آتے ہیں کہ کسی پہاڑی جھرنے کا گمان ہوتا ہے۔اسلوب بیاں سے قطع نظر امت مسلمہ کی دگرگوں حالت کا ادراک رکھنے کے باوجود انتظار نعیم صاحب کسی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ امید جتاتے ہیں ۔

مگر میں پھر بھی پر امید ہوں ، غم خوار آئیں گے
مدینہ (پھر سے) دہراتے ہوئے انصار آئیں گے

انتظار نعیم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کے قائل نہیں۔ان کی دعا بھی دعوتِ عمل اور عزم و حوصلہ کی غماز ہے ۔

الٰہی !دے ہمیں توفیق
ہم بیدار ہو جائیں
ضرورت ہو اگر جانوں کا بھی نذرانہ دینے کی
تو ہم تیار ہو جائیں
الٰہی !ان درندوں کو خس و خاشاک کرنا ہے

مدد مولیٰ! زمیں سے ان کا قصہ پاک کرنا ہے

دعوت و عزیمت کی شاہراہ کے مراحل اور منزل کا یقین اس کتاب کی روح رواں ہے

جس کا اظہار مختلف انداز میں ہوتا ہے مثلاً۔

لہو، جو بہتا رہا ہے وہ سرخ رو ہوگا

خوشا! اے اہلِ وفا جشنِ آرزو ہوگا

بنے ہیں خواب کچھ میں نے' پر اپنے تاثرات کو میں اس نظم کے اقتباس پر ختم کروں گا'

جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ یہ نظم کے جی بی سے سبکدوش نو مسلم الیکزنڈر کی

شہادت پر خراج تعزیت ہے۔

الیکزنڈر!

خدا کی رحمتیں تم پر رہیں سایہ فگن ہر دم

کہ تم نے حق نوائی کی نئی تاریخ لکھی ہے

خدا کا قرب پانے کو

بغاوت کفر سے کی ہے

اسی کے مرکزِ الحاد نے تم کو سزا دی ہے

یہ حیرت ہے کہ وہ اب بھی نہیں واقف

کہ ظالم اپنی تدبیروں کی زد میں خود ہی آکر ٹوٹ جاتا ہے!

جو حق پر جان دیتا ہے

ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

کیجریوال نے مودی کو بھیگی بلی بنادیا

سیاسی جنگل میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شیر بڑے اہتمام کے ساتھ کسی خونخوار چیتے کے کچھار میں داخل ہو اور وہاں اس کا سابقہ گیدڑ سے پیش آجائے۔ کیجریوال نے ساری دنیا پر چیتے کی کھال میں چھپے ہوئے گیدڑ کا راز فاش کردیا۔ آگے چل کر الیکشن کا نتائج جو بھی نکلیں لیکن فی الحال یہ حقیقت ہے کہ اپنے گجرات دورے کے دوران اروند کیجریوال نے نریندر مودی کو ذرائع ابلاغ کے دنگل سے ناک آؤٹ کرکے باہر پھینک دیا ہے۔ کسی بھی کھیل کے مقابلے میں میزبان کی کامیابی سے زیادہ اہمیت مہمان کو حاصل ہونے والی فتح کی ہوتی ہے۔ ممبئی کی زبان میں اسے گھر میں گھس کر مارنا کہا جاتا ہے ایسا ہی کچھ اس دورے میں ہوا۔ مودی کے ساتھ ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ اکشر دھام مندر پر حملے کے وقت بھی اس کے اپنے گھر کے سامنے ہونے والی پولس کارروائی کئی گھنٹوں تک ساری دنیا میں نشر ہوتی رہی لیکن مودی گھر میں دبکا بیٹھا رہا جب سب کچھ ختم ہوگیا تو وہ باہر آیا۔ ایسے میں کیجریوال کا بیان کہ میں کوئی دہشت گرد تو نہیں ہوں جو مودی مجھ سے ملنے سے کترائیں نہایت معنی خیز ہو جاتا ہے۔

یہ مسئلہ مودی کا نہیں سنگھ پریوار اور بی جے پی کا ہے کہ وہ نازک صورتحال کا بروقت مقابلہ نہیں کرپاتی اور بعد میں کبھی اس پر پچھتاتی ہے تو کبھی الٹا اس کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ ماضی میں اس کی تین بڑی مثالیں سامنے آچکی ہیں ۔ بابری مسجد کی شہادت کے وقت یہ اپنے دہشت گردوں کو مشتعل کرکے وہ ایودھیا لے آئے اور ان کو قابو میں نہ رکھ سکے جس کا فائدہ نرسمھا راؤ نے اٹھا لیا۔ اس کے بعد اڈوانی کو خود ٹائمز میں مضمون لکھ کر اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا ۔ اس کے برخلاف مودی نے سابرمتی ایکسپریس میں لگنے والی آگ کا فائدہ اٹھا کر فسادات بھڑکائے اور اس کا سیاسی فائدہ خود حاصل کرلیا۔ سہراب الدین کو قتل کرکے اس پر بھی اپنی سیاسی روٹیاں سینکیں لیکن اب وہی تمغے اس کی پیشانی پر کلنک بنے ہوئے ہیں ۔ بی جے پی اپنی سب سے بڑی کمزوری کا ثبوت اس وقت دیا جب ائیر انڈیا کا جہاز کا اغواء ہوگیا۔ وہ جہاز ایندھن لینے کیلئے امرتسر اترا اس کے باوجود بی جے پی کی مرکزی و ریاستی حکومتیں اسے اڑنے سے روک نہیں سکیں۔ اور اس کے بعد یرغمالوں کو چھڑانے کیلئے وزیرخارجہ جسونت سنگھ کو بھیجنے کی فاش غلطی ان سے سرزد ہوئی جس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو خیر اٹل جی تھے جو جسونت کو روانہ کرکے مطمئن ہوگئے اگر مودی ہوتا تو ہاتھ جوڑ کر خود پہنچ جاتا ۔

گجرات جانے سے قبل کیجریوال نے اترپردش کا دورہ کیا تھا اور جب وہ کانپور

پہنچے تو مودی کی لکھنؤ میں اور ملائم کی الہ باد میں ریلی تھی حقیقت یہ ہے کہ اپنے بلند بانگ دعووں کے سبب جہاں لکھنؤ کا جلسہ ناکام رہا وہیں الہ باد کی ریلی کامیاب رہی اروند کیجریوال اس دورے میں کوئی خاص اثر مرتب نہیں کرسکے اس کے برعکس گجرات میں صورتحال یکسر بدل گئی۔ ایسا کیوں ہوا یہ سمجھنا ضروری ہے؟ مودی اور ملائم ہندوستانی سیاست کے روایتی کھلاڑی ہیں اور کیجریوال کی یاترا بھی روایتی قسم کی تھی اس لئے کیجریوال اس کھیل میں انہیں ہرا نہیں سکے لیکن گجرات کا دورہ نہایت غیر روایتی قسم کا تھا اور اس متبادل طریقۂ کار میں فی الحال ہندوستانی سیاست کے اندر اروند کیجریوال کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ کیجریوال اگر کوئی یاترا لے کر یا مختلف شہروں میں جلسوں کا منصوبہ بنا کر گجرات جاتے تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو یوپی میں ان کی مہم کا ہوا تھا لیکن اس بار انہوں نے اعلان کیا کہ میں ایک مطالعاتی سفر پر یہ جانچنے کیلئے گجرات جارہا ہوں کہ مودی کے ترقیاتی دعوے کس حد تک درست ہیں۔

ہندوستانی سیاستدان فی الحال ایسی کسی مشق میں دلچسپی نہیں رکھتے اس لئے دورے کے مقصد کی ندرت نے ذرائع ابلاغ کو اپنی جانب متوجہ کرلیا اروند کیجریوال کے نزدیک ترقی کا اپنا مخصوص معروضی نقطۂ نظر ہے۔ وہ عوامی فلاح و بہبود کو روایتی اعداد و شمار کے پیمانے پر نہیں پرکھتے بلکہ اس بابت

بدعنوانی، بنیادی عوامی سہولیات مثلاً تعلیم و صحت کی سہولیات کا فقدان ، کسان ، ان کی زمینوں کا معاوضہ، ان کے اندر خود کشی کے واقعات، نوجوان اوران کی بیروزگاری، چھوٹی صنعتوں کا بند ہونا، ماہی گیر، نمک بنانے والے غریب لوگ اور ان کے مسائل وغیرہ کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان موضوعات پر روایتی انداز میں ٹسوے بہانے کے بجائے وہ منتخب بستیوں میں پہنچ گئے اور لوگوں سے ان کی حالت زار دریافت کرنے لگے چونکہ ذرائع ابلاغ ان کا پیچھا کررہا تھا اس نے انہیں نشر کرنا شروع کردیا اور مودی کی قلعی کھلنے لگی ۔ اس مقصد کیلئے خاص طور پر ایسے علاقوں کا انتخاب کیا گیا تھا جو اس کسوٹی پر بری طرح پسماندہ ہیں اس لئے مودی کے غباروں سے ایک ایک کرکے ہوا نکلنی شروع ہو گئی مودی کا سارا زور چونکہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ خوش فہمی پیدا کرکے اپنی شخصیت کا لوہا منوانے پر ہے اس لئے وہ گھبرا گیا اور ڈرانے دھمکانے کی اپنی فطرت پر لوٹ آیا لیکن یہ چال الٹی پڑی اور کیجریوال کی گرفتاری بریکنگ نیوز بن گئی ۔ اور تو اور بی جے پی کے دہلی و لکھنؤ کے دفاتر پر عام آدمی پارٹی کے کارکنان جھاڑو لے کر پہنچ گئے ۔ بی جے پی کے غنڈوں نے ان پر حملہ کرکے مزید کام بگاڑ دیا ۔ اس ہنگامے نے اروند کیجریوال کو پھر ایک بار میڈیا کا بے تاج بادشاہ بنادیا۔

مودی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے کیجریوال کو رہا کروادیا۔ پولس کا

کہنا کہ ہم نے کیجریوال کو گرفتار نہیں کیا بلکہ انہیں روک کر الیکشن کمیشن کا ضابطۂ اخلاق سمجھا رہے تھے اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ ہے۔ گجرات کی بدنام زمانہ پولس فورس جس کے آدھے درجن افسران قتل و غارتگری کے سنگین الزامات میں جیل کی چکی پیس رہے ہیں کسی سابق آئی اے ایس افسر کو ضابطۂ اخلاق سکھلائیں اس سے مضحکہ خیز بات اور نہیں ہو سکتی۔ اجازت نامے کے بغیر لاؤڈ اسپیکر کا استعمال والا الزام بھی بے بنیاد نکلا لیکن اروند کیجریوال کا ماسٹر اسٹروک ابھی باقی تھا اور جب وہ سامنے آیا تو مودی کے ہاتھ سے طوطے اڑ گئے۔ لوگوں نے دیکھ لیا کہ سلمان خان کے پتنگ بازی کیلئے جس وزیراعلیٰ کے پاس وقت ہے اس کے پاس ایک سابق وزیراعلیٰ کے ساتھ ملاقات کی فرصت نہیں۔ مودی نے محسوس کرلیا کہ جس طرح سلمان کی فلم فلاپ ہو گئی اسی طرح کیجریوال سے اس ملاقات کے بعد اس کی اپنی پتنگ بھی ''کائی پوچھے''ہو جائیگی (یعنی کٹ جائیگی)۔

نریندر مودی جب سے بی جے پی پر وزیراعظم کا امیدوار بن کر مسلط ہوا ہے اس وقت سے اس کی دلچسپی گجرات میں ختم ہو گئی ہے اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا وزیراعظم سمجھنے لگا ہے۔ ایسے میں گاندھی نگر میں قیام کے باوجود مودی کا اپنے پاس چل کر آنے والے مہمان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دینا اس کے احساسِ کمتری کی دلیل ہے۔ پچھلے دنوں امریکی سفیر سے ملاقات کے سبب خبروں

میں رہنے والے نریندر مودی کو اروند کیجریوال نے اس کے دروازے پر دستک دے کر بوکھلاہٹ کا شکار کردیا۔ اروند کیجریوال کو پانچ کلومیٹر دور روک دیا گیااور باقائدہ وقت لے کر حاضری دینے کیلئے کہا گیا۔ وقت لینے کیلئے منیش سسودیہ جب مودی کے دفتر میں پہنچے تواس کے سکریٹری نے نہ صرف اس وقت بلکہ آئندہ چار دنوں تک مصروف ہونے کا بہانہ بنادیا۔ اب نریندر مودی کو کون سمجھائے کہ جس ہندوتوا کا وہ علمبردار ہے اس میں ''اتیتھی دیو بھوو'' کا مسلمہ اصول ہے۔

مودی کی چائے کے چرچے فی الحال ہندوستان کی حدود سے نکل کر امریکہ اور یوروپ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کی ابتداء کچھ اس طرح ہوئی کہ کسی احمق کانگریسی نے کہہ دیا ایک چائے بیچنے والا ملک کا وزیراعظم نہیں بن سکتا۔ پھر کیا تھا مودی کا موقع مل گیا اس نے پہلے تو اپنے تقریر میں اعلان کیا میں چائے بیچتا تھا دیش نہیں گویا کانگریسی قوم فروش ہیں لیکن معاملہ یہیں پر نہیں رکا بلکہ اس کے بعد ملک بھر میں 'نامو' نامی چائے کی دکانیں کھل گئیں اور چائے پر چرچا شروع ہو گئی۔ اس چرچا میں ٹی وی چینلس کے ذریعہ کئے جانے والے مصنوعی جائزوں پر گفتگو ہوتی ہے اور یہ طے کیا جاتا ہے کہ مودی کو وزیراعظم بنانے کیلئے کیا کیا جائے ؟ اس سوال کے نت نئے جواب آئے دن ایجاد کئے جاتے ہیں اور خیالی پلاؤ بنائے جاتے ہیں لیکن جب گجرات کے نہایت

سنگین اور سنجیدہ مسائل پر چرچا کرنے کیلئے اروند کیجریوال نے مودی کو دعوت دی تو اچانک اس کی چائے پھیکی اور سرد ہو گئی۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ گاندھی جی نے لوگوں کو اپنی ٹوپی پہنا کر خود اسے پھینک دی۔ گجرات میں سب مشہور چائے کی پتی کا برانڈ 'واگھ بکری' چائے ہے۔ کیجریوال کے ساتھ چائے نوشی سے انکار کرکے مودی نے خود ظاہر کردیا کہ ان دونوں میں شیر کون ہے اور کون بکری ہے ؟

مودی کی بزدلی اور راہِ فرار کی مثالیں اس سے قبل بھی سامنے آچکی ہیں مثلاً اس نے ایک بار کہا تھا کشمیر کے متعلق دستور کی دفع ۳۷۰ پر قومی سطح پر عوامی مباحثہ ہونا چاہئے۔ کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ نے اس تجویز کی تائید کی اور مودی کو پیشکش کی کہ وہ کسی بھی وقت اس موضوع پر بحث کرنے کیلئے تیار ہیں ۔ اس کے بعد نریندر مودی کو سانپ سونگھ گیا اور خاموشی سے اپنی شکست تسلیم کرلی۔ جب راہل گاندھی کو نریندر مودی نے کھلے مباحثے کی دعوت دی تو اس کے جواب میں مرکزی وزیر کپیل سبل نے مودی کو اس کی اپنی دلچسپی کے موضوع پر مباحثے کیلئے بلایا اس پیشکش کو بھی مودی قبول نہیں کرسکا۔ اس کی وجہ مودی کی معلوماتِ عامہ کی کمی ہے جس کے سبب وہ کبھی سکندر اعظم کو بہار پہنچا دیتا ہے تو کبھی بھگت سنگھ کو انڈمان روانہ کردیتا ہے ۔

مودی کو وزیر اعظم بنانے کا ٹھیکہ جس امریکی کمپنی کو دیا گیا ہے اسے ٹی پارٹی کا اچھا خاصہ تجربہ ہے اس لئے ممکن ہے اسی نے چائے پر چرچا کا آئیڈیا دیا ہو۔ امریکہ میں ٹی پارٹی کے نام سے قائم ہونے والی ایک نیم سیاسی تحریک چائے کی پیالی میں انقلاب لانے کی ناکام کوشش کرچکی ہے۔ سنا ہے مودی نے اسی امریکی عوامی رابطے کی کمپنی کو اپنے پروپگنڈے کا کام سونپ رکھا ہے جو دو مرتبہ براک اوبامہ کو صدر منتخب ہونے سے روکنے میں ناکام ہو چکی ہے کوئی بعید نہیں ہے اس بار اس کی حماقتوں کے سبب اروند کیجریوال کو ہندوستان کا وزیر اعظم بن جائے اس لئے کہ تیسرے محاذ میں جس کی نشستیں سب سے زیادہ ہوں گی اس کا رہنما وزیر اعظم بنے گا۔ ایسے میں اگر عام آدمی پارٹی کو ۵۰ نشستیں حاصل ہو جائیں تو اس کا رہنما اپنے آپ وزارتِ عظمیٰ کا سب سے طاقتور دعویدار ہو جائیگا۔

کیجریوال نریندر مودی سے گجرات کی ترقی کے حوالے جو ۱۶ سوالات کئے ان میں سب سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

حال میں ۸۰۰ کسان خود کشی کیلئے کیوں مجبور ہوئے؟ بجلی کے کنکشن کے لئے ۴ لاکھ کسانوں نے کئی سال سے پریشان کیوں ہیں؟ کوڑیوں کے بھاو میں ان کی زمین ہتھیا کرامبانی جیسے سرمایہ داروں کو سستے داموں پر کیوں دی جارہی ہے۔ کیجریوال نے مودی کو امبانی، اڈانی اور ٹاٹا کا پراپرٹی ایجنٹ قرار دے

دیا۔ کچھ کے کسانوں کو ان کی زمین سے نکالنے کے لئے سپریم کورٹ میں کیس کیوں درج کیا گیا؟زرعی پیداوار میں کمی کے چلتے زراعت کی شرح اضافہ کا دعویٰ کیونکر درست ہے ؟کچھ کے لوگوں کو پانی کیوں نہیں مل رہاہے؟بدعنوانی عام کیوں ہے؟ امبانی کے داماد کو وزیر کیوں بنایا گیا؟ نوجوانوں کو ٹھیکے کی نوکری پر رکھ کر استحصال کیوں کیا جارہاہے؟گجرات کے اسکولوں کا برا حال کیوں ہے؟گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کو کیوں بند کیا جارہاہے؟یہ سوالات مودی کے دعووں کو سفید جھوٹ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔

نریندر مودی نے کسی زمانے میں اپنا سینہ ٹھونک کر کہا تھا'۵۶ انچ کا سینہ' پچھلے دنوں راہل گاندھی نے اس کا جواب یوں دیا کہ ہمیں ۵۶ انچ کا سینہ نہیں بلکہ اس کے اندر کشادہ دل کی ضرورت ہے۔راہل کا اشارہ تو لوگ سمجھ گئے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ مودی کا دل تنگ ہے۔نریندر مودی کے دل کی تنگی پر کیجریوال کے ساتھ اختیار کئے جانے والے رویہ نے مہرثبت کردی اس لئے راہل کو مودی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے ویسے بی جے پی فی الحال عام آدمی پارٹی کے اقدامات سے اس قدر بوکھلائی ہوئی کہ جواب دینے کے بجائے معذور بچے کی طرح شکایت لے کر الیکشن کمیشن کے دروازے پر پہنچ گئی ۔ذرائع ابلاغ اس کے پاس ہر سوال ایک ہی جواب ہے کہ عام آدمی پارٹی کانگریس کی ایجنٹ ہے اور کانگریس نے اسے مودی کو روکنے کیلئے میدان میں اتارا ہے

حالانکہ راہل کے بہنوئی واڈرد کی بدعنوانی کو بی جے پی نے نہیں بلکہ عاپ نے افشاء کیا۔ سلمان خورشید کے خلاف عاپ نے محاذ کھولا اور شیلادکشت کو عاپ نے ہرایا جبکہ بی جے پی ان کے خلاف کمزور امیدوار کھڑا کرتی رہی ۔اسی لئے شاید کانگریس کے رہنما یوسف ابراہانی نے ممبئی میں اعلان کردیا کہ عاپ کو دیا جانے والا ہر ووٹ دراصل بی جے پی کیلئے ہے۔

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی کانگریس اور بی جے پی کے درمیان عاپ کے حوالے سے بلا کی یکسانیت نظر آتی ہے ایسے میں عام آدمی پارٹی کا دعویٰ کہ کانگریس اور بی جے پی دونوں مکیش امبانی اور ان جیسے سرمایہ داروں کے مہرے ہونے کے سبب یکساں ہیں زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں جماعتوں کے رہنماؤں میں ایک مشترک چیز یہ بھی ہے کہ راہل اور مودی دونوں لکھی لکھائی تقریر کرنے میں ماہر ہیں ۔ان دونوں کے اندر حاضر دماغی اور برجستگی کا زبردست فقدان ہے یہی وجہ ہے کہ راہل تو کبھی کبھار اخبار نویسوں کے ساتھ بھی گفتگو بھی کرلیتے ہیں لیکن مودی نہ کبھی کسی مباحثے میں شریک ہوتا ہے اور نہ کسی اخبار یا ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتا ہے ایک مرتبہ ٹائم سے گفتگو کرتے ہوئے گاڑی کے نیچے کتے کے مرنے کی مثال اسے مہنگی پڑ چکی ہے۔ مودی کو رٹے رٹائے مکالمات کو فلمی انداز میں بیان کرنے کا فن خوب آتا ہے اور اسی کے سبب وہ اپنے جلسوں اور ان کی رپورٹنگ کے سبب ذرائع ابلاغ پر

چھایا رہتا ہے۔

نریندر مودی کا ایک سنگین مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس بیچارے وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار کو گجرات کے اندر اور باہر کوئی محفوظ نشست نہیں مل رہی ہے گاندھی نگر پر اڈوانی جی سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب بی جے پی والوں نے بنارس کی نشست سے مودی کو لڑانے کی چرچا شروع کیا تو اچانک ۸۰ سالہ مرلی منوہر جوشی خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ انہوں نے سارے شہر میں اپنے پوسٹر لگوادیئے۔ اپنے نئے دفتر کا افتتاح کردیا اور اپنی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ایک کتاب کا اجراء بھی اپنی اہلیہ سے کروادیا۔ اڈوانی اور سشما کے بعد اب جوشی نے بھی ناراضگی کا بگل بجادیا ہے لیکن ڈاکٹر جوشی کو ہوشیار رہنا چاہئے اس لئے کہ فی الحال یوپی کی بی جے پی کا نگراں امیت شاہ ہے اور کسی ونجارہ کی مدد سے ڈاکٹر جوشی کا بھی وہی حشر کرسکتا ہے جو سہراب الدین اور عشرت جہاں کا کیا گیا۔ عاپ نے اول تو یہ اعلان کیا کہ مودی گجرات کے باہر جہاں سے بھی الیکشن لڑے کیجریوال اس کے سامنے امیدوار ہوگا اور اب احمدآباد میں یہ نعرہ لگایا ہے کہ ”شیلا دکشت ہاری ہے اب مودی کی باری ہے“۔ اس نعرے کے بعد بھی اگر ارون جیٹلی اپنے بیان میں مودی کی حمایت کرتے ہوئے اروند کیجریوال کو باؤلا کہتے ہیں تو ان سے بڑا نادان کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

یوکرین: جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی

قومی مسائل خاص طور پر انتخابات کبھی کبھار ہمارے اعصاب پر اس طرح سوار ہوجاتے ہیں کہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے نہایت اہم تبدیلیاں بھی اپنی جانب ہماری توجہ مبذول کرانے میں ناکام رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ یوکرین میں رونما ہونے والے غیر معمولی واقعات بھی ہمیں متوجہ نہ کرسکے۔ ہوا یوں کہ مسیویو (یوروپینیونین) ایک عرصے سے جنابیوکر (یوکرین) پر ڈورے ڈال رہی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں اپنے رشتۂ نکاح کا اعلان کرتے یوکر کی زوجہ بیگم کرامہ (کرائمیہ) نے ایک چالاک لومڑی کی طرحان سے قطع تعلق کرلیا۔ اس پر یوکر صاحب بندر کی مانند ہوا میں اچھلے لیکن اس سے پہلے کہ مس یویو اپنے بھائی ناٹو کی مدد سے انہیں سنبھالتی کرامہ بیگم نے مسٹر بھالو (روس) سے بیاہ رچالیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ لومڑی اور بھالو اپنے نئے گھر سنسار میں دادِ عیش دے رہے ہیں اور مسٹر یوکر و مس یویو مع اعزہ و اقارب غم اندوہ کا شکار ہیں ۔ یہ معاملہ ۱۰۰۰ ہفتوں تک لگاتار چلتے رہنے کا ریکارڈ توڑنے والی ہندی فلم 'دل والے دلہنیا لے جائیں گے' سے کم دلچسپ نہیں ہے اس کے باوجود کوئی اس پر غور نہیں کرتا۔

یوکرین تنازعہ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ یوکرین کے روس نواز صدر وکٹر یانوکو ویچ نے گزشتہ ماہِ نومبر میں یوروپی یونین کے ساتھ معاہد کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنی شرائط رکھ دیں۔ اس کی وجہ ان کے روس کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے۔ بس پھر کیا تھا ساری مغرب نواز نمک خوار برادری حرکت میں آگئی اور نوکو ویچ ان کے خلاف زبردست مظاہرے شروع ہو گئے۔ ان مظاہروں میں حزب اختلاف پیش پیش تھا عالمی ذرائع ابلاغ اسے خوب بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ترکی کے اندر ہونے والے احتجاج کی پذیرائی کی جاتی ہے۔ یوکرین کی راجدھانی کئیف کی سڑکوں پر ایک طرف مظاہروں میں شدت آرہی تھی اور دوسری جانب پارلیمان کے ممبران کو ایک ایک کرکے خریدا جارہا تھا اور اس کا نقطۂ عروج اس وقت آیا جب کہ حزب اختلاف کے غلبہ والی پارلیمان نے آئینی صدر کے ساتھ کئے گئے ۲۱ فروری کے معاہدے کو بالائے طاق رکھ کر انہیں برخواست کردیا اور اسپیکر الیکژانڈر ترچی نوف کو قائم مقام صدر بنا دیا۔

کئیف میں جس وقت صدر کے خلاف احتجاج ہو رہا تھا اس وقت مشرقی سرحد پر واقع روس سے متصل نیم خود مختار صوبے کرائمیہ میں صدر نوکو ویچ کی حمایت میں
مظاہرے ہو رہے تھے۔ بعد میں جب معزول شدہ صدر کئیف سے فرار ہو کر روس میں نمودار ہوئے تو روسی فوج کرائمیہ میں داخل ہو گئی۔ روسی فوج کی پشت پناہی میں مظاہرین نے اہم سرکاری عمارتوں اور ہوائی اڈے پر قبضہ کر لیا اور ان پر روسی

پرچم لہرا دیا۔ اسی کے ساتھ کرائمیہ کی صوبائی حکومت کو برخواست کر دیا گیا اور سرگئی آکسیونوو کی سربراہی میں ایک نئی حکومت قائم ہو گئی۔ گویا کرائمیہ کے مرکزی شہر سمفیروپول میں وہی ڈرامہ کھیلا گیا جو کئیف میں رچایا گیا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ وہاں یوروپ اور امریکہ مظاہرین کی حمایت کر رہے تھے اور اسے عظیم انقلاب قرار دے رہے تھے نیز روس اس کو غیر آئینی بیرونی سازش قرار دے رہا تھا جبکہ کرائمیہ میں روس کی سرپرستی میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو مغرب ایک آزاد ملک کی خودمختاری میں فوجی مداخلت اور اس کی سالمیت کے لئے خطرہ قرار دے کر اس کی مخالفت کر رہا تھا ۔ روسی اور امریکی الزام تراشی پر یہ شعر یاد آتا ہے

آپ کہتے ہیں پرایوں نے کیا ہم کو تباہ
بندہ پرور کہیں اپنوں ہی کا یہ کام نہ ہو

اس معاملہ کی نزاکت و اہمیت کے پیش نظر امریکی صدر براک اوباما نے اپنے روسی ہم منصب ولادمیر پوتن سے ٹیلی فون پر تقریباً ۹۰ منٹ گفتگو کی اور کہا کہ روس نے یوکرین میں فوج بھیج کر بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ صدر براک اوباما نے روسی صدر پر زور دیا کہ وہ یوکرین میں اپنی فوجوں کو واپس بلائے۔ اس کے جواب میں روسی صدر ولادمیر پوتن نے کہا کہ ماسکو یوکرین میں روسی بولنے والوں لوگوں کے مفادات کا دفاع کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ان کے

مطابق یوکرین اور یورپی یونین کے درمیان آزاد تجارتی معاہدہ روسی معیشت کے لیے بڑا خطرہ ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ روس کیلئے سب سے بڑی پریشانی یوکرین کے یوروپی یونین میں شامل ہو جانے کے بعد بحر اسود میں ناٹو فوجوں کی آمد ہے۔ اس سے نہ صرف روس غیر محفوظ ہو جائیگا بلکہ خطے میں اس کی فوجی برتری کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ چونکہ روسی بحری دستہ کرائمیہ کی بندرگاہ پر تعینات ہے اس لئے وہاں اپنا فوجی تسلط برقرار رکھنا روسی ضروری سمجھتے ہیں۔

یوروپ اور امریکہ کی گیدڑ بھبکی کا روس اور کرائمیہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ۸ مارچ ۲۰۱۴ء کو کرائمیہ کی نوزائدہ پارلیمانے روسمیں کرائمیہ کی شمولیت کے بارے میں اصولی فیصلہ کرلیا۔ کرائمیہ کے نائب وزیر اعظم رستم تیمیر گالیئیو نے جب عوام کے سامنے اس فیصلے کا اعلان کیا تو حاضرین نے "روس زندہ باد" کے نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا۔ رستم نے یہبھی بتایا کہکرائمیہ کی روس میں شمولیت کی بابت ۱۶ مارچ کو استصواب رائے کرایا جائے گا۔ ریفرینڈم میں عوام سے تین سوال کئے گئے کہ آیا وہ وفاق روس میں کرائمیہ کی شمولیت کے حق میں ہیں؟ یا ۱۹۹۲ء میں منظور کردہ کرائمیہ کے آئین کی بحالی چاہتے ہیں جس کے تحت کرائمیہ کو یوکرین میں شامل کیا گیا تھا؟ یا دیگر اصلاحات پر اکتفا کریں گے؟

اس بیچ امریکہ اور اس کے ہمنواؤں نے اقوام متحدہ میں کرائمیہ کے اندر منعقد ہونے والے استصواب کو غیر قانونی قرار دے دیا اور سلامتی کونسل کے اندر ریفرنڈم کے خلاف قرارداد پیش کردی لیکن وہ بھول گئے کہ جس روس کے خلاف یہ قرارداد پیش کی جارہی ہے وہ بھی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا مستقل رکن ہے اور بڑی آسانی سے اسے ویٹو کرسکتا ہے۔ ہوا بھی یہی روس نے اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے قرارداد کو منظور ہونے سے روک دیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ میں روس کے مستقل مندوب وتالی چرکن نے اعلان کیا کہ روس کرائمیہ کے حقرائے دہی کیتعظیمکرے گا۔اس بابت روس کا موقف شہزاد احمد کے اس شعر کی طرح تھا

تمام عمر سمٹ آئے ایک لمحے میں
میں چاہتا ہوں کہ ہونا ہے جو ابھی ہو جائے

اس مسئلہ پر سلامتی کونسل میں پھر ایک بار سرد جنگ کا سا ماحول بن گیا تھا۔ چین نے اس بکھیڑے میں پڑنے سے یہ کہتے ہوئے غیر جانبدار ہو گیا کہ اس اقدام سے تصادم اور مسائل پیدا ہوں گے۔ یورپی یونین نے کرائمیہ میں ہونے والے ریفرنڈم کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اس کے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اسی کے ساتھ یوکرین کے دارالحکومت کئیف میں ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے یوروپ نواز وزیراعظم آرسینی یاٹسنیوک نے کرائمیہ کی یوکرین سے علیحدگی کی حمایت کرنے والے سیاست دانوں کو "ان کی اس حرکت پر سزا دینے" کی

دھمکی دے ڈالیلیکن کیا پدیؔ اور کیا پدیؔ کا شوربہ کی مثل کسی نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اقوام متحدہ میں منھ کی کھانے کے بعد استصواب کو روکنے کیلئے اس سے دو دن قبل امریکی وزیرِ خارجہ جان کیری نے لندن میں اپنے روسی ہم منصب سرگئی لاوروف کے ساتھ ملاقات کرکے یوکرین کے بحران پر تبادلہ خیال کیا۔ امریکی وزیرِ خارجہ جان کیری روس کو پہلے ہی خبردار کرچکے تھے کہ اگراس نے کرائمیہ کو اپنے ساتھ ملاکر یوکرین کو تقسیم کرنے کی کوشش کی تواس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔۔ ملاقات کے بعدپریس کانفرنس سےخطاب کرتے ہوئے کیری نے کہا وہ نہیں جانتے کہ کرائمیہ میں ریفرنڈم کے بعدروس کے صدر ولادی میرپوتن کیا فیصلہ کریں گے۔ اس کے برعکس روسی وزیرِ خارجہ نے کہااس مسئلے پر روس اور مغرب کے درمیان خلیج بدستوربرقرار ہے۔ ان کے مطابق یوکرین میں روس نواز حکومت کے خلاف یورپ نواز حزبِ اختلاف کی بغاوت کے بعد کرائمیہ کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہےاور ان کا ملک کرائمیہ کے عوام کی خواہشات کا احترام کرے گا۔ انہوں نے واضح کیاکہ روسی افواج کا باقی ماندہ یوکرین پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں۔

حسبِ منصوبہ نہایت جوش وخروش کے ساتھ استصواب منعقد ہوے۔ کرائمیہ کی خبر

رساں ایجنسی "کریم انفورم" کے مطابق ۲۳ ممالک سے تعلق رکھنے والے ۱۳۵ مبصرین اور کرائمیہ کی سیاسی جماعتوں اور سماجی انجمنوں کے ۲۴۰ اراکین نے ریفرینڈم کی نگرانی کی اور کسی شدید دھاندلی کی نشاندہی نہیں کی۔ ریفرنڈم کمیشن کے نگران میخائل میلے شیوو کے مطابق ۸۳ فی صد لوگوں نے اس رائے شماری میں حصہ لیا۔ کرائمیہ کے وزیرِ اعظم سرگئی آکسیونوو نے ریفرنڈم کے نتائج کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ علاقے کے ۹۳ فی صد سے زائد رائے دہندگان نے روس کے ساتھ الحاق کے حق میں ووٹ دیااور یہ اطلاع بھی دی کہ کرائمیہ کا ایک وفد اگلے دن ماسکو پہنچے گا تاکہ روس میں کرائمیہ کی شمولیت سے وابستہ معاملات پر تبادلہ خیال کیا جائے۔ کرائمیہ کے مرکزی شہر سمفیروپول میں ووٹنگ مکمل ہونے کے بعد ایک بڑا مظاہرہ اور جشن منایا گیا جس میں شرکاء روس اور کرائمیہ کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ کنسرٹ میں حصہ لینے والے روس اور کرائمیہ کے مقبول موسیقاروں نے حب الوطنی پر مبنی گیت پیش کئے گویا پیشگی جشنِ آزادی کا اہتمام ہو گیا۔

ان واقعات کے بعد یوروپ اور امریکہ روس پر اقتصادی پابندی لگانے کی دھمکی تو دے رہے ہیں لیکن ہمت نہیں جٹا پا رہے اس لئے کہ ایندھن کے حوالے سے یوروپ اور یوکرین کا انحصار روس پر ہے اور روس کی ناک دبائی جاتی ہے تو یوروپ کا منہ کھل جاتا ہے۔ اس صورتحال نے سرد جنگ کے روایتی حریف روس اور امریکہ کی

منافقانہ پالیسی کو ساری دنیاکے سامنے بے نقاب کردیا اور یہ حقیقت ظاہر کردی کہ ان استحصالی گِدھوں کے اصول نظریات کی بنیاد ابن الوقتی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ آزادی وحقوق انسانی کے بلند بانگ دعووں کے پس پردہ صرف اور صرف مفاد پرستی کارفرما ہوتی ہے۔ پہلے امریکہ کے موقف پر نظر ڈالیں جسے کرائمیہ میں روس کی مداخلت پر اعتراض ہے جبکہ خود امریکی وزارتِ داخلہ کے حکام نے تسلیم کیا ہے کہ انھوں نے گزشتہ بیس سالوں میں یوکرین میں جمہوریت کی بحالی پر ۵ بلین ڈالر خرچ کئے ہیں۔

امریکہ کی جانب سے جب بھی جمہوریت کی بحالی پر رقم خرچ کرنے کی بات ہوتی ہے تو اس کا مطلب حکومت کا تختہ پلٹنا لیا جاتا ہے۔ استعماری قوتوں کے بل بوتے پر پلنے اور چلنے والی تحریکوں پر محسن نقوی کے یہ اشعار صادق آتے ہیں۔

شکل اس کی تھی دلبروں جیسی
خو تھی لیکن ستمگروں جیسی
میری دنیاکے بادشاہوں کی
عادتیں ہیں گداگروں جیسی

امریکہ نے کرائمیہ کی نئی حکومت کے قیام پر اور روس کی جانب سے اسے تسلیم کئے جانے پر غم غصہ کا اظہار کیا ہے لیکن ایسی ہی جلدبازی ایک ماہ قبل امریکہ اور یوروپی یونین نے یوکرین کی بلاجواز قائم ہوجانے والی

الیگزانڈر رٹر چینو قلّی حکومت کو تسلیم کرکے دکھلائی تھی۔ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی خود مختار ملک میں فوجی مداخلت کی مخالفت کرنے والے بھول گئے کہ خود امریکہ نے نوریگا کو گرفتار کرنے کی خاطر پنامہ میں فوج کشی کی تھی۔ گرینڈا میں امریکیوں کو یرغمال بنائے جانے کا شور مچا کر ہلہ بول دیا تھا جبکہ کسی کو یرغمال بنایا ہی نہیں گیا تھا۔ عراق فوج روانہ کرنے کیلئے عمومی تباہی کے ہتھیاروں کا بہانہ بنایا گیا جو سرے سے موجود ہی نہیں تھے۔ افغانستان میں ناٹو فوجی بلاثبوت ۱۱ ستمبر کا الزام لگا کر داخل ہوگئے جس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وزیرستان میں آئے دن ڈرون حملوں سے بے قصور لوگوں کو شہید کردیا جاتا ہے لیکن اس وقت کسی کو خود مختار ملک میں مداخلت کا خیال تک نہیں آتا ہے۔

یوروپ وامریکہ کا ایک الزام یہ بھی ہے روس نے استصواب رائے کو تسلیم کرکے پڑوسی ملک کی سالمیت سے کھلواڑ کیا ہے اور مہذب دنیا اس خلاف ورزی کو قبول نہیں کرے گی۔ لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ سربیا سے کوسوو کو الگ کرنے کیلئے اسی طریقۂ کار کو نہایت مہذب جواز تسلیم کیا گیا تھا۔ جنوبی سوڈان کی علٰحیدگی کیلئے کئے جانے والے ریفرنڈم کی پرزور حمایت کی گئی تھی۔ ایریٹیریا کو اسی طریقے سے ایتھوپیا سے جدا کیا گیا۔ مشرقی تیمور کی انڈونیشیا سے جدائی کیلئے اسی حکمتِ عملی کا انتخاب کیا گیا اور اگر ایسا کرنے سے مسائل

حل ہوتے ہیں تو اس میں برا کیا ہے؟ ہندوستان میں کشمیری استصوابِ رائے کو ایک گالی سمجھا جاتا ہے اور اس کی حمایت کرنے والے کو قوم دشمن قرار دے دیا جاتا ہے حالانکہ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ کشمیر سمیت ناگالینڈ اور میزورم کے مسائل کا حل فوجی تسلط نہیں بلکہ استصواب رائے ہے۔ جو لوگ ساتھ نہیں رہنا چاہتے انہیں زبردستی ساتھ رکھنا خود اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی عذاب میں گرفتار رکھنے کا مترادف ہے نیز اگر وہ ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو استصواب رائے کا نتیجہ از خود علٰحیدگی پسندوں کے خلاف دلیل بن جاتا ہے۔

روس کے موقف میں بھی بڑے بڑے جھول صاف دکھائی دیتے ہیں۔ روس کا دعویٰ ہے یوکرین کی نئی حکومت نے آئینی صدر کو برخواست کرکے دستوری کے خلاف بغاوت ہے اسی لئے انہوں نے وکٹر یونوکووچ کو اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے اور اسی کو یوکرین کا جائز حکمراں مانتے ہیں لیکن ان کا دوغلا پن اس وقت واضح ہوگیا جب اس بحران کے دوران مصر کے وزیر دفاع نے ماسکو کا دورہ کیا تو پوتن نے خود استقبال کیا۔ دو بلین ڈالر کے اسلحہ کا وعدہ کیا اور مبارکباد دیتے ہوئے کہا مجھے پتہ چلا ہے تم نے صدارتی انتخاب لڑنے کا من بنالیا ہے۔ یہ بڑا ذمہ دارانہ فیصلہ ہے اور اس معاملہ میں میری ذاتی اور روسی عوام کی نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا یوکرینی خودساختہ وزیراعظم آرسینییاٹسنیوکی طرح السیسی نے بھی صدر موری کے ساتھ وہی معاملہ نہیں کیا جو وکٹر کے ساتھ

کیا گیا؟ ایسے میں ایک کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت چہ معنی دارد؟ بلکہ السیسی کا دامن تو معصوم شہداء کے خون سے بھی داغدار ہے۔

کرائمیہ کے اندر اپنی فوجی مداخلت کو جواز پوتن نے اس طرح پیش کیا وہاں رہنے والی روسی عوام کا تحفظ کرنا اس کی ذمہ داری ہے اس لئے کہ کئیف میں قائم ہونے والی قوم پرست یوکرین حکومت سے انہیں خطرہ ہے لیکن یہی خطرہ دمشق میں قائم بعثی بشارالاسد سے شام کی عوام کو ہے جو گزشتہ دو سالوں سے معصوم عوام کا بے دریغ خون بہا رہا ہے اور روس ہر قدم پر اس کا معاون و مددگار بنا ہوا ہے؟ کیا کرائمیہ کے لوگوں کی طرح شام کے عوام کا خونِ ناحق کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ روس کو نہ ہی کرائمیہ کی عوام سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ شام کے مسائل میں کوئی دلچسپی ہے۔ کرائمیہ اور شام دونوں مقامات پر اسے اپنے فوجی تنصیبات کی حفاظت کرنی ہے اب اگر ایسا کرتے ہوئے کسی مظلوم کی مدد ہوتی یا ظالم کو فائدہ پہنچتا ہو تو اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مغرب کے مادہ پرستانہ نظریہ حیات کا یہ سب سے بڑا فتنہ ہے

امریکہ کا مشہور جریدہ فوربز ہر سال دنیا کے سب سے موثر ترین افراد کی فہرست شائع کرتا ہے۔ سال ۲۰۱۳ء کے لئے اس نے ولادی میر پوتن کو براک اوباما پر فوقیت دی ہے۔ گزشتہ تین برسوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ اوباما فوربز کی اس

فہرست میں پہلے درجے سے نیچے آئے ہیں۔اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ امریکی صدر کی ملکی سیاست پر گرفت نسبتاً کمزور ہوئی جبکہ روسی سیاست میں پوتن کا دبدبہ برقرار رہا۔فوربز کا کہنا ہے کہ ولادی میر پوتن بارہ برس سے روسی سیاست میں کلیدی حیثیت کے حامل رہے ہیں۔انہیں مارچ ۲۰۱۲ء میں دوبارہ روس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔اس کے برعکس امریکہ میں 'شٹ ڈاؤن' اور قرض کی حد کے بحران کی وجہ سے صدر اوباما کی گرفت متاثر ہوئی ہے۔یوکرین بحران کے بعد ایسا لگتا ہے گویا پوتن نے بین الاقوامی سطح پر اوبامہ کو مات دے دی ہے لیکن اس ادلا بدلی سے دنیا کی مظلوم عوام کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔اس لئے اب وقت آگیا ہے دنیا بھر کے انصاف پسندان نام نہاد چارہ گروں سے صاف کہہ دیں۔

تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر میں تمہیں کس طرح سے کہوں
تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے، مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

نریندر مودی کی گرتی دیوار بکھرتے خواب

قومی انتخابات کے ابتدائی مرحلے میں نریندر مودی نے سرمایہ داروں کی دولت اور ذرائع ابلاغ کی شہرت سے خوب ہوا بنائی لیکن جیسے ہی امیدواروں کی نامزدگی کا مرحلہ آیااس کی ہواا کھڑنے لگی اور گھبراہٹ کے عالم میں حماقتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فی الحال بغاوت کے طوفان میں گھری بی جے پی کو سجھائی نہیں دے رہا ہے کہ آخر کرے تو کیا کرے؟ اسی لئے کبھی رام بیناکے پروین متلک کا پارٹی میں استقبال کیا جاتا ہے تو کبھی اخراج کردیا جاتا ہے۔ایم جے اکبر کو پارٹی میں شامل کیا جاتا ہے تو جسونت سنگھ کا پتہ کاٹ دیا جاتا ہے۔جگدمبیکا پال کو کانگریس سے بلا کر ٹکٹ تھما دیا جاتا ہے اور ۶ مرتبہ لگاتار کامیاب ہونے والے احمد آباد کے رکن پارلیمان ہرین پاٹھک کو دروازہ دکھا دیا جاتاہے۔ رام ولاس پاسوان کے ۵ کے بجائے ۷ نشستوں سے نواز دیا جاتاہے مگر سابق رکن پارلیمان لال منی لال چوبے کو محروم کردیاجاتا ہے دراصل یہ تمام تو مرض کی علاماتِ محض ہیں۔بیماری کا پتہ لگانے کیلئے مریضِ اعظم یعنی نریندر مودی کی جانچ پڑتال ناگزیر ہے۔

بی جے پی پر ۲۷۲ کا بھوت کچھ اس طرح سوار ہے کہ اس کی گنتی وہیں سے شروع ہو

کر وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ گزشتہ دنوں بڑے طمطراق کے ساتھ یہ خبر آئی کہ نریندر مودی تشہیر کے آخری مرحلے میں ۲۷۲ جلسوں سے خطاب کریں گے اور یہ کارپٹ بامبنگ ہوگی۔ جس کی ابتداء کیلئے جموں کا انتخاب کیا گیا۔ اس لئے کہ لاکھ اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگانے کے باوجود کشمیر کی وادی میں جاکر جلسۂ عام کرنے کی جرأت آج تک کوئی سنگھ پریوار کا رہنما نہیں کر سکا ہے۔ جموں کے جلسۂ عام میں مودی نے بمباری تو ضرور کی لیکن اس کا نشانہ بی جے پی کا وہ خیمہ تھا جس کی آبیاری ایک مخصوص انداز میں وہ خود گزشتہ دوسال سے کر رہا تھا اور ہوا یہ ایک لحہ میں سارا خواب چکنا چور ہو گیا۔

نریندر مودی نے اپنے وزیر اعظم بننے کے خواب میں رنگ بھرنے کا کام دوسال قبل سدبھاؤنا یاترا سے شروع کیا تھا۔ سدبھاؤنا (خیر سگالی) مہم کی مدد سے کٹر ہندوتوا کے علمبردار بھیڑیئے نے بھیڑ کی کھال اوڑھ لی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مودی نے اپنا تشخص بدلنے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی اور ایم جے اکبر جیسے کہنہ مشق صحافی بھی اپنا مستقبل سنوارنے کیلئے اس کا ڈھول بجانے لگے ۔ مودی نے رام کا نام بدنام کرنے کے بجائے ترقی ، بدعنوانی اور موروثیت کی بنیاد پر کانگریس پر نشانہ سادھا۔ لیکن اول تو گجرات کی نام نہاد ترقی کا پول اروند کیجریوال نے کھول دیا اور پھر بدعنوانی کے معاملے میں بھی کیجریوال کے سامنے مودی بونہ نظر آنے لگا۔ یدوریا اور ریڈی

.برادران کو پارٹی میں شامل کر لینے کے بعد وہ مدعا اپنی موت مر گیا۔ موروثیت کے باب میں مودی کی منظورِ نظر وزیراعلیٰ وجئے راجے سندھیا نے (جو ایک سیاستداں کی بیٹی، دوسرے کی بہن اور تیسرے کی پھوپی ہیں) اپنے بیٹے ماویندر کو ٹکٹ دلوا کر سونیا گاندھی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ کانگریس سے سونارام چودھری کو بلا کر اپنی ہی .برادری کے جسونت سنگھ کا باڑمیر سے پتہ کاٹ دیا۔

مذکورہ بالا تمام محاذ پر بے دست و پا ہو جانے کے بعد نریندر مودی کی بلی وقت سے پہلے تھیلے سے باہر آگئی لیکن اس بار اس نے کھمبا نوچنے کے بجائے خود اپنا ہی منھ نوچ لیا۔ مودی کے ہاری حواریوں نے جب اسے بتایا کہ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود کوئی مسلمان یا عیسائی تو اس کے قریب نہیں آیا بلکہ خود اس کے اپنے انتہا پسند حامی مایوس ہو کر دور جانے لگے ہیں تو وہ اپنے اصلی رنگ روپ میں لوٹ آیا۔ جموں کے اندر مودی نے پاکستانی اخبارات کا سہارہ لے کر کہا کہ وہ لوگ تین اے کے سے بہت خوش ہیں۔ اول تو اے کے ۴۷ دوسرے اے کے انٹونی اور تیسرے اے کے ۴۹ یعنی اروند کیجریوال۔ اس طرح گویا پاکستان کا نام لے کر نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یو پی اے کے معروف عیسائی وزیر پر توپ داغ کر فرقہ پرستی کا کارڈ کھیلا گیا نیز اس میں اروند کیجریوال کا اضافہ کرکے اسے بھی پاکستانی ایجنٹ بنا دیا گیا۔

اروند پر الزام ہے کہ عاپ کی ویب سائٹ پر ہندوستان کے نقشے میں کشمیر کو ہندوستان سے الگ دکھلایا گیا ہے۔ میں نے اس الزام کے بعد عام آدمی پارٹی کی ویب سائٹ پر وہ نقشہ خوب تلاش کیا لیکن نہیں ملا اور یقیناً مودی کو بھی نہیں ملے گا بشرطیکہ وہ اسے تلاش کرے۔ ویسے بھی فی الحال بیچارے مودی کو سوائے وزیر اعظم کی ٹوٹی ہوئی کرسی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ مودی کے مطابق انٹونی اور کیجریوال پاکستان کے ایجنٹ ہیں۔ یہ عجیب منطق ہے کہ جو ناراض کانگریسی اپنی پارٹی کو چھوڑ کر بی جے پی میں آجاتا ہے وہ نہ صرف دیش بھکت بن جاتا ہے بلکہ بدعنوانی کے سارے داغ اس کے دامن سے یکسر دھل جاتے ہیں اور جو نہیں آتا وہ پاکستان کا ایجنٹ قرار پاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کرسی کیلئے اپنے ملک کے وزیر دفاع پر غیر ملکی ایجنٹ ہونے کا الزام لگانے والے انسان سے بڑا دیش دروہی کوئی نہیں ہو سکتا؟

بنارس سے اروند کیجریوال نے کاغذاتِ نامزدگی کیا داخل کئے کہ بی جے پی کے خیمہ میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ اس کا مظاہرہ کہیں سیاہی کے چھڑکنے سے تو کہیں انڈوں کو پھینکنے سے ہو رہا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ مودی اپنے کارکنان کو ان اوچھی حرکات سے منع کرتا لیکن اس نے اپنے غیر ذمہ دارانہ بیان سے نہ صرف ہمت افزائی کی ہے بلکہ مزید شہ دی ہے جو اسے مہنگی پڑے گی۔ بنارس کا براہمن مودی کو اس لئے ووٹ نہیں دے گا کیونکہ مرلی منوہر جوشی کا ٹکٹ کاٹ دیا گیا۔

لال منی چوبے نے بکسر سے آزاد امیدوار کے طور پر کاغذات داخل کرنے کے بعد کہا کہ ان کا تعلق وارانسی سے بھی ہے اور وہ وہاں جاکر مودی کے خلاف مہم چلائیں گے ۔ یادو ساجوادی کے ہمنوا ہیں اور ہر ہر مودی کے نعرے کو اچھال رہے ہیں ۔ بنیا کیجریوال کو چھوڑ کر بھلا کسے ووٹ دیں گے جو خود بنیا ہے۔ دلت بہوجن سماج پارٹی کو ووٹ دے گا چاہے ان کا امیدوار جیتے یا ہارے۔اگر کانگریس دگ وجۓ سنگھ کو اپنا امیدوار بنادے تو راجپوت انہیں کو اپنا ووٹ دیں گے۔ویسے بھی دگ وجۓ کے یہ کہنے پر کہ مودی سے بہتر سشما ہے سشما نے دگ وجۓ کو راہل سے بہتر قرار دے ہی دیا ہے۔ ایسے میں کاسٹنگ ووٹ مسلمانوں کا ہوگا جو کیجریوال کے حصے میں آئیگا اور وہ جیت جائیگا۔ مودی کو بنارس کے اندر اپنی شکست کا احساس ابھی سے ہوگیا ہے ۔اسی لئے وہ ہذیان بکنے لگا ہے ۔

جسمانی مریض خود پریشان رہتا ہے لیکن دماغی یا نفسیاتی مریض جسے عرف عام میں پاگل کہا جاتا ہے دوسروں کو پریشان کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ وہ خود سکون میں ہو بلکہ وہ خود بھی بے شمار مصیبتوں میں گرفتار ہوتا ہے مودی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ مودی کی وجہ سے عام آدمی کو تو یہ پریشانی ہے کہ وہ سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے ان کی دولت کے سہارے اپنی انتخابی مہم چلا رہا ہے اس لئے جب انہیں دولت واپس کمانے کا موقع دے گا تو

مہنگائی میں بے شمار اضافہ ہوگا۔ جس طرح گجرات میں ٦۵ ہزار چھوٹی صنعتوں کو اس نے بڑے صنعتکاروں کے اشارے پر بند کروادیا اسی طرح ہندوستان بھر میں کرے گا ۔ مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اپنی شہرت کو بڑھانے کیلئے مودی گجرات میں جو مسلم نوجوانوں کا فرضی انکاؤنٹر کروایا کرتا تھا اب وہی کھیل قومی سطح پر کھیلا جائیگا۔ جو بھولے بھالے لوگ یہ کہنے لگے تھے مودی بدل گیا ہے ان کی غلط فہمی کو مودی نے مولانا عبدالقوی صاحب کو دہلی میں احمد آباد پولس کے ذریعہ گرفتار کرواکر دور کردی ۔

مولانا عبدالقوی کا نام اے ٹی ایس نے ہرین پنڈیا قتل کیس میں گرفتار ہونے والے بے قصوروں کی زبان سے سنا تھا۔ اب وہ سارے نوجوان رہا ہو چکے ہیں اس کے باوجود مولانا دس سال بعد دھر لئے گئے جبکہ ہرین پنڈیا کے والد اور بیوی علی الاعلان نریندر مودی پر اپنے دوست کے قتل کا الزام لگاتے ہیں ۔ اگر وزیراعظم بننے سے قبل یہ مودی کی یہ چال ڈھال ہے تو بعد میں کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عین انتخاب سے قبل ایک پاکستانی دہشت گرد محمد ضیاء الرحمان عرف وقاص کی گرفتاری اجمیر سے عمل میں آتی ہے ۔اس کے بعد محمد معروف جے پور سے اور محمد ثاقب انصاری کو جودھپور سے وقار اظہر کے ساتھ گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ اسی دوران دھنباد کے محمد یاسر اور گیا سے تعلق رکھنے والے محمد عبدالواحد کی گرفتاری دہلی میں

ابو الفضل انکلیو سے ہوتی ہے۔ ان تمام نوجوانوں پر پٹنہ میں مودی کی ہنکار ریلی کے دوران ہونے والے بم دھماکوں کا الزام جڑ دیا جاتا ہے جبکہ عوام کے دباؤ پر یاسر اور واحد رہا بھی کر دیئے جاتے ہیں۔

حیرت اس پر نہیں ہے کہ بی جے پی کی وزیر اعلیٰ سندھیا یہ تماشہ کرتی ہیں اس لئے کہ انھوں نے مودی پر راجیو گاندھی جیسے حملے کا اندیشہ ظاہر کر ہی دیا ہے بلکہ تعجب اس پر ہے کہ مرکزی وزیر داخلہ سشیل کمار شندے جنھوں نے پولس کو شک شبہ کی بنیاد پر بلا تحقیق مسلم نوجوانوں کی گرفتاری سے منع کیا تھا اس دھاندلی پر پولس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے ایک بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کانگریس کو یہ خوش فہمی کہ مسلمان مودی کے خوف سے اسے لامحالہ ووٹ دیں گے اس بار مہنگی پڑنے والی ہے۔ بی جے پی جہاں ان زیادتیوں کے ذریعہ ہندو رائے دہندگان کی خوشنودی حاصل کر رہی ہے وہیں کانگریس بھی اکثریتی فرقے کی دلجوئی میں لگی ہوئی ہے۔ چکی ان دو پاٹوں کے درمیان جن میں سے ایک گھومتا ہے دوسرا اپنی جگہ ساکت ہے مسلمان بلاوجہ پس رہے ہیں۔

اس بیچ وقاص کے توسط انڈین مجاہدین کا نام نہاد سربراہ تحسین اختر نیپال کی سرحد پر پکڑ لیا جاتا ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بنگلہ دیش کے راستے پاکستان جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید ہماری خفیہ ایجنسیوں کو نہیں

معلوم کہ سقوطِ پاکستان کو ایک مدت گزر چکی ہے اور اب پاکستان جانے کیلئے بنگلہ دیش سے بہتر راستہ ہندوستان اور نیپال سے ہے۔ تحسین اختر کے بارے میں بتلایا گیا کہ اس کی عمر کل ۲۳ سال ہے گویا یہی وہ کم عمر نوجوان جو گزشتہ کئی سالوں سے ایس آئی ٹی، سی بی آئی اور 'را' کو تگنی کا ناچ نچا رہا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو شرمناک ہے۔ اس ڈرامے سے ثابت ہو گیا ہے کہ انڈین مجاہدین کی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ خفیہ ایجنسی کا ہی گورکھ دھندہ ہے۔ جو مسلمان انتخابی عمل کو رحمت و نعمت کہتے نہیں تھکتے ان کیلئے ان واقعات میں سامانِ عبرت ہے۔

یہ تو خیر مودی کے سبب دوسروں کے مسائل ہیں اب آیئے اس کے اپنے امراض کی جانب جن کی علامات کا اشارہ مضمون کی ابتداء میں کیا گیا۔ مودی بیک وقت کئی امراض میں مبتلاء ہے۔ سب سے پہلے تو اسے یہ اندیشہ کھائے جاتا ہے کہ آج نہیں تو کل اسے جیل کی ہوا کھانی ہی ہوگی۔ مایا کندنانی اور بابو بجرنگی کی خود گجرات کی عدالت کے ذریعہ سنائی جانے والی سزا نے اس کے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ اس سزا سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ کسی طرح وزیر اعظم بن کر دہلی بھاگ جائے۔ مودی کا دوسرا مسئلہ اس کی پسماندہ ذات اور اس کا براہمنی پریوار ہے۔ مودی بھی نتیش، اروندیا کیجریوال کی مانند ایک آرزو مند سیاستداں ہے جو وزیر اعظم بننے کے سپنے سجاتا ہے لیکن اس کی ذات اور سنگھ

پریوار کے درمیان موافقت نہیں ہے۔ شتری کی تلوار اور ویش کی دولت کے سبب ان کی سنگھ میں کسی حد تک پذیرائی ہو جاتی ہے لیکن پسماندہ ذات کے لوگوں کا محض استحصال ہوتا ہے۔ مودی کے سامنے لکشمن، کلیان سنگھ، یدورپا، اوما بھارتی اور منڈے جیسے نہ جانے کتنے لوگوں کا عبرتناک انجام ہے جن کو سنگھ نے ٹیشو پیپر کی مانند استعمال کرکے پھینک دیا۔ بنگارو لکشمن پارٹی کے قومی صدر تھے اس کے باوجود ان پر بدعنوانی کا الزام لگا، انہیں سزا ہوئی اور ان کا انتقال ہوا لیکن کسی نے ان پر ایک آنسو نہیں بہایا۔ مودی نے اسی اندیشے کے پیش نظر اپنی پارٹی کے ایک ایک براہمن کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی ہے۔ اڈوانی، جوشی، کلراج مشرا، لال جی ٹنڈن، منی لال چوبے، اننت کمار اور نتن گڈکری یہ سب کے سب براہمن ہیں۔ کیسری ناتھ ترپاٹھی کو شکست دینے والے نند گوپال گپتا کو جب بی ایس پی سے بلا کر الہ باد سے ٹکٹ دینے کی کوشش کی گئی۔ ساکشی مہاراج جن پر لکھنؤ کے معروف براہمن رہنما کے قتل کا الزام ہے پڑوس کے ضلع سے ٹکٹ دیا گیا۔ اس بیچ اٹل جی کی بہن رائے پور میں بی جے پی سے نکل کر کانگریس میں چلی گئیں۔ بہار میں رام ولاس پاسوان کا استقبال کرتے ہوئے مودی نے خود کو سب زیادہ پسماندہ طبقہ کا فرد بتاتے ہوئے کہا کہ اگر بی جے پی براہمن بنیا جماعت ہوتی تو وہ وزیراعظم کا دعویدار نہ ہوتا۔ اس جلسے کا بہار کے بڑے رہنماؤں مثلاً سی پی ٹھاکر، گری

راج سنگھ اشونی چوبے اور کیرتی آزاد نے بائیکاٹ کیا۔ مودی کا خیال ہے کہ براہمن بھی بی جے پی کو ووٹ دینے کیلئے اسی طرح مجبور ہیں جیسے کانگریس مسلمانوں کی مجبوری ہے لیکن یہ مودی کی غلط فہمی ہے۔ مسلمان بی جے پی کو اس لئے ہرانا چاہتا ہے کہ وہ نہ صرف ان کے دین و شریعت (پرسنل لاء) کے خلاف ہے بلکہ دینی شعائر مثلاً بابری مسجد کو شہید کرنے کی مجرم بھی ہے۔ وہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کرواتی ہے جس کی سب سے بڑی مثال گجرات کا فساد ہے جس کی نگرانی خود مودی نے کی۔ اس لئے مسلمان بی جے پی کو شکست دینے کیلئے کانگریس کو ووٹ تو دیتا ہے مگر اس صورت میں جب کہ اس کے پاس کوئی متبادل نہ ہو۔ براہمنوں کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور وہ ماضی میں نہ صرف کانگریس بلکہ بی ایس پی کو بھی بڑے پیمانے پر ووٹ دیتے رہے ہیں۔

نریندر مودی کو ایک خوف یہ بھی لاحق ہے کہ کہیں اس کا حال بھی اڈوانی کا سا نہ ہو جائے جو اپنی رتھ یاترا کی مدد سے سنگھاسن تو کھینچ کر لانے میں کامیاب ہو گئے لیکن حامی جماعتوں نے اس پر اٹل جی کو بٹھا دیا۔ میڈیا پر کروڈوں روپئے خرچ کرنے کے بعد بھی بی جے پی دو سو کے ہندسے کو پار نہیں کرپائی این ڈی ٹی وی نے نمک خواری کرتے ہوئے نتیش کو پانچ پر پہنچا دیا۔ مہاراشٹر میں شیو سینا کے ساتھ لاکھ سر پھٹول کے باوجود نشستیں دلوادیں۔ کرناٹک میں یدورپا کے نام پر ۲۸ میں سے ۲۰ پر کامیاب کردیا ۲۳ اور یوپی میں ۹

سے ۴۰ پر لے گئے اس کے باوجود مجموعی ہندسہ ۲۰۰ سے کم ہی رہا اور یہ جائزہ آپسی رقابت کے اظہار سے پہلے کا تھا۔ ان جھگڑوں کے بعد یقیناً اس میں کمی ہوئی ہوگی؟ اس سوال نے مودی کو پریشان کردیا ہے اور مودی اپنی پریشانی کو قوم میں تقسیم کررہا ہے نیز مسلمانوں کو دہشت زدہ کررہا ہے۔

دہلی کے صوبائی انتخاب میں ناکامی دو وجوہات خود بی جے پی کی مرکزی کمیٹی نے تسلیم کی تھیں ۔ اول داخلی چپقلش اور دوسرے عاپ کو کمزور سمجھنا۔ اگر مودی اور بی جے پی واقعی ان نتائج سے عبرت پکڑتی تو آج یہ حال نہ ہوتا کہ اول تو نصف ریاستوں میں اس وجود نہیں ہے اور جہاں موجود ہے آپس میں دست و گریباں ہے۔ بی جے پی کے اندر عجب نفسا نفسی کا عالم ہے ہر سینئر رہنما محفوظ نشست کے چکر میں اپنے سے جونئیر کی کامیاب شدہ نشست پر ہاتھ مار رہا ہے جس کی بدترین مثال ارون جیٹلی نے سدھو اور راج ناتھ نے لال جی ٹنڈن کی حق تلفی کرکے پیش کی ۔ مودی کے بھی عدم تحفظ کا یہ عالم ہے کہ وہ گجرات کے وزیراعلیٰ کی کرسی کسی اور کو سونپ کر قومی سیاست میں جانے کی جرأت نہیں دکھا سکا شاید اس کا یہ فیصلہ درست ہی تھا اس لئے مودی کا گراف اچانک اس طرح گرنے لگے گا اس کا وہم و گمان تو شاید کانگریس کو بھی نہیں تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انتخابی تماشے میں کون اس گرتی ہوئی دیوار سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے اور کون اس کے تلے دب کر مر جاتا ہے؟

اوبامہ کا دورہ: کعبہ میرے آگے ہے کلیسا میرے پیچھے

امریکہ کے صدر براک اوباما نے گزشتہ ہفتہ یورپ اور مشرق وسطی کا سفارتی دورہ کیا۔ ہندوستان کے ذرائع ابلاغ نے اسے پوری طرح نظر انداز کر دیا۔ اردو اخبارات میں یہ خبر ایسے آئی وہ گویا صرف سعودی عرب آئے اور لوٹ گئے حالانکہ اوباما کے اس دورے کی ابتداء ہالینڈ سے ہوئی جہاں انہیں جوہری تحفظ کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ دوسرے دن انہوں نے یوروپی یونین کے صدر مقام برسلز میں ای یو اور نیٹو کے عہدیداروں سے ملاقات کی۔ پھر وہ اٹلی پہنچے جہاں عیسائیوں کے مقدس شہر ویٹیکن میں جاکر پوپ فرانسس کے خانقاہ میں حاضری دی۔ اس دورے کے آخری اور فیصلہ کن مرحلہ سعودی عرب میں طے ہوا جہاں ان کی ملاقاتشاہ عبداللہ سے ہوئی۔ ریاض میں قیام کے دوران صدر نے امریکی محکمہ خارجہ کی جانب سے باہمت خاتون ایوارڈ کے تمغے سے ڈاکٹر ماہا المناف کو نواز کر ساری دنیا کو چونکا دیا۔ عرب دنیا کی نام نہاد روشن خیال خواتین بھی اغیار سے مصافحہ کرنے سے کتراتی ہیں لیکن ماہا المناف نے جس بے دھڑک انداز میں براک اوبامہ کے ساتھ ہاتھ ملایا وہ دراصل سعودی عرب کے معاشرے رونما ہونے والی بڑی تبدیلیوں کا ایک ننھا سا مظہر ہے۔

براک اوبامہ اس دورے کے دوران ہر روز نت نئے مسائل سے جوجھتے رہے اور گوں

ناگوں وجوہات کی بناء پر کسی ایک میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں حاصل کرسکے۔یوروپ اور امریکہ اپنے آپ کو ایک دوسرے کا حلیف کہتے ہیں اس لئے کہ فی زمانہ نہ صرف ان کا مذہب ، تہذیب اور اقدار بلکہ مفادات بھی مشترک ہیں اس کے باوجود گزشتہ دنوں جبامریکہ کی جانب سے عالمی رہنماؤں کی نگرانی کا معاملہ سی آئی اے کے سابق اہلکار ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے افشا کیا گیا تو ہنگامہ مچ گیا۔ سنوڈن نے ٹھوس دستاویزات کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ امریکہ کی نیشنل سکیورٹی ایجنسی جرمن چانسلر مرکل سمیت ۳۴ عالمی رہنماؤں کی نگرانی کرتی رہی ہے۔

ان انکشافات کا امریکہ کے یوروپی ممالک کے ساتھ تعلقات پر منفی اثر پڑا۔ امریکہ کی جانب سے اس کا صاف انکار ناممکن تھا اس لئے گول مول باتیں بنائی گئیں مثلاً سینیٹر ڈائین فائن شٹائن نے کہا کہ دوست ممالک کے رہنماؤں کی جاسوسی کیا جانا صحیح نہیں گویا دشمنوں کے ساتھ ایسا کرنا درست ہے۔ صدر نے اتحادی ممالک کے رہنماؤں کی جاسوسی سے لاعلمی ظاہر کردی۔ امریکی سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کے سربراہ نے جاسوسی کی کارروائیوں کا مفصل جائزہ لینے کا اعلان کردیا ہے۔ اس بیچ امریکہ میں صدارتی دفتر پر بھی دباؤ بڑھنے لگا کہ وہ عالمی رہنماؤں کی جاسوسی کی اطلاعات اور صدر اوباما کی بظاہر لاعلمی کو واضح کرے۔ اس پس منظر میں صدر اوبامہ کو اپنے دورے کے اولین مرحلے میں یوروپی برادری کے اعتماد کو بحال کرنے کا مشکل کام کرنا تھا۔

امریکہ بہادر کی جانب سے یہ جاسوسی نہ صرف باہر کے لوگوں کی جاتی ہے بلکہ نگرانی کے نام پر خود اپنے شہریوں کی ذاتی زندگی میں بھی جھانکا جاتا ہے جو انسانی حقوق کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ انتظامیہ کی اس زیادتی کے خلاف قدامت پسند کارکن لیری کلیمین نے واشنگٹن ڈی سی کی ایک وفاقی عدالت سے رجوع کیا اور اس کے جج رچرڈ لیون نے این ایس اے کے نگرانی کے پروگرام کو غیر قانونی اور بے ربط مداخلت قرار دے دیا۔ عدالت کا فیصلہ اپنی جگہ مگر انتظامیہ اس بابت نہ تو شرمندہ ہے اور نہ کسی قسم کی مصالحت کیلئے تیار ہے۔ اس کی ڈھٹائی کا اندازہ امریکی خفیہ ایجنسی کے سربراہ کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے برملا کہا کہ عالمی رہنماؤں کے ارادوں سے باخبر رہنا جاسوسی کی قومی کارروائیوں کا بنیادی مقصد ہے۔
نیشنل خفیہ ایجنسی کے ڈائریکٹر جیمز کلیپر نے مذکورہ بیان امریکی ایوانِ نمائندگان کے پینل کے سامنے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس قسم کے اقدامات امریکی خفیہ ایجنسی کے اہم ترین فرائض میں شامل ہیں۔ جیمز کے مطابق 'غیر ملکی رہنماؤں کے ارادوں سے واقفیت ہمارے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ یہ معلومات ہم جمع کرتے ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں'۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ان کے غیر ملکی اتحادی بھی امریکی حکام اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی جاسوسی کرتے ہیں اور ایسا کرنا معمول کی بات ہے۔ تاہم کسی اور ملک کے پاس

اتنے بڑے پیمانے پر نگرانی کا نظام نہیں ہے جتنا کہ امریکہ کے پاس ہے۔ جنرل الیگزینڈر کا کہنا تھا کہ ذرائع ابلاغ نے جس معلومات کا ذکر کیا ہے اس میں سے زیادہ تر کو خود یورپی خفیہ اداروں نے اپنے لئے اکٹھا کیا اور پھر امریکہ کو فراہم کیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہمیں اس پروگرام کو ترک کرنے کے بجائے تنقید کو خاطر میں نہ لاکر ملک کا دفاع کرنا چاہئے۔

جس ملک کا انتظامیہ اس قدر اڑیل اور خودسر ہو تو صدر مملکت کس طرح اپنے دوست ممالک کا اعتماد بحال کرسکتا ہے؟ اس کے باوجود اوبامہ نے اپنی سی کوشش کی۔ ہالینڈ میں منعقد ہونے والی جوہری تحفظ کانفرنس میں کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہو سکی۔ جب سے امریکہ نے ایران کے تئیں اپنا موقف نرم کیا ہے آپسی اختلافات کے باوجود ایک گرما گرم موضوع سرد خانے میں چلا گیا ہے۔ ہالینڈ سے نکل کر اوبامہ جب برسلز پہنچے تو حسب توقع یوکرین کا مسئلہ زیر بحث آگیا۔ اس معاملے میں روس نے جس سرعت کے ساتھ اقدامات کئے ہیں اس سے کریمیہ کا تو فی الحال کوئی ذکر ہی نہیں کرتا ہر کسی کو اس بات کی فکر ہے کہ کہیں روس یوکرین پر چڑھائی نہ کردے۔ روس پر ممکنہ معاشی پابندیوں پر نیٹو کے ارکان کے ساتھ بات چیت ہوئی لیکن کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اس لئے کہ ایسا کرنے سے دیگر ممالک روس سے زیادہ مسائل کا شکار ہو جائیں گے خاص طور پر یوکرین اور برطانیہ کا جینا محال ہو جائیگا۔

برسلز کے بعد صدر براک اوباما نے اٹلی کا رخ کیا جہاں انہیں رومن کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پوپ فرانسس سے ویٹیکن میں ملاقات کرنی تھی۔ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ یہ ملاقات ایک ایسے وقت ہوئی ہے جب اوباما انتظامیہ اور کیتھولک چرچ کے درمیان اسقاط حمل اور مانع حمل کے معاملات پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گھنٹے تک جاری رہنے والی اس تاریخی ملاقات کے بعد کسی اختلاف کے بجائے "بڑھتی ہوئی عدم مساوات (معاشی) " کو کم کرنے کے "مشترکہ عزم" کا اظہار کیا گیا۔ اوباما نے کہا کہ پوپ فرانسس کی " عظیم اخلاقی اتھارٹی" سے عالم گیریت اور معاشی تبدیلیوں کی سبب خوشحال اور بدحال لوگوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تفاوت کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ گزشتہ چند دہائیوں میں امریکہ کے اندر بہت امیر اور متوسط طبقہ کی آمدنی میں فرق کو بڑھا ہے۔ وہ بولے یہ مسئلہ صرف امریکہ کا ہی نہیں سبھی ممالک کا ہے اور یہ نہ صرف اقتصادی بلکہ یہ اخلاقی مسئلہ بھی ہے"۔ اوبامہ نے پوپ کو وائٹ ہاوس آنے کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کیا۔
ویٹیکن سے اوبامہ کی آمد سعودی عرب کی راجدھانی ریاض میں ہوئی اور یہاں اقتصادی یا اخلاقی مسائل کے بجائے ساری توجہ سیاست پر مرکوز رہی ۔ ان دونوں ملاقاتوں کی سطح کا فرق ان تحائف سے لگایا جاسکتا ہے جو اوبامہ کو ویٹیکن

اور ریاض میں ملے۔ پوپ فرانسس نے اوبامہ کو دو عدد تمغات کے علاوہ اپنی کتاب صحیفہ (انجیل) کی لطف مسرت'' دی۔ اس کے جواب میں اوبامہ نے کہا کہ انہیں جب'' کبھی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوگی وہ اسے پڑھیں گے اور مجھے یقین ہے کہ یہ قوت فراہم کرے گی اور تسلی دے گی۔ اس کے برعکس شاہ عبداللہ نے ایک قیمتی سونے کا ہار اوبامہ کو تحفہ میں دیا جس کو پہنتے وقت اوبامہ کا سر عقیدت سے اپنے آپ ان کے آگے جھک گیا۔ شاہ عبداللہ جانتے ہیں کہ اوبامہ کا اقتدار تاحیات نہیں ہے جلد ہی ان کی میقات عمل ختم ہو جائیگی۔ اس مرحلے میں اگر پوپ فرانسس کی کتاب بھی انہیں اطمینان و سکون بخشنے میں ناکام ہو جائے تو یہ طلائی ہار ان کے ضرور کام آئیگا۔

سعودی عرب اور امریکہ کے تعلقات فی الحال خوشگوار نہیں ہیں لیکن ۶۰ سالہ دوستی میں یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ جب یہ کشیدگی آئی ہے۔ اس سے قبل ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران بھی تناؤ آیا تھا اور نائن الیون کے ہائی جیکروں میں سعودیوں کی بڑی تعداد کے سبب بھی تعلقات کشیدہ ہوئے تھے لیکن جس قدر اختلافات فی الحال پائے جاتے ہیں پہلے کبھی نہیں تھے۔ حالیہ کشیدگی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب امریکہ نے اپنے قدیم حلیف حسنی مبارک سے منہ پھیر لیا۔ سارے عرب سربراہ امریکہ سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ اپنے نمک خوار کی مدد پر آئیگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بعد مصر کے معاملے میں امریکہ کے

ہر اقدام عرب سربراہان کو مایوس کیا۔ نہ انہیں امریکہ کی جانب سے محمد موری کی حمایت ایک آنکھ بھائی اور نہ السیسی کی امداد بند کرنا راس آیا۔ میدان رابعہ عدویہ کے میدان پر شہید ہونے والوں معصوموں پر امریکہ کا بناوٹی غم و غصہ تک ان کے گلے سے نہ اتر سکا۔

اس کے بعد شام کا معاملے میں امریکہ نے مسلم دنیا کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی مایوس کیا۔ اس نے ایک ایسے وقت میں جبکہ کیمیائی اسلحہ کے استعمال کے سارے ثبوت سامنے آگئے تھے نہ صرف خود کوئی اقدام کرنے سے انکار کردیا بلکہ مجاہدین کی مدد سے بھی پلہّ جھاڑ لیا۔ اس رویہ کا نتیجہ یہ ہوا بشار الاسد ایک ہاری ہوئی بازی جیتنے میں کامیاب ہوگیا۔ کیمیاوی اسلحہ کو برباد کرنے کا بہانہ بنا کر امریکہ اس محاذ سے کنارہ کش ہوگیا۔ امریکہ کی یہ دغا بازی کیا کم تھی کہ امریکہ نے ایران کے ساتھساتھ ملا لیا اور یہ بات سامنے آئی کہ اپنے روایتی حلیفوں کو تاریکی میں رکھتے ہوئے ایک طویل عرصہ تک وہ ایران کے ساتھ رابطے میں تھااور اسگفت و شنید کے نتیجے میں بالآخر معاشی پابندیوں کے خاتمہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ان تمام واقعات نے سعودی عرب کو امریکہ کے تئیں اس قدر کبیدہ خاطر کیا کہ اس نے احتجاجاًاقوام متحدہ کی حفاظتی کاؤنسل کی رکنیت کو لات ماردی

حالانکہ اس کا کوئی معقول جواز نہیں تھا۔ خطے کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر بھی سعودی عرب کی جھنجھلاہٹ واجبی لگتی ہے اس لئے کہ اس سے قبل وہ اتنا تنہا کبھی نہیں تھا۔ ایران کے علاوہ عراق ،شام اور لبنان مخالف کیمپ میں ہیں۔ اومان اور یمن کا مخالفین سے دوستانہ ہے۔قطر اور ترکی جو شام کے معاملے میں سعودی کے سب سے بڑے حامی تھے وہ مصر کے حوالے سے مخالف ہوگئے ہیں۔ حماس کبھی بھی ساتھ نہیں تھا اور اب بحرین بھی شورش زدہ ہے اور تو اور دبئی نے تک ایران کے ساتھ پینگیں بڑھانی شروع کردی ہیں ۔ شمالی افریقہ میں سوڈان، تیونس اور لیبیا سے حمایت کی کوئی امید نہیں ہے ایسے میں امریکہ کی بے وفائی کچھ زیادہ ہی کھلنے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ولیعہد شہزادہ سلمان نے حال میں چین اور جاپان کے دورے کیے ۔ بھارت اور انڈونیشیا سے بھی دفاعی تعاون کے معاہدے کیے نیز پاکستان کے ساتھ تعلقات کو مزید مستحکم کیا۔

سعودی عرب سے اوبامہ نے سوائے خیر سگالی اور غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے علاوہ نہ کچھ حاصل کیا اور نہ اس کی توقع تھی ۔ اوبامہ کے دورے کی اگر کوئی یادگار تقریب تھی تو وہ ماہا منیف کی پذیرائی جس کا تصور بھی ماضی میں ممکن نہیں تھا۔ خواتین کے حقوق کی حمایت اور گھروں میں خواتین پر تشدد کے خلاف آواز اٹھانے والی ممتاز سعودی کارکن ماہا منیف سے مل کر اسے انعام واکرام سے نوازتے ہوئے اوبامہ نے کہا کہ وہ اپنی اہلیہ مشعل کی جانب سے اس فرض کی

ادائیگی کر رہے ہیں جو انعام یافتہ خواتین کو تمغہ سے نوازتی ہیں۔ اوبامہ نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ مشعل اوبامہ اس وقت موجود نہیں ہے لیکن ڈاکٹر ماہا کی تصویر شاہد ہے کہ انہیں اس کا مطلق افسوس نہیں ہے کہ وہ ۴ مارچ امریکہ میں جا کر یہ سند کیوں نہ حاصل کر سکیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر ماہا منیف کی مہم کے جد پہلو نے امریکہ کو متوجہ کیا ہے وہ مردوں کے ولی اور سرپرست کی حیثیت سے خواتین کے کامل اختیارات دے دینے کے خلاف آواز اٹھانا بھی ہے۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ جس روز براک اوباما نے ماہا منیف سے ملاقات کی ہے۔ اسی روز سعودی خواتین کی ڈرائیونگ کے اختیار کو لے کر از سر نو مزاحمت کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں مدیحہ الجروش نے عالمی خبر رساں ایجنسی کو بتایا کہ صدر اوباما کے سعودی عرب میں ہوتے ہوئے خواتین کے ڈرائیونگ کے ایشو کو سامنے لانا محض اتفاق ہے۔ مدیحہ الجروش نے کہا ''ہم اپنی سرگرمیوں کیلئے ہر مہینے کا ایک دن مقرر کرتے ہیں تاکہ اپنا مطالبہ سامنے لا سکیں۔'' اس پر امریکی انتظامیہ کے ایک ذمہ دار کا کہنا تھا کہ ''ہمیں سعودی عرب میں انسانی حقوق کی صورتحال پر، حقوق نسواں، مذہبی آزادیوں اور اظہار رائے کے معاملات کے حوالے سے تشویش ہے لیکن اس دورے پر ہمارا زیادہ تر وقت شام اور ایران سے متعلق مسائل پر صرف ہوگیا۔ اس وجہ سے انسانی حقوق کا معاملہ زیر

بحث نہ آسکا''۔ ویسے اگر یہ مسئلہ زیر بحث آتا بھی تو اس کا کوئی حل اوبامہ کے پاس نہیں تھا۔ سعودی معاشرے کے سنگین مسائل (مثلاً طلاق کی شرح جو ۲۰۱۲ء میں ۳۱ ہزار سے زیادہ سے زیادہ یعنی کل نکاح کے ۲۱ فیصد ہے) کا حل انہیں خود اسلام کی روشنی میں نکالنا ہوگا۔

اوبامہ کے لوٹ کر جانے کے بعد سعودی فرمانروا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز کا ایک اہم بدلتے ہوئے سیاسی منظرنامہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس فرمان کے تحت شہزادہ مقرن کو موجودہ ولی عہد شہزادہ سلمان کا جانشین مقرر کیا گیا ہے اور وہ کرسیٔ اقتدار خالی ہونے کی صورت میں ملک کے بادشاہ بھی بن سکتے ہیں۔ اس اعلان کے ساتھ منسلک شرط کہ '' اس شاہی فرمان کو کسی بھی طریقے سے کوئی بھی شخص کسی بھی وجہ یا تشریح کی بنا پر تبدیل نہیں کرسکتا ہے''۔اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ممکن ہے یہ باہمی تنازعہ کو روکنے کیلئے اٹھایا جانے والا اقدام ہو۔ ایسا اس لئے بھی ہے کہ شہزادہ مقرن شاہ عبدالعزیز آل سعود کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ اور ان کے بعد اقتدار کو دوسری نسل میں منتقل ہونا ہے۔ شہزادہ مقرن کی عمر ۶۹ سال ہے جبکہ ولیعہد شہزادہ سلمان ۷۸ اور خود شاہ عبداللہ ۹۰ سال کے ہیں۔ اس اعلان کے بعد یہ قیاس آرائیاں بھی کی جانے لگی ہیں کہ ممکن ہے شاہ عبداللہ اب سبکدوش ہو کر اقتدار اپنے ولیعہد سلمان کے حوالے کرنے کی سوچ رہے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اتفاق سے صدر اوبامہ کا یہ

دوسرا دورۂ سعودی عرب اہم تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔

صدر اوباما جب مئی ۲۰۰۹ء میں ریاض آئے تھے تو اس وقت وہ نئے نئے صدر بنے تھے اور وہ بہت مقبول تھے۔ شاہ عبداللہ بھی امریکی انتخابات میں براک اوباما کی کامیابی پر خوش تھے۔ اس کے بعد انہوں نے قاہرہ کا قصد کیا تھا اپنے مشہور خطاب میں مسلمانوں اور عرب دنیا کے ساتھ امریکی تعلقات کے ایک نئے باب کی نوید سنائی تھی جو وقت کے ساتھ صدا بہ صحراء بن گئی۔ اس بار ماحول یکسر مختلف تھا۔ سعودی حکام نے اوبامہ کی آمد سے قبل واشنگٹن میں مقیم یہودی اخبار 'یروشلم پوسٹ' کے امریکی نامہ نگار کو ویزا دینے سے انکار کرکے اپنے تیور واضح کردیئے۔ قومی سلامتی کی مشیر سوزن رائیس اور دوسرے امریکی افسران کے اصرار کے باوجود سعودی عرب نے ویزے کے معاملے میں کوئی لچک نہیں دکھائی جس پر وہائٹ ہاؤس نے شدید مایوسی کا اظہار کیا حالانکہ یہ ایک مستحسن اقدام تھا۔ لیکن اس دورے کے دوران امریکہ کی جانب سے ایک نہایت شرمناک واقعہ ہالینڈ میں منظرِ عام پر آیا جب ایک امریکی اہلکار کو ایمسٹرڈیم کے ہوٹل کی راہداری میں شراب کے نشے میں دھت بے ہوش پایا گیا۔ وہ اوبامہ کے حفاظتی دستے کی حملہ آور ٹیم کا رکن تھا۔ بعد میں اس کو دو ساتھیوں سمیت 'انتظامی تعطیل' پر واپس بھیج دیا گیا۔ بہتر ہوتا کہ انہیں امریکہ کے بجائے ویٹیکن روانہ کیا جاتا۔ اس لئے کہ امریکی خفیہ ایجنسی کا یہ

پہلا واقعہ نہیں ہے اس سے قبل ۲۰۱۳ء میں دو اہلکاروں کو جنسی استحصال کے الزام میں اور ۲۰۱۲ء میں کئی افسران کو کولمبیا سے طوائفوں کی خدمات حاصل کرنے کے جرم میں واپس بھیجا گیا تھا لیکن ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پوپ فرانسس بھی اپنی تمام تر اخلاقی اتھارٹی کے باوجود اخلاقی پستی میں غرق ان اہلکاروں کی اصلاح کر سکیں گے یا بالآخر ان پر حد جاری کرنے کیلئے سعودی عرب روانہ کرنا پڑے گا تاکہ دوسرے ان سے عبرت پکڑ سکیں؟

انتخابی کھیل کوئی پاس کوئی فیل

ایک عام ہندوستانی مزاجاً تفریح پسند ہوتا ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ کرکٹ کا ٹی ۲۰ ٹورنامنٹ ختم ہوا اور قومی انتخابات شروع ہوگئے۔ ٹی ۲۰ کا فائنل ڈھاکہ میں کھیلا گیا اور رائے دہندگی کا آغاز بنگلہ دیش کے پڑوس میں واقع ریاستِ آسام اور تریپورہ سے ہوا لیکن فائنل مقابلے کے نتائج میں ہندی سیاستدانوں کیلئے عبرت کا سامان ہے۔ عالمی مقابلے میں ہندوستانی ٹیم کی شکست کوئی نئی بات نہیں ہے اور ہر شکست کے پیچھے کسی نہ کسی کھلاڑی کی ناکامی ہوتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ شائقین کسی کھلاڑی کے گھر پر جاکر نہ صرف گالم گلوچ بلکہ پتھراؤ بھی کریں جیسا کہ یووراج سنگھ کے ساتھ ہوا۔
سوال یہ ہے کہ اس بار ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا نہایت سہل اور آسان جواب ہے عوام کی بیجا توقعات نے ٹیم کی شکست کو جھنجلاہٹ اور مایوسی میں تبدیل کردیا اور یہ بیجا توقعات صرف اور صرف ذرائع ابلاغ کی مرہونِ منت تھیں۔
ذرائع ابلاغ نے گوناگوں وجوہات کی بناء پر جو معاملہ ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے ساتھ کیا وہی کچھ بی جے پی کے ساتھ بھی کررہاہے۔ اتفاق سے ہندوستانی ٹیم

ٹورنامنٹ کے دوران یکے بعد دیگرے اپنی فتح درج کراتی رہی اور میڈیا اسے آسمان پر اٹھاتا رہا لیکن آزمائش کی گھڑی میں وہ ٹیم کی مدد کیلئے میدان میں نہیں اتر سکا اور میڈیا کے ذریعہ کھڑا کئے گئے گورکھ دھندے کی قیمت یوراج سنگھ نے چکائی۔ کوئی بعید نہیں کہ انتخابی نتائج کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کے ہمدردو غمخوار اپنے غم و غصہ اتارنے کیلئے نریندر مودی کے گھر اسی طرح سے رخ کریں جس طرح کہ یوراج سنگھ کے گھر گئے تھے اگر ایسا ہوتا ہے اس کیلئے وہ جعلی سروے ذمہ دار ہوں گے جو ذرائع ابلاغ نے پیسے کھا کھا کر تواتر کے شائع کئے ہیں اور جس کے نتیجے میں نریندر مودی کے تئیں بی جے پی کارکنان کی توقعات میں بے شمار اضافہ ہو گیا ہے۔

ٹی ۲۰ ٹورنامنٹ میں تو ہندوستانی ٹیم فائنل کے اندر شکست دوچار ہوئی لیکن بی جے پی کی کشتی فائنل سے قبل ہی ہچکولے کھانے لگی۔ پولنگ والے دن یکے بعد دیگرے تین واقعات نے اس کی قلعی کھول دی ۔ اول تو انتخابی منشور کا معاملہ تھا جو شیطان کی آنت بنا ہوا تھا یہاںتک کے الیکشن کمیشن کی پابندی کا شکار ہوگیا۔ کسی قومی جماعت کیلئے جو بزعم خود اقتدار پر قابض ہونے کا خواب دیکھ رہی ہو ایک منشور تک کے ظاہر کرنے میں معذوری اس کی بہت بڑی کمزوری کا پتہ دیتی ہے ۔ اس تاخیر کیلئے مختلف وجوہات سامنے آئیں ۔ اول تو یہ بتایا گیا کہ کمیٹی کے سارے ارکان چونکہ انتخاب لڑ رہے ہیں اس لئے اپنے

حلقۂ انتخاب میں مصروف ہیں۔ جب سارے ملک میں لہر چل رہی ہے تو ارکان کمیٹی کا اس طرح مصروف ہوجانا چہ معنی دارد ایسا تو اس وقت ہوتا ہے جبکہ ہوا اُکھڑ رہی ہو۔ بعد میں پتہ چلا داخلی اختلافات رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

بی جے پی کے منشور میں تاخیر کی ایک اور وجہ غالباً ان سرمایہ داروں کا دباؤ رہا ہوگا جن کی دولت کے بل بوتے پر موجودہ انتخاب لڑا جارہا ہے۔ اس صورتحال میں بی جے پی کیلئے عوامی فلاح و بہبود کی خاطر کوئی ایک بھی ایسا وعدہ کردینا جو کارپوریٹ دنیا کے خلاف ہو مہنگا پڑ سکتا تھا۔ اس لئے بی جے پی اس بار خاصہ محتاط رخ اختیار کیا۔ ٹیکس کی بابت اصلاحات سے مراد ٹیکس دہندگان کو حاصل ہونے والی سہولیات ہوتی ہیں۔ بی جے پی کے اس وعدے کا سرمایہ داروں نے کشادہ دلی سے استقبال کیا ہے مگر خوردہ بازار میں بیرونی سرمایہ کاری پر پابندی کی بات کرکے بی جے پی نے اپنے کرم فرماؤں کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لے ہی لیا۔

کانگریس کے مینی فیسٹو کو مودی فیسٹو بتانے والے ایک دانشور نے کہا مودی کے ہوتے کسی منشور کی ضرورت ہی نہیں ہے جو کچھ مودی کہتا ہے وہی پارٹی کا منشور ہے۔ اس بیوقوف کو نہیں معلوم کہ مودی کبھی کہتا ہے سکندر اعظم کو بہاریوں نے شکست دی ۔ وہ کبھی بھگت سنگھ کو انڈمان پہنچا دیتا ہے تو کبھی اروند کیجریوال کو اے کے ۴۹ کے خطاب سے نواز دیتا ہےاور وزیر دفاع اے کے

انٹونی کو پاکستان کا ایجنٹ قرار دے دیتا ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ مودی خود نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ایسے میں اس کے کہے کو کسی جماعت کا منشور قرار دینا اس جماعت کی توہین ہے۔ نیز اگر یسا ہے تو پھر آگے چل کر منشور پیش ہی کیوں کیا گیا؟

بھارتیہ جنتا پارٹی کو مودی نے فی الحال ایک ایسے دلدل میں دھنسا دیا ہے کہ اس کا دماغ ماؤف ہوچکا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر اس کو منشور کی ضرورت ہے یا مودی کی ؟ دہلی کے اندر ۷ اپریل کو نریندر مودی کی رام لیلا گرؤنڈ پر ہونے والے جلسے کی منسوخی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ مودی سے پارٹی کا دل اچاٹ ہو رہا ہے۔ اس ریلی کی منسوخی کے پیچھے اگلے دن ہونے والا راہل کا کامیاب جلسہٗ عام تھا۔ جب بی جے پی کو لگا کہ ہم اس سے زیادہ لوگ نہیں جمع ہو پائیں گے تو ریلی کو منسوخ کرکے الکٹرانک تشہیر کا بہانہ بنایا گیااور اسے بھی تکنیکی خرابی کے چلتے ملتوی کرنا پڑا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اروند کیجریوال کے گڑھ دہلی میں ایک کامیاب ریلی کرکے مودیعاپ پارٹی کے احمد آباد میں منعقدہ جلسہٗ عام کا منھ توڑ جواب دیتا لیکن بی جے پی ایسا کرنے میں ناکام رہی اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ملک کو ان تینوں یعنی بی جے پی ، اس کے منشور یا اس کے یوو راج مودی میں سے بھی کسی ضرورت ہے یا نہیں ؟

بھارتیہ جنتا پارٹی کا کانگریس کے خلاف یہ الزام ہوا کرتا تھا کہ وہ ایک فیملی بزنس ہے لیکن نریندر مودی نے یہ پیغام دے کر کہ لوگ اسے ووٹ دیں بی جے پی کو اپنی ذاتی کاروبار بنادیا۔ کل تک بی جے پی کو اپنے کیڈر پر ناز تھا لیکن اب وہ امتیاز خاک میں مل گیا ہے۔اس اعلان کے پیچھے یہ اعتراف پوشیدہ ہے کہ بی جے پی کا نام اور کام نریندر مودی ملک کو وزیر اعظم بنانے کیلئے ناکافی ہے۔ اس لئے اسے خود جھولی پسار کر راستے پر آنا پڑا۔ مودی نے اعلان کیا آج میں آپ سے اپنے لئے ووٹ مانگ رہا ہوں۔ میری اپیل ہے کہ ہر گلی اور کوچے سے آپ کا ووٹ سیدھے سیدھے مجھے ملے گا۔ ریڈیو بی جے پی پر یہ اعلامیہ سنتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی شخص ووٹ مانگ نہیں بلکہ بھیک مانگ رہا ہے۔ شرد پوار نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ مودی نئے بھکاری کی مانند جلدی میں ہے۔ سنگھ پریوار نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وزارتِ عظمیٰ کا سنگھی امیدوار کرسی کی خاطر اس قدر نیچے گر جائیگا۔

چنڈی گڑھ میں نریندر مودی نے اپنے آپ کو مستقبل کا وزیراعظم بتاتے ہوئے عوام سے نشستوں کی دہائی دی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی یہ مطالبہ ۱۰ سال بعد دوبارہ سامنے آیا ۳۰۰ ہے۔ ۲۰۰۴ء میں اس نے چمکتا دمکتا ہندوستان کا نعرہ لگا کر بی جے پی نے ۳۰۰ نشستوں پر کامیابی کا دعویٰ کیا تھا۔ ذرائع

ابلاغ کے سارے جائزے بی جے پی کی کامیابی کو یقینی قرار دے چکے تھے۔ لیکنقومنے اسے ۱۱۴ نشستوں پر اکتفاء کرنے پر مجبور کردیا۔ دس سال قبل تومیڈیا کی پیشن گوئی غلط ثابت ہوئی تھی اس بار کیا ہوگا یہ تو وقت ہی بتائیگا۔ میڈیا میں سونیا گاندھی کی ۸ کروڑ جائیداد کا چرچا چل ہی رہا تھا کہ ارون جیٹلی کے ۱۱۳ کروڑ کی دولت اور بیس کروڑ کی گاڑیاں و کوٹھیوں کا انکشاف ہوگیا۔ اگر اقتدار میں آنے سے قبل یہ حال ہے تو انتخاب میں کامیابی کے بعد یہ لوٹ کھسوٹ کا بازار کس قدر گرم ہو جائیگا یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے۔

نریندر مودی نے اپنی ایک انتخابی تقریر میں یہ بھی کہا کہ سونیا اپنے بیٹے راہل کیلئے قومی مفاد کو قربان کررہی ہیں۔ تاریخی واقعات اس مضحکہ خیز الزام کے خلاف ہیں ۔ سونیا گاندھی کی قیادت میں دو مرتبہ یوپی اے کامیاب ہوئی اس کے باوجود خود وزیراعظم بننے کے بجائے انہوں نے منموہن سنگھ کو اس عہدے پر فائز کیا جبکہ مودی نے وزیراعظم بننے کے چکر میں اپنے گرو اڈوانی کا پتہ صاف کیا ایسے میں خود غرض کون ہے اور بے غرض کون ہے اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ۔ ویسے اڈوانی جی خود بھی کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں اس لئے کہ انہوں نے بھی اپنے محسن اٹل جی کو رسوا کرکے پارٹی کی قیادت ان سے چھین لی تھی اور خود وزیراعظم بننے کا خواب دیکھنے لگے تھے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ اب نریندر مودی کے خواب کا کیا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا؟

بی جے پی کا بار بار الیکشن کمیشن کے دروازے پر دستک دینا بھی اس کی بوکھلاہٹ کا ثبوت ہے۔ مہنت اویدیہ ناتھ برسوں سے بی جے پی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑتے ہیں۔ سا کشی مہاراج کو کانگریس سے بلا کر بی جے پی نے ٹکٹ دیا ہے۔ اس نے منشور سے قبل بابری مسجد کی جگہ رام مندر کے تعمیر کا اعلان کردیا۔ وارانسی میں کبھی مودی کو ہرہر مہادیو کا درجہ دیا جاتا ہے تو کبھی شلوکوں میں اس کا نام شامل کردیا جاتا ہے لیکن یہ سب مذہب کا غلط استعمال نہیں ہے۔ رام سینے کے پر مود متلک کو پارٹی میں شامل کرلینے پر بھی بی جے پی کے سیکولرزم پر آنچ نہیں آتی۔ عباس نقوی کے مطابق صابر علی کے تعلقات یٰسین بھٹکل سے ہیں مگر وہ بھی بی جے پی میں آکر گنگا نہا لیتے ہیں لیکن سونیا گاندھی کا شاہی امام سے ملاقات کرلینا قیامت برپا کردیتا ہے۔ کیا شاہی امام ہندوستان کے شہری نہیں ہیں ؟ کیا انہیں کسی کی حمایت کرنے کا حق نہیں ہے؟ کیا مودی کا سابق مہتمم دارالعلوم مولانا غلام کے اعزاز و تکریم کے لئے دعوت دینا سیکولرزم کی خلاف ورزی نہیں تھا۔ بی جے پی کو اوچھے الزام لگانے سے قبل اپنے دامن میں جھانک کر دیکھ لینا چاہئے۔

عمران مسعود کا معاملہ اچھال کر بی جے پی خود اپنے جال میں پھنس گئی ۔ عمران کی جس ویڈیو میں اس نے مودی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بات کہی تھی وہ ٦ ماہ

پرانی تھی اور اس وقت عمران کانگریس میں نہیں بلکہ سماجوادی پارٹی میں تھا اس کے باوجود جب کانگریس نے سہارنپور سے اسے ٹکٹ دے دیا تو بی جے پی نے اس ویڈیو کی تشہیر کردی۔ عمران کو گرفتار کیا گیا اور ضمانت بھی ہو گئی لیکن جب اس کے جواب میں کوسرا ٹائمز کی جانب سے بابو بجرنگی کی ویڈیو سامنے آئی تو بی جے پی بلبلا اٹھی۔ اس نے کہا کانگریس والے ۱۲ سال پرانے زخموں کو تازہ کرکے ملک کی فضا مکدر کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عمران مسعود کی ویڈیو سے فضا مکدر نہیں ہوئی تھی۔ ان دونوں ویڈیوز میں جہاں ایک فرق مدت کا ہے وہیں یہ فرق بھی ہے کہ ایک میں کاٹنے کی کھوکھلی دھمکی دوسرے میں عملاً اس پر عملدرآمد کیا گیا ہے۔ بابو بجرنگی کا جرم عدالت میں ثابت ہو چکا ہے۔ وہ عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے ایسے میں اس کا یہ کہنا کہ مودی نرودہ پاٹیہ آکر ہمارا آتساہ (ہمت) بڑھایا اور قتل عام کے بعد ہم نے اپنے کارنامہ کی انہیں فخریہ اطلاع دی مودی کو نچلی عدالت سے ملنے والی کلین چٹ کی دھجیاں اڑاتا ہے۔

عمران مسعود کے جواب میں راجھستان کی وزیر اعلیٰ وجئے راجے سندھیا کا یہ کہنا کہ انتخاب ہو جانے دو اس کے بعد پتہ چل جائیگا کہ کون کس کو کاٹے گا سنگین اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ عمران کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے لیکن وجئے راجے راجھستان کی حدتک بااختیار ہیں اور مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرکے

وہ اپنے ارادے ظاہر کرچکی ہیں ۔ ایسے میں کانگریسیوں کو چاہئے کہ وہ امیت شاہ کے بجائے سندھیا کے خلاف پولس میں شکایت درج کروائیں اس لئے کہ امیت شاہ کے بدلہ والے بیان میں دم نہیں ہے اور اس سے وہ باآسانی بچ نکلے گا لیکن سندھیا کو عمران کی طرح پریشان کیا جاسکتا ہے۔ کانگریس نے عمران مسعود کے معاملے میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ اس طرح کی زبان کا استعمال ہمارا شعار نہیں ہے لیکن نہ ہی اس کی امیدواری بدلی اور نہ راہل کی دیوبند میں ہونے والی ریلی کو منسوخ کیا گیا۔ اس طرح کانگریس کو مسلمانوں کو لبھانے کا کام کردیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان رائے دہندگان جذباتیت کا شکار ہو کر کمزور کانگریسی امیدواروں پر اپنا ووٹ ضائع کردیں گے بلکہ وہ ان مضبوط امیدواروں کو کانگریسی امیدوار پر ترجیح دیں گے جو بی جے پی کو شکست دے سکے۔

اس میں شک نہیں کہ نریندر مودی نے بی جے پی کے مردہ جسد میں جان ڈال دی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے میدان میں اترنے سے ملک کا مسلمان بیدار ہوگیا۔ اگر یہ انتخاب نتن گڈکری کی قیادت میں لڑا جاتا اور مودی حاشیہ پر ہوتا تو مسلمانوں کو اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کہ مظفر نگر فساد کے بعد وہ نہ صرف کانگریس بلکہ سماجوادی پارٹی سے بھی مایوس ہو چکے تھے اور ملک میں رائج جمہوری نظام سے ان کا اعتماد اٹھ

سا گیا تھا لیکن نریندر مودی کی آمد نے انہیں ایک ہدف سے نواز دیا اور وہ اپنی سابقہ روایت کے مطابق ہرانے والی سیاسی حکمتِ عملی پر سرگرم کار ہو گئے۔ مودی نے جہاں اپنی حماقتوں سے بی جے پی کے اندر افتراق انتشار پھیلایا وہیں مسلمانوں کے اندر انتخاب کے حوالے سے بلا کی یکسوئی اور سنجیدگی پیدا کردی۔ مسلمان کی مودی مخالفت کا جواب اس شعر میں دیکھئے کہ ؂

مے خانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

اس دوران کچھ پڑھے لکھے مسلمان خوف ودہشت کی نفسیات کا شکار ضرور ہوئے۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ انتخاب کو بھی کرکٹ کے ٹورنامنٹ کی طرح سے دیکھیں جن کا انعقاد وقفہ وقفہ سے ہوتا رہتا ہے۔ اس تماشے میں ٹی وی چینلس کو اشتہارات ملتے ہیں، صنعتکاروں کا مال بکتا ہے، کھلاڑی جیت یا ہار دونوں صورتوں میں مالا مال ہوتے ہیں اور تماشائیوں کو تفریح پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ انتخاب کے کھیل میں کھلاڑی سیاستداں ہیں جن کی اعلان شدہ جمع پونجی میں اقتدار کے بغیر بھی کروڑوں کا اضافہ ہوا ہے اور رائے دہندگان تماشائی ہیں۔ جس طرح کرکٹ میچ کی شکست کا غم غلط کرنے کیلئے اعداد و شمار کا سہارا لیا جاتا ہے اسی طرح انتخابی اعداد و شمار پر نظر ڈالی جائے تو سارا غم غلط ہو جاتا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ پندرہویں لوک سبھا کے انتخابات ہیں اس سے قبل ۱۴ مرتبہ یہ تماشہ ہوچکا ہے اس میں جہاں ۸ مرتبہ کانگریس کو فتح حاصل ہوئی وہیں ۶ مرتبہ اسے شکست سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ان ۶ مرتبہ کی شکست میں جہاں ۳ مرتبہ غیر بی جے پی محاذ کو کامیابی ملی وہیں ۳ مرتبہ بی جے پی کو بھی کامیابی نصیب مل چکی ہے اس لئے بی جے پی کا انتخاب میں جیت جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بی جے پی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے والے اڈوانی جی کسی طرح مودی سے کم نہیں تھے یہ اور بات ہے اقتدار اٹل جی کو مل گیا۔ ان اعداد و شمار کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں کانگریس نے کل ۶ وزیر اعظم ہندوستان کو دیئے وہیں غیر بی جے پی محاذ نے بھی ملک کو ۶ عدد وزرائے اعظم سے نوازہ یہ اور بات ہے کہ ان کی مدت عمل قلیل تھی۔ کانگریس کے ۶ وزرائے اعظم میں سے ۳ کا تعلق اگر نہرو گاندھی خاندان سے تھا تو ۳ باہر والے بھی تھے وہ تو بیچاری بی جے پی ہی ہے کہ جو ۳ مرتبہ کامیاب ہونے کے باوجود صرف ایک وزیر اعظم تک سمٹ گئی ۔ دوسرے کا انتظار اس قدر طویل ہوا کہ تیسرے نے اس پر ہاتھ مار لیا اور اب تیسرا کس قدر انتظار کرے گا یہ وقت ہی بتائے گا۔ اس لئے کہ بقول محسن بھوپالی

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

نریندر مودی کی شادی خانہ بربادی

اروند کیجریوال اور نریندر مودی کے درمیان سانپ اور منگوس کا رشتہ ہے کہ سانپ جیسے ہی پھنکارتا منگوس اسے آلیتا ہے۔ لاکھ جوڑ توڑ کے بعد اپنے آپ کو بی جے پی کا امیدوار نامزد کروالینے کے بعد نریندر مودی نے جب پانچ ریاستوں کے اسمبلی انتخابات کی مدد سے اپنا سکہ جمانے کی کوشش کی تو دہلی میں بی جے پی کی شکست نے رنگ میں بھنگ ڈال دیااور مودی اپنا سامنہ لے کر احمدآباد لوٹ آیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کانگریس کو ٹھکانے لگانے کی خاطر اپنا قومی ویژن (نقطۂ نظر) پیش کرنے کیلئے دوبارہ دہلی کا رخت سفر باندھا۔ اس مہم کے لئے کسی جیوتش نے اسے ۱۹ جنوری ۲۰۱۴ء کا مہورت نکال کردیا۔ ادھر کانگریس سے پریشان اروند کیجریوال کواس سے اپنا پیچھا چھڑانے کیلئے بھی غالباً اسی جیوتش نے کیجریوال کو ۲۰ جنوری کا شبھ مہورت نکال کردے دیا۔ پھر کیا تھا اروند نے آؤ دیکھا نہ تاؤوزیر داخلہ کے گھر جانب کوچ کیا اور درمیان میں دھرنے پر بیٹھ گیا۔ اس احتجاج کے نتیجے میں کیجریوال کا کوئی بھلا تو نہیں ہوا لیکن مودی کا خواب کافور ہوگیا اس لئے کہ ٹیلی ویژن پر مودی کے ویژن کی جگہ اروند کیجریوال کا دھرنا چھاگیا۔

نریندر مودی نے دولت کی مدد سے ذرائع ابلاغ کو اپنا ہمنوا بنا کر جب پھر ایک بار اپنی شہرت کا غبارہ ہوا میں چھوڑا اور ساری قوم اسے آسمان میں اڑتا ہوا دیکھنے لگی تو اروند کیجریوال نے گجرات کا دورہ کرنے فیصلہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے دن تو گجرات کے نام نہاد ترقی کا پول کھل گیا اور دوسرے دن مودی نے ملاقات سے انکار کرکے خود اپنی مٹی پلید کروالی سچ تو یہ ہے کہ مودی کے غبارے کا ذکر تو راہل نے خوب کیا لیکن اس کے اندر سے ہوا نکالنے کا سہرہ اروند کیجریوال کے سر جاتا ہے۔ اس کے بعد نریندر مودی پھر ایک بار جوش میں آگیا اور جب بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس نے بڑودہ سے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کیلئے وہ سابق شاہی خاندان کی ایک معزز خاتون اور ایک چائے والے کو ساتھ لے کر جلوس کی شکل میں الیکشن کمیشن کے دفتر پہنچا لیکن جس دن اس خبر کو ذرائع ابلاغ پر چھا جانا تھا اروند کیجریوال دہلی میں رکشا ڈرائیور لالی کے گھر پہنچ گیا پھر کیا تھا ایک اور مرتبہ مودی کو اروند نے ذرائع ابلاغ میں دھول چٹادی۔

اروند کیجریوال کا یہ قدم دہلی میں انتخاب سے ٹھیک ایک دن قبل اٹھایا گیا تھا گویا جب لوہا بالکل گرم تھا اس نے ہتھوڑا ماردیا۔ اس ضرب کے اثرات کانگریس اور بی جے پی والے نتائج کے اعلان والے دن محسوس کریں گے۔ اروند کیجریوال پر احمدآباد، وارانسی، روہتک اور دہلی میں حملہ ہو چکا تھا۔ اول

الذکر تین حملوں کا جائے حادثہ حملہ آور کے بارے میں چغلی کھاتا تھا لیکن چوتھا حملہ دہلی کے ایک مسلم نوجوان عبدالواحد نے کیا تھا اور آخری لالی نے جس کا سارا خاندان عاپ پارٹی کا حامی ہے۔ کیجریوال نے پہلے تو وہی دشمن کی چال والا شور مچایا۔ صرف ہمیں پر حملے کیوں ہوتے ہیں؟ ان حملوں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ یہ سوال کیا پھر گاندھی سمادھی پر جاکر اعلان کیا کہ میں ان حملوں سے ڈر کر نہ تحفظ لوں گا اور نہ ان کا جواب دوں گا۔ اروند نے یہاںتک کہہ دیا کہ تشدد سے اگر مسائل حل ہوتے ہیں تو مجھے بتایا جائے کہ میں کب اور کہاں آؤں اور لوگ مجھے مارپیٹ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرلیں۔ اروند کیجریوال کی یہ ساری حکمت عملی سنگدل میڈیا کا دل نرم نہ کرسکی اور بائیکاٹ جاری رہا لیکن پھر اس نے ایک ایسا داؤں کھیلا کہ میڈیا چاروں شانے چت ہوگیا۔ اروند کیجریوال کے رکشا ڈرائیور لالی کے گھر جانے کوئی وی چینل والے نظرانداز نہیں کرسکے۔ لالی اروند کیجریوال کے قدموں میں گرگیا اور کہا کہ آپ دیوتا سمان ہیں میں عاپ کا وفادار ہوں، مجھے آپ کے اقتدار چھوڑ دینے کا دکھ تھا۔ میں نے جنتا دربار میں ملاقات کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ لالی نے ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی تسلیم کی اور اروند کیجریوال نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے معاف کردیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ نریندر مودی کے ساتھ جانے والوں کا نام کیا تھا لیکن لالی کو سارا ہندوستان نہ صرف

جانتا بلکہ پہچانتا بھی ہے۔ اسے کہتے ہیں سو سنار کی تو ایک لوہار کی اور وہ بھی ایسے موقع پر جب کہ لوہا گرم بھی ہو اور نرم بھی۔

ذرائع ابلاغ جب لالی اور کیجریوال سے پیچھا چھڑا کر واپس بڑودہ پہنچا تو وہاں نریندر مودی کا حلف نامہ نے ان کا منتظر تھا۔ اچانک پانچویں مرتبہ کاغذاتِ نامزدگی داخل کرتے ہوئے نریندر مودی اپنی شادی کا اعتراف کرکے سب کے ہوش اڑا دیئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ انتخابات نریندر مودی کو وزیر اعظم بنا سکیں گے یا نہیں لیکن اس نے بیوہ کی سی زندگی گزارنے والیجشودھا بین کو ایک کاغذی شوہر ضرور عطا کردیا۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ جشودھا بین ۴۰ سال کے بعد الیکشن کے بغیر ہی بلا مقابلہ کامیاب ہو گئیں۔ اس سے قبل مودی نے چار مرتبہ کاغذاتِ نامزدگی داخل کئے اور ہر مرتبہ بیوی کے خانے کو خالی چھوڑ دیا۔ کسی سنگھ پرچارک کے اس کالم کا خالی ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی لیکن پانچویں مرتبہ اچانک حلف نامہ میں اعتراف کیجریوال پر ہونے والے پانچویں حملے سے زیادہ چونکادینے والا تھا اس لئے فلمی اداکارائیں تو گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر اپنی شادی کو راز میں رکھتی ہیں لیکن کسی سیاستداں کی جانب سے سامنے والا یہ پہلا مشہور واقعہ تھا۔

نریندر مودی نے اس مرتبہ یہ اعتراف کیوں کیا؟ اس سوال بہت ہی آسان جواب

یہ ہے کہ گزشتہ سال کسی رضاکار تنظیم نے سپریم کورٹ میں گہار لگائی کہ رائے دہندگان کے بنیادی حقوق میں یہ بات شامل ہے کہ امیدوار اپنے حلف نامہ میں ساری معلومات فراہم کرے۔ اس پر فیصلہ کرتے ہوئے عدالت عالیہ نے ۱۳ ستمبر ۲۰۱۳ کو یہ فیصلہ دیا کہ اگر کوئی امیدوار مکمل معلومات فراہم نہیں کرتا تو انتخابی افسر اس کو یاددہانی کرائے اور اس کے باوجود اگر کوئی بات چھپائی جاتی ہے تو اس کی درخواست کو رد کردے۔ سپریم کورٹ کے اس ڈنڈے نے نریندر مودی کا منہ کھلوایا اور اس سے جشودھا بین کے بھاگ (تقدیر) کھلے اس لئے جشودھا کو اس تنظیم اور عدالت کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

اس خبر پر جو سیاسی بونڈر کھڑا ہونا تھا سو ہوا۔ راہل گاندھی نے کہا نریندر مودی دہلی میں آکر خواتین کے حقوق پر لمبی چوڑی تقریریں کرتے ہیں لیکن خود اپنی اہلیہ کا نام تک لینے سے کتراتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو اپنی بیوی کو سنبھال نہ سکا وہ ملک کیا سنبھالے گا اور ملک کی خواتین اس سے انصاف کی توقع کیسے کرسکتی ہیں؟ دگ وجئے سنگھ نے چٹکی لی مودی جھوٹا ہے اس نے حلف نامہ پر جھوٹ کہا ہے اس لئے اس پر فوجداری مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔ دگ وجئے نے کہا کہ اگر مودی کو جشودھا سے کنارہ کشی اختیار کرنی ہی تھی تو لازم تھا کہ وہ طلاق دیتا۔ دگ وجئے نے مودی کی بیوی کا معاملہ اس وقت بھی اٹھایا تھا جب مودی نے کانگریسی رہنما ششی تھرور کی ازدواجی زندگی پر تنقید کی تھی۔ اس

نیچ وزیر قانون کپلسبل نے ایک وفد کے ساتھ الیکشن کمشنر سے ملاقات کرکے مودی کی جانب سے ماضی حلف نامںپر غلط بیانی کے خلاف مناسب کارروائی کا مطالبہ کیا۔
کپِل سبل نے بی جے پی کی جانب سے کئے جانے والے اس دفاع کو مسترد کردیا کہ یہ مودی کا ذاتی معاملہ ہے۔ سبل کے مطابق اپنے امیدوار کے بارے یہ معلومات جاننا رائے دہندگان کا حق ہےاور اسے چھپانا ان کی حق تلفی ہے۔ بی جے پی والے اس معاملے میں جس قدر دفاع کرتے ہیں اتنے ہی پھنستے چلے جاتے ہیں۔ کوئی شخص اگر کسی مال غصب کرلے اور کہہ دے کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے تو کیا وہ معاف کردیا جائیگا۔ بی جے پی یہ بھی کہتی ہے کہ وہ بچپن کی شادی تھی جو زبردستی کردی گئی تھی۔ ۱۷سال کی عمر میں یہ شادی ہوئی اور تین سال تک وہ دونوں ساتھ رہے تو کیا یہ کوئی بچوں کا کھیل تھا ۔ مدھو کشور جو آج کل مودی کی بڑی وکیل بنی ہوئی ہیں فرماتی ہیں دراصل وہ ایک رسم تھی شادی ہوئی ہی نہیں تھی ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر ایسا ہے تو مودی نے اپنے حلف نامہ میں جشودھا کو اپنی بیوی کیوں لکھا؟ دراصل اگر شادی نہیں ہوئی تھی تو یہ حلف نامہ غلط ہے اور اگر ہوئی تھی تو پرانے حلف نامے غلط تھے ۔ دونوں کسی صورت درست نہیں ہو سکتے۔

بی جے پی کی وینکٹ رمن کہتی ہیں کہ وہ بچپن کی شادی تھی جو قانون کے خلاف ہے۔ اگر ایسا تو جن لوگوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کی ہے ان کو سزا ملنی چاہئے۔ نیز اس منطق سے اگر اس ملک کی لاکھوں شادیوں کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے تو نہ جانے کتنے خاندان اجڑ جائیں گے۔ ایک آدمی کو بچانے کیلئے بی جے پی ملک کے کروڑوں لوگوں کو مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہے۔ بی جے پی کا یہ بھی کہنا ہے کہ دیش کی بھکتی میں مودی نے اپنی اہلیہ کو چھوڑ دیا۔ اگر ایسا ہے تو کہ کیا مودی کے علاوہ بی جے پی کے دیگر شادی شدہ ارکان دیش بھکت نہیں ہیں؟ اس بار بی جے پی رہنماؤں مثلاً یشونت سنہا، صاحب سنگھ ورما، رمن سنگھ، وسندھرا راجے، مینکا گاندھی، کلیان سنگھ، پرمود مہاجن وغیرہ وغیرہ نے اپنی اولاد کو سیاسی اکھاڑا ہے تو کیا یہ سب دیش د روہی ہیں۔ درحقیقت اس بابت مودی نے نہ صرف ملک و قوم بلکہ سنگھ پریوار کو بھی دھوکہ دیا ہے۔

بی جے پی کے ترجمانوں کو جب کوئی جواب نہیں سوجھا تو وہ دھمکی پر اتر آئے اور کہنے لگے ہمارے پاس بھی نہرو گاندھی خاندان کے خلاف بہت کچھ مواد ہے اور اگر ہم اسے باہر لے آئیں گے تو ہنگامہ مچ جائیگا لیکن بی جے پی کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ مسئلہ دھمکیوں سے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔ بی جے پی کے منشور میں اس بار بھی یکساں سول کوڈ کی بات کی گئی ہے جو بلاواسطہ مسلم پرسنل لاء کی مخالفت ہے۔ سنگھ پریوار کو مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ ایک

سے زیادہ نکاح کرتے ہیں۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے متھرا سے بی جے پی امیدوار ہیما مالنی خود تعدد ازدواج کی محرک اور دھرمیندر کی دوسری بیوی ہیں۔ ویسے ماضی میں دھرمیندر بھی بی جے پی کے رکن پارلیمان رہ چکے ہیں۔ مودی کے سب سے بڑے حامی رام جیٹھ ملانی اور سابق بی جے پی نائب صدر کی بھی دو عدد بیویاں ہیں اور نہ جانے ایسے کتنے بی جے پی رہنما ہیں جو مسلم پرسنل لاء سے استفادہ بھی کرتے ہیں اور اس کی مخالفت بھی کرنے سے باز نہیں آتے۔

اس کے علاوہ بی جے پی کو مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ بے دریغ طلاق دے کر اپنی بیوی کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اگر مسلمان طلاق کی بابت دینی حدود قیود کا خیال نہ رکھیں تو اس سے خواتین کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے لیکن پھر بھی زوجہ دوسری شادی کرنے کیلئے آزاد تو ہو جاتی ہے اور ایسا کرنا ۴۰ سال سے زیادہ عرصہ اپنی دھرم پتنی کو معلق چھوڑ دینے سے بہتر ہے۔ جہاں تک انصاف کا سوال ہے نریندر مودی نے کاغذات نامزدگی میں اپنی جائیداد ڈیڑھ کروڑ بتلائی ہے لیکن اس کثیر دولت میں اس کی بیوی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ خود سرکاری محل میں رہتا ہے جبکہ بیوی ۵۰۰ روپے والے کرائے کے مکان میں رہتی ہے جس کے اندر بیت الخلاء تک کی سہولت نہیں ہے۔ اس کو جب اپنے بھائی کے پاس پڑوس کے گاؤں میں جانا ہوتا ہے تو بس یا رکشا سے جاتی

ہے جبکہ مودی چارٹرڈ ہوائی جہاز پر چلتا ہے کیا یہی انصاف کا اعلیٰ نمونہ ہے؟ مودی نے اپنے حلف نامہ میں بیوی کی جمع پونجی یا پین کارڈ کے متعلق لکھا کہ اسے معلومات نہیں ہے۔ اگر جشودھا کا گھر ٹمبکٹو میں ہوتا تب تو اس بیان پر یقین کیا جاسکتا ہے لیکن یہ کیسا وزیر اعلیٰ ہے جو اپنی ہی ریاست میں رہنے والی ایک خاتون کا بینک بیلنس یا پین کارڈ نمبر معلوم کرنے سے قاصر ہے جبکہ بقول خود وہ اس کی بیوی بھی ہے۔

مودی کو ان الزامات سے بچانے کی آسان سی ترکیب آسارام باپو کے ساتھ کیا جانا والا مردانگی کا ٹسٹ ہے جس کے مثبت نتائج نے اسے ضمانت سے محروم کردیا۔ اگر مودی اس ٹسٹ میں ناکام ہوجائے تو طبّی بنیاد پر اسے راحت مل سکتی ہے لیکن اس کے باوجود نریندر مودی کو بال.برہما چاریکا سرٹیفکٹ نہیں مل سکتا۔ اس لئے کہ ۱۷ اپریل ۲۰۱۳ء کو سی بی آئی کے سامنے گجرات ایس آئی ٹی کے آئی پی ایس افسر جی ایل سنگھل نے جو انکشافات کئے وہ نریندر مودی کی فطرت سے آگاہ کرتے ہیں۔ سنگھل دراصل عشرت جہاں کے فرضی انکاؤنٹر میں ملوث تھا اور اسی تفتیش کے دوران یہ معاملہ سامنے آیا۔ سنگھل نے ۲۵۷ ٹیلی فون ٹیپ پر مشتمل ایک یو ایس بی سی بی آئی کے حوالے کی جس میں کے دوران پران لال سونی بیٹی کی نجی زندگی کینگرانیغیر قانونی طور پر نریندر ۲۰۰۹ء مودی کے منشاء کے مطابق کی گئی تھی۔ مودی کے ساتھ ۲۰۰۵ء میں کچھ شردا تسو کے دوران اس کنواری

لڑکی کی ملاقات کا ذکر ضلع کلکٹر پردیپ شرما نے سپریم کورٹ میں اپنے داخل کردہ حلف نامہ میں کیا ہے۔

گجرات پولس نے نہ صرف گجرات میں اس لڑکی سمیت اس کے منگیتر کے ٹیلی فونس ٹیپ کئے بلکہ ہر جگہ ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ ہوٹل میں ان کے برابر والے کمرے میں پولس والے کو تعینات کر دیا گیا۔ بنگلور میں جہاں وہ رہتی تھی وہاں بھی اس کے فون کو ٹیپ کرانے درخواست کی گئی مگر یدورپا نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ بی جے پی نے اس بابت یہ صفائی پیش کی اس لڑکی کے والد نے اس کی درخواست کی تھی لیکن سچ تو یہ ہے اس نگرانی کا پتہ نہ لڑکی کو تھا اور نہ اس کے منگیتر یا باپ کو۔ بی جے پی نے ڈرا دھمکا کر خط لکھوالیا لیکن قانون کے مطابق اگر کوئی ملک و قوم کیلئے خطرہ نہ ہو تو اس کے فون ٹیپ نہیں کئے جا سکتے اور بی جے پی نے تسلیم کیا ہے کہ اس سے ریاست کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اس نگرانی میں مودی کی دلچسپی اور امیت شاہ پر دباؤ کا اندازہ ایک فون گفتگو سے کیا جا سکتا ہے جو سنگھل اور شاہ کے درمیان ہوئی۔ اس ۹ اگست ۲۰۰۹ء کی گفتگو میں شاہ کہتا ہے صاحب کو کسی اور سے پتہ چلا کہ وہ لوگ دو مرتبہ باہر گئے اور ہمارے آدمی اس کی اطلاع نہ دے سکے۔ مجھے لگتا ہے کہ

اپنے آدمی ٹھیک کام نہیں کر رہے۔ سنگھل توجہ دو تاخیر سے اطلاع آنے کی صورت میں ہماری تصویر بگڑ جاتی ہے۔ جس خوف کا شکار امیت شاہ تھا اسی خوف و دہشت کا شکار فی الحال جشودھا بین ہے اس لئے وہ کہتی ہے کہ اسے مودی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ مودی وزیر اعظم بن جائے۔ وہ اس کیلئے دعا کرتی ہے وغیرہ۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ۲۰۰۹ء میں ہیما دیشپانڈے اس سے ملی تھی تو وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسکول کے پرنسپل نے اول تو منع کیا پھر کچھ لوگوں کو بلا کر ان سے ڈرایا دھمکایا گیا۔ اس کے بعد وہ ہیما سے ملے بغیر ہی چلی گئی اور اب تو سنا ہے کہ وہ یاترا پر نکل چکی ہے۔

مظلوم جشودھا کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہے اس لئے کہ وہ نریندر مودی جیسے درندہ صفت انسان کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے جس کے نزدیک انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ اپنی تمام تر سفاکی کے باوجود نریندر مودی کی بیچارگی کا یہ عالم ہے کہ بی جے پی کا یہ خودساختہ سپر اسٹار ہر فلمی ستارے کے پیچھے بھاگتا ہے۔ پہلے اس نے سلمان خان کے ساتھ پتنگ بازی کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملاقات کے بعد آنے والی سلمان کی فلم جئے ہو بری طرح فلاپ ہو گئی۔ اب مودی رجنی کانت سے ملنے کیلئے بیتاب ہے۔ رجنی کانت نے ۲۰۰۴ء میں بی جے پی کو ووٹ دیا بی جے پی تمل ناڈو میں اپنا کھاتہ نہ کھول سکی۔ ۲۰۰۹ء

میں اڈوانی نے ملاقات کی لیکن اس کا اعتماد نہ حاصل کرسکے۔ اب مودی نے ملاقات کی کوشش کی تو اس نے پہلے انکار کردیا لیکن جب تمل اکائی نے بہت منت سماجت کی تو راضی ہوگیا۔ دراصل رجنی کانت کی بیٹی کی ہدایت میں بننے والی پہلی فلم کوچہ دایان مئی میں ریلیز ہونے والی ہے۔ مودی سے ملاقات کے بعد اس فلم کا کیا حشر ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

ایک انتخابی جلسہ میں مودی نے کہا تھا" میرے نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے میں بدعنوانی کس کیلئے کروں گا" فی الحال ذرائع ابلاغ میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ دراصل انسان جرائم کا ارتکاب خود اپنے لئے کرتا ہے لیکن دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ مودی نے یقیناً اپنی کرتب نگاری سے سنگھ کو اپنے آگے سے ہٹا دیا ہے اور جشودھا بین سمیت اپنے سارے خاندان سے پیچھا چھڑا لیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے پیش نظر اقتدار کا حرص اور پیچھے اروند کیجریوال ہے جو اس کے لئے خطرہ بنا ہوا ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ اقتدار کے حصول کی خاطر اور اسے قائم و دائم رکھنے کیلئے مودی نے نہ صرف بدعنوانی بلکہ قتل و غارتگری تک سے گریز نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اقتدار کے ہاتھ سے نکل جانے کے خطرہ اسے نہ چین سے بیٹھنے دیتا ہے اور نہ دے گا۔یقیناً جب انسان اقتدار کے ساتھ عائد ہونے والی ذمہ داری کے احساس سے بے بہرہ ہوجائے تو وہ ظالموں اور جاہلوں کی قبیل میں شامل ہو

جاتا ہے اور بدقسمتی سے اس بابت بیشتر سیاستداں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔

چین ملتا ہے تو ٹی وی کے خبر نامے میں - قسط اول

خبردار نے اپنے ٹی وی چینل پر نیا جائزہ پیش کرنے کے بعد سردار کو فون کر کے پوچھا:

خبردار: کیوں جناب سردار صاحب اب تو آپ مطمئن ہیں ۔ آپ کا پیسہ وصول ہوا یا نہیں ؟

سردار: (غمگین لہجے میں) ہم پیار میں جینے والوں کو چین کہاں آرام کہاں ؟

خبردار: کس کے پیار کی بات ہو رہی ہے؟ کرسی کے یا بسنتی کے؟

سردار: (چونک کر) کرسی تو ٹھیک ہے لیکن یہ بسنتی کون ہے؟آج کل تو میں نے تانگہ وانگہ چھوڑ کر ہوائی جہاز پر سواری شروع کر دی ہے۔

خبردار: اوہو آپ بھول گئے وہی بنگلور والی حسینہ جس کی آپ جاسوسی کروایا کرتے تھے۔

سردار: بھئی تم نے تو پرانے زخم ہرے کر دیئے ۔ الیکشن کی گہما گہمی میں تو میں اپنے آپ کو بھول گیا تھا ؟

خبردار: وہ بھی ٹھیک ہے لیکن کسی سنگھ پر چارک کو پیار محبت کی باتیں زیب نہیں دیتیں ۔ یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے سردار صاحب ؟

سردار: کیوں؟ کیا کوئی سنگھ سیوک انسان نہیں ہوتا ؟ اور وہ پیار نہیں

کر سکتا؟

خبردار: کیوں نہیں ؟کیوں نہیں ؟ جناب آپ کی جماعت میں تو ایک عاشق مزاج بلانوش پر چارک بھی تو گزرا ہے جس کو وزیراعظم بننے کا بھی سو بھاگیہ پراپت ہوا اور اتفاق سے وہ شاعر بھی تھا۔ مجھے یاد ہے وہ جب بھی شراب کے نشے میں ٹنُ ہو جایا کرتے تھے تو محبت کے پیارے پیارے نغمے گاتے تھے ۔ کہیں آپ نے بھی تو•••••••• (خبردار کی زبان لڑکھڑا گئی)

سردار: میں نے؟ میں نے کیا تم رک کیوں گئے ؟ بولو تم تو اپنے ہی آدمی ہو۔

خبردار: جی نہیں۔ کچھ نہیں ۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں آپ نے بھی تو ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دو چار پیگ نہیں لگا لیے۔ اس لئے کہ وہ پینے کے بعد ہی بہک جایا کرتے تھے ۔

سردار: ارے بھائی وہ پرانے لوگ تھے جینے بہکنے کیلئے سوم رس کا سہارا لینا پڑتا تھا ہم تو اس کے بغیر ہی ••••••••

خبردار: جی ؟؟؟ میں نے تو ایسے کئی لوگ دیکھے ہیں جو پی کر بھی نہیں بہکتے مثلاً آپ کے گرو گھنٹال اناڑی جی اور آپ جام و سبو کے بغیر••••• بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی ؟

سردار: بھئی ہم سنگھ کے کاریہ کرتا ہیں صدا دیش بھکتی کے نشے میں چوُر رہتے ہیں ۔

خبردار: وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں یہ پوچھ رہا تھا کہ اب تو آپ کا پیسہ وصول

ہو گیا ہوگا اس لئے آپ ہماری آخری قسط بھی بھجوا دیجئے۔

سردار: ابھی کہاں؟ ابھی تو انتخاب ایک مہینہ چلیں گے اور اس کے بعد رائے شماری ہو گی تب جاکر ہم وزیر اعظم بنیں گے۔

خبردار: وہ تو ٹھیک ہے سرکار لیکن آپ کے وزیر اعظم بننے یا نہ بننے سے ہمارا کیا تعلق؟

سردار: کیا مطلب؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ میں وزیر اعظم بنوں؟

خبردار: یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں یہ نہیں چاہتا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ بغیر الیکشن کے وزیر اعظم بن جائیں لیکن کیا کریں مجبوری ہے؟

سردار: ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ میرے وزیر اعظم بننے یا نہ بننے سے تمہارا کیا تعلق؟

خبردار: جی جناب وہ تو میں اپنے ٹھیکہ کی بات کر رہا تھا۔ ہمارے درمیان یہ معاملہ طے پایا تھارائے دہندگی تک ہم بتدریج انتخابی جائزے لے لے کر این ڈی اے کو ۲۷۲ تک پہنچا دیں گے سو ہم نے اتوار کو اسے ۲۷۵ پر پہنچا دیا اس لئے ہمارا کام پورا ہو گیا اب ہمیں اپنا معاوضہ مل جانا چاہئے۔

سردار: سو تو ہے لیکن ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ایک ماہ رک جاؤ۔اس کے بعد سود سمیت سارا قرض چکا دیا جائیگا۔

خبردار: لیکن جناب یہ تو وعدہ خلافی ہے۔آپ لوگوں نے کہا تھا سروے کے دو دن کے اندر ساری بقایا جات چکا دی جائیں گی اب تو چار دن گزر چکے ہیں

اور آج کل آپ لوگوں کے وعدے پر تو اب بھولی بھالی عوام بھی اعتماد نہیں کرتی۔

سردار: ارے بھائی تم کہاں دو چار دنوں کا رونا لے کر بیٹھ گئے۔ ایک مرتبہ میں کرسی پر بیٹھ گیا تو سالوں سال عیش کروگے سالوں سال۔ دیکھا نہیں تم نے گجرات میں گزشتہ بارہ سالوں سے کس کی مجال ہے جو مجھے ہٹا سکے۔ دہلی میں بھی یہی ہوگا۔

خبردار: جی ہاں جناب مجھے یقین ہے کہ یہی ہوگا لیکن میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا اس لئے آپ کی بھلائی اس میں ہے کہ آج شام تک رقم بھجوا دیں۔

سردار: اچھا! مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ سردار کو آنکھ دکھا رہے ہو؟ تم نہیں جانتے کہ سہراب الدین کے ساتھ میں نے کیا سلوک کیا؟ جو ہم سے ٹکراتا ہے مٹی میں مل جاتا ہے۔ اگر رقم نہیں پہنچی تو تم کیا کرلوگے؟

خبردار: دیکھئے جناب ویسے بھی ہم پر پنجہ بردار کا بہت دباؤ ہے۔ ہم تو بس یہ کریں گے آج سے اپنا لب و لہجہ تبدیل کردیں گے اور چار دن بعد ایک نیا جائزہ پیش کردیں گے جس میں وہ اعداد و شمار ناظرین کے سامنے رکھ دیئے جائیں گے جن کو ہم نے آپ کی خاطر سے بدل دیا تھا۔ اس سے ہماری کھوئی ہوئی ساکھ بھی واپس آجائیگی نیز اطالوی ہاتھ سے جو ملے گا وہ علحیدہ ہے۔

سردار: یار خبردار کچھ تو شرم کرو۔ میں تو تمہیں شریف آدمی سمجھتا تھا لیکن تم تو بڑے کمینے نکلے

خبردار: آپ ہی کیوں ساری دنیا مجھے وہی سمجھتی تھی جو آپ سمجھتے تھے اور اب ساری دنیا مجھے وہی سمجھتی ہے جو آپ سمجھتے ہیں اس لئے اب شرم کیسی؟

سردار: میں سمجھ گیا۔ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا تمہیں اپنی بقایا جات آج شام تک مل جائیں گی لیکن اتنا یاد رکھو کہ تمہارا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ یہ تو اسی وقت ختم ہو گا جب میرا کام شروع ہوگا۔

خبردار: شکریہ جناب لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے اب گیند عوام کے پالے میں ہے۔ جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ اب ان کی مرضی ہے کہ وہ گیند کو گول کے اندر ماریں یا میدان کے باہر اچھال دیں۔

سردار: یار اس موقع پر تم گیند کے میدان سے باہر جانے کی بات نہ کرو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی اگر جام لبوں سے چھن جائے تو کیسا لگے گا؟ تمہیں بولو کیسا لگے گا؟

خبردار: بھئی یہ تو مہ نوش کا مسئلہ ہے کہ وہ اس کا کیا کرتا ہے۔ مہ فروش کے لئے تو سب یکساں ہے۔ چاہے مہ خوار سے بوتل کھو جائے، ٹوٹ جائے، پی لی جائے یا کسی اور کو ہدیہ کر دی جائے اس کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا مال بک گیا منافع مل گیا بات ختم۔

سردار: یار تم سے بڑا خبر فروش کوئی اور نہیں ہو سکتا لیکن سچ بتاؤں تم لوگوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ کوئی ایسی ترکیب

بتاؤ کہ سب کچھ یقینی ہو جائے۔

خبردار: (کچھ دیر سوچ کر) میری رائے ہے کہ آپ سابق وزیر اعظم دیودار سے مل لیں۔

سردار: دیودار سے کیوں؟آج کل پارٹی کی زمامِ کار اس کے بیٹے کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہمارے ساتھ کام بھی کرچکا ہے اس سے کیوں نہیں؟

خبردار: اس سے ملنے کا کوئی انتخابی فائدہ نہیں ہے اس لئے کہ کرناٹک میں آپ کی پارٹی کا جہاز ویسے ہی ڈوب رہا ہے اس لئے الیکشن سے پہلے تو وہ آپ کے ساتھ آنے سے رہے۔

سردار: اگر بیٹا نہیں تو باپ کیسے ہاتھ آیگا؟ یہ کل یگ ہے اس میں باپ کا بیٹے پر نہیں بلکہ بیٹے کا باپ پر زور چلتا ہے۔

خبردار: میں زور آزمائی کی نہیں بلکہ سکون و چین کی بات کر رہا تھا۔

سردار: موجودہ سیاست میں پنجہ آزمائی کے بغیر چین کہاں؟میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔

خبردار: میرا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانے میں یہ بات کسی اور کے تو دور خود دیودار کے خواب و خیال میں نہیں تھی کہ وہ ملک کے وزیر اعظم بھی بن سکتے ہیں لیکن وہ بن گئے۔ اس لئے اگر آپ ان سے مل کر دریافت کریں کہ وہ چمتکار کیسے ہوا؟ اور اس نسخۂ کیمیا کو آزمائیں۔ ممکن ہے بات بن جائے؟

سردار: یار تم چمتکار کی بات مت کرو۔ جانتے ہوئے گزشتہ دنوں میں بنگال جب

میں تقریر کر رہا تھا تو کیا ہوا؟

خبردار: جی نہیں چونکہ بنگال میں آپ کے جلسوں میں لوگ کم آرہے تھے اس لئے ہم لوگوں نے ان خبروں کا بلیک آؤٹ کر رکھا تھا۔ اب آپ ہی بتا دیجئے کہ کیا ہوا؟

سردار: (ہنس کر) یہی کہ میں نے حسب معمول لوگوں سے کہا کہ ہماری سرکار آئیگی تو مہنگائی کم ہو جائیگی۔ بیروزگاری دور ہو جائیگی۔ خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ بھارت سوپر پاور بن جائیگا وغیرہ وغیرہ۔

خبردار: ہمیں پتہ ہے۔ یہ سب تو آپ ہر جلسہ میں کہتے ہیں۔ اس میں نیا کیا ہے؟

سردار: وہ دراصل آخر میں حسب عادت میں نے نعرہ لگایا ''اب کی بار'' عوام نے جواب دیا ''پی سی سرکار''۔ میں نے اپنے لوگوں سے پوچھا کہ یہ پی سی سرکار کون ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ بنگال مشہور جادوگر ہے۔

خبردار: تو آپ نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ کیا وہ آپ سے بھی بڑا جادوگر ہے؟

سردار: (قہقہہ لگا کر) بھئی کیوں نہیں میں نے یہ سوال کیا تو جانتے ہو اس کا کیا جواب ملا؟

خبردار: (حیرت سے) کیا؟

سردار: جواب تھا۔ جی ہاں جس طرح گجرات میں آپ سے بڑا کوئی بازیگر نہیں ہے اسی طرح بنگال میں پی سی سرکار سے بڑا کوئی جادوگر نہیں ہے۔

خبردار: (خوش ہو کر) بھئی اب تو آپ حجتِ بنگال کے قائل ہو گئے ہوں گے۔ پھر اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟

سردار: ہم نے پی سی سرکار کو پکڑ کر اپنی پارٹی کا ٹکٹ دے دیا۔ اب وہ بنگال میں ہمارے لئے چمتکار کرنے جارہا ہے۔

خبردار: بہت خوب۔ آپ تو ہر خطرے سے موقع نکال لینے میں ماہر ہیں لیکن دیودار سے ملاقات کے بارے میں کیا رادہ ہے اگر مرضی ہو تو میں کوشش کروں؟

سردار: جی ہاں میں سوچتا ہوں مل ہی لوں لیکن دیکھو رجنی کانت پہلے ہی سرد مہری کا مظاہرہ کرچکا ہے اگر دیودار نے بھی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تو بڑی سبکی ہوگی۔

خبردار: آپ فکر نہ کریں یہ ذاتی نوعیت کی خفیہ ملاقات ہوگی۔ کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

سردار نے فون بند کیا اور آواز لگائی ارے او سانبھا میرا مطلب ہے شاہ چل بدل چینل اور ایم ٹی وی چلا دے۔ جیسے ہی چینل بدلا گیا اس پر عزیز نازاں کی قوالی جھوم برابر جھوم شرابیکار یمکس چل رہا تھا۔ سردار بولا ارے یہ کیا بنتی یہاں بھی نہیں ہے؟

(جاری)

(قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو (قسط دوم

کرناٹک کے ہردن ہلّی گاؤں میں سردار کے ڈرائیور نے سابق وزیر اعظم دیودار کے فارم ہاؤس کے قریب گاڑی روک کر پوچھا اب؟ سردار نے کہا تم جاؤ اور جب میرا فون آئے آجانا لیکن کسی بتانا نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ڈرائیور بولا سرکار آپ کا نمک کھایا ہے۔ سردار بولا جی ہاں پتہ ہے مگر خیال رکھنا ورنہ گولی کھائے گا۔ ڈرائیور سر جھکا کر چل دیا اور سردار کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا جہاں سابق وزیر اعظم اس کے منتظر تھے۔

سردار: پرنام گرودیو

دیودار: میرا نام گرودیو نہیں دیودار ہے ہردن ہلّی دوڈے دار دیودار۔ کہیے کیسے یاد کیا؟

سردار: (مسکرا کر) جی ہاں مجھے آپ کا لمبا چوڑا نام اور لمبے چوڑے کام دونوں پتہ ہیں۔ بس یونہی چونکہ آپ وزیر اعظم بن چکے ہیں اس لئے میں نے سوچا کیوں نہ آپ کا آشیر واد لے لوں۔

دیودار: (خوش ہو کر) زہے نصیب لیکن تمہارے اپنے پریوار کے مہ خوار جی بھی تو حیات ہیں۔

سردار: جی ہاں، لیکن وہ کسی کو پہچانتے نہیں ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا تو

پوچھنے لگے تم کون ہو؟ اب بتاؤ اس دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے نہیں جانتا ہو؟

دیودار: جی ہاں مہ خوار جی جیسے کروڑوں لوگ تمہیں نہیں جانتے اور تم بھی انہیں نہیں جانتے اس لئے ان کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ ملاقات کی وجہ کیا ہے ؟

سردار: بس یونہی سمجھ لیجئے۔

دیودار: یہ یونہی کیا ہوتا ہے۔ ہمارے پیشے میں تو باپ بھی اپنے بیٹے سے بلاغرض نہیں ملتااور ان حالات میں ••••••••

سردار: جی ہاں۔دراصل میں اس راز کو پانا چاہتا تھا جس کی بدولت بغیر کسی محنت و سعی کے آپ کو وزیراعظم بن گئے؟ کیاآپ مجھے یہ بتانے کی زحمت کریں گے آپ پردھان منتری کیسے بن گئے تھے؟

دیودار: (مسکرا کر) یہ ایک پرانی کہانی ہے کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم وہ سب کیوں جاننا چاہتے ہو؟

سردار: (جھینپ کر) کیا بتاؤں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ میں بھی اس رام بان نسخہ کو آزمانا چاہتا ہوں۔ تاکہ میں بھی •••••••••آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

دیودار: جی ہاں۔آج کل تم میڈیا میں بہت اچھے جارہے ہو اور اگریہی ہوا بنی رہی تو ممکن ہے میری طرح تمہارا بھی لاٹری کا ٹکٹ لگ جائےاور اقتدار کاتاج تمہارے سرپر سجادیا جائے لیکن ••••••••••••••

سردار: (چونک کر) لیکن کیا گرودیو کوئی سنکٹ ہے کیا؟ اگر ایسا ہے تو سمئے رہتے بتا دیجئے تا کہ اپائے کیا جاسکے۔

دیودار: دیکھو ویسے ہی مجھے ہندی ٹھیک سے نہیں آتی اور تم درمیان میں یہ کیا کون سی زبان بولنے لگے تھے کہیں گجراتی تو نہیں تھی۔

سردار: جی نہیں گرودیو۔ وہ میں شدھ میرا مطلب ہے اصلی ہندی بولنے لگا تھا جیسی کہ ہم اپنے سنگھ پریوار کے اندر بولتے ہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے آپ سے مل کر ایسا لگ رہا ہے جیسے میں سر سنگھ چالک کے سمکش بیٹھا ہوا ہوں۔

دیودار: پھر سے تم نے وہی سنگھی بولی شروع کر دی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں یہ حماقتیں ہی تمہاری لٹیا نہ ڈبو دیں؟

سردار: کیسی باتیں کرتے ہیں گرودیو۔ میرا پریوار تو میری نیا کا کھیویا بنا ہوا ہے۔ اس نے مجھے کامیاب کرنے کیلئے اپنے ۲ہزار سیوک وارانسی روانہ کئے ہیں۔

دیودار: (ہنس کر) مجھے نہیں لگتا کہ سنگھ سیوک مرلی منوہر جوشی کی جگہ پر تمہیں جتائیں گے ۔ براہمن آخر براہمن ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں مثل مشہور ہے کہ اگر براہمن اور سانپ ایک ساتھ مل جائیں تو پہلے براہمن کو مارو۔

سردار: جی ہاں سرکار ہمارے یہاں بھی یہ بات زبان زدِ عام ہے اس لئے اب کی بار میں نے ایک ایک براہمن کا کانٹا نکال دیا ہے۔ مرلی منوہر جوشی سے کر تو لال جی ٹنڈن تک کسی کو نہیں چھوڑا۔

دیودار: مجھے لگتا ہے تم نے اس بابت بڑی جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے اسی لئے مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ براہمن تمہارا کانٹا نہ نکال دیں۔ اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو سب سے پہلے سنگھ سیوکوں کو وارانسی سے نکالو ورنہ وہ گنگا گھاٹ میں تمہارا شرادھ (آخری رسومات ادا) کر کردیں گے۔

سردار: (ہنس کر) مجھے اس کی چنتا نہیں۔ یوپی سے تو میں یونہی لڑ رہا ہوں اور اگر ہار بھی جاؤں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنی بڑودہ کی سیٹ تو محفوظ ہے وہاں سے جیت کر وزیر اعظم بننے میں کیا حرج ہے؟ ویسے اگر میں اترپردیش سے جیت بھی گیا تو میرا ارادہ اس نشست کو چھوڑ دینے کا ہے۔ اب اگر کوئی مسئلہ ہو تو بتائیں ؟

دیودار: ایک مسئلہ تمہاری زبان ہے جس پر کوئی لگام نہیں ہے۔ ایک تو تم بولتے کم ہو اور اگر کبھی بولتے بھی ہو تو کتے بلی کی مثال دے دیتے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے تمہیں اپنے احمقانہ بیانات سے خطرہ درپیش ہے۔

سردار: وہ ایسا ہے جب بھی ۲۰۰۲ء کے فسادات کا ذکر ہوتا ہے میرا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو تو بتائیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے وارانسی کے مسلمانوں کا دل جیتنے کیلئے میں نے آج ہی کیا کہا؟

دیودار: جی نہیں ویسے بھی آج کا بیان تو اخبار میں کل چھپے گا تو اسے بھی دیکھ لوں گا۔

سردار: (ہنس کر) ارے صاحب آپ بھی آخر پرانی نسل کے آدمی نکلے۔ آج کل

اخبار کون پڑھتا ہے سارے لوگ ٹی وی دیکھتے ہیں۔

دیودار: میں بھی ٹی وی دیکھا کرتا تھا لیکن فی الحال چھوڑ رکھا ہے۔

سردار: وہ کیوں ؟ ٹی وی دیکھنے کا اصلی لطف تو انتخاب ہی کے زمانے میں ہے۔

دیودار: ہوگا ! مگر میں ٹی وی تفریح کیلئے نہیں بلکہ خبروں کیلئے دیکھتا تھا اور اب تو ہر چینل پر نمو نمو کی اشتہاری رٹ کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دیتا اس لئے کر بور ہو کر چھوڑ دیا ہے۔ خیر ٹی وی کو چھوڑ اور تم خود ہی اپنا بیان بتادو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دلچسپ ہوگا۔

سردار: (سینہ پھلا کر) جی ہاں جناب شکریہ۔ میں نے کہا کہ میں مسلمانوں کے خلاف نہیں ہوں اور وہ جب مجھ سے ملیں گے تو انہیں مجھ سے پیار ہو جائیگا۔

دیودار: یہ تو تم نے بڑا منفی بیان دے دیا۔

سردار: آپ کیسی بات کرتے ہیں گرودیو؟ آپ کو تو میری ہر بات غلط نظر آتی ہے۔

دیودار: دیکھو میں تمہارا خیر خواہ ہو اس لئے تم میری بات کا برا نہ مانو۔ تم نے اپنے بیان میں ایک تو یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ابھی تک تم سے ملے نہیں ہیں۔ اگر تم اپنے حلقۂ انتخاب کے لوگوں سے رابطہ تک نہ کرسکے تو ان کا ووٹ کیسے پاؤگے ؟

سردار: لیکن وہ محبت والی زبردست بات اس کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟

دیودار: بھئی تم نے یہ نہیں کہا کہ تمہیں ان سے محبت ہے اور یہ کہہ دیا کہ

ان کو محبت ہو جائیگی؟

سردار: اس سے کیا فرق پڑتا ہے

دیودار: بہت فرق پڑتا ہے۔ کسی کا پیار حاصل کرنے کیلئے پہلے اس سے محبت کرنی پڑتی ہے۔ کسی کا اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اعتماد کیا نہ جائے۔

سردار: لیکن یہ کس نے کہہ دیا کہ میں مسلمانوں پر اعتماد نہیں کرتا۔

دیودار: تمہارے ٹوپی پہننے سے انکار اور اس پر اصرار نے۔

سردار: میں تو ٹوپی پہننے کے بجائے ٹوپی پہنانے کو اہمیت دیتا ہوں۔

دیودار: وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم یہ کیوں کہہ دیا کہ تم لوگوں کو بے وقوف بنانے کیلئے ٹوپی نہیں پہنتے۔

سردار: (بیزاری کے ساتھ) پھر آپ مسلمانوں کا رونا لے بیٹھے۔ ویسے بھی مسلمان مجھے ووٹ نہیں دے رہے ہیں اس لئے کیا فرق پڑتا ہے؟

دیودار: یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تم نے اس بیان سے ہندوؤں کی دل آزاری کیوں کردی؟

سردار:آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں گرودیو۔ ہندوؤں کا تو اس میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے کٹر پنتھی ہندو تو خوش ہوئے ہوں گے کہ میں نے مسلمانوں کی خوشامد نہیں کی۔

دیودار: دیکھو سردار ان شدّت پسندوں کے پاس تو کوئی متبادل ہی نہیں ہے اس

لئے وہ لا محالہ تمہی کو ووٹ دیں گے ۔ میں تو کہتا ہوں تم ان کی چنتا چھوڑ دو۔ رام سینے کے پر مود متلک کو ہی دیکھو تم لوگوں نے اسے لات مار کر بھگا دیا اس کے باوجود زبان لٹکائے تمہارے تلوے چاٹتا رہا۔ اگر اپنی عزت نفس کا ذرہ برابر بھی خیال ہوتا تو مڑ کر تمہاری جانب نہ دیکھتا۔ اس نے تو ہمارے کنڑی وقار کو ملیا میٹ کر دیا۔

سردار: تو گویا آپ ہمارے اس رویہ کی توثیق کرتے ہیں ۔

دیودار: جی ہاں وہ اقدام تو ٹھیک ہی تھا لیکن تمہیں دیگر اعتدال پسند ہندووں کو اپنے قریب کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور یاد رکھو تم لوگ جب بھی مسلمانوں کی دل آزاری کرتے وہ معتدل ہندو دور چلا جاتا ہے۔

سردار: وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے ٹوپی والے بیان سے ان کی دل آزاری کیسے ہو گئی ؟

دیودار: تمہارے بیان کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے مسلمانوں کی طرح ٹوپی لگا لینے سے وہ بیوقوف نہیں بنیں گے لیکن اس کا یہ پہلو بھی تو ہے کہ جو آئے دن جو تم ہندووں اور سکھوں کے نت نئی پگڑیاں باندھتے ہو اس سے وہ بیوقوف بن جائیں گے۔

سردار: آپ تو بہت دور کی کوڑی لائے گرودیو۔ اتنا کون سوچتا ہے؟اور ہمارے اکالی دل والے سردار تو بالکل بھی نہیں سوچتے ۔

دیودار: سوچنے سمجھنے میں سکھوں کو پہلے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن

ان میں کم از کم قومی خودداری ہوا کرتی تھی لیکن تم لوگوں کی صحبت نے ان کو بھی بے غیرت بنا دیا ہے۔ اس نوجوت سنگھ سدھو کو ہی دیکھو۔ بلاجواز امرتسر سے اس کا ٹکٹ کاٹ کر ارون جیٹلی کو دے دیا گیا اس کے باوجود وہ تمہارے حق میں چوکے چھکے لگائے جارہا ہے۔

سردار: آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا پارٹی کا وفادار کارکن ہونا بھی کوئی عیب ہے ؟

دیودار: کیوں نہیں۔ اگر وہ خوبی ہوتی تو پارٹی اس کو انعام دیتی اس کا پتہ نہ کاٹتی۔

سردار: بات بار بار ٹوپی سے شروع ہوتی ہے لیکن پھر کہیں اور نکل جاتی ہے۔

دیودار: بھئی میں تو اپنی بات کہہ چکا۔ ایک عام ہندو بہت کچھ سوچتا ہے اس لئے تمہیں احتیاط برتنی چاہئے

سردار: آپ کی بات درست ہے لیکن میں آپ کو اندر کی بات بتاتا ہوں۔ وہ ہوا یہ کہ انڈیا ٹی وی پر آپ کی عدالت والے پروگرام میں سوالات و جوابات دونوں ہمارے نمک خوار وفادار شرمانے بنا کر دیئے میں نے تو صرف اپنے انداز میں انہیں پیش کر دیا تھا اس لئے اس حماقت کی ذمہ داری مجھ پر نہیں آتی۔

دیودار: یہی تو میں کہتا ہوں دوسروں پر آنکھیں موند کر بھروسہ کرنے کی حماقت سے باز آجاؤ۔

سردار: کیا بتاؤں اس قدر جلسوں سے خطاب کرنا پڑتا ہے کہ کچھ یاد ہی نہیں

رہتا اس لئے دوسروں پر انحصار کرنا ہی پڑتا ہے

دیوار: میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم صبح شام پابندی کے ساتھ چیون پراش کھایا کرو

سردار: یہ چیون پراش بیچ میں کہاں سے آگیا؟ میں کوئی بچہ ہوں اور مجھے کوئی امتحان پاس کرنا ہے جو چیون پراش کھاؤں

دیودار: دیکھو سردار۔ بچہ اور بوڑھا ایک سمان ہوتا ہے اور پھر کسی سیاستدان کیلئے انتخاب سے بڑا امتحان کون سا ہو سکتا ہے۔

سردار: کیا آپ واقعی سنجیدگی سے مشورہ دے رہے ہیں یا یوں ہی دل لگی کر رہے ہیں

دیودار: یہ میرا نہایت سنجیدہ مشورہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم نے اس پر عمل کیا تو تم وہ احمقانہ بیان دینا بند کردوگے جن کے سبب ذرائع ابلاغ میں تمہاری فضیحت ہوتی رہتی ہے۔

سردار:آپ کس ذرائع ابلاغ کی بات کر رہے ہیں اسے تو دن رات نمو نمو کی گردان سے فرصت نہیں ہے۔ کیا آپ میری کسی ایسی غلطی کی نشاندہی کر سکیں گے ؟

سردار نے یہ کہہ کر ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور اسے چلا دیا۔ اتفاق سے اس وقت نریندر مودی کی مہاراشٹر کے وردھا میں کی جانے والی تقریر نشر ہو رہی تھی۔ سردار نے کہا کہ آپ میری یہ تقریر سنیں اور بتائیں کہ کیا اس سے اچھا خطیب ہندوستان کی تاریخ میں پیدا ہوا ہے۔ دیودار نے حمام کی جانب جاتے

ہوئے کہا ٹھیک ہے۔تم فکر نہ کرو اس ٹی وی کے اسپیکر ہر طرف لگے ہوئے ہیں میں وہاں بھی تمہاری تقریر سن سکتا ہوں۔

(جاری)

فلسطین: مجھ میں اور ان میں سبب کیا جو لڑائی ہو گی

فلسطین کے اندر غزہ پٹی کے علاقے میں الفتح اور حماس کے ایک مشترکہ اجلاس میں دونوں تحریکوں کے رہنماؤں نے ۵ ہفتوں کے اندر ایکمتحدہ عبوری حکومت کے قیام پر اتفاق کر لیا ہے۔ اس موقع پر فلسطین کے منتخب وزیراعظم اسماعیل ہنیہ نے کہا یہ قومی معاہدہ اتحاد کا نیا باب ہے۔ ہنیہ کے مطابق انتخابات کے ذریعہ حکومت اور شراکت ہی امن کی راہِ نجات ہے۔ انہوں نے اپنے موقف کو واضح کرتے ہوئے فرمایا بیت المقدس، مسجد الاقصی اور فلسطینی پناہ گزینوں کی واپسی جیسے اہم قومی مسائل کی بابت حماس کی حکمت عملی غیر متزلزل ہے۔ اس موقع پر الفتح تنظیم کے معمر رہنما عزام الاحمد نے بھی دونوں تنظیموں کے اتحاد اور متحد فلسطین کو اہم مقصد بتایا۔ یہ ملاقات تقریبا ٦ گھنٹے تک جاری رہی اور اس میں دونوں تنظیموں نے مل کر حکومت بنانے پر زور دیا۔ غزہ میں ساحلِ سمندر پر واقع مہاجرین کے کیمپ میں معاہدے کے بعد وزیراعظم اسماعیل ہنیہ نے جب اعلان کیا کہ 'یہ ہمارے عوام کے لیے خوش خبری ہے۔ تقسیم کا دور ختم ہو چکا ہے۔' تو غزہ میں فلسطینی عوام نے اس خبر کا خیر مقدم کرتے

ہوئے جشن منایا اور ہزاروں افراد سڑکوں پر نکل آئے۔ دو بھائیوں کے درمیان اتحاد آشتی کا پھر سے قائم ہو جانے پر فرحت و انبساط ایک فطری عمل ہے لیکن جو دوست نما دشمن بھائیوں کو آپس میں لڑا کر ان کی دشمنی کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ان پر غم واندوہ کے کالے بادل چھاگئے۔ امریکہ نے کہا کہ اسے فلسطینی صدر محمود عباس کی جماعت 'تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او)' اور اسلام پسند مزاحمتی تنظیم 'حماس' کے درمیان ہونے والی مفاہمت پر مایوسی ہوئی ہے۔ واشنگٹن میں امریکی محکمۂ خارجہ کی ترجمان جین پساکی نے دونوں فلسطینی گروہوں کے درمیان معاہدے کے وقت کو پریشان کن قرار دیتے ہوئے کہا کہ امریکی حکومت کو اس سمجھوتے پہ افسوس ہوا ہے۔امریکہ کے اس ردعمل نے اس کے دل میں چھپے بغض و عناد کی چغلی کردی اور ظاہر کردیا کہ بظاہر ہمدردی کا دم بھرنے والی اس خوشنما نقاب کے پیچھے کیسی خباثت پوشیدہ ہے۔بقول شاعر

مجھ میں اور ان میں سبب کیا جو لڑائی ہوگی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

امریکی ترجمان کے مطابق اس معاہدے کے نتیجے میں مشرقِ وسطیٰ میں قیامِ امن کے لیے امریکی سرگرمیوں اور فلسطین و اسرائیل کے درمیان مذاکرات جاری رکھنے کی کوششوں کو شدید دھچکا پہنچے گا۔ اس میں شک نہیں اب وہ مذاکرات پوری طرح بے معنی ہوگئے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فلسطینیوں کو اس پر افسوس

کیوں نہیں ہے؟ اس کی وجہ صاف ہے ان مذاکرات سے ان کو سوائے دھوکہ اور فریب کے کچھ بھی نہیں مل رہا تھا۔ مذاکرات کا تماشہ بند ہو جانے سے اسرائیل کا ضرور نقصان ہوا ہے جس کا اظہار امریکی محکمۂ خارجہ کی ترجمان نے اس طرح کیا کہ اس سمجھوتے کے بعد اسرائیل سے یہ توقع کرنا بہت مشکل ہوگا کہ وہ ایک ایسی فلسطینی حکومت کے ساتھ مذاکرات کرے گا جو اس کے وجود کا حق ہی تسلیم نہیں کرتی۔ امریکہ کو اسرائیل سے کیا توقعات ہیں یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن مسلم دنیا کو اس غاصب و سفاک درندے سے کوئی توقع نہیں ہے۔ ایک سوال یہ بھی اگر تحریکِ حماس اسرائیل کا ناجائز وجود تسلیم نہیں کرتی تو کیا اسرائیل اور امریکہ فلسطینیوں کی آزادی و خودمختاری کو تسلیم کرتے ہیں؟ یہ عجب ہٹ دھرمی ہے کہ مذاکرات میں شامل ایک فریق اپنی ساری شرائط منوانے پر مُصر ہو ثالث بھی اسی کا ہمنوا ہو نیز دونوں فریق ثانی کی کسی بات کو نہ مانیں۔
امریکہ کو یہ بات سمجھنی چاہئے کہ یہ معاہدہ دراصل فلسطینی اتھارٹی اور اسرائیل کے درمیان امریکی کوششوں سے ہونے والے امن مذاکرات میں بار بار پیدا ہونے والے تعطل کا نتیجہ اور محمود عباس کا اسرائیل کے خلاف جوابی اقدام ہے۔ اسرائیل نے ان مذاکرات کو کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا اور اس میں کئے گئے فیصلوں کا کبھی بھی احترام نہیں کیا اور نہ امریکہ نے انہیں منوانے کیلئے زبانی جمع خرچ سے آگے بڑھ کر کوئی اقدام کیا۔ اس لئے ان

مذاکرات کو امریکہ اور اسرائیل منہ پر دے مارنے کے علاوہ محمود عباس کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس دانشمندانہ اقدام پر اسرائیل کا ردعمل امریکہ سے دو ہاتھ آگے ہے۔ بنیامن نیتن یاہو نے فوراً سیکیورٹی کابینہ کا ہنگامی اجلاس طلب کرلیا تاکہ مذکورہ معاہدے پر اسرائیل کے باضابطہ ردِ عمل کا فیصلہ کیا جائے لیکن یاہو کی بوکھلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ اس نے کابینی اجلاس میں کوئی مشورہ کرنے سے قبل ہی غزہ پر فضائی حملہ کرکے ۱۲ شہریوں کے زخمی کردیا۔

صدر محمود عباس نے جب گذشتہ دنوں حماس کی قیادت سے مذاکرات کے لیے فتح کا اعلیٰ سطحی وفد غزہ بھیجا تو اسرائیل چوکنا ہو گیا۔ نتن یاہو نے اپنے دھمکی آمیز انداز میں محمود عباس کو حماس کے ساتھ مصالحتی مذاکرات پر خبردار کیا اور کہا کہ انہیں اسرائیل اور اس کی دشمن جماعت حماس میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا لیکن جب اسرائیل کی گیدڑ بھبکی کو جوتے کی نوک پر اڑا فلسطینیو ں آپس میں مصالحت کرلی تو یاہو نے کہا'' محمود عباس حماس کے ساتھ امن چاہتے ہیں یا اسرائیل کے ساتھ ؟عباس نے حماس کو گلے لگا کر اپنی ترجیحات واضح کردی ہیں''انتہا پسند اسرائیلی وزیر خارجہ ایویگڈور لائبرمین نے وزیراعظم کے اس دھمکی کو کافی نہیں سمجھا اور کہا تھا کہ محمود عباس نے اگر حماس کے ساتھ قومی اتحاد کے معاہدے پر دستخط کیے تو یہ اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی کے درمیان مذاکرات کی منسوخی پر دستخط ہوں گے۔ لائبرمین

بولا محمود عباس حماس اور اسرائیل میں سے کسی ایک کے ساتھ ہی امن قائم کر سکتے ہیں۔ اسرائیل کے اس احمقانہ رد عمل پر محمود عباس کا رویہ معمولی ترمیم کے ساتھ مضطر خیرآبادی کا اس شعر کی مصداق ہے ؎

تمہیں چاہوں، تمہیں نہ چاہنے والوں کو نہ چاہوں
مرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

فلسطینی صدر کے ترجمان نبیل ابو رودینہ نے اسرائیلیوں کی اس غوغا آرائی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ فلسطینیوں کے درمیان اتحاد ہمارا داخلی معاملہ ہے۔ محمود عباس نے امن اور فلسطینی عوام کے اتحاد کا انتخاب کیا ہے کیونکہ فلسطینیوں کے درمیان اتحاد سے امن کو تقویت ملے گی نیز مصالحت اور مذاکرات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ویسے بھی اسرائیلی اور فلسطینی مذاکرات کاروں کے درمیان امن عمل سکراتکے عالم میں اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اس کے خاتمہ تاریخ ۲۹ اپریل ہے۔ ان مذاکرات کے حوالے سے اسرائیل کا موقف نہایت دلچسپ اور منافقت کی اعلیٰ ترین مثال ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتا ہے کہ اس گفتگو میں سارے فلسطینی شامل نہیں ہیں اس لئے کہ حماس اس سے الگ ہے۔ فلسطینیوں کے اندر آپسی اتفاق و اتحاد کا فقدان اسے بے فائدہ بنا دیتا ہے لیکن جب اتحاد و مفاہمت ہو جاتی ہے تو کہتا ہے کہ جب آپ نے حماس سے ہاتھ ملا لیا ہے تو ہم آپ سے بات نہیں کر سکتے۔ گویا 'چت بھی میری اور پٹ بھی میری' کی

مصداق ہم کسی صورت امن نہیں چاہتے والا اثریل رویہ۔ اب ایسے فریق سے گفتگو کے جاری رہنے یا ختم ہو جانے سے فریق ثانی کا کیا بگڑتا ہے ؟

اسرائیل کی تمامتر مخالفت کے باوجود فتح اور حماس کے درمیان مفاہمت کا آغاز اتفاق سے اپریل ہی کے آخری ہفتہ میں تین سال قبل ۲۰۱۱ء میں حسنی مبارک کے اقتدار سے بے دخل ہو جانے کے بعد مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں ہوا۔ حماس کے رہنما خالد مشعل اور الفتح کے سربراہ محمود عباس نے اس میں شرکت کی ۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے اس تقریب میں شرکت کے لیے ایک سرکردہ خصوصی مندوب بھیجکر اتحاد کو سراہا۔ لیکن امریکہ اور اسرائیل نے اس وقت بھی ہو بہو اسی طرح کا منفی رویہ اختیار کیا تھا اور کہا تھا فلسطینی اتھارٹی کو امن یا حماس میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا بدقسمتی سے وہ گفتگو بارآور نہ ہو سکی تین سال کا وقفہ گزرا لیکن فلسطینیوں کو امن کی شاخ تو دور ایک پتہ بھی نہیں ملا۔ اس دوران دوحہ میں گفتگو آگے بڑھی اور اب اس کو غزہ کے اندر حتمی شکل دی گئی ۔

قاہرہ یا دوحہ کے بنسبت غزہ کے اندر حماس کی میزبانی میں اس معاہدے کا وقوع پذیر ہونا اپنے آپ میں ایک بہت بڑی علامت ہے جبکہ گزشتہ سال حالات اس قدر دگر گوں ہو گئے تھے کہ حماس کے رہنماڈاکٹر موسیٰ ابو مرزوق کو کہنا پڑا تھا ’’فتح کے ایک ترجمان نے اسرائیل کے بجائے حماس کو اپنا مرکزی دشمن بنا

رکھا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جس میں موصوف کی جانب سے حماس کو بدنام کرنے کے لیے کوئی نیا جعلی شوشہ نہیں چھوڑا جاتا۔ فتح کے ترجمان حماس پر الزام تراشی اور جماعت کو بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتے ہیں"۔انھوں نے صدر محمود عباس سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنی جماعت کے ان سورماؤں کی زبان کو لگام دیں جو قومی مفاہمت کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔دوسری جانب اسرائیل اور امریکہ کی جانب سے محمود عباس کو یکے بعد دیگر ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔
نام نہاد امن مذاکرات جس کے خاتمہ پر آج کل ٹسوے بہائے جارہے ہیں ان کی ناکامی کاامکان تو گزشتہ جولائی میں پیدا ہوگیا تھا جب فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس کی انتظامی انقلابی کونسل نے جان کیری کے منصوبے کو مسترد کرتے ہوئے تجاویز میں تبدیلی کا مطالبہ کیا تھا۔ فلسطینی رکن پارلیمان مصطفیٰ برغوثی نے اعلان کیا تھا کہ " قائدین کے اجلاس کے دوران فلسطین کے اکثر طبقات نے اسرائیل کے ساتھ امن بات چیت کے نئے آغاز کی تجاویز کو رد کردیا ہے"۔ مجلس عاملہ کے رکن واصل ابویوسف نے مسترد کرنے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیا کہ "جان کیری نے یہودی بستیوں کی تعمیر رکوانے کی کوئی ضمانت دی ہے اور نہ ہی امن مذاکرات کی بنیاد ۱۹۶۷ء کی سرحدوں کو بنانے کی بات کی ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء ہی سے فلسطینی رہنما امریکہ کی

ٹال مٹول والی پالیسی کو سمجھنے لگے تھے۔

اس سال ماہِ مارچ میں فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس نے خلاف توقع اسرائیل سے غزہ پر جاری بمباری اور کشیدگی ختم کرنے کیلئے کہہ کر سب کو چونکا دیا۔ اسرائیل ان دنوں غزہ سے مجاہدین کے جنوبی اسرائیل پر راکٹ برسانے کا بہانہ بنا کر معصوم شہریوں پر بمباری کر رہا تھا۔ فلسطینی صدر نے مطالبہ کیا تھا کہ ''محاصرہ زدہ غزہ کی پٹی پر حملے بند کئے جائیں۔'' نومبر ۲۰۱۲ء کے بعد اسرائیل کی جانب سے وہ شدید ترین بمباری تھی۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے بھی اسرائیلی حملہ کی مذمت کی تھی جس میں تین فلسطینی شہید ہو گئے تھے۔ اس کے فوراً بعد محمود عباس نے اسرائیل کے خلاف کٹڑہ رخ اختیار کرتے ہوئے کہا تھا وہ کسی بھی صورت اسرائیل کو بطور صہیونی ریاست تسلیم نہیں کریں گے اور نہ اسرائیل کے زیر تسلط مقبوضہ بیت المقدس کے صرف ایک حصے پر فلسطینی ریاست کے دارالحکومت کے طور پر اکتفا کریں گے۔ انہوں نے اقوام متحدہ میں فلسطینی ریاست کو تسلیم کرانے کے لیے کوشش کے دوران بین الاقوامی دباؤ اور واشنگٹن کے اعتراضات کی مزاحمت کا بھی ذکر کیا اور کہا ''وہ دباؤ ڈال رہے ہیں کہ صہیونی ریاست کے بغیر امن نہیں ہوگا لیکن ہم اس کو کسی بھی طرح تسلیم نہیں کریں گے''۔ اس بیان سے ظاہر دباؤ کس کی جانب سے ڈالا جا رہا ہے۔

اس کے برعکس نیتن یاہو کا موقف یہ تھا کہ ’’ میں تنازعے کے خاتمے کے لیے آگے بڑھنے کو تیار ہوں لیکن ہم فلسطینی ریاست کے قیام کی اجازت نہیں دیں گے کیونکہ یہ تنازعے کو جاری رکھے گی۔اس لیے انہیں صہیونی ریاست کو اسی طرح تسلیم کرنا ہوگا جس طرح وہ ہم سے فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کررہے ہیں‘‘۔یاہو نے مقبوضہ بیت المقدس کو بھی اسرائیل کی عمل داری رکھنے کا اعادہ کردیا۔غاصب اسرائیل کے دو بنیادی مسائل ہیں ایک تو کسی بھی ناجائز اولاد کی طرح اسے اپنے ولدالحرام ہونے کا شدید احساس ہے اسی لئے وہ کبھی مسلم ممالک کی کانفرنس کی جانب سے اس کے تسلیم نہ کرنے کے اظہار پر چراغ پا ہو جاتا ہے تو کبھی فلسطینیوں پر اسے تسلیم کرنے پر اصرار کرنے لگتا ہے حالانکہ دنیا بھر کے کئی ممالک اس کو تسلیم کرچکے ہیں۔
بقول محمود عباس ’’تنظیم آزادیٔ فلسطین (پی ایل او) ۱۹۹۳ء میں اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرچکی ہے‘‘ لیکن اسرائیل کو اس پر اطمینان ہی نہیں ہوتا۔فلسطینیوں کو خدشہ ہے کا کہ اسرائیل صہیونی ریاست تسلیم کرنے کا مطالبہ دراصل فلسطینی مہاجرین کے حق واپسی کو محدود کرنے کے لیے اور صدیوں سے آباد عربوں کے حقوق سلب کرنے کیلئے دوہراتا رہتا ہے۔اسرائیل چونکہ غاصب اور سفاک ہے اس لئے وہ ایک احساس جرم میں گرفتار رہتا ہے اور اسے اپنے وجود کا خوف مسلسل ستاتا رہتا ہے۔یہی وجہ ہے اگر کسی بھی گوشے سے اس کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی آواز آتی ہے تو وہ حواس باختہ ہو کر بلبلا اٹھتا ہے۔

اسرائیل چونکہ مشرقی بیت المقدس پر اپنا قبضہ اور مغربی کنارے کی وادی اردن میں اپنی موجودگی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔اسی طرح وہ غرب اردن میں قائم یہودی بستیوں سے انخلاء کو بھی تیار نہیں ہے۔ اسرائیلی حکومت نے غرب اردن میں یہودی بستیوں کی تعمیر بھی جاری رکھی ہوئی ہے اور سال ۲۰۱۳ء کے بعد سے یہودیوں کی آبادکاری کا عمل دگنا کر دیا گیا ہے۔ مصر کے اندر فوجی حکومت کے قیام سے غزہ کا محاصرہ دن بدن تنگ

ہوتا جارہا ہے ایسے میں اگر حماس اور فتح ایک ساتھ ہو جائیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ موجودہ مصالحت کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔غزہ آنے والے فتح کے رہنما عزام الاحمد نے یہی کہا کہ ''ہم تو فلسطینی جماعتوں کے درمیان باہمی اختلافات کا خاتمہ چاہتے ہیں، خواہ اسرائیل کے ساتھ مذاکرات ہو رہے ہوں یا نہ ہو رہے ہوں، ہم اسرائیلی قبضے کا خاتمہ اور غزہ و مغربی کنارے کی تعمیر چاہتے ہیں اس لئے کہ ہم ایک ملک ہیں۔ایک ہی لوگ ہیں اور دنیا کی کوئی بھی طاقت ہماری اس مقدس سرزمین کو پامال نہیں کرسکتی''۔اس کے جواب میں غزہ کے وزیراعظم اسماعیل ہنئیہ نے یقین دلایا''ہمیں قومی مصالحت کے عمل کو پایہ تکمیل کو پہنچانا ہے اور اپنے باہمی اختلافات کا خاتمہ کرنا ہے تاکہ ہماری ایک حکومت ہو،ایک قومی سیاسی ایجنڈا اور ایک ہی نظام ہو۔ان مذاکرات میں ناکامی کی کوئی گنجائش نہیں ہے''۔اس صورتحال میں جبکہ مشکلات کے اندر سے خیر کا پہلو نکلتا ہوا

نظر آرہا ہے صادق حسین کا یہ شعر یاد آتا ہے

تندیِ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے

فلسطین کے علاوہ ایک دلچسپ اور خوش آئند خبر تہران سے آئی جب سعودی عرب کے نئے سفیر غرمان الشہری نے گزشتہ ماہ تہران میں اپنا عہدہ سنبھالتے وقت ایران کے نائب وزیر خارجہ حسین امیر عبداللھیان کے ساتھ ملاقات میں ایران کے ساتھ تعلقات میں فروغ کے لئے سعودی فرمانروا عبداللہ بن عبدالعزیز کے مثبت نقطۂ نگاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا عالم اسلام میں دونوں ملکوں کی اہمیت کے پیش نظر اعلی سطح پر دونوں ملکوں کے تعلقات کا جائزہ لینا چاہیئے ۔ عبدالرحمان غرمان الشہری نے کہا کہ علاقے اور عالم اسلام کے حساس حالات کے پیش نظر، ایران اور سعودی عرب کے حکام کے درمیان حکمت و درایت ، ہم آہنگی اور مشترکہ تعاون کا ہونا ایک اہم ضرورت ہے ۔اس ملاقات میں حسین امیر عبداللھیان نے کہا کہ ہمسایہ ملکوں اور عرب حکومتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا ایران کی ترجیحات میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں ایران سعودی عرب کے لئے ایک خاص اہمیت کا قائل ہے اور تمام شعبوں میں سعودی عرب کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنانے کا خواہاں ہے ۔کاش کے یہ بے جان الفاظ اخلاص کا جامہ پہن کر عمل کی دنیا میں آئیں ۔ عدل و قسط کا قیام اور حق کی سربلندی کا وسیلہ

ہیں۔ اس لئے کہ عدل و قسط قائم کرنا اور اعلائے کلمتہ الحق امت مسلمہ کا فرض منصبی ہے لیکن اس کو ادا کرنے کیلئے ان دونوں ممالک کو شام و مصر کے تئیں اپنے اپنے موقف میں تبدیلی کرنی ہو گی ارشادِ خداوندی ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے (۴:۱۳۵)

(قصہ ٹوپی کا (قسط سوم

سابق وزیر اعظم دیودار جب دیوان خانے میں لوٹ کر آئے تو ٹی وی پر تقریر ختم ہو چکی تھی اور کانگریس کا ترجمان اس کا پوسٹ مارٹم کر رہا تھا۔ سردار نے غصے سے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا یہ چلے آئے کھمبا نوچنے والے ۔اگر میرا بس چلے تو ان کی کھال ادھیڑ دوں یا ان سب کو پاکستان بھیج دوں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ میں نے کیا غلط کہا۔ کوئی ایک بھی بات نا معقول ہو تو آپ نشاندہی فرمادیں۔

دیودار: (مسکرا کر) بھئی تم ایک کی بات کر رہے ہو اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس کتنی غلطیاں بتاؤں؟ مثلاً تم نے مہاراشٹر کے وزرائے اعلیٰ کی تعداد ۲۷ بتادی اور دیکھا تم نے اس ترجمان نے اس کی تردید کرتے ہوئے ۱۷ وزارائے اعلیٰ کی فہرست سنا دی ۔ کیا تمہیں گنتی تک نہیں آتی مجھے تو تمہاری گجراتیت پر شبہ ہو رہا ہے۔

سردار: کیا بتاوں گرودیو کہ اسکول کے زمانے میں حساب ہی میرا سب سے پسندیدہ مضمون تھا۔ اس کے بعد جب چائے کی دوکان پر بھی تھا تو حساب کتاب میں مجھ

سے کبھی کوئی بھول چوک نہیں ہوتی تھی لیکن سنگھ کی شاکھاؤں میں جانے کے بعد کم بخت سارا ہی کھاتہ ہی غلط ہو گیا۔ وہاں کبھی دو دونی پانچ تو کبھی دو دونی تین ہونے لگا۔ اس لئے اس میں میرا نہیں بلکہ پریوار کا قصور ہے۔

دیودار: (مسکرا کر) تم نے تو بڑی چالاکی سے اپنی کمزوری کیلئے اپنی مادرِ تنظیم کو موردِ الزام ٹھہرا دیا لیکن اس سے کام نہیں چلے گا۔ سنگھ نے تمہیں حساب نہ سہی تاریخ کا سبق تو پڑھایا ہی ہوگا؟

سردار: جی ہاں کیوں نہیں سکندر سے لے کر بابر تک آپ کسی کے بارے میں بھی مجھ پوچھیں میں درست جواب دوں گا۔

دیودار: اچھا! تو گویا سکندر اور بابر دونوں ہی مسلمان تھے؟

سردار: جی ہاں اس میں کیا شک ہے؟ دونوں حملہ آور مسلمان تھے جو سارے ہندوؤں کو کلمہ پڑھانے آئے تھے وہ تو ہمارے پریوار نے ان سے دھرم یدھ کرکے انہیں ناکام کر دیا۔

دیودار: اچھا؟ تمہارا پریوار اس وقت کہاں تھا؟ میں تو سنا ہے ہیڈگوار نے

سنگھ پریوار کی بنیاد ڈالی تو کیا ہیڈگیوار کا جنم سکندر سے پہلے ہوا تھا اور انتقال بابر کے بعد

؟

سردار: جی ہاں کیوں نہیں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

دیوادر: فرق کیوں نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ اگر یہ درست ہے تو ہیڈگیوار کی عمر ۱۸۰۰ سال سے زیادہ ہونی چاہئے۔

سردار: کیا ۱۸۰۰ سال آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ ۱۸۰۰ سال قبل پاٹلی پتر کہاں تھا جس پر سکندر نے چڑھائی کی تھی ؟

دیودار: اچھا پاٹلی پتر نہیں تھا تو کیا چانکیہ تمہارے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا۔

سردار: جی نہیں ویسے ہمارے گاؤں کا نام براہمن واڑہ ہے لیکن وہاں ایسے مشکل نام نہیں رکھے جاتے۔

دیودار: لیکن تم نے اچانک پاٹلی پتر کا ذکر کیوں چھیڑ دیا؟

سردار: اوہو آپ نہیں جانتے پاٹلی پتر میں ہی تو سکندر کو ہمارے پریوار نے شکست دی تھی۔

دیودار: اچھا میں نے تو سنا ہے کہ پورس سے اس کی لڑائی سندھ ندی کے کنارے ہوئی تھی اور وہ وہیں سے واپس لوٹ گیا تھا۔

سردار: ہو سکتا ہے اس وقت سندھ ندی بہار میں بہتی رہی ہو اور اب وہ راستہ بدل کر پاکستان چلی گئی ہو؟

دیودار: (حیرت سے) جی ہاں تمہارے راج میں کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن دیکھو تم زبدہ کو سنبھالو کہیں اس کا پیر نہ پھسلے اور پاکستان کی جانب نکل جائے۔

سردار: کیسی باتیں کرتے ہیں گرودیو۔ ہم نے اس کا پکا انتظام کر رکھا ہے۔

دیودار: اچھا؟ وہ کیسے؟

سردار: آپ نے سردار سرور کا نام نہیں سنا؟

دیودار: جی ہاں وہ تو ڈیم ہے۔ میرے زمانے میں بھی اس بند کے ایک حصے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا۔

سردار: وہی تو! ہم نے اس کو اسی لئے مکمل کیا ہے تاکہ کہیں نربدہ اپنے پیر پھیلا کر پاکستان کی جانب نہ نکل جائے۔ جب سارا پانی ہم گجرات ہی میں روک لیں گے تو وہ پاکستان جا کر کیا کرے گی بلکہ پاکستانی اسے اپنے ملک میں داخل ہونے کا ویزہ بھی نہیں دیں گے۔

دیودار: ویزہ؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو سردار؟

سردار: وہی جو آپ سن رہے ہیں گرودیوَ۔ ویزہ یعنی اجازت نامہ۔ خیر جس طرح ویزہ آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے اسی طرح ۱۸۰۰ سال والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟

دیودار: (جھنجلا کر) ارے احمق تجھے نہیں معلوم سکندر اور بابر کی پیدائش کے دوران ۱۸۰۰ سال کا فرق تھا۔

سردار: (قہقہہ لگا کر) کیسی بات کرتے ہیں سرکار کیا مغلیہ سلطنت اتنی طویل

تھی ؟ میں نہیں مانتا۔ میں نے تو سنا ہے ڈھائی تین سو سال میں سارا کھیل ختم ہوگیا تھا۔

دیودار: وہ تو تم نے صحیح سنا لیکن تمھیں کس نے بتایا کہ سکندر مغل تھا؟

سردار: (ہنس کر) نہیں تو کیا انگریز تھا ؟

دیودار: جی ہاں وہ تو یوروپین تھا۔

سردار: (تعجب سے) اچھا! تب تو آپ یہ بھی کہہ دیں گے کہ وہ مسلمان نہیں تھا۔

دیودار: اس میں کیا شک ہے۔

سردار: اچھا تو سکندر عیسائی اور بابر مسلمان ؟ حیرت ہے۔

دیودار: ارے احمق تجھے یہ کس نے کہہ دیا کہ وہ عیسائی تھا۔

سردار: کس نے؟ آپ نے ہی تو ابھی کہا کہ وہ ••••••••

دیودار: کیا کہا میں نے ؟

سردار: یہی کہ وہ بابر سے ۱۸۰۰ سال قبل پیدا ہوا تھا اور یوروپ سے آیا تھا اس لئے لازماً عیسائی رہا ہوگا ؟

دیودار: (سرپر ہاتھ مار کر) ارے بھائی حضرت عیسیٰؑ کی بعثت سے قبل کوئی عیسائی کیسے ہو سکتا ہے؟

سردار: وہ بھی درست ہے؟

دیودار: اب تمہاری سمجھ میں آیا ہیڈگیوار، سنگھ پریوار اور سکندر کے درمیان کا فرق؟

سردار: (کچھ سوچ کر) جی ہاں میں سمجھ گیا۔ ہیڈگیوار نے نہیں تو گوتم بدھ نے سکندر کو ہرایا ہوگا جیسے میں نتیش کمار کو ہرانے والا ہوں۔

دیودار: تمہارا گوتم بدھ سے کیا واسطہ؟ وہ بہاری اور تم گجراتی۔

سردار: یہ آپ سے کس نے کہا کہ گوتم بدھ بہاری تھا؟

دیودار: نہیں تو کیا گجراتی تھا؟

سردار: بھئی اس وقت سارا بھارت ایک اکھنڈ بھارت تھا۔ بہار، گجرات، بنگلہ دیش اور پاکستان وغیرہ نہیں تھا۔

دیودار: تب بھی گوتم بدھ سے تمہاری کیا نسبت؟

سردار: یہی کہ اس نے بھی گھربار چھوڑ دیا تھا اور میں نے بھی ....

دیودار: اب بس بھی کرو یار۔ اس نے تو تخت وتاج چھوڑنے کیلئے گھربار چھوڑا تھا اور تم نے اقتدار پانے کیلئے گھر سنسار چھوڑا ہے اس لئے اس سے تمہارا کیا واسطہ ؟

سردار: گرودیو آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ بہت دور نکل جاتے ہیں۔ بھئی کس لئے چھوڑا ؟اسے چھوڑیئے ! چھوڑا یا نہیں یہ اہم ہے۔

دیودار: اچھا اب زیادہ لمبی لمبی نہ ہانکو یہ بتاؤ کہ وہ شیامہ جی کرشنا ورما کا کیا معاملہ ہے جسے تم نے شیامہ پرشاد مکرجی بنا دیا۔ تم اپنی پارٹی کے پہلے اوتار بھارتیہ جن سنگھ کے صدر سے تک واقف نہیں ہو؟

سردار: (جھینپ کر) وہ دراصل ہماری امریکی ایجنسی نے گوگل سے معلومات حاصل کی تو نام کی وجہ سے تھوڑا سا کنفیوزن ہو گیا تھا۔

دیودار: تھوڑا کنفیوزن؟ کیسی بات کرتے ہو۔ تمہارا مکرجی ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا اور وویکا نند کا ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔ اس کے باوجود تم نے دونوں کی بات چیت کروادی۔ اور تو اور مکرجی کا انتقال سرینگر میں ہوا اور تم اس کی راکھ لینے برطانیہ پہنچ گئے بھئی دماغ بھی تو کوئی چیز ہے؟ تمہیں اپنی ریاست کے مجاہدِ آزادی اور اپنی پارٹی رہنما کے بارے میں بھی امریکیوں سے پوچھنا پڑتا ہے۔

سردار: گرودیو میں نے کب کہا کہ شیامہ پرشاد مکرجی کا تعلق گجرات سے تھا؟

دیودار: جی ہاں مجھے تمہارے گجرات پریم کا بھی پتہ ہے تم اپنی دھرتی کے مہان سپوت گاندھی جی کے بارے میں بھی نہیں جانتے کہ انہوں نے اپنے مشہور و معروف بھارت چھوڑو آندولن کا اعلان ممبئی میں کیا تھا جبکہ ابھی ابھی تم

نے وردھا میں اعلان کیا کہ یہاں موجود آشرم سے بھارت چھوڑو تحریک شروع ہوئی تھی۔

سردار: (مسکرا کر) گرودیو آپ تاریخ سے جغرافیہ کی جانب نکل گئے۔ وردھا اور ممبئی کا فرق تو جغرافیہ میں آتا ہے۔

دیودار: جغرافیہ سہی لیکن تم نے جغرافیہ بھی پڑھا تھا یا نہیں ؟اسی لئے تو میں کہتا ہوں اگر تم وزیر اعظم بن گئے تو میں سیاست سے سنیاس لے لوں گا۔

سردار: اچھا یہ تو بہت اچھی خبر ہے! اگر آپ نے واقعی سنیاس لے لیا تو ہمارے گجرات میں آجانا میں بیٹے کی طرح آپ کی خدمت کروں گا۔

دیودار: (چونک کر) یہ ہمارا گجرات کیا ہے؟

سردار: ارے آپ گجرات نہیں جانتے وہی مشہور زمانہ صوبہ جس کا میں وزیر اعلیٰ ہوں۔

دیودار: وہ تو میں جانتا ہوں لیکن تم وزیر اعظم گجرات کے بنوگے یا

ہندوستان کے ؟

سردار: کیسی بات کرتے ہیں گرودیو؟ میں اس ٹوٹے پھوٹے ہندوستان کا نہیں بلکہ اکھنڈ بھارت کا وزیراعظم بنوں گا جس میں سندھ ندی کے دونوں کنارے شامل ہوں گے۔

دیودار: لیکن کرناٹک بھی شامل ہوگا یا نہیں ؟

سردار: کرناٹک ہی کیا ہر ناٹک اس میں شامل ہوگا۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔

دیودار: اگر کرناٹک بھی اس میں شامل ہوگا تو تم مجھے گجرات کیوں بلا رہے ہو؟ کیا تم احمدآباد میں بیٹھ کر ملک کا کاروبار چلاؤگے اور میری خدمت بھی بجا لاؤگے۔

سردار: جی ! جی نہیں۔ وہاں گاندھی جی کا سابرمتی آشرم جو ہے۔ (سردار نے بات بنانے کی کوشش کی)

دیودار: (بگڑ کر) کیا تم مجھے آشرم میں بھرتی کرنا چاہتے ہو۔ کہیں تم نے

مجھے اپنی طرح لاوارث تو نہیں سمجھ لیا ہے۔ جس کا نہ کوئی آگے اور نہ کوئی پیچھے ؟

سردار: تو کیا کسی کا آگے پیچھے ہونا اچھی بات ہے ؟

دیودار: یہ کسی کے آگے پیچھے ہونے کی بات نہیں بلکہ کسی کے آگے پیچھے کسی اور کے ہونے کی بات ہے۔

سردار: (منہ بنا کر) آگے پیچھے ! پیچھے آگے ! !آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی گرودیو؟

دیودار: یہ آسان سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟ اوہو میں بھول گیا تھا کہ کسی بات کو سمجھنے کیلئے عقل کی ضرورت پڑتی ہے اور تمہارے سنگھ پریوار میں عقل کا استعمال ممنوع ہے۔

سردار: گرودیو کیا آپ کو نہیں لگتا کہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی ناراض ہو رہے ہیں؟ میں تو سر سنگھ چالک کے ہاتھوں بھی ایسی خواری برداشت نہیں کرتا۔

دیودار: لیکن تم نے بات ہی کچھ ایسی کردی کہ کوئی بھی خوددار اور عزت دار آدمی ناراض ہو جائے۔ میری سیوا کیلئے میرا گھرپریوار موجود ہے۔ انہیں چھوڑ کر سابرمتی آشرم میں جائیں میرے دشمن۔

سردار: اس میں اس قدر ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ میں نے خدمت کی ایک پیشکش کی اسے قبول کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی ہے؟

دیودار: (جھنجھلا کر) ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔بڑے آئے خدمت کرنے والے۔ اگر تمہیں سیوا کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنی بیوی کو اپنے پاس بلا کر اس کی خدمت کرو تاکہ آخری عمر میں اس کی حق تلفی کا کچھ نہ کچھ کفارہ ادا ہو جائے۔

یہ کہہ کر غصے سے کالے پیلے سابق وزیر اعظم ہردن ہلی دوڑے دار دیودار کمرے سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔

(جاری)

وارانسی: اب اصولوں کیلئے ماتم پرانے ہو گئے

حالیہ انتخابات موروثیت اور فسطائیت کے نام پر لڑے جارہے ہیں۔ نریندر مودی گاندھی خاندان کی موروثی حکومت کو ختم کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے تو راہل گاندھی سنگھ پریوار کے فسطائی شکنجہ سے قوم کو بچانے دہائی دے رہا ہے لیکن ان خوشنما اور بلند بانگ نعروں کے پس پردہ موقع پرستی اور ابن الوقتی کا جو گھناؤنا کھیل ہو رہا ہے اس کی سب سے عمدہ مثال وارانسی میں نظر آتی ہے۔ یہاں پر مودی نے موروثیت کی آڑ میں اپنی ہی جماعت کے معمر رہنما اور سابق صدر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا اور ان کے سیاسی مستقبل کو لے جاکر کانپور میں دفن کردیا۔ یہ عمل اس سفاکی کے ساتھ کیا گیا مرلی جی کو کہنا پڑا نہ جانے میں نے کون سا گناہ کیا تھا جو تعلیم کا شعبہ چھوڑ کر سیاست میں (خوار ہونے کیلئے) چلا آیا۔ مودی کے وار اور جوشی کی حالت زار پر راجیش ریڈی کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

اپنے ہنسنے رونے کے اب دن پرانے پڑ گئے
کچھ ہوئی دنیا نئی کچھ ہم پرانے پڑ گئے

نریندر مودی کو اروند کیجریوال نے چیلنج دے رکھا تھا کہ گجرات کے باہر مودی

جہاں کہیں سے بھی انتخاب لڑے گا وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ اروند کیجریوال نے اس اعلان سے بلاواسطہ اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ گجرات کے اندر وہ مودی کو شکست فاش سے دوچار نہیں کرسکتا۔ اگر مودی کے اندر دم خم ہوتا اور اس کی صحیح معنی میں لہر ہوتی تو وہ کیجریوال سے کہتا ٹھیک ہے میں تمہاری دہلی میں آکر تمہیں ہراؤں گا۔ ایسا بھی نہیں کہ دہلی میں بی جے پی کمزور ہو۔ گزشتہ اسمبلی انتخاب میں اس نے عام آدمی سے زیادہ ووٹ اور نشستیں حاصل کی تھیں لیکن مودی خود جانتا تھا کہ ذرائع ابلاغ میں جو کچھ دکھلایا جارہا ہے اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس لئے مودی نے ایک تو یہ کیا کہ گجرات کے بڑودہ سے اپنے کاغذاتِ نامزدی داخل کئے اور دوسرے اعلان کردیا کہ مجھے گنگا میّا نے وارانسی میں بلا ہے۔ اب یہ تو وقت ہی بتائیگا کہ گنگا میّا نے اس کے پاپوں کو دھوکر اسے پوتر کرنے کیلئے بلایا ہے یا اسے ڈوباکر ملک کی سیاست کو پوتر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

وارانسی میں گزشتہ مرتبہ تین اہم امیدوار تھے جن کو ایک لاکھ سے زیادہ ووٹ ملے۔ جن میں سب سے آگے مرلی منوہر جوشی تھے جنہیں ۲۰۳ ہزار ووٹ ملے اس کے بعد مختار انصاری جنہیں ۱۸۶ ہزار ووٹ ملے اور تیسرے نمبر پر اجئے رائے تھے جنھوں ۱۲۴ ہزار ووٹ حاصل کئے۔ کانگریس کے راجیش مشرا اور اپنا دل کے وجئے پرکاش جیسوال ۶۶ ہزار کے آس پاس اکتفا کرنا پڑا۔ اس بار چونکہ مرلی جی کا

ٹکٹ خود ان کے سابق چیلے اور حالیہ استاد نریندر مودی نے کاٹ دیا ہے اور مختار انصاری کو اجئے رائے کے بھائی اودھیش کے قتل کا الزام آگرہ جیل میں لے گیا ہے اس لئے سابقہ تین آگے رہنے والوں میں سے صرف ایک اجئے رائے میدان میں ہے۔ اجئے رائے کا سیاسی سفر نہایت دلچسپ ہے۔ وہ ماضی میں وارانسی کے ایک اسمبلی حلقہ پنڈراسے بی جے پی کے رکن اسمبلی اور وزیر بھی تھا۔ بی جے پی نے ۲۰۰۹ء کے پارلیمانی انتخاب میں اسے کمل نہیں دیا تو وہ سماجوادی پارٹی کی سائیکل پر چڑھ گیا لیکن اس کے مقابلے مختار انصاری بی ایس پی کے ہاتھی پر چڑھ کر آیا اور سائیکل کو کچل دیا مگر کمل کو کھلنے سے نہیں روک سکا۔ اس طرح بنارسی کمل ایوانِ پارلیمان میں کھل اٹھا۔

وارانسی کے مسلمانوں کیلئے پچھلے انتخاب میں فیصلہ کرنا نہایت آسان تھا۔ ان کے سامنے ایک دشمن بی جے پی اور اسے ہرانے کیلئے دو متبادل سماجوادی اور بہوجن سماج پارٹی تھے۔ سماجوادی نے چونکہ سابق بھاجپائی کو ٹکٹ دے دیا تھا اس لئے مسلمانوں نے اس سے منہ موڑ لیا اور بی ایس پی نے چونکہ مسلمان کو ووٹ دے دیا تھا اس لئے اس کے پیچھے ہو لئے۔ یہی وجہ ہے کہ دلتوں اور مسلمانوں کی مشترکہ حمایت کے نتیجے میں انصاری نے جوشی کی نیند حرام کردی اور کسی طرح مرتے پڑتے وہ کامیاب ہوئے۔ اب کی بار انصاری مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ سیکولر ووٹوں کی تقسیم نہیں چاہتے اس لئے مودی کو ہرانے

کیلئے رائے کو ووٹ دیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ مرتبہ بھی یہی رائے ایک سیکولر جماعت سماجوادی کا امیدوار تھا اور سیکولر ووٹ اگر سائیکل و ہاتھی میں تقسیم نہیں ہوتا تو کمل نہیں کھلتا۔ مختار انصاری کی ۲۰۰۹ء میں یہ منطق کہ مجھے جتانے کیلئے رائے کو ووٹ مت دو اور اب مودی کو ہرانے کیلئے رائے کو ووٹ دو سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ اصول پسندی نہیں بلکہ موقع پرستی ہے کہ جب وہ مجھے جیل بھیجنا چاہتا تھا تو اس کو ہراؤ اور جب وہ مجھے رہا کرانے پر راضی ہو گیا ہے تو اس کو جتاؤ لیکن ابن الوقتی کے اس دور میں اصولوں کی بات کون کرتا ہے بقول راجیش ریڈی

موت پر قدروں کی اب تو جشن ہی کا ہے چلن

اب اصولوں کیلئے ماتم پرانے پڑ گئے

مختار انصاری اور اجئے رائے کی دشمنی تقریباً ایک چوتھائی صدی پرانی ہے۔ یہ دشمنی بام عروج پر اس وقت پہنچی جب دن دہاڑے مختار انصاری کے آدمیوں نے اجئے رائے کے بھائی اودھیش رائے کو ۱۹۹۱ء میں قتل کر دیا۔ وہ مختار انصاری کا خوف ہی تھا جو اجئے رائے کو اپنی ہی برادری کے بی جے پی رہنما اور رکن اسمبلی کرشنا نند رائے کے شرن میں لے گیا لیکن مختار انصاری نے کرشنا نند کو اس کے سات ساتھیوں سمیت ۲۰۰۵ء میں مروا دیا اس طرح مشرقی اتر پردیش سے بھومی ہاروں کا زور توڑ کر وہ باہو بلی (زور آور) بن گیا لیکن کرشنا نند

کے راستے سے نکلنا اجے رائے کیلئے ایک نعمت ثابت ہوا اور بی جے پی نے اجئے رائے کو کرشنانند کا وارث تسلیم کرکے نہ صرف اسمبلی کا رکن بلکہ وزیر بھی بنا دیا۔ اس طرح گویا مختار انصاری کی حالیہ حمایت اجئے رائے پر پہلا نہیں بلکہ دوسرا احسان ہے۔ اس لحاظ سے مختار اور اجئے کی رقابت نہ صرف سیاسی ہے بلکہ خاندانی نوعیت کی ہے۔
نتن گڈکری کے جس بیان پر بہار میں خوب لے دے ہوئی وہ تھا بہار کی عوام کے خمیر جینس) میں ذات پات کا پایا جانا ہے۔ اس بات کا اظہار چاہے جتنا بھی ناپسندیدہ ہو) لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ رام دیو کے نہایت قابل مذمت بیان میں اگر دلتوں کے بجائے غریبوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہوتا تو اس قدر ہنگامہ نہ ہوتا لیکن اب لاکھ صفائی کے باوجود ہنی مون والا بھونڈا بیان رام دیو سمیت بی جے پی کے گلے کی ہڈی بنا ہوا ہے۔ ساڑی پہن کر اور پلو اوڑھ کر اپنے آپ کو گرفتاری سے بچانے کی کوشش کرنے والے یوگا گرو کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب کون سا آسن اسے گرفتاری سے بچا سکتا ہے۔ اس لئے کہ آج بھی ہندوستان کے اندر ذات.برادری کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پارٹی جب کسی حلقۂ انتخاب سے اپنا امیدوار کھڑا کرتی ہے وہاں بسنے والوں کی ذات پات کا تناسب ضرور دیکھ لیتی ہے۔
وارانسی کے اندر سب.بڑی تعداد مسلم اور پٹیل.برادری کے لوگوں کی یعنی

تقریباً ۲.۵ لاکھ ہے۔ یہ سب گجرات کے پٹیل نہیں ہیں بلکہ ان پٹیلوں میں ۶۰ ہزار کے آبا و اجداد گجرات سے جا کر کاشی کے اندر بس گئے تھے۔ اس کے بعد براہمن سماج ہے جن کی آبادی ۲.۱۵ لاکھ اور پھر ویشیا برادری کا نمبر آتا ہے جس کی آبادی ۲ لاکھ ہے۔ ان چار بڑی اکائیوں کے بعد بھومی ہار اور دلتوں کی باری آتی جو ایک ایک لاکھ کی تعداد میں یہاں ہیں۔ یادو صرف ۸۰ ہزار اور ٹھاکر ۶۰ ہزار ہیں۔ راج ناتھ کی نظر اس حلقۂ انتخاب پر کیوں نہیں پڑی اور ملائم نے یہاں آنے جرأت کیوں نہیں کی اس کا راز ان اعداد و شمار میں پوشیدہ ہے۔ اس حساب کتاب سے کوئی بات تو نہیں بنتی اگرچہ کہ اپنا غم غلط کرنے کیلئے اس جمع تفریق میں کچھ وقت صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بقول شاعر ؎

روز ہی اپنے غموں کا کرتے رہتے ہیں حساب
کتنے غم تازہ ہیں کتنے پرانے پڑ گئے

اس بار کا انتخاب اس معنیٰ میں دلچسپ ہے کہ مودی لا مقابلہ کرنے کیلئے کوئی طاقتور مسلمان امیدوار میدان میں نہیں آیا ورنہ اس کا کام آسان ہو جاتا۔ مختار انصاری کی اپیل کا کوئی خاص اثر اس لئے نہیں ہوگا کہ مسلمانوں نے اسے مثبت ووٹ نہیں دیا تھا بلکہ انہیں ایسا محسوس کیا تھا چونکہ بہوجن سماج کے نام کے سبب دلت ووٹ تو اسے ملنے ہی ملنے ہیں ایسے میں اگر مسلمان ووٹ بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں تو وہ جوشی کو ہرا سکتا ہے لیکن اب چونکہ ایسا

کوئی حساب کتاب نہیں بنتا اس لئے مسلمان اس کی درخواست پر توجہ نہیں دیں گے۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ مسلمان بھومی ہاروں کی حمایت کے پیش نظر اجئے رائے کو طاقتور امیدوار سمجھ کر مودی ہرانے کیلئے اس کی جانب متوجہ ہوں لیکن اب ہوا کا رخ بدل رہا ہے۔ بھومی ہار خوددار قوم ہے اور عزت و وقار کو اہمیت دیتی ہے لیکن برا ہو انتخابی منافقت کا کہ اس نے اجئے رائے کو اپنے بھائی کے قاتلوں سے ہاتھ ملانے پر مجبور کردیا۔ کرشانند کی بیوہ الکا رائے نے اجئے رائے کی ابن الوقتی بھومی ہار سماج سے غداری قرار دیا ہے۔ الکارائے فی الحال نریندر مودی کی حمایت میں بھومی ہار ووٹ بٹورنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی ہے۔ ایسے میں مسلمان رائے کے بجائے کیجریوال کو رائے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔

اترپردیش کا طاقتور پسماندہ کرمی سماج پٹیل کہلاتا ہے۔ بہار کی مانند اترپردیش میں بھی یہ لوگ یادوسماج کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور ملائم کے بغض میں بی جے پی کے قریب رہے ہیں لیکن ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ان لوگوں نے اپنی سیاسی جماعت اپنا دل بنالی۔ اس جماعت کے امیدوار وجئے پرکاش جیسوال کو گزشتہ مرتبہ وارانسی میں کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل ہوئی تھی اور کانگریس کے بعد چوتھے نمبر پر آئے۔ اس بار بی جے پی اپنا دل کو اپنا حلیف بناکر یہ سوچ رہی تھی کہ ڈھائی لاکھ پٹیل رائے دہندگان پر اس کا مکمل قبضہ

ہو جائیگا لیکن اس کے اس منصوبے پر مایاوتی نے وجئے پرکاش جیسوال کو اپنا ٹکٹ دے کر پانی پھیر دیا اس طرح اس بار پٹیل رائے دہندگان کے ووٹ بنک میں ایک لاکھ دلتوں کا اضافہ ہو گیا جو ایک خطرناک اشتراک ہے جسے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اگر مسلمان جنھوں نے پچھلی مرتبہ ہاتھی پر نشان لگایا تھا اس مرتبہ پھر وہی کرتے ہیں تو جیسوال کو جیتنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ویسے بھی تین مرتبہ شنکر پرشاد جیسوال پارلیمان میں وارانسی کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

اس مرتبہ جہاں بی جے پی.براہمنوں کو نظر انداز کرکے پسماندہ طبقات پر توجہ دے رہی ہے وہیں مایاوتی دلتوں کے بجائے.براہمنوں کو لبھانے میں لگی ہوئی ہیں۔ مایاوتی نے صرف ۱۷ دلت امیدواروں کو ٹکٹ دیا اس کے برعکس ۱۹ مسلم اور ۲۱.براہمنوں کو میدان میں اتارا ہے۔ مایاوتی کی فہرست میں ۱۵ او بی سی اور ۸ ٹھاکر بھی شامل ہیں اس طرح وہ.بڑے موثر انداز میں بہوجن سماج کے بجائے سرو سماج کے نعرے کو عملی جامہ پہنارہی ہیں۔ مایاوتی کا ہاتھی ٹی وی کے پردے پر نہیں بلکہ حقیقت کی دنیا چلتا ہے اور ہر انتخاب میں اپنا اثر دکھلاتا ہے۔ اس بار بھی اس کے چمتکار یقیناً دیکھنے کو ملیں گے لیکن اگر اس نے وارانسی میں کمل کو روند دیا تو وہ بہت.بڑی فتح ہو گی۔

مرلی کی رسوائی سے ناراض براہمنوں کیلئے سابق کانگریسی وزیراعلی اور صدر کملاپتی ترپاٹھی کی بیٹی اندرا ترپاٹھی میدان میں ہے لیکن اندرا کی شخصیت مجموعہ ضدین ہے۔ وہ ایک کٹر کانگریسی کی بیٹی ہونے کے باوجود سیکولر نظریہ کی حامل نہیں بلکہ ہندو مہا سبھا سے فکری ہم آہنگی رکھتی ہیں ۔ اس پر طرۂ امتیاز یہ ہے کہ مودی کی بہت بڑی مخالف ترنمول کانگریس نے اپنے ٹکٹ نوازہ ہے ۔ ایسے میں جو براہمن مرلی منوہر جوشی کو وارانسی سے تڑی پار کرنے سے ناخوش ہیں ان میں سے کتنے اندرا ترپاٹھی کو ووٹ دے کر مودی کو زک پہنچائیں گے یہ کہنا مشکل ہے اس لئے مسلمانوں کی طرح براہمن بھی بہت سوچ سمجھ کر ووٹ دیتا ہے اور اپنا ووٹ ضائع نہیں کرتا۔ ویسے گزشتہ انتخاب میں کانگریسی امیدوار کا تعلق براہمن سماج سے تھا اور جوشی کی موجودگی کے باوجود کانگریس کے ۶۰ ہزار ووٹ اس بات کے غماز ہیں براہمنوں کا ایک طبقہ کابی جے پی کے خلاف ہے اور اس میں اس بار یقیناً اضافہ ہوگا لیکن اندرا کی کمزور امیدواری کے سبب ممکن ہے زیادہ تر براہمن مودی کی حمایت کریں۔

اروند کیجریوال کا تعلق بنیا سماج سے رہا ہے جس کے دو لاکھ ووٹر وارانسی میں ہیں ۔ یہ سماج روایتی طور پر بی جے پی کے ساتھ رہا ہے لیکن بی جے پی نے اسے اقتدار سے دور ہی رکھا ہے۔ اس بار ان کے سامنے ان کی اپنی برادری کا ایک نہایت طاقتور امیدوار اروند کیجریوال موجود ہے ۔ اروند کیجریوال کو ایسے

نوجوانوں کی حمایت بھی حاصل ہے جو ذات دھرم سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں اگر ویشیا سماج نے بڑے پیانے پر اروند کیجریوال کی حمایت کا فیصلہ کرلیا تو مسلمانوں کے ووٹ کا اس میں اضافہ کیجریوال کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اب مسلمانوں کو یہ دیکھنا ہے کہ کس قدر پٹیل جیسوال کے ساتھ یا کتنی تعداد میں بنیے کیجریوال کے ساتھ ہیں ۔ اس لئے کہ سماجوادی پارٹی نے بھی اس بار کیلاش چورسیا نامی وزیر ابتدائی تعلیم کو اپنا ٹکٹ دیا ہے جس کا تعلق پان بیچنے والے بنیا سماج سے ہے۔ چورسیا عرصہٗ دراز تک پان بیچتے رہے ہیں اور مودی کے چائے کا منہ توڑ جواب ہیں ۔ ۶۰ ہزار یادو ووٹ ان کی جیب میں ہیں ایسے میں کتنے بنیا ان کے ساتھ ہوتے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ چورسیا بیک وقت مودی اور کیجریوال کو نقصان پہنچائیں گے ۔چورسیا اور اندرا ترپاٹھی کی کامیابی کے امکانات مفقود ہیں ۔ ٹھاکر ووٹر بی جے پی کی جھولی میں ضرور آئیگا لیکن اس کا کریڈٹ مودی نہیں بلکہ راج ناتھ کو جائیگا۔

اب سوچنے والی بات یہ کہ مسلمانوں کی تمام تر حکمت عملی کے باوجود اگر سیکولر ووٹ عام آدمی پارٹی، سماجوادی پارٹی اور کانگریس میں تقسیم ہوجاتا ہے اور اس کے نتیجے میں مودی کامیاب ہو جاتا ہے تو کیا ہوگا؟ اس پر اگر مودی بڑودہ کی اپنی سیٹ کو رکھ کر وارانسی سے استعفیٰ دے دے تو کیا صورت بنے گی ؟ اس کے بعد وارانسی میں ہونے والے ضمنی انتخاب سے قبل اگرا جئے رائے گنگا نہا

کر اپنے سنگھ پریوار میں لوٹ آئے اور بی جے پی اس کو ٹکٹ دے دے تو مختار انصاری ، کانگریس پارٹی اور سماجوادی کیا کہیں گے ؟ یہی نا کہ فسطائیت سے ملک کو بچانے کیلئے اجئے رائے کو ووٹ نہ دو جبکہ اس انتخاب میں مختار وراہل اور پچھلے انتخاب میں ملائم اجئے رائے کیلئے ووٹ مانگ چکے ہیں ۔ نیز جو بی جے پی دوا نتخاب میں اجئے رائے کی مخالف رہی ہے وہ اس کی حامی بن کر کھڑی ہوجائیگی۔ ایسے میں جن مسلمانوں نے اب کی بار اسے ووٹ دیا ہوگا وہ اپنے ووٹ کا استعمال اس کے خلاف کریں گے ۔کیا اس موقع پرستی اور ابن الوقتی کا نام سیکولر سیاست ہے؟کیا یہی فسطائیت اور موروثیت کے خلاف مقدس جنگ ہے ؟اس غلیظ انتخابی تماشے میں امت مسلمہ کا یہ حال ہو گیا ہے کہ

چارہ گر پر چارہ گر بدلے کئی ہم نے مگر
زخم تازہ ہی رہے مرہم پرانے ہو گئے

گاندھی جی کے تین مودی

کسی زمانے میں گاندھی جی کے تین بندر دنیا بھر میں معروف تھے لیکن آج کل ہندوستان کے تین مودی دنیا بھر میں مشہور ہوگئے ہیں۔ نریندر، سشیل اور للت مودی۔ ان میں سے ایک نریندر مودی کے ہاتھ کانوں پر ہوتے ہیں ۔ وہ کسی کی نہیں سنتا۔ نہ سنگھ پریوار کی نہ گاندھی پریوار کی اور نہ اپنے پریوار کی جس میں پرورش پائی تھی۔ بس بے تکان بولتا رہتا ہے۔ جو من میں آئے بول دیتا ہے مثلاً اگر ہمیں واضح اکثریت حاصل ہوجائے تب بھی ہم دیگر جماعتوں کو ساتھ لے کر مخلوط حکومت بنائیں گے۔ اب اس بیان پر تو کوئی عقل کا اندھا ہی یقین کرسکتا ہے خاص طور پر نتیش کمار کا انجامِ بد دیکھنے کے بعد کوئی جماعت بی جے پی کی حکومت میں شامل ہونا تو کجا اس کو اپنی حکومت میں لینے سے پہلے بھی سو بار سوچے گی اس لئے کہ یہ لوگ نہ صرف جس تھالی میں کھاتے ہیں اس میں سوراخ کرتے ہیں بلکہ اس کو چرا کر لے جانے کی سعی بھی کر ڈالتے ہیں۔ لیکن نریندر مودی کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کی بات پر کوئی یقین کرتا ہے یا نہیں اس کا کام ہر روز نت نئے شوشے چھوڑتے رہنا ہے اس لئے کہ ہر نئی بات کے ساتھ پرانی صحیح یا غلط بات بھلا دی جاتی ہے۔

نریندر مودی کی اپنی جماعت میں ایک عقل کا اندھا سشیل مودی ہے جسے آج کل لوگ پیار سے سومو کہہ کر پکارنے لگے ہیں۔ اس سومو کی ہیڈ لائٹ بند ہے مطلب اس کا ہاتھ آنکھوں پر ہے اس لئے اس کوئی زمینی حقیقت نظر نہیں آتی۔ یہ جو کچھ سنتا وہی بول دیتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ کہا کرتا تھا کہ نتیش کمار مستقبل میں وزیر اعظم بن جائیں گے اب یہ کہتا ہے کہ نتیش کمار بہار کے وزیر اعلیٰ بھی نہیں رہیں گے اس لئے کہ جے ڈی یو پچاس ارکان اسمبلی اس کے رابطے میں ہیں۔ گویا جس طرح نریندر مودی آنکھیں کھول کر وزیر اعظم بننے کے سپنے دیکھ رہا ہے اسی طرح سشیل مودی آنکھیں موند کر وزیر اعلیٰ بننے کے خواب سجا رہا ہے لیکن جب انتخابی نتائج کا اعلان ہوگا تو ایک کی آنکھ کھل جائیگی اور دوسرے کی بند ہو جائیگی۔

تیسرا مودی فی الحال ہندوستان سے فرار اور لندن میں مقیم ہے۔ اس کا ہاتھ منہ پر ہے یہ بولتا بہت کم ہے لیکن خوب اچھی طرح دیکھ سن کر ایسی چال چلتا ہے کہ تمام مخالفین چاروں شانے چت ہو جاتے ہیں۔ للت مودی ۲۰۰۵ء میں راجستھان کرکٹ بورڈ کا صدر منتخب ہوا اور شرد پوار سے سانٹھ گانٹھ کرکے بی سی سی آئی اور آئی سی سی کے صدر جگموہن ڈالمیا کی چھٹی کروادی۔ اس کارنامہ کا انعام یہ ملا کہ بی سی سی آئی کا نائب صدر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد

میں اس نے آئی پی ایل کا تماشہ شروع کیا اور اس کا کمشنر بن گیا۔ ۲۰۱۰ء میں اس پر بدعنوانی کے کئی الزامات لگے اور بی سی سی آئی نے للت مودی پر تاحیات پابندی لگا دی۔ للت جیل جانے کے بجائے لندن چلا گیا لیکن وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے ریموٹ کنٹرول سے راجھستان کرکٹ ایسو سی ایشین کا انتخاب لڑا۔

بغیر کسی انتخابی جائزے کے کرکٹ بورڈ کی سمجھ میں آگیا کہ اس انتخاب کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ بی سی سی آئی نے اس انتخاب کے خلاف سپریم کورٹ کے دروازے پر دستک دی۔ ۶ مرتبہ اس کے اعلان پر روک لگوائی لیکن جب ساتویں مرتبہ عدالت عالیہ نے اس کی اجازت دی تو ایک ایسا نتیجہ نکلا جس کا خواب نہ ششیل مودی دیکھ سکتا ہے اور نہ نریندر مودی۔ للت مودی نے اپنے مخالف کو ۵ کے مقابلے ۲۴ ووٹوں سے شکست دے دی۔ ان نتائج میں یہ پیغام پوشیدہ ہے کہ انتخاب میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اس میں کسی شریف اور بدمعاش کی کوئی قید نہیں۔ بڑا سے بڑا بدعنوان بڑی سے بڑی کامیابی درج کروا سکتا ہے۔ ہوس کے بازار میں ایمان اسی طرح بکتا ہے جس طرح کے اس انتخابی مہم کے دوران ہندوستان کی عوام نے ذرائع ابلاغ میں کام کرنے والے نام نہاد صحافیوں اور دانشوروں کو بکتے ہوئے دیکھا۔

اندراگاندھی اور نریندر مودی جیسے لوگوں کی آمد سے قبلجس طرح سیاست سلجھے ہوئے شریف لوگوں کا میدان تھا اسی طرح للت مودی اور جگموہن ڈالمیا جیسے لوگوں سے پہلے کرکٹ پروقار لوگوں کا کھیل (جنٹلمینس گیم) کہلاتا تھا۔ ابیہ عالم ہے کہ آئی پی ایل کو کھلے عام جواریوں کی دولت پر چلنے والا عیاشی کا کوٹھا قرار دیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تمام تر لعنت ملامت کے باوجود بدنام زمانہ للت مودی راجھستان کرکٹ ایسوسی ایشن کا صدر منتخب ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ سیاست کے میدان میں ہو سکتا ہے اس لئے کہ قومی سیاست کی حالت کرکٹ کی دنیا سے بدتر ہے۔ اخلاقی و معاشی انحطاط کے چلتے سیاسی منظر نامے پر رونما ہونے والی تبدیلی فلمی دنیا کی طرح ہے جہاں کسی زمانے میں میں ’’آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا‘‘ گایا اور سنا جاتا تھا اور اب ’’میں نے ماری انٹری یار دل میں بجی گھنٹی یار پم پم پم‘‘ نے لے لی ہے۔ عوام کالانعام کا تو یہ حال ہے بھیڑ بکریوں کی طرح جو بھی چارہ ان کے آگے ڈال دیا جاتا ہے وہ اس سے کام و دہن کی آگ بجھانے میں جٹ جاتے ہیں۔

نریندر مودی نے اپنے حالیہ انٹرویو میں ایک سمجھداری کی بات یہ کہی کہ سرکار بنانے اور سرکار چلانے میں فرق ہے۔ یہ درست ہے کہ لیکن گزشتہ چار ماہ کے اندر سیاستدانوں کی جانب سے جس قوائد کا مظاہرہ ہوا ہے اس میں ساری توجہ سرکار بچانے یا سرکار ہتھیانے پر مرکوز تھی۔ حزب اقتدار یوپی اے کسی طرح

اپنی حکومت کو بچانے کیلئے ہاتھ پیر مار رہا تھا اور این ڈی اے اسے ہتھیانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ علاقائی جماعتیں زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کرکے مستقبل کی مخلوط حکومت سازی میں اپنا حصہ بڑھانے کی تگ و دو میں لگی ہوئی تھیں۔ حکومت کون بنائے گا اور کیسے بنائے گا اس سوال پر سارے تجزیہ نگار اپنی توانائیاں صرف کرتے رہے لیکن حکومت کیسے چلائی جائیگی؟ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔ حکومت چلانے کے حوالے سے سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ آئندہ حکومت کس کے مفاد میں چلائی جائیگی؟ ان سیاستدانوں کیلئے جن کی بڑی تعداد پہلے ہی کروڑپتی بن چکی ہے؟ یا ان سرمایہ داروں کی خاطر کہ جن کی دولت کے سہارے یہ انتخاب لڑا گیا ہے؟ یا پھر اس عوام کی فلاح بہبود کیلئے بھی کچھ کرے گی جن کے ووٹوں سے حکمراں کا انتخاب ہو رہا ہے؟

ان انتخابات کا اگر کوئی تعلق عوام کی فلاح و بہبود سے ہوتا تو اس میں وہ مسائل زیر بحث لائے جاتے جن سے لوگ پریشان ہیں۔ نریندر مودی ایک ظالم حکمراں ہے اس لئے ہر انصاف پسند انسان چاہتا ہے کہ مودی نہ صرف اقتدار سے دور رہے بلکہ ذلیل و خوار بھیہو۔ ان لوگوں میں مسلمان بھی شامل ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کے مسائل مثلاً فرقہ وارانہ فسادات، مسلمانوں کی بیجا گرفتاریاں اور انکاؤنٹرس۔ تعلیمی و

معاشی پسماندگی کیلئے جس قدر بی جے پی ذمہ دار ہے کانگریس بھی اس سے کم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ ملک کی دیگر عوام کے بھی بے شمار مسائل ہیں جن کی زد مسلمانوں پر کچھ زیادہ ہی پڑتی ہے مثلاً مہنگائی، غربت و بے روزگاری۔ صحت عامہ کی سہولیات کا ناپید ہونا یا کم ہونا۔انصاف کا حصول بے حد مشکل اور بے حد مہنگا ہونا۔ شہری سہولیات ۔ سڑک بجلی پانی، تعلیم کے معیار میں پایا جانے والا زبردست تفاوت، خواتین پر ہونے والے مظالم میں بے دریغ اضافہوغیرہ وغیرہ۔

ان مسائل پر یا تو سرے سے انتخابی مہم کے دوران گفتگو نہیں ہوئی یا اگر ہوئی بھی ہے تو الزام تراشی کے انداز میں ایک دوسرے کواس کیلئے موردِ سزا ٹھہرایا گیا۔ ہر کوئی یہ دعویٰ کرتا رہاہے کہ مہنگائی کم کردے گا۔ اس کے اقتدار میں آنے سے غربت کا خاتمہ ہو جائیگا اور نوجوانوں کو روزگار مل جائیگا لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگا؟ وہ کون سے اقدامات کئے جائیں گے جن سے اس سمت پیش رفت ہوگی؟ ان سنجیدہ باتوں کو نہ ذرائع ابلاغ میں جگہ ملتی تھی اور نہ عوام اس پر گفتگو کرتے تھے۔ کبھی چائے، کبھی ٹوپی، کبھی اونچ نیچ، کبھی ذات پات یہی سب موضوعِ بحث بنا رہتا ہے۔ عقل تو یہ کہتی ہے کہ سیاسی جماعتوں نے عوام کو جن سہولتوں کی فراہمی کا وعدہ کیا ہے اس کے نتیجے میں سرکاری خزانے کا خسارہ لازماً بڑھے گا۔ ان

سیاسی جماعتوں کو چندہ دینے والے صنعتکار اس کی قیمت عوام سے وصول کریں گے اور اس کے نتیجے میں گرانی یقیناً بڑھے گی۔

یہ اندازہ لگایا جارہا ہے آئندہ چند سالوں میں ہندوستانی عوام کی اکثریت شہروں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو جائیگی جس کے سبب شہروں کی سڑکوں کیلئے اس کو سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ ٹرافک اور فضائی آلودگی پر قابو پانا ناممکن ہوگا لیکن یہ ہمارے سیاستدانوں کیلئے کو مسئلہ ہی نہیں ہے۔ سرکاری اسکولوں کا برا حال ہے اور طبّی سہولیات کے معاملے میں ہندوستان عالمی معیار ۱۲۰۰ پر ایک کے بجائے ۱۷۰۰ لوگوں پر ایک ڈاکٹر ہے اور یہ تقسیم بھی مساوی نہیں ہے۔ عدالتوں کے دروازے ویسے تو تمام لوگوں کیلئے کھلے ہوئے ہیں لیکن ان نیایہ مندروں کے پروہت وکیل صاحبان کی فیس اگر کوئی عام آدمی سنے تو بے ہوش ہوجائے۔ ارون جیٹلی کی اعلان کردہ سیکڑوں کروڈ کی دولت سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مودی کہتا ہے گنگا کا پانی آلودہ ہو چکا ہے تو کیجریوال کے مطابق سابرمتی کا پانی زیادہ آلودگی کا شکار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں کی طرح ملک کی ساری ندیاں آلودہ ہو چکی ہیں اور اس کی وجہ سے ملک کے عوام اپنے بنیادی حق یعنی پینے کے صاف پانی سے محروم کردیئے گئے ہیں۔

گزشتہ سال دہلی ، ممبئی ، جئے پوراور کولکتہ خواتین پر ہونے والے مظالم کے سبب سرخیوں میں رہے۔ دہلی میں عصمت دری و قتل کا بہیمانہ واقعہ ، ممبئی میں زانیوں کو موت کی سزااور کولکتہ و جے پور میں غیر ملکی خواتین تک سے بدسلوکی اخباروں میں چھائے رہی ۔ اسپر بڑے بڑے عوامی احتجاج ہوئے لیکن جب الیکشن کا بخار چڑھا تو لوگ انہیں بھول گئے۔ بدعنوانی کے خلاف چلنے والی عظیم تحریک کے باوجود ساری جماعتوں نے دھڑلے کے ساتھ بدعنوان رہنماؤں کو ٹکٹ سے نواز کر یہ ثابت کردیا کہ ان چیزوں کوانتخابی سیاست میں کوئی اہمیت نہیں ہے اور تو اور غنڈے بدمعاش بھی اس انتخاب میں تمام ہی جماعتوں کے ٹکٹ پر اپنی قسمت آزمانے کیلئے میدان میں اترے ۔کسی نے انہیں ہندوتوا کی سرفرازی کیلئے ووٹ دیا کوئی سیکولرزم کے تحفظ کی خاطر ان کی نصرت وحمایت پر اتر آیا۔ سنگین جرائم مثلاً قتل و غارتگری وغیرہ کیلئے موردِ الزام ٹھہرنے والے امیدوار کی تعداد گزشتہ پانچ سالوں میں ۶۰۸ سے بڑھ کر۸۸۹ یعنی ۸ فیصد سے ۱۱فیصد تک پہنچ گئی۔

ہندوستانی سیاست میں زور بازو کے علاوہ دولت کی ریل پیل نے بھی ساری دنیا کو چونکا دیا ہے۔۲۰۰۴ کے اندر انتخاب لڑنے والے کروڑ پتی امیدواروں کی تعداد صرف ۱۳ فیصد تھی ۲۰۰۹ کے آتے آتے اس میں ۳ فیصد کا اضافہ ہوااور یہ تعداد ۱۶ فیصد پر جا پہنچی لیکن پھر اس کے بعد ۵ سالوں میں یہ تعداد ۲۷ فیصد پر پہنچ گئی۔ اس بار ۲۲۰۸ کروڑ پتی امیدوار اپنی قسمت آزمارہے

ہیں۔ایسا نہیں ہے ان میں بڑی تعداد بدعنوان ترین یو پی اے کے امیدواروں کی ہے بلکہ کل دولت جس کا اعلان ہوا ہے اس میں کانگریس کے امیدواروں کی اوسط میراث ۱۳ کروڈ ہے یعنی ۷۹ فیصد کانگریسی امیدوار کروڈ پتی ہیں تو بی جے پی کے لوگوں کی اوسط جائیداد بھی ۱۰ کروڈ ہے اور ۷۳ فیصد کروڈ پتی لوگوں پر بی جے پی نے نظر کرم کی ہے۔ اقتدار کے بغیر یہ حال ہے توخدا نا خواستہ اقتدار حاصل ہو جانے پر کیا حالت ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہندوستان کا غریب ترین طبقہ دلت سماج ہے انکی جماعت بہوجن سماج پارٹی بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہے۔بی ایس پی کے ۱۱ فیصد امیدوار کروڈ پتی ہیں ان کی اوسط دولت ساڑھے تین کروڈ ہے جبکہ بدعنوانی کے خلاف جہاد چھیڑنے والیعام لوگوں کی عام آدمی پارٹی کے امیدواروں میں ایک تہائی کروڈ پتی ہیں اس طرح عاپ امیدواروں کی اوسط جائیداد پونے تین کروڈ بنتی ہے۔ خدا کرے کہ ان لوگوں نے پورا پورا ٹیکس ادا کیا ہو۔

مجموعی طور ہندوستان کے انتخابی امیدواروں کی اوسط آمدنی ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ ہے جن میں چائے بیچنے والا نریندر مودی شامل ہے جو ڈیڑھ کروڈ کا مالک بن گیا ہے لیکن جس عوام کے سامنے یہ امیدوار جھولی پھیلا کر ووٹ مانگ رہے ہیں ان کی حالت زار کو عریاں کرنے والی ایک رپورٹ اقوام متحدہ کی جانب ان دنوں سامنے آئی۔ دنیا بھر میں ۱۰۰ کروڈ لوگ رفع حاجت کی مناسب سہولیات سے محروم

ہونے کے سبب کھلے میں فارغ ہونے کیلئے مجبور ہیں۔ ان میں سے ۸۳ فیصد لوگ دس ممالک میں رہتے ہیں ۔ ان دس میں سے نو ملکوں میں ایسے لوگوں کی تعداد ۲۳ کروڑ ہے جبکہ اکیلے ہندوستان میں اس سے دوگنا سے بھی زیادہ یعنی ۶۰ کروڑ۔ یہ ایک نہایت تلخ حقیقت ہے۔ اسی لئے شاید اپنی انتخابی مہم کے آغاز میں مودی نے کہا تھا میرے نزدیک دیوالیہ سے زیادہ اہمیت شوچالیہ کی ہے لیکن پھر اس کے بعد لوگوں نے اسے سمجھایا کہ ایسا نہ کہے ورنہ وہ بھی اڈوانی کی مانند نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا اور اب یہ حال ہے مودی شوچالیہ کو بھول کر رام مندر کی تصویر کے آگے رام راجیہ کا نعرہ بلند کرکے لوگوں کو احمق بنا رہا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ وقت کے ساتھ جمہوریت بے نقاب ہو چکی ہے ۔ عوام کے ذریعہ عوام کی خاطر عوام کے اقتدار کا کھوکھلا نعرہ اب بے معنی ہو کر رہ گیا ہے بلکہ عصرِ حاضر میں یہ عوام کے ذریعہ ، سرمایہ داروں کیلئے سیاستدانوں کی حکومت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس صورتحال کو ایک بیل گاڑی کی مثال سے باآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ بیل گاڑی میں سب سے آگے بیل نظر آتے ہیں ۔ جمہوری نظام کی مانند اس گاڑی کا نام بیلوں سے منسوب ہوتا ہے۔ بیل اس کو چلانے کیلئے بظاہر پیش پیش ہوتے ہیں ۔ وہی سب سے زیادہ محنت و مشقت کرتے ہیں لیکن ان کی لگام اوپر بیٹھے گاڑی بان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو انہیں اپنی مرضی سے جس

طرف چاہتا ہے ہانک کرلے جاتا ہے۔

اس گاڑی میں لدا ہوا مال نہ بیلوں کا ہوتا ہے اور نہ گاڑی بان کا بلکہ اس کا مالک ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا فرد یعنی تاجر ہوتا ہے جس سے گاڑی بان سودے بازی کرتا ہے۔ وہ تاجر کا مال مختلف بازاروں میں پہنچاتا ہے اور اپنا کرایہ وصول کرتا ہے۔ اس منافع میں سے ایک قلیل رقم بیلوں کے چارے پر بھی خرچ ہوتی ہے تاکہ وہ زندہ رہ کر خدمت گزاری کر سکیں لیکن اس کا بڑا حصہ بیل گاڑی والے کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ ان دونوں سے زیادہ فائدہ وہ سرمایہ دار اٹھاتا ہے جس کی مال برداری کی جاتی ہے۔ بیل گاڑی کا سفر میں جھومتے چلتے بیلوں کی نظر سے سرمایہ دار اوجھل ہوتا ہے جبکہ گاڑی بان کا تعلق بیلوں اور سرمایہ داروں دونوں سے ہوتا ہے۔۔ سرمایہ دارانہ نظام جمہوریت کے اس کاروبار میں بیلوں کے خون پسینے پر گاڑی بان اور تاجر خوب عیاشی کرتے ہیں اور بیلوں کی مانند محنت و مشقت کرنے والے عوام کو (معذرت کے ساتھ) یعقوب تصور کے اس شعر پر اکتفا کرنا پڑتا ہے کہ

کھلیانوں میں عمر ہماری بیت گئی
گھر والوں نے شیش محل تعمیر کیا

انتخابی نتائج : کیوں وساوس دل کو دھڑکاتے ہیں یوں انجام سے ا

انتخابی نتائج کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ایک مسلم نکتہ نظر ہے دوسرے ہندتووادی نظریہ۔ اس کے علاوہ ایک ایسے عام ہندوستانی شہری کی نظر سے جسے دین دھرم میں کوئی دلچسپی نہ ہو اور پھر ذرائع ابلاغ و کارپوریٹ کی دنیا۔ اس بار کارپوریٹ کی دنیا نے مودی کے ذریعہ سے ذرائع ابلاغ پر خوب دولت لٹائی اس لئے بی جے پی کی زبردست کامیابی میں مودی کی محنت وجدوجہد کے ساتھ وہ بھی برابر کا شریک ہے۔ نتائج کے بعد میڈیا نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ ملک کی عوام کا موروثی سیاست کے خلاف غم و غصہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو راہل اور سونیا کامیاب نہیں ہوتے اس لئے کہ ایمرجنسی کے بعد اترپردیش کی عوام نے اندراگاندھی اور سنجے گاندھی کو شکست فاش سے دوچار کردیا تھا۔ مینکا گاندھی اور ورون گاندھی بھی بی جے پی کے ٹکٹ پر کامیاب نہ ہوتے اس لئے اس ماں بیٹے کا تعلق بھی اسی گاندھی خاندان ہے ۔ وسندھرا راجے کا بیٹا اور بھائی نیز راجناتھ اور کلیان سنگھ کا بیٹا بھی انتخاب ہار جاتے۔ پرمود مہاجن کی بیٹی جو پہلے الیکشن ہار چکی تھی اور رام ولاس پاسوان کا بیٹا جو سیاست میں نووارد ہے پارلیمان کیلئے منتخب نہ ہوتا۔ ملائم سنگھ یادو اوران کی بہو نیز چندر شیکھر راؤ کا اپنے بیٹے

اور بھتیجے کے ساتھ کامیاب ہونا ممکن نہ ہوتا۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ یہ یو پی اے ۲ کی بدعنوانی کے خلاف احتجاج ہے اگر یہی بات ہوتی تو یدورپا کو کامیابی نہیں ملتی جس کو بدعنوانی کے سبب اقتدار چھوڑنا پڑا تھا۔

مسلم نکتۂ نظر: ہندواحیاء پرستوں نے چونکہ اپنی تحریک کی بنیاد اسلام دشمنی پر رکھی ہے اس لئے ان لوگوں نے نہ صرف اسلام کے خلاف عام ہندووں کے اندر نفرت کے جذبات پیدا کئے بلکہ مسلمانوں کو قوم دشمن قرار دے دیا۔ کبھی یکساں سول کوڈ تو کبھی بابری مسجد کے نام ہندوؤں کے اندر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان کی سب سے بڑی دلیل تقسیم ہند ہے جبکہ اس تقسیم میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ اتفاق سے تقسیم ملک کیلئے ہندوستان کا لادینی (سیکولر) ہندو ذمہ دار تھا اس لئے فسطائی طاقتوں نے اپنے حریف کو مسلمانوں کا ہمدرد بتا کر ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی۔

سچ تو یہ ہے کہ کانگریس اور دیگر سیکولر جماعتوں کو بھی مسلمانوں سے کوئی خاص ہمدردی نہیں ہے لیکن سنگھ پریوار کے مقابلے وہ ہمیں اپنے غمخوار اور نجات دہندہ محسوس ہوتے ہیں۔ چونکہ ہماری سنگھ دشمنی کا براہِ راست فائدہ کانگریس اور دیگر سیکولر جماعتوں کو ہوتا ہے اس لئے بی جے پی کے اندر امت مسلمہ کے تئیں شدید نفرت پائی جاتی ہے اور وہ لوگ اپنے سیاسی فائدے کیلئے

فرقہ وارانہ فسادات کرانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ فسادات بھی سیکولر جماعتوں کا بھلا کرتے ہیں اس لئے کہ مسلمانوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس جس قدر بڑھتا اسی قدر شدومد کے ساتھ مسلمان اپنی ساری معاشی و سماجی محرومیوں کو بھلا کر ان سیکولر جماعتوں کی حمایت پر کمربستہ ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نام نہاد سیکولر جماعتیں فسادات کے روک تھام کی سنجیدہ کوشش نہیں کرتیں بلکہ اس پر زبانی لیپا پوتی کرکے اپنا سیاسی الو سیدھا کرتی ہیں بلکہ وقتِ ضرورت فساد کرانے سے بھی پس و پیش نہیں کرتیں۔

بی جے پی کے اندر بھی دو طرح کے رہنما پائے جاتے ہیں جیسے واجپائی اور پرتھوی راج چوہان وغیرہ جو مسلمانوں کی دلآزاری سے گریز کرتے ہیں اس لئے ان کا اقتدار میں آجانا مسلمانوں کو اس قدر گراں نہیں گزرتا جتنا کہ اڈوانی یا مودی کا اقتدار پر قابض ہو جانا اس لئے کہ ان کے ہاتھ بابری مسجد کی شہادت اور معصوم مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ایسے میں مودی کا اس قدر بڑی اکثریت سے کامیاب ہوجانا فطری طور پر مسلمانوں کو غمزدہ کردیتا ہے۔ عام طور پر جب بی جے پی کے اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو وہ لوگ مسلمانوں کے پیچھے نہیں پڑتے اس لئے ممکن ہے ابھی کچھ عرصہ کوئی خاص مشکل کھڑی نہ کی جائے لیکن جب ان کی مقبولت میں کمی واقع ہوگی اور کرسی خطرے میں پڑ جائیگی تو مسلمانوں کیلئے نت نئے مسائل پیدا کرکے مایوس ہونے والے ہندو رائے دہندگان کی توجہ اپنی ناکامی سے ہٹانے کی کوشش کی جائیگی۔ یہ دراصل

مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی بے چینی کی بنیادی وجہ ہے جس پر ابن فرید کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

کیوں حوادث صبح کے خائف ہیں اپنی شام سے
کیوں وساوس دل کو دھڑکاتے ہیں یوں انجام سے

مسلمان عام طور پر بی جے پی کو اقتدار میں آنے سے روکنے کیلئے بڑی ذہانت کے ساتھ ووٹ کا استعمال کرتے ہیں لیکن اس بار مایوسی کا شکار ہو کر غالباً ایسا نہ کرسکے۔ اس کی دو بڑی مثالیں ہیں۔ ریاستِ آسام میں مسلمانوں کا تناسب سب سے زیادہ ہے اور ان کے بل بوتے پر کانگریس اقتدار میں آتی ہے لیکن گزشتہ سالوں میں بوڈو علاقوں کے اندر مسلمانوں کے تحفظ میں کانگریس نے زبردست کوتاہی کا مظاہرہ کیا۔ اس سے بددل ہو کر مسلمانوں نے اپنے ووٹ اس طرح ضائع کئے کہ کانگریس دو اور بی جے پی دس سیٹوں پر کامیاب ہو گئی۔ اترپردیش میں بھی یہی ہوا۔ مسلمانوں نے بڑی توقعات کے ساتھ سماجوادی کو کامیاب کیا تھا مگر مظفر نگر میں سماجوادی پارٹی اقتدار کے باوجود فساد کی روک تھام میں بری طرح ناکام رہی مایاوتی بھی خاموش تماشائی بنی رہی۔ ان لوگوں کو ہندو رائے دہندگان کی ناراضگی کا خوف لاحق ہوگیا تھا اس سے مایوس ہو کر مسلمانوں نے غالباً ایسی جماعتوں کو ووٹ دیا جن کی کامیابی کا امکان نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا بی جے پی ۷۳ نشستوں پر کامیاب ہو گئی۔ مسلمانوں کی ہر

حال میں مودی رو کو تحریک کا رد عمل ہندوؤں پر یہ ہوا کہ وہ بی جے پی کے ساتھ ہو گئے۔یہی وجہ ہے کہ تمل ناڈو بنگال اور اڑیسہ جیسی ریاستوں میں جہاں لٹڑی چوٹی کا زور نہیں لگایا گیا بی جے پی کا خاص فائدہ نہیں ہوا لیکن اتر پردیش اور بہار میں اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ مسلمانوں نے جن کو عصا بنانے کی کوشش کی وہ تو ٹوٹ گئے اب ان کیلئے حفیظ میرٹھی کا اس شعر میں اک پیغام ہے

بے عصا اپنی کلیمی ہے تو ہو
وقت کے فرعون سے ڈر جائیں کیا

فسطائی ہندوتوا کا نکتہ نظر: آزادی کے بعد آر ایس ایس نے جن سنگھ قائم کی لیکن اسے مرکز میں اقتدار کا مزہ ایمرجنسی کے بعد ہی ملا جب وہ جنتا پارٹی کا حصہ بنی۔ اس کے بعد ان کی اپنی حکومت ۱۹۹۶ء میں بنی جو تیرہ دنوں کے بعد گر گئی اس کے بعد ۱۹۹۸ء اور ۱۹۹۹ء میں ان لوگوں نے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر حکومت بنائی۔ اس لئے وہ خواہش کے باوجود اڈوانی کو وزیر اعظم نہیں بنا سکے اور سیکولر حلیفوں کے دباؤ میں رام مندر کے ایجنڈے پر بھی عملدرآمد نہیں کر سکے لیکن اس بار بی جے پی کسی کی محتاج نہیں ہے۔ سنگھ پریوار ممکن اس کا فائدہ اٹھا کر ہندوتوا کے ایجنڈے پر سرگرم عمل ہو جائے لیکن اگر ایسا کیا گیا تو وہ عوام جنھوں نے روزگار اور خوشحالی کیلئے بی جے پی کو ووٹ دیا ہے۔برگشتہ ہو جائیں گے۔ ممکن ہے نریندر مودی اپنا اقتدار بچانے کی خاطر آر ایس

ایس کو اس کی اجازت نہ دے۔امکان یہی ہے کہ جب تک سنگھ اس کیلئے مفید ہوگا فائدہ اٹھائیگا اور جب پریشان کرے گا تو اسے نظر انداز کردے گا لیکن اگر وہ ایسا نہ کرسکا تو جلد ہی اسے اقتدار سے محروم ہونا پڑے گا۔

سیکولر عام ہندوستانی: کچھ لوگ کہنے لگے ہیں کہ ہندوؤں نے اپنے رویہ سے ثابت کردیا ہے کہ وہ سیکولر نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ این ڈی اے کو ۴۰ فیصد سے کم ووٹ ملے ہیں گویا ۶۰ فیصد رائے دہندگان میں سے اگر ۲۰ فیصد مسلمان نکال دیئے جائیں تب بھی ۴۰ فیصد ہندو اب بھی اس کے خلاف ہیں ۔ مسلمانوں کا بے دین طبقہ بھی چونکہ فسادات کا شکار ہوتا ہے اس لئے بی جے پی کی مخالفت کرتا ہے لیکن سیکولر ہندو کا یہ مسئلہ نہیں ہے۔ اس کو اپنے بنیادی مسائل میں دلچسپی ہے اور وہ جس کے اندر امید کی کرن دیکھتا ہے اس کے ساتھ ہولیتا ہے ۔ اس بار وہ مہنگائی اور بیروزگاری کے سبب کانگریس سے مایوس ہوچکا تھا اور چاہتا تھا کہ اس سے نجات ملے ۔ ایسے میں ذرائع ابلاغ نے اپنے تجارتی مفاد کے پیش نظر نریندر مودی کو متبادل کے طور پر موثر انداز میں پیش کیا۔ نریندر مودی نے بھی خوب محنت کی جسے میڈیا نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور عام ہندو جو بی جے پی کے مظالم کا براہ راست شکار نہیں ہوا تھا جھانسے میں آگیا ۔

اس طرح کے نتائج دیکھ کر مسلمانوں کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ دیگر مذاہب کے ہم وطن ہمارا درد محسوس کیوں نہیں کرتے؟ لیکن یہ ایک عمومی سماجی مسئلہ ہے جس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اندرا گاندھی نے گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی کی اور پھر راجیو گاندھی نے دہلی کے سکھ فساد کا جواز پیش کردیا۔ ان دونوں واقعات کا کانگریس کو زبردست سیاسی فائدہ ہوا اور کانگریس نے بی جے پی کی حالیہ کامیابی سے بڑی فتح درج کرائی ۔ واجپائی و اڈوانی تک الیکشن ہار گئے۔ ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں نے سکھوں کے کرب کو محسوس نہیں کیا۔ اس کے بعد جب بابری مسجد شہید اور گجرات کا فساد ہوا تو سکھ مسلمانوں کے ساتھ آنے کے بجائے بی جے پی کے ساتھ لگے رہے ہندووں نے گجرات میں مودی کے اقتدار کی توثیق کردی۔ یہ دراصل ہمارے معاشرے کا سب سنگین مسئلہ ہے کہ یہاں جان و مال کی حرمت پامال ہونے پر بھی لوگ صرف اپنے اوپر گزرنے والی مصیبت کو محسوس کرتے ہیں دوسروں کے غم میں شریک نہیں ہوتے۔ اس صورتحال کا بدلنا ضروری ہے۔

ویسے اس کامیابی کے پیچھے ہندوستانی انتخابی نظام کی ایک بہت بڑی خرابی بھی کارفرما ہے۔ اس کیلئے دو مثالیں بنگال اور بہار میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ بہار میں این ڈی اے محاذ کو تقریباً ۴۰ فیصد ووٹ ملے اور ۲۶ نشستوں پر کامیابی ملی ۔ جبکہ یو پی اے کو ۳۵ فیصد ووٹ ملے اور صرف ۶ سیٹیں ملیں ۔

بنگال میں ترنمل نے ۳۵ فیصد ووٹ لے کر ۳۲ سیٹیں جیتیں۔ کانگریس ۱۰ فیصد ووٹ لے کر ۵ سیٹیں جیت گئی جبکہ بی جے پی ۱۸ فیصد ووٹ لے کر ۳ اور کمیونسٹ ۲۷ فیصد کے آس پاس ووٹ لے کر صرف ۲ سیٹوں پر کامیاب ہوئے۔ دہلی میں عاپ کے ووٹ کا تناسب بڑھا اس کے باوجود اس کا صفایہ ہوگیا۔ این ڈی اے کو اس بار کل ۳۹ فیصد ووٹ ملے مگر ۶۰ فیصد سے زیادہ سیٹیں اس کے حصے میں آئیں۔ جبکہ یوپی اے کو ۲۳ فیصد ووٹ ملے مگر نشستیں ۱۵ فیصد سے کم ان دونوں کے علاوہ دیگر جماعتوں کو ۳۶ فیصد ووٹ ملے یعنی این ڈی اے سے صرف ۳ فیصد کم مگر وہ ۱۵۰ تک بھی نہیں پہنچ سکے۔ اس لئے یہ نشستیں رائے دہندگان کی حقیقی حمایت کی ترجمان نہیں ہیں۔

انتخاب سے قبل سیاسی سطح پر یہ صورتحال تھی کہ مودی کے سبب مختلف جماعتیں بی جے پی سے دور ہورہی تھیں لیکن پھر بھی وہ لوگ دیگر جماعتوں کو ساتھ جوڑنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال رام ولاس پاسوان ہے جس نے یو پی اے سے تین سیٹیں مانگیں کانگریس اور لالو نے صرف ایک کی پیش کش کی بی جے پی نے اسے ۵ سیٹیں دے دیں اور وہ پانچوں پر جیت گیا۔ بی جے پی نے مہاراشٹر میں شیوسینا کے علاوہ ایم این ایس کو بھی اپنے ساتھ کیا یدورپاّ کی پارٹی کو دوبارہ بی جے پی میں ضم کیا جس کے سبب کرناٹک کے پارلیمانی نتائج اسمبلی سے مختلف آئے اور مہاراشٹر میں کانگریس کا صفایہ ہوگیا۔ تیلگو دیسم کو بہت

تاخیر سے سہی بی جے پی سمجھا منا کر این ڈی اے میں لے آئی لیکن ٹی آر ایس کو کانگریس نے دور کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کانگریس نقصان میں رہی اور بی جے پی کا فائدہ ہوا ۔

اگر کانگریس چاہتی تو ٹوجی گھوٹالے کے بعد ڈی ایم کے سے ناطہ توڑ کر انا ڈی ایم کے کو قریب کر سکتی تھی ، ترنمل اور سماجوادی کو ساتھ لیا جا سکتا تھا بلکہ جگنموہن کا اس قدر دباؤ تھا کہ اگر کانگریس کوشش کرتی تو ممکن ہے تیلگو دیسم بھی ساتھ ہو جاتی ۔ ۲۰۰۴ء میں سونیا نے مختلف جماعتوں کو ساتھ ملا کر بی جے پی کو اقتدار سے بے دخل کیا تھا۔ گزشتہ سال پانچ ریاستوں میں بری طرح ناکام ہونے کے بعد کانگریس سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ وہ اپنی صفوں کو درست کرے گی اور نئے حلیف تلاش کرے گی لیکن ایسا کوئی اقدام دکھائی نہیں دیا جس کی بڑی قیمت اسے چکانی پڑی۔ ۲۰۰۴ء میں سونیا بڑی دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود وزیر اعظم بننے کے بجائے منموہن سنگھ کو وزیر اعظم بنا دیا تھا لیکن ۲۰۰۹ء کے بعد راہل گاندھی کو وزیر اعظم بنانے کا نادر موقع سونیا نے گنوا دیا اور اس بار جب اسے آگے بڑھایا گیا تو یہ حال ہوا کہ ۔

چہرے پہ شفق تھا جو لہو ہار گئے،اک ولولۂ سوز نمو ، ہار گئے
کس سے کہیں کھائی ہے ہزیمت کیا کیا،جب پیاس ہوئی تیز سبو ہار گئے

عام آدمی پارٹی سے لوگوں نے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں لیکن اس سے پہلی غلطی کانگریس کی مدد سے دہلی میں حکومت قائم کرنے کی ہوئی اور پھر جلد بازی میں استعفیٰ ۔اگر ملک بھر میں کانگریس کے خلاف انتخاب لڑنا ہوتا تو یہ ضروری تھا لیکن اگر بی جے پی اور مودی کو ہی نشانہ بنانا تھا تو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ عاپ نے کانگریس اور بی جے پی سے زیادہ امیدوار کھڑے کردیئے جس سے توجہات منتشر ہوگئیں۔ اس انتخاب میں اروند کیجریوال نریندر مودی س زیادہ خود اعتماد تھے۔ اس لئے کہ مودی نے تو بنارس کے علاوہ بڑودہ سے بھی کاغذات داخل کئے لیکن کیجریوال نے صرف بنارس سے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا وہ اگر کم از کم دہلی سے بھی لڑتے تو یقیناً وہاں سے کامیاب ہوجاتے۔ بنارس میں الیکشن لڑنے کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ وہ بنارس ہیں مقید ہو کر رہ گئے اور دیگر مقامات پر نہیں جاسکے۔

عام آدمی پارٹی کے پاس قابل اور بے لوث لوگوں کی بہت بڑی فوج اور اچھے اقدار دونوں موجود تھے۔ عاپ کی ناکامی نے تنظیمی ڈھانچے کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ ڈرامہ بازی یا ڈائیلاگ کا فائدہ نہایت محدود ہوتا ہے جیسے پہلے دہلی اور اب پنجاب میں ہوا۔ ان لوگوں نے ملک کے سب سے سلگتے ہوئے بدعنوانی مسئلے پر ایک عوامی تحریک بھی چلائی تھی اس کے باوجود وسائل کا فقدان انہیں لے ڈوبا۔ ہندوستان میں انتخابات اب روپیوں کے

بل بوتے پر لڑے جاتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ بغیر خاطر خواہ وسائل کے سیاست کی دنیا میں قدم رنجا فرمانے کا خواب دیکھتے ہیں ان کیلئے عام آدمی پارٹی کے انجام میں سامانِ عبرت ہے۔ دنیا کی سب بڑی جمہوریت امریکہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ سرمایہ دار صرف دو جماعتوں پر پیسہ لگاتے ہیں اور انہیں کی ذرائع ابلاغ سے تشہیر ہوتی ہے نیز انہیں کو زیادہ تر ووٹ ملتے ہیں باقی لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ وہ انتخاب ہارنے کیلئے لڑتے ہیں اور ان کی ہار پر کوئی آنسو نہیں بہاتا۔

مودی کی آندھی کو ممتا، جئے للیتا اور بیجو پٹنائک روکنے میں کامیاب رہے اس لئے کہ ان کے پاس ریاستی اقتدار تھا اس لئے مقامی سرمایہ داروں کی سرپرستی انہیں حاصل رہی ہوگی۔ بہار میں نتیش کے سرپر سے دولتمندوں نے ہاتھ کھینچا مسلمانوں نے لالو اس پر ترجیح دی اور وہ زمین پر آگیا۔ ان انتخابی نتائج سے ذرائع ابلاغ اس لئے خوش ہے کہ اس نے مصنوعی لہر بنا کر کسی بھی فرد یا جماعت کو کامیاب کرنے کی اپنی بیش بہا صلاحیت کا مظاہرہ کردیا ہے۔ اسے توقع ہے کہ اسکی بنیاد پر وہ آئندہ انتخابات میں مارکٹنگ کی اپنی خدمات کو اونچے داموں پر فروخت کرسکے گا۔ اس میں سیاستدانوں کا بھی فائدہ ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کا جھنجٹ پالنے کے بجائے سرمایہ داروں کا اعتماد حاصل کرو اور ان کے روپیوں کے بل بوتے پر ذرائع ابلاغ کی مدد سے ہوا بنا کر انتخاب جیت لو۔

ان نتائج نے ان لوگوں کو مایوس کیا ہے جو انتخابی عمل سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے۔ انتخابی نتائج نے بیجا خوش فہمیوں کا خاتمہ کرکے یہ ظاہر کردیا کہ عوام کو رائے دہندگی کا حق حاصل ہونا یقیناً ایک بہت بڑی نعمت ہے لیکن ایک فلاحی ریاست کے قیام کیلئے یہ کافی نہیں ہے بلکہ محض حقِرائے دہندگی توظالم کو اقتدار میں آنے سے روکنے کی سکت بھی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس لئے انتخاب کی سہولت کے علاوہ دیگر لوازمات بھی لازمی ہیں جن کے بغیر یہ چیز نہ صرف بے فائدہ بلکہ کبھی کبھار نقصان دہ بھی ہو جاتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہٹلر سے لے کر مودی تک سارے لوگ انتخاب میں کامیابی درج کرواکر اقتدار سنبھالتے ہیں جن پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ ۔

اس دور کے ٹھہرے ہیں مسیحا وہ لوگ
جو روح کو زخموں کی قبا دیتے ہیں

اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے مثلاً اگر کسی مملکت میں عوام کو اس بات کا اجازت نہ ہو کہ وہ اپنی نجی گاڑی رکھ سکیں بلکہ ان کیلئے لازم ہو کہ وہ بس یا ٹرین ہی سے سفر کریں تو یہ ان کی حق تلفی ہے۔ اب اگر ان کا یہ حق بحال کردیا جائے کہ وہ گاڑی تو رکھ سکتے ہیں مگر ان کو ذرائع وسائل سے محروم کردیا جائے کہ تو یہ اختیار بیکار ہو جاتا ہے۔ اگر وسائل کے حصول میں

جائز و ناجائز کی تفریق نہ ہو تو معاشرے میں لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اگر سڑکیں ٹھیک نہ ہوں تو ٹرافک جام کے سبب وقت بچتا نہیں ہے بلکہ زیادہ خرچ ہوتا ہے اور اگر نظم و نسق درست نہ ہو یا اس کے نفاذ میں کوتاہی پائی جائے تو حادثے ہونے لگتے ہیں۔

اس لئے گاڑی رکھنے کے اختیار کے ساتھ وسائل، سڑک اور معقول قوانین کا نفاذ موثر ٹرافک نظام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ہمارے سیاسی نظام میں پہلی چیز کے علاوہ باقی سب ندارد یا مفلوج ہیں۔ اس لئے انتخابی عملکو مفید بنانے کیلئے مکمل نظام کی درستگی ناگزیر ہے۔ محض ظاہری تبدیلیوں سے یہی ہوگا کہ واجپائی کی جگہ منموہن آجائیں گے اور منموہن کو ہٹا کر مودی جیسے لوگ آتے جاتے رہیں گے۔ انتخاب کے دوران تفریح کے علاوہ عوامی بھلائی کا کوئی ٹھوس کام نہیں ہوسکے گا۔ مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ۹۰ کی دہائی میں بی جے پی اترپردیش کی بڑی پارٹی تھی اور ریاست و مرکز میں اس کی حکومت تھی لیکن پھر یہ ہوا کہ کچھ تو ہندو اس سے مایوس ہوئے اور کچھ مسلمانوں نے ذہانت کے ساتھ ووٹنگ کی جس کے نتیجے میں پچھلے پارلیمانی انتخاب میں وہ چوتھے نمبر پر پہنچ گئی اور اسمبلی میں بری طرح ناکام رہی لیکن کسی بھی کھیل میں ہمیشہ جیت نہیں ہوتی۔ اس بار بی جے پی نے ہمیں مات دے دی انتخاب کے کھیل میں یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے قرآن

کا یہ فرمان یاد رکھنا چاہیے کہ ’’ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے‘‘۔ ہمیں ہر حال میں صبر و شکر کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے بارگاہِ خداوندی سے اچھی توقع رکھنا چاہیے۔

انتخابی نتائج : کیا ؟ کیوں ؟ اور کیسے ؟

اتر پردیش کے انتخابی نتائج نے مسلمانوں کے ذہن میں خلجان پیدا کر دیا ہے ۔ ایک تو ان کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ سارے مسلمان کیوں ہار گئے ؟ اور دوسرے بہوجن سماج پارٹی کیوں اپنا کھاتہ نہیں کھول سکی ؟ لوگ پریشان ہیں کہ یہ کیا ہوگیا ؟ کیوں ہوگیا ؟ اور کیسے ہوگیا ؟ یہ سوالات ان ریاستوں کے حوالے سے پیدا نہیں ہوتے جہاں بی جے پی کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی مثلاً کیرالا، تمل ناڈو، اڑیسہ ، مغربی بنگال اور سیماندھرا یا تلنگانہ وغیرہ اس لئے کہ اس کا آسان سا جواب ہے وہاں ایک ایسی علاقائی قیادت موجود تھی جس پر مودی لہر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ مدھیہ پردیش ، راجھستان ، گجرات، چھتیس گڑھ اور جھارکھنڈ ، ہریانہ، آسام اور ہماچل وغیرہ کے علاقائی رہنما اس قدر کمزور تھے کہ وہ اس آندھی کا مقابلہ کرکے اس لئے بہہ گئے لیکن ان ریاستوں میں بھی ۹۰ سے سو فیصد نشستوں کا چمتکار ایک سوالیہ نشان ہے ؟ اس کے برعکس اتر پردیش میں ملائم اور مایاوتی جیسے رہنماؤں کے ہوتے اور بہار میں لالو اور نتیش کے باوجود یہ آندھی کیوں نہیں رکی ؟ یہ سب سے اہم سوال ہے ۔ دراصل یہ کوئی چمتکار نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی پر کامیابی کے ساتھ عملدرآمد کے نتائج ہیں جس کیلئے نریندر مودی، امیت شاہ اور

راجناتھ سنگھ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ مودی اور شاہ کے سارے پاپ دھل گئے بلکہ یہ سیاسی کامیابی کی پذیرائی ہے۔ کیا؟ کیوں اور کیسے؟ کا معقول جواب پانے کیلئے بی جے پی کی چتا پر لیٹ کر سوچنا ناگزیر ہے۔

کیا ہوا؟ یہ جاننے سے قبل یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کیا ہوتا رہا ہے جس کے نہ ہونے سے ہم حواس باختہ ہیں ورنہ بات واضح نہ ہوسکے گی؟ نتن گڈکری نے بہار میں کہہ دیا تھا کہ ذات پات یہاں کی رگ وپے (جینس) میں سمائی ہوئی ہے۔ اس پر ہنگامہ ہوا لیکن یہ حقیقت ہے۔ اس ذات پات کی تقسیم کے سبب ہندو ووٹ تقسیم ہوتا تھا اوراس کے بعد ہی مسلم ووٹ اہم ہو جاتا تھا۔ پچھلی مرتبہ بی جے پی کو اترپردیش میں صرف ۹ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی اور مسلمانوں کی دانشمندانہ رائے دہندگی کے بڑے چرچے ہوئے۔ اس بار بی جے پی کے سامنے سب سے بڑا چیلنج ذات پات کی دیوار کو توڑنے کا تھا۔ اس لئے کہ ذات پات کی تقسیم ہندو اکثریت کو اقلیت بناتی دیتی ہے اور اس کے ٹوٹتے ہی ہندو اقلیت پھر سے اکثریت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ امیت شاہ کو گجرات کے اندر اس کام کا تجربہ تھااس لئے اس کو اترپردیش لایا گیا۔

امیت شاہ کا نام آتے ہی ہم لوگ ایک خاص سمت میں سوچنے لگتے ہیں۔ امیت شاہ

نے آتے ہی مظفر نگر کے فساد کروائے اور ہندو عوام کا دل جیت لیا۔ شاید یہ اس قدر سہل نہیں ہے۔ اگر کسی کے پاس مرکزی اور ریاستی حکومت نہ ہو تو اس کیلئے اس قدر بڑا فساد کروا دینا اور اسے روکنے میں رکاوٹ پیدا کرنا ناممکن ہے۔ سچ تو یہ ہے مظفر نگر فساد سے بی جے پی نے کوئی خاص فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ امیت شاہ کے جس بیان پر بوال مچایا گیا تھا وہ تھا آپ اپنے اپمان کا بدلہ ہمیں ووٹ دے کر لیں ۔ اس میں تشدد کی نہیں ووٹ کے ذریعہ جواب دینے کی بات تھی جس میں کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ مظفر نگر کا فساد جس نے بھی کرایا ملائم نے اسے روکنے میں کوتاہی کی تاکہ جاٹوں کو اجیت سنگھ سے متنفر کرکے اپنے قریب کیا جاسکے اور کانگریس نے مسلمانوں کو بلا واسطہ یہ پیغام دیا کہ ملائم تمہاری حفاظت نہیں کرسکتا اس لئے آئندہ پارلیمانی انتخاب میں تمہیں ہماری پناہ میں آجانا چاہئے۔ مایا وتی خاموش تماشائی بنی رہیں ۔ یہ لوگ انجامِ بدتک اس لئے پہنچے کہ مسلمان تینوں سے مایوس ہوگئے تھے۔ مسلمانوں کا ووٹ لے کر انہیں مجبور سمجھنے والوں کو اپنی اس شکست سے صحیح پیغام مل گیا ہوگا اور ممکن ہے وہ اپنا رویہ درست کریں گے۔

اس جملۂ معترضہ (پیراگراف) کے بعد دوبارہ بی جے پی کی جانب لوٹیں کہ اس نے ذات پات کے مسئلے کو اس قدر سنجیدگی سے کیوں لیا؟ اس کو ایک مثال سے سمجھیں

ہندوستان میں چونکہ پارلیمانی نظام رائج ہے اس لئے ہر حلقۂ انتخاب

کا ایک امیدوار ہوتا ہے۔ اب وہ امیدوار کسی ایک ذات برادری کا ہی ہو سکتا ہے۔

فرض کیجئے کسی حلقۂ انتخاب میں ٹھاکروں کی اکثریت ہے تو بی جے پی ایک ٹھاکر برادری کے آدمی کو ٹکٹ دے دیا۔ اس کے بعد کرمیوں کا نمبر آتا ہے تو ملائم نے کرمی کو ٹکٹ دے دیا۔ براہمن تیسرے نمبر ہیں تو اس کو مایا وتی نے ٹکٹ دے دیا۔ کانگریس نے کسی بنیا کو اپنا امیدوار بنا دیا۔ اب ملائم کے یادو ووٹ کرمیوں میں جمع ہو گئے۔ مایا کے ساتھ دلت پہلے سے ہیں اب براہمن بھی ساتھ آگئے ۔ کانگریس کے پاس اس کے وفادار ووٹرس موجود تھے اس میں بنیا سماج کا اضافہ ہوگیا۔ مسلمان یہ دیکھتا تھا کہ ان تینوں میں سے کون زیادہ طاقتور ہے۔ وہ اپنا وزن اس کے پلے میں ڈال کر بی جے پی کو ہرا دیتا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بی جے پی اس مشکل کے حل کیلئے کیا حکمت عملی اپنائی ؟اس نے ذات پات کی دیوار کو ڈھانے کیلئے مقامی امیدوار کی اہمیت کو ختم کر دیا گیا۔ مودی کا یہ کہنا کہ آپ کا ووٹ میرے لئے ہے دراصل حلقۂ انتخاب کے امیدوار کی اہمیت کے خاتمے کا اعلان تھا اس لئے اگر اس امیدوار کی حیثیت مٹادی جائے تو اس کی ذات اپنے آپ غیر اہم ہو جاتی ہے۔ اس کام کو کرنے کیلئے امیدواروں کے حلقۂ انتخاب بڑے پیمانے پر تبدیل کئے گئے مرلی جی اس کو نہ سمجھ سکے اس لئے ناراض ہو گئے لیکن راج ناتھ کی مثال سے اسکو سمجھا جاسکتا ہے ۔ راج ناتھ ٹھاکر ہیں لیکن وہ ٹھاکروں کا غازی آباد چھوڑ کر

براہمنوں کے لکھنو چلے آئے حالانکہ روایتی طور پر وہاں کسی مشرا یا جوشی کو لایا جانا چاہئے تھا۔ سماجوادی اور کانگریس دونوں نے براہمنوں کو ٹکٹ دیا لیکن بی جے پی نے رائے دہندگان سے کہا آپ کسی ٹھاکر کو نہیں مودی کو ووٹ دے رہے ہیں۔ کانپور میں براہمن کم ہیں لیکن وہاں بھی لوگوں سے کہا گیا آپ براہمن امیدوار نہیں مودی کو وزیر اعظم بنانے کیلئے ووٹ دیں۔ دیوریہ میں کہا گیا آپ کا ووٹ کلراج مشرا کیلئے نہیں مودی کیلئے ہے۔

اوپر کی مثال میں جو براہمن ووٹر یہ سوچتے تھے کہ بی جے پی نے ٹھاکر کو ٹکٹ دیا ہے ہم اس کو ووٹ کیوں دیں ؟ لیکن ہمارے براہمن کو تو بی ایس پینے ٹکٹ دیا ہے ہم اس کو ووٹ دیں گے وہ ذات پات سے اٹھ کر سوچنے لگا۔ اس حکمت عملی نے اپنا رنگ دکھایا ۔ لوگوں نے اپنے امیدوار کا جب مودی سے تقابل کیا تو وہ انہیں بونا نظر آیا لیکن امیٹھی رائے بریلی ،اعظم گڑھ اور مین پوری میں یہ داؤں نہیں چل سکا اور وہاں کے رائے دہندگان نے مودی پر راہل ، سونیا اور ملائم کو ترجیح دی لیکن دیگر مقامات کے لوگ مودی پر فدا ہو گئے اس لئے وہاں کانگریس اور سماجوادی کا مقامی امیدوار کا ہار گیا۔ ملائم اور سونیا اپنے مقامی امیدوار کیلئے ووٹ مانگتے تھے تو جو کسی نہ کسی ذات کا بندہ تھا مگر مودی اپنے لئے ووٹ مانگتا تھا اس لئے امیدوار کی ذات ثانوی ہو جاتی تھی۔ اس حکمت عملی کا تقاضہ یہ بھی تھا کہ وزیر اعظم کے امیدوار کا اعلان پہلے کیا

جاتا تھا اڈوانی اس ضرورت کو نہیں سمجھ سکے اور مودی کے اعلان پر استعفیٰ تک دے دیا۔ مینی فیسٹو کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی ضرورت نہیں مودی جو کچھ بولتا ہے وہی مینی فیسٹو۔ نام کا برانڈ امیج مثلاً نا مو چائے یا ہر ہر مودی گھر گھر مودی اسی حکمت عملی کا حصہ تھا جو کامیاب رہی۔

گجرات کا تجربہ: گودھرا کا فساد یقیناً مودی کی سیاسی زندگی کا ایک سنگ میل تھا لیکن ہم گزشتہ ۱۲ سال نے اسے اسپین کی نسل کشی کے تناظر میں دیکھ رہے ہیں حالانکہ مودی اور امیت شاہ نے اپنی سیاسی ساکھ بڑھانے کیلئے اور بھی بہت کچھ کیا۔ فساد کے بعد ان لوگوں نے انکاؤنٹرس کی مدد سے اپنی مقبولیت کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور اس کے پس پردہ گجرات کی اکثریتی پٹیل برادی کے سیاسی رسوخ کی بیخ کنی کردی۔ کیشو بھائی پٹیل کو دوبارہ اقتدار میں آنے سے روکنے کیلئے یہ ان کی اولین ضرورت تھی۔ ان لوگوں نے گجرات کی عوام سے ووٹ مقامی رہنماؤں کے توسط سے کبھی نہیں مانگا۔ گجرات کے اندر ہر اسمبلی الیکشن میں تیس فیصد کے آس پاس امیدوار بدل دیئے جاتے تھے جس سے ان کی عدم کارکردگی پر بھی پردہ پڑ جاتا تھا اور کسی رہنما کی کسی حلقۂ انتخاب کے حوالے سے شناخت بھی نہیں بنتی تھی۔ مودی اس معاملے میں اس قدر سفاک ہے کہ اس اپنی پارٹی کے نہایت ہونہار رکن اسمبلی اور اپنے قریبی ساتھی ہرین پنڈیا کا قتل محض اس لئے کروا دیا کہ اس نے ایلس برج حلقۂ

انتخاب مودی کیلئے خالی کرنے سے انکار کردیا تھا (یہ ہرین کے والد کاالزام ہے جن کا تعلق سنگھ سے رہا ہے)۔ گجرات اسمبلی انتخاب میں لوگ مقامی امیدوار کے بجائے مودی کو وزیر اعلیٰ بنانے کیلئے ووٹ دیتے ہیں اور اس امیدوار کی ذات کو ثانوی درجہ دیا جاتا تھا۔

اس مرتبہ گجرات کے لوگوں نے مودی کو وزیر اعظم بنانے کیلئے ووٹ تو دے دیا اب اگلی بار کیا ہوگا یہ دیکھنا پڑے گا۔ نریندر مودی نے دراصل پہلے بی جے پی کو گجرات کی سطح پر جئے للیتا، ممتا، بیجو، ملائم ،مایا اور چندرا بابو جیسے لوگوں کی طرح اپنی ذاتی پراپرٹی بنایا اب قومی سطح پر گاندھی خاندان کی تقلید کرتے ہوئے اسے اپنی ذاتی ملکیت میں بدل دیا۔ اڈوانی اور جوشی کا اس بات کا افسوس ایک تو اس لئے کہ وہ خود وزیر اعظم نہ بن سکے لیکن یہ غم بھی ہے کہ جس پارٹی کو انہوں فرد کے بجائے نظریئے کی بنیاد پر پروان چڑھایا تھا اس میں تنظیم سے زیادہ اہمیت فرد کو حاصل ہو گئی ہے۔ یہ نہ صرف نریندر مودی کی بلکہ بی جے پی کی بھی ایک بہت بڑی ضرورت تھی۔ اس لئے کہ جیسے افراد کے ساتھ ذات پات لگی ہوئی ہے اسی طرح یہ سیاسی جماعتوں کی بھی شناخت بن جاتی ہے۔ قومی سطح پر کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ کسی ایک

ذات یا مذہب کی نمائندہ نہیں سمجھی جاتی اب اس فہرست میں عام آدمی پارٹی کا اضافہ ہوا ہے۔ علاقائی پارٹیوں میں ڈی ایم کے، انا ڈی ایم کے، بیجو جنتا دل، ترنمل وغیرہ پر ایسا کوئی نشان نہیں ہے لیکن ان کے علاوہ جے ڈی یو اور سماجوادی یادووں کی جماعت سمجھی جاتی ہے۔ جے ڈی یو کرمیوں کی اور بی ایس پی دلتوں کی۔ شیوسینا پر ذات کا نہیں بلکہ فرقہ پرستی کا نام کھدا ہوا اور بی جے پی نہ صرف فرقہ پرست بلکہ براہمن بنیا پارٹی کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ بی جے پی فرقہ پرستی کا نشان پوری طرح اس لئے نہیں مٹانا چاہتی کہ اس کے ذریعہ سے اسے ہندو سماج کو متحد کرنے میں مدد ملتی ہے اس لئے درمیان میں کوئی گری راج بول دیتا ہے اور اس کی سرزنش نہیں کی جاتی لیکن اقتدار کی خاطر براہمن بنیا والے داغ کو دھونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے تنظیم کے بجائے فرد یعنی مودی کو تشہیر کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس لئے کہ بی جے پی کا نام آتے ہی براہمنوادی عکس سامنے آجاتا ہے۔ یہ گویا اسی حکمت عملی کا حصہ تھا۔

ہندو سماج کے اندر ذات پات کے علاوہ ایک اور تقسیم پائی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو ذات برادری کو اہم سمجھتے ہیں اور وہ جو اسے اہم نہیں سمجھتے۔ اول الذکر لوگوں میں بڑی تعداد بزرگوں کی ہوتی ہے جن کو اپنے ماضی سے محبت ہوتی ہے اور مؤخر الذکر زیادہ تر جواں عمر لوگ ہوتے ہیں جن کو مستقبل کی فکر بے چین کئے

رہتی ہے۔ اس کے علاوہ روایتی سوچ کے لوگوں کی بڑی تعداد گاوں میں اور غیر روایتی آبادی شہروں میں آباد ہے۔ پہلے طبقے کی وفاداری اپنی ذات.برادی والی جماعت کے ساتھ مستقل ہوتی ہے لیکن دوسری قسم کے لوگوں کی وفاداری بدلتی رہتی ہے جسے فلوٹنگ ووٹرس کہا جاتا ہے۔ ساری انتخابی مہم اس دوسرے طبقہ کو اپنے قریب کرنے کیلئے کی جاتی ہے اور اگر ان کے درمیان کوئی لہر چلادے تو وہ کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس بار مودی لہر نے ان ووٹرس کا دل جیتنے میں کامیابی حاصل کی۔

اس طبقہ کی نفسیات یہ ہے کہ یہ بہت جلد پرامید ہوجاتا ہے اور بہت جلد مایوسی کا شکار بھی ہوجاتا اور اسی بنیاد پر اپنی وفاداری بدل دیتا ہے۔ اس کا مظاہرہ مختلف مواقع پر ہوتا رہا ہے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو ایک آزادی صبح نے اس کو پرامید کردیا تھا لیکن چین کی جنگ کے بعد جب مایوسی چھانے لگی تو اندراگاندھی نے غریبی ہٹاؤ کا نعرہ لگا کر اس کو پرامید کیا۔ اس سے رام منوہر لوہیا کے سوشلزم کی کشش کانگریس کی جھولی میں آگئی بی جے پی کے راشٹر واد (نیشلزم) کو بے اثر کرنے کیلئے بنگلہ دیش کی جنگ کا سہارا لیا گیااور انتخابات میں کامیابی درج کرائی گئی۔ اندراجی نے فسطائی حکمت عملی کا استعمال سکھوں کے خلاف کیا اور اس کی مدد سے اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کو سنبھالا۔ راجیو نے ۲۱ ویں صدی میں نوجوان قیادت کا نعرہ لگا اس

طبقے کو ساتھ لیا۔ بی جے پی کو تو ۲۵ جماعتوں کی حمایت سے ۲۸۲ نشستوں پر کامیابی ملی ہے جبکہ ۱۹۸۴ء میں کانگریس کو اپنے بل بوتے پر ۴۱۵ سیٹیں ملی تھیں۔ سیاست میں نووارد راجیو کے ساتھ ماں کی موت سے حاصل ہونے والی ہمدردی کی لہر بھی تھی۔ جنتا پارٹی نے اس طبقہ کا دل جیتنے کیلئے ایمرجنسی کے بعد جمہوریت کی بحالی کا نعرہ لگایا اور کامیاب رہی۔ پانچ سال بعد وی پی سنگھ راجیو گاندھی سے بددل ہونے والوں کا دل جیتنے کیلئے بوفورس کی توپ سے لیس ہو کر میدان میں اترے اور قلعہ فتح کر لیا۔ اڈوانی جی نے نرسمہا راو کے خلاف رام رتھ یاترا نکال کر اس طبقہ کو قریب کرنے کی کوشش کی اور اٹل جی نے بنگلہ دیش کی طرح کارگل کی جنگ کا سہارا لے کر تیسری بار حلف لیا۔ سونیا نے اٹل کے مقابلے کانگریس کا ہاتھ عام آدمی کے ساتھ کا نعرہ لگا کر ۲۰۰۴ء میں کامیابی حاصل کی اور ۲۰۰۹ء میں راہل کے ذریعہ ایک روشن مستقبل کی امید دلا کر ان ووٹرس کو قریب کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے ۲۰۰۹ء میں کانگریس کی سیٹوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا لیکن جب ۲۰۱۴ء میں یہ طبقہ مایوسی کا شکار ہوا تو کانگریس کوئی موثر حکمت عملی نہیں اختیار کر سکی۔ مودی نے ترقی کا حسین خواب دکھلا کر ذرائع ابلاغ کی مدد سے ان کا من موہ لیا۔ ذات پات کی دیوار کے علاوہ یہ دوسرا سبب تھا جو اس بار بی جے پی کی کامیابی کا سبب بنا۔ دراصل بی جے پی کے

سامنے اب سب سے بڑا چیلنج اس کو ساتھ رکھنے کا ہے اس لئے کہ اس کی وفاداری مستقل نہیں ہوتی اور یہ بہت جلد بددل ہو جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف راجیو اور وی پی سنگھ کا ساتھ بہت جلد چھوڑ دیا بلکہ اٹل جی سے بھی پیچھا چھڑانے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ اس انتخاب کے دوران عام آدمی پارٹی کی حکمت عملی کے اندر اچانک ایک بڑی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ بدعنوانی کی تحریک کے دوران کانگریس اس کے نشانے پر تھی

اوراخبار والوں کو ان سے بی جے پی کے خلاف ایک جملہ اگلوانے میں خاصی محنت کرنی پڑتی تھی لیکن پھر یہ ہوا کہ ان کی مخالفت کا مرکز مودی ہوگیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب اسی غیر مستقل ووٹر کا دل جیتنے کی کوشش میں پوشیدہ ہے۔ عاپ نے یہ دیکھا کہ لوگ بدعنوانی پر کان نہیں دھرتے اور راہل کی مخالفت سے نہ خبر بنتی ہے نہ نوجوان ووٹرس ساتھ آتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ پہلے ہی مودی کا راہل کا متبادل تسلیم کر چکے ہیں تو انہوں نے اپنے آپ کو مودی کا متبادل بنا کر پیش کیا۔ ان کا دعویٰ تھا مودی کی ترقی کا وعدہ کھوکھلا ہے حقیقی ترقی کا علمبردار وہ نہیں ہم ہیں ۔کیجریوال کا گجرات دورہ اس حکمت عملی کا حصہ تھا۔ عاپ نے رائے دہندگان کو یقین دلانے کیلئے مودی کو راہل نہیں کیجریوال روک سکتے ہیں بنارس سے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہ حکمت عملی درست تھی مگر تنظیم اور وسائل کی کمی ان کے راستے کا

روڑہ بن گئی۔ اس حکمت عملی سے بلا واسطہ بی جے پی کا یہ فائدہ ہوا کہ کانگریس اور ایس پی کا وفادار مسلم ووٹر جوان کی بے اعتنائی سے بھرا بیٹھا تھا عاپ کے ساتھ ہوگیا لیکن ہندو سماج نے اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی۔

کیا؟ کیوں؟؟؟ اور کیسے ؟؟؟؟ کے بعد اب نوے سے سو فیصد سیٹوں کی جانب چلتے ہیں۔ رائے دہندگان کے تناسب پر منحصر نمائندگی کا نظام ہمارے یہاں نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی جماعت ہر حلقۂ انتخاب میں ۵۱ فیصد ووٹ حاصل کر لے تو یقینی طور پر ۱۰۰ فیصد سیٹیں اسے مل جائیں گی۔ لیکن ۵۱ فیصد کی ضرورت اس وقت پیش آئیگی جب مخالفت متحد ہو۔ اگر مخالف منقسم ہیں اور مخالفین میں سے کوئی بھی اگر کسی حلقۂ انتخاب میں فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل نہیں کرسکے تو ہر جگہ ۳۱ فیصد ووٹ حاصل کرنے والی ۳۰ جماعت کو بھی صد فیصد سیٹیں مل سکتی ہیں۔ اس کا فائدہ اٹھا کر بی جے پی نے چند ریاستوں کی ساری نشستوں پر قبضہ کرلیا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ بی جے پی کل ۳۱ فیصد ووٹ ملے اور ۵۱ فیصد نشستیں اس کے حصے میں آئیں جبکہ کانگریس کو ۱۹ فیصد ووٹ ملے مگر اس کو ۸ فیصد پر اکتفاء کرنا پڑا۔ اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قومی سطح پر تیسرے نمبر رہنے والی بہوجن سماج پارٹی جس کو ۴ فیصد ووٹ ملے اپنا کھاتہ نہ کھول سکی۔ ترنمل کانگریس نے صرف ۸ء۳ فیصد ووٹ حاصل کرکے ۳۴ نشستوں پر قبضہ جمایا

اور اس سے بھی کم ۳ء۳ فیصد ووٹ پانے والی انا ڈی ایم کے ۷ نشستوں پر کامیاب ہوئی۔ ایک اور دلچسپ موازنہ دیکھیں عاپ کو ۲ فیصد ووٹ کے عوض چار نشستیں ملیں جبکہ شیوسینا کو ۹ء۱ ووٹ کے بدلے ۱۸ اور بیجو جنتا دل ۶ء۱ فیصد ووٹ پا کر ۲۰ نشستیں جیت گئی۔ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیٹوں کی تعداد کا زمینی حقائق سے سیدھا تعلق نہیں ہے۔

مندرجہ بالا حقائق سے قطع نظر سچی بات تو یہ ہے کہ جمہوری سیاست میں اقلیت کیلئے ان حلقۂ انتخاب کے علاوہ جہاں وہ اکثریت میں بھی ہوں اور منقسم بھی نہیں ہوں اپنے بل بوتے پر کامیابی کی گارنٹی ممکن نہیں ہے۔ اقلیت کیلئے یہ تو ممکن ہے کہ وہ اکثریت کی تقسیم کا فائدہ اٹھائے لیکن اگر کوئی قوم اگر اپنے آپ کو مذہب کی بنیاد پر متحد کرنا چاہتی ہے تو اسے روکنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ جس طرح ہم انہیں امت مسلمہ کو تقسیم کرکے اس کا فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتے اسی طرح بیجے پیا گر نفرت وعناد کا سہارا لئے بغیر آپس میں اتحاد قائم کرے تو ہمارا جز بز ہونا مناسب نہیں ہے۔ جمہوری نظام کی کسی کمزوری سے اگر ہم مستفید ہو سکتے ہیں تو ان کو بھی اس کا حق ہے۔ جس کو انہوں نے اس بار بڑی چالاکی سے استعمال کیا ہے۔ اس مسئلہ کا ایک حل ووٹ کے تناسب کے مطابق نمائندگی ہے لیکن اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر غیر مسلمین کی کوئی سیاسی جماعت اس پر راضی نہیں ہوگی۔

مسلمانوں کی سیاسی بے وزنی کا خاتمہ کیلئے کم از کم بی جے پی مخالف دھڑے کا اتحاد لازمی ہے۔اس لئے کے آج بھی ۶۹ فیصد لوگوں بی جے پی کی اور ۶۱ فیصد لوگوں نے این ڈی اے کی تائید نہیں کی ہے۔ لیکن اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سیکولر ابن الوقتوں کے ذاتی مفادات اور اقرباء پروری ہے۔ مثلاً اگر کل کو سماجوادی اور بہوجن سماج آپس میں اتحاد کرلیں جیسا کہ ماضی ایک بار کرچکے ہیں تو اترپردیش میں بی جے پی کیلئے مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس سے مسلمانوں کے ووٹوں کی تقسیم کا مسئلہ بھی حل ہو جائیگا لیکن یہ فی الحال ناممکن نظر آتا ہے۔ بہار کی مثال لیں نتیش کی حکومت بچانے کیلئے لالو اور کانگریس نے ہاتھ بڑھایا ہے اگر یہ اتحاد قائم ہو جائے تو مودی کا جادو فیل ہو سکتا ہے لیکن اگر لالو پرشاد سے نتیش کمار پوچھیں کہ لالو جی میری جگہ وزیراعلیٰ کے طور پر آپ کس کا نام تجویز فرمائیں گے اور اس کے جواب میں لالو ارشاد فرمائیں میری بیٹی میسا بھارتی کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے؟ تو بھلا یہ اتحاد کیونکر دیرپا ہوسکے گا۔ میں تو کہتا ہوں اگر یہ دونوں مل کرچراغ پاسوان کو وزیراعلیٰ بنانے پر راضی ہوجائیں تو بہار میں بی جے پی کا بیڑہ غرق ہوجائیگا لیکن ایسا صرف مسلمان چاہتا ہے باقی لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ ۔

ہر قبیلہ اپنے اک اک فرد کی ایک فوج ہے

میں نے ایک کی کہی تھی میں اکیلا رہ گیا

۲۶ مئی: ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا زعفرانی دن

وزیر اعظم نریندر مودی کی حلف برداری کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا زعفرانی دن کہنا اس لئے مناسب حال معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سیاہ و سفید ہونے میں اختلاف ہے۔ ایک طرف جہاں ہندوتوادیوں کیلئے یہ ایک تابناک مستقبل کی علامت ہے وہیں مسلمانوں کیلئے یہ یقیناً یوم سیاہ ہے اس لئے وہ مودی کے مظالم کو نہ بھولے ہیں اور نہ بھول سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے ۱۹۹۱ء میں ملائم سنگھ یادو نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بابری مسجد کو توڑنے کی کوشش کرنے والے کارسیوکوں پر گولی چلائی تھی ۔ سنگھ پریوار اس کو ابھی تکبھول نہیں سکا اس لئے جب بھی ملائم کو کوئی سیاسی کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ چراغ پا ہو جاتا ہے۔ گجرات کے فسادزدگان توخیر بے قصور تھے۔

راہل گاندھی کیلئے یہ سیاہ تر دن ہے جو گزشتہ ۱۰ سالوں سے وزیر اعظم بننے کا خواب سجا رہا تھا اور جیسے تیسے اس بار کمان سنبھال لینا چاہتا تھا۔ اس کا خواب توچکنا چور ہوگیا لیکن اب عمر ہی کیا ہے۔ پھر سے قسمت آزمائی کرکے وہ کامیاب بھی ہو سکتاہے۔ لال کرشن اڈوانی کیلئے یہ سیاہ ترین دن ہے اس لئے کہ

اب وہ خواب میں بھی وزیراعظم نہیں بن سکتے گزشتہ دس سالوں سے منتظر وزیراعظم کے لقب سے وہ محروم ہو چکے ہیں۔ جس شخص نے اقتدار کی خاطر بابری مسجد کو شہید کیا اور سارے ملک میں آگ و خون کی ہولی کھیلی وہ تو اپنے دردناک انجام کو پہنچ گیا۔ جن کے ہاتھ معصوموں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں وہ اپنے انجام کے منتظر ہیں ۔ مشیت کا کھیل ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جاری ہے۔

انسانی نفسیات نتائج کو اپنی توقعات کی بنیاد پر مثبت یا منفی قرار دیتی ہے یہی وجہ ہے کسی ایک کیلئے حوصلہ افزاء نتیجہ دوسرے کو دل شکستہ کر دیتا ہے۔نریندر مودی اور امیت شاہ کی سفاکیت اور انکاؤنٹرس کا شکاریوں توہرین پنڈیا اور پرجاپتی جیسے ہندو بھی ہوئے لیکن سب سے زیادہ قیمت مسلمانوں نے چکائی اسلئے دنیا کے سارے مظلوم ان دونوں کو بابو بجرنگی اور مایا کوندنانی کے ہمراہ جیل کے اندر دیکھنا چاہتے تھے چونکہ اس کے برخلاف وہ اقتدار پر فائز ہوگئے اس لئے مایوسی کا پیدا ہونا فطری ہے لیکن جس پارلیمان میں منتخب ارکان کی ایک بڑی تعداد مجرم ہے بی جے پی کے ایک تہائی ارکانِ پارلیمان خطرناک قسم کے مقدمات میں ملوث ہونے کا اعتراف کر چکے ہیں تو سربراہ کے مجرم ہونے پر حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں ہے کہ فی الحال ہندوستانی جمہوریت کی گاڑی دولت اور جرم کے پہیوں پر چل رہی ہے۔

اس بار انتخابی مہم کا سب سے منفی پہلو دولت کے ریل پیل کے سبب ذرائع ابلاغ کی جانبداری تھا مگر ماضی سے موازنہ کرنے پر ایک مثبت پہلو بھی سمجھ میں آتا ہے۔ سنہ ۱۹۹۰ کی دہائی میں انتخاب سے قبل ایک دھرم سنسد ہوتی تھی ۔ سادھو سنت وشوہندو پریشد کا پرچم تھام کر میدان میں نکل آتے تھے ۔ بجرنگ دل کے غنڈے دنگا فساد کرنے میں جٹ جاتے تھے۔ ''مندر وہیں بنائیں گے'' کا نعرہ بلند ہوتا اور تمام مسلمانوں کو بابر کی اولاد قرار دینے کی مذموم کوشش کی جاتی تھی۔اس کے جواب میں راجیو گاندھی تک کو ایودھیا میں شیلانیاس کرکے رام راجیہ قائم کرنے کا اعلان کرنا پڑتا تھا۔ اس بار ترقی و خوشحالی کی بنیاد پر انتخابات ہوئے۔ بی جے پی کی ریاستوں میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ مظفر نگر میں ایس پی اور آسام کے بوڈو علاقوں میں کانگریسی خاموش تماشائی بنی رہے۔ فرقہ وارانہ فسادات سے سیاسی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اعظم گڑھ کے متعلق امیت شاہ کا دہشت گردی والا بیان بی جے پی کے کام نہ آسکا۔ گری راج کے پاکستان والے بیان کی ذرائع ابلاغ میں مذمت ہوئی۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بی جے پی کو انتخاب فرقہ پرستی کے بجائے خوشحالی و ترقی پر لڑنا تھا تو اس نے نریندر مودی کو وزیر اعظم کا امیدوار کیوں بنایا ؟ اس کا سہل ترین جواب قحط الرجال ہے۔ بی جے پی کے پاس اس مرتبہ مودی

سے بہتر کوئی امیدوار موجود نہیں تھا لیکن اور بھی وجوہات ہیں۔ پچھلی بار واجپائی، اڈوانی اور پرمود مہاجن کی تریموریتی نے بی جے پی کو انتخاب میں کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ واجپائی سنگھ کے باہر والوں کو خوش کرنے کیلئے تھے۔ اڈوانی کا کام سنگھ کے اندر موجود سخت گیر عناصر کو مطمئن رکھنا تھا اور پرمود مہاجن کی ذمہ داری سرمایہ داروں سے چندہ جمع کرنے کی تھی۔ اس بار گجرات میں سرمایہ داروں کو مراعات دے کر مودی نے پہلے تو مہاجن کا کام کیا اس کے بعد اٹل جی کی سدبھاونا کا مکھوٹا اوڑھ لیا۔ سیکولر دانشوروں اور مسلمان عوام کی مخالفت سے کٹر ہندو خوش ہوتے رہے اور سوچتے رہے چونکہ یہ ہمارے دشمنوں کا دشمن ہے اس لئے ہمارا نجات دہندہ ہوگا ہی ہوگا اس طرح گویا ایک آدمی سے تین کام ہو گئے اور ۱۹۹۸ والا چمتکار پھر ہوگیا۔

اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ فسطائیوں کے دل بدل گئے ہیں۔ ایک سیاسی مجبوری فی الحالبی جے پی کو فرقہ پرستی سے اجتناب کروارہی ہے۔ خوشحالی و ترقی کے نام پر قریب آنے والا نیا ووٹر اور تشہیر پر سرمایہ لگانے والا نیا ڈونر دونوں چاہتے ہیں کہ امن و امان قائم رہے جو عوام و خواص کی ترقی و خوشحالی کیلئے یہ ناگزیر ہے لیکن جب یہ دونوں مایوس ہو کر اپنا منہ موڑنے لگیں گے تو بی جے پی بھی فسطائیت کی جانب رخ کرنے پر مجبور ہو جائیگی ۔ یہ وقت کب آیگا کوئی نہیں بتا سکتا لیکن چونکہ ان لوگوں کو فرقہ پرستی

کی سیاست کا اچھا خاصہ تجربہ ہے اور ان کا انحصار مسلمان رائے دہندگان پر نہیں ہے اس لئے ان کے فسطائیت کی جانب راغب ہونے کے امکانات ہمیشہ روشن رہتے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر مسلمانوں کو بی جے پی سے خوف کھانے یا اس کا ہمنوا بن جانے کے بجائے اس کے متبادل کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ جمہوری نظام میں حزب اختلاف تو بہر حال موجود رہے گی۔

انتخابی نتائج کے فوراً بعد ذرائع ابلاغ نے اس کامیابی کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا لیکن اب وہ خود اس کی قلعی کھول رہا ہے۔ جہاں تک بی جے پی کا سوال ہے یقیناً اسے پہلی مرتبہ اکثریت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ کوئی ایسی فتح نہیں ہے جو پہلی بار کسی کے حصے میں آئی ہو بلکہ کسی کا صرف ۳۱ فیصد ووٹ سے اکثریت کا حاصل کرلینا سب سے کمزور فتح ہے۔ گزشتہ انتخاب میں کانگریس کے اپنے ۲۹ فیصد ووٹ تھے اس بار بی جے پی کے ۳۱ فیصد ہیں۔ پچھلی بار بی جے پی نے ۱۹ فیصد ووٹ حاصل کئے تھے اور اس بار کانگریس کے ۲۰ فیصد کئے ہیں گویا رائے دہندگان کے حوالے سے فرق یکساں ہے لیکن بی جے پی کے اثرات چونکہ چند ریاستوں میں مرتکز ہیں اس لئے کامیابی کا تناسب بہتر نظر آتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس بار بی جے پی کو حاصل ہونے والی ۲۸۲ نشستیں ۱۹۸۴ء میں کانگریس کی ۴۱۴ سے بہت کم ہیں۔ اُس وقت بی جے پی ۲ پر پہنچ گئی تھی کانگریس

اب بھی ۴۴ پر ہے اور اترپردیش میں ۱۹۸۴ء کے اندر کانگریس ۸۲ میں سے ۸۰ نشستوں پر کامیابی درج کرائی تھی جبکہ بی جے پی نے ۸۰ میں ۷۱ سیٹیں حاصل کی ہیں۔ اس لئے بلاوجہ کی مرعوبیت کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ انتخابی سیاست جادو کا پٹارہ ہے۔ ہندوستان کو ایک زمانے تک سپیروں کا اور جادوگروں کا ملک کہا جاتا تھا۔ اب حال یہ ہے سانپ تو سارے سیاسی جماعتوں میں چلے گئے مگر انتخابی سیاست کا جادو پوری قوم کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ عوام کالانعام سانپوں کیلئے آستینوں کا انتظام کرکے خود اپنے آپ کو برضا و رغبت ڈسوانے کا اہتمام کرتے ہیں اور سیاستداں اپنی عیاری پر بغلیں بجاتے ہیں۔ حفیظ میرٹھی نے اس صورتحال کی کیا خوب ترجمانی کی ہے کہ

سانپ آپس میں کہہ رہے ہیں حفیظ
آستینوں کا انتظام کرو

انتخابی پٹارے سے نمودار ہونے والا یہ چمتکار نیا نہیں ہے لیکن چونکہ ذرائع ابلاغ اس غبارے میں بہت زیادہ ہوا بھر چکا تھا اس لئے اس کی ندرت کو محسوس نہیں کیا جاسکا۔ ہندوستان کی تاریخ میں تیسرا انتخاب ۱۹۶۲ء میں ہوا جب پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کا ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ بامِ عروج پر تھا لیکن پھر چین کے ساتھ جنگ نے اس خواب کو نہ صرف چکنا چور کیا بلکہ ملک کو پنڈت نہرو کی قیادت سے محروم کردیا۔ ان کے بعد لال بہادر شاستری وزیراعظم

بنے اور پاکستان کی جنگ کا صدمہ ان کی موت کا سبب بن گیا۔ اس وقت آزادی کی جدوجہد میں شریک رہنے والے کئی معمر سیاستداں کانگریس پارٹی میں موجود تھے اس کے باوجود گونگی گڑیا اندرا گاندھی کا وزیر اعظم بن جانا ایک چمتکار تھا لیکن اس کے بعد کانگریس میں پھوٹ پڑ جانے کے باوجود اور سارے بڑے رہنماوں کی بغاوت کے چلتے اندرا گاندی کا ۱۹۶۷ء میں ۲۸۳ نشستوں پر کامیابی حاصل کرکے واضح اکثریت حاصل کرلینا ایک بہت بڑا انتخابی کرشمہ تھا۔

اندرا گاندھی اپنے بیٹے سنجے گاندھی کو اپنا ولیعہد بنانا چاہتی تھیں اور راجیو گاندھی کا حال یہ تھا کہ وہ سونیا سے شادی کرکے اٹلی منتقل ہونے کا منصوبہ بنا رہے تھے ۔ یہ ایک حقیقت ہے سنجے گاندھی کی حیات میں راجیو کبھی بھی سیاست کے قریب نہیں پھٹکے لیکن مشیت کو یہ منظور تھا کہ سنجے کے بجائے وہ وزیر اعظم بنتے اور انتخابی سیاست نے یہ چمتکار بھی کیا کہ نوآزمودہ راجیو گاندھی نے نہ صرف اپنے والدہ بلکہ نانا کا ریکارڈ توڑ دیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ نرسمھا راو جیسے گھاگ سیاستداں جس بی جے پی کو شکست نہ دے سکے اس کو سونیا گاندھی کی قیادت میں کانگریس نے ۱۹۹۴ء میں اقتدار سے بے دخل کردیا حالانکہ اٹل بہاری واجپائی، ایل کے اڈوانی، جارج فرناڈیس جیسے سیاستدانوں کے سامنے ایک غیر ملکی بہو کی جو ہندی زبان تک ٹھیک سے نہیں جانتی تھی کوئی حیثیت نہیں تھی ۔ یہ یقیناً ایک غیر متوقع کرشمہ تھا۔

نرسمہا راؤ اور منموہن سنگھ کا وزیر اعظم بن جانا بھی ایک چمتکار ہے اس لئے کہ ۱۹۸۹ء کے انتخاب میں راجیو گاندھی نے انہیں ٹکٹ تک سے محروم کردیا تھا۔ وہ اپنی ریاست میں اس قدر غیر مقبول تھے کہ مہاراشٹر سے الیکشن لڑتے تھے لیکن راجیو گاندھی کے قتل کے بعد این ڈی تیواری، ارجن سنگھ اور شرد پوا کی لڑائی نے انہیں وزیر اعظم بنا دیااور پھر انہوں نے گاندھی خاندان سمیت ان تینوں کو ٹھکانے لگادیا۔ وزیر اعظم بننے کے بعد انہوں نے ریکارڈ توڑ کامیابی درج کرائی۔نرسمہا راؤ کا ایک کمال یہ تھا کہ انہوں نے اندرا کانگریس کو پھر سے انڈین نیشنل کانگریس میں تبدیل کردیا۔ منموہن کا دس سال تک وزیر اعظم بنا رہنا بھی ایک حیرت انگیز بات ہے اس لئے کہ وہ پیشہ ور سیاستداں کبھی نہیں تھے۔ وہ تو لوک سبھا کا انتخاب لڑنا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ اقتدار کے چور دروازے راجیہ سبھا پر ہی اکتفاء کرلیا کرتے تھے۔

یہ معاملہ صرف کانگریسیوں کے ساتھ ہی نہیں ہوا ۱۹۹۶ء میں جب بی جے پی کی ۱۳ دنوں والی حکومت گر گئی تو لوگوں نے وی پی سنگھ کو وزیراعظم بنانے کی کوشش کی ان کے انکار پر جیوتی باسو کو تیار کیا گیا لیکن پارٹی نے اجازت نہیں دی اس کے بعد ایک اور چمتکار ہوگیا دیوے گوڑا جو آخری نمبر کے ایم پی

تھے پہلے نمبر پر آکر وزیر اعظم بن گئے۔ بی جے پی کے ساتھ بھی یہ ہوا کہ ۱۹۸۴ء کی زبردست ناکامی کے بعد اٹل جی کو رسوا کرکے ہٹا دیا گیا اور اڈوانی جی نے رتھ یاترا نکال کر پارٹی کو زندہ کیا لیکن الیکشن میں کامیابی کے بعد حامی جماعتوں نے اڈوانی کو مسترد کردیا اور اٹل جی وزیر اعظم بن گئے جبکہ سنگھ اڈوانی کے حق میں تھا۔ کسی زمانے میں نریندر مودی کو کیشو بھائی پٹیل اور سنجے جوشی نے گجرات بدر کرکے دہلی روانہ کردیا تھا ۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد فرقہ وارانہ فساد کے سبب اٹل جی نے اس کا استعفیٰ طلب کرلیا تھا لیکن مہاجن اور جیٹلی وغیرہ کی مدد سے کسی طرح کرسی بچی اور ۱۳ سال بعد وہ ہندوستان کے وزیر اعظم بن گئے جو جمہوریت کا ایک اور چمتکار ہے۔

اس انتخابی مہم کے دوران جن تنازعات کو نظر انداز کیا گیا تھا وہ اب پھر سے سر اٹھانے لگے ہیں۔ پہلے تو گجرات اسمبلی میں مودی کو دیئے جانے والے الوداعیہ کے اندر کانگریسی رہنما شنکر سنگھ واگھیلا نے طنزیہ انداز میں ان کا ذکر کیا۔ ایک سابق سنگھی سے جو مودی کے ساتھ پرچارک رہا ہو اس کی توقع بیجا نہیں ہے پھر وشو ہندو پریشد کے اشوک سنگھل ہوش میں آئے اور انہوں نے ایک ایک کرکے رام مندر سمیت سارے مطالبات کا اعادہ کردیا لیکن اس بار انداز جارحانہ نہیں تھا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا تھا کہ اٹل جی کے پاکستانی دورے کے مخالفت کرتے ہوئے وی ایچ پی نے کہا تھا ہم تو چاہتے ہیں

کہ وہ بس میں نہیں بلکہ ٹینک پر سوار ہو کر پاکستان جائیں لیکن اس بار نواز شریف کی آمد کی مخالفت میں شدت نہیں ہے۔ اخبار نویسوں کے کرید نے پر سنگھل نے کہا شریف کا دورہ علامتی نوعیت کا ہے اسے ہو جانا چاہئے۔

نریندر مودی کی حلف۔برداری میں سری لنکا کے سر۔براہ مملکت کو مدعو کرنے پر تنازعہ کھڑا ہوگیا۔ اتفاق سے اس بار مخالفت کرنے والا مسلمان نہیں بلکہ ہندو طبقہ تھا اس کے۔برخلاف نواز شریف کی حلف۔برداری کی تقریب میں شرکت کا مسلمانوں نے استقبال کیا۔ نواز شریف کی آمد کے اثرات سیاسی اور تجارتی دونوں طرح کے ہوں گے۔ تجارتی سطح پر اگر پڑوسی ممالک کے تعلقات میں بہتری آتی ہے تو اس کا فائدہ مسلمانوں سے زیادہ ہندو تاجروں کو ہوگا لیکن اس کے سبب اگر پاکستان دشمنی کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کا کام بند ہو جائے تو یہ مسلمانوں کیلئے عافیت کا سبب ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ نریندر مودی نے اپنی حلف۔برداری تقریب میں نواز شریف کو بلا کر ایک مثبت پیغام دیا ہے۔ خدا کرے کہ اس کے سبب قائم ہونے والی فضا قائم و دائم رہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ مسلمان مودی کے اقتدار میں آنے سے پیدا ہونے والیکیفیت سے بہت جلد نکل گئے۔ اس لئے نریندر مودی کے ساتھ وہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہندی مسلمانوں کی قلبی کیفیت کا اظہار اس شعر میں کیا خوب پایا جاتا ہے کہ

یہ بات نرالی دل خود دار کرے ہے
تڑپے ہے مگر درد سے انکار کرے ہے

وزارت سازی: بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

اچھے.برے دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے جو دن کسی ایک فرد کیلئے اچھا ہوتا ہے وہی دوسرے کیلئے.برا ہو جاتا ہے۔ جس دن وزیراعظم نریندر مودی کی دہلی میں حلف.برداری ہوئی دہلی سے گورکھپور جانے والی گورکھ دھام ایکسپریس حادثے کا شکار ہو گئی اور ۴۰ افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ دو دن بعد جب نئے وزراء نے اپنے دفاتر میں قدم رنجا فرمایا تو بہرائچ سے دہلی آنے والی ایک بس حادثے کا شکار ہو گئی اور دس لوگ جان بحق ہو گئے لیکن اس کے بعد جس دن وزیر اعظم اپنے سرکاری مکان ریس کورس روڈ پر منتقل ہوئے تو دہلی میں ایسی آندھی آئی کہ گیارہ افراد کو اپنے ساتھ اڑا کر لے گئی ۔ ۳۵۰ پیڑ اکھڑ گئے۔ بے شمار گاڑیوں کے علاوہ ۵ ہوائی جہازوں کو بھی نقصان پہنچا۔ میٹرو ریلوے کو بند کرنا پڑا اور کئی علاقوں میں ۵ گھنٹوں تک بجلی منقطع رہی۔اس تباہی سے بنگال، اترپردیش اور جھارکھنڈ اور یوپی بھی متاثر ہوئے اس روز بشمول دہلی جملہ ۴۵ لوگ ہلاک ہو گئے۔ چلئے ان سب وارداتوں کو نحوست کے بجائے اتفاق کے زمرے ڈال کر امید کریں کہ یہ سلسلہ دراز نہ ہو۔

نریندر مودی کی حکومت کے آنے سے.برے دنوں کی ابتداء بی جے پی کی حلیفوں سے

ہوئی۔ اگر حلف برداری کی تقریب میں اسرائیل کے وزیراعظم کو دعوت دی جاتی تو مسلمان لاٹھی بلم لے کر میدان میں اتر آتے اور یہ کہا جاتا کہ عوام کی رائے کا احترام نہیں کرتے لیکن ہوا یہ کہ سری لنکا کے صدر راجپاکسے کے خلاف بی جے پی تمہلی حلیف میدان میں کود پڑے۔ کرونا ندھی اور جۓ للیتا نے تو خیر اخباری بیانات پر اکتفاء کیا لیکن وائیکو دہلی کی سڑکوں پر آگئے۔ اس طرح مودی کی اولین عملی مخالفت کرنے کا شرف ایم ڈی ایم کے کے وائیکو کے حصے میں آیا جو این ڈی اے کا حصہ ہیں۔ وائیکو سے علی الرغم بی جے پی کی سب سے قدیم ہمنوا شیوسینا کو پاکستان کے وزیراعظم کی دعوت پر اعتراض تھا۔ گزشتہ سال نواز شریف نے اپنی حلف برداری میں سابق وزیراعظم منموہن سنگھ کو دعوت دی لیکن بی جے پی نے اس قدر دباؤ بنایا کہ وہ ہمت نہ کرسکے۔ بی جے پی کا الزام تھا کہ ۲۶ نومبر کے ملزم حافظ سعید ہنوز پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ داؤد ابراہیم پاکستان میں پناہ گزین ہے۔ سربجیت سنگھ کو جیل میں ہلاک کردیا گیا اور چند پاکستانی فوجیوں نے سرحد پر ہندوستانی فوجیوں کا گلا کاٹ دیا ایسے میں منموہن پاکستان کیونکر جاسکتے ہیں؟

اس ایک سال کے دوران کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس کے باوجود نواز شریف کو دعوت دی گئی۔ اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بھی ہندوپاک تعلقات بہتری کی جانب بڑھتے ہیں اچانک کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ کیوں رونما ہوجاتا ہے جس سے امن و آشتی کی فضا مکدر ہوجاتی ہے۔ مثلاً واجپائی کے

پاکستان دورے کے بعد کارگل کا واقعہ یا صدر پاکستان آصف زرداری کی آمد سے قبل فوجیوں کا قتل وغیرہ۔ عام طور سے ایسے میں پاکستانی فوج یا آئی ایس آئی کو ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہندپاک دشمنی کا سب سے زیادہ فائدہ امریکہ بہادر کو ہوتا ہےاس لئے امریکی زاویہ سے اس پر غور ہونا چاہئے۔ ہرات پر حملے کے ذریعہ کچھ لوگوں کو یرغمال بناکر وزیراعظم نواز شریف کی آمد کو روکنا مقصود تھا لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس حملے کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی اور جس بری طرح وہ ناکام ہوا وہ بھی طالبان کی روایت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ افغانستان میں موجود امریکیوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ یہ حملہ کروایا ہو۔

وزیراعظم نواز شریف کی آمد سے قبل ہرات میں ہندوستانی سفارتخانے پر جو حملہ ہوا اس کے حوالے سے تصور کریں کہ اگر یہ کانگریس کے دور میں ہوا ہوتا تو بی جے پی کے کیا تیور ہوتے؟ لیکن اس بار تو ایسا ہوا کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ شیو سینا نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ شیو سینا کی دوسری ناراضگی اننت گیتے کو ملنے والی بڑی صنعتوں کے قلمدان کو لے کر تھی۔ ایک زمانے میں جب حکومت کے تحت بڑی بڑی صنعتیں قائم کی جاتی تھیں یہ اہم شعبہ تھا لیکن نرسمھا راؤ کے زمانے سے انہیں نجی ہاتھوں کو

فروخت کرنے کا سلسلہ چل پڑا اور اب حکومت کے پاس صرف مہابیمار صنعتیں بچی ہیں جن کا کوئی گاہک نہیں ملتا۔ چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کے چلتے کسی نئی سرکاری صنعت کا امکان نہیں ہے بینا کو امید تھی اسے پہلے کی طرح بجلی کا قلمدان مل جائیگا لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو اننت گیتے نے ابتداء میں انکار کردیا۔ ممکن ہے بی جے پی والوں نے انہیں بتایا ہو کہ اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ نئی دلہن راج ٹھاکرے کی ایم این ایس ہمارے لئے کافی ہے اس لئے وہ بادلِ ناخواستہ راضی ہو گئے۔ قدیم ترین حلیف کے ساتھ بی جے پی کا یہ سلوک اس کی طوطا چشمی کا غماز ہے۔

خواتین عام طور پر امور خانہ داری کی ماہر سمجھی جاتی ہیں مگر نریندر مودی نے اڈوانی کی بھکت سشما سوراج کو بیرون خانہ کی ذمہ داری دے کر ملک بدر سا کردیا۔ اپنے دفتر میں امور کارجہ کا ایک نیا سکریٹری مقرر کرکے یہ پیغام دے دیا کہ وہ اس بابت خود کفیل ہوں گے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حلف برداری کی تقریب میں آنے والے کسی بیرونی مہمان نے سشما سے ملاقات کی زحمت نہیں کی۔ نواز شریف نے نریندر مودی کے علاوہ ہیما مالنی، دھرمیندر اور شتروگھن سنہا کے ساتھ کچھ وقت گزارہ جامع مسجد گئے اور واپس ہو لئے۔ اسرائیل کا سفارتکار بھی سشما کے بجائے سمرتی ایرانی سے ملنے چلا گیا جبکہ اس کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ اوما بھارتی کو بے اہم آبی وسائل اور گنگا جل دے ٹرخا دیا گیا۔ ان دونوں کو وزارت دینا مودی کی مجبوری تھی اور اب دیکھنا یہ

ہے

کہ کب اور کیسے اپنی ان مجبوریوں سے نجات پائی جاتی ہے؟

نریندر مودی کی ذہانت اور مہارت کے حوالے سے ذرائع ابلاغ نے جو ہوا بنائی تھی اس کی قلعی تو وزارت سازی میں کھل گئی۔ مودی نے بھی اپنی ساری صلاحیت کا استعمال فلاح بہبود کے بجائے اپنی گدی مضبوط کرنے اور پارٹی کے اندر اپنے مخالفین کا قلع قمع کرنے میں صرف کردی۔ ۷۵ سال کی حد نافذ کرکے ایک ساتھ کئی کانٹے نکال دیئے لیکن اگر ۷۵ سال سے زیادہ عمر کا آدمی وزارت نہیں سنبھال سکتا تو اسے انتخاب لڑ کر پارلیمان کا رکن بھی نہیں بننا چاہئے اور اس لئے بی جے پی کو چاہئے تھا کہ وہ کسی بزرگ کو ٹکٹ نہیں دیتی لیکن نریندر مودی کے اندر انتخاب سے قبل یہ جرأت نہیں تھی اس لئے ان تمام لوگوں کو انتخاب لڑایا گیا اور پھر ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا گیا۔

شتروگھن سنہا کے علاوہ جسے کوئی وزارت نہیں ملی کسی نے اس فیصلے پر اعتراض کرنے کی غلطی نہیں کی۔ مہا بھارت کی طرح مودی نے دھرت راشٹر کو ٹھکانے لگا دیا۔

جمہوری نظام کے دلدادہ دن رات یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس میں عوام کے نمائندوں کے توسط سے جمہور حکومت کرتی ہے حالانکہ ہر انتخاب کے بعد اس دعویٰ کی سرِعام دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ کانگریس کی اس روایت پر نریندر مودی نے خوب عمل کیا۔ اس کی وزارت میں اہم عہدوں پر تقریباً آدھے چہرے تو ایسے ہیں

جنھوں نے انتخاب لڑنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی ۔ ایسے چاپلوس ترجمانوں کو جن کا کام ٹیلی ویژن کے پردے پر مودی کے نام کا بھجن کرنا تھا اپنی وفاداری کے عوض خوب نوازے گئے۔ ہندوستان کے دستور کا یہ ایک نقص ہے کہ وہ ان لوگوں کو وزیر بننے کے حق سے نواز دیتا ہے جو عوام کی نمائندگی نہیں کرتے ۔ اس دستوری کجی کا ہر سیاسی جماعت نے بشمول بی جے پی زبردست فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے نااہل وفاداروں کو اہم ذمہ داریاں تفویض کرکے ملک و قوم کے ساتھ غداری کی ۔

کسی ایک ایسے شخص کو جو نہایت باصلاحیت ہو مگر انتخاب لڑنے کی سکت نہ رکھتا ہو کوئی اہم وزارت دے دینے کو اگر سیاسی مجبوری سمجھ لیا جائے تب بھی کسی ایسے شخص کو جس نے بڑے طمطراق سے انتخاب لڑا ہو۔ جس کو کامیاب کرنے کیلئے خود وزیر اعظم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہو اور اس کے باوجود عوام نے اسے مسترد کر دیا تو اس کو وزیر بنا کر عوام پر تھپ دینا جمہور کی توہین ہے۔ سونیا گاندھی نے شیوراج پاٹل کو انتخاب میں ناکامی کے بعد وزیر داخلہ بنادیا تھا اور نریندر مودی نے ارون جیٹلی کو وزیر دفاع اور وزیر خزانہ کے دو اہم ترین قلمدان اسے سونپ کر یہ پیغام دیا کہ ہندوستانی جمہوریت میں عوام کی مرضی پر رہنما کی مرضی کو فوقیت حاصل ہے۔

ارون جیٹلی ایک ماہر قانون ہیں لیکن انہیں وزارت قانون کا کا شعبہ نہیں بلکہ وزارت خزانہ کی ذمہ داری دی گئی جس کی بظاہر کوئی منطق نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ وہ مودی کی آنکھ اور کان ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سب سے امیر وزیر ہیں ان کی اعلان شدہ میراث ۱۱۳ کروڑ ہے۔ مثل مشہور ہے روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ اب جیٹلی انتخاب کے بعد روپیوں کی ضرورت کو پورا کریں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ بدعنوانی وزارت دفاع میں ہوتی ہے اس لئے کہ اس پر قومی سلامتی کی چادر پڑی رہتی ہے تو وہ شعبہ بھی انہیں کو دے دیا گیا۔ ارون جیٹلی کے علاوہ سمرتی ایرانی کو وزارت انسانی وسائل کا قلمدان سونپنا فی الحال متنازعہ بنا ہوا ہے۔

اس انتخاب سے قبل ایم جے اکبر کی طرح مدھو کشور نے اپنا سرخ پرچم پھینک کر بھگوا چولہ اوڑھ لیا تھا اور انٹرنیٹ پر مودی نامہ شروع کیا نیز مودی اور مسلمان نامی کتاب لکھ کر نریندر مودی کی تعریف میں آسمان وزمین کے قلابے ملادیئے۔ مدھو کشور کو امید رہی ہوگی کہ ان کی اس مدح سرائی کے بدلے انہیں وزارت تعلیم تو مل ہی جائیگی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ایک بارھویں پاس سمرتی ایرانی کو اس شعبہ سے نواز دیا گیا تو وہ چراغ پا ہو گئیں اور انھوں نے مخالفت کا محاذ کھول دیا۔ کانگریس نے تائید کی بعد میں چلا ایرانی الیکشن کمیشن میں جمع کئے گئے اپنے حلف نامہ میں کذب بیانی بھی کر چکی ہیں۔ پہلے

انہوں نے اپنے آپ کو بی کام کہا تھا پھر بارہویں پاس ہو گئیں لیکن اگر خود نریندر مودی اپنے حلف نامہ میں جھوٹ لکھ سکتا ہے تو ایرانی کیوں نہیں ؟ مثل مشہور ہے چور چور موسیرے بھائی بلکہ بھائی بہن ۔

ایک نظریاتی جماعت آر ایس ایس کیلئے جس کے بارے میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اس نے بڑے پیمانے پر ہندو تعلیم یافتہ دانشوروں کو اپنے نرغے میں لے لیا ہے ایک پڑھا لکھا وزیر تعلیم فراہم کرنے میں ناکام ہو جانا یا تو زبردست قحط الرجال یا بے پناہ بے بسی کی علامت ہے۔ مسئلہ صرف سمرتی ایرانی تک محدود نہیں ہے بلکہ مودی وزارت کے دس وزیر ایسے ہیں جن کو کالج کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔اب یہ جاہل وزیر ان پڑھے لکھے نوجوانوں کا مستقبل سنواریں گے جنہوں نے مودی کی چکنی چپڑی باتوں اور میڈیا کے بہکاوے میں آکر اس نئی حکومت سے روشن مستقبل کی امیدیں باندھ رکھی ہیں ۔ اس وزارت میں جاہلوں کے علاوہ تیس فیصد سنگین قسم کے مجرم لوگ بھی ہیں لیکن ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ۹۱ فیصد وزیر کروڑ پتی ہیں ۔ ان میں سے دو کا اثاثہ سو کروڑ سے زیادہ ہے اور جو سب سے غریب ہے اس کے پاس ۶۵ لاکھ سفید دولت ہے کالا دھن اس سے علٰحیدہ ہے۔ ایسے میں چائے والے وزیر اعظم کی وزارت سے عام آدمی بھلا کس خیر کی توقع رکھ سکتا ہے؟

کشمیر کے دفع ۳۷۰ حوالے سے نا تجربہ کار وزیر جیتندر سنگھ ایک نیا تنازعہ کھڑا کر دیا۔ عمر عبداللہ اور محبوبہ مفتی اس پر زبردست احتجاج کیا اور قانونی و دستوری زاویہ سے بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہندوستان کا کشمیر سے الحاق اسی بنیاد پر ہے۔ سنگھ کے رام مادھو نے اڑیل رخ اختیار کرتے ہوئے بلادلیل جواب دیا کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے مگر اس پر بہترین تبصرہ حریت کانفرنس کے رہنما ایاز اکبر کا تھا جنھوں نے کہا چونکہ ہم کشمیر سے ہندوستان کا الحاق تسلیم ہی نہیں کرتے اس لئے اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم جنسی کے حوالے کانگریس کے زمانے میں راج ناتھ سنگھ نے پارلیمان میں کڑا رخ اختیار کیا تھا لیکن اب خود سنگھ پریوار نے اس کے حوالے سے اپنے موقف میں لچک پیدا کرلی ہے۔آر ایس ایس کا یہ موقف تھا کہ وہ سارے لوگوں کو ہندوستانی شہری سمجھتی ہے اور اکثریت و اقلیت کا فرق روا نہیں رکھتی یہ تفریق کانگریس کی ووٹ بنک سیاست ہے لیکن اقلیتی امور کی وزارت نجمہ ہیبت اللہ کو سونپ کر اس نے اپنے برسوں پرانے موقف کی مٹی پلید کردی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اقتدار حاصل کرنے سے قبل جو کچھ کہتے ہیں بعد میں وہ نہیں کرتے بلکہ کچھ اور کرنے لگتے ہیں۔

اترپردیش کے اندر بدایوں میں دو خالہ زاد بہنوں کی عصمت دری اور بہیمانہ قتل کے واقعہ نے ایک سنگین سیاسی موڑ لے لیا ہے۔ اس میں حملہ آور یادو ہیں اور مظلوم بہنوں کا دلت سماج سے تعلق ہے۔ ان دوشیزاؤں کو بدایوں اعظم گڈھ

اغواء کرکے لے جایا گیا جو ملائم کا حلقۂ انتخاب ہے۔ یہ واقعہ ایک خطرناک سازش کا حصہ ہو سکتا ہے لیکن اگر نہ ہو تب بھی بی جے پی کیلئے نہایت فائدہ بخش ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ اگر ملائم ظالموں کے خلاف اقدام کرتے ہیں تو ان کی اپنی برادری ان سے ناراض ہو جائیگی ورنہ دلتوں کے ان کے قریب آنے کے امکانات مفقود ہو جائیں گے۔ اس طرح جو کچھ بہار میں ہوا کہ لالو نے جنتا دل (یو) کی حکومت کو گرنے سے بچا کر بی جے پی کو مایوس کیا اس صورتحال کے اترپردیش میں پیدا ہونے کا امکان ختم ہو جائیگا۔

اس موقع پر مایاوتی نے سی بی آئی کی تفتیش کا مطالبہ کرکے کھلیش یادو کیلئے آسانی پیدا کردی انہوں نے مایاوتی کے مطالبے کو تسلیم کرلیا اور معاملہ سی بی آئی کے حوالے کرکے ایک طرف ہو گئے۔ اب اگر سی بی آئی کی جانب سے سخت کارروائی ہوتی ہے تو وہ یادو سماج سے کہیں گے یہ بی جے پی نے کیا ہے۔ اگر سی بی آئی کچھ نہیں کرتی تو اس کا الزام بھی مرکزی حکومت پر چلا جائیگا۔ اس طرح گویا اس گیند کو مرکزی حکومت کے پالے میں اچھال کر پہلی مرتبہ اکھلیش نے سیاسی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس صورتحال یں امت مسلمہ ہی ذات پات سے اوپر اٹھ کر ظلم کے خلاف احتجاج کر سکتی ہے اور اس کو آگے بڑھ کر ایسا کرنا چاہئے اس لئے کہ مظلوم کی حمایت و نصرت ہمارا دینی فریضہ ہے۔

سیاست کے اس کھیل میں کانگریس اور بی جے پی کی یکسانیت آئے دن عیاں ہوتی جارہی ہے۔ مودی نے اپنے وزراء سے کہا کہ وہ کنبہ پروری سے گریز کرتے ہوئے اپنے اعزہ کو کوئی ذمہ داری نہ دیں لیکن یوپی کی پرینکا سنگھ نے اس کے حکم کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اپنے والد کو اپنا نمائندہ نامزد کردیا۔ اس سے دلچسپ معاملہ راؤ اندرجیت سنگھ کا ہے جو کسی زمانے میں کانگریس کے وزیر تھے ان پر بی جے پی کے کیریٹ سومیا نے فوج کی زمین کو ممبئی کے ایک بلڈر کلپترو کو بیچ کھانے کا الزام لگایا تھا۔ اس کی تصدیق سی اینڈ جی کی رپورٹ میں بھی ہوئی اور مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ پرتھوی راج چوہان نے بھی اس کا اعتراف کیا تھا۔ انتخاب سے قبل راؤ صاحب پالا بدل کر بی جے پی میں چلے
آئےاور کامیاب بھی ہوگئے۔ مودی نے انہیں وہی قلمدان پھر سے سونپ دیا لیکن اب کیریٹ سومیاؔ کے سامنے خود اپنی ہی پارٹی کے وزیر کی مخالفت کا دھرم سنکٹ آن کھڑا ہواہے۔ یہ واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو مختلف کہنے والے نریندر مودی اور کانگریس میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور انتخابی مہم کے دوران جو شور شرابہ کیا گیا تھا وہ محض عوام کو بے وقوف بنانے کا ایک حربہ تھا۔ اقتدار حاصل کرنے اور اسے قائم رکھنے کی بابت تمام سیاسی جماعتوں کے اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس حمام میں سب یکساں طور پر عریاں ہیں۔

مہاراشٹر کی مہابھارت

جمہوری سیاست کی مثال آسمانی جھولے کی سی ہے۔ اس میں ایک طرف کچھ لوگ اوپر کی جانب رواں دواں ہوتے ہیں تو دوسری جانب کچھ اور لوگ نیچے کی طرف جارہے ہوتے ہیں ۔ اس جھولے میں اوپر جانے والا اپنے سامنے نیچے آنے والے کو دیکھ کر خوش تو لیکن اس سے عبرت نہیں پکڑتا۔ اس کے برعکس نیچے آنے والے چونکہ آگے کی جانب ہوتے ہیں اس لئے وہ نہ بلندیوں کی سیر کرنے والے کو نہیں دیکھ پاتے ہیں۔ ویسے اگر عروج والے نظر بھی آئیں تو زوال خوردہ اپنی آنکھوں پر پردہ ڈال لیتے ہیں ۔ اس سیاسی جھولے پر سوار کوئی نیچے آنے والا اپنی گروات کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس بیچارے کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ وہ بلندیوں سے پستیوں کی جانب محوِ سفر ہے یہاں تک کہ وہ زمین پر چاروں شانے چت ہوجاتا ہے۔

عام آسمانی جھولوں اور سیاسی جھولے میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ یہ گھڑی کی مانند صرف ایک رخ پر نہیں گھومتا بلکہ کبھی کبھار درمیان ہی میں اس کی سمت بدل جاتی ہے جس کے نتیجے میں اچانک اوپر جانے والا نیچے آنے لگتا ہے اور نیچے آنے والا اوپر کی جانب چل پڑتا ہے۔ اس سیاسی جھولے کی آرامدہ

کرسیوں پر براجمان ہو کر سیاستداں حضرات آسمان کی سیر کرتے ہیں۔ پارٹی کے عام کارکنان زمین پر کھڑے ہو کر اسے گھماتے ہیں اور تماش بین عوام اپنے رہنماوں کو اوپر نیچے آتے جاتے دیکھ کر بغلیں بجاتے ہیں۔ مہاراشٹر کی مہابھارت سے قبل دہلی کی ایک دلچسپ خبر کو مندرجہ بالا مثال کی روشنی میں دیکھیں۔

دس سال قبل بھارت ورش پر متحدہ قومی محاذ کی حکومت ہوا کرتی تھی ۔ اس حکومت میں اڈوانی جی نائب وزیراعظم اور وزیر داخلہ تھے اس طرح ان کے قبضۂ قدرت میں ایوانِ پارلیمان میں دو دفاتر تھے ۔ جب اقتدار سے محروم ہوئے تو حزب اختلاف کے لیڈر بنا دیئے گئے اور وزیر مملکت کے ٹھاٹ باٹ سمیت ایک دفتر سے نواز دیئے گئے۔ جب وہ کرسی بھیپارٹی نے چھین لی تو ان کو این ڈی اے کا کارگزار صدر بنا دیا گیا۔ چونکہ این ڈی اے کی صدارت اٹل جی کے نام تھی اور وہ سیاست سے سبکدوش ہو چکے تھے اس لئے اس کے دفتر پر اڈوانی جی کا بلا شرکت غیرے قبضہ ہو گیا اس طرح گویا دو دفاتر کا مالک ایک دفتر پر آگیا لیکن اس کے دروازے پر دو لوگوں کا یعنی اٹل جی اور اڈوانی جی کا نام لکھا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ہندوستان میں یو پی اے کی حکومت تھی ۔ سیاسی پہیہ گھوم رہا تھا اور پھر یہ ہوا کہ این ڈی اے تو کجا بی جے پی کو اکثریت سے سرفراز ہو گئی ۔ اڈوانی سات لاکھ سے زیادہ ووٹ حاصل کرکے پارلیمان

میں پہنچے لیکن مودی نے ۷۵ سال کا فرمان جاری کرکے اڈوانی جی کی وزارت کا پتہ صاف کر دیا۔ اس کے بعد یہ قیاس آرائی ہونے لگی کہ اڈوانی جی کو ایوان زیریں کا صدر یعنی اسپیکر بنا دیا جائیگا لیکن آگے چل کر اس کرسی پر سمترا مہاجن کو بٹھا دیا گیا۔ اڈوانی جی کی دنیا اب این ڈی اے کے دفتر تک سمٹ گئی تھی جس کی اب کوئی خاص ضرورت تھی نہ اہمیت مگر سر چھپانے کا ایک آسرا ضرور تھا۔ اڈوانی جی کے ستارے ہنوز گردش میں تھے کہ جمعرات کی صبح اچانک این ڈی اے دفتر کے دروازے سے ان کے نام کی تختی ہٹا دی گئی۔ یہ حرکت اس لئے بلاضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ابھی تک این ڈی اے کے نئے لیڈر کا انتخاب نہیں ہوا ہے اور پھر یہ حرکت صرف اڈوانی جی کو رسوا کرنے کی غرض سے کی گئی جبکہ اٹل جی کا نام ہنوز قائم و دائم (اٹل) ہے۔

اڈوانی جی کی یہ درگت دیکھ کر بی جے پی کی فتح کے بعد ان کے آنسو یاد آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ خوشی کے آنسو تھے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اڈوانی جی غالباً اس وقت چشم تصور میں اپنا یہ انجام بد دیکھ رہے تھے اور کیوں نہ دیکھتے اس لئے کہ سنگھ پریوار کی روایات سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ خود انہوں نے بی جے پی کے بانی صدر اٹل بہاری واجپائی کو ۱۹۸۰؁ میں ہونے والی انتخابی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرا کر جس طرح پارٹی کی صدارت سے ذلیل و رسوا کرکے نکالا تھا وہ منظر اس وقت ان کی آنکھوں میں گھوم

گیا ہوگا اور وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ اب ان کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے لیکن اس موقع پر مودی کو وہ کہانی یاد کرنی چاہئے جس میں ایک بچے نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ اس چادر کو جسے آپ داداجان کو گھر سے نکالتے ہوئے دے رہے ہیں دو حصے کر دیجئے۔ جب باپ نے پوچھا وہ کیوں تو بچے کا جواب تھا کہ میں آپ کو رخصت کرتے ہوئے باقیماندہ حصہ دے سکوں۔ اپنے انجام سے غافل انسان یہ بھول جاتا ہے کہ وقت کا پہیہ ہر نفس کو اس بلندی پر یقیناً پہنچاتا ہے جہاں سے پھینکا جانا اس کا مقدر ہے۔اڈوانی کے انجام میں مودی کیلئے یہ عبرت ہے کہ بقول راحت اندوری

جو آج صاحبِ مسند ہیں کل نہیں ہوں گے

کرائے دار ہیں ذاتی مکان تھوڑی ہے

نریندر مودی بھی چونکہ اس جمہوری سیاسی جھولے کا جھلکڑ ہے اس لئے اس کو بھی ایک دن اوپر سے نیچے آنا ہی ہے لیکن اس سفر کا آغاز اس قدر جلد ہو جائیگا اس کا اندازہ اس کے بڑے سے بڑے دشمن کو نہیں رہا ہوگا۔ مشیت ایزدی نے جس طرح اڈوانی کو سزا دینے کا کام اس کے سب سے بڑے چیلے نریندر مودی سے لیا اسی طرح مودی کے رتھ کی ہوا نکالنے کا کام بی جے پی کے سب سے قدیم ہمنوا اور ہندوتوا کے علمبردار شیوسینا سے لے رہی ہے۔ سنا ہے ناکامی رشتوں کو توڑ دیتی ہے اور کامیابی لوگوں کو جوڑ دیتی ہے لیکن اگر تعلقات میں حرص وہوس کا

زہر گھل جائے تو عقلمندی کا سیسہ بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ سینا اور بی جے پی نے اس بار مہاراشٹر میں ایسی غیر معمولی کامیابی حاصل کی جس کا تصور بھی محال تھا۔ کانگریس کو ریاستِ مہاراشٹر میں ۱۷ سے ۲ پر پہنچا دینے کے بعد شیوسینا کو محسوس ہوا کہ اب بی جے پی اس پر منحصر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے بل بوتے پر کامیابی حاصل کر سکتی ہے۔
اس احساسِ خوف نے شیوسینا کو چوکنا کر دیا اور اس نے یکے بعد دیگرے بی جے پی کو تین جھٹکے دے دیئے۔ سب سے پہلے نواز شریف کی مخالفت جس کو بی جے پی نے چالاکی کے ساتھ نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد وزارت کے قلمدان کو لے کر ناراضگی جو بجا معلوم ہوتی ہے۔ فی الحال پارلیمان میں ایل جے پی کے ۶ ارکان ہیں اس کو ایک اہمیت کی حامل کابینی وزارت مل گئی۔ آر ایل ایس کے واحد ایم پی خشواہا کو ریاستی وزیر بنا دیا گیا مگر شیوسینا کو ۱۸ ارکان پارلیمان کے باوجود ایک غیر اہم وزارت دے کر ٹرخا دیا گیا۔ اس کے برعکس مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والے بی جے پی کے کل پانچ لوگوں کو وزارت سے نوازہ گیا جن میں سے دو کابینی اور تین ریاستی وزیر بنے۔ اس ناانصافی کا ردعمل تو ہونا ہی تھا لیکن اس آگ میں راج ٹھاکرے کے انتخاب لڑنے کے فیصلے نے تیل ڈال دیا۔ اس سے پہلے کہ راج کا وزیراعلیٰ بن جانا ذرائع ابلاغ میں بحث کا موضوع بنتا سینا نے ادھو ٹھاکرے کو وزیراعلیٰ کا امیدوار بنا دیا۔

ادھو ٹھاکرے کو جس جلسے میں امیدوار بنایا گیا اس میں بی جے پی ممبئی کے کامیاب ہونے والے ارکان پارلیمان کی پذیرائی اٹل پرب نامی معمولی رہنما کے ذریعہ کروا کر بی جے پی کی توہین کی گئی۔ اس کے بعد ادھو ٹھاکرے نے اپنی تقریر میں کہا کہ دہلی پر قبضہ سے آنجہانی بال ٹھاکرے کا سپنا ساکار نہیں ہوا بلکہ مہاراشٹر میں کامیابی کے بغیر یہ خواب ادھورا ہے۔ ادھو ٹھاکرے نے اپنی ۲۰ منٹ کی تقریر میں ایک مرتبہ بھی نریندر مودی کا ذکر نہیں کیا اور کامیابی کا سہرہ شیوسینکوں اور بال ٹھاکرے کے سر باندھ دیا۔ کون جانتا تھا کہ اولین اجلاس پارلیمان سے قبل نریندر مودی کو اپنے قریب ترین حلیف کے ہاتھوں رسوائی کا یہ دن دیکھنا پڑے گا۔ بی جے پی اس اعلان پر جز بز تو ہو سکتی ہے لیکن اعتراض نہیں کر سکتی کہ ادھو کو انتخاب سے قبل وزیر اعلیٰ کا امیدوار کیوں بنا دیا گیا؟ جبکہ خود بی جے پی نے نریندر مودی کو وزیر اعظم کا امیدوار بنایا تھا۔ دہلی میں مودی تو ممبئی میں ٹھاکرے اس میں کیا مسئلہ ہے؟ بی جے پی کو چونکہ اس بار ۲۳ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی ہے اور شیوسینا کو صرف ۱۸ پر اس لئے بی جے پی والے سوچ رہے ہیں وزارت اعلیٰ کی کرسی پر ان کا حق بنتا ہے لیکن وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ سینا بی جے پی الحاق کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی اور صوبائی انتخاب میں شیوسینا زیادہ نشستوں پر انتخاب لڑے گی۔ ویسے کوئی بعید نہیں کہ

بی جے پی عمداً ایسے حالات پیدا کررہی ہو کہ ادھو بھی نتیش کی مانند ازخود الحاق ختم کردے اور وہ بلا شرکت غیرے مہاراشٹر میں اپنی حکومت قائم کرسکے لیکن اگر بی جے پی نے خوش فہمی کا شکار ہو کر ایسی حماقت کی تو اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔
اس بار شیوسینا کی کامیابی اس لئے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ اس نے ۲۰ میں سے نشستوں پر کامیابی حاصل کی اور بیک وقت کانگریس، این سی پی کے علاوہ مہاراشٹر نو ۱۸ زمان سینا کا بھی مقابلہ کیا جبکہ بی جے پی نے راج کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کرلی تھی۔ماضی میں شیوسینکوں کو مودی کے ہندو ہردیہ سمراٹ کے لقب پر بھی اعتراض رہا ہے اس لئے کہ وہ صرف بالا صاحب ٹھاکرے کو اس کا حقدار سمجھتے ہیں۔ ادھو ٹھاکرے کا گڈکری و
مودی کی بنسبت اڈوانی اور سشما سے قریب تر ہونا جگ ظاہر ہے ۔بی جے پی کا یہ
اعتراض بھی بے بنیاد ہے کہ اعلان سے قبل اس کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا گیااس لئے کہ نتن گڈکری نے راج ٹھاکرے کے ساتھ الحاق کرنے سے قبل ادھو ٹھاکرے سے مشورہ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی اور نہایت خودغرضانہ شرائط پر شیوسینا کے مفاد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ اگر بی جے پی اپنے حلیف کی پیٹھ میں چھرا گھونپ سکتی ہے تو شیوسینا کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔ مہاراشٹر کے انتخابات اکتوبر میں ہونے ہیں اور صرف چار ماہ کا وقفہ ہے اس لئے جلدی بازی

کاالزام بھی نہیں لگایا جاسکتا۔بی جے پی مہاراشٹر کے صدر دیوندر فردنویس نے یہ کہہ کر کہ ہم نے گوپی ناتھ منڈے کو چار ماہ کیلئے دہلی بھیجا ہے اپنے وزیر اعلیٰ کے امیدوار کابلاواسطہ اعلانکر ہی دیا تھا اور ایسا کرنے سے پہلے انہوں نے بھی شیو سینا کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔

مہاراشٹر کے اندر شیو سینا کے ساتھ بی جے پی کے الحاق کا سہرہ گوپی ناتھ منڈے کے بہنوئی پر مود مہاجن کے سر ہے اور شیو سینا بی جے پی حکومت میں گوپی ناتھ منڈے نائب وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ وہ ٹھاکرے خاندان سے خاصے قریب رہے ہیں۔ بالا صاحب ٹھاکرے منڈے کی علی الاعلان تعریف کیا کرتے تھے۔ فی الحال مہاراشٹر کے اندر ادھو ٹھاکرے سے زیادہ مقبول رہنما اگر حزب اختلاف کے پاس کوئی ہوسکتا تھاتو وہ گوپی ناتھ منڈے تھے لیکن دہلی سے ممبئی آتے ہوئے وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر چل بسے۔ اس طرح بی جے پی نے اپنا وزارتِ اعلیٰ کا امیدوار کھودیا۔

منڈے کے علاوہ بی جے پی کے دیگر معروف رہنما نتن گڈکری اور ریاستی صدر دیویندر فردنویس برہمن ہیں اس لئے ان کی قیادت میں بی جے پی مہاراشٹر کا انتخاب نہیں جیت سکتی۔

گوپی ناتھ منڈے کا حادثہ اگر دہلی کے بجائے ممبئی میں ہوتا تو بی جے پی والے آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ منڈے کے آبائی شہر پرلی میں عوام کے غم و

غصے کا شکار نہ صرف کانگریسی وزراء ہوئے بلکہ وزیر داخلہ و بی جے پی صدر راجناتھ ، نتن گڈکری بھی ہوئے کئی بی جے پی رہنماؤں کو سنگ باری کا شکار ہو کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ گڈکری اور منڈے کے درمیان جاری سرد جنگ سے مہاراشٹر کا بچہ بچہ واقف ہے ۔دہلی میں بی جے پی کی حکومت کے چلتے مہاراشٹر حکومت سے سی بی آئی جانچ کا مطالبہ احمقانہ ہے۔منڈے کی کار سے ٹکرانے والے گروبندر سنگھ کا خالصتانی دہشت گردی سے تعلق جوڑا جارہا ہے ۔ اگلے دن آر ایس ایس کے صدر موہن بھاگوت کے محافظ کی گاڑی سے ہریانہ سرکار کی گاڑی کا بھڑ جانا اور ڈرائیور سومپال کا گرفتاری بھی شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے۔

مہاراشٹر کے اندر بی جے پی سینا کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ نہ نریندر مودی کا چمتکار ہے اور نہ بالا صاحب ٹھاکرے کا آشیرواد بلکہ اس کے پیچھے گوپی ناتھ منڈے کے ذریعہ قائم کئے جانے والے ٦ جماعتوں کے اتحاد کا بہت بڑا دخل ہے ۔ اس محاذ میں شامل رام داس اٹھاولے کے ریپبلکن دھڑے نے کسی نہ کسی حد تک دلت ووٹوں کو بی جے پی جھولی میں ڈالا اور راج ٹھاکرے کے معاہدے نے شہری علاقوں میں بی جے پی کو فائدہ پہنچایا ۔ ان کے علاوہ دیہی علاقوں میں راجو شیٹی کے سوابھیمان پکش نے مغربی مہاراشٹر کے اندر شرد پوار اور کانگریس کے روایتی مراٹھا ووٹ بنک میں سیندھ لگا کر بی جے پی کو بہت بڑا

فائدہ پہنچایا۔ اس پارٹی کا ایک امیدوار کامیاب بھی ہوا۔ راجو شیٹی کے علاوہ شرد پوار کے دست راست مراٹھا رہنما ونایک میٹے کی جماعت شیو سنگرام پارٹی جو مراٹھا سماج کیلئے ریزرویشن کا مطالبہ کرکے اپنی مقبولیت میں اچھا خاصہ اضافہ کر چکی ہے اس بار زعفرانی محاذ میں شامل تھی۔ ان لوگوں نے ایک طرف تو کانگریس اور این سی پی جڑیں کھوکھلی کیں اور دوسری جانب بی جے پی کے وارے نیارے کئے۔

کانگریس این سی پی محاذ اگر صوبائی انتخاب میں دوبارہ کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کیلئے لازم ہے کہ نہ صرف ریاستی قیادت میں خاطر خواہ تبدیلی کرے بلکہ اپنے بھولے بسرے ساتھیوں کو بی جے پی سے توڑ کر دوبارہ اپنا ہمنوا بنائے۔ اس کے بغیر مہاراشٹر کی مہابھارت میں کامیابی کا امکان نہیں ہے۔ جس طرح بی جے پی نے پارلیمانی انتخاب کانگریسی انتشار کا فائدہ اٹھایا اگر اسی طرح کانگریس بھی زعفرانی سر پھٹول سے فیضیاب ہو جائے تو کوئی بعید نہیں کہ مہاراشٹر پھر سے کانگریس کی جھولی میں آجائے گا ورنہ اس ریاست میں زعفرانی پرچم کا لہرانا یقینی ہے۔

آج جبکہ مہاراشٹر کی مہابھارت میں دشمنانِ اسلام آپس میں دست و گریباں ہیں۔ مسلمانوں کا ایک کا قلیل شکست خوردہ گروہ کوئی مثبت سیاسی حکمت عملی

اختیار کرنے کے بجائے دین کی دشمنسیاسی جماعتوں کے منشور میں اپنے مطالبات کا اندراج کرانے کی خاطر جھولی پسارنے پر غور کررہاہے۔ سیاسی گداگری کی ایک شکل چند مراعات حاصل کرلینا ہے لیکن اس کی ادنی ترینصورت سیاسی جماعتوں کے مینی فیسٹو میں اپنے مطالبات شامل کروالینا ہے اس لئے کہ فی زمانہ سیاسی جماعتوں کے نزدیک انتخابی منشور کی اہمیت ٹائلیٹ پیپر سے بھیکم ہے۔اللہ کا شکر ہے امت کا سوادِ اعظم اس احساسِ کمتری و محرومی سے محفوظ ہے۔ رب ذوالجلال سے دعا ہے کہ اپنے اذنِ خاص سے دشمنانِ دین کی ہوا اکھاڑ دے اور اپنے دین کو غالب و سرخروفرمائے کہ اسے غالب ہونا ہی ہے۔اللہ تعالیٰ اس نازک گھڑی میں امت کے اندر وہ قیادت.برپا فرمائے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا

جنرل وی کے سنگھ : دشمن کے ہتھیار خود اپنے گھر سے نکلے ہیں

جنرل وی کے سنگھ (سبکدوش) کے باغیانہ تیور نے نریندر مودی کا غرور چکنا چور کردیا۔ وزیر مملکت سنگھ نے نامزد کمانڈر انچیف دلبیر سنگھ کی مخالفت کیلئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں خود وزیراعظم اور امیت شاہ اس کی زد میں آجاتے ہیں ۔ وی کے سنگھ نے اپنے ٹویٹ میں لکھا ''اگر کوئی (فوجی) اکائی معصوموں کا قتل کرے ۔ڈکیتی میں ملوث ہو اور اس تنظیم کا سربراہ ان کو تحفظ فراہم کرے تو کیا اس کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جائے؟ مجرموں کو کھلا چھوڑ دیا جائے!''۔ اس سوال کو اگر گجرات کے پس منظر پر چسپاں کیا جائے تو وہ حرف بحرف نریندر مودی پر صادق آتا ہے۔ دلبیر سنگھ تو خیر اس زمانے میں ڈیوٹی پر موجود ہی نہیں تھے جب یہ قابلِ مذمت وارداتیں رونما ہوئیں لیکن نریندر مودی نے تو وزیراعلیٰ کی حیثیت سے نہ صرف گجرات قتل عام کی نگرانیکی بلکہ اس کے بعد ریاستی انتخاب میں اس کا بھرپور سیاسی فائدہ اٹھایا۔ ایسے میں اگر چندافراد کے قاتلوں کو تحفظ دینے والا دلبیر سنگھ سہاگ مجرم ہے تو ہزاروں کے قتل عام کا ذمہ دار نریندر مودی کاوزیراعظم ہونااور اس کی وزارت میں وی کے سنگھ کی شمولیت ،اگر سیاسی منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ حسن اتفاق ہے کہ جنرل وی کے سنگھ کو فی الحال شمال مشرقی صوبوں کا قلمدان سونپا گیا ہے اور مذکورہ واقعات اسی علاقہ میں رونما ہوئے ہیں اس لئے ان کی حقیقت جان لینا ضروری ہے؟ ۲۰ مارچ ۲۰۱۰ء کو دیما پور میں تین لاشیں ملیں اور اسے آپسی چپقلش کا نتیجہ قرار دے دیا گیا۔ اس واقعہ کے تقریباً دو سال بعد ۲۵ جنوری ۲۰۱۲ء کو میجر روی کرن نے مشرقی کمانڈ ہیڈ کوارٹر کو شکایت بھیجی اور فوجیوں پر اس قتل میں ملوث ہونے کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ اس نے طعام گاہ کے پیچھے گولیوں کی آواز سنی تھی۔ اس شکایت کی ایک نقل فوجی سربراہ وی کے سنگھ کو روانہ کردی گئی۔ جن لوگوں کو اس معاملہ میں گواہ بنایا گیا تھا ان سب نے جون ۲۰۱۲ء میں اس کا انکار کردیا اس لئے شکایت خارج کرکے تفتیش بند کردی گئی۔ اس کے بعد منی پور عدالت میں ایک عوامی شکایت داخل کی گئی جس میں جنرل دلبیر سنگھ پر اس فرضی انکاؤنٹر میں شامل ہونے کا الزام لگایا گیا لیکن جب عدالت کو بتلایا گیا کہ وہ ۲۰۱۰ء میں وہاں نہیں تھے تو ان کا نام ملزمین کی فہرست سے خارج کردیا گیا۔

دوسرا ڈکیتی کا واقعہ ۲۰ دسمبر ۲۰۱۱ء کی رات کو جورہاٹ میں پیش آیا۔ اس میں دلبیر سنگھ اور تین فوجیوں پر ایک ٹھیکیدار سرجیت گوگوئی کے گھر پر چھاپہ مارنے کا الزام ہے۔ اس کی تفتیش ۲۹ دسمبر کو دلبیر سنگھ کے دفتر سے رجوع

کرنے کے بعد شروع ہوئی۔ ۳فروری کو مقامی عدالت نے اپنا کام ختم کیا اور کئی فوجیوں کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ گوگوئی نے اپریل کے اندر ہائی کورٹ سے رجوع کیا۔ اکتوبر میں فوج نے عدالت سے کورٹ مارشل کی یقین دہانی کرواکر مقدمہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو فوج نے حولدار تھاپا کو تین مہینے کی سزا سنائی جو چرایا ہوا موبائیل استعمال کر رہا تھا۔ مزید دو جونیر نوجوانوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی۔ روبینہ کور نامی خاتون افسر کو جس کے زیر نگرانی یہ کارروائی کی گئی تھی محض ڈانٹ لگائی گئی اور کمانڈنگ افسر سری کمار چونکہ چھٹی پر تھے ان لئے اس کے تئیں صرف ناراضگی پر اکتفاء کیا گیا۔

سرجیت گوگوئی نے ایک ملاقات میں بتلایا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس گھر پر دہشت گردوں کے چھپے ہونے کا جھوٹا الزام لگا کرڈاکہ ڈالا گیااس میں سب سے اہم ملزم روبینہ کو کوئی سزا نہیں دی گئی اور ایسا دلبیر سنگھ کو بچانے کیلئے کیا گیا۔ ان فوجیوں نے اس کے گھر سے ڈیڑھ لاکھ روپئے اور زیورات بھی چرائے تھے مگر فوج نے انہیں لوٹائے بغیر دھمکا کراس کی رسید حاصل کرلی۔ گوگوئی کے مطابق جورہاٹ تیزپور کا علاقہ جس فوجی دستے کے تحت آتا ہے وہ روبینہ کور کے دستے سے مختلف ہے۔ فوجیوں کو جورہاٹ میں تفتیش سے قبل پولس کو بتانا پڑتا ہے جو نہیں کیا گیا۔ گوگوئی یہ بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں

ہے کہ روبینہ کا فوجی دستہ کربی آنلونگٹ ، گولا گھاٹ نامی دو ضلعوں سے گزر کر جورہاٹ کارروائی کرنے کیلئے پہنچ جائے اور ان کے کمانڈر دلبیر سنگھ کو اس کا علم نہیں ہو ؟اسی کے ساتھ روبینہ کور کو بچانے کا الزام تو ان پر لگتا ہی لگتا ہے۔ اس واقعہ نے شمال مشرقی ہندوستان میں دہشت گردی کے نام پر ہونے والی فوجی لوٹ مار کو طشت ازبام کردیا ہے۔ جنرل وی کے سنگھ نے انہیں واقعات کے سبب دلبیر سنگھ پر تادیبی کارروائی کی اور ان کی ترقی پر روک لگادی جسے ان کے بعد آنے والے جنرل منسوخ کردیا۔

جنرل وی کے سنگھ کی نظر میں تو جنرل دلبیر سنگھ مجرم ہو سکتے ہیں لیکن نریندر مودی کیلئے نہیں اس لئے کہ نریندر مودی نے نرودہ پاٹیہ میں معصوم عورتوں اور بچوں کا قتل عام کروانے والی مایا کوندنانی کو وزیر فلاح و بہبود برائے خواتین و اطفال بنادیا تھا۔

ریاستی حکومت کے تمام تر بچاؤ کے باوجود گجرات کی عدالت نے اس مجرم تسلیم کرلیا اور ۳۰ سال کی سزا سنادی۔ گجرات سے تڑی پار امیت شاہ وزیر اعظم کا دست راست ہے۔ عشرت جہاں اور پرجاپتی فرضی انکاؤنٹر کیس میں ملوث ضمانت پر رہا پولس افسران کو بی جے پی کی ریاستی حکومتوں نے حال ڈیوٹی پر بلا لیا ہے ایسے میں وی کے سنگھ کا موقف اس کلین چٹ والے مفروضے کی دھجیاں اڑاتا ہے جس کی دہائی آئے دن بی جے پی والے دیتے رہتے ہیں اس لئے کہ اسی طرح کی کلین چٹ تو دلبیر سنگھ کی جیب میں بھی

ہے۔ وی کے سنگھ کی اس بغاوت سے نریندر مودی کو اس شعر کی مصداق سمجھ میں آگیا ہوگا کہ سارے ہندوستان کو گجرات سمجھ کر اس ماڈل میں ڈھالنے کی کوشش کرنا ایک احمقانہ خوش فہمی ہے۔

جب سے اپنے گھر کے بام و در سے نکلے ہیں
کیسے کیسے منظر، پس منظر سے نکلے ہیں

جنرل وی کے سنگھ کو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے متنازعہ کمانڈر ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ انہوں نے نہ صرف دلبیر سنگھ پر کارروائی کی بلکہ اپنی تاریخ پیدائش کا معاملہ لے کر یو پی اے حکومت کے خلاف عدالتِ عالیہ کا دروازے پر دستک دی یہ اور بات ہے کہ عدلیہ کا فیصلہ ان کے خلاف تھا لیکن بہرحال ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ وی کے سنگھ نے اودھیش کمار بدعنوانی کے الزام میں کورٹ مارشل کرایااور ایک سابق فوجی افسر پر خود کو ٹھیکے کے عوض رشوت کی پیشکش کا الزام لگایا۔ سبکدوش ہونے کے بعد وہ انا ہزارے کی بدعنوانی کے خلاف تحریک میں بھی شامل ہوئے۔ اس دور میں چونکہ وی کے سنگھ کی لڑائی کانگریس کے خلاف تھی اسلئے بی جے پی بغض معاویہ میں ان کی حمایت میں آگئی اور اقتدار کی لالچ میں انکو انتخاب لڑادیا لیکن وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ کل کو جب ہوا کا رخ بدلے گا تو وہ خود اس طوفان کی زد میں آجائیں گے۔

اس بار طوفان اس طرح آیا کہ پارلیمانی اجلاس کے دوران لیفٹنٹ جنرل روی دستانہ کا حکومت کے خلاف ۲۰۱۲ میں قائم کردہ مقدمہ زیر سماعت آگیا۔ جنرل روی دستانہ کا الزام ہے کہ گزشتہ حکومت نے طرفداری کرتے ہوئے سنگین الزامات کے باوجود جنرل دلبیر سنگھ کو سربراہ نامزد کیا ہے۔ دستانہ نے اپنے حق میں جنرل وی کے سنگھ کی جانب سے دلبیر پر لگائے جانے والے قتل اور ڈکیتی کے الزامات کو پیش کیا۔ وزارتِ دفاع نے اس کے جواب میں اپنا پرانا حلف نامہ داخل کردیا جس میں جنرل سنگھ کے اقدامات کو غیر قانونی، مبالغہ آمیز اور منصوبہ بند تھے۔ چونکہ جنرل سنگھ خود حکومت میں شامل ہیں اس لئے گویا یہ حلف نامہ ایک وزیر کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہوگیا۔ اگر جنرل سنگھ عام سیاستدانوں کی طرح ماضی کی اس واردات کو بھول کر اپنی کرسی سے چپکے رہتے تو کانگریس والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا لیکن انہوں نے آبیل مجھے اور میری سرکار کو مار کی مصداق متنازعہ ٹویٹ کردیا۔ پھر کیا تھا کانگریس نے اس حلف نامہ کی بنیاد پر
وزیر موصوفکو برخواست کرنے کا مطالبہ کردیا اور مودی سرکار کھائی اور آگ کے درمیان پھنس گئی۔ اب وہ بیک وقت کمانڈر چیف کی حمایت کررہی ہے اور اپنے وزیر کو بچارہی ہے جس کے نتیجے میں وہ دونوں تو محفوظ ہیں لیکن حکومت کی ساکھ داوں پر لگی ہوئی ہے۔ وی کے سنگھ کے ٹویٹ پر کانگریسی حملے کے بعد مرکزی حکومت کی حالتِ زار پر اشفاق احمد کا یہ شعر یاد دلاتا ہے کہ

کس سے جنگ لڑیں گے کس کو فتح کریں گے ہم
دشمن کے ہتھیار خود اپنے گھر سے نکلے ہیں

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وی کے سنگھ نے اس جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کیوں کیا ؟ اور مودی نے اپنی اس ذلت کو برداشت کیوں کرلیا ؟ اس کی وجہ صاف ہے وی کے سنگھ کو نہیں لگتا کہ وہ مودی کی مہربانی سے انتخاب میں کامیاب ہوئے ہیں یا انہیں وزیر بناکر کوئی احسان کیا گیا ہے۔ اس بار سب سے زیادہ ووٹوں کے فرق سے نریندر مودی نے کامیابی تو حاصل کی لیکن وارانسی میں نہیں بلکہ اپنے گڑھ بڑودہ میں ۔ وارانسی میں مودی نے جس فرق سے کامیابی درج کرائی اس سے زیادہ ووٹوں کے فرق سے وی کے سنگھ نے غازی آباد میں کامیاب ہوئے جبکہ غازی آباد عاپ کے گڑھ دہلی سے متصل ہے۔ وہاں اروند کیجریوال کا گھر ہے۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مودی کا دست راست ارون جیٹلی تمام تر کوشش کے باوجود اس امرتسر سے کامیاب نہ ہوسکا جہاں سے سدھو جیسا مسخرہ بغیر کسی لہر کے کامیاب ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود وی کے سنگھ کو وزارتِ دفاع کی ذمہ داری دینے کے بجائے جس کے وہ بجا طور پر حقدار ہیں شکست خوردہ ارون جیٹلی کو نہ صرف وزیر خزانہ بلکہ کارگزار وزیر دفاع بھی بنا دیا گیا۔ جہاں اس طرح کی بے اعتمادی اور ناانصافی کی فضا ہو اس میں وی کے سنگھ جیسے لوگوں کے غم وغصے پر حیرت کا اظہار چہ معنی دارد۔

نریندر مودی کے اندر پائی جانے والی انانیت کے چلتے اس طرح کے مزید واقعات کی توقع کرنا بیجا نہیں ہے۔ وزیراعظم کے دفتر سے حال میں تمام وزارتوں کو یہ فرمان جاری ہوا ہے کہ پی ایم او سے بھیجی جانے والی ہر فائل کا ۲۴ گھنٹوں کے اندر جواب آنا لازمی ہے اور اس پر متعلقہ وزیر کی توثیقضروری نہیں ہے۔ اس میں وزراء کی توہین اپنی جگہ ہے لیکن اس طریقۂ کار ایک نقصان یہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں تنازعہ کھڑا ہو جائے تو وزیر اپنا ہاتھ جھٹک کرالگ ہو جائیگا اور ساری ذمہ داری وزیراعظم پر آجائیگی۔ اس فیصلے کی حکمت یہ بتلائی گئی ہے کہ اس سے کام میں تیزی آئیگی لیکن اس کے برعکس وزراء کو تیزی دکھانے کیلئے وزیراعظم کی توثیق کے بغیر فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس طرح گویا اختیارات لئے تو گئے ہیں لیکن دیئے نہیں گئے۔

بی جے پی کو جب سے نریندر مودی کی قیادت میں اکثریت حاصل ہوئی مسلمانوں کے اندر پایا جانے والا عدم تحفظ کا احساس ذرائع ابلاغ میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ محسن شیخ کی شہادت نے اس میں اضافہ کیا لیکن اسی کے ساتھ دہلی سے متصل نوئیڈا میں بی جے پی رہنما وجئے پنڈت کو اروند شرما نے قتل کروادیا اور مظفر نگر میں بی جے پی کے نائب صدر اوم ویر سنگھ کو دن دہاڑے گولی مار کر ہلاک کردیاگیا۔ یہ واقعات اس بات کی علامت ہیں کہ بی جے پی خود اپنے لوگوں

کی حفاظت کرنے میں بھی ناکام ہے۔ خیر سے سیاسی مفاد کے پیش نظر فی الحال اس قتل و غارتگری کیلئے ملائم سنگھ کو موردِ الزام ٹھہرایا جارہا ہے لیکن اگر بی جے پی کی ریاستی حکومت میں یہ ہونے لگے تو خدانا خواستہ اچانک انڈین مجاہدین یا لشکر کے نام پر فرقہ وارانہ کشیدگی اور بے قصور مسلم نوجوانوں کی گرفتاریاں شروع ہو سکتی ہیں خدا کرے ایسا نہ ہو۔

آر ایس ایس کے نیم عسکری تنظیم ہونے کا دعویٰ اپنی جگہ ہے اس کی شاکھاؤں میں ہر صبح برسوں سے ہوا میں لاٹھی چلائی جارہی ہے لیکن اس کے بغل بچہ بی جے پی پہلی مرتبہ خود اپنے بل بوتے ایوانِ پارلیمان میں اکثریت حاصل ہو جانے کے بعد یہ قابلِ شرم بات ہے کہ تاریخ میں پہلی بار قوم ایک قائمقام وزیر دفاع سے کام چلا رہی ہے۔ کیا سنگھ پریوار ملک کو ایک قابل وزیر دفاع دینے کا اہل بھی نہیں ہے اور وزیر اعظم کو ڈیڑھ سو کروڑ عوام میں ایک آدمی بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کو یہ ذمہ داری سونپی جائے۔

دراصل یہ نریندر مودی کے اندر پائی جانے والی خود اعتمادی کی کمی کا بلاواسطہ اظہار ہے ۔نریندر مودی کی قوت فیصلہ پر رطب اللسان ذرائع ابلاغ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ واضح اکثریت کے باوجود یہ اہم قلمدان کسی کو کیوں نہ دیا جا سکا؟ ایسا لگتا ہے کہ وزیر اعظم کو لاحق اقتدار کا خوف مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے عدم تحفظ کے احساس سے فروتر ہے۔اس کی وجہ صاف ہے انسا نجس شہ سے جس

قدر شدید محبت کرتا ہے اسے اس کو گنوانے کا اندیشہ اسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ اقتدار کے جنون میں گرفتار حکمرانوں پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

عجب وحشت میں ہم سب جی رہے ہیں
عجب ڈر ہے کہ ڈر دکھتا نہیں ہے

سیاستداں کی ترجیحات اور خوف نیز فوجی کی نفسیات اور ذہنیت مختلف ہوتی ہیں۔ جنرل وی کے سنگھ ویسے تو ہریانوی ہیں لیکن ان کی جائے پیدائش پونے ہے۔ سبکدوشی سے قبل انہوں نے پونے کی کھڑک واسلہ چھاؤنی میں الوداعی خطاب کیا تھا جس سے ان کے اندازِ فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جنرل سنگھ نے فوجیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ”ہم جس پیشے میں ہیں اس سے مقدس اور بہتر کچھ اور نہیں ہے۔ اس کیلئے اخلاقی اور معنوی اقدار کا بہترین امتزاج درکار ہے۔ آپ کبھی بھی اپنے ذاتی فائدے کو پیشہ ورانہ ذمہ داریوں پر حاوی ہونے کی اجازت نہ دیں“ اس پس منظر میں جنرل دلبیر پر لگائے جانے والے قاتلوں وڈکیتوں کے تحفظ کے الزام کو دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا وزیر بن جانے کے بعد وہ اپنے ارشاد ”حق کا ساتھ دینا مشکل اور باطل کی حمایت آسان ہے۔“ اور سرکاری جبر واستبداد کے کے خلاف اپنے بیان ”گاندھی جی نے کہا تھا ناانصافی کا کرنا اور سہنا دونوں یکساں طور پر غلط ہے۔“ پر قائم رہ سکیں گے؟

جنرل سنگھ نے سابق حکومت اور وزیر دفاع کے بارے میں تو یہ کہا تھا کہ ''وزارت دفاع اور ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ فوج حکومت کا حصہ ہے۔ ہم ایک ہیں ۔ ہم جو کہتے ہیں وہ سنا جاتا ہے۔ ضابطوں کے سبب جو تاخیر ہوتی ہے اس سے کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ ہماری کوئی نہیں سنتا لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ہمارے وزیر دفاع انٹونی) ایک صاف ذہن کے آدمی ہیں اور فوج کی حمایت کرتے ہیں۔'' کیا وہ موجودہ) حکومت اور حالیہ وزیر دفاع جیٹلی کے بارے میں بھی یہی کہیں گے؟ وی کے سنگھ نے فوج کے بارے میں تو کہا تھا کہ وہ '' غیر سیاسی، خالص سیکولر اور غیر جانبدار ہے۔'' بی جے پی کی حکومت میں وزیر بن جانے کے بعد کیا وہ خود اپنے بارے میں یہی دعویٰ کر سکیں گے ۔ سبکدوش ہونے کے بعد جنرل وی کے سنگھ اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرنا چاہتے تھے مگر اسے بھول کر وہ انتخابی سیاست میں چلے آئے اور وزیر بن کر جنرل دلبیر سنگھ سے اپنی پرانی دشمنی کا دکھڑا لے بیٹھے۔ اگر یہی رویہ رہا تو ان کا خواب'' وہ چاہتے ہیں کہ انہیں ایک فوجی کی حیثیت سے یاد کیا جائے جس نے فوجی اقدار کو سربلند کیا'' شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا اس لئے انہیں چاہئے کہ بقول شاعر اس خواب کو بھلا دینا چاہئے ۔

ایک بجھاؤ ایک جلاؤ خوابوں کا کیا ہے
آنکھوں میں رکھ کر سو جاؤ خوابوں کا کیا ہے

شیلف پہ الٹا کر کے رکھ دو اور پھر بسرا دو
گل دانوں میں پھول سجاؤ خوابوں کا کیا ہے

عراق: مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ

شمالی عراق کے تین بڑے شہر موصل ، تکریت اور کرکوک ایک ہفتہ کے اندر دیکھتے دیکھتے بغداد کے قبضۂ قدرت سے آزاد ہو گئے اور آئی ایس آئی ایل نامی ایک گمنام تنظیم اچانک ذرائع ابلاغ پر چھا گئی ۔ اسی کے ساتھ آئی ایس آئی ایل کو یہ زبردست کامیابی کیوں کر حاصل ہوئی اس بابت حقیقت تک پہنچنے کے بجائے مختلف قسم کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں ۔ کوئی انہیں باغی کہتا ہے تو کوئی خارجی کہہ کر پکارتا ہے اور کسی کو وہ القاعدہ کے دہشت گرد نظر آتے ہیں بلکہ کچھ لوگوں نے انہیں سعودی عرب کے پیادے یاامریکہ اور اسرائیل کا ایجنٹ تک قرار دے دیا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ۔ جو لوگ شام کی صورتحال سے واقف ہیں انہیں پتہ ہے کہ بشار الاسد کے خلاف برسرِ جنگ دو گروہوں میں سے سعودی عرب اور مغرب جس سیرین لبریشن آرمی کا حامی ہے آئی ایس آئی ایل کی مادر تنظیم النصرۃ اس کا مخالف ہے ۔ سعودی عرب خود نہیں چاہتا کہ اس طرح کی صورتحال اس کی سرزمین پر رونما ہو اس لئے اس نے ان اقدامات کی حمایت کرنے کے بجائے نوراالمالکی کی تنقید پر اکتفاء کیا ہے ۔امریکہ ان پر بمباری کی تیاری کر رہا ہے۔ القاعدہ کے ڈاکٹر ایمن الظواہری سے داعش کمانڈر ابوعمر بغدادی کے اختلافات جگ ظاہر ہیں۔

آئی ایس آئی ایل نے جس سفاکی کے ساتھ فوجیوں کو ہلاک کیا وہ یقیناً قابلِ مذمت ہے لیکن اس طرح کی بہیمیت کا مظاہرہ خود نورالمالکی، بشارالاسد اور عبدلفتاح السیسی اپنے شہریوں کے ساتھ کرچکے ہیں۔ موصل سے پانچ لاکھ لوگوں کی ہجرت کیلئے آئی ایس آئی ایل کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا گیا کہ لوگ داعش کے خوف سے فرار ہو رہے ہیں جبکہ مہاجرین کا کہنا تھا کہ حکومت کے رد عمل کا ڈر انہیں مجبور کرہا ہے۔ نورالمالکی نے امریکہ کو بمباری کی دعوت دے کر عوامی اندیشوں کی تائید کردی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ امریکی حملوں میں جس قدر جنگجو مارے جائیں گے اس سے کہیں زیادہ شہری لقمۂ اجل بنیں گے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آئی ایس آئی ایل باغی ہے تو عراقی فوج نے اس کا مقابلہ کیوں نہیں کیا ؟ اور اگر وہ لوگ خارجی دہشت گرد ہیں تو عوام نے ان کی مخالفت کیوں نہیں کی ؟ ان بنیادی سوالات کی مدد سے حقیقت تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے ۔

ایک سال پہلے تک آئی ایس آئی ایس کا اثرورسوخ شام تک محدود تھا اور عراق میں اس کا کوئی نام لیوا نہیں تھا۔اس دوران (۲۰۱۳؁ میں) عراق کے اندر عرب بہار کی طرز پر حکومت مخالف پرامن عوامی احتجاج کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے اثرات سنی و شیعہ فرقوں کے اکثریتی علاقوں میں نظر آتے تھے۔ فرقہ بندی سے

: عاری یہ تحریک شمالی عراق کے سنی علاقوں میں مندرجہ ذیل مطالبات کر رہی تھی
عراقی جمہوریت میں سنی فرقہ کی بے وزنی کا خاتمہ *
سیاسی مخالفین کے خلاف دہشت گردی مخالف قوانین کے استعمال کی روک تھام *
سزائے موت کے قانون کا خاتمہ *
بدعنوانی کی بیخ کنی *

یہ نہایت ہی معقول اور جائز مطالبات تھے لیکن وزیراعظم نور المالکی نے انہیں نظر انداز کیا عوام کے اندر پائے جانے والے غم و غصہ کو کم کرنے کے بجائے فوج کی مدد سے اس پر امن احتجاج کو کچلنے کی کوشش کی۔ نہ صرف مظاہرین پر حملے ہوئے، ان کو ہلاک کیا گیا بلکہ اس کے رہنماوں کو بھی قتل کیا گیا۔ اس کے باوجود مظاہرین نے صبر و ضبط کا دامن نہیں چھوڑا اور عزم استحکام کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے یہاں تک کہ دسمبر ۲۰۱۳ء میں فوجی قوت کے ذریعہ فلوجہ اور رمادی کے احتجاجی کیمپوں کا صفایہ کر دیا گیا۔
اس موقع پر مظاہرین کا عدم تشدد کی حکمتِ عملی کے اوپر سے اعتماد اٹھ گیا اور مایوسی کے

ے عالم میں مسلح مزاحمت کے امکان پر غور خوض کا آغاز ہوا۔ بقول شاعر

میں یوں رہزن کے بدلے پاسباں پر دار کرتا ہوں مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے
وابستہ

فلوجہ میں شیخ عبداللہ جنابی کی قیادت میں عراقی انقلابیوں کی فوجی کونسل کا قیام عمل میں آیا جس میں قبائلی رہنما اور سابق فوجی شامل تھے۔ شیخ عبداللہ جنابی نے ۲۰۰۴ء کے اندر امریکی تسلط کے خلاف مجاہدین کی شوریٰ کاونسل کے قائد تھے۔امریکہ نے فلوجہ پر دوبارہ حملہ کیا تو وہ شام کی جانب نکل گئے لیکن ۲۰۱۱ء کے اندر عراق لوٹ آئے۔ شیخ عبداللہ نے مختلف قبائلی جنگجو گروہوں کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرکاری دہشت گردی کے خلاف منظم ہونے والے ان قبائلی مسلح دستوں کے وجود میں آنے کے بعد داعش کو یہ زمین زرخیز نظر آئی اور اس نے یہاں کا رخ کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس جنگجو جتھے میں کئی گروہ شامل تھے حکومت نے ان سب کو آئی ایس آئی ایل کے دہشت گرد قرار دے دیا اور اعلان کردیا کہ جو بھی ہماری فوج سے ٹکرائے گا اس کے ساتھ آئی ایس آئی ایل جیسا سلوک ہوگا اگرچہ کہ اس کا تعلق آئی ایس آئی ایل سے ہو یا نہ ہو۔

فلوجہ شہر کے اندر عراقی حکومت نے گزشتہ چند ماہ میں بمباری کرکے ۳۴۴ شہریوں کو ہلاک کیا اور ہسپتالوں تک کو نشانہ بنایا۔ یوروپی پارلیمان کے وفد برائے عراق کے سربراہ اسٹران اسٹیونسن نے اس کارروائی کو نسل کشی قرار دیا جس میں ۱۶۵۷ لوگ زخمی ہوئے اور تقریباً ۵۰ ہزار خاندان ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ نورالمالکی کے اس جبر واستبداد کے جواب میں آئی ایس آئی ایل کو عوام کی ہمدردیاں حاصل ہو گئیں اور مایوس نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ اس میں شامل ہوگیا۔ اس عوامی بغاوت کا مقابلہ کرنا فوج کیلئے ناممکن ہوگیا اس لئے وہ جان بچا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب غیر ملکیوں کو بمباری کے ذریعہ اس کو کچلنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ عراقی فوج اسی طرح کا مظاہرہ صدام حسین کے دور میں بھی کرچکی ہے۔ عراق میں ۱۹۹۱ کے اندر اس طرح کی بغاوت ہو چکی ہے اور جسے کچل دیا گیا تھا۔ اس بار کیا ہوگا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے جو ایرانی رہنما ماضی میں صدام حسین کے مظالم کی مخالفت کرتے تھے وہ اب نوارالمالکی کی حمایت میں فوج روانہ کررہے ہیں اور سعودی عرب جیسے ممالک جو صدام کی حمایت کیا کرتے تھے وہ نوارالمالکی پر تنقید کررہے ہیں۔ مغرب کا عجب حال ہے کہ وہ شام میں حکومت سے برسرپیکار جن لوگوں کاآزادی کے متوالے کا لقب عطا کرتا ہے عراق میں انہیں کو باغی دہشت گرد قرار دیتا ہے۔

عراق کے اندر مسلح جدو جہد کے آغاز کا سہرہ آئی ایس آئی ایل کے سر نہیں

جاتا بلکہ اس کیلئے امریکی جارحیت ذمہ دار ہے جس نے مہلک اسلحہ کا بہانہ بنا کر فوج کشی کی۔ لاکھوں افراد کو ہلاک کرنے اور لاکھوں کروڑ ڈالر خرچ کرنے کے بعد بڑی بے شرمی کے ساتھ تسلیم کرلیا کہ وہاں عمومی تباہی کا اسلحہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا اور انٹلی جنس کی اطلاع غلط تھی۔ صدام کا تختہ الٹ کر جارج ڈبلیو بش کو دوسری بار انتخاب میں کامیابی حاصل کرلی اس کا مقصد پورا ہوگیا۔ اس کے بعد اوبامہ فوج واپس بلانے کا نعرہ لگا کر انتخابی اکھاڑے میں اترے اور کامیاب ہو گئے۔ اہوں نے دوبارہ انتخاب سے قبل اپنی فوج واپس بلا لی اور اب جانے سے پہلے پھر فوج روانہ کررہے ہیں گویا امریکی فوجی جارحیت بھی ایک تماشہ ہوگیا کہ اپنی سیاسی ضرورت کے پیش نظر جب چاہا فوج روانہ کردی اور جب چاہا واپس بلالیا۔

عراق کے اندر اپنی دو کامیابیوں کا ذکر امریکی بڑے فخر سے کرتے ہیں اول تو عراق کو ایک تربیت یافتہ فوج دینے کا اور دوسرے جمہوریت کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کا کارنامہ۔ امریکہ کے ذریعہ تربیت یافتہ فوج کی دلیری تو حال میں ساری دنیا نے دیکھ لی کہ جب آئی ایس آئی ایل کے جنگجو آئے تو وہ رنگروٹ اپنی وردی تک چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عراق سے امریکیوں کو بھگانے کا کام شیعوں اور سنیوں نے مشترکہ طور اپنے اپنے علاقوں میں کیا لیکن مغربی جمہوریت نے اس اتحاد کو پارہ پارہ کردیا۔ نورالمالکی نے اقتدار میں آنے کے بعد

پہلا کام تو یہ کیا کہ صدام حسین کو عین عیدالاضحیٰ کے دن پھانسی دے دی اور اس کا ویڈیو بھی لیک کرادیا۔ اگر نورالمالکی اس حرکت سے گریز کرتے تو یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوتا۔ اس کے باوجود دوسری مرتبہ انتخابات میں وہ واضح اکثریت نہیں حاصل کر سکے۔ ایسے میں انہیں اقتدار کسی اور کے حوالے کرکے کنارہ کش ہو جانا چاہئے تھا لیکن کئی مہینوں کے سیاسی تعطل کے بعد وہ پھر سے اقتدار پر قابض ہو گئے اس طرح گویا عراق میں باقائدہ دستوری آمریت کا آغاز ہو گیا۔

امریکہ کے زیر نگرانی ۲۰۰۶ء کے اندر منعقد ہونے والے انتخابات کے بعد علی الادیب پر امریکہ نے نورالمالکی کو اس لئے ترجیح دی کہ وہ ایران سے قریب سمجھے جاتے تھے۔

جارج بش نے المالکی کو ''عراق میں ہمارا آدمی'' کہہ کر پکارا تھا۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد المالکی نے کردوں اور سنیوں کو قریب کرنے کے بجائے فرقہ بندی کی راہ اختیار کی اور صرف شیعہ وفاداروں پر اعتماد کرنا شروع کیا۔ اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی غرض سے ایک غیر دستوری حفاظتی دستہ بھی قائم کیا جو وزیر دفاع یا وزیر داخلہ کے بجائے صرف ان سے احکامات لیتا ہے۔ اس کے بعد مالکی نے سابق وزیر خزانہ رفیع عساوی کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی جو ابورشا نامی طاقتور قبیلہ کی پناہ میں چلے گئے جس نے حالیہ بحران میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سنی فرقہ کے ساتھ حکومت کی سطح

پر ہونے والے امتیازی سلوک موجودہ صورتحال کا بنیادی سبب ہے۔
امریکی جاتے جاتے یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ پرامن اور مستحکم عراق کو اپنے پیچھے چھوڑے جارہے ہیں اس لئے ان کی موجودگی المالکی پر دباؤ رہا۔ امریکی فوجی سربراہوں نے قبیلوں کے سرداروں کو اعتماد میں لے کر القاعدہ کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کی لیکن ۲۰۱۱ء کے اواخر میں امریکی انخلاء سے ایک روز قبل سابق کارگزار صدر ایاض علاوی کے گروپ نے اپنے ارکان کی بیجا گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے پارلیمان کی کارروائی کا
بائیکاٹ کردیا۔ نورالمالکی نے ان کا اعتماد بحال کرنے کے بجائے امریکیوں کے نکل جانے کے چوبیس گھنٹوں کے اندر نائب صدر طارق الہاشمی پر دہشت گردی کا الزام لگا کر گرفتاری کا وارنٹ جاری کروادیا۔ اس کے تین دن بعد نائب وزیراعظم صالح العراقی کو طویل تعطیل پر روانہ کردیا گیا۔ العراقی نے اسی وقت المالکی پر آمریت کا الزام لگاتے ہوئے اقتدار سے الگ ہو کر کسی اور کی قیادت میں انتخابات کے انعقاد کا مطالبہ کیا تھا اور ممکنہ خانہ جنگی کے خطرے سے بھی آگاہ کردیا تھا۔
نورالمالکی کی نااہلی اور بدانتظامی سے نہ صرف سنی رہنما ناراض تھے بلکہ

مقتدیٰ الصدر نے بھی جن کی جماعت کے ۳۹ ارکان پارلیمان تھے پارلیمان تحلیل کرکے ازسرِ نو انتخابات کے انعقاد کا مطالبہ کیا تھا۔ الصدر کے دست راست اور احرار بلاک کے رہنما باہاالاراجی نے اعتراف کیا تھا کہ ایوانِ پارلیمان کے کچھ سیاستداں غیر ملکی ایجنڈا پر عمل کرتے ہیں اور کچھ دہشت گردوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نیم خود مختار کرد خطے کے صدر مسعود بارزانی نے بھی انتخابات کے انعقاد کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا فی الحال عراق امریکی جارحیت کے بعد سب سے سنگین بحران سے گزر رہا ہے۔ انہوں نے دستور کے تحت دفاقی ڈھانچے کو قائم کرنے پر زور دیا تھا۔ اس موقع پر شمالی عراق کے عنبر، صلاح الدین، دیالہ اور نینواکے صوبوں میں جہاں سنی فرقہ کی اکثریت ہے مزید خود مختاری کا مطالبہ سامنے آیا لیکن اس پر کان دھرنے کے بجائے نورالمالکی نے مقامی شیوخ سے دورانِ گفتگو دھمکی آمیز انداز میں کہا اگر دفاقیت کو غیر فطری ذرائع سے لانے کی کوشش کی جائیگی تو خون کی ندیاں بہیں گی۔ اگر سربراہِ مملکت عوام کے نمائندوں کے ساتھ اس لہجے میں بات کرے تو سیاسی بحران کا رونما ہونے پر حیرت نہیں ہونی چاہئے۔

عام طور پر اس طرح کی صورتحال میں شیعہ سنی اختلافات کو چھیڑ کر نفسِ مسئلہ سے توجہ ہٹا کر سرکاری مظالم کی پردہ پوشی کی جاتی ہے۔ صدام حسین اپنے وگاداروں کی مدد سے اپنا اقتدار مضبوط کرتے رہے اور اپنے مخالفین کو

معتوب کرتے رہے اتفاق سے ان کے ہمنوا سنی فرقے کے لوگ تھے اور مخالف شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے جائز حقوق کیلئے احتجاج کرنے والے شیعہ حضرات اس زمانے میں باغی کہلاتے تھے۔ اب وقت بدل گیا نورالمالکی اپنے حامیوں کی مدد سے اپنا اقتدار مستحکم کر رہے ہیں اور مخالفین پر ستم ڈھارہے ہیں ایسے میں ظلم کے خلاف احتجاج کرنے والے سنیوں کو باغی کہا جارہا ہے حالانکہ یہ شیعہ سنی عوام کا نہیں بلکہ ان حکمرانوں کا مسئلہ جو بہر صورت اپنے اقتدار سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ اس برسرِ اقتدار طبقے کی حمایت کرنے والی دیگر حکومتوں کو بھی نہ عوام کی فلاح و بہبود میں کوئی دلچسپی ہوتی ہے نہ امن و امان سے کو سروکار ہوتا ہے بلکہ انہیں یا تو اپنے دوست کو بچانے کی فکر لاحق ہوتی ہے یا اپنے دشمن کو سبق سکھانا ہوتا ہے۔

ملک کی عوام مل جل کر رہنا چاہتی ہے جس کا ثبوت بغداد میں لاکھوں کردوں کی آبادی ہے جو کبھی عربوں کے حملوں کا شکار نہیں ہوئی۔ بصرہ کے ۲۰ فیصد سنیوں کو شیعہ ہمسایوں سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ سامرہ ایک سنی اکثریتی شہر ہے جس میں شیعہ فرقہ کے مقامات مقدسہ کے وہ متولی ہیں۔ قرآنِ مجید میں فرعون کی حکمت عملی یوں بیان ہوئی ہے کہ وہ عوام کو تقسیم کرتا تھا۔ ان میں سے ایک کو مظالم کا شکار کرتا اور دوسرے کو نوازتا تھا۔ وقت اور زمانہ بدل گیا لیکن فرعون کے نقش قدم پر چلنے والے حکمراں نہیں بدلے۔ ان کی فرعونیت

کے سبب

دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف بنیادوں پر تقسیم در تقسیم کا عمل جاری ہے۔ جور و ظلم کا دور دورہ ہے اور اس کے خلاف ہونے والے رد عمل کو بغاوت و دہشت گردی کے نام پر کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

صدام حسین اور نورا المالکی کے طریقۂ کار میں بے شمار مشابہت نظر آتی ہے۔ عراق کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہاں وہاں صرف چار ٹی وی چینلس ہیں اور سب پر صدام حسین چھایا ہوا ہے لیکن صدام حسین کی موت کے دس سال بعد عراق میں ذرائع ابلاغ کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا ہے۔ الجزیرہ سمیت ۹ ٹی وی چینلس کی نشریات پر تشدد بھڑکانے کا الزام لگا کر پابندی لگا دی گئی ہے ۔اس کے علاوہ امریکہ بہادر کی نظر التفات بھی ایران سے جنگ کے دوران صدام حسین پر تھی فی الحال نور المالکی امریکہ کے منظور نظر بنا ہوا ہے۔ صدام امریکہ کے سب سے بڑے دشمن سوویت یونین کا بھی دوست تھے نور المالکی بھی امریکہ کے سب سے بڑے دشمن ایران کے یارِ غار ہیں۔ دونوں کے اندر سفاکیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لئے کوئی بعید نہیں کہ دونوں کا انجام یکساں ہو۔

ایک غیر روایتی جرنیل (س) کرنل اشفاق حسین خان کے ساتھ ایک روایت شکن شام

پاکستان ایسو سی ایشن دبئ کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں مجھے سبکدوش کرنل اشفاق حسین کو ''مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'' کی امتیازی شان کے ساتھ قلمی جہاد فرماتے ہوئے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اور پھر یہ بھی ہوا کہ ''نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں'' کی مصداق انہوں نے وہاں موجود
تمامسامعینکادل جیت لیا۔ فوج کو لوگ باگ کانٹوں کی سیج اور صحافت کو پھولوں کا ہار سمجھتے ہیں اس لئے اکثر آرزو مند فوجی حضرات تلوار کو پھینک کر قلم (یاآج کل ٹی وی کے پردے پر مائک) کو سنبھالنے کیلئے اس قدر بے چین ہوتے ہیں کہ جیسے ہی وظیفہ کے مستحق قرار پاتے ہیں قبل از وقت سبکدوش ہو کر صحافت کی چکا چوند دنیا میں قدم رنجا فرمالیتے ہیں۔
اس کے برعکس چونکہ کرنل اشفاق حسین کرنل صاحبایک روایت شکن انسان ہیں اس لئے نصف صدی قبلذرائع ابلاغ میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنے کے بعد وہ صحافت کی چمک دمک کو خیرباد کہہ کر فوج میں داخل ہوگئےاور بنجر و سنگلاخ عسکری زمین پر ظرافت کے رنگ برنگے خوشبودار پھول کھلانے میں مصروف ہو گئے۔ بارہ سال قبل مجبوراًفوجی وردی کو اتار پھینکنے کے بعد بھی سبکدوشکرنل صاحب

گلشنِ ادب کو گلِ گلزار کرنے کے کارِ خیر میں لگے ہوئے ہیں۔ الحمد اللہ یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے اور ہم جیسے قارئین کی دعا ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ غالب نے کہا تھا ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالب اس دور کا شاعر تھا جب غلامی کی بس آمد آمد تھی لیکن منیر نیازی کے زمانے تک جس کا خود انھوں نے اعتراف اس طرح کیا ہے کہ ''نسلوں کا فاصلہ ہے میرے ان کے درمیاں'' امت غلامی میں طاق ہو چکی تھی۔ گردشِ زمانہ کے نشیب و فراز نے 'جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا' کی مصداق ہماری کایا پلٹ کے کر رکھ دی۔ من حیث القوم ہم تلوار کے بجائے قلم پر قناعت کر بیٹھ گئے اور اسی کو اپنے لئے باعثِ فخر و سعادت سمجھنے لگے۔ ایسے میں منیر نیازی کو کہنا پڑا ؎

سو پشت سے تھا پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت ہوئی مجھے

مندرجہ بالا دونوں اشعار میں معمولی سی تبدیلی سے معنٰی اور مفہوم میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ نفسیاتی ہے۔ فوج پیشے کا نہیں

ایک مخصوص طرزِ فکر و عمل کا نام ہے۔ غالب چونکہ فوجی ذہنیت کے حامل تھے اس لئے شاعری بھی کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنا تخلص غالب رکھا حالانکہ فتح و غلبہ کا تعلق شاعری سے نہیں جنگ و جدال سے ہے۔ شاعری تو منیر نیازی جیسے عاجز و نیاز مند لوگوں کا شعار ہوتا ہے جو بڑی انکساری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا

اس لئے میری تو رائے یہ ہے کہ سپہ گری کی نفسیات سے نہ ہی کوئی غیر فوجی کماحقہٗ واقف ہو سکتا ہے اور نہ اس کی معرفت ہی کروا سکتا۔ اس کام کیلئے تو عقل و خرد کا حامل فوجی درکار ہوتا ہے جو بقول کرنل اشفاق حسین اپنی تربیت کے دوران نہ صرف زخمی بلکہ شہید بھی قرار دیا جاچکا ہو۔ کرنل صاحب نے فوجی تربیت کے دوران جعلی زخمیوں اور شہیدوں کی دو نہایت عمدہ مثالیں پیش کیں۔ انھوں نے بتایا فوج میں تربیت کے دوران فوجی دستوں کو مختلف فرضی صورتحال سے گزارہ جاتا ہے مثلاً کسی ایسے درۂ کو پار کرنا جس پر دشمن تعینات ہو۔ زیر تربیت دستہ جس احتیاط کے ساتھ اس میں سے گزرتا ہے اس کی بنیاد پر ممتحن فیصلہ کر دیتا ہے کہ اس میں سے کتنے فوجی مارے گئے اور کون کون زخمی ہوا۔ ایک فوجی ٹرک اسی طرح کی تربیت سے لوٹتے ہوئے خراب ہو گیا۔ گاؤں

والوں کو مدد کیلئے بلایا گیا تو انہوں نے دیکھا ٹرک کے اندر کئی فوجی موجود ہیں لیکن نیچے اتر نہیں رہے لوگوں کے استفسار پر انہیں بتلایا گیا کہ یہ سب زخمی ہیں حالانکہ سب کے سب بھلے چنگے تھے۔

ایک اور دفعہ ان سے کسی افسر دوست نے شکایت کی کہ مجھے اس پل کے پار جاکر چائے پینی ہے لیکن یہ چوکیدار سپاہی ہے کہ جانے نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ یہ پل تباہ ہو چکا ہے حالانکہ وہ صحیح سلامت ہے۔ کرنل صاحب نے کہا اس احمق کے بجائے اس کے افسر سے بات کرو۔ دوست نے بتایا میں نے افسر سے بات کی تو اس نے جواب دیا کہ وہ شہید ہو چکا ہے۔ اب اس طرح کے تجربات و مشاہدات سے کوئی شہری بھلا کیوں کر بہرہ ور ہو سکتا ہے؟ اس لئے کرنل صاحب کی تحریر و تقریر عسکری آداب واطوار اور تہذیب و تمدن کو جاننے کا نہایت معتبر اور دلچسپ وسیلہ ہے۔ اس کی بنیاد قیاس و گمان کے بجائے حقائق پر رکھی گئی ہے۔ کرنل صاحب کا انداز بیان اس قدر ظریفانہ ہے کہ ان کی معیت میں سامع یا قاری فرط و مسرت کے عالم میں علم و عرفان کے بیش بہا موتی سمیٹتا چلا جاتا ہے اور بوریت اس کے قریب نہیں پھٹکتی۔

فوج اپنی تلوار کے زور سے زمینوں پر قابض ہوتی ہے لیکن فنکار اپنے قلم کی مدد سے دلوں کو مسخر کرتا ہے اور اس کا بہترین نمونہ کرنل اشفاق حسین کی

ذاتِ گرامی ہے۔ ویسے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ فوجیوں کو بہادری کے جوہر دکھلانے کیلئے اپنی سرحد سے نکل کر دشمن کی سرحدوں میں داخل ہونا پڑتا ہے لیکن کرنلصاحب نے دوستوں کی سرزمین دبئی میں آکر بت شکن محمود غزنوی کی طرحامارات کی ایک ایک ادبی روایت کو چن چن کر توڑا۔ میں تو اس شخص کی تلاش میں سرگرداں ہوں جس نے کرنل صاحب کو ہماری ان ساری روایتی کمزوریوں سے واقف کرایا۔

آہنی زنجیروں کو توڑنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن ذہنی شکنجوں سے آزادی حاصل کرنا نہایت مشکل۔اس لئے کہ لوہے کا قفل ہر کس و ناکس کو نظر آجاتا ہے مگر دل پر پڑے ہوئے تالے دوسروں کو تو کجا خود اپنے آپ کو بھی دکھلائی نہیں دیتے۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ کرنل صاحب نے اپنی شگفتہ ضرب کاری سے اس معرکہ کو بخوبی سر کیا۔ عسکری ادب میں جنٹلمین کے حیثیت سے پہچانے جانے والے اس روایت شکن جرنیل نے اپنی مبارک مہم کی بسم اللہ وقت کی پابندی سے کی۔ عصرِ حاضر کی ایک بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ پابندیٔ وقت کے ساتھ پانچ وقت نماز قائم کرنے والی امت کو بھی وقت کا پابند بنانے کیلئے فوجی ڈنڈے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

متحدہ عرب امارات کی روایت کا یہ جزو لاینفک ہے کہ اگر کوئی ادبینشست

بعد مغرب شروع کرنا ہو تو عصر بعد کا اعلان کیا جائے اسی لئے جب مجھے بتایا گیا کہ پروگرام ساڑھے سات بجے ہے تو میں سمجھ گیا کہ یہ ساڑھے آٹھ بجے ہوگا۔ حسب عادت جب میں ۹ بجے پہنچا تو لوگ نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر اجتماع گاہ میں جمع ہو رہے تھے لیکن مجھے حیرت کا جھٹکا اس وقت لگا جب پتہ چلا کہ یہ دوسری نشست ہے اور عشاء سے قبل ایک نشست ہو چکی ہے جس میں میرے چہیتے مزاح نگار کبیر خان صاحب اپنی تحریر سنا کر فارغ ہو چکے ہیں اور دیگر کئی اکابر اپنا خراج عقیدت پیش کر چکے ہیں۔ کرنل صاحب کی تقریر کے دوران مژدہ کھلا کہ مبادہ یہ فوجی تربیت کا اثر ہو۔ اگر ایک فوجی کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب میں بھی وقت کی پابندی نہ ہو سکے تو بھلا آئی ایس پی آر ٹریننگ کا کیا فائدہ ؟

ہمارے یہاں منتظمین کرام تقریب کے آغاز میں ہونے والی تاخیر کا ٹھیکرہ سامعین کے سر پھوڑتے ہیں اور یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ اگر شرکاء وقت پر نہ آئیں تو پروگرام وقت پر کیوں کر شروع کیا جائے۔ لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سامعین تو کجا صاحب اعزاز اور منتظمین تک وقت پر نہیں آتے۔ دبئ میں غالباً کورٹ مارشل کا خوف سب کو وقت پر لے آیا۔ میں نے اپنا غم غلط کرنے کیلئے سوچا کبیر خان صاحب اپنے ہی آدمی ہیں۔ ان سے مضمون لے کر پڑھ لوں گا لیکن اس سے پہلے کہ میں جھولی پھیلاتا سامعین میں

سے ایک نوجوان نمودار ہوا اور کبیر خان صاحب سے ان کا مضمون لے اڑا۔ میں اپنی دوسری شکست پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور اپنے آپ کو بہلانے کیلئے سوچنے لگا کسی مضمون کو پڑھنے اور سننے میں وہی فرق ہے جو کھونٹے پر ٹنگی ایک بے جان وردی اور وردی پوش فوجی میں ہے۔ چھوڑو اس نوجوان کو ویسے بھی کوئی مزہ نہیں آیگا لیکن ایسا کرتے ہوئے میں بھول گیا کہ جس لطف کی محرومی کا میں ماتم کر رہا ہوں وہ نوجوان تو اس سے بہرہ مند ہو چکا ہے اور اسے دوبالا کرنے کے اہتمام میں بھی مجھ پر سبقت لے گیا ہے۔

امارات کی ادبی دنیا کا سب سے بڑا بت شاعری ہے۔ یہاں پر ادبی تقریب مشاعرہ کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔جب بھی نثری نشست پر گفتگو ہوتی ہے تو کہہ دیا جاتا ہے نثر میں کسی کو دلچسپی نہیں ہے ایسی نشست میں کوئی نہیں آیگا وغیرہ وغیرہ۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ آخر اس حصار سے کیونکر آزادی نصیب ہو لیکن اب پتہ چلا کہ اس کیلئے کسی کرنل کی ضرورت ہوتی ہے جس کا قلم تلوار سے تیز ہو۔ کرنل اشفاق حسین کے اعزاز میں منعقد ہونے والی نثری نشست اس کی زندہ مثال ہے جس میں نہ صرف شرکاء کی تعداد و دلچسپی قابلِ رشک تھی بلکہ نظم و ضبط کے حوالے سے بھی یہ نہایت پر وقار اور یادگار محفل تھی۔ حاضرین کے ذوق و شوق نے ان تمام دلائل کی ہوا نکال دی جو نثری نشستوں کے خلاف پیش ہوتی تھیں۔ کرنل صاحب کے اس احسان عظیم کیلئے شعراء حضرات نہ سہی لیکن جناب کبیر

خان اور مجھ جیسے نہ جانے کتنے نثر نگار ان کے ممنون و مشکور ہیں۔ کرنل صاحب کے اس چمتکار نے ایک اور خلش دور کردی کہ آخر فوجیوں کا ادب میں کیا کام ؟ یہ نہایت خوش کن انکشاف تھا کہ دنیائے ادب میں بہت سارے ایسے کام ہیں جنہیں کوئی غیر فوجی نہیں کرسکتا۔ ان کو انجام دینے کیلئے وردی پوش سپاہیوں کو قلم تھام کر مارشل لاء نافذ کرنا پڑتا ہے۔

اردو دنیا میں ایک مایوس کن غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی کہ کتاب سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا ہے لیکن اس بت کو توڑنے کیلئے کرنل اشفاق حسین کی کتاب جنٹلمین بسم اللہ کے ۲۵ ایڈیشن اور دیگر کتابوں کے مزید ۴۰ ایڈیشنس کی اشاعتکافی ہے۔ گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر یہ ممکن ہے کہ کتابوں سے ہمارا اپنا رابطہ ٹوٹ گیا ہو لیکن آج بھی ایسے طلباء موجود ہیں جو امتحان کے زمانے میں اپنی درسی کتابوں کے اندر کرنل صاحب کی کتاب چھپا کر پڑھتے ہیں اور اپنی اس حرکت کا جواز بھی ان کے پاس موجود ہے۔ قصہ یوں ہے کہ کرنل اشفاق حسین صاحب کو کسی طالب علم کا خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ امتحان کا زمانہ ہے اور اس دوران وہ اپنی درسی کتاب کے اندر ان کی کتاب چھپا کر پڑھتا ہے۔ کرنل صاحب نے اسے لکھا کہ برخوردار اپنے آپ پر اور مجھ پر رحم کرو۔ امتحان کے بعد میری کتابیں پڑھ لینا۔ اس طالب علم نے جواب دیا۔ میں تو آپ کو عقلمند آدمی سمجھتا تھا لیکن افسوس کہ آپ بھی میرے والد کی طرح بے وقوف

نکلے۔ آپ کو اتنا بھی نہیں پتہ کہ اس زمانے میں درسی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہم لوگ کس قدر بور ہو جاتے ہیں اس لئے درمیان میں آپ کی کتاب پڑھنی پڑتی ہے۔ جس مصنف کا قاری اس قدر ذہینو فطین ہو اس کی ذہانت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

دوسروں کی ہنسی اڑانا نہایت سہل ہوتا ہے لیکن اپنے آپ پر ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا بڑا مشکل کام ہے۔ جو لوگ دبئی کی نشست میں موجود تھے ان کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ کرنل صاحب کیلئے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کرنل صاحب نے فوجی زندگی کے جو واقعات سنائے ان میں کمال اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ تھا، خود نمائی کے بجائے اپنے آپ کا تمسخراور دیگر افرد کی تعریف و توصیف کا پہلو اجاگر ہوتا تھا مثلًا ایک افسر کا نووارد اشیاق حسین سے یہ سننے کے بعد بھی کہ اسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے محض دلجوئی کی خاطر کہہ دینا کہ اس کے بغیر تربیت رکی ہوئی اسلئے وہ تاخیر نہ کرے اور اس بہلوائے پر کرنل صاحب کا یقین کرلینا۔ اس کے علاوہ نفسیاتی تفتیش کے دوران اپنے ناکام ہو جانے کا برملا اعتراف اور اس کے باوجود منتخب ہو جانے کا ذکر۔ سچ تو یہ ہے جن پاکیزہ نفوس کے اندر عجز و انکسار پایا جاتا ہے رب کریم کی جانب سے ان کے تکریم و احترام کا اہتمامکر دیا جاتاہے اور جس پر العزیز والرحمٰن مہربان ہو جائے اس کیلئے قبولیت عام لکھ دی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت گلگت کا وہ طالب علم ہے جس نے

کہا تھا کرنل صاحب میں آپ پر جان نثار کر سکتا ہوں لیکن فی الحال آپ کو دینے کیلئے میرے پاس صرف یہ معمولی سا قلم ہے۔

عصر حاضر کی نفسا نفسی کے عالم میں ہنسنے ہنسانے سے مشکل کام دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنا اور سامعین و قارئین کو اس غم میں شریک کر لینے کا فن ہے۔ کرنل صاحب نے اپنے خطاب کے اختتام پر میجر شبیر شریف شہید کا ذکر کیا اور ان کی زندہ دلی کے ایسے واقعات سنائے جو 'فاتح سبونہ' میں پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جب انہوں نے میجر شبیر کی شہادت کا واقعہ نہایت دلسوز انداز میں بیان کیا تو ہال میں موجود کوئی ایک دل ایسا نہیں تھا جس نے میجر کی ماں کا درد محسوس نہ کیا ہو اور کوئی ایک آنکھ ایسی نہ تھی جو نمناک نہ ہوئی ہو۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ عقیدت و محبت کے بادل دبے پاؤں کہاں سے وارد ہوئے اور کیونکر برسنے لگے۔ کرنل صاحب نے محترمہ مریم جمیلہ کی کتاب کا ترجمہ کرکے ایک باشعور مصلح کی ذمہ داری ادا کی ہے۔ موصوفہ نیویارک کے یہودی گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں اور مشرف بہ اسلام ہو کر امریکہ سے لاہور آبسی تھیں۔ امید ہے کرنل صاحب کا یہ ثوابِ جاریہ روزِ قیامت ان کیلئے عظیم اثاثہ قرار پائے گا۔

دبئی کی اعزازی تقریب میں بعد از خطاب سوال و جواب کا موقع تھا اور اس دوران وہ راز افشاء ہو گیا کہ جس نے کرنل اشفاق حسین کو اس قدر عظیم مصنف

بنا دیا ہے کہ نہ وہ لکھنے سے تھکتے ہیں اور نہ قاری پڑھنے سے تھکتا ہے۔ مختلف پیچیدہ اور مایوس کن سوالات کے نہایت سہل اور امیدافزاء جوابات اس حقیقت کی دلیل تھے کہ یہ خداداوصف جسے حاصل ہو جائے وہ خود بھی خوش رہنے کا سراغ پالیتا ہے اور دوسروں کواپنی خوشیوں میں شریک کرلینا اس کیلیئے آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے خوشیوں کو جس قدر تقسیم کیا جائے انمیں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

کرنل صاحب کو رب کائنات نے نہ صرف منفی روایات کو مسمار کرنے کے فن سے نوازہ ہے بلکہ مثبت روایات کو قائم کرنے کی صفتِ عالیہ سے بھی آراستہ فرمایا ہے۔ عصر حاضر کے بازار میں.برانڈیڈ شہ ویسے بھی مہنگی بکتی ہے۔ کرنل صاحب نے جنٹلمین کو اپنا ٹریڈ مارک یعنی امتیازی نشان بنایااور اب تو یہ عالم ہے کہ اگر کوئی اور بھی جنٹلمین ماشاء اللہ نام کی کتاب لکھ مارے تو لوگ اسے کرنل اشفاق حسین کی تصنیف سمجھ کر پڑھنے لگیں گے لیکن بہت جلد انہیں پتہ چل جائیگا کہ یہ اصلی نہیں بلکہ نقلی جنٹلمین ہے۔ کرنل صاحب کی جنٹلمین استغفر اللہ جن لوگوں نے پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ جو جعلی ہو وہ جنٹلمین نہیں ہو سکتا بقول شاعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے فوج میں جنٹلمین پیدا

سمع خراشی معاف یہ علامہ اقبال کا نہیں میرا اپنا شعر ہے۔ اگر منیر نیازی جیسا صاحبِ ثروت شاعر غالب کے شعر پر ہاتھ مار سکتا ہے تو مجھ جیسے حقیر فقیر انسان کے گنجینۂ اقبال سے ایک آدھ شعر اچک لینے پر کیسے اعتراض ہو سکتا ہے ؟ یہ کرنل اشفاق حسین صاحب کا اعجاز ہے کہ ان پر زیر تحریر مضمون نے مجھ جیسے خشک ماحولیاتی ڈاکٹر کو فائر کرکے شاعر بنا دیا۔ میں اس عنایت کیلئے کرنل صاحب کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میرے اس نوزائیدہ نحیف و لاغر شعر کو اپنی داد سے نواز کر میری حاصلہ افزائی کی اور دعا کرتا ہوں کہ کرنل صاحب ہماری ملاقات مزید اللہ والے جنٹلمین حضرات سے کرواتے رہیں تاکہ ہماری کڑوی کسیلی زندگی میں ہنسی کے فوارے چھوٹیں اور ماحول خوشگوار سے خوشگوار تر ہوتا چلا رہے۔

اب کی بار: جو سانپ نکلے تو لوگ سمجھے

قومی انتخاب سے قبل جب معروف صحافی ایم جے اکبر کو بی جے پی نے اپنے گھر بٹھا لیا تو لوگوں نے سوچا کہ شاید انہیں الیکشن لڑا کر مسلمانوں کو رجھایا جائیگا لیکن ایسا نہیں ہوا پھر لوگوں کو خیال ہوا کہ ممکن ہے انہیں ترجمان بنادیا جائے جو حکومت کے کرتوت خوشنما بنا کر پیش کرے لیکن وہ بھی نہیں ہوا۔ اب لوگ حیرت کرنے لگے کہ آخر اکبر جیسے صحافی بی جے پی سے کس بات کی تنخواہ لیتے ہیں۔ بھولی بھالی عوام کو کیا پتہ کہ آج کل سیاسی رہنماوں نے سوشیل میڈیا کے ذریعہ اپنے رائے دہندگان کے ساتھ براہِ راست رابطہ قائم کرلیا ہے وہ وقتاً فوقتاً انہیں خطوط اور پیغامات بھیجتے رہتے ہیں۔ اب بھلا سیاستداں کے پاس اس کام کیلئے نہ دماغ ہے نہ وقت تو اس کے پاس تو اقتدار اور دولت کی فراوانی ہوتی ہے لیکن قلمکار کے پاس دماغ بھی ہوتا ہے اور وقت بھی تو گویا باہم اشتراک و تعاون کی بنیاد پر ایک اپنا مضمون یا سلوگن دوسرے کو دے کر اس کے دھن دولت میں شریک ہو جاتا ہے اور دونوں کا کام نکل جاتا ہے۔ اس مرتبہ ۲۵ جنوری کو مودی سرکار نے ایک ماہ کی مدت پوری کی اور اتفاق سے وہ ایمرجنسی کی ۳۹ ویں سالگرہ بھی تھی اس لئے نریندر مودی کی جانب سے ایک خط اور ایک مضمون عوام کی خدمت میں پہنچ گیا

ایمرجنسی پر لکھے گئے مضمون کے اندر ۲۵ جون ۱۹۷۵ء کو ہندوستان کی جدید تاریخ کا سیاہ ترین دن قرار دیا گیا اس لئے کہ اس دن سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ملک پر ایمرجنسی نافذ کردی تھی۔ کانگریس کی یو پی اے حکومت نے اس تاریخ کو اسی طرح بھلا دیا تھا جس طرح بی جے پی چاہتی ہے کہ مسلمان گجرات کے فسادات کو بھول جائیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایمرجنسی کو ۳۹ سال بعد بھی نہیں بھلایا جاسکتا جس میں مودی کو صرف روپوش ہونا پڑا تھا۔ آرایس ایس کے بڑے رہنما ایک ایک کرکے معافی نامہ لکھ کر رہا ہو گئے تھے تو مسلمان گجرات کے فسادات کو کیوں کر بھول سکتے ہیں جن کے خاک و خون سے نہ صرف ریاستی انتخاب میں کامیابی حاصل کی گئی بلکہ قومی اقتدار کیلئے بھی راہ ہموار کرنے کا کام لیا گیا۔ ملت اسلامیہ ہند اس غم واندوہ کو آسانی سے بھول نہیں سکتی اس لئے کہ بقول شاعر

بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت، مت بھول ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

ایمرجنسی کے نفاذ کو مودی کے بلاگ میں بجا طور پر تاریک ترین دور کا آغاز قرار دیا گیا جب مغرور سیاستدانوں نے اقتدار کے نشے میں مدہوش ہو کر استعفیٰ دینے کے بجائے قوم کے جمہوری دامن کو تار تار کردیا تھا۔ مودی کو

چاہئے کہ وہ ایمرجنسی پر ٹسوے بہانے کے بعد موت کے ساتھ نبرد آزما احسان جعفری سے کہا ہوا اپنا جملہ ''کیا تم ہنوز زندہ ہو'' بھی یاد کرلے اور مظلوموں کے ریلیف کیمپ اجاڑنے سے قبل کی گئی توہین پر بھی نظر ثانی کرے کہ '' یہ بچے پیدا کرنے کے کارخانے بن گئے ہیں ''۔ مودی نے اس وقت وزیر اعظم واجپائی کی پھٹکار کے باوجود اقتدار سے چپکے رہنے کو ترجیح دی اور معافی مانگنے کے بجائے ڈھٹائی دکھلاتے ہوئے کہا اگر میں نے کوئی غلطی کی ہے تو مجھے سزا دو۔

ایمرجنسی لگانے کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔ انتخابی بدعنوانی میں وزیراعظم اندرا گاندھی کے خلاف الہ باد کی عدالت کا فیصلہ اس کی پہلی وجہ تھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ

ایمرجنسی پر طول طویل تحریر کے صرف پانچ روز بعد یعنی ۳۰ جون کو احمد آباد کی ایک عدالت نے نریندر مودی کو انتخابی فریب کاری کا مجرم قرار دے دیا۔ ماہِ اپریل میں جب پہلی مرتبہ نریندر مودی نے اپنے شادی شدہ ہونے کا اعتراف کیا تھا تو عام آدمی پارٹی کے رکن نشانت ورما نے رانیپ پولیس اسٹیشن سے رجوع کرکے مودی کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ ورما نے

نریندر مودی پر ۲۰۱۲ء اسمبلی انتخابات کے دوران اپنے ازدواجی حقائق کو

چھپانے کا الزام لگایا تھا۔ اس لئے کہ انتخابی حلف نامہ میں جشودھا بین کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ ایمرجنسی میں سیاسی مخالفین کو جبر و استبداد کا رونا رونے والے مودی کے گجرات میں پولس نے نشانت ورما کی ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کرکے ظاہر کر دیا کہ گجرات بھی اس وقت غیر اعلان شدہ ایمرجنسی کے نرغے میں محصور تھا۔

انتظامیہ کے اس معاندانہ رویہ کے خلاف جب ورما نے احمد آباد کی مقامی عدالت سے رجوع کیا تو اضافی چیف جوڈیشل مجسٹریٹ ایم ایم شیخ نے پولیس کو تین ہفتوں کے اندر حلف نامہ میں مبینہ طور پر حقائق کی پردہ پوشی سے متعلق عائدہ کردہ الزام کی تحقیقاتی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت دی۔ پولس کے دلائل مسترد کرتے ہوئے عدالت نے نریندر مودی کو کاغذات نامزدگی میں اپنی ازدواجی حیثیت چھپانے کا مجرم قرار دیا تاہم شکایت درج کرنے کی مدت میں ایک سال سے زیادہ تاخیر کے سبب اس کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی اجازت نہیں دی گویا عدالت کی نظر میں مجرم قرار پانے والا مودی ایک تکنیکی حیلہ کے سبب کم از کم چھ ماہ جیل کی چکی پیسنے سے بچ گیا۔ کیا یہ انتخابی بدعنوانی نہیں ہے؟ اور کیا عدالت کے ذریعہ نامزد کسی مجرم کو وزیر اعظم کی کرسی پر براجمان ہونے کا اخلاقی حاصل ہے؟ لیکن پھر ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مودی جیسے اقتدار پرست سے اعلیٰ اخلاق و کردار کی توقع کرنا درست ہے؟ اگر نہیں تو کم از کم وزیر

اعظم کو اپنے گریبان میں جھانک کر بیجا وعظ و نصیحت سے گریز کرنا چاہئے اس لئے کہ فی الحال کانگریس اور بی جے پی کے درمیان اس شعر کی سی مماثلت پیدا ہو گئی ہے

تیرا میرا شیشے کا گھر میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
پھر دونوں کے ہاتھ میں پتھر میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

نشانت ورما کے وکیل کا کہنا ہے کہ انہوں نے شادی کے اعتراف کے فوراً بعد پولس اور انتخابی کمیشن سے رجوع کیا اسلئے تاخیر کی شق کا اطلاق نہیں ہوتا اور اب وہ سپریم کورٹ جائیں گے ۔ نریندر مودی چونکہ بڑودہ سے استعفیٰ دے چکے ہیں اس لئے ممکن ہے سپریم کورٹ اس معاملے میں کچھ زیادہ نہ کرکے لیکن اب ایک نئی مصیبت وارانسی میں کھڑی ہو گئی ہے جہاں کانگریس کے ناکام امیدوار اجئے رائے سمیت ایک رائے دہندہ مادھو پرساد اپادھیائے مودی کے خلاف الہ باد عدالت سے رجوع کیا ہے جہاں اندرا گاندھی کے خلاف فیصلہ ہوا تھا۔ شکایت کنندگان کے مطابق مودی نے اپنی اہلیہ جشودھا بین کے پان کارڈ کی تفصیل اور آمدنی کی معلومات نہ دے کر سپریم کورٹ کے ہدایات کی خلاف ورزی کی ہے اسلئے کہ امیدوار کیلئے تمام کالمس کو پر کرنا لازمی ہے۔ بی

جے پی اس انتخاب پر ۷۰ لاکھ کے بجائے پچاس کروڑ روپے خرچ کرنے کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مقدمہ میں عدالت کا فیصلہ کیا آتا ہے؟ اور حکومت اس کے تئیں کیا مؤقف اختیار کرتی ہے؟

وزیراعظم کے مضمون میں ایمرجنسی کے دوران ذرائع ابلاغ کی خاموشی پر بھی افسوس کا اظہار کیا لیکن فیس بک اور ٹویٹر پر مودی کے خلاف پیغام لکھنے والوں کے ساتھ کئے جانے والے سلوک پر نظر ڈالی جائے تو ایسا لگتا ہی نہیں کہ ایمرجنسی ختم ہو چکی ہے۔ اس وقت میڈیا کو خوفزدہ کرکے خاموش کردیا گیا تھا اب خرید کر اس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ مودی کی حکومت کی پے درپے ناکامیوں کے باوجود فروخت شدہ ذرائع ابلاغ دن رات نمو نمو کا جاپ لگائے رہتا ہے۔ مودی کے دستِ راست ارون جیٹلی نے اندرا گاندھی کی حکومت کے ساتھ ساتھ سپریم کورٹ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جو دورانِ ایمرجنسی حکومت کی تابعداری میں سربسجود ہو گئی تھی۔ بیچارے ارون جیٹلی کو آج کل قانون کی کتاب بند کرکے بہی کھاتہ کھول بیٹھے ہیں اور دن بدن مہنگائی کے سیلاب میں بہے جارہے ہیں۔انہیں یہ نہیں پتہ تھا کہ ایک ہفتہ بعد یہی الزام ان کی سرکار پر لوٹ آیگا اور گوپال سبرامنیم کے معاملے میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی جانب سے حکومت کو پھٹکار ملے گی۔

گوپال سبرامنیم نے سہراب الدین جعلی انکاؤنٹر مقدمہ میں سپریم کورٹ کی اعانت کی تھی اور امیت شاہ کا ناطقہ بند کردیا تھا۔ ان کی اس جرأتمندی کے عوض جب سپریم کورٹ کے نئے ججوں کی مجوزہ فہرست میں بی جے پی نے ان کا نام دیکھا تو دشمنی پر اتر آئی اور سی بی آئی کے ذریعہ ان کی شخصیت کو داغدار کرنا شروع کردیا۔ ان پر ٹوجی گھوٹالہ میں نیرا راڈیا کے ساتھ ساز باز کرنے کا الزام لگایا گیا جو سراسر بہتان ہے۔ سبرامنیم نے گجرات کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے نریندر مودی کی جانب سے سرکاری مہمان نوازی تک کی پیشکش ٹھکرادی تھی۔کانگریس کے جعلی سیکولرزم پر تنقید کرنے والی بی جے پی حکومت نے سبرامنیم کے عقائد اور روحانی رویہ پر اعتراض کرتے ہوئے انہیں غیر سیکولر قرار دیا اس الزام کے جواب سبرامنیم اعتراف کیا کہ عدالتی معاون کے طور کہ گمشدہ خزانہ کی تحقیقات کرتے ہوئے انہوں نے مندر میں داخل ہونے سے قبل وہ بعض مذہبی روایات کی پاسداری کی خدا سے ہدایت دعا کی لیکن ایک وکیل کے طور پر اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے ان کا رویہ کلّی طور پر سیکولر اور منطقی رہا ہے۔ اس طرح کی بے بنیاد افواہوں کو ان کی کردار کشی کے پیش نظر ذرائع ابلاغ میں منصوبہ بند طریقہ پر پھیلایا گیا۔

گوپال سبرامنیم کے بیان کی تصدیق کرکے چیف جسٹس آر ایم لودھا نے حکومت کے

منہ پر زوردار طمانچہ جڑدیا یہی وجہ ہے کہ خوب چندرا چندرا کرٹی وی کے پردے پر چہکنے والے وزیر قانون روی شنکر پرشاد کی زبان گنگ ہو گئی ۔ جسٹس لودھا نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ سبرامنیم کا نام یکطرفہ طور بغیر مجھے بتائے یا توثیق لئے حکومت نے فہرست سے الگ کردیا بدقسمتی سے جو نہایت غلط اقدام ہے۔ انہوں نے کہا میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اعلیٰ دستوری عہدوں کے ساتھ کس قدر لاپرواہی سے حکومت کھلواڑ کررہی ہے۔ جسٹس لودھا نے سولیسیٹر جنرل کے عہدے سے سبرامنیم کے استعفیٰ پر جس طرح دل کھول کر ان کی تعریف کی اس سے بھی حکومت کے رویہ پر تنقید ہوتی ہے۔ جسٹس لودھانے سبرامنیم کو لکھا ''مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ آپ نے سولیسیٹر جنرل آف انڈیا کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ آپ ہر مقدمے میں مرکزی حکومت یا اس کے شعبہ جات کی پیروی کرتے ہوئے اپنی مہارت کا مظاہرہ کیا س دوران آپ کا اعلیٰ کردار، خوش خلقی اوریکسوئی قابلِ تعریف تھی۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کے باوجوداین ڈی اے کے ارادے خطرناک ہیں ۔ اس نے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کے تقرر میں حکومت کا عمل دخل بڑھانے کی غرض سے قومی عدالتی کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیاہے۔ موجودہ نظام کے تحت عدالتی کمیٹی کو اصرار کرکے حکومت کی سفارش کو مسترد کرنے کا حق حاصل ہے جس پر شب خون مارنے کی تیاری کی جارہی ہے تاکہ سبرامنیم جیسے باضمیر لوگوں کے پر کترے جاسکیں۔ فی

الحال ملک کی صورتحال یہ ہے اصحاب اقتدار کے آگے عدالیہ بھی بے بس ولاچار نظر آرہی ہے بقول فیض

بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

جسٹس لودھا نے گوپال سبرامنیم سے ملاقات کے دوران انہیں اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے کیلئے کہا اس پر سبرامنیم نے ایک دن کا وقت مانگا مگر دوسرے دن اپنے مختصر سے خط میں بتایا کہ وہ اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اس معاملے کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جسٹس لودھا نے اپنی مشفقانہ ذمہ داری ادا کرتے ہوئے سبرامنیم کی دلجوئی کی لیکن سبرامنیم کی عزت نفس نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ ان کے محسن کو حکومت کے آگے ہاتھ پھیلانا یا اس سے

ٹکرانا پڑے۔ اس لئے وہ نہایت پروقار انداز میں حکومت کی جانب سے عدالتی نظام میں دخل اندازی پر احتجاج کرتے ہوئے کنارہ کش ہوگئے۔ سبرامنیم کے مطابق وہ کسی عہدے کے طلبگار نہیں تھے بلکہ انہیں اس کی پیشکش کی گئی تھی اور ۳۸ سال قوم کی خدمت کرنے کے بعد انہیں حکومت سے کسی سپاس نامہ کی ضرورت نہیں ہے۔ سبرامنیم نے عہدے کو ازخود ٹھوکر مار کر سیاست دانوں کو دکھلا دیا کہ ساری دنیا ان کی مانند ابن الوقت اور موقع پرست نہیں ہے۔ ان کا قابلِ تعریف

ـ رویہ ان اشعار کی مصداق ہے کہ

کبھی نا ختم کیا میں نے روشنی کا سفر جہاں چراغ بجھا دل جلا لیا میں نے

کمال یہ ہے کے دشمن پہ جو چلانا تھا وہ تیر اپنے کلیجے پہ کھا لیا میں نے

وزیر اعظم نریندر مودی کی جانب سے حکومت کے ایک ماہ کی تکمیل پر عوام کے نام ایک خط روانہ کیا گیا جس میں تھکن اور مایوسی کی جھلک نمایاں تھی۔ مودی نے لکھا ہمیں ہنی مون کیلئے ۱۰۰ دن نہیں ملے بلکہ ۱۰۰ گھنٹوں کے اندر ہمارے فیصلوں پر تنقید شروع ہو گئی۔ دراصل مودی کو شکایت کرنے کے بجائے یاد رکھنا چاہئے کہ انہیں ملک کی عوام نے ہنی مون منانے کیلئے احمدآباد سے دہلی نہیں بھیجا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کئی سال قبل جب ان کے والدین نے ہنی مون منانے کیلئے ان کا نکاح جشودھا بین سے کردیا تھا تو ستاّ کی موہ مایا (اقتدار کی محبت) میں گرفتار ہو کرانھوں نے سنیاس لے لیا اور اب برسوں کی تپیاّ کے بعد جب سنگھاسن نصیب ہوا تو ہنی مون کا خواب دیکھنے لگے۔ کانگریس کی نااہلی اور بے اعتنائی سے پریشان حال عوام کو جب نریندر مودی نے حسین مستقبل کے ـ رنگین خواب دکھلائے تو بقول سلمان احمد

وہ خواب ہی تھے چنبیلیوں سے، سو سب نے حاکم سے بیعت کر لی
پھر ایک چنبیلی کی اوٹ سے، جو سانپ نکلے تو لوگ سمجھے

کانگریس نے جن غلطیوں کو کرنے میں کئی سال کا عرصہ صرف کیا تھا وہ اس نئی سرکار سے ایک ماہ کے اندر دھڑا دھڑ سرزد ہوتے چلے گئے۔ مہنگائی کا جو ریکارڈ کانگریس نے قائم کیا تھا اسے توڑنے میں اس نے ایک خاصی سرعت کا مظاہرہ کیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ کہیں لوگ ریل کی پٹری پر کچلے جا رہے ہیں تو کہیں انہیں ڈیزل اور گیس کی آگ جھلسا رہی ہے۔ بجلی کے بحران سے حیران پریشان لوگوں کو پیاز کی قیمت خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ اس صورتحال میں کمار وشواس کا ٹویٹ درست لگتا ہے کہ نیا نیا ڈرائیور ایک مہینے کے اندر کئی حادثات کر چکا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ حادثہ کوئی کرتا ہے اور زخمی کوئی اور ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ زخمی اور ہلاک ہونے والے رائے دہندگان کس قدر جلد اس سانپ کا سر کچلنے کی فکر کرتے ہیں۔ ویسے حادثات کی رفتار اس بات کی غماز ہے کہ جلد ہی یہ برے دن جانے والے ہیں۔ عوام نے چنبیلی کے اوٹ سے نکلنے والے سانپ کو دیکھ لیا ہے اور انہیں محسوس ہونے لگا ہے کہ

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غمِ دل

ایمرجنسی کی دوسری وجہ جےؑ پرکاش نارائن کی جانب سے بلند کیا جانے والا مکمل انقلاب کا نعرہ تھا جس نے اس زحمت کو نعمت میں بدل دیا۔ ایمرجنسی کے جبر و استبداد کے خلاف علم
بغاوت بلند کرتے ہوئے جےؑ پرکاش نارائن نے عوام کو حکومت کے بجائے دستور کی

بجاآوری کیلئے پکارا تھا اور ملک بھر میں احتجاج کا ایک سلسلہ شروع کردیا گیا تھا۔ جئے پرکاش نارائن چونکہ کسی مخصوص سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور خود اقتدار کے دعویدار نہیں تھے اس لئے دیگر سیاسی جماعتیں انہیں اپنا حریف نہیں سمجھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ سارے لوگ بڑی آسانی سے ان کے پرچم تلے جمع ہوگئے۔ اب یہ کام انا ہزارے تو کرسکتے ہیں لیکن اروند کیجریوال نہیں کرسکتے اس لئے انقلاب کی یہ عوامی تحریک عام آدمی پارٹی کے تحت نہیں چل سکتی جسے دیگر علاقائی جماعتیں اپنا حریف سمجھتی ہیں۔ اگر وہ دہلی کی علاقائی جماعت کے طور حزب اختلاف کے اتحاد میں شامل ہوجائیں تو ایک مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ یہ سب کب ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ ہوگا بھی یا نہیں ؟ یہ تو وقت بتائے گا!

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سرزمینِ فلسطین پر پھر ایک بار کربلا برپا ہے۔ مجاہدین اسلام اور فلسطین کی جیالے عوام اپنے لہو سے گلشنِ اسلام کی آبیاری کررہے ہیں ۔ دین اسلام کا شجر برگ وبار لارہا ہے ۔اس بیچ اچانک مصر کے منافق حکمرانوں کی جانب سے ایک امن کی تجویز پیش کی گئی اور اسے اسرائیل کی پارلیمان نے منظور کرلیا لیکن حماس اور اسلامی مزاحمت کاروں نے مسترد کردیا۔ دنیا کے بھر کے مسلمان جو غزہ کے اندر جاری خون خرابے سے پریشان تھے اور جلد از جلد اس کا خاتمہ چاہتے تھے اس پیش رفت سے حیرت زدہ رہ گئے لیکن وہ لوگ جو قریب سے حالات کا مشاہدہ کررہے تھے انہیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ جس طرح کا ڈرامہ اس بار اسرائیل کے ساتھ مل کر کھیلا گیا اس کے ساتھ یہی قرار واقعی سلوک تھا۔ اس مرتبہ فلسطین میں اسرائیلی درندگی کا آغاز غزہ کے بجائے مغربی کنارے سے ہوا لیکن مصری خاموش تماشائی بنے رہے۔ اس کے بعد غزہ پر بمباری شروع ہوئی معصوم شہری اس کا شکار ہونے لگے تب بھی ان کی زبان سے مذمت کا ایک لفظ نہیں پھوٹا۔ ان ڈاکٹروں کیلئے جو اپنی جان سے کھیل کر دنیا بھر سے غزہ کے زخمیوں کا علاج کرنے کیلئے آئے تھے انہیں تک مصری انتظامیہ نے غزہ جانے سے روک دیا۔

اللہ تعالٰی کی جانب سے مسلمانوں پر آنے والی آزمائش کی ایک وجہ سچے اور کچے اہل ایمان یعنی منافقین کو الگ چھانٹ دینا بھی ہوتا ہے۔ گزشتہ مرتبہ جب اسرائیل نے حملہ کیا تھا تو صدر محمد مورسی نے اپنے وزیر اعظم قندیل کو سیکڑوں رضاکاروں سمیت غزہ روانہ کیا تھا لیکن اس بار مصری حکمرانوں نے اپنا ہرکارہ غزہ کے بجائے تل ابیب روانہ کیا تاکہ اسرائیلی حکومت کے ساتھ تال میل کیا جاسکے۔ اسرائیل کو بے دریغ بمباری سے روکنے کے بجائے سینائی میں کارروائی کرکے اسرائیل کی جانب پھینکے جانے والے راکٹ .برادروں پر حملہ کرکے صہیونیوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس کے بعد ایک سازش کے تحت امریکہ کے اشارے پر فلسطینیوں کو اعتماد میں لئے بغیر ایک جنگ بندی کی پیشکش اسرائیل کی خدمت میں پیش کردی اور جسے اسرائیل کی پارلیمان نے شرف قبولیت سے نواز دیا۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کسی کو ایک ہفتہ تک جیل میں زدوکوب کیا جائے۔ اس کو بھوکا پیاسا رکھنے کے بعد اس کی جانب ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جائے۔ ایسے میں اگر وہ خوددار قیدی اس روٹی کے ٹکڑے کو ظالم کے منھ پر دے مارے تو کہا جائے کہ اس پر ہونے والے مظالم کو اسی کے سر ڈال کر انہیں حق بجانب قرار دے دیا جائے

حماس کے جنگ بندی کو قبول نہ کرنے سے اسرائیل کو اب اپنی جارحیت جاری رکھنے

کا نیا بہانہ مل گیا ہے۔ جب یہ انکار سامنے نہیں آیا تھا اس وقت یہ جواز تھا چونکہ حماس کی جانب سے راکٹ پھینکے جارہے ہیں اس لئے وہ مجبور ہے۔ جب راکٹ نہیں پھینکے جارہے تھے یہ بنیاد تھی کہ حماس کے لوگوں نے تین یہودیوں کا قتل کردیا ہے اس لئے تمام فلسطینیوں کو اجتماعی سزا دینے کا حق اسے حاصل ہوگیا ہے۔ جب یہودی قتل نہیں ہوئے تھے اس وقت فلسطینی نوجوانوں کو شہید کرنے کیلئے نقبہ کے دن پرامن احتجاج میں شریک ہونا وجۂ جواز تھا۔ جب وہ احتجاج نہیں ہوا تھا اس وقت محمود عباس کے ساتھ امن معاہدے پر گفتگو ترک کرنے کیلئے یہ دلیل پیش کی گئی کہ عباس نے حماس کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنالی ہے جبکہ اس اتحاد سے سے پیشتر محمود عباس کو عار دلائی جاتی تھی وہ سارے فلسطینیوں کی نمائندگی نہیں کرتے حماس ان کی رہنمائی تسلیم نہیں کرتی اس لئے ان سے بات چیت بے سود ہے۔ گویا بہانے، دلائل اور جواز بدلتے رہے لیکن بربریت کا بازار بہر صورت گرم رہا۔ گویا جبر و استبداد کو جاری رکھنا بنیادی مقصد ہے اس کیلئے بوقتِ ضرورت مختلف قسم کے حیلے بہانے تراش لئے جاتے ہیں۔

حماس اور اسلامی جہاد کے رہنما بھی مصر کی مفاہمت کا خواہشمند تھے لیکن مصری اہلکاروں کو چاہئے تھا کہ وہ یکطرفہ طور اسرائیل کے مشورے سے تیار کئے جانے والی تجویز کو پیش کرنے کے بجائے حماس یا عباس گفتگو کرکے ان کی شرائط کو

بھی اس میں شامل کرتے لیکن کسی غلام سے اس بات کی توقع کیوں کر ممکن ہے کہ وہ دوسروں کی آزادی اور عزت و وقار کا پاس و لحاظ کرے گا۔ حماس کے اس جرأتمندانہ فیصلے کے بعد ممکن ہے مصر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ہو اور آئندہ وہ مفاہمت کرنے سے قبل کسی ایک فریق کا حلیف بننے کے بجائے غیر جانبدار ثالث کا کردار ادا کرے گا اور دونوں فریقوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرے گا نیز ظالم و مظلوم کے درمیان امتیاز کرکے مظلوم کی ہمنوائی بھی کرے گا۔ مصر کے حالیہ موقف سے وہ مژدہ بھی کھل گیا کہ گزشتہ سال ڈاکٹر مورسی کی برطرفی کے بعد اسرائیل کی خوشی کی وجہ کیا تھی؟ اسرائیل اپنے آپ کو اور سارا مغرب اس کو بڑے فخر سے مشرق وسطیٰ کی واحد جمہوریت قرار دیتا ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اپنے پڑوس میں ایک عوامی حکومت کا تختہ الٹ کر فوجی آمر کے برسرِ اقتدار آجانے پر وہ رنج و غم کا اظہار کرتا لیکن اس کے برعکس اس نے آگے بڑھکر جنرل السیسی کا استقبال کیا تھا اس لئے کہ اسے پتہ تھا کہ جس طرح ڈاکٹر مورسی نے بروقت مداخلت کرکے اس کی جارحیت کو روکا ہے اس کا مظاہرہ یہ فوجی کھال کے اندر چھپا ہوا بزدل نہیں کرسکے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسرائیل کا حوصلہ بلند کرنے والوں میں نہ صرف السیسی بلکہ اس کی حمایت کرنے والے مسلم ممالک کے سارے رہنما برابر کے شریک ہیں جن کی زبانوں اور دلوں پر قفل پڑا ہوا ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ حماس اور اسلامی جہاد تحریک کے لوگ جنگ وجدال کے خوگر ہیں جبکہ اسرائیل اور مصر امن کا خواہاں ہے حالانکہ حقیقی صورتحال اس کے برعکس ہے۔ اسلامی جہاد نے بہت پہلے مصری مداخلت کا خیر مقدم کرتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ مصر کے ثالث کا کردار نبھائے بغیر دشمن کو جنگ بندی کیلئے آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی کے ساتھ رمضان شالا نے یہ بھی اعلان کیا تھا یہ جنگ اس وقت تک بند نہیں ہوگی جب تک کہ غزہ کا محاصرہ ختم نہیں کیا جاتا۔ انہوں نے کہا کہ سکون برائے سکون قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حماس کے ترجمان سامی ابوزہری نے کہا تھا کہ ہم اپنے عوام کی مدافعت جاری رکھیں گے اور امن کی بھیک نہیں مانگیں گے۔ جب ہمارے سامنے ایک مناسب، معقول، مربوط و سنجیدہ تجویز پیش کی جائیگی تو اس پر غور کریں گے لیکن مصر و اسرائیل نے ان تمام لوازمات کو بالائے طاق رکھ کر ایک مصنوعی جنگ بندی تھوپنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔

جنگ بندی کی تجویز کو مسترد کرکے حماس نے یہ پیغام دیا ہے کہ اب یہ نہ ہوگا پہلے اسرائیل کو خوب خاک و خون کی ہولی کھیلنے کا بھرپور موقع دیا جائے اور پھر جنگ بندی کی چاکلیٹ تھما کر مجاہدین اسلام کو ان کے حق مدافعت سے محروم کردیا جائے۔ اس جنگ بندی معاہدے میں جسے مغرب کے جنگی مجرم ٹونی بلیر نے لکھا ان شہداء کیلئے کوئی خراج عقیدت نہیں ہے جنھوں نے اپنی جان کا نذرانہ

پیش کیا۔ بے دریغ بمباری کے نتیجے میں لگنے والے زخموں پر نمک پاشی کی گئی ہے ۔گھروں کو مسمار کرنے والوں کے سارے قصور معاف کردیئے گئے ہیں ۔ اس جنگ بندی کو اس وقت تک نافذ کرنا بے معنی ہے جب تک کہ مجرم کی نشاندہی نہ ہو۔ اس کی سرزنش نہ کی جائے۔ مصر کے ساتھ سرحد کو کھولا نہ جائے اور جن بے قصور لوگوں کو حال میں یا اس سے قبل گرفتار کیا گیا ہے انہیں رہا نہ کیا جائے۔

اسرائیل کے وزیر اعظم نتن یاہو نے اس جنگ بندی کے حوالے سے اپنے ارادوں کا ظہار کرتے ہوئے جرمنی کے وزیر خارجہ سے دل کی بات یوں کہی کہ اس کی بدولت غزہ کو غیر مسلح کرنے کا نادر موقع ہمارے ہاتھ آجائیگا۔ کسی ایسی جنگ بندی کو بھلا فریق ثانی کیوں کر قبول کرسکتا ہے جو اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے والی ہو۔ اسی لئے اس کی تجویز کی حمایت کرنے والے اسرائیل پارلیمان میں موجود حزب مخالف کے رہنما نے کہا کہ یہ دوبارہ جارحیت کے

درمیان ایک وقفہ ثابت ہوگی کیوں کہ اس کے نتیجے میں کوئی بامعنی معاہدہ نہیں ہو سکتا ۔اسرائیلی حکومت کے انتہا پسند وزیر دفاع افگڈور لیبر من اور وزیر تجارت نفتال بینیٹ نے اس جنگ بندی کے خلاف ووٹ دیا۔ اس ناکامی کے بعد جہاں نتن یاہو نے دوبارہ حملے تیز کرنے کا اعلان کیا وہیں جنگ میں ہلاک ہونے والے پہلے یہودی کے موت کی خبر بھی منظر عام پر آئی۔ مسلمانوں کیلئے

تقریباً دو سو شہداء کے مقابلے صرف ایک یہودی کے موت کی خبر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی لیکن اسرائیل جہاں ہیبران کا چیف ربیؔ ڈوف لیور علی الاعلان یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ایک ہزار غیر یہودیوں کی زندگی ایک یہودی کے ناخن کے برابر بھی نہیں ہے وہاں ایک یہودی کی موت بھی بہت بڑی خبر ہے اس لئے کہ یہودیوں کے اندر پائے جانے موت کے خوف کا گواہ کلامِ ربانی ہے۔

اس معاملے میں عالمی برادری کی جانبداری بھی قابلِ دید ہے اگر اسرائیل کے اندر فلسطینی مجاہدینِ آزادی ردعمل کے طور پر ایک دھماکہ کردیں اور اس سے دوچار لوگ ہلاک ہوجائیں تو اسے دہشت گردانہ حملہ قرار دے کر اسلام پر سوالیہ نشان لگا دیا جاتا ہے اور روشن خیال مسلمان فوراً صفائی دینے جٹ جاتے ہیں کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ دہشت گرد سرے سے مسلمان ہی نہیں ہیں لیکن کوئی یہودیوں سے سوال نہیں کرتا کہ کیا ڈوف لیور کا فتویٰ یہودی صحائف کا ترجمان ہے اور یہودیت کی یہی تعلیم ہے۔ یوروپ اور امریکہ کے اکثر و بیشتر نصرانی ظالم اسرائیل کے بجائے مظلوم فلسطینیوں کو اس جنگ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ کیا عیسائیت کی رحملی اور غیر جانبداری اسی رویہ کا تقاضہ کرتی ہے؟ ان کی نمائندہ نام نہاد سیکولر جمہوری حکومتیں حماس کی راکٹ باری کی پرزور مذمت کرتی ہیں جن میں کوئی ہلاک نہیں ہوتا لیکن اسرائیلی بمباری کو حق بجانب قرار دیتی ہیں کیا اسی کا نام

انصاف اور رواداری ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری طاغوت کی فریب کاریاں جن کی خوشنما نقاب ان حالات میں تارتار ہو جاتی ہے اور ان کا اصلی چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ اسرائیل کی جانب سے کی جانے والی جارحیت کی کئی داخلی و خارجی وجوہات ہیں۔ نتن یاہو کے خلاف اس کی اپنی جماعت لکڈ کے اندر شدید بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ یا ہو مخالف سب سے زیادہ طاقتور رہنما وزیر انصاف زپی لیونی نے ۱۱ جون کو حکومت سے الگ ہونے کی دھمکی دی اور ۱۲ جون کو تین یہودی نوجوانوں کے اغواء کی خبر آئی۔ ان میں سے ایک فوجی تھا اور دوسرا فلسطینی قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کیلئے معروف تھا۔ ان کو دو فلسطینیوں نے قتل کردیا جس کا پتہ حکومت کو فوراً چل گیا لیکن یا ہو نے جان بوجھ کر اس خبر کو صیغۂ راز میں رکھا اور مغربی کنارے کے فلسطینوں کے خلاف محاذ کھول دیا۔ سیکڑوں معصوموں کو گرفتار کیا گیا جن میں ارکان پارلیمان بھی شامل تھے اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے ایک ایسا زبردست ہنگامہ کھڑا کیا گیا کہ لیونی کی مخالفت پس پردہ چلی گئی ۔ سارے دنیا میں نفرت و عناد کی آگ بھڑکا کر محمود عباس پر حماس سے قطع تعلق کیلئے دباؤ ڈالا گیا جبکہ حماس نے اس معاملے میں ملوث ہونے سے صاف انکار کردیا تھا۔

اس حادثے کی تفتیش کے دوران پولس اہلکاروں نے کئی بے قصور فلسطینیوں کو شہید کیا اور پھر دو یہودی نوجوانوں کی جانب سے عبدالقدیر کو زندہ جلانے کا واقعہ بھی منظر عام پر آیا۔ اس پر حکومت نے کارروائی کا آغاز کیا اور ٦ لوگوں کو گرفتار کرلیا تاکہ مقدمہ کو کمزور کیا جاسکے جبکہ ویڈیو میں دونوجوانوں کو صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے یہودی قاتلوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی میں ان کے متعلقین کو معتوب نہیں کیا گیا۔ ان سے متعلق کسی جماعت کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا گیا اس کے برخلاف مسلم قاتلوں کے گھروں کو منہدم کیا جاچکا ہے جس جواز دنیا کے کسی قانون میں نہیں ہے اس لئے ان کے اہل خانہ کا اس جرم میں کوئی حصہ نہیں ہے لیکن جہاں انصاف کے پیمانے جدا جدا ہوں اور اس طرح کی وارداتوں سے سیاسی فائدہ حاصل کرنا مقصود ہو یہی سب ہوتا ہے۔

ایک اور حقیقت یہ ہے کہ نتن یاہو اپنی پارلیمان میں اکثریت سے محروم ایک مخلوط حکومت چلا رہا ہے۔اس کا اقتدار انتہا پسند دائیں بازو کی جماعتوں کی بدولت قائم ہے اور ان کے مطالبات کو پورا کرنے اور ان کی توقعات پر پورا نہ اتر پانے کے سبب وہ یکے بعد دیگرے یاہو سے دور ہوتی جارہی ہیں ۔ان جماعتوں لیبر من کی اسرائیل بنتانو نے ٧ جولائی کو اپنا معاہدہ ختم کردیا۔ اس نئی مصیبت پر قابو پانے اور انتہا پسند یہودی رائے دہندگان کی دلجوئی کیلئے نتن یاہو نے غزہ پر حملہ کردیا اور ایک ایسی صورتحال پیدا کردی جس میں لیبر من

کو وقتی طور پر تو حکومت گرانے کے ارادوں کو ملتوی کرنا پڑا۔ اسرائیلی حکمرانوں کا انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر یا اپنی سیاسی ناکامی کی جانب سے توجہ ہٹانے کی غرض سے فلسطینیوں کو نشانہ بنانا اب جگ ظاہر ہو چکا ہے۔

اس بار اسرائیل کی اور بھی کئی ضرورتیں تھیں جنہیں جنگ کے ذریعہ حاصل کرنے کی سعی کی گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فلسطینیوں کو بے گھر کرکے وہاں نئی بستیاں بنانے کی مخالفت نے اسرائیل کو عالمی پیمانے پر یکہ و تنہا کر دیا تھا۔ اوبامہ انتظامیہ بھی اس معاملے میں اسرائیل کی مذمت کا ڈھونگ کرتا رہا تھا۔ اقوام متحدہ کے اندر فلسطینیوں کو ملنے والی حمایت سے یہ لوگ پریشان تھے ایسے میں حماس اور فتح کی مخلوط حکومت نے اسرائیل کی نیند اڑا دی۔ حماس کے اقتدار سے دستبردار ہو جانے کے بعد غزہ کے حصار کا وہ لنگڑا لولا جواز بھی اپنی موت مر گیا جس کے سہارے اسرائیل غزہ کی پٹی کو کھلی جیل میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس فیصلے سے حواس باختہ ہو کر ماہِ اپریل میں اسرائیل نے امریکہ کی سربراہی میں ہونے والی امن گفتگو سے اپنے آپ کو الگ کرکے اسے مزید ناراض کر دیا تھا لیکن اس جنگ کے ذریعہ پھر ایک بار اسرائیل نے ساری عالمی برادی کے سامنے اپنے آپ کو حماس کے راکٹوں کا شکار بنا کر پیش کیا اور یوروپ و امریکہ نے جانتے بوجھتے ہوئے بڑی بے شرمی کے ساتھ اس کی حمایت

کی۔ اس طرح گویا اسرائیل کی بین الاقوامی تنہائی دور ہو گئی بلکہ اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون نے بھی جو اسرائیل کے مخالف رہے ہیں نہایت مایوس کن بیان دے کر اسرائیل کے بجائے حماس کی مذمت کرڈالی۔

اس میں شک نہیں کہ اسرائیل کی فوجی طاقت کے مقابلے حماس کے وسائل نہایت محدود ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت کہ حماس کے قوت ایمانی، شجاعت وجرأتمندی اور صبر استقامت صہیونیوں کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ اس لئے وقفہ وقفہ سے اس طاقت کو کچلنے کی مذموم کوشش اسرائیل کرتا رہا ہے۔ حالیہ برسوں میں ۲۰۰۶؁ کے بعد ۲۰۰۸؁ اور پھر اواخر ۲۰۰۸؁ میں اس کی سعی کی گئی۔ اس جنگ سے قبل ۲۰۱۲؁ میں بھی یہ حربہ آزمایا گیا۔ ۲۰۰۸؁ میں نہ صرف ہوائی حملہ کیا گیا بلکہ زمینی جنگ بھی ہوئی جس میں اسرائیلی ذرائع کے مطابق ۱۱۶۶ افراد شہید ہوئے اور جن میں سے ۷۰۹ مجاہدین تھے۔ ان اعداوشمار پر یقین تو نہیں کیا جاسکتا لیکن رجحان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس جنگ میں ۱۳ اسرائیلی مارے گئے تھے جن میں ۱۰ فوجی تھے لیکن ۲۰۱۲؁ کے دوران چونکہ مصر میں حماس کی حامی حکومت برسرِ اقتدار تھی۔ ایک انسانی حقوق کی تنظیم کے مطابق ۱۶۷ فلسطینی شہید ہوئے تھے جن میں نصف سے کچھ کم مجاہدین تھے جبکہ ۶ یہودی مارے گئے جن میں سے دو فوجی تھے۔

اس بار ابھی تک ۱۹۷ فلسطینی شہید ہو چکے ہیں اور اقوام متحدہ کے مطابق ان میں ۸۰ فیصد شہری ہیں جبکہ ایک یہودی کے مارے جانے کی خبر آچکی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس مرتبہ پہلی بار نہ صرف تل ابیب بلکہ یروشلم تک پر راکٹ برسائے گئے ہیں اور مجاہدین نے راکٹ کے علاوہ ڈرون کا بھی استعمال کیا۔ سیاسی اعتبار سے حماس نے اپنی حکومت کو قربان کرکے جو کچھ گنوایا تھا اسے پھر سے حاصل کرلیا ہے۔ آج ساری دنیا جانتی ہے کہ فلسطینیوں کا حقیقی نمائندہ اور محافظ کون ہے ؟ نہ صرف غزہ بلکہ مغربی کنارے پر بھی ہر کوئی حماس کے ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مغربی کنارے سے وزیر صحت نے غزہ کا دورہ کیا تو عوام نے

اس کو جوتے دکھا کر نعرے لگائے ۔ محمود عباس جاسوس ہے اور وزیر اعظم رامی حمداللہ غدار ہے۔

محمود عباس نے کم از کم اس مرتبہ غزہ والوں کو اس جنگ کیلئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا لیکن یہ ضرور کہا کہ یہ راکٹ کیوں پھینکے جاتے ہیں ہم حکمت و سیاست کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن بیچارے محمود عباس کو کیا پتہ کہ اسرائیل کی جانب جانے والا ہر میزائل یہ پیغام لے کر جاتا ہے کہ اے اسرئیلیو ! ہمارا واپسی کا حق اس راکٹ کی مانند بنیادی نوعیت کا ہے اور اس پر

کوئی مصالحت ممکن نہیں ہے۔ تم نے ہماری زمین پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے۔ تمہارا تعلق اس سرزمین سے نہیں ہے۔ کسی ناجائز قبضے کی طوالت اسے جائز نہیں بنا سکتی۔ اس لئے تم پہلی فرصت میں متبادل مسکن تلاش کرکے نکل جاؤ۔ یہی اس جنگ کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ مجاہدین نے اس بار کون سی حربی اور نفسیاتی حکمتِ عملی اختیار کی یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے لیکن مختصراً رونما ہونے والے حقائق اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں کہ اسرائیلی جارحیت اور عالمی مخالفت کے باوجود اسلامی مزاحمت کمزور ہونے کے بجائے مضبوط تر ہوتی جارہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب شہیدوں کا لہو رنگ لائیگا۔ شہداء کی سعید روحیں جنت کے فانوس پر بیٹھ کر نظارہ کریں گی کہ جس شجر خبیثہ نے ان کی سرزمین پاک کو آلودہ کردیا تھا اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا جاچکا ہےاور گلشن اسلام اسرائیل نامی ناسور سے پاک ہو چکا ہے۔ اللہ کا کلمہ غالب ہو کر رہے گا کہ وہ غالب ہونے ہی کیلئے ہے۔

علاقائی سیاست: پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں

اس سال قومی انتخاب میں بی جے پی نے محض ۳۱ فیصد ووٹ حاصل کرکے جو غیر معمولی کامیابی درج کرائی اس کی بنیادی وجہ شمالی وسطی ہند میں اس کا ارتکاز تھا۔ اس کے سبب اسے ایک فیصد ووٹ کے بدلے ۹ سے زیادہ سیٹیں مل گئیں اس کے برعکس بہوجن سماج پارٹی نے جسے ۴ سے زیادہ فیصد ووٹ حاصل ہوئے خالی ہاتھ رہ گئی اس لئے اس کی طاقت بکھر گئی تھی۔ جن ریاستوں میں بی جے پی نے غیر معمولی کامیابی درج کرائی ان میں یا تو اس کی صوبائی حکومت تھی یا ماضی میں وہ وہاں پر حکومت کر چکے تھے گویا عوام میں اس کا نفوذ تھا۔ ان میں سے تین بہار، مہاراشٹر اور اترپردیش ایسی بڑی ریاستیں ہیں جہاں بی جے پی ریاستی اقتدار سے محروم ہے۔ انتخابی کامیابی کے بعد بی جے پی کی رال ان صوبوں میں ٹپکنے لگی اور شروع ہوگیا نیا سیاسی چکرویوہ۔ بقول فیضؔ

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں

بہار: ریاستِ بہار کی کامیابی نے بی جے پی سمیت ساری دنیا کو چونکا دیا۔ جنتا دل (یو) کا جب صفایہ ہوگیا تو بی جے پی نے یہ افواہ اڑادی کہ جے ڈی

یو کے پچاس ارکانِ اسمبلی اس سے رابطے میں ہیں اور جلد ہی ریاست میں سشیل مودی وزیر اعلیٰ بننے والے ہیں۔ اس بار سارے لوگوں کو ایسا لگنے لگا کہ بی جے پی کا یہ خواب واقعی شرمندۂ تعبیر ہوجائیگا لیکن اس نازک صورتحال میں نتیش کمار اور لالو یادو نے کمال دانشمندی کا ثبوت دیا۔ بی جے پی کے سیلاب پر بندھ باندھنے کیلئے ان دونوں نے بالترتیب اقتدار پرستی اور انانیت پسندی کو بالائے طاق رکھ دیا نتیجہ میں سشیل مودی کاخواب چکنا چور ہوگیا۔

اس بابت اول تو نتیش کمار قابلِ ستائش ہیں کہ انہوں نے شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ پیش کردیا۔اس غیر متوقع فیصلہ نے بھاجپ کے مخالفت کی ہوا نکال دی۔ اب ایک نئے وزیر اعلیٰ کی مخالفت بی جے پی کس منہ کرسکتی تھی جس کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو اور جو انتخابی شکست کیلئے سرے سے ذمہ دار بھی نہ ہو۔ نتیش کمار کے استعفیٰ نے لالو یادو کیلئے جے ڈی یو کی حمایت کو سہل بنادیا۔ بی جے پی نے اسے ناپاک الحاق قرار دیا گویا پاسوان اگر لالو کو چھوڑ کر ان سے مفاہمت کرے تو وہ پاک صاف دوستی ہوگی اور نتیش اگر ان چھوڑ کر لالو کے ساتھ جائیں تو ناپاک تعلق ہوجائیگا ۔ لالو یادو نے اپنی برسوں پرانی دشمنی پر خاک ڈال کر وسعتِ قلبی و بالغ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نئی حکومت کو اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں مدد کی ۔ اس طرح گویا لالو نے اڈوانی کی رتھ یاترا کی طرح مودی کے رتھ کو بہار میں روک دیا۔

لالو نے آگے چل کر ایوانِ بالا کے انتخاب میں بھی جے ڈی یو کے صدر شر د یادو کو بلا مقابلہ کامیاب کروا دیا۔ اب لالو اور نتیش مشترکہ محاذ بنا کر آئندہ انتخاب لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس اقدام سے غیر بی جے پی رائے دہندگان کے اندر ایک نیا اعتماد اور ولولہ پیدا ہوا ہے جو یقیناً رنگ لائیگا۔ اس پر مہنگائی کی مار اور رام ولاس پاسوان جیسے اشیائے خوردنی کے وزیر کا بیان کہ مہنگائی کا سبب ذرائع ابلاغ ہے اپنا اثر ضرور دکھلائے گا۔ مرکزی حکومت کے چہرے سے اٹھنے والی نقاب اٹھ جانے کے سبب اس کا عوام دشمن کریہہ چہرہ رائے دہندگان کے سامنے آچکا ہے س لئے بہار میں بی جے پی کیلئے اقتدار کا حصول اب آسان نہیں ہو گا۔

اترپردیش : ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والے کسی اندازے نے اترپردیش میں بی جے پی کو ۵۵ سے زیادہ اور بی ایس پی کو پانچ سے کم سیٹیں نہیں دی تھیں لیکن نتائج اس طرح سے آئے کہ بی جے پی ۷۲ اور بی ایس پی کا پتہ صاف ہو گیا۔ ایس پی پانچ اور کانگریس کو دو پر اکتفاء کرنا پڑا۔ اس کامیابی نے اترپردیش کے بی جے پی رہنماؤں کو اقتدار کیلئے بے کل کر دیا۔ ان کیلئے اترپردیش میں بھی سب سے بڑا خطرہ وہی ہے جو بہار میں تھا یعنی ایس پی اور بی ایس پی کا اتحاد۔ ویسے اسمبلی میں واضح اکثریت کے سبب اکھلیش کو کسی حمایت کی ضرورت

نہیں ہے لیکن بی جے پی والے عوامی سطح پر ایک ایسی صورتحال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ مایاوتی کیلئے ملائم کے ساتھ جانا ناممکن ہو جائے اور اگر مایاوتی اس کی کوشش کرے تو دلت رائے دہندگان ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر ایک نہایت گھناؤنی سازش رچی گئی اور شروع کیا گیا دلت لڑکیوں کی عصمت دری کا سلسلہ ۔ اس بربریت کا الزام پوری طرح ملائم پر ڈالنے کیلئے اس منصوبے پر عملدرآمد کیلئے ان علاقوں کا انتخاب کیا گیا جہاں یادو برادری کی اکثریت اور ایس پی کا زور ہے۔ یہ ایک دو دھاری حکمت عملی تھی ۔ اگر ملائم اس بابت نرمی دکھلائیں تو دلت سماج کے اندر ان کے خلاف نفرت بھڑکاکر مایاوتی کو سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور کردیا جائے تاکہ دونوں کے درمیان کی کھائی وسیع تر ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر ملائم ملزمین کے خلاف سخت رویہ اختیار کریں تو یادو سماج کو ایس پی سے برگشتہ کرکے اپنا ہمنوا بنالیا جائے ۔

اس معاملے میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اترپردیش میں ایس پی کی سرکار ابھی حال میں تو قائم نہیں ہوئی بلکہ وہ دوسال کا عرصہ گذار چکی ہے۔ اگر اس طرح کے واقعات کی وجہ اس کا اقتدار میں آنا ہے تو اس کا آغاز بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اترپردیش کے سیاسی افق پر ماضی قریب

میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ بی جے پی کی کامیابی ہے اس لئے اگر اس کے پس پشت سیاسی محرکات ہیں تو اس کی سوئی بی جے پی کی جانب مڑتی ہے۔ کم از کم یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ بی جے پی کی کامیابی نے ظالموں کے حوصلے اس قدر بلند کردیئے کہ وہ معصوم لڑکیوں کی عصمت دری کرکے انہیں پیڑ پر لٹکانے تک سے باز نہیں آتے۔ ذرائع ابلاغ میں ان واقعات کو اس طرح اچھالا گیا گویا اس انارکی اور جنگل راج کیلئے صرف اور صرف اکھلیش سرکار ذمہ دار ہے۔

بی جے پی نے سڑکوں پر اتر کر جب احتجاج کرنا شروع کیا تو ایسا لگنے لگا کہ اکھلیش کی الٹی گنتی شروع ہوگئی ہے وہ دن دور نہیں جبکہ اترپردیش میں صدر راج نافذ کرکے انتخابات کا اعلان کردیا جائیگا اور پھر دیکھتے دیکھتے زعفرانی پرچم لکھنؤ پر لہرانے لگے گا ۔لیکن پھر ہوا کا رخ بدلا مدھیہ پردیش سے بھی دلت خواتین کی عصمت دری کے بہیمانہ واقعات منظرِ عام پر آئے اور مرکزی وزیر پٹرولیم نہال چند میگھوال کو عصمت دری کے الزام میں جےپور کی عدالت نے ملزم کی حیثیت سے حاضر ہونے کا حکم دے دیا۔ اس واقعہ نے بی جے پی سرکار کے ہاتھ سے عصمت دری کا مدعا چھین لیا۔ بی جے پی کیلئے میگھوال کو وزیر رکھنا اور نکالنا دونوں مشکل ہوگیا اس طرح عصمت دری کی سیاست پر روک لگ گئی ۔

اس کے بعد بی جے پی نے مرادآباد ضلع میں فرقہ وارانہ پانسہ پھینکا اور مسلمانوں کو دلتوں سے لڑانے کی کوشش کی۔ کانٹھ نامی گاوں میں کل چار چار ہزار ہندو اور مسلمان آباد ہیں ۔ ہندووں کی زیادہ تر آبادی دلت ہے۔ وہاں ایک مندر کا لاوڈا سپیکر خراب ہوگیا تھا جسے مرمت کے بعد جب دوبارہ لگایا گیا تو کسی نے پولس میں شکایت کردی اور اسے اتار لیا گیا۔ بی جے پی نے اس معمولی سے مسئلہ پر مہا پنچایت بلا کر مظفر نگر کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس بابت پولس کا بیان کہ لاوڈا سپیکر کی اجازت نہیں لی گئی تھی احمقانہ لگتا ہے اس لئے کہ مذہبی مقامات پر لگائے جانے والے لاوڈا سپیکر کی اجازت لینے کا رواج ہمارے ملک میں نہیں ہے۔ ایس ایس پی کی جانب سے بی جے پی کو موردِالزام ٹھہرانے پر اور بی جے پی ایم ایل اے کے خلاف ایف آئی آر درج کئے جانے پر بی جے پی چراغ پا تو ہوئی لیکن کچھ کر نہ سکی ۔

سماجوادی پارٹی کو چاہئے تھا کہ سماج کے سرکردہ لوگوں کو ساتھ بٹھا کر باہمی گفت و شنید کے ذریعہ اس مسئلہ کا حل نکالتی لیکن اس نے قانون کے ڈنڈے سے اسے سلجھانے کی کوشش کی جس سے بی جے پی کو اس کا ناجائز سیاسی فائدہ اٹھانے کا نادر موقع مل گیا۔ ایس پی کا بھی عجیب معاملہ ہے کبھی تو وہ

ہندوؤں کی دلجوئی کیلئے مظفر نگر میں انہیں جی بھر کے مظالم کرنے کا موقع عنایت کر دیتی ہے تو کبھی مسلمانوں کو خوش کرنے کیلئے سختی پر اتر آتی ہے۔اس بار مہاپنچایت کو روکنے میں اس نے کامیابی تو حاصل کر لی ہے لیکن کشیدگی ہنوز قائم ہے۔ مرکزی وزارت داخلہ نے اس سانحہ کا سخت نوٹس لیا ہے اور ریاستی حکومت سے رپورٹ طلب کی ہے۔ بی جے پی نے اپنے ارکانِ پارلیمان کی تفتیشی کمیٹی بھی جائے حادثہ کا جائزہ لینے کیلئے روانہ کی ہے۔ ایس پی کو آئندہ اس طرح کی صورتحال میں پختہ سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرنا ہوگا ورنہ وہ دونوں جانب سے خسارے میں رہے گی۔

مہاراشٹر: اس سال ماہِ دسمبر کے اندر مہاراشٹر میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہونے والے ہیں۔ مہاراشٹر کے اندر بی جے پی اور شیوسینا کی حکومت تقریباً یقینی نظر آرہی ہے لیکن یہاں اصل جنگ خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے۔ مہاراشٹر گو کہ آر ایس ایس کی جنم بھومی ہے اور نہ صرف اس کے بانی ڈاکٹر ہیڈگیوار بلکہ مفکرِ اعظم گرو گولوالکر کا تعلق بھی اسی ریاست سے ہے۔اس کے باوجود سنگھ کو مہاراشٹر میں عرصۂ دراز تک پذیرائی نہیں ملی ۔ مہاراشٹر میں دائیں بازو کا زور رہا اور براہمن دانشوروں نے بھی ہندوتوا پر اشتراکیت کو ترجیح دی۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ جہاں ہندو مہاسبھا کے ساورکر اور گوڈسے پیدا ہوئے وہیں جیوتی با پھلے اور ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی اپنی اصلاحی

تحریک چلائی بلکہ کانشی رام نے بھی اپنے کام کا آغاز پونے میں کیا تھا۔ کانگریس کو بال گنگا دھر تلک اور گوپال کرشن گوکھلے جیسے رہنما اسی سرزمین سے ملے۔

بی جے پی کو مہاراشٹر کے اندر اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کیلئے علاقائی جماعت شیو سینا کے رہنما بال ٹھاکرے کے آگے جھولی پسارنی پڑی نیز براہمنوں کے بجائے پسماندہ طبقات کے ہاتھ میں ریاستی قیادت سونپنے پر مجبور ہونا پڑا۔ گوپی ناتھ منڈے کو اسی حکمت عملی نے ریاست کا نائب وزیر اعلیٰ بنایا۔ اب تک ریاستی انتخاب میں شیو سینا کو علاقائی جماعت کے طور پر بی جے پی سے زیادہ نشستیں ملتی تھیں اور پارلیمانی انتخاب میں قومی جماعت ہونے کی حیثیت سے بی جے پی کو بڑا حصہ دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی کو شیو سینا سے کم نشستوں پر کامیابی حاصل ہوتی تھی لیکن اس بار معاملہ الٹ گیا اور بی جے پی نے زیادہ نشستیں جیت لیں اور وہ اپنے آپ کو جونئیر کے بجائے سینئر پارٹنر سمجھنے لگی۔ بی جے پی والوں کو ایسا لگنے لگا کہ وہ شیو سینا کے بغیر راج ٹھاکرے کی نونرمان سینا کی مدد سے وہ انتخاب جیت سکتے ہیں۔

بال ٹھاکرے کی موت کے بعد شیو سینا کے اندر جو کمزوری آئی تھی اس کا فائدہ

اٹھا کر اس بار انتخاب سے قبل نتن گڈکری نے شیوسینا کی پرواہ کئے بغیر راج ٹھاکرے کے ساتھ مفاہمت کرلی۔ جسے ادھو ٹھاکرے بادلِ ناخواستہ برداشت کرلیا۔ اس کے بعد وزارت سازی میں شیوسینا کو صرف ایک اور غیر اہم قلمدان دیا گیا۔ نواز شریف کو دعوت دینے کے

خلاف شیوسینا کے اعتراض کو بی جے پی نے نظرانداز کردیا اور ریلوے کرایہ میں اضافہ پر شیوسینا کی مخالفت کو مودی نے مسترد کردیا۔ شیوسینا نے اس کا بدلہ اس طرح لیا کہ اپنی کامیابی کا کوئی کریڈٹ مودی کو نہیں دیا۔ شیوسینا ممبئی کے صدر کو تہنیتی جلسہ میں حاشیہ پر رکھا یہاں تک کہ ادھو ٹھاکرے نے اپنے کارکنان کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کردیا کہ مودی کی ہوا نکل چکی ہے اب ہم اس کے سہارے انتخاب نہیں جیت سکتے اس لئے کسی خوش فہمی کا شکار رہنے کے بجائے اپنے حلقۂ انتخاب پر توجہ دی جائے۔

گوپی ناتھ منڈے بی جے پی کے پختہ کار رہنما تھے اور ان کی موت سے پارٹی میں ایک بڑا خلاء پیدا ہوگیا ہے۔ان کے متبادل سمجھے جانے والے بی جے پی ممبئی کے صدر اشیش شیلار نے اپنی ناتجربہ کاری اور بچکانہ پن کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے اپنے کارکنان سے کہا کہ ممبئی میں پانچ روپے کہ اندر پیٹ بھر کھانا ملتا ہے جبکہ مہنگائی کے سبب ممبئی کا مشہور ناشتہ وڈا پاؤ بھی ۱۲ روپے سے

کم میں نہیں ملتا اور پانی پوری کیلئے ۲۰ روپئے دینے پڑتے ہیں۔ یہ سوال پر کہ یہ کہاں ملتا ہے؟ جواب تھا ماہم درگاہ کے باہر۔ دراصل وہاں فلاحی ادارے بھکاریوں کو پانچ روپئے میں کھانا کھلاتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بی جے پی غریبوں کی بھوک کس طرح مٹانا چاہتی ہے۔ اس اہم اجلاس میں یہ بھی کہا گیا کہ شیوسینا کے ساتھ الحاق باقی رکھا جائے یا توڑ دیا جائے اس کا فیصلہ رہنماؤں کی ملاقات کے بعد ہوگا۔

انتخاب سے قبل اسی طرح کی رعونت کے سبب کانگریس پارٹی کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ اب اقتدار کا یہ نشہ بی جے پی کو مہنگا پڑ سکتا ہے اس لئے کہ مرکزی حکومت ایک بڑے قحط کی پیشن گوئی کررہی ہے اور عوام مہنگائی کی ایک سونامی کو تیزی کے ساتھ اپنی جانب آتا ہوا دیکھ رہے ہیں اس پر سلمان احمد کا یہ شعر یاد آتا ہے

وہ جن درختوں کی چھاؤں میں سے مسافروں کو اٹھا دیا تھا انہیں درختوں سے اگلے موسم میں پھل نہ اترے تو لوگ سمجھے

ایک طرف زعفرانی خیمے میں دراڑ بڑھتی جارہی دوسری طرف کانگریس اپنے کھوئے ہوئے ووٹ بنک کو دوبارہ رجھانے میں جٹ گئی ہے۔ اس نے مراٹھا سماج کیلئے ۲۰ فیصد اور مسلمانوں کی خاطر ۵ فیصد ریزرویشن کا اعلان کردیا ہے۔ ان فیصلوں کا انتخابات پر کیا اثر پڑے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا اس لئے کہ مہاراشٹر

میں کانگریس کا رتھ انہیں دو پہیوں پر چلتا رہا ہے۔ اس دوران کچھ فرقہ پرست عناصر نے فیس بک پر شیواجی کی بے حرمتی کرکے فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے کی مذموم کوشش کی اور ایک مسلم نوجوان کو پونے میں شہید کردیا لیکن حکومت نے مجرمین پر بروقت کارروائی کرکے اس فتنہ کو دبا دیا اور سینا بی جے پی نے اس کا فائدہ اٹھانے سے گریز کیا۔ کچھ حلقوں کی جانب سے لاوڈاسپیکر میں اذان کی مخالفت بھی سامنے آئی لیکن شیوسینا رہنما تاوڑے نے ایک مسلم وفد کو یقین دہانی کرائی کہ وہ مطمئن رہیں ایسے کسی اقدام کی حمایت نہیں کی جائیگی۔

مذکورہ بالا تین ریاستوں کے علاوہ بی جے پی کی حکومت والی والے صوبے راجستھان اور مدھیہ پردیش میں بھی ایک سرد جنگ برپا ہے۔ ان صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نے گزشتہ ریاستی انتخاب میں مودی کی مدد کے بغیر گجرات سے بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ مدھیہ پردیش کے شیوراج چوہان نے ابتداء میں نریندر مودی کے وزارت اعظمی کیلئے امیدواری کی مخالفت بھی کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اڈوانی جی کو گاندھی نگر میں خوف محسوس ہوا کہ مودی سازش کرکے انہیں ہرادے گا تو انہوں نے بھوپال میں جاکر پناہ لینے کی کوشش کی۔ مودی کے دہلی میں برسرِ اقتدار میں آنے کے بعد چوہان کے ارد گرد شکنجہ کسا جارہا ہے۔ چوہان کی اہلیہ اور مودی کی ناقداوما بھارتی کے

ے خلاف بدعنوانی کے الزامات منصوبہ بند طریقہ پر منظر عام پر لائے جارہے ہیں گویا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

راجھستان کی وزیراعلیٰ کو اس بات کا قلق ہے کہ ان کی ریاست سے صرف ایک ایم پی کو وزیر بنایا گیا اور وہ بھی اگران کا چشم وچراغ ہوتا جسے بڑے ارمانوں سے کامیاب کیا گیا تھا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اسے نظرانداز کرکے ایک ہریجن میگھوال کو اس عہدے سے نواز دیا گیا۔۔ وزیر پٹرولیم اور کیمیاوی مصنوعات نہال چند میگھوال کو ۲۰۱۱ کے اندر ایک اجتماعی عصمت دری کے الزام میں ملوث پایا گیا تھا مگر کانگریس کے اشوک گہلوت نے انہیں کلین چٹ دلوادی۔ یہ تو پرائے کا احسان تھا مگر بی جے پی کی وسندھرا راجے سندھیا نے اس مقدمہ کو زندہ کرکے اپنی ہی جماعت کے مرکزی وزیر کو دوبارہ مقدمے پھنسا دیا ہے تاکہ اس کا پتہ کٹے تو اپنے بیٹے دشینت سنگھ کی قسمت کھلے ۔اس داخلی مہابھارت سے مودی کیسے نمٹتا ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن اگر وہ اس میں ناکام ہوجاتا ہے تو ممکن ہے راج ناتھ کی قسمت کھل جائے اور وہ ہندوستان کے تخت وتاج کے مالک ہو جائیں۔

کانگریس کے اچھے دن

کانگریس پارٹی کیلئے پچھلے ۶ سالوں میں راہل گاندھی جو چمتکار نہ کرسکے وہ نریندر مودی
نے ۶۰ دنوں کے اندر کردیا اور ایسا لگتا ہے کہ کانگریس کے اچھے دنوں کی شروعات
ہوگئی۔ اتراکھنڈ دراصل اترپردیش کی داہنی پسلی سے نکل کر الگ ہونے والی ایک
ریاست ہے جہاں گزشتہ انتخاب میں بی جے پی نے یوپی سے بڑی کامیابی حاصل کی
تھی۔ یوپی میں جہاں ۸۰ میں سے ۷۲ تو اتراکھنڈ میں ۵ میں سے ۵ یعنی صد فیصد
نشستیں بی جے پی کو ملی تھیں۔اس وقت اترپردیش میں بی جے پی کا نگراں امیت شاہ
ہوا کرتا تھا اب جو پارٹی کا کل ہند صدر بن گیا ہے لیکن اس کا پارٹنر ترویندر سنگھ
راوت ہنوز اترپردیش بی جے پی کے نگرانِ کار بنا ہوا ہے۔ان تبدیلیوں کے علی الرغم
ایک بڑا فرق نریندر مودی کے وزیراعظم بن جانے کا واقع ہوچکا ہےاور وہ خواب ٹوٹ
کر بکھر چکا ہے جو فریب دے کر سجایا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ حالیہ ضمنی انتخاب میں
کانگریس نے تینوں نشستوں پر کامیابی درج کراکے بی جے پی کو دھول چٹادی۔

اتراکھنڈ کوئی ایسی ریاست نہیں ہے جہاں بی جے پی کا اثرورسوخ نہ رہا ہو۔ ۲۰۱۲ء سے
قبل وہاں بی جے پی کا وزیراعلیٰ ہوا کرتا تھا لیکن اس کی نااہلی

کے خلاف عوام کا غم و غصہ اس قدر بڑھا کہ انہوں نے بی سی کھنڈوری کو اسمبلی انتخاب میں رکن اسمبلی بھی بننے نہیں دیا۔ اس کے باوجود کانگریس کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔ ۷۰ رکنی ایوانِ اسمبلی اسے ۳۲ اور بی جے پی کو ۳۱ نشستوں پر کامیابی ملی۔ کانگریس نے بی ایس پی اور دیگر جماعتوں کی مدد سے حکومت سازی کی لیکن بی جے پی کے سابق وزیراعلیٰ رمیش پوکھریال نے جنہیں بدعنوانی کے سبب معزول کردیا گیا تھا اپنا دوئی واڑ کا قلعہ سلامت رکھا تھا۔اس پارلیمانی انتخاب میں رمیش پوکھریال کی رکن پارلیمان ہو گئے اور انہیں اسمبلی کا حلقہ خالی کرنا پڑا لیکن کون جانتا تھا کہ پارلیمان کی صد فیصد کامیابی اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں صد فیصد ناکامی میں بدل جائیگی۔ پوکھریال کا مضبوط قلعہ اس طرح مسمار ہو گا کہ بی جے پی کے قومی سکریٹری و اترپردیش کے مشترک نگراں ترویندر سنگھ راوت کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے گا نیز امیت شاہ کی ساری نام نہاد ذہانت و ذکاوت پر خاک پڑ جائیگی۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ کانگریسی وزیراعلیٰ ہریش راوت نے سیدھے مقابلے میں بی جے پی کے امیدوار بی ڈی جوشی سے تین گنا زیادہ ووٹ حاصل کرکے امیت شاہ کا بھانڈا سرِ بازار پھوڑ دیا۔

امیت شاہ کو پارٹی کی صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ہندوستان کی عوام نے پہلا جھٹکا ایسا کرارہ دیا کہ یکلخت سارا خمار اتر گیا۔ نریندر مودی نے

وزیراعظم بننے کے بعد کانگریس کو پہلی خوشخبری سے نوازہ ہے۔ اس کا یقین ویسے تو سبھی کو تھا لیکن یہ اس قدر جلد نصیب ہو گی اس کا گمان غالباً کانگریسیوں کو بھی نہیں تھا۔ لگتا ہے مودی کی مہربانی سے کانگریس کے اچھے دن بہت جلد آنے والے ہیں۔ اتراکھنڈ میں اس بار اگر بی جے پی تین میں سے دونشستوں پر بھی اگر کامیاب ہو جاتی تو اس کے ارکان کی تعداد کانگریس کے برابر ہو جاتی اور وہ حکومت سازی کی جوڑ توڑ میں لگ جاتی لیکن قدرت کا کرنا یہ ہوا کہ اب وہ ۳۱ سے ۲۸ پر پہنچ گئی ہے کانگریس نصف نشستوں پر قابض ہو گئی ہے اس لئے اسے دیگر لوگوں کی حمایت درکار نہیں ہے۔ اتراکھنڈ کے علاوہ جن تین ریاستوں کے اقتدار پر بی جے پی کی رال ٹپک رہی ہے وہ ہیں بہار، مہاراشٹر اور اترپردیش۔ ان صوبوں میں بی جے پی ماضی کے اندر حکومت کر چکی ہے اور پارلیمانی انتخاب کے دوران اسے زبردست کامیابی بھی ملی ہے اس لئے وہ جلد از جلد دوبارہ اقتدار

پر قابض ہونے کا سپنا سجانے میں مصروف ہے اوراپنے مقصد کے حصول کی خاطر نت نئی سازشوں کا جال بن رہی ہے بقول فیض ؎

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں

بہار: ریاستِ بہار کی کامیابی نے بی جے پی سمیت ساری دنیا کو چونکا دیا۔ جنتا دل (یو) کا جب صفایہ ہوگیا تو بی جے پی نے یہ افواہ اڑادی کہ جے ڈی یو کے پچاس ارکانِ اسمبلی اس سے رابطے میں ہیں اور جلد ہی ریاست میں سشیل مودی وزیر اعلیٰ بننے والے ہیں۔ اس بار سارے لوگوں کو ایسا لگنے لگا کہ بی جے پی کا یہ خواب واقعی شرمندۂ تعبیر ہوجائیگا لیکن اس نازک صورتحال میں نتیش کمار اور لالو یادو نے کمال دانشمندی کا ثبوت دیا۔ بی جے پی کے سیلاب پر بندھ باندھنے کیلئے ان دونوں نے بالترتیب اقتدار پرستی اور انانیت پسندی کو بالائے طاق رکھ دیا نتیجہ میں سشیل مودی کا خواب چکنا چور ہوگیا۔ اس بابت اول تو نتیش کمار قابلِ ستائش ہیں کہ انہوں نے شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ پیش کردیا۔اس غیر متوقع فیصلہ نے بھاجپ کے مخالفت کی ہوا نکال دی۔ اب ایک نئے وزیر اعلیٰ کی مخالفت بی جے پی کس منہ کرسکتی تھی جس کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو اور جو انتخابی شکست کیلئے سرے سے ذمہ دار بھی نہ ہو۔ نتیش کمار کے استعفیٰ نے لالو یادو کیلئے جے ڈی یو کی حمایت کو سہل بنادیا۔ بی جے پی نے اسے ناپاک الحاق قرار دیا گویا پاسوان اگر لالو کو چھوڑ کر ان سے مفاہمت کرے تو وہ پاک صاف دوستی ہوگی اور نتیش اگر ان چھوڑ کر لالو کے ساتھ جائیں تو ناپاک تعلق ہو جائیگا ۔ لالو یادو نے اپنی برسوں پرانی دشمنی پر خاک ڈال کر وسعتِ قلبی و بالغ نظری کا مظاہرہ کرتے

ہوئے نئی حکومت کو اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں مدد کی۔ اس طرح گویا لالو نے اڈوانی کی رتھ یاترا کی طرح مودی کے رتھ کو بہار میں روک دیا۔

لالو نے آگے چل کر ایوانِ بالا کے انتخاب میں بھی جے ڈی یو کے صدر شرد یادو کو بلا مقابلہ کامیاب کروادیا۔ اب لالو اور نتیش مشترکہ محاذ بنا کر آئندہ انتخاب لڑنے کی تیاری کررہے ہیں۔ اس اقدام سے غیر بی جے پی رائے دہندگان کے اندر ایک نیا اعتماد اور ولولہ پیدا ہوا ہے جو یقیناً رنگ لائیگا۔ اس پر مہنگائی کی مار اور رام ولاس پاسوان جیسے اشیائے خوردنی کے وزیر کا بیان کہ مہنگائی کا سبب ذرائع ابلاغ ہے اپنا اثر ضرور دکھلائے گا۔ مرکزی حکومت کے چہرے سے اٹھنے والی نقاب اٹھ جانے کے سبب اس کا عوام دشمن کریہہ چہرہ رائے دہندگان کے سامنے آچکا ہےس لئے بہار میں بی جے پی کیلئے اقتدار کا حصول اب آسان نہیں ہوگا۔

اترپردیش: ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والے کسی اندازے نے اترپردیش میں بی جے پی کو ۵۵ سے زیادہ اور بی ایس پی کو پانچ سے کم سیٹیں نہیں دی تھیں لیکن نتائج اس طرح سے آئے کہ بی جے پی ۷۲ اور بی ایس پی کا پتہ صاف ہوگیا۔ ایس پی پانچ اور کانگریس کو دو پر اکتفاء کرنا پڑا۔ اس کامیابی نے اترپردیش کے بی جے پی رہنماؤں کو اقتدار کیلئے بے کل کردیا۔ ان کیلئے اترپردیش میں

بھی سب سے بڑا خطرہ وہی ہے جو بہار میں تھا یعنی ایس پی اور بی ایس پی کا اتحاد۔
ویسے اسمبلی میں واضح اکثریت کے سبب اکھلیش کو کسی حمایت کی ضرورت نہیں ہے لیکن بی جے پی والے عوامی سطح پر ایک ایسی صورتحال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ مایاوتی کیلئے ملائم کے ساتھ جانا ناممکن ہو جائے اور اگر مایاوتی اس کی کوشش کرے تو دلت رائے دہندگان ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔
اس مقصد کے حصول کی خاطر ایک نہایت گھناؤنی سازش رچی گئی اور شروع کیا گیا دلت لڑکیوں کی عصمت دری کا سلسلہ ۔ اس بربریت کا الزام پوری طرح ملائم پر ڈالنے کیلئے
اس منصوبے پر عملدرآمد کیلئے ان علاقوں کا انتخاب کیا گیا جہاں یادو برادری کی اکثریت اور ایس پی کا زور ہے۔ یہ ایک دو دھاری حکمت عملی تھی ۔ اگر ملائم اس بابت نرمی دکھلائیں تو دلت سماج کے اندر ان کے خلاف نفرت بھڑکا کرمایاوتی کو سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور کردیا جائے تاکہ دونوں کے درمیان کی کھائی وسیع تر ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر ملائم ملزمین کے خلاف سخت رویہ اختیار کریں تو یادو سماج کو ایس پی سے برگشتہ کرکے اپنا ہمنوا بنالیا جائے ۔

اس معاملے میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اترپردیش میں ایس پی کی سرکار ابھی حال میں تو قائم نہیں ہوئی بلکہ وہ دوسال کا عرصہ گذار چکی ہے۔ اگر اس طرح کے واقعات کی وجہ اس کا اقتدار میں آنا ہے تو اس کا آغاز بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔
اترپردیش کے سیاسی افق پر ماضی قریب میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ بی جے پی کی کامیابی ہے اس لئے اگر اس کے پس پشت سیاسی محرکات ہیں تو اس کی سوئی بی جے پی کی جانب مڑتی ہے۔ کم از کم یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ بی جے پی کی کامیابی نے ظالموں کے حوصلے اس قدر بلند کردیئے کہ وہ معصوم لڑکیوں کی عصمت دری کرکے انہیں پیڑ پر لٹکانے تک سے باز نہیں آتے۔ ذرائع ابلاغ میں ان واقعات کو اس طرح اچھالا گیا گویا اس انارکی اور جنگل راج کیلئے صرف اور صرف اکھلیش سرکار ذمہ دار ہے۔
بی جے پی نے سڑکوں پر اتر کر جب احتجاج کرنا شروع کیا تو ایسا لگنے لگا کہ اکھلیش کی الٹی گنتی شروع ہو گئی ہے وہ دن دور نہیں جبکہ اترپردیش میں صدر راج نافذ کرکے انتخابات کا اعلان کردیا جائیگا اور پھر دیکھتے دیکھتے زعفرانی پرچم لکھنؤ پر لہرانے لگے گا ۔لیکن پھر ہوا کا رخ بدلا مدھیہ پردیش سے بھی دلت خواتین کی عصمت دری کے بہیمانہ واقعات منظرِ عام پر آئے اور مرکزی وزیر پٹرولیم نہال چند میگھوال کو عصمت دری کے الزام میں جئے پور کی عدالت نے ملزم کی حیثیت سے حاضر ہونے کا حکم دے دیا۔ اس واقعہ نے بی جے

پی سرکار کے ہاتھ سے عصمت دری کا مدعا چھین لیا۔ بی جے پی کیلئے میگھوال کو وزیر رکھنا اور نکالنا دونوں مشکل ہو گیا اس طرح عصمت دری کی سیاست پر روک لگ گئی۔

اس کے بعد بی جے پی نے مرادآباد ضلع میں فرقہ وارانہ پانسہ پھینکا اور مسلمانوں کو دلتوں سے لڑانے کی کوشش کی۔ کانٹھ نامی گاوں میں کل چار چار ہزار ہندو اور مسلمان آباد ہیں۔ ہندووں کی زیادہ تر آبادی دلت ہے۔ وہاں ایک مندر کا لاوڈا سپیکر خراب ہو گیا تھا جسے مرمت کے بعد جب دوبارہ لگایا گیا تو کسی نے پولس میں شکایت کر دی اور اسے اتار لیا گیا۔ بی جے پی نے اس معمولی سے مسئلہ پر مہا پنچایت بلا کر مظفر نگر کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس بابت پولس کا بیان کہ لاوڈا سپیکر کی اجازت نہیں لی گئی تھی احمقانہ لگتا ہے اس لئے کہ مذہبی مقامات پر لگائے جانے والے لاوڈا سپیکر کی اجازت لینے کا رواج ہمارے ملک میں نہیں ہے۔ ایس ایس پی کی جانب سے بی جے پی کو موردِالزام ٹھہرانے پر اور بی جے پی ایم ایل اے کے خلاف ایف آئی آر درج کئے جانے پر بی جے پی چراغ پا تو ہوئی لیکن کچھ کر نہ سکی۔

سماجوادی پارٹی کو چاہئے تھا کہ سماج کے سرکردہ لوگوں کو ساتھ بٹھا کر باہمی گفت و شنید کے ذریعہ اس مسئلہ کا حل نکالتی لیکن اس نے قانون کے ڈنڈے

سے اسے سلجھانے کی کوشش کی جس سے بی جے پی کو اس کا ناجائز سیاسی فائدہ اٹھانے کا نادر موقع مل گیا۔ ایس پی کا بھی عجیب معاملہ ہے کبھی تو وہ ہندووں کی دلجوئی کیلئے مظفر نگر میں انہیں جی بھر کے مظالم کرنے کا موقع عنایت کردیتی ہے تو کبھی مسلمانوں کو خوش کرنے کیلئے سختی پر اتر آتی ہے۔اس بار مہاپنچایت کو روکنے میں اس نے کامیابی توحاصل کرلی ہے لیکن کشیدگی ہنوز قائم ہے۔ مرکزی وزارت داخلہ نے اس سانحہ کاسخت نوٹس لیاہے اور ریاستی حکومت سے رپورٹ طلب کی ہے۔ بی جے پی نے اپنے ارکانِ پارلیمان کی تفتیشی کمیٹی بھی جائے حادثہ کا جائزہ لینے کیلئے روانہ کی ہے۔ ایس پی کو آئندہ اس طرح کی صورتحال میں پختہ سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرنا ہوگا ورنہ وہ دونوں جانب سے خسارے میں رہے گی۔

مہاراشٹر: اس سال ماہِ دسمبر کے اندر مہاراشٹر میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہونے والے ہیں۔ مہاراشٹر کے اندر بی جے پی اور شیوسینا کی حکومت تقریباً یقینی نظر آرہی ہے لیکن یہاں اصل جنگ خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے۔ مہاراشٹر گوکہ آرایس ایس کی جنم بھومی ہے اورنہ صرف اس کے بانی ڈاکٹر ہیڈگوار بلکہ مفکرِ اعظم گروگولوالکر کا تعلق بھی اسی ریاست سے ہے۔اس کے باوجود سنگھ کو مہاراشٹر میں عرصۂ درازتک پذیرائی نہیں ملی۔ مہاراشٹر

میں دائیں بازو کا زور رہا اور براہمن دانشوروں نے بھی ہندوتوا پر اشتراکیت کو ترجیح دی۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ جہاں ہندو مہا سبھا کے ساورکر اور گوڈسے پیدا ہوئے وہیں جیوتی با پھلے اور ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی اپنی اصلاحی تحریک چلائی بلکہ کانشی رام نے بھی اپنے کام کا آغاز پونے میں کیا تھا۔ کانگریس کو بال گنگا دھر تلک اور گوپال کرشن گوکھلے جیسے رہنما اسی سرزمین سے ملے۔

بی جے پی کو مہاراشٹر کے اندر اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کیلئے علاقائی جماعت شیوسینا کے رہنما بال ٹھاکرے کے آگے جھولی پسارنی پڑی نیز براہمنوں کے بجائے پسماندہ طبقات کے ہاتھ میں ریاستی قیادت سونپنے پر مجبور ہونا پڑا۔ گوپی ناتھ منڈے کو اسی حکمت عملی نے ریاست کا نائب وزیر اعلیٰ بنایا۔ اب تک ریاستی انتخاب میں شیوسینا کو علاقائی جماعت کے طور پر بی جے پی سے زیادہ نشستیں ملتی تھیں اور پارلیمانی انتخاب میں قومی جماعت ہونے کی حیثیت سے بی جے پی کو بڑا حصہ دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی کو شیوسینا سے کم نشستوں پر کامیابی حاصل ہوتی تھی لیکن اس بار معاملہ الٹ گیا اور بی جے پی نے زیادہ نشستیں جیت لیں اور وہ اپنے آپ کو جونئیر کے بجائے سینئر پارٹنر سمجھنے لگی۔ بی جے پی والوں کو ایسا لگنے لگا کہ وہ شیوسینا کے بغیر راج ٹھاکرے کی نونرمان سینا کی مدد سے وہ انتخاب جیت سکتے

ہیں۔

بال ٹھاکرے کی موت کے بعد شیو سینا کے اندر جو کمزوری آئی تھی اس کا فائدہ اٹھا کر اس بار انتخاب سے قبل نتن گڈکری نے شیو سینا کی پرواہ کئے بغیر راج ٹھاکرے کے ساتھ مفاہمت کرلی۔ جسے ادھو ٹھاکرے بادلِ ناخواستہ برداشت کرلیا۔ اس کے بعد وزارت سازی میں شیو سینا کو صرف ایک اور غیر اہم قلمدان دیا گیا۔ نواز شریف کو دعوت دینے کے خلاف شیو سینا کے اعتراض کو بی جے پی نے نظر انداز کر دیا اور ریلوے کرایہ میں اضافہ پر شیو سینا کی مخالفت کو مودی نے مسترد کر دیا۔ شیو سینا نے اس کا بدلہ اس طرح لیا کہ اپنی کامیابی کا کوئی کریڈٹ مودی کو نہیں دیا۔ شیو سینا ممبئی کے صدر کو تہنیتی جلسہ میں حاشیہ پر رکھا یہاں تک کہ ادھو ٹھاکرے نے اپنے کارکنان کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ مودی کی ہوا نکل چکی ہے اب ہم اس کے سہارے انتخاب نہیں جیت سکتے اس لئے کسی خوش فہمی کا شکار رہنے کے بجائے اپنے حلقۂ انتخاب پر توجہ دی جائے۔

گوپی ناتھ منڈے بی جے پی کے پختہ کار رہنما تھے اور ان کی موت سے پارٹی میں ایک بڑا خلاء پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے متبادل سمجھے جانے والے بی جے پی ممبئی کے صدر اشیش شیلار نے اپنی ناتجربہ کاری اور بچکانہ پن کی ایک مثال پیش کرتے

ہوئے اپنے کارکنان سے کہا کہ ممبئی میں پانچ روپے کہ اندر پیٹ بھر کھانا ملتا ہے جبکہ مہنگائی
کے سبب ممبئی کا مشہور ناشتہ وڈا پاؤ بھی ۱۲ روپے سے کم میں نہیں ملتا اور پانی پوری کیلئے ۲۰ روپے دینے پڑتے ہیں۔ یہ سوال پر کہ یہ کہاں ملتا ہے؟ جواب تھا ماہم درگاہ کے باہر۔ دراصل وہاں فلاحی ادارے بھکاریوں کو پانچ روپے میں کھانا کھلاتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بی جے پی غریبوں کی بھوک کس طرح مٹانا چاہتی ہے۔ اس اہم اجلاس میں یہ بھی کہا گیا کہ شیوسینا کے ساتھ الحاق باقی رکھا جائے یا توڑ دیا جائے اس کا فیصلہ رہنماؤں کی ملاقات کے بعد ہوگا۔ انتخاب سے قبل اسی طرح کی رعونت کے سبب کانگریس پارٹی کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ اب اقتدار کا یہ نشہ بی جے پی کو مہنگا پڑ سکتا ہے اس لئے کہ مرکزی حکومت ایک بڑے قحط کی پیشن گوئی کر رہی ہے اور عوام مہنگائی کی ایک سونامی نے نگل لیا ہے اس صورتحال پر سلمان احمد کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

وہ جن درختوں کی چھاؤں میں سے مسافروں کو اٹھا دیا تھا
انہیں درختوں سے اگلے موسم میں پھل نہ اترے تو لوگ سمجھے

ایک طرف زعفرانی خیمے میں دراڑ بڑھتی جارہی دوسری طرف کانگریس اپنے کھوئے ہوئے ووٹ بنک کو دوبارہ رجھانے میں جٹ گئی ہے۔اس نے مراٹھا سماج کیلئے ۲۰ فیصد اور مسلمانوں کی خاطر ۵ فیصد ریزرویشن کا اعلان کردیا ہے۔ان فیصلوں کا انتخابات پر کیا اثر پڑے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا اس لئے کہ مہاراشٹر میں کانگریس کا رتھ انہیں دو پہیوں پر چلتا رہا ہے۔اس دوران کچھ فرقہ پرست عناصر نے فیس بک پر شیواجی کی بے حرمتی کرکے فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے کی مذموم کوشش کی اور ایک مسلم نوجوان کو پونے میں شہید کردیا لیکن حکومت نے مجرمین پر بروقت کارروائی کرکے اس فتنہ کو دبا دیا اور سینا بی جے پی نے اس کا فائدہ اٹھانے سے گریز کیا۔کچھ حلقوں کی جانب سے لاؤڈ اسپیکر میں اذان کی مخالفت بھی سامنے آئی لیکن شیوسینا رہنما تاوڑے نے ایک مسلم وفد کو یقین دہانی کرائی کہ وہ مطمئن رہیں ایسے کسی اقدام کی حمایت نہیں کی جائیگی۔

مذکورہ بالا تین ریاستوں کے علاوہ بی جے پی کی حکومت والی والے صوبے راجستھان اور مدھیہ پردیش میں بھی ایک سرد جنگ برپا ہے۔ان صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نے گزشتہ ریاستی انتخاب میں مودی کی مدد کے بغیر گجرات سے بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ مدھیہ پردیش کے شیوراج چوہان نے ابتداء میں نریندر مودی کے وزارت اعظمی کیلئے امیدواری کی مخالفت بھی کی تھی۔یہی وجہ ہے کہ جب اڈوانی جی کو گاندھی نگر میں خوف محسوس ہوا کہ مودی سازش کرکے

انہیں ہرا دے گا تو انہوں نے بھوپال میں جا کر پناہ لینے کی کوشش کی۔ مودی کے دہلی میں برسرِ اقتدار میں آنے کے بعد چوہان کے ارد گرد شکنجہ کسا جارہا ہے۔ چوہان کی اہلیہ اور مودی کی ناقدا وما بھارتی کے خلاف بدعنوانی کے الزامات منصوبہ بند طریقہ پر منظر عام پر لائے جارہے ہیں گویا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

راجستھان کی وزیر اعلیٰ کو اس بات کا قلق ہے کہ ان کی ریاست سے صرف ایک ایم پی کو وزیر بنایا گیا اور وہ بھی اگر ان کا چشم و چراغ ہوتا جسے بڑے ارمانوں سے کامیاب کیا گیا تھا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اسے نظر انداز کر کے ایک ہریجن میگھوال کو اس عہدے سے نواز دیا گیا۔۔ وزیر پٹرولیم اور کیمیاوی مصنوعات نہال چند میگھوال کو ۲۰۱۱ کے اندر ایک اجتماعی عصمت دری کے الزام میں ملوث پایا گیا تھا مگر کانگریس کے اشوک گہلوت نے انہیں کلین چٹ دلوا دی۔ یہ تو پرائے کا احسان تھا مگر بی جے پی کی وسندھرا راجے سندھیا نے اس مقدمہ کو زندہ کر کے اپنی ہی جماعت کے مرکزی وزیر کو دوبارہ مقدمے پھنسا دیا ہے تاکہ اس کا پتہ کٹے تو اپنے بیٹے دشینت سنگھ کی قسمت

کھلے ۔اس داخلی مہابھارت سے مودی اور امیت کی جوڑی کیسے نمٹتی ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن اترا کھنڈ کے انتخابی نتائج نے ان کی نیند یقیناً اڑادی ہوگی اگر یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو بی جے پی کے اچھے دن آئیں نہ آئیں کانگریس کے اچھے دن ضرور آجائیں گے اور کوئی بعید نہیں کہ جس طرح منموہن سے بیزار ہو کر عوام نے مودی کو وزیراعظم بنا دیا اسی طرح مودی سے پریشان ہو کر وہ راہل وزیراعظم بنادیں۔اس طرح سیاستدانوں کی قسمت تو بنتی بگڑتی رہے گی لیکن کیا عوام کے دن بھی کبھی بدلیں گے ؟اس سوال کے مثبت جواب سے جمہوری نظام حکومت کا دامن خالی ہے۔

لیکن میری آنکھوں میں تجھے ڈر نہ ملے گا

اسرائیل اور غزہ کے درمیان جاری حالیہ جنگ میں مجاہدین فلسطین کی جنگی و نفسیاتی حکمت عملی کو سمجھنے کیلئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا موازنہ ۱۹۶۷ء کی ۶ روزہ تیسری عرب اسرائیل جنگ کیا جائے جس میں مصر کو عراق، اردن اور شام کی حمایت حاصل تھی اور اسرائیل کی پشت پر امریکہ موجود تھا۔ ۴۷ سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی امریکہ کی پشت پناہی اسرائیل کو بدستور حاصل ہے لیکن اس بار غزہ کے محصور فلسطینی مجاہد اپنی جنگ اللہ کے بھروسے خود اپنے بل بوتے پر لڑ رہے ہیں۔ عراق، اردن و شام کی مدد سے وہ یکسر محروم ہیں۔ مصر اسرائیل کا باجگذار بنا ہوا ہے اور عرب ممالک میں اسے نئے حامی میسر آگئے ہیں۔ ماضی کی جنگ کل ۶ دنوں کے اندر ختم ہو گئی تھی جبکہ یہ مزاحمت تیسرے ہفتے میں داخل ہو گئی، مجاہدین اسلام ہنوز صبر و استقامت کے ساتھ محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ عالمی دباؤ میں آکر سازش کے تحت پیش کردہ مصالحت کو مسترد کر رہے ہیں۔ کسی بھی جنگ کی غرض و غایت عام طور پر محض قتل و غارتگری نہیں ہوتی بلکہ جبر و استبداد کا بازار گرم کرکے پوشیدہ حقیقی مقاصد کے حصول کی سعی کی جاتی ہے۔ اسرائیل کی موجودہ بربریت کے مندرجہ ذیل محرکات ہیں:

نتن یاہو پر داخلی سیاسی دباؤ o

امریکی ناراضگی کو رضامندی میں بدلنا o

حماس کو کمزور اور یکہ و تنہا کر دینا o

فلسطینی عوام کو خوفزدہ کرکے انہیں حماس سے برگشتہ کر دینا o

فلسطین کے حالیہ سیاسی اتحاد کو منتشر کر دینا o

پرانے امن معاہدے (۲۰۱۲ء) کو ایک نئے معاہدے سے بدل دینا o

حماس کی فوجی دستے کو بے اسلحہ کر دینا o

اس مہم سے قبل نتن یاہو کی مخلوط حکومت پر دائیں بازو کے انتہا پسندوں کی جانب سے زبردست دباؤ تھا اور وہ اپنی حمایت واپس لینے کی دھمکیاں دے رہی تھے۔ اس جنگ نے انہیں اس پر روک لگا دی لیکن یہ ایک وقتی فائدہ ہے۔ جنگ کے ختم ہو جانے پر ممکن ہے نتن یاہو کا بھی وہی حشر ہو جو ۲۰۰۶ء کی شکست کے بعد یہود اولمرٹ کا ہوا تھا اس لئے کہ اس قدر بڑی تعداد میں صہیونی فوجیوں کا مارا جانا اور زخمی ہونا اسرائیل کے ان بلند بانگ دعووں کی کی مٹی پلید کرتا ہے کہ وہ دنیا کی چوتھی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس ہزیمت کی قیمت نتن یاہو ضرور چکائے گا۔ شدید پابندیوں کے باوجود حماس کی زبردست فوجی تیاری، سرنگیں اور اسلحہ کا بڑا ذخیرہ اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں کی پیشانی پر کلنک سے کم نہیں ہے۔ جب جنگ کے بادل چھٹ جائیں گے تو نتن یاہو کیلئے اس مجرمانہ غفلت

وناکامی کی توجیہ بے حد مشکل ہو جائیگی۔

امریکہ کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات اس دوران عجیب نشیب و فراز کا شکار رہے۔ تنازعہ سے قبل امریکہ اسرائیل سے ناراض تھا اس لئے کہ الفتح اور اسرائیل کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اسرائیل یکطرفہ طور پر عباس اور حماس کے اتحاد کا بہانہ بنا کر الگ ہو گیا تھا لیکن جنگ کے دوران جب ساری دنیا نے اسرائیل کا ساتھ چھوڑ دیا تو امریکہ نہایت بے حیائی کے ساتھ اس کا پشت پناہ بنا رہا جس پر صہیونی بہت خوش ہوتے رہے لیکن پیرس کے اندر ترکی، قطر اور دیگر یوروپی ممالک کے ساتھ بیٹھ کر جان کیری نے جو جنگ بندی کی جو پیشکش مرتب کی اس پر اسرائیلی حکومت اور عوام دونوں نے مل کر جان کیری اور امریکہ کی خوب مذمت کی۔ اس لئے کہ اول تو اس گفتگو میں مصر کو شامل نہیں کیا گیا۔ دوسرے حماس کو ایک اہم فریق کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا اور اس کے اسلحہ رکھنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا۔اس طرح گویا جہاں ابتدائی گرمجوشی کے بعد ان دونوں ممالک کے تعلقات پھر سے سرد مہری کا شکار ہو گئے اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کی اسرائیلی سعی بارآور نہ ہو سکی۔

ان دو مقاصد کے علاوہ تیسرا خطرناک مقصد ذرائع ابلاغ کی مدد سے حماس کو دہشت گرد قرار دے کر اس کو عالمی سطح پر یکہ و تنہا کر دینا تھا لیکن جس بربریت کا

مظاہرہ اسرائیل نے اس دوران کیا اس نے دنیا بھر کے انصاف پسند لوگوں اور حکومتوں کو اس کی مذمت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ساری دنیا میں ہونے والے احتجاج نے یوروپی حکومتوں پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ ان کیلئے اقوام متحدہ کے حقوقِ انسانی کمیشن میں اسرائیل کی حمایت کرنا مشکل ہوگیا اور وہ اسرائیل کا ساتھ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اسرائیل کے خلاف انسانی حقوق کی پامالی اور جنگی جرائم کے ارتکاب والی قرارداد اتفاق رائے سے پاس ہوجاتی مگر امریکہ نے گڑبڑ کر دی۔ خوش قسمتی کمیشن میں کسی کو ویٹو کی طاقت میسر نہیں ہے وہ قراداد کو منظور ہونے سے روک نہ سکا اور اسرائیل کے سبب خود اکیلا پڑ گیا۔

جنگ کی ابتداء میں ہونے والی بے دریغ بمباری کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ فلسطینی عوام حماس سے برگشتہ ہو جائیں لیکن ہوا یہ کہ نہ صرف غزہ کے لوگ بلکہ مغربی کنارے کے فلسطینیوں کی بھی زبردست حمایت حماس کو حاصل ہو گئی۔ مغربی کنارے کے اندر جس طرح کے مظاہرے اس بار دیکھنے میں آئے اس کی مثال قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسرائیلی حکومت نے بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر وہاں بھی طاقت کا بیجا استعمال کر کے کئی مظاہرین کو شہید اور زخمی کر دیا۔ صہیونی حکومت یہ سوچ رہی تھی کہ اس کی بربریت سے خوف کھا کر فتح اپنے آپ کو حماس سے الگ کر لے گی اور ان کے درمیان اتحاد میں دراڑ پڑ جائیگی لیکن اس کے برعکس جب محمود عباس سے حماس کی جانب سے پیش کردہ جنگ بندی کی شرائط کے

متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا وہ صرف حماس کا نہیں بلکہ سارے فلسطینیوں کا مطالبہ ہے۔ وزیر اعظم حمداللہ رامی نے بھی اقوام متحدہ کے اندر مصری جنگ بندی کی حمایت کرنے کے بجائے حماس کے موقف کو حق بجانب قرار دیتے محاصرے کے خاتمہ پر اصرار کیا۔ یہ ساری پیش رفت اسرائیل کی توقعات کے خلاف تھیں۔

مندرجہ بالا مقاصد کی نوعیت ضمنی اس مہم کا بنیادی ہدف ۲۰۱۲ء کے اندر ہونے والے امن معاہدے کی بلاواسطہ منسوخی ہے۔ ۲۰۱۲ء کے اندر اسرائیل نے جب اس طرح کی حرکت کی تو مصر کے اندر اسلام پسند ڈاکٹر محمد مورسی برسر اقتدار تھے۔ انہوں نے فوراً اسرائیلی سفارتکار کو ملک سے نکال باہر کیا اور رضاکاروں کی ایک کثیر جماعت کو وزیر اعظم قندیل کی قیادت میں غزہ روانہ کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیگر اسلامی ممالک کے رہنماؤں نے بھی غزہ کا رخ کیا اور اسرائیل کو اپنی کارروائی بند کرنے پر مجبور ہونا پڑا لیکن اس سے قبل حماس رہنما خالد مشعل قاہرہ آئے اور دونوں فریقوں کے درمیان دیرپا امن کا ایک معاہدہ طے پایا۔ اس جنگ بندی کی رُو سے اسرائیل نے اپنے فوجی جلاد شالیط کی رہائی کے عوض ۱۰۰۰ سے زیادہ فلسطینی قیدی رہا کئے۔ جن میں سے کئی لوگوں کو اس جنگ سے قبل اسرائیلی حکومت نے تین شہریوں کے قتل کا بہانہ بنا کر گرفتار کرلیا یہ اسرائیل کی پہلی خلاف ورزی تھی۔

اس معاہدے کے تحت غزہ کا محاصرہ ختم کرنے پر اتفاق ہوا تھا۔ڈاکٹر محمد مورسی کی مصری حکومت نے رفاح کی سرحد کو کھول کر اپنا وعدہ نبھایا لیکن السیسی نے اسے دوبارہ بند کرکے دوسرے عہد کو پامال کیا۔ اسرائیل نے سرے سے اس معاہدے پر عملدرآمد کیا ہی نہیں تھا لیکن اس حوالے سے وہ وعدہ خلافی کا مرتب تھا۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں خوب بمباری کرکے شدید تباہی و بربادی مچانے کے بعد بدنامِ زمانہ ٹونی بلئیر نے اسرائیل کے اشارے پر ایک نیا جنگ بندی کا معاہدہ لکھا جسے السیسی نے سعادتمند غلام کے طور پر پیش کردیا۔ اس سازش کے اندر جنگ بندی کے پسِ پشت اسلحہ بردار مجاہدین کو ہتھیار سے محروم کرنے کی تجویز بھی شامل تھی۔ حماس کی بیدار مغز قیادت نے اس جنگ بندی کی سازش کو مسترد کردیا۔

حماس کے اس اقدام نے اسرائیل اور مصر کی بازی الٹ دی۔ اس زبردست رسوائی پر پردہ ڈالنے کیلئے اسرائیل نے بری حملہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن انہیں نہیں پتہ تھا کہ فلسطینی مجاہدین ان کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں۔ اس سے قبل ۲۰۰۹ء کے اندر اسرائیل نے اپنے ٹینک غزہ کے اندر روانہ کئے تھے۔ تین ہفتہ کی اس مہم کے دوران جتنے یہودی فوجی ہلاک ہوئے تھے اس سے زیادہ اسرائیلی فوجیوں کو مجاہدین نے دو دن کے اندر مار گرایا اور ایک کو یرغمال

بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اسرائیل نے بڑی مشکل سے اپنے فوجی کے قیدی بنائے جانے کو تسلیم تو کیا لیکن یہ کہہ دیا کہ ممکن ہے وہ ہلاک ہو گیا ہو۔ اس مرتبہ ابھی تک اسرائیل نے ۴۲ فوجیوں کی ہلاکت کو تسلیم کیا ہے جبکہ مجاہدین کے مطابق یہ تعداد ۸۰ سے تجاوز کرتی ہے اور زخمی ہونے والے سیکڑوں ہیں۔

اس جنگ میں طاقت کا توازن بھی چونکانے والا ہے۔ مغربی ذرائع کے مطابق غزہ میں مجاہدین کی تعداد جملہ ۱۰ ہزار ہے ان سے مقابلہ کرنے کیلئے ۵۰ ہزار فوجی ٹینکوں کے اندر سوار ہو کر میدان میں اتارے گئے ہیں۔ان پچاس ہزار کے سر پر ہوائی دستے کا سایہ ہے جس سے حماس کے مجاہدین پوری طرح محروم ہیں۔ اسرائیلی فوجیوں کے درمیان ۵ ہزار غیر ملکی دہشت گرد بھی شامل ہیں جس کا ثبوت دو امریکی اور ایک ہندوستانی کی ہلاکت سے ملتا ہے۔ اس کے باوجود مجاہدین نے نہ صرف ٹینک شکن میزائیلوں کا استعمال کرکے یہودی فوج کے چھکے چھڑا دیئے بلکہ بارودی سرنگوں تک سے ان کے پر خچے اڑائے۔ اس دوران اپنی بنائی ہوئی سرنگ سے ہو کر مجاہدین اسلام اسرائیل کے اندر بھی داخل ہوئے اورانہوں عام شہریوں کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ فوجیوں سے بھڑ گئے۔ اس مہم میں انہوں نے نہ صرف جام شہادت نوش کیا بلکہ دشمن کے فوجیوں کو واصل جہنم بھی کیا۔

اسرائیل کے ساتھ فلسطینی مجاہدین کی موجودہ جنگ کا موازنہ اگر ۱۹۶۷ء کی جنگ

سے کیا جائے تو حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں یہ ہوا تھا کہ جمال عبدالناصر کی قیادت میں لڑنے والی عرب افواج کے ۲۱ ہزار فوجی ہلاک، ۴۵ ہزار زخمی اور ۶ ہزار قیدی بنالئے گئے تھے جبکہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اسرائیل کے ۷۷۹ فوجی مارے گئے تھے، ۲۵۶۳ زخمی اور ۱۵ قیدی بنائے گئے تھے۔ حالیہ جنگ میں گوکہ ۱۰۰۰ سے زائد فلسطینیوں نے جامِ شہادت نوش کیا ہے لیکن اس میں مجاہدین کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ اسرائیلیوں نے بیشتر نہتے عوام، خواتین اور بچوں کو اپنی بربریت کا شکار بنایا ہے۔ ہسپتال اور پناہ گزین کیمپوں پر بمباری کی ہے۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں شکست کے نتیجے میں غزہ اور جزیرہ نمائے سینا کا ۲۴ ہزار مربع میل علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلاگیا تھا لیکن اس بار ابھی تک اسرائیلی بری فوجی غزہ کے اندر دو کلومیٹر سے آگے نہیں بڑھ پائی ہے۔

حالیہ مزاحمت کی کامیابی کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۷ء کی شکست کے سبب مصری فوج کی عزت خاک میں مل گئی تھی۔ عوام فوجیوں کو دیکھ کر فقرے چست کرنے لگے تھے اس بار پھر مصری حکمران اسی صورتحال سے دوچار ہیں جبکہ مجاہدینِ فلسطین عالم اسلام کی آنکھوں کا تارہ بنے ہوئے۔ حکمرانوں کے رویئے سے قطع نظرامت مسلمہ کے ہر فرد بشر کی آنکھ ان کیلئے نمناک ہے اور ہر دل ان کی کامیابی کیلئے دعا گو ہے۔ فلسطینیوں کو خوفزدہ

کرنے کے ارادے سے نکلنے والے اب خود اس جنجال سے جان چھڑانے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ مجاہدین اسلام اور فلسطینی عوام کی قوت ایمانی ہے جس نے انہیں وسیم بریلوی کے اس شعر کی مصداق بنا دیا ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ میرا سر نہ ملے گا
لیکن میری آنکھوں میں تجھے ڈر نہ ملے گا

یہ معجزہ کیوں کر رونما ہو گیا اس کا بہترین جواب خالق کائنات کے عظیم ترین معجزے سے بہتر کون دے سکتا ہے ؟ سورۂ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے ”جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا اُن میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیز گار ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے“۔ یہ آیت غزوۂ احد کے بعد نازل ہوئیں جس میں کل ۶۵۰ مجاہدین اسلام میں سے ۷۰ یعنی دس فیصد سے زیادہ جلیل القدر صحابہؓ کرام شہید ہو چکے تھے۔ امت مسلمہ کا یہ ایک غیر معمولی نقصان تھا۔ ابوسفیان نے میدان جنگ سے واپس ہوتے ہوئے چیلنج کیا تھا کہ ہم آئندہ سال بدر کے میدان میں ملیں گے لیکن جب ایک سال کی مدت کے خاتمہ کا وقت آیا تو اس کے اندر ہمت نہیں تھی کہ مسلمانوں کے مقابلے پر آئے۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کے اندر افواہیں پھیلا کر ان کا حوصلہ پست کرنے کی کوشش کی۔ یہ باطل کا وہی پرانا حربہ ہے جسے آج بھی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ استعمال کیا جا رہا ہے لیکن اہل ایمان پر اس کا الٹا

اثر پڑتا ہے ارشادِ ربانی ہے "اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ، تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، اُن سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے" اس طرح گویا اسلام دشمنوں کی اس حکمت عملی سے اہل ایمان کا حوصلہ ۱۴۰۰ سو سال قبل بھی بلند ہوا تھا اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

اللہ کی مدد و نصرت پر غیر معمولی توکل اور بھروسہ اہل ایمان کو دنیا جہان کی ریشہ دوانیوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ دشمن کی طاقت اور دوستوں کی بے وفائی ان کا کچھ بگاڑ نہیں پاتی ۔ وہ صرف اور صرف اللہ کے سہارے پیشقدمی کرتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر کامیاب و کامران ہو کر لوٹتے ہیں۔ بدرِ اخریٰ کی تاریخ گواہ ہے کہ جب ابوسفیان کو معلوم ہوا کہ دلیر و جری اہل ایمان دوسری مرتبہ میدانِ بدر میں اس کو شکست کا مزہ چکھانے کیلئے مجتمع ہو چکے ہیں تو وہ خود خوف و دہشت کا شکار ہو گیا اور درمیان سے لوٹ گیا۔ مسلمان جنگ کے بغیر فتحمند ہوئے ارشاد ربانی ہے "آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے"۔

اس واقعہ کے بعد اللہ رب العزت ایمان والوں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ "اب

تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحب ایمان ہو'' اسی کے ساتھ انہیں آگاہ کیا جاتا ہے کہ '' جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے، اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے'' اس طرح اس دنیا کی کشمکش کو مالک الملک نے آخرت کے انجام سے جوڑ دیا اور ان مسلمانوں کو جو اس معرکۂ حق و باطل میں طاغوت کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں تنبیہ کی ہے کہ ''جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں، اُن کے لیے دردناک عذاب تیار ہے''۔ مسلم دنیا کے بزدل حکمرانوں کیلئے دنیا کے اندر اپنی اصلاح کا موقع موجود ہے لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ جب یہ مہلت عمل ختم ہو جائیگی تو اللہ کے دردناک عذاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

اس سیاق و سباق میں حق باری تعالیٰ نے اپنی کتاب حکمت میں معرکۂ حق و باطل کی دو وجوہات بیان فرمائی ہیں اول تو یہ کہ '' اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو'' اس لئے ہمیں بجا طور پر یہ امید رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کشمکش کے خاتمے پر امت کی حالتِ

مظلومیت کو غلبہ و سربلندی میں اسی طرح بدل دے گا جیسا کہ بدرِ اخریٰ کے بعد ہوا تھا۔ دوسری حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ '' وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کرکے رہے گا مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسولوں میں جس

کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے لہٰذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلوگے تو تم کو بڑا اجر ملے گا''۔اس آیت کی روشنی میں دیکھیں تو حالیہ کشمکش کے دوران جس طرح باطل کے ہمنوا مسلم حکمراں بے نقاب ہوئے ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اقتدار کے نشے میں چور غفلت کا شکار ان لوگوں کے متعلق رب ذوالجلال ارشاد فرماتا ہے کہ ''یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انہیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر اُن کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے''۔ قرآن مجید کی ان آیات میں ساری عالمِ انسانیت کیلئے نشانِ عبرت ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کون ان سے نصیحت حاصل کرتا ہے؟

(تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی (قسط اول

اسوۂ رسول اکرم ﷺ جس طرح امت مسلمہ کے ہر فرد کی خاطر تمام عمر نمونۂ حیات ہے اسی طرح سیرت النبی ﷺ کے حالات و واقعات ملت اسلامیہ کی ہر ہر موڑ پر رہنمائی کرتے ہیں۔ گزشتہ شعبان سے لے کر اس سال شوال تک رونما ہونے والے عالمی واقعات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو بے ساختہ عام الحزن یعنی غم کا سال یاد آجاتا ہے۔ نبوت کا دسواں سال جس میں ایک ایک کرکے سارے دنیاوی سہارے بکھرتے چلے گئے۔ گھر کے اندر نبی کریمؐ کی دمساز و غمگسار، تمام مشکلات و پریشانیوں میں آپ کے شانہ بشانہ نبرد آزما رہنے والی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ داغ مفارقت دے کر عدم آباد کی جانب کوچ کر گئیں۔

مکہ مکرمہ کے اندر قبیلہ بنو ہاشم کے سردار اور آپ ﷺ کے سرپرست و نگہبان، دشمنانِ اسلام کی ہر مخالفت کا سینہ سپر ہو کر چٹان کی مانند دفاع کرنے والے شفیق و مہربان چچا حضرت ابوطالب نے بھی جہانِ فانی کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ آپؐ کا اولین دشمن ابولہب بنو ہاشم کا سردار بن گیا اور جب آپؐ نے ان حالات میں جائے پناہ کی خاطر میں طائف کا سفر فرمایا تو آپؐ کو اپنی زندگی کے سب سے سخت ترین دن کا سامنا پیش آیا

گویا ایک ایک کے بعد ابتلاء و آزمائش میں بدستور اضافہ ہوتا ہی چلا گیا۔ اس دوران نبیؑ کریم ﷺ کے ساتھ آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کرام بھی نت نئی آزمائشوں سے دوچار ہوتے رہے لیکن مشکلات کے اس ٹھاٹیں مارتے سمندر کے اندر پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی اس لئے کہ انہیں یقین تھا ۔

مرے جنوں کا نتیجہ ضرور نکلے گا

اسی سیاہ سمندر سے نور نکلے گا

عالمِ اسلام گزشتہ سال اسی قسم کے سنگین حالات سے دوچار تھا کسی جانب سے کوئی خوشخبری سنائی نہیں دیتی تھی ۔ اس سے پہلے کہ ایک گھاؤ بھرتا نیا زخم لگ جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس کی ابتداء مظفر نگر فسادات سے ہوئی جس کی مثال اترپردیش کی تاریخ میں نہیں ملتی اس کے بعد بوڈو لینڈ میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور بالآخر دہلی میں نریندر مودی کی حکومت کو دو تہائی اکثریت ۔۔برما کے اندر روہنگیا مسلمان انتہا پسند بودھ بھکشوں کے مظالم اور حکومت کی مسلسل بے اعتنائی کا شکار رہے ۔ بنگلہ دیش میں دوبارہ اقتدار پر قابض ہونے کی غرض سے شیخ حسینہ تحریک اسلامی کی دشمنی پر اتر آئیں اور ایک بے بنیاد مقدمہ میں شہید عبدالقادر ملا کی تختۂ دار تک پہنچا دیا۔

مصر کے اندر ڈاکٹر محمد مورسی کی حکومت کا تختہ ایک بین الاقوامی سازش کے

تحت الٹ دیا گیا جس میں اپنے پرائے سب شامل تھے اور پھر اس کے بعد اخوانیوں کے ساتھ خود مصری فوج نے جس ظلم و سفاکی کا مظاہرہ کیا اس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔ لیبیا میں جنرل ہفتار کا اسلام پسندوں کی منتخبہ حکومت کو اقتدار سے بے دخل کرکے سیکولر آمریت قائم کردینا بھی ایک بری خبر تھی۔ شام کے اندر بشار الاسد کے ساتھ مغرب نے کیمیاوی اسلحہ کو ضائع کرنے کا ناٹک کرکے رشتہ استوار کرلیا اور پھر وہ انتخاب کے ڈرامہ میں اس طرح کامیاب ہوا کہ گویا اب کوئی اس کا بال بیکا نہیں کرسکتا ہے۔ عراق میں نورالمالکی اپنی تمام تر نااہلی کے باوجود انتخاب میں کامیاب ہو کر اقتدار کا دعویدار بن گیا۔ ترکی میں رجب طیب اردوان کے خلاف اشتراکی تقسیم چوک پر مظاہرہ کرہی رہے تھے کہ معروف عالم دین فتح اللہ گلین بھی خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے اور ذرائع ابلاغ نے ایسی ہوا بنائی کہ گویا ان کا اقتدار بھی جلد ہی یہ جا وہ جا ہوا چاہتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ حماس کی بیخ کنی کے ناپاک ارادے سے اسرائیل نے غزہ پر ہلہ بول دیا۔ اس بار عرب ممالک کا اسرائیل کے ساتھ اشتراک و عمل کا شرمناک نظارہ بھی فلک گیتی نے کرلیا۔

حالات کی یہ سنگینی دراصل بالعموم اہل ایمان اور بالخصوص اسلامی تحریکات کی روز افزوں تقویت کے خلاف دشمنانِ اسلام کے اضطراب وپریشانی کا اظہار تھا۔ سیرت النبیؐ کے واقعات میں بھی ہمیں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ دین

اسلام جب تک ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مانند تھا اس وقت تک مشرکین مکہ اسے ناقابل اعتناء بتا کر نظرانداز کرنے کا ڈھونگ رچاتے رہے۔ لیکن جیسے جیسے اس کی روشنی پھیلتی چلی گئی مخالفت میں شدت آتی گئی۔ جب لعن طعن، الزام تراشی اور دشنام طرازی بے فائدہ ہو گئی تو مار پیٹ اور ایذارسانی کی نوبت آگئی۔ اسی دورِ ابتلاء میں حضرت امیر حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے طاقتور پھول گلشن اسلام کی زینت بن گئے اور پورا قبیلۂ بنو ہاشم حضور اکرمؐ کے تحفظ و حمایت میں کھڑا ہو گیا۔

اس کامیابی نے دشمنانِ اسلام کی نیند حرام کردی اور ان لوگوں نے معاشی مقاطعہ کا فیصلہ کردیا جس کے نتیجہ میں پورے قبیلہ بنو ہاشم کو شعب بن ابی طالب کے اندر محصور ہونا پڑا۔ یہ اقدام اسلامی تحریک کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کیلئے آزمایا گیا تھا۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے غزہ کی حصار بندی باطل کا پرانا حربہ ہے جسے پہلے بھی آزمایا جاچکا ہے۔ یہ اور بات ہے دشمنان اسلام کو اس میں نہ پہلے کامیابی ملی تھی اور نہ اب ملی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اسلام کی قوت و شوکت میں جس قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس کے شانہ بشانہ مخالفت بھی اسی شدت کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

سیرت کے واقعات شاہد ہیں کہ عام الحزن اور طائف سے گزر کر تحریک اسلامی کا یہ قافلۂ سخت جان معراج النبیؐ کی بلندترین منازل کو طے کرتا ہوا مدینہ

منورہ میں خیمہ زن ہو گیا اور آفتاب رسالت کی کرنوں نے عالم انسانیت کو منور کر دیا۔
اس دوران اہل ایمان کبھی حزن و مایوسی کا شکار نہیں ہوئے اس لئے کہ بقول ساغر صدیقی ؎

ایک ننھا سا آرزو کا دیا ضوفشاں تھا بہار سے پہلے

عصرِ حاضر کے حالات بھی گواہی دے رہے ہیں کہ تاریکی نے جب سارے عالم کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا تو اچانک چہار جانب سے ایک ایک کرکے روشنی کے ننھے ننھے چراغ روشن ہونے لگے ۔ خزاں رسیدہ چمن میں سبک خرام بادِ بہاری داخل ہو گئی ۔ ہوا کا رخ اس سمت سے بدلا جس کا کسی کو گمان تک نہیں تھا۔ قطع نظر اس کے کہ شام و عراق کی سرحد پر عالم وجود میں آنے والی یہ نئی ریاست کب تک باقی رہتی ہے اس کا قائم ہو جانا اپنے آپ میں ایک بہت بڑا چمتکار ہے۔اس نے ساری دنیا کو حیرت زدہ کر رکھا ہے۔
داعش کے حوالے سے بے شمار افواہوں کا بازار گرم ہے لیکن النصرہ نامی تحریک جو مغرب اور اس کے حلیفوں کی مخالفت کے باوجود بشار کے آگے سینہ سپر رہی ہے فی الحال داعش کے ساتھ ہے ۔اس لئے اسے امریکہ یا سعودی عرب کا ایجنٹ قرار دے کر یکسر مسترد کر دینا درست نہیں لگتا۔
موجودہ صورتحال تو یہ ہے کہ داعش کے خلاف امریکہ اور سعودی عرب ، ایران اور

بشار کا تعاون کرنے پر راضی ہو گئے ہیں ۔ داعش کے جملہ مظالم کو ہزار سے بھی ضرب کردیا جائے تب بھی وہ بشار کے مقابلے عشر عشیر ہی ہوں گے ایسے میں داعش کے خلاف بشار کی مدد کرنا یا اس سے تعاون لینا چہ معنی دارد؟ کل تک جو ایران مرگ بر امریکہ کے نعرے لگاتا تھا اور جو سعودی عرب اس کو علاقائی امن و امان کیلئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیتا تھا وہ دونوں اب امریکہ کی سرپرستی میں یکجا ہو گئے ہیں ۔ منفی مقاصد کے حصول کی خاطر سہی ایران اور سعودی عرب کے درمیان دوستی و مفاہمت پیدا کرنے کا منفرد کارنامہ داعش نے انجام دیا ہے ۔ اس نئی صف بندی سے جنم لینے والے اندیشوں پر یہ شعر صادق آتا ہے ۔

جشن بہار نو ہے نشیمن کی خیر ہو

اٹھا ہے کیوں چمن میں دھواں روشنی کے ساتھ

داعش کے ساتھ ایسے انتہا پسند گروہ شامل ہیں جن کی سفاکی اور شعائر اسلام کی بے حرمتی یقیناً قابل مذمت ہے لیکن وہ ایسے لوگوں کی حرکات ہو سکتی ہیں جو داعش کے قابو سے باہر ہوں ۔ ویسے اب تو وہ سلسلہ بھی بند ہو چکا ہے اور امریکی ان کے نشانے پر ہیں۔ داعش کی کامیابی نے پہلے تو اس غلط فہمی کا خاتمہ کیا کہ بشار کامیاب ہو چکا ہے ۔ اول تو شامی تیل کے ذخائر دیکھتے دیکھتے نئی ریاست کے قبضے میں چلے گئے ہیں اور بشار ہاتھ ملتا رہ گیا ہے۔ اس کے بعد عراق کے ایک بڑے علاقہ اور اس میں موجود سب بڑی ریفائنری اس کے ہاتھ

لگ گئی۔ عراقی فوج جو اسلحہ اور گولا بارود چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی وہ ان کے پاس ہیں۔ حال میں مجاہدین شام النصرہ کی گولان سرحد اسرائیل کے ساتھ بھی جھڑپ ہو چکی ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ ایک نئی ریاست کے بن جانے کو اور اس کے ابتدائی مرحلے میں ہونے والے خون خرابے کو بہت ہی حیرت انگیز خبر بنا کر پیش کر رہا ہے حالانکہ ابھی چند سال قبل سوڈان کو تقسیم کرکے جنوبی سوڈان کو الگ کر دیا گیا اور ایک نئی ریاست عالم وجود میں آ گئی۔ جنوبی سوڈان کے بنانے کا جواز یہ تھا کہ وہاں کے باشندوں کو خرطوم کی حکومت پر اعتماد نہیں تھا۔ اب اگر عراق و شام کے سرحدی علاقہ کے عوام کا اعتماد بغداد و دمشق کے اوپر سے اٹھ جائے تو کیا ایک نیا ملک نہیں بن سکتا ہے؟ کیا اس پر اقوام متحدہ کی مہر ضروری ہے؟ جبکہ اس ادارے کا امتیازی رویہ جگ ظاہر ہے۔ جنوبی سوڈان میں چونکہ اب خلفشار ہے اس لئے کیا ساری دنیا کی فوجیں وہاں حملہ آور ہو گئی ہیں؟ اگر نہیں تو یہ پیمانہ صرف عراق و شام کے درمیان قائم ہونے والی نئی ریاست کیلئے کیوں ہے؟ جنوبی سوڈان کی مانند اسے بھی تسلیم کرکے اس کا تعاون کیوں نہیں کیا جاتا؟

حالیہ بحران کا ایک بڑا فائدہ تو نور المالکی کے اقتدار کا خاتمہ ہے۔ وہ تو

اچھا ہوا کہ اس معاملے شیعہ سنی تنازع بنا کر پیش کرنے کی مذموم کوشش نہیں ہو سکی اس لئے کہ نورالمالکی سے نہ صرف اہلسنت، اہل تشیع بلکہ کرد بھی یکساں طور پر بیزار تھے۔ علامہ سید علی سیستانی نے اول توڈھکے چھپے الفاظ میں المالکی کوسبکدوش ہونے کیلئے کہا مگر پھر صاف خط لکھ دیا۔ مالکی نے عدالت سے رجوع کیا، وہاں سے ناکامی کے بعد اس کی اپنی جماعت الدعوہ نے ہاتھ کھینچ لیااور بالآخر ایران کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا اس طرح عراق کو نورالمالکی سے نجات دلانے کا سہرہ یقیناً داعش کے سر ہے۔

بنگلہ دیش اور میانمار میں فی الحال پہلے جیسی ہیجانی کیفیت نہیں پائی جاتی ۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کے اندر بھی مودی کا جادو تیزی سے روبہ زوال ہے ۔ اس موقع پر سب سے زیادہ خوش کن خبر ترکی سے آئی جہاں رجب طیب اروان پہلے ہی راؤنڈ میں ۵۲ فیصد ووٹ حاصل کرکے اولین عوامی صدر بن گئے ۔ اس کامیابی کی اہمیت کا اندازہ حزب اختلاف کے سیکولر امیدوار اکمل الدین احسان اگلوکے بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ انتخاب سے قبل جب ان سے سوال کیا گیا کہ آپ روشن خیال مسلمان ہیں کہ قدامت پرست تو جواب تھا میں خداترس مسلمان ہوں ۔ جس ترکی میں اسلام پسندوں کو بھی بابانگ دہل اسلام کی شہادت دینے سے روکا جاتا تھا وہاں ایک سیکولر رہنما کا مذکورہ اعتراف ترکی میں برپا ہونے والے عظیم انقلاب کا مظہر ہے۔

صدر مملکت رجب طیب اردوان نے انتخاب میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد استنبول سے انقرہ جاتے ہوئے ایوپ سلطان مسجد میں رک کر نمازدوگانہ ادا کی ۔ یہ وہی تاریخی مسجد ہے جہاں خلافت عثمانیہ کے دور میں تاجپوشی سے قبل خلیفہ وقت روایتی طور پر نماز شکرانہ ادا کرتا تھا۔ یہ علامتی قدم مرغِ بادبان کی مانند ہوا کے رخ کا نقیب اور قرآن مجید کی اس بشارت کا ترجمان ہے جس میں فرمایا گیا ''(اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو جن لوگوں نے اِس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے، صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا''

ایک اور خوشخبری حال میں لیبیا سے موصول ہوئی جہاں جنرل خلیفہ ہفتار کی فوج کو طلوع لیبیا کے فوجی دستے نے طرابلس سے مار بھگایا۔ خلیفہ ہفتار نے اسلام پسند قومی پارلیمان کے خلاف بن غازی میں بغاوت کردی تھی ۔ اس ماہ مئی میں احتجاج کے بعد جنرل ہفتار کے حامیوں نے قومی پارلیمان کو برخواست کرکے اقتدار پر قبضہ کرلیا اور انتخابی ڈرامہ کرکے نمائندوں کی مجلس قائم کردی ۔ جنرل ہفتار کے اقتدار کو بچانے کیلئے آخری لمحات میں مصر کے السیسی نے اپنے قومی مفاد پر داؤں پر لگا کر فوجی مداخلت بھی کی لیکن وہ بارآور نہ ہو

سکی ۔ طرابلس میں پھر ایک قومی پارلیمان پر سرِ اقتدار آچکی ہے جو السیسی اور اس کے حامیوں کیلئے بری خبر ہے۔

فلسطین کو اسرائیل کے چنگل سے آزاد کرانے کا بیڑہ ماضی میں مصر و شام نے مل کر اٹھایا تھا۔ جزیرۃ العرب کے ممالک ان کی زبانی حمایت کرتے تھے مگر وہ یکے بعد دیگرے ناکامی سے دوچار ہوتے رہے۔ اس بار اپنی آزادی کیلئے جب سرفروش اسلام پسند غزہ کے اندر کمربستہ ہوئے تو وہی روایتی ہمدرد و مددگار دشمنی پر اتر آئے اور دشمنوں سے ساز باز کر لی ۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے قرآن عظیم کا بیان ہے ”کیا اِن لوگوں نے کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں ۔ کیا اِنھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اِن کی راز کی باتیں اور اِن کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے اِن کے پاس ہی لکھ رہے ہیں“ ۔ غزہ پر حالیہ اسرائیلی حملہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جنرل عبدالفتاح السیسی نے اپنے آقاؤں کے اشارے تحریک اسلامی کو نیست و نابود کرنے جو بیڑہ ایک سال قبل اٹھایا ہے اسے غزہ میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

جنرل صاحب اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ اسرائیل کی بمباری سے خوفزدہ ہو کر حماس ہتھیار ڈال دے گی اور اس کے بعد وہ اسرائیل کی شرائط پر فلسطینیوں

کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر جنگ بندی کرادیں گے ۔ غزہ سے حماس و محمود عباس کو بے دخل کرکے اس کا انتظام وانصرام محمد دہلان کے حوالے کردیا جائیگا۔ اس طرح ذرائع ابلاغ کی مدد سے ایک طاقتور ثالث کے طور پر مشرق وسطیٰ میں السیسی کی حیثیت کا لوہا منوالیا جائے گا۔ لیکن ۵۰ دن کی اس جنگ نے ان ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور وہ اپنے سارے حلیفوں سمیت بے نیل و مرام رہ گئے۔ جس تحریک کو وہ دہشت گرد گردانتے تھے اس کے رہنماؤں کا انہیں قاہرہ میں استقبال کرنا پڑا اور ان کی شرائط پر جنگ بندی کیلئے مجبور ہونا پڑا۔

اس جنگ نے السیسی کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا کہ وہ پوری طرح بے نقاب ہوگیا یہودی رہنماؤں نے کھلے عام پذیرائی کرکے اس کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی ۔ جس روز وہ اپنی اجرت لینے کیلئے جدہ پہنچا اس کے ہاتھ خالی تھے مگر گلے میں شاہ عبداللہ کی جانب سے عطا کردہ نقرئی ہار لٹک رہا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ شکست کا غم غلط کرنے کیلئے عطا کیا گیا ہے۔ لیکن قدرت کا کرنا یہ ہوا کہ اسی دن ہیومن رائٹس واچ نے ایک سال قبل السیسی کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم کی

رپورٹ کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرکے اس کی مٹی پلید کردی۔ ہیومن رائٹس واچ کے وفد کا داخلہ ممنوع قرار دے کر السیسی نے اپنے جرائم اور کمزوری کا

بلا واسطہ اعتراف کرلیا۔ حماس کے ہاتھوں اسرائیل کو جو شکست ہوئی ہے اس کا بیان ایک علٰحیدہ مضمون کا تقاضہ کرتا ہے اس لئے قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس شعر کے ساتھ دوسری قسط کا انتظار کریں ۔

تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی
پائے جنوں سے حلقۂ گردش حال لے گئی

پاکستان: میں اپنی فتح سمجھتا تھا، ہار ہونے تک

کرکٹ ایک عجیب و غریب کھیل ہے۔ اس کے اسرار و رموز سے ڈاکٹر علامہ طاہر القادری کا ناواقف ہونا تو قابلِ فہم ہے لیکن عمران خان صاحب کا اسے بھول جانا ناقابلِ معافی جرم ہے۔علامہ طاہر نہ سیاسی کھلاڑی ہیں اور نہ کرکٹ کے مہار تھی لیکن یہ استثناء عمران خاں کو حاصل نہیں ہے اس لئے ان سے سوجھ بوجھ کی توقع کرنا کوئی نامعقول بات نہیں لیکن افسوس کہ عمران خان کے موجودہ موقف پر مشہور شاعر افتخار عارف کی نظم بارہواں کھلاڑی یاد آتی ہے۔ بارہویں کھلاڑی کی حالت بھی عمران خان کی مانند ہوتی ہے جو میدان یعنی ایوان پارلیمان سے باہر اقتدار کا منتظر ہوتا ہے۔اس نظم میں شاعر کے نام کو 'کیپٹن صاحب' سے بدلنے کی گستاخی کیلئے میں معذرت چاہتا ہوں۔ افتخار عارف بارہویں کھلاڑی کے دل کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

کھیل سے کھلاڑی کا، عمر بھر کا رشتہ ہے
عمر بھر کا یہ رشتہ ، چھوٹ بھی تو سکتا ہے
آخری وسل کے ساتھ ، ڈوب جانے والا دل
ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
تم بھی کیپٹن صاحب، بارھویں کھلاڑی ہو

علامہ طاہر القادری کا دانستہ یا نادانستہ طور پر پرویز مشرف کو بچانے کیلئے سرگرم عمل ہونا قرین قیاس ہے اگر اس کوشش میں فوج برسرِ اقتدار آجائے تو اس میں ان کا کوئی نقصان نہیں ہے اس لئے کہ وہ مشرف کے ساتھ شمالی امریکہ چلے جائیں گے جہاں سرخ قالین بچھا کر ان کا استقبال کیا جائیگا لیکن اس صورت میں عمراں خان کا کیا ہوگا ؟ وہ توہٹ وکٹ ہو کر میدان سے باہر ہو جائیں گے اور اس سے قبل کے آئندہ انتخاب کا اعلان ہو ممکن ریٹائرمنٹ کی عمر میں داخل ہو جائیں۔ اس لئے خان صاحب کو چاہئے کہ کسی اور کاچراغ جلانے کیلئے اپنا آشیانہ پھونکنے سے پرہیز کریں۔ عمران خان اس بار جوش میں آکر خود اپنے ملک و قوم اور جماعت و صدر کے ساتھ بھی انصاف نہ کرسکے اس لئے کوئی بعید نہیں کہ آئندہ انتخاب میں عوام ان کا سپڑا صاف کردے۔

پاکستان کی لوگ عموماً ہندوستانی جمہوریت کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے کہ دور کے ڈھول بہر حال سہانے ہوتے ہیں۔ گزشتہ سال ہندوستان میں دو بڑی عوامی تحریکیں چلیں ۔ پہلی بابا رام دیو نے چلائی ۔ بابا رام دیو کی مقبولیت علامہ طاہر القادری سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے ۔ اس تحریک سے اگر علامہ کوئی سبق لیتے تو اچھا تھا لیکن ان کے سامنے یقیناً مصر کی مثال رہی ہوگی لیکن یہ حقیقت اس بار کھل کر سامنے آگئی کہ پاکستانی سیاست

فی الحال مصر کے مقابلے ہندوستان کے ساتھ زیادہ مماثلت رکھتی ہے ورنہ کب کا فوج اقتدار پر قابض ہو چکی ہوتی اور حسنی مبارک کی مانند پرویز مشرف پر چلنے والے مقدمات کو کمزور کرنے کا کام شروع ہو گیا ہوتا۔ بابا رام دیو نے نعرہ تو کالے دھن کو بیرونی ممالک سے واپس لانے کا لگایا تھا لیکن بالآخر اندرون ملک کے ایک دو نمبری سیاستداں کو وزیراعظم بنانے کی مہم میں لگ گئے اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے لیکن اگر وہ قادری صاحب کی طرح اڑیل رویہ اختیار کر لیتے تو یہ چمتکار کبھی بھی ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ باباجی کے رویہ میں صوفی صاحب کیلئے عبرت کا سامان ہے۔

ہندوستان میں چلنے والی دوسری تحریک انا ہزارے کی تھی ۔ اس تحریک کے مطالبات کا اگر آزادی و انقلاب مارچ سے موازنہ کیا جائے تو اچھی خاصی مشابہت دکھلائی دیتی ہے ۔ بدعنوانی اور انتخابی اصلاحات پر ہر دو جگہ زور دیا گیا تھا۔اِدھر انا ہزارے کے ساتھ اروند کیجریوال تو اُدھر طاہر القادری کے ساتھ عمران خان تھے لیکن ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اروند کیجریوال نے عوامی تحریک چلانے کے بعد سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور عمران خان سیاست کے میدان سے نکل کر سڑک پر آئے۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ جب اروند نے انتخابی سیاست کی راہ لی تو اناجی نے ان سے دوری اختیار کر لی جبکہ سیاست کے میدان سے عوام میں آنے والے عمران خان کو طاہر القادی نے گلے لگا

لیا۔

ہندوستان کے لوگوں نے جس طرح کی توقعات لوک پال تحریک سے وابستہ کی تھیں وہی معاملہ انقلاب مارچ کے ساتھ تھا۔ عوامی تحریک نے اروند کیجریوال کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ بھی کیا لیکن جب انہوں نے اپنی چادر سے زیادہ پیر پھیلانے کی کوشش کی تو نہ صرف چادر پھٹ گئی بلکہ خود بھی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے خدا نہ کرے عمران خان کا یہ حال ہو۔ عمران خان کو چاہئے کہ وہ اروند کیجریوال سے سبق حاصل لیں جنہوں نے جوش میں آکر دہلی کی حکومت گنوادی اور اس کے نتیجے میں نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ عمران کی حالت اب بھی کیجریوال سے بہت بہتر ہے لیکن اگر فوج برسر اقتدار آجاتی ہے تو صوبہ پختونخواہ میں ان کی حکومت منٹوں میں برخواست کردی جائیگی اور اگر وہ سڑک پر اسی طرح نکلیں گیں تو جیل بھیج دیئے جائیں گے۔ اس وقت ان کی مدد کو نہ پرویز آسکیں گے اور نہ طاہر۔ اس لئے عمران کو خود اپنے پیر پر کلہاڑی چلانے کے بجائے کنٹینر سے باہر آکر کھلے دماغ سے سوچ کر آگے کی سیاسی حکمت عملی وضع کرنی چاہئے۔ ویسے شاہراہ دستور سے واپس ڈی چوک پر آنے کے فیصلے امید کرن ضرور ہے۔

عمران خان کو یاد رکھنا چاہئے کہ صرف ابتدائی زمانے میں کرکٹ کا میچ غیر

میعادی ہوا کرتا تھا لیکن جب شائقین کے ساتھ کھلاڑیوں کی بھی دلچسپی اس طول طویل میچ سے ختم ہونے لگی تو اس پر پانچ دنوں کی میعاد مقرر کر دی گئی۔ٹسٹ میچ میں ہر ٹیم کو دو مرتبہ کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ ایک مرتبہ کی غلطی کو دوسری بار ازالہ ممکن ہوسکے۔ اس کے باوجود کئی میچ ہار جیت کے بغیر ختم ہو جایا کرتے ہیں۔ دونوں حریف جماعتوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنے والا حزب اختلاف کا سیاسی جرگہ اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی طرح اس میچ کو ڈراڈکلییر کر دیا جائے۔ عمران خان کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اسلام آباد نواز شریف کا ہوم گراؤنڈ ہے اس پر شکست کوئی بڑی اہمیت کی حامل نہیں ہے لیکن اگر کل کو پشاور کے اندر بھی ہار گئے تو وہ بڑی خواری ہوگی۔عمران خان کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ سیاسی جرگہ کی پیشکش کو غنیمت جان کر لوٹ جائیں ورنہ تو وہی ہوگا جو انگلینڈ اور آسٹریلیا کی ابتدائی سیریز میں ہوا تھا۔

کرکٹ کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ اس کی ابتداء برطانیہ میں ہوئی لیکن برطانوی ٹیم نے سب سے پہلا دورہ امریکہ کا کیا۔ یہ دلچسپ انکشاف ہے یوروپ کے بے شمار ممالک کو چھوڑ کر اسے سات سمندر پار امریکہ جانا پڑا اس لئے کہ یوروپ کے لوگوں کے پاس لہو ولعب میں ضائع کیلئے اتنا وقت نہیں تھا۔ امریکہ اور کینیڈا کو اس سیریز کے بعد وقت کے بے انتہا ضیاء کا احساس ہوا تو وہ دونوں

تائب ہو کر بیں بال کی جانب مڑ گئے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جب برطانیہ کے چھکے چھڑا دیئے تو امریکہ کو اس کی مدد کے لئے دوڑ کر آنا پڑا۔ عمران خان کو یاد رکھنا چاہئے کہ زمانہ بدل گیا ہے ۔ فی زمانہ ٹسٹ کرکٹ کے شائقین دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں۔ نوجوان نسل تو اب دن بھر ففٹی ففٹی اوورس کا میچ دیکھنے کے بجائے ٹوینٹی ٹوینٹی دیکھنے لگے ہیں۔ اس لئے انہیں اپنے کھیل کا انداز بدلنا ہوگا ۔عمران خان کیلئے سیاسی کرکٹ میں وقت کی اہمیت کو سمجھنا بے حد ضروری ہے اس لئے کہ اس بار گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی ان کی مدد پرآمادہ ہیں لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو جائیگا جیسا کہ فی الحال دریائے چناب میں ہو رہا ہے تو سارے لوگ جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوں گے اور کوئی تعاون کیلئے آگے نہیں آئیگا۔

کرکٹ کا عشق برطانیہ کو ہزاروں میل کی دوری پر واقع اپنی نوآبادیات آسٹریلیا لے گیا۔ اس کے آگے لاہور سے اسلام آباد کے لانگ مارچ کا فاصلہ کچھ بھی نہیں ہے ۔ برطانوی ٹیم اس زعم میں مبتلاء تھی کہ وہ آسٹریلوی کھلاڑیوں کو آسانی سے مات دے دیں گے لیکن بازی اسی طرح الٹ گئی جیسی کہ اب اسلام آباد میں الٹی ہوئی ہے۔ ناکام و نامراد برطانیہ نے واپس آتے ہوئے آسٹریلیا کو ازراہِ تکلف اپنے ملک آنے کی دعوت دی جسے آسٹریلوی ٹیم نے

بسر و چشم قبول کرلیا اور برطانیہ پہنچ گئے ۔ اب کیا تھا برطانیہ کی سرزمین پر بھی آسٹریلیا نے انگلینڈ کو دھول چٹا دی ۔

انگلینڈ کی شکست کے بعد برطانوی کرکٹ پر تعزیت نامہ اس طرح لکھا گیا تھا برطانوی کرکٹ کو اوول کے میدان میں جلا کر خاک کردیا گیا اور اس راکھ کو آسٹریلوی اپنے ساتھ لے گئے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انصاف پارٹی کی مشتِ خاک مشرف اورالقادری اپنے ساتھ امریکہ لے جائیں ۔ اس لئے کہ امریکی انتظامیہ کی خدمت میں اس سے قیمتی تحفہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ صوبہ پختونخواہ امریکی نقطۂ نظر سے بہت ہی اہم علاقہ ہے اور وہاں پر صرف عمران خان ہی ان کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی جرأت رکھتا ہے اس لئے عمران کا سیاسی سر امریکہ کیلئے بیش بہا اہمیت کا حامل ہے۔

اسلام آباد میں چلنے والا کھیل کھلاڑی کم اور شائقین میں بیٹھے ہوئے جواری زیادہ کھیل رہے ہیں ۔ کرکٹ میدان میں مختلف ٹیمیں جیتتی یا ہارتی رہتی ہیں لیکن جواری کبھی نہیں ہارتے وہ ہر حال میں کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ اس کھیل میں اگر نواز شریف کی جگہ فوج آجائے تو اس میں امریکہ کا سیدھا سیدھا فائدہ ہے اور اگر عمران خان کی سیاسی ساکھ کا خاتمہ ہو جائے تو اس سے بھی امریکہ کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کا سیاسی بحران امریکہ بہادر کے

علاوہ مشرف اور قادری کے لئے بھی فائدہ بخش ہے۔ سیاسی استحکام امریکی مداخلت کے امکان کو کم کردیتا ہے اوراسی کے ساتھ اس کی اہمیت کو ختم ہوجاتی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فوجی اقتدار نے ہمیشہ ہی امریکی کے عمل دخل میں اضافہ کیا ہے۔

عمران پاکستانی ٹیم کے مایہ ناز آل راؤنڈر تھے۔ انہوں نے اپنی گیند کے علاوہ بلے سے بھی کمال دکھایا۔ اس بارجب نواز شریف کی گیند پر انہوں نے بلہ گھمایا تو وہ کچھ زیادہ ہی گھوم گیااور بال باؤنڈری کی جانب جانے کے بجائے آسمان کی طرف اچھل گئی۔

عمران کے اس غلط شاٹ کو بڑے آرام سے جھیلا جاسکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ فیلڈرس اس کو تھامتے تیسرے امپائر نے نوبال کا اشارہ کردیا اس طرح عمران خان کیچ آؤٹ ہونے سے بال بال بچ گئے۔ عمران کے جو حامی تیسرے امپائر کے تساہلی سے مایوس ہو رہے تھے خوشی سے اچھل پڑے۔

مذکورہ سانحہ کے بعد عمران کا حوصلہ بلند ہوگیا انہیں یقین ہوگیا کہ تیسراامپائر (یعنی فوج) ہمارے ساتھ ہے۔ عمران بار بار کامیابی کی دو انگلیاں اٹھا کر یہ کہتے رہے کہ امپائر کی ایک انگلی اٹھ جائیگی ساری دنیا جانتی تھی کہ اس سے کیا مراد ہے؟ عمران نے اپنے پہلے ہی اوور میں جب یارکر گیند پھینکی تو نواز شریف چوک گئے اور گیند ان کے پیڈ میں الجھ کر رہ گئی۔

یہ دیکھ کر عمران نے ایل بی ڈبلیو کی زوردار اپیل کی اور پہلے امپائر پی پی کی طرف دیکھا اس نے اپیل کو مسترد کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے لیگ امپائر کی جگہ کھڑی ہوئی جماعت اسلامی کی جانب بڑی امید کے ساتھ نظر دوڑائی لیکن وہ بھی گم صم رہی۔ اب تیسرے امپائر یعنی فوج کے علاوہ کوئی اور سہارہ نہ بچا تھا لیکن اس بار تیسرے امپائر نے کمال دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انگوٹھا (ٹھینگا) دکھادیا۔

عمران کے جن حامیوں کو امپائر کے اس فیصلے نے مایوس کیا ہے انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ موجودہ سیاسی بحران میں عمران کا سب بڑا خیر خواہ وہی تیسرا امپائر ہے اس لئے کہ اس کی انگلی کے اشارے نواز شریف وقتی طور پر تو گھر چلے جاتے لیکن دوبارہ انتخاب جیت کر لوٹ آتے لیکن عمران خان جو سر پر کفن باندھ کر میدان میں اترے ہیں اس قبر میں لٹا دیئے جاتے جسے مولاناطاہر القادری نے نواز شریف کیلئے کھود رکھا ہے۔ سیاست کی دنیا میں عوام کا اعتماد کوئی گنوا بیٹھنے والوں کی حالت بارہویں کھلاڑی جیسی ہو جاتی ہے

تم بھی افتخار عارف ، بارھویں کھلاڑی ہو

انتظار کرتے ہو، ایک ایسے لمحے کا

ایک ایسی ساعت کا

جس میں حادثہ ہوجائے ، جس میں سانحہ ہوجائے

تم بھی کیپٹن صاحب

تم بھی ڈوب جاوٴگے ، تم بھی ٹوٹ جاوٴگے

پاکستان کے حالیہ سیاسی بحران پر ہندوستانی ذرائع ابلاغ نے ابتداء میں خوب بغلیں بجائیں۔ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ پاکستان صرف ڈنڈے کے زور سے چل سکتا ہےاس کے ڈی این اے میں جمہوریت نہیں ہے۔ اس طرح کی بات کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی فوج سرکس کا شیر ہے۔ دانت اور ناخن نکال کر اس کو سدھایا جاچکا ہے لیکن پاکستانی فوج کی زبان سے اقتدار کا خون لگا ہوا ہے اس کے باوجود جس صبر تحمل کا مظاہرہ کمانڈران چیف راحیل شریف نے کیا وہ قابل تحسین ہے۔ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے اپنے باہمی اختلافات سے اوپر اٹھ کر بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے ملک کو بحران سے نکالنے کی مخلصانہ کوشش کی اور ذرائع ابلاغ نے بھی اپنی شورش کو بڑھا چڑھا کر اپنی مقبولیت بڑھانے کے بجائے فہم وفراست کا ثبوت دیا نیز حکمراں جماعت خوف واندیشے کا شکار ہو کر طاقت کے بیجا استعمال سے گریز کرتی رہی ۔ اس غیر معمولی تعاون واشتراک نے دور ونزدیک دشمنوں کو مایوس کردیا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ عمران اور طاہر بھی محسن نقوی کی مانند قوم کے مفاد میں اپنی ضد چھوڑ کراعلان کریں

آوٴ وعدہ کریں

سانس لیں گے متاعِ سخن کے لئے
جان گنوائیں گے ارضِ وطن کے لیے
دیدہ و دل کی، شوریدگی کی قسم
آسمانوں سے اونچا رکھیں گے عَلم

آؤ وعدہ کریں
آج کے دن کی روشن گواہی میں ہم
آؤ وعدہ کریں

پاکستان: آستیں سے بھی ذرا اب قیمتی خنجر نکال

ہندوستان کی عوام کو پاکستانی سیاست کی بہ نسبت کرکٹ میں دلچسپی زیادہ ہے اس لئے گفتگو کا آغاز کرکٹ سے کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ سیاسی بحران کا گہرا اور معروضی جائزہ لیا جائے۔ یہ عمران خان اور نواز شریف یا علامہ طاہر القادری اور شہباز شریف کے درمیان بپا ہونے والا معمولی تنازع نہیں ہے بلکہ اس نے مقننہ، عدلیہ اور فوج تینوں کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقننہ میں بھی یہ صرف مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف پارٹی تک یہ محدود نہیں رہا بلکہ پاکستان پیوپلس پارٹی اور جماعت اسلامی بھی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ یہ سیاسی سیلاب اپنے اندر دریائے چناب میں آنے والی طغیانی سے زیادہ بھیانک اور دوررس تباہی کے امکانات رکھتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ملوث ہر فریق کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے۔ پاکستان مسلم لیگ (ن): نواز شریف اوران کے بھائی شہباز شریف پر لگائے جانے والے اقرباء پروری کے الزامات سے انکار ناممکن ہے۔ بدعنوانی اور دھاندلی کے الزامات سے بھی انہیں بری الزمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ماڈل ٹاؤن کی فائرنگ کا معاملہ شہباز شریف کے ماتھے پر بدنما کلنک سے کم نہیں ہے لیکن

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح کے مظاہروں اور مطالبوں سے مذکورہ مسائل کا حل ممکن ہے ؟ کہیں یہ دوا بیماری سے زیادہ نقصان دہ تو نہیں ؟ بدقسمتی سے پاکستان کی سیاسی تاریخ کی روشنی میں اس سوال کا جواب حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس لئے کہ سیاسی بحران کا فائدہ اٹھا کر فوج ملک و قوم کو زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔

لوگ بجا طور پر یہ سوال کرتے ہیں کہ آصف زرداری کے دورِ حکومت میں اس طرح کا بحران کیوں نہیں پیدا ہوا ؟ نواز شریف اس کو وجود میں آنے سے کیوں روک نہ سکے ؟ ان سوالات کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آصف زرداری نے مکمل طور پر امریکی انتظامیہ کے آگے ہتھیار ڈال رکھے تھے ۔ اس لئے امریکہ کو انہیں ہٹانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن نواز شریف صد فیصد نہ سہی مگر کسی نہ کسی حد تک اپنی منفرد سوچ رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ امریکی انتظامیہ کے نزدیک وہ دوسروں کی بہ نسبت ناقابلِ اعتماد اور کم پسندیدہ رہے ہیں۔

نواز شریف کو پڑوسی ممالک خاص طور پر ہندوستان کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنے میں خصوصی دلچسپی ہے اس لئے کہ اس میں پاکستان کا بالواسطہ اور بلا واسطہ فائدہ ہے۔ اگر ان ہم سایہ ممالک کے تعلقات بہتر ہو جائیں تو دفاعی

امور کے اخراجات میں کمی ممکن ہے اور خزانے کا بڑا حصہ عوام کی فلاح بہبود میں استعمال ہو سکتا ہے۔ ہندوستان ایک بہت بڑی تجارتی منڈی ہے جس میں پاکستانی تاجر اپنی مصنوعات اچھے داموں پر باآسانی فروخت کر سکتے ہیں اور دور دراز کے ممالک سے سامان برآمد کرنے کے بجائے ہندوستان کے بازار سے استفادہ بہتر ہے۔ اس سے دونوں ممالک کے تاجر اور صارفین کا فائدہ ہے لیکن یہ دونوں باتیں امریکہ کیلئے نقصان دہ ہیں۔ اس کے سبب اس کے اسلحہ کی کھپت، اس کو ادھار بیچ کر اپنے رسوخ میں اضافہ کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ پاکستانی صنعت کا مال اگر ہندوستان میں بکنے لگے تو وہ یوروپ اور امریکہ کو بہتر داموں پر اپنا مال فروخت کر سکتے ہیں۔

نواز شریف نے اس بابت شعوری کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے اپنی حلف برداری میں منموہن سنگھ کو شرکت کی دعوت دی اور خود مودی کی حلف برداری میں شریک ہوئے۔ یہ دراصل خیر سگالی کا ایک علامتی اظہار تھا۔ جب تک امریکہ افغانستان میں الجھا ہوا تھا اسے پاکستان میں امن و سلامتی درکار تھی لیکن وہاں سے نکل جانے کے بعد یہ ضرورت ختم ہو جائیگی۔ جنوب ایشیا میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کیلئے امریکہ کیلئے ان دونوں ہمسایہ ممالک کے درمیان کشیدگی مفید تر ہے۔ اس کے رہتے وہ دونوں کو اسلحہ فروخت کرکے اپنے وارے نیارے کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا کے اسلحہ فروش نواز شریف کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔

اس آزمائش کے دوران نواز شریف کا سب سے بڑا ہتھیار ضبط و تحمل تھا۔ یہ تحریک پنجاب میں چل رہی تھی ۔ یہ علاقہ ان کے حامیوں سے اٹا پڑا ہے۔ ان کے پاس مرکزی اور صوبائی اقتدار ہے اس کے باوجود لاہور سے اسلام آباد مارچ کے دوران کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی گئی۔ اسلام آباد آنے کے بعد مظاہرین کے پیر بتدریج پھیلتے چلے گئے۔ پہلے تو وہ ڈی چوک تک آئے پھر شاہراہِ دستور میں داخل ہوئے اس کے بعد ایوان پارلیمان کے سامنے جا بیٹھے ۔جب وہاں بھی بات نہ بنی تو وزیراعظم کے گھر پر چڑھائی کر دی۔ گویا طاقت کے استعمال پر اکسانے والا آخری حربہ بھی استعمال کر لیا گیا لیکن کامیابی ہاتھ نہ آئی اس لئے کہ نواز جانتے اس میدان میں ہار تو کجا جیت بھی ہار ہے۔ وہ عوام کو کچل کر ان کے حقوق کی علمبرداری کا دم نہیں بھر سکتے۔ نواز شریف نے ایک عقلمند کھلاڑی کی مانند مخالف کے پالے میں سڑک پر اترنے کے بجائے ایوان پارلیمان کا اجلاس بلا کر ترپ کا پتہ ڈالا اور بازی جیت لی۔

پاکستان پیوپلس پارٹی: ایوان پارلیمان میں سب سے بڑی حزب اختلاف ہونے کے سبب پی پی پی کا مسلم لیگ کے خلاف ہونا فطری امر ہے۔ اس طرح بلاواسطہ عمران خان کو اس کی حمایت کا حقدار ہو جانا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ وہی بالغ نظری ہے جس کا مظاہرہ ٦ سال قبل نواز شریف نے کیا تھا۔ گزشتہ مرتبہ جب پی

پی پی اکثریت سے محروم رہ گئی تو اس کی سب سے زیادہ خوشی پرویز مشرف کی حمایت یافتہ مسلم لیگ (ق) کو ہوئی۔ انہیں یقین تھا کہ پی پی حکومت سازی کیلئے ان کے آگے جھولی پسارے گی اور وہ اس نئی حکومت کو چور دروازے سے یرغمال بنالیں گے۔ اگر یہ نہ ہوا تو مسلم لیگ (ن) اقتدار کے لالچ میں ان کے دام میں پھنس جائیگی لیکن ان تمام قیاس آرائیوں پر پانی پھیرتے ہوئے نواز شریف نے آصف زرداری کی جانب اپنا تعاون کا ہاتھ بڑھا دیا۔

انتخابی سیاست کی تاریخ میں یہ منفرد واقعہ تھا جس میں ایک اور دو نمبر کی جماعتیں ایک ساتھ ہو گئی تھیں ورنہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ پہلی کے ساتھ تیسرے نمبر والی جماعت ہوتی ہے یا دوسرے اور تیسرے نمبر کی جماعتیں یکجا ہو کر اول آنے والی جماعت کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ نواز شریف نے جس طرح اپنے سیاسی مفاد سے اٹھ کر اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا اس بار پی پی نے اس کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ لوٹا دیا۔ پی پی نے اس قومی بحران سے سیاسی فائدہ اٹھانے کے بجائے دونوں متحارب گروہوں کے درمیان مفاہمت کرانے کوشش کی۔ پاکستان پیوپلس پارٹی کا یہ موقف یقیناً قابلِ تحسین ہے جس کی قدردانی ہونی چاہئے۔

جماعت اسلامی (پاکستان): اس سیاسی بحران نے جماعت اسلامی پاکستان کو نہایت

نازک پوزیشن میں پہنچا دیا اس لئے کہ جماعت صوبہ پختونخواہ میں تحریک انصاف کی حلیف ہے اس لئے سیاسی مفاد کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اقتدار کی خاطر عمران خان کے ہر بیجا مطالبے کی بھرپور حمایت کی جاتی لیکن یہ رویہ قومی مفاد سے متصادم تھا اس لئے جماعت نے اپنے سیاسی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر ایک اصولی موقف اختیار کیا۔ ابن الوقتی کی انتخابی سیاست یہ نہایت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر جس سیاسی بالغ نظری کا مظاہرہ امیر جماعت نے کیا وہ ان کی پر اعتماد قیادت وحسنِ تدبر کا ثبوت ہے۔ جماعت کیلئے یہ بھی بہت آسان تھا کہ وہ عمران خان پر تنقید کرکے ایک جانب ہو جاتی اور اپنے آپ کو جمہوریت نواز پارسا ثابت کرنے کو شش کرتی لیکن جماعت نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔

امیر جماعت کو غالباً اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں آگے چل کر ثالثی کی ذمہ داری ادا کرنی پڑے گی ایسے میں لازم تھا کہ ان کا جھکاؤ کسی ایک فریق کی جانب نہیں بلکہ متوازن ہو۔ انہوں نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا کہ ہم نہیں چاہتے کہ مظاہرین خالی ہاتھ واپس جائیں اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ کوئی دستوری بحران پیدا ہو یا غیر دستوری مطالبہ پورا ہو۔ اس عادلانہ مفاہمت نے انہیں دونوں فریقوں کا اعتماد حاصل کرنے میں مدد کی اور ایک درمیان کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کام کو آگے بڑھانے کیلئے انہوں نے آصف زرداری

سے بھی ملاقات کی اور قومی مفاہمت کی ایک سازگار فضا تیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔
تحریک انصاف پارٹی: اس بحران کے دوران عمران خان سب سے زیادہ ذرائع ابلاغ میں نظرآئے لیکن ان کی شبیہ دن بدن بگڑتی چلی گئی۔ پاکستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں بد قسمتی سے موروثیت کے موذی مرض کا شکار ہیں لیکن عمران خان کی جماعت اس سے محفوظ ہے۔ نوجوان طبقہ میں عمران خان کی مقبولیت بہت زیادہ ہے اور وہ امید کے ساتھ ان کی جانب دیکھتے ہیں۔ مستقبل قریب میں اگر کسی رہنما سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ شریف اور بھٹو خاندان کے چنگل سے پاکستان کو نکال سکے گا تو وہ عمران خان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ عمران کو صوبہ پختونخواہ سے باہر بقیہ تین صوبوں میں اپنا سیاسی اثر و رسوخ بڑھانا ہے اور اس کام کیلئے چار سال کی مدت بہت زیادہ نہیں ہے۔ اگر عمران خان سنجیدگی کے ساتھ اس کام کو کرپائے تو انہیں اقتدار میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن عمران کو یاد رکھنا ہوگا کہ اس معاملے میں جلد بازی اور ہنگامہ آرائی سم قاتل ہے۔
عمران کا علاقہ افغانستان سے متصل ہونے کے سبب کافی اہم ہے۔ اس علاقہ کے لوگ مختلف سمتوں سے ظلم و جبر کا شکار رہے ہیں ایسے میں ان کے اندر غم و

غصہ کا پایا جانا اور اس کا اظہار ہونا فطری ہے۔ عمران کیلئے ضروری ہے کہ ان کا اعتماد حاصل کرے ان کو تخریب کی راہ سے نکال کر تعمیر کی راستے پر گامزن کرے۔ اگر ایسا ہوگیا تو یہ نہ صرف پاکستان بلکہ امن عالم کیلئے ایک سنگ میل ہوگا۔ عمران کو چاہئے کہ وقتی تماشوں پر اپنا وقت اور توانائی صرف کرنے کے بجائے اس موقع کا بھرپور استعمال کرے اور اپنی خداداد صلاحیت کا لوہا منوالے لیکن اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ امریکی مفادات ہیں۔ امریکہ کی آنکھوں کا سب بڑا کانٹا عمران خان ہے اور وہ ضرور چاہے گا کہ عمران پاکستانی سیاست میں بے وزن ہو جائے اس لئے اسے امریکی مفادات کے محافظین سے ہوشیار و خبردار رہنا ہوگا اور ان جھانسے میں آنے سے اپنے آپ کو بچانا ہوگا۔

تحریک انقلاب کے رہنما علامہ طاہر القادری پر ڈاکٹر عاصم واسطی کا یہ شعر معمولی ترمیم کے ساتھ صادق آتا ہے

قادری گلدستہ تیرے ہاتھ میں خوش رنگ ہے
آستیں سے بھی ذرا اب قیمتی خنجر نکال

ڈاکٹر قادری کی مسئلہ یہ ہے کہ جس قیمتی خنجر کا استعمال ان کے پیش نظر ہے

وہ فی الحال فوج کی آستین میں ہے اور خوش قسمتی سے فوجی سربراہ راحیل شریف واقعی شریف آدمی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس خنجر کا استعمال دوستوں پر نہیں بلکہ دشمن پر ہونا چاہیئے۔ ویسے راحیل شریف کے سامنے پرویز مشرف بھی نشانِ عبرت بنا ہوا ہے جو خود پاکستان میں راندۂ درگاہ ہے۔ اس کے اوپر قوم سے غداری کے سنگین مقدمات ہیں۔ کمانڈر چیف جانتے ہیں عالمی طاقتیں فوجی آمر کا استعمال ٹشو پیپر کی طرح کرتی ہے۔ ہاتھ پوچھنے کے بعد جب وہ بھیگ کر نرم ہو جاتا ہے تو اسے کوڑے دان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ راحیل شریف نے اپنے آپ کو اس عبرت ناک انجام سے بچا کر غیر معمولی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے اور اس کیلئے وہ قابلِ مبارکباد ہیں۔ عمران خان اور طاہر القادری نے گوناگوں وجوہات کی بناء پر فوج کے بجائے عدالت عالیہ کے سامنے گہار لگائی لیکن عدالت کو پتہ تھا کہ اس کا کام دستور کو پامال کرنا نہیں بلکہ اس کو نافذ کرنا ہے لیکن اس بار اس کے تحفظ کی ذمہ داری عدالت نے بخیر و خوبی ادا کی۔

علامہ طاہر القادری کے علم و فضل سے کوئی انکار نہیں کرسکتا اپنے ہم عمر علماء میں وہ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ہمنواؤں نے ہر گرم و سرد میں ان کا ساتھ دے کر یہ ثابت کردیا کہ وہ عوام کے ایک طبقہ میں خاصے مقبول ہیں اور اگر وہ پاکستان کی سیاست میں کوئی مثبت اور اہم کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کا استقبال کیا جانا چاہیئے۔ لیکن اس کیلئے طاہر صاحب کو سب

سے پہلے تو اپنے غیر ملکی پاسپورٹ کو دریا برد کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ایک ساتھ دو کشتیوں کے اندر سواری کی کوشش کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد سیاسی سمجھ بوجھ کے ساتھ جستہ جستہ آگے بڑھنا ہوگا۔ جو سیاسی انقلاب ان کے پیش نظر ہے وہ صرف مظاہروں اور تقریروں سے برپا نہیں ہوگا۔

میدانِ سیاست میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے سیاست کے اسرار و رموز سے واقفیت کے ساتھ ساتھ سلیقہ مندی سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ محض عقائد ودعوت پر علم و تحقیق اور خطابت کی مہارت کافی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کو پرویز مشرف سے فاصلہ بنا کر اپنے آپ کو اس کا آلۂ کار بنانے سے بچانا ہوگا ورنہ علم و فضل کی بدولت جو اعلیٰ مقام انہوں نے حاصل کیا ہے وہ بھی داغدار ہوجائیگا۔ ڈاکٹر طاہر القادری کا اعلان کہ مظاہرین عیدالاضحیٰ اپنے گھروں پر منائیں گے اور عمران خان کی جانب سے ۱۳ ستمبر کو ون نیشن ' ڈے کا اعلان اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ سیاسی طوفان کا پانی ' بھی دریائے چناب کی مانند اتر رہا ہے لیکن اس طغیانی نے جو تباہی مچائی ہے اس کی بھرپائی میں خاصہ وقت لگے گا۔

ضمنی انتخابات : ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

نریندر مودی خوش قسمت تھے کہ جب کانگریس کی عدم مقبولیت بام عروج پر پہنچی تو بی جے پی نے پارٹی کی کمان اڈوانی سے چھین کر ان کے ہاتھوں میں تھما دی۔ شومئی قسمت سے ان کی لاٹری لگ گئی اور وہ انتخاب جیت گئے لیکن مہورت ٹھیک نہیں نکلا۔ سنچری (سو دن) کے مکمل ہونے کا وقت آیا تو بہار سے ہار کی خبر آگئی۔ مدھیہ پردیش اور کرناٹک میں بھی خزاں چھا گئی۔ اپنی کنڈلی کو درست کرنے کیلئے انہوں نے نیپال کے پشوپتی ناتھ مندر کا رخ کیا۔ وہاں کروڑوں کے صندل کا ہون کیا لیکن وہ کوشش بھی اکارت گئی۔ گجرات سے دہلی آنے کے بعد جب وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنی پہلی سالگرہ منانے کیلئے واپس احمد آباد پہنچے تو اس موقع پر اترپردیش، راجھستان اور گجرات سے شکست کی خبروں نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ غم کے کالے بادل ذرائع ابلاغ پر یوں چھاگئے کہ نریندر مودی کی حالت زار پر ساغر نظامی کا یہ شعر (محبت کے بجائے سیاست کی ترمیم کے ساتھ) صادق آگیا۔

رُودادِ سیاست کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دو دِن کی مسرت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

وزیر اعظم کے ستارے اقتدار سنبھالتے ہی اس وقت گردش میں آگئے تھے جب حلف

.برداری سے قبل شیو سینا اور ایم ڈی ایم کے نے پاکستان اور سری لنکا کے سربراہان کی شرکت پر علم بغاوت بلند کردیا۔ اس کے بعد وزیر مملکت وی کے سنگھ کا کمانڈر چیف کے ساتھ تنازع سامنے آگیا اس سے نکلے تو نہال چند میگھوال پر عصمت دری کا مقدمہ قائم ہوگیا اور اسی کے ساتھ اترانچل کے ضمنی انتخاب میں بی جے پی ساری سیٹیں ہار گئی۔

یکے بعد دیگرے رونما ہونے والے ان واقعات سے پریشان ہو کر مودی نے اعتراف کر لیا کہ انہیں تو ہنی مون منانے کا موقع بھی نہیں ملا لیکن اب بات کس قدر آگے بڑھ گئی ہے اس کا اندازہ شیو سینا کے ادھو ٹھاکرے کی بیان بازی سے لگایا جاسکتا ہے۔

ادھو ٹھاکرے نے اپنے اخبار سامنا کے اداریہ میں بی جے پی کو مخاطب کرکے لکھا ''بیجا ہوس کا مطالبہ طلاق تک پہنچ سکتا ہے'' اس کے جواب میں ایک بی جے پی رہنما نے چوٹ کی کہ ''نامردی بھی طلاق کا سبب بنتی ہے''۔ سینا بی جے پی کا الحاق ۲۵ سال پرانا ہے۔ ازدواجی زندگی کی سلور جوبلی کے بعد بھی اگر کوئی جوڑا بھری محفل میں اس طرح دشنام طرازی کرے تو یہ قابل شرم بات ہے لیکن ہندوتوپریوار کے یہی سناتن سنسکار ہیں اس لئے کوئی بعید نہیں کہ بی جے پی والے آج جس طرح ادھو ٹھاکرے کو نامردی کا طعنہ دے رہے ہیں کل وزیراعظم پر بھی اسی طرح کا اعتراض کرنے لگیں اور نریندر مودی کو کہنا پڑے کہ

اڑتا ہوا غبار سر راہ دیکھ کر

انجام ہم نے عشق کا سوچا تو رو دیئے

تین لوک سبھا کی نشستوں پر حال میں ضمنی انتخابات ہوئے۔ جن میں سے دو پر بی جے پی ہار گئی اور ایک پر کامیابی ملی ۔ اس طرح ٹسٹ میچ کی اس سیریز میں بی جے پی کا مین آف دی میچ امیت شاہ بین آف دی میچ بن گیا لیکن اس کے ساتھ ہی نہ صرف نام نہاد شاہ بلکہ اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھنے والے نریندر مودی کا وقار بھی داؤں پر لگ گیا ہے۔ خود وزیر اعظم کے اپنے حلقۂ انتخاب وارانسی میں واقع روہنیا سے حلیفِ بی جے پی اپنا دل کے صدر کو سماجوادی امیدوار مہندر سنگھ پٹیل نے دھول چٹا دی ۔ جاپان جانے کے بعد نریندر مودی کو ہندوستان کے بے شمار تیر تھ استھانوں میں سے کسی کی یاد نہیں آئی ۔ وہ رام کی جنم بھومی ایودھیا کو بھول کر وارانسی کو کیوٹو کی مانند بین الاقوامی سیاحتی مرکز بنانے کا معاہدہ کرکے لوٹ آئے لیکن اس کے باوجود روہنیا کے رائے دہندگان نے بی جے پی کو دھتکار دیا۔ مرکزی وزیر اوما بھارتی خود اپنی چر کھاری سیٹ بھی نہیں بچا سکیں ۔ اتر پردیش میں فساد زدہ سہارنپور اور دو شہری حلقوں کے علاوہ تمام سیٹوں پر بی جے پی چاروں شانے چت ہو گئی ۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ اس شکست کیلئے نریندر مودی ذمہ دار نہیں ہے تو وہ غلط ہے اس لئے کہ ۲۰۱۲ء کے اندر مودی کی مدد کے بغیر بی جے پی نے ان ۱۱ حلقہ ہائے انتخاب پر کامیابی حاصل کی تھی ۔ مرکز میں بی جے پی اقتدار کے چار ماہ کے اندر ملنے والی اس ہار کی سیدھی ذمہ داری مودی سرکار پر ہے۔ راجھستان میں بھی یہی ہوا۔ وہاں پر گزشتہ سال وجئے راجے سندھیا نے زبردست کامیابی درج کرائی اور پھر پارلیمان میں ساری کی ساری نشستوں پر قابض ہو گئیں لیکن نئی مرکزی حکومت کے قائم ہوتے ہی چار میں سے تین پر ناکامی ہاتھ آئی ، اب اس کیلئے کون ذمہ دار ہوا ؟

گجرات میں نریندر مودی نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے جن نشستوں کو جیتا تھا ان میں سے تین پر وزیر اعظم بننے کے بعد مودی بی جے پی امیدوار کو کامیاب نہ کرسکے ۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ گجرات کی عوام کے نزدیک وہ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے تو وہ قابلِ قبول تھے مگر وزیر اعظم بننے کے اہل نہیں ہیں۔ یہ نتائج نریندر مودی کے وارانسی اور گجرات کے ساتھ زبردست امتیازی سلوک کے باوجود برآمد ہوئے ہیں۔ گجرات کیلئے بولیٹ ٹرین کا معاملہ مودی نے جاپان میں طے کیا۔ چینی سربراہ کو لے جانے کیلئے بھی انہیں گجرات کے علاوہ کوئی اور ریاست نظر نہیں آئی لیکن اس کے باوجود گجراتی عوام نے تین نشستوں پر

کانگریس کو کامیاب کرکے جتادیا کہ بی جے پی کے برے دن شروع ہو چکے ہیں ۔ بقول شاعر

محفلیں لُٹ گئیں جذبات نے دم توڑ دیا
ساز خاموش ہیں نغمات نے دم توڑ دیا

بی جے پی کیلئے ایک خوشخبری مغربی بنگال کے بصیر ہاٹ سے آئی جہاں اس کے امیدوار شمک بھٹاچاریہ نے ترنمل کانگریس کے دیپیندو بسواس کو شکست دے کر کامیابی درج کرائی ۔ ۱۵ سال قبل ترنمل کی مدد سے بی جے پی کو مغربی بنگال کے اندر ایک اسمبلی حلقہ میں کامیابی ملی تھی اب یہ دوسری بار ہوا ہے۔ پارلیمانی انتخاب میں اس حلقہٗ انتخاب کے اندر بی جے پی کو ۳۰ ہزار ووٹوں کی برتری حاصل تھی جو اب پندرہ سو ووٹ تک سمٹ گئی گویا ۲۸ ہزار ووٹ کا نقصان ۔ اس بیچ مرکزی حکومت نے ممتا کو پریشان کرنے کیلئے سردھاچٹ فنڈ معاملے میں سی بی آئی کو پیچھے لگا دیا اس کے باوجود چورنگی حلقہٗ انتخاب سے ترنمل امیدوار نینا بندو پادھیائے ۱۴ ہزار سے زیادہ ووٹ سے کامیاب ہو گئیں ۔

بنگال میں عرصہٗ دراز تک حکومت کرنے والی سی پی ایم کیلئے یہ انتہائی تشویش کا مقام ہے۔ بصیر ہاٹ سے لگاتار ۷ مرتبہ سی پی ایم کے نارائن مکرجی کامیاب

ہوئے تھے اور ان کی موت کے ساتھ یہاں سے سی پی ایم کا جنازہ اٹھ گیا اور وہ تیسرے نمبر پر پہنچ گئی۔ بنگال کے اندر ۲۰۱۱ء کے اسمبلی انتخابات میں سی پی ایم کو ۴۱ فیصد ووٹ ملے تھے لیکن پچھلے سال پارلیمانی انتخاب میں وہ تناسب گھٹ کر ۳۰ فیصد پر پہنچ گیا اور اسے صرف دو نشستوں پر کامیابی ملی۔ سی پی ایم نے جو ۱۱ فیصد ووٹ گنوائے وہ سیدھے بی جے پی کی کشکول میں چلے گئے اور اس کے رائے دہندگان کا تناسب ۴ فیصد سے بڑھ کر ۱۷ فیصد پر ہو گیا۔ اس حقیقت کا اعتراف خود پارٹی کے جنرل سکریٹری پرکاش کرات نے کیا۔ ان نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ انتخابی کامیابیوں کا فکری انقلاب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے ورنہ یہ کیونکر ہو گیا کہ سی پی ایم کے ووٹرس نے اس قدر جلدی لال جھنڈا پھینک کر زعفرانی پرچم تھام لیا۔

اترپردیش میں یہی حشر بہوجن سماج پارٹی کا ہوا۔ ایک وقت میں وزیراعظم بننے کا خواب دیکھنے والی مایاوتی کی بی ایس پی پارلیمانی انتخاب میں ایک بھی نشست نہ جیت سکی۔ ملک گیر سطح پر اس کے رائے دہندگان کا تناسب صرف دو فیصد کم ہوا مگر اترپردیش میں گزشتہ پانچ سالوں کے اندر وہ ۲۷ فیصد سے ۲۰ فیصد پر پہنچ گئی۔ مسلمانوں کے اندر جو سیاسی جماعتیں اٹھتے بیٹھتے مایاوتی کا حوالہ دے کر اپنے لئے جواز فراہم کرتی تھیں ان کیلئے اس میں عبرت کا

سامان ہے کہ برسوں کی محنت سے پروان چڑھنے والے انتخابی درخت کی جڑیں اس قدر کمزور ہوتی ہیں کہ ہوا کہ ایک جھونکے سے وہ اکھڑ جاتا ہے۔ اس بار مایاوتی نے ضمنی انتخاب سے اپنے آپ کو الگ رکھ کر دانشمندی کا ثبوت دیا۔اس اقدام سے ان کی اپنی عزت بھی رہ گئی اور بی جے پی کی ہوا بھی اکھڑ گئی۔ سی پی ایم اور بی ایس پی کی حالتِ زار پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

بھولی ہوئی صدا ہوں مجھے یاد کیجیے
تم سے کہیں ملا ہوں مجھے یاد کیجیے

اترپردیش کے اندر بی جے پی کو اس منافقت مار گئی۔ پارلیمانی انتخاب کے وقت اس نے یکسوئی کے ساتھ تعمیر وترقی کے نعرے پر انتخاب لڑا تھا۔ امیت شاہ نے اعظم گڑھ کو دہشت گردوں کی سرزمین اور مظفر نگر میں بدلہ کی بات کہہ کر جو غلطی کی تھی اس کا فوراً اعتراف کرکے اس طرح ازالہ کردیا کہ کبھی کبھار ماہر بلہ باز بھی ہٹ وکٹ ہو جاتا ہے۔ اس سے عوام کو یہ خوش فہمی ہو گئی کہ اب کی بار بی جے پی واقعی سنجیدہ ہے۔
نریندر مودی کی چکنی چپڑی باتوں سے بیجا توقعات وابستہ کرکے لوگ ان کے جھانسے میں آگئے۔ لیکن انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے عہد و پیان بھول کر بی جے پی نے پھر سے فرقہ پرستی کا پرانا کھیل شروع کردیا۔ اس کی ابتداء سنگھ سربراہ بھاگوت کے اس اعلان سے ہوئی کہ سارے ہندوستانی ہندو ہیں۔

اس کے بعد بی جے پی نے پارلیمان کے اندر فرقہ پرستی پر ہونے والی بحث کا جواب دینے کیلئے اپنے سرکردہ رہنماؤں کو کنارے کرکے مہنت اویدیہ ناتھ نامی بدزبان کو میدان میں اتارا۔ اویدیہ ناتھ کا اس عزت افزائی سے دماغ ہی خراب ہوگیا۔ اس نے لو جہاد کے نام پر ساری ریاست کی فضا مکدر کرنے کی بھرپور کوشش کرڈالی اور اشتعال انگیز بیانات کا سلسلہ شروع کردیا۔ اویدیہ ناتھ کیا کم تھا کہ ساکشی مہاراج بھی نیند سے بیدار ہوگئے اور انہوں نے مدرسوں کے خلاف محاذ کھول دیا۔ اپنی ویب سائٹ پر اس احمق رکن پارلیمان نے ہندو لڑکیوں سے شادی کرکے انہیں مسلمان بنانے کی خودساختہ انعامی رقم کی فہرست بھی شائع کردی۔ بی جے پی اس بابت تذبذب کا شکار رہی اس لئے تمام تر تیاری کے باوجود متھرا کے اجلاس میں لو جہاد پر قرارداد پاس نہیں ہوسکی لیکن اس کی بنیاد پر نفرت کا بازار گرم ہوتا رہا۔

اویدیہ ناتھ کو شکست کے بعد شکایت ہے کہ بی جے پی نے امیدواروں کے انتخاب میں غلطی کی۔ بی جے پی کی انتخابی حکمت عملی غلط تھی اور اسے ساری ریاست کے اندر تشہیر کا موقع نہیں دیا گیا۔ کاش کہ سارے امیدوار مہنت کی مرضی سے طے کئے جاتے اور وہ سب کے سب مہنت اور مہاراج ہوتے۔ اس کو فرقہ پرستی کی بنیاد پر حکمتِ عملی بنانے کی موقع دیا جاتا تاکہ جن تین حلقوں سے بی جے پی

کامیاب ہوئی ہے وہاں سے بھی اس کا صفایہ ہو جاتا۔اویدیہ ناتھ کو سماجوادی پارٹی نے لکھنؤ اور نوئیڈا میں آنے سے روکا اور اس پر ایف آئی آر کرائی جس کے نتیجے میں دونوں مقامات پر بی جے پی جیت گئی یہی سہارنپور میں بھی ہوا۔ اگر اویدیہ ناتھ کو کھلی چھوٹ دے دی جاتی تو یہ تین نشستیں بھی بی جے پی ہار جاتی۔ اس لئے ممکن ہے آئندہ سماجوادی پارٹی اپنے جعلی کارکنان کی مدد سے ریاست بھر میں اویدیہ ناتھ کے جلسہ کروائے تاکہ بی جے پی کا صفایہ ہو جائے۔بھاگوت اور مہنت جیسے لوگوں کے بارے میں غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

بی جے پی ویسے تو ساری دنیا کو احمق سمجھتی ہے لیکن حقیقت میں خود نہایت بے وقوف جماعت ہے۔ جس وقت لو جہاد کی گونج سارے عالم میں گونج رہی تھی بی جے پی کے سینئر رہنما اور مرکزی وزیر کلراج مشرا نے اعلان کردیا وہ نہیں جانتے لو جہاد کیا ہے۔ چھوٹی اور درمیانہ صنعت کے وزیر کو اگر اس کی معلومات نہ ہو اس میں بڑی حیرت کی بات نہیں ہے لیکن وزیر داخلہ اور کابینہ میں دوسرے نمبر کے رہنما راج ناتھ نے مشراجی کی تائید کرکے ساری دنیا چونکا دیا۔ یہ ایک ایسا سفید جھوٹ تھا جو کسی وزیر داخلہ کو زیب نہیں دیتا اور اگر وہ سچے ہیں تو انہیں اس اہم ترین وزارت کے قلمدان سے سبکدوش ہو جانا چاہئے۔ جو وزیر

داخلہ اپنی آنکھ کان کھلے رکھنے کے بجائے افیون کے نشے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتا ہو اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس دوغلے پن کی وجہ سے بی جے پی کو نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اس فسطائی جماعت کو بشمول اترپردیش سارے ہندوستان میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا بی جے پی کا فی الحال یہ حال ہے کہ اس میں شاہ اور شہنشاہ کے علاوہ سارے لوگ بے وقعت ہوگئے ہیں اور یہ دونوں اپنی من مانی کررہے ہیں۔ انہیں لوگوں نے راج ناتھ کے خلاف افواہیں پھیلا کرانہیں خوار کیا۔ سارے بزرگ رہنماؤں کو کوڑے دان کی نذر کیا۔ پہلے اترپردیش اور پھر قومی سطح پر پارٹی اور حکومت پر قبضہ کرلیا اس لئے جس طرح تمام کامیابیوں کا سہرہ زر خرید ذرائع ابلاغ ان کے سر باندھتا رہا اسی طرح دیانتداری کا تقاضہ ہے کہ ناکامی کا کلنک بھی انہیں کے ماتھے پر لگنا چاہئے۔ لیکن جب صحافت تجارت بن جائے تو اس سے دیانت کا توقع چہ معنی دارد؟ اس ناکامی نے مسلمانوں کے علاوہ اڈوانی سے لے جوشی تک اور راج ناتھ سے لے کر مشرا تک سارے لوگوں کو خوش کردیا ہے۔ ادھو ٹھاکرے کے تو وارے نیارے ہوگئے ہیں۔ وزیر اعظم کو چاہئے کہ اب یوم اساتذہ پر طلباء کا وقت ضائع کرنے کے بجائے خود سیاست کی ابجد سیکھیں۔ اگر مودی اور شاہ نے اس ناکامی سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا تو بہت جلد ان کا نام سیاست کی اسکول سے خارج کردیا جائیگا۔

مودی اپنی کلاس میں جو مستقبل کے رائے دہندگان تیار کر رہے ہیں اگر انہیں روزگار کے بجائے وچن اور پر وچن پر گزارہ کرنا پڑے تو وہ بی جے پی کا بھی وہی حشر کریں جو کانگریس کا کیا ہے۔ چھپن انچ کی چھاتی بھی ایک دن پچکے گی اس کا یقین تو سب کو تھا لیکن ان اچھے دنوں کا آغاز اس قدر جلد ہو جائیگا اس کا وہم و گمان کسی کو نہیں تھا۔ دراصل 'ہوا' کا کیا ہے کہ جس قدر تیزی سے بھرتی ہے اسی سرعت سے نکل بھی جاتی ہے۔ ان پے درپے ناکامیوں کے سبب نریندر مودی کی حقیقت اس شعر کی مانند کھلتی جارہی ہے

اب اپنی حقیقت بھی ساغر بے ربط کہانی لگتی ہے
دُنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

مہاراشٹر: ہر بار کا رونا تو بے کار کا رونا ہے

ازدواجی زندگی میں تنازعات کی ابتدا عام طور پر مال و دولت کی تقسیم یا استعمال کو لے کر ہوتی ہے پھر اس کے بعد وہ انا یا ناک کا مسئلہ بن جاتی ہے اور جذبات سے کھلواڑ شروع ہو جاتا ہے۔ اس جوتم پیزار کا تعلق سوجھ بوجھ سے نہیں ہوتا لیکن جب دونوں فریق ٹھنڈے دماغ سے اپنے یا بچوں کے مستقبل پر غور کرتے ہیں تو عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔ شیوسینا اور بی جے پی کے درمیان یہی ہو رہا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر دباو بناتے رہے لیکن جب دونوں نے طلاق سے اپنی متوقع اولاد یعنی حصولِ اقتدار پر پڑنے والے نتائج پر سنجیدگی سے غور کیا تو عقل ٹھکانے آگئی۔ اپنے سخت موقف کو پس پشت ڈال کر دونوں مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔

زن و شو دونوں ملازمت پیشہ ہوں اور آگے چل کر بیوی کی تنخواہ شوہر سے زیادہ ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟ بیوی اپنا رعب دکھانے لگتی ہے ایسے میں اگر شوہر کی پرانی اکڑ باقی رہے تو جھگڑا کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے۔ میاں بیوی کی کم ظرفی اور غیر تجربہ کاری ان کی لڑائی کو چوراہے پر لے آتی ہے اور اس سے سارا محلہ محظوظ ہوتا ہے فی الحال یہی ہو رہا ہے۔ ۲۰۰۹ کے انتخابات سے پہلے ہر بار ودھان سبھا میں شیوسینا کی نشستیں زیادہ ہوتی تھیں اور وہ قوام

کے منصب پر فائض ہوا کرتی تھی لیکن پچھلی مرتبہ سینا کو ۴۴ جبکہ بی جے پی کم نشستوں پر انتخاب لڑنے کے باوجود ۴۶ سیٹوں پر کامیابی ملی۔ پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی نے شیوسینا کے ۱۸ کے بالمقابل ۲۲ حلقوں میں کامیابی درج کرائی اس لئے بجا طور پر اس کے دماغ میں قوامیت کا بھوت سوار ہوگیا۔

سینا اور بی جے پی کے درمیان یہ لڑائی نئی نہیں ہے لیکن اس سے پہلے اڈوانی اور ٹھاکرے مل کر بیٹھتے تھے واجپائی جی مداخلت کرتے تھے اور معاملہ سلجھ جایا کرتا تھا۔ اس بار شیوسینا کے اندر ناتجربہ کار ادھو ٹھاکرے اور ان کا بیٹا ادتیہ ٹھاکرے آگے آگئے ہیں ۔ ان کے مدمقابل نریندر مودی اوران کا چیلا امیت شاہ ہیں۔ دونوں فریقوں کی ناتجربہ کاری ، کم ظرفی اور قوت فیصلہ کا فقدان تقریباً دو ہفتوں تک ذرائع ابلاغ میں نت نئے گل کھلا رہا ہے اور عوام کے تفریحِ طبع کا سامان کر رہا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ الیکشن میں بھی انہیں اس کی قیمت چکانی پڑے۔

شیوسینا اور بی جے پی کی شناسائی ۲۵ نہیں ۳۰ سال پرانی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں پہلی مرتبہ ان فسطائی جماعتوں کا وصال ہوااور دونوں نے مل کر انتخاب لڑا۔ یہ نہایت منحوس آغاز تھا کیونکہ اس قومی انتخاب میں شیوسینا تو کجا بی جے پی کا بھی مکمل صفایہ ہوگیا۔ راجیوگاندھی نامی نوزائیدہ سیاستداں ایک سونامی

بن کر ہندوستان کے سیاسی افق پر نمودار ہوئے اور اپنی ماں اندرا گاندھی کی ہمدردی کے سبب ۴۰۰ سے زیادہ نشستوں پر کامیاب ہوگئے۔ بی جے پی کے واجپائی اور اڈوانی دونوں شکست فاش سے دوچار ہوگئے۔ پارلیمان میں ان کی موجودگی دو ارکان پر سمٹ گئی۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء کے اندر مہاراشٹر کے ریاستی انتخاب میں بی جے پی نے بے وفائی کی اور شیوسینا کا دامن جھٹک کر کانگریس پارٹی کے باغی رہنما شرد پوار کی آغوش میں چلی گئی

۔

کانگریس کو جب احساس ہوا کہ شرد پوار تو کماؤ پوت ہے اور پوار کو لگا کہ ان بھانت بھانت کے حامیوں کے نخرے اٹھانے سے بہتر ہے اپنے گھر لوٹ جایا جائے تو وہ ۱۹۸۶ء میں میکے لوٹ آئے۔ ہرجائی بی جے پی اپنی بیوگی کا غم غلط کرنے کیلئے پھر سے ۱۹۸۹ء کے اندر سینا کی بانہوں میں سمٹ آئی لیکن پھر ۱۹۹۲ء میں ان دونوں نے ایک دوسرے خلاف ممبئی میونسپلٹی کا الیکشن لڑا اور کانگریس کے ۱۱۲ کے مقابلے ۶۹ و ۱۴ یعنی جملہ ۸۴ نشستیں جیت سکے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان پھر من مٹاؤ ہوگیا لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر انتخاب سے قبل یہ دونوں جماعتیں کھلے عام ایک دوسرے سے لڑتی اور پھر یکجا ہوجاتی ہیں۔ اس لئے ان کی ''تو تو میں میں'' پر کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ مراٹھی میں اسے ''بنوا بنوی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بقول ندا فاضلی

اچھا سا کوئی موسم، تنہا سا کوئی عالم ہر روز کا رونا تو بے کار کا رونا ہے

بی جے پی مہاراشٹر کے اندر اس بار خود اپنے دام میں بری طرح پھنس گئی تھی۔ اس نے پہلے تو پارلیمانی انتخاب میں راج ٹھاکرے کے ساتھ مفاہمت کی انہیں خرید کر اپنے خلاف امیدوار کھڑا کرنے سے روکا مگر شیوسینا کے خلاف الیکشن لڑوایا۔ راج ٹھاکرے نے سینا کے ووٹ کاٹے اور اس کے نتیجہ میں بی جے پی کو سینا سے ۴ نشستیں زیادہ مل گئیں۔ وزارت سازی کے دوران بھی یہ ہوا کہ قومی جمہوری محاذ کی سب سے بڑی جماعت شیوسینا کو صرف ایک اور وہ بھی کم اہمیت کا حامل قلمدان دیا گیا تاکہ اس میں اضافہ کا لالچ دے کر ریاستی انتخاب کے موقع پر سینا سے سودے بازی کی جائے۔

ریاستی انتخاب سے قبل سب سے پہلے بی جے پی نے دیگر چار حلیف جماعتوں کو پچکار کر اپنے سے قریب کیا اور ان کے ذریعہ سے شیوسینا پر دباؤ ڈالنے کی مذموم کوشش کی۔ اس کے بعد ذرائع ابلاغ میں آئے دن یکساں تعداد میں نشستوں کا مطالبہ ہونے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ الحاق کو ختم کرنے کے اشارے پہلے بی جے پی کی طرف سے آئے۔ شیوسینا پر مودی کو انتخابی کامیابی کا کریڈٹ نہ دینے پر غم وغصے کا اظہار کیا گیا۔ امیت شاہ نے مقامی رہنماؤں کو شہ دے کر چھوٹ

دے دی اور چابک و گاجر کا کھیل کھیلنے لگے ۔ ادھو ٹھاکرے نے جب دیکھا کہ پانی سر سے اوپر ہو رہا ہے تو بی جے پی کا وار اسی پر پلٹ دیا اور میڈیا میں جا کر آخری دھمکی دے دی ۔

ادھو ٹھاکرے نے رنگ شاردہ ہال کے اندر پہلی مرتبہ جب اپنے والد بالا صاحب ٹھاکرے کے تیور دکھلائے اور بی جے پی کو احسانات یاد دلا کر لتاڑہ تو اس کے ہوش ٹھکانے آگئے ۔ ویسے اتر پردیش، گجرات اور راجستھان کے ضمنی انتخاب میں ہاتھ آنے والی شکست نے بھی بی جے پی کا دماغ درست کیا۔ وزیر اعظم کے الحاق قائم رکھنے کی تلقین کے بعد شاہ نے ناک گھس کر ادھو کو فون کیا۔ اس کے باوجود جب ادھو نے لچک نہیں دکھائی تو بی جے پی نے بالکل بھکاری کی مانند مطالبہ کرڈالا کہ کم از کم ان ۳۳ نشستوں میں سے گیارہ ہمیں دے دو جن پر گزشتہ ۲۵ سالوں میں ہر بار تمہاری ضمانت ضبط ہوتی رہی ہے۔ ادھو نے کہا نہیں اگر چاہو تو الحاق میں شامل دیگر جماعتوں کے پیٹ پر لات مار کر ان کی دس نشستیں لے لو ۔ اس طرح گویا شیوسینا نے حامی جماعتوں کو بی جے پی
کا دشمن بنا دیا۔ بی جے پی نے دیگر جماعتوں کی حق تلفی کر کے گھٹنے ٹیک دیئے اور ادھو ٹھاکرے کو منا لیا۔

مہاراشٹر کے اندر بی جے پی اور سینا کے ساتھ سوابھیمان شیتکری سنگھٹن، ریپبلکن آٹھولے) راشٹریہ سماج پارٹی، شیو سنگرام سنگھٹن الحاق میں شامل ہے۔ کل تک جن کی) خوشامد کی جارہی تھی اب انہیں بلی کا بکرہ بنایا جارہا ہے۔ سوابھیمانی رہنما راجو شیٹی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ قربانی دینے کی ہماری روایت ہے اگر ہماری نشستیں کھا کر تمہارا پیٹ بھرتا ہے تو ایسی تجویز لاو۔ رام داس اٹھاولے نے راشٹر وادی کے متبادل کا اعلان تک کردیا۔ راشٹریہ سماج کے مہادیو جانکر نے سوابھیمان کے ساتھ مل کر انتخاب لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا بالآخر جب ان جماعتوں کو صرف ۷ کی پیشکش کی گئی تو میٹنگ سے اٹھ کر چلی گئیں اور مل جل کر بی جے پی سینا کے خلاف انتخاب لڑنے کا اشارہ دے دیا لیکن یہ صرف گیدڑ بھپکی ہے۔ سینا بی جے پی اب ان کے محتاج نہیں ہیں اور اقتدار کے بعد وزارت لا لالچ ان ابن الوقتوں کے غم وغصے کو ہوا کرسکتا ہے۔ اگر کانگریس انہیں اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کا بڑا فائدہ ہوتا لیکن ایسی کشادہ دلی کی توقع اقتدار میں رہتے ممکن نہیں۔ جب ہار جائیں گے تو دماغ اپنے آپ درست ہو جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ سینا اور بی جے پی کے میل ملاپ سے شیوسینا نے اپنے بل بوتے پر اقتدار میں آنے کا ایک نادر موقع گنوا دیا ہے۔ شیوسینا گزشتہ کئی سالوں سے کمزور ہوتی جارہی ہے۔ اس کی نہ صرف نشستیں بلکہ ووٹ کا تناسب بھی

گھٹ رہا ہے لیکن اس بار بازی الٹنے کا سنہرا موقع ادھو کے ہاتھ آیا تھا اگر بال ٹھاکرے حیات ہوتے تو بی جے پی کی پیشکش کو اس کے منہ پر دے مارتے۔ اگر ادھو کی جگہ نریندر مودی ہوتے تو اس صورتحال کا فائدہ اٹھا کر علاقائی عصبیت کے سہارے بڑے آرام سے انتخاب جیت جاتے۔

ادھو کو کرنا یہ تھا کہ نریندر مودی کی احسان فراموشی کا خوب چرچا کیا جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ گجرات فساد کے بعد جس وقت بی جے پی نریندر مودی کو وزیر اعلیٰ کے عہدے سے ہٹانے کی تیاری کر رہی تھی بالا صاحب ٹھاکرے نے اسے بچایا اور وزیراعظم بن جانے کے بعد مودی نے سینا سے دغابازی کی ۔ اس کے سبب مسلمان ضرور ناراض ہوتے لیکن وہ تو یوں بھی شیوسینا کو ووٹ نہیں دیتے ۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ نریندر مودی اپنی شبیہ سدھارنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں ساری دنیا کو یہ یاد دلانا کہ ۲۰۰۲ء میں گجرات کے اندر ہونے والے فسادات کا اصل مجرم مودی ہے۔ بی جے پی خود اسے سزا دینے جارہی تھی ایک بہترین سیاسی حربہ تھا جس میں احسانمندی کے ساتھ مخالفت ممکن تھی۔ اٹل جی سے شیوسینا کا وزارت نہ طلب کرنے کو جذبۂ قربانی کے طور پر پیش کیا جاسکتا تھا۔

ادھو کے پاس سب سے بڑا ہتھیار علاقائی عظمت و وقار کی بحالی کا تھا جو دھرتی پتر سینا کا مقصد وجود ہے۔ اس کے اٹھاتے ہی راج ٹھاکرے کی سیاست کا اپنے آپ

خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ مہاراشٹر کی عوام سے کہہ سکتے تھے کہ مودی اور شاہ نے گجراتی سرمایہ داروں کے کہنے پر شیوسینا سے الحاق ختم کیا ہے۔ دولت کا غرور میں وہ سرمایہ کے بل بوتے پر مہاراشٹر کے اندر گجراتی وزیر اعلیٰ مسلط کرنا چاہتے ہیں ۔ شیوسینا اگر ذرائع ابلاغ کی مدد سے یہ مشہور کردیتی کہ بی جے پی کرٹ سومیا کو وزیر اعلیٰ بنانا چاہتی ہے تو سارے صوبے میں آگ لگ جاتی اور بی جے پی سمیت مودی اور شاہ کا بینڈ بج جاتا ۔

بی جے پی پر اولین مراٹھی خاتون پرتبھاتائی پاٹل کو صدر جمہوریہ بننے سے روکنے کاالزام لگا کران کو صدر بنانے میں سینا کی حمایت کو بھنایا جاسکتا تھا۔ شیوسینا یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ نریندر مودی چین کے مقابلے اپنی سرحدوں کی حفاظت کرنے میں میں ناکام ہوگئے ہیں اس لئے وہ ملک کے مفاد میں مرکزی حکومت سے الگ ہو رہی ہے ۔ اس طرح مرکزی وزیر استعفیٰ دے دیتے جو ایک بڑی خبر بنتی اور مودی سرکار کو پہلا جھٹکا لگتا ۔ ادھو ٹھاکرے نے رنگ شاردا کی تقریر میں بی جے پی کا حوالہ دیتے ہوئے شیواجی اور افضل خان کا واقعہ یاددلایا اور کہا کہ ہم کسی کی قدوقامت سے ڈرنے والے لوگ نہیں ہے۔ یہ اشارہ صاف نریندر مودی کی جانب تھا جنہیں افضل خان کی تشبیہ دی گئی تھی۔ سچ

تو یہ ہے کہ شیوسینا کے پاس اس بار بی جے پی مخالفت کرنے کیلئے بہت کچھ تھا۔ اس کے برعکس بی جے پی فی الحال گوپی ناتھ منڈے جیسے مقبول و ہر دلعزیز پسماندہ ذات کے رہنما سے محروم ہے۔ قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ گوپی ناتھ منڈے کی بیٹی پنکجہ منڈے کے ذریعہ سنگھرش یاترا نکلوائی گئی اور معمر رہنما ونود تاوڑے نے یہاں تک کہہ دیا کہ سیاست کے میدان میں نووارد پنکجا کے اندر وزیر اعلیٰ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ بی جے پی کے پاس موجود دونوں معروف چہرے نتن گڈکری اور دیویندر فردنویس براہمن ہیں جن کے خلاف مراٹھا اور دیگر پسماندہ طبقات کے اندر شدید نفرت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

بی جے پی کے مودیتوا کے مقابلے علاقائیت کی بنیاد پر اگر شیوسینا انتخاب لڑتی تو اسے لازماً کامیابی ملتی اور اگر اکثریت میں کوئی کسر باقی بھی رہ جاتی تو راشٹروادی کو راضی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ادھو ٹھاکرے کے اندر خوداعتمادی کا فقدان ان کے پاوں کی زنجیر بن گیا ۔آئندہ انتخاب میں یہ موقع ان کے ہاتھ نہیں آئیگا اور بی جے پی کا میٹھا زہر سینا کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا جائیگا۔ ادھو ٹھاکرے کو اس موقع پر اس مینڈک کی کہانی یاد کرنی چاہئے جو ایسے برتن میں گر گیا جس کے اندر پانی کا درجہ حرارت لگاتار

بڑھتا جارہا تھا اور وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ باہر کود جائے یا اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلے۔ وقت گزرتا رہا اور وہ کسی طرح اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرتا رہا یہاں تک کہ پانی ابلنا لگا۔ اب مینڈک کیلئے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوگیا اور ابلتے ہوئے پانی میں مینڈک کا سوپ بن گیا۔ کاش کے سوشیل میڈیا میں گردش کرنے والی اس کہانی کو کوئی ادھو ٹھاکرے کو بھیجتا اور وہ اس سے عبرت پکڑتے۔

جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے نہ تو شیو سینا کے فائدے سے ان کا کوئی نقصان ہے اور نہ شیو سینا کے نقصان سے ان کا کوئی فائدہ ہے اس لئے کہ شیو سینا اول درجہ کی فسطائی کی جماعت ہے۔ اس کے عزائم و ارادے بی جے پی سے اگر زیادہ نہیں ہیں تو کم خطرناک بھی نہیں ہیں۔ یہ سوچنا چونکہ ادھو ٹھاکرے کے دادا پربودھنکار ٹھاکرے سیکولر تھے اس لئے اس کے اندر سیکولرزم کے جراثیم موجود ہیں ایک خام خیالی ہے۔ پربودھنکار کا سیکولرزم ان کے اپنے بیٹے بالاصاحب ٹھاکرے پر بھی اثر انداز نہ ہوسکا جو پہلے علاقائی عصبیت اور پھر ہندوتوا کی گود میں چلے گئے۔ ادھو ٹھاکرے نے بالاصاحب کی گود میں تربیت حاصل کی ہے۔

اس بات کو بھلایا نہیں جاسکتا کہ مسلم رہنماوں سے چکنی چپڑی باتیں کرنے

والے ادھو ٹھاکرے ماہِ رمضان کے اندر ایک مسلمان روزے دار کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے اپنے رکن پارلیمان کی سرزنش نہ کرکے اور ۲۲ ستمبر کے دن شیوسینا کے ترجمان روزنامہ سامنا کا اداریہ بھی شیوسینا کے ذہن کا عکاس ہے۔ بی جے پی سے لڑائی کے باوجود مسلمانوں سے متعلق وزیراعظم کے حالیہ بیان کی تعریف کرتے ہوئے مسلمانوں کے حوالے سے جو زہر اگلا گیا ہے وہ چونکانے والا ہے۔ پربودھنکار کے زمانے سے صحافت کرنے والا ٹھاکرے خاندان اچھی طرح جانتا ہے کہ سیاسی جماعت کے اخبار کا اداریہ اس کی پالیسی اور پروگرام کا ترجمان ہوتا ہے۔

امریکہ یاترا: مان نہ مان میں ترا مہمان

مثل مشہور ہے ''سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی''۔ وزیر اعظم نریندر مودی اپنے سو دن مکمل کرنے کے بعد ہی مون منانے کی خاطر سو گھنٹے کیلئے امریکہ نکل گئے لیکن جس طرح سو دیش کے اندر سو دنوں کے اختتام پر ضمنی انتخاب کے نتائج نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا اسی طرح امریکہ میں ہونے والے احتجاج نے ۲۰۰۲ء کے فسادات کی بدنامی تازہ کردی۔ نحوست کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ اس دورے سے جب ''لوٹ کے بدھو گھر پر آئیں گے'' تو ممکن ہے شیوسینا کے اننت گیتے کا استعفیٰ ان کا استقبال کرے گا۔ جو رہنما اپنے ہندوتوا وادی حلیف کو ساتھ نہ رکھ سکا وہ کتنی دور اوبامہ کو ساتھ چلا سکے گا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ جس وقت مودی جی عالمی امن کا مژدہ سنا رہے تھے ان کے اپنے حلقۂ انتخاب بڑودہ میں خاک و خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی اور وہ نوراتری کے اپواس کا پاکھنڈ فرمارہے تھے۔ انسان ۹ دن صرف پانی پی کر زندہ تو رہ سکتا ہے لیکن اس دوران چار دن میں ۵۰ میٹنگ نہیں کرسکتا ہے اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کا پیٹ پیٹھ کو لگ جانا چاہئے لیکن ایسا کچھ نظر تو نہیں آیا۔

زر خرید ذرائع ابلاغ کی ہنگامہ آرائی سے قطع نظر بات صرف اتنی سی تھی اقوام

متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہر سال نیویارک میں منعقد ہوتا ہے جس میں دنیا بھر کے رہنما خطاب کرتے ہیں۔ اس بار بھی مختلف ممالک کے سربراہ وہاں آئے اور نہایت پروقار انداز میں اپنے ملک کا موقف عالمی برادری کے سامنے رکھ کر واپس ہو گئے لیکن ہمارے نوٹنکی وزیر اعظم نے اس سفر کو ایک تماشہ بنا دیا۔ اگر نریندر مودی اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت فرما کر چپ چاپ لوٹ آتے تو انہیں احتجاج کا سامنا کرنے کی ہزیمت نہ اٹھانی پڑتی لیکن موقع کا بیجا فائدہ اٹھانے کی پرانی عادت ان کے گلے کی ہڈی بن گئی۔ ماڈیسن اسکوائر پارک میں ۱۹۶۸ء سے آج تک صرف رقص سرود کی محفلیں سجتی ہیں۔ کوئی پروقار رہنما وہاں ناچ گانے والوں کے درمیان اپنے کرتب نہیں دکھانے کی حماقت نہیں کرتا لیکن شہرت کی حرص نے وزیر اعظم سے وہ بھی کروا دیا۔

امریکہ میں ۳۰ لاکھ کے آس پاس ہندوستانی قیام پذیر ہیں ان میں سے ۲۰ ہزار کو جمع کرنے کیلئے مودی بھکتوں نے ۹ کروڑ روپے پھونک دیئے اور پھر ٹکٹ خرید کر آنے والے بھی صرف امیر کبیر لوگ تھے۔ اس طرح مودی جی نے جتا دیا کہ انتخاب سے قبل غریبوں کے ساتھ یکجہتی جتانا اور کامیابی کے بعد ان سے منہ موڑ لینا کسے کہتے ہیں؟ لیکن وزیر اعظم کو یاد رکھنا چاہئے کہ جب یہ غریب ان سے منہ موڑ کر دوسری جانب نکل جائیں گے تو ٹکٹ خرید کر شو میں آنے والے بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انہوں نے اپنے عام رائے دہندگان کے ساتھ کیا

ہے۔اس میوزیکل شو کی بابت منتظمین نے کہا کہ لاٹری کے ذریعہ اس کے ٹکٹ فروخت کئے گئے لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ سنگھ پریوار کے علاوہ کسی کا نام قرعہ اندازی میں ڈالا ہی نہیں گیا ہوگا تاکہ مودی اس مجمع میں لوگوں سے مل سکیں۔ شرکائے محفل نے اپنے سنگھی سنسکار کا مظاہرہ راجدیپ سردیسائی کے ساتھ بدسلوکی کرکے کیا۔ راجدیپ احمدآباد کا پلا بڑھا صحافی ہے۔ وہ وہاں احتجاج کرنے نہیں گیا تھا اور نہ لو جہاد کیلئے آیا تھا۔ اس کے باوجود راجدیپ کی ان کے بیٹے کے سامنے مارپیٹ، گالی گلوچ نے ساری دنیا پر ظاہر کردیا کہ نریندر مودی جس عظیم جمہوریت پر فخر جتا رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

مودی کے بھکت ایک طرف اپنے ہم وطن دیسائی کو آنکھ دکھا رہے تھے اور دوسری جانب وائٹ ہاؤس کے سامنے گربا ناچ رہے تھے۔ راجدیپ اور ان کی اہلیہ سگاریکا کو پاکستان جانے کیلئے کہہ رہے تھے امریکیوں سرمایہ داروں کو ہاتھ جوڑ کر ہندوستان آنے کی دعوت دے رہے تھے اسے کہتے ہیں سنگھ پریوار کی دیش بھکتی۔ اس کے باوجود نمک خوار ڈھٹرھ سو رپورٹروں کی فوج دن ہر ہر مودی کا جاپ کر رہی تھی یہاںتک کہ نکھل واگلے کو کہنا پڑگیا اب تو ان صحافیوں اور چیر لیڈرس (دل بہلانے والی نمائشی لڑکیاں) کے درمیان فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ کرکٹ کے دوران ان لڑکیوں کا کام ہر چوکے یا چھکے پر نیم عریاں بھڑکیلے لباس پہن کر ناچنا ہوتا ہے لیکن مودی کے بولڈ یا کیچ آؤٹ ہو جانے پر بھی ان

رپورٹرس کا مٹکنا اور تھرکنا جاری و ساری رہتا تھا۔

آئی بی این۔ سی این این کے ایک صحافی کو اس دوران ایک عجیب شرارت سوجھی۔ وہ وزیر اعظم کی تصویر دکھلا کر سڑک پر چلنے والے امریکیوں سے پوچھنے لگا کہ کیا آپ انہیں جانتے ہیں ؟ ان میں سے بیشتر نے مودی کو پہچاننے سے انکار کردیا۔ ایک نے اندھیرے میں تیر چلایا یہ شخص ہندوستانی وزیر اعظم سے مشابہ دکھائی دیتا ہے۔ اس صحافی نے سچن تندولکر کی تصویر جسے بھی دکھائی وہ پہچان گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے امریکی میڈیا نے مودی کو کس قدر اہمیت دی۔ ایسا نہیں ہے کہ نریندر مودی کی میڈیا ٹیم نے جو لگ بھگ دوہزار ہمہ وقتی صحافیوں پر مشتمل ہے کوشش نہیں کی۔ سی این این کے فرید زکریا کو بلا کر انٹرویو کروایا گیا اور وال اسٹریٹ جنرل میں مودی کے نام سے نہ جانے کس کا مضمون بھی چھپوایا گیا یہاںتک کہ مودی جی ۹۱۱ کی یادگار زیرو لینڈ پر پھول بھی چڑھاآئے لیکن افسوس کہ اس کے باوجود وہ امریکی عوام کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

شہرت کے مارے مودی جی کو مشہور لوگوں کے ساتھ تصویر کھنچوانے کا بڑا شوق ہے اس کیلئے وہ کبھی سلمان خان کو اپنے پاس بلواتے ہیں تو کبھی رجنی کانت کے پاس خود پہنچ جاتے ہیں۔ امریکہ کے مختلف صنعتکاروں سے ملاقات کا مقصد یہی

تھا ورنہ جہاں تک انہیں سرمایہ کاری کیلئے راضی کرنے کا تعلق ہے وہ کام وزیراعظم کا نہیں بلکہ سودیشی سرمایہ داروں یا سرکاری افسران کا ہےزیادہ سے زیادہ وزیر صنعت و تجارت کو یہ ذمہ داری ادا کرنی چاہئے لیکن مودی اپنے علاوہ کسی کو کسی قابل سمجھیں تو نہ اسے کام کرنے دیں۔ وہ تو سارا کریڈٹ خود ہی لینا چاہتے ہیں لیکن اس دورے کے دوران انہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ امریکی سرمایہ کاروں کو بے وقوف بنانا ہندوستانی رائے دہندگان کو رجھانے کی طرح آسان کام نہیں ہے اس لئے کہ امریکی تجارتی انجمن نے اپنے صدر کو ایک خط لکھااور کہا کہ مودی حکومت کی کتھنی اور کرنی میں تضاد ہے۔ اس نے ڈبلیو ٹی او کی اصلاحات کی حال میں مخالفت کی ہے۔ اپنی شکایات و توقعات کا خط اپنے اوبامہ کو لکھ کراس کی نقل ذرائع ابلاغ کے حوالے کی گئی تاکہ مودی جی خود آئینہ دیکھ لیں۔

اس دورے میں وزیراعظم کی سب سے بڑی ناکامی امریکی پارلیمان کے مشترکہ اجلاس میں خطاب سے محرومی ہے۔ اس سے قبل پنڈت نہرواور اندراگاندھی تو کجا نرسمہاراؤ اور اٹل جی تک کو یہ اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔کمزورترین کے لقب سے یاد کئے جانے والے منموہن نے بھی ۲۰۰۵ء میں خطاب کیا تھالیکن لاکھ کوشش کے باوجود مودی کے حامی یہ موقع اس بار نہ حاصل کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرے سے یہ سرکاری دورہ ہی نہیں تھا۔ اوبامہ نے ایک رسمی دعوتنامہ بھیجا اور

وائٹ ہاؤس میں انہیں ذاتی دعوت پر مدعو کیا۔جب مودی اوباما کے گھر پہنچے تو ان کے گھر والی مشعل اوباما غائب تھیں۔ مغربی معاشرے میں کسی مہمان کی اس سے بڑی توہین کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ میزبان کی نصف بہتر دعوت میں موجود نہ ہو۔ ویسے اس سلوک کی ذمہ داری خود نریندر مودی پر ہے۔ اگر وہ اپنی نصف بہتر جشودھا بین کو ساتھ لے کر جاتے تو یقیناً اس ہزیمت سے بچ جاتے۔ انہوں نے تاجروں اور صنعتکاروں کے اجلاس میں کہا ہند امریکی تعلقات میاں بیوی کے رشتے کی مانند ہیں جو ہمیشہ خوشگوار نہیں رہتے لیکن بیچاری جشودھا بین کی ازدواجی زندگی تو دائمی خزاں رسیدہ ہے اور آئندہ بھی اس میں بہار کے آثار نہیں ہیں۔

وزیراعظم نریندر مودی نے بین الاقوامی سطح پر انگریزی کے بجائے ہندی کی طرح ڈالی۔ اقوام متحدہ کے اجلاس سے بھی انہوں نے ہندی زبان میں خطاب کیا لیکن جب صدر اوباما سے ملنے کیلئے قصر ابیض پہنچے تو اوباما نک ''کیم چھو'' کے ساتھ استقبال پر مودی اس قدر خوش ہوئے کہ وہ ہندی کو بھول کر انگریزی پر اتر آئے۔ چواین لائی انگریزی جاننے کے باوجود چینی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی غیر ملکی سربراہ نے ان کو انگریزی میں لطیفہ سنایا تو وہ اسے سمجھنے کے باوجود وہ بے حس بیٹھے رہے مگر جب اس کا ترجمہ ہوا تو قہقہہ لگا کر جواب دیا لیکن بیچارے مودی کا حکمتِ چین سے کیا واسطہ؟

ممکن ہے اوبامہ کو پتہ ہی نہ ہو کہ ہندوستان کی قومی زبان گجراتی نہیں بلکہ ہندی ہے۔ ہو سکتا ہے انہیں ہندی اور گجراتی کا فرق ہی نہ معلوم ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے ابھی تک نریندر مودی کو عالمی تو درکنار قومی رہنما تک تسلیم نہ کیا ہو بلکہ صرف ایک علاقائی لیڈر سمجھتے ہوں۔

امریکہ کی سرزمین پر نریندر مودی کا خیر مقدم ان کے خلاف عدالتی سمن سے ہوا۔ اس طرح نریندر مودی وہ پہلے وزیر اعظم ہیں جنہیں امریکی ویزا محض عہدے کے سبب ملا اور اس سے پہلے ۹ سال تک امریکہ نے انہیں اپنی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اب مودی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوگیا ہے کہ وہ پہلے ہندی وزیر اعظم ہیں جن کے خلاف کسی بیرونی ملک کی عدالت نے سمن جاری کیا۔ امریکہ میں عدالتوں کو مکمل طور پر آزاد سمجھنا غلط ہے۔یقیناً جج نے یہ فیصلہ سنانے سے قبل انتظامیہ کا عندیہ معلوم کیا ہوگا اور حکومت کی جانب سے سبز سگنل ملنے پر ہی یہ اقدام کیا گیا ہوگا۔

جو سلوک ہندی وزیر اعظم کے ساتھ کیا گیا اگر روس یا چین کے سربراہ کے ساتھ کیا جاتا تو امریکہ کو دال آٹے کا بھاو معلوم ہو گیا ہوتا لیکن امریکی جانتے ہیں کہ ہندوستانی اس طرح کی ذلت برداشت کرلیتے۔جارج فرنانڈلیس سے لے کر عبدالکلام تک سارے لوگ بے چوں چرا اس طرح کی اہانت سے گزر چکے ہیں اب اس

فہرست میں نریندر مودی کا نام بھی شامل ہوگیا۔ مودی کے بھکت معروف صحافی سوپن داس گپتا نے اس واقعہ کے بعد ٹویٹ کیا کہ مودی کو احتجاجاً اقوام متحدہ کے اجلاس میں تقریر کرنے کے بعد لوٹ آنا چاہئے لیکن سوپن داس خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں انہیں نہیں پتہ کہ ہمارے شیر امریکہ کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی بھیگی بلی بن جاتے ہیں ۔ اور جو بلیّ گلے میں کشکول باندھے آنکھ بند کرکے دودھ پینے کی قائل ہو وہ بھلا کیونکر واپس آسکتی ہے۔

اٹل جی جب ۲۰۰۰ء میں امریکہ گئے تھے تو رام مندر تحریک کے سو سے زیادہ سادھوان کے جلسہ عام میں موجود تھے ۔ ان کے جلسہ میں دو اسٹیج لگے تھے ایک پر سادھو سنت اور دوسرے پر سیاست داں حضرات براجمان تھے ۔ وہاں پر جوش میں آکر اٹل جی نے اپنے چہرے کے اوپر سے مکھوٹا اتار پھینکا تھا اور اعلان کردیا تھا کہ میں پہلے سویم سیوک ہوں اور یہ حق مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ دو تہائی اکثریت مل جانے پر خوابوں کا بھارت تعمیر کرنے کا وعدہ کیا اشارہ رام مندر کی طرف تھا جو ان کی حیات میں تو شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہا لیکن مودی جی نے یہ کیا کہ امریکہ جانے کے بعد اپنے چہرے پر راک اسٹار کا مکھوٹا سجا لیا۔ ان کے اسٹیج میں ایک طرف وہ تو دوسری جانب ناچنے گانے والے لوگ تھے ۔ امریکی اداکار اور ملکۂ حسن نینا دیولوری کے علاوہ پاپ سنگر انجلی رندیوے بھی موجود تھیں لیکن بھلا ہو مظاہرین کا کہ انہوں نے اس

مکھوٹے کو نوچ پھینکا۔ اٹل جی کی طرح مودی جی نے بہت سارے وعدے کئے ہیں اب
وقت ہی بتائے گا کہ ان میں سے کتنے پورے ہوتے ہیں اور کتنے وعدۂ فردا بن جاتے ہیں
؟

مودی کی جن تقریروں کے بڑے چرچے ہیں ان میں پائی جانے والی حماقتیں بھی کم
دلچسپ نہیں ہیں ماڈیسن اسکوائر پر مودی نے راشٹر پتا مہاتما گاندھی نام غلط لیا اور انہیں
موہن داس کے بجائے موہن لال کہہ دیا۔ مودی نے اپنی تقریر میں ہندوستانی
صنعتکاروں کو واپس ہندوستان آنے کی دعوت دی اور امریکیوں کو بھی بلانے کیلئے ہوائی
اڈے پر ویزہ کی سہولت کا لالچ دیا لیکن اسی کے ساتھ اپنے ملک سے اساتذہ اور نرس کو
برآمد کرنے کی بات بھی کہہ دی۔ ہندوستان میں فی الحال کئی لاکھ اساتذہ کی اسامیاں
خالی ہیں اور صحت عامہ کی صورتحال تشویشناک ہے ایسے میں اساتذہ اور نرس کی برآمد
کا ذکر مضحکہ خیز تھا؟ مودی کے اکثر ڈائیلاگ پرانے تھے مثلاً سانپ اور ماؤس سے
کھیلنے کی بات وہ ایوان میں کہہ چکے تھے۔ ۳ ڈی والی بات جو دہلی کے میک انڈیا مہم
میں کہی تھی اسے بھی دوہرایا گیا۔ اس کے علاوہ انتخابی مہم کے گھسے پٹے جملہ مثلاً چائے
والے کی چائے گرم۔

اقوام متحدہ کی تقریریوں تو ہندی میں تھی لیکن اس میں تلفظ کی کئی غلطیاں

سامنے آئیں جو عام طور پر گجراتی داں حضرات سے سرزد ہوتی ہیں۔ انہوں نے صدر مجلس سام کٹیسا کو کریسا کہہ دیا۔ انہترویں اجلاس کے بجائے سکسٹی نائن تھویں بول گئے جو نہ انگریزی تھا اور نہ ہندی۔ مودی نے ہندوستان کے انگریزی اساتذہ کا ذکر تو کیا ایک عشاریہ دو پانچ کے بجائے لڑکھڑاتے ہوئے ایک عشاریہ پچیس کہہ دیا۔ یہ ایسی غلطی ہے کہ پانچویں کا طالبعلم بھی نہیں کرتا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ۱۵کے بجائے ۳۵ منٹ تک بولتے رہے جسے بین الاقوامی فورم میں نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود عالمی سطح پر ہندوستان کو ایک ابھرتی ہوئی سپر پاور کے طور پر پیش نہیں کرسکے۔ افغانستان میں حالات کے معمول پر آنے کی تعریف تو کی لیکن ہندوستان کا رول واضح نہیں ہوا۔ داعش کے حوالے سے بھی مودی تذبذب کا شکار رہے اور کوئی واضح موقف سامنے نہیں آیا۔

اس اجلاس میں دیگر ممالک سے آنے والے رہنماوں نے جس جرأتمندی کا مظاہرہ کیا اس سے مودی کو سبق لینا چاہئے مثلاً فلسطین اتھارٹی کے صدر محمود عباس نے امریکہ کو ناراض کرتے ہوئے اسرائیل پر جنگی جرائم کے مقدمہ چلانے کا پرزور مطالبہ کیا۔ ترکی کے رجب طیب اردوان نے مصر میں السیسی کی جانب کئے جانے مظالم کی مذمت کی اور اقوام متحدہ ایسے حکمرانوں کی موجودگی پر اعتراض کیا۔ برازیل کی صدر ڈلما رووسف نے امریکی جاسوسی کی جم کر مذمت کی اور احتجاجاً اوبامہ سے اپنی ملاقات منسوخ کرکے چلی گئیں۔ اس کے باوجود

امریکی اخبارات میں مودی کی نہیں بلکہ رووسف کی تقریر شاہ سرخی بنی۔ اس کے برعکس مودی نہ خود اپنی جماعت بی جے پی کی جاسوسی پر زبان نہ کھول سکے اور نہ کھوبراگڑے کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا ذکر کر سکے۔ اوبامہ کے ساتھ چوٹی کانفرنس میں بھی انسانی حقوق کا ذکر نہ آسکا۔ رووسف نے داعش کے خلاف واضح موقف اختیار کرتے ہوئے وہاں فوجی مداخلت کی مخالفت کی اور فلسطین کی کھل کے حمایت کی۔ ایکویڈور نے بھی امریکی جاسوسی پر تنقید کی اور سنوڈن کو پناہ دینے کے اقدام کو حق بجانب قرار دیا ۔ میکسیکو نے ویٹو پاور کو محدود کرنے پر زور دیا۔ وینزویلا نے غزہ، عراق اور شام پر ڈرون حملوں کی مخالفت کی۔

ارجنٹینا کی صدر کرشنر نے امریکہ کے معاشی استحصال کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کہا یہ گدھ دراصل معاشی دہشت گرد ہیں جو غربت، فاقہ اور رنج و غم کو جنم دیتے ہیں۔ انہوں امریکہ کے عدالتی نظام کی بھی مذمت کی جو سرمایہ داروں کا حامی ہے۔ کرشنر نے داعش کے خلاف طاقت کا استعمال کرنے کے بجائے گفت و شنید پر زور دیا۔ انہوں نے برطانیہ کے دوغلے پن کی بھی مذمت کی جو ایکطرف جوہری اسلحہ کے پھیلاو کی مخالفت کرتا ہے اور دوسری جانب اس کی تجارت کرتا ہے۔ انہوں نے اسرائیل کے غزہ حملے کی کھل کے مذمت کی اور کہا کہ ارجنٹینا کے یہودی مرکز پر بمباری کا الزام ایران پر ڈالنے کیلئے امریکہ اور اسرائیل کی

جانب بیجا دباؤ ڈالا گیا تھا جس کو مسترد کرنے کے اب اصل مجرمین کی تلاش کیلئے ایران کے ساتھ مشترکہ تحقیقات کی جارہی ہیں۔ مودی جی امریکی خوشنودی کے پیش نظر گول مول باتیں کرتے رہے اور جرأتمندانہ اظہار خیال اختیار نہ کرسکے لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ عزت و وقار مصلحت کوشی اور منافقت کی نہیں حق گوئی و بے باکی کی میراثِ خاص ہے۔

خارجہ پالیسی : جاپانی ٹرین، امریکی سگنل، چینی پٹری اور گجراتی دل

وزیراعظم پنڈت نہرو اور نغمہ نگار شیلندر اشتراکیت کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈت جی کی خارجہ پالیسی کو شیلندر نے نہایت خوبصورت انداز میں اس طرح بیان کیا کہ ”میرا جوتا ہے جاپانی، اور پتلون انگلستانی، سر پر لال ٹوپی روسی لیکن پھر بھی دل ہے ہندوستانی“۔ آزادی کے بعد عرصۂ دراز تک ہندوستان کی خارجہ پالیسی مدرجہ بالا خطوط پر کاربند رہی لیکن جب اشتراکی لال ٹوپی خود سوویت یونین کے سر سے ہوا ہو گئی تو اس وقت کے شری ۴۲۰ وزیراعظم نرسمھا راؤ نے اپنا قبلہ و کعبہ تبدیل کردیا۔ اس کے بعد مختلف نظریات کی حامل جماعتیں اقتدار میں آتی جاتی رہیں لیکن عالمی برادری کے ساتھ ہمارے تعلقات اسی ڈگر پر آگے بڑھتے رہے جو ابن الوقتی کی بنیاد پر استوار کی گئی تھی۔ وزیراعظم نریندر مودی کے اقتدار میں آتے آتے حالت یہ ہو گئی کہ ”بولٹ ٹرین ہے جاپانی، اس کے سگنل ہیں امریکی، نیچے پٹری تو ہے چینی، پھر بھی چھاتی ہے گجراتی“

بیرونی ممالک کے دوروں کی خبر خوب بنتی ہے۔ اس سے ذرائع ابلاغ میں چھائے رہنے کا بہترین موقع ہاتھ آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ملک کے اندر موجود پیچیدہ

اور متنازعہ مسائل سے جان چھوٹ جاتی ہے اس لئے وزیر اعظم نریندر مودی فی الحال امورِ خارجہ کا مورچہ سنبھالے ہوئے ہیں ۔ عالمی رہنماؤں کے ساتھ دعوتیں اڑانا اور بڑی بڑی باتیں کرنا نہایت آسان و سہل کام ہے۔ اس افیون سے وزیر اعظم تو راہِ فرار اختیار کر سکتے ہیں لیکن سنگین مسائل سے دوچار غریب عوام کو اس طرح کے نشہ میں مدہوش کرنا ممکن نہیں ہے ۔ ضمنی انتخابات میں لوگوں تیور سے لگتا ہے وہ اس موقع کے منتظر ہیں کہ جب وہ ان لوگوں کو ہوش میں لایا جائے جنہوں نے حسین خواب دکھلا کر انہیں جھانسے میں لے لیا تھا ۔

ننھے منے ہمسایہ ممالک سے فارغ ہونے کے بعد وزیر اعظم نے جاپان کا دورہ کیا۔ جاپان ایک ترقی یافتہ ملک ہے اور اس کا شمار دنیا کی بڑی معیشتوں میں ہوتا ہے ۔ اس دورے کو سیاسی نہیں بلکہ معاشینقطۂ نظر سے اہم سمجھا جا رہا تھا۔ وزیر اعظم کے ساتھ ایک اعلیٰ سطحی تجارتی وفد تھا جس میں ان کے منظورِ نظر گوتم اڈانی تو شامل تھے لیکن ہندوستان کے امیر ترین صنعتکار مکیش امبانی غائب تھا ۔ مودی جی کی تقریبِ حلف برداری یں گجراتی امبانی پریوار کے مکیش اور انل کے ساتھ ان کی والدہ کوکیلا بین و دیگر اہل خانہ موجود تھے ۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ مکیش امبانی کے تجارتی مفادات جاپان کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں بلکہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ جب تیل اور گیس کی کھوج کا کام نجی شعبہ کے حوالے کیا گیا تو کرشنا گوداوری کے ڈیلٹا میں امبانی کی ریلائنس

نے جاپانی کمپنی کے ساتھ مل کر ٹھیکہ لیا۔ اس کے باوجود عین موقع پر امبانی کا بلا کسی ٹھوس وجہ کے پیچھے ہٹ جانا دال میں کالا بتلاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مکیش امبانی اور نریندر مودی کے درمیان تعلقات فی الحال کشیدہ ہیں جس کی وجہ حکومت کی جانب سے گیس کی قیمتِ خرید کے تعین میں تاخیر ہے۔ فی الحال بھارت سرکار امبانی سے ۴٫۲ ڈالر فی ایم بی ٹی یو کے نرخ پر گیس خریدتی ہے۔ سابق وزیر اعظم منموہن سنگھ کے معاشی مشیر سی رنگا راجن نے یکم اپریل سے دوگنی قیمت یعنی ۸٫۴ ڈالر تجویز کردی تھی جسے یو پی اے حکومت نے تسلیم بھی کرلیا لیکن انتخابی کمیشن نے اس پر عمدار آمد میں روک لگا دی۔ امبانی نے اس امید میں اپنے وسائل انتخابی مہم میں جھونک دیئے کہ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد مودی جی اس فیصلے کو نافذ العمل کریں لیکن مودی جی اس کی جرأت نہیں کرپارہے ہیں اس لئے کہ ایسا کرنے پر یا تو مہنگائی میں بے شمار اضافہ ہوجائیگا یا خزانے کا خسارہ بے انتہا بڑھ جائیگا۔ مودی جی نے چار سرکاری افسران پر مشتمل ایک گروہ تشکیل دیا ہے جسے آئندہ چند ہفتوں میں گیس کی نیا نرخ طے کرنا ہے۔ سرکار پر دباؤ بنانے کیلئے مکیش امبانی نے جاپان کے دورے سے قبل ایک زور کا جھٹکا دھیرے سے لگا دیا۔

وزیر اعظم نریندر مودی کے جاپان دورے کا اہم مقصد جوہری بجلی گھر کی تکنیک میں تعاون حاصل کرنا تھا لیکن جاپان نے اس معاملے میں ساتھ دینے کے بجائے ہاتھ دے دیا۔ مودی جی بولٹ ٹرین کا کھلونا اور خوشنما وارانسی کا سپنا دکھلا کر لوٹا دیا۔وزیر اعظم کی ٹیم نے نہ جانے کیا سوچ کر چینی صدر کے دورے کو اس کے حریفِ اول جاپان اور امریکہ کے درمیان میں رکھا۔ یہ لوگ اس بات کو بھی بھول گئے کہ جاپان اور چین کے سمندری حدود کا تنازع کشمیر سے بھی زیادہ سنگین نوعیت کا ہےاس لئے جاپان سے واپس ہوتے ہوئے مودی جی نے ایک ایسا احمقانہ بیان دے آئے کہ جس سے چینی صدر کے دورے کی رنگ پھیکی پڑ گئی۔

جاپان کی سرزمین پر صنعتکاروں اور تاجروں سے خطاب کرتے ہوئے مودی جی کے اندر چھپا ہوا پرچارک اچانک بیدار ہو گیا اور انہوں بلا سوچے سمجھے اپنا پروچن شروع کردیا ۔پرتھم (سویم) سیوک مودی جی جوش میں یہ کہنے سے بھی نہیں چوکے کہ '' فی الحال دنیا میں دو طرح کے دھارے (نقطہائے نظر) پائے جاتے ہیں ۔ ایک توسیع پسندی کا اور دوسرا ترقی پذیری کا۔ آج ہم اپنے چہار جانب ۱۸ویں صدی کے انداز میں پایا جانے والا توسیع پسندانہ رجحان دیکھتے ہیں۔یہی ذہنیت ہے جس کے تحت کسی ملک میں دراندازی کرکے اس کے علاقوں کو غصب کرلیا جاتا ہے یا دوسروں کی سمندری حدود میں داخل ہو کر ان پر قبضہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی توسیع پسندی کسی صورت عوامی فلاح و بہبود کو یقینی نہیں بنا سکتی ۔ مودی جی نے دانستہ یا نادانستہ طورچینپر زبردست چوٹ کردی اور اپنی عادت

کے مطابق اسے بھول گئے لیکن چینی صدر شی جن پنگ اسے نہیں بھولے ۔

جاپان کے اندر ہندوستانی وزیراعظم کا یادگار کارنامہ ڈھول بجانے سے آگے نہ بڑھ سکا۔اس ڈھول کے شور نے کمبھ کرن کی مانند خوبِ خرگوش میں مبتلا راہل گاندھی کو گہری نیند سے بیدار کردیا۔انتخاب میں ناکامی کے بعد راہل کا واحد بیان جو اخبارات کی زینت بنا وہ ان کے اپنے حلقۂ انتخاب امیٹھی میں دیا گیا تھا جس میں انہوں نے کہا ملک کے اندر بجلی نداردہے، نوجوان بیروزگاری سے پریشان ہے اور وزیراعظم بیرونِ ملک ڈھول بجارہا ہے۔ جاپان سے واپسی کے بعد مودی سرکار کی دوسری حماقت صدر مملکت پرنب مکرجی کا ویتنام کا دورہ تھا جہاں پرنب دانے ویتنام کو سمندر کی تہہ میں موجود تیل کی کھوج میں تعاون کا یقین دلایا۔ شاید پرنب دا کو نہیں معلوم کہ وہ جن تیل کے ذخائر کی بات کررہے ہیں ان پر چین کا دعویٰ ہے۔ مودی سرکار کو اگر عقل ہوتی تو صدرِ مملکت کا دورہ ایک ماہ بعد رکھا جاتا اور چینی صدر کے دورے سے قبل ان کے زخموں پر نمک پاشی سے گریز کیا جاتا۔فکری عدم استحکام کے سبب مودی جی بیک وقت دو دشمنوں کو خوش کرنے کے چکر میں دونوں کو ناراض کرتے ہوئے کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔اس صورتحال میں کی ان کی قابلِ رحم حالت پر یہ شعر صادق آتا ہے

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ راہبر یہ کہے

چلے کہاں سے تھے لیکن کہاں نکل آئے

جن پنگ کو دہلی کے بجائے احمد آباد بلایا گیا۔ سفارتی آداب کے مطابق یہ ہونا چاہئے تھا کہ مودی جی دوسرے دن دہلی میں چنگ کا استقبال کرتے لیکن وہ بذات خود احمد آباد پہنچ گئے اور اس قدر مکھن لگایا کہ امول فیکٹری خالی ہو گئی۔ اروناچل پردیش کے لوگوں کو گھروں میں نظر بند کر دیا گیا۔ حکومتِ گجرات کی جانب سے تقسیم کئے جانے والے نقشے میں نہ صرف اروناچل پردیش بلکہ اکسائی چین اور آزاد کشمیر کو بھی متنازعہ علاقہ دکھلادیا گیا۔ اس کے باوجود دورے کے درمیان ہی ۱۰۰۰ چینی فوجیوں نے سرحد پر اچانک ہلہ بول دیا۔ چینی حکومت کے اس طرز عمل سے عام لوگ تو حیران رہ گئے لیکن جنہیں پتہ تھا کہ مودی جی جاپان کے اندر کیا گل کھلا کر آئے ہیں اور پرنب دا کے ویتنامی دورے کا رد عمل کیا ہو سکتا ہے وہ اس کارروائی کے محرکات جان گئے۔ مودی جی کی مانند چینی صدر بول بچن کے قائل نہیں ہیں بلکہ جس موقف کو درست سمجھتے ہیں اس کا اعلان بندوق کی نال سے کرتے ہیں۔ مودی جی کا جاپانی غیر دانشمندانہ بیان تو داستانِ پارینہ بن گیا لیکن چینی اقدام نے ہند چینی تعلقات پر انمٹ نشان ثبت کر دیئے۔

ہندوستان کا ذرائع ابلاغ جو اس دورے کے حوالے سے شیخ چلی کی مانند خواب بن

رہا تھا چینی فوج کی پیشقدمی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ پیٹ پجاری صحافیوں کو لگا کہ گجراتی پکوان کی سوندھی سوندھی خوشبو سرحد عبور کر گئی ہے۔ کھانے کی بو نے فوجیوں کو اس قدر بے قابو کر دیا ہے کہ وہ اپنے صدر کے ساتھ ڈیڑھ سو اقسام کے کھانوں سے لطف اندوز ہونے کی خاطر ہندی سرحد میں داخل ہو گئے ہیں۔اس سے پہلے کہ کوئی

احمق چینل اس دراندازی کا کریڈٹ مودی اوران کے خاص باورچی باورچیبدری کو دیتا موت کی خاموشی چھا گئی۔ سابرمتی ندی کے ساحل پر واقع گاندھی آشرم کے ارد گرد منڈلانے والی مہاتما کی سادگی پسند روح اس فضول خرچی پر خون کے آنسو بہا رہی تھی۔

غاصب چینی فوجیوں کا غالباً پتہ نہیں تھا کہ چومار سے احمدآباد کے درمیان کس قدر طویل فاصلہ ہےاوران کے صدر بھی شاید نہیں جانتے تھے کہ ہند چینی سرحد پر کیا ہنگامہ برپا ہے۔ یا ممکن ہے ان دونوں کا اس کا علم ہو کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟ لیکن ہمارے وزیر اعظم یقیناً اس دراندازی کی وجوہات سے واقف نہیں تھے ورنہ مانسرور کیلئے نیا راستہ کھولنے پر شکریہ ادا کرنے کے بجائے وہ پرانے راستے کے بند ہونے پر غم و غصے کا اظہار کرتے۔ ویسے کوئی بعید نہیں کہ چین کی جانب سے متوقع سرمایہ کاری نے ان کے لبوں پر قفل ڈال دیا ہو۔ اس سے قبل منموہن سنگھ کے زمانے میں چینیوں نے دلائی لامہ کے دورے کو لے کر دباؤ بنانے کیلئے اور اپنے سابقہ صدر کے ہندوستانی

دورے سے

قبل اسی طرح کی مذموم حرکت کی تھی جس کے جواب میں حکومتِ ہند نے دورہ منسوخ کرنے دھمکی دے کر چینی فوج کو واپس جانے پر مجبور کیا۔ اس بار جن چنگ کا جن ان کے احمدآباد میں قدم رنجا فرمانے کے بعد بوتل سے اس طرح باہر آیا کہ مودی جی ہاتھ ملتے رہ گئے۔

وزیراعظم مودی کے ساتھ جو سلوک جن ژی چنگ نے کیا اس طرح کوئی مہمان اپنے معزز میزبان کے ساتھ پیش نہیں آتا لیکن ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ اس مختصر سے دور اقتدار میں یہ تیسرا واقعہ ہے۔اس سے قبل برازیل جاتے ہوئے راستے میں رک کر انہوں نے جرمنی کی چانسلر انجیلا مرکل سے ملاقات کا ارادہ کیا۔جب وہ جرمنی پہنچے تو انجیلا بنا بتائے برازیل فٹبال میچ دیکھنے چلی گئیں ۔ اگر مودی معمول کے مطابق فرینکفرٹ سے ہوتے ہوئے جاتے تو اس ہزیمت سے بچ جاتے۔امریکہ میں بھی یہی ہوا کہ جس اوبامہ نے منموہن سنگھ کے استقبال کیلئے سکریٹری آف اسٹیٹ کونڈالیزا رائس کو بھیجا تھا اسی نے اس بار سکریٹری کے نائب کو روانہ کردیا۔ منموہن کے اعزاز میں دی جانے والی دعوت میں ۳۰۰ لوگ شریک ہوئے تھے مودی کو ۲۰ لوگوں کے ساتھ ٹرخا دیا گیا اور جس جگہ یہ دعوت ہوئی وہ کوئی تقریب گاہ نہیں بلکہ انتظار گاہ تھی ۔ وزیراعظم پر غیر ملکی دوروں کے بخار کو دیکھ کر یہ اشعار یاد آتے ہیں ؂

ہر محفل سخن میں میں جاتا ضرور ہوں

لیکن میرا مقام ابھی زیر غور ہے
کہنے لگے عنایتِ عجلت پسند سے
بھیا تمہارا کام ابھی زیر غور ہے

دراصل مودی جی کے مزاج میں پائی جانے والی عجلت پسندی ان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ ان کو عالمی سطح کے رہنما اس لئے اہمیت نہیں دیتے کہ انہوں نے اپنی شخصیت کا لوہا ابھی منوایا نہیں ہے۔ صرف انتخاب جیت جانا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہوتا بلکہ اقتدار میں آنے کے بعد کچھ کرکے دکھانا ہوتا ہے اور وہ مرحلہ ابھی نہیں آیا۔ اگر وہ دو چار سال یکسوئی کے ساتھ جم کر کام کریں اپنی ساکھ بنائیں تو لوگ اپنے آپ ان کا احترام کریں گے ورنہ الفاظ کی بازیگری سے بھولے بھالے عوام کو کچھ دیر تک بہلایا پھسلایا تو جا سکتا ہے لیکن عالمی رہنماوں کے درمیان کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا۔ زر خرید ذرائع ابلاغ کا معاملہ تو اس بھجن منڈلی کی طرح ہے کہ اسے جس قدر دکشنا دو وہ اسی قدر نمو نمو کا ورد کرتی رہے گی۔

وزیراعظم مودی ہندوستان کی سرزمین پر جس چینی فوج کو ان کے صدر سے بات چیت کرکے واپس نہ کر سکے، امریکہ کے اندر وزیر خارجہ سشما سوراج نے اپنے چینی ہم منصب سے گفت و شنید کرکے وہ کام کردیا۔ غالباً محترمہ سشما سوراج نے صاف صاف پوچھ لیا ہوگا کہ بھائی آپ کو کیا پریشانی ہے ؟آپ جو پیغام دینا

چاہتے تھے وہ تو ساری دنیا کو پہنچ گیا۔ سب کو پتہ چل گیا کہ آپ ڈنکے کی چوٹ پر توسیع پسندی کے قائل ہیں اور ایسا کرنے سے آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اب تو کم از کم اپنے فوجیوں کو واپس بلا لو۔ اس کے جواب میں چینی وزیر خارجہ نے سرحد کے قریب ہندوستان کی حدود میں بننے والی سڑک کو روکنے کا مطالبہ کیا جسے تسلیم کرلیاگیا۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ آئندہ جمعہ سے انخلاء کی کارروائی شروع ہو گی اور ایک ہفتہ میں مکمل ہو جائیگی ۔ گویا جو علاقہ چینی فوج نے ایک دن کے اندر اپنے قبضے میں لے لیا تھا اس کو خالی کرنے میں دو ہفتوں کا وقت لگے گا۔ سشما نے دو ہفتوں کے اندر انخلاء کرواکر مودی کی ''گو گیٹر پی ایم'' (یعنی کر گزرنے والا وزیر اعظم) کی شبیہ کو معمولی سی سوئی سے پنچر کردیا۔

صدر جن پنگ کی آمد سے قبل یہ قیاس آرائی کی جارہی تھی کہ اس دورے کے نتیجہ میں ۱۰۰ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری ہو گی لیکن جب جن پنگ نے دراندازی کرنے بعد گجرات کے شیر کا خود اپنے کچھار کے اندر دم خم دیکھ لیا تو سوچا مودی جیسے وزیر اعظم کی سربراہی میں ہندوستان کے اندر سرمایہ کاری محفوظ نہیں ہے۔ اس کا بہتر استعمال کسی اور ملک میں ہونا چاہئے اس لئے کل سرمایہ کاری کی مقدار ۳۰ بلین سے آگے نہ بڑھ سکی ۔ جن پنگ کے بعد آسٹریلیا کے وزیر اعظم ٹونی ایبٹ ہندوستان آئے ۔ انہوں نے منہ مانگے داموں پر یورینیم

فراہم کرنے کا وعدہ تو کردیا لیکن اڈانی کے ذریعہ اپنے ملک کے اندر کوئلہ کان کی صنعت میں ۱۰۰ ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی یقین دہانی بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف تو ہمارے وزیر اعظم امریکی سرمایہ کاروں کو خوش کرنے کیلئے جان لیوا بیماریوں کی دواؤں کو مہنگا کررہے ہیں تو دوسری طرف وزیر اعظم کے چہیتے سرمایہ دار گوتم اڈانی بدیس میں جاکر سرمایہ کاری کررہے ہیں۔

چینی فوج جس وقت ہندوستان کی سرحد کے اندر اپنے خیمہ گاڑ رہی تھی مہاراشٹر میں شیوسینا بی جے پی کے خیمہ اکھاڑ رہی تھی۔ جس طرح سرحد پر ہمارے جوان خاموش تماشائی بنے دہلی سے احکامات کا انتظار کررہے تھے اسی طرح ممبئی میں بیٹھے مہاراشٹر بی جے پی کے رہنما پارٹی کے صدر امیت شاہ کے مون برت کے ٹوٹنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ شاہ کا حال یہ تھا کہ ممبئی میں آکر کسی واضح موقف کا اظہار کرنے کے بجائے اپنا طے شدہ دورہ منسوخ کئے جارہے تھے۔ بیچاری بی جے پی سرکار نہ چینی صدر کو خوش کرنے میں کامیاب ہوئی اور نہ ادھو کو منا پائی اور جو رشتے ماضی میں بڑی محنت سے استوار کئے گئے تھے وہ بالآخر ٹوٹ کر بکھر گئے۔

امریکہ سے واپسی کے بعد مودی جی نے خود تو گاندھی جی کی یاد میں جھاڑو تھام

لیا اور صاف ستھرا کپڑا ڈلوا کر اسے صاف کرنے کا ناٹک کرنے لگے مگر دوردرشن کا مائیک گاندھی جی کے قاتلوں کی تنظیم آر ایس ایس کے سربراہ موہن بھاگوت کو تھما دیا تاکہ عوام کے ذہنوں کو پراگندہ کیا جائے۔ سنگھ پریوار کا دہشت گردی کے مختلف واقعات میں ملوث ہونا جگ ظاہر ہے۔ سمجھوتہ ایکسپریس اور مکہ مسجد کے دھماکوں میں اسیمانند اور سادھوی پرگیہ جیل میں چکی پیس رہے ہیں۔ گجرات کا کلنک ابھی مٹا نہیں ہے کہ ایک نیا داغ انہوں نے اپنے ماتھے پر سجا لیا۔ بھاگوت کی تقریر دوردرشن پر نشر کروانے کے بعد مودی جی کس منہ سے دہشت گردی کے خاتمہ کا دعویٰ کریں گے اور کون اس پر اعتبار کرے گا؟ اقتدار کے زعم میں مودی جی بار بار متضاد رخ اختیار کرتے ہیں اور بار بار ٹھوکر کھاتے ہیں بقول حافظ

غرورِ جادہ شناسی بجا سہی لیکن
سراغِ منزل بھی مقصود بھی کوئی پائے

فلسطین: آپ ہی مقتل بول اٹھے گا کون جری ہے کون نہیں

وزیر اعظم رامی الحمد اللہ کی قیادت میں غزہ کے اندر فلسطین کی متحدہ قومی حکومت کا اولین اجلاس غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن اس موقع پر مغربی ذرائع ابلاغ نے ہمیں ملالہ کا جھنجھنا پکڑا دیا اور جن کو اس میں دلچسپی نہیں تھی انہیں داعش کی دہشت کا شکار کردیا۔ مغرب کا مکار میڈیا مسلمانوں کے انتشار وافتراق کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ ہماری ناکامیوں کو خوب اچھالتا ہے اور مغرب کی ناکامی و مظالم پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ وہ ہماری کامیابی کو نظرانداز کرتا ہے اور ہم بھی ان کی جانب متوجہ نہیں ہوتے بلکہ اخلاص کے ساتھ امت کو بیدار کرنے کی خام خیالی میں اس کی لائن کو پیٹتے ہوئے ملت میں مایوسی پھیلانے میں لگے رہتے ہیں اور سوشیل میڈیا میں ایسی ویڈیوز پھیلاتے رہتے ہیں جن میں سے بیشتر دشمنوں کا پروپگنڈا ہوتی ہیں ورنہ کیا وجہ ہے نہ تو اقوام متحدہ میں محمود عباس کی تقریر کا کوئی کلپ دیکھنے کو ملتا ہے اور نہ رامی الحمداللہ کی غزہ میں گارڈ آف آنر کے ساتھ تصویر نظر آتی ہے بلکہ غزہ کی تعمیر نو کیلئے منعقدہ کامیاب کانفرنس کے اعداد شمار بھی ہمارے آنکھوں سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔

فلسطین کے وزیر اعظم رامی الحمداللہ گزشتہ ہفتہ جب پہلی مرتبہ غزہ تشریف لائے تو حماس کے نائب سربراہ اسماعیل ہنیہ نے ان کے ساتھ آنے والے ارکان اجلاس کا خیر مقدم کیا اس کے بعد حماس کے اہم رہنماوں کے ساتھ ان کی میٹنگ ہوئی اور وزیر اعظم نے غزہ میں متحدہ تمام سہولیات فراہم کرنے کیلئے حماس کا شکریہ ادا کیا۔ ان تمام خوش کن خبروں کو تو گمنامی کے غار میں جھونک دیا گیا لیکن اگر کل کو ان کے درمیان کوئی اختلاف کھڑا ہو جائے تو عالمی ذرائع ابلاغ اسے اچھالنے لگے گا اور ہم بھی اس کی پیروی میں انہیں پھیلا کر ایک دوسرے کو لعن طعن کرنے یا گریہ و ماتم کرنے میں جٹ جائیں گے۔۔

فلسطین کی یہ نوزائیدہ متحدہ قومی حکومت ۲۳ اپریل ۲۰۱۴ء کو حماس اور فتح کے درمیان طے پانے والے ایک معاہدے کے تحت قائم ہوئی ہے۔ ماہِ جون سے رام اللہ کے اندراس کو اپنا کام شروع کرنا تھا لیکن چونکہ اس کی ۱۷رکنی کابینہ میں سے ۵ کا تعلق غزہ سے تھا اس لئے غاصب اسرائیل نے ان وزراء کو تقریب حلف برداری کیلئے آنے سے روک دیا۔ مشیت نے چار ماہ بعد وہ دن دکھلایا کہ سرزمینِ غزہ پر فلسطین کی متحدہ قومی حکومت کا اولین اجلاس منعقد ہوگیا اور بے دست و پا اسرائیلی حکومت ذلت و رسوائی کے عالم میں اس پیش رفت کو دیکھ کر کڑھتی رہی۔

اسرائیلی اخبار ہآرتض نے جون کے اندر ہی اپنی حکومت کو متنبہ کر دیا تھا کہ " فلسطین کی متحدہ قومی حکومت کا دنیا کے بیشتر ملکوں کی جانب سے خیر مقدم کئے جانے کے بعد اب اسرائیل کے پاس اس کو تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے"۔ اس دانشمندانہ مشورے پر کان دھرنے کے بجائے اسرائیل کی دہشت گرد حکومت نے بزور قوت حکومت کے قیام میں رخنہ اندازی کی خاطر امسال ۸ جولائی کو غزہ پر جنگ مسلط کردی مگر تحریک مزاحمت حماس کے صبر و استقامت اور دلیری و جوانمردی نے صہیونی عزائم کو ملیامیٹ کردیا۔ اس عظیم کامیابی سہرہ باہمی اتحاد اور نصرت الٰہی کے سر ہے۔ جو تحریک سرِ مقتل حق کی شہادت دیتی ہے اس پر مولانا عطاء الرحمٰن وجدی کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؎

آپ ہی مقتل بول اٹھے گا کون جری ہے کون نہیں
ان کے ہاتھ میں سنگیں ہیں ہم نے سینے تانے ہیں

وزیر اعظم رامی نے اجلاس کے بعد کہا کہ حکومت طے شدہ معاہدوں پر عمل درآمد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ انہوں نے اس کام کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی کے تشکیل کا اعلان کیا۔ وزیر اعظم نے یقین دلایا کہ غزہ کے عوام کی ہر طرح سے خدمت کی جائے گی اور حکومت اس سلسلے میں کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کرے گی۔ اس موقع پر نائب وزیر اعظم اور وزیر خزانہ محمد مصطفیٰ نے بتایا کہ فلسطین کے مقبوضہ علاقوں سے ملحقہ غزہ کی گذرگاہوں کو نئی حکومت نے اپنے

کنٹرول میں لے لیا ہےاور اس کے فنی ماہرین غزہ کے راستوں پر آمد و رفت اور تعمیر نو کی خاطر آنے والی درآمدات کی نگرانی کر رہے ہیں۔

نو تشکیل شدہ فلسطینی حکومت کا دنیا بھر کے امن پسند ممالک نے کا خیر مقدم کیا تھا۔ روسی وزارت خارجہ نے اس کے قیام کو ایک تاریخ ساز واقعہ قرار دیتے ہوئے کہا تھاکہ باہمی اتحاد و یک جہتی کے بغیر فلسطینی ارمانوں کی تکمیل اور صیہونی حکومت کے ساتھ اختلافات کا منصفانہ حل ممکن نہیں ہے۔ماسکو نے فلسطین کی متحدہ قومی حکومت کے ساتھ دوستانہ روابط کے فروغ اور تعاون کا یقین دلایا تھا۔اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون کے خصوصی ایلچی برائے مشرق وسطی رابرٹ سیری نے اس قومی حکومت کی حمایت کرتے ہوئے اسرائیل اور مصر سے غزہ کی پٹی کا محاصرہ ختم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ رابرٹ سیری نے اسرائیل کی مخالفت کے باوجود غزہ کا دورہ کرکے چار وزراء سے ملاقات کی اور اقوام متحدہ کی جانب سے فلسطینیوں کے لیے مزید امداد کا وعدہ بھی کیا۔ نئ حکومت کے قیام کے بعد وہ غزہ کا دورہ کرنے والے پہلے عالمی عہدے دار تھے۔

فلسطین کی مخلوط حکومت کے قیام سے اسرائیل کو سب سے بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب اسرائیل کے سرپرستِ اعلیٰ امریکہ نے اس حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنے کا اعلان کر دیا۔امریکہ نے یہ اعلان فلسطین کی مخلوط حکومت کے حلف اٹھانے کے

محض چند گھنٹے کے اندر نیتن یاہو کے اس انتباہ کے باوجود کیا تھا کہ " عالمی برادری فلسطینی حکومت کو تسلیم کرنے میں عجلت سے کام نہ لے "۔ اسرائیلی حکومت نے امریکی موقف پر غم وغصے کا اظہار اس طرح کیا کہ " ہم مخلوط فلسطینی حکومت کے متعلق امریکی دفتر خارجہ کے بیان سے سخت مایوس ہوئے ہیں " جبکہ فلسطینی اتھارٹی کے ایک عہدیدار کے مطابق امریکہ کی جانب سے نو منتخب وزیر اعظم رامی الحمدللہ کو واشنگٹن کے دورے کی دعوت موصول ہوئی جو اس بات کا عندیہ ہے کہ امریکہ فلسطین میں حماس کی شراکت سے وجود میں آنے والی قومی حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے لیکن جنگ نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔

اسرائیل کی تمامتر رکاوٹوں کے باوجود فلسطینی حکومت کا اولین اجلاس ۱۲ اکتوبر کو غزہ کی بازآبادکاری کیلئے مصر اور ناروے کی مشترکہ میزبانی میں عالمی امدادی کانفرنس کے اہتمام سے تین دن قبل منعقد ہوا۔ کانفرنس سے قبل وزیر اعظم رامی الحمداللہ نے بذاتِ خود پچاس روزہ اسرائیلی وحشیانہ بمباری کی تباہ کاری کا جائزہ لیا ہے۔ان کے اندازے کے مطابق غزہ میں تعمیر نو کے لیے چار ارب ڈالرز کی رقم اور تعمیراتی منصوبوں کی تکمیل کیلئے تین سال درکار ہے۔ اس کانفرنس میں ۳۰ ممالک کے مندوبین نے شرکت کی جن میں بان کی مون، جان کیری، یورپی یونین کی کیتھرین آشٹن اور عرب لیگ کے ڈاکٹر نبیل العربی کے

علاوہ فرانس، ،برطانیہ، اردن، جاپان اور قطر کے وزرائے خارجہ شامل تھے۔
ڈونرز کانفرنس کی غیر معمولی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ غزہ کی تعمیر نو کے لیے چار ارب ڈالرز کا مطالبہ کیا گیا تھا جس کے جواب میں عالمی مندوبین نے پانچ ارب چالیس کروڑ ڈالرز کی رقوم دینے کے وعدے کیے۔ امریکہ نے ۲۱ کروڑ ۲۰ لاکھ تو یوروپین یونین نے اس سے دوگنی رقم کی یقین دہانی کرائی لیکن قطر جیسے ننھے سے ملک نے امریکہ اور یورپی یونین دونوں پر بازی مارلی اور سب زیادہ ایک ارب ڈالرز دینے کا اعلان کرکےثابت کردیا کہ فلسطینیوں کا سچا ہمدرد کون ہے؟ صدر محمود عباس نے امدادی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''گذشتہ ۶ سال کے دوران غزہ کو تین جنگوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اس کے تمام علاقے تباہ ہو چکے ہیں اور اب تباہ شدہ سرکاری اداروں کی بحالی کے لیے فنڈز درکار ہیں''۔ امداد سے آگے بڑھ کر آپ نے فرمایا فلسطینی ،اسرائیلی تنازع کے حل کیلئے اب نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے اور عالمی'' برادری کو اقوام متحدہ کی قرارداد کے ذریعہ اسرائیلی قبضہ ختم کرانا چاہیے''۔اقوام متحدہ کے سکریٹری بان کی مون نے منگل کو غزہ میں عوام سے براہ راست گفتگو کی۔
اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کمشنر ناوی پلے نے اسرائیل پر الزام لگایا تھا

کہ اس نے غزہ میں شہری علاقوں، اسکولوں، اسپتالوں مکانوں اور اقوام متحدہ کی تنصیبات کو نشانہ بنا کر بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ ناوی پلے نے اسرائیلی فوج کے غزہ پاور پلانٹ، نکاسیِ آب کے نظام اور پانی کے کنوؤں پر حملوں کی کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسرائیلی فوج نے ۲۰۰۹ء میں بھی بجلی گھر اور پانی کی فراہمی و نکاسی کے نظام کو اسی طرح تباہ کر دیا تھا۔ اب امریکی دفتر خارجہ کہتا ہے کہ وہ اسرائیل کو غزہ کی تعمیر نو کے لیے ضروری سہولتیں دینے پر تیار کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے اسرائیل نے غزہ کا محاصرہ کر رکھا ہے اور مصر آئے دن رفح راہداری کو بند کر دیتا ہے۔ امریکی ڈرامہ سے قطع نظر حالیہ جنگ بندی معاہدے کے تحت اسرائیل ساحل کی جانب سے غزہ کا محدود پیمانے پر راستہ کھولنے پر مجبور ہوا ہے۔

عالمی برادری کا یہ عجیب منافقانہ رویہ ہے کہ پہلے اسرائیل کو تباہی مچانے کی چھوٹ دی جاتی ہے اور پھر تعمیر نو کیلئے امداد جمع کی جاتی ہے۔ اسرائیل کو اس کے جرائم کی سزا دینے کے بجائے فلسطین پر اسرائیل کے خلاف عالمی اداروں سے رجوع نہ کرنے کیلئے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ امریکہ جانتا ہے کہ اسرائیل کے جنگی جرائم کو عالمی عدالت میں لے جانے سے اسرائیل مشکل میں پڑ سکتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی کنارے کی سیاسی جماعتیں صہیونی ریاست کے خلاف عالمی

فوجداری عدالت سے رجوع کرنے کیلئے صدر محمود عباس پر دباؤ بنائے ہوئے ہیں۔اس دباؤکے تحت صدر عباس نےاقوام متحدہ میں اسرائیل کو نسل کشی کا مرتکب قرار دے دیا۔ انہوں نے غزہ کے خلاف جنگ کو قطعی طور پر جنگی جرائم کاایک سلسلہ گردانتے ہوئےاس کے قصوروار اسرائیل کوسزادلانے کے لئے جرائم کی عالمی عدالت سے رجوع کرنے کے عزم مصمم کااظہار کیا۔

صدر محمود عباس تمام عمر مصلحت کوشی کا شکار گول مول باتیں کرتے رہے اس لئے مغرب نے انہیں سرآنکھوں پر رکھااور امن کے گاجر دکھا کر بے وقوف بناتا رہا۔ گزشتہ سال انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ فلسطین کی آزادی کا سال ہے لیکن اسرائیل اور اس کے ہمنواؤں نے انہیں اس قدر مایوس کیا کہ بالآخر انہوں نے ببانگ دہل حق بات کہنے کا فیصلہ کرلیااور مغرب کی تنقید کانشانہ بن گئے امریکہ نے صدر عباس کی تقریر کو جارحانہ کردار کشی قراردیتے ہوئے اس پرافسوس کااظہار کیا۔ محمود عباس کی حق گوئی کے جواب میں نتن یاہو نے جنرل اسمبلی میں الزام لگایا کہ ’’حماس اور داعش کاایک ہی انتہا پسند مذہب سے تعلق ہے‘‘ حالانکہ ہٹلر اور اوبامہ بھی ہم مذہب ہیں اور جہاں تک ظلم وسفاکی کا سوال ہے اس بابت ہٹلر اور داعش کو صہیونیوں نے کب کا پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

فتح کے حان اشراوی نے یاہو کی تقریر کے بارے میں کہا کہ ’’یہ حقائق کو مسخ کر کے عالمی رہنماؤں کو گمراہ کرنے کی ایک اندھی کوشش تھی۔ یہ بدزبانی اور غلط گوئی مخبوط الحواسی کا مظہر ہے۔اس پر حماس کے ترجمان سامی ابوزہری نے کہا کہ ’’نتن یاہو نے حماس اور داعش کو ایک ہی سکے کے دو رخ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ اسے پتہ ہے کہ حماس اپنی قومی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی تحریک ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں اسرائیل بدی، غصب اور دہشت گردی کا دوسرا نام ہے‘‘۔

نتن یاہو کی بدحواسی قابل فہم ہے اس لئے کہ دن بدن عالمی سطح پر اسرائیل کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے اور ملک کے اندرونی حالات بھی دگرگوں ہوتے جارہے ہیں۔ اس کی دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ نومبر ۲۰۱۲ء میں جب اقوام متحدہ کے اندر فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کی تجویز رکھی گئی تو اسے ۹ کے مقابلے ۱۳۸ ووٹوں سے شاندار کامیابی ملی مخالفت کرنے والے اسرائیل، امریکہ، کینیڈا اور جمہوریہ چیک کے علاوہ کچھ گمنام جزیرے تھے۔ اس انتخاب میں ۴۱ ممالک نے رائے دینے سے اجتناب کیا تھا جن میں بیشتر کا تعلق مغربی یوروپ سے تھا لیکن اب یوروپی قلعہ میں شگاف پڑنے لگا ہے۔ پہلے تو سویڈن نے اعلان کیا کہ وہ فلسطین کو تسلیم کرنے جارہا ہے اور پھر برطانوی پارلیمان نے ۱۲ کے مقابلے ۲۷۴ ووٹ سے فلسطین کو تسلیم کرنے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہودیوں کے

گن

گانے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس ووٹنگ سے قبل ایک لاکھ ۴۰ ہزار برطانوی مسلمانوں نے اپنے ممبران پارلیمان سے رابطہ کیا جبکہ یہودی صرف ۲ہزار دستخط جمع کرپائے۔

اسرائیل کے اندر پچھلے دنوں جرمنی چلو نام کی ایک مہم چلائی گئی جس کے تحت ۹۰۰۰ یہودی اسرائیل کو خیر باد کہہ کراس جرمنی کا رخ کرنے پر مجبور ہوئے جہاں ہٹلر نے ان کا قتل عام کیا تھا۔ جس ادارے نے یہ مہم چلائی اب وہ اسرائیل چھوڑوکے تحت یوروپ کے مختلف ممالک میں یہودیوں کو لے کر جانے کا رادہ رکھتا ہے۔ نقل مکانی کرنے والے یہودی اسرائیل کے اندر مہنگائی اور بیروزگاری کے سبب مایوسی کا شکار ہیں ۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ یوروپ کا ماحول ان کیلئے سازگار ہے بلکہ فرانس کے یہودی ان کے خلاف غم وغصے سے پریشان ہیں۔ یوروپ کے اندر سب سے زیادہ یہودی آبادی والے پولینڈ میں قوم پرست حزب اختلاف نے صہیونیوں کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے اس کے باوجود ترکِ وطن کی لہر غمازی کرتی ہے کہ اسرائیل کی معیشت دم توڑ رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے میں ان مکانوں کے اندر کون رہے گا جنہیں عالمی رائے عامہ کو ناراض کرکے اسرائیلی حکومت تعمیر کررہی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر یہ ان فلسطینیوں کے استعمال میں آئیں جن کو بے خانماں کرکے یہ مکانات بنائے جارہے ہیں؟

فلسطین کے اندر قائم ہونے والے فتح اور حماس کے اتحاد کو مغرب کے دانشور مصر کی سرپرستی سے محرومی کے سبب حماس کی کمزوری قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں اتحاد کی ان کوششوں کا آغاز ڈاکٹر محمد مورسی کے ایماء پر ۲۰۱۳ء جنوری میں ہوا جب عباس اور مشعل کی قاہرہ میں ملاقات ہوئی ۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ اسلامی تحریک کے نزدیک اتحاد ملت دنیوی مجبوری نہیں بلکہ دینی فریضہ ہے ۔ اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کیلئے ایک بین الاقوامی سازش کے تحت ڈاکٹر محمد مورسی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اس کے باوجود اتحادو یکجہتی کا کارواں رواں دواں رہا۔

حماس نے اپنے سیاسی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر متحدہ قومی حکومت کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ حماس اقتدار سے محرومی کے بعد از خود کمزور ہو جائیگی لیکن اسرائیل کی مسلط کردہ جنگ میں حماس نے ساری دنیا کو دکھا دیا کہ ان کی طاقت کا سرچشمہ اقتدار کے اندر نہیں مزاحمت میں ہے ۔ وہ انسانوں کے سہارے نہیں بلکہ اللہ کے بھروسے پر لڑتے ہیں ۔ آج ساری دنیا اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ حماس اپنی استقامت اور حسنِ اخلاق سے اسرائیل کے حامی محمود عباس کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوگئی ہے اوراب صدر عباس بھی حماس کی بولی بولنے لگے ہیں ۔ اسرائیل کی اس شرمناک

شکست اور تحریک مزاحمت حماس کی عظیم کامیابی پر ایڈوکیٹ صادق حسین کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے

شرد پوار: مہاراشٹر کی مہابھارت کا بھیشم پتامہ

مہاراشٹر کی حالیہ مہابھارت کے دوران این سی پی رہنما اور سابق نائب وزیر اعلیٰ چھگن بھجبل نے ایک مرتبہ اعلان کردیا کہ شرد پوار کو انتخاب کے بعد وزارت اعلیٰ کا منصب سنبھال لینا چاہئے ۔ شرد پوار نے بڑی انکساری سے معذرت چاہتے ہوئے کہا اب میری عمر ۷۵ سال ہونے والی ہے مجھے کسی عہدے کی طلب یا خواہش نہیں ہے۔ اس مکالمہ بازی کو پڑھ کر بے ساختہ مشہوررزمیہ داستان مہابھارت کے بھیشم پتامہ کی یاد آگئی۔ جس وقت پوار نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا اس وقت وزارت اعلیٰ کے دو بڑے دعویدار ادھو ٹھاکرے اور ویویندر فردنویس پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ بھیشم پتامہ نے بڑی لمبی عمر پائی تھی یہی حال پوار کا ہے۔ پوار کے ساتھ کام کرنے والے
اکثر سیاستداں کیلاش واسی ہوچکے ہیں اور جو یم دوت کے ہتھے نہیں چڑھے وہ مودی جی اور راہل جی کے ہاتھوں سبکدوش کردیئے گئے۔ بھیشم پتامہ اپنے لیے نہایت
پروقار موت منتخب کرسکتا تھا اس لئے کہ اس کو اپنی موت کے انتخاب کا وردان ملا تھا لیکن مہابھارت گواہ ہے کہ وہ بڑے عبرتناک انجام سے دوچار ہوا اور اپنے بھائی کے پوتے ارجن کے ہاتھوں مارا گیا۔ شرد پوار کے سیاسی ارتھی کو اٹھانے کی ذمہ داری بھی ان کے بھتیجے اجیت پوار نے انجام دی ۔ مہاراشٹر کے اور مہابھارت کے بھیشم پتامہ میں بے شمار مشابہت پائی جاتی ہیں۔

شرد پوار سے لوگوں نے ہمیشہ ہی غلط توقعات وابستہ کیں اور انہوں نے ہر بار عوام کو مایوس کیا۔ شرد راؤ جی پوار کی آرزو مندی اور اور ابن الوقتی ان سے ہر دس پندرہ سال میں ایک حماقت سرزد کرواتی رہی اور وہ بیچارے منہ کی کھاتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں شرد پوار نے یشونت راؤ چوان کی انگلی پکڑ کر مہاراشٹر کی سیاست میں قدم رکھا اور بارامتی سے اسمبلی کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی ۔ وسنت دادا پاٹل نے انہیں وزارت سے نوازہ لیکن جس طرح بھیشم پتامہ نے اپنے گرودیو پرسورام کو قتل کیا اسی طرح شرد پوار نے دہلی میں سرکار کے بدلتے ہی اپنے استاد وسنت دادا کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ نوجوان شرد پوار دس سال سے وزیر اعلیٰ بننے کا خواب سجا رہا تھا اس لئے جیسے ہی موقع ملا تو فوراً اپنی پارٹی سے غداری کرکے نہ صرف الگ ہوگیا بلکہ ترقی پذیر محاذ بنا کر وزیر اعلیٰ بن گیا۔ اس وقت انہیں جنتا پارٹی میں بی جے پی کی بلاواسطہ حمایت حاصل تھی جو شامل تھی۔ اس طرح مہاراشٹر میں کانگریسی قلعہ کے اندر شگاف ڈالنے کا اولین کارنامہ پوار جی کے نام جاتا ہے۔

جنتا سرکار جلد ہی آپس کی سرپھٹول کا شکار ہو کر بکھر گئی اور جب اندرا گاندھی نے دوبارہ اقتدار سنبھالا تو شرد پوار کو اپنے کئے کی سزا دیتے ہوئے ان کی حکومت برخواست کردی۔ ۱۹۸۰ء کے اندر منعقد ہونے والے انتخابات میں

کانگریس پھر سے اقتدار میں آگئی اور دہلی و ممبئی میں ہل بردار کسان (جنتا پارٹی کا نشان) کی جگہ کانگریسی گائے اور بچھڑا (یعنی اندرا اور سنجے) کا بول بالا ہوگیا۔ اس کے بعد تقریباً سات سال اقتدار سے محروم رہنے کے بعد ۱۹۸ء میں شرد پوار کانگریس میں لوٹ آئے اور وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ کانگریس کلچر کے تحفظ کی خاطر واپس ہوئے ہیں۔ ۱۹۹۵ء کے انتخاب سے قبل شرد پوار کو اندازہ ہوگیا تھا کہ نرسمہا راؤ انتخاب کے بعد انہیں بن باس پر روانہ کردیں گے اس لئے پوار نے اپنی جماعت کے خلاف باغی امیدوار کھڑے کئے تاکہ اکثریت سے محرومی کی صورت میں انہیں اپنے وفادار مگر پارٹی کے باغی ارکان کی مدد سے حکومت سازی کا موقع ملے اور ان کے اقتدار محفوظ ہو جائے۔

مہابھارت کی جنگ میں بھیشم پتامہ گوکہ کوروؤں کا کمانڈر تھا لیکن اس پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ پانڈوؤں کیلئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی فوج کے جوانوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھتا ہے مگر ماہر تیر انداز ہوتے ہوئے بھی دشمن فوج پر تیر نہیں برساتا۔ دریودھن کے اس الزام سے ناراض ہو کر ایک مرتبہ بھیشم پتامہ نے اپنے طلائی تیر اٹھا بھی لئے تاکہ پانڈو فوج کا تمام کردے لیکن دریودھن نے اس پر بھروسہ کرنے کے بجائے اس سے تیر اپنے قبضے میں کر لئے۔ شرد پوار کی بھی کانگریس میں یہی حالت ہو گئی تھی کہ انہیں

کانگریسی دشمن کا آدمی سمجھنے لگے تھے۔ ان کی انتخابی حکمتِ عملی ناکام ہو چکی تھی۔ بی جے پی کا قومی جمہوری محاذ دہلی میں جیسے ہی اقتدار پر قابض ہوا اسی طرح مہاراشٹر میں بھی شیوسینا کے منوہر جوشی بی جے پی کی مدد سے وزیر اعلیٰ بن گئے گویا دہلی و ممبئی دونوں مقامات پر زعفرانی پرچم لہرانے لگا تھا۔

۱۹۹۹ء میں جب پرمود مہاجن نے ''چمکتا دمکتا ہندوستان'' نام کی مہم چلائی تو شرد پوار کو غلط فہمی ہو گئی کہ بی جے پی پھر ایک بار کامیاب ہو جائیگی اس لئے انہوں نے دوسری بار بغاوت کرکے راشٹر وادی کانگریس بنالی لیکن قدرت کا کرنا یوں ہوا کہ دہلی سے اٹل جی ٹل گئے اور مہاراشٹر میں کانگریس سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھر آئی۔ اب شرد پوار نے بلاتکلف اس کانگریس سے ہاتھ ملالیا جس کے خلاف انتخاب لڑا تھا۔ کانگریس بھی اقتدار کی خاطر ان سے بغلگیر ہو گئی اور این سی پی کے چھگن بھجبل نائب وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔ ۲۰۰۵ء کے انتخاب میں شرد پوار نے کانگریس کے ساتھ مل کر انتخاب لڑا اور ان کی این سی پی نے کانگریس کی بہ نسبت دو عدد زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ اصولاً اس بار مہاراشٹر میں این سی پی کا وزیر اعلیٰ ہونا چاہئے تھا لیکن شرد پوار نے اپنی پارٹی کی پشت میں چھرا گھونپتے ہوئے مرکزی وزارت کے عوض وزیر اعلیٰ کی کرسی بیچ دی۔

۲۰۰۵ء کے بعد سے وہ کانگریس کی مرکزی حکومت میں وزیر بنے رہے۔ ۲۰۰۹ء میں ان کی حالت شیوسینا کی مانند پتلی ہوچکی تھی اس لئے جہاں سینا کو بی جے پی سے دو نشستیں کم ملیں وہیں این سی پی کو کانگریس کے مقابلے ۲۰ نشستیں کم ملیں۔ ۲۰۱۴ء کے ریاستی انتخابات سے قبل دہلی میں پھر ایک بار بی جے پی کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی اور سینا نے مل کر کانگریسیوں کا مکمل صفایا کردیا تھا۔ شرد پوار نے سوچا کانگریس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا یہ نادر موقع ہے اس لئے انہوں حالیہ انتخاب میں نصف نشستوں کا مطالبہ کردیا اور نصف مدت کیلئے وزارت اعلیٰ کی کرسی پر اصرار کرنے لگے جو نہایت نامعقول بات تھی۔

ایسا اس لئے ہوا کہ شرد پوار جیسے گھاگ سیاستدان کو اندازہ ہوچکا تھا کہ اس بار کملا بائی یعنی بی جے پی) جس کے بارے میں بال ٹھاکرے کہا کرتے تھے کہ اس کی نظر ہمیشہ) کھڑکی کی جانب رہتی ہے اپنی نیت بدل چکی ہے۔ اس نے سینا کے ساتھ اپنا ۲۵ سال پرانا بندھن توڑ کر باہر چھلانگ لگانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر پوار نے نہ صرف کانگریس کے ساتھ الحاق کرنے سے انکار کیا بلکہ صوبائی حکومت سے اپنی حمایت واپس لے کر وزیر اعلیٰ کو چلتا کردیا۔ اس طرح گویا انتخاب کے نازک موقع پر پوار جی نے اقتدار کی کنجی

گورنر کے توسط سے بی جے پی کے حوالے کر دی۔ شرد پوار کو یقین ہے کہ ان کے اس احسان کی قدردانی ضرور کی جائیگی حالانکہ انتخابی سیاست سے احسانمندی عنقاء ہو چکی ہے۔

شرد پوار کو یہ توقع بھی ہے کہ بی جے پی کو واضح اکثریت حاصل نہیں ہوگی جس کی گواہی ایگزٹ کے علاوہ سارے انتخابی اندازوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ایسے میں بی جے پی کیلئے شیوسینا کی بہ نسبت این سی پی اچھا معاون ثابت ہوگی اس لئے راشٹروادی مطالبات شیوسینا کے مقابلے کم ہوں گے نیز اگر بی جے پی مرکزی حکومت سے شیوسینا کے وزیر کو نکال کر وہ کرسی شرد پوار یا ان کی بیٹی کے حوالے کردے شرد راؤ جی پوار کا آخری خواب شرمندۂ تعبیر ہوجائیگا۔ مہاراشٹر کی مہابھارت میں سیاسی بساط لپیٹی جاچکی ہے۔ اقتدار کی خاطر عزت و ناموس کی علامت دروپدی کو داؤں پر لگایا جاچکا ہے۔ اب سارا ملک اس کے وستر ہرن کے درشن کا منتظر ہے۔ ٹیلی ویژن کے کیمرے اس کو براہِ راست نشر کرنے کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شرد راؤ جی کی یہ آخری خواہش پوری ہوگی یا نہیں ؟

ویسے مہابھارت میں بھیشم پتامہ کی موت کا منظر نہایت دلچسپ ہے۔ بھیشم چونکہ اپنی موت پر اختیار رکھتا تھا اس لئے کوئی اور اسے مار نہیں سکتا تھا۔

جنگ طویل ہوتی جارہی تھی اس کے خاتمہ کیلئے سپہ سالار بھیشم کا مرنا ضروری تھا اس لئے بھیشم نے اپنے مخالفین کے سامنے ایک عجیب و غریب شرط رکھ دی اور ان سب کو مخمصہ میں ڈال دیا۔ اس نے کہا کہ اگر میرے سامنے پانڈو کسی ایسے شخص کو لے آئیں جو نہ مرد ہو اور نہ عورت تو وہ اس پر تیر نہیں چلائے گا اس لئے کہ ایسا کرنا اس کے وقار کے خلاف ہے۔ پانڈو فوج کیلئے کسی مخنث کو اپنے ساتھ میدانِ جنگ میں اتارنا ایک قابلِ شرم بات تھی۔ شرد پوار نے جب بی جے پی کے سامنے یہ شرط رکھی ہوگی کہ پہلے سینا سے ناطہ توڑو تب سرکار گراوں گا تو امیت شاہ کی بھی یہی حالت ہوئی ہوگی۔

اس صورتحال میں کرشنا نے ارجن کو سمجھایا کہ اسے وقار کا مسئلہ نہ بنائے بلکہ شکھنڈی کو اپنے رتھ میں سوار کرکے میدان جنگ میں اترے۔ ارجن نے یہی کیا لیکن وہ بھیشم کے تیروں کی تاب نہ لا سکا اور اس کے رتھ کا پہیہ ٹوٹ گیا۔ اس موقع پر کرشنا نے رتھ کو تھام لیا اور بھیشم کی طرف بڑھا۔ کرشنا نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ میدانِ جنگ میں ہتھیار نہیں اٹھائیگا لیکن بھیشم نے اسے عہد توڑنے پر مجبور کردیا۔ جب بھیشم اور ارجن آمنے سامنے ہو گئے تو بھیشم نے کہا کہ وہ اگر شکھنڈی کی آڑ میں چلا جائے تو اس پر تیر نہیں چلائے گا۔ ارجن نے یہی کیا بھیشم نے اپنی کمان رکھ دی۔ ارجن نے تیر چلا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مہاراشٹر کی اس مہابھارت میں بھیشم کون ہے یہ تو

آپ کو پتہ چل گیا لیکن اب قارئین کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس مہابھارت میں شکھنڈی کون ہے ؟ ارجن کون ہے اور کرشنا کون ہے؟ اگر ان سوالات کے جواب نہ ملیں تو انتخابی نتائج کے آنے کا انتظار

مہاراشٹر : غالباً کوئی دشمن دوستوں میں شامل ہے

مہاراشٹر کے انتخابی نتائج عین توقعات کے مطابق آئے اس لئے ان میں تحیر اور تعجب کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ نہ صرف ذرائع ابلاغ کے اندازوں کے مطابق ہیں بلکہ مہاراشٹر کی انتخابی روایت بھی یہی رہی ہے کہ یہاں کے عوام نے دہلی سرکار کی قدمبوسی کو ہمیشہ اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھا ہے۔ مرکز میں جو بھی اقتدار سنبھالتا ہے ہم اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں ۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ متحدہ مہاراشٹر کی مخالفت کرنے والی کانگریس پارٹی کے وزیراعلیٰ مرارجی دیسائی نے مظاہرین پر گولیاں برسائیں مگر جب ریاست بن گئی تو یہاں کی عوام نے کانگریس کے یشونت راؤ چوہان کے سر پر تاج رکھ دیا۔ اس بار ممبئی میں آکر توہین آمیز بیان دینے والی بی جے پی کی گجراتی وزیراعلیٰ کو نظر انداز کرکے مہاراشٹر کو منقسم کرنے والے دیویندر فردنویس کو اقتدار تھما دیا۔
اس سے قبل جب مرکز میں جنتا پارٹی اقتدار میں آئی تھی تو پہلی بار مہاراشٹر میں غیر کانگریسی حکومت قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں جب اٹل جی نے ۱۳ دنوں کیلئے سرکار بنائی تو مہاراشٹر میں بی جے پی اور شیوسینا کے اتحاد نے اقتدار سنبھالا۔ اٹل جی حکومت تو گر گئی مگر شیوسینا نے اپنی مدتِ کار کو

پورا کیا۔ ۱۹۹۹ء میں کانگریس کے اندر پھوٹ پڑ گئی اس کے باوجود سینا بی جے پی اتحاد اپنی کرسی بچا نہ سکا اور کانگریس کو پھر ایک بار راشٹر وادی کی مدد سے اقتدار حاصل ہوگیا۔ پارلیمانی انتخاب میں اس بار بی جے پی اور اس کی اتحادی جماعتوں کو اترپردیش اور بہار کی طرح مہاراشٹر میں بھی زبردست کامیابی نصیب ہوئی لیکن بہار واترپردیش میں سیکولر طاقتوں نے اپنی شکست سے سبق لیتے ہوئے باہمی اتحاد پیدا کرکے بی جے پی کو ناکوں چنے چبوا دیے اس کے برعکس مہاراشٹر میں پہلے سے قائم شدہ سیکولر اتحاد کو این سی پی کی ابن الوقتی نے پارہ پارہ کر دیا۔ اس ناعاقبت اندیشی پر یہ شعر صادق آتا ہے

غیروں کو کیا پڑی ہے کہ رسوا کریں مجھے
ان سازشوں میں ہاتھ کسی آشنا کا ہے

مہاراشٹر کے اندر شیوسینا ہندوتوا کی حامی جماعت ہے اور سخت گیر ہندوتوا میں یقین رکھتی ہے جو نریندر مودی کا اپنا نظریہَ حیات ہے اس کے باوجود مودی اور اس کے بغل بچہ امیت شاہ کے شیوسینا سے ناطہ توڑ لینے کی اصل وجہ نشستوں کے بٹوارے کا اختلاف نہیں تھا۔ دراصل یہ مودی جی کی ترجیحات کا مسئلہ ہے جس میں سب سے نیچے ہندوتوا کا نظریہ آتا ہے لیکن اگر اس سے پارٹی کا مفاد ٹکرائے تو پارٹی کو اس پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے ۔ مہاراشٹر میں فی الحال سینا اور بی جے پی کا اختلاف نظریاتی نہیں بلکہ جماعتی مفاد کا

ہے۔ مودی جی کے سامنے اگر ایک جانب جماعتی مفاد اور دوسری طرف ذاتی فائدہ ہو تو ذات کو جماعت پر سبقت حاصل ہو جاتی ہے ۔ اسی ذاتی وفاداری نے امیت شاہ کو بی جے پی کا صدر بنا دیا ورنہ ان کے علاوہ پارٹی میں اور بھی سینئر لوگ موجود تھے۔

ایک زمانے میں کانگریس کے صدر دیو کانت بروا نے کہا تھا انڈیا از اندرا۔ ان کے کہنے سے انڈیا تو اندرا نہیں بن سکا ہاں انڈین نیشنل کانگریس ضرور اندرا کانگریس بن گئی ۔

اب عملاً بی جے پی کا حال یہ ہے کہ وہ ایم جے پی یعنی مودی جی کی پارٹی بن کر رہ گئی ہے ۔ دراصل مودی جی پر سنگھ پریوار کے سنسکار سے زیادہ اندرا گاندھی کی مطلق العنانی اثر انداز ہوئی ہے اور اندرا جی کی طرح انہوں نے پارٹی کو بے وقعت بنا کر رکھ دیا۔ یہ تو قانونِ فطرت ہے کہ جس طرح اندرا جی کی حماقت کی قیمت فی الحال کانگریس پارٹی چکا رہی ہے اسی طرح مودی جی کی بے وقوفی بھی آگے چل کر بی جے پی کو مہنگی پڑے گی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس انتخاب میں کامیابی کے لئے سارے ممکنہ ہتھکنڈے استعمال کر لئے ۔ اس کی ابتداء گوپی ناتھ منڈے کے حادثے سے ہوئی ۔ اگر ان کی موت کا ہرین پنڈیا کی موت سے موازنہ کیا جائے تو بہت ساری مشترک باتیں نظر آتی ہیں ۔ دونوں نریندر مودی کے احمد آباد اور دہلی میں اقتدار سنبھالنے

کے بعد قریبی عرصے میں رونما ہونے والے واقعات ہیں۔ دونوں رہنما عوام میں مقبول ہونے کے سبب مودی جی کی مدد کے محتاج نہیں تھے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ منڈے کی بیٹی پریتم منڈے نے مودی کا ریکارڈ توڑتے ہوئے ۷ لاکھ کے مقابلے ۷ لاکھ ووٹ کے فرق سے کامیابی حاصل کی۔ منڈے اور پنڈیا صبح ۵ تڑکے نہایت ہی محفوظ علاقوں میں اپنی گاڑی کے اندر ہلاک ہوئے۔ پنڈیا کے بارے میں بتایا گیا کہ انہیں دہشت گردوں نے مار ڈالا جبکہ وہ مسلمانوں میں مقبول تھے اور گجرات فساد کے بارے میں مودی جی کے خلاف بیان دے چکے تھے ایسے شخص کو مسلمان بھلا کیوں ہلاک کرتے ؟ ہرین پنڈیا کی موت اس شعر کی منہ بولتی تصویر ہے کہ ۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محظر لگی ہوئی

گوپی ناتھ منڈے کا مرکزی وزیر ہونے کے باوجود بغیر سیکیورٹی کے ایک غیر بولٹ پروف کار میں ہوائی اڈے جانا بھی ایک معمہ ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک تیز رفتار انڈیکا نے ان کی گاڑی کو ٹکر ماردی۔ ان کو معمولی چوٹ آئی۔ انہوں نے ڈرائیور سے پانی مانگا لیکن جب ہسپتال لے جایا گیا تو سانس بند ہو چکی تھی۔ ایک عام آدمی کی سمجھ میں تو یہ واردات نہیں آتی لیکن سی بی آئی نے اسے حادثہ قرار دے کر فائل

بند کردی۔ دراصل گوپی ناتھ منڈے اگر زندہ ہوتے تو مہاراشٹر کے معاملات میں امیت شاہ کا عمل دخل اس طرح نہیں ہوتا۔ وہ مودی جی کو مہاراشٹر میں بے شمار جلسوں سے خطاب کرنے کی زحمت نہیں دیتے اور کامیابی کا کریڈٹ کا بھی انہیں کو ملتا لیکن ان کے ہٹ جانے سے منظر بدل گیا۔

بی جے پی نے اس بار اپنے نظریاتی حلیف شیوسینا سے پلہّ جھاڑ کر تنہا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ شیوسینا کے علاوہ جو دیگر تین حلیف جماعتیں الحاق میں شامل تھیں انہیں ساتھ لے کر شیوسینا کو بالکل تنہا کردیا گیا۔ بی جے پی نے اپنے مخالف محاذ کے اندر بھی انتشار پیدا کیا اور راشٹروادی سے بغاوت کرواکر اس کو اپنا پوشیدہ حلیف بنا لیا۔ این سی پی کے حمایت واپس لیتے ہی انتخاب تک وزیراعلیٰ کو کارگزار رکھنے کے بجائے فوراً گورنر راج نافذ کردیا۔کانگریس اور اور این سی پی پر بدعنوانی کا الزام لگاتے ہوئے ان کے ۵۰ ممبران کو اپنی پارٹی میں شامل کرکے ٹکٹ دے دیا۔ وزیراعظم نریندر مودی کو دلیّ سے گلی میں لے آئے اور ان سے ۲۷ عدد جلسہ کروائے جن میں مودی جی اپنے ہلکے پن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ عوام کو دھوکہ دینے کیلئے بالاصاحب ٹھاکرے کی دہائی دینے سے لے کر ممبئی میں مہاراشٹر کو متحد رکھنے کا نعرہ لگانا اور اس کے فوراً بعد ریاستی صدر کا ناگپور میں ودربھ کو الگ کرنے کی بات کرنا۔اسی کے ساتھ نتن گڈکری کا لوگوں کو کھلے عام ووٹ کے بدلے نوٹ لینے کی ترغیب

دینا۔ یہ تماشہ دن رات چلتا رہا۔

بی جے پی دولت کا بے شمار استعمال کرکے سب سے بڑی پارٹی ضرور بن کر ابھری لیکن اگر اس کی کامیابی کا موازنہ پانچ ماہ قبل حاصل ہونے والے لوک سبھا انتخاب سے کیا جائے تو پتہ چلتا ہے بی جے پی کے ۲۷ فیصد ووٹ میں ایک فیصد کا اضافہ ہوا اور کانگریس کے ۱۸ فیصد میں ایک فیصد کی بھی کمی نہیں ہوئی۔ بی جے پی کو ۴۸ میں سے ۲۳ نشستیں یعنی تقریباً ۵۰ فیصد کامیابی ملی تھی جو اب کی بار گھٹ کر تقریباً ۴۰ فیصد پر آگئی۔ این سی پی ۱۶ سے ۱۸ فیصد پر پہنچی یعنی اگر این سی پی اور کانگریس اتحاد نہیں ٹوٹتا تو اس کے پاس بی جے پی سے ۸ فیصد ووٹ زیادہ ہوتے اور بی جے پی کسی صورت اقتدار میں نہیں آتی۔ شیوسینا کے ووٹ کا تناسب ایک فیصد بڑھا یعنی ۱۹ سے ۲۰ پر پہنچا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سینا نریندر مودی کی محتاج نہیں ہے۔ ویسے ان جماعتوں کی آپسی جوتم پیزار نے ان کے چہرے پر پڑی سیکولرزم اور ہندوتوا کی نقاب نوچ کر پھینک دی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نقاب کشائی کے باوجود جو لوگ آنکھیں موندے بیٹھے ہیں انہیں نظر نہیں آتا کہ اس سیاسی اکھاڑے میں کوئی کسی کا دوست نہیں سب ایک دوسرے کے اور عوام کے بھی جانی دشمن ہیں۔ اسی لئے پل بھر میں برسوں کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ ایسے لوگ اس شعر کی مصداق ہیں کہ ۔

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے

لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

بھارتیہ جنتا پارٹی کی شیو سینا سے غداری تو قابلِ فہم ہے لیکن این سی پی کو کیا پڑی تھی کہ اس نے انتخاب سے قبل کانگریس سے ناطہ توڑ لیا اور نتائج کے بعد بی جے پی کی غیر مشروط حمایت کرنے میں زبردست پھرتی کا مظاہرہ کیا جبکہ سیکولرزم کے نام پر اس کو ووٹ دینے والے مسلمان ابھی اس کے امیدواروں کی کامیابی پر مٹھائی بھی تقسیم نہ کرسکے تھے۔ مسلمانوں اور سیکولر ہندوؤں کو بے وقوف بنانے کیلئے این سی پی نے بی جے پی کے ساتھ اپنی ملی بھگت کو صیغۂ راز میں رکھا لیکن اب بلی تھیلے سے باہر آچکی ہے آئندہ الیکشن میں اس کا حشر بھی راج ٹھاکرے کی طرح ہو جائیگا جس نے پچھلی بار بی جے پی کی حمایت کی اس بار نونرمان کا صفایہ ہوگیا۔ ایم این ایس کی حالیہ ناکامی کیلئے جس طرح راج ٹھاکرے ذمہ دار ہے اسی طرح راشٹروادی کی محرومی کا سہرہ کسی اور کے نہیں بلکہ خود شرد پوار کے سر بندھتا ہے۔ یہ دونوں حضرات اپنی اپنی جماعت کے بانی بھی ہیں اور دشمن بھی بقول شاعر

ہر قدم پہ ناکامی ہر قدم پہ محرومی

غالباً کوئی دشمن دوستوں میں شامل ہے

ویسے بھولے بھالے مسلمانوں کا کیا ہے اس بار وہ اتحادالمسلمین کی کامیابی

کا جشن منا رہے ہیں جیسے کبھی سماجوادی پارٹی یا مسلم لیگ کی کامیابی پر خوش ہوا کرتے تھے ۔ انتخابی سیاست کا تو یہ معاملہ اسی طرح کا ہے کہ جیسے ایک زمانے میں ہندوستان نے ورلڈ کپ جیت لیا تھا۔ شائقینِ کرکٹ نے رائے دہندگان کی مانند اس سے تفریح حاصل کی اور خوشی منائی ۔ کھلاڑیوں نے سیاستدانوں کی طرح انعام حاصل کیا اور سٹہ بازوں نے سیاسی جماعتوں پر روپیہ خرچ کرنے والے سرمایہ کاروں کی مانند اپنی تجوری بھری ۔ حق بحق دار نصیب کی مثل ہر کسی کو وہی ملا جس کا کہ وہ حقدار تھا۔

مہاراشٹر کے واقعات کو اگر جئے للیتا کی گرفتاری سے جوڑ کر دیکھا جائے تو بات قدرے واضح ہو جاتی ہے۔ فی الحال چند ایک کے علاوہ ساری سیاسی جماعتیں بدعنوان ہیں الّا ماشا اللہ۔ ایسے میں کرناٹک کے یدورپاّ کو جسے بدعنوانی کے سبب اقتدار ہٹا دیا گیا تھا پارٹی کا نائب صدر بنا دیا جائے ۔ وہ خود رکن پارلیمان ہو اور اس کا بیٹا اسمبلی میں براجمان ہو اور بنگلور کی عدالت اس سے آنکھیں موند کر جئے للیتا کو جیل بھیج دے کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟ ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ شرد پوار جیسوں کو پیغام دیا جاسکے کہ اقتدار کے باوجود تم سب جیل جاسکتے ہو ۔ اب جئے للیتا تمام بدعنوان رہنماؤں کیلئے نشانِ عبرت ہے جس کی مثال دے کر انہیں بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ ادھر انتخابات کا خاتمہ ہوا ادھر جئے للیتا کو ضمانت مل گئی اور وہ گھر آگئیں

کیا یہ سب اتفاقی واقعات ہیں؟

اس بار مہاراشٹر اور ہریانہ میں انتخابات ہوئے۔ پانی پت کا میدان ہریانہ میں واقع ہے اس کے باوجود ہریانہ کے بجائے مہاراشٹر میں اسے خوب یاد کیا گیا۔ اس لئے کہ مراٹھی زبان میں پانی پت کی تیسری جنگ کے حوالے جس قدر محاورے ہیں دنیا کی شاید ہی کسی زبان میں ہوں۔ مراٹھوں اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان ۱۷۶۱ء کے اندر لڑی جانے والی اس جنگ نے مراٹھی نفسیات پر جو اثرات مرتب کئے ہیں اس کا موازنہ مراٹھا تاریخ کے کسی اور واقعہ سے نہیں کیا جاسکتا۔ شیوسینا کے بارے میں تو بس یہی کہنا کافی ہے کہ ''شیو سینے چے پانی پت جھالے'' یعنی شیوسینا کا پانی پت ہوگیا۔ گویا پانی پت میں جو حالت احمد شاہ ابدالی نے کی تھی وہی حالت امیت شاہ گجراتی نے شیوسینا کی کردی۔ اتفاق سے دونوں فاتحین کے نام میں شاہ مشترک ہے۔ شیوسینا بی جے پی کو اپنا دوست سمجھتی تھی اوراس نے بڑے جتن سے اس کو پال پوس کر بڑا کیا تھا لیکن اب اس کے خطرناک تیور دیکھ کر ادھو ٹھاکرے کی زبان پر یہ شعر ہوگا کہ

ہٹائے تھے جو راہ سے دوستوں کی\
وہ پتھر مرے گھر میں آنے لگے ہیں

اپنے بل بوتے پر حکومت بنانے کا خواب دیکھنے والی بی جے پی سے جس کو ۱۶۵

نشستوں پر کامیابی دلا کر وزیراعظم مودی نے دیوالی کا حسین تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا پانی پت کا ایک اور محاورہ صادق آتا ہے ’’ سنکرانتی کو سلملی‘‘ یعنی ہم پر دیوالی کے بجائے اماوس کی رات چھا گئی۔ اس لئے کہ اب اقتدار میں آنے کیلئے بی جے پی کو این سی پی یا شیوسینا کے سامنے جھولی پسارنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ کانگریس نے اس بار تشہیر کی مہم نارائن رانے کے حوالے کی تھی وہ خود کڈال حلقۂ انتخاب سے ہار گئے اس لئے ان کے بارے میں کہنا پڑے گا ’’ آمچا وشواس پانی پتات گیلا‘‘ یہ ذومعنی محاورہ ہے۔ پانی پت کی جنگ میں معروف مراٹھا سپہ سالار کا نام وشواس راؤ تھا جو میدان جنگ میں کام آگیا تھا۔ اسی کے ساتھ مراٹھا فوج جنگ ہار گئی۔ چونکہ وشواس اعتماد کو بھی کہتے ہیں اس لئے اس کا ایک مطلب ہے ہماری خود اعتمادی پانی پت کی جنگ میں ختم ہو گئی۔

راشٹر وادی کیلئے ایک اور سپہ سالار دتاّجی کے الفاظ مشعلِ راہ ہیں جو اس نے مرتے وقت کہے تھے ’’بچیں گے تو اور بھی لڑیں گے‘‘۔ ایسا لگتا ہے دتاّجی کی طرح لڑنے کا موقع شرد پوار کو نہیں ملے گا ایسے میں این سی پی کے مسلمان حامیوں پر فی الحال یہ شعر صادق آتا ہے کہ

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

مہاراشٹر : شیو شاہی سے پیشوائی تک

مہاراشٹر اور ہریانہ میں کہنے کی حد تک بھارتیہ جنتا پارٹی کے وزرائے اعلیٰ کی حلف برداری ہو گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہریانہ میں جو کچھ ہوا وہ مہاراشٹر میں نہ ہو سکا۔ ہریانہ کے اندر پانچ ماہ قبل پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی کو ۹ میں سے ۷ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی تھی اس لئے امیت شاہ کو امید تھی کہ اسمبلی انتخاب میں انہیں ۹۰ میں سے ۷۰ نشستیں مل جائیں گی اس لئے انہوں نے ہریانہ وکاس کانگریس کے بشنوئی کو رسوا کرکے بھگا دیا۔ اس کے باوجود بی جے پی کو ۷۰ نہ سہی تو ۴۷ پر کامیابی مل ہی گئی ۔ یہ اور بات ہے کہ ان ۴۷ منتخبہ ارکان میں ۲۷ سابق کانگریسی ہیں۔ ہریانہ ویسے بھی اپنے ''آیا رام گیا رام'' کیلئے معروف ہے جس کا فائدہ ماضی میں کانگریس اٹھاتی رہی ہے اس بار بی جے پی اس سے مستفید ہو گئی ۔ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہفی الحال'' کانگریس مکت بھارت بن رہا ہے یا کانگریس یکت بھاجپ وجود میں آرہی ہے؟'' سچ تو یہ ہے کہ ملک میں ایک حکمراں طبقہ ہے جو حسبِ ضرورت اپنا چولہ بدلتا رہتا مگر اقتدار نہیں چھوڑتا۔

ہریانہ میں تو یہ ہوا کہ اتوار کو نتائج کا اعلان ہوا اور پیر کی شام کو

وزیر اعلیٰ منوہر لال کھٹر کا نام ساری دنیا کو معلوم ہو گیا اس کے ایک ہفتہ بعد کھٹر کی حلف برداری تک ہو گئی مگر مہاراشٹر کا نیا وزیر اعلیٰ ندارد تھا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ مہاراشٹر میں مودی جی حسب دعویٰ ۱۶۵ نشستوں پر کامیابی درج کرانے میں ناکام رہے ۔کیا وزیر اعظم ہونے کے باوجود یہ کوئی ناممکن ہدف تھا؟ اس سوال کا جواب ماضی قریب میں ہے۔ مودی کے وزیر اعظم بننے سے پانچ ماہ قبل بھی پانچ ریاستوں میں انتخابات ہوئے تھے جن میں میزورم کے علاوہ چار ریاستوں میں بی جے پی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی ۔ اس وقت منموہن وزیر اعظم اور راج ناتھ پارٹی کے صدر تھے۔ اس بار مودی جی مہاراشٹر میں وہ بھی نہ کرسکے جو چھتیس گڑھ میں رمن سنگھ نے کردیا۔مدھیہ پردیش میں شیوراج چوہان نے جوزبردست کامیابی درج کرائی اس کی بابت اگر کوئی کہتا ہے کہ وہاں پہلے سے بی جے پی کی حکومت تھی تو اس کیلئے راجستھان کی مثال موجود ہے جہاں کانگریس کی حکومت تھی اس کے باوجود اسے صرف ۲۱ نشستوں پر روک کر وجئے راجے سندھیا نے ۱۶۲ نشستیں جیت لیں ۔ مودی جی اگر اپنا خون پسینہ ایک کرنے کے بجائے ریاستی رہنماؤں کو یہ کام سونپتے تو مہاراشٹر میں بھی وہی ہوتا جو ان کے وزیر اعظم بننے سے قبل راجستھان میں ہوا تھا۔

بی جے پی مہاراشٹر میں چونکہ اکثریت سے محروم رہی اس لئے انتخاب کے بعد اقتدار کی رسہ کشی کا نیا باب کھل گیا جس میں دونوں سروں پر ہندوتواوادی تھے اور درمیان میں این سی پی اس طرح کھڑی تھی جیسے دو بلیوں کو آپس میں لڑا کر

بندر تماشہ دیکھتا ہے۔ زعفرانی جماعتیں اس طرح دست و گریبان ہوئیں کہ کانگریسی بھی شرمسار ہو گئے۔ کبھی کوئی کسی کی چوٹی پکڑتا تھا تو کبھی کوئی کسی کی چڈی کھینچتا تھا۔ اس کھینچاتانی کے چلتے شیوسینا کے گلے میں ہر روز ذلت و پشیمانی کی ایک نئی پھول مالا ڈالی جاتی تھی۔ اگر بی جے پی ابتداء میں صاف کردیتی کہ این سی پی کی حمایت اس کیلئے کافی ہے اور وہ اقلیتی حکومت سے کام چلالے گی تو شیوسینا کی یہ درگت نہیں ہوتی۔ لیکن اسے بیم و رجا کا شکار رکھا گیا تاکہ شیوسینا کی ریڑھ کی ہڈی کو بالکل اسپرنگ بنا دیا جائے اور وہ ہوا کے جھونکوں سے بھی اِدھر اُدھر ڈولنے لگے۔ سینا کی حالتِ زار پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ناخدا نے مجھے دلدل میں پھنسائے رکھا
ڈوب مرنے نہ دیا پار نکلنے نہ دیا

انتخابی نتائج کے بعد شیوسینا گو کہ اس بات سے غمگین تھی کہ دوسرے نمبر پر رہی لیکن خوش بھی تھی کہ بی جے پی واضح اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ سینا کو یقین تھا کہ اس کو اقتدار میں شراکت داری کا موقع ملے گا۔ ایک طرف آرایس ایس والوں نے شیوسینا کی امیدیں بڑھا رہے تھے اور ہندوتوادی اتحاد کی دہائی دے رہے تھے دوسری جانب اڈوانی جی نے مفاہمت کیلئے اپنی خدمات پیش کردیں وہیں پر سینا کا بیڑہ غرق ہوگیا۔ آجکل بی جے پی کے اندر اڈوانی جی کیحالت یہ

ہے کہ جس کے سر پر وہ ہاتھ رکھتے ہیں سب سے پہلے وہی سر قلم ہوتا ہے۔ انتخاب کے بعد سیناپتی ادھو راؤ نے بڑے طمطراق سے اعلان کیا تھا کہ وہ این سی پی کی مانند غیر مشروط حمایت نہیں کریں گے اگر بی جے پی ان سے حمایت مانگے گی تو اپنی شرائط پر الحاق کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کریں گے۔ ویسے بی جے پی اگر چاہے تو این سی پی کے ساتھ چلی جائے۔

ادھو ٹھاکرے کی اس گیدڑ بھبکی کا بی جے پی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے بعد سینا کے ذرائع نے کہا کہ امیت شاہ نے وزیر اعظم کی موجودگی میں ادھو ٹھاکرے سے فون پر بات کرکے مبارکباد پیش کی اور سارے معاملات مل جل کر طے کرنے کا عندیہ دیا لیکن اس خبر کے ساتھ ہی بی جے پی کی تردید بھی اخبارات کی رونق بنی جس میں اس گفتگو کا انکار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد شیوسینا نے اپنا رخ نرم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر بی جے پی مہاراشٹر کو متحد رکھنے کا وعدہ کرے تو وہ مستحکم حکومت کے قیام میں تعاون کر سکتی ہے۔ اس کے جواب میں بی جے پی کے ریاستی صدر نے اعلان کر دیا کہ ودربھ کے مخالفین سے مصالحت نہیں ہوگی۔ اس بیچ ریپبلکن پارٹی کے رہنما رام داس آٹھولے نے ادھو ٹھاکرے سے ملاقات کرنے کے بعد بتایا کیا کہ وہ الحاق کیلئے آمادہ ہیں ساتھ ہی ذرائع ابلاغ سے شیوسینا میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرنے کیلئے پارٹی میں پھوٹ کے امکانات پر بحث چھیڑ دی گئی اور مختلف شہروں کے بلدیاتی انتخابات میں شکست کی پیشن گوئی کرنے لگے۔

ادھو ٹھاکرے نے دیکھا کہ مہاراشٹر میں دال نہیں گلتی تو انہوں نے اپنے دست راست دیسائی برادران کو دہلی روانہ کردیا تاکہ وہاں پر بی جے پی مہاراشٹر کے نگراں جے پی نڈا ہی سے ملاقات ہوجائے لیکن ان دونوں کے ساتھ دہلی میں وہی اہانت آمیز سلوک ہوا جو اندراجی نے مہاراشٹر کے عظیم سپوت یشونت راؤ چوہان کے ساتھ کیا تھا۔ مودی اور شاہ تو درکنار راج ناتھ یا نڈا نے بھی ان سے ملاقات کرنے سے انکار کردیااور وہ دنوں بیرنگ لوٹ آئے۔ اگر ادھو ٹھاکرے میں ذرہّ برابر غیرت ہوتی تو وہ اسی وقت اپنے مرکزی وزیر سے استعفیٰ دلوادیتے اور این ڈی اے سے علٰحیدہ ہوجاتے لیکن اقتدار کی ہوس اچھے اچھوں کو خوار کرتی ہے۔ اس موقع پر انتخابی مہم کے دوران کی نوک جھونک یاد آتی ہے جب شیوسینا نے کہا تھا کہ زیادہ کی ہوس زوجین میں طلاق کا سبب بن سکتی ہے اس کا جواب بی جے پی نے دیا تھا نامرد کے ساتھ کب تک گزارہ ہوسکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے انتخاب کے بعد بی جے پی نے شیوسینا کی نسبندی کرکے اسے واقعی نامرد بنادیا ہے۔

اس رسوائی کے بعد ایک اور امید کا دیا روشن کردیا گیا اور یہ خبر اڑائی گئی کہ دہلی میں وزیراعظم این ڈی اے میں شامل جماعتوں کو دیوالی کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس میں شریک ہونے کیلئے ادھوراؤ دہلی جائیں گے اور سارے معاملات

ٹھیک کرکے آئیں گے لیکن اس کا دعوت نامہ بھی ادھو کو نہیں آیا۔ توجیہ یہ کی گئی کہ دعوت صرف ارکان پارلیمان کیلئے ہے اس لئے شیوسینا کے لوک سبھا ممبرس اس میں شریک ہوں گے اور ادھوراؤ گھر میں بیٹھے رہیں گئے۔ اس کے بعد جدید ہرکسن داس دواخانے کا افتتاح کرنے کیلئے مودی جی نے ممبئی کا دورہ کیا اب یہ خبر گرم ہوئی کہ اس میں ادھو اور مودی بات چیت کریں گے یا کم از کم ان کے درمیان علیک سلیک ہی ہو جائیگی لیکن وہ بھی نہ ہوسکا۔ وہاں بھی ادھو کو بلانے کی زحمت دواخانے کے مالک مکیش امبانی نے نہیں کی۔ بی جے پی ترجمان نے کہہ دیا کہ وزیراعظم سماجی کاموں کے دوران سیاسی باتیں نہیں کرتے۔

اس دوران نوبت یہاں تک پہنچی کہ بی جے پی کے ریاستی رہنماؤں نے واضح کردیا کہ وہ شیوسینا کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ وزارتوں کی بابت کوئی مفاہمت نہیں ہوگی۔ نائب وزیراعلیٰ کا عہدہ ہی نہیں رکھا جائیگا اور شیوسینا کا اسپیکر بھی نہیں بنے گا جیسا کہ کانگریس اور این سی پی کے دور میں ہوتا تھا کہ جونیر پارٹنر کو اسپیکر کا عہدہ دیا جاتا تھا۔ شیوسینا کو اس کی طاقت کے مطابق نہیں بلکہ اپنی ضرورت کے لحاظ سے دو یا زیادہ سے زیادہ پانچ وزارتیں ملیں گی۔ اس کا معنیٰ یہ ہیں کہ شیوسینا کی نشستیں بی جے پی کی نصف سے زیادہ ہیں تو ہوا کریں اس کو بی جے پی سے نصف وزارتیں نہیں بلکہ بی جے پی کو چونکہ صرف ۲۳ کی ضرورت ہے اس کے لحاظ سے سینا کی وزارتوں کا تناسب طے ہوگا

۔اس طرح گویا سیاست کے بازار کو شاہ جی بنیا نے پرچون کی دوکان بنادیا۔

شیوسینا کے ترجمان سنجے راؤت نے جب دیکھا کہ سختی سے کام نہیں چل رہا ہے تو اپنا لب و لہجہ بدل کر بولے کہ اگر ہندوستان اور پاکستان بات کر سکتے ہیں تو بی جے پی اور شیوسینا کیوں نہیں؟ لیکن وہ بھول گئے کہ جہاں بی جے پی پاکستان سے بات چیت کی قائل ہے وہیں شیوسینا اس کی مخالف ہے نیز وزیراعظم مودی پاکستانی سربراہ نواز شریف کو تو بریانی کھلا سکتے ہیں لیکن ادھو ٹھاکرے کو گھاس نہیں ڈال سکتے۔ اس کے بعد راؤت نے جذباتی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہابی جے پی کا اور ہمارا بلڈ گروپ ایک ہی ہے لیکن بی جے پی نے اس خون کے رشتے کو بھی اہمیت نہیں دی۔ بالآخر شیوسینا بھارتیہ ابلہ ناری کے سمان غیر مشروط حمایت پر راضی ہو گئی اس کے باوجود بی جے پی نے اس کی ناقدری کرتے ہوئے رسید تک بھیجنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ اب شیوسینا کیلئے صرف دو متبادل ہیں یا تو پیر کی جوتی بن کر ہندوتوا پریوار میں بیٹھی رہے یا اپنی مانگ کا سندور پونچھ کراور ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ کر گھر سے باہر نکل جائے۔ شیوسینا کی حالت مرزا غالب کے اس شعر کی مصداق ہے کہ

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

مہاراشٹر کی تاریخ چھترپتی شیواجی سے وابستہ ہے ان سے قبل مراٹھوں کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ شیواجی کی موت کے وقت ان کا پوتا شاہو جی اورنگ زیب عالمگیر کی قید میں تھا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد بہادر شاہ اول نے شاہو مہاراج کو چند شرائط کے عوض رہا کردیا اور وہ اپنے دادا کی وراثت کا حقدار بن کر اقتدار پر فائز ہوگیا۔ شیواجی کے ساتھ کایستھ اور دیشاستھ براہمن تو تھے لیکن چتپاون براہمنوں کو انہوں نے دور رکھا تھا مگر شاہو جی نے بالاجی وشوناتھ پیشوا کو اپنا وزیراعظم بنا دیا۔ شیوسینا جب بنی تو اس کا حال بھی شاہو جی جیسا تھا کہ اس کی پرورش کانگریس نے کی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں جب اسے اقتدار ملا تو بالاصاحب ٹھاکرے نے بھی جو خود کایستھ تھے ایک چتپاون براہمن منوہر جوشی کو وزیراعلیٰ بنانے کی غلطی کی اور براہمنوں کی جماعت بی جے پی پر اعتماد کیا۔ بی جے پی نے اپنے پرکھوں کی روایت کو دوہراتے ہوئے وہی کیا جو بالاجی کے بیٹے باجی راؤ نے کیا تھا کہ شیوشاہی کو پیشوائی میں بدل کر مراٹھا سلطنت پر قابض ہوگیااور شیواجی کے خاندان کو اقتدار سے بے دخل کردیا۔ اب اگرادھو ٹھاکرے اپنی تاریخ سے سبق نہیں سیکھنا چاہتے تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟

پیشوائی کا خاتمہ جس آپسی سر پھٹول کے سبب ہوا تھا اس کا مظاہرہ بی جے پی

کرنے لگی ہے۔ ہریانہ کے نظم و ضبط کا مظاہرہ مہاراشٹر کی بی جے پی نہ کرسکی بلکہ وہ مختلف راجواڑوں میں منقسم نظر آئی ۔ اول دن سے شاہ اور مودی کی جوڑی دیویندر فردنویس کے ساتھ تھے اس کے باوجود سب سے پہلے سابق ریاستی صدر سدھیر منگنٹیوار نے مرکزی وزیر نتن گڈکری کا نام پیش کرکے تنازع کھڑا کردیا۔ گڈکری کے ناگپور آمد پر ۳۰ سے زیادہ ارکانِ اسمبلی نے ان کے گھر پر جا کر اپنی طاقت و حمایت کا مظاہرہ کیا۔ نتن یہ کہتے رہے کہ وہ دہلی میں خوش ہیں لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ اگر پارٹی کہے گی تو وہ مہاراشٹر میں آسکتے ہیں ۔ اس طرح گویا انہوں نے بلاواسطہ اپنی خواہش ظاہر کردی۔ تین ارکان نے استعفیٰ دے کر اپنے حلقہ سے گڈکری کو انتخاب لڑنے کی پیشکش تک کردی ۔ یہاںتک کہ امیت شاہ کو سدھیر کے ڈانٹ لگانی پڑی لیکن بات بڑھتی چلی گئی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گڈکری اور فردنویس دونوں کا تعلق ہے ناگپور اور آر ایس ایس سے ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ان کے گھریلو تعلقات بھی ہیں ۔ دیویندر فردنویس کے والد گنگادھر فردنویس کو نتن اپنا سیاسی گرو مانتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ہی دیویندر کو سیاست میں آنے کی ترغیب دی ہے اس کے باوجود ایک بار گڈکری کے منہ سے یہ نہیں چھوٹا کہ وہ وزارت اعلیٰ کے عہدے پر دیویندر فردنویس کے حامی ہیں ۔

ناگپور میں جہاں کالی ٹوپی والے سنگھی ایک دوسرے کی پگڑی اچھال رہے تھے وہیں خاندیش میں سابق حزب اختلاف کے رہنما

ایکناتھ کھڑسے نے فرد نویس کو چیلنج کردیا اور وزیراعلیٰ کی کرسی پر اپنا دعویٰ پیش کردیا۔ ان کی حمایت میں زبردست جلوس بھی نکلا اور انتخاب سے ایک روز قبل انہوں نے اپنے باغیانہ تیور بھی دکھائے۔ اس سے گھبرا کر روڈی اور ماتھر کو ان کے گھر سمجھانے کیلئے جانا پڑا۔ اس کے باوجود کھڑسے نے ایک نجی ٹیلی ویژن چینل سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ان کا نام بھی زیر غور ہے اور ہنوز کسی کے نام پر اتفاق نہیں ہوا ہے۔

اس خلفشار کے دوران ودھان پریشد میں بی جے پی کے رہنما ونود تاوڑے نے بھی اپنا زور دکھایا ساتھ ہی پنکجا منڈے نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ بی جے پی کے مرکزی رہنماؤں کو دیویندر فرد نویس کو نامزد کرنے کیلئے بڑی محنت و مشقت کرنی پڑی۔ دیویندر فرد نویس کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ ان کی شبیہ صاف ستھری ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان پر ۲۲ مقدمات ہیں ۔ یہ بی جے پی کی بدقسمتی ہے کہ اسے مرکز میں اقتدار ملا تو ایک ایسے شخص کے ذریعہ جس کا دامن گجرات کے فساد سے داغدار ہے اور مہاراشٹر وزیراعلیٰ ملا تو ایسا کہ جس پر دنگا فساد جیسے جرائم میں ملوث ہونے کا الزام ہے۔ ویسے فرد نویس پارٹی کی سطح پر اکثریت سے محروم ضرور ہے لیکن ان کی اسمبلی میں جرائم کے الزامات میں ملوث افراد اکثریت میں یعنی ۵۷ فیصد ہے اور خود بی جے پی کے اندر ایسے لوگ ۶۰ فیصد ہیں اس لئے ان کا منتخب ہوجانا فطری لگتا ہے۔ حد تو یہ ۲۰

خواتین ارکان اسمبلی میں سے ۷ پر جرائم میں ملوث ہونے کا الزام ہے ویسے آدرش ریاست گجرات میں تو مایا کوندنانی کو سزا بھی ہو چکی ہے۔

بی جے پی نے شیوسینا سے تو انتخاب سے قبل پیچھا چھڑا لیا لیکن اس کی تین حلیف جماعتیں اب اپنا اپنا دعویٰ پیش کر رہی ہیں۔ راشٹریہ سماج پارٹی کے مہادیو جانکر اور شیوسنگرام کے ونایک میٹے نے ودھان پریشد کی رکنیت کے ساتھ کابینی درجہ کی وزارت کا مطالبہ پیش کر دیا ہے۔ ویسے ان میں سب سے زیادہ آرزومند اور طاقتور رام داس آٹھولے ہیں وہ تو مرکزی وزارت کا مطالبہ کرنے سے بھی نہیں چوکیں گے۔ بی جے پی کا منصوبہ یہ ہے کہ فی الحال اقلیتی حکومت قائم کرکے آزاد ارکان اسمبلی کی مدد سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا جائے۔ این سی پی تحریک اعتماد میں غیر حاضر رہ کر اپنی بلاواسطہ حمایت پیش کر رہی چکی ہے لیکن اس سے پہلے کہ وزارت اعلیٰ کا فیصلہ ہوتا آزاد امیدواروں نے بھی اپنے پر نکالنے شروع کردیئے اور اپنا ایک سات لوگوں کا گروہ تشکیل دے کر ایک کابینی، دو ریاستی وزارتیں نیز باقیماندہ چار حضرات کیلئے صوبائی کارپوریشنس کی سربراہی کا مطالبہ کردیا۔ روی رانا نے یہ دلچسپ انکشاف کیا ان سے کانگریسیوں نے حمایت کے عوض وزارت کا وعدہ کیا تھا جو وفا نہیں کیا گیا اس لئے اس بار وہ محتاط ہیں۔ یہ ہے ہندوستانی جمہوریت میں آزادی کہ کانگریس اقتدار میں آئے تو ہاتھ کے ساتھ اور بی جے پی اقتدار

سنبھالے کمل کے بغل میں جاکر بیٹھ جاؤ۔

اس بار مہاراشٹر کے پانچ رخی انتخابات میں راج ٹھاکرے کی ایم این ایس کا جنازہ اٹھ گیاہے۔ شرپوار کی این سی پی نے گوناگوں وجوہات کی بناء پر خودکشی کرلی ۔ اب آئندہ پانچ سالوں تک شیوسینا اور بی جے پی ایک دوسرے کی قبر کھودنے میں لگے رہیں گے ایسے میں کانگریس کیلئے سنہری موقع ہے۔ اگر وہ اپنی ساری توجہات کو رائے دہندگان کے فلاح و بہبود کی جانب مرکوز کردیتی ہے اور ودھان سبھا میں بی جے پی کے بالمقابل موثر حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی ہے تو جب عوام اس حکومت سے مایوس و بیزار ہوں گے تو لازماً کانگریس کا رخ کریں گے اس لئے کہ ان کے پاس کوئی اور متبادل نہیں ہوگا۔

کانگریس پارٹی ان مواقع کو اپنے حق میں کس حد استعمال کرپاتی ہے یہ تو وقت ہی بتائے گالیکن اگر وہ اس براہمنی پیشوائی کا سدباب کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو نہ صرف شیوشکتی کے سپہ سالار مراٹھے بلکہ بھیم شکتی کے علمبردار دلت اور میم شکتی

کے خواستگار مسلمان بھی خوش ہوں گے۔

مسجد اقصیٰ کے تناظر میں اسرائیل و امریکہ کے تعلقات

امریکی نژاد انتہا پسند یہودی ربی یہودہ گلیک یروشلم میں واقع میناشم بیگن ثقافتی مرکز سے ''یہودیو ہیکل سلیمانی کی جانب لوٹو'' کے موضوع پر منعقد ہونے والی ایک کانفرنس سے لوٹنے کیلئے اپنا سامان سمیٹ رہا تھا کہ کسی نے اس کے قریب آکر پوچھا کہ کیا اس کا نام یہودہ گلیک ہے؟ جیسے ہی گلیک نے تائید کی نوادارد نے اس پر تین گولیاں برسائیں اور موٹر سائیکل پر فرار ہوگیا۔ اس کا بہانہ بنا کر اسرائیلی حکومت نے مسجد اقصیٰ کو وقتی طور پر بند کردیا لیکن اس کا معروضی جائزہ لینے پر شک کی سوئی کو دوسری جانب موڑ جاتی ہے۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اس قدر قریب سے کئے گئے حملہ میں گلیک مرا کیوں نہیں ؟ وہ بچ کیسے گیا؟ دوسرا اہم ترین سوال یہ ہے کہ اس وقت اسرائیل کی پارلیمان کا ڈپٹی اسپیکر موشے فیگلن اس قدر موجود تھا کہ اس نے گلیک سے کیا جانے والا سوال تک سن لیا اور ٹیلی ویژن پر گواہی دی کہ یہ سوال عبرانی میں کیا گیا تھا مگر لہجہ عربی تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان عبرانی کیوں بولے؟ اور اگر کوئی فلسطینی نژاد یہودی عبرانی بولے تو اس کا لب و لہجہ عربی نہ ہوگا تو کیا امریکی ہوگا؟

ان دو شواہد کے علاوہ اہم ترین سوال یہ ہے کہ اگر موشے فیگلن اس قدر قریب تھا تو حملہ آور نے فیگلن کو کیوں بخش دیا اس لئے گلیک سے کہیں زیادہ اشتعال انگیزی موشے فیگلن کرتا رہا ہے۔غزہ حملے کے دوران وہ اپنے سفاکانہ موقف" اسرائیلی حکومت کو چاہئے کہ غزہ سے فلسطینیوں کا مکمل صفایہ کردے" کیلئے ساری دنیا کی لعنت وملامت کا نشانہ بن چکا ہے۔ فیلگن کو معروف ہونے کے سبب پہچانا بھی آسان ہے ایسے میں موشے فیگلن کو چھوڑ کر گلیک کا شکار بے معنی ہے۔ گلیک کو گولی مارنے اور زندہ چھوڑنے کے پیچھے کارفرما سازش کا اشاری گلیک کے انٹرویو سے ملتا ہے۔ حارث نامی اسرائیلی اخبار کے پوچھے جانے پر کہ حالات کب بدلیں گے تو اس نے کہا تھا جیسے ہی کسی عرب نے مسجد اقصیٰ کے قریب کسی یہودی کو نقصان پہنچایاوزیراعظم بیدار ہو جائیں گے لیکن اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی ہوگی۔فیگلن نے بھی حملے کے بعد کہا کہ مجھے اس کا صدمہ ہے حالانکہ یہ متوقع تھا۔ دہشت گردی کے خلاف حکومت کی کمزوری اورنااہلی اور ہیکل سلیمانی کو عبادت کیلئے بند کرنے کے سبب یہ قتل کی کوشش ہوئی ۔اس موقع پر اسرائیل کے وزیر تعمیرات یوری ایریل کا بیان بھی قابل توجہ جس میں اس نے کہا میں یہودہ گلیک کی مکمل صحتیابی کیلئے دعاگو ہوں۔ یہودہ پر چلائی گئی گولی نے ان تمام یہودیوں پر ہے جو اپنی مقدس ترین عبادتگاہ ہیکل سلیمانی میں عبادت کرنے کا اخلاقی اور مذہبی حق رکھتے ہیں۔ان تمام بیانات کو ملا کر دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ گلیک کو ایریل اور

فیلگن کے اشارے پر زخمی کرکے اس کے بہانے سے مسجد اقصیٰ کو بند کرنے کی سازش رچی گئی اور اس کے ردعمل کا اندازہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسرائیل کو یاد رکھنا چاہئے کہ دوسری انتفاضہ تحریک کا آغاز ایریل شیرون کی ۲۰۰۰ء میں مسجدِ اقصیٰ کی پامالی سے ہوا تھا جس کے نتیجہ میں آگے چل کر غزہ کو خودمختاری حاصل ہوئی۔

اس بار بھی یہی ہوا کہ جمعہ کے دن مغربی کنارے کے سبھی شہروں میں فلسطینیوں نے اسرائیلی حکومت کے خلاف احتجاجی جلوس نکالے اور اپنے غم وغصے کا اظہار کیا۔ حکومت کی مذمت میں نعرے لگائے۔ غزہ میں اسلامی جہاد کے ترجمان نے اعلان کیا کہ ہم اپنے جان و دل سے مسجد اقصیٰ کی حفاظت کریں گے اور جو بھی اس پر حملہ کرے گا وہ اس کی بڑی قیمت چکائے گا۔ اس مشترکہ احتجاجی جلسہ میں پی ایل او سے کہا گیا کہ وہ مغربی کنارے میں مزاحمت کو پھلنے پھولنے کا موقع دے تاکہ وہ اسرائیلی جارحیت اور دراندازی کا مقابلہ کیا جاسکے۔ پاپولر مزاحمت تحریک کے رہنما

نبیل ابوسیف نے پی ایل او سے کہا کہ وہ اسرائیل کے ساتھ خفیہ معلومات کے تبادلے کا سلسلہ منقطع کردے اور مزاحمتی گروہوں کی پشت پناہی کرے اس لئے کہ مسجدِ اقصیٰ کے تحفظ کی اس کے علاوہ کوئی اور سبیل نہیں ہے۔

مسجد اقصیٰ کو بند کرنے کے بعد اسرائیلی حکومت نے دوسری سفاکیت یہ کی کہ اسی رات ۳۲ سالہ معتاذ حجازی پر جھوٹا الزام لگا کر شہید کر دیا۔ اسرائیلی پولس ملزمین کو پکڑنے میں کس قدر مستعد ہے اس کا اندازہ ۲ جولائی کو محمد ابوخدیر کے زندہ نذرِ آتش کرنے کے واقعہ سے لگایا جاسکتا جس کی ویڈیو موجود تھی پھر بھی بین الاقوامی دباؤ کے باوجود مجرمین کو گرفتار کرنے میں اس نے کئی دن لگا دیئے۔ اس سے قبل ۱۵ مئی کو بیتونہ میں ندیم نوارہ اور محمد ابوالتاشیر کو ایک یہودی نے گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ کئی زاویوں سے اس کی ویڈیو بھی منظر عام پر آگئی اس کے باوجود چھے ماہ تک کوئی گرفتار نہ ہو سکا لیکن گلیک کا حملہ آور حیرت انگیز طریقہ پر چند گھنٹوں کے اندر ہاتھ آگیا۔ حقیقت یہ ہے حجازی ۱۱ سال اسرائیلی جیل میں گزار چکا تھا اور تین سال قبل اسے رہائی ملی تھی۔ وہ خفیہ ایجنسی کی فہرست میں تھا۔ اس موقع کا بہانہ بنا کر اسرائیلی حکومت نے بے قصور حجازی کو شہید کر دیا تاکہ فلسطینیوں کو دہشت زدہ کیا جاسکے۔ معتاذ حجازی کے جنازے میں صرف ۴۵ لوگوں کو شریک ہونے کی اجازت دی گئی اور سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے اس کے باوجود ہزاروں فلسطینی بے خوف ہو کر اپنے گھروں سے نکل آئے۔

یہودہ گلیک وشوہندو پریشد کے پروین توگاڑیہ کی طرح کا ایک بدنامِ زمانہ

یہودی راہب ہے جو اپنی اشتعال انگیزی کے سبب کئی مرتبہ گرفتار ہو چکا ہے۔ اس کی تحریک کا ہدف مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا ہے۔ وہ ٹمپل انسٹی ٹیوٹ کا بانی اور منتظم ہے جس کو حکومتِ اسرائیل کی فراخدلانہ حمایت حاصل ہے۔ ایسے کئی ادارے ہیں جو حکومت کے تعاون سے چل رہے ہیں اور اس کے ایماء پر کام کرتے ہیں ۱۹۹۶ء میں جب نتن یاہو وزیر اعظم بنا تھا اس وقت اس نے اس طرح کے دہشتگرد اداروں کی سرپرستی شروع کی تھی جو ہنوز جاری ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل نے مشرقی یروشلم پر قبضہ کیا تو بین الاقوامی اداروں کے سامنے مسجدِ اقصیٰ کے تحفظ کی یقین دہانی کی تھی اور اسرائیل کے چیف ربی نے یہودیوں کو وہاں عبادت کرنے سے منع کیا تھا لیکن آگے چل کر یہودہ گلیک جیسے لوگوں نے یہ مفروضہ گھڑا کہ مقدس ترین مندر ہیکل سلیمانی کے نیچے ہے اس لئے اس پورے علاقہ میں ایک ۵۰ میٹر اونچا کنیسہ تعمیر ہونا چاہئے جس کے اندر موجودہ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر سما جائیں جن کو اونچائی ۲۵ میٹر ہے۔

اسرائیل کی حکومت کو اپنا ناعاقبت اندیش فیصلہ بدلنے پر جن مختلف وجوہات نے مجبور کیا ان میں سے ایک اہم سبب امریکی انتظامیہ کا دباؤ بھی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں ممالک مختلف معاملات میں ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اس لئے چاہے نہ چاہے ایک دوسرے کی حمایت بھی کرتے ہیں لیکن مسجد اقصی کی بندش کو لے کر امریکی محکمہ خارجہ کے ترجمان کا ردِ عمل نہایت واضح تھا۔

امریکی حکومت نے خلاف روایت اسرائیل سے نہایت دوٹوک انداز میں مسجد اقصیٰ کو دوبارہ کھولنے کا مطالبہ کیا اور اس کی کوئی لولی لنگڑی توجیہ کرنے سے گریز کیا۔

اسرائیل کیلئے امریکی مطالبہ حکم کے درجہ میں آتا ہے اور اس کا یہ اثر نظر آیا کہ دوسرے ہی دن اسرائیلی حکومت نے مسجدِ اقصیٰ کا دروازہ وکھول دیا۔ نتن یاہو نے بھی کابینہ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے عہد کیا کہ بیت المقدس کی عبادت گاہوں میں طویل مدت سے جاری روایات کو برقرار رکھا جائے گا اور یہ مقام تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے کھلا رہے گا۔ نتن یاہو کے اس بیان نے اس کے حواریوں کو ضرور ناراض کیا مگر امریکہ کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات فی الحال اس قدر کشیدہ ہو گئے ہیں کہ نتن یاہو کیلئے یہ موقف اختیار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

امریکی انتظامیہ گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر باہمی کشیدگی کا برملا اظہار تو نہیں کرتا لیکن اندر ہی اندر جو کھچڑی پکتی ہے وہ مختلف بیانات کی شکل میں اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہے۔ مثلاً پچھلے دنوں امریکی انتظامیہ کے ایک سینئر افسر کا نتن یاہو پر تبصرہ کہ وہ مرغی کا فضلاء ہے ذرائع ابلاغ میں آگیا جو انگریزی میں ایک حقارت بھری گالی ہے۔ امریکی انتظامیہ نے اسے غیر سرکاری گردانہ توکچھ مبصرین نے اس کو اوبامہ اور نتن یاہو کے مزاج میں اختلاف پر موقوف کرکے غیر اہم قرار دینے کی کوشش کی اور کہا کہ اسرائیل اور

امریکہ ایک نا قابلِ طلاق رشتۂ ازدواج میں منسلک ہیں اور اس طرح کی نوک جھونک اس پر اثرانداز نہیں ہو سکتی لیکن یہ سب بکواس ہے فی زمانہ مفاد پرستی کی سیاست میں ایسا کوئی تعلق نہیں ہے نہ صرف منقطع کرلیا جاتا ہو بلکہ استوار بھی ہوجاتا ہو۔ امریکہ اور ایران کے بنتے بگڑتے تعلقات اس کی زندہ مثال ہیں۔

امریکہ اور اسرائیل کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجہ مشرقی یروشلم کے اندر جاری غیر قانونی جدید تعمیرات ہیں جن کے سبب محمود عباس نے جان کیری کی سربراہی میں جاری والی گفت و شنید سے منہ موڑ لیا۔ اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں میں امریکہ ہنوز اسرائیل کی ہر جارحیت کو ویٹو تو کرتا جارہا ہے لیکن دن بدن تبدیل ہونے والی سیاسی صورتحال میں اس کیلئے ایسا کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہاہے۔ ایک طرف داعش کی مخالفت اور دوسری جانب اس سے سفاک تر اسرائیل کی حمایت یہ بات اقوامِ عالم کے گلے سے اتر نہیں پارہی ہے۔ فی الحال بین الاقوامی سطح پر اسرائیل کے ساتھ ساتھ امریکہ بھی تنہا ہوتا جارہاہے ۔ آزادی اور انسانی حقوق کے حوالہ سے اس کی منافقت آئے دن بے نقاب ہوجاتی ہے۔ اسرائیل کے اندر روزافزوں تشدد اور نسل پرستی کو خود اسرائیلی صدر ریوفن ریفلن نے یروشلم کے وکلاء کی تنظیم میں تسلیم کرتے ہوئے کہاکہ ہم احمق ہیں اگر ہم ’’عرب مردہ باد‘‘ کی صدا بلند کریں۔ یہ نعرے

اب رات کی تاریکی میں ویران دیواروں پر نہیں لکھے جاتے بلکہ دن دہاڑے بلند کئے جاتے ہیں۔

اس طرح کی اشتعال انگیزی کے اثرات عالمی رائے عامہ پر پڑتے ہیں جس کا مظاہرہ اسرائیل کے وزیر تحفظ موشے یعلون کے حالیہ امریکی دورے کے وقت ہوا جبکہ اسرائیلی لابی کی ساری اٹھاپٹخ کے باوجود کسی سینئر افسر کو اس سے ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ دونوں فریقوں نے اس رسوائی کو ڈھانپنے کی حتی الامکان کوشش کیا اس کے باوجود اسرائیل کے ذرائع نے اعتراف کر ہی لیا کہ اصل نشانہ یعلون نہیں بلکہ یاہو تھا۔ نتن یاہو فی الحال دوطرفہ دباؤ کے درمیان پس رہا ہے۔ ایک طرف اسے اپنا اقتدار بچانا ہے تاکہ حامی جماعتیں ناراض ہو کر حکومت گرانہ دیں اور دوسری جانب اپنے آقا و مالک امریکہ بہادر کو خوش رکھنا ہے۔ نتن یاہو کی مجبوری کا ادراک کرنے کیلئے اسرائیل کی داخلی سیاسی صورتحال کو سمجھنا ضروری ہے۔ اسرائیل کے اندر متناسب نمائندگی کا اصول نافذ ہے اس کے چلتے گزشتہ سال انتخاب میں نتن یاہو کی لکڈ پارٹی کے ۱۲۰ میں سے صرف ۲۰ نمائندے پارلیمان میں جاسکے۔ یاہو کے دائیں بازو والے صہیونی الحاق کے پاس کل ۶۱ نمائندے ہیں ۔اس کی حکومت ۱۲۰ اپنے تو ۴۱ غیر جماعتی کٹر فسطائی گروہوں کی حمایت پر ٹکی ہوئی ہے ۔ وہ انتہا پسند جماعتیں بیک وقت اقتدار کا فائدہ بھی اٹھاتی ہیں اور وزیر اعظم کو

کمزوری کا طعنہ بھی دیتی ہیں۔ حسب ضرورت اپنے سخت گیر رائے دہندگان کو ہمنوا بنائے رکھنے کیلئے حکومت گرانے کی دھمکی دینے سے بھی باز نہیں آتیں۔ ایسے میں نتن یاہو کبھی غزہ سے جنگ تو کبھی ہیکل سلیمانی کی کہانی چھیڑ دیتا ہے جس سے بشمول امریکہ دنیا بھر کی رائے عامہ اس کے خلاف ہو جاتی ہے۔

نتن یاہو کو اسی مشکل نے دنیا کا کمزور ترین رہنما بنا دیا ہے۔ اس لئے کہ اسے آئے دن کسی نہ کسی کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت کا مظاہرہ حال میں اس وقت ہوا جب اس نے امریکہ اور یورپ کے دباو میں آکر مشرقی یروشلم میں تعمیرات کا کام موقوف کر دیا۔ اسرائیل کے سابق ڈپٹی وزیر خارجہ ڈینی اعلون نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے اس رجحان کو خطرناک قرار دیا۔ اعلون کے مطابق جب ان تعلقات کی خرابی بہت زیادہ بڑھ جائیگی تو اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوں گے اس لئے کہ اس سے امریکی رائے عامہ اسرائیل کے خلاف ہو جائیگی۔ اس میں شک نہیں کہ امریکی حکمرانوں کے نزدیک اپنے عوام کی رائے اسرائیل سے تعلقات کی بہ نسبت زیادہ اہم ہیں۔ اس لئے کہ جمہوری نظام میں اقتدار کا دارومدار رائے عامہ پر ہوتا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک پر امریکہ سے تعلقات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا لیکن اسرائیل کیلئے جو امریکہ کے ٹکڑوں پر پلتا ہے اور اس کی مدد سے جیتا ہے امریکی تعلقات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسکی خرابی اسرائیل جیسی طفیلی ریاست کی کمر توڑ سکتی ہے۔

رائے عامہ کے بناؤ اور بگاڑ کا انحصار بہت حد تک ذرائع ابلاغ پر ہوتا ہے اور چونکہ امریکی میڈیا میں یہودیوں کا اثرورسوخ بہت زیادہ ہے اس لئے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا لیکن امریکی ذرائع ابلاغ کا معاملہ بھی اردو میڈیا جیسا ہے کہ بی جے پی کے خلاف وہ امت کیلئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے رہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ملت کی داخلی کمزوریوں پر خوب مواخذہ بھی کرتے ہیں۔ امریکی میڈیا فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل کی بھرپور حمایت کرتا ہے مگر اسرائیل کی داخلی کمزوریوں پر بھی دل کھول کر گفتگو کرتا ہے۔بدقسمتی امریکی ذرائع ابلاغ قومی میڈیا بھی ہے اسے سے صرف یہودی نہیں بلکہ عام لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ اردو کے ساتھ یہ نہیں ہوتا اس لئے اندر کی بات اندر ہی رہ جاتی مگر امریکہ میں یہ ہانڈی بیچ چوراہے پر جاکر پھوٹ جاتی ہے۔ اسرائیل کے بارے میں جاننے کیلئے عبرانی اخبارات کا مطالعہ ضروری نہیں ہوتا سب کچھ انگریزی میں مل جاتا ہے۔

اخبار گارجین کے اندر اسرائیل کے حالیہ صدارتی انتخاب پر تبصرہ اس حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے ۔گارجین نے اسے اب تک کی سب خراب صدارتی مہم قرار دیا۔ ویسے تو اسرائیل میں صدارت کا عہدہ ہاتھی کے دانت کی مانند آرائش وزیبائش کی چیز ہے۔ اس کے باوجود چار لوگ اس کیلئے میدان میں کود پڑے۔ ان میں سے

ایک سلوان شالوم پر جنسی تشدد کا الزام لگایا گیا جس کے بعد اس نے اپنا نام واپس لے لیا۔ اس کے بعد معروف لیبر رہنما بن یامین پر معاشی بدعنوانی کا الزام لگا اور وہ بھی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان واقعات سے اسرائیلی سیاست میں اخلاقی انحطاط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ حزب اقتدار لکڈ کے رہنما ریوفن ریفلن کو بدنام کرنے والی ایک ویڈیو بھی ارکان پارلیمان کے درمیان گردش کرنے لگی۔ اس بابت تلخ ترین انکشاف یہ ہوا کہ خود وزیر اعظم یاہو اپنی جماعت کے امیدوار کی مخالفت کررہا تھا۔

نتن یاہو کی مخالفت اس وقت اپنے بام عروج پر پہنچ گئی جبکہ اس نے امریکہ میں مقیم نوبل انعام یافتہ ایلی وائزل پر انتخاب لڑنے کیلئے دباو ڈالنا شروع کیا۔ نتن یاہو اس اندھی مخالفت میں یہ بھی بھول گیا کہ ایلی اسرائیل کا شہری نہیں ہے اس لئے صدارتی انتخاب لڑنے کا اہل قرار نہیں پاتا۔ ویسے ایلی اگر دلچسپی لیتے تو ممکن یاہو شہریت بھی بحال کردیتا لیکن اس کے برعکس انہوں نے معذرت چاہ لی۔ اس کے باوجود یاہو باز نہیں آیا بلکہ اپنے مشترک دوستوں کے ذریعہ دباؤ ڈالتا رہا۔ ان میں سے ایک نے ایلی سے کہا جنت میں بیٹھا تمہارا باپ تمہیں اسرائیل کا صدر بنتا دیکھ کر کس قدر خوش ہوگا۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ تم پر فخر کرے۔ اس کے باوجود ایلی نے یہ پیش کش ٹھکرادی اور کہا میں کتابیں لکھتا ہوں اور یہ کام میرے مزاج کے مطابق نہیں

ہے۔ ایلی کے اس جواب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے امریکہ کے یہودی دانشوروں کے نزدیک اسرائیل کے اولین شہری ہونے کا اعزاز کس قدر غیر اہم اور بے وقعت ہے؟

ان واقعات کی روشنی میں مقبوضہ فلسطین کی اسلامی تحریک کے سربراہ الشیخ رائد صلاح کی ترکی کے ثقافی دارلخلافہ استنبول میں کی جانے والا حالیہ خطاب یاد آتا ہے۔ انھوں نے فرمایا' ہر گزرتے سال کے ساتھ اسرائیل کی عمر کم ہوتی جا رہی ہے۔ قابض اسرائیلیوں کے مسجد اقصیٰ پر حملہ امت مسلمہ کے لئے چیلنج ہے اور امت مسلمہ اس پر خاموش نہیں رہے گی۔ قبلہ اول پر ۶۴ سالہ تسلط کے باوجود اسرائیل ایک ظالم اور باطل مملکت ہے جو تیزی سے اپنی شناخت کھو رہی ہے۔ الشیخ رائد صلاح نے اس موقع پر عثمانی دور کے ترانہ بجانے والے بینڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ فتح استنبول کا ترانہ ہمارے لہو گرما گیا ہے۔ اب آپ القدس کی فتح کا ترانہ گانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ شیخ رائد کے ایمان افروز اور حوصلہ افزا بیان نے ساری دنیا کے مسلمانوں کے دل میں امید کا ایک چراغ روشن کردیا ہے۔ جس کا نور ظلم و جور کی تاریکی کو نگل جائیگا اور اس کے بطن سے فلسطین آزادی و خودمختاری کی مبارک صبح نمودار ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

ہند اسرائیل تعلقات: مشترک نظریہ مماثل رویہ

افراد اور اجتماعیت (تنظیم و تحریک یا ملک و قوم) کے حرکات و سکنات کا حقیقی محرک اس کی ضرورت یا خصلت کے مطابق ہوتے ہیں۔ عام طور پر ضرورت وقتی ہوتی ہے اور خارجی عوامل کے سبب عالم وجود میں آتی ہے۔ اس کے برعکس دائمی خصلت کا منبع و مرجع داخلی فطرت میں پنہاں ہے۔ انسانی سماج میں رونما ہونے والے واقعات کا معروضی جائزہ اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ اس کے پسِ پشت کارفرما ضرورت و مصلحت کا پتہ لگایا جائے۔ لیکن یہی ایک پہلو کافی و شافی نہیں ہے بلکہ اس واقعہ میں ملوث افراد و اجتماعیت کی خصلت وفطرت کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ اس ماہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایک تجویز پیش ہوگی جس میں ۲۰۱۶؁ تک فلسطینی حدود سے اسرائیلی فوج کے مکمل انخلاء کا مطالبہ کیا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ صہیونی انتہا پسند حواس باختہ ہوکر مسجدِ اقصیٰ کو نشانہ بنانے لگے ہیں۔

جمعرات ۳۰ اکتوبر کو اسرائیل کی غاصب حکومت نے ایک انتہا پسند یہودی ربی یہودہ گلیک پر حملے کا بہانہ بنا کر مسجد اقصیٰ کو دن بھر کیلئے بند کردیا ۱۹۶۷؁ کے بعد پہلی مرتبہ کئے گئے اسرائیل کے اس ظالمانہ اقدام کو اعتدال پسند فلسطینی رہنما محمود عباس نے بھی اعلان جنگ قرار دیا۔ دوسرے دن مسجد

کو کھول دیا گیا اور مسلمانوں نے اپنی روز مرہ کی عبادات کا آغاز کر دیا لیکن اسرائیلی اشتعال انگیزی بند نہیں ہوئی۔ اتوار کے دن اسرائیلی پارلیمان کے ڈپٹی اسپیکر فیگلن مسجد اقصیٰ کے احاطے میں پہنچ گیا اس کے بعد شولی معلم نے اس کی اقتداء کی اور دوسرے دن زپی ہوٹو فیلی نے بھی بیت المقدس کا رخ کیا۔ اسرائیلی سیاستدانوں کی ان حرکات کی مذمت اسرائیل کے نہایت سخت گیر وزیر خارجہ افوگڈور لائیبر مین نے بھی کی اور اسے غیر دانشمندانہ قرار دیا۔ لائیبر مین نے کہا کہ یہ سستی اور آسان شہرت کیلئے کی جانے والی نازیبا حرکت اور پیچیدہ سیاسی صورتحال کا استحصال ہے۔ لیبر مین نے اعتراف کیا کہ کشیدگی میں اضافہ سے کچھ بھی ہاتھ نہ آئیگا۔ لیبر مین نے مسجد اقصیٰ کو وہ سرخ لکیر بتایا جسے کسی صورت عبور نہیں کرنا چاہئے نیز واضح کیا کہ اس کی اپنی جماعت اس ہنگامے سے دور ہے اور انتہا پسند عناصر سماج میں آگ لگا کر اس پر اپنی سیاسی روٹیاں سینک رہے ہیں۔

اردن کے شاہ عبداللہ ثانی مسجدِ اقصیٰ کے متولی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں طے شدہ معاہدے کی رو سے یہودیوں کو مسجد اقصیٰ کے کمپاؤنڈ میں داخلے کی اجازت تو ہے لیکن عبادت کا حق نہیں ہے۔ پہلے چار یا پانچ یہودی زائرین ادھر کا رخ کرتے تھے لیکن حال میں یہودی زائرین (جو عبادت نہیں کرتے) کی یومیہ تعداد پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ ۵ نومبر کو ۳۰۰ حفاظتی دستوں کی معیت میں انتہا پسند

یہودیوں کے ایک گروہ مسجدِ اقصیٰ کے اندر عبادت کیلئے داخل ہوگیا۔ پولس نے اس کو روکنے کے بجائے عبادت گزار مسلمانوں پر پلاسٹک کی گولیاں برسائیں ۔ آنسو گیس کے گولے چھوڑے اور مسجد کا تقدس پامال کیا۔ اس واقعہ کے بعد اردن نے تل ابیب سے اپنا سفیر واپس بلالیا اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں باضابطہ شکایت دائر کرنے کا اعلان کردیا۔ اس سے گھبرا کر اسرائیلی وزیر اعظم نے اردن کے شاہ عبداللہ کو فون کرکے یقین دلایا کہ وہ مسجد اقصیٰ کا تقدس بحال رکھیں گے ۔

مغربی کنارے کے اندر فلسطینی نوجوانوں نے اس ظلم کے خلاف شدید غم و غصہ کا اظہار کیا۔ ہیبرون میں اسرائیلی فوجیوں پر ایک ٹرک چڑھا دیا گیا جس سے چودہ فوجی زخمی اور ایک ہلاک ہوا۔ اس واقعہ کے بعد ٹرک ڈرائیور کو پولس نے شہید کردیا۔ اس کے علاوہ ایک فلسطینی نوجوان نے ٹرین کیلئے انتظار کرنے والے ایک ہجوم پر منی وین چڑھا دی جس میں تیرہ مسافر زخمی ہوئے اور دو ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد تل ابیب میں ایک عورت اور فوجی کو قتل کردیا گیا۔ اس ردعمل سے ہیبت زدہ سفاک اسرائیلی پارلیمان نے گاڑی پر پتھر مارنے والوں کیلئے ۲۰ سال کی مضحکہ خیز سزا تجویز کردی ہے لیکن مظاہرین پر طاقت کے استعمال کی حکمت عملی اس بار پوری طرح ناکام ہو گئی۔ صہیونی انٹیلی جنس کے مطابقان پر تشدد مظاہروں کے پس پردہ معاشی پس ماندگی ، ابو خضیر نامی بے قصور نوجوان کا اغواء اور

شہادت جیسے عوامل کارفرما ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ منظم ریاستی دہشت گردی، مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور فلسطینیوں کی املاک پر غیر قانونی اور ناجائز قبضہ وہ بنیادی اسباب ہیں جنھوں نے فلسطینی عوام کو صہیونی ریاست کے خلاف مشتعل کر رکھا ہے۔ اسرائیلی خفیہ ادارے تسلیم کرتے ہیں کہ بیت المقدس میں برپا شورش کا حل قانونی و انتظامی نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ انتظامیہ کی اس تنبیہ کے باوجود اسرائیلی وزیر تعمیراتی وریایریلکا کہنا ہے کہ چھوٹے موٹے کنیسہ تعمیر ہوچکے اب ہمیں مسجدِ اقصیٰ کے پاس عظیم ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا ہے۔ اس طرح کے اشتعال انگیز بیانات پر لگام لگائے بغیر تشدد کی لہر پر قابو پانا ناممکن ہے۔

اسرائیلی حکومت میں شامل زیفولون اورلیف کے خیال میں عظیم کنیسہ کی تعمیر کے جواب میں کروڑوں مسلمان اسرائیل کے خلاف عالمی جنگ کا چھیڑ دیں گے۔ ان خطرات کے باوجود اسرائیلی سیاستدانوں کی ناعاقبت اندیشیکو ہندی مسلمان بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ جس طرح ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا اعزاز حاصل ہے اسی طرح اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کی واحد جمہوریت ہونے پر ناز ہے۔ دونوں ممالک میں باقاعدگی کے ساتھ انتخابات کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس لئے ہر دو مقامات پر سیاستدانوں کی ضرورتیں یکساں ہیں۔ سیاسی جماعتوں کی ہیئتیں بھی یکسانیت ہے۔ دونوں ممالک میں دائیں بازو کی

فسطائی لکڈ اور بیچ پیکہ حکومت ہے۔ بائیں بازو کی جماعت لیبر ہر دو جگہ بے وزن ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سے قبل برسراقتدار قدیمہ پارٹی کا حال تو کانگریس سے بھی برا ہے کہ فی الحال اسرائیلی پارلیمان میں اس کے صرف دو ارکان ہیں۔

اسرائیل اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ سیاسی جماعتوں کا رویہ بھی یکساں ہے۔ تمام تر نظریاتی و سیاسی اختلافات کے باوجود عملاً ساری بڑی سیاسی جماعتیں مسلمانوں کی دشمن یا بے مصرف دوست ہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ لگانے کیلئے لیبر پارٹی کے رہنما اسحاق ہرزوگ کا غزہ جنگ کے دوران دیا گیا بیان ملاحظہ فرمائیں۔ ہرزوگ نے جنگ کے بعد نئے انتخابات کا مطالبہ کیا جس کی حیثیت استصواب کی ہوتا کہ فلسطینی اتھارٹی سے گفت و شنید پر عوام کا عندیہ معلوم کیا جاسکے۔ اس کے مطابق محمود عباس سے گفتگو اسرائیل کی ناگزیر ضرورت ہے۔ حزب اختلاف کے رہنما نے الزام لگایا کہ نتن یاہو کی حکومت ہر محاذ پر ناکام ہو چکی ہے۔ اس کے مطابق اسرائیل معاشی تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے اور امن گفتگو تعطل کا شکار ہے۔ ہرزوگ کے مطابق نتن یاہو نے عباس سے قطع تعلق کرکے حماس کی بلاواسطہ مدد کی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں اسرائیلی عوام کو اعتماد بامل کرنا چاہئے ہم اس طرح کی حالت میں ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔ ہرزوگ نے اعتراف کیا تھا کہ ہم لاکھوں فلسطینیوں کو پریشر کوکر میں نہیں رکھ سکتے۔ جو لوگ یہ نہیں چاہتے کہ مغربی کنارہ بھی خدانخواستہ غزہ بن جائے تو

انہیں ہمت سے کام لے کر امن بات چیت کا آغاز کرنا چاہئے۔

اسحٰق ہرزوگ نے آگے چل کر کانگریسی منافقت کا بھی مظاہرہ کردیا اور کہا ہمیں حماس پر اس طرح سے چوٹ کرنی چاہئے گویا کوئی امن گفتگو نہیں ہو رہی ہے اور عباس سے اس طرح گفتگو ہونی چاہئے گویا حماس پر کوئی حملہ نہیں ہو رہا ہے۔ بائیں بازو کا یہ احمق رہنما نہیں جانتا تھا کہ جنگ کے فوراً بعد عباس اور حماس متحد ہو جائیں گے اور مذکورہ حکمت عملی خاک میں مل جائیگی۔ ہندوستان و اسرائیل کی سیاسی جماعتیں اکثریت کو ناراض کرکے اپنا سیاسی نقصان نہیں کرنا چاہتیں یہی ان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ لہٰذا اور قدیمہ فلسطینیوں پر مظالم کا ویسا ہی سیاسی استعمال کرتی ہیں جیسے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا کیا جاتا ہے نیز ان دونوں جماعتوں کیلئے مسجد اقصیٰ کی وہی حیثیت ہے جو ہندوستان میں بی جے پی اور کانگریس کیلئے بابری مسجد کی ہے۔ اس لئے جس طرح انتخابات کے آتے ہی ہندوستان میں فسادات ہونے لگتے ہیں یا مندر وہیں بنائیں گے کا شور بلند ہوتا ہے اسی طرح اسرائیل میں یا تو جنگ چھڑ جاتی ہے یا ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کا شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جمہوری نظام میں یہ انتخابی لوازمات ہیں۔

مغرب کا جمہوری دیو استبداد دونوں ممالک پر مسلط ہے اس لئے دونوں مقامات پر

کمزوروں کو نشانہ بنا کرطاقتور اکثریت کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔ عوام کا جذباتی استحصال کرکے سیاسی دوکان چمکائی جاتی ہے۔ سنگھ پریوار نے اسی لئے رام مندر کا مسئلہ چھیڑ کر اسے ۱۹۱۹ تک مؤخر کردیا ہے تاکہ حسب ضرورت اس کا انتخابی فائدہ اٹھایا جاسکے ۔ اگر ترقی و خوشحالی کا نعرہ اس وقت نہ چل پائے تو مندر وہیں بنائیں گے کی گوہار لگادی جائے۔ جمہوری نظام میں یہ صرف ہندو یا یہودی ہی نہیں کرتے بلکہ عیسائی ہٹلر نے بھی انتخابی کامیابی کی خاطر یہودیوں کو تہہ تیغ کیا تھا جارج بش نے اسی مقصد کیلئے عراق پر حملہ کردیا تھا۔ برما کے بودھ اسی لئے مسلمانوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں ۔اندرا گاندھی نے سیاسی مفاد کے پیش نظر سکھوں کے خلاف یہی حربہ استعمال کیا تھا۔ ایک زمانے تک جنوبی افریقہ میں عیسائی و قبائلی مذہب کے ماننے والے سیاہ فام عوام کے ساتھ وہاں کی ہم مذہب جمہوری حکومت نے یہی رویہ اختیار کررکھا تھا۔ اس طرح گویا جمہوی نظام میں تمام ہی مذاہب کے ماننے والے مختلف مواقع پر معتوب ہوتے رہے ہیں۔

بنگلہ دیش میں بھییہی صورتحال ہے۔ شیخ حسینہ واجد نے عوام کی توجہات کو اپنی ناکامی سے ہٹانے کی خاطر قوم پرستی کی مصنوعی آگ بھڑکا رکھی ہے اور جمہوری تندور میں اپنی سیاسی روٹیاں سینک رہی ہے۔ چونکہ وہ سارے مسلمانوں کے خلاف محاذ نہیں کھول سکتیں اس لئے جماعت اسلامی بنگلہ دیش کو الگ کرکے انتخاب

کی آگ میں جھونک دیا گیا ہے۔ اسلامی تحریک کے بے قصور رہنماؤں کو یکے بعد دیگرے تختۂ دار پر پہنچایا جا رہا ہے۔ گزشتہ انتخاب سے قبل حسینہ نے جماعت کے رہنما عبدالقادر ملا کو عین انتخابات سے قبل شہید کر دیا۔ جماعت پر پابندی لگا دی اور بی این پی کے بائیکاٹ کا فائدہ اٹھا کر اقتدار پر پھر سے قابض ہو گئیں۔ اب بی این پی کے انتخابات کی خاطر راضی ہونے پر انتخاب کا ماحول بنا تو پروفیسر غلام اعظم رحلت فرما گئے۔ ان کے جنازے میں عوام کا جم غفیر دیکھ کر حسینہ واجد کے ہوش اڑ گئے اس لئے کہ وہ تو اس خمار میں تھی کہ شہید عبدالقادر ملا کی پھانسی کے بعد یہ تحریک بکھر چکی ہوگی۔ اس کے رد عمل میں پھر ایک بار نام نہاد جنگی جرائم کا ٹریبونل حرکت میں آگیا اور اس نے دھڑا دھڑ پھانسی سنانی شروع کر دی۔ حسینہ واجد جس آگ سے کھیل رہی ہے اس کے نتائج اس وقت نظر آئیں گے جب نارِ جہنم کی لپٹیں آسمان کو چھو رہی ہونگی اور دنیا کا اقتدار دوزخ کی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا ہوگا۔

ہندوستان، بنگلہ دیش اور اسرائیل بظاہر مذہبی و تہذیبی اعتبار سے مختلف ممالک ہیں لیکن ان تینوں کے درمیان جمہوریت کی مغربی اقدار مشترک ہیں۔ اہل مغرب نے اپنی جمہوریت کے حوالے سے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ عصرِ حاضر میں آزادی اور رواداری کا واحد علمبردار یہی نظام سیاست ہے۔ جہاں تک رواداری کا سوال ہے یوروپ میں آزادی کے سب سے بڑے علمبردار فرانس کے اندر ایک مسلم

عورت کو اپنے پسند کا لباس زیب تن کر کے سڑک پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ غیروں کی مرضی کے مطابق کپڑے پہن کر باہر آئے۔ طالبات سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اسکارف نہیں چھوڑ سکتیں تو تعلیم چھوڑ دیں حالانکہ یہ تو خالص نجی معاملہ ہے۔ یہ تو ایک مثال ہے ہندوستان اور امریکہ جیسے جمہوری ممالک میں اس طرح کے واقعات کا شمار ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے فوجی آمروں اور شہنشاہوں کو جمہوری ممالک کی پشت پناہی حاصل ہے۔ وہ ان کی دامِ درہم سخن قدم معاونت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی عوام کے ذریعہ منتخب کردہ جائز حکومت کا تختہ الٹ کر زبردستی عوام پر مسلط ہو جائے تب بھی اسے گلے لگالیا جاتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال مصر ہے۔ یہ لوگ انتخابات میں کامیابی کے بعد حماس کی اکثریتی حکومت کو تسلیم کرنے کے بجائے فتح کو اقلیتی حکومت کرنے پت اکساتے ہیں اور اس کی پذیرائی کرتے ہیں۔

جمہوریت کے حق میں افہام و تفہیم اور رائے مشورے کا بھی بڑا چرچا ہے۔ انتخاب کی حد تک اس کی کسی حد تک پاسداری کی جاتی ہے مگر انتخابی مہم کے دوران عوام کی رائے کو متاثر کرنے کیلئے جو اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں اس کون سبھی جانتے ہیں۔ انتخاب سے قبل سرمایہ داروں کی پشت پناہی حاصل کرنے میں جو لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں وہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عوام پر

چھاجاتے ہیں ۔ انتخابات کے بعد عوام سے کئے گئے اکثر و بیشتر وعدوں کو بھلا کر سرمایہ داروں کو استحصال کا بھرپور موقع فراہم کیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد سیاستداں اور سرمایہ کار ایک دوسرے کے تعاون سے قومی خزانے پر اپنا ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ عوام کی فلاح بہبود کی قسمیں کھانے والے دفاعی سودوں میں مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کاروبار میں بدعنوانی پر قومی سلامتی کی چادر پڑی ہوتی ہے۔ کوئی اسلحہ بیچ کر تو کوئی خرید کر دولت بٹورتا ہے اس کاروبار میں دونوں جانب جمہوریت کے علمبردار ہوتے ہیں کوئی اسلحہ فروخت کرنے کیلئے دھماکے کرواتا ہے تو کوئی خریدنے کی خاطر امن وآشتی کا دشمن بن جاتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ایک طرف عوام کی فلاح بہبود کی خاطر غیر ملکیوں کے آگے جھولی پھیلائی جاتی ہے وہیں سرکاری خزانے سے اسّی ہزار کروڑ کی خطیر رقم دفاعی اخراجات پر خرچ کرنے کا فیصلہ یکلخت کرلیا جاتا ہے۔ ان سودوں کو حتمی شکل دینے کی خاطر وزیر اعظم امریکہ پہنچ جاتے ہیں اور وزیر داخلہ اسرائیل جاکر دیوار گریہ پر اپنا ماتھا ٹیک آتے ہیں ۔ ان تینوں ممالک میں ایسا کون ہے جو جمہوریت کا علمبردار نہیں ہے؟ اور کس رہنما کا دامن خونِ ناحق سے داغدار نہیں ہے؟

اپنے غریب عوام کا پیٹ کاٹ کر اسلحہ خریدنے اور بیچنے والے یہ موت کے سوداگر عدل وانصاف کی خاطر اٹھنے والوں کو دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔ ایسے

رہنماؤں اور ایسی حکومتوں سے سابق فلسطینی وزیراعظم اسماعیل ہنیہ سوال کرتے ہیں کہ کیابیت المقدس اور اہالیان بیت المقدس کے خلاف صہیونی ریاست کے جرائم دہشت گردی نہیں ہے؟ کیا ہمارے وطن کی سرزمین پر قبضہ دہشت گردی نہیں ہے؟ مقدس مقامات کی بے حرمتی کیا دہشت گردی نہیں؟ کیا مسجد اقصیٰ کی بندش اور اس پر انتہا پسندوں کی یلغار دہشت گردی نہیں ہے؟ ان سولات کے بعد اسماعیل ہنیہ نے وہ بنیادی سوال اٹھایا جس کا جواب دینے سے مغرب گھبراتا ہے۔ کیا صرف فلسطینی دہشت گرد ہیں جو اپنے دفاع کے لیے بندوق اٹھانے پر مجبور ہیں؟ اور اس کے بعد انہوں نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا جب تک ارض فلسطین پر صہیونیوں کا ناجائز قبضہ برقرار ہے تب تک اسرائیل کو کسی قسم کا تحفظ حاصل نہیں ہوگا۔ آخری فلسطینی پناہ گزین کی وطن واپسی اور آباد کاری تک صہیونیوں کے خلاف جدو جہد جاری رہے گی۔ حماس رہماف نے عرب ممالک، عالم اسلام اور بین الاقوامی برداری پر زور دیا کہ وہ بیت المقدس کے دفاع اور فلسطین کی آزادی کے لیے ایک مربوط اور مبسوط حکمت عملی وضع کرکے عملی اقدامات کرے۔ محض مذمتی بیانات سے فلسطین آزاد نہیں ہوسکتا اور نہ ہی قبلہ اول کو یہودیوں کی ریشہ دوانیوں سے بچایا جاسکتا ہے۔ ایسے میں یوروپین یونین کے خارجہ شعبہ کی نئی سربراہ محترمہ فیدریکا مورغینی کا غزہ میں کیا جانے والا اعلان نہایت خوش آئند ہے جس میں انہوں نے کہا ہم ابھی اور اسی وقت بلاتاخیر فلسطینی آزادی کا خواہاں ہیں۔ مورغینی کے بیان کے بعد یہ قیاس

آرائی تیز ہو گئی ہے کہ یوروپ کے سارے ممالک سویڈن کی مانند فلسطین کو تسلیم کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ مجاہدانہ مزاحمت اور عالمی حمایت سے ان شاء اللہ جلد ہی اسرائیل کی بیخ کنی ہو جائے گی اور بالآخر آزادئ فلسطین کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائیگا۔

سیاسی بے وزنی کا احساسِ زیاں

قومی انتخاب کے بعد سے ذرائع ابلاغ میں مسلمانوں کی سیاسی بے وزنی کو لے کر صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ اس کی تائید میں مسلمانوں کے ارکان پارلیمان یا اسمبلی کی مختصر تعداد کا بکھان کیا جاتا ہے۔ دانشور حضرات خاص طور پر بی جے پی کی حکومت والی ریاستوں میں مسلم وزیروں کی تعداد کو لے کر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ ایسے میں جبکہ کانگریس یا ان علاقائی جماعتوں کی صوبائی حکومتوں میں جو مسلمانوں کے ووٹ سے انتخاب میں کامیاب ہوئی ہیں مسلم وزراء بے دست وپا ہیں اگر بی جے پی کسی نجمہ یا کسی نقوی کو وزیر بنا بھی دے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے مسلمان اس بات پر احتجاج کریں کہ ہندو احیاء پرست مسلم نوجوانوں کو نوراتری کے تہوار میں شرکت سے کیوں منع کرتے ہیں۔ یہ ملت کے کرنے کا کام تھا کہ وہ اپنے نوجوانوں کو اس مشرکانہ فعل سے روکتے لیکن جب ہم ناکام ہو گئے تو ہمارے دشمنوں نے یہ کر دیا۔ اس کیلئے ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ بی جے پی کی حکومت میں مسلمان وزیر کے موجود نہ ہونے پر ہمیں افسوس کرنے کے بجائے خوش ہونا چاہئے اس لئے کہ یہ باعث خیر ہے۔ کم از کم کم از کم ملت کا کوئی فرد امت کی بیخ کنی میں براہِ راست ڈھٹائی کے ساتھ ملوث نہیں ہے۔

نام نہاد سیاسی بے وزنی پر بلاوجہ جذباتیت کا شکار ہونے کے بجائے معروضی انداز میں اس بنیادی سوال پر غور ہونا چاہئے کہ آخر یہ کیا بلا ہے؟ اس سلسلہ میں چند ثانوی نوعیت کے سوالات بھی جنم لیتے ہیں مثلاً کیا یہ افتاد صرف مسلمانوں پرآن پڑی ہے؟ یا دیگر لوگ بھی اس کا شکار ہوے ہیں؟ کیا ایسا پہلی بار ہوا ہے یا پہلے بھی ایسی صورتحال پیدا ہو چکی ہے؟ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بے وزنی کے کیا نتائج مرتب ہو سکتے ہیں؟ یعنی اس سے کون سی مصیبت آجائیگی یا کون سے مواقع بے وزن امت کو محروم کردیا جائیگا؟ یہ صرف ایک نفسیاتی احساس ہے یا حقیقت کی دنیا میں اس کا کوئی ٹھوس وجود بھی ہے؟

ذرائع ابلاغ میں ساری توجہ آخری سوال پر مرکوز ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے مسلمانوں کے دینی تشخص کو خطرات لاحق ہوجائیں گے۔ ان کیلئے شریعت پر عملدرآمد مشکل ہو جائیگا۔ شعائر اسلام پر حملے تیز تر ہوجائیں گے۔ عدم تحفظ میں اضافہ ہوگا یعنی فسادات ہوں گے یا بیجا گرفتاریوں کے سبب مسلمان خوف و دہشت کے عالم میں زندگی گزارنے پر مجبور کردیئے جائیں گے۔ معیشت کو تباہ و برباد کرکے انہیں خوشحالی سے محروم کردیا جائیگا اور وہ بدحالی کے گڑھے میں ڈھکیل یئے جائیں گے۔ ان کے مطالبات عدم توجہ کی نذر ہو جائیں گے اور کوئی دادرسی نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے بے شمار اندیشوں کا شکار کرنے کے بعد اس حالتِ زار کیلئے ذمہ دار افراد کی نشاندہی کرکے ان پر لعنت ملامت کی جاتی ہے اور جن لوگوں سے اختلاف ہوتا ہے یا جو ناپسند ہوتے ہیں ان کے خلاف

سارا انزلہ اتار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ فسادات اور بیجا گرفتاریوں کا سلسلہ اس دور میں بھی جاری رہا جب ہماری تعداد اچھی خاصی تھی ۔ مسلمانوں کی دادرسی کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ جہاں تک معاشی بدحالی کا سوال ہے سرمایہ دارانہ نظام میں یہ عذاب عام ہے۔ سرمایہ داری غریب کو غریب تر اور امیر کو امیر تر بناتی ہے سرمایہ دارانہ نظام استحصال مذہبی تفریق و امتیاز کی قائل نہیں ہے ۔ ہندو مسلم سارے اس چکی میں پس جاتے ہیں نام نہاد سیاسی وزن کسی کام نہیں آتا۔

شعائر اسلام پر سرزمینِ ہند میں دو بڑے حملے ہوے ۔ اول شاہ بانو مقدمہ کے فیصلے میں شریعت کے اندر دراندازی نیز بابری مسجد کے مقام پر رام مندر کے تعمیر کی تحریک ۔ ان دونوں کی داغ بیل ایسے وقت میں پڑی جب مرکز میں بی جے پی برسرِاقتدار نہیں تھی اور نہ ہی کانگریسی حکومت کی قیادت نرسمھاراؤ جیسے فرقہ پرست کے ہاتھ میں تھی بلکہ پنڈت جی اور ان کے نواسے راجیو جی دہلی کے تخت پر فائز تھے۔ شاہ بانو کے معاملے میں مسلمانوں کی عوامی تحریک کامیاب رہی اور بابری مسجد کی بابت ناکام ہوئی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کیلئے بی جے پی اور کانگریس یکساں ذمہ دار ہیں ۔ اگر بی جے پی اس کو توڑنے کیلئے قصوروار ہے تو کانگریس اسے روکنے میں کوتاہی برتنے کی سزاوار ہے اس طرح گویا یہ کانگریس اور بی جے پی کی مشترکہ کارروائی تھی

جس سے دونوں نے سیاسی فائدہ حاصل کیا۔

عدم تحفظ کے باب میں جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا سوال ہے ان میں یقیناً گجرات کافساد سر فہرست ہے اور اسے دیگر فسادات پر فوقیت حاصل ہے لیکن آسام کا فساد بھی کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔ دونوں مقامات پر مرنے والوں کی تعداد یکساں تھی۔ گجرات میں جس طرح سیاسی مفاد کے پیش نظر وزیراعلیٰ نریندر مودی نے اس آگ کو بھڑکایا اور اسے حق بجانب قرار دے کے ریاستی انتخاب میں کامیابی حاصل کی اسی طرح آسام میں کانگریس نے فسادیوں پر کارروائی نہیں کی گویا انہیں عام معافی دے کر اپنی سیاسی دوکان چمکائی۔ مسلمانوں کی آبادی کا سب سے بڑا تناسب آسام میں ہے گزشتہ انتخاب میں مسلمانوں نے آسام کے اندر خود اپنی پارٹی بنا کر غیر معمولی کامیابی درج کرائی اورسب سے بڑی حزب اختلاف بن گئے۔ برسر اقتدار جماعت کانگریس بھی مسلمانوں کی ہمنوائی کا دم بھرتی ہے اس کے باوجود بوڈو لینڈ کے فسادات رونما ہوے اور لاکھوں مسلمان بے گھر ہوئے۔

اترپردیش کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے جہاں گزشتہ انتخاب میں مسلمانوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت و بیدار مغزی کا ثبوت دیتے ہوئے سب سے زیادہ مسلم ارکان اسمبلی کو کامیاب کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اترپردیش اسمبلی میں مسلم ارکان کی تعداد آبادی میں کے تناسب سے زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان

کی پسندیدہ جماعت کو اقتدار مل گیا اور حزب اختلاف کی سب سے بڑی جماعت بی ایس پی پر بھی ان کا اچھا خاصہ اثر و رسوخ قائم ہو گیا۔ اس کے باوجود کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اسی سنہرے دور میں اترپردیش کی تاریخ کا سب سے بھیانک فساد مظفر نگر میں رونما ہوا؟ وہ بھی ایک ایسے وقت جبکہ مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی۔ جس میں ریموٹ کنٹرول ایک عیسائی خاتون کے اور اقتدار کی زمامِ کار ایک مہذب سکھ کے ہاتھوں میں تھی۔ اقتدار کے گلیارے میں رہنے بسنے والے کسی قابلِ ذکر مسلم رہنما نے آج تک ان سنگین مسائل پر نہ پرزور احتجاج کیا اور نہ اپنا استعفیٰ پیش کیا بلکہ اکثر و بیشتر اپنی جماعت اور حکومت کی صفائی پیش کرنے کے کارِ خیر میں لگے رہے۔ مسلمانوں کی بازآبادکاری اور ان کو انتظامیہ کی ظلم وزیادتی سے بچانے کیلئے بھی یہ نمائندے آگے نہیں آئے۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تحفظ کا ان کی سیاسی نمائندگی سے (بلا تفریق پارٹی) کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ مصائب کی تپش میں یہ بھاپ بن کر اڑ جانے والا جھاگ ہے۔

اس بابت مسلم لیڈرشپ کا معیار زیر بحث آسکتا ہے کہ اگر قابل اعتماد اور صاحب کردار افراد کو مسلمان ایوان پارلیمان میں منتخب کرکے روانہ کریں تو صورتحال بدل سکتی ہے گویا اس حالتِ زار کیلئے نہ وہ رہنما ذمہ دار ہیں جو اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کوتاہی برتتے ہیں اور نہ وہ سیاسی جماعتیں جو.

انہیں ٹکٹ دیتی ہیں اور وزیر عمال بنا کر اپنے پاس رکھتی ہیں بلکہ خود امت ہی قابلِ گردن زدنی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک خیالی مفروضہ ہے اس لئے کہ آزاد ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ بارسوخ اور لائق و فائق سیاسی رہنما تو کوئی اور پیدا نہیں ہوا۔ وہ کانگریس پارٹی کے صدر بھی رہ چکے تھے اور آزادی کے بعد وزیر تعلیم بنائے گئے تھے اس کے باوجود خود ان کی اپنی وزارت کے تحت اردو زبان کی بیخ کنی کی گئی اور وہ بے یار و مددگار دیکھتے رہ گئے۔ اپنے دورِ اقتدار میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیم گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار تک بحال نہیں کرسکے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ یہ سب کانگریس کی فرقہ پرستی کے سبب ہوا تو اسے یاد کرنا چاہیے کہ جنتا دل کی سرکار میں کشمیری رہنما مفتی محمد سعید کو وزیر داخلہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت وی پی سنگھ جیسا مسلم دوست وزیر اعظم تھا اس کے باوجود نہ کشمیر کے معاملے میں کوئی قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی اور نہ مسلمانوں کے دیگر مسائل ہوے۔ جنتا پریوار میں سید شہاب الدین جیسا پڑھا لکھا رکن پارلیمان موجود تھا۔ وہ مجلسِ مشاورت اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے صدر بھی تھے اس کے باوجود وہ کچھ نہ کرسکے؟ گویا ایوان میں مسلم ارکان کی قابلیت کا فائدہ بھی تعداد کی مانند محض ایک خام خیالی ہے۔

اب آیئے مسلمانوں سے باہر نکل کر دیکھیں۔ ہندوستان میں جو ۸۰ فیصد سے

زیادہ ہندو رہتے ہیں کیا ان کا سیاسی وزن ہندوتوا وادی بی جے پی کے اقتدار میں آنے سے بڑھ گیا ہے۔ ہندوؤں کی سیاسی جماعتوں پر نظر ڈالیں تو کانگریس کا یہ حال ہے کہ وہ حزب اختلاف کا رہنما نامزد کرنے کی بھی مجاز نہیں ہے۔ کمیونسٹ اپنی بقاء کی فیصلہ کن جنگ لڑ رہے ہیں اور دیگر علاقائی جماعتوں کا بھی حال اچھا نہیں ہے۔ جے للیتا کا سیاسی مستقبل تاریک کرنے کی بھرپور کوشش کی جاچکی ہے اور مایاوتی کو بھی حاشیہ پر پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ جماعتیں ماضی میں بی جے پی کا ساتھ دے چکی ہیں مگر حال میں مخالف رہی ہیں اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بی جے پی کی مخالفت کی قیمت چکا رہی ہیں لیکن ہریانہ وکاس پارٹی تو آخر تک ساتھ رہی لیکن اسے بھی بے وزن کردیا گیا۔ شیوسینا اپنے جائز مطالبات کے ساتھ بی جے پی سے الحاق کرنا چاہتی تھی اور اس میں بھی کافی لچک پیدا کرچکی تھی مگر ہندوتوا وادی ہونے کے باوجود ایک منصوبہ بند سازش کے تحت اس کا وزن گھٹایا گیا۔ ہندی سیاست میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے قبل جب اندرا جی کو بلکہ مرارجی بھائی کو بھی ایوانِ پارلیمان میں واضح اکثریت حاصل ہوئی تھی تو یہی طرز عمل اختیار کیا گیا تھا۔ انتخابی سیاست میں رواداری محض ایک مجبوری ہوتی ہے۔ جیسے ہی وضو آتا ہے تیمّم از خود غائب ہوجاتا ہے۔

بی جے پی کی نارواداری اور خودسری آج کل موضوع بحث بنی ہوئی ہے اور کہا

جارہا ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی اور سیاسی جماعت کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اس لئے دوست و دشمن سب کا صفایہ کرنے پر تلی ہوئی ہے لیکن بی جے پی کے اندر جھانک کر دیکھیں تو اڈوانی جی، مرلی منوہر جوشی اور کلیان سنگھ وغیرہ یہ سب تو بی جے پی کے رہنما ہیں ۔ان لوگوں نے پارٹی کی خاطر اپنی زندگی جھونک دی اقتدار میں آنے کے باوجود ان کے سیاسی وزن کو کون سا روگ لگ گیا؟ آج کوئی ان کو پوچھ کر نہیں دیتا بلکہ ان کے قریب جانے سے خود بی جے پی والے خوف کھاتے ہیں ؟ اڈوانی کا حالیہ بہار دورہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آرایس ایس کے اثرات سے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سنگھ کے اصرار کے باوجود بی جے پی نے مہاراشٹر میں شیوسینا پر این سی پی کو ترجیح دی۔ حالانکہ ریاست کا وزیر اعلیٰ دیویندر فردنویس اور مہاراشٹر بی جے پی کا سب سے بڑا رہنما و سابق صدر نتن گڈکری آرایس ایس کا پروردہ ہے۔ دونوں کو اپنی خاکی نیکر اور کالی ٹوپی پر ناز ہے اس کے باوجود وہ سرسنگھ چالک کے بجائے پردھان سنگھ سیوک کے اشاروں پر چلنے کیلئے مجبور ہیں کیا اسے سیاسی بے وزنی میں شمار نہیں کیا جائیگا؟ بی جے پی کے بزرگ رہنماوں کو بے وزن کرنے کیلئے یہ جواز پیش کیا گیا کہ ان کی عمر ۷۵ سال سے تجاوز کرگئی ہے لیکن ۸۷ سالہ لوکیش چندر کو انڈین کاونسل آف کلچرل ریلیشن کا سربراہ بنا دیا گیا۔۔ آرایس ایس اپنے آپ کو ثقافتی تحریک کہتی ہے لیکن سنگھ کی کوکھ سے پیدا ہونے والی بی جے پی کو ثقافتی

روابط کی استواری کیلئے کوئی سنگھی دانشور میسر نہیں آیا۔ حکومت نے یہ ذمہ داری ایک ایسے کھدر دھاری پروفیسر کے حوالے کی جو بقول خود ساری عمر نہ صرف کانگریسی رہا ہے بلکہ اندرا گاندھی کا معتمد بھی تھا۔ جس کا دعویٰ ہے کہ اس کے سوویت یونین کے کئی رہنماوں سے ذاتی تعلقات تھے ۔اس خبط الحواس انسان نے اپنا سیاسی وزن بڑھانے کیلئے کہہ دیا نریندر مودی نے کارل مارکس سے زیادہ غریبوں کو متاثر کیا ہے ۔ وہ مہاتما گاندھی سے عظیم ہے بلکہ بھگوان کا اوتار ہے۔ ہمارے ملک میں سیاسی وزن کی حقیقت کو واضح کرنے والا یہ واقعہ اپنی مثال آپ ہے۔

پروفیسر لوکیش چندر کیسااسی بساط پر کوئی اہمیت نہیں ہے اس لئے اس کے سیاسی وزن سے اگر صرف نظر بھی کیا جائے تو راجستھان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرنے والی وجئے راجے سندھیاکے بارے میں آپ کیا کہیں گے جن کا تعلق برسرِ اقتدار بی جے پی سے ہے ۔ وہ اپنی ہی پارٹی کے صدر سے ملاقات کیلئے دہلی آتی ہیں اور دو دن تک وقت نہیں ملنے کے سبب بے نیل و مرام لوٹ جاتی ہیں۔ ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود ان کا بیٹا وزیر نہیں بن پاتا۔ اس سے بھی زیادہ چشم کشا واقعہ شیوراج چوہان کا ہے جو مدھیہ پردیش میں گجرات سے بڑی کامیابی درج کراچکے ہیں ۔جب سریش پربھو نے وزیر ریلوے بننے کے بعد ٹویٹ کیا کہ وہ تمام لوگ جو ریلوے میں کام کرتے ہیں وزیر اعظم کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کریں

تو ایسا لگا گویا انڈین ریلوے کسی فرد واحد کی نجی ملکیت ہے جو اس ادارے میں برسر روزگار سارے ملازمین کو وہ اپنی جیب سے تنخواہ دیتا ہے اس لئے ان سب کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ اپنے آقا و مالک کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کریں۔

وزیر ریلوے کے اس شرمناک بیان پر ایک طنزیہ ٹویٹ کرنے کی جرأت مدھیہ پردیش کے وزیراعلیٰ شیوراج چوہان نے کردی اور لکھا کہ مجھے یہ پسند آیا جو آپ نے کہا کہ عزت مآب وزیراعظم کا خواب (کو پورا کریں) نہ کہ ہندوستانیوں کا۔ وہ (یعنی وزیراعظم) یقیناً آپ کی بھکتی پر خوش ہوں گے۔ آپ (بلند) مقامات پر پہنچیں گے۔ اس بیان میں کہی جانے والی بات صد فیصد درست ہے۔ اس کا اسلوب بیان نہایت مہذب اور ظریفانہ ہے۔ اس بات کو کہنے والا ایک نہایت طاقتور سیاسی رہنما ہے اس کے باوجود اس کی بے وزنی کا یہ عالم ہے کہ بہت جلد یہ ٹویٹ ہٹا دیا جاتا ہے اور یہ پوچھے جانے پر کہ یہ فقرہ آپ نے کیوں کسا اور پھر کیوں اس سے رجوع کرلیا؟ اس کا انکار کردیا جاتا ہے۔ صفائی کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ٹویٹر اکاؤنٹ پر کسی نے وقتی طور پر قبضہ (ہیک) کرلیا تھا۔ یہ ایسی کذب بیانی جو خود اپنے خلاف گواہی دیتی ہے اس لئے کہ اس قدر مختصر وقفہ کیلئے ٹویٹر اکاؤنٹ کا ہیک ہوجانا اور اپنے آپ اس کا بحال ہوجانا ناقابل یقین جھوٹ ہے۔ سچ یہ ہے کہ چوہان صاحب ڈر گئے جو درحقیقت بے

وزنی کی ایک علامت ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مغرب کا جمہوری نظام عوام وخواص کیلئے جس سیاسی وزن کا دعویٰ کرتا ہے وہ محض ایک ڈھکوسلہ ہے۔ عوام کو خوش فہمی کا شکار کرکے ان کا استحصال کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے جس میں باشندگانِ وطن کو یہ کہہ کر بے وقوف بنایا جاتا ہے کہ ساری سیاسی قوت ان کے ہاتھوں میں ہے جبکہ حقیقت میں قوت وطاقت کا سرچشمہ صاحبِ اقتدار کے پنجہ میں مرکوز ہوتا ہے۔ یہاں بھی حاکمِ وقت کے آگے سارے لوگ عملاً بے وزن ہوتے ہیں۔ رہنماوں کے طرزِ عمل یا طور طریقوں سے کبھی کبھار غلط فہمی ضرور پیدا ہوتی ہے مگر اس سے حقیقتِ واقعہ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ صاحبِ اقتدار اندرا گاندھی ہو یا مرارجی دیسائی اور راجیو گاندھی ہو یا نریندر مودی، ان تمام پر (واضح اکثریت والے) اقتدار کا نشہ یکساں طور پر اثر انداز ہوتا ہے اور بلا شرکت غیرے حکمرانی کا جادو سرچڑھ کے بولتا ہے۔ اصحاب اقتدار کی بابت کسی مغربی مفکر کا قول ہے اقتدار بدعنوان بناتا ہے اور مکمل اقتدار بدعنوانی کی تکمیل کردیا ہے لیکن اس نظام میں عوام کو لاحق ہونے والی خوش فہمیوں کا ازالہ ساغر صدیقی نے کیا خوب کیا ہے

سمجھی ہے جس کو سایۂ اُمّید عقلِ خام
ساغرؔ کا ہے خیال.بڑی تیز دُھوپ ہے

رام بھکت بمقابلہ رام پال بھکت: حصار میں زعفرانی دہشت گردی بے نقاب

ملائم سنگھ یادو نے سابقہ اور حالیہ وزرائے اعظم کا موازنہ کرتے ہوئے ایک نہایت دلچسپ بات کہی۔ وہ بولے منموہن کچھ بولتے ہی نہیں تھے اور مودی بے تکان بولے چلے جاتے ہیں۔ سیاستدانوں کو جب بولنے کیلئے کچھ نہیں سوجھتا تو وہ دہشت گردی کا راگ الاپنے لگتے ہیں ایسا ہی کچھ ہمارے بڑبولے والے وزیر اعظم کے ساتھ حالیہ آسٹریلیا دورے کے موقع پر ہوا۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے مشرقی ایشیا سربراہ اجلاس میں دہشت گردی کے خلاف سخت موقف اختیار کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ دہشت گردی اورانتہا پسندی کے چیلنج بڑھتے جارہے ہیں اس لئے تمام ممالکمذہب اور دہشت گردی کے درمیان ہر تعلق کا خاتمہ کردیں۔ وزیر اعظم نے کہا کہ دہشت گردی کا جامع طور پر جواب دینے کے لیے بین الاقوامی اشتراک کی ضرورت ہے۔ برس بن میں منعقدہ جی ۲۰ اجلاس میں بھی انہوں نے دہشتگردی کے خاتمہ کے لئے عالمی اتحاد کو ناگزیر قرار دیا۔ وزیر اعظم نے دولت اسلامیہ (داعش) سے متعلق اعلانیہ کو ہندوستان کی حمایت کا بھی اعلان کیااور تمام ملکوں کو تلقین کی کہ امن واستحکام کے لیے بین الاقوامی قوانین اوراصولوں کی پابندی کریں کیونکہ عالمگیریت کے اس دور یں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ وزیر اعظم نے یہ بھی کہا کہ حکمرانی تبدیلی کا نقطۂ آغاز ہے اور یہ تجارت کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا عوام

کے لیے۔ آپ بھارت میں یہ تبدیلی پائیں گے۔

عالمی و قومی ذرائع ابلاغ میں جس وقت یہ بیانات نشر کر رہا تھا اس دوران دہلی کی ہمسایہ ریاست ہریانہ کے شہر حصار میں بابا رام پال آشرم کے مناظر ٹیلی ویژن کے پردے ان بلند بانگ دعووں کی ہنسی اڑا رہے تھے۔ جب انھوں نے کہا'' دہشت گردی اور انتہا پسندی کے چیلنج بڑھتے جا رہے ہیں'' تو ایسا لگا گویا وہ حصار کی صورتحال پر تبصرہ فرما رہے ہیں۔ جب بولے کہ '' مذہب اور دہشت گردی کے درمیان ہر تعلق کا خاتمہ کردیں'' تو یوں لگا گویا نوزائیدہ وزیر اعلیٰ کھٹر کو نصیحت کر رہے ہیں۔ لیکن جب وزیر اعظم نے کہہ دیا کہ '' دہشت گردی کا جامع طور پر جواب کے لیے بین الاقوامی اشتراک کی ضرورت ہے'' تو اندیشہ ہوا کہیں وہ اقوام متحدہ سے درخواست کرکے ہریانہ میں بین الاقوامی امن فوج نہ طلب کرلیں۔ اس لئے کہمبر سبنمیں وہ
دہشتگردیکے خاتمےکے لئے عالمیاتحاد کو ناگزیر قرار دے چکے تھے۔ وزیر اعظم نے جب داعش سے متعلق اعلانیہ کو ہندوستان کی حمایت کا اعلان کیا تو خیال ہوا کہ جس ملک کے چالیس ہزار حفاظتی دستے کئی دنوں تک ایک سادھو کو گرفتار نہ کرسکیں وہ بھلا داعش کا کیا مقابلہ کریں گے۔ آپ نے جب تمام ملکوں کو تلقین کی کہ امن و استحکام کے لیے بین الاقوامی قوانین کی پابندی کریں تو اس وقت وزیر اعلیٰ ہریانہ ہاتھ جوڑ کر رام پال بابا کے بھکتوں سے گزارش کر رہے تھے

کہ برائے کرم عدالتی احکامات کے نفاذ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ اگر اس کے جواب رام پال باباکے بھکت بھی وشوا ہندو پریشد والا جواب دے دیتے کہ رام مندر ہماری شردھا کا ویشہ ہے اس بابت ہم کسی عدالت کی مداخلت نہیں برداشت کریں گے تو ان کو کیسا لگتا؟ وزیر اعظم کے بیان '' حکمرانی تبدیلی کا نقطۂ آغاز ہے ۰۰۰۰۰۰ آپ بھارت میں تبدیلی پائیں گے'' سننے کے بعد جی چاہا کہ سامعین کو ان ریاستوں کا دورہ کرنے کی دعوت دی جائے جہاں بی جے پی برسرِ اقتدار آچکی ہے تاکہ وہ اس عظیم تبدیلی کا بچشمِ خود مشاہدہ کرکے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرسکیں دور نہ سہی تو دہلی کے بغل میں ہریانہ ہے وہیں چلے جائیں۔

رام پال باباکے بارے میں یہ جاننے کے بعد کہ وہ بی جے پی کیلئے داعش سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا ہے قارئین یہ جاننا چاہیں گے آخر یہ ہے کون؟ اس لئے کہ وزیراعظم کے بابت لوگ وہ سب بھی جان گئے ہیں جو وہ نہیں ہیں۔رام پال کی پیدائش نریندر مودی کے ایک سال بعد ماہ ستمبر ہی میں میں ہوئی۔ اس طرح دونوں کی جنم کنڈلی ایک جیسی ہے۔ خوش قسمتی سے رام پال کو بچپن میں کوئی سنگھ کی شاکھا نہیں ملی ورنہ وہ بھی وارنٹ کے نکلتے ہی یدوریپا کی طرح کسی ہسپتال میں داخل ہوتا اور وہاں سے عدالت میں جاکر ضمانت پر رہا ہوجاتا۔ رام پال بابا کس قدر خطرناک آدمی ہے اس کا اندازہ کرنے کیلئے جودھپور کورٹ میں کاپرڈاکے مہندر کھاروال کا لگایا ہوا الزام کافی ہے۔ مہندر کے مطابق اس کے

والد جگدیش رام کو اغواء کرکے اس کی بلی چڑھایا گیا ہے۔ شکایت کنندہ کے مطابق مہیش میواڑ اور اس کی ماں جشودہ دھوکے سے جگدیش رام کو رام پال کے آشرم میں لے گئے اور وہاں اولاد کے حصول کی خاطر اس کی بلی چڑھا دی۔ مہندر ۱۰ جون ۲۰۱۳ء کو جب ست لوک آشرم میں پہنچا تو اسے اپنے والد کی کٹی پھٹی لاش ملی۔ اس کے پیر کی انگلی کٹی ہوئی تھی اور پیر داغا گیا تھا۔ کنپٹی، سینے، کندھے، گردن اور دونوں ہاتھوں پر کسی دھار دار ہتھیار سے زخم کے کئی نشان تھے۔

رام پال بابا نے انجینئر بننے کے بعد ۱۹ سالوں تک محکمہ زراعت میں ملازمت کی ۲۰۰۰ء میں لاپرواہی کے سبب اسے نکال دیا گیا۔ اس سے قبل ۱۹۹۹ء میں وہ کرونتھا کے اندر اپنا ست لوک آشرم قائم کر چکا تھا۔ ۲۰۰۱ء میں بروال کا آشرم بنا جو ۳ ایکڑ پر تھا لیکن تک ۱۲ ایکڑ میں پھیل گیا۔ دیکھتے دیکھتے ہریانہ وہ دیگر ریاستوں میں بھی کئی کئی ۲۰۰۱ء ایکڑ پر بہت سارے آشرم عالم وجود میں آگئے۔ شروعات میں سب کچھ ٹھیک تھا مگر ۲۰۰۶ء میں رام پال بابا نے دیانند سرسوتی پر تنقید کردی جس سے کرونتھا کے آریہ سماجی چراغ پا ہوگئے۔ ۱۲ جولائی ۲۰۰۶ء کو جب آریہ سماجی ست لوک آشرم کے باہر مظاہرہ کررہے تھے تو ان پر اندر سے گولی چلائی گئی جس میں ایک نوجوان ہلاک ہوگیا۔ اس معاملے میں رام پال اور اس کے ۳۷ ہمنواؤں پر مقدمہ درج ہوگیا۔ اس کے ۷

سال بعد پولس اور مظاہرین کے درمیان جھڑپ میں ۳ لوگوں کی موت واقع ہو گئی۔
مئی ۲۰۱۳ء کو پولس نے کرونتھا کا آشرم خالی کرایا اس کے بعد رام پال بروال چلے ۱۴ آئے۔ رام پال کی ایسی ٹھاٹ ہے کہ ۱۴ مئی ۲۰۱۴ء کو ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ اس کی حصار عدالت میں پیشی ہوئی اس طرح اس نے ثابت کردیا کہ اگر پابندی کے باوجود نریندر مودی ویڈیو کے ذریعہ امریکہ اپنی تقریر نشر کروا سکتے ہیں تو وہ بھی عدالت میں قدم رکھے بغیر پیش ہو سکتے ہیں۔ بابا رام پال تو عدالت میں نہیں گئے لیکن ان کے بھکتوں نے عدالت یں گھس کر خوب ہنگامہ کیا اور نعرے بازی کرتے ہوئے وکیلوں کے ساتھ ہاتھا پائی بھی کی۔
عدالت اس کا سخت نوٹس لیا اور توہین عدالت کا الزام لگا کر غیر ضمانتی وارنٹ جاری کردیا۔ عدالت نے انتظامیہ کو حکم دیا کہ وہ پہلے ۵ اور پھر ۱۰ نومبر تک رام پال کو حاضر کرے لیکن پولس اور نئی نویلی بی جے پی حکومت سوتی رہی ۔ اس کے بعد ۱۷ نومبر تک کا وقت دیا گیا انتظامیہ اس بار بھی ناکام رہا تو عدالت نے حکومت اور پولس دونوں کوزوردار پھٹکار لگائی اور ۲۱ نومبر تک کسی صورت ملزم کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اب انتظامیہ ہوش میں آیا اور اس نے حفاظتی دستوں کو جمع کرنا شروع کیا یہاں تک کے ۴۵ ہزار جوان جمع ہوگئے اور ان پر ۴۰ کروڑ روپئے پھونک دیئے گئے۔ اس کے بعد وزیر اعلیٰ نے ایمرجنسی اجلاس بلایا

اور باباکے بھکتوں سے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کی کہ وہ پولس کو قانون کی بجاآوری کرنے دیں ۔اس کے بعد آشرم کی بجلی اور پانی کا کنکشن کاٹ دیا گیا اور حفاظتی دستوں نے آشرم کی جانب یوں پیشقدمی کی گویا مہابھارت کی جنگ لڑنے کیلئے کروکشیتر جارہے ہوں۔ یہ خبر بھی گرم ہے کہ پولس فورس میں ۱۰ فیصد بابا رام پال کے بھکت ہیں اس لئے پولس افسران تذبذب کا شکار ہیں۔

حکومت جس وقت یہ تیاریاں کررہی تھی رام پال کے بھکت اپنی پیش بندی میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ آگے کیا کچھ ہو سکتا ہے اس لئے ان لوگوں نے بھکتوں کی ایک بہت کثیر تعداد کو آشرم میں جمع کرلیا جس میں بڑی تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی تاکہ انہیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ خوراک اور پانی کا بڑا ذخیرہ جمع کرلیا گیاتاکہ حصار کے دوران باآسانی وقت گزرے یہاںتک کے جنریٹر اور ڈیزل بھی لے آئے جس سے بجلیکے بغیر گزارہ کیا جاسکے۔ آشرم کے اندر بھکتوں کے پاس اشیائے خوردونوش کے علاوہ اچھی خاصی مقدار میں اسلحہ اور پٹرول بم بھی ہے جس کا وہ نہایت چابکدستی کے ساتھ استعمال بھی کرچکے ہیں ۔ دو ہفتہ قبل جب عدالت نے وارنٹ جاری کیا اس وقت یہ آشرم سونا پڑا تھا اور رام پال کو گرفتار کرنا نہایت آسان تھا لیکن سرکار اور انتظامیہ گھوڑے بیچ کر سورہی تھی اور باباکے بھکت تیاری کررہے تھے اب چڑیا کھیت چگ چکی ہے اس لئے پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ چین

کو دھمکی دینے والے بے دست پا وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ اپنی ہی جماعت کے وزیراعلیٰ سے رپورٹ طلب کررہے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ وہ تل ابیب میں اپنے قلبی شراکت دار نتن یاہو سے رابطہ کرکے پوچھیں کہ اس مسئلہ پر کیسے قابو پایا جائے ؟

رام پال کے حامی دیوار پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پٹرول اور تیزاب بم نیز پتھر ہیں جنہیں وقتِ ضرورت پولس کی جانب اچھال دیا جاتا ہے۔ ڈی جی پی کے مطابق آشرم سے گولیاں بھی چلائی گئیں۔ پولس ایکشن کے ۶ گھنٹوں میں ۹۰ راونڈ فائرنگ ہوئی۔ دونوں جانب سے ۲۳۰ لوگ زخمی ہوئے جن میں ۱۲۵ پولس اہلکار ہیں ان میں سے ۹ کو گولی لگی ہے اور ۶۷ کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ آشرم کے ذمہ دار کا کہنا ہے اس کارروائی میں ۸ لوگ ہلاک ہوئے جن میں پانچ خواتین ہیں پولس نے ہلاکتوں کی تردید کی ہے لیکن آشرم سے ۵ لاشیں باہر آچکی ہیں۔ ۴۵ ہزار کا عظیم دستہ ۶ گھنٹے بعد صرف ایک دیوار گرانے میں کامیاب ہوسکا اس لئے کہ سامنے گیس سلنڈر لگا کر رکھے گئے تھے۔ پولس تو یہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ باباکے بھکتوں نے اس کا فائدہ اٹھا کر پٹرول کی بالٹی دیوار گرانے والے جے سی بی پر پھینک کر اسے آگ لگادی۔ اس بیچ دہلی کی نرملا دیوی اور احمدآباد کی گیتا دیوی نے خودکشی کی کوشش کی۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ دہلی اور احمدآباد دونوں شہروں کا تعلق فی الحالوزیراعظم

سے ہے۔

رام (پال) کے بھکتوں کی آنکھ مچولی سے بیزار فورس نے اپنا غصہ ٹی وی رپورٹروں پر اتارا۔ پہلے انہوں نے ٹائمز ناؤ کے نامہ نگار کو پیٹا اور پھر آج تک چینل کے رپورٹر کی دھنائی کردی۔ کل ۳۰ نامہ نگاروں کے زخمی ہونے کی اطلاع آچکی ہے۔ رام پال کے حامی حصار سے نکل کر دہلی پہنچ گئے ہیں اور جنتر منتر پر مظاہرہ کررہے ہیں۔ ان کا ارادہ سپریم کورٹ کے محاصرے کا بھی ہے۔اناج ختم ہو جانے کے سبباس میں شک نہیں کہ جلد ہی آشرم انتظامیہ کے قبضے میں ہوگا اور رام پال عدالت میں لیکن اس واقعہ نے زعفرانی دہشت گردی کو پوری طرح بے نقاب کردیا اور اس کے مقابلے میں رام بھکتوں کی نااہلی کی قلعی بھی کھول دی ہے۔ رام پال کے مقابلے رام دیو بابا بہت زیادہ طاقتور ہے اس کے باوجود جس آسانی سے کانگریس نے اس کو قابو میں کرلیا اس مہارت کا مظاہرہ بی جے پی نہ کرسکی ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پرچارک وزیراعلیٰ مدن لال کھٹر اپنے کارکنان کے ساتھ وزیراعظم کی واپسی کا انتظار کررہے ہیں ۔ان کارکنان کی اخلاقی حالت ظاہر کرنے والا واقعہ اس وقت سامنے آیا جب کھٹر انتخاب میں کامیابی کے بعد پہلی مرتبہ اپنے حلقۂ انتخاب کرنال پہنچے ۔ایک عظیم الشان جلسہ میں ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ انہوں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر کارکنان کو نظم و ضبط کی نصیحت دی لیکن اس کی قلعی اس وقت

کھل گئی جب پروگرام کے بعد لڈو کے ڈبے کھلے اور کارکنان آپے سے باہر ہو کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ جس جماعت کے لوگ لڈو کو دیکھ کر قابو سے باہر ہو جاتے ہیں وہ بھلا رام پال بابا کے بھکتوں کا کیا خاک مقابلہ کریں گے؟

کشمیر میں کشمیریت ، جموں میں جمہوریت اور بھارت میں انسانیت

کشمیر کے ریاستی انتخابات کو قومی ذرائع ابلاغ نے وشو ہندو پریشد کے رہنما اشوک سنگھل کے احمقانہ بیان سے بھی کم اہمیت دی جس میں سنگھل نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ ۸۰۰ سال کے بعد دہلی پر ایک خوددار ہندو راج کر رہا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ درمیانی وقفہ میں دہلی کا کوئی ہندو حکمراں بشمول اٹل جی ، پنڈت جی اور اندرا جی غیر تمند نہیں تھا جبکہ اندرا گاندھی کو اٹل بہاری درگا ماتا کے خطاب سے نواز چکے تھے اور پنڈت نہرو کو وہ اپنا پسندیدہ رہنما تسلیم کر چکے تھے۔ سنگھل کی نظر میں چونکہ خود اٹل جی کی خودداری مشکوک ہے تو اندرا اور نہرو کس شمار و قطار میں آتے ہیں؟ جس دن سنگھل یہ بیان دے رہے تھے نریندر مودی کشتوار میں اٹل جی کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا عزم دوہرا رہے تھے۔اب کوئی اشوک سنگھل سے پوچھے کہ یہ کیسی خودداری ہے جو کسی بے خود کا سپنا ساکار کرنا چاہتی ہے۔

انتخاب سے قبل سنگھل نے کہا تھا کہ صرف مودی ہی ہندوستان میں رام راجیہ قائم کر سکتے ہیں جبکہ مودی نے کشمیر میں کہہ دیا کہ سیاست کو مذہب سے نہ جوڑا جائے۔ اب اگر ہندو دھرم کو راج نیتی سے الگ کر دیا جائے تو بھلا ہندو

راشٹر کیسے بنے گا؟ اشوک سنگھل نے یہ اعلان بھی کیا تھا ہمارا کام سیاست نہیں ہے بلکہ صرف رام بھکتوں کو کامیاب کرکے پارلیمان میں روانہ کرنا ہے۔ سنگھل نے مزید انکشاف کیا تھا کہ مودی کو کامیاب کرنے کیلئے ۱۵۰۰۰ سادھو سنت میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ رام بھکتوں نے تو مودی کو پردھان منتری بنادیا لیکن مودی نے رام بھکتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ آسارام کو جیل سے نکالنے کے بجائے رام پال کو اس کے پاس چکی پیسنے کیلئے بھیج دیا اور اس پر بغاوت کا مقدمہ بھی جڑ دیا۔ سنگھل جی اسے کہتے ہیں راج دھرم جس کا سبق اٹل جی نے نریندر مودی کو گجرات فساد کے بعد پڑھایا تھا۔ اشوک سنگھل کو چاہئے کہ وہ پہلی فرصت میں کہیں سے پرتھوی راج چوہان کی تصویر حاصل کرکے نریندر مودی کو تحفہ دیں ورنہ اگر انہیں کبھی وزیراعظم کے دفتر میں جانے کی سعادت نصیب ہوگی تو شاید وہ غش کھا کر گر جائیں گے اس لئے کہ سنا ہے وزیراعظم کے دفتر میں ولبھ بھائی پٹیل کے علاوہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویریں بھی لگی ہوئی ہیں۔ گاندھی جی کو سنگھ پریوار ملک کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور پنڈت نہرو کو مسلمانوں کی دلجوئی کا مجرم ٹھہراتا ہے۔ ویسے ولبھ بھائی پٹیل بھی نہ تو ہندو مہاسبھا کے آدمی تھے اور نہ سنگھ پریوار سے ان کا کوئی تعلق تھا بلکہ وہ تمام عمر کانگریسی رہے۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد وزیر داخلہ کی حیثیت سے آر ایس ایس

پر پہلی بار پابندی لگانے کا کارخیر انہیں کے دست مبارک سے انجام پایا۔ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ اس شخص نے اپنے دفتر میں ان تین کانگریسیوں کی تصاویر سجا رکھی ہیں جو ''کانگریس مکت بھارت'' کا نعرہ لگا کر انتخاب میں کامیاب ہوا تھا۔ مودی جی کے اس کانگریسی کرن کا اثر غالباً پر سنگھل جی پر بھی ہوا ہے اس لئے کل تک دھرم پریشد کرنے والے سنگھل فی الحال وشو ہندو کانگریس کا انعقاد کررہے ہیں اور اس میں مودی کے بھجن گا رہے ہیں۔

نریندر مودی کیلئے اس طرح کی منافقت کا مظاہرہ نیا نہیں ہے۔ ۲۰۰۷ء میں دوسری مرتبہ گجرات کی انتخابی کامیابی کے بعد انڈیا ٹوڈے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا میرے لئے مثالی رہنما ''ویر ساورکر، بھگت سنگھ، سردار پٹیل اور مہاتما گاندھی'' ہیں ۔اس طویل فہرست کے اندر سے نہ صرف سنگھ کے مہاگرو گولوالکر کا نام غائب تھا بلکہ جن سنگھ کے پہلے صدر شیاما پرشاد

مکرجی، پہلے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی اور مودی کے دھرم گرو سوامی وویکا نند کا نام بھی نہیں تھا۔ گاندھی جی کے ساتھ ان کے قاتل ناتھورام گوڈسے کو آشیرواد دینے والا ویر ساورکر اس میں حیرت انگیز طور پر موجود تھا۔ بھگت سنگھ ملحدانہ نظریۂ حیات کا حامل مجاہد آزادی تھا تو ولبھ بھائی پٹیل

کانگریسی سیاستداں۔ یہ چوں چوں کا مربہّ اس حقیقت کا مظہر تھا کہ مودی جی کے اندر اپنے دل کی بات ببانگِ دہل کہنے کا حوصلہ نہیں ہے۔اگر ایسا نہیں ہے تو وہ خود کنفیوژ ہیں یا عوام کو دھوکہ دینا چاہتے تھے۔ مودی جی کی گاندھی بھکتی پر یہ سید قاسم سجاد کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؎

جلاکے لوگوں کو باپو تمہاری دھرتی پر
جہاں میں پارسا خود کو بتا رہا ہے کوئی

کشمیرکے حالیہ انتخاب میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی منافقت بامِ عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ جموں کے اندر دستور کی دفعہ ۳۷۰ کے خاتمہ کی بات کی جاتی ہے۔ وزیر اعظم کے دفتر میں ریاست جموں کے وزیر جتندر سنگھ فرماتے ہیں کہ بی جے پی کے منشور میں شامل تمام مسائل بشمول دفعہ ۳۷۰ زیرِ بحث آئیں گے۔ اس کے برخلاف ریاستی وزیر دفاع سبکدوش جنرل وی کے سنگھ صاف مکر جاتے ہیں اور سرینگر میں اعلان کرتے ہیں کہ بی جے پی نہ دفعہ ۳۷۰ کو منسوخ کرنا چاہتی ہے نہ اس میں ترمیم کی خواہاں ہے۔ وادی کے اندر بی جے پی کی امیدوار حنا بھٹ اعلان فرماتی ہیں کے اگر دفعہ ۳۷۰ سے کسی نے چھیڑ چھاڑ کی تو سب سے پہلے وہ بندوق اٹھائیں گی۔ اب بندوق اٹھا کر چلائیں گی بھی یا نہیں یہ تو انہوں نے نہیں کہا اور اگران کے ہاتھوں میں موجود زعفرانی بندوق چلے گی بھی تو کس پر گولیاں برسائے گی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ حنا بھٹ کے دعویٰ پر

ے محبوب اکبر کا یہ شعر معمولی ترمیم کے بعد پوری طرح چسپاں ہوتا ہے کہ

کبھی دشمن کے گھر رہتی تھی یا لیڈر کی باتوں میں

سیاست اب مگر بندوق کی نالی میں رہتی ہے

اس انتخاب میں بی جے پی کا لب ولہجہ اور پوسٹر کا رنگ وروغن بھی گرگٹ کی مانند بدلتا رہا۔ جموں میں کمل زعفرانی رنگ میں کھلتا ہے اور اس کے آس پاس نارنگی رنگ کی بھرمار ہوتی ہے جبکہ زعفران کی پیداوار کیلئے ساری دنیا میں معروف وادیٔ کشمیر کے اندر کمل کا رنگ سفید ہوجاتا ہے۔ اس کی پشت پر نارنگی نہیں بلکہ سبز رنگ آجاتا ہے۔ مودی جی اودے رنگ کی جیکٹ اور مہتاجی بھورے رنگ کے کرتے میں نظر آتے ہیں۔ عوام کی دھندلی سی تصویر میں بھی ایک ہری ٹوپی والا دکھائی دے جاتا ہے۔ وزیر اعظم کشتوار میں جن سنگھ کے پہلے صدر شیاما پرشاد مکرجی کو بھول کر جن کے بارے میں آر ایس ایس کا دعویٰ ہے کہ انہوں کشمیر کے الحاق کیلئے اپنی جان بلیدان کردی اٹل جی کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا عزم دوہراتے ہیں۔ ان کی تقریر میں ترقی کی گردان تو خوب سنائی دیتی ہے لیکن دفعہ ۳۷۰ کا ذکر نہیں ملتا۔

اس بات کا امکان ہے کہ یہ رام جیٹھ ملانی کی کوششوں کا نتیجہ ہو جو ۲۰۰۲؁ میں اٹل جی کے ذریعہ قائم کردہ کشمیر کمیٹی کے صدر نشین ہیں۔ سابق بی جے

پی ایم پی کا کہنا ہے کہ دستور کی دفعہ ۳۷۰ دستور ہند کے بنیادی ڈھانچہ کا حصہ ہے۔ جس کو کوئی چھو نہیں سکتا۔ ان کے ''جب میں نے اس دفعہ کی وضاحت وزیر اعظم نریندر مودی پر کی تب سے بی جے پی اس بابت خاموش ہے۔ جموں و کشمیر دستور ساز اسمبلی کی خواہش کے تحت دفعہ ۳۷۰ کو دستور ہند میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کی منسوخی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' جیٹھ ملانی نے مودی کو تلقین کی کہ وہ بی جے پی کے قائدین کو اس پر اظہار خیال سے باز رکھیں جس پر عمل کرتے ہوئے وزیر اعظم نے اپنے ایک وزیر کی سرزنش بھی کی۔ رام جیٹھ ملانی ویسے تو کشمیر کے حق میں بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ وہاں ہونے والے مظالم کی مذمت بھی کرتے ہیں نوجوانوں کی گرفتاریوں اور رہنماؤں کی نظربندیوں کے خلاف آواز بھی اٹھاتے ہیں۔ حریت کانفرنس سے رابطے میں رہتے ہیں لیکن جب حق خودارادی کی بات آتی ہے تو اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ کر صابر فخرالدین کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ ؎

دوستی کی آڑ میں ہم مخلصوں سے
کون کب تک دشمنی کرتا رہے گا

اسکاٹ لینڈ کے اندر ابھی حال میں ہونے والے استصواب کے نتائج کو ہندوستان کے ذرائع ابلاغ میں خوب سراہا گیا لیکن وہ نتائج جس سیاسی عمل کے بعد سامنے آئے اس پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ یہ اس حقیقت کا بلا واسطہ اعتراف ہے

گزشتہ ساٹھ سالوں سے کشمیری عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کے باوجود ہم ان کا دل نہیں جیت سکے۔ حکومت ہند کو کشمیر کے استصوابِ رائے میں اس نتیجہ کی توقع نہیں ہے جو اسکاٹ لینڈ میں سامنے آیا۔ ویسے برطانوی حکومت اپنی مرضی کے خلاف فیصلہ تسلیم کرنے کیلئے تیار تھی لیکن حکومت ہند اس کیلئے بھی راضی نہیں ہے۔ اٹل جی نے اس صورتحال کا اعتراف اس طرح کیا تھا کہ ہم میدانِ جنگ میں کامیاب ہو گئے مگر ہم نے موقع گنوا دیا یہی وجہ ہے کہ وادیٔ کشمیر کا ایک تہائی حصہ پاکستان کے قبضے میں ہے۔ کشمیر کے مسئلہ پر رام جیٹھ ملانی کا خیال ہے کہ پرویز مشرف کے پیش کردہ چار نکات بہترین حل کی بنیاد تھے لیکن اس کوشش کو حکومت ہند نے ناکام بنایا۔

کشمیر کے تئیں حکومت کے رویہ میں جماعتوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ رام جیٹھ ملانی علٰحیدگی پسندوں سے رابطہ کرتے ہیں خود وزیر اعظم بھی سیاسی مفادہ کی خاطر پیپلز کانفرنس کے رہنما سجاد لون سے ملاقات کرتے ہیں جن کی بابت اچانک یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ وہ تائب ہو چکے ہیں حالانکہ ان کی جماعت اب بھی حریت کانفرنس میں شامل ہے۔ اس کے برخلاف اگر پاکستانی سفارتکار حریت رہنماوں سے گفتگو کرتا ہے تو ہند پاک بات چیت معطل کردی جاتی ہےاور مودی جی امریکہ میں نواز شریف سے نہیں ملتے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ سے جب اس بابت دریافت کیا تو وہ کہہ دیتے ہیں چونکہ انڈیا

نے گفتگو معطل کی ہے اس لئے اعادہ بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ کٹھمنڈو میں مودی نواز ملاقات کی راہ ہموار کرنے کیلئے وزیر داخلہ راج ناتھ بیان دیتے ہیں کہ ہم اس کیلئے تیار ہیں لیکن وہ پہل کریں۔ پاکستانیوں کو کیا پتہ کہ راج ناتھ کا تعلق لکھنؤ سے ہے جہاں پہلے آپ پہلے آپ میں گاڑی نکل جاتی ہے اور وہ اس وقت چھوٹ گئی جب نواز شریف نے اوبامہ سے گزارش کردی کہ ہندوستان میں دورے کے وقت کشمیر کا مسئلہ اٹھائیں۔ اس دوران وزیر خارجہ سشما سوراج کی خاموشی نہایت معنی خیز بنی ہوئی ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے پاس وزارتِ خارجہ کا قلمدان ہے۔ وزیراعظم نے انہیں قلمدان تھما کر حاشیے پر کھڑا کردیا ہے اور ساری عالمی مجالس میں خود چہکتے پھدکتے نظر آتے ہیں۔

کشمیر کے حوالے سے حکومت ہند کے حالیہ اقدامات پر نظرڈالیں تو ایسا لگتا ہے وزیراعظم نریندر مودی ہو بہو اٹل جی کی پیروی کررہے ہیں۔ اٹل جی نے اپنے دورِ اقتدار میں کشمیریت، جمہوریت اور انسانیت کا نعرہ لگا کر ترقیاتی منصوبوں کی مدد سے کشمیری عوام کا دل جیتنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں اکھنڈ بھارت یا ہندو قومیت کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ انسانیت کی بنیاد پر حزب المجاہدین کے سید صلاح الدین تک سے رابطہ کیا گیا تھا۔ پاکستان بس یاترا کے بعد بات اس قدر آگے بڑھ گئی تھی کہ بقول نواز شریف ہم لوگ مسئلہ کے حل کے قریب پہنچ گئے تھے لیکن پرویز مشرف نے تختہ الٹ کر سارے کئے کرائے پر پانی

پھیر دیا۔ اس سال مئی میں انتخاب سے قبل مودی جی نے جموں میں کہا تھا کشمیر کا مسئلہ جو ساٹھ سال میں حل نہیں ہوا میں ساٹھ دن کے اندر اسے حل کر دوں گا۔ یہ کہتے وقت شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی اقتدار میں آجائیں گے اور ساٹھ تو کجا ۱۸۰ دنوں کے بعد یہ مسئلہ یونہی معلق کا معلق ہی رہے گا۔

اس بیچ کشمیر سے ایک اچھی خبر یہ آئی کہ فوجی عدالت نے ایک فرضی جھڑپ کے دوران تین کشمیری نوجوانوں کے قتل کے الزام میں دو افسران سمیت سات فوجی اہلکاروں کو عمر قید کی سزا سنا دی۔ یہ تصادم اپریل ۲۰۱۰ء کے آخری ہفتے میں شمالی کشمیر کے کپواڑہ ضلع میں ماژہل گاؤں میں پیش آیا تھا۔ اس میں تین مزدوروں کا قتل کیا گیا تھا۔ مقامی پولیس نے اس واقعہ کی تفتیش میں فوج کے لیے کام کرنے والے دو کشمیریوں اور نو فوجی اہلکاروں کے خلاف مقدمہ درج کیا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس تصادم کا راز افشا ہونے کے بعد کشمیر میں طویل احتجاجی تحریک چلی جسے دبانے کے لئے پولیس اور نیم فوجی دستوں نے مظاہرین پر فائرنگ کرکے ۱۲۰ سے زائد نوجوانوں کو ہلاک اور سینکڑوں کو زخمی کر دیا۔ اس کارروائی میں ہزاروں کم سن لڑکوں کو گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ انسانی حقوق کے اداروں کے مطابق ۲۴ سالہ شورش کے دوران کشمیر میں ۱۰ ہزار افراد لاپتہ ہوئے ہیں۔ وادی میں ۶ ہزار سے زائد گمنام قبروں کا انکشاف

ہوا ہے۔ جن میں فوج فرضی جھڑپوں میں نوجوانوں کو ہلاک کرکے ان قبروں میں دفن کردیتی تھی۔ بقول فائق

میری بستی میں ہر پتھر کے نیچے
لہو آمیز منظر سو رہا ہے

فرضی انکاؤنٹر میں کشمیری نوجوانوں کی ہلاکت کی تصدیق کا انکشاف ایک ایسے وقت میں ہوا جب ۳ نومبر کی شب فوج کے ہاتھوں مارے جانے والے ۲ نوجوانوں کی ہلاکت کا معاملہ ابھی زیرِ تفتیش ہے۔ فوج نے فرضی جھڑپ میں ملوث دو افسروں سمیت چھ فوجی اہلکاروں کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح کا ایک اندوہناک واقعہ ۲۰۰۰ء میں امریکی صدر بل کلنٹن کی بھارت آمد کے وقت بھی پیش آیا تھا جب دہشت گردی کا ہوا کھڑا کرنے کی خاطر جنوبی کشمیر کے چھتی سنگھ پورہ گاوں میں سکھ شہریوں کا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کے بعد فوج نے پتھری بل کے ۳۵ مقام پر ایک تصادم کا دعویٰ کیا اور کہا کہ سکھوں کے قتل میں ملوث پاکستانی شدت پسندوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ آگے چل کر سرکاری تحقیقات سے پتہ چلا کہ وہ عام شہری تھے جنھیں ان کے گھروں میں ہی زندہ جلا دیا گیا تھا۔ یہ معاملہ جب کئی عدالتوں کے چکر کاٹتا ہوا سپریم کورٹ پہنچا تو فوج کو حکم دیا گیا کہ مقررہ وقت کے اندر اس کی تفتیش کی جائے۔ یہ تفتیش ابھی مکمل نہیں ہوئی بلکہ تحقیقات جاری ہیں۔ خاک و خون

۔ میں لپٹی کشمیر کی تازہ صورتحال کی عکاسی سلیمان مجاز کے اس شعر میں ملاحظہ فرمائیں

خون سے سرخ ہوئی وادیٔ کشمیر مجاز
لوگ کیا اب بھی اسے رشک جہاں کہتے ہیں

وزیراعظم نے وادی میں انتخابی تقریر کے دوران ترقی کے عوض ماضی کو بھلا دینے کی نصیحت کی۔ یہ عجیب منطق ہے کہ دہلی میں انتخابی فائدے کیلئے سکھوں پر مظالم کی یاد کئے جاتے ہیں اور کشمیر میں ظلم و جبر کو بھول جانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ سنجیدہ مسائل سیاسی شعبدہ بازی سے حل نہیں ہوتے۔ کشمیر کے اندر سیلاب کے بعد آنے والی تباہی کے بعد مرکزی حکومت کی بے اعتنائی وہاں کی عوام دیکھ چکی ہے۔ اس کے بعد یہ انتخابی تقاریر کس قدر اثر انداز ہوں سکیں گی یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔ بی جے پی کی ساری امیدیں جموں سے وابستہ ہیں اگر وہاں پر سارے ہندو کانگریس کا ساتھ چھوڑ کر بی جے پی کے ساتھ ہو جائیں اور وادی کے مسلم ووٹ نیشنل کانفرنس، پی ڈی پی اور کانگریس میں تقسیم ہو جائیں تو اس سے بی جے پی ماضی کے کانگریس کی طرح ایک بڑی پارٹی بن کر ابھر سکتی ہے۔ وزیراعظم نے کشمیر میں لوٹ مار کی ذمہ داری مفتی اور عبداللہ خاندان پر ڈال کر کانگریس کو بچا لیا۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ کانگریس کی جگہ بی جے پی لے لے۔ اس سے کشمیر کی لوٹ تو بند نہیں ہو گی ہاں لٹیرہ بدل

جائیگا۔ انتخابی نتائج کشمیر کی زمینی صورتحال پر اثر انداز نہیں ہو سکتے اس لئے کہ نمائشی ردوبدل عزت و وقار کا متبادل نہیں ہے اور عدل و انصاف ہی حقیقی و پائیدار امن وسلامتی کا ضامن ہے۔

ششماہی نتائج: ٦ ماہ کے اندر چھٹی کا دودھ یاد آگیا

نئی مرکزی حکومت نے کسی طرح اپنی عمر کا آدھا سال مکمل کرہی لیا ہے۔ اب اگر کوئی انتخابی وعدوں کی روشنی میں جائزہ لے کہ اس عرصہ میں ہم نے کیا کھویا کیا پایا تو اس کے سامنے دلچسپ انکشافات ہوں گے ۔ اسے پتہ چلے گا کہ جو خواب دکھلائے گئے تھے وہ تو چکنا چور ہوگئے لیکن جو کچھ ہوا وہ بھی کسی کے خواب و خیال میں نہیں تھا۔ مثلاً جب وزیراعظم گوہاٹی میں خفیہ ایجنسیوں کے اعلیٰ افسران سے خطاب کرتے ہوئے اچانک بھول گئے کہ وہ بچوں کی کلاس روم نہیں ہیں اور کسی استاد کی طرح اے فور اپیل کی گردان پر ہال میں موجود شرکاء کو ''اسمارٹ پولیسنگ'' کا مطلب سمجھانے لگے۔ ایس سے حساس اور سخت (sensitive & strict)، ایم سے جدید اور متحرک (Modern & mobile)، اے سے ہوشیار اور جوابدہ (alert & accountable)، آر سے قابل بھروسہ اور مدد کو آنے والا (reliable & responsive)، اور ٹی سے تربیت یافتہ اور تکنیکی ماہر (trained & technical savvy) ہوتا ہے تو اس وقت سی بی آئی کے ڈائرکٹر رنجیت سنہا نیند کے جھونکے کیتے ہوئے پائے گئے۔ ٹیلی ویژن کے پردے پر ساری دنیا ان کے اونگھنے کا نظارہ کیا۔ سوال یہ ہے پیدا ہوتا ہے کہ نام نہاد خطیب اعظم کی تقریر کے دوران یہ نوبت کیوں پیش آئی؟ وجہ صاف ہے سرکاری افسران کے کان پر دھان پر چارک کے گھسے پٹے پروچن سن

سن کر پک چکے ہیں۔

عوام کے اندر جو بیزاری پیدا ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قومی ذرائع ابلاغ میں وزیر اعظم کی تعریف و توصیف میں لکھے جانے والے کئی مضامین کی سرخی متضاد لگی ہوتی ہے مثلاً حال میں ایک خبر چھپی جس کا عنوان تھا مودی سرکار صرف باتوں کی شیر ہے لیکن اندر سارا مضمون وزیر اعظم کی تعریف سے اٹا پڑا تھا اس کے باوجود یہ منفی سرخی اس لئے لگائی گئی کہ لوگ مودی کی خوشامد پڑھتے پڑھتے اس قدر بور ہو گئے ہیں کہ اب مزید پڑھنا گوارہ نہیں ہے۔ ۶ ماہ کے اندر اس قدر جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس کی وجہ وزیر اعظم کے طریقۂ کار ہے۔ مثلاً مودی جی نے نیپال جاتے ہوئے ٹویٹ کیا کہ وہ اپنے ساتھ ۲۶ سالہ جیت بہادر کو لے جارہے ہیں جو ۱۶ سال قبل اپنے والدین کو چھوڑ کر ان کے پاس آیا تھا۔بڑی مشکلوں سے اس کے ماں باپ کا پتہ لگایا گیا ہے اور اب وہ جیت بہادر کو اپنے والدین سے ملانے والے ہیں۔ اس جھوٹ کا بھانڈہ اس وقت پھوٹ گیا جب جیت بہادر کے فیس بک پر اس کی دو سال قبل اپنے والدین کے ساتھ کھنچوائی گئی تصویر ذرائع ابلاغ کی زینت بن گئی۔ جو شخص اس قدر جھوٹ بولے اور اس طرح شیخی بگھارے تو بھلا اس کی بات پر کس طرح یقین کیا جائے اور اسے کس طرح سنجیدگی سے لیا جائے۔

وزیراعظم کو اشتہار باز صحافی بڑی مہارت کے ساتھ اقتدار میں تو لے آئے لیکن اب وہی لاشعوری طور پر ان کے دوست نما دشمن بنے ہوئے ہیں اور انہیں اس طرح کی اوچھی حرکات سجھاتے ہیں جن پر بغیر سوچے سمجھے مودی جی عمل پیرا ہوتے ہیں۔ نئی حکومت کا سب سے بڑا مسئلہ خود وزیراعظم ہیں اس لئے کہ انہوں نے ساری توجہات کا مرکز اپنی ذات کو بنا لیا ہے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں اس لئے ان کے ذاتی مسائل بھی حکومت کے لئے دردِ سر بن جاتے ہیں۔ سچ تو یہ کہ بہت زیادہ تیز دوڑنے کے چکر میں وزیراعظم نت نئے مسائل میں بری طرح گھر چکے ہیں اور اس قلیل سے مدت میں حکومت مختلف محاذ پر ناکام ہو چکی ہے۔ وزیراعظم کے لئے گھر سے لے کر حلقۂ انتخاب تک سنگین مشکلات کا سامنا ہے۔اندرون ملک اور عالمی سطح پر درپیش چیلنجز کو دیکھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ مودی جی کا ستارہ گردش میں آچکا ہے۔ کوئی بعید نہیں جلد ہی وہ بھی وزیر تعلیم سمرتی ایرانی کی طرح کسی جیوتش کو اپنا ہاتھ دکھلاتے ہوئے نظر آئیں لیکن اصل مسئلہ ہاتھ کا نہیں سر کا ہے بہتر ہوگا کہ وہ کسی ماہر نفسیات سے رجوع فرمائیں تاکہ دماغ درست ہو سکے۔

وزیراعظم کو اپنی سرکار کی پہلی نصف سالگرہ پر بہترین مبارکباد ان کی نصف بہتر جشودھا بین نے دی۔ انہوں نے مہسانہ پولس تھانے میں جا کر حق معلومات کے تحت جو وضاحتیں طلب کی ہیں وہ شکایات کا ایک ایسا دفتر ہے کہ اس نے ساری

قوم کو اقوام عالم کے سامنے رسوا کردیا۔ ساری دنیا کے لوگ زبانِ حال سوال کر رہے ہیں کہ کیا کوئی پتی اپنی دھرم پتنی کے تئیں اس قدر کٹھور ہو سکتا ہے؟ اگر شخص اپنی زوجہ کی اس طرح حق تلفی کرے تو کیا اس کے پاس حکومت کرنے کا اخلاقی استحقاق ہوتا ہے؟ کیا ایسے سربراہ مملکت سے ملک کی خواتین اپنے حقوق کا محافظ بنا سکتی ہیں؟ ایک زمانے میں شہنشاہ سلیم جہانگیر کی ملکہ نورجہاں نے قیام عدل کی خاطر انصاف کا ترازو نصب کروایا تھا لیکن آج ایک جمہوری بادشاہ کی ملکہ خود اپنے حقوق کی خاطر دردر کی ٹھوکریں کھارہی ہے۔ وہ اپنے شوہر نامدار کی جانب سے اپنی حفاظت پر تعینات محافظین سے خوف کھاتی ہے اور برملا کہتی ہے کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ محترمہ جشودھا بین نے اپنے سوالنامہ میں دس وضاحتیں طلب کی ہیں اور ٦ مرتبہ یہ لکھا ہے کہ میں جشودھا بین وزیر اعظم نریندر مودی کی زوجہ یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ۔۔۔۔۔۔ مودی جی کو اپنی حکومت کے ٦ ماہ کی تکمیل پر اس سے بہتر تحفہ اور کیا مل سکتا تھا؟

وزیر اعظم نریندر مودی ریاستِ گجرات کے رہنے والے ہیں وہاں سے ایک نہایت دلچسپ خبر یہ آئی ہے کہ کرایہ دار اور زراعتی زمین کا قانون جو نریندر مودی نے ۲۰۱۱ میں وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے منظور کرکے دہلی بھیجا تھا اسے وزیر اعظم مودی کی وزارتِ داخلہ نے تکنیکی بنیاد پر نامنظور کرکے واپس

بھیج دیا ہے۔ اس قانون پر نہ صرف گورنر نے بلکہ یو پی اے سرکار نے بھی اعتراض کیا تھا لیکن وہ سب تو خیر دشمن تھے اب تو ان کی اپنی حکومت ہے اس کے باوجود وضاحت کی خاطر اس بل کا واپس ہوجانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدرش گجرات میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ مرکزی حکومت کے ادارے سی اے جی کی رپورٹ گجرات سرکار کے اس دعویٰ کی تردید کرتی ہے کہ ریاست میں اسکول سے نکلنے والے طلباء کی تعداد گھٹ کر ۹ء۷۰ فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ یہ تعداد ۷ء۱۹ فیصد ہے۔ اس کی وجہ اسکولوں میں سہولیات کی عدم فراہمی بتلائی جاتی ہے۔ وزیراعظم کو معلوم ہونا چاہئے کہ یوم اساتذہ پر تقریر کرنا جس قدر آسان ہے تعلیم کے فروغ کی خاطر سنجیدہ کوشش اسی قدر مشکل ہے۔ معیشت کے میدان میں بھی حکومت ہند کے حالیہ انکشاف کے مطابق گزشتہ سال کے اعداد و شمار کی بنیاد پر ملک کی سب سے زیادہ جی ڈی پی (مجموعی پیداوار کی شرح) والی جن پانچ ریاستوں کے نام کا اعلان کیا گیا ہے اس میں گجرات تو کجا بی جے پی حکومت والی کوئی ایک بھی ریاست نہیں ہے۔ سب سے اوپر مہاراشٹر جو حال میں بی جے پی کے ہاتھ آئی ہے اور یکم دسمبر کی خبر کے مطابق وزیراعلیٰ فردنویس کے علاقہ ودربھ کے اندر ایک دن کے میں ۱۸ افراد نے خودکشی کی ہے اور وزیراعلیٰ سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہیں۔ اس کے بعد اترپردیش، آندھراپردیش، تمل ناڈو اور پھر اڑیسہ کا نمبر آتا ہے۔ اس کے باوجود بی جے پی والے بے شمار خوش فہمیوں کو شکار ہیں۔ بی جے پی کی ریاستی سرکاروں پر یہ شعر صادق

ے آتا ہے کہ

خوش فہمیوں کے سلسلے اتنے دراز ہیں ہر اینٹ سوچتی ہے کہ دیوار مجھ سے ہے۔

وزیر اعظم نے بڑودہ کے علاوہ (جہاں وہ کسی زمانے میں سنگھ پرچارک تھے) وارانسی سے بھی انتخاب لڑا لیکن حلف برداری کے بعد بڑودہ سے استعفیٰ دے کر وارانسی کی نمائندگی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب پتہ چلا ہے کہ وارانسی میں ۳ لاکھ گیارہ ہزار فرضی رائے دہندگان کی شناخت ہو چکی ہے۔ اور تفتیش جاری ہے۔ ان فرضی ووٹرس کی تعداد ساڑھے چھے لاکھ تک جانے کا امکان ہے۔ یہ کوئی ہوائی الزام تراشی نہیں ہے بلکہ الیکشن کمیشن کے ذریعہ گھر گھر جا کر رائے دہندگان کی شناخت کے کام کا نتیجہ ہے۔ ایسے میں جب یکم جنوری کو نئی فہرست جاری ہوگی اور اس میں سے فرضی ووٹرس نکال دیئے جائیں گے تو اروند کیجریوال کے اچھے دن اپنے آپ آجائیں گے اس لئے کہ مودی جی کا انتخاب تو کالعدم قرار دے دیا جائیگا۔ ویسے بھی الہ باد کی عدالت میں زوجہ جشودا بین کی آمدنی کے حوالے لاعلمی کے اظہار پر حلف نامہ میں دروغ گوئی کا مقدمہ چل ہی رہا ہے۔ اس قضیہ میں ایک الزام کا اضافہ ہو جائیگا۔

مودی جی وارانسی کے بارے میں خاصے فکر مند ہیں جب کبھی انہیں نروان ہوتا ہے

کہ پاپیوں کے پاپ دھوتے دھوتے رام جی کی گنگا میلی ہوچکی ہے تو وہ پھاوڑا لے کر اس کے گھاٹ کی صفائی کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ جاپان جاتے ہیں تو کاشی کو کیوٹو کی طرح بنانے کا عزم کرنے لگتے ہیں۔ نیپال میں جاکر اسے گوتم بدھ کے جائے پیدائش لوم بنی اور نروان گاہ بودھ گیا سے جوڑنے کیلئے بس روانہ کرواتے ہیں جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں ایک دوسرے سے برسرپیکار طلباء کو ایک دوسرے سے جوڑا جائے۔ بی ایچ یو میں ودیارتھی سنگھ اور وریارتھی پریشد کی لڑائی ٹھاکر اور براہمنوں کا تنازع بن گئی ہے۔ ۱۱۰ طلباء گرفتار کرکے جیل بھجوائے جاچکے ہیں۔ اس جھگڑے میں یقیناً براہمنوں کو جوشی جی کا تو ٹھاکروں کو راج ناتھ کا آشیرواد پراپت ہوگا لیکن مودی جی کے ساتھ ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ مودی جی کو چاہئے کہ وہ اپنی پارٹی کے کارکنوں کو علی گڑھ کے بجائے بنارس ہندو یونیورسٹی کے کیمپس میں بھیج کر اپنا قلع محفوظ کرائیں ورنہ اگلی بار ضمانت ضبط ہو جائیگی۔

حلقۂ انتخاب سے نکل کر اگر قومی سطح پر آئیں تو وہاں آج کل کالا دھن چرچے میں ہے۔ سپریم کورٹ اس معاملہ میں سرکار کو پھٹکار لگا چکا ہے اس کے باوجود کمال ڈھٹائی کے ساتھ وزیر پارلیمانی امور وینکیا نائیڈو نے انتخابی وعدے سے مکرتے ہوئے اعلان فرمادیا کہ ہم نے کبھی کہا ہی نہیں تھا کہ ۱۰۰ دن

کے اندر کالا دھن واپس لائیں گے ۔ سفید دھن کی بات کریں تو غریب عوام کیلئے جو جن دھن یوجنا شروع کی گئی ہے اس کے تحت لاکھوں لوگوں کے بنک کھاتے تو کھولے گئے لیکن ان میں ڈالنے کیلئے سرکار کے پاس ایک دمڑی نہیں ہے جبکہ گوتم اڈانی کو وزیر اعظم خود اپنی موجودگی میں آسٹریلیا کے اندر سرمایہ کاری کی خاطر سرکاری بنک سے ۶ ہزار کروڈ کا قرض مہیا کروادیا۔ اب یہ واپس ہوگا یا نہیں اس کا علم نہ لینے والے کو ہے اور نہ دینے والے کو جہاں تک دلانے والے کا سوال ہے اس کے فرشتے بھی اس بابت کچھ نہیں جانتے۔ ایسے میں ہندوستان کے غریب لوگ جنھوں نے اپنا قیمتی ووٹ دے مودی جی کو کامیاب کیا تھا سوال کرتے ہیں

خود اتنا جو ہوادار سمجھ رکھا ہے کیا ہمیں ریت کی دیوار سمجھ رکھا ہے

اس دوران گاندھی جینتی کے موقع پر راشٹر پتا گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے صفائی مہم چلائی گئی ۔ اس کار خیر میں شریک ہونے کیلئے قومی سطح پر وزراء اور افسران کی فوج جھاڑو لے کر سڑکوں پر اتر آئی ۔ اس مہم کے نتیجے میں کچرا صاف تو نہیں ہوا لیکن کچرے کی مانگ ضرور بڑھ گئی اور اس کی قدر و قیمت میں بھی خوب اضافہ ہوا۔ اس لئے کہ صفائی مہم سے پہلے سڑک کو بڑے اہتمام سے صاف کیا جاتا تھا پھر کچرے کو ڈھو کر وہاں پھیلایا جاتا تھا۔ ٹیلی ویژن والوں کو خبر کی جاتی تھی اور جب وہ پہنچ جاتے تو سرکاری افسران

اور وزرائے کرام میک اپ کرکے جھاڑو تھامتے اور کچرے کی جانب بڑھتے تو پتہ چلتا کہ کچرا کم ہے اور صفائی کرنے والے زیادہ ہیں ۔ خود وزیراعظم کے حصے میں جو دوچار ہرے پتے آئے جنہیں دیکھ کر ماہرین نباتات حیران رہ گئے کہ ان سبز پتوں کو آخر ہوا نے اپنی شاخ سے کیسے الگ کردیا ۔ اس معمہ کا راز انڈیا اسلامک سینٹر پر کھل گیا جہاں ٹیلی ویژن کا کیمرہ مین وقت سے پہلے پہنچ گیا اور اس نے کچرا صاف کرنے والوں سے قبل اس کے پھیلانے والوں کی رنگ برنگے کچرے کے ساتھ فلم بندی کرلی نتیجہ یہ ہوا کہ کچرا پھیلانے والے ہیرو ہوگئے اور اس کو صاف کرنے والے زیرو ۔ اس طرح گویا ہمارے سیاستدانوں نے اپنے مفاد کی خاطر گاندھی جینتی کا بھی کچرا کردیا۔

وزیراعظم فی الحال اپنے گھر سے نکلتے ہیں تو کسی انتخابی مہم میں جٹ جاتے ہیں یا غیر ملکی دورے پر نکل جاتے ہیں ۔ ان چھ ماہ میں پورے ایک ماہ تو وہ ملک سے باہر رہے جب اندر تھے تو آنے جانے کی تیاریوں میں مصروف عمل رہے ۔ ان کی کفایت شعاری کا یہ عالم ہے کہ ہے برازیل جاتے ہوئے جرمنی کی چانسلر سے ملنے کی ناکام کوشش کرڈالی۔ اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے امریکہ گئے تو ناچ گانے والوں کے ساتھ وہاں رہنے بسنے والے ہندوستانیوں کی تفریح طبع کا سامان کیا۔ تاجروں اور صنعتکاروں کی خوشامد میں لگے رہے اور اسرائیل کے وزیراعظم سے مل کر ہتھیاروں کا سودہ بھی کرآئے۔ صدر واوبامہ کے

مہمان بن کر شہرت بٹورنے کی کوشش کی۔ جاپان میں جاکر ڈھول تک بجا دیا لیکن اس کے باوجود نیوکلیائی بجلی گھر کی تکنیک لانے میں ناکام رہے۔ آسٹریلیا پہنچے ہر تصویر میں اپنے مخاطب کے بجائے فوٹو گرافر کو دیکھتے نظر آئے۔ آسٹریلیا والوں سے اپنے ملک میں سرمایہ کاری کرانے کے بجائے خود ان کے ملک میں سرمایہ کاری کر آئے لیکن ان سب سے دلچسپ سفر نیپال کا رہا۔

نیپال کا سفر وزیر اعظم نے دو مرتبہ کیا۔ پہلی بار وہ صرف پشوپتی ناتھ مندر میں پوجا پاٹ کرنے کیلئے گئے تھے اور ڈھائی ٹن صندل ہون میں پھونک آئے۔ دوسری بار سارک کانفرنس میں جانے کا ارادہ کیا تو ساتھ ہی لوم بنی، مکتی ناتھ اور جنک پوری جانے کا بھی منصوبہ بنا لیا۔ یہ شہر مدھیش کی ترائی میں ہیں جہاں ہندی بولنے والے کثیر تعداد میں رہتے بستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حکومت نیپال نے اس کی اجازت نہیں دی تو اس کے خلاف وہاں کے لوگوں نے احتجاج کرکے یہ ثابت کردیا کہ مودی جی کا دورہ نیپال کی داخلی سیاست میں مداخلت کے مترادف تھا۔ بظاہر دورے کے اختصار کی وجہ اندرونِ ملک مودی جی مصروفیت کو قرار دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ ایسی کون سے ناگہانی مصروفیت اچانک آگئی تھی جو دورہ مختصر کرنا پڑا؟ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے آخر رام بھکت مودی کو اچانک سیتا جی کی جنک پوری کیوں یاد آگئی؟

وشو ہندو پریشد ہر پانچ سال میں ایک مرتبہ ایودھیا سے جنک پوری تک رام بارات کا اہتمام کرتی ہے۔ اس بار وہ بارات ۷۱ نومبر کو ایودھیا سے نکلی۔ وی ایچ پی والے چاہتے تھے مودی جی ایودھیا سے اس بارات کو ہری جھنڈی دکھلائیں لیکن وزیر اعظم کے دفتر نے انہیں زعفرانی جھنڈی دکھا کر آگےبڑھا دیا۔ وی ایچ پی والوں نے اترپردیش کے گورنر رام نائک سے کام چلا لیا۔ اس بارات کو ۳۰ نومبر کے دن جنک پوری پہنچنا تھا اور اگر وزیر اعظم کا دورہ منسوخ نہ ہوتا تو مودی جی اسی کے آس پاس جنک پوری پہنچتے گویا بارات کا استقبال کرتے لیکن سارے کئے کرائے پر نیپالی حکومت نے پانی پھیر دیا۔ اس قضیہ کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے ایک ہندو راشٹر نے سیتا کی نگری جنک پوری میں ایک رام بھکت وزیر اعظم کو رام بارات کا استقبال کرنے سے محروم کردیا۔ ایسا ظلم تو شاید راون بھی نہیں کرتا لیکن یہ کل یگ اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مودی جی نے ٹراما سینٹر کا افتتاح کرتے ہوئے نیپالی حکومت پر اپنا نزلہ اتارا۔ انہوں نیپالی حکومت کو نہایت سخت انداز میں دو نصیحتیں کرڈالیں اول تو یہ کہ میعاد مقررہ کے اندر دستور سازی کا کام مکمل کرلیا جائے نیز اس کام میں اکثریت کی رائے کے بجائے اتفاق رائے پر انحصار کیا جائے۔

مودی جی کے اس پروچن کی نیپال کے ایوانِ سیاست اور ذرائع ابلاغ میں خوب جم کر تنقید ہوئی۔ عوام و خواص دونوں کو پھر ایک بار بڑے بھائی والا ہندوستانی

کردار یاد آگیا۔ مودی جی کی نصیحت کو داخلی معاملات میں مداخلت سمجھا گیا۔ اتفاق رائے کی سیاست کا درس دینے والے وزیراعظم مودی نے خود اپنے پرنسپل سکریٹری نرپندر مصرا کا تقرر حزب اختلاف کو اعتماد میں لئے بغیر کیا۔ دستور کے مطابق ٹی آر اے آئی کے سربراہ کو کوئی اور سرکاری ذمہ داری دینے کی اجازت نہیں ہے لیکن اس بل کو بالائے طاق رکھ ایوان زیریں میں اکثریت کی بنیاد پر آرڈیننس کو حق بجانب ٹھہرا دیا گیا جبکہ ایوان بالا میں حکمراں جماعت کو اکثریت حاصل نہیں ہے اور وہاں سب سے بڑی جماعت کانگریس اس کی مخالف تھی اس کے باوجود من مانی کی گئی۔ جو لوگ خود اپنی دستوری ذمہ داریوں کا پاس و لحاظ نہیں رکھتے انہیں دوسروں کو نصیحت کرنے قبل یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ۔

شیش محل میں رہنے والو ہم پر پتھر نہ پھینکو
پتھر واپس لوٹیں گے تو پھر شیش محل کا کیا ہوگا

میں ہوں 'آتنک' میرا نام ہے دہشت گردی

جھارکھنڈ اور جموں کشمیر ان دو ریاستوں میں فی الحال انتخابی مہم چل رہی ہے۔ اس دوران کشمیر کے اندر ایک ہی دن میں چار دہشت گردانہ حملے ہوئے جس کی گونج جھارکھنڈ کے جلسوں میں سنائی دی۔ پہلے تو وزیراعظم نے کشمیر میں مرنے والے فوجیوں کو خراج عقیدت پیش کیا اور اعلان کیا کہ یہ ہماری جمہوریت پر حملہ ہے جسے ہم ناکام بنادیں گے۔ اس کے بعد راہل گاندھی نے اس کا جواب دیا کہ کانگریس کے دس سالہ دورِ اقتدار کے دوران کشمیر میں امن و امان تھا اور وہاں سیاح آتے تھے۔ اب بی جے پی کی حکومت میں دہشت گرد آتے ہیں۔ راہل گاندھی یہ بولنے سے بھی نہیں چوکے کہ مودی جہاں بھی جاتے ہیں امن و امان غارت ہو جاتا ہے۔ ان دونوں رہنماؤں کی ساری باتیں درست ہیں لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ انہیں جھارکھنڈ کے اندر کشمیر کا غم تو ستاتا ہے لیکن پڑوس کی ریاست چھتیس گڑھ میں ہونے والا حملہ نظر نہیں آتا جبکہ ضلع بستر میں ہونے والے حملے میں زیادہ فوجی کام آئے اور حملہ آوروں کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔

جھارکھنڈ اور جموں کشمیر کی نہ تاریخ یکساں ہے اور نہ جغرافیہ جبکہ ایک دوسرے سے متصل جھارکھنڈ و چھتیس گڑھ کی تہذیب و ثقافت تک مشترک ہے اس لئے

فطری طور پر یہ ہونا چاہئے تھا کہ جھارکھنڈ میں کشمیر کے بجائے چھتیس گڑھ کی دہشت گردی موضوع بحث بنتی لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس سوال کے جواب میں دہشت گردی کے حوالے سے ہماری سیاسی جماعتوں کا رویہ پوشیدہ ہے۔ چھتیس گڑھ کے قبائلی عوام کی طرح جھارکھنڈ کے ادیباسیوں کی ہمدردیاں بھی ماؤنوازوں کے ساتھ ہیں ۔اس لئے راہل گاندھی ماؤ وادیوں پر تنقید کرکے انہیں انتخاب کے موقع پر ناراض نہیں کرنا چاہتے ۔ وزیراعظم چھتیس گڑھ کا حوالہ اس لئے نہیں دے سکتے کہ گزشتہ دس سالوں سے وہاں ان کی اپنی پارٹی حکومت کررہی ہے ۔اب اگر بی جے پی اس طویل عرصہ میں اپنے تمام لاؤلشکر اور بلند بانگ دعووں کے باوجود سرخ دہشت گردی پر قابو پانے میں ناکام رہی تو بھلا کشمیر میں کیا کرلے گی ۔ چھتیس گڑھ میں بی جے پی کے بجائے کسی اور جماعت کی حکومت ہوتی تو اسے بدنام کرنے کیلئے ممکن ہے جھارکھنڈ میں ماونوازوں کی دہشت گردی موضوع بحث بن جاتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں دہشت گردی کی آگ پر اپنی سیاسی روٹیوں کو سینکنے میں مہارت حاصل کرچکی ہیں ۔اس لئے وہ دہشت گردی کی آگ کو بجھانا تو درکنار جب یہ ازخود سرد ہونے لگتی ہے تو اس میں تیل ڈال دیتی ہیں ۔

عصر حاضر میں دہشت گردانہ حملوں کے پس پشت کارفرما وجوہات کا پتہ لگانا ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے اس لئے کہ ہر حملہ کے اغراض و مقاصد ایک

دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ مختلف لوگ اس سے انواع اقسام کے فائدے اٹھاتے ہیں اس لئے حقائق شاذونادر ہی ذرائع ابلاغ کی زینت بن پاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جنگ آمنے سامنے فوجیوں کے درمیان میدان میں لڑی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب ترقی ہوئی تو فضا سے نہتے شہریوں پر بمباری ہونے لگی لیکن وہ معاملہ بھی دشمن کے حدود میں ہوتا تھا اب یہی چیز دہشت گردی کی شکل اختیار کرکے جمہوری حکمرانوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئی ہے جس سے وہ انتخاب میں کامیابی حاصل کرکے اقتدار حاصل یا محفوظ کرتے ہیں۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ جب حکومت پیچیدہ مسائل میں گھر جاتی ہے تو عوام کی توجہات کو دوسری جانب مبذول کرانے کی خاطر یہ گھناؤنا کھیل شروع کروادیا جاتا ہے۔

جھارکھنڈ میں جو کچھ ہوا وہ عوامی نقطۂ نظر سے بے حد افسوسناک اور انتظامی زاویہ سے نہایت شرمناک ہے۔ بستر ضلع کے سوکما گاوں میں ہونے والے اس حملے میں کل ۱۴ جوانوں کے ہلاک ہونے کی تصدیق ہوچکی ہے جن میں سے دو کی لاش تک نہیں ملیجبکہ حملے کے بعد کوبرا بٹالین کے ۶۰ جوان رات دیر گئے اپنے کیمپ میں نہیں لوٹے تھے۔ انتظامیہ کی نااہلی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرنے والوں میں سے ایک دیپک کمار زخمی ہونے کے ۷ گھنٹے بعد ۹ کلومیٹر تک گھسٹتا ہوا کسی طرح چھاؤنی تک پہنچا اور وہاں بھی مناسب طبّی سہولیات کی عدم موجودگی کے سبب لقمۂ اجل بن گیا۔ ایک ایسی ریاست میں جس کا وزیر اعلیٰ

ڈاکٹر من سنگھ طبّی پیشے سے متعلق ہے فوجیوں کے ساتھ یہ بے اعتنائی کس قدر اہانت آمیز ہے۔بی جے پی والوں کو دیش بھکتی کے بھجن گانا تو خوب آتا ہے لیکن فوجی جوانوں کے ساتھ اس کی ریاستی اور مرکزی حکومت کا یہ سلوک سنگھ پریوار کی پاکھنڈ کو بے نقاب کرتا ہے۔اس حملے کے بعد فوجی تقدس کو پامال کرنے والا ایک اور واقعہ اس وقت سامنے آیا جب فوجیوں کی وردی امبیڈکر اسپتال کے کچروں کے ڈبے میں پائی گئی جنہیں کانگریسی اپنے ساتھ لے گئے اور خوب شہرت حاصل کی۔

دنیا بھر کی سیر کرنے والے وزیراعظم کو جائے حادثہ پر جانے کی توفیق اس لئے نہیں ہوئی کہ فی الحال وہاں انتخابات کا انعقاد نہیں ہو رہا ہے لیکن مودی جی نے دیپک کمار کے جموں میں واقع سامبا میں انتخابی جلسہ سے ضرور خطاب کیا۔ وزیراعظم وہاں دہشت گردی کے خلاف دھواں دھار تقریر تو کر آئے لیکن جو حکومت اپنے فوجیوں کے علاج و معالجہ سے قاصر ہو اس کی کھوکھلی تقاریر کا کیا فائدہ؟ دیپک کمار کے علاوہ مرنے والوں میں وادیٔ کشمیر کا ایک جوان محمد شفیع بھٹ بھی تھا۔ ان دونوں کے علاوہ دیگر آٹھ ریاستوں کے ۱۲ جوان تھے لیکن ان میں سے کسی کا تعلق گجرات سے نہیں تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گجرات نے ملک ایک مہاتما دو وزرائے اعظم اور دو نائب وزرائے اعظم تو دیئے لیکن ایک بھی قابلِ ذکر فوجی نہ دے سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ریاست یا تو امبانی، اڈانی اور مفت لال جیسے سرمایہ دار تیار کرتی ہے یا ۵۶ انچ کا سینہ

رکھنے والے سیاستدان لیکن دشمن سے سینہ سپر ہونے والا بہادر جوان یہاں پیدا نہیں ہوتے۔

وزیر اعظم نے کشمیر میں جب یہ اعلان کیا کہ آپ لوگ مجھے ووٹ دو تاکہ میں ''اچھے دن لا سکوں'' تو لوگوں کو لگا کہ وہ بھی کوئی لطیفہ سنانے جارہے ہیں اس لئے کہ گزشتہ ماہ میں سب سے زیادہ لطائف اسی اچھے دن والے فقرہ یا نعرہ پر گھڑے گئے ہیں۔ویسے جھارکھنڈ میں تو وزیر اعظم نے لطیفہ سنا ہی دیا۔ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ اس ریاست کی تشکیل کے بعد کسی نے اس کی ترقی کی جانب توجہ نہیں دی اب میں دوں گا۔ مودی جی کو نہیں معلوم کہ تشکیل ریاست کے بعد ۱۴ میں سے ۹ سال بی جے پی وہاں حکومت کرچکی ہے اب وہ بتائیں کہ ان کی اپنی جماعت نے ریاست کی ترقی سے صرفِ نظر کیوں کیا؟ اور اگر پہلے اس جانب توجہ نہیں دی تو آگے کیسے دیں گے؟ دوسرا لطیفہ انہوں نے یہ سنایا کہ اگر اس ریاست میں کوئلہ نکل آتا ہے وہ مرکزی خزانے سے ہزار کروڑ روپئے دیں گے۔ یہ اعلان نہایت معنی خیز ہے یعنی اگر کوئلہ نہ نکلے تو ۲۰ نہیں دیں گے گویا اس رقم کا تعلق ووٹ سے ہے نہیں کوئلے سے ہے۔

وزیر اعظم کو ممکن ہے اس بات کا علم نہ ہو کہ ان کی مجوزہ امداد کے بغیر جھارکھنڈ سے لاکھوں ٹن کوئلہ تو نکل رہا ہے ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ

یہ ۲۰ ہزار کروڑ کی خطیر رقم کیسے دی جائیگی؟ کیا ان غریبوں کو جو جلسہ میں زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے؟ جی نہیں یہ رقم گوتم اڈانی جیسے کسی سرمایہ دار کو دی جائیگی تاکہ وہ زمین کے اندر سے یہ کالا سونا نکالے اور حکومت کو چالیس ہزار کروڑ میں فروخت کرکے اپنے وارے نیارے کرلے۔ وزیر اعظم کا ایسا ہے کہ وہ جاپان جوہری تکنیک حاصل کرنے کیلئے جاتے ہیں تو بولیٹ ٹرین لے کر لوٹ آتے ہیں۔ آسٹریلیا میں جوہری ایندھن لینے کیلئے جاتے ہیں کوئلے کی کان میں سرمایہ کاری کرآتے ہیں۔ تیل دراصل کوئلے سے بہتر ایندھن ہے اس لئے کہ اس کی کان کنی پر کم خرچ آتا ہے اس کے استعمال سے فائی آلودگی بھی کم ہوتی ہے اس لئے اس کی روک تھام پر سرمایہ خرچ نہیں ہوتا لیکن چونکہ کوئلہ سستا ہوتا تھا اس لئے ان مشکلات کو انگیز کیا جاتا تھا۔ اب صورتحال بدل گئی ہے آج کل تیل کا بھاؤ اس قدر کم ہوگیا ہے کہ ایسے میں کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے کرنا بے سود ہے لیکن جو شخص اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتا ہو اسے بھلا یہ بات کیسے سمجھائی جاسکتی ہے؟

وزیراعظم نریندر مودی اور وزیرداخلہ راج ناتھ سنگھ کے درمیان فی الحال کاموں کی تقسیم کچھ اس طرح ہے کہ اول الذکر انتخابی جلسوں میں عوام کا دل لبھاتے ہیں اور موخرالذکر عوام کی مشکلات کو سلجھاتے ہیں اس لئے چھتیس گڑھ کا دورہ راج ناتھ نے کیا اور واپس آکر پارلیمان میں اس پر بیان بھی دیا۔ اس

حملے کو بزدلانہ قرار دے کر اس کی مذمت کی۔ علاج اور وردی کے مسئلہ پر انہوں نے وزیر اعلیٰ سے گفتگو کی اور کہا کہ جو بھی اس ذمہ دار ہو گا اس پر کڑی کارروائی کی جائیگی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ ڈاکٹر رمن سنگھ کو سخت سست کہتے یا ان پر کارروائی کرتے لیکن یہ بی جے پی کی سنسکرتی کے خلاف ہے کہ کسی اپنے آدمی کی سرزنش کی جائے چاہے وہ سادھوی نرنجن جیوتی ہو یا ڈاکٹر رمن سنگھ۔ راج ناتھ سنگھ نے ہلاک شدگان کے وارثین کو ۳۸ لاکھ وزخمیوں کو ۵۶۰۰۰ ہزار کی امداد کا اعلان کیا۔ ملک کی خاطر جان لڑانے والوں کیلئے کیا حکومت کے پاس یہی کچھ ہے جبکہ یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ نکسلیوں سے لڑنے والے ۱۴میں ۱۰ جوان ملیریا کے شکار تھے ۔ اس حملے کے بعد مزید ۱۱ہزار جوانوں کو بستر ضلع میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا حالانکہ ۳۱ ہزار نفری حفاظتی دستہ وہاں پہلے سے موجود ہیں۔

چھتیس گڑھ ریاست کی تشکیل کے بعد سے گزشتہ ۱۵ سالوں میں وہاں ایک ہزار سے زیادہ فوجی ہلاک ہو چکے ہیں۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں بی جے پی والوں اپنے اس بیان پر نظر ثانی کرنی چاہئے کہ سارے مسلمان تو دہشت گرد نہیں لیکن سارے دہشت گرد مسلمان ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ بی جے پی کی حکومت میں جنگجو تحریکوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ چھتیس گڑھ میں سب سے بڑا حملہ اپریل ۲۰۱۰ء میں ہوا تھا جس میں ۷۶

فوجی جوان ہلاک ہوئے تھے۔ اس وقت اٹل جی وزیر اعظم تھے اور لوہ پروش اڈوانی جی وزیر داخلہ تھے۔اس علاقہ میں فوجیوں کے حوصلے اس قدر پست ہیں کہ ابھی حال میں بستر ضلع کے اندر تعنیات حفاظتی دستوں کے ۱۸ جوانوں کو نکسلی حملے کے وقت پیٹھ دکھا کر بھاگنے کے الزام میں معطل کردیا گیا۔ دیپک کمار کو جن لوگوں نے دم توڑتے دیکھا ہے ان کے حوصلے کس قدر شکستہ ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ کشمیر اور جھارکھنڈ کی سیاسی صورتحال میں یہ فرق ہے کہ جھارکھنڈ کے اندر بی جے پی آج بھی سب سے بڑی جماعت ہے مگر اکثریت سے محرومی اور دیگر جماعتوں کی عدم حمایت کے سبب بی جے پی اقتدار سے دور ہے اس لئے اسے صرف اپنے ارکان اسمبلی کی تعداد میں اضافہ درکار ہے۔ جھارکھنڈ مکتی مورچہ اور کانگریس کا اتحاد انتخاب سے قبل ٹوٹ چکا ہے جس کے سبب بی جے پی کی راہ آسان ہو گئی ہے۔ اس کے برعکس وادیٔ کشمیر میں بی جے پی کو کبھی بھی قبل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی ۔ جموں کے اندر فی الحال وہ کانگریس کی جگہ لے کر ایک بڑی جماعت بن چکی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان دہشت گردانہ حملوں سے جموں کا ہندو ووٹ تقسیم ہونے کے بجائے یکمشتبی جے پی کی جھولی میں گرجائیگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دہشت گرد اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں؟ اور اگر انہیں پتہ ہے کہ اس میں فی الحال بی جے پی کا سیدھا فائدہ ہے تو آخر اس موقع پر وہ لوگ یہ حملے کیوں کررہے ہیں؟ نیز کس کے اشارے پر کررہے ہیں ؟ اس سوال کا

جواب حملہ آوروں کی شناخت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

دہشت گردی کے حوالے سے ایک نہایت دلچسپ اداریہ بی جے پی کے ترجمان کمل سندیش میں شائع ہوا۔ اس میں راجیہ سبھا کے رکن اور پارٹی کے نائب صدر پربھات جھا نے لکھا کہ ان آشرموں کی گہری تفتیش ہونی چاہئے جو عقیدے کی بنیاد پر دہشت گردی کا مرکز بن گئے ہیں۔ اندھی عقیدت کی بنیاد پر ہونے والا استحصال اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم ہنوز تاریک دور میں جی رہے ہیں ۔ اس اداریہ اس طرح کے تمام آشرم پر پابندی لگانے کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے اور رام پال جیسے لوگوں پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی بات کہی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ کانگریسی حکومت پر الزام لگایا گیا کہ اس نے ست لوک آشرم کو ایک اسلحہ خانہ میں تبدیل ہونے کی اجازت دی۔ پربھات جھا صاحب کو شاید نہیں معلوم کہ ہریانہ ہی میں ایک آشرم ڈیرہ سچا سودہ بھی ہے۔ اس کے سربراہ پر قتل و غارتگری کے کئی الزامات ہیں اور اس نے گزشتہ انتخاب میں بی جے پی کی حمایت کی جسے بصد شوق قبول کیا گیا۔ کمل سندیش میں اعلان کیا گیا کہ رام پال کے آشرم کو خالی کرانے میں ایک قطرہ خون نہیں بہا جو خلاف واقعہ بات ہے اس میں نہ صرف عام شہری بلکہ حفاظتی دستوں کے لوگ بھی مارے گئے ۔

اس دوران ایک اور دلچسپ واقعہ گجرات کے اندر رونما ہوا جہاں وزیر اعظم کے

حلقۂ انتخاب بڑودہ میں پولس نے وشو ہندو پریشد کے چار کارکنان کو حافظ سعید کا پتلا جلانے کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ یہ لوگ حافظ سعید کے اس بیان پر غم وغصہ کا اظہار کررہے تھے جس میں انہوں نے کشمیریوں کو اپنا بھائی قرار دیا اور کہا کہ انتخابات کو استصواب کا متبادل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ مظاہرین کا مطالبہ تھا کہ حکومت کو پاکستان سے گفتگو بند کرکے جنگ کرنی چاہئے ان کے رہنما بھگوان بھرواڈ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی گرفتاری پر جو اس کے خیال میں سچے دیش بھکت ہیں حکومت کی پرزور مذمت کی ۔ اب کمل سندیش کو چاہئے کہ ان دیش بھکتوں کو بھی نصیحتکرنے کیلئے ایک اور اداریہ لکھے۔ سردوان فساد کے بعد وہاں سے قریب ۲۵ میل پر واقع سمولیہ مدرسے کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا گیا۔ این آئی اے نے وہاں اسلحہ کا پتہ لگانے کیلئے تالاب تک کو خالی کردیا لیکن ناکام ونامراد لوٹے اور بالآخر سارے الزامات بے بنیاد ثابت ہوئے اس کے برعکس ست لوک آشرم میں اسلحہ کا ڈھیر اور تربیت یافتہ کمانڈو کو ساری قوم نے ٹی وی پر دیکھا۔ جو لوگ کل تک مدرسوں کو دہشت گردی کا اڈہ بتاتے تھے ان کی جانب سے آشرم اور مٹھوں کو دہشت گردی کا مرکز قرار دیا جانا اور ان پر پابندی کا مطالبہ یقیناً ایک خوش آئند پیش رفت ہے۔

سانحہ پشاور: کل میری آنکھ نے پھولوں کے جنازے دیکھے

پشاور کے فوجی اسکول پر بہیمانہ حملہ ایسی انسانیت سوز حرکت ہے کہ اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ساری دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ ایسے مواقع پر لوگ اپنے آپسی اختلافات کو بھلا کر ظلم کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کے اندر فی الحال اس کا بہترین نمونہ دیکھنے کو ملا۔ اس سانحہ کے بعد فوج اورایوان سیاست کے درمیان کوئی کشیدگی منظر عام پر نہیں آئی۔ حزب اختلاف اور حزب اقتدار دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نظر آئے۔ سب نے مل معصوم بچوں کے شہادت پر رنج و غم کا اظہار کیا نیزان کے والدین کی ڈھارس بندھائی اور ان کے غم میں شریک ہوئے۔ کسی سیاسی یا غیر سیاسی جماعت نے اپنے مخالف کو موردِ الزام ٹھہرا کریا باہم الزام تراشی کرکے اس سانحہ کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ کسی نے دیگر ممالک پر بغیر کسی ثبوت کے بے بنیاد الزام لگا کرجنگ چھیڑ دینے کا نعرہ بلند کیا اور نہ نفرت کے جذبات کو ہوا دے کر عوام کا استحصال کیا۔ کوئی یہ کہتے ہوئے نہیں سنا گیا کہ بڑے۔بڑے شہروں میں چھوٹے موٹے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔اس سے قطع نظر جو نقصان ہوا وہ ناقابلِ تلافی ہے اور اس کی بہت بڑی قیمت یہ دہشت گرد نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی چکائیں گےاس لئے کہ مظلومین کی صدا کوئی اور سنے یا نہ سنے ان کا خالق اور مالک

ضرور سنتا ہے۔

حکومتِ ہند نے بھی اس موقع پر بالغ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سانحہ کی شدید الفاظ میں مذمت کی۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف کو ذاتی طور پر فون کیا اور تعزیت کی نیز اپنا تعاون پیش کیا۔ ایوان پارلیمان میں دو منٹ خاموشی اختیار کرکے شہداء کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور وزیر خارجہ سشما سوراج نے ارکان پارلیمان کا ظہرانہ منسوخ فرمادیا۔ اس رویہ کا اثر ذرائع ابلاغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے عموماً مثبت رخ اختیار کیا۔اس کے برعکس امت کے اندر مختلف قسم کا رد عمل دیکھنے میں آیا۔ ایسے لوگ جن کو دین اسلام سے یا دینی تحریکوں سے خدا واسطے کا بیر ہے اس اندوہناک سانحہ کے بعد بھی اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکے ۔اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مخالفین پر اوٹ پٹانگ الزامات لگانے لگے ۔ کسی نے اس درندگی کو دین اسلام سے جوڑ دیا۔ کوئی اس کیلئے دینی تحریکوں کو بہتان باندھنے لگا۔ کسی کو کلمہ پڑھوانا کھٹکا تو کسی کو ان کی عربی بول چال پر حیرت ہوئی اور کچھ لوگ تو ان دہشت گردوں کی داڑھی پر تبصرہ کرنے سے بھی باز نہیں آئے۔

دہشت گردی کی ابجد سے بھی جو لوگ واقف ہیں انہیں پتہ ہے کہ اس طرح کے حملے

کرنے والوں کا اپنے مخالفین کا سا حلیہ بنا لینا یا ان کی زبان بولنا عام سی بات ہے۔ یہ جگ ظاہر حقیقت ہے کہ ناتھورام گوڑسے نے جس کو رکن پارلیمان ساکشی مہاراج بہت بڑا دیش بھکت مانتے ہیں اور مہاراشٹر کی حکومت خراج عقیدت پیش کرتی ہے ایک مسلمان کا بہروپ دھار کر گاندھی جی کا قتل کیا تھا۔ اجمل قصاب نے بھی ہندوانہ حلیہ اختیار کر رکھا تھا اور اس کے ساتھی نے مراٹھی میں پانی بھی مانگا تھا اس لئے کسی کا عربی زبان یا داڑھی کو دیکھ کر مغالطہ میں پڑ جانا بچکانہ پن ہے۔ کلمہ پڑھانے والی بات بھی عجیب ہے کہ اگر وہ کلمہ پڑھنے کی بنیاد پر لوگوں کو چھوڑ دیتے تھے تو بھلا اسکول جانے والا کون سا بچہ ایسا ہو سکتا ہے جو کلمہ طیبہ نہ جانتا ہو۔ ویسے کلمہ والی ایک اور اندھا دھند گولی باری کی بے شمار شہادتیں ملی ہیں۔

دہشت گرد دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ چند سال قبل ناروے کے عیسائی دہشت گرد کا واقعہ روشنی میں آیا۔ امریکہ میں قتل و غارتگری کے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کے اندر رام پال باباکے ۳۰۰ کمانڈوز کی خبر ابھی حال میں آچکی ہے۔۔برما کے اندر بودھ بھکشو قتل وغارتگری کرتے نظر آتے ہیں اور اسرائیل میں انتہا پسند یہودیوں کا ظلم کس نے نہیں دیکھا لیکن

کہیں بھی ان افراد کی دہشت گردی کو ان کے دین سے نہیں جوڑا جاتا۔ اس دہشت گردی کی بنیاد پر ان مذاہب کی تبلیغ و اشاعت کیلئے کام کرنے والی مذہبی جماعتوں کو معتوب نہیں کیا جاتا۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہوتا ہے کہ جیسے ہی کوئی مسلم دہشت گردسفاکیت کا مظاہرہ کرے تو اس کی آڑ میں دین اسلام اور اس کی شریعت کو بدنام کیا جائے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسا کرنے والوں میں خود مسلمان پیش پیش ہوتے ہیں حد تو یہ کہ جب بے دین عناصر مسلم تحریکوں پر مظالم کے پہاڑ توڑتی ہیں تب بھی یہ لوگ ظالم کی مذمت کرنے کے بجائے مظلوم کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔

دہشت گردی فی زمانہ ایک نہایت پیچیدہ سیاسی حکمت عملی ہے اس کو صرف دو اور دو چار کی طرح نہیں دیکھا جاسکتا۔ کیا ہم یہ بھول گئے ہیں کہ کسی زمانے میں اجمیر دھماکہ، مکہ مسجد کا دھماکہ، مالیگاؤں بلاسٹ اور سمجھوتہ ایکسپریس میں ہونے والے بم دھماکوں کیلئے لشکر طیبہ اور جیش محمد کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا اور کئی مسلم نوجوانوں کو اس کے الزام میں گرفتار بھی کیا گیا تھا لیکن آگے چل کر خود قومی خفیہ ایجنسی نے اعلان کیا کہ ان کیلئے ہندو دہشت گرد ذمہ دار تھے جو فی الحال زیر حراست ہیں۔ عشرت جہاں کو بھی لشکر کا ایجنٹ کہہ کر انکاؤنٹر کردیا گیا جبکہ یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے وہ بے قصور تھی اور سیاسی فائدہ اٹھانے کیلئے اس کا ناحق قتل کیا گیا تھا۔ سہراب

الدین کے متعلق ابھی دو روز قبل قومی خفیہ ایجنسی کے وکیل نے عدالت میں کہا کہ وہ ایک مجرم پیشہ آدمی تھا۔ امیت شاہ اور ونجارہ نے پرجاپتی کے ساتھ مل کر سازش رچی اور اسے گرفتار کرواکر موت کے گھاٹ اتار دیا اس کے بعد اسے بھی لشکر کا دہشت گرد بھی قرار دے دیا گیا حالانکہ وزیر داخلہ اور پولس کا کام اسے گرفتار کرکے عدالت میں پیش کرنے کا تھا۔ اس کی اہلیہ کے ساتھ جو سلوک ہوا اس کا کوئی جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایسے میں کسی مجرم کے کسی تنظیم سے جوڑ دیے جانے پر جلد بازی دکھانے کے بجائے احتیاط سے کام لینا بہتر ہے اور سطحی گفتگو کے بجائے معروضی مطالعہ ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دہشت گردی کے واقعات کے پیچھے حکومتیں بھی سرگرم عمل ہوتی ہیں اور وہ بین الاقوامی سطح پر بھی یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے کچھ لوگ تو میدانِ عمل میں قتل و غارتگری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ پس پردہ
اپنے اغراض و مقاصد حاصل کرتے ہیں ایسے میں صرف ایک فریق پر نظر رکھنا اور دوسرے کو نظر انداز کردینا مناسب نہیں ہے بلکہ دونوں کو شناخت کے بغیر مسئلہ کی جڑ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ افغانستان کی طالبان اور تحریک طالبان پاکستان کی زبان، لباس طریقہ کار ایک جیسا ہے اس کے باوجود ان کے درمیان ایک ایسا بنیادی فرق ہے جس، نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے اس لئے یہ کہہ دینا کہ سب ایک ہی ہیں ایسا ہے جیسے کہ کوئی کہہ دے کہ

ہندوستان کے اندر پائے جانے والے سارے اشتراکی ایک سے ہیں۔ اشتراکیوں کے اندر کوئی روس نواز تو کوئی چین نواز ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مسلح جدوجہد میں یقین رکھتا ہے تو کوئی انتخابی حکمتِ عملی کا قائل ہے۔ محض ان کے اشتراکی ہونے کے سبب اور کسی ایک کی حرکت کیلئے دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرادینا یا اس کے ڈانڈے نظریہ سے جوڑ کر اپنی بھڑاس نکالنا درست رویہ نہیں ہے۔

افغانی مجاہدین کی لڑائی پہلے تو سوویت یونین سے تھی اس لئے کہ سوویت فوج نے انہیں طاقت کے بل پر انہیں غلام بنانے کی کوشش کی تھی۔ سوویت یونین کے خلاف پہلے تو ان کی مدد کیلئے پاکستان آگے آیا اس لئے کہ اسے اندیشہ تھا اگر سوویت بھالو کو آج افغانستان میں نہیں روکا گیا تو کل وہ پاکستان کے اندر پیر پسارے گا۔ ویسے پورے مشرقی یوروپ کو وہ اپنا باجگذار بنا ہی چکا تھا۔ بعد میں امریکہ نے سوچا سوویت یونین سے ویتنام کا بدلہ لینے کا یہ نادر موقع ہے اس لئے وہ بھی مجاہدین کی مدد کیلئے آگیا۔ اس طرح ایک مثلث بن گیا۔ سوویت یونین کی شکست کے بعد امریکہ نے خانہ جنگی لگا کر بانٹو اور کاٹو کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا دیگر قبائل کو پختونوں سے لڑا کر ان کی مدد کرنے لگا۔ اس صورتحال کو پاکستان کی مدد سے طالبان نے قابو میں کیا اور خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا لیکن پھر ۱۱ ستمبر کا بہانہ بنا کر امریکہ نے طالبان کو اقتدار سے بے دخل کردیا اور فوج کشی کی۔ اس کے بعد طالبان اور

امریکہ کے درمیان اسی طرح کی جنگ چھڑ گئی جیسے کہ سوویت یونین کے ساتھ تھی۔
بالآخر افغانستان میں امریکہ کو ویتنام سے طویل جنگ کے باوجود شکست کا منہ دیکھنا پڑا
اس کا اعتراف حال میں امریکی جنرل دانیال بولگر نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اس کی
وجوہات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔
امریکہ کی مجبوری یہ تھی کہ اس کی فوج کیلئے خورد ونوش سے لے کر جنگ وجدال تک کا
سارا سامان پاکستان سے ہو کر آتا تھا اس لئے وہ پاکستان سے دشمنی مول نہیں لے سکا۔
اس لئے ایک طرف طالبان سے لڑتا رہا اور دوسری جانب پاکستان کا دوست بنا رہا۔
پاکستان کی فوج امریکہ کی دوستی کے باوجود طالبان کی حمایت کرتی رہی ۔ اس پیچیدہ
سیاسی صورتحال میں امریکہ نے حامد کرزئی کو اپنا پٹھو بنا کر اقتدار سونپ دیا تو طالبان کی
لڑائی امریکہ اور کرزئی دونوں سے ہو گئی۔ پاکستانی فوج چونکہ طالبان کی حامی تھی اس
لئے حامد کرزئی اسے بھی اپنا دشمن سمجھنے لگا ۔ ایسے میں حامد کرزئی کیلئے امریکہ بہت
زیادہ قابلِ اعتماد ساجھی دار نہیں تھا اس لئے کہ اس کی دوستی پاکستان سے تھی ۔ حامد
کرزئی نے اس صورتحال میں ہندوستان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اس لئے کہ
دونوں کا مشترکہ دشمن پاکستان تھا۔ حامد کرزئی کے دور میں ایک حیرت انگیز صورتحال
تھی کہ ہندوستان سے افغانستان کی سرحدوں میں فاصلہ کے باوجود دونوں ممالک کے
تعلقات بہت خوشگوار تھے جبکہ ہند پاک اور پاک افغان

سرحدیں مشترک ہیں اس مگر ہند پاک اور پاک افغان تعلقات میں کشیدگی پائی جاتی تھی ۔

ایسے میں تحریک طالبان پاکستان عالم وجود میں آئی ۔ پاکستان طالبان اور افغان طالبان دونوں امریکہ کے دشمن تو ہیں مگر ایک پاکستان کا دوست اور دوسرا پاکستان کا دشمن ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس نے دونوں کو ایک دوسرے کا مخالف بنا دیا ہے ۔ اسی لئے سانحہ پشاور کو انجام دینے کی ذمہ داری ٹی ٹی پی قبول کرلیتی ہے اور افغان طالبان اس کی مذمت کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ حامد کرزئی اور ہندوستان کی حکومت پر ٹی ٹی پی کی مدد کرنے کا الزام لگتا ہے لیکن افغانی طالبان کی مدد کا الزام نہیں لگایا جاتا۔۔ ویسے پاکستانی فوج پر دباوڈالنے کیلئے امریکہ نے بھی ٹی ٹی پی کا تعاون کیا ہے۔ ٹی ٹی پی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ زیر زمین مجرموں کا ایک بہت بڑا گروہ بن چکا ہے جو اپنے آقاوں کے اشارے پر قتل وغارتگری وارداتیں کرتا رہتا ہے اور سانحہ پشاور بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔

حامد کرزئی کے بعد اشرف غنی کے اقتدار میں آجانے سے یہ ہوا ہے کہ افغان اور پاکستان کے تعلقات میں بہتری کا آغاز ہوگیا۔ اس سے ٹی ٹی پی کا پریشان ہوجانا فطری رد عمل ہے اس لئے کہ وہ اپنے ایک سرپرست سے محروم ہوگئی ۔

افغانستان کی نئی حکومت اگر پاکستان سے تعاون پر آمادہ ہو جائے تو ٹی ٹی پی کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اسی گھبراہٹ کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ ماہ جنرل راحیل شریف کے پہلے افغان دورے سے ۵ روز قبل واگھہ سرحد کے پاس زبردست دھماکہ ہوا جس میں افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ اس حملے کی ذمہ داری جنداللہ نامی تنظیم نے قبول ۶۰ کی جو ٹی ٹی پی کا حصہ ہے۔ جنرل راحیل اشرف نے افغانی صدر کے ساتھ اپنی ملاقات کے دوران ٹی ٹی پی کی بیخ کنی کیلئے تعاون طلب کیا تھا اور اشرف غنی نے اس کا یقین بھی دلایا تھا لیکن اس ملاقات ۴۰ روز بعد عین سقوط پاکستان کے دن فوجی اسکول پر حملہ ہوگیا۔ اس سانحہ کے فوراً بعد پاکستان کے فوجی سربراہ راحیل اشرف نے کابل کا دوسرا دورہ کیا اور صدر اشرف غنی سے ٹی ٹی پی کے سربراہ ملا فضل اللہ کی گرفتاری کا مطالبہ کیا ۔ اشرف غنی نے راحیل شریف کے درمیان تعاون واشتراک کے چلتے ٹی ٹی پی کیلئے دہشت گردی کی کارروائیوں کو جاری رکھنا مشکل ہو جائیگا۔

پاکستان کے حوالے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ اسلامی دنیا کی سب بڑی فوجی طاقت ہے جس کو جوہری اسلحہ سے لیس ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ پاکستان غذا کے معاملے میں خود کفیل ہے ۔ اس کے پاس معدنیات اور گیس کے ذخائر ہیں جغرافیائی اعتبار سے اس کا محل و وقوع زبردست اہمیت کا حامل ہے نیز چین سے اس کے بہترین سیاسی تعلقات ہیں ۔ ان وجوہات کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں سے

پرخاش رکھنے والے مغرب کو مملکت خداداد ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے کی بین الاقوامی سازشیں چلتی رہتی ہیں ۔ داخلی امن و امان کو غارت کرنے کیلئے بھی دنیا بھر کے ممالک کی خفیہ ایجنسیاں سرگرم کار رہتی ہیں اور وہ مقامی مجرم پیشہ لوگوں کو مختلف ناموں سے منظم کرکے اپنا آلہ کار بنانے کی سعی کرتی ہیں ۔ پاکستان کے اندر رونما ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کا اس پس منظر میں جائزہ لے کر ہی سانحہ پشاور کے مضمرات کی حقیقت تک رسائی ممکن ہے ورنہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو کر گریہ وزاری کرنے کا رویہ بے سود ہے ۔

آثار قدیمہ کے ماہرین کا اِس بات پر اِتفاق ہے کہ پشاور برا عظم ایشیاء کا قدیم ترین زندہ تاریخی شہر ہے۔ لیکن افغانستان پر استعماری قوتوں کے قبضے کے بعد اس شہر نے دوادوار میں بم دھماکے اور آگ و خون کے کئی مناظر دیکھے ہیں لیکن سانحہ ۱۶ دسمبر نے تو امن و آشتی کا گہوارا اور پھولوں کا شہر کہلانے والے پشاور میں معصوم پھولوں کا جنازہ اٹھادیا اور سارے عالم کو سوگوار کرگیا۔ جنازوں پر پھول تو عام طور پر نظر آتے ہیں پھولوں کا جنازہ دیکھ کر وہ کون سی آنکھ ہوگی جو نم نہ ہوئی ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو جنت کا سدا بہار پھول بنائے اور ان کے والدین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نوع انسانیت کو اس طرح کی بہیمیت و درندگی سے نجات دلائے۔

پھول دیکھے تھے جنازوں پہ ہمیشہ شوکت کل میری آنکھ نے پھولوں کے جنازے دیکھے

پشاور سے آسام تک: خون اپنا ہو یا پرایا ہو نسل آدم کا خون ہے آخر - قسط اول

پشاور قتل عام کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد آسام میں ناحق معصوموں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ اس میں اب تک ۷۰ لوگوں کے مرنے کی تصدیق ہو چکی ہے جن میں ۲۱ خواتین اور ۱۸ بچے ہیں۔ ۳ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے اور پولس کی گولیوں کا نشانہ بنے اور ۲ لوگوں کو بدلہ لینے کیلئے مار دیا گیا۔ ان واقعات پر معروف صحافی راجدیپ سردیسائی نے ٹویٹ کیا ''آسام کی قتل و غارتگری ہمارا اپنا پشاور ہے۔ نفرت اور بندوق مہلک مرکب ہے۔ مہلوکین کیلئے دعائیں'' ۔ اس ٹویٹ کے علاوہ سوائے وزیراعظم اور وزیرداخلہ کی جانب سے مذمتی دو جملوں والے پیغامات اور صدر مملکت و وزیراعلیٰ کے بیانات کے سوا کسی قابل ذکر ہستی کا کوئی پیغام نظروں سے نہیں گزرا۔ فیس بک پر ہلاک ہونے والے بچوں صرف ایک تصویر ہمارے دوست شفیع مدنی صاحب نے بھیجی جس کو میں نے اپنے صفحہ پر اس تبصرے کے ساتھ پیش کیا کہ '' بچے تو آخر بچے ہیں چاہے پشاور میں ہوں یا آسام میں'' یقین کریں کسی ایک فرد نے بھی اس پر نہ تبصرہ کیا اور نہ اس کو لائیک کیا۔

ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ردعمل میں آخر یہ اتنا بڑا فرق

کیوں واقع ہو گیا؟ یہ درست ہے کہ مرنے والوں کی تعداد نصف ہے لیکن کیا ہمارا احتجاج تعداد کے اوپر منحصر ہے؟ اور اگر ایسا بھی ہے تو نصف نہ سہی تو کم از دسواں حصہ بلکہ ایک فیصد رد عمل تو ہوتا؟ وہ غم و غصہ کا سیلاب، وہ تصاویر کا انبار، وہ فقرے، وہ شاعری، وہ مضامین کے حوالے اور ماتم و سینہ کوبی آخر کہاں غائب ہو گئی؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس قدر خود غرض ہیں کہ جب ہماری اپنی ملت کے نونہالوں کا خون بہایا جائے ہم تڑپ اٹھتے ہیں اور جب دوسرے کا ناحق لہو بہے تو ہمیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ ہمارا دین اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ایک انسان کا ناحق قتل ساری انسانیت کا قتل ہے۔ اس میں نہ تعداد کا ذکر اور نہ مقتول کے مذہب کا۔ بات صرف اور صرف انسانیت کی ہے۔ ایسے میں دیگر لوگوں پر ہونے والے ظلم سے ہمارا دل کیوں نہیں تڑپتا؟ ایک اور سوال یہ ہے کہ پشاور کے سانحہ پر نہ صرف مسلمان تڑپ اٹھے تھے بلکہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی بے چین ہو گئے تھے۔ پارلیمان کے اندر اور باہر، سڑکوں اور چوراہوں پر، اسکولوں اور دفاتر میں، الیکٹرانک میڈیا اور سوشیل میڈیا کے اندر ہر جگہ ہر مقام پر لوگ اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ آخر ان تمام لوگوں کو اچانک کیا ہو گیا۔ جو لوگ مسلم بچوں سے اس قدر ہمدردی جتا رہے تھے وہ خود اپنی قوم کے بچوں، عورتوں اور بزرگوں کے قتل عام پر کیوں

کر چھچی سادھے ہوئے ہیں ۔ کیا انہیں اپنے قوم سے زیادہ مسلمان قوم سے ہمدردی ہے ؟
اگر ایسا ہے تو دنیا بھر میں ہونے والے مسلمانوں کے قتل عام پر وہ کیوں نہیں بولتے۔
مثلاً غزہ کی بمباری میں جو ۲۰۰۰ شہری شہید ہوئے ان میں ایک چوتھائی بچے تھے ۔ ان
معصوموں کی موت پر کوئی آہ کیوں نہیں نکلی ؟ کیوں آنسو نہیں ڈھلکا؟ شاید اس لئے کہ
ان کو ہلاک کرنے والے مسلمان نہیں تھے ۔

اس کا مطلب کہیں یہ تو نہیں ہے کہ سارا ہنگامہ اس بات کو لے کر تھا کہ پشاور کے حملہ
آوروں کا نام اور لباس مسلمانوں جیسا تھا۔ ان کے چہرے پر داڑھیاں تھیں اور ان کا
تعلق طالبان سے تھا۔ اگر وہ نام کے سہی مسلمان نہ ہوتے یا بشار الاسد کی طرح سیکولر
مسلمان ہوتے تو کیا تب بھی یہ طوفان برپا ہوتا؟ اگر ایسا ہے تو یہ نہایت خطرناک
رجحان ہے۔ ظلم کی مذمت اور مظلوم کی حمایت میں اس طرح کا تفریق و امتیاز ہر گز
درست نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شعوری طور پر اس طرح کے واقعات کا فائدہ
اٹھا کر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایسے لوگ نہیں
کے برابر ہیں جو گدھ کی مانند اس قسم سانحات کے منتظر رہتے ہیں اور ان کے رونما
ہوتے ہی اسلام پسندوں کے خلاف اپنے من بھڑاس نکالنے میں جٹ جاتے ہیں لیکن یہ
بھی ایک حقیقت ہے کہ امت کے اندر ایسے بھولے بھالے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو
جذبات

میں آکر ان شرارت پسندوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ کوئی اسلام دشمنوں کا آلۂ کار بن کر بندوق اٹھالیتا ہے اور مسلمانوں کی لاشیں بچھا دیتا ہے تو کوئی الفاظ کی بندوق سے اسلام کا سینہ چھلنی کردیتا ہے اور جب اسلام کا جنازہ اٹھایا جاتا ہے تو یہ بھولے بھالے مخلص مسلمان بھی جوش و خروش کے ساتھ اس میں شریک ہو کر کندھا دینے کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔

ہم ہیجان کا شکار ہو کر خس و خاشاک کی مانند ہر آندھی طوفان میں کس طرح بہتے چلے جاتے ہیں اس کی ایک مثال ابھی حال میں سامنے آئی۔ چار دن قبل کسی ڈاکٹر صاحب نے ایک خبر گڑھی جس کا مفہوم تھا اسلامی جہاد شروع ہو چکا ہے اور ایسے میں بچوں کا قتل معمولی قربانی ہے۔ اس خبر کے برابر میں منور حسین صاحب کی تصویر نیچے امیر جماعت اسلامی لکھا تھا۔ یہ تصویر فیس بک سے گردش کرتی ہوئی لکھنو کے ایک بڑے اردو اخبار کے دفتر میں پہنچی اور اخبار کے مالک کے مضمون کے ساتھ پہلے صفحہ پر لگ گئی۔ پہلے تو اس میں منور حسین کو جو ڈیڑھ سال قبل اس عہدے سے سبکدوش ہو چکے ہیں جماعت اسلامی کا امیر بتلایا گیا۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ منور حسین نے ٹی وی چینل پر اس سانحہ کی شدید مذمت کرتے ہوئے اسے جہاد فی سبیل اللہ نہیں بلکہ جہاد فی سبیل الشیطان قرار دیا ہے۔ ممکن ہے محترم کالم نگار یہ نہیں جانتے ہوں کہ پاکستان کا امیر جماعت کون ہے؟ انہوں نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی ہو کہ منور حسین نے کیا بیان دیا

ہے۔ کسی نے ان کی اس جانب توجہ دہانی کی بھی زحمت نہیں ہو کہ ان سے کیسی فاش غلطی سرزد ہوئی ہے یا اگر ایسا ہوا بھی ہے تو انہوں نے معذرت پیش کرنے کو ضروری نہیں سمجھا۔ اگر پڑھے لکھے اسلام پسندوں کی یہ حالت ہو تو بیچارے جاہل گنوار کس شمار قطار میں آتے ہیں۔

یہ تو عوامی سطح کی بات ہوئی اب ذرا پشاور اور آسام کے سرکاری رد عمل کا موازنہ بھی ہو جائے۔ پاکستان کی حکومت نے اس سانحہ پر تین دن کے سوگ کا اعلان کیا اور ایوان پارلیمان کا خصوصی اجلاس طلب کیا۔ غور وخوض کے بعد اس کے خلاف متفقہ قرارداد منظور کی ۔ ہمارے ملک میں آسام کے حوالے سے تین منٹ کا سوگ بھی نہیں منایا گیا۔ پارلیمان کا کوئی خصوصی اجلاس طلب نہیں کیا گیا حالانکہ اجلاس کے آخری دن یہ حادثہ رونما ہوا ایسے میں ارکان پارلیمان دہلی کے اندر ہی تھے اور انہیں خصوصی اج؛اس کیلئے طلب کرنا نہایت آسان کام تھا۔ حکمراں جماعت کے پارلیمانی بورڈ میں روایتی مذمت کے بعد انتخابی شکست کے باوجود کشمیر میں حکومت سازی کا فیصلہ کیا گیا۔ پاکستان کے وزیراعظم نے بذاتِ خود پشاور کا دورہ کیا مگر ہندوستان کے وزیراعظم اپنے وزیر داخلہ

کوآسام روانہ کرکے خود اپنے حلقۂ انتخاب وارانسی پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے مدن موہن مالویہ کے مجسمہ کو ہار پہنایا۔ اسی گھاٹ مین صفائی مہم کا جائزہ

لیا۔ یونیورسٹی میں ایک عمارت کی سنگ بنیاد رکھی۔ ڈیریکا کے نئے انجن کو ہری جھنڈی دکھلائی، ویڈیو کانفرنسنگ کی اور لوٹ آئے۔ غالباً یہ اوبامہ کو وارانسی کا دورہ کرانے کی تیاری تھی۔ عمران خان نے اپنا ملک گیر احتجاج منسوخ کردیا لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی جھارکھنڈ میں کامیابی کا جشن منانے میں لگی رہی جبکہ آسام میں ہلاک ہونے والے قبائل کا تعلق جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ سے ہے۔

پاکستان کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں نے اس سانحہ کی مذمت کی لیکن ہندوستان میں مذہبی رہنما تو درکنار سونیا گاندھی اور امیت شاہ نے بھی اس بابت خاموش رہنا پسند کیا ۔ کسی علاقائی جماعت کے رہنما کا بیان بھی ذرائع ابلاغ میں نہیں آیا۔ اشتراکی رہنماوں کی ایک بڑی فوج مغربی بنگال میں آباد ہے وہ بھی چپی سادھے رہے۔ مذکورہ وزراء کے علاوہ راہل گاندھی وہ واحد سیاسی رہنما ہیں جن مذمتی بیان منظر عام پر آیا۔ سارے بڑے دانشور یا کالم نگار کشمیر میں حکومت سازی اور جھارکھنڈ میں بی جے پی کی کامیابی پر اپنا زور قلم صرف کرتے نظر آئے کسی نے اس قتل عام کا جائزہ لے کر اس کی وجوہات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آسام کے وزیراعلیٰ ترون گوگوئی نے اپنا جرمنی کا دورہ ضرور منسوخ کیا لیکن فساد زدہ علاقہ کا دورہ کرنے کے بجائے اپنے ۶ وزراء کے ایک وفد کو روانہ فرمادیا۔ گوہاٹی میں اخبار نویسوں

کے سامنے یہ وضاحت تو کی کہ پولس کی گولی سے ۵ نہیں بلکہ ۳ لوگ مارے گئے ہیں لیکن یہ نہیں بتلایا کہ پولس نے آخر مظاہرین پر گولیاں کیوں برسائیں اور خاطی انتظامیہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائیگا؟ چونکہ حملہ آور مسلمان نہیں ہیں اس لئے ان کا تعلق بنگلہ دیش کے مجاہدین سے نہیں جوڑا جاسکا لیکن کسی کو یہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ ان دہشت گردوں کا کوئی تعلق ان کے مذہب سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ ذرائع ابلاغ کی نظر میں مسلمان تو پیدائشی دہشت گرد ہے اس لئے ہمیں صفائی پیش کرنی پڑتی ہے کہ دہشتگردی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے دیگر دہشت گرد نہ ہندو ہوتے ہیں اور نہ عیسائی وہ تو بس دہشت گرد ہوتے ہیں۔

(آسام کے حالیہ قتل عام کی وجوہات ان شا اللہ دوسری قسط میں)

(آسام: قبلہ بنے ہوئے ہیں قبیلہ پرست لوگ (قسط دوم

کوکراجھار شہر سے ۸ کلومیٹر دور پکری گڑی گاؤں میں ۷ سالہ کالو ٹوڈو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا اور اس کی ماں نہانے کے بعد اپنے بال سکھا رہی تھی کہ اچانک بوڈو دہشت گردوں نے حملہ کردیا۔ قدرت کا کرنا یہ ہوا کہ کالو کی ماں کا انتقال ہو گیا اور باوجود اس کے کہ ننھے کالو کے چہرے، ہاتھ، کہنی اور کمر پر گولی لگی وہ بچ گیا۔ کالو کا باپ سوم اسے گوہاٹی علاج کیلئے لے آیا۔ اسپتال کے اندر کالو کا علاج کرانے میں مصروف سوم اپنی زوجہ کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہو سکا۔ کالو کے بھائی نے اپنی ماں کی چتا کو اگنی دی۔ وزیر اعظم نے مرنے والوں کے پسماندگان کو ۲ لاکھ روپئے دینے کا اعلان کیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دو لاکھ روپیوں میں سوم کو اپنی چاند سی بیوی اور کالو اپنی دیوی سمان ماں مل جائیگی ؟

جلد بازی میں ہرجانے کا اعلان کرنے والے مودی جی کو نہیں معلوم کہ مہنگائی کس قدر بڑھ چکی ہے۔ نکسل وادی حملوں میں مارے جانے والوں کے ہرجانے کی رقم کو ۳ لاکھ سے بڑھا کر ۵ لاکھ کر دیا گیا ہے۔ ہریانہ میں تو ان کی سرکار نے

سڑک حادثے میں ہلاک ہونے والے ٹی وی کے ایک صحافی کے پسماندگان کو ۵ لاکھ روپئے دے دیئے جبکہ ست پال آشرم سے لوٹتے ہوئے اس کی گاڑی آوارہ جانور کے ٹکرانے سے حادثہ کا شکار ہو گئی تھی۔ آسامی مظلوموں کے لئے وزیراعظم نے تو ۲ لاکھ پر اکتفا کرلیا لیکن بعد میں مرکزی حکومت نے اسے بڑھا کر ۳ لاکھ کردیا اس میں ریاستی حکومت نے ۳ لاکھ ملا کر اس کو ۶ لاکھ تک پہنچا دیا مگر یہ خطیر رقم بھی بیچارے سوم اور کالو کیلئے کس کام کی جبکہ ایک کا گھر اور دوسرے کی دنیا ویران ہو گئی ؟

وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ نے آسام کا دورہ کرنے کے بعد واضح اعلان کیا کہ جو جنگجو ۵ ماہ کے بچہ کے منہ میں گولی مار دے وہ دہشت گرد ہے اور اس سے بات چیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن کوکرا جھار میں جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا وہ داعش کو بھی شرمندہ کرنے والی ہے۔ سابق فوجی پرن باسماتری کے مطابق اس کے بھائی کو پہلے تیر سے زخمی کیا گیا اور پھر بھالے سے ہلاک کرنے کے بعد اس کا سر کاٹ دیا گیا۔ اس پر حملہ آوروں کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا تو ان کا گھر نذر آتش کردیا گیا۔ ایسی خبریں بھی ہیں کہ اس حملے کی بہت تفصیلی اطلاعات قومی خفیہ ایجنسی کو مل چکی تھی اور اگر ان کو سنجیدگی سے لیا جاتا اور روک تھام کے مناسب اقدامات کئے جاتے تو یہ سانحہ ٹل سکتا تھا۔ وزیر داخلہ کو اپنے اہلکاروں سے اس بابت پوچھنا ہوگا اور قوم

کو بتانا ہوگا کہ اس کوتاہی کی کیا وجوہات تھیں اور جو لوگ اس کے ذمہ دار ہیں ان کو کیا سزا دی گئی۔

آسام کے حالیہ تشدد کے نتیجے میں تقریباً ۷۰ ہزار متاثرین کو اپنا گھربار چھوڑ کر مہاجرین کیمپ میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ حالات اس قدر سنگین ہو گئے تھے بھوٹان، چین اور میانمار کی سرحدوں کو سیل کر دینا پڑا۔ اس کے باوجود مریخ پر کمند ڈالنے والے عظیم بھارت کے دلیر وزیر داخلہ کسی طرح دہلی سے سونت پور تک تو پہنچ پائے مگر شورش زدہ علاقوں کا دورہ کئے بغیر اور راحت کیمپ میں جا کر متاثرین سے ملے بنا بشوانا تھ چیرالی میں واقع ڈاک بنگلے میں ادیباسیوں کے نمائندوں سے ملاقات کر کے لوٹ آئے۔ اپنی کوتاہی پر پردہ ڈالنے کیلئے انتظامیہ نے وہاں تک رسائی کیلئے سڑک کی عدم موجودگی کا بہانہ بنایا۔ تعجب اس بات پر ہے کہ آج کل معمولی رہنماوں کو انتخابی مہم چلانے کیلئے نجی ہیلی کاپٹر مل جاتا ہے لیکن ملک کے وزیر داخلہ کو غریبوں کے دکھ درد بانٹنے کی خاطر سرکاری ہیلی کاپٹر نہیں مل پاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب نیت ہی میں کھوٹ ہو تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ مگرمچھ کے آنسو بہانے والے ہمارے ان رہنماوں پر افتخار راغب کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

حقیقت کھل کے تیری سامنے جس دن سے آئی ہے
دکھاوا سب تری ہمدردیاں معلوم ہوتی ہیں

تشدد کے حالیہ واقعات میں اب تک ۸۷ لوگ لقمۂ اجل بن چکے ہیں ان میں ۷۱ دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ۴ بدلے کی کارروائی میں مارے گئے اور ۳ مظاہرہ کرنے کے جرم میں پولس کی بربریت کا شکار ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حملہ این ڈی ایف بی (ایس) نے کیا ہے۔ طالبان ہم سے دور دراز علاقوں میں سرگرم عمل ہے اس کے باوجود اس کے بارے بہت کم جانتے ہوئے بھی ہم لوگ بہت کچھ جانتے ہیں لیکنکم ہی افراد ایسے ہوں گے جو ہماری اپنی سرزمین پر کام کرنے والی مذکورہ تنظیم کا پورا نام بھی بتا سکیں۔ یہ دراصل نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ آف بوڈولینڈ کا سونگبی جیت دھڑا ہے۔ ۱۹۸٦ء میں بوڈو علاقوں کو آزاد کرانے کی غرض سے بوڈو سیکیورٹی فورس نامی ایک مسلح تنظیم کا قیام عمل میں آیا تھا جس نے عظیم تر مصالح کے پیش نظر ۱۹۹۴ء میں اپنا نام بدل کر نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ آف بوڈو لینڈ رکھ لیا۔ اس لئے کہ آج کل بس نام میں ڈیموکریسی کا لفظ ڈال دینے سے سارے پاپ دھل جاتے ہیں۔

اس علٰحیدگی پسند باغی گروہ میں دو مرتبہ پھوٹ پڑی پہلی مرتبہ اس کے بطن سے این ڈی ایف بی (ترقی پذیر) نے الگ ہو کر حکومت سے مصالحت کرلی لیکن اس کا بانی رنجن ڈائیماری اپنی این ڈی ایف بی کے ساتھ سرکار سے برسرپیکار رہا۔ کون جانے آگے چل کر رنجن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا یا فوج کا دباؤ

اس کیلئے ناقابلِ برداشت ہوگیا خیر وجہ جو بھی ہو اس نے بھی حکومت وقت سے ہاتھ ملا لینے میں بھلائی سمجھی۔ یہ دوسری تقسیم تھی جس میں اپنے نام کا مخفف لگا کر نجن نے ایک اور این ڈی ایف بی بنا ڈالی اور مادرِ تنظیم سے الگ ہوگیا۔ رنجن ڈائیماری کے ساتھ سرگرم عمل فوجی کمانڈر آئی کے سونگبی جیت کو اپنے رہنما کا یہ اقدام ناگوار گزرا تو اس نے ۲۰۱۲ء میں این ڈی ایف بی (آر) سے الگ اپنا گروہ تشکیل دے دیا اور اسلحہ کا سارا ذخیرہ اپنے ساتھ لے گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کے حواری دہشت گردوں کی کل تعداد صرف ۲۷۰ ہے جن میں سے ۱۵۰ میانمار یعنی برما میں رہتے ہیں۔

اس موقع پر چند دلچسپ باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ این ڈی ایف بی کے تین میں سے دو دھڑے حکومت کے ساتھ رابطے میں ہیں اور ایک برسرِ بغاوت تینوں کا نام ایک ہی ہے بس آگے بریکیٹ میں یو یا آر یا ایس لگ جاتا ہے اس کے باوجود کوئی دانشمند یہ نہیں کہتا کہ یہ سارے ایک ہیں، ان میں کوئی اچھا یا برا بوڈو مجاہد نہیں ہے۔ ان سب کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہئے بلکہ ان کے درمیان فرق کیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر مختلف رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہے کہ ایک مختصر سے جنگجو گروہ کو بھی قابو میں کرنا کس قدر مشکل کام ہوتا ہے اور وہ کس طرح کی تباہی مچا سکتا ہے۔ اس کیلئے نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ حکومت کی ناکامی ہے نہ

خفیہ اداروں کی اس کے ساتھ ساز باز یا اس کی سرپرستی کے اوٹ پٹانگ الزامات لگاتا ہے۔

تیسرا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ ان دہشت گروں کی پناہ گاہیں بھی بیرون ملک میامنار اور بھوٹان میں ہیں۔ وزیر خارجہ سشما سوراج ان دونوں ممالک سے تعاون کی مؤدبانہ درخواست کی ہے۔ اس میں کہیں الزام تراشی اور دھونس دھمکی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس کے برعکسپاکستان میں بیٹھا ہوا کوئی دہشت گرد اگر تخریب کاری میں ملوث پایا جاتا ہے تو حکومت کا لب و لہجہ یکسر بدل جاتا ہے۔ ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا صرف عوام کو ورغلانے اور اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے کیلئے کیا جاتا ہے؟ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ یہ بات بھی منظر عام پر آئی کہ این ڈی ایف بی کے زیادہ تر کارکن عیسائی ہیں لیکن ان کیدہشت گردی کو بجا طور پر ان کے دین سے نہیں جوڑا لیکن مسلمان دہشت گرد کی آڑ کے سامنے آتے ہی دین اسلام زیر بحث آجاتا ہے کیونکہ عصر حاضر میں کسی بھی مذہب کے ماننے والے کو دہشت گردی کے جال میں پھنسا لینا اور اس کو اپنا آلۂ کار بنا لینا کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔ یہ بات دنیا بھر میں آئے دن رونما ہوتی رہتی ہے؟ آج تخریب کاری کے کام میں لوگوں کو اس صفائی کے ساتھ ملوث کرلیا جاتا ہے کہ دوسروں کو تو کجا خود ان کو بھی اس کی خبر بہت دیر سے ہوتی ہے یا کبھی کبھار نہیں بھی ہوتی بقول شاعر ؎

ہمارے ہاتھوں وہ ہم کو تباہ کرتے ہیں
یہ اور بات کہ اس کی ہمیں خبر بھی نہیں

این ڈی ایف بی جیسی تحریکیں سیاسی سرپرستی کے بغیر پھل پھول نہیں سکتیں۔آسام کی صورتحال سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کانگریس اور بی جے پی دونوں نے ان کی آبیاری کی ہے۔پارلیمانی انتخاب کے دوران مئی کے اندر کوکراجھار میں مسلمانوں پر حملہ ہوا تھا۔اس حملے کیلئے بوڈو پیوپلس فرنٹ (بی پی ایف) کی رکن اسمبلی پرمیلا رانی برہما کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔انہوں نے ۳۰ اپریل کو کہا تھا چونکہ مسلمان رائے دہندگان سابق یو ڈی ایف رکن اور آزاد امیدوار بابا کمار سرانیہ کی حمایت کر رہے ہیں اس لئے بی پی ایف کے ریاستی وزیر چندن برہما لوک سبھا کا انتخاب نہیں جیت پائیں گے۔ پرمیلا نے آگے بڑھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ اس صورتحال میں بی پی ایف کو بی جے پی کے امیدوار کی حمایت کرنی چاہئے۔

اس اشتعال انگیز بیان کے فوراً بعد دھننجے ناتھ نامی صحافی پر حملہ ہوااور اس کے بعد نرسنگھ پارہ میں ۳ لوگ ہلاک کر دیئے گئے۔اس رات دہشت گردوں نے حملہ کر کے ۸ لوگوں کو ہلاک اور ۴ کو زخمی کر دیا۔دوسرے دن یعنی ۲ مئی کو گمپارہ میں ۲۱ لوگوں کو قتل کیا گیا۔بی پی ایف کے سربراہ ہنگراما موہیلاری پر مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کی غرض سے تشدد بھڑکانے کا الزام لگا۔

تشدد کی ان وارداتوں کے بعد آسام کی صوبائی حکومت کے وزیر صدیق احمد نے شورش زدہ علاقوں کا دورہ کرکے تشدد میں بی پی ایف کے ارکان کے ملوث ہونے کی تصدیق کی اور یہ انکشاف بھی کیا کہ دہشت گردوں کو محکمہ جنگلات کے افسران نے بندوقیں فراہم کی تھیں۔ اس علاقہ میں چونکہ انتظامیہ کی باگ ڈور کانگریس کی شراکت سے بی پی ایف کے ہاتھوں میں ہے اس لئے اس کے ڈپٹی چیف کھمپا بورو گویاری پر شک کا اظہار کیا گیا اس لئے کہ وہ محکمۂ جنگلات کی انتظامیہ کا رکن ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ آسام کی سیاست میں بی پی ایف بی جے پی کی حلیف جماعت نہیں بلکہ کانگریس کی ریاستی حکومت میں شامل ہے اور کانگریس کے رہنما عبدالخالق نے پرمیلا رانی کی گرفتاری کا بھی مطالبہ کیا تھا اور الزام لگایا تھا چونکہ مسلمان دہشت زدہ نہیں ہوئے اور انہوں نے بی پی ایف کو ہرا کر سرانیہ کو کامیاب کردیا اس لئے بدلہ لینے کی خاطر یہ قتل و غارتگری کی کارروائی کی گئی۔ اس واقعہ کی روشنی میں انتخابی سیاست کے پس پردہ پنپنے والی دہشت گردی کا کردار نمایاں ہوجاتا ہے اور کانگریس کی سازباز بھی بے نقاب ہوجاتی ہے۔ دہشت گردی کی نشوونما میں ویسے بی جے پی بھی کانگریس سے پیچھے نہیں بلکہ دو قدم آگے ہے۔ ان دونوں قومی جماعتوں کے رویہ پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

یک جا ہیں سارے فہم و فراست میں پست لوگ
قبلہ بنے ہوئے ہیں قبیلہ پرست لوگ

سونت پور کا علاقہ تیزپور پارلیمانی حلقہ میں آتا ہے۔ اس بار پارلیمانی انتخاب سے ایک ماہ قبل ۳۰ مارچ کو سونت پور کے بی جے پی رہنما بھابا دیو گوسوامی نے بیانگ دہل یہ اعلان کردیا کہ این ڈی ایف بی کے سونبیبی جیت اور رنجن دیو نامی دو دھڑے آئندہ انتخاب میں بی جے پی کی حمایت کر رہے ہیں ۔ یہ انکشاف ٹیلی ویژن کے ایک نامہ نگار کی موجودگی میں کیمرے کے سامنے کیا گیا تھا۔ بھابا نے صاف گوئی کے ساتھ آسام اروناچل کی سرحد پر بھالکپونگ گاؤں میں این ڈی ایف بی کے رہنماوں سے ملاقات کی تفصیل بھی پیش کردیں اور بتلایا کہ یہ دنوں دھڑے کانگریس پارٹی کی کارکردگی سے غیر مطمئن ہیں اس لئے بی جے پی کی حمایت کر رہے ہیں۔

بھابا گوسوامی کا یہ اعتراف وزارت عظمیٰ کے امیدوار نریندر مودی کی بسوانا تھ چیرالی میں منعقدہ عوامی جلسے کے موقع پر کیا گیا تھا اس نے کہا تھا کہ سامنے جلسہ گاہ میں دونوں باغی گروہوں کے علاوہ کچھ ہتھیار ڈالنے والے سابق جنگجو بھی موجود ہیں۔ تیزپور سے انتخاب لڑنے والے بی جے پی کے امیدوار آر پی سرمانے بھی ٹی وی چینل پر گوسوامی کے بیان کو درست ٹھہرایا لیکن بعد

میں جب اس پر تنقید شروع ہو گئی بی جے پی کے مقامی صدر نے اس کی تردید کردی اور گوسوامی کے بے بنیاد بیانات پر کارروائی کرنے کا اعلان کیا۔ اس تردید و تائید سے قطع نظر این ڈی ایف بی کا عمل حقیقت کا ترجمان تھا۔ این ڈی ایف بی نے راہل گاندھی کے دورے والے دن یعنی ۷ ۲ مارچ کو تو ۱۲ گھنٹے کے بند کا اعلان کرکے اس کو ناکام کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن دو دن بعد جب مودی جی نے دورہ کیا تو نہ صرف کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی بلکہ خود بھی اس میں شریکہو کر غالب کے شعر کی عملی تفسیر بن گئے ؂

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

آسام کے وزیر اعلیٰ ترون گوگوئی نے گوسوامی کے بیان کے بعد بی جے پی پر دہشت گردوں سے ساز باز کا الزام لگا کرکے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا تھااور اسی کے ساتھ ٹی وی چینلس پر سیاستدانوں اور دہشت گردوں کے درمیان اشتراک عمل کی بحث چھڑی گئی تھی ایسے میں آسام کی سب سے بڑی جنگجو تنظیم الفاکے رہنما جتن دتہّ نے ٹی وی کے پردے پر اعتراف کرلیا کہ ان لوگوں نے بھی ماضی میں سیاسی جماعتوں کا تعاون کیا ہے۔ کوکراجھار میں نہ سہی مگر تیزپور میں بی جے پی دہشت گردوں کی مدد انتخاب جیت گئی اورآر پی سرمارکن پارلیمان بن گئے۔ اب وہ کس منہ سے اپنے کرم فرماؤں کے خلاف اقدام کریں گے اور ایسے میں

وزیر داخلہ کے بلند بانگ دعووں کا کیا حشر ہوگا یہ جاننا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تشدد کے ان قابل مذمت واقعات کے بعد اگر وزیر اعظم گوہاٹی میں بیٹھے ہوئے ترون گوگوئی کے بجائے اپنے تیز پور کے رکن پارلیمان رام پرساد سرما سے گفتگو کرتے اور پتہ لگانے کی کوشش کرتے کہ حملہ آور کون ہیں ؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں تو انہیں حقیقت حال کا پتہ چل جاتا لیکن جب سیاست کا دامن مہر ووفا اور خلوص و محبت کے اعلیٰ اقدار سے خالی ہو جائے تو بھلا اس کی توقع چہ معنی دارد بقول افتخار راغب۔

کیسے بنے گا حلقۂ سالم خلوص کا
جب جھک رہا ہے آپ کا پرکار اک طرف
شہر ہوس میں مہر ووفا کے ستار کا
اک تار اک طرف ہے تو اک تار اک طرف

وزیرا اعظم نے تو حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی مگر قارئین کو چاہئے کہ وہ آسام کے متعلق مودی جی کا نظریہ جان لیں جس کا اظہار انہوں نے ماہِ فروری میں سلچر کے اندر وزیر اعظم کے امیدوار کی حیثیت سے کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ’’دو طرح کے لوگ بنگلہ دیش سے آسام آئے ہیں۔ وہ جو سیاسی سازش کے طور پر ایک خاص سیاسی جماعت کا ووٹ بنک بڑھانے کیلئے یہاں لائے گئے (یعنی مسلمان) اور دوسرے وہ جن کو پڑوسی ملک میں خوفزدہ کیا گیا (یعنی ہندو)۔ جو

ووٹ بنک بڑھانے کی خاطر لائے گئے یا اسمگلرس ہیں انہیں دھکا دے کر بھگا دیا جانا چاہئے جبکہ دوسری قسم کے لوگوں کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہئے۔" ممکن ہے مودی جی کو وزیر اعظم بن جانے کے بعد یہ بیان یاد نہ ہو لیکن رام پرشاد سرما کو ضرور یاد ہوگا اور مسلمان بھی اسے کیسے بھول سکتے ہیں؟ اسی منفی طرزِ فکر کو ہوا دے کر بی جے پی نے آسام میں اپنی کامیابی کو ۴ سے ۷ تک پہنچایا ہے۔ دہشت گرد جانتے ہیں کہ دونوں سیاسی جماعتیں کانگریس اور بی جے پی ان کی محتاج ہیں اس لئے جو من میں آئے کرتے پھرتے ہیں اور غریب عوام کو اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ آسام کی دہشتگردی صرف اور صرف مذہبی منافرت، نسلی عصبیت اور سیاسی منافقت کا نتیجہ ہے۔ جب تک ان عوامل کی بیخ کنی نہیں کی جاتی اس وقت تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

الوداع سالِ گزشتہ الوداع

۲۰۱۴ کو الوداع کہتے ہوئے لوگ اس سال کا سب سے اہم واقعہ تلاش کر رہے تھے کہ اچانک اس صدی کا اہم ترین واقعہ رونما ہوگیا۔ ۲۸ سمبر کو امریکہ اور 'نیٹو' نے ۱۳ سالہ افغانی جنگ کے خاتمے کا باضابطہ اعلان کردیا۔ طالبان کے حملے سے خوفزدہ اتحادی فوج کے سربراہ جنرل جان کیمپبل نے یہ اعلان ایک خفیہ تقریب میں کیا اور کہا کہ ہمارے سامنے عظیم چیلنج ہے مگر ہم اس میں کامیاب ہوں گے۔ یہ اپنے آپ میں بلاواسطہ اعتراف ہے کہ یہ مہم ہنوز کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی ہے۔ اس موقع پر بین الاقوامی اتحادی لشکر کا پرچم اتارنے کے بعد افغان فوج کے سربراہ جنرل شیر محمد کریمی نے غیر ملکی فوجیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے رنج سے کہا کہ ہم آپ کی اور آپ کے ذریعہ فراہم کردہ وسائل کی کمی محسوس کریں گے۔ ایساف کے پاس سب کچھ تھا جبکہ ہمارے وسائل محدود ہیں اس کے باوجود ہم اچھا کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کسی درخت کے سوکھ جانے پر اس پر پلنے والے طفیلی بیل بوٹے جس کرب والم میں مبتلا ہوجاتے ہیں وہی فی الحال جنرل شیر محمد کا وہی حال ہے۔ ان کو امریکیوں کی غلط صحبت نے بلی بنادیا ہے۔

شیر محمد کے بیان کا تقابل اگر اللہ کے بھروسے اپنی جان کی بازی لگانے

والے طالبان کے ترجمان ذبیح اللہ کے اعلان سے کیا جائے تو جیت اور ہار کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ذبیح اللہ نے فون پر بتایا'' یہ تقریب اس بات کی مظہر ہے کہ امریکہ اور ناٹو کی مہم پوری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ وہ لوگ افغانستان سے راہِ فرار اختیار کر رہے۔ افغانی مجاہدین کو شکست دینے کے اپنے مقصد کو وہ حاصل نہیں کر سکے ہیں''۔ اس امر کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر امریکہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو یہ تقریب ڈھکے چھپے انداز میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا کھلے عام جشن منایا جاتا۔ ناٹو اتحادیوں کو جب یقین ہو گیا کہ وہ اپنے مقاصد کو کسی صورت حاصل نہیں کر سکتے تب جا کر انھوں نے بے آبرو ہو کر بھاگ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔

اس شکست کے آثار ۲۰۱۱ء سے نمایاں ہونے لگے تھے۔ دو سال قبل طالبان نے سوویت فوج کی واپسی کی ۲۳ ویں سالگرہ منائی تھی اور یہ بیان جاری کیا تھا کہ ''خود غرض امریکیوں کو روس کی ہار سے عبرت پکڑنا چاہئے اور جیالے افغانیوں سے یہ بے معنی لڑائی ختم کر کے جلد از جلد اپنی جارح فوج کو لے جانا چاہئے۔ آج قابض امریکی اور اس کے ہمنوا بعینہٖ اسی مستقبل کی جانب گامزن ہیں جو ماضی میں روس کو درپیش تھیں''۔ طالبان کی پیشن گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی اس کے باوجود امریکی صدر اوبامہ نے بڑی ڈھٹائی سے اپنی رسوائی کو ایک سنگ میل قرار دیا۔ یہ سنگ میل بلکہ وہ سنگ راہ ہے جس سے ٹھوکر کھا کر امریکہ اپنے حواریوں سمیت منہ کے بل گر پڑا ہے۔

افغانستان پر پہلی فوج کشی۔برطانوی سامراج نے ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۲ء کے دوران کی تھی اور اسی طرح منہ کی کھائی تھی ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کابل میں۔برطانوی سفیر سر مارٹن ایوان نے اپنی کتاب افغانستان سے ایک نئی تاریخ میں لکھا تھا ''یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ۔برطانیہ نے یہ کیوں سوچ لیا کہ افغان سکھوں کی جارحیت کو تسلیم کرلیں گے اور ایک ایسے کٹھ پتلی اقتدار کے زیر نگیں ہو جائیں گے جن کے ایک سے زیادہ مرتبہ ملک بدر کیا جاچکا ہے۔اکیسویں صدی میں انگریزوں نے پھر ایک بار اپنی تاریخ کو فراموش کرکے ایک اور مرتبہ جانباز افغانیوں کو اپنی تابناک تاریخ رقم کرنے کا موقع عطا کردیا۔

افغان جنگ کا آغاز ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کے چند ہفتوں بعد افغانستان پر امریکی حملے سے ہوا تھا۔اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے اوراق کو الٹ کر امریکی صدر جارج بش کی اس تقریر پر نظر ڈالی جائے جو اس نے فوج کشی سے قبل ۷ اکتوبر کو قصر ابیض میں بیٹھ کر کی تھی۔ اس جنگ کی ہمہ گیری کو بیان کرتے ہوئے جارج بش نے کہا تھا ''اس مہم میں ہمارے ساتھ۔برطانیہ ، کناڈا،آسٹریلیا ، جرمنی اور فرانس ہے۔ یوروپ، مشرق وسطیٰ ، افریقہ اور ایشیا کے ۴۰ سے زیادہ ممالک نے ہمیں اپنی فضا کو استعمال کرنے کے اور ان کی سرزمین پر اترنے کے حقوق عطا کردیئے ہیں اور کئی لوگوں نے معلومات فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے ۔ ہمارے ساتھ ساری دنیا کی اجتماعی قوت

ارادی ہے۔ اس کے برخلاف ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر مسلم حکمرانوں کو تک افغانی مجاہدین کے خلاف کر دیا گیا تھا۔ دنیا کے ۵۰ ملکوں سے تعلق رکھنے والے 'نیٹو' کے ایک لاکھ ۴۰ ہزار فوجیوں پر مشتمل لشکرِ جرار کو دیکھ کر جوہری طاقت سے لیس پرویز مشرف بھی گھبرا گیا۔ اس نے طالوت کے ان نافرمان ساتھیوں کا سا رویہ اختیار کرنے میں اپنی عافیت سمجھی جنھوں نے کہا تھا '' آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے ''

اس کے برعکس بے سروسامان مٹھی بھر افغان باطل کے آگے سینہ پر ہو گئے اور انہوں نے طالوت کے جاں نثار ہمنواوں کی یاد تازہ کر دی جن کی بابت ارشاد ربانی ہے ''لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، انھوں نے کہا: "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے"۔ اسی کے ساتھ حق و باطل ایک نئی عالمی جنگ چھڑ گئیجس میں مجاہدین اسلام اللہ کے بھروسے ساری دنیا سے ٹکرا گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہنکلا کہ امریکہ کو اپنی تاریخ کی طویل ترین جنگ لڑنی پڑی۔ اس جنگ میں نام نہاد سپرپاور نے ویتنام سے بھی زیادہ وقت خراب کیا اور اس سے بڑی ذلت اٹھائی اس لئے کہ افغانیوں کو ویتنامیوں کی مانند سوویت یونین اور چین کی حمایت حاصل نہیں تھی۔

تیرہ سال طویل اس جنگ کے دوران امریکہ نے لگ بھگ ۳۵۰۰ غیر ملکی فوجیوں کی موت کا اعتراف کیا ہے جن میں اکثریت ۲۲۰۰ کا تعلق امریکہ سے ہے۔ ایسے سنگین معاشی بحران کے دوران جبکہ امریکی معیشت چرمرا رہی تھی امریکی استعمار نے اس جنگ پر ایک ٹریلین سے زیادہ پھونک دیئے اس کے باوجود ذلت آمیز شکست فاش کو ٹال نہ سکا۔ جہاں تک طالبان حکومت کا سوال ہے اس کا خاتمہ تو ۵ ہفتہ کے اندر ہوگیا تھا اور افغانستان کی تباہی کا تعلق ہے اسے تو سوویت نے برباد کرہی دیا تھا۔ اتحادی افواج تو ۱۳سال تک طالبان کی قوت جہاد کو توڑنے میں لگی رہیں اور تین لاکھ پچاس ہزار نفری پر مشتمل افغانی دستہ بھی تیار کرلیا اس کے باوجود دارالخلافہ کابل تک کو پوری طرح قابو میں نہیں کرسکیں۔ اس ایک سال میں امریکہ کی تربیت یافتہ افغانی فوج کے ۴۶۰۰ فوجی امریکہ کی ناقص حکمت عملی کا شکار ہوئے۔ امریکی فوج کے اعلیٰ ترین افسر میجر جنرل ہیرالڈ گرین کو بھی اسی سال اگست میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اب اس کے باوجود بھی اگر امریکی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے افغانستان کو محفوظ تر بنا دیا ہے تو ان کی عقل پر ماتم کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ زمینی صورتحال تو یہ ہے کہ افغانستان کے طول و عرض پر اب بھی طالبان کا سکہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانی صدر اشرف غنی ان کو مذاکرات کی دعوت دے رہے ہیں۔

امریکی انتظامیہ اگر ۱۳سال قبل دھونس دھمکی کے بجائے مصالحت پر آمادہ ہوتا

تو اس کی یہ درگت نہیں ہوتی مگر اس وقت تو بش کے دماغ میں ہوا بھری ہوئی تھی اس نے کہا تھا ہمارے مطالبات صاف ہیں۔ تمام دہشت گردی کے کیمپ بند کر دیئے جائیں۔ اس طویل جنگ کے نتیجے میں طالبان کا کوئی کیمپ بند تو نہیں ہوا ہاں امریکیوں سے لڑنے کیلئے انہیں کئی نئے کیمپ ضرور قائم کرنے پڑے۔ القائدہ کے رہنماوں کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ (ورنہ ہم زندہ یا مردہ انہیں ملا عمر سمیت اٹھا لے جائیں گے)۔ اس بابت یہ ہوا کہ اسامہ بن لادن تو خیر انتقال کر گئے لیکن امریکیوں نے نہ جانے ان کے کس ہم شکل کو مار کر سمندر میں پھینک دیا۔ اگر وہ واقعی اسامہ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ان کی لاش ذرائع ابلاغ کے سامنے پیش ہوتی اور ڈی این اے کے ذریعہ ثابت کیا جاتا کہ دنیا کے سب سے بڑے نام نہاد دہشت گرد کو ہلاک کر دیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں تھا اس لئے ایک ڈرامہ کر کے فائل بند کر دی گئی۔ ڈاکر ایمن ظواہری کو مارنے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہیں اور ملا عمر کی گرفتاری سے امریکہ خود تائب ہو گیا۔

جارج بش نے یہ بھی کہا تھا ہم امن پسند قوم ہیں اس کے باوجود ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ اچانک رونما ہونے والی دہشت گردی کے سبب دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ ان ۱۳ سالوں کے دوران افغانستان کے مظالم اور عراق پر بلاجواز فوج کشی نے ثابت کر دیا کہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد کوئی اور نہیں بلکہ

امریکی سامراج ہی ہے۔ اس نے اپنے کرم فرما پاکستان کے شہریوں کو بھی ڈرون حملوں کا شکار کرکے اپنی نمک حرامی ظاہر کردی۔ اسرائیل کے ساتھ سانٹھ گانٹھ امریکی امن پسندی کی نقاب تارتار کرتی ہے۔ بش کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ ''ان سارے غیر ملکی شہریوں کو رہا کردیا جائے جن غیر قانونی طور پر حراست میں رکھا گیا ہے'' ۔

قیدیوں کی بابت تو افغانیوں نے اپنی اخلاقی برتری کا لوہا ساری دنیا سے منوالیا۔ کئی امریکی فوجی ان کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ معروف صحافی ایوان ریڈلی جو مجاہدین کی حراست میں تھی آزاد ہونے کے بعد اسلام کے آغوش رحمت میں آگئیں اور آج کل اپنے قلم سے مغرب کی نقاب کشائی کررہی ہیں ۔اس کے برعکس امریکیوں کی بربریت پہلے تو ابوغریب میں سامنے آئی ۔ اس کے بعد گونتے ناموکے مظالم خود امریکی سینٹ میں پیش ہونے والی رپورٹ میں شائع ہو گئے۔ اس رپورٹ کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی مغرب کو مہذب کہتا ہے تو اس کی نظروں سے مرعوبیت کا پردہ کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اس ماہ بدنام زمانہ امریکی قید خانہ سے جو ۴ افغانی قیدی رہا ہوئے ان کے خلاف فردِ جرم داخل کرنے کی زحمت نہیں کی گئی ۔ الزام لگاتے بھی تو کیا جبکہ ان کا کوئی جرم ہی نہیں تھا۔ ان کو تو بس افغانی مسلمان ہونے کی سزا دی گئی۔ ان بے قصوروں کو اپنی عمر عزیز کے ۱۰ سال بلاوجہ قیدو بند میں

گزارنے پڑے اور طرح طرح کی تعذیب سے گزرنا پڑا۔ کیا عدل وانصاف کے بلند بانگ دعووں کی یہی حقیقت ہے جس کا دن رات رونا رویا جاتا ہے۔ اس جنگ نے امریکہ کے حوالے سے یہ صرف یہ غلط فہمی بھی دور کردی کہ وہ اپنے تمام حواریوں سمیت ناقابلِ تسخیر ہے۔ چشم فلک نے یہ بھی دیکھ لیا کہ جاپان یا جرمنی کو میدان جنگ میں ہرانا تو ممکن ہے مگر ویتنام یا افغانستان کے جیالوں کو شکست فاش دینا ممکن نہیں ہے۔

امریکہ سے شائع ہونے والا ٹائم نامی جریدہ ۱۹۲۷ء سے ہر سال ''ٹائم مین آف دی اَیر'' کا خطاب تقسیم کرتا ہے۔ یہ خطاب ایسے شخص یا گروہ کو دیا جاتا ہے جو سال بھر کی خبروں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا ہو۔ اس کیلئے پہلے قارئین سے رائے لی جاتی اور اس کے بعد ماہرین کی ایک ٹیم اپنا حتمی فیصلہ سناتی ہے۔ اس سال جب یہ رائے دہندگی کا سلسلہ ختم ہوا تو اس میں وزیراعظم نریندر مودی سب سے آگے تھے۔ اس لئے کہ سب سے زیادہ ووٹ امریکہ اور ہندوستان سے پڑے تھے ۔ اب ان رائے دہندگان میں سے کتنے ٹائم پڑھتے یا سمجھتے ہیں یہ ایک الگ تحقیق کا موضوع ہے لیکن بہرحال اس دوڑ میں مودی جی نے بازی مارلی اور اب معاملہ کمیت سے کیفیت کی جانب بڑھا جہاں مودی جی کا ماہرین سے سابقہ پیش آیا۔ اس مرحلہ میں ماہرین نے جن ۸ افراد یا اداروں مختصر فہرست مرتب کی اس میں روس اور عراق کے صدور تو موجود تھے لیکن امریکی صدر یا ہندوستانی

وزیراعظم ندادرد تھے۔ بالآخر ایبولا فائٹرس کو ”ٹائم مین آف دی اَیر“ کیلئے منتخب کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایبولا فائیٹرس نے ان سیاستدانوں کی بہ نسبت بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن عدل کا تقاضہ یہ تھا کہ اس سال افغانی مجاہدین کو اس خطاب سے نوازہ جاتا۔ ویسے مغرب سے اس طرح کی کشادہ دلی کی توقع ہی فضول ہے۔

خیر جیسے تیسے ۲۰۱۴ء نے ہم سے رخصت لی اور ۲۰۱۵ء ہمارا منتظر ہے۔ یہ سال فلسطین کے حوالے سے ایک نئی تاریخ رقم کرسکتا ہے اس لئے گزشتہ سال غزہ کے لوگ ایک بہت بڑی آزمائش سے گزرے لیکن انہوں نے شدید ترین حالات میں کمال صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔بڑی پامردی اور عزم واستقلال کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا ۔اس کے نتیجہ میں حماس اور فتح کے درمیان غیر معمولی اتحاد واتفاق کی فضا وجود میں آئی اور ایک متفقہ حکومت کا قیام بھی عمل میں آیا۔ عالمی رائے عامہ میں تبدیلیاں نمایاں ہونے لگیں ۔ یوروپ میں فلسطین کے تئیں ہمدردی اور اسرائیل کے خلاف غم وغصہ کی ایک لہر نظر آئی ۔ اس پیش رفت سے اسرائیلی سیاستداں بوکھلا گئے ہیں اور انہوں نے اسرائیل کو ایک نسلی امتیاز پر منحصر یہودی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش تیز کردی ہے ۔جس کی حیثیت حقیقت حالکے اعتراف سے زیادہ نہیں ہے اس کے باوجود اسرائیل کے حامیوں کیلئے اب اس کی حمایت کو جاری رکھنا مشکل تر ضرور ہو جائیگا۔

مغربی کنارے

میں پہلی بار انقباضہ کے آثار نظر آئے ہیں اور خالد مشعل نے سال کے اختتام پر ترکی کا دورہ کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دلیل صبح روشن ہوا چاہتی ہے اور قرآن کریم کی بشارت ’’دل شکستہ نہ ہو غم نہ کرو تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو‘‘ کی تکمیل کا لمحہ قریب آگا ہے۔ علی سردار جعفری نے اس طرح کی نئی صبح کی منظر کشی اس طرح کی تھی

شفق کے نور سے روشن ہیں محرابیں فضاؤں کی
ثریا کی جبیں زہرہ کا عارض تمتماتا ہے
پرانے سال کی ٹھٹھری ہوئی پرچھائیاں سمٹیں
نئے دن کا نیا سورج افق پر اٹھتا آتا ہے
زمیں نے پھر نئے سر سے نیا رخت سفر باندھا
خوشی میں ہر قدم پر آفتاب آنکھیں بچھاتا ہے
ہزاروں خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں سینے میں
جہانِ آرزو کا ذرہ ذرہ گنگناتا ہے
مسرت کے جواں ملاح کشتی لے کے نکلے ہیں
غموں کے ناخداؤں کا سفینہ ڈوبا جاتا ہے

ایک مودی نے کہا تھا کہ سال اچھا ہے

ہندوستان کے تناظر میں ۲۰۱۴ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے '' اک انتخاب سے پہلے اک انتخاب کے بعد''۔ یہ فرق عنایت علی خان صاحب کی پیروڈی کی مصداق ہے ''پہلے آتی تھی ایک اشارے پر، اب کسی بات پر نہیں آتی''۔ جہاں تک ہنگامہ آرائی کا سوال ہے سو تو وہ دونوں حصوں میں مشترک ہیں لیکن ان کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ پہلا نصف میں اچھے اچھوں کو یقین سا ہوگیا تھا کہ بس اچھے دن آیا ہی چاہتے ہیں۔ اب برے دنوں کو جانے سے اور اچھے دنوں کو آنے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ برے دن سے مراد کانگریس کا اقتدار ہے اور اچھے دنوں سے مراد بی جے پی سرکار ہے۔ اس حدتک تو مودی جی کی بات درست نکلی کہ کانگریس کا صفایہ ہوگیا لیکن وزارت عظمیٰ کے امیدوار نریندر مودی نے تو صرف یہ نہیں کہا تھا بلکہ وہ تو گویا (ترمیم کی معذرت کے ساتھ) صابر دت کی درج ذیل نظم سنا رہے تھے

ایک مودی نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے\
ظلم کی رات بہت جلد ٹلے گی اب تو\
آگ ہر روز ہی چولہوں میں جلے گی اب تو\
بھوک کے مارے کوئی بچہ نہیں روئے گا

چین کی نیند ہر ایک شخص یہاں سوئے گا
آندھی نفرت کی چلے گی نہ کہیں اب کے برس
پیار کی فصل اگائیگی زمیں اب کے برس
ملک میں اب نہ کوئی شور شرابہ ہوگا
ظلم ہوگا نہ کہیں خون خرابہ ہوگا
اوس اور دھوپ کے صدمے نہ سہے گا کوئی
اب میرے دیش میں بے گھر نہ رہے گا کوئی
نئے وعدوں کا جو ڈالا تھا وہ جال اچھا تھا
مودی جی نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

بھولے بھالے پریشان حال عوام ان قسموں وعدوں کے جھانسے میں آگئے اور بھول گئے کہ شاعر نے اس نظم کو کس مصرع پر ختم کیا ہے وہ کہتا ہے ''دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''۔ گزشتہ سال کا آغاز مودی جی نے نائب صدر حامد انصاری کے ساتھ ملاقات کے ساتھ کیا تھا مگر سال کے خاتمہ پر محبوبہ مفتی کو ان کے حق سے محروم کرنے کی سازش رچی جارہی ہے۔ اس طرح گویا'' سب کا ساتھ سب کا وکاس'' کا جو خواب ایک سال قبل دکھلایا گیا تھا اس کو اپنے ہاتھوں سے چکنا چور کیا جارہا ہے۔ مولانا آزاد بھون میں حامد انصاری سے ملاقات کرکے مودی جی نے ہندوستان کے سیکولر ہندوؤں کو یہ پیغام دیا تھا کہ

اب وہ مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے لیکن کشمیر میں کسی طرح اقتدار کو ہتھیانے کی جدوجہد اس بات کا ثبوت دیا جارہا ہے کہ اب ہمیں مسلمانوں کی پرواہ نہیں ہے۔

راج بھون سے نکلنے کے بعد مودی جی نے باہر موجود نوجوانوں سے ملاقات کرکے انہیں نئے سال کی مبارکباد دی۔ یہ لوگ خواتین کے تحفظ کی خاطر تیار کردہ ''ہمت'' نامی ویب سائٹ کا اجراء کررہے تھے۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ ان نوجوانوں کو جس جیوتش نے راج بھون پر جاکر یہ کارخیر کرنے کا مشورہ دیا تھا اسی نے مودی جی کیلئے شبھ مہورت نکالا تھا اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے وہ نوجوان ازخود آئے نہیں تھے بلکہ خبر بنانے کی خاطر) لائے گئے تھے۔ اس خبر میں یہ پیغام دیا گیا تھا کہ کانگریس کے راج) میں خواتین کی عصمت وعفت محفوظ نہیں ہے لیکن ایک سال بعد لیکن وقت بدل گیا۔ حال میں جب دہلی کی یوبر ٹیکسی میں عصمت دری کا واقعہ رونما ہوا تو مودی جی کو سانپ سونگھ گیا۔

اتفاق سے یکم جنوری ۲۰۱۵ء کی بھی سب بڑی خبر خواتین کے تحفظ کے حوالے سے تھی۔ اور یہ کوئی معمولی خاتون نہیں بلکہ وزیراعمل کی اہلیہ محترمہ کی خبر تھی جنھوں نے نومبر کے اواخر میں اپنی حفاظت پر تعینات محافظوں پر اعتراض

کرتے ہوئے ان کی معلومات طلب کرنے کیلئے آرٹی آئی کے دروازے پر دستک دی تھی۔مہسانہ پولس نے محترمہ جشودھا بین کو یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ یہ معلومات مقامی خفیہ بیوروکے تحت آتی ہیں جو آرٹی آئی سے مستثنیٰ ہیں ۔اس کے خلاف جشودھا بین نے درخواست کی کہ میں اپنی حفاظت پر تعنیاتی کا جو حکمنامہ مانگا ہے وہ ایل آئی بی (مقامی خفیہ بیورو) کے تحت نہیں آتا ۔اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جشودھا بین کو نہ صرف ان کے حق سے محروم کیا جارہا ہے بلکہ ان کے ساتھ کذب بیانی کی جارہی ہے۔جشودھا بین نے یہ الزام لگایا کہ یہ کسی اعلیٰ فرد کے اشارے پر ہورہا ہے۔اس الزام میں اشارہ کس جانب ہے اسے جاننے کیلئے کسی جیوتش سے رجوع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ محترمہ جشودھا بین کی جانب سے اس بات کا اعادہ کہ اندراگاندھی کو ان کے حفاظتی دستے نے ہلاک کردیا تھا ان کے اندر پائے جانے والے شدید عدم تحفظ کے احساس کا غماز ہے۔یہ خبر ۲ جنوری کے انڈین ایکسپریس میں منظر عام پر آئی۔

مودی جی کے ازدواجی مسائل سے قطع نظران کا سنگھ پریوار فی الحال تعمیر وترقی کے بجائے تبدیلیٔ مذہب کی مہم میں جٹا ہوا ہے لیکن اجتماعی تبدیلیٔ مذہب کا یہ شوشہ بھیبالآخر لوجہاد کی طرح ٹائیں ٹائیں فش ہوتا جارہا ہے۔جس وقت لوجہاد چھڑا ہوا تھا اس وقت مودی سرکار ہنی مون منارہی تھی اس لئے حزب اختلاف بھی اس نئی نویلی دلہن کو کھلنے کھیلنے کا موقع دے رہا تھا۔

دولہے راجہ کے قدم زمین پر ٹکنے کا نام نہیں لیتے تھے کبھی نیپال تو کبھی بھوٹان ، کبھی برازیل تو کبھی جاپان، کبھی امریکہ تو کبھی آسٹریلیا گویا سپنوں کا سوداگر خوابوں کے حسین سفر میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اپنی اردھانگنی جشودھا بین کو براہمن واڑہ میں چھوڑ کر دور گگن کی چھاؤں میں اِدھر سے اُدھر پھدکتا پھرتا تھا۔ بینڈ ماسٹر ذرائع ابلاغ آئے دن اچھے دنوں کی آمد آمد کا ڈھول پیٹتا اور پریوار والے باراتی دھرتی ماتا کے سینے پر لوجہاد کی شہنائی بجاتے۔ اس بیچ ضمنی انتخاب کے نتائج کا اعلان ہوا۔ اترپردیش اور بہار کی کراری ہار نے مدھو چندرما کو کڑوے کسیلے اماوس میں بدل دیا۔ محبت کے جہاد میں سنگھ پریوار شکست فاش سے دوچار ہوگیا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ مسلمان تو جہاد بھی محبت سے کرتا ہے جبکہ سنگھ پریوار دھرم یدھ میں نفرت کا پریوگ کرتا ہے۔ ایسے میں نئے سال کا جشن منانے والے سنگھیوں کو یہی کہنا پڑے گا کہ

نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر
نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا
نہ رہنماؤں کی مجلس میں لے چلو مجھ کو
میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

جب دہلی کے انتخابات قریب آئے تو بی جے پی نے ارکانِ پارلیمان کو میدان

میں اتارا۔ اس بیچتر عفرانی چولے سے عوام کا موہ بھنگ ہو چکا تھا۔ دہلی کے رائے دہندگانا چھے دنوں کی آمد سے مایوس ہو کر گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے لگے تھے۔ انہیں نیلے سویٹر اور لال مفلر والے کیجریوال کی یاد ستانے لگی تھی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے جلسوں میں خالی کرسیاں حسرت بھاری نگاہوں سے التجا کرتی تھیں کہ چند لمحوں کی خاطر سہی ہمارے بھاگ سنوارو لیکن کوئی پھٹکتا نہیں تھا۔ عوام نے مودی جی کو اتنا زیادہ دیکھ لیا تھا کہ وہ نہ ان کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے ان کے چیلوں کو سننا چاہتے تھے۔
جس گری راج سنگھ نے مودی مخالف مسلمانوں کو پاکستان بھیجنے کا نعرہ بلند کرکے اپنے آپ کو مرکزی وزارت کا حقدار بنا لیا تھا وہ دہلی کے لوگوں سے کہتا نظر آیا کہ کرپا مہربانی) کرکے صرف چند منٹ کیلئے بیٹھ جایئے میں زیادہ سے نہیں لوں گا پھر بھی) کوئی نہیں بیٹھا۔ ہندووں نے سوچا ہوگا یہ مسلمانوں کو تو پاکستان بھیج دے گا لیکن ہم ۳۸ کروڈ ہندو رائے دہندگان کہاں جائیں گے جنھوں نے مودی کو ووٹ نہیں دیا۔
اکلوتا ہندو راشٹر نیپال تو ہمیں اپنے م شرن میں لے نہیں سکتا اور اگر وہاں چلے بھی جائیں گے تو کیا ہمالیہ کی برف کھا کر اپنی بھوک مٹائیں گے۔
گری راج جیسا گھامڑ کندۂ ناتراش تو منھ لٹکا کر لوٹ آیا لیکن سادھوی نرنجن جیوتی نہایت چالاک نکلی اس نے کہہ دیا بھارت واسیو اب آپ کو فیصلہ

کرنا ہے کہ آپ رام زادوں کو ووٹ دیں گے یا حرام زادوں کو یعنی جو رام زادہ ہے وہ رامزادے کو اور جو حرام زادہ ہے حرام زادے کو ووٹ دے۔اس طرح سادھوی جی نے ہندوستان کے ۳۱ فیصد رائے دہندگان کو رام زادہ کہہ کر ان کی عزت افزائی کردی اور ۶۹ فیصد رائے دہندگان کو حرام زادہ بنادیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی اگر ۱۵ فیصد بھی مان لی جائے اور اسے ۶۹ میں سے کم کردیا جائے تب بھی سادھوی جی کے مطابق ۵۴ فیصد ہندو حرام کی اولاد قرار پاتے ہے۔ ہندو سماج کی یہ توہین دولہے راجہ کوزمین پر لے آئی اور گجرات کے فسادات پر اکڑ کر یہ کہنے والا خود سر فرعون کہ اگر میں مجرم ہوں تو مجھے پھانسی چڑھادو ایوان پارلیمان میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوا نظر آیا۔ مودی جی نے کہا سادھوی جی دیہات سے پہلی مرتبہ منتخب ہو کر ایوان میں آئی ہیں ۔وہ پارلیمانی آداب سے واقف نہیں ہے اور انہوں نے معافی بھی مانگ لی ہے اس لئے کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو معاف کردینا چاہئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی نا تجربہ کار جاہل گنوار کو مودی جی نے وزیر کیوں بنایا ؟ کسی تجربہ کار مہذب بھاجپائی کو کیوں نہیں ؟اصل بات یہ ہے کہ مودی جی کو اپنی جماعت کے باصلاحیت لوگوں سے خوف محسوس ہوتا ہے اسی لئے وہ ایک سے ایک نااہل کو پکڑ کر وزارت تھما دیتے ہیں تاکہ احسانمندی اور چاپلوسی کا بول بالا رہے۔ان وزراء سے کسی صورت کوئی خطرہ لاحقنہ ہو۔

بی جے پی کیلئے سب سے بڑا چیلنج اپنے ہندو رائے دہندگان کو جوڑے رکھنا ہے۔ اے بی پی چینل کے ایک جائزے کے مطابق مودی جی کی مقبولیت نومبر سے لے کر دسمبر تک میں ۵ فیصد کم ہوئی ہے۔ اس گرتے ہوئے گراف کو روکنے کے لئے غالباً تبدیلیٔ مذہب کا شوشہ چھوڑا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ساکشی مہاراج کے گوڈسے کو دیش بھکت قرار دینے سے لے کر اویدیہ ناتھ کے دھرم پریورتن تک سارے واقعات اترپردیش میں رونما ہوتے ہیں۔ بی جے پی کی زیر نگرانی چلنے والی ریاستوں میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں کیا جاتا اس لئے کہ وہاں ریاستی اقتدار قبضے میں آچکا ہے اس لئے ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن اترپردیش اور دہلی میں صوبائی حکومت قائم کرنا ہے اس لئے وہیں ساری مہابھارت کھیلی جاتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بی جے پی کیلئے یہ مذہبی نہیں بلکہ خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ لیکن اس نے سنگھ پریوار کو لوجہاد بلکہ حرام زادے والے تنازع سے زیادہ رسوا کیا۔ ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ نہ سیاست سلیقہ سے کر سکتے ہیں اور نہ عبادت۔

دھرم جاگرن والوں نے آگرہ کے جن مسلمانوں کو ورغلا کر اپنے دام میں پھنسایا تھا وہ تو واپس اپنے دین میں لوٹ گئے مگر دھرم پریورتن سنگھ پریوار کے گلے کی ہڈی بن گیا۔ پہلے تو اس کا سرغنہ والمیکی فرار ہوگیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ پہلے سے شراب کی اسمگلنگ اور غنڈہ گردی میں بھی مطلوب ہے۔ بجرنگیوں نے کہا بھئی ہمیں کیوں پریشان کرتے ہو ہم تو بس چوکیدار ہیں اصلی کرتا

دھرتا کو پکڑو۔ اس کے بعد کرسمس کے دن علی گڑھ میں ہنگامہ کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اویدیہ ناتھ نے بڑے طمطراق سے کہا کہ میں وہاں جاوں گا اگر کوئی روک سکتا ہے تو روک لے لیکن یادو جی کی لاٹھی نے اس کاغذی شیر کو بھیگی بلی بنا دیا اور پروگرام منسوخ ہو گیا۔ ایوان پارلیمان میں اس مسئلہ کو لے کر خوب ہنگامہ آرائی ہوئی اور حزب اختلاف نے ایوان بالا میں اکثریت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت کے ناکوں چنے چبوا دیئے۔ مودی جی دہلی میں ہونے کے باوجود منہ چھپاتے پھر رہے تھے کہ کانگریس کے ششی تھرور نے ''وزیراعظم کی گھر واپسی'' (یعنی ایوان میں واپسی) کا نعرہ بلند کر دیا۔ سہمے سہمے مودی جی کو مجبوراً ایوان میں آنا پڑا لیکن بی جے پی نے اعلان کر دیا کہ وہ اس مسئلہ پر بیان نہیں دیں گے۔ حزب اختلاف وزیر اعظم کے جواب پر اڑ گیا اور کارروائیشور وغل کی نذر ہو گئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے وزیر اعظم کی زبان پر کس چیز نے قفل ڈال دیا ہے اور لمبی چوڑی ہانکنے والے اس مسئلہ پر بیان دینے سے کیوں گھبرا گئے؟ دراصل مودی جی فی الحال ایک ایسی پل صراط پر چل رہے ہیں جس کے ایک جانب کھائی اور دوسری طرف آگ ہے۔ جو ۳۱ فیصد ووٹ بی جے پی کو ملے ہیں اس میں سے ۱۲ فیصد لوگ تو ترقی و خوشحالی کے نام پر جھانسے میں آ گئے تھے اور باقی ۱۹ فیصد کا تعلق سنگھ پریوار سے تھا۔ اب اگر وہ تبدیلیٔ مذہب کی حمایت کریں تو ۱۲

فیصد ناراض ہوتے ہیں اور مخالفت کریں تو ۱۹ فیصد کی دلآزاری ہوتی ایسے میں وہ بیچارے کریں بھی تو کیا کریں؟ سنگھ پریوار والوں کبھی دستور ہند کو تو غور پڑھا نہیں ہے اس لئے انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی ہے واضح اکثریت کی مدد سے وہ جو من میں آئے کر سکتے ہیں اسلئے کبھی ہندو راشٹر تو تبدیلیٔ مذہب کے خلاف قانون سازی کی ڈینگ مارتے ہیں۔ یہ بیچارے نہیں جانتے کہ دستوری ترمیم کیلئے دو تہائی ارکان درکار ہوتے ہیں معمولی اکثریت سے کام نہیں چلتا۔

پارلیمانی انتخاب میں کامیابی کے بعد ریاستی انتخابات میں بی جے پی نے اپنی کامیابیوں کے سلسلے کو جاری و ساری رکھا نیز ہریانہ، مہاراشٹر، جھارکھنڈ میں اپنی حکومت قائم کرلی لیکن ان کامیابیوں میں بھییک گونہ فرق ہے۔ ہریانہ کے علاوہ کسی ریاست میں بی جے پی اپنے بل بوتے پر واضح اکثریت نہیں حاصل کر سکی۔ مہاراشٹر میں اسے مخلوط حکومت بنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ جھارکھنڈ میں بھی اسے ۸۲ میں سے صرف ۳۷ نشستوں پر کامیابی ملی ۵ نشستیں حلیف جماعت اے جے ایس یو کی ہیں جبکہبی جے پی کیلئےاس بار سیاسی حالات نہایت سازگار تھے۔ ہر جگہ انات مخالف خیمہ منتشر تھا۔
جھارکھنڈ میں کانگریس اور مکتی مورچہ میں اسی طرح دراڑ پڑ چکی تھی جیسے مہاراشٹر میں این سی پی اور کانگریس میں جبکہ بی جے پی دونوں مقامات اپنے حلیفوں کے ساتھ تھی۔ اس کے باوجود اگر بی جے پی نکل نہیں پائی تو جب وہ تنہا الیکشن لڑے گی تو کیا

ہوگا؟

کشمیر میں بی جے پی کی لٹیا پوری طرح ڈوب گئی ۔ جموں کشمیر کے کل تین خطے ہیں ۔ ایک میں مسلمان دوسرے میں بدھ مت کے ماننے والے اور تیسرے میں ہندووں کی اکثریت ہے۔ کشمیر کے اندر بی جے پی کے سارے امیدواروں کی ضمانت ضبط ہو گئی گویا مسلمانوں نے زعفرانیوں کو پوری طرح مسترد کر دیا۔ لداخ کے اندر بھی بی جے پی اپنا کھاتہ نہیں کھول پائی ۔ جموں میں بھی جہاں ہندو اکثریت ہے اگر بی جے پی ساری جماعتوں کا صفایہ کردیتی تب بھی وہ سب سے بڑی پارٹی بن سکتی مگر وہ بھی نہ ہو سکا۔ ایسے میں جبکہ سیکولر اور مسلمان ووٹرس تین خیموں میں تقسیم ہو چکے تھے بی جے پی کا دوسرے نمبر پر آنا اس بات کی علامت ہے کہ بی جے پی کے اچھے دن لد چکے ہیں ۔ اس میں شک نہیں ۲۰۱۴ء کا نصف اول بی جے پی اور وزیراعظم نریندر مودی کیلئے کامیابیوں کی حسین ترین خواب تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ ۲۰۱۵ء ان خوابوں کی بدترین تعبیر بن کر سامنے آئیگا۔ سال نو کے اختتام پر میں عوام (ترمیم کے ساتھ) یہ شعر پڑھ رہے ہیں

نہ شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے
کس نریندر نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

(مذہبی آزادی اور تبدیلی مذہب مخالف قانون (قسط اول

یوروپ میں بدقسمتی سے صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی اخلاقی انحطاط کا دور بھی شروع ہوگیا۔ یوروپ میں رائج مسخ شدہ مسیحی تعلیمات چونکہ سائنسی ایجادات سے ٹکراتی تھیں اس لئے دانشوروں میں مذہب سے بیزاری پیدا ہوئی جو بالآخر خدا کے انکار پر منتج ہوئی۔ مغربی مفکرین نے ایسے گمراہ کن نظریات گھڑے جن کی رو سے اشرف المخلوقات انسان کا درجہ گرا کر اسے سماجی جانور قرار دے دیا گیا۔ جانوروں اورانسانوں کے درمیان فرق کو ختم کرنے کیلئے انہوں نے جنگل کی مانند ایک ایسا مادر پدر آزاد سماج بنانے کی کوشش کی جس میں انسان وحشی جانور بن گیا۔ اس دور میں بدعنوان مذہبی رہنما ظالم حکمرانوں کی آلۂ کار بنے ہوئے تھے اور جبر واستحصال میں ان کے مددگار اور حصہ دار تھے اس لئے عوام بھی دین بیزار ہو گئے اور اخلاقی اقدار کا جنازہ اٹھ گیا۔ اس دورِ پرفتن کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس میں مشیت ایزدی نے مغرب کے مفکرین سے گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر انسانی حقوق کا تعین کروالیا۔

طلوعِ اسلام کے تقریباً ۶۰۰ سال بعدجب اسلام کی روشنی یورپ میں پہنچی وہاں پر امراء نے بادشاہ وقت کی زیادتیوں کے خلاف اپنے حقوق کے تحفظ کی

خاطر انسانی حقوق کا بحث کا آغاز کیا جو آگے چل کر میگنا کارٹا کے نام پر عوام کیلئے بحال کردیئے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے بھی ان حقوق کو تسلیم کرلیا۔ بنیادی حقوق کی اس فہرست میں جہاں مساوات، جان ومال کا تحفظ اور آزادی کی ضمانت دی گئی ہے وہیں عقیدہ و فکر اور مذہبی آزادی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دستور ہند کی دفع ۲۵ میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ جو کوئی بھی ہندوستان میں رہتا ہے اور اس کو مذہب اختیار کرنے، اس کی اتباع کرنے اور تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ بنیادی حقوق شہریوں کو بحیثیت انسان حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو نہ کوئی عطا کرتا ہے اور نہ منسوخ کرسکتا ہے۔ یہ لوگوں کے صوابدید پر ہے کہ وہ انہیں تسلیم کریں یا انکار کردیں لیکن جو اسے تسلیم کرتا ہے وہ انسانیت کا علمبردار اور جو پامال کرتا ہے انسانیت کا دشمن قرار پائے گا۔ اس پس منظر میں سنگھ پریوار یا بی جے پی کی جانب سے تجویز کردہ تبدیلیٔ مذہب مخالف قانون کا جائزہ لیا جانا چاہیے نہ کہ گھر واپسی کے ہنگامے کے تحت اس پر گفتگو کی جائے اس لئے کہ ایسا کرنے سے حقیقت حال تک رسائی ممکن نہ ہوسکے گی۔

سچ تو یہ ہے کہ اینٹی کنورژن بل (تبدیلیٔ مذہب مخالف قانون) کے متعلق نہ بی جے پی سنجیدہ اور نہ حزب اقتدار۔ دستور میں ترمیم کیلئے بی جے پی کو دو تہائی اکثریت درکار ہے اور حزب اختلاف کبھی بھی اس بابت اس کا تعاون نہیں

کرے گا اس لئے یہ معاملہ یونہی لٹکا رہے گا۔ ایسے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سنگھ پریوار چاہتا کیا ہے؟ ایک طرف تو اس کی خواہش ہے کہ ہندوستان کے سارے باشندے ہندو مذہب اختیار کرلیں۔ یہ خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک کہ غیر ہندو اپنا آبائی مذہب تبدیل نہ کریں۔ دوسری جانب سنگھ پریوار کی جانب سے مذہبی تبدیلی کی روک تھام کا قانون بنانے کی بھی پیشکش کی جاتی ہے اور اس کیلئے دیگر سیاسی جماعتوں سے تعاون طلب کیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ متضاد مطالبات کیوں کئے جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہی ہے کہ سنگھ پریوار اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر قانون کا سہارا لے کر ہندو سماج کے لوگوں کو مذہب کی تبدیلی کے حق سے محروم کرنا چاہتا ہے اور گھر واپسی کے چور دروازے سے مسلمانوں اور عیسائیوں کو اپنے گھر میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے سنگھ پریوار دعوت تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہب کو تبدیل کروانے کا حوصلہ اپنے اندر کیوں نہیں پاتا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ مذہب کی تبدیلی دعوت و تبلیغ کے شجر کا ثمر ہے۔ اگر اس پودے کو حسن اخلاق کی آبِ حیات، حسنِ کردار کی شمسی تمازت اور خدمت و محبت کی کھاد میسر آجائے تو یہ بڑی تیزی سے پروان چڑھتا ہے لیکن خدا نخواستہ اخلاص کا فقدان ہو جائے تو یہ مرجھا جاتا ہے۔ ہندو احیاء پرستوں کے

شدھی کرن میں ناکامی کی بنیادی وجہ ان کی منافقت اور بدنیتی ہے۔ خوف و ہراس اورفریب و لالچ وہ کیڑے مکوڑے ہیں جو دین دھرم کے بیج کو چٹ کرجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی جانب سے کی جانے والی ہر گھر واپسی کی تحریک ناکام ہو جاتی ہے ۔ اس کے نتیجے میں کوئی باہر سے اندر تو داخل نہیں ہو پاتا ہاں گھر کے اندر رہنے بسنے والے بہت سارے سمجھدار ہندو ان حماقتوں سے بیزار ہو کر الحاد و اباحیت کی شاہراہ پر نکل جاتے ہیں اوران میں سے کچھ اسلام و عیسائیت کی پناہ میں بھی آجاتے ہیں۔ اپنے تمام تر ذرائع و وسائل کے باوجود ناکام ہونے والے ہندو احیاء پرستوں کے بالمقابل مسلمان اور عیسائی اپنے محدودوسائل اور نامساعد حالات کے باوجود اس مقصد جلیل میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔

ہندو تواوادی تحریکیں بشمول بھارتیہ جنتا پارٹی تبدیلیٔ مذہب کاہنگامہ کھڑا کرکے مذہب کی تبدیلی پر پابندی لگانا چاہتی ہیں۔ ان کے لئے یہ بلیک میل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بار بھی جیسے ہی اس مسئلہ پر شور بپا ہوا سنگھ پریوار نے فوراً تبدیلیٔ مذہب پر پابندی کا اپنا پرانا راگ چھیڑ دیا۔ دعوت دین ہندو مبلغین کے بس کا روگ نہیں ہے کیونکہ اول تو ان کا تصور دین اس قدر مہمل اور گنجلک ہے کہ دھرم کی بنیادوں پر ہی اتفاق نہیں ہوپاتا۔ دوسرے خود ان کے اپنے اندر ایمان و یقین کا زبردست فقدان ہے ایسے میں وہ کسی اور کو بھلا ایمان کی دعوت کیسے دے سکتے ہیں ؟اس پر سیاسی برتری

کی محدود غرض وغایت بھی ان کے راستے کا روڑا ہے اس لئے کہ جب وہ محسوس کرتے ہیں سیاسی غلبہ حاصل کرنے کا سہل متبادل موجود ہے تو دعوت و تبلیغ کے پاپڑ کیوں بیلے جائیں ۔ ایسے میں وہ اس مشکل شاہراہ کو خیرباد کہہ کر آسان راستوں کی جانب نکل جاتے ہیں ۔

ہندومت در حقیقت قدامت پرستی اور روایت پسندی کا ناقابلِ فہم ملغوبہ ہے۔ جس دن انسان اپنی عقل کا استعمال کرکے غور فکر سے کام لیتا ہے اس دھارمک کرم کانڈ کے حصار سے نکل جاتا ہے ۔ اس لئے یہ لوگ تبدیلیٔ مذہب پر پابندی لگانے کے بہانے دعوت دین پر قدغن لگانے کیلئے کوشاں ہیں۔ دستوری ترمیم کے ذریعہ تبدیلیٔ مذہب پابندی لگانے کی سعی ماضی میں تین مرتبہ ہو چکی ہے۔پنڈت نہرو کے دورِ اقتدار میں ۱۹۵۵ء کے اندر یہ بل پارلیمان میں پہلی بار پیش ہوا ۔ اس وقت بحث کا جواب دیتے ہوئے وزیراعظم نے کہا کہ اس کے ذریعہ غلط ذرائع کی روک تھام کے بجائے عوام کو خوفزدہ کرنے کا کام لیا جائیگا۔ انہوں نے ولبھ بھائی پٹیل کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا دستور سازی کے دوران تین کمیٹیوں نے اس پر غور کیا لیکن وہ کوئی ایسا لائحہ عمل تجویز نہ کرکے جس سے آگے چل کر اس کے بیجا استعمال کو روکا جاسکے۔ دستور ساز اسمبلی ہندو احیاء پرستوں کے اغراض و مقاصد سے واقف تھی اس لئے وہ ان کے ناپاک ارادوں میں مانع ہوئی۔ پنڈت جی نے اسی کی جانب واضح اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا دھونس اور دھوکہ کے

ذریعہ اگر کوئی مذہب کی تبدیلی کرواتا ہے تو اس پر عام قوانین کے ذریعہ لگام لگائی جا سکتی ہے لیکن اگر تبلیغ دین کو شرائط وضوابط کا پابند کیا جائیگا تو اس سے پولس کو دخل در معقولات (ڈرانے دھمکانے)کے بے شمار اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔

مرکز میں ناکامی کے بعد ہندو احیاء پرستوں نے ریاستی سطح پر قوانین وضع کرنے کا چور دروازہ کھولنے کوشش کی اور جملہ ۶ ریاستوں کے اندر انہیں جزوی کامیابی حاصل ہوئی لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس گناہ بے لذت سے لطف اندوز ہونے والوں میں صرف جن سنگھ یا بی جے پی ملوث نہیں تھی بلکہ ۱۹۶۷ء میں جب یہ قانون اڑیسہ میں بنا تو وہاں سوتنترا پارٹی کی حکومت تھی۔ مدھیہ پردیش کے اندر ۱۹۶۸ء میں یہ پابندی لگائی گئی اس وقت کانگریس سے نکل کر مخلوط حکومت بنانے والے گووند نارائن سنگھ برسر اقتدار تھے۔ اروناچل پردیش میں کانگریس نے ۱۹۷۸ء میں یہ کارنامہ انجام دیا اور پھر اسی جماعت نے ۲۰۰۶ء میں ہماچل پردیش کے اندر بھی یہی حرکت کرڈالی۔ گجرات کے اندر نریندر مودی نے ۲۰۰۳ء میں نے یہ قانون نافذ کیا جبکہ راجستھان اور چھتیس گڑھ میں ۲۰۰۶ء کے اندر یہ قانون وضع کرکے صدارتی توثیق کے لئے روانہ کیا گیا جو ہنوز دستخط کا منتظر ہے۔ اس معاملے میں سب سے دلچسپ صورتحال تمل ناڈو کی ہے جہاں بی جے پی کو خوش کرنے کیلئے یہ قانون بنا اور ۲۰۰۴ء میں اس کے اقتدار سے ۲۰۰۲ء بے دخل ہوتے

ہی اس کا خاتمہ کر دیا گیا اس طرح گویا ثابت ہو گیا یہ سیاسی مفاد کا کھیل ہے دین و مذہب سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے۔

اڑیسہ کی عدالت نے تو اس قانون کو دستور کی دفع ۲۵ میں تسلیم شدہ مذہبی آزادی کے حق سے متصادم قرار دے دیا مگر مدھیہ پردیش کی عدالت نے جب اس کی توثیق کردی تو معاملہ سپریم کورٹ میں پہنچا۔ وہاں پر جسٹس اے این رائے نے لفظ تبلیغ کے لغوی معنیٰ لے کر فرمادیا کہ اگر زید جان بوجھ کر بکر کا مذہب تبدیل کروانے کیلئے اپنے مذہب کی تبلیغ کرے تو وہ گویا بکر کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا ہے جبکہ حقیقت حال اس سے متضاد ہے۔ تبلیغ دین کے سبب بکر کے سامنے مواقع و امکانات کھلتے ہیں کہ وہ اپنی آزادی مذہب کا حق استعمال کرکے جس دین کو چاہے اختیار کرے۔ اگر تبلیغ پر پابندی لگ جائے تو بکر کیلئے اپنی پسند کے دین کو اختیار کرنے اور اس کی پیروی کرنے حق سلب ہو جائیگا اور زید تبلیغ دین کے دستوری حق سے محروم ہو جائیگا۔ اس حماقت خیز قانون کے تحت نجات اور جنت کے حصول کی ترغیب لالچ میں شمار ہوتی ہے اور جہنم کی سزا کو ڈرانا دھمکانا قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح گویا عالمی سطح پر تسلیم شدہ انسانی حقوق کی پامالی کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ایسے میں ہندی اور غیر ہندی مذاہب کی تفریق بھی مضحکہ خیز ہے مثلاً اگر کوئی ہندو مذہب کو چھوڑ کر بودھ مت اختیار کر لے یا کوئی جین اپنا مذہب تبدیل کرکے سکھ بن جائے تو

کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا لیکن جہاں کسی ہندو نے اسلام یا عیسائیت کو اختیار کیا واویلا مچایا جاتا ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں جب کہ ساری دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے حق کے نور کو سودیشی و پردیسی کے خانوں میں تقسیم کرنے سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس معاملے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے آزادیٔ مذہب پر پابندی لگانے والے اس کالے قانون کو آزادیٔ مذہب کے قانون کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنا وینکیا نائیڈو کے اس بیان جیسا ہے کہ دہلی کا نام بدل کر ہستنا پور یا اندر پرستھ رکھ دیا جانا چاہئے۔ اس پر سابق جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے فرمایا میرے خیال میں یہ بہترین تجویز ہے لیکن بات آگے بڑھنی چاہیے۔ میری رائے ہے کہ بیروزگاری کو کامل روزگار کا نام دے دیا جائے۔ غذائی قلت کا نام بدل کر خوراک کی افزونی رکھ دیا جائے۔ بیمار کو صحتمند اور جاہل کو عالم فاضل کہہ کر پکارا جائے۔ کسانوں کی خودکشی کو کسانوں کا جشن اور غریب کا نیا نام امیر رکھ دیا جائے۔ اس سے ملک کے سارے مسائل یکلخت حل ہو جائیں گے۔ ویسے مودی سرکار جسٹس کاٹجو جیسے لوگوں کے مشورے پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ میک ان انڈیا کا نعرہ لگا کر بیروزگار نوجوانوں کو الو بنایا جاتا ہے۔ صفائی ابھیان چھیڑ کر امن و آشتی کا صفایہ کیا جاتا ہے۔ کالے دھن کے خواب دکھلا کر عوام کو نیند کا انجکشن لگایا جاتا ہے۔ تعلیم کے نام پر حکمت و دانائی سے

کھلواڑ کیا جاتا ہے۔

ہندو احیاء پرست آج کل ہر سائنسی ایجاد کا کریڈٹ اپنے نام کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کوئی ہوائی جہاز ایجاد کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو پائیتھا گورس تھیورم کو اپنے نام کرکے اپنا مذاق بناتا ہے لیکن وینکیا نائیڈو کا مندرجہ بالا طرز عمل یقیناً مغرب سے مستعار لیا گیا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کا ایک اہم کام ''خوب کو ناخوب اور ناخوب کو خوب کرنا'' ہے۔ اس لئے وہاں پر خواتین کے استحصال کیلئے آزادیٔ نسواں کا خوشنما نعرہ بلند کیا گیا اور وہ لوگ خاتون خانہ کو بازار حسن میں لے کر آنے میں کامیاب ہوگئے۔ مردوزن کی مساوات کا نعرہ لگا کر مرد اپنی معاشی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگیا۔ طوائف کو سیکس ورکر قرار دے کر قحبہ گری کو تقدس عطا کردیا گیا۔ ہم جنسی کو فطری بتا کر نکاح کی ضرورت کو بے معنی بنا دیا گیا۔ سود کو خوشحالی کا شاہ کلید کے طور پر پیش کرکے افراد اور قوموں کو اپنا غلام بنا لیا گیا۔ جہاد کے ساتھ مذموم واقعات کو منسوب کرکے اسے گالی بنا دیا گیا ورنہ دھرم یدھ اور ہولی وار ہندومت اور عیسائیت میں تقدس مآب تھے۔

ہندوستان میں بھی یہی کھیل کھیلا جاتا ہے کہ مذہبی آزادی پر قدغن لگانے کی خاطر تبدیلیٔ مذہب کی روک تھام کا قانون وضع کیا جاتا ہے اور اسے آزادیٔ مذہب کا قانون کہا جاتا ہے۔ حکومت وقت فی الحال اسی منتر کا جاپ دن رات کررہی ہے لیکن ایسا کرنے سے اس

کے پاپ نہ مٹیں گے اور نہ چھپیں گے۔ جب عوام پوچھے گی کہ کیا آپ اقتدار میں یہ قانون بنانے کیلیۓ آۓ تھے تو ان کو جواب دینا مشکل ہو جائیگا اور وہ دن دور نہیں ہے۔

(جاری، ان شا اللہ)

(گھر واپسی کا مایا جال اور لکشمن ریکھا (قسط دوم

گھر واپسی کی بحث میں بیرسٹر اسدالدین اویسی کے اس بیان کے بعد کہ اسلامی عقیدے مطابق دنیا کے سارے لوگ پیدائشی مسلمان ہیں ایک نئی جان پڑ گئی ہے۔اصولی طور اویسی صاحب کا بیان صد فیصد درست ہے اور اس سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں مگر جب اسے گھر واپسی کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جاتا ہے تو بات کہیں اور نکل جاتی ہے۔
مختلف اصطلاحات کا استعمال اپنے ساتھ اس کا پس منظر بھی در آمد کرلیتا ہے۔ ہر بچہ دین فطرت پر دنیا میں آتا ہے اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس بچے کے سامنے دین اسلام کو پیش کیا جائے اور اسے دعوت دی جائےتاکہ اس کا خاتمہ بھی اسلام پر ہو۔ اس بابت ابتداء سے زیادہ اہمیت انتہا کو حاصل ہے اگر کسی بچہ کواس کے والدین یہودی یا نصرانی نہ بنائیں اور وہ شیطانی آیات تصنیف کرے یا اس دنیا سے جاتے جاتے یہ وصیت کرجائے کہ اس کی لاش کو دفنانے کے بجائے جلا دیا جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے؟ اس لئے ہمیں گھر واپسی کا راگ الاپ کر سیاسی فائدہ اٹھانے کے بجائے اصلاح و تبلیغ کی جانب توجہ دینی چاہئے۔
فسطائی منافقت کی اعلیٰ ترین مثال تو یہ ہے کہ ہندووں کا دھرم پریور تن جرم

عظیم ہے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہب کی تبدیلی گھر واپسی۔ اسی کو کہتے ہیں جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ جو ہندو احیاء پرست یہ کہتے ہیں کہ سارے مسلمان اور عیسائی کسی زمانے میں ہندو تھے ان کو ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر مسلمان یا عیسائی بنایا گیا وہ دراصل اپنے پرکھوں کی توہین کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہی حربہ استعمال کرکے مسلمانوں اور عیسائیوں کو دوبارہ ہندو بنا دیں لیکن اس ملک کے مسلمان یا عیسائی ان کی اس دلیل سے اس تک حد تک تو اتفاق کرتے ہیں کہ ممکن ہے ہمارے آبا و اجداد میں سے بہت سارے ہندو رہے ہوں لیکن وہ ان ہندو احیاء پرستوں کی مانند ڈرپوک لوگ نہیں تھے مثلاً آگرہ میں دھرم پریورتن کا ناٹک رچانے والا والمیکی جو گرفتاری کے خوف سے فرار ہوکر کسی چوہے کے بِل میں جا چھپا تھا۔ وہ راج کشور کی طرح بزدل بھی نہیں تھے کہ جس نے انتظامیہ کی ایک دھمکی سے علی گڑھ کا سمیلن ملتوی کردیا اور نہ آر ایس ایس کی مانند ابن الوقت تھے کہ مشکل گھڑی میں اپنے ۳۶ سال پرانے وفادار کو دربدر کردیا۔ ہمارے آبا و اجداد اگر ایسے ہوتے تو کبھی بھی اسلام قبول کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور ابھی تک سنگھ پریوار کی مانند خاکی نیکر پہن کر ہوا میں لاٹھیاں گھما رہے ہوتے۔ وہ ایسے لالچی بھی نہیں تھے کہ ایک مسلمان کو ہندو بنانے کی خاطر پانچ لاکھ روپئے چندہ جمع کیا اور ایک ڈرامہ پر ۱۵۰۰ روپئے خرچ کرکے اور ۱۵ کروڑ روپئے ڈکار گئے (اگر ۳۰۰ کا دعویٰ سچا ہے)۔

اگر ہندو احیاء پرست واقعی جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے نورحق کو کس طرح قبول کیا تو تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھ لیں ۔ اس کی ایک مثال ۵۸۶ ہجری کی ہے جب خواجہ معین الدین چشتیؒ دعوت و تبلیغ کی غرض سے ہندوستان کیلئے نکلے ملتان میں رک کر پانچ سال تک سنسکرت زبان سیکھی اوراجمیر میں آن بسے۔ مقامی لوگوں نے جب ان کی کٹیا میں داخل ہو کر آمد کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ میں مسلمان ہوں اور تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کیلئے آیا ہوں۔ گو کہ میں تمہارے درمیان تنہا ہوں۔ پھر بھی تمہیں خدا کا پیغام سناؤں گا اور تمہیں وہ پیغام سننا ہوگا۔ اگر تم اپنے کان بند کر لو گے تو تمہاری سماعتوں میں شگاف پڑ جائیں گی۔ یہ پیغام تمہارے ذہن و دل کی گہرائیوں میں اتر کر رہے گا۔ اگر تم اپنے گھروں کے دروازے بند کر لو یادل و دماغ پر پہرے بٹھا دو

تب
بھی روشنی کی کرنیں آہنی دروازوں سے گزر کر تم تک پہنچ جائیں گی۔ یہ بات راجپوتوں کو ناگوار گزری انہوں نے تلخ لہجے میں کہا کہ ہم اپنی زمین پر یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ زمین اللہ کی ہے اگر کسی انسان کی ملکیت ہوتی تو تمہارے باپ دادا موت کا ذائقہ نہ چکھتے یا زمین کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔ آپ کا یہ جواب سن کر راجپوتوں نے کہا کہ ہم کسی اللہ کو

نہیں جانتے زمین و آسمان پر ہمارے دیوتاؤں کی حکومت ہے یہاں تمہارے رہنے کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ تم دوبارہ اپنی زبان پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لاؤ۔ اس پر آپ نے فرمایا ''میں تو اسی کے نام سے زندہ ہوں اور تمہیں بھی اسی کے نام کی برکت سے زندہ کرنے آیا ہوں۔'' ایک راجپوت نے اللہ کا وہ پیغام سننے کی فرمائش کی جسے لیکر آپ تشریف لائے تھے۔ آپ نے سورہ اخلاص پڑھ کر اس کا ترجمہ سنسکرت زبان میں سنایا اور کہا کہ اللہ کو سب سے ناپسند اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش ہے۔ مٹی کے جو بت ایک جگہ سے دوسری جگہ خود حرکت نہیں کر سکتے وہ تمہاری مدد کیا کریں گے؟ یہ جواب سن کر راجپوت سپوت آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا ان میں سے جو کپوت تھے وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن بن گئے۔ ان کے ونشج آج بھی اسلام کی دشمنی پر تلے ہوئے ہیں لیکن ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسلام کا نور پھیلتا رہا۔

ہمارے پرکھوں نے تمام تر مخالفت کے باوجود نہ صرف اسلام کو قبول کیا بلکہ صبر و استقامت کے ساتھ اس روشن شاہراہ پر اپنی زندگی کا سفر جاری و ساری رکھا۔ اسی کے ساتھ وہ تبلیغ دین کی اپنی ذمہ داری سے بھی غافل نہیں ہوئے۔ چراغ سے چراغ روشن کرنے کا سلسلہ نہ کبھی رکا ہے اور نہ رکے گا۔ اس سال بھی میلاد النبیؐ کے موقع پر ملک بھر میں بے شمار ایسی مجلسوں کا اہتمام کیا گیا جس میں برادران وطن تک دین اسلام کی دعوت پہنچائی گئی۔ گجرات کے فساد

زدہ علاقہ نرودہ پاٹیہ میں بھی چوراہے کے اوپر بک اسٹال لگا کر اسلامی کتب غیر مسلمین تک پہنچایا گیا۔ مہاراشٹر میں جہاں اتحاد المسلمین جملہ ۲ اور دیگر جماعتوں کے کل ۸ مسلم ارکان اسمبلی انتخابی عمل میں کامیابی درج کرا سکے جماعت اسلامی ہند نے "اسلام سب کیلئے" کے موضوع پر ایک زبردست عوامی بیداری مہم شروع کی اور کروڑوں غیر مسلمین تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا۔

تبلیغ دین مسلمانوں کی کوئی سیاسی ضرورت نہیں بلکہ فرض منصبی ہے۔ یہ کام نہ قانون کے زور سے چلتا ہے اور نہ اسے قانون کی مدد سے روکا جاسکتا ہے۔ ہمارے آبا و اجداد نہایت جری اور بہادر لوگ تھے جو اپنے تن من دھن کی بازی لگا کر دین اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ وہ نہایت ذہین لوگ تھے کہ جنھوں نے حق کے آجانے بعد اسے قبول کرنے میں کوئی پس پیش نہیں کیا۔ نہ کسی سے خوف کھایا اور نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرے۔ وہ بلاخوف وخطر بت پرستی کے اوہام سے نکل کر اور ذات پات کی زنجیروں کو توڑ کر اسلام کے مضبوط قلعہ میں داخل ہو گئے۔ اہل ایمان ہمارے اس معاشرے کی سعید روحوں سے یہی توقع کرتے ہیں اور اسی لئے ان تک دین کی دعوت پہنچاتے ہیں۔ جو ملت اسلام کی شجاعت اور وقناعت سے سرفراز ہو اس کو دھرم جاگرن منچ کے راجیشور سنگھ جیسے لوگ خوفزدہ نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ ۲۰۲۱ء تو کجا قیامت تک دیار ہند سے اسلام اور

ے مسلمانوں کا صفایہ نہیں کر سکتے۔ بقول شاعر

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

سنگھ پریوار سے قطع نظر امت کے لئے آگرہ جیسے واقعات میں عبرت و نصیحت کا نہایت اہم پیغام ہے اور اگر ہم نے اپنی صفوں کو درست نہیں کیا نیز اصلاح حال کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تو سنگھ نہ سہی کوئی اور ہمارے قافلہ پر شب خون مار کر اسے لوٹ لے گا۔ آگرہ میں جو لوگ سنگھ کے جھانسے میں آئے ان کے بارے میں یہ خبر منظر عام آئی کہ وہ غریب الوطن بنگلہ دیشی نہایت کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس بابت حضور اکرمؐ کی ایک حدیث بیہقی، شعب الایمان میں ہے کہ ''کاد الفقر اِن یکون کفرًا'' یعنی ''قریب ہے کہ فقر و فاقہ انسان کو کفر تک لے جائے۔'' یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے اور نہ ہی لازمی امر ہے بلکہ مسلمانوں کی تاریخ میں غریب و مسکین طبقہ نے بے شمار عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں اور صبر و عزیمت کے روشن چراغ جلائے ہیں لیکن کمزور ایمان والے لوگ ہر طبقہ میں پائے جاتے ہیں اور ضعف ایمانی کے ساتھ اگر فقر و فاقہ جمع ہو جائے تو خطرات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے کفر کے ساتھ ساتھ فقر سے پناہ مانگنے کی بھی دعا سکھلائی (اللھم إنّی اعوذبک من الکفر والفقر)۔ گوناگوں وجوہات کی بناء پر ہم اپنے ان

بھائیوں سے غافل ہو گئے تھے لیکن اس طوفان نے ہماری توجہ ان کی جانب مبذول کروادی ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ ہم ان کا خیال رکھیں۔

وہ سیدھے سادے اور بھولے بھالے لوگ نہیں جانتے تھے کہ انہیں کس چیز کی دعوت دی جارہی اور کس جال میں پھنسایا جارہا ہے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ کوئی معمولی سا ڈرامہ ہوگا اس کے بعد ہمیں آدھار کارڈ اور راشن کارڈ وغیرہ مل جائیگا۔ اس سے نہ صرف کچھ سہولتیں حاصل جائیں گی بلکہ عدم تحفظ کی کیفیت بھی ختم ہو جائیگی ۔ اس کے بعد ہم پہلے جیسی مسلمانوں کی سی زندگی گزارتے رہیں گے لیکن جب یہ ہنگامہ برپا ہوگیا تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ لوگ گھبرا گئے اور توبہ و استغفار کرنے لگے ۔ ایسے میں سنا ہے کچھ لوگوں نے انہیں ڈانٹنے ڈپٹنے کی بھی کوشش کی حالانکہ وہ ہمدردی کے مستحق تھے ۔ ہمیں چاہئے تھا کہ ہم ان کو کافر قرار دینے سے قبل اپنی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرتے۔ ان کے دکھ درد کا مداوہ کرتے۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھتے اور انہیں احساس دلاتے کہ ہر آزمائش و مشکل میں ہم ان کے شریک کار ہیں ۔ علامہ اقبال کی دعا کہ ''خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے'' ایک انوکھے انداز میں قبول ہوئی ہے۔ امت کے اندر اضطراب پیدا ہوا ہے۔ خدا کرے کے اضطراب یہ موجیں ان منتشر بوندوں کو اپنے آغوش میں سمیٹ لے جن کو یہ بھیڑیئے چٹ کرجانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے ان بھائیوں کے قلب وذہن میں حکیم الامت کا یہ

۔پیغام جاگزیں کرنا ہوگا کہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اس بیچ وزیر خزانہ ارون جیٹلی نے این ڈی ٹی وی پر ایک انٹرویو کے دوران اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ذرائع ابلاغ کی سرخیوں کو ترقی و خوشحالی کے بجائے گھر واپسی نے اغواء کرلیا ہے۔ یہ بات درست ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کیلئے ذمہ دار کون ہے؟ نیز اگر حکومت ذمہ دار نہیں بھی ہے تو اس نے اس اغواء کی کارروائی کو روکنے کا کیا اہتمام کیا؟ اس بابت اگر جیٹلی جی اپنے دھرم گرنتھ رامائن سے بھی سبق لے لیں تو بہت ہے۔ رام لکشمن جب سیتا مائی کو جنگل کی کٹیا میں چھوڑ کر شکار کیلئے نکلے تو ایک لکیر کھینچ دی جو لکشمن ریکھا کے نام سے ضرب المثل بن گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت نے اس بابت کوئی لکشمن ریکھا کھینچنے کی زحمت یا جرأت کی ہے یا نہیں؟ جیٹلی جی کو یاد رکھنا چاہئے کہ سیتا کو اغواء کرنے کیلئے راون اپنے اصلی رنگ روپ میں نہیں بلکہ بھکشو کا روپ دھارن کرکے آیا تھا اور لکشمن ریکھا سے باہر نکل کر دکشنا دینے کی اصرار کرنے لگا تھا۔ آرایس ایس بھی فی الحال وہی کردار ادا کر رہا ہے جو راون کا تھا۔ اس میں آخری سبق یہ ہے کہ سیتا مائی کی معمولی سی غلطی کی بہت بڑی قیمت خود ان کو اور رام چندر جی کو

چکانی پڑی تھی۔ اگر مودی سرکار نے اس رزمیہ داستان سے کوئی سبق نہیں سیکھا تو اسے بھی بہت.بڑی قیمت چکانی پڑے گی۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

عالمی ذرائع ابلاغ کے مطابق پیرس کے اندر جو کچھ ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فرانس ایک حریت پسند ملک ہے وہاں ہر کسی کو اپنی مرضی کے مطابق جینے کی اور اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہے۔ مسلمان ناروادار ہیں اور وہ قتل غارتگری میں ملوث ہوتے ہیں۔یہودی قابلِ رحم ہیں اس لئے کہ براہِ راست ان کی دہشت گردی کا شکار ہوتے ہیں ۔ایسے میں ان کی محافظ ریاست اسرائیل کی حمایت کی جانی چاہئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کے پس منظر میں درج ذیل عنوانات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے تاکہ حقیقت حال تک رسائی ہوسکے:

- اظہار رائے کی آزادی
- مسلمانوں کی دہشت گردی
- یہودیوں اور اسرائیل کی مظلومیت

اظہار رائے کی آزادی: ہم لوگوں میں سے اکثر نے فرانس کو براہ راست دیکھا نہیں ہے اور اگر دیکھا بھی ہے تو فائی اسٹار ہوٹل کے شیشے سے جو ہر شہ کو خوشنما بنادیتا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ذرائع ابلاغ ہمیں فرانسیسی معاشرے کے بارے میں جو خوش کن نغمہ سناتا ہے ان پر ہم ایمان لے آتے ہیں۔ لیکن اگر

بدنام زمانہ چارلی ہیبدو کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو حقیقی صورتحال نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس جریدے کا اجراء ۱۹۶۹ء میں ہوا۔ اس وقت یہ انتہا پسند بائیں بازو کے افکار کا حامل انارکی پسند نظریات کا حامل رسالہ تھا جو اشتعال انگیز لب لہجے میں اظہار خیال کیا کرتا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں جب سابق فرانسیسی وزیراعظم جنرل چالس ڈیگال کا انتقال ہوا تو اس نے سرورق پر لکھا ''کولمبی (ڈیگال کا گاؤں) میں المناک رقص الوداع، ایک موت'' اس شمارے کے شائع ہوتے ہی اس جریدے پر وزارت داخلہ کی جانب سے پابندی لگا دی گئی۔

اظہار رائے کی آزادی کا نعرہ لگانے والی حکومت نے ذرائع ابلاغ کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا لیکن اس کے خلاف حرف احتجاج بلند نہیں ہوا جبکہ جس سیاسی رہنما کے خلاف لکھا گیا تھا اس کے مظالم اور سفاکی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس کے باوجود نہ اظہار رائے کے قتل عام کا ماتم کیا گیا اور نہ کسی کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ فلپ وال کی ادارت میں کے اندر اس جریدے نے اپنا رخ تبدیل کیا اور ۲۰۰۶ء میں لبنان سے برسرجنگ ۲۰۰۰ء اسرائیلی جارحیت کی تائید کی۔ اس کے بعد چارلی نے ڈنمارک میں شائع ہونے والے قابل اعتراض کارٹونس شائع کیے۔ اس پر کئی غیر مسلم دانشوروں نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔ اسی زمانے میں وال نے اسلام کے خلاف ایک اعلامیہ پر دستخط کیے۔ اس کے بعد اس جریدے سے کئی لوگوں نے وال سے اختلاف کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔

چارلی ہیبدو سے اس نام نہادآزادی کے حامی مدیر نے معروف کارٹونسٹ سائن کو یہودی مخالف کارٹون شائع کرنے کے جھوٹے الزام میں نکال باہر کا۔ صدر سارکوزی کی حکومت نے فلپ وال کے اس ظلم وزیادتی پر خوش ہو کر اسے سرکاری ریڈیو اسٹیشن کی ادارت سے نواز دیا۔ ان واقعات کی مدد سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فرانس میں اظہار رائے کی آزادی کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ننگی تلوار ضرور ہے لیکن جب اس کا مقابلہ سیکولر نظریات یا عیسائیت و یہودیت سے ہوتا ہے تو یہ میان میں دبک کر بیٹھ جاتی ہے۔

یوروپ کے اندر سب سے زیادہ تعداد میں مسلمان اور یہودی فرانس میں رہتے ہیں۔ فرانس کے اندر سیکولر اقدار کا اس قدر مبالغہ ہے کہ ۲۰۰۴ء میں حکومت نے ایک قانون بنا کر طالبات کو اسکارف پہن کر تعلیم گاہوں پر آنے سے روک دیا گیا۔ عام طور سے طالبان کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے دشمن ہیں لیکن جب فرانسیسی مسلم طالبات نے کہا کہ ہمارے حقوق پر اس درندازی کے سبب ہمیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا تو حکومت کا موقف تھا اپنی بلا سے ہمارے نزدیک تمہاری تعلیم سے زیادہ اہمیت ہمارے اقدار کی ہے۔ حکومت کے جبر و ظلم کا سلسلہ یہیں نہیں رکا بلکہ اس نے ۲۰۱۰ء میں برقعہ پر پابندی لگادی اور جس کے معنی یہ تھے کہ تم اپنا دین اپنے گھر میں رکھو یعنی

اندرون خانہ اپنے محرم افراد سے پردہ کرو لیکن باہر ہمارے سامنے بے نقاب ہو کر آو۔ یہ کس قدر احمقانہ منطق ہے اس کا ادراک کرنے کیلئے جو کم از کم عقل چاہئے اس سے بھی یہ لوگ پیدل نظر ہیں۔ یہ عجب تماشہ ہے کہ مسلمانوں کی دلآزاری کرنے والے کارٹون تو بازار میں بکیں گے اس لئے کہ یہ ہمارے اقدار ہیں لیکن تمہارا نقاب گھر کے اندر رہے گا اس لئے کہ وہ دین ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ہندو سے مسلمان بننے والا دھرم پریورتن کرتا ہے جو خلاف قانون ہے اور اگر مسلمان ہندو ہو جائے تو پسندیدہ گھر واپسی ہے۔ اس متضاد رویہ سے اہل اسلام اب پریشان نہیں ہوتے بلکہ مسکراتے ہوئے سوال کرتے ہیں ۔

تضادِ جذبات میں یہ نازک مقام آیا تو کیا کروگے
میں رو رہا ہوں تو ہنس رہے ہو میں مسکرایا تو کیا کروگے

مسلمانوں کی دہشت گردی: اس واقعہ کی مدد سے یہ پیغام دینے کوشش بھی کی جارہی ہے کہ سارے مسلمان دہشت گرد ہیں۔ جریدے پر حملہ کرنے والے مسلمانوں کے نمائندے ہیں۔ ایسا کرنے کیلئے ذرائع ابلاغ کو ایک کام تو یہ کرنا پڑا کہ اس حملے میں ہلاک ہونے والے سب سے پہلے شخص کا نام غائب کردینا پڑا اس لئے کہ احمد مرابت نہ صرف مسلمان بلکہ پولس اہلکار تھا۔ اس کا نام دینے سے یہ پیغام جاتا تھا کہ مسلمان دہشت گردی کے خلاف سب سے پہلے اپنی جانِ عزیز کا نذرانہ پیش کرتا ہے اور قانون کے مطابق زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی

نمائندگی کرتا ہے۔ احمد کے علاوہ چارلی جریدے کے اندر زیر ملازمت ایک مسلمان کی موت کو بھی چھپا دیا گیا اس لئے کہ اس کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عوامی جذبات کو برانگیجتہ کرنا ناممکن ہے۔ مسلمانوں کی ناروادی پر آنسو بہانے والے اس حملہ کے رد عمل میں ملک بھر کے اندر ہونے والے حملوں پر خاموش رہے حالانکہ صدر ہولندی اعلان کر چکے تھے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں اور ان کی عبادتگاہوں پر حملے کرکے فرانس کی آبادی کے ۵ تا ۱۰ فیصد مسلمانوں کو خوف و دہشت کا شکار کردیا گیا۔

ایک تاثر یہ بھی ہے کہ یوروپ نہات پرامن علاقہ ہے اور یہاں سارا خون خرابہ مسلمانوں کے سبب سے ہے۔ حالانکہ پیرس شہر میں ہر سال ۱۳۵ قتل کے واقعات ہوتے جن کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ یہ تعداد نہایت محفوظ سمجھے جانے والے نیویارک کی بہ نسبت ایک تہائی ہے ۲۰۱۳ء میں نیویارک کے اندر ۳۳۳ افراد کا قتل ہوا جو ۱۹۶۳ء کے بعد سب سے کم تعداد تھی۔ ان اعداد و شمار کی مدد سے مغرب کے اندر پھلنے پھولنے والی قتل و غارتگری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ پیرس کے اندر رونما ہونے والا ۱۹۶۱ء کا واقعہ کون بھول سکتا ہے جب الجزائر کے پرامن مظاہرین پر پولس فائرنگ کے نتیجے میں ۲۰۰ سے زائد لوگوں کو پولس نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرے دن دریا میں

بہنے والی لاشوں کے سبب انتظامیہ نے ۳ افراد کی موت کو تسلیم کیا اور ۱۹۸۰ء میں ۴۰ ہلاکتوں کا اعتراف کیا لیکن سبھی مجرمین کو عام معافی دے دی گئی۔ اس قتل کے عام کے بعد ساری دنیا کے رہنماوں کا پیرس آنا تو درکنار فرانس کے سربراہِ مملکت نے بھی اپنے محل سے باہر آنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ظلم کا ارتکاب کرنے والے پولس افسر موریس پاپون کو یہودیوں کو نازی کیمپ میں بھیجنے کے سبب ۱۰ سال کی سزا ہوئی۔ یہی ہے عدل ومساوات جس کی تعریف و توصیف میں اکثر و بیشتر روشن خیال مفکرین کرام رطب اللسان رہتے ہیں۔

فرانس نے کے خلاف الجزائر کی جنگ آزادی میں ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۲ء کے درمیان دس لاکھ لوگ تہہ تیغ کئے گئے۔ اس کے بعد فرانس کا قبضہ تو ختم ہوگیا مگر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں فرانس نے الجزائر کے حکمرانوں کے ساتھ ساز باز کرکے ایک لاکھ جزائری باشندوں کو ہلاک کیا۔ فرانسیسی حکومت کے ان کرتوت کو جو چشم دید گواہ ہیں ان جزائری حملہ آور نوجوانوں کے اوپر بھلا فرانسیسی کھوکھلے دعووں کیا اثر ہوسکتا ہے جن کو ٹیلی ویژن پر دیکھ کر ہم سر دھنتے ہیں۔ اس بابت کانگریسی رہنما منی شنکر ائیر کا موقف قابل تعریف ہے۔ انہوں چارلی ہیبڈو پر حملے کی مذمت کرنے کے بعد اسے ۱۱ ستمبر کے بعد مغرب کی جانب سے چھیڑی گئی دہشت گردی کے خلاف جنگ کا فطری رد عمل قرار دیا۔

انہوں نے ڈرون حملوں اور فلسطین کے اندر جارحیت کا ذکر کرنے کے بعد کہا جو کچھ ہوا وہ ہیبت ناک ہے اور میں اس سے غمزدہ ہوں مگر دنیا میں ایسی کوئی جنگ نہیں جس میں دشمن پلٹ کر حملہ نہیں کرتا اور یہ اسی کا حصہ ہے۔ بقول قابل اجمیری ؎

راستہ ہے کہ کٹتا جاتا ہے، فاصلہ ہے کہ کم نہیں ہوتا

وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

یہودیوں اور اسرائیل کی مظلومیت: اس حملے کا ایک اہم ترین حصہ دوسرے دن منظر عام پر آیا جب احمد کالیبلی نے ایک یہودی سپر مارکیٹ میں یہودی گاہکوں کو یرغمال بنا کر حملہ آور برادران کے رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس حملے کی طوالت اور یہودیوں کا یرغمال بنایا جانا بے ساختہ ممبئی میں تاج حملے کی یاد دلاتا ہے۔ گزشتہ سال اسرائیل کی غزہ پر جارحیت نے مظالم کے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے اور اس نے یوروپ کے عوام اور حکمرانوں کے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد مختلف ممالک میں اسرائیل کے خلاف غم و غصہ کی لہر اٹھی جو بلاواسطہ فلسطین کے حق میں ہوگئی ۔ مختلف ممالک یں فلسطین کی حکومت کو تسلیم کرنا شروع کیا جن میں اسپین، برطانیہ اور پھر فرانس نے پیش قدمی کی ۔ اس کے علاوہ یوروپی یونین کی زبردست حمایت فلسطین و غزہ کو حاصل ہوئی ۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں جب اسرائیل سے تین برس میں فلسطینی علاقے خالی کرنے کے مطالبے پر مبنی قرارداد پیش ہوئی تو ۱۵ رکنی سلامتی کونسل میں اس کی منظوری کے لیے ۹ ووٹ درکار تھے مگر اس کی حمایت میں آٹھ ووٹ پڑے اس لئے ایک ووٹ سے وہ نامنظور ہوگئی۔ اس کی مخالفت کرنے والوں میں صرف دو ممالک امریکہ اور آسٹریلیا تھے جبکہ پانچ ممالک برطانیہ، لیتھوینیا، نائجیریا، جمہوریہ کوریا اور روانڈا نے ووٹنگ میں حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ویسے قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس قرارداد کی حمایت کرنے والے ممالک میں فرانس سرفہرست تھا اور چین، روس، ارجنٹائن، چاڈ، چلی، اردن اور لگزمبرگ اس کے ساتھ تھے۔ اس حملے نے مسلمانوں اور فلسطین کے حق میں سازگار ہونے والی اس فضا کا یکسر خاتمہ کردیا ہے اور سپر مارکیٹ کے ڈرامہ نے ہوا کا رخ تبدیل کردیا ہے۔ یہودیوں پر یوروپ کی تنگ ہوتی زمین کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ ۱۰ سالوں میں سب زیادہ یعنی ۲۶۵۰۰ لوگوں نے ۲۰۱۴ء میں اسرائیل کی جانب نقل مکانی کی۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد ۷ ہزار فرانس سے لوٹ کر آئی جبکہ ۲۰۱۳ء میں یہ تعداد نصف سے کم یونی ۳۴۰۰ تھی۔ یہ لوگ اسرائیل کی محبت میں نہیں بلکہ مقامی آبادی کے غم غصہ سے پریشان ہو کر اور معاشی بدحالی کے سبب اسرائیل کا رخ کررہے ہیں ورنہ یوکرین سے لوٹنے والوں کی تعداد ۵۸۰۰ نہیں ہوتی۔ اس لئے قطع نظر اس کے حملہ آوروں کی نیت اور ارادہ کیا تھا بظاہر اس سے فلسطین کاز کا نقصان اور صہیونی طاقتوں کا فائدہ ہوا ہے

۔اب وہ لوگ ذرائع ابلاغ کی مدد سے اس کا بھرپور فائدہ اٹھانے میں جٹے ہوئے ہیں۔
سوئے اتفاق سے چارلی ہیبڈ پر حملہ اسی دن ہوا جس دن اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے اعلان کیا کہ فلسطینی ریاست یکم اپریل ۲۰۱۵ء کو انٹر نیشنل کریمنل کورٹ کا حصہ بن جائے گی۔اس کے نتیجے میں اسرائیل کو جنگی جرائم کی بنیاد پر بین الاقوامی عدالت کے کٹھہرے میں لانے کا حق فلسطینیوں کو حاصل ہو جائیگا۔اسرائیل اور امریکہ نے فلسطین کے انٹر نیشنل کریمنل کورٹ کا حصہ بننے کی بھرپور مخالفت کی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔آئی سی سی نسل کشی،انسانیت مخالف جرائم اور جنگی جرائم کے الزامات میں مشتبہ افراد کے خلاف مقدمات چلا سکتی ہے۔یہ عدالت معاہدۂ روم کے تحت یکم جولائی ۲۰۰۲ء کو قائم کی گئی تھی۔اب تک ایک سو بائیس ممالک اس عدالت کے قیام کے لیے معاہدۂ روم کی توثیق کر چکے ہیں۔تاہم امریکہ اور اسرائیل نے ابھی تک اس معاہدے پر دستخط نہیں کئے ہیں۔
فلسطین کی اس کامیابی پر اسرائیل نے پھر ایک بار اپنی جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلسطینی اتھارٹی کے لئے ۱۲ کروڑ سات لاکھ ڈالر کے محصولات روک لی۔امریکی کانگریس نے جہاں ایک طرف چوالیس کروڑ ڈالر کی امداد روک لینے کی

دھمکی دی وہیں اسرائیل کی جانب سے فلسطین کو محصولات کے ذریعے وصول کی جانے والی رقوم کی منتقلی روکنے کی مخالفت بھی کردی اس لئے کہ کسی سے محصول وصول کرنا اور اسے واپس نہ کرنا سراسر چوری اور دغابازی ہے۔ اسرائیل کی داداگیری سے اب فلسطینی خوفزدہ نہیں ہوتے اقوام محدےہ میں فلسطینی مندوب ریاض منصور نے اعلان کیا کہ فلسطین آئی سی سی میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے خلاف اسرائیل کی جانب سے فلسطینی علاقوں میں یہودی بستیوں کی تعمیر کے بارے میں بھی مقدمہ دائر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے تئیں پیدا ہونے والی ہمدردی کی لہر سے اسلام دشمن عناصر پہلے ہی سے خائف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک میں اسلاموفوبیا کا ہوآ کھڑا کیا جاتا رہا ہے۔ اس حملے سے قبل اکتوبر سے جرمنی میں اسلام مخالف یورپی تنظیم پیگیڈا' نے 'مغرب کی اسلامائزیشن' کے خلاف ہر ہفتہ ایک ریلیکا انعقاد کیا لیکن وقت' کے ساتھ میڈیا میں ان ریلیوں کی مخالفت بھی شروع ہو گئی۔ جرمن اخبار 'بلڈ' کی طرف سے شروع کی گئی ایک مہم کی حمایت سابق چانسلر ہلمٹ، اداکارہ کیروکائن ہرفرت اور ریٹائرڈ فٹ بالر اولیور بیئر ہوف کے علاوہ ۸۰ کے قریب مشہور شخصیات نے کی۔ 'پیگیڈا' کی اسلام مخالف ریلیوں کے خلاف جرمنی کے شہروں برلن، کولگنی، ڈریسڈن اور سٹٹگرٹ میں بھی ہزاروں لوگ نے سڑکوں پر مظاہرے کیے انہیں بتدریج تقویت ملتی چلی گئی۔ جن شخصیات

نے 'پیگیڈا' کے خلاف مہم میں شمولیت اختیار کی ہے، وہ انتہا پسندی اور نفرت کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہیں اور رواداری و بھائی چارے کے علمبردار ہیں۔

پولیس کے مطابق برلن میں ۵ ہزار کے قریب احتجاجی مظاہرین نے 'پیگیڈا' کے چند سو حامیوں کا راستہ روک دیا۔ خبر رساں ایجنسی ڈی پی ایس کے مطابق سٹٹگرٹ، مووینسٹر اور ہیمبرگ میں ۲۲ ہزار لوگوں نے 'پیگیڈا' کے خلاف احتجاجی جلوس نکالے۔ کولوگنی میں 'پیگیڈا' کی حمایت میں صرف ڈھائی سو افراد باہر نکلے جب کہ ان کی مخالفت میں ہزاروں افراد نے احتجاج کیا۔ مسلمانوں کے ان حوصلہ مند اقدامات کا فائدہ یہ ہوا کہ فضا پھر ایک بار ان کے حق میں ہموار ہونے لگی۔ سابق چانسلر گیرڈ شیراڈ اور معرف ٹی وی اینکر تھامس گوٹسچاک نے بھی 'پیگیڈا' کی اسلام مخالف ریلیوں پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے اور ابتداء میں پیگیڈا کی حامی نظر آنے والی موجودہ چانسلر انجیلا مارکیل بھی اس کی مذمت کی۔ یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ فی الاظل مسلمان ایسے دبے کچلے بھی نہیں ہیں کہ اسلام دشمن کی سازشوں کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلیں یا ان سے خوف کھا کر گھر بیٹھے رہیں۔ وہ اللہ تعالی پر توکل کرکے باہر نکلتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کی مدد و نصرت سے کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ بقول شاعر

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا
آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

دہلی انتخاب: بیدی کا عروج مودی کا زوال

احمد آباد میں بیٹھ کر دہلی کو فتح کرنا جس قدر آسان ہے دہلی میں آنے کے بعد یہ کام اتنا ہی مشکل ہے۔ مثل مشہور ہے دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں اور ویسے بھی ابلیٰ اپنے خوشنما تھیلے سے باہر آچکی ہے اس لئے اس کی اچھل کود کے پیچھے ٹی وی پر بجنے والی شیر کی چنگھاڑ سے کوئی خوف نہیں کھاتا۔ وادیٔ کشمیر کے اندر کراری شکست کے بعد جہاں بی جے پی کے تمام امیدواروں کی ضمانت ضبط ہو گئی اب دہلی کے اندر اپنی عزت بچالے جانا پارٹی کے وقار کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ گزشتہ اسمبلی انتخاب میں بی جے پی کی دہلی شاخ کے داخلی انتشار وافتراق پر قابو پانے کیلئے مودی جی نے غیر معروف ڈاکٹر ہرشوردھن کو آگے بڑھادیا تھا مگر وہ اکثریت کے حصول میں ناکام رہے۔ فی الحال ہرش وردھن مرکزی وزیر ہیں اور انہیں ریاستی سیاست میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے ایسے میں عصر حاضر کے خودساختہ چانکیہ امت شاہ نے ممبران پارلیمان کی مدد سے دہلی کا میدان مارنے کی ٹھانی۔

ممبران پارلیمان والی حکمت عملی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ یہ باہر والے لوگ نہ کسی کے رفیق تھے اور نہ رقیب۔ اس کام کیلئے شاہ جی نے سادھو سا کشی

مہاراج اور سادھوی نرنجن جیوتی کا انتخاب یہ سوچ کر کیا کہ ان کے گیروے پیراہن سے بھولے بھالے ہندو عوام کو فریب دیا جاسکے گا لیکن وہ بھول گئے کہ اس چمکدار زعفرانی لباس کے اندر ایک سیاہ دل اور سرخ زبان بھی پائی جاتی ہے جو آگ اور زہر اگلتی ہے۔ ان حضرات نے وہ گل کھلائے کہ ایوان پارلیمان میں مودی جی کا چراغ گل ہوگیا اور زبان پر تالہ پڑ گیا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ارکان پارلیمان کے سامنے سادھوی نرنجن جیوتی کی حرام زدگی پر معافی مانگی۔ ساکشی مہاراج بیچارے خواتین کو چار بچوں کا مشورہ دینے کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکے۔

سنگھ پریوار برہما چریہ میں وشواس رکھتا ہےاور ساکشی مہاراج خود بھی برہما چاری ہیں ایسے میں اگر مہاراج کی آگیہ کا پالن کرنے کیلئے ان کی کوئی بھکت کسی مسلم لڑکے سے وواہ کرلیتی ہے تو مہنت اویدیہ ناتھ لو جہاد کا نعرہ لگا کر دھرم یدھ چھیڑ دیتے ہیں۔ اب بیچاری ہندو خواتین کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ کریں تو کیا کریں؟ کوئی انہیں ہندو دھرم کی رکشا کرنے کیلئے ۴ بچے پیدا کرنے کی صلاح دیتا تو کوئی مودی سرکار کو بچانے کیلئے ۱۰ بچوں کا مشورہ دیتا ہے۔ یہ سنت مہنت اور شنکراچاریہ شاید نہیں جانتے کہ ان کا مشورہ قبول کرنے کے بعد بچہ کو جنم دینے میں اچھا خاصہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اور پھر کوئی بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی ووٹ نہیں ڈال سکتا۔ یہ حق اسے بالغ

ہونے کے بعد یعنی ۱۸ سال کی عمر میں حاصل ہوتا ہے۔ اب اس پس منظر میں غور کریں کہ کیا آج سے ۲۰ سال بعد سن بلوغ کو پہنچنے والا ہندوستانی جوان کیا ۸۳ سالہ مودی کو وزیر اعظم بنائے گا جبکہ وہ خود ۷۵ سال سے زائد عمر والے سیاستدانوں کے سیاست میں عمل دخل کے روادار نہیں ہیں۔ خیر اگر ان سادھو سنتوں میں اتنی سمجھ ہوتی تو یہ بیچارے سنگھ پریوار کے چکر میں کیوں پڑتے ؟

اس مہم میں ناکامی کے بعد شاہ جی نے وزراء کی جانب رخ کیا اور مودی جی کے سب سے بڑے بھکت گری راج سنگھ جیسوں کو میدان میں اتارا لیکن ان کی بھی دال نہیں گلی لوگوں کو ان کے جلسوں میں نہ آنا تھا سو وہ نہیں آئے۔ امیت شاہ کے پاس پارٹی کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کیلئے آخری ترپ کا پتہ وزیر اعظم نریندر مودی تھے سو وہ انہیں بھی رام لیلا میدان میں لے آئے۔ اعلان ہوا کہ ایک لاکھ مودی بھکت ریلی میں آئیں گے حالانکہ اس اعلان میں خود اعتمادی کا فقدان عیاں تھا اس لئے کہ گزشتہ سال مودی جی کو دیکھنے کیلئے رام لیلا میدان میں ایک لاکھ ۳۵ ہزار لوگ آئے تھے لیکن اب انہوں نے مودی جی کو دیکھ لیا ہے۔

پہلے ہی مرحلے میں ۲۵ فیصد مقبولیت کی کمی کا اعتراف کرنے کے بعد جب شاہ جی نے دیکھا دہلی کے لوگ متوجہ نہیں ہو رہے تو ہریانہ کا رخ کیا اور وہاں سے

بھیڑ اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ ہزاروں بسیں اس کام میں لگائی گئیں لیکن اس کے بعد بھی لوگ دہلی کی سرکاری سیر کیلئے تیار نہیں ہوئے۔ مفت آنا جانا اور اوپر سے دکشنا ان کے اندر کوئی کشش پیدا نہ کر سکی۔ اس کے بعد حقیقت پسندی کا دامن تھامتے ہوئے پولس سے صرف ۷۵ ہزار افراد کے پیش نظر بندوبست کرنے کیلئے کہا گیا لیکن ہائے افسوس کہ ساری ڈنڈ بیٹھک کے بعد ۲۵ سے ۳۵ ہزار کے درمیان لوگ کسی طرح جمع ہوئے۔ یہ تو کسی بھی وزیراعظم کیلئے توہین ہے۔ اس جے دمیں مودی جی نے امیت شاہ کی ناکامی کا بخار کیجریوال پر اتارا اور انہیں نکسلوادی قرار دے کر جنگل میں چلے جانے کا مشورہ دیا تاکہ دہلی میں جنگل راج قائم کرکے وہ شبھ منگلم ساودھان کر سکیں۔

اس عظیم ناکامی کے بعد براک اوبامہ کے علاوہ کوئی اور سہارا نہیں بچا۔ چانکیہ جی نے سوچا کیوں نہ یوم جمہوریہ کے موقع پر براک اوبامہ کی آمد کے سہارے اپنی ڈوبتی نیا کو پار لگا لیا جائے۔ وہ فوراً اپنا سجھاؤ لے کر سمراٹ اشوک کے سمکش پہنچے اور پرارتھنا کی مہابلی اب ہماری عزت اوبامہ کے ہاتھ میں ہے۔ فی الحال اوبامہ کی مقبولیت کا گراف بھی دن بدن نیچے گر رہا ہے ایسے میں اگر آپ ان کے اور وہ آپ کی ناؤ کے کھیویا بن جائیں تو ممکن ہے ہم کنارے پہنچ جائیں گے۔ سمراٹ اشوک اپنے چانکیہ کی اس ونتی پر بہت خوش ہوئے ان کو شاباشی دی اور فوراً انتخابات کی تاریخ کا اعلان کروادیا۔ ان

لوگوں کی یہ خام خیالی ہے کہ اوبامہ کی آڑ میں اپنا خوب چرچا کرکے عوام کو مسحور کردیں گے اوراس سے قبلکے لوگ ہوش میں آئیں ہم انتخاب جیت جائیں گے ۔

اس حکمت عملی میں ایک مشکل یہ ہے کہ براک اوبامہ دہلی سے انتخاب نہیں لڑ سکتے اس لئے انہیں وزیراعلیٰ کا امیدوار نہیں بنایا جاسکتا۔ اس سے پہلے جن ریاستوں میں انتخابات کا انعقاد ہوا وہاں اروند کیجریوال جیسا مضبوط دعویدار موجود نہیں تھا لیکن دہلی میں تو وزیرااعلیٰ کا امیدوار پیش کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ جس طرح وارانسی کے رائے دہندگان جانتے تھے کہ اروند کیجریوال اگر کامیاب بھی ہو جائیں تو وزیراعظم نہیں بن سکتے اسی طرح دہلی کے ووٹرس بھی جانتے ہیں کہ اگر بی جے پی کو اکثریت حاصل بھی ہو جائے تو نریندر مودی وزیراعلیٰ نہیں بن سکتے۔ ایسے میں ایک طاقتوار امیدوار کے اعلان کی مجبوری بی جے پی پر آن پڑی۔

امیت شاہ کے پاس کسی امیدوار کے انتخاب میں ۳ ایس کی کسوٹی ہے۔ سنگھ ، سانسد رکن پارلیمان) اور سروے۔ اس کسوٹی پر سنگھ کے نام پر بی جے پی میں بے شمار) امیدوار ہیں لیکن ان لوگوں پر جب اراکین پارلیمان کی رائے لی جاتی ہے تو ان میں سے بڑی تعداد نااہل ٹھہرتی ہے اور جب ان کے نام کا عوامی جائزہ (سروے) کرایا جاتاہے توانہیں کتا نہیں پوچھتا اس لئے عدم مقبولیت کی بناء

پر ان کا پتہ کٹ جاتا ہے۔ امیت شاہ نے اس صورتحال سے نمٹنے کیلئے سنگھ سے باہر نظر دوڑائی اور عام آدمی پارٹی یعنی عاپ کے اندر کیجریوال سے ناراض لوگوں پر نشانہ سادھا۔ سب سے پہلے ان کی نظر عنایت شاذیہ علمی پر پڑی۔

ایک زمانے میں شاذیہ نے مسلمانوں کو فرقہ پرست بن کر ووٹ دینے کا مشورہ دیا تھا اور بڑی تنقید کا نشانہ بنی تھیں لیکن بی جے پی جیسی فرقہ پرست جماعت میں شامل ہو جانے کے بعد انہیں کم از کم مذکورہ بالا رائے کا اظہار کرکے بدنام ہونے کی ضرورت نہیں پیش آئیگی۔ سابق صحافی شاذیہ نے قلمتوڑ کر اول تو عاپ کا جھاڑو سنبھالا تھا مگر جب پارلیمان کی رکنیت سے محروم رہیں تو مودی جی کی صفائی ابھیان میں شامل ہو گئیں۔ اس طرح بی جے پی کے اندر آنے کا راستہ انہوں نے خود صاف کردیا۔ اس کے بعد جب امیت شاہ نے اس راستے پر پھول بچھائے اور وہ اس پر دوڑی چلی آئیں لیکن چونکہ وہ نام سے مسلمان ہیں یہی وجہ ہے کہ بی جے پی کیلئے انہیں وزیر اعلیٰ کا امیدوار بنانا مسئلہ بن گیا اس لئے تلاش جاری رہی۔

ہندوستان کو ہندوراشٹر بنانے والے بانجھ سنگھ پریوار کیلئے یہ شرم کامقام ہے کہ ۹۰ سال کی جدوجہد کے بعد وہ دہلی شہر کیلئے ایک قابل وزیر اعلیٰ کا امیدوار تک پیدا نہ کرسکا۔ کس کام کا وہ لٹریچر اور کس فائدے کی وہ شاکھائیں جو ایسا معمولی کام نہ کرسکیں جسے دو سال قبل بننے والی عاپ پارٹی نے کردکھایا ہو۔ خیر شاذیہ کے بعد چانکیہ جی کو سابق پولس کمشنر کرن بیدی کے

اندر امید کی کرن نظر آئی ۔ ان پر جب ڈورے ڈالے گئے تو خلاف توقع وہ پکے ہوئے پھل کی طرح دام میں آگریں۔ کرن بیدی حالانکہ پشاوری ہندو ہے اس لئے انہیں تقسیم کا درد اور مسلمانوں سے نفرت وراثت میں ملی ہے۔ کرن بیدی نے چونکہ ایک سکھ سے بیاہ رچا لیا اس لئے لوگ انہیں سکھ سمجھنے لگے ویسے موجودہ دور میں عام سیاستدانوں کا دین و مذہب صرف اور صرف ابن الوقتی ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ سنگھ پریوار سکھوں کو ہندو گردانتا ہے لیکن نہ کوئی سکھ اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہے اور نہ ہندوستانی دستور انہیں ہندو سماج میں شامل کرتا ہے۔

بدعنوانی کے خلاف چلائی جانے والی لوک پال تحریک ہیں کرن بیدی اور اروند کیجریوال ایک ساتھ تھے۔ اروند کیجریوال سے ان کا اختلاف انتخابی سیاست میں شمولیت کو لے کر ہوا تھا۔ وہ سیاسی جماعت بنا کر انتخاب لڑنے کے خلاف تھیں لیکن اب اچانک وہ وزیر اعظم کی گرویدہ ہو گئی ہیں جبکہ ماضی میں مودی جی پر گجرات فساد کو لے کر وہ تنقید کرچکی تھیں ۔ وزارت اعلیٰ کی لالچ میں کرن دیدی بھول گئیں کے کسی زمانے میں وہ بی جے پی کو بھی کانگریس کی مانند بدعنوان سمجھتی تھیں ۔ دراصل کرن بیدی نے منافقت میں شاذیہ علمی کو بھی مات دے دی اس لئے شاذیہ کا انتخابی سیاست سے کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا۔ کرن بیدی کی نامزدگی کے بعد سب سے پہلے انہیں کیجریوال نے مبارکباد دی اور

مباحثہ کی دعوت بھی دی اس پر کرن ڈر گئیں اور کہا ہم فلور پر مباحثہ کریں گے۔ جس پارٹی کا چھتیس انچ والا سینہ کیجریوال کے سامنے پچک گیا اس میں مباحثے کا دم خم کہاں؟ بیدی نے کہا میں بات نہیں کام کرتی ہوں۔ مودی جی کے بارے میں لوگوں کا یہی خیال تھا لیکن اب بدل گیا ہے۔ اب تو نہ وہ بات کرتے ہیں اور نہ رٹی رٹائی تقریر کرنے کے علاوہ کوئی اہم کام کرتے ہیں۔

کرن بیدی کے پاس انتظامی اور تحریکی تجربہ تو ہے لیکن سیاسی سوجھ بوجھ کا فقدان ہے اس لئے جیسے امتن شاہ نے انہیں وزیراعلیٰ کا امیدوار بنانے کا عندیہ دیا وہ خود ہوا میں اڑنے لگیں مگر بی جے پی میں بھونچال آگیا۔ اس زلزلہ کی ذمہ داری خود جلد باز طبیعت کی حامل کرن بیدی پر بھی ہے جنھوں نے نہ صرف اپنے گھر پر ارکان پارلیمان کی نشست بلوالی بلکہ شمالی اور مشرقی دہلی کے میئرس اور کاؤنسلر کو بلا کر انہیں بیجا نصیحتیں بھی کر ڈالیں۔ کرن بیدی کی ان مانیوں نے بی جے پی والوں کو پہلے ہی مرحلے میں پریشان کردیا اور وہ ان سے مایوس ہو کانگریسی رہنما کرشنا تیرتھ کو وزارت اعلیٰ کا لالچ دے کر پکڑ لائے۔ اب وزارت اعلیٰ کی کرسی گویا ایک انار اور سو بیمار کی سی کیفیت میں گرفتار ہے جس کا جھانسہ دے کر شاہ جی ہر روز نت نئے شکار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

کرن بیدی کے گھر پر ہونے والی نشست کا جو حشر ہونا تھا سو ہوا یعنی وہ بھی فلاپ ہو گئی ۔ اسکے اندر ے میں سے صرف ۴ ارکان پارلیمان وقت پر آئے۔ مرکزی وزیر
ہرشوردھن بادلِ ناخواستہ تاخیر سے آئے توانہیں نہ کرن ملی اورنہ چائے ملی اوروہ بے نیل و مرام لوٹ گئے۔ منوج تیواری جو پہلے ہی کہہ چکے تھے پارٹی میں تھانیداری نہیں چلے گی بولے کہ اگر پارٹی کا صدر بلائے تومیٹنگ میں جانا بنتا ہے لیکن کوئی کل پارٹی میں شامل ہو اور ہمیں بلا بھیجے تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تیواری نے ہرشوردھن کے ساتھ ہونے والے سلوک کو لے کر بھی بیدی پر تنقید کی۔
بی جے پی کے پرانے رہنماوں کو کرن بیدی کے آجانے سے یہ مشکل ہو گئی ہے کہ اب وہ اپنے چہیتوں کو ٹکٹ نہ دلا سکیں گے ۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ان میں سے ہر کوئی اپنے کسی نہ کسی رشتہ دار کوپارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑانا چاہتا ہے۔ڈاکٹر ہرش وردھن جو کبھی وزیراعلیٰ کی کرسی کے دعویدار تھے کرشن نگر میں اپنے بیٹے کو امیدوار بنانے کے چکر میں شاہ جی سے ڈانٹ کھا چکے ہیں۔ منوج تیواری.براڑی سے اپنے بھانجے کو ٹکٹ دلوانا چاہتے ہیں۔ رکن پارلیمان رمیش بگھوڑی اپنے بھتیجے وکرم بھگوڑی کو تغلق آباد سے اوررمیش ورما اپنے بھائی کو مہرولی سے الیکشن لڑانا چاہتے ہیں۔ ادیت راج سلطان پور سے اپنے بھانجے کو، ماجرہ سے رکن پارلیمان کیرتی آزاد اپنی بیوی کو اسی طرح وجئے گویل بھی

ماڈل ٹاؤن سے اپنی اہلیہ کو انتخاب لڑانا چاہتے ہیں۔ یہ تو خیر وہ لوگ ہیں جو فی الحال رکن پارلیمان ہیں لیکن ان کے علاوہ سابق وزیراعلیٰ مدن لال کھرانا بھی اپنے بیٹے کو ہری نگر سے کامیاب کرنے کے خواہشمند ہیں، سابق ریاستی صدر وجیندر گپتا اپنی اہلیہ کیلئے روہنی سے، سابق رکن پارلیمان وی کے ملہوترا اپنے بیٹے کو گریٹر کیلاش سے لڑانا چاہتے ہیں تو سابق رکن اسمبلی او پی ببر خود تلک نگر سے قسمت آزمانا چاہتے ہیں۔ یہ اس جماعت کا حال ہے جو کانگریس پارٹی کو اقرباء پروری کا طعنہ دیا کرتی ہے۔

امتج شاہ کیلئے بی جے پی کے پرانے رہنماؤں سے نمٹنا تو کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے لیکن یہاں تو وزیر خزانہ ارون جیٹلی اور وزیر خارجہ سشما سوراج کے بھی چہیتے ہیں جو تنکوں کے سہارے تیرنا چاہتے ہیں۔ ارون جیٹلی خود انتخابی میدان میں چاروں شانے چت ہوچکے ہیں سشما جی اپنی بہن کو ہریانہ کی اسمبلی میں کامیاب کرچکی ہیں مگر دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ امتا شاہ کو پتہ ہے کہ یہ پٹے ہوئے مہرے بازی جیت نہیں سکتے اس لئے وہ عاپ پارٹی سے دل بدل کر بی جے پی کے دلدل میں آنے والی کرن بیدی، شاذیہ علمی کے علاوہ ونود کماربنی، اشوک چوہان کو عاپ کے بڑے رہنماؤں کے خلاف لڑانا چاہتے ہیں۔ امتا شاہ کو اپنی پارٹی کے امیدواروں کی بہ نسبت عاپ کی شکست خوردہ امیدوار فرحانہ انجم اہل تر نظر آتی ہے۔

اس انتخابی دنگل کی محاذ آرائی بھی بہت سوں کو کنفیوژ کرتی ہے مثلاً کانگریس کا فرقہ پرست بی جے پی کے بجائے سیکولر عاپ کی مخالفت کرنا۔ اس کی وجہ صاف ہے کانگریس کا سارا ووٹ بنک فی الحال عاپ کی جیب میں چلا گیا ہے اور اسے واپس لائے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔ بی جے پی بھی کانگریس کے بجائے عاپ کو نشانہ بنائے ہوئے جب کہ قومی سطح پر اس کا دعویٰ کانگریس مکت بھارت کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی میں بی جے پی کی حریف اول کانگریس نہیں بلکہ عاپ ہے۔اس جماعت نے اسمبلی الیکشن میں کانگریس کے ووٹ پر ہاتھ صاف کیا مگر پارلیمانی انتخاب میں اس نے بی جے پی ووٹ بھی کھائے۔اس طرح گویا عاپ کو بیک وقت کانگریس اور بی جے پی دونوں سے مقابلہ درپیش ہے۔ عاپ نے بی جے پی کو اس لئے نشانہ بنایا ہوا ہے کہ بی جے پی کی جیب سے نکلنے والا ہر ایک ووٹ اس کیلئے دو کے برابر ہے۔ بی جے پی کے کشکول سے نکل کر آنے والے ہر ووٹ سے اس کے صندوق میں نہ صرف ایک ووٹ کا اضافہ ہوگا بلکہ اس سے دشمنِ اول کی جیب سے ایک ووٹ کم بھی ہو جائے گا۔ اس طرح ایک تیر سے بیک وقت دو شکار ہو جائیں گے ۔ یہ سیاسی جمع خرچ نہ دانشور سمجھتے ہیں اور نہ عام آدمی سمجھتا ہے لیکن سیاستداں خوب سمجھتے ہیں اور اروند کیجریوال کی پارٹی کا نام جو بھی ہو وہ بہر حال ایک ماہر سیاستداں بن گئے ہیں ۔

اوبامہ کی دہلی یاترا: گھر آیا میرا پردیسی

امریکی صدر براک اوبامہ کے استقبال کی تیاری دیکھ کر بے ساختہ آوارہ فلم کا نغمہ یاد آتا ہے ''گھر آیا میرا پردیسی'' لیکن موجودہ سیاسی صورتحال میں اس کا دوسرا مصرع معمولی ترمیم کا متقاضی ہے یعنی ''پیاس بجھی ہے الیکشن کی''۔ اوبامہ کی جس قدر ضرورت مودی جی کو فی الحال ہے شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ دہلی انتخاب میں فی الحال بی جے پی کی نیاّ ڈول رہی ۔ ٹائمز ناؤ کے پروگرام میں ارنب سے گفتگو کرتے ہوئے کرن بیدی کی راہ فرار نے انہیں ((Iron lady سے (I run lady) بنا دیا ہے۔ ویسے براک اوبامہ کے سخت حفاظتی انتظامات نے مہنگائی میں بی جے پی کا آٹا گیلا کر دیا ہے۔ ان کی آمد کے سبب دہلی کے باشندوں کو جو زحمت اٹھانی پڑ رہی ہے اس کا خمیازہ بی جے پی کو آئندہ انتخاب میں چکانا پڑ سکتا ہے۔

سنگھ پریوار جو ہندو راشٹر بنانا چاہتا ہے اس کے مطابق قدیم ہندوستانی تہذیب میں انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو چار چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ذات پات کا نظام تو سماجی تقسیم کیلئے وضع کیا گیا تھا مگر انفرادی زندگی کی تنظیم کیلئے اسے بھی چار حصوں میں بانٹا گیا تھا جسے آشرم کہا

جاتا تھا۔ اس لفظ کی بابت اردو داں طبقہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا شرم وحیا سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ سنسکرت کے شرم سے آیا جس کے معنی کام کے ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا زندگی کے مختلف مراحل کو ان میں کئے جانے والے افعا لسے منسوب کرکے تقسیم کیا گیا ہے ۔ اس میں پہلا مرحلہ برہمہ چریہ ہے جسے بال آشرم بھی کہتے ہیں۔

سنگھ پریوار والے بیچارے چونکہ زندگی بھر ذہنی طور پر سنِ بلوغ میں داخل نہیں ہو پاتے اس لئے دوسرے آشرم یعنی گرہست آشرم سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں اور اگر کسی کے ماں باپ زور زبردستی کرکے اس کا بیاہ رچا دیں تو وہ گھر سے بھاگ کر اپنے آپ کو مجرد بنا لیتا ہے ۔ اس کی زوجہ کو اپنے حقوق کی حصولیابی کیلئے دردر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں ۔ اس کی مثال جگ ظاہر ہے۔ اس کے بعد وان پرستھ آشرم ہے جس میں انسان دنیا کی دیگر ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے لگتا ہے مگر اپنی ازدواجی زندگی جاری و ساری رکھتا ہے ۔ زندگی آخری مرحلے یعنی سنیاس آشرم میں انسان مکمل رہبانیتاختیار کرکے جنگل بیابان کی جانب نکل جاتا ہے۔ ہندو راشٹر کے مفکر اعظم سبرامنیم سوامی شاید نہیں جانتے کہ امریکی صدر کی سیاسی زندگی کے مختلف مراحل میں اساساطیری تقسیم کا عکس بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔

امریکی آئین کسی شخص دو سے زیادہ میقات کیلئے صدر بنے رہنے کی اجازت نہیں دیتا اس لئے کوئی دو مرتبہ سے زیادہ انتخاب لڑنے کی سعادت نہیں حاصل کرپاتا۔ پہلے انتخاب سے قبل امریکی صدارتی امیدوار گویا بال آشرم ہوتا ہے اور عوام کے ساتھ فلاح بہبود کی بڑی بڑی باتیں کرتا ہے (مودی جی نے بھی یہی کیا) ۔ کبھی لوگ اس کے جھانسے میں آتے ہیں کبھی نہیں آتے لیکن اگر وہ کامیاب ہوجائے تو گویا گرہستھ آشرم میں داخل ہوجاتا ہے جہاں اسے اپنا اور اپنے بال بچوں کا مستقبل سنوارنا ہوتا ہے ۔ایسا کرنے کیلئے امریکی صدر کو اپنے عہدو پیان بھلا کر عوام کے بجائے ان سرمایہ داروں کا بہی خواہ بن جانا پڑتا ہے جن سے چندہ لے کراس نے انتخاب لڑا تھا اور جن کے تعاون کے بغیر وہ دوسری مرتبہ انتخاب نہیں جیت سکتا۔

مذکورہ بالا مجبوری یا وعدہ خلافی کا نتیجہمیں وہ عوام کی توقعات پر پورا اترنے میں ناکام رہتا ہے ۔اس لئے دوسرا انتخاب عالمی دہشت گردی کے خلاف صلیبی جنگ کی نذر ہوجاتا ہے ۔اس جنگ میں دشمن بدلتا رہتا ہے۔ کبھی سوویت یونین ، کبھی عراق، کبھی ایران یا کبھی اسامہ وغیرہ وغیرہ ۔اس طرح ایک اور مرتبہ عوام کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس میں بھی کبھی کامیابی ہاتھ آتی ہے تو کبھی ناکامی۔ کامیاب ہوجانے کے بعد امریکی صدر جان جاتا ہے اب قصرابیض کے اندر اس کے قیام کی الٹی گنتی شروع ہو گئی ہے۔ عوام

کی دولت پر عیش و طرب کا یہ آخری موقع ہے۔ اس لئے امریکی صدر کی دوسری میقات امن و امان ، چین و سکون اور عیش و عشرت کی نذر ہونے لگتی ہے اور اس کی سیاسی زندگی وان پرستھ آشرم کی جانب رواں دواں ہوجاتی ہے جہاں وہ اپنے آپ کو سبکدوشی کیلئے تیار کرنے میں جٹ جاتا ہے۔ امریکی صدر کی دو میقاتی صدارتی زندگی کا خلاصہ علامہ اقبال کے اس شعر میں دیکھا جاسکتا ہے (ترمیم کی معذرت کے ساتھ)۔

آتجھ کو بتاؤں میں تقدیر 'صدر' کیا ہے
شمشیر سناں اول طاؤس و رباب آخر

براک اوبامہ فی الحال اپنے طاؤس و رباب والے آخری دور سے لطف اندوز ہورہے ہیں ۔ ہندوستان کا حالیہ دورہ بھی ہے اسی کا ایک حصہ ہے۔ قصرابیض کے اندر مارٹن لوتھر کنگ (ثانی) کو پرنام کرنے کے بعد وزیراعظم نریندر مودی جب صدر اوبامہ کے ساتھ لوٹ رہے تھے تو انہوں نے بڑے افسوس کے ساتھ اپنی ایک دیرینہ حسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا میری بیٹیوں کو مجھ سے شکایت ہے کہ دوران صدارت میں نے انہیں ساری دنیا کی سیر کرائی لیکن ہندوستان نہیں دکھلایا۔ اب کیا تھا مودی جی نے فوراً انہیں مع اہل و عیال ہندوستان آنے کی دعوت دے ڈالی اس لئے کہ ویسے بھی جس وقت مودی جی اوبامہ کے گھر گئے تھے ان کے اہل خانہ کہیں اور نکل گئے تھے۔ اس لئے کہ ان میں کوئی بھی مودی جی

سے ملنے کا مشتاق نہیں تھا۔ اوبامہ نے اس دعوت پر بصد شوق لبیک کہا اس لئے کہ انہیں پتہ ہے سنیاس آشرم میں داخل ہونے کے بعد انہیں نہ تو کوئی امریکہ میں پوچھے گا اور نہ ہندوستان میں ۔ اگر وہ ہندوستان اپنے ذاتی خرچ پر بھی تشریف لائیں گے تب بھی مودی جی تو دور کوئی معمولی سیاستداں بھی ان کو منہ نہیں لگائے گا۔ یہ حفاظتی انتظامات اور ٹھاٹ باٹ کا تو تصور بھی محال ہوگا۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے بلکہ جارج ڈبلیوبش کے سبکدوش ہونے کے بعد اس کے بھارتی دورہ اس کی زندہ مثال ہے۔

.براک اوبامہ کے بارے میں پہلے تو یہ خبر اڑی کی اوبامہ کو وارانسی لے جایا جائیگا تاکہ وہاں کے رائے دہندگان کو احساس دلایا جاسکے کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کو منتخب کرکے پارلیمان میں بھیجا جس نے انہیں شہشاگہ عالم کے درشن کرواکر سارا احسان اتار دیا۔ پھر بعد میں کسی نے مودی جی کو یاد دلایا کہ اوبامہ نے شاہجہاں کے تعمیر کردہ تاج محل کو دیکھنے میں دلچپی کا اظہار کیاہے۔ان کی بنارس کے بسیّ گھاٹ پر جانے کی کوئی خواہش نہیں ہے جسے مودی جی نے خود اپنے ہاتھ میں پھاوڑا لے کر صاف کیا ہے ۔ اس کے بعد اوبامہ نے اپنے انتظامات کا معائنہ کرنے کیلئے اپنے دست راست جان کیری کو بھیجا تو مودی جی انہیں احمدآباد لے گئے۔ احمدآباد میں کیری کو متاثر کرنے کیلئے مودی جی نے فراٹے کے ساتھ انگریزی میں خطبہ ارشاد فرمادیا۔ یہ عجب حماقت ہے امریکہ

میں جا کر ہندی میں خطاب کیا جائے اور احمد آباد کے اندر انگریزی جھاڑی جائے۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ در حقیقت مودی جی تقریر نہیں کر رہے تھے بلکہ تحریر شدہ بیان پڑھ رہے تھے اس لئے اس کے قابلِ تعریف تھا ہونے کا کریڈٹ لکھنے والے کو جاتا ہے۔

دہلی اور آگرہ کے لوگ اول تو اوبامہ کی آمد سے بہت خوش ہوئے لیکن جب حفاظتی دستوں نے اپنا پنجہ کسنا شروع کیا تو لوگوں کا جینا دوبھر ہو گیا۔ مختلف راستوں کو بند کر دیا گیا۔ تاج محل کے آس پاس سے عوام کو دور رکھنے کے فرمان جاری کر دیئے گئے۔ امریکی حفاظتی ماہرین نے یوم جمہوریہ کی تقریبات کے دوران اسے نو فلائی زون میں تبدیل کرنے کا مطالبہ بھی کیا گویا یوم جمہوریہ کے دن سرزمین ہند پر آسمان تک امریکہ کا بول بالا ہو گیا۔ فوجی سربراہان نے نو فلائی زون کی پابندی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن دیش بھکت سرکار شاشٹانگ نمسکار کرتے ہوئے اس فیصلے کے آگے بھی نتمستک سرِ تسلیم خم) ہو گئی۔)

صدر اوبامہ کی حفاظت میں ۵۰ ہزار اہلکار اور ۱۵ ہزار کیمرے نصب کئے گئے۔ میرا بھاٹیہ نربے۔ عصمت دری معاملے کے بعد دہلی شہر کو خواتین کیلئے محفوظ بنانے کیلئے سرکار کی جانب سے ذمہ دار بنائی گئی ہیں۔ جب انہوں نے عدالت کو آگاہ کیا کہ اوبامہ کی آمد کے پیش نظر ہزار اضافی ۱۵ ہزار کیمرے نصب کئے جائیں گے تو جج صاحبان بدر درینر احمد اور سنجیو سچدیو نے اس پر حیرت کا

اظہار کیا۔ انہوں نے کہا یہ آپ ہندوستانی شہریوں کیلئے نہیں بلکہ ایک غیر ملکی صدر کیلئے کر رہی ہیں۔ اگر ہم یہی انتظام ہندوستانیوں کے لئے کرنے کا حکم دیں تو اس پر عملدرآمد میں مہینے بلکہ سالہا سال لگ جائیں لیکن (غیروں کیلئے) کیلئے آناً فاناً ہفتوں کے اندر یہ کام ہو جاتا ہے۔ یوم جمہوریہ کے موقع پر جس غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ مرکزی حکومت نے کیا ہے اس نے تقریب کے وقار پر پانی پھیر دیا۔

اس دورے کے موقع پر مودی جی نے قوم کے ساتھ اپنے پریوار کو بھی نظر انداز کیا۔ جس وقت اوبامہ بھارت کیلئے پر تول رہے تھے امریکہ میں انسانی حقوق کیلئے جدوجہد کرنے والی سکھوں کی ایک تنظیم نے آر ایس ایس اور اس کی تمام ذیلی تنظیموں کو ”غیر ملکی دہشت گرد تنظیم“ کے زمرے میں شامل کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے عدالت سے رجوع کیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس دہشت گرد تنظیم کو امریکہ کے لوگ مالی امداد کرتے ہیں جس پر پابندی لگنی چاہئے۔ اس مقدمہ کے پیش نظر عدالت نے سکریٹری آف اسٹیٹ جان کیری کو ۶۰ دن کے اندر جواب دینے کا حکم جاری کیا ہے۔ اگر مودی جی میں عزت نفس کی رمق ہوتی تو وہ صدر اوبامہ سے مقدمہ خارج کروانے کا مطالبہ کرتے ورنہ دورہ رد کرنے کی دھمکی دیتے یا کم از کم سنگھ پریوار یہ مطالبہ کر دیتا لیکن ایسا لگتا ہے اس پورے پریوار کو سانپ سونگھ گیا ہے اور وہ اپنی ساری ہتک بھلا کر سرخ قالین بچھانے میں

مصروف ہے۔ مودی جی جس وقت واشنگٹن گئے تھے تو ان کا استقبال کرنے کیلئے اوبامہ نے ایک معمولی افسر کو بھیجا دیا تھا جبکہ اوبامہ کا خیر مقدم کرنے کیلئے مودی جی خود ہوائی اڈہ پہنچ گئے اور جس جوہری معاہدے کے چرچے ہیں وہ منموہن سنگھ اور جارج بش کے درمیان ۲۰۰۶ء میں طے پا چکا ہے۔

دنیا کا سب سے بہادر اور بے خوف آدمی کون ہے اس سوال پر تو اختلاف ممکن ہے لیکن امریکی صدر کیلئے کئے جانے والے حفاظتی انتظامات کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا نہایت سہل ہوجاتا ہے کہ دنیا سب سے زیادہ بزدل اور غیر محفوظ انسان کون ہے؟ اس واقعہ میں اہل بصیرت کیلئے عبرت کا اور بھی سامان ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور اس صدر دنیا کا سب سے بارسوخ انسان ہے۔ وہ جو چاہے کرسکتا ہے حالانکہ وہ بیچارہ اپنے بال بچوں کے ساتھ تاج محل کی سیر تک نہیں کرسکا جبکہ ایسا کرنا آگرہ میں رہنے والے ہر فقیر و مسکین کیلئے ممکن ہے۔ اس بار لاکھ اہتمام کے ساتھ آگرہ کا منصوبہ بنایا گیا لیکن مشیت کو یہ منظور نہیں تھا۔ دورے سے قبل شاہ عبداللہ کا انتقال ہوگیا۔ اوبامہ کیلئے ممکن تھا دورہ مکمل کرکے جاتے ہوئے ریاض ہوتے ہوئے جاتے لیکن اگر تقدیر میں محرومی لکھی ہو تو اسے کون بدل سکتا ہے؟ بقول غالب

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دہلی سے بہار تک: نئی اک حماقت، حماقت کے بعد

مشیت ایزدی انسانی خواہشوں اور تمناوں کی طابع نہیں ہوتی ۔ یہ اپنے انوکھے انداز میں سرگرم کار عمل رہتی ہے۔ نہ جانے کس جیوتش نے امیت شاہ کے بیٹے کی شادی کا مہورت ۱۰ فروری کو نکالا جس دن دہلی میں امیت کی بربادی کا جشن منایا گیا اور امیت نے کس لئے ۱۵ فروری کو دہلی میں عشائیہ رکھا ممکن ہے اس دن کیجریوال کی حلف برداری ہو جائے۔ ابن آدم اپنی لاکھ کوشش کے باوجود مشیت کے فیصلوں پر دست درازی تو کجا انکا ادراک تک نہیں کرسکتا۔ جس کو جتنی زور سے پٹخنا ہوتا ہے اسے پہلے اسی قدر اوپر اٹھایا جاتا ہے اور پھر دھڑام سے اس کو زمین پر لے آیا جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ مودی جی کے ساتھ ہوا کہ پہلے تو انہیں پارلیمانی انتخابات میں غیر متوقع کامیابی مل گئی جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد منعقد ہونے والے انتخابات میں وہ کامیابی دوہرائی تو نہیں جا سکی مگر ناکامی ایسی تھی کہ جس کی کسی طرح پردہ پوشی ممکنہو گئی۔ مثلاً ضمنی انتخابات میں ناکامی کو چھپانے کیلئے کہہ دیا گیا کہ اس کا قومی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہریانہ میں مرتے پڑتے اکثریت مل گئی تو پہلی مرتبہ بی جے پی سرکار کا نعرہ بلند کردیا گیا۔ اس کے بعد مہاراشٹر اور جھارکھنڈ میں اکثریت سے محرومی کو دیگر جماعتوں کی حمایت سے پورا کیا گیا۔ کشمیر کی وادی

کے تمام نشستوں پر ضمانت کی ضبطی کو جموں میں حاصل ہونے والی کامیابی کی خوشنما چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ بی جے پی کا یہ نام نہاد وجئے رتھ پنچر حالت میں جب دہلی پہونچا تو کمان امیت کے ہاتھ میں تھی اور مودی سارتھی بنے ہوئے تھے ۔ اس کے باوجود دہلی میں اس کے دونوں پہیوں کی ہوا نکل گئی ۔ اس رسوا کن ناکامی پر مودی جی کو یہی کہنا پڑے گا کہ ؎

زلف ہستی کو کئی بار سنوارہ ہم نے
اس کی فطرت ہے بکھرنا یہ بکھر جاتی

وزیر اعظم جملہ ۵ مرتبہ اپنی زلفیں سنوار کر خاص طور پر کارزارِ دہلی میں اترے لیکن چاندی جیسی سفید زلفوں کو بکھرنا تھا سو بکھرکے رہی ۔ بننے سنورنے سے بے نیاز امیت شاہ اپنے حجرے میں بیٹھ کر نت نئی سازشوں کے جال بنتے رہے اور ان میں پھنستے اور دھنستے رہے۔ ان کا ہر داوں الٹا پڑا اور بالآخر کل یگ کے چانکیہ کی چوٹی ہستنا پور دہلی میں کٹ کر پتنگ ہو گئی ۔ مودی اور شاہ کا عبرتناک انجام بابل کے فرمانروا نمرود کی یاد دلاتا ہے۔ جس کی بابت ارشاد ربانی ہے '' بھلا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس (غرور کے) سبب سے کہ خدا اس کو سلطنت بخشی تھی ابراہیم سے پروردگار کے بارے میں جھگڑنے لگا جب ابراہیم نے کہا میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے وہ بولا کہ جلا اور مار تو میں بھی سکتا ہوں'' ایک روایت کے مطابق ۴۰۰

سال تک اقتدار پر فائز رہنے کے باعث اس میں رعونت اور انانیت آ گئی تھی، سرکشی اور تکبر، نخوت اور غرور اس کی عادت بن گئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونکنے کی سفاکیت کا مظاہرہ اسی نے کیا تھا لیکن اللہ نے اس کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے ایک معمولی سے مچھر کو استعمال کیا جو نمرود کے نتھنے میں گھس گیا اور عرصۂ دراز تک اس کا دماغ چاٹتا رہا۔ اس عذاب سے نکلنے کیلئے وہ اپنا سر دیواروں اور پتھروں پر مارتا پھرتا تھا، ہتھوڑوں سے کچلواتا تھا۔ اس طرح دیگر انسانوں کو مچھر سے حقیر سمجھنے والے خود سر فرمانروا کو مچھر کے ذریعہ ٹھکانے لگادیا گیا۔

اروند کیجریوال کے چاہنے والوں سے معذرت کے ساتھ (جنہیں مچھر کی مثال گراں گزرے گی) حقیقت یہ ہے کہ ابھی ۸ ماہ قبل مودی نے کیجریوال کو وارانسی میں دو لاکھ سے زیادہ ووٹ سے شکست دی تھی۔ مودی جی کی قیادت میں بی جے پی کو تقریباً ۳۰ فیصد ووٹ ملے تھے جبکہ عاپ کو صرف ایک فیصد۔ عاپ کے گڑھ دہلی میں صورتحال یہ تھی کہ تمام نشستوں پر بی جے پی نے کامیابی درج کرائی تھی۔ اسمبلی حلقوں پر اسے تقسیم کیا جائے تو ۶۰ میں بی جے پی کو فوقیت حاصل تھی اور ۱۰ میں عاپ کو۔ یہ سب اس وقت ہو گیا تھا جب مودی جی کے سر پر دہلی کا تاج نہیں تھا۔ اب تو وہ دہلی کے تخت پر براجمان ہیں۔ سرکاری مشنری ان کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ دولت کی ایسی ریل پیل ہے کہ اڈانی اور امبانی ان کے

آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ وہ دن میں چار مرتبہ کپڑے بدلتے ہیں جن میں دس لاکھ کا کوٹ بھی ہوسکتا ہے۔ ۲۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے جلسہ عام میں آنے کیلئے ہیلی کاپٹر کا استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے ۔ ذرائع ابلاغ میں بنے رہنے کیلئے وہ امریکی صدر اوبامہ تک کی خدمات حاصل کرلیتے ہیں ۔

مودی جی کے دست راست شاہ جی کے بارے میں یہ افواہ اڑا دی گئی ہے کہ انہوں نے اب تک جملہ ۱۴۲ انتخابات لڑائے جن میں سے کسی میں انہیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔ شاہ جی نے دہلی انتخاب کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کراز خود اپنا پول کھول دیا۔ اوچھے اشتہارات کی بھرمار نے ان ذہنیت کا پتہ دے دیا۔ وزراء کے ساتھ ساتھ ۱۲۰ ارکان پارلیمان کے ٹڈی دل کورن بھومی میں اتار کر ان کی بھی مٹی پلید کرادی گئی۔ ہر دو دن میں ایک نئی حکمت عملی ان کے عدم اعتماد کی چغلی کھانے لگی ۔ وہ کبھی عاپ کے رہنماوں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملاتے تو کبھی کانگریسیوں کو خریدتے ایسے میں بیچارے بی ایس پی والوں کی کیا بساط؟ شانتی بھوشن کے بیان سے خوش ہوکر ان کی جانب پینگیں بڑھائی گئیں اور بالآخر کرن بیدی کو وزارت اعلیٰ کا لالچ دے کرانتخابی پرچم تھما دیا گیا۔ کرن بیدی کو وزیراعلیٰ کا امیدوار بنانا بقول امیت شاہ کے ایک ماسٹر اسٹروک تھا مگر اس کے اندر یہ اعتراف چھپا ہوا تھا کہ کیجریوال کو زیر کرنے کیلئے اکیلے مودی کافی نہیں ہے اور پھر وقتِ ضرورت بیدی کو بلی کا بکرہ بھی بنا

یا جاسکتا ہے۔ جب شاہ جی نے دیکھا کہ بیدی نامی نائٹ واچ مین پہلی ہی گیند پر ہٹ وکٹ ہو کر پویلین میں لوٹ رہی ہیں تو مجبوراً مودی جی کو بلّا تھما دیا گیا لیکن مودی کا حال بیدی سے بھی بدتر ہوا۔ وہ تو ریٹائرڈ ہرٹ ہو کر اسٹریچر پر پویلین میں واپس ہوئے۔ مودی جی کواس حالتِ غیر پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

تونے بیدی کا انتخاب کیا
خود کو بکرا بنالیا میں نے

انتخابی نتائج سے ٹھیک ایک ماہ قبل مودی جی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ رام لیلا میدان میں آئے لیکن بی جے پی کے داخلی انتشار نے کام گیلا کردیا۔ اس جلسہ عام کی ناکامی کا غصہ مودی جی نے ڈی آر ڈی او کے سربراہ سریش چندر پر اتار اجو اگنی میزائل کے راجہ جنگ سمجھے جاتے ہیں ان کو رسوا کرکے ہٹایا گیااور وجہ یہ بتائی گئی کہ کسی نوجوان کو لانا ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کم عمر سربراہ آخرکیا کرے گا جبکہ اسرو کی ٹیم میں دس چوٹی کے سائنسداں سریش چندر سے بھی عمر دراز ہیں اگر ڈی آر ڈی اور میں نئی روح پھونکنی تھی توان کی بھی چھٹی کی جاتی لیکن اندھی نگری چوپٹ راج میں اس طرح کے سوالات کا کون کرتا ہے؟ انتخاب سے قبل آخری ہفتے میں مودی جی نے سجاتا سنگھ کا پتہ کاٹ دیا۔ اوبامہ کی تنبیہ یا نیویارک ٹائمز کی تنقید کے

بعد اگر یہ اقدام کیا جاتا تب تو کوئی بات بھی تھی لیکن اب اگر جلسوں میں لوگ نہیں آرہے تو اس میں خارجہ سکریٹری کا کیا قصور؟ اس کے بعد جب دیکھا کہ بی جے پی آپسی سر پھٹول ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تو ماتنگ سنگھ کے نام پر داخلہ سکریٹری انل گوسوامی کی گھر واپسی کر دی گئی۔ مودی جی اور شاہ جی کی تمام دھونس دھمکی کے باوجود بی جے پی کی دہلی شاخ کے باغیانہ تیور اور اس کے عبرتناک انجام پر یہ شعر صادق آتا ہے

سیاست کا انجام کیا خوب ہے
اطاعت سے پہلے بغاوت کے بعد

اس مہم کے دوران بی جے پی سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ جس نے چین کا دل باغ باغ کر دیا۔ بی جے پی کے دہلی مینی فیسٹو یں شمال مشرقی ریاستوں کے باشندوں کو غیر ملکی قرار دے دیا گیا۔ چین کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہاں کے لوگوں چین میں داخل ہونے کیلئے ویزے کی ضرورت نہیں ہے۔ ریاستی وزیر داخلہ کرن رجیجو کا تعلق چین کی سرحد سے متصل اروناچل پردیش سے ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا اس معاملے پر رجیجو سے استعفیٰ لیا جاتا لیکن بلی کا بکرہ گوسوامی بنے۔ دراصل مودی جی کو اب غیر متعلق لوگوں پر برسنے کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہئے کہ آخر پانی کہاں مر رہا ہے۔ کل تک جان چھڑکنے والا ووٹر آخر کیوں بدظن ہو گیا ہے؟ اچھے دن کے خواب کیوں چکنا چور ہو گئے؟

مودی جی اگر اس سوال پر جذباتیت کو بالائے طاق رکھ کر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو ان کو پتہ چلے گا کہ انتخاب سے قبل جب انہوں نے اپنے آپ کو چائے والا کہا تھا تو عام لوگوں کو لگا کہ یہ اپنا آدمی ہے وزیر اعظم بننے کے بعد کچھ نہیں تو ایک کپ چائے ہی پلا دے گا لیکن اب جا کر پتہ چلا کہ یہ اوبامہ کو تو چائے پلاتا ہے لیکن اپنی عوام کو پوچھ کر نہیں دیتا۔ شاہ جی نے این ڈی ٹی وی پر لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ کالے دھن کو واپس لا کر انہیں دینے کی بات۔ محاورتاً کہی گئی تھی حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں امیروں نے تو بی جے پی کو ووٹ دیا لیکن غریب ان سے دور ہو گیا۔ مودی جی نے انتخاب والے دن نوجوان رائے دہندگان سے خاص طور پر اپیل کی کہ وہ ووٹ دینے کیلئے ضرور جائیں لیکن مودی جی کو نہیں معلوم تھا کہ ان ۸ مہینوں میں ملک کا نوجوان ان سے مایوس ہو چکا ہے اس نے ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ووٹ تو دیا لیکن کمل کے بجائے جھاڑو کے نشان پر مہر لگا کر لوٹ آیا۔ حکومت کے رویہ سے قوم کے نوجوانوں کو احساس ہو گیا ہے کہ

ان درختوں سے ہمیں چھاؤں ملے گی کیسے
جن درختوں کے کسی شاخ پہ پتا ہی نہیں

نوبھارت ٹائمز کے مطابق پہلی بار ووٹ دینے والے رائے دہندگان میں سے ۵۲ فیصد

نے عاپ اور ۲۷ فیصد نے بی جے پی کے حق میں رائے دی۔ ۲۲ سال تک نوجوانوں میں ۴۶ فیصد عاپ اور ۳۸ فیصد بی جے پی کے ساتھ تھے۔ طلباء اور بیروزگاروں میں سے بھی ۴۴ فیصد کی پسند عاپ اور ۴۱ کو بی جے پی راس آئی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ جی نے اپنے انٹرویو میں اعتراف کیا تھا کہ کیجریوال میں ذرائع ابلاغ کو متوجہ کرنے کی کشش زیادہ ہے۔ یہ کشش کس سے زیادہ ہے انہوں نے نہیں بتایا مگر نتائج نے بتادیا کہ مودی سے زیادہ ہے۔ مودی نے بی جے پی کو ایسی ذلت آمیز شکست سے دوچار کروایا جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ اس کی ذمہ داری مودی سرکار پر آتی ہے نہ کہ کیجریوال کی انتخابی مہم پر بقول شاعر

اس میں کچھ دوش مری جان ہوا کا ہی نہیں
وہ بھلا کیسے اڑے گا جو پرندہ ہی نہیں

ذرائع ابلاغ کا طوطا چشمی رویہ دیکھ کر بیربل کی مشہور کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک بندریہ کو تالاب کے درمیان میں بچے سمیت بٹھا کر سطح آب کو بلند کیا جاتا ہے۔ ایسے میں بندریہ پہلے تو بچے کو سر کے اوپر اٹھالیتی ہے لیکن جب پانی اس کی ناک تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنی جان بچانے کی خاطر بچے پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس بار ذرائع ابلاغ میں یہی ہوا۔ سرکاری احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا میڈیا پہلے تو بی جے پی کے حق میں جائزے شائع کرتا رہا

لیکن جب انتخاب سر پر آگئے اور ہوا رخ نہیں بدلا تو اپنی ساکھ بچانے کیلئے اس نے اپنا رخ بدل دیا اور آخری ہفتہ میں تین معتبر ٹی وی چینلس اور اخبارات مثلاً آج تک، اے بی پی اور اکونومکس ٹائمز نے عاپ کی بڑھت شائع کردی۔ اس کے بعد مودی جی نے اعلان کیا انتخابی جائزے روپیہ لے کر شائع کئے جاتے ہیں۔ یہ بات ان سے زیادہ کون جان سکتا ہے اس لئے کہ وہ خود یہ کھیل کرتے رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد بی جے پی نے روپیہ دے کر انڈیا ٹی وی، زی ٹی وی، آئی بی این اور دی ویک کا جائزہ شائع کروادیا جس میں بی جے پی کو کامیاب کیا گیا تھا مگر پولنگ کے بعد ایک کے علاوہ سب مکر گئے اور اس بات پر اتفاق کرلیا کہ عاپ جیت رہی ہے اور بی جے پی ہار چکی ہے۔ ویسے تو کیجریوال اب انتخاب جیت چکے ہیں اور اب وہ دہلی کی میونسپلٹی سے سنگھ کی بیخ کنی کئے بغیر نہیں مانیں گے لیکن اگر وہ انتخاب ہار بھی جاتے تو سڑکوں مظاہرے کر کرکے بی جے پی کی ناک میں دم کردیتے۔ کم از کم دہلی کی حد تک تو مودی کیلئے اروند کیجریوال ایک مسلسل عذاب سے کم نہیں ہیں بقول شاعر ؎

نئی ایک الجھن نیا ایک غم
نئی اک مصیبت، مصیبت کے بعد

بی جے پی کی اس ناکامی میں صرف اس کا داخلی خلفشار، شاہ جی کی حماقتوں اور مودی جی کی بدمزہ حکایتوں کا ہی دخل نہیں ہے بلکہ اروند کیجریوال اور عاپ

کے کارکنان کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ پارلیمانی انتخاب کے بعد عآپ نے اپنی ناکامی کا جائزہ لیا اور اپنی غلطی کا برملا اعتراف کیا۔ کیجریوال کا عوام سے اپنے استعفیٰ پر معافی مانگنا ایک ایسا اقدام تھا جس نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ کیجریوال اور ان کی ٹیم نہ بی جے پی کی مانند بیجا خوداعتمادی کے نشے میں چور ہوئی اور نہ کانگریس کی طرح مایوسی کا شکار رہی بلکہ گلی گلی محلہ محلہ جاکر عوام سے رابطہ کیا اور اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا۔ ان کو پتہ چل گیا تھا کہ جب تک بی جے پی کے ہاتھ میں اقتدار کی زمامِ کار ہے دہلی کے امیر کبیر لوگ اس کے دامن سے لپٹے رہیں گے اس لئے اس نے اپنی ساری توجہ غریب بستیوں کی جانب مبذول کردی۔ مسلمانوں کو جو بی جے پی کو ہر حال میں سبق سکھانا چاہتے تھے یہ یقین دلایا گیا کہ بی جے پی کو شکست دینے صلاحیت کانگریس میں نہیں بلکہ عآپ میں ہے۔ اروند کیجریوال کی للکار اس شعر کی مصداق تھی کہ

امیر شہر سے اونچے سروں میں بات کرو
امیر شہر کو اونچا سنائی دیتا ہے
امیر شہر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو
امیر شہر تو اندھا دکھائی دیتا ہے

دہلی انتخابات کے فوری اثرات تو جموں کشمیر اور بہار کی سیاست پر پڑیں گے

اور دیرپا اثر بی جے پی داخلی سیاست پر ہوگا۔ جس دن دہلی میں پولنگ ہوئی اس کے دوسرے دن جموں کشمیر میں راجیہ سبھا یعنی ایوان بالا کے انتخابات ہوئے۔ ایوان بالا میں چونکہ بی جے پی اقلیت میں ہے اس لئے وہاں ایک ایک رکن بی جے پی کیلئے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس کے علاوہ چونکہ راجیہ سبھا میں کانگریس کے لیڈر غلام نبی آزاد اپنی قسمت آزمارہے تھے اس لئے یہ وقار کا مسئلہ بھی بن گیا تھا۔ آزاد کو ہرانے کیلئے بی جے پی نے پی ڈی پی کے ساتھ ساز باز کی تاکہ اس کے اور پی ڈی پی کے دودو امیدوار کامیاب ہو جائیں لیکن اس کھیل میں اسے ناکامی ہوئی ۔ غلام نبی آزاد نے نیشنل کانفرنس اور آزاد ارکان اسمبلی کی مدد سے بی جے پی کے چندر موہن شرما کو ہرا دیا۔ آزاد کے علاوہ پی ڈی پی کے دونوں امیدوار فیاض احمد میر اور نذیر احمد لوئے بھی کامیاب ہو گئے ۔ بی جے پی کو صرف شمشیر سنگھ پر اکتفا کرنا پڑا۔ شمشیر سنگھ کو جتانے کیلئے بی جے پی کو پی ڈی پی کی ضرورت نہیں تھی اس طرح دوسروں کی آنکھ میں دھول جھونکنے والی بی جے پی کشمیر کے اندر خود بے وقوف بن گئی اور اس کا یہ دعویٰ بھی کھوکھلا ثابت ہوگیا کہ آزاد ارکان اسمبلی کی حمایت اسے حاصل ہے۔

بہار کے اندر جنتادل (یو) کی سمجھ میں آگیا کہ آئے دن مودی کی تعریف کرنے والے جتن رام مانجھی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ مانجھی کسی بھی وقت اپنی کشتی

بیچ کر بھاجپ کے گندے تالاب میں کود سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کے تجربہ نے ثابت کردیا کہ وزارت اعلیٰ کا امیدوار رائے عامہ کو ہموار کرنے میں بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اگر بی جے پی نریندر مودی پر انحصار کرنے کے بجائے سوشیل مودی کو وزیر اعلیٰ کا امیدوار بنادے تو مانجھی کیلئے اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائیگاایسی صورتحال میں نتیش کمار جیسا گھاگ سیاستدان ہی نیّا پار لگا سکتا ہے۔ اس لئے بجا طور پر مانجھی کو نتیش سے بدلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بلی تھیلے سے باہر آگئی ورنہ اگر وہ انتخاب کے بعد جنتا دل (یو) کے کامیاب ارکان اسمبلی کو لے کر بی جے پی میں چلے جاتے تو بڑا نقصان ہوتا لیکن بی جے پی نے کرن کی مانند مانجھی کی حمایت کرنے کی تازہ حماقت کرڈالی لیکن بہار کی حماقت ان دونوں کو بہت مہنگی پڑے گی لیکن اس سے بھی سنگین خطرہ اندرونِ جماعت ان مخالفین سے ہے جو پہ درپہ کامیابیوں کے شور میں خاموش ہیں۔ دہلی کے بعد بہار میں ہاتھ آنے والی ناکامی مخالفین کے حوصلے بلند کردے گی اور وہ لوگ ان دونوں کا بوریہ بستر گول کرکے انہیں گجرات جانے والی سابرمتی ایکسپریس میں بٹھا دیں گے۔ اس وقت ان کی حالت مجید امجد کے اس شعر کی مصداق ہو جائیگی ؎

جہاں سے اڑے تھے، وہیں آ گئے
پرندے سبھی اک مسافت کے بعد

مودی سرکار کے اچھے اور برے دن

یہ حسن اتفاق ہے کہ ایک طرف بازارِ حسن میں جہاں مودی جی کے قیمتی لباس اور تحفہ تحائف کی بولی لگائی جارہی ہے۔ ان کا نام والا کوٹ سرِ عام بک رہا ہے۔ دس لاکھ کے اس کوٹ کی سب سے پہلی بولی ۱۱ لاکھ لگی یعنی مودی جی کے اس کو زیب تن کر لینے سے اس کے بازار بھاؤ میں دس فیصد کا اچھال دیکھنے میں آیا گویا برطانیہ سے دہلی لانے کا خرچ اور درزی کی بخشیش بھی اس میں شامل ہو گئی لیکن پھر مودی بھکتوں کو جوش آیا اور ان لوگوں نے اسے ۵۱ لاکھ پر پہنچا دیا۔ گرانی کے اس دور میں سورت کے اندر جہاں یہ نیلامی ہو رہی ایک معمولی چائے خانہ بھی ۵۰ لاکھ میں میسر نہیں آتا اس لئے مودی بھکت راجیش جونیجہ کی غیرت نے اسے للکارہ اور اس نے آگے بڑھ کر اس قیمت ایک کروڑ ۲۰ لاکھ لگا دی۔ یہ سب تماشہ ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جبکہ بازارِ سیاست میں مودی جی کی مقبولیت کی شرح دن بدن گھٹتی جارہی ہے۔

سورت میں لگائی جانے والی اس نیلامی میں کوٹ کے علاوہ مودی جی کو ملنے والے دیگر تحائف بھی بک رہے ہیں لیکن کسی کو ان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے یہاں تک کہ ہندو راشٹر نیپال کے سب سے مقدس مندر پشوپتی ناتھ کی مورت کو بھی کوئی ۵

ہزار سے زیادہ میں خریدنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ مشہور کھلاڑی بریٹ لی نے جو ٹی شرٹ مودی جی کو تحفہ میں دی تھی اس کو تو کوئی ۲۰۰۰ سے زیادہ نہیں دینا چاہتا۔ اس خبر کو پڑھ کر بریٹ لی اپنا سر پیٹ رہا ہوگا اور اپنے آپ کو کوس رہا ہوگا کہ یہ تحفہ دینے کی حماقت اس سے کیوں کر سرزد ہو گئی۔ مودی جی نے اس بازارو حرکت سے نادانستہ طور پر وزیراعظم کے اہم عہدے اوران کو ملنے والے تحفائف کی تضحیک ہے۔ مودی جی کو شاید نہیں معلوم کہ دستور ہند کے تحت کسی بھی وزیر کو غیر ملکی دورے پر ملنے والے ہزار سے زیادہ قیمت کے تحفہ پر اس کی اجارہ داری نہیں ہوتی بلکہ سرکاری توشہ خانہ ۵ میں جمع کرانا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کوئی وزیر بشمول وزیراعظم ان کو بیچنا تو درکنار استعمال تک نہیں کرسکتا لیکن سوئے اتفاق اس قانون شکنی کا ارتکاب بانگ دہل ہورہا ہے۔ اب اگر وزیراعظم کا دفتر یہ صفائی پیش کردے کہ ان کی قیمت ۵ ہزار سے کم ہے تب بھی یہ تحفہ دینے والے نامور ہستیوں کی توہین ہے جنھوں نے ہماری قوم کے منتخب نمائندے کی خدمت میں (موکلف ہونے کے باوجود)اس قدر حقیر تحفہ پیش کیا۔ یہ کوٹ اگراوبامہ کی جانب سے مودی کو تحفہ میں ملا ہوتا تواس پر کوئی قانونی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بابت کہا جارہا ہے کہ کسی ذاتی شناسا نے یہ تحفہ دیا ہے۔ کسی بھکت کے محبت بھرے تحفہ کو

سربازار نیلام کرنا اپنے آپ میں ایک معیوب بات ہے لیکن کسی وزیر کا اپنے کسی قریبی رشتے دار کے علاوہ کسی اور سے اس طرح کا قیمتی ہدیہ قبول کرنا بجائے خود دستور کی خلاف ورزی ہے۔ اس معاملے میں سب سے دلچسپ دعویٰ یہ ہے کہ نیلامی کے ذریعہ جمع کی جانے والی دولت سے گنگا کو صاف کیا جائیگا یعنی گنگا کنارے واقع مودی جی کے حلقۂ انتخاب وارنسی میں یہ رقم خرچ ہوگی لیکن کہ کیا اس طرح کی کمائی سے گنگا پوتر ہو جائیگی ۔ کلیگ کی یہ مہان کرانتی ہے کہ جس گنگا میں ڈبکی لگا کو لوگ اپنی آتما پوتر کرتے تھے اب اس کو غلط ذرائع سے دولت جمع کرکے پاک کیا جارہا ہے۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو رام جی کی گنگا اس قدر میلی ہو جائیگی کہ اس میں زندوں کا اشنان تو کجا مردوں کا استھی کلش بھی نہیں بہایا جائیگا اور یہ عظیم کارنامہ پردھان رام بھکت شری نریندر دامودر مودی کے سر جائیگا۔

مودی جی کے کوٹ کی مانند ان کے اچھے دن بھی پھر ایک اخبارات کی زینت بن گئے ہیں ۔ اس پر ونجارہ اور انا ہزارے دونوں نے ایک ساتھ متضاد انداز میں اظہار خیال کیا۔ عشرت جہاں ، سہراب الدین اور پرجاپتی قتل کے ملزم ڈی ایس پی ونجارہ نے نے کہا لوگ پوچھتے ہیں اچھے دن کب آئیں گے ؟ میں تو کہتا ہوں میرے تو اچھے دن آچکے ہیں ۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ قتل و غارتگری حکومت کے ایماء پر کی ہے اگر میں ایسا نہ کرتا تو گجرات دوسرا کشمیر بن جاتا اگر

ونجارہ کی بات کو درست مان لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کیا بی جے پی کی اپی ڈی پی کی مدد سے جموں کشمیر میں حکومت ساری کشمیر کو گجرات بنانے کی کوشش ہے۔ معروف سماجی کارکن انا ہزارے نے کہا مودی کسانوں اور غریبوں کی بجائے صنعت کاروں کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں۔ بی جے پی کے برسر اقتدار آنے کے بعد صرف صنعت کاروں کیلئے اچھے دن آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ حکومت کی حالیہ حکمت عملی سے ہندوستان کا مستقبل درخشاں نہیں ہو سکتا۔ اناجی پھر بار دہلی میں ۲۳ اور ۲۴ فروری کو حصول اراضیات آرڈیننس کے خلاف احتجاجی دھرنا دینے والے ہیں۔ اناجی کے دعویٰ کا زندہ ثبوت مہاراشٹر ہے جہاں اچھے دنوں کے منتظر کسان بی جے پی کی نئی حکومت کے بعد مایوس کر پھر سے خودکشی کرنے لگے ہیں گزشتہ ۳۵ دنوں کے اندر وزیراعلیٰ کے علاقہ ودربھ میں ۹۰ سے زیادہ کسانوں خودکشی کی ہے۔

عوام کو یقین ہو چلا ہے کہ اس بی جے پی سرکار کے چلتے کم از کم ان کے ان اچھے دن تو آنے سے رہے لیکن ان کے برے دن ضرور آگئے ہیں۔ اس کی ایک مثال تیستا ستیلواد کو گرفتار کرنے کی پیہم کوشش ہے۔ عدالت کی جانب سے ایک طرف قاتل سیاستدانوں کو کلین چٹ دی جارہی اور مجرم قرار دی جانے والی مایا کوندنانی کی ضمانت پر رہائی ہورہی ہے۔ دوسری جانب ضمانت پر رہا ہونے والے پولس افسران کو دھڑلے کے ساتھ گجرات کے اندر اہم عہدوں فائز کیا جارہا ہے۔

ایسے میں تیستا کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ انہوں نے گجرات کے مظلوم مسلمانوں کی حمایت میں آواز اٹھائی اور اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر ان کی پیروی کی۔ اس طرح گویا جہاں ظالموں کے اچھے دن آگئے وہیں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں کے برے دن بھی آرہے ہیں۔ تیستا کی بابت گاندھی کے پڑپوتے تشار گاندھی نے کہا گجرات فساد متاثرین کو انصاف دلانے کے لئے سالوں سے جدوجہد کر رہی سماجی کارکن تیستا سیتلواڑ کے خلاف جان بوجھ کر سازش رچی جارہی ہے۔ یہ انسانی حقوق کے لئے لڑ رہے سماجی کارکنوں کی آواز دبانے کی کوشش ہے۔ میں نے کبھی تیستا اور جاوید کو مہنگے کپڑے پہنے نہیں دیکھا، مہنگے کپڑے کون پہنتا ہے یہ سب جانتے ہیں۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مودی جی کے گجرات میں وزیر اعلیٰ رہتے ہوئے جو کام نہ کرسکے وہ ان کے ہٹ جانے کے بعد کیسے ممکن ہوگیا؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ مودی جی جس وقت گجرات میں تھے ان کا دائرۂ اختیار محدود تھا۔ گجرات کی عدالت پر بھی مرکزی حکومت کا کسی نہ کسی حد تک دباؤ ہوتا تھا۔ مرکز کی سرکاری ایجنسیاں جو یو پی اے سرکار کے تحت کام کرتی تھیں مودی کے عمل دخل سے پوری طرح آزاد تھیں۔ ان ملزمین کے مقدمات کبھی ممبئی ہائی کورٹ میں منتقل ہوجاتے تھے تو کبھی سپریم کورٹ میں مظلومین کی دادرسی ہوجاتی تھی۔ قومی افق پر این ڈی اے کا سورج طلوع ہوتے ہی ساری عدالتوں پر

زعفرانی رنگ نمایاں ہو گیا۔ ہمارے یہاں ویسے بھی چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے؟ سوریہ نمسکار دراصل محض ایک جسمانی ورزش کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ معصوم بچوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ وہ جس کسی کا سورج طلوع ہوتا ہوا دیکھیں اس کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں۔ راجستھاں کی ریاستی حکومت بالجبر اسکولوں میں اسے نافذ کرنے کی مذموم کوشش کررہی ہے اور مرکزی حکومت عدالتوں میں اس کے نفاذ کیلئے سرگرم عمل ہے۔

ان دنوں مظلومین کے ساتھ ساتھ ان پر ظلم وستم ڈھانے والوں کے ستارے بھی گردش میں نظر آرہے ہیں۔ اس کا ایک واضح اشارہ تو دہلی کے انتخابات میں نظر آیا۔ اس بابت ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جس کرن بیدی کو بلی کا بکرہ بنانے کیلئے لایا گیا تھا وہ تو رسی تڑا کر بھاگ کھڑی ہوئی لیکن ساکشی مہاراج نے آگے بڑھ کر شکست کی ذمہ داری قبول فرمالی۔ ساکشی مہاراج کے اعتراف کو ان کی انکساری قرار دینے کے بجائے مرکزی وزیر وینکیا نائیڈو نے توثیق کردی کہ یہ شکست کٹر ہندوتووادی بیانات کی بدولت ہوئی ہے۔ اس پر موہن بھاگوت بھی نیند سے بیدار ہوئے اور انہوں نے فرمایا ہندو خواتین بچے پیدا کرنے کی مشین نہیں ہیں۔ یہ تمام لوگ بہت دیر سے جاگے جبکہ دہلی میں بھگوا سورج غروب ہو چکا تھا اگر پہلے بیدار ہوئے ہوتے تو کم از کم یہ بری گت نہیں بنتی۔

ہندوتوا پریوار کے یہ برے دن اندر اور باہر دونوں جانب سے آئے۔ دہلی کے اندر جو ہوا سو ہوا لیکن واشنگٹن کے اندر سے جو اشارے آئے اس نے مودی جی کی نیند اڑا دی اس لئے کہ اوبامہ کی تنقید سے گزشتہ سال رچائے گئے سارے کئے کرائے پر پانی پھر رہا تھا۔ اوبامہ کو یہ توقع توہر گز نہیں رہی ہوگی کہ ان کو دہلی آنے کی دعوت دینے کے بعد دہلی ہی کے اندر ۵ عیسائی عبادتگاہوں پر حملہ کیا جائیگا۔ اوبامہ نے محسوس کیا کہ جاتے جاتے سنگھ پریوار کو جو بلاواسطہ نصیحت دی انہوں نے کی تھی وہ علامہ اقبال کے مصرع مرد ناداں پر زبان ترم و نازک بے اثر'' کی مصداق ہو گئی ہے۔ اس لئے انہیں واپس'' جاکر کہنا پڑا کہ مذہبی ناروا داری کے حوالے سے ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھ کر گاندھی جی بھی شرمسار ہو جاتے۔ اوبامہ کے اس بیان کو بنیاد بنا کر واشنگٹن پوسٹ اور دیگر امریکی اخبارات نے ہندوستانی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا اور مودی جی سے سوال کر دیا کہ آخر وہ کب تک اس نازک مسئلہ پر چپی سادھے رہیں گے ؟ ان کی خاموشی کب ٹوٹے گی؟ اس دباؤ نے مودی جی کی زبان پر لگے قفل کو توڑ دیا جسے ہندوستانی پارلیمان نہیں کھول سکی تھی۔

سادھوی نرنجن جیوتی پر ایوانِ پارلیمان میں ہنگامہ کے بعد مودی جی بڑی مشکل سے کہا تھا وہ بیچاری نئی ہے انہوں نے معافی مانگ لی ہے اس لئے درگذر کر دیا

جائے۔ انہوں نے مذمت تو کجا نفسِ مسئلہ پر اظہار خیال تک سے گریز کیا تھا۔ ویسے مودی جی امریکہ بہادر کے سامنے بھی اپنا نئی دنیا والا بیان دوہرا سکتے تھے کہ اگر میں نے کوئی غلطی کی ہے تو مجھے پھانسی چڑھا دیجئے یا کم از کم ٹائم میگزین کے اس مکالمہ کا حوالہ دے دیتے کہ اگر میری گاڑی کے نیچے کوئی کتے کا پلّا آجائے تب بھی مجھے موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے لیکن انہیں پتہ تھا یہ سب اخبارات میں تو چلتا ہے لیکن امریکی انتظامیہ کے آگے نہیں۔ امریکہ کے اندر ویسے بھی آر ایس ایس پر پابندی لگانے کے متعلق ایک مقدمہ زیر سماعت ہے اور اگر اس پر عدالت کا کوئی درست فیصلہ سامنے آجائے تو سنگھ پریوار کی خاکی نیکر ڈھیلی ہو جائیگی اور کالی ٹوپی ہوا میں اڑ جائیگی۔

امریکی خوشنودی کی خاطر مودی جی نے نئی دہلی میں عیسائیوں کی جانب سے منعقدہ کانفرنس سے خطاب میں کہا کہ میں کسی بھی مذہب کے خلاف تشدد کی مذمت کرتا ہوں۔ میری حکومت کسی بھی اکثریتی یا اقلیتی گروپ کو دیگر لوگوں کے خلاف نفرت پر اکسانے کی اجازت نہیں دے گی۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ ملک میں ہر شخص کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے اور اس پر عمل کی مکمل آزادی ہے۔ مودی جی کا بیان اس بچہ کی یاد دلاتا ہے جسے کڑوی دوا پلانے کیلئے ماں کو اس کی ناک دبانی پڑتی ہے۔ اگر مودی جی عقل سلیم کا استعمال کرتے ہوئے امریکہ کو اس

کا موقع نہ دیتے تو وہ ملک و قوم کیلئے بہتر تھا۔

گجرات کے جس شہر سورت میں مودی جی کے کوٹ کی نیلامی ہو رہی اس میں کوسٹ گارڈ کے نائب انسپکٹر جنرل بی کے لوشالی ایک حیرت انگیز بیان دے کر حکومت ہند کی نیند اڑا دی ۔لوشالی شمال مغربی خطے کے چیف آف سٹاف ہیں۔ انہوں نے سینہ پھلا کر فرمایا کہ 'مجھے امید ہے کہ آپ کو ۳۱ دسمبر کی رات یاد ہو گی۔ میں وہاں موجود تھا، میں نے اس (پاکستانی) کشتی کو اڑنے کا حکم دیا تھا۔۔۔ میں نے کہا کشتی کو اڑا دو، ہم انہیں بریانی نہیں کھلانا چاہتے'۔ یہ بیان وزارتِ دفاع کے اس دعویٰ کے خلاف ہے کہ کشتی پر دہشت گرد سوار تھے، اس میں دھماکہ خیز مواد لدا ہوا تھا اور جب کوسٹ گارڈ نے کشتی کو تلاشی کے لیے روکنے کی کوشش کی تو اس میں سوار افرد نے اس میں آگ لگا دی تھی۔ لوشالی کے بیان کے بعد وزیر دفاع موہن پریکر نے کہا کہ 'ہم اپنے موقف پر قائم ہیں، اگر کسی افسر نے کوئی غلط بیان دیا ہے تو انکوائری کے بعد اس کے خلاف کارروائی کی جا سکتی ہے۔ یہ معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

وزیر دفاع کو یاد رکھنا چاہئے کہ معاملہ ختم نہیں بلکہ اب شروع ہوا ہے۔ جنوری کے اندر وہ جو ثبوت پیش کرنے والے تھے ساری دنیا ہنوز اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اب از خود ایک ثبوت سامنے آگیا تو وہ اس کی تردید فرما رہے ہیں

۔ ویسے لوشالی نے اپنا بیان بدل دیا ہے لیکن بد قسمتی سے اس کی ویڈیو موجود ہے ۔ لوشالی کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ سیاستداں تو غیر ذمہ دارانہ بیان دے کر بدل سکتے ہیں لیکن سرکاری افسران ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر انہوں نے غلط بیانی کی ہے اس کی انہیں قرار واقعی سزا ملے گی اگر وہ درست نکلا تو اس سے دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کی قلعی کھل جائیگی اور پھر ایک بار سمجھوتہ ایکسپریس کا دھماکہ زیرِ بحث آجائیگا جس میں سنگھ پریوار کے لوگ ملوث ہیں ۔ لوشالی نے بہر حال مودی سرکار کی کالی رات میں ایک برے دن کا اضافہ ہی کیا ہے۔

(چنگو اور منگو کی سیاسی نوک جھونک - (قسط اول

دہلی انتخابات کے نتائج سارے ٹی وی چینلس پر زور و شور سے نشر ہو رہے تھے۔ نامور صحافی چونگیری لال عرف چنگو کی آنکھیں سے حیرت سے وہ مناظر کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ کانوں سے غیر یقینی باتیں سن رہا تھا اور گرم گرم معلومات قلمبند کرتا جارہا تھا گویا ہمہ تن اپنے تازہ مضمونمیں غرق تھا کہ اچانک شاہ جی کی مانند اس کے بچپن کا یار منگیری لال عرف منگو بن بلائے آدھمکا۔ چنگو سمجھ گیا کہ اب اس کا کام بند ہو جائیگا یہ نووارد نہ کچھ دیکھنے کی اجازت دے گا اور نہ سننے کی مہلت دے گا بس مودی جی کی طرح اپنے ہی گن گاتا رہے گا۔ چنگو معذرت خواہانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولا بھائی منگیری لال معاف کرنا میں فی الحال ذرا مصروف ہوں کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ دیر میں اپنا بچا کچا کام نمٹا کر آجاو تاکہ ہم لوگ فرصت سے گپ شپ کر سکیں۔

منگیری چہک کر بولا کام ؟ کیسا کام ؟؟؟ اب تو آم ہی آم ؟چنگو نے حیرت سے کہا اس موسم میں آم ؟ تمہارا دماغ تو ۰۰۰۰۰۰۰ وہ میری بات کاٹ کر بولا ارے بھائی کیوں اپنا وقت خراب کرتے ہو جو شہ موجود ہی نہ ہو وہ خراب کیسے ہو

سکتی ہے۔ ویسے اگر آم خراب بھی ہو جائے تو چنتا کی کوئی بات نہیں بلا تکلف کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔ ہر طرف ہماری پارٹی کا جھاڑو چل رہا ہے صفائی ہو جائیگی۔چنگو نے پھر حیرت سے پوچھا تمہاری پارٹی۔ تمہیں کس احمق نے اپنی پارٹی میں لے لیا۔ منگیری سینہ ٹھونک کر بولا بھئی مجھے کون روک سکتا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا ایک زمانے تک میں بھی انا تھا تم بھی انا تھے۔ اب ہم سب عام آدمی ہیں۔ عآپ ہماری پارٹی ہے اگر اروند کیجریوال بھی ہمیں روکنے کی جرأت کرے گا تو ہم لوگ اسے خاص آدمی بنا کر اسے پارٹی سے نکال دیں گے۔

منگیری کے آم اور منگیری کی باتیں اب چنگو کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ ٹیلی ویژن کب کا بند ہو چکا تھا اور چنگو کے قلم کا سر نہ جانے کیا جیسے ماکن کی مانند قلم ہو چکا تھا۔ اب صرف اس کے کان سن رہے تھے۔ اگر چنگو کے علاوہ کوئی اور منگیری کے منہ سے یہ جملہ سنتا کہ وہ کیجریوال کو عآپ سے نکال دے گا تو شاید بیہوش ہو کر گر جاتا لیکن اسے پتہ تھا یہ عام آدمی ہے یہ کچھ بھی کر سکتا ہے یہ مودی جی کے ہوش اڑا سکتا ہے تو کیجریوال بیچارا کس کھیت کی مولی ہے۔چنگو نے اس کی تائید کو اور کہا جی ہاں بھائی مجھے پتہ ہے تم کچھ بھی کر سکتے ہو اب بتاؤ کہ یہاں کیا کرنے کیلئے آئے ہو۔ منگیری بولا اتنے سارے اوٹ پٹانگ سوالات کے بعد تم نے یہ پہلا کام کا سوال کیا ہے؟ خیر میں

تو اپنی فتح کا جشن منانے کیلئے تمہارے پاس حاضر ہوا تھا لیکن تم تو بالکل سنگھیوں کی مانند منہ لٹکائے ، آستین چڑھائے مجھ پر چڑھ دوڑے ۔

چنگو اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا نہیں بھائی ایسی بات نہیں دراصل تمہارے آنے سے قبل میں عام آدمی پارٹی کی کامیابی کا جشن ٹیلی ویژن پر دیکھ رہا تھا تاکہ اخبار کیلئے مضمون لکھ سکوں ۔ایک ایسا مضمون کہ جس کو دیکھ کر تمہارا میرا مطلب ہے ہمارا کیجریوال بھی خوش ہو جائے۔ منگیری بولا کیجریوال کو خوش کرنے کی خاطر تمہیں چنداں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کو دہلی کی عوام نے اس قدر خوشی نواز دیا ہے کہ نواز شریف بھی حیرت زدہ ہے ۔ اس کے پاس اپنی خوشی کو رکھنے کیلئے جگہ نہیں اس لئے اب وہ مرکزی حکومت سے گزارش کرکے آم کے خالی گودام کرائے پر لینے والا ہے تاکہ آم کا موسم آنے تک اس سے کام چلائے اور جب پارلیمان کے آنگن میں لگے پیڑ پر آم کا پھل پک جائے تو پھر اس کا مزہ لے سکے۔

چنگو نے کہا دیکھو منگیری جب سے اپنے اناجی دہلی چھوڑ کر نندی گرام رخصت ہوئے ہیں۔ منگیری درمیان میں ٹوک کر بولا ابے بیوقوف تو اناجی کے گاوں کا نام تک نہیں جانتا ؟ میں کیجریوال کو بول کر تجھے بھی ان کے پاس بھجوا دوں گا۔ منگیری اس طرح بول رہا تھا گویا چنگو کو کالا پانی روانہ کردے گا۔ چنگو

نے حیرت سے پوچھا تو مجھے کہاں بھجوائے گا ؟ اناجی کے گاوں کا کیا نام ہے۔ منگیری بولا وہ تو میں بھی نہیں جانتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ نندی گرام نہیں لیکن فکر کی بات نہیں کیجریوال جانتا ہے۔ وہ سب جانتا ہے وہ تجھے بنا ٹکٹ بھجوادے گا۔ منگیری اس طرح بول رہا تھا گویا وہ چنگو کا نہیں بلکہ کیجریوال کا لنگوٹیا یار ہے۔ چنگو نے منگیری کو چھیڑنے کیلئے پوچھا کیوں بے ؟ تجھے کیسے پتہ چل گیا نندی گرام اناآجی کا گاوں نہیں ہے ؟ منگیری بڑے اعتماد بولا تو کیا مجھے کوئی معمولی آدمی سمجھتا؟ چنگو بولا نہیں بھائی پہلے تو میں تجھے عام آدمی سمجھتا لیکن اب پتہ چلا تو کیجریوال کا خاص آدمی ہے لیکن یہ نندی گرام کا کیا ماجرا ہے؟ منگو بولا دراصل میں نندی گرام جاچکا ہوں؟ اچھاچنگو نے حیرت سے پوچھا تو وہاں کیسے پہنچ گیا؟ منگو سینہ پھلا کر بولا وہ دراصل سی پی ایم والے مجھے وہاں لے گئے تھے۔ چنگو کو حیرت ہوئی سی پی ایم والے اس احمق کو کیوں لے گئے ؟اس نے پوچھا وہاں تو سی پی ایم کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ وہ تجھے یہاں دہلی سے کیوں لے گئے؟ منگو نے کہا یہی تو تم جیسا احمق صحافی نہیں سمجھ سکتا۔ ہم لوگ دراصل وہاں اس تحریک کا زور توڑنے کیلئے گئے تھے۔ ہمارا کام تھا مظاہرین میں شامل ہو کر ہلڑ بازی کرکے تحریک کو بدنام کرنا۔ چنگو نے پوچھا اس کام کیلئے دہلی سے لوگوں کو لے جانے کی ضرورت میری سمجھ میں نہیں آتی ؟ منگو بولا سی پی

ایم والے باہر والوں کی مدد سے یہ کام کرانا چاہتے تھے تاکہ اگر دھر لئے جائیں تو کسی کو شک نہ ہو۔چنگو بولا وہاں تو پولس ان کی اپنی تھی جب سیاں بھے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔ منگو نے کہا سچ تو یہ ہے کہ آج کل سیاسی جماعتوں کو پولس سے زیادہ تم جیسے خونخوار صحافیوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔

چنگو کے لئے یہ کہانی دہلی انتاپیب سے زیادہ دلچسپ ہوتی جارہی تھی اس نے پوچھا تو تم نے کیا کیا؟ ہم نے وہاں جاکر گاوں والوں کی خوب دھنائی کی اور کیا؟ اچھا! چنگو نے حیرت سے پوچھا لیکن تم تو ٠٠٠٠٠٠منگو بولا ہاں ہاں سی پی ایم والوں نے تو صرف ہلڑ مچانے کے پیسے دیئے تھے لیکن ممتا جی نے کہا تم گاوں والوں کو خوب مارو پیٹوتاکہ سی پی ایم خوب بدنام ہو جائے۔ اچھا تو پھر تم نے کیا کیا؟ ہم نے وہی کیا جو ممتا دیدی نے کہا۔ کیوں؟چنگو نے سوال کیا۔ اس لئے کہ وہ اوپر کی آمدنی تھی اور چونکہ سی پی ایم کی حکومت تھی اس لئے ہمیں کی کاڈر بھی نہیں تھا۔چنگو بولا اوہو تو ایسی بات ہے میں تو تمہیں انا جی کا آدمی سمجھتا تھا لیکن تم تو کچھ اور ہی نکلے۔ منگو بولا یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں انا جی کا آدمی نہیں ہوں بلکہ جب سے انہوں نے کیجریوال کو مبارکباد دے دی ہے کچھ زیادہ ہی ان کا آدمی ہو گیا ہوں ۔

چنگو نے حیرت سے پوچھا یہ کچھ زیادہ کیا ہوتا ؟ وہ بولا اتنا بھی نہیں

جانتے۔ زیادہ تو بس زیادہ ہوتا ہے جیسے دہلی میں ہماری کامیابی تمہیں نہیں لگتا کہ کچھ زیادہ ہو گئی ہے ۔چنگو بولا مجھے کیا خود کیجریوال نے ابھی ابھی ٹیلی وژن پر اس کا بڑی انکساری کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ منگو نے کہا بھائی جس پیڑ پر آم زیادہ ہوتے ہیں وہ جھکا ہوا ہوتا ہے اور ببول کے درخت کو دیکھو وہ کڑوا کسیلا درخت کس طرح اکڑا ہوا ہوتا ہے ۔چنگو نے معصومیت سے پوچھا کس کی طرح میرا مطلب ہے اشارہ کہ تمہاراا شارہ کس طرف ہے ؟ منگو بولا تم بہت بھولے ہو میرے دوست ۔ بھئی اپنے وزیراعظم کی طرح دون ان کا چہرہ ٹیلی وژن پر کیا نہیں دکھائی دیا کہ تم انہیں بھول ہی گئے ۔چنگو نے کہا میں انہیں اتنی آسانی سے نہیں بھول سکتا۔ انا جی کی تحریک ختم ہوئی تو میں بالکل بیروزگار سا ہو گیا لکھنے کیلئے کوئی ڈھنگ کا موضوع ہی نہیں ملتا۔ منگو نے پہلی بار سوال کیا پھر؟ پھر کیا ہوا؟چنگو بولا پھر ؟ پھر مودی جی مل گئے اور میں ان کے بھجن گانے لگا۔ میری آمدنی بھی تمہاری طرح دوگنی ہو گئی ۔ اول تو اخبار والے خوشی خوشی مضمون شائع کرتے اورنذرانہ بھی دیتے۔ اس کے بعد جب مضمون چھپ جاتا تو میں اس کی نقل مودی جی کے دفتر بھیج دیتا وہاں سے بھی ہر ماہ چیک آجاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس مودی جی کو بی جے پی نے وزیراعظم کا میدوار بنایا میرے تو اچھے دن اسی وقت سے آگئے تھے ۔

منگونے بھرپور تائید کی اور بولا سچ میں دوست اس دوران میں نے بھی خوب

کمائی کی ۔ پہلے تو بنارس میں ڈیرہ ڈال دیا۔ پھر ہریانہ ، مہاراشٹر اور جموں کشمیر۔ قسم سے پہلی بار کشمیر گیا تو وہاں سے واپس آنے کا من نہیں کرتا تھا لیکن کیا کروں پاپی پیٹ یہاں واپس لے آیا۔چنگو بولا تجھے کشمیر کا دکھ ہے میں تو مودی جی کے ساتھ امریکہ ، جاپان اور آسٹریلیا کی سیر کرکے چلا آیا لیکن اب لگتا ہے کہ ان کے چکر میں رہیں گے تو جشودھا بین کے گاوں کیا نام ہے تمہیں پتہ ہے۔ منگو بولا اس گاوں کا نام جاننے سے کیا فائدہ وہاں مودی جی نہ صرف صحافیوں بلکہ ہم جیسے سیاسی کارکنان کی ضرورت سے بھی بے نیاز ہوں گے ۔ بس وہ اور ان کی بین میرا مطلب بیوی ہوگی ۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے ۔۔۔۔۔چنگو بولا جی ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ اب اگر مودی جی دہلی میں بھی رہے تو ان پر لکھنے سے اپنا گزارہ نہیں ہوگا۔ منگو نے پوچھا کیوں؟ دہلی الیکش کے نتائج سے پتہ چل گیا ہے کو لوگ ان کے بارے میں پڑھ پڑھ کر پک گئے ہیں۔ اب ان کی تعریف میں لکھے جانے والے مضامین کا چھپنا مشکل ہے اور ان کے خلاف لکھے جانے والے مضمون پر وہ روپیہ کیوں دیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں ٹاڈا لگا کر جیل نہ بھجوادیں بلکہ سہراب الدین کی طرح انکاؤنٹر نہ کروادیں۔

منگو نہایت ہمدردانہ انداز میں بولا ایسے مایوس نہیں ہوتے میرے شیر۔ اب تم اپنا سُر بدل دواور کیجریوال جی کی تعریف و توصیف شروع کردو مضامین بھی

چھپنے لگیں گے اور میں دکشنا کا بھی بندوبست کروادوں گا۔ منگو بلا کی خود اعتمادی کے ساتھ ہانک رہا تھا اس لئے چنگو کو اس پر اعتماد کرنا پڑا۔چنگو نے کہا اچھا تو مجھے کرنا کیا ہوگا ؟ وہ بولا تم اناجی سے ملنے ان کے گاوں جاوگے اور ان کا انٹرویو لے کر آوگے۔ منگو احکامات صادر کر رہا تھا۔چنگو نے کہا تم جو ابھی کہہ رہے تھے بلا ٹکٹ ؟ تو بھئی بلا ٹکٹ میں اتنا لمبا سفر کیسے کروں گا؟ منگو بولا کیسے کروگے ؟ٹرین سے کروگے اور کیسے ؟ کوئی ٹکٹ پوچھے تو کہہ دینا کہ میں کیجریوال کا قاصد ہوں اور ان کے کہنے پر اناجی سے ملنے جارہاہوں بس کوئی تمہیں کچھ نہیں کرسکتا۔کیا سمجھے ؟اور اگر کوئی گڑبڑ کرے تو چنگو نے کہا ہاں یہی میں پوچھنے والا تھا۔ منگو بولا مجھے پتہ تھا۔ کیجریوال کی ...... طرح مجھے بھی سب پتہ ہے۔ اگر کوئی پریشان کرے تو فون پر مجھ سے بات کروادینا۔ میں سب ٹھیک کردوں گا۔چنگو سمجھ گیا اگراِس شیخ چلی کواُس نے مشکل میں فون کیا تو کمبخت فون ہی نہیں لے گا۔

چنگو نے منگو سے کہا وہ تو ٹھیک ہے دوست میں جب رالے گن سدھی جاوں گا، سو جاوں گا لیکن اب تو مجھے کچھ لکھنے دوتاکہ اس وقت اپنا پیٹ بھر سکوں ، منگو بولا یہ تجھے اچانک رالے گن جانے کی کیا سوجھی ؟چنگو نے حیرت اس کی جانب دیکھ کرابھی تو تو کہہ رہا تھا کہ اناجی کے گاوں جاوں ۔ ان کا گاوں رالے گن نہیں تو کیا ہے؟ منگو بولا اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔ ویسے مجھے یاد آیا

کیجریوال نے انہیں حلف برداری کی تقریب میں آشیرواد دینے کیلئے انہیں دعوت دے رکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئیں گے۔ تو تمہیں ان سے مل کر انٹرویو لے لینا۔ اتنے دور جانے کی کیا ضرورت؟ منگو بڑی صفائی کے ساتھ پینترا بدل رہا تھا۔ چنگو بولا ہاں یار یہ اچھا ہے لیکن وہ کب آنے والے ہیں؟ کیجریوال نے تو تمہیں بتایا تو ہوگا؟ منگو بولا لگتا ہے انہوں نے ابھی تک دعوت قبول نہیں کی ورنہ کیا مجال ہے کہ کیجریوال مجھے نہ بتائے۔ چنگو نے اسے چھیڑنے کیلئے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ روٹھے پیا میرا مطلب روٹھے انا جی کو منانے کیلئے وہ وہ تمہیں اپنا قاصدِ خاص بنا کر بھیج دے۔

منگو کو چنگو کا یہ مذاق اچھا نہیں لگا وہ بولا تو میری چھوڑ اور اپنی سوچ۔ چنگو بولا میرا کیا ہے مجھے تو بس انٹرویو لینا ہے جو میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ منگو بڑے ناصحانہ انداز بولا لیکن میرے دوست تو ان سے وہی سوال پوچھنا جو کمار وشواس تجھے لکھ کر دیں اور ان کا وہی جواب لکھنا جو یوگیندر یادو بتائیں کیا سمجھے؟ اپنی طرف سے کوئی بات نہ لکھ دینا۔ چنگو نے حیرت سے پوچھا اور انا جی کی طرف سے؟ ان کی بھی وہ باتیں شائع کردینا جس کی اجازت سسودیا جی دے دیں۔ چنگو نے پوچھا یہ درمیان میں سسودیا کہاں سے آگیا۔ اوہو تم نہیں جانتے۔ یہ اب دہلی کا نائب وزیر اعلیٰ ہے اور کیجریوال کو جسے بھی کچھ دینا ہوگا اسی سسودیا کے ہاتھ سے دیا جائیگا۔ لیکن آشیرواد

کون دے گا؟ انا یا سسو میرا مطلب ہے سسو دیا؟ بھئی کیجریوال کو انّا اور تم کو سسو دیا دکشنا کے ساتھ آشیر واد بھی دیں گے۔

چنگو بولا سمجھ گیا مگر میں نے تو سنا تھا لوگ آشیر واد لینے جاتے ہیں دینے نہیں آتے۔ منگو بولا وقت وقت کی بات ہے دوست انتخاب جیتنے سے قبل لوگ آشیر واد لینے جاتے ہیں لیکن جب کامیاب ہو جاتے ہیں تو آشیر واد دینے والے خود چل کر آتے ہیں۔ تجھے یاد ہے کسی زمانے میں مودی کے پاس کیجریوال کیلئے وقت نہیں تھا اب کیسے نکل آیا؟

چنگو بولا ہاں یار تیری یہ بات تو کم از کم صحیح ہے۔ منگو بگڑ کر بولا یہی کیوں میری سب باتیں صحیح ہیں اور سن میں تجھے اپنا مضمون شائع کرانے کی زبردست ترکیب بتاتا ہوں تو اپنا مضمون میرے کارٹون کے ساتھ بھیج دے۔ اس کارٹون کے طفیل اگر وہ پہلے صفحہ پر شائع نہ ہو تو میرا نام بھی منگو نہیں کیا سمجھا۔ چنگو یہ سن کر چونک پڑا اور بولا منگو تیرا کارٹون؟ بھئی کارٹون تو مشہور لوگوں کا بنتا ہے تاکہ کارٹون بنانے والا ان کا چہرہ کتنا بھی بگاڑ دے تب بھی لوگ اسے پہچان جائیں تجھے کون پہچانتا ہے؟

منگو بولا بے وقوف میرا کارٹون سے مراد میرا بنایا ہوا کارٹون۔ وہ کارٹون جس کا میں خالق ہوں۔ چنگو نے پوچھا تو نے کارٹون بنا دیا تو ایک لکیر تو سیدھی

کھینچ نہیں سکتا کارٹوں کیسے بنادیا؟ منگو بولا منطق غلط ہے کارٹوں کے اندر کوئی لکیر سیدھی نہیں ہوتی لیکن اب زمانہ بدل گیا۔ یہ گوگل کا زمانہ ہے اس میں کارٹونسٹ کا آرٹسٹ ہونا لازمی نہیں ہے۔چنگو نے پوچھا اچھا تو پھر کیا ضروری ہے؟ منگو بولا بس اس کے پاس انٹرنیٹ کا ہونا کافی ہے۔ گوگل پر جاؤ چند تصویریں نکالو ان کو فوٹو شاپ میں لے جاکر کھچڑی پکاو اور دیکھو کارٹوں تیار۔ یہ کہہ کر اس نے چنگو کو ایک شکاری کی تصویر دکھلادی جو ایک بندر کو پکڑ کرلے جارہا تھا۔ شکاری کے دھڑ پر کیجریوال کا سر اور بندر کے گردن مودی چہرہ لگا ہوا تھا۔چنگو نے مسکرا کرپوچھا اگر نتائج الٹے آتے تو؟ منگو بولا بس چہرے بدل جاتے اور کیا شکاری کی جگہ بندر اور بندر کی جگہ شکاری۔ کارٹون وہی رہتا۔

چنگو نے کہا یار منگو بے وقوف بنانے کیلئے تجھے کوئی اور نہیں ملا صبح سے کم ازکم دس لوگ مجھے واٹس اپ پر یہ کارٹون بھیج چکے ہیں اور اب تو کہہ رہا ہے کہ یہ تو نے بنایا ہے کم ازکم جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ منگو بولا اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے۔ جن دس لوگوں نے یہ کارٹون بھیجا تو کیا ان سب اسے بنایا ہے؟چنگو بولا نہیں سب ایک ہی کارٹون کیسے بنا سکتے ہیں؟ منگو نے پھر سوال کیا ان میں سے کسی دعویٰ کیا ہے کہ یہ اس کی اپنی تخلیق ہے؟چنگو بولا نہیں سب تمہاری طرح ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ تھوڑی نا بول سکتے ہیں ؟

منگو نے کہا اگر انہوں نے بنایا نہیں تو بھیجا کیسے ؟چنگو بولا ارے بھائی اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ کسی نہ کسی نے تو اسے بنایا ہی ہوگا۔ انہوں نے تو بس یہ کیا اس کارٹون وصول کیا اور آگے بڑھا دیا۔ منگو بولا بہت خوب اب یہ بتاؤ کہ وہ کارٹوں بنانے والا کوئی اور تمہارا یہ دوست منگو نہیں ہو سکتا۔ کیا تم یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہو؟

چنگو چپ ہو گیا۔ منگو نے کہا بولو چپ کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں۔اس کے بعد حاتم طائی کے انداز میں منگو بولا میں تو کہتا ہوں اپنے نام سے بھیج دو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں عام آدمی ہوں میرا دل بہت کشادہ ہے تم نے نہیں دیکھا بی جے پی کو ۵ فیصد نشستیں نہیں ملیں پھر بھی ہم نے انہیں حزب اختلاف کی کرسی دان کر دی۔ اپنی جیب سے کیا جاتا ہے اور وہ ۳ کر بھی کیا لیں گے۔ ہمارے احسان تلے دبے رہیں گے۔

چنگو بولا مان گئے استاد تم نے تو مودی جی کو بھی مات دے دی۔ منگو بولا اب یہ جی جی کرنا چھوڑو اور مضمون لکھو۔

اس من گھڑت نوک جھونک کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی اگر)
(آپ کو دلچسپی ہو تو دوسری قسط کا انتظار کیجئے

(کشمیر کی مخلوط حکومت: اے خزاں تجھ کو بھی انداز بہار آہی گیا (قسط اول

مفتی محمد سعید نے بی جے پی کے ساتھ الحاق کا اعلان بالآخر کرہی دیا اور اس کے حق میں یہ جواز پیش کیا کہ انہیں عام آدمی پارٹی کی مانند واضح اکثریت نہیں حاصل ہوئی ہے لیکن اِس اعتراف کی آڑ میں وہ اُس حقیقت کی پردہ پوشی کر گئے کہ بی جے پی کو اقتدار سے دور رکھنے کی غرض سے نیشنل کانفرنس اور کانگریس حکومت سازی میں ان کی حمایت کیلئے تیار تھے ۔ اس مخلوط حکومت کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ عوام کو پتہ چل گیا کہ پیوپلس ڈیموکریٹک پارٹی یعنی پی ڈی پی کس قدر ابن الوقت اور موقع پرست ہے۔ عام آدمی پارٹی کی طرح اگر اس کو واضح اکثریت حاصل ہو جاتی تو کسی کو بھی نہیں پتہ چلتا کہ مفتی محمد سعید اور ان کی دختر نیک اختر محبوبہ مفتی کتنے احسان فراموش ہیں ۔ بصورتِ دیگر مسلمان تو یہی سمجھتے کہ مفتی خاندان سے بڑا ان کا اور کشمیری عوام کا خیر خواہ کوئی اور نہیں ہے۔ انہیں کے دم سے ہندواحیاء پرست اپنے گھناؤنے مقاصد میں ناکام ہوئے ہیں اور اگر یہ نہیں ہوتے تو مودی سرکار ان پر نہ جانے کون کون سے مظالم ڈھاتی ۔ یہی وہ عظیم قوت ہے جس نے آگے بڑھ کر فسطائیت کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا لیکن اس کے برعکس بی جے پی کے ساتھ الحاق کرکے پی ڈی پی نے اپنے متعلق پائی جانے والی ساری خوش فہمیوں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا اور رائے

دہندگان کے توقعات پر خاک ڈال دی۔ پی ڈی پی کی پشت زنی پر کشمیر کی عوام کچھ اس انداز میں فریاد کناں ہے کہ

دشمنوں کی جفا کا خوف نہیں

دوستوں کی وفا سے ڈرتے ہیں

اس مخلوط حکومت سازی سے نہ صرف مسلمان بلکہ ملک بھر کے ہندو احیاء پرست اور خاص طور پر جموں کے ہندووں کو بھی سخت مایوسی ہوئی ہے جنھوں نے بڑے ارمانوں کے ساتھ اس بار بی جے پی کو خوب دل کھول کر ووٹ دیا اور غیر معمولی کامیابی سے نوازہ۔ انہیں کیا پتہ تھا انتخاب سے پہلے سرحد پر ہونے والی گولہ باری محض ایک تماشہ تھا۔ اس لئے کہ سرحدی تنازع وونگ کے دن تک زور وشور سے جاری رہا ہے لیکن انتخاب کے ختم ہوتے ہی اچانک بند ہو گیا۔ وہ بیچارے نہیں جانتے تھے کہ مودی جی کا آئے دن کارگل آنا اور جموں سے ہوتے ہوئے واپس جانا ان کو لبھانے کی ایک سازش تھی اس لئے کہ انتخاب کے بعد وزیراعظم نے سرحد پر تعینات فوجیوں کو یکسر بھلا دیا۔ جموں کے ہندو سوچ رہے تھے کہ بی جے پی کی حکومت اقتدار میں آتے ہی دستور کی دفعہ ۳۷۰ کو منسوخ کردے گی۔ وہ بیچارے نہیں جانتے تھے کہ پی ڈی پی حکومت میں شامل ہونے کیلئے سنگھ پریوار جن سنگھ کے اولین صدر شیاماپرشاد مکرجی کے بلیدان کو بھلا کر ایوان پارلیمان میں نہ صرف دفعہ ۳۷۰ کے تحفظ کی یقین دہانی کرے گا بلکہ فوج کے اثرورسوخ کو بھی

کشمیر سے بتدریج کم کرنے پر راضی ہو جائیگا۔ کشمیر میں اقتدار کی ہوس نے مودی جی اور شاہ جی کے ابن الوقتی کو بھی بے نقاب کردیا ہے اور دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ اس سیاسی حمام میں سبھی برہنہ ہیں۔

جموں کشمیر کے انتخابات میں اس مرتبہ پہلی بار بی جے پی نے بڑے زور و شور سے حصہ لیا۔ مودی جی نے جموں کے علاوہ کشمیر میں بھی خوب مہم چلائی اور اٹل جی کا چولہ پہن کر عوام کو ورغلانے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی کے ساتھ پہلی مرتبہ بی جے پی نے بڑے پیمانے پر اپنے امیدوار نہ صرف جموں بلکہ کشمیر اور لداخ میں کھڑے کئے۔ اس ریاست کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے تین حصوں میں سے ہر ایک پر مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا غلبہ ہے۔ وادیٔ کشمیر کے مسلمانوں پر مودی جی کی گرمجوشی کا یہ ردعمل ہوا کہ انہوں نے ریکارڈ ووٹنگ کی اور بی جے پی کے سارے امیدواروں کی ضمانت ضبط کرادی۔ اس معاملے میں لداخ کے بودھ بھی پیچھے نہیں رہے انہوں نے بھی بی جے پی کا پوری طرح صفایہ کردیا۔ جموں کے ہندوؤں کی یکمشت حمایت نے زعفرانی پارٹی کو دوسری سب سے بڑی جماعت بنادیا لیکن اقتدار ہوس میں بی جے پی نے انہیں مایوس کرڈالا۔

کشمیر کے انتخابی نتائج پر اگر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت عیاں ہے کہ برسرِ اقتدار نیشنل کانفرنس کے ووٹ کا تناسب ۳ فیصد کم ہوا مگر اس کے نتیجے میں

اس کی سیٹیں ۲۸ سے ۱۵ پر پہنچ گئیں۔کانگریس کے ووٹ کا تناسب عشاریہ ۳ فیصد بڑھا جبکہ اس کی نشستیں ۱۷ سے گھٹ کر ۱۲ پر پہنچ گئیں۔پی ڈی پی کے ووٹ ۱۵ سے ۲۲ فیصد پر پہنچے اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے کامیاب ارکان کی تعداد ۲۱ سے ۲۸ ہو گئے ۔بی جے پی نے دیگر جماعتوں اور آزاد امیدواروں کے ووٹ پر ہاتھ صاف کیا اور اپنے ووٹ میں ۱۰ فیصد کا اضافہ کیا۔اس کے ارکان کی تعداد دوگنا سے زیادہ یعنی ۱۱ سے ۲۵ ہو گئی۔ دیگر جماعتوں کے ووٹ میں دس فیصد کی کمی دیکھنے کو ملی مگر ان کے ارکان کی تعداد ۱۰ سے ۷ پر پہنچی۔ نمائندگی کے لحاظ سے صرف بی جے پی ایک ایسی بڑی جماعت تھی جسے لداخ اور کشمیر کی عوام نے پوری طرح مسترد کردیا تھا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ بی جے پی دوسرے نمبر پر آئی اپنی مرکزی حکومت کے سبب اسے یہ غرۃ تھا کہ وہ آزاد امیدواروں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیگی اور پھر پی ڈی پی یا نیشنل کانفرنس اس کی مدد کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔یہی وجہ تھی کہ مرکزی وزیر خزانہ ارون جیٹلی نے سب سے پہلے کشمیر کا دورہ کیا اور اعلان کیا کہ وزیراعلیٰ ہر حال میں بی جے پی کا ہی ہوگا۔اس کے بعد پی ڈی پی کے ساتھ مذاکرات کا آغاز ہوا۔انتخاب سے قبل بی جے پی کے ساتھ کسی بھی تعلق کو مسترد کرنے والی پی ڈی پی نے اس گفتگو کا سرِعام اعتراف کرلیا اور بی جے پی کے سامنے دو بڑی شرائط رکھ کر اسے اپنے

دام میں پھنسا لیا۔ جو کھیل بی جے پی نے مہاراشٹر میں شیو سینا کے ساتھ کھیلا تھا وہی کھیل پی ڈی پی نے بی جے پی کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود بی جے پی دھن دولت کے نشے میں خاصی پر امید تھی ۔ اس دوران راجیہ سبھا کے انتخابات آئے جس میں ارکان اسمبلی کو ووٹ دینا تھا اور اس سے ان کا رجحان واضح ہوگیا۔ اس انتخاب میں بی جے پی کے امیدوار کو کانگریس کے غلام نبی آزاد نے شکست دے کر بی جے پی کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے اور وہ زمینی حقائق سے آگاہ ہو گئی اور پی ڈی پی کو اپنا قوام تسلیم کرلیا نیز نائب وزیر اعلیٰ کی کرسی پر راضی ہو گئی۔ شاہ جی کی مفتی صاحب کے در پر حاضری شفیق جونپوری کے اس شعر کی مصداق ہے کہ ؎

کشتۂ ناز کی میت پہ نہ آنے والا پھول دامن میں لئے سوئے مزار آہی گیا

کشمیر میں فی الحال جو کچھ ہو رہا یہ کھیل اس سے پہلے کئی بار ہو چکا ہے اور اسی طرح کی بدمعاشی نے کشمیر کو شورش زدہ علاقہ بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آزادی کے وقت کشمیر کے راجہ ہری سنگھ کا جھکاؤ ہندوستان کے بجائے پاکستان کی جانب تھا اس لئے کہ ریاست کی ۷۷ فیصد عوام مسلمان تھے۔ لیکن پاکستان کی جانب سے ہونے والے قبائلیوں کے حملے سے خوف کھا کر اس نے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے فوجی مدد طلب کرلی۔ چونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا اختیار عمل پاکستان پر نہیں تھا اس لئے انہوں نے فوج کشی سے قبل ہندوستان کے ساتھ

الحاق کی شرط رکھی۔ اس نازک وقت میں شیخ عبداللہ نے حکومت ہند کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ اس وقت پنڈت جی نے اقوام متحدہ میں کشمیریوں کے استصواب کا حق تسلیم کیا تھا۔

جموں کشمیر وہ واحد ریاست ہے جس کا اپنا منفرد پرچم اور مختلف دستور ہے۔ وہاں کے لوگوں کو آج بھی جزوی خود مختاری حاصل ہے۔ خارجہ، دفاعی اور مواصلاتی امور کے علاوہ ہندوستانی پارلیمان کا کوئی قانون وہاں کی ریاستی حکومت کی منظوری کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کشمیر میں ۱۹۶۵ء تک صدر مملکت اور وزیر اعظم کا عہدہ ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں جس کا اعتبار مشکوک ہے پہلی مرتبہ کانگریس کو کامیابی ملی اور اس نے فوراً کشمیر کے دستور میں ترمیم کرکے صدر کے عہدے کو گورنر میں بدل دیا اور وزیر اعظم کو وزیر اعلیٰ بنا دیا اس طرح غلام محمد صادق نے سب سے پہلے وزیر اعلیٰ کا عہدہ کا حلف لیا۔ ایک طرف تو ریاستِ دہلی کے اختیارات میں اضافہ کا دعویٰ بی جے پی کانگریس اور عاپ والے کرتے رہتے ہیں دوسری جانب کشمیر رہنماوں نے مرکزی، حکومت کے دباؤ میں اپنے اختیارات کا سودہ کردیا۔ اب اگر عوام ان پر اعتماد نہیں کرتے تو اس میں کس کا قصور ہے؟ پنڈت نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی نے اپنے والد کے دوست شیخ عبداللہ کی وفاداری کا انہیں یہ صلہ دیا کہ شیر کشمیر کو تمل ناڈو کی جیل میں قید کردیا۔ وہ جیل سے رہا ہوئے تو وزیر اعظم

سے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر راضی ہو گئے۔ ان کے بعد فاروق عبداللہ نے اقتدار سنبھالا تو ۱۹۸۴ء میں کانگریس نے ان کے بہنوئی غلام محمد شاہ کی مدد سے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر ایک کٹھ پتلی سرکار عوام پر مسلط کر دی۔

۲۰۰۲ء میں پی ڈی پی پہلی بار سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری مفتی محمد سعید کانگریس کی مدد سے وزیر اعلیٰ بنے۔ ۲۰۰۵ء میں انہوں نے کانگریس کے غلام نبی آزاد کو حکومت کی باگ ڈور تھمادی اور انتخاب سے قبل امرناتھ مندر کو اراضی دینے کی مخالفت کا بہانہ بنا کر کانگریس کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کانگریس نے ہندوؤں کو تو پی ڈی پی نے مسلمانوں کا دل جیتنے کی ناکام کوشش کی لیکن اس جوتم پیزار میں نیشنل کانفرنس کا بھلا ہو گیا۔ ۲۰۰۸ء میں عمر عبداللہ کانگریس کی حمایت سے برسر اقتدار آگئے۔ اس بار پھر کشمیر کی عوام نے نیشنل کانفرنس سے بیزار ہو کر اسے مسترد کر دیا اور پی ڈی پی کو کامیاب کر دیا لیکن اس نے کانگریس کے بجائے بی جے پی کا ساتھ گوارہ کرلیا اس لئے کہ مرکز میں بی جے پی برسرِ اقتدار ہے۔ اس اٹھا پٹخ سے ظاہر ہے کہ عبداللہ خاندان اور مفتی خاندان وقفہ وقفہ سے کشمیری عوام کا استحصال کر رہا ہے پہلے کانگریس ان کی ہمنوا تھی اب وہ جگہ بی جے پی نے لے لی ہے۔ اسی کے ساتھ کشمیر کے اندر جس جمہوریت کا ساری دنیا میں چرچا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ بقول شاعر

یہ بیاباں، یہ شب ماہ، یہ خنکی، یہ ہوا
اے خزاں تجھ کو بھی انداز بہار آہی گیا

پی ڈی پی اگر چاہتی تو کانگریس اور نیشنل کانفرنس کی مدد سے اپنی مخلوط حکومت قائم کر سکتی تھی لیکن اسے پتہ تھا کہ اس صورت میں مرکزی حکومت آئے دن اپنے گرگوں کی مدد سے کشمیر میں شورش برپا کرتی رہے گی۔ کشمیر کے اندر حفاظتی دستوں کی مدد سے کی جانے والی دہشت گردی جگ ظاہر ہے۔ فوجیوں کا کورٹ مارشل اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہ جمہوریت کا وہ کریہہ چہرہ ہے جسے اس نیلم پری کے عشاق دیکھنا نہیں چاہتے۔ مفتی خاندان کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اگر دہشت گردی پاکستان کے نام سے کی جائے اور اس پر روک تھام میں ناکامی کا الزام ریاستی حکومت پر دھر دیا جائے تو اس بہانے سے اسے باآسانی برخواست کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر مرکزی حکومت سے مفاہمت کرلی جائے تو سرکاری خزانے کا منہ کھل جاتا ہے جیسا کہ حکومت سازی پر رضامندی کے فوراً بعد وزیراعظم نے ۴۲۶ کروڑ کی امداد کا اعلان سیلاب زدگان کی باز آبادکاری کیلئے کردیا۔ مرکز میں وزارت کے مل جانے سے اپنی ذاتی تجوری بھرنے کے بھی بے شمار مواقع حاصل ہو جاتے ہیں ۔ یہ ہنٹر اور گاجر کی حکمت عملی ہے جس پر ہر مرکزی حکومت عمل کرتی رہی ہے۔ اسی بلیک میلنگ کے سبب موقع پرستی کا پودہ پروان چڑھتا ہے۔ مرکز میں وی پی سنگھ کی حکومت آتی ہے تو مفتی محمد سعید

وزیر داخلہ بن جاتے ہیں۔ اٹل جی کی حکومت میں عمر عبداللہ وزیر مملکت.برائے خارجہ امور اور مودی حکومت میں محبوبہ مفتی اسی طرح کی کوئی وزیر بن جاتی ہیں۔ اگر فی الحال مرکز میں منموہن سنگھ کی حکومت ہوتی تو پی ڈی پی کو کیا ضرورت تھی کہ بی جے پی کے ساتھ ہاتھ ملاتی وہ تو سیدھے سیدھے کانگریس کا ہاتھ تھام لیتی۔

پی ڈی پی ایک ایسے وقت میں بی جے پی کے ساتھ الحاق کررہی ہے جبکہ این ڈی اے میں شامل شیوسینا اور اکالی دل نے بی جے پی کے تحویلِ اراضی قانون کے خلاف الم بغاوت بلند کررکھا ہے۔ ویسے اس دھاندلی سے کشمیر کی عوام محفوظ ہے اس لئے کہ وہاں کوئی غیر ملکی تو کجا غیر کشمیری بھی زمین خریدنے کا مجاز نہیں ہے۔ پی ڈی پی کو یہ بھی پتہ ہے کہ بی جے پی نے مہاراشٹر، بہار اور ہریانہ میں اپنے حلیفوں کے ساتھ کس قدر اہانت آمیز سلوک کیا ہے لیکن جو لوگ اقتدار کی خاطر اپنے اصول نظریات کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ عوام کے جذبات و احساسات کو قدموں تلے روندتے ہیں وہ اسی سلوک کے حقدار ہوتے ہیں۔ مہاراشٹر کے اندر پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی کا ساتھ دینے کے بعد راج ٹھاکرے کی نوزمان سینا نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ ہریانہ میں وشنوئی کو ذلیل کرکے بھگا دیا گیا۔ نتیش کمار کو بی جے پی نے جس قدر رسوا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے باوجود مفتی محمد سعید اور شرد پوار اگر بی جے پی کے ساتھ پینگیں

بڑھاتے ہیں تو وہ کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں ۔ شرپوار کی تو یہ مجبوری ہے کہ وہ بدعنوانی کے الزام میں جیل نہیں جانا چاہتے لیکن مفتی صاحب کو بدعنوانی میں ملوث ہونے کے لئے بی جے پی کا آشیر واد درکار ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے جس وزیراعظم کے پاس دہلی کی تقریبِ حلف.برداری میں شرکت کیلئے وقت نہیں تھا وہ سرینگر جانے کیلئے پر تول رہا ہے۔

اس موقع پر ملک کے رائے دہندگان کو ٹھہر کر اس سوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے کہ.بڑے ارمانوں سے جن امیدواروں کو وہ کامیاب کرتے ہیں انہیں بعد میں کیا ہو جاتا ہے؟اس سیاسی نظام میں ووٹر اس قدر بے بس کیوں ہے کہ عوامی نمائندے من مانی کرتے ہیں مگر ان کا بال بیکا نہیں ہوتا؟ ہر سیاسی رہنما اس نمک کی کان میں جلد یا بدیر نمک کیوں بن جاتا ہے؟ بلا تفریق ساری جماعتیں وقت کے ساتھ اپنے اصول نظریات کو بھلا کر سرتاپا بدعنوانی کے دلدل میں کیسے دھنس جاتی ہیں یا غیر مفقود ہو جاتی ہیں؟ اس نظام میں ایسی کون سی خرابی ہے جو ہر سیاسی گردہ کو بتدریج ابن الوقت اور مفاد پرست بنا دیتی ہے اور دیکھتے دیکھتے پی ڈی پی و بی جے پی کے درمیان کا فرق مٹ جاتا ہے؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی جماعتوں یا ان کے امیدواروں کے بجائے اس سیاسی نظام کا متبادل تلاش کیا جائے ورنہ انتخاب آتے اور جاتے رہیں گے مگر جبر و استحصال ختم نہیں ہوگا۔ پی ڈی پی اور بی جے پی کا مدھر ملن اس سیاسی نظام

کی کمزوریوں سے خبردار کرتا ہے لیکن افسوس کے عوام کو خواب غفلت سے بیدار کرنے
والے دانشور خود انہیں پتوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں جو آئے دن ہوا دیتے رہتے ہیں
ہے۔ہماری حالت زار پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

نسیم صبح تو کیا سونے والوں کو جگائے گی
ابھی تو صبح خود سوئی ہوئی معلوم ہوتی ہے

کیجریوال جی: تمہارے شہر میں آئینے جھوٹ بولتے ہیں

۱۴فروری ساری دنیا میں ویلنٹائن ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ گذشتہ سال اس دن دہلی کے وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال نے اقتدار کی دیوی کو محبت بھرا گلاب دینے کے بجائے ببول کا کانٹا پکڑا دیا اور اسی کے ساتھ حمایت والا کانگریسی ہاتھ لہولہان ہوگیا۔ اس طرح جن لوک پال بل کی بنیاد پر اصول نظریات کی خاطر اقتدار سے سبکدوش ہونے والا نادر و منفرد واقعہ ہندوستان کی موقع پرست سیاست میں رونما ہوگیا۔اپنی الوداعی تقریر میں کیجریوال نے کہا تھا ''میں وزیر اعلیٰ کی کرسی ایک بار تو کیا ہزار بار چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو دیش کے لیے اپنی جان تک دینے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ہمارا آخری اجلاس ہے۔''

اس سال پھر ایک بار اقتدار کی دیوی ۱۴فروری کو سر جھکائے اروند کیجریوال کے سامنے کھڑی تھی ۔ کیجریوال نے جب اس کے گلے میں ور مالا ڈالی اور اگنی کے پھیرے لینے جارہے تھے تو اخبار نویسوں کو کہانی ولن لوک پال یاد آگیا انہوں نے پوچھا جن لوک پال بل کب پاس ہوگا ؟ اروند کیجریوال نے جواب دیا عوام نے ہمیں ۵ سال کا وقت دیا ہے۔ یہ جملہ سن کر اقتدار کی دیوی خوشی سے

جھوم اٹھی اس لئے کہ لوک پال سے بڑااس کا رقیب روسیاہ کوئی اور نہیں ہے۔ اسے یقین ہوگیا کہ کیجریوال اب خبطی سیاستداں نہیں رہا۔ ان کی رفاقت کواب دوام حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ جو وزیراعلیٰ محض ۲۸ ارکان اسمبلی کے ساتھ لوک پال کے بغیر ۵۰ دن کا وصال برداشت نہ کرسکا وہ ۶۷ ارکان کی حمایت کے باوجود ۵ سال تک صبر کرنے کیلئے اسی تیار ہوگیا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔

اقتدار کی دیوی کو اروند کیجریوال کا وہ تاریخی جملہ بھی یاد آیا کہ جس نے ماضی میں اسے شرم سے پانی پانی کردیا تھا کیجریوال نے کہا تھا ’’دوستو! میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ میری کوئی اوقات نہیں لیکن جب سے ہماری سرکار بنی ہمارے وزرا نے دن رات کام کیا۔ ہم نے ایمانداری سے کام کیا۔‘‘ اقتدار کی دیوی کو احساس ہوا کہ اب یہ کوئی چھوٹا آدمی نہیں ہے۔ اس بار وہ میٹرو میں بیٹھ کرحلف برداری کی خاطر رام لیلا میدان تک نہیں آیا ہے بلکہ اپنے وزراء کے ساتھ قافلہ کی شکل میں رام لیلا کیلئے آیا ہے ۔ اقتدار کی دیوی کو اس موقع پر مریادہ پرشوتم رام چندرجی کے راون کو شکست دینے کے بعد ایودھیا میں واپسی کا منظر یاد آگیا جبکہ چہار جانب دیپاولی کا جشن منایا جارہا تھا۔ بھارت کی دھرتی پراپنے طویل تجربہ کی بنیاد پر اقتدار کی دیوی کو احساس ہو گیا تھا اب عیش و عشرت کے اچھے دن آگئے ہیں اور اسی کے ساتھ ایمانداری کے ساتھ دن رات کام کرنے کے دن لدچکے۔

اروند کیجریوال نے اپنی الوداعی تقریر میں ایک اور دلچسپ بات کہی تھی ’’ہم لوگ پہلی بار منتخب ہو کر اسمبلی میں آئے تھے تو ہم نے سوچا تھا کہ یہاں بہت سارے سینئر پارلیمینٹیرین موجود ہیں۔ ہم اِن سے اسمبلی کے آداب اور سیاست کے طور طریقے سیکھیں گے۔ لیکن کانگریس اور بی جے پی کے ارکان نے کیا کیا۔ انھوں نے میرا مائیک توڑ دیا اور میرے کاغذ پھاڑ دیئے۔ اس سے مجھے بہت صدمہ اور مایوسی ہوئی ہے۔‘‘

پارلیمانی انتخاب میں ہاتھ آنے والی زبردست ناکامی کے بعد اس صدمہ اور مایوسی میں یقیناً اضافہ ہوا ہوگا اور اس کے بعد جب کیجریوال نے خود احتسابی کے عمل سے گزرے ہوں گے تو انہیں احساس ہوا ہوگا کہ کانگریس، بی جے پی اور دیگر علاقائی جماعتوں سے بہت کچھ سیکھے بغیر وہ سیاست کے گندے تالاب میں پھل پھول نہیں سکتے۔

عام آدمی پارٹی (عآپ) میں برپا ہونے وا

لی حالیہ سر پھٹول کے پس پردہ وہی سبق کارفرما ہے جسے سیکھنے کیلئے اروند کیجریوال ایوانِ اقتدار میں گئے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں قومی سیاست کا درس بہت جلد ازبر کرلیا ہے یہی وجہ ہے کہ کانگریس اور بی جے پی کا اصلی چہرہ دکھلانے والے کیجریوال کا اپنا رعونت بھرا چہرہ ساری دنیاکے سامنے آگیا ہے۔ پرشانت بھوشن اور یوگیندر یادو کو پارٹی سے نکالنے کیلئے جو حربہ استعمال کیا گیا اسے دیکھ کر مودی جی بھی حیران ہوں گے کہ پارٹی کے اندر اپنے

حریفوں کو ٹھکانے لگانے کیلئے جو خونریزی انہوں نے کی اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی اسکے بغیر بھی نہایت صفائی سے یہ کام ہو سکتا تھا بقول مرحوم کلیم عاجز ؎

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

عام آدمی پارٹی کے اختلافات دہلی کی انتخابی مہم کے دوران سامنے آئے تھے۔ وہ بہت ہی بنیادی نوعیت کے اختلافات تھے مثلاً داغدار پس منظر کے لوگوں کو پارٹی کا ٹکٹ دیا جانا۔ امیدوار کے پاس شراب کا پکڑا جانا اور غلط طریقوں سے چندہ جمع کرنا وغیرہ۔

ہندوستان کی سیاست میں یہ معمولی باتیں ہیں۔ اگر عآپ بھی ایک عام سی سیاسی جماعت ہوتی تو ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا لیکن چونکہ لوگ اسے ایک اصول و نظریات کی حامل جماعت سمجھتے تھے اس لئے بجا طور پر اعتراض کیا گیا۔ اس کی اصلاح کوئی بہت مشکل کام نہیں تھا۔ اگر آئندہ کیلئے داغدار لوگوں کو ٹکٹ دینے سے توبہ کر لی جاتی، خاطی رکن اسمبلی کی سرزنش کی جاتی اور چندہ کے طریقہ کو مزید صاف شفاف بنانے کے لئے ضروری اقدام کئے جاتے تو عوام کی نظر میں اس سے عآپ کا احترام بڑھ جاتا لیکن عوام کی اہمیت تو اقتدار میں آنے کیلئے ہوتی ہے سو وہ ۵ سال تک کیلئے ختم ہو گئی اب تو منتخب شدہ ارکان زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔

عاپ کی جوان قیادت نے اپنی نا تجربہ کاری کے سبب اصولی اختلافات کو شخصیات کی جنگ میں بدل دیا اور پارٹی کی توسیع کو جھگڑے کی بنیاد قرار دے دیا۔ اروند کیجریوال کے حامیوں نے اعتراض کا منطقی جواب دینے کے بجائے نہایت رکیک ذاتی الزامات لگانے پر اتر آئے اور معترضین کو کیجریوال اور پارٹی کا دشمن قرار دے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ لوگ اروند کیجریوال کو قومی کنوینر کے عہدے سے ہٹا کر پارٹی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی ان جماعتوں میں بھی جو انحطاط کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہیں یہ دو عہدے مختلف لوگوں کے پاس ہوتے ہیں (یہ اور بات ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کا کٹھ پتلی ہوتا ہے) اس لئے دو مختلف لوگوں کی ان عہدوں پر فائز کرنے کا مطالبہ غیر معقول نہیں تھا۔ اگر اروند ازخود ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرکے دوسرا عہدہ کسی اور کے حوالے کردیتے تو سارا اختلاف اپنے آپ ختم ہوجاتا لیکن افسوس کے ایسا نہیں ہوا۔ جان دینے والا کرسی نہ دے سکا۔

پارٹی کی توسیع کے حوالے سے اروند کیجریوال کا فیصلہ بھی کئی معنی میں مضحکہ خیز ہے۔ اول تو یہ پارٹی کا متفقہ فیصلہ ہے اس لئے اسے کوئی فرد واحد نہیں بدل سکتا۔ اروند کیجریوال کی سوراج نامی کتاب جو آج بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے حکومت کو ہر اہم فیصلے سے قبل عوام سے مشورے کا پابند کرتی

ہے۔ اروند کیجریوال نے گذشتہ انتخاب سے قبل کہا تھا کہ ہم کانگریس یا بی جے پی کا تعاون نہیں لیں گے لیکن کانگریس کے تعاون سے حکومت سازی سے پہلے وہ عوام میں گئے اور ان کی توثیق حاصل کرنے کے بعد وزیراعلیٰ کے عہدے کا حلف لیا۔ اس مثال کی روشنی میں پارٹی کی توسیع کا فیصلہ بھی علاقائی کارکنان کے مشورے سے ہونا چاہئے تھا لیکن اس کیلئے کیجریوال نے بغیر کسی سے پوچھے فرمان جاری کردیا اور سوراج یعنی عوام کی خودمختاری کو اپنے ذاتی اختیار میں لے لیا۔

عآپ کے اندرونی خلفشار کا آتش فشاں جب پھٹا تو پہلے کیجریوال نے مودی جی کی مانند چپیّ سادھ لی اور جب بولے بھی تو کسی فلسفی بابا کے سمان کہا مجھے یہ سب دیکھ بہتر نجیدہ ہوں حالانکہ اگر وہ کوئی واضح موقف اختیار کرلیتے یا اپنے حامیوں کو ڈانٹ دیتے تو صورتحال ہر گز نہیں بنتی ۔ عام آدمی پارٹی کا یہ امتیاز ہے کہ اس میں ایک داخلی لوک پال ہے اور پارٹی کے دستور میں اس کے متعلق درج ہے کہ ” لوک پال پارٹی کا رکن نہیں ہوگا مگر اسے پارٹی کی سب سے اعلیٰ فیصلہ ساز مجلس سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں گے “۔ اس عہدے پر فائز ایڈمرل رام داس نے پارٹی میں داخلی جمہوریت کے فقدان ، باہمی اعتماد کی کمی اور تعلقات کے تعطل پر تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک قومی جماعت کیلئے اپنے آپ کو کسی ایک ریاست تک محدود کردینے کا موقف درست

نہیں ہے لیکن سارے ملک کو لوک پال کے تحت لانے کا مطالبہ کرنے والوں نے خود اپنی پارٹی کے لوک پال کی رائے ٹھکرا دیا اس لئے کہ وہ پارٹی سپریمو کی مرضی کے خلاف تھی۔

اس ڈرامہ کا کلائمکس خاصہ دلچسپ ہوا۔ یوگیندر یادو تو پہلے ہی سے مفاہمت کی بات کررہے تھے لیکن پرشانت نے بھی اپنا موقف نرم کرتے ہوئے اروند کیجریوال سے ملاقات کی کوشش کی تاکہ پی اے سی سے قبل کوئی درمیان کی راہ نکل سکے۔ مائنک گاندھی کے مطابق پارٹی میں اتحادو اتفاق کو برقرار رکھنے کی خاطر کئی تجاویز سامنے آئیں مثلاً یہ دونوں لوگ معافی مانگ لیں جو سراسر ہتک آمیز مطالبہ تھا۔ اس کے علاوہ پی اے سی کی تشکیل جدید کی جائے اور نئے ارکان کی فہرست سے ان کا نام خارج کردیا جائے یا چونکہ اروند کیجریوال ان کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے اس لئے ان کی رکنیت کو تو برقرار رہے مگر وہ اجلاس میں شرکت سے بازرہیں وغیرہ لیکن کیجریوال کے حامی انہیں رسوا کرکے نکالنے پر مصر تھے اس لئے سسودیہ نے یہ نامعقول قرارداد پیش کرکے رائے شماری پر اصرار کیا۔

عآپ کی سیاسی امور کی کمیٹی میں کل ۲۱ ارکان ہیں جن میں سے دو کیجریوال کے خوف سے غیر جانبدار ہوگئے ۸ نے مخالفت کی اور ۱۱ کی حمایت سے یوگیندر یادو

اور پرشانت بھوشن کو پارٹی کے پی اے سی سے نکال باہر کیا گیا یعنی اگر دو لوگ ووٹ دیتے تو ۱۰ اور ۱۱ کی بات تھی۔ اس طرح یہ متفقہ فیصلہ تو درکنار بڑی اکثریت کی رائے بھی نہیں تھی۔ مایئنک گاندھی کو دھمکی دی گئی کہ اگر انہوں نے ان حقائق کا انکشاف کیا تو انجام ٹھیک نہیں ہوگا مگر انہوں نے عمران عظیم کی مصداق حق گوئی سے کام لیا۔

لوآج ہار کے ہم بھی زبان کھولتے ہیں

تمہارے شہر کے آئینے جھوٹ بولتے ہیں

کیجریوال جی کے ذریعہ اس طرح اجلاس کا بائیکاٹ کرنا نریندر مودی کے اس رویہ کی یاد دلاتا ہے جو انہوں نے اپنے سب سے بڑے مخالف سنجے جوشی کو پارٹی کے اعلیٰ کمان میں آر ایس ایس کے ذریعہ نامزد کرنے کے خلاف اختیار کیا۔ وہ مختلف بہانوں سے پارٹی کے مرکزی مجلس انتظامیہ کے اجلاس سے اس وقت دور رہے جب تک کہ جوشی کو ذلیل کرکے نکال باہر نہیں کیا گیا۔ سوئے اتفاق سے فی الحال سیاسی افق پر بظاہر مختلف نظر آنے والی ان دو مقبول ترین شخصیات میں زبردست یکسانیت پائی جاتی ہے۔ نریندر مودیجہاں بیجے پیکا واحد چہرہ ہیں وہیں عآپ بھیاروند کیجریوالکے طواف میں مستعد ہے۔ دونوں حضرات پارٹی کے اندر اختلاف کرنے والوں کے ساتھ نرمی کے قطعی روادار نہیں ہیں۔ سیاسینظریاتسے قطع نظر دونوںکے اندر صبر و تحمل کی کمی ہے اور ضوابط کی پاسداری کا خیال بھی وہ ضروری

نہیں سمجھتے۔ مصمم ارداہکرکے اسپراڑجانا اورآسانی سے رجوع نہ کرنا ان کی عادت ثانیہ ہے۔ شاید اسی لئے لوگ کہتے ہیں ان دونوں کا عزم مصمم جو اپنے حدود سے تجاوز کرکے جب ضد میں تبدیل ہوجاتا ہے تو بیک وقت انکیقوت کا سرچشمہ اور سبسے۔ڑیکمزوریبھی بن جاتاہے۔

ذرائع ابلاغ میں یہ خبر گرم ہے کہ کیجریوال نے ان یادو اور بھوشن کے انخلاء کی خاطر دباؤ بنانے کیلئے قومی کنوینر کی ذمہ داری سے استعفیٰ دے کر اسے واپس لینے کیلئے انہیں نکالنے کی شرط لگادی تھی۔ کیجریوال کے استعفیٰ کا متفقہ طور پر مسترد کیا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ فی الحال عاپ کے اندر کوئی ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے جس پر اروند کیجریوال دہلی کے وزیر اعلیٰ یا پارٹی کا قومی کنوینر کے طور پر اعتماد کرسکتے ہوں ۔ یہ قحط الرجال کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے؟ شانتی بھوشن نے نہ صرف کرن بیدی بلکہ نریندر مودی کی بھی تعریف کی تھی اور ان پر گھر کی تعمیر میں ٹیکس چوری کا الزام بھی لگا تھا اس لئے اگر پارٹی کی اصولی و عملی مخالفت کے سبب کسی کو نکالا جانا چاہئے تھا تو وہ شانتی بھوشن تھے لیکن انہیں بخش دیا گیا اور نظریاتی مخالفین کی چھٹی کردی گئی ۔

کیجریوال پارٹی کے نازک ترین دور میں اپنے فطری علاج کیلئے بنگلور سدھار

گئے۔ لوگوں کو یہ توقع تھی کہ وہ اپنی فطرت پر لوٹ آئیں گے لیکن میر کے شعر کی مصداق ''الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا''۔ ویسے اروند کیجریوال اگر واقعی اپنی بیماری کی تشخیص کرکے فطرت کی جانب لوٹنا چاہتے ہیں تو اس کا جواب ان کی اپنی تقاریر میں موجود ہے۔ کیجریوال نے جیت کے بعد ۱۰ فروری کو اپنے پہلے رد عمل میں کارکنان کو تلقین کی تھی کہ وہ تکبر اور گھمنڈ کے شکار نہ ہوں۔ بحیثیت وزیر اعلیٰ اپنی پہلی تقریر میں فرمایا تھا کہ حکومت کے ذمہ داروں، وزراء، اراکین اسمبلی اور کارکنان میں تکبر اور گھمنڈ نہیں پایا جانا چاہئے۔

دوسروں کو اہنکار سے بچنے کا درس دینے والا عام آدمی پارٹی کا بہت ہی خاص آدمی خود اپنے آپ کو اس خرابی سے نہیں بچا سکا۔ موجودہ خلفشار میں کیجریوال کا رویہ اس بات کا غماز ہے کہ انہوں نے رام لیلا میدان میں پروردگار سے جو دعا کی تھی کہ وہ انہیں عقل سلیم عطا فرمائے، کبریائی سے بچائے غالباً مستعجاب نہیں ہوئی۔ ویسے جو کچھ عآپ اور کیجریوال کے ساتھ ہوا ہے وہ افسوسناک تو ضرور ہے لیکن غیر متوقع نہیں ہے اس لئے کہ ان سے قبل اچھے اچھوں کو یہ نظام اپنے رنگ میں رنگ چکا ہے۔ اس بار بھی یہی ہوا کہ سیاسی نظام کو بدلنے کا عزم کرکے بھاری اکثریت سے کامیاب ہونے والے ایک انقلابی رہنما کو جس سے لوگوں نے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں سیکولر جمہوی نظام

اپنے اندر نگلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہولی کی آگ میں کوئی اپنا اہنکار نہیں جلاتا بلکہ اقتدار کی بھنگ پی کر ساری جماعتوں کے رہنما آپسی بھید بھاو مٹا کر سیاسی حمام میں .برہنہ تن داخل ہو جاتے ہیں۔ ایوانِ اقتدار میں ہولی کھیلنے والے اور گلال اڑانے والے تمام سیاسی رہنما یک رنگ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم خان کے ناول وہم زاد : جیتو جلاد کا اورنگ آباد میں رسم اجراء

معروف افسانہ نویس اور ناول نگار جناب نورالحسنین کے زیر صدارت ایک پروقار تقریب میں ڈاکٹر سلیم خان کے ناول وہم زاد: جیتو جلاد کی رسم رونمائی ادارہ ادب اسلامی (مہاراشٹر) کے صدر ابراہیم خان صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اورنگ آباد کے مولانا آزاد ریسرچ سینٹر میں منعقدہ پروگرام کا آغاز ذکراللہ خاں صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ابتداء میں مولانا الیاس فلاحی صاحب نے ادارہ ادب اسلامی کا تعارف اور اغراض و مقاصد پیش فرمائے۔ آپ نے بتایا کہ ادب اور انسان کا تعلق اتنا غیر معمولی ہے کیونکہ اللہ رب العالمین نے انسان کو ادبی ذوق کے ساتھ پیدا فرمایا۔ ادب انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ قرآن خود ایک عظیم ادبی معجزہ ہے۔ ادارے کے مقامی صدر جناب احمد اقبال صاحب نے صاحبِ تصنیف کا تعارف پیش کیا۔ امیر مقامی جناب عباس انصاری نے مصنف کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔

کتاب پر تبصروں کا آغاز ممبئی کے مشہور شاعر جناب اسلم غازی کے تحریر کردہ مقالہ سے ہوا۔ آپ نے فرمایا وہم زاد: جیتو جلاد ایک طبعزاد تخلیق ہے جس میں اچھے ناول کے سارے اجزائے ترکیبی بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ ناول کا پلاٹ

بہت اچھوتا ہے۔ڈاکٹر سلیم خان نے اس ناول میں ادیباسیوں کے انسانی اور سماجی حقوق کی مسلسل پامالی سے بحث کی ہے۔اردو ادب میں شاید یہ پہلی تصنیف ہے جس میں اس سلگتے ہوئے مسئلہ کو مرکزی موضوع بنایا گیا ہے۔ادیباسیوں کے انسانی حقوق کے تحفظ کیلئے کام کرنے والی تنظیموں میں مسلمان نظر نہیں آتے مگر ڈاکٹر سلیم خان نے امت مسلمہ پر عائد ایک فرض کو ادا کرنے کی جانب پہل کی ہے۔غازی صاحب نے مزید فرمایا کہ اپنے اعداد و شمار کے سبب یہ ناول ایک دستاویزی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ رام چندر جی پر تنقید کو انہوں نے نامناسب قرار دیا۔

معروف افسانہ نگار اسلم خان نے کہاادب میں ادب اور اخلاق موجود ہوتا ہے۔ ادب اسلامی پر اعتراض کرنے والوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے سوال کیا کہ اگر ترقی پسند ادب ہوسکتا ہے، دلت ادب ہوسکتا ہے تو اسلامی ادب کیوں نہیں ہوسکتا؟ مصنف کی بابت اسلم خان نے کہا کہ سلیم خان وہ مدرس ہے جو اپنے نظریئے کو صحافت کے ذخیرے سے سنوار کر کہانی کے پیکر میں ڈھالتا ہے۔ اورنگ آباد کی مشہور علمی شخصیت ایڈوکیٹ اسلم مرزانے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا کہ اس ناول کا مصنف مذہب، تہذیب وتمدن اور سائنس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ یہ ناول اپنی کہانی، پلاٹ کردار نگاری اور اس کے اختتامیہ کی وجہ سے ایک اچھوتی تصنیف بن گیا ہے۔ قاری کے، تجسس کو قائم رکھنا ناول نگار کا

سب سے بڑا کمال ہوتا ہے اور اس میں سلیم خان کامیاب ہے۔ یہ ناول بہت تیز چلتا ہے اور قاری کو بالکل تھکن محسوس نہیں ہوتی۔ ناول کے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں پر ان کی پکڑ ہے۔ یہ ناول ایسے زمینی حقائق سے جڑا ہوا ہے جن کا اردو ادب میں فقدان ہے۔آپ نے فرمایا کہ مکالمہ کو بیانیہ کا حصہ بنا دینا اس کتاب کا نقص ہے۔

کتاب کا اجراء فرمانے والے ابراہیم خاں صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ مظلوم طبقات کی دادرسی اس ناول کا مرکزی موضوع ہے۔ سلیم خان نے حیرت انگیز طور پر خلیج میں بیٹھ کر چھتیس گڑھ اور اڑیسہ کے ماحول کی مکمل عکاسی کی ہے۔ناول کے شروع میں جو تجسس جنم لیتا ہے وہ آخر تک قائم رہتا ہے۔ اس ناول میں سیاستدانوں کی مکاری اور بین الاقوامی کمپنیوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیاہے۔ یہ ایک ایسے ناول نگار کی کہانی ہے جو اپنے کردار میں کھو جاتا ہے اور اپنے آپ کو اپنا کردار سمجھنے لگتا ہے۔اس کتاب میں تاریخ، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، قبائلی معاشرت اور سرکاری اسکیموں کے معلومات کا خزانہ ہے۔یہ مصنف کا ایک قلمی جہاد ہے۔ مراٹھواڑہ کی نہایت معتبر علمی شخصیت پروفیسر شاہ حسین نہری نے فرمایا سلیم خان کہانی بہت بہتر طریقے سے بن سکتا ہے۔ کہانی بننے کی صلاحیت کو وہ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر فن کو متاثر کئے بغیر استعمال کر رہے ہیں لیکن اس بابت احتیاط کی ضرورت ہے۔ سلیم خان کے یہاں

کہانی در کہانی کا سا انداز بھی ہے اور درمیان میں وہ اپنی باتیں بھی کہتے جاتے ہیں۔اس ناول کو ہندی میں بھی چھپنا چاہیے۔ صدارتی خطبہ سے قبل ڈاکٹر سلیم خان نے خدا کا شکر ادا کیا اور منتظمین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کتاب کے چند صفحات پڑھ کر سنائے۔

صدر مجلس جناب نورالحسنین جو معروف افسانہ نگار ہونے کے ساتھ کئی ناول تصنیف کر چکے ہیں نے اپنا پر مغز مقالہ پیش کیا۔جس کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں'' اس ناول کا انداز گوکہ نیا نہیں ہے لیکن موضوع یقیناً اردو قارئین کیلئے نیا ہے۔اس ناول میں سلیم خان نے ان پہاڑی علاقوں میں آباد ادیباسیوں کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی ہے جو غربت کی سطح کے نیچے زندگی گذار رہے ہیں اور جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ ڈاکٹر سلیم خان نے ان آدیباسیوں کی زندگی ان کی معاشرت ، ان کی غربت ، ان کے استحصال، غیر ملکیوں کے اپنے مفاد، ملکی سیاست، سیاست کے بازیگروں کی خودغرضیاں اور ان کیلئے کام کرنے والے بے لوث افراد، نکسلی تنظیم، ان کے بندوق اٹھانے کی وجوہات،مذہب کے نام ہونے والے مظالم ، غلط فہمیاں ، سوشیل تنظیمیں، سیمینار، عالمی بنک سے ملنے والے فوائد اور عالمی بنک کے اپنے مفادات،ڈیم اور بند کی تعمیرات، ان کی خاطر دیہاتوں کا انخلاء ، دیہاتیوں کا بے زمین ہونا، ان کی بازآبادکاری میں عدم تعاون،بدعنوانی اور مغربی نظریات جیسے بے شمار

موضوعات وواقعات کو اپنے ناول میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ جناب نورالحسنین نے اپنے مقالہ میں ناول کے اقتباسات کو موتیوں کی مانند پرو کر ثابت کیا کہ اس میں ادیباسیوں کے پچھڑنے کی وجوہات اور اس کا حل سمجھایا گیا ہے۔ ادارہ کے سکریٹری جناب معین عظیم صاحب نے اظہار تشکر کیا اور تقریب کی نہایت شگفتہ نظامت جناب صلاح الدین صدیقی نے فرمائی۔

(مسرت عالم کی پر مسرت رہائی (قسط اول

.برادرانِ یوسفؑ کو اگر پتہ ہوتا کہ یہ اندھا کنواں دراصل دربارِ مصر کا روشن باب ہے تو وہ اپنے سوتیلے بھائی کو اس میں ڈھکیلنے کی حرکت ہر گز نہ کرتے لیکن مشیت کے آگے بھلا کس کا زور چلتا ہے۔ مشیت کی کارفرمائی یوں بھی ہوتی ہے کہ بظاہر شر کے بطن سے خیر جنم لے لیتا ہے۔ مسرت عالم کے ساتھ یہی ہوا لیکن احمق لوگ یہ جانے بغیر کہ مسرت عالم کون ہے؟ اسے کیوں گرفتار کیا گیا تھا؟ اور اس کی رہائی کیوں کر عمل آئی ذرائع ابلاغ میں ، ایوانِ پارلیمان میں اور سوشیل میڈیا میں لٹھ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔اس کی بد نما مثال عام آدمی پارٹی کے رہنما ڈاکٹر کمار وشواس جیسے لوگ اگر حقائق سے واقفیت حاصل کرتے تو یہ نہیں کہتے کہ '' مجھے تو کئی بار ذاتی طور سے ایسا لگتا ہے بھارت کے فوجی دستوں سے ہمیں استدعا کرنی چاہئے کہ ایسے آد خور بھیڑیوں کو مٹھ بھیڑ میں گرفتار کرنے کے بجائے سیدھے گولی ماردیں تو ٹھیک ہے''صرف صرف ہندوستان کی سرزمین پر ایک پڑھا لکھا سیاستدں اس طرح کا غیر ذمہ دارانہ بیان دے کر آزادی کے ساتھ گھوم سکتا ہے ورنہ کسی مہذب معاشرے میں اس کا تصور بھی محال ہے۔

مسرت عالم بٹ حریت (گ)کے سینئر لیڈر اور مسلم لیگ کے سربراہ ہیں۔ مسرت عالم

پر سال ۲۰۱۰ء کے عوامی مظاہروں کی سرپرستی کا الزام ہے۔ یہ احتجاج ضلع کپوارہ کے مژھل سیکٹر میں فوج کے ہاتھوں تین معصوم کشمیری نوجوانوں کے حراستی قتل پر شروع ہوا تھا۔ ان نوجوانوں کو اول تو پاکستانی دہشت گرد بتلایا گیا تھا لیکن آگے چل کر جب فوج نے خود تحقیق و تفتیش کو اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ بارہ مولا کے رہنے والے تھے۔ ان بیچاروں کو پہلے تو فوج میں قلی کی ملازمت پر رکھا گیا اور بعد میں فرضی انکاؤنٹر کے نام پر ہلاک کردیا گیا۔ اس کورٹ مارشل میں سانحہ کے چار سال بعد پانچ فوجیوں کو بشمول دو افسران کو عمر قید کی سزا سنائی گئی اور ایک کو جسے چھوڑ دیا گیا تھا ۱۲ مارچ ۲۰۱۵ء کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ ایسے میں ڈاکٹر کمار وشواس ان فوجی افسروں کیلئے کیا سزا تجویز کریں گے جنھوں نے ان فوجیوں کو عمر قید کی سزا دی ہے؟

اس موقع پر ٹھہر کر غور کرنا چاہئے کہ اگر عام آدمی پارٹی جیسی سیکولر جماعت کے پڑھے لکھے رہنما کا یہ حال ہے تو بجرنگ دل، وی ایچ اپی، شیوسینا، بی جے پی، آر ایس ایس اور کانگریس کے جاہلوں کا کیا حال ہوگا؟ اب کمار جی یہ بتائیں کے اگر کالے دھن کے خلاف انّا کا احتجاج درست ہے تو کیا اس ظلم عظیم کے خلاف آواز اٹھانا غلط ہے؟ اس احتجاج کے دوران فوج اور پولس نے پتھر کا جواب گولی سے دیا اور سو سے زیادہ نوجوانوں اور بچوں کو شہید کردیا۔ کیا حفاظتی دستوں کا وہ معاندانہ رویہ درست تھا؟ فریاستی وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ

جو دہلی میں بیٹھے آقاوں کی خوشنودی کیلئے یہ احکامات صادر کررہے تھے کیا حق بجانب تھے اور اب ان کی قرار واقعی سزا کیا ہے؟ عمر عبداللہ کی شکست کے پیچھے اس ظلم کا ہاتھ ہے۔

مسرت عالم کو پولیس نے احتجاج کو ہوا دینے اور امن و قانون کی فضا بگاڑنے کے الزامات میں گرفتار کیا تھا، تاہم حکومت عدالت میں مسرت عالم پر لگائے گئے الزامات کو ثابت نہیں کرسکی۔ مسرت عالم پر ۲۷ ا من گھڑت لزامات لگائے اور ان سب میں انہیں عدالت نے ضمانت دے دی لیکن ہر بار رہائی کے وقت انہیں کسی نئے بہانے سے دوبارہ گرفتار کرلیا جاتا۔ مسلسل ۶ مرتبہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت انہیں حراست میں لیا گیا جو قانون کے ساتھ کھلواڑ تھا۔ مسرت عالم کی رہائی کی کارروائی کا آغاز کشمیر میں صدر راج کے دوران ہوا جبکہ بلاواسطہ بی جے پی حکمرانی تھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ مفتی صاحب کی حلف.برداری کے بعد ۴ مارچ کو جموں ضلع کے جج نے پولس کو لکھا چونکہ وزارت داخلہ نظر بندی کی توثیق نہیں کی اس لئے انہیں رہا کردیا جائے۔ مفتی صاحب کی جگہ عمر عبداللہ ہوتا تو ممکن ہے حزب اختلاف میں.براجمان بی جے پی کے متوقع شور شرابے سے خوف کھا کر کسی نئے الزام میں گرفتاری کی توسیع کروادیتا۔ بی جے پی کے حلیف پی ڈی پی کو ایسا کوئی ڈر نہیں تھا اس لئے انہوں نے یہ حماقت نہیں کی بلکہ اس کی آڑ میں اپنی سیاسی دوکان کو چمکانے میں لگ گئے۔

بی جے پی کے عقل سے پیدل رہنما کیل ٹھونک میدان کارزار میں کود گئے۔ ان میں سے کوئی بیان بازی کرنے لگا تو کسی نے احتجاج شروع کردیا۔ توگڑیا جموں پہنچ کر دوبارہ گرفتاری کا مطالبہ کرنے لگا۔ ریاستی رہنماوں نے حمایت واپس لینے کی دھمکی دے ڈالی اور ایوانِ پارلیمان میں مودی اور راج ناتھ کو اپنے رائے دہندگان کو بہلانے پھسلانے کی غرض سے مگرمچھ کے آنسو بہانے پڑے۔ کانگریس نے بی جے پی کے کوما میں چلے جانے کا اعلان کردیا اور اے آئی ڈی ایم نے ایوان میں سوال اٹھایا کہ کیا جموں کشمیر حکومت ۱۰ہزار علٰحیدگی پسندوں کو رہا کرنے جارہی ہے۔ اس سے ریاستِ جموں کشمیر کی دگرگوں صورتحال طشت ازبام ہو گئی کہ جہاں اس قدر بڑی تعداد میں عوام کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دیا گیا ہے۔

مسرت عالم کی رہائی کا پس منظر یہ ہے کہ جموں ضلع مجسٹریٹ اجیت کمار ساہو نے ۱۵ ستمبر ۲۰۱۴ء کو مسرت عالم کی حراست کے نئے احکامات صادر کئے جس میں روایتی وجوہات کے علاوہ یہ کہا گیا تھا کہ ان کی رہائی سے اسمبلی انتخابات میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ ان احکامات کی توثیق ۱۲ دن کے اندر ہونی تھی لیکن وہ کاغذات ۲۳ دن بعد ریاستی وزارت داخلہ میں پہنچے اس تاخیر کا الزام سیلاب کے سرمنڈھ دیا گیا۔ وزارتِ داخلہ نے اسے ماہرین کے حوالے کیا تو ان کی رائے

آئی کہ نئے سرے سے حراستی احکامات جاری ہونا لازمی ہے۔ ۴ فروری ۲۰۱۵ء کو ریاستی داخلہ سکریٹری.برائے نے جموں کے ضلعی مجسٹریٹ کو بتایا کہ مسرت عالم کی نظر بندی کے احکامات کالعدم ہوگئے ہیں اس لئے وزارت داخلہ اس کی توثیق نہیں کر سکتی۔ اسی کے ساتھ عدالت سے استفسار کیا گیا کہ کیا ملزم کی نظر بندی کو جاری رکھنے کا کوئی جواز موجود ہے عدالت کا جواب منفی تھا۔ وزارتِ داخلہ نے ضلع مجسٹریٹ کو نئے احکامات صادر کرنے کا فرمان بھیجا لیکن اس کیلئے سپریم کورٹ کے تلقین شدہ طریقہ کار کی پابندی ضروری تھی۔

جموں کشمیر کے داخلہ سکریٹری سریش کمار کے مطابق سپریم کورٹ نے ہدایت دے رکھی ہے کہ آپ کسی فرد کو ایک ہی الزام میں بار بار حراست میں نہیں لے سکتے۔ اگر کسی کو دوبارہ حراست میں لینا ہو تو اس پر نئے الزامات عائد کرنے ہوں گے۔ مسرت کی رہائی کا دفاع کرتے ہوئے کمار نے کہا پی ایس اے کے تحت حراست میں رکھنے کے حدود ہیں آپ ٦ ماہ کیلئے ایسا کر سکتے ہیں اور اس میں صرف ایک مرتبہ کی توسیع ہو سکتی ہے یعنی کل ایک سال تک اس تعزیرات کے تحت کسی کو زیر حراست رکھا جا سکتا ہے) جبکہ مسرت عالم ۲۰۱۰ء سے حراست میں ہے۔ آپ کتنے دنوں تک یہ سلسلہ جاری رکھیں گے آخر آپ کو ملک کے قانون کی پاسداری بھی تو کرنی ہے۔ پی ایس اے کا اطلاق چونکہ پھر سے نہیں کیا جا سکتا اس لئے مسرت عالم رہا کر دیئے گئے۔ جموں کشمیر کے ڈائرکٹر جنرل آف پولس کے

راجندرا نے بھی مذکورہ موقف کی تائید میں کہا سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق قوانین کی عمل بجاآوری کے تحت مسرت عالم کی رہائی عمل میں آئی ہے۔

بی جے پی نے غالباً ان بیانات کے بعد عقل کے ناخون لئے اور اس کے مقامی رہنما اشوک کول نے تسلیم کیا کہ ہماری یہ سمجھ ہے کہ مسرت عالم کو تو رہا ہونا ہی تھا ہم اس کا انکار نہیں کرتے لیکن اس کا ایک نظام ہونا چاہئے۔ حکومت کو چاہئے تھا کہ وہ وزیر اعلیٰ، ڈی جی پی، چیف سکریٹری اور وزراء پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دیتی اور اس کے توسط سے ایسے لوگوں کو جو سزا یافتہ نہ ہوں یا جن کے خلاف ایف آئی آر تک درج نہیں کی گئی ہو رہا کردیا جائے۔ اس بار چونکہ یہ اچانک ہو گیا اس لئے سارے ملک میں بلکہ ایوان پارلیمان میں بھی اس پر ردعمل سامنے آیا۔ اب تو یہ حالت ہے کانگریس والے بھی ہمیں قوم پرستی کا درس دے رہے ہیں ۔ ویسے اس معاملہ میں بی جے پی ہزیمت قابلِ دید تھی پہلے تو اس نے کہا کہ یہ سی ایم پی یعنی کم از کم طے شدہ پروگرام کی خلاف ورزی ہے اس کا جواب یہ سامنے آیا کہ سی ایم پی کے تحت سارے متعلق لوگوں کو اعتماد لینے کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اب لوگوں کو جیل میں رکھ کر اعتماد میں کیسے لیا جاسکتا ہے؟ اس لئے یہ خلاف ورزی نہیں ہے۔ اس کے بعد کہا گیا کہ ہم سے پوچھا نہیں گیا۔ اس کا جواب یہ ملا کہ ہر بات اگر پوچھی جائے تو تب تو کوئی کام نہیں ہوگا۔ جب راجناتھ نے کہا حکومت بچانے

کیلئے امن و قانون پر کوئی مفاہمت نہیں ہوگی تو اس کا ترکی بہ ترکی جواب آگیا کہ امن و سلامتی ریاستی حکومت کا سر درد ہے اس کیلئے مرکز کو پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔

بی جے پی کی حالت زار پر فرعون کا انجام یاد آتا ہے۔ اس مغرور حکمراں کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ موسیٰؑ کا پیچھا کرتے ہوئے وہ اپنی فوج سمیت موت کے منہ میں جارہاہے ورنہ کسی صورت دونیم دریائے نیل کے درمیان قدم رکھنے کی جرأت اس میں نہیں ہوتی لیکن مثل مشہور ہے جب گیدڑ کی موت آتی ہے وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ ایسا ہی کچھ بی جے پی کے ساتھ ہوا جب اس نے پی ڈی پی سے پینگیں بڑھائیں اور اپنے ساتھ حکومت سازی کیلئے اس پر دباؤ بنایا۔ حکومت تو بن گئی لیکن اسی کے ساتھ بی جے پی کیلئے قومی سطح پر مسائل در مسائل کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلہ شروع ہوگیا۔ بی جے پی نے اقتدار کی بساط پر یہ سب سے زیادہ پرخطر پانسہ پھینکا ہے جس کے دوررس نتائج نہ صرف قومی سیاست پر رونما ہوں گے بلکہ سنگھ پریوار کی نظریاتی بنیادوں پر بھی اس کے زبردست اثرات پڑیں گے۔ یہ اونٹ بالآخر کس کروٹ بیٹھے گا یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔ اس کے نتیجے میں سنگھ کیا کھوئے گا اور کشمیر کے عوام کیا پائیں گے اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ گمان غالب یہی ہے کہ بی جے پی اور پی ڈی پی والے کچھ عرصے بعد کفِ افسوس ملتے ہوئے یہ شعر

سے پڑھتے نظر آئیں گے

رُودادِ محبّت کیا کہیے کُچھ یاد رہی کُچھ بھُول گئے
دو دِن کی مُسرّت کیا کہیے کُچھ یاد رہی کُچھ بھُول گئے

(مسرت عالم کی رہائی کے سیاسی پیچ و خم (قسط دوم

جموں کشمیر کی موجودہ صورتحال پر بی جے پی، پی ڈی پی اور دیگر سیاسی جماعتوں کی سر پھٹول سے قطع نظر مسرت عالم بٹ کا بیان رہائی کی حقیقی داستان اور اس کے پس پشت کارفرما سیاسی پیچ و خم بیان کرتا ہے انہوں نے کہا کہ ”میں اپنی گرفتاری کے خلاف ایک قانونی جنگ لڑ رہا تھا جس کی بنیاد پر مجھے رہا کیا گیااوراس میں سرکار کا کوئی رول نہیں ہے بلکہ یہ صرف اور صرف عدالتی کارروائی کا نتیجہ ہے“۔انہوں نے مزید کہا ”مخلوط سرکار میں شامل دونوں جماعتیں پی ڈی پی اور بی جے پی اس معاملے سے سیاسی فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہیں“۔ حقیقت یہی ہے کشمیر میں فی الحال پی ڈی پی کا تو تھوڑا بہت فائدہ ہوتا دکھائی دے رہاہے لیکن بی جے پی سراسر خسارے میں نظر آتی ہے۔ وہاں کی سیاسی صورتحال کااگر معروضی جائزہ لیا جائے تو بی جے پی کی حماقت واضح ہو جاتی ہے۔
دسمبر ۲۰۰۸ کے اندر ہونے والے انتخابات میں نیشنل کانفرنس کا وہی حال تھا جو اس بار پی ڈی پی کا ہے یعنی وہ ۲۸ نشستیں جیت کر سب سے بڑی پارٹی تو بن گئی مگر اکثریت سے محروم رہی۔ اس وقت مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی جس نے

اسمبلی میں ۱۷ نشستیں جیتی تھیں۔ اس لئے ان دونوں کی مخلوط حکومت بن گئی۔ ۲۰۰۹ء کا پارلیمانی انتخابات بھی ان دونوں نے ایک ساتھ لڑا۔ این سی نے وادی کی ۳، کانگریس نے جموں کی دو اور لداخ سے ایک آزاد امیدوار کامیاب ہو گیا لیکن ۲۰۱۴ء کے پارلیمانی انتخاب میں سیاسی منظر نامہ یکسر بدل گیا۔ بی جے پی جو پچھلی مرتبہ ایک سیٹ بھی نہیں جیت سکی تھی جموں کی تینوں نشستوں پر کامیاب ہو گئی اور پی ڈی پی نے کشمیر کی تینوں نشستوں پر قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد جموں کشمیر کے صوبائی انتخابات کا اعلان ہوا۔ دو قطبی فضا میں بی جے پی نے ہندو اکثریت کو اپنا ہمنوا بنالیا اور اس کے ردعمل میں مسلمان اکثریت پی ڈی پی کی جانب چلی گئی۔ ایسے میں نیشنل کانفرنس نے سوچا کانگریس کو ساتھ لینے کے سبب مسلمان ناراض ہوجائیں گے اور کانگریس میں یہ سوچ تھی کہ کہیں این سی کا ساتھ ہندووں کو دور نہ کردے اس لئے ان دونوں نے آزادانہ انتخابات لڑا۔ ان کا ارادہ یہ رہا ہوگا کہ انتخاب کے بعد پھر سے ایک ہو جائیں گے لیکن یہ نہیں ہوا۔ پی ڈی پی نے ۲۸ اور بی جے پی نے ۲۵ پر کامیابی حاصل کرلی لیکن اگر کانگریس کی ۱۲ اور این سی کی ۱۵ نشستوں کو یکجا کرکے دیکھا جائے تو وہ بھی ۲۷ بنتی ہیں۔ ایسے میں پی ڈی پی کے سامنے دو متبادل تھے ایک تو این سی اور کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومت اور دوسرے بی جے پی کے ساتھ الحاق۔ بی جے پی وادی میں پی ڈی پی کی حریف اول نہیں ہے اس لئے اس کا ساتھ لینے میں سیاسی نقصان کاخطرہ کم تھا اور بی جے پی کے پاس چونکہ مرکزی حکومت

کی زمامِ کار ہے اس لئے اس کی بدولت نہ صرف سرکاری خزانے سے استفادے کے امکانات روشن تھے بلکہ مرکز میں وزارت کی بھی توقعات موجود ہیں۔ استحکام کے حوالے سے وادی میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ شورش برپا کرکے ریاستی حکومت کو برخواست کردینا بی جے پی کے لئے بے حد سہل تھا اس لئے پی ڈی پی نے بی جے پی کے ساتھ ہاتھ ملانے میں عافیت سمجھی اور ابن الوقتی کی ایک ایسی تاریخ رقم کردی جس کی مثال ہندوستان کی سیاسی تاریخ نہیں ملتی۔

جموں کشمیر کی اس خودغرضانہ سیاست میں بی جے پی برابر کی شریک ہے۔ اس نے بھی اپنے رائے دہندگان سے دغابازی کی تھی حالانکہ اس کے سامنے کوئی مجبوری نہیں تھی۔ اس سیاسی صورتحال میں بی جے پی کا حزب اختلاف میں بیٹھ کر اپنی ساکھ بڑھانا زیادہ مناسب تھا لیکن اقتدار کی ہوس آڑے آگئی۔ دہلی انتخاب میں ناکامی کے بعد اسے یقین ہوگیا ہوگا کہ اب ایسے اچھے دن دوبارہ لوٹ کر کبھی نہیں آئیں گے اور ایسا نادر موقعہ پھر کبھی نہیں ملے گا اس لئے اس کا جو بھی فائدہ اٹھانا ممکن ہو اٹھا لیا جائے۔ اس طرح گویا ایک گدھے اور گھوڑے نے شادی رچا کر اپنا گھر بسا لیا۔ پی ڈی پی والے جب اپنے گھر زعفرانی دلہن لے کر آئے تو باراتیوں کے علاوہ اہل خانہ بھی چراغ پا ہوگئے۔ انہیں راضی کرنے کیلئے حلف برداری کے فوراً بعد مفتی محمد سعید نے نائب وزیراعلیٰ اور دیگر وزراء کی موجودگی میں انتخابات کے انعقاد کا سارا کریڈٹ

پاکستان، علٰحیدگی پسند جنگجو لوگوں اور حریت کانفرنس کو دے دیا۔ یہ بلاواسطہ اس بات کا اعلان تھا کہ ان کی حیثیت جورو کے غلام کی سی نہیں ہے۔ اس بات پر دلہن کے میکے میں ہنگامہ برپا ہوگیا اور راج ناتھ نے اعلان کیا کہ ہم اس سے اختلاف کرتے ہیں اور جموں کشمیر کے انتخابات کا کریڈٹ عوام، حفاظتی دستوں اور الیکشن کمیشن کو دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ میاں بیوی کے موقف میں کوئی ایک بھی قدرِ مشترک نہیں ہے۔ بی جے پی نے مفتی صاحب کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا یہ بات تو میں وزیراعظم سے کہہ چکا ہوں اور اس پر قائم ہوں۔

انتخاب کے حوالے پی ڈی پی کا دعویٰ مان بھی لیا جائے تب بھی یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ پی ڈی پی کی کامیابی کا کریڈٹ پوری طرح بی جے پی کو جاتا ہے۔ اس مرتبہ پہلی بار بی جے پی نے جموں کشمیر انتخاب میں اپنی ساری قوت جھونک دی اور مشن ۴۴+ کا نعرہ لگا کر میدانِ کارزار میں اتری۔ اس سے مسلمانوں کو اندیشہ لاحق ہوگیا کہیں بی جے پی واقعی اقتدار پر قابض نہ ہوجائے۔ جموں کے ہندوؤں کو بھی اس خوش فہمی کا شکار کردیا گیا کہ پہلی مرتبہ جموں کشمیر کی زمامِ کار ایک ہندو وزیراعلیٰ کے ہاتھوں میں آیا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علٰحیدگی پسندوں میں انتخابات کے بائیکاٹ پر اصرار نہیں کیا اس لئے کہ اس کے نتیجے میں بی جے پی کی کامیابی کے امکانات روشن ہوجاتے تھے۔ کشمیر کے

عوام کا بڑے پیمانے پر رائے دہندگی میں حصہ لینا بھی پی ڈی پی کو کامیاب کرنے کیلئے نہیں بلکہ بی جے پی کو روکنے کیلئے تھا لیکن مفتی محمد سعید نے سیاسی مفادات کے پیش نظر اپنے رائے دہندگان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا اور ان کی زخمی پشت پر مذکورہ بیانسے مرہم رکھا۔ یہ دراصل ان کی سیاسی مجبوری تھی اس لئے کہ اگر وہ سچائی کا اعتراف کرلیتے تو ان کا عزت خاک میں مل جاتی ۔

مفتی صاحب کے بیان سے بی جے پی تلملا کر اپنے زخموں کو سہلانے لگی ۔ نیشنل کانفرنس اور کانگریس نے ان پر نمک پاشی شروع کردی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایوان پارلیمان میں مودی جی کو صفائی کیلئے مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے کہا لوگ ہمیں دیش بھکتی کا سبق نہ سکھائیں یہ بالکل درست بیان ہے بلکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ لوگ ان سے دیش بھکتی کا سبق سیکھیں۔ دیش بھکتی کے نام پر عوام کو بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کا فن میں اگر کوئی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے بی جے پی سے بڑا وشواودیالیہ اور مودی جی سے بڑا گرو گھنٹال کوئی اور نہیں مل سکتا۔

مفتی صاحب نے جب دیکھا کہ کشمیریوں کو لگنے والا زخم بھر نہیں رہا ہے۔ وہ پھر ایک بار نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی جانب متوجہ ہورہے ہیں تو پی ڈی

پی کی جانب سے ایک نہایت ہی جذباتی مسئلہ اچھال دیا گیا۔ یہ افضل گرو کی باقیات کو واپس لانے کا مطالبہ تھا۔ افضل گرو کو پھانسی میں تاخیر کے خلاف بی جے پی وقتاً فوقتاً کانگریس کو گھیرتی رہی تھی۔ کانگریس نے بی جے پی کے روز روز کے رونے سے پیچھا چھڑانے کیلئے قومی انتخاب سے ایک سال قبل ۲۰۱۳ء میں افضل گرو کو پھانسی پر چڑھادیا تھا۔ افضل گرو کی پھانسی کے خلاف پی ڈی پی ہمیشہ بیان بازی کرتی رہی۔

افضل گرو نے ۱۹۹۶ء میں اسلحہ ڈال دیا تھا اور پھر دہلی منتقل ہوگیا تھا ایسے میں وہ یقیناً پولس کی نگرانی میں رہا ہوگا۔ اس نگرانی کے چلتے کسی ایسے فرد کا پارلیمان پر حملہ جیسی بڑی دہشت گردی میں ملوث ہونا بعید از قیاس ہے۔

افضل کے ساتھ جواہر لال یونیورسٹی کے پروفیسر ایس اے آر گیلانی کو بھی راست میں لیا گیا تھا اور ان کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا تھا وہی پارلیمنٹ پر حملے کے ماسٹر مائینڈ ہیں۔

سپریم کورٹ نے انہیں بے قصور پاکر باعزت طریقہ پر رہا کردیا۔ افضل کی بھابی افسانہ کو بھی جنہیں شریک کار قرار دیا گیا تھا چھوڑ دیا گیا۔ افضل کے بجائی بھائی شوکت گرو کی سزا میں تخفیف کرکے اسے دس سال میں بدل دی گیا اس لئے کہ گرفتاری کو پانچ سال ہو چکے تھے لیکن افضل کی پھانسی برقرار رہی حالانکہ سپریم کورٹ نے تسلیم کیا کہ افضل کا کسی دہشت گرد گروہ سے تعلق نہیں تھا ان کے خلاف ثبوت صرف واقعاتی نوعیت کے تھے انہیں

تو قومی جذبات کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے موت کی سزا دی گئی۔ وہ کیسے قومی جذبات ہیں جو اپنی ہی قوم کے معصوم لوگوں کے خون سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں؟

اگر اس بے وزن الزام کو مان بھی لیا جائے تو قانون کی نظر میں جو لوگ بذاتِ خود کسی قتل و غارتگری میں ملوث نہیں ہوتے بلکہ محض سازش میں شریک ہوتے ہیں انہیں موت کی سزا نہیں سنائی جاتی۔ افضل گرو بہرحال اجمل قصاب کی مانند رنگے ہاتھ گرفتار ہونے والا حملہ آور نہیں تھا اس کے باوجود خفیہ طور پر اس کے اہل خانہ کو اطلاع دیئے بغیر افضل گرو کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کانگریس کے رہنماوں نے حال میں اس پر معافی مانگی ہے۔ ششی تھرور نے تسلیم کیا ہے کہ اس معاملے میں کوتاہی ہوئی۔ افضل گرو کے اہل خانہ کو نہ صرف اطلاع دینا بلکہ ملاقات کا موقع دینا ضروری تھا اور آخری رسومات کی ادائیگی کیلئے اس کی لاش ان کے حوالے کی جانی چاہئے تھی۔ دنیا بھر کے حقوق انسانی کی تنظیموں نے اس کی مذمت کی تھی لیکن اب چونکہ پی ڈی پی اور بی جے پی کا الحاق ہوچکا ہے اس کے ذریعہ افضل گرو کی باقیات کو لوٹانے کا مطالبہ بی جے پی کے گلے ہڈی بن گیا اور وہ پھر ایک بار مدافعت میں آکر آئیں بائیں شائیں بکنے لگی ہے۔

اس سے پہلے کے یہ طوفان تھمتا مسرت عالم رہا ہوگئے۔ مفتی محمد سعید نے انہیں دوبارہ کسی معاملے میں پھنسانے سے گریز کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کیا لیکن اس کا سارا کریڈٹ انہیں مل گیا۔ اس واقعہ کے بعد پی ڈی پی کے وارے نیارے ہوگئے اور کشمیری عوام کو یہ دھوکہ ہونے لگا کہ پی ڈی پی اب بھی ان کی ہمدرد و غمخوار ہے۔ بی جے پی کی بھلائی اس میں تھی کہ وہ اسے نظر انداز کردیتی لیکن چونکہ پارلیمان کا بجٹ سیشن جاری تھا اس لئے یہ کام مشکل ہوگیا اور اس بابت اس کے ہر بیان نے اس کی مشکلات میں اضافہ کیا۔ پی ڈی پی کے پاس ان کے ہر اعتراض کا کرارہ جواب موجود تھا۔ مسرت عالم کی دوبارہ گرفتاری کے دباؤ سے بچنے کی خاطر پی ڈی پی نے سیاسی دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کردیا کہ ان تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائیگا جن کے خلاف مجرمانہ الزامات نہیں ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں ڈاکٹر عاشق حسین فکتو عرف قاسم کی رہائی موضوع بحث بن گئی جو ۲۲ سالوں سے زیر حراست ہیں اور جن کا مقدمہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔اپریل ۲۰۱۳ء میں دہلی کے دستوری کلب میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کیلئے کام کرنے والی تنظیم سی آر پی پی نے ڈاکٹر فکتو کی حیات پر ایک کتاب کا اجراء کرتے ہوئے ان جیسے ۴۰ افراد کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا جو دس سال سے زیادہ کا وقفہ جموں کشمیر کی جیل میں گزار چکے ہیں۔اس موقع پر جتن مرانڈی بھی موجود تھے جنہیں جھارکھنڈ کے اندر ایک فرضی مقدمہ میں گرفتار کرکے سزائے موت سنادی گئی تھی لیکن بعد میں ہائی کورٹ نے

انہیں رہا کردیا۔ اس تقریب میں موجود بھگت سنگھ کے بھتیجے جگموہن نے کہا تھا کہ ہمیں جتن مرانڈی سے حوصلہ لیتے ہوئے ڈاکٹر قاسم جیسے سارے سیاسی قیدیوں کو رہا کرانے کی جدوجہد تیز کردینی چاہئے۔
مسرت عالم کی رہائی کے بعد سوامی اگنیویش نے مفتی محمد سعید کو اس حوصلہ افزاء اقدام پر سراہا اور وزیر اعظم مودی کو اس موقف پر استقامت دکھانے کی تلقین کی۔ انہوں نے پاکستان کے ساتھ خارجہ سکریٹری جئے شنکر کے توسط سے گفتگو کے از سر نو آغاز کی بھی تعریف کی جو حریت رہنماوں کے پاکستانی سفیر سے ملاقات کے بعد تعطل کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس نوٹنکی بابا رام دیو نے مسرت عالم کی رہائی پر غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے بی جے پی کو مشورہ دیا کہ فوراً مفتی محمد سعید کی حمایت واپس لے لیجائے۔ اس احمق یوگی کو نہیں معلوم کہ مفتی کی حمایت میں کانگریس اور نیشنل کانفرنس تیار کھڑے ہیں۔ اس الحاق کو قائم رکھنا پی ڈی پی کی نہیں بی جے پی کی ضرورت ہے۔ اس صورتحال کا بھرپور فائدہ مہاراشٹر میں بی جے پی کی حلیف شیوسینا نے اٹھایا اس لئے کہ جس قدر بی جی پی نے اسے رسوا کیا تھا اس سے کہیں زیادہ پی ڈی پی بی جے پی کو ذلیل کررہی تھی۔ اس تنازع کی مدد سے شیوسینا ان انتہا پسند ہندو رائے دہندگان کو واپس لانے میں جٹ گئیے جو اسے داغ مفارقت دے کر بی جے پی کی جھولی میں چلے گئے تھے ۔آرایس ایس نے بھی اپنے کارکنان کو ورغلانے کیلیے

سوال کر دیا کہ مفتی ہندوستانی بھی ہیں یا نہیں ؟ یہ سوال تو اسے اپنے نمائندے رام مادھو سے کرنا چاہئے جو آئے دن جموں کشمیر میں منڈلاتے رہتے ہیں یا امیت شاہ سے جو حال میں ناگپور کے صدر دفتر میں حاضری دینے کیلئے پہنچے تھے ۔

جموں کشمیر میں ابن الوقتی کی بنیاد پر قائم شدہ اس سیاسی محاذ کی آئندہ حکمت عملی یہ ہو سکتی ہے کہ پارلیمانی انتخاب تک کسی طرح اسے کھینچا جائے اور دونوں فریق اقتدار کی ملائی کھاتے رہیں۔ کشمیری دستور کے مطابق وہاں انتخاب ۵ کے بجائے ۶ سال بعد ہوتے ہیں اس لئے آخری سال میں دونوں فریق نورا کشتی کا ڈرامہ کرکے الگ ہو جائیں گے۔ پی ڈی پی مسلمانوں سے کہے کہ ہم بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر بی جے پی نے کرنے نہیں دیا اس لئے کہ آپ لوگوں نے صرف ہمیں ووٹ دینے کے بجائے این سی اور کانگریس کو بھی ووٹ دیا تھا اب اپنی سابقہ غلطی تلافی اس طرح سے کی جائے کہ سب کو چھوڑ کر صرف ہمیں ووٹ دیا جائے۔ بی جے پی بھی ہندووں سے یہی کہے گی کہ ہم دفعہ ۳۷۰ ختم کرنا چاہتے لیکن آپ لوگوں نے صرف ۲۵ نشستوں سے نوازہ اس لئے اب کی بار کم از کم ۴۴ نشستوں پر کامیاب کرو تاکہ ہم کسی بیساکھی کے بغیر اچھے دن لا سکیں۔ گمانِ غالب تو یہ ہے کہ اس وقت تک بی جے پی مرکز میں اقتدار سے محروم ہو چکی ہو گی اور کشمیری عوام اس کی شریک حیات پی ڈی پی کو بھی بن باس پر روانہ کر دیں گے ۔

مسرت عالم کی رہائی کے معاملے میں جہاں مختلف سیاسی جماعتوں کے لوگ بے سر پیر کے بیانات دے رہے ہیں خود انہوں نے جس غیر معمولی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ رہائی کے بعد انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا" اپنی ۴۲ سالہ زندگی میں سے ۱۷ سال میں جیل میں گزار چکا ہوں اور آزادی کیلئے پھر ایک بار جیل جانے کیلئے تیار ہوں ۔ اس کے بعد حریت پسند کشمیری عوام کے جذبات کی بہترین ترجمانی کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا" میں ایک چھوٹی جیل سے نکل کر بڑی جیل میں آگیا ہوں جس کا نام کشمیر ہے"۔ جو شخص عوامی جذبات و احساسات کا اس قدر ماہر نباض ہو تو اگر اسے عوام میں مقبولیت حاصل نہ ہوگی تو کیا بھیڑیا نما عمر عبداللہ، گیدڑ کی مانند غلام نبی آزاد یا لومڑی کی طرح چالاک مفتی محمد سعید پر لوگ جان نچھاور کریں گے۔

مسرت عالم کے بیان میں حزن و ملال کا کوئی شائبہ نہیں ہے اسے پڑھنے کے بعد یہ شعر یاد آتا ہے

مِری زیست پُر مسرت کبھی تھی نہ ہے نہ ہو گی
کوئی بہتری کی صورت کبھی تھی نہ ہے نہ ہو گی

کوئلے کی دلالی اور موجودہ سیاسی نظام

حکومتِ ہند نے حال میں مالدیپ کے صدر محمد نشید کی گرفتاری پر تشویش کا اظہار کیا ۔ محمد نشید نے ۲۰۱۲ء میں عوامی مظاہروں کے پیش نظر استعفیٰ دے دیا تھا اور اس کے ایک سال بعد ہونے والے انتخابات ہار گئے تھے۔اب ان پر دہشت گردی کا الزام ہے اور عدالت کا خیال ہے کہ وہ اس دوران ملک سے فرار ہو سکتے ہیں اس لئے حراست میں لینے کا حکم دیا گیا۔ ایک طرف تو حکومتِ ہند مالدیپ کے سابق صدر کی گرفتاری سے پریشان ہے لیکن دوسری جانب وہ خود اپنے سابق وزیراعظم کو کوئلہ گھوٹالہ میں رسوا کرنے میں جٹی ہوئی ہے اور انہیں سی بی آئی عدالت نے ملزم نمبر ۶ کی حیثیت سے بہ نفس نفیس حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ اس خبر سے سیاسی حلقوں میں ایک زلزلہ برپا ہو گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ منموہن سنگھ کی حکومت کا زمانہ زبردست بدعنوانیوں کے سبب یاد رکھا جائیگا۔ یہ ایک ایسے دور کے گھوٹالے ہیں کہ جب نوین جندل جیسے صنعتکار کہتا ہے" ہم سے وصول کیا جانے والے سیاسی چندے کا ایک فیصد پارٹی فنڈ اور ۹۹ فیصد سیاستداں کی جیب میں چلا جاتا ہے"۔ اس کے باوجود منموہن سنگھ کا بڑے سے بڑا دشمن یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے کہ انہوں نے اس کے

ذریعہ اپنی ذات کیلئے دولت وثروت کا سامان کیا ہے۔ان پر یہ الزام ضرور بنتا ہے کہ وہ بدعنوانی کو روکنے میں ناکام رہے لیکن سپریم کورٹ نے انتولے سیمنٹ معاملے میں یہ فیصلہ سنایا تھا کہ جب تک ایسے شواہد نہیں مل جاتے کہ کسی سیاستداں نے ذاتی طور سے بدعنوانی کا فائدہ اٹھایا اسے سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس کے باوجود منموہن کو پریشان کرنا بدلے کی کارروائی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا ذکر وزیراعظم نے اپنی ایک تقریر میں کیا تھا کہ مجھے پتہ ہے گرفتاری کے خوف میں کیسے جیا جاتا ہے؟میں طویل عرصہ اس دور سے گذر چکا ہوں اور اب ایسا لگتا ہے وہ اس کا بدلہ لے رہے ہیں۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ کانگریس کو حزب اختلاف کے طور پر عوامی مظاہرے کا پہلا کڑا رخ بدعنوانی کی حمایت میں اختیار کرنا پڑا۔

منموہن سنگھ کے ساتھ جو سلوک مرکزی حکومت کر رہی ہے وہی معاملہ اروند کیجریوال اور ان کے ساتھیوں کو بھی درپیش ہے۔ اروند کو اپنے نائب منیش اور ساتھی یوگیندر یادو کے ساتھ عدالت میں حاضر ہونے کیلئے پھٹکار حال میں سننی پڑتی ہے۔ جج صاحب کے مطابق ان لوگوں کی نظر میں قانون کا کوئی احترام نہیں ہے۔وہ جج حضرات جو مجرموں اور قاتلوں کو آئے دن کلین چٹ دینے سے نہیں تھکتے ان کی زبان سے یہ جملہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ویسے اس عدالتی سختی کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ یادو اور کیجریوال جو ایک دوسرے کو ایک آنکھ نہیں

بھاتے عدالت میں سسودیہ کے ساتھ ایک قطار میں کھڑے نظر آئے۔ یہ سب ایسے دور میں ہو رہا ہے جبکہ سنگھ پریوار والوں کے بیانات سے خود بی جے پی پریشان ہے۔ ان کے بیانات اس قدر بیہودہ ہیں کہ ان کو پڑھ کر شرم آتی ہے اور ان اوٹ پٹانگ بیانات کے سبب ملک و قوم کا نام ساری دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ان پر کوئی لگام کسنے والا نہیں ہے۔ اسی کو کہتے ہیں اندھی نگری چوپٹ راج بقول مولانا رومی

اہل دل کے لئے یہ نظم بست وکشاد
کہ سنگ وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد

قومی سیاست میں بدلے کی کارروائی نئی نہیں ہے۔ اندراگاندھی نے ایمرجنسی لگا کر اپنے سارے مخالفین کو ایک ساتھ جیل بھیج دیا تھا اس کی انہیں بھاری قیمت چکانی پڑی۔ جنتا پارٹی نے اندراگاندھی کو گرفتار کیا آگے چل کر اس کا سیاسی فائدہ کانگریس کو ہوا۔ اٹل جی نے نرسمہا راؤ کو یوریا بدعنوانی کے معاملے میں عدالت میں کھینچا اس کا نقصان بی جے پی کو ہوا۔ سیاسی داوں پیچ سے علی الرغم اہم سوال یہ ہے کہ مسٹر کلین کہلانے والے راجیو گاندھی اور منموہن سنگھ کو آخر بدعنوانی کے سبب کیوں اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ یہ دونوں بظاہر غیر سیاسی رہنما کرپشن کے دلدل میں کیسے جا دھنسے ؟ ان کو بدعنوان بنانے کا سہرہ کس کے سر جاتا ہے ؟ اس سوال کا نہایت سہل اور سیدھا

جواب ''موجودہ سیکولر جمہوری نظام '' ہے کہ اس کی انتخابی دلالی میں اچھے اچھے سفید پوش لوگوں کے ہاتھ تو کجا منہ بھی کالا ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال میں انور مسعود کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ریل گاڑی اور الیکشن میں ہے اک شے مشترک
لوگ بے ٹکٹے کئی اس میں بھی ہیں اُس میں بھی ہیں

اس خوشنما نظامِ سیاست کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ محکوم عوام بڑے ارمانوں سے جس صاف ستھری شبیہ کے رہنما کو اقتدار کی کرسی پر فائز کرتے ہیں ایک قلیل عرصے کے اندر اس کا دامن داغدار ہو جاتا ہے اور اس کی بدعنوانی سے تنگ آکر عوام کو اقتدار کی زمام کار اس سے چھین لینے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ رہنما اپنی صلاحیت یا صالحیت سے اس پر اثر انداز نہیں ہو پاتے بلکہ یہ نظام بڑی آسانی سے حکمرانوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ فی الحال بدعنوانی کے خلاف دھرم یدھ چھیڑنے والا اروند کیجریوال بڑی تیزی کے ساتھ اس مکافاتِ عمل کا شکار ہے۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ جس جماعت کی شفافیت کا یہ عالم تھا کہ اس کا بہی کھاتہ ویب سائٹ پر رکھا جاتا ہے آج یہ حال ہو گیا ہے کہ الیکشن کمیشن کو اسے پچھلے سال ہونے والے قومی انتخابات کا حساب پیش کرنے کیلئے دو مرتبہ نوٹس دینے کے بعد تیسری مرتبہ دھمکی دینی پڑتی ہے کہ ۲۰ دنوں کے اندر اگر وہ اس کام کو نہیں کر سکی تو اس کا نشان یعنی جھاڑو اس سے

چھین لیا جائیگا۔ یہ بات قابل شرم ہے کہ ۹۰ دن کے اندر جس کام کو کرنا تھا اور زیادہ تر سیاسی جماعتیں اسے کر چکی ہیں ''عاپ'' ۱۱ ماہ بعد بھی نہیں کر سکی۔

سیاست کی عمارت تین ستونوں پر قائم ہوتی ہے گویا ان اجزائے ترکیبی کے بغیر اس کا تصور محال ہے۔ ان میں سے ایک محکوم ہے دوسرا حاکم اور تیسرا ان کے باہمی تعلق کو متعین کرنے والا سیاسی نظام مثلاً جمہوریت، آمریت یا ملوکیت وغیرہ۔ انسانی فطرت بلاوجہ کسی کی حکمرانی قبول نہیں کرتی سیاسی نظام حاکم کیلئے وجہٗ جواز فراہم کرتا ہے۔ اس کی ذمہ داریوں کو متعین کرکے اسے اصول و ضوابط کا پابند بناتا ہے اور محکوم کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں انتخابات کو سیاست کی اصل سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اس کے ذریعہ آنے تبدیلیوں سے چند مظاہر بدلتے ہیں۔ چونکہ بنیادی سیاسی ڈھانچے انتخابی عمل اثر انداز نہیں ہوتا اس لئے کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ گویا پتوں کی تراش خراش تو ہوجاتی ہے لیکن جڑ کے خصائل جوں کے توں قائم و دائم رہتے ہیں۔ ظاہری سرسبزی و شادابی فطرتاً امیدوں اور توقعات کو جنم دیتی ہیں لیکن جڑ کا زہر بہت جلد حزن و یاس بن کر نس نس میں پھیل جاتا ہے۔

جمہوری نظام سیاست میں بھی محکوم عوام کو سیاسی اعتبار سے دو طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک بے شعور اور بے عمل (سیاسی) عوام کا جم غفیر اور دوسرا مختصر سا باشعور طبقہ جو سیاسی میدان میں مستقل مزاجی کے ساتھ سرگرم عمل رہتا ہے۔ مؤخر الذکر عوامی اقلیت عام طور پر کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے جڑی ہوتی ہے۔ ان کی غالب اکثریت ابن الوقتی اور مفاد پرستی کی بنیاد پر سیاسی جماعت سے منسلک ہو جاتی ہے اور ایک ننھی سی بے لوث اقلیتاصول و نظریہ کی بنیاد پر وابستگی اختیار کرتی ہے۔ اس طرح گویا عملی سیاست میں حصہ لینے والے بے لوث لوگوں کا تناسب نہایت قلیل اور ناقابلِ ذکر ہوتا ہے۔ وقتی جوش میں سوڈا واٹر کی مانند نکل کھڑے ہونے والے اور پھر بہت جلد مایوسی کا شکار ہو کر اپنا راستہ بدل دینے والوں کو سنجیدہ سیاسی کارکن نہیں کہا جاسکتا لیکن یہی غیر سنجیدہ عوامی ریلہ کبھی غریبی ہٹاوکے نعرے سے متاثر ہو کر تو کبھی بدعنوانی کے خاتمہ کی خاطر ہوا کے رخ کو وقتی طور پر تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جسے سیاسی زبان میں انتخابی لہر کا نام دیا جاتا ہے۔ چونکہ تبدیلی لانے والے خود سنجیدہ نہیں ہوتے اور خود ان کے اپنے اندر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اس لئے ان کے ذریعہ کوئی بڑاانقلاب برپا نہیں ہوتا۔

نظام باطل نے فی زمانہ حکمرانوں کی سہولت کے لحاظ سے کئی برانڈ رائج کر رکھے

ہیں مثلاً ملوکیت، آمریت یا جمہوریت ۔ ان سب میں حکمراں کے اقتدار میں آنے کا جواز اور طریقۂ کار مختلف ضرور ہوتا ہے لیکن اقتدار کی باگ ڈور سنبھال لینے کے بعد ان کی نفسیات اور رویہ یکساں ہوتا ہے۔جب ایک عام آدمی ممبئی میں شیوسیناکے پوسٹر پر بالاصاحب ٹھاکرے کے ساتھ ادھو ٹھاکرے اور ان کے بیٹے ادیتہ ٹھاکرے کی تصویر دیکھتا ہے تو اسے بے ساختہ ملک عبدالعزیز، ملک سلیمان اور ولیعہد مقرن کی تصاویر یاد آجاتی ہیں۔جب وہ دیکھتا ہے کہ کانگریس کے کارکنان کو صرف اور صرف پرینکاکے اندر اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے تو اسے امریکہ کی ری پبلکن پارٹی یاد آجاتی ہے جسے بل کلنٹن کے مقابلے جارج بش کے بیٹے جارج ڈبلیو بش کے علاوہ کوئی لائق و فائق امیدوار نظر نہیں آیا اور اس ناہنجار پر امریکیوں نے دومرتبہ اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ مودی کا وزیر اعلیٰ سے وزیراعظم بن جانا ویسا ہی ہے جیسے پوتن کا وزیراعظم سے صدر بن جانا۔ جسے یعنیمتبادل کی عدم موجودگی سے تعبیر کرتی ہے۔(TINA) خود آرایس ایس بھی حکمرانوں کے امزاج میں بھی بلا کی یکسانیت پائی جاتی ہے ایک امیر وکیل کا بیٹا جبغریب ملک کا وزیراعظم بنتا ہو تو اپنے کپڑے دھلنے کیلئے پیرس بھجواتا ہے وہیں ایک چائے والاجب وزیراعظم کی کرسی سنبھالتا ہے تو برطانیہ سے اپنے کپڑے سلا کر منگواتا ہے۔ اقتدار وارثت میں ملے یا انتخابات سے عوام

کی پسند کو بانگ دہل پامال کیا جاتا ہے ورنہ کیا وجہ ہے ۳۰۰ منتخب ارکان کو درکنار کرکے مودی جی حکومت کی اہم ترین ذمہ داریاں یعنی وزارت دفاع، وزارتِ خزانہ، وزارت ریلوے اور انسانی وسائل کے قلمدان ان کو تھما دیتے ہیں جن کو عام نے یا تو مسترد کردیا یا منتخب ہی نہیں کیا۔ اقتدار پر اپنی پکڑ کو مضبوط کرنے کیلئے جس طرح ملک سلمان مختلف اہم عہدوں پر اپنے وفاداروں کو فائز کرتے ہیں اسی طرح مودی جی پارٹی کے اہل تر لوگوں کو درکنار کرکے اپنے مرید خاص شاہ جی کو پارٹی کا صدر بنادیتے ہیں۔ اگر شاہ جی کو وہ انعام اترپردیش کے انتخابات میں کامیابی کیلئے دیا گیا تھا تو دہلی کی ناکامی کے بعد اس سے محروم کردیا جانا چاہئے تھا لیکن جب تک مودی جی برسرِ اقتدار ہیں اور وہ مودی جی کی وفاداری ہیں،ان کا بال بیکا نہیں ہوگا۔ جس دن شاہ جی کی وفاداری مشکوک ہوجائیگی یا مودی جی کا قتدار ختم ہوجائیگا انہیں بھی اڈوانی جی کی مانند سیاسی کوڑے دان کی نذر کردیا جائیگا۔ مختلف سیاسی جماعتوں اور رہنماوں کے منفرد طرز زندگی کے سبب حکمرانوں کے رویہ سے چند نمائشی تبدیلیوں کے باوجود ہر کوئی اقتدار سے چمٹے رہنا چاہتا ہے اور وہ اس بابت جائز و ناجائز یا حلال وحرام کا مطلق پاس ولحاظ نہیں کرتا۔

حاکم ومحکوم چونکہ اپنا طبعی وجود رکھتے ہیں اس لئے ان کی پرکھ نسبتاً آسان ہے لیکن نظام ایک غیر مرئی شہ ہے اس لئے اس کا ادراک خاصہ پیچیدہ ہے۔

نظام کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنا یا پروان چڑھا سہل تر ہے۔ مثلاً جمہوریت میں اکثریت کی حکومت ہوتی ہے۔ اگر اقتدار کے دو سے زیادہ طاقتور دعویدار ہوں تو شاذو نادر ہی اکثریت کی حکومت ہوتی ہے ووٹوں کی تقسیم کے سبب اکثر اقلیت کا اقتدار پر قبضہ ہوتا ہے جیسا کہ مرکز میں ہے۔ جمہوری نظام کی تمام تر نام نہاد خوبیوں کے باجود کنگ اور کنگ میکر یعنی شاہ گدا کی تفریق موجود ہے۔ اقلیت زیادہ سے کنگ میکر بن سکتی ہے کنگ نہیں بن سکتی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس ظالمانہ طرز سیاست میں عوام اپنی محکومیت کا جشن مناتے ہیں وہ دوسروں کے سر پر اقتدار کا تاج رکھ اپنا دل بہلاتے ہیں لیکن گہرائی میں جاکر اس استحصالی نظام استحصال کو کھنگالنے اور ٹٹولنے کی سعی نہیں کرتے بقول شاعر ؎

ووٹوں سے کہ نوٹوں سے کہ لوٹوں سے بنے ہیں
یہ راز ہیں ایسے جنھیں کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
اندر کی جو باتیں ہیں ٹٹولا نہیں کرتے

انتخابات کے حوالے سے فی زمانہ بہت ساری غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مختلف قسم کے انتخابات ہر سیاسی نظام میں منعقد ہوتے ہیں لیکن جمہوری نظام میں چونکہ اس کی بنیاد پر حکومت چلانے والے ہاتھ بدل جاتے ہیں اس لئے بجا طور

یہاں اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ انتخابات اس لحاظ سے نعمت ہیں کہ اس کے ذریعہ عوام اندرا یا مودی جیسے ظالم حکمرانوں سے اپنا پیچھا چھڑا سکتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہی نظام ان لوگوں کو اقتدار پر فائز بھی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر یہ زحمت نہ سہی تو کم از کم رحمت بھی نہیں ہے۔ عام لوگ انتخابی عمل کو ہی کل سیاسی نظام سمجھ لیتے ہیں حالانکہ یہ سیاسی نظام کا ایک معمولی کل پرزہ ہے۔ اس کی مثال پریشر کوکر میں لگی سیٹی کی سی ہے جس کا شور تو خوب سنائی دیتا ہے لیکن رول بہت مختصر و محدود ہوتا ہے۔ پریشر کوکر کے اندر اقتدار کی کھچڑی پکتی ہے جو سیاستداں پکاتے ہیں۔ اگر اس میں دال چاول نہ ڈالا جائے تو بیچاری سیٹی کیا کرے۔ یہ دال نہیں گلتی جب تک کے عوام اپنا خون نہ جلائیں۔ ایندھن کے بغیر سیٹی کی کوک نہیں نکل سکتی۔ جمہوری نظام کو ایندھن محکوم فراہم کرتا ہے اور بریانی حکمراں کھاتے ہیں کچھ ہڈیاں عوام کے سامنے ڈال کران پر احسان جتایا جاتا ہے۔

بنیادی طور پر سیٹی کے دو کام ہوتے ہیں ایک تو پریشر کو ریلیز کر دینا۔ انتخابی عمل سے یہ ہوتا ہے کہ ظالم و بدعنوان حکمرانوں کے خلاف عوامی غم و غصہ کا دباؤ کافور ہو جاتا اور یہ استحصالی نظام ایک نئے استبداد کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ ہندوستان میں منفی ووٹنگ عام سی بات ہے تمل ناڈو اور کیرالہ جیسی ریاستوں میں ہر پانچ سال بعد حکمران کا بدل دیا جانا اس طرز

عمل کا ترجمان ہے۔ سیٹی کے بجنے سے یہ اعلان بھی ہو جاتا ہے کہ اب کھانا پک چکا ہے اس لئے عوام کو مزید ایندھن فراہم کرنے کی ضرورت نہیں ۔ انہوں نے اپنا فرض منصبی ادا کردیا اب وہ پانچ سال آرام سے انتظار کریں اگر مظالم واستحصال قابل برداشت ہوں تواقتدارِ وقت کومزید موقع عنایت فرمائیں اور اگر ناگزیر ہوجائے تو اقتدار کی باگ ڈور موجودہ حکمراں سے چھین کر کسی اور کے حوالے کردیں۔

کانگریس کو سبق سکھانے کیلئے بی جے پی کو لائیں یا بی جے پی کو عام آدمی پارٹی کے ذریعہ سبق سکھائیں۔ اس معاملے میں دوسروں کو سبق سکھانے والے کبھی خود کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ وہ اس بات کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ ہر بار آسمان کو چھونے والی اصلاح کی لہر ان کے ہاتھ میں سبق سکھانے کی چھڑی تھما کر جھاگ کی مانند کہاں غائب ہو جاتی ہے؟ عوام مسلسل ایک سراب کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ دور سے پانی کا عکس دیکھ کر خوش ہوجاتے ہیں اور جب پانی کے بجائے پیاس سے سابقہ پیش آتا ہے تو کسی نئے فریب میں مبتلا ہوجاتے ہیں ۔ وہ حکمرانوں کو بدلنا چاہتے ہیں لیکن خود اپنے آپ کو بدلنا نہیں چاہتے۔ وہ دوسروں کو سبق سکھاتے ہیں لیکن خود کوئی سبق نہیں سیکھتے ۔ایسے بھولے بھالے لوگوں کیلئے انور مسعود کے پاس بہت قیمتی مشورہ ہے۔

اپنی جمہوری ترقی کا قصیدہ پڑھ ضرور

لیکن اس کے بعد باقی عمر استغفار پڑھ

انتخابی نتائج سے عوام اگر کوئی ٹھوس سبق سیکھنا چاہتے ہیں تو یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے آپ کو بدلیں اور پھر اس کے بعد اس ملک میں رائج نظام سیاست کو تبدیل کریں۔ جب تک لوگ اس جمہوری گورکھ دھندے سے نہیں نکلیں گے اس وقت تک ان کے دامن میں دہلی کی مانند وقتی راحت اور دائمی زحمت آتی جاتی رہے گی لیکن جب وہ خود بدل جائیں گے اور پھر نظام کو تبدیل کردیں گے تو حکمراں اپنے آپ بدل جائیں گے۔ معبود حقیقی کا باغی یہ خدافراموش نظام سیاست کوئلے کی ایسی دلالی ہے جو اس میں ملوث سارے لوگوں کے منہ کالا کردیتی ہے۔ یہ ہر کیجریوال کو بدلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس لئے کیجریوال جی لاکھ بنگلور جائیں لیکن جب واپس آکر اس نظام کا حصہ بنیں گے تو پھر اپنی فطرت سے انحراف کرنے کیلئے مجبور ہوجائیں گے اور اپنی جماعت کو بدعنوانی سے پاک کرنے کے بجائے اس کے خلاف آواز اٹھانے والے یوگیندر اور بھوشن کو پارٹی سے نکال باہر کرنے کی سعی کریں گے۔ اس نظام باطل کو نظام حق سے بدلے بغیر محض افراد کو بدل کسی عظیم تبدیلی کی توقع کرنا عظیم ترین خام خیالی ہے۔

سنگھ پریوار کا سوریہ نمسکار

نریندر مودی سرکار کے ۳۰۰ دن اسی بے رنگ انداز میں پورے ہوئے جیسا کہ حالیہ غیر ملکی دورہ بے نام ونشان ٹھہرا۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں کہاں گئے اور کیا کچھ کیا؟ ۳۰۰ دن کی تکمیل پر نہ ان کے کسی چمچے کو اور نہ زعفرانی پریوار کو اس کا خیال آیا، نہ پیر دھانسیو کا ور نہ ہیا نکر دفتر نے جشن منایا۔ لیکن مخالفین نے انہیں ضرور یاد دلایا کہ 'سب کا ساتھ اور سب کا وکاس' والا گمراہ کن نعرہ لگانا جس قدر آسان ہے اس کو عملاً کر دکھانا اتنا ہی مشکل ہے۔ ان ۳۰۰ دنوں میں جو سب سے بڑا کارنامہ مودی جی نے انجام دیا ہے وہ ۶۰۰ فرقہ وارانہ وارداتیں ہیں۔ یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے کہ جسے خود ان کے سوا کوئی اور آسانی سے نہیں توڑ سکتا۔ اس معاملے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جہاں ۱۴۹ واقعات مسلمانوں کے خلاف ہوئے ہیں وہیں ۱۴۹ عیسائیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ کسی ایسی بے ضرر اور سیاسی طور پر بے وزن اقلیت پر اس قدر بڑی تعداد میں حملے مودی سرکار کی بے مہار فسطائیت کے غماز ہیں۔

ایک طرف تو بی جے پی کا اقلیتوں کے حوالے سے یہ معاندانہ رویہ ہے دوسری جانب مسلمانوں کے اندر علٰحیدگی پسندوں کی دل پسند پی ڈی پی کو نہ صرف اس کی

حمایت حاصل ہے بلکہ وہ اسکی حکومت میں شریک کار بھی ہے۔ مہاراشٹر اور ہریانہ میں گئوکشی پر پابندی لگانے والی بی جے پی گوا کے اندر اپنے ہاتھوں سے گئو ونش کا گوشت پروس رہی ہے۔ اس منافقانہ طرزِ عمل کی روشنی میں سنگھ پریوار کی نفسیات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دشمن کی نفسیات کو نظر انداز کر دینا ایک بڑی غفلت ہے لیکن اس کا اپنے آپ پر قیاس کرلینا عظیم ترین حماقت ہے۔ اپنے پر قیاس سے مراد یہ ہے کہ دشمن کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ بھی کسی خاص مسئلہ پر اسی طرح سے سوچتا ہوگا کہ جیسے کہ ہم سوچتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اگر آپ سے پوچھا جائے کہ بتایئے لکشمی کانت پرسیکر کون ہے تو اکثر لوگ اپنی لاعلمی کا ظہار کریں گے۔ ایک آدھ کہہ دے گا یہ منوہر پاریکر کا کوئی رشتہ دار ہوگا اس لئے کہ نام مشابہے۔ اندازہ درست ہے۔ یہ پاریکر کے رشتے دار نہیں بلکہ سیاسی وارث ہیں۔ مودی جی نے جب شکست خوردہ ارون جیٹلی کو وزیر خزانہ کے ساتھ وزارتِ دفاع کا عہدہ بھی سونپ دیا تو لوگ طعنے کسنے لگے کہ کیا انہیں اپنے پورے سنگھ پریوار میں ایک بھیایسااہل اور قابلِ اعتماد آدمی نہیں ملا جس کو وہ دونوں میں سے کوئی ایک عہدہ سونپتے؟ اس تنقید و تشنیع سے تنگ آکر مودی جی نے تمام بڑے دفاعی سودوں سے نمٹ لینے کے بعد بادلِ ناخواستہوزارتِ دفاع کا قلمدان ڈاکٹر منوہر پاریکر کو سونپ دیااور پرسیکر کو ریاستِ گوا کا عزت مآب وزیر اعلیٰ بنادیاگیا۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ نریندر مودی اور موہن بھاگوت وغیرہ یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ کذب بیانی میں سنگھ پریوار کا کوئی ثانی نہیں ہے، پریکر نے سچ بول کر ساری دنیا کو حیرت زدہ کردیا۔ پریکر ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے سبرامنیم سوامی کی مانند اقتدار کی لالچ میں بھگوا چولا اوڑھ لیا ہو بلکہ وہ آرایس ایس کے گوا میں سربراہ ہوا کرتے تھے۔ آرایس ایس نے انہیں چند ساتھیوں کے ساتھ ۱۹۹۰ء کے اندر بی جے پی میں بھیجا اور کہا پورے ۴۰ حلقوں پر انتخاب لڑاؤ۔ اس وقت بی جے پی کی حالت ایسی گئی گزری تھی کہ اسے صرف گیارہ امیدوار میسر آئے وہ سارے کے سارے انتخاب ہار گئے۔ ۱۹۹۴ء میں ۴ کامیاب ہوئے اس کے بعد ۱۰ پھر ۱۴ اور بالآخر ۲۱ اس طرح اپنے بل بوتے پر بی جے پی گوا کے اندر اقتدار میں آگئی۔ پریکر نے اعتراف کیا کہ ۲۰۰۲ء تک خود انہیں اپنے حلقہ انتخاب کے ان پولنگ بوتھ میں جہاں ۱۰۰ فیصد عیسائی رہتے ہیں ایک ووٹ بھی نہیں ملا تھا لیکن بتدریج بڑی محنت سے ۲۴ سال بعد اقلیتوں کا اعتماد حاصل ہوا۔

اس پس منظر میں گوا کے وزیراعلیٰ پریکر کہتے ہیں کہ ہمیں یہاں پر اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ایک طویل عرصہ لگا ہے جسے ہم یونہی نہیں گنوا سکتے۔ بڑے جانور کا گوشت گوا کی اقلیت کے غذا کا جزو لاینفک ہے اس لئے مرکزی حکومت کے موقف سے قطع نظر ہم گوا میں اس پر کیوں اور کیسے پابندی لگا سکتے

ہیں؟ اس طرح گویا مہاراشٹر اور ہریانہ کے بعد قومی سطح پر مرکزی حکومت کا بڑے جانوروں کے ذبیحہ پر پابندی عائد کرنے کی راہ میں خود بی جے پی کی اپنی گوا سرکار آڑے آگئی۔ پرسیکر کے مطابق وہ گائے سے متعلق ہندووں کے جذبات جانتے ہیں لیکن اس کا اطلاق بیل پر نہیں ہوتا۔ ویسے گوا میں گائے اور بیل دونوں ذبح نہیں ہوتے مگر بڑے جانور کا گوشت کرناٹک اور مہاراشٹر سے درآمد کیا جاتا ہے۔ یہ اجازت نامہ جاری رہے گا اس لئے کہ گوا کے عیسائی اور مسلمان وہ گوشت کھاتے ہیں۔

اس بیان سے ایسا لگتا ہے کہ گویا اجازت کی بنیادی وجہ لوگوں کے عادات واطوار ہیں۔ لیکن کیا صرفگوا کا اقلیتی فرقہ بڑے کا گوشت کھاتا ہے؟ مہاراشٹر یا ہریانہ کے مسلمان و عیسائی بلکہ ہندو بھی بڑے کا گوشت نہیں کھاتے؟ ایسا نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ گوا میں بی جے پی کو اقتدار میں رہنے کیلئے عیسائیوں کے ووٹ کی ضرورت ہے اس لئے وہ انہیں ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہی۔ جموں کشمیر میں تو وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی اس لئے کہ جس دن اس کا مطالبہ ہوگا اسی دن سرکار گرجائیگی اس لئے بی جے پیدستور کی دفعہ ۳۷۰ کا ذکر بھی نہیں کرتی۔ خود اس کی اپنی امیدوار حنا بٹ ببانگ دہل اعلان کرتی ہیں کہ اگر کسی نے دفعہ ۳۷۰ پر نگاہِ غلط ڈالی تو وہ بندوق اٹھالیں گی اس کے باوجود حنا پر کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ یہ اقتدار کا کھیل ہے۔

گوا میں ۲۶ فیصد باشندے عیسائی ہیں اور بڑے کا گوشت کھانے والی آبادی تقریباً ۳۰ فیصد ہے جن کیلئے ۳۰ سے ۵۰ ٹن گوشت روزآنہ درکار ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہاں کے گوشت بیوپاریوں نے گئورکشا سمیتی کی بیجا مداخلت سے تنگ آکر مارچ کے وسط میں ہڑتال کردی تو عیسائیوں نے بڑے جانور کے گوشت کی کمی پر شور مچانا شور کردیا۔اب بات اجازت کی حدود سے نکل گئی ، عوام کے غم وغصے سے گھبرا کر خود بی جے پی حکومت نے کرناٹک اور مہاراشٹر سے بڑے جانور کے گوشت کی درآمد کرنا شروع کردیا ۔ یہ عجب منافقت ہے کہ مہاراشٹر اور ہریانہ میں جہاں بڑے جانور کا گوشت رکھنا ناقابلِ ضمانت جرم ہے وہیں گوا کی حکومت خودوہی جرم بیانگِ دہل انجام دے رہی ہے۔ دراصل ان ابن الوقتوں کی شریعت اور حرام وحلال کا واحد پیمانہ سیاسی فائدہ ہے اس لئے اگر مہاراشٹر میں گائے کو مقدس قراردینے سے ووٹ ملتے ہیں تو اس کے سارے خاندان کو پوتر مان لیا جائے اور گوا میں ایسا کرنے سے ووٹ گھٹتے ہیں تو اس تقدس کو پامال کردیا جائے ۔ یہ ہے سنگھ پریوار کا سوریہ نمسکار۔

اس دوران عیسائی سماج پر دل دہلا دینے والے حملے کی خبر مغربی بنگال کے رنگا گھاٹ سے آئی جہاں ایک ۷۲ سالہ راہبہ کی عصمت دری کی گئی۔اس واقعہ کو چوری کی واردات کہہ کر ہلکا کیا جارہا ہے لیکن مغربی بنگال کے اقلیتی کمیشن کی نائب صدر پروفیسر ماریہ فرنانڈلیس نے موقعہَ واردات کا دورہ کرنے کے بعد

بتایا کہ انہیں اندیشہ ہے اس کا تعلق ''گھر واپسی'' یعنی تبدیلیٔ مذہب سے ہے۔ اس لئے کہ حملہ آوروں نے ساری کم عمر راہباؤں کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور ان سب کی سربراہ بزرگ ترین راہبہ کی عصمت و عفت سے دوسرے کمرے میں کھلواڑ کیا۔ کلیسا میں توڑ پھوڑ کرنے کے بعد مقدس صحیفوں کی بے حرمتی بھی کی۔ اس لئے ماریہ سوال کرتی ہیں کیا یہ گھر واپسی کا حصہ نہیں ہے؟

عیسائیوں پر ہونے والے تازہ حملوں سے ناراض ہو کر پدم بھوشن یافتہ سابق پولس افسر جولیو ربیرو نے این ڈی ٹی وی پر کہا کہ ساری عمر قوم کی خدمت کرنے کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے میں اپنے ہی ملک میں ہٹ لسٹ پر آگیا ہوں۔ ویسے ان پر ۱۹۸۶ء میں پنجاب کے اندر جان لیوا حملہ ہو چکا ہے۔ ربیرو نے اپنا ماضی بیان کرتے ہوئے انڈین ایکسپریس میں لکھا کہ ۲۹ سال قبل وزیر اعظم راجیو گاندھی کی ذاتی گزارش پر وہ وزارت داخلہ میں سکریٹری کا عہدہ چھوڑ کر شورش زدہ پنجاب گئے تھے۔ قومی جنگ میں شریک ہونے کی خاطر انہوں نے جب کمتر عہدہ قبول کیا تو پارلیمانی سکریٹری دیشمکھ اور صدر مملکت گیانی ذیل سنگھ نے ان سے سوال کیا کہ وہ اس پیشکش کو کیوں قبول کر رہے ہیں۔ پنجاب میں ان کے جانے کے بعد ۲۵ آر ایس ایس کے کارکنان کو خالصتانیوں نے ہلاک کر دیا۔ ہلاک شدگان کے گھروں پر گورنر رائے اور جولیو ربیرو گئے۔ لوگوں نے گورنر کو بھگا دیا لیکن ربیرو کا استقبال کیا۔ آج انہیں لوگوں کی نگاہ میں

عیسائی ہونے کے سبب ربیرو ناپسندیدہ ہوگئے ہیں بلکہ ہندوستانی تک نہیں رہے۔
ربیرو کا کہنا ہے کہ عیسائی تو صرف دو فیصد ہیں آگے چل کر اگر یہ انتہا پسند مسلمانوں کارخ کریں تو وہ تصور نہیں کر سکتے کہ اس ملک کا کیا حشر ہوگا؟

جولیو ربیرو نے سی این این آئی بی این پر اپنے ایک بیان میں کہا کہ ہندوستان پاکستان بن رہا ہے۔ انہوں نے یہ بیان یوحنا آباد کے واقعہ کے پس منظر میں دیا ہوگا جہاں دو خودکش حملوں میں ۱۵ لوگ ہلاک ہوئے۔ جولیو ربیرو کو پتہ ہونا چاہئے کہ مذکورہ کلیسا کے مسلمان چوکیدار نے اپنی جان پر کھیل کر دہشت گرد کو اندر داخل ہونے سے روکا۔ مشتعل عیسائیوں نے دو لوگوں کو شبہ میں مار مار کر ہلاک کردیا اور ان کی لاشوں کو جلا دیا۔ چار پولس والے جو میچ دیکھ رہے تھے انہیں یرغمال بنا لیا۔ کیا اس طرح کے ردعمل کی توقع ہندوستان میں عیسائی تو کجا سکھ یا مسلمان بھی کر سکتے ہیں؟ اس شدید ردعمل کے باوجود عوام نے مشتعل ہجوم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جبکہ دہلی میں سکھوں کے ساتھ اور گودھرا کے بعد سارے گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ایسے مواقع پر ہندوستان میں عوام اقلیتوں پر پل پڑتے ہیں اور انتظامیہ و سیاستداں ان کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

گوا میں بی جے پی نے عیسائیوں کا اعتماد کیسے حاصل کیا اس کو ایک اور مثال

سے وزیراعلیٰ پریکر نے واضح کیا۔انہوں نے بتایا کہ گوا میں سینٹ زیویرس کے مقدس بال کی نمائش کیلئے ایک ۴۵ روزہ تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ساری دنیا سے ۴۵ لاکھ عیسائی زائرین نے شرکت کی اور اس پر گوا کی بی جے پی حکومت ۵۰ کروڑ روپے خرچ کئے۔ سڑک اور دوسری سہولیات فراہم کرنے کیلئے جو رقم خرچ ہوئی وہ اضافی ہے۔پریکر کے مطابق ہم اقلیتوں کو ان کے ادارے قائم کرنے میں خصوصی تعاون دیتے ہیں کانگریس کی طرح یہ نہیں سوچتے کہ وہ لامحالہ ہمیں کو ووٹ دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ گجرات میں تو بی جے پی عیسائی تعلیمی اداروں پر قدغن لگاتی ہے۔مدھیہ پردیش، ہریانہ، دہلی اور چھتیس گڑھ سمیت مختلف ریاستوں میں عیسائی عبادتگاہوں پر آئے دن حملے ہوتے ہیں تو گوا میں ان کی منہ بھرائی کیوں کی جاتی ہے؟

سنگھ پریوار کے سوریہ نمسکار یں اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے۔ یہ محض ایک طریقۂ عبادت نہیں بلکہ فلسفۂ حیات ہے۔ یہ لوگ اقتدار کی خاطر گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں اور جب ضرورت ختم ہو جاتی ہے گدھے کی مانند دولتی جھاڑ دیتے ہیں۔گجرات جیسی ریاستوں میں جہاں یہ جماعت اقلیتوں کے ووٹ سے بے نیاز ہے انہیں عیسائی امیدوار تک میسر نہیں آتا لیکن گوا جہاں عیسائیوں کے بغیر دال نہیں گلتی عیسائی ارکان اسمبلی کی تعداد ہندووں سے تجاوز کرجاتی ہے۔ یہ چڑھتے سورج کی پجاری ہیں۔جب ان لوگوں کو یقین ہوتا ہے کہ مسلمان انہیں

ووٹ نہیں دیں گے یہ کسی مسلمان کو ٹکٹ تک نہیں دیتے لیکن جب انہیں مسلمانوں کے ساتھ اقتدار میں شرکت کرنی ہوتی ہے تو مفتی محمد سعید جیسے منہ پھٹ وزیراعلیٰ کے تلوے چاٹنے لگتے ہیں۔

مسلمان جس طرح سنگھیوں کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور جب وہ ان کی توقعات سے مختلف نکلتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں یہی حال سنگھ پریوار کا ہے۔ ان لوگوں نے بھی مسلمانوں کو اپنے جیسا سمجھنے کی غلطی کر رکھی ہے۔ ان کی پریشانی یہ ہے کہ مسلمان ان کی طرح ابن الوقت اور موقع پرست کیوں نہیں ہیں؟ جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آگیا ہے تو وہ ان کے آگے دم کیوں نہیں ہلاتے؟ یہ چاپلوسی کر کے اقتدار میں اپنا حصہ کیوں نہیں لگاتے؟ جس طرح ان لوگوں نے رام مندر کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا ہے مسلمان بابری مسجد سے دستبردار کیوں نہیں ہو جاتے؟ ان لوگوں نے تو یکساں سول کوڈ کا راگ الاپنا بند کر دیا مگر امت پرسنل لاء کو نہیں چھوڑتی۔ دفعہ ۳۷۰ پر جیسے بی جے پی نے مصالحت کر لی ہے وادی کے مسلمان آزادی کا نعرہ کیوں نہیں چھوڑتے اور یوم پاکستان میں شریک ہونے کیلئے پاکستان کے سفارت خانے میں آنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں؟ بی جے پی والوں کو تو سرینگر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن یہ بے دھڑک دہلی چلے آتے ہیں ان سے خوف نہیں محسوس کرتے۔

سنگھ پریوار اگر مسلمانوں کے رویہ کو واقعی سمجھنا چاہتا ہے تو اسے اپنی بوسیدہ زعفرانی عینک کو ہٹانا ہوگا اور اگر پھر بھی صاف شبیہ نظر نہ آئے تو سبز عینک لگا کر دیکھنا ہوگا۔

مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ سنگھ کی نفسیات کو قیاس و گمان کے بجائے ان کے اظہار و عملکی روشنی میں جانچے اور پرکھے۔ اس معاملے میں یہ طرزِ فکر درست نہیں ہے کہ وہ لوگ بہت جھوٹ بولتے ہیں اس لئے ان کی کوئی بھی بات قابلِ یقین نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا کاذب گوں ناگوں وجوہات کے سبب کبھی نہ کبھی سچ بول ہی دیتا ہے۔

حکمت و دانائی وہ مقناطیس ہے جس کو جھوٹ کے برادے میں ڈال کر اس میں سے سچ کا لوہا الگ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک صبر آزما کام ہے اس لئے ہم میں سے اکثر اس کی زحمت کرنے کے بجائے اپنی پسند یا ناپسند کے کسی بیان کی بنیاد پر قیاس آرائی کی ایک ایسی کمزور عمارت تعمیر کرلیتے ہیں جو ہوا کہ ایک جھونکے سے زمین پر آجاتی ہے اور اس ہوا محل کی زد میں ہمارا دشمن نہیں آتا بلکہ ہم خود آجاتے ہیں۔ جب مسلمانوں کی حکومت تھی تو یہ لوگ بڑے اطاعت گذار اور فرمانبردار ہوا کرتے تھے اور اگر دوبارہ کسی طرح امت کے ہاتھوں میں اقتدار آجائے تو پھر وہی ہوگا لیکن اگر وہ مسلمانوں سے بھی یہی توقع کریں گے تو ان کے ہاتھ سوائے مایوسی کے کچھ نہیں آئیگا۔ اس لئے کہ مسلمان اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے

سنگھ پریوار کی اگنی پریکشا

جنتا پریوار میں آج کل پھر ایک بار بادِ بہاری چل رہی ہے۔ یادو، کمار اور گوڑا کے ہنستے مسکراتے چہرے ٹی وی کے پردے پر نظر آنے لگے ہیں۔ بجٹ اجلاس کے دوسرے حصے سے قبل جو ۲۰ اپریل سے شروع ہوگا ٦ جماعتوں کے ضم ہوجانے کے روشن امکانات ہیں۔ اس نوزائیدہ جماعت کے ایوان زیریں میں ۱۵اور ایوان بالا ۳۰ ارکان ہوں گے اور پھر یہ دیگر ہم خیال علاقائی جماعتوں سے الحاق کرکے اپنا رسوخ بڑھانے کی کوشش کرے گا۔ اگر ممتا، جےؔ للیتا، پٹنائک، راؤ اور عبداللہ بھی اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں تو اسے نظر انداز کرنا مشکل ہو جائیگا۔ تحویل اراضی جیسے قوانین پر اسے کانگریس اورکمیونسٹ پارٹی کے علاوہ این ڈی اے میں شامل اکالی دل اور شیوسینا کی حمایت بھی حاصل ہو سکتی ہے اس لئے کہ وہ دونوں کھل کر کسان مخالف قانون کی مخالفت کر رہی ہیں۔

قومی انتخاب میں ناکامی کے بعد علاقائی جماعتوں کو شدید اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کہ اب ان کے دن پورے ہو گئے ہیں ۔ اس خوف نے ان کے اندر اتحاد کی ضرورت کو پیدا کیا۔ یہ اتحاد بہار کے ضمنی انتخاب میں رنگ لایا اور بی جے پی کے وجئے رتھ کو لگام لگی لیکن اس کے باوجود خود اعتمادی کی کمی ٹھوس

اقدامات کی راہ میں حائل رہی۔ دوسرا مسئلہ مانجھی کی بغاوت نے پیدا کیا لیکن دہلی انتخاب میں بی جے پی کی ناکامی نے ان لوگوں کے حوصلے بلند کردیئے اور یہ احساس پیدا کیا کہ کسی غیر کانگریسی جماعت کو بھی عوام کی زبردست حمایت حاصل ہو سکتی ہے۔ جنتا پریوار اس سے قبل سنگھ پریوار کے شانہ بشانہ کانگریس کے خلاف محاذ آراء رہا ہے لیکن یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ اب کانگریس اس کے ساتھ بی جے پی کے بالمقابل برسرپیکار ہے۔ یہ مجبوری بھی ہے اور ابن الوقتی کا بھی تقاضہ ہے۔ اس طرح کی موقع پرستی کا مظاہرہ سنگھ پریوار بھی کرتا رہتا ہے لیکن اس میں اور جنتا پریوار میں فرق یہ ہے کہ سنگھ کے لوگ اپنے پریوار والوں کے ساتھ غداری نہیں کرتے ایک دوسرے سے نہیں لڑتے جبکہ جنتا والے آپس میں بھڑ جاتے ہیں جس کے نتیجے میں سوڈہ واٹر کے ابال کی مانند قائم ہونے والا اتحاد دیکھتے دیکھتے بکھر جاتا ہے۔

خالص ابن الوقتی کو بھی اگر ایک نظریہ مان لیا جائے تو ہندوستان میں فی الحال چار نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک ہندو فسطائیت ہے، دوسرے اشتراکیت، تیسرا اسلام اور چوتھا مادیت یا ابن الوقتی ۔ویسے مختلف نظریات کے حامل بھی بحالتِ مجبوری موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن وہ ان کا نظریہ نہیں بلکہ اپنے اس سے انحراف ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کو بھی لوگ ایک نظریہ کہتے ہیں لیکن شاید اس کی مثال اندھیرے کی سی ہے کہ اجالا جیسے جیسے کم ہوتا جاتا ہے

تاریکی اپنے آپ پھیلتی چلی جاتی ہے اور جب روشنی پوری طرح غائب ہو جاتی ہے تو اندھیرے کا بول بالا ہو جاتا ہے۔ ان نظریاتی تحریکات میں سنگھ پریوار کو قدرتی طور پر ایک طرح کا امتیاز حاصل ہو گیا ہے اس لئے کہ اس کی ابتداء ڈاکٹر ہیڈگیوار نے ایک سماجی تحریک کی حیثیت سے کی تھی لیکن انہیں گرو گولوالکر جیسا مفکر میسر آگیا جس نے اس میں مذہبی و تہذیبی رنگ ڈال کر اسے فسطائی تحریک بنا دیا۔

جب تک ہندو مہاسبھا متحرک تھیقومی افق پر کسی اور ہندوتوادی سیاسی جماعت کیلئے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن اس کے مفقود ہو جانے کے بعد سنگھ نے جن سنگھ کے نام سے اپنا ایک سیاسی شعبہقائم کر دیا اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا تعلیم گاہوں کیلئے ودیار تھی پریشد،زراعتی شعبے میں کسان سنگھ، صنعت و حرفت میں مزدور سنگھ، میناکشی پورم کے خلاف وی ایچ پی، رام مندر کیلئے بجرنگ دل، غیر ملکی سرمایہ کاری کے خلاف سودیشی جاگرن اور قبائلیوں کی فلاح کیلئے ونواسی کلیان جیسی تقریباً ۴۳ تنظیمیں عالم وجود میں آگئیں جن کا مجموعہ سنگھ پریوار کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ جماعتیں باہر سے کسی مجبوری کے تحت یکجا نہیں ہوئیں بلکہ انہیں ایک خاص مقصد کے تحت شعوری طور پر قائم کیا گیا اس لئے ان کے اندر فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کے اندر اختلافات تو ہوتے ہیں لیکن اس کے سبب انتشار نہیں پیدا ہوتا اتحاد کی فضا قائم رہتی ہے۔

ہندوستان کی دیگر نظریاتی تحریکات کے ساتھ یہ ہوا کہ ان کی توجہات کسی خاص شعبے تک محدود رہیں جس کے سبب اثرات بھی محدود رہے۔ ان میں سے کچھ نے کارکنان کی خاطر خواہ تعداد کے بغیر جب اپنا دامن پھیلانے کی کوشش کی تو بے اثر ہو کر رہ گئے۔ یہ بھی ہوا کہ سنگھ پریوار کی مانند ۹۰ سال تک بغیر کسی خاطر خواہ کامیابی کے صبر و استقامت کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہنے کی کمی نے انہیں درمیان میں مایوس و بددل کردیا لیکن سب بڑا نقصان بہوجن سماج یا دراوڈ کلگم جیسی تحریکوں کا ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی سیاسی جماعت بنانے کے بعد نظریاتی بیداری اور تنظیم و تربیت کو خیرباد کہہ دیا اور انتخاب کی نذر ہوگئے۔ اگر سنگھ نے بھی یہی کیا ہوتا تو اندرا گاندھی کی موت کے بعد ہاتھ آنے والی شکست کے بعد اس کا بھی نام ونشان مٹ جاتا لیکن اس کے برعکس سنگھ پریوار نے بی جے پی کو ۲۵ سال بعد دوبارہ خود اپنے بل بوتے پر اقتدار کا حقدار بنادیا۔

آر ایس ایس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کسی فرد واحد یا خاندان کی جاگیر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر تین سال بعد انتخابات ہوتے ہیں جس میں سر سنگھ چالک یعنی صدر کے بجائے سرکاریہ واہک یعنی سکریٹری جنرل چنا جاتا ہے۔ سنگھ کے اندر سکریٹری جنرل کی حیثیت دوسرے نمبر کی ہوتی ہے لیکن سنگھ کی تنظیم و ترتیب

اس کی اولین ذمہ داری ہوتی ۔ سنگھ چالک کا بنیادی کام فکری رہنمائی ہوتا ہے ۔ اس فکری رہنمائی کا مظاہرہ آئے دن موہن بھاگوت کی جانب سے ہوتا رہتا ہے ۔ کبھی تو وہ یہ ارشاد فرمادیتے ہیں کہ ہندوستان کے رہنے والے سارے باشندے ہندو ہیں تو کبھی مدر ٹیریسا پر کیچڑ اچھال دیتے ہیں۔ سنگھ کے سکریٹری جنرل کے عہدے پر سریش عرف بھیاجی جوشی ۲۰۰۹ء سے براجمان ہیں ۔

سابق سر سنگھ چالک سدرشن جب صحت کی بنیاد پر از خود اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے تو موہن بھاگوت کو سکریٹری جنرل سے سر سنگھ چالک بنادیا گیا۔ دیگر جماعتوں میں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے کہ کوئیخود اپنی مرضی سے معذرت پیش کردے بلکہ خود بی جے پی کے اندر عہدوں کیلئے بڑی جوڑ توڑ ہوتی ہے ۔ موہن بھاگوت کی ترقی کے سبب جو جگہ خالی ہوئی اس پر سنگھ کے اندر انتخاب ہوا۔ پرتی ندھی سبھایعنی مجلس نمائندگانکے ارکان نے ونواسی آشرم میں غیر معمولی کارکردگی دکھانے والے بھیاجی جوشی کو اس ذمہ داری کیلئے منتخب کیا۔ ۲۰۱۲ء میں دوبارہ مجلس نمائندگان نے اعتماد کا اظہار کردیا۔

اس اجلاس سے قبل ذرائع ابلاغ میں یہ افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ اس بار بھیا جوشی کی چھٹی کردی جائیگی اور نریندر مودی کی قریبی سمجھے جانے والے جوائنٹ سکریٹری دتاتریہ ہوسابلے کو جنرل سکریٹری بنادیا جائیگاتاکہ موہن

بھاگوت کے بعد وہ سر سنگھ چالک بن جائیں اور بی جے پی کی طرح آر ایس ایس بھی مودی جی کی جیب میں آجائے لیکن ہوسابلے کو مودی جی قربت مہنگی پڑی اور سنگھ نے پھر ایک بار بھیا جی کو ان عمر ٦٧ کے باوجود اتفاق رائے سے منتخب کیا۔ اس بابت دو رائیں سامنے آئی ہیں۔ ایک پرچارک کا خیال ہے کہ ہم نہیں چاہتے کہ سریش سونی جیسا کوئی سیاستدانوں سے قریب آدمی سنگھ کی اہم ذمہ داری پر فائز ہو۔ ایسا کرنے سے حکومت میں اپنے رسوخ بڑھانے والی بات بھی سنگھ کے اندر پسند نہیں کی گئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی چونکہ ہوسابلے مودی سے جونیر ہیں اس لئے پھر وہی صورتحال نہ پیدا ہوجائے جو پرمود مہاجن کے زمانے میں ہو گئی تھی جبکہ وہ سنگھ کو اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ دوسری رائے زیادہ سنگین ہے ایک معمر پرچارک نے بھیا جوشی کے دوبارہ انتخاب کو قحط الرجال سے تعبیر کیا وہ بولا ہمارے یہاں قابل اور باصلاحیت افراد کی شدید کمی پائی جاتی ہے۔اوپر کی سطح پر ذمہ داریوں کو پر کرنے کیلئے لائق و فائق افراد کا فقدان ہے اسی لئے بھیا جی دوبارہ منتخب ہو گئے۔

سنگھ پریوار کی گومگوں کیفیت کا اثر اجلاس میں موجود ارکان پر دیکھا گیا۔ آوٹ لوک جریدے کے ایک صحافی نے جب ایک معمر پرچارک سے اس کے تاثرات دریافت کئے تو اس نے دو الفاظ میں ساری کہانی کہہ دی‘ پست ہمت اور مجہول (demoralized & confused) اس کی وجہ دریافت کئے جانے پر وہ بولا یہاں

پر ''ہمارے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ہم تین دن تک یہ سوچتے رہے ہمارے رہنما نئی فکر اور حکمت عملی سامنے لائیں گے لیکن وہی پرانی باتیں دوہرائی گئیں خاص طور پر اس صورتحال میں جبکہ لوک سبھا میں ہماری اکثریت ہے۔نہ تو حکومت آرایس ایس کی سنتی ہے مثلاً وزارت انسانی وسائل اور نہ ہمارے پاس کرنے کو کچھ ہے''۔ یعنی پہلے ایک کام تو یہ تھا حکومت کی مخالفت کرواور اپنی حکومت بناواب اپنی حکومت بن چکی اس کی مخالفت کرنہیں سکتے اس لئے گویا بے کار ہو گئے ہیں۔ سنگھ کے ایک اور پر چارک نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہمارے رزولیوشن دیکھئے۔اب ہمیں کیا کرنا ہے یوگا اور مادری زبان میں تعلیم ۔کیا یہی آئندہ تین سالوں کا ہدف ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ۲۰۱۴ء کی انتخابی کامیابی کے بعد حکومت سنگھ کو مضبوط کرنے میں تعاون کرے گی لیکن اب پھر ہمیں توسیع کے کام میں لگا دیا گیا ہے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ ۲۰۱۴ء کے قومی انتخابات کا انعقاد ایک ایسے وقت میں ہوا جب کانگریس پارٹی کی عدم مقبولیت بام عروج پر پہنچ چکی تھی۔ بدعنوانی کا سیلاب سر سے اونچا ہو چکا تھا اور مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔اس سے پہلے کے تیسرا محاذ اپنے آپ کو منظم کرپاتا کارپوریٹ دنیا نے اپنا سرمایہ بی جے پی پر لگادیا اور ذرائع ابلاغ کے اندر نریندر مودی کی ایسی ہوا بنائی گئی کہ اس میں اچھے اچھوں کے قدم اکھڑ گئے۔ یہ ایک حیرت

انگیز حقیقت ہے کہ الیکشن کمیشن میں داخل شدہ رپورٹ کے مطابق بی جے پی نے حزب اختلاف میں ہونے کے باوجود ۷۱۴ کروڑ روپے خرچ کئے جبکہ کانگریس اقتدار پر قابض ہونے باوجود صرف ۵۱۶ کروڑ خرچ کر سکی۔ یہ تو وہ روپیہ ہے جس کا حساب دیا گیا جو کالا دھن خرچ کیا گیا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ نریندر مودی کو اپنے سامنے کسی مضبوط مدمقابل کی عدم موجودگی کا فائدہ ملا اور بی جے پی کو اپنے بل پر اکثریت حاصل ہو گئی۔

اس کامیابی میں حسب سابق سنگھ پریوار نے اپنی ساری توانائی جھونک دی۔ اس سے پہلے چونکہ کامیابی نہیں ملتی تھی اس لئے سنگھ والے یہ بتانے کوشش نہیں کرتے تھے کہ انہوں نے کون کون سے پاپڑ بیلے اس کے باوجود کچھ ہاتھ نہیں آیا لیکن اس بار چونکہ اکثریت آگئی تو سنگھ کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کامیابی کا سہرہ بھی بھیاجی کے سر باندھا گیا حالانکہ ۲۰۰۹ میں بھی انہوں نے یہی سب کیا تھا لیکن اس وقت لاٹری نہیں لگی۔ بی جے پی کی حکومت کے قیام کے بعد یہ پہلا مجلس نمائندگان کا اجلاس منعقد ہوا ہے۔ کاش کہ سنگھ کی میعاد چند ماہ قبل مکمل ہو گئی ہوتی یا بی جے پی کی مرکزی حکومت نے عوام کو اس قدر مایوس نہیں کیا ہوتا لیکن مشیت کے فیصلوں میں بھلا کس کا عمل دخل ہے۔

اس بار مجلس نمائندگان کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کا کام دہلی کے انتخابی نتائج نے کیا اس لئے کہ یہ سوال پیدا ہوگیا اگر حقیقت میں سنگھ اس قدر طاقتور ہے تو اپنے گڑھ دہلی کے اندر وہ بی جے پی کو کیوں کامیاب نہیں کرسکا؟ سنگھ کیلئے دوسرا مسئلہ کشمیر کی پی ڈی پی حکومت میں بی جے پی شمولیت تھی۔ بی جے پی نے تو بڑی آسانی سے دستور کی دفعہ ۳۷۰ کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا لیکن آر ایس ایس ایسا نہیں کرسکتا اس کے علاوہ مفتی صاحب کے بیانات سے بھی سنگھ اتفاق نہیں کرسکتا اس لئے جوائنٹ سکریٹری دتاترے ہوسابلے نے یہ تسلیم کیا کہ ہم ان باتوں سے خوش نہیں ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہم اس بابت جلد بازی نہیں کریں گے بلکہ سنگھ بی جے پی کو اور وقت دینا چاہتا ہے۔ اس معاملے میں بی جے پی نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا۔ اسے پتہ تھا سنگھ کو اس معاملے میں راضی کرنا ایک مشکل کام ہوگا اس لئے امیت شاہ نے یہ کیا کہ سنگھ سے آئے ہوئے رام مادھو کو جموں کشمیر کی حکومت سازی کی پیش رفت میں شامل کرلیا تاکہ سنگھ قیادت کو سمجھانے منانے کا کام انہیں کو سونپا جاسکے اور یہی ہوا۔

یہ تو سیاسی معاملات تھے لیکن سنگھ چونکہ سیاست کے علاوہ مذہبی جذبات کا بھی بھرپور استحصال کرتا ہے اس لئے وی ایچ پی اور ہندو جاگرن منچ کے اپنے مسائل ہیں ۔رام مندر کے معاملے کو سنگھ نے علی الاعلان آئندہ چار سال تک

کیلئے برف دان میں ڈال دیا ہے اور وی ایچ پی کو اس کیلئے کوئی عوامی تحریک چلانے سے منع کردیا گیا ہے۔ گھر واپسی کے ہنگاموں سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوا اس لئے بی جے پی کی مرکزی حکومت کو اس کے خلاف موقف اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ امریکی دباؤ کے تحت وزیر اعظم کو صفائی پیش کرنی پڑی۔ اس مسئلہ پر ایوان کے اندر خوب فضیحت ہوئی اور دنیا بھر میں الگ بدنامی ہوئی۔ اس کے بعد گھر واپسی کے نام پر چھوٹے موٹے ہنگامہ کی امید تو کی جاسکتی ہے لیکن کسی بڑی تحریک کی توقع کم ہے۔

ایوان پارلیمان میں تحویل اراضی کے قانون پر حزب اختلاف کے متفقہ موقف نے مرکزی حکومت کی نیند اڑا دی ہے۔ اس مسئلہ پر این ڈی اے کے اندر پھوٹ پڑ گئی ہے۔ راجیہ سبھا میں بی جے پی اکثریت سے محروم ہے اس لئے اس کا پاس ہونا ناممکن ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر سنگین ہے کہ انتخابات میں ناکامی کے بعد پہلی مرتبہ کانگریس کو اس کے توسط سے عوام میں جانے کا موقع مل گیا۔ سونیا جی نے راجستھان اور ہریانہ کے کئی علاقوں کا دورہ کیا بلکہ کانگریس اس بابت رتھ یاترا بھی نکالنے جارہی ہے۔ ایسے میں بے موسم بارش نے فصلیں تباہ کردی۔ کسانوں کی خودکشی کے واقعات میں زبردست اضافہ ہوگیا ہے مہاراشٹر میں تو اس کی شرح ڈیڑھ گنا ہو گئی ہے۔ جنتا پریوار بھی کسانوں سے رابطہ کررہا ہے پہلے بھارتیہ کسان سنگھ کے لوگ اس صورتحال میں متحرک ہو جاتی تھی۔ وہ کسانوں کے

پاس جاکر انہیں کانگریسی حکومت کے خلاف ورغلا کر اپنا ہمنوا بناتی تھی لیکن اب یہ حالت ہے کہ بی جے پی کی مرکزی اور ریاستی سرکاریں غفلت کی نیند سو رہی ہے۔ وزیراعظم اپنے من کی بات سے ان کا دل بہلانے کی کوشش کررہے ہیں انہیں تو بس تحویل اراضی کا قانون کسی طرح پاس کرکے صنعتکاروں کا بھلا کرنے کی فکر دن رات ستا رہی ہے۔ بھارتیہ کسان یونین کی برسوں کی کمائی ہوئی ساکھ پر اوس پڑ رہی ہے ۔ وہ کسانوں کو منہ دکھانے کی جرأت نہیں کرپارہی ہے۔

یہ عجیب و غریب اتفاق ہے کہ سیٹھ جی اور بھٹ جی کی آرایس ایس نے جب بھارتیہ مزدور سنگھ بنائی تو اس کی طاقت بائیں بازو کی مزدور تنظیموں سے زیادہ ہو گئی۔ یہ لوگ کانگریس کے دور میں حکومت کی مزدورمارے لف پالیسیوں کی خوب جم کر مخالفت کرتے تھے اور خود ان کا ہمدرد و غمخوار بتاتے تھے لیکن اب ایسا محسوس ہورہا ہے کہ سرمایہ داروں نے بی جے پی سرکار کو خرید لیا ہے وہ مزدوروں کے خلاف قوانین بنائے جارہی ہے لیکن بھارتیہ مزدور سنگھ کو بھی زبانی مخالفت سے آگے بڑھ کر حکومت کے خلاف مورچہ نکالنے کی اجازت نہیں ہے ایسے میں کوئی مزدور یونین بھلا کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ یہی حال سودیشی جاگرن منچ کا ہے جو بیرونی سرمایہ کاری کے خلاف زہر اگلا کرتا تھا۔ اب اس کی زبان پر لگام لگا دی گئی ہے اس لئے کہ غیر ملکی سرمایہ کاری کی جیسی حمایت مودی جی کرتے ہیں پہلے کسی وزیراعظم نے نہیں کی تھی۔ اب اگر ان ذیلی

تنظیموں کی نس بندی کردی جائے جن کی جدوجہد نے بی جے پی سرکار کو اقتدار میں لانے کیلئے اہم کردار ادا کیا تھاتو سنگھ پریوار کی توسیع کا کام کیسے ہوگا؟ دیکھنا یہ ہے کہ سنگھ پریواراس اگنی پریکشا سے کیسے گزرتا ہے؟

بی جے پی جب تک اقتدار سے محروم تھی ان ذیلی تنظیموں کے نخرے اٹھانا اس کی مجبوری تھی لیکن اب وہ اس سے بے نیاز ہوگئی اور پھر سمندر کا یہ اصول بھی تو ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے یہی کچھ سنگھ پریوار میں اب ہونے لگا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے آرایس ایس خود اپنی ننھی ذیلی تنظیموں کے بچاؤ میں آنے کے بجائے انہیں بلی کا بکرہ بنا رہی ہے۔ ویسے جنگلی جانوروں کے عادات واطوار کی تحقیق کرنے والوں نے انکشاف کیا ہے کہ بعض جانوروں میں یہ خصلت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے جھنڈ پر تسلط و غلبہ برقرار رکھنے کی غرض سے اپنی ہی اولاد کو قتل کردیتے ہیں۔ یہ صفت جہاں شیروں میں پائی جاتی ہے وہیں قدیم ہندوستانی لنگور کے اندر بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس لئے اگر بجرنگ بلی کے بھکت بھی اس کا مظاہرہ کرنے لگیں تو اس پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔

نائیجیریا کی انقلابی بہار

نائیجیریا کا نام آتے ہی بوکوحرام کا خوفناک تصویر آنکھوں میں آجاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ خونخوار لوگوں کا کوئی غیر مہذب علاقہ ہے حالانکہ نائیجیریا.براعظم افریقہ کا نہ صرف سب بڑا ملک بلکہ سب بڑی معیشت بھی ہے۔آبادی کے لحاظ سے عالمی سطح پر یہ ساتویں مقام پر ہے اورافریقہ تو درکنار یوروپ کا بھی کوئی ملک اس کا ہمسر نہیں ہے۔ پٹرول.برآمد کرنے والے ممالک میں وہ آٹھویں نمبر پر ہے ۔اس رنگ .برنگے ملک میں ۲۵۰ بھانت بھانت کے قبائل آباد ہیں جن میں سے ہر ایک کی منفرد زبان ہے اوربولیوں کا اگر شمار کیا جائے تو اس کی تعداد۴۰۰۰ بنتی ہے۔ نائیجیریا میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۵۰،۳ ہے باقیماندہ لوگوں کو عیسائی شمار کیا جاتا ہے حالانکہ ان میں قدیم افریقی اوہام پرست مذاہب کے ماننے والے بھی شامل ہیں۔

نائیجیریاکے اندر گذشتہ دنوں انتخابات کا انعقاد ہوااور ایک غیر معمولی تبدیلی رونما ہوگئی ۔اس انقلاب کااندازہ اس بات سے کیا جاسکتاہے کہ الجزیرہ چینل کے جن دو صحافیوں کوانتخاب سے قبل بوکوحرام کے خلاف فوجی

اقدامات کی تحقیقات کا الزام لگا کر حراست میں لیا گیا تھا رہا کر دیئے گئے۔ یہ اقتدار کی منتقلی سے پہلے ہی رونما ہونے والی تبدیلیاں ہیں جبکہ مصر کے اندر گرفتار شدہ دو صحافیوں میں سے ایک برسوں بعد بھی قید و بند کی صعوبتیں میں مبتلاء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نائیجیریا کے اندر انتخابی عمل کے نتیجے میں رونما ہونے والے اس پرامن انقلاب کو افریقہ کی بہار سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے چونکہ اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی اس لئے ہمارے قومی میڈیا نے بھی اس کو نظر انداز کر دیا۔

نائیجیریا کے حالیہ انقلاب کو نظر انداز کرنا مغرب کی مجبوری ہے۔ اگر شکست خوردہ صدر جوناتھن گڈلک کے بجائے محمد بخاری ہوتے اور ان پر بدعنوانی کے سنگین الزامات بھی ہوتے۔ عوام ان کی نااہلی سے بیزار ہو کر بدعنوانی سے نجات کی خاطر جوناتھن کو ۲۰ لاکھ ووٹوں کے فرق سے کامیاب کر دیتے تو یقیناً یہ مغرب کیلئے ایک بہت بڑی خبر بن جاتی۔ اس لئے کہ محمد بخاری کی آڑ میں مسلمانوں کو اور اسلام کو بدنام کرنے کا نادر موقع اس کے ہاتھ آجاتا لیکن وہاں تو سب کچھ الٹا ہو گیا۔ نائیجیریا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی برسراقتدار صدر کو انتخاب کے ذریعہ اقتدار سے بے دخل کرنے کا کارنامہ ایک مسلمان رہنما محمد بخاری نے انجام دے دیا اس سے بھلا اسلام اور مسلمانوں کے دشمن کیونکر خوش ہو سکتے ہیں؟

نائیجیریا کا انتخابی نظام اس قدر سیدھا سادہ بھی نہیں ہے کہ کئی جماعتیں

ایک دوسرے کے خلاف انتخاب لڑیں اور ایک جماعت کسیطرح ۳۰ فیصد کے لگ بھگ ووٹ حاصل کرکے بلاشرکت غیرے اپنی سرکار بنالے یا ۲۰ فیصد کے آس پاس ووٹ بھی اگر مل جائیں تو جوڑ توڑ کرکے مخلوط حکومت قائم کردے۔ وہاں اول تو صدارتی امیدوار کو براہِ راست عوام سے ۵۰ فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے پڑتے ہیں دوسرے کامیاب امیدوار کیلیئے لازم ہے کہ وہ کم از کم دو تہائی ریاستوں میں ۲۵ فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل کرے۔ اس لئے کسی ایک علاقہ میں مقبول رہنما اقتدار پر قابض نہیں ہوسکتا۔

نائیجیریا کا شمالی حصہ مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل ہے اور جنوب میں عیسائی آباد ہیں لیکن اس مرتبہ یہ بات دیکھنے میں آئی کہ جنوب کے لوگوں نے ایک تو رائے شماری میں دلچسپی نہیں لی اور جو ووٹ دیئے گئے انہوں نے بخاری کی اے پی سی کو پسند کیا۔ اس لئے کہا جارہا ہے کہ پہلی مرتبہ نائیجیریا کی عوام نے نسلی، علاقائی اور مذہبی عصبیت سے اوپر اٹھ کر بدعنوانی کے مسئلہ پر ووٹ دیا ہے۔ محمد بخاری کے خلاف پی ڈی پی والے ان کے ماضی کا حوالہ دے کر عوام کو ورغلاتے تھے۔ انہیں ڈرایا جاتا تھا کہ اس سابق فوجی کو اگر پھر سے حکمرانی کا موقع مل جائے تو جمہوریت کا خاتمہ ہوجائیگا۔ انسانی حقوق سلب کردیئے جائیں گے۔ شریعت کے سخت قوانین نافذ ہوجائیں گے اور بوکو حرام جیسے جنگجو طاقتور ہوجائیں گے۔

لیکن جب عوام نے دیکھا کہ ان کا چہیتا رہنما جوناتھن گڈ لک بو کو حرام کے خلاف بری طرح ناکام ہو گیا ہے اور بدعنوانی کے دلدل میں سر سے پیر تک دھنس چکا ہے۔

انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد سے تیل کی برآمد کے عوض ملک کے اندر آنے والے ۶۰۰ بلین ڈالر میں سے ۴۰۰ بلین ڈالر یعنید و تہائی اہل اقتدار کی جیب میں چلے گئے ہیں۔اس کے برعکس ۷۰ فیصد عوام غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذارنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ۸۰ فیصد نوجوان بیروزگار ہیں ۔اس مایوس کن صورتحال میں عوام نے بڑی امیدوں کے ساتھ محمد بخاری سے رجوع کیا ہے جو ۲۰۰۳ء کے بعد سے لگاتار تین مرتبہ حزب اختلاف اے پی سی کے رہنما کی حیثیت سے پی ڈی پی کا مقابلہ کرتے رہے لیکن دل شکستہ نہیں ہوئے ۔ یہ ۷۲ سالہ محمد بخاری کی صبر واستقامت کا ثمر ہے کہ انہیں بالآخر فتح نصیب ہو گئی اور وہ اڈوانی جی کی مانند مستقل امیدوار کے لقب سے بچ گئے ۔

اس موقع پر بچپن کی ایک کہانی یاد آتی ہے ۔ کسی جنگل میں ایک مرتبہ جانوروں نے سوچا کہ شیر حکمرانی خاصی طویل ہو گئی ہے اب اسے تبدیل ہونا چاہئے ۔ شیر بھی انسانوں کی طرح حرص و ہوس کا مارا نہیں تھا، حکومتکرتے کرتے تھکگیا تھا۔ اس لئے اس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور کہا ٹھیک ہے آپ لوگ مل جل کر سربراہ مقرر کرلو میں اس کو اقتدار کی باگ ڈور

سونپ کر سبکدوش ہو جاتا ہوں۔ اب جانوروں میں اس بات پر اختلاف ہوگیا شیر کے بعد جنگل کا راجہ کون بنے۔ ایسے میں لومڑی نے ترکیب بجھائی کیوں نہ انسانوں کی طرح انتخاب کرلیا جائے جس کے حق میں سب سے زیادہ رائے آئے وہی سربراہ ہو۔ سارے جانوروں نے اس تجویز پر اتفاق کرلیا۔

جنگل میں بندروں کی تعداد بہت زیادہ تھی ۔ اس کے علاوہ کچھ اور پیڑوں پر رہنے والے بھی ان کے ہمنوا ہوگئے اور ایک قلندر نما بندر کے حق میں اپنی رائے دے دی۔ بندر کے اقتدار میں آتے ہی سارے جانوروں کے دل سے شیر کا خوف ختم ہوگیا اور پھر وہاں بھی انسانی بستیوں کی مانند جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا جنگل راج قائم ہوگیا۔ جانور ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کرنے لگے لیکن بندر بادشاہ اس سے بے نیاز شاخوں پر اچھل کود کرتا رہا۔طاقتور جانور کمزوروں کی حق تلفی کرتے رہے اور بندر بادشاہ بندریہ کے جوں نکال نکال کر کھاتا رہا اس طرح گویا جنگل کی پرامن فضا میں کہرام مچ گیا۔

اس درمیان ایک دن بھیڑیئے نے ہرن کا بچہ اٹھا لیا۔ ہرنی بیچاری دوڑی بندر بادشاہ کے پاس آئی اور اس کے سامنے رونے دھونے لگی ۔بندر اس کی بات سن کر اپنی جگہ سے اٹھا اور بھیڑیئے کی جانب بڑھا لیکن بھیڑیئے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بندر سوائے مختلف شاخوں پر اچھل کود کے علاوہ کچھ نہ

کرسکا یہاںتک کہ بھیڑیا ہرن کے بچے کو چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ اس واردات کے بعد بندر نے ہاتھ جوڑ کر ہرنی سے معذرت کرلی کہ میں نے تو اپنے بہت کوشش کی لیکن افسوس کہ تمہارے کسی کام نہ آسکا۔ اس واقعہ نے جانوروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان سب نے دوبارہ شیر کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

شیر کے پاس جب وہ لوگ اپنی تجویز لے کر پہنچے تو شیر بولا تم لوگ پانچ سال انتظار کرلو جب دوبارہ انتخابات ہوں تو مجھے منتخب کرلینا۔ جانوروں نے کہا پانچ سال کا انتظار بہت طویل ہے آپ فوراً دوبارہ بادشاہ بن جائیں۔ شیر بولا جب تک بندر راجہ ہے میں اپنی خانقاہ سے نہیں نکلوں گا اور میں اپنے اقتدار کی خاطر انسانوں کی طرح خون خرابہ بھی نہیں کروں گا۔ جانور بندر سے نجات حاصل کرنے کی ترکیب سوچنے لگے پھر ایک بار لومڑی نے عقل لگائی اور بولی بندر نقلچی ہوتا ہے۔ اس کے سامنے جو بھی حرکت کی جائے وہ اسے دوہراتا ہے اس لئے اگر کوئی اس کے سامنے کنوئیں چھلانگ لگا دے تو وہ بھی کود جائیگا۔ اس طرح ہمیں بندر کی حکمرانی سے نجات مل جائیگی۔

اس تجویز سے جانور پریشان ہو گئے کیوں کہ جنگل کی فلاح و بہبود کیلئے کوئی موت کے کنوئیں میں کودنے کیلئے تیار نہیں تھا ایسے میں مینڈک سامنے آیا اور اس نے اپنی خدمات پیش کیں۔ سارے جانور خوش ہوگئے اور مینڈک کا شکریہ

ادا کیا۔ اس کے بعد مینڈک بندر بادشاہ کے سامنے گیا اور اچھلنے کودنے لگا بندر بھی وہی حرکتیں کرنے لگا۔ میڈک اچھلتے کودتے کنوئیں کے پاس آگیا اور اس میں چھلانگ لگا دی بندر بھی اس کے پیچھے پیچھے کود گیا۔ سارے جانور خوشی سے جھوم اٹھے مینڈک اندر سے پھدک کر باہر آگیا اور بولا میں نے پہلے ہی کنوئیں کی دیوار میں ایک سوراخ دیکھ لیا تھا اس لئے چھلانگ لگا کر وہاں بیٹھ گیا اور پھر واپس آگیا۔ شیر کے اقتدار کا راستہ صاف ہوگیا اور وہ دوبارہ جنگل کا راجہ بن گیا۔ بدقسمتی سے نائیجیریا میں نہ لومڑی تھی اور نہ مینڈک اس لئے محمد بخاری کو ۳۰ سالوں تک اقتدار کا انتظار کرنا پڑا لیکن آخرکار وہ شیر کی مانند دوبارہ کرسیٔ اقتدار پر متمکن ہو گئے۔

محمد بخاری کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ نوعمری میں وہ فوجی بن گئے اور ۱۹۷۶ء کے اندر اولوسیگون اوبسانجو نامی فوجی حکمراں کے زمانے میں وزیر کی حیثیت سے سیاست میں قدم رکھا۔ دسمبر ۱۹۸۳ء کے اندر ہونے والی غیر خونی بغاوت کے بعد فوجی افسران نے انہیں اقتدار سونپ دیا۔ ان کے دورِاقتدار میں سرکاری فضول خرچ پر لگام کسی گئی۔ بدعنوان سیاستدانوں کے علاوہ منشیات کے اسمگلروں اور ہتھیار بند لٹیروں کو جیل بھیج دیا گیا۔ اگست ۱۹۸۵ء میں جنرل ابراہیم باباگنڈا نے محمد بخاری کا تختہ الٹ کر اور انہیں پابند سلاسل کر دیا۔ ۴۰ ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد وہ رہا ہوئے۔

نائیجیریا میں انگریزی استعمار کے بعد چار سالوں کے علاوہ فوجی حکومت کرتے رہے۔ بعد میں انتخابات ہونے لگے تو اس پورے عرصہ پی ڈی پی حکومت کرتی رہی۔ اگست ۲۰۱۰ء میں پی ڈی پی کے سابق صدر یاعدو علیل ہو گئے تو نائیجیریا کے عوام جوناتھن گڈ لک کے ہاتھوں

یں ملککو باگڈور سونپنے کا مطالبہ کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے جو اس زمانے میں بے حد مقبول رہنما تھے ۲۰۱۱ء کے انتخابات میں انہوں نے محمد بخاری کو شکست بھی دی لیکن اس کے بعد وہ عوام سے کئے گئے خوشنما وعدوں کو بھول گئے اور ۲۰۱۵ء کا انتخاب جیتنے کی خاطر وہی گھسا پٹا حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی جس کا آج کل دور دورہ ہے۔ دنیا بھر کے سیکولر سیاسی رہنماوں کی مانند اپنی ناکامیوں کے اوپر پردہ ڈالنے اور عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے دہشت گردی کا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

نائیجیریا کے اندر انتخاب کے سالمیں بوکوحرام کے ذریعہ ۳۰۰ طالبات کے اغواء کا واقعہ ذرائع ابلاغ میں بحث کا موضوع بن گیا۔ اس کے حوالے سے جو مضحکہ خیز خبریں ذرائع ابلاغ کی زینت بنتی تھیں اس کو کسی تصدیقکے بغیر پھیلایا جاتا رہا۔ لیکن اس درمیان ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا کہ ساری قلعی اپنے آپ کھل گئی۔ ان طالبات کی رہائی میں ناکامی کے خلاف نائیجیریا میں قومی سطح پر احتجاج ہو رہے تھے اور مظاہرین صدر جوناتھن کی بے حسی پر غم و غصے کا اظہار

کر رہے تھے۔ اس دوران خواتین کے ایک وفد نے جوناتھن کی اہلیہ پیشنز سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران پیشنز کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے دو مظاہرین کو حراست میں لینے کا فرمان جاری کر دیا۔

پیشنز نے (جو اس وقت نائیجیریا کی خاتون اول تھیں) نہ صرف اغواء کی واردات کے وقوع پذیر ہونے پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا بلکہ مظاہرین کو بوکو حرام کے ارکان قرار دے دیا۔ گرفتار ہونے والی خاتون ندیر پایا کے مطابق پیشنز نے ان پر اپنے خاوند کا مخالف ہونے کا اور حکومت کو بدنام کرنے کے الزام کے ساتھ ساتھ اغواء کی داستان گھڑنے کا الزام بھی لگا دیا۔ گرفتاری سے قبل پیشنز نے دھمکی دی کہ اگر یہ احتجاج جاری رہا تو ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اپنے انجام کیلئے وہ خود ذمہ دار ہوں گی۔ اس واقعہ سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے؟ ایک تو حکمراں کی بیوی خود اغواء کی واردات کو من گھڑت بتا رہی ہے اور دوسرے مظاہرین کو اسی سلوک کی دھمکی دے رہی ہے جس کا الزام بوکو حرام پر لگایا جا رہا ہے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ اروند کیجریوال کی مانند محمد بخاری کی اے پی سی کا انتخابی نشان بھی جھاڑو ہے۔ لوگ ان سے بھی یہ توقع کر رہے ہیں کہ وہ ملک کو بدعنوانی کی لعنت سے پاک کر دیں گے جبکہ سابق صدر جوناتھن پر ۵۰۰ ملین ڈالر کے غبن کا الزام ہے۔ بخاری نے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ قوم کی دولت پر صرف عوام

کا حقہ جو بھی اس پر ہاتھ صاف کرے گا اسے سیدھے جیل بھیج دیا جائیگا۔ محمد بخاری قومی معیشت کو صرف تیل کی حد تک محدود رکھنے کے بجائے وسعت دینے کے قائل ہیں تاکہ ۳۰ لاکھ بیروزگار نوجوانوں کو روزگار مہیا کیا جاسکے۔ تشدد کے خاتمہ کی بابت وہ زخموں پر مرہم رکھنے اور حالات کا جائزہ لے کر اقدامات کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ یہ نہایت معقول حکمت عملی ہے پی ڈی پی نے یہ کیا تھا کہ اپنے علاقہ کے جنگجو گروہوں کو مراعات دے کر ہمنوا بنا لیا اور شمال کے شدت پسندوں کے خلاف صلیبی جنگ چھیڑ دی ۔ اگر شمال کے نوجوانوں کے مسائل پر بھی ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے تو انہیں بھی حل کیا جاسکتا ہے اور دیرپا امن وآشتی کا ماحول بن سکتا ہے۔

انتخابات کے ذریعہ حکمرانوں کے متعلق رائے عامہ کا پتہ لگایا جاتا ہے اس کا مقصد عوام کی نفسیات کا اظہار نہیں ہوتا لیکن اس دوران اپنے آپ قومی نفسیات بھی سامنے آجاتی ہے۔ نائیجیریا کے لوگوں نے لگاتار چار بار پی ڈی پی کو کامیاب کیا جو ہندوستان کے ابتدائی ایام میں کانگریس کے ساتھ اختیار کئے جانے والے رویہ سے مطابقت رکھتا ہے لیکن پانچویں مرتبہ تبدیلی واقع ہو گئی۔ تبدیلی کی عام طور دو وجوہات ہوتی ہے۔ ایک سبق سکھانے کیلئے اس میں لوگ متبادل کی شخصیت پر غور نہیں کرتے جیسا کہ ایمرجنسی کے بعد ہوا لوگوں کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اندراجی کے بعد کون آئیگا وہ تو بس انہیں سبق

سکھانا چاہتے تھے اس لئے کانگریس کے ہر مخالف کی حمایت کی گئی۔ اس کے برعکس اگر تبدیلی کسی خاص مقصد کے پیش نظر ہو جیسے بدعنوانی کا خاتمہ تو عوام متبادل کی جانب غور سے دیکھتے ہیں۔ مثلاً وی پی سنگھ نے جب راجیو گاندھی کے خلاف بوفورس کی توپ داغی تو وہ لوگوں کیلئے جانے پہچانے تھے ۔ وہ سیاست میں ہونے کے باوجود ایک بے داغ شخصیت کے حامل تھے اور بدعنوانی کے خاتمہ کیلئے انہوں نے وزارت کو چھوڑا تھا اس لئے عوام نے ان پر اعتماد کیا۔ ایسا ہی کچھ محمد بخاری کے ساتھ بھی ہوا۔ ماضی میں ان کا نظم و ضبط اور بدعنوانی کے خلاف کئے گئے اقدامات ان کے کام آئے ۔ تبدیلی کا یہ لازمی عنصر ہے۔

محمد بخاری کے سرپر نائیجیریا کی عوام نے اپنی توقعات کا تاج رکھا ہے ۔ یہ کوئی معمولی بوجھ نہیں ہے۔ اگر وہ اس کا حق ادا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اپنی جماعت اے پی سی کے روشن مستقبل کے ضامن بن جائیں گے۔ ان کے سامنے بے شمار خارجی چیلنجز ہیں ان میں سے ایک اہم ترین داخلی محاذ بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تبدیلی کے خواہشمند یہ نئے رائے دہندگان کیا ۲۰۱۹ء میں بھی ان پر اعتماد کا اظہار کریں گے جبکہ وہ ۷۶ سال کے ہوچکے ہوں گے ؟ اگر نہیں تو ان چار سالوں کے اندر محمد بخاری اپنے ساتھیوں کی ایک ایسی فعال ٹیم عوام کے سامنے پیش کرنی ہوگی جن کے درمیان سے وہ اپنے مستقبل کے رہنما کا انتخاب کرسکیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اے پی سی کا جائزہ لیں ۔ باصلاحیت لوگوں

کو مختلف اہم امور کی ذمہ داریاں تفویض کریں۔ مختلف وزارتوں میں انہیں اپنے جوہر دکھانے موقع دیں۔ ان پر اعتماد کریں اور ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اگر خدانخواستہ محمد بخاری اس ہدف میں ناکام ہو جائیں گے تو کوئی بعید نہیں کہ عوام پھر سے پی ڈی پی جانب لوٹ جائیں جیسا کہ ہندوستانی سیاست میں ہوتا رہتا ہے کہ لوگ وقتی طور پر اِدھر اُدھر جاتے ہیں مگر پھر لوٹ کر کانگریس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ نائیجیریا کے علاوہ ساری دنیا کے لوگوں کی نیک خواہشات اور دعائیں محمد بخاری کے ساتھ ہیں۔

مودی جی کا دورہ: سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں

سیاست کی دنیا میں سابق وزیر اعظم منموہن سنگھ جیسے لوگ کام زیادہ اور باتیں کم کرتے تھے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ بولتے تو بہت ہیں مگر کرتے بہت کم ہیں جیسے وزیر اعظم نریندر مودی۔ منموہن سنگھ نے خاموشی کے ساتھ ہندوستان کو دفاعی میدان میں خود کفیل بنانے کیلئے ۲۰۰۶ء میں ایم ایم آر سی اے بنا کر ۲۰۱۲ء تک بہت کچھ کیا مگر مودی جی نے دس ماہ کے اندر اس پر پانی پھیر دیا۔ ان دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ منموہن کیکتھنی اور کرنی میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا وہ جعلی دیش بھکتی کا شور شرابہ کئے بغیر اپنا فرض ادا کرتے تھے جبکہ مودی جی جو کہتے ہیں اکثر اس کے بالکل اکثر کام کرتے ہیں۔ بسیار کلامی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ بہت زیادہ بولنے والے سے غلطیاں بھی اتنی ہی زیادہ سرزد ہوتی ہیں اور یہی سب حالیہ دورے کے دوران ہوتا رہا۔

یوروپ کے اس دورے کی ابتداء ہی بدشگونی سے ہوئی۔ فرانس اور جرمنی کے علاوہ مودی جی یوروپین یونین کے صدر مقام برسلز جانا چاہتے تھے لیکن وہاں سے اس قدر سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا کہ مجبوراً بیلجیم کے بجائے کناڈا کو دورے میں شامل کرنا پڑا۔ اس دورے کا اصل مقصد تو فرانس میں جا کر رافیل جنگی جہازوں

کا سودہ کرنا تھا لیکن اس کے ساتھ جرمنی کی نمائش اور کناڈا کی فرمائش کو زبردستی نتھی کر دیا گیا۔ مودی جی نے خوداس حقیقت کا اعتراف اپنے انٹرویو میں اس طرح کیا کہ ہم احمدآبادی ایک ٹکٹ پر دو سفر کرنے کے قائل ہیں یعنی فرانس جاؤ تو واپسی میں جرمنی سے ہوتے ہوئے آو لیکن جرمنی کے بعد تین گنا فاصلہ طے کرکے کناڈا کے ونکوور شہر تک جانے کی حماقت بھلا کون کرسکتا ہے؟ عام احمدآبادی اس لئے کفایت شعار ہوتا ہے کہ اسے سیر سیاحت پر جیب سے خرچ کرنا پڑتا ہے لیکن مودیجیکا معاملہمختلفہے۔ وہ چونکہ سرکاری خرچ پر مزے لوٹتے ہیں اس لئےان پر خواجہ میر درد کا یہ شعر صادق آتا ہے

سیر کر دنیاکیغافلزندگانیپھرکہاں
زندگی گرکچھ رہی تو یہ جوانی پھر کہاں

مودی جی کی جوانی تو کب کی گزر گئی لیکن اقتدار کے ملتے ہی دل جوان ہوگیا ہے ویسے اقتدار بھی جوانی کی مانند ڈھلتا سایہ ہے۔ مودی جی جب وزیراعلیٰ تھے تو اس وقت بھی اپنے سیر سپاٹے کے ارمان نکال سکتے تھے لیکن گجرات فساد کے سبب امریکہ اور کناڈا نے ان پر پابندی لگادی۔ دیگر مہذب ممالک نے بھی فاصلہ بنا لیا۔ اب صورتحال بدل چکی ہے دنیا بھر کے دروازے کھل گئے ہیں اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھالیا جائے۔ان کی مقبولیت میں واقع ہونے والی کمی کا اعتراف انڈیا ٹوڈے کے حالیہ سروے میں ہوچکا ہے

اور اظہار دہلی کے انتخابی نتائج نے کردیا ہے۔

اس دورے کے دوران پانچ مقامات سے ضمنی انتخاب کے نتائج سامنے آئے۔

مہاراشٹر کے باندرہ میں جہاں چند ماہ قبل سینا اور بی جے پی نے مل کر جملہ ۶۷ ہزار ووٹ حاصل کئے تھے اس بار اقتدار کے باوجود ۵۳ ہزار سے آگے نہ بڑھ سکی جبکہ دونوں کانگریس کا مشترکہ امیدوار ۲۲ ہزار سے ۳۳ ہزار پر پہنچ گیا۔ چرکھاری اترپردیش کی نشست پر جو اوما بھارتی کے حلقۂ انتخاب میں ہے بی جے پی ۳۶ ہزار ووٹ کے فرق سے ہار گئی۔ بی جے پی کے حلیف دو مقامات پر کامیاب رہے لیکن خود اسے ایک سیٹ بھی نہیں ملی۔ اس لئے مودی جی کو چل چلاؤ سے قبل ساری دنیا کی سیر کر لینے کی جلدی ہے۔ان کیحالتبھی اس شعر کے مصداق ہے کہ

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاو
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

پیرس میں جو کچھ ہوااس کی سنگینی پر ذرائع ابلاغ فی الحال خاموش ہے اس لئے کہ دورے کو رنگین بنانے کیلئے جو دولت کی شراب پلائی گئی ہے اس کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ جب خمار اترے گا تو حقائق سامنے آئیں گے لیکن اس موقع پر مودی جی کے نئے بھکت اور بی جے پی کی قومی انتظامیہ کے رکن سبرامنیم سوامی کے بیان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سوامی نے دھمکی دی کہ حکومت

اگر رفالے کا معاہدہ کرتی ہے تو وہ قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ ان کے مطابق لیبیا اور مصر میں رفالے کی کارکردگی دیگر جنگی جہازوں سے خراب رہی ہے اسی لئے کئی ممالک نے اپنے آرڈر منسوخ کردیئے۔ اس جہاز کو بنانے والی کمپنی ڈیسالٹ دیوالیہ ہونے کے درپے ہے اس لئے اس کے ضروری کل پرزوں کی فراہمی بھی مشکل ہے۔ ایسے میں یہ معاہدہ صرف حکومتِ فرانس کی دلجوئی کیلئے کیا جارہا ہے۔ سوامی کے خیال میں اگر فرانس کا تعاون کرنا لازمی ہے تو بہتر ہے ڈیسالٹ کو خرید لیا جائے۔

ڈیسالٹ کے ساتھ کئے جانے والے اس نئے سودے کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو اس کے ذریعہ ٹیکنالوجی ٹرانسفر کیلئے ماضی میں کی گئی ساری کوشش پر پانی پھر گیا اور دوسرے کھلے ٹینڈر کے نتیجے میں جو شفافیت اور مسابقت تھی اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اب یہ حکومت سے حکومت کا معاملہ ہے اس لئے اس پر رازداری کا پردہ پڑ جائیگا۔ ۲۰۰۶ء میں منموہن سنگھ نے ہندوستان کے اندر دفاعی پیداوار کو فروغ دینے کیلئے ایم ایم آر سی اے کے تحت ٹینڈر میں حصہ لینے والی غیر ملکی کمپنیوں کو اپنی تکنیک دینے کا پابند کیا تھا۔ پہلی کھیپ کے بعد بقیہ جہاز اور کل پرزے ہندوستان میں بننے تھے۔ پہلے تو کوئی تیار نہیں تھا۔ چھ سال کی طول طویل جدوجہد کے بعد ۲۰۱۲ء میں ڈیسالٹ اس پر راضی ہوئی۔ اس سودے کی تمام تفصیلات ذرائع ابلاغ میں موجود ہے۔

فروری ۲۰۰۶ء میں اس کام کی ابتداء ہوئی مئی ۲۰۰۸ء میں فرانس حکومت نے یقین دہانی کرائی کہ ڈیسالٹ مکمل تکنیک ہندوستان کے حوالے کرے گا ۲۰۰۹ء میں ڈیسالٹ نے آنا کانی کی تو اس کو برخواست کرنے کی نوبت آگئی۔ اس کے بعد اس نے ٹاٹا اور امبانی سے کل پرزوں اور دیکھ ریکھ کی سودیشی کمپنی بنانے میں تعاون کا وعدہ کیا۔ ۲۰۱۲ء میں سب سے کم دام کی بنیاد پر ڈیسالٹ سے سودہ طے ہوگیا۔ اگست ۲۰۱۴ء میں ارون جیٹلی نے وزیر دفاع کی حیثیت سے ایوان پارلیمان کو یقین دلایا کہ ڈیسالٹ ۱۸ جہاز بہت جلد فراہم کرے گی اور باقی ۱۰۸ اپنے لائسنس والی کمپنیوں سے (ہندوستان کے اندر) بنوا کر آئندہ سات سالوں مہیا کرے گی۔ دسمبر ۲۰۱۴ء میں فرانس کے وزیر دفاع لی دریان نے ہندوستان کے نئے وزیر دفاع منوہر پاریکر سے ملاقات کی اور امید ظاہر کی کہ ڈیسالٹ سودے کی مشکلات تیز رفتاری سے دور کی جائیں گی۔ اس بیچ ائیر بس نے اس کمپنی سے سرمایہ نکالنا شروع کیا اور حکومت فرانس کو اسے سنبھالنے کیلئے آگے آنا پڑا۔ جنوری ۲۰۱۵ء میں حکومت ہند نے ڈیسالٹ کو تنبیہ کی اور اپریل میں اس طرح کا معاہدہ کرلیا اس طرح ایم ایم آر سی اے کے تحت ہندوستان میں جہاز بنانے کا خواب کافور ہوگیا۔ اس فیصلے سے 'میک ان انڈیا' کے نام عوام کو بے وقوف بنانے کا جو کھیل رچایا

جارہا تھا اس کو شدید جھٹکا لگا لیکن اس پر پردہ ڈالنے کیلئے مودی جی نے جرمنی کے ہنوور شہر کی صنعتی نمائش میں 'میک ان انڈیا' کا ڈھول پیٹنا شروع کردیا۔ اگر یہ جہاز ہندوستان میں بنتے تو غیر ملکیوں کو ہندوستان میں آکر سرمایہ کاری کرنے کیلئے منت ساجت کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہنوور کی یہ صنعتی نمائش ہر سال لگتی ہے جس میں دنیا کے کئی ممالک اپنا پیویلین لگاتے ہیں لیکن شاذو نادر ہی کسی ملک کا سربراہ اس میں شرکت کرتا ہے۔ ہندوستان نے بھی اس بار اپنا پیویلین لگایا اور مودی جی اسی موقع پر وہاں پہنچ گئے اس لئے انجیلا مرکل انہیں اپنے ساتھ افتتاح کی تقریب میں لے گئیں۔ اس کے بعد یوں خبر بنائی گئی گویا مودی جی کو اس کا افتتاح کرنے کی دعوت دی گئی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ فرانس کی غلطی پر پردہ پڑ گیا۔

اس دورے میں پہلی مرتبہ مودی جی نے غیر ملکی سرزمین پر قومی سیاست کی بخیہ ادھیڑی جس کے سبب کانگریس کو کہنا پڑا کہ کیا مودی اگلا انتخاب پیرس سے لڑنے والے ہیں؟ جس مودی سرکار نے گرین پیس نامی تنظیم کی پریا پلیئی کو دہلی ایرپورٹ پر یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ اگر وہ برطانیہ میں ہندوستانی کان کنی صنعت پر تنقید کردیں گی تو قوم کی بدنامی ہوگی اسی کے وزیر اعظم نے بار بار اس جرم کا ارتکاب کیا۔ فرانس میں مودی جی نے کہا کہ سابقہ حکومت نے کوئلہ کانوں کے ٹھیکے اس طرح تقسیم کئے جیسے رومال یا قلم تحفہ میں دیا جاتا ہے بلکہ ایسا کرتے ہوئے بھی دیکھا جاتا ہے کہ پانے والا اس کا مستحق

ہے یا نہیں۔ اپنی شیخی بگھارتے ہوئے مودی جی نے کہا ہم نے ان سودوں کو منسوخ کیا حالانکہ وہ کام عدالت نے کیا) جس میں سابق وزیر اعظم کا نام بھی ہے۔ مودی جی) اپنی تقریر میں اس قدر جوش میں آگئے کہ کہنے لگے ہم نے صرف دس فیصد کام کیا ہے اگر پوری میعاد یہ کرتے رہے تو لوگ کہیں گے ۲۵ سال آپ ہی حکومت کریں۔ مودی جی کی خوش فہمیاں اپنی جگہ لیکن لوگ کیا کرنے والے ہیں اس کا اشارہ انہوں نے دہلی کے انتخاب دے دیا ہے۔ ممکن ہے چار سال بعد ان کی حالت زار کی ترجمانی یہ شعر کرے کہ

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

برلن میں مودی جی نے جو مضحکہ خیز تقریر کی اسے سن کر جرمنی کی چانسلر انجیلا مرکل یقیناً ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئی ہوں گی۔ انہوں نے کہا گزشتہ مرتبہ جب میں برلن آیا تھا تو جرمنی نے ورلڈ کپ جیت لیا تھا۔ اس طرح انہوں نے خود یاد دلا دیا انجیلا ان سے ملنے کے بجائے برازیل چلی گئی تھیں۔ مودی جی شاید یہ کہنا چاہتے تھے کہ ان مبارک قدموں کی بدولت جرمنی ورلڈ چمپین بنا یہ اسی طرح کا دعویٰ ہے جو انہوں نے دہلی میں کیا تھا کہ لوگ کہتے ہیں تم اتنے خوش قسمت ہو کہ تمہاری وجہ سے تیل کا بھاؤ گر گیا لیکن اب لوگ مودی جی سے نہیں کہتے کہ تم ایسے بدقسمت ہو کہ تمہارے سبب کسانوں کی فصل تباہ ہو

گئی۔

برلن کے اجتماع میں شرکت کیلئے سبھاش چندر بوس کے پوتے کو ہیمبرگ سے بلایا گیاتا کہ پنڈت نہرو پر کی یہ الزام لگا کر کردار کشی کی جاسکے کہ انہوں سبھاش چندر بوس کے اہل خانہ کی جاسوسی کی تھی۔ ذرائع ابلاغ میں یہ خبر بھی آئی کہ اندرا گاندھی نے خفیہ فائلوں کو نذرِ آتش کیا۔ ملک سے باہراس طرح کی اوچھی سیاست ماضی میں کسی ہندوستانی سیاستداں نے نہیں کھیلی۔ ہندوستانیوں سے خطاب کرتے ہوئےانہوں نے کہامیں جرمن صنعتکاروں کو اپنے ملک کے اندر سرمایہ کاری کی دعوت دینے کیلئے آیا ہوں اور وہ لوگ ہرسال کم ازکم پانچ سیاح ہندوستان بھیجیں تاکہ سیاحت کی صنعت کو فروغ ملے۔ کیا یہ باتیں کسی ایسے ملک کے وزیراعظم کو زیب دیتی ہیں جو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کا دعویدار ہو۔

مودی جی نے جرمنی میں یہ بھی کہاکہ جرمن ریڈیو سے ۱۹۵۰ء کے اندر سنسکرت میں خبریں نشر ہوتی تھیں جبکہ ہمارے ملک میں یہ سیکولرزم کے منافی ہے۔ مودی یا تو تاریخ سے واقف نہیں ہیں یا اوروں کو احمق سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۹۵۶ء کے اندر سنسکرت کمیشن پنڈت نہرو نے قائم کیا اور ۱۹۷۴ء میں اندرا جی نے سنسکرت خبروں کا بلیٹین شروع کیا جبکہ دستور میں سیکولرزم کی شق اس کے بعد میں ڈالی گئی اس کے باوجود سنسکرت بلیٹین جاری رہا۔ اب اگر جرمنی کے لوگ

مودی جی سے پوچھیں ہم نے سنسکرت کو اس زمانے میں زندہ رکھا جبکہ اس کو کوئی پوچھتا نہیں تھا لیکن تمہاری حکومت کے اقتدار میں آتے ہی کیندریہ ودیالیہ سے تعلیمی سال کے وسط میں بزور قوت جرمن زبان کو ہٹا کر سنسکرت مسلط کردی گئی۔ کیا یہ احسان فراموشی نہیں ہے؟

مودی جی میں اگر ذرہ برابر دوراندیشی ہوتی تو وہ مسئلہ کو چھیڑ کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑی نہ مارتے۔ مودی جی سے اگر کوئی پوچھے کہ سنسکرت کی بقاء و ترویج کیلئے ان کی سرکار اور سنگھ پریوار نے کیا کیا؟ تو وہ کیا جواب دیں گے۔ سنسکرت ایک قدیم زبان ہے اور اس کا علمی وادبی سرمایہ بہت وسیع ہے۔ مودی جی اس زبان کو دوبارہ زندہ تو نہیں کرسکتے لیکن اگر وہ سنسکرت کے ادبی سرمایہ کا ترجمہ ہی کروادیں تو یہ ملک و قوم کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی لیکن چونکہ اس طرح کے سنجیدہ کام کرنے سے کوئی سیاسی فائدہ نہیں ہوتا اس لئے مودی جی سے تو کم از کم اس کی توقع کرنا فضول ہے۔

سیاسی اعتبار سے کناڈا ہندوستان کیلئے ایک غیر اہم ملک ہے ۴۲ سال قبل اندراگاندھی نے وہاں کا دورہ کیا تھا اس کے بعد کسی وزیراعظم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کناڈا میں ۱۲ لاکھ ہندی نژاد لوگ بستے ہیں اور ان کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اسی لئے وزیراعظم ہارپر کے لئے مودی جی کے دورے

کی سیاسی اہمیت ہے۔ ہندوستان کے مقابلے چین کے ساتھ کناڈا کے قریبی تعلقات ہیں جس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ۲۰۱۴ء میں چین اور کناڈا کی درآمد و برآمد بلین تھی جبکہ ہندوستان کے ساتھ صرف ۶ بلین کا کاروبار ہوا۔ ایک سروے میں ۷۸ جب کینڈین لوگوں سے پوچھا گیا کہ آپ ہندوستان اور چین کے درمیان تجارت کیلئے کس کو ترجیح دیں گے تو ۵۸ فیصد نے چین کے حق میں رائے دی۔

مودی جی نے گزشتہ سال امریکہ کا دورہ کرکے اپنی شہرت بڑھانے کیلئے کیا کچھ نہیں کیا اس کے باوجود پڑوسی کناڈا میں صرف ۲۲ فیصد لوگ مودی جی کی تصویر کو پہچان سکے اب اس میں کتنا فیصد گھٹا تھا کون جانے؟ کسی زمانے میں کناڈا ہندوستان کو یورینیم فراہم کرتا تھا لیکن ۱۹۷۰ء کے جوہری دھماکوں کے بعد اس نے پابندی لگادی۔ مودی جی کی کوشش ہے کہ یورینیم کی فراہمی پھر سے شروع ہوجائے۔ اس سروے میں جب لوگوں سے دریافت کیا گیا کہ ہندوستان کے تعلق سے آپ کے ذہن میں سب سے پہلے کیا خیال آتا ہے تو نہایت دلچسپ جوابات سامنے آئے۔ ۶۸ فیصد لوگوں نے کہا وہ کثیر آبادی والا ملک ہے۔ ۴۶ فیصد لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خواتین کیلئے غیر محفوظ خطہ ہے۔ ہندوستان کو عظیم جمہوریت سمجھنے والے صرف ۱۲ فیصد اور معاشی پاورہاوس خیال کرنے والوں کی تعداد ۷ فیصد نکلی۔ اس سروے سے عالمی سطح پر میک ان انڈیا والے کاغذی شیر کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ کناڈا کی راجدھانی اوٹاوہ میں گجرات کے فسادات کو لے کر

مظاہرین نے احتجاج بھی کیا۔ ۲۰۰

مودی جی چاہے ساری دنیا میں اپنا شیر دکھاتے پھریں لیکن ان کے دل میں جو عدم تحفظ کا احساس ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس نو دن کے دورے پر جاتے ہوئے بھی انہوں نے کسی کو اپنا قائم مقام بنانے کی جرأت نہیں کی۔ ایسا لگتا ہے کہ وقت کے ساتھ ان کے اندیشوں میں اضافہ ہو رہا ہے اس لئے کہ پہلے تو وہ راجناتھ سنگھ کو اپنا قائم مقام بنا کر جایا کرتے تھے لیکن اب شاید انہیں لگتا ہو کہ کہیں راجناتھ واپسی پر اپنی جگہ خالی کرنے سے انکار نہ کردیں۔ اس بار مودی جی کی غیر موجودگی میں پے درپے نکسلی حملوں کے بعد پارلیمانی بورڈ کی ایک ہنگامی نشست راجناتھ کے گھر پر ہوئی تو یہ موضوع زیر بحث آگیا۔

یہ پوچھے جانے پر کہ کیا راجناتھ سنگھ قائم مقام ہیں تو جواب ملا نہیں۔ جب پوچھا گیا اس نشست کی صدارت کس نے کی تو جواب تھا یہ غیر رسمی ملاقات تھی اس لئے کسی نے صدارت نہیں کی ۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو وزیراعظم اپنے ساتھیوں پر اعتماد نہیں کرتا اس پر قوم کیسے اعتماد کرے؟ بقول دگ وجئے سنگھ یہ عجیب حکومت ہے کہ جب اس کا وزیراعظم ودیشی دورے پر جاتا ہے تو وزیر خارجہ ودیشا میں یعنی حلقہ انتخاب میں ہوتی ہیں اورجب وہ دفاعی سودے کررہا

ہوتا ہے تو وزیر دفاع گوا میں مچھلیاں خرید رہے ہوتے ہیں۔ خیر وہ دن دور نہیں جب خود وزیراعظم بھی وہی سب کر رہے ہوں گے جو فی الحال ان کے وزراء کر رہے ہیں اس لئے کہ

نقش سارے نقش باطل کی طرح مٹ جائیں گے
صفحۂ ہستی پہ اک نقش فنا رہ جائے گا
جادۂ ہستی میں یہ شور و شغب کچھ دیر ہے
ہو کا عالم ہوگا، سونا راستہ رہ جائے گا

پپو پاس ہو گیا اور فیکو فیل ہو گیا

ہندوستانی عوام کی سب سے بڑی تفریح سیاست ہے اور اس کا سب اہم حصہ انتخابات ہیں ۔ وقت کے ساتھ اس کا رنگ ڈھنگ بھی بدلتا رہتا ہے۔ ایک زمانے میں انتخابات کا کارزارِ عمل گلیاں اور میدان ہوتے تھے لیکن اب وہ ٹی وی اور موبائل پر لڑے جاتے ہیں۔ پہلے لوگ تقریر سنتے تھے اب کمنٹس کرتے ہیں ۔ پہلے لوگ نعرے لگاتے تھے اب نعرے گھڑتے ہیں۔ پہلے پوسٹر دیکھے جاتے تھے اب بنائے جاتے ہیں ۔ زمانہ بدل گیا ہے سچ مچ زمانہ بدل گیا۔ پہلے لوگ ارکان پارلیمان سے متاثر ہو کر ان کے مکالمے دوہراتے تھے لیکن اب ارکان ایوان سوشیل میڈیا کے فقروں کا سہارا لیتے ہیں اور ایسا ہی ہوا جب راہل گاندھی کی تقریر میں خلل ڈالنے والے پپو یادو سے وزیر پارلیمانی امور وینکیا نائیڈو نے کہا ''پپو بابو بیٹھ جاؤ'' تو سارے لوگوں کو لگا کہ وہ راہل سے مخاطب ہیں۔

ہندوستانی سیاست کا شاید ہی کوئی ایسا طالب علم ہو جو پپو اور فیکو کو نہیں جانتا ہو۔ راہل گاندھی کی حالیہ تقریر کے بعد اس کہانی میں ایک نیا موڑ آگیا۔ اس موڑ کو سمجھنے کیلئے پہلے کہانی سن لیجیے۔ پپو اور فیکو ایک ساتھ اسکول میں داخل ہوئے۔ انتظامیہ کے سامنے سوال تھا کہ کسے مانیٹر بنایا جائے؟

وہ ان دونوں کو کھیل کے میدان میں لے آیا۔ یہاں پر فیکو نے خوب قلابازیاں دکھائیں پپو سے وہ کرتب نہ ہوسکے اس طرح فیکو مانیٹر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد جب پڑھائی شروع ہوئی تو فیکو کا دل کلاس میں نہیں لگتا تھا وہ کبھی لٹو گھما رہا ہوتا تو کبھی کنچیاں کھیلتا نظر آتا۔ کبھی گلی ڈنڈا لیکر کسی جانب نکل پڑتا تو کبھی کبڈی کے میدان میں شور مچاتا۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ امتحان قریب آئے تو پپو غائب ہو گیا ۔ فیکو نے سوچا میدان صاف ہے لیکن امتحان والے دن پپو اچانک نمودار ہوگیا اور اس نے پیپر میں کچھ ایسے گل کھلائے کہ فیکو بیچارہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس طرح پپو پاس اور فیکو فیل ہوگیا۔

وزیر اعظم نریندر مودی نے گجرات میں کیا کچھ کارنامے انجام دیئے اس کے بارے میں جو بھی جھوٹ اور سچ اخبارات میں چھپتا رہا ہے اس میں ان کی ایوان اسمبلی کی کسی کارکردگی کا کوئی ذکر نہیں ملتا سوائے شاہ اور کندنانی کے وزیر بنانے اور ہٹانے کے ۔ مایا کندنانی کے خلاف نرودہ پاٹیہ کے فسادات میں عملاً ملوث ہونے کے سنگین الزامات تھے ۔ اس کے باوجود اقتدار کے نشے میں چور نریندر مودی نے عورتوان اور بچوں کی اس قاتل کو وزیر برائے بہبود طفلو خواتین بنادیا۔ بعد میں جب عدالت کی پھٹکار پڑی تو اسے ہٹانا پڑا۔ یہی حال امیت شاہ کا تھا کہ سہراب الدین کے قتل میں ملوث ہونے کے باوجود اور ہفتہ وصولی

کے سنگین الزامات کے بعد انہیں وزیر داخلہ بنائے رکھا گیا لیکن جب عدالت نے گجرات سے تڑی پار کیا تو مجبوراً ہٹانا پڑا۔

ان دو کارناموں کے علی الرغم ایک ڈکٹیٹر کی مانند لوہے کی چھڑی ہاتھ میں لے کر انھوں نے بارہ سال حکومت کی۔ دہلی میں آنے کے بعد ایوان پارلیمان میں انھوں نہ کوئی معقول تجویز پیش کی اور نہ اچھی تقریر کی بلکہ گھر واپسی کے بعد جب وزیر اعظم کی ایوان میں واپسی کا شور بلند ہوا تو بادلِ ناخواستہ اجلاس میں تشریف لائے ۔ اس دوران عوام نے انہیں اکثر و بیشتر ناچنے گانے والوں کے ساتھ اچھلتے کودتے ہی دیکھا۔ اندرونِ ملک مودی جی نے صرف ان ریاستوں کا دورہ کیا جہاں انتخابات ہونے تھے ۔ ایک آدھ بار اپنے حلقۂ انتخاب سے بھی ہو آئے باقی وقت بیرونِ ملک سیر و سیاحت میں صرف ہوا۔ گزشتہ سرکار کے تیار کردہ معاہدوں پر دستخط کرنا اور اس پر لعن طعن کرنا یہ مودی جی کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔

ایوان پارلیمان کے بجٹ اجلاس کے دوسرے حصے سے قبل جب کانگریس نے کسان ریلی کا اعلان کیا اور راہل نے واپسی کے بعد کسانوں سے ملاقات کی تو اچانک مودی جی کو پیر کے نیچے سے ریت کے کھسکنے کا احساس ہوا اور انھوں نے ارکان پارلیمان کیلئے ایک تربیتی اجتماع کا اہتمام فرمایا۔ مودی جی ان کے سامنے

یہ انکشاف کیا کہ یہ امیروں کی نہیں بلکہ غریبوں کی سرکار ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی یہ غریبوں کی سرکار ہے تو حکومت میں شامل ارکان کو یہ بتانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان کو یہ تو نہیں بتانا پڑتا کہ یہ این ڈی اے کی سرکار ہے اس لئے کہ وہ سب اساطہر منا لشمسحقیقت سے واقف ہیں اسی طرح وہ اس بات سے کیوں واقف نہیں ہیں کہ یہ سرکار کس کی ہے اور کس کی نہیں ہے؟ عوام کو کسی نے نہیں بتایا کہ یہ کارپوریٹ کی سرکار ہے لیکن انہیں پتہ چل گیا اس لئے کہ بقول غالب

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مودی جی نے ارکان پارلیمان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ عوام کے پاس جاکر حکومت کے کارنامے بیان کریں۔ سرکار ان کی فلاح و بہبود کیلئے جو کچھ کررہی ہے اس کا انہیں پتہ نہیں چل رہا ہے۔ یہ عجیب احمقانہ منطق ہے مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ لوگ دھوپ میں کھڑے ہیں کوئی ان کے سرپر سائبان باندھ دے اور اسے معلوم نہ ہو۔ ہاں اگر آپ سائبان کو باندھے بغیر ان کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اب وہ دھوپ میں نہیں سائے میں ہیں تو یہ مشکل کام ہے۔ اس لئے مودی جی کو چاہیے کہ وہ زعفرانی رنگ کا سہی مگر سائبان تو کھڑا کریں عوام کو خود ہی پتہ چل جائیگا ورنہ اگر ارکان پارلیمان ان کی نصیحت پر عمل کریں گے تو

لوگ انہیں پاگل خانے میں لے جاکر جمع کردیں گے۔ مودی جی نے اس اجلاس میں یہ بھی کہہ دیا کہ ملک کیلئے ایک طاقتور حزب اختلاف ضروری ہے۔ چونکہ ان کا ابھی تک گجرات یا دہلی میں طاقتور حزب اختلاف سے پالا نہیں پڑا اس لئے وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ امید ہے راہل گاندھی کی حالیہ تقریر اور تحویل اراضی بل کے بار بار ناکام ہو جانے سے انہیں اندازہ ہو جائیگا۔

اس بار کانگریس نے پارلیمانی اجلاس سے قبل دہلی کے رام لیلا میدان میں کسان ریلی کا اہتمام کیا۔ اس ریلی میں تقریباً پچاس ہزار کسانوں کو دیکھ کر منموہن سنگھ خوش ہو گئے اور انہوں نے وہاں موجود کسانوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔ دہلی کے اندر نہ کھیت بچے ہیں اور نہ کسان چہار جانب کانکریٹ کا ایک جنگل آباد ہے۔ دہلی کے آس پاس تمام ریاستوں میں غیر کانگریسی حکومتیں ہیں اس لئے اس ریلی کے حوالے سے بڑی مایوسی کا اظہار کیا جارہا تھا لیکن بھلا ہو مودی جی کی کسان دشمن پالیسیوں کا جو اتنی بڑی تعداد میں کسانوں کو اس ریلی میں لے آئی۔ انتخاب سے قبل جس طرح کانگریس سے بیزار لوگ بی جے پی کے جلسوں میں آتے تھے اب کانگریس کے جلسوں میں آنے لگے ہیں۔ عوام کا بھلا کوئی نہیں کرتا لیکن ان کو اہل اقتدار سے توقع ہوتی ہے اور جب وہ پوری نہیں ہوتی تو وہ دوسری جانب نکل جاتے ہیں۔ اس طرح گویا یہ سیاستداں

نادانستہ طور پر ایک دوسرے کا بھلا کرتے ہیں عوام تو یونہی دونوں سروں کے درمیان پنڈولم کی مانند جھولے کھاتے رہتے ہیں۔

پارلیمانی اجلاس کی ابتداء میں کانگریسیوں نے سونیا گاندھی کے خلاف گری راج سنگھ کے بیان پر اعتراض کیا۔ بی جے پی غالباً اس کیلئے تیار ہو کر آئی تھی اس لئے اس نے فوراً گری راج سنگھ سے معافی مانگنے کیلئے کہہ دیا لیکن کانگریسی نہیں مانے ان کا کہنا تھا چونکہ گری راج سنگھ وزیر ہیں اور وزیراعظم حکومت کے سربراہ ہیں اسلئے انہیں اپنا موقف واضح کرکے معذرت طلب کرنی چاہیے۔ بی جے پی اس کیلئے تیار نہیں تھی اس لئے کانگریسی ایوان سے باہر نکل آئے اور اجلاس عارضی طور پر معطل کردیا گیا۔ اس کے بعد جب واپسی ہوئی تو راہل گاندھی نے حزب اختلاف کے رہنما کی حیثیت سے ۱۶ ویں لوک سبھا میں اپنا پہلا خطاب پیش کیا اور ۱۵ منٹ کے اندر بازی الٹ دی۔

راہل نے جب اپنی تقریر کی ابتداء انگریزی میں کی تو حکمراں جماعت کی میزوں سے شور بلند ہوا ہندی میں ۔ راہل نے برجستہ جواب دیا فکر نہ کریں ہندی میں بھی بولوں گا۔ اس کے بعد راہل ہندی میں آئے۔ انہوں نے جب بار بار کہا آپ کے وزیراعظم تو اعتراض کیا گیا وہ دیش کے وزیراعظم ہیں اس وقت بھی راہل نے رک کر کہا ہاں ہاں دیش کے وزیراعظم ۔ اگر آپ انہیں اپنا وزیراعظم نہیں

سمجھتے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ راہل گاندھی سے اس طرح کی برجستگی کو توقع بی جے پی والے تو کجا کانگریس بھی نہیں کررہی تھی۔ اس کے بعد جب راہل نے مودی جی کے مہنگے کوٹ کا ذکر کیا تو پھر ہنگامہ ہوگیا اس پر راہل نے مسکرا کر کہا جی ہاں چونکہ آپ لوگ اسے نیلام کرچکے ہیں میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ اب خوش ۔ مودی جی بہت اچھے خطیب ضرور ہیں لیکن اس طرح کی حاضر جوابی کا مظاہرہ وہ ابھی تک تو نہیں کرسکے آگے کیا ہوگا کون جانے ؟

راہل گاندھی کی تقریر میں ''یہ سوٹ بوٹ والی سرکار ہے'' والا فقرہ ضرب المثل بن گیا اوراسے '' اچھے دن'' کی مانند یاد رکھا جائیگا۔ راجیو گاندھی نے بی جے پی پر الزام لگایا کہ اس نے انتخاب جیتنے کیلئے جن صنعتکاروں سے رقم لی تھی اب اس کی بھرپائی کررہی ہے۔ وہ ان کی خوشنودی کیلئے کسانوں کی زمین چھین لینا چاہتی ہے۔ راہل گاندھی نے اس معاملے میں ماہرین زراعت ،وزارت زراعت اور مودی جی کے ذریعہ پیش کردہ اعدادوشمار کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کا ذکر کیا اور پوچھا کہ آخر کون جھوٹ بول رہا ہے؟ راہل گاندھی نے مودی جی سے سوال کیا کہ وہ خود کسانوں سے بات کیوں نہیں کرتے ؟ اس پر حزب اختلاف کی جانب سے شور بلند ہوا وزیراعظم کو غیر ملکی دوروں سے فرصت کہاں ہے؟ اس سوال کا کوئی جواب حزب اقتدار کے پاس نہیں تھا۔

راہل گاندھی کی تقریر اپنے شباب پر اس وقت پہنچی جب مرکزی وزیر نتن گڈکری کی تعریف کرتے ہوئے وہ بولے اس سرکار میں نتن جی واحد آدمی ہیں جو دل کی بات کہتے ہیں۔ اس فقرے میں مودی جی ماہانہ نشر ہونے والی من کی بات پر طنز چھپا تھا۔۔ اس کے بعد راہل نے گڈکری کے اس بیان کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے یہ کہا کہ کسانوں کی مدد کوئی نہیں کرسکتا نہ بھگوان اور نہ سرکار۔ راہل نے کہا اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کسانوں کی بابت کس قدر غیر حساس ہے۔اس طرح گویا انھوں نے زعفرانی ڈنڈے سے حکومت دھنائی کردی۔ نتن گڈکری کے اس بیان کا بین ثبوت خود ان کی اپنی ریاست مہاراشٹر کے اندر بی جے پی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد گزشتہ تین ماہ میں کسانوں کی خودکشی ہے۔ اس پر مدھیہ پردیش میں بی جے پی وزیر وجئے ورگیا کا ۱۰۶ بیان کہ کسان فصل کی تباہی کے سبب نہیں بلکہ اپنے نجی مسائل کی وجہ سے خودکشی کررہے ہیں کسانوں کے زخموں پر نمک پاشی ہے۔

ایسا نہیں ہے کسان ناراض ہیں اور کارپوریٹ خوش ہے بلکہ وہاں بھی حکومت کے تئیں شدید بے چینی پائی جاتی۔ اس کا ایک ثبوت تو بجٹ اجلاس کے پہلے ہی دن سنسکس کا پوائنٹس نیچے گرنا ہے جو گزشتہ چار سیشنس میں ۱۱۶۰ پوائنٹس گرا ہے۔یہ ۵۵۶ گراوٹ سرمایہ کاروں کے عدم اطمینان کی واضح علامت ہے۔ اس پر رتن ٹاٹا کا بیان کہ صنعتکار اس حکومت سے اس قدر جلد مایوس نہ ہوں اور اسے کام

کرنے کا مزید موقع دیں بلکہ اس کے ساتھ تعاون کریں۔ اس بیان میں ایک پیغام تو یہ ہے کہ ملک کا سرمایہ دار مایوس ہو رہا ہے ورنہ اس نصیحت کی چنداں ضرورت نہیں تھی ۔ دوسرے سرمایہ داروں کو حکومت سے تعاون کی تلقین کرنا اس امر کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ فی الحال وہ ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ ایچ ڈی ایف سی کے سربراہ دیپک پاریکھ اور ماریکو کے ہرش ماریوالا بھی اپنے عدم اطمینان کا اظہار کر چکے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قدر جلدی مودی جی نے کارپوریٹ دنیا کو کیسے مایوس کر دیا اور کیا وہ اداسی رتن ٹاٹا کی پندو نصائح سے دور ہو جائیگی یا اس کیلئے حکومت کو بھی کچھ کرنا ہوگا؟

مذکورہ بے اطمینانی کی کئی وجوہات ہیں اول تو مودی جی نے جوش خطابت میں صنعتکاروں کو کچھ زیادہ ہی سبز خواب دکھلا دیئے تھے نیز ان کی نظر عنایت جس طرح اڈانی اور امبانی تک محدود ہے اس سے بھی دیگر لوگوں کی ناراضگی فطری ہے۔ اس پر ان کے وزراء کی نااہلی بھی گل کھلا رہی ہے جس کا ثبوت بجٹ سے قبل نئے انکم ٹیکس فارم کا پیش ہونا اور پھر اسے واپس لے لینا ہے۔ وزیر خزانہ ارون جیٹلی اگر اس فارم کو جاری کرنے سے قبل ماہرین کو دکھلا دیتے تو ہزیمت سے بچ جاتے لیکن حکومت کرنے کا فن بی جے پی کو نہ پہلے کبھی آیا تھا اور شاید نہ آگے کبھی آئے۔

بی جے پی کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ راہل گاندھی کے مشورے پر سنجیدگی سے عمل کرے جو انہوں نے مودی جی کو دیا ہے۔ راہل نے کہا مودی جی اس قدر ماہر سیاستداں ہیں اس کے باوجود وہ مٹھی بھر سرمایہ داروں کی دلجوئی کیلئے ۶۰ فیصد کسانوں اور مزدوروں کو نظرانداز کررہے ہیں۔ جب کسان ان کی جانب سے نظر پھیر لیں گے تو یہ سودہ ان کو مہنگا پڑے گا لیکن جو شخص خودپسندی کے مرض میں مبتلا ہو وہ بھلا کسی بات پر کب توجہ دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ دن بدن مودی جی کی حالت ''نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ''کی سی ہوتی جارہی ہے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ جس ملاح نے زعفرانی ناؤ پار لگائی تھی وہی اس کو ڈبونے پر تلا ہوا ہے۔

راہل کی تقریر کا نزلہ مودی جی نے گری راج سنگھ پر اتارا اور انہیں کمرے میں بلا کر اس طرح پھٹکارہ کہ وہ روپڑے۔ وینکیا نائیڈو نے راہل کی تقریر کو شیطان کے وعظ سے تعبیر کیا حالانکہ جب راہل سے اخبار نویسوں نے پوچھا کیا آپ کی جانب کھڑے کئے جانے والے سوالات کے جواب مل گئے تو ان کا کہنا تھا یہ حکومت مسائل کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتی۔ وینکیا نائیڈو نے یہ بھی کہا کہ کانگریس کسانوں کے مسائل پر صرف باتیں کرتی رہی ہے اسی لئے وہ حزب اختلاف میں ہے اور ہم سرکار میں۔ نائیڈو کو یاد رکھنا چاہیے

کہ ان کی حکومت بھی کانگریس کے نقش قدم چل رہی ہے اس لئے ممکن ہے بہت جلد کانگریسیوں کو ان کا جملہ دوہرانے کا موقع مل جائے کیوں کہ کسانوں کی نہ بی جے پی سے رشتہداری ہے اور نہ وہ کانگریس کے رشتے دار ہیں۔

جانتا ہوں میں یہ لاشوں کی سیاست چلن

’’دہلی کے اندر ایک کسان گجندر سنگھ نے سرِ عام خود کشی کر لی‘‘۔ یہ ایک اندوہناک واقعہ ہے لیکن اس سے زیادہ شرمناک بات یہ کہ ہمارے سیاست داں اس پر بھی سیاست کرنے سے باز نہیں آئے۔ گجندر دہلی میں دوسا (راجستھان) سے عام آدمی پارٹی کی کسان ریلی میں شریک ہونے کیلئے آیا تھا۔ اس لئے بی جے پی نے اروند کیجریوال کو اس حادثے کیلئے ذمہ دار ٹھہرادیا۔ کانگریس نے نہ صرف عاپ بلکہ بی جے پی کی کسان مخالف پالیسی پر سوال اٹھائے؟ اور کیجریوال کے ساتھ ساتھ مودی پر بھی مقدمہ دائر کرنے کا مطالبہ کردیا لیکن عام آدمی پارٹی نے جو کچھ کیا وہ تمام ہی اخلاقی حدود کو پھلانگنے والا تھا۔

گجندر سنگھ جنتر منتر پر ہونے والے جلسے میں اسٹیج کے قریب پیڑ پر چڑھا ہوا تھا۔ اس کو عاپ کے سکریٹری سنجے سنگھ نے دیکھا اور نیچے آنے کی درخواست کی ۔ گجندر سنگھ نے سنجے سنگھ کا مشورہ مسترد کردیا۔ پرشانت بھوشن یا یوگیندر یادو کی مانند سنجے سنگھنے اس پر کوئی کارروائی نہیں کی اس لئے کہ وہ نافرمان تو تھا مگر باغی نہیں تھا۔ اس جلسے کیلئے عاپ نے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اس لئے کہ فی الحال دہلی میں جھاڑو کا بول بالا ہے۔ اس کے باوجود پولس کمشنر وجئے سنگھ کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ اس مظاہرے میں

ہزار لوگ شریک ہوں گے اس لئے انہوں نے اس کو رام لیلا میدان میں منتقل کرنے کا مشورہ دیا لیکن آج کل کیجریوال جی کسی کی نہیں سننے کی نہیں بلکہ صرف بولنے کے قائل ہیں۔ خیر بھلا ہو کیجریوال کی عدم مقبولیت کا جو صرف ۳ ہزار لوگ اس ریلی میں آئے اور وہ بھی دہلی سے نہیں بلکہ پنجاب سے لے کر مہاراشٹر تک کے لوگ ان میں شامل تھے۔ ان اعداد و شمار سے دہلی کے اندر عاپ سے عوام کی بیزاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عاپ کے سب سے تیز طرار مقرر کمار وشواس جب تقریر کر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ کوئی پیڑ سے لٹکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہوں نے اس شخص کو نیچے آنے کی تلقین کی۔ جب سنجے سنگھ نے دیکھا کمار وشواس جیسے مسخرے شاعر سے بات نہیں بن پا رہی ہے تو انہوں نے خود مائک سنبھال لیا اور پولس کو مدد کیلئے بلانے لگے۔ پولس والے جو پاس کھڑے تھے اس حادثے کی تفصیلا اپنے واکی ٹاکی پر نہ جانے کس کو بتاتے رہے لیکن مدد کیلئے آگے نہیں آئے۔ ہمارے ملک کی پولس اس قدر نظم ضبط کی پابند ہے کہ اس وقت تک حرکت میں نہیں آتی جب تک کہ اعلیٰ افسران اس کا حکم نہ دیں۔ اعلیٰ افسر اس وقت حکم نہیں دیتے جبتک کہ ان کے پاس شکایت درج نہ کرائی جائے اور اسے رشوت یا سیاست کے دباؤ سے زیر بار نہ کیا جائے۔

اس موقع پر عاپ کے کسی رہنما نے اسٹیجسے نیچے آنے کی زحمت نہیں کی ۔ وزیراعلیٰ اور نائب وزیراعلیٰ کو فراہم کردہ حفاظتی دستہ بھی خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ ان کو کسی نے حکم دیا کہ وہ مدد کیلئے جائے اور نہ انہوں نے خود اجازت طلب کی کہ ایک عام آدمی کی جان کو بچایا جاسکے۔ بالآخر عام آدمی کی مدد کیلئے عام آدمی آگے آیا۔ تین لوگ اوپر پیڑ پر چڑھ گئے اور چار نیچے چادر تان کر کھڑے ہوگئے۔ سنجے سنگھ وہاں موجود خاموش تماشائیوں کو اپنی جگہ اطمینان وسکون کے ساتھ بیٹھے رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ اوپر چڑھنے والوں سے جب پھندا نہ کھلا تو انہوں نے اسے کاٹ کر گجندر کو نیچے گرا دیا۔ گجندر کے جسم کا وزن نیچے والوں کی چادر سنبھال نہ سکی اور وہ پھٹ گئی۔ گجندر کی لاش زمین بوس ہو گئی ۔ عاشرکائے جلسہ گجندر کو لے کر رام منوہر لوہیا اسپتال چلے گئے جہاں ڈاکٹروں نے انہیں مردہ قرار دے دیا۔

جنترمنتر پر یہ ہنگامہ ۱۵تا۲۰ منٹ چلا اور اس کے بعد سب کچھ معمول پر آگیا۔ جلسے کی کارروائی ایسے آگے بڑھی اور اگلے ۸۷ منٹ تک چلتی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جب سارے مقرر نمٹ گئے تو نائب وزیراعلیٰ منیش سسودیہ کو دعوت سخن دی گئی انہوں نے اعلان کیا کہ وہ جلسے کے بعد اسپتال جائیں گے اور اس کے بعد مہمان اساتذہ کے مسئلہ پر بولنے لگے۔ انتخاب سے قبل ان اساتذہ کو مستقل کرنے کا وعدہ کرکے عاپ نے کیا تھا لیکن اب اپنے وعدے سے صاف مکر گئی۔ یہ

بیچارے جب اروند کیجریوال کے خلاف نعرے لگانے لگے کہ کیجریوال ہوش میں آو تو وہاں موجود دسا معین نے ان کا ساتھ دینے کے بجائے انہیں مودی کے چمچے قرار دے دیا اور نعرے بازی کا تصادم شروع ہوگیا۔

شمع محفل جب گھوم پھر کر پروانے یعنی اروند کیجریوال کے سامنے آئی تو لوگ غالباً اس سانحہ کے سبب بھول گئے کہ انہیں تالیوں کے ساتھ اپنے چہیتے رہنما کا استقبال کرنا چاہیے ایسے میں کمار واشواس نے موجود سامعین کی یاددہانی کروائی اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں کیجریوال نے اس سانحہ کیلئے دہلی پولس کو موردِ الزام ٹھہرادیا اور حاضرین کو یاد دلایا کہ دہلی پولس ان کے نہیں بلکہ مرکزی حکومت اختیار میں ہے اس لئے بی جے پی پر اس کیلئے ذمہ دار ہے۔ کیجریوال یہ بتانے سے بھی نہیں چوکے کہ گجندر سنگھ راجستھان سے مایوس ہو کر خودکشی کرنے کیلئے دہلی آیا تھا اور وہاں بھی وجئے راجے سندھیا برسرِ اقتدار ہے اس لئے بی جے پی کی دوہری ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد عآپ کے مختلف رہنماوں نے آگے بڑھ کر اروند کیجریوال کو بھی شرمندہ کردیا۔ سومناتھ بھارتی نے ٹویٹ کیا کہ یہ سیاسی سازش ہے جب اس پر وبال مچا تو رجوع فرمالیا۔ معروف صحافی اسوتوش نے کہا ہم دیوار اٹھانے کی تربیت سے محروم ہیں اور پھر طنز کیا کہ جی ہاں کیجریوال کو پیڑ پر چڑھ جانا

چاہیے تھا۔ ان کو بھی بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو معذرت چاہ لی ۔ سنجے سنگھ سے بھلا کب صبر ہونے والا تھا جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ لوگوں نے اپنا جلسہ معطل کیوں نہیں کیا تو انہوں بڑی بے حیائی سے یاددلایا کہ مودی جی بھی تو پٹنہ میں دھماکے باوجود تقریر کرکے لوٹے تھے گویا سنگھ صاحب نے تسلیم کرلیا کہ اب ان لوگوں نے بھی مودی جی کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ کرلیا ہے اس لئے کہ جمہوریت کی دیوی اسی راہ پر چلنے والوں کے سرپر تاج سجاتی ہے۔ آج مودی جی وزیر اعظم ہیں کل کیجریوال ہو جائیں گے لیکن ملک غریب کسان کی تقدیر نہیں بدلے گی وہ آج بھی خود کشی کرتا ہے اور کل بھی فاقہ مست رہے گا۔

اس حادثہ پر احتجاج کا بھی سلسلہ چل نکلا ۔ راہل گاندھی اسپتال پہنچ گئے اور اس کو معاملے تحویل اراضی قانون سے جوڑ دیا۔ کانگریسی کیجریوال کے گھر جاپہنچے اور وہاں پتلا نذرِ آتش کرآئے۔ بی جے پی والے نے اپنا دامن جھٹکنے کیلئے پولس دفتر سامنے مظاہرہ کیا اوروہاں موجود حفاظتی دستوں کے پانی والے فواروں سے اپنا تن من ٹھنڈا کرکے لوٹے۔ تمام حزب اختلاف نے ایک آواز ہو کر ایوانِ پارلیمان میں یہ مسئلہ اٹھایا اور بی جے پی نے بھی اس پر صاد کہا۔ وزیر اعظم سے بیان کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے ایک پھسپھسا بیان دے ڈالا۔ اپنے ٹویٹ میں کہا ہم کسان کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لئے کہ اناج

تو برآمد کیا جا سکتا ہے لیکن ووٹ نہیں ۔

راجستھان کی وزیر اعلیٰ وجئے راجے سندھیا نے کہا ہم ہر صورت میں کسان کے ساتھ ہیں لیکن ان کے ساتھی بی جے پی رکن پارلیمان سمیندھانند سرسوتی نے نہایت دلچسپ بیان دے دیا۔ وہ بولے ہماری ریاست کے کسان صبر و ضبط کیلئے ساری دنیا میں مشہور ہیں ۔ وہ مسلسل ۱۵ سالوں تک قحط کا سامنا کرنے کے باوجود مایوس نہیں ہوتے ۔ اس لئے یہ پتہ کرنا پڑے گا کہ کیا عآپ کی ریلی میں موجود لوگوں نے اسے ہیجان کا شکار کردیا تھا یا خودکشی کے پیچھے کچھ اور عوامل کارفرما تھے۔ سرسوتی جیسے لوگ نہ جانے کس دور میں جی رہے ہیں اس لیے کہ گجندر کی چتا جلنے سے قبل ایک اور کسان نے راجستھان ہی میں ریلوے پٹری پر کود کر خودکشی کرلی ۔

الور کے رہنے والے ہرسک لال جاٹو نے بنک سے قرض لے کر کھیتی کی مگر فصل تباہ ہو گئی ۔ وہ چند بورے گیہوں لے کر گھر آیا اور اسے دیکھتا رہا غالباً سوچتا رہا کہ اس پر سال بھر گزارہ کیسے ہوگا ؟ اس غریب کو نہیں پتہ تھا کہ ریاستی وزیر اعلیٰ اس کے ساتھ ہیں اور وزیر اعظم اس کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اسے تو لگا کہ اب بنک والے اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اس لئے اس نے ان کے ہاتھوں قتل ہونے کے بجائے از خود چلتی ٹرین کے سامنے چھلانگ لگا کر خود کو

ہلاک کر دیا۔ ہرسک لال کی موت چونکہ ایک دیہات میں ہوئی اس لئے اس پر کسی کو سیاست کرنے ضرورت نہیں پیش آئی مگر گجندر کی موت کے نت نئے زاویئے ظاہر ہونے لگے۔

ایک بات تو یہ سامنے آئی کہ اس کی کھیت کا نقصان بہت کم ہوا ہے۔ دوسرے اس کی اور بھی کھیتی باڑی ہے۔ اس نے کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ جلسہ میں اپنی خالا سے یہ کہہ کر گیا تھا کہ شام کھانے پر آئے گا۔ اپنے بھائی کو فون کرکے کہا ٹی وی پر دیکھو میں نظر آوں گا۔ اپنی بہن سے کہا کہ واپس آکر اس کو فرنیچر دلانے کیلئے لے کر جائیگا۔ وہ بلند حوصلہ، آرزومند اور خوش مزاج طبیعت کا انسان تھا۔ دو مرتبہ اسمبلی انتخاب لڑ چکا تھا۔ سسودیہ کے بلانے پر دہلی آیا تھا اور ملاقات بھی کی۔ وہ پیڑ کے اوپر جھاڑو لے کر چڑھا تھا۔ وہاں سے بی جے پی کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کی خودکشی والی چٹھی بھی مل گئی اور اس کے گھر والوں نے یہ کہہ دیا اس کا خوشخط اس وصیت سے مختلف تھا اور عآپ کے مقامی لوگوں پر شک کا اظہار کر دیا۔

حالات اسی طرح سے موڑ لے رہے ہیں جیسا کہ ۱۹۹۰ء میں منڈل کمیشن کی سفارشات کے لاگو ہونے کے بعد ہوئے تھے۔ سب سے پہلے راجیو گوسوامی نے دہلی میں خودسوزی کی کوشش کی اور وہ بچا لیا گیا لیکن اس کے بعد سریندر سنگھ چوہان

نے خود کو نذرِ آتش کرلیا اور ملک بھر میں اس طرح کے کئی واقعات رونما ہوئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ان میں اکثر نوجوانوں کو ہجوم نے زندہ جلا دیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ منڈل کی آگ نے وی پی سنگھ کی سرکار کو بھسم کردیا۔ سیاست کا یہ کھیل نیا نہیں ہے اور نہ صرف شمالی ہندوستان میں بلکہ جنوب میں بھی مختلف انداز میں کھیلا جاتا ہے۔ اس کی ایک نہایت کریہہ مثال حیدرآباد میں سامنے آئی۔

۷ اپریل کو ۵ زیر حراست قیدی وقار احمد، سید امجد علی، محمد ذاکر، ڈاکٹر محمد حنیف اور اظہار خان کو آلیر اور جنگاؤں کے درمیان پولیس نے حیدرآباد کی عدالت کو منتقلی کے دوران فرضی انکاؤنٹر میں ہلاک کردیا۔ اس انکاؤنٹر کی بنیادی وجہ نام نہاد سیمی کے کارکنوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے تین پولیس ملازمین کے خون کا بدلہ لینا تھا۔ اس کے باوجود شہر حیدرآباد میں نہ تو وزیر اعلیٰ کے گھر کے باہر اور نہ پولس دفتر کے سامنے کوئی مظاہرہ ہوا۔ ایوان پارلیمان میں کیرالہ کے ای عبداللہ نے تو اس کا ذکر کیا لیکن اتحادالمسلمین کے اسدالدین اویسی اپنی زبان پر قفل لگائے رہے۔ ان کے اخبار اعتماد نے ارباب اقتدار کو گھیرنے کے بجائے ان کی وکالت اس طرح سے کی کہ پولس میں موجود زعفرانی عناصر وزیر اعلیٰ کو بدنام کرنے کیلئے یہ سب کررہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ چندر شیکھر راؤ اگر واقعی ایسے نیک نام ہیں تو وہ خاطی پولس والوں کا بچاؤ کرنے کے بجائے ان کو سزا کیوں نہیں دیتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس جماعت کو ان معصوموں کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا چاہیے وہ ریاستی حکومت کے ساتھ سیاسی سودے بازی میں لگی ہوئی ہے۔ حیدرآباد کے سیاست اخبار میں شائع شدہ خبر کے مطابق ایم آئی ایم دو وزراء اور وقف بورڈ کی صدارت کیلئے بھاؤ مول کرنے میں مصروف ہے۔ لاشوں کے اس بیوپار کے باوجود مہاراشٹر کے مسلمانوں نے اورنگ آباد کے بلدیاتی انتخابات اسی جماعت پر اعتماد کا اظہار کردیا۔ جو قوم اپنے دوست اور دشمن میں فرق نہیں کرتی اور بار بار ایک ہی بلِ سے ڈسی جاتی ہے اس کے نہ نوجوانوں کا انکاؤنٹر ہوتا ہے اوراس کے کسان خودکشی کرتے ہیں۔

سنتے ہیں خوشی بھی ہے زمانے میں کوئی چیز

نیپال میں آنے والے بھیانک زلزلے اور شمالی ہندوستان میں محسوس ہونے والے اس کے اثرات سے ہر کوئی بجا طور پر غمگین ہے۔ ذرائع ابلاغ میں نظر آنے والی تصاویر خون کے آنسو رلاتی ہیں اور ہر کس نا کس کو زلزلے کی زد میں آنے والوں کے غم میں شریک کرتی ہیں ۔ عام لوگ تو متاثرین کیلئے صرف دعا گو ہیں مگر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو میدانِ عمل میں اتر کر ریلیف کے کام کر رہے ہیں۔ان کے علاوہ جو دامے درہے سخنے قدمے اس کارِ عظیم میں اپنا حصہ بٹا رہے ہیں وہ بھی قابلِ تحسین ہیں ۔ اس غم واندوہ کے ماحول میں بھارتی کوہ پیما سنگیتا بہل کا اپنے خاوند انکور بہل سے رابطہ ٹوٹ گیا جو زلزلہ سے قبل ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے مگر جب دو روز کی تشویشناک پریشانی کے بعد سنگیتا کو ان کے شوہر انکور نے فون پر بتایا کہ وہ خیریت سے ہیں تو انھوں نے چین کا سانس لیا اور خوشی کا اظہار کیا۔ انکور نے بھی ٹائمز کے نامہ نگار سے کہا ہم خوش قسمت ہیں جو زندہ بچ گیا اس لئے کہ زلزلہ کے وقت وہ تقریباً ۲۰ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے ۔ اور وہاں کسی مدد کا پہنچنا بظاہر ناممکن تھا لیکن بفضلِ تعالیٰ ہیلی کاپٹر کے ذریعہ انہیں واپس لے آیا گیا۔ اس صورتحال میں سنگیتا

ے (کی کیفیت فیض کے ان اشعار کی سی ہو گئی ہے (ترمیم میں معذرت کے ساتھ

رات یوں گھر میں ترا کھویا ہوا فون آیا
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراوں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

تباہی و بربادی کے اس قیامت صغریٰ میں سنگیتا اور انکور کو خوش دیکھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ خوشی کیا چیز ہے جو اس حالت میں میسر آجاتی ہے ؟ خوشی کی روایتی تعریف تلاش کرنے کیلئے اگر دائرۃ المعارف سے رجوع کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ایسے احساس کا نام ہے کہ جس میں اطمینان، تسلی، تشفی، محبت اور فرحتومسرتکی کیفیات اجاگر ہوتی ہوں۔ خوشی کی متعدد نفسیاتی، حیاتیاتی و مذہبی تعریفیں موجودہیں لیکن اس کا عالمی سطح پر کوئی یکساں پیمانا یا اکائی مقرر نہیں ہے۔ علم طب و حکمت کے لحاظ سے خوشی کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہخوشی ایک ایسا صحت مند جذبہ یا احساس ہے کہ جس کے خصائص میں طمانیت اور شادمانی کے مظاہر شامل ہوں۔ انسانی نفس وذہن میں مسرت و انبساط کے انتہائی اہم اور شدید ادراک نے اسے دیگر جانداروں سے اشرف اور ممتاز مقام پر فائز کردیا ہے۔ ابن آدم کی فطرتِ نے اسے ہمیشہہی خوشی کی تلاش میں مصروفِ عمل رکھا (well-being) راحت الوجود ہے۔ مذہب اور فلسفے میں

عموماً خوشی کو محض جسمانی راحت (عیش / صحت) سے الگ رکھا جاتا ہے لیکن علم طب کے مطابق خوشی جسمانی اور ذہنیصحت کے بغیر نامکمل ہے۔ بقول غالب

تنگ دستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

خوشی چونکہ ایک غیر مرئی احساس ہے اس لئے اس کی پیمائش ناممکن ہے۔ اس کے باوجود اقوام متحدہ کی جاری کردہ ایک دلچسپ رپورٹ میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ دنیا کے کون سے ممالک ایسے ہیں جن کے عوام نسبتاً زیادہ یا کم خوش ہیں اور اُن کی خوشی کی وجہ کیا ہے؟ یہ رپورٹ پائیدار ترقی کا حل نیٹ ورک (ایس ڈی ایس این) نامی ادارے کے ماہرین اقتصادیات، نفسیات اور عمرانیات نے مل کر تیار کی ہے۔ اس پروجکٹ میں شامل کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر جیفری ساشس کے مطابقکس ملک کے لوگ کتنے خوش ہیں اس کا اندازہ لگانے کیلئے انہوں نے اس ملک کے تعلیمی معیار، انفرادیآمدنی، مجموعی قومی پیداوار، صحت مند زندگی، مختلف معاملات پر چیزوں کے انتخاب میں تبدیلی اور بدعنوانی سے پاک معاشرہ جیسی خصوصیات کو پیش نظر رکھا۔ ساشس کے مطابق کسی ملک میں خوشی کا معیار طے کرنے کے لیے دولت کے ساتھ ساتھ ایمانداری، اعتماد، انصاف اور بہتر صحت کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ کسی بھی قوم کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں 'خوشی اور اطمینان

کا بہت اہم کردار ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ حکومتوں کو منصوبہ بندی کرتے ہوئے عوام کی خوشی کو خصوصی اہمیت دینی چاہیے۔

ایک سال قبل انتخابی مہم کے دوران وزیراعظم نریندر مودی نے کہا تھا ''اچھے دن آنے ہی والے ہیں'' ۔ اچھے دن بھی فرحت وانبساط سے ملتی جلتی کیفیت کا نام ہے۔ جمہوری سیاست میں یہ ہوتا ہے کہ حکومت کتنا بھی اچھا کام کرے حزب اختلاف گوں ناگوں وجوہات کی بنیاد پر اس میں کیڑے نکالتا ہے اور حکومت اپنی تمام تر ناکامی کے باوجود اپنے اقدامات کو حق بجانب ٹھہراتی ہے نیز اپنے ہمنواوں کی مدد سے خود کو کامیاب ترین قرار دیتی ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ عوام سے پتہ لگایا جائے کہ وہ کیا سوچتے ہیں ؟ اور ان سے کچھ ایسے سوالات کئے جائیں جن سے ان کے قلب کی کیفیتمعلوم ہوسکے۔ ان سوالات کو نہ حکومت طے کرے نہ حزب اختلاف بلکہ کسی ایسے غیر جانبدار ادارے کی اس بابت مدد لی جائے جو حکومت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو۔ جس کے نہ مفادات سرکار سے وابستہ ہوں اور جو نہ حکمرانوں یاان کے مخالفین کے زیر نگیں ہو۔

ایسے میں مذکورہ بالا رپورٹ جو مودی سرکار کے پہلے سال کے اختتام پر منظر عام پر آئی ہے وزیراعظم کیلئے ایک کارآمد آئینہ ثابت ہو سکتی ہے۔

عالمی خوشی کی اس درجہ بندی ییں کل ۱۵۸ ممالک کو شامل کیا گیا۔ ہندوستان کو

میں ۱۱۱ ویں نمبر پر رکھا گیا تھا لیکن اب وہ نیچے کھسک کر ۱۱۷ ویں نمبر پر پہنچ گیا ہے ۲۰۱۳ء

۔زرخرید ذرائع ابلاغ رات دن ہمیں اس خوش فہمی کا شکار کرنے میں لگا رہتا ہے کہ ایشیا کی سب سے ابھرتی ہوئی معاشی طاقت بھارت ہے۔ میک ان انڈیا کا شیر جلد ہی چین کو چیر پھاڑ کر کھا جائیگا اور معاشی دوڑ میں ہم چین سے آگے نکل جائیں گے۔اس رپورٹ کے مطابق چین کی بھی حالت بہت اچھی نہیں ہے لیکن پھر بھی دونوں پروسی ممالک کے درمیان ایک بڑی کھائی ہے اس لئے کہ وہ ۸۴ویں مقام پر ہے۔ ہندوستان کے ۱۱۷ ویں نمبر پر ہے ہونے کی وجہ غربت کے علاوہ معاشی ناہمواریاں بتائی گئی ہیں۔ اس سے یہ معمہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ دنیا کے امیر ترین افراد کی فہرست ہمارے افراد کی تعداد کے روز افزوں اضافہ کے باوجود گیندر سنگھ جیسا کسان سرعام خودکشی کرنے پر کیوں مجبور ہوتا ہے؟

خوشی کی بابت جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کا تقابل بھی نہایت دلچسپ ہے۔ یہاں پر سب سے اوپر حیرت انگیز طریقہ پر ایک ننھا سا ملک بھوٹان ۹۷ نمبر پر ہے اور کا قریب ترین ساتھی ۸۱ ویں مقام پر پاکستان ہے۔ افغانستان میں امریکی مداخلت کے بعد پاکستان کے اندر پیدا ہونے والے بے شمار مسائل کے باوجود اگر اس کا یہ حال تو اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس کے بغیر وہ کہاں ہوتا؟ پاکستان کے بعد بھی ہندوستان کا نہیں بلکہ بنگلہ دیش کا نمبر آجاتا ہے جو ۱۰۹ ویں پائیدان پر ہے۔ امیت شاہ جی بنگلہ دیش کے ہندووں کو

ہندوستان میں پناہ دینے کی بات کر رہے ہیں لیکن اگر یہ رپورٹ وہاں کے اکثریت و اقلیت دونوں کی ترجمان ہے تو بھلا وہاں کا ہندو ہندوستان میں آنے کی غلطی کیوں کرے گا جبکہ حسینہ واجد حکومت اپنے اقتدار کی خاطر مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو اقلیت دلجوئی کچھ زیادہ کر رہی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیاکے دیگر ممالک کا تقابل بھی نہایت دلچسپ ہے ۔ ان میں ایک تو خالص ہندو ریاست نیپال ہے دوسری ہندو اکثریتی سیکولر ہندوستان اور تیسرا بودھا کثریتی سیکولر ملک سری لنکا ہے۔ ان تینوں کے درمیان سرفہرست ہندوستان ضرور ہے لیکن نیپال جسے بہت زیادہ پسماندہ سمجھا جاتا ہے ہم سے قریب ہی ۱۲۱ ویں مقام پر ہے۔ سب سے نیچے سری لنکا ہے جو ۱۳۲ ویں مقام پر آتا ہے۔ایک اور بودھ ریاست برما کا بھی حالت خراب ہے وہ ۱۲۹ ویں نمبر پر ہے۔ ہندوستان میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص ان لوگوں کیلئے جو دن رات تقسیم ہند کو کوستے رہتے ہیں اور اسی کو ملت کی ساری پریشانیوں کی وجہ قرار دیتے ہیں اس رپورٹ میں عبرت کا بڑا ساماان ہے ۔

اقوام متحدہ کی اس رپورٹ کے مطابق خوشی کی بابت دنیاکے ۱۰ سرفہرست ممالک میں اقوام متحدہ کی سلامتی کاونسل کے مستقل ارکان میں سے ایک بھی شامل نہیں ہے جنھیں کہ ویٹو کا حق حاصل ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی فوجی اور معاشی طاقتوں

کا اول دس ممالک سے ندارد ہونا یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ جو لوگ خود اپنی عوام کو خوش نہیں رکھ سکتے وہ بھلا دنیا بھر کو خوشی اور اطمینان کس طرح مہیا کرسکیں گے؟ اس فہرست کے مطابق سوئٹزر لینڈ کے لوگ غموں سے آزاد اور اس کرہ ارض کے سب سے زیادہ پر مسرت افراد ہیں اس کے بعد آئس لینڈ، ڈنمارک، ناروے، کینیڈا، فن لینڈ، ہالینڈ، سوئیڈن، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کا نمبر آتا ہے۔ آبادی کے لحاظ یہ ننھے منے اور سیاسی اعتبار سے ان غیر اہم ممالک کی عوام سب زیادہ خوش و خرم ہونا مغرور و متکبر ممالک کو منہ چڑھاتا ہے۔

اس رپورٹ نے یہ واضح کردیا ہے کہ دنیا کے طاقتور ترین ممالک کے افراد اپنی حکومتوں اور سماجی نظام سے خوش نہیں ہیں۔ امریکا جیسا نام نہاد سپر پاور ملک ۱۵ویں مقام پر ہے جبکہ ۲۱ویں مقام پر فائز برطانیہ سے بہتر حالت متحدہ عرب امارات کی ہے جو ۲۰ ویں نمبر پر ہے۔ اومان جیسا ننھا سا ملک ۲۲ویں مقام پر ہے جبکہ جرمنی جیسا ترقیہ یافتہ ملک ۲۶ویں پر ہے۔ ۲۸ویں مقام پر موجود قطر کی حالت فرانس سے بہتر ہے جو ۲۹ ویں نمبر ہے۔ کویت اور سعودی عرب جو بالترتیب ۳۵ویں اور ۳۹ویں مقام ہیں دنیا کی دو سوپر پاورس روس اور چین سے بہتر ہیں جو ۶۴ویں اور ۸۴ویں نمبر پر ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے اس سے بہتر صورتحال تو ایران کی ہے جو ۱۱۰ویں ہے۔
فلسطین و عراق بھی جو

ویں اور ۱۱۲ ویں نمبر پر ہندوستان سے آگے ہیں ۔ ان اعداد و شمار میں مسلم دنیا کو ۱۰۸ اٹھتے بیٹھتے برا بھلا کہنے والوں کیلئے نصیحت ہے۔

اگر اس فہرست میں کم ترین خوشیوں کے مالک آخر کے دس ممالک کو دیکھیں تو ان میں افغانستان ، شام ، ٹوگو، برونڈی، روانڈا، برکینو فیسو، آئیوری کوسٹ، گینیا، چاڈ اور وسطی افریقی جمہوریہ شامل ہیں۔ یہاں پر صرف دو مسلم ممالک افغانستان اور شام موجود ہیں جو عرصۂ دراز سے خانہ جنگی کا شکار ہیں دیگر ممالک غربت اور افلاس کے سبب غم واندوہ کا شکار ہیں۔ ویسے یہ فہرست دنیا بھر کے ممالک کا ایک تقابل ضرور پیش کرتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے سرمایہ داری کے ظالمانہ استحصالی نظام نے دنیا کی ایک بہت بڑی آبادی کو غمزدہ کر رکھا ہے۔ حالت یہ ہے کہ دنیا بھر کے وسائل چند ہاتھوں میں سمٹ آئے ہیں اور عوام کی ایک بڑی اکثریت دانے دانے کو ترس رہی ہے۔ان کی حالتِ غیر پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

سنتے ہیں خوشی بھی ہے زمانے میں کوئی چیز
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں کدھر ہے وہ کہاں ہے؟

سوئزرلینڈ کے اندر منعقدہ عالمی معاشی مجلس کے حالیہ اجلاس میں آکسفیم انٹرنیشنل نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس کے اعداد و شمار مذکورہ عدم مساوات کی

منہ بولتی تصویر ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق دنیا کی کل دولت کا نصف صرف ایک فیصد امیر کبیر لوگوں کے قبضے میں ہے۔ دنیا کی آبادی میں جو ۵۰ فیصد لوگ نیچے کے درجے میں ان کو حاصل کل دولت سے ۶۵ گنا زیادہ دولت صرف ان ایک فیصد لوگوں کے پاس ہے۔ جس قدر دولت اس پچاس فیصد آبادی کے پاس ہے اتنی تو صرف ۱۸۵ امیر ترین لوگوں کی تجوری میں بند ہے۔ دنیا کی ۷۰ فیصد آبادی ان ممالک میں رہائش پذیر ہے جہاں گزشتہ ۳۰ سالوں کے اندر عدم مساوات میں اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ کے اندر معاشی بحران کے بعد (۲۰۰۹ء) جو معاشی ترقی ہوئی اس کے ۹۵ فیصد کا فائدہ صرف ایک فیصد لوگوں کو ہوا جبکہ ۹۰ فیصد لوگ غربت کا شکار ہوئے۔ ایک اور جائزے کے مطابق دنیا کے وسائل میں ۲۰۰۰ء کے بعد سے غیر معمولی اضافہ ہوا ہے جو ۱۱۷ ٹریلین ڈالر سے بڑھ کر ۲۶۳ ٹریلین ڈالر تک پہنچ گئے ہیں لیکن اس دولت کی رسائی عوام تک نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ چند ہاتھوں کے اندر سمٹتی جارہی ہے۔ ایسے مٹھی بھر افراد خوش ہو رہے ہیں اور باقی غمگین ہوتے جارہے ہیں۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ یہ دنیا فی الحال نئے عالمی نظام کے تحت ایک ظالمانہ معیشت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس سفاک سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار نہیں چاہتے کہ ان کا کوئی متبادل عوام کے سامنے آئے اس لئے کہ اگر ایسا ہو جائے تو عوام کی اکثریت اس سے دامن جھاڑ کر

نئے نظام رحمت کے سایۂ عافیت میں چلی جائیگی ۔یہی وجہ ہے کہ مغربی استعمار ہر متبادل کے پیچھے ہاتھ دھو کرپڑ جاتا ہے اور جب بھی کسی ملک میں اسلام ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے متبادل کے طور پر سامنے آتا ہے وہاں حکمرانوں کی سمجھا منا کر اپنا ہمنوا بنا لیا جاتا ہے یا اپنے حواریوں کی مدد سے بغاوت کروادی جاتی ہے۔ فوجی آمروں کو مسلط کرکے ان کی بھرپور پشت پناہی کی جاتی ہے۔ چین اور روس کو مغرب اپنے دام میں گرفتار کرچکا ہے کیوبا میں یہ کوشش جاری ہے۔ مصر کے اندر بھی انہیں یہی خوش فہمی تھی کہ اسلامی حکومت بھی ہماری حاشیہ بردار بن جائیگی لیکن جب مایوسی ہوئی تو تختہ پلٹ دیا گیا۔ دیگر لوگ مغرب کے جھانسے یں جلد یا بدیر آجاتے ہیں لیکن اسلامی تحریکات پر ان کا زور نہیں چلتا اس لئے انہیں بے دست و پا کرنے کوششیں جاری و ساری رہتی ہیں ۔ اس سعی و جدو جہد کے پیچھے بھی وہی استعماری نظام کے تحفظ کا مقصد کارفرما ہوتا ہے۔

باطل کی ان ریشہ دوانیوں سے اہل حق مایوس نہیں ہوتے ان کیلئے رب کائنات کی یہ بشارت کافی ہے ”اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہےاور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤگے“ (القرآن ۵،۴: ۹۳) جس خوشی کی خبر اس آیت میں دی گئی ہے وہ یقیناً آخرت میں مخلص اہل ایمان کا مقدر ہوگی لیکن کوئی بعید نہیں کہ اس دنیا میں بھی وہ بعد

والا بہتر دور انہیں نصیب ہو جائے اور اسے پا کر وہ خوش ہو جائیں۔ دراصل انسان کی خوشی اور غم کا گہرا تعلق اس کے مقصدِ حیات سے ہوتا ہے۔ معرفت الٰہی کی طلبگار نفوس کیلئے سب سے بڑی خوشی راہِ ہدایت ہے جس کا ذکر قرآنِ عظیم میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ''لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔اے نبیؐ، کہو کہ ''یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی، اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے، یہ اُن سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں'' (القرآن ۵۸،۵۷:۱۰)۔

مذکورہ بالا آیت سے پتہ چلتا ہے کہ دنیائے فانی کے جس سامانِ تعیش کو حاصل کر کے لوگ خوش ہوتے ہیں اور جن کے چھن جانے پر وہ غمگین ہو جاتے ہیں ان سے بہتر اور افضل اللہ کی نصیحت یعنی قرآن حکیم کی نعمت ہے۔ سکونِ قلب اور فرحت و انبساط کا اصل مرجع اور منبع یہی فرقانِ عظیم ہے۔ اہل ایمان کی خوشیوں کی معراج کا ذکر سورۂ توبہ کی اس آیت میں کیا گیا ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر

جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے" (القرآن ۱۱۱:۹)۔ مومنین کی خوشی کے معیار اور کسوٹی کی ترجمان قرآنِ حکیم کی یہی آیت ہے۔

سالگرہ اسپیشل: تشنہ لب آئے تھے دامن تر چلے

مودی سرکار کی پہلی سالگرہ جیسے جیسے قریب آرہی ہے اس کیلئے بری خبروں کا سلسلہ دراز ہوتا جارہا ہے۔ اس میں تازہ اضافہ فرینده مہاراج گنج کا ضمنی انتخاب ہے۔ ویسے تو اس دوران بی جے پی نے مختلف انتخابات میں منہ کی کھائی ہے مگر اس حلقہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ حلقہ اترپردیش میں واقع ہے جس نے صحیح معنی میں بی جے پی کا مقدر بدل دیا۔ جس نے نریندر مودی کو وزیراعظم اور امیت شاہ کو بی جے پی کا صدر بنادیا۔ اس ریاست میں بی جے پی اور اس کی حامی اپنا دل کو جملہ ۸۰ میں ۷۳ نشستوں پر کامیابی ملی۔ ریاست میں حکمراں جماعت سماجوادی پارٹی کو صرف ۵ اور کانگریس کو ۲ پر اکتفاء کرنا پڑا۔ بی جے پی کو ملنے والے ووٹ میں ۲۵ فیصد کا اضافہ ہوا جبکہ کانگریس اور بی ایس پی کو بالترتیب ۱۱ اور ۸ فیصد کا نقصان اٹھانا پڑا۔ سماجوادی پارٹی کیلئے اطمینان کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ووٹ کا تناسب صرف ایک فیصد کم ہوا تھا لیکن اس کے باوجود اسے ۱۸ نشستیں گنوانی پڑی تھیں جبکہ بی جے پی ۱۰ سے اچھل کر ۷۱ پر جا پہنچی تھی اور انہیں ۶۱ نشستوں نے ملک کا سیاسی منظر نامہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اترپردیش کی عوام کو اپنی غلطی کا احساس بہت جلد ہوگیا۔ ۵ ماہ بعد ستمبر کے

اندر جبگیارہ اسمبلی حلقوں میں ضمنی انتخابات ہوئے تو۸ پر سماجوادی پارٹی کو اور صرف ۳ پر بی جے پی کو کامیابی ملی۔ ان نتائج کی خاص بات یہ تھی کہ یہ ایسے حلقہ ہائے انتخابات تھے جہاں سے ۲۰۱۲ء میں بی جے پی کے ارکان اسمبلی کامیاب ہوئے تھے۔ یہ ارکان اسمبلی پارلیمانی انتخاب میں کامیاب ہو کر لوک سبھا میں چلے گئے تھے جس کے سبب یہ نشستیں خالی ہوئی تھیں۔ان میں سے صرف ایک روہنیا ایسی تھی جو پہلے سے سماجوادی پارٹی کے پاس تھی۔ ایس پی نے اس پر بھی اپنا دبدبا برقرار رکھا اور اس کے علاوہ بی جے پی سے اس کی ۷ نشستیں چھین لیں۔اس مرتبہ قومی سطح پر بھی بی جے پی کو صرف ۱۳ نشستوں پر کامیابی ملی تھی اور اس کا کل ۱۳ نشستوں کا نقصان ہوا تھا جبکہ ایس پی نے ۷ کا اور کانگریس نے اپنے ارکان اسمبلی میں ۵ کا اضافہ کیا تھا ایک نشست پر یو ڈی ایف بھی کامیاب ہوئی تھی۔

اترپردیش میں سماجوادی پارٹی کی کامیابیوں کا سلسلہ جاری رہا اور اکتوبر کے اندر اس نے بی جے پی کو مغربی یوپی کے دو حلقہ ہائے انتخاب شاملی اور کیرانہ میں شکست فاش سے دوچار کردیا۔ ان نشستوں پر بی جے پی کا ۱۹۹۶ء سے قبضہ تھا اور مظفر نگر کے فساد کے بعد بی جے پی کو یہ خوش فہمی ہوگئی تھی کہ اب جاٹ پوری طرح اس کی جھولی میں آگئے ہیں لیکن یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ حال میں تبلیغی جماعت پر قابلِ مذمت حملے اسی علاقہ میں ہوئے ہیں۔اس سال اپریل

میں پھر چرکھاری اور مہاراج گنج میں ضمنی انتخابات کا اعلان ہوگیا چرکھاری کسی زمانے میں اومابھارتی کا حلقہ ہوا کرتا تھا لیکن پچھلے ستمبر میں بی جے پی نے وہاں سے شکست کھانے کے بعد یہ کیا بی ایس پی کے سابق رکن پارلیمان گنگا چرن کو پارٹی میں شامل کرلیا اور ان کے بیٹے اکھل راجپوت کو ٹکٹ دے دیا۔ بیایس پی نے اس بار وہاں سے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کیا جس سے بی جے پی کو اطمینان ہوگیا کہ اس بار تو کامیابی یقینی ہے لیکن چناؤ سمراٹ امیت شاہ کی یہ چانکیہ نیتی بھی اکارت گئی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ چرکھاری میں ضمنی انتخاب کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ گزشتہ ستمبر میں کامیاب ہونے والے سماجوادی رکن اسمبلی کپتان راجپوت اور اس کے بھائی لکشمن راجپوت کو ۲۰۰۲ء کے اندر پولس تھانے میں گھس کر قتل کرنے کے الزام میں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ سماجوادی پارٹی کی ڈھٹائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان سنگین الزامات کے باوجود اس نے کپتان راجپوت کی اہلیہ ارمیلا کو اپنا امیدوار بنادیا۔ بی جے پی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس بدنام زمانہ رکن اسمبلی کی اہلیہ کو بھی وہ شکست نہ دے سکی اور عوام کا رجحان بھی قابلِ توجہ ہے انہوں نے ارمیلا کے نام پر گویا کپتان سنگھ کو پھر ایک بار ۴۵ ہزار ووٹ کے فرق سے کامیاب کردیا۔ یہ انتخابی منظر نامہ نہ صرف بی جے پی بلکہ ساری قوم کیلئے تازیانۂ عبرت ہے۔ یہ اس

بات کا مظہر ہے کہ عوام کس طرح ووٹ دیتے ہیں اور کن کو کامیاب کرتے ہیں۔

مہاراج گنج کی نشست پر ۲۰۰۰ء سے بی جے پی کا قبضہ تھا۔ ۲۰۰۲ء میں وہاں سے کانگریس کے شیام نارائن نے بی ایس پی کے ویریندر چودھری کو شکست دی تھی لیکن ۲۰۰۷ء میں ۳۴ سالہ بجرنگ بہادر نے ویریندر چودھری کو ہرا کر یہاں زعفرانی پرچم لہرا دیا۔ ۲۰۱۲ء میں وہ دوبارہ کامیاب ہو گئے اور اس دوران انہوں رکن اسمبلی ہوتے ہوئے سرکاری ٹھیکے بھی لے لئے۔ لوک آیوکت نے اس پر اعتراض کیا اور بی جے پی کے گورنر رام نائکنے انہیں برخواست کردیا۔ اس طرح یہ نشست خالی ہو گئی اور یہاں پر گزشتہ ماہ اپریل کے اندر ضمنی انتخابہونا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے یہاں اپنے چہرے سے شرافت کا مکھوٹا نکال پھینکا اور ایک راندۂ درگاہ رکن اسمبلی کو پھر سے ٹکٹ دے دیا۔ یہ نہ صرف بی جے پی کے اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت ہے بلکہ اس کے اندر پائے جانے والے شدید قحط الرجال کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ سنگھ پریوار کے بلند بانگ دعووں کی ہوا ایسے ہی مواقع پر نکل جاتی ہے۔

بجرنگ بہادر نے اس انتخاب کے خلاف الہ باد ہائی کورٹ سے رجوع کیا اور اس پر روک لگا دی۔ مخالفین نے اسے خوف پر محمول کیا لیکن بجرنگ کی بہادری

سپریم کورٹ میں نہیں چلی جس کے سبب اسے بادل ناخواستہ رائے دہندگان کے سامنے ہاتھ پسار کر جانا پڑا۔ اس بار سماجوادی پارٹی کے ونود تیواری اور کانگریس کے ٹکٹ پر ویریندر چودھری میدان میں تھے۔ گزشتہ انتخاب میں اس یہاں پر سماجوادی پارٹی کو صرف ۲۶ ہزار ووٹ ملے تھے اور وہ تیسرے مقام پر تھی لیکن اس بار اس نے تقریباً ۶۵ ہزار ووٹ حاصل کئے۔ دلچسپ بات یہ ہے بی جے پی کا یہ سابق رکن اسمبلی دوسرے مقام پر بھی نہیں آسکا بلکہ کانگریس کے ویریندر سنگھ نے ۵۵ ہزار سے زیادہ ووٹ حاصل کرلئے جو گزشتہ کے ۳۴ ہزار ووٹ کے مقابلے ۲۱ ہزار زیادہ ہے۔ ویریندر چودھری ۲۰۰۲ء سے یہاں قسمت آزمارہے ہیں دو مرتبہ وہ جن سماج پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے وہ ناکام ہوئے اور دو مرتبہ وہ کانگریس کے ٹکٹ پر ہار گئے۔ بجرنگ بہادر کو اس بار صرف ۴۷ ہزار ووٹ ملے اور وہ تیسرے مقام پر کھدیڑ دیا گیا۔ الیکشن کمیشن کے سامنے خود بجرنگ بہادر نے حلف نامہ میں اپنی جائیداد کے کروڑوں میں ہونے کا اعتراف کیا ہے اس کے باوجود ان کی حالتِ زار پروفیسر عنایت علی خان کے اس شعر کی مصداق ہے کہ ؎

تشنہ لب آئے تھے دامن تر چلے\
''جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے''

بی جے پی اس دعوے کے ساتھ بڑے طمطراق سے اقتدار میں آئی تھی کہ اب '' اچھے

دن آنے ہی والے ہیں'' ۔ بعد میں اسے مہاراشٹر، ہریانہ اور جھارکھنڈ میں بھی مرتے پڑتے کامیابی مل گئی جس سے اس کا دماغ بالکل ہی خراب ہوگیا۔ اس دوران اسے ضمنی انتخابات کے جھٹکے لگتے رہے لیکن میڈیا میں اس کا خاطر خواہ اثر نہیں دیکھا جاسکا لیکن پھر دہلی کے انتخابات نے اس کی ہوا پوری طرح اکھاڑ دی اور ساری دنیا کو پتہ چل گیا کہ اب یہ زعفرانی بہار خزاں رسیدہ ہو گئی۔ اس سلسلے کا ایک بڑا جھٹکا تو مغربی بنگال کے حالیہ میونسپل انتخابات لگا لیکن اس سے قبل ایک نظر مہاراشٹر میں ہونے والے دو بلدیاتی انتخابات پر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ریاستی انتخاب میں کامیابی کے بعد بی جے پی نے نعرہ لگایا تھا کہ ''بھاجپ باپ سینا ہاف'' لیکن اس بار جب نوی ممبئی اور اورنگ آباد کے انتخابات سے قبل اس نے ناک گھس کے شیوسینا کے ساتھ الحاق کرلیا۔ اس الحاق کے باوجود نوی ممبئی میں بی جے پی کو کانگریس سے کم یعنی ۱۰ کے مقابلے ۶ نشستوں پر کامیابی ملی۔ اورنگ آباد کے اندر اسے مجلس اتحاد مسلمین نے پچھاڑ دیا اور اس کے ۲۲ سے ایک زیادہ یعنی ۲۳ نشستوں پر کامیابی درج کرالی۔ اگر اس میں دو حامیوں کو شامل کرلیا جائے تو یہ تعداد ۲۵ ہوجاتی ہے۔ اس انتخاب میں نہ صرف نشستیں بلکہ بی جے پی کے ووٹ کا تناسب بھی ایم آئی ایم سے کم رہا۔

مغربی بنگال کے اندر گزشتہ سال کے قومی انتخابات میں بی جے پی نے ویسے تو

صرف ۲ نشستوں پر کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کے ووٹ کا تناسب ۶ فیصد سے بڑھ کر ۱۷ فیصد پر پہنچ گیا تھا۔ اس اضافہ کے بعد بی جے پی نے ترنمول کو سردھا بد عنوانی کے معاملے پھنسا دیا اور اس کو خوب جی بھر کے بدنام کیا۔ دسمبر کے اندر امیت شاہ نے کولکاتہ جاکر اعلان کر دیا کہ ممتا بنرجی کیالٹی گنتی شروع ہوچکی ہے اور بہت جلد مغربی بنگال میں زعفرانی پرچم لہرانے والا ہے۔ ان حرکات سے زعفرانی دہشت گردوں کے حوصلے اس قدر بلند ہوگئے کہ وہ ایک سن رسیدہ راہبہ کی عصمت دری کرنے سے بھی باز نہیں آئے لیکن پھر اس کے بعد بلدیاتی انتخابات کا اعلان ہوگیا تھا۔ امیت شاہ نے دسمبر میں اعلان کیا تھا کہ وہ ہر ماہ آئیں گے لیکن اس کے بعد ایک بار بھی بنگال نہیں پھٹکے عوام نے سوچا جو صدر اپنی پارٹی سے وعدہ وفا نہیں کرتا وہ ہمارے ساتھ کیا کرے گا؟

کولکاتہ بلدیہ ویسے بھی ترنمول کانگریس کے قبضے میں تھی لیکن اس بار کئی ترنمول رہنماوں کے ممتا سے دور ہو جانے کے سبب ایسا لگ رہا تھا کہ ترنمول کمزور پڑ گئی ہے اور اس کا فائدہ بی جے پی کو ملے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ٹی ایم سی کے کاونسلرس کی تعداد ۹۵ سے بڑھ کر ۱۱۴ پر پہنچ گئی ۔ بائیں بازو کی جماعتوں کو ۳۳ کے بجائے ۱۵ پر اکتفاء کرنا پڑا۔ بی جے پی کا بائیں محاذ کو ہٹا کر سب سے بڑی حزب اختلاف بننے کا خواب چکنا چور ہوگیا اور وہ صرف ۷

نشستوں پر سمٹ گئی۔ کانگریس کو ۵ اور ۳ آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ بی جے پی کے راہل سنہا نے ایسے ہیں اعلان کردیا کہ ۵۰ مقامات پر ان کے امیدوار دوسرے نمبر آئے ہیں لیکن یہ دعویٰ بھی جھوٹ نکلا اس لئے کہ صرف ۳۸ مقامات پر بی جے پی دوسرے نمبر پر آئی اس کے برعکس ۶۵ مقامات پر بایاں محاذ دوسرے نمبر پر آیا۔ اس مرتبہ کولکاتہ میں جہاں بی جے پی کو ۱۵ فیصد ووٹ ملے وہیں ترنمول کو ۵۱ فیصد ووٹ ملے۔ ہندسوں کا یہ الٹ پھیر معمولی نہیں ہے۔

کولکاتہ کے علاوہ دیگر بلدیاتی اکائیوں میں ٹی ایم سی نے ۹۱ میں سے ۶۹ مقامات پر اپنی برتری ثابت کردی۔ کانگریس اور بائیں محاذ ہردونے ۵ مقامات پر اپنی اکثریت ثابت کی لیکن بیچاری بی جے پی تو اپنا کھاتہ تک نہ کھول سکی اور ایک بڑا سا رس گلہ چبا کر بیٹھ گئی۔ ترنمول کو جملہ ۱۴۲۵ وارڈس میں کامیابی ملی اس کے برعکس بی جے پی کا رتھ ۸۵ پر جاکر رک گیا جبکہ کانگریس ۱۸۶ تو بایاں بازو ۲۸۵ وارڈس میں کامیاب رہا۔ سلی گڑی کے انتخاب میں جسے سی پی ایم اور ٹی ایم سی نے وقار کا مسئلہ بنا دیا تھا کل ۴۷ نشستوں میں سے ۲۳ پر دایاں محاذ کامیاب رہا جبکہ ٹی ایم سی کو صرف ۱۷ نشستیں ملیں۔ بائیں محاذ کو یہی سی بڑی کامیابی تھی۔ بی جے پی کے اندر پائی جانے والی بدنظمی کا یہ حال تھا کہ بڑی مشکلوں سے وہ مہابھارت سیریل کی دروپدی محترمہ گنگولی کو پارٹی میں لے کر آئے تاکہ انہیں کولکاتہ کا متوقع میئر کی حیثیت سے پیش کیا جاسکے لیکن وہ بیچاری کولکاتہ کی ووٹر تک نہیں تھیں بلکہ ان کا ۲۴ پرگنہ

کے رائے دہندگان کی فہرست میں نکلا۔ مودی جی کی جرمنی کے اندر نیتاجی سبھاش چندر بوس کے پوتوں سے ملاقات بھی بی جے پی کے کسی کام نہ آئی اس لئے کہ اب ملک کے عوام یہ نوٹنکی سمجھ چکے ہیں اور ہر کوئی انتظار میں ہے کہ ذرا اونٹ پہاڑ کے نیچے آئے تو اسے دال آٹے کا بھاو بتایا جائے۔

بجرنگ بہادر کو تو خیر ۲۰۰۲ء میں ایک سرکاری ٹھیکہ لینے کے سبب لوک آیوکت کی سفارش پر گورنر نے برخواست کردیا لیکن کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل کی تازہ رپورٹ میں سابق صدر بی جے پی اور وزیر ہائی وے نتن گڈکری پر سنگین الزامات دھر دیئے۔ اس رپورٹ کے مطابق سرکاری ادارے آئی آر ای ڈی اے نے ۴۸٫۶ کروڑ روپئے گڈکری کی کمپنی پورتی ساکھر کارخانے کو دیئے۔ اس کارخانے کو رقم اس لئے دی گئی تھی ماحولیات کے تحفظ کی خاطر بھوسے کو جلاکر اس سے بجلی بنائے لیکن اس کارخانے کے شروع ہوتے ہی ۱۳ دن کے اندر سے ناقابلِ استعمال قرار دے دیا گیا جو غالباً ایک سازش تھی۔ اس وقت تک پورتی پر سود سمیت ۸۴٫۱۲ کروڑ روپئے واجب الاداء ہو گئے تھے لیکن ریاستی ادارہ صرف ۷۱٫۳۵ کروڑ روپئے لینے پر راضی ہوگیا اس طرح سرکاری خزانے کا ۱۲٫۷۷ کروڑ روپیہ نقصان ہوا۔ اس کے علاوہ اب وہ کارخانہ کوئلہ اور تیل پر چلتا ہے جبکہ اس طرح کے ایندھن پر چلنے والا کارخانہ اس قرض کا مستحق ہی نہیں تھا۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ اس بدعنوانی کے سبب وزیر سڑک نتن گڈکری کی بھی چھٹی

کرکے انہیں سڑک پر بھیج دیا جائے اور وہ جب دوبارہ انتخاب لڑنے کیلئے جائیں تو عوام انہیں بھی بجرنگ بہادر کی مانند سبق سکھائیں۔ ویسے وارانسی میں وزیراعظم نریندر مودی کی حالت بھی بجرنگ بہادر سے بہت مختلف نہیں ہے اس لئے کہ پی ایم صاحب نے اپنے ایم پی فنڈ سے ایک نیا پیسہ بھی ابھی تک وارانسی کی عوام کے فلاح و بہبود پر خرچ نہیں کیا ہے۔ شاید وہ بھول گئے ہیں کہ باتوں سے میڈیا کا تو پیٹ بھرتا ہے اور ان کے بھکتوں کی آنکھیں بھی ٹھنڈی ہوتی ہیں مگر عوام کا نہیں کی بھوک نہیں مٹتی۔ فاقہ کش لوگ ووٹ نہیں دیتے بلکہ چوٹ کرتے ہیں جس کا مظاہرہ ضمنی و بلدیاتی انتخابات کے نتائج میں ہورہا ہے۔ اپنی پہلی سالگرہ پر مودی سرکار اگر ان نتائج سے کوئی سبق لے تو اچھا ہے ورنہ چار سال بعد اس پر بھی یہ مزاحیہ قطعہ صادق آجائے گا(ترمیم کے ساتھ رخصتی پر تھا نریندر کے کسی کا تبصرہ

بڑبڑاتا آیا تھا اور گڑگڑا کر چل دیا
تبصرے پر ماہدولت نے لگائی یہ گرہ
ہائے وہ 'غنچہ دہن' جو بن کھلے مرجھا گیا

مغربی بنگال: جنتا نے منہ پھیر لیا تو ممتا کی آغوش

مودی جی گوناگوں وجوہات کی بنیاد پر ویلنٹائن ڈے نہیں مناتے مگر چونکہ امبے ماں کے بھکت ہیں اس لئے ” ماتا دیوس ”یعنی مدرس ڈے کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ اس مرتبہ یہ مبارک دن انہوں نے مغربی بنگال میں ممتا بنرجی کے ساتھ منایا اور دوسرے دن سیاست کی دنیا میں اماں کہلانے والی جئے للیتا کو عدالت سے بری کرواکران کی خدمت میں مبارکباد بھی پیش کردی۔ اس طرح گویا ” مدرس ڈے” کا حق ادا کردیا۔ وزیراعظم کے یہ اقدامات دراصل اپنی ایک سال کی مایوس کن کارکردگی کا حقیقت پسندانہ اعتراف ہیں اور اس کیلئے وہ خود مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وقت کے ساتھ اب انہیں دال آٹے کا بھاؤ معلوم ہوگیا ہے اور دماغ رفتہ رفتہ ٹھکانے آرہا ہے۔ ورنہ گزشتہ سال دسمبر میں ان کے دست راست امیت شاہ کا کولکاتہ میں مشہوراعلان کسے یاد نہیں” میں امیت شاہ ہوں۔ بی جے پی کا ایک ادنٰی سا خادم۔ میں یہاں ٹی ایم سی کو جڑ سے اکھاڑنے کیلئے آیا ہوں”۔ گزشتہ سال ستمبر میں بھی اسی طرح کا اعلان چنئی میں جئے للیتا کے خلاف بھی کیا گیا تھا۔ قومی انتخابات کے بعد ملک کو کانگریس سے پاک کرنے کے بعد بہت جلد علاقائی جماعتوں کو بھی نیست نابود کردینے کے عزم بھی شاہ جی نے دوہرایا تھا۔

امیت شاہ کا دماغ پہلے تو کشمیریوں نے درست کیا جو وادی سے انہیں خالی ہاتھ لوٹا دیا اس کے بعد دہلی میں کیجریوال نے ان کے دماغ کی چولیں درست کیں اور ان کی چتا کو آگ دکھانے کا کام شیلانگ میں ہوا جہاں شاہ کا استقبال گائے کے گوشت کی بریانی سے کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس منفرد احتجاجی جشن میں بی جے پی کے مقامی ارکان بھی شامل تھے ۔ امیت شاہ تو خیر اس تذلیل کے خلاف ایک لفظ نہ بول سکے مگر انہوں نے سنگھ سے درآمد شدہ رام مادھو کو آگے کردیا۔ مادھو نے کہا ملک کی مختلف ریاستوں میں سماجی و معاشی وجوہات کی بنیاد پر گئو کشی پر پابندی ہے لیکن شمال مشرقی ریاستوں میں گئو کشی پر پابندی لگانے کی کوئی تجویز مرکزی حکومت کے زیر غور نہیں ہے۔ شیلانگ میں جاکر بیچارے مادھو جی ''گائے ہماری ماتا ہے'' والا مشہور و معروف نعرہ بھول گئے۔

راہل گاندھی کی گھر واپسی کے بعد اچانک بی جے پی کو محسوس ہونے لگا ہے کہ وہ جس قبر پر فاتحہ پڑھ چکے تھے اس کے اندر کی لاش ابھی زندہ ہے۔ وہ نہ صرف سانس لے رہی ہے بلکہ دولتیّ جھاڑ رہی ہے۔ اس کے بعد ملک کا منظر نامہ بدلنا شروع ہوا۔ پچھلے سال انتخاب سے قبل یہ حال تھا کہ مودی جی ایک شوشہ چھوڑتے تھے لوگ اس کا جواب دینے لگتے تھے اس سے پہلے کہ اس کا پڑیا کا اثر ختم ہوتا ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا جاتا۔ اب حالات اس کے برعکس ہوگئے ہیں۔ راہل نے جب سوٹ بوٹ والی سرکار کا تیر چلایا تو مودی جی کو ایک ہفتہ میں دو

مرتبہ کہنا پڑا کہ یہ مکیش امبانی یا گوتم اڈانی کے مفادات کا تحفظ کرنے والی سرکار نہیں ہے گویا مودی جی مدافعت میں آگئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انہیں ایک سال بعد یہ صفائی دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس کے بعد راہل نے پنجاب اور مہاراشٹر کا دورہ کرکے طنز کیا کہ مودی جی کو غیر ملکی دوروں سے فرصت ملے تو اپنے ملک کا بھی دورہ کرلیا کریں۔ اس کے جواب میں مودی جی نے مغرب کے بجائے مشرقی ریاستیں چھتیس گڑھ اور مغربی بنگال کی جانب کسانوں کے بجائے آدیباسیوں سے ملنے کا ارادہ کرلیا۔ راہل نے جب کیدار ناتھ مندر کارخ کیا اور ایک طویل پیدل یاترا کرکے ذرائع ابلاغ پر چھا گئے تو مودی جی کو اپنے گروآتم شٹھا نند کی یاد آگئی اور اسی کے ساتھ مودی جی نے کالی کے مندر میں جاکر آرتی اتارنے کا بھی فیصلہ کرلیا۔ اس طرح گویا اپنی پیروی کروانے والا رہنما اپنے مخالف کی اتباع کرنے پر مجبور ہوگیا۔

بیچارے مودی جی کا ستارہ چونکہ فی الحال گردش میں ہے اس لئے پہلے تو چھتیس گڑھ میں ان کیلئے بنائے جانے والے مضبوط اسٹیج کو تیز آندھی نے اکھاڑ پھینکا اور بیچارے ۳۵ مزدور زخمی ہوگئے۔ خیر قدرتی آفات پر بھلا کس کا اختیار لیکن جن نکسلوادیوں کو بے وقوف بنانے کیلئے مودی جی چھتیس گڑھ گئے

تھے ان لوگوں نے بھی مودی جی کی ہوا اکھاڑ دی اور ان کا ۵۶ انچ کا سینہ پچک کر نہ جانے کتنے انچ کا ہوگیا۔ پہلے تو خبر یہ آئی کہ نکسلوادیوں نے ۱۵۰ لوگوں کو اغواء کرلیا ہے اس کے بعد پتہ چلا کہ یرغمالیوں کی تعداد ۵۰۰ ہے اور بالآخر ۱۰۰۰ لوگوں کی تصدیق ہو گئی۔ نکسلوادیوں نے اپنے اس اقدام سے یہ بات ثابت کردیا کہ دہلی یا رائے پور میں جس کسی کی بھی حکومت ہو لیکن ان کے اپنے علاقہ میں انہیں کا سکہّ چلتا ہے۔

مودی جی غالباً یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ ایک سال کے اندر انہوں نے نکسلی تشدد کو قابو میں کرلیا ہے لیکن وہ ایسا نہ کرسکے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینےکے قائل مودی جی نکسلوادیوں کی خدمت محبت کا پھول پیش کرکے آگے بڑھ گئے۔

چھتیس گڑھ میں اگر بی جے پی کے علاوہ کسی اور جماعت کی حکومت ہوتی تو ریاستی سرکار کو اس شرمناک واقعہ کیلئے موردِ الزام ٹھہرا دیا جاتا لیکن یہاں تو دانت بھی اپنے ہی تھے اوران کے درمیان زبان بھی اپنی ہی تھی لیکن اس طرح کی رسوائی آج سے قبل کسی وزیراعظم کے حصے ؔمیں نہیں آئی کہ اس کی ناک کے نیچے اس قدر لوگوں کو یرغمال بنالیا جائے اور وہ بے دست پا ان مناظر دیکھتا رہ جائے۔ مودی جی کے بنگال چلے جانے کے بعد بھی ریاستی حکومت یرغمالیوں کو آزاد نہ کراسکی بلکہ ماؤوادیوں نے ازخود انہیں واپس کردیا۔ مودی جی نے اعلان کیا اس تشدد کا واحد علاج ترقی و خوشحالی ہے اور وہ اس کی

خاطر ایک لوہے کا کارخانہ لگائیں گے۔ مودی جی کے دہلی لوٹنے سے قبل ہی ضلع بستر کے میں کارخانے کے خلاف احتجاج شروع ہوگیا اور گاوں والوں نے اعلان کردیا کہ جب تک حکومت پوری آبادی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں ٹھونس دیتی یہ کارخانہ نہیں لگ سکتا۔ اس طرح گویا مودی جی تشدد کی آگ کو بجھانے کے بجائے اس میں تیل ڈال کر لوٹے۔

مودی جی نے چھتیس گڑھ میں سینہ ٹھونک کر اعلان کیا کہ ایک سال کا عرصہ ہوگیا کیا کسی بدعنوانی کا نام سنا؟ بیچارے مودی جی اگر اس دوران لوک سبھا ٹیلی ویژن چینل ہی دیکھ لیتے تو انہیں پتہ چلتا کہ حزب اختلاف ان کی سرکار کے سینئر وزیر نتن گڑکری کے استعفیٰ کا مطالبہ کررہا ہے اور سارے ملک میں پورتی گھوٹالے کا شور سنائی دے رہا ہے لیکن مودی جی کسی کی سنتے کب ہیں وہ اپنی سنانے میں لگے رہتے ہیں لیکن اب لوگ بھی ان کی سنتے کم ہیں اور جو کچھ سنتے ہیں اس پر یقین بالکل بھی نہیں کرتے۔ مودی جی چھتیس گڑھ سے کولکاتہ گئے تو اپنی سیاست چمکانے کیلئے تھے لیکن درمیان میں دھرم کرم کا پاکھنڈ شروع کردیا۔

مودی جی اپنے گروجی سے ملاقات کیلئے جس بلور آشرم میں گئے اس کے متعلق بتایا گیا کہ سال کی عمر میں مودی جی گھر سے بھاگ کر وہاں سنیاسی بننے ۱۶

کیلئے پہنچے تھے مگر چونکہ گریجویٹ نہیں تھے اس لئے انہیں داخلہ نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد انہیں چاہیے تھا کہ ۳ سال کسی کالج میں جاکر تعلیم حاصل کرتے مگر وہ ہمالیہ پربت چلے گئے وہاں سے واپس آئے تو آتم شٹھانند راجکوٹ پہنچ چکے تھے۔ مودی جی نے پھر سے سنیاسی بننے کی خواہش ظاہر کی مگر گروجی نے منع کردیا۔ چوتھی بار وزیراعلیٰ بننے کے بعد وہ گروجی کی خدمت میں گئے اور کہا کہ آپ کی وجہ سے میں وزیراعلیٰ بن گیا۔ گروجی نے انہیں جو پھول پرساد کے طور پر دیئے ان کو جیب رکھ کر مودی جی نے حلف.برداری کی۔ وزیراعظم بن جانے کے بعد گروجی نے ازخود انہیں دعوت دی تو مودی جی کولکاتہ کے بجائے امریکہ کی سیر پر نکل گئے۔ فی الحال گروجی بستر مرگ پر ہیں اوران میں کسی دعویٰ کی تصدیق یا تردید نہیں کرسکتے تو مودی جی ان کی خدمت میں پہنچ گئےاور یہ کہانیاں ذرائع ابلاغ یں گردش کرنے لگیں۔

مذکورہ بالا افسانوں کو اگر درست مان لیا جائے تو مودی جی کے گروجی کے بارے میں ضرور یہ کہنا پڑے گا کہ وہ بڑے فرد شناس انسان ہیں ۔ مودی جی کو دیکھ کر وہ بھانپ گئے کہ اگراس شخص کو آشرم شامل کرلیا تو یہ آشرم کی نہ جانے کیا گت بنادے گا۔ اس لئے انہوں نے بار بار اصرار کے باوجود انہیں اپنے آشرم میں پھٹکنے نہیں دیا لیکن گاندھی جی کے قتل کے بعد گجرات میں کوئی سنگھ پریوار کے قریب پھٹکتا نہیں تھا۔ ان لوگوں کو لگا کہ یہ ہمارے کام کا

آدمی ہے اس لئے انہیں نہ صرف سویم سیوک بلکہ پرچارک بنالیا۔ سوامی آشٹھا آنند نے اپنے آشرم کو تو مودی جی کے پر کوپ سے بچا لیا لیکن پورے راشٹر کو سنکٹ میں جھونک دیا۔

وزیراعظم کی ممتا بنرجی سے ملاقات اور جے للیتا تو مبارکباد قومی سیاست پر دوررس نتائج ڈال سکتی ہے۔ فی الحال ایوان پارلیمان میں پورا حزب اختلاف ہر معاملے میں مودی حکومت کا مخالف بنا ہوا ہے اس طرح گویا این ڈی اے کے باہر ساری جماعتیں بلاواسطہ کانگریس کے ساتھ ہو گئی ہیں۔ ایوان بالا میں این ڈی اے اقلیت میں ہے۔ اس کے صرف ٦٠ جبکہ یوپی اے کے ٩٤ ارکان ہیں۔ اس لئے جس قانون میں حزب اختلاف چاہتا ہے رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔ پہلے این ڈی اے والے اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ بہت جلد ساری ریاستوں میں ان کی حکومت قائم ہو جائیگی اور ایوان بالا میں انہیں اکثریت حاصل ہوجائیگی لیکن اب اس کا امکان معدوم ہو چکا ہے۔ ایسے میں ممتا، مایااور جے للیتا کو اگر ساتھ لے لیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔ ویسے ممتا اور مایا کے پاس بھی جملہ ٢٣ ارکان ہی ہیں ۔ یہ تینوں جماعتیں پہلے بھی این ڈی اے ساتھ رہ چکی ہیں اس لئے پھر سے انہیں اپنے ساتھ لے لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہ بی جے پی کا نہ صرف اعتراف شکست بلکہ اس کی مجبوری بھی ہے۔

سردھا بدعنوانی کی آڑ میں ممتا کو پریشان کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔

.بردوان دھماکہ اور بنگلہ دیشی گھس پیٹھیوں کے ساتھ ساز باز کا الزام بھی ممتا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ ممتا بنرجی نے اس دوران مودی کے خلاف جو لب و لہجہ اختیار کیا وہ بھی قابل غور ہے۔ کبھی تو انہیں دنگا بابو تو کبھی گدھا کے لقب سے نوازہ۔ من کی بات پر طنز کرتے ہوئے کہا دماغ ہے نہیں تو چلے گا کیسے اور سمرتی ایرانی کے کپڑے بدلنے والے کمرے میں کیمرے کی کہانی پر یوں تبصرہ کیا کہ یہی معاملہ اگر مودی کے ساتھ ہوتا تو وہ کیمرے کو دیکھتے ہی تقریر شروع کردیتے۔ ویسے بی جے پی بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں تھی اس نے ممتا کے قریبی رہنماوں پر سردھا چٹ فنڈ میں ١٦ لاکھ لوگوں کو دھوکہ دینے کا الزام لگایا اور امیت شاہ نے کولکاتہ میں اعلان کیا کہ ہماری کامیابیوں کی ابتداء کولکاتہ میونسپلٹی سے ہوگی اور اس کی انتہا آئندہ سال اسمبلی انتخاب میں ہوگی جب بنگال سے ٹی ایم سی کا مکمل صفایہ ہوجائیگا۔

بلدیاتی انتخابات کے نتائج نے بی جے پی کو آئینہ دکھلادیا ریاست بھر میں اسے اوسطاً صرف ۴ فیصد ووٹ ملے اور کولکاتہ میں اس کا تناسب ۲۵ سے گھٹ کر ۱۵ پر پہنچ گیا اس لئے صوبائی انتخاب سے ایک سال قبل ہی بی جے پی نے ممتا کو اپنا حلیف بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ ممتا عوامی سطح پر لاکھ مقبول سہی لیکن ان

میں انتظامی صلاحیت کا فقدان ہے۔ صوبائی حکومت ۴۷ء۲ لاکھ کروڑ خسارے میں ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ مرکز اس قرض کو معاف کردے۔ ممتا بنرجی اس کیلئے سابقہ حکومت پر الزام دھرتی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود انہوں نے اسے کم کرنے کیلئے کیا اقدامات کئے؟ ممتا بنرجی کو آئندہ سال انتخابات سے قبل عوامی فلاح بہبود کیلئے بھی مرکزی امداد چاہیۓ اس لئے اب وہ لڑائی جھگڑے کے بجائے پیار محبت کی باتیں کرنے لگی ہیں اور مودی جی بھی کہہ رہے ہیں کہ ممتا کی شکایت بجا ہے۔ انہوں نے میرے سامنے اس لئے اسے رکھا ہے کہ وہ جانتی ہیں صرف میں ہی ان کی مدد کرسکتا ہوں۔ ممتا کے ساتھ آجانے سے بی جے پی کو ممکن ہے دو چار ایم ایل اے مل جائیں اور راجیہ سبھا میں اس کی مشکلات قدرے کم ہو جائیں لیکن مغربی بنگال کے اندر بی جے پی ملیا میٹ ہو جائیگی۔ ممتا کو بھی یقیناً نقصان اٹھانا پڑے گا اس لئے کہ بغضِ مودی میں جو مسلمان رائے دہندگان یکمشت انہیں ووٹ دے رہے ہیں وہ کانگریس و بائیں محاذ کی جانب نکل جائیں گے۔ ممتا کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بنگال کے اندر مسلمانوں کی تعداد گجرات کی مانند کم نہیں ہے وہ کئی مقامات پر نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ویسے سیکولرزم کا دم بھرنے والے ممتا جیسے موقع پرست سیاستدانوں کا کیا ہے اگر وہ ریاستی سطح پر ہار بھی جائیں تو مرکز میں وزیر بن جائیں گی۔ ابھی تک تین قوانین کو وضع کرنے

میں ترنمل کانگریس مودی سرکار کی حمایت کرچکی ہے اور بدلے میں سردھا گھوٹالے کی تفتیش کا کام دھیما کردیا گیا۔ سی پی ایم رہنما محمد سلیم نے اسے ''ملے سُر میرا تمہارا'' سے تعبیر کیا ہے۔

جے للیتا کی رہائی کے بعد نہ صرف ان کے پھر سے وزیراعلیٰ بن جانے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں بلکہ ممکن ہے وہ ہمدردی کی اس لہر کا فائدہ اٹھانے کیلئے قبل از وقت انتخابات کا اعلان بھی کردیں۔ ایسے میں کانگریس اور بی جے پی دونوں ان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے لیکن چونکہ مرکز میں بی جے پی کی حکومت ہے اس لئے کانگریس کے ہاتھ سے بہتر کمل کا ساتھ ہے۔ احسانمندی کا بھی تقاضہ ہے کہ اے آئی ڈی ایم کے دو پتوں کے درمیان کمل کا پھول کھلا ہوا ہو (اتفاق سے ممتا کا انتخابی نشان بھی دو پتے ہیں) قومی انتخاب کے بعد بی جے پی نے محسوس کیا تھا کہ تمل ناڈو کے اندر ایک زبردست سیاسی خلاء پیدا ہوگیا ہے۔ جے للیتا بدعنوانی کے الزامات میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا ہیں ۔ ڈی ایم کے کے دو سابق وزراء ۲جی گھوٹالہ کے سبب جیل کی ہوا کھارہے ہیں۔ کانگریس کا مکمل صفایہ ہوچکا ہے ایسے میں صرف بی جے پی اور اس کے ہمنوا پی ایم کے وغیرہ رہ جاتے ہیں اور انہیں اب اقتدار میں آنے سے روکنے والا کوئی نہیں ہے لیکن اب ان کے ہوش ٹھکانے آگئے ہیں اور سمجھ گئے ہیں کہ تمل رہنماوں کے اندر یا باہر ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا عوام تو انہیں کو

ووٹ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے پی نے خود اقتدار میں آنے کا خیال بالائے طاق رکھ کر جئے للیتا کی جئے جئے کار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جئے للیتا اور ممتا کے بعد بی جے پی کوشش ہوگی کہ اترپردیش میں مایاوتی کے ساتھ پینگیں بڑھائی جائیں اس لئے کہ آئندہ انتخاب میں سائیکل کو کچلنے کیلئے ہاتھی میرے ساتھی کا نعرہ لگانا لازمی ہے۔

بی جے پی کیلئے سب سے کڑا امتحان بہار میں ہے۔ نتیش کمار کے دوبارہ اقتدار سنبھالنے کے بعد اے بی پی اور نیلسن نے مل کر ایک جائزہ لیا تھا کہ اگر اب انتخابات کا اعلان ہوجائے تو کس جماعت کو کس قدر ووٹ ملیں گے۔ اس جائزے مطابق بی جے پی اپنے حلیفوں سمیت ۴۱ فیصد پر تھی اور نتیش و لالو کا محاذ ۵۶ فیصد پر تھا۔ ۱۵ فیصد ووٹ کی کھائی کو عبور کرنا کوئی معمولی بات نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مودی کی مقبولیت ریت کی دیوار کی مانند گررہی ہے ایسے میں نومبر تک اس کھائی وسیع تر ہونے کے قوی امکانات ہیں اور اس طرح کے فرق سے تو دو قطبی مقابلے میں کمزور فریق کا صفایہ ہوجاتا ہے جیسا کہ گزشتہ مرتبہ یوپی میں ہوا تھا۔

پنجاب میں صوبائی انتخابات بھی دن بدن قریب تر ہوتے جارہے ہیں جہاں عوام کا تعلق ہے وہ بی جے پی کی مرکزی اور اکالی دل کی ریاستی حکومت کے خلاف بھرے

بیٹھے ہیں۔ گزشتہ قومی انتخاب میں زبردست مودی لہر کے باوجود بھاجپ اکالی اتحاد کو ۱۳ میں سے ۷ نشستوں پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مودی سرکار میں سب سے زیادہ طاقتور وزیر خزانہ ارون جیٹلی بھی جالندھر کے اکھاڑے سے دھول چاٹ کر لوٹے۔ ایسے میں کوئی بعید نہیں جو اگر بی جے پی کو محسوس ہوا کہ اکالی دل کے بادل اس بار صرف گرجیں گے مگر برسیں گے نہیں تو وہ اپنے کٹر حریف کیجریوال سے ہاتھ ملالے۔ بی جے پی اگر مفتی صاحب کی پی ڈی پی کے ساتھ مخلوط حکومت بنا سکتی ہے اور این سی پی کی حمایت سے مہاراشٹر میں اعتماد کا ووٹ حاصل کر سکتی ہے تو عام آدمی پارٹی میں کیا برائی بلکہ بھلائی ہے۔ ابن الوقتی کے سیاسی حمام میں فی الحال تمام جماعتیں برہنہ ہیں اس لئے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سیاست کے اندر وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے جیسا کہ ممتا دیدی نے کیا، کل تک جسے گدھا کہتی تھیں آج دادا کہہ کر پچکارنے لگیں۔

عصر حاضر میں فرعون و کلیم کا معرکہ

ڈاکٹر محمد موری اور ان کے ساتھ ۱۰۰ سے زیادہ افراد کو ایک نام نہاد عدالت کے ذریعہ سزائے موت سنوا کر مصر کے فوجی سربراہ عبدالفتاح السیسی نے اپنے آپ کو پھر ایک بار فرعونِ وقت ثابت کردیا ہے۔ گزشتہ ماہ ایک اور عدالت نے انہیں اپنے صدارتی محل کے باہر مظاہرین کی گرفتاری اوران کی ایذارسانی کیلئے ۲۰ سال کی سزا سنائی تھی۔ اب ایک اور عدالت نے انہیں جیل سے فرار ہونے کا الزام میں موت کی سزا سنائی جبکہ سابق مصری چیف آف اسٹاف.بریگیڈیر سمیع عنان نے صدر موری کو اس بابت بے خطا قرار دیا تھا لیکن اس بار وہ شہادت بھی بے سود رہی۔ صدر موری اور ان کے دیگر ساتھیوں کو جیل نکلنا تو موجوع بحث ہے مگران لوگوں کو جیل میں کیوں بھیجاگیا تھا اس پر کوئی گفتگو نہیں کرتا۔ سابق فوجی آمر حسنی مبارک نے اپنا اقتدار بچانے کیلئے ہزاروں مصریوں کو بلاجواز جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دیا تھا۔ ان میں اخوان کے دیگر رہنماوں کے ساتھ صدر موری بھی تھے۔ حسنی مبارک کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عبدالفتاح السیسی نے بھی ۴۱ ہزار بے قصور لوگوں کو جیل میں قید کررکھا ہے۔ حسنی مبارک نے تحریر چوک کے مظاہروں کے دوران اور قبل نہ جانے کتنے مظاہرین کو شہید کروادیا لیکن اس ظالم کو تومصری عدالت محض ۳ سال کی سزا سنائی جبکہ موری اوران کے

ساتھیوں کو سزائے موت کا مستحق قرار دیا جو عدالتی جانبداری کے جبر و قہر کا شاخسانہ ہے۔

صدر محمد موری کی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں بجا طور پر بہت کچھ لکھا گیا مگر جن دیگر افراد کو سزا موت سنائی گئی ان کی تفصیل بھی عدل و انصاف کا پھانسی چڑھاتی ہے۔ مثلاً صنم عاصم جو سب سے کم عمر ملزمہ ہے۔ وہ اس لئے قابلِ گردن زدنی ٹھہریں کہ آزادی و انصاف پارٹی کی ترجمان تھیں اور ویب سائٹ کا نظم کرتی تھیں۔ انہوں انقلابی تحریک میں شاملی نوجوانوں کی مثالی حوصلہ افزائی کی اور یہیاں کے تختۂ دار تکپہنچنے کا سبب بنا۔ اس فہرست میں عماد شاہین کا نام بھی ہے جو قاہرہ میں واقع امریکی یونیورسٹی اور جارج ٹاون یونیورسٹی میں درس وتدریس کا کام کرتے ہیں ۔ وہ عالمی شہرت یافتہ دانشور ہیں اور ان کے سیاسی افکار کو ساری دنیا میں قدردانی کی جاتی ہے۔ بظاہر تو ان پر جاسوسی کا الزام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعلیم گاہوں کے میں حریت کے جذبے کو کچلنے کیلئے انہیں سزائے موت دی گئی ہے۔ عالم اسلام کے معزز ترین علماء میں سے ایک علامہ یوسف القرضاوی کا نامِ نامی بھی مذموم عدالتی فیصلے میں شامل ہے جبکہ وہ عرصۂ دراز سے جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان پر اگر کوئی الزام ہو سکتا ہے تو وہ انقلاب کے بعد تحریر چوک پر تاریخی خطبہ ارشاد فرمانے کا ہے۔ صدر موری کو جیل چھڑانے کے الزام میں کئی

فلسطینیوں کو بھی سزا سنائی گئی ہے جن میں سے تین کا انتقال اس واقعہ سے قبل ہو چکا ہے۔ یہ فاش غلطی اس بات کا ثبوت ہے کہ فلسطینیوں کی یہ فہرست احمق یہودیوں کی مرتب کردہ ہے جو یہ نہ نہیں جانتے کہ ان کے مطلوبہ افراد میں کون زندہ ہے اور کون اس دارِ فانی سے کوچ کرچکا ہے۔

اس بہیمانہ فیصلے کی مذمتّ ساری دنیاکے انصاف پسندوں نے کی۔ یوروپی یونین اور امریکہ نے بھی تشویش کا اظہار کیا اور اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون بھی خاموش نہیں رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مصری حکمرانوں نے اسے حق بجانب ٹھہرانے اور عوام کو گمراہ کرنے کی خاطر صحرائے سینا میں تین ججوں پر حملہ کرکے انہیں ہلاک کروادیا۔ ایک اور شخص بھی ہلاک ہوا ممکن ہے وہی حملہ آور ہو مزید تین جج زخمی ہو گئے۔ اس حملے کا الزام اسلام پسندوں پر دھر دیا گیا اور اسے قاہرہ کے فیصلے سے کچھ اس طرح جوڑ دیا گیا کہ غایت نظر میں یوں محسوس ہوتا ہے گویا جس عدالت نے محمد موری اور ان کے ساتھیوں کو سزا سنائی انہیں پر گولی چلی جبکہ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ابہام اس قیاس آرائی کو جنم دیتا ہے جس کی مدد سے زر خرید ذرائع ابلاغ رائی کا پہاڑ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس سے قبل قاہرہ کے ایک جج معتاذ خفگی کے گھرکے باہر بم دھماکہ ہوا جس نے جنوری میں ۱۱۲ اخوانی رہنماوں کو موت کی سزا سنائی تھی۔ اس حملے میں کسی کا بال بیکا نہیں ہوا لیکن اخوان کے خلاف نفرت کا ماحول ضرور بن گیا۔ وزارتِ داخلہ نے قاہرہ کے مضافات میں ایک پولس

والے کے ہلاک ہونے کی خبر بھی دی جسے موٹر سائیکل پر سوار بندوق برداروں نے ہلاک کردیا۔ اس واقعہ کو بھی بلاواسطہ اخوان سے جوڑ دیا گیا جبکہ اخوان اول روز سے ہر طرح کے تشدد کی مذمت کرتی آرہی ہے لیکن ہر بار اسی کو موردِ الزام ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

اس ناعاقبت اندیش فیصلے کے بعد مصری حکام نے ۶ افراد کو فوجیوں کا قتل کرنے کے جرم میں تختہ دار پر لٹکا دیا۔ان افراد پر جولائی ۲۰۱۳ء میں ڈاکٹر محمد مرسی کی برطرفی کے بعد سکیورٹی فورسز پر حملوں کے الزامات میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مصر کی ایک فوجی عدالت نے ان کی پھانسی کی سزا بحال رکھتے ہوئے معافی کی اپیل مسترد کردی تھی۔ان لوگوں کا تعلق شورش زدہ جزیرہ نما سیناء میں برسرپیکار جنگجو گروپ انصار بیت المقدس سے بتایا گیا۔انہیں داعش سے بھی انہیں وابستہ کردیا گیا۔انسانی حقوق کی تنظیموں نے پھانسی کی سزا پر عمل درآمد موخر کرنے کا مطالبہ کیا تھا اس لئے ان میں سے دو مدعا علیہان تو مذکورہ واقعے کے رونما ہونے سے قبل ہی زیر حراست تھے۔انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق ان افراد کے خلاف بالکل غیر منصفانہ انداز میں مقدمہ چلایا گیا ہے اور انصاف کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے کیونکہ اس مقدمہ کا واحد گواہ خفیہ پولیس کا ایک افسر تھا۔اخوان کے قائد سید قطب شہید کو ۱۹۶۶ء میں اسی قسم کے بے بنیاد الزامات میں پھانسی کی

سزا دی گئی۔ان پر بھی مصر کے خلاف سازش کا الزام عائد کیا گیا تھا۔مصر کا موجودہ سیاسی ماحول بھی ۱۹۶۰ء کے عشرے جیسا ہی ہے لیکن یہ سیکولر حضرات کیوں بھول جاتے ہیں کہ اپنی تمام تر سفاکی و بربریت کے باوجود وہ اسلامی تحریک کو نہ ماضی میں ختم کرسکے ہیں اور نہ مستقبل میں کرسکیں گے۔

مصری حکمرانوں کی جانب سے فلسطینی نام نہاد تنظیم انصار بیت المقدس کے نام کو اچھالنا اور فلسطینیوں کو سزائے موت سنانا دراصل مصری عوام کے دلوں میں فلسطینیوں کے خلاف بغض و نفرت کے جذبات پیدا کرکے انہیں اسرائیل نواز بنانے کی سازش کا حصہ ہے تاکہ امریکہ کی خوشنودی حاصل کی جاسکے۔مصری حکمرانوں نے اپنے آپ پر یہ مجبوری ۱۹۷۰ء کے اندر عائد کرلی جب جمال عبدالناصر اسرائیل سے شکست کے بعد امریکہ کی جانب سے عرب اسرائیل تنازع کے حل کی خاطر تجویز کردہ راجرس پلان میں شامل ہوگئے۔ عرصۂ دراز تک چونکہ وہ فلسطینی حقوق کے سب سے بڑے محافظ سمجھے جاتے تھے اس لئے قاہرہ میں زیر تعلیم فلسطینی طلباء نے۔ان کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔اس کے جواب میں جمال عبدالناصر نے راتوں رات تمام طلباء کو گرفتار کرکے اردن روانہ کردیا۔اس کے بعد انور سادات نے کیمپ ڈیوڈ میں امریکہ و اسرائیل کے ساتھ مصالحت کرلی اور ان کے مفادات کے محافظ بن گئے۔ حسنی مبارک نے اس کام کو آگے بڑھایا اور امریکہ کی معاشی و فوجی امداد کے عوض اسرائیل کو کم نرخ پر گیس فراہم کرنے لگے۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ مصری گیس خود ان کی عوام کو

دوگنی قیمت پر میسر آتی ہے جبکہ اسرائیلی حکومت کو نصف قیمت پر مہیا کی جاتی ہے۔
عبدالفتاح السیسی نے بھی اقتدار سنبھالتے ہی غزہ کی ناکہ بندی سخت کردی اورزیر زمین سرنگوں کو تباہ کرنے کاکام تیز کردیا۔ یہ تمام لوگ ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جن میں استثناء واحد منتخبہ صدر ڈاکٹر محمد موری تھے جنھوں نے فلسطین کی کھل کر حمایت کی اور اسی لئے جمہوریت نواز امریکہ نے غیر جمہوری طریقہ سے ایک سازش کے تحت ان کا تختہ الٹ دیا۔
مصر کے اندر رونما ہونے والے حالیہ واقعات اور قصہ فرعون کلیمؑ میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے۔ سورہ اعراف میں ارشاد ربانی ہے ’’موسیٰ نے کہا : اے فرعون، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوانہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں، للہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے‘‘۔ حضرت موسیٰؑ کی اس دعوت کو سن کر ’’فرعون نے کہا: اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر۔ موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا‘‘۔ جس طرح فرعون اور اس کے درباری موسیٰؑ کے معجزات کو دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے یہی حال تحریر چوک پر ہونے والے مظاہرے کو دیکھ کر حکمراں

فوجی ٹولے کا تھا۔ ان لوگوں نے سوچا کہ حسنی مبارک سے نجات حاصل کرنے کا یہ نادر موقع ہے جو اپنے بیٹے کو صدارت کی کرسی پر براجمان کرنے کیلئے بے چین ہے۔ فوج نے مظاہرین کے ساتھ تصادم کے بجائے تعاون کی راہ اختیار کی۔ انہیں یقین تھا کہ انقلاب کے بعد وہ انتخاب کے جادو سے پھر ایک بار عوام کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیں گے اور ایک نیا فوجی آمر اقتدار سنبھال لے گا۔

حضرت موسیٰ کے معجزات کو دیکھ کر فرعون کے درباریوں نے ان سے ٹکراؤ کے بجائے انہیں جادوگروں کی مدد سے زیر کرنے منصوبہ بنایا لیکن دلچسپ بات یہ ہے عصر حاضر کے فرعونیوں کی مانند انہیں بھی زمین سے بے دخل ہوجانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا جس کا بیان کچھ اس طرح ہے کہ ’’ اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ: یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، اب کہو کیا کہتے ہو؟ پھر اُن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے۔ کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے اُنھوں نے: اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟ فرعون نے جواب دیا: ہاں، اور تم مقرب بارگاہ ہوگے‘‘۔ اس طرح گویا پارلیمانی انتخابات کا اعلان ہوگیا۔

مصر میں کئی نئے پرانے جادوگر تھے جو اپنی سیکولر سیاسی ڈگڈگی بجایا کرتے تھے اور سبھی کو یہی توقع تھی کہ وہ کامیاب ہوں گے فوج کو یقین تھا کہ یہ

اپنے مفادات کی خاطر ہمارے باجگذار بن جائیں گے لیکن ہوا کہ خلاف توقع اسلام پسندوں کو بھاری اکثریت سے کامیابی ملی اور جادوگروں سمیت ان کے آقا بھی ناکام نامراد ہوگئے۔ ان کی حالت ان جادوگروں سے مختلف نہیں تھی جن کا بیان قرآن کریم میں ہمیں پڑھنے کو ملتا ہے فرمایا'' پھر اُنہوں نے (جادوگروں) موسیٰ سے کہا: تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟ موسیٰ نے جواب دیا: تم ہی پھینکو۔ انہوں نے جو اپنے آنچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنالائے۔ ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔ اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ اُنہوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدان مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) الٹے ذلیل ہو گئے''۔ یہ گویا فوجی حکمرانوں اور ان کے حاری حواری سیاسی جماعتوں کے انتخابی حکمت عملی کی فاش ناکامی تھی۔

عوام کا حال جادوگروں جیسا تھا جنھوں نے لادینیت اور الحاد کے بجائے اسلام کو پسند کرلیا تھا اور اسلام پسندوں کو کامیابی و کامرانی سے نوازہ تھا۔ قرآن مجید میں جادوگروں کا رویہ ملاحظہ فرمائیں'' اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے: ہم نے

مان لیا رب العالمین کو۔ اُس رب کو جسے موسیٰ اور ہارونؑ مانتے ہیں''۔ انتخاب کا اعلان تو خود فوجی اقتدار نے کیا تھا لیکن نہ توانہوں نے پارلیمانی انتخاب کے نتائج کو دل سے قبول کرکے ایوانِ پارلیمان کو آزادانہ طور پر دستور سازی کی اجازت دی اور نہ صدارتی انتخاب میں کامیاب ہونے والے مصر کے اولین غیر فوجی صدر ڈاکٹر محمد مورسی کو یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا۔ وہ عوام سے اس لئے بددل ہو گئے تھے ان لوگوں فوج کی مرضی کا خیال کیوں نہیں کیا۔ سابق جنرل اشفاق کو کیوں شکست سے دوچار کردیا؟ یہ رویہ بھی فرعونیوں سے بہت مشابہ تھا''فرعون نے کہا: تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں؟ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا''۔

متکالمین نامی عربی چینل پر حال میں مصر کی سب سے پرانی وفد پارٹی کے رہنما بداوی اور ایک فوجی سربراہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو نشر کیا گیا۔ یہ گفتگو صدر مورسی کے انتخاب سے پہلے کی ہے جب بداوی اخوان اور نور پارٹی کی مدد سے صدارتی انتخاب لڑنا چاہتے تھے۔ ان کے اس ارادے پر ایک فوجی نے بالکل فرعون کے لب ولہجے کہا تھا آنے والے وقت اخوان کیلئے بہت برا ہوگا۔

اسلحہ بردار سرکاری غنڈے ان کے گھروں میں گھس کر ان کو ذبح کریں گے۔ جو بھی مزاحمت کرے گا اسے اس کے بستر پر قتل کردیا جائیگا۔ دہشت گردی مصر میں عام ہو جائیگی۔ ہم اخوان سے اور ان تمام لوگوں سے انتقام لیں گے جن لوگوں نے حکومت کا تختہ الٹنے میں حصہ لیا ہے۔ فی الحال وفد پارٹی کو فوج نے اپنا لیا ہے۔

صدر موری کے اقتدار سنبھال لینے کے بعد فوج اور عدلیہ آئے دن کے خلاف نت نئے مسائل پیدا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک سازش کے تحت انہیں معزول کردیا گیا اور جب اس فوجی بغاوت کے خلاف اسلام پسندوں نے صدائے احتجاج بلند کی تو فوجی حکمرانوں نے ان پر ظلم و ستم کی انتہا کردی۔ اس کے باوجود رابعہ میدان میں عہدِ حاضر کے مجاہدین نے ایمان لانے والے جادوگروں کے صبر واستقامت کی یاد تازہ کردی۔

فرعونیوں کے دھونس دھمکی کے جواب میں جادوگروں نے کہا تھا''بہر حال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انہیں مان لیا اے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اِس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں''۔

طاقت اور قوت کے بل بوتے پر اسلام پسندوں کی پرامن عوامی مزاحمت کو وقتی طور پر کچل دیا گیا لیکن عصر حاضر کے فرعون صفت حکمراں اس پر قانع نہیں

ہوئے بلکہ ہزاروں لوگوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا اور عدالت کی آڑ میں ان کو سخت ترین سزائیں کا دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ زمین کو ظلم وفساد سے بھر دینے والے ان فوجی آمروں کی دلیل بھی فرعونیوں سے مختلف نہیں ہے جس کو کلام الٰہی میں اس طرح رقم کیا گیا ہے کہ ”فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تو موسیٰ اور اُس کی قوم کو یونہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے؟ فرعون نے جواب دیا: میں اُن کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے“۔ آج مصر میں وہی منظر دوہرایا جارہا ہے جس کا ارادہ فرعون نے کسی زمانے میں کیا تھا لیکن اہل اسلام اس جبر استبداد کے باوجود مایوس نہیں ہیں۔ ان کی لبوں پر آج بھی وہی کلمہ ہے جو کسی زمانے میں حضرت موسیٰ کی زبان پر تھا۔ اس موقع پر” موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری کامیابی انہی کے لیے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں“۔

امت کے اندر آج بھی ایسے ناعاقبت اندیش لوگ موجود ہیں جو سارے ظلم و فساد کا الزام الٹا اخوان پر ڈالتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا بھی اس وقت یہی رویہ تھا کہ ”اس کی قوم کے لوگوں نے کہا: تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے

تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں"۔ لیکن ان نادانوں سے ناراض ہونے کے بجائے وقت کا نبی ان کو جواب دیتا ہے" قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو"۔ ۷۰ کی دہائی میں جمال عبدالناصر اور انور سادات اس خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے کہ انہوں نے اسلام کے چراغ کو گل کر دیا ہے لیکن ۲۰۱۲ میں دنیا نے دیکھا کہ اسلام کا پرچم لہرا رہا ہے اور ان دونوں کی لعنت ملامت ہو رہی ہے۔ فی الحال حسنی مبارک اور عبدالفتاح السیسی بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ انہوں نے اسلام کا علم سرنگوں کر دیا ہے لیکن یہ پرچم اسلام تو حضرت موسیٰ کی زمانے میں بھی لہرا رہا تھا اور قیامت تک یونہی لہراتا رہے گا۔ اس لئے کہ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا (بلند و عزیز تو اللہ کا کلمہ ہے: سورہ توبہ)۔

(اس مضمون میں قوسین کے اندر سورہ اعراف کی آیات ۱۰۴تا۱۲۹ کا ترجمہ قرآنی ترتیب میں درج ہیں)

مودی جی: اقتدار کام کا انعام نہیں موقع ہے

وزیراعظم نریندر مودی کی حلف برداری کو ایک سال ہوا چاہتا ہے۔ اس موقعہ پر مختلف زاویوں سے ان کارکردگی کے بجائے شخصیت کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ لوگ اس بات پر گفتگو نہیں کررہے کہ اس دوران مودی جی نے قومی یا عالمی سطح کے کن کن مسائل کو حل کیا بلکہ ان کے ذریعہ پیدا کردہ مسائل زیر بحث آرہے ہیں ۔ ایسے میں ایک موضوع یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آخر مودی جی کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ ۲۶ مئی ۲۰۱۴ء سے قبل تو ان کا ہدفِ واحد حلف برداری تھا لیکن اب وہ کیا چاہتے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اب وہ تاحیات اقتدار میں رہنا چاہتے ہیں اور تو اٹل جی کی مثال سامنے ہے۔ انہیں اگر آج پھر سے وزیراعظم بنا بھی دیا جائے تو وہ نہیں جان سکیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟ ممکن ہے مودی جی کو ابھی تک خود اس سوال پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہو کہ وہ کیا اور کیسے کرنا چاہتے ہیں؟ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ جلد از جلد اس کیلئے فرصت نکالیں اور غوروخوض کرکے کسی نتیجے پر پہنچیں اس لئے کہ صرف باتوں سے پیٹ تو نہیں بھرتا مگر طبیعت اوب جاتی ہے۔ خیر مودی جی کے مسائل جو بھی ہوں لیکن عوام ملک کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ان

کے اچھے دن تو نہیں آئے مگر سیاست کے اوچھے دن ضرور آگئے ورنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ملک کا وزیر اعظم بیرون ملک اپنے ہی باشندوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ''پہلے لوگ سوچا کرتے تھے کہ انہوں نے پچھلے جنم میں کیا پاپ کئے ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوگئے''۔ اس ایک جملے سے وزیر اعظم کی نفسیات کا پتہ چلتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جملے میں 'پہلے' سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے مودی جی کے وزیر اعظم بن جانے سے پہلے۔ دوسرا سوال کون لوگ یہ سوچا کرتے تھے؟ چونکہ وزیر اعظم ہنوز اپنے آپ کو سنگھ کا پرچارک سمجھتے ہیں اس لئے لوگ سے مراد سنگھ سیوک ہیں۔ یہ لوگ اپنے علاوہ کسی کو انسان ہی کب سمجھتے ہیں اور اپنے مخالفین کو شیطان سے کم نہیں سمجھتے۔ پونر جنم کے بکھیڑے پر بھی یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔

گجرات میں کیشو بھائی پٹیل کو دوبارہ اقتدار میں لانے کے بعد جب سنگھ پریوار نے مودی جی کو گجرات سے تڑی پار کرکے دہلی روانہ کردیا تھا یا جب امریکہ نے گجرات کے فسادات کے بعد ان کا اپنے ملک میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا تو اس وقت مودی جی ضرور یہ سوچتے رہے ہوں گے کہ انہوں نے پچھلے جنم میں کون سا پاپ کردیا جس کے سبب وہ ہندوستان میں پیدا ہوگئے اور سنگھ پریوار کا حصہ بن گئے لیکن اب وزیر اعظم بن جانے کے بعد صورتحال بدل گئی ہے اس لئے ان کی سوچ بھی تبدیل ہونی چاہئے۔ ممکن ہے ہنوز وہ ماضی میں جی رہے

ہوں اور ہندوستانی عوام کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اپنی اس سوچ کو سارے ہندوستان سے منسوب کردیا ہو؟ جمہوریت میں غالباً یہ ان کا حق ہے۔

اس سرکار کا المیہ یہ ہے کہ بات جہاں سے بھی شروع ہو گھوم پھر کر مودی جی اور ان کی حماقتوں تک پہنچ جاتی ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی وجہ تلاش کی جائے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مودی جی یہ حرکات جان بوجھ کر نہیں کرتے ہیں بلکہ ان سے وہ بے ساختہ سرزد ہوجاتے ہیں ۔ جیسے اگر کوئی شخص اپنے پیر سے بڑا جوتا پہن لے اور تیزی سے چلنے کی کوشش کرے تو اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔ وہ جب اپنے گھر یا پریوار کے اندر گرتے ہیں تو کسی کو نظر نہیں آتے مگر جب غیر ملکی دورے پر یہ ہوتا ہے تو ساری دنیا دیکھتی ہے۔ اپنی ان حماقتوں سے دنیا کو روشناس کرنے کا اہتمام بھی وزیراعظم خود کرواتے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور ان لوگوں کا ہے جنھوں نے ان کے پیر کی جسامت دیکھے بغیر انہیں اتنا بڑا جوتا پہنا دیا۔ اب نہ پیر بڑا ہوسکتا ہے اور نہ جوتا چھوٹا ۔ اس کے چلتے کبھی سیول تو کبھی ٹورنٹو میں ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے

ہندوستان کی عوام نے نہ صرف وزیراعظم کو غلط جوتا پہنا دیا بلکہ ان کے سر پر بہت بڑا تاج بھی رکھ دیا۔ مودی جی کے سر میں چونکہ بہت ساری ہوا بھری

ہے اس لئے بظاہر محسوس نہیں ہوتا کہ تاج ڈھیلا ہے لیکن یہ تو طبیعات کا مسلّمہ اصول ہے کہ جب انسان ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بلندی پر جاتا ہے تو ہوا کے دباو میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور مودی جی کے ساتھ جب ایسا ہوتا ہے تو تاج زمین پر آجاتا ہے۔ یہ تاج جس عوام نے ان کے سر پر کھا ہے ساری غلطی انہیں کی ہے مودی جی کا اسمیں کوئی قصور نہیں ، لیکن اس کے سبب بیچارے وزیراعظم کو آئے دن ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے ۔بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ دنیا کے ہر مسئلہ کا حل ہے مگر مودی جی کو اپنا یہ مسئلہ خود حل کرنا ہوگا۔ اس کا ایک آسان سا حل تو یہ ہے کہ مودی جی اس تاج کو از خود اتار دیں لیکن کسی بھی سیاستداں کیلئے یہ بہت ہی مشکل کام ہے اس لئے اس متبادل کو چھوڑ دینا بہتر ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا حل یہ ہے کہ مودی جی اپنے سر میں سے ہوا کو نکالیں اور اور اس کے اندر ٹھوس افکار و نظریات کو جگہ دیں ۔ اگر ان کے سر کی جسامت اور تاج کا سائز یکساں ہو جائیگا تو یہ مسئلہ کسی قدر حل ہو جائیگا اور وہ اپنے آپ کو بار بار گرنے سے بچا سکیں گے۔اس کیلئے انہیں ہوا میں اڑنے کے بجائے زمین پر اپنے قدم جمانے ہوں گے ۔ اس سے جوتوں کی اور پیروں کی جسامت یکساں ہو جائیگی۔ مودی جی کو ایسا لگتا ہے عہدے پر آجانا ہی سب کچھ ہے جبکہ حقیقت کی دنیا میں عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنی کارکردگی سے اس کا حق ادا کرنے کے بعد دنیا ذہانت و صلاحیت کا لوہا تسلیم کرتی ہے۔ پہلے کام پھر

انعام' یہ اصول مودی جی کی جلد باز طبیعت سے متصادم ہے اور یہی ٹکراو ان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ایک سال قبل وہ پہلی مرتبہ ایک ریاست سے نکل کر قومی سیاست میں آئے تھے۔ انہیں چاہئے تھا کہ دو تین سال جم کر کام کرتے۔ جن توقعات کے ساتھ لوگوں نے انہیں منتخب کیا تھا ان کو کسی نہ کسی حد تک پورا کرتے تو اپنے آپ عالمی سطح پر ان کی ساکھ قائم ہوتی اور لوگ ان کی پذیرائی کرتے لیکن انہوں نے قومی سطح پر آتے ہی کوئی بڑا کارنامہ انجام دیئے بغیر عالمی سطح پر چھلانگ لگا دی۔ اس جلد بازی نے انہیں نہ ملک کے اندر کچھ کرکے دکھانے کا موقع دیا اور نہ ملک کے باہر ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔ مودی جی کو یاد رکھنا چاہئے کہ محض اقتدار میں آجانا کام کا انعام نہیں ہے بلکہ کچھ کر دکھانے کا قیمتی موقع ہے جسے وہ بے دریغ ضائع کر رہے ہیں۔

مودی جی ! شادی سے قبل خواب دیکھے جاتے ہیں اور شادی کے بعد ان کو شرمندۂ تعبیر کیا جاتا ہے۔ حلف برداری کے بعد اب اقتدار کے ساتھ سات پھیرے ہو چکے ہیں۔ اب لوگ خوابوں سے نکل کر حقیقت دنیا میں آنا چاہتے ہیں لیکن آپ خوابِ غفلت سے بیدار ہونا ہی نہیں چاہتے۔ ایسا نہ ہو کہ آئندہ انتخابات کے نتائج ہی آپ کی نیند اڑائیں؟ یا درمیان ہی میں بی جے پی کو اپنی غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ صرف باتیں کرنے والے وزیراعظم کے بجائے کسی کام کرنے والے آدمی کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ڈور سونپ دے۔ پہلی سالگرہ سے قبل

راجناتھ کا سنگھ کے سنگھ کے دفتر ناگپور جانا اور پھر امیت شاہ کا بلایا جانا اپنے اندر بہت سارے پیغامات رکھتا ہے۔ امیت شاہ کے بعد وزیر خزانہ ارون جیٹلی کے بجائے وزیر دفاع منوہر پریکر کے ناگپور درشن میں بھی (ان لوگوں کیلئے جو اقتدار کے نشے میں مدہوش نہیں ہیں) واضح اشارے موجود ہیں۔ سرکار پہلی سالگرہ منانے کی خوشی میں اگر ان خطرات سے چشم پوشی کی جائے تو جلد یا بہ دیر بڑا حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔

آئی پی ایل: صارفیت کا پر فریب جال

آئی پی ایل کا بخار بھی مودی سرکار کے خمار کی مانند خوب سر چڑھ کر بولا اور پھر ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا۔ شائقین نے دیکھا کہ امبانی سیٹھ کی جو ٹیم پہلے چار کھیل لگاتار کھیل کر سب سے نیچے کی پائیدان پر تھی وہ بالآخر فائنل جیت گئی۔ دولت و ثروت کے جادو نے مودی جی کی بی جے پی کو جس طرح کامیاب کیا تھا اسی طرح روہت شرما کی ممبئی انڈین کو بھی کامیابی ملی ۔ امبانی کے نزدیک بی جے پی اور ممبئی انڈین ویسے ہی زر خرید ہیں جیسے روہت شرما اور مودی۔ سرمایہ دارانہ تجکاری کے بعد کرکٹ کے کھیل کی جو درگت بنی ہے وہی حال سرمایہ کاروں کے عمل دخل سے ہندوستانی جمہوریت کا ہوا ہے۔ اس سیاسی انقلاب کو سمجھنے کیلئے کرکٹ کی دنیا میں آئی پی ایل کے ذریعہ برپا ہونے والی تبدیلیوں کاادراک کافی ہے۔ چونکہ ان دونوں میدانوں آنے والی تبدیلیوں کے پس پشت کارفرما محرکات یکساں ہیں اس لئے نتائج میں بھی کوئی فرق نہیں ہے ۔ یکے بعد دیگرے آئی پی ایل کے عہدیداران بدعنوانی کے سنگین الزاماتکے تحت رسوا ہو رہے ہیں جس کا موازنہ صرف اور صرف سیاست کے گھناؤنے کھیل سے کیا جاسکتا ہے جو سر سے پیر تک گھوٹالوں کے گندے نالے میں غرق ہے۔ کیا یہ یکسانیت یا مشابہت چونکانے والی نہیں ہے؟

ایک زمانہ وہ تھا جب ایک قومی ٹیم ہوا کرتی تھی جو دوسرے ممالک کی قومی ٹیموں کے ساتھ سال میں دو چار سیریز یا دس بارہ میچ کھیل لیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ مختلف ریاستوں کی ٹیمیں ہوتی تھیں جن کی سرپرستی صوبائی حکومت کرتی تا کہ کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور رنجیت ٹرافی و دلیپ ٹرافی جیسے ٹورنامنٹ کی مدد سے قومی سطح کے اہل کھلاڑیوں کا انتخاب کیا جاسکے۔ کچھ کھلاڑی بنکوں یا ریلوے وغیرہ میں ملازمت بھی کرتے تھے لیکن ان کا تشخص بہر حال ان کے اپنے صوبے یا قوم سے وابستہ تھا۔ لوگ ریڈیو پر کمنٹری سنتے تھے یا اسٹیڈیم میں جاکر میچ دیکھتے تھے۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن کا زمانہ آیا۔ جب تک کہ ایک سرکاری چینل ہوا کرتا تھا کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں آئی لیکن پھر نجی چینل میدانِ عمل میں آئے تو ان کی آمد کو بجا طور پر ایک خوش آئند تبدیلی گردانہ گیا اس لئے کہ ذرائع ابلاغ سرکار کے چنگل سے بظاہر آزاد ہو چکا تھا۔ ابتداء میں نجی ٹی وی چینلس نے عوام کو احساس دلایا کہ خود ان کے ووٹ سے عالم وجود میں آنے والی جمہوری حکومت نہ صرف حقائق کی پردہ پوشی کرتی ہے بلکہ نت نئے انداز میں انہیں گمراہ بھی کرتی ہے۔ لوگوں نے سوچا کہ ان نئے چینلس کی بدولت وہ نہ صرف حقیقت سے آگاہ ہو سکیں گے بلکہ سرکاری گمراہی سے نجات

پا جائیں گے لیکن عوام کی یہ خوش فہمی بہت جلد دور ہو گئی۔ نجی چینلس کے اوپر سرکار کا سایہ نہیں تھا لیکن سرکار کا دباؤ ضرور تھا۔ کسی بھی صحافی یا چینل کو معتوب کرکے اپنی اطاعت کیلئے مجبور کرنا حکومت کیلئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چینل کے مالک کو منہ بولی قیمت پر خرید کر اپنا آلۂ کار بنا لینے میں بھی کوئی دقت نہیں تھی بلکہ یہ حکومت اور سرمایہ داروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس کام کو سہل بنانے کیلئے ٹی وی چینلس کی نشریات کو مہنگا کیا گیا اور اس کے مالکین کے اندر دولت کی حرص و ہوس کو ہوا دی گئی اس کے بعد جب ان کے آگے دانہ ڈالا گیا تو اپنے آپ صیاد یعنی صحافی سمیت شکار یعنی ناظر دام فریب میں گرفتار ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ حربہ نہایت کامیاب رہا۔ اس کے ذریعہ حکومت کو نیک نامی و شہرت ملی، سرمایہ دار دولت وثروت سے نوازے گئے اور ناظرین کے حصے میں نام نہاد تفریح ونشاط آیا۔

اس طرح گویا خبریں اور ان پر ہونے والے تبصرے بھی سامانِ تفریح بن گئے۔ زیادہ سے زیادہ ناظرین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی تگ و دو نے خبروں کی نشریات اور ان پر ہونے والے مباحثوں میں ہیجانیت کے عنصر کو بڑھا دیا اس لئے کہ جس چینل کے ناظرین کی تعداد زیادہ ہوتی تھی مشتہرین کے اندر اس کے تئیں اپنے آپ کشش میں اضافہ ہو جاتا تھا اور وہ کامیابی کامرانی کے بلند

مدارج طے کرتا چلا جاتا تھا۔ اب ذرائع ابلاغ سرکار کے علاوہ ان سرمایہ کاروں کے مفادات میں کام کرنے لگا جن کی دولت کا ایندھن اس گاڑی کو چلاتا تھا یا جن کے اشتہارات سے یہ کاروبار چلتا تھا۔ اشتہارات کے ذریعہ عوام کے اندر صارفیت کے رجحان کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا گیا تاکہ صنعتی مصنوعات کو بڑی مقدار میں فروخت کیا جاسکے۔ جب یہ جنون بڑھا تو بنکوں کے بھی وارے نیارے ہوگئے اور عام آدمی سود کے سنہرے جال میں پھنستا چلا گیا۔

ایک ایسے دورِ پر فتن میں جہاں ذرائع ابلاغ کا مقصدِ وجود عوام کے اندر حرص و ہوس کی تپش کو ہوا دے کر شعلۂ جوالہ بنا دینا ہے تاکہ وہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سامانِ تعیش کے حصول کی خاطر پاگل ہوجائیں آئی پی ایل جیسے لہو و لعب کا ضرورت و اہمیت کو آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں یہ آٹھواں ٹورنامنٹ ہے جس میں کل ۶۰ میچ کھیلے گئے۔ اگر ایک میچ کیلئے ۴ گھنٹوں کا وقت پکڑا جائے تو گویا ۲۴۰ گھنٹوں تک کروڑوں لوگ ٹی وی سے چپکے رہے۔ اس سال اس ٹورنامنٹ کے حوالے سے ناظرین کی تعداد میں ۱۴ فیصد کا اضافہ ہوا ہے اور پہلے ۵ کھیلوں میں جو نسبتاً کم اہم تھے دس کروڑ سے زیادہ ناظرین کو اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ گزشتہ سال یہ تعداد ۱۸ کروڑ سے تجاوز کرچکی ہے۔

اس پورے عرصے میں جو بھی کھلاڑی لوگوں کو نظر آئے اس کے لباس پر کسی نہ کسی

کمپنی کا اشتہار تھا اور جو بھی مبصر ٹی وی کے پردے پر نمودار ہوگا اس کے عقب میں بھی کسی کا نہ کسی ادارے کا نام تھا۔ اشتہار کے ذریعہ جملہ ایک ہزار کروڑ روپئے کی آمدنی کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ہر اوور کے بعد ایک منٹ۔ درمیان میں ۴۰ منٹ اور ہر ٹائم آوٹ سے قبل ڈھائی منٹ یعنی ۴ کیلئے ۱۰ منٹ اس طرح ہر میچ کیلئے جملہ ۶۵ منٹ کے اشتہارات اور ہر ۱۰ ایکنڈ کا اشتہار عام کھیلوں میں ۱۰ تا ۱۲ لاکھ میں اور سیمی فائنل کے بعد لاکھ میں فروخت ہوتا ہے۔ اس کمائی کیلئے کھلاڑیوں کی کیسے منہ بھرائی ہوتی ہے وہ ۲۰ بھی دیکھیں پنجاب کنگس الیون نے وریندر سہواگ کو ۲ء۳ کروڑ میں خریدا۔ اس نے کل ۸ میچوں میں ۹۹ رن بنائے اس طرح گویا اس کے ہر رن کی قیمت سوا تین لاکھ تھی لیکن چونکہ فی الحال کھلاڑی ایک ماڈل بن گیا ہے اس لئے اس کا کچھ کرنا ضروری نہیں بلکہ نظر آنا کافی ہے۔

اس ٹورنامنٹ میں کھیلنے والے کھلاڑیوں کا تشخص نہ کسی ملک سے ہے نہ صوبے سے ہے۔ جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد یہ کھلاڑی صرف اور صرف اس سرمایہ دار کے غلام ہیں جنھوں نے منہ مانگے داموں میں ان لوگوں کو ایک مقررہ مدت کیلئے خرید لیا ہے۔ کسی زمانے لوگ دوسروں کو خریدا اور بیچا کرتے تھے اب لوگ خود اپنے آپ کو سربازار نیلام کرتے ہیں۔ بڑے فخر سے کھلے عام ان کی بولیاں لگائی جاتی ہیں اور بڑی شان سے کھلاڑی اپنا سودہ طے کرتے ہیں۔ اس سال ۱۶

فروری کو ہونے والی اس نیلامی میں یووراج سنگھ کو دہلی ڈیر ڈیولس کے مالک ایم جی آر گروپ نے ۱۶ کروڑ میں خریدا اور سارے ابلاغ میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ جملہ کھلاڑیوں کو خریدنے پر سرمایہ داروں نے کل ۸۷ء۶۰ کروڑ روپے خرچ کئے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کسان اس لئے خودکشی کرتا ہے کہ اس کی تباہ شدہ فصل پر سرکار مناسب نقصان بھرپائی نہیں دے پاتی صرف ۶۷ کھلاڑیوں پر اس خطیر رقم کا خرچ اگر اصراف نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور ایسا کرنے والے شیطان کے بھائی نہیں ہیں تو اور کون ہیں؟

خرید و فروخت کا سلسلہ یہاں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد ٹورنامنٹ کو نشر کرنے کے حقوق بیچے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کھلاڑیوں پر لگائے جانے والے اور نشریات کے دوران دکھلائے جانے والے اشتہارات کا وقت بکتا ہے۔ بالآخر اسٹیڈیم کی ٹکٹیں فروخت ہوتی ہیں اس طرح گویا جو سرمایہ کاری کی جاتی ہے اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر وصول کرلیا جاتا ہے۔ اس ہنگامے میں ہر کوئی کماتا ہے لیکن اگر کوئی گنواتا ہے تو وہ عام آدمی ہے جو نہ صرف اپنی محنت کی کمائی بلکہ قیمتی وقت بھی اس حماقت کی نذر کرتا ہے۔ بدذوق ناظرین کی توجہات کو مبذول کرنے کیلئے اخبارات میں ان کھیلوں سے متعلق جھوٹی سچی خبریں شائع کی جاتی ہیں یہاں تک کہ ان کی تسکینِ نظر کیلئے نیم برہنہ خواتین کو محو رقص رکھا جاتا ہے جو ہر چوکے اور چھکے

پر اچھل کود کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان خواتین کیلئے ''چیئر لیڈرس'' کی خوبصورت اصطلاح وضع کی گئی تاکہ اس مذموم حرکت کی کراہت پر پردہ ڈالا جاسکے۔

مادہ پرست دنیا میں جہاں دولت کی ریل پیل ہو وہاں بدعنوانی کا سانپ لازمی ہے۔ فی الحال یہ دنیا کا سب سے بڑا ٹورنامنٹ ہے جس میں ۲۴۰۰۰ کروڑ روپیوں کا الٹ پھیر ہوتا ہے۔اس لئے بدعنوانی بھی اس کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ ۲۰۱۰ء کے اندر یہ بدعنوانی آئی پی ایل کے سربراہ للت مودی کی برخواستگی کا سبب بنی۔ اُس سال کوچی اور پونے کی ٹیموں کو آئی پی ایل میں شامل کیا گیا تھا۔ پونے واریئرس کے مالک سہارا گروپ کے اوپر کالے دھن کا استعمال کرنے کے سنگین الزامات عائد ہوئے ویسے بھی سہارا شری سبروتو رائے فی الحال جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ مودی کے چکر میں سابق ریاستی وزیر خارجہ ششی تھرور کو بھی استعفیٰ دینا پڑا۔ للت مودی کے اوپر ۲۲ سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔ ۲۰۱۳ء کے اندر بی سی سی آئی کی ایک سہ رکنی کمیٹی نے جس میں کانگریس کے جیوترادتیہ سندھیا اور بی جے پی کے ارون جیٹلی بھی شامل تھے ان میں سے کئی الزامات کی توثیق کردی اور اس کے بعد مودی پر تاحیات پابندی لگا دی گئی۔ ویسے مودی ان الزامات کی ہنوز تردید کرتے ہیں اور ان کے خیال میں یہ ممانعت بے معنی ہے اس لئے کہ اسے لگانے والی کمیٹی نے اپنے بیجا مفادات کے پیش

نظر یہ فیصلہ کیا ہے۔

للت مودی سے چھٹکارہ پانے باوجود یہ کھیل بدعنوانی کی لعنت سے نجات نہیں حاصل کرسکا بلکہ ۲۰۱۱ میں مرکزی حکومت کے ذریعہ اس ٹورنامنٹ پر عائد ہونے والا ۴۵ کروڈ تفریحی ٹیکس کے معاف کردیئے جانے پر تنازع پیدا ہوگیا۔ اس طرح گویا اس کھیل تماشے سے جو تھوڑا بہت عوامی فلاح و بہبود کا کام ہو سکتا تھا اس پر بھی پانی پھیر دیا گیا۔ ممبئی میں شیوسینا کے رمیش پربھو نے شرد پوار کی دشمنی میں اس کا پردہ فاش کیا۔ چنئی میں واسن نامی ایک شخص نے عدالت سے رجوع کیا تو ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ وہ آئی پی ایل ٹیکس کی رعایت کو درست تسلیم نہیں کرسکتے اس لئے کہ یہ سراسر تفریحی سرگرمی ہے۔ اس کے بعد سابق وزیر خزانہ پرنب مکرجی نے بدعنوانی کے الزامات کی تفتیش کا اعلان کیا اور پھر معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا۔ ہندوستان میں بدعنوانی کے پھلنے پھولنے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہاں کرپشن کے موضوع پر سیاست ہوتی ہے، شور شرابہ بھی ہوتا ہے لیکن کوئی ٹھوس اقدام نہیں ہوتا جس کے سبب سزا کا خوف لوگوں کے دل سے نکل چکا ہے۔ عوام کو یقین ہے کہ رشوت ستانی کے الزام سے جلد یا بدیر چھٹکارہ مل ہی جائیگا۔ مثل مشہور ہے لے کے رشوت پھنس گیا تو دے کے رشوت چھوٹ جا۔

آئی پی ایل کی ایک خرید و فروخت تو وہ ہے جو علی الاعلان ہوتی ہے اور دوسرے وہ رشوت خوری ہے جس کا لین دین اندر ہی اندر خفیہ طور پر ہوتی ہے لیکن اس ایک تیسرا تاریک پہلو ان کھیلوں پر لگنے والا سٹہ ہے۔ اس بابت اندر کے آدمی للت مودی کا دعویٰ ہے کہ ہر میچ پر ۹ سے ۱۰ ہزار کروڑ روپیوں کا جوا کھیلا جاتا ہے اس طرح کو ۶۰ مقابلوں سے لے کر ۶۰۰۰۰ کروڑ کا سٹہ اس ٹورنامنٹ میں کھیلا جائیگا۔ دلچسپ بات یہ ۵۴۰ ہے کہ ہندوستان میں جہاں مختلف قسم کی لاٹری کو جائز قرار دے دیا گیا ہے یہ جوا ہنوز غیر قانونی ہے اس کے باوجود آئی پی ایل کی آڑ میں یہ بازار زور شور کے ساتھ گرم ہے۔ جیٹلی جی کے حالیہ بجٹ میں بنیادی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کل ملا کر قومی سطح پر ۶۹ ہزار کروڑ روپئے مختص کئے گئے جو صرف ایک ٹورنامنٹ کے سٹے کی رقم کے برابر ہے۔ یہ رقم ویسے تو گزشتہ سال کی مختص شدہ رقم سے صرف ۲ فیصد کم ہے لیکن جو خرچ ہوا ہے اس کی بہ نسبت ۱۶ فیصد کی کمی ہے۔ جس قوم کے ترجیحات کا یہ عالم ہو اس کے لئے کھیل تماشہ تعلیم و تربیت سے زیادہ اہم ہو جائے اس کے مستقبل کی بابت کیا کہا جا سکتا ہے؟

کروڑوں میں کھیلنے والے یہ سٹے باز اپنے وارے نیارے کرنے کیلئے کھیل کے نتائج پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ کھلاڑیوں کو رشوت دے کر خرید لیا جاتا ہے۔ ۲۰۱۲ء کے اندر چار ٹیموں کے پانچ کھلاڑیوں پر رشوت لینے کا الزام لگا

جنہیں صدر راجیو شکلا نے فوراً معطل کر دیا۔ ۲۰۱۳ء میں راجستھان رائیلس کے تین کھلاڑیوں پر یہ الزام لگا انہیں بھی معطل کیا گیا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ ۲۰۱۴ء میں سپریم کورٹ نے بی سی سی آئی کے چیرمین سری نواسن کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تا کہ غیر جانبداری کے ساتھ تفتیش کا کام کیا جا سکے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ سری سنتھ نے ۴۰ لاکھ روپے رشوت لے کر آخری اوور میں ۱۳ رنز دے دیئے تھے جس سے اس کی ٹیم ہار گئی۔ حال میں وہی لوگ اس بات پر حیران تھے کہ سب سے نیچے کی سطح پر موجود دہلی ڈیر ڈیویلس نے اول نمبر کی ٹیم چنئی سپر کنگ کو کیسے شکست دے دی جو ان سٹے بازوں کی کارستانیوں سے ناواقف ہیں۔۔

عدالت نے ان میچ فکسنگ الزامات کی تحقیق کا کام جسٹس مدگل کمیٹی کے سپرد کیا دلچسپ بات یہ ہے کہ بی سی سی آئی نے خود عدالت سے درخواست کی کہ جن لوگوں پر اس کی رپورٹ میں الزام ہے انہیں بر سر عام نہیں کیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انڈین کرکٹ بورڈ بد عنوان کھلاڑیوں کی پردہ پوشی کیوں کر رہا ہے؟ کیا اس لئے کہ بورڈ کے اہلکار بھی اس گورکھ دھندے میں شامل ہیں اور وہ اپنے آپ کو بچانے کیلئے بد عنوان کھلاڑیوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں ؟ میچ فکسنگ کرکٹ کی دنیا میں ایک عام وباء بن گئی ہے۔ کئی مشہور کھلاڑیوں پر اس کے الزامات لگے۔ کئی لوگوں پر پابندی لگا دی گئی۔ کئی کھلاڑیوں نے از خود

اعتراف تک کرلیا اور جنوبی افریقہ کے ہینسی کرونی جیسے کھلاڑی کو اس چکر میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ پاکستان ٹیم کے کوچ باب وولمر کو سٹے بازوں نے بے رحمی کے ساتھ قتل کردیا اس کے باوجود یہ کھیل تماشہ بڑے زور شور کے ساتھ جاری ہے۔ کرکٹ جیسے پروقار کھیل کی اس درگت کیلئے صرف سرمایہ دار، سیاستداں اور ذرائع ابلاغ ہی ذمہ دار نہیں بلکہ کھلاڑی اور شائقین بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں جو اس پر اپنا قیمتی وقت اور توانائی اس پر صرف کرتے ہیں۔ اگر وہ آج اپنا منہ پھیر لیں تو کل یہ ڈرامہ بند ہوجائے۔ آج کرکٹ کا حال یہ ہے کہ آئی پی ایل کی انعامی رقم ورلڈ چمپین شپ سے دوگنی ہے۔ آئی پی ایل کے کھلاڑی، منیجر اور کوچ چار ماہ قبل طے ہو جاتے ہیں جبکہ دس روز بعد بنگلہ دیش کے دورے پر جانے والی ہندوستانی ٹیم کے منیجر کا تعین ابھی نہیں ہوا ہے۔ صارفیت کے اس تماشے کو روکنے میں عوام بہت بڑا رول ادا کرسکتے ہیں مگر ان بھولے بھالے لوگوں کو بیدار کرنے کا کام جو ذرائع ابلاغ کرسکتا ہے وہ اپنے گوناگوں مفادات کے پیش نظر انہیں افیون پلا کر سلا رہا ہے اور جو سیاستداں اس پر قدغن لگا سکتے وہ بدعنوانی کی اس میلی گنگا میں صرف ہاتھ نہیں دھو رہے بلکہ ڈبکی لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشی استحصال کی یہ چکی زور شور کے ساتھ چل رہی ہے اور عوام اس میں پسے جارہے ہیں۔

(مودی جی کا مکمل چھاپ زعفرانی چائے خانہ (قسط اول

(اس مضمون کے واقعات و کردار حقیقی نہیں بلکہ خیالی ہیں، مماثلت اتفاقی ہے)

جدید ہندوستان کی تاریخ میں ۳۰ مئی ۲۰۱۵ء سنہری حروف میں لکھے جانے کا حقدار ہے اس لئے کہ اس روز وزیر اعظم عزت مآب نریندر مودی نے حلف برداری کے ۳۷۰ دنوں کے بعد پہلی مرتبہ سچ کہنے کی جرأت کی ۔ اس دن کی غیر معمولی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ ممکن ہے دوبارہ وہ ایسی غلطی کبھی نہ کریں یہاں تک کہ ان کی مدت عمل ختم ہو جائے۔ چونکہ وزیر اعظم کی کذب بیانیوں کے ٹھاٹیں مارتے سمندر میں سے سچ کا موتی ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اس لئے میں خود اس کی جانب اشارہ کئے دیتا ہوں ۔ مودی جی نے کہا ''جو اچھے دن آنے والے تھے آچکے'' ۔ یہ مختصر سے کوزے میں سمندر سمایا ہواہے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ مودی جی کے اپنے جو اچھے دن آنے والے تھے آچکے اب ان کے اس سے بہتر دن نہیں آئیں گے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان کے سب سے بڑے بھکت گوتم اڈانی کے بھی اچھے دن آچکے ہیں۔ جن کے خزانے میں ایک سال کے اندر ۴۸ فیصد کا اضافہ ہوا اور جس طرح مودی جی سیاست کے میدان میں اول مقام پر ہیں اسی طرح وہ بھی دھن دولت کے بازار میں پہلے نمبر پر پہنچ گئے۔ تیسرا

اہم ترین مطلب یہ ہے کہ عوام اب اچھے دنوں کی توقع کرنا چھوڑ دیں۔ فی الحال جو دگر گوں صورتحال ہے مودی جی کے خیال میں وہی ان کے ''اچھے دن'' ہیں۔ اس سے اچھے دن اب نہیں آئیں گے۔

.برے دنوں کے بارے میں مودی جی کا کہنا ہے کہ حزب اختلاف کے.برے دن آچکے ہیں اور وہ ہمیشہ رہیں گے۔ عوام کے برے دنوں کی بابت ان کی خاموشی گواہ ہے کہ اب ان کے.برے دن مودی جی کے ساتھ ہی جائیں گے۔ اس لئے کہ پہلے بے موسم کی .برسات نے تباہی مچائی اس کے بعد زلزلہ آگیا۔ زمین کے بعد سورج غضب ناک ہو گیا اور دو ہزار سے زیادہ لوگ جان بحق ہو گئے۔ موسم باراں کی آمد آمد تھی محکمۂ موسمیات نے اعلان کیا کہ اس سال پھر قحط کا امکان ہے۔ مودی جی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد یکے بعد دیگرے آسمانی آفات کا نزول ہو رہا۔ اس سے گھبرا کر جب حکومت میں ترقی کی شرح کم کی اور مہنگائی میں اضافہ کا امکان ظاہر کیا تو حصص مارکٹ گرنے لگا۔ یونیٹیک جیسی.بڑی کمپنی کے شیئر ۵۰ فیصد نیچے چلے گئے۔ ادھر شیئر بازار نیچے کی جانب اُدھر ڈالر کی قیمت اوپر کی جانب چل پڑی۔ عالمی بازار میں تیل کی قیمتوں میں کمی پر اپنے آپ کو خوش قسمت کہنے والے مودی جی بیچارے جائیں تو کہاں جائیں اس لئے اسرائیل کی جانب چل دیئے۔

وزیراعظم کے اچھے دن والے بیان کو سن کر ماضی قریب کا ایک ایک منظر آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ دن یاد آگیا جب شہر میں کمل چھاپ زعفرانی چائے کی دوکان کے جلد ہی کھل جانے کا اعلان ہوا تھا۔بڑی آب وتاب کے ساتھ قلب شہر میں ایک بڑا سا بورڈ آویزاں کردیا گیا تھا جس میں ایک جانب مرجھایا ہوا کمل اور دوسری جانب مسکراتے ہوئے چائے والے کی تصویر تھی۔ ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی درج تھی کہ چند ماہ کے اندر جب یہ چائے خانہ کھل جائیگا تو سب مل کر یہاں چائے پر چرچا کریں گے۔ چائے مفت ملے گی بسکٹ کفایتی داموں پر فراہم کئے جائیں گے۔ جن کی غذائیت اور ذائقہ ایسا ہوگا کہ لوگ کھانا بھول جائیں گے۔ بھوک اور غربت کے مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے۔ چائے بنانے کیلئے پتی ، شکر اور ایندھن بیرونِ ملک جمع کالے دھن کی واپسی سے مہیا کی جائیگی۔ چائے خانے کے باہر لگے لاؤڈ اسپیکر پر صبح کے وقت نمو نمو کے بھجن کیرتن، دوپہر میں ترقی و خوشحالی کے پر جوش ترانے اور شام میں ڈسکو کے کیف آگیں نغمے بجتے تھے۔ لوگ اس شور شرابے میں کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ گویا ایک سونامی چل پڑی جس میں ہاتھ ، گھڑی ،سائیکل اور ہاتھی وغیرہ سب بہہ گئے۔

سونامی کا خمار اترا تو چائے خانے کی تعمیر کا آغاز ہوچکا تھا اور ایک سال کی مدت کے بعد اس کا افتتاح بھی ہوگیا۔ مفت چائے کی امید میں جب لوگ جوق در جوق چائے خانے پر پہنچے تو دروازے پر بندوق بردار ارون جیٹلی دربان بنے

کھڑے تھے اور سامنے لگے کاؤنٹر کی جانب اشارہ کرکے کہہ رہے تھے پہلے وہاں سے کوپن لو پھر اندر جاو۔ لوگوں نے کہا تمہارا دماغ خراب ہے ہمیں تو ڈیڑھ سال سے یہ بتایا جارہا ہے کہ یہاں زعفرانی کڑک چائے مفت میں ملے گی۔ جیٹلی بولے اس میں کیا شک ہے، چائے تو مفت ہی میں ملے گی مگر یہ تو اندر آنے کی فیس ہے۔ تم سے یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ اس چائے خانے میں داخلہ مفت ہوگا۔ لوگ شش و پنج میں گرفتار ہوگئے۔ ایک بولا لیکن بھائی کسی چائے خانے میں داخلے کی فیس تھوڑی نا ہوتی ہے۔ جیٹلی نے وکیلی انداز میں مسکرا کر کہا لیکن کسی عام چائے خانے چائے مفت بھی تو نہیں ملتی ؟ دیکھو یہ بہت ہی خاص چائے کی دوکان ہے ایک زمانے میں ملک کا وزیر اعظم یہاں چائے بنایا کرتا تھا اور کوئی بعید نہیں کہ یہاں چائے پی کر کل کو تم بھی وزیراعظم بن جاو۔ یہ سن کر بہت سارے لوگ خوشی خوشی کوپن کے کاؤنٹر کی جانب چل دیئے۔

ایک بوڑھا کسان بھوپندر سنگھ بولا میں نے سنا ہے آئندہ ۲۵ سال مودی جی سرکار چلائیں گے۔ تب تک تو ہم مرکھپ جائیں گے۔ جیٹلی نے کہا دیکھو اس قدر مشکل سوالات کا جواب میں رٹ کر نہیں آیا ویسے چہرے سے تم کسان لگتے ہو؟ بھوپندر سنگھ نے تائید کی تو جیٹلی نے اسے وزیر زراعت رادھا موہن سنگھ کے کمرے کی جانب کا حکم دیا۔ بھوپندر نے حیرت سے سوال کیا بیک وقت رادھا بھی اور موہن بھی یہ مرد ہے یا عورت؟ جیٹلی نے چڑ کر کہا دیکھو ان دونوں کے

علاوہ ایک تیسری صنف بھی ہوتی ہے تم ایسا کرو کہ اپنے سوال کا جواب انہیں سے معلوم کرو۔ بھوپندر سنگھ رادھا موہن کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور اپنا پہلے والا سوال دوہرا دیا۔ رادھا موہن بولے تمہاری دونوں باتیں درست ہیں۔ مودی جی نہ آئندہ ۲۵ سالوں تک کرسی چھوڑنے کا اردہ رکھتے ہیں اور نہ تمہارے ۲۵ سالوں تک جینے کا کوئی امکان ہے لیکن تم اپنی اولاد کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے وہ اگر یہاں کی زعفرانی کڑک چائے پئیں گے تو ممکن ہے مودی جی کی طرح وزیر اعظم بن جائیں۔

بھوپندر نے کہا لیکن اگر وہ وزیر اعظم بن جائیں گے کھیت میں ہل کون چلائے گا اناج کون اگائے گا؟ رادھا موہن بولے ہمارے وزیر اعظم بہت تیز آدمی ہیں وہ ساری دنیا کا دورہ کرکے اناج باہر سے درآمد کرلیں گے۔ تمہیں اس کیلئے پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ رادھا موہن کی بات سن کر کسان حیران رہ گیا وہ بولا جناب اگر ہم لوگ کھیتی نہیں کریں گے تو کیا کریں گے؟ رادھا موہن بولے تم لوگ بھی عیش کروگے جیسا کہ ہم کررہے ہیں۔ بھوپندر نے کہا لیکن وقت گزاری کیلئے کچھ تو۰۰۰۰رادھا موہن بولے بھئی اس چائے خانے میں آکر چائے پیو، صبح کے وقت بھجن ، دوپہر کو۰۰۰۰۰۰۰ بھوپندر نے جملہ کاٹ کر کہا صاحب گزشتہ ڈیڑھ سال سے یہ سب ہم لوگ بغیر اندر آئے باہر ہی باہر سن رہے ہیں۔ اس کیلئے کوپن لے کر اندر آنے کی کیا ضرورت؟

رادھا موہن بولے چونکہ ہم لوگ پہلے باہر تھے اس لئے آپ لوگوں کا منورنجن باہر ہی باہر کردیا کرتے تھے لیکن اب ہم اندر آگئے ہیں اس لئے باہر کا لاؤڈ اسپیکر جلد ہی بند کردیا جائیگا اور ان دلفریب نغموں سے محظوظ ہونے کی خاطر اندر آنا لازمی ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ ان ڈیڑھ سالوں میں جو لت لگ چکی ہے وہ تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دے گی بلکہ کھیت ، کھلیان اور گھر ہر جگہ سے یہاں کھینچ کرلے آئیگی ۔ بھوپندر نے کہا وہ ٹھیک ہے مگر یہ ٹکٹ کا کیا چکر ہے؟ رادھا موہن بولے بھئی دیکھو دنیا میں کوئی چیز مفت میں نہیں ملتی کیا تم اپنا اناج مفت کے اندر بازار میں ڈال آتے ہو؟ بھوپندر لاجواب ہو گیا وہ بولا لیکن جناب ڈیڑھ سال سے تو ••••••• رادھا موہن بولے بھائی نمونے کا وہ مفت اشتہار عارضی تھا لیکن مستقل طور پر بلا قیمت بھلا کیا ملتا ہے؟

کسان بولا جی سرکار سمجھ گیا لیکن اگر ہم کھیتی نہیں کریں گے تو ہماری زمین بنجر ہو جائیگی ۔ رادھا موہن نے کہا جی نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ سرکار آپ لوگوں سے زمین خرید کر صنعتکاروں کو مہیا کردے گی تاکہ وہاں کارخانے لگائے جا سکیں۔ کسان بگڑ کر بولا ہم اپنے باپ دادا کی زمین سرکار کو کیوں دیں گے بھلا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں ہم یہ سب ہونے دیں گے ؟ رادھا موہن مسکرا کر بولے

کیسے نہیں ہونے دوگے ؟ تم کون ہوتے ہو روکنے والے ؟ بھوپندر بولا ہم ! اس دھرتی کے مالک ہیں۔ سرکار کون ہوتی ہے ہم سے زمین چھین کر صنعتکاروں کو دینے والی اور ان سرمایہ داروں کی کیا مجال کہ وہ ہماری زمین پر اپنے کارخانہ لگائیں ؟

رادھا موہن نے جب بھوپندر کے یہ تیور دیکھے تو آگ بگولا ہو گئے۔ وہ بولے تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو اور سرکار کو کیسے روک سکتے ہو؟ ہم اس کیلئے تحویل اراضی کا قانون بنائیں گے اور اگر آپ لوگوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کی تو پولیس آپ سب کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دے گی۔ رادھا موہن نے دیکھا بھوپندر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ اس کا کام ہو چکا تھا اب وہ اپنا لہجہ نرم کرکے بولا اچھا تو بھوپندر سنگھ ذرا یہ بتاؤ کہ کیا کوئی اپنی زمین جیل میں ساتھ لے کر جاسکتا ہے اور وہاں کھیتی باڑی کرسکتا ہے؟رادھا موہن کی دھمکی سن کر کسان ترقی و خوشحالی کے سارے ترانے بھول گیا۔

اس بیچ رادھا موہن کے ایک دست راست نے آکر بھوپندر کے کان میں کہا چودھری صاحب اس زعفرانی چائے کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔اگر چائے پر یہ چرچا اسی طرح جاری رہی تو کوئی بعید نہیں کہ رادھا موہن آپ کو ملک بدر کرکے پاکستان روانہ کردیں

۔

قومی اور عالمی تناظر میں وزیراعظم کا بنگلا دیش دورہ

وزیراعظم نریندر مودی نے اپنے دوسرے سال کی ابتداء ایک نہایت ہی اہم غیر ملکی دورے سے کی۔ بنگلا دیش کے اس دو روزہ مختصر دورے میں ناٹک کم اور کام زیادہ ہوا۔ اس کا جہاں ایک علاقائی اور اور ایک قومی پہلو ہے تو وہیں ایک بہت ہی اہم عالمی تناظر بھی ہے جسے ذرائع ابلاغ نے گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر نظر انداز کردیا۔
علاقائی سطح پر اس کا منفرد حصہ ممتا بنرجی کا ساتھ ہے۔ جو وزیراعظم اپنی وزیر خارجہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا روادار نہ ہو اس کا ایک ایسی وزیراعلیٰ کو اپنے ساتھ لے جانا جس نے اسے مغلظات تک سے نوازہ ہو کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وزیراعظم نے بنگلا دیش میں ۲۲ معاہدے کئے مگر تیستا ندی کے پانی کی تقسیم کا فیصلہ نہیں کیا ۲۰۱۱ء میں جب سابق وزیراعظم منموہن سنگھ نے اس موضوع کو چھیڑا تو وزیراعلیٰ ممتا بنرجی نے خوب شور شرابہ کیا۔ اس بار وزیراعظم نریندر مودی نے تیستا ندی کے پانی کی تقسیم کو ممتا بنرجی پر چھوڑ کر ان کا دل خوش کردیا۔ اس طرح مودی جی نے آئندہ سال منعقد ہونے والے انتخابات میں ترنمل کے ساتھ الحاق کی راہ ہموار کردی۔ پنچایت انتخاب کے نتائج سے بی جے پی کو دال آٹے کا بھاو معلوم ہوگیا ہے اور اب وہ ترنمول کی بیساکھی پر ریاستی حکومت میں شامل ہو کر ترنمل کو مرکزی حکومت کا حصہ بنا

نا چاہتی ہے۔ راہل گاندھی کو اس پیش رفت میں امید کی کرن نظر آگئی اور مودی کے ڈھاکہ پہنچتے ہی وہ کولکاتہ پہنچ گئے۔ راہل نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ ممتا نے بنگلادیش جانے کیلئے منموہن کے بجائے مودی کو کیوں پسند کیا؟

قومی سطح پر اس دورے میں کئی اہم فیصلے ہوئے جس میں بس سروس، چٹاگانگ کی بندر گاہ کا استعمال اور سرحدی تنازع بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈھاکہ سے اگرتلہ اور ڈھاکہ سے شیلانگ ہوتے ہوئے گوہاٹی تک کی بس سروس شمالی مشرقی ہندوستان کے باشندوں کیلئے بہت مفید ہوگی۔ شمال مشرقی ریاستیں چونکہ بندرگاہ سے محروم ہیں اس لئے چٹاگانگ کے استعمال سے ان کی درآمدات و برآمدات آسان ہو جائیں گی۔ اس سے ان پسماندہ ریاستوں کے لوگوں کو نہ صرف آمدورفت سہولت میسر آئیگی بلکہ صنعت و تجارت کو بھی فروغ ملے گا۔ اس بندرگاہ سے بڑے پیمانے پر چینی مصنوعات کی بھی ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک رسائی ہوجائیگی اس طرح چین کا بہت فائدہ ہوگا مگر اس کی تعمیر کا وہی مقصد بھی ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ ہندوستان اور بنگلا دیش کے لوگ بھی اس سے استفادہ کرسکیں گے۔

سرحدی تنازع کا حل اس لحاظ سے خوش آئند ہے کہ اس سے تقریباً ۵۱ ہزار لوگوں کو کسی نہ کسی ایک ملک کی باقائدہ شہریت مل جائیگی اور ان نظر انداز شدہ علاقوں تک بھی شہری سہولیات کی فراہمی کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ یہ کل

ملا کر ۱۶۲ گاؤں ہیں جن میں سے ۱۱۱ تو بنگلا دیش کو دے دیئے گئے اور ۵۱ ہندوستان کے حصے میں آئے۔ رقبہ اگر دیکھیں تو ۱۷ ہزار ایکڑ بنگلا دیش کو ملا اور ۷ ہزار پر ہندوستان نے قناعت کی۔ آبادی کا موازنہ کیا جائے تو بنگلا دیش کو ملنے والے علاقے میں ۳۴ ہزار اور ہندوستان کے علاقہ میں ۱۴ ہزار لوگ رہتے ہیں۔ اگر یہی سمجھوتہ کانگریس والے کرتے تو بی جے پی کی دیش بھکتی جوش میں آجاتی اور بھارت کی پاون دھرتی کے بنگلا دیش کے حوالے کئے جانے پر آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا۔ اس کے علاوہ کانگریس پر مسلمانوں کے ووٹ بنک کی خاطر بنگلا دیش کے ساتھ سودے بازی کا الزام لگا دیا جاتا لیکن اب کی بار چونکہ زعفرانی وزیراعظم نے خود جھک کر یہ معاہدہ کر دیا ہے تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

اس دورے کو تاریخی بنانے والے مذکورہ معاہدے کی حقیقت بھی نہایت دلچسپ ہے۔ مئی ۱۹۷۴ء کو اندرا گاندھی اور شیخ مجیب الرحمٰن نے مل کر بھارت اور بنگلا دیش ۱۶ کے درمیان یہ بٹوارہ طے کر دیا تھا۔ اس کے بعد بنگلا دیش کی ایوان پارلیمان نے اسے منظوری دے دی لیکن ہندوستان نے اس میں غیر معمولی تاخیر کی۔ اس سمجھوتے پر باقاعدہ دستخط ۶ ستمبر ۲۰۱۱ء کو وزیراعظم منموہن سنگھ نے کئے۔ اب کی بار تو صرف یہ ہوا کہ اس کے دستاویز خارجہ سکریٹریوں کے درمیان لئے دیئے گئے لیکن اسے اس طرح پیش کیا گیا گویا وزیراعظم نریندر مودی نے تاریخ

رقم کردی۔ اس بابت بی جے پی نے اپنے دورِ اقتدار میں دستوری ترمیم کے ذریعہ اسے قابلِ عمل بنایا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود منموہن سنگھ نے معاہدے پر دستخط کے بعد یہ ترمیم کیوں نہیں کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دستوری ترمیم کیلئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہوں نے اس کیلئے ۲۰۱۳ء میں تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ مشاورت کی جس میں بی جے پی کی جانب سے اڈوانی، راجناتھ، جیٹلی اور سشما نے شرکت کی اور صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اس کی مخالفت کرے گی اور یہ ترمیم نہیں ہوسکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ معاملہ ٹل گیا لیکن اقتدار میں آنے کے بعد بی جے پی نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر وہی دستوری ترمیم خود کروالی جس کی مخالفت وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کیا کرتی تھی۔

اس دورے کے دوران یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان نے بنگلا دیش کو ۲ بلین ڈالر کی کریڈٹ دے کر اس غریب پڑوسی ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جی ڈی پی کے معاملے میں ہندوستان کی حالت بنگلا دیش سے بہت بہتر ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی فلاح بہبود کی شرح کا موازنہ کیا جائے تو کئی معاملات میں بنگلا دیش کو ہندوستان پر سبقت حاصل ہے مثلاً بنگلا دیش میں خواتین کی شرح خواندگی ۸۸ فیصد ہے جبکہ ہندوستان میں صرف ۶۸ فیصد۔ پرائمری اسکول میں لڑکوں کے مقابلے لڑکیوں کی تعداد ہندوستان میں ۱۰۲

فیصد ہے تو بنگلادیش میں ۱۰۶ فیصد سیکنڈری اسکول میں یہی تناسب ۹۴ کے مقابلے ۱۱۴ ہے۔ جس وزیراعظم نے شیخ حسینہ کے بارے میں ''عورت ہو کر بھی'' کہہ کر دنیا بھر کی بدنامی مول لے لی اسے پتہ ہونا چاہیے کہ بنگلادیش تو کجا خود ان کے اپنے ملک میں لڑکیوں کے تعلیم کی شرح لڑکوں سے بہتر ہے۔ بنگلادیش میں ۳۶ فیصد خواتین ملازمت کرتی ہیں اس کے مقابلے ہندوستان میں ۲۹ فیصد۔ بنگلادیش میں اوسط عمر ۱۹۷۰ میں سال تھی مگر اب ۷۱ سال ہے جبکہ بھارت میں ۶۶ سال۔ پانچ سال سے کم عمر ۴۷ بچوں کے موت کی شرح بنگلادیش میں ۴ فیصد ہے جبکہ ہندوستان میں ۵ فیصد۔ پیدائش کے وقت ماں کی موت کا خطرہ ہندوستان کے اندر ۱۹۰ میں ایک ماں کو ہوتا ہے جبکہ بنگلادیش کے اندر ۲۵۰ میں سے ایک ماں کو۔ ان اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے سرحدی علاقوں کے جن لوگوں کو اس بات کا موقع دیا گیا ہے کہ وہ چاہے جس ملک کی شہریت اختیار کریں تو وہ اپنے اس حق کا استعمال کس کے ملک کے حق میں کریں گے۔

اس دورے کا سب سے مضحکہ خیز پہلو اٹل بہاری واجپائی کو دیا جانے والا ''لبریشن ایوارڈ آف وار آئر'' ہے جسے بنگلادیشی صدر محمد عبدالباسط نے وزیراعظم نریندر مودی کے حوالے کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اٹل جی نے بنگلادیش کی لڑائی میں اندرا گاندھی کو درگا دیوی کے لقب سے نوازنے کے علاوہ

کیا کیا تھا؟ اٹل جی نے جس شخصیت کو درگا دیوی کے خطاب سے نوازہ گیا تھا اسے نظر انداز کرکے اٹل جی تمغہ عطا کرنا دراصل احسان فراموشی ہے اور اٹل جی اپنے ہوش و حواس میں اسے کسی صورت قبول نہ کرتے۔ ویسے اچھا ہی ہوا کہ مودی جی کو یاد نہیں آیا کہ نبگلا دیش کی جنگ اندرا گاندھی کے زمانے میں لڑی گئی ورنہ وہ کہہ دیتے کہ عورت ہو کر بھی اندرا جی نے یہ کارنامہ انجام دے دیا جیسا کہ حسینہ واجد کے بارے میں کہہ دیا کہ عورت ہونے کے باوجود وہ دہشت گردی کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ مودی جی تو مرد ہو کر جسودا بین کو چھوڑ کر فرار ہوگئے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا جبکہ وہ اب بھی اپنے خاوند کیلئے چشم براہ ہیں۔

اندرا جی کا ذکر آیا تو بنگلا دیش کے حوالے سے عالمی سیاسی تناظر اپنے آپ سامنے آجاتا ہے۔ پاکستان سے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سابق وزیراعظم لال بہادر شاستری نے صدر ایوب خان کے ساتھ تاشقند میں معاہدہ کرلیا اور پہلے جیسی حالت صورتحال بحال ہوگئی۔ اندرا گاندھی نے پاکستانی حملے کا بدلہ بنگلا دیش میں لیا اور مہاجرین کے کیمپ میں مکتی باہنی کو تیار کرکے اس کے ذریعہ بنگلا دیش آزاد کروا لیا۔ اس طرح ہندوستان نے اپنے سب سے بڑے حریف کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ اس کے بعد پورے علاقہ پر اپنا تسلط قائم کرنے کیلئے پوکھرن میں جوہری دھماکہ کردیا لیکن پاکستان نے اس کے جواب میں یکے بعد دیگرے تین دھماکے کرکے یہ ظاہر کردیا ہے ایٹمی اسلحہ کی دوڑ میں وہ بھارت

سے پیچھے نہیں ہے۔

سوویت یونین نے افغانستان میں فوج کشی کی تو اسے ہندوستان کی حمایت حاصل تھی۔ پاکستان اور امریکہ اس کے مقابلے مجاہدین کے حامی تھے۔ اس جنگ میں مکتی باہنی کی مانند مجاہدین کامیاب ہوئے اور روس وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پاکستان نے بنگلا دیش کا بدلہ لینے کیلئے ہندوستانی پنجاب میں خالصتان تحریک کو شہ دے کر شورش بپا کی لیکن نرسمھا راؤ نے اسے آہنی پنجے سے کچل دیا اور سکھ جنگجو بنگلہ دیش یا افغانستان کی مانند کامیابی سے محروم رہے۔ خالصتان کی تحریک کے اثرات کا اندازہ گزشتہ ہفتہ جموں میں رونما ہونے والے احتجاج سے لگایا جاسکتا ہے جو سنت بھنڈارن والا کے پوسٹر ہٹانے کے خلاف تھا۔ اس معاملے میں جب سکھ مذہبی پیشواوں اور دانشوروں سے بات کی گئی تو ان میں سے اکثر نے جرنیل سنگھ بھنڈران والا کو سکھ پنتھ کا شہید قرار دیا اور حفاظتی دستوں کی جانب سے پوسٹر ہٹائے جانے کی مذمت کی۔ اس احتجاج میں سکھ نوجوانوں کی جانب سے پاکستان زندہ باد کے نعرے کی بھی ایک وکیل نے تصدیق کی۔ ستمبر کے بعد افغانستان کی صورتحال یکسر بدل گئی۔ حکومت ہند نے دہشت گردی کی ۱۱ مخالفت کے نام پر امریکی فوج کشی کی حمایت کردی اور پرویز مشرف کو امریکہ نے خرید لیا۔ امریکہ نے جب حامد کرزئی کو کٹھ پتلی صدر بنایا تو اس

کا مقابلہ طالبان تھا جس کی حمایت پاکستانی فوج یا آئی ایس آئی کررہی تھی اس لئے حامد کرزئی نے ہندوستان کے سامنے دست سوال دراز کیا تاکہ پاکستان میں بدامنی پھیلا کر پاکستانی فوج کو اپنے گھر میں مصروف کردیا جائے۔اس مقصد کی خاطر تحریک طالبان پاکستان بنائی گئی جس نے پاک افغان سرحدی علاقے میں شورش برپا کردی۔ اس تحریک کے نام میں طالبان کا فائدہ یہ اٹھایا گیا کہ اس کی تخریبی کارروائیوں کے نتیجہ میں پاکستانی عوام کی رائے عامہ افغانی طالبان کے خلاف ہو گئی اس لئے کہ عام لوگ ان دونوں کے درمیان فرق کرنے سے قاصر تھے۔ بے دین دانشور اور صحافی جانتے بوجھتے اس فرق کو نظر انداز کرکے اسلام کے خلاف زہر اگلنے میں لگے رہے۔ بنگلا دیش میں مودی جی نے کہا کہ پاکستان کی کارستانیوں کے سبب بنگلا دیش بدنام ہے لیکن سچ تو یہ ہے پاکستان کی بدنامی کے پس پشت اس کے پڑوسیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مودی جی کا بنگلادیش میں پاکستان پر دہشت گردی کا الزام لگانا ان کی سفارتی شکست کا شاخسانہ ہے۔ اگر پاکستان دہشت گردی کو فروغ دینے والا ملک ہے تو اس کے وزیراعظم کو حلف برداری کے موقع پر کیوں بلایا گیا؟ پاکستان پر یہ الزام اگر درست بھی ہے تو پاکستان کی جانب سے ہندوستان پر لگایا جانے والا الزام بھی غلط نہیں ہے۔ اس حمام میں دونوں برہنہ ہیں۔ اس پر وزیر دفاع منوہر پاریکر کے دہشت گرد بنانے والے بیان کی روشنی میں مودی جی کا دہشت گردی کے خلاف واویلا مضحکہ خیز لگتا ہے۔

حامد کرزئی کی بدولت جب بھارتی خفیہ ایجنسیوں کو افغان پاک سرحد پر قدم جمانے کا موقع ملا تو پاکستان کا امن و امان غارت ہوگیا۔ اس دوران صوبہ پختونخواہ کے علاوہ بلوچستان کے اندر علٰحیدگی پسندوں نے سر ابھارااور ایک وقت میں ایسا لگنے لگا تھا پاکستان صرف پنجاب کی حد تک سمٹ کر رہ جایئگا اس لئے کہ سندھ کے دیہاتوں میں جیۓ سندھ اور کراچی میں ایم کیو ایم کی دہشت گردی بامِ شباب پر پہنچ گئ تھی لیکن اس سے قبل کے یہ آتش فشاں پھٹتا امریکہ نے اپنی شکست کو تسلیم کرکے افغانستان سے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک اور اتفاق یہ ہوا کہ امریکہ بہادر نے افغانستان کے اندر جو دستور بنوایا تھا اس کی رو سے حامد کرزئی کیلیۓ دو سے زیادہ مرتبہ صدر بنے رہنا ممکن نہیں تھا اس لئے ناٹو کے ساتھ اس کی مدت کار بھی اختتام کو پہنچی۔ اس طرح گویا امریکی شجر اور کرزئی کی شاخِ نازک پر جو آشیانہ تعمیر کیا گیا تھا وہ اپنے بوجھ سے زمین دوز ہو گیا۔

افغانستان میں گزشتہ سال صدر اشرف غنی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد حکومتِ افغانستان کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اشرف غنی نے سب سے پہلے سعودی عرب اور پھر پاکستان کے بعد چین کا دورہ کردیا اس طرح گویا بڑے جتن سے جو اثر روسوخ کا جال افغانستان میں بنا گیا تھا وہ مکڑی کے جال کی

مانند بکھر گیا۔ چشم زدن میں افغانستان کے پاکستان اور چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ مودی جی نے چین کو پاکستان سے دور کرنے کی خاطر پہلے چینی سر براہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور پھر چین جاکر پاکستان کے ساتھ سڑک بنانے سے باز رکھنے کیکوشش کی لیکن چین نے اسے مسترد کردیا۔ حامد کرزئی نے سبکدوش ہونے کے بعد صدر اشرف غنی کو پاکستان سے دوری بنائے رکھنے کی تلقین کی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

پشاور حملے کے بعد پاکستانی فوجی سر براہ راحیل شریف کا کابل دورہ اور اشرف غنی کے تعاون کا وعدہ پاک افغان تعلقات میں گرم جوشی نمایاں ثبوت تھا۔ اس دوران طالبان کا دفتر قطر میں کھل چکا تھا۔ حامد کرزئی کے زمانے میں طالبان کے جنپیر پردہ پڑا رہا وہ اشرف غنی کے صدر بن جانے کے بعد علیٰ الاعلان سنجیدہ گفت و شنید میں تبدیل ہو گئے۔ اس پیش رفت میں چین کو شامل کیا گیا اورطالبانی رہنما قاری دین محمد نے گزشتہ سال نومبر میں بیجنگ کا دورہ کیا۔ اس سال فروری میں وہ پاکستان آئے اورانہوں نے افغانی حکومت کے رابطہ کیا مگر اسے صیغۂ راز میں رکھا گیا لیکن یکم مئی کو افغان حکومت کا ۲۰ رکنی وفد علی الاعلان طالبان کے ساتھ گفت و شنید کرنے کیلئے قطر گیا اور دونوں فریقوں نے کھل کر باہمی تعاون کے مسئلہ پر بات چیت کی۔ طالبان کے حوالے سے خواتین کے اندر بے شمار شکوک شبہات پیدا کئے گئے تھے لیکن یہ حسن

اتفاق ہے کہ جب مودی جی بنگلا دیش میں تھے افغانی خواتین کا ایک ۹ رکنی وفد جس میں ارکان پارلیمان شامل تھیں اوسلو میں طالبان کے رہنماوں سے اعتماد بحالی کی خاطر ۵ محوِ گفتگو تھا۔

اس صورتحال میں بنگلا دیش کے اوپر سے چین کے اثرات کو زائل کرنے کی خاطر وزیراعظم نریندر مودی اپنے بھولے ہوئے پڑوسی کی جانب متوجہ ہوئے جہاں چین چٹاگانگ کے اندر ایک بندرگاہ تعمیر کرچکا تھا اور گہرے سمندر میں سوناڈیہ کاکس بازار کے قریب دوسری بندرگاہ بنانے میں مصروف ہے۔ حامد کرزئی کے زمانے میں ہندوستان نے افغانستان کو دو بلین ڈالر کی سب سے خطیر امداد دی تھی لیکن اب ۲ بلین ڈالرکے قرض کی سہولت سے بنگلا دیش کو نوازدیا گیاتاکہ وہ اس کے عوض ہندوستانی مصنوعات خرید سکے۔ جنوب مشرقی ایشیا کی سیاست میں جو تبدیلی آئی ہے اس کا تصور بھی چند سال قبل محال تھا۔ فی الحال بنگلا دیش اور سری لنکا چین کے نرغے میں ہیں وہ نیپال تک ریلوے لائن بچھانے کے فراق میں ہے پاکستان اس کا یارِ غار ہے۔ ایسے میں یہ حکومتِ ہند کی اولین ضرورت ہے کہ وہ اس کے اثرورسوخ کوزائل کرنے کی جانب سنجیدہ اقدامات کرے لیکن اس معاملے میں احتیاط کی بڑی اہمیت ہے۔ مثلاً بنگلا دیش کو قریب کرتے ہوئے اگر ہم نے میانمار کو دور کردیا تو یہ کوئی فائدے کا سودہ نہیں ہوگا۔ ایک طرف تو چین نے میانمار سے قربت پیدا کرنے کیلئے آنگ سان سوچی کو بیجنگ آنے کی دعوت دی اور اسی دن ہماری فوج نے اسے اعتماد میں لئے بغیریک طرفہ کارروائی

کردی۔ اس سے میانمار اور ہندوستان کے درمیان دوری پیدا ہو سکتی ہے اور شمال مشرقی ریاستوں میں شورش پر قابو پانا مشکل ہو سکتا ہے۔ اس تناظر میں وزیراعظم نریندر مودی کا حالیہ دورۂ بنگلادیش غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ اگر وزیراعظم اپنی زبان پر لگام رکھتے تو اس افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

گجیندر سے جگیندر تک ۔۔۔۔: قلب انساں سے خدا بننے کی خواہش نہ گئی

اترپردیش کے شاہجہاں پور ہیں جگیندر سنگھ نامی صحافی کو دن دہاڑے زندہ جلا دیا گیا لیکن فلمی اداکاروں کی مانند ہر گھنٹے میں دو مرتبہ اپنے کپڑے بدلنے والے قومی ذرائع ابلاغ میں سے کسی ایک کو بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ واردات کے فوراً بعد اس خبر کو اپنی ویب سائٹ پر شاہ سرخی بناتا۔ خبروں کے چینل پر شام کو اسے بحث کا مرکزی موضوع بنایا جاتا۔ اخبار کے پہلے صفحے پر ان کی تویر اور خبر شائع ہوتی۔ اپنی ہی برداری کے فرد پر ہونے والے اس حملے کے خلاف کوئی احتجاج تو درکنار میڈیا والوں نے اسے عام آدمی پارٹی کے جلسہ عام میں خودکشی کرنے والے گجیندر سنگھ جتنی بھی اہمیت بھی نہیں دی ۔جگیندر سنگھ کے ساتھ ہونے والے ظالمانہ سلوک پر قومی میڈیا کا ردعمل سلمان خان کی گرفتاری اور ضمانت کو لے کر پیدا کئے جانے والے ہیجان کے مقابلے عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔ بے شمار مضامین، قیاس آرائیاں ، تبصرے، فلمی و غیر فلمی ہستیوں کی جانب سے اس کی حمایت و ستائش اور تصاویر کا جو طوفان بد تمیزی ایک مجرم کی گرفتاری کو لے کر برپا کیا گیا تھا ایسی کوئی گرم جوشی یکم جون کو ذرائع ابلاغ میں نظر نہیں آئی تھی۔میڈیا کی یہ عیاری وسرد مہری اس شعر کی مصداق تھی کہ

ہیں اس کی آستیں میں ابھی لاکھ شعبدے

جل دے نہ جائے وقت کا عیار دیکھنا

جگیندر سنگھ کا معاملہ پرسب سے پہلے سوشیل میڈیا میں غم و غصہ کا اظہار ہوا اس کے بعد نیویارک کیصحافتی آزادی کے تحفظ کیلئے کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیم سی پی جی (کمیٹی ٹوپروٹیکٹ جرنلسٹ) اور امنیسٹی انٹر نیشنل جیسی حقوق انسانی کی تنظیموں صدائے احتجاج بلند کی اور اس کے بعد ہی سیاسی و انتظامی گلیارے میں ہلچلمچی۔ ورما کے چار ساتھی اور مقامی پولس افسر سری پرکاش رائے اور چار پولس والوں کے خلاف شکایت درج ہوئی اور انہیں معطل کر دیا گیا لیکن وزیر موصوف اس مضمون کے لکھے جانے تک فرار ہے۔ اس دوران ذرائع ابلاغ میں راوی چین لکھتا رہا۔ نامہ نگار تومر کی گرفتاری، بنگلا دیش کی یاترا اور میامنار کی فوجی کارروائی کی جھوٹی سچی حکایا تو تصاویر نشر کرتے رہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ :

جگیندر سنگھ کون تھا؟ ○

اس کا قصور کیا تھا؟ ○

اسے کس بات کی یہ سزادی گئی؟ ○

اس کو سزا دینے والا کون تھا؟ ○

کس کے ایماء پر اسے اپنی جان گنوانی پڑی؟ ○

جگیندر کی موت کے تیرہویں دن اچانک ایک آتش فشاں پھٹ پڑا اور ساری دنیامندرجہ بالا سوالات کا جواب سے واقف ہو گئی۔ لیکن وہ بنیادی سوال کہ کیاجگیندر کے قاتلوں کو قرار واقعی سزا ملے گی؟ اس کا جواب کوئی نہیں جانتا۔ قیاس کی بنیاد پر تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ سیاسی نظام میں اس کے امکانات مفقود ہیں۔ جگیندر ایک مقامی اخبار کیلئے کام کرتا تھا اور شاہجہاں پور سماچار کے نام سے ایک ای اخبار بھی نکالا کرتا تھا۔ گزشتہ دنوں اس نے مقامی رہنما رام مورتی ورما پر سنگین الزامات اپنے فیس بک صفحہ پر لگائے ۔ ورما پر جبراً زمینوں پر قبضہ اوروہ آنگن واڑی میں کام کرنے والیملازمہ کی اپنے غنڈوں کے ساتھ اجماوعی عصمت دری میں ملوث ہونے کاالزام بھی ہے۔ ان انکشافات کے سبب جگیندر پر ورماکے ساتھیوں نے ۲۸ اپریل کو حملہ کردیا جس کی شکایت درج کرانے کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اس کے خلاف ایک فرضی مقدمہ درج ہوگیا۔ ۲۲ مئی کو جگیندر سنگھ نے اپنے فیس بک پیج پر جوکچھ لکھا تھا وہ اس کی حالتِ زار کا عکاس و ترجمان ہے۔ انہوں نے لکھا تھا:

”رام مورتی سنگھ ورما میرا قتل کرواسکتے ہیں۔اس وقت سیاستداں، غنڈے اور پولس سب میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ سچ لکھنا زندگی پر بھاری پڑ رہاہے۔ رام مورتی ورما کے کچھ کارناموں کا انکشاف کیا تو حملہ کرادیا۔ ان کے لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کرائی توان کے ایک ساتھی امیت نے میرے خلاف لوٹ، اغوااور قتل کی کوشش کی شکایت درج کروادی۔ ۲۸ اپریل کے حملے میں میرے پیر کا پنجہ

ٹوٹا تھا اور پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ اب پولس کو کون سمجھائے کہ پیر ٹوٹا آدمی اغواء تو دور مارپیٹ بھی کیسے کرسکتا ہے۔ اب پولس میرے گھر کی ایسے نگرانی کررہی ہے جیسے میں کہیں سے ڈکیتی ڈال کریا قتل کرکے بھاگ آیا ہوں۔ ڈی جی پی، داخلہ سکریٹری اور ڈی آئی جی بریلی سب سے ملا اور میرے خلاف درج شکایت کے جانچ کا مطالبہ کیا مگر ایسا لگتا ہے کہ سپا (سماجوادی پارٹی) سرکار میں سارے افسر وزیر کے دباو میں ہیں۔ باوثوق ذرائع سے اطلاع مل رہی ہے کہ ریاستی وزیر ورما میرے قتل کی سازش رچارہے ہیں اور جلد ہی کچھ غلط ہونے والا ہے''۔

جگیندر نے جس اندیشے کا اظہار کیا تھا وہ ۹ دن بعد یکم جون کو حقیقت بن گیا۔ نذرِ آتش کردیئے جانے کے ایک ہفتہ بعد ۸ جون کو لکھنؤ کے کنگ جارج ہسپتال میں انہوں نے دم توڑ دیا۔ پولس کا بیان ہے کہ جب وہ گرفتار کرنے کیلئے جگیندر کے گھر گئی تو اس نے ازخود اپنے آپ کو آگ میں جھونک دیا۔ کیا کوئی نڈر صحافی جو اعلیٰ سرکاری افسران سے بذاتِ خود ملاقات کرچکا ہو پولس کی گرفتاری کے خوف سے خودسوزی پر آمادہ ہوسکتا ہے؟ موت سے قبل مجسٹریٹ کے سامنے جگیندر سنگھ نے جو ویڈیو بیان دیا ہے اب وہ ذرائع ابلاغ میں آچکا ہے۔ اس ویڈیو میں زخموں سے چور تڑپتے لرزتے جگیندر کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ موت سے قبل اپنے آخری بیان میں جگیندر نے کہا تھا کہ

کوتوال سری پرکاش رائے چارپانچ پولس والوں کے ساتھ دیوار پھاند کر ان کے گھر میں گھس آیااور اس پر پٹرول ڈال کر اسے آگ لگا دی۔ جگیندر یہ دہکتا ہوا سوال چھوڑ کر اس دارِ فانی سے کوچ کرگیا کہ مجھے گرفتار کرنا تھا تو گرفتار کرلیتے مارا کیوں اور جلایا کیوں؟'' جگیندر کی حالت زار ان اشعار کی مصداق ہے۔

آگ بھڑک کر بجھ بھی چکی پر اب بھی دھواں سا اٹھتا ہے
امیدیں دم توڑ چکی ہیں لیکن حسرت باقی ہے
بات کسی کے جوروستم کی صاف نہ کہنی تھی ہم کو
اب تک ان کے شیشۂ دل پر بارِ کدورت باقی ہے

اس ویڈیو کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی قومی ذرائع ابلاغ کا ضمیر بیدار ہوا جبکہ اس اندوہناک واردات کو ۱۳ دن گزر چکے ہیں۔ یہ ایک ایسی ویڈیو ہے کہ جسے دیکھ کر پتھر بھی پگھل جائے لیکن تاحال یعنی جگیندر کی موت کے پانچ دن بعد تک اترپردیش کے سنگدل وزیراعلیٰ اکھلیش یادو کے کان پر جوں نہیں رینگی ۔ وزیراعلیٰ بیرونی دباؤ میں تو ہیں لیکن ان کا ضمیر ہنوز موت کی نیند سورہا ہے اور وہ اپنے وزیرورما کو برخواست کرنے سے کترا رہے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ملزم ورما کا تو ابھی تک بال بیکا نہیں ہوا لیکن ان کی گرفتاری کا مطالبہ کرنے والے سماجوادی پارٹی کے سابق رکن اسمبلی دیویندر

سنگھ کو پارٹی سے معطل کر دیا گیا۔ اسے کہتے ہیں مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ جس پر کارروائی ہونی چاہئے اسے بچایا جارہا ہے اور جس کو انعام دیا جانا چاہئے اسے سزادی جارہی ہے۔ حکومت اترپردیش پران واقعات الٹا اثر ہورہا ہے سنا ہے شاہجہاں پور سے ڈھائی سے کلومیٹر دور شراوستی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران آئی بی این کے نامہ نگار سنتوش کمار وشواکرما نے یوپی کے سب سے طاقتور وزیر شیوپال یادو سے سوال کرلیا کہ کیاان کے بھتیجے وزیراعلیٰ کا سپریم کورٹ کے احکامات کے باوجود سرکاری اشتہار پر اپنی تصویر چھپوانا درست ہے؟ اس سوال پر شیوپال اس قدر ناراض ہوئے کہ ڈی ایم کے ذریعہ سنتوش پر کارروائی کی سفارش کروادی۔

رام مورتی ورما کی بہ نسبت شیوپال یادو بہت زیادہ بارسوخ سیاستداں ہیں۔ اس لئے اگر سنتوش وشواکرما کے ساتھ بھی خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو یہ نخوت سماجوادی پارٹی کو بہت مہنگی پڑے گی ۔ اس دوران باندہ ضلع سے بھی ایک شخص کو گھر میں گھس کر مارنے کی خبر ملی ہے جس کو حملہ آوروں نے گھر میں ہی جلادیا۔ اس قتل کا سبب متوفی کے گھر والے سماجوادی پارٹی کے رکن اسمبلی وشمبھر یادو کی رنجش بتاتے ہیں۔ سماجوادی پارٹی ایک اور بڑے رہنما رام گوپال یادو سے جب اس بابت استفسار کیا گیا تو آنجہانی جگندر کیلئے ایک ہمدردی کا بول ان زبان سے نہیں پھوٹا مگر اپنے ساتھی ورما کے بچاو میں

وہ بولے صرف ایف آئی آر کے درج ہو جانے سے کیا ہوتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ جگیندر کے خلاف بھی تو صرف ایف آئی آر ہی درج ہوئی تھی ایسے میں کوتوال پانچ جوانوں کے ساتھ ان کے گھر پر کیوں جا دھمکا اور انہیں ایسے اندوہناک انجام سے دوچار کیوں کیا؟ اقتدار کا نشہ اچھے اچھوں کو کبر و غرور کا شکار کرکے ان کا دماغ خراب کر دیتا ہے بقول شاعر ؎

قلب انساں سے خدا بننے کی خواہش نہ گئی
گرچہ واقف ہے کہ اس جرم کی تعزیر بھی ہے

جب بھی اقتدار کے حامل سیاستداں زبان حال یا قال سے خدائی کی دعویٰ کرتے ہیں مشیت کی تعزیر کا کوڑا ان پر برستا ہے لیکن افسوس کہ کوئی اس سے سبق نہیں سیکھتا۔ سماجوادی پارٹی کے سابق رکن پارلیمان متھلیش کمار جبھگر مچھ کے آنسو بہانے کی خاطر جگیندر سنگھ کے پسماندگان سے ملنے کیلئے گئے تو انہوں نے جو کچھ کہا وہ اقتدار کی نفسیات ترجمان ہے۔ جگیندر کے بیٹے راہل کے مطابق سابق وزیر نے فرمایا ’’ یہ خیال سے دل نکال دو کہ مقدمہ دائر کردینے سے وزیر گرفتار ہو جائیگا۔ وہ تو اسی وقت گرفتار ہوگا جب پولس اسے قصور وار پائے گی (گویا ایسا تو کبھی نہیں ہوگا)۔ کوئی وزیر بھلا اس طرح کا طریقۂ کار کیوں اختیار کرے گا وہ بھی پولس کی مدد سے۔ اگر پولس واقعی تمہارے والد کو جلانا چاہتی تو تمہارے گھر کے بجائے تھانے کے اندر یہ کر سکتی تھی‘‘۔

راہل نے یہ بھی بتایا کہ سابق وزیر نے کہا ''تمہارا باپ بلیک میلر تھا جو ماضی میں میرے خلاف بھی لکھ چکا ہے اور اب وزیر کے خلاف غیر ضروری باتیں لکھ رہا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ تم جذبات میں آنے کے بجائے ذمہ داری کے ساتھ کام کرو اور اپنے خاندان کے مفاد کا خیال کرو''۔ اسطرح کے واقعات عوامالناس پر یقیناً اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس حرکت کا جو نتیجہ نکلنا تھا سونکلا وہاں موجود لوگوں نے متھلیش کمار کو دھتکار کر بھگا دیاآخر منافقت اور غنڈہ گردی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ راہل نے اخبار نویسوں کو بتایا اگر کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ میرا باپ بلیک میلر تھا یا نہیں تو ہمارے گھر کو دیکھے۔ ہم اپنے دادا کے گھر میں رہتے ہیں جہاں نہ ٹی وی ہے اور نہ انورٹر۔ یہ جاننے کیلئے کہ انھوں نے بلیک میلنگ سے کتنا روپیہ کمایاہے آپ لوگانکابنکاکاؤنٹبھی دیکھ سکتے ہیں۔ راہل کا بیان خون کے آنسو رلاتا ہے۔

اس طرح کی ظلم و زیادتی کے خلاف عوام کے ردعمل کاظاہر ہونا آنا فطری ہے وہ اپنے غم و غصہ کا اظہار کرکے رہتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے بی جے پی والے ابھی تک جگیندر کے گھر نہیں پہنچے ورنہ اس طرح کی صورتحال کا فائدہ اٹھانے میں وہ پیش پیش ہوتےہںف۔ ہمیں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اچھے بھلے لوگ

بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی فرقہ پرست جماعت کو کیوں کامیاب کر دیتے ہیں؟ اس میں بی جے پی کا کوئی کارنامہ نہیں ہوتا بلکہ فسطائی قوتیں اس طرح کے حالات کا فائدہ اٹھا کر عوام کو اپنا ہمنوا بنا لیتی ہیں۔ جگیندر کے دو بیٹے اور بیوی اس وقت گھر میں موجود تھے جب انکو زندہ جلانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بے دست وپا کر دیئے گئے تھے وہ اس واردات کا چشم دید گواہ ہیں۔

اس سلسلے میں الہ بادہائی کورٹ کے اندر ایک عوامی مفاد کا ایک قضیہ (پی آئی ایل) داخل کیا گیا ہے جس میں عدالت سے درخواست کی گئی ہے کہ اس معاملے کی غیر جانبدار تفتیش کروائی جائے۔ چونکہ اس میں ریاستی حکومت کا وزیر ملوث ہے نیز پولس ریاستی حکومت کے تحت ہے، وہ خود اپنے افسران اور اپنی حکومت کے خلاف مبنی بر انصاف تفتیش نہیں کر سکتی اس لئے مرکزی تفتیشی ایجنسی کو یہ ذمہ داری سونپی جائے۔ ویسے سی بی آئی بھی چونکہ متحارب جماعت کی آلۂ کار ہے اس لئے اس سے بھی انصاف کی توقع مشکل ہے۔ اس طرح ہر دو صورت میں جانبداری تو ہوگی لیکن متاثرین کیلئے سی بی آئی تفتیش میں عافیت ہے اس لئے ہے کہ حبِ علی میں نہ سہی تو بغضِ معاویہ میں حقائق سامنے آجائیں گے۔ پی آئی ایل میں پسماندگان کیلئے خاطر خواہ معاوضہ کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔

قومی سیاست میں جو انحطاط فی الحال دکھائی دیتا ہے اس کا آغاز اس وقت ہوا

جب سیاستدانوں نے اپنے مخالفین کی آواز دبانے کیلئے جرائم پیشہ افراد کا استعمال شروع کیا ۔ انتظامیہ ایسے مجرمین کا تحفظ کرتا تھا۔ آگے چل کر وہ جرائم پیشہ لوگ سیاست میں آگئے۔ پولس والوں سے ان کے تعلقات پہلے ہی استوار ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے اپنے مخالفین کے خلافپولسکااستعمال شروع کر دیا۔ اس کا سب سے موثر اور بھیانک استعمال گجرات کے اندر ہوا۔ فساد کے دوران پولس نے بلوائیوں کی مدد کی اور کبھی کبھار ان کے شانہ بشانہ لوٹ مار میں بھی شریک ہو گئی۔ اس کے بعد پولس کے استعمال سے سیاسی مخالفین کو ٹھکانے لگایا گیا۔ پھر آگے چل کر بلڈرس کے اشارے پر سہراب الدین کا انکاؤنٹر کر دیا گیا۔ اس جرم کے چشم دید گواہ پرجاپتی کا کانٹا نکالنے کیلئے بھی پولس کا استعمال ہوااور عشرت جہاں کے معاملے میں ساری حدود و قیود کو پھلانگ دیا گیا۔ یہی وہ گجرات ماڈل ہے جس میں کئی اعلیٰ پولس افسران اور سیاستدانوں جیل کی ہوا کھانی پڑی ۔

انتخابی سیاست کا یہ چمتکار ہے اس نے گزشتہ انتخاب اسی ماڈل کے راجہ جنک کو ملک کی باگ ڈور سونپ دی۔ اس کے بعد ایک ایک کرکے ملزم چھوٹنے لگے ۔ ان کی ملازمت بحال ہونے لگی بلکہ ترقی بھی ہونے لگی ۔ امیت شاہ جس کو گجرات سے تڑی پار کر دیا گیا تھا وہ برسرِ اقتدار پارٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ جس تفتیشی ایجنسی نے اس پر سنگین الزمامت عائد کئے تھےاس نے اپنا بیان بدل

دیااور اسے عدالتِ عالیہ نے کلین چٹ دے دی۔ مودی جی مقبولیت دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کا ایک ثبوت سابق فوجیوں کے ملک گیر مظاہرے ہیں جن کی ابتداء ۱۴ جون کو ہو چکی ہے اور کل سے وہ بھوک ہڑتال کررہے ہیں۔ اس لئے کہ حکومت بنگلا دیش کی آزادی میں فوجیوں کے کردار کو سراہتی ہے۔ میانمار کے حملے کا کریڈٹ بھی لیتی ہے لیکن ایک عہدہ ایک پنشن کا مسئلہ حل نہیں کرتی بلکہ صرف وعدے کرتی ہے۔

اس طرح کی بے عملی کی سزا مودی سرکار کو ضرور ملے گی اور اس کا قوی امکان ہے کہ آئندہ انتخاب میں پھر ایک بار کسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو۔ اس صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کی حمایت سے جنتا پریوار کے ملائم سنگھ یادو وزیر اعظم بن جائیں ۔ اگر یہ کرشمہ ہوجاتا ہے تو ممکن ہے وہ مودی جی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ رام مورتی ورما کو سماجوادی پارٹی کا صدر بنادیں ۔ اسی کے ساتھ ان کے خلاف الزامات کا پٹارہ بند کردیا جائے اور عشرت جہاں و سہراب الدین کی مانند جگندر سنگھ کو بھی بھلا دیا جائے۔ اس کے بعد جس طرح فی الحال فسطائیت اور ہندوتوا کا ڈنکا بج رہاہے سیکولرزم و سوشلزم کی شہنائی بجادی جائے؟ ایسی صورتحال پر عنایت علی خان صاحب کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

خزاں چمن سے چلی بھی گئی تو کیا ہوگا

پھر اک فریبِ بہاراں کا سلسلہ ہوگا

یوگ راج سے بھوگ راج تک : پاکھنڈ ہی پاکھنڈ

مثل مشہور ہے ’’جیسی نیت ویسی برکت‘‘۔ ’’یوگا دن کا جشن‘‘ اس کا عملی مظہر ہے۔ مودی جی یوگ کریں یا بھوگ چڑھائیں اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو جاتا ہے اس لئے اگر نیت ہی ٹھیک نہ ہو تو برکت کہاں سے آئے؟ اس کی ایک مثال گزشتہ دنوں نیپال میں سامنے آئی جہاں زلزلے کے نام پر ہندوستانی جہاز نامہ نگاروں کو لے کر جاتے تھے اور اپنے شہریوں کے ساتھ واپس آجاتے تھے۔ ان نامہ نگاروں نے وہاں جو گل کھلائے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوراشٹر نیپال سے ہمیں رسوا کرکے نکال باہر کیا گیا۔ یوگا دن کا حشر اس سے بھی خراب ہوا۔ ساری دنیا کو ملانے کا دعویٰ کرنے والے دہلی کے گورنر کو اور وزیراعلیٰ کو یکجا نہ کرسکے۔ یوگا سے ملنے والی طاقت کا اندازہ شام میں ہوا جب بنگلا دیش کی ٹیم نے ہندوستان کو بڑے آرام سے شکست دے کر نہ صرف میچ بلکہ سیریز جیت لی۔ اب مودی جی کو چاہئے کہ اپنی کرکٹ ٹیم کو بابارام دیو کے حوالے کرکے اسے دن رات یوگا کروائیں تاکہ کرکٹ کا اگلا عالمی کپ یقینی طور پر ہندوستان آسکے۔

یوگا کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ ذہنی تناؤ سے نجات پانے کا نسخۂ کیمیا ہے لیکن جو ملک یہ پیغام ساری دنیا کو دے رہا ہے اس کی کرکٹ ٹیم کا

کیپٹن کول'' کہلانے والا کپتان کبھی مخالف ٹیم کے گیند باز کو ٹکر مار کر میدان سے'' باہر کرنے کی کوشش میں اپنی ۷۵ فیصد فیس سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو کبھی جھنجلا کر ساری غلطیوں کے لئے خود کو ذمہ دار ٹھہرا دیتا ہے۔ یہ چراغ تلے اندھیرا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یوگا دن کے موقع پر ہندوستانی ٹیم کا عبرتناک انجام دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب مودی جی سے بھی دھونی کی مانند سوال کیا جائیگا کہ اب آپ کو کپتانی کرتے ہوئے کیسا لگتا ہے؟ اور مودی جی وہی جواب دوہرائیں کہ اگر وزیراعظم کے بدل دینے سے ہندوستان کے حالات سدھر سکتے ہیں تو مجھے بدل دیجئے۔ یہ کہنا دھونی کیلئے جس قدر آسان ہے مودی کیلئے اتنا سہل نہیں ہے اس لئے کہ جس طرح طلسمی کہانیوں میں شہزادے کی جان طوطے میں ہوتی ہے اسی طرح ہمارے سیاستدانوں کی آتما کرسی میں پھنسی ہوتی ہے ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ ''جگ کل ریت صدا چلی آئی جان جائی پر سنگھاسن نہ جائی''۔ مودی جی کو اپنے ساتھ ''پہلی بار'' کا لقب لگانے کا بڑا شوق ہے تو بنگلا دیش نے انہیں اپنی پیٹھ سہلانے کا ایک اور موقع عنایت کردیا اب وہ سینہ ٹھونک کر کہہ سکتے ہیں کہ ان کی قیادت میں پہلی بار ہندوستان نے بنگلا دیش سے سیریز ہارنے کا اعزاز حاصل کیا ہے اس سے پڑوسی ممالک کے تعلقات بہتر ہوں گے اور خطے میں امن قائم ہوگا۔

جس دن یوگا کے ذریعہ ساری دنیا کو امن و شانتی کا پیغام دیا جارہا تھا اسی

روز آر ایس ایس کے گڑھ ناگپور کے علاقے سے ایک دل دہلا دینے والی خبر آئیجہاں سندیپ کوٹھاری نامی صحافی کو مدھیہ پردیش کے بالا گھاٹ سے اغواء کرکے لایا گیا اور قتل کرنے کیلئے جلادیا گیا۔اتفاق سے مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر دونوں مقامات پر بی جے پی کی ریاستی حکومتیں ہیں۔یہ بھی اتفاق ہے شدید مطالبت کے باوجود سندیپ کوٹھاری کے قتل کی تحقیقات بی جے پی کی ریاستی حکومت سی بی آئی کو دینا نہیں چاہتی اس لئے کہ اسے خود اپنی مرکزی سرکار پر اعتبار نہیں ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ کہیں مودی جی اس کا فائدہ اٹھا کر چوہان صاحب کا بوریہ بستر گول نہ کردیں۔ سندیپکا قصور یہ تھا کہ اس نے غیر قانونی طور کان کنی کرنے والوں اور چٹ فنڈ چلانے والوں کے خلاف مقامی عدالت میں دائر کردہ مقدمہ واپس لینے سے انکار کردیا تھا۔

میڈیا اس اہم خبر کو شام تک پیٹ میں لئے بیٹھا رہا اور یوگا کی بانسری بجاتا رہا۔ اس پر دولت کا ایسا نشہ سوار تھا کہ اس نے ممبئی میں ۱۰۰ سے زیادہ زہریلی شراب پی کر مرنے والوں کے لواحقین کا دکھ درد کو بھی نظر انداز کردیا۔ یہ حادثہ بی جے پی کی مہاراشٹر حکومت کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے جس نے بڑے جانور کے ذبیحہ پر پابندی لگا کر اسے سختی سے نافذ کرنے کی کوشش کی ہے مگر دیسی وانگریزی شراب تو کجا زہریلی شراب کے قہر سے بھی اپنی عوام کو نہیں بچا سکی۔ مرکزیسرکار نے دو عالمی ریکارڈ قائم کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔

سب سے زیادہ لوگوں کے ایک ساتھ یوگا کرنا اور سب سے زیادہ قومیت کے حامل لوگوں کے یوگا کرنے کا ورلڈ ریکارڈ۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کرکے ہندوستان نے کس کا ریکارڈ توڑا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ اولمپک میں سونے کا تمغہ نہیں جیت سکتے تو کبڈی کا کھیل شامل کرواکر خود عالمی چمپین بنالیا جائے جب کوئی کھیلے گا نہیں تو ہارے گا کیسے ؟ ''یوگادن'' کے موقع پر مودی جی نے جن ۱۵آسنوں کا انتخاب کروایا تھا ان میں سے بھی صرف ۱۳ کرتے کرتے ان کے پسینے چھوٹ گئے۔ جب آسن نہ کرسکے اس کی خجالت کو مٹانے کیلئے بچوں کو سکھانے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی اس چالاکی کو عوام تو دور بچے بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ پنڈت نہرو کی سر کے بل شیرش آسن میں تصویر شائع کرکے کانگریسنے مودی جی کی ہوا نکال دی اس لئے کہ وہ توتاڑآسن بھی نہیں کرسکے۔ اس طرح اصلی اور جعلی یوگی کا فرق ساری دنیا کے سامنے آگیا۔ راج پتھ پر جو ۳۸ ہزار چٹائیاں بچھائی گئی تھیں جو تمام تر سرکاری دباوکے باوجود پرُ نہ ہوسکیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ 'میک اِن انڈیا' کا شور مچانے والے شیر کو انہیں چین سے برآمد کرنا پڑا۔ اس سے شیر اور گیدڑ کا فرق بھی ظاہر ہوگیا۔ اس تماشے کو کامیاب کرنے کیلئے ۳۰تا۴۰ کروڑ روپئے پھونک دیئے گئے اور حکومت کا ارادہ نوزائیدہ وزارت آیوش کو۵۰۰ کروڑ سے نوازنے کا ہے۔ ایکطرف تو حکومت تعلیم و صحت جیسی بنیادی سہولیات کے بجٹ میں

کٹوتی کر رہی ہے اور دوسری جانب نمائشی کاموں پر بے دریغ خرچ کر رہی ہے۔ ایسا کرنا ممکن ہے۔برسرِ اقتدار جماعت کیلئے کسی قدر فائدہ بخش ہو مگر یہ بہت بڑا قومی خسارہ ہے۔ مودی جی نے اپنے سارے وزراء کو بن باس پر روانہ کردیا تاکہ دہلی میں صرف وہی نظر آئیں لیکن برا ہو کیجریوال اور یادو رجنگ کا کہ وہ تماشائی بننے کے بجائے میدان میں کود گئے۔ اپنے سب سے قریبی میت (ہمدم) امیت شاہ کو یوگا کا سیاسی فائدہ اٹھانے کیلئے پٹنہ بھیج دیا لیکن بھلا ہو نتیش کمار کہ انہوں نے امیت شاہ کو اپنی لحیم شحیم جسم کے پیش نظر گھر کے اندر ہی یوگا کرنے کا مشورہ دے دیا۔ امیت شاہ نے نتیش کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے یوگا کی افادیت پر تقریر پر اکتفا کیا اور بغیر ہاتھ پیر مارے لوٹ آئے۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ امیت جن ارادوں کے ساتھ بہار گئے تھے ان پر تقریر تو کرسکتے ہیں لیکن ان میں کامیابی حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ امیت شاہ نے تو یوگا نہیں کیا لیکن جن بہاری رہنماوں نے یوگا کیا ان کے اندر ایسی توانائی آئی کہ وہ سب کے سب اپنے آپ کو وزیراعلیٰ کی کرسی کا حقدار سمجھنے لگے۔ اب ان احمقوں کو کون سمجھائے کہ ایک وقت میں ایک ریاست کے ایک سے زیادہ وزیراعلیٰ نہیں ہو سکتے۔ ایک امریکی یونیورسٹی نے تحقیق کی ہے کہ یوگا سے جسمانی فائدے تو ہوتے ہیں لیکن دماغ پر برا اثر پڑتا ہے۔ بہار خشواہا نے وزارت اعلیٰ کا دعویٰ کرکے اس کی توثیق کردی۔ مانجھی اور پاسوان نے غالباً دو چار الٹے سیدھے اضافی

آسن کر لئے تھے اس لئے کہ ان میں بھی نشستوں کی تقسیم کو لے کر مہابھارت چھڑ گئی ہے۔اب موضوعِ بحث یہ سوال ہے کہ یوگا سے اتحاد قائم ہوتا ہے یا انتشار ؟

وزیر خارجہ سشما سوراج کو نیویارک روانہ کیا گیا تاکہ وہ بان کی مون کے ساتھ یوگا کر سکیں۔ بان کی مون کے یوگا کرنے کی خبر تو آئی لیکن سشما کی جی نہ خبر اور نہ تصویر۔ وہ تو خیر سے سشما جی کی کوئی تصویر نہیں آئی ورنہ امیت شاہ پر نتیش کمار کے تبصرے کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ویسے اگر وہ تصویر کہیں شائع ہو تو اس میں ان کے آس پاس بدنامِ زمانہ للت مودی کو تلاش کرنا چاہئے اس لئے کہ سشما کی بدولت وہ مطلوبہ ملزم دو سالوں تک ساری دنیا کی سیر کرنے کیلئے آزاد کر دیا گیا ہے۔ سشما کی بیٹی بانسری سوراج للت مودی کی وکیل بنی ہوئی ہیں اس لئے مرکزی حکومت عدالت میں ان کے خلاف پیروی نہیں کرتی اور ۲۲ سالوں تک سشما کے شوہر نامدار کوشل سوراج للت مودی کے قانونی صلاح کار بنے رہے ہیں ایسے میں جو ۱۲۵ کروڑ کا گھپلہ کرنے والے للت مودی پر سشما کا یہ حق تو بنتا ہی بنتا ہے۔ اگر للت مودی امریکہ نہ آسکیں ہوں تو ممکن ہے سشما واپسی میں لندن میں ان سے ملاقات کرتے ہوئے لوٹیں ۔ اس بیرونی سفر میں وزیر خارجہ نے کس کس گھپلے باز سے ملاقات کی یہ تحقیق کا دلچسپ موضوع ہو سکتا ہے۔

ویسے یوگا دن کا سار ہنگامہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑا گورکھ دھندہ ہے۔ اس کے اہتمام کیلئے ۱۹۹ کیمپوں کے اہتمام کی ذمہ داری بابا رام دیو کو دے کر انہیں ۱۹۱ لاکھ کی رشوت دی گئی تاکہ وہ کالا دھن واپس لانے کا اپنا مطالبہ پیش کرنے سے باز رہیں۔ بابا رام دیو جنہیں ہریانہ کی حکومت نے اپنا (برانڈ ایمباسیڈر) بنا رکھا ہے کھلے بازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ یہ بھوگی ہریانہ کے وزیر اعلیٰ سے نہیں پوچھتا کہ آخر اس کو کسی برانڈ ایمبا سیڈر کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ رام دیو کا دعویٰ ہے یوگا سے دماغ، جسم اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اگر ایسا ہی ہے تو پولس کے آنے پر وہ عورت کا بھیس بدل کر فرار ہونے کی بزدلانہ حرکت اس نے کیوں کی۔ یوگا اگر امن و سلامتی کا پیغامبر ہے ہے تو اس کے آشرم میں ٹرک ڈرائیور پر گولی کیوں چلائی گئی۔ اس کا بھائی جو اس جرم میں شریک پایا جاتا ہے کیا یوگا نہیں کرتا۔ اسلحہ کا ذخیرہ رام دیو کے آشرم میں ملا اس کیلئے سنجے دت کی طرح اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے کیوں نہیں ٹھونسا گیا؟ سری سری روی شنکر کو اپنی مکھن بازی کے عوض ۶۵ لاکھ کا انعام دیا گیا۔ یوگا دن کا اہتمام کرکے مودی جی نے آر ایس ایس اور وشوا ہندو پریشد کے دباو سے چھٹکارا پانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اپنے وفادار سادھو سنتوں کی مدد سے اتنے بڑے پیانے پر عوام سے رابطہ قائم کرکے یہ پیغام دے دیا گیا ہے کہ اب وہ سنگھ پریوار کے بہت زیادہ محتاج نہیں ہیں۔

یوگا دن' کو لے کر مودی جی کی فضیحت کا آغاز مسلمانوں کی جانب سے ہوا جب پرسنل لاء بورڈ نے صاف اور واضح اعلان کر دیا کہ عقائد کے معاملے میں کسی قسم کی کوئی مصالحت نہیں ہوگی۔ ہم لوگ سوریہ نمسکار نہیں کر سکتے اس لئے کہ ہم سوریہ کے نرماتا کو نمسکار کرتے ہیں اور عقلمندی کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ہر صاحب عقل مخلوق کے بجائے خالق کے آگے سجدہ ریز ہو۔ اس کے بعد یوگا کو سیکولر بنانے کی خاطر اس میں سے سوریہ نمسکار کو نکال دیا گیا۔ مسلمانوں کی جانب سے دوسرا اعتراض ''اوم'' کو لے کر تھا۔ ایسے میں مرکزی وزیر برائے ثقافت و سیاحت سری پد نائک نے اعلان کر دیا کہ یوگا میں اشلوک کا پڑھنا لازمی نہیں ہے اور مسلمان ''اوم'' کے بجائے اللہ کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح گویا مسلمانوں کو شامل کرنے کے چکر میں پہلے تو یوگا کی چربی نکال کر اسے فیٹ فری دودھ جیسا بنادیا گیا اور پھر اس کے بعد اس میں سے مکھن بھی نکال لیا گیا۔ اب جو چھاچ بچ گئی اس میں نہ غذائیت باقی تھی اور نہ لذت اس طرح مسلمانوں کیلئے یہ جنسِ حرام ہندوؤں کیلئے بھی ایک گناہِ بے لذت بن کر رہ گئی۔ اس کے باوجود وی ایچ پی کے پروین توگاڑیہ اسے سیکولر قرار دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اوم کے بجائے اللہ کا نام لینا شیوا کی توہین ہے۔ اس طرح گویا نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ آر ایس ایس نے رام مادھو اپنا نمائندہ بنا کر بی جے پی میں بھیجا ہے اور

لگتا ہے کہ اس کا یوگا کر کرکے دماغ خراب ہو گیا ہے۔ رام مادھو نے یوگا دن کے موقع پر نائب صدر حامد انصاری کی عدم موجودگی پر اظہار حیرت کیا۔ چونکہ راجیہ سبھا چینل کے سربراہ نائب صدر مملکت ہیں اس لئے اس کے یوگا بلیک آوٹ پر بھی تنقید کی اور سارے معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا لیکن جب حکومت کی جانب سے پھٹکار پڑی تو معذرت کرتے ہوئے ایک نیا جھوٹ گھڑ دیا کہ مجھے پتہ چلا ہے نائب صدر علیل ہیں اور ان کے دفتر کا احترام کیا جانا چاہیے بعد میں یہ دونوں ٹویٹ نکال دیئے گئے لیکن نقصان ہو چکا تھا۔ اس معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ نائب صدر بیمار نہیں تھے بلکہ انہیں دعوت ہی نہیں دی گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر کسی تقریب میں نائب صدر کو دعوت دی جائے تو دستوری طور پر ان سے کمتر عہدے پر فائز وزیر اعظم کو مہمانِ خصوصی نہیں بنایا جاسکتا لیکن یہ ناممکن تھا اس لئے انصاری کو دعوت دینے سے گریز کیا گیا۔ اب وہ دعوت کے بغیر بن بلائے مہمان کی طرح شریک تو نہیں ہو سکتے تھے۔ اس سے پہلے بھی ان جاہلوں نے ان کے پرچم کو سلامی نہ دینے پر تنازع پیدا کیا تھا جبکہ دستور کی خلاف ورزی خود وزیر اعظم اور وزیر دفاع سے ہوئی تھی نہ کہ نائب صدر سے۔ یہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ان کے دماغ پر یہ یوگا کے اثرات ہوں۔

اقوام متحدہ میں یوگا دن کو تسلیم کروانے کو ایک نادرِ روزگار کارنامہ بنا

کر پیش کیا گیا حالانکہ اس سے قبل اقوام متحدہ ۱۲۹ دنوں کو مختلف مسائل سے منسوب کرچکی ہے اس طرح ہر ماہ میں ۱۰ سے زیادہ ایسے دن آتے اور نکل جاتے ہیں جنہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ۲۱ جون ویسے ہی ہائیڑولوجی (آبیات) کے دن سے منظور شدہ تھا لیکن مودی جی کی ٹیم نے اس پر اصرار اس لئے کیا کہ اگر یہ اتوار نہ ہوتا اورکام کے دن لوگ اپنے دفاتر چلے جاتے تو ٹی وی کے سامنے بیٹھ کراس نوٹنکی کو کون دیکھتا؟ لیکن سرکار کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر سال ۲۱ جون اتوار کو نہیں آئیگا۔ ماہِ جون کی ۲۱ تاریخ کو الٹ دیں تو ۱۲ جون کو بچوں کی مزدوری کا دن تھا۔ یہ ہندوستان کا ایک سنگین مسئلہ ہے جہاں ایک کروڑ سے زیادہ بچے اسکول جانے کے بجائے مزدوری کرنے کرتے ہیں۔ ۹ تا ۱۴ سال کے بچوں کے درمیان یہ تناسب ۱۱ فیصد بنتا ہے۔ اس مسئلہ کی سنگینی کے پیش نظر گزشتہ سال بچوں کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرنے والے سماجی کارکن کیلاش ستیارتھی کو نوبل انعام سے نوازہ گیا۔ اگر مرکزی حکومت واقعی قوم کے مستقبل کی بابت سنجیدہ ہوتی تو ۱۲ جون کو بچوں کی مزدوری کا دن منایا جاتا اور اس عذاب سے بچوں کو نکالنے کیلئے بڑے پیانے پر کام کیا جاتا لیکن اس طرح کے کاموں سے شہرت نہیں ملتی اس لئے مودی جی کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے وہ تو یوگا کے نام پر ایک تماشہ کرکے عوام کو بہلانے پھسلانے میں یقین رکھتے ہیں۔

مودی جی کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس طرح کے تماشے درد مٹانے والے 'پین کلر' کی طرح ہیں۔ان عارضی راحت تو ملتی ہے مگر بیماری کا علاج نہیں ہوتا وہ جوں کی توں باقی رہتی ہے۔ عوام کی ناراضگی کم ہونے کے بجائے بڑھتی جاتی ہے اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ایک اسکول میں الکٹریشین کی جگہ خالی تھی انٹرویو کیلئے جو امیدوار آئے ان میں سے ایک بہت چرب زبان ہنس مکھ رائے بھی تھا۔اس نے اپنے بول بچن کے ذریعہ ملازمت بھی حاصل کرلی لیکن کام کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کسی نے ایک دن اسکول کے صدر دروازے پر لگا بلب توڑ دیا ہے۔جب ہنس مکھ رائے کو بلایا گیا تو پتہ چلا وہ طالبات کیلئے زیر تعمیر حمامات کی نگرانی کررہا ہے۔پرنسپل نے کہا یہ تو ٹھیکیدار کا کام ہے لیکن ہنس مکھ رائے مسکرا کر بولا لیکن چونکہ یہ بہت اہم کام ہے اس لئے فی الحال تو میں یہ کررہا ہوں قمقمہ بعد میں بدل دوں گا۔اس کے بعد شکایت آئی کہ راہداری کی ٹیوب لائٹ بجھ گئی ہے۔ہنس مکھ رائے کوتلاش کیا گیا تو معلوم ہوا وہ چھوٹے بچوں کی دیکھ ریکھ کیلئے ان کے ساتھ پکنک پر گیا ہوا ہے۔پرنسپل کو پھر غصہ آیا انہوں نے پوچھا یہ تو خالہ ماں کا کام ہے جواب ملا لیکن فی الحال یہی سب سے اہم کام ہے۔

اس کے بعد کسی کلاس روم کا پنکھا خراب ہوگیا تب بھی ہنس مکھ رائے ندارد تھا اسے تلاش کیا تو وہ باغات کی صفائی مہم میں جٹا ہوا تھا۔ صدر مدرس نے

پوچھا لیکن وہ مالی کیا کررہے ہیں تو انہیں بتایا گیا کہ وہ ہنس مکھ رائے کی تصویر کھینچ رہے ہیں تاکہ اخبارات میں اسے چھپوا کر اسکول کا نام روشن کیا جاسکے ۔ایک دن پانی کا پمپ خراب ہوگیا اسکول کے طلباء قطرے قطرے کو ترس گئے اس دن ہنس مکھ رائے سالانہ کھیل کود کے مقابلوں کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ صدر مدرس کا پارہ دن بدن چڑھتا جارہا تھا ایک دن ان کے اپنے کمرے کا اے سی بگڑگیا انہوں ہنس مکھ رائے کو بلوا بھیجا تو پتہ چلا وہ یوم اساتذہ کے موقع پر بچوں سے اپنے من کی بات کررہا تھا۔ پسینے سے شرابور پرنسپل نے اس کو اسکول سے نکال باہر کرنے کا فرمان جاری کردیا۔ جب ہنس مکھ رائے نے آکر پرنسپل سے پوچھا کہ جناب میں نے آپ کی اسکول وہ سب کیا جو کسی الکٹریشین نے مجھ سے پہلے نہیں کیا تھا اس پر پرنسپل صاحب نے اس سے پوچھا جی ہاں لیکن جس کام کیلئے تمہیں ملازمت پر رکھا گیا تھا ہنس مکھ رائے کیا تم نے کبھی وہ کام بھی کیا ؟ ہنس مکھ رائے کے انجام میں مودی جی کیلئے ایک پیغام ہے۔ اگر راج پتھ کو یوگ پتھ بنانے کے باوجود ان کا دماغ درست ہو تو انہیں اس سے درسِ عبرت لینا چاہئے۔

لوک تنتر کا مول منتر: کھاؤ اور کھانے دو

وزارت عظمیٰ کے امیدوار نریندر مودی نے جب یہ اعلان کیا تھا کہ ’’نہ کھاؤں گا اور نہ کھانے دوں گا‘‘ تو عوام کو یوں لگا کہ گویا وہ بدعنوانی پر اظہار خیال فرما رہے ہیں لیکن اقتدار میں آنے کے ایک سال بعد پتہ چلا کہ وہ تو گئو کشی کی بات کر رہے تھے۔ یعنی ’’نہ میں بڑے جانور کا گوشت کھاؤں گا اور نہ کھانے دوں گا‘‘ اب اگر کوئی ان سے پوچھے کہ ’’تو آپ کیا کریں گے؟‘‘ اس سوال کا بہت ہی آسان جواب ان کے پاس ہے برآمد کروں گا اس لئے کہ غیر ممالک میں گائے کے گوشت کی قیمت اندرونِ ملک سے زیادہ ہے۔ بدعنوانی کی بابت ملک کے بھولے بھالے لوگوں نے موجودہ سیاسی نظام سے غلط توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ جمہوری سیاست میں رشوت خوری کے بغیر گزارہ ناممکن ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اروند کیجریوال کا یہ حشر کبھی نہ ہوتا۔ سیکولر جمہوریت کی گاڑی ہی بدعنوانی کے ایندھن سے چلتی ہے۔ یہاں لوگ رشوت سے اس لئے گریز نہیں کرتے کہ اسے برا سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے نہیں کھاتے کہ اس کا موقع نہیں ملتا۔ اقتدار کا سارا جھگڑا ہی بدعنوانی کا موقع حاصل کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ حزب اختلاف کیلئے رشوت خوری کے مواقع محدود ہوتے ہیں اور حزب اقتدار کے سامنے لامحدود اس لئے ساری جدوجہد اس تنگی کو کشادگی میں بدلنے کیلئے ہوتی ہے۔ قومی جمہوری محاذ کے دوسرے سال کی

ابتداء میں پھٹ پڑنے والے بدعنوانی کے آتش فشاں اس حقیقت کا غماز ہے۔

ہندوستانی سیاست میں ہر کوئی بدعنوان ہے الا ماشا اللہ لیکن چونکہ سرکار اس میں سرتاپا ملوث ہوتی ہے اس لئے اپوزیشن کو اس کا شور مچا کر اپنے آپ کو نیک نام کی حیثیت سے پیش کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ کانگریس کے راج میں بی جے پی والے یکے بعد دیگرے گھوٹالوں کو اچھالتے تھے اور عوام کو یہ باور کراتے تھے کہ مہنگائی اور بے روزگاری کی بنیادی وجہ یہی بدعنوانی کا عفریت ہے۔ جب وہ اقتدار میں آئیں گے تو یہ مسائل حل ہو جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ بی جے پی نے اقتدار میں آتے ہی زور و شور سے بدعنوانی کا بازار گرم کردیا۔ وزیر اعظم کے ساتھ ہر غیر ملکی دورے پر سایہ کی طرح ساتھ رہنے والے گوتم اڈانی نے ایک سال کے اندر اپنی دولت وثروت میں ڈیڑھ گنا اضافہ کرلیا۔ وزیر خارجہ سشما سوراج نے اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کرکے بدنامِ زمانہ مفرور ملزم للت مودی پر لگی ساری پابندیوں کو اٹھا دیا۔

للت مودی تو سیاسی افق پر کچھ اس طرح نمودار ہوا کہ ہزاروں میل کے فاصلے سے اس نے نریندر مودی کی روشنی کو ماند کردیا۔ فی الحال ذرائع ابلاغ پر للت مودی اسی طرح چھایا ہوا ہے جیسے کسی زمانے میں نریندر مودی ہوا کرتے تھے۔ ہر کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ للت مودی نے کیا کہا؟ اس کے دستاویزات میں سے کون

سا نیا انکشاف ہوا؟ اس کے ای میل میں کس کا نام آیا؟ وہ آئے دن یوروپ سے لے کر جنوبی امریکہ تک اپنے نجی جہاز میں اسی شان کے ساتھ گھومتا پھر رہا ہے جیسے کبھی نریندر مودی گھوما کرتے تھے۔ للت مودی کے حرکات و سکنات سے مودی جی کی ٹورنٹو والی تقریر کا یہ مکالمہ یاد آتا ہے ’’جن کو گندگی کرنی تھی وہ گندگی کرکے چلے گئے۔ ہم صفائی کرکے جائیں گے‘‘۔ مودی سرکار کے ہاتھ کی صفائی اور رشوت کی کمائی دن بدن سامنے آرہی ہے۔ کبھی وزیر مواصلات نتن گڈکری کے گھپلے پر سی اے جی کا اعتراض نظر آتا ہے۔ کبھی وزیر انسانی وسائل سمرتی ایرانی کا غلط حلف نامہ آنکھیں دکھاتا ہے تو کہیں سشما اور سندھیا کی للت گاتھا سنائی دیتی ہے۔

آج سارے ملک میں للت مودی اور سشما و راجے کو لے کر ہنگامہ برپا ہے لیکن بڑ بولے وزیراعظم کی بولتی بند ہے ایسے میں ایک من چلے نے للت مودی کو ٹویٹ کرکے لکھا ’’آپ مشکل ترین وکٹ پر آگے بڑھ کر کھیلتے ہو۔ آپ ہمارے وزیراعظم کو کیا صلاح دیں گے جو ذرائع ابلاغ کو سنبھالنے میں لڑکھڑا رہے ہیں‘‘۔ یہ کس نے سوچا تھا کہ وزیر اعظم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کیلئے ان کا کوئی مرید للت مودی جیسے بدعنوان بھگوڑے سے رجوع کرے گا؟ اس پیغام کے جواب میں للت مودی نے جو کچھ لکھا ہے اس کے آگے تو ہمارے سیاستداں بھی پانی بھرتے ہیں۔ للت نے لکھا ’’ ہمارے وزیر اعظم نہایت شاطر آدمی ہیں۔

انہیں کسی صلاح و مشورے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے بلّے سے گیند کو میدان کے باہر کر سکتے ہیں''۔آج حالت یہ ہے کہ للت مودی تو بڑے آرام سے وزیراعظم کو خراج تحسین پیش کررہا ہے لیکن نریندر مودی اس پر لب کشائی کی جرأت نہیں کرپارہے ہیں۔ ان کی گھبراہٹ کا یہ عالم ہے کہ وجئے راجے سندھیا جب نیتی آیوگ کی نشست میں شرکت کرنے کیلئے دہلی آتی ہیں اور ملاقات کیلئے وقت مانگتی ہیں تو وہ نہ صرف خود ملاقات سے دامن بچالیتے ہیں بلکہ اپنے شاگردِ خاص میت شاہ کو بھی منع کردیتے ہیں۔ مودی جی نے اپنے فرانس کے دورے پر ایک عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے سوال کیا تھا ''آپ نے کوئلہ گھوٹالے کے متعلق سنا ہوگا۔ کوئلے کی کان کنی کے ٹھیکے اس طرح تقسیم کئے گئے جیسے تاش کے پتے یا قلم اور رومال۔ معمولی قلم بھی کسی کو دینے سے قبل انسان سوچتا ہے کہ کیا یہ شخص اس کا اہل ہے؟'' اب اگر کوئی یہی سوال ان سے کرے کہ کیا ۱۲۵ کروڑ روپے کا لٹیرا للت مودیاس سلوک کا اہل تھا کہ اس کیلئے وزیر خارجہ اور وزیراعلیٰ نے ایسی زحمت گوارہ کرتے کہ جیسے کسی شریف ترین انسان کیلئے بھی نہیں کی جاتی۔ حکومت ہند نے جس کے خلاف نیلے کارنر والا نوٹس جاری کروا رکھاہےتاکہ وہ برطانیہ سے فرار نہ ہوسکے۔اس کو ساری دنیا میں گھومنے پھرنے کی اجازت مرحمت فرمانے کیلئے جس طرح تمام اصول و ضوابط کو بالائے طاق رکھا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مودی جی نے اپنی سرکار کی سالگرہ مناتے ہوئے چھتیس گڑھ کے لوگوں سے پوچھا تھا کیا پچھلے ایک سال میں آپ لوگوں نے کوئی گھوٹالہ سنا ؟ اب وہ بیچارے ادیباسی کیا جانیں کہ شہروں میں رہنے والے یہ شیطان سیاستدان کیا کیا گل کھلاتے ہیں اس لئے ہونقوں کی مانند ان کا منہ دیکھتے رہے لیکن اپنا یہی راگ انہوں نے متھرا کے قریب نانگلہ گاوں میں بھی دوہرایا۔ وہ بولے ایک زمانے میں ہندوستان کی حکومت ریموٹ کنٹرول سے چلتی تھی ۔ مودی جی کا اشارہ سونیا گاندھی کی جانب تھا لیکن اب تو خود ان کی پارٹی کے سب سے معمر رہنما لال کرشن اڈوانی ارشاد فرماتے ہیں کہ ملک اب بھی ایمرجنسی کے خطرے سے دوچار ہے۔ ویسے اڈوانی جی تو الیکشن کے پہلے ہی سے مودی جی پر پوری پارٹی کو یرغمال بنا لینے کا الزام لگا رہے ہیں۔ مودی جی نے متھرا میں کہا یو پی اے کے زمانے میں آئے دن ایک نیا گھپلا سامنے آتا تھا لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہر روز ایک سے زیادہ گھوٹالے منظر عام پر آتے ہیں ۔

مودی جی نے رابرٹ وادرہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ایک زمانہ تھا جب بدعنوانی میں بیٹوں اور دامادوں کا نام آیا کرتا تھا لیکن پردھان سنتری، پردھان سیوک اور سرکاری خزانے کے امانتدار محافظ کی حیثیت سے میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ اگر ایسا ہے تو جب سشما کی بیٹی بانسری سوراج عدالتِ

عالیہ میں للت مودی کی پیروی کرنے کیلئے کیوں جاتی ہے؟اور ستم ظریفی یہ ہے کہ عدالت کا فیصلہ بھی ایک رشوت خور گھپلے باز کے حق میں ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ حکومت کی جانب سے خاطر خواہ مخالفت نہیں ہوتی۔ اور تو اور سشما کے شوہر نامدار برسوں تک اس بدعنوان مودی کے قانونی صلاح کار بنے رہتے ہیں اور اس کے خرچ پر پانچ ستارہ ہوٹلوں میں عیش کرتے پھرتے ہیں۔ سشما کی انسانی ہمدردی للت مودی جیسے مجرم پیشہ شخص کے حق میں ہی زور مارتی ہے دیگر مجبور لوگوں کا دکھ درد وہ محسوس نہیں کرتیں۔ یہاں تو نہ صرف بیٹا اور داماد بلکہ پورا خاندان ایک بدعنوان کا ہمنوا بنا ہوا ہے۔ اس کے باوجود پوری بی جے پی بشمول وزیراعظم اس کی محافظ بنی ہوئی ہے۔

یہ انسانی ہمدردی کا قصہ بھی نہایت دلچسپ ہے کہ سنتے ہیں للت مودی کو اپنی بیمار اہلیہ کے آپریشن کے کاغذات پر دستخط کرنے کیلئے پرتگال جانا تھا۔ اول تو طبّی سہولیات پرتگال کی بہ نسبت برطانیہ میں بہتر ہیں اس لئے للت مودی کا بغرضِ علاج پرتگال جانا اپنے آپ میں ایک معمہ ہے دوسرے یہ انکشاف کہ وہاں سرے سے آپریشن ہوا ہی نہیں سارے معاملے کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ اجازت نامہ علاج کے خاطر تھا تو اسے ایک آدھ مہینے کیلئے کسی مقام خاص تک محدود ہونا چاہئے تھا یہ کیا کہ دوسال کیلئے ساری دنیا کی سیر سیاحت کا پروانہ عطا کردیا جائے۔ للت مودی پرتگال کے جس ہسپتال میں اپنی

اہلیہ کا علاج کرانے کیلئے گیا تھا وہاں جراحت تو نہیں ہوئی ہاں راجستھان کی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ ضرور ہوگیا جس کی بدولت جئے پور میں اس کا تحقیقاتی و معالجاتی مرکز قائم ہوگیا۔ اب کون جانے کہ وہ پرتگال اپنی اہلیہ کا اعلاج کرانے کیلئے گئے تھے یا وجئے راجے سندھیا کا احسان اتارنے کی خاطر کہ جنھوں نے اس شرط پر ان کے حلف نامہ پر دستخط کئے تھے کہ حکومتِ ہند کو اس کا پتہ نہیں لگنا چاہیے۔

وجئے راجے سندھیا کا فرزندِ ارجمند رکن پارلیمان دشینت سنگھ کے للت مودی کے ساتھ معاملات کی نوعیت بھی کم خطرناک نہیں ہے۔ دشینت سنگھ نے ۲۰۰۵ میں نیانت ہوٹلس نامی کمپنی قائم کی ۔ اس کے اندر للت مودی کی آنند ہوٹلس نے ۱۲ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی ۔ اس سرمایہ کاری سے متعلق وزیر خزانہ اور سپریم کورٹ کے مشہور وکیل ارون جیٹلی کا کہنا ہے کہ یہ ایک کاروباری معاملہ ہے تو ذرا اس کی تفصیلات بھی دیکھ لی جائے۔ دشینت کی غیر معروف کمپنی کے دس روپے کے حصص شئیر) جنھیں کوئی پوچھ کر نہیں دیتا تھا للت مودی جیسے عیار انسان نے ۹۶ ہزار روپے) کی شرح پر خرید لیے۔ کیا کوئی دیوانہ بھی ایسی حرکت کر سکتا ہے؟ للت نے دشینت کو ۸۰ کروڑ روپے قرض دیئے لیکن دشینت نے انکم ٹیکس کا ریٹرن فائل کرنے کی زحمت ۳ نہیں کی۔ اس لئے کہ اسے پتہ تھا اپنی ماں کے وزیر اعلیٰ ہوتے کوئی مائی کا لال انکم ٹیکس آفیسر اسکی جانب نظر اٹھا

کر نہیں دیکھ سکتا۔ دشینت سنگھ نے انتخاب لڑنے کی خاطر جو حلف نامہ داخل کیا اس میں بھی کمپنی اور قرض کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ تو وہ لین دین ہے جو کھلے عام ہوا ہے اس کے علاوہ جو کالا دھن آیا گیا ہوگا اس کی بابت اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

وجئے راجے سندھیا کے للت مودی سے قدیم گھریلو تعلقات ہیں اور ان کے خلاف اتنے سارے شواہد آگئے ہیں کہ اب ان کا استعفیٰ لینے کے بجائے انہیں نکال باہر کیا جانا چاہئے لیکن ایسی جرأت کم از کم مودی جی کے بس میں نہیں۔ نریندر مودی نے گجرات کی ۱۸۲ میں سے ۱۲۱ نشستوں پر کامیابی درج کروائی تھی اس کے باوجود وہ پارٹی کے صدر نتن گڈکری کو بلیک میل کیا کرتے تھے۔ سندھیا نے ۲۰۰ میں سے ۱۶۰ نشستوں پر کامیابی حاصل کی ہےاورایوانِ پارلیمان کی ساری ۲۵ نشستیں جیت لی ہیں۔ یہ ارکان اسمبلی اور پارلیمان مودی سے زیادہ سندھیا کے وفادار ہیں اور سندھیا کو ہٹائے جانے پر وہ بغاوت کر سکتے ہیں۔ بغاوت کی صورت میں بی جے پی کے پاس ۱۱۵ارکان اسمبلی بھی نہیں بچیں گے اور کم از کم ۲۰ ارکان پارلیمان کم ہو جائیں گے۔ راجستھان میں سندھیا کا اقتدار مودیپر منحصر نہیں ہے بلکہ مرکز میں مودی سندھیا کے محتاج ہیں۔

بدعنوانی کی بابت راجستھان سے برا حال مدھیہ پردیش کا ہے جہاں ویاپم گھوٹالہ کو دبانے کیلئے قتل وغارتگری کا بازار گرم ہے۔ یہ بدعنوانی ۲۰۰۰ کروڑ

کے لگ بھگ ہے اس لئے کہ اس میں ایک لاکھ ۴۰ ہزار لوگوں کی غیر قانونی بھرتی اور ہزاروں طلباء کا داخلہ ہوا ہے۔ اس گھوٹالے کی تفتیش کرنے والی ایس آئی ٹی نے اب تک ۱۸۰۰ لوگوں کو گرفتار کیا ہے اور مزید ۸۰۰ لوگ مطلوب ہیں۔ ایس آئی ٹی کے سربراہ کے مطابق اس سے متعلق ۴۰ لوگ ہلاک کئے جا چکے ہیں جس میں مزید ۲ کا اضافہ ہو چکا ہے۔ عدالت میں ایس آئی ٹی ۲۳ لوگوں کے غیر فطری موت کو تسلیم کیا ہے حالیہ ۲افراد کے اضافہ کے بعد یہ تعداد ۲۵ ہو چکی ہے۔ مہلوکین یا تو پولس کی حراست میں جاں بحق ہوئے یا ضمانت پر تھے اس کے باوجود ایس آئی ٹی نے ہنوز ان کی موت کی تفتیش شروع نہیں کی ہے۔ ویسے مدھیہ پردیش کے وزیر داخلہ بابولال گور کے مطابق یہ ساری اموات فطری ہیں۔ ایس آئی ٹی گور کے تحت کام کرتی ہے ایسے میں اس سے انصاف کی توقع رکھنا خام خیالی ہے لیکن عوام نہ چوہان کے ماتحت ہیں اور نہ مودی کے اس لئے جب وہ سزا دینے پر آئیں گے تو یہ سارے بے دست و پا ہو جائیں گے ۔ سابق ایڈوکیٹ جنرل وویک ٹنکھا کے مطابق اب تک ویاپم کے متعلق صرف ۲۰ فیصد معلومات باہر آئی ہیں جبکہ فورینسک ماہر پرشانت پانڈے کے کہنا ہے کہ اب تک صرف پانچ فیصد بے ضابطگی منظر عام پر آئی ہے۔

مدھیہ پردیش میں تو خیر بی جے پی عرصۂ دراز سے حکومت کر رہی ہے لیکن مہاراشٹر میں تو چند ماہ کے اندر اس کے پانچ وزراء پر سنگین قسم کے الزامات

لگ گئے ہیں جن میں سب سے مشہور پنکجا منڈے پر بغیر ٹینڈر کے ۲۰۶ کروڑ کا ٹھیکہ دینے کا الزام ہے۔ اس کے علاوہ ہریانہ کے وزیراعلیٰ کھٹر پر پنشن گھوٹالے میں ۸۰ کروڑ کے غبن کا الزام ہے۔ گجرات کی وزیراعلیٰ آنندی بین پر میٹرو ریل میں ۱۰۰ کروڑ اور چھتیس گڑھ کے رمن سنگھ پر چاول گھوٹالے میں ۱۵۰ کروڑ کھا جانے کا الزام ہے۔ کرناٹک میں بی جے پی نائب صدر یدورپا کے خلاف کئی ایف آئی آر درج کی جاچکی ہیں اور ممکن ہے انہیں جلد ہی پھر سے گرفتار کرلیا جائے۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر حزب اختلاف تو کجا پارٹی کے اندر مودی کے مخالفین نے محاذ کھول دیا ہے۔ گووندآچاریہ نے اخلاقی بنیادوں پر سشما اور سندھیا کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا اوراڈوانی جی نے اپنی مثال دے کر کہا کہ جب حوالہ ڈائری میں ان کا نام آیا تھا تو انہوں نے خود آگے بڑھ کر استعفیٰ پیش کردیا تھا۔ یہ اڈوانی جی کی سب سے بڑی حامی سشما سواراج کو سیاسی مستقبل پر خطرے کی گھنٹی ہے۔

مودی جی کا اعلان کہ بدعنوان لوگوں کے برے دن آگئے ہیں اب ان کے گلے کا ہڈی بن گیا ہے۔ للت مودی جس کے ساتھ کانگریس نے سختی کرتے ہوئے اس کے اسلحہ بردار محافظین کو ہٹا لیا تھا اور برطانیہ سے واپس لانے کی کوشش کی تھی۔۔ برطانوی حکومت اس کیلئے تیار بھی ہو گئی تھی مگر اس نے راکیش ماریہ کے ذریعہ اپنے خلاف داؤد ابراہیم کے خطرے کی تصدیق کروائی اور عدالت کا فیصلہ

اس کے حق میں ہوگیا۔ اس طرح وہ برطانیہ میں محصور ہو کر رہ گیا لیکن بی جے پی کے اقتدار میں آتے ہی اس کے اچھے دن آگئے۔ کانگریس نے تو خیر اپنے چند وزراء کا استعفیٰ بھی لے لیا تھا لیکن راج ناتھ فرماتے ہیں کہ یہ این ڈی اے ہے اس میں استعفیٰ نہیں لیا جاتا گویا بدعنوان لوگوں کو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس طرح گویا ایک سال کے اندر یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ بدعنوانی کو جڑ سے اکھاڑنے والے خود اس میں بری طرح ملوث ہو چکے ہیں اس لئے کہ لادینی جمہوریت کا بنیادی اصول ہی ہے ’’کھاؤ اور کھانے دو‘‘۔ بی جے پی جب تک اقتدار میں ہے اسے جی بھر کے سرکاری خزانے کو لوٹنے کی آزادی ہے لیکن کل جب اس کا اقتدار ختم ہو جائیگا تو یہی آزادی کانگریس کو مل جائیگی اور وہ بھی بڑھ چڑھ کر گھپلے کرے گی اور لادین جمہوریت پروان چڑھتی رہے گی۔

دل میں کھوٹ، زباں پر جھوٹ

۱۳ ستمبر ۲۰۱۳ء کے دن گوا کے اندر بی جے پی نے وزارتِ عظمیٰ کیلئے نریندر مودی کو اپنا امیدوار بنایا اور ۱۵ ستمبر کو انہوں نے ہریانہ کے ریواڑی میں سابق فوجیوں سے اپنا پہلا خطاب کیا۔ اس تقریر میں مودی جی کہا تھا'' اس سے بری بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے جن فوجیوں نے مادرِ وطن کی خاطر میدانِ جنگ میں اپنے ہاتھ، پیر یا آنکھیں قربان کی ہیں۔ انہیں ہسپتالوں اور ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگنا پڑے میں اس سے بدترین کسی چیز کا تصور نہیں کرسکتا۔ ہمارے سابق فوجیوں کو عزت و وقار سے جینے اور ان کے جائز مطالبات کو پورا کرنے میں کون رُکاوٹ بن رہا ہے؟ ہم ایک عہدہ اور ایک پنشن کے بارے میں کئی سالوں سے سنتے آرہے ہیں۔ کیا مسئلہ ہے؟ آج میں فوج اور سابق فوجیوں کی جانب سے عوامی طور پر حکومت سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ ایک عہدہ ایک پنشن اسکیم پر قرطاس ابیض شائع کیا جائے''۔ مودی جی کی تقریر کا یہ اقتباس آج بھی ان کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔

اس اعلان کو سننے کے بعد ریواڑی میں موجود سابق فوجی کس قدر پر امید ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ مودی جی نے یہ بھی کہا تھا کہ

دوستو(ں) مجھے یقین ہے کہ اگر ۲۰۰۴ء میں واجپائی جی حکومت سازی میں کامیاب ہوجاتے توآج تک یہ مسئلہ نہیں الجھا رہتا۔ لوگ سر جوڑ کر بیٹھتے اور اٹل جی اس مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالتے اور سبکدوش فوجیوں کو عزت و وقار کی زندگی سے نواز دیتے۔ اس تقریر کے بعد کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ اٹل جی ۴ سالوں تک برسرِ اقتدار تھے۔ اس دوران ان کی دیش بھکتی کہاں سوئی رہی؟ انہوں نے اس عرصے میں یہ مسئلہ حل کیوں نہیں کیا؟ خیر ۲۰۰۴ء میں جو ہوا سو ہوا لیکن ۲۰۱۴ء میں تو خود مودی جی کی سرکار بن گئی اس کے بعد کیا ہوا؟ اب ان سابق فوجیوں کے عزت و وقار کی زندگی میں روڑا کو نبنا ہوا ہے؟

مودی جی اپنے دیگر وعدوں کی طرح اس عہد کو بھی بھول گئے۔ جب سبکدوش فوجیوں کے مطالبات سے کمبھکرنی نیند سونے والی سرکار کے کانوں پر جوں نہیں رینگی تو مجبوراً انہیں عدالتِ عالیہ کا رخ کرنا پڑا۔ سپریم کورٹ نے ۱۷ فروری ۲۰۱۵ء کو یاددہانی کرائی اور مرکزی حکومت کو اپنا ۶ سال پرانا فیصلہ نافذ کرنے کا حکم دیا۔ اسی کے ساتھ خبردار کیا کہ اگر ۳ ماہ کے اندر یہ نفاذ نہیں ہوا تو وہ توہینِ عدالت کے مترادف ہوگا۔ عدالت کی اس پھٹکار کا بھی حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا تو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار مجبور ہو کر سبکدوش فوجیوں کو دہلی میں دھرنا اور احتجاج کرنا پڑا۔ کیا اس سے بدترین کسی چیز کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ سابق فوجی ۳ ہفتوں سے احتجاج کر رہے ہیں اور حکومت کو یوگا

کا تماشہ کر رہی ہے۔ وزیر خارجہ سشما کے دل میں للت مودی کیلئے ہمدردی کے جذبات تو امڈتے ہیں لیکن وزیراعظم کا دل اپنے سابق فوجیوں کیلئے نہیں دھڑکتا۔ منوہر پریکر دنیا کے واحد وزیر دفاع ہیں جو اپنے فوج کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں '' چونکہ گزشتہ ۴۰ تا ۵۰ سالوں میں کوئی جنگ نہیں ہوئی اس لئے فوج کا احترام کم ہوا ہے''۔ اسے کہتے ہیں ناگپوریکمل چھاپ زعفرانی دیش بھکتی۔

جنتر منتر پر اور ملک کے کئی شہروں میں ۳ ہفتوں تک احتجاج کرنے کے بعد اب سابق فوجیوں کے متحدہ محاذ نے طے کیا ہے کہ وہ ارکان پارلیمان کے گھروں کے سامنے احتجاج کریں گے۔ اس کے علاوہ جن ریاستوں میں انتخابات ہونے والے مثلاً بہار وہاں جاکر عوام کو مودی سرکار کے خلاف ووٹ دینے کی تلقین کی جائیگی۔ اگر یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا تو بالآخر جنگ میں بیوہ ہونے والی خواتین اپنے خون سے صدر مملکت کو خط لکھیں گی اور اسے اپنی چوڑیوں کے ساتھ روانہ کریں گی۔ اس احتجاج کی خبر ذرائع ابلاغ عوام کو نہیں دیتا اس لئے اس کا اصول ' گاجر اور لگام ' ہے۔ اگر فوجیوں کی انجمن کو کیجریوال کی طرح بین الاقوامی تنظیموں سے چندہ ملتا اور وہ اسے ذرائع ابلاغ کو بانٹتے تو یقیناً اس مظاہرے کی خبریں نشر ہوتیں۔ یہ تو رہی گاجر والی بات لیکن یہاں تو حکومت نے بھی لگام کھینچ رکھی ہے کہ ہمارے خلاف احتجاج کو نشر کرکے ہمیں بدنام

کرنے کی جرأت نہ کی جائے۔ ایسے میں کون احمق ایسا ہوگا جو ان سبکدوش فوجیوں کی ہمدردی میں حکومت کو ناراض کرکے اپنے پیٹ پر لات مارے۔

سابق فوجیوں کی یہ دکھ بھری کہانی بہت پرانی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی لڑائی میں فوج نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی اس کا تحفہ یہ دیا گیا کہ ۱۹۷۳ء کے اندر تیسرے پے (تنخواہ کے) کمیشن نے فوجیوں کی پنشن کو ۷۰ فیصد سے گھٹا کر ۵۰ فیصد کردیا گیا اس کے (برعکس دیگر سرکاری ملازمین کی پنشن کو ۳۰ فیصد سے بڑھا کر ۵۰ فیصد کردیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں کے پی سنگھ دیو کی قیادت والی پارلیمانی کمیٹی نے سب سے پہلے 'ایک عہدہ ایک پنشن' کی اصطلاح کا استعمال کیا لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اس لئے اسے سبکدوش فوجیوں کیلئے خیرات سمجھنا درست نہیں ہے۔ یہ دراصل فوج کے ساتھ بد عہدی کا طویل سلسلہ ہے جو ۴۰ سالوں پر محیط ہے۔ اس مسئلہ کی جانب توجہ مبذول کروانے کیلئے ماضی میں سبکدوش فوجیوں نے کئی بار نہایت نظم و ضبط کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی بلکہ اپنے تمغہ تک لوٹائے لیکن اس کے باوجود انہیں فوجی سربراہ سے ملاقات تک کا موقع نہیں دیا گیا۔

فوج کے اپنے مسائل ہیں جن کا موازنہ دیگر ملازمتوں سے نہیں کیا جاسکتا۔ فوج میں ترقی تیزی کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ یہاں لوگ ۳۵ سال کے آس پاس سبکدوش

ہو جاتے ہیں جبکہ ان کے سامنے زندگی کا طویل سفر تو ہوتا ہے لیکن کوئی خاص بچت نہیں ہوتی۔ جو پہلے کسی عہدے پر سبکدوش ہوتے ہیں انہیں اپنی تنخواہ کے لحاظ سے پنشن ملتی ہے اور جو بعد میں وہی مدت گذار کر اسی عہدے پر سبکدوش ہوتے ہیں انہیں اپنی آخری تنخواہ کے حساب سے پنشن ملتی ہے لیکن نئی اور پرانی پنشن میں خاصہ فرق واقع ہوچکا ہوتا ہے۔ سبکدوش ہونے والے نئے اور پرانے حضرات ایک ہی سماج میں گذر بسر کرتے ہیں جہاں ان کے مسائل بھی یکساں ہوتے ہیں اور مہنگائی کی مار بھی برابر پڑتی ہے اور اس کا براہِ راست اثر ان کے معیار حیات پر پڑتا ہے۔

سبکدوشفوجیوں کامطالبہنہایتسہلہے کہکسیایکعہدےپریکساںمدتخدمتانجامدینے والے کوایکے ریٹائرمنٹکیتاریخسے قطعنظریکساں پنشنملنیچاہیے۔یہ آسان سی بات ہر کسی کی سمجھ میں آسکتی ہے لیکن وزیراعظم اس کو سمجھنا نہیں چاہتے اس لئے انہوں نے ''من کی بات''میں کہا کہ یہ نہایت پیچیدہ معاملہ ہے اس لئے کہ اس کئی تعریفیں ہیں۔ مسئلہ پیچیدگی کا نہیں نیت کا ہے۔ سابق وزیر دفاع کے زیر نگرانی فروری ۲۰۱۴ء میں پارلیمانی کمیٹی ایک تعریف پر اتفاق رائے کرچکی ہے جسے فوجی تسلیم کرتے ہیں۔اب مودی جی کو نئی تعریف وضع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ انہیں تو بس اسے نافذ کرنا ہے لیکن جب من میں کھوٹ ہو تو بھلا زبان پر سچ کیسے آسکتا ہے؟

اس معاملے کڑوا سچ یہ ہے کہ فوجی جرنیلوں کے ساتھ مل کر وزارت دفاع نے جو

تجویز مرتب کی تھی اسے وزارتِ خزانہ نے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ وہ اس کام کیلئے سالانہ ۸۴۰۰ کروڑ کا انتظام نہیں کرسکتی۔ انتخاب سے قبل جب راہل گاندھی نے اس معاملے کو حل کرنے کیلئے پہل کی تھی تو اس کیلئے بجٹ میں ۵۰۰ کروڑ رکھے گئے۔ اس کے بعد وزیر خزانہ ارون جیٹلی نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر اس رقم کو دوگنا یعنی ۱۰۰۰ کروڑ کردیا لیکن یہ رقم بھی ناکافی ہے۔ بظاہر یہ بہت بڑی رقم لگتی ہے لیکن اس سال کے بجٹ میں سرکاری ملازمین کی پنشن کیلئے جو ۸۸۵۲۱ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں اس کے مقابلے ۱۰ فیصد سے بھی کم ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی حکومت کے خزانے میں تنگی ہے؟ اگر ایسا ہے تو یوگی اویدیہ ناتھ کی سربراہی میں قائم کردہ پارلیمانی کمیٹی نے سابق ارکان پارلیمان کے پنشن میں ۷۵ فیصد کے اضافہ کا مطالبہ کیوں کیا؟ اس فضول خرچی کیلئے روپیہ کہاں سے آئیگا؟ سابق ارکان پارلیمان کے علاوہ حالیہ ارکان کی تنخواہوں میں ۱۰۰ فیصد اضافے کی تجویز بھی ہے۔ کیا یہ شرمناک صورتحال نہیں ہے کہ عام آدمی تو تمام تر محنت و مشقت کے باوجود ۱۰ فیصد تنخواہ کی بڑھوتری سے بھی محروم رہ جاتا ہے جبکہ ان کے نمائندے ۱۰۰ فیصد اضافہ چاہتے ہیں۔ فی الحال ارکان پارلیمان کو بغیر کسی محنت کے ۵۰ ہزار روپے ماہانہ ملتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ارکان خود کو حاصل طبّی سہولیات سے

نہ صرف اپنے بچوں بلکہ پوتوں اور نواسیوں تکلو مستفید کروانا چاہتے ہیں۔
یہ عوامی نمائندے سرکاری خرچ پر پارلیمان کے اجلاس میں حاضری دینے کیلئے دہلیتشریف لاتے ہیں۔ کرایہ کے علاوہ راستے میں جیب خرچ کیلئے انہیں سیکنڈ اے سی کے کرایہ جتنا بھتہ ملتا ہے جسے وہ بڑھا کر فرسٹ اے سی کے برابر کروانا چاہتے ہیں۔ سوچنے والی بات یہ ہے اگر ایک رکن پارلیمان ناگپور سے دہلی کا سفر کرے تو کیا وہ ۱۸ گھنٹے میں روپیوں کا کھانا کھائے گا۔ یہ رقم تو پیچھے سیکنڈ کلاس میں لگی بوگی کے سارے ۳۰۰۰ مسافروں کا پیٹ بھرنے کیلئے کافی ہے لیکن جب ساری رقم عوام کے نمائندے کھاجائیں تو بیچاری جنتا فاقہ کشی کا شکار نہ ہو تو اور کیا ہو؟ حد تو یہ ہے ان ارکان پارلیمان (مثلاً ہیما مالنی) کی تیز رفتار گاڑی اگر کسی عام آدمی کی گاڑی سے ٹکرا جائے تو مظلوم کی دم توڑتی بچی کو رکن پارلیمان کے ساتھ لے جا کر اس کا خاطر خواہ علاج تک نہیں کیا جاتا۔
دہلی آنے کے بعد ارکانِ پارلیمان محل نما سرکاری مکان یا فائیو اسٹار ہوٹل میں عیش کرتے ہیں۔ ایوان کی کینٹین میں سستا کھانا کھا کر شور ہنگامہ کرتے ہیں۔ لیکن اس احسانِ عظیم کے عوض انہیں الگ سے ۲۰۰۰ روپیہ یومیہ مل جاتے ہیں۔ یوگی جی اس میں بھی خاطر خواہ اضافہ کے طلبگار ہیں۔ کمیٹی کے مطابق

مہمانوں کو چائے پلانے پر روزآنہ ۱۰۰۰ روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ ویسے سیاسی رہنماوں کو عوام کی مفت چائے پیتے تو ہر کسی نے دیکھا ہوگا لیکن کیا کسی نے سیاستداں کو اپنی جیب عوام کو چائے پلاتے دیکھا ہے؟ ممکن ہے جو رشوت دینے والے سرمایہ دار ان سے ملنے آتے ہوں ان کی اس طرح خاطر مدارات کی جاتی ہو؟ لیکن اگر رشوت کی رقم سے چند روپئے گاہک کی خدمت میں صرف بھی ہو جائیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کی اپنی جیب سے خرچ کرنے کی عادت ہی چھوٹ گئی ہے وہ صرف اور صرف سرکاری خزانے پر جینا اور مرنا جانتے ہیں۔

ارکان پارلیمان کو اپنے مستقبل کا کس قدر خیال ہے اس کا اندازہ اس سرکاری فیصلے سے کیا جاسکتا ہے جس میں حکومت نے ان اربابِ اقتدار کی خاطر ۱۰۰ نئے عالیشان مکان تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مکان ۲۰۱۹؁ کے انتخابات سے قبل تیار ہو جائیں گے۔ گزشتہ انتخاب کے بعد جن ارکان پارلیمان کو ہوٹلوں میں ٹھہرانا پڑا تھا اس پر حکومت نے ۳۵ کروڑ روپئے خرچ کئے۔ ارکان پارلیمان کیلئے گنگا کے ساتھ ساتھ جمنا، سرسوتی، برہمپترا اور کاویری وغیرہ کے نام پر رہائش گاہیں تو تعمیر ہو رہی ہیں لیکن حکومت کے ذریعہ گنگا کی صفائی کیلئے جو ۲۰ ہزار کروڑ ۲۰۱۵؁ اور ۲۰۱۶؁ کے بجٹ میں رکھے گئے ہیں اس پر پہلے تین ماہ میں ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ دراصل گنگا کا پانی عوام پیتے ہیں

اس لئے اس پر سرکار کی مختص شدہ رقم بھی خرچ نہیں ہوتی ارکان پارلیمان تو ”منرل واٹر“ پیتے ہیں سرکاری خزانہ اس پر پانی کی طرح پیسہ بہاتا ہے۔

سنا ہے وزیر اعظم نریندر مودی امریکی صدر براک اوبامہ کے اچھے دوست ہیں۔ اس لئے انہیں چاہئے کہ کم از کم اپنے دوست اوبامہ کی اس ہدایت پر عملدرآمد کریں جس میں انہوں سابق فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”جب آپ لوگ وردی اتار دیں گے (یعنی سبکدوش ہو جائیں) تب بھی ہم آپ کی اسی طرح خدمت کریں گے جس طرح آپ نے ہماری (قوم) کی خدمت کی ہے۔ اس لئے کہ جو قوم کیلئے لڑتا ہے اسے ملازمت کیلئے، اپنے سر پر چھت کیلئے یا گھر آنے پر درکار دیگر سہولیات کیلئے لڑنے کی نوبت نہیں آنی چاہیے“۔ اگر اوبامہ کی اس نصیحت پر توجہ نہ دی گئی تو خدانخواستہ ہمارے یہاں بھی امریکہ کی ۱۹۳۰ء والی صورتحال رونما ہو جائے گی جب کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سبکدوش فوجیوں نے اپنے بقایا جات کے حصول کی خاطر ایوان صدر کا محاصرہ کر لیا تھا اور صدر نے ان پر گولی چلانے کا حکم دے دیا تھا۔ یہ کسی بھی امریکی صدر کا بدترین فیصلہ شمار کیا جاتا ہے۔

مودی جیکے اس رویئے میں عام لوگوں کیلئے یہ پیغام ہے کہ وہ حقیقت پسند بنیں

اور اپنی توقعات درست کرلیں۔ جو شخص سابق فوجیوں سے کئے گئے اپنے اولین وعدے سے مکر سکتا ہے وہ بھلا دیگر وعدوں کا پاس و لحاظ کیونکر کر سکتا ہے۔ ویسے مودی جی کو یاد رکھنا چاہئے کہ اپنے ریواڑی میں کئے گئے عہد سے پھر کر وہ ۲۵ لاکھ سابق فوجیوں اور تین لاکھ بیواؤں کے جذبات سے کھلواڑ کر رہے ہیں اور عدالت عالیہ کی توہین بھی ان سے سرزد ہو رہی ہے۔ ہندوستانی فوج 'نام، نمک اور نشان' کیلئے جیتی اور مرتی ہے لیکن افسوس کہ اسے اپنے جائز حقوق کے حصول کی خاطر نام و نمود کے بھوکے نمک حرام سیاستدانوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جو قوم اپنے فوجیوں کے ساتھ یہ ناروا سلوک کرتی ہے کال چکر انہیں بے نام و نشان کر دیتا ہے۔

اچھے دنوں کی سلور جوبلی

بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر امیت شاہ صاحب لائق صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے سیاستداں ہونے کے باوجود ایک حقیقت پسندانہ اعتراف کرلیا۔ امیت شاہ کا یہ کہنا کہ ’’اچھے دن ۵ سال میں نہیں بلکہ ۲۵ سال بعد آئیں گے‘‘ کمال فصاحت و بلاغت کا حامل ہے۔ اس پر جس زاویے سے نگاہ ڈالو ایک نیا معنیٰ و مفہوم نکل آتا ہے۔ سب سے پہلے یہ سوال کہ آخر امیت شاہ کو یہ جملہ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ چونکہ امیت شاہ پارٹی کے صدر نشین اور وزیر اعظم کے دستِ راست ہیں اس لئے جماعت اور حکومت کے مسائل سے پوری طرح واقف ہیں۔ فی الحال اس حکومت کا سب سے بڑا مسئلہ اس سے وابستہ عوام کی بیجا توقعات ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ توقعات خود بی جے پی کی ایک کامیاب انتخابی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ اگر اس طرح کے بلند بانگ دعوے نہ کئے جاتے اور ملک کے بھولے بھالے رائے دہندگان اس کے جھانسے میں نہ آتے تو بی جے پی کیلئے واضح اکثریت تو درکنار سب سے بڑی پارٹی بھی بن کر ابھرنا مشکل ہوجاتا۔ خیر جس طرح شادی سے قبل ہر جائی عاشق آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے اور تاج محل بنوانے کے وعدے کرتا ہے یہی کچھ بی جے پی نے کیا لیکن پھر شادی کے بعد میاں بیوی دونوں کو دال آٹے کا بھاو معلوم ہوجاتا ہے۔ اب وہی سب عوام اور بی جے پی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ سارے سہانے سپنے

ایک ایک کرکے بکھرنے لگے ہیں۔

امیت شاہ کو اندازہ ہے توقعات کے اس غبارے میں مزید ہوا بھرنے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی ہوا کو بتدریج نکال کر اس کا دباو کم کیا جائے ورنہ انتظار کے بوجھ سے یہ از خود پھٹ جائیگا۔ ان کا حالیہ بیان اس غبارے کو ایک بڑے دھماکے کے ساتھ اچانک پھٹ پڑنے سے بچانے کی حکمت عملی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ ایسی کوشش انہوں نے دہلی انتخاب سے قبل بھی کی تھی اور کالے دھن کو واپس لانے کے بارے میں کھلے عام اعتراف کرلیا تھا کہ وہ محض ایک سیاسی جملہ (بمعنی ڈھکوسلہ) تھا۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ کالا دھن آسانی سے واپس نہیں آسکتا اور اسے عوام کے کھاتوں میں منتقل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ باتیں تو انتخابی مہم کے دوران عوام کو رجھانے کیلئے کی جاتی ہیں۔ امیت شاہ کی یہ کوشش بار آور ہوئی خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے دہلی کے رائے دہندگان کی نیند ٹوٹی اور انہوں نے عام آدمی پارٹی کو ایسی غیر معمولی کامیابی سے نوازہ جس کا تصور خود کیجریوال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ جس طرح بی جے پی کی حالیہ حکومت کے قیام میں کانگریسی بدعنوانیوں کا حصہ ہے اسی طرح عآپ کی کامیابی میں امیت شاہ کے اس بیان نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

دہلی کے بعد بی جے پی کی دوسری اگنی پریکشا بہار میں ہونے والی ہے۔ اس سے قبل امیت شاہ نے ایک اور دھماکہ کردیا اور اچھے دنوں کی آمد کو ۲۵ سالوں کیلئے موقوف فرمادیا۔اس کا خاطر خواہ فائدہ اگر لالو اور نتیش کمار نے اٹھالیا تو یقیناً بہار میں بھی بی جے پی کی وہی حالت ہو سکتی ہے جو دہلی میں ہوئی ہے لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ امیت شاہ صاحب بہار کیلئے بھی کرن بیدی کی مانند کسی انوکھے امیدوار میدان میں اتاریں۔ بہار کے سابق وزیراعلیٰ جتن مانجھی اب بھی پرامید ہیں کہ انہیں بی جے پی اپنے وزیراعلیٰ کے امیدوار کی حیثیت سے پیش کرے۔ بصورتِ دیگر وہ پپو یادو کے ساتھ مل کر لالو اور نتیش کے علاوہ پاسوان اور سشیل کے خلاف کمربستہ ہونے دھمکی بھی دے رہے ہیں۔

امیت شاہ صاحب نے حال میں بہار کے اندر پھلنے پھولنے والی ذات.برادری کی سیاست کے پیش نظر ایک اور معرکتہ الآراء بیان دے دیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ بی جے پی نے ملک کو پہلا دیگر پسماندہ ذاتوں سے تعلق رکھنے والا او بی سی وزیراعظم دیا۔ اس بیان کو پڑھنے کے بعد انتخاب سے قبل والا ایک احمقانہ بیان یاد آگیا جس میں مودی جی نے بہار کی عوام کو سکندراعظم کو روکنے کیلئے مبارکباد دی تھی۔ انہیں یقیناً اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ سکندراعظم مسلمان نہیں تھا اور نہ وہ یہ جانتے ہوں گے کہ سکندر اپنی فوج کے ساتھ بہار

تو درکنار پنجاب سے ہی واپس لوٹ گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امیت جی کو پتہ ہی نہ ہو کہ دیوے گوڑا اور چودھری چرن سنگھ بھی وزیر اعظم تھے اور ان برادی کا شمار دیگر پسماندہ ذاتوں میں ہوتا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے خیال میں ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی ہوں اور دوسرے نریندر مودی۔

ویسے مودی جی کو اپنے ساتھ 'سب سے پہلے' کا لقب لگانا بہت پسند ہے لیکن پھر بھی اگر مودی جی کی دل آزاری نہ ہوتی ہو تو کوئی بعید نہیں کہ کل کو امیت شاہ یہ انکشاف فرمادیں کہ ملک کو پہلا بہاری وزیر اعظم دینے کا شرف بی جے پی کو حاصل ہے۔ اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر وہ اٹل بہاری واجپائی کو پیش کر سکتے ہیں اور اعلان کر سکتے ہیں کہ اٹل جی کو اپنے بہاری ہونے پر بڑا ناز تھا۔ ویسے یہ ایک تحقیق کا موضوع ہو سکتا ہے اٹل بہاری واجپائی کا بہار سے کیا تعلق تھا؟ وہ نہ بہار میں پیدا ہوئے اور نہ وہاں شادی کی بلکہ ساری عمر کنوارے رہےاور ان کی سیاست بھی مدھیہ پردیش واترپردیش کے درمیان گردش کرتی رہی۔ لیکن اگر مودی خاندان کے جیالے بیک وقت اترپردیش گوجرمل مودی)، راجستھان (للت مودی)، گجرات (نریندر مودی) اور بہار) سشیل مودی) کر رہنے والے ہو سکتے ہیں تو اٹل جی کے شجرے میں بھی بہار کا نکل آنا) بعید از قیاس نہیں ہے۔

امیت شاہ کے اس بیان پر ذرائع ابلاغ میں بڑی لے دے ہوئی لوگوں نے سوال اٹھائے کہ یہ کیسے اچھے دن ہیں کہ انتخابی مہم کے دوران کئی بار اور ۱۶ مئی ۲۰۱۴ء کو کامیابی کے بعد حتمی طور پر وزیراعظم اعلان فرماتے ہیں کہ ’’اچھے دن آنے ہی والے ہیں‘‘ اس کے ایک سال بعد یکم جون ۲۰۱۵ء کو انکشاف کرتے ہیں کہ اچھے دن آچکے ہیں حالانکہ اچھے دن اعلان کے محتاج نہیں ہوتے ۔ اس کی گواہی تو عوام کو خود آگے بڑھ کر دینی چاہئے بشرطیکہ وہ حقیقت میں آچکے ہوں۔اس لئے کہ خوشحالی دراصل بتانے سمجھانے سے زیادہ محسوس کرنے کی چیز ہوتی ہے۔ اور اب ۱۴ جولائی کو امیت شاہ فرماتے ہیں کہ اچھے دنوں کے آنے میں ۲۵ سال لگیں گے تو آخر اس تضاد بیانی کی وجہ کیا ہے ؟ جو چیز ڈیڑھ ماہ قبل آچکی تھی آخر وہ ان ۴۵ دنوں میں ۲۵ سال دور کیونکر چلی گئی اور اگر فاصلہ اسی طرح بڑھتا رہا تو آئندہ ۴ سالوں میں یہ کھائی کس قدر وسیع ہوجائیگی ؟

بی جے پی والے فی الحال اس بات کی تردید میں لگے ہوئے ہیں کہ امیت شاہ نے سرے اچھے دنوں کا ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ امیت شاہ کی تقریر سنا کر سوال کرتے ہیں کہ اس میں اچھے دنوں کا ذکر کہاں ہے؟ دراصل ہوا یہ کہ امیت شاہ نے شروع ہی میں اچھے دنوں کی بات کہہ دی اب اگر آپ تقریر کا ابتدائی حصہ حذف کردیں

تو تقریر سے بھی اچھے دن اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے کہ ملک سے عنقاء ہیں۔ ویسے بی جے پی کا کیا کل کو اگر وہ دعویٰ کردے کہ وزیراعظم نے بھی اچھے دنوں کا ذکر سرے سے کیا ہی نہیں تھا یا اگر کیا بھی تھا تو اس کا مطلب لوگ سمجھ نہیں پائے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ تو اسے کون روک سکتا ہے۔ مودی جی کے اس ٹویٹر کو لاکھوں بی جے پی والوں نے طغرے بنا کر اپنے گھروں اور دفاتر میں سجایا ہوا ہے اور مخالفین نے بھی محفوظ کررکھا ہے کہ وقت ضرورت کام آئے اس لئے صاف انکار مشکل ہے مگر غلط فہمی والا متبادل قرین قیاس ہے۔

عوام کا مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی شاطر رہنما اپنی ذات سے متعلق کچھ کہتا ہے بے وقوف لوگ اس کا انطباق اپنے اوپر کرلیتے ہیں۔ انتخابی مہم کے دوران جب مودی جی یہ اعلان کرتے تھے کہ اچھے دن آنے والے ہیں تو اس میں انہوں نے یہ کب کہا تھا کہ اس سے مراد ملک کی عوام کے اچھے دن آنے والے ہیں؟ وہ تو بیچارے یہ کہنا چاہتے تھے کہ میری پارٹی نے مجھے امیدوار بنادیا ہےاب اگر آپ لوگوں نے ہماری پارٹی کو کامیاب کردیا تو میرے اچھے دن آجائیں گے۔ انتخاب میں کامیابی کے بعد بھی انہوں نے یہی کہا کہ نتائج ہمارے حق میں آچکے ہیں جلد ہی میری حلف.برداری ہوجائیگی اور میرے اچھے دن آجائیں گے۔ ایک سال بعد انہوں نے یہی بات کہی کون کہتا ہے اچھے دن نہیں آئے میرے) اچھے دن تو کب کے آچکے ہیں۔ان سارے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے)

عوام کو

چاہئے کہ وہ رہنماؤں پر بگڑنے کے بجائے اپنی سوچ اور فکر کو درست کرے۔

امیت شاہ نے جو کچھ کہا وہ بھی درست ہے۔ مودی جی ۶۵ سال کے ہونے والے ہیں سال بعد اگر حیات نے ساتھ دیا تو ان کی عمر ۹۰ سال کی ہوجائیگی اب اس عمر میں ۲۵ تو وہ وزیراعظم بننے سے رہے اس لئے کون بنے گا؟ اس سوال کے بے شمار جوابات ہو سکتے ہیں لیکن اگر کوئی شاہ صاحب کے دل سے پوچھے تو ''میں اور صرف میں'' کے علاوہ کوئی اور دھڑکن سنائی نہیں دے گی۔ اس لئے امیت جی نے بھی اپنے متعلق کہہ دیا کہ (میرے) اچھے دن اس ۵ سال کی مختصر مدت میں تو نہیں آسکتے اس کیلئے (مجھے) کم از کم ۲۵ سال انتظار کرنا پڑے گا اس وقت مودی جی، راجناتھ جی، جیٹلی جی وغیرہ وغیرہ اڈوانی جی، جوشی جی اور سنہا جی کی صف میں ہوں گے اور میرے اچھے دن آجائیں گے۔ دراصل ہمارے سیاسی رہنما اس قدر منکسر المزاج ہیں کہ وہ اپنی ذات کا ذکر کرنے سے کتراتے ہیں اور سیدھے سادے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔

شاہ جی نے ہندوستان کے دنیا بھر میں پہلے مقام پر آنے کو ۲۵ سالوں تک بی جے پی کے پنچایت سے لے کر لوک سبھا تک سارے انتخابات میں کامیابی سے مشروط کردیا ہے۔ اس کڑی شرط کو دیکھ کر تو یہی کہنا پڑے گا کہ نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔ اگر ۲۵ سال کے بعد کوئی امیت شاہ صاحب سے پوچھے گا

کہ ۲۵ سال گزر گئے ہندوستان پہلے مقام پر کیوں نہیں پہنچا تو وہ مسکرا کر جواب دیں گے اس دوران پنچایت سے لے کر لوک سبھا تک ہر انتخاب میں عوام نے بی جے پی کو کامیاب نہیں کیا۔ اس لئے اس ناکامی کی ذمہ داری رائے دہندگان پر ہے۔شاہ جی کے مذکورہ بیان کو ایک اور زاویہ سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔آپ نے اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ’’ اگر دیش کو دنیا کے سر ووچ استھان (بلندترین) مقام پر بٹھانا (فائز کرنا) ہے جو برطانوی راج سے قبل عالمی سطح پر ہندوستان کی حیثیت تھی تو پانچ سال کی سرکار کچھ نہیں کر سکتی۔‘‘

شاہ جی کے اس بیان میں یہ اعتراف پوشیدہ ہے۔برطانوی استعمار سے قبل ہندوستان دنیا بھر میں سونے کی چڑیا تھا لیکن شاید امیت جی کو نہیں معلوم کہ اس وقت ملک پر نہ تو سمراٹ اشوک کی حکومت تھی اور نہ رانا پرتاپ کا اقتدار تھا۔ انگریزوں سے قبل اس ملک پر مغلیہ سلطنت تھی۔ اسی نے ملک کے طول و عرض کو جوڑ کر ایک عظیم ہندوستان بنایا تھا جو سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ دراصل ہندوستان کے زوال کیلئے جہاں مغلیہ سلطنت کی کمزوری کا عمل دخل ہے وہیں اس کے خلاف ہونے والی بغاوتوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی حصہ ہے۔آج کے دیش بھکت جنہیں اپنا ہیرو سمجھتے ہیں ان میں سے اکثر نے اس دورِ پرفتن میں انگریزوں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کرلی تھی (اور اب بھی کر رہے ہیں) لیکن ووٹ

اور نوٹ کا بہی کھاتہ سنبھالنے والے شاہ جی کو تاریخ کا مطالعہ کرنے کی اور اس سے عبرت پکڑنے کی فرصت کہاں؟

کانگریس کو بی جے پی سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ وہ ان حکومت کی جاری کردہ سرکاری اسکیموں کو نیا جامہ پہنا کر ہتھیا لیتی ہے۔ حالانکہ یہ شکایت کی نہیں خوشی کی بات ہے کہ عوامی فلاح و بہبود کے جو کام کانگریس سرکار کر رہی تھی انہیں کسی اور نام سے سہی نئی سرکار کر تو رہی ہے۔ لیکن سیاست میں اگر مسابقت کے بجائے رقابت کا عنصر شامل ہوجائے تو یہی ہوتا ہے خیر۔ بی جے پی کا رویہ نیا نہیں ہے وہ تو اس کی ابتداء انتخاب سے پہلے ہی کر چکی ہے۔ اس نے بھی اپنی جماعت کو نظریہ اور تنظیم کے بجائے کانگریس کی مانند ایک فرد تک محدود کردیا اور ایک سپر ہائی کمانڈ تشکیل دے دیا جس میں صرف اور صرف ایک فرد کا طوطی بولتا ہے۔ ''اچھے دن'' والے نعرے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

لوک سبھا انتخاب سے قبل ۸ جنوری ۲۰۱۴ء کو پرواسی بھارتیہ دیوس کے موقع پر دیسی ہندستانیوں سے مخاطب کرتے ہوئے سابق وزیراعظم نے انگریزی میں کہا تھا'' جی ہاں فی الحال ہم برے دور سے گزر رہے ہیں لیکن جلد ہی اچھے دن آنے والے ہیں''۔ دوسرے انہیں لوگوں کے سامنے سابق وزیراعلیٰ گجرات نریندر مودی نے منموہن سنگھ کے بیان کو ہندی میں دوہرا دیا ''اچھے دن آنے والے ہیں'' جو آگے چل کر بی جے پی کی تشہیری مہم کا اہم نعرہ بن گیا۔ حکومت سازی

کے بعد بی جے پی نے اس نعرے پر منحصر جشن فتح کا ترانہ بھی بنوایا اس طرح یہ الفاظ ضرب المثل بن گئے اور اس قدر مقبول ہوئے کہ برطانوی سیاستداں جارج اسبورن جب ایک تجارتی وفد کے ساتھ ہندوستان آئے تو انھوں نے بھی اسے استعمال کیا۔ اس مسروقہ نعرے نے جہاں بی جے پی کو اقتدار میں لانے کیلئے اہم کردار ادا کیا وہیں اس کے تعلق سے توقعات میں بھی بے شمار اضافہ کردیا جن پر اب مایوسی کی اوس پڑ رہی ہے۔ اس نعرے کو لے بی جے پی کی حالت ''پکڑو تو کاٹتا ہے اور چھوڑو تو بھاگتا ہے'' کی سی ہو گئی ہے۔ یہ کاٹنے اور بھاگنے والی مخلوق دراصل وہ رائے دہندگان ہیں جن لوگوں نے اچھے دنوں کی امید میں کمل کے نشان پر مہر ثبت کردی تھی۔

نیتن یاہو: اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

اسرائیل کے وزیر اعظم بن یا من نیتن یاہو نے پہلی بار اپنے ایک بیان سے ساری دنیا کو خوش کر دیا کہ ''اگر امریکی کانگریس نے اس (ایران کے عالمی جوہری معاہدے) کی منظوری دے دی تو وہ بطور احتجاج میں خود کو ہلاک کر لوں گا''۔ماہرین نفسیات کے خیال میں ۹۰ فیصد سے زیادہ لوگ دماغ کی خرابی کے سبب خود کشی کرتے ہیں اور اس امر میں کسی کو ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ اسرائیل کے جنونی وزیر اعظم کا دماغ ناقابلِ مرمت حد تک خراب ہے۔یہی وجہ ہے کہ نیتن یاہو کے اس احمقانہ بیان پر کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ خود کشی کی جانب مائل کرنے والا سب سے اہم نفسیاتی مرض انتہائی افسردگی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے فی الحال نیتن یاہو حزن و ملال کے گہرے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے استاد ذوقؔ کا یہ شعر گنگنا رہا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

بسا اوقات یکہ و تنہا ہو جانا بھی کسی کو خود سوزی کیلئے مجبور کر سکتا ہے اور اس جوہری معاہدے کے بعد اسرائیل پہلی بار بالکل اکیلا پڑ گیا ہے۔ امریکی

استعمار بھی (جو اس کا سب سے بڑے سہارا ہوا کرتا تھا) منہ پھیر چکا ہے۔ اس طرح وہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی ہے کہ یہودی بلاواسطہ نہ صرف امریکہ بلکہ ساری دنیا پر راج کرتے ہیں ۔ نیتن یاہو امریکہ کی ایوان نمائندگان کے ڈیموکریٹ ارکان کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کر رہا ہے کہ وہ اپنے ہی جماعت کے صدر براک اوباما کے خلاف ووٹ دیں اور ری پبلکن ارکان کے ساتھ مل جائیں جبکہ براک اوبامہ نے صاف کردیا ہے کہ اگر معمولی اکثریت سے یہ تجویز مسترد بھی ہوجائے تو وہ ویٹو سے معاہدے کی توثیق کردیں گے ۔ اوبامہ کو ایسا کرنے سے روکنے کیلئے دوتہائی ارکان کی مخالفت ضروری ہے جو بظاہر ناممکن ہے۔ اس طرح یہودیوں کی بابت قرآن عظیم کی یہ پیشن گوئی پھر ایک بار سچ ثابت ہو گئی کہ :

’’یہ جہاں بھی پائے گئے، ان پر ذلت کی مار پڑی۔ کہیں اللہ یا انسانوں کی حفاظت میں انہیں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر گئے ہیں اور محتاجی اور مغلوبی ان پر مسلط کردی گئی ہے۔‘‘ (آل عمران۔۱۱۲) ۔ اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک صہیونی حکومت کے خلاف صف آراء ہیں جس کا مظاہرہ اس سال کئی مرتبہ اقوام متحدہ کے مختلف اجلاس میں ہوچکا ہے۔ فی الحال اسرائیل محض امریکہ کے بل بوتے پر قائم ہے جو ہر مرتبہ ویٹو کا استعمال کرکے اس کو بچالیتا ہے لیکن ممکن ہے اس بار پہلی مرتبہ امریکی صدر کا ویٹو اسرائیل کے خلاف استعمال ہو جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ نیتن یاہو اس جوہری

معاہدے کو صہیونی ریاست کے تحفظ کولاحق سب سے بڑا خطرہ اور تاریخی غلطی قرار دیتا ہے۔

جوہری معاہدے کے بعد یاہو کو منانے کیلئے ایک امریکی وفد نے تل ابیب کا دورہ ضرور کیا مگر وہ بھی زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے نمک چھڑک کر لوٹ آیا۔ امریکہ کے وزیر دفاع ایشٹن کارٹر نے صاف کہا کہ وہ جوہری معاہدے سے متعلق نیتن یاہو کے موقف کو تبدیل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ مبصرین کا قیاس ہے کہ امریکہ اسرائیل کو جو تین ارب ڈالر سالانہ فوجی امداد فراہم کرتا ہے جوہری معاہدے کے تناظر میں اس کے اندر معمولی اضافہ کردیا جائے گا اور ایک معمولی سی ہڈی سے اس کا بھونکنا بند ہو جائیگا۔

نتین یاہو کیلئے ایک خوشخبری یہ ہے کہ جلد ہی ہندوستان کے وزیر اعظم اسرائیل کا دورہ کرنے والے ہیں۔ اس دورے کے دوران یقیناً ہندوستان اسرائیل سے بہت سارا اسلحہ خریدے گا اوران دفاعی سودوں کی رشوت ستانی سے دونوں فریق مالا مال ہو جائیں گے۔ اس طرح ممکن ہے کچھ غم غلطہوجائے لیکن اس کے باوجود بھی اگر نتین یاہو اپنا خودکشی کا ارادہ ترک نہیں کرتا تو مودی جی کو چاہیے کہ وہ اسے ہندوستان بلا کر تاج محل دیکھنے کیلئے آگرہ روانہ کردیں جہاں اوبامہ نہیں جاسکے تھے۔ سنا ہے آگرہ میں بہت بڑا پاگل خانہ جہاں یاہو کے دماغ کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے اور اگر پھر بھی وہ درست نہ ہو توتاج محل سے بہتر

مقام خودکشی کیلئے کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ اسی ہفتے دو پریمیوں نے وہاں خودکشی کی ناکام کوشش کر چکے ہیں ویسے حکومت کی نگرانی میں اسے کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ اب اس گناہِ بے لذت میں یاہو کا ساتھ کون دے گا یہ تو نہیں پتہ لیکن جو بھی اس کے ساتھ پرلوک سدھارے گا ملک و قوم کیلئے بہتر ہی ہوگا۔

اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو مضبوط تر بنانے کے چکر میں بھارت بھی عالمی برادری سے کٹتا جارہا ہے۔ اس کی تازہ مثال اقوام متحدہ کی کونسل برائے انسانی حقوق کے اجلاس میں فلسطینیوں پر مظالم کے کیخلاف پیش کردہ قرارداد پر بھارت کا خود کو ووٹنگ سے دور رکھا س ہے۔ اس موقع پر جبکہ امریکہ کے علاوہ ساری دنیا اسرائیل کے خلاف صف آراء ہو گئی تھی ہندوستان دنیا کے غیر اہم ممالک مثلاً کینیا، ایتھوپیا اور پیراگوئے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس سے قبل ہندوستان کی ایسی درگت کبھی نہیں ہوئی ۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ ہندوستان کھل کر اسرائیل کی حمایت کر دیتا اور امریکہ کے ہمرکاب ہو جاتا اس لئے کہ ان دونوں کی مخالفت کے باوجود اسرائیل کی مذمت والی تجویز تو زبردست اکثریت سے کامیاب ہو ہی جاتی لیکن حکومتِ ہند نے اس شعر کے مصداق دوستی نبھائی ہے کہ

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعویٰ تجھ پر

بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مُکر جائیں گے

اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل میں غزہ پر اسرائیلی حملے کے دوران جنگی جرائم اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں پر کونسل کی رپورٹ کا قرارداد کے ذریعے خیر مقدم کیا گیا اور اس رپورٹ کی سفارشات پر فوری عملدرآمد کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے بعد اسرائیل کو دوسرا جھٹکا گزشتہ ہفتے اس وقت لگا جب غزہ کی ناکا بندی کو ختم کرنے کیلئے آنے والے قافلے فلوٹیلا پر بین الاقوامی سمندر میں کئے جانے والے اسرائیلی فوج کے حملے کی ازسرِ نو تفتیش کا حکم بین الاقوامی تعزیراتی عدالت نے دے دیا۔ پانچ سال قبل اس قافلۂ حریت کے ۹ لوگوں کو اسرائیلی افواج نے بین الاقوامی سمندر میں شہید کردیا تھا اور ایک زخمی بعد میں جان بحق ہوا۔ ۲۰۱۳ء میں اس کے خلاف عالمی عدالت میں شکایت درج کرائی گئی تھی لیکن فاتوبسودہ نامی پراسیکیوٹر نے نومبر ۲۰۱۴ء میں اس کی تفتیش کو لپیٹ دیا۔ اس حرکت کو فاضل جج صاحبان نے سنگین غلطی قرار دیتے ہوئے کرپھر سے تفتیش کا حکم صادر کردیا۔ حالانکہ اسرائیلی وزیر اعظم نے اسے سیاسی فیصلہ قرار دیا ہے لیکن اسرائیل کا کثیرالاشاعت اخبار حارث اسے اسرائیل کیلئے نئی مشکلات کا آغاز بتاتا ہے۔

گزشتہ سال ان دنوں میں غزہ کے لوگ شدید ترین ظلم و جبر کا شکار تھے ۔ اس ۵۱

روزہ جنگ میں ۱۸ تا ۲۰ ہزار ٹن آتشیں مادہ غزہ پر برسایا گیا جو ہیروشیما کے برابر کی تباہ کاری ہے۔ اسرائیل نے کل ۵ ہزار سے زیادہ حملے کئے یعنی اوسطاً یومیہ ۱۰۰ مرتبہ بمباری جس میں ۲۲ سو فلسطینی شہید ہوئے جن میں بچوں کی تعداد ۵۵۰ تھی۔ اسرائیل کے ۷۳ افراد مارے گئے جن میں صرف ۶ شہری اور بقیہ فوجی تھے لیکن اس کے باوجود اسرائیل نے جب دیکھا کہ یہ لوگ جھکنے والے نہیں ہیں تو حماس کی شرائط پر جنگ بندی قبول کرلی۔ اس جنگ میں اسرائیل کے شانہ بشانہ امریکہ اور مصر کھڑے تھے۔ مصر کی پشت پناہی سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کررہے تھے۔ غزہ کے ساتھ ترکی، ایران اور قطر کے علاوہ یوروپی یونین تھی لیکن اس ایک سال میں ناقابلِ تصور تبدیلیاں واقع ہوچکی ہیں۔

غزہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کو دنیا سے رابطہ کرنے کیلئے مصر پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ غزہ کا دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اسے اسرائیل کے ساتھ گفت و شنید کیلئے مصر کو ثالث بنانا پڑتا تھا۔ فی الحال مصری حکومت اپنے بغض و عناد کے سبب اسرائیل سے بھی زیادہ سخت موقف اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس دوران حماس نے اسرائیل کے ساتھ براہِ راست رابطے استوار کئے جس سے الفتح اور مصر دونوں کی دخل اندازی سے یکسر نجات مل گئی۔ چونکہ فی الحال محمود عباس کی سفارتی اہمیت صفر ہوکر رہ گئی ہے اس لئے وہ آئے دن مشترکہ عبوری حکومت کو برخواست کرنے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ اس دوران ٹونی بلئیر جیسا

کائیاں سیاستداں بھی غزہ میں بازآبادکاری کی خاطر براہِ راست حماس سے رابطے میں ہے اور یہ گفتگو بہتر نتائج کی جانب گامزن ہے۔

سعودی عرب کے نئے فرمانروا شاہ سلمان کی آمد کے بعد سیاسی ماحول میں جو تبدیلی آئی اس کا فائدہ پہلے تو ترکی نے اٹھایا اور اپنے تعلقات درست کئے اس کے بعد حماس نے بھی اس جانب اچھی خاصی پیش رفت کی۔ ان سفارتی کوششوں کے نتیجے میں مصر کی غاصب سرکار پر دباو بنایا گیا اور یہی وجہ ہے کہ فروری میں مصر کی ایک عدالت کے حماس کو دہشت گرد قرار دے دیا تھا مگر جون میں دوسری عدالت نے اس فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا۔ رفاہ کی راہداری جو غزہ کیلئے باہر کی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ ہے اور اسے نے دہشت گردی کے بہانے سے بند کر رکھا تھا سعودی عرب کے دباو میں شہریوں کی سہولت کے لئے کئی بار کھولا گیا۔

حماس اور سعودی عرب کے درمیان یہ سفارتکاری گزشتہ ہفتہ ایک اہم مرحلے میں داخل ہو گئی جب حماس کے سربراہ خالد مشعل ایک اعلیٰ سطحی وفد کے ساتھ عمرہ کی خاطر حرمین شریفین کا قصد کیا۔ اس وفد میں موسیٰ ابومرزوقی، صالح ارعری، عزت الرشق اور محمد ناصر شامل تھے۔ شاہ سلمان نے اپنے وزیر دفاع کی موجودگی ہیں اس وفد کے ساتھ ملاقات کی اور الفتح کے ساتھ اتحاد پر زور دیا۔

حماس نے اس کام کیلئے سعودی عرب کو ثالث کی حیثیت سے تسلیم کرلیا لیکن الفتح نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ اس طرح الفتح کی مصنوعی مصالحت پسندی کا پردہ بھی چاک ہوگیا۔ اسرائیل اور مصر کے درمیان گھٹ گھٹ کر مرنے والے محمود عباس کی حالت پر فی الحال غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

سابق وزیر اعظم اسماعیل ہنیہ نے تو اس دورے کو کامیاب بتایا مگر ایران جو ایک زمانے تک غزہ کا واحد سب سے بڑا حامی رہا ہے اس پیش رفت سے بے چین ہوگیا۔ ایرانی خبر رساں ایجنسی فارس نے اس موقع پر یہ افواہ اڑا دی کہ سعودی عرب نے یمن میں حوثیوں سے لڑنے کیلئے حماس سے تعاون مانگا ہے اور خالد مشعل اپنے ۷۰۰ مجاہدین کو روانہ کرنے پر رضامند ہوگئے ہیں۔ خبر میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ فلسطینی مجاہدین کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ وہ میدان چھوڑ کر نہیں بھاگتے۔ حماس کے ترجمان سامی ابوالزہری اس خبر کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے ہوئے مسترد کردیا۔ شام کے معاملے میں اسلامی تحریکات اور ایران کے درمیان بنیادی قسم کا اختلاف ہے۔ بشار کی حمایت نے ایران کی عدلانہ حیثیت کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے جوہری معاہدے میں زبردست سفارتی کامیابی اور معاشی پابندیوں کے خاتمہ کا مسلم دنیا میں شایانِ شان

استقبال نہیں ہوسکا۔

عالمی طاقتوں کے ساتھ ایران کے جوہری معاہدے کو جو لوگ اس کے موقف میں کسی غیر معمولی تبدیلی کا شاخسانہ قرار دے رہے تھے ان کو آیت اللہ خامنہای کے خطبے نے مایوس کردیا۔ ایران کے روحانی پیشواء نے صاف کہا کہ متکبر امریکہ کے ساتھ ہمارے تعلق میں کوئی اصولی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ یہ معاہدہ جوہری توانائی اور اقتصادی پابندیوں کے خاتمہ تک محدود ہے۔ ایران ہمیشہ سے جوہری توانائی کو پرامن مقاصد کیلئے استعمال کرنے کا دعویدار رہا ہے لیکن اگر کل کو وہ جوہری اسلحہ بنانے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو یہ معاہدہ اس کے راہ کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اس کیلئے پاکستان اور شمالی ویتنام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

امریکہ اور شمالی کوریا کے درمیان ۱۹۹۴ء میں اسی طرح کا ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت شمالی کوریا نے اپنے جوہری پروگرام کو منجمد کردیا تھا لیکن یہ سمجھوتا ۲۰۰۳ء میں شمالی کوریا کے جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے عالمی معاہدے (این پی ٹی) سے نکل جانے کے بعد ختم ہوگیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ شمالی کوریا بہت جلد جوہری بم بنانے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے ایٹمی دھماکہ بھی کرڈالا۔ چین کے سراغرساں اداروں کے مطابق شمالی

کوریا کے پاس فی الحال ۲۰ جوہری ہتھیار موجود ہیں۔ اس سے بڑی مثال پاکستان کی ہے۔ ۱۹۷۶ء کے اندر ویانا ہی میں فرانس کی مدد سے پاکستان نے جوہری ری ایکٹر قائم کرنے معاہدہ کیا تھا اور بین الاقوامی جوہری توانائی کے ادارے نے اس کی توثیق بھی کردی تھی۔

افسوس کہ اس وقت پاکستان کے سب بڑے حلیف امریکہ نے اس معاہدے کی مخالفت میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو پر دباؤ ڈالا لکن بھٹو نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا اور ۱۹۷۷ء میں او آئی سی کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں پاکستان کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت کے خلاف قرار داد منظور کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی سال امریکی تائید سے جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ فرانس نے آگے چل کر جوہری معاہدہ منسوخ کردیا لیکن جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کی پھانسی کے بعد بھی جوہری پروگرام منجمد نہیں کیا بلکہ اسے جاری رکھا اور جب پوکھرن میں بھارت نے دھماکے کئے تو اس کے جواب میں نواز شریف نے کئی دھماکے کرڈالے۔ قدرت کا کرنا یہ ہوا کہ نواز شریف بھی ایک فوجی بغاوت کے نتیجے میں ملک بدر کردیئے گئے۔ پرویز مشرف نے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر پاکستانی جوہری اسلحہ کے بابا آدم ڈاکٹر قدیر کو نشانِ عبرت بنانے کی مذموم کوشش کی لیکن اس کا

بھی جوہری منصوبے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایک جائزے کے مطابق پاکستان کے پاس آج سے زیادہ ایٹم بم ہیں ۔ ہندوستان پر امریکہ نے پوکھرن کے دھماکوں کے بعد بے ۱۰۰ شمار پابندیاں لگا دی تھیں لیکن یہ حکمتِ عملی بھی مؤثر نہ ہو سکی ۔ ہندوستان کے بموں کی تعداد بھی ۱۰۰ کے آس پاس ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے اسرائیل نے خود چوری سے بم بنا رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تسین یاہو کی خودکشی والی دھمکی کو عالمی ۲۰۰ رہنما اس قدر اہمیت بھی نہیں دیتے جتنا کہ بالی ووڈ کے شائقین اداکارہ دیپکا پڈوکون کے اس بیان کو دیتے ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ اگر وہ محبت میں گرفتار ہو گئی تو انڈسٹری کو خیرباد کہہ کر شادی رچا لے گی۔ ساری دنیا جانتی ہے نہ دیپکا کو کسی سے محبت ہوگی اور نہ نیتن یاہو خودکشی کرے گا یہ سب مگرمچھ کے آنسو ہیں جو عوام کو بہلانے پھسلانے کیلئے بہائے جاتے ہیں ورنہ یاہو جیسے کینہ پرور سیاستداں سے تو موت کا فرشتہ بھی پناہ مانگتا ہے بقول شاعر

غمِ حیات سے بے شک ہے خودکشی آساں
مگر جو موت بھی شرما گئی تو کیا ہوگا

راجہ ہو یا رنک یہاں تو سب ہیں چوکیدار

رانی جھانسی کی نگری میں ۲۵ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو وزیراعظم نریندر مودی نے اعلان کیا تھا ''مجھے پردھان منتری نہیں چوکیدار بنایئے'' لیکن جب عوام نے انہیں یہ ذمہ داری سونپ دی تو ۱۵ اگست ۲۰۱۴ء کو انہوں نے اعلان کیا کہ '' میں پردھان منتری نہیں پردھان سیوک ہوں''۔ خیر پردھان سیوک نے راجناتھ سنگھ کو قوم کا چوکیدار نامزد کرکے انہیں وزارت داخلہ کا قلمدان سونپ دیا۔ راجناتھ سنگھ نے کرن رجیجو کو اپنا نائب بنالیا اس طرح ملک کے تحفظ کیلئے محافظین کی ایک تریمورتی وجود میں آگئی۔ اب یہ دیکھیں کے کہ گرداسپور میں جب دہشت گردانہ حملہ ہوا تو اس تریمورتی نے اپنی ذمہ داریوں کو کس خوبی سے ادا کیا؟

صبح ۵ بجے حملہ ہوا اور اس کے ۵ گھنٹے بعد چوکیدار یہ کہہ کر مدھیہ پردیش کے نیمچ شہر روانہ ہو گئے کہ ''حالات قابو میں ہیں۔ میں نے وزیراعلیٰ پنجاب سے بات کرلی ہے اور ضروری احکامات صادر کردیئے ہیں'' ۔ حالات کس کے قابو میں ہیں ؟ وزیراعلیٰ سے کیا بات ہوئی ہے ؟ اور کس کو کیا احکامات صادر کئے؟ اس بابت انہوں نے کچھ نہیں بتایا مگر پاکستان کے رویہ پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ ہم دوستی کا ہاتھ

بڑھاتے ہیں وہ دہشت گردی پھیلاتا ہے۔ ہم پہل نہیں کریں گے لیکن کڑہ جواب دیں گے۔ ان کے نائب کرن نے صرف یہ کہنے پر اکتفاء کیا دہشت گردوں نے کسی کو یرغمال نہیں بنایا ہے۔

پردھان سیوک نے چوکیدار کے دہلی سے نکل جانے کے بعد صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے ایک میٹنگ بلوائی۔ اس نشست میں ان کے منظور نظر ارون جیٹلی جو پنجاب سے انتخاب لڑ کر ہار چکے ہیں موجود تھے۔ ان کے علاوہ وزیر دفاع منوہر پریکر اور پارلیمانی امور کے وزیر وینکیا نائیڈو شریک ہوئے۔ یہ کہا گیا کہ اس نشست کے بعد وزیر خزانہ ارون جیٹلی اخبار نویسوں سے بات چیت کریں گے لیکن وہ اخباری کانفرنس ہوئی ہی نہیں۔ منوہر پریکر گزشتہ دنوں قسم کھا چکے ہیں کہ وہ ۶ ماہ تک کچھ نہیں بولیں گے اس لئے کہ ان کی ہر بات کا غلط مطلب نکال لیا جاتا ہے اس لئے وہحسبِ توقع خاموش رہے۔ وینکیا نائیڈو بیچارے جو کہتے ہیں وہ خود ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتا اس لئے انہوں نے بھی پردہ کرلیا۔

مذکورہ نشست میں راجناتھ تو اس لئے شریک نہیں ہوسکے کہ وہ دہلی سے باہر تھے لیکن کرن رجیجو دہلی ہی میں موجود تھے لیکن انہیں بلانا ضروری نہیں سمجھا گیا جو باہمی بداعتمادی کی دلیل ہے۔ اس حملے کے تقریباً ۲۴ گھنٹے بعد پردھان سیوک نے پارلیمانی بورڈ کی میٹنگ میں اسے بزدلانہ حملہ قرار دیتے

مذمت کی اور پنجاب پولس کی تعریف و توصیف بیان کی ۔ وزیرِداخلہ نے پارلیمانی بورڈ کی نشست میں اس مہم کی طوالت کا یہ جواز پیش کیا کہکم از کم ایک دہشت گرد کو زندہ گرفتار کرنا مقصود تھا تاکہ ان کی حقیقت آشکار ہوسکے۔ اگر وزیرداخلہ کی اس دلیل کو تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انہیں اس مقصدِ جلیل میں ناکامی ہوئی اس لئے کہ تینوں دہشت گرد مارے گئے اس طرح سارے راز ان کے سینوں میں دفن ہوگئے۔ اب ان کے بارے میں جو کچھ کہا جارہا ہے وہ سب قیاس آرائی ہے اور شکوک شبہات کے دائرے میں آتا ہے۔اس میٹنگ کے دیگر مباحث کو بھی صیغۂ راز میں رکھا گیا۔

چوکیدار نیپچ میں جس وقت بارڈر سیکیورٹی فورس کے لوگوں کو وعظ و نصیحت کررہے تھےپردھان سیوک مون برت رکھے بیٹھے تھے اور چوکیدار کے پارلیمانی بیان کا کا انتظار کررہی تھی۔ اس دوران سابق صدر جمہوریہ عبدالکلام کے موت کی اندوہناک خبر آگئی اور ذرائع ابلاغ کی توجہ گرداسپور سے ہٹ گئی۔ وزیراعظم نے سابق صدر کو خراج عقیدت پیش کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی اور دہلی میں ان کے جسدِ خاکی کا انتظار کرنے لگے ۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کام میں حکومت کو ۷۱گھنٹے کا وقت کیوں لگا؟ اب پردھان سیوک تمل ناڈو میں جاکر سابق صدر کی آخری رسومات میں شرکت کی تیاری کررہے ہیں لیکن ابھی تک سیوکوں، بھکتوں اور چوکیداروں میں سے کسی نے پنجاب جانے کے ارادے کا

اظہار نہیں کیا جبکہ کانگریسی وفد وہاں پہنچ گیا۔

بنگلہ دیش کے اندر تو پردھان جی نے پاکستان کی بڑی دھمکی دی تھی دہشت گردی کو بالکل بھی برداشت نہیں کرنے عہد کیا تھا۔ برما میں جاکر فوجی کارروائی کے بعد بھی بڑے بڑے دعوے کئے گئے تھے لیکن اب جبکہ کچھ کر دکھانے کا موقع آیا تو سب کی زبان گنگ ہو گئی اور ہاتھ پیر شل ہو گئے۔ حزب اختلاف تو درکنار قومی جمہوری محاذ میں شامل اکالی دل اور خود بی جے پی کے رکن پارلیمان اہلووالیا تک ایوانِ پارلیمان میں بحث و قرارداد کا مطالبہ کرتے رہے مگر وینکیا نائیڈو اس قومی مسئلے پر سیاست نہ کرنے کی دہائی دینے سے آگے نہیں جاسکے۔ نہ کوئی بیان، نہ بحث اور نہ قرارداد قوم حیرت سے دیکھ رہی کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ بی جے پی کے ایس ایس اہلووالیا ایک زمانے میں کانگریس کے اندر تھے۔ انہیں پتہ ایسے موقع پر حکومت کی جانب سے موثر قرارداد آئے تو وہ اتفاق رائے سے پاس ہو جائیگی لیکن بی جے پی والوں کو کچھ سجھائی ہی نہیں دیا۔

بی جے پی نے اس مرتبہ جس کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے یہ اس کی پرانی بیماری ہے۔ سبکدوش کرنل بھارت بھوشن وتس کا بیان اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔ ۱۴ سال قبل ایوانِ پارلیمان پر حملے کے بعد پاکستان پر حملہ کرنے کیلئے انہیں وہاں

روانہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۹۹ء سے لے کر ۲۰۰۶ء تک اپنی پنجاب میں تعیناتی کے دوران ۹ ماہ تک وہ اسی دینا نگر میں مقیم تھے۔ پاکستان کو سبق سکھانے کیلئے آپریشن پراکرم کے تحت میزائلس کو ائیر کنڈیشن سے نکال ٹینکس پر لگا دیا گیا تھا۔ اس وقت پاکستان کی فوج افغانستان کی سرحد پر مصروف عمل تھی اس کے باوجود ۹ ماہ کے انتظار بسیار کے بعد فوج کو واپس بلا لیا گیا اور سارا معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا جبکہ نام نہاد لوہ پوروش اڈوانی جی وزیر داخلہ تھے۔ خیال رہے اسی زمانے میں نیپال سے بھارتی ہوائی جہاز کا اغواء ہوا تھا اور اسے چندی گڑھ میں ایندھن کیلئے اترنا پڑا تھا۔ ایسے میں جہاز کو اپنے قبضے میں لینے کا نادر موقع ہاتھ آگیا تھا لیکن بی جے پی کے قوت فیصلہ کی کمی آڑے آگئی اور وہ تیل لے کر قندھار روانہ ہو گیا۔ اس طرح اغواء کار اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے۔

بھارت بھوشن نے بتایا کہ دہشت گرد جموں کشمیر کے ہیرانگر سے ۸۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے اسلحہ سمیت دینا نگر پہنچے جبکہ اس بیچ ۵ چیک پوسٹ آتے ہیں اس لئے یہ خفیہ ایجنسیوں کی خامی کی جانب اشارہ ہے۔ دینا نگر پٹھانکوٹ اور گرداس پور کے درمیان ۳۰ کلومیٹر کے یکساں فاصلے پر واقع ہے اور ان دونوں مقامات پر فوجی مراکز ہیں۔ اس کے باوجود وہاں پہنچ کر پانچ مقامات پر ریلوے پٹری پر بم نصب کر دینا خاصہ حوصلہ شکن کام ہے۔ وتس کے مطابق اگر یہ کشمیری

ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کشمیری جنگجو اب اپنی ریاست سے باہر بھی ہاتھ پیر پھیلانے لگے ہیں اور اگر یہ خالصتانی ہیں تو گویا ۲۰ سال قبل اس آسیب کا پھر ایک بار متحرک ہو جانا ایک بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے۔

اس حملے سے ۲ روز قبل ۲۶ جولائی کو دہلی میں کارگل کی فتح کا جشن منایا گیا۔ وزیراعظم نے بھی اس جنگ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والے فوجیوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اتفاق سے کارگل کا معاملہ بھی بی جے پی کے دورِ حکومت کا ہے۔ ان یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کارگل کی جنگ میں ویر چکر حاصل کرنے والے سبکدوش ایئر وائس مارشل ادیتیہ وکرم پیٹھیا نے کہا کہ اس دراندازی کی خبر بھی چرواہوں کی مدد سے ملی جبکہ ان لوگوں نے ہندوستانی چوکیوں پر پاکستانی جنگجو دیکھے اور اس کے بعد جب پٹرولنگ کی گئی تو پتہ چلا کہ اس علاقہ میں بڑے پیمانے پر گھس پیٹھ ہو چکی ہے۔ اس کے بعد بری اور ہوائی فوج کی مدد سے اپنا علاقہ تو واپس لئے گیا اس کا جشن بھی منایا گیا۔ انتخاب میں اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی گئی مگر اس عظیم کوتاہی سے کوئی سبق نہیں لیا گیا ورنہ گرداس پور کے دینا نگر کا یہ واقعہ رونما نہیں ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ سارے سرکاری ادارے اور ذرائع ابلاغ اس حملے کیلئے پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ چند ہفتہ قبل

جموں میں تیس سال قبل آپریشن بلیو اسٹار کی برسی منانے والے پوسٹرس منظر عام پر آگئے تھے اور جب حفاظتی دستوں نے انہیں ہٹانے کی کوشش کی تو اس پر ہنگامہ بھی ہوا۔ بی جے پی رہنما اور سابق داخلہ سکریٹری آر کے سنگھ کے مطابق آئی ایس آئی نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ سکھ دہشت گردی کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ آپریشن بلیو اسٹار کی قیادت کرنے والے سبکدوش لیفٹننٹ جنرل کے ایس برار نے گرداس پور کے حملے کیلئے آئی ایس آئی کے ساتھ پنجاب کی ریاستی حکومت کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے ریاستی حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہا پنجاب کی حکومت خالصتانی دہشت گردوں کے ساتھ نرمی برت رہی ہے اور اپنے ووٹ بنک کی خاطر انہیں رہا کررہی ہے جس کے سبب یہ صورتحال پیدا ہوئی ہے۔ برار نے حفاظتی دستوں پر قابو پانے میں تاخیر پر تنقید کی اور دہشت گردوں کو زندہ گرفتار کرنے میں ناکامی کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ ایک بہترین موقع گنوادیا گیا ہے۔ ان کے مطابق اس طرح کے حملوں کی روک تھام کیلئے خبر رسانی کے نظام کی تدوین نو درکار ہے۔

یہ دلچسپ صورتحال ہے کہ فی الحال پنجاب میں اکالی دل کی حکومت ہے اور وہ بی جے پی کی حلیف ہے اس کے باوجود پنجاب کے وزیراعلیٰ پرکاش سنگھ بادل نے اس حملے کی تمام تر ذمہ داری مرکزی حکومت پر ڈال دی اور یہ بھول گئے کہ اس میں ان کی بہو ہرسم راث اس میں وزیر بنی ہوئی ہیں۔ بادل کا کہنا ہے کہ دہشت گردی

کسی ریاست کا نہیں بلکہ قومی مسئلہ ہے اور مرکزی حکومت اسے روکنے میں ناکام رہی ہے۔ یہ خفیہ ایجنسیوں کی بڑی ناکامی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ قومی مسئلہ ہونے کے سبب اس کا سدِباب قومی پالیسی کے مطابق ہونا چاہئے۔ اکالی دل رکن پارلیمان چندو ماجرا نے مرکزی حکومت پر نشانہ سادھتے ہوئے کہا یہ کہنا غلط ہے کہ ہمیں اس کی اطلاع دی گئی تھی۔ اکالی دل نے مطالبہ کرتی رہی کہ اس مسئلہ پر ایوان پارلیمان میں سنجیدگی کے ساتھ بحث ہونی چاہئے مگر مرکزی حکومت حملہ جاری ہے کا بہانہ کرکے منہ چراتی رہی۔

اکالی دل نے گوکہ مرکزی حکومت پر طرح طرح کی الزام تراشی کی مگر لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود سنگین الزامات کے گھیرے میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ حملہ تقریباً ۱۲ گھنٹے چلا۔ ممبئی میں تاج اور اوبیرائے کے بعد یہ سب سے طویل ترین حملہ تھا۔ وہاں پر ممبئی کی مشہور زمانہ پولس صرف گھیرابندی کرکے رات بھر دہلی سے آنے والی اسپیشل ٹاسک فورس کا انتظار کرتی رہی اس کے برعکس گرداس پور میں چند گھنٹوں کے اندر فوج اور خصوصی دستہ پہنچ گیا لیکن حکومت پنجاب نے اسے رکھوالی میں لگا دیا اور کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔ ٹی وی پر ساری دنیا نے دیکھا کہ پولس کے پاس بولیٹ پروف جاکیٹ اور لوہے کی ٹوپی تک نہیں تھی اور وہ غیر پیشہ وارانہ انداز میں وہ روایتی اسلحہ سے مقابلہ کررہے تھے۔ سنا ہے خصوصی دستے نے اسرائیل سے تربیت حاصل کی ہے اگر یہی وہ تربیت

ہے تو اس کے بغیر ہی پنجاب پولس بہتر تھی۔ فوج کے مطابق یہ دو ڈھائی گھنٹے کا کام تھا جس پر ۱۲ گھنٹے صرف کئے گئے۔

دوپہر بارہ بجے جب ایس پی دلبیر سنگھ کو گولی لگی تو ڈھائی بجے اسپیشل ٹاسک فورس کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے ۴بج کر ۳۵ منٹ پر تینوں دہشت گردوں کی ہلاکت کا اعلان کردیا اور اس کے بعد پنجاب پولس زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ پنجاب کے اکالیوں نے جس طرح مرکزی حفاظتی دستے پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے اگر کوئی اور سیاسی جماعت کرتی تو بی جے پی والے آسمان سر پر اٹھالیتے لیکن اب کیا کیا جائے کہ ہونٹ اور دانت دونوں ہی اپنے ہیں۔ اگر جموں کشمیر کی حکومت میں بی جے پی شامل نہ ہوتی تو یہ کہہ دیا جاتا کہ اگر ہم ہوتے تو انہیں داخل ہی نہ ہونے دیتے لیکن جموں میں بی جے پی کے اثرات جب سے بڑھے ہیں پے درپے کئی حملے ہوئے ہیں۔ حکومت سازی کے بعد چار ماہ قبل کٹھوا اور سامبا میں یکے بعد دیگرے اسی طرح کے دو حملے ہوچکے ہیں۔

یہ زمانہ ذرائع ابلاغ کا ہے یہاں ۲۴ گھنٹے ٹیلی ویژن والوں کو خبریں نشر کرنی پڑتی ہیں اور آن لائن اخبار کو ہر آدھے گھنٹے کے اندر اپنی شاہ سرخی بدلنی پڑتی ہے اس لئے اگر حکومت یہ کہہ کر خاموش بھی ہوجائے کہ وہ حملے کے خاتمے پر ہی میں بولے گی تب بھی ٹی وی والے کسی نہ کسی کو ماہر تجزیہ نگار

کے طور پر کھڑا کر دیتے ہیں اور وہ آدھی ادھوری معلومات کی بنیاد پر اوٹ پٹانگ قیاس آرائیاں کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اس کا بہترین مظاہرہ گرداس پور حملے کے دوران ہوا۔ دوپہر تک حملہ آوروں کی تعداد ۴ بتائی جاتی رہی اور ان کے درمیان ایک خاتون دہشت گرد کا قیاس بھی کیا جاتا رہا لیکن اچانک شام میں پتہ چلا وہ صرف ۳ تھے اور عورت غائب ہو گئی۔

ابتداء ہی میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ حملہ آوروں کا تعلق سرحد پار نروول گاوں سے ہے ۔ بعد میں پتہ چلا کہ نقشے پر سرحد کی دوسری جانب قریب ترین گاوں نروول ہے غالباً اسی لئے ہوا میں یہ تیر چھوڑ دیا گیا۔ یہ بتایا گیا کہ وہ صبح سویرے داخل ہوئے ، بعد میں جی پی ایس سے پتہ چلا کہ وہ ۲۱ تاریخ کو داخل ہو گئے تھے اور پھر اسے بند کر دیا گیا تھا لیکن اس کے بعد جی پی ایس کی مدد ان کے سفر کی ساری تفصیل برآمد ہوتی رہی اور بتایا کہ وہ ۱۲ کلومیٹر پیدل آئے تھے۔ اس قدر اسلحہ اور گولہ بارود لے کر ۱۲ کلومیٹر چلنا یہ تو کوئی جن بھوت ہی کر سکتا ہے۔ یہ بات بتائی گئی کہ وہ امرناتھ یاتریوں کو مارنے کیلئے کٹھوا جانے والے تھے لیکن اچانک گھبرا کر پولس تھانے کا رخ کر لیا۔ آج کل تو عام شہری بھی پولس تھانے میں جانے سے گھبراتا ہے کجا کہ دہشت گرد از خود وہاں پہنچ جائیں بعد میں پتہ چلا ان کے جی پی ایس میں پولس تھانے کا محل و وقوع موجود تھا اور وہ قصداً آئے تھے اس کے ساتھ یہ انکشاف

بھی ہو گیا کہ وہ کس کس کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔ دن بھر خبروں کا بازار گرم رہا جو ایک دوسرے کی تردید کرتی رہیں۔

دہشت گردوں کے پاس جو اسلحہ ملا اسکے بارے میں پہلے بتایا گیا وہ چینی نوعیت کا ہے پھر کہا گیا اس پر بنانے والے ملک کے نشان مٹادیئے گئے ہیں۔ اس دوران ایک حیرت انگیز انکشاف یہ ہوا کہ پٹری پر لگائے گئے بم کے نزدیک رات کے اندھیرے میں استعمال کی جانے والی عینک بھی ملی جو صرف امریکی فوجی استعمال کرتے ہیں اور جنہیں کھلے بازار سے خریدا نہیں جاسکتا۔ بعد میں اس کی یہ توجیہہ کی گئی کہ افغانی مجاہدین انہیں امریکیوں سے لوٹ لیتے ہیں اس لئے ممکن ہے یہ حملہ آور افغانیوں سے ربط میں رہے ہوں۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس حملے کا منفی اثر ہندپاک بات چیت پر پڑے گا جو امریکہ کے مفاد میں ہے۔

گرداس پور حملے کے دوران جو بدانتظامی اور ربط و ضبط کی کمی سامنے آئی اس کی پردہ پوشی ڈاکٹر عبدالکلام کے انتقال اور یعقوب میمن کی پھانسی سے کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی مگر اس کے باوجود عام آدمی پارٹی کے رہنما سنجے سنگھ کا وہ بیان صد فیصد درست معلوم ہوتا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ وزیراعظم نریندر مودی سب سے ناکام وزیراعظم ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے پہلے سال

میں پاکستان نے ۵۸ اور چین نے ۳۸ مرتبہ سرحد کو پامال کیا۔ غالباً ان کا ۵۶ انچ کا سینہ پچک چکا ہے۔ گرداس پور کا حملہ، اروناچل پردیش میں گھس پیٹھ، کشمیر میں پاکستانی اور آئی ایس آئی کے پرچم کا لہرانا اور للت گیٹ و ویاپم جیسے معاملات پر وہ پراسرا خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں بس ریڈیو پر من کی بات کردیتے ہیں لیکن اس طرح کی چوکیداری آخر کتنے دن چلے گی جس میں سیندھ شمال کے اندر گرداس پور میں لگتی ہے تو چوکیدار جنوب میں رامیشورم کی جانب بھاگتا ہے۔ مودی جی کو چاہئے وہ راجندر کرشن کا یہ نغمہ یاد رکھیں ؎

خبردار .... خبردار

یہ دنیا (کرسی) نہیں جاگیر کسی کی

راجہ ہو یا رنک یہاں پر سب ہیں چوکیدار

کچھ تو آکر چلے گئے کچھ جانے کو تیار

نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

یعقوب میمن کی پھانسی پر جس قدر لکھا اور کہا گیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ آئے دن نت نئے پہلو سامنے آرہے ہیں اور ان سب کا احاطہ کرنے کیلئے ایک مضمون تو کجا ایک کتاب بھی ناکافی ہے۔ سوگوار انصاف پسند عوام اور مسلمان سوال کرتے ہیں کہ سزائے موت صرف ایک قوم کیلئے خاص ہو کر کیوں رہ گئی ہے؟ یہ سوال اہم ضرور ہے لیکن اس کے جواب سے ساری دنیا واقف ہے۔ باطل نظام حکومت میں سیاسی اہمیت کے حامل عدالتی فیصلے آزادانہ طور پر نہیں کئے جاتے اس لئے ان میں سے اکثر و بیشتر مبنی بر انصاف نہیں ہوتے۔ عدالتی آزادی اس حد تک ہوتی ہے کہ جب تک وہ اہل اقتدار کیلئے نقصان دہ نہ ہو۔ان حدود کے آگے اس کے پر کتر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت کا عدالتوں سے اپنے لئے مفید و معاون فیصلے کروانا بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یہ کسی ایک پارٹی کا خاصہ نہیں بلکہ ساری جماعتیں اس جرم کا ارتکاب کرتی ہیں۔ طاغوت اسی طرح کے فیصلوں سے اپنے چہرے پر پڑی خوشنما نقاب از خود تار تار کرتا رہتا ہے۔

بابری مسجد کے تالے کھلوانے کا فیصلہ راجیو گاندھی کی سرکار نے اپنے مفاد میں کروایا تھا تاکہ ہندو رائے دہندگان خوش ہو جائیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔

راجیو گاندھی کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد اس کے خاطیوں کو اس لئے باآسانی رہا کر دیا گیا کہ نرسمھا راؤ ہندو رائے دہندگان کو ناراض کر کے اپنا نقصان نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن وہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور انہیں بھی کرسی چھوڑنی پڑی۔ منموہن سنگھ کی حکومت نے ہندو دہشت گردوں کو اس لئے شکنجہ میں لیا تاکہ بی جے پی مدافعت میں آجائے اور کمزور حکومت کا کلنک ماتھے سے مٹ جائے لیکن وہ ہندو رائے دہندگان کی ناراضگی کے خوف سے زعفرانی دہشت گردوں کو قرار واقعی سزا دینے سے کتراتی رہی۔ منموہن کی یہ حکمت عملی ان کے کام نہیں آئی۔ بدعنوانی اور مہنگائی کے سبب ان کے خلاف اٹھنے والی اکثریتی طبقہ کی ناراضگی نے ان کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔

اس حقیقت کو افضل گرو کی مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ایوانِ پارلیمان پر بی جے پی کے دورِ حکومت میں حملہ ہوا۔ بی جے پی نے اس کے الزام میں افضل گرو اور پروفیسر سید احمد رحمٰن گیلانی کو موردِ الزام ٹھہرایا لیکن ان کیلئے کوئی سزا بحال کئے بغیر رخصت ہو گئی۔ کانگریس نے اقتدار میں آنے کے بعد اس معاملے کو آگے بڑھایا اور ایک ملزم پروفیسر ایس اے آر گیلانی کو تو رہا کروا دیا مگر افضل گرو کو تختۂ دار پر پہنچا دیا جبکہ دونوں ہی یکساں طور پر بے قصور تھے۔ کانگریس کا خیال تھا کہ پروفیسر گیلانی کی رہائی

سے مسلمان اور سیکولر ہندو خوش ہو جائیں گے۔ اسی کے ساتھ شدّت پسند ہندووں کو یہ پیغام ملے گا کہ بی جے پی نہ ایوان پارلیمان پر حملہ روک سکی اور نہ اس کے ملزم کو سزا دلا سکی جبکہ ہم نے یہ کردکھایا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ منموہن کے اس اقدام نے مسلمانوں کو ناراض توکیا مگر ہندو شدت پسندوں کو خوش نہ کرسکا اور وہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔

مودی سرکار فی الحال اسی حکمتِ عملی پر عملدرآمد کررہی ہے۔ یہ لوگ داؤد ابراہیم کو واپس لانے کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اقتدار میں آئے تھے لیکن اب شاید انہیں احساس ہوگیا ہے کہ یہ خاصہ مشکل کام ہے۔اس لئے انہوں نے کانگریس کے دورِ اقتدار میں ہونے والے دھماکوں کے ایک گرفتار شدہ ملزم یعقوب میمن پر اپنی توجہات مرکوز کردیں اور اسے سزا بحال کرکے اپنے رائے دہندگان کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ کانگریس جس کو سزا نہیں دے سکی اس کو ہم نے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا اس لئے ہم ان سے بڑے دیش بھکت ہیں ۔زعفرانی دہشت گردوں کے ساتھ نرمی اور یعقوب میمن کو سزا دے کر یہ سرکار اسی طبقے کی خوشنودی چاہتی ہے۔ ویسے حکومت اپنے گھناونے مقصد میں کامیاب ہوجائی گی اس کا امکان کم ہے اس لئے کہ اس حرکت نے شدت پسندوں کو مطمئن کرنے کے بجائے ان کی بھوک میں اضافہ کردیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں اگر یعقوب کے بجائے ٹائیگر کو پھانسی ہوتی تو ہمیں خوشی ہوتی یعنی ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تم شیر کے

شکاری ہو لیکن تم نے بکری کی بلی چڑھا دی۔ ویسے انتخاب کے وقت عام لوگ ان جذباتی ڈھکوسلوں سے بہل جائیں گے یا بے روزگاری اور ویاپم جیسے مسائل کو اہمیت دیں گے ؟ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

یعقوب میمن کی زندہ گرفتاری سے جس طرح نرسمہا راو خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے اسی طرح اوران کی پھانسی کی سزا سے نریندر مودی کے حصے میں حسبِ توقع کامیابی نہیں آئی ۔۱۹۹۳ء میں یعقوب میمن کی گرفتاری کے بعد حکومتِ ہند نے ان کے ذریعہ کئے گئے انکشافات اور ثبوتوں کی بنیاد پر پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کی زبردست مہم چلائی اور پاکستان کے حوالے سے امریکہ کا نظریہ بدلنے بھی لگا تھا۔ اس کی نجی بدنام زمانہ فہرست میں پاکستان کا نام شامل ہو گیا تھا مگر پھر افغانستان کے حوالے سے امریکہ کی مجبوری ان عزائم میں رکاوٹ بن گئی اس طرح ممبئی دھماکوں میں پیش کردہ تمام تر شواہد کے باوجود پاکستان کا شمار دہشت گرد ممالک میں نہیں کرایا جاسکا جو نرسمہا راو کی سفارتی ناکامی تھا۔

جبر واستبداد کے معاملے میں کانگریس زیادہ تجربہ کار ہے اس لئے اس نے اندازہ لگا لیا کہ افضل گرو کی پھانسی کے اعلان اور اس کے جسدِ خاکی کو سرینگر روانہ کئے جانے کے کیا اثرات پڑ سکتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس

حکومت نے بربریت کی انتہا کرتے ہوئے افضل گرو کے اہل خانہ کو بھی اس سے آخری وقت میں ملنے نہیں دیا۔ افضل گرو کی تجہیز و تکفین راتوں رات دہلی کے تہاڑ جیل میں کردی گئی اس لئے کہ اگر افضل کو سرینگر میں سپردِ خاک کیا جاتا تو سارا کشمیر امڈ پڑتا۔ حالات قابو سے باہر ہوجاتے اور مرکزی حکومت کی بدنامی میں بے شمار اضافہ ہوجاتا۔ اس کے برعکس بی جے پی کے تجربہ کار سیاستداں اپنی اس رسوائی کا اندازہ نہیں کرپائے اور زبردست خسارے میں رہے۔

ہندوستان میں قانونی داؤں پیچ کے اندر سالہا سال گزر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یعقوب میمن کی گرفتاری کے بعد سزا کے اعلان اور اس کے نفاذ میں ۲۲ سال کا وقفہ لگا۔ وزیراعظم راجیو گاندھی کے قاتل اسی کا فائدہ اٹھا کر اپنی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کروا چکے ہیں۔ عدالت میں وقت کا دورانیہ سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے لیکن اس بار مرکزی اور ریاستی بی جے پی نے غیر معمولی جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلاوجہ ۳۰ جولائی کو مقدس بنادیا۔ جو مقدمہ ۲۲ سال سے چل رہا تھا اگر اس کا فیصلہ مزید ۲۲ دن بعد نافذ ہوتا تو اس سے حکومت پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن سرکار نے اسے وقار کا مسئلہ بنالیا اور اپنی جگ ہنسائی کرالی۔ ساری دنیا نے دیکھا کہ اس بار سزا دینے والے لوگ سزا پانے والے سے زیادہ بوکھلاہٹ کا شکار ہیں۔

حکومت نے اپنی اس حماقت میں عدالت کو شریک کرکے اس کے عزت و وقار کو بھی مجروح کردیا۔ رات تین بجے عدالت کا قائم ہونا اور صبح پانچ بجے اس کے فیصلے کا صادر ہونا یہ عجیب و غریب ہیجان کی علامت ہے جس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ جن لوگوں کو اپنی رسوائی کا احساس یا پرواہ نہیں ہوتا وہی ایسی عجلت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہندوستان کے اندر فی الحال زیر سماعت مقدمات کی تعداد کروڑوں میں ہے اور دو تہائی قیدی اپنے فیصلے کے منتظر ہیں لیکن ان کیلئے کوئی جج راتوں کی نیند تو درکنار دوپہر کا قیلولہ بھی قربان نہیں کرتا ایسے میں کسی ایک ملزم کیلئے نصف شب میں غیر معمولی سرعت کا مظاہرہ بجا طور پر شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے۔یعقوب میمن کی وطن واپسی کے بعد سے اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ فیض احمد فیض کے ان اشعار کی مصداق ہے کہ

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کے شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

یعقوب میمن کی ساری توقعات دھری کی دھری رہ گئیں اس کے باوجود وہ طویل قیدوبند کے دوران مایوسی کا شکار نہیں ہوا۔ اس نے اپنے تعلیمی سلسلے کو

جاری رکھااور دو مرتبہ ماسٹرس کی سند حاصل کی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی تعلیم وتدریس کا کام بھی کرتا رہااور کئی قیدیوں نے اس کی مدد سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں اس نے ناگپور جیل میں تعلیم گاہ کا ماحول بنا دیا تھا۔ یہ بھی لکھا گیا کہ اس کی سزا پر قیدیوں نے احتجاج کرتے ہوئے بھوک ہڑتال کردی۔ یہ یعقوب میمن کی بہت بڑی اخلاقی فتح ہے۔ہمارے سیاستداں بھی جیل میں جاتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں اس طرح کی باتیں سننے کو نہیں ملیں۔ ہندو دہشت گرد جو جیل کی چکی پیس رہے ہیں ان سے تو خیر اس کی توقع کرنا ہی حماقت ہے۔ ذرائع ابلاغ میں اس مقدمہ کو جو غیر معمولی اہمیت دی گئی اس سے سزائے موت کے مخالفین کو بھی اپنی بات رکھنے کا بھرپور موقع ملا اور یہ بات واضح ہو کر سامنے آئی کہ کم از کم پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے طبقہ میں اس کے مخالفین کی تعداد حامیوں سے زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد نے عدالتی نظام کے دوہرے معیار کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔

ذرائع ابلاغ میں اس خبر کے اچھالنے کا ایک مقصد مسلمانوں کو مایوسی وپژمردگی کا شکار کرنا بھی رہا ہوگا لیکن اس کا الٹا اثر ہوا۔ پہلے تو یہ خبر آئی تھی کہ یعقوب میمن کی تدفین ناگپور جیل میں ہوگی اور اس کی ضروری تیاری بھی کی جاچکی ہے لیکن جب حکومت کو اطمینان ہو گیا کہ ہم نے میڈیا کے

ذریعہ مسلمانوں کو احساسِ جرم کا شکار کر دیا ہے اور اب اس کی تدفین میں شریک ہونے کیلئے کوئی نہیں آیگا تو اس نے یعقوب کی میت کو ممبئی پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ اس خبر کے آتے ہی ممبئی کے مسلمانوں نے جس غیرتِ ایمانی کا ثبوت دیا اس سے سرکار کے ہوش اڑ گئے ۔ ماہم میں یعقوب کی نماز جنازہ پڑھی جانے والی تھی اس لئے ہزاروں کی تعداد میں سوگوار وہاں پہنچ گئے۔

حکومت نے یہ دیکھ کر اعلان کروایا کہ نماز جنازہ قبرستان میں ہوگی لیکن اس کے باوجود ماہم میں جنازے کی نماز ادا کی گئی ۔بڑا قبرستان یعقوب کی رہائش گاہ سے کافی دور ہےاس لئے جلوس کی شکل میں پیدل جانے کی اجازت نہیں دی گئی ۔ دفع ۱۴۴ نافذ کرکے لوگوں کے جمع ہونے پر پابندی لگا دی گئی اور صرف قریبی رشتے داروں کو جنازے میں شرکت کی اجازت دی گئی لیکن جب یعقوب میمن کی میت قبرستان پہنچی تو وہاں ایک جم غفیر منتظر تھا۔ حکومت نے اسے بھی جنازے میں شامل ہونے دیا۔ پھر سے جنازے کی نماز ادا کی گئی اور ہزاروں کی موجودگی میں یعقوب میمن کو سپردِ قبر کر دیا گیا۔یعقوب میمن کے والد عبدالرزاق میمن کا ۲۰۰۱ء میں انتقال ہوا۔ انہوں نے بھی اپنے آپ کو پولس کے حوالے کیا تھا اور ضمانت پر رہا ہوئے تھے مگر ان کے تئیں اس والہانہ تعلق کا اظہار نہیں کیا گیا اور نہایت سادگی کے ساتھ ان کی تدفین اسی قبرستان کے اندر عمل میں آئی۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یعقوب میمن بھی رہائی کے بعد دائی

اجل کو لبیک کہتے تو کیا اس قدر لوگ انکے جنازے میں شریک ہوتے ؟کیا حکومت کو دفع ۱۴۴ نافذ کرنے کی ضرورت پیش آتی ؟کیا ذرائع ابلاغ میں جنازے کی نشریات پر روک لگانے کی نوبت آتی ؟آخر یعقوب میمن کی اس غیر معمولی مقبولیت کا ذمہ دار کون ہے؟ رب کریم اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ ''یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی'' (۲۷:۱۵۰)

یعقوب میمن کے جنازے میں امت کی یہ والہانہ شرکت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نہ مایوس ہوئی ہے اور نہ پژمردہ؟ ذرائع ابلاغ کے زور وشور، عدالت کے فیصلوں اور حکومت کی پابندیوں کے باوجود وہ جانتی ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ اس مت کو آسانی سے بہکایا نہیں جاسکتا۔ اس کو خوفزدہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے دل میں اللہ کی خشیت ہے اس لئے یہ دنیا سے نہیں ڈرتی ۔ یہ روز جزا میں یقین رکھتی ہے۔ یہ رب العالمین کے عدل وانصاف سے پرامید ہے اس لئے دنیاوی ناانصافی اسے حزن وملال کا شکار نہیں کرتی ۔ اس قدر ہیجان انگیز ماحول میں امت مسلمہ نے جس وقار اور حوصلہ کے ساتھ حلم وبردباری کا مظاہرہ کیا ہے یہ اسی کا حصہ ہے۔ ۳۰ جولائی کو بارگاہِ خداوندی میں اٹھنے والے یہ ہاتھ خالی لوٹ نہیں سکتے۔ ان دلوں سے اٹھنے والی دعائے مغفرت یقیناً مستجاب ہوگی ۔ ان شا اللہ۔

گرداس پور سے اودھم پور تک آتنک ہی آتنک

گرداس پور حملے کے بعد جموں کشمیر کے اودھم پور میں حملہ ہوا اور ایک پاکستانی دہشت گرد کو زندہ گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اجمل قصاب کے بعد یہ دوسرا پاکستانی دہشت گرد ہے جو گرفتار ہوا ہے۔ گرداس پور کے معاملے میں ایوانِ پارلیمان کے اندر وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ نے ایک نہایت دلچسپ بیان دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ دہشت گرد سرحد پار سے آئے تھے لیکن پاکستانی انتظامیہ کو اس کا علم نہیں تھا۔ ہمارے ملک کی خفیہ ایجنسیاں غالباً نجومیوں کی مدد سے چلتی ہیں۔ اس لئے دہشت گردوں کے پکڑے یا مارے جانے یا تفتیش سے قبل ہی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کون ہیں ؟ کہاں سے آئے ہیں اور کس نے انہیں کس مقصد کے تحت روانہ کیا ہے؟ راجناتھ سنگھ نے بلا تحقیق پاکستانی انتظامیہ کو جو کلین چٹ دے دی اور گفت و شنید کو جاری رکھنے کا جو عندیہ دیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مودی جی کسی صورت اپنے پاکستانی دورے کو منسوخ کرنا نہیں چاہتے ورنہ تعلقات میں کشیدگی کی خاطر یہ واقعات بہت کافی تھا۔

نیا اجمل قصاب چند گھنٹوں کے اندر اپنے تین نام بدل چکا ہے اور عمر بھی کبھی ۲۰ سال تو کبھی ۱۶ بلکہ ۲۲ سال تک ہوجاتی ہے ۔ اس کا بیان ہے کہ وہ

فیصل آباد کا رہنے والا ہے۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ لیکن اپنی آمد سے متعلق بھی وہ طرح طرح کے بیان دے رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے گزشتہ ۱۱ دنوں سے یہاں گھوم رہا۔ کبھی کہتا ہے وہ ۵۰ دن قبل آیا تھا اور پھر بتاتا ہے اس کی آمد رمضان میں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آنے مقصد ہندووں کو مزہ لینے کیلئے ہلاک کرنا بتایا اور اس کی وجہ کشمیری روزآنہ ہونے والوں کی ہلاکت قرار دیا۔ نام نہاد عثمان، قاسم یا نوید نامی بہروپیہ کے بیانات اس قدر متضاد ہیں کہ فی الحال ان سے کسی نتیجہ پر پہنچ جانا جلد بازی ہوگا۔ پاکستان کے انتظامیہ نے بھی بلا کسی تحقیق و تفتیش کے اس کو پاکستانی شہری تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اس دہشت گرد کا ساتھی نے بی ایس ایف کے دو جوانوں کو ہلاک کردیا مگر اس کے مارے جانے پر بھی اختلاف ہوگیا۔ بی ایس ایف اور سی آئی ایس ایف نے اس کی ہلاکت کا کریڈٹ اپنے اپنے جوانوں کو دیا ہے۔ یہ ممکن تو ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو لوگوں کے ہاتھوں مارا جائے لیکن مشکل ضرور ہے۔

کیا یہ محض اتفاق ہے کہ جس دن پاکستان کے سابق اعلیٰ افسر طارق کھوسا نے ڈان اخبار میں ۲۶/۱۱ کی واردات کے اندر نکتہ بہ نکتہ ہندوستان کے موقف کی بھرپور تائید کرتے ہوئے اجمل قصاب کے پاکستانی ہونے کی تصدیق کی اس کے اگلے ہی دن ایک نیا پاکستانی دہشت گرد زندہ گرفتار ہوگیا؟ نفسِ مسئلہ تک رسائی کیلئے

ان تانوں بانوں کو جوڑنا بہت ضروری ہے۔ قاسم نامی گرفتار شدہ دہشت گرد کسی بڑی سازش کا حصہ ہوسکتا ہے کیونکہ صرف مزہ لینے کیلئے کوئی اپنی جان کو جوکھم میں نہیں ڈالتا۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ ان بین الاقوامی طاقتوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہو جو یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں بہتری آئے اور وزیراعظم نریندر مودی پاکستان کے دورے پر جائیں۔ ایسا چاہنے والا امریکہ بھی ہو سکتا ہے اور چین بھی۔ ایک قیاس یہ بھی ہے کہ پاکستانی فوج بھی ان تعلقات میں بہتری نہیں چاہتی اس لئے وہ بھی اس کارروائی کے پس پردہ ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ حزب اختلاف کو دوبارہ ایوانِ پارلیمان میں آنے پر مجبور کرنا اور داخلی مسائل کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے یہ سب کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔ یوم آزادی کے موقع پر کئے جانے والے خطاب کو کوچٹپٹا بنانے کا نمک مرچ کے طور بھی اس کا استعمال ہو سکتا ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ جب وہ اقتدار سے محروم ہوتی ہے تو پاکستان کے خلاف خوب شور غوغا کرتی ہے اور اسے ملک کا دشمن اعظم قرار دیتی ہے لیکن اقتدار میں آتے ہی اس کا رویہ بدل جاتا ہے اور وہ دوستی کے سریلے نغمہ گانے لگتی ہے۔ بنگلہ دیش کی جنگ کے بعد ہند پاک تعلقات میں جو سرد مہری آئی تھی اس کو اٹل جی نے جنتا پارٹی کی سرکار میں وزیرخارجہ

بننے کے بعد گرمجوشی میں بدل دیا۔ جب اٹل جی وزیر اعظم بنے تو انہوں نے دونوں ممالک کے درمیان بس سروس کا آغاز کیا اور بذاتِ خود بس میں سوار ہو کر سرحد عبور کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آگے چل کر سخت گیر سمجھے جانے والے اڈوانی جی بھی اپنے آپ کو پاکستان جانے سے نہیں روک سکے اور قائدِ اعظم کو خراج عقیدت پیش کرنے کی پاداش میں حزب اختلاف کی رہنمائی سے محروم کر دیئے گئے۔

مودی جی اب کی بار پاکستان جانے کیلئے پر تول رہے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ ممالک جو اپنے یہاں مودی جی کی خاطر سرخ قالین بچھاتے تھے اب ان راہوں میں کانٹے بونے میں لگ گئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا مودی جی ان کانٹوں پر چل کر پاکستان کا دورہ کر سکیں گے یا حالات سے مصالحت کر کے اپنا ارادہ بدل دیں گے؟ اگر انہوں نے دورہ منسوخ کر دیا تو ہندپاک دوستی کے دشمن کامیاب ہو جائیں گے اور اس پر قائم رہے تو ان کے زعفرانی رائے دہندگان ناراض ہو جائیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس اگنی پریکشا سے کیسے گزرتے ہیں؟ ابھی تک تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے عزائم جوان ہیں ورنہ پاکستان کو اس کی زبان میں جواب دینے کا دعویٰ کرنے والے وزیر اعظم کی پراسرار خاموشی اور وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ اودھم پور پر دیئے جانے والے بیان میں پاکستان کے ذکر کا نہ ہو ہونا چہ معنی دارد؟

گرداس پور کے حملے پر تو راجناتھ کا بیان بہت مثبت تھا۔ اودھم پور بھی انہوں تفصیلات بیان کرنے کے بعد مرنے والے جوانوں کو اعزاز و اکرام سے نوازنے اور گرفتار کرنے میں مدد کرنے والوں کی تعریف وتوصیف کے بعد انہیں تحفظ فراہم کرنے پر اکتفاء کیا۔ کانگریس یا کوئی جماعت اگراس صورتحال میں ایسا نرم رویہ اختیار کرتی اور بات چیت کو جاری رکھتی تو سنگھ پریوار اسے دیش دروہی قراردے دیتا۔ اس کی اس حرکت کو مسلمانوں کی دلجوئی بتاتا۔ راجناتھ کا اودھم پور والا بیان تو بالکل سادہ تھا مگر گرداسپور کے بعد نفسِ مسئلہ سے توجہ ہٹانے کیلئے انہوں نے بڑی چالاکی کے ساتھ اپنے بیان میں یہ اضافہ کردیا تھاکہ یوپی اے سرکار نے ہندو دہشت گردی کی اصطلاح ایجاد کرکے دہشت گردی کے خلاف ہماری جنگ کو کمزور کردیا ہے۔ اس بیان کے بعد جسٹس منموہن لبراہن نے یہ اعلان کیا کہ ہندو دہشت گردی ان کی اپنی وضع کردہ اصطلاح ہے۔ بابری مسجد شہادت کی تحقیقات کیلئے حکومت نے جو کمیشن قائم کیا تھااس کی ۱۷ سالہ محنت کے بعد مرتب شدہ رپورٹ میں اسے استعمال کیا گیا تھا اور وہ اس پر اب بھی قائم ہیں۔ اس طرح گویا ایک بے سر پیر کے الزام سے کانگریس کی گلوخلاصی ہو گئی ۔دراصل مسئلہ اصطلاح کا یا اس کی ایجاد کا نہیں ہے بلکہ ہندو دہشت گردی کے وجود یا عدم وجود کا ہے۔

گاندھی جی رام راجیہ کے قائل تھے اور ہے رام کہہ کر پرلوک سدھار گئے۔ ان پر گولی برسانے والا ناتھو رام گوڈسے بھی رام راجیہ کا دلدادہ تھا اور ممکن ہے اس نے دل ہی دل میں جئے شری رام کا نعرہ لگا کر گولیاں چلائی ہوں لیکن اپنی زبان پر اسے نہیں لا سکا ۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی زعفرانی دہشت گردی کو اسلام کی سبز چادر سے ڈھانپ دینا چاہتا تھا۔ ناتھو رام گوڈسے جانتا تھا کہ ہندو دہشت گردی کیا ہے؟ اور اس کی پردہ داری کیوں ضروری ہے؟ اسی لئے اس نے مسلمان کا بھیس بدل کر یہ گھناونی حرکت کی تھی ۔گاندھی جی کے ساتھ اگر اس وقت پونے کے رہنے والے کاکا صاحب گاڈگل موجود نہ ہوتے یا وہ ناتھو رام کو پہچان نہ پاتے تو کوئی بعید نہیں کھگوڈسے کو پاکستان سے آنے والا مجاہد اسلام قرار دے دیا جاتا۔

یہ حسنِ اتفاق ہے گاندھی، گوڈسے اور گاڈگل تینوں کے نام 'گ' سے شروع ہوتے ہیں اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ رام راجیہ پر اتفاق کے باوجود گاندھی اور گوڈسے میں اختلاف ایک ایسی حقیقت ہے جس انکار خود راجناتھ سنگھ نہیں کرسکتے۔ ویسے محض اختلاف کرنے سے کوئی دہشت گردی کے دائرے میں نہیں آجاتا۔ اپنے سے اختلاف کرنے والے کے ساتھ اختیار کیا جانے والا رویہ یا اقدام یہ طے کرتا ہے کہ آیا وہ دہشت گرد ہے یا نہیں ۔ مہاتما گاندھی اور قائدِ اعظم میں بھی اختلافات تھے لیکن انہوں نے ایک دوسرے کے اوپر

گولیاں نہیں برسائیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا بھی گاندھی جی سے شدید اختلاف تھا مگر ان دونوں نے بھی ایک دوسرے کے خلاف تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ اس لئے کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی دہشت گرد نہیں تھا۔

اس کے برعکس ہندو مہا سبھا کے سربراہ ونایک دامودر ساورکر نے ناتھو رام گوڈسے اور اس کے ساتھی نارائن آپٹے کی حوصلہ افزائی کی۔ ان دونوں کو اپنا آشیرواد دے کر گاندھی جی کا قتل کرنے کیلئے روانہ کیا اور ناتھورام گوڈسے نے یکے بعد دیگرے تین گولیوں سے بابائے قوم کا سینہ چھلنی کردیا۔ اس لئے کہ اس کے دل میں گاندھی جی کے تئیں سخت نفرت تھی۔ اس کا اندازہ ناتھو رام کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جو اس نے آرتھر روڈ جیل میں بابو ہری سنگھ نامی پولس افسر کے سامنے دیا تھا۔ اس نے کہا تھا میں چونکہ غیر فطری موت مر رہا ہوں اس لئے میری روح کو نجات نہیں ملے گی۔ وہ دنیا میں بھٹکتی رہے گی اور میں پونر جنم میں بھی یقین رکھتا ہوں۔ میری دعا یہ ہے کہ میرا دوبارہ جنم گاندھی جی کے ساتھ ہو اور میں انہیں اگلے جنم میں بھی گولی ماروں۔

نفرت و عداوت کی یہ آگ جس ناروا داری کو جنم دیتی ہے اس کی شدت آگے چل کر دہشت گردی کا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ ناتھو رام گوڈسے کی مذکورہ بیان کا موازنہ اگر یعقوب میمن کے آخری کلمات سے کیا جائے کہ جس میں اس نے اپنے

پھانسی دینے والے سپاہی سے کہا تھا کہ میرا خدا جانتا ہے میں بے گناہ ہوں۔ تم اپنی ڈیوٹی کر رہے ہو اس لئے میں نے تمہیں معاف کیا تو باآسانی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ کون دہشت گرد ہے اور کون نہیں ہے؟ بدقسمتی سے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر آج کل اسی نفرت کی آگ کو ذرائع ابلاغ اور سرکار ہوا دیتی ہے۔ گاندھی جی کے بہیمانہ قتل کے ۶۶ سال بعد ہندو مہا سبھا والے اتر پردیش میں میرٹھ کے قریب ایک مندر بنا کر اس میں ناتھو رام گوڈسے کی مورتی نسب کرنے کا اعلان کرتے ہیں تاکہ اس کی پوجا پاٹ کی جائے۔ ایسا کرنے والوں کو برسر اقتدار بی جے پی کے رکن پارلیمان کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ کیا اس واقعہ کے بعد بھی یہ تحقیق طلب موضوع ہے کہ دہشت گردی کی پشت پناہی کون کر رہا ہے اور کے خلاف کون جنگ لڑ رہا ہے؟

فرقہ وارانہ منافرت کے جس بیج کو ہندو مہا سبھا اور سنگھ پریوار نے خون پسینہ بہا کر سینچا۔ اس فصل کو پروان چڑھانے کیلئے ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات برپا کئے گئے۔ بابری مسجد کو شہید کیا گیا اور اجمیر شریف سے لے کر مکہ مسجد تک دھماکے کروائے گئے۔ راج ناتھ سنگھ جی اگر وزیر داخلہ کی حیثیت سے اپنے راج دھرم کا پالن کرنا چاہتے ہیں تو انہیں دہشت گردی کے شوشے سے نکل کر تشدد کی ذہنیت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ یہ درست نہیں ہے کہ ہندو دہشت گردی کی اصطلاح کے سبب دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کمزوری آئی ہے بلکہ یہ

تو یہ کہ زعفرانی دہشت گردوں کے منظر عام پر آنے کے سبب بی جے پی کا یہ موقف کمزور ہوا ہے کہ ''سارے مسلمان دہشت گرد تو نہیں مگر سارے دہشت گرد مسلمان ضرور ہیں۔''بی جے پی کے سامنے فی الحال سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی میں ملوث اپنے کارکنوں کو قانون کے چنگل سے بچانے کا ہے۔

راجناتھ سنگھ جی اگر واقعی دہشت گردی کو بلالحاظ مذہب وملت ختم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بابو بجرنگی، مایا کوندنانی ،اسیمانند اور سادھوی پرگیہ جیسے لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے کے بجائے قرار واقعی سزا دلوانی ہوگی لیکن اس دورِ پرفتن میں عدل وانصاف کی خاطر اپنے رائے دہندگان کو ناراض کرنے اور اپنے اقتدار کو خطرے ڈالنے کی جرأت بی جے پی اور کانگریس تو درکنار دیگر علاقائی جماعتیں بھی نہیں کرتیں۔ اس لئے یہ اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ سیکولر جمہوری نظام میں اکثریتی طبقہ کی دہشت گردی سے نجات کی کوئی صورت فی الحال موجود نہیں ہے۔ لیکن افسوس کے لوگ اس کے آگے جاکر سوچنا ہی نہیں چاہتے ۔ اس کے متبادل پر غور ہی نہیں کرتے۔ اس سیاسی نظام سے جو لوگ لمبی چوڑی توقعات وابستہ کئے بیٹھے ہیں ان سے افتخار راغب کہتا ہے۔

لگا رکھی ہیں تم نے آس لیکن بھول بیٹھے ہو
کہ قارونی خزانے سے کسی کو کچھ نہیں ملتا

عروج کیسا؟ زوال کیسا؟ حکومتوں کا حساب کیسا؟

قومی سیاست میں اس غیر معمولی اہمیت کے حامل سال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا پہلا دور گزشتہ یوم آزادی سے لے کراس سال یوم جمہوریہ تک ہے اور دوسرا یوم جمہوریہ سے لے کر تو یوم آزادی تک کا دورانیہ ہے۔ اس دوران قوم نے وزیراعظم کا عروج اور زوال دونوں دیکھ لیا ہےاور لوگوں کو پتہ چل گیا جو جس قدر تیزی کے ساتھ اوپر جاتا ہے اسی سرعت کے ساتھ نیچے بھی آجاتا ہے۔ عروج کے زمانے کی ابتداء انتخابی نتائج کے اعلان سے ہوئی۔ خود بی جے پی کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ اسے اپنے بل پر اکثریت حاصل ہو جائیگی۔ پہلی بار کسی ایسی جماعت کو یہ اعزاز حاصل ہوا جو اس کے خواب و خیال میں نہیں تھا۔ زوال کی ابتداء دہلی کے انتخابی نتائج سے ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نوزائیدہ جماعت کو ایسی فتح حاصل ہوئی جس کا تصور محال تھا لیکن سچ یہی ہے کہ حقائق کی پرواز تصورات کے آگے نکل جاتی ہے۔ ایوانِ پارلیمان میں گزشتہ ہفتہ سشما سوراج نے تو اعتراف کرلیا کہ فی الحال وہ اپیش پرو (ناکامیوں کے دور) سے گذر رہی ہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ یوم آزادی کی تقریر میں وزیراعظم بھی اعلان فرمادیں کہ فی الحال دیش کے یعنی ان کے اپنے ستارے گردش میں ہیں۔

انتخاب سے قبل مودی جی کے ہمنوا جن اوصاف کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے مناسب معلوم ہوتا کہ انہیں کی روشنی میں وزیراعظم کی سالانہ کارکردگی کا جائزہ لیا جائے۔ وہ اوصاف و خصوصیات مندرجہ ذیل تھیں:

○ ترقی کا نشان،

○ تاجروں اور صنعتکاروں کا دوست،

○ بدعنوانی سے پاک صاف،

○ ہندو قوم پرست اور

○ کام کروانے میں ماہر۔

کام کی مہارت: یوم آزادی کے موقع پر گزشتہ سال مودی جی نے کیا کہا تھا اگر یہ تو شاید ہی کسی کو یاد ہو اس لئے کہ خود مودی جی نے بھی کہنے کے بعد ان باتوں کو فراموش کردیا تھا مگر ''سوچھ بھارت'' کا نعرہ بھلا کون بھول سکتا ہے؟ مودی جی نے کھلے میں فراغت کی مجبوری کو اس قدر کھول کر بیان کیا تھا ساری قوم شرمسار ہو گئی اور دنیا بھر کی توجہ بھی اس جانب مبذول ہو گئی اور اقوام متحدہ کے اعداد و شمار بھی سامنے آگئے کہ اس مصیبت میں گرفتار نصف آبادی ہندوستان میں بستی ہے۔ ڈھائی ماہ بعد گاندھی جینتی کے موقع پر بڑے طمطراق کے ساتھ ''سوچھ بھارت'' نامی مہم کا آغاز ہوا۔ ٹی وی پر خوشنما نظر آنے والے رنگ برنگے کچرے کو صاف کرکے پھیلایا گیا تاکہ وزیر محترم کو بو نہ

آئے اور پھر ذرائع ابلاغ کے سامنے اس کو صاف کرنے کا ڈرامہ کیا گیا۔ اس مہم کی تشہیر پر ۹۴ کروڑ روپے خرچ بھی ہوئے لیکن اس کے دس ماہ بعد بی جے پی کی ہی مرکزی حکومت کے وزارتِ شہری ترقی نے ۴۷۶ شہروں کا جائزہ لے کر جو ہوشربا انکشافات کئے اسے پڑھ کر مودی سرکار کو استعفیٰ دے دینا چاہئے۔

صفائی ستھرائی میں سب سے بہترین کارکردگی دکھانے والے ۱۰۰ شہروں میں سے ۳۹ کا تعلق جنوب ہند سے ہے جہاں کسی ریاست میں بی جے پی برسرِ اقتدار نہیں ہے۔ دوسرا مقام مشرقی ریاستوں کا ہے وہ بھی ہنوز کمل کا سایہ سے محفوظ ہیں۔ مغرب اور شمال جہاں بی جے پی کی ریاستی حکومتیں بالترتیب تیسرے اور چوتھے درجے میں ہیں۔ دس بہترین شہروں کی اگر بات کی جائے نوی ممبئی کے علاوہ ایک بھی شہر کسی ایسی ریاست میں نہیں ہے جہاں بی جے پی برسرِ اقتدار ہو۔ سب سے خراب کارکردگی دکھانے والے دس شہروں پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے ۸ بی جے پی کی سرکار والی ریاستوں میں ہیں۔ وارانسی جو مودی جی کا اپنا حلقۂ انتخاب ہے ۴۱۸ ویں مقام پر ہے۔ یہ کام کروانے کا فن ہے یا چراغ تلے اندھیرا کی کیفیت ہے۔

ہندو قوم پرستی: ہمارے ملک میں دانشوروں کی ایک بہت بڑی فوج ایسی بھی ہے جس کے نزدیک کسی رہنما کا ہندو قوم پرست ہونا معیوب نہیں بلکہ پسندیدہ ہے۔

مودی جی کے اقتدار میں آتے ہی ہندو قوم پرستوں کے حوصلے بلند ہوگئے۔ زبانیں بے لگام ہو گئیں۔ کسی نے کہا سارے ہندوستانی ہندو ہیں۔ کسی نے رام زادے اور حرام زادے کا فرق بتانا شروع کردیا۔ کوئی لوجہاد کے خلاف کمربستہ ہوگیا تو کسی نے گھر واپسی کی مہم چھیڑ دی۔ فرقہ وارانہ فسادات اور مساجد کے ساتھ گرجا گھروں پر بھی ہونے والے حملوں میں اضافہ ہوگیا لیکن جب عالمی سطح پر تنقید ہوئی تو مودی جی نے ساکشی مہاراج کو بلا کر کچھ اس طرح ڈانٹا کہ وہ رو پڑے۔ سارے مہارتھیوں کو پیغام زباں بندی مل گیا اور پھر کیا تھا۔ آرایس ایس نے اپنی تاریخ میں پہلی بار مسلمانوں کیلئے افطار پارٹی کا اہتمام شروع کردیا اور اب تو علماء کے اجلاس بھی ہونے لگے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ اس کا فائدہ کیا ہوگا کم از کم لوجہاد اور گھر واپسی کے سبب جو فضا خراب ہورہی تھی اس پر روک لگ گئی۔ اب تو حال یہ ہے کہ جنتر منتر پر علی الاعلان دلت اسلام قبول کرتے ہیں مگر سنگھ پریوار علامتی مخالفت سے آگے نہیں جاتا۔ سرحد پار سے ہونے والے دہشت گردانہ حملوں پر بھی کسی زبان نہیں کھلتی۔

بدعنوانی کا قلع قمع: مودی جی اپنے سرکار کی پہلی سالگرہ کے موقع پر چھتیس گڑھ میں عوام سے سوال کیا تھا۔ اس سال کے دوران کیا آپ لوگوں نے کوئی گھوٹالہ سنا؟ وزیراعظم کو نہیں پتہ تھا کہ خود چھتیس گڈھ میں ڈیڑھ لاکھ

کروڑ کا چاول گھوٹالہ ابل رہا ہے۔ اس کے بعد تو بد عنوانی کا آتش فشاں پھٹ پڑا مہاراشٹر میں چکی کا گھوٹالہ، ہریانہ میں زمین کا گھپلا اور مدھیہ پردیش کی ویاپم بدعنوانی سامنے آتی چلی گئی۔ ویاپم گھوٹالے کو دبانے کیلئے شیوراج سنگھ چوہان نے جو رویہ اختیار اس پر سوشیل میڈیا میں لطیفہ مشہور ہوگیا کہ ''ہمارے یہاں یم راج نہیں شیوراج آتا ہے''۔ جس کسی نے زبان کھولنے کی جرأت کی اس کا گلا گھونٹ دیا گیا اور اب ۷۰ سے زیادہ طلباء صدر مملکت سے خودسوزی کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ اس طرح ''نہ کھاؤں گا اور نہ کھانے دوں گا'' والے نعرے کی دھجیاں اڑ گئیں۔

اس ایک سال میں آنے والی سب سے بڑی تبدیلی ''نامو سے لامو'' تک کا سفر ہے۔ ایک سال قبل چہار جانب نامو (یعنی نریندر مودی) کا بول بالا تھا۔ ہر کوئی یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس مسئلے پر کیا کہہ رہے ہیں اور ان کی ہر اوٹ پٹانگ بات ذرائع ابلاغ پر چھا جاتی تھی لیکن وہ مون دھارن کئے ہوئے ہیں۔ انتخابی جلسوں میں رٹی رٹائی تقریر یا بیرونِ ملک لکھے ہوئے بیان کے علاوہ وہ زبان نہیں کھولتے۔ انتخابی جلسوں کی تقاریر کا بھی یہ حال ہے کہ بہار کے گیا شہر میں ان کی حالیہ تقریر کا منٹوں میں نتیش کمار نے ایسا پوسٹ مارٹم کیا کہ ذرائع ابلاغ میں مودی کے بجائے نتیش کا بول بالا ہوگیا۔ اس کے برخلاف للت مودی کا یہ حال ہے کہ اگر وہ کوئی معمولی سا ٹویٹ بھی

کرے تو ذرائع ابلاغ پر چھا جاتا ہے اور لوگ اس کی بات کو وزیراعظم کے من کی بات سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ سشما کے طفیل اپنے خلاف وارنٹ کے باوجود وہ آسٹریلیا میں آئی سی سی کے مدمقابل ایک نیا نظام قائم کرنے کا اعلان کر رہا ہےاور ساری دنیا اس کی جانب متوجہ ہے۔

للت مودی کے تنازع نے مودی سرکار کی بے مثال رسوائی کی ہے ۔ وزیر خارجہ سشما سوراج اس کے چکرویوہ میں آئے دن پھنستی جارہی ہیں ۔ وہ جب بھی کچھ بولتی ہیں ان کی مصیبت میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔ ابھی حال میں انہوں نے ایوانِ پارلیمان میں کہا کہ کسی کینسر زدہ خاتون کی مدد کرنا اگر جرم ہے تو وہ اس کی مجرم ہیں۔ اس کے بعد وہ بولیں کہ میں نے یہ تعاون زبانی کیا ہے اگر کسی کے پاس میرے خلاف ثبوت ہو تو پیش کرے۔ راہل نے سشما کے بیان کو انہیں پر الٹ دیااور کہا کہ اگر سشما انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کسی مدد کرنا چاہتی تھیں تو ایسا چوری چھپے کیوں کیا گیا ؟ علی الاعلان اپنے دفتر سے انہوں نے خط کیوں نہیں لکھوایا؟ یہ پردہ داری ہی ان کے خلاف شاہد ہے اور انہیں قوم کو یہ بتانا پڑے گا اس معاملے میں انہوں نے للت مودی سے کتنی رقم رشوت کے طور پر لی ہے ؟ سونیا نے تو اسے ڈرامہ بازی قرار دے کر خارج کردیا لیکن مودی جی کی چونچ ابھی تک اس سنگین معاملے میں نہیں کھلی اس لئے مچلنا سبل جیسے لوگوں نے مودی جی کو ’’بدعنوانوں کا چوکیدار‘‘ کے لقب سے نواز دیا۔

بہار کے اندر انہوں نے سندھیا اور چوہان کی تعریف و توصیف بھی کرڈالی جن کے خلاف بے شمار ثبوت منظر عام پر آچکے ہیں۔

نامو اور لامو'' کے باہمی تعلق کے حوالے سے بہت زیادہ حقائق ابھی پس پردہ ہیں'' لیکن کانگریس کا الزام ہے مودی جی کے منظورِ نظر گوتم اڈانی کے للت مودی سے قریبی تعلقات ہیں۔ یہ اس وقت استوار ہوئے جب وہ وزیراعلیٰ کی حیثیت سے گجرات کرکٹ ایسو سی ایشن کے صدر تھے۔ مودی نے بعد میں یہ عہدہ اپنے دستِ راست امیت شاہ کے حوالے کیا اور ان کے زمانے میں للت مودی کے ساتھ تعلقات خوب پھلے پھولے۔ للت مودی کے معاملے مودی جی خاموشی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس دن وہ زبان کھولیں گے چہار جانب سے الزامات کا ایک آتش فشاں پھٹ پڑے گا جو ان کے بظاہر صاف ستھرے دامن کو داغدار کردے گا۔

بدعنوانی کے خلاف مودی جی کے دھرم یدھ کی قلعی بی جے پی سابق نائب صدر رام جیٹھ ملانی نے کھول دی۔ بدعنوانی پر لگام لگانے کی خاطر چیف ویجلنس کمشنر کے طور جناب کے وی چودھری کی سفارش کے خلاف جیٹھ ملانی نے صدرِ مملکت پرنب مکرجی کو خط لکھ کر گزارش کی کہ وہ اس سے گریز فرمائیں اس لئے کہ یہ نامزدگی قوم کیلئے ایک بہت بڑی تباہی بنے گی۔ رام جیٹھ ملانی نے کے وی چودھری پر یہ

الزامات لگائے کہ وہ نہ صرف بہت بدعنوان ہیں بلکہ جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں ۔ قوم دشمن عناصر کے ساتھ اپنے تعلقات کی بناء پر وہ بچ نکلتے ہیں۔ مودی جی اگر اس طرح کے آدمی کی مدد سے بدعنوانی کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کی نیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ رام جیٹھ ملانی نے وزیراعظم کو خط لکھ کر بتایا کہ ’’ ان کے نزدیک وزیراعظم کے روبہ زوال احترام کا مکمل خاتمہ ہو گیا اور اب وہ عدالت عالیہ اور عوام کی عدالت میں برسرپیکار ہوں گے‘‘۔ یہ وہی رام جیٹھ ملانی ہیں جنھوں نے سب سے پہلے وزیراعظم کے امیدوار کے طور پر نریندر مودی کی حمایت کی تھی۔

صنعت و حرفت: مودی جی نے اپنے پہلے ۶ ماہ کے اندر گوتم اڈانی اور مکیش امبانی کے وارے نیارے کردیئے اور ’’میک ان انڈیا‘‘ کا نعرہ بلند کرکے ساری دنیا کے صنعتکاروں کو ہندوستان میں آکر سرمایہ کاری کی دعوت دی لیکن لوگ اس کاغذی شیر کے جھانسے میں نہیں آئے ۔ اس دوران انہوں تحویل اراضی کا نیا قانون وضع کرکے کسانوں کی زمینوں پر شب خون مارنے کی ناکام کوشش کی مگر راہل کے الزام ’’سوٹ بوٹ والی سرکار‘‘ نے وزیراعظم کی چولیں ہلادیں ۔ جب انہیں دہلی اور بنگال کے انتخابی نتائج سے یہ احساس ہوا کہ غریب عوام کے اندر ان شبیہ خاصی بگڑ چکی ہے تو انہوں نے ہڑبڑاہٹ میں جو اقدامات کئے اس سے ملک کے سرمایہ دار بھی ناراض ہو گئے اور ان کی حالت نہ خدا ہی ملا نہ

وصال صنم کی سی ہو گئی ۔ مودی جی کی صلاحیتوں کے معترف راہل بجاج نے اپنے حالیہ بیان میں ان کا جس طرح سے باجا بجایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔

راہل بجاج کا والد بہت بڑے کانگریسی تھے لیکن ان کے خیال میں حالیہ کانگریس پارٹی گاندھی جی تو کجا نہرو جی والی بھی نہیں ہے ۔ راہل بجاج نے بدعنوانی سے بچنے کی خاطر کبھی بھی سرکار کے ساتھ کاروبار نہیں کیا اس لئے وہ بلا تکلف اظہار خیال کیلئے مشہور ہیں ۔ راہل بجاج نے گجرات فساد کے بعد مودی جی پر تنقید ضرور کی تھی لیکن بعد میں وہ مودی جی کے مداحوں کی فہرست میں شامل ہو گئے تھے ۔ ابھی حال میں این ڈی ٹی وی سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ۳۰ سال کے بعد ہندوستان کی عوام نے کسی جماعت واضح اکثریت سے نواز دیا اور ۲۷ مئی کے دن قوم کو ایک شہنشاہ میسر آگیا ۔ یہ ایک تاریخی کامیابی تھی ۔ میں حکومت کے خلاف نہیں ہوں لیکن حقیقت یہ ہے اس حکومت کی چمک دمک ماند پڑتی جارہی ہے ۔ راہل نے یہاں تک کہہ دیا کہ ’’یہ نریندر مودی کی حکومت نہیں ہے‘‘ یہ جملہ دراصل صنعت و حرفت کے شعبے میں مودی سرکار کے تئیں پائی جانے والی شدید مایوسی کی غماز ہے ۔ ملک کے تاجر و صنعتکار طبقہ نے نئی حکومت کے ساتھ جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ سارے خواب چکنا چور ہو چکے ہیں ۔ عروج و ترقی کی علامت سمجھے جانے والے نریندر مودی پر زوال و پستی کا گرہن لگ چکا ہے ۔ ویسے یہ تو ہونا ہی تھا مگر یہ سب اس قدر جلدی ہو جائیگا

اس کی امید مودی جی کے بڑے بڑے سے دشمن کو بھی نہیں تھی ۔ ویسے بقول محسن بھوپالی ۔

عروج بخت مبارک، مگر یہ دھیان رہے
انہی دنوں کے تعاقب میں ہیں زوال کے دن

یہ کیوں ہورہا ہے اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن یوم آزادی کے پر مسرت موقع پر ایک دلچسپ مثال دیکھیں ۔ نریندر مودی کی ان تمام خوبیوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا بہت ساری خامیاں بھی ہیں مثلاً اگر آپ دنیا کے سب سے بڑے مجرم کی تلاش کرنے کیلئے گوگل بابا کی مدد لیں تو مودی جی کی تصویر دکھلا دیتے ہیں اسی طرح اگر اس سائٹ پر احمق ترین وزیراعظم ٹائپ کریں تب بھی گوگل بابا مودی جی کی جانب اشارہ کردیتے ہیں ۔نہ جانے ان کو ہمارے وزیراعظم سے کون سا بیر ہے۔ خیر ان تمام خوبیوں اور خامیوں کے علی الرغم کبھی کسی نے یہ نہیں سنا کہ مودی جی کتابیں بھی لکھتے ہیں بلکہ ان کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے یہ بات بھی اخبارات کی زینت نہیں بنی لیکن اب اچانک یہ انکشاف بھی ہوگیا ہے کہ امیت شاہ صاحب دہلی میں مودی جی کی تین کتابوں کا اجراء فرمانے والے ہیں ۔ اس تقریب کی صدارت راجناتھ سنگھ کریں گے ۔
کتاب کا عنوان بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ سوشیل ہارمنی یعنی سماجی خیر سگالی ۔

مودی جی کو چاہئے تھا کہ اگر وہ کسی کو اپنے نام سے کتاب لکھنے کیلئے کہتے تو کم از کم اس کا موضوع تو ان کی شخصیت کے مطابق ہوتا۔ اب کہاں خیر سگالی اور کہا نریندر مودی، یہ تو گویا چور کی داڑھی میں تنکا والی بات ہو گئی۔ دوسری کتاب کا نام جیوتی پنج ہے جس میں انہوں ایسے افراد کی سیرت بیان کی ہے جن سے انہیں زندگی میں حوصلہ اور رہنمائی ملی۔ کتابیں لکھوا کر خراج عقیدت پیش کرنا تو بہت آسان ہے مگر اپنے اڈوانی اور جوشی جیسے بزرگوں کو 'مارگ درشک' بنا کر انہوں نے جس طرح ''باہر کا راستہ دکھلا دیا'' وہ جگ ظاہر ہے۔ ان کے اس اقدام سے مارگ درشک کے اصلی معنیٰ '' راہ دیکھنا'' یا ''راستہ ناپنا'' واضح ہوگیا۔ تیسری کتاب شعری مجموعہ ہے۔ کل یگ کی اس سے بڑی نشانی اور کیا ہوگی کہ جو شخص لکھی ہوئی تقریر پڑھنے میں بھی غلطیاں کرتا ہو وہ کتابیں لکھ رہا ہے۔ ویسے مودی جی اگر اس یومِ آزادی کی تقریر میں اعلان فرمادیں کہ اب وہ سیاست کو خیرباد کہہ کر تصنیف وتالیف کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیں گے تو یہ ان کے اپنے اور قوم کے حق میں ایک نہایت مبارک فیصلہ ہوگا۔ یوم آزادی کو دراصل یوم احتساب کے طور پر منایا جانا چاہئے مگر اپنے انجام سے بے خبر شتر بے مہار کی مانند منہ اٹھائے چلنے والی عصر حاضر کی سرکاروں پر یہ نظم (ترمیم کے ساتھ) صادق آتی ہے کہ

یقین کیسا؟ گمان کیسا؟

عروج کیسا؟ زوال کیسا؟

سوال کیسا؟ جواب کیسا؟
حکومتیں تو حکومتیں ہیں
حکومتوں کا حساب کیسا؟

یوم آزادی: ٹیم وراٹ کوہلی اور ٹیم سمراٹ مودی کا مایوس کن مظاہرہ

وزیراعظم نریندر مودی کو ان کے نت نئے اصطلاحات کیلئے یاد کیا جائیگا۔ گزشتہ مرتبہ انھوں نے لال قلعہ سے ''میک ان انڈیا'' کا نعرہ اچھالا تھا تاکہ بین الاقوامی سرمایہ کار ہندوستان آکر اپنی مصنوعات یہاں بنائیں ۔ اس نعرے کو سن کر ملک کے بھولے بھالے عوام تو بے وقوف بن گئے لیکن شاطر سرمایہ کار اس کے جھانسے میں نہیں آئے۔ اس مرتبہ انھوں نے عوام کو کنفیوژ کرنے کی خاطر ٹیم انڈیا کی نئی اصطلاح وضع فرمادی اور کہا کہ ہندوستان کے ۱۲۵ کروڈ لوگ ٹیم انڈیا ہیں ۔ ہم جیسے لوگ اس نعرے کو سن کر سوچنے لگے کہ اگر ہم ٹیم انڈیا ہیں تو وہ جو سری لنکا میں ٹسٹ میچ کھیل رہے ہیں وہ کون ہیں ؟ سہولت کیلئے اسے ٹیم وراٹ کوہلی کہہ لیجئے ۔ ایک اور سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر عوام ٹیم وشال انڈیا ہے تو حکومت کیا ہے ؟ چونکہ حکومت کے سربراہ مودی جی ہیں اس لئے اسے ٹیم سمراٹ مودی کہہ لیجئے ۔

مودی جی نے جب ٹیم انڈیا کا نعرہ لگایا تو اس سے سب سے زیادہ خوشی یقیناً وراٹ کوہلی اور اس کے ساتھی کھلاڑیوں کو ہوئی ہوگی جو صبح صبح اٹھ کر پریکٹس کرنے کے بجائے مودی جی تقریر سن رہے تھے اور تقریر بھی ایسی کہ ختم

ہونے کا نام نہ لیتی تھی ۔ اتنی دیر میں تو ٹوئنٹی ٹوئنٹی میچ کی ایک اننگ ختم ہوجاتی۔ مودی جی نے اپنی تقریر میں ایک اور نعرہ اچھالا ''اسٹینڈ اپ اینڈ اسٹارٹ اپ'' جس کے معنی ہوں ''کھڑے ہوجایئے اور شروع ہوجایئے''۔ وراٹ کوہلی نے سوچا مودی جی کی نصف نصیحت پر تو ہم نے ان کے ارشاد فرمانے سے قبل ہی عمل کرلیا اور پہلی اننگز میں ایسے جم کر کھڑے ہوئے کہ سری لنکا کے ۱۸۳ کے جواب میں ۳۷۵ کا زبردست اسکور کھڑا کردیا اور دوبارہ سری لنکا کو ۳۶۷ پر ڈھیر بھی کردیا۔

یوم آزادی کے دن وراٹ کوہلی کی ٹیم کو صرف ۱۵۳ رن بنانے تھے اور ۹ وکٹ اس کے ہاتھ میں تھے۔ جس ٹیم نے پہلی اننگز میں ۳۷۵ بنائے ہوں اس کیلئے ۱۷۶ رن بنا کر میچ جیت لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی ۔ لیکن برا ہو مودی جی کی تقریر کا جس میں انہوں نے کھڑے ہونے کے بعد شروع ہو جانے کی نصیحت کرڈالی تھی اور حوصلہ بڑھانے کیلئے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کئی لاکھ بیت الخلاء بنا کر ہم نے ثابت کردیا کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں ۔ وراٹ کوہلی بیچارہ بھول گیا کہ سرکاری خرچ سے اسکولوں میں بیت الخلاء کی تعمیر اور سری لنکا کے میدان میں کرکٹ کے میچ میں کامیابی دو مختلف چیزیں ہیں ۔ مودی جی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہندوستانی بلے بازوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس شروع ہوگئے کہ جیسے مودی جی شروع ہوجاتے ہیں اور بلہ اٹھا اٹھا کر مارنے لگے ۔

وراٹ کوہلی تو وزیر اعظم کی تقریر سن کر اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا تھا کہ اب رنوں کی ایسی برسات ہوگی کہ دیکھتے دیکھتے جن دھن یوجنا کی طرح کروڈوں بنک کھاتے کھل جائیں گے ۔ وہی ہوا کھاتے تو کھلے لیکن ان میں کوئی رقم نہیں آئی۔ بلے باز یکے بعد دیگرے بڑے جوش کے ساتھ میدان میں جاتے تھے اور بہت جلد کوئی خاص رن اپنے کھاتے میں جمع کئے بغیر لوٹ آتے تھے ۔ خود وراٹ کوہلی جس نے پہلی اننگز میں ۱۰۳ رنز بنائے تھے سمراٹ مودی کے مشورے پر چلتے ہوئے ۳ رنز بنا کر لوٹ آیا۔ اس طرح وزیر اعظم کی نصیحت پر عمل کرنے کے نتیجے میں جیتی ہوئی بازی الٹ گئی۔ پوری ٹیم ۱۱۲ کے معمولی سے اسکور پر سمٹ گئی اور ٹیم وراٹ کوہلی شکستِ فاش سے دوچار ہو گئی۔ یوم آزادی کے موقع پر ٹیم سمراٹ مودی کی مانند ٹیم وراٹ کوہلی نے بھی ٹیم انڈیا یعنی ملک کے ۱۲۵ کروڈ لوگوں کو مایوس کرکے جشنِ آزادی مزہ کرِ کرا کر دیا۔

سیاست میں چونکہ لوگ اول تو اپنی کمزوری کو تسلیم نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنا پلہّ جھاڑ لیتے ہیں مگر کرکٹ میں ایسا نہیں ہوتا وہاں ناکامی کا جائزہ لیا جاتا ہے، وجوہات تلاش کی جاتی ہیں اور ذمہ داروں کی نشاندہی بھی کی جاتی اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے کرکٹ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود سیاست سے زیادہ سنجیدہ کھیل ہے۔

ٹیم وراٹ کوہلی کی ناکامی کی وجہ یہ سامنے آئی کہ ٹونٹی ٹونٹی کے میچ کھیل کھیل کر ہمارے کھلاڑی ٹسٹ میچ کھیلنے کا فن بھول گئے ہیں۔ ٹونٹی ٹونٹی میچ میں فنی مہارت یا حکمت عملی کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ جیسے من میں آئے بلہ گھماؤ تقدیر سے ٹیم ہار یا جیت جاتی ہے لیکن ٹسٹ میچ چونکہ ۵ دن کا کھیل ہوتا اس میں سنبھل کر کھیلنا پڑتا ہے اور سوجھ بوجھ رکھنے والے درمیان میں بازی الٹ دیتے ہیں جیسا کہ سری لنکا نے پہلی اننگز کی لیڈ اور دوسری اننگز میں ۵ وکٹ گنوانے کے باوجود اپنے آپ کو سنبھالا اور ہندوستان کے سامنے ۱۷۵ کا ایک ہدف رکھنے کے بعد اپنی غیر معمولی بالنگ سے میچ جیت لیا۔

کرکٹ کا اگر سیاست کے کھیل سے موازنہ کیا جائے تو یوں سمجھ لیجئے کہ تقریباً ۵ یا ۶ ماہ چلنے والی انتخابی مہم ٹونٹی ٹونٹی کا میچ ہے۔اس میں سیاسی جماعتیں خوب اٹھا پٹخ کرتی ہیں۔ نعرے بازی سے لے کر ہلڑ بازی تک سب جائز ہوجاتا ہے۔ اوٹ پٹانگ وعدے کئے جاتے ہیں جو من میں آئے کہہ دیا جاتا ہے مثلاً اچھے دن آنے ہی والے ہیں اور ۵۶ انچ کی چھاتی، کالے دھن کی واپسی، بیف کی برآمد پر پابندی وغیرہ وغیرہ۔ اس دھوبی پچھاڑ میں سٹہ بھی خوب لگتا ہے نیز کسی نہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کی لاٹری بھی لگ جاتی ہے۔ لیکن حکومت چلانا ٹسٹ میچ جیسا ہے جہاں سوجھ بوجھ کی ضرورت پڑتی ہے۔ صرف

کھوکھلے نعروں سے کام نہیں چلتا بلکہ لوگ نتائج دیکھنا چاہتے ہیں اور تب جاکر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔

وراٹ کوہلی اور سمراٹ مودی دونوں ہی ٹو نٹی ٹو نٹی کے مہارتھی ہیں لیکن ٹسٹ میچ میں ابھی تک اپنی پہلی کامیابی درج کرانے کیلئے ترس رہے ہیں اس کے باوجود ان دونوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ وراٹ کوہلی نے شکست کے بعد بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اس کی ذمہ داری قبول کرلی ۔ اس نے صاف الفاظ میں اعتراف کر لیا کہ اس شکست کیلئے ہم اپنے آپ کے سوا کسی اور کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے ۔ اس کا کہنا تھا کہ پہلے ۵ وکٹ لینے کے بعد ہم اس کا فائدہ اٹھانے سے چوک گئے۔ مودی جی کا بھی یہی مسئلہ ہے انتخاب میں واضح اکثریت حاصل کرنے کے بعد وہ ایوانِ پارلیمان میں اس کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ بی جے پی اور کانگریس کے ارکان کی تعداد میں ویسا ہی فرق ہے جیسا کہ بھارت اور سری لنکا کے پہلی اننگز کے رنوں کا فرق تھا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ۔ اس کے باوجود پورے مانسون سیشن پر پانی پھر گیا اور ٹیم کا خوفزدہ کپتان سیلاب زدہ ایوان میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرسکا۔

اس کے برعکس انتخابی نتائج کے بعد کانگریس کی حالت سری لنکا کی دوسری اننگز سے مماثل تھی۔ ایک تو پہلی اننگز میں ۱۹۲ رنز کی لیڈ اور اوپر سے ۹۵ کے حقیر

اسکور پر ۱۵ اہم بلے بازوں کا آوٹ ہو کر لوٹ آنا۔ اس کے باوجود دنیش چاندی مل کا حوصلہ پست نہیں ہوا بلکہ اس نے ناٹ آوٹ ۱۶۲ کا ذاتی اسکور کرکے سری لنکا کو ۳۶۲ رنز پر پہنچا دیا۔ گزشتہ پارلیمانی سیشن میں راہل گاندھی نے بالکل دنیش چاندی مل کی طرح مودی جی کے مہنگے کوٹ کی دھجیاں اڑا دیں اور ان کی حکومت کو سوٹ بوٹ والی سرکار قرار دے دیا۔ راہل نے مودی جی کو مشورہ دیا کہ اگرانہیں بیرونِ ملک دوروں سے فرصت ملے تو خودکشی کرنے والے کسانوں کی خبر گیری بھی کرلیا کریں۔ حکومت کو چاہئے تھا کہ ہوا کے رخ کی تبدیلی کو سمجھتی اور خاطر خواہ تیاری کرتی لیکن ٹیم سمراٹ مودی بھی ٹیم وراٹ کوہلی کی طرح خوش فہمیوں کا شکار تھی۔

اس مانسون سیشن میں ایوان کے اندر کانگریس کے رہنما ملک ارجن کھرگے نے للت مودی کے مسئلے پر رنگنا ہیراتھ کی مانندہلہ بول دیا جس نے ۷ وکٹ لے کر ٹیم وراٹ کو دھول چٹادی۔ وراٹ کوہلی نے جس طرح بگڑتی ہوئی صورتحال پر قابو پانے کیلئے پانچویں نمبر پر ہربھجن کو بھیج دیا اسی طرح سمترا مہاجن نے کانگریس کے ۲۵ ارکان پارلیمان کو ۵ دنوں کیلئے معطل کردیا لیکن وہ پانسہ بھی الٹا پڑا۔ دیگر جماعتیں جو کانگریس کے ساتھ آنے میں ہچکچا رہی تھیں وہ اس کے ساتھ مظاہرے میں شامل ہونے پر مجبور ہوگئیں۔ ہر بھجن کو اس موقع پر میدان میں اتارنا کپتان کی سب سے بڑی نادانی تھی وہ بیچارہ صرف ایک رن بناکر آوٹ ہوگیا اور اسی کے ساتھ پوری ٹیم کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ یہی کچھ بی جے

پی کے ساتھ ہوا۔

سمراٹ مودی کو چاہئے کہ وہ وراٹ کوہلی کے اعترافِ شکست کو گرہ سے باندھ کر رکھ لیں۔ وراٹ نے تسلیم کیا کہ ہم اپنی حکمت عملی پر عملدارآمد نہیں کرپائے۔ ایسے دباؤ والے حالات میں سوچ واضح ہونی چاہئے۔ یہی آپ کو اوسط درجہ کی ٹیموں اور کھلاڑیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم نے آج کی شکست سے یہی سبق سیکھا کہ جیسے معمولی ہدف سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن مگر کنفیوژنہوتو فرق پڑتا ہے۔ ۱۷۰ ہمیں میچ میں کامیاب کرنے والی ساجھے داریاں بنانی ہوں گی اور نفسیاتی قوت بہت ضروری ہے جس کی کمی محسوس ہوئی۔ کوہلی نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہاجب مخالف ٹیم فارم میں نظرآئے تواسے ایک اوور میں ۳ یا ۴ باؤنڈری لگانے سے روکنا چاہئے ایسے میں ہر اوور میں ۲۰ رن دینا حماقت تھی۔ اس وقت ہمیں سمجھداری سے کام لینا چاہئے تھا۔ کوہلی نے جس نا سمجھی کا مظاہرہ کھیل کے میدان میں کیا وہی غلطیمودی سرکار نے ایوان پارلیمان میں کی۔ حزب اختلاف نے خوب چوکے چھکے لگائےاور حکومت کو منھ کی کھانی پڑی۔ کوہلی نے تو درسِ عبرت سیکھ لیاہے اور اگر وہ اصلاح کرلے توآئندہ اپنی شکست کو کامیابی میں بدل سکتاہے لیکن مودی جی کے یہاں ابھی تک اس کے آثار نہیں نظرآتے۔

للت مودی کے بغیر کرکٹ کا بیان ویسا ہی ہے جیسے سیاست کے ذکر میں نریندر مودی

کی غیر موجودگی۔ للت مودی نے یوم آزادی کے دن انڈیا ٹوڈے کے راجدیپ سردیسائی سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ اس پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اس کو کوئی سمن نہیں ملا ۔اس نے انٹرپول سے بھی معلوم کیا اس کے خلاف کوئی ریڈ کارنر وارنٹ نہیں ہے۔ وہ تو محض انڈر ورلڈ کے خوف سے واپس نہیں آرہا ہے۔ یہ سب کہنے کے بعد اس نے کہا کہ ہندوستان میں ایک زبردست کرکٹ مافیا سرگرم عمل ہے۔ سری نواسن اور راجیو شکلا کے علاوہ ارون جیٹلی بھی اس مافیا میں شامل ہیں۔یہ دعویٰ اگر درست ہے اور ارون جیٹلی مافیا کا حصہ ہے تو ان کو وزیر خزانہ کا اہم ترین قلمدان سونپنے والا اپنے آپ اس مافیا کا سربراہ ہو جاتا ہے۔

کرکٹ سے قطع نظر اس بار ۱۵ اگست ۲۰۱۵؁ کو وزیر اعظم نریندر مودی ’’ ایک عہدہ ایک پنشن ‘‘ کی تجویز کو منظور کرکے یوم آزادی کی تقریب کو یادگار بنا سکتے تھے لیکن افسوس کہ انہوں نے یہ سنہری موقع گنوا دیا۔ جنتر منتر پر گزشتہ دوماہ سے مظاہرہ کرنے والے سابق فوجیوں نے اس بار وزیر اعظم سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان لوگوں نے اپنے احتجاج کے مقام پر دیوہیکل ٹی وی نصب کروا رکھا تھا تاکہ وزیر اعظم کے اعلان کو براہِ راست سن کر بلاتاخیر جشن منائیں۔ اگر منظوری نہ سہی تاریخ کا اعلان بھی ہوجاتا تو جنتر منتر کا دھرنا جشن مودی میں بدل جاتا لیکن جب مظاہرین کو اندازہ ہوگیا کہ وزیر اعظم

ان کے ساتھ پھر سے دغا بازی کر رہے ہیں تو انہوں نے مودی جی کی زبان سے جئے ہند کا انتظار کئے بغیر ہی ٹی وی کو بند کردیا۔ سچ تو یہ ہے کہاس بار وزیر اعظم نے اپنی طویل اور بے مزہ تقریر سے نہ صرف سابق فوجیوں کو بلکہ پوری قوم کو بیزار کیا۔

اس مرتبہ جنتر منتر پر مظاہرہ کرنے والے سابق فوجیوں کو حیرت کا پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب دہلی پولس نے ۱۴ اگست کو ان کا خیمہ بزور قوت ہٹانے کی کوشش کی۔ اس دوران ایک ۸۴ سالہ سابق فوجی کی قمیض بھی پھٹ گئی۔ اس کے بعد کرن رجیجو نے مداخلت کرکے پولس کو منع کیا۔ اس توہین آمیز سلوک کے باوجود وہ بیچارے پر امید تھے مگر وزیر اعظم نے پھر سے وہی ۱۷ ماہ پرانا راگ الاپا کہ اصولی طور پر وہ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ بات چیت چل رہی ہے۔ بہت جلد کوئی فیصلہ ہو جائیگا۔ کسی بات کو اصولی طور پر تسلیم کرنے کے بعد اس پر عملدرآمد نہ کرنا بلکہ مدت کا تعین تک نہ کرنا اس امر کا اشارہ ہے کہ یا تو دعویٰ کرنے والا اپنی کمزوری کے سبب اقتدار میں ہونے کے باوجود اپنی مرضی کا مختار نہیں ہے یا پاکھنڈی ہے۔ مودی جی کے بارے میں دونوں ہی باتیں جزوی طور پر درست ہو سکتی ہیں۔ وزارتِ خزانہ ان کی سن کر نہیں دیتا اور وہ عوام کو بہلاتے پھسلاتے رہے م ہیں۔ مظاہرین نے یہاں تک کہا ہمیں یہ کہنے میں شرم آتی ہے کہ وہ جھوٹے ہیں اور ان کی نیت میں فتور ہے۔

مودی جی کی کمزوری ایوانِ پارلیمان کے مانسون اجلاس میں کھل کر سامنے آگئی ۔ بیس دنوں کے ہنگاموں میں وہ ایک منٹ کیلئے بھی وہاں نہیں پھٹکے اور راہل گاندھی کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ جس نے ہمیں شکست دی ہے اس میں دم ہے لیکن اب پتہ چل گیا ہے کہ دم نہیں ہے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ ۴۴ ارکانِ پارلیمان کے ساتھ ہم کریں گے لیکن ہم نے انہیں ڈرادیا ہے ، وزیراعظم ڈرپوک ہے۔ خود بی جے پی نے بھی اقتدار میں ہونے کے باوجود احتجاج کرکے یہ ثابت کردیا کہ وہ کمزور ہے ورنہ جس کے پاس اقتدار کی باگ ڈور ہو وہ بھلا احتجاجی جلوس کیوں اور کس کے خلاف نکالے ؟ احتجاج عام طور پر اپنے سلب شدہ حقوق کی بحالی کیلئے کیا جاتا ہے ۔ جو حکومت خود اپنے حقوق کے تحفظ سے قاصر ہے وہ بھلا دوسروں کو کیا تحفظ فراہم کرے گی اور سابق فوجیوں یا عام لوگوں کی دادرسی کیسے کرے گی؟

وزیراعظم نے ہندوستان کی عوام کو جس جدید لقب ''ٹیم انڈیا'' سے نوازہ ہے وہ فی الحال ٹیم وراٹ کوہلی سے زیادہ سنگین مسائل سے دوچار ہے۔ اس کا اندازہ یوم آزادی سے دو دن قبل میرٹھ کے اندر پیش آنے والے ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ۳۵ سالہ فوجی جوان وید مترا چودھری جب دودھ لینے کیلئے کر روہتا روڈ کی ایک دوکان میں گیا تو دیکھا کچھ شرپسند دوکان کے مالک کی بیٹی کو چھیڑ رہے ہیں۔ چودھری نے مداخلت کی تو آکاش نامی لڑکے نے اپنے ساتھیوں کو

بلایا اور وہ سب لاٹھی ڈنڈوں کے ساتھ وید مترا پر ٹوٹ پڑے۔ دو ن بعد یعنی یوم آزادی کے دن فوجی ہسپتال میں لانس نایک وید مترا چودھری نے دم توڑ دیا۔اس معاملے میں ۸ لوگوں کے خلاف نامزد شکایت درج ہوئی اس کے باوجود پولس آکاش، سنجو اور رتیش کو گرفتار کرنے پر اکتفاء کئے ہوئے ہے۔

اس واقعہ کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس میں مجرمین کے بجائے شاہدین خوفزدہ ہیں۔ دوکان کے مالک کا کہنا ہے اسے جوابی حملے کا خوف ہے۔ابھی تک پولس تحفظ فراہم نہیں کیا گیا ہے۔ پولس اپنا پلہّ جھاڑتے ہوئے اس دعویٰ کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ وہ فی الحال یوم آزادی کے بندوبست میں مصروف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی آزادی ہے کہ جس کی حفاظت کی جارہی ہے؟ وہ آزادی جس میں اپنے والد کو چائے دینے کیلئے آنے والی بیٹی کے ساتھ کھلے عام چھیڑ خوانی کی جاتی ہے؟اس کو روکنے والے فوجی کو ہلاک کردیا جاتا ہے؟مرنے والے فوجی کے بیوی بچوں کی دادرسی نہیں کی جاتی ؟ کیا ان سنگین مسائل کو ٹیم مودی صرف ''اسٹینڈ اپ اور اسٹارٹ اپ'' کے کھوکھلے نعروں اور نمائشی دوروں سے حل کرے گی یا ٹھوس اقدامات بھی کرے گی؟ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کہیں اسغیر سنجیدہ، بدعنوان اور کمزور ٹیم مودی سے ایسی توقع رکھنا خام خیالی تو نہیں ہے؟

ہاردک مل گیا مودی کو بھی مسانے سے

گجرات زلزلوں کی سرزمین ہے ۔ گاندھی کے اس دیس میں تقریباً ۳۰ سال تک (۳ سال کے استثناء کے ساتھ) کانگریس کی حکومت رہی ۔ ابتدائی دس سال اس نے پٹیل برادری کی خوب ناز برداری کی لیکن اس کے بعد شتریوں ، ہریجنوں ،ادیباسیوں اور مسلمانوں کو ملاکر اپنا ووٹ بنک قائم کیا۔ اس کے خلاف پٹیل برادری نے ۱۹۸۱ میں نونرمان نام کی زبردست تحریک چلائی اور کانگریس کو اقتدار سے بے دخل کردیا۔ یہ تحریک بظاہر ریزرویشن کے خلاف تھی لیکن اس کے نتیجے میں حکومت جنتا پریوار کی چمن بھائی پٹیل کے ہاتھوں میں آگئی جب وہ ابن الوقتی اور بدعنوانی کے دلدل میں جادھنسے تو پٹیل برادری نے بی جے پی کا رخ کیا اور کیشو بھائی پٹیل کے سرپر اقتدار کا تاج رکھ دیا۔ کیشو بھائی کو بھوج کا زلزلہ لے ڈوبا اور نریندر مودی کے بھاگ کھل گئے انہوں نے فرقہ واریت کی آگ کو ایسے ہوا دی کہ پٹیل سماج ذات پات کا فرق بھلا کر ان کا ہمنوا بن گیا۔ یہ جادو گزشتہ سال تک سرچڑھ کے بولتا رہا۔

مودی جی کو اس خطرے کا اندازہ تھا اس لئے وہ دہلی جاتے ہوئے آنندی بین پٹیل کو وزیراعلیٰ کی کرسی سونپ گئے تاکہ پٹیل برادری بھی خوش رہے اور اپنی

کرم بھومی پر ان کی سیاسی پکڑ بھی بنی رہے لیکن ہاردک پٹیل نے ۵۰ دن کے اندر نریندر مودی کے ۵۰ سال کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ اپنے دورِ اقتدار میں بھی مودی جی ۹ لاکھ لوگوں کی کوئی ریلی نہیں کرسکے جبکہ ہاردک پٹیل نے ان کے گڑھ احمد آباد میں یہ کارنامہ کردکھایا۔ اس پٹیل برادری نے جو نیویارک سے لے کر دبئی تک مودی کی تال پر کتھک کرتی تھی دن دہاڑے ان کو تارے دکھلا دیئے۔ اکتوبر میں جب مودی جی امریکہ جائیں گے تو پٹیل سماج کالے جھنڈوں کے ساتھ انکا استقبال کرے گا۔ گجراتی زبان میں ہاردک کے معنیٰ 'دل سے' کے ہوتے ہیں اور ہاردک نے اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے احمد آباد کے جلسے میں مودی جی کو ایسی ہاردک خواری کی کہ نتیش اور لالو تو کجا کیجریوال اور راہل گاندھی بھی پیچھے رہ گئے۔

مختلف اقسام کے زہر کو ملا کر اگر مرکب بنایا جائے تو اس کا تریاق مشکل ہوجاتا ہے۔ ۲۲ سالہ ہاردک پٹیل ایکایسا ہیایک چھلاوہ ہے جس کے آگے مودی جی بے بس ہیں اور اس سے ہاتھ جوڑ کر گزارش کررہے ہیں تشدد سے کسی کا بھلا نہیں ہوگا۔ امن قائم رکھیں۔ مودی جی کے منھ سے یہ اپدیش اچھے نہیں لگتے اس لئے کہ تشدد سے خود انہوں نے جتنا فائدہ اٹھایا ہے شاید ہی کسی اور نے اٹھایا ہوگا۔ ہاردک کے والد بی جے پی کے رکن ہیں۔ وہ خود کسی زمانے میں کانگریس سیوادل میں تھا۔ وہاں سے بغاوت کرکے اس نے ولبھ بھائی پٹیل سیوادل قائم

کرلی۔ گزشتہ پارلیمانی انتخاب میں وہ کیجریوال کی عاپ کا ہمنوا بن گیا اور اب ریزرویشن کی حمایت میں ایک عوامی تحریک برپا کرکے مودی جی کو چیلنج کردیا کہ اگر ہمارے مطالبات تسلیم نہیں کئے گئے تو ۲۰۱۷ء کے اندر گجرات میں کمل نہیں کھلے گا۔ ہاردک نے کہا تو نہیں لیکن اس بات کا امکان ہے کہ آئندہ انتخاب میں گجرات کے اندر بھی دہلی کی طرح جھاڑو چلے گا اور بی جے پی کا سپڑا صاف ہو جائیگا۔ اس لئے کہ ہاردک کے بقول پٹیل سماج حکومت بنانا تو جانتا ہے مگر سرکار گرانا بھی جانتا ہے۔

گزشتہ دوماہ سے جاری اس احتجاج میں ۸۰ مظاہرے ہوئے لیکن سب کے سب پرامن تھے۔ احمدآباد میں آنے کے بعد ہاردک کو حراست میں لیا گیا اور اسی کے ساتھ یہ پرتشدد ہوگیا ہے۔ حکومت نے اقدام کیوں کیا اس کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ آتش زنی کے بعد لاٹھی چارج ہوا اور کرفیو لگا دیا گیا۔ اس سے قبل ہاردک پٹیل کو بہلانے پھسلانے کیلئے وزراء کی ایک مجلس سے بات چیت کیلئے بلایا گیا اور مظاہرہ رد کرنے کی اپیل کی گئی مگر وہ اس جھانسے میں نہیں آیا۔ اس کے بعد پولس نے اس سے کہا کہ وہ ڈی ایم کو اپنا میمورنڈم دے کر مظاہرہ ختم کرے۔ ہاردک جب ڈی ایم کے دفتر کی جانب چلا تو ۶۰ ہزار لوگ اس کے ساتھ ہولیے۔ انتظامیہ کو توقع تھی کہ ہاردک میمورنڈم دینے کے بعد اپنے گھر جاکر سوجائیگا لیکن ہاردک وہیں دھرنے پر بیٹھ گیا اور ایک ایسا مطالبہ

کرڈالا جس نے سرکار کی نیند اڑادی۔ اس نے کہا کہ وزیراعلیٰ آنندی بین پٹیل خود ۴۸ گھنٹے کے اندر آکر میمورنڈم وصول کریں ورنہ وہ غیر میعادی بھوک ہڑتال پر چلا جائے گا۔ آنندی بین اسے اپنے پاس بلانے کے بجائے ڈی ایم کے پاس روانہ کرنے کی غلطی تو پہلے ہی کرچکی تھیں اب ایک نئے جال میں پھنس گئیں۔ میمورنڈم لینے کیلئے جانے سے ناک کٹتی تھی اور نہیں جانے کے نتیجے میں تشدد کا خطرہ تھا۔

نریندر مودی کے اشارے پر چلنے والی آنندی بین نے وہی کیا جس کی توقع تھی ۔ انہوں نے مصالحت کے بجائے مزاحمت کا راستہ چنا اور اپنے پیروں پر کلہاڑی مارلی ۔ یہ ایک تحقیق کا موضوع ہے کہ ۵۰ دنوں تک پرامن چلنے والا احتجاج اچانک پرتشدد کیسے ہوگیا؟ کوئی بعید نہیں کے یہ اسے بدنام کرکے اس پر پولس ایکشن کو جائز قرار دینے کی سازش کا نتیجہ ہو۔ برما کے مسلمانوں کی خاطر ممبئی میں ہونے والے مسلمانوں کے مظاہرے کو بدنام کرنے کیلئے مٹھی بھر شرپسندوں کی مدد سے جو کھیل کانگریس نے کھیلا وہ بی جے پی بھی کھیل سکتی۔ مہاراشٹر میں کانگریس مسلمانوں کی اسی طرح احسانمند تھی جیسے کہ گجرات میں بی جے پی والے پٹیل سماج کے ہیں اور جس سیاست میں احسان فراموشی نہ ہو اسے جمہوری کہلانے کا حق ہی نہیں ہے۔ اب یہ حال ہے کہ ہاردک حراست میں ہے۔ بڑودہ اور احمدآباد میں انٹرنیٹ تو کجا فون لائن تک بند ہے۔

گجرات پھر ایک بار جل اٹھا ہے۔ یہ آگ کہاں تک پھیلے گی یہ کوئی نہیں جانتا۔ گجرات کی راجدھانی سمیت ۱۲ سے زیادہ شہر تشدد کا شکار ہیں ۔ ۱۲۵ گاڑیوں کے جلائے جانے کی خبر ہے۔ ۱۶ پولس تھانوں کو آگ لگائی جاچکی ہے۔ مہسانہ ضلع جہاں سے مودی ، امیت شاہ اور آنندی بین کا تعلق ہے سب سے زیادہ متاثر ہے ۔ یہاں پر وزیر مملکت امورِ داخلہ رجنی پٹیل کے گھر کو لوگوں نے پھونک دیا اور کئی وزراء کے گھر اور دفاتر جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔ مودی کے حلقۂ انتخاب بڑودہ کے بی جے پی رکن اسمبلی اور رکن پارلیمان دونوں کو جلا کر ان کو آئینہ دکھلا دیا گیا ہے۔ گاندھی نگر سمیت کئی شہروں میں کلکٹر اور ایس پی کے دفتر کو آگ لگا دی گئی ہے۔ ان مقامات پر آگ زنی سے قبل آگ بجھانے والے دستوں کے دفاتر کو بھیڑ نے گھیر لیا تاکہ وہ اپنا کام نہ کرسکیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ مودی جی کی فراہم کردہ تربیت کا استعمال پٹیل سماج بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ خود ان کی حکومت کے خلاف کر رہا ہے۔ کئی شہروں میں ریل گاڑی کی پٹریوں کو اکھاڑ دیا گیا ہے۔ پٹیل نوجوان ہاردک کے اس دعویٰ کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں کہ اگر ہمیں اپنا حق نہیں دیا گیا تو ہم اسے چھین لیں گے۔ ہاردک نے یہ بھی کہا کہ ہم گاندھی اور پٹیل کے وارث ہیں لیکن اگر بھگت سنگھ بن گئے تو راون کی لنکا کو آگ لگا دیں گے اور سچ تو یہ ہے مودی جی بھی راون کی مانند بے یارومددگار اپنی لنکا کو جلتا ہوا دیکھ رہے ہیں ۔

ہاردک کے مطابق پٹیلوں کی آبادی گجرات میں تو دو کروڑ سے کم ہے مگر ملک بھر میں وہ کروڑ ہیں ۔ اس کے مطابق ایوانِ پارلیمان میں ۱۷۰ ارکان کا تعلق پٹیل سماج سے ۲۷ ہے۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ نائیڈو اور نتیش بھی پٹیل ہیں ۔این ڈی اے کے اندر فی الحال پٹیلوں کی دو سیاسی جماعتیں اپنا دل اور راشٹریہ سمتا پارٹی شامل ہیں لیکن اس نے ان کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے ہاردک پٹیل اپنے مہا کرانتی مظاہرے میں بندوق کے ساتھ آیا تھا اور اس نے اعلان کیا کہ اگر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کیلئے نوجوان سڑکوں پر آجائے اور پھر اسے اپنے حقوق نہ ملیں تو ان میں سے کچھ نکسلوادی اور کچھ دہشت گرد بن جائیں گے۔ نکسلواد اور دہشت گردی کو اس طرح ببانگِ دہل وجہِ جواز فراہم کرنے کیلئے ہاردک پٹیل مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ بابری مسجد سے لے کر گجرات کے فسادات تک ہر دہشت گردی کو سنگھ پریوار عوامی جذبات کا بے ساختہ اظہار قرار دے کر جائز قرار دیتا رہاہے لیکن اب ہاردک پٹیل نے کانٹے سے کانٹا نکالا ہے۔

ہاردک پٹیل کے مطالبات کو منظور کرلینا بی جے پی کیلئے بہت آسان نہیں ہے۔ گجرات میں سرگرم عمل شتریہ ٹھاکور سینا نے اس مطالبے کی مذمت ہوئے کہا کہ اگر پٹیل ۱۲ فیصد ہیں تو ہم ۷۸ فیصد ہیں اگر حکومت نے پٹیلوں کو ایک فیصد

ریزرویشن بھی دیا تو ۲۰۱۷ دور کی بات ہے ہم اسی سال حکومت کو اکھاڑ دیں گے۔
حکومت کی نیت پر شک کرتے ہوئے الپیش ٹھاکور نے کہا ممکن ہے حکومت اس بہانے سے ریزرویشن ختم کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان عمومی ذات (یعنی نام نہاد اعلیٰ ذات) کے لوگوں نے مسلمانوں کو ہمارا دشمن بنا کر پیش کیا اور پسماندہ سماج کو ان سے لڑا دیا لیکن اب ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ مسلمان بھی پسماندہ ہیں۔ وہ ہم میں سے ہیں۔ ہمیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ہمارے اصل دشمن وہ لوگ ہیں جو ہم سے اپنا ریزرویشن کا حق چھین لینا چاہتے ہیں۔
ہاردک پٹیل ایک حقیقت پسند نوجوان ہے۔ اسے پتہ ہے کہ ریزرویش کے خلاف چلنے والی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ہندو معاشرے کی بنیاد ذات پات پر ہے اور تمام سیاسی جماعتیں ذات پات کی سیاست کھیلتی ہیں۔ ایسے میں دوسروں کو ریزرویشن سے محروم کرنے کیلئے ہاتھ پیر مارنے کے بجائے خود بھی اس سے فائدہ اٹھانا بہتر متبادل ہے۔ پٹیل برادری کی جانب سے ریزرویشن کے مطالبے نے مودی جی کے گجرات ماڈل کی قلعی کھول دی ہے۔ اگر پٹیل بھی پسماندہ ہیں تو آخر گجرات میں ترقی کس نے کی ہے؟ کیا صرف اڈانی، امبانی، ٹاٹا اور برلا کی خوشحالی پورے گجرات کے ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے۔ پٹیل سماج اگر واقعی میں خوشحال ہوتا تو اس تحریک کو ایسی پذیرائی نہیں ملتی۔ یہ تو اندر

ہی اندر پکنے والے آتش فشاں کا اچانک پھٹ جانا ہے۔ اس لاوے کو طویل عرصے تک پروپگنڈا کے فریب سے مودی جی نے ڈھانپے رکھا۔

پٹیل بنیادی طور پر کاشتکار لوگ ہیں ۔ ان لوگوں نے زراعت سے جو کچھ کمایا اسے چھوٹے اور اوسط درجے کی صنعتوں میں لگایا لیکن مودی جی کے ترقی پذیر گجرات نے جب اپنی توجہات بڑی بڑی صنعتوں کی جانب مرکوز کردی تو یہ لوگ نظر انداز ہوگئے۔ ریزرو بنک کے اعداد و شمار کے مطابق گجرات کے چھوٹے اور اوسط درجے کی کل دو لاکھ ہزار اکائیوں میں سے ۴۸ ہزار بیمار ہیں ۔ اس کے باوجود مودی جی کو بہار تو بیمار و ۶۱ نظر آتا ہے گجرات نہیں۔ ان صنعتوں میں ۲۱ لاکھ لوگ ملازمت کرتے ہیں جن میں بڑی تعداد پٹیل برادی کی ہے اور ان میں سے اکثر بے روزگار ہو چکے ہیں ۔ سورت میں ہیروں کا کاروبار پٹیل برادی کے ہاتھ میں ہے لیکن پچھلے ۶ ماہ سے وہاں مندی چھائی ہوئی ہے اس لئے تقریباً ۱۵۰ کارخانے بند ہوگئے جس کے سبب ۱۰ ہزار لوگوں کو ملازمت گنوانی پڑی۔ سورت میں ہاردک پٹیل کی ریلی میں جو ۵ لاکھ افراد شریک ہوئے تھے اس کے پیچھے یہی عوامل کارفرما تھے۔ ہاردک کے مطابق اب تک گجرات میں ۶۰۰۰ ہزار کسان خودکشی کرچکے ہیں مگر اب اگر ایک بھی کسان مرے گا تو سارا ملک اس کی قیمت چکائے گا۔ یہ زمینی صورتحال ہے جس نے پٹیل سماج کو سڑکوں پر اترنے کیلئے مجبور کردیا ہے۔

سیلفی ماسٹر مودی جی اور ان کے بھکتوں کو کریڈٹ لینے کا خبط سوار ہے اس لئے گزشتہ ہفتے تک کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے پائے گئے کہ آنندی بین پٹیل کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی خاطر یہ مودی کی سازش ہے۔ اگر آنندی بین بھی شیوراج چوہان یا وجئے راجے سندھیا کی طرح مضبوط رہنما ہوتیں جنھوں نے دو مرتبہ اپنے بل بوتے پر غیر معمولی انتخابی کامیابی درج کروائی تو یہ بات معقول لگتی لیکن آنندی بین کے نامزد کئے جانے تک کسی ان کا نام بھی نہیں سنا تھا اور پھر اس گجرات میں جہاں مودی جی نے اپنے وفادار ایک سے ایک خطرناک پولس افسر کو جیل سے نکال کر اہم عہدوں فائز کر رکھا ہے نیز سنجیو بھٹ جیسے افسران کو ٹھکانے لگا دیا ہے کسی بھی رہنما کو ہرین پنڈیا کے انجام سے دوچار کردینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ پہلے کم از کم سی بی آئی کی تفتیش میں کچھ حقائق سامنے آجاتے تھے لیکن اب تو اس کا امکان بھی مفقود ہوچکا ہے اس لئے آنندی بین کو گھر بھیجنے کیلئے کسی تحریک کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ ایک ہلکا سا اشارہ کافی ہے۔

کائنات ہستی میں گمراہ انسان پرجب مشیت کی نوازشیں ہوتی ہیں تو اس کے اندر جذبۂ تشکر کے بجائے کبر و نخوت جنم لیتا ہے۔ حکمرانوں کا ظلم طغیان جب اپنی حدوں سے گزر جاتا ہے تو مشیت اپنے انوکھے انداز میں اس سے انتقام لیتی ہے۔

اپنے دور کے سب بڑے بت ساز و بت پرست کے گھوارے میں عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا بت شکن ابراہیمؑ خلیل اللہ پیدا ہوتے ہیں۔ فرعون کی فرعونیت کے خاتمے کیلئے اٹھنے والے موسیٰ کلیم اللہ کی پرورش کا انتظام فرعون کے محل میں کردیا جاتا ہے۔ شاید ایسا ہی کچھ ہمارے ملک میں ہونے جارہا ہے مودی جی کا توڑ پیدا کرنے میں جب ساری ریاستیں ناکام ہوگئیں تو خود ان کے اپنے گجرات میں ہاردک پٹیل نے جنم لیا اور ان کے گورکھ دھندے کو ملیا میٹ کردیا۔ یہی بات قرآنِ عظیم میں کچھ اس طرح سے بیان ہوئی ہے کہ ’’اور اگر خدا ایک گروہ کا دوسرے گروہ کے ذریعہ سے دفاع نہ کرے تو زمین تباہ و برباد ہو جائے۔ مگر خدا تمام جہانوں پر بڑا لطف و کرم کرنے والا ہے۔ (البقرہ ۲۵۱)‘‘

گجرات سے نیپال تک آگ اور خون کی ہولی

نیپال کو اگر ہندو راشٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہے تو گجرات کو کم از کم ہندو راجیہ تو کہا ہی جاسکتا ہے۔ ویسے گجرات کو بجا طور پر ہندوتوا کی تجربہ گاہ بھی کہا جاتا ہے حالانکہ راجستھان کی اسمبلی میں بی جے پی کے ارکان کا تناسب گجرات سے زیادہ ہے۔ خیر کسی بھی تجربہ گاہ میں بننے والی ادویات کے بارے میں سائنسداں یہ نہیں جانتے کہ اس سے کون لوگ استفادہ کریں گے۔ جن تجربہ گاہوں میں زہر تیار کیا جاتا ہے اس کے متعلق بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس کے خلاف استعمال ہوگا۔ اسلحہ کی مثال ہمارے سامنے ہے کلاشنکوف روس کی ایجاد ہے مگر مجاہدین اسلام نے افغنستان اس کا بہترین استعمال روس کے خلاف کیا۔ ناٹو کا اسلحہ چھین کر اس کے خلاف استعمال کئے جانے واقعات بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ دنیا اس میں آنے والوں کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ اس کے بنانے والے کی مرضی سے چلتی ہے۔ ۱۳ سال قبل رونما ہونے والے گجرات فساد کے مندرجہ ذیل عوامل حالیہ انتشار کے پیچھے مختلف انداز میں کارفرما ہیں:

- عوام کا نفرت و عناد
- انتظامیہ کا امتیازی سلوک
- ریاستی حکومت کا سیاسی مفاد

مرکزی حکومت کی چشم پوشی ○

نفرت و عناد: پٹیل سماج کے اندر دیگر پسماندہ ذاتوں کے تئیں بغض و عناد بہت پرانا ہے۔ راہل گاندھی نے اپنے ردعمل میں یہی بات کہی ہے کہ موجودہ انتشار مودی جی کی نفرت انگیز سیاست کا یہ نتیجہ ہے۔ راہل کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس موقع پر نہ تو پٹیل احتجاج کی مخالفت کرسکتے ہیں اور نہ حمایت۔ راہل یہ چاہتے ہیں کہ یہ آگ پھیلے اور مودی کے قلعہ کو خاکستر کرے لیکن وہ اس کی حمایت کرکے اپنے رائے دہندگان کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے۔ بی جے پی حکومت کی مانند کانگریس کے حامی بھی اس احتجاج کے مخالف ہیں یہی وجہ ہے کہ ایوان اسمبلی میں کانگریس کے رہنما شنکر سنگھ واگھیلا نے نفس مسئلہ پر کلام کرنے کے بجائے مظاہرین پر قابو پانے میں ریاستی حکومت کی ناکامی کو آڑے ہاتھوں لے کر وزیراعلیٰ کے استعفیٰ کا مطالبہ کردیا۔

پٹیل سماج کو حبِ علی نے نہیں بلکہ بغض معاویہ نے بی جے پی کا حامی بنایا تھا لیکن صرف ان کے بل بوتے پر حکومت سازی ممکن نہیں تھی اس لئے بی جے پی نے دیگر پسماندہ طبقات کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرکے انہیں اپنا ہمنوا بنایا۔ فرقہ پرستی کی آگ نے عارضی طور پر ذات پات کی تفریق کو مٹا دیا لیکن اب ایک بار پھر وہ بھڑک اٹھی ہے۔ یہی وجہ ہے ابھی تک تشدد کی آنچ

پر سیاسی روٹیاں سینکنے والی بی جے پی امن وامان کا راگ الاپنے لگی ہے۔ جب تک اس آگ سے مسلمانوں کے گھر جلتے تھے اور ان کے محل تعمیر ہوتے تھے تب تک تو یہ لوگ اس ہندوتوا کا نور قرار دے رہے تھے اب جبکہ ان شعلوں کی زد میں ان کا اپنا قتدار آگیا ہے یہ فساد کے علمبردار امن کے پیغامبر بن گئے ہیں۔

اس صورتحال میں اگر پٹیل برادری بھی یادو سماج کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی منفرد سیاسی جماعت بنالے تو بی جے پی ، کانگریس اور اس نئی علاقائی جماعت کے ووٹ کا تناسب یکساں ہوجائیگا اور گجرات میں بی جے پی کے بلاشرکت غیرے اقتدار کا چراغ بجھ جائیگا۔ ساری سیاسی جماعتوں کو گجرات کے تجربے سے یہ سبق سیکھ لینا چاہئے کہ نفرت وعناد ایک دودھاری تلوار ہے۔ اس کی آگ ہوا کے رخ میں تبدیلی کے سبب مختلف سمتوں میں پھیل سکتی ہے۔ گجرات کا مسلمان حیرت سے ان لوگوں کے گھروں کو جلتا دیکھ رہا ہے جو کل تک سرکاری تحفظ میں ان کے گھر جلاتے تھے ۔ قدرت کا انتقام شاید اسی کا نام ہے۔

انتظامیہ کا معاندانہ رویہ: فرقہ وارانہ فسادات عام طور پر سیاسی سرپرستی میں انتظامیہ یعنی پولس نااہلی کے سبب رونما ہوتے ہیں ۔ بسا اوقات پولس فسادیوں کے شانہ بشانہ آگ اور خون کے اس کھیل میں شریک بھی ہوجاتی ہے۔ پولس کی بے اعتنائی کی وجہ اس میں شاملمسلمانوں سے نفرت کرنے والے کٹر ہندو

عناصر ہوتے ہیں۔ چونکہ فوج مقامی پولس کے مقابلے غیر جانبدار ہوتی ہے اس لئے مسلمان کی تعیناتی کا مطالبہ کرتے ہیں،اور یہ حقیقت بھی ہے کہ گوج کی آمد کے بعد اکثر حالات قابو میں آجاتے ہیں۔ مسلمانوں کے اس جائز مطالبے کو یہ کہہ کر مسترد کردیا جاتا ہے کہ اس سے پولس فورس کا مورل ڈاؤن ہوجائیگا۔ اگر ایسا ہے تو اس بار گجرات میں ہزار پولس والوں کے ہوتے ہوئے فوج کو کیوں زحمت دی گئی اور فلیگ مارچ ۳۰ کیوں کیا گیا؟ دیگر ریاستوں میں یہ تماشہ اس وقت کیا جاتا ہے جب چڑیا کھیت چگ چکی ہوتی ہے لیکن گجرات میں جہاں اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا تھا دوسرے ہی دن فوج تعینات کردی گئی۔

گجرات کے اندر گوج کی تعیناتی کا یہ جواز پیش کیا گیا کہ پولس فورس میں پہلے بھی پٹیل کم تھے۔ حالیہ دنوں میں جو بھرتی ہوئی ہے اس میں ریزرویشن کے چلتے دیگر ذاتوں کے تناسب میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ان لوگوں کے دلوں میں پٹیل سماج اور اس احتجاج کے خلاف نفرت ہے اس لئے جس قدر طاقت کا استعمال کرنے کیلئے کہا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ ہوا۔ پولس افسران نے خود اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اس الزام کی تحقیق کا حکم دیا ہے۔شاہی باغ کے علاقے میں پولس کی جانب سے کی جانے والی توڑ پھوڑ کی ویڈیو بھی لوگوں نے ہندوستان ٹائمز کے حوالے کی ہے۔ گجرات کی تقدس مآب پولس (جس کے بدنام افسران ایک کے بعد ایک قتل وغارتگری کے سنگین الزامات سے.بری ہو کر اپنے

عہدوں پر فائز ہو رہے ہیں) اب تحقیق و تفتیش کا نشانہ بنے گی۔ان کے خلاف کارروائی ہوگی بھی نہیں؟اور ہوگی بھی تو کیا؟ یہ وقت ہی بتائے گا لیکن پٹیل سماج کی دلجوئی کیلئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا اس لئے وہ مسلمان تو ہیں نہیں کہ بھول کر بی جے پی کو ووٹ نہیں دیتے وہ تو معزز زعفرانی رائے دہندگان ہیں وزیراعلیٰ کے ذات بھائی بھی ہیں۔
پولس کارروائی کے بعد ہاردک پٹیل نے جو بیان دیا اسے پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ کسی شعلہ بیان مسلم رہنما کا خطاب ہو۔اس نے کہا ہم تشدد نہیں چاہتے تھے مگر یہ سب پولس کے نوجوانوں کو پیٹنے کے سبب ہوا ہے۔ ہم پرامن تھے مگر پولس نے ہمارے ساتھ دہشت گردوں کا سا سلوک کیا۔ ہم دہشت گرد نہیں ہیں۔ ہاردک نے یہ بھی کہاکہ پولس نے خواتین پر لاٹھیاں برسائیں انہوں نے رات ساڑھے گیارہ بجے ہمارے گھروں میں گھس کر ہمیں پیٹا۔ ہاردک پٹیل سے مسلمان یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا مودی جی کے آدرش گجرات میں یہ پہلی بار ہوا ہے؟ گجرات پولس کو تو یہی تعلیم دی گئی ہے کہ جو بھی حکومت کا دشمن ہے وہ دہشت گرد ہے۔ پٹیل چونکہ اس بار حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں تو لامحالہ اس سلوک کے مستحق بن گئے۔ اگر پٹیل سماج اس سے قبل مسلمانوں کے خلاف اس معاندانہ رویہ کی مخالفت کرتا تو آج مسلمانوں کو اپنے ساتھ پاتا لیکن ہمارے ملک میں مظلومین ایک دوسرے کی حمایت نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی

حلات زار پر بغلیں بجاتے ہیں۔ شاید اسی لئے باری باری سے ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔

ریاستی حکومت کا سیاسی مفاد: جی ایم ڈی سی گراؤنڈ پر تعینات تمام پولس کی معطلی کا مطالبہ کرنے بعد ہاردک پٹیل نے الزام لگایا کہ وہ اپنے سیاسی آقاوں کے اشارے پر تشدد میں ملوث ہوکر ہماری تحریک کو پٹری سے اتار رہی ہے۔ پولس ریاستی یا مرکزی حکومت کے اشارے پر ہمارے خلاف کارروائی کررہی ہے۔ ہاردک کے مطابق چونکہ گجرات کی حکومت کو اس بات کا خوف تھا کہ ہمارے تحریک ذرائع ابلاغ پر چھا جائیگی اس لئے انہوں ہمیں اکسا کر بدنام کرنے کیلئے یہ اقدام کیا لیکن میں گجرات کو پولس کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر ایک بھی پٹیل کے بیٹے کو مارا پیٹا گیا تو اس کیلئے پولس اور ریاستی سرکار ذمہ دار ہوگی۔ہاردک نے کہاگاندھی، پٹیل اور نہرو کے راستے پر چل کر بہت دیکھ لیا لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جو ریاستی وزیرِ داخلہ اپنا گھر نہ بچا سکا وہ دوسروں کی کیا حفاظت کرے گا؟ یہ بہت اچھی منطق ہے کہ پہلے کسی کا گھر جلاو اور پھر اسی کو موردِ الزام ٹھہراو۔ اس سے پہلے یہی کھیل ریاستی حکومت مسلمانوں کے ساتھ کھیلتی تھی کہ ان کے اوپر ہونے والے مظالم کا الزام انہیں کے سر منڈھ دیا جاتا تھا اب یہ خود اس کے ساتھ ہورہا ہے۔

بی جے پی کے مقامی رہنما بھی اب اپنی ریاستی حکومت کی اس حماقت پر نادم و شرمسار ہیں۔ ان کے خیال میں اگر ہاردک پٹیل کو گرفتار کرنا ضروری بھی تھا تو اس میں اس قدر جلدی مچانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات کسی بھی معمولی عقل کے انسان کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس دن ہاردک کے ساتھ ۶۰ ہزار لوگ تھے جو دو دن بعد یقیناً ۶ ہزار سے بھی کم ہوجاتے ۔ اس وقت اس کو حراست میں لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن یہ تو اسی وقت ممکن تھا جب آنندی بین ٹھنڈے دماغ کے ساتھ اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرتیں لیکن وہ بیچاری بھی کیا کرے ؟ اس کے پاس اپنی کرسی بچانے کیلئے دہلی میں بیٹھے ہوئے پیر مغاں کی بے چوں چرا فرمانبرداری کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ اس سوال پر غور ہونا چاہئے کہ دہلی والوں نے ایسا حماقت خیز مشورہ کیوں دیا؟

مرکزی حکومت کی چشم پوشی: یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ۱۳ سال قبل جب گجرات میں فساد ہوا تھا اس وقت بھی مرکز میں بی جے پی برسرِ اقتدار تھی اور اس بار بھی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اس وقت کا وزیراعلیٰ اب وزیر اعظم بن چکا ہے۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے فسادات کے بعد گجرات کا دورہ کیا تھا اور بھری مجلس میں وزیراعلیٰ نریندر مودی کو راج دھرم پالن کرنے کی تلقین کردی تھی۔ سنا ہے وہ مودی جی کو ہٹانے کی تیاری کرچکے تھے مگر مہاجن اور جیٹلی کے مشورے پر مودی نے ازخود استعفیٰ دے دیا اور وہمودی کے بجائے استعفیٰ کی

مخالفت کرنے لگے۔ اڈوانی جی کی مداخلت نے مودی جی کی نیا پار لگادی ۔ اس بار مودی جی نے بھی حالات سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان کے بگڑنے کا انتظار کیا اور دوسرے دن اپنے پیچھے پٹیل اور گاندھی کی تصویریں سجا کر دہلی میں بیٹھے بیٹھے ایک بیان نشر کردیا۔ احمدآباد آنے کی ہمت وہ نہیں جٹا پائے۔ ویسے یہ ان کا پہلا بیان ورنہ اپنے دور اقتدار میں یا اس سے قبل انہوں نے کبھی اس طرح کی صورتحال میں امن و شانتی کی تلقین نہیں کی۔

مرکزی حکومت کی جانب سے اس بار جس ناقص العقلی کا مظاہرہ ہوا اس کی وجہ جاننے کیلئے احتجاج والے دن وزیر داخلہ اور وزیر اعظم کی مصروفیات پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہے۔ صبح ساڑھے دس بجے جب احمدآباد میں لاکھوں لوگ جمع ہوچکے تھے دہلی میں وزیر اعظم اور وزیر داخلہ چندرا بابو نائیڈو سے بات چیت کر رہے تھے ۔ دوپہر ایک بجے ہاردک پٹیل مظاہرین کو بھگت سنگھ کے راستے کی تلقین کر رہے تھے تو وزیر اعظم نیپال کے وزیر اعظم کوئرالا کے ساتھ وہاں کی صورتحال پر گفتگو کر رہے تھے اور انہیں حالات کو قابو میں رکھنے کے گرُ سکھلا رہے تھے ۔ شام ساڑھے تین بجے پٹیل سماج کے لوگ ریاستی حکومت کے خلاف جارحانہ منصوبہ بندی کر رہے تھے تو اس وقت دہلی میں راجناتھ سنگھ اپنے گھر پر پارٹی اور سنگھ رہنماوں کے ساتھ بہار کی انتخابی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ گجرات سے رابطہ تو کیا لیکن مظاہرے کا معمولی ذکر ہوا۔

اس بابت خفیہ ایجنسیوں نے جو معلوماتفراہم کی تھیں انہیں نظرانداز کیا گیا اور رات میں داخلہ سکریٹری سے رپورٹ طلب کرنے کے بعد ۶۰۰۰ مرکزی حفاظتی دستہ اور فوج روانہ کی گئی لیکن اس وقت تک ۱۰۰ مقامات پر تشدد کے واقعات رونما ہوچکے تھے اور ۳۵۰۰ ہزار کروڑ سے زیادہ کی املاک کا نقصان ہوچکا تھا۔

نیپال کی طرح گجرات کو ہندو راجیہ اس لئے بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہاں کی برسر اقتدار جماعت نے پچھلے ۱۵ سالوں سے اپنی ریاست میں موجود سب سے بڑی اقلیت کے کسی آدمی کو وزیر بنانا تو درکنار اسمبلی الیکشن کا ٹکٹ دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اتفاق سے نیپال اور گجرات ایک ہی وقت میں تشدد کا شکار ہوئے۔ نیپال میں فی الحال دستور سازی کا عمل جاری ہے اور مختلف صوبوں کی تنظیم نو کی جارہی ہے۔ اس کے چلتے ہندوستان کی سرحد سے متصل میدانی علاقوں کے تھارو قبیلے کے لوگ اس بات کو لے کر خفا ہیں کہ کائیلالی اور کنچن پور ضلعوں کو تھاروہاٹ صوبے میں شامل نہیں کیا گیا۔ حکومت کے اس فیصلے خلاف وہاں کے لوگوں نے مظاہرہ کیا جس میں ۲۰ لوگ ہلاک ہوگئے اور ۱۰۰ سے زیادہ زخمی ہوگئے۔ ویسے تو یہ نیپال کا داخلی معاملہ ہے اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مودی جی کو اس پر بیان دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

نیپال کے نائب وزیراعظم اور وزیرداخلہ بام دیو گوتم نے تشدد کے واقعات پر

تبصرہ کرتے ہوئے ایوانِ پارلیمان میں یہ بیان دے دیا کہ تشدد کے ان واقعات میں غیر ملکی لوگ ملوث ہیں۔ان کے مطابق یہ غیر ملکی سازش کا حصہ ہیں۔ اپنے دعویٰ کی دلیل میں بام دیو نے ہتھیار بند پولس ہیڈ کانسٹبل کے زندہ جلائے جانے اور ایس ایس پی کو بھالوں سے چھلنی کرنے کی وارداتوں کو مثال کے طور پر پیش کیا۔ یہ ایک قابل ذکر فرق ہے کہ گجرات کے برعکس جہاں ۸ مہلوکین میں سے صرف ایک پولس اہلکار ہے نیپال کے ۲۰ میں سے ۱۷مرنے والوں کا تعلق پولس کے دستے سے ہے۔ نیپال کے نائب وزیراعظم کا یہ بیان وزیراعظم مودی پر گراں گذرااور وہ اپنی ریاست کو بھول کر پڑوسی ملک کی جانب متوجہ ہوگئے۔ ذرائع کے مطابق مودی جی نے نیپالی رہنماوں کو اپنے داخلی مسائل میں ہندوستان کو بلاوجہ گھسیٹنے سے گریز کرنے کی تلقین کی۔ اس سے پہلے پاکستان کی حکومت ہندوستان پر مداخلت کےاور اپنے گھریلو مسائل سے توجہ ہٹانے کیلئے اس کو موردِ الزام ٹھہرانے کاالزام لگاتی رہی ہے اب وہی کچھ نیپالکے خلاف ہندوستان کررہاہے۔

مودی جی نے نیپال کی صورتحال پر تشویش کااظہار کرنے کے بعد وہاں پر مرنے والوں کیلئے تعزیت پیش کی لیکن گجرات کی صورتحال پرانہوں سے صرف امن کی تلقین پر اکتفاء کیا کسی تشویش کااظہار نہیں کیااور نہ مہلوکین کے ساتھ ہمدردی کااظہار کیااگر مظاہرین نہ سہی تو کم از کم پولس والے کے بارے میں

چھوٹے منھ دو بول کہہ دیتے۔ انہوں نے وزیر اعظم کوئرالا سے کہا کہ ۵ یا ۱۰ لوگ کسی کمرے میں بیٹھ کر دستور سازی نہیں کر سکتے ۔ تمام متعلقہ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو ہونی چاہئے تاکہ سیاسی اور سماجی استحکام بحال کیا جاسکے ۔ اگر یہی مشورہ مودی جی آنندی بین کو دیتے کہ ہاردک کو حراست میں لینے کے بجائے اس کے ساتھ گفت و شنید کرو یا اسے میرے پاس بھیجو میں اس سے بات کروں گا تاکہ سماجی خیر سگالی آئے تو یہ ہنگامہ کیوں ہوتا؟ دراصل دوسروں نصیحت کرنا جس قدر آسان ہے خود اس پر عمل کرنا خاصہ مشکل ہے۔ ہاردک پٹیل تو خیر بہت دور گجرات میں تحریک چلا رہا ہے نیپال کے وزیر اعظم کو مل بیٹھ کر گفتگو کرنے کا پروچن دینے والے وزیر اعظم کو ۱۵ جون سے احتجاج کرتے ہوئے تھک ہار کر غیر میعادی بھوک ہڑتال کرنے والے سابق فوجیوں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنے کی توفیق بھی ابھی تک نہیں ہوئی ایسے میں بیچارہ ہاردک پٹیل کیا توقع کر سکتا ہے؟

تازہ ہوا بہار کی، دل کا ملال لے گئی

وزیر اعظم نریندر مودی کی محنت و کاوش رنگ لانے لگی ہے۔ ان کے مخالفین کے اچھے دن آنے لگے ہیں۔ اس کی ابتداء ویسے تو دہلی سے ہوئی لیکن اس کی انتہاء ممکن ہے بہار میں ہو جائے۔ مودی جی میں اگر سمجھ بوجھ ہوتی تو چھوٹی سی دہلی کی بڑی شکست سے عبرت پکڑتے ہوئے پر وقار انداز میں صوبائی انتخابات سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے ۔ دہلی میں تو بی جے پی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی ۔ صدر راج کے چلتے اقتدار کی زمامِ کار بلاواسطہ بی جے پی کے ہاتھوں میں تھی۔ حزب اختلاف دو حصوں میں منقسم تھا۔ انتخابی مہم میں حصہ لینے کیلئے کہیں جانے کا قصد نہیں کرنا پڑتا تھا اور اوبامہ کو جشنِ جمہوریہ میں بلا کر عوام کو گمراہ کرنے کا بھی نادر موقع تھا۔
کیجریوال کے دامن پر وقت سے پہلے استعفیٰ دے کر بھاگ کھڑے ہونے کا داغ بھی تھا، اس کے باوجود شاہ جی اور مودی جی کی پے درپے حماقتوں نے کیجریوال کو ایسی کامیابی سے نواز دیا جس کا تصور بھی محال تھا۔
اس کے برعکس بہار میں بی جے پی کچھ عرصہ پہلے تک جنتا دل (یو) کی جونیر پارٹنر ضرور رہی لیکن اس

کو کبھی بھی اپنے بلبلوتے پر اقتدار نصیب نہیں ہوا۔ اسپارلیمانی انتخابات کا اگر جائزہ لیا جائے جس میں بی جے پی نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ حزب اختلاف کے انتشار کا نتیجہ تھا۔ بی جے پی کو اپنے دو حواریوں کے ساتھ کل ملا کر ۸ء فیصد ووٹ ملے تھے جبکہ جے ڈی یو، آر جے ڈی اور کانگریس نے جملہ ۳ء۴۴ فیصد ۳۵ ووٹ حاصل کئے تھے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ مودی جی کے اقتدار میں آتے ہی رائے دہندگان کا جھکاو بی جے پی کی جانب بڑھ گیا ہو اس لئے کہ ضمنی انتخاب میں بھی جہاں بی جے پی اور ایل جے پی نے مشترکہ طور پر ۹ء۳۷ فیصد ووٹ حاصل کئے وہیں کانگریس، جے ڈی یو اور آر جے ڈی نے مل کر ۶ء۴۵ فیصد ووٹ حاصل کئے۔ یہ گزشتہ سال اگست کی بات ہے جب مودی جی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اب ایک سال گزر جانے کے بعد بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ انکی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے تو اس سے بڑا مودی جی کا اندھا بھکت کون ہو سکتا ہے؟

بہار کی حالیہ انتخابی مہم کا اگر گزشتہ سال کے قومی انتخابات کی مہم سے موازنہ کیا جائے تو ایک زبردست مشابہت نظر آتی ہے۔ پچھلے سال کانگریس کا یہ حال تھا کہ وہ اقتدار کے نشے میں چور بغیر کسی خاص حکمت عملی کے روایتی انداز میں بے دلی کے ساتھ جلسے جلوس کر رہی تھی۔ اس دوران اس نے کوئی نیا الحاق تو در کنار پرانے حلیفوں کا بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس بی جے پی

نے اپنی انتخابی منصوبہ بندی کیلئے پرشانت کشور جیسے ذہین مشتہر کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں جو متنوع انداز میں مہم کی منصوبہ بندی کر رہا تھا اور مودی جی کی پرجوش قیادت میں بی جے پی اس پر عملدرآمد کر رہی تھی ۔ اس دوران ہر چھوٹی بڑی جماعت کو ساتھ الحاق کرنے کی کوشش بھی جاری تھی اور قومی جمہوری محاذ میں شامل جماعتوں کی تعداد ۲۵ تک پہنچ گئی تھی ۔

اس بار نتیش کمار نے آسمان میں اڑنے کے بجائے زمین سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ ماجھی کو گھر بھیج کر مودی کی طرح خود کمان سنبھالی۔ لالو یادو اور کانگریس کے ساتھ اپنے الحاق کو مستحکم کیا۔ لالو یادو نے بھی کمال پختگی اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے نتیش کمار کو اس مہاگٹھ بندھن کا چہرہ بنایا اور خود اس کے ریڑھ کی ہڈی بن گئے ۔ لالو نے اپنی انا قربان کردی اور ساجوادی کو اپنے حصے میں ۵ نشستیں دے کر سیکولر محاذ کو ٹوٹنے سے بچالیا۔ کانگریس کو ۴۰ نشستیں دے کر پروقار انداز میں ساتھ لیا اور نتیش کمار نے بھی اقتدار میں ہونے کے باوجود ۱۰۰ نشستوں پر اکتفاء کرلیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے پرشانت کشور کی خدمات حاصل کیں تاکہ بی جے پی کو منھ توڑ جواب دیا جاسکے ۔

اس کے برخلاف بی جے پی نے وہی روایتی پروپگنڈا، وزیراعظم پر بیجا انحصار ، جلسے جلوس اور قسمیں وعدے شروع کردیئے جن پر پہلے تو لوگوں نے انجانے میں اعتماد کرلیا تھا لیکن اب کسی کا اعتبار نہیں رہا۔ وزیر اعظم

نے ایک کے بعد ایک تین ریلیاں کیں جن کے سارے اثرات کو نتیش لالو اور سونیا نے پٹنہ کی ایک مہاریلی کے ذریعہ زائل کردیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی فی الحال کئی محاذ پر ایک ساتھ جوجھ رہی ہے۔ کانگریس کی منموہن سرکار دس سالوں میں جس قدر بدنام ہوئی تھی مودی سرکار اس ایک سال کے عرصے میں اس سے زیادہ رسوا ہوچکی ہے۔ بی جے پی کے پاس کوئی وزیراعلیٰ کا امیدوار نہیں ہے اور عوام جانتے ہیں کہ مودی جی دہلی کا تخت وتاج چھوڑ کر بہار کا اقتدار سنبھالنے کیلئے نہیں آئیں گے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے اندر وزیراعلیٰ کی کرسی کے کئی خواہشمند ہیں اور ان کی ناراضگی سے بچنے کیلئے وہ اپنے امیدوار کا اعلان کرنے سے کترا رہی ہے۔ اننت کمار نے جب کہا کہ وزیراعظم کے نام پر ووٹ مانگا جائیگا تو سشیل مودی ناراض ہوگئے مگر ۸۰ سالہ سی پی ٹھاکر نے کہہ دیا کہ وہ اس عہدے پر ذمہ داری ادا کرنے کیلئے تیار ہیں۔ پٹنہ سے بی جے پی کے رکن پارلیمان شتروگھن سنہا اس کیلئے بہت بڑا سر درد بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یعقوب میمن سمیت کئی مسائل میں پارٹی موقف کی مخالفت کرنے کے بعد نتیش کمار کو بہار کا سرپرست تک قرار دے دیا۔

نتیش کمار نے اس بیچ ایک ایسی چال چلی جس نے بی جے پی کے کئی مہرے الٹ گئے۔ اروند کیجریوال کو بہار بلانا اوران کو اپنا ہمنوا بنا کر پیش کرنا کئی اعتبار سے اہم ہے۔ نتیش پر یہ الزام ہے کہ وہ بدعنوان لالو کا ساتھ ہوگئے

ہیں لیکن کرپشن کے خلاف لڑنے والے والے کیجریوال کی حمایت اس کو کمزور کردیتی ہے۔ کیجریوال شہری علاقوں میں خاصے مقبول ہیں اس لئے ان کی حمایت کا اثر بی جے پی کے شہری متوسط طبقے کے رائے دہندگان کو متاثر کرسکتا ہے۔ اس بار بہار کے ہر حلقہ انتخاب میں ۸ تا ۱۰ ہزار نوجوان ووٹرس ہیں وہ یقین کیجریوال کی شخصیت کے اندر ایک کشش محسوس کرتے ہیں۔ یہ رائے دہندگان ذات پات کو کم اہمیت دیتے ہیں ایسے میں جو نام نہاد اونچی ذات کے رائے دہندگان بی جے پی کا ساتھ چھوڑنے کے سبب نتیش سے دور ہوگئے ہیں ان میں سے کچھ کیجریوال کے توسط سے قریب آسکتے ہیں۔

کیجریوال اور نتیش کمار کے درمیان کوئی سودے بازی نہیں بلکہ بے لوث دوستی ہے۔ نتیش نے دہلی انتخاب میں کیجریوال کی حمایت کی بدلے میں کچھ نہیں مانگا یہی کیجریوال نے بھی کیا اور پھر دشمن کا دشمن تو دوست ہوتا ہی ہے۔

بی جے پی نے اس دوران جتن رام مانجھی اور پپو یادو کو بھی اپنے قریب کرنے کی کوشش کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ نئے حلیف تو درکنار اس کے پرانے ساتھی رام ولاس پاسوان اور اوپندر خوشواہا بھی بی جے پی سے ناراض چل رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو انہیں بی جے پی نعرے ''اب کی بار بی جے پی سرکار'' پر اعتراض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بی جے پی کے بجائے اس نعرے میں این ڈی اے ہونا چاہئے۔ ان کو یہ شکایت بھی ہے کہ بی جے پی نشستوں کی تقسیم کو بلاوجہ ٹال رہی ہے۔ اس

سے بی جے پی کی نیت کا شبہ بھی ظاہر ہو رہا ہے اور تیاری بھی متاثر ہو رہی ہے۔ خشواہا نے بی جے پی کو گزشتہ مرتبہ کی طرح صرف ۱۰۲ نشستوں پر انتخاب لڑنے کا مشورہ دیا ہے۔ جبکہ بی جے پی کم از کم ۱۶۰ نشستوں پر لڑنا چاہتی ہے۔ اس کھائی کو پاٹنے کیلئے ۳۱ اگست کو امیت شاہ کی قیادت میں حلیف جماعتوں کے ساتھ ایک نشست ہوئی لیکن اس میں ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اگر بی جے پی ۱۵۰ پر بھی راضی ہو جائے تو بقیہ ۹۰ نشستوں کو چار جماعتوں میں کیسے تقسیم کیا جائیگا ؟ اس لئے لوک جن شکتی ۷۵ نشتیں چاہتی ہے لوک سمتا پارٹی کا ۶۶ پر دعویٰ ہے اور مانجھی کی 'ہم' ۴۰ کی خواہشمند ہے۔ اس بندر بانٹ میں جو گلُ کھلیں گے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

بی جے پی کی حامی جماعتوں میں بھی وزارت اعلیٰ کی کرسی کو لے کر بھی اچھے خاصے اختلافات ہیں۔ مانجھی چونکہ وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں اس لئے اپنے آپ کو اس عہدے کا سب زیادہ حقدار سمجھتے ہیں۔ رام ولاس پاسوان نے مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کیلئے پھر ایک بار مسلم وزیر اعلیٰ کی تجویز پیش کی ہے۔ اوپندر خشواہا چاہتے ہیں کہ رام والاس پاسوان کو وزیر اعلیٰ کا امیدوار بنا کر پیش کیا جائے۔ اس سے زیادہ باہمی عدم اعتماد کیا ہو سکتا ہے تمام تر اختلاف کے باوجود سارے حامیوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وزیر اعلیٰ بی جے پی کا نہ ہو۔ ایل جی پی کے رامچندر پاسوان تو بی جے پی پر ودھان پریشد کے انتخاب میں

ان کے امیدوار کی شکست کا الزام بھی لگا چکے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ ہمارے کارکنان اس زیادتی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کریں گے۔

بی جے پی کا سب سے بڑا ہتھیار نتیش کمار سرکار کی ناکامی کا پرچار ہے لیکن بدقسمتی سے نتیش کے دس سالہ اقتدار میں سے آٹھ سال بی جے پی اس کی حصہ دار رہی ہے۔ بی جے پی بار بار یہ کہہ رہی ہے نتیش اور لالو کی دوستی ناپاک ،ابن الوقتی اور غداری ہے ۔اس لئے کہ انھوں نے بی جے پی سے ناطہ توڑ لیا لیکن نتیش کمار نے بی جے پی کے ساتھ آنے سے قبل لالو کا ساتھ چھوڑا تھا تو کیا وہ اس وقت گنگا کی طرح پوتر دیش بھکتی تھی ۔رام ولاس پاسوان کا جو ایک زمانے تک بی جے پی کے سخت مخالف تھے لالو کو چھوڑ کر بی جے پی کے ساتھ آجانا ابن الوقتی اور موقع پرستی نہیں ہے ؟ کیا عوام کو بے وقوف بنانا اسی قدر آسان ہے جتنا بی جے پی سمجھتی ہے۔ گڈکری نے کہا تھا بہار کے خون میں نسل پرستی ہے لیکن فی الحال گجرات میں جو ہو رہا ہے اس کے سامنے بہار تو بالکل بونا نظر آنے لگا ہے۔ مودی جی بہار کو گجرات بنانے چلے تھے مگر اس دوران خود گجرات بہار بن چکا ہے۔ مودی سوچ رہے ہوں گے کہ ہاردک پٹیل کو اگر احتجاج کرنا ہی تھا تو کم از کم بہار انتخاب بعد کرتا اس موقع پر ہنگامہ آرائی کرکے اس نے بی جے پی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔

ان تمام حقائق سے قطع نظر مہا گٹھ بندھن کا سب سے بڑا اثاثہ مودی جی کی حماقتیں ہیں جو ان سے یکے بعد دیگرے سرزد ہو رہی ہیں مثلاً عین مہاریلی کے دن 'من کی بات' میں تحویل اراضی بل پر اپنی شکست کا اعتراف کرکے انہوں نے مخالفین کو اپنی دھنائی کا نادر موقع عطا کردیا۔ سارے ہی بڑے رہنماوں کی تقریر میں اس کا ذکر تھا اور اس کے ذریعہ سے یہ بات ثابت کی گئی کہ مودی غریب کسانوں کی زمین چھین کر سرمایہ داروں کو دینا چاہتے تھے ۔ حزب اختلاف نے ان کو ایسا کرنے سے روک دیا اور اپنا موقف تبدیل کرنے پر مجبور کردیا۔ اگر نریندر مودی اپنے وزارت عظمیٰ کے وقار کو داؤں پر لگا بہار کے دنگل میں نہیں کودتے تو مہاریلی اس طرح کی تنقید کا نشانہ ہر گز نہیں بنتے ۔ وزیراعظم کے ذمہ انتخابی مہم چلانے اور غیر ملکی دورے کرنے کے علاوہ بھی بہت سارے کام ہیں اور سچ تو یہ ہے جن نمائشی کاموں میں مودی جی اپنا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں یہ سرے سے ان کی ذمہ داری ہی نہیں ہے۔

انتخابی مہم پر نگاہ ڈالیں تو نتیش کمار اسی حکمت عملی پر عملدرآمد کررہے ہیں جو مودی جی نے گجرات میں اختیار کر رکھی تھی۔ مودی جی بار بار گجرات کی عوام کے عزت و وقار سوابھیمان) کی دہائی دیتے تھے۔ ان کا الزام تھا کہ دہلی کی برسراقتدار سرکار دراصل) گجرات کے سارے لوگوں کو (فسادات کے پس منظر میں) قاتل اور زانی گردانتی ہے۔ یہ گجراتیوں کی توہین ہے اور وہ اس کو بحال کرنے

کیلئے کھڑا ہوئے ہیں اس لئے عوامی حمایت کے مستحق ہیں۔ مودی جی اپنے اوپر لگنے والے ہر الزام کو بڑی عیاری کے ساتھ عوام کے سر منڈھ کر ان کا جذباتی استحصال کر تے تھے ۔ اس طرح مودی جی نے تین مرتبہ گجرات کی عوام کو بے وقوف بنایا ۔ اب ان کو چاہئے کہ وہ کم از کم اپنے مخالف کو ایسا کرنے کا موقع نہ دیں لیکن ایسا کرنے کیلئے عقل و فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔

مودی جی نے پہلے توڈی این اے کی بات کہہ کر نتیش کمار کو اسے بہاریوں کی توہین قرار دے کر ' الفاظ واپس لو' تحریک چلانے کا موقع دیا۔ اس کے بعد مودی جی نے بہار کے پیکیج کا اعلان کچھ اس طرح سے کیا گویا نیلامی ہورہی ہے ۔ اس کو لالو جی نے بہاریوں کی توہین قرار دیتے ہوئے کہہ دیا کہ 'بہاری ٹکاؤ ہے بکاؤ' نہیں ہے۔ مودی جی نے بہار کو بیمارو کہا تو نتیش کمار نے بہار کا موازنہ گجرات سے کرکے ثابت کردیا کہ کئی معاملات میں بہار گجرات سے بہتر ہے۔ مودی جی نے نتیش کمار کو یاچک (مانگنے والا) کہہ کر ان پر ذاتی حملہ کیا تو اسے بھی بہاریوں کی توہین سے جوڑ دیا گیا۔ سوال کیا گیا کہ کیا مودی جی کا وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے مرکزی حکومت سے اپنا حق مانگنا جھولی پسارنا تھا۔ مودی جی کے اہانت آمیز سلوک نے پٹنہ ریلی کو سوابھیمان ریلی کا بنا دیا۔

سوابھیمان ریلی کے بعد مودی جی اپنی چوتھی ریلی کرنے کیلئے بھاگلپور پہنچے۔ پہلے اس ریلی کو ۳۰ اگست کو ہونا تھا لیکن چونکہ اسی دن پٹنہ میں مہاریلی کا اعلان ہوگیا بی جے پی نے اسے دو دن کیلئے ملتوی کردیا۔ اس ریلی سے قبل نتیش کمار نے ٹویٹ کرے وزیراعظم کو مزید سینہ کوبی اور نئے وعدوں کے بجائے پرانے وعدوں کی تاریخ بتانے کیلئے کہا اس کے جواب مودی جی نے ۲۰۱۹ء کی تاریخ دے دی۔ اس بار مودی جی نے ڈرامہ بازی تو کم کی مگر آئندہ ۵ سالوں کیلئے ۳ لاکھ ۴۷ ہزار کروڑ کا وعدہ پھر بھی کردیا۔ انہوں صحت کی بابت بہار کے ۲۰۰۵ء کے بعد پچھڑنے ذکر کیا اور بھول گئے کہ اس دوران بی جے پی اقتدار میں بھاگیدار تھی۔ مودی کی ریلی کے بارے کانگریسی رہنما علی انور نے کہا پٹنہ جیسی ریلی کرنے کیلئے پردھان منتری کو دوسرا جنم لینا ہوگا۔ اس دن مودی کی قسمت ہی خراب تھی کہ ریلی سے پہلے بارش ہوگئی اور اس کے بعد شئیر بازار ۷۰۰ پوائنٹ گرگیا۔ اسی کے ساتھ ایک ناکام ریلی کی خبر بھی ذرائع ابلاغ سے اتر گئی۔ پچھلے الیکشن میں مودی نے اپنے آپ کو چائے والے کے طور پر پیش کیا اور نتیش کو مغرور بتاتے ہوئے ان پر مرکزی سرکار کی مدد کو ٹھکرنے کا، ان کے ساتھ اپنی دعوت منسوخ کرنے کا اور مانجھی کی طشتری سے نوالہ چھین لینے کا الزام لگایا۔ اس کے جواب میں نتیش کمار نے خود کو ایک غریب مجاہد آزادی کا

پیٹا بنا کر پیش کیا۔ انہوں نے بہار کی تاریخ میں انقلابیوں کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ جن کے والدین نے قوم کیلئے کوئی کارنامہ نہیں انجام دیا وہ ہمارے ڈی این اے کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ دہلی انتخاب کے وقت بی جے پی نے کیجریوال کے گوتر (سرشت) پر انارکی کا فقرہ کسا تھا جو اسے کافی مہنگا پڑا لیکن بہار میں پھر اسی غلطی کا اعادہ کیا جارہا ہے۔ نتیش کمار نے مودیجیکے ۱۴ ماہ بعد ساری دنیا کی سیر کر لینے کے بعد بہار کا رخ کرنے پر بھی طنز کیا۔ انتخابات میں چمتکار ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان تمام حقائق کے باوجود اگر بی جے پی کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ ایک معجزہ ہی کہلائے گا۔

اٹل جی کی انتخابی شکست سے بی جے پی کو ایسا کرارہ جھٹکا لگا تھا کہ وہ دس سال پیچھے چلی گئی اور یہی وجہ ہے کہ دس سال بعد پھر سے اقتدار میں آگئی لیکن ایسا لگتا ہے کہ مودی جی کی شکست اس قدر ہیبت ناک ہوگی کہ بی جے پی کم از کم ۵۰ سال پیچھے جن سنگھ کے زمانے میں پہنچ جائیگی۔ کمل کے پھول میں کل پانچ پنکھڑیاں ہیں جن میں ایک کو انہوں نے پہلے سال میں نوچ کر پھینک دیا ہے۔ اپنی مدتِ کار کے خاتمہ تک ساری پنکھڑیاں ایک ایک کرکے جھڑ جائیں گی اور پھر سنگھ پریوار کے نیکر دھاری بھکت جن سنگھ والا چراغ لے کر ڈھونڈنے نکلیں گے اور کیچڑ میں کھڑے ڈنٹھل کو دیکھ کر پوچھیں گے یہاں جو کمل بابو ہوا کرتے تھے وہ کہاں غائب ہو گئے؟ لوگ کہیں گے ایک ٹھو جملیشور بابو آئے

رہے جو انہیں دس لاکھ کے کوٹ میں ٹانک کر اپنے ساتھ لے گئے۔ بقول عزیز حامد مدنی ؎

تازہ ہوا بہار کی، دل کا ملال لے گئی
پائے جنوں سے حلقۂ گردش حال لے گئی

سنگھ اور سرکار: شامل پس پردہ بھی ہیں اس کھیل میں کچھ لوگ

سنگھ پریوار کے ساتھ سرکار کی مشترکہ نشست پر اس قدر اظہار خیال ہوا کہ عرصۂ دراز کے بعد مایاوتی کا نام اور تصویر بھی ذرائع ابلاغ کی زینت بن گئی ورنہ تو لوگ ہاتھی کی مایا کو بھول ہی گئے تھے؟ مایاوتی نے سوچا ہوگا مسلمانوں کو رجھانے کا یہ نادر موقع ہے۔ ملائم سنگھ گوناگوں وجوہات کی بناء پر بی جے پی سے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ پہلے تو ایوان پارلیمان میں وہ اچانک حزب اختلاف کے احتجاج سے الگ ہوگئے اور اب بہار کے مہاگٹھ بندھن سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اگر شردپوار کی این سی پی کے ساتھ ملائم سنگھ ایک نیا محاذ بنا کر بہار کے دنگل میں کودپڑیں تو ممکن ہے گھر کے نہ گھاٹ کے جتن رام مانجھی بھی ان کے ساتھ بی جے پی کی ناؤ کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش میں لگ جائیں۔ ایسے میں مسلمان لازماً ملائم سنگھ سے ناراض ہوکر متبادل تلاش کریں گے اور مایاوتی کے مایا جال میں پھر سے پھنس جائیں گے۔ اس لئے مسلمانوں کی دلجوئی کا اس سے اچھا موقع کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کی نفسیات کچھ ایسی ہے کہ وہ اپنی تعریف سے بھی زیادہ سنگھ پریوار پر تنقید سے خوش ہوتے ہیں۔

بہوجن سماج پارٹی کی جو مشکل ہے وہی مسئلہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا بھی ہے۔

جس طرح مسلمانوں کو خوش کرنا بی ایس پی کے دوبارہ اقتدار میں آنے کیلئے ضروری ہے اسی طرح اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے سنگھ پریوار کی خوشنودی بی جے پی کی مجبوری ہے۔ مسلمان جس طرح بی جے پی کو ہرانے کیلئے تن من دھن سے جٹ جاتے ہیں بالکل اسی طرح سنگھ کے رضاکار بی جے پی کو کامیاب وکامران کرنے کیلئے اپنا ساری توانائی جھونک دیتے ہیں۔ ان مفت کی فوجوں کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ رکھنا اور کچھ نمائشی اقدامات سے ان کو خوش کرتے رہنا سیاسی جماعتوں کی ابن الوقتی کا تقاضہ ہے۔ انتخابی سیاست میں ہر سیاسی جماعت اپنے رائے دہندگان بشمول کارکنان کا جذباتی استحصال کرتی ہے۔ اس طرح وہ نہ صرف اقتدار حاصل کرتی ہیں بلکہ جب کامیاب ہو جاتی ہیں تو اسے دوام بخشتی ہیں۔

زعفرانیوں کا یہ الزام کہ سیکولر جماعتیں مسلمانوں کے اشارے پر چلتی ہیں ایسا ہی ہے کہ جیسے یہ کہا جائے کہ بی جے پی کا ریموٹ کنٹرول آر ایس ایس کے ہاتھوں میں ہے۔ کوئی سیکولر جماعت مسلمانوں کے مفاد میں کوئی ٹھوس کام نہیں کرتی ہاں ان کے دورِ اقتدار میں چند مسلم رہنماوں کے وارے نیارے ضرور ہو جاتے ہیں۔ کوئی مفتی وزیر داخلہ تو کوئی سلمان وزیر خارجہ بنا دیا جاتا ہے مگر عام مسلمان کی حالتِ زار پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بی جے پی کے اقتدار میں آتے ہی کچھ سشما اور جیٹلی جیسے لوگ مالا مال تو

ہو جاتے ہیں لیکن ہندو عوام کا بھلا نہیں ہوتا۔ سنگھ پریوار کے چند رہنماوں کے ساتھ حکومت کے کچھ وزراء کا مل بیٹھنا اور بادلِ ناخواستہ پند و نصائح زہر مار کر لینے کو سنگھ کے آگے حکومت کی سجدہ ریزی قرار دینا ایک سادہ لوحی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فلمی اداکاروں کی مانند سیاسی رہنما بھی اس طرح کی افواہوں کو اپنے مفاد کے پیش نظر پھیلاتے رہتے ہیں۔

اس میں کسی شک نہیں کہ بھارتیہ جنتا پارٹی سنگھ پریوار کا ایک اٹوٹ انگ ہے لیکن اب یہ پسر جوان ہوچکا ہے وہ ازراہِ عقیدت اپنے بزرگوار کی باتیں سن تو لیتا ہے مگر سب نہیں مانتا۔ جو مناسب لگتی ہیں ان پر عمل کرتا ہے باقی پر معذرت کرلیتا ہے۔ حکومت میں شامل اکثر و بیشتر وزراء سنگھ کی شاکھاؤں میں تربیت حاصل کرکے آئے ہیں اس لئے یہ لوگ ہمیشہ ہی ایک دوسرے کے رابطے میں رہتے ہیں۔ اٹل جی اور اڈوانی جی کے زمانے میں بھی یہی صورتحال تھی اور بی جے پی کو جب بھی اقتدار نصیب ہوگا یہ فطری عمل ہوگا۔ سنگھ اور بی جے پی ایک دوسرے کیلئے اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جیسے نہرو گاندھی خاندان اور کانگریس یا مایاوتی اور بی ایس پی ۔فرق صرف یہ ہے کہ ایک پبلک لیمیٹیڈ کمپنی ہے جس کے کئی شیئر ہولڈرس ہیں اور دوسرا ایک مخصوص خاندان کا پرائیوٹ لیمیٹیڈ ادارہ ۔ان تمام سیاسی تاجروں کی فطرت تمام تر ظاہری فرق کے باوجود یکساں ہے۔

ایسے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنگھ اور بی جے پی نے ایسا بڑا تماشہ اس سے قبل مرکز تو کجا کسی ریاست میں بھی کیوں نہیں کیا؟ یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو پردھان سیوک کہنے والے مودی جی نے بھی وزیراعلیٰ کی حیثیت سے اس طرح کے کسی اجتماع میں شرکت نہیں کی۔ دراصل اٹل جی نے رجوّ بھیاکے زمانے میں اقتدار سنبھالا لیکن خوش قسمتی سے بہت جلد سدرشن سر سنگھ چالک (سربراہ) بنا دیئے گئے۔ سدرشن اپنی طبعی اور تنظیمی عمر میں اٹل واڈوانی سے چھوٹے تھے اس لئے سدرشن کا ان پر زور نہ چلتا تھا۔ فی الحال مودی اور بھاگوت ہم عمر ہیں مگر دیگر وزراء اور امیت شاہ خاصے جونیر ہیں اس لئے بھاگوت کو باآسانی گرومان کر ان کے آگے زانوئے تلمذ طے کردیتے ہیں۔ اس طرح بھاگوت کی آتما کو شانتی (روحانی تسکین) مل جاتی ہے اور سنگھ پریوار خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ اٹل جی کی حکومت مخلوط تھی جس میں کئی (بظاہر) سنگھ مخالف جماعتیں بھی شامل تھیں اس لئے وہ اپنے حامیوں کی ناراضگی کا بہانا بنا کر کنی کاٹ لیا کرتے تھے لیکن مودی جی ایسا نہیں کر سکتے۔

بی جے پی کو چونکہ پہلی مرتبہ اپنے بل بوتے پر اکثریت حاصل ہو گئی ہے اس لئے سنگھ رضاکاروں کی توقعات پہلے کی بہ نسبت بہت بڑھ گئی ہیں۔ اٹل جی کی سرکار پر رام مندر بنانے کا بہت دباؤ تھا اس لئے کہ اڈوانی جی نے اسی بنیاد پر ووٹ مانگا تھا لیکن مودی جی پر ایسا دباؤ نہیں ہے۔ مودی جی ترقی

وخوشحالی کا بلند بانگ دعویٰ کرکے اقتدار پر قابض ہوگئے ہیں اس لئے عوام ان سے اپنے وعدے نبھانے کی توقع کرتے ہیں جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے عوام کی بے اطمینانی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ سنگھ کے رضاکار جنھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے انتخابی کامیابی حاصل کی تھی وہ بھی شدید مایوسی کا شکار ہورہے ہیں۔ دراصل انہیں رضاکاروں کو اطمینان دلانے یا بے وقوف بنانے کیلئے یہ تماشہ کیا گیا۔ مرکزی وزراء کو ایک قطار میں بھاگوت کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہوئے دیکھ کر سنگھ کے کارکن دھنیہ ہوگئے اور ان خوابوں کو بھول گئے جنھیں شرمندۂ تعبیر کرنے کیلئے انہوں نے اپنا وقت اور توانائی صرف کی تھی۔

وینکیا نائیڈو کا پہلے دن یہ کہنا کہ ہمارا سنگھ کے ساتھ بیٹھنا ایسا ہی ہے جیسے ایک سعادتمند بیٹے کا اپنی ماں کے پاس جانا دراصل سنگھ کارکنان کا جذباتی استحصال تھا۔ دوسرے دن راج ناتھ صاف کردیا کہ ہم نے ان سے کوئی احکامات نہیں لئے اور نہ ان کو احتساب دیا۔ ان لوگوں کے پاس معلومات کا خزانہ ہے اس لئے تبادلۂ خیال کیا گیا اور رائے مشورہ تو کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ راجناتھ نے تھنک ٹینک کی بات کہی جس سے رہنمائی کیلئے رجوع کیا جاسکتا ہے لیکن وہ بھول گئے کہ بی جے پی کی اپنی بھی اڈوانی اور جوشی جیسے لوگوں پر مشتمل ایک مارگ درشک کمیٹی ہے۔ حکومت نے آج تک ان کے ساتھ کسی

اہم تو درکنار غیر اہم مسئلہ پر بھی مشورہ نہیں کیا۔اس نشست میں جہاں سنگھ کی جانب سے ۹۵ افراد کو جمع کرلیا گیا اور حکومت کے ۲۰ وزراء حاضر ہوگئے تھے تو ازراہِ تکلف ہی سہی مارگ درشک کمیٹی کے بزرگ ارکان کو بھی بلا کر ان کی تالیف قلب کا سامان کردیا جاتا لیکن خود غرض اور کینہ پرور سیاستدانوں سے اس طرح کی توقعکارِ عبث ہے۔جہاں تک رہنمائی کا تعلق تھا وہ تو سرے سے مقصود ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی مسلمانوں کی حق تلفی میں بی جے پی آر ایس ایس سے دو قدم آگے نکل چکی ہے۔

وزیراعظم نریندر مودی نے آخری دن بڑے طمطراق سے اس نشست میں شریک ہو کر مذکورہ مفروضے کی تصدیق فرمادی۔ پہلے تو سنگھ نے انہیں اپنی سہولت سے حاضر ہونے اجازت دے کر اپنی اوقات بتادی۔ اس کے بعد مودی جی نے حسب عادت ایک انتخابی تقریر کرکے یہ واضح کردیا کہ کس کی اہمیت کیا ہے؟ مودی جی نے یہ اعتراف ضرور کیا کہ میں آج اس مقام پر سنگھ کے سنسکاروں کی بدولت پہنچا ہوں لیکن یہ ایک ذومعنی جملہ ہے جس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ان سنسکاروں کا فائدہ اٹھا کر میں نے جو بلندی حاصل کرلی تم اس سے محروم ہو۔ اس کے بعد مودی جی نے خود اپنی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ حکومت نے اس دوران بہت ساری کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اب یہ آپ لوگوں کا کام ہے کہ انہیں عوام تک لے جائیں (انہیں اس سے آگاہ کریں) گویا سنگھ سے رہنمائی لینے کے بجائے

اسے کام میں لگا کر لوٹ آئے۔ یہ احکامات لینا اور احتساب دینا ہے یا احکامات صادر فرمانا؟

اس نشست کے بعد لوگ امید کر رہے تھے کہ سنگھ نے حکومت کو کم از کم للت مودی یا ویاپم جیسے معاملے میں کوئی ہدایت دی ہو گی۔ لیکن پتہ چلا کہ اس نے تو صرف حکومت کی تعریف و توصیف بیان کرنے اور اسے مزید وقت دینے کے علاوہ کچھ اور نہیں کیا۔ جہاں تک مہلتِ عمل کا سوال ہے وہ ہندوستان کی عوام نے بی جے پی کو دے دیا ہے اور سنگھ نہ بھی چاہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ رام مندر جیسے تنازع پر سنگھ ترجمان نے کہہ دیا کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔ پاکستان کی جانب سے سرحد پر ہونے والے یکے بعد دیگرے حملوں کو لے کر سنگھ سے کڑے رویہ کی توقع کی جارہی تھی لیکن اس پر بھی اس نے حکومت کو پاکستان کے ساتھ بھائی چارگی کے ماحول میں بات چیت جاری رکھنے کی تلقین کر دی۔ سرحد پر چینیحملوں کے خلاف سنگھ برابر آگ اگلتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ارکان کو چین کے دورے پر جانے تک کی اجازت نہیں دیتا تھا مگر پچھلے ایکسا لسے اسکیز بانپر قفللگا ہوا ہے۔ آج کل اپنی عوام کو چینی مال استعمال کرنے پر ڈانٹتا تو ہے مگر حکومت کو درآمدات بند کرنے کیلئے نہیں کہتا۔ قومی تناظر میں اس صورتحال کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سنگھ پریوار حکومت پر اثر انداز ہونے کے بجائے اس کے زیر اثر آرہا ہے۔ بقول شاعر ؎

شامل پس پردہ بھی ہیں اس کھیل میں کچھ لوگ
بولے گا کوئی، ہونٹ ہلائے گا کوئی اور

اگر ایسا نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ خود مودی جی نے ابھی تک تو کوئی افطار پارٹی نہیں دی بلکہ صدر جمہوریہ تک کی دعوتِ افطار میں شرکت کرنے سے باز رہے مگر سنگھ نے نہ صرف افطار پارٹیوں کا بلکہ علماء کی مجالس تک کا اہتمام کرڈالا۔ اس سے قطع نظر کے کس قدر مسلمان اس کے جھانسے میں آئے سنگھ کی جانب سے ان حرکات کا سرزد ہونا بجائے خود اس کی نظریاتی شکست ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تحریک و تنظیم چلانا یا زبردست مہم چلا کر کسی جماعت کو انتخاب میں کامیاب کردینا ایک کام ہے اور حکومت کے انتظامی امور کو بحسن خوبی انجام دینا دیگر فعل ہے۔ مودی سرکار کی پے در پے ناکامیوں کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ وزیراعلیٰ کی حیثیت سے کئی سالوں کا عملی تجربہ بھی نریندر مودی، راجناتھ سنگھ اور منوہر پریکر کو اچھا منتظم نہیں بنا سکا۔

تحویل اراضی کے معاملے میں حکومت کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس بیچ فحش ویب سائٹس پر پابندی لگانے کی کوشش کی گئی مگر پھر گھبرا کر یوٹرن لے لیا اور اب پونہ فلم انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ کو لے کر مدافعت میں آگئے۔ گجندر چوہان کو غیر فعال بنانے کی سعی جارہی ہے۔ سابق فوجیوں کی پنشن کے معاملے میں اس

حکومت کی نا تجربہ کاری اپنی مثال آپ ہے۔ وظیفہ یافتہ فوجی ۸۴ دنوں تک احتجاج کرتے رہے اور حکومت گھوڑے بیچ کر سوتی رہی لیکن جب دیکھا کہ اس کے منفی اثرات بہار انتخابات پر پڑ سکتے ہیں تو ضابطۂ اخلاق کے نافذ ہونے سے تین دن قبل جلد بازی میں اس کی منظوری کا اعلان کردیا اور وہ بھی ایسے کہ مظاہرین کے ۷ مطالبات میں سے صرف ایک کو قبول کیا گیا اس لئے احتجاج ختم نہیں ہوا۔

اس معاملے کی تفصیلات بے حد دلچسپ ہیں۔ صبح ۱۱ بجے سابق فوجیوں کے نمائندوں کو وزیر دفاع ملاقات کیلئے بلایا تو اس وقت رضاکارانہ سبکدوش ہونے والے فوجیوں کو اس سے الگ رکھنے کا مسئلہ زیر بحث آیا ہی نہیں۔ شام ۵ بجے خود وزیر دفاع پریکر نے اعلان کردیا کہ رضاکارانہ وظیفہ یافتہ فوجی اس سے مستفید نہیں ہوسکیں گے۔ اسی شام ۷ بجے دوبارہ جب وفد نے دوبارہ ملاقات کی تو وزیر دفاع نے کہا نہ جانے وہ شق کہاں سے آگئی؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود وزیر دفاع نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور ایک معمولی سی غلطی سے ۴۵ فیصد فوجیوں کی پنشن شہید کردی۔ بعد میں وزیراعظم نے تردید کیلو گبھر میھیلا کر گمراہکر رہے ہیں اور کہا سارے فوجی اس سے فائدہ اٹھائیں گے جبکہ یہ کارخیر خود ان کے وزیر دفاع سے سرزد ہو رہا تھا۔ وزیراعظم کے مطابق ۱۴ مہینوں سے وہ اس پر کام لگے ہوئے ہیں مگر وزیر دفاع فرماتے ہیں کہ کاغذات کی

تیاری میں دو ہفتوں سے لے کر ایک ماہ تک لگ سکتا ہے۔

اگر سابق فوجیوں کو وزیراعظم کی زبان پر اعتبار ہوتا تو ان کی یقین دہانی پر احتجاج ختم کر دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مظاہرین نے کہا کہ ہم اپنا مرن برت تو ختم کئے دیتے ہیں لیکن احتجاج اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جبتک کہ ہمارے سارے مطالبات تسلیم نہیں کئے جاتے اور ہمیں لکھ کر نہیں دیا جاتا۔ فوجیوں کا عدم اعتماد بجا ہے۔ وزیر خزانہ اسے نامعقول اور غیر عملی قرار دے چکے ہیں۔ وزیراعظم کی یقین دہانی کے باوجود سرکاری افسران کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے بہتر ملازمت کیلئے فوج کو خیرباد کیا وہ اس سہولت کے مستحق کیونکر ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے کوئی پنشن کی محرومی کا یہ فائدہ بتلاتا ہے کہ اس سے فوجیوں کی فرار سے حوصلہ شکنی ہوگی۔

بداعتمادی کی یہ انتہا ہے کہ سابق فوجی تک اس حکومت اور اس کے سربراہ کی زبان پر اعتبار نہیں کرتے ایسے میں عوام کس شمار میں آتے ہیں؟ سنگھ سے حکومت کی گفت و شنید کا ناٹک سنگھ پریوار کوں کا اعتماد تو بحال کر سکتا ہے مگر عام لوگوں پر اس تماشے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ یہ باتاظہر من الشمس ہے کہ سابق فوجیوں کو پنشن دینے کا فیصلہ سنگھ کے کہنے پر نہیں بلکہ بہار کے انتخابات کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ اگر وہ انتخابات سر پر نہ ہوتے یا اس میں

بی جے پی کی شکست کے امکانات روشن نہ ہوتے تو یہ فیصلہ ہر گز نہ ہوتا۔ نام نہادزعفرانی دیش بھکتوں کے دل میں اگر قوم کی عزت و وقار خیال ہوتا تو وہ دہلی کے مدھیانچل بھون میں تین دن کی سرکاری خرچ پر پکنک منانے کے بجائے جنتر منتر پر جا کر ان سابق فوجیوں کو اعتماد میں لیتےاور ان کا احتجاج پر وقار انداز میں ختم کرواتے۔ مظاہرہ کرنے والے سابق فوجیوں کی حالتِ زار اور نااہل حکومت کی بے حسی پر آنس معین کے یہ اشعار صادق آتے ہیں ۔

پتھر ہیں سبھی لوگ، کریں بات تو کس سے؟
اس شہرِ خموشاں میں صدا دیں، تو کسے دیں؟
ہے کون کہ جو خود کو ہی جلتا ہوا دیکھے؟
سب ہاتھ ہیں کاغذ کے دیا دیں، تو کسے دیں؟

جہاں میں کامیابی کی یقیں والوں سے یاری ہے

ایک معمولی سا تنکا ہوا کے رخ پتہ دیتا ہے۔دہلی یونیورسٹی اور دہلی میں واقع جواہر نہرولال یونیورسٹی کے انتخابات کے نتائج تعلیم یافتہ نوجوانوں کے فکری وسیاسی رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ گزشتہ سال دہلی کے نوجوانوں کیلئے وزیراعظم نریندر مودی امید کی کرن تھے اور دہلی میں بی جے پی غیر معمولی کامیابی میں ان بہت بڑا حصہ تھا لیکن ۸ ماہ بعد دہلی کے صوبائی انتخابات میں ایک نیا منظر نامہ سامنے آیا۔اس بار یہ نوجوان نریندر مودی کا دامن جھٹک کر اروند کیجریوال سے بغلگیر ہوگئے تھے۔یہی وجہ تھی کہ بی جے پی نے جہاں تمام پارلیمانی حلقوں میں کامیابی حاصل کی تھی وہیں عاپ نے ۷۰ میں سے ۶۷ نشستوں پر اپنا پرچم لہرادیا تھا۔اس قدر کم وقت میں ایسا بڑا انقلاب کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا لیکن وہ برپا ہو کر رہا۔

دہلی میں فی الحال کیجریوال کا بول بالا ہے۔اپنی پارٹی کے اندر وہ سارے مخالفین کو ٹھکانے لگا چکے ہیں۔ مرکز کی ریشہ دوانیوں پر بھی بڑی حد تک قابو پا چکے ہیں اس لئے یہ توقع کی جارہی تھی کہ نوجوانوں کے منظور نظر اروند کیجریوال کا جادو یونیورسٹی انتخابات میں سرچڑھ کر بولے گا اور کانگریس و بی جے پی کا صفایہ کردے گا لیکن افسوس کہ وہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

کالج کے طلباء نے اروند کیجریوال سے اپنا رخ پھیر لیا اور پھر دوبارہ انہیں سیاسی جماعتوں کی جانب متوجہ ہو گئے جن پر وہ ماضی میں اعتماد کیا کرتے تھے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی چونکہ اقامتی درسگاہ ہے اس لئے اس میں بیرونِ دہلی کے طلباء کی تعداد زیادہ ہوگی اور دہلی یونیورسٹی کے کالجوں میں مقامی طلباء کی بہتات ہونا فطری ہے۔ اس لئے ان نتائج سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہر دہلی اور بیرونِ دہلی کی طلباء برادری کس رجحان کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔ دہلی میں چونکہ مرکزی حکومت بی جے پی کی ہے اور صوبائی اقتدار عاپ کے ہاتھوں میں ہے اس لئے توقع یہ کی جا رہی تھی اصل مقابلہ انہیں دونوں جماعتوں کے طلباء تنظیموں بالترتیب اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد (اے بی وی پی) اور چھاتر یوا سنگھرش سمیتی (سی وائی ایس ایس) کے درمیان ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

دہلی یونیورسٹی میں اے بی وی پی کا بول بالا رہا ہے۔ گزشتہ دو سالوں سے وہ چاروں اہم عہدوں (صدر، نائب صدر، سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری) پر قابض رہی ہے۔ اس بار پھر سے یہی ہوا کہ اس نے ان چاروں نشستوں کو جیت لیا۔ سی وائی ایس ایس نہ صرف اپنا کھاتہ کھولنے میں ناکام رہی بلکہ وہ چار میں صرف ایک مقام پر دوسرے نمبر پر آسکی بقیہ تینوں عہدوں کیلئے اے بی وی پی کو کانگریس کی طلباء تنظیم این ایس یو آئی کو پچھاڑنا پڑا۔ این ایس یو آئی

نے سکریٹری کا عہدہ آپسی لڑائی کے سبب گنوایا۔ این ایس یو آئی کے امیدوار امیت شیراوت کو ۱۰ ہزار سے زیادہ اور باغی امیدوار امیت چودھری کو ۹ ہزار سے زائد ووٹ ملے جبکہ اے بی وی پی کی انجلی رانا صرف ۱۴ ہزار ووٹ حاصل کرکے کامیاب ہو گئیں۔ ڈی یو ایس یو کی صدارت پر ستیندر آوانہ بڑے آرام سے فائز ہو گئے۔ انہوں نے این ایس یو آئی کے پردیپ وجین کو ۶ ہزار سے زیادہ کے فرق سے شکست فاش دے دی۔ نائب صدر کے عہدے پر سی یو ایس ایس نے اے بی وی پی کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ گریما رانا کو صرف ۷۵۵ ووٹوں کے معمولی فرق سے شکست ہوئی۔ اس عہدے پر عاپ نے اپنی موجودگی کا احساس زور دار طریقہ پر دلایا۔ سکریٹری شپ پر اے بی وی پی کی انجلی رانا نے ۴ ہزار ۶ سو ووٹوں کے فرق سے اور جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر چھپال یادو نے ۶ ہزار کے فرق سے این ایس یو آئی کے امیدواروں کو شکست دے کر ثابت کردیا کہ طلباء نے پھر ایک زعفرانی پرچم اٹھا لیا ہے اور کانگریس ان سے لوہا لینے کی کوشش کررہی ہے۔ طلباء برادری کے اندر جھاڑو کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔

ان تعلیم گاہوں کی اور ریاستی انتخابی مہم میں بھی ایک مماثلت ہے۔ گزشتہ مرتبہ نریندر مودی یہ بھول گئے تھے کہ وہ وزیراعظم ہیں اور دہلی کے

انتخابات میں پارٹی کو کامیاب کرنا ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔ امیت شاہ نے دہلی کے مقامی رہنماؤں کو کنارے کرکے باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی یہی وجہ ہے کہ دہلی کی شرمناک شکست کیلئے کسی مقامی رہنما کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ ساری بحث کا محور مودی اور شاہ رہے۔ اس مرتبہ بی جے پی کی لیڈرشپ نے اپنے آپ کو کیمپس انتخابات سے دور رکھا حالانکہ ارون جیٹلی اے بی وی پی سے ہو کر سیاست میں آئے ہیں اور بی جے پی ترجمان سمبت پاترا بھی جے این یو طلباء یونین کے صدر رہ چکے ہیں۔ اس حکمت عملی کا فائدہ یہ ہوا کہ جو لوگ زمینی حقائق سے واقف ہیں انہوں نے صحیح انداز میں انتخاب لڑا اور اپنی کامیابی کو دوہرا دیا۔

اس کے برعکس اروند کیجریوال اور ان کے ساتھیوں نے وہ غلطی کی جو بی جے پی کے رہنما پچھلی مرتبہ کرچکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اے بی وی پی کے قومی سکریٹری روہت چاہل نے اپنی کامیابیکا سہرہ جہاں کارکنان کے سر باندھا وہیں عام آدمی پارٹی کی حکمت عملی کو بھی اپنے حق میں سازگار گردانہ۔ چاہل کے مطابق اگر کیجریوال اشتہاری تماشوں کے بجائے بنیادی مسائل پر اپنی توجہ مبذول کرتے تو نتائج مختلف ہو سکتے تھے۔ یہ تبصرہ اس بات کا غماز ہے نمائشی مہم جس طرح نریندر مودی کیلئے بے فائدہ ہے اسی طرح کیجریوال کیلئے بھی بے سود ہے۔ کانگریس کیلئے ان نتائج میں یہ امید کی کرن ہے کہ طلباء

.برادری کے اندر وہ بی جے پی کو تو اپنے پیچھے نہیں کر سکی مگر عاپ سے یقیناً آگے نکل گئی ہے اور .برسرِ اقتدار جماعتوں کے تئیں نوجوانوں کی مایوسی اس کیلئے سود مند ثابت ہو رہی ہے۔

دہلی یونیورسٹی کے انتخابات تو ایک چنگھاڑتی پہاڑی ندی کے طرح ہوتے ہیں مگر جے این یو ایک نہایت پرسکون تالاب کی مانند ہے۔اس لئے جے این یو کے نتائج کسی اور رجحان کا پتہ دیتے ہیں۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک بھر سے جو ذہین طلباء جے این یو میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے آتے ہیں ان کے اندر ہنوز اشتراکی نظریات کی حامل تحریکیں مقبول ہیں۔جس طرح اے بی وی پی گزشتہ دوسالوں سے دہلی کے چاروں عہدوں پر قابض ہے اسی طرح جے این یو کے ان چاروں نشستوں پر سرخ پرچم لہراتا رہا ہے لیکن اس مرتبہ اس کی سب سے نچلی پائیدان یعنی جوائنٹ سکریٹری کی کرسی پر زعفرانیوں نے کامیابی حاصل کرکے یہ بتادیا کہ ان کی قوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ نائب صدر اور سکریٹری کی جنگ میں بھی ان کا امیدوار دوسرے نمبر پر رہا۔

صدارت کیلئے اصل مقابلہ بائیں بازو کی طلباء تنظیموں کے درمیان تھا۔کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی طلباء تنظیم اے آئی ایس ایف کے امیدوار کنھیا کمار نے اس بار انتہا پسند نظریات کی حامل اے آئی ایس اے کے وجئے کمار کو

ووٹ کے فرق سے شکست دے دی۔ اس کے باوجود نائب صدر کے عہدے پر ۲۷
شہلا رشید اور سکریٹری جنرل کی نشست پر اے آئی ایس اے کے راما ناگا پھر ایک بار
کامیاب ہو گئے لیکن ان دونوں مقامات پر ان سے ہارنے والے امیدواروں کا تعلق اے
بی وی پی سے تھا۔ جوائنٹ سکریٹری کے نسبتاً کم اہم عہدے پر تو اے بی وی پی کے سور بھ
کمار شرما نے اے آئی ایس اے کے حامد رضا کو شکست دے دی۔

ایک ہی شہر میں واقعد و یونیورسٹیوں کے انتخابی نتائج کا فرق طلباء کی مختلف نفسیات کا
اظہار ہے۔ عام کالج کے طلباء انتشار فکر کا شکار ہیں۔ وہ ہر لہر کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔
باآسانی مختلف شخصیات کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی مدد سے ان کو اپنے
قابو میں کرنا مشکل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ جلد باز طبیعت کے حامل ہیں۔ جس قدر
جلدی کسی کے گرویدہ ہوتے ہیں اتنی ہی تیزی کے ساتھ اس سے بدل بھی ہو جاتے
ہیں۔ اس کے برعکس جے این یو کے طلباء میں فکری استحکام پایا جاتا ہے۔ وہ سوچ سمجھ
کر اپنا حق رائے دہندگی استعمال کرتے ہیں اور آسانی سے کسی ورغلانے میں نہیں آتے۔

دہلی یونیورسٹی کی طرح جے این یو میں این ایس یو آئی یا سی یو ایس ایس کا کہیں دور دور
تک اتہ پتہ نہ ہونے کا یہی بنیادی سبب ہے۔ جے این یو کے نظریاتی ماحول میں فکر و نظر
سے عاری کسی تنظیم کی گنجائش نہیں ہے۔ اے بی وی پی اپنے فسطائی نظریہ کے باوجود
ایک نظریاتی تنظیم ہے۔ دوسری چونکا دینے والی حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی فکر کیلئے ان
گئے گزرے حالات میں بھی

اعلیٰتعلیم گاہوں کے اندر کشش باقی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے اس کے چار میں دو امیدوار مسلمان تھے جن میں سے ایک نے کامیابی حاصل کی اور دوسرا معمولی سے فرق ہار گیا۔

اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (ایس آئی او) جیسی نظریاتی طلباء تنظیم کیلئے اس میں خوشخبری ہے۔ جے این یو کے ذہین طلباء اگر ہندوتوا کے نظریہ سے متاثر ہو سکتے ہیں تو اسلام سے کیوں نہیں؟ جے این یو کے مسلم طلباء اگر اشتراکیت کا پرچم بلند کر سکتے ہیں تو وہاں کے غیر مسلم طلباء اسلام پسند تنظیم کے جھنڈے تلے انتخاب کیوں نہیں لڑ سکتے؟ دراصل ان کامیابیوں کے پیچھے نظریہ کے علاوہ ان طلباء تنظیموں کی ٹھوس فلاحی خدمات بھی ہیں۔ ایس آئی او اگر طلباء کی بے لوث خدمت کا بیڑہ اٹھائے تو کوئی بعید نہیں کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مانند جے این یو کے بھی اپنی کامیابی کا جھنڈا گاڑ سکتی ہے۔ ایک زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اشتراکیوں کا گڑھ ہوا کرتی تھی لیکن گزشتہ سال ایس آئی او کے صدارتی امیدوار عبداللہ عزامکی کامیابی نے ثابت کردیا کہ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ اس جانب اگر قدم بڑھایا گیا تو جلد یا بدیر یقیناً کامیابی قدم چومے گی بقول ایک انگریزی شاعر ؎

سفر آغاز جب کرنا

تو بس اتنا سمجھ لینا

جہاں میں کامیابی کی یقیں والوں سے یاری ہے
اگر تم بھی یقیں رکھو
تو پھر منزل تمھاری ہے۔

وزیراعظم کا امریکی دورہ: اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

وزیر اعظم نریندر مودی پھر ایک بار امریکہ کے دورے پر روانہ ہو رہے ہیں۔ گزشتہ مرتبہ کی طرح وہ پہلے اقوام متحدہ کے عمومی اجلاس سے خطاب کریں گے۔ اس کے بعد واشنگٹن کے بجائے سیلیکون ویلی جائیں گے۔ پچھلی مرتبہ میڈیسن اسکوائر نیویارک میں انہوں نے ایک ناچ رنگ کے پروگرام میں شرکت کی تھی لیکن اس بار وہ سان جونس میں واقع سیپ سینٹر کے اندر پروقار انداز میں ہندوستانی عوام سے خطاب کریں گے۔ ایک سال بعد سہی وزیر اعظم کو اپنے ملک کی عزت ووقار کا خیال آگیا یہ خوش آئند بات ہے۔ حسبِ سابق صنعتکاروں سے ملاقات اور اس کے علاوہ وہ فیس بک کے دفتر دورہ بھی ہوگا۔ پچھلے سال صرف سکھوں نے مظاہر کیا تھا لیکن اس بار گجرات کے رہنے والے پٹیل سماج کا غم وغصہ بھی ان کا منتظر ہو گا۔

گجرات میں جب سے ریزرویشن کی تحریک کا آغاز ہوا ہے وزیر اعظم نے اپنا رخ بہار اور وارانسی کی جانب کرلیا۔ گجراتی عوام کے دلوں کی بادشاہت کا دعویٰ کرنے والے اس خودساختہ شہنشاہ نے گزشتہ تین ماہ میں ایک بار بھی گجرات کے اندر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی مگر گجرات کی آگ ان کے آگے امریکہ پہنچ گئی۔ گجرات اگر مودی جی کا میکہ ہے تو سسرال دہلی ہے۔ فی الحال جہاں ایک طرف

گجرات سے لے کر امریکہ تک پٹیل سماج آگ بگولا ہے وہیں خود مودی جی نے ملک کو فسطائیت کی آگ میں جھونک رکھا ہے۔امریکہ میں مودی کا انتظار کرنے والی پٹیل برادری کے دل میں پھپھولے پھوٹ رہے ہیں۔بقول شاعر

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

امریکہ کے اندر پٹیل سماج نے بیرونِ ملک پٹیل امانت سوسائٹی (اوپاس) قائم کرکے وزیراعظم نریندر مودی کی آمد کے موقع پر امریکی انتظامیہ سے احتجاجی جلوس نکالنے کی اجازت بھی حاصل کرلی ہے۔۔اوپاس کے کنونیر تیجبس پٹیل کے مطابق وہ لوگ کالے کپڑے پہن کر سیاہ جھنڈوں کے ساتھ مظاہرہ کریں گے۔اوپاس کے رہنما بلدیو پٹیل کا کہنا ہے کہ پچھلی مرتبہ ہم نے وزیراعظم کیلئے سرخ قالین بچھایا تھا اس مرتبہ ہم سیاہ پرچم لہرائیں گے۔ایک اور رہنما ستیش پٹیل نے کہا کہ ہم نے بھارت وکاس ایسو سی ایشن کے ناظم بھارت.برائی سے اپنا چندہ لوٹانے کا مطالبہ کیا ہے گزشتہ سال دیا تھا۔ اس مطالبے کے جواب میں بھارت.برائی نے میڈیسن اسکوائر میں کئے گئے تماشے کی قلعی بھری بزم میں کھول دی۔انہوں نے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس پروگرام کیلئے جملہ ایک ہزار بیں کروڈ روپے جمع کئے گئے تھے جس میں سے ایک ہزار کروڈ تو پروگرام کے انتظام وانصرام پر صرف ہوگئے اور باقی رقم سوچھ بھارت مشن کو سونپ دی

گئی گویا اس پر بی جے پی نے ہاتھ صاف کرلیا۔اس سے ظاہر ہے کہ وہ دیش بھکتی کا مظاہرہ نہیں بلکہ ایک ہزار کروڈ کے اصراف سے منعقد کردہ ایک تفریحی کھیلتا۔

پٹیل سماج اقوام متحدہ کے دفتر سے لے کر ہندوستانی سفارتخانے تک کے علاوہ سان جوس میں بھی احتجاج کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ امریکہ کے مختلف شہروں میں بھی مظاہرے ہوں گے ۔ اس کے سبب سرکاری ایجنسیاں پٹیلوں کو مودی جی کے پروگراموں میں لانے کے بجائے دور رکھنے میں جٹی ہوئی ہیں۔ امریکہ میں موجود مودی بھکتوں کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنے داخلی مسائل کو ہندوستان کے حدود سے باہر نہیں لانا چاہئے مگر خود وزیراعظم جب سابقہ حکومت پر فرانس، کینیڈا، چین اور دبئی میں کھلے عام تنقید فرماتے ہیں تو یہ مودی بھکت انہیں حق بجانب ٹھہراتے ہوئے بغلیں بجاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی بیرونِ ہندان پر تنقید کرے تو دیش بھکتی جاگ اٹھتی ہے اور وہ اس پر لعنت ملامت کرنے لگتے ہیں۔

مودی جی آج کل سبھاش چندر بوس پر دل و جان سے فدا ہیں۔ پچھلے ایک ہفتہ میں ان کے دفتر سے بوس کے اہل خانہ کو ۸ مرتبہ فون کیا گیا گجرات کے مردآہن اور سنگھ پریوار کے منظور نظر ولبھ بھائی پٹیل کے احتجاج کرنے والے خاندان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ سردار پٹیل کا پڑپوتا (بھتیجا) کیول پٹیل فی الحال

امریکہ میں مقیم ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ ریزرویشن کے سبب وہ انجینیرنگ کالج میں داخلہ سے محروم رہا اور ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ ایک اور رہنما دکشیش پٹیل بی جے پی حکومت کے ذریعہ گجرات کے اندر پٹیل مظاہرین پر مظالم سے ناراض ہیں۔ ان کا شکایت ہے کہ ہم اپنے حقوق انسانی کی پامالی سے مودی جی کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس احتجاج میں پٹیل برادری کے ساتھ گجرات کے براہمن بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر مودی جی نے گجرات براہمنوں کا سیاسی اثرو ورسوخ ختم کردیا یہی وجہ ہے امریکی خلاء باز سنیتا ولیم کے والد دیپک پنڈیا نے کہا کہ وہ اپنے گاوں کی پٹیل برادری کی حمایت کررہے ہیں۔ سارے سیاسی دانشور حیرت و استعجاب کے عالم میں گجراتیوں کے ذریعہ مودی جی کی مخالفت اور براہمنوں کے اندر بی جے پی حکومت سے ناراضگی کا چمتکار دیکھ رہے ہیں۔

ملک کے اندر فی الحال بے شمار مسائل ہیں۔ ان کو نظر انداز کرکے وزیراعظم نریندر مودی اس قدر غیر ملکی دورے کیوں کرتے ہیں ؟ اس سوال کا سہل ترین جواب یہ ہے کہ ایوان پارلیمان میں جاکر مباحث میں حصہ لینے کی نہ ان میں صلاحیت ہے اور نہ جرأت ۔ اندرون ملک ان کی باتوں پر نہ کوئی توجہ دیتا ہے نہ اعتماد کرتا ہے اس لئے خبر نہیں بنتی ۔ اس لئے خبروں میں رہنے کا سب سے آسان طریقہ بیرونِ ملک دورہ ہے لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خبروں میں رہنا

کیوں ضروری ہے؟ جمہوریت کی مجبوری یہ ہے کہ یا تو عوام کے کام کرو یا کم از کم شور کرو؟ مودی جی نے دوسرا متبادل پسند فرمایا ہے۔ مودی جی نہایت ذہین آدمی ہیں وہ اپنی خوبیوں اور کمزوریوں سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کون سا کام وہ بحسن و خوبی کر سکتے ہیں اور کیا ان کے بس کا روگ نہیں ہے اس لئے حسبِ استطاعت وہ قوم کی خدمت کرنے میں لگے ہوئے ہیں اب یہ خدمت عوام کیلئے رحمت ہے زحمت اس سے ان کو کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ تو اسے اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے ہیں نیز نارسیسس کی مانند خود ہی اپنے سیلفی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ میں آج کل منموہن سنگھ اور نریندر مودی کے غیر ملکی دوروں کا موازنہ کیا جارہا ہے۔ منموہن نے ۱۰ سالوں میں ۴۰ ممالک کا دورہ کیا مودی جی ایک سال میں ۲۰ ممالک گھوم آئے۔ اس طرح اگر پانچ سال کا موقع انہیں مل جائے تو سیکڑہ پورا ہوجائیگا۔ یہ بھی کہا جارہا ہے مودی جی پر گزشتہ امریکی دورے کے دوران ۳۱ مضامین لکھے گئے جبکہ منموہن جی کے دورے پر صرف ۸ مضامین لکھے گئے تھے۔ ان مضامین میں لکھا کیا گیا تھا؟ مودی جی کی مخالفت اور منموہن کی کس قدر تعریف کی گئی تھی وہ ایک تحقیق کا موضوع ہے۔ان مضامین میں کتنے اپنے طور پر لکھے گئے تھے اور کتنے لکھوائے گئے تھے اس کی تفصیل بھی دلچسپ ہوسکتی ہے۔ مودی جی کے ٹی وی پر نظر آنے کا شوق صدر اوبامہ کے دورے پر نظر

آیا۔ مودی جی کے ساتھ وہ ۲۵۵ گھنٹوں تک ٹی وی کے پردے دکھائی دیئے جبکہ منموہن کے زمانے میں صرف ۸۲ گھنٹوں تک عوام کواوبامہ کا دیدار نصیب ہوا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سرکاری اشتہار بازی سے مودی جی اور اوبامہ کو تو خوب بھلا ہوا لیکن عوام کو تفریح کے علاوہ کیا ملا؟

یہ عوامی تفریح مفت نہیں تھی بلکہ ان کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونے والے ٹیکس میں سے ایک خطیر رقم وزیراعظم کے دوروں کی نذر ہو گئی ۔آسٹریلیا میں مودی جی کے وفد کو ٹھہرانے پر ۵٫۶ کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے اور ٹیکسی کا بل ۲٫۴ کروڑ روپے تھا۔ مودی جیبھوٹان کے دورے پر بھی ۴۱ لاکھ سے زیادہ پھونک آئے۔ امریکہ میں انہوں نے رہنے سہنے پر ۶ کروڑ سے زیادہ خرچ کئے۔ پچھلی مرتبہ مودی جی نیویارک پیلس میں رکے تھے اور قصرابیض بھی تشریف لے گئے تھے۔ اس بار اوبامہ نے مودی جی کے بجائے پاکستانی وزیراعظم نواز شریف کو قصرابیض کا مہمان بنالیا تو ممکن نے مودی جی کے حواریوں نے سوچا ہو کہ کیوں نہ مودی جی کو اوبامہ کے ساتھ والڈروف اسٹوریہ نامی ہوٹل میں ٹھہرادیا جائے جہاں پچھلی مرتبہ اوبامہ کا قیام تھا ممکن ہے ایک آدھ سیلفی کا موقع ہاتھ آجائے لیکن بدقسمتی سے اوبامہ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور وہ خود نیویارک پیلس میں منتقل ہو گئے جہاں مودی ٹھہرے تھے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ سان جوس سے واپسی کے بعد مودی اور اوبامہ کی باہمی گفتگو والڈروف اسٹوریہ میں

منعقد ہو۔

ڈرامہ بازی سے لوگ بہت جلداوب جاتے ہیں اس لئے اسے ایک ہی انداز میں بار بار دوہرایا نہیں جاسکتا ہے۔ فلمی دنیا کے لوگ اسی لئے اپنے فارمولوں کو باری باری سے ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ مودی بھکتوں نے بھی سوچا بار بار ناچ رنگ کا کھیل نہیں چلے گا اس لئے اب کی بار صنعتکاروں کی ملاقات کے علاوہ اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں خطاب رکھوادیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یونیورسٹی کے اندر مودی جی زبردست تقریر پڑھ کر سنائیں گے اس لئے کہ ایم جے اکبر جیسے لکھنے والوں کی خدمات انہوں نے حاصل کررکھی ہیں لیکن اگر وہاں کسی طالبعلم نے مودی جی سے ان کی تعلیمی لیاقت دریافت کرلی تو مسئلہ ہو جائیگا۔ گجرات کے ایک آر ٹی آئی رضاکار نے حق معلومات کے تحت مودی جی کی ۱۰ویں، ۱۲ویں اور ایم اے کی مارک شیٹ طلب کرلی تو اس کو وزیراعظم کے دفتر اور الیکشن کمیشن سے دلچسپ جوابات موصول ہوئے۔

وزیراعظم کے دفتر نے اسے وزیراعظم کی ویب سائٹ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا لیکن اس سے قبل وہاں سے ایم اے (پولیٹیکل سائنس) والا جملہ حذف کردیا گیا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ الیکشن کمیشن نے کہا کہ وہ وزیراعظم کے حلف نامہ کو دیکھے۔ وہ رضاکار عدالت میں پہنچ گیا تو وہاں پر

موجود جج ایس ای رضوی صاحب نے فیصلہ سنایا'' عوامی نمائندوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ریکارڈ میں موجود معلومات فراہم کریں لیکن اس بابت چونکہ دفتری ریکارڈ میں معلومات موجود نہیں ہے اس لئے وزیراعظم کے دفتر وہ فراہم نہیں کرسکتا''۔ عدالت نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی اجازت دی تھی اس لئے وہ بھی کردی گئی تو جواب ملا وہ پھر سے آرٹی آئی کے تحت درخواست دے گویا یہ ثابت کردیا گیا کہ دنیا گول ہے اور مودی جی تعلیمی لیاقت میں کہیں نہ کہیں جھول ہے۔ ان کے بھکت آج کل کالی داس، سور داس اور کبیر داس کی مثالیں دے رہے ہیں کہ ان کے پاس کون سی ڈگری تھی لیکن وہ بھول جاتے ہیں ڈگری کا نہ ہونا مسئلہ نہیں ہے مگر اس کا جھوٹا دعویٰ کردینا ایک سنگین جرم ہے جس کا ارتکاب کرنے والے سنگھ داس (سمرتی ایرانی, ونود تاوڑے اور نریندر مودی) کھلے عام گھوم رہے ہیں مگر عاپ کے سابق وزیر قانون جتیندر سنگھ تومر جیل میں چکی پیس رہے ہیں۔

اس سال مودی جی کی سالگرہ کے موقع پر ان کے اساتذہ اور طلباء کے تاثرات اخبارات کی زینت بنے۔ اتفاق سے سارے اساتذہ اسکول کے تھے حالانکہ مودی جی کے کالج کے کسی نہ کسی پروفیسر کو پکڑ کر اس سے ان کی تعریف کروالینا کوئی مشکل کام نہیں تھا بشرطیکہ ایسا کوئی فرد بشر موجود ہوتا۔ ان کے ساتھ پڑھنے والے ایک طالبعلم نے کالج کے پہلے سال کا ذکر کیا ہے لیکن ایم اے

کرنے کیلئے مزید ۵ سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے اس لئے کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے کالج کا کوئی ہم جماعت طالبعلم تعریف و توصیف کرنے کیلئے آگے نہیں آیا۔ مودی جی کے ساتھ پڑھنے والوں نے ڈراموں میں ان کی اداکاری کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جراثیم ان کے اندر بچپن ہی سے پائے جاتے ہیں۔ ویسے مودی جی نے ابھینیتا بننے کے بجائے نیتا بن جانے کا اچھا فیصلہ کیا ورنہ یہ عیش و عشرت اور ایسی شہرت انہیں کیونکر میسر آتی؟

سان فرانسسکو کے علاقہ میں مودی جی ۳۳ سال بعد جانے والے پہلے وزیراعظم ضرور ہیں لیکن ان سے قبل ۳ ہندوستانی وزرائے اعظم اس خطے کا دورہ کرچکے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں جبکہ سیلیکون کی وادی کا وجود نہیں تھا پنڈت جواہر لال نہرو نے یو سی برکلی یونانی مرکز میں خطاب کیا۔ ان کے بعد ۱۹۷۸ء میں مرارجی دیسائی اور پھر ۱۹۸۲ء میں اندرا گاندھی لاس اینجلس کا دورہ کرچکی ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں اٹل جی بھی وہاں جانا چاہتے تھے مگر نہیں جاسکے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ مرارجی دیسائی کے دورے کی بھی وہاں کے تعلیم یافتہ حضرات نے مخالفت کی تھی اور انہیں ہندوستانی عوام کا قصائی قرار دیا تھا اور اب وہ مودی جی کے خلاف کمربستہ ہیں۔ ذرائع کے مطابق، امریکی یونیورسٹیوں میں جنوبی ایشیا کے امور پر گہری نظر رکھنے والے ۲۴ پروفیسروں نے ایک بیان جاری کرکے حقوق انسانی اور شہری حقوق کو پامال کرنے والی مودی حکومت سے محتاط رہنے کی اپیل

کی ہے۔ ان حضرات نے مودی کے دورۂ امریکہ اور سلیکون ویلی کے ساتھ ہندستان کے کاروباری امکان کا حق تسلیم کرتے ہوئے گجرات فسادات کو یاد دلانے کی کوشش کی ہے۔

کھاڑی کے اس علاقہ میں ۲ لاکھ ۷۰ ہزار ہندوستانی نسل کے لوگ آباد ہیں جن میں سے دو تہائی کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی ہے۔ ان میں سے کچھ اہم عہدوں پر فائز ہیں مثلاً گوگل کے سربراہ سندر پچائی اور اڈوب سسٹم کے سی ای او شنتانو نارائن۔ مودی جی سیپ سینٹر ہیں ساڑھے ۱۸ ہزار ہندوستانیوں سے خطاب کرنے کے علاوہ ان صنعتکاروں سے بھی گفت و شنید کریں گے۔ مودی جی سرمایہ کاروں سے بات تو بہت کرتے ہیں لیکن اس کی اثر پذیری کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

امریکہ اور ہندوستان کے درمیان ۵۰۰ بلین ڈالر کا کاروبار متوقع تھا مگر صرف ۱۰۰ بلین ڈالر ہوا جبکہ اس کے مقابلے خاموش طبع چین نے امریکہ کے ساتھ ۶۰۰ بلین ڈالر کا کاروبار کیا اور اس میں سے چین کی برآمدات ۴۵۰ بلین ڈالر ہے اور برآمد صرف ۱۵۰ بلین ڈالر ہے۔ مثل مشہور ہے جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔

اس دورے پر مودی جی فیس بک کے دفتر میں جا کر ذوکربرگ سے بھی ملیں گے۔ اس ملاقات کو دورے کی غیر معمولی کامیابی قرار دیا جا رہا ہے حالانکہ گزشتہ دنوں

گھڑی بنانے کی پاداش میں گرفتار ہونے والے سوڈانی طالبعلم احمد کی حمایت کرتے ہوئے فیس بک کے مارک زوکربرگ نے کہا تھا ''کسی چیز کو بنانے کی صلاحیت اور خواہش قابلِ تعریف ہے نہ کہ قابلِ گرفت ۔ مستقبل احمد جیسے بچوں کا ہے''۔ اس کے بعد ہونہار احمد کو زوکربرگ نے اپنے دفتر میں آنے کی دعوت بھی دی ۔ صدر اوباما نے بھی احمد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''شاندار گھڑی احمد۔ کیا تم اسے قصرابیض میں لانا چاہوگے ؟ تم سے دوسرے بچوں کو بھی سائنس میں دلچسپی لینے کا حوصلہ ملاہے۔ اسی وجہ سے امریکہ عظیم ہے''۔ یہ واقعہایک طرف توامریکی معاشرے میں موجود قابلِ مذمت اسلاموفوبیاکا پتہ دیتا ہے وہیں یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ جہاں سیاستداں جھوٹی شہرت کیلئے پاپڑ بیلتے پھرتے ہیں وہیں شہرت کی دیوی ازخودآکر احمد جیسے بے نیاز لوگوں کے قدم چومتی ہے۔

فیس بک کے دیوارِ گریہ پر وزیر اعظم کا بوسہ امتیاز

ٹیکنولوجی کا زمانہ ہے۔ بچہ بچہ انٹرنیٹ کا دیوانہ ہے۔ وزیر اعظم بھی اس شمع کے پروانے ہیں (اس لئے کہ وہ بھی بچوں کی مانند ناپختہ کار ہیں)۔ لیکن نسل کا فرق تو بہر حال ہوتا ہی ہے۔ اگر آپ کسی ۸۰ سال کے بزرگ کو ایپل کا ایس ٦ فون بھی تھما دیں تو وہ اس سے بات چیت کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں لے سکے گا۔ اس کے برعکس نوعمر طالب علم نوکیا کے نیم جدید فون سے نہ صرف فیس بک پر چلا جائیگا بلکہ یوٹیوب ، ٹویٹر اور واٹس اپ وغیرہ ڈاؤن لوڈ کرنے کے بعد اپنی پسند کے ویڈیو گیمس بھی کھیلنے لگے گا۔ ایسا ہی کچھ مودی جی کے ساتھ ہو رہا ہے جسے ایک مثال کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک امیر کبیر داماد کا خسر جیٹھالال پٹیل اپنے نواسے نانو پٹیل سے کہتا ہے بیٹے میں تاج محل دیکھنا چاہتا ہوں ۔ تیز طرار نانو جواب دیتا ہے ناناجی اس میں کون سی مشکل ہے۔آپ احمدآباد سے دہلی کی فلائیٹ لیجئے اور وہاں سے کار میں بیٹھ کر آگرہ نکل جایئے۔ میں گھر بیٹھے آپ کیلئے انٹرنیٹ پر ہوائی جہاز کا ٹکٹ مختص کروادیتا ہوں۔آپ کو اگر کھڑکی کے پاس بیٹھنا ہے تو وہ نشست یا اگر آپ راہداری کے قریب بیٹھنا چاہتے ہیں

تو وہ سیٹ بھی آن لائن بک ہو جائیگی ۔ بورڈنگ کارڈ میں چھاپ دوں گا آپ کو لائن میں لگنے زحمت بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ آپ کی پسند کا کھانا یہاں بیٹھے بیٹھے آرڈر کردیا جائیگا۔ آپ ہوائی جہاز میں بیف کٹلیٹ بھی کھا سکتے ہیں اس لئے کہ زمین کی پابندیاں آسمان کی بلندیوں پر نافذ نہیں ہوتیں۔ ائیر پورٹ پر ٹیکسی سروس کی ادائیگی کردوں گا تاکہ ایک ڈرائیور نام کی تختی لے کر آپ کا انتظار کرے۔ وہ آپ کو آگرہ کی پانچ ستارہ ہوٹل میں پہنچا دے گا۔ کمرہ میں بک کردوں گا اور پھر آپ کو تاج محل کی سیر کروانے کے بعد وہی ڈرائیور دہلی ہوائی اڈے لے آئیگا۔ آپ جیسے جائیں گے ویسے ہی ہشاش بشاش لوٹ آئیں گے۔

جیٹھا بھائی توقع کررہا تھا کہ نواسہ ساتھ چلے گا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ کنی کاٹ رہا تو بولے بیٹا یہ تو خاصہ پیچیدہ کام ہے۔ یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا ہم لوگ تو ایک جھولے میں کپڑے بھر کر ٹرین میں سوار ہوجاتے تھے اور راستے میں ڈھوکلا پھاپڑا کھاتے ہوئے آگرہ پہنچ جاتے تھے ۔ اس کے بعد کسی سرائے میں رات گزاری دن میں رکشا پر بیٹھ کر تاج محل دیکھا اور پھر واپس ریلوے اسٹیشن آگئے۔ نواسے کو یہ جواب سن کر بہت مایوسی ہوئی وہ بولا لیکن نانا اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اس وقت آپ میری طرح کڑیل جوان تھے اب نہیں ہیں۔ ٹرین میں ایسی بھیڑ بھی نہیں ہوتی رہی ہوگی جیسے کہ اب ہوتی ہے۔ اس لئے آپ

اس مہم جوئی سے گریز فرمائیں اور اپنے آپ کو خطرات میں نہ ڈالیں۔ اس میں آپ کی عافیت اور ہماری بھلائی ہے۔

نانا نے کہا اگر واقعی زمانہ بدل گیا ہے تو کیا کوئی ایسی صورت نہیں بن سکتی ہے کہ میں آگرہ جائے بغیر یہیں بیٹھے بیٹھے تاج محل دیکھ لوں ؟نانو بولا کیوں نہیں یہ بھی ممکن ہے۔ ہمارے گوگل بابا کو آپ کیا سمجھتے ہیں وہ اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے آپ کو تاج محل کے درشن کروادیں گے۔ جیٹھا بھائی نے پوچھا وہ کیسے ؟نانو چہک کر بولا میں گوگل ارتھ پر تاج محل ٹائپ کروں گا اور سیٹیلائیٹ کیمرہ آگرہ پہنچ جائیگا۔ اس طرح آپ یہیں اس کمپیوٹر کے پردے پر تاج محل کا نظارہ کرلیں گے ۔ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب آپ کو دکھائی دینے لگے گا۔ جیٹھا بھائی نے سوچا یہ تو زبردست بات ہے پھر انہیں خیال آیا کہ ان کے مٹھائی کی دوکان کے پڑوس میں جو لڑکا چائے بیچا کرتا تھا وہ آج کل وزیر اعظم بنا ہوا ہے اور سنا ہے وہ بھی خاصہ کمپیوٹر سیوی ہے۔ جیٹھا بھائی نے اپنے نواسے نانو کو حکم دیا کہ وہ مودی جی کے خاص فون کا نمبر ملائے۔

جیٹھا بھائی پٹیل کی گرجدار آواز مودی جی فوراً پہچان گئے اور بولے جیٹھا سیٹھ کیم چھو؟

جیٹھا بولا یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا؟ مودی جی

بولے یار تُرے اچھے وقت پر تم نے فون کیا۔ وہ اپنے ہاردک کو سمجھاؤ اس کی وجہ سے پٹیل سنتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں دورے نہ پڑنے لگیں۔ جیٹھا بھائی بولے ارے نرو تیرے پاس دل ہی کہاں ہے جو دھڑکے یا اس پر دورہ پڑیں تیری تو بس ۵۶ انچ کی چھاتی ہے جس میں ہوا بھری رہتی ہے۔ مودی جی نے جواب دیا وہ بھی ٹھیک ہے کہیے کیسے یاد کیا؟ کہیں تجھے میرے کی ہاتھ مسالے والی چائے تو نہیں یاد آگئی۔ جیٹھالال نے کہا نہیں بھائی اب وہ چائے ہمارے نصیب میں کہاں جسے اوبامہ نوش فرماتے ہیں۔ مودی جی بولے وہ بھی درست ہے مگر میں تیرے لئے وہ زحمت کر سکتا ہوں بشرطیکہ کہ تو ۰۰۰۰ میں سمجھ گیا جیٹھالال نے کہا میں ہاردک کو سمجھا دوں گا۔ مودی جی بولے اچھا تو بول کیسے یاد کیا؟

جیٹھالال نے کہا میرا ایک نواسہ ہے بالکل تمہاری طرح، جو من میں آئے کہہ دیتا ہے۔ آج کہہ رہا تھا کہ میں گوگل پر تاج محل دیکھ سکتا ہوں؟ کیا یہ سچ ہے یا بس یوں ہی انتخابی جملہ ہے؟ مودی جی بولے جیٹھالال پٹیل تمہارا نواسہ بہت ذہین ہے اور سچ بولتا ہے اسے میرے پاس بھیج دے۔ جیٹھالال نے کہا اگر ایسا ہے تو میں اسے نہیں بھیج سکتا۔ مودی جی نے چونک کر پوچھا کیوں؟ میں اسے چائے کی دوکان پر نہیں بلا رہا ہوں۔ تجھے تو پتہ ہی ہے میں وزیر اعظم بن گیا ہوں۔ جیٹھا نے جواب دیا نہیں وہ دوسری بات جو تم نے کہی نا

کہ سچ بولتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آگے بھی سچ بولنے کا سلسلہ جاری رہے اس لئے روک رہا ہوں۔ مودی بولے خیر کوئی بات نہیں لیکن یہ سچ ہے کہتم گوگل ارتھ کی مدد سے آگرہ جائے بغیر تاج محل دیکھ سکتے ہو۔ گوگل کا سربراہ سندر پچائی میرا بہت بڑا مداح ہے۔ میں تمہیں سیدھے گوگل کے نیویارک دفتر میں بھیج دوں گا بلکہ اگر ایک مہینہ رک سکو دہلی سے براہِ راست سان فرانسسکو فلائیٹ بھی روانہ کرسکتا ہوں۔ میں نے پہلی بار یہ خدمت شروع کروائی ہے۔ میں اس کا تمہیں پہلا مسافر بنادوں گا جو مفت میں سفر کرے گا۔ ہمارا سفیر ہوائی اڈے سے تمہیں گوگل کے دفتر میں لے جائیگا اور تم وہاں پر تاج محل کو دیکھ سکوگے۔

اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ آج کل حکومتی سطح پر ٹکنالوجی کا استعمال کس طرح ہو رہاہے۔ جو کام گھر میں بیٹھ کر کرنا چاہئے اس کیلئے دنیا بھر کی سیر کی جارہی ہے۔ یہی بات عاپ کے اروند کیجریوال نے مودی جی کے دورے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہہ دی لیکن ان سے پہلے بی جے پی کے یشونت سنگھ بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر ہم ''میک ان انڈیا'' کے بجائے ''میک انڈیا'' پر توجہ دیں تو ہمیں کسی کے دروازے پر جاکر ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پیش آئیگی بلکہ لوگ از خود لائن لگا کر ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کرنے کیلئے آئیں گے لیکن اگر ہم نے تعلیم ، صحت، مواصلات اور دیگر اصلاحات کی جانب توجہ نہیں کی تو

لاکھ دوروں اور ملاقاتوں کے باوجود ایک اضافی پھوٹی کوڑی نہیں آئیگی۔ وزیراعظم کے محنت و مشقت کے بغیر جو سرمایہکاری پہونچے ہو تی رہے گی۔

مودی جی نے گوگل کے دفتر میں جاکر سب سے پہلے تاج محل کو دیکھا لیکن پھر انہیں خیال آیا ہوگا کہ یہ تو مسلم بادشاہ کی تعمیر کردہ یادگار ہے اس لئے وہ بولے مجھے بنارس کے گھاٹ دکھلاؤ۔ یہ سوال مودی جی کی ذہانت کا غماز ہے۔ مودی جی کے وارانسی دورے سے قبل ان کے حلقہٗ انتخاب کی آرائش وزیبائش کا کام شروع ہوجاتا ہے اس لئے انہیں نہ پانی میں تیرتی لاوارث لاشیں نظر آتی ہیں اور نہ کچرے کے ڈھیر۔ گوگل میپ پر اچانک مودی جی نے بنارس دیکھنے کی فرمائش کرکے سوچھ بھارت ابھیان کی قلعی کھول دی لیکن بھول گئے کہ اس وقت جو کچھ انہوں نے دیکھا اس کا نظارہ دنیا بھر کے بہت سارے لوگوں نے کیا اور سب کو پتہ چل گیا کہ کیوٹو کے طرز پر تعمیر ہونے والے خواب کی تعبیر کیا ہے؟

بنارس کے بعد مودی جی نے کہا میں پٹنہ کے قریب میں واقع کھگول نامی گاؤں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ نام گوگل والوں نے پہلی بار سنا تھا اس لئے وہ پریشان ہوگئے۔ گوگل میں زیر ملازمت بانکے بہاری نے کہا جناب پٹنہ دیکھ لیجئے آپ وہ کھگول کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ مودی جی بولے پٹنہ میں لالو کا

ڈنکا بجتا ہے میں اسے سننا یا دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم مجھے کھگول لے چلو۔ بانکے بہاری نے اس گاوں کا نام بھی نہیں سنا تھا اس لئے پوچھا لیکن کھگول میں ایسا کیا ہے اور جو آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں ؟ مودی جی بولے تم بہار کی تاریخ نہیں جانتے ۔ کسی زمانے میں وہیں آریہ بھٹ کی تجربہ گاہ تھی اور وہ اس لیباریٹری میں بیٹھ کر ستاروں کی چال دیکھا کرتے تھے ۔ بانکے بولا لیکن جناب یہ تو گزرے زمانے کی بات ہے۔ اب تو وہاں نہ آریہ بھٹ ہے اور نہ اس کی تجربہ گاہ ہے ۔ فی الحال تو وہاں نتیش کمار ہی نتیش کمار ہے۔

مودی جی بولے یہ تم مجھے بتا رہے ہو۔ نتیش کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں وہ نمک حرام ہماری مدد سے ہی تو وزیراعلیٰ بنا تھا لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہم اپنے بل بوتے پر دوبارہ بہار میں آریہ بھٹ کی حکومت قائم کرنے جارہے ہیں ۔ گوگل کے سربراہ سندر پچائی نے حیرت سے سوال کیا۔ کیا آپ آریہ بھٹ کو چتا کے اندر سے نکال کر لائیں گے ؟ مودی جی بولے تم امریکہ میں آکر اپنے عقائد و نظریات بھول گئے ۔ تم نہیں جانتے ہم لوگ پونر جنم میں وشواس کرتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ آریہ بھٹ پھر سے پیدا ہوچکا ہے اب صرف اسے تلاش کرکے اس کو بہار کی گدیّ پر بٹھانے کا کام رہ گیا ہے سو میں کردوں گا۔

فیس بک کا مارک زوکر برگ جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھا تھا درمیان میں بول پڑا۔ جی ہاں اگر ایسا ہے تو آپ اس کے ساتھ ایک سیلفی نکال کر فیس بک پر ڈال دیجئے۔ اس کا بھی کام ہو جائیگا، آپ کا اور میرا بھی۔ سندر پچائی بولا لیکن اس کے ساتھ سیلفی لینے کیلئے اس کو ڈھونڈنا بھی تو ضروری ہے وہ کام کیسے ہوگا؟ مودی جی بولے آسمان میں اڑنے والے زمینی حقائق سے واقف نہیں ہوتے۔ بہار کے ریاستی انتخابات کا اعلان ہو چکا ہے ۔ میں ہر ہفتہ دو مرتبہ بہار جاکر وہاں کے گلی کوچوں میں یہ اعلان کرتا پھروں گا کہ دیکھو میں امریکہ میں جاکر بھی بہاریوں کو نہیں بھولا۔ میں نے وہاں بھی آریہ بھٹ کی تجربہ گاہ کو گوگل کے نقشے پر دیکھا اور انتخاب کے بعد میں وہاں عبدالکلام کے نام پر ایک تجربہ گاہ قائم کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس اعلان کو سن کر کئی آریہ بھٹ ٹکٹ کی لائن میں لگ جائیں گے۔ بانکے بہاری کو یہ بات ناگوار گزری وہ بولا عبدالکلام کے نام پر کیوں؟ آریہ بھٹ کے نام پر کیوں نہیں؟

مودی جی بولے تم نہیں سمجھوگے۔ آریہ بھٹ کا وارث براہمن سماج فی الحال ہماری مٹھی میں ہے اب ہمیں مسلمانوں کو قریب کرنا ہے۔ شاہنواز حسین اس کام کو بڑی تندہی سے کررہا ہے۔ اسی نے عبدالکلام کے نام پر تجربہ گاہ قائم کرنے کا نادر مشورہ دیا ہے ۔ سندراس دوران گوگل سائٹ پرآریہ بھٹ کے بارے میں پڑھ چکا تھا وہ بولا آریہ بھٹ کی ایجاد صفر بھی تو آخر صفر ہی ہے۔ یہ سن کر

بانکے بہاری کی بہاریت جاگ اٹھی۔ قومی حمیت سے سرشار بانکے بہاری نے جواب دیا یہ بات درست ہے کہ مجرد صفر کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔اس کی دائیں جانب والے ہندسوں پر بھی وہ اثرانداز نہیں ہوتا۔ لیکن فی الحال اس کے دائیں جانب گوگل ہے اس لئے ہر صفر کا اضافہ ہماری قدر و قیمت میں دس گنا کے اضافہ کا سبب بن سکتا ہے۔ بانکے بہاری کی منطق سے خوش ہو کر سندر بولا بانکے میں تو تمھیں بھی مودی جی کی طرح سمجھتا تھا لیکن تم تو بڑے ذہین آدمی نکلے۔

مودی جی نے کہا یہی تو میں کہہ رہا ہوں ہم اس تجربہ گاہ کو قائم کرکے اس کے بائیں جانب یکے بعد دیگرے صفر کا اضافہ کرتے چلے جائیں گے جس سے بہار کا نام بھی گجرات کی مانند ساری دنیا میں روشن ہو جائیگا۔زوکرسرگ بولا لیکن جناب گجرات کا نام کہاں روشن ہے؟ وہاں تو صفر تک ایجاد نہیں ہوا۔میں نے جب سے آپ کے ساتھ مصافحہ کیا ہے لوگ مجھے ہاتھ صاف کرنے والی جراثیم کش دوائیں بھیج رہے ہیں تاکہ میں اپنی آستین پر لگے گجرات کے معصوموں کا خون دھو سکوں۔ مودی جی مسکرا کر بولے تم ان فسادات کو بھول جاؤ جیسا کہ میں بھول چکا ہوں ہوں اور اگر کوئی پوچھ لے کہ ہاتھ پر کیا لگا ہے تو کہہ دینا یہ خوبصورت مہندی مودی جی لگا کر گئے ہیں۔ زوکرسرگ نے کہا لیکن جناب یہ امریکہ ہے؟ مودی جی بولے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ محبوب کی مہندی ہے جو ہر جگہ رنگ لاتی ہے۔ زوکرسرگ نے سوچا ان کو سمجھانا مشکل ہے میں ٹٹو کہہ

دوں گا۔

احمدآباد میں نانو پٹیل اپنے نانا کے ساتھ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا یہ مناظر دیکھ رہا تھا ۔ جیٹھا بھائی نے پوچھا نانو تم کیا کررہے ہو؟ نانو بولا مودی جی تقریر دیکھ رہاہوں؟ جیٹھا لال نے بگڑ کر کہا تقریر تو سننے کی چیز ہوتی ہے۔ نانو بولا جی نہیں نانا۔ مودی جی کے دل کی بات ضرور سننے کیلئے ہوتی ہے لیکن امریکہ میں جاکر وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ تو دیکھنے لائق ہوتا ہے یہ دیکھئے وہ کیا کررہے ہیں ؟ مودی جی کہہ رہے ہیں میں تمہارے درمیان کھڑا ہوں ۔آپ لوگ مجھے سرٹیفکیٹ دیجئے۔ جیٹھا بولا اس میں حیرت کی کیا بات ہے نانو یہ تو فطری تقاضہ ہے۔ نانو نے کہا کیسی بات کرتے ہیں نانا جی سرٹیفکیٹ کون مانگتا ہے استاد یا طالب علم؟ مودی جی اپنے ملک میں یوم اساتذہ کے موقع پر استاد بن جاتے ہیں اور پردیس میں ہاتھ پسار کر اپےہ جاہل بھکتوں سے سرٹیفکیٹ طلب فرماتے ہیں۔ جیٹھا بولا جیسے چائے اسی کو تو پلائی جاسکتی ہے جو اس کا طالب ہو اسی طرح سرٹیفکیٹ بھی اسی سے مانگا جاسکتا ہے جو اسے مرحمت فرمائے۔ ہم لوگ اپنی مٹھائی کی دوکان اسی میلے میں لگاتے تھے جہاں وہ بکتی تھی۔ کسی زمانے میں ہم دونوں دسہرہ کے موقع پر رام لیلا بھی ہم اسی محلے میں کھیلتے تھے جہاں دکشنا ملتی تھی۔ کبھی میں رام بن جایا کرتا تھا اور نریندر راون تو کبھی نریندر رام کا کردار نبھاتا تھا اور میں

راون بن جایا کرتا تھا۔ یہ دنیا ہے دنیا۔ یہاں یہی سب چلتا ہے۔

نانو نے دیکھا مودی جی ٹی وی کے پردے پر مارک زوکر برگ سے معانقہ فرمارہے ہیں۔ اس نے پوچھا نانا جی یہ آپ کے دوست مودی جی بدلیس جاتے ہیں تو ہر ایرے غیرے نتھو خیرے گورے سے لپٹ جاتے ہیں۔ میں نے انہیں کسی ہندوستانی سے گلے ملتے نہیں دیکھا اس کی کیا وجہ ہے؟ جیٹھا اس سوال پر سنجیدہ ہوگیا اور خلاء میں دیکھنے لگا۔ نانو نے کہا معاف کیجئے نانا جی شاید آپ کو میری بات بری لگی اس لئے معذرت چاہتا ہوں۔ جیٹھا نے کہا نہیں بیٹے ایسی بات نہیں مجھے پتہ ہے اب یہ جادو کی جھپی میرا مقدر نہیں بن سکتی۔ نانو نے پوچھا وہ کیوں؟ جیٹھا نے جواب دیا بیٹے بات یہ ہے کہ ہمارے عقائد و نظریات زمان و مکان کے پابند ہیں۔ ہمارا سلوک اور رویہ وقت اور مقام کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ ایک زمانے میں نریندر مجھ کو چائے پلاتا تھا اب اوبامہ کو پلاتا ہے۔ گئو کشی ہمارے ملک میں حرام ہے لیکن وہی گوشت دیگر ممالک کو برآمد کرکے اجنبی لوگوں کو کھلانا نہ صرف حلال بلکہ مستحب ہے۔

نانو بولا لیکن وکی پیڈیا میں تو میں نے یہ سب نہیں پڑھا۔ نانو اور نانا کی گفتگو بتدریج مائل بہ سنجیدگی تھی۔ جیٹھا نے کہا بیٹے یہ علم و حکمت کی معرفت تمہیں گوگل بابا نہیں کرا سکتے اس کیلئے تمہیں منو باباکے آشرم میں

جانا ہوگا۔ نانو نے پوچھا منو بابا؟ ان کا نام تو میں نے کبھی نہیں سنا جبکہ آئے دن ٹیلی ویژن پر آسارام باپو کی طرح کے کسی نہ کسی بابا بلکہ بابی کا نام بھی سنائی دیتا ہے۔ جیٹھا نے چونک کر پوچھا پروین بابی تو کب کی مر کھپ گئی یہ نئی بابی کہاں سے آگئی۔ نانو بولا بابی کا مطلب بابا کی دھرم پتنی۔ آج کل تو ان کا چرچا کچھ زیادہ ہی ہے کبھی رادھے ماں تو کبھی سادھوی پراچی جب ٹی وی والوں کو کوئی نہیں ملتا تو وہ ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں خیر آپ منو بھائی کے بارے میں بتا رہے تھے۔ جیٹھا لال نے کہا یہ منو بھائی تمہارے منا بھائی کی مانند فرضی ایم بی بی ایس کی ڈگری والا نہیں ہے بلکہ اس عالم فاضل ودوان نے شہرہ آفاق صحیفہ منو سمرتی تصنیف کیا۔ اس کا گیان پراپت کرنے کیلئے تمہیں افلاطون کے بجائے چانکیہ کے آگے زانوئے تلمذ طے کرنا پڑے گا اور یہ سنسکار تمہیں سنگھ کی شاکھا میں ملیں گے جہاں سے تربیت حاصل کرکے مرکا دوست وزیر اعظم بن گیا۔

(جاری، ان شاءاللہ)

(اس مضمون کے واقعات و مکالمے فرضی ہیں، حقیقت سے ان کا تعلق اتفاقی ہے)

ایک گھر کی آگ سے لگ جائیگی ہر گھر کو آگ : ۱۱/۷

ممبئ لوکل ٹرین دھماکے پر جب مکوکا عدالت نے چند روز قبل اپنا فیصلہ محفوظ کردیا تو اس کے بعد جمیعۃ العلما ہند (مہاراشٹر) کے رہنما مولانا عبدالخالق فارقلیط کی ایک دلگداز تحریر نظروں سے گذری جس میں انہوں نے اس توقع کا اظہار فرمایا تھا کہ ''میں ملزمین کے مقدمہ کی پیروی میں اول دن سے حصہ لیتا آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ عبدالوحید کی طرح تمام ملزمین بے قصور ہیں ۰۰۰۰ مجھے امید تھی کہ جس طرح اکشر دھام مندر پر حملہ سے مفتی عبدالقیوم اور دیگر ملزمین کو باعزت رہائی نصیب ہوئی تھی اسی طرح لوکل ٹرین بم دھماکے کے معاملے میں بھی ملزمین باعزت.بری کئے جائیں گے۔''اس کے علاوہ ایک سنگین خدشہ بھی بیان کیا گیا تھا''اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ ملزمین کو پھانسی کی سزا سنائی جائیگی''۔ عدالت نے ۱۲ میں سے ۵ کو پھانسی کی سزا سنا کر مولانا کے خدشات کی توثیق کردی۔ فارقلیط صاحب چونکہ ابتداء سے اس معاملے سے منسلک تھے اس لئے ان کا اندیشہ بجا تھا لیکن مجھ جیسے لوگ جو اس معاملے کو تقریباً بھولے ہوئے تھے ان کی توقعات بھی مختلف نہیں تھیں۔ مولانا نے اپنے مکتوب میں امت کی غفلت و بے حسی کا جو شکوہ کیا ہے اس پر تو بس یہی کہنا پڑے گا

کہاں کی آہ و فغاں لب ہلا نہیں سکتا

وہ رات ہے کہ دیا بھی جلا نہیں سکتا

ہمارے ملک کا عدالتی نظام بہت ہی سہل و آسان ہے۔ یہاں اکثر و بیشتر فیصلے اس بنیاد پر کئے جاتے ہیں کہ ملزم کون ہے اور اس پر کسے قتل کرنے کا الزام ہے؟ یعنی مرنے والا کون ہے اور مارنے کا الزام کس پر ہے؟ اس معاملے میں جملہ چار امکانات ہو سکتے ہیں :

- ہندو پر ہندو کو مارنے کا الزام ہو
- ہندو پر غیر ہندو کو مارنے کا الزام ہو
- غیر ہندو پر ہندو کو مارنے کا الزام ہو
- غیر ہندو پر غیر ہندو کو مارنے کا الزام ہو

خوش قسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں آخری صورتحال پیدا نہیں ہوئی اس لئے پہلے تین امکانات کی مثالیں دیکھیں۔ اندرا گاندھی وزیر اعظم تھیں ان کو ایک سکھ نے مار دیا۔ ملزم کو عدالت نے پھانسی کی سزا سنادی۔ اندرا جی کے فرزند ارجمند راجیو گاندھی کو (جو وزیر اعظم رہ چکے تھے) ایک ہندو نے مار دیا۔ عدالت اس کو پھانسی کی سزا نہیں دے سکی۔ راجیو گاندھی کی بیوہ پر ایسا دباؤ بنایا گیا کہ انہوں نے سخت سزا کا مطالبہ کرنے کے بجائے معافی کا اعلان کر دیا۔ایک فرق یہ بھی ہے کہ اندرا گاندھی کے قتل کا بدلہ عام سکھوں

سے لیا گیا اور راجیو جی نے اسے یہ کہہ کر حق بجانب ٹھہرایا کہ جب کوئی بڑا پیڑ گرتا ہے تو زمین ہلتی ہے لیکن جب راجیو گاندھی خود گرے تو زمین کیوں نہیں ہلی؟ زمین ہلتی نہیں ہے ہلائی جاتی ہے۔ راجیو گاندھی کی موت کا بدلہ کون لیتا اور کس سے لیتا؟ کوئی قوم اپنے آپ سے کیسے بدلہ لے سکتی ہے؟

گاندھی جی کے قاتل گوڈسے کو سزا تو ہوئی تھی مگر قتل و غارتگری پھر بھی نہیں ہوئی ۔ناتھو رام گوڈسے کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہیں کیا جاسکا اس کی کئی وجوہات ہیں ۔ایک تو آزادی کے فوراً بعد ہندو احیاء پرست یعنی ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس بہت کمزور تھے۔ کانگریسی اقتدار کو نہ ان فسطائی جماعتوں سے کوئی خطرہ لاحق تھا اور نہ ہندو رائے عامہ کے خلاف ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ گوڈسے کو گاڈگل نے فوراً پہچان لیا تھا اس لئے وہ رنگے ہاتھ پکڑا گیا۔ گوڈسے اگر پہچانا نہ جاتا اور اس کا کوئی ساتھی یا گاندھی جی کا محافظ اسے ہلاک کردیتا تو ممکن ہے گاندھی جی کے قتل کا الزام پاکستان پر لگا کر ہندوستان کے مسلمانوں پر اس کا بخار اتارا جاتا لیکن آگے چل کر قومی سیاست کی صورتحال بدل گئی۔ ہندو رائے عامہ کی خوشنودی کے پیش نظر خود کانگریس بھی اپنے اقتدار کی خاطر ہندو مجرمین کے خلاف اقدام کرنے سے کترانے لگی اس کے باوجود اس کی حالتِ زار پر فی الحال یہ شعر صادق آتا ہے کہ۔

دوستو محفوظ نہ سمجھو تم اپنے آپ کو

ایک گھر کی آگ سے لگ جائیگی ہر گھر کو آگ

فسطائی قوتیں قتل و غارتگری کے راستے پر ہنوز گامزن ہیں۔ چند سال قبل مہاراشٹر میں ہندو توہمات کے خلاف برسرِپیکار ڈاکٹر نریندر دابھولکر کا قتل ہوگیا۔ ظاہر ہے وہ قتل کسی ہندو نے کیا تھا۔ اس وقت مہاراشٹر میں اور مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی لیکن قاتلوں کے تئیں نرمی کا رویہ اختیار کیا گیا اور کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ اس کے بعد بی جے پی برسراقتدار آگئی تو گووند پانسرے اور ان کی اہلیہ کو گھر میں گھس کر قتل کردیا گیا۔ پانسرے کے قاتل بھی عرصۂ دراز تک آزاد گھومتے رہے۔ ان سے حوصلہ پاکر کرناٹک کے ہندو احیاء پرستوں نے پروفیسر مالے شپا کالبرگی کو قتل کردیا۔ ہندو سینا نے اس قتل کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کے بعد کے ایس بھگوان کا نمبر ہے۔ کرناٹک میں کانگریس کی حکومت ہے اس کے باوجود اس اشتعال انگیز دھمکی کو نظر انداز کردیا گیا۔

مہاراشٹر میں شیوسینا اور کانگریس دونوں پانسرے کے قاتلوں کی گرفتاری کا دباو بڑھاتے رہے یہاں تک کہ پولس نے سناتن سنستھا کے ارکان کو گرفتار کرلاو۔ ویسے اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ پولس ان کے خلاف ٹھوس ثبوت فراہم کرکے انہیں کیفرِ کردار تک پہنچائے لیکن جب سناتن سنستھا پر پابندی کا

مطالبہ سامنے آیا تو پہلے شیوسینا نے اس کی جم کر مخالفت کی اور پھر اقلیتی امور کے وزیر ایکناتھ کھڑسے بھی سناتن کی حمایت میں لنگوٹ باندھ کر کود پڑے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر بغیر ثبوت کے سناتن پر پابندی لگانا ہو تو کیوں نہ ایم آئی ایم پر پابندی لگا دی جائے؟ یہ کس قدر احمقانہ منطق ہے۔ سناتھن سنستھا کے کئی لوگ بم بناتے ہوئے ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس کے ارکان کو پانسرے قتل میں پولس نے گرفتار کیا ہے۔ اس کے باوجود وزیر موصوف کو کوئی ثبوت دکھائی نہیں دیتا۔ ابوعاصم اعظمی صاحب نے فرمایا اگر سیمی پر پابندی ہے تو سناتن پر کیوں نہیں؟ گویا غیر شعوری طور پر سیمی کی پابندی کو حق بجانب قرار دے دیا جبکہ ابھی تک خود حکومت کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پیش کر سکی۔
۔اس طرح کے بیانات پڑھ کر یہ شعر یاد آتا ہے کہ

ہم جیسے تیغ ظلم سے ڈر بھی گئے تو کیا
کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں سر بھی گئے تو کیا

یہ تو انفرادی قتل و غارتگری کے واقعات ہیں عوامی قتل عام کا بھی ایک معاملہ ابھی حال میں مدھیہ پردیش کے اندر پیش آیا۔ جھبوا کے پٹیلواد میں تقریباً ۱۰۰ لوگ ایک دھماکے میں ہلاک ہوگئے۔ اس بابت پہلے تو یہ خبر آئی کہ گیس سلنڈر کے پھٹنے سے یہ حادثہ رونما ہوا۔ ایک گیس سلنڈر اگر ۱۰۰ لوگوں کی جان لے سکتا ہے تو دہشت گردوں کو خطرناک بم استعمال کرنے کی ضرورت ہی

کیا ہے؟ بعد میں پتہ چلا چونکہ یہ دھماکہ خیز اشیاء ایک سویتا مبر جین راجندر کسوا کے گودام میں رکھے ہوئے تھے جو بی جے پی کے تاجروں کی مقامی تنظیم کا صدر بھی ہے تو عقدہ کھلا کہ وہ افواہ مجرم سے توجہ ہٹانے اور جرم پر پردہ ڈالنے کی خاطر گھڑی گئی تھی۔ ساری دنیا کو گوشت، مچھلی اور انڈے تک کھانے سے روکنے والے جین سماج کے ایک فرد نے ۱۰۰ بے قصور لوگوں کی جان لے لی لیکن کسی جین منی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ یہ ہے آدم خور سبزی خوری کا ایک نادر نمونہ۔ کسوا پہلے تو فرار ہوگیا اور بعد میں گرفتار بھی ہوگیا۔ بہت جلد اس کی ضمانت ہو جائیگی اور معاملہ رفع دفع کردیا جائیگا اس لئے کہ مرنے والے ہندو ضرور تھے لیکن مارنے والا اعلیٰ درجہ کا خوشحال زعفرانی ہندو ہے۔

زعفرانی ہندوؤں پر اگر عام ہندوؤں کے قتل کاالزام ہو تو نظر انداز کردیئے جاتے ہیں لیکن اگر وہ مسلمانوں کے قتل کا ارتکاب کریں تو انعام واکرام سے نوازے جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت نرودہ پاٹیہ میں بچوں اور خواتین تک کا قتل عام کرانے والی مایا کوندنانی کو وزیر فلاح بہبود بنادیا جاناتاں۔ امیت شاہ پارٹی کے صدر اور نریندر مودی وزیراعظم بنا دیئے جاتے ہیں۔ عشرت جہاں اور سہراب الدین کا انکاؤنٹر کرنے والے پولس افسران نہ صرف باعزت بری ہو جاتے ہیں بلکہ ترقی کے ساتھ ان کا عہدہ بحال کردیا جاتا ہے۔ ایسمانند جس

نے خود اپنے جرائم کا اعتراف کرلیا تھا جب ضمانت کی درخواست کرتا ہے تو مرکزی تفتیشی ایجنسی اس کی مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے اس لئے کہ بقول داخلی امور کے مرکزی وزیر مملکت ہری بھائی چودھری ’’قومی جانچ ایجنسی نے سوامی ایمانند کو مشروط ضمانت دیئے جانے کی مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ اس لئے کیا کہ اسے چیلنج کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ملی۔ اب اگر حکومت ہی مخالفت نہیں کرے تو بھلا عدالت کو کیا پڑی ہے کہ ضمانت سے انکار کرے؟ جب سیّاں بھیۓ کوتوال تو ڈر کاہے کا؟ لیکن ان لوگوں کو تاریخ کے اوراق پر ظالموں کے انجام سے عبرت لینی چاہئے بقول شاعر

وہی ہلاکو کہ جس نے کئے ہزاروں ہلاک
اسے بھی وقت کی یلغار نے ہلاک کیا

کرنل پروہت اور سادھوی پرگیہ کے معاملے میں عدالت عالیہ کا رخ تو بے مثال ہے۔ مالیگاؤں دھماکے کی کلیدی ملزم پرگیہ سنگھ ٹھاکر اور کرنل سری کانت پروہت کے معاملے میں سپریم کورٹ نے نچلی عدالت کو ہدایت کی کہ ان ملزمان کے ضمانت کی درخواست پر ایک ماہ کے اندر غور کیا جائے۔ اس دوران مکوکا کی دفعات پر غور نہیں کرنے کا بھی حکم دیا گیا اس لئے کہ بقول جسٹس فقیر محمد ابراہیم اور جسٹس شیو کیرتی سنگھ پہلی نظر میں یہ ثابت نہیں ہو پا رہا ہے کہ ان پر مکوکا کیوں لگایا گیا ہے۔ اگر ان دھماکوں میں مرنے والے مسلمان

نہ ہوتے اوراس کا الزام ہندووں پر نہ ہوتا تو کیا جسٹس فقیر محمد اور جسٹس شیو کیرتی یہ موقف اختیار کرنے کی جرأت کرتے؟ عدالتوں کا فی زمانہ یہ حال ہے

خونی و خائن و راشی و شقی ایک ہوئے
اس کے دربار میں پہنچے تو سبھی نیک ہوئے

یہ تبدیلی قصداً لائی جاتی ہے جس کا زندہ ثبوت مشہور وکیل روہنی سالیان کا وہ انٹرویو ہے جس میں انہوں نے کہا کہ مرکز میں تبدیلیٔ اقتدار کے بعد مالیگاوں بم دھماکہ معاملہ میں این آئی اے کا دباؤ ہے کہ وہ اس معاملہ میں " نرم" رویہ اپنائیں۔ وکیل روہنی کے مطابق" این ڈی اے سرکار بننے کے بعد این آئی اے کے ایک افسر نے انہیں فون کیا۔ جب انہوں نے فون پر کیس کی بات کرنے سے انکار کردیا تو افسر نے ان سے مل کر بتایا کہ انہیں ملزموں کے تئیں نرم رخ اپنانا چاہئے۔ سالیان نے بتایا کہ ۱۲ جون کو معاملہ کی سماعت سے ٹھیک پہلے اسی افسر نے مجھ سے کہا کہ "چیف" چاہتے ہیں کہ ان کی جگہ پر کوئی اور وکیل عدالت میں پیروی کرے۔ روہنی سالیان ایک معروف وکیل ہیں اور وہ جے جے شوٹ آوٹ، بوریولی ڈبل مرڈر، بھرت شاہ معاملہ اور ملنڈ دھماکہ جیسے کئی مقدمات کی پیروی کرچکی ہیں۔

اس کے برعکس کر مقتولین ہندو ہوں اور اس الزام کسی مسلمان کے سر منڈھ دیا جائے تو عدالت اور سیاست کا رخ یکسر بدل جاتا ہے اس کی سب سے مشہور مثالیں افضل گرو اور یعقوب میمن ہیں۔ افضل گرو حکومت کے ایماء پر علٰحیدگی پسندی سے تائب ہو تھا۔ وہ مستقلاً خفیہ ایجنسیوں کی نگرانی میں تھا بلکہ ان کا تعاون بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے اہل خانہ کے مطابق خفیہ ایجنسی کے کہنے پر وہ دہلی گیا تھا جہاں اسے دھماکے کے الزام میں گرفتار کرلیاگیا اور بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے قومی جذبات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ یعقوب میمن اپنے بھائی ٹائیگر میمن کی ہدایت کے خلاف واپس آتے ہوئے اپنے ساتھ ایسے پاکستان مایلف ثبوت لیتاآیاکہ جو خفیہ ایجنسیاں بھی حاصل نہیں کرپائی تھیں اس کے باوجود اسے پھانسی دی گئی ۔چونکہ یہ دونوں مسلمان تھے اور ان پر ہندووں کو مارنے کا الزام تھا اس لئے سارے شواہد و ضوابط بے معنی ہو کر رہ گئے ۔سیاست، عدالت اور صحافت سب ان کے خلاف ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس دگرگوں صورتحال کا سبب یاتو مسلمانوں کا اقلیت میں ہونا قرار دیا جاتا ہے یاتوان کے انتشار کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے لیکن اس خطۂ ارض میں انگریزوں کی آمد سے قبل بھی مسلمان اکثریت میں نہیں تھے اور ان میں کوئی مثالی اتحاد بھی نہیں تھا بلکہ وہ ایک دوسرے پر فوج کشی بھی کیا کرتے تھے اس کے باوجود وہ ایسے خوار کبھی نہیں ہوئے۔ دراصل انگریز جاتے

جاتے ایک ایسا نظام چھوڑ گئے جس میں اکثریت کو خوش کرنا حکمرانوں کی مجبوری ہے۔ اس خوشنودی کے حصول کی خاطر وہ اقلیتوں پر مظالم کرتے ہیں اور اکثریت کی ناراضگی سے بچنے کیلئے اکثریتی فرقہ کے انتہا پسندوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ بابری مسجد کو ہندو دہشت گردوں نے علی الاعلان شہید کردیا اور اس کے ردعمل میں سورت و دیگر مقامات پر مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ فسادات بھی کرنے لگے۔ اس سنگین جرم کے کسی مجرم کو کوئی سزا نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اپنی سیاست چمکانے کی خاطر گودھرا میں رام بھکتوں کو جلانے کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ کر گجرات کو خاک و خون کی نذر کردیا گیا۔ دونوں صورتوں میں جب چاقو خربوزے پر گرا تب بھی اور جب خربورہ گرا چاقو پر گرا تب بھی خسارے میں خربوزہ ہی رہا چاقو کا کچھ نہیں بگڑا۔

؎بقول شاعر

سب فائدے آپ کیلئے ہیں
نقصان ہیں جتنے ہم بھریں گے

اس صورتحال میں درست رویہ تو وہی ہے جو عبدالخالق فارقلیط صاحب نے اختیار کر رکھا ہے۔ بغیر کسی حزن و ملال اور شور شرابے کے وہ گزشتہ ۹ سالوں سے ان مظلومین کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں اور جو کچھ ان سے بن پڑتا ہے اخلاص کے ساتھ للہ فی اللہ کر رہے ہیں۔ بعید نہیں کہ ان کوششوں کے نتیجے میں معاملہ کسی

ایسی عدالت میں چلا جائے جس میں جسٹس تہلیانی جیسا جج موجود ہو جو حکومت کے بجائے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے اور ۲۶/۱۱ کے ملزم فہیم انصاری اور صباح الدین کی طرح ان ملزمین کو بھی رہا کردے۔ مولانا اپنے مکتوب میں آگے رقمطراز ہیں کہ ملزمین نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ہائی کورٹ میں وہ پھر سے اپنا دفاع کریں گے۔انہیں ’’بس ہماری حمایت اور سپورٹ کی ضرورت ہے۔ ہمیں انہیں تنہا محسوس ہونے نہیں دینا ہے۔ اللہ کی ذات سے انہیں پوری امید ہے‘‘۔یہی مومن کا شیوہ ہے۔ اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ اور اعتماد اسے کسی حال میں مایوس نہیں ہونے دیتا اور وہ صبر واستقامت کے ساتھ اپنے رب کو راضی کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس دنیا سے جانا اس لئے غیر اہم ہے کہ ہر ایک کو ایک دن جانا ہے لیکن کامیابی وکامرانی توانہیں کا مقدر ہے جو اپنے رب راضی کرکے اس کے حضور حاضر ہوتے ہیں۔ بقول باصر کاظمی ؎

خدا کا شکر ہے پستی نہ ہم کو کھینچ سکی
ہمیں بلندیٔ معیار نے ہلاک کیا

(اس مضمون میں سارے اشعار باصر کاظمی کے ہیں)

گاندھی جینتی: گاندھی جی اب دیکھ لیں آکر اپنا ہندوستان

ہندوستان میں تین موسم کی مانند تین قومی دن بھی ہیں ۔ گرما گرم یوم آزادی اور ٹھنڈا ٹھنڈا یوم جمہوریہ ۔ ان کے علاوہ موسمِ باراں یعنی گاندھی جینتی ۔ ان تینوں مواقع پر صدر جمہوریہ قوم کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہیں۔ اس بار گاندھی جینتی کے موقع 'پرنب دا' نے اپنے پیغام میں کہا: ''گاندھی جینتی ایک ایسا مخصوص دن ہے، جب ہمیں اپنے آپ کو بابائے قوم مہاتما گاندھی کے عدم تشدد، امن اور رواداری کے آدرشوں کے تئیں وقف کردینا چاہئے''۔ گاندھی جی بنیادی طور انہیں تین اصولوں کے علمبردار تھے۔ لیکن کل یگ کے گاندھی وادیوں نے گاندھی جی کی لاٹھی کو جھاڑو میں تبدیل کرکے ''سوّچھ بھارت'' سے جوڑ دیا ہے۔ ہاتھ کی صفائی سے اہنسا (عدم تشدد) کا 'الف' نکال کر اسے ہنسا (تشدد) میں اور شانتی کے پہلے الف لگا کر اسے اشانتی (بدامنی) میں بدل دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ چہار جانب تشدد کا بازار گرم ہے اور بدامنی کا دور دورہ ہے۔ رواداری کے فقدان کی سب سے بڑی مثال دادری میں ایک فوجی سرتاج کے والد اخلاق اور بھائی دانش کا بہیمانہ قتل ہے۔ ؁۲۰۰ یں اقوام متحدہ نے گاندھی جی کے یومِ پیدائش کو 'بین الاقوامی عدم تشدد کا دن' قرار دیا تھا ممکن ہے حالیہ واقعات کے بعد یہ عالمی ادارہ اس دن کی موزنیت پر نظر ثانی کیلئے مجبور ہو جائے۔

اس سال ۲ اکتوبر کو جہاں بڑے سیاسی رہنما گاندھی سمادھی راج گھاٹ پر خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے پہنچے وہیں وزیر ثقافت مہیش شرما اور اسدالدین اویسی بساہڑا گاوں کے محمد اخلاق کے گھر ان کے اہل خانہ کی تعزیت کیلئے گئے۔ محمد اخلاق کی موت اس قدر اہم کیوں ہو گئی کہ اگلے دن اروند کیجریوال اور راہل گاندھی نے بھیان کے گھر جانے کی زحمت کی ؟ یہ ایک اہم سوال ہے؟ اس سوال کا جواب آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کے اس بیان میں پوشیدہ ہے جو انہوں نے مہاتما گاندھی کی موت پر دیا تھا ''وہ روشنی ہم سے رخصت ہو رہی ہے جو جانے کے بعد بھی ہزاروں برس بعد بھی ہماری زندگیوں کو منور کرتی رہے گی۔ گاندھی جی کے آدرش ہماری اجتماعی زندہ وراثت کی حیثیت رکھتے ہیں''۔ مذہبی رواداری اور گئو کشی کے متعلق گاندھی جی کا آدرش تو یہ تھا کہ ''ہندوستان میں گئو کشی کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔۔۔۔ میں عرصہ دراز سے گائے کی خدمت کا حلف بردار ہوں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرا مذہب بقیہ ہندوستانی شہریوں کا بھی مذہب ہو جائے ؟ اس کے معنی ان لوگوں کے خلاف جبر ہوگا جو ہندو نہیں ہیں''۔ پنڈت جی کی قیادت میں کانگریس نے اتر پردیش میں گئو کشی کی ممانعت کا قانون بنا کر گاندھی جی کی وراثت گنوا دی۔

اس قانون کے مطابق گائے بیل ذبح کرنا ، اس کا تعاون کرنا یعنی گوشت بیچنا اور اس کا حمل و نقل قابلِ تعزیر جرم قرار پایا۔ اس کا ارتکاب کرنے والے

کیلئے زیادہ سے زیادہ ۷ سال قید بامشقت اور دس ہزار روپے جرمانہ کی سزا تجویز کی گئی۔ ہوائی جہاز اور ریل گاڑی کے مسافروں کو بڑے کا گوشت بیچنے کی بابت استثناء دیا گیا۔ اس قانون میں بڑے کا گوشت کھانے والے کا کوئی ذکر نہیں ہے یعنی اگر کوئی مسافر ریلوے اسٹیشن یا ہوائی جہاز سے بڑے کا گوشت اپنے ساتھ لے آئے اور کھائے تو یہ جرم نہیں ہے۔ ایسے میں محمد اخلاق کے گھر میں رکھے ہوئے گوشت کے تجربہ گاہ میں بھیجنے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ اگر اخلاق نے گائے ذبح بھی کی ہوتی تب بھی تو اس کی سزا موت نہیں ہے اور اس سزا کو بحال کرنے کا حق کسی دہشت گرد بھیڑ کو نہیں بلکہ عدالت کو حاصل ہے لیکن ان باتوں پر وہی توجہ دے سکتا ہے جو قانون کی حکمرانی میں یقین رکھتا ہو۔ جسے اپنی من مانی کرنی ہو؟ جو جانتا ہو کہ قتل غارتگری کے بعد وہ بھی مظفر پور فساد کے ملزم سنگیت سوم کی طرح بری ہوجائے گا تو بھلا ان باتوں پر وہ کیوں کان دھرے؟

اترپردیش حکومت سے ترغیب پا کر ۱۹۵۵ کے اواخر میں بہار کے اندر بھی گئو کشی پر پابندی لگا دی گئی۔ اس قانون میں مجرم پائے جانے والے شخص کیلئے صرف ۶ ماہ تک کی سزا تجویز کی گئی تھی اور جرمانے کی رقم بھی بیش از بیش ۱۰۰۰ روپے تھی۔ اس قانون کے اطلاق سے مذہبی مقاصد کیلئے وقف شدہ بیلوں کو مذہبی طور طریقہ سے ذبح کرنا مستثنیٰ قرار دیا گیا لیکن یہ انتظامیہ کے اجازت نامہ سے مشروط تھا۔ مدھیہ پردیش میں جب قانون بنا تب بھی انتظامیہ کی اجازت سے

مذہبی اور طبّی تحقیق کی خاطر بھینس کے ذبیحہ کی اجازت تھی۔ سزا زیادہ سے زیادہ ایک سال اور جرمانہ صرف ایک ہزار روپے طے کی گئی تھی۔ کسی سر پھری بھیڑ کو بڑے جانور کا گوشت کھانے والے کو قتل کرنے کا پروانہ نہیں کسی قانون نے نہیں دیا۔
دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام قوانین میں ذبیحہ کی خاطر گائے بیل کا حمل و نقل اور خرید و فروخت قابل تعزیز جرم ہے۔ فی الحال ہندوستان بڑے کا گوشت برآمد کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اس لئے ظاہر ہے جن ریاستوں میں بڑے مذبح خانے ہیں ان کے آس پاس والی ریاستوں سے بھی جانور وہاں لائے جاتے ہوں گے نیز ان کا گوشت جن بندرگاہوں سے برآمد کیا جاتا ہے مثلاً ممبئی وہاں بھی نقل و حمل کا کام ہوتا ہی ہوگا لیکن یہ قانون ان بڑے سرمایہ داروں پر بھی اسی طرح نافذ نہیں ہوتا جیسے پانچ ستارہ ہوٹلوں کو دولت کے زور پر استثناء مل جاتا ہے۔ گزشتہ انتخابی مہم میں گلابی انقلاب کی اصطلاح ایجاد کرکے عوام کو ورغلایا گیا تھا لیکن نئی حکومت کے پہلے سال میں برآمد پر پابندی تو درکنار اس میں اضافہ ہوگیا۔ جو جین سماج اپنے تہوار کے دوران گوشت خوروں کو سبزی کھانے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ خود اپنے سماج کے مخیّر حضرات کو بڑے جانور کا گوشت برآمد کرنے سے نہیں روکتا۔

کے اندر گئو کشی پر پابندی لگانے والے قوانین کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء پانچ ججوں کے سربراہ چیف جسٹس ایس آر داس نے گائے اور بچھڑوں کے علاوہ دوسرے بڑے جانوروں کے ذبیحہ کی اجازت دے دی۔ سپریم کورٹ نے یہاں تک کہا بے کار جانوروں کو پالنا قومی نقصان ہے ان کا ذبیحہ غریبوں کی غذا ہے۔ چیف جسٹس نے اعتراف کیا کہ بڑے جانور کا گوشت عام آدمی کی خوراک ہے۔ اس فیصلے کے ۴۷ سال بعد ۲۰۰۵ء میں سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ بدل کر گجرات میں لگی مکمل پابندی کو حق بجانب قرار دے دیا۔ جسٹس لاہوتی نے ۷ رکنی بنچ کا اکثریتی فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ ۴۷ سال بعد بڑے جانور کا گوشت ہی غریب آدمی کیلئے پروٹین والی عام غذا نہیں ہے۔ ملک میں غذا کی پیداوار خاصی بڑھ گئی ہے مسئلہ غذائی اشیاء کی منصفانہ تقسیم ہے۔

عدالت نے مذہب کے بجائے معیشت اور غذائیت کی بنیاد پر فیصلہ کیا اور گوبر کو کوہ نور ہیرے کا ہم پلہ قرار دے دیا۔ اصل معاملہ مذہبی نہیں بلکہ معاشی و سیاسی ہی ہے۔ قانون کے تحت جانور کو ذبح کرنے اور اسے بیچنے پر پابندی ہے کھانے پر نہیں۔ اس پر عملدارآمد اس طرح سے ہونا چاہئے تھا کہ بیف کی درآمد میں اضافہ ہوتا۔ یہ جانور دیگر ممالک میں کٹتے اور یہاں ان کی کھپت ہوتی لیکن اس کے برعکس درآمد کے بجائے برآمد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے جانور تو اب بھی زور و شور سے ذبح کئے جارہے ہیں اور ان کا

گوشت بیچا بھی جارہا ہے یعنی قانون کی خلاف ورزی ہورہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے عام ہندوستانی یہ جانور خریدتا تھا اور اسے ذبح کرکے عام ہندوستانی کو بیچ دیتا تھا اس طرح گویا اس کاروبار سے عام لوگوں کا فائدہ ہوتا تھا۔

ماضی میں جو جانور ذبح کئے جاتے تھے وہ اب بھی نہ تو گئو شالاوں میں پلتے ہیں اور نہ سڑکوں پر ایڑیاں رگڑ کر مرتے ہیں بلکہ پہلے کی طرح چند خاص سرمایہ داروں کے نجی مذبح خانوں میں ذبح کئے جاتے ہیں۔ تجارت سے وہ سرمایہ کار مستفید ہوتے ہیں اور اپنا فائدہ سیاستدانوں کے ساتھ بانٹ کر عیش کرتے ہیں۔ وزیراعظم نے انتخابی مہم کے دوران اعتراف کیا تھا کہ ان کے جین دوست بھی اس کاروبار میں ہیں اب بھلا اقتدار میں آنے کے بعد اپنے دوستوں کو کون ناراض کرسکتا ہے؟ جہاں تک عوام کا تعلق ہے مذہبی جذبات کو گئو ماتا کے نام پر بھڑکا کر انہیں باآسانیبے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مغربی بنگال میں گئو کشی پر پابندی نہیں ہے۔ یہاں سے کچھ بڑے جانور سرحد پار کرکےبنگلا دیش بھی بھیج دیئے جاتے تھے۔ اب اسے اسمگلنگ قرار دے کر بند کردیا گیا تاکہ وہ جانور ان بڑے مذبح خانوں میں آسکیں جن سے گوشت برآمد کیا جاتا ہے گویا پہلے اس کاروبار سے بڑے پیمانے پر غریب بیچنے والے اور بنگلا دیش کے غریب کھانے

والے مستفید ہوتے تھے اب اس سے امیر بیچنے والے اور یوروپ و خلیج کے خوشحال کھانے والے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ جمہوریت کی بابت یہ غلط فہمی پیدا کردی گئی ہے اس میں ووٹ کو نوٹ پر فوقیت حاصل ہے۔ استثنائی صورتحال میں کبھی کبھار مثلاً ایمرجنسی کے بعد اس کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔

ووٹ اور نوٹ کے تفاوت کی کئی وجوہات ہیں ۔ ووٹ ایک خودرو فصل کی مانند ہر انتخاب کے وقت بغیر کسی محنت مشقت کے اپنے آپ اگ جاتا ہے اس لئے اس کی خاص اہمیت نہیں ہوتی لوگ اسے ایک شراب کی بوتل کے عوض بھی بیچ دیتے ہیں۔ ووٹ کا استعمال بہت زیادہ سوچ سمجھ کر نہیں کیا جاتا۔ اس کے برعکس اکثر و بیشتر نوٹ کمانے کیلئے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے بڑے غورو فکر کے بعد اسے کہیں لگایا جاتا ہے ۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ ووٹ کا استعمال مجبوری ہوتی ہے اگر انتخاب کے وقت اسے استعمال نہ کیا جائے تو وہ ضائع ہوجاتا ہے جبکہ نوٹ ضائع نہیں ہوتے اسے مناسب موقع تک سینت کر رکھا جاسکتا ہے۔ نوٹ کے کاروبار میں نفع نقصان کا حساب کتاب آسان ہوتا ہے ووٹ کے دھندے میں یہ ناممکن ہوتا ہے۔ نوٹ دینے والے مٹھی بھر لوگوں کو خوش کرنا بھی سہل تر ہے لیکن ووٹ دینے والے کروڈوں لوگوں کی فلاح و بہبود ایک مشکل تر کام ہوتا ہے اس لئے سیاستداں اس بکھیڑے میں نہیں پڑتے۔آخری بات عام آدمی کو ورغلانا

سیاستدانوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر سرمایہ داروں کو فریب دینا جوئے شیر لانا ہے۔

جن قوانین کا اوپر ذکر ہوا وہ تو خیر آزادی کے بعد وضع کئے گئے لیکن جموں کشمیر کا دستور ڈوگرراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے کا بنایا ہوا ہے اس لئے اسے آئی پی سی کے بجائے آر پی سی یعنی رنبیر پینل کوڈ کہا جاتا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں وہاں گائے ذبیحہ پر پابندی لگائی گئی ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے کیلئے دس سال کی سزا اور گوشت رکھنے پر ایک سال کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ یہ قانون ابھی تک صرف کتابوں کی زینت بنا ہوا تھا اور کسی کو اس پر عملدآمد کا خیال تک نہیں آیا تھا لیکن بی جے پی کی مرکزی حکومت اور ریاستی اقتدار میں حصہ داری کے بعد وکیل پرموکش سنگھ نے عوامی مصلحت کے قانون کے تحت کا ہائی کورٹ میں ایکمقدمہ داخل کردیا اور اس قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ جسٹس دھیرج سنگھ ٹھاکر اور جسٹس جنک راج کوتوال نے فوراًڈائرکٹر جنرل پولس کو حکم دیا کہ وہ قانون کے نفاذ کو یقینی بنائیں اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دینے دھمکی دے ڈالی۔اس فیصلے کو جموں کشمیر بار کونسل نے عوام کے بنیادی حقوق کی پامالی قرار دیااور ریاست کے اکثریتی فرقہ کے مذہبی جذبات سے کھلواڑ بتایااور ۱۲ ستمبر کو ہڑتال کا اعلان کردیا۔

اس کے بعد دیگر ملی جماعتوں نے بھی عوامی بند کا اعلان کر دیا اور ساری وادی منجمد ہو گئی ۔ مختلف رہنماوں کو اپنے گھروں میں نظر بند کر دیا گیا اس کے باوجود بند کو غیر معمولی کامیابی ملی ۔اس دن ساری ریاست میں بڑے پیمانے پر علی الاعلان بڑے جانور ذبح کئے گئے۔ یہاں تک کے گورنمنٹ میڈیکل کالج کے طلباء نے بھی اپنے ہاسٹل میں اس ظالمانہ قانون کی دھجیاں اڑا دیں ۔ میر واعظ نے کہا یہ بند اس بات کا ثبوت ہے کہ کشمیری عوام اپنے مذہبی معاملات میں مداخلت برداشت نہیں کریں گے ۔یٰسین ملک نے اسے جبر و تسلط کو مسترد کرنے کے مترادف بتایا۔ مجلس اتحاد ملت نے گوشت کے تاجروں کو یقین دلایا کہ وہ بلاخوف اپنا کاروبار کریں اگر پولس نے روکا تو مجلس اس کے خلاف خاطر خواہ حکمت عملی اختیار کرے گی اور اگر حالات خراب ہوئے تو انتظامیہ اس کیلئے ذمہ دار ہوگا۔

جموں بنچ کے اس فیصلے کو کشمیر ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا اور اس نے حکومت سے صفائی مانگ لی۔ ریاستی حکومت صفائی دینے کے بجائے سپریم کورٹ میں پہنچ گئی اور سپریم کورٹ نے دوماہ کیلئے جموں ہائی کورٹ کے فیصلے کو معطل کرکے دونوں بنچوں سے کہا وہ آپس میں بیٹھ کر اس تنازع کو سلجھائیں ۔اس قانون کی منسوخی کیلئے نیشنل کانفرنس نے پی ڈی پی کو اپنی حمایت پیش کر دی ۔ اب پی ڈی پی کیلئے دھرم سنکٹ پیدا ہوگیا یا تو وہ بی جے پی کو خوش کرے یا اپنے رائے

دہندگان کو راضی کرنے کیلئے نیشنل کانفرنس کے ساتھ ہاتھ ملائے لیکن اس موقع پر بی جے پی میں شامل خورشید احمد نے بیف پارٹی دینے کا اعلان کرکے سب کو چونکادیا۔ خورشید ملک جنوبی کشمیر سے بی جے پی کے ٹکٹ پر ریاستی اسمبلی کا انتخاب لڑ چکے ہیں۔ ان کے مطابق اس دعوت میں ہندو مسلم دونوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ سبزی خور لوگوں کیلئے سبزی کا اہتمام تھا۔ انہوں نے اس دعوت کے ذریعہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ میں اضافہ کی توقع کی تھی۔ ملک سے جب پوچھا گیا کہ کیا آپ نے پارٹی سے اجازت لی ہے تو وہ بولے کیا مجھے مسجد جانے کیلئے پارٹی سے اجازت لینی ہوگی یہ مذہبی معاملہ ہے اس سے بی جے پی کوئی لینا دینا نہیں ۔ مذہبی معاملات میں کوئی مصالحت ممکن نہیں ہے۔ میں ایک سیاسی رہنما کے علاوہ مسلمان بھی ہوں اور عدالت ہمارے مذہبی امور میں مداخلت کررہی ہے۔

بی جے پی رہنما کا اگر یہ حال ہو تو عوام کی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ کشمیر میں سب سے زیادہ فوج اور نیم فوجی دستے متعین ہیں ۔ ریاستی حکومت میں بی جے پی کا عمل دخل ہے اور مرکزی حکومت بھی اسی کی ہے اس کے باوجود ان کی ایک نہیں چلی ۔ کسی ایسے گاوں میں جہاں چند مسلمان خاندان رہتے ہوں فوجی بیٹا گھر سے دور ہو دو سو لوگوں کا دو نہتے افراد پر حملہ بول دینا پرتاپ سینا کی دلیری نہیں بزدلی اور رانا پرتاپ کی توہین ہے ۔ ان لوگوں میں اگر

ہمت ہوتی تو وادی کشمیر میں قانون نافذ کروادیتے اور کسی کو سزا دینا تو درکنار گرفتار ہی کروالیتے لیکن یہ تو اپنی گلی کے شیر ہیں جب باہر نکلتے ہیں تو بھیگی بلی بن جاتے۔ اس نفسیات کا غماز بی جے پی کے معمر رہنما پروفیسر ہری اوم کی یہ تجویز ہے کہ کشمیر مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ اسے چار حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ ایک جموں دوسرا لداخ تیسرا وادی میں پنڈتوں کا علاقہ اور چوتھا کشمیر۔ یہی خوف کی نفسیات ہے جو کسی زمانے میں تقسیم ہند کا سبب بنی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ کشمیر ہی وہ ریاست ہے جہاں اسمبلی کے اندر محمد اخلاق پر حملہ کی مذمت کرنے والی قرارداد پیش کی گئی۔

شمالی و مغربی ہندوستان کی اکثر ریاستوں میں بڑے جانور کے ذبیحہ پر پابندی ضرور ہے لیکن جنوبی و مشرقی ہند میں ایسا قانون نہیں ہے۔ گوا کے اندر بی جے پی حکومت ہے اس کے باوجود چونکہ وہاں عیسائیوں کی اکثریت ہے جو بڑے کا گوشت کھاتی ہے اس لئے بی جے پی اس پر پابندی کی جرأت نہیں کرتی۔ میگھالیہ میں امیت شاہ کی آمد کے موقع پر ان کا استقبال بیف پارٹی کے ساتھ کیا گیا اور بی جے پی کے مقامی ذمہ دار کھلور سنگھ لنگڈوہ نے پابندی کی مخالفت کرتے ہوئے کہا بڑے جانور کا گوشت قبائلیوں کی غذا ہے۔ یہ علاقائی معاملہ ہے اور اسے روکا نہیں جاسکتا۔ مظاہرین نے اس دن بند کا اعلان کیا اور اس طرح کی

پابندی کو قبا ئلی مخالف جبر و استبداد قرار دیتے ہوئے احتجاج کیا۔ بی جے پی سنگھی ترجمان رام مادھو نے اس موقع پر اپنا موقف رکھتے ہوئے کہا تھا بڑے جانور کے ذبیحہ پر پابندی کی خبر محض افواہ ہے جو غلط فہمی کا سبب بنی ۔ ہم ملک کی مختلف تہذیبوں اور مذاہب کا احترام کرتے ہیں ۔ اس موقع پر وزیر مملکت برائے داخلہ امور کرن رجیجو نے یہ کہہ کر بی جے پی کو پریشانی میں ڈال دیا تھا کہ وہ بھی بڑے جانور کا گوشت کھاتے ہیں ۔

محمد اخلاق کی شہادت کے بعد سنگھ پریوار کی مخالفت میں جو آتش فشاں پھٹا اس سے ان کی برسوں کی محنت سے پھیلائی ہوئی غلط فہمی روئی کے گالوں کی مانند اڑ گئی کہ ہندو بڑے جانور کا گوشت نہیں کھاتے۔ کئی دلت رہنماوں نے علی الاعلان کہا کہ وہ بڑے جانور کا گوشت کھاتے ہیں ۔ کیرالا کے ہندووں نے محمد اخلاق سے یکجہتی کا اظہار کرنے کی خاطر بڑے جانور کی بریانی کھاتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر ہمت ہے تو آو ہمیں قتل کرو۔ اس کے علاوہ لالو یادو نے اعتراف کیا کہ ہندو بھی بیف کھاتا ہے۔ شوبھا ڈے نے چیلنج کیا میں نے ابھی ابھی بیف کھایا آو اور مجھے مار ڈالو۔ جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے وارانسی ہندو یونیورسٹی کے اندر برملا کہا گائے بھی ایک جانور ہے وہ کسی کی ماں کیسے ہو سکتی ہے۔ میرا جی چاہے تو میں بیف کھاوں گا مجھے کون روک سکتا ہے؟

سوامی ناتھن انکلیسریا نے تو ہندو صحیفوں کا حوالہ دے کر لکھا کہ میں براہمن ہوں میرے آبا و اجداد بڑے جانور کا گوشت کھاتے تھے اور میں بھی کھاتا ہوں یہ میرا حق ہے۔ ان بیانات سے سنگھ پریوار کے دعویٰ کی قلعی کھل گئی اور اس کا کھوکھلا پن بے نقاب ہوگیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کروڈوں روپئے پھونک کر وزیراعظم نے ساری دنیا میں ملک کا جو تاثر قائم کیا تھا وہ اس ایک حملہ سے ہوا ہوگیا اور ساری محنت اکارت گئی ۔ اس مرتبہ امریکی دورے کے دوران تو غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے وزیراعظم کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی مگر محمد اخلاق پر ہونے والے تشدد کی خوب جم کر مذمت ہوئی اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ صدر اوبامہ نے وزیراعظم کے کسی کارنامہ کی تعریف و توصیف نہیں کی مگر دادری کے واقعہ پر اپنی ناراضگی کا برملا اظہار ضرور کردیا۔ گاندھی جی نے تو یہ بھی کہا تھا کہ اگر مسلمانوں کے ہاتھوں ہندو گائے کو ذبحہ ہونے سے نہیں روک پاتے تو وہ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے لیکن اگر وہ گائے کو بچانے کی خاطر مسلمانوں سے لڑتے ہیں تو سنگین گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں ۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ گاندھی کے بھکت ہیں یا گوڈسے کے کہ گاندھی جیسے جس کام کیلئے مسلمانوں سے لڑنے کی اجازت تک نہیں دی تھی اس کیلئے قتل و غارتگری کرتے ہیں۔ مجرمین کو بچانے کیلئے طرح طرح کی احمقانہ منطق پیش کرنے والے ۔ مقتول پرگائے ذبح کرنے کا مقدمہ قائم کرنے کا مطالبہ کرنے والے۔

اسے اتفاقی حادثہ قرار دینے والے۔ اخلاق کے بیٹے دانش کے زخموں سے پتہ چلانے والے کہ ملزم قتل کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اخلاق کی موت کا سبب دانش کی موت کے صدمے کو قرار دینے والے۔ ملزمین پر عمداً کے بجائے سہواً قتل کا مقدمہ درج کرنے سفارش کرنے والے؟ گرفتار شدگانکے حقوقکے تحفظکی یقین دہانی کرنے والے۔ گائے کے ساتھ عقیدت کے باعث اشتعال انگیزی کو حق بجانب ٹھہرانے والے اورگائے کا گوشتکھانے والوں کو اسیانجامکی دھمکی دینے والے مودی جی کے بھکت تو ہوسکتے ہیں گاندھی جی کے پیروکار نہیں ہوسکتے۔ اس گاندھی جینتی کا یہی پیغام ہے جس کی بہت خوب منظر کشی منظر بھوپالی نے اس طرح کی ہے۔

گاندھی جی اب دیکھ لیں آکر اپناہندوستان
کیسے کیسے آپکے چیلے ہوگئے بے ایمان
مکاری ہے، عیاری ہے، اس یگ کی پہچان
گاندھی جی اب دیکھ لیں آکر اپنا ہندوستان

نیپال: ہندوراشٹر میں سرخ پرچم کو زعفرانی پرنام

سابق وزیراعظم سشیل کوئرالا کو ۲۴۹ کے مقابلے ۳۳۸ ووٹ سے ہرا کر معمر اشتراکی رہنما کھڈگا پرشاد اولی نیپال کے ۳۸ ویں وزیراعظم بن گئے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس طرح وزیراعظم نریندر مودی کی تاجپوشی کے وقت سشیل کوئرالا سب سے پہلے دہلی کی دعوت پر لبیک کہہ کر دوڑے چلے آئے تھے اس طرح مودی جی بھی قرض کی ادائیگی کیلئے کٹھمنڈو تشریف لے جاتے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ تو خیر اولی کو مودی کی طرح کا خود نمائی کا شوق نہیں تھا ورنہ اگر وہ کسی کو اپنے رسم حلف.برداری میں شرکت کی دعوت دیتے تو وہ نریندر مودی نہیں بلکہ شی جین پنگ ہوتے حالانکہ بقول اڈوانی جیجس طرحمودی جی کے اقتدار میں کانگریس کی نااہلی کا.بڑا کردار ہے عین اسی طرح اولی جی کی وزیراعظم منتخب ہو جانے میں مودی جی کا بہت.بڑا حصہ ہے۔ مودی جی کی داداگیری نے نیپالی عوام اور سیاستدانوں کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ہندوستان کیلئے نرم خو کوئرالا کا بھی دشمن بنا دیا۔ ایک سال قبل کھڈگا کو خبط الحواس کہنے والے ماؤ نوازتک ان کے حامی بن گئے اور وہ وزیراعظم کی کرسی پر متمکن ہوگئے۔

وزیراعظم بن جانے کے بعد مودی جی کو غیر ملکی دوروں کی اس قدر عجلت تھی کہ

فوراً اعلان ہو گیا وہ پہلا دورہ جاپان کا کریں گے لیکن جاپان جانا احمد آباد جانے جیسا تو تھا نہیں اس لئے مودی جی بھوٹان کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ بھوٹان جانے کیلئے وزیر اعظم تو درکنار ایک عام ہندوستانی کیلئے بھی کوئی دقت نہیں ہے جہاں تک ضرورت و اہمیت کا تعلق ہے ان باتوں پر غور و فکر کرنے کی وزیر اعظم کو فرصت نہیں ہے۔ بھوٹان سے واپس آنے کے بعد بھی مودی جی کا چنچل من شانت نہیں ہوا تو ممکن ہے کسی نے مشورہ دیا ہو گروجی نیپال کے پشوپتی ناتھ مندر میں جاکر شانتیکا کشٹ کرو۔ وہاں پوجا پاٹھ کے بعد مودی جی نے ٹویٹ کیا میں نہایت خوش بخت محسوس کر رہا ہوں۔

پشوپتی ناتھ مندر میں مودی جی نے خوش ہو کر تقریباً ۴ کروڑ کی صندل اور ۹ لاکھ کا گھی دان کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ دولت سرکاری خزانے سے خرچ کی گئی تھی؟ اگر ہاں تو کیا مودی جی عوام کے ٹیکس کا روپیہ کسی نجی ادارے پر خرچ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں؟ اگر وہ ان کی ذاتی دولت تھی تو اچانک وزیر اعظم بنتے ہی وہ ان کے ہاتھ کہاں سے آگئی۔ ان کی دو ماہ کی جائز تنخواہ تو چار کروڑ نہیں ہے۔ انتخابی حلف نامے میں جمع پونجی کا اندراج تو صرف ایک کروڑ ۶۵ لاکھ تھا۔ اگر وہ رقم کسی دوست نے انہیں تحفہ میں دی تھی تو وہ کالا دھن تھا یا سفید یعنی اس پر انکم ٹیکس ادا کیا گیا تھا یا نہیں؟ جو شخص بار بار سینہ ٹھونک کر یہ اعلان کرتا ہو کہ اگر میرے اوپر کوئی

بدعنوانی کا الزام ہو تو بتاؤ؟ اسے چاہئے کہ وہ ان سوالات کے جواب دے یا کھوکھلی دعویداری بند کردے۔

پشوپتی ناتھ مندر سے مودی جی بھگوا وستر دھارن کرکے جب باہر نکلے تو ان گلے میں رودراکش کی مالا اور ماتھے پر چندن کا تلک ایسے سجا تھا گویا مہارشی جی دہلی کے بجائے سیدھے کیلاش پربت کوچ کرنے والے ہیں۔ خیر بعد میں پتہ چلا کہ ایسے مناظر ہر غیر ملکی دورے پر دیکھنے ملیں گے کہیں وہ کوٹ پہن کر ڈھول بجارہے ہیں ہوں گے تو کہیں ہیٹ پہن کر بین بجارہے ہوں گے جیسا دیس ہوگا ویسا ہی بھیس ہوگا۔ وہ تو خیر امارات کے دورے پر مسجد میں جاتے ہوئے انہوں نے عربی کندورہ نہیں پہن لیا ورنہ غضب ہوجاتا۔ مندر سے واپس ہوتے ہوئے انہوں نے زائرین کی بیاض میں لکھا کاشی (جو ان کے حلقہ انتخاب میں واقع ہے) اور پشوپتی یکساں ہیں۔ وہ نیپال اور ہندوستان کو متحد رکھتے ہیں، میں پرارتھنا کرتا ہوں کہ انکا آشیرواد دونوں ممالک کی عوام پر جاری و ساری رہے''۔ اس ایک سال کے عرصے میں مودی جی نے پشوپتی ناتھ کے آشیرواد کو بھی رائیگاں کردیا اور دیکھتے دیکھتے ہندنیپال اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔

امریکہ کے علاوہ نیپال ہی وہ ملک ہے جہاں کا دورہ مودی جی اس دوران دو بار کیا۔ مودی جی کے امریکہ آنے جانے کا فائدہ توپاکستان کو یہ ہوا کہ امریکہ

نے اس کے ساتھ جوہری معاہدے کی پیشکش کردی اور جو کامیابی سابق وزیراعظم منموہن سنگھ نے برسوں کی محنت سے حاصل کی تھی اس کی راہ ہموار نواز شریف کیلئے آسان ہو گئی۔ نیپال کی آمدورفت کے نتیجے میں وہ ہندوستان کے بجائے چین سے قریب تر ہو گیا۔ یہی وہ سفارتی کارنامے ہیں جن کے سبب مودی جی کا موازنہ پنڈت نہرو سے کیا جاتا ہے جنھوں نے غیر جانبدار تحریک کی ایسے قیادت کی تھی کہ مٹھی بھر استعماری طاقتوں کے علاوہ ساری دنیا کے ممالک ایک پرچم تلے جمع ہو گئے۔

وزیراعظم کا دوسرا نیپال دورہ بھی کم دلچسپ نہیں تھا۔ ویسے تو انہیں سارک کانفرنس میں شرکت کیلئے جانا تھا لیکن اچانک وشوا ہندو پریشد کو یاد آگیا کہ سیتا کا میکہ جنک پوری نیپال کے حدود میں واقع ہے اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رام بھکت مودی نیپال جائیں اور راجہ جنک کے دربار میں حاضری نہ دیں۔ ان لوگوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مودی جی جلسۂ عام کا اعلان کردیا اور ایودھیا سے برات نمایاترا لے کر جنک پوری کی جانب نکل پڑے ۔ مودی جی کے استقبال اورخطاب عام کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں ۔ اس دوران سنگھ پریوار نے سوچا نیپال تو ہندو راشٹر ہے وہاں رام بھکتوں کو سیتا کی میکے میں جانے سے کون روک سکتا ہے؟ وہ بیچارے بھول گئے کہ کل یگ میں نیپال اکھنڈ بھارت کا حصہ نہیں بلکہ ایک خود مختار ملک ہے اور وہاں کی حکومت کو اعتماد میں لینا

ضروری ہے۔ جنکپوری کی ترائی میں رہنے والے مدھیشی باشندوں کو ویسے بھی پہاڑی نیپالی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ایسے میں وہ مودی جی کو وہاں خطاب عام کی اجازت دینے کی غلطی وہ کیسے کر سکتے تھے۔ خیر حفاظتی وجوہات کا بہانہ بنا کر جلسہ منسوخ کیا گیا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

مودی جی کو نیپالیوں کے تیور سے ہوا کے رخ کا اندازہ لگانا چاہیے تھا لیکن کسی بھی خود پسند انسان کیلئے یہ بہت مشکل کام ہے۔ انہوں کٹھمنڈو کے اندر نیپالی حکومت کو دستور سازی کے حوالے سے ہدایات جاری فرماتے ہوئے تاخیر کے نتائج سے خبردار کیا نیز اکثریت کے بجائے اتفاق رائے سے دستور جاری کرنے کی تلقین کرڈالی ۔ اس طرح کی عوامی غلطی تو وائسرائے لارڈ کرزن نے بھی دستور ہند کے وقت نہیں کی تھی بلکہ قبل پنڈت نہرو کے پاس صرف اپنا ایک نمائندہ بھیجنے پر اکتفاء کیا تھا۔ مودی جی اگر جانتے کہ پنڈت نہرو نے لارڈ کرزن کے نمائندے کو کیا کہہ کر لوٹا دیا تھا تو وہ اس کی حماقت کو دوہرانے کی جرأت نہیں کرتے۔

مودی جی سے دستور کی تکمیل کے بعد خارجہ سکریٹری ایس جئے شنکر کو اپنا خصوصی ایلچی بنا کر نیپال بھیجنے کی جو فاش غلطی سرزد ہوئی اس نے ہند نیپال تعلقات کو ناقابلِ اصلاح نقصان پہنچایا۔ جئے شنکر کی پیش کردہ تجاویز کو

مسترد کرتے ہوئے ماؤنواز پشپا کمار داہل نے واضح انداز میں کہا کہ نیپالی کسی بھی جانب سے کوئی ایسا دباو برداشت نہیں کریں گے جس سے خودمختاری پر حرف آتا ہو۔ ہم ہندوستان کے جی حضوریے نہیں ہیں۔ وزیراعظم کھڑگ پرشاد اولی نے کہا ۱۹۵۰ کا وہ زمانہ لدگیا جب ہندوستانی سفیر نیپالی ایوانِ پارلیمان میں بیٹھا کرتا تھا یا حکومت ہند بادشاہت کے خلاف سیاسی جماعتوں کی پشت پناہی کرتی تھی اور گروہی رہنماوں کو اپنے قابو میں رکھتی تھی۔

جئے شنکر نے کٹھمنڈو میں جاکر ایسے مدھیشی رہنماوں سے ملنا جو انتخابات میں ناکام ہوچکے ہیں۔ یہ پاکستانی خارجہ سکریٹری کے کشمیری علٰحیدگی پسند رہنماوں سے ملاقات جیسا عمل تھا جس پر پابندی کے سبب ہند پاک گفتگو میں رخنہ پڑ گیا۔ یعنی جس سفارتکاری کی اجازت ہم پاکستان کو دہلی میں اس لئے نہیں دیتے کہ وہ ہماری خودمختاری کے خلاف ہے وہی حرکت کٹھمنڈو میں جاکر کرنے کو درست سمجھتے ہیں ۔جئے شنکر کی پیش کردہ تجاویز کونیپال کے داخلی معاملات میں مداخلت کیوں سمجھا گیا یہ جاننے کیلئے ان پر ایک غائر نظر ڈالنا کافی ہے۔ان تجاویز دستور کی مختلف شق کا حوالہ دے کر اس طرح احکامات صادر کئے گئے ہیں۔ دفع ۶۳ (۳) مدھیشیوں کیلئے آبادی کے تناسب سے حلقہ ہائے انتخابات اور دفع ۲۱ میں ریاستی ڈھانچے میں ان کی متناسب نمائندگی ۔ دفع ۸۶ میں تبدیلی کرکے مدھیشیوں کی آبادی کے لحاظ سے ایوان میں نمائندگی ۔ کیا

ہندوستان میں قومی سطح پر ریاستی سطح پر اقلیتوں کو ان آبادی کے لحاظ سے متناسب نمائندگی حاصل ہے۔ جس بی جے پی نے گجرات کے مسلمانوں کو ۱۲ سال سے ایم ایل اے کا ٹکٹ تک نہیں دیا اور جس کے منتخب شدہ ۲۸۲ ارکان پارلیمان میں ایک مسلمان یا عیسائی نہیں ہے اس کا نیپال میں جاکر متناسب نمائندگی کا مطالبہ کیا مضحکہ خیز نہیں ہے۔

دفع ۱۵۴ میں حلقہ ہائے انتخاب میں ترمیم کی مدت کو ۲۰ سال سے گھٹا کر ۱۰ سال کرنے کی تجویز دی گئی۔ اس طرح کے انتظامی فیصلے تو ہندوستان کے اندر کسی صوبائی حکومت کیلئے بھی جاری نہیں کئے جاتے کجا کہ کسی پڑوسی ملک کے ساتھ یہ کیا جائے۔

مودی سرکار کے لئے دستور میں دو باتیں سب سے زیادہ پریشان کن تھیں اول تو نیپال کو ہندو راشٹر کے بجائے لامذہبی (سیکولر) جمہوری ریاست قرار دیا جانا لیکن اس کی مخالفت کرنا اس لئے ممکن نہیں تھا کہ خود ہندوستان ہنوز ایک سیکولر جمہوریہ ہے۔

دوسرا مسئلہ دستور کی دفع ۲۸۳ ہے جس کے تحت کسی ایسے شخص کا جس کے والدین نیپالی نہ ہوں صدر، وزیر اعظم یا چیف جسٹس کے عہدے کا اہل نہ ہونا۔ جئے شنکر نے تجویز پیش کی کہ نکاح کی بنیاد پر شہریت اختیار کرلینے والے کو ان عہدوں کا حقدار ہونا چاہئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہندوستان کو اس سے کیا غرض کہ نیپال میں سربراہی کا حقدار کون ہے اور کون اس سے محروم ہے؟ سونیا گاندھی کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کی

مخالفت خود بی جے پی نے جس بنیاد پر کی تھی کیا وہ لوگ اسے بھول گئے ہیں؟

نیپال کے دستوران طویل اصلاحات کی تکمیل ہے جن کا آغاز ۱۸۵۴ء میں جنگ بہادر رانا نے ملکی آئین جاری کرکے کیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پدما شمشیر رانا نے میں دستور سازی کی ابتداء کی اور ۱۹۴۸ء میں جو دستور بنا اس میں بادشاہت تو ۱۹۴۵ء موجود تھی لیکن ایک طاقتور وزیراعظم پر زور دیا گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہ اپنے اقتدار کی خاطر دستور کو پامال کرتے رہے اور سیاسی جماعتیں اس کا مطالبہ کرکے معتوب ہوتی رہیں۔ ۱۹۷۹ء میں راجہ بریندر نے دستوری اصلاحات کیلئے ۱۱ رکنی کمیشن قائم کیا اور ۱۹۹۰ء میں احتجاج کے سبب نیا دستور تسلیم کرنے پر مجبور کردیئے گئے جس سے ان کے اپنے اختیارات محدود ہوگئے۔ ۱۹۹۶ء میں اشتراکی بغاوت نے زور پکڑا دس سال بعد ۲۰۰۶ء میں ایک امن معاہدہ طے پایا۔ اس کے باوجود آئین سازی کا کام مختلف وجوہات کی بناء پر ٹلتا رہا اور بالآخر ۶۰۱ ارکان پر مشتمل دستور ساز اسمبلی نے واضح اکثریت کے ساتھ اسے منظور کرلیا۔ جن مدھیشیوں کی خاطر حکومتِ ہند پریشان ہے ان کے ۶۹ نمائندوں نے دستور سازی کا بائیکاٹ کیا جبکہ ہندوراشٹر کے حق میں صرف افراد نے رائے دی۔ ۲۱

نئے آئین نے آئین ساز اسمبلی کو باقاعدہ ایوان پارلیمان میں تبدیل کردیا۔

اس آئین میں اقتصادی مساوات اور سماجی انصاف اور مساوات پر مبنی معاشرہ بنانے کی ضمانت دی گئی ہے۔ آئین کے دیباچے میں کثیر جماعتی جمہوری نظام، شہری آزادی، نسانی حقوق، حق رائے دہندگی، اظہار رائے کی آزادی، آزاد اور منصفانہ عدلیہ اور قانون و سوشلزم کی بنیاد پر ایک آنند پورن (خوش کن) سماج کے تعمیر کی بات کہی گئی ہے۔ صدر مملکت کو سربراہ ریاست ہیں مگر متناسب انتخابی نظام کی بنیاد پر منتخب شدہ کابینہ کو برتری حاصل ہے۔ ۲۰ ستمبر کو دستور کے منظور ہوتے ہی عوام اس کا جشن منانے کیلئے سڑکوں پر اتر آئے۔ ساری دنیا سے مبارکباد کے پیغام موصول ہونے لگے لیکن حکومت ہند نے نہ صرف اس سے احتراز کیا بلکہ اظہار ناراضگی کے طور پر اپنے سفیر کو دہلی میں طلب کر لیا ۔

ہندوستان کی ناراضگی کے جواب میں نیپالی وزیر اعظم نے کہا کہ اصولی طور پر یہ بات درست ہے کہ آئین قومی اتفاق رائے کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے لیکن جہاں ایسا ممکن نہ ہو تو بھاری اکثریت سے منظور کردہ آئین کا خیر مقدم ہونا چاہیے نیز آئین کو اکثریت یا اتفاق رائے کی سے تشکیل دینا نیپال کا اندرونی معاملہ ہے، بھارت کو اس میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ حکومتِ ہند کے منفی رد عمل نے نیپالی عوام کو نہ صرف مایوس کیا بلکہ ان کے اندر غصے اور ناراضگی کی ایک لہر دوڑا دی ۔ نیپال ایک گھرا ہوا ملک ہے اور اس کا بیرونی دنیا سے بری

رابطہ ہندوستان کی مرہونِ منت ہے۔ اس کی تجارت کا تقریبا٦٥ فیصد ہندوستان سے ہے۔ نیپالی عوام کی تمام اہم ضروریات زندگی مثلاپ یٹرول، کھانے کا تیل، آٹا سبزیاں اورگارمنٹس ہندوستان سے جاتی ہیں۔ دستور کی تیاری کے آخری مراحل میں ترائی کے اندر حفاظتی دستوں کے خلاف تشدد پھوٹ پڑا۔ ابتداء میں پولس والے مارے گئے پھر بعد ان کی جانب سے بھی زیادتی شروع ہو گئی۔ دستور کی منظوری کے بعد مدھیشیوں کے احتجاج کا بہانہ بنا کر ہندوستان کی جانب سے جانے والی آمدورفت بند کردی گئی اور بلااعلان ١٩٧٥ء کی طرح کا معاشی مقاطعہ نافذ کردیا گیا۔

اس اقدام کے سبب ہندوستان نواز نیپالی کانگرس بھی دہلی سرکار کی جارحانہ روش کی مخالفت کرنے پر مجبور ہو گئی ۔نیپال کے سیاسی رہنماوں نے اقتصادی ناکہ بندی کی مذمت کرتے ہوئے عالمی برادری سے اپنا کردار نبھانے کی اپیل کی ہے۔ تین اکتوبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے نیپال کے نائب وزیر اعظم ''پرکاش مان سنگھ'' نے کہا ہے کہ پچھلے دو ہفتوں سے نیپال کی اقتصادی ناکہ بندی کردی گئی ہے جس کی وجہ سے کھانے پینے کی اشیاء اور پٹرول ڈیزل وغیرہ کی شدید قلت کے سبب پونے تین کروڑ نیپالی عوام سخت مشکلات کا شکار ہیں اور آنے والے دنوں میں بہت بڑا انسانی المیہ جنم لے سکتا ہے۔

مودی جی کو اس بیجا مداخلت کے نتائج کا احساس ہوتا تو وہ اپنے دورے کے موقع پر یہ نہ کہتے کہ میں نے تو چند ماہ کے اندر نیپال کا دورہ کرلیا جبکہ منموہن سنگھ دس سالوں میں نہ کرسکے۔ اس دوران نیپال میں دستور سازی کا عمل جاری تھا۔ اس لئے حکومت ہند در پردہ جو کچھ کرسکتی تھی کرتی رہی لیکن اعلانیہ مداخلت سے احتراز کیا گیا تاکہ اس کا منفی رد عمل نہ ہو لیکن جلد باز طبیعت کے مالک مودی جی اس نزاکت کو نہیں بھانپ سکے اور اپنی ناتجربہ کاری کے سبب برسوں کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ ایک نیپالی سفارت کار کے بقول '' نیپال میں بھارت مخالف جذبات اتنی شدت اختیار کرچکے ہیں کہ انہیں معمول پر آنے میں شاید کئی عشرے درکار ہوں ''۔ اس لئے کہ بقول نیپال کے ایک دانشور امیت ڈھاکل جے شنکر کے پاس اپنے آقا کا کوئی پیغام نہیں بلکہ صرف دھمکی تھی۔ جس دھمکی کا خدشہ ڈھاکل نے ظاہر کیا تھا غالباً اس کو عملی جامہ پہنایا جاچکا ہے۔

اپنے راج ابھیشیک کے بعد پشوپتی ناتھ مندر سے نکلتے ہوئے مودی جی کے دل میں یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ پشوپتی ناتھ کی طرح کاش کاشی وشوناتھ بھی ہندو راشٹر میں ہوتا۔ انہوں نے من ہی من میں عزم بھی کیا ہوگا کہ ایک دن وہ ہندوستان کو بھی نیپال کی طرح ہندو راشٹر بنا دیں گے لیکن وہ نہیں جانتے تھے

کہ بہت جلد خود نیپال بھی ہندو راشٹر نہیں رہے گا بلکہ سیکولر راجیہ میں تبدیل ہو جائیگا۔

اس وقت چونکہ مودی جی اس انقلاب کا اندازہ نہیں کر سکے اس لئے آج ہند نیپال کے تعلقات میں کشیدگی پر یہ شعر صادق آرہا ہے

جب شکل آئینے میں ہماری بگڑ گئی
احساس تب ہوا ہمیں شیشے کے بال کا

موہن بھاگوت: ہوئے تم دوست جس کے...

وزیراعظم نریندر مودی کی پہ در پہ ناکامیوں پر اب تو ان کے دشمنوں کو بھی رحم آنے لگا۔ میرے ایک قاری نے اسی کیفیت میں لکھا ''اے کاش خدا مودی جی کو عقل سلیم عطا فرمائے''۔ اس تبصرے کو پڑھنے کے بعد اخبار دیکھا تو اس میں خبر تھی بہار میں مودی جی کے ۶ خطابات عام منسوخ کردیئے گئے۔ میں نے دعا کو اس قدر جلدی مستجاب ہوتے کم ہی دیکھا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب یہ خبر آئی تھی کہ مودی جی نے اپنے جلسۂ عام کی تعداد میں اضافہ فرمادیا ہے اور اب وہ دو دن میں ۴ کے بجائے ۶ مقامات پر عوام کو مخاطب کریں گے تبھی اندازہ ہوگیا تھا کہ حالت پتلی ہے۔ اس خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ مودی جی ان خطابات عام کے دوران دہلی واپس آنے کے بجائے پٹنہ میں قیام فرمائیں گے تاکہ آپسی جھگڑے مٹاسکیں تو اس سے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ دال میں کالا ہے۔ ویسے جہاں مودی اور شاہ کی جوڑی موجود ہو جھگڑے آسانی سے لگ تو سکتے ہیں لیکن مٹائے نہیں جاسکتے۔

مودی جی نے اپنے جلسوں کو منسوخ کرکے اور پوسٹرس کے اوپر سے اپنی اور امیت شاہ کی تصاویر ہٹا کر عقل کے ناخون تو ضرور لئے ہیں اس لئے کہ فی الحال

بہار میں '' بہاری اور باہری'' کا نعرہ گونج رہا ہے۔ اس پر آئے دن لالو جی کوئی نہ کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے اپنی اور نتیش کمار کی جانب اشارہ کرکے ارشاد فرمایا دو بہاری سپوتوں نے وزیر اعظم سمیت ان کی کابینہ کے ۵۰ وزراء اور ۲۰۰ ارکان پارلیمان کو دوڑا رکھا ہے۔ اب سوال کردیا کہ جس طرح نقاب پوش وزیراعلیٰ کے ساتھ وزیر اعظم اپنے بل بوتے پر انتخاب لڑا رہے ہیں ایسے میں اگر بی جے پی ہار جاتی ہے تو کیا وہ اس کی ذمہ داری لیتے ہوئے استعفیٰ دے دیں گے ؟ ایک بات تو طے ہے کہ بہار انتخاب کے بعد وزیر اعظم کا نہ سہی تو امیت شاہ کا بوریہ بستر گول ہونا ہی ہونا ہے۔ ایسے میں وہ بیچارہ کہاں جائیگا یہ کہا نہیں جاسکتا اس لئے کہ سنگیت سوم اسے اترپردیش میں گھسنے نہیں دے گا۔ شاہ جی نے اس کے دادری جانے پر تنقید جو کردی ہے اور ہاردک پٹیل اسے گجرات میں آنے نہیں دے گا اس لئے کہ بنیا سماج پٹیلوں کے خلاف ہے۔ امیت شاہ تو بیچارہ نہ گھر کا ہوگا اور نہ گھاٹ کا ممکن ہے اس صورت میں وہ اپنی پرانی کمین گاہ تہاڑ جیل کے اندر اپنے لئے محفوظ پناہ گاہ تلاش کرے۔

مودی جی بہار سے دہلی بھی اپنی حماقتوں سمیت آئے۔ دہلی میں انہوں نے اعلان فرمایا کہ یہاں میرے ساتھ اسٹیج پر پرکاش سنگھ بادل بیٹھے ہوئے ہیں جو ہندوستان کے نیلسن منڈیلا ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک نہایت منفرد بیان

ہے۔ ایک زمانہ تھا جب دنیا بھر کے لوگ اپنے رہنماؤں کا موازنہ گاندھی جی سے کرکے فخر محسوس کیا کرتے تھے اور نیلسن منڈیلا کو بھی جب جنوبی افریقہ کا گاندھی کہہ کر پکارا جاتا تھا تو ان کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔ نیلسن منڈیلا اگر حیات ہوتے تو وزیراعظم کے ذریعہ بادل کے ساتھ اپنا موازنہ سن کر ان کا سر شرم سے جھک جاتا۔ گاندھی جی کا تو کیا ہے کہ ان کی اپنی ریاست کا ہاردک پٹیل علی الاعلان کہتا پھرتا ہے گاندھی کے راستے پر بہت چل کر دیکھ لیا۔ اس سے کچھ بھی نہیں ملا اب ہم بھگت سنگھ کا راستہ اپنائیں گے۔ وہ تو خیر ہاردک پٹیل نے مودی جی کی پیروی میں یہ نہ کہا کہ ہم پنجاب کے منڈیلا پرکاش سنگھ بادل کا راستہ اپنائیں گے۔

مودی جی کے اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یا تو وہ نیلسن منڈیلا کی انقلابی زندگی سے ناواقف ہیں یا پرکاش سنگھ بادل کے کالے کارناموں کو نہیں جانتے ورنہ یہ جرأت کبھی نہ کرتے۔ ان کے خیال میں ان دونوں رہنماؤں کے درمیان قدر مشترک جیل جانا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر مودی جی کو بھی یہ سعادت نصیب ہو جائے تو کیا وہ دور جدید کے سبھاش چندبوس کہلائیں گے۔ دراصل جیل جانا اپنے آپ میں کوئی اہم بات نہیں ہے۔ گزشتہ دنوں وہ خود لالو جی کے جیل جانے پر تنقید کر چکے ہیں لیکن جب لوگوں نے انہیں یاد دلایا خود امیت شاہ بھی جیل یاترا کر چکے ہیں تو ان کی زبان کو لگام لگ گئی۔
بادل سکھ پنتھ کی

خاطر جیل گئے تھے اگر بادل اس بناء لائق تکریم ہیں تو سنت بھنڈارن والا نے سکھ پنتھ کیلئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے کیا مودی جی ایوانِ پارلیمان میں ویر ساو کرکے بغل میں سنت بھنڈارن والا کا مجسمہ بھی نصب کروائیں گے۔

وزیراعظم کے بیان پر سنا ہے جنوبی افریقہ کی کسی عدالت میں ہتک عزت کا دعویٰ بھی درج ہوا ہے جبکہ وزیراعظم کے بیان پر ہندوستان میں ہتک عزت کا دعویٰ درج ہونا چاہئے اس لئے کہ پرکاش سنگھ بادل جیسے بدعنوان اور نااہل سیاستدان کو ہندوستان کا منڈیلا محض اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ وہ بی جے پی کا باجگذار ہے۔ پنجاب کے عوام پرکاش سنگھ بادل کی اقرباء پروری سے نالاں ہیں۔ ان کا بیٹا نائب وزیر اعلیٰ اور بہو مرکزی وزیر ہے۔ بدعنوانی کے معاملات میں وجئے راجے سندھیا اور شیوراج سنگھ چوہان بھی ان کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ ان کے دور میں پنجاب کے اندر منشیات کا استعمال اس قدر بڑھا ہے کہ ۴۰ فیصد سے زیادہ نوجوان اس کا شکار ہو گئے ہیں۔ ابھی حال میں گروگرنتھ صاحب کی بے حرمتی کو لے کر ریاست پنجاب میں جو بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے وہ رام رحیم پنتھ کے لوگوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں جن پر اس مذموم حرکت کا الزام ہے۔ ویسے مودی جی کو اس طرح کے واقعات سے کیا فرق پڑتا ہے ان کے اپنے حلقۂ انتخاب وارانسی میں فی الحال گنیش وسرجن کو لے

سادھو سنتوں اور انتظامیہ کے دوران ٹھنی ہوئی ہے۔ سادھو سنت سپریم کورٹ کے احکامات کے خلاف گنیش کی مورتی گنگا میں ڈبونا چاہتے ہیں انتظامیہ روکتا ہے تو وہ اس سے بھڑ جاتے ہیں اور سارا شہر سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن مودی جی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

وزیراعظم کو ویسے سنجیدہ معاملات میں دلچسپی کم ہی ہوتی ہے۔ ان کیلئے کسی ٹیم کا جیت جانا یا کسی کھلاڑی کا بیمار ہوجانا تو قابل توجہ ہوتا ہے۔ وہ اس پر فوراً ٹویٹ بھی کردیتے ہیں لیکن دادری جیسے سانحہ پر پراسرار چپی سادھ لیتے ہیں۔ جب ان کی خاموشی کے خلاف شور شرابہ آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے تو وہ صدر محترم سے بیان دلوا کر اس کی جانب توجہ اس طرح توجہ دلاتے ہیں کہ جیسے بھارتیہ ناری کہتی ہے منے کے پاپا ذرا دیکھئے ناپڑوسی کس بات کی شکایت کررہے ہیں۔ اس پر بھی طوفان نہیں تھمتا تو بادلِ ناخواستہ کہہ دیتے ہیں دادری کا واقعہ قابل مذمت ہے لیکن اس سے مرکز کا کیا تعلق ؟ لاء اینڈ آرڈر کیلئے ریاستی حکومت ذمہ دار ہے (جو اتفاق سے سماجوادی کی ہے)۔ یہی بیان اگر مودی جی دو ہفتہ قبل دے دیتے تو اس قدر بدنامی نہیں ہوتی لیکن اس کیلئے جو دور اندیشی درکار ہے وہ کہاں سے آئے؟ مودی جی کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر بی جے پی رہنما فسادیوں کی پشت پناہی میں لگ گئے جس سے کام اور خراب ہوگیا اور انتظار بسیار کے بعد بیان بھی آیا تو اس کا خاطر خواہ

فائدہ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ جو نقصان ہو نا تھا ہو چکا تھا۔

وزیراعظم کے بیان پر جہاں ان کے بھکت بغلیں بجا رہے تھے بی جے پی کی نظریاتی ہمزاد شیوسینا کے سنجئے راوت نے اوس ڈال دی۔ سنجئے راوت نے مودی جی کے بیان پر اظہار افسوس کرتے ہوئے یاد دلایا کہ مودی جی کی اصل شناخت گودھرا سے ہے۔ ہم گودھرا کے سبب ان کا احترام کرتے ہیں اور دادری پر بیان دے کر انھوں نے اپنے تشخص کو پامال کیا ہے۔ سنجئے راوت نے بڑی صفائی سے مودی جی کو وہ آئینہ دکھا دیا جسے توڑنے کی کوشش میں ان کی انگلیاں بار بار لہو لہان ہو جاتی ہیں۔ فی الحال سینا اور بی جے پی میں نئی مہابھارت چھڑی ہوئی ہے۔ جس طرح مودی جی نے دہلی میٹرو کے افتتاح میں وزیراعلیٰ اروند کیجریوال کو نظر انداز کر دیا اسی طرح ممبئی میں سینا سپریمو ادھو ٹھاکرے کو دعوت دینے سے گریز کیا گیا۔ ادھو نے بگڑ کر بی جے پی کو بدنام کرنے کیلئے انہیں تاریخوں میں ودربھ کے کسانوں سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔

وزیراعلیٰ دیویندر فردنویس کو بہت دیر سے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے ایک وزیر کے ہاتھوں ذاتی طور دعوتنامہ روانہ کیا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ ادھو نے وزیراعظم کی تقریب کا دعوتنامہ ٹھکرا کر اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کر دیا۔ اس سے قبل شیوسینا غلام علی کے پروگرام کی مخالفت کر چکی تھی۔

وزیر اعلیٰ کے تمام تر یقین دہانی کے باوجود منتظمین نے پروگرام منسوخ کرکے شیوسینا کے حوصلے بلند کردیئے۔ اس کے بعد بی جے پی کے دانشور سدھیندر کلکرنی نے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی کتاب کے ممبئی میں اجراء کا اعلان کردیا۔ شیوسینا کو اس سے اپنے آپ کو بی جے پی سے بڑا زعفرانی ثابت کرنے کا ایک اور موقع مل گیا اور اس نے اس کے بھی منسوخ کرنے کا مطالبہ کردیا اور اپنا احتجاج جتاتے ہوئے سدھیندر کلکرنی کے منھ پر کالک پوت دی۔ کلکرنی نے اپنے کالے منھ کے ساتھ پریس کانفرنس کرکے شیوسینا کا منھ کالا کردیا۔

اس واقعہ پر ساری دنیا شرمسار ہوئی یہاں تک کہ مودی جی نے بھی اس پر اظہار تاسف کیا لیکن شیوسینا کو اس پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس کے مطابق یہ نہایت مہذب اور عدم تشدد کے طریقے پر کیا جانے والا ہے احتجاج تھا۔ اس احتجاج کے دوران چونکہ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا اس لئے اسے پرتشدد احتجاج تو نہیں کہا جاسکتا اور جہاں تک سیاستدانوں کے چہروں پر کالک کا سوال ہے وہ کوئی نئی بات ہے نہیں مثل مشہور ہے کوئلے کی دلالی میں تو صرف ہاتھ کالے ہوتے ہیں اقتدار کی دلالی میں منھ بھی کالا ہوتا ہے۔ فردنویس نے قصوری کی کتاب کا اجراء کرواکر شیوسینا کے منھ پر کالک پوت دی۔

شیو سینا کے مطابق سدھیندر کلکرنی اجمل قصاب جیسا ہے ۔ اب اگر شیو سینا کے ہوتے اجمل قصاب ممبئی میں کسی پاکستانی کے کتاب کا اجراء کروادے تو وہ اس کیلئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ بھگوا دھاری اس طرح ایک دوسرے کا منھ کالا کرتے رہیں تو ان کا خانگی معاملہ ہے اس پر کسی تیسرے کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے لیکن سنجئے راوت نے سدھیندر کلکرنی کے چہرے پر پوتی جانے والی سیاہی کو سرحد پر بہنے والے فوجی جوانوں کا لہو کہہ کر فوج کی ایسی توہین کی ہے کہ اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے ۔ سیاستدانوں کے منھ تو کالے ہو سکتے ہیں مگر فوجیوں کا خون کالا نہیں ہو سکتا۔
جوانوں کا لہو تو سرخ ہوتا ہے لیکن زعفرانی سیاستدانوں کو اس کا علم اسی وقت ہو گا جب وہ آپسی سر پھٹول سے نکل کر سرحد پر جائیں اور ملک و قوم کیلئے قربانی دیں ۔ فی الحال سینا اور بی جے پی ایک دوسرے کی قبر کھودنے میں مصروف ہیں اب اس میں کون دفن ہوگا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔
مہاراشٹر کے اندر جس طرح بی جے پی کی مصیبتوں کا سرچشمہ شیو سینا ہے اسی طرح بہار میں اس کی حامی جماعتیں لوک جن شکتی پارٹی ، راشٹریہ سمتا دل اور ہندوستان عوام پارٹی ہے۔ وہ سب جہاں ایک دوسرے کے دشمن وہیں بی جے پی کے اندر بھی گھمسان پڑا ہوا۔ آئے دن بی جے پی رہنماوں کے ایک دوسرے خلاف بیانات نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اب تو امیت شاہ بھی ان کے نشانے پر آگئے ہیں

اور وہ ان کی بیجا مداخلت پر سر عام اعتراض کیا جارہا ہے۔آرایس ایس کو چونکہ بی جے پی والے اپنا مہا گرو مانتے ہیں اس لئے سر سنگھ چالک کا اس معاملے میں سب زیادہ حق بنتا ہے۔ بھاگوت جی نے ریزرویشن کے خلاف بیان دے کر لالو اور نتیش کے ہاتھ میں جو ہنٹر پکڑا دیا ہے اس سے بہار میں بی جے پی لہو لہان ہے۔

بی جے پی نے پہلے تو اس بیان سے دہلی میں پلہّ جھاڑا پھر اس کے بعد وزیر اعظم نے بہار میں ریزرویشن کو قائم و دائم رکھنے کی یقین دہانی کی بلکہ ممبئی میں بھی اس کا اعادہ کیا لیکن موہن بھاگوت بھی آسانی سے قابو میں آنے والے پرانی نہیں ہیں۔ اگست ۲۰۱۲ء میں جب ان سے غیر ملکی صحافیوں نے مختلف ریاستوں کی ترقی کی بابت پوچھا تھا تو انہوں نے بہار کو گجرات پر ترجیح دی تھی ۔ اس کے معنیٰ یہی ہوتے تھے کہ وزیراعلیٰ کے طور پر نتیش کمار کو نریندر مودی پر سبقت عطا کی گئی تھی ۔ بھاگوت جی بار کیلئے نئے نہیں ہیں ۔ دس سال سے زیادہ بہار میں وہ پرچارک کے طور پر کام کرچکے ہیں ۔ ان کو ریاستِ بہار کے مسائل اور بہاری عوام کی نفسیات کا اندازہ ہے ۔اس کے باوجود عین انتخابی مہم کے دوران موہن بھاگوت کا یہ بیان اور وزیر اعظم کے حلہَ انتخاب میں اس کا اعادہ غالب کے اشعار یاد دلاتے ہیں ۔

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں

عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

سیاسی بساط پر سانپ سیڑھی کا کھیل

سیاست کی بساط ایک زمانے میں شطرنج کی بازی ہوا کرتی تھی ۔ دونوں فریق ہاتھی ، گھوڑے ، فوج سمت ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتے۔ شئے دی جاتی مات ہوجاتی اور اقتدار بدل جاتا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب سیاست اصول و ضوابط کی پابند تھی۔ ہاتھی ، گھوڑے اور فوج تو درکنار بادشاہ کی چال بھی متعینہ حدود کا پاس و لحاظ کرتی تھی لیکن آگے چل کر یہ سانپ سیڑھی کا کھیل بن گئی۔ جس میں اچانک کسی کو سیڑھی ملتی ہے تووہ شہریت کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے پھر جب سانپ کاٹتا ہے تو دھڑام سے گمنامی کی کھائی میں گرجاتا ہے ۔ ایسا نہ صرف جمہوری نظام ہی میں ہوتا ہےبلکہ آمریت اور ملوکیت میں ہوتا رہتا ہے جس کی بے شمار مثالیں جابجا پھیلی ہوئی ہیں ۔

سعودی عرب میں دو ولی عہد اس لئے بادشاہت سے محروم رہے کہ باری آنے سے قبل ان کا انتقال ہوگیا اور ملک سلمان کی لاٹری لگ گئ ۔ ان کے بھائی اور متوقع ولیعہد مقرن کو سانپ نے ڈس لیا اور بھتیجے محمد بن نائف کو سیڑھی مل گئ۔ مصر میں جمال عبدلناصر کو اسرائیل سے شکست کے صدمے سے جاں بحق ہوگئے توانور سادات کی لاٹری لگ گئ ۔ انور سادات کو گولی لگی تو حسنی مبارک کو

سیڑھی مل گئی۔ عوامی بغاوت کا سانپ جب نامبارک اقتدار کو نگل لیا تو جنرل اشفاق نے سیڑھی چڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ڈاکٹر محمد مورسی کے اقتدار پر مغرب نے سازشی سانپ چھوڑ دیئے اور السیسی کو سیڑھی تھما کر اقتدار پر فائز کردیا۔ پاکستان میں بے نظیر بھٹو کو پرویز مشرف کے ناگ نے ڈس لیا مگر زرداری کو سیڑھی مل گئی اور وہ پورے پانچ سال تک صدارتی محل میں دادِ عیش دیتے رہے۔

ہندوستانی سیاست تو اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ شاستری جی کی ناگہانی موت سے گونگی گڑیا اندراجی کی قسمت کا ستارہ چمک گیا۔ سونیا گاندھی کے اقتدار سنبھالنے کا وقت آیا تو اطالوی نسل کے سانپ نے انہیں ڈس لیا اور اسی کے ساتھ نرسمھا راو کو سیڑھی مل گئی۔ ان کے بعد وی پی سنگھ کو ان کے ضمیر نے روک دیا اور جیوتی باسو کو پارٹی کے سانپ نے ڈس لیا جس کے سبب دیوے گوڑا جیسے گمنام آدمی کی لاٹری لگ گئی اور وہ وزیراعظم کی کرسی پر براجمان ہوگئے۔ اڈوانی جی کو قائدِ اعظم پر تبصرہ لے ڈوبا تو مودی جی کی وارے نیارے ہوگئے اور یہ ابھی پچھلے سال کی بات ہے کہ دیکھتے دیکھتے ان کا سورج اقتدار کے فلک پر جگمگانے لگا لیکن آج کل وہ بے شمار زعفرانی سنپولوں کے درمیان پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ دہلی کی شکست کا کلنک مٹانے کیلئے بہار گئے تو وہاں بھی دال نہیں گلی۔ ویسے اگر دال کا بھاؤ گوشت سے زیادہ ہو جائے تو وہ

گلے بھی کیسے ؟

آج کل مودی جی کا یہ حال ہے کہ اس سے قبل وہ پہلے سنپولے کا گلا دبانے میں کامیابی حاصل دونئے ناگ دیوتا ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں ۔ سنگیت سوم کو پھٹکارہ تو ساکشی مہاراج پھنکارنے لگے ۔ امیت شاہ نے ساکشی کو دفتر میں بلا کر ڈانٹا تو کھٹر نے کہہ دیا مسلمان ملک میں رہ سکتے ہیں مگر انہیں بیف کھانا چھوڑنا پڑے گا''۔ کھٹر کی دھمکی کے'' ساتھ ہی راحت اندوری کی غزل ''کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے'' پھر سے زندہ ہو گئی۔ خیر امیت شاہ نے منوہر لال کھٹر کو تو فون پر جتا دیا کہ تو'' کرائے دار ہے مالک مکان تھوڑی ہے'' اور منوہر لال نے معذرت بھی پیش کردی کہ میں تو گزارش کررہا تھا میں کوئی حکم تھوڑی نا لگا رہا تھا لیکن.برا ہو آر ایس ایس کا کہ اس کے ترجمان پانجنیہ میں ایک مضمون شائع ہوگیا جس میں کہا گیا تھا کہ ویدوں کے مطابق گائے کاٹنے والے کا قتل جائز ہے۔

بی جے پی والوں نےجب سنگھ کو سمجھایا گیا تو اس نے عجیب و غریب صفائی دی ۔ ایک ترجمان نے کہا کسی مضمون نگار کے خیالات سے جریدے کا اتفاق ضروری نہیں ہے لیکن دوسرا دو ہاتھ آگے نکل گیا اور بولا پانجنیہ سنگھ کا ترجمان ہی نہیں ہے ۔ جو لوگ خود اپنے بارے میں اس قدر دھڑلے سے جھوٹ بولتے ہوں ان سے

دوسروں کی بابت کیا توقع کی جائے۔ اس صورتحال میں مودی جی نے جن غیر ملکی سرمایہ کاروں بڑی مشکل سے میک ان انڈیا کیلئے تیار کیا ہے وہ بڑے تذبذب کا شکار ہیں اس لئے کہ سرزمین ہندپر اگران کے مسابقین میں سے کوئی ان کا کانٹا نکالنا چاہے تو یہ بے حد آسان ہے۔ جب وہ اپنے ہوٹل سے دفتر جارہا ہو تو مخالف کے چند گھنٹے یہ افواہ اڑا دیں گے کہ اس نے ابھی ابھی بیف برگر کھایا ہے اور پھر اس پر ہلہّ بول کر گئو ماتا کے نام پر اس کی بلی چڑھادی جائے اس لئے کہ ویدوں میں تو یہی لکھا ہے اور فی الحال یہاں پر ویدوں کی تعلیمات کے مطابق سارا کاروبار چل رہا ہے۔

لوگ بار بار یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر سنگھ پریوار بڑے کے گوشت کا اس قدر مخالف ہے تو وہ بی جے پی کی مرکزی حکومت سے بیف کی برآمد پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیوں نہیں کرتا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ سنگھ پریوار فی الحال بیف کے تاجروں کا دلال بنا ہوا ہے۔ وہ بیف کی برآمد کو بڑھانے کیلئے ہی ہندوستان کے اندر اس کے کھانے پر پابندی لگوا رہا ہے۔ ہندوستان میں بڑے جانور کے گوشت کی پیداوار صرف ۴۱ لاکھ ٹن ہے یعنی وہ دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے پانچویں نمبر پر ہے اس کے باوجود اس کی برآمد ۲۱ لاکھ ٹن ہے جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے جبکہ ہندوستان جیسی آبادی والا ملک چین ہم سے ڈیڑھ گنا زیادہ ۶۹ لاکھ ٹن بیف تیار کرنے کے باوجود ۳۷ لاکھ ٹن درآمد کرتا ہے۔ اب

اگر ہندوستان اپنا اول نمبر کا مقام برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اس لئے لازم ہے کہ اندرونِ ملک اس کی کھپت گھٹائی جائے۔ اس لئے کہ بیف کی پیداوار کو مزید بڑھانا ناممکن ہے۔یہی وجہ ہے کہ بیف مخالف بھگوا دھاری سرمایہ داروں کے دلال چاہتے ہیں کہ سارے کا سارا ۲۱ ۴ لاکھ ٹن بڑے جانور کا گوشت پردیس بھیج کر اپنی تجوریبھر لی جائے۔ اِدھر بیف برآمد کرنے والے عوام کا گلا گھونٹ رہے ہیں اُدھر دال درآمد کرنے والے عوام کو لوٹ رہے ہیں ۔ لوٹ کھسوٹ کی اس چکی میں عام لوگوں کے ساتھ مودی سرکار بھی گیہوں سمیت گھن کی مانند پسی جارہی ہے جس کا نمونہ ممکن ہے بہار کے اندر دیکھنے کو ملے ۔

ایک زمانے میں بی جے پی کا نعرہ تھا بھئے (خوف) ، بھوک (فاقہ) اور بھرشٹاچار بدعنوانی) مکت بھارت ۔ اب اس کی عملی تفسیر لوگ دیکھ رہے ہیں ۔ بہار کے اندر) جنگل راج کا خوف دلایا جارہا ہے، اچھے دنوں کی بھوک بڑھائی جارہی ہے اور بدعنوانی کے بل بوتے پر انتخاب جیتنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ملک بھر میں گائے کا خوف دلا کر قتل و غارتگری کا ننگا ناچ جاری ہے، کہیں پاکستان کے نام پر بدمعاشی ہورہی ہے تو کہیں دلت سماج پر مظالم ڈھائے جارہے ہیں ۔ عام لوگوں سے ان کی دال روٹی چھین کر انہیں فاقہ کشی کا شکار کیا جارہا ہے اور بدعنوانی کا یہ عالم ہے کہ پچھلے ایک ہفتہ میں ملک سے ۶۰۰۰ کروڑ روپیہ باہر چلا گیا جس کی تلاش جاری ہے ۔ راجستھان کے ایک ماربل

بیوپاری کے پاس کئی ہزار کروڑ نقد ملے نیز ریاستی سرکار نے کوئلہ کے ٹھیکے منسوخ کرکے بدعنوانی کا الزام بلاواسطہ تسلیم کرلیا۔ یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ زعفرانی دہشت گرد بیخے مکت (بے خوف) ہوگئے ہیں۔ سرمایہ داروں کو استحصال کی کھلی چھوٹ مل گئی ہے اور غریب عوام بے بس و لاچار ہیں۔ قوم کا نام نہاد چوکیدار چادر تان کرکمبھ کرن کی نیند سو رہا ہے۔

وزیراعظم کے دادری والے بیان پر دی ہندو نے جو کارٹون بنایا وہ درسی کتاب میں پڑھائی جانے والی پنوکیو کی کہانی کی علامت پر ہے۔ پنوکیو جب بھی جھوٹ بولتا تھا اس کی ناک لمبی ہو جاتی تھی۔ سریندر نے دیو ہیکل مودی جی کی ناک کی جگہ پیمائش کی پٹی لگا دی جو ۵۵ انچ لمبی ہو چکی ہے۔ اس کے سامنے ننھے امیت شاہ کو ایک سیڑھی پر کھڑا کردیا اور اس کے ہاتھ میں محدب عدسہ ہے تھمادیا جسے وہ پٹی کے آگے رکھ کر کہتا ہے کہ دیکھو اس پر صاف لکھا ہے کہ وزیراعظم نے دادری کے سانحہ پر افسوس کا اظہار کیا ہے جب کہ ناک پر ایسا کچھ بھی نہیں لکھا۔ خلیل جبران کا مشہور فقرہ امیت شاہ پر صادق آتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا، سوائے اس ایک جھوٹ کے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا"۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ جب انسان پہلے پہل جھوٹ بولتا ہے تو اسے مشکل ہوتی ہے اس کے بعد ہچکچاہٹ ہوتی پھر ندامت و پشیمانی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے اور انسان اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولنے لگتا ہے لیکن یہ سب عام

لوگوں کے ساتھ ہوتا ہوگا ہمارے سیاستدان تو پہلی ہی جست میں چاروں مراحل طے کر لیتے ہیں۔

دادری کی آگ کے ہماچل پردیش تک پہنچ جانے کی بنیادی وجہ یہی ہے قاتلوں کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ جموں کے زاہد کا قتل اسی سازش کا حصہ ہے۔ مودی جی نے دادری کے متعلق تو یہ کہہ دیا کہ اس کا مرکز سے کوئی واسطہ نہیں ہے یہ ریاستی سرکار کا مسئلہ ہے لیکن دہلی کی پولس تو مرکزی حکومت کے تحت ہے یہاں ایک ہی دن میں دو معصوم بچیوں کی عصمت دری اور قتل ہوگیا اس کیلئے کیا وہ اروند کیجریوال کو ذمہ دار ٹھہرائیں گے ؟ ابھی ان اندوہناک سانحات کی گرد بیٹھی بھی نہیں تھی راجدھانی دہلی کے قریب فرید آباد میں رات ۳ بجے ایک دلت خاندان کی جھونپڑی کے آس پاس تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ اس حملے سے گھر کے مالک میاں بیوی تو کسی طرح جھلس کر بچ نکلے مگر دو معصوم بچے زندہ نذرِ آتش ہوگئے۔

فرید آباد اتفاق سے بی جے پی منوہر لال کھٹر کے ہریانہ میں آتا ہے۔اب کھٹر کی ہمت نہیں ہے کہ وہ فرید آباد کے ٹھاکروں سے کہے کہ تم لوگ شہر میں رہ تو سکتے ہو لیکن تمہاری جگہ گھر پر نہیں جیل میں ہے جہاں سے پھانسی کا پھندا تمہارا منتظر ہے۔ ملک کا وزیر داخلہ خود ٹھاکر ہیں وہ نہ تو دادری کے ٹھاکروں کا کچھ بگاڑ سکے اور نہ فرید آباد کے ٹھاکروں پر کوئی اقدام کر سکے۔

دادری سے لے کر فرید آباد تک وزیر داخلہ کا کام صرف رپورٹیں وصول کرکے انہیں فائل میں لگانا ہے۔ اس لئے ظالموں کا تعلق ان کی اپنی برادری سے ہے۔ ابھی تو خیر راج ناتھ وزیر اعظم نہیں بنے تو ٹھاکروں کے حوصلے اس قدر بلند ہوگئے ہیں کل کو اگر ایسا انرتھ ہوجائے تب تو ملک بالکل اناتھ ہوجائیگا۔

ویسے وزیر اعظم کی حوصلہ مندی نے بہتوں کے حوصلے بلند کردیئے ہیں۔ شیوسینا تو بالکل آپے سے باہر ہوگئی ہے۔ غلام علی سے شروع ہونے والا سلسلہ سدھیندر کلکرنی سے ہوتا ہوا ششانک جوشی تک پہنچ گیا۔ جیٹلی جی نے شیوسینا کو بحث و مباحثہ کے معیار کو اونچا کرنے کی مشورہ دیا ہے۔ جو گفت و شنید میں یقین رکھتا ہو اس سے تو اس طرح کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن جو برسرِ عمل ہو اس پر قابو پانے کیلئے عملی اقدامات کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیٹلی جی کو چاہئے کہ وہ شیوسینا سے کہیں کہ بھائی ان ہنگاموں کے بجائے اپنی توانائی کا مثبت استعمال کیجئے اور ایک کرکٹ ٹیم بنایئے جو پچ کھودنے یا بی سی سی آئی کے دفتر پر حملہ کرنے بجائے میدان میں اتر کر کھیل دکھائے۔ اس لئے کہ فی الحال جنوبی افریقہ نے ہندوستانی ٹیم کا برا حال کر رکھا ہے۔ ٹی ۲۰ کے دو میچ وہ لوگ جیت گئے تیسرا بارش کی نذر ہوگیا ورنہ آسمان کے بجائے کولکاتا کے شائقین آنسو بہاتے۔ ون ڈے سیریز کے پانچ میچ بالکل بہار کے پانچ مراحل میں پولنگ کی طرح ہیں ۔ پہلا میچ بھارت ہار گیا تو دوسرے میں زور لگا کر اسے

جیت لیا لیکن تیسرے میں پھر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ پہلے میچ میں شکست کی وجہ دھونی کا دھنائی کرنے کے بجائے آخر میں اچانک آوٹ ہو جانا تھا اور تیسرے میں گھبرائے ہوئے دھونی کی موجودگی میں ۳۰ سے ۴۰ اوور کے دوران ٹیم کا صرف ۳۸ رن بنانا۔ بہار میں بی جے پی کے کپتان کا بھی یہی حال ہے کبھی وہ اچانک آوٹ ہو جاتا ہے تو کبھی ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ دھونی نے تو خیر پچ کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنی جان چھڑا لی دیکھنا یہ ہے کہ مودی جی کس کو بلی کا بکرا بناتے ہیں۔

تیسرا میچ راجکوٹ کے اندر کھیلا گیا جہاں ادھو ٹھاکرے کے بجائے ہاردک پٹیل ہنگامہ مچائے ہوئے تھا۔ ہاردک سے بی جے پی اس قدر خوفزدہ تھی کہ وزیر اعلیٰ نے میدان میں جا کر کھیل دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ڈیجیٹل انقلاب کے معمار مودی جی کی راج کوٹ میں ایسا شگاف پڑا کہ انٹرنیٹ کی سروس میچ کے پہلے دن رات دس بجے سے اگلے دن صبح ۶ بجے تک کیلئے بند کر دی گئی۔ ہاردک کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر پرچم کی توہین اور بغاوت کے الزامات لگائے گئے حالانکہ قومی پرچم کی توہین تو وزیر اعظم سے بھی امریکہ میں سرزد ہو چکی ہے جب انہوں نے باورچی وکاس کو دیئے جانے والے جھنڈے پر دستخط فرما دیئے تاکہ وہ اسے اوبامہ کو وہ تحفہ میں پیش کر سکے۔ اول تو پرچم پر دستخط کرنا غلط تھا اور دوسرے باورچی کے ذریعہ اسے اوبامہ تک پہنچانا یہ منطق تو شاید اس بل گیٹس

کی سمجھ میں نہیں آئی ہوگی جو مودی جی بہت بڑے مداح ہیں۔

جہاں تک کہ بغاوت کے مقدمے کا سوال ہے وہ تو اتر پردیش کی ایک نچلی عدالت میں وزیر خزانہ ارون جیٹلی کے خلاف بھی قائم ہوگیا ہے۔ دراصل ہوا یہ کہ جب سپریم کورٹ نے نئی حکومت کے وضع کردہ ججوں کی تقرری کے قومی کمیشن کو غیر دستوری قرار دے کر مسترد کردیا تو وزیر خزانہ جو ماہر قانون سمجھے جاتے ہیں نے اپنے نادرِ روزگار خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بلاگ میں لکھا کہ غیر منتخب شدہ اداروں کا ظلم نہیں برداشت کیا جائیگا۔ یعنی منتخب شدہ نمائندوں کی زیادتی تو قابل برداشت ہے لیکن یہ غیر منتخبہ لوگ ظلم و جبر کے حقدار نہیں ہیں۔ یہ بیان اگر کوئی چائے والا دیتا تو اسے لاعلمی پر موقوف کرکے نظر انداز کیا جاسکتا تھا لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ارون جیٹلی جیسے عدالتِ عالیہ کے معروف وکیل نے دستور کی وفاداری کا حلف اٹھانے کے بعد سب سے محترم دستوری ادارے کو ظالم قرار دے دیا۔ اتر پردیش کے مہوبہ ضلع کی عدالت کے جج انکت گوئل نے اس بیان کو قوم دشمن قرار دیتے ہوئے وزیر خزانہ کو ۱۹ نومبر کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ جیٹلی جی کا اگر یہ اخباری بیان ہوتا تو اس سے مکر جانا بہت آسان تھا، یہ کہہ دینا کہ ان کی بات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا سیاستدانوں کا روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ مگر یہ تو ان کے اپنے بلاگ پر لکھا ہوا ان کا اپنا مضمون ہے جس کی ذمہ داری

کسی اور پر ڈالنا ناممکن ہے۔
ہاردک پٹیل تو خیر سیاسی دباو بنا کر سارے الزامات سے چھوٹ جائیگا لیکن اگر گبرؔ کے لہجے میں پوچھیں کہ ’’اب تیرا کیا ہوگا جیٹلی‘‘ تو اس کا کیا جواب ہوگا؟ سوم، سا کشی، کھٹر، ادھو اور ہاردک جیسے سنپولوں سے تو مودی جی کسی طرح نمٹ لیتے تھے لیکن اب دیکھنا یہ ہے جیٹلی جیسے اژدھے کے ساتھ وہ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ گردشِ زمانہ کو دیکھئے کہ پچھلے سال مودی جی جب بھی پانسہ پھینکتے تھے سامنے ایک سیڑھی نظر آتی تھی جس پر چڑھتے ہی ان کی چھاتی ایک انچ پھول جاتی تھی۔ آج کل یہ حال ہے ہر قدم پر ایک سانپ دکھائی دیتا ہے اور جب وہ اس کا سر کچلنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی ناک لمبی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں راحت کا وہ مصرع یاد آتا ہے ’’جو آج صاحبِ منصب ہیں کل نہیں ہوں گے‘‘۔ اس روشن حقیقت پر زمانے کی گواہی کافی ہے لیکن اس وقت تک کتنی تاریکی پھیل چکی ہوگی کوئی نہیں جانتا۔

پنجاب کی معیشت میں سیاست کی آگ

اس سال سنگھ پریوار کو دیوالی کا خصوصی تحفہ سکھوں کی جانب سے موصول ہوا۔ سنگھ کے بقول ہندوؤں کی تلوار سکھ سماج کی جانب سے ایک حیرت انگیز اعلان سامنے آیا بدقسمتی سے جسے نظر انداز کردیا گیا۔ چندی گڑھ سے شائع ہونے والے دی ٹریبون کے مطابق شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی نے اس سال گولڈن ٹیمپل اور دوسرے گردواروں میں دیوالی کا تہوار سادگی کے ساتھ منانے کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی کے صدر اوتار سنگھ مکڑ نے اعلان کیا کہ اس سال ہر مندر صاحب میں حسبِ روایت چراغاں نہیں کیا جائیگا اور آتش بازی بھی نہیں ہوگی بلکہ صرف مٹی کے دیئے جلائے جائیں گے۔ عام طور پر طلائی مندر میں دیوالی کا تہوار بڑے زور شور سے منایا جاتا تھا اور نہ صرف مندر کی سجاوٹ اور روشنی بلکہ آتش بازی بھی قابلِ دید ہوتی تھی۔ ۱۲ اکتوبر کو فرید کوٹ کے برگادی گاوں میں ہونے والی گرو گرنتھ صاحب کی بے حرمتی کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔اس مذموم حرکت کے خلاف مظاہروں میں دو سکھ نوجوان پولس کی گولی سے ہلاک ہوئے اور اس کے بعد سارے پنجاب میں احتجاج کے شعلے جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئے۔

حالیہ تنازعہ کی ابتداء ماہِ جون میں برگٹ جواہر گردوارہ سے گرو گرنتھ صاحب

کی چوری سے ہوئی۔ سکھ قوم گرو گرنتھ صاحب کو نہ صرف مقدس صحیفہ بلکہ زندہ گرو مانتے ہیں ۔ اس اہانت کے خلاف شکایت پر پولس نے توجہ نہیں دی یہاں تک کہ کسی نامعلوم فرد کی ایک تحریر منظر عام پر آگئی ۔ اس میں دعویٰ کیا گیا تھا مسروقہ صحیفہ اس کے پاس ہے۔ اس کے خاتمہ پر ''دھن دھن ست گرو'' بھی درج تھا۔ یہ دراصل ڈیرا سچا سودہ پنتھ کے ماننے والوں کا نعرہ ہے۔ یہ الزام بھی ہے کہ تحریر میں سکھ سماج اور ان کے مذہبی پیشواوں کے خلاف برا بھلا لکھا ہوا تھا۔ ان حالات کے باوجود ماہِ ستمبر میں اکال تخت کے سب سے بڑے گرنتھی نے ڈیرہ سچا سودہ کے سربراہ گرمیت رام رحیم کی معافی کا اعلان کرکے ساری دنیا کو چونکا دیا۔

گرمیت رام رحیم نے ۲۰۰۷ء میں گرو گوبند سنگھ سے مشابہ لباس زیب تن کرلیا تھا جسے سکھوں نے مذہبی توہین قرار دیا اور اس کے خلاف برسرِ جنگ ہوگئے۔ گردوارہ پربندھک کمیٹی چونکہ شرومنی اکالی دل کے قبضے میں ہے اس لئے اس کے فیصلے کو پرکاش سنگھ بادل سے جوڑ دیا گیا اور عوام یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اکالی دل نے ۲۰۱۷ء کے ریاستی انتخابات کے پیش نظر ڈیرہ سچا سودہ کے ماننے والوں کو رجھانے کیلئے یہ فیصلہ کروایا ہے۔ اس متنازعہ فیصلے سے سکھوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے اور وزیراعلیٰ پرکاش سنگھ بادل کی ہوا خراب ہوگئی ۔ بی جے پی چونکہ عرصۂ دراز سے اکالی دل کی حلیف بنی ہوئی ہے اس لئے لازماً سکھ اس سے بھی ناراض ہوگئے۔

مذہب اور سیاست کی اس رسہ کشی کے دوران اکتوبر کے اندر کسانوں نے ریل روکو تحریک شروع کردی۔ اس سال ٹڈی دل حملوں کے سبب فصلیں تباہ ہوئی ہیں جس کے سبب پنجاب جیسے خوشحال علاقہ کے کسان بھی خودکشی پر مجبور ہوئے ہیں مگر حکومت نے ان کی جانب توجہ نہیں دی۔ کسانوں کی تحریک کے رہنماوں کا مطالبہ ہے کہ خودکشی کرنے والوں کے اہل خانہ کو ۵ لاکھ روپیہ معاوضہ دیا جائے۔ ریل گاڑیوں کے روکے جانے سے عوام کو ہونے والی پریشانی کے خاتمہ سے قبل ۱۲ اکتوبر.برگادی گاوں میں گرو گرنتھ صاحب کے پھٹے ہوئے صفحات ملے جس سے متعلق شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے صدر اوتار سنگھ مکڑ نے دعویٰ کردیا کہ وہ مسروقہ صحیفے کے ہیں۔ اس خبر نے سکھوں کے اندر زبردست بے چینی پیدا کردی اور سمرنجیت سنگھ مان کی قیادت میں اکالی دل (امرتسر) و سکھ سنگھرش کمیٹی نے بند کا اعلان کردیا۔

ان ریاست گیر مظاہروں کے تحت کوٹکاپورہ اور بہبل کلاں میں بھی عوام نے پرامن احتجاج کیا۔ پنتھ پریت سنگھ اور رنجیت سنگھ کی قیادت میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پولس کی مدد سے گرو گرنتھ صاحب کو چرانے والوں کا پتہ لگائے اور اہانت کرنے والوں کو سزا دلائے۔ ان مظاہرین کو منتشر کرنے کیلئے نہ صرف آنسو گیس اور لاٹھی کا استعمال کیا گیا بلکہ گولی بھی چلی جس میں ۸۰ زخمی اور دو نوجوان ہلاک ہوگئے۔ حالات جب قابو سے باہر ہونے لگے تو سرکار

کو ہوش آیا۔ نائب وزیراعلیٰ سکھبیر سنگھ بادل نے پولس کو حکم دیا کہ وہ مظاہرین کے خلاف درج شدہ سارے مقدمات واپس لے۔ اہانت اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات کی تحقیقات کیلئے ہائی کورٹ کے ایک جج کا تقرر کیا گیا تاکہ مجرمین کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ مذہبی صحیفے کے چور کو گرفتار کرنے میں مدد کرنے والی خبر دینے والے کیلئے ایک کروڑ کے انعام کا اعلان بھی کیا گیا۔

ان اعلانات کے بعد عوام کے غم وغصے کو کم کرنے کی خاطر بیر گاوں میں روپندر سنگھ اور جسوندر سنگھ نامی دو نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا لیکن ان کے متعلق یہ انکشاف ہوا کہ وہ امرت دھاری مذہبی سکھ ہیں ۔ ان کی گرفتاری کے خلاف ۱۵ مذہبی رہنماوں کی قیادت میں ۳۰۰۰ سکھوں نے مظاہرہ کیا اور پولس پر الزام لگایا کہ اس کی جانب سے گھڑی جانے والی بدیسی ہاتھ کی کہانیجھوٹیہےاور موگا کے بے قصور نوجوانوں کو بلی کا بکرہ بنایا گیا ہے۔ مظاہرین نے ڈپٹی کمشنر ملوندر سنگھ جگیؔ کو میمورنڈم دے کر گرفتار شدگان کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ نوجوانوں کی گرفتاری اور موت کے خلاف ہونے والے مظاہروں نے موگا، فرید کوٹ ، فیروز پور، مکتسر، بھٹنڈا، جالندھر، ترن تارن ، امر تسر اور دیگر اضلاع کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ ناراضگی نہ صرف پولس بلکہ برسر اقتدار اکالی دل اور بی جے پی کے خلاف بھی تھی ۔ موگا کے سابق کاونسلر سکھوندر سنگھ آزاد

نے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان سارے مسائل کا بنیادی سبب سکھ مذہبی اداروں پر اکالیوں کا تسلط ہے۔ وہ شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کی مدد سے اپنے سیاسی مفادات حاصل کر رہے ہیں۔ آزاد کے خیالات کی تصدیق اس دوران کئے جانے والے اکال تخت کے مختلف فیصلوں سے ہوتی ہے۔

۲۴ ستمبر کو جس طرح اکال تخت نے اچانک گرومیت رام رحیم کو معاف کرکے ساری دنیا کو چونکا دیا تھا اسی طرح ۱۷ اکتوبر کو اس نے اپنا فیصلہ واپس لے کر سب کو حیرت زدہ کر دیا۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ پنتھ کے اندر اس پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ عوام نے اس فیصلے کو احتجاج کے دباؤ میں کیا جانے والا ایک سیاسی فیصلہ قرار دیا۔ اگر پرکاش سنگھ بادل کے ہاتھوں میں اکالی دل کے ساتھ ساتھ گرودوارہ پربندھک کمیٹی اور اکال تخت کی باگ ڈور نہیں ہوتی تو یہ خیال کسی کو نہیں آتا مگر قوت کا ارتکاز عوام کو بجا طور پر ان خطوط سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس دوران پنج پیارا کے ذریعہ پانچ تخت کے جتھیداروں کو برخواست کرنے کے فیصلہ کیا گیا اور ان کے سارے حقوق سلب کر لینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اکال تخت کے جتھیداروں نے پنج پیارا کے اس حق کو چیلنج کر دیا۔

پرکاش سنگھ بادل کے کٹھ پتلی پربندھک کمیٹی کے صدر اوتار سنگھ مکڑ نے جب

پنج پیارا کے فیصلے کو غیر آئینی قرار دیا تو رامن دیپ نامی ملازم نے اپنا استعفیٰ ان کے منھ پر دے مارا بعد میں اسے مسترد کرنے کے بعد رمن دیپ کو نکال دیا گیا اور آگے چل کر پھر بحال بھی کر دیا گیا۔ مکڑ نے اپنی مخالفت کے خوف سے ایس جی پی سی کی انتظامیہ کی نشست منسوخ کر دی اور پنج پیارا کو معطل کر دیا۔ بعد میں جب پربندھک کمیٹی کا اجلاس ہوا تو اس نے مکڑ کی حمایت نہیں کی۔ اس انتشار و ہنگامے سے عوام کو مزید بے چین کر دیا اور مختلف گرودواروں میں اکالی رہنماؤں کی مخالفت شروع ہو گئی۔ کپور تھلہ گرودوارے میں اکھنڈ پاٹھ کے درمیان سے کئی معمر اکالی رہنماؤں کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ اس طرح کے واقعات دیگر مقامات پر دیکھنے کو ملے۔

ان ہنگاموں کے سبب کسانوں کی تحریک پس منظر میں چلی گئی۔ کسانوں کی تحریک بھارتیہ کسان یونین فی الحال دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اس کے ایک دھڑے بی کے یو اوگھرا) کے جنرل سکریٹری سکھدیو سنگھ کھو کرنے اس کی سیدھی ذمہ داری حکومت پر ڈال دی۔ ان کے مطابق مذہبی صحیفے کی اہانت ریاستی حکومت کی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے اور اس کا مقصد پنجاب کے بنیادی مسائل کی جانب سے توجہ ہٹانا ہے۔ بی کے یو داکنڈا) کے جنرل سکریٹری جگموہن سنگھ اس دعویٰ سے اتفاق تو نہیں کرتے کہ اہانت) کے پیچھے حکومت کا ہاتھ ہے لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ پنجاب سرکار سست رو ہے۔ وہ مسائل کو حل کرنے میں بہت وقت لگاتی ہے۔

اس واقعہ نے نوجوانوں کی توانائی کو تقسیم کیا ہے اور ان کے احتجاج سے مجبور ہو کر حکومت نے جو اقدامات کئے وہ بہت پہلے کئے جانے چاہئے تھے۔ کسانوں کو حکومت کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی خاطر ایک ہفتہ ریلوے لائن پر احتجاج کرنا پڑا۔
جگموہن کے مطابق ریاستی حکومت اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام ہو چکی ہے۔ اس کا غیر ذمہ دارانہ رویہ خطرناک اور قابلِ مذمت ہے۔
حکومت کی جانب سے عدم توجہی نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ قومی سطح پر بھی نظر آتی ہے۔ ہر مسئلے کو ابتدائی مرحلے میں سلجھانے کے بجائے پہلے اسکو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جب پانی سر سے اونچا ہونے لگے تو سرکار کے کان پر جوں رینگتی ہے اور اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے ۔ وزیر اعظم کو تو خیر انتخابی مہم اور غیر ملکی دوروں یا غیر ملکی مہمانوں کی خاطر مدارات سے فرصت نہیں ہے مگر وزیر خزانہ ارون جیٹلی کو ان معاملات میں دلچسپی لینی چاہئے تھی۔ انہوں نے امرتسر سے انتخاب لڑا تھا (گوکہ ہار گئے) اس لئے ان کو ان سلگتے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش ان کی ذمہ داری تھی لیکن فی الحال بی جے پی کے اعصاب پر بہار سوار ہے اس لئے جیٹلی چندی گڑھ کے بجائے پٹنہ پہنچ گئے ۔ بہار جہاں فی الحال مودی جی دال نہیں گل رہی ہے وہاں بھلا جیٹلی جی کیا کرتے ۔ ایک پریس کانفرنس میں دال بھات پرچرچا کرنے کے بعد اپنی کامیابی کا پرفریب اعلان کرکے وہ لوٹ آئے۔

پنجاب کے لوگ زراعت کے سبب ویسے تو خوشحال ہیں اس کے باوجود اپنے معیار زندگی کو مزید بہتر بنانے کی شدید خواہش نے انہیں دنیا بھر میں پھیلا دیا ہے۔ پنجاب کی یہ آگ اب ہندوستان کی حدود سے نکل کر دیگر ممالک تک پہنچ گئی ہے۔ دنیا بھر کے مختلف ممالک میں سکھوں نے اپنی یکجہتی کا اظہار کرنے کیلئے مظاہرے کئے۔ برطانیہ میں سکھوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ وہاں بھی ایک بڑا احتجاج ہوا جس میں ہندوستانی سفارتخانے کے باہر سیکڑوں سکھوں نے مظاہرہ کیا۔ یہ پرامن احتجاج آگے چل کر مشتعل ہوگیا جس کے بعد پولس نے سفارتخانے کی گھیرابندی کردی اور ۲۰ مظاہرین کو گرفتار کرلیا۔ احتجاج کے منتظم جسویر سنگھ نے بتایا یہ مظاہرہ پنجاب کے اندر رہنے والے بھائیوں کے ساتھ یکجہتی کے اظہار اور ان پر ہونے والے پولس کے مظالم سے متعلق عوامی بیداری کیلئے کیا گیا تھا۔

وزیراعظم ۱۲ نومبر کو ترکی جاتے ہوئے برطانیہ کا دورہ کرنے والے ہیں۔ اس سے قبل ۷ نومبر کو ان کا سرینگر دورہ متوقع ہے۔ اگر وہ امرتسر کے اوپر سے آتے جاتے ہوئے وہاں اتر کر سکھ رہنماوں سے بھی اس خلفشار پر گفتگو کرلیں تو اچھا ہے ورنہ برطانیہ میں انہیں سکھوں کے احتجاج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ویسے برطانوی حزب اختلاف کے لیبر رہنما جیرمی کاربن کی قیادت میں ۱۳۹ ارکان

پارلیمان نے ایوان کے اندر ایک تجویز پیش کی تاکہ اپنے وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون پر ہندوستان کے اندر حقوق انسانی کی پامالی پر گفتگو کرنے کیلئے دباو بنا سکیں۔ بی بی سی کے ذریعہ بنائی گئی دہلی عصمت دری کے واقعہ پر دستاویزی فلم پر پابندی، گرین پیس کیلئے کام کرنے والی پریا پلائی کی برطانیہ میں داخلے پر پابندی، ارم شرمیلا کی بھوک ہڑتال اور ایمنسٹی کے ذریعہ اٹھائے گئے کشمیر میں حقوق انسانی کی پامالی کا اس موشن میں ذکر ہے ۔ تعجب کی بات ہے کہ جن مسائل کو ملک کے اندر نظر انداز کیا جاتا ہے ان کی جانب برطانوی ارکان پارلیمان نے توجہ مبذول کرائی ہے۔

وزیر اعظم کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا بھر میں تقاریر سے جو ساکھ قائم ہوتی ہے وہ ایک بہیمانہ تشدد کے واقعہ سے ملیامیٹ ہوجاتی ہے۔ بیرونی سرمایہ کار بھی امن و امان کے بغیر یہاں آنے کی غلطی نہیں کرسکتے۔ ٹیسلا موٹرس کی مثال سامنے ہے۔ مودی جی کے امریکہ میں ان کے کارخانے میں دورے کے باوجود انہوں نے ہندوستان کے بجائے چین جانے کا فیصلہ کیا۔ اس واقعہ میں ان لوگوں کیلئے عبرت کا سامان ہے جو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ پنجاب ایک آتش فشاں کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔ گزشتہ پانچ ماہ میں عوام کے اندر پائی جانے والی بے چینی اور تناو میں بتدریج اضافہ ہوا ہے لیکن چونکہ ذرائع ابلاغ پر بہار کا بھوت سوار ہے اس لئے کوئی دوسری جانب مڑ کر دیکھنے کا روادار

نہیں ہے۔ احتجاج و تشدد کی اکا دکا خبریں ضرور شائع ہوتی ہیں لیکن اس کا حل تو درکنار لوگ اس کی وجوہات کا تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ بہار میں متوقع جنگل راج پر تو بہت کچھ بولا اور لکھا جاتا ہے لیکن پنجاب میں پھلنے پھولنے والے جنگل راج کی کوئی بات نہیں کرتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجاب میں انتخابات ڈیڑھ سال بعد ہیں۔ ملک کے سیاستدانوں کو کسی صوبے میں اسی وقت دلچسپی پیدا ہوتی ہے جب وہاں انتخابات ہونے والے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ کسی کو اپنا اقتدار بچانا کی فکر لاحق ہوجاتی ہے تو کوئی اس کے حصول کی خاطر سرگرم عمل ہوجاتا ہے۔

ذرائع ابلاغ کا کام ان سیاستدانوں کے پیچھے کیمرے اور مائک لے کر دوڑنا ہے۔ ان کے اوٹ پٹانگ بیانات کو شائع کرنا اور ان کا تجزیہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنے سے ان کے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہوتا ہے۔ سیاسی جماعتیں اس کا بھرپور معاوضہ دیتی ہیں اور عوام کی پذیرائی سے ٹی آر پی بھی بڑھتی ہے جس سے خوب اشتہارات ملتے ہیں۔ یہ قومی صحافت کا صارفیت کی بھینٹ چڑھ جانا اور ذرائع ابلاغ کا تجارت میں بدل جانا ہے کہ اس کی دلچسپی عوامی مسائل سے ہٹ کر سیاستدانوں اور سرمایہ کاروں کی رہین منت ہوجائے۔ گوکہ ہمارا ذرائع ابلاغ اس سے صرف نظر کررہا ہے مگر ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ آگ کو بھڑکنے کیلئے ایندھن، ہوا اور چنگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ پنجاب کی آگ میں معاشی مسائل کی

ایندھن کاکام کررہے ہیں۔ سیاستداں اس کو انتخابی مفاد کی چنگاری دکھا کرمذہبی جذبات سے ہوا دے رہے ہیں۔ لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پنجاب ایک سرحدی ریاست ہے اور وہاں خالصتان کی تحریک چل چکی ہے۔ سکھ ایک خوددار قوم ہے اور اس قومی تلوار کے ساتھ سے کیا جانے والا کھلواڑ سنگین نتائج کا موجب بن سکتا ہے۔

ویرو یادو اور جئے کمار کی سپر ہٹ ' شعلے

اس میں شک نہیں کہ اگر گزشتہ سال کا قومی انتخاب مغل اعظم تھا تو حالیہ بہار الیکشن شعلے ہے۔ بہار کا انتخاب فی الحال زبردست بلاک بسٹر ''شعلے'' کی طرح مقبول عام ہے اور اسی کی مانند تفریح کا سامان بھی کر رہا ہے۔ شعلے کے کرداروں کا اگر بہار کے انتخابی بساط پر برسرِ جنگ مہروں سے موازنہ کیا جائے تو وہاں بھی زبردست مشابہت نظر آتی ہے۔ شعلے کی کہانی میں گبّر سنگھ نامی ڈاکو ٹھاکر بلدیو سنگھ کے دونوں ہاتھ کاٹ کر اسے اپاہج بنا دیتا ہے۔ گبّر سے بدلہ لینے کی خاطر ٹھاکر، ویرو اور جئے کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ پچھلے قومی انتخابات میں مودی نے راہل کا وہی حال کر دیا جو گبر نے ٹھاکر کا کیا تھا۔ بہار میں نریندر مودی سے بدلہ لینے کی خاطر راہل گاندھی نے لالو اور نتیش کو اپنے ساتھ لے لیا۔ ان کے مدمقابل مودی کے ساتھ سانبھا اور کالیا کی جگہ امیت شاہ اور رام ولاس پاسوان موجود ہیں۔

ان کرداروں کے مزاج کا موازنہ کیا جائے تو اس میں بھی زبردست مماثلت نظر آتی ہے۔ کوئی ٹھاکر کی طرح خاموش طبع ہے تو کوئی گبر کی مانند چیخ پکار کرنے والا۔ لالو کے اندر ویرو کی شوخی ہے تو نتیش میں جئے کی سنجیدگی۔ بے

حس اور بے وزن سانجھا اور اور کالیا کے بارے میں تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ نہ کام کے نہ کاج کے بس نو من اناج کے۔اب اگر آپ پوچھیں کہ مانجھی اور شاہنواز حسین کا کیا ؟ تو آپ کو انگریز کے زمانے کے جیلر اور سورما بھوپالی یاد نہیں ؟ اس کھیل میں ان دونوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جن لوگوں کو شعلے کا انجام یاد ہے ان کیلئے بہار انتخابات کے نتائج کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔اس میں شک نہیں ہے اکثر کہانیاں حقائق کی ترغیب سے جنم لیتی ہیں لیکن کبھی کبھار افسانہ بھی حقیقت بن کر نمودار ہو جاتا ہے۔

بہار کے انتخابی نتائج کا جو اندازہ عام لوگ لگا رہے ہیں گبرؔ اور سانبھا کی رائے بھی اس سے مختلف نہیں ہے لیکن ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ دوران جنگ اسے تسلیم نہیں کر سکتے ۔ اگر وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کردیں تو ان کی شکست اور زیادہ بھیانک ہوجائیگی ۔ وہ تمام لوگ جو فریب خوردگی کے سبب ان کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں اپنا دامن جھٹک کر رفو چکر ہو جائیں گے ۔ بہار کے مرحلہ وار انتخابی مہم میں بی جے پی کا بار بار پینترا بدلنا اس کا عدم اعتماد اور انتشار فکر ظاہر کرتا ہے ۔پہلے جو ۶ ٹی وی سروے سامنے آئے تھے ان میں سے ۳ نے این ڈی اے کی کامیابی کی پیشن گوئی کی تو ۳ عظیم اتحاد کے حق میں تھے لیکن اب چوتھے مرحلے کی پولنگ سے قبل آئی بی کے مطابق قومی جمہوری محاذ کو صرف ۷۰ سے ۷۵ جبکہ مہاگٹھ بندھن کو ۱۵۰ سے ۱۵۵ نشستیں ملنے کی توقع ہے۔

آئی بی چونکہ مرکزی حکومت کے تحت کام کرتا ہے اس لئے وہ اپنے آقاوں کے خلاف رپورٹ دینے کی جرأت آسانی سے نہیں کرسکتا لیکن اپنے بچاو کی خاطر اس نے اپنا فرض منصبی جیسے تیسے ادا کرہی دیا۔

بہار میں دراصل بی جے پی کا مہورت ہی غلط نکلا۔ مودی جی کا ڈی این اے والا فقرہ ان کے گلے کی ہڈی بن گیا۔ ایک طرف لوگ اپنے ناخون کے سیمپل ڈی این اے ٹسٹ کیلئے بھیجنے لگے اور دوسری طرف الفاظ واپس لو کی تحریک چل پڑی۔ یہیں سے بہاریوں کی تحقیر وتضحیک کے خلاف عزت و وقار کی بحالی کی مہم شروع ہو گئی جس نے بہار بمقابلہ مرکز کا ماحول بنا دیا۔ اس مسئلہ کا امیت شاہ کے پاس نہایت آسان حل تھا۔ وہ نتیش اور لالو کے سامنے اپنی بہاری فوج میدان میں اتار دیتے۔ فی الحال این ڈی اے کے پاس جتنے معروف بہاری چہرے ہیں ماضی میں کبھی نہیں تھے۔ بہار کے صوبائی انتخاب کے پیش نظر اول تو پانچ بہاریوں کو مرکز میں وزارت سے نوازہ گیا اور اس پر بھی اطمینان نہیں ہوا تو توسیع میں ایک اور بہاری کو شامل کرلیا گیا۔ ان کے علاوہ چونکہ بہار میں بی جے پی تقریباً ۹ سالوں تک اقتدار میں حصہ دار رہی ہے اس لئے سشیل کمار مودی جیسے کئی ریاستی رہنماوں کو بھی مشہور ہونے کا موقع ملا۔ بہار میں بی جے پی کے پاس شتروگھن سنہا جیسا بہاری فلمی ستارہ بھی موجود ہے۔

یہ سارے لوگ مل کر بڑی آسانی سے ڈی این اے کے مضر اثرات کو زائل کر سکتے تھے لیکن بی جے پی کی یہ " دھرم ویر" کی جوڑی اپنے علاوہ کسی اور کچھ سمجھتی ہی نہیں ۔امیت شاہ نے سارے علاقائی رہنماؤں کو کچرے کی ٹوکری میں ڈال کر خود کمان سنبھال لی اور مودی جی کو میدان میں اتار دیا جس سے کام اور خراب ہوگیا۔ مودی جی کے بہار کو گجرات بنانے کے نعرے سے بات اور بگڑ گئی اس لئے کہ اب بہاری بمقابلہ گجراتی کی جنگ چھڑ گئی ۔ اس سے ڈی این اے والا معاملہ سمٹنے کے بجائے طول پکڑ گیا۔ گزشتہ سال تک گجرات کے بارے میں کہا جانے والا ہر جھوٹ ملک بھر میں بک جاتا تھا اس لئے کہ "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا" لیکن اب لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ گزشتہ ۱۶ ماہ سے مودی ہندوستان بھر پر حکومت کر رہے ہیں اور ان کی سربراہی میں گھر کی دال مرغی کے برابر" ہو گئی ہے۔ وزیراعظم آسمان کی سیر کرتے ہیں اور مہنگائی" آسمان سے باتیں کرتے ہوئے ان سے کہتی ہے "ہم بنے تم بنے ایک دوجے کیلئے"۔جب "عوام ہلہ مچاتے ہیں تو وزیراعظم کہتے ہیں "ہم آپ کے ہیں کون؟

بی جے پی کا اصل مسئلہ عدمتحفظ کا خوف ہے۔ امیت شاہ اور مودی جی جانتے ہیں کہ وہ تنظیم کے اندر فطری انداز میں آگے بڑھتے ہوئے ان عہدوں پر نہیں پہنچے۔ وزیراعظم نے پہلی بار ایوانِ پارلیمان میں قدم رکھا تو وہ وزیراعظم تھے ۔ پارلیمانی امور کا تجربہ بالکل بھی نہیں تھا اس کے باوجود حالات کچھ

اس طرح کے بنے کہ قیادت کا تاج ان کے سر پر آگیا۔ بی جے پی کو دوسری سیاسی جماعتوں پر یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ وہ کسی خاندان کی اجارہ اداری نہیں ہے۔ اس کا اپنا کیڈر ہے اور اس کا تنظیمی ڈھانچہ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود انتخابی عمل کے ذریعہ وجود میں آتا تھا۔ اس میں کسی فردِ خاص سے وفاداری کے بجائے سنگھی نظریہ سے تعلق کو اہمیت دی جاتی تھی لیکن اقتدار میں آنے کے بعد سب سے پہلے اٹل جی ایک اپنے ایک نامعلوم وفادار بنگارو لکشمن کو پارٹی کا صدر بنایا۔ اس کے بعد اڈوانی جی کو ہٹنا پڑا تو انہوں نے پارٹی کی صدارت اپنے معتمدِ خاص راج ناتھ کے حوالے کی اور مودی جی نے بھی اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے قابلیت کے بجائے وفاداری کی بنیاد پر ایک بے صلاحیت آدمی کو پارٹی کا صدر بنا دیا۔ اس سے پہلے چونکہ بنانے والا اور بننے والا کا تعلق مختلف علاقوں سے ہوتا تھا اس لئے کم از کم علاقائیت کی بو نہیں تھی مگر مودی جی نے امیت شاہ کو صدارت کے عہدے پر فائز کروا کر یہ الزام بھی اپنے سر لے لیا۔

ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کو ایک دوسرے کے علاوہ کسی اور پر اعتماد نہیں نیز باقی تمام لوگ بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ بی جے پی کے مقامی رہنماوں کے درمیان پائی جانے والی نااتفاقی کے سبب وہ لوگ وزیراعلیٰ کے امیدوار پر اتفاق نہیں کر سکتے۔ اقتدار کی ہوس نے انہیں اس قدر خود غرض بنا دیا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے بجائے جڑ کاٹنے

میں مصروف رہتے ہیں۔ اس صورتحال میں پارٹی کا صدر یہ کر سکتا ہے کہ ان سب کے ساتھ بیٹھ کر کسی ایک نام پر اتفاق رائے کرادے لیکن وہ خود ایسا نہیں چاہتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ زمینی سطح کے رہنما اس قدر مضبوط ہو جائیں کہ ان کا انحصار پارٹی کے بڑے رہنماوں کے اوپر نہ رہے۔ قومی انتخاب کے بعد ہاتھ آنے والی مہاراشٹر اور ہریانہ کی کامیابی نے ان کا دماغ خراب کردیا۔ ان لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی ہے کہ ہم اپنے بل بوتے پر انتخاب جیت سکتے ہیں اور کسی بھی نامعلوم آدمی کو وزارت اعلیٰ کی کرسی پر بٹھا کر اس سے اپنی مکمل تابعداری کروا سکتے ہیں۔ دہلی میں جب دیکھا کہ کیجریوال کے سامنے وزیراعلیٰ کا امیدوار ناگزیر ہے تو دہلی کے سارے دُھرندر رہنماوں کو کنارے کرکے کرن بیدی کو درآمد کیا گیا جو بی جے پی کو تو کیا جتاتی خود اپنی سیٹ ہار گئی۔

اس دوران بی جے پی کے ستارے برابر گردش میں رہے۔ دادری کا واقعہ پیش آیا۔ اول تو اس سے فائدہ اٹھانے کی خاطر بڑے رہنماوں نے خاموشی اختیار کی اور ٹٹ پونجیے لیڈروں کو فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے کی اجازت دی گئی لیکن جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو اس کی مذمت کرکے معاملے کو رفع دفع کیا گیا اور پھر سے ترقی و خوشحالی کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اس نعرے میں مفلوک الحال پسماندہ ذات کے لوگوں کو ضرور دلچسپی ہے ۔ خوشحال اور پڑھے لکھے سورن جانتے

ہیں بہار کی خوشحالی کیلئے نتیش کمار نے جو کچھ کیا ہے اور جو آگے کر سکتے ہیں وہ نہ نریندر مودی کے بس کا روگ ہے اور نہ سشیل مودی کے بس کا کام ہے۔ اس لئے انہیں مودی جی کا ترقی و خوشحالی کا نعرہ پر کشش نہیں لگتا۔ ان سورنوں کو رجھانے کیلئے موہن بھاگوت نے ریزرویشن پر دوبارہ غوروخوض کی بحث چھیڑ دی۔

اس سودے میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ تھا۔ لالو اور نتیش نے اب اس لڑائی کو بہار کا وقار یا بہاری اور باہری سے آگے بڑھا کر پسماندہ اور سورنوں کی مہابھارت بنا دیا۔

اس دوران ہریانہ میں پہلے تو دلت بچوں کے زندہ جلائے جانے کا واقعہ رونما ہوگیا اور پھر اس کے بعد وی کے سنگھ نے کتے کی مثال دے کر اس آگ میں تیل ڈال دیا۔ ابھی یہ شعلے بجھے بھی نہیں تھے کہ ہریانہ ہی میں پولس کی حراست کے اندر ایک دلت نوجوان کی موت کا واقعہ سامنے آگیا۔ اس ہلاکت کو حکومت نے خودکشی قرار دیا لیکن اس پر یقین کرنا مشکل تھا اور اگر یہ بات درست بھی ہو تب بھی یہ پولس کی کوتاہی میں شمار ہوگا کہ اس کے سامنے کوئی خودکشی کرلے اور وہ اسے روک نہ سکے۔ ان واقعات کے بعد بہار کے اندر گجرات کے بجائے ہریانہ کا ماڈل زیر بحث آگیا۔ جتن رام مانجھی تک کو اپنی لٹیا ڈوبنے سے بچانے کیلئے اس کی مذمت کرنی پڑی۔ جب بی جے پی

کیساری چالیں ناکام ہو گئیں تو نتیش کی ڈیڑھ سال پرانی تانترک والی ویڈیو کو پھیلایا گیا اور لالو کے کالا مرغا ذبح کرنے کی افواہ اڑائی گئی لیکن اس سے

بھی بات نہیں بنی۔

بہار کا جغرافیہ کچھ اس طرح کا ہے اس کے مشرقی علاقہ میں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے اور اس خطے میں رائے دہندگی چوتھے اور پانچویں مرحلے میں ہونی تھی ۔ یہاں پہنچتے پہنچتے بی جے پی کے اوپر کے علاوہ سارے مہرے پٹ چکے تھے ۔ ایسے میں وہ ’’ سب کا ساتھ اور سب کا وکاس ‘‘ بھول کر فرقہ پرستی کی آغوش میں پناہ گزین ہو گئی۔ اب بی جے پی کا ہدف مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلا کر ہندو رائے دہندگان کو اپنا ہمنوا بنانا تھا۔ اس مقصد کیلئے پہلے تو یہ کہا گیا کہ نتیش اور لالو دیگر پسماندہ ذاتوں کو ریزرویشن سے محروم کرکے مسلمانوں کو دے دینا چاہتے ہیں بلکہ وزیراعظم نے چوری تک کے الفاظ استعمال کئے۔ اس کے بعد نتیش اور لالو پر دہشت گردوں کو پناہ دینے کا الزام بھی لگا دیا گیا۔ اس بابت جاری کئے گئے اشتہارات پر الیکشن کمیشن بھی خاموش نہیں رہ سکا بلکہ اس نے آگے بڑھ مذمت کی اور پابندی لگادی جو کسی بھی برسر اقتدار جماعت کیلئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

الیکشن کمیشن کی پھٹکار کے باوجود امیت شاہ باز نہیں آئے بلکہ انہوں نے پاکستان کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ انہوں نے کہا اگر بہار میں خدانخواستہ مہاگٹھ بندھن کامیاب ہوجائے تو پاکستان میں پٹاخے چھوٹیں گے ۔ اس بیان میں جہاں

مہا گٹھ بندھن کی کامیابی کے امکان کا اعتراف تھا وہیں اور بھی کئی سوالات پوشیدہ تھے۔ مثلاً اگر پاکستان کی خوشی اور ناراضگی کی بی جے پی کو اتنی فکر ہے تو مودی جی نے اپنی حلف برداری میں نواز شریف کو دعوت کیوں دی تھی؟ اٹل جی نے بس سے پاکستان کا سفر کیوں کیا تھا؟ اور خود مودی جی پاکستان جانے کیلئے کیوں پھڑ پھڑا رہے ہیں؟ رادھا موہن سنگھ نے کہہ دیا کہ لالو اور مودی پر جناح کا جن سوار ہے جب کہ وہ بھول گئے کہ جناح کی قبر پر جاکر خراج عقیدت پیش کرنے کے سبب اڈوانی جی کو صدارت گنوانی پڑی تھی۔ سشیل کمار مودی کو یاد آگیا کہ نتیش کمار نے ۲۰۰۵ء میں پاکستان کا دورہ کیوں کیا تھا؟ اگر وہ کوئی گناہِ عظیم تھا تو بی جے پی نے اقلیت میں ہونے کے باوجود نتیش کمار کو وزیراعلیٰ کیوں بنایا اور وہ خود ان کے نائب بن کر جوتیاں کیوں سیدھی کرتے رہے؟ پاکستان کا جن بھی بی جے پی کیلئے ڈی این اے جیسی مصیبت بن گیا جب تکنیکی صلاحیت میں اضافے کے وزیر راجیو پرتاپ روڈی نے یہ انکشاف کردیا کہ نتیش کمار نے پاکستان کے آن لائن اخبار ڈان میں اپنا اشتہار جاری کیا ہے۔ روڈی نے ویب پیج کی جو تصویر ذرائع ابلاغ کو دکھلائی اس میں اشتہار سے متعلق وضاحت تھی کہ وہ گوگل کے ذریعہ ڈالا گیا مفت کا اشتہار ہے۔ اس پر نتیش نے سوال کردیا کہ جو وزیر خود اتنا بڑا جاہل ہے کہ وہ نہیں جانتا گوگل کے مفت

اشتہارات کس طرح دکھلائے جاتے ہیں وہ دوسروں کی صلاحیت میں کیا اضافہ کرے گا۔ نتیش نے ڈان کے گزشتہ سال کے آن لائن کی تصویر بھی لوگوں کو دکھلائی جس میں گوگل کی مہربانی سے مودی اور راج ناتھ دونوں نظر آرہے تھے۔ خیر اب پانچواں اور آخری راونڈ باقی ہے بی جے پی کو خوف ہے کہیں اس کی حالت ممبئی میں کھیلے جانے والے پانچویں اور آخری ون ڈے کی طرح نہ جسے شیوسینا بھی نہیں بچاپائی تھی ۔

امیت شاہ کے بیان سے متاثر ہو کر ٹائمز آف انڈیا میں اجیت نینان نے کارٹون بنایا جس میں ایک پاکستانی کسٹم آفیسر کے سامنے دو نقاب پوش دہشت گرد کھڑے ہیں اور ان کے درمیان دیوالی کی پھلجھڑیوں کا بکس رکھا ہے۔ دہشت گرد کہہ رہے ہیں یہ تحفہ ہمیں امیت شاہ نے بھجوایا ہے۔ دراصل پاکستانی دہشت گردوں کو کیا معلوم کہ کلیان، کولہاپور یا وارانسی اور بجنور کہاں ہے ؟ ان لوگوں نے یہ سوچ کرکے یہ سب بہار میں ہی ہیں ان پٹاخوں کو استعمال بھی کرلیا ہوگا۔ کلیان ڈومبیولی میں وزیراعلیٰ فردنویس کے سارازور لگانے کے باوجود بی جے پی کو صرف ۴۲ نشستوں پر کامیابی ملی جبکہ شیوسینا نے ۵۲ مقامات پر کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح کولہاپور میں جہاں کانگریس کو ۲۷ اوراین سی پی کو ۱۵ نشستیں ملیں بی جے پی کو محض ۱۲ پر اکتفاء کرنا پڑا۔ امیت شاہ کو جس اترپردیش کا چانکیہ سمجھا جاتا ہے اس کے بجنور ضلع کے پنچایت کے نتائج ظاہر

ہورہے ہیں۔ اس حلقۂ انتخاب سے ۲۰۱۴ء میں بی جے پی امیدوار کو ۴۶ فیصد ووٹ ملے تھے لیکن اب کی بار بی جے پی ۵۷ میں سے صرف ۴ میں آگے چل رہی ہے۔ مودی جی نے وارانسی کے اندر جیاپور نام کا گاوں گود لے رکھا ہے اس میں بی جے پی کے امیدوار رنکو سنگھ ہار گئے۔ وارانسی کے ۵۸ میں ۸ لکھنو کے ۲۸ میں سے ۴ اور دیوریہ کے ۵۶ میں ۷ یہ بی جے پی کا حال ہے۔ لگتا ہے اگلی بار مودی جی کو کوئی محفوظ حلقۂ انتخاب تلاش کرنا پڑے گا۔ ایسے میں راجناتھ کا یہ کہنا کہ بہار کے نتائج جو بھی آئیں امیت شاہ کو ان کے عہدے سے نہیں ہٹایا جائیگا معنیٰ خیز ہوجاتا ہے۔ شاید وہ کہنا چاہتے ہیں کہ بے چارے سانبھا کو بلی کا بکرہ بنانے سے کیا حاصل اگر ہٹانا ہے ہی ہے تو گبر کو ہٹاو۔

انتخابی سیاست میں تو ''کبھی خوشی کبھی غم'' کا معاملہ ہوتا رہتا ہے۔ بی جے پی کا یہ حشر صرف بہار میں نہیں ہوا بلکہ کشمیر کی وادی میں بھی کمل کے پھول کو ''زنجیر'' نے جکڑ لیا تھا لیکن جموں کے نتائج نے '' مقدر کا سکندر'' بن کر لاج رکھ لی۔ اس کے بعد دہلی میں ایک جھاڑو نے ان کی ''دیوار'' گرادی اور وہ ۳۱ سے ۳ پر پہنچ گئی۔ مثل مشہور ہے سمجھدار کیلئے اشارہ کافی ہے ''،اگر پردھان سیوک اس نوشتۂ دیوار کو پڑھ لیتے تو'' ازخود بہار کے ''شعلے'' سے گریز کرتے۔ مگر بزرگوں نے بہت سوچ سمجھ کر اشارہ سمجھنے کیلئے سمجھداری کی شرط لگائی ہے۔ ویسے اس نا سمجھی میں خیرِ کثیر ہے۔ اگر یہ سلسلہ دراز رہا

تو کوئی ''دبنگ'' بی جے پی کے کام نہیں آیگا اور یہ ''رام شیام'' کی جوڑی بار بار فلاپ ہوتی جائیگی یہاں تک کہ اگر وہ ''میرا نام جوکر'' بھی بنائیں گے تو چل نہیں پائیں گے۔ جب ''بازیگر'' کی ''ہیرا پھری'' نہیں چلے گی تو ملک سے ''ڈر'' کا ماحول ختم ہو جائیگا۔ لگان''کی ''غلامی'' سے ''آزاد'' ہونے کا عوامی ''سنگھرش'' رنگ لائے گا اور ڈیڑھ '' سال بعد اتر پردیش میں بھی ''دل (سائیکل) والے (اقتدار کی) دلہنیا (اپنے ساتھ) لے جائیں گے''۔ کمل والے دیکھتے رہ جائیں گے۔

چلو کہ جشن بہار دیکھیں چلو کہ ظرف بہار جانچیں

بہار انقلابوں کی سرزمین ہے۔ ہندو تہذیب کا سقراط یعنی چانکیہ کا تعلق اسی ریاست سے تھا۔ سناتن دھرم کا سب سے بڑا باغی اور مصلح گوتم بدھ نے بھی اسی دھرتی پر جنم لیا۔ چندرگپت موریہ اور سمراٹ اشوک جیسے بادشاہوں نے وہیں حکومت کی۔ گاندھی جی حالانکہ بہاری نہیں تھے لیکن ان کی تحریک آزادی کی چمپارن میں سب سے پہلے پذیرائی ملی۔ ایمرجنسی کے خلاف جئے پرکاش نارائن اٹھے تو ان کی آواز پر بھی سب سے پہلے بہاریوں نے لبیک کہا۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے جارج فرنانڈیس کو ریکارڈ فرق سے کامیاب کیا۔ اڈوانی جی اپنی رام رتھ یاترا کو لے کر سارے ملک میں نفرت کی آگ پھیلاتے رہے لیکن بہار کے اندر ان کے رتھ کو روک دیا گیا۔

مودی جی چونکہ ہوائی رہنما ہیں اس لئے زمین پر چلنے کے بجائے اڑن کھٹولہ میں بیٹھ کر بہار کی خاک چھانتے رہے لیکن بہار کی عوام نے ان کو بھی دھول چٹا دی۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن بہاریوں نے گاندھی جی اور جارج فرنانڈیس کو باہری ہونے باوجود اپنایا انہوں نے مودی جی اور امیت شاہ کو کیوں دھتکار دیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بہاری اپنی پرامن ریاست کو

گجرات نہیں بنانا چاہتے۔ مودی جی کیلئے اس شکست میں یہ پیغام ہے کہ اگر انہوں نے سارے ملک یں گجرات کی آگ پھیلانے کی کوشش کی تو اس ملک کے عوام انہیں بہار کی مانند ملک بدر کردیں گے۔

اس انتخاب کا موازنہ مہاراشٹر سے کیا جانا چاہئے۔ ان دونوں ریاستوں میں بی جے پی نے اپنے حلیف کی مدد سے قدم جمائے اور اس کے مخالفین ہم نظریہ ہونے کے کے باوجود دو دھڑوں میں تقسیم تھے۔ امیت شاہ نے مہاراشٹر میں یہ کیا کہ شرد پوار کو بلیک میل کرکے کانگریس کا مخالف بنا دیا۔ اس کے بعد خود اپنے حلیف شیوسینا کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ اکثریت حاصل کرنے میں محرومی کے بعد سینا کے بجائے این سی پی کی مدد سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا اور سینا کو خوب رسوا کرنے کے بعد گلے لگالیا۔ بہار میں اس کے برعکس یہ ہوا کہ لالو اور نتیش ساتھ ہوگئے۔ کانگریس بھی ان کے شانہ بشانہ کھڑی ہو گئی اور شاہ صاحب کی کاٹو اور پیٹو والی حکمت عملی زمین بوس ہو گئی۔ اس کے باوجود امیت شاہ نے اعلان کیا جس دن یہ عظیم اتحاد قائم ہوا اسی دن ہماری جیت ہو گئی حالانکہ وہ ان کی ہار کا دن تھا۔

بہار کے نتائج کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ مودی جی کو پہلا بڑا جھٹکا دہلی میں لگا۔ بہار میں ان کے لئے اپنے دامن سے وہ داغ مٹانے کا

موقع تھا۔ اسے دھونے کیلئے امیت شاہ صاحب پوتر گئو موتر لے آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ داغ صاف ہونے کے بجائے اور بھی پھیل گیا اور دامن کے ساتھ ازار بھی داغدار ہو گئی ۔ وزیراعظم اسے صاف کرنے کیلئے نیچے جھکے تو بھاگوت جی نے ریزرویشن کی مکھیاں لاکر چھوڑ دیں اور ان میں سے ایک ناخلف مودی جی کی ناک پر جا بیٹھی۔ مودی جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی ناک کھجانے لگے۔ جس کے نتیجے میں ان کی ناک کالی ہو گئی ۔ جب اخبار نویسوں نے پوچھا کہ آپ کی ناک کو کیا ہوا تو اپنا داغ کو چھپانے کیلئے انہوں نے ہاتھ دھوئے بغیر منہ ڈھانپ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منہ کالا ہو گیا اور ناک غائب ہو گئی ۔

اس انتخاب میں مودی جی اور امیت شاہ کی طرح ماہرین انتخابات جیسے پرنورائے اور چانکیہکی بھی ارتھی اٹھ گئی ۔ یہ حسن اتفاق ہے جو چانکیہ قومی انتخابات اور دہلی کے نتائج کے بعد اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے سے نہیں تھکتا تھا ان کی چٹیا اپنی ریاست بہار میں کٹ کر ایسی اڑی کی نیپال پہنچ گئی ۔ نیپال کے اشتراکی حکمرانوں نے اسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ اب یہ ہندو راشٹر نہیں ہے۔ پولنگ کے بعد جو سات جائزے سامنے آئے ان میں چار عظیم اتحاد کے حق میں تھے لیکن تین کا جھکاؤ متحدہ قومی محاذ کی جانب تھا۔ مہاگٹھ بندھن کے حامیوں نے اسے بالکل سرحد پر رکھا تھا اور معمولی فرق کے ساتھ جیت کا امکان ظاہر

کیا تھا۔

چانکیہ مہاراج نے اونچی چھلانگ لگاتے ہوئے قومی محاذ کو ۱۵۵ نشستوں سے نواز دیا اور اتحاد کو سنچری سے بھی محروم کردیا۔ اب صورتحال بالکل برعکس ہے اور چانکیہ جی شیرش آسن کرتے نظر آرہے ہیں جس میں سر نیچے اور پیر اوپر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں انتخابی جائزوں کے بھیشم پتامہ سمجھے جانے والے پرنو رائے کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے ۷۶ ہزار لوگوں کی مدد سے ایک مہاجائزہ لیا اور مرتے پڑتے قومی جمہوری محاذپر اکثریت نچھاور کردی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پردھان منتری اور ان کے پردھان سیوک نے دو راتیں سکون کے ساتھ گزاریں لیکن اس کے بعد جب اتوار کی صبح میں جاگے تو انہیں دن میں تارے نظر آرہے تھے۔

اتوار کے دن مودی جی کو ایک عرصے بعد اپنے گرواڈوانی جی کی یاد آئی جب فیس بک نے بتایا کہ آج ان کی ۸۸ ویں سالگرہ ہے۔ پہلے تو انہوں نے مبارکباد کا پیغام بھیجا اور پھر بھی دل نہیں مانا تو اپنا غم غلط کرنے کی خاطر ان کے گھر پہنچ گئے۔ وزیراعظم بننے کے بعد شاید یہ پہلی بار ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے بہار کی ہار نے مودی جی کے مغرور دماغ کو تھوڑا بہت درست ضرور کیا ہے۔ مودی جی نے کہا کہ ایک کارکن کی حیثیت سے میں نے ذاتی طور پر اڈوانی جی

سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ہم جیسے کارکنان کے لئے وہ بہترین (نمونہ) ہیں۔ دراصل اڈوانی جی کو بی جے پی کیلئے سب سے زیادہ انتخابی مہمات چلانے کا اور ناکام ہونے کا وسیع تجربہ حاصل ہے اس لئے مودی جی کو ان سے اس طرح کی صورتحال کا مقابلہ کرنے کا فن بھی سیکھ لینا چاہئے۔ مودی بھکتوں نے اس ملاقات سے خوش ہو کر کہنا شروع کردیا کہ اس سالگرہ کا بہترین تحفہ بہار میں کامیابی ہے لیکن افسوس کہ اڈوانی جی اس بار بھی بدقسمت رہے۔

وزیراعظم نریندر مودی نے بڑی کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فون پر نتیش کمار کو مبارکباد دی اور کہا کہ انہوں نے بہار کی ترقی کیلئے جو اقدامات کئے ہیں عوام کی جانب سے یہ اس کا اعتراف ہے۔ کاش کے مودی جی بھی پچھلے ۱۶ ماہ میں فرقہ پرستی پھیلانے کے بجائے وہی کرتے جو نتیش کمار نے کیا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو وہ مبارکباد دینے کے بجائے اسے وصول کررہے ہوتے۔ آگے اگر مودی جی اس لین دین کی سمت بدلنا چاہتے ہیں تو انہیں صدر مملکت کے مخلصانہ مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔ پرنب مکرجی نے اپنے ٹویٹ میں کہا وزیراعظم یا تو فل ٹائم (ہمہ وقتی) وزیراعظم بن جائیں یا پرچار منتری کا عہدہ سنبھال لیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں کسی صدر کی جانب سے منتخبہ وزیراعظم کی یہ سب سے بڑی توہین ہے جس کا خمیازہ پرنب دا کو اپنی میقات کے خاتمہ پر ادا کرنا ہوگا۔ اب یہ یقینی ہے کہ بہار میں نہ سہی صدارتی محل میں ضرور تبدیلی واقع

ہو جائیگی۔

مشیت کے فیصلوں کو سمجھنے میں اکثر انسانی عقل ناکام رہتی ہے۔ اگر مودی جی گجرات ہی تک محدود رہتے تو انہیں دنیا میں اپنے کئے قرار واقعی سزا کبھی نہیں ملتی۔ ملک بھر میں بلکہ دنیا بھر میں بار بار رسوا ہونے کیلئے ان کا وزیر اعظم بننا لازمی تھا۔ اس لئے دہلی سے جس مبارک سلسلے کا آغاز ہوا ہے وہ بہار میں ایک قدم آگے بڑھا ہے۔ بی جے پی چاہتی تھی کہ بہار سے زیادہ زیادہ امیدواروں کو کامیاب کرکے ایوان بالا میں اپنے ارکان کی تعداد میں اضافہ کرکے تاکہ ایوانِ زیریں کی طرح وہاں بھی اکثریت حاصل ہو جائے اور حزب اختلاف کی رکاوٹوں سے نجات ملے لیکن اب الٹا راجیہ سبھا میں بی جے پی ارکان کی تعداد کم ہو جائیگی۔ اس لئے کہ عظیم اتحاد کو دوتہائی اکثریت حاصل ہو رہی ہے۔ ایک زمانے میں امیت شاہ صاحب کانگریس فری انڈیا کا نعرہ کا لگاتے پھرتے تھے لیکن اب ایسا وقت آیا ہے کہ بی جے پی کوئی فری میں بھی نہیں پوچھتا۔

مثل مشہور ہے ’’گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں‘‘ لیکن اب اس میں معمولی ترمیم کی ضرورت ہے ’’گرتے ہیں، بار بار، بار بار، شہسوار میدان جنگ میں‘‘۔ بہار کی مہابھارت میں فسطائیوں نے اپناسب سے بڑا برہماستر (ہتھیار) بھی استعمال کرلیا۔

موہن بھاگوت نے یہاں تک کہہ دیا کہ کینیا کے قبائل گائے کا خون پیتے ہیں مگر اسے جان سے نہیں مارتے لیکن ان بھکتوں نے اپنے اقتدار کی خاطر گئو ماتا کا ودھ کر دیا اور یہ ثابت کردیا کہ گائے سیاسی جانور نہیں ہے۔ وہ اپنے بھکتوں کو دودھ تو پلا سکتی ہے مگر ووٹ نہیں دلا سکتی۔ پارلیمانی انتخاب کے بعد اترپردیش کے نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک نامور صحافی نے کہا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار مسلم رائے دہندگان کی اہمیت صفر ہو گئی ہے۔ اگر وہ تجزیہ درست تھا تو ابیہ کہنا چاہئے کہ بہار کے انتخابات کے بعد ہندو احیاء پرستوں کی قدر و قیمت ختم ہو گئی ہے۔اس وقت مسلمانوں کی حالت زار پر ساغر صدیقی کے یہ اشعار صادق آتے تھے لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے۔

یہ کیا قیامت ہے باغبانو کہ جن کی خاطر بہار آئی
وہی شگوفے کھٹک رہے ہیں تمہاری آنکھوں میں خار بن کر
اگرچہ ہم جا رہے ہیں محفل سے نالۂ دلفگار بن کر
مگر یقیں ہے کہ لوٹ آئیں گے نغمۂ نو بہار بن کر

نتیش کمار کو اس کی کامیابی پر ویسے تو اروند کیجریوال سے لے کر عمر عبداللہ تک بہت سارے لوگوں نے مبارکباد کا پیغام دیا لیکن سب سے دلچسپ بیان ہندوتوا وادی شیوسینا کے سنجے راوت نے دیا۔ انہوں نے کہا اس انتخاب میں نتیش ایک ہیرو بن کر سامنے آئے ہیں۔ یہ لازمی تھا کہ نتیش بہار میں پھر سے اقتدار

میں آتے اس لئے وہ بہار کی عوام کو مبارکباد دیتے ہیں ۔ ہنجے نے اس انتخاب میں زیرو ہوجانے والے وزیراعظم کے چٹکی لیتے ہوئے کہاجب انتخاب.بڑے رہنماوں کے بل بوتے پر لڑا جاتا ہے تو انہیں اس کی ذمہ داری اپنے سر لینی چاہئے۔ یوپی اے کی ہار جس طرح سونیاگاندھی کی ہار تھی اسی طرح بی جے پی کی شکست کیلئے مودی جی کو ذمہ داری قبول کرنی چاہئے۔

انتخابی نتائج پر بی جے پی رہنماوں کے بھی دلچسپ تبصرے سامنے آئے ۔ مثلاً شاہ رخ خان پر تنقید کرکے مشہور ہونے والے کیلاش وجئے ورگیہ نے جوش میں آکر ٹویٹ کردیا کہ بہار کا کریڈٹ مودی جی اور امیت شاہ کو جاتا ہے ۔ ان کو نہیں معلوم کہ انگریزی زبان میں قرض کیلئے بھی کریڈٹ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے ۔ بی جے پی کے جوکر گری راج سنگھ نے کہا میں ۲۰۰ فیصد کنفیھرم ہوں کہ بہار میں این ڈی اے کی سرکار بنے گی ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ انھوں نے تاریخ نہیں بتائی اس لئے ممکن ہے دوچار سو سال کے بعد ان کا یہ سپنا ساکار ہوجائے۔ امیت شاہ کے درد کو ان کے ساتھیوں نے محسوس کیا اور دھرمیندر پردھان، جے پینڈا، بھوپندر یادو اور جتیندر سنگھ نے ان سے بنفس نفیس ان کی عیادت کی۔ بی جے پی صدر کا انتخاب چونکہ صرف دوسال کیلئے ہوتا ہے اس لئے یہ بات یقینی ہے کہ آئندہ سال امیت شاہ کو دوبارہ صدر بنانے کیلئے وزیراعظم کو آسمان سے تارے توڑ کر لانے ہوں گے۔

انتخابی نتائج کے دن صبح صبح اخبار نویس لالو یادو کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے کہا" نریندر مودی کا بیڑا صاف ہوگیا، بی جے پی کوما میں ہے اور اس کے رہنما آئی سی یو میں ہیں" ۔ جس وقت لالو جی یہ بیان دے رہے تھے انتخابی نتائج کی ابتدائی بڑھت آنے لگی تھی اور جلد باز مودی بھکت پٹاخے چھوڑنے میں لگ گئے تھے لیکن گھاگ سیاستدانوں نے انہوں روکنے سے گریز کیا اس لئے کہ وہ جانتے تھے ۔ اگر ان پٹاخوں کو ابھی نہیں چھوڑا گیا تو انہیں پاکستان بھیجنا پڑے گا اور اس کے حمل و نقل کا خرچ پٹاخوں سے زیادہ ہو جائے گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ پاکستانی دہشت گردوں کو ایکسپریس منی سے روپئے بھیج دیئے جائیں تاکہ وہ ان سے پٹاخے بھی خرید سکیں اور اپنی پسندیدہ گرم گرم جلیبی بھی نوش فرمالیں ۔

اس موقع پر ایک اور سنگین مسلہ پیدا ہوگیا۔ بی جے پی والوں نے پٹاخوں کے ساتھ ۱۰۰ کلو مٹھائی کا آرڈر بھی دے دیا ۔ پٹاخے تو پہلے سے تیار تھے اس لئے فوراً پہنچ گئے اور ان کے ساتھ گانے بجانے والے بھی آگئے۔ بی جے پی کے اندر ناچنے والوں کی پہلے بھی کمی نہیں تھی مگر نئی سرکار کے اقتدار میں آنے کے بعد اس میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اس لئے شور شرابہ شروع ہوگیا۔ ٹی وی چینل والے اپنے کیمروں کے ساتھ پہلے سے موجود تھے اس لئے ناچ گانا

نشر ہونے لگا اور انتخابی نتائج کے بجائے ناظرین ٹھمکوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔
مٹھائی کا معاملہ مختلف تھا وہ چونکہ تیار نہیں تھی اس لئے حلوائی رنکو سنہا اور اس کا نائب للوّ یادو اسے بنانے میں جٹ گئے۔ اس دوران بازی پلٹ گئی۔ اس سے قبل کے رنکو کا اس میں شکر ڈالتا للوّ بولا استاد اس کی ضرورت نہیں۔ اب آپ چاہے جتنا شکر ڈالیں مٹھائی ان کو میٹھی نہیں لگے گی۔ اس بیچ بی جے پی کے دفتر سے فون آگیا کہ آرڈر کینسل۔ رنکو بولا صاحب مٹھائی تو بن گئی۔ اب میں اس کا کیا کروں پیسے تو آپ کو دینے ہی ہوں گے، ہماری سرکار پھر آگئی ہے۔ سامنے سے آواز آئی ایسا کرو اسے ایم آئی ایم کے دفتر میں پہنچادو۔ وہ اپنے لوگ ہیں مگر فی الحال ہماری ہار پر خوشی منا رہے ہیں۔ اس طرح وہ پھیکی مٹھائی کسی اور پتہ پہنچادی گئی۔ اس خوشی کے موقع پر بھی ساغر صدیقی کے یہ اشعار یاد آتے ہیں ؎

چلو کہ جشن بہار دیکھیں چلو کہ ظرف بہار جانچیں
چمن چمن روشنی ہوئی ہے کلی کلی پہ نکھار سا ہے
یہ تیر بردوش کون آیا یہ کس کی آہٹ سے گل کھلے ہیں
مہک رہی ہے فضائے ہستی تمام عالم بہار سا ہے

ان (ترمیم شدہ) اشعار کے خالق نے تو 'جشن بہار' اور ظرف بہار' کے 'ب' پر زبر رکھا

ہے لیکن آج جو بھیان کو پڑھتا ہے تو وہ 'ب' کے نیچے زیر لگا دیتا ہے۔ بہار کے اس جشن سے امیت شاہ کی پیشنگوئی کے مطابق پاکستان میں پھلجڑیاں نہیں پھوٹ رہی ہیں بلکہ سرزمینِ ہند کی کلی کلی میں نکھار آگیا ہے۔ چہار جانب چراغاں ہے چمن کا ایک ایک گوشہ روشنی سے نہایا ہوا ہے۔ اسلئے کہ کانگریس کے ہاتھ میں لالو کی قندیل ہے اور نتیش کمار کا تیر کمل کا سینہ چاک کرکے آر پار نکل گیا ہے۔ جس کے سبب خزاں رسیدہ فضائے ہستی میں پھر ایک بار بہار کا موسم لوٹ آیا ہے گویا ملک کی عوام نے پھر سے راجر تن دھن پالیا ہے۔

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشیدِ مبیں

بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے ۔جب انسان بہت خوش ہو تو اسے کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہئے۔جب غصے میں ہو تو جواب نہیں دینا چاہئے اور جب اداس ہو تو کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ انسان اس نصیحت سے روگردانی کی قیمت زندگی کے ہر شعبے میں چکاتا ہے لیکن چونکہ اخبارات سیاسی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں اس لئے اس کی مثالیں بہ آسانی سیاسی دنیا سے مل جاتی ہیں ۔ انتخابی مہم کے دوران جب سیاسی رہنما اپنی کامیابی کی خوش گمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو خوشی کے مارے بے تکان وعدے کرنے لگتے ہے ۔اس بات کا خیال تک نہیں آتا کہ انہیں پورا بھی کرنا ہے اور وہ کیسے ہوگا؟ حالانکہ مندرجہ بالا نصیحت کے مطابق وعدے وعید کیلئے وہ نامناسب وقت ہے۔ جب سیاستدانوں کو اپنی ہار کے آثار نظر آتے ہیں تو وہ غصے سے مغلوب ہو اپنے مخالفین تو درکنار رائے دہندگان اور کارکنان تک پر برس پڑتے ہیں حالانکہ وہ چپ رہنے کا موقع ہوتا ہے ۔ انتخابی نتائج کے بعد ناکام ہونے والوں کی حالت قبل دید ہوتی ہے ۔ چہرے مرجھا جاتے ہیں ۔کیمرے کے سامنے سے لوگوں کو دھکا دے کر ہٹانے والے اپنامنہ چھپاتے پھرتے ہیں لیکن اسی حالت میں وہ اہم فیصلے کرنے کیلئے بیٹھ جاتے ہیں حالانکہ وہ فیصلے کی نہیں سنبھلنے کی گھڑی ہوتی ہے۔

جمہوریت کا جنازہ بھی چونکہ اس کی بارات میں شریک ہونے والے عوام کے کندھوں پر نکلتا ہے اس لئے شکست و فتح کے ان قافلۂ سخت جاں میں عام لوگ بھی بصد شوق یا بحالتِ مجبوری شامل ہوجاتے ہیں۔ خوشی دراصل کامیابی کا فطری نتیجہ ہے اس لئے جس طرح پچھلے سال فسطائی عناصر خوشی سے جھوم رہے تھے اسی طرح اس سال مسلمان جشن منارہے ہیں۔ناکامی پر پہلی نظر تو غصہ دلاتی ہے مگر بہت جلد وہ مایوسی میں بدل جاتی ہے۔ مسلمانوں نے گزشتہ سال اول تو اپنے انتشار کا ٹھیکرہ مذہبی و سیاسی رہنماوں پر پھوڑااور ان کی جی بھر کے ملامت کی حالانکہ انہیں غصے کے عالم میں اپنی زبان پر لگام لگانی چاہئے تھی۔ اس کے بعد جب دیکھا رہنما خود بھی ملول ہیں تو مایوس ہو کر بیٹھ گئے اور شکست خوردگی کے عالم میں حکمت عملی وضع کرنے لگے حالانکہ مایوسی کے عالم میں منفی لائحہ عمل کی تشکیل کا قوی امکان ہوتا ہے۔اب ہندو فسطائیوں کی وہی کیفیت ہے۔ ارون شوری سے لے کرچندن مترا تک کھلے عام تنقید کر رہے ہیں۔ حکم دیو سنگھ یادو سمیت ۶ ارکان پارلیمان اور مارگ درشک کمیٹی مرکزی قیادت پر برس رہی ہے جبکہ فی الحال صبر و ضبط مطلوب ہے۔ بھاگوت کو اداس دیکھ کر امیت شاہ کا غصہ ہرن ہوگیااور مایوس ہو کر انہوں نے کہہ دیا گرودیو آپ کا کوئی قصور نہیں۔ کامیابی و ناکامی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتی ہے۔ گوتم بدھ کی دھرتی پر مایوسی کے گہرے سمندر سے شاہ جی کو یہ نروان کا قیمتی موتی ہاتھ لگا ہے۔

بہار کی ہنگامہ خیز انتخابی مہم کے خاتمہ پر دھماکہ خیز نتائج کا موازنہ اگر گزشتہ سال کے قومی انتخاب سے کیا جائے تو ان میں بے شمار مماثلت نظر آتی ہے۔ مثلاً دونوں مرتبہ جہاں ہنگامہ غیر معمولی تھا وہیں نتائج بھی غیر متوقع تھے یہی وجہ ہے کہ غیر عقلی اور غیر معروضی ردعمل دوہرایا جارہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کردار بدل گئے ہیں ۔ سماج کا جو طبقہ کل خوشی سے پھولا نہیں سمارہا ہے وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے اور جواداس تھا وہ بغلیں بجارہاہے۔ سوشیل میڈیا میں ایک سال پرانے کارٹون پھر سے لوٹ آئے ہیں۔ اسی شراون کمار والی تصویر میں جہاں راہل ، سونیا اور منموہن کے سر لگائے گئے تھے ان پر مودی، شاہ اور سشیل کا چہرہ چسپاں کردیا گیاہے۔کچھ لوگوں نے دہلی انتخابات کے بعد والی ڈبلیو ڈبلیو ایف کی تصویر میں کیجریوال کو لالو سے بدل دیا ہے۔ گویاآئینہ تونہیں بدلا مگر چہرے بدل گئے ہیں۔

ان سطحی تبدیلیوں

پر جشن منانے کا جوش جیسے جیسے کم ہورہاہے نتائج کے دوررس اثرات پر غوروخوض کا آغاز ہوگیاہے ۔ اس مرحلے میں بھی جو باتیں سامنے آرہی ہیں اس کا بڑا حصہ جذباتیت کا شکار ہے مثلاً رام جیٹھ ملانی کا بیان کہ وزیراعظم کو خودکشی کرلینی چاہئے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ بیان اس قابل ہے کہ اسے کم از کم اردو اخبارات میں شاہ سرخی بناکر قارئین کو خوش کردیا جائے۔ یہ احمقانہ

اعلان جیٹھ ملانی صاحب کے پوری طرح سٹھیا جانے کا بین ثبوت ہے۔ان کیلئے بھی منور رانا کی طرح (تاحیات)آمرن مون برت رکھ لینا بہتر ہے۔ رام جیٹھ ملانی ہندوستانی سیاست کا وہ ناکام مہرہ ہے جس نے ایمرجنسی کے بعد وزیر قانون ایچ آر گوکھلے کو شکست دے کرایوان پارلیمان میں قدم رکھا۔ جیٹھ ملانی کو یقین تھا قانونی مہارت و ذہانت کے سبب انہیں وزیر قانون بننے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن بدقسمتی سے راج نرائن کی پیروی کرکے اندراگاندھی کا انتخاب کالعدم کرانے والے شانتی بھوش بھی انتخاب جیت چکے تھے اس لئےانہوں نے بازی مارلی۔

دوسری مرتبہ اڈوانی جی کی سفارش پر اٹل جی نے انہیں وزیر قانون بنایا مگر سالیسیٹر جنرل کے ساتھ تنازع کے سبب انہیں ہٹاناپڑا۔ جب پہلی بار نریندر مودی کا نام وزیراعظم کے طور پر سامنے آیا تو جیٹھ ملانی نے اپنے محسن اڈوانی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر مودی پر جوا کھیلا۔ ابتداء سے مودی جی کی حمایت میں پیش پیش رہے لیکن مودی جی نے وزیراعظم بننے کے بعد انہیں نظر انداز کردیا۔ ایک سال تک وہ مایوس نہیں ہوئے لیکن جب حکومت نے عدالت عالیہ میں کالے دھن کی بابت معذوری پیش کی تو جیٹھ ملانی نے کھلا خط لکھ کر کہہ دیا کہ اب ان کے دل سے وزیراعظم کا احترام پوری طرح ختم ہو چکا ہے۔انہوں نے بہار میں جاکر بی جے پی کی مخالفت کا اعلان کیا لیکن یہ صرف ذرائع ابلاغ

کی حدتک موثر تھا۔ جس ریاست کی عوام اپنے باہری ہونے کے سبب وزیراعظم کی بات پر کان نہیں دھرتے کہ وہ بھلا سندھ کے رہنے والے جیٹھ ملانی کی کیا سنتے جبکہ وہ وزیراعظم بھی نہیں ہے۔

اس انتخاب میں بہار کے سیاسی افق پر دو نئے ستارے چمکے ایک جتن رام مانجھی اور دوسرا اسدالدین اویسی۔ نتیش کمار نے جب مانجھی کو وزیر بنایا تو پہلی مرتبہ ان کا نام سننے میں آیا۔ نتیش اس زمانے میں او بی سی کے اندر سے ای بی سی کو الگ کرکے اپنا ہمنوا بنانے کی فکر میں تھے اور مانجھی ان کا نمائندہ تھا لیکن بہت جلد مانجھی رشوت لیتے ہوئے پکڑے گئے۔ چارہ گھوٹالے کے خلاف انتخاب جیتنے والے نتیش کیلئے ان کا بچاؤ ناممکن ہوگیا۔ اس لئے وہ وزارت سے محروم کردیئے گئے لیکن ۶ ماہ کے اندر انہیں الزام سے بری کرواکر دوبارہ وزیر بنادیا گیا۔ پارلیمانی انتخاب میں زبردست ناکامی کے بعدجب نتیش نے استعفیٰ کا پانسہ پھینکا تو مانجھی کو اپنی ڈوبتی کشتی کا پتوار تھمادی لیکن مانجھی نے بی جے پی کے ساتھ پینگیں بڑھانی شروع کردیں اور جب انہیں ہٹانا ناگزیر ہوگیا تو وہ باوت پر اترآئے اور مخالف خیمے میں داخل ہوگئے۔ ۲۰ نشستوں میں سے دوپر خود مقابلہ کیا اوراس میں سے بھی ایک میں شکست فاش سے دوچار ہوئے۔اس طرح نتائج کے دن ان کی وزیراعلیٰ بننے کی تیاری بیکار ہوگئی۔اس لئے کہ ان کی جماعت کے باقی سارے امیدوار ہار گئے تھے۔

بہار کی سیاست میں اسدالدین اویسی کے بجائے ان کے ماجھی اخترالایمانزیادہ توجہ کے مستحقھیں ۔ اختروہ سیاسی گھوڑا ہے جو تیزی سے دوڑتاتو ہے مگراسی سرعت کے ساتھ اپنے سوار بھی بدلتاہے۔ وہ دومرتبہ آر جے ڈی کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کرایوان اسمبلی میں پہنچ چکے ہیں مگر گزشتہ پارلیمانی انتخاب میں پالا بدل کر نتیش ساتھ آگئےاور مولانا اسرارلحق قاسمی کے خلاف ٹکٹ بھی پاگئے ۔ عین وقت پر نتیش سے غداری کرکے وہ کانگریس کے حق میں بیٹھ گئے ۔ اخترالایمان کی ملت میں خوب پذیرائی ہوئی ۔ انہیں یقین تھاکہ آئندہ صوبائی انتخاب میں کانگریس کاٹکٹ پکاّ ہے لیکن اس بار کانگریس نے آر جے ڈی اور جے ڈی یو سے الحاق کرلیااور اپنے حلیفوں کی خوشنودی کیلئے اس نے اختر الایمان کو دروازہ دکھادیا۔

اویسی صاحب نے ایسے میں اخترالایمان کو اپنی صوبائی یونٹ کا سربراہ بنادیا۔ اخترالایمان کواس بار بھی ۳۶ ہزار ووٹ ملے ، بی جے پی امیدوار کو ۴۶ ہزار اور کانگریسی امیدوار ۵۶ ہزار ووٹ حاصل کرکے کامیاب ہوگیا۔ اگراخترالایمان کو ۱۰ ہزار مزید ووٹ ملتےتو تینوں امیدوار برابر ہوجاتے ایسے میں ممکن ہے پہلی ہی مرتبہ میں بہارکے اندر ایم آئی ایم کاپرچم لہراجاتا۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت میں اس ابن الوقت کی کامیابی سے مسلمانوں کون سابڑا فائدہ ہوجاتا؟ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بی جے پی کی امیدوار معمولی سے

فرق سے جیت جاتی ۔ ایم آئی ایم کے باقی ۱۵ امیدواروں کو کل ۲۵ ہزار ووٹ ملے اور ضمانت ضبط ہو گئی۔ ان نتائج نے بی جے پی کو یہ پیغام دیا ہے ہندو رائے دہندگان کو احمق بنانا جس قدر آسان ہے مسلمانوں کو نہیں ہے ۔ویسے سیاست کے کھیل میں اویسی اور مانجھی کی حیثیت بارہویں اور تیرہویں کھلاڑی کی سی ہے جو ٹیم میں شامل تو ہوتے ہیں لیکن صرف چائے کے وقفہ میں انہیں میدان کے اندر آنے کا موقع ملتا ہے۔ کسی کھلاڑی کے زخمی ہونے پر وہ فیلڈنگ بھی کر سکتے ہیں لیکن بولنگ یا بیٹنگ نہیں کر سکتے ۔ ہمارے سیاسی نظام میں کھلاڑیوں سے بڑا مسئلہ کھیل کے اصول و ضوابط کا ہے۔ یہاں پر رائے دہندگان کی نمائندگی ان کی حمایت کے مجموعی تناسب کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہر حلقہ انتخاب میں اکثریت پر ہوتی ہے یعنی پہلے نمبر آنے والے کو کامیاب قرار دیا جاتا۔ اس طرح ہر حلقہ میں ۵۱ فیصد ووٹ حاصل کرنے والی جماعت کو ۱۰۰ فیصد کامیابی اور ۴۹ فیصد لوگوں کی حمایت والی جماعت صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔ دو سے زیادہ جماعتیں انتخاب لڑ رہی ہوں تو ۵۱ کی شرط بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اس بار بہار میں بی جے پی محاذ کے رائے دہندگان کا تناسب ۳۵۔۶ فیصد ہے مگرارکان صرف ۶۰ جبکہ اسے ۹۰ ہونا چاہئے تھا لیکن اگر یہ اصول مرکز میں لاگو کیا جائے تو اس کے نمائندگان کی تعداد نصف ہو جائیگی۔ اس لئے کوئی بھی برسر اقتدار گروہ اپنے مفاد کی خاطر یہ اصلاح نہیں کرتا۔

۲۰۱۰ء کے

اسمبلی انتخاب میں کانگریس اور آر جے ڈی الگ تھے اور جے ڈی یو بی جے پی کے ساتھ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس ۴ اور آر جے ڈی ۲۲ تک محدود ہو گئی۔ بی جے پی اور جے ڈی یو نے ۹۱ اور ۱۰۵ نشستیں جیتیں۔ جبکہ ان جماعتوں کے ووٹ تناسب وہی تھا۔
پارلیمانی انتخاب میں کانگریس اور آر جے ڈی ساتھ ہوئے مگر جے ڈی یو الگ تھی تب بھی بات نہیں بنی اور بی جے پی نے میدان مار لیا۔ گزشتہ سال آر جے ڈی اور کانگریس اتحاد کو ۲۶٫۴ فیصد ووٹ ملے تھے اور بی جے پی اتحاد کو ۳۸٫۸ فیصد اگر اس سال جے ڈی یو ان کے ساتھ نہیں آتی اور ووٹوں کا تناسب وہی رہتا تو کانگریس آر جے ڈی اتحاد کو کل ۶۴ نشستیں ملتیں اور ۱۷۲ پر بی جے پی اتحاد کامیاب ہو جاتا۔ لیکن اس بار اتحاد میں جے ڈی یو کی شمولیت سے بازی پلٹ گئی۔ عظیم اتحاد کا ۲ فیصد اور بی جے پی کا ووٹ ۳ فیصد کم ہوا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ بی جے پی اتحاد کو ۶۰ پر ڈھکیل کر عظیم اتحاد ۱۷۸ پر پہنچ گیا۔ آر جے ڈی کے ۲۲ سے ۸۱ اور کانگریس ۴ کے ۲۷ ارکان اسمبلی ہو گئے جن میں سے ۱۹ نے بی جے پی کو شکست دی۔
یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ اب بھی بی جے پی کے ساتھ رائے دہندگان کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور یہی دباؤ عظیم اتحاد کے فریقوں کو متحد رکھے ہوئے ہے۔

کانگریس نے اس سے قبل جنتا پریوار کی حکومت سازی میں باہر سے حمایت تو کی تھی مگر وہ کبھی اس میں شامل نہیں ہوئی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کانگریس ایک جونئیر پارٹنر کے طور پر جنتا پریوار میں شامل ہوئی ہے۔ پارلیمانی انتخاب کے بعد کانگریس کی حالت کوما میں مبتلا مریض کی سی ہو گئی تھی۔ ایسا مریض یا تو مر کھپ جاتا ہے یا اس کی حالت میں بہتری آتی ہے۔ بی جے پی والے کانگریس کے انتم سنسکار کی تیاری کر رہے تھے مگر اب اسکی سانس درست ہونے لگی ہے پھر بھی طویل سنبھلنے میں طویل عرصہ درکار ہے۔ پہلے تو یہ لازم ہے کہ تیسرا محاذ بی جے پی کو شکست دے کر اقتدار میں آئے پھر داخلی اختلاف کے سبب بکھر جائے۔ اس وقت اگر بی جے پی کی طاقت کانگریس سے کم ہو گی تبھی اسے حکومت سازی کا موقع ملے گا۔ تب تک ممکن ہے راہل گاندھی کی عمر نریندر مودی کے برابر ہو جائے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں منموہن کی عمر تک انتظار کرنا پڑے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

بہار کے بعد کئی ریاستوں میں صوبائی انتخابات ہیں لیکن بنگال، تمل ناڈو اور کیرالہ میں بی جے پی کوئی بڑا کمال نہیں دکھا سکتی۔ پنجاب میں بہار جیسی ناکامی اس کا مقدر بن سکتی ہے لیکن چونکہ وہ شکست کانگریس کے ہاتھوں ہوگی اس لئے اس کے اثرات قومی سیاست پر پڑیں گے۔ بی جے پی کیلئے سب سے بڑا امتحان اتر پردیش میں ہے۔ اگر یوپی میں سماجوادی پارٹی، بہوجن سماج پارٹی

اور کانگریس ایک ساتھ ہوجاتے ہیں تو بی جے پی کیلئے اترپردیش میں بھی بہار جیسی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ بہت سارے لوگ یہ توقع کررہے ہیں کہ بہار سے عبرت حاصل کرکے مودی جی اور امیت شاہ اپنا طور طریقہ بدلیں گے لیکن امکان کم ہے اس لئے کہ ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس حقیقت کے اعتراف بی جے پی کے بڑے رہنما پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔

پہلی پھلجڑی تو خیر باہر والے مانجھی نے چھوڑی اس کے بعد پاکستان کے بجائے بی جے پی بہار کے اندر پٹاخے چھوٹنے لگے۔ حکم دیو نرائن، بھولا سنگھ، شکونی چوبے، آر کے سنگھ اور شترو گھن سنہا نے خوب دل کھول کے دیوالی منائی۔ ان ارکان پارلیمان میں بی جے پی کے حامی چاروں طبقات (ٹھاکر، بھومہار، براہمن اور لالہ) کی نمائندگی ہے۔ جو تھوڑے بہت یادو بھول بھٹک کر لالو کے بغض معاویہ میں بی جے پی کے ساتھ آگئے تھے ان کا ترجمان بھی موجود ہے۔ ان سب نے شاہ کی آڑ میں مودی جی پر بھی نشانہ سادھا ہے بلکہ بھولا نے تو اسے پارٹی کی خودکشی قرار دیا ہے۔ بہار کی پٹاخے بازی ابھی تھمی بھی نہیں تھی کہ دہلی میں بڑا دھماکہ ہوگیا۔ بی جے پی مارگ درشک کمیٹی کے اڈوانی اور جوشی نے دیگر دو بڑے رہنما یشونت سنہا اور شانتا کمار کی دستخط سے ایک بیان عین دیوالی کی صبح جاری کرکے شاہ صاحب کا دیوالیہ پیٹ دیا۔ اس میں اجتماعی ذمہ داری کی دلیل کو اپنا تحفظ گردانہ گیا اور ایسے غیر جانبدار لوگوں کی

مدد سے شکست کی وجوہات کا پتہ لگانے کا مطالبہ کیا گیا جو مہم میں شامل نہیں تھے۔ اس بیان میں الزام لگایا گیا ہے کہ پارٹی کے اندر باہمی صلاح و مشورہ کا مزاج ختم ہو چکا ہے اور پارٹی اس وقت جن کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے انہوں نے دہلی کی شکست سے کوئی سبق نہیں لیا۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دہلی سے سبق نہ لینے والے بہار سے عبرت پکڑ کر اتر پردیش میں اپنا رویہ بدلیں گے۔ اس معاملے ہیں مودی اور شاہ کیلئے صبر کرنے کی راہ میں سنگین مشکلات ہیں۔ اتر پردیش میں اگر شاہ صاحب آگے نہیں آتے تو پارٹی کی کمان مودی جی کے اولین حریف راجناتھ سنگھ اور سب سے بڑے ناقد مرلی منوہر جوشی کے ہاتھ میں چلی جائیگی جسے یہ دونوں کسی صورت.برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ دیگر وجوہات بھی ہیں مثلاًاتر پردیش ہی کے بل بوتے پر امیت شاہ کو پارٹی کا صدر بنایا گیا ہے اور وہ اپنے آپ کو وہاں کا چانکیہ سمجھتے ہیں۔ مودی جی کا حلقۂ انتخاب اتر پردیش میں واقع ہے ایسے میں اتر پردیش میں وہ اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا ئے بنا نہیں رہ سکتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وزیر اعظم جہاں بھی زور لگاتے ہیں پارٹی کا دم نکل جاتا ہے۔ ہریانہ تو انہوں نے ہنستے کھیلتے جیت لیا۔ مہاراشٹر اور جھارکھنڈ میں مرتے پڑتے گرلیں مارکس سے کامیاب ہوئے۔ جموں کشمیر میں اے ٹی کے ٹی ہوگیا۔

اور دہلی و بہار میں بری طرح فیل ہو گئے۔ دہلی کے کیجریوال سے مودی اس لئے ناراض تھے کہ انہوں نے وارانسی میں جا کر ان سے دوبدو جنگ کی تھی اور بہار کے نتیش کمار نے ان کی سب سے پہلے مخالفت کی تھی۔ مودی جی ان دونوں کے مقابلے تو چاروں شانے چت ہو گئےاب دیکھنا یہ ہے کہ ملائم اور مایا کے آگے کیا ہوتا ہے؟ ایک بات طے ہے کہ ۲۰۱۷ء کے اندر یوپی میں جو ہوگا بہت ممکن ہے ۲۰۱۹ء میں وہی کہانی قومی سطح پر دوہرائی جائے۔ بہار کے نتائج تو اس بات کے شاہد ہیں کہ اترپردیش میں بی جے پی کی کامیابی اور ناکامی کا سارا دارومدار ان کے مخالفین کے اتحاد یا انتشار پر منحصر ہے۔ اس لئے اس کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ کسی صورت ہاتھی اور سائیکل کا ساتھ نہ ہو ۔اب بی جے پی کی اس کوشش میں ملائم اور مایا کس حد تک معاون و مددگار ہوتے ہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔بقول شاعر

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

پیرس حملہ: منظر پس منظر

پیرس کی سڑکوں پر بہنے والا غیر متعلق اور بے قصوروں کا ناحق خون یقیناً عالم انسانیت کا قتل ہے۔ یہ قرآن کریم کی تعلیم ہے جسے اسلام کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ پیرس اور ممبئی حملوں میں زبردست مشابہت پائی جاتی ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی فوٹو کاپی معلوم ہوتے ہیں۔ جس وقت ممبئی میں حملے ہوئے تھے داعش کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی تو پھر یہ کیسے ہوگیا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ داعش جیسے ترقی یافتہ دہشت گرد گروہ نے لشکر جیسے پسماندہ تنظیم کی نقل کی ہو؟ اگر نہیں تو ان دونوں کے درمیان مشترک کیا ہے؟ کہیں مغرب کی وہ طاقتیں تونہیں جو اپنے مفادات کی خاطر کبھی جیش کے نام پر تو کبھی لشکر کے نام پر، کبھی بوکوحرام کے نام پر تو کبھی داعش کے نام پر قتل و غارتگری کا بازار گرم رکھتی ہیں۔ جنگ عظیم تک تو مغرب آمنے سامنے کی لڑائی لڑتا تھا لیکن اس کے بعد جو پس پردہ جنگ کی حکمت اختیار کی اس کا نام سرد جنگ رکھا گیا۔ یہ براہِ راست ایک دوسرے سے ٹکرانے کے بجائے کسی اور کی آڑ میں اپنا حساب کتاب چکانے کی حکمتِ عملی ہے۔

ممبئی اور پیرس کے حملوں میں ایک دلچسپ مشابہت یہ بھی ہے کہ دونوں حملے

امریکی انتخابی مہم کے اہم ترین مرحلے میں ہوئے تھے ۔ اوبامہ کی آمد سے قبل ممبئی حملہ ، اوبامہ کے دوبارہ منتخب ہونے سے پہلے اسامہ کی موت کا ڈرامہ اور اوبامہ کے جانے سے قبل پیرس کا حملہ۔ یہ سب محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے مگر نہیں بھی۔ اس لئے کہ امریکی انتخاب میں دہشت گردی کے خوف سے زیادہ کچھ اور نہیں بکتا۔ بدقسمتی سے وہ تفتیشی ادارے جن کا کام حقائق کو بے نقاب کرنا ہے وہ ایسے حکمرانوں کے آلۂ کار بنے ہو ئے ہیں جو انہیں حقائق کی پردہ پوشی پر مجبور کرتے ہیں۔ اس لئے وہ سچائی کبھی بھی بے نقاب نہیں ہوتی جو ان حکمرانوں کے اپنے یا ان کے آقاوں کے خلاف ہو ۔ ذرائع ابلاغ کا کام بھی مسخ شدہ سرکاری موقف کو نشر کرنا ہو کر رہ گیا ہے اس لئے اکثر و بیشتر حقیقتِ حال پر پردہ پڑا رہتا ہے۔

کوئی بعید نہیں کہ ممبئی کی طرح آگے چل کر پیرس حملے کے پس پردہ بھی کوئی رچرڈ کولمن ہیڈلی جیسا پراسرار ماسٹر مائنڈ نکل آئے جو امریکہ سے نمودار ہو کر وہیں جا چھپا ہو۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ ہندوستان کا بہترین حلیف ہوتے ہوئے بھی اور دہشت گردی کی جنگ دونوں ممالک کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے باوجود امریکہ نے اس اہم ترین مہرے کو تفتیش کی خاطر ہندوستان کے حوالے کرنا تو درکنار ہندوستان کی پولس سے ملنے بھی نہیں دیا۔ حقیقت تو یہ ہے اجمل قصاب کے مقابلے رچرڈ ہیڈلی نے ممبئی کے حملوں میں بہت بڑا کردارا

دا کیا ہے۔ وہ ہندوستان کے اندر آکر عملاً سرگرم عمل رہا ہے پھر بھی حافظ سعید کی واپسی کا مطالبہ تو ہوتا ہے مگر رچرڈ ہیڈلی کا نام کوئی نہیں لیتا۔ ہوسکتا ہے پیرس حملے کا تعلق بھی کسی ہیمنت کرکرے جیسے ایماندار افسر اور اس کے ساتھیوں کو راستے سے ہٹا کر فرانس میں جاری فسطائی دہشت گردی کی پردہ پوشی ہو۔

ہندوتوا وادی قوتوں کی مانند یوروپ بھر میں جرمنی کی پیگیڈیا اور برطانیہ کی انڈپینڈنٹ پارٹی جیسی میں انتہا پسند قوم پرست تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے اپنے سیاسی عزائم ہیں۔ وہ بنیادی طور پر سارے غیر ملکیوں کے خلاف ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ ایسا ہے کہ وہ اپنے ہم وطن مسلمان باشندے کو بھی اپنی قوم کا حصہ نہیں سمجھتے ۔ ایک جائزے کے مطابق قومی محاذ نامی فرانسیسی انتہا پسند جماعت کی رہنما لی میرین لی پین کی مقبولیت فی الحال دیگر تمام سیاسی رہنماوں سے زیادہ ہو گئی اور وہ آئندہ صدارتی انتخاب بھی جیت سکتی ہیں ۱۹۱۱ء میں یہ محاذ تیسرے نمبر پر تھا مگر ۲۰۱۴ء میں پہلے نمبر پر آگیا ہے۔ ایسے میں ان کا دہشت گردی میں ملوث ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔ ان سے زیادہ اپنے آپ کو دیش بھکت ثابت کرنے کیلئے سرکوزی جیسے درمیانہ درجے کے انتہا پسند بھی اس سے حملے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتے ہیں ۔ اتفاق سے فرانس کی اور ہندوستان کی فسطائی محاذ کا نام یکساں ہے اور

چارلی ہیبڈو حملے کے بعد پیرس کے دھماکوں نے اس کے وارے نیارے کردیئے ہیں۔ عالمی حالات پر اگر نظر ڈالیں تو یقیناً داعش تنازع کے مرکز میں ہے۔شام کے اندر فی الحال فرانس کے علاوہ امریکہ اور روس بھی بری طرح ملوث ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ داعش کی مغرب کے پروردہ دہشت گرد تنظیم ہے۔ ناٹو نے افغانستان اور عراق میں اپنی شکست کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اب اپنی باقائدہ فوج ان علاقوں میں نہیں بھیجے گا، اس لئے کہ ایسا کرنے سے مقامی عوام ان کا جینا دوبھر کردیتے ہیں۔ اس لئے کرائے کے فوجیوں کو اسلامی نام دے کر اور مقامی لوگوں کا نجات دہندہ بنا کر میدان میں اتارا گیا۔ عوام چونکہ حکومت کے مظالم سے پریشان تھے اس لئے انہوں اس مصیبت کو اپنے لئے رحمت سمجھا اور اس کا استقبال کیا۔ اس تجربے کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ ان دہشت گردوں کے مظالم کی ذمہ داری مغرب پر نہیں آتی تھی بلکہ اس کا الزام اسلام پسندوں کے سرمنڈھ دیا جاتا۔ یہ تجربہ بہت جلد ناکام اس لئے ہوگیا کہ ان جرائم پیشہ لوگوں نے اسلام کے نام پر ایسی ایسی سفاکی کا مظاہرہ شروع کردیا جسکا تصور بھی اسلام جیسے دین رحمت میں محال تھا۔ ان احمقوں نے اپنی حرکات سے خود اپنے آپ کو بے نقاب کردیا۔

داعش کو روانہ کرنے کا اصل مقصد بشار الاسد کو اقتدار سے ہٹانا تھا لیکن

مغرب میں ناکام رہا اس لئے کہ داعش کے خلاف روس اور ایران کو بشار کی حمایت کا موقع مل گیا۔ داعش کو بھگانے کی آڑ میں روس نے بشار کے خلاف لڑنے والے مجاہدین آزادی کا قلع قمع شروع کردیا۔ اس طرح گویا داعش کے مجرمین نے اپنے علاوہ دیگر متحارب گروہوں کا بھی بھلا کیا اور اس کے سبب بشار کے ظالمانہ اقتدار کو نئی زندگی مل گئی ۔ داعش کے ذریعہ جو واحد کامیابی مغرب کو حاصل ہوئی ہے وہ کردستان کے لوگوں کو اسلحہ فراہم کرنا اور انہیں فوجی تربیت دینے کا موقع ہے۔ کرد قوم سے وابستہ لوگ عراق ، شام اور ترکی میں آباد ہیں ۔ اب انہیں ایک علٰحیدہ ملک بنانا اور وہاں بیٹھ کر اس پورے خطے میں بدامنی پھیلانے کے امکانات روشن ہوگئے ہیں ۔ کرد سنجر نامی اہم شہر داعش کے قبضے سے آزاد کرا چکے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ یہ آندھی جس تیزی سے آئی تھی اسی سرعت سے غائب ہوجائے۔

شام کی خانہ جنگی کو چار سال سے زیادہ ہوچکے ہیں ۔ اس دوران کئی لاکھ شامی مہاجرین ترکی ،اردن اور دیگر پڑوسی ممالک کے پناہ گزین کیمپوں میں ہجرت کیلئے مجبور ہوئے ۔ ان لوگوں نے کبھی یوروپ کا رخ نہیں کیا۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ جب داعش کی ضرورت وافادیت ختم ہوگئی اور روس کے علاوہ امریکہ اور فرانس نے بھی اس کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا تو اچانک پناہ گزینوں نے یوروپ کا رخ کرنا شروع کردیا؟ ممکن ہے کہ جو لوگ یوروپ سے مغرب کی نجی

فوج میں داعش کا بھیس بدل کر آئے تھے وہ واپس جارہے ہوں اور ان لوگوں نے مظلوم شامیوں کو بھی ورغلا کر اپنے ساتھ کرلیا ہو۔ بلاشک شبہ داعش کے دن بھر چکے ہیں اور ان بدمعاشوں کیلئے مسلم دنیا میں کوئی جگہ نہیں اس لئے ان جرائم پیشہ افراد وکا لوٹ کر جانا فطری عمل ہے۔ مغرب کو ہے کہ واپس آنے کے بعد اگر کوئی طاقت ان پیشہ ور فوجیوں کی خدمات حاصل کرکے ایک نیا دستہ تشکیل دے اور اسے ان کے خلاف کھڑا کردے تو کیا ہوگا؟ پناہ گزینوں کے حوالے سے فرانس کا موقف جرمنی سے متضاد ہے ۔ وہ شام میں بمباری تو کرنا چاہتا ہے مگر اس کے نتیجے میں بھاگنے والے پناہ گزینوں کی ذمہ داری قبول کرنا نہیں چاہتا۔ اس حملے سے قبل شامی پناہ گزینوں کی آمد پر پابندی لگانا مشکل تھا مگر اب سہل ہوگیا ہے۔

پیرس حملے کو اپنے گوں ناگوں مفاد کے پیشِ نظر ساری دنیا صرف داعش کے زاویہ سے دیکھ رہی ہے لیکن روسی طیارے کی تباہی سے بھی اسے جوڑا کر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ داعش مغرب کی پروردہ ہے اور اگر اس نے روس کا طیارہ تباہ کیا تو روس والے مغرب کے اس حملے کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرسکتے۔ روس نے یہ بات تو تسلیم نہیں کی اس کا جہاز دہشت گردی کا شکار ہوا ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنے سے اس کی داعش کے خلاف کی جانے والی کارروائی پر سوال کھڑے ہوتے ہیں۔ جو لوگ والدیمیر پوتن اور روسی حکمرانوں کے مزاج سے

واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انتقام کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے فرانس کا شمار بشار الاسد کے سب سے بڑے دشمنوں میں ہوتا ہے اور اگر اس حملے میں شامی باشندے ملوث ہیں تو ان کا تعلق داعش کے علاوہ بشارالاسد سے بھی ہو سکتا ہے۔

اسرائیل کے مظالم میں جب بھی اضافہ ہوتا ہے اور یوروپی رائے عامہ اس کے خلاف ہونے لگتی ہے تب بھی اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ چارلی ہیبڈو کے سانحہ کو بھنانے کی جو کوشش نیتن یاہو نے کی تھی وہ سب کے سامنے ہے۔ فی الحال اسرائیلی عدالتیں فلسطینیوں کے گھروں کو منہدم کرکے یہودیوں کیلئے مکانات بنانے کی اجازت دے رہی ہے۔ اسرائیلی مظالم کے خلاف غزہ کے بعد مغربی کنارے میں بھی انتفاضہ کا آغاز ہوچکا ہے۔ اسرائیل کا جبر اپنے حدود سے گزر رہا ہے اور اس کے خلاف یوروپ کے انسانیت نواز حلقوں میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے۔ نتن یاہو کی برطانیہ میں آمد کے موقع پر گرفتاری کی عرضداشت پر دس لاکھ لوگوں نے دستخط کئے جن میں بڑی تعداد غیر مسلمین کی ہے۔ اقوام متحدہ میں فلسطین کے تعلق سے جس طرح رائے عامہ ہموار ہو رہی ہے اس سے امریکہ اور اسرائیل پریشان ہیں ۔ اس لئے موساد بھی اس طرح کے حملوں سے مسلمانوں اور فلسطینیوں کے خلاف نفرت کا زہر پھیلا سکتی ہے۔

ان امکانات کا اظہار نفس مسئلہ کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے نہیں کیا جارہا ہے بلکہ حکومتوں کی جانب سے جعلی دھماکے کرواکر اپنے مفادات حاصل کرنے کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس معاملے میں بلا تفریق مشرق و مغرب سب ملوث ہیں اتفاق سے مسلمانوں کا حصہ بہت کم ہے اور جو ہے وہ سب بھی پرویز مشرف یا السیسی جیسے سیکولر اور نام نہاد روشن خیال مسلمان ہیں :

- ۱۹۳۱ء میں جاپانیوں ریلوے پٹری پر دھماکہ کیا اور اس کا الزام چینیوں کے سر منڈھ کر منچوریہ میں دھاوا بول دیا۔
- نازی میجر نے یہ تسلیم کیا گستاپو کے حکم کی تعمیل میں اپنے ہی لوگوں پر حملہ کرکے اس کا الزام پولینڈ پر لگایا گیا تاکہ چڑھائی کی جاسکے۔
- نازی جنرل فرانز نے یہ اعتراف بھی کیا کہ ۱۹۳۳ء جرمن ایوان پارلیمان کو فوج نے آگ لگا کر اس کیلئے اشتراکیوں کو موردِ الزام ٹھہرا دیا۔
- خروشچیف نے یہ تسلیم کیا ۱۹۳۹ء میں سرخ فوج نے روس کے مینیلہ گاوں پر بمباری کرکے اس کا الزام فن لینڈ پر لگا دیا۔
- گورباچیف اور پوتن نے اسٹالن پر الزام لگایا کہ ۱۹۴۰ء میں ۲۲۰۰۰ پولینڈ کے لوگوں کو ہلاک کرکے اس کا الزام نازیوں پر لگا یا گیا۔
- برطانوی حکومت نے ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء کے درمیان ہٹلر کے خوف سے بھاگنے والے یہودی جہازوں کو تباہ کرکے عرب فلسطینیوں کی محافظ نامی خودساختہ تنظیم کو اس ۵ کیلئے موردِ الزام ٹھہرایا۔

○ اسرائیل نے ۱۹۵۴ء میں مصر کی مختلف عمارتوں بشمول امریکی قونصل خانےمیں بم نصب کرکے عربوں کو ملزم قرار دیا گیا۔

○ سی آئی اے نے ۱۹۵۰ء میں ایران کے منتخبہ صدر کے خلاف ایرانیوں سے بم دھماکے کرائے الزام اشتراکیوں پر لگایا۔

○ اٹلی کے سابق وزیراعظم نے تسلیم کیا کہ ۱۹۵۰ء پنٹاگون اور ناٹو نے اٹلی اور یوروپ کے دیگر شہروں میں بمباری کرکے اس کا الزام اشتراکیوں پر رکھا۔

○ برطانوی وزیراعظم کے مطابق ۱۹۵۷ء میں امریکی صدر نے تختہ پلٹنے کی خاطر شام پر حملہ کروا کر اس کا الزام شامی حکومت پر رکھ دیا۔

○ ۱۹۶۴ء کے اندر شمالی ویتنام کے ٹونکن کھاڑی سے متعلق ایک جھوٹ گھڑکے ویتنام پر حملے کا جواز پیدا کیا گیا۔

○ ۱۹۷۰ء میں ترکیوں نے سائپرس کی ایک مسجد کو آگ لگا کر اس کا الزام مقامی باشندوں پر لگا دیا۔

○ ۱۹۷۸ء میں جرمنی نے خود ایک جیل کی دیوار کو بم سے اڑا دیا اور اندر قید سرخ فوج پر بم دھماکے کا الزام لگا دیا

○ ۱۹۸۴ء نے موساد نے معمر قذافی کے گھر میں ریڈیو ٹرانسمیٹر نصب کرکے جعلی پیغامات نشر کئے جس کی بنیاد پر رونالڈ ریگن نے بمباری کی۔

○ ۱۹۹۰ء میں الجیریائی فوج نے عوام کا قتل عام کرکے اس کا الزام اسلام پسندوں پر لگا دیا

- ۱۹۸۸ء میں انڈونیشیا کے اندر ہونے والے فسادات میں فوج کے ملوث ہونے کی تصدیق ہوئیہے۔
- ۱۹۹۹ء میں کے جی بی ایک رہائشی عمارت کو بم سے اڑا کر اس کا الزام شیشان کے مجاہدین پر لگایا اور جنگ چھیڑ دی۔
- ۱۱ ستمبر کا بہانہ بنا کر افغانستان اور عراق میں جو گھناؤنا کھیل کھیلا گیا وہ کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔
- ۲۰۱۱ء میں مصر کے سرکاری ملازمین نے میوزیم کو لوٹ کر اس کا الزام مظاہرین پر لگا دیا۔
- ۲۰۱۳ء صدر محمد مورسی کو اقتدار سے بے دخل کرنے کیلئے بربریت کا مظاہرہ اور الٹا اخوانیوں پر الزام تراشی تاریخ کا حصہ بن چکی ہے

اس طرح کی مذموم حرکات کا احاطہ کرنے کیلئے یہ مضمون ناکافی ہے۔ پیرس کے حملے کا ایک غیر متوقع فائدہ تو یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے اوپر ہونے والے مغرب کے مظالم یاد آ گئے۔ مسلمانوں نے اور ان کے ہمدرد غیر مسلمین نے مغربی ذرائع ابلاغ کے امتیازی سلوک کو اچھالنا شروع کر دیا۔ اس شور شرابے کے پس پشت وہ خوش فہمی کارفرما ہے کہ مغربی ذرائع ابلاغ آزاد اور انصاف پسند ہے حالانکہ وہ نہ صرف حکمرانوں بلکہ سرمایہ داروں کے تلوے چاٹنے والے لوگ ہیں اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے کہ وہ مسلمانوں کے اوپر

ہونے والے مظالم کو بھی یکساں اہمیت دیں گے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے نہ سہی لیکن اپنی عوام پر ہونے ظلم کے حق میں تو کم از کم ہمدردی پیدا کی۔ جو کچھ انہوں نے اپنے لوگوں کیلئے کیا ویسا کرنے سے ہمیں کس نے روکا تھا اگر فرانس کے حملوں پر مغرب بھی ویسی ہی سرد مہری کا مظاہرہ کرتا جیسا کہ ہم اپنے اوپر ہونے والے مظالم پر کرتے ہیں تو کیا ہمیں عراق، لبنان، فلسطین اور شام یاد آتے؟

اس طرح کی صورتحال میں امت کو چاہئے کہ وہ حکومت اور عوام کے اندر فرق کرے۔ ہم دیگر اقوام سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ہمارے حکمرانوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کیلئے تمام امت کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں یہی توقع دوسری اقوام کے لوگ بھی ہم سے کر سکتے ہیں۔ حکومتوں کے ناعاقبت اندیش فیصلوں کی قیمت بے قصور عوام چکاتے ہیں۔ ان لوگوں کو مارنے والے ہمارے نمائندے نہیں ہیں اس لئے ہمیں مدافعت میں آکر اپنی صفائی ہرگز نہیں پیش کرنی چاہئے لیکن ان سے ہمدردی کے اظہار میں بخالت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ عام لوگوں کو نہ تو ان کی حکومت کی سفاکی کی سزا دینا مناسب ہے اور ان کے ذرائع ابلاغ کے امتیازی سلوک کیلئے ذمہ دار ٹھہرانا چاہئے کہ اس لئے کہ ان دونوں پر عام لوگوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ خاموشی اختیار کرنے میں کوئی بھی حرج نہیں ۔ پیرس دھماکوں میں مغرب کی جنگ کے مغرب کی جانب لوٹنے کے آثار نمایاں ہیں۔

(شجرِ خبیثہ کی شاخ نازک پر زعفرانی آشیانہ - (قسط اول

پندرہ ستمبر کو اشوک سنگھل کے سالگرہ کے موقع پر موہن بھاگوت اور راجناتھ سنگھ ان سے ملنے گڑگاوں کے اسپتال میں پہنچے اور رام مندر کی یاد تازہ کی۔ ۱۷ نومبر کو اشوک سنگھل کا انتقال ہوگیا تو ان کے تعزیتی اجلاس میں ۲۲ نومبر کو موہن بھاگوت نے کہا ’’سنگھل کے صرف دو ارمان تھے ایودھیا میں رام مندر بنانا اور ویدوں کا پرچار کرنا۔
امید ہے کہ آنے والے سالوں میں ہم رام مندر کی تعمیر کے سپنے کو پورا کرنے کی سمت بہتر قدم اٹھا پائیں گے۔ اس بیان کی بے یقینی ’آئندہ سالوں میں‘ ، ’امید ہے‘،’ سمت بہتر قدم‘ کے الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے لیکن اسی نشست میں امیت شاہ نے بھاگوت کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔ شاہ نے کہا آزاد ہندوستان میں رام جنم بھومی کی تحریک سب سے بڑی تحریک تھی اور اس کے خالق اشوک سنگھل تھے ۔ امیت شاہ نے رام مندر کی تحریک کو ماضی کی داستان پارینہ قرار دے کر اسے زندہ کرنے کا عزم نہ کرکے رام مندر کا خواب چکنا چور کردیا۔
اشوک سنگھل جی اس دنیا سے جاتے جاتے رام مندر کے بجائے اپنے اور اپنی تحریک وشوہندوپریشد کے اوپر یہ سنگین الزام چھوڑ گئے کہ اس نے رام مندر کے نام پر

جمع کئے گئے ۱۴۰۰ کروڑ روپے غبن کئے ہیں ۔ ۲۵ سال قبل جمع کی گئی اس رقم کو آج کے حساب سے دیکھیں تو یہ ۳۰۰۰ کروڑ کے آس پاس بنتی ہے۔ سنگھ پریوار پر یہ الزام کسی ہندوتوا کے دشمن نے نہیں بلکہ ہندو مہا سبھا نے لگایا ہے ۔ اکھل بھارتیہ ہندو مہا سبھا کے قومی ترجمان دیویندر پانڈے نے اس رقم کا حساب مانگنے کیلئے وزیر اعظم نریندر مودی ، سر سنگھ چالک موہن بھاگوت اور اشوک سنگھل کو ماہِ جولائی میں ایک خط لکھا تھا جس کا جواب نہ ملا ہے اور نہ ملے گا۔

اشوک سنگھ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانسیں لے رہے تھے ہندو مہا سبھا ناتھو رام گوڈسے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ''بلیدان دیوس'' منا رہی تھی۔ گوڈسے کی خدمات کو خوشنما بنا کر پیش کرنے کیلئے ویب سائٹ کا اجراء کیا جارہا تھا اور ملک بھر میں سے زیادہ مقامات پر ناتھورام کیلئے ہون کیا جارہا تھا ۔ ایسا اہتمام تو بابائے قوم ۲۰۰ گاندھی جینتی پر بھی نہیں کیا جاتا ۔ ہندو مہاسبھا کی ان حرکات پر سیکولر حضرات نے بی جے پی اور آر ایس ایس پر دھاوا بول دیا جس سے وہ لوگ مدافعت میں آگئے اور آر ایس ایس کے حوصلے بھی پست ہوگئے ۔ ناتھو رام گوڈسے کی پھانسی کے دن کو 'بلیدان دیوس' کے طور پر منانے پر آر ایس ایس کے معمر رہنما ایم ایس ویدیہ نے کمال تجاہلِ عرفانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا میں نہیں جانتا یہ کون لوگ ہیں؟ لیکن ہم ناتھو رام

گوڈسے کی عزت و تکریم کے خلاف ہیں اس لئے کہ وہ قاتل تھا۔

سنگھ پریوار کے مذہبی اخلاص پر ویسے بھی ہندو مہاسبھا مشکوک رہی ہے لیکن مودی جی کے اقتدار میں آنے کے بعد اس کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ اب ان کے اچھے دن آگئے ہیں۔ چند ماہ قبل جب ان لوگوں نے ناتھو رام گوڈسے کا مندر تعمیر کرنے کا اعلان کیا اور مہاراشٹر میں گوڈسے کی یاد میں شوریہ دیوس منایا۔ اس پر راجیہ سبھا میں کانگریسیوں نے ہنگامہ کھڑا کردیا تو مرکزی حکومت نے گوڈسے کی پذیرائی کی مذمت کیلئے مجبور ہونا پڑا۔ اس کے بعد اب ویدیہ کے بیان نے ہندو مہا سبھا کو چراغ پا کردیا۔ مہا سبھا کے نائب صدر اشوک شرما نے کہا کہ آر ایس ایس نہ صرف غدارِ وطن ہے بلکہ اس نے ہندوؤں سے بھی غداری کی ہے۔ کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ ہندو مہاسبھا ہی آر ایس ایس کی سرپرست تھی لیکن گاندھی جی کے قتل کے بعد جب وہ معتوب ہوئی تو یہ لوگ اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر نہرو سے جا ملے اور سارے روابط منقطع کردیئے اس لئے یہی سب سے بڑے دغاباز ہیں۔

اشوک شرما کے مطابق آج بھی آر ایس ایس صرف اقتدار کی بھوکی ہے اور بی جے پی نے ہندو وقار کی بحالی کیلئے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ مہا سبھا کا بی جے پی یا آر ایس ایس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شرما نے اس

عزم کا اظہار کیا کہ وہ بہت جلد ایک تحریک چلا کر عوام کو بتائیں گے کہ کس طرح بی جے پی نے ہندوؤں کے جذبات کا استحصال کرکے اقتدار پر قبضہ کیا ہے۔ شرما کے مطابق بی جے پی نے صرف ووٹ کیلئے مسلم مخالف جذبات بھڑکائے اور ان مسائل کو اغواء کرلیا جو ہندو مہاسبھا نے اٹھائے تھے۔ شرما نے سوال کیا کہ ۱۹۴۸ء میں جس وقت مہاسبھا نے رام جنم بھومی کا مسئلہ اٹھایا تھا تو اس وقت جن سنگھ یا آر ایس ایس کہاں تھے ؟ پولس کی رپورٹ میں جن سنگھ کا نہیں بلکہ مہاسبھا کا نام درج ہے۔

سنگھ پریوار کی فسطائی سیاست کے نتیجے میں فی الحال سارا ہندوستان کارزار بنا ہوا ہے۔ نت نئے مسائل آئے دن کھڑے کئے جاتے ہیں اور اس میں ملک کی پرامن عوام کو ایندھن کی مانند جھونک کر اس پر سیاسی روٹیاں سینکی جاتی ہیں ۔ کرناٹک کی کانگریسی حکومت نے پچھلے دنوں مسلمانوں کو خوشنودی کیلئے ٹیپو سلطان جینتی منانے کا فیصلہ کیا۔ ہندو احیاء پرستوں کو اس سے فرقہ واریت پھیلانے کا نادر موقع ہاتھ آگیا اور انہوں نے ٹیپو سلطان کو ہندو دشمن بنا کر مخالفت شروع کردی حالانکہ ٹیپو سلطان کی کے دربار اور فوج میں ہندو بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ٹیپو سلطان کی لڑائی دراصل انگریزوں سے تھی ۔ غیر ملکی استعمار کے خلاف چھیڑی گئی وہ جنگ آزادی ہندو مسلم سب کیلئے تھی اس لئے لوگ بلا تفریق مذہب وملت ان کے ساتھ تھے ۔ اس تاریخی حقیقت سے بھلا

تنگ ذہن سنگھ پریوار کے لوگ کیونکر واقف ہو سکتے ہیں۔ جس پارٹی کا وزیر ثقافت اور مظفر نگر فساد کا ملزم مہیش شرما بڑی بے حیائی کے ساتھ یہ کہتا ہو کہ سابق صدر عبدالکلام مسلمان ہونے کے باوجود ایک اچھے انسان تھے اور اسے ایسی حماقت کے بعد عبدالکلام کا مکان عنایت کر دیا جاتا ہو تو ایسے لوگوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

آج کل ہمارے ملک یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاتی ہے کہ رواداری ہمارے خون میں شامل ہے جبکہ تاریخ اس کے خلاف شہادت دیتی ہے۔ اسی طرح اتحاد و اتفاق سے بھی اس دھرتی کے باسیوں کا کبھی یارانہ تھا۔ معاشرے کو منوسمرتی کی بنیاد ذات پات میں اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ جس کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کسی مخصوص خاندان میں پیدائش کے سبب جو ناروا سلوک دبے کچلے لوگوں کے ساتھ روا رکھا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مذہب کے ذریعہ ان مظالم تقدس عطا کیا گیا اور سیاست کے زور سے نافذ کیا گیا۔ پراچین کال میں مختلف راجا مہاراجہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی مثال بابر کی ہندوستان میں آمد ہے جسے ایک ہندو راجہ نے مسلمان بادشاہ کے خلاف آنے کی دعوت دی اور جب بابر نے اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا اور یہاں کی عوام کے فلاح بہبود میں لگ گیا تو وہ اس کے دشمن ہو گئے۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ گئورکشا کے معاملے میں وزیر داخلہ راجناتھ بابر کی مثال دیتے ہیں اور رام مندر کی بات آتی ہے تو اسی مثالی بادشاہ کو ظلم کا پیکر بنا کر پیش

کیا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بابر کے نام پر چلائی جانے والی رام مندر تحریک جنوبی ہندوستان پر اثر انداز نہیں ہوسکی اس لئے بابر کے بجائے ٹیپو سلطان کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔

۱۰ نومبر کو ٹیپو جینتی منانے کے خلاف بجرنگ دل نے ریاست گیر بند کا اعلان کردیا۔ اس احتجاج کے دوران جنوبی کنڑ میں ناوور کے قدیم دروازے کے قریب ہریش پجاری نامی ایک فرد ہلاک کردیا گیا۔ ذرائع ابلاغ نے خبر اس طرح سے گول مول کرکے پیش کیا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ شخص احتجاج کرتے ہوئے پولس کی گولی سے مرا یا مسلمانوں نے جلوس پر حملہ کرکے اسے ہلاک کردیا۔ لیکن اب پولس کی تحقیقات سے ایک نئی حقیقت اجاگر ہوگئی۔ انتظامیہ کے مطابق بجرنگ دل سے تعلق رکھنے والے بھاوت شیٹی اور اچھیوت ایک ماروتی اومنی میں وہاں آئے اور ان لوگوں نے ہریش کے ساتھ موجود سمیع اللہ پر حملہ کیا۔ سمیع اللہ تو کسی طرح بچ نکلا لیکن ہریش ہلاک ہوگیا۔ حملہ آور یہ نہیں جانتے تھے کہ سمیع اللہ کے ساتھ کون ہے ؟ان کا گمان رہا ہوگا کہ وہ مسلمان ہے۔ حملہ آوروں نے جب لوگوں کو ان کی جانب آتے دیکھا تو فرار ہوگئے۔

بھاوت شیٹی اور اچھیوت کے خلاف ضلع کے بنٹاوال علاقہ پولس تھانے میں کئی مجرمانہ شکایات درج ہیں ۔ بھاوت کو معروف کنڑ دانشور کے ایس بھگوان کو

دھمکی آمیز ٹویٹ بھیجنے کے سبب گرفتار بھی کیا جاچکا ہے۔ اس نے بھگوان کو لکھا تھا کہ تم کو بھی پروفیسر ایم ایم کالبرگی کی طرح گھر میں گھس کر مارڈالیں گے۔ اس دھمکی سے پتہ چلتا ہے کہ ہریش پجاری کا قتل انہوں نے مسلمان سمجھ کر بھول سے ضرور کردیا لیکن وہ لوگ اپنے مخالف نظریات کے حامل ہندووں کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ کالبرگی کے قتل میں گرفتار ہونے والا پرشانت پجاری بھی ایک ہندو ہی ہے اور کرناٹک کے وزیرابھئے چندر جین کو دھمکی دینے والا بھی کوئی اور نہیں ہندو ہی ہے۔
وزیراعلیٰ سدھارمیاّ نے جب کہا کہ ویسے تو وہ بیف نہیں کھاتے لیکن اگر کھانا چاہیں تو کون روک سکتا ہے ؟اس کے جواب بی جے پی رہنماچینا باسپا نے کہا اگر انہوں نے ایسا کرنے کی جرأت کی تو میں بھرے بازار میں ان کا قتل کردوں گا۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اب یہ فسطائی عناصر مسلمانوں کے علاوہ اپنے ہم مذہب لوگوں کے بھی دشمن بن گئے ہیں۔
انتشار و نااتفاقی ایک ایسازہر ہے کو اپنے استعمال کرنے والوں کے درمیان تفریق امتیاز نہیں کرتا بلکہ ہر کسی کو یکساں طور پر تباہ تاراج کرتا ہے۔ اسپین سے مسلمانوں کے نکلنے میں جس قدر حصہ دشمن کی چالوں کا تھا اس سے بڑا کردار آپسی رنجشوں نے نبھایا تھا۔ یوروپ کی تباہی و بربادی میں ان کی درمیان لڑی جانے والی عالمی جنگوں کا کردار کسی تحقیق کا محتاج نہیں ہے۔ عیسائیوں نے کیتھولک اور پرٹسٹنٹ فرقوں میں بٹ کر جو خوں ریزی کی وہ تاریخ

کا حصہ ہے۔ یہودیوں کی بابت قرآن میں گواہی موجود ہے کہ وہ باہمی رقابت کے پیش نظر متحارب گروہوں کا ساتھ دیتے اور شکست وریخت کے بعد انہیں اپنا دین یاد آتا اور قومی حمیت جاگتی۔ ہندوستان کے اندر اشتراکی تحریک کی ہوا اکھاڑنے والا سب سے بڑا آسیب آپی انتشار ہے جو اس قدر تاخیر سے اتحاد میں بدلا کہ تحریک پوری طرح بے وزن ہو چکی تھی۔ اب یہی بیماری ہندو فسطائیت کی حامل تحریکوں کو بھی لگ گئ ہے۔ قرآن حکیم ہمیں اس مرض کی وجہ اور اس کے انجام دونوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کارگہہ ہستی میں خس وخاشاک کو بھی عارضی طور پر پنپنے کا موقع مل جاتا ہے۔ سورہ ابراہیم میں ارشاد ہے'' اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اُس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے''۔اس کے برعکس دین حق کے صدا بہار شجرِ سایہ دار کی بابت فرمایا''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے''۔ عصر حاضر میں یہ امت کی بدبختی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس مثال کی مصداق نہیں بنایا۔نہ عقائد کی جڑیں ہمارے قلب و ذہن میں گہرائی تک اتری ہوئی ہیں اور نہ ہمارا عمل دین کا ترجمان ہے۔ اسلامی شجر رحمت سے

نہ خود ہم مستفید ہوتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کے لذیذ پھلوں سے استفادہ کا موقع دیتے ہیں۔

ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس کا جھگڑا۔ شیو سینا اور بی جے پی کی لڑائی۔ بی جے پی کے اندر چھڑی ہوئی مہابھارت یہ سب ہمارے کسی کام نہ آسکے گی۔ اس صورتحال میں اہل ایمان اس خوش فہمی کا شکار نہ ہوں کہ ان کی سر پھٹول کے نتیجہ میں اقتدار کا عقاب اپنے آپ ہمارے شانے پر آکر بیٹھ جائیگا۔ اقتدار کا پھل محنت و مشقت کے بغیر کسی کو نہیں ملتا اور اہل ایمان تو جب تک آزمائش کی بھٹی میں جل کر کندن نہیں بن جاتے انہیں بارگاہِ خداوندی سے دین حنیف کو قائم کرنے کی سعادت نہیں مل سکتی۔ اللہ کے دوست حضرت ابراہیمؑ کی بابت ارشادِ ربانی ہے کہ ''یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن سب میں پورا اتر گیا، تو اس نے کہا: ''میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں'' ابراہیمؑ نے عرض کیا: ''اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے''۔ امت مسلمہ نے اللہ کے دین اور اس کے بندوں کے ساتھ جو ظالمانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے اگر وہ اس سے باز نہیں آتی تو اس پر علامہ اقبال کی بیان کردہ قرآنی پیشن گوئی صادق آکر رہے گی۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

(جاری ان شاء اللہ)

مجاہد و چودھری: کہ دستِ قدرت میں زندگی کی لکیر ہوں میں

برصغیر کی تاریخ میں ۲۲ نومبر ۲۰۱۵ء کا شمار سیاہ ترین دنوں میں ہوگا۔ اس روز پڑوسی ملک بنگلہ دیش میں ایک ظالم حکمراں نے محض اپنے اقتدار کو محفوظ و مامون رکھنے کی خاطر اور اپنے رائے دہندگان کی خوشنودی کیلئے حزب اختلاف کے دو معصوم رہنماؤں علی محمد احسن مجاہد اور صلاح الدین قدیر چوہدری کو دارالحکومت ڈھاکہ کی سینٹرل جیل میں پھانسی دے دی ۔ جماعت اسلامی بنگلہ دیش اور بی این پی کے ان رہنماوں پر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان کی حمایت کرنے کا الزام تھا۔ پاکستان کے معمر سیاسی چودھری نثار نے اس جبر استبداد پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ’’بنگلہ دیش میں پھانسیاں انسانیت کا قتل ہے۔انتقام کی آگ کو اب ٹھنڈا ہونا چاہئے‘‘۔

چودھری نثار جس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی دہائی دے رہے ہیں دراصل شیخ مجیب الرحمٰن ان شعلوں کو بہت پہلے بجھا کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ شیخ مجیب نے جولائی ۱۹۷۲ء میں ایک قانون وضع کیا جس کی رو سے بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی میں شریک نہ ہونے والے یا اسکی مخالفت کرنے والے یا پاکستانی فوجیوں کے مددگاروں کو مجرم قرار دیا گیا۔ اس قانون کے تحت ایک لاکھ سے زائد افراد کو

گرفتار کیا گیا۔ ان میں سے ۱۳۴۳۱ افراد عدم ثبوت کی بنا پر بری کر دیئے گئے۔ صرف ۲۸۴۸ کے خلاف مقدمہ قائم ہوا اور ۹۵۲ کو سزا ہوئی۔ ۲ نومبر ۱۹۷۳ء کو شیخ مجیب نے ان تمام قصورواروں کو عام معافی دے کر رہا کر دیا۔ اس طرح گویا انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس باب کو بند کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۶ء عوامی لیگ کو حسینہ واجد کی قیادت میں حکومت کرنے کا موقع ملا لیکن اسے جنگ آزادی کے جنگی جرائم یاد نہیں آئے ۲۰۰۱ء میں بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور ۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۹ء تک جماعت اسلامی بھی اس حکومت میں شامل رہی۔

افسوس کا پہلو یہ ہے کہ شیخ حسینہ واجد کو جب ۲۰۰۹ء میں دوبارہ اقتدار ملا تو اس نے انتقام کے جذبے سے جماعت اسلامی اور بی این پی کو ظلم و جور کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اول تو جماعت کے ۸۰۰ سے زائد افراد گرفتار کئے گئے۔ قائدین کی نقل وحرکت اور بیرون ملک سفر پر پابندی عائد کی گئی۔ فروری ۲۰۱۰ء سے جلسہ جلوس پر پابندی لگا دی گئی، اگر کہیں کوشش ہوتی تو اسی مقام پر عوامی لیگ جلسہ کرنے کا اعلان کر دیتی اور پولیس نقص امن کے تحت جماعت کے ذمہ داران کو گرفتار کر لیتی۔ اس کے بعد جماعت کا میڈیا ٹرائیل شروع ہوا اور تحریک سے وابستہ افراد کو گھروں اور تعلیمی اداروں سے گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کیا جانے لگا۔ دفاتر کو نذر آتش کئے گئے۔ سیکولرزم کا پرفریب لبادے کے اندر چھپا خوفناک، مکروہ اور جابرانہ چہرہ بنگلہ دیش میں وہ عیاں ہو گیا مگر انسانی حقوق کی اس پامالی کے خلاف کسی نے

صدائے احتجاج نہیں بلند کی ؟آزادئ اظہارِ رائے کیا اس حق سلبی پر ساری دنیا کے سیکولر دانشور خاموش تماشائی بنے رہے بلکہ درپردہ اس کی حمایت کرتے رہے۔

چودھری نثار نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''پھانسیوں سے شدید صدمہ ہوا، بڑی تشویش ہے ہے ۱۹۷۱ء کے معاملات کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھیں تو ہم آہنگی اور خیرسگالی کو فروغ ملے گا۔ مفاہمت کی پالیسی اپنائی جائے۔ متعصب عدالتی کارروائی کیلئے عالمی برادری کا ردعمل دیکھ رہے ہیں۔ ہم تو پاکستانی اور بنگالی بھائی چارہ چاہتے ہیں۔ یکطرفہ ٹرائل پر عالمی برادری توجہ دے''۔ چودھری نثار کی دردمندانہ اپیل کا شیخ حسینہ واجد پر اثر کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ از سرِ نو نفرت کے شعلوں کو دے رہی ہیں۔ حسینہ کو اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ بنگلہ دیش کی عوام کو اس آگ اور خون کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور خود اسے بروزِ قیامت اس کی کیا قیمت چکانی پڑے گی؟ چودھری صاحب نے اعتراف کیا کہ ''... افسوس کہ ہم ان لوگوں کیلئے کچھ نہ کرکے جنہوں نے ۴۵ سال پہلے پاکستان کے ساتھ وفاداری نبھائی''

پاکستان کے ساتھ وفاداری کے نام پر سیکولر قوم پرست عوامی لیگ جو چاہے بہتان تراشے مگر امیر جماعت اسلامی بنگلہ دیش مولانا مطیع الرحمن نظامی (جو پانچ بار مسلسل قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے ہیں سابقہ

وزیر اور ۲۵ کتب کے مصنف ہیں) کا اس بابت بے لاگ موقف یہ ہے کہ "کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد سے پاکستان علیحدہ ملک ہے اور بنگلہ دیش علیحدہ۔ جب یہ پاکستان تھا تو ہم اسکے وفادار تھے، اب ہماری ساری وفاداریاں بنگلہدیش کے ساتھ ہیں"۔ کیا کسی فرد یا جماعت کو اپنے ملک سے وفاداری کی سزا دینا درست ہے؟ پابند سلاسل حوصلہ مند مطیع الرحمٰن نظامی نے اربابِ اقتدار کو آگاہ کیا تھا کہ "اگر ملک قوم کی بہی خواہ جمہوریت نواز اور امن پسند مذہبی جماعتوں کا راستہ روکا گیا تو نتیجتاً ملک میں عسکریت پسندی جنم لے گی۔"

اپنے حالیہ دورِ اقتدار میں ڈیڑھ سال تک ظلم وجور کا سلسلہ دراز رکھنے کے باوجود حسینہ واجد کو لاحق خوف ختم نہیں ہوا بلکہ اقتدار کی ہوس میں اس نے ۲۹ جون ۲۰۱۰ء کو ۶۷ سالہ امیر جماعت مطیع الرحمٰن نظامی سمیت سیکریٹری جنرل مولانا دلاور حسین اور مولانا علی احسن مجاہد کو گرفتار کروادیا۔ ۳۰ جون کو انکی ضمانت ہوگئی، مگر حکومت نے مزید ۵ مقدمات میں انہیں دوبارہ گرفتار کرکے ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک شروع کردیا۔ ان مقدمات میں ایک نام نہاد بین الاقوامی تعزیزی عدالت کے اندر ۱۹۷۱ء کے جنگی جرائم کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ یہ عدالت ابھی تک ۱۷ مقدمات کا فیصلہ سناچکی ہے جس ۱۳ لوگوں کو سزائے موت دی گئی۔ ان معتوبین میں ۱۰ جماعت کے اہم رہنما ہیں جن میں سے ایک مولانا عبدالقادر ملا کو ۲۰۱۳ء کے اواخر نیز قمرالزماں اور علی احسن مجاہد کو

اس سال شہید کر دیا گیا لیکن اگر شیخ حسینہ یہ سمجھتی ہیں کہ ان کے دس کے دس مجاہدین اسلام کو شہید کر کے بھی وہ اسلام کا چراغ حریت بجھا دیں گی تو یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔آزادی کے یہ متوالے محض زبانی جمع خرچ پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے حریت فکر و عمل کی شمع کو روشن رکھتے ہیں بقول شاعر

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تخت جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کا

عوامی لیگ نے گزشتہ دو سالوں کے اندر اپنا حلقہ جبر وسعت کرتے ہوئے اس بار جماعت کے علاوہ بی این پی کے بھی ایک رہنما کو تختۂ دار پر سربلند کر دیا۔ صلاح الدین قدیر چودھری کا تعلق چٹاگانگ کے روزآنہ گاوں سے ہے۔ ان کے والد فضل القادر چودھری بنگلہ دیش کے قیام سے قبل نہ صرف پاکستانی قومی اسمبلی کے اسپیکر بلکہ کئی مرتبہ قائم مقام صدر بھی رہ چکے ہیں۔ چودھری کے خاندانی مراسم نہ صرف خالدہ ضیاء بلکہ حسینہ واجد کے خاندان سے بھی ہیں۔ ان کا ایک عم زاد بھائی صابر حسین عوامی لیگ کا رکن پارلیمان ہے اور دوسرا اسلمان رحمٰن ایک سرکاری کارپوریشن کا چیئرمین بھی ہے۔ وہ خود ۱۹۷۹ء میں وہ پہلی مرتبہ منتخب ہو کر ایوانِ پارلیمان میں پہنچے اور اس کے بعد لگاتار ۶ مرتبہ انہوں نے انتخابی کامیابی درج کرائی۔ خالدہ ضیاء کے دور

اقتدار میں وہ پارلیمانی امور کے مشیرِ خاص تھے۔ ان پر ٹاٹا گروپ کی ۳ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری میں رکاوٹ ڈالنے کا بھی الزام لگا ہے اور ان کی سزا کے پس پشت کارفرما عوامل میں اس کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔

بنگلہ دیش کا قیام نظریاتی طور پر لادین، ترقی پسندانہ، قوم پرست اصولوں پر کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں کے دستور میں مذہب کی بنیاد پر سیاست پر پابندی لگادی گئی اور سیکولرازم کو بنیادی ضابطہ قرار دے کر تمام مذہبی جماعتوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود شیخ مجیب الرحمٰن نے اعلانیہ کہا تھا کہ "انکو مسلمان ہونے پر فخر ہے اور انکی قوم دنیا کی دوسری بڑی مسلم قوم ہے"۔ عوامی لیگ نے مدارس کی امداد کے بجٹ کو، جو ۱۹۷۲ء میں ۵ء۲ ملین ٹکا تھا، ۱۹۷۳ء تک ۲ء۷ ملین ٹکا کر دیا۔ سرکاری میڈیا میں اسلام کے علاوہ ہندو مت، بدھ مت اور عیسائیت کو بھی اپنا نقطۂ نظر بتانے کا موقع دیا گیا، جو مذہبیت کے فروغ کا باعث بنا لیکن ان کی بیٹی نے شیخ مجیب الرحمٰن کی اس حکمت عملی کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔

گزشتہ دنوں میری ملاقات ایک بنگلہ دیشی مزدور سے ہوئی جو سڑک کے کنارے کھڑا کسی سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کو اپنی گاڑی میں بٹھانے کے بعد میں نے دریافت کیا تمہارے بنگلہ دیش میں فی الحال کیا چل رہا ہے؟ اس کم تعلیم

یافتہ شخص نے دو جملوں میں اس فرق کو واضح کرتے ہوئے حقیقت بیان کردی۔ اس نے کہا حسینہ واجد چاہتی ہیں کہ لوگ صرف نماز روزہ اور تسبیح و تحلیل میں لگے رہیں۔ اسلام کو عملی زندگی میں لانے کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔ اس لئے جو لوگ اسلامی نظام حیات کی بات کرتے ہیں وہ انہیں پھانسی پر لٹکا دیتی ہے۔ یہ آسان سی بات جو اس مزدور کی سمجھ میں تو آگئی اندانشوروں کی سمجھ میں نہیں آتی جو دن رات عدم رواداری کا رونا روتے رہتے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے پروفیسر کالبرگی کو یاد کرتے ہیں۔ ہندوستان کے صحافی دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ ایک تو سیکولر لوگ جو اپنی اسلام دشمنی کے سبب اس طرح کے واقعات سے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں مگر اپنی منافقت کو چھپانے کی خاطر اس کا اظہار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ دوسرے ہندو احیاء پرست وہ اس لئے بھی خاموش ہیں کہ حسینہ واجد کی حکومت ان کی ہمنوا ہے۔ یہی وجہ ہے اس ظلم عظیم کو ہندوستانی ذرائع ابلاغ نے پوری طرح نظر انداز کردیا۔

دو سال قبل جب علی احسن مجاہد نے عدالت میں یہ فیصلہ سنا توانہوں نے کٹھہرے میں کھڑے ہو کر جج سے کہا جنگ آزادی کے دوران میں فرید پور میں تھا ہی نہیں (تو اس قتل غارتگری میں کیسے ملوث ہوتا جس کا جھوٹا الزام مجھ پر لگایا جارہا ہے)۔ میرا جرم تو صرف یہ ہے کہ میں نے اسلامی تحریک سے وابستہ ہوں۔ انہوں نے قرآن مجید کے سورۃ البروج کی آیت بھی تلاوت کی جس کا ترجمہ

ہے: ’’ اور اُن اہل ایمان سے اُن کی دشمنی اِس کے سوا کسی اور وجہ سے نہ تھی کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے‘‘۔ امیر جماعت اسلامی ہند نے اس پھانسی کو خونِ ناحق قرار دیتے ہوئے انصاف کا قتل بتایا۔ تختہ دار کی جانب خوشی خوشی رواں دواں علی احسن مجاہد نے کہا میں اللہ کے دین کے لیے کئی بار جان قربان کرنے کو تیار ہوں۔ رب کائنات ایسے شہیدوں کا استقبال اس طرح فرماتا ہے کہ ’’اے نفسِ مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو مجھ سے راضی اور میں تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا جنت میں‘‘۔ امیر جماعت اسلامی (پاکستان) سراج الحق نے اس واقعہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ’’ان لوگوں نے امام حسینؓ کی یاد تازہ کر دی ہے۔‘‘ اسلام کے لیے موت کو گلے لگانے والے شیوۂ حسینیؓ پر عمل کرتے ہیں۔ یہ جذبۂ شہادت ہے۔ یہ لوگ شہید ہیں اور ان کے بابت حکم ربانی ہے کہ: جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں تم انہیں مردہ نہ کہو۔ وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ظلم و جبر کے خلاف عدل و قسط کا چراغ جلانے والے علی محمد احسن مجاہد اور صلاح الدین قدیر چوہدری جیسے آزادی کے متوالوں کو آنس معین تمام عالم پر محیط زندگی کی لکیر قرار دیتا ہے۔

زمیں تو بس ایک نقش پا ہے
اور عالموں پہ محیط ہوں میں
کہ دستِ قدرت میں زندگی کی لکیر ہوں میں

(علی محمد احسن اور قدیر چوہدری کے خلاف بے بنیاد الزامات کی تفصیل ان شاء اللہ پھر کبھی)

بھگوا بھارت: تمہاری انجمن ہے جس کو چاہو بے وفا کہہ لو

مرکزی حکومت آج کل دلت رائے دہندگان کی جانب خاص توجہ فرما رہی ہے۔ برطانیہ میں ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے گھر کو خرید کر نمائش گاہ بنانے کی تقریب میں وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ مہاراشٹر نے شرکت کی۔ دلتوں کے مسیحا اور دستور ساز کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی ۱۲۵ ویں جینتی دھوم دھام کے ساتھ ایوان پارلیمان میں منائی گئی ۔ اس موقع پر وزیر انسانی وسائل سمرتی ایرانی نے شرد یادو کے جلد کی رنگت والے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تصور کیجئے اگر دستور سازی کے وقت ایسے رہنما موجود ہوتے خواتین کے حقوق کا کیا حشر ہوتا؟ شرد یادو نے انشورنس بل پر بحث کرتے ہوئے سمرتی ایرانی سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ مجھے پتہ ہے تم کون ہو؟ جس وقت سمرتی ایرانی اپنے حقوق کی بحالی پر ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کو خراج عقیدت پیش کر رہی تھیں اس وقت ہریانہ میں خود ان کی پارٹی کے وزیر انل وِج ایک خاتون پولس کمشنر کے حقوق کی پامالی کر رہے تھے ۔ بھری محفل میں اس کو تہین کرکے الٹا تبادلہ کروا رہے تھے۔ ہریانہ حکومت کے رویہ پر کلیم عاجز کا یہ شعر صادق آتا ہے

بڑی ہی چالبازی آئے ہے اس آفت جاں کو\
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگاوے ہے

قول و عمل کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ باتیں ہوا میں ہوتی ہے اس لئے فقروں اور جملوں کو بہ آسانی سے توڑا مروڈا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس عمل چونکہ زمینی حقیقت ہوتا ہے اس لئے اس کا انکار وتردید بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس پر اگر کوئی حرکت ویڈیو کے فیتہ کے اندر قید ہوکر سوشیل میڈیا میں کینسر کی مانند پھیل جائے تب تو اس کا مسترد کرنا غیر ممکن ہوجاتا ہے۔ عدم رواداری پر شاہ رخ خان یا عامر خان کے بیانات کو غلط رنگ سے پیش کرنا نام نہاد دیش بھکتوں کیلئے جس قدر سہل ہے انل وِج کی سنگیتا کالیا کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کو حق بجانب ٹھہرانا اتنا ہی مشکل ہے۔ انل وِج نے عوام کے سامنے اپنا رسوخ دکھانے کی خاطر پہلے تو دھونس جماتے ہوئے شراب کی اسمگلنگ کے روک تھام کی تفصیل طلب کی۔ اس کے جواب میں یہ بتائے جانے پر کہ پولس نے ۲۵۰۰ پرچہ اسی سال کاٹے مگر عدالت نے انہیں رہا کردیا اور وہ پھر شراب بیچنے لگے ۔ اس پر منہ زور وزیر نے پوچھا پھر آپ نے کیا کیا؟ جواب ملا ہم ان کو جان سے تو نہیں مار سکتے ؟اس پر وزیر صاحب نے پولس پر شراب بکوانے کا سنگین الزام لگا دیا۔ جب اس کا یہ جواب ملا کہ شراب کے لائسنس تو حکومت دیتی ہے بات بڑھ گئی اور یہ بحث وتکرار اپنے حدود سے نکل گئی ۔ اس سے چراغ پا انل وِج نے سنگیتا کالیا کو دفعان ہونے کا (گیٹ

آوٹ) حکم دے دیا۔ سنگیتا نے جب کہا کہ میں نہیں جاوں گی تو وہ خود دم دبا کر چل دیئے اور سنگیتا کا لیا کا تبادلہ کروادیا۔ سنگیتا کالا پہلے تو اپنی بیباکی سے وزیر صحت کو بیمار کیا اور وزیر کھیل کود کو عملاً سمجھادیا کہ کسی آئی پی ایس افسر کے ساتھ الجھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

اس واقعہ میں عدم رواداری کی وجوہات ،اس کا رویہ اور انجام سب کچھ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ عدم رواداری کی بنیادی وجہ کبر و غرور ہوتا ہے۔ شراب اسمگلنگ کی شکایت کرنے والے عام آدمیاور وزیر موصوف کے لب و لہجے میں فرق کی بنیادی وجہ عہدے اور حیثیت کا تکبر ہے ۔میں وزیر ہوں ۔ میری ہر بات درست ہے ۔ میرے آگے ہر کسی کو سرِ تسلیم خم کرلینا چاہئے اور اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو میں اسے ذلیل و رسوا کروں گا۔ اس کو دھونس دھمکی دوں گا ۔ یہ عدم رواداری کا طور طریقہ ہے اس کے نتیجے میں اگر میرا مخالف میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو تو اپنی پیٹھ تھپتھپاوں گا ورنہ اپنا گال سہلاتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑا ہووں گااور پھر چھپ کر اس سے انتقام لوں گا۔ یہ ساری باتیں سنگیتا اورانل کے تنازع میں کھل کر سامنے آگئیں ۔ اقتدار کے نشے میں لڑکھڑانے والوں کیلئے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

انل وِج کوئی نوعمر سیاستداں نہیں بلکہ پانچ مرتبہ انتخاب جیت چکے ہیں اس کے باوجود ان کی کم فہمی کا یہ عالم ہے کہ دادری سانحہ کے بعد انہوں نے وزیراعظم کو خط لکھ کر بنگالی شاہی چیتے کے بجائے گائے کو اس لئے قومی جانور بنانے کا مطالبہ کیا کیونکہ ان کے خیال میں ملک کے بیشتر حصے میں گائے کو مقدس مان کر اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ اس مطالبے کے بعد ایسا لگا کہ گئو ماتا سے عقیدت و محبت وِج سے یہ مطالبہ کروارہی ہے مگر سنگیتا کالیاکے سانحہ کے بعد ایک اور پہلو سامنے آگیا۔ گیٹ آوٹ کہنے کے بعد چپ چاپ گیٹ آوٹ ہونے والا کاغذی شیر دلیر چیتے کا شکاری نہیں بلکہ بے ضرر گائے کا بھکت ہی ہو سکتا ہے۔

ہریانہ میں بی جے پی کو گزشتہ سال جب پہلی بار اقتدار ملاتو اس وقت انل وِج وزیراعلیٰ کی دوڑ میں سب سے آگے تھے۔ وہ وزیراعلیٰ تو نہیں بن سکےاس کے باوجود تین عدد اہم وزارتی قلمدان ان کے پاس ہیں۔ سچ تو یہ ہے خود سر انل وِج وزیراعلیٰ منوہر لال کھٹر کو بھی منہ نہیں لگاتے اوراپنے بڑبولے پن کی وجہ سے ہمیشہ ذرائع ابلاغ میں رہتے ہیں۔ مرکزی حکومت کی جانب سے 'بیٹی بچاو۔ بیٹی پڑھاو' مہم کو ہریانہ میں عملی جامہ پہنانے کیلئے جب فلمی اداکارہ پرنیتی چوپڑہ کو علامتی سفیر (برانڈ ایمبسیڈر) بنایا گیا تو وہ کافی ناراض

ہوگئے اور کہا میں نہیں جانتا کہ کس نے انہیں میرے شعبہ کی ذمہ داری دے دی۔ اس کے بعد وزیراعلیٰ پر تنقید کرتے ہوئے کہہ دیا۔ میرے شعبے میں خونصی دلچسپی لینے کیلئے وزیراعلیٰ آپ کا شکریہ، میں اب بے فکر ہوگیا ہوں۔

انل وِج کی بیانات کی روشنی میں فسطائی ذہنیت کو سمجھا جا ستاز ہے۔ انہوں نے جون میں کہا تھا یوگا ایک قدیم ہندوستانی حکمت ہے جس کا لوہا ساری دنیا تسلیم کرتی ہے۔ یوگا کی مخالفت کرنے والے لوگ غدار ہیں۔ ان کا منہ بند کردیا جانا چاہئے۔ جہاں تک غداری کا سوال ہے فی الحال حکومتِ وقت کی مخالفت کرنے والا ہر شخص وطن کا باغی ہے لیکن منہ بند کروانے والے نے یہ نہیں بتایا کہ اس کارِ خیر کو کیسے عملی جامہ پہنایا جائے؟ شاید وہ جانتے نہ ہوں یا کوئی ایسا طریقہ ان کے ذہن میں ہو جس کا اظہار سیاسی طور پر نقصان دہ ہو۔ اس سانحہ میں جب اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا تو اسے پتہ چلا کہ مخالفین کی چونچ کیسے بند کی جاتی ہے؟ سنگیتا کالیا نے جس طرح وزیر موصوف کا بینڈ بجایا ہے اس کے بعد کوئی ذی عقل وزیر کسی خاتون افسر سے بھری محفل میں الجھنے کی گستاخی نہیں کرے گا۔

مثل مشہور ہے کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اگر ایسا ہے تو ہر مرد کی رسوائی کے آگے بھی کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ

ہونا چاہئے۔ عامر خان کو لیجئے کل تک وہ بے مثال بھارت کا سفیر (یعنی انکریڈبل انڈیا کا برانڈ ایمبسیڈر) ہونے کے سبب دیش بھکتوں کی نظر میں ہیرو نمبر ون تھا لیکن عدم رواداری کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال پر اسے اپنی اہلیہ کرن راو کا خدشہ یاد آگیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنی اہلیہ کی بات کو توجہ سے سنتا ہی نہیں یا فوراً اپنی یادداشت سے نکال دیتا اور اگر وہ بھی ممکن نہیں تھا تو کم از کم بھری محفل میں اسے بیان کرنے سے گریز کرتا لیکن بیچارے عامر کا 'دل ہے کہ مانتا نہیں'۔ اس نے نہایت احتیاط اور افسوس کے ساتھ اپنی ہندو اہلیہ کی بات بیان کرکے 'قیامت سے قیامت تک' پھر سے ریلیز کردی۔ اربابِ اقتدار اور ان کے ہمنوا اپنے چہیتے 'سرفروش' کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے اس کو پھانسی پر چڑھانے کا مطالبہ کرنے لگے۔

انل وِج سے بھی یہی غلطی ہوئی کہ اول تو انہیں سنگیتا سے سوال کرنا نہیں چاہئے تھا۔ کر ہی لیا تھا تو ان کے جواب کو نظر انداز کرا گلے سوال کی جانب بڑھ جانا چاہئے تھا۔ اگر ایسا بھی ممکن نہیں تھا ان سے سرِ بازار الجھنے کے بجائے خاموشی سے تبادلہ کروادیتے لیکن وہ ان سارے محاذوں پر ناکام ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو عوام کے سامنے ذلیل ہوکر رنچھوڑ داس کہلائے اور بعد میں ابلہ ناری پر ظلم کرنے والے بزدل مہاویر کے لقب سے نوازے گئے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ یہ تو 'بس ایک جھانکی ہے، معافی اور جیل باقی ہے'۔

آگے خطرناک مراحل ان کے منتظر ہیں۔ ہریانہ کی سڑکوں پر ان کے پتلے جلائے جارہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں ان پر عامر اور شاہ رخ سے تنقید ہو رہی ہے۔ سرکاری افسران کی تنظیم نے سنگیتا کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہم ان کی جرأت کو سلام کرتے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں کہ اعلیٰ افسران کے وقار کا خیال رکھا جائیگا۔ معافی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر یہ توہین نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

یہ معاملہ زبانی معافی تلافی سے آگے بھی جاسکتا ہے۔ جس بابا صاحب امبیڈکر کی تعریف و توصیف آج کل آسمان سے باتیں کررہی ہے انہیں کے وضع کردہ دستور ہند میں ۱۹۸۹ء کے اندر دلتوں اور قبائلی لوگوں کو بر سرِ عام توہین سے محفوظ رکھنے کیلئے ایکٹ میں ترمیم کی گئی جس کے ذریعہ دلتوں کی کھلے عام اہانت کو قابلِ تعزیز جرم قرار دیا گیا۔ ہریانہ کی شیڈول کاسٹ شیڈول ٹرائب ایسو سی ایشن کے عہدیدار ایشور سنگھ نے بتایا کہ انہوں نے ریاست کے چیف سکریٹری سے سات دن کے اندر ایک تفصیلی رپورٹ طلب کی ہے۔ انہوں نے اس معاملے پر کڑا رخ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ لوگ حکومت کے جواب سے مطمئن نہیں ہوں گے تو وزیر موصوف کے خلاف عدالت میں تعزیری مقدمہ داخل کریں گے۔

اس مقدمہ کے تحت اگر انل وِج کا وارنٹ جاری ہوجائے تب بھی انہیں وزارت سے

ہاتھ دھونا پڑے گا اور اس کے بعد جیل بھی جانا پڑ سکتا ہے۔ اگر انہوں نے جیل جانے سے کسی طرح اپنے آپ کو بچا بھی لیا تب بھی پارٹی کی بدنامی تو بہت ہوگی ۔ اس کے نتیجے میں بہوجن سماج کو ساتھ لے کر اترپردیش میں انتخاب لڑنا بھی بی جے پی کیلئے مشکل ہوجائیگا اور اترپردیش انتخاب کے بعد بھی انل وِج کو اپنا وہی بیان دوہرانا پڑے گا جو انہوں نے بہار کے نتائج کو دیکھکر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ’’بہار انتخاب میں ذات پات کی سیاست کامیاب ہوگئی اور اتحاد، یکجہتی اور ترقی ہار گئی۔ دیش کیلئے یہ بہت منحوس اشبھ دن) ہے۔ ہوشیار (ساودھان)۔ ۸ نومبر ملک کیلئے مبارک تھا یا منحوس اس پر تو) اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ۲۷ نومبر انلِ وِج کیلئے یقیناً منحوس ترین دن تھا۔ اس واقعہ میں سرکار دربار کے لوگوں کی خاطر یہ نصیحت ہے کہ ۔

بات گرچہ بے سلیقہ ہو کلیم

بات کرنے کا سلیقہ چاہیے

اس بار ایوان پارلیمان کے سرمائی اجلاس میں یوم دستور کا اہتمام کرکے ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقع پر بھی وزیر داخلہ اپنے آپ کو عامر خان کی چٹکی لینے سے نہیں روک سکے اور کہہ گئے کہ ہزار ہا توہین برداشت کرنے کے باوجود ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے دل میں ملک چھوڑنے کا خیال نہیں آیا۔ اس احمقانہ بیان میں وزیر داخلہ نے اول تو یہ

تسلیم کیا کہ بابا صاحب امبیڈکر تک کی توہین کی جاتی تھی۔ دوسرے انھوں نے اہانت آمیز سلوک کرنے والوں کی مذمت کرنے کے بجائے عوام کو بلاواسطہ ذلت برداشت کرنے کی نصیحت کرڈالی۔ اس کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے سیکولرزم اور سوشلزم کے الفاظ کو دستور میں شامل کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ راجناتھ نے یہاں تک کہا کہ فی الحال سیکولرزم کا سب سے زیادہ غلط استعمال کیا جارہا ہے۔ اس طرح گویا یوم دستور پر وزیر داخلہ نے دستور ہند کی جڑ پر کلہاڑی چلادی۔

ایوان کے اندر کانگریس کے پارلیمانی بورڈ کے رہنما ملک ارجن کھرگے اس اوٹ پٹانگ منطق پر خاموش نہیں رہ سکے اور درمیان میں اسپیکر مہاجن کے منع کرنے کے باوجود میں کھڑے ہوگئے۔ یہ دیکھ کر راجناتھ سنگھ خود بیٹھ گئے اور کھرگے کو اپنا موقف رکھنے کا موقع دیا۔ کھرگے نے راجناتھ کے تینوں اعتراضات کا ترکی بہ ترکی دے کر ان کے لیڈر بنائے جانے کو حق بجانب ٹھہرادیا۔ کھرگے نے کہا آپ لوگ زیادہ دیش بھکتی کا ناٹک نہ کریں۔ آپ آریہ قوم کے لوگ اس ملک میں حملہ آور بن کر باہر سے آئے ہیں ۔ بابا صاحب کو ملک چھوڑ کر جانے کا خیال کیوں آتا وہ تو یہاں کے اصلی باشندوں میں سے تھے۔ ہم (دلت/دراوڈ) تمام تر ذلت و رسوائی برداشت کرنے باوجود ۵۰۰۰ سالوں سے اس ملک کا دفاع کررہے ہیں۔

ہندوتوانواروں کو آئینہ دکھانے کے بعد کھرگے نے کہا بابا صاحب سیکولرزم اور سوشلزم کے الفاظ دستور میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن اس وقت حالات سازگار نہیں تھے ۔ ایسا ہندو کوڈ بل کے ساتھ بھی ہوا تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں ان لوگوں کے نام بتاوں جنھوں نے اس کی مخالفت کی تھی ۔ آخری بات انہوں نے یہ کہی کہ اگر دستور کی بنیادوں سے کھلواڑ کرنے کی کوشش کی گئی تو اسے برداشت نہیں کیا جائے گا اور ملک میں زبردست خون خرابہ ہوگا۔ اس طرح گویا عامر خان کو جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی بلکہ راجناتھ سنگھ کو ان کے سوال کا منہ توڑ جواب ایوان کے اندر ہی مل گیا ۔

عدم رواداری پر مہیش بھٹ کے تاثرات زیادہ قرین قیاس ہیں اس لئے کہ وہ ان کے ذاتی تجربات ہیں ۔ انہوں نے کہا ’’ہمارے اجداد نے ہم سے کہا تھا کہ یہ ملک سب کا ہے اور لیکن اب یہ ملک ہم سے کہہ رہا ہے کہ ’’دیکھو! یہ ہمارا ملک ہے، تمہارا نہیں ہے‘‘۔ مہیش بھٹ کے والد اہندو مگروالدہ مسلمانتھیں،وہ ان سے کہتی تھیں ’’تم تو ایک ہندو باپ کی اولاد ہو۔ تم اپنی اسی پہچان کو لے کر آگے چلو، کیوں کہ یہ ملک اُن کا ہے۔ جیسا وہ چاہتے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔‘‘ جب وہ اپنی والدہ سے لڑتے اور ملک کے آئین میں برابری کے حق کا تذکرہ کرتے تو وہ کہتیں ’’ بیٹا !زیادہ حجت مت کیا کرو۔ اس ملک نے، اس سوچ نے گاندھی کو

نہیں بخشا، تو تجھے کیا بخشے گا۔ یہ تجھے بھی مار ڈالیں گے۔ میں کچھ نہ کر سکوں گی !۔۔۔"

یہ اس وقت کی بات ہے، جب بی جے پی یا آر ایس ایس سے اقتدار سے دور تھے اب تو ان کے ہاتھ میں قوم کی زمامِ کار ہے ایسے میں کلیم عاجز کا یہ شعر یاد آتا ہے

تمہاری انجمن ہے جس کو چاہو بے وفا کہہ لو
تمہاری انجمن میں تم کو جھوٹا کون سمجھے گا

۶ دسمبر: مندر نہیں بنائیں گے (قسط دوم)

کسی زمانے میں سنگھ پریوار کا نعرہ تھا 'مندر وہیں بنائیں گے' لیکن اب اس کا موقف بدل کر 'مندر نہیں بنائیں گے' ہوگیا ہے۔ اس تبدیلی کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اس باسی کڑھی میں اب ابال نہیں آتا۔ عوام اس کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ اس کے ذریعہ عوام کا جذباتی استحصال کرکے ووٹ حاصل کرنا ناممکن ہوگیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک مندر کی تعمیر کا سوال ہے سنگھ والوں کو اس میں دلچسپی نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ سنگھ پریوار کے لوگ تو صرف کیمرے کے آگے پوجا پاٹ کرتے ہیں اور اس کے ہٹتے ہی سیاسی داؤں پیچ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ رام مندر کے بیج سے سارا تیل نکالا جا چکا ہے اب اس کے برادے پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ ویسے بعید نہیں کہ اس نسل کے گزر جانے کے بعد جو یہ کھیل تماشے دیکھ چکی ہے ایسے نئے لوگوں کے سامنے جو واقف نہ ہوں یہ مسئلہ پھر سے زندہ کردیا جائے۔ پونر جنم میں وشواس رکھنے والے یہ لوگ خود تو دوبارہ جنم نہیں لے سکتے۔ مگر ان کے پیدا کردہ تنازعات مثلاً گائے، لوجہاد، گھر واپسی، یکساں سول کوڈ، دستور کی شق ۳۷۰، مسلمانوں کی آبادی وغیرہ کا باربار جنم ہوتا رہتا ہے۔

رام مندر تحریک کے متعلق مذکورہ دعویٰ محض خام خیالی نہیں ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲

کے بعد رونما ہونے والے واقعات پر غائر نظر ڈالنے پر یہ حقیقت اپنے آپ عیاں ہوجاتی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ رام مندر کی تحریک ۱۹۸۴ء سے اٹھ کر ۱۹۹۲ء میں بامِ عروج پر پہنچی ۔ اس پورے عرصے میں ہندوستان کے اندر کانگریس یا تیسرے محاذ کی حکومت تھی مگر اس کے زوال کا آغاز شیلا دان سے ہوا جب قومی جمہوری محاذ کے نام پر بی جے پی برسرِ اقتدار تھی ۔ اٹل جی دورِ اقتدار میں ۱۵ مارچ ۲۰۰۲ء کو وشو ہندو پریشد کے اشوک سنگھل اور رام جنم بھومی نیاس کے مہنت رام چندر پرمھنس نے عارضی رام مندر کے اندر سپریم کورٹ کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے علامتی پوجا پاٹ کا اعلان کرکے ہلچل مچادی۔ ان لوگوں کو امید تھی کہ جب نرسمہاراو ہمیں چور دروازے سے مسجد کو ڈھانے کی اجازت دے سکتے ہیں تو ہمارے اپنے لوگ پوجا کرنے سے کیونکر روک سکتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مرکزی حکومت نے وی ایچ پی اور آر جے این کو مجبور کیا کہ وہ شیلا نیاس کرنے کے بجائے دگمبر اکھاڑہ ہی میں وزیر اعظم کے دفتر سے آنے والے شتروگھن سنگھ کو شیلا دان کردیں ۔ شیلا دان کیلئے بابری مسجد کی اراضی سے قریب جس رام کوٹ محلّہ کا اعلان کیا گیا تھا وہاں تک بھی جانے کی اجازت حکومت نے انہیں نہیں دی ۔

کارسیوک رام بھکتوں نے اس تبدیلی کو دھوکہ دھڑی قرار دیا اور سنگھل و پرمھنس پر خوب لعن طعن کی۔ وی ایچ پی کے اس احمقانہ اقدام کی مخالفت کرتے

ہوئے نرموہی اکھاڑے کے مہنت جگناتھ داس نے کہا سرحد پر کشیدگی کے چلتے یہ تنازعہ غیر دانشمندانہ ہے۔ مہنت جگناتھ نے واضح کیا چونکہ رام مندر کی زمین پر حق ملکیت کا دعویٰ نرموہی اکھاڑے کا ہے اس لئے مندر زمین کسی اور کو نہیں دے سکتی۔انہوں نے یہ سنگین الزام بھی لگایا کہ اشوک سنگھل نے انہیں حق ملکیت منتقل کرنے کے عوض دس کروڑ روپے رشوت کی پیشکش کی جسے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ میں اپنا عقیدہ نہیں بیچ سکتا۔ رام چبوترہ کے دعویدار مہنت رگھور داس نے الزام لگایا کہ ان کا اکھاڑہ ۱۸۸۵ء سے عدالتی جنگ لڑ رہا ہے۔ وی ایچ پی والے عوام کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔جب ان کو زمین ہی نہیں ملے گی تو وہ مندر کیسے بنائیں گے ؟ ایودھیا کے چوتھے بڑے

اکھاڑے ہنومان گڑھی کے سربراہ مہنت گیان داس بھی وی ایچ پی کے مخالف تھے۔ وہ سب عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنے کے قائل تھے۔ان کا یہ الزام بھی تھا کہ سنگھ پریوار نے رام چندر پرمہنس کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور ان کا استحصال کررہا ہے۔

پرمہنس مورتی رکھنے سے لے کر بابری مسجد کی شہادت تک تو بہت سرگرم تھے مگر میں شیلادان کے تماشے نے ان کا دل توڑ دیا۔ سپریم کورٹ نے چونکہ جون کی ۲۰۰۲ء تاریخ دے رکھی تھی اس لئے اشوک سنگھل نے عوام کو بے وقوف بنانے کیلئے ۱۰۰ دنوں کا پورن آہوتی یگیہ شروع کردیا مگر رامچندر پرمہنس اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ان کا لب ولہجہ بدل گیا اور وہ باہمی مفاہمت سے اس قضیہ کو چکانے کا

راگ الاپنے لگے ۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ رام مندر کو مقامی لوگوں پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ بڑی آسانی سے نمٹ جاتا مگر سیاستدانوں نے اپنے مفاد کی خاطر اسے بگاڑ دیا۔ اپنے مقلدین سے انہوں نے یہاں تک کہا کہ میرا مندر کسی ایک بھی مسلمان کے خون پر نہیں بنے گا۔ ٦ جولائی ۲۰۰۳ء کو دل کا دورہ پڑنے سے رامچندر پرمہنس کا انتقال ہوگیا۔ وی ایچ پی کے نائب صدر گری راج کشور نے الزام لگایا کہ ایک ماہ قبل لال کرشن اڈوانی سے ملاقات کے بعد وہ شدید دباو میں تھے اور ان کے ہلاکت خیز دورے کا سبب اڈوانی جی ہیں۔ اس طرح گویا نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اڈوانی نے نادانستہ سہی رام جنم بھومی تحریک کی ایک ٹانگ توڑ دی۔

میں بالآخر بی جے پی حکومت رام للا کو اپنے پیش روز سہاراو کے تعمیر کردہ ۲۰۰۴ء عارضی چھجے میں چھوڑ کر رخصت ہو گئی ۔ اس تحریک میں دوسری دراڑ ۲۰۰۹ء کے انتخاب سے قبل پڑی جب اڈوانی جی پھر ایک بار وزیر اعظم کی دوڑ میں کمر کس کے اترے۔ اس وقت ان کی راہ کا سب سے بڑا روڑہ بابری مسجد کی شہادت کا داغ تھا۔ رتھ یاترا کے مہار تھی ایل کے اڈوانی نے اپنا دامن اجلا کرنے کیلئے پہلے تو یہ صفائی دی کہ ان کا ارادہ بابری مسجد کی مسماری نہیں تھا۔ اس کے بعد بولے وہ بابری مسجد کی مسماری پر سوگوار تو ہوئے مگر انہیں اس کا افسوس نہیں ہے ۔ آگے چل کر جب محسوس ہوا کہ یہ کافی نہیں ہے تو اعلان

کردیا کہ ۶ دسمبر ان کی زندگیکا رنجیدہ ترین دن تھا۔ یہ اعتراف انہوں نے نہ صرف اسلام آباد میں جا کر کیا بلکہ اپنی سوانح حیات ''میرا ملک میری زندگی'' میں بھی اسے درج کیا۔ اڈوانی جی اپنی ساری قلابازیوں کے باوجود نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ اشوک سنگھل نے اڈوانی جی کے رویہ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا اڈوانی جی اس طرح کا مدافعانہ رویہ ترک کردیں۔ وہ ہندووں کی تاریخ کا روشن ترین باب تھا۔ تپن گھوش نامی راشٹر سنگھ کے ایک مخلص کارکن نے ۶ دسمبر ۲۰۰۹ء کو اشوک سنگھل کے نام ایک کھلا خط لکھا۔ اس خط کا اقتباس اندر کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس خط کے اندر رام مندر کی تعمیر میں خارجی رکاوٹوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا تھا کہ رام مندر تحریک کے رہنماوں سے ایک عظیم غلطی سرزد ہوئی۔ انہوں نے رام مندر تحریک کے ذریعہ حاصل کردہ سرمایہ کو سیاست کی نذر کردیا اور اکثریت میں آنے سے قبل ہی اقتدار پر فائز ہوگئے۔ اس کے پس پشت اقتدار کا لالچ کارفرما تھا۔ تحریکی رہنماوں نے حرص و ہوس کے علاوہ مایوسی و انتشار کا شکار ہو کر اپنے نظریات سے مفاہمت کرلی اور اس جرم میں نہ صرف بی جے پی بلکہ پورا سنگھ پریوار شریک ہے۔ انہوں نے اپنی گاڑیوں پر سرخ بتی لگوانے کیلئے رام مندر کو لال بتی دکھادی۔ جب تک پہلے مندر اور پھر اقتدار تھا تحریک کامیاب تھی لیکن جب اقتدار کی مندر پر فوقیت ناکامی

کا سبب بن گئی۔ اصول و نظریات پر اقتدار و آسائش کی ترجیح نے بیڑہ غرق کردیا۔ تپن کا خیال تھا سنگھ نے جلد بازی سے کام لیا۔ اسے اکثریت میں آنے کا انتظار کرنا چاہئے تھا مگر آج اگر وہ زندہ ہے تو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ بی جے پی کا اپنے بل بوتے پر اقتدار میں آنا بھی رام مندر کے کسی کام نہیں آسکا۔

۲۰۱۴ء کے انتخابات سے قبل اڈوانی جی کا ٹکٹ کٹ گیا۔ مودی جی نے رام مندر کا سہارا لینے کے بجائے 'سب کا ساتھ اور سب کا وکاس' والا نعرہ بلند کرکے اپنے دامن پر لگے گجرات فساد کے داغ کی پردہ پوشی کی اور اقتدار میں آگئے اس طرح گویا رام مندر تعمیر کرنے کی ذمہ داری سے وہ اپنے آپ سبکدوش ہوگئے۔ اب وی ایچ پی والے بھی ان پر یہ الزامات نہیں لگا سکتے تھے کہ انہوں نے رام مندر کے نام پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اسے بھلا دیا۔ اشوک سنگھل کو بھی اس بات کا شدید احساس ہوگیا تھا کہ مودی حکومت ان کے مرہونِ منت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سال ۲۱ دسمبر کو اشوک سنگھل نے ایک کتاب کی تقریبِ رونمائی میں طول طویل تقریر کی اور دعویٰ کیا کہ ان پچاس سالہ جدو جہد کے نتیجے میں ۸۰۰ سال کی غلامی کے بعد ہندو اپنا گنوایا ہوا سامراج قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اسی بیان کو محمد سلیم نے ایوان پارلیمان میں راجناتھ سے جوڑ کر ہنگامہ مچا دیا۔

اشوک سنگھل نے بارہویں صدی کے پرتھوی راج چوہان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ۸۰۰ سال بعد ملک ہندوتوا کی محافظ سرکار عالم وجود میں آئی اور مرحلہ وار ہماری اقتدار کو قائم کیا جارہا ہے۔ انہوں نے ہندو سماج کے ذریعہ عالمی فلاح و بہبود کی بات کی اور کہا ہم لوگوں کا دین نہیں بلکہ ان کا دل بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ بات اشوک سنگھل نے گھر واپسی تحریک کے دوران کہی تھی۔ عالمی جنگ سے لے کر اسلامی دہشت گردی تک بے شمار مسائل سنگھل کی تقریر میں زیر بحث آئے لیکن وہ رام مندر کے ذکر سے خالی تھی۔ جو شخص رام مندر کے بغیر ایک نوالہ نہ نگلتا ہو اس کا اس مسئلہ کو ڈکار جانا کھلا اعتراف تھا کہ رام چندر پرمہنس کی موت کے گیارہ سال بعد سنگھل بھی مایوسی شکار ہو چکے ہیں اور یہ کارِ خیر بھی بی جے پی کے زیر اقتدار ہوا۔

۱۵ ستمبر ۲۰۱۵ء کو اشوک سنگھل ۸۹ ویں سالگرہ کے موقع پر ان کی سوانح حیات بنام 'ہندوتوا کے پرودھا' کا اجراء عمل میں آیا۔ اس موقع پر آر ایس ایس کے صدر موہن بھاگوت، وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ کے علاوہ سوامی ستیامترانند اگیری، سادھوی رتھمبرا، سادھوی نرنجن جیوتی، راگھوالو ریڈی، مرکزی وزراء مہیش شرما اور ہرش وردھن موجود تھے۔ ان لوگوں نے اشوک سنگھل کی خدمت میں طول طویل خراج عقیدت پیش کیا مگر سوائے وی ایچ پی کے صدر وشنو ہری

ڈالمیا کے کسی نے جھوٹے منہ رام مندر کے تعمیر کی بات بھی نہیں کی۔ ڈالمیا نے کہا جنم دن کے موقع پر تحفے تحائف دینے کی قدیم روایت ہے۔ میں وزیراعظم سے کہوں گا کہ وہ اشوک سنگھل جی کو ان کی ۹۰ ویں سالگرہ پر رام مندر کا تحفہ دیں۔ راجناتھ سنگھ یہاں موجود ہیں اور وہ اس پیغام کو مودی تک پہنچا سکتے ہیں۔ بیچارے ڈالمیا نہیں جانتے تھے کہ آئندہ سالگرہ کا تحفہ لینے کیلئے سنگھل خود موجود نہیں ہوں گے۔ اس مجلس کے بعد مبصرین نے لکھا تھا کہ اشوک سنگھل خود مودی سرکار کے رام مندر کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دینے سے بہت تشویش کا شکار ہیں۔ اس تقریب کے دوماہ بعد اشوک سنگھل بھی اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے اور اس طرح رام جنم بھومی تحریک کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی بلکہ بی جے پی کے ہی دورِ اقتدار میں اشوک سنگھ کے ساتھ رام مندر تحریک نے بھی دم توڑ دیا ہے۔ تپن کمار گھوش نے اشوک سنگھل کی حیات میں ان کو خیرباد کہتے ہوئے میں لکھا تھا پورے سنگھ پریوار میں رام مندر کے سب سے بڑے حامی ہونے کے ۲۰۰۹ باوجود آپ اس جنم میں جس حقیقت کا ادراک نہ کر کے لیکن چونکہ ہندو پونر جنم میں وشواس رکھتے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ اگلے جنم میں آپ یہ ضرور دیکھیں گے۔

اس سال ۳۰ ستمبر کو وشو ہندو پریشد کی ایک پریس کانفرنس میں سبرامنیم سوامی بھی شریک ہوئے اور مرکزی حکومت پر زور دیا کہ وہ بابری مسجد کی خطہ اراضی

کو اپنی تحویل میں لے کر مسلمانوں کو اس کے عوض سریو ندی کے دوسری جانب مسجد کی تعمیر کیلئے متبادل جگہ عطا کردے۔ اس موقع پر سوامی نے بتایا کہ وہ وزیراعظم کو خط لکھ کر مندر کی تعمیر کیلئے کئی تجاویز پیش کرچکے ہیں لیکن ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ٹویٹر کے بادشاہ مودی جی کی اس نازک معاملہ میں خاموشی حیرت انگیز نہیں ہے؟ سوامی نے یہ بھی کہا وہ امیت شاہ سے اس مسئلہ پر قومی کونسل کے خصوصی اجلاس کی درخواست بھی کرچکے ہیں لیکن وہاں بھی سناٹا چھایا ہوا ہے۔ صحافیوں نے جب پوچھا اس بابت بی جے پی حکومت کا موقف کیا ہے تو اشوک سنگھل نے مبہم جواب دیتے ہوئے کہا رام مندر کی تعمیر پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ اشوک سنگھل نے یہ بھی بتایا تھا کہ جنوری کی ۱۰ اور ۱۱ تاریخ کو دہلی میں رام مندر کا مسئلہ کے قانونی حل پر بحث کرنے کیلئے ایک قومی سیمینار کا انعقاد کیا جائیگا۔ اشوک سنگھل نہیں جانتے تھے کہ فرشتۂ اجل ان کو سیمینار میں شریک ہونے کا موقع نہیں دے گا۔

ایودھیا شہر کے فیصل آباد میں رہنے والے محمد مصطفیٰ اپنی پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے دن اشوک سنگھل نے فوجی لباس زیب تن کر رکھا تھا اور کارسیوکوں کو احکامات صادر کررہے تھے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس قیامت کی گھڑی میں محمد مصطفیٰ وہاں کیا کر رہا تھا؟ دراصل اس وقت

محمد مصطفیٰ کا نام شیو پرساد تھا۔ وہ بجرنگ دل کا کپتان تھا۔ اس نے چار ہزار لوگوں کو اس بات کی تربیت دی تھی کہ بابری مسجد کو کیسے شہید کیا جائے۔ وہ ان چند بدنصیب لوگوں میں سے ایک تھا جو بابری مسجد کے گنبد پر چڑھ گئے تھے۔ مسجد کی شہادت کے بعد اس کے اندر داخل ہونے والوں اور واپس آکر فیصل آباد میں رام رام ۔جئے شری رام کا نعرہ لگانے والوں میں شیو پرساد پیش پیش تھا۔

شیو پرساد کی تقدیر نے پلٹا کھایا۔ اس کے اندر احساسِ جرم نے جنم لیا۔ اس کو محسوس ہونے لگا کوئی بہت بڑا گناہ اس سے سرزد ہوگیا ہے وہ بے چین رہنے لگا۔ اسی کیفیت میں ۱۹۹۷ء کے اندر وہ ملازمت کی خاطر شارجہ پہنچ گیا۔ یہاں بھی کام میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ ۱۹۹۸ء میں جمعہ کے دن وہ ایک مسجد کے باہر سے گزر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں اردو خطبے کے الفاظ پڑے۔ وہ رک کر سننے لگا۔ اللہ کی ہدایت اس کے دل میں اترنے لگی ۔اس کے بعد ہر جمعہ کو مسجد کے قریب بیٹھ کر خطبہ سننا اس کا معمول بن گیا یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا یہاں تک کہ بابری مسجد کی شہادت کے ۷ سال بعد ۶ دسمبر ۱۹۹۹ء کو شیو پرساد نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ کائنات ہستی ایک امتحان گاہ ہے جس میں مختلف لوگوں کو ایک ہی امتحانی پرچہ ملتا ہے لیکن وہ متضاد نتائج سے ہمکنار ہوتے ہیں ۔اشوک سنگھل اور شیو پرساد کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

محمد مصطفیٰ (شیوپرساد) کے کٹر سنگھیوالد ترکال پرشاد اور دوسرے اہل خانہ کو جب پتہ چلا کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا ہے تو وہ اس کے سخت مخالف ہوگئے۔ وی ایچ پی اور بجرنگ دل کے لوگ اسے جان سے مارنے دھمکی دینے لگے لیکن محمد مصطفیٰ کا کہنا ہے کہ اس کے دین رحمت سے پھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب تو جان اسی دین حنیف پر جائیگی۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے اہل خانہ اور دیگر سنگھی بھی اسلام قبول کرلیں۔ اشوک سنگھل کے حق میں تو محمد مصطفیٰ کی دعا قبول نہیں ہوئی لیکن کون جانے کس کے حق میں قبول ہوجائے؟ اشوک سنگھل اور شیوپرشاد (محمد مصطفیٰ) کی زندگی میں ان تمام لوگوں کیلئے پیغامِ نصیحت ہے جو دیدۂ عبرت نگاہ رکھتے ہیں۔ اشوک سنگھل کے عبرت ناک انجام پر خواجہ عزیزالحسنین مجذوب کی مشہور زمانہ نظم یاد آتی ہے

اجل نے نہ کسریٰ ہی چھوڑا نہ دارا
اسی سے سکندر سا فاتح بھی ہارا
ہر ایک چھوڑ کے کیا کیا حسرت سدھارا
پڑا رہ گیا سب یہیں ٹھاٹ سارا
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

یہ اور بات دل پہ قیامت گزر گئی، لیکن شکست سے بھی بڑا فائدہ ہوا

وزیر اعظم جو آج کل مفاہمت اور سمجھداری کی باتیں کر رہے ہیں اس کے پیچھے دہلی سے شروع ہو کر بہار، اترپردیش اور اب یہ مدھیہ پردیش سے ہوتا ہوا گجرات تک پہنچنے والا شکست و ریخت کا طویل سلسلہ کارفرما ہے۔ گجرات گرام پنچایت کے انتخابی نتائج کو دیکھنے کے بعد یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ انہوں نے بڑودہ کے حلقۂ انتخاب پر وارانسی کو ترجیح کیوں دی؟ گجرات کا جھٹکا بہار سے زوردار ہے۔ اس لئے کہ گجرات نہ صرف وزیر اعظم کی کرم بھومی ہے بلکہ امیت شاہ بھی وہیں کہ دھرتی پتر ہیں ۔ ان کے علاوہ وزیر خزانہ ارون جیٹلی بھی ایوانِ بالا میں گجرات کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ انسانی وسائل کی وزیر سمرتی ایرانی کا تعلق بھی گجرات سے ہے اور بی جے پی کے بھیشم پتامہ لال کرشن اڈوانی کا حلقۂ انتخاب بھی گجرات ہی میں ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ۱۵ اگست ۲۰۱۴ء کو وزیر اعظم نے جس آدرش گرام یوجنا کا اعلان کیا تھا اس کے تحت مذکورہ بالا تینوں رہنماوں نے گجرات کے تین گاوں گود لئے اور ان تینوں مقامات پر بی جے پی پنچایت چناو ہار گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ بی جے پی کے جو اچھے دن مختصر سے مدت کیلئے آئے تھے وہ بہت جلد لوٹ گئے۔ کامیابی کی بوند بوند کو ترسنے والے وزیر اعظم کے پاس اب عظیم اقبال کا یہ شعر گنگنانے کے علاوہ کیا چارۂ کار ہے

یہ مری انا کی شکست ہے، نہ دعا کرو، نہ دوا کرو
جو کرو تو اتنا کرم کرو، مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

کوئی بعید نہیں کہ وزیراعظم ان پہ در پہ لگنے والے زخموں کا غم غلط کرنے کیلئے غیر ملکی دوروں پر نکل کھڑے ہوتے ہوں ۔ چونکہ خود مودی جی اترپردیش کو گجرات پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے پہلے اترپردیش بلکہ وارانسی کا ذکر ہوجائے۔ وزیراعظم نے آدرش گرام یوجنا کے تحت جیاپور نام کا گاوں گود لیا اور بڑی شان سے اعلان کیا کہ میں نے جیا پور کو نہیں بلکہ جیاپور نے مجھے گود لیا ہے۔ جیاپور کا پنچایت انتخاب جیتنے کیلئے مہنت اویدیہ ناتھ نے اپنی ہندو واہنی کو بنجے جوشی کے ساتھ وہاں بھیجا اس کے باوجود بہوجن سماج پارٹی کے ایک براہمن امیدوار گڈو تیواری نے بی جے پی کے ارون کمار سنگھ کو شکست دے دی ۔ ارون کمار سنگھ مقامی بجرنگ دل کا ناظم ہے ۔ اس پر قتل اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے مقدمات بھی ہیں اس لئے اگر آدرش گاوں کے لوگوں نے اسے دھتکار دیا تو کیا غلط کیا؟

بی جے پی کے اپنے دعویٰ کے مطابق اسے ضلعی پنچایت انتخاب میں صرف ۱۷ فیصد نشستوں پر کامیابی ملی ۔ وارانسی میں کامیابی کی شرح بھی لگ بھگ وہی رہی ۴۸ میں ۹ امیدوار کامیاب ہوئے باقی سارے ہار گئے۔ اس کے برعکس سماجوادی پارٹی

نے ۲۵ نشستوں پر اپنی کامیابی درج کرائی ۔ وہ تو خیر سے مودی جی نے خود کو انتخابی مہم سے روکے رکھا ورنہ ان ۹ امیدواروں کی کامیابی بھی مشکوک ہو جاتی ۔اس طرح کے مواقع پر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا مودی جی کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے مبادہ ان کے صبر و ضبط کی وجہ افتخار راغب کے اس شعر میں بیان ہوئی ہو ؎

جب بھی میں نے چاہا، راغب دشمن پر یلغار کروں
خود کو اپنے سامنے پا کر میں نے خود کو روکا ہے

اس دوران بی جے پی کیلئے اچھی خبر منی پور سے آئی جہاں اس کے دو امیدوار کامیاب ہو کر صوبائی اسمبلی پہنچ گئے ۔ وہیں میزورم کے شمالی ایزول کی نشست پر کانگریس نے اپنی پکڑ بنائے رکھی اور میگھالیہ میں ایچ ایس پی ڈی پی نے اپنی کامیابی درج کرائی ۔ مدھیہ پردیش میں بی جے پی کو ایک فتح اور ایک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دیواس میں تکوجی پوار کے موت سے خالی ہونے والی نشست پر بی جے پی نے ان کی بیوی گایتری راجے پوار کو امیدوار بنایا۔ گایتری نے کانگریس کے جئے پرکاش شاستری کو ہرادیا لیکن پچھلی مرتبہ کے مقابلے شکست کے فرق میں ۲۰ ہزار ووٹوں کی کمی آگئی۔ شوہر ۵۰ ہزار ووٹ سے جیتا تھا زوجہ صرف ۳۰ ہزار سے کامیاب ہوئی۔ لیکن بی جے پی کو اس سے بڑا جھٹکا جھبوا رتلام میں لگا جہاں کچھ عرصہ قبل دھماکوں میں ۸۰ سے زائد لوگ ہلاک ہوئے تھے۔

کانگریسی موروثیت کی اٹھتے بیٹھتے مخالفت کرنے والی بی جے پی نے جھبوا میں بھی آنجہانی رکن پارلیمان دلیپ سنگھ بھوریا کی بیٹی نرملا بھوریا کو اپنا امیدوار بنایا۔ یہ روایتی طور پر یہ کانگریس کی سیٹ ہے اور یہاں سے کانتی لال بھوریا ۴ مرتبہ کامیاب ہوچکے ہیں لیکن پچھلی مرتبہ مودی لہر کے چلتے وہ ۴۰ ہزار ووٹ سے ہار گئے تھے لیکن اس بار انہیں ۸۰ ہزار کے فرق سے کامیابی ملی ۔ اس نشست کو وزیر اعلیٰ شیوراج چوہان نے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ انہوں نے وہاں ۶ دنوں تک قیام کیا ۲۷ خطابات عام کئے دھماکے سے مرنے والے مہلوکین کے گھر گھر گئے لیکن اس کے باوجود جو حشر ہوا وہ سامنے ہے۔ ویسے ویاپم گھوٹالے میں پھنسے ہوئے شیوراج چوہان اگر وزیر اعظم کے نقش قدم پر چل کر اپنی مٹی پلید نہ کراتے تو اچھا تھا۔ ایم پی میں جہاں برسرِ اقتدار بی جے پی کی یہ درگت بنی وہیں تلنگانہ میں ٹی آر ایس نے ورنگل میں ۴ لاکھ ۵۰ ہزار کے فرق سے کامیابی حاصل کرکے بتا دیا کہ مقبولیت کس کو کہتے ہیں ؟ ملک بھر کے بی جے پی رہنما اپنے آس پاس دشمنوں کو جشن مناتے ہوئے حیرت سے دیکھ رہے ہیں ان کی حالت اس شعر کی مصداق ہے

یہ کون چھوڑ گیا ہے ہمیں اندھیرے میں
شکست کھائے ہوئے دشمنوں کے گھیرے میں

گجرات کی کہانی سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کی ایک جھلک بلساڑ ضلع پنچایت کی کلواڑ نشست میں دیکھنے کو ملی۔ اس نشست پر بی جے پی نے ہریش بھائی پٹیل کو ٹکٹ دیا تو کانگریس نے ان کی بیوی جئے شری بین پٹیل کو اپنا امیدوار بنایا۔ ان دونوں کا مقدمہ گزشتہ ۹ سالوں سے عدالت کے فیصلے کا منتظر ہے۔ غالباً عدالت سے مایوس ہو کر یہ لوگ سیاست کے اکھاڑے یں ایک دوسرے خلاف کود پڑے اور نتیجہ یہ نکلا کہ جئے شری کو وجئے شری پراپت ہو گئی اس نے اپنے شوہر نامدار کو ۹۱۷ ووٹوں سے شکست دے دی۔ ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ راجیہ سبھا میں اپنے ارکان کی تعداد کو بڑھانے کی خاطر مودی جی نے جو ۷ نئے ضلعے بنائے تھے۔ ان میں سے صرف ایک گیر سومناتھ میں کانگریس اور بی جے پی دونوں کے ۱۴ امیدوار کامیاب ہوئے لیکن باقی ۶ میں بی جے پی کو کراری ہار کا سامنا کرنا پڑا۔ موربی اور بوتاڑ میں تو بی جے پی کے دو امیدواروں کے مقابلے کانگریس کے ۲۲ اور ۱۸ امیدوار کامیاب ہو گئے۔

گجرات اس بار شہر اور گاوں کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ ۶ بڑے شہروں کے میونسپل کارپوریشنس پر کمل کھلا اور ۵۶ میں سے ۴۲ میونسپلٹی پر بی جے پی کا قبضہ برقرار رہا حالانکہ اس کی نشستوں کی تعداد میں پہلے کی بہ نسبت کمی آئی۔ اس کے برعکس تعلقہ سطح پر بی جے پی ۲۰۱۰ کے مقابلے ۲۴۶۰ سے ۲۰۱۷ پر اتر آئی اور کانگریس ۱۴۲۸ سے چڑھ کر ۲۵۴۸ پر پہنچ گئی۔ ضلعی پنچایت میں بی جے پی

کے ۳۶۸ تو کانگریس کے ۵۹۵ امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس طرح ۳۱ میں سے ۲۱ ضلعی پنچایت پر کانگریس کا قبضہ ہو گیا ۲۰۱۰ء میں بی جے پی کا ۳۰ ضلع پنچایت پر قابض تھی لیکن اب وہ ۶ تک محدود ہو گئی ہے۔ پانچ سال قبل کانگریس کی کسی ایک ضلع میں بھی اکثریت میں نہیں تھی لیکن اب ۲۱ پنچایتیں اس کے قبضے میں آگئی ہیں۔

تعلقہ سطح پر بی جے پی کو ۲۰۱۰ء کے ۱۹۲ سے ۷۳ پر آنا پڑا جبکہ کانگریس ۲۷ سے بڑھ کر تعلقہ پنچایت میں کامیاب رہی۔ میونسپلٹی میں جہاں بی جے پی ۴۷ سے گھٹ کر ۱۳۲ پر پہنچی وہیں کانگریس اپنی قوت میں صد فیصد اضافہ کرکے ۵ سے ۱۰ مقامات پر ۴۲ کامیاب ہو گئی۔ ان نتائج کو اگر ووٹ کے فیصد میں تبدیل کیا جائے تو کانگریس کے ۵۲ فیصد اور بی جے پی کے ۴۴ فیصد ووٹ بنتے ہیں۔ اس طرح گزشتہ سال کے پارلیمانی انتخابات کے مقابلے بی جے پی کے ووٹ بنک میں ۱۵ فیصد کی زبردست کمی واقع ہوئی ہے۔ جس کے اثرات یقیناً ۲۰۱۷ء کے ریاستی انتخابات پر پڑیں گے۔

بی جے پی کو اپنے انجام کا اندازہ تھا اس لئے گجرات کی حکومت مختلف بہانوں سے بلدیاتی انتخابات ٹال رہی تھی۔ الیکشن کمیشن کے خلاف اس نے عدالت میں گہار لگائی کہ آزاد و غیر جانبدار انتخاب کروانے کیلئے ماحول سازگار نہیں ہے

لیکن عدالت نے اس نامعقول دلیل کو مسترد کردیا اور اسے مجبوراً انتخابات کرانے پڑے۔ بی جے پی نے آگے چل ایک اور داوں کھیلتے ہوئے رائے دہندگی کی تاریخ دیوالی اور شادی کا موسم میں طے کردی۔ ان لوگوں کو خام خیالی تھی کہ عام لوگ دلچسپی نہیں لیں گے اور ان کے کارکن بڑھ چڑھ کر کامیابی سے ہمکنار کردیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جہاں میونسپل کارپوریشن میں ۲۰۱۰ء کے مقابلے زیادہ رائے دہندگان (۴۵ فیصد) نے حصہ لیا وہیں تعلقہ پنچایت میں یہ تعداد بڑھ کر ۶۰ پر پہنچ گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ لوگ اپنی دیگر مصروفیات کو چھوڑ کر قصداً بی جے پی کو ہرانے کیلئے پولنگ بوتھ میں آئے۔ اس طرح گویا ۷ ماہ کی پائیدار تحریک نے بی جے پی کے ۱۷ سالہ اقتدار کی چولیں ہلا دیں۔

قومی سیاست میں جو مقام اتر پردیش کو حاصل ہے وہی حیثیت گجرات کے اندر سوراشٹر کی ہے اور مثل مشہور ہے کہ جو سوراشٹر سے کامیاب ہوتا ہے وہی گجرات پر راج کرتا ہے ۔ سوراشٹر کو ہندوتوا کی لیبارٹری کہلانے کا بھی شرف حاصل ہے اس کے باوجود وہاں جو کچھ ہوا وہ چونکا دینے والا ہے۔ سوراشٹر کے اندر کانگریس کو ۱۱ میں سے ۱۰ ضلعوں میں کامیابی ملی اور صرف گاندھی نگری پوربندر میں بی جے پی اپنی ناک بچا سکی۔ تعلقہ سطح پر کانگریس نے ۶ مقاما تبڑے فرق کے ساتھ بی جے پی سے چھین لئے۔ کڑوا پٹیل اور لیوا پٹیل کے

درمیان کا اختلاف بھی بی جے پی کے کام نہ آسکا۔ لیوا پٹیل سماج کے طاقتور رہنما وٹھل رادڑیہ کے امیدواروں کو راجکوٹ میں ۳۶ میں سے ۳۵ نشستوں پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شمالی گجرات کے مہسانہ، گاندھی نگر، سابر کانٹھا اور پاٹن ضلعوں سے جو وزیراعظم نریندر مودی، وزیراعلی آنندی بین پٹیل اور دیگر بڑے وزراء کا علاقہ ہے بی جے پی کا بیڑا صاف ہوگیا۔ ایسا کیوں ہوا اس کی وجہ ناصر کاظمی کے شعر میں دیکھیں

پیاسی دھرتی جلتی ہے، سوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں، نگری نگری کال پڑا

مبصرین کا خیال ہے کہ یہ حکومت کے خلاف عوامی ناراضگی کا اظہار ہے۔ فصلوں کی تباہی کسانوں کی خودکشی، غیر واضح تحویل اراضی کا قانون اور بے روزگاری جیسے حقیقی، مسائل نے بی جے پی کا بیڑہ غرق کردیا۔ عوام کو فی الحال گھروں کی قیمتوں میں اضافہ اور سڑکوں و پلوں کی خستہ حالت نے تنگ کر رکھا ہے اس لئے وہ اسمارٹ سٹی، وائی فائی والے شہر اور ترقی پذیر گجرات جیسے نعروں سے متاثر نہیں ہوتے۔ سماجی فلاح و بہبود کی کسوٹی پر ۲۰۰۰ء میں گجرات ۱۰ویں مقام پر تھا۔ اس کے بعد مودی کی دورِ اقتدار میں تک وہ ایک پائیدان نیچے کھسک کر ۱۱ویں مقام پر پہنچ گیا۔ یہ اس گجرات ماڈل کی ۲۰۱۱ء تلخ حقیقت ہے جس کو دکھلا کر ساری ملک کی عوام کو بیوقوف بنایا گیا اور ملک

کے بھولے بھالے لوگ بھی خوب اس کے جھانسے میں آگئے بقول شاعر (ترمیم میں معذرت کے ساتھ) ۔

اچھے دن کی آس لگا کر میں نے خود کو جھونکا تھا
کیسے کیسے خواب دکھا کر میں نے خود کو جھونکا تھا

گجرات کے بڑے شہروں میں بی جے پی کی کامیابی اور دیہات میں ناکامی کی ایک وجہ آمدنی کا تفاوت بھی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں گجرات کا عام شہری ایک دیہاتی کے مقابلے ۵۰ فیصد زیادہ کماتا تھا۔ یہ فرق ۲۰۰۰ء میں ۶۸ فیصد تک پہنچ گیا اور اب بھی وہیں ہے۔ ہاردک پٹیل کی تحریک کے پیچھے بھی یہ عوامل کارفرما ہیں اس لئے کہ زیادہ تر پٹیل برادری کسان ہے اور چھوٹے شہروں میں رہتی ہے۔ اس تفریق و امتیاز کی سب سے بڑی قیمت ادیباسیوں اور مسلمانوں نے چکائی۔ ادیباسیوں کے قومی کمیشن نے اور سچر کمیٹی کی رپورٹ نے ریاستی حکومت کی توجہ اس جانب مبذول تو کرادی لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے حکومت نے کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ بی جے پی کو پتہ ہے مسلمان اور ادیباسی روایتی طور پر کانگریس کے ساتھ رہے ہیں۔ لیکن ان نتائج کے بعد کم ازکم اب یہ بات حکومت کی سمجھ میں آنی چاہئے کہ ''میک ان انڈیا'' کے تحت شہروں میں بڑی کمپنیوں کے آجانے سے دیہات کی بیروزگاری دور نہیں ہوگی۔

ان انتخابی نتائج کا فی الحال قومی سیاست پر تو کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا لیکن بی جے پی کی اندرونی جاری رسہ کشی پر یہ ضرور اثر انداز ہوں گے اور امیت شاہ کا پھر سے صدر منتخب ہونا خطرے میں پڑ سکتا ہے۔.بزرگ رہنماوں نے غم و غصہ کے اظہار سے امیت شاہ کو یہ احساس کرادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے پی کے آئندہ قومی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ۸۰ لوگوں کو خصوصی مدعو کے طور پر شریک کیا جارہا ہے جبکہ اس کے کل ۱۰۵ ارکان ہیں۔ امیت شاہ چاہتے ہیں کہ اپنے حواریوں کی مدد سے مخالفین کے اثرات کو زائل کریں۔ امیت شاہ کے دوبارہ منتخب ہونے یا نہ ہونے کا سیدھا اثر آئندہ سال ہونے والے آسام ، مغربی بنگال، تمل ناڈو، کیرالہ اور پنجاب پر پڑ سکتا ہے۔یکے بعد دیگرے ناکامیوں سے دوچار کانگریس فری انڈیا کا نعرہ لگانے والے امیت شاہ کی حالت ِزار پر یہ شعر صادق آتا ہے

،یہ جو ایک ترکشِ وقت ہے
ابھی اس میں تیر بہت سے ہیں
،کوئی تیر تم کو نہ آ لگے
مرے حالِ دل پہ نہ یوں ہنسو

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

شاعر مشرق علامہ اقبال کا کلام اسلامی عقائد و فلسفہ کے ساتھ امت کی تاریخ تہذیب کا بیش بہا گلدستہ ہے۔ ایک مخلص مصلح کی حیثیت سے انہوں نے ملت مسائل کا تجزیہ فرمایا۔ زوالِ ملت کے اسابب و علل کی نشاندہی کرنے کے بعد قرآن و سنت کی روشنی میں اس کا حل بھی پیش کیا اس لئے بجا طور پر ان کو حکیم الامت کہلانے کا حق اور شاعر اسلام ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں معرفت الٰہی کے پہلو بہ پہلو عشق نبیؐ کا دریا موجزن ہے وہیں دیگر مذاہب و نظریات کے حوالے بھی جا بجا نظر آتے ہیں ۔ عصر حاضر کا یہ المیہ بھی ہے کہ آج کل عامیانہ اور سطحی قسم کے شعراء کی خوب پذیرائی ہوتی ہے مگر گہری اور سنجیدہ شاعریکرنے والوں کو یہ شرف کم ہی حاصل ہوتا ہے ۔ علامہ اقبال کا یہ امتیاز ہے کہ نے نہایت اعلیٰ پائے کی فکری اور اصلاحی شاعری کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی مقبولیت سے نوازہ ۔

علامہ اقبال سے بہت پہلے اردو شاعری غم جاناں کے حصار سے نکل غم دوراں کی آغوش میں آچکی تھی۔ غالب نے شاعری کو فلسفۂ حیات کے اسرار و رموز کو کھولنے کا ذریعہ بنایا اور ان کے شاگردِ رشید حالی نے شاعری کے ذریعہ اصلاح

امت کا بیڑہ اٹھایا۔ اس دور میں جہاں حالی نہایت سنجیدگی سے یہ فرض منصبی ادا کررہے تھے وہیں اکبر الہ بادی نے بڑے ظریفانہ انداز میں ایک نہایت کامیاب کوشش کی اور اصلاح امت کے مشکل ترین کام کو بہت عام فہم انداز میں پیش کرنے عظیم کارنامہ انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے اشعار ضرب المثل بنے ہوئے ہیں۔ اس طرح کی استثنائی سعید روحوں کے علاوہ عموی صورتحال وہی تھی جسے شاعر مشرق نے کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

ہائے بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

علامہ اقبال نے صنف شاعری کی مدد سے خواب غفلت کی شکار قوم کو بیدار کرنے کی ذمہ داری ادا کی۔ ان کے بعد اٹھنے والی ترقی پسند تحریک نے بھی بڑے پیمانے پر شاعری سے عوامی بیداری کی خدمت لی لیکن اس میں اسلام کے بجائے اشتراکی نظریات کی ترویج و اشاعت کا بول بالا تھا۔ کسی بھی تحریک کیلئے اس بنیاد نہایت اہم ہوتی ہے۔ بہترین صلاحیتوں کے حامل افراد پر مشتملترقی پسند تحریک کے بہت قلیل عرصہ میں خزاں رسیدہ ہوجانے کی وجہ اس کا کمزور محرک کمزور ہے۔ اس کے برعکساقبال نے مایوسی کا شکار مسلمانوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے کی خاطر اسلام کی عظمت کو اجاگر کیا۔ اقبال کو چونکہ مغرب میں جاکر اس کے مشاہدے اور تجربے کی سعادت نصیب ہوئی تھی اس لئے اس کی حقیقت اور بودہ

پن ان پر پوری طرح عیاں ہو چکا تھا۔ اقبال نے زندگی کے مختلف شعبوں میں مغربی نظریات کی تباہ کاریوں کو بہت قریب سے دیکھا وہ دونوں جنگ عظیم کے چشم دید شاہد تھے اس لئے انھوں شعوری طور پر امت کو مغربی تہذیب کی مرعوبیت سے نکالنے کی سعی و جدوجہد کی ۔ علامہ اقبال نے صدابہار دین اسلام کی بنیاد پر مسلمانوں میں جو بیداری پیدا فرمادی وہ خزاں ناآشنا ہے اسی لئے آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ اللہ

علامہ اقبال نے قرآن سنت کے علاوہ مغربی نظریات اور ہندوستان کے قدیم فلسفہ اور شخصیات سے بھی استفادہ کیا۔ علامہ اقبال نے قدیم وجدید زعماء کی عظمت کے اعتراف میں بڑی وسیع القلبی کا مظاہرہ فرمایا۔ علامہ کی شاعری میں جہاں امت مسلمہ کے اکابرین کا ذکر ہے وہیں غیر مسلمین کے حوالے بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ سرزمین ہند کی نامور ہندو شخصیات مثلًا رام چندر ، شری کرشن ، گوتم بدھ ، گرونانک ، وشوامتر ، سوامی رام تیرتھ وغیرہم بھی علامہ کی نظموں کو مقبولت حاصل ہوئی اور گاہے بگاہے ان کے حوالے دیئے جاتے ہیں ۔ ایک مرتبہ پنجاب کے گورنر نے ان سے شمس العلماء کے خطاب کیلئے نام پیش کرنے کی استدعا کی۔ اس کے جواب میں جذبۂ احسانمندی سے سرشار اقبال نے جب اپنے ا

ستاد سید میر حسن کے نام کی سفارش کی تو گورنر نے کہا ہم نے تو نہ ان کا نام سنا اور نہ ان کی کوئی تصنیف دیکھی۔ اقبال بولے میں ان کی زندہ تصنیف ہوں۔ لاہور میں اپنے انگریزی اور فلسفہ کے استاد پروفیسر آرنلڈ کی انگلستان واپسی نے علامہ کو غمگین کر دیا جس کا اظہار نظم نالۂ فراق میں کے لازوال عقیدت کے پھولوں صورت میں ہوا

تو کہاں ہے اے کلیم ذرۂ سینائے علم
تھی تری موج نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

علامہ کی وسعتِ نظری اور کشادہ دلی نے انہیں سرزمین ہند کے عظیم فلسفی اور شاعر بھرتریہری کا بھی دلدادہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی مشہور کتاب بال جبریل کے سرورق پر بھرتری ہری کے شعر کا ترجمہ لکھا ہے۔ کسی شعری مجموعے کی ابتداء میں کسی دوسرے فلسفی کے شعر کے موجودگی کا منفرد اعزاز کم ہی لوگوں کو حاصل ہوا ہوگا۔ بھرت ریہری پہلی صدی عیسوی قبل مسیح میں سن کر تتزبان کا شاعر تھا۔ ریاستِ مالوہ کے اس راجہ کا دارالخلافہ اجین تھا۔ اس ماہر لسانیات نے سنسکرت صرف و نحو کی معرکتہ الآرا کتاب تصنیف کی جس کا آج بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بھرتری ہری تین شعری مجموعے ہیں جن میں زندگی کے تین اہم شعبہ جات پر اشعار درج ہیں۔ پہلی کتاب شر نگار شتک میں عشق و محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسری کتاب نیتیشتک اس دور کی تصنیف ہے جب وہ مالوہ کی ریاست اجینکا راجکمار تھا۔ اس میں بھرتری ہری نے اپنے دور کے سیاسی حالات و نظریات کو پیش کیا ہے۔اس شاعر کی اہم ترین کتاب ویراگیہشتک ہے۔ اپناراجپاٹ چھوڑ کر سنیاس لینے کے بعد اس نے ویراگیہشتک لکھی جس میں معرفتِ الٰہی اور فقر و غناء کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔علامہ اقبال ایک شاعر کی حیثیت سے بھرت ریہری کے بڑے مداح تھے اور اس کی عظمت کا گنگاتے تھے۔

بھرتری ہری کی شاعری میں موجود موضوعات کے تنوع اور وسعت کی بنیادی وجہ اس کی زندگی کے نشیب و فراز ہیں۔ سنیاس لینے سے قبل اس نے ایک کامیاب دنیا دار زندگی کا تجربہ کیا اور دنیاوی آلائشات میں اس حد تک منہمک ہوا کہ فکری اور تخلیقی زندگی کے شعبوں سے غافل ہوگیا۔ اس غفلت کیلئے اس کا اپنی بیوی رانی پنگلہ کے ساتھ جنون کی حد تک عشق کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ بھرتری ہری کے سوتیلے بھائی وکرمادتیہ نے اسپر اعتراض کیا تو رانی پنگلہ نے کمال رعونت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے شوہر کی مدد سے اسے ملک بدر کروادیا۔

بھرتری ہری کے بابت ایک نہایت دلچسپ واقعہ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی سادھو سنت نے بھرتری ہری سے خوش ہو کر اس کی خدمت میں ایک پھل پیش کیا اور یہ وردان بھی دیا کہ اسے کھانے سے عمر میں اضافہ ہوگا۔ بھرتری ہری چونکہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اس لئے اس نے اپنی ذات پر اسے ترجیح دی۔ بھرتری ہری نے وہ پھل اپنی چہیتی بیوی کو دے کر کہا کہ نہانے کے بعد اسے کھائے۔ پنگلہ ایک سائیس کے عشق میں گرفتار تھی اس لئے اس نے پھل اس کو دے دیا۔ سائیس ایک طوائف کا عاشق تھا اس لئے وہ پھل تحفہ کی صورت میں طوائف تک پہنچ گیا۔ طوائف نے بادشاہ کو خوش کرنے کیلئے وہ پھل بھرتری ہری کی نذر کر دیا۔ اس نے پھل تو کھا لیا مگر اس کو پتہ چل گیا کہ رانی پنگلہ بے وفا ہے۔ اس واقعہ سے دل برداشتہ ہو کر بھرتری ہری نے نہ صرف اپنی بیوی سے کنارہ کشی اختیار کی بلکہ راج پاٹ چھوڑ کر سنیاسی بن گیا۔ رانی پنگلہ کا کردار حقیقت ہے یا علامت یہ تو تحقیق کا موضوع ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ کل یگنے سفاک وبے وفا رانی پنگلہ کو جمہوی لباس پہنا کر نیلم پری بنا دیا ہے جو علامہ اقبال کے اس شعر میں اپنے درشن کراتی ہے

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

عصرِ حاضر میں اس نیلم پری نے اپنا دامِ فریب کچھ اس طرح سے پھیلا رکھا ہے

کہ جمہوری دستور نے اقتدار کا پھل (حق) بظاہر عوام کے قدموں میں ڈال دیا۔ عوام نے فی زمانہ بی جے پی پر فریفتہ ہو کر اس پھل سے اسے نواز دیا۔ بی جے پی کا معشوق نریندر مودی تھا اس لئے وہ مودی جی کو تھما دیا گیا۔ مودی جی سرمایہ داروں کے عاشق ہیں اس لئے انہوں نے اڈانی اور امبانی کو اس پھل سے مالامال کر دیا۔ سرمایہ داروں کے دل میں اگر عوام کی محبت ہوتی تو اور وہ پھل انہیں لوٹا دیتے تو دائرہ مکمل ہو جاتا لیکن کل یگ میں یہ کیونکر ممکن تھا اس لئے حریص سرمایہ داروں اسے اپنی تجوری میں بند کر دیا اور ملک کے عوام کی اکثریت نانِ جویں کے محتاج ہو گئی۔

جمہوریت کا یہ طلسماتی پھل دستور کے طفیل انتخاب کے موسم میں گاوں گاوں شہر شہر ہر شاخ پر اپنے آپ لگ جاتا ہے۔ عوام اس کے سحر زدہ میں گرفتار ہو کر اپنے سارے دکھ درد بھلا دیتے ہیں اور سیاسی رہنماوں کی تقاریر کی بدولت نت نئے خواب سجانے لگتے ہیں۔ پچھلی بار تو قومی سطح پر عوام نے اس پھل سے بی جے پی کو نواز دیا تھا لیکن چونکہ انہیں اپنی غلطی کا روز افزوں احساس ہو رہا ہے اس لئے ممکن ہے وہ آئندہ اس پھل کو کانگریس کے ہاتھ میں دے دیں۔ پھر وہی سلسلہ چل پڑے گا۔ کانگریس اسے راہل کی جھولی میں ڈال دے گی اور پھر گھوم کر وہ سرمایہ دار کی تجوری میں چلا جائیگا۔ بیکس و لاچار عوام پھر نئے انتخابی موسم کا انتظار کریں گے اور کانگریس کو سبق سکھانے کیلئے ممکن ہے تیسرے

محاذ کو وہ پھل تھمادیں لیکن بالآخر لالو نتیش یا ملائم بھی اسے سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کرنے سے نہیں چوکیں گے۔ عوام کو تو اس نظام میں صبر کے میٹھے پھل پر ہی اکتفاء کرنا ہوگا۔ وہ اسے کبھی نہ چکھ پائیں گے۔

عوام کی یادداشت چونکہ بہت قلیل المدت ہوتی ہے اس لئے قوی امکان ہے کہ اگلے زمانوں کے لوگ بی جے پی کی دھوکہ دھڑی کو بھول چکے ہوں۔ انہیں کمل پھر سے خوشنما لگنے لگے وہ پھر ایک بار اس کے دامِ فریب میں گرفتار ہو جائیں۔ متبادل کے طور راضی خوشی نہ سہی تو بادلِ ناخواستہ عالمِ بیزاری میں اقتدار کے پھل کو اس وقت کے مودی کے چرنوں میں ڈال دیں اور وہ سرمایہ داروں کے آگے سربسجود ہو جائے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت میں اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری و ساری رہے گا جب تک کہ لوگ مغرب کے پروردہ اس لادینی جمہوری نظام کو اپنے لئے باعثِ رحمت سمجھتے رہیں گے اور اس کی بیخ کنی کرنے کے بجائے اس کی آبیاری میں جٹے رہیں گے۔ بھرتری ہری کی طرح موجودہ سیاستدانوں میں سے نہ کوئی سنیاس لے گا اور نہ راشٹر کا کلیان ہوگا۔ علامہ اقبال نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں مغرب کے اس جمہوری نظام کی جو عکاسی کی تھی آج ہندوستان کا بچہ بچہ بسر و چشم اس کا نظارہ کر رہا ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اس جدید نظام استبداد کی بدولت بھرتری ہری کی سرزمین ہند پر فی الحال جو شخص حکمرانی کررہا ہے جو بزعم خود سنیاسی نہ سہی تو کم از کم برہماچاری ضرور ہے۔ اس نے طلاق کے بغیر ہی رشتہ ازدواج منقطع کر رکھا ہے۔ وہ اپنی والدہ سے نمائشی ملاقات تو کرتا ہے لیکن ان کو اپنے پاس نہیں بلاتا۔ وہ بڑے طمطراق کے ساتھ یہ دعویٰ تو کرتا ہے کہ اس کاآگے پیچھے کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کیلئے وہ بدعنوانی میں ملوث ہو حالانکہ جو شخص سرکاری خرچ پر دن میں پانچ مرتبہ کپڑے بدلے اور ان میں ایک آدھ ۱۰ لاکھ تک کا سوٹ بھی شامل ہو تو اس کو بدعنوانی کے جال میں پھنسنے کیلئے کسی اور کی کیا حاجت ؟ بھرتری ہری کے بعد سے یہ ملک بے مثال فکری و عملی انحطاط کا شکار ہوا ہے ۔ وہ تو خیر علامہ اقبال کی ملاقات موجودہ وزیراعظم سے نہیں ہوئی ۔ اگر ایسا ہوا ہوتا اور اس کے بعد انہوں نے بھرتری ہری والاوہ ضرب المثل شعر کہا ہوتا تو یقیناً وزیراعظم کے حواری اسے اپنے چہیتے رہنما سے منسوب کردیتے۔ مودی جی بھی جن کے نام سے ایک شعری مجموعہ شائع ہوچکا ہے اس شعر کو سمجھے بغیر بخوشی اس بات پر فخر جتاتے ہوئے کہتے کہ پہلی بار کسی عظیم شاعر نے کسی وزیراعظم پر شعر کہا ہے لیکن چونکہ ان پیدائش سے ۱۲ سال قبل علامہ اقبال اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے تھے اس لئے اس حادثے کا امکان نہیں ہے ۔ ابھی تک

اگر آپ نہیں جان سکے وہ کون سا شعر ہے جو ان کی شخصیت کا بھرپور عکاس ہے تو لیجئے پڑھئے بالِ جبریل کے سرورق پر بھرتری ہری کا معرکتہ الآراء خیال

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کیجریوال کے وزیراعظم کو بزدل اور نفسیاتی مریض کہنے پر آج کل بی جے پی والے خوب واویلا مچا رہے ہیں اور انہیں اپنی زبان پر لگام دینے کی تلقین کر رہے ہیں۔ بی جے پی جیسی بدزبان پارٹی کا جس کی ایک سادھوی رامزادے اور حرام زادے کی اصطلاح ایجاد کرتی ہے۔ جس کا ایک وزیرزیر حراست دلت نوجوان کی زیر حراست موت کو کتے کے پلے کی موت قرار دیتا ہے۔ جس کے رہنما علی الاعلان بیف کھانے والوں کیلئے موت کی سزا تجویز کرتے ہیں اور خود وزیراعظم گجرات کے فساد کو اپنی گاڑی کے پہیے تلے آنے والے کتے سے تعبیر کرتا ہے، دوسروں کی لب کشائی پر تنقید کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اروند کیجریوال نے مذکورہ شعر کی روشنی میں کہا کہ چونکہ وزیراعظم سیاسی میدان میں مجھ پر قابو نہیں پا سکے اس لئے اوچھی حرکات پر اتر آئے ہیں اور یہ بھی بولے کہ ملک کا وزیرخزانہ کاذب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر لاتوں کے بھوت کی پوجا جوتوں سے ہوتی ہے۔

ابھی انصاف بہرا ہے، ابھی قانون اندھا ہے

اندھا اس کو کہتے ہیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ جو سن نہیں سکتا وہ بہرہ کہلاتا ہے بولنے سے معذور انسان کو گونگا کہتے ہیں۔ لولا اپنے ہاتھوں سے کوئی شئے اٹھا نہیں سکتا اور نہ لنگڑا اپنے پیروں پر چل سکتا ہے مگر ایک نابالغ عصمت دری کر سکتا ہے! اگر آپ کو اس پر حیرت نہیں ہے تو جان لیجئے کہ مجنون اپنے دماغ سے سوچ نہیں سکتا۔

نربھیا عصمت دری کے معاملے میں نام نہاد نابالغ مجرم کی رہائی ہم سے سوال کر رہی ہے کہ کیا عدلیہ عقل و فہم سے عاری ہے؟ لیکن عدالت کا موقف یہ ہے کہ ہم قانون بنا نہیں سکتے ہم تو صرف اس پر عملدرآمد کے پابند ہیں۔ تو پھر کیا مقننہ یعنی ہمارے سیاستداں پاگل ہیں؟انہوں نے قانون وضع کیوں نہیں کیا؟

ایسا لگتا ہے کہ ہمارے معزز حکمراں نہیں چاہتے کہ شہر دہلی نے دنیا بھر کی عصمت دری کے دارالخلافہ ہونے کا جو اعجاز حاصل کیا اس سے وہ محروم ہو جائے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہر ۲۰ منٹ میں ملک کے اندر جو ایک عصمت دری کی واردات کا اندراج ہوتا ہے اس شرح میں کمی آئے۔ ایک تحقیق کے مطابق جنسی زیادتی کے ۶۹ میں سے صرف ایک کی پولس میں شکایت درج ہوتی ہے۔ اگر انتظامیہ

کو موصول ہونے والی کل شکایتوں کو ۶۹ سے ضرب کردیا جائے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے وطن عزیز میں صنف نازک کس ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ اس کی ایک وجہ مناسب قانون کی عدم موجودگی ہے اور دوسرے اس پر عمل بجاآوری میں کوتاہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی خواتین کمیشن کی سربراہ سواتی مالیوال نے دہلی ہائی کورٹ کے حالیہ فیصلے پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ انتہائی دکھ کی بات ہے کہ نربھیا کا مجرم ۲۰ دسمبر کو رہا ہو جائے گا۔ نربھیا کے مجرم کی رہائی کا دن تاریخ کا سیاہ ترین دن ہوگا۔

نربھیا کی آبروریزی اور قتل کے بعد اس کی آنتیں باہر نکال کر سڑک پر پھینکنے والا سنگین مجرم تین سال ایک اصلاح کے مرکز میں عیش کرنے کے بعد باعزت بری کردیا گیا۔ یہ ظلم عظیم کیوں ہوا اس کی لاکھ توجیہ کی جائے لیکن اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اس ملک میں اسلامی شریعت نافذ نہیں ہے۔ معروف ماہر قانون ڈاکٹر طاہر محمود کے مطابق شریعت اسلامی کی ابتدائی کتب میں ۹ سے ۱۲ سال کے درمیان بچے کے سن بلوغ کو پہنچ جانا مذکور ہے۔ آیت اللہ صادقی تہرانی نے بھی سن بلوغ کی مختلف قسمیں بیان کرتے ہوئے اسے ۱۰ تا ۱۳ سال لکھا ہے۔ شریعت کسی غیر فطری حدبندی کے بجائے جسمانی و طبعی تبدیلیوں کی بناء بالغ ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ نربھیا کے مجرم نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ چکا ہے اس لئے وہ اسی سزا کا مستحق جو بالغوں کیلئے

ہے۔ شریعتِ اسلامی ایوانِ پارلیمان کے توثیق کی محتاج نہیں ہے اور نہ وہ انسانوں کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ شریعت میں خرد.برد کرے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اپنے اقتدار کا بیجا استعمال کرتے ہیں جس کے سبب معاشرے میں سفاک مجرم بلا خوف وخطر دندناتے پھرتے ہیں اور مظلوم و مقہور عوام بے بس و لاچار ہوجاتے ہیں۔ پولس رہائی کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں کو نربھیاکے والدین سمیت گرفتار کرلیتی ہے۔

بنی نوع انسان کی سمجھداری اس میں ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کا مکمل ادراک کرکے ان کا بھرپور استعمال کرے اور اپنی محدودیت کو بھی ملحوظِ خاطر رکھے۔ دنیا کا ماہر ترین بس ڈرائیور بھی اگر ہوائی جہاز چلانے کی کوشش کرے تو وہ نہ صرف خود حادثے کا شکار ہوکر بے موت مارا جائیگا بلکہ اپنے جہاز میں سوار مسافروں کی ہلاکت کا سبب بھی بنے گا۔ آج کل یہی ہورہاہے۔ نربھیاکے واقعہ سے بعد یوپی اے حکومت خواتین کو دست درازی سے بچانے کیلئے قانون بنایا تو اس ۱۸ سال سے کم عمر والوں کو کمسن قرار دے دیا لیکن یہ نہیں سوچا کہ اس فائدہ اٹھا کر کتنے مجرم اپنے آپ کو قرار واقعی سزا سے محفوظ کرلیں گے۔ اس سال مئی کے اندر نئی حکومت نے دستور ہند میں ایک ترمیم کرکے اس عمر کو ۱۶ سال کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ دستوری ترمیم ایوان زیریں میں تو کامیاب ہوگئی لیکن ایوانِ بالا میں حزب اختلاف نے اسے نظر ثانی کیلئے منتخب

پارلیمانی کمیٹی کے حوالے کر دیا۔
ایوان پارلیمان میں مئی کے گرمائی اجلاس کے بعد بارانی اجلاس اور اب سرمائی اجلاس تک حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں نے اس سنگین مسئلہ پر مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا۔ اگر یہ قانون بن جاتا تو عدالت کیلئے اس مجرم کو سزا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن ہمارے سیاستدانوں کو اگر انتخابی مہمات، بیرونی دوروں اور ایک دوسرے کے خلاف بہتان طرازی سے فرصت ملے تو وہ عوام کی فلاح و بہبود کی جانب توجہ دیں۔ وہ تو دن رات سیاسی جوڑ توڑ اور بدعنوانی کے ذریعہ لوٹ کھسوٹ میں لگے رہتے ہیں۔
وزیراعظم اور وزیر خزانہ کو سرمایہ داروں کو خوش کرنے والے جی ایس ٹی بل کا غم کھائے جاتا ہے بلکہ اب تو وہ سرمایہ کاروں کا نجات دہندہ دیوالیہ قانون بھی پاس کرانے فراق میں ہیں۔ حزب اختلاف کانگریس کا یہ حال ہے کہ کبھی وہ سوٹ بوٹ پر ہنگامہ کرتی ہے تو کبھی اپنی بدعنوانی پر پردہ ڈالنے کیلئے عدالت کے چکر کاٹتی ہے۔ مجاہد کرپشن کیجریوال ایک بدعنوان افسر کو بچانے کیلئے سردھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور سابق وزیر قانون ان پر ہتک عزت کا دعویٰ کرنے کیلئے عدالت کے دروازے پر دستک دیتے ہیں لیکن کوئی نربھیا کے قاتل کو سزا دینے کیلئے عدلیہ کا رخ نہیں اختیار کرتا۔

ہمارے ملک میں وزیراعظم اور وزیر خزانہ کے علاوہ ایک وزیر قانون سدا آنند گوڑا بھی ہیں جن کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ سدا آنند کے معنی دائمی خوش باش کے ہوتے ہیں اسی لئے ہر تصویر میں ان کی بتیسی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ ۶ ماہ کے اندر اندر اس دستوری ترمیم پر منتخب کمیٹی کی رپورٹ ایوان میں پیش کرتے اور ۲۰ دسمبر سے قبل اسے پاس کروا کر اس مجرم کو رہا ہونے سے روکتے لیکن سدا آنند خود اپنے ذاتی مسائل میں ایسے غرق ہیں کہ انہیں قوم کیلئے فرصت ہی نہیں۔ نئی حکومت کے قیام کے بعد سدا آنند گوڑا کو وزیر ریلوے بنایا گیا۔ اس کے چند ماہ بعد ہی ان کے لڑکے کارتک کو ایک فلمی اداکارہ کو فریب دے کر عصمت دری کرنے کے الزام گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے بعد انہیں وزارت سے ہٹانے کیلئے دباؤ بننے لگا۔

وزیراعظم نے جب پہلی مرتبہ اپنی وزراء کے عہدوں میں پھیر بدل کیا تو سدا آنند گوڑا کو ریلوے کی ذمہ داری سے سبکدوش کردیا لیکن مجلسِ وزراء سے نکال باہر کرنے کے بجائے وزیر قانون بنا دیا۔ اس طرح گویا سدا آنند گوڑا کو اپنے بیٹے کو سزا سے بچانے کیلئے سہولت فراہم کردی گئی اس لئے کہ ایسے جج تو ملک میں کم ہی ہوں گے جو اپنے وزیر کے فرزند ارجمند کو جیل بھیجنے کی جرأت رندانہ کا مظاہرہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولس نے ملزم کو سزا دلوانے کے بجائے یہ ثابت کرنے پر اپنا زور صرف کیا کہ کارتک سے ملاقات

کیلئے وہ اداکاری ازخود آئی تھی اس لئے پر زور زبردستی کا مقدمہ نہیں بنتا ہاں دھوکہ دہی یعنی دفع ۴۲۰ ضرور لگتی ہے۔

وزیر قانون کے سامنے اب نیا مسئلہ اپنے ۴۲۰ بیٹے کی شادی کرانے کا تھا۔ وہ اس کام میں جٹ گئے اور اس سال اکتوبر میں اس فرض منصبی سے بھی فارغ ہوگئے جبکہ اس فلمی اداکارہ کے مطابق کارتک نے ۵ جون ۲۰۱۴ء کو اس کے گلے میں منگل سوتر ڈالا تھا اور اپنے دوستوں سے اس کا تعارف بیوی کے طور پر کرایا تھا۔ اداکارہ کے مطابق یہ کارتک کی یہ دوسری شادی ہے۔ اس دوران سدا آنند پر زمین گھوٹالے کا ایک نیا الزام بھی لوک آیوکت کی عدالت میں لگ گیا۔ اب ایسے میں بیچارہ وزیر قانون اپنے آپ کو قانونی شکنجوں سے بچائے یا کارتک کو نظر انداز کرکے نربھیا کی آبروریزی کرنے والے کو سزا دلوائے ؟

عوام کے دباو میں ممکن ہے ۲۲ دسمبر کو دستوری ترمیم عمل میں آجائے گی لیکن اس کے باوجود جو مجرم رہا ہو چکا ہے اس کو سزا دینا ناممکن ہے۔ فی الحال اشتراکیوں کے علاوہ سارا حزب اختلاف اور سرکار اس قانون کو پاس کرنے کے حق میں ہے کہ وہ۔ سیتارام یچوری اب بھی اسے مزید غوروخوض کیلئے سیلیکٹ کمیٹی کے حوالے کرنا چاہتے ہیں لیکن اندیشہ یہ ہے کہیں پھر سے ٹھنڈے بستے میں نہ چلا جائے۔ ویسے اس قانون کے پاس ہوجانے کے باوجود مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ جس روز ایوان بالا میں اس پر بحث ہو رہی اسی دن روہتک کی عدالت نے ایک نیپالی لڑکی

کی نہایت بہیمانہ عصمت دری اور قتل پر ۷ لوگوں کو موت کی سزا سنائی۔ اس جرم کے آٹھویں ملزم نے خود کشی کر لی لیکن نواں ۱۵ سال کا ہے۔ نئے قانون کے باوجود وہ مجرم زیادہ سے زیادہ ۳ سال اصلاحی مرکز میں قیام کے بعد رہا ہو جائیگا۔ اس طرح گویا پھر ایک بار ثابت ہو جائیگا کہ الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو کر وضع کردہ انسانی قوانین ناقص ہوتے ہیں۔ ضرورت قانون بدلنے کی نہیں تبدیلیٔ نظام کی ہے بقول مظفر وارثی

فولاد سے فولاد تو کٹ سکتا ہے لیکن
قانون سے قانون کو بدلا نہیں جاتا

انسانوں کے فلاح و بہبود کا حقیقی ضامن تو ان کے خالق و مالک کے سوا کوئی اور کا بنایا ہوا قانون کیوں کر ہو سکتا ہے؟ شارحین اسلام کا دورِ اول ہی میں سن بلوغ کی عمر کا تعین طبعی بنیاد پر ۹ تا ۱۲ سال کر دیا تھا (اگرچہ کہ علامات کے ظاہر نہ ہونے کی صورت میں ۱۵ سال تک کا استثناء بھی موجود ہے) اس بات کا بینّ ثبوت ہے کہ وہ اسلامی شریعت اور انسانی فطرت سے خوب واقف تھے۔ برطانیہ میں بھی ۱۰ تا ۱۷ سال کے نوجوانوں کو کمسن شمار کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ قتل یا آبرو ریزی جیسے گھناونے جرائم کا ارتکاب کریں تو نوجوانوں کی عدالت سے ان کا مقدمہ ملکہ کی عدالت (کراون کورٹ) میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

امریکہ کی مختلف ریاستوں میں قانون مختلف ہے لیکن کم از کم ۱۴ سال کے لڑکے کو بڑوں کی سزا مل سکتی ہے۔ ونکوسن کے ۱۶ سالہ نوجوان بروگن رافرٹی کو ۲۰۱۱ میں قتل کے الزام میں جیل بھیجا گیا۔ اسی سال کولاریڈو کے ایک ۱۲ سال کے لڑکے نے اپنے والدین کو ہلاک کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائیوں پر حملہ کیا۔ اعتراف جرم کے بعد اسے کمسنوں کی عدالت نے ۷ سال کی سزا سنائی۔ آبرو ریزی کے واقعات امریکہ کے ترقی یافتہ معاشرے میں بھی سامنے آئے ہیں مثلاً اسٹیوبن ولا میں دو ۱۶ سالہ فٹ بال کھلاڑیوں نے ایک نشے میں دھت نوجوان لڑکی کی عزت لوٹ لی۔ سندر لینڈ میں ایک ۱۲ سال طالب علم نے اپنی استانی کی عصمت تار تار کر دیا۔ بولٹن کے ۱۲ سالہ لڑکے نے دو لڑکیوں کی عزت لوٹ لی جن عمر ۱۰ اور ۱۱ سال تھی۔ امریکہ میں ۲۰ فیصد جرائم کا ارتکاب یہ نام نہاد کمسن نوجوان کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی کم عمر نوجوانوں میں جرائم کے رجحان میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ گوہاٹی کے اندر گزشتہ دنوں پانچ لڑکے ایک ۱۲ سالہ لڑکی کو ورغلا کر اپنے جھوپڑے میں لے گئے اور اس کی عصمت تار تار کرتے رہے۔ پکڑے جانے پر ان سب نے اپنے کم سن ہونے کا دعویٰ کر دیا بعد میں ان کو اصلاح اطفال کے مرکز روانہ کر دیا گیا۔ اگر قانون میں تبدیلی ہو بھی جائے تب بھی ان میں سے کچھ

اپنے آپ کو ۱۶ سال سے کم کا ثابت کرکے ۳ سال کے اندر چھوٹ جائیں گے۔ جرائم کا اعداد و شمار رکھنے والے قومی ادارے (این سی آر بی) کے مطابق ۲۰۱۲ء میں ۳۵ ہزار سے زیادہ کم سن لوگ جرائم میں ملوث پائے گئے جن میں سے ایک تہائی یعنی دس ہزار سے زیادہ ۱۶ سال سے کم عمر کے تھے۔ ان جرائم کے اندر چوری چکاری تو صرف دوگنا بڑھی لیکن خواتین کے اغواء میں ۶ء۶ گنا اضافہ ہوا۔ ۲۰۰۲ء سے لے کر ۲۰۱۲ء کی دہائی میں ان نام نہاد کم سنوں کے ذریعہ عصمت دری کے واقعات میں ۵ء۱ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس عرصے میں خواتین اور بچیوں کے اغواء کی وارداتیں ۵ گنا بڑھ گئیں۔

اس بھیانک صورتحال کی اولین ذمہ داری ہمارے سیاستدانوں پر جاتی ہے جن کے ناعاقبت اندیش رویہ نے مجرمین کے حوصلے بلند کردیئے ہیں۔ مثال کے طور دو ماہ قبل دہلی میں دو معصوم بچیوں کی اجتماعی عصمت دری کے بعد وزیر اعلی اروند کیجریوال نے دہلی پولیس پر نشانہ سادھتے ہوئے وزیراعظم اور لیفٹننٹ گورنر پر حملہ بول دیا ہے۔ کیجریوال نے دہلی میں بڑھتے جرائم کے لئے دہلی پولیس کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے (اس لئے کہ وہ مرکزی حکومت کے تحت ہے)۔ کیجریوال نے دہلی میں مسلسل ہونے والی عصمت دری کے وارداتوں کو شرمناک اور باعث تشویش قرار دیتے ہوئے سوال کیا کہ پی ایم اور ایل جی کیا کر رہے ہیں؟ اس کے جواب میں دہلی خواتین کمیشن کی سابق صدر برکھا سنگھ نے کیجریوال حکومت پر

الزام لگایا کہ کیجریوال حکومت صرف اپنی تشہیر میں لگی ہوئی ہے جبکہ دہلی میں خواتین کے خلاف جرائم بڑھتے جا رہے ہیں۔

ماضی میں اس طرح کی سیاسی بیان بازی کا مظاہرہ وزیر خزانہ ارون جیٹلی بھی کر چکے ہیں۔ انہوں نے وزارت سیاحت کے ایک اجلاس میں آبرو ریزی کے واقعات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ دہلی میں ایک معمولی واقعہ کے مشتہر ہو جانے کے سبب ملک کو سیاحت کے شعبے میں کھربوں روپے کا خسارہ اٹھانا پڑے۔ ان کے خیال میں عصمت دری کے واقعات کے وقوع پذیر ہونے سے زیادہ نقصان دہ ان کی تر ہی ہے اور وہ اس خسارے کو دولت ترازو میں تولتے ہیں۔ ایوان میں بحث کے اندر حصہ لیتے ہوئے ٹی ایم سی کے ڈیرک اوبرائن نے کمال خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اگر وہ خدانخواستہ میری بیٹی ہوتی تو میں دنیا کا بہترین وکیل کرتا یا بندوق اٹھا کر اس مجرم کو قتل کر دیتا۔ اس کے برعکس جیوتی سنگھ عرف نربھیا کی والدہ آشا دیوی نے کہتی ہیں کہ ہندوستان کی ہر لڑکی کے تحفظ کی خاطر وہ اپنی جنگ جاری رکھیں گے۔ انہوں نے یہ سوال بھی کیا کہ ہمیں عدالت عالیہ سے کسی موافق فیصلے کی توقع نہیں تھی لیکن میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ آخر قانون کی تبدیلی کیلئے کتنی نربھیا درکار ہیں؟

اس موقع پر سب سے اہم بات سواتی مالیوال نے کہی کہ اب وقت آگیا ہے کہ خواتین موم بتی کہ بجائے مشعل اٹھا کر میدان عمل میں اتریں۔ خواتین ہی کیوں مردوں کو بھی ظلم و جبر کے خلاف اس جنگ میں شانہ بشانہ شامل ہونا پڑے گا تبھی اس کا سدّباب ہوسکے گا۔ نربھیا کے والد بدری سنگھ پانڈے نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم مجبور نہیں ہیں مگر نظام عاجز ہے۔ وہ اپنی اہلیہ آشا دیوی کے ساتھ اس تاریخی اجلاس کا مشاہدہ کرنے کیلئے ناظرین کی صف میں آکر بیٹھے جس میں دستور کی ترمیم پر بحث ہو رہی تھی۔ اس سے قبل بدری سنگھ نے ایوان میں پارلیمانی امور کے وزیر مملکت مختار عباس نقوی سے ملاقات کے بعد کہا باتیں بہت ہوچکی اب مزید کسی تاخیر کے عملدرآمد ہونا چاہئے۔ نربھیا کے والدین کی ایوان پارلیمان میں موجودگی پر مظفر وارثی ہی کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

دریا کے کنارے تو پہنچ جاتے ہیں پیاسے
پیاسوں کے گھروں تک کوئی دریا نہیں جاتا !

پاک دورہ: وہ کیا تغیرات کے سانچے میں ڈھل گئے

’’اب تو یہ آنا جانا لگا رہے گا‘‘ وزیر اعظم نریندر مودی نے یہ جملہ کس کس سے کہا یہ شمار کرنا تو مشکل ہے مگر آخری بار جس کو کہا اسے سب جانتے ہیں۔ گزشتہ دنوں سوشیل میڈیا پر ایک کارٹون چل پڑا تھا جس میں اوبامہ کو مودی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوتن سے یہ کہتے دکھایا گیا تھا کہ خبردار اس آدمی سے ہوشیار رہنا۔ یہ تم کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دے گا اور اگر جواب میں تم نے بھی تکلفاً اسے اپنے یہاں بلا لیا تو فوراً بوریا بستر باندھ کر آدھمکے گا۔ یہ لطیفہ یوں ہی نہیں بنا۔ مودی جی پہلی مرتبہ بن بلائے ہی جرمنی پہنچ گئے تھے مگر انجیلا مرکل ان سے جان چھڑا کر ورلڈ کپ دیکھنے کیلئے برازیل چلی گئیں۔ غیر ملکی دوروں کا یہ سلسلہ سلور جوبلی منا چکا ہے مگر اس کی کیفیت میں ہنوز کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ۔ مودی جی کا سنکٹ وموچن منجن غیر ملکی سفر ہے ۔ دہلی کی شکست کے بعد اپنا غم غلط کرنے کیلئے وہ سیشلیس نامی نامعلوم جزیرے سے ہو کر ماریشس پہنچے اور سری لنکا سے ہوتے ہوئے واپس آ گئے ۔ بہار کی ہار کے بعد برطانیہ کی جانب نکل کھڑے ہوئے۔ اب جبکہ کیرتی آزاد نے ان کے منظور نظر ارون جیٹلی کی گردن دبوچ لی تو مودی جی نے روس کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ اس کے بعد جب دادری معاملے کی فرد

جرم داخل ہونے کا وقت آیا جس میں بی جے پی کے مقامی رہنما کا بیٹا اور بھتیجا دونوں نامزد ہیں تو وہ افغانستان کی پناہ یں روپوش ہوگئے اور سجن جندل کی احسانمندی یں پاکستان ہوتے ہوئے لوٹے۔

پولس والوں کو جب کسی جرم کا سراغ نہیں ملتا تو وہ اس سوال پر غور کرنے لگتے ہیں کہ اس سے کس کو خطرہ تھا یا اس میں کس کا فائدہ ہے ؟ اسی طرح ذرائع ابلاغ کے کاغذی رہنماؤں کی خبروں کے پس پردہ ان واقعات کو تلاش کرنا ضروری ہوتا ہے کہ جو خبر بن کر انہیں نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس منطق کا اگر حالیہ واقعات پر انطباق کیا جائے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ بی جے پی نے کانگریس کو ایوان بالا میں راہ پر لانے کیلئے نیشنل ہیرالڈ کا قضیہ اچھال دیا لیکن ان سے غلطی یہ ہوگئی کہ انہوں نے اسی دوران کیجریوال پر بھی ہاتھ ڈال دیا جبکہ اس کی فی الحال ضرورت نہیں تھی۔ کانگریسی تو خیر بیان بازی سے آگے نہیں بڑھے لیکن کیجریوال چونکہ سیاست سے پہلے ایک احتجاجی تحریک کے کارندے ہیں اس لئے انہوں نے اپنی مدافعت کے بجائے الٹا بی جے پی پر ہلہ بولتے ہوئے ارون جیٹلی کو نشانے پر لے لیا۔ اس سے کانگریس کا بھلا ہوگیا عوام یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ بی جے پی اپنے مخالفین کو بدلے کی نیت سے بلاوجہ پریشان کر رہی ہے۔

دہلی سرکار کے ڈی ڈی سی اے بدعنوانی کی تفتیش کے فیصلے پر ارون جیٹلی کی بے

چٹنی نے ثابت کردیا کہ دال میں کالا ہے۔ کیجریوال پر چونکہ ان کا زور نہیں چلتا تھا اس لئے دس کروڈ کی ہتک عزت کا دعویٰ ٹھونک کر ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی گئی اور کیجریوال کا نزلہ کرکٹ کھلاڑی اور بی جے پی کے رکن پارلیمان کیرتی آزاد پر اتارا گیا۔ کیرتی آزاد کا مطالبہ نیا نہیں ہے بلکہ گزشتہ دس سالوں سے وہ یہ الزام لگا رہے ہیں لیکن کانگریس نے انہیں نظر انداز کر رکھا تھا۔ کیرتی آزاد کی حمایت میں پہلے تو شتروگھن سنہا آئے اور اس کے بعد سبرامنیم سوامی بھی آگئے۔ سوامی جی اپنی عمر کے اس آخری پڑاؤ میں کسی سرکاری عہدے کیلئے ہاتھ پاوں مار رہے ہیں۔ پہلے تو انہیں امید تھی کہ اگر وزیر خزانہ نہ سہی تو کم از کم وزیر مملکت کا قلمدان ہاتھ آجائیگا لیکن جب وہ بھی نہیں ملا تو مایوس ہوگئے۔ اس کے بعد جے این یو کے وائس چانسلر کا جھنجھنا دکھا کر انہیں بہلایا گیا مگر پھر ٹھینگا دکھا دیا گیا۔ ایسے میں سوامی کو لگا کہ اگر جیٹلی کی چھٹی ہو جائے تو ان کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں اس لئے وہ آزاد کے حامی بن گئے۔

ارون جیٹلی ایک زمانے میں وزیر دفاع اور وزیر خزانہ دونوں عہدوں پر فائز تھے بعد میں ان سے وزارتِ دفاع کا قلمدان لے کر منوہر پریکر کو دے دیا گیا اور اب حزب اختلاف کی جانب وزارت خزانہ سے استعفیٰ کا مطالبہ بھی کیا جارہا تھا اس لئے جیٹلی کی پریشانی بھی بجا ہے۔ بی جے پی نے اول تو کیرتی آزاد کو بھی

شتروگھن سنہا کی طرح نظر انداز کیا مگر جیٹلی نے اسے وقار کا مسئلہ بنالیا۔ کیرتی آزاد نے جیٹلی پر باقائدہ الزام تراشی کرنے کے بجائے صرف بدعنوانی کی بات کی تھی اس کے باوجود جیٹلی نے امیت شاہ سے کہہ دیا کہ اگر آزاد کو پارٹی سے نہیں نکالا جاتا تو وہ وزارتِ خزانہ کے علاوہ پارٹی کے سارے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں گے۔ جیٹلی کی اس دھمکی نے پارٹی صدر اور وزیراعظم دونوں کو تشویش میں مبتلاء کردیا۔ اس طرح گویا پارٹی کے ایک پروہت نے کالے دھن کے مرگھٹ پر کیرتی آزاد کو بلی کا بکرہ بنادیا۔ بی جے پی اس سے قبل یہی سلوک رام جیٹھ ملانی اور ارون شوری کے ساتھ کرچکی ہے۔ ان دونوں کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر وزیراعظم پر تنقید کی جرأت رندانہ کا مظاہرہ کیا تھا۔

کیرتی آزاد کے پروانہ آزادی پر مہرثبت کرکے مودی جی روس روانہ ہوئے اور اُدھر اترپردیش کی عدالت میں دادری معاملے کی فردِ جرم داخل کردی۔ اس کے اندر ۱۵ لوگوں کے نام موجود ہیں اور مزید دو لوگوں کو شامل کیا جانا باقی ہے۔ محمد اخلاق کی بیٹی شائستہ کی شکایت پر جو پورے سانحہ کی چشم دید گواہ ہے یہ چارج شیٹ تیار کی گئی۔ قاتلوں نے شائستہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کے خلاف زبان کھولنے کی غلطی نہ کرے ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس کے باپ اور بھائی کا ہوا ہے۔ بزدل قاتل یہ بھول گئے تھے کہ شائستہ مسلمان ہے اور

مسلمان خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ شائستہ نے نہ صرف اپنا تفصیلی بیان درج کروایا بلکہ ملزمین کی شناخت بھی کرلی ۔ ان میں اہم ترین ملزم بی جے پی رہنما سنجے رانا کا بیٹا وشال اور بھتیجا شیوم ہے جس نے اپنے جرم اعتراف کرلیا ہے۔ وشال نے پولس سے کہا ہے کہ جب اسے یہ خبر دی گئی کہ محمد اخلاق نے گائے ذبح کرکے اس کا گوشت کھایا ہے تو اس کا خون کھول گیا اور اس نے مندر سے اعلان کروانے کی بعد ہجوم کو جمع کرکے حملہ کردیا۔

اس فردِ جرم کے بعد قوی امکان تھا کہ پھر ایک بار ذرائع ابلاغ میں عدم برداشت اور نارواداری موضوع بحث بن جاتے۔ اس لئے کہ روس کے اندر وزیراعظم کا اسلحہ خریدنے کے علاوہ جو واحد کارنامہ اپنے ہی ملک کے قومی ترانے کے دوران چل پڑنا تھا۔ روسی افسران چونکہ اس کو قومی ترانے کی توہین سمجھتے ہیں اس لئے انہیں مودی جی کو کندھا پکڑ کر واپس لانا پڑا جو اپنے آپ میں ایک توہین تھا خیر اس کی ویڈیو کو قومی ذرائع ابلاغ نے خوب اچھالا اور یہ عوام کی تفریح کا سامان بنی۔ غیر ملکی دوروں پر اس طرح کی دلچسپ حرکات سے مفت کی تفریح فراہم کرنا مودی جی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس پر سوشیل میڈیا میں جو تبصرے ہوئے وہ بہت دلچسپ ہیں ۔ کسی نے لکھا کہ وزیراعظم اپنے قومی ترانے کو پہچان نہیں سکے۔ کسی نہ کہا مودی جی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر قومی ترانہ بجانے والوں کو اپنا کام بند کردینا چاہئے تھا گویا وہ وزیراعظم کی نہیں ان

لوگوں کی غلطی تھی۔ یا کم از کم اس افسر کو عدم برداشت کا مظاہرہ کرنے بجائے اس معمولی سی غلطی کو برداشت کرکے اسے نظر انداز کردینا چاہئے تھا۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ وزیراعظم اس سے قبل الٹے پرچم کے ساتھ تصویر کھنچوا چکے ہیں بلکہ ایک بار اس سے اپنا پسینہ بھی پونچھ چکے ہیں۔

مودی جی کی جلدبازی دیکھ کر روسیوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہوگی کہ انہیں افغانستان جانے کی جلدی ہے۔ ایسے میں ممکن ہے ان لوگوں نے کوی بھرت ویاس کے انداز میں انہیں سمجھانے کی بھی کوشش کی ہو ''اتنی جلدی کیا ہے گوری ساجن کے گھر جانے کی، سکھیوں کے سنگ بیٹھ ذرا کچھ باتیں سمجھانے کی''۔ افغانستان کے بارے میں روسیوں سے زیادہ کون جانتا ہے اس لئے کہ ان کو افغان مجاہدین نے جو زخم دیا ہے وہ اسے قیامت تک بھول نہیں سکتے لیکن روسیوں کو کیا پتہ کہ ہمارے وزیراعظم کے پاس سمجھنے سمجھانے پر ضائع کرنے کیلئے وقت نہیں ہے وہ تو بس ''کرم کئے جا پھل کی اِچھا مت کر انسان، جیسے کرم کرے گا ویسے پھل دے گا بھگوان'' میں وشواس کرنے والے بھلے مانس ہیں۔ خیر آگے چل کر پتہ چلا کہ وزیراعظم ایسے بھولے بھالے بھی نہیں جیسا کہ روسی سمجھتے تھے وہ افغانستان میں نہیں بلکہ پاکستان میں اپنے ساجن سے ملنے کیلئے بے چین تھے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ جب وہ اقتدار سے محروم ہوتی ہے اسے پاکستان وِلن نظر آتا ہے اور جب وہ انتخاب میں کامیاب ہوجاتی ہے تو پاکستان اچانک اس کا ساجن بن جاتا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب راج ناتھ سنگھ نے منموہن سنگھ کے یوسف رضا گیلانی سے مصافحہ کرنے پر اعتراض کیا تھا اور اب یہ حالت ہے کہ معانقہ تو درکنار یہ لوگ قدموں تک کو چوم رہے ہیں ۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کہ جب نواز شریف نے اپنی والدہ کا تعارف مودی جی سے کرایا تو انہوں نے چرن چھوئے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اٹل جی کے بعد پاکستان کا دورہ کرنے کا شرف مودی جی کو حاصل ہوا ہے۔ جب کوئی کانگریسی رہنما پاکستان سے تعلقات استوار کرنے کی بات کرتا ہے تو انہیں سرحد پر بہنے والا فوجیوں کا لہو یاد آتا ہے۔ ممبئی دھماکے ، کارگل کی فوج کشی، تاج کی دہشت گردی اور ایوانِ پارلیمان پر حملہ نظر آتا ہے لیکن جب وہ خود پاکستان سے پینگیں بڑھاتے ہیں تو انہیں اکھنڈ بھارت کے خواب دکھائی دینے لگتے ہیں ۔ یہ لوگ ٹائیگر میمن ، داؤد ابراہیم، حافظ سعید اور ذکی الرحمٰن لکھوی وغیرہ کی پاکستان میں موجودگی کو یکسر فراموش کردیتے ہیں ۔ نام نہاد دہشت گردی کی کمین گاہ یکلخت ان کیلئے امن کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔

بی جے پی کیلئے پاکستان دشمنی ایک انتخابی ضرورت ہے اسی لئے انتخاب سے قبل پاکستان کو اس کی اپنی زبان میں جواب دینے کی وکالت کرنے والے مودی جی کو

اپنی حلف برداری میں مہمان خصوصی کے طور پر سب سے پہلے نواز شریف کا خیال آتا ہے۔ اس کے بعد جموں کشمیر میں انتخاب کے وقت اچانک سرحد پر گولہ باری تیز ہوجاتی ہے۔ حریت سے پاکستانی سفار تکار کی ملاقات کو وقار کا مسئلہ بنا کر مذاکرات منسوخ کردیئے جاتے ہیں۔ بہار کے انتخاب سے قبل کشمیر پر بات چیت نہ کرنے کی شرائط ڈال کر کڑا رخ اختیار کیا جاتا ہے اور بہار میں بی جے پی کی شکست پر پاکستان میں دیوالی منائے جانے کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے بعد موسم کے بدلتے ہی گرگٹ اپنی جلد کا رنگ تبدیل کردیتا ہے۔ ایک خبر تو یہ بھی ہے کہ نیپال میں سجن جندل کے کمرے میں ملاقات کے دوران مودی جی نے خود یہ کہا تھا کہ جموں کشمیر کے انتخاب کے باعث وہ کوئی اہم پیش رفت نہیں کرسکتے نواز شریف نے بھی فوج کے دباو کا ذکر کرکے وقت مانگا۔ خیر اب ممکن ہے آئندہ سال پنجاب کے انتخاب تک یہ خوشگوار ماحول رہے اس کے بعد کیا ہوگا یہ کہنا مشکل ہے؟

پاکستان کے حوالے سے مودی جی نہ صرف داخلی دباو بلکہ خارجی خوشنودی کے پیش نظر بھی بیان بازی کرتے رہے ہیں مثلاً بنگلہ دیش کے اندر عوامی لیگ کو خوش کرنے کیلئے انہوں نے پاکستان کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ یمن کے بعد چونکہ امارات کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے اس لئے دبئی کے اندر بھی مودی جی نے پاکستان کے خلاف خوب زہر افشانی کرکے مقامی حکمرانوں کی خوش

کردیا۔ افغانستان کے اندر بھی وہ بلاواسطہ پاکستان کو برا بھلا کہنے سے نہیں چوکے مگر اس کے چند گھنٹوں بعد ہی پاکستان میں جاکر ''ملے سُر میرا تمہارا'' کا راگ الاپنے لگے ۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہی کرنا تھا وہ درمیان میں اس ناٹک کی ضرورت کیا تھی؟ اور اگر یہ ڈرامہ ہے تو حقیقت کیا ہے؟اس سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کی نوٹنکی سے مستحکم بنیادوں پر ہمسایہ ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار ہو سکتے ہیں؟ کیا مل جل کر سالگرہ کا کیک کاٹنے سے دل بھی آپس میں مل جاتے ہیں ؟ اگر یہ کام اسی قدر آسان ہے تو مودی جی کیرتی آزاد، رام جیٹھ ملانی اور ارون شوری کے ساتھ سالگرہ کیوں نہیں مناتے ؟ ویسے بہار کے انتخابی نتائج والے دن لال کرشن اڈوانی کے ساتھ مودی جی نے یہ حربہ آزمانے کی کوشش تو کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی ۔ اڈوانی جی فی الحال اپنے دیرینہ شاگردِ رشید ارون جیٹلی کے بجائے ان کے دشمن کیرتی آزاد کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔

پاکستانی دورے کے متعلق یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی کہ فیصلہ اچانک ہوگیا تھا حالانکہ یہ بالکل بچکانہ بات تھی ۔ اخبار جنگ نے یہ راز فاش کردیا کہ لاہور ہوئی اڈے کو ایک دن قبل ہی پروازوں کی تحدید کے احکامات جاری کردیئے گئے ۔ اس کے علاوہ مودی جی نواز شریف اور ان کے اہل خاندان کو جو نواسی کی شادی کے موقع پر جو تحفے تحائف دیئے ان کا اہتمام

فوراً کیوں کر ہو سکتا تھا؟ یہ حسن اتفاق ہے کہ شام ۴بج کر ۲۰ منٹ پر جب مودی جی کا جہاز لاہور ہوائی اڈے پر اترا تو گھڑی کے کانٹے اس من گھڑت کہانی کی چار سو بیسی پر مسکرا رہے تھے۔ اب تو یہ بات تھیلے سے باہر آگئی ہے کہ ہندوستانی فولاد بنانے والے صنعتکاروں کا ایک ادارہ افغان آئرن اینڈ اسٹیل کنسٹوریم بامیان (افغانستان) سے معدنیات درآمد کرتا ہے۔ اس میں سجن جندل نامی سرمایہ دار کے ۱۶ اور اس کے عم زاد بھائی کے ۴ فیصد حصص ہیں۔ یہ لوگ فی الحال روس کے راستے اپنا مال لاتے ہیں لیکن اگر یہی فراہمی پاکستان کے راستے کراچی سے ہونے لگے تو وقت اور سرمایہ کی بڑی بچت ہو سکتی ہے۔ نواز شریف چونکہ خود بھی فولاد کے بہت بڑے تاجر ہیں اس لئے جندل سے ان کے خاندانی مراسم ہیں اسی لئے جندل کی تحریک پر مودی جی نے پاکستان جانے کا قصد فرمایا۔

وزیراعظم کا کھل کر اڈانی اور امبانی جیسے سرمایہ داروں کو طرفداری کرنا ان کے عہدے کے وقار کو مجروح کرتا ہے۔ اس پر جہاں حزب اختلاف کو اعتراض ہے وہیں عام لوگوں کو بھی تشویش ہے۔ لیکن اپنی دیش بھکتی پر ناز کرنے والی بی جے پی کے نزدیک یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ ویسے تو بی جے پی معاشی شعبے کے سربراہ نریندر تنیجا اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ وزیراعظم کو اپنی ملاقات طے کرنے کیلئے کسی تاجر کی ضرورت ہے۔ ان کا کہنا ہے وزیراعظم براہ راست

نواز شریف سے بات کر سکتے ہیں اور حال میں دونوں سربراہ پیرس میں مل بھی چکے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ تنیجا نے یہ اعتراف بھی کیا کہ اس دور میں ۲۰۰۰ء کے کارگل کے زمانے کی سفارتکاری ممکن نہیں ہے۔ آج کل ۸۰ فیصد سفارتکاری کا فیصلہ تاجر حضرات کرتے ہیں۔ تنیجا کے مطابق تجارت و حرفت کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور مودی اس خیال کے بہت بڑے حامیمیں۔ یہی وجہ ہے کہ سجن جندل دہلی میں نواز شریف کو چائے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کے لڑکے کو اپنے ساتھ کھانے پر لے کر جاتا ہے۔ نیپال میں اپنے کمرے کے اندر دونوں سربراہان کی ملاقات کرواتا ہے اور مودی کی آمد سے قبل لاہور پہنچ جاتا ہے۔ قوم کی حالت زار پر ''راجہ بیوپاری جنتا بھکاری'' کی مثل صادق آتی ہے۔

گزشتہ انتخابی مہم کے دوران اچھالے جانے والے نعروں میں '' اچھے دن'' اور کالادھن'' کے علاوہ ''نہ کھاوں گا نہ کھانے دوں گا'' ضرب المثل بن گئے تھے۔ یہ'' تینوں وعدے مودی جی نے ڈیڑھ سال کے اندر پورے کردیئے۔ اڈانی اور امبانی تو کجا کانگریسی جندل تک کے اچھے دن آگئے۔ کالادھن جتنا کچھ بھی واپس آیا عوام کے بجائے بھکتوں میں تقسیم ہوگیا۔ جہاں تک کھانے کھلانے کا سوال ہے مودی جی نے اپنی پارٹی والوں کو بھی اس کا موقع نہیں دیا بلکہ خود ہی سب کچھ ہڑپ کرگئے۔ اس نعرے کے مطابق انسان کھلانے سے پہلے کھاتا ہے اور چونکہ وزیراعظم سارے سرمایہ داروں کو جی بھر کے کھانے کا موقع فراہم کررہے

ہیں بلکہ عملاً ان کے سرپرست بن گئے ہیں۔ آسٹریلیا میں انہوں نے اڈانی کو نہ صرف ٹھیکہ دلوایا بلکہ فوراً سرکاری بنک سے قرض بھی مہیا کروادیا۔ افغانستان سے معدنیات کا برآمد کرنے والوں کے لئے پاکستان کی راہ ہموار کردی۔ تو کیا مودی جی یہ خدمت بلاقیمت کررہے ہوں گے ؟ اگر ایسا ہے تو اس کے سب سے زیادہ حقدار وہ رائے دہندگان ہیں جنھوں نے انہیں اقتدار کی کرسی پر فائز کیا ہے لیکن وہ بیچارہ اس کی قیمت تو ادا نہیں کرسکتا نہیں سرمایہ دار ضرور اس کی بھرپور قیمت چکا سکتے ہیں۔ جمہوری نظام حکومت کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس میں سیاستداں ایک سے ووٹ اور دوسرے سے نوٹ لے کر خود عیش کرتا ہے۔

پٹھانکوٹ کا دہشت گردانہ حملہ

جنوری (۲۰۱۵ء) کی شام ساڑھے چار بجے دوسری بار یہ خبر آئی کہ سارے دہشت ۴ گرد مارے جاچکے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ بالآخر ٦٠ گھنٹوں کے بعد وہ آپریشن ختم ہوچکا ہے جس میں ۷ فوجی جوان اور ٦ دہشت گرد مارے گئے (جس طرح پہلے ۴ کے بجائے ۵ کے مارے جانے دعویٰ کیا گیا تھا اس طرح بعد میں ٦ کی تعداد گھٹ کر ۵ پر آگئی)۔ اس سے دو گھنٹے قبل یعنی ڈھائی بجے ایک اور چونکا دینے والی خبر آئی۔
پنجاب پولس نے یہ بتایا کہ پنجاب اس نے راجدھانیچندیگڑھسے متصلموہالی
یںمنشیات کے تین اسمگلرس کو گرفتار کیا ہے جن کے پاس پاکستانی سم کارڈس اور پاکستان میں بنی خودکار رائفل و دیگر اسلحہ بھی تھا۔ پولس آفیسر جی پی ایس بھلر نے دعویٰ کیا کہ ان کاپٹھانکوٹ کی دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عام
طوراسمگلرس اپنے سرحد پار متعلقین سے رابطہ کرنے کیلئے پاکستانی سم کارڈ استعمال کرتے ہیں۔ یہ اس گروہ کے افراد ہیں جسے پولس پہلے ہی تحلیل کرچکی ہے۔
پٹھانکوٹ ہوائی فوج کے اڈے پر ہونے والا یہ حملہ یقیناً قابلِ مذمت ہے لیکن یہ کئی سلگتے ہوئے سوالوں کو جنم دیاہ ہے؟ ذرا سوچئے کہ اگربفرض محال اس گرفتاری کے بجائے مڈ بھیڑ ہوجاتی تو ٹیلی ویژن کے پردے پر ہمیں کیا کچھ

دیکھنے کو ملتا اور اخبارات میں ہم کیا پڑھتے۔ سب سے پہلے تو ان بدمعاشوں کی شہریت بدل جاتی اور وہ ہندوستانی سے پاکستانی بن جاتے۔ اس کے بعد ان کے سرحد پار کرنے کی معلومات تفصیلات کے ساتھ نشر ہونے لگتیں۔ لشکر یا جیش سے ان کا تعلق طشت ازبام ہوجاتا۔ ان کے فون سے جو تفصیلات برآمد ہوتیں اس سے پتہ چل جاتا کہ ان کا کس گروہ سے تعلق ہے اور اس کا سرغنہ کون ہے؟ یہ بھی معلوم ہوجاتا کہ وہ کہاں حملہ کرنے والے تھے؟ ممکن ہے ہندوستان کے اندر ان کے رابطوں کی مکمل تفصیلات مع تصاویر نشر ہوجاتیں اور چند اخبار والے پاکستان میں ان کے اعزہ واقرباء سے ملاقات کرنے کیلئے پہنچ جاتے لیکن افسوس کہ پولس نے کو انہیں معمولی اسمگلرس بتا کر ٹی وی چینلس کو ایک سنسنی خیز خبر اور عوام کو زبردست تفریح سے محروم کردیا۔

یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ حملے سے ۸۰ گھنٹے بعد بھی ایک غیر یقینی صورتحال بنی ہوئی ہے۔ دہشت گردانہ کارروائی کے اختتام سے متعلق لاکھ اختلاف کے باوجود اس کی ابتداء پر سارے لوگوں کا اتفاق ہے۔ اس شک نہیں کہ انتہائی بارسوخ ذرائع سے کارروائی کی بھنک انتظامیہ کو ۲۴ گھنٹے پہلے مل چکی تھی۔ جمعہ یکم جنوری کو ایک حیرت انگیز خبر نے ساری دنیا کو چونکا دیا کہ جموں پٹھانکوٹ روڈ پر ایک اعلیٰ پولس آفیسر سلویندر سنگھ کو کچھ نامعلوم افراد نے گاڑی سمیت اغواء کرلیا۔ جب تک کہ سلویندر کا سراغ نہیں ملا تھا

یہ قیاس آرائی کی جارہی تھی کہ یا تو چورانہیں اٹھالے گئے ہیں یا دہشت گردوں کی حرکت ہے۔ گاڑی پر چونکہ نیلی بتی لگی ہوئی تھی اس لئے اس کے غلط استعمال کا اندیشہ بھی ظاہر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سلویندر پولس کے ہتھے چڑھ گیا اور اس نے بتایا کہ اس کو اغواکاروں نے دوست اور باورچی سمیت کار سے نیچے پھینک دیا۔

سلویندر سنگھ کی کہانی پوری فلمی لگتی ہے۔ یہ اعلیٰ افسر گورداسپور میں مندر درشن کیلئے جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ حفاظتی دستے کے بجائے زیورات کا تاجر دوست راجیش ورما اور باورچی مدن گوپال ہوتا ہے۔ رات میں سفر کے دوران اس کی گاڑی پر لگی نیلی بتی بند ہوتی ہے۔ دہشت گرد انجانے میں اسے پکڑ لیتے ہیں۔ اس کی پگڑی سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیتے ہیں اور اس کی گاڑی کو لے کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فرار ہونے سے قبل وہ اسے بغیر کوئی زک پہنچائے گاڑی سے پھینک دیتے ہیں لیکن اس کے دوست اور باورچی کو مارنا پیٹنا نہیں بھولتے۔ اغواکار اس کا فون لے بھاگتے ہیں اور اس پر آنے والے فون سے انہیں پتہ چلتا ہے کہ یہ کس کی گاڑی ہے۔ وہ اسے مارنے کیلئے واپس آتے ہیں لیکن خواجہ اجمیری کی عقیدت اس کی جان بچا دیتی ہے۔ مدن گپتا کے مطابق جب ایک گھنٹے کی پیدل مسافت طے کرنے کے بعد سلویندر سنگھ ایک پولس اسٹیشن سے اپنے اعلیٰ افسران کو فون کرتا ہے تو وہ اس کو گھر جا کر دوسرے دن دفتر آنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ایک پولس افسر کی شکایت پر اس کے سینئرس کے اس ردعمل نے تو بالی

ووڈ کو بھی شرمندہ کردیا ہے؟

مندرجہ بالا معلومات فرضی نہیں ہیں بلکہ سلویندر سنگھ کے بیان کی بنیاد پر پیش کی گئی ہیں ۔ سلویندر سنگھ کے اس بیان پر عام قاری تو درکنار این آئی اے نے بھی یقین نہیں کیا اور جنوری کو ٦ گھنٹوں تک اس سے تفتیش کی گئی۔ اس کا سرحدی علاقہ میں جانا سب ۴ سے پہلا شبہ پیدا کرتا ہے۔ حفاظتی دستے کی غیر موجودگی بھی سارے بیان کو مشکوک بنا دیتی ہے۔ جن دہشت گردوں نے اس سے پہلے والے ٹیکسی ڈرائیور ایکاگر سنگھ کو ہلاک کردیا ان کا سلویندر اس کے ساتھیوں کو زندہ چھوڑ دینا باعثِ حیرت ہے ۔ پولس کار کی مدد سے بڑی آسانی کے ساتھ دہشت گردوں اپنے ہدف سے نصف کلومیٹر تک پہنچ جانا بھی اتفاق نہیں لگتا۔ سلویندر کی جانب سے دی جانے والی وارننگ پر توجہ نہیں دینے کی وجہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ اس کو ایک خاتون پولس اہلکار کی دست درازی کی شکایت پر منتقل کیا گیا اس لئے دہشت گردی سے متعلق اس کے شبہ کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔

این آئی اے کے مطابق وہ اپنا بیان بدلتا رہا ہے۔

جس وقت اس حیرت انگیز واقعہ کی خبر اخبارات (نیٹ ایڈیشن) کی زینت بنی اسی کے ساتھ قارئین نے یہ بھی پڑھا کہ وزیراعظم موسمیات کی تبدیلی (کلائمیٹ چینج) جیسے دقیق سائنسی موضوع اپنی تصنیف کردہ کتاب اعلیٰ سرکاری افسران کی

خدمت میں پیش کر رہے ہیں ۔ ایک عام سیاستداں کیلئے کلائمیٹ چینج پر کتاب لکھنا تو درکنا اس کے اسرار و رموز کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ میں خود ۳۰ سال سے ماحولیات کی دنیا میں کام کرنے کے باوجود اس کے متعلق بہت سارے پہلو نہیں سمجھ پایا ہوں لیکن پھر ہیں ایسا وزیراعظم بھی تو نہیں ہوں جو صوبائی انتخابات میں تقریریں کرتا پھرتا ہو اور دنیا بھر کے دوروں سے جسے فرصت نہ ہو۔ اس دوران جو مہا مانو شاعری بھی کرتا ہے اپنے کرم فرماوں پر کتابیں بھی لکھتا ہے ۔ اس کیلئے پنجاب کے ان معمولی واقعات پر توجہ دینا کس قدر دشوار ہے؟

سنیچر کی صبح پٹھانکوٹ فوجی چھاونی پر حملہ ہوگیا ۔ جس وزیراعظم نے نیپال کے وزیراعظم کو یہ اطلاع دی تھی کہ ان کے ملک میں زبردست زلزلہ آیا ہے اسے یقیناً اپنے ملک رونما ہونے والی اس سنگین واردات کی خبر مل گئی ہوگی ایسے میں اسے چاہئے تھا کہ پنجاب کا رخ کرتا ۔ اگر وہاں جانے کیجرأت نہیں تھی تو کم از کم دہلی میں بیٹھ کر اس کی کمان سنبھالتا لیکن وہ تو شمال کے بجائے جنوب میں میسور چلا گیا ؟ وزیراعظم تو دور کسی مرکزی وزیر نے پٹھانکوٹ جانے کا حوصلہ نہیں دکھایا ۔ حملے کے چار دن بعد وزیر دفاع منوہر پاریکر کو خیال آیا کہ انہیں ہوائی فوج کی چھاونی میں جاکر اپنے فوجیوں کی خیر خبر لینی چاہئے۔ گرداسپور کے حملے کے وقت بھی یہی ہوا تھا کہ وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ

کو اسی دن بی ایس ایف کے جلسے میں شریک ہونے کیلئے بھوپال جانا تھا۔ اس اہم واردات کے باوجود وزیر داخلہ نے اپنے دورے کو ملتوی کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ہمارے فوجیجس وقت اپنی جان کا نذرانہ پیش کر رہے تھے اور قوم دم بخود ٹیلی ویژن پر ان روح فرساں مناظر کو دیکھ رہی تھی ملک کا وزیر اعظم میسور کی حسین وادیوں میں قدم رنجا فرما رہا تھا۔ پہلے تو وزیر اعظم نے گنپتی سچدانند آشرم میں ایک دواخانے کا افتتاح کیا اور پھر للیتا پیلس ہوٹل میں سکون کی نیند سوگئے۔ دوسرے دن ستور مٹھ میں کی صد سالہ تقریبات میں شرکت فرماکر بھکتوں سے خطاب کیا اور سالانہ سائنس کانگریس کا افتتاح کرنے کیلئے مانسگنگوتری یونیورسٹی کے کیمپس میں چلے گئے۔ اس کے بعد بنگلورو سے ۱۰۰ کلومیٹر دور گنٹور میں ہندوستان ایئر و نوٹیکلس کے نئے کارخانے کا سنگ بنیاد رکھا اور پھر شام میں بنگلور و کے اندر پانچ روزہ یوگا کی عالمی کانفرنس کا افتتاح کرکے دہلی لوٹ آئے۔

وزیر اعظم جس وقت ان تقریبات میں تقاریر فرما رہے تھے بنگلورو میں مقیم قومی حفاظتی دستے کمانڈو ۳۵ سالہ لیفٹنٹ کرنل نرنجن کمار نےپٹھانکوٹ میں اپنی جان وطن عزیز پر قربان کردی۔ وزیر اعظم کے دل میں بنگلورو کے نادر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ نرنجن کے اہل خانہ کی تعزیت کی جائے۔ یاد رہے کہ یہ وہی

نریندر مودی ہیں جو ۲۶ نومبر کے تاج حملے کے وقت احمد آباد سے سیدھے ممبئی جا کر اس میں مارے جانے والے ہیمنت کرکرے کے گھر بھی پہنچ گئے تھے۔ (یہ اور بات ہے کہ ان کی اہلیہ نے گجرات کے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا)۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ایک وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم بننا تھا لیکن اب اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وزیر اعظم نے سنیچر کی شام سے اتوار کی شام تک جن سرگرمیوں میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا وہ ضروری تھیں اور انہیں اس میں کم از کم معمولی سی تبدیلی کرکے لیفٹننٹ کرنل نرنجن کے گھر نہیں جانا چاہئے تھا؟ کیا یہ تبدیلی کابل سے براہِ راست دہلی آنے بجائے لاہور سے ہوتے ہوئے آنے سے زیادہ مشکل تھی؟

دہلی آنے کے بعد وزیر اعظم نے بجا طور پر ایک اعلیٰ سطحی نشست کی صدارت کی جس میں قومی سلامتی کے مشیر اجیت دوول تو موجود تھے لیکن وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ ندارد تھے۔ اس میٹنگ میں وزارت خارجہ کے سکریٹری ایس جے شنکر کو بھی بلا گیا تھا مگر وزیر خارجہ سشما سوراج غائب تھیں۔ ان اہلکاروں کے علاوہ دو غیر منتخبہ وفادر وزراء منوہر پریکر اور ارون جیٹلی ضرور موجود تھے۔ اس اہم نشست میں وزیر دفاع کی موجودگی تو قابلِ فہم ہے لیکن وزیر خزانہ کا کیا کام؟ بعد میں پتہ چلا چونکہ دوسرے دن سے حکومت کا دفاع کرنے کی ذمہ داری ارون جیٹلی کو سونپنی تھی اس لئے انہیں زحمت دی گئی۔ اس نازک گھڑی میں بھی

قومی سلامتی کے براہِ راست ذمہ دار وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ اور جس وزارت خارجہ کے کام کاج پر یہ حملہ سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا ہے اس کی غیر حاضری شدید باہمی عدم اعتماد کی فضا کا پتہ دیتی ہے۔

وزارتِ داخلہ گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے پاکستانی ایجنٹوں کو ملک کے کونے کونے میں تلاش کرتا پھر رہا ہے اور اس نے آئی ایس آئی کیلئے کام کرنے والے ۱۴ جاسوسوں کو گرفتار کرنے کا دعویٰ بھی کیا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں بلکہ فوجی بھی ہیں۔ اس طرح گویا پاکستان کے خلاف ماحول گرما رہا تھا کہ مودی جی نے پاکستان کا اچانک دورہ کرکے ہوا کا رخ تبدیل کردیا لیکن ابھی خوشگوار برف باری رکی بھی نہیں تھی کہ آسمان سے شعلے برسنے لگے اور دیکھتے دیکھتے سارے کئے دھرے پر پانی پھر گیا۔ ہمارے ذرائع ابلاغ کی سہل پسندی کا یہ عالم ہے کہ جیسے ہی کوئی دہشت گردی کا واقعہ رونما ہوتا ہے وہ فوراً بلا کسی تحقیق و تفتیش اس کے تانے بانے پاکستانی سیاستداں، مذہبی رہنما، فوجی سربراہ، آئی ایس آئی، طالبان، القاعدہ، جیش اور لشکر سے جوڑ دیتا ہے لیکن بقول سابق وزیر اعلیٰ جموں کشمیر عمر عبداللہ ہم لوگ ماضی کے تجربات سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ اس صورتحال پر طنز کرتے ہوئے ایک پاکستانی سفارتکار نے دہلی کے اندر کہا تھا کہ آپ لوگ تو موسم کی خرابی کیلئے بھی آئی ایس آئی کو موردِ الزام ٹھہرا دیتے ہیں۔

اس حملے کی بنیادی وجوہات میں نہ صرف ایک دن پہلے سے عملدرآمد ہونے والے منصوبے کی مجرمانہ چشم پوشی بلکہ ۱۶ماہ قبل رچی جانے والی سازش کو نظرانداز کرنا بھیشامل ہے۔ پولس نے اس چھاونی کی معلومات پاکستان تک پہنچانے کے الزام میں اگست ۲۰۱۴ کو جودھپور کے رہنے والے فوجی سنیل کمار کو گرفتار کیا تھا۔ قومی سلامتی سے متعلق اس سنگین معاملے کو اس قدر ہلکا سمجھا گیا کہ پولس وقت پر اس کا چالان تک جمع نہیں کراسکی اور اس کو ضمانت مل گئی۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب انتظامیہ نے یعقوب میمن کو تختۂ دار پر پہنچانے کی خاطر آدھی رات میں عدالتِ عالیہ کے دروازے پر دستک دی تھی۔ حسن اتفاق یہ ہے راجستھان اور مہاراشٹر دونوں ریاستوں میں بی جے پی کی حکومت تھی۔ اگر سنیل کمار کا نام مسلمانوں جیسا ہوتا تو ممکن ہے اسے سنجیدگی سے لیا جاتا۔

افغانستانچند اکا دکا واقعات سے قطع نظرایک عرصے سے ہندوستان کیلئے محفوظ ملک تھا لیکن وزیراعظم کے کامیاب دورے کا اثر یہ ہوا کہ مزار شریف میں ہندوستانی سفارتخانے پر حملہ کے بعد جلال آباد میں بھی ہوگیا اس طرح گویاپٹھان کوٹ سے لے کر افغانستان تک عدم تحفظ کا ماحول بن گیا۔ سنگھ پریوار کے پاس اس کی صورتحال کے تین حل ہیں ۔ اول تو راضی خوشی سے یازور

زبردستی سے اکھنڈ بھارت بنا کر پاکستان ، افغانستان اور بنگلہ دیش کو ہندوستان میں شامل کرلیا جائے اورجب یہ ہوجائے تو بیچارے سری لنکا، نیپال اور برما کی کیا بساط وہ اپنے آپ چلے آئیں گے نیز اکھنڈ بھارت کے سارے باشندوں کو ثقافتی ہندو قرار دے دیا جائے لیکن اگر اس کے بعد بھی اس طرح کی واردات رونما ہوجائے تو یہ بیچارے اس کاالزام کس پر لگائیں گے اس لئے کہ نہ مسلمان موجود ہوگا اور نہ پاکستان ؟

ایک حل یہ بھی سمجھایا جاتا تھا کہ پاکستان میں موجود دہشت گردی کے اڈوں کو بمباری کرکے تباہ کردیا جائے لیکن پٹھانکوٹ میں کارروائی کی طوالت کا جواز یہ پیش کیا جارہا ہے کہ کم از کم جانیں ضائع ہوں ۔ مذکورہ بمباری اس کا احتمال کیسے ہوسکےگا؟ اس سوال کا جواب توامریکہ کے پاس بھی نہیں ہے۔ گزشتہ سال سنگھ پریوار کے کئی رہنماوں نے اپنے مخالفین کو پاکستان چلے جانے کا مشورہ دیا تھا ۔ ان کی اس درخواست پر ہندوستان میں صرف وزیراعظم نے عمل کیا اور وہ اچانک پاکستان کا دورہ کرکے چلے آئے لیکن ان کی اتباع میں پاکستانی دہشت گرد بن بلائے ہندوستان کی جانب نکل کھڑے ہوئے ۔ اس آنے جانے کا جو نتیجہ نکلا اسے ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ تین مرتبہ مہم کے خاتمے دعویٰ کے باوجود یہ تحریر جاری ہے اور گولی باری کی چھٹ پٹ آوازیں سنائی دے رہی ہیں ۔ دہشت گردی پر قابو پانے کیلئے پاکستان پاکستان کو سبق سکھانے

کا راگ الاپنے والوں کی زبان اس پر اس سے تعاون کے نغمے سن کر سیتارام یچوری جیسا رہنما حیرت سے سوال کرتا ہے کہ ۵۶ انچ والی سرکار کو یہ کیا ہوگیا؟

مفتی محمد سعید: اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

مفتی محمد سعید کے ساتھ کشمیر کی سیاست کا ایک اہم باب بند ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ عبداللہ کے بعد ان کا شمار وادی کے مقبول ترین رہنماؤں ہوگا۔ مفتی صاحب نے اپنی سیاسی زندگی کا طویل ترین عرصہ کانگریس میں گذارہ۔ کانگریس کا ساتھ چھوڑ کر وی پی سنگھ کے ساتھ جن مورچہ میں جانے کے فیصلے نے انہیں ملک کا پہلا مسلم وزیر داخلہ بنایا اس کے بعد وہ کانگریس میں لوٹے مگر پھر کنارہ کشی اختیار کرکے پی ڈی پی قائم کی۔ یہ فیصلہ بھی ان کیلئے نیک فال ثابت ہوااور وہ تیسرے نمبر پر ہونے کے باوجود ۲۰۰۲ء میں کانگریس کی مدد سے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر متمکن ہوگئے۔ ۲۰۱۴ء میں ان کی جماعت کو سب سے زیادہ نشستیں حاصل ہوگئیں اور انہوں نے بی جے پی کے ساتھ مل کر حکومت قائم کرلی۔ اس طرح گویا ساری سیاسی جماعتوں کے ساتھ اقتدار میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنی زندگی کا سفر تمام کیا۔ اس موقع پر یہ ضرب المثل شعر (ترمیم کے ساتھ) یاد آتا ہے

مفتی تار رے ساتھ عجب حادثہ ہوا
تم چلدیئے تا کرا زمانہ بچھڑ گیا

۲۰۱۴ء کے انتخابی نتائج نے جہاں قومی سطح پر خود بی جے پی کو چونکا دیا وہیں جموں کشمیر میں بھی ساری دنیا کو حیرت زدہ کردیا۔ اس مرتبہ جموں اور کشمیر گویا زعفرانی اور سبز رنگ میں مکمل طور پر تقسیم ہوگئے تھے۔ جموں کی تین نشستیں بی جے پی تو وادی کی تینوں نشستیں پی ڈی پی کے حصے میں چلی گئیں۔ مہاراشٹر اور ہریانہ کے صوبائی انتخاب میں بی جے پی نے خود اپنے بل بوتے پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ کر ساری سیاسی جماعتوں خوفزدہ کردیا تھا۔ اس کے بعد جب جموں کشمیر میں ریاستی انتخابات کا اعلان ہوا تو مفتی صاحب نے کہا صرف پی ڈی پی ہی ریاست میں بی جے پی کی پیش رفت کو روک سکتی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا تھا چونکہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کی طاقت ٹوٹ چکی ہے اس لئے بی جے پی اور پی ڈی پی کے درمیان سیدھا مقابلہ ہے اور بی جے پی کا اقتدار میں آنا ملک و صوبہ دونوں کیلئے نقصان دہ ہے۔ محبوبہ مفتی نے بی جے پی کے ساتھ جانے سے صاف انکار کردیا تھا مگر پھر باپ بیٹی اور باپ بیٹے کی سرکار کے خاتمہ کا اعلان کرنے والے وزیراعظم نے بھائی بھائی کی سرکار بنا لی جس میں ایک کے سرپر زعفرانی پگڑی تو دوسرے کے سر پر ہری ٹوپی تھی۔

۲۰۰۲ء سے لے کر ۲۰۱۴ء تک کے انتخابی نتائج پر نظر ڈالیں تو نہایت دلچسپ انکشافات ہوتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں نیشنل کانفرنس نے ۲۸ نشستیں پر کامیابی حاصل کی تھی اور پی ڈی پی ۱۶ نشستوں پر کامیاب ہوئی تھی جبکہ ۲۰۱۴ء کے آتے آتے

یہ ہوا کہ نیشنل کانفرنس ۱۵ پر تو پی ڈی پی ۲۸ پر پہنچ گئی ۔ اس بیچ پی ڈی پی کی نشستوں میں برابر اضافہ دیکھنے کو ملا ۲۰۰۸ء میں اسے ۲۱ نشستیں ملی تھیں ۔ اس کے ووٹ کا تناسب بھی بتدریج ۱۴٫۵ سے ۱۸٫۵ اور پھر ۲۲ فیصد تک جا پہنچا اس کے برعکس گوکہ نیشنل کانفرنس کی نشستیں ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۸ء میں یکساں یعنی ۲۸ تھیں مگر اس رائے دہندگان کا تناسب ۲۸ فیصد سے گھٹ کر ۲۳٫۵ فیصد ہو چکا تھا اور اس بار تو ۲۰ فیصد پر ہے۔ کانگریس کی حالت بھی نیشنل کانفرنس سے مختلف نہیں ہے۔ اس کی نشستوں کی تعداد ۲۰ سے ۱۷ اور اب صرف ۱۲ ہے۔ کانگریس کے ووٹ کا تناسب ۲۶ سے گھٹ کر ۲۰ سے ہوتا ہوا اب ۱۵ پر پہنچ چکا ہے اس طرح جہاں پی ڈی پی کو نیشنل کانفرنس کی کمزوری نے فائدہ پہنچایا وہیں بی جے پی نے کانگریس کی ناکامی سے استفادہ کیا۔

بی جے پی کا سیاسی سفر نہایت دلچسپ ہے ۱۹۹۶ء میں کانگریس کو سب سے بڑا جھٹکا اس وقت لگا اس کے ارکان اسمبلی کی تعداد ۲۶ سے گھٹ کر ۷ پر آ گئی ۔ اس وقت چونکہ پی ڈی پی موجود نہیں تھی اس لئے کانگریس کے انحطاط کا بڑا فائدہ نیشنل کانفرنس کو ملا جو ۴۰ سے ۵۷ پر پہنچ گئی ۔ بی جے پی بھی ۲ سے بڑھ کر ۸ پر جا پہنچی اور کانگریس ۷ پر سمٹ گئی۔ اس طرح گویا وادی کے مسلمانوں نے نرسمہاراؤ کو بابری مسجد کی شہادت کی سزا دے دی۔ ۲۰۰۲ء میں کانگریس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر سے ۲۰ پر پہنچی مگر بی جے پی کو ایک پر پہنچا

دیا۔ اس الیکشن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نیشنل کانفرنس کی مخالفت میں آر ایس ایس نے بھی کانگریس کا ساتھ دیا تھا۔

۲۰۰۲ء میں پی ڈی پی اور کانگریس کے درمیان یہ معاہدہ ہوا تھا کہ وزارت اعلیٰ کی مدت کار کو تقسیم کیا جائیگا اس لئے ۲۰۰۵ء میں غلام نبی آزاد کو وزیراعلیٰ بنایا گیا لیکن اس عرصے میں بی جے پی نے امرناتھ ٹرسٹ کی زمین کا مسئلہ اٹھا کر فرقہ واریت کو خوب ہوا دی بلکہ کشمیر اور دہلی کا راستہ بند کردیا اس طرح کشمیر سے دہلی آکر بکنے والے پھلوں کے ٹرک راستے میں روک دیئے گئے۔ یہ حکمت عملی بی جے پی کیلئے کارآمد ثابت ہوئی اور اس نے ۲۰۰۸ء میں ۹ فیصد ووٹ حاصل کرکے ۱۱ نشستیں جیت لیں اور کانگریس سے ٦ کے فاصلے پر آگئی حالانکہ کانگریس کے پاس اب بھی ۲۰ فیصد ووٹ تھے۔ اس بار کانگریس نے نیشنل کانفرنس کی حمایت کا اعلان کیا۔ ۲۰۱۴ء میں نیشنل کانفرنس نے ۳ء۵ ووٹ گنوائے جن میں سے ۲ء۵ تو پی ڈی پی کی جھولی میں چلے گئے اور ایک فیصد بی جے پی کے حصے میں آگئے۔ ادھر کانگریس کو ۵ فیصد ووٹ کا نقصان ہوا جو سب کا سب بی جے پی کو مل گیا۔ اس کے علاوہ تمام علاقائی جماعتوں کے بھی ووٹ بٹور کر بی جے پی نے سب سے زیادہ ۲۳ فیصد ووٹ حاصل کرلئے مگر بدقسمتی سے اس کی نشستوں کی تعداد ۲۲ فیصد ووٹ پانے والی پی ڈی پی سے ۳ کم تھی۔

بی جے پی کے سر پر چونکہ مرکزی حکومت کا آشیر واد تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ وہ پی ڈی پی کو مرکز میں وزارت کا قلمدان دے کر جموں کشمیر پر اپنا وزیر اعلیٰ مسلط کرنے میں کامیاب ہو جائیگی لیکن اس خام خیالی کو مفتی محمد سعید نے خاک میں ملا دیا اور کوئی جلد بازی نہیں دکھائی ۔ جب یہ حربہ ناکام ہو گیا تو بی جے پی والوں نے نصف مدت کیلئے وزارت اعلیٰ کے عہدے کا مطالبہ کیا۔ مفتی صاحب اس کیلئے بھی راضی نہیں ہوئے ۔ بی جے پی والوں کا دماغ چونکہ آسمان میں تھا اس لئے وہ گورنر راج لگا کر بلاواسطہ حکومت کرنے لگے مگر دہلی کی شکست سے عقل ٹھکانے آگئی تو وہ نائب وزیر اعلیٰ کے عہدے پر راضی ہو گئی لیکن یہ شرط لگا دی کہ وزارت اعلیٰ کی کرسی پر محبوبہ مفتی نہیں بلکہ مفتی محمد سعید خود براجمان ہوں گے ۔

مفتی صاحب کے انتقال تک تو بی جے پی نے کسی طرح اپنے آپ کو روکے رکھا لیکن اب ان کی امنگیں پھر سے جوان ہو گئی ہیں اور وہ دوبارہ نصف مدت کیلئے وزارت اعلیٰ کے عہدے کا مطالبہ کرنے لگے ہیں ورنہ عام روایت تو یہ ہے کہ اگر وزیر اعلیٰ کا انتقال ہو جائے تو گورنر راج نہیں لگایا جاتا بلکہ سب سے سینئر وزیر عارضی طور اس عہدے کو سنبھال لیتا ہے اس طرح ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ نائب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر نرمل کمار وزارت اعلیٰ کا عہدہ سنبھال لیتے اور محبوبہ مفتی کی حلف برداری کے بعد ان کے ہاتھوں میں اقتدار سونپ دیتے لیکن

شاید نہ پی ڈی پی کو یہ قابلِ قبول تھا اور نہ بی جے پی اس کیلئے راضی تھی ۔ بی جے پی اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی شرائط منوانے کے فراق میں ہے لیکن ہنوز اس مقصد میں اسے کامیابی نہیں ملی اور بالآخر گورنر راج لگا دیا گیا۔ محبوبہ سے معاملات طے کرنے کیلئے سرینگر آنے والے بی جے پیکی کشمیر شاخ کے نگراں رام مادھو نے اپنے ارکان اسمبلی کو واپس جموں جانے کی اجازت دے دی ہے۔

بی جے پی کے دباو کو کم کرنے کیلئے محبوبہ مفتی نے ایک چھوڑ چار شرائط سامنے رکھ دی ہیں ۔ اول تو وہ نائب وزیر اعلیٰ کے عہدے کو سرے سے ختم کرکے ڈاکٹر نرمل کمار کو وزیر مملکت کی سہولیات دے کر عیش کرنے سامان فراہم کرنا چاہتے ہیں۔اہم وزارتیں جو بی جے پی نے ہتھیا لی تھیں ان کی مساویانہ تقسیمکا مطالبہ بھی ہے ۔ سارے متنازعہ مسائل سے بی جے پی دستبرداری کی یقین دہانی پر محبوبہ مفتی کااصرار ہے اور وہ مرکزی امداد میں اضافہ بھی چاہتی ہیں ۔ ایک کے جواب میں چار شرائط سے بی جے پی بو کھلا گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے پی والے زبانی حمایت کا اعلان تو کرتے ہیں لیکن ابھی تلگورنر کو باقائدہ خط نہیں لکھا۔

جموں کشمیر کے اندر پھر ایک بار غیر یقینی سیاسی صورتحال رونما ہو گئی ہے۔ اس میں اضافہ سونیا گاندھی کے سرینگر دورے نے کیا۔ ویسے جب مفتی صاحب دہلی

میں زیر علاج تھے تو اس وقت بھی تو سونیا جی ان کی عیادت کیلئے ہسپتال گئی تھیں لیکن اس ملاقات میں کوئی سیاسی رنگ نہیں تھا۔ سرینگر کی ملاقات کو اہمیت دی جارہی اور ایک نئی سیاسی صف بندی کا قیاس آرائی شروع ہو گئی ہے۔ بی جے پی کے سابق صدر اور مرکزی وزیر نتن گڈکری نے بھی اس صورتحال سے خوفزدہ ہوکر سرینگر کا دورہ کیا۔ کہنے کو محبوبہ مفتی اپنے والد کے سوگ میں اقتدار کی باگ ڈور نہیں سنبھال رہی ہیں۔ سونیا اور گڈکری ان کو پرسہ دے رہے ہیں لیکن ان سنگدل سیاسی رہنماوں کی ان باتوں پر اب کوئی یقین نہیں کرتا۔

کشمیر میں فی الحال چار امکانات ہیں اول یہ ہے کہ بی جے پی اور پی ڈی پی پھر سے من مٹاؤ کرکے ساتھ ہوجائیں۔ بی جے پی نصف مدت کیلئے وزارت اعلیٰ کے عہدے کا اصرار چھوڑدے اور اور محبوبہ مفتینائب وزیر اعلیٰ کا عہدے پر ڈاکٹر انل کمار کو بحال کردیں۔ اس معاملے میں رکاوٹ یہ ہے محبوبہ مفتی ان ۱۱ ماہ میں بی جے پی کی فتنہ سازیوں سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکی ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ مفتی صاحب کی تمام تر ذہانت و ذکاوت کے باوجود پی ڈی پی کی مقبولیت میں کمی آئی ہے۔ عین ممکن ہے انتخاب سے قبل بی جے پی ہندو ووٹرس کی خوشنودی کی خاطر اپنے سخت گیر رویہ میں اضافہ کرے۔ ایسے میں وادی کے اندر پی ڈی پی کی ہوا اکھڑ جائیگی اور وہ نہ گھر کی رہے گی نہ

گھاٹ کی۔ اس لئے محبوبہ مفتی محتاط ہیں اور ممکن ہے یہ روٹھنے منانے کا سلسلہ طویل ہوجائے۔

ایک امکان یہ ہے کہ پی ڈی پی اور کانگریس ایک ساتھ ہوجائیں لیکن تب بھی معمولی اکثریت کیلئے مزید ایک رکن اسمبلی کی ضرورت ہوگی جسے کسی آزاد امیدوار کی مدد سے پورا کرناپڑے گا۔ اس صورتحال کا فائدہ یہ ہے کہ بی جے پی سے ناطہ توڑ کر محبوبہ مفتی کسی نہ کسی حدتک اپنی شبیہ سدھار سکیں گی اور کانگریس کی خوداعتمادی میں بھی اضافہ ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بی جے پی اور نیشنل کانفرنس ایک ساتھ ہوجائیں۔ واجپئی حکومت میں عمر عبداللہ مرکزی وزیر اور فاروق عبداللہ وزیراعلیٰ رہے ہیں لیکن اس حماقت کا انہیں یہ خمیازہ بھگتناپڑاکہ عرصہ درازکے بعد عبداللہ خاندان کو اقتدار سے بے دخل کردیا گیااور مفتی خاندان کو عروج نصیب ہوا۔ اس لئے فاروق عبداللہ دوسری بار ماضی کی حماقت دوہرائیں اس کا امکان کم ہے۔ مفتی محمد سعید کی مقبولیت کا گرتا ہوا گراف بھی وہ چکے ہیں نیزانہیں پتہ ہے کہ مودی جی کی بی جے پی سابقہ اٹل جی والی بی جے پی سے خاصی مختلف اور ناپختہ کار ہے۔

مرکزی حکومت کیلئے یہ مشکل نہیں ہے کہ اسمبلی کو تحلیل کرکے دوبارہ انتخاب کروا دے۔ بی جے پی کو اگر یہ فیصلہ ایک سال قبل کرنا ہوتا تو نہایت سہل تھا

اس لئے کہ وزیر اعظم کی مقبولیت کے طفیل وہ ارکان کی تعداد کو ۲۵ سے بڑھا کر ۳۵ تک لے جانے کا خواب دیکھ سکتے تھے لیکن دہلی اور بہار کے بعد قوی امکان ہے کہ یہ تعداد گھٹ کر ۱۵ سے ۲۰ کے درمیان آجائے اور کانگریس کے ارکان بھی ۱۵ سے ۲۰ کے درمیان ہوجائیں۔ اُدھر وادی میں ممکن ہے پی ڈی پی کو مفتی صاحب کے انتقال سے کچھ ہمدردی ملے لیکن پھر بھی اس کے ارکان ۲۰ کے آس پاس ہی ہوں گے اور نیشنل کانفرنس بھی اتنے ہی امیدواروں کو جتانے میں کامیاب ہوجائیگی۔ دوبارہ انتخاب کا انعقاد بی جے پی اور ٹی ڈی پی کے بجائے حزب اختلاف کیلئے سودمند ہوں گے اور اگر مخالفین انتخاب سے قبل اتحاد قائم کرلیتے ہیں تب تو انہیں آرام سے اکثریت مل جائیگی اس لئے بی جے پی والوں سے ایسی حماقت کی توقع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

کشمیر کے اندر وزیر اعظم نریندر مودی کے سبب سے بی جے پی ایسی اچھوت جماعت بن چکی ہے کہ کوئی اس کے قریب آنا نہیں چاہتا اس لئے کہ سارے لوگ جانتے ہیں بی جے پی کے ساتھ ان نیاّ بھی ڈل جھیل میں ایسے ڈوبے گی کی اس کا سراغ نہیں ملے گا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ بی جے پی کی یہ حالت ایک ایسے وقت میں ہوئی جبکہ اسے دیگر تمام جماعتوں سے زیادہ تناسب میں ووٹ ملے ہیں اور اس کے منتخب شدہ ارکان کی تعداد بھی تقریباً ۳۰ فیصد ہے۔ بی جے پی کے ارکان اسمبلی سوچ رہے ہوں گے کہ کاش وہ کسی اور جماعت میں ہوتے تو بڑے اطمینان سے

اقتدار میٹھے میٹھے پھل کھاتے ۔ان سیاستدانوں کا حزن و ملال بھی بجا ہے اس لئے تمام تر بلند بانگ نظریاتی دعووں کے باوجود ان کا مطمح نظر اقتدار کی عیش کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت کشمیر کی سیاست ہے۔

وادی کے اندر مسلمانوں کے دو بڑے مسائل ہیں جنھیں پی ڈی پی اور نیشنل کانفرنس اٹھاتی رہتی ہے۔ اول تو اے ایف پی ایس اے کا قانون جس کے تحت حفاظتی دستوں کو غیر معمولی تحفظ حاصل ہے اور دہشت گردی کے قلع قمع کے نام پر آئے دن عام شہری سرکاری دہشت گردی کا شکار ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ بی جے پی کی فسطائیت کے سبب جمہوریت اور ہم آہنگی کے خاتمے کا رونا بھی رویا جاتا ہے۔ بی جے پی کے نقطۂ نظر سے دستور کی دفع ۳۷۰ اہم ترین مسئلہ جس کے خاتمہ کیلئے ان کے بقول جن سنگھ کے اولین صدر شیاما پرساد مکرجی نے اپنی جان گنوائی ۔ دوسرا مسئلہ پاکستان سے آنے والے مہاجرین کی شہریت کا ہے ۔ یہ لوگ ہندو ہیں بی جے پی ان سے ہمدردی جتا کران کے ہم مذہب ووٹرس کو رجھاتی ہے اور سوچتی ہے کہ اگر انہیں شہریت مل جائے تو وہ ان کے سچے اور پکے حامی بن جائیں گے ۔ یہ سب انتخابی مہم کی باتیں لیکن فی الحال بی جے پی اور اس کے مخالفین اپنے اصول و نظریات کو بالائے طاق رکھکر اقتدار کی جوڑ توڑ میں مصروف ہیں ۔اقتدار کے حصول کی خاطر اصولوں کے بجائے ابن الوقتی کی بنیاد پر سودے

باری ہو رہی ہے۔

جموں کشمیر سے باہر کم لوگ جانتے ہیں کہ مرحوم مفتی محمد سعید کی پارٹی پی ڈی پی کا نشان قلم دوات ہے۔ اس جماعت کے کاتب تقدیر مفتی محمد سعید خود تھے اور اب ان کے ساتھ یہ قلم ٹوٹ گیا ہے۔ ان کے نمازِ جنازہ میں یوں تو کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی جن میں وزیرداخلہ راجناتھ سنگھ بھی شامل تھے لیکن شرکاء کی تعداد توقع سے کم تھی۔ یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ دوات کی سیاہی بہت حدتک سوکھ چکی ہے۔ مفتی صاحب کی جانشین محبوبہ مفتی کے سامنے سب سے بڑا چیلنج اس سیاہی کی مقدار کو بحال کرنا ہے۔ جمہوری نظام کے اندر قلم کا استعمال رہنما کرتا ہے مگر سیاہی فراہم کرنے کی مزدوری عوام کرتے ہیں۔ جس رہنما کے پاس جتنی سیاہی ہوتی اس کا قلم اسی تیزی کے ساتھ چلتا ہے اورجب سیاہی خشک ہوجاتی ہے تو قلم بیکار ہوجاتا ہے۔ حقیقت میں یہ سیاسی سیاہی ختم نہیں ہوتی بلکہ دوسری دوات میں منتقل ہوجاتی اور جس کسی کے دوات میں قدم رنجا فرماتی ہے اس کا قلم فرفر چلنے لگتا ہے۔

قلم دوات کسی سیاسی جماعت کا نشان تو ہوسکتی ہے لیکن اس کی ضرورت اور اہمیت تو عوام جانتے ہیں جس کا منہ بولتا ثبوت غالب گرو کی غیر معمولی کامیابی ہے۔ عوام کے حقیقی مسائل سے بے بہرہ یہ سیاسی جماعتیں جہاں کرسی کی جوڑ توڑ

میں لگی ہوئی ہیں وہیں ایک اچھی خبر مرحوم افضل گرو کے گھر سے آئی ۔ ان کے چشم و چراغ غالب گرو نے دسویں جماعت کے امتحان میں ۹۵ فیصد نمبر حاصل کرکے گریڈ اے پلس میں کامیابی درج کرائی۔ غالب نے تمام پانچ پرچوں میں اے پلس حاصل کیا۔

افضل گرو کی بزدلانہ پھانسی اور اہل خانہ کی غیر موجودگی میں راتوں رات تدفین کے بعد ان کی اہلیہ تبسم گرو نے کہا تھا۔ ہم عام لوگ ہیں سادہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ہمارا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ان کے بیٹے نے ثابت کردیا کہ وہ بہت خاص باپ کی ہونہار اولاد ہے۔

اپنے والد کی شہادت کے بعد غالب نے کہا تھا میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں ۔ میرے والد کو اس بات کا پتہ تھا اس لئے میں جب بھی ان سے ملاقات کیلئے جیل میں جاتا وہ ہمیشہ مجھے محنت کرنے کی تلقین کرتے ۔ اس امتحان میں غالب نے اپنے مرحوم والد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرکے دکھادیا۔ اپنے والد کی پھانسی سے ٦ ماہ قبل جب اس کی ملاقات جیل میں افضل گرو سے ہوئی تو انہوں نے قرآن مجید اور ایک سائنس کی کتاب اسے تحفے میں دی ۔ غالب گرو نے اپنے باپ کے تحفہ کو نہ صرف طاق میں سجا کر رکھا بلکہ اس کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کردیا۔ایک مظلوم و مشفق باپ کے سعادتمند بیٹے نے اپنی محنت اور لگن سے ثابت کردیا کہ بقول شوکت واسطی

ہم زندگی کی جنگ میں ہارے ضرور ہیں

لیکن کسی محاذ پہ پسپا نہیں ہوئے

جعلی ہنگو سے روہت کی خودکشی تک

روہت واامولا کی خودکشی نے قومی سیاست میں ہلچل مچا دی ہے۔ماہِ اگست میں جب یوم آزادی منانے کی تیاری چل رہی تھی حیدرآباد میں روہت سمیت امبیڈکر اسٹوڈنٹس یونین کے پانچ ارکان کو پولس نے اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کے کارکنان پر حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ جنوری میں یوم جمہوریہ سے قبل روہت نے خودکشی کرلی۔ایسے میں اروندکیجریوال کا اس خودکشی کو جمہوریت اور سماجی مساوات کا قتل قرار دیتے ہوئے مرکزی وزیر بندارو دتاترے کی برخواستگی اور وزیراعظم کی معافی کا مطالبہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ ان دونوں طلبہ تنظیموں کے کارکنان نے درمیان جھڑپ ہوئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اے بی وی پی نے پہلے اے ایس اے کی تقریب پر دھاوا بولا اور پھراس کے صدر نے فیس بک پرانہیں قوم دشمن غنڈے لکھاجس کے لئےاسے تحریری معافی مانگیب پڑی تاکہ معاملہ رفع دفع کیا جاسکے۔آگے چل کر اکھل بھارتیہ ودیاپریشد کاایک رکن نے روہت اوراس کے ساتھیوں پراسے زخمی کرنے کا بے بنیاد الزام لگادیا۔اس کی حمایت میں اس نے اپنڈکس آپریشن کے جعلی کاغذات لگا دیئے۔

اس کے بعد مرکزی وزیر بندارو دتاترے کو جوش آیا اور انہوں نے سمرتی ایرانی

کو خط لکھا کہ یونیورسٹی نسل پرستی، انتہا پسندی اور قوم دشمن سیاست کا اڈہ بن گئی ہے اس لئے فوراً کارروائی کی جائے۔ بندارو نے اپنے خط میں جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ یہ طلباء یعقوب میمن پر بنائی دستاویزی فلم دیکھ رہے تھے حالانکہ ایسی کسی فلم کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ سراسر فرقہ پرستی کو ہوا دینے والا الزام تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ طلباء مظفر نگر فساد پر بنی فلم دیکھ رہے تھے جس میں بی جے پی کئی رہنما ملوث تھے جن میں سے ایک وزیر بنا ہوا ہے۔ اس لئے اے بی وی پی کی ناراضگی قابل فہم ہے لیکن اسے یعقوب میمن سے جوڑنا نہایت مذموم حرکت ہے۔ اس واقعہ کے بعد بی جے پی کے مقامی ایم ایل سی رامچندر راؤنے وائس چانسلر سے ملاقات کرکے یونیورسٹی انتظامیہ پر دباؤ بنایا جس کے نتیجے میں براہمن پروفیسرس پانڈے اور شرما پر مشتمل تفتیشی کمیٹی بنائی گئی۔ ابتدائی رپورٹ میں تحقیقی کمیٹی نے روہت اور اس کے ساتھیوں کو بے قصور پایا لیکن آخری فیصلہ ان کے خلاف نکلا اور پانچوں کو معطل کرکے ہاسٹل سے نکال دیا گیا۔

میرٹ لسٹ پر داخلہ لینے والا پی ایچ ڈی اسکالر روہت ۲۱ دسمبر کو ہاسٹل سے نکالے جانے کے بعد یونیورسٹی گیٹ کے باہر ایک ٹینٹ میں رہنے پر مجبور ہوگیا اور بالآخر اس نے اپنے دوست کے کمرے میں آکر جان دے دی۔ روہت نے اپنی وصیت میں ضرور کہا ہے اس کی خودکشی کیلئے وہ خود ذمہ دار ہے نیز اس کے

دوستوں یا دشمنوں کو پریشان نہیں کیا جائے لیکن یہ بھی حقیقت ہے معطلی کے بعد اس نے وائس چانسلر اپا راؤ کو لکھا تھا وہ ان کیلئے زہر یا خوبصورت سے پھندے کا انتظام کردیں۔ اس جملے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ روہت کو خودکشی کی جانب ڈھکیلنے کیلئے ذمہ دار کون ہے؟ سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس مارکنڈے کاٹجو کے نزدیک اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں'' اکثر غیر دلت (اپنے ہم جماعت دلت طلباء) کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کو انسان نہیں سمجھتے، ان پر طنز کرتے ہیں، ان کا تمسخر اڑاتے ہیں بلکہ ان پر زیادتی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہ قومی سطح پر شرمناک ہے۔ جب تک کہ یہ جاگیردارانہ ذہنیت تبدیل نہیں ہوتی ہمارا ملک ترقی نہیں کرسکتا''۔ اس ظلم میں اگر طلباء کے ساتھ حکمراں سیاستداں اور انتظامیہ شریک کار ہوجائے تو حالات دگرگوں ہوجاتے ہیں۔ حیدرآباد کے اندر گزشتہ دس سالوں میں آٹھ طلباء نے خودکشی کی ہے اور مسلسل اس طرح کا موحول بنایا جاتا رہا ہے کہ طلباء اس انتہائی اقدام کیلئے مجبور ہوجائیں۔

حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں دسمبر کے اندر طلباء نے بیف فیسٹیول منانے کا فیصلہ کیا ۔ یوم انسانیحقوق کے موقع پر اس کا اہتمام ۲۰۱۱ء، ۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۴ء میں ہوچکا ہے لیکن اس کی کوئی خاص مخالفت نہیں ہوئی۔ اس سال بی جے پی کے ایم ایل سی راجہ اسے روکنے کیلئے مرنے مارنے پر اتر آئے۔ عدالت

نے پابندی لگائی پولس کا زبردست بندوبست کیا گیا اس کے باوجود وہ تقریب کامیاب رہی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے ڈاکٹر امبیڈکر ہاسٹل کے طلباء نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اس کے بعد ہی اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کیلئے زعفرانیوں نے اپنی سبکی پر پردہ ڈالنے کیلئے روہت اور اس کے ساتھیوں کو معطل کروایا۔ آندھرا پردیش کا شمار ملک ان ریاستوں میں ہوتا ہے جہاں گائے اور بچھڑے کے ذبیحہ پر تو پابندی ہے لیکن بیل اور دیگر جانوروں کو ذبح کرنے کی اجازت ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کیلئے سزا بھی صرف ایک ہزار روپے ہے۔ آندھرا سے ہزاروں ٹن بڑے جانور کا گوشت دنیا بھر کے ممالک میں برآمد کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کی معرکتہ الآراء نظم ''لب پہ آتی ہے دعا'' کے بارے یوں کہا جاتا ہے کہ وہ اردو ادب کی مقبول ترین نظم ہے۔ لیکن اسکے بعد یقیناً اسماعیل میرٹھی کی ''ہماری گائے'' کا نمبر آتا ہوگا۔ اردو زبان کا کون سا ایسا قاری ہے جو ''رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی'' سے واقف نہ ہو۔ گائے کے ایسے ایسے استعمال ہندوستانیوں نے ایجاد کر رکھے ہیں کہ اگر اسماعیل میرٹھی کو ان کا علم ہوتا تو ایک نظم پر اکتفاء کرنے کے بجائے اس موضوع پر پوری کتاب تصنیف فرماتے۔ گائے کا دودھ تو ساری دنیا پیتی ہے مگر اس کے گوبر کو آنگن و دیوار پوتنے کیلئے استعمال کرنے کی جرأت شاید ہی

کسی نے کی ہوگی۔ اس کے علاوہ گائے کے پیشاب کے جس قدر فائدے بابا رام دیو جانتے ہیں ان کی اگر ٹھیک سے تشہیر ہوجائے تو نہ جانے کتنی دواوں کی کمپنیوں کو تالے لگ جائیں گے اور ہسپتال بند ہوجائیں گے اس لئے کہ لوگ گھر بیٹھے شفایاب ہوجائیں گے۔

بھارت میں گائے کی نہ صرف پوجا کی جاتی ہے بلکہ قدرتی آفات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کیلئے گائے کا کسی بیل سے بیاہ بھی رچادیا جاتا ہے۔ دوسال قبل اندور کے ایسی ہی ایک شادی میں ۵ ہزار لوگوں نے شرکت کی اور اس پر دس لاکھ روپئے خرچ کیا گیا۔ اس شادی میں نہ صرف منتر پڑھے گئے بلکہ دولہا اور دلہن نے اگنی کے پھیرے بھی لئے نیز اپنی خوشحال ازدواجی زندگیکیلئے نیک خواہشات بھی وصول کیں۔ یہ سب تو عوام الناس کے بکھیڑے ہیں سیاستداں ووٹ حاصل کرنے کے حرص و ہوس میں گائے تک کو نہیں بخشتے۔ یہ اور بات ہے کہ جب گائے کو ان کے گھناونے مقاصد کا علم ہوجاتا تو حزن ملال کے شکار اس بے ضرر مویشی کے تھن سوکھ جاتے ہیں اور اس کا استحصال کرنے والے سیاستداں ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

انتخابی مہم میں وزیراعظم گلابی انقلاب کا ذکر فرماتے تھے اور انہیں ہر بڑے جانور کا گوشت گائے کا نظر آتا تھا۔ اس گلابی انقلاب کو سبز انقلاب میں

بدلنے کیلئے انہوں نے عوام سے ووٹ مانگا لیکن انتخاب میں کامیاب ہوتے ہی وہ گوشت بھینس کا ہوگیا اور پھر کیا تھا زعفرانی انقلاب گلابی گلابی ہوگیا۔ گئو کشی پر پابندی لگاتے ہوئے اس کی نسل کو تحفظ عطا کرنے کے بہانے بیل کے ذبیحہ پر بھی پابندی لگا دی گئی اس لئے کہ ویسے بھی گائے کے سارے مذکر رشتے دار باپ، بھائی اور بیٹا بیل ہی تو ہوتے ہیں۔ اب بیل کو ناراض کرکے گائے کو کیسے راضی کیا جاسکتا ہے؟ بہار الیکشن میں جب سارے حربے ناکام ہوگئے تو بی جے پی کے آخری پوسٹر میں گائے نمودار ہوگئی۔ اب کی بار اس بات کی توقع تھی کہ تمل ناڈو الیکشن کے پہلے ہی پوسٹر میں بیل نظر آجائے۔ گائے کی تعریف و توصیف کے ساتھ مذکورہ نظم میں ایک شعر یہ بھی ہے کہ بچھڑے اس کے بیل بنائے جو کھیتی کے کام میں آئے''۔

بیل کو بھی ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں کھیتی کے بجائے کھیل کے میدان میں تفریح کا سامان بنایا جاتا ہے۔ اس پر قابو پا کر لوگ اپنی دلیری کے جھنڈے گاڑتے ہیں جسے تمل ناڈو میں ''جلی کٹو'' کہا جاتا ہے اور مہاراشٹر، کرناٹک، گجرات، ہریانہ اور پنجاب میں بیل گاڑیوں کی دوڑ منعقد کی جاتی ہے۔ بیل کے اس استعمال کو مویشیوں کے حقوق کیلئے جدوجہد کرنے والے لوگ ظلم قرار دیتے ہیں اور اس کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ہندوستانی پارلیمان نہ صرف ووٹ دینے والے انسانوں کا بلکہ گونگے بہرے جانوروں کے بنیادی حقوق کا

پاس ولحاظ کرتی ہے۔ وزارتِ ماحولیات نے ۱۹۹۱ء میں ایک حکمنامہ جاری کرکے بھالو، بندر، شیر، تیندوہ، چیتا اور کتے کی تربیت اور نمائش پر پابندی لگادی۔ سرکس والوں کی تنظیم نے دہلی ہائی کورٹ میں اس کو چیلنج کیا لیکن عدالت نے انسانوں کے دلائل کو مسترد کرکے جانوروں کے حق میں فیصلہ دیا۔ ۲۰۱۱ء کے اندر اس حکمنامہ میں خاص طور پر بیل کو بھی شامل کردیا اس طرح گویا تمل ناڈو میں پونگل کے موقع پر جلی کٹو کی رسم پر پابندی لگ گئی۔

جلی کٹو کے خلاف اس ترمیم کو بھی عدالت میں چیلنج کیا گیا لیکن عدالت نے مئی ۲۰۱۴ء میں اپنے فیصلے کو حق بجانب ٹھہرادیا۔ مئی ۲۰۱۴ء تو خیر نئی سرکار کے قیام کا پہلا مہینہ تھا اس لئے کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں دی ۲۰۱۵ء گئوماتا کا سال تھا اس لئے کسی کو بیل کا خیال نہیں آیا لیکن اپریل ۲۰۱۶ء کے اندر تمل ناڈو کے ریاستی انتخابات منعقد ہونے والے ہیں اس لئے اچانک پونگل اور جلی کٹو کے بیلوں کو اہمیت حاصل ہو گئی۔ ساری سیاسی جماعتیں یک زبان ہو کر سیاسی طور طاقتور پسماندہ تھیور سماج کی خوشنودی میں لگ گئیں جو تروچرا پلی، مدورائی، تھنی، پدوکوٹائی اور ڈنڈی گل ضلعوں میں یہ تہوار زور شور سے مناتا ہے۔ ان لوگوں نے سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف النگنالور اور پالامیدو کے شاہراہ بند کردی اور دھمکی دی کہ اگر سپریم کورٹ اپنا فیصلہ نہیں تبدیل کرے گا تو اپنے راشن کارڈس اور ووٹرس آئی ڈی واپس

کر دیں گے ۔ اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ وہ انتخاب کا بائیکاٹ کریں گے ۔

عام دنوں میں تو اس طرح کی دھمکیوں سے سیاستدانوں پر اثر نہیں ہوتا چونکہ انتخابات قریب ہیں اس لئے ڈیڑھ سال بعد اچانک مرکزی حکومت نیند سے بیدار ہو گئی اور اس نے ۷ جنوری کو ایک نیا حکمنامہ جاری کرکے جلی کٹی میں بیلوں کی شمولت پر لگی پابندی اٹھا دی۔ اس حکمنامہ پر روک لگانے کیلئے جانوروں کے حقوق کیلئے کام کرنے والی مختلف تنظیموں نے مل کر عدالت میں گہار لگائی بلکہ حکومت پر ۲۰۱۴ء کے سپریم کورٹ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کرنے کے سبب عدالت کی توہین کے دو مقدمات بھی قائم کر دیئے ۔ حکومت کے حکمنامہ کی حمایت میں بی جے پی تمل ناڈو کے صدر سندر راجن نے بڑی صفائی سے اعتراف کرلیا کہ اپریل میں ہونے والے انتخاب کے پیش نظر بی جے پی کیلئے یہ لازمی ہے کہ عوام کے ساتھ نظر آئے ۔ انہوں نے کہا اس پابندی کا خاتمہ الیکشن میں بی جے پی کیلئے مفید ثابت ہوگا۔ اپنی صاف گوئی کے سبب سندر راجن یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ عدالت عالیہ اس حکمنامہ کو حکومت کے منہ پر دے مارے گی اور اس صورت میں فائدے کے بجائے نقصان ہو جائیگا۔

سندر راجن نے یہ انکشاف بھی کیا کہ پارٹی صدر امیت شاہ نے اس پابندی کو ختم کروانے کیلئے وزیر ماحولیات پرکاش جاوڈیکر سے کئی ملاقاتیں کیں۔ کاش کے

امیت شاہ پرکاش جاویڈیکر پر وقت ضائع کرنے کے بجائے عدالت کے ججوں پر اپنے اثر رسوخ کا استعمال کرتے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اب عدالت کو بھی ان کی بے وزنی کا احساس ہوگیا ہے۔ سابق وزیر اعلیٰ کروناندھی نے وزیر اعظم سے کہا کہ وہ فوراً آرڈیننس جاری کرکے تمل ناڈو میں جلی کٹی کے انعقاد کو یقینی بنائیں ۔ وزیر اعلیٰ جئے للیتا نے وزیر اعظم کو یاد دلایا کہ پونگل کا تہوار ۱۴ جنوری سے شروع ہو رہا ہے۔ اس لئے جلی کٹو سے متعلق تمل ناڈو کی عوام کے جذبات کا پاس و لحاظ کرنا بہت ضروری ہے۔

سوال یہ ہے ان عوامی جذبات کا خیال سیاسی جماعتوں کو ۴ سال بعد کیوں آرہا ہے ۔ عدالت جلی کٹو کو تہذیب کا حصہ نہیں مانتی اس نے حکمنامہ کے خلاف کی جانے والی اپیل کا جواب دینے کیلئے حکومت کو چار ہفتوں کا وقت دیا ہے ۔

حکومت سے اس فیصلے بی جے پی کے اندر بھی ایک مہابھارت چھڑ گئی ہے ۔ ملک میں انسانوں سے زیادہ جانوروں سے ہمدردی والی مرکزی وزیر مینکا گاندھی نے حکومت کے حکمنامہ کے خلاف عدالت کے فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے۔ مینکا کے مطابق یہ مغربی تصور ہے میں جانور اور انسان کی جان بھی جاتی ہے ۔ مکر سنکراتی کے موقع پر پیڑ پودوں کی پوجا ہونی چاہئے لیکن جانوروں پر ظلم کیا جاتا ہے۔ گائے بیل کسانوں کیلئے مفید جانور ہیں ان کی حفاظت ہونی چاہئے ۔ مینکا کے اس بیان پر بی جے پی کے حلیف اور پی ایم کے کے صدر رام دوس خوب چراغ پا

ہوئے اور انہوں نے مینکا کو اس رسم کی تاریخ اور تمل ناڈو کے تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کرنے کی نصیحت کرڈالی۔ انہوں بی جے پی سے وضاحت طلب کی کہ کیا وہ مینکا کے موقف کی حامی ہے؟

رام دوس کا غم و غصہ سے قطع نظر جو لوگ جلی کٹو کی تفصیل جانتے ہیں وہ عدالت کے فیصلے سے اتفاق کریں گے۔ اول تو یہ کوئی مذہبی تقریب نہیں ہے دوسرے اس میں شامل ہونے والے بیلوں کا ذہنی توازن بگاڑنے کیلئے انہیں زبردستی شراب پلائی جاتی ہے۔ ان کو جوش دلانے کی خاطر مارا پیٹا جاتا ہے۔ ان کو سوئیاں چبھائی جاتی ہیں۔ ان کی دم کو مروڑا جاتا ہے بلکہ ان کی آنکھوں اور شرم گاہ پر مرچ رگڑنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ ۱۹۶۰ء میں دستور کے اندر ترمیم کرکے جانوروں کو انسانی سفاکی سے بچانے کیلئے قانون بنایا گیا۔ عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے میں جانوروں کے پانچ بنیادی آزادیوں (حقوق) کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے بھوک، پیاس اور ملاوٹ والی غذا سے نجات، اس کے بعد خوف اور تھکان، طبعی اور شدید موسم میں بچاو، زخم و بیماری سے تحفظ اور ان کے معمولات کے رویہ کے اظہار کی آزادی شامل ہے۔ جلی کٹو کے ہنگامہ میں ایک جم غفیر بیلوں کو زمین پر گراکر اپنی فتح مندی پر بغلیں بجاتا ہے۔ مذکورہ بالا تمام حقوق کو محض تفریح طبع کیلئے سلب کرکے جلی کٹو میں بدترین سفاکی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

عدالت عالیہ نے اپنے حکمنامہ میں جانوروں کے حقوق کو دستوری درجہ دینے کی سفارش کی ہے۔ دوسرے ممالک کی مثال دے حکومت سے اصرار کیا ہے کہ وہ جانوروں کے ادب واحترام کے تحفظ کو یقینی بنائے۔ ایسے میں حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عدالت کی سفارشات پر سنجیدگی سے غور کرے اور اس پر عمدرآمد کی کوشش کرے اس کے برعکس ایک طرف یہ سرکار گائے کو ماں کا درجہ دے کر قابلِ پرستش ٹھہراتی اور دوسری جانب اس بھائی، باپ یا بیٹے کے ساتھ غیر انسانی سلوک کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ اگر سنگھ پریوار واقعی گائے کا ہمدرد ہوتا تو اس رسم پر پابندی لگواتا لیکن ووٹ کی لالچ میں اس نے پابندی کو اٹھا کر اس نے اپنے چہرے پر پڑی منافقت کی نقاب از خود نوچ کر پھینک دی اور سپریم کورٹ کے احکامات کی دھجیاں اڑاتے ہوئے مختلف شہروں میں جلی کٹو کا تہوار علی الاعلان منایا گیا۔ کسی نے اسے روکنے ٹوکنے کی جرأت نہیں کی۔

ہمارے سماج کی یہ ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف دستور اور عدالت جانوروں تک حقوق کے حفاظت کی ضمانت دیتی ہے نیز سیاستداں گائے جیسے جانور کو مادرِ وطن ٹھہرا کر عوامی جذبات کا استحصال کرتے ہں‌د دوسری جانب انسانوں کے ساتھ جانوروں سے بھی برا سلوک کیا جاتا ہے۔ دہلی کے نجف گڑھ میں ایک مری ہوئی گائے کو لے جانے والے دلت نوجوان شنکر کو مسلمان سمجھ کر گئوکشی کے الزام میں ہلاک

کردیا جاتا ہے۔ اس دوغلی سیاست کے سبب حیدرآباد میں روہت راملو جیسے ہونہار
طالبعلم کی خودکشی کا دل دہلانے والا واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اس سانحہ میں نہ صرف وائس
چانسلر بلکہ مرکزی وزیر محنت دتاترے بنڈارو کے خلاف شکایت درج کرائی گئی
ہے۔ روہت کی خودکشی کے خلاف ہونے والے احتجاج کے شعلوں کی تپش بنڈارو سے
آگے نکل کر سمرتی ایرانی اور نریندر مودی کے دامن کو چھورہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے
عنقریب منعقد ہونے والے صوبائی انتخابات پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے اس لئے کہ حزب
اختلاف کی ساری سیاسی جماعتیں اسے اپنے حق میں بھنانے کیلئے سرگرم عمل ہیں۔

امیت شاہ کی تاجپوشی: بڑھتے ہوئے قدم کو نہیں روکتا کوئی

امیت شاہ پھر ایک بار بی جے پی کے صدر بن گئے ۔ اس سے پہلے انہیں راجناتھ سنگھ کے وزیر داخلہ بن جانے کے سبب درمیان میں صدارت کی کرسی سنبھالنی پڑی تھی لیکن اس بار وہ میقات کی ابتداء میں منتخب ہوئے ہیں۔ وینکیا نائیڈو نے اس موقع پر کہا فی الحال ہم میں سب سے زیادہ باصلاحیت یہی شخص ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا کہ اگر زیادہ باصلاحیت کا یہ حال ہے تو کم صلاحیت کے حامل کیسے ہوں گے اور بے صلاحیت کا کیا حال ہوگا؟ کیا یہ امیت شاہ کا معمولی کارنامہ ہے کہ جس وقت صدر نہیں بنے تھے اترپردیش میں ''ہر ہر مودی گھر گھر مودی'' کے نعرے لگتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ اسی اترپردیش میں ''گوبیک مودی گوبیک مودی'' کا نعرہ لگ رہا ہے۔ مودی جی میک ان انڈیا کی مالا جپتے ہوئے چینی ساخت کی ای رکشا بانٹ رہے ہیں اور جس روہت ویمولا کی خودکشی پر احتجاج کرنے والوں کو سبرامنیم سوامی آوارہ کتے کے لقب سے نوازتے ہیں مودی جی اس کی موت پر ٹسوے بہا رہے ہیں۔

امیت شاہ کو عہدۂ صدارت پر فائز کرنے کا یہ جواز پیش کیا گیا تھا کہ ان کی قیادت میں اترپردیش کے اندر بی جے پی نے ۸۰ میں ۷۲ نشستوں پر کامیابی درج کرائی ہے۔ اگر کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے ہی کسوٹی ہے تو انہیں اس بار ہٹا

دیا جانا چاہئے تھا اس لئے کہ اس لئے کہ بعد کے ضمنی انتخابات اور حالیہ گرام پنچایت کے الیکشن میں اترپردیش کے اندر بی جے پی کو زبردست شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ وہ نہ صرف مودی جی کے اپنے حلقۂ انتخاب بلکہ ان کے اپنے گود لئے گاوں میں بھی ہار چکی ہے۔ اترپردیش تو خیر دور کی بات ہے امیت شاہ اور نریندر مودی کے گجرات میں کانگریس نے قصبوں اور دیہاتوں میں بی جے پی کو دھول چٹا دی ہے۔ مغربی بنگال میں جہاں لمبے چوڑے خواب سجائے جارہے تھے سارے سپنے بکھر گئے ہیں ۔ دہلی میں جو کچھ ہوا وہی کیا کم تھا کہ بہار سے بھی وہ بے آبرو ہو کر لوٹے ہیں اور اپنے ساتھ مودی جی کی بھی مٹی پلید کروادی ہے۔ اس کے باوجود ان کا دوبارہ منتخب ہوجانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ پچھلی مرتبہ بھی وزیراعظم کے اعتماد اور وفاداری کے سبب منتخب ہوئے تھے اور اسبار بھی ان کی کامیابی کے پس پشت وہی چاپلوسی کارفرما ہے۔ ملک میں رائج موجودہ ضمیر فروش سیاست سے اسی کی توقع ہے کیونکہ بقول شاعر ؎

خودی، خود آگہی، خودرائی جس میں جلوہ گر ہوتے

وہ آئینہ تو پہلے دن ہی چکنا چور تھا ہم سے

امیت شاہ کی مختلف ریاستوں میں بی جے پی کی حکومت قائم کروانے کا کریڈٹ دیا جاتا ہے اس موقع پر اس دعویٰ کا بھی ایک مختصر جائزہ لے لیا جانا چاہئے۔ اس عرصے میں بی جے پی کو سب سے بڑی کامیابی ہریانہ میں ملی ۔ ہریانہ کے اندر

برسر اقتدار کانگریس کے تئیں زبردست بے چینی کی لہر تھی ۔ قومی انتخاب کی کامیابی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ مودی جی کے حسین خوابوں کا خمار ابھی اترا نہیں تھا۔ لوک دل کے سربراہ چوٹالہ جیل سے پیرول پر انتخابی مہم چلانے کیلئے باہر آئے تھے اور عاپ بھی قومی سطح پر اپنی زبردست شکست سے بوکھلائی ہوئی تھی ۔ ان سارے اسباب کا فائدہ بی جے پی کو ملا اور اپنے بل بوتے پر اسے پہلی بار صوبائی اقتدار مل گیا لیکن اس کا کریڈٹ کبھی مودی جی تو کبھی شاہ جی کو دیا جاتا رہا ہے ۔ اس طرح کلیان جی آنند جی کی اس جوڑی نے عارضی طور پر توخوب خوشیاں منائیں لیکن آگے چل کر اس سے نہ پارٹی کا کلیان ہوا اور نہ عوام کو آنند ملا۔

ہریانہ کے ساتھ ہی مہاراشٹر میں انتخابات کا انعقاد ہوا۔ مہاراشٹر کے اندر امیت شاہ کی اولین ترجیح تو یہ تھی کہ اپنے بل بوتے پر شیوسینا کی مدد کے بغیر حکومت قائم کی جائے۔ اس کیلئے انہوں نے شرد پوار اور ان کے بھتیجے اجیت پوار کو سینچائی گھوٹالے کا خوف دلا کر بلیک میل کیا۔ یہ سازش کامیاب رہی اور این سی پی نے کانگریس سے رشتہ منقطع کرلیا۔اس سے حوصلہ پا کر شاہ نے بھی ٹھاکرے کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا لیکن بی جے پی کو واضح اکثریت سے ہمکنار نہیں کرسکے۔ شاہ جی کی دوسری ترجیح یہ تھی کہ این سی پی کے تعاون سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے بعد شیوسینا کو توڑ دیا جائے اور اس کے باغی

گروہ کو ساتھ لے کر شیوسینا کے بغیر حکومت تشکیل دی جائے جیسا کہ کانگریس نے بھجبل کے زمانے میں کیا تھا لیکن شاہ جی اپنی اس کوشش میں بھی ناکام رہے۔ جب دیکھا کہ شیوسینا کے قلعہ میں کوئی دراڑ نہیں پڑ رہی ہے تو اس سے وزیراعظم کی توہین کیلئے عوامی سطح پر معافی کا مطالبہ کیا گیا۔ ادھو ٹھاکرے نے اس سے بھی انکار کردیا تو بی جے پی نے مجبوراً جھک کر اس کے ساتھ الحاق کرلیا۔

مہاراشٹر اور مرکز میں شیوسینا اور بی جے پی کے اتحاد کے باوجود ان کے آپسی تعلقات بے حد کشیدہ ہیں۔ شیوسینا وزیراعظم نریندر مودی پر تنقید وتضحیک کا کوئی موقع نہیں گنواتی۔ پاکستان کے حوالے سے شیوسینا کے جارحانہ رویہ کے آگے کانگریس کی تنقید کو بھی پھیکی نظر آتی ہے۔ مختلف شہروں کے بلدیاتی انتخابات میں یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے خلاف انتخاب لڑتی ہیں اور خوب جوتم پیزار کے بعد بڑی بے حیائی کے ساتھ پھر سے بغلگیر ہوجاتی ہیں لیکن اکثر و بیشتر شیوسینا کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اب تو کانگریس نے بھی بی جے پی کے گڑھ سمجھے جانے والے ودربھ کے اندر گھس کر اس کو شکست دینی شروع کردی ہے۔ مہاراشٹر کے اندر کمل کی پتیاں بہت تیزی کے ساتھ بکھر رہی ہیں لیکن شاہ جی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے؟

اس درمیان جھارکھنڈ میں انتخابات ہوئے۔ شاہ جی کو یقین تھا کہ جھارکھنڈ مکتی مورچہ اور کانگریس کے اختلاف کا فائدہ اسے ملے گا اور بی جے پی کو اکثریت حاصل ہوجائیگی لیکن وہ بھی نہیں ہوسکا۔ ۸۸ ارکان پر مشتمل اسمبلی کے دنگل میں شاہ صاحب ۴۴+ کا نعرہ بلند کرکے اترے تھے لیکن ان کا رتھ ۳۷ پر ٹھہر گیا۔ بی جے پی کیحلیف جماعت اے جے ایس یو نے ۸ میں ۵ نشستوں پر کامیابی درج کروائی اس کے باوجود ۲ کی کمی رہ گئی جسے آزاد ارکان کی مدد سے پورا کیا گیا اور مرتے پڑتے حکومت قائم ہوگئی۔ بہار کی طرحکا اتحاد اگر جھارکھنڈ میں بھی ہوجاتا تو کانگریس اور جے ایم ایم مل کر بی جے پی کو آسانی کے ساتھ دھول چٹا سکتے تھے لیکن خیر اس وقت شاہ صاحب کے ستارے عروج پر تھے اس لئے کسی طرح ان کی ناؤ پار لگ گئی۔

اس کے بعد کشمیر کا صوبائی انتخاب کا اعلان ہوا۔ اس بار امیت شاہ کو یہ خوش فہمی تھی کہ وادی کشمیر کے اندر بی جے پی کا کھاتہ کھل جائیگا لیکن مودی اور شاہ کی جوڑی کو اس میں ناکام رہی۔ جموں کے اندر بے شک بی جے پی نے غیر معمولی کامیابی درج کروائی اور اس بات کا امکان تھا کہ پی ڈی پی، این سی اور کانگریس کے انتشار کا فائدہ اٹھا کر وہ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھرے گی۔ ایسا نہ ہوسکا اور وہ پی ڈی پی کے مقابلے ۲ نشستوں سے پچھڑ گئی۔ شاہ جی پی ڈی پی کو مرکز میں چارہ ڈال کر جموں کشمیر پر اپنا وزیر اعلیٰ مسلط کرنا چاہتے تھے لیکن مفتی محمد سعید نے اس حربے کو ناکام بھی کیا اور بی جے پی کو

مستقل صدر راج نافذ کرنے کا بہانہ بھی نہیں دیا۔ ایک طویل انتظار کے بعد مایوس ہو کر بی جے پی نائب وزیراعلیٰ کے عہدے پر راضی ہو گئی۔

مفتی صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی محبوبہ مفتی نے بی جے پی کیلئے مزید مسائل کھڑے کردیئے اور نائب وزیراعلیٰ کے عہدے کو ہی ختم کرنے کے فراق میں ہیں۔

دراصل محبوبہ مفتی کے سامنے نتیش کمار کی مثال ہے۔ بی جے پی سے تعلق توڑنے کے بعد پارلیمانی انتخاب میں نتیش کمار کا نقصان ضرور ہوا لیکن صوبائی سطح نہ صرف وہ اپنا اقتدار بچانے میں کامیاب رہے بلکہ ریاستی انتخاب میں بھی انہوں نے بی جے پی شکست فاش سے دوچار کردیا۔ اگر نتیش کمار بی جے پی کا ساتھ نہ چھوڑتے تو ان کا حشر ادھو ٹھاکرے سے برا ہوتا۔ مطلب نکل جانے پر بی جے پی اپنے حلیفوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی اگر کوئی جاننے کیلئے ہریانہ میں بنسی لال کے بیٹے کلدیپ بشنوئی کی حالت دیکھ لو۔ ۲۰۱۴ء کے قومی انتخاب میں بی جے پی نے ہریانہ جن ہت دل کے ساتھ الحاق کرکے حصار کی نشست انہیں دی لیکن جب وہ دشینت چوٹالہ سے ہار گئے تو تین ماہ بعد منعقد ہونے والے انتخاب میں ان کے ساتھ اتحاد تو دور ملاقات تک نہیں کی گئی۔

محبوبہ مفتی نے اگر ان واقعات سے عبرت پکڑ کر بی جے پی سے ناطہ توڑ لیا تو شاہ جی کو ایک اور جھٹکا لگے گا۔

اروناچل پردیش میں شاہ جی نے کانگریس میں پھوٹ ڈال کر اقتدار کو ہتھیانے کی ناکام کوشش کی۔ اروناچل پردیش چین کی سرحد سے متصل ریاست ہے جس میں سیاسی استحکام کی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے لیکن افسوس کہ شاہ جی اس نزاکت کو سمجھے بغیر وہاں جوڑ توڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ اروناچل پردیش کی جملہ ۶۰ نشستوں میں سے ۴۷ کانگریس کے پاس ہیں۔ بی جے پی نے ۲۱ کانگریسی ارکان کو ورغلا کر اپنے ساتھ کرلیا جبکہ کانگریس کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس رشوت ستانی کے ثبوت ہیں اس طرح بی جے پی کے گیارہ ارکان نے کانگریسی باغیوں کے ساتھ مل کر اکثریت کا دعویٰ کردیا۔ اس سازش میں گورنر کو شامل کرکے اسمبلی سیشن وقت از وقت بلوایا گیا اور باغی ڈپٹی اسپیکر کو صدارت کرنے کی ہدایت کی جبکہ کانگریس اس کو برخواست کرچکی تھی۔ اس ڈپٹی اسپیکر اسمبیل ہال کے بجائے ایک کمیونٹی سینٹر میں اجلاس منعقد کرکے وزیراعلیٰ کو برخواست کردیا۔ گورنر کی اس دھاندلی کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا تو جسٹس رشی کیش رائے نے یہ تسلیم کیا کہ بظاہر گورنر کے فیصلے دستور کی دفع ۱۷۴ اور ۱۷۵ کے خلاف ہیں۔ اس کے بعد ایک ہمگامی پارلیمانی اجلاس میں اروناچل پردیش کے اندر صدر راج سفارش کی گئی جس پر پرنب مکرجی نے وضاحت طلب کرلی یعنی بلا واسطہ مسترد کردیا۔ کانگریس صدر راج کے خلاف بھی عدالت میں جارہی ہے۔ اروناچل کے وزیر مملکت کرن رجیجو اور شاہ جی کو ابھی تک اس کھیل صرف رسوائی ہی ہاتھ آئی ہے اور آگے بھی یہی امکان ہے ۔اس لئے کہ ایوان بالا کے اندر چونکہ

جے پی اقلیت میں ہے اس لئے اسے منظوری ہی نہیں ملے گی۔

بی جے پی کی خامی یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی سے سبق نہیں سیکھتی۔ پچھلے سال یوم جمہوریہ کے موقع پر اوبامہ کو بلا کر دہلی کے رائے دہندگان کو متاثر کرنے کوشش کی گئی لیکن اس میں بری طرح ناکامی کے باوجود اس سال فرانس کے صدر ہولنڈی کی مدد سے پنجاب کا انتخاب جیتنے کی حماقت دوہرائی جارہی ہے۔ ہولنڈی کو اسی سیاسی مقصد کے تحت چندی گڑھ لے جایا گیا فرانسیسی آرکیٹیک کا ڈیزائن بنانا تو ایک بہانہ ہے۔ چندی گڑھ کے جس 'راک گارڈن' میں مودی اور ہولنڈی کی ملاقات ہوئی ہے اس کے خالق نیک چند کے بیٹے انوج سینی کو وہاں سے نکال کر بی جے پی نے یہ بتا دیا کہ وہ ہندوستانیوں کی کیسے ناقدری کرتی ہے حالانکہ سینی نے بذاتِ خود اس تقریب کے اہتمام بہت زیادہ محنت کی تھی۔ نیک چند نے یہ باغ اپنی ذاتی زمین پر لگایا کر اپنی زندگی اس کو سجانے سنوارنے کیلئے جھونک دی۔ اسی لئے غالباً انوج سینی کہنا پڑا کہ ''مجھے ایسا لگا کہ گویا میں اپنے گھر سے نکال دیا گیا ہوں''۔

چندی گڑھ ہریانہ کے ساتھ ساتھ پنجاب کا بھی دارالخلافہ ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ فرانکوئس ہولنڈی کا استقبال کرنے کیلئے صرف گورنر، ہریانہ کے وزیراعلیٰ اور بی جے پی کی ایم پی کرن کھیر ہوائی اڈے پر آئے۔ ایک بھی سکھ

وہاں موجود نہیں تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا پنجاب کے گورنر پرکاش سنگھ بادل بھی آتے لیکن وہ بیمار تھے اس لئے ان کے بیٹے نائب وزیر اعلیٰ سکھبیر کو آنا چاہئے تھا لیکن وہ بھی نہیں آئے ۔ وزیر اعظم کا استقبال کرنے کیلئے اکالی دل کے وزیر غذا کیرون کا تقرر کیا گیا جو بی جے پی اور اکالی دل کے درمیان پنپنے والی کشیدگی کا واضح ثبوت ہے۔ مودی جی شاید اسی لئے پرکاش سنگھ بادل سے ملاقات کیلئے اسپتال گئے۔ فرانس کے اندر سکھ طلباء کو پگڑی پہن کر اسکول جانے کی اجازت نہیں ہے جس کے خلاف وہ احتجاج کرتے رہے ہیں ۔ اکالی دل کی جانب سے ہولنڈی کے فاصلے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سکھ رائے دہندگان کو ناراض نہیں کرنا چاہتے لیکن بی جے پی نے اپنی نافہمی کے سبب سکھوں کے زخموں پر نمک لگانے کا کام کرہی دیا ہے۔

بی جے پی کے اپنی غلطی سے سبق نہیں سیکھنے کی ایک مثال آندھرا پردیش میں سامنے آئی۔ سنا ہے روہت کی پھانسی کے بعد جب ہنگامہ بڑھا تو وزیر اعظم نے مرکزی وزیر بندارو دتاترے سے استعفیٰ لینے کا من بنا لیا تھا لیکن آر ایس ایس آڑے آگئی ۔ بندارو آر ایس ایس کے قدیم کارکن ہیں اور انہیں وزیر بنانے کی سفارش خاص طور پر ناگپور سے آئی تھی ۔ آر ایس ایس کا خیال ہے کہ روہت کے بہانے اے بی وی پی کو گھیرا جارہا ہے اور وزیر کے استعفیٰ سے اس کے حوصلے پست ہوں گے۔ مودی جی نے سنگھ کے آگے سپر ڈال دی نتیجہ یہ ہوا کہ ان

کے اترپردیش دورے پر روہت کا گہن لگ گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود لکھنؤ میں وزیراعظم کے خلاف نعرے لگانے والے طلباء کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو روہت اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اب اگر خدانخواستہ ان میں سے کوئی کچھ کرگذرے تو اس کا سیدھا الزام وزیراعظم پر آئیگا۔ ان لوگوں کو صرف زخموں پر نمک پاشی آتی ہے مرہم لگانا نہیں آتا ورنہ یہ نہ ہوتا کہ وائس چانسلر اپا راؤ کو چھٹی پر بھیج کر روہت کو سزا دینے والے وپن سریواستو کو ان کی جگہ بٹھا دیا جاتا جبکہ سریواستو پر ۲۰۰۸ء میں خودکشی کرنے والے سینتھل کمار کو ہراساں کرنے کا بھی الزام ہے۔

اس سال جن ریاستوں میں انتخاب ہورہے ہیں ان میں کامیابی کا امکان بہت کم ہے اس لئے سمجھداری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس موقع پر صدارت کی باگ ڈور کسی اور تھما دی جاتی۔ ایسا کرنے پر بھی نتیجہ کم و بیش وہی آتا لیکن لوگ سوچتے کہ اگر پارٹی کی کمان امیت شاہ کے ہاتھوں میں ہوتی تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا اور اس مشکل میں بھی کوئی نہ کوئی چمتکار کرہی دیتے۔ اس طرح مارگ درشن کمیٹی کے نامزد کردہ کسی رہنما کو بلی کا بکرہ بنانے کا نادر موقع مودی جی نے گنوا دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو دوسال بعد شاہ جی کو واپس لانے کا مطالبہ زور شور سے سامنے آتا اور آئندہ قومی انتخاب کے موقع پر پارٹی کی کمان شاہ جی کے ہاتھوں میں ہوتی لیکن اب تو اس بات کا بھی امکان ہے کہ ان

دوسالوں میں ہاتھ آنے والی ناکامیوں کیلئے شاہ جی ذمہ دار ٹھہرا کر اگلی بار ان کی چھٹی کردی جائے اور وزیراعظم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔

امیت شاہ کے دوبارہ صدر منتخب ہوجانے پر بی جے پی کے صدر دفتر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے بی جے پی کی خوشیوں میں امت مسلمہبھی شریک ہوتی ہو لیکن اس بار یہ ہونا چاہئے۔ شاہ جی نے اپنی ڈیڑھ سالہ کارکردگی سے یہ ثابت کردیا ہے کہ بی جے پی کے زعفرانی پرچم کو پاتال کے اندر دفن کرنے کی جو صلاحیت ان میں ہے کسی اور میں نہیں ہے۔ اٹل جی کو بی جے پی کا مکھوٹا کہا جاتا تھا لیکن خوش قسمتی سے امیت شاہ کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ہے؟ ان پر بلڈرس سے تاوان وصولی سے لے کر انکاؤنٹر (قتل) تک کا الزام ہے۔ انہیں اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا تھا۔ وہ جیل کی ہوا بھی کھا چکے ہیں اور اپنی ریاست سے تڑی پار ہونے کا شرف بھی انہیں حاصل ہے۔ سیاسی اثر ورسوخ سے جو 'کلین 'چٹ انہوں نے فی الحال حاصل کر رکھی ہے وہ اقتدار سے محرومی کی صورت میں 'ڈرٹی' بھی ہوسکتی ہے۔ سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ شاہ جی دوبارہ بلکہ سہ بارہ بھی صدر بن جائیں تو کیا مودی جی کو دوبارہ کامیاب کرواسکیں گے؟ اور اگر نہیں (جس کا قوی امکان ہے) توجب مودی جی اقتدار سے بے دخل کردیئے جائیں گے تو شاہ جی کو جیل جانے سے کون بچائے گا؟ اس وقت ممکن ہے شاہ جی مظفر حنفی کا یہ شعر گنگناتے نظر آئیں ۔

یہ زمانہ لگا ہے کہ اب جسم یہاں نثار کے واسطے قطرۂ خوں نہیں
ایک وہ وقت بھی تھا کہ چلتے تھے ہم راستے بھر کو گلنار کرتے ہوئے

روہت رومیلا: ایک پھول ہزار کانٹے

روہت ویمولا کی موت پر جس وقت ساری قوم سراپا احتجاج بنی ہوئی تھی وزیراعظم شاعری فرمارہے تھے ۔ اتوار ۱۷ جنوری کو روہت نے خودکشی کی اور پیر ۱۸ جنوری کو مودی جیوزرائے زراعت کے ایک اجلاس کو خطاب کرنے کیلئے سکم کی راجدھانی گینگ ٹوک پہنچے ۔جب ان کی تقریر لکھی گئی ہوگی اس وقت کسی کو روہت کی خودکشی کا علم نہیں تھا اس لئے اس کا براہِ راست ذکر تو نہیں آیا مگر جو کویتا (نظم)انھوں پر ستوت : پیش)کی وہ من و عن روہت کے سانحہ پر منطبق ہو گئی ۔ وزیراعظم نے کہا)

مجھے پھول جیسا نازک مت بننے دینا

میں کانٹوں کے بیچ رہا ہوں

مجھے کانٹوں کے بیچ ہی رہنا ہے

یہ آزاد نظم نہ صرف مودی جی اور سنگھ پریوار کا بہترین تعارف کراتی ہے بلکہ روہت جیسے لوگوں پر ان کے اثرات کی جانب بھی بلاواسطہ اشارہ کرتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے مودی جی اپنی ذاتِ والا صفات کے بارے میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ میں پھولوں جیسا نازک نہیں ہوں ۔ اپنے مستقبل کے ارادوں کی بابت فرماتے ہیں کہ آگے چل کر بھی میں پھول جیسا (خوشنما اور خوشبودار) نہیں

بننا چاہتا۔ اس کے بعد وہ اپنے کانٹا ہونے کا بنیادی سبب صحبت کو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے کانٹوں کے درمیان اپنی زندگی گذاری ہے۔ اس طرح مودی جی نے اپنے علاوہ سنگھ پریوار کو بھی کانٹوں کا ہار بنادیا اس لئے کہ ان کا جیون توآرایس ایس کی سیوا میں گذرا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے لال قلعہ سے اپنا تعارف راشٹر سیوک کی حیثیت سے کرایا تو لوگوں نے اسے سنگھ سیوک ہی سنا اور پھر سنگھ کے ساتھ وزراء کی مشترکہ نشست کا اہتمام کرکے ثبوت بھی بہم پہنچادیا۔

اس اہم انکشاف کے بعد مودی جی اس نظم میں اپنے پھول بنے رہنے کا سبب بھی ارشاد فرماتے ہیں۔ چونکہ انہیں آگے چل کر بھی پھولوں کے بجائے کانٹوں کے درمیان ہی رہنا ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو بدلنے کی جرأت نہیں کرسکتے ۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے پھول بننے کی کوشش کی تو سنگھ کے کانٹے ان کا کیا حشر کریں گے ؟ اس لئے اب کانٹے کی سی زندگی گذارنا نہ صرف مودی جی کی پسند بلکہ مجبوری بھی ہے۔ یہ نہ صرف ان کی بلکہ دیگر لوگوں کی بھی مجبوری ہے اس لئے کہ اپنے پھولوں کے گلدستے میں کانٹے کو سجانے کی حماقت بھلا کون کرسکتا ہے؟ اسکویتا کوپڑھنے کے بعد یہ نہیں لگتا کہ یہ کسی زعفرانی فکر و خیال کے خیر خواہ کی تخلیق ہے لیکن مودی جی یا ان کے بھکتوں کی سمجھ میں یہ راز کیسے آسکتا ہے؟ شاعری جیسی صنف نازک کے ساتھ بھلا کانٹوں کا کیا سروکار؟

شاید یہی وجہ ہے کہ سنگھ پریوار نے اپنے سوئم سیوکوں پر برہما چاری جیون کو لازمی قرار دیتا ہے۔اس غیر فطری پریوار یں جو شادی کرلیتا ہے اسے سوئم سیوک کے اعزاز سے محروم کردیا جاتا ہے مگر جن کا نکاح سیوک بننے سے قبل ہو چکا ہوتا ہے انہیں اپنی زوجہ کو بغیر طلاق کے بے یارومددگار چھوڑ دینے پر مجبور کردیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ لوگ جس دین کے حامل ہیں اس میں خواتین خلع کے حق سے بھی محروم ہیں ۔اس لئے راشٹر کی سیوا کرنے والے کانٹوں کی پھول سی بیوی اپنے شوہر نامدار کی خدمات سے محروم ہوجاتی ہے۔ سنگھیوں کے مزاج میں جو سختی اور کرختگی پائی جاتی ہے اس کی ایک وجہ یہ مجرّد طرزِ زندگی بھی ہے۔ جو لوگ اپنی فطرت سے برسرپیکار ہوں وہ بھلا دنیا امن و سلامتی کیسے قائم کر سکتے ہیں ؟

وزیر اعظم نے روہت ویمولا کے سانحہ پر اظہار خیال کرنے کیلئے جب ۵ دن لگائے تو لوگوں نے اس تاخیر پر حیرت کا اظہار کیا۔ ایسا کرنے والے لوگ بھول گئے تھے کہ غیر فطری طرزِ حیات انسان کے فکر و عمل کو کیسے متاثر کرتا ہے۔ ایسے لوگ جو خود اپنوں سے صلہ رحمی کا سلوک نہیں کرتے وہ بھلا دوسروں کا دکھ درد کیسے محسوس کر سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ اپنے لکھنؤ کے اولین دورے کے موقع پر جب وزیر اعظم نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ یہ کہا کہ سیاست سے

قطع نظر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ماں نے اپنا لال گنوایا ہے تو سامعین پر اس کوئی اثر نہیں ہوا۔ مودی جی کی اداکاری کے جواب میں بھیم راو امبیڈکر یونیورسٹی کے طلباء ہرہر مودی گھر گھر مودی" کے بجائے "گوبیک مودی گو بیک مودی" کے نعرے لگا" نے لگے۔

اتر پردیش ہی وہ ریاست ہے جو بی جے پی کے اقتدار میں آنے کا بنیادی سبب بنی ہے۔ یہاں پر بی جے پی کو ۸۰ میں ۷۳ نشستوں پر کامیابی ملی۔ ان نتائج سے خوش ہوکر مودی جی نے اپنی بڑودہ والی نشست چھوڑ کر وارانسی کو اپنا لیا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ سمندر کی جھاگ کی مانند چھا جانے والی یہ مقبولیت دیکھتے دیکھتے کافور ہو جائیگی۔ دلت طلباء کے ان نعروں نے اے بی وی پی والوں کو رام مندر کی یاد دلا دی اور وہ جواب میں "رام للا ہم آئے ہیں مندر وہیں بنائیں گے" کی گھوشنا (نعرہ) کرنے لگے۔ اس اوٹ پٹانگ ردعمل کو دیکھ کر ہال میں موجود صحافیوں اور سامعین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر روہت کا رام مندر سے کیا تعلق ہے؟ دراصل روہت ویمولا کا تو رام مندر سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں مگر سنگھ پریوار کا رام مندر کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ زعفرانی گروہ جب بھی مشکلات میں گھر جاتا ہے اور اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا تو اسے رام مندر کی یاد آجاتی ہے۔ ملک کی عوام اب اس فریب دہی سے واقف ہو گئے ہیں اور حالت یہ ہے کہ اگر بی جے پی والے عدالت کے فیصلے کے

مطابق یا خلاف کوئی مندر تعمیر بھی کردیں تب بھی لوگ انہیں دوبارہان کے جھانسے میں نہیں آئیں گے ۔

لکھنو یونیورسٹی کا معاملہ صرف رام مندر کی نعرے بازی تک محدود رہ جاتا تو اس میں سنگھ کی عافیت تھی لیکن بات اور آگے بڑھی نیز ۳ طلباء کو معطلی تک جا پہنچی ۔ یہ عجیب منافقت ہے کہ جس وقت اپنی غلطی کا اعتراف کرکے حیدرآباد میں روہت کے ساتھیوں کا تعطل ختم کیا جارہا تھا اسی وقت لکھنو میں دلت طلباء پرایک بے ضرر احتجاج کی بنیاد پر کارروائی کی جارہی تھی ۔ سیاسی بصیرت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس کو نظرانداز کردیا جاتا لیکن عقل کے اندھوں سے شاید یہ توقع کرنا درست نہیں ہے۔ اس اقدام کے باوجود اگر بی جے پی کو یہ خوش فہمی ہے کہ اترپردیش کے دلت بی ایس پی کو چھوڑ کراس کو ووٹ دیں گے ۔ اب تو حالت اتنی بگڑ گئی ہے کہ اگر مایاوتی بھی بی جے پی کے ساتھ مفاہمت کرنے کی حماقت کرگذرے تو اس کے ردعمل میں دلت سماج بی ایس پی سے کنارہ کش ہوجائیگا ۔ ایسے میں اگر کوئی حیرت زدہ ہے کہ محمد اخلاق کا نام اپنی زبان پر نہیں لانے والے وزیراعظم کو آخر روہت سے اظہارِ ہمدردی کی ضرورت کیوں پیش آئی تو اسے چاہئے کہ وہ مودی جی کی مذکورہ نظم کے دوسرے حصے کو پڑھ لے۔ سنگھ پریوار اپنے دام میں پھنس جانے والے شکار کے ساتھ جو پاکھنڈی رویہ اختیار کرتا ہے اس کی قلعی اپنے آپ کھل جائیگی۔ نظم یوں آگے بڑھتی ہے

لیکن جہاں ضرورت ہو
وہاں پھولوں جیسی کوملتا (نزاکت) کے ساتھ
دکھی کے آنسو پونچھنے کے کام یہ زندگی آجائے
اس سے بڑا کیا سوبھاگیہ (خوش بختی) ہوگا

سنگھ پریوار ضرورت پڑنے پر دکھی کے آنسو پونچھنے کا سوبھاگیہ کیسے پراپت (حاصل) کرتا ہے اس کا نمونہ حیدرآباد یونیورسٹی میں ملاحظہ فرمالیں کہ ان لوگوں نے عوامی غم و غصہ کو کم کرنے کیلئے وائس چانسلر اپا راؤ کو تو چھٹی پر روانہ کردیا لیکن ان کی جگہ روہت کو سزا دینے والے پروفیسر وپن سریواستو کو لاکر بٹھادیا۔ اس اقدام سے زخموں پر مرہم لگنے کے بجائے نمک پاشی ہوگئی۔ وپن سریواستو وہی شخص ہے جس پر روہت سے قبل میں خودکشی کرنے والے سینتھل کمار کو ہراساں کرنے کا بھی الزام ہے۔ یہی ۲۰۰۸؁ وجہ ہے کہ مودی جی کے الفاظ کا روہت کی ماں پر کوئی اثر نہیں بلکہ اس نے سوال کیا وزیراعظم نے ان کے غم میں شریک ہونے کیلئے ۵ دن کا وقت کیوں لگایا؟ روہت کی والدہ نے صاف کہا کہ ہمیں ہمدردی کے بول یا اقتصادی مدد نہیں بلکہ انصاف چاہئے ۔ میرے بیٹے کی خودکشی کے لئے ذمہ دار افراد کو جب تک قرار واقعی سزا دلانا میرا مطمح نظر ہے۔

روہت ویمولا کی خودکشی پر سمرتی ایرانی اور سبرامنیم سوامی کی نمک پاشی کے اثرات زائل ہورہے تھے کہ سشما سوراج اور کیلاش وجئے ورگیہ نے اپنی زہر افشانی نے سے بھونچال مچادیا۔ سشما نے کہا کہ تمام الزامات بے بنیاد ہیں ۔ روہت سرے سے دلت تھا ہی نہیں ۔ اول تو یہ بات غلط ہی ہے مگر اسے درست مان بھی لیا جائے تو روہت کا دلت ہونا اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی معطلی اور خودکشی زیر بحث ہے۔ اگر وہ دلت نہیں بھی تھا تو کیا اس کو معطل کرنے کا اقدام درست تھا؟ اگر وہ فیصلہ صحیح تھا تو اس کے ساتھ معطل ہونے والے دیگر ۴ طلباء کے اوپر سے پابندیاں کیوں اٹھائی گئیں؟ اگر یہ فیصلہ بروقت کیا جاتا تو کیا روہت خودکشی کرتا؟ اس فیصلے کو کرنے اور کرانے والا کون ہے ؟ اس کو سزا کون دلوائے گا؟ کیا وزیراعظم کا کام صرف آنسو بہانہ اور آنسو پونچھنا ہے؟ ان سوالات کا جواب دینے کے بجائے دلت اور غیر دلت کی بحث چھیڑ کر بی جے پی نفسِ مسئلہ سے توجہ ہٹا رہی ہے۔

روہت کو غیر دلت ثابت کرنے کیلئے اس کی دادی کے بیان کو بنیاد بنا رہے ہیں جنھوں نے کہا ان کا اور ان کی بہو کا تعلق دلت ذات سے نہیں ہے۔ لیکن یہ نصف سچائی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی دادی وڈیرہ ذات سے ہے جو دلت نہیں ہے لیکن ان کے بیٹے نے اپنی اہلیہ کو بچوں سمیت چھوڑ دیا تھا۔ روہت کی ماں

ملا ذات سے تعلق رکھتی ہے دلت ہے۔ روہت کی والدہ نے بچوں کی تربیت دلت نظریہ حیات کے مطابق کی ہے۔ اس کا اعتراف خود روہت اپنی تحریر و تقریر میں کرچکا ہے۔ بی جے پی کا مسئلہ یہ ہے کہ اسے دلت ووٹ کا خوف ستا رہا ہے وہ انسانیت کے بجائے سیاست کے نقطۂ نظر اس معاملے کو دیکھ رہی ہے اور خود اپنے پیر پر آئے دن کلہاڑی چلائے جارہی ہے۔ ان لوگوں کا ہر بیان دلت سماج کو برگشتہ کرنے والا ہے۔

روہت کی سالگرہ پر ہونے والے احتجاج سے گھبرا کر بی جے پی رہنما کیلاش وجئے ورگیہ نے نیا تنازعہ کھڑا کردیا۔ وجئے ورگیا ویسے بھی اپنی بدزبانی کیلئے مشہور ہیں۔ انہوں نے کہا تھا گوکہ شاہ رخ خان ہندوستان میں رہتے ہیں مگران کی روح پاکستان میں بسی ہوئی ہے۔ وہ شتروگھن سنہا کو بھی اس کتے کے مماثل قرار دے چکے ہیں جو اپنے پیچھے آنے والی گاڑی کے بارے میں سوچتا کہ میں اس کی قیادت کررہا ہوں۔ روہت کے معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دیتے ہوئے وجئے ورگیہ بولے وہ ایسا کمزور بھی نہیں تھا کہ معمولی سی بات پر خودکشی کرلیتا۔ جو دہشت گردوں کی پھانسی کی مخالفت کرتا ہو، جس نے یعقوب میمن کی پھانسی کی مذمت کی ہو، جو بیف پارٹی کے اہتمام کا اعلان کرتا ہو ایسا شخص خودکشی کرتا ہے۔ روہت کی خودکشی کا الزام اس کے حامیوں پر ڈالتے ہوئے وجئے ورگیہ نے کہا جو اس کی حمایت میں مظاہرے کررہے ہیں وہی اس خودکشی کیلئے ذمہ دار ہیں

۔ راہل گاندھی کے اس مظاہرے میں شرکت کو لے کر وجئے ورگیہ بولے کہ اس طرح راہل ایوان پارلیمان کے بجٹ اجلاس کو برباد کرنے کا ماحول بنا رہے ہیں ۔
وجئے ورگیہ کے بیان پر جب ہنگامہ برپا ہوا تو وہ حسب سابق اپنے بیان سے مکر گئے ۔
انہوں نے ویمولا کی خودکشی کو افسوسناک قرار دیتے کہا کہ وہ ایک جراًتمند نوجوان تھا جو بہاؤ کے خلاف تیرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ میں نہیں مانتا کہ محض ہاسٹل خالی کرائے جانے کا معمولی واقعہ اس کی خودکشی کا سبب بنا ہوگا۔ اپنی صفائی کے دوران وجئے ورگیہ نے روہت پر یہ الزام بھی لگا دیا بھگوا رنگ کو دیکھ کر اس کا خون کھولتا تھا اور یعقوب میمن کیلئے نمازیں پڑھا کرتا تھا۔ اس احمق کو نہیں معلوم کہ نماز جنازہ صرف ایکبار پڑھی جاتی ہے اور وہ بھی کوئی غیر مسلم کیوں پڑھے گا بھلا؟ وجئے ورگیہ نے کانپور میں یہ انوکھا انکشاف بھی کیا کہ روہت کیلئے مظاہرہ کرنے والے لوگ دراصل وزیراعظم اور حکومت کی مخالفت کررہے ہیں ۔ بی جے پی والوں کے اعصاب پر اپنے اقتدار سے محروم ہوجانے ایسا خوف سوار ہوگیا ہے کہ انہیں ہر کوئی اپنا مخالف نظر آتا ہے۔
اس خوف کی جائز وجوہات ہیں ۔ اٹل جی نے ایک بار کہا تھا کانٹے کو کانٹے سے نکالا جاتا ہے ایسا لگتا ہے مشیت اس کانٹے کو نکالنے کیلئے چہار جانب سے

مصروفِ عمل ہو گئی ہے۔ جنوبِ ہند میں تلنگانہ کے اندر روہت کی مصیبت کیا کم تھی کہ آندھراپردیش میں کپو سماج نے ریزرویشن کی خاطر بی جے پی کی حامی ٹی ڈی پی کے خلاف بغاوت کردی اور ٹرین کے ۸ ڈبے نذرِ آتش کردیئے نیز اب تو ایک شخص نے خودکشی بھی کرلی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تحریک کی قیادت ایک سابق ٹی ڈی پی وزیر کررہا ہے۔ یہ تحریک گجرات کے روہت پٹیل کی تحریک سے زبردست مشابہت رکھتی ہے۔ کپو اور پٹیل دونوں کسان ہیں۔ سیاسی اعتبار سے خاصے مضبوط ہیں۔ بی جے پی یا ٹی ڈی پی کے حامی رہے ہیں اور اب مخالف ہوگئے۔ چندرا بابو نائیڈو دراصل ان سے ریزرویشن کا وعدہ کرکے مکر چکے ہیں اس لئے اب ان کا اقتدار خطرے میں ہے نیز بی جے پی نے اس احتجاج کی مخالفت کرکے ان کی لٹیا دی ہے۔ مغرب کی طرف گجرات میں سناہی آنندی بین کو خبردار کیا جاچکا ہے کہ پٹیل احتجاج ختم کرائیں یا گھر جائیں۔ شمال میں محبوبہ مفتی آئے دن ایک نیا زخم دیتی ہیں اور مشرق کے اروناچل پردیش میں صدر راج کو لے کے عدالت حکومت کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے دل یعنی دہلی میں کیجریوال آئے دن ایک نیا مسئلہ کھڑا کردیتے ہیں فی الحال وہ کوڑا کرکٹ کے جھاڑو سے بی جے پی کا کچرا کررہے ہیں۔ لگتا قوم کی آنکھ کا یہ کانٹا اب بستر مرگ پر اپنی آخری سانسیں گن رہا ہے اور پھولوں کا موسم آیا ہی چاہتا ہے۔ اس لئے بقول ساحر لدھیانوی ؎

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں

وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

بجٹ اجلاس کی گھن گرج اور بد عنوانی کے کالے بادل

بجٹ اجلاس کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں ۔ ماہرین اقتصادیات قیاس آرائیوں میں مصروف ہیں ۔ عوام پھر ایکبار ''اچھے دنوں'' کے سپنے سجانے میں لگ گئے ہیں اور حزب اختلاف محاذ آرائی کے خطوط کار طے کرنے میں جٹ گیا ہے ۔ اس موقع پر این ڈی اے میں شامل دیگر جماعتوں نے بی جے پی کے خلاف محاذ کھول کر ساری دنیا کو چونکا دیا ہے ۔ ایسی صورتحال میں ایوان پارلیمان کے اندر کیا کچھ ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے ۔ شور و ہنگامہ کے بیچ وزیر خزانہ اپنا تحریر شدہ بجٹ کسی طرح پڑھ کر سنائیں گے ۔ حزب اقتدار بنا سنے اس کی تائید و حمایت کرے گا اور حزب اختلاف بنا سمجھے اس کی مخالفت کرے گا۔ بالآخر بجٹ منظور ہوجائیگا اور اسی کے ساتھ سرمایہ داروں اور سیاستدانوں کے وارے نیارے ہوجائیں گے نیز غریب عوام ہاتھ ملتے رہ جائیں گے ۔

وزیر اعظم کے آسام میں دیئے جانے والے بیان سے کانگریس فی الحال بہت ناراض ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ''ایک مخصوص خاندان ملک میں منفی رجحانات کو فروغ دے رہا ہے'' ۔ اس بیان کی ضرب چونکہ براہ راست سونیا گاندھی اور راہل گاندھی پر پڑتی ہے اس لئے کانگریس کی پریشانی بجا ہے۔ کانگریسی میزانِ عمل

میں اگر سارے قومی مفادات ترازو کے ایک پلڑے میں ہوں اور گاندھی نہرو خاندان کا تقدس دوسرے میں تو وہ لازماً دوسری جانب جھکے گا۔ کانگریسی ترجمان وی تھامس کے مطابق وزیراعظم اس طرح کا لب ولہجہ اختیار کرنے کے بعد اپوزیشن سے تعاون کی توقع نہیں کرسکتے ۔ ویسے ایک گمان یہ بھی ہے کہ بی جے پی خود آرایس ایس کی مخالفت کے سبب جی ایس ٹی بل کی منظوری نہیں چاہتی مگر اس کیلئے کانگریس کو موردِ الزام ٹھہرانا چاہتی ہے۔

کانگریس کے پاس ہنگامہ آرائی کیلئے بی جے پی نے اور بھی بہت ساری سہولیات مہیا کررکھی ہیں مثلاً روہت رومیلا کی خودکشی پر حکومت کی سرد مہری ، اروناچل پردیش میں صدر راج کا نفاذ ، ہیما مالنی اور آنندی بین مہتا پر بدعنوانی کے سنگین الزامات ۔ متھرا سے بی جے پی کی رکن پارلیمان ہیما مالنی کے ٹرسٹ کو ممبئی میں ۲ہزار مربع گز زمین صرف ۷۰ ہزار میں دے دی گئی جبکہ اس کی قیمت کروڑوں میں ہے۔ ہیما مالنی نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ پچھلے ۲۰ سالوں سے اس کیلئے جدوجہد کررہی ہیں لیکن کوئی نہ کوئی قانونی اڑچن آجاتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ بی جے پی کے مرکز اور صوبے کے اندر اقتدار میں آتے ہی ساری رکاوٹیں کیوں کر کافور ہوگئیں ۔ ایک طرف سی بی آئی کانگریس کے سابق وزیراعلیٰ اور رکن پارلیمان اشوک چوہان کو آدرش بدعنوانی کے معاملے میں گھیرنے کی کوشش کررہی اور دوسری جانب ہیما مالنی پر زمین لٹا رہی ہے ۔ بی جے

پی رہنماؤں کو یاد رکھنا چاہئے کہ آج جو حالت چوہان کی ہے کل وہی درگت ہیمامالنی کی ہوسکتی ہے اس لئے اقتدار کی دیوی ہمیشہ کسی پر مہربان نہیں رہتی۔

چوہان یا ہیما کا معاملہ تو ایک قطعہ زمین تک محدود ہے لیکن آنندی بین کی کہانی بڑی طول طویل ہے۔ مودی جی جب گجرات سے نکل کر دہلی کیلئے روانہ ہوئے تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر انہوں نے آنندی بین کو اپنا جانشین کیوں بنایا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب تک مودی گجرات میں تھے اس وقت تک لوگوں نے ان کے علاوہ صرف شاہ جی کا نام سنا تھا جب کہ انہیں گجرات سے تڑی پار کردیا گیا۔ آنندی بین کو کوئی نہیں جانتا تھا لیکن اب ان کا کچا چٹھا باہر آرہا ہے۔ آنندی بین اور مودی جی میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ جس طرح مودی جی نے اپنی اہلیہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی اسی طرح آنندی بین بھی ۳۰ سال کی ازدواجی زندگی کے بعد اپنے شوہر مفت لال پٹیل سے الگ ہوگئیں۔ ۷۸ سالہ گاندھی وادی مفت لال نے اٹل جی اور اڈوانی جی کو خط لکھ کر شکایت کرچکے ہیں کہ نریندر مودی نے اپنے رسوخ کا استعمال کرکے ان کی اہلیہ کو ان سے دور کردیا ہے۔ انہوں نے آنندی بین کے خلاف انتخابی مہم میں بھی حصہ لیا تھا اور دو سال قبل وہ کیجریوال کی عام آدمی پارٹی میں شامل ہوگئے۔ معروف

دانشوروں کے ساتھ عاپ میں شمولیت کے موقع پر انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ انتخاب تو نہیں لڑیں گے مگر مودی سرکار کی بدعنوانی کا پردہ فاش کریں گے ۔ مودی جی کی ریاستی حکومت میں جہاں قتل و غارتگری کے الزامات وزیرِاداخلہ امیت شاہ پر لگتے تھے وہیں بدعنوانی کا الزام وزیرِ امحصول آنندی بین پر لگایا جاتا تھا۔ مودی سرکار میں اڈانی، امبانی اور ٹاٹا کو کوڑیوں کے بھاؤ میں سرکاری زمین بانٹنے کا سہرہ دراصل مودی جی کے آشیرواد سے آنندی بین ہی کے سر بندھتا ہے۔ سرمایہ داروں کے ذریعہ مودی جی کی کھلے عام تعریف و توصیف اور پس پردہ پشت پناہی کے پیچھے یہی احسانات کارفرما تھے۔

کانگریس کے زمانے میں جب اس طرح کے الزامات لگائے جاتے تھے تو اسے سیاسی رقابت پر مہمول کیا جاتا تھا لیکن بی جے پی کی مرکزی حکومت کے قیام کے ایک ماہ بعد جون ۲۰۱۴ء میں سپریم کورٹ نے ایک عوامی دلچسپی کے مقدمہ (پی آئی ایل) میں ۲۳ گجرات کی متوقع وزیرِاعلیٰ آنندی بین کی سرزنش کردی ۔ معاملہ انڈی گولڈ ریفائنری کو سرکاری زمین دینے سے متعلق تھا جو ۳ سال کے اندر تعمیر کا کام شروع کرنے میں ناکام رہی تھی۔ قانون کے مطابق ایسی صورت میں سرکار کو چاہئے تھا کہ وہ مذکورہ قطعۂ زمین واپس اپنے قبضے میں لیتی اور اس کی پھر سے نیلامی کرواتی لیکن آنندی بین نے وزیرِ محصول کی حیثیت سے انڈی گولڈ کو زمین فروخت کرنے کا اجازت نامہ دے دیا۔

عدالت عالیہ نے وزیر موصوف کے اس فیصلے کو قانون کی نظر میں خراب اور ظالمانہ من مانی قرار دیا۔ اس لئے کہ وزارت محصول کے سکریٹری اور چیف سکریٹری انڈی گولڈ کو ایسا کرنے سے منع کرچکے تھے۔ ان دونوں نے یہ صاف کردیا تھا کہ اب اس زمین پر انڈی گولڈ کا کوئی حق نہیں وہ سرکاری زمین ہے اس لئے اسے فروخت نہ کیا جائے۔

آنندی بین کے آشیرواد کا فائدہ اٹھا کر انڈی گولڈ ریفائنری نے وہ زمین المیونا ریفائنری نامی نجی کمپنی کو ۲ء۱ کروڑ میں فروخت کردی۔ جب المیونا ریفائنری نے اس زمین پر اپنی سرمایہ کاری کا دکھڑا سنایا تو سپریم کورٹ نے المیونا ریفائنری کے مالکان کو حکم دیا کہ وہ اگر اس زمین کو اپنے تصرف میں لینا چاہتے ہیں تو حکومت کے خزانے میں مزید ۱۵ء۳ کروڑ روپئے جمع کرائیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ رقم سرکاری خزانے کے بجائے آنندی بین کی ذاتی تجوری میں چلی گئی تھی۔ مودی جی اگر ملک سے بدعنوانی کو ختم کرنے میں سنجیدہ ہوتے تو اس شرمناک واقعہ کے بعد آنندی بین کو گجرات کا وزیراعلیٰ نہیں بناتے لیکن سیاست میں ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہوتے ہیں، کھانے کے اور ۔

آنندی بین جب تک وزیرِ محصول تھیں اس وقت تک تو مودی جی کے اشارے پر سرمایہ داروں کا بھلا کرکے اپنی تجوری بھرتی رہیں لیکن وزیراعلیٰ بننے کے

بعد انہوں نے خود اپنے بچوں کی جانب توجہ فرمائی اور دیکھتے دیکھتے ان کے بیٹے شیواانک اور بیٹی انار کے اچھے دن لوٹ آئے۔ ان کی کمپنی انار انڈسٹری لمیٹڈ کی شیئر کی قیمت اچانک ۶۳ء۷ روپے سے بڑھکر گزشتہ سال جولائی میں ۴۵ء۶۰ روپے پر پہنچ گئی اور اب بھی مندی کے باوجود ۸۵ء۴۴ پر ہے۔ یہ کمپنی ۱۹۹۲ء میں قائم کی گئی تھی اور ۲۳ سالوں میں اس نے کبھی منافع نہیں دکھایا جبکہ پچھلے ۵ سالوں میں خسارہ مسلسل بڑھتا رہا لیکن آنندی بین وزیراعلیٰ کیا بنیں کہ سارے دلدّر دور ہو گئے۔

۲۰۱۵ء میں اس نے ۷۰ لاکھ کا خسارہ کیا اس کے پہلے سال گھاٹا ۱۸ لاکھ تھا اس کے باوجود کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ لوگ اس میں سے سرمایہ نکالنے کے بجائے سرمایہ کاری کرتے رہے ؟ انار کے ساتھ مسابقت کرنے والی کامیاب کمپنیوں کا اس دوران یہ حال تھا ان کا گراف نیچے ہی نیچے جارہا تھا۔ سیٹ انڈسٹری کے شیئرس کا بھاو گزشتہ ۳ سالوں میں ۱۱ فیصد گرا۔ ایم پاور کو بڑی مشکل سے ۳ فیصد کا فائدہ ہوا۔ نوکیتن اور سن شائن کے حصص اپنے سرمایہ کاروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے مگر انار بغیر کسی قابلِ ذکر پروجکٹ کے اپنے پیاروں کے وارے نیارے کرتی رہی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے اڈانی کے شیئر انتخاب سے قبل کئی گنا بڑھ گئے تھے۔

انار انڈسٹری کے شیئر کیوں بڑھ رہے تھے اس کا راز بھی آخر کار افشاء ہو ہی گیا۔
دراصل آنندی بین نے اپنی بیٹی انار پٹیل کے شراکت دار دکشیش شاہ کی وائلڈ ووڈ نامی کمپنی کو گیر کے جنگلات کی ۲۵۰ ایکڑ زمین صرف ڈیڑھ کروڑ میں دان کردی تاکہ وہاں پر تفریح گاہ تعمیر کی جائے۔اس زمین میں ۱۷۲ ایکڑ زراعت کیلئے مختص تھی اس لئے اس پر تعمیر کی اجازت مرحمت فرمانے کا کارنامہ بھی گجرات سرکار نے انجام دیا۔ بازار بھاؤ کے لحاظ سے اس زمین کی قیمت ۱۲۵ کروڑ بنتی ہے۔سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ سرکاری خزانے پر سیندھ لگانے کا فیصلہ مودی جی کے دہلی جانے بعد نہیں کیا گیا بلکہ اس وقت ہوا جبکہ وہ گجرات کے وزیراعلیٰ تھے۔یہ عجیب و غریب صورتحال ہے کہ ایک طرف تو بی جے پی کے تحت راجستھان پولس رابرٹ وادرہ کو بدعنوانی کے الزام سے بری کرتے ہوئے انہیں بدعنوانی کا شکار قرار دیتی ہے اور تحقیق و تفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ وادرہ کو دھوکہ دے کر سرکاری زمین فروخت کی گئی تھی دوسری جانب آنندی بین کے بیٹی سے بدعنوانی کا الزام آسیب کی مانند لپٹ جاتا ہے۔
بدعنوانی سے پاک بھارت'' کا نعرہ لگانے والی بی جے پی پر مسلسل بدعنوانی کے سنگین'' الزامات لگ رہے ہیں۔پہلے تو ویاپم کی گھن گرج نے شیوراج سنگھ چوہان کی چولیں ڈھیلی کیں اس کے بعد میں للت مودی نے وجئے راجے سندھیا کے

ساتھ سشما سوراج کو بھی کٹہرے میں کھڑا کردیا لیکن یہ سارے لوگ نریندر مودی کے مخالفین شمار کئے جاتے تھے اس لئے اس کا مودی کی ساکھ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا بلکہ کچھ تجزیہ نگاروں نے اسے مودی کی چال قرار دے دیا۔اب کی بار جو بدعنوانی کے الزامات لگ رہے ہیں اس میں مودی جی کی منظورِ نظر منجدھار میں پھنسی ہوئی ہیں۔ آنندی بین پر لگنے والے الزامات چونکہ نریندر مودی کے زیر نگرانی کئے گئے ہیں اس لئے ان کی آنچ براہِ راست وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر آتی ہے۔آنندی بین کی بدولت بجٹ اجلاس میں اس بار مودی جی کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی اس لئے ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ کسی غیر ملکی دورے پر نکل جائیں۔

مودی جی جب تک گجرات کے اندھے کنویں میں بند تھے اس وقت انہیں مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت نہیں تھی لیکن اب قومی سطح پر ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ مسلمان رائے دہندگان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کو رجھانے کیلئے بات داعش سے شروع کی گئی۔ بے قصور نوجوانوں کو گرفتار کرکے ایک مصنوعی ماحول تیار کیا گیا اور اب کچھ علماء کو جمع کرکے ان کے ذریعہ امت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن بی جے پی نہیں جانتی کہ مسلمانوں کو بے وقوف بنانا ایسا آسان بھی نہیں ہے۔ مودی جی امت میں اس قدر بدنام ہیں کہ جو کوئی بھی ان کے ساتھ جائیگا وہ ملت کے اندر بے نام و

نشان ہو جائیگا۔ ایسے میں مودی جی کو چاہئے کہ وہ دوسروں کا گھر جلانے کے بجائے خود اپنے گھر کی آگ پر قابو پانے کی کوشش کریں۔

قومی سطح پر مودی جی امیت شاہ کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں اس لئے تمام تر ناکامیوں کے باوجود انہیں دوبارہ صدر منتخب کیا گیا۔ گجرات کے اندر مودی صرف آنندی بین پٹیل پر اعتماد کرتے ہیں اس لئے پاٹیدار آندولن کے مقابلے میں ناکامی کے باوجود انہیں اقتدار سے بے دخل نہیں کیا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ پٹیل اور شاہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں ۔برسوں سے ان کے درمیان بات چیت بند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ کے اشارے پر آئندہ سال انتخاب سے قبل بدعنوانی کی یہ فائلیں باہر آرہی ہیں تاکہ آنندی کا آنند چھین لیا جائے۔ شاہ تو ویسے بھی انہیں وزیراعلیٰ بنانے کے خلاف تھے لیکن مودی جی صدارت کا گاجر دکھلا کر ان کو خاموش کردیا۔

حال میں جب شاہ جی دوبارہ صدارت کیلئے منتخب ہوئے تو آنندی بین نے بیماری کا بہانہ بنا کر ان کی تاجپوشی کی تقریب سے معذرت چاہ لی۔ مودی جی کو انہیں فون کرکے حاضر رہنے کی تاکید کرنی پڑی لیکن پٹیل اور شاہ کی مہابھارت اب بھی جاری ہے۔ بظاہر وہ دونوں ایک دوسرے کی جڑ کاٹ رہے ہیں لیکن اس جنگ میں مودی جی کی پگڑی سلامت رہے اس کا امکان کم ہے۔ کسی نے درست کہا ہے جو لوگ دوسروں کیلئے گڑھا کھودتے ہیں وہ خود ان میں منہ بل گرجاتے ہیں۔

بظاہر اس کے آثار نمایاں میں آگئے بجٹ اجلاس میں یہ لڑائی کیا گل کھلاتی اس کی جانب ساری نظریں لگی ہوئی ہیں۔

بجٹ کے اجلاس میں حزب اختلاف کے تیور تو صاف ہیں مگر اس سے لوہا لینے کیلئے امیت شاہ نے جب اپنے حلیفوں کا اجلاس بلایا تو ان کے ہاتھ سے طوطے اڑ گئے۔ اس اجلاس میں شریک چندرا بابو نائیڈو نے بی جے پی کو نصیحت کی کہ وہ اپنی حلیف جماعتوں کو مضبوط بنانے کی جانب توجہ کرے۔ شیو سینا کے سنجے راوت نے شکایت کی کہ گزشتہ ۲۰ ماہ کے دوران بی جے پی نے اپنے حلیفوں کو نظر انداز کیا ہے۔ اس موقع سب سے زیادہ خطرناک تیور اکالی دل کے سکھبیر سنگھ بادل نے دکھلائے۔ انہوں نے کہا بی جے پی ہمیں مجبور نہ سمجھے اور ہمارے ساتھ وہی رویہ اختیار کرے جو اٹل جی کا تھا۔ بادل نے کہا گزشتہ چند ماہ سے بی جے پی کے مقامی رہنما اتحاد کو توڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ بی جے پی کی مرکزی قیادت اپنا موقف صاف کرے۔ انہوں نے دھمکی آمیز انداز میں سوال کیا کہ بی جے پی عیسائیوں اور مسلمانوں کو تو برگشتہ کر ہی چکی ہے اب کیا وہ سکھوں کو اپنے سے دور کرنا چاہتی ہے؟ بجٹ اجلاس میں مطلع صاف ہو جائیگا کہ آیا یہ بادل صرف گرجتے ہی ہیں یا برستے بھی ہیں۔

زعفرانی دہشت گردی: حیدر آباد یونیورسٹی سے جواہر لال یونیورسٹی تک

جموں کشمیر کے پمپور مقام پر عسکریت پسندوں کے حملہ میں ایک دہشت گرد کے علاوہ پانچ فوجی ہلاک ہوئے جن میں سے ایک پون کمار کا تعلق نہ صرف ہریانہ بلکہ جے این یو سے بھی تھا۔ وہی ہریانہ جس میں ریزرویشن کی مانگ کو لے کر چلنے والی تحریک نے ابھی تک ۱۲ لوگوں کی جان لے لی ہے۔ پون کمار جے این یو کا طالبعلم تھا جہاں کشمیر کے نام پر ایک مصنوعی زلزلہ برپا کردیا گیا اس طرح گویا آگ اور خون کا دریا دہلی سے لے کر ہریانہ ہوتا ہوا سرینگر پہنچ گیا ہے۔اس دوران جن نام نہاد شیر دل زعفرانی وکلاء نے جے این یو ایس یو کے صدر کنھیا کمار پر سپریم کورٹ کے احکامات کے خلاف چھتیس ہزاری کورٹ کے احاطے میں پولس سے ملی بھگت کرکے بزدلانہ حملہ کیا تھا وہ بھیگی بلی بن کر نہ جانے کس سرنگ میں دبک گئے ہیں ۔ اسی کے ساتھ عمر خالد کو بدنام کرنے کی خاطر جعلی ویڈیو نشر کرنے والے ٹی وی چینلس کا منہ بھی کالا ہوگیا۔

اس سنگین صورتحال میں ساری قوم نے جب بڑی امید کے ساتھ ۵۶ انچ کی چھاتی والے وزیراعظم کی جانب دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ دہلی کا سنگھاسن چھوڑ کر مشرق کی دور دراز کی ریاستوں چھتیس گڑھ ، اڑیسہ، بنگال کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے ہیں اور واپسی میں اپنے حلقۂ انتخاب وارانسی سے ہوتے ہوئے دہلی لوٹنے والے ہیں

تاکہ ان کی آمد سے قبل سارا معاملہ اپنے آپ ٹھنڈا ہوجائے۔ اس دورے پر وہ کسانوں کو خطاب فرما کر اپنے خلاف بُنی جانے والی سازشوں کا رونا رو رہے ہیں اور اس سے ملک کے کمزور ہونے کی دہائی دے رہے ہیں حالانکہ ان دونوں میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ وہی پرانا گھسا پٹا جذباتی استحصال کا راگ کہ لوگوں کو ایک چائے والے کا وزیراعظم بننا کھل رہا ہے حالانکہ گزشتہ دوسالوں میں انہوں نے صدر اوبامہ کے علاوہ کسی کو چائے نہیں پلائی۔ یہ وہی براک اوبامہ ہیں جنہوں نے حال میں پاکستان کو ایف ۱۶ طیارے عنایت فرما کر مودی جی کو ناراض کردیا۔ مودی جی کو چاہئے تھا کہ وہ چائے کے ساتھ کچھ نمک پارے بھی اوبامہ کے منہ میں ٹھونس دیتے تاکہ اس نمک حرامی کا ارتکاب نہ ہوتا۔

مودی جی نے اپنے طوفانی دورے کے دوران ممتا بنرجی سے ملنے کے بعد کسی مٹھ میں وعظ و نصیحت بھی کی حالانکہ انہیں چاہئے تھا کہ چندی گڑھ جاکر ہریانہ کے وزیراعلیٰ کھٹر سے ملاقات کرتے اور جاٹ مظاہرین کو امن وشانتی کا اپدیش دیتے۔ وارانسی میں بی ایچ یو کے اندر نمائشی بھاشن بازی کے بجائے دہلی کے اندر جے این یو میں جاکر پولس کے مظالم کا شکار طلباء کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ انتظامیہ اور میڈیا کی سانٹھ گانٹھ سے ان کو دیئے جانے والے زخموں پر مرہم رکھتے یا کم از کم دہلی کے چھتیس ہزاری کورٹ میں آکر اپنے بھکتوں کو

دن دہاڑے قانون اور دستور کی دھجیاں اڑانے سے منع کرتے ۔ کشمیر کے اندر محبوبہ مفتی کے ساتھ مل حکومت سازی کی جوڑ توڑ کرنے کے بجائے وہاں کی عوام کا دل جیتنے کی کوشش کرتے تاکہ دائمی امن قائم ہوسکے لیکن وزیراعظم کی نہ یہ خواہش ہے اور نہ ان میں ایسا کرنے کی جرأت ہے۔ ان کا اپنا سنگھ پریوار اور ان کی اقتدار پسندی انہیں کسی صورت میں بھی اس کی اجازت نہیں دے گا۔

مودی جی کی انہیں اقتدار سے بے دخل کرنے کی سازش کو اگر سنجیدگی سے لیا جائے تو شک کی سوئی ان کے اپنے ہندوتواپریوار ہی کی جانب مڑجاتی ہے جو دانستہ اور نادانستہ طور پر آئے دن ان کیلئے ایک نئی قبر کھود کر تیار کردیتا ہے۔ پہلے تو ادیتہ ناتھ اور ساکشی مہاراج جیسے لوگوں نے لوجہاد اور گھرواپسی کے نام پر آتنک پھیلایا اور ساری دنیا میں ہندوستان کو بدنام کیا۔ اس کے بعد گئوہتیا اور عدم رواداری کا بے مثال مظاہرہ کرکے حکومت کی جڑوں کو بالکل کھوکھلا کردیا گیا۔ ان ہنگامہ آرائیوں پر حکومت ابھی قابو بھی نہیں پاسکی تھی ریزرویشن کے لئے زبردست مظاہروں نے سر ابھارا۔ اس کے نتیجے میں گجرات ، آندھراپردیش اور ہریانہ میں تشدد کی آگ بھڑکی اتفاق سے ان تینوں صوبوں میں بی جے پی یا اس کی حلیف ٹی ڈی پی کی حکومت ہے۔ لیکن اس فتنہ سامانی کے بازار میں پر اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کے غنڈوں نے بازی مارلی۔ ان لوگوں نے پہلے تو حیدرآباد یونیورسٹی اور پھر جے این یو کو

اپنی دہشت گردی کا نشانہ بنایا۔
جے این یو کے معاملے میں تو زعفرانی سیاست کی بے مثال مٹی پلید ہوئی ہے۔ اے بی وی پی والوں نے ایک ایسے بے ضرر احتجاج کا سیاسی فایدہ اٹھانے کی کوشش کی جو گزشتہ تین سالوں سے ہو رہا ہے اور ملک میں اس کی کسی کو خبر تک نہیں ہوئی۔ افضل گرو کی پھانسی کے فیصلے کے خلاف مظاہرے کو اس سال بھی جازت مل گئی تھی مگر آخری وقت میں اسے اے بی وی پی کے دباو کے تحت نئے وائس چانسلر نے منسوخ کردیا۔ اگر یہ نہ کیا جاتا تو وہ غیر اہم واقعہ اپنے آپ دب جاتا لیکن زعفرانی ابن الوقتوں نے اس کا سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور خود اپنے جال میں پھنس گئے۔ اب تو حال یہ ہے کہ سابق سالیسیٹر جنرل سولی سوراب جی نے برملا اعتراف کرلیا ہے کہ افضل گرو کی پھانسی کے خلاف احتجاج کرنا کوئی جرم نہیں ہے ہاں اس کا بدلہ لینے کی دھمکی دینا ہوسکتا ہے۔ اس طرح گویا ان تمام لوگوں کیلئے جو افضل گرو کی پھانسی کے خلاف مظاہرے کرنا چاہتے ہیں احتجاج کا دروازہ کھل گیا۔ آئندہ سال یقیناً ایسے کئی مظاہرے ہوں گے۔
اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کے ناتجربہ کار رہنماوں نے جو غلطی کی سو کی لیکن مرکزی حکومت نے جب ناعاقبت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دہلی پولس کے بیجا استعمال کیا تو گویا کریلا نیم چڑھا ہوگیا۔ ان احمقوں کو چاہئے تھا کہ

وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے رپورٹ طلب کرکے معاملے کو رفع دفع کردیتے لیکن نے انہوں نے اس بے ضرر مظاہرے سے صرفِ نظر کرنے کے بجائے اسے قومی مسئلہ بنا دیا۔ وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ نے اس کے ڈانڈے آئی ایس آئی اور حافظ سعید تک سے جوڑ دیئے اور تو اور جے این یو اسٹوڈنٹس یونین کے صدر کنھیا کمار کو گرفتار کرلیا۔

کنھیا کا قصور تو صرف یہ تھا جب اسے اجازت کی منسوخی کی اطلاع ملی تو وہ مودی جی کی مانند راہِ فرار اختیار کرنے کے بجائے مظاہرہ گاہ پر پہنچ گیا۔اس نے وہاں تقریر بھی کی جو مظاہرین کا غم وغصہ کم کرنے کیلئے ضروری تھی لیکن اس میں کشمیر یا افضل گرو کی بابت کوئی ایسی بات نہیں کی جس کا ہندتوا نواز فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے باوجود اے بی وی پی والے کب ماننے والے تھے ان لوگوں نے کنھیا کمار کی ویڈیو کے پیچھے کشمیر میں ہونے والے ایک مظاہرے کی آواز لگا کر اسے اپنے زرخرید میڈیا کے ذریعہ نشر کرنا شروع کردیا۔ اس طرح گویا کنھیا کمار کو ملک کا غدار بنا کر پیش کیا گیا۔ بہت جلد وہ جھوٹ کھل گیا اور جو چینل اسے جعلی ویڈیو کو نشر کر رہے تھے ان کے مسابقین نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا۔ اس کے بعد پولس اور زعفرانی غنڈوں کی ملی بھگت سے ظلم وتشدد کا ننگا ناچ شروع ہوا۔ جو لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ افضل گرو کی پھانسی کی مخالفت کرنا عدالتی فیصلے کی توہین ہے ان لوگوں نے عدالت کے احاطے میں

دستور اور قانون کو اپنے قدموں تلے روندا۔ پولس نے کنہیا کمار کو لا کر زعفرانی وکلاء کے حوالے کردیا اور وہ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس غیر معمولی واقعہ کا سپریم کورٹ نے نوٹس لیا اور کہا کہ اگلے دن جب کنہیا کمار کی دوبارہ پیشی ہو تو عدالت کو محفوظ کیا جائے اور اپنے نگراں روانہ کئے۔

دوسرے دن پھر وہی کھیل دوہرایا گیا۔ عدالت کے تمام دروازوں پر غنڈوں نے قبضہ کرلیا۔ صحافیوں تک کو زدوکوب کیا گیا۔ ان کے کیمرے چھین لئے گئے اور نعرہ لگایا گیا کہ ''فون بھی توڑیں گے اور بون (ہڈی) بھی توڑیں گے''۔ کنہیا کمار پر دوسرے دن پھر حملہ ہوا۔ سپریم کورٹ کی ٹیم کسی طرح اپنی جان بچا کر لوٹی مگر اس کی رپورٹ کو دبا دیا گیا اس کے باوجود آر کے دھون جیسے باضمیر وکیل نے این ڈی ٹی وی پر حکومت کے چہرے سے نقاب نوچ کر پھینک دی اور سرکار کو وہ صلوٰتیں سنائی ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے باوجود کنہیا کمار کو ضمانت نہیں ملی بلکہ اس کو افضل گرو کے کمرے میں قید کردیا گیا۔ اس کے برعکس کنہیا کمار پر حملہ کرنے والے بی جے پی کے رکن اسمبلی او پی شرما کو ضمانت مل گئی۔ جن وکلاء نے کنہیا کمار پر حملہ کیا تھا ان کی ویڈیو ذرائع ابلاغ میں نشر ہوتی رہی۔ ان کی عوامی پذیرائی بھی ہوتی رہی لیکن دہلی پولس ان کو شناخت نہ کرسکی اور چند نامعلوم افراد کے خلاف شکایت درج کی گئی۔ دارالخلافہ دہلی کے اندر قانون کی ایسی دھجیاں تو شاید

ایمرجنسی کے دوران بھی نہیں اڑائی گئی ہوں گی۔

اس مرحلے میں سنگھ پریوار کو اپنی غلطی کا جو احساس ہوا وہ بھی ناقص تھا۔ اسے لگا کہ کنھیا کمار ہندو ہے اور اس کی گرفتاری سے ممکن ہے ہندو رائے عامہ ہمارے خلاف ہو جائے اس لئے اس نے جے این یو معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کا فیصلہ کیا اور پہلے پروفیسر ایس اے آر گیلانی پر ہاتھ ڈالا گیا۔ گیلانی صاحب کو افضل گرو کے مددگار کے طور پر بھی پہلے گرفتار کیا گیا تھا لیکن عدالت عالیہ نے انہیں رہا کردیا تھا۔ اس موقع پر بھی کمال منافقت کا مظاہرہ ہوا۔ گیلانی صاحب کے خلاف ایک ویڈیو ٹیپ عدالت میں پیش کی گئی لیکن اسٹیج پر ان کے ساتھ بیٹھنے والے غیر مسلمین کی گرفتاری تو درکنار انہیں پہچاننے سے بھی پولس نے انکار کردیا اور مزید دو نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا۔

پروفیسر گیلانی کو پھنسانا آسان نہیں ہے اس لئے عمر خالد کا ہوا کھڑا کیا گیا۔ وہ عمر خالد جو ٹیلی ویژن چینلس پر انٹرویو دے رہا تھا اور تن تنہا پوری زعفرانی ٹیم کا ناطقہ بند کئے ہوئے تھا اچانک دہشت گرد بنا دیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ تیس ہزاری کورٹ کے اندر کنھیا کمار کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے بعد بھیزی ٹی وی کے نامہ نگار نے بڑی بے حیائی کے ساتھ عمر خالد

کے والد ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس سے سوال کر ڈالا کہ وہ عدالت میں حاضر کیوں نہیں ہوتا۔ اگر اس نامہ نگار کے کیمرہ مین کو عدالت میں سپریم کورٹ کی ہدایت کے باوجود دو مرتبہ مارا پیٹا جائے تو کیا وہ خود عدالت میں پہنچ کر اپنے آپ کو بلی کا بکرہ بنائے گا؟ اس سے آگے بڑھ کر ایک اور احمقانہ سوال یہ کیا کہ کیا وہ اپنے بیٹے کی حرکات کیلئے معافی مانگیں گے ؟ یہ مطالبہ تو کوئی عدالت کسی مجرم سے بھی نہیں کرسکتی کجا کہ کسی ایسے ملزم کے والد سے اس کا مطالبہ کیا جائے کہ جس پر اوٹ پٹانگ الزامات لگائے جارہے ہیں۔ ناتھورام گوڈسے نے مہاتما گاندھی کے قتل کی معافی نہیں مانگی ۔ گوپال گوڈسے اپنے قاتل بھائیکو حق بجانب ٹھہراتے ہیں اور گوڈسے بھکت اس کا مندر تعمیر کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ سب دیش بھکتی ہے اور عمر خالد کا افضل گرو کیلئے نعرہ لگا دینا دیش دروہ ہے ؟ انصاف کا ایسا ترازو تو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔

جے این یو میں جو حماقت بی جے پی سے سرزد ہوئی اس کا نتیجہ تو اسے آئندہ انتخاب میں یقیناً بھگتنا پڑے گا مگر اس پیشگی قسط ابھی سے اس کو ملنے لگی ہیں ۔ جے این یو کے اندر جب کنھیا کمار کی گرفتاری کے خلاف احتجاج ہوا اور انسانی زنجیر بنائی گئی تو وہ طلباء بھی ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے تھے جو سرخ نظریئے کے خلاف ہیں ۔ وہ تمام لوگ دراصل زعفرانی غنڈہ گردی کے خلاف متحد ہوگئے تھے ۔ ہوا کے رخ کی اس تبدیلی کا دوسرا اثر براہ راست اے بی وی

پی پر پڑا جب اس کے تین بڑے عہدے داران نے استعفیٰ دے دیا ان میں جے این یو یونٹ کا نائب صدر بھی شامل تھا۔ بی جے پی بھی ان شعلوں سے محفوظ نہ رہ سکی اس کے آئی ٹی سیل کے سربراہ نے بھی یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ ان حالات میں زعفرانی ٹولے میں دم گھٹنے لگا ہے۔ بڑی بے حیائی کے ساتھ اس مہم میں جٹے ہوئے ذرائع ابلاغ کے سرخیل زی ٹی وی کے ایک باضمیر صحافی سدھارتھ ورداراجن نے بھی علی الاعلان استعفیٰ دے کر یہ ثابت کردیا کہ اب اس کاغذ کی ناو کے دن لد چکے ہیں اور اس کا غرقاب ہونا یقینی ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ آر ایس ایس اور بی جے پی کا پینگیں بڑھانے کی کوشش کرنا اس احساس کا ثبوت ہے کہ ان کیلئے ملت کو نظر انداز کرکے ملک پر حکومت کرنا ناممکن ہے۔ ایسے میں اگر وہ افضل گرو کی پھانسی کا صحیح استعمال کرتے تو بڑا سیاسی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس معاملے میں ظلم عظیم کا ارتکاب کانگریس پارٹی نے کیا تھا۔ عدالت کے فیصلے ٹھوس ثبوت کی بنیاد پر عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کئے جاتے ہیں لیکن افضل گرو کو ناقص ثبوت کے باوجود نام نہاد قومی ضمیر کو مطمئن کرنے کیلئے تختۂ دار تک پہنچا دیا گیا ۔ اس موقع پر کانگریس پارٹی نے اپنے آپ کو بی جے پی سے بڑا دیش بھکت ثابت کرنے کیلئے کمال بے ضمیری کا مظاہرہ کیا تھا۔ قومی انتخاب میں خون ناحق رنگ لایا کانگریس کو منہ کی کھانی پڑی اور وہ ذلیل و رسوا ہو کر اقتدار سے بے دخل ہوئی۔

بی جے پی اگر کانگریس کی عبرتناک شکست سے سبق سیکھکر مسلمانوں کو قریب کرنے کیلئے چند زرخرید علماء کو بیساکھی بنانے کے بجائے افضل گرو کے معاملے میں کانگریس کو بے نقاب کرتی تو ممکن کچھ مسلمان اس کے جھانسے میں آجاتے۔ اگر افضل گرو کی ہڈیاں قبر سے نکال کرایک تابوت میں افضل گرو کے اہل خانہ کے سونپ دی جاتیں اور ان کی وادی میں تدفین ہوجاتی تو کشمیر میں سنگھ پریوار کی زہر افشانی کا اثر کسی قدر زائل ہوجاتا ۔ لیکن بی جے پی نے افضل گرو کے خلاف ماحول بنا کر کانگریس کا جرم اپنے سر باندھ لیا اور اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی اب حال یہ کہ بی جے پی کانگریس کے کئے کی سزا بھگتنے کی تیاری میں مصروف ہو گئی ہے اور اپنے لئے سیاسی پھانسی کا پھندا تیار کررہی ہے حالانکہ پنجاب میں انتخابی فائدہ اٹھانے کیلئے بینت سنگھ کے قاتل کو بچایا جارہا ہے۔ دہشت گردی کے الزام میں گرفتار لوگوں کو رہا کیا جارہا ہے تمل ناڈو میں راجیو گاندھی کے قاتلوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے کم از کم یہ رویہ کنھیا کمار اور عمر خالد کے ساتھ بھی اختیار کیا جانا چاہئے لیکن اس کے لئے جس فہم و فراست کی ضرورت ہے اس سے سنگھ پریوار محروم ہے۔

سنگھ پریوار کے سارے مسائل کی جڑ اس کی ناعاقبت اندیش اور کم ظرف قیادت ہے۔ یہ لوگ ہر ہنگامے کا سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے کسی

بھی پلیتہ تو شعلہ دکھا دیتے ہیں۔ ابتداء میں ان کو اندازہ نہیں ہو پاتا کہ آگے چل کر اس کے نتائج کیا نکلیں گے؟ پھر جب ان حماقت خیز اقدامات کے نتیجے میں فساد پھوٹ پڑتا ہے جیسا کہ ہریانہ میں رکن اسمبلی سینی کے بیان سے پھوٹ پڑا تو قوت فیصلہ کی کمی ان کے پیروں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ جب حالات پوری طرح بے قابو ہو جاتے ہیں تب جا کر انہیں ہوش آتا ہے اور اس وقت تک بہت بڑا خسارہ ہو چکا ہوتا ہے۔ جو کچھ ہریانہ، آندھرا اور گجرات میں ہوا وہی ایف ٹی ٹی آئی، حیدرآباد یونیورسٹی اور جے این یو میں بھی ہوا لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ایک کے بعد ایک نت نئی غلطیوں کو دوہراتے ہوئے اپنے انجام بد کی کی جانب رواں دواں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مشیت کو بھی یہی منظور ہے ورنہ کوئی صاحب عقل ایسی حماقت کیسے کر سکتا ہے؟ جے این یو پانچ طلباء بشمول عمر خالد جن پر بغاوت کا الزام ہے کیمپس میں لوٹ آئے ہیں مگر سنگھ پریوار کے راہِ راست پر آنے کے آثار نظر نہیں آتے۔

ہریانہ میں کل یگ کی مہابھارت

ہریانہ کے اندر جاٹ ریزرویشن کی تحریک نئی نہیں ہے۔ ۱۹۹۸ء میں پسماندہ ذاتوں کے قومی کمیشن نے جاٹوں کو ریزرویشن دینے کی سفارش تو کردی مگر اندر کمار گجرال کی حکومت نے اس پر عملدرآمد نہیں کیا۔ ایک سال بعد اٹل جی نے راجستھان کے جاٹوں کو دیگر پسماندہ ذاتوں میں شامل کرنے کا وعدہ کرکے صوبے کی ۲۲ میں ۱۶ نشستیں جیت لیں اور اپنا وعدہ وفا کرتے ہوئے بھرت پور ودھول پوری کے علاوہ ساری ریاست کے جاٹوں کو ریزرویشن دے دیا۔ اس فیصلے سے شہ پاکر جاٹوں کے ریزرویشن کی تحریک دیگر ریاستوں میں بھی پھیل گئی۔ احتجاج کی ابتداء ۲۰۰۴ء میں ہوئی جب سیاسی جماعتیں انتخاب سے قبل وعدہ کرکے بعد میں مکر گئیں۔ ۲۰۰۷ء کے اندر دہلی میں جاٹ مہاسبھا کے اجلاس میں ریزرویشن ہی بنیادی مسئلہ تھا نیز ۲۰۰۸ء میں اس مقصد کیلئے اکھل بھارتیہ جاٹ آرکشن سنگھرش سمیتی کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت احتجاجی جلسے جلوس کا لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔

کانگریس پارٹی اس احتجاج کو حکمت کے ساتھ نمٹتی رہی ہے ۲۰۱۴ء میں تو اس نے جاٹوں کو ریزرویشن سے نواز بھی دیا لیکن عدالتِ عالیہ نے اس فیصلے کو مسترد کردیا اس طرح سانپ تو نہیں مرا مگر لاٹھی یعنی کانگریس ضرور ٹوٹ پھوٹ

گئی ۔ ہریانہ کے اسمبلی انتخاب سے قبل بی جے پی نے کانگریس کے فیصلے کو حق بجانب ٹھہرایا اور اس کا بھرپور سیاسی فائدہ اٹھایا لیکن پھر اس کی نیت بدل گئی اور مودی جی کی قیادت میں پسماندہ ذاتوں کی قومی مجلس نے اس کے خلاف سفارش کردی جس کی بنیاد پر سپریم کورٹ نے ۲۰۱۵ء میں اسے پھر سے مسترد کردیا۔ بی جے پی جاٹوں کو بہلا پھسلا کر رام کرسکتی تھی لیکن جن کے دماغ میں رعونت کی ہوا بھری ہوئی ہو وہ بھلا کب کسی کو گھاس ڈالتے ہیں ؟

جاٹ احتجاج کی آگ میں تیل ڈالنے کا کام اس بار کوروکشیتر کے بی جے پی رکن پارلیمان راج کمار سینی نے کیا انہوں نے نہایت اہانت آمیز انداز میں جاٹوں کے مطالبات کو مسترد کرتے ہوئے ان کے آگے نہیں جھکنے کی اور مظاہرین کو گرفتار کرنے کی دھمکی دے ڈالی ۔ راجکمار اپنی بدزبانی کیلئے مشہور ہیں اور ماضی میں وہ اسٹیج پر جاٹوں کو گالیاں دے چکے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ جاٹوں کی طرف سے پانی یا دودھ بند کردینے کی دھمکی سپریم کورٹ کی خلاف ورزی ہے۔ حالیہ ضمنی انتخاب میں کامیاب ہونے والے سونی پت کے بی جے پی باہوبلی سنجیو بالیان نے نومبر کے اندر سینی کے جواب میں کہا تھا جاٹوں کو ریزرویشن مل کر رہے گا جسے نکل جانا ہے چلا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہریانہ کی ہوا گرم ہے جس کی تپش ہم مغربی اترپردیش میں محسوس کررہے ہیں ۔ بی جے پی اپنے ہی رکن پارلیمان کی وارننگ پر توجہ دے کر اگر سینی کی زبان پر لگام

لگادیتی تو حالات قابو سے باہر نہیں ہوتے۔

فروری سے ۱۸ فروری کے درمیان پر امن انداز میں چلنے والی جاٹ تحریک کو اس ۱۴ بار سینی جیسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ میں ''۳۵ برادی سنگھرش سمیتی'' کی مزاحمت سے سابقہ پیش آیا۔اس کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ خالص ذات برادری کی نام پر جاٹوں کے خلاف دیگر ذاتوں کو مشتعل کرنے والا اقدام تھا۔ اس کے رد عمل میں جاٹ مظاہروں کے اندر مزید شدت آئی مگر گھمنڈی سینی اپنے حواریوں کو میدان میں اتار کر کولکاتہ کی جانب کھسک گئے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے سابق وزیراعلیٰ بھوپندر سنگھ ہوڈا امن کی منافقانہ اپیل کرکے جنتر منتر پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ اس معاملے میں کانگریس اور بی جے پی کا رویہ بالکل یکساں تھا دونوں پر ابن الوقتی کا عفریت سوار تھا۔ برادری سنگھرش سمیتی کے نعروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا مظاہرہ کس ۳۵ قدر اشتعال انگیز تھا۔ ''سی ایم صاحب مت گھبراو ۳۵ برادری آپ کے ساتھ ہے''۔ دوسرا نعراہ اور بھی زیادہ خطرناک نعرہ تھا ''ہمیں مجبور نہ کرو کہ ہمیں کٹھور (سخت) قدم اٹھانا پڑے''۔ اس نعرے نے تو گویا جاٹوں کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچا دی۔

سینیوں ، ناکسوں اور پنجابیوں کے اس جلوس کے جوش وجنون کا اندازہ اس بات سے

لگایا جاسکتا ہے کہ بھوانی بس اڈے سے دوپہر ڈھائی بجے جب اس کو راستے پر لیجے این یو کے خلاف مظاہرہ کرنے والے کچھ وکیل ملے تو یہ غلط فہمی میں ان سے بھڑ گئے۔ جے این یو کے مظاہرین (جو دراصل بی جے پی کے ہی حامی تھے) نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ نہیں مانے اور جن تین لوگوں کو زخمی کیا وہ سب کے سب پنجابی تھے۔اس حملے کی خبر جب سوشیل میڈیا سے پھیلی تو جاٹ نوجوان بھی میدان میں نکل آئے اور مختلف مقامات پر جلوس کے اوپر پتھراؤ کیا گیا نیز مارپیٹ بھی ہوئی ۔ اسی کے ساتھ تشدد کی وارادتیں شہر میں پھیلنے لگیں۔ اس دوران ایک واقعہ جاٹ کالج چوراہے پر بھی رونما ہوا جس میں طلباء پر پولس والوں پر حملے کا الزام ہے۔ اس کے جواب میں پولس کا عملہ رات کی تاریکی میں نیکی رام ہاسٹل کے اندر داخل ہوگیا اور طلباء کی خوب جم کر پٹائی کی ۔ اقامت گاہ کے جاٹ طلباء نے ظلم وجبر کی اس واردات کو موبائل کی مدد سے فلمبند کرلیا۔ جیسے ہی یہ ویڈیو سوشیل میڈیا میں پھیلنی شروع ہوئی تو اسی کے ساتھ تشدد کی آگ بھی پھیلتی چلی گئی یہاں تک کے حالات پوری طرح قابو سے باہر ہوگئے۔ کمبھ کرن کی نیند سونے والی ہریانہ سرکار نے اب ہاسٹل کے چھاپے کی تحقیقات کیلئے ایک پینل نامزد کیا ہے۔ پولس اور انتظامی افسران کے رویہ کی تفتیش ایک سبکدوش آئی پی ایس افسر پرکاش سنگھ کے سپرد کی گئی ہے۔اس بیچ کانگریسی رہنماپروفیسر ویریندر سنگھ کے اوپر ایک ٹیپ کی بنیاد پر بغاوت کا

مقدمہ درج کرلیا گیا ہے۔ منوہر لال کھٹر جو کچھ اپنے مخالفین کے خلاف کر رہے ہیں اگر اس کا عشر عشیر بھی خود اپنے لوگوں کو قابو میں رکھنے کیلئے کرتے تو اس خاک و خون کی ہولی کو ٹالا جاسکتا تھا۔

اس فساد کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں ان میں نا تجربہ کاری سب سے اہم ہے۔ اس مرتبہ پہلی بار غالباً ملک کی عوام نے ایک ایسے شخص کو وزیراعظم کی کرسی پر فائز کردیا کہ جس نے کبھی رکن پارلیمان کی حیثیت سے ایوان میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ مودی جی کو گجرات میں حکومت کا تجربہ تو تھا لیکن وہاں بھی انہوں حکومت کم اور سیاست زیادہ کی تھی اور یہ دونوں یکسر مختلف چیزیں ہیں۔ جہاں تک گجرات کی خوشحالی و ترقی کا سوال ہے وہ تو مودی جی سے پہلے جیسا تھا بعد میں بھی ویسا ہی ہے اس میں حکومت کا نہیں بلکہ وہاں کے قدرتی وسائل اور عوام کا اہم کردار ہے۔ مودی جی کو چاہئے تھا کہ وہ اپنی نا تجربہ کاری کا ازالہ کرنے کیلئے پارٹی میں موجود جہاندیدہ لوگوں سے استفادہ کرتے لیکن شاید انہیں خود اعتمادی میں کمی کے سبب ایسے لوگوں سے خوف محسوس ہوتا ہے یا انانیت ان کو اس کی اجازت نہیں دیتی خیر وجہ جو بھی حقیقت یہی ہے کہ وہ سمرتی ایرانی، وی کے سنگھ اور منوہر پاریکر جیسے کندۂ ناتراش پر انحصار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ مرکز سے لے کر تو ریاستوں تک پھیلا ہے۔

اقتدار میں آنے کے بعد مودی جی نے جتنے لوگوں کو وزارت اعلیٰ کی کرسی پر

فائز کیا وہ سب کے سب نا تجربہ کار اور نااہل تھے ۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ان کے انتخاب کی ایک کسوٹی سنگھ پریوار سے وابستگی اور دوسرے مودی جی سے وفاداری تھا۔ اس میں کہیں بھی قابلیت اور صلاحیت کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ اس کے علاوہ مودی اور شاہ کی جوڑی نے ہر جگہ وہاں کے روایتی ذات پات کے ڈھانچے کو توڑنے کی سعی کی مثلاً جھارکھنڈ میں کسی قبائلی کو وزیراعلیٰ بنانے کے بجائے اڑیسہ کے رگھوبرداس کو وزیراعلیٰ بنایا گیا۔ مہاراشٹر میں مراٹھا یا پسماندہ ذاتوں کا وزیراعلیٰ ہوا کرتا تھا بالاصاحب ٹھاکرے نے اس سے انحراف کرکے براہمن منوہر جوشی کو وزیراعلیٰ تو بنادیا لیکن انتخاب سے قبل انہیں نارائن رانے سے بدل کر مراٹھا کو لے آئے۔ مودی جی نے بھی براہمن فردنویس کو وزیرااعلیٰ بنا دیا اور ہریانہ میں اپنی ہی طرح کے ایک ایسے سنگھی کو وزیراعلیٰ کا عہدہ سونپا جو پہلی مرتبہ رکن اسمبلی بنا تھا۔

اس ناقص حکمت عملی کے نتائج ہریانہ کے اندر تو ساری دنیا نے دیکھ لئے کہ اس قدر ہنگامہ کے دوران وزیراعلیٰ منظر سے غائب تھا۔ بی جے پی والوں کے دل آپس میں اس قدر پھٹے ہوئے ہیں دہلی سے قربت کے باوجود نہ وہ خود دہلی آئے اور نہ کوئی اوران کی مدد کیلئے چنڈی گڑھ گیا۔ آج کلبی جے پی کے اندر یا باہر کسی کو وزیراعظم اور ان کے نامزد کردہ مہروں سے ذرہ برابر ہمدردی نہیں ہے۔ ہر

کوئی اس نحوست زدہ ماحول سے سے جلد از جلد چھٹکارہ پانے کیلئے چھٹپٹا رہا ہے۔ ہوا میں لاٹھی چلانے والے تلک دھاری خاکی چڈی والے وزیر اعلیٰ نے گھبرا کر ایک دن کے اندر فوج طلب کر لی حالانکہ اس طرح کی صورتحال مقامی پولس حالات سے بہتر واقفیت کی بناء پر موئثر ثابت ہوتی ہے اور فوج کو ناگزیر صورتحال میں طلب کیا جاتا ہے۔ کھٹر کا خیال رہا ہوگا کہ پولس میں شامل جاٹ اپنے لوگوں کے ساتھ نرمی کریں گے مگر واضح احکامات سے محروم فوج پولس کی حوصلہ شکنی کے علاوہ کچھ اور نہ کر سکی ۔اس دوران حالت یہ تھی کہ فسادیوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کسے کیا کرنا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ غیر جاٹوں نے بھی کھٹر کو دھکے دیئے اور کالی جھنڈیاں دکھائیں ۔ وزراء نے تک اپنے وزیر اعلیٰ پر نہ صرف غیر موئثر ہونے کا الزام جڑ دیا بلکہ انہیں کو سارے فتنہ و فساد کیلئے موردِ الزام بھی ٹھہرا دیا۔

یہ محض اتفاق نہیں بلکہ سنگھ پریوار کیسوچی سمجھی حکمت عملی تھی جو حقائق سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ ہریانہ میں جاٹ تقریباً ۳۰ فیصد ہیں ۔ انتخاب سے قبل وہ دو دھڑوں میں تقسیم تھے اس لئے کہ کانگریس کے وزیر اعلیٰ بھوپندر سنگھ ہوڈا بھی جاٹ تھے اور ان کے خلاف چوٹالہ بھی جاٹ ووٹ کے دعویدار تھے ۔ بی جے پی نے سوچا یہ اچھا موقع ہے جاٹوں کو نظر انداز کرکے دوسری ۳۵ ذاتوں پر توجہ مرکوز کی جائے اور ان کی دلجوئی کرکے انتخاب جیت لیا جائے ۔ یہ حکمت

کامیاب رہی بی جے پی کو پہلی بار زبردست کامیابی نصیب ہوگئی۔ بی جے پی نے منوہر لال کھٹر کو وزیراعلیٰ بنا کر جاٹوں کی مزید دلآزاری کردی جس سے سینی اور دیگر ذات کے لوگوں کا حوصلہ بلند ہوگیا۔ دراصل جاٹوں کے ساتھ دھوکہ ہوا انتخاب سے قبل امیت شاہ نے جاٹ رہنما کپتان ابھیمنیو کے وزیراعلیٰ بنائے جانے کا عندیہ دیا تھا مگر اکثریت مل جانے کے بعد وہ بدل گئے اور ایک پنجابی کو وزیراعلیٰ بنوا دیا۔ جاٹ برادری کو انتخاب کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اپنے سیاسی اختلافات مٹا کر متحد ہوگئے اور بی جے پی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ افسوس اس بات کا ہے بی جے پی کی ابن الوقتی کی قیمت عوام کو چکانی پڑی۔ ہزاروں کروڑ کی مال و متاع اور ۲۸ زیادہ تر بے قصور لوگوں کی جانیں تلف ہوئیں۔

مارچ کو ہریانہ میں غیر ملکی سرمایہ کاری کیلئے میک ان انڈیا کی نمائش ہونے والی ہے ۵ ۔ ممبئی کے پرامن ماحول میں بڑے طمطراق سے یہ تماشہ منعقد ہوا تو اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی ایسے میں ہریانہ کے پر تشدد فضا میں وہاں جانے کی غلطی کون کرے گا؟ جس ریاست میں غیر ملکیوں کو بیف کھانے کیلئے وزیراعلیٰ پرمٹ دینے پر غور کررہے ہیں اور ان کے دست راست انل وِج اس کے جواب میں اعلان فرمارہے ہیں کہ جنھیں بیف کھانا ہو وہ ہمارے یہاں نہ آئیں وہاں پر صنعت لگانے کیلئے کتنے پرمٹ لینے پڑیں گے یہ سوال بھی سرمایہ کاروں

کو پریشان کر رہا گا؟ بی جے پی گجرات میں گیر کے ان جنگلات کو جو شیروں کیلئے محفوظ کرکے رکھے گئے تھے اپنے اقرباء میں کوڑیوں کے بھاو بانٹ رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہاں نکل شیر کبھی میک ان انڈیا کے پوسٹر میں نظر آتے ہیں تو کبھی پٹیالہ ہاوس میں لیکن ان دونوں قسم کے کاغذی شیروں کا حال یہ ہے کہ باہر سے وہ جیسے صحتمند اور دلیر نظر آتے ہیں اندر اسی قدر کھوکھلے اور کمزور ہیں۔

بی جے پی والے ہریانہ میں کانگریس پر جو الزامات لگا رہے ہیں وہی کھیل ہے وہ آئے دن مسلمانوں کے خلاف کھیلتے رہے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ اس مرتبہ اس کا شکار وہ خود ہوئے ہیں۔ اس بار مخالفین کے بجائے حوارین کو زخم لگا ہے۔ ایسے میں اگر کانگریس کی ریاستی حکومت ہوتی تو اروناچل پردیش کی طرح اسے بھی برخواست کرکے صدر راج لگا دیا جاتا اور آیا رام گیا رام کی مدد سے بی جے پی اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتی لیکن ہریانہ میں زبان خود اپنے ہی دانتوں میں گھری ہوئی ہے۔ اس فساد نے زعفرانی دہشت گردوں کے دلیری کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی۔ جب ان کا مقابلہ کمزور اور بے بس لوگوں سے ہوتا ہے تو یہ بہت شیر بنتے ہیں لیکن جب کسی طاقتور سے پنجہ آزمائی کا موقع آتا ہے تو یہ بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ ان فسادات کا اثر پنجاب اور اتر پردیش کے انتخاب پر ضرور پڑے گا اور جن علاقوں میں جاٹوں کا دبدبہ ہے وہاں سے بی جے پی کو اپنی ضمانت بچانا مشکل ہو جائیگا۔

ہریانہ کی تباہی کے بعد ملک کی ہندو اکثریت حیرت زدہ ہے کہ ہندو ہردیہ سمراٹ نریندر مودی جی کے زیر اقتدار یہ انرتھ (انہونی) کیسے ہوگیا؟ اس لئے کہ غالباً پہلی مرتبہ چن چن کر وزیراعلیٰ کے ذات بھائیوں کی دوکانوں، کارخانوں اور گھروں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ پولس کی گولی سے مرنے والے اکثر و بیشتر زعفرانی اکثریت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دوران ہریانہ خواتین کی اجتماعی عصمت دری بھی ہوئی اور پولس نے اسے افواہ ٹھہرا کر شکایت تک درج کرنے سے انکار کردیا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وطن عزیز میں یہ پہلی بار ہوا؟ جی نہیں اس ملک کی اقلیتوں اور دلتوں کے ساتھ تو یہ آئے دن ہوتا رہتا ہے اس لئے انہیں یہ سب دیکھ کر کوئی حیرت و پریشانی نہیں ہوتی۔ اس بار تو بس یہ ہوا ہے کہ چکرویوہ کی دِشا (سمت) تبدیل گئی جس نے اکثریتی طبقے کی دشا (حالت) کو بدل کر رکھ دیا۔ اس سانحہ سے اگر ملک کی اکثریت عبرت پکڑ کے اپنے رویہ پر نظرثانی کرے تو ممکن ہے وطن عزیز میں امن و امان رہے گا اور وہ مشیت ایزدی کے اس طرح کے انتقام سے بھی محفوظ و مامون رہیں گے۔

ہریانہ میں جاٹ اکثریت میں نہیں ہیں اس کے باوجود انہوں نے تباہی و بربادی کا طوفان برپا کرکے ثابت کردیا کہ فتنہ و فساد بپا کرنے کیلئے کسی قوم کا اکثریت میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس ملک میں فسطائی عناصر

ایک بہت معمولی اقلیت ہیں ۔ ان سارے حامیوں سمیت جو مختلف مفادات اور دھوکہ و فریب کے سبب ان کے جھانسے میں آجاتے ہیں ان لوگوں کی تعداد ۳۱ فیصد سے تجاوز نہیں کرتی اس کے باوجود یہ لوگ گجرات، دہلی اور آسام جیسے خونریز فساد کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہ فساد اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کرتے ہیں کہ جب ان کی ہمنوا حکومت قائم ہوجائیگی تو فرقہ وارانہ فسادات کا نام ونشان مٹ جائیگا ۔ اس لئے کہ فی الحال نہ صرف قومی سطح پر بلکہ ریاست کے اندر بھی ہندوتوا وادی سرکار برسرِ اقتدار ہے جس کو فسادزدگان نے ابھی حال میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ منتخب کیا تھا ۔ امت کے جو علماء اور دانشور دین وملت کے تحفظ کی خاطر صرف اور صرف انتخابی جدوجہد کے قائل ہیں ان کیلئے ہریانہ کے واقعات میں تازیانۂ عبرت ہے۔

مہابھارت کی رن بھومی (میدان جنگ) کوروکشیتر تھا یعنی کوروؤں کا علاقہ ۔ وہی کورو اس وقت بی جے پی کی مانند اقتدار پر قابض تھے ۔ اتفاق سے ہریانہ کی حالیہ مہابھارت کا بگل بھی اسی تاریخی شہر کروروکشیتر میں بجا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کل یگ کے پانڈو یعنی کانگریس پارٹی بن باس سے واپس لوٹ آئی ۔ ہریانہ میں دریودھن کا کردار راجکمار سینی نے ادا کیا۔ نابینا یودھشٹر کی جگہ منوہر لال کھٹر نظر آئے اور بے یارومددگار بھیشم پتامہ کے مقام پر وزیراعظم نریندر مودی دیکھے گئے۔ سابق وزیر اعلیٰ بھوپندر سنگھ ہوڈا نے شری

کرشنا کی مانند بغیر اسلحہ اٹھائے بازی لی اور ارجن کی مانند چوٹالہ نے ان کا ساتھ دیا۔ مہابھارت کے اس ری میک (دوہرائے جانے) میں روہتک کی تباہی کے مناظر دیکھ کر عوام کو ٹی وی سیریل مہابھارت کا اختتامی منظر یاد آگیا ہوگا جس میں کورو یعنی غیر جاٹ پوری طرح تباہ و تاراج کردیے گئے تھے اور پانڈو یعنی جاٹوں کا بال بیکا بھی نہیں ہوا تھا۔

من کی اور دھن کی بات

کبھی خوشی کبھی غم ‘کے خالق کرن جوہر نے جب کہہ دیا کہ اس ملک میں صرف ’ وزیر اعظم ہی من کی بات کہہ سکتا ہے تو اروند کیجریوال نے فوراً ’دوستانہ ‘ نبھاتے ہوئے ان کی تائید کردی ۔ایسے میں مودی جی نے امیت شاہ سے ضرور کہا ہوگا ’کچھ کچھ ہوتا ہے‘ اور شاہ جی نے جواب دیا ہوگا ’اے دل ہے مشکل ‘ جینا یہاں ذرا ہٹ کے ذرا بچ کے یہ ہے دلّی مری جاں۔اس ملک میں من کی بات کہنے کا حق جس کسی کو بھی حاصل ہو لیکن اس پر کان نہیں دھرنے کا حق ہر کس و ناکس کے پاس ہے اور لوگ باگ وزیر اعظم کی حدتک اس کا بھرپور استعمال کرتے ہیں ۔ وقت کے ساتھ مودی جی کو یہ احساس ہوگیا ہے کہ اب قوم مہینے میں ایک مرتبہ بھی ان کاآکاش وانی سے نشر ہونے والا بھاشن تک سننا نہیں چاہتی اس لئے اس بار وہ اپنے ساتھ سچن تندولکر اور وشوناتھ کو لے آئے کہ مبادہ ان کے طفیل کچھ لوگ ان کی جانب توجہ فرمالیں ۔

امتحان کا موسم چونکہ شروع ہوا چاہتا ہے اس لئے مودی جی نے اپنی تقریر کے اختتام پر کہا ’کل میرا امتحان ہے۔ کل جب بجٹ پیش ہوگا تو ۱۲۵ کروڑ لوگ میرا امتحان لیں گے اور میں بہت ہی پر اعتماد ہوں ‘ ۔

سچن تندولکر اگر کسی میچ سے قبل یہ دعویٰ کرے تو لوگ اگلے دن کھیل کا اسکور

بورڈ دیکھیں گے؟ اس لئے آیئے دیکھتے ہیں دوسرے دن حصص (شئیر) بازار میں کیا ہوا؟
میچ بہت دلچسپ تھا پہلے تو بہار کی مانند ۱۲۰ نکات کا اچھال آیا اور اس کے بعد وہ گرنا شروع ہوا تو ۶۶۰ پوائنٹ نیچے پہنچ گیا لیکن پھر سنبھلنا شروع ہوا اور جب کھیل کی آخری سیٹی بجی تو ۱۵۲ رن سے مودی جی یہ میچ ہار گئے۔ سینسیکس تو خیر ٹسٹ میچ کی مانند تھا لیکن نیفٹی جو ففٹی ففٹی جیسا ہے اس میں بھی مودی جی کو ۴۳ رنوں سے شکست فاش ہوئی۔ دراصل مودی جی کا مسئلہ یہ ہے کہ راہ چلتی مصیبت کو غیر ملکی سربراہ سمجھ کر بے ساختہ گلے لگا لیتے ہیں۔ بجٹ بنا کر پیش کرنا وزیر خزانہ کا کام ہے اگر مودی جی اس بلا سے نہ لپٹتے تو لوگ جیٹلی کی ناکامی کا ماتم کرتے لیکن بھلا ہو مودی جی کی جلد بازی کا جو انہوں نے وزیر خزانہ کو رسوائی سے بچا لیا۔
بھولے ناتھ کے بھکت مودی جی خود بھی بتھ بھولے ہیں وہ بھی (ہندوستان کی بھولی بھالی عوام کی مانند) رحمت اور زحمت کے درمیان فرق نہیں کرپاتے ہیں ورنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ سمرتی ایرانی کی اداکاری پر خوش ہو کر اس تقریر پر 'ستیہ میو جیتے' کی مہر ثبت کرتے جو کذب و مکاری کا پلندہ تھی اور 'جھوٹ میو مرتے' کہلانے کا سزاوار بھی نہیں تھی۔ اب حال یہ ہے کہ لوگ سمرتی جی کے بجائے مودی جی کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ مودی جی کو سمرتی ایرانی کی ڈرامہ بازی اس لئے پسند آئی کہ وہ خود بھی نوٹنکی کرتے رہتے

ہیں۔ عرصہَ دراز کے بعد پچھلے دنوں وزیر اعظم کو جب ممبئی کا خیال آیا تو ان کی دلجوئی کیلئے وزیراعلیٰ دیویندر فردنویس نے چوپاٹی پر ’’ میک ان انڈیا‘‘ کا تماشہ لگادیا۔ اس کی افتتاحی تقریب میں شرکت فرماکر وزیر اعظم واپس ہوئے تو پنڈال میں آگ لگ گئی ۔

میک ان انڈیا کی آگ میں تیل ڈالنے کا کام وزیر اعظم کی زوجہ محترمہ جسودا بین نے اسی دن ممبئی مظاہرہ کرکے کیا۔ ایک مقامی غیر سرکاری تنظیم کے زیراہتمام احتجاج میں محترمہ جسودہ بین موسم باراں کے اندر جھگیوں کو مسمار کئے جانے کے خلاف بھوک ہڑتال کررہی تھیں جبکہ وزیر اعظم امیر کبیر لوگوں کے ساتھ دعوت اڑا رہے تھے ۔ ان تقریبات کے اندر یہ سوال پوشیدہ ہے کہ آخر یہ تضاد ہے جہاں بھری برسات میں خود اپنے باشندوں کی چھت کو بچانے کیلئے وزیر اعظم کی اہلیہ کو سڑک آکر نعرہ لگانا پڑتا ہے مگر دیش بھکت وزیر اعظم ان کی التجاء پر کان دھرنے کے بجائے غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لئے سرخ قالین بچھا کرائیر انڈیا کے مہاراجہ کی مانند ہاتھ جوڑ کر مسکراتا ہے۔

میک ان انڈیا کے پنڈال سے امیتابھ بچن اور عامر خان کو صحیح سلامت نکالنے کے بعد بہت جلد آگ پر قابو پالیا گیا لیکن چوپاٹی سے قریب ہی میں واقع

ممبئی اسٹاک میں جو آگ لگی ہوئی تھی اس کے شعلوں کو دیکھ کر کون احمق سرمایہ کار ادھر پھٹکنے کی حماقت کرے گا بلکہ ان شعلوں کو تو قومی بجٹ بھی بجھا نہیں سکا۔ فی الحال حصص بازار شعلہ زن ہے ،ہر روز کروڑوں کا سرمایہ خاک میں مل رہا ہے۔ بجٹ والے دن وہ اس سال کے سب سے کم تر سطح پر پہنچ گیا اس کے باوجود عصر حاضر کا نیرو ارون جیٹلی چین کی بنسی بجارہا ہے۔یو پی اے کے زمانے میں وزیر اعظم خود ایک ماہر معاشیات تھے اس کے باوجود انہوں نے پی چندمبرم اور پرنب مکھرجی جیسے ماہرین کووزارت خزانہ کا قلمدان سونپا۔اب حال یہ ہے کہ چائے والے وزیراعظم کا وزیر خزانہ دہلی کرکٹ ایسو سی ایشین میں نوٹ کھیلتا ہے۔ایسے میں اگر قومی معیشت سکرات کے عالم میں دم توڑنے لگے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے ؟

ارون جیٹلی ایک ماہر وکیل ضرور ہیں لیکن معاشی معاملات کا انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے اس کے باوجود وفاداری کے سبب وہ وزیر خزانہ بنادیئے گئے۔اس میں شک نہیں کہ ارون جیٹلی نے للت مودی جیسے کھلے باروں کی وکالت اور نریندر مودی جیسے سفاکوں کی چاپلوسی کرکے اپنے ذاتی خزانے کو مالا مال کیا ہے لیکن اپنی جیب بھرنے اورملک کی معیشت کو سنبھالنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ خام تیل کی قیمتوں میں گراوٹ کا فائدہ اٹھا کر عوام کی فلاح وبہبود کی جانب توجہ دی جاتی لیکن ایسا کرنے کیلئے جو غریب پرور ذہنیت

درکار وہ اس حکومت کے اندر ندارد ہے۔ مرکزی حکومت کو فی الحال اپنے رائے دہندگان کے بجائے ان سرمایہ داروں کا اربوں کھربوں کا قرض ستا رہا ہے جنھوں نے چندہ دے کر پچھلے انتخاب میں مودی جی کو وزارت عظمیٰ کی کرسی تک پہنچایا تھا۔ حق نمک ادا کرنے کی خاطر موجودہ سرکار سرمایہ داروں کا قرض معاف کرکے آئندہ انتخاب میں اپنی اعانت کو یقینی بنارہی ہے۔ وہ تو خیر سپریم کورٹ نے اس پر روک لگا کر قرض چرانے والوں کی فہرست طلب کرلی ورنہ کب کا یہ چور چور موسیرے بھائی ایک دوسرے کے وارے نیارے کرچکے ہوتے۔

قومی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جانے والے بنک خسارے کے بحران سے گذر رہے ہیں۔ اسٹیٹ بنک آف انڈیا نے دسمبر کے خاتمہ پر ۶۷ فیصد گھاٹے کا یعنی ۱۲۶۰ کروڑ کے نقصان کا اعلان کیا۔اس نے یہ بھی بتایا کہ ۲۰۷۰۰ کروڑ کے قرضہ جات کا واپس آنا مشکل ہے۔ پنجاب نیشنل بنک، یونین بنک آف انڈیا اور دیگر بنک بھی اس طرح کے خسارے کا شکار ہیں۔ معاملہ اس قدر سنگین ہے کہ اس معاملے میں سپریم کورٹ کو مداخلت کرنی پڑی اور اس نے ریزرو بنک سے ان کمپنیوں کی فہرست طلب کرلی جن پر ۵۰۰ کروڑ سے زیادہ کا قرض ہے اور انہیں سہولت دی جارہی ہے۔ عدالتِ عالیہ کو اس پر تشویش ہے کہ بغیر کسی واضح رہنمائی اور واپسی کی ضمانت کے کن بنیادوں پر عوامی بنک اور معاشی ادارے قومی خزانے پر یہ عظیم بوجھ ڈال رہے ہیں؟ حکومت کی معاشی کارکردگی کی کھری کسوٹی آئندہ سال

کیلئے خوشنما بجٹ پیش کر دینا نہیں بلکہ گزشتہ بجٹ پر عملدرآمد ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جیٹلی جی کے پچھلے بجٹ پر ایک نگاہ ڈالی جائے اور دسمبر کے اواخر تک اس پر عملدرآمد کا جائزہ لیا جائے؟

گزشتہ سال کے بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے سابق وزیر خزانہ چدمبرم نے کہا تھا کہ اس بجٹ کا زیادہ جھکاؤ صنعتی دنیا اور انکم ٹیکس ادا کرنے والے طبقے کی طرف ہے جبکہ ملک بڑی آبادی کے مفادات اس بجٹ سے غائب ہیں۔ یہ لوگ نہ صنعتی دنیا سے وابستہ ہیں اور نہ انکم ٹیکس چکاتے ہیں۔ عوامی فلاح و بہبود کے ان شعبوں میں بڑی ظالمانہ کٹوتی کی گئی ہے جو حکومت سے مدد و تعاون کی امید سے رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر پسماندہ طبقات سے متعلق کیلئے ۲۰۱۴ء میں ۴۳۲۰۸ کروڑ روپے مختص گئے تھے جو گھٹ کر کروڑ روپے ہو گئے۔ درج فہرست قبائل کے لئے ۲۰۱۴ء میں ۲۶۷۱۴ کروڑ کا ۳۰۸۵۱ الاٹمنٹ کیا گیا تھا جو کم ہو کر ۱۹۹۸۰ کروڑ ہو گیا۔ بچوں کی فلاح بہبود کا بجٹ ۱۸۶۹۱ سے گھٹا کر محض ۸۷۵۴ کروڑ روپے کر دیا گیا۔ قومی سماجی امداد، چھوٹی اور متوسط صنعتیں، اقلوتوں کے ملٹی سیکٹورل ڈیولپمنٹ پروگرام، ماحولیات اور جنگلات کا شعبہ اور دیہی سڑک منصوبہ کی مد میں بھی رقم گھٹائی گئی۔ اس کے برعکس حکومت نے صنعتی ٹیکس میں پہلے ہی سال ایک فیصد یعنی تقریباً ۲۰ ہزار کروڑ روپے کی راحت دی اور ہر سال یعنی ۵ سالوں تک جملہ ایک لاکھ کروڑ کی سہولت دینے جا رہی ہے۔ اس لئے

حکومت کا یہ دعویٰ کہ ترقی ہوگی تو اس کا فائدہ سب کو ملے گا باؤلے کا خواب لگتا ہے۔
اس سال کے حتمی اعداد و شمار تو مارچ کے اواخر میں آئیں گے لیکن دسمبر تک یعنی تین چوتھائی سال کا جائزہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ساری وزارتوں میں تقریباً ۷۵ فیصد اخراجات سرف ہوتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۰ شعبوں نے نصف بھی خرچ نہیں کیا اور ۷ نے ۹۰ فیصد سے زیادہ خرچ کرڈالا جبکہ ایک چوتھائی سال باقی تھا۔ تفصیل میں جاکر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ میک انڈیا کے نقطۂ نظر سے تکنیکی صلاحیت میں اضافہ کی خاطر قائم کردہ وزارت نے صرف ۳۳ فیصد خرچ کئے۔ اسمارٹ سٹی بنانے والے شعبے نے صرف ۱۸ فیصد سرف کئے جبکہ اس کے تحت شہروں کی غربت کو دور کرنے کا شعبہ بھی آتا ہے۔ غذائیت کی کمی کے لاکھ شور شرابے کے باوجود غذائی رسد کی وزارت نے صرف ۴۴ فیصد خرچ کئے۔ اقلیتوں کے شعبے کو پہلے رقم کم مختص کی گئی اور اس میں سے بھی ۹ ماہ کے اندر صرف ۳۸ فیصد کا استعمال ہوا۔ بڑی صنعتوں اور دفاعی امور جیسی وزارتوں میں ۷۵ کے بجائے ۲۵ فیصد خرچ ہوا۔
اس کے برعکس کوئلہ، بجلی اور معدنی تیل و گیس کے شعبے نے ۹۰ فیصد سے زیادہ خرچ کردیئے۔ وزارتِ آب رسانی، ہوابازی، پنچایت راج اور خواتین و اطفال

کے فلاح بہبود کے شعبے دتو۱۰۰ سے تجاوز کرکے ۱۳۷ فیصد تک پہنچ چکے تھے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کے ۳ ماہ میں وہ اپنا کام کیسے چلاتے رہے؟ پچھلے سال بجٹ کی ابتداء میں وزیر خزانہ ارون جیٹلی کا طنزیہ فرلہ ''وراثت میں ہمیں جذباتی عذاب اورادا سی ملی ہے'' اب خودان پر صادق آرہا ہے جبکہ مزید ۳ سال باقی ہیں ۔۔برآمدات کی شرح ایک تہائی ہوچکی اور روپیہ دن بدن گرتا جارہا ہے ایسے میں جب یہ لوگ اپنا بوریہ بستر گول کرکے جائیں گے تو قومی معیشت کا کیا حال ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

منموہن سنگھ نے تواپنی مدت کار میں سینسیکس کو ۸ ہزار سے ۲۴ ہزارتک اٹھایا تھااب یہ اسے کہاں تک گرا کر جائیں گے یہ کوئی نہیں جانتا؟

اس موقع پر وزیراعظم کو چاہئے کہ وہ اپنے من کی بات پر خود کان دھریں۔ مثلاً انہوں نے کہا تھا'' امتحان صرف اعداد کا کھیل نہیں ہے بلکہ اسے اعلیٰ مقاصد سے وابستہ کرنا چاہئے''۔ اسی طرح بجٹ بھی اعداد و شمار کی کرشمہ سازی نہیں ہے اسے بھی عوامی فلاح وبہبود سے منسلک کیا جانا چاہےل ۔ وزیراعظم نے نظم و ضبط کی جو تلقین کی ہے اس پر اے بی وی پی والے عملدارآمد کریں تو تعلیم گاہوں میں امن و امان قائم ہوجائیگا۔

وزیراعظم نے طلباء کواچھی طرح سونے کا مشورہ بھی دیا لیکن ساتھ یہ بھی کہا امتحان گاہ میں نہ سوئیں اور کم نمبرآنے پر انہیں موردِ الزام نہ ٹھہرائیں اگر کوئی طالب علم وہاں

موجود ہوتا تو کہتا جناب عالی امتحان گاہ کوئی ایوان پارلیمان تو ہے نہیں جہاں سمرتی ایرانی کی ہنگامہ آرائی کے دوران بھیار بابِ اقتدار گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں۔ وزیرا عظم کا ''اپنے اہداف طے کرکے بغیر کسی دباو کے کھلے ذہن سے اسے حاصل کرتے ہوئے اپنے آپ پر سبقت لے جانے کی کوشش'' کرنے کی نصیحت لفاظی اور نرگسیت کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے اس لئے اسے نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔

اس بار من کی بات میں شریک دیگر شرکاء تو ایسا لگتا تھا کہ وزیر اعظم سے مخاطب تھے مثلاً وشوناتھ آنند کا مشورہ کہ ''اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ بیجا خود اعتمادی یا قنوطیت کا شکار ہونے سے اپنے آپ کو بچاو'' خالص مودی جی کیلئے تھا۔ سی این آر راو کی نصیت بھی خاص طور وزیر اعظم کے لئے تھی جب انہوں نے طلباء سے کہا '' امتحانات ہیجان پیدا کرتے ہیں لیکن پریشان نہ ہوں بلکہ جو کچھ بہتر ہو سکتا ہے کریں۔ ملک میں بہت سارے مواقع اور امکانات ہیں''۔ یعنی کل کو وزارت عظمیٰ کی کرسی چلی بھی جائے تو چائے کی دوکان تو موجود ہی ہے۔ راو نے یہ بھی کہا کہ '' آپ زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو یہ طے کرنے کے بعد اسے چھوڑو نہیں۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں''۔ مودی جی تو پہلے ہی اس مشورے پر عمل کرچکے ہیں لیکن جب ملک کی عوام ان سے نجات حاصل کرنے پر تُل جائیں گے تو راؤ صاحب کی نیک خواہشات کسی کام نہیں آئیں گی۔

اس صورتحال میں تو میں مودی جی کو مراری باپو کی پروچن کا پالن کرنا ہوگا جو من کی بات میں انھوں نے دیا۔ مراری باپو نے اپنے من کی بات ان الفاظ میں بتائی کہ ’’ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر کوئی کامیاب ہو اس لئے ناکامی کے ساتھ جینا سیکھو‘‘۔ مودی جی اگر باپو کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لیں تو وہ آگے چل کر وہ ان کے بہت کام آئیگی لیکن اڈوانی جی کو اس کی اتباع کرنی چاہیے۔

قوم پرستی اور لادینیت کا ٹمٹماتا چراغ

دنیا بھر میں قوم پرستی کا چراغ فرقہ پرستی کے ایندھن سے جلتا ہے۔ جرمنی میں ہٹلر نے قوم پرستی کے شعلوں کو بھڑکانے کیلئے یہودیوں کو نذرآتش کیا اور یہودی فلسطین میں مقامی مسلمانوں کو نشانہ بنا کر اسرائیلی قوم پرستی کو ہوا دے رہے ہیں۔ دورِغلامی میں وطن عزیز کے دانشوروں کو اس کا ادراک ناممکن تھا لیکن آزادی کے ۶۹ سال بعد اب آنچ محسوس ہونے لگی ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت روزنامہ ٹیلی گراف کے منعقدہ اجلاس میں برکھا دت کا معرکتہ الآراء خطاب ہے جو سوشیل میڈیا پر بجا طور پر چھایا ہوا ہے۔ اس معرفت کی بنیادی وجہ جے این یو کے حالیہ واقعات ہیں جس میں بی جے پی یہ بھول گئی کہ دیش بھکتی کی ہولی سامپرداکتا (فرقہ پرستی) کے بغیر نہیں جل سکتی۔ فرض کیجئے کہ کنھیا کمار کے بجائے سیدھے عمر خالد پر ہاتھ ڈالا گیا ہوتا اور اس کے بعد پروفیسر ایس اے آر گیلانی کو گرفتار کیا گیا ہوتا تو کیا قوم کا ضمیر اس طرح بیدار ہوتا؟ اس قدر مضامین لکھے جاتے ؟ اس قدر بحث و مباحثہ ہوتا؟ ناممکن !

آج کل بہت سارے سیکولر دانشور مسلمانوں کو کنھیا کمار سے سبق سیکھنے کا مشوہ دے رہے ہیں حالانکہ اس موقع پر خود انہیں اپنے گریبان میں جھانک

کر دیکھنا چاہئے۔ جب کسی مسلم نوجوان کو کنھیا کی مانند غدارِ وطن قرار دے کر ملک سے بغاوت کے الزام میں گرفتار کرلیا جاتا ہے تو پوری قوم دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک تو وہ مذہبی ہمدردانِ ملت جو دیگر لوگوں کو تعذیب و ابتلاء سے بچانے کی نیت سے فوراً اعلان کر دیتے ہیں کہ دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اسلام کا ایک امن پسند دین ہے اور ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح ایک تو ملزم کو مجرم تسلیم کرلیا جاتا ہے اور ان کی مدد و استعانت کے بجائے اعلانِ برأت کر دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ امت کے اندر اور باہر سیکولر حضرات کا ایک بہت بڑا طبقہ موجود ہے جسے اپنے قلم اور زبان سے اسلام کی مخالفت کا نادر موقع مل جاتا ہے۔ یہ حضرات براہِ راست اسلام کے بجائے ملاوں اور مدرسوں کے خلاف محاذ کھول دیتے ہیں اور ان کی آڑ میں عوام کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی دانستہ یا نادانستہ سعی میں لگ جاتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ان کا اپنے غیر مسلم دوستوں کی نگاہ ہیں مخلص سیکولر ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فی زمانہ یہ مسلم و غیر مسلم سیکولر حضرات عمر خالد تو دور پروفیسر گیلانی تک کو بھلا بیٹھے ہیں ایسے میں کسی عام مسلمان کی کیا بساط؟ اس مایوس کن صورتحال کے باوجود جب فلاحی تنظیموں کی سعی جمیل کے نتیجے میں برسوں بعد یہ بے قصور رہا ہو جاتے ہیں تو اس پر بھی سیکولر حضرات خوش ہونے کے بجائے اسے انتظامیہ کے ثبوت جٹا پانے کی ناکامی قرار دے کر افسوس کا اظہار کرتے ہیں (گویا یہ لوگ تو دراصل مجرم ہی تھے)۔

اس منفی رویہ کے برعکس ساری ہندو قوم اپنے اختلاف بھلا کر کنھیا کمار کے شانہ بشانہ کھڑی ہو گئی ۔ مسلمان بھی کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حمایت میں اتر آئے اور اس کے بعد ہی فسطائی حکومت کو جھکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اگر کنھیا کمار کے معاملے میں بھی سیکولر حضرات کا وہی رویہ ہوتا جو مسلم نوجوانوں کے ساتھ ہوتا ہے تو اسے بھی جیل سے باہر آنے میں کئی سال لگ جاتے۔ عرصۂ دراز کے بعد رہا شدہ کنھیا گمنامی کے تاریک غار میں ڈھکیل دیا جاتا اور وہ اس طرح ہیرو نہیں بن پاتا۔ برکھا دت نے اپنی مذکورہ تقریر میں نیشنلزم کے علاوہ سیکولرزم پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ماضی میں یہ اصطلاح انہیں بہت عزیز تھی لیکن دونوں طرف کی سیاسی جماعتوں نے اس کا اس قدر استحصال کیا کہ اب وہ گالی بن گئی ہے۔ برکھا کے مطابق سیاسی جماعتوں نے سیکولر اور سیوڈو (نقلی) سیکولر کی بحث کرکے ان کو سیکولرزم سے محروم کردیا ہے اور اب وہ سیکولر کے بجائے پلورل (تکثیری) کی اصطلاح کو ترجیح دینے لگی ہیں ۔ سیکولرزم کی اصطلاح میں اگر اس کی گنجائش ہی موجود نہ ہوتی تو سیاسی جماعتیں اس کا استحصال نہیں کرپاتیں ۔

سیکولرزم چونکہ بنیادی طور لامذہبیت کا دوسرا نام ہے اس لئے پہلے تو کانگریس کو یہ صفائی پیش کرنی پڑی کہ ہمارا سیکولرزم کسی مذہب کے خلاف نہیں

ہے بلکہ تمام مذاہب کی پیروی اور تبلیغ کے یکساں مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ دراصل ایک ڈھکوسلہ ہے۔ زندگی کے دیگر شعبہ جات تو درکنار اپنی عائلی زندگی میں بھی جب مسلمان اپنی شریعت پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جس قدر مخالفت ہندو احیاء پرستوں کی جانب سے ہوتی ہے ویسی ہی مخالفت سیکولر حضرات بھی کرتے ہیں۔ ابھی حال میں کیرالہ کے اندر ہائی کورٹ کے جج کمال پاشا نے یہ سوال کیا کہ اگر مسلمان مرد چار بیویاں رکھ سکتا ہے تو عورت چار شوہر کیوں نہیں رکھ سکتی؟ اس سوال کا آسان جواب تو یہ ہے کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا لیکن اس ملک میں ایسے لاکھوں مرد ہیں جن کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کا مذہب انہیں ایک سے زائد شادی کی اجازت بھی نہیں دیتا اس کے باوجود دو بیویوں کے شوہر ہیں مثلاً دھرمیندر جس نے اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں ہیما مالنی سے شادی کرلی۔ اب کیا پاشا صاحب ہیما سے یہ کہنے کی جرأت کرسکیں گے چونکہ ان کے شوہر نے دوسری شادی کرلی اس لئے وہ بھی .... ۔ اگر پاشا صاحب نے ایسی حماقت کی تو اس عمر میں بھی دھرم ان کا خون پی جائیگا اور ہیما مالنی وزیر قانون سے کہہ کر انہیں جج سے پیشکار بنوا دیں گی۔

سیکولرزم کے نشے میں چور یہ حواس باختہ دانشور اسلامی شریعت کے خاتمہ کا مطالبہ تو کرتے ہیں لیکن ہندو کوڈ بل پر انگشت نمائی کی جرأت نہیں کرتے۔

فسطائی جماعتیں مسلم پرسنل لاء کو کانگریس کی جانب سے مسلمانوں کی دلجوئی اور ووٹ بنک کی سیاست قرار دیتی ہیں۔ وہ چار شادیوں اور ۲۵ بچوں کا خوف دلا کر ہندو عوام کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ملک میں پائی جانے والی ساری رواداری کا سرچشمہ سیکولرزم ہی ہے حالانکہ یہ نظریہ تو اپنی جنم بھومی فرانس کے پیروکاروں کو بھی روادار نہیں بنا سکا۔ فرانس کے اندر جہاں برہنگی کی کھلی چھوٹ ہے کسی خاتون کو حجاب پہن کر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ ایسا کرنے کی پاداش میں اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ طالبان کو بچیوں کی تعلیم کا دشمن قرار دیا جاتا ہے حالانکہ وہ تو صرف مخلوط تعلیم کے خلاف ہیں فرانس کے اندر اسکارف پہن کر آنے والی طالبات کو سیکولرزم کی بقاء کی خاطر علم کی دولت سے محروم کردیا جاتا ہے۔ سیکولرزم کے فروغ کی خاطر اسکول کینٹین میں ہفتہ میں کچھ روز صرف خنزیر کا گوشت رکھا جاتا ہے۔ اس کے باعث معصوم مسلم طلباء کو فاقہ کشی پر کسی کو رحم نہیں آتا۔

اس نظریہ نے جب ترکی جیسے مسلم ملک میں قدم جمائے تو وہاں بھی کالج کی طالبات کا اسکارف پہن کر آنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ہندوستان کے قائدین مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلاء ہونے کے باوجود زمینی حقائق سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس ملک میں مسلمان تو کجا ہندووں کے دینی معاملات میں

مداخلت بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اس لئے سیکولرزم کی ایک نئی تعریف ایجاد کر لی گئی اور کہا گیا کہ ہمارا سیکولرزم وہ نہیں ہے جو مغرب کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ نہیں ہے تو سیکولرزم ہی کیوں کر ہے؟ دراصل اس وقت ہمارے رہنماؤں کو متبادل اصطلاح نہیں سوجھی لیکن اب برکھا دت نے پلولرزم (یعنی تکثیریت) کی اصطلاح وضع کرکے مسئلہ حل کردیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ خود اس پر کب تک قائم رہتی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اصطلاحات کے استعمال میں احتیاط ضروری ہے اس لئے کہ ہر اصطلاح اپنے ساتھ ایک خاص نظریہ اور پس منظر لے کر آتی ہے۔

نیشلزم (یعنی قوم پرستی) کی بابت برکھا دت نے کہا کہ سیکولرزم کی طرح اب یہ اصطلاح بھی ہم سے چھینی جارہی ہے۔ ان کے مطابق اب وہ نیشلزم کے بجائے پیٹرائزم (حب الوطنی) کے استعمال کو ترجیح دیں گی۔ برکھا دت نے کہا کہ یہ اصطلاح انہوں نے جے این یو کی تحریک سے مستعار لی ہے۔ کنھیا کمار کے بقول قوم پرستی ایک مغربی نظریہ ہے اور ان ممالک میں پروان چڑھا ہے جہاں ایک قوم بستی تھی۔ ہمارا دستور یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ ملک کئی قوموں کی آماجگاہ ہے۔ اس لئے یہاں نیشلزم کے معنی کسی ایک قوم کی زبردستی اور دوسری اقوام کی زیردستی کے ہوں گے۔ لیکن اگر قوم پرستی کے بجائے حب الوطنی کو بنیاد بنایا جائے تو مختلف قومیں اپنی تمام تر انفرادیت اور باہم اختلاف کے

باوجود وطن سے محبت کر سکتی ہیں۔ ایسے میں قوم پرستی یا دیش بھکتی کا جو پہلو اسلام کے عقیدۂ توحید سے براہِ راست ٹکراتا ہے وہ بھی نمٹ جاتا ہے اس لئے کہ اسلام بھی وطن سے محبت کے فطری جذبہ کو تسلیم کرتا ہے۔

عصر حاضر میں سیکولرزم اور نیشنلزم کے علاوہ آزادی پر بہت زور دیا گیا ہے۔۔برکھادت نے کہا کہ دستور پر چلنے کی آزادی کا تحفظ صحیح معنیٰ میں حب الوطنی ہے۔ آزادی ایک تو دستور کے اوراق میں ہے اور دوسرے عمل کی دنیا میں ہے۔ اس فرق کو اگر کوئی مسلمان بتانے کی کوشش کرے تو اسے پاکستان نواز قرار دے کر سرحد پار جانے کا مشورہ دے دیا جائے گا لیکن اس موضوع پر مشہور صحافی نکھل واگلے کی لب کشائی بھی آج کل سوشیل میڈیا میں گونج رہی ہے۔ یہ حضرت بھی برکھادت کی مانند اچھے خاصے سیکولر ہیں اور سوشلزم کی جانب جھکاو رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں شیوسینا اور بی جے پی پر ان کی تنقید کے سبب ان کا اخبار مہانگر بہت مقبول تھا۔ آگے چل کر نکھل واگلے نے آئی بی این کے مراٹھی چینل کی کمان سنبھال لی اور قومی سطح پر جگمگانے لگے۔

نکھل واگلے نے اپنی حالیہ تقریر میں کہا کہ جے این یو میں جو کچھ ابھی ہو رہا ہے اس کی ابتداء ۲۰۱۱ء میں ہوئی جب نریندر مودی کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ ملک کے سرمایہ داروں نے کیا۔ جن لوگوں کو عوام کی رائے تبدیل کرنی ہوتی ہے

ٹی وی چینلس کے مالکان کو خرید لیتے ہیں اور اپنے پسندیدہ امیدوار کے حق میں رائے عامہ ہموار کراتے ہیں۔ انہوں نے خود اپنی مثال دیتے ہوئے کہا جب تمام ٹی وی چینلس یو پی اے کی حکومت کی بدعنوانیوں کا پے درپے پردہ فاش کر رہے تھے تو ہمیں سچا اور پکا دیش بھکت کہا جاتا تھا۔ اس وقت ہم پر مالکان کے ذریعہ دباو ڈالا جاتا تھا کہ ہم کانگریس کے خلاف تو خبریں نشر کریں لیکن مودی یا بی جے پی کی مخالفت نہ کریں۔ نکھل کے مطابق ان کے پاس اس کے شاہد ای میل موجود ہیں۔ یہ سلسلہ رائے دہندگی تک جاری رہا اور جب کام نکل گیا تو جون ۲۰۱۴ء میں ان چینلس سے جنہیں خود انہوں نے اور سردیسائی نے شروع کیا تھا استعفیٰ دے کر نکل جانے پر مجبور کیا گیا۔ اس لئے نکھل کہتے ہیں حقیقی آزادی دراصل موجود ہی نہیں ہے۔ جے این یو کے سانحہ نے تو بس پوری قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے اور اصل جدوجہد اس آزادی کی بحالی ہے۔

برکھا دت اور نکھل واگلے جیسے لوگوں کے خیالات ہمیں نہ صرف حقیقت حال سے واقف کراتے ہیں بلکہ آزادی، سیکولرزم اور نیشلزم جیسی کھوکھلی اصطلاحات کی قلعی کھولتے ہیں۔ جے این یو معاملہ پہلے کیمپس کے چوراہے سے نکل کر سوشیل میڈیا میں آیا۔ پھر الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ گھر گھر پہنچا۔ اس کے بعد انتظامیہ کی مدد سے حکومت اس کو عدالت میں لے آئی جہاں زعفرانی وکیلوں نے اپنی غنڈہ گردی سے اس کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ عالمی سطح سے

لے کر ایوان پارلیمان تک میں اپنی جگ ہنسائی کروا لینے کے بعد حکومت نے بالآخر کنھیا کو تو رہا کر دیا لیکن اب گفتگو نعروں اور احتجاج کی حدود سے نکل نظریاتی سطح پر پہنچ گئی ہے۔ فسطائی قوتیں اس محاذ پر ہمیشہ منہ کی کھاتی ہیں اور دلائل کے بجائے گالی گلوچ پر اتر آتی ہیں جس کے نمونے آئے دن ٹی وی چینل کے مباحث میں دیکھے جا سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ وزیر خزانہ اس غل غپاڑے کو حکومت کی فتح قرار دیتے ہیں۔ بحث و گفتگو کا رخ اب افراد واقدام کے بجائے ان نظریات و اصطلاحات کی جانب از خود مڑ گیا جس کی بنیاد پر یہ ہوائی محل تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ صورتحال ان اسلامی دانشوروں کو ٹھہر کر سوچنے کی دعوت دیتی ہے کہ جو اس مکڑ جال کے فریب میں گرفتار ہو چکے ہیں اور اسے بچانے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگانے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہیں غور کرنا چاہئے کہ جو شاخ نازک خود اپنے بوجھ سے ٹوٹنے لگی ہے۔ جس کے معتقدین کا ایمان اس پر سے متزلزل ہو رہا ہے وہ بھلا ہمارے کس کام آسکے گی ؟

یہ حسن اتفاق ہے کہ ایک مختلف انداز میں سیکولرزم کی بحث ملک کی سرحد سے نکل کر بنگلہ دیش پہنچ چکی ہے۔ ۴۵ سال قبل ۱۹۷۱ء جب بنگلادیش بنا تو اس کے دستور نے ریاست کی نظر میں سارے مذاہب کو یکساں بتایا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں فوجی آمر جنرل ارشاد نے دستوری ترمیم کرکے اسلام کو ریاستی دین قرار دے دیا۔ اس وقت ۱۲ شہریوں نے اس ترمیم کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا تھا

جسے آگے چل کر موقوف کردیا۔ اس گروہ کے رہنما شہریار کبیر کے مطابق جب انہیں اندازہ ہوا کہ یہ بنچ ہمارے حق میں فیصلہ نہیں سنائے گی تو وہ آگے نہیں بڑھے۔ اب جب یہ قضیہ دوبارہ زندہ ہوا ہے تو بنگلا دیش کے اندر وقوع پذیر ہونے والے حالیہ تشدد کے واقعات کی وجوہات بھی ظاہر ہو گئی ہیں۔ حکومت کے مطابق بنگلا دیش کے اندر داعش کا کوئی وجود نہیں ہے اس کے باوجود متعدد بم دھماکوں کی ذمہ داری داعش نے قبول کی ہے۔ یہ دھماکے نہ صرف مندروں بلکہ مسجدوں پر بھی ہوئے۔ اس میں ہندو اور مسلمانوں عوام کے علاوہ فلاحی اداروں میں کام کرنے والے کارکن اور پولس اہلکار بھی ہلاک ہوئے۔ ان حملوں کا شکار ہونے والوں میں جاپانی اور اطالوی سیاح بھی شامل تھے ۔ عدالت میں اب اس تشدد کیلئے ملک کے دستور کا اسلامی ہونا قرار دیا جائیگا حالانکہ داعش جس ملک کے اندر بنی اور پروان چڑھی وہ ملکِ شام نصف صدی سے پکا سیکولر ملک ہے۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا کہ اگر ان دھماکوں کے پس پشت داعش نہیں ہے تو کون ہے؟ کہیں وہ لوگ تو نہیں جو اس مقدمہ کیلئے ماحول سازی کرتے رہے ہیں ؟ یہ سوال سیکولرزم اور نیشلزم کے حامیوں کی اپنے مقاصد کی خاطر اختیار کی جانے والی سفاکی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

حسینہ واجد کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اسلام کی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے سیکولرزم کو دستور میں شامل کرلیا گیا۔ شہریار کبیر کے خیال میں یہ

تضاد ہے اور اسے دور کرنے کیلئے انہوں نے ۲۸ سال بعد پھر عدالت سے رجوع کیا ہے۔ ۲۷ مارچ کو اس مقدمہ کی سماعت ہونی ہے۔ شہریار کبیر سے لاکھ اختلاف کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تضاد تو ہے اور اصلاح کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ سیکولر کے دم چھلے کو دستور سے خارج کرکے اسے خالص اسلامی بنا دیا جائے۔ سرکاری وکیل رانا داس گپتا کے مطابق عدالت دونوں فریقین کے دلائل سن کر فیصلہ کرے گی لیکن اس طرح کے مقدمات میں وقت لگتا ہے۔ یہ دلچسپ صورتحال ہے جس میں کبیر جیسے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور موجودہ بنچ ان کے حق میں فیصلہ کردے گی جبکہ وہ ظالم حکومت جو اپنے سیاسی مفاد کی خاطر قوم پرستی کی بنیاد پر بے قصور اسلام پسندوں کو شہید کررہی ہے دستور کے اندر اسلام کا دفاع کرے گی۔ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے لیکن اگر حسینہ نے اسلام کو دستور سے بھی نکال دیا تو یہ ان کے سیاسی تابوت کی آخری کیل ثابت ہوگا۔

اصطلاحات کو جب تقدس حاصل ہوجاتا ہے تو لوگ اس پر کچھ کہنا تو کجا سوچنا بھی بند کردیتے ہیں لیکن آج کل یہ چیزیں ازخود زیر بحث آنے لگی ہیں ۔ گزشتہ سرمائی سیشن میں راجناتھ سنگھ نے سیکولرزم کو سب سے زیادہ استحصال شدہ لفظ قرار دیا تو اس پر بڑا ہنگامہ ہوگیا اور اسے بجا طور پر سنگھ پریوار کے خفیہ ایجنڈے کی جانب پیش رفت قرار دیا گیا لیکن برکھا دت اور

نکھل واگلے جیسے لوگوں کے بارے میں تو یہ بات نہیں کہی جاسکتی اس لئے مسلم دانشوروں کو کھلے ذہن کے ساتھ اس پر غوروخوض کرکے اپنے موقف کا جرأتمندانہ اظہار کرنا چاہئے۔ یہ حقیقت ہے کہ بنگلادیش ہی کی طرح ابتداء میں ہندوستان کے دستور کے اندر بھی ڈاکٹر امبیڈکر نے سیکولرزم کو شامل نہیں کیا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں اندرا گاندھی نے ۴۲ویں ترمیم کے ذریعہ سیکولرزم اور سوشلزم کا اضافہ کیا۔ اندرا جی جنرل ارشاد کی مانند فوجی آمر تو نہیں تھیں مگر ایمرجنسی انہوں نے بھی نافذ کی تھی اور انتخاب میں کامیابی ارشاد کی جاتیہ پارٹی کو بھی ملی تھی۔ ایمرجنسی لگانا ہندوستانیوں کو ناگوار تو گذرا تھا مگر بہت جلد قوم نے اندرا جی کو معاف کرکے انہیں دوبارہ زمام اقتدار سونپ دی۔ اس سے عوام کی نظر میں جمہوریت اور آمریت کی اہمیت کا فرق بھی واضح ہوجاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عوام نظریات کے گورکھ دھندے میں کم ہی پڑتے ہیں لیکن علماء اور دانشور اپنے مرتبہ اور مقام نیز فرضِ منصبی کے سبب ان سے صرف نظر نہیں کرسکتے۔

سیاست میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

انگریزی زبان میں لونگ کے معنی جینے اور لیونگ کا مطلب جانے کے ہوتے ہیں ۔ سری سری روی شنکر جینے کا فن سکھاتے ہیں اور وجئے ملیا جانے کی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ ان دونوں کا مسکن بنگلورو میں ہے نیز ان کے درمیان قدرِ مشترک بی جے پی ہے۔ وجئے ملیا نے ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے راجیہ سبھا کی رکنیت اختیار کی تو انہیں جنتا دل (ایس) نے ۲۳ ووٹ اور بی جے پی نے ۳۰ ووٹ عنایت کئے تھے اس طرح ۵۳ ووٹ لے کر وہ ایون بالا کے رکن بنے اور ان کے فرار میں ارکان پارلیمان کو حاصل سفارتی پاسپورٹ ہی کام آیا اور اس طرح مختلف بنکوں کا ۹۰۰ کروڑ قرض چرا کر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ملیا کی طرح روی شنکر بھی وزیراعظم کے بہت بڑے مداح ہیں اور انہیں برسوں سے یوگا سکھانے کی کوشش کررہے ہیں یہ اور بات ہے کہ مودی جی کی اکڑ اور توند ان کی راہوں میں حائل ہے ۔

مودی جی کو چاہئے کہ وہ آر ایس ایس کی شاکھاوں میں لاٹھ بازی کے بجائے یوگا کی ورزش کا اہتمام کروائیں تاکہ کم از کم سنگھ پریوار کی آئندہ نسل اس قدر لچکدار ہو جائے کہ یوگا کرسکے۔ ویسے مودی جی کی فیشن پرستی کا آرایس ایس پر یہ اثر ضرور ہوا کہ اس نے خاکی نیکر کے بجائے پتلون پہننے کا فیصلہ

کرلیا۔ ویسے کچھ لوگوں کا خیال ہے اس تبدیلی میں سب سے اہم کردار راتڑی دیوی نے اداکاش ہے۔ انھوں نے کہا تھا یہ لوگ نیکر پہن کر عوامی مقامات پر آجاتے ہیں انہیں شرم نہیں آتی ؟ ہمیں شرم آتی ہے۔ راتڑی دیوی کے اس فقرے میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ اچانک نیکر کی لمبائی میں اضافہ ہوگیا اور وہ اچانک پتلون بن گئی۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ سنگھ پریوار کی چڈی ڈھیلی کرنے میں نتیش سے لے کر کنھیا تک بہاریوں نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔

سنگھ پریوار کی ٹوپی اچھالنے کا کام دہلی میں اروند کیجریوال نے کیا تھا اور ایسی پٹخنی دی کہ ہندوتوا والے راجدھانی میں جلسہ کرنا بھول گئے۔ اسی لئے سری روی شنکر کی شکر میں لپٹی ہوئی زہر کی پڑیا لے کر مودی جی کو آنا پڑا لیکن شومئی قسمت سے شکر کی پرت دیکھتے دیکھتے بارش میں بھیگ جمنا میں بہہ گئی۔ پروگرام کے دو ہفتہ قبل اجتماع گاہ کی تیاری کے سبب ہونے والے ماحولیات کے نقصان کو لے کر کچھ لوگوں نے قومی سبز عدالت کے دروازے پر دستک دی۔ عدالت نے اپنے ماہرین کی ایک ٹیم کو نقصان کا اندازہ لگانے کی ذمہ داری سونپی تو ۱۲۰ کروڑ کا تخمینہ لگایا گیا۔ سری سری روی شنکر کو جینے کا فن سکھانے کیلئے ان پر کم از کم ۲۵۰ کروڑ کا جرمانہ لگایا جانا چاہئے تھا لیکن گوں ناگوں وجوہات کی بناء پر عدالت نے ۱۰۰ کروڑ پر اکتفاء کیا۔

روی شنکر جی چونکہ جینے کا فن سیکھ چکے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے اس جرمانے کو گھٹا کر ۵ کروڑ کروادیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب باقی کے ۱۱۵ کروڑ کون خرچ کرے گا؟ اگر حکومت کرے گی تو کیوں؟ یا پھر اس نقصان کی بھرپائی ہی نہیں ہوگی؟ اگر نہیں تو لعنت ہو زندگی گذارنے کے اس فن پر جس نے نہ صرف مقامی لوگوں کا بلکہ وہاں رہنے بسنے والے چرند پرند کا بھی جینا اجیرن کردیا ہے۔

اگرایک عام ہندوستانی سے یہ سوال کیا جائے کہ زندگی گذارنے کا فن کیا ہے تو وہ برجستہ کہے گا ’’جیو اور جینے دو‘‘ لیکن سری سری روی شنکر اس حقیقت سے ناواقف ہیں ۔ ایک زمانے تک وہ صبر و ضبط کے ماہر سمجھے جاتے تھے حالانکہ وہ تو ایک مکھوٹا تھا جسے چڑھا کر وہ عوام میں آتے تھے۔ اپنے بھکتوں کے درمیان وہ اسی رعونت اور غم وغصہ کا مظاہرہ کرتے تھے جو سنگھ پریوار کا خاصہ ہے۔ یوٹیوب پر ڈاکٹر ذاکر نائک کو لعن طعن کرنے والا ویڈیوز اس کا شاہد ہے۔

تہمتِ چند اپنے ذمےّ دھر چلے
کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

مودی جی نے سوچا ہوگا کہ لوگوں کو مارنے کا گُر تو آر ایس ایس سے سیکھ لیا اب کیوں نہ سری سری روی شنکر سے جینے کا فن سیکھا جائے؟ لیکن ایسا لگتا ہے مودی جی کے بجائے خود سوامی جی ان کے بھکت بن گئے ہیں ورنہ یہ اعلان

نہیں کرتے کہ میں ۵ کروڑ جرمانہ ادا کرنے کے بجائے جیل جانا پسند کروں گا۔ سوامی جی کو یہ غلط فہمی تھی کہ حکومت سے ان کی قربت کے سبب عدالت ان کی گیدڑ بھپکی میں آجائیگی لیکن جب ایوان میں اس پر ہنگامہ ہوگیا توانہیں اندیشہ ہوا کہ مبادہ اس سخت گیر موقف کے سبب پابندی نہ لگ جائے ؟ بعد از خرابیٔ بسیار سوامی جی نے جرمانہ یکمشت ادا کرنے کے بجائے چار ہفتوں کا وقت مانگا۔ عدالت نے فوراً ۲۵ لاکھ جمع کرنے کی شرط پر ۳ ہفتوں کی مہلت دے دی ۔ یہ اسی طرح کا گھوم جاو تھا جیسے تحویل اراضی کے بل پر مودی سرکار کا پہلے اڑنا اور پھر جھک جانا یا ای پی ایف پر ٹیکس کو لے کر مختلف حیلوں بہانوں کے بعد بالآخر جیٹلی جی کا گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جانا۔

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

ویسے بات بنانےکے فن میں جیٹلی جی وزیر اعظم سے آگے نکل چکے ہیں ۔ وجئے ملیاکے نکل بھاگنے پر جب ایوان پارلیمان میں ہنگامہ ہوا تو جیٹلی کو قطروچی یاد آگئے ۔ انہوں نے کہاکانگریس بھی قطروچی کو روکنے میں ناکام رہی تھی۔ یہ منطق کئی دلچسپ سوالوں کو جنم دیتی ہے۔ اول تو کیا جیٹلی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بدعنوانی کے معاملے میں کانگریس اور بی جے پی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے؟ دوسرے کیا اب بی جے پی کی نظر ہیں کانگریس کا اب قطروچی کے فرار

میں مدد کرنا جائز ہوگیا ہے؟ تیسرے کیا بی جے پی نے کانگریس کی مجبوری کا خیال کرتے ہوئے ہنگامہ نہیں کیا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ کانگریس نے قطروچی اور بوفورس کے معاملے کی جو قیمت چکائی تھی بی جے پی کو بھی اب اس کیلئے تیار ہو جانا چاہئے؟ یاد رہے راجیو گاندھی کے ساتھ لوک سبھا میں ۴۰۰ سے زیادہ ارکان تھے اور بوفورس کی بدعنوانی نے انہیں اقتدار سے محروم کردیا تھااس لئے بی جے پی ۲۷۵ کی کیا بساط ہے؟

قطروچی اور وجئے ملیا میں کا معاملہ خاصہ مختلف ہے۔ بوفورس کی دلالی کل ۶۴ کروڈ تھی جس میں افراط زر کا تناسب بھی جوڑیں تب بھی ۹۰۰ کروڈ نہیں بنتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ ساری رقم قطروچی کی جیب میں چلی گئی تھی تو راجیوگاندھی کے خلاف چلائی جانے والی ساری مہم تہمت بازی میں بدل جاتی ہے۔ قطروچی یقیناً اس رشوت کا ایک حصہ دار تھااور وہ رشوت بھی ناجائز تھی لیکن ایک غیر ملکی کمپنی کی جیب سے نکل کرآئی تھی ۔ وجئے ملیا نے تو ہمارے اپنے بنکوں کو لوٹا ہے۔ وجئے ملیا کی طرح قطروچی رکن پارلیمان نہیں بلکہ ایک غیر ملکی باشندہ تھا۔ اس پر اگر مقدمہ قائم بھی ہوتا تو اطالوی سرکار کا دباو اسے چھڑا سکتا تھا جیسا کہ کیرالا میں اطالوی جہاز رانوں کو اپنے ماہی گیروں کے قتل کی سزادلانے میں مودی سرکار ناکام رہی ۔

وجئے ملیا کے معاملے میں کوئی غیر ملکی دباو نہیں بلکہ خود اپنی حکومت کا دباو کام کر رہا تھا ۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۵ کو سی بی آئی کی جانب سے جو سرکولر جاری ہوا اس میں ہدایت کی گئی تھی کہ وجئے ملیا کو ہوائی اڈے پر دیکھتے ہی گرفتار کرلیا جائے۔ ملیا صاحب اس وقت برطانیہ میں عیش کررہے تھے ۔ واپس آنے سے قبل انہوں نے اس سرکولر کو تبدیل کروادیا اوراب انہیں گرفتار کرنے کے بجائے نظر رکھنے کی تاکید کی گئی ۔ سی بی آئی کے مطابقگرفتاری کا اندراج ایک جونیر افسر کی غلطی تھی حالانکہ وہ فیصلہ درست تھا۔ اگر اسی وقت ملیا کو گرفتار کرلیا جاتا تو آج جیٹلی جی کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ بنک نے عدالت سے رجوع کرنے میں تاخیر کی۔ جیٹلی جی یہ نہ بتائیں کہ بنک والوں نے کیا نہیں کیا بلکہ یہ وضاحت فرمائیں کہ ان کی حکومت نے کیا کیا؟ اور اگر کچھ نہیں کیا تو اس ۹۰۰ کروڑ میں کتنا حصہ اس کی اپنی تجوری میں جمع ہوگیا۔ وجئے ملیا نے اکتوبر کے بعد ۳ مرتبہ غیر ملکی سفر کیا اور چوتھی بار للت مودی کی مانند ہمیشہ کیلئے فرار ہوگیا۔

وجئے ملیا ہی کی طرح بی جے پی نے للت مودی کے ساتھ بھی کمال شفقت کا مظاہرہ کیا۔ راجستھان کی وزیراعلیٰ وجئے راجے سندھیا نے للت مودی کے فرار میں سہولت فراہم کرنے کیلئے حلف نامہ دیا۔ وزیرخارجہ سشما سواراج نے انسانی بنیادوں پر للت مودی کے فرار کا جواز فراہم کیا۔ ایوانِ پارلیمان میں اس

مسئلہ پر ہنگامے کے بعد حکومت نے بڑے طمطراق سے گرفتار کرنے کا عزم دوہرایا لیکن جو مودی سرکار گزشتہ ۶ ماہ سے للت مودی کے خلاف ریڈ کارنر نوٹس جاری کروانے میں ناکام رہی ہے وہ بھلا وجئے ملیا کو کیا واپس لائے گی ؟ ویسے اگر حکومت وجئے ملیا کو واپس لانے میں کامیاب بھی ہوجائے تو اس کا کیا بگاڑ لے گی؟ ایک عرصے سے چھوٹا راجن حکومت کی تحویل میں عیش کررہا ہے۔ اس کا بال بیکا نہیں ہوا یہی کچھ وجئے ملیا کے ساتھ بھی ہوگا۔

سری سری روی شنکر کو جینے کا فن سکھانے کیلئے تین فٹبال گراونڈ کے برابر کا اسٹیج بنانا پڑا اور اس پر ۳۵ ہزار سازندوں کو بٹھانا پڑا اس کے باوجود ان کے اس تماشے میں شریک ہونے کیلئے دنیا بھر سے کوئی قابلِ ذکر ہستی آنے کیلئے تیار نہیں ہوئی۔ مجبوراً دنیا کے سب سے بدعنوان آمر صدر موگابے کو مہمانِ اعزازی بنانا پڑا لیکن جب مودی جی کے صلاح کاروں نے اسٹیج کو غیر محفوظ قرار دیا تو" موگامبو ڈر گیا" اور شرکت سے انکار کردیا۔ صدر جمہوریہ دیکھا کہ اس پروگرام کے منتظمین نے اکثر و بیشتر محکموں سے اجازت حاصل نہیں کی ہے اور ماحولیات کو بری طرح تباہ و برباد کررہے ہیں تو وہ بھی کنیّ کاٹ گئے ۔وزیراعظم نریندر مودی اپنے آپ کو نہیں روک سکے اور انہوں نے اپنے لئے علٰحیدہ اسٹیج بنوا کر شرکت کی۔ مودی جی نے اس کو فن و ثقافت کا کمبھ میلہ قرار دے دیا۔ ہندو ہردیہ سمراٹ کے علاوہ اگر کوئی اور یہ حرکت

کرتا تو سنگھ پریوار اس بیان کو لے کر آسمان سر پر اٹھالیتا۔ ہندو دھرم کی توہین کا بہانہ بنا کر ملک بھر میں ہنگامہ کھڑا کردیتا۔

مودی جی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اگر ہم ہر شے کو تنقید کا نشانہ بنائیں گے تو دنیا ہمارا احترام کیسے کرے گی؟ اس بیان میں ایک طرف تو یہ اعتراف ہے کہ وزیراعظم ماحولیات کی تباہی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ۔ ان کے نزدیک ملکی قوانین کو پامال کرنا معمولی بات ہے۔ وزیراعظم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ساری دنیا کے اندر ملک کی عزت و توقیر تو درکنار دن بہ دن بدنامی ہورہی ہے ۔ اس رسوائی کیلئے کوئی اور نہیں بلکہ ان کا اپنا سنگھ پریوار ذمہ دار ہے اگر وہ سلسلہ بند ہوجائے تو بغیر کسی تماشے کے قوم کا نام روشن ہوجائیگا۔ وزیراعظم نے اپنی تقریر میں ہندوستانی ثقافت پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ سری سری روی شنکر کے شکرگذار ہیں کہ انہوں نے اسے ساری دنیا میں پھیلا دیا ہے۔ مودی جی نے پچھلے دنوں اس قدر غیر ملکی دورے کئے کہ جمنا کے کنارے بھی انہیں احساس نہیں ہوا کہ وہ بیرونِ ملک نہیں بلکہ خود اپنے ملک میں بھاشن دے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ سوامی جی نے اپنی ثقافت کو برآمد کرنے کے بجائے دنیا بھر کے فنکاروں کو یہاں جمع کرلیا ہے جو ان کی تہذیب سے ہندوستانیوں کو مرعوب کررہے ہیں۔ شرکاء کا یہ حال ہے کہ وہ بھنگڑہ کے بجائے افریقی ناچ کی دھنوں پر تھرک رہے ہیں ۔ مودی جی جب امریکہ گئے تھے تو انہوں نے لوگوں کو جمع کرنے کیلئے کسی کتھک رقاصہ کے بجائے کے راک ڈانسر کو بلایا

اس کے باوجود کوئی انگہ۔ٹر ان کے قریب نہیں پھٹکا اب چونکہ ہندوستان میں بھی عوام نے مودی جی کے جلسوں میں آنا ترک کردیا ہے اس لئے دنیا بھر کے ناچنے گانے والوں کو جمع کرکے مجمع لگایا گیا لیکن برا ہو بادو باراں کا کہ اس نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ شاید آج کل عدالت تو کجا قدرت بھی سرکار سے نالاں ہے۔ آج کل ان لوگوں کی حالتِ زار پر خواجہ میر درد کا یہ شعر صادق آتا ہے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

سری سری ہری کے مطابق اس نوٹنکی میں شریک ہونے کیلئے کل ۳۶ ہزار فنکاروں کو اندرون وبیرونِ ملک سے بلایا گیا۔ ان قسمت کے ماروں کو آندھی آئے یا طوفان پنڈال کے اندر تو آنا ہی تھا۔ اخباروں کے مطابق پہلے دن جب وزیراعظم نے تقریر کی تو صرف ۴۰ سے ۵۰ ہزار کے درمیان لوگ موجود تھے۔ مطلب پروگرام کے شرکاء کی تعداد پیسے دے کر بلائے جانے والے فنکاروں کی بہ نسبت ایک چوتھائی بھی نہیں تھی ۔ دوسرے دن صبح لیڈر شپ کیمپ پروگرام سری سری روی شنکر نے یہ کہہ کر ملتوی کردیا کہ جب لوگ ہی نہیں ہیں تو کیا فائدہ۔ بعد میں قریب کے ایک ہال میں ۳۰۰ لوگوں کو جمع کرکے معیشت پر گفتگو شروع ہوئی تو حکومت کے خلاف شکایت کا دفتر کھل گیا۔ایک اور پروگرام ییں سارے غیر ملکی

سیاستداں اقتدار سے بے دخل ہو جانے والے تھے۔ ان میں سے ایک فرانس کے سابق صدر ویلپین نے کہا کہ افغانستان ، عراق اور لیبیا پر فوج کشی ایک حماقت تھی بلکہ دہشت گردی کے خلاف چھیڑی جانے والی یہ جنگ بجائے خود ایک بہت بڑی حماقت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مودی جی اٹھتے بیٹھتے دہشت گردی کے خلاف جس عالمی جنگ میں شریک ہونے کا نعرہ بلند کرتے ہیں وہ کیا ہے؟

اس عالمی ثقافتی میلے کا نقطۂ عروج اس وقت آیا جب پاکستان سے آنے والے مفتی سعید احمد خاں کی تقریر کے بعد جوش میں آکر سوامی جی نے وزیر داخلہ کی موجودگی میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کردیا۔ جواہر لال یونیورسٹی کے اندر پاکستان زندہ باد کے نعرے کی افواہ پھیلا کر ہونڈر مچانے والے سارے بھکت سوامی جی کے نعرے پر تالیاں پیٹتے رہے حالانکہ یہ تو ان کیلئے سر پیٹ لینے کا مقام تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کو اب جینے کا فن سیکھنے کے بجائے آرٹ آف رننگ یعنی بھاگنے کا فن سیکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ وزیراعظم نے خود تسلیم کرلیا ہے کہ جب اقتدار اور حکومت ناکام ہوجاتی ہے تو اس طرح کے میلوں ٹھیلوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس اعتراف کے بعد ان لوگوں کو اب اپنے جانے کی تیاری شروع کردینی چاہئے۔ آرٹ آف رننگ کیلئے ویسے بی جے پی خود کفیل ہے ۔ اس کو کسی سوامی جی کے بجائے شریمتی ہیمالنی اور سوبھاگیہ وتی سمرتی ایرانی سے استفادہ کافی و شافی ہے۔ چند ماہ قبل راجستھان میں ہیمامالنی کی

گاڑی نے ایک اور گاڑی کو ٹکر مار کر اس ایک بچے کو ہلاک اور باپ کو زخمی کر دیا۔ ہیما مالنی کیلئے خصوصی سواری کا اہتمام کیا گیا اور انہیں نجی اسپتال میں پہنچا دیا گیا تاکہ فوراً پلاسٹک سرجری ہوسکے نیز مرنے والے بچے اور اس کے زخمی باپ کو سرکاری دواخانے میں لے جا کر ڈال دیا گیا جہاں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ موجودہ سیاست کا شعار یہی ہے بقول غالب (ترمیم کے ساتھ)۔

سیاست میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس جابر پہ دم نکلے

ہیما مالنی کی جب طبیعت سنبھلی تو انھوں نے ٹویٹ کرکے بچے کی موت پر اظہار افسوس کیا مگر اس کیلئے اس کے باپ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہہ دیا کہ اگر وہ ٹرافک کے قوانین کی پاسداری کرتا تو اپنے بچے کو نہ گنواتا۔ اس طرح ہیماجی نے یہ ثابت کر دیا کہ ٹرافک کے قوانین کی بابت وہ پولس سے زیادہ ماہر ہیں۔ پولس نے ہیما کے ڈرائیور کو حراست میں لے رکھا تھا اور یہ بات طے ہے کہ انتظامیہ کسی وی آئی پی کے چپراسی پر بھی خوب سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالتا ہے۔ ہیما مالنی تو خیر اب ساس کا کردار نبھانے لائق ہو گئی ہیں لیکن بی جے پی کی تیز طرار بہو ان سے دو قدم آگے نکل گئیں۔ آگرہ شاہراہ پر جب ان کے قافلے کی ایک گاڑی نے موٹر سائیکل پر سوار ایک ڈاکٹر کو ٹکر ماری تو اس کے

بچے بلک بلک کر روتے رہے لیکن سنگدل سمرتی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔زخمیوں کی مدد کرنے کے بجائے انہوں نے یہ ماننے سے انکار کردیا کہ ٹکر مارنے والی گاڑی ان کے قافلہ میں شامل تھی نیز مرحوم ڈاکٹر کی بیٹی سے ایف آئی آر میں ایک فرضی گاڑی کا نمبر اندراج کروادیا۔ان لوگوں کیحرکات تو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ بہت جلد بی جے پی کے معنی ''بھاگو جنتا پیٹے گی'' ہو جائیں گے اور اس وقت اس پارٹی کے رہنما للت مودی اور وجے مالیا کے نقش قدم پر کروڑوں کے گھپلے کرکے ملک بدر ہو جائیں گے۔لوگ تو کہیں گے خس کم جہاں پاک لیکن ان کی زبان پر یہ شعر ہوگا ؎

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

گئو ماتا کے رکشک یا بھارت ماتا کے بھکشک

کیا یہ محض اتفاق ہے کہ بہار انتخابات سے ۱۴ روز قبل پڑوسی ریاست اترپردیش میں دادری کے مقام پر گائے کے نام محمد اخلاق کو قتل کردیا گیا اور مغربی بنگال میں انتخابات سے ۱۶ دن پہلے لاتیہار میں گئو رکشا کمیٹی کے لوگوں نے محمد مظلوم اور عنایت اللہ کو قتل کرکے پیڑ سے لٹکا دیا گیا۔ دونوں سانحات کے بعد کئی دنوں تک مرکزی بی جے پی حکومت کی زبان پر قفل پڑا رہا۔ جھارکھنڈ کے معاملے میں تو پہلے دو دنوں تک کسی سیاسی جماعت کے رہنما کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ پسماندگان کو پرسہ دے۔ راہل جی دو مرتبہ حیدرآباد تو ہوآئے مگر لاتیہار نہ جاسکے۔ غلام نبی آزاد نے ایک خط لکھ کر خاموشی اختیار کرلی۔ مسلمانوں کے مسیحا سمجھے جانے والے لالو اور نتیش تو کجا ممتا بنرجی اوریچوری تک نے کمال بے حسی کا مظاہرہ کرتے رہے اور بھارت ماتا کی جئے کے خلاف گردن کٹانے والوں کا بھی کوئی بیان منظر عام پر نہیں آیا۔ جے این یو کے معاملے گلا پھاڑ پھاڑ کر بولنے والوں کو آخر کیوں سانپ سونگھ گیا جبکہ اس بار تو معاملہ گائے کے ذبیحہ کا بھی نہیں بلکہ بیلوں کے خرید وفرخت کا تھا۔

ہمارے ملک میں سارا شوروغل سیاسی مفاد کے پیش نظر ہوتا ہے اور خاموشی بھی

اسی مقصد سے اختیار کی جاتی ہے۔ غیر بی جے پی جماعتیں کا گلا غالباً اس خوف نے گھونٹ دیا کہ اس سانحہ کا فائدہ اٹھا کر بی جے پی مغربی بنگال میں میدان نہ مارلے۔ دو دنوں تک ذرائع ابلاغ میں گونجنے کے بعد یہ سیاستدانوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوااور مجبوراً ایک ایک کرکے لوگوں نے بولنا شروع کیا۔اس کے باوجود سیتا رام یچوری کے علاوہ جنہوں نے دوجملے ٹویٹ کرکے مذمت کرنے پر اکتفاء کیا کسی پارٹی کے سربراہ نے اپنی زبان نہیں کھولی۔ ہر کسی نے اپنے ترجمان کے کندھے پر بندوق رکھ کر مگرمچھ کے آنسو بہانے کو کافی سمجھا۔ ان سارے بیانات پر نظر ڈالنے سے ایک بات صاف نظر آتی ہے کہ بی جے پی کو حکومت کو توسب نے موردِ الزام ٹھہرایا اور جی بھر کے اس پر لعنت ملامت کی لیکن پسماندگان کیلئے کسی زبان پر سے ہمدردی کا ایک بول نہیں پھوٹا۔ قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ تو درکنار کسی نے ان کی ایسی مذمت بھی نہیں کی جیسا کہ اس کا حق تھا۔

مظلومین کے گھر صرف کانگریس کے ریاستی صدراور جھارکھنڈ وکاس مورچہ (جنتانترک) کے رہنما پہنچے۔ بابولال مرانڈی (جو بی جے پی کے سابق وزیراعلیٰ بھی رہے ہیں) نے دونوں خاندانوں کیلئے فی کس ۵۰ ہزار کی مدد کا اعلان کیا۔ مرانڈی نے بتایا دونوں مقتولوں پر گھر چلانے کی ذمہ داری تھی۔ ۳۵ سالہ مظلوم کے گھر میں ۸ افراد ہیں اور ۱۵ سالہ عنایت اللہ کے والد معذور ہیں۔ بابولال

مرانڈی کے اس قدم کو سیاسی ابن الوقتی پر محمول کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لئے یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ بی جے پی سے نکلنے کے بعد اس کے لوگوں میں بھی انسانیت جاگتی ہے لیکن جب تک وہ اس کے اندر رہتے ہیں امید کی کوئی کرن نہیں پھوٹتی ۔اس لئے وزیراعظم کو چاہئے کہ تصوف کے پیغام امن سے سارے عالم کو منور کرنے سے قبل خود اپنے گھر میں اس کی روشنی پھیلائیں ۔ سنگھیوں کے قلب سے زیادہ دنیا کا تاریک ترین گوشہ فی الحال کوئی اور نہیں ہے۔

کانگریس کے ریاستی صدر سکھ دیو بھگت نے پسماندگان سے ملاقات کے بعد بی جے پی کو خوب برا بھلا کہا اوراس سانحہ کی تفصیلی رپورٹ بنوا کر اپنی پارٹی کے مرکزی رہنماوں نیزچیف سکریٹری اور ڈی جی پی کو بھی روانہ کرنے کا عزم کیا۔ظاہر ہے وہ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب کس کا کیا دھرا ہے اور کیوں ؟اس لئے وہ رپورٹ یقیناً کوڑے دان کی نذر ہوجائیگی۔ بھگت نے ریاستی حکومت سے معاوضہ اور مقتول کی اہلیہ کیلئے راشن کی دوکان بنوا کر دینے کا مطالبہ بھی کیا تاکہ وہ اپنا گھر چلاسکے۔ سکھ دیو بھگت نے غالباً وزیراعلیٰ رگھوبرداس کا بیان نہیں پڑھا ورنہ یہ مطالبہ نہ کرتے۔

رگھوبرداس کو جب اس بہیمانہ قتل کی اطلاع ملی تو انہیں مقتولین سے ہمدردی

نہیں ہوئی بلکہ یاد آیا کہ جھارکھنڈ میں بھی اتراکھنڈ کی مانند ایک قانون ہے جس کی رو سے جانوروں کو دوسری ریاست میں لے جانے پر پابندی ہے اس لئے یہ اسمگلنگ کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ کاش کہ وزیر اعلیٰ یہ بھی بتا دیتے کہ اس قانون میں اسمگلر کی سزا کھلے عام پھانسی ہے اور اس سزا کو نافذ کرنے کی ٹھیکہ ہم نے گئورکشا سمیتی کو دے رکھا ہے۔ جس زعفرانی پریوار کے رنگروٹ اس طرح کی سفاکی کا مظاہرہ کریں اور رہنما اس کا جواز فراہم کریں تو انہیں غلام نبی آزاد سے ناراض ہونے کے بجائے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ آزاد نے آرایس ایس کو آئی ایس ایس کا ہم پلہ قرار دے دیا۔

اس طرح کی صورتحال میں طویل پر اسرار خاموشی کے بعد اس طرح کے بیانات دے کربی جے پی ہندو دہشت گردوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ تم جو جی میں آئے کرو ہمارے ہوتے تمہارا بال بیکا نہیں ہوگا اس لئے انوپ بھرتا رائے جیسے پولس افسر ہمارے قبضے میں ہے۔ اس معاملے میں پانچ لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے اور تین ملزم فرار ہیں ۔ ایک گرفتار شدہ اور دوسرے فرار ملزم کا تعلق گئورکشا سمیتی سے ہے۔ گرفتار شدہ متھلیش پرشاد ساہو کے چچا دلیپ کمار کے مطابق وہ مقامی بجرنگ دل کا سربراہ ہے۔ مقتولین کے پسماندگان نے بتایا کہ ہر سال بالوناتھ گاوں میں جہاں یہ قتل ہوا گئو کتھا کا اہتمام کرکے نفرت پھیلانے کام کیا جاتا ہے ۔

سیاسی جماعتوں کے دو بنیادی مسائل کے ہوتے ہیں۔ انتخابات سے قبل کسی طرح کامیاب ہوجانا اور اقتدار میں آجانے کے بعد اپنے حامیوں کو خوش رکھنا۔ دوسرے مسئلہ کا آسان سا حل تو یہ ہے قومی وسائل کو عوام کی فلاح بہبود پر خرچ کیا جائے جس سے اپنے پرائے سب خوش ہوجائیں اور عوام میں نفوذ بڑھے لیکن ایسا کرنے میں ذاتی مفاد اور ان سرمایہ کاروں کا فائدہ آڑے آجاتا ہے جن کے تعاون سے انتخاب لڑا جاتا ہے۔ بی جے پی کے پاس اس کا دوسرا حل یہ ہے کہ ٹھوس کام کرنے کے بجائے اپنے حامیوں کے اندر فرقہ وارانہ جذبات کو فروغ دو اور اس نتیجے میں جب وہ ظلم و ستم کا ارتکاب کر بیٹھیں تو ان کو تحفظ فراہم کرکے انہیں خوش کردو۔ بی جے پی قاتلوں کے ساتھ نرمی سے پیش آکر اپنے آپ کو ان کا مسیحا تو ثابت کردیتی ہے مگر اس کی قیمت مسلمان چکاتے ہیں۔ اس کا ثبوت فرقہ وارانہ فساد کے اعداد و شمار ہیں۔ سابق وزیر اعلیٰ مرانڈی کے مطابق ریاست جھارکھنڈ میں ۲۰۱۴ کے اندر فرقہ وارانہ فسادات کی تعداد ۱۵ تھی جو ۲۰۱۶ میں بڑھ کر ۵۵ ہوگئی۔ کیا اسی کا نام سب کا ساتھ اور سب کا وکاس ہے۔

فسطائی جماعتیں تو ایسے مواقع پر اس لئے چپی سادھ لیتی ہیں کہ ہندو اکثریت خوش رہے مگر نام نہاد سیکولر جماعتوں کی زبان پر اس لئے تالہ پڑ جاتا ہے کہ

کہیں ان کی مذمت سے ہندو اکثریت ناراض نہ ہو جائے۔ اس طرح گویا تمام تر اختلاف کے باوجود جمہوری نظام میں ساری سیاسی جماعتیں اقلیتی فرقے کے خلاف ظالموں کی حامی و مددگار بن جاتی ہیں ۔ شدید احساس کمتری کا شکار کانگریس نے بھی آج کل ہندووں کو خوش کرنے کی خاطر زعفرانی چولہ اوڑھ رکھا ہے۔ جے این یو میں پہلے تو مظاہرین کی کھل کر حمایت کی گئی مگر بعد میں اسے نعرہ نہ لگانے والوں کی حد تک محدود کردیا گیا۔ مہاراشٹر میں ایم آئی ایم کے رکن اسمبلی کی معطلی پر کانگریس بی جے پی سے بڑھ کر دیش بھکتی کا مظاہرہ کیا۔ مدھیہ پردیش اسمبلی میں کانگریس کے تیواری جی بھارت ماتا کی حمایت کرکے بی جے پی والوں کو چونکا دیا۔ گجرات میں گائے کو راشٹر ماتا بنانے کے چکر میں مظاہرہ کرنے والے ایک نوجوان نے خودکشی کرلی اس کی حمایت میں بی جے پی کے بجائے کانگریسیوں نے اسمبلی میں نعرے لگائے۔ واگھیلا نے اعلان کیا کہ اگر بی جے پی پیش قدمی کرے تو کانگریس کو وہ اپنا ہمنوا پائے گی۔ اس لئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارت ماتا بھکتوں میں اکی مظلومیچوں کی خبرگیری کرنے والا کوئی نہیں ہے نیز بجرنگ دل کے دہشت گرد تو بھارت ماتا کی سنتان کو گئو ماتا کے چرنوں میں قربان کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

جھارکھنڈ کا لاتیہار ضلع نکسل باری تحریک سے متاثر ہے۔ گزشتہ ماہ ماؤ نوازوں نے ضلع کے صدر تھانہ میں نیواڑی پنچایت کے دفتر کو دھماکے سے اڑا

دیا۔ اس دھماکے سے پوری عمارت زمین بوس ہو گئی اور سارا ساز و سامان برباد ہوگیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے دو موبائل ٹاورس کو بھی آگ لگا دی۔ ہفتۂ احتجاج کے تحت منعقدہ اس مظاہرے کے دوران نکسلوادیوں نے نعرے بازی کرنے کے بعد اس کی ذمہ داری بھی قبول کی لیکن ان سے لوہا لینے کیلئے کوئی دیش بھکت بھارت ماتا کی رکشا کرنے کیلئے اپنے بل سے باہر نہیں آیا۔ نہتوں پر گھات لگا کر شب خون مارنا جن کا شعار ہو ان سے کسی دلیری کی توقع فضول ہے۔اس واقعہ سے ایک دن قبل وزیر داخلہ نے ماؤ نوازوں سے اپیل کی تھی اگر وہ تشدد کی راہ چھوڑ دیں تو سرکار ان سے بات چیت کیلئے تیار ہے۔ بفرضِ محال اگر وہ اپنا راستہ بدل دیں اور پھر روزی روزگار کیلئے مویشیوں کی تجارت شروع کردیں توکیا وزیر داخلہ اس بات کی ضمانت دیں گے کہ ان
کے پریوار والے قتل کرکے ان کی لاش پیڑ سے نہیں لٹکائیں گے۔راجناتھ مجرمین کو سزا دلانا تو دور جھوٹے منہ کم از کم اس سفاکی کی مذمت ہی کردیں گے۔ماؤ نوازوں کے خلاف کارروائی پر انتظامیہ کی تعریف کرنے والے وزیر داخلہ کو کیا کبھی مظلوم اور عنایت کے قاتلوں کو سزا دلوانے کی بھی خوشی ہوگی؟

ایک سال سے اس علاقہ میں مویشیوں کے تاجروں کوڈرایا دھمکایا جارہا ہے۔ پچھلے ٦ ماہ میں ۵ مرتبہ دھمکیاں مل چکی ہیں۔ اس کے باوجود پولس افسرانوپ بھرتا رائے فرماتے ہیں گزشتہ ایک سال میں کسی تنظیم کے خلاف کوئی شکایت درج نہیں

ہوئی۔ شکایت تو اسی وقت درج ہوگی جب اس کے لئے پرامن ماحول ہو تاکہ لوگ بے خوف ہو کر آگے آسکیں اور اگر اس کے باوجود پولس شکایت درج کرنے سے انکار کردے تو بیچارے گاوں والے کیا کرسکتے ہیں ؟ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا پولس کا محکمہ شکایت کے درج ہونے کے بعد ہی حرکت میں آتا ہے ؟ جو بے قصور مسلمان.برسوں تک جیل میں رہنے کے بعد باعزت.بری ہوجاتے ہیں ان کے خلاف شکایت کون درج کرواتا ہے؟ ان بے قصور لوگوں کانام تو کسی شکایت کے بغیرہی جیش اور لشکر سے جوڑ دیا جاتا ہے اور ان کا میڈیاٹرائل شروع ہوجاتا ہے۔

لاتیہار ضلع میں جس روز یہ مذموم واقعہ رونما اسی دن انسانی حقوق کے قومی کمیشن نے پرہلاد پرشاد نامی حقوق انسانی کیلئے کام کرنے والے ایک کارکن کی موت پر ریاست جھارکھنڈ کے چیف سکریٹری، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولس سپرنٹینڈنٹ کو دو ہفتوں کے اندر کارروائی کرنے کی ہدایت کی۔ پرساد ٹوری ریلوے سائیڈنگ کی تعمیر کے سبب ہونے والے ماحولیاتی نقصان کے خلاف احتجاج کررہے تھے۔ اس قتل کی کسی نے شکایت نہیں درج کرائی بلکہ اخبار میں شائع شدہ خبر کے پیش نظر کمیشن نے یہ ازخود یہ قابلِ تحسین اقدام کیا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ایک نامعلوم خبر کی جانب تو کمیشن نے توجہ فرمادی لیکن جس خبر نے ذرائع ابلاغ میں زلزلہ.برپا کردیا وہ کمیشن کی نظروں سے اوجھل رہی۔ ممکن ہے اس کی وجہ پرہلاد اور مظلوم کے ناموں کا فرق ہو۔اس تفریق و امتیاز کی توقع سنگھ

پریوار سے تو کی جاتی ہے مگر انسانی حقوق کے کمیشن کو یہ رویہ زیب نہیں دیتا۔
انتظامیہ فی الحال اسے چوری ڈکیتی کی واردات بتا کر رفع دفع کرنے کے فراق میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چور اور ڈاکو بھی کبھی کبھار اپنے شکار کو قتل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن ان کی لاش پیڑ سے لٹکانے کی زحمت کوئی نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ایسا کرنے میں ان کا کوئی فائدہ تو نہیں ہے ہاں پکڑے جانے کا خطرہ ضرور ہوتا ہے اس لئے وہ جائے واردات سے جلد از جلد فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ایسی حیوانیت کا مظاہرہ توزعفرانی فرقہ پرستوں کا خاصہ ہے۔ کانگریسی وفد میں شامل شمشیر عالم نے پسماندگان سے ملاقات کے بعد اس قیاس کی تصدیق کرتے ہوئے الزام لگایا کہ یہ قتل اچانک نہیں ہوا بلکہ منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھا۔ لوٹنے کی نیت سے حملہ کرنے والے مجرم پیشہ لوگ قتل تو کر سکتے ہیں لیکن لاش کو پیڑ پر نہیں لٹکا سکتے۔ان کے مطابق پولس معاملے کو دبا رہی ہے۔
مویشیوں کے چور اگر اس طرح کی سفاکی کا مظاہرہ کریں تو اس کے نتیجے میں یا تو اس علاقہ میں یہ کاروبار ٹھپ ہو جائیگا یا تاجر اپنا راستہ بدل دیں گے۔ ہر دو صورت میں چوروں کا نقصان ہے۔ اگر تجارت ہی ٹھپ ہو جائے تو لوٹا کسے

جائیگا؟ نیز اگر حمل و نقل کا راستہ تبدیل ہو جائے تو کسی دوسرے کے علاقے میں جا کر ڈاکہ ڈالنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چوروں کا بھی سیاستدانوں کی مانند اپنا اپنا حلقۂ اثر ہوتا ہے۔ وہ کسی غیر کو اپنے علاقہ میں داخل ہونے کی اجازت دیتے اور اگر کوئی کوشش کرے تو بے تکان بھونکنے لگتے ہیں۔ اس کھیل میں مودی جی جیسا کوئی شامل ہو جائے تو بات اور ہے جو مرلی جی کو وارانسی سے اٹھا کر کانپور میں پھینک دے اور خود کاشی وشوناتھ مندر کا پروہت بن بیٹھیں۔

سیاسی جماعتوں کی اکثریت پروری انتخابات میں کبھی ان کے کام آتی ہے اور کبھی نہیں بھی آتی لیکن یہ لوگ ہندووں کو خوش کرنے میں کس حد تک کامیاب ہو رہے ہیں اس کا انداز گجرات سے آنے والے اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے جہاں گزشتہ ۱۴ سال سے بی جے پی بر سرِ اقتدار ہے۔ اس ریاست میں مذہبی آزادی کے نام پر تبدیلیٔ مذہب کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کیلئے مذہب تبدیل کرنے والے کو سرکار سے اجازت لینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مذہب تبدیل کرنے کی خاطر درخواست گذاروں میں سب سے زیادہ ۱۷۵۳ ہندو ہیں اس کے بعد ۵۷ مسلمان، ۴۲ عیسائی اور ۴ پارسی ۔ان سرکاری اعداد و شمار کے برعکس گجرات کی دلت تنظیم کے صدر جینت مانکنیا کے مطابقتبدیلیٔ مذہب کے خواہاں ہندووں کی تعداد ۵۰ ہزار ہے اور چند سال قبل

راجکوٹ میں ایک لاکھ ہندوؤں نے بودھ مت قبول کیا تھا۔ وشو ہندو پریشد کے شعلہ بیان رہنما پروین توگڑیا کی ناک کے نیچے اگر ہندوتوا کی تجربہ گاہ سمجھے جانے والے گجرات کی یہ صورتحال ہے تو دوسرے مقامات پر اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ گئو ماتا کے رکشک راکشسوں کو ان حقائق سے عبرت پکڑنا چاہئے۔

اتر کھنڈ کا جعلی اور پنجاب کا حقیقی آئینی تعطل

اترا کھنڈ میں دستوری تعطل کا بہانہ بنا کر مرکزی کابینہ نے صدر راج کی سفارش کر کے جمہوریت کی پیٹھ میں ترشول گھونپ دیا۔ اس تنازع کی ابتداء ۱۸ مارچ کو ہوئی جب معاشی بل پر حزب اختلاف نے رائے شماری کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے ۹ (نو) ارکان بغاوت کرکے بی جے پی سے مل چکے تھے۔ کانگریس پارٹی نے آواز کی حمایت سے بل پاس کرکے ایوان کا اجلاس ۲۸ مارچ تک کیلئے ملتوی کردیا۔
ایوان کے صدر یعنی اسپیکر گووند سنگھ کنجوال نے ۹ باغی ارکان کو وجہ بتاو نوٹس دے کر دریافت کیا کہ کیوں نہ ان کے خلاف دل بدلو قانون کے تحت کارروائی کی جائے۔ ان کے جواب سے غیر مطمئن اسپیکر نے ایوان اسمبلی کے اجلاس سے دو دن قبل باغیوں کی رکنیت منسوخ کردی۔ یہ اقدام عین دستور کے مطابق تھا۔ گورنر نے مرکز کو یکے بعد تین خط لکھے ان میں سے کسی میں اسمبلی تحلیل کرنے کی سفارش نہیں کی گئی تھی۔
کیا یہ سارے لوگ آئین کی خلاف ورزی کر رہے تھے؟ اگر کر بھی رہے تھے تب بھی بی جے پی کو چاہئے تھا کہ ایک دن رک کر وزیر اعلیٰ ہریش راوت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرتی۔ وہ اگر اعتماد حاصل کرنے میں ناکام ہوجاتے تو

یہ معلوم ہوجاتا کہ اکثریت کس کے پاس ہے؟ اس کے بعد کسی اور حکومت سازی کا موقع دیا جات جب سب ناکام ہوجاتے تو صدر راج نافذ کردیا جاتا۔ سوال یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے مزید ایک دن انتظار کیوں نہیں کیا؟ اتراکھنڈ اسمبلی میں کل ۷۰ ارکان ہیں جن میں سے ۳۶ کانگریسی اور ۲۸ بی جے پی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ۳ آزاد، ۲ بی ایس پی اور ایک یو کے ڈی والوں نے پی ڈی ایف نام کا ایک محاذ تشکیل دے رکھا ہے جو کانگریس کا حامی ہے۔ اس طرح کانگریس کو بی جے پی کے ۲۸ کے بالمقابل ۴۲ ارکان کی حمایت حاصل تھی۔ اقتدار کی لالچ میں بی جے پی نے کانگریس پارٹی میں پھوٹ ڈالی اور ۹ کو اپنا ہمنوا بنالیا۔

ملک میں رائج دل بدلو مخالف قانون کے تحت باغی ارکان اسمبلی کو رکنیت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے مگر اس کے اندر ایک استثناء یہ ہے کہ اگر کسی جماعت کے ایک تہائی یا اس سے زیادہ ارکان بغاوت کرکے اپنا علٰحیدہ گروہ تشکیل دے دیں تو وہ اس کے اطلاق سے محفوظ رہتے ہیں۔ کانگریس کے ارکان کی تعداد چونکہ ۳۶ تھی اس لئے رکنیت بچانے کیلئے کم ازکم ۱۲ ارکان کی بغاوت لازمی تھی۔ افسوس کہ وزیر خزانہ ارون جیٹلی ایک ماہر وکیل ہونے کے باوجود نہ قانون جانتے ہیں اور نہ حساب یا دونوں کی جانکاری رکھنے کے باوجود آنکھ موند کر دودھ پینے کے قائل ہیں لیکن جب سر پر عدالتی ڈنڈا پڑے گا تو ان کے

چاروں طبق روشن ہو جائیں گے۔ جیٹلی بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ ۱۸ فروری کو معیشت کے بل کا پاس ہونا غیر آئینی تھا اس لئے کہ ریاستی سرکار کیلئے استعفیٰ دینا لازمی ہوگیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ ہریش راوت اگر استعفیٰ بھی دے دیتے تو کیا بی جے پی ان باغیوں کی مدد سے اکثریت کا دعویٰ کرنے میں کیسے حق بجانب تھی جو آئین کی رو سے اپنی رکنیت گنوا بیٹھے تھے؟

حقیقت یہی ہے کہ اتراکھنڈ میں آئینی بحران کا راگ الاپنے والے خود دستور کو پامال کررہے ہیں ۔ وہ نہیں چاہتے کہ آئین کا اطلاق ان لوگوں پر ہو جو دل بدلو قانون کی زد میں آتے ہیں اس لئے کہ وہ بی جے پی کے ہمنوا ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ بی جے پی خود کو اور اپنے حامی سابق کانگریسیوں کو دستور سے بالاتر سمجھتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بی جے پی کانگریس کے ارکان کو خریدنے میں تو کامیاب ہو گئی لیکن پی ڈی ایف کی دیوار میں دراڑ نہیں ڈال سکی۔ ۲۸ فروری کو صورتحال یہ تھی کہ ۹ ارکان کی برخواستگی کے بعد ممبران اسمبلی کی جملہ تعداد ۶۱ ہو گئی تھی ۔ ان میں سے ۲۷ کانگریس کے اور ۶ پی ڈی ایف کے ملا کر بی جے پی کے ۲۸ کے مقابلے واضح اکثریت میں تھے۔ اس صورتحال سے خوفزدہ وزیراعظم اپنا آسام کا انتخابی دورہ ادھورا چھوڑ کر بھاگے بھاگے دہلی آئے اور اسمبلی کے اندر آمنے سامنے مقابلہ کرنے کے بجائے پیچھے سے وار کردیا۔

اروناچل پردیش میں کانگریس کے باغی ارکان کی تعداد ایک تہائی سے زیادہ تھی اس لئے بی جے پی کو کانگریس کا تختہ پلٹنے میں کامیابی نصیب ہو گئی لیکن اتراکھنڈ میں وہ ایسا نہ کر سکی۔ اس لئے پارٹی کے سکریٹری وجئے ورگیہ نے پہلے تو پولس کمشنر کو دھمکی دی کہ وہ سوچ لیں اگر کل کو حکومت بدل گئی تو ان کا کیا ہوگا؟ حالانکہ انتظامیہ سے اس لہجے میں گفتگو کرنا کسی مہذب جماعت کے رہنما کو زیب نہیں دیتا۔ اس کے بعد اسپیکر کے اس فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ انہوں نے ۲۴ گھنٹے کے اندر اسمبلی کا اجلاس کیوں نہیں بلایا؟ حالانکہ اس مطالبے کی کوئی آئینی حیثیت نہیں ہے۔ بعد ازیں ایک خصوصی طیارے کے ذریعہ باغی ارکان اسمبلی کو لے کر دہلی لا کر نہ صرف یرغمال بنائے رکھا بلکہ ان کے ساتھ بلا جواز صدارتی محل کی یاترا بھی کی۔

وجئے ورگیہ کو یہ ساری ڈرامہ بازی کرنے کے بجائے کانگریس کے ۳مزید ارکان کو خرید لینا چاہئے تھا تاکہ ان پر دل بدلو قانون کا اطلاق نہ ہوتا لیکن ان کی حالتو یہ تھا جیسے کسی ٹیم کو آخری اوور میں ۱۲ رن بنانے ہوں اور وہ ۹ رن بنا کر ڈھیر ہو جائے۔ ویسے وجئے ورگیہ کیلئے اپنی پہلی ناکامی کے بعد ایک اور موقع تھا۔ چونکہ ۹ ارکان کی برخواستگی کے بعد کانگریسی ارکان اسمبلی کی تعداد گھٹ کر ۲۷ ہو گئی تھی ایسے میں اگر بی جے پی والے پی ڈی ایف میں پھوٹ

ڈال کران کے کم از کم ۳ ارکان کو اپنے ساتھ کرلیتے تو ۶۱ لوگوں کی اسمبلی میں بی جے پی اور اس کے ہمنوا ۳۱ ہوجاتے اور وہ اکثریت میں آجاتی لیکن یہ بھی نہ ہوسکا۔ پی ڈی ایف متحد رہی اور بی جے پی ۲۸ پر ٹھٹھر کر رہ گئی ۔کانگریس نے آخری گیند پر چھکا لگا کر اپنا اسکور ۳۳ پر پہنچا دیا۔

جب یہ ناکامی بی جے پی کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس سے پہلے کہ ریفری مقابلے کے نتیجے کا اعلان کرتا بی جے پی کے غنڈے بھارت ماتا کی جئے کا نعرہ لگا کر میدان میں کود گئے اور پچ کو کھود دیا۔ اس کے بعد کمنٹری بکس سے اعلان ہوگیا کہ آر ایس ایس نے نہیں بلکہ آئی ایس ایس نے یہ دھاندلی کی ہے اس لئے میچ منسوخ کیا جاتا ہے۔ حالیہ ٹی ۲۰ ٹورنامنٹ میں وراٹ کوہلی کا کھیل دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان یہ ٹورنامنٹ جیت جائیگا لیکن سیاسی بساط پر نریندر مودی کا مایوس کن کارکردگی یقیناً بی جے پی کو پہلے ہی راونڈ میں باہر کردے گی۔ اس لئے کہ بقول صدف برنی ؎

خدا نے اس کو ذرا سا عروج کیا بخشا
وہ شخص دیکھئے اپنا طواف کرنے لگا

بی جے پی اگر اپنے اولین مقصد میں کامیاب ہوجاتی تو وہ ان کانگریسیوں کو جن کے خلاف اس نے انتخاب لڑا تھا اہم وزارتوں سے نواز کر اپنا وزیر اعلیٰ مسلط کردیتی۔ اس کے بعد وہ سارے دیش دروہی ، بدعنوان اور نااہل کانگریسی سچے دیش

بھکت اور دودھ کے دھلے شمار کئے جاتے ۔ ہر دو محاذ پر ناکامی کے بعد اس نے یہ غیر جمہوری بزدلانہ حرکت تو کردی لیکن معاملہ اب عدالت میں چلا گیا ہے۔ ۱۹۸۹ کے بومئی کیس میں عدالت عالیہ کا واضح ہدایت موجود ہے کہ اکثریت کا فیصلہ گورنر ہاوس یا صدارتی محل میں نہیں بلکہ ایوانِ اسمبلی ہوگا۔ اس فیصلے کی رو سے بی جے پی کو عدالت میں منہ کی کھانی پڑے گی لیکن آئے دن عدالت میں رسوا ہونے والی جماعت کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

مرکزی حکومت کے اس متنازع فیصلے سے قبل ایک ویڈیو جاری ہوئی جس میں وزیراعلیٰ ہریش راوت اپنے ہی سابقہ ارکان اسمبلی کو ایک صحافی کے توسط سے رشوت کی پیشکش کرتے ہوئے نظر آئے۔ اس ویڈیو کو بی جے پی والے بہت بڑا اخلاقی مسئلہ بنا کر پیش کررہے ہیں حالانکہ ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ قومی وریاستی سطح کی ساری بڑی سیاسی جماعتیں سر سے پاوں تک بدعنوانی کے دلدل میں دھنسی ہوئی ہیں ۔ کانگریسی بغاوت کا اولین محرک دولت وثروت ہی ہے اور پھر ویڈیو کا کیا؟ جب سمرتی ایرانی جے این یو کی ویڈیو میں کشمیری مظاہرے کی آواز ڈال سکتی ہیں تو وجئے ورگیہ کیا نہیں کر سکتے؟ کانگریس بھی دیوی لال کے زمانے میں ہریانہ کے اندر اور این ٹی راماراو کے دور میں آندھرا پردیش کے اندر ایسی گھناونانی سازش کرچکی ہے لیکن اس کے بعد جب انتخابات ہوئے تو عوام نے اسے سبق سکھا دیا۔ بی جے پی کو اگر یہ غلط فہمی

ہے کہ ارونا چل پردیش اور اتراکھنڈ میں چور دروازے سے ہاتھ آنے والا یہ اقتدار دیرپا ثابت ہوگا تو جلد ہی اس کی یہ خوش فہمی دور ہو جائیگی اس لئے کہ بقول رمزی شمسی

آپ کو ڈبو دیگی آپ ہی کی خوش فہمی
آدمی کی دشمن ہے آدمی کی خوش فہمی

اس جعلی آئینی بحران کے برعکس پنجاب کے اندر برپا ہونے والا حقیقی آئینی تعطل بھی دیکھیں۔ ۱۸ فروری کو پنجاب اسمبلی کے اندر اکالی دل ، کانگریس اور بی جے پی تینوں نے مل کر ایک قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی جس کے مطابق ''ستلج جمنا نہر کو کسی بھی قیمت پر کسی بھی حال میں بننے نہیں دیا جائیگا۔ کسی بھی جانب سے کوئی بھی ایسا فیصلہ قبول نہیں کیا جائیگا جو پنجاب کی عوام کو ان کے جائز حق سے محروم کرے''۔ اس قرارداد میں کسی سے مراد سپریم کورٹ ہے اور کوئی فیصلہ یعنی ۳۰ مارچ تک ستلج جمنا نہر کیلئے کسانوں سے تحویل میں لی گئی زمین کو واپس نہ کرنے کی عدالتِ عالیہ کی ہدایت ہے۔ حکومت پنجاب نے اس بابت محض زبانی جمع خرچ پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ سپریم کورٹ کے فیصلے کی عملاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ۴ ہزار ایکڑ زمین کسانوں کو لوٹا دی اور سیاستدانوں نے نہر کو بند کرنے کیلئے اس میں کیچڑ ڈالنے کا کام

شروع کر دیا۔ انتظامیہ اور پولس اس قانون کی خلاف ورزی کو چپ سادھے دیکھتے رہے اور مرکزی حکومت آنکھ موند کر سوتی رہی۔ اس طرح گویا ایک ریاست کی اسمبلی کے سارے ارکان نے سپریم کورٹ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ ذرائع ابلاغ نے اس مسئلہ پر مباحثہ کرنے کے بجائے قوم کو ''بھارت ماتا کی جئے''میں الجھائے رکھا جبکہ یہ حقیقی اور سنگین آئینی بحران ملک کے دفاقی ڈھانچے کیلئے سم قاتل ہے۔

پنجاب اسمبلی کی قراداد کے مطابق ستلج جمنا نہر کی ضرورت نہ پہلے کبھی تھی اور نہ اب ہے جبکہ دسیوں سال پرانے معاہدے کے تحت اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس نہر کا ۸۵ فیصد کام مکمل ہو چکا ہے اور اس پر ۷۰۰ کروڑ روپئے خرچ ہو چکے ہیں جس کا بڑا حصہ ہریانہ نے ادا کیا ہے۔ ہریانہ اور پنجاب کی اس مہابھارت میں دونوں جانب ایک ہی دھرتراشٹر کے افرادِ خانہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ پنجاب کی حکومت میں بی جے پی شامل ہے اور ہریانہ میں تو بی جے پی کی اپنی حکومت ہے۔ ہریانہ کے وزیراعلیٰ مہاجر پنجابی ہیں اور جاٹوں کے احتجاج نے ان کی نیند اڑا رکھی لیکن پنجاب سے آنے والی اس مصیبت نے تو انہیں بستر مرگ پر پہنچا دیا۔ اس لئے حالت سکرات میں وہ صرف یہ کہہ سکے کہ پنجاب اسمبلی کی یہ قرارداد عدالت عالیہ کے فیصلے کی کھلی خلاف ورزی ہے اور ہم اس کے خلاف سپریم کورٹ میں جائیں گے۔

سپریم کورٹ تو پہلے ہی ہریانہ کے حق میں فیصلہ کرچکا ہے۔ انہیں تو چاہئے تھا اس پر عملدرآمد کیلئے مرکزی حکومت کے پاس جاتے لیکن کھٹر کو پتہ ہے کہ مودی جی میں وہ دم خم نہیں ہے کہ پنجاب کی حکومت کو جھکا سکیں اس لئے دوبارہ بلاوجہ سپریم کورٹ میں جاکر ٹائم پاس کرنا چاہتے ہیں ۔ جولوگ سپریم کورٹ کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے ان کے خلاف عدالت عالیہ کے دروازے پر پھر سے دستک دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ بی جے پی والے اگر اس طرح عوام کو بے وقوف بنانا چاہتے ہیں تو بہت جلد انہیں دال آٹے کا بھاو معلوم ہو جائیگا۔ منوہر لال کے مقابلے مرکزی وزیر.بریندر سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے فیصلے کو سیاسی قرار دیتے ہوئے الزام لگایا کہ پڑوسی ریاست کو ملک کے دفاقی ڈھانچے پر اثر انداز ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔

سابق وزیراعلیٰ بھوپندر سنگھ نے کہا کہ پنجاب کی اسمبلی نے چونکہ دفاقی ڈھانچے کو خطرے میں ڈال دیا ہے اس لئے اس کے خلاف ہریانہ کے سارے ارکان پارلیمان اور ارکان اسمبلی کو صدر مملکت کے سامنے احتجاجاً استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ انہوں نے بجا طور پر دونوں ریاستوں میں صدرراج نافذ کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔ ہریانہ میں بی جے پی رہنمامدن موہن متل نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ چونکہ پنجاب اسمبلی کے ارکان نے سارے قوانین و ضابطوں کی خلاف ورزی کردی ہے

اس لئے اب مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ پنجاب اور ہریانہ کی تنظیم نو کی جائے اوران کو دوبارہ ضم کردیاجائے۔

ہریانہ کی حزب اختلاف انڈین نیشنل لوک دل کے اکالی دل سے قریب تعلقات رہے ہیں لیکن اس نے بھی سارے رشتے منقطع کر لئے ہیں۔ لوک دل کے ۱۰ارکان اسمبلی نے تو پنجاب اسمبلی پر نعرے لگاتے ہوئے ہلہ بھی بول دیا وہ تو خیر پولس درمیان میں آگئی ورنہ ہاتھا پائی ہوجاتی۔ اس کے جواب میں پنجاب کے دس کانگریسی ارکان اسمبلی ہریانہ اسمبلی میں گھس گئے اور وہاں نعرے لگائے کہ ایک قطرہ پانی ہریانہ کو نہیں دیں گے۔

اس ہنگامے میں دیش بھکت زعفرانی شیر دم دبائے خاموش تماشائی بنے رہے۔اڈوانی جی نے کسی زمانے میں اپنے مخالفین کیلئے جعلی (سیوڈو) سیکولرزم کی اصطلاح ایجاد کی تھی اب وقت آگیا ہے کہ بی جے پی کے خلاف جعلی نیشلزم کی اصطلاح استعمال کی جائے۔ یہ حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اتراکھنڈ میں ایک نقلی آئینی بحران کی جانب تو ساری قوم متوجہ ہے لیکن اسی دوران متصل پنجاب اور ہریانہ میں ایک اصلی آئینی طوفان کی جانب کوئی پھٹک کر نہیں دیکھتا۔ یہی زرخرید ذرائع ابلاغ کا سب سے بڑاکارنامہ ہے کہ وہ غیر اہم کو اہم اور اہم کو غیر اہم بنا دیتا ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

وزیراعظم ایک اور سرکاری پکنک سے لوٹ آئے۔ مودی جی کے سیاسی گراف کو دیکھنے کیلئے ان کے بیرونی دوروں پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہے مئی ۲۰۱۴ کے اواخر میں حلف لینے والے ساتھ ہی غیر ملکی دوروں کی منصوبہ بندی شروع ہو گئی اور وسط جون میں لامتناہی ''وشوا یاترا'' کا آغاز ہوگیا۔اب حال یہ ہے کہ دو سال کے اندر ہی وہ ۳۱ ممالک گھوم آئے جبکہ براک اوبامہ نے ۹ سالوں کے اندر صرف ۵۲ ممالک دورہ کیا اور روس کے صدر پوتن نے تو اپنے طویل دورِ اقتدار میں ۵۰ ممالک کی سیر کی۔ اس بابت اعداد و شمار کا جائزہ خاصہ دلچسپ ہے۔پہلے ۶ ماہ یعنی جون تا دسمبر ۲۰۱۴ میں وزیراعظم نے جملہ ۹ ممالک کا دورہ کیا۔ اس دوران پانچ ریاستوں کی انتخابی مہم ان کے پیروں کی زنجیر بن گئی اور وہ من مانے انداز میں رقص نہ کرسکے۔ایک سال بعد یعنی جون تا دسمبر ۲۰۱۵ کے دوران بہار کی جنگی مہم کے باوجود مودی جی کے دوروں کی تعداد ۹ سے بڑھ کر ۱۸ ہو گئی یہ سو فیصد کا اضافہ تھا۔

سال ۲۰۱۵ میں مودی جی نے کل ۲۸ دورے کئے تھے یعنی ہر سہ ماہی میں اوسطاً ۷ دورے۔ اس غیر معمولی کارکردگی کی بدولت انہیں این آر آئی وزیر اعظم کے

خطاب سے نوازہ گیا اور راہل گاندھی کو درخواست کرنی پڑی کہ اگر کبھی غیر ملکی دوروں سے فرصت ملے تو اپنے ملک کے کسانوں سے بھی ملاقات کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ یہاں تک کہ سوشیل میڈیا میں ایسا کارٹون بھی دیکھنے کو ملا کہ وزیر خارجہ سشما سوراج مودی جی کو الوداع کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی ہیں ''بھارت ماتا کی یاترا کرنے کیلئے دھنیا باد'' ۔ اب آیئے سالِ رواں کو دیکھیں۔ پہلے تین ماہ میں صرف ۳ ممالک اور آئندہ ۶ ماہ کے منصوبے میں مزید ۳ ممالک اس طرح گویا اس سال کے پہلے ۹ ماہ میں صرف ۶ یعنی پچھلے سال کے پہلے ۹ ماہ میں ۲۰ کی بہ نسبت زبردست گراوٹ جوان کی ڈھلتی مقبولیت کی غماز ہے۔

اس تیزی کے ساتھ کسی رہنما کا غیر مقبول ہوجانا اپنے آپ میں ایک تحقیق کا موضوع ہے۔ اس کا سبب میزبانوں کی بیزاری ہے یا خود ان کے دل کا اس موہ مایا سے اچاٹ ہوجانا یا دونوں وجوہاتہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔ جہاں تک ملک کی عوام تعلق ہے ان کا من نہ صرف وزیراعظم سے اچاٹ ہو چکا ہے بلکہ ان کی تصاویر دیکھ دیکھ کر وہ حد درجہ بیزار ہوچکے ہیں ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے جس وقت وزیراعظم مودیبیلجیم سے ہوتے ہوئے صدر براک اوباماسے ملاقات کیلئے امریکہ روانہ ہو رہے تھے تو قومی ٹیلی ۔ویژن پر وراٹ کوہلی چھایا ہوا تھااور لوگ بھارت ویسٹ انڈیز کے میچ میں مست تھے

معیار کوچونکہ مقدار پر فوقیت حاصل ہے اس لئے ان دوروں کی کمیت کے بعد کیفیت کا موازنہ بھی ہوجائے ۔ اس دوران مودی جی نے امریکہ کا ۳ باراور مشرق وسطیٰ کے دو دورے کئے۔ یہ دونوں خطے چونکہ ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں اس لئے ان کا جائزہ کافی ہے۔ گجرات قتل عام کے سبب چونکہ امریکہ میں داخلے پر پابندی تھی اس لئے ان کے پہلے امریکی دورے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ۔ اس موقع پر میڈیسن اسکوائر پر منعقد ہونے والے تفریحی پروگرام میں مودی جی کو راک اسٹار کے طور پر پیش کیا گیا۔ امریکہ میں رہنے بسنے والے عام ہندوستانیوں کا جوش خروش اور خاص طور پر گجراتیوں کا جنون قابلِ دید تھا۔ زعفرانی جنونیوں کے غیض و غضب کا شکار ہونے والوں میں سے ایک راجدیپ سردیسائی بھی تھے ۔ اس کے بعد قصر ابیض میں مودی جی کی عام سی ملاقات کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا کہ لوگ اٹل جی کو بھول گئے۔

مودی جی نے ایک سال بعد جب دوسری مرتبہ امریکہ کیلئے رختِ سفر باندھا تو وقت بدل چکا تھا۔ مودی جی کا سحر کیجریوال نے توڑ دیا تھا۔ اچھے دنوں کی آس میں نریندر مودی کو منتخب کرنے والے لوگ خواب غفلت سے بیدار ہو کر منموہن سنگھ کا زمانہ یاد کر رہے تھے۔ ان کی زبان پر راجکپور کی بڑے بجٹ کی فلاپ فلم میرا نام جوکر کا نغمہ ’’ جانے کہاں گئے وہ دن ‘‘ مچل رہا تھا۔ مودی جی

کے انتخابی مہم پر خرچ ہونے والے سرمائے کا کارکردگی سے موازنہ کیا جائے تو ''میرا نام مودی'' جوکر سے بھی بڑی فلاپ نکلے گی۔ بہت ممکن ہے حزن ملال کے عالم میں خود مودی جی بھی ''جانے کہاں گئے وہ لوگ'' گنگنا رہے ہوں۔ اس لئے کہ ایک سال قبل پھول بچھانے والی گجرات کی پٹیل برادری آگ برسا رہی تھی۔ ہاردک پٹیل کی رہائی کیلئے مظاہرے کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ پٹیل سماج میڈیسن اسکوئر کے لئے دیا جانے والا اپنا چندہ واپس مانگ رہا تھا۔

ان زمینی حقائق کے اعترافنے دوسرے امریکی دورے کو کسی قدر پروقار بنا دیا۔ عوامی خطاب سے اجتناب کرتے ہوئے صنعتکاروں کی جانبتوجہ کی گئی۔ میک انڈیا کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کیلئے گوگل، فیس بک اور بجلی سے چلنے والی گاڑی بنانے والی امریکی کمپنی ٹیسلا کا دورہ کیا گیا۔ ٹیسلا چونکہ امریکہ سے باہر کارخانہ کھولنے پر غور کر رہی تھی اس لئے اسے ہندوستان بلانے کی کوشش کی گئی۔ اس غرض سے وہ لوگبنگلورو بھی آئے لیکن چین کو ترجیح دی اور میڈ ان چائنا گاڑی بنانے کا فیصلہ کیا۔ فیس بک والے انٹرنیٹ بیسکس نامی ایک پروجکٹ بازار میں لانا چاہتے تھے لیکن دنیا بھر میں اس کی مخالفت ہو رہی تھی۔ فیس بک کے زوکرسرگ نے مودی جی کو اپنے جھانسے میں لے کر ہندوستان کے بازار میں گھسنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے لیکن انٹرنیٹ کی خودمختاری کیلئے سرگرم عمل غیر سرکاری تنظیموں نے حکومت پر اس قدر دباو بنایا کہ اس سے

رجوع کرنے پر مجبور کر دیا۔

مودی جی کا تیسرا دورۂ امریکہ خالص سیاسی اور سفارتی نوعیت کا تھا۔ اس میں نہ کوئی تفریحی ڈرامہ تھا اور نہ ہی تجارتی نشانہ۔ اس بار مودی جی بی جے پی کے ماتھے پر لگا پرانا کلنک مٹانا چاہتے تھے۔ ممبئی حملے کی بعد پٹھانکوٹ حملے کا الزام مسعود اظہر پر ہے لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسعود اظہر ایک زمانے تک ہندوستان کی جیل میں تھے۔ حکومت ہند اس کے خلاف کوئی فردجرم داخل نہیں کی اور بالآخر اٹل بہاری واجپائی کے دور میں وزیر خارجہ جسونت سنگھ خود اغواء طیارے کے عوض انہیں کابل چھوڑ آئے۔ اس بار مودی جی نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مولانا مسعود اظہر کو دہشت گرد قرار دینے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ جملہ ۱۵ میں سے ۱۴ ارکان کو اپنا ہمنوا بنا لیا لیکن چین نے حسب سابق اس تجویز کو ویٹو کر دیا۔

جیش محمد کو ۲۰۰۱ میں دہشت گرد قرار دیا جاچکا ہے لیکن ۲۰۰۸ میں ممبئی حملے کے بعد جب مسعود اظہر پر پابندی کی تجویز پیش کی گئی تھی تو چین نے اسے ویٹو کر دیا تھا۔ گزشتہ سال ہندوستان کی جانب سے مطیع الرحمٰن لکھوی پر کارروائی کرنے کی خاطر پاکستان کو مجبور کرنے کیلئے جو مہم چلائی گئی اسے بھی چین کی مداخلت کے سبب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔اس بار اگر وہ چین کو راضی کر لی

تو ان کے بجائے دیگر ے ارکان سے کام چل جاتا لیکن وزیر اعظم اگر ایسی سمجھداری کا مظاہرہ کرنے لگیں تو اُن بیچاروں کا کیا ہوگا جن کی بہترین مصروفیت مودی جی پر نت نئے کارٹون بنا کر لوگوں کو ہنسانا ہے۔

اس سفارتی ناکامی کی پردہ پوشی کیلئے پہلے تو ڈھکے چھپے انداز میں چین اور پاکستان کو دہشت گردوں کا محافظ قرار دیا گیا لیکن بعد میں پارلیمانی امور کے وزیر وینکیا نائیڈو نام لینے سے بھی نہیں چوکے۔ اس طرح سعود اظہر کا تو بال بیکا نہ ہوا مگر چین اور پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بحالی میں جو پیش رفت ہوئی تھی اس پر پانی پھر گیا۔ اس سرکار کی غیر دانشمندی نے پاکستان تو کجا نیپال نامی واحد سابقہ ہندو راشٹر کو بھی چین کی گود میں ڈھکیل دیا ہے۔ مودی جی نے دو مرتبہ نیپال کا دورہ کیا اس کے باوجود وہ دشمن بنا ہوا ہے۔ چین اور نیپال کے درمیان ریلوے کی پٹری بچھائی جارہی ہے اور توقع ہے کہ مستقبل میں چینی اشیاء نیپال سے ہوکر بلا روک ٹوک ہندوستان کے بازار میں پھیل جائیں گی اور ہم لوگ میک ان انڈیا کی مالا جپتے رہ جائیں گے۔

امریکہ کیلئے چین ہی فی الحال سب سے بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔ چین کے خلاف امریکی حکام ہندوستان کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کا چین سے برسرِ پیکار ہوجانا امریکہ کے مفاد میں ہے اس لئے وہ ہمیں اکساتے ہیں اور ہم ان کے

دامِ فریب میں آجاتے ہیں ۔ اس موقع پر سوچنے والی بات یہ ہے کہ چین کے ساتھ بہتر تعلقات ہندوستانی عوام کے حق میں مفید ہیں یا نہیں؟ نیز امریکہ کس قدر قابلِ بھروسہ دوست ہے؟ چین ہمارا پڑوسی نیز وہ معاشی اور فوجی اعتبار سے بہتر حالت میں ہے۔

گزشتہ چند سالوں کے اندر ہند چینی تجارت میں اچھی خاصی پیش رفت ہوئی اور ہندوستان کے اندر چین سرمایہ کاری کاارادہ بھی رکھتا ہے جو دونوں ممالک کی عوام کیلئے فائدہ بخش ہے ایسے میں کسی تیسرے کی خشنودی کیلئے خود اپنا نقصان کرلیناخلافِ دانشمندی ہے؟

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امریکہ نے اپنے ہر ہمنوا کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔ افغانستان میں القاعدہ کو ساتھ لے سوویت یونین کا مقابلہ کیا اور پھر اس کے دشمن بن گئے۔ ایران کے مقابلے صدام حسین کی ہمنوائی کی اور پھر اقتدار سے بے دخل کرکے تختۂ دار تک پہنچا دیا۔ شام کے مجاہدین کی پہلے حمایت کی اور آگے چل کر وہاں داعش کو اتار دیا جو بشار کے بجائے النصرہ کی سرکوبی کرنے لگی۔ اس کی ایک مثال خود سعودی عرب بھی ہے۔اسلامی انقلاب کے بعد امریکہ نے ایران کے خلاف صلیبی جنگ چھیڑ دی ۔ اس جنگ میں مجاہدین خلق سے لے کر صدام حسین تک سب کو میدان میں اتار گیا۔ جوہری اسلحہ کا بہانہ بناکر ایران پر معاشی پابندی مسلط کردی گئی لیکن سارے حربے یکے بعد دیگرے ناکام ہوگئے۔ اس دوران امریکہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب ایران کی جانب سے پہلے جیسا نظریاتی خطرہ نہیں ہے اس لئے ایران کی جانب دوستی کا

ہاتھ بڑھادیا۔

مسقط کے اندر سفارتی گفت و شنید کا آغاز ہوا اور طویل بحث و مباحثہ کے بعد ایران نے جوہری ایندھن پر محدود پابندی قبول کرلی ۔ اس طرح امریکی انتظامیہ کو معاشی پابندی ختم کرنے کا جواز مل گیا۔ مشرق وسطیٰ کے اندر سعودی عرب امریکہ کا ایک ایسا حلیف رہا ہے جو ہر سرد و گرم میں اس کا باجگذار بنا رہا لیکن ایران کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنے سے قبل اس کو پوچھا تک نہیں گیا۔ امریکہ کے اس رویہ سے جزیرۃالعرب کے سارے حلیف امریکہ سے ناراض ہوگئے اور ان کا اعتماد امریکہ کے اوپر سے اٹھ گیا۔ اس حوالے سے عرب حکام کے اندر پائی جانے والی شدید بے چینی کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ مودی جی کو اس سے عبرت پکڑنا چاہئے۔

مودی جی کی سعودی یاترا کا گزشتہ سال کے امارات کے دورے سے موازنہ بھی ضروری ہے۔ یمن میں فوج کشی سے انکار کے پاکستانی موقف نےان دونوں ممالک کو پاکستان سے ناراض کیا ہے۔ اسی کشیدگی نے مودی جی کے دورے کی راہ ہموار کی ہے۔ مودی جی جب ابوظبی پہنچے تھے تو ہوئی اڈے پر ان کا استقبال وزیر دفاع محمد بن زائد نے کیا تھا لیکن ریاض میں ان کے استقبال کیلئے شہر کے گورنر تشریف لائے۔ اس کے بعد مودی جی کو شیخ زائد مسجد دکھلائی گئی ۔ ریاض شہر

میں بھی بہت ساری خوبصورت مساجد ہیں لیکن ایسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ ابوظبی میں مودی جی نےایک لیبر کیمپ کا بھی نمائشی دورہ کیا لیکن سعودی عرب میں زیادہ تعداد کے باوجود وہ ہندوستانی محنت کشوں سے ملاقات نہ کرسکے۔ ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں مخصوص لوگوں کے خطاب پر انہیں اکتفاء کرناپڑا جبکہ دبئی کے اندر ایک اسٹیڈیم میں ہندوستانی عوام کے جم غفیر سے انہوں نے خطاب کیا تھا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ سال اوراس سال کے دورے میں کات فرق ہے؟

امارات کے دورے پر مودی جی کا سب بڑا ناٹک ابوظبی میں بننے والے ایک مندرکے منصوبے پر خوشی کا اظہار تھا۔ سوامی نارائن کے مندر کو دوسال قبل تعمیر کی اجازت مل چکی تھی لیکن مودی جی اور ان کے بھکتوں نے یہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی یہ مندر ان کی سعی کا حاصل ہے۔ سعودی عرب کے اندر تواس کا تصور محال تھا۔ ابھی حال میں وزیر اعظم نے دہلی کے اندر ورلڈ صوفی کانفرنس کے نام جو ڈرامہ کیا اس میں وہابیت کی خوب جم کر مخالفت ہوئی۔ سلفیت کو داعش کا مرجع و ماویٰ قرار دیا گیا اور حرمین شریفین کو سعودی عرب کے چنگل سے آزاد کرنے کا عزم دوہرایا گیا۔ ایسے اجتماع کی سرپرستی کرنے کے بعد بھی اگر مودی جی سعودی عرب سے توقع رکھیں کہ ان کے ساتھ گرمجوشی کا مظاہرہ ہوگاتو یہ سراسر حماقت ہے۔

وہ تو خیر 'حب امریکہ اور بغض پاکستان' میں یہ دورہ منسوخ نہیں ہوا ورنہ ممکن ہے کہ عالمی صوفی کانفرنس کے بعد ہندوستان اور سعودی عرب کے تعلقات بگڑ جاتے۔ اس بات کا امکان ہے کہ مودی جی نے سعودی حکومت کو یقین دلا دیا ہو کہ وہ عوام کو بے وقوف بنانے کیلئے ایک جمہوری تماشا تھا لیکن اس دورے کے سبب مودی جی کو بریلوی مکتبِ فکر کے علماء اور عوام کی جو تھوڑی بہت حمایت حاصل ہو گئی تھی اس پر تو پوری طرح پانی پھر گیا ہے۔ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش میں مودیجی کی لٹیا آئے دنا سی طرح ڈوبتی رہتی ہے اس لئے کہ فوری فائدے کو وہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر دور اندیشی کا فقدان ہے۔ دوست اور دشمن میں تمیز کئے بغیر مخالف فریقوں کو خوش کرنے کی کوشش میں وہ دونوں کو ناراض کر دیتے ہیں۔ ان کی حالتپر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

گئے دونوں جہاں سے خدا کی قسم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے رہے
نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے رہے

وزیر اعظم کے سعودی عرب دورے کو ایسے پیش کیا جارہا ہے گویا کوئی معجزہ ہوگیا۔ این ڈی ٹی وی نے لکھا ۲۰۱۰ کے بعد کسی ہدوستانی وزیر اعظم کا یہ پہلا دورہ ہے۔ ۲۰۱۰ میں منموہن سنگھ نے سعودی عرب کا دورہ کیا تھا۔ منموہن

کے بعد مودی پہلے وزیراعظم بھی تو ہیں اور یہ صرف ۶ سال پرانی بات ہے ۶۰ سال نہیں۔ اس دورے سے قبل سعودی ہندوستان کا سب سے بڑا تیل فراہم کرنے والا ملک تھا۔کاروبار ۴۰ بلین ڈالر اور ۳۰ لاکھ ہندوستانی پہلے سے وہاں زیر ملازمت تھے تو اس میں نیا کیا ہوگیا؟ سدھیندر کلکرنی فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک پاکستان کے دوست کو دوست بنا لیا لیکن سوال یہ ہے کہ سعودی عرب ہندوستان کا دشمن کب تھا؟ لیکن کیا وہ اب پاکستان کا دشمن بن گیا ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ حال میں سعودی عرب کے اندر جو سب سے بڑا فوجی مظاہرہ ہوا اس میں شرکت کیلئے ان لوگوں نے نواز شریف کو بلایا تھا نریندر مودی کو نہیں۔ مودی جی سعودی عرب سے ہندوستانی عوام کیلئے کیا لائے؟ اس سوال کا جوب دوسرے دن کے اخبارات میں تھا پٹرول دو روپیہ اور ڈیزل ایک روپیہ مہنگا ہوگیا۔ اس سوغات کیلئے جو لوگ وزیراعظم کو مبارکباد دینا چاہتا ہیں وہ شوق سے دے سکتے ہیں۔

! حکومت کے خواب عدالت کا جواب

سیاسی نظام کے دایاں ہاتھ مقننہ اور بایاں ہاتھ عدلیہ ہے انتظامیہ کی حیثیت پیروں کی سی ہے۔ دماغ مطلق العنان ہے اس کا کام اصول و ضوابط طے کرکے احکامات جاری کرنا ہے۔ قادر مطلق کے نمائندے کی حیثیت سے مقننہ کا فرض منصبی اپنے آقا کے احکامات پر عملدرآمد کو سہل بنانے کیلئے قوانین اور ضابطے وضع کرنا ہے۔ انتظامیہ کی اولین ذمہ داری قوانین کا نفاذ ہے۔ عدلیہ یہ دیکھتا ہے کہیں قانون کی خلاف ورزی تو نہیں ہورہی ہے گویا ظلم واستحصال کو روککر عدل قائم کرنا اس کا فرض عین ہے۔انتظامیہ کی دوسری ذمہ داری عدلیہ کے فیصلوں کا نفاذ ہے اس طرح گویا ایک پیر مقننہ کی خدمت کرتا ہے اور دوسرا عدلیہ کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ تمام سیاسی نظاموں کے یہ مشترک اجزائے ترکیبی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اسلامی نظام میں سرپر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ جمہوریت میں سرپر عوام براجمان ہوتے ہیں لیکن اگر دنیا کے کسی خطے میں سرمایہ دارانہ جمہوریت قائم ہوجائے تو سرمایہ داروں کو عوام کے سرپر سوار کردیا جاتا ہے۔آمریت میں اس مقام پر کوئی فوجی اور ملوکیت میں بادشاہ مسلط ہوتا ہے۔

فی زمانہ ذرائع ابلاغ بھی سیاسی نظام جزولاینفک بن بیٹھا ہے۔ اس خود ساختہ

دعویدار کی حیثیت زبان کی سی ہے۔ اس کا کام ویسے تو عوام کے مسائل کو اجاگر کرنا اور حکمرانوں کی غلط کاریوں کے خلاف آواز اٹھانا ہے لیکن جب مادہ پرستی کا بول بالا ہوگیا اور اس کی رال ٹپکنے لگی تو سرمایہ داروں نے اسے خرید لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیاسی نظام کے پیروں کی جوتی بن گیا ہے۔ اب تو اس کی حیثیت دم کی سی ہو گئی ہے جو سرکار کے اشارے پر ہلتی رہتی ہے۔ اس امر کے مظاہر اخبارات، رسائل اور ٹی وی چینلس پر موقع بہ موقع دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ گزشتہ پارلیمانی انتخاب وہ پوری طرح بے نقاب ہوگیا اور جواہر لال یونیورسٹی سانحہ کے بعد تو ضمیر فروشی میں حکومت سے بھی دو قدم آگے نکل گیا۔ اس لئے امید کی آخری کرن عدلیہ ہے لیکن ان میں سرکاری مداخلت ہوتی رہتی ہے۔ جب کوئی جج سرکار سے مرعوب نہیں ہوتا ہے تو انصاف ہوتا ہے ورنہ عدالت سے بھی عدل کے بجائے ناانصافی ہی ہاتھ آتی ہے اور سیاست سے تو خیر خالی خولی نعروں کے علاوہ کچھ ہاتھ ہی نہیں آتا۔

قانونِ فطرت یہ ہے کہ اگر جسم کا ایک حصہ مفلوج ہوجائے تو اس کا کام کسی نہ کسی حد تک دوسرا کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مقننہ کیا پنی بنیادی ذمہ داری سے غفلتکے سبب عدلیہ کو اپنے حدود سے نکل کر حکمرانی کے فرائض انجام دینے کیلئے بھی مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ فلاح عام کے مسائل پر آئے دن اس کی دلچسپی اور مداخلت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ ابھی حال میں ۱۲ اپریل

کو چیف جسٹس ٹی ایس ٹھاکر کی صدارت والے بھنچنے آر بیآئی کی جانب سے بڑے ۲۰۱۶
قرض چوروں کی فہرست پر وزارت خزانہ اور انڈین بینک ایسوسی ایشن کو نوٹس جاری
کرتے ہوئے پوچھا کہ قرض خواہوں سے وصولی کے لئے کیا قدم اٹھائے

جارہے ہیں؟ عدالت عظمی کا یہ تبصرہ ایک معاملے کی سماعت کے دوران کیا گیا، جس میں
اخبار کے اندر آرٹیآئی کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر پر حکومت پر انحصار کرنے
کے بجائے از خود اقدام کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

اخبار کے مطابق ۲۹ سرکاری بینکوں نے ۲۰۱۳ سے ۲۰۱۵ کے درمیان تقریبا ۱۸ء۱ ۲لاکھ کروڑ
روپے کے قرض کے معاف کردیئے۔ درخواست دہندہ نے آر بیآئی سے ان کمپنیوں اور
افراد کی فہرست سونپے جانے کو کہا تھا، جن پر پبلک سیکٹر کے بینکوں کا ۵۰۰ کروڑ روپے یا
اس سے زیادہ کا قرض واجب الادا ہے۔ آر بیآئی کو سپریم کورٹ کی پھٹکارتے ہوئے کہا
کہ معمولی قرض لینے والے غریب کسانوں پر تو سخت کارروائی ہوتی ہے۔ ان سے قرض
وصول کرنے کیلئے کی زمین کو کرکی کرکے بیچ دیا جاتا جبکہ ہزاروں کروڑ روپے قرض لینے
والے لوگ اپنی کمپنیوں کٹ ودیوالیہ بتا کر بیرون ملک عیش کرتے ہیں۔ عدالت نے
آر بیآئی کو سخت لہجے میں ریگولیٹر کے طور پر اس کی یہ ذمہ داری یاد دلائی اور ان معاملات
پر کڑی نگاہ رکھنے کی تلقین کی۔

دستور کی نظر میں ایک کسان اور ایک سرمایہ دار کے حقوق یکساں ہیں۔ ملک میں بڑے سرمایہ داروں کی تعداد اس ایک سال میں ریاستِ مہاراشٹر کے اندر خودکشی کرنے والے کسانوں سے بھی کم ہے۔ حکومت سرمایہ داروں کے ووٹ سے نہیں بلکہ کسانوں کی رائے سے بنتی ہے۔ ملک میں چونکہ سرمایہ دارانہ جمہوریت غالب ہے اس لئے حکومت مٹھی بھر سرمایہ داروں کا آلۂ کار بن کر غریب کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کررہی ہے۔ اس مجبور اکثریت کے نمائندہ کی حیثیت سے عام محنت کش عوام کے حقوق کا تحفظ اس کا فرض منصبی ہے۔ کسانوں کے حوالے سپریم کورٹ نے ایک سال کے اندر یہ دوسری مرتبہ اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۵ کو عدالت عظمی نے کہا تھا خود کو کسان دوست کہنے والی مرکزی سرکار کو کسانوں کی خودکشی کے معاملے سنجیدہ'' نہیں ہے۔ عدالت نے اس وقت حکومت کی غفلت دور کرنے کی غرض سے وقت حلف نامہ دائر نہ کرنے کے سبب ۲۵ ہزار روپے کا جرمانہ بھی عائد کیا تھا۔

اس وقت عدالت کے سامنے نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو کے اعداد و شمار تھے جس کے مطابق ۲۰۱۴ میں ۶ ہزار سے زیادہ کسانوں نے خودکشی کی تھی اور یہ سلسلہ بدستور جاری تھا۔ اس معاملے میں ۱۲ اگست ۲۰۱۵ کو سپریم کورٹ نے مرکزی حکومت کو ۴ ہفتوں کے اندر حلف نامہ داخل کرنے کا حکم دیا لیکن حکومت نے ۲ ماہ بعد بھی حلف نامہ جمع نہیں کیا جس پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ کورٹ نے

حکومت سے کااستفسار کیاکہ اس مقصد کیلئے قائم کردہ ایم ایس سوامی ناتھن کمیٹی رپورٹ کے ۱۹۰ نکات پر اتفاق رائے کے باوجود اسے لاگو کرنے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ کورٹ نے افسوس کے ساتھ کہا گو صورتحال نہایت سنگین ہے پھر بھی سوامی ناتھن کمیٹی کی سفارشات کے نفاذ کی خاطر بنائے گئے حکومتی پینل کی گزشتہ ۸ سالوں میں صرف ۵ نشستیں ہوئی ہیں۔ جو حکومت سپریم کورٹ کی ہدایت پر کاغذی کارروائی تک کرنے میں تاخیر کرتی ہو اس سے کسی ٹھوس اقدام کی توقع کرنا بے سود ہے۔

دو ماہ قبل فروری میں سپریم کورٹ نے فوڈ سیکورٹی ایکٹ کو نافذ نہ کرنے پر کچھ ریاستوں کو سخت پھٹکار لگائی تھی۔ عدالت نے سخت الفاظ میں سرزنش کرتے ہوئے پوچھا تھاکہ پارلیمنٹ کی طرف سے منظور قانون کوآخر گجرات جیسی ریاست کیوں نافذ نہیں کر رہی ہے؟ جسٹس مدن بی لوکر کی قیادت والی بنچ نے کہا تھاآخر پارلیمنٹ کیا کر رہی ہے؟ کیا گجرات ہندوستان کا حصہ نہیں ہے؟ قانون کہتا ہے کہ وہ پورے ہندوستان کے لئے ہے اور گجرات ہے کہ اس پر عمل نہیں کر رہا ہے۔ کل کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ مجرمانہ ایکٹ اور تعزیرات ہند کو نافذ نہیں کرے گا۔علاوہ ازیں سپریم کورٹ نے ۱۰فروری تک مرکزی حکومت کو خشک سالی سے متاثرہ ریاستوں کی تفصیلی معلومات پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ سپریم کورٹ نے اپنے حکم میں ان ریاستوں میں چلائی جانے والی مختلف اسکیموں ، فوڈ

سیکورٹی ایکٹ اور مڈڈے میل کے متعلق حلف نامہ داخل کرنے کی ہدایت دی تھی۔

ملک کے اندر جب سے نئی سرکار قائم ہوئی ہے قحط سالی کا دور دورہ ہے۔ مہاراشٹر، کرناٹک، چھتیس گڑھ، راجستھان، آندھراپردیش اور تلنگانہ سمیت نو ریاستیں خشک سالی کی زد میں ہیں۔ کئی ریاستوں میں حالات اتنے بدتر ہو گئے ہیں کہ لوگ پینے کے پانی کی خاطر نقل مکانی پر مجبور ہیں۔ ایسے میں یوگیندر یادو اور پرشانت بھوشن نے مفاد عامہ کی عرضی داخل کرکے مطالبہ کرناپڑاکہ وہ خشک سالی سے متاثرہ ریاستوں کی عوام کو غذائی تحفظ قانون کے تحت اناج فراہم کرنے کی خاطر مرکزی حکومت ہدایت جاری کرے۔ ان کیغیر سرکاری تنظیم "سوراج ابھیان" نے راحت اور بازآبادکاری کے دیگر اقدامات کے لئے بھیعدالت سے درخواست کی کہ وہ مرکز کو حکمنامہ جاری کرے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک این جی اوپر عوامی فلاح بہبود کے معاملے میں براہ راست حکومت سے رجوع کرنے کے بجائے عدالت کے دروازے پر دستک دینے کی مجبوری کیوں آن پڑی؟

اس سوال کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اس قومی مسئلہ کی جانب نہ تو ریاستی حکومتیں توجہ دیتی ہیں اور مرکزی حکومت سنجیدگی اختیار کرتی ہے۔ مرکزی حکومت کا موقف یہ ہے اس کی ذمہ داری صرف وسائل فراہم کردینے اور ہدایات جاری کردینے تک محدود ہے اس پر عملدرآمد ریاستی سرکار کا کام ہے۔ عدالت اس

سے اتفاق نہیں کرتی اس کا کہنا ہے کہ ملک کے نو ریاست خشک سالی سے متاثر ہیں اس لئے مرکزی حکومت اپنی آنکھیں بند نہیں رکھ سکتی۔ اس سنگین صورتحال سے نمٹنے کے لئے مرکزی حکومت کو ضروری اقدام کرنے پڑیں گے۔ سرکار کی بے حسی کے پیش نظر عدالت نے مرکز کو ایک دن کے اندر حلف نامہ داخل کرکے یہ بتانے کی ہدایت دی کہ مہاتما گاندھی قومی دیہی روزگار گارنٹی قانون (منریگا) خشک سالی سے متاثرہ ریاستوں میں کس طرح لاگو کیا جا رہا ہے؟ عدالت عظمی نے حکومت سے یہ بھی جاننا چاہا کہ ان ریاستوں میں مالیات کی فراہمی کیسے ہو رہی ہے؟

سپریم کورٹ کی اس پھٹکار کا بھی مرکزی حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دوسرے دن سماعت میں اس کا وکیل تقریباً ۱۵ منٹ دیر پہنچا۔ ایڈیشنل سالیسٹر جنرل کے انتظار میں خفا ہو کر ججوں نے ناراضگی جتاتے ہوئے کہا کہ اس اہم مسئلے پر بھی خاطر خواہ سنجیدگی دکھائی نہیں دیتی۔ کیا یہ آپ کی ترجیح نہیں ہے؟ کیا ہم لاوارث لوگ ہیں؟ ہم یوں ہی خالی بیٹھے رہیں۔ کیا آپ ہم سے یہ توقع کرتے ہیں کہ ہم کچھ نہ کریں، ٹائم کاٹتے ہوئے ہوئے صرف گھڑی کو دیکھتے رہیں؟ اس کے بعد جو حلف نامہ داخل کیا گیا اس کے مطابق مرکزی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر منریگا کے تحت ریاستی حکومتوں کو ۱۱۰۳۰ کروڑ دے گی۔ عدالت کے دباو میں حکومت کی جانب سے اس خطیر رقم کی فراہمی اس بات کا ثبوت ہے

غریب مزدوروں کے اس حق پر سرکار سانپ بن کر بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس ناگ دیوتا کو وہاں ہٹانے کی خاطر ہی سوراج ابھیان والوں کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا تھا۔ اگر وہ براہ راست سرکار کے بل میں جاتے تو وہ اژدہا انہیں بھی نگل جاتا۔

عدالت عظمیٰ نے جو وضاحت طلب کی تھی اس کے جواب میں حلف نامہ کے اندر درج تھا کہ ۲۰۱۴ء۔ ۱۵میں منریگا کے تحت کام کرنے والوں میں سے صرف ۲۷ فیصد کو ان کا محنتانہ ادا کیا گیا یعنی ۷۳ فیصد لوگ اپنی شدید ترین مجبوری کے عالم میں اس مدد سے محروم رہے۔ منریگا پر سیاست تو خوب ہوئی پہلے تو گزشتہ حکومت کی ناکامی قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا گیا پھر ناکامی کی یادگار کے طور پر جاری رکھنے کا عزم کیا۔ منریگا کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ اس کے تحت مزدور کو اسی شام مزدوری چکائی جاتی تھی لیکن نئی سرکار کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ مزدور کو ۳ ماہ تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی مزدور بھلا اس اسکیم میں کام ہی کیوں کرے؟ اور اپنی مزدوری پانے تک زندہ کیسے رہے؟ دوسرے سال یعنی ۲۰۱۵ء۔ ۱۶ میں قدرے بہتری آئی اس کے باوجود صرف ۴۵ فیصد کو ان کی مزدوری وقت پر ملی ۵۵ فیصد پھر بھی محروم ہی رہے۔

دیہی ترقیات کے مرکزی وزیر بریندر سنگھ نے کو ضاحت کی کہ مہاتما گاندھی دیہی

روزگار گارنٹی ایکٹ کے نفاذ کے سلسلے میں ریاستوں کو ۱۲۲۳۰ کروڑ روپے جاری کئے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس رقم کے اجراء سے ریاستوں کی زیر التواء اجرت کی ذمہ داری کو نمٹایا جائے گا اور نئے مالی سال کے دوران ریاستوں کو مدد ملے گی۔

حلف نامہ کے مطابق ۷۹۸۳ کروڑ روپے کی رقم ریاستوں کے بقایا جات کی ہے اور ۲۷۲۳ کروڑ روپے خشک سالی کا شکار ریاستوں میں منریگا کے تحت کام کرنے والے مزدوروں کیلئے ہے تا کہ انہیں مزید ۵۰ دن کا روزگار مل سکے۔ عدالت نے وعدوں پر طنز کستے ہوئے کہا کہ نئی مزدوری کے خواب چھوڑیئے اور پہلے پرانی ادائیگی کیجئے۔ کیا آپ چاہتے ہیں دیگر ریاستوں کے مزدور اس بات کا انتظار کریں کہ جب اس کی ریاست کو قحط زدہ نامزد کیا جائے تو اس کے بعد وہ اضافی مزدوری کیلئے آپ کے پاس آئے۔

عوامی مسائل کے تئیں حکومت کی بے حسی کے ایک علامت مہاراشٹر میں آئی پی ایل کے کھیلوں کا انعقاد بھی ہے۔ گزشتہ ہفتے مہاراشٹر میں آئی پی ایل کی میزبانی کے خلاف ایک غیر سرکاری تنظیم 'لوک ستہ موومنٹ' کی داخل کردہ مفاد عامہ کی عرضی کی سماعت کے دوران ممبئی ہائی کورٹ نے مہاراشٹر کرکٹ اسوسی ایشن (ایم سی اے) کی سرزنش کی اور بورڈ آف کنٹرول فار کرکٹ اِن انڈیا (بی سی سی آئی) سے کہا کہ ریاست کے قحط زدہ علاقوں سے انڈین پریمیر لیگ (آئی پی ایل) میچز کو منتقل کردیں۔ ہائی کورٹ نے ایم سی اے سے کہہ دیا کہ پانی کی

حفاظت ٹورنامنٹ کے انعقاد سے کہیں زیادہ اہم ہے، بالخصوص ایسے وقت میں جب ریاست پانی کی شدید قلت سے دوچار ہے۔ آپ لوگ اس طرح پانی کیوں کر ضائع کر سکتے ہو۔ عوام زیادہ اہم ہیں یا آپ کے آئی پی ایل میچز؟ آپ اس قدر بے پرواکیسے ہو سکتے ہو؟'' یہ دراصل حکومت کے کرنے کا کام ہے لیکن چونکہ وہ اپنی ذمہ داری سے گریز کر رہی اس لئے مجبوراً عدالت کو میدانِ عمل میں آنا پڑ رہا ہے۔

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکومت یہ سب نہیں کر رہی ہے تو کر کیا رہی ہے؟ اس بابت چند ماہ قبل مہاراشٹر کی ریاستی حکومت پر یہ سنگین الزام لگا تھا کہ اس نے ودربھ کے کسانوں کی فلاح بہبود پر مختص رقم کا کچھ حصہ کوریا کے رقاصوں پر خرچ کردیا۔ اس سال مہاراشٹر کے ۳۲۰۰ سے زیادہ کسان خودکشی کر چکے ہیں جو پچھلے ۱۴ سالوں میں سب سے زیادہ ہے اس کے باوجود وزیراعلیٰ کو کسانوں کے مسائل حل کرنے کے بجائے ''بھارت ماتا کی جئے'' کا نعرہ لگا رہے ہیں اور اعلان عوام کو فریب دینے کیلئے فرمارہے ہیں کہ اگر مجھے وزیراعلیٰ کے عہدے سے ہاتھ دھونا پڑا تب بھی میں باز نہیں آوں گا۔ دیویندر فردنویس کی اس حماقت خیز سیاست کا سب سے اچھا جواب کٹر قوم پرست پارٹی اور بی جے پی کی حلیف شیوسینا کے رہنما ادھو ٹھاکرے نے دیا۔ اپنے اخبار سامان کے اداریہ میں انھوں نے لکھا کہ فی الحال بھارت ماتا کی جئے پر

سیاست زوروں پر ہے۔ مجھے زیادہ خوشی ہوتی اگر فرد نویس کہتے کہ وہ مہاراشٹر کے ہر گھر میں پانی پہنچائیں گے یا مستعفی ہو جائیں گے۔

ادھو ٹھاکرے نے کہا نعرہ لگانے کیلئے انسان کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ بھارت ماتا کے بیٹے پانی کو ترس رہے ہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یاد دلایا کہ نوجوان ناانصافی کے خلاف اسلحہ اٹھا کر نکسلوادی بن جاتے ہیں۔ کیا مراٹھواڑہ کے نوجوانوں کو ایک گھونٹ پانی کیلئے دہشت گرد بن جانا پڑے گا؟ اگر ایسا ہو گیا تو بھارت ماتا کا نعرہ بے معنی ہو جائیگا۔ اگر بھارت کے لوگ خوش نہ ہوں گے تو بھارت ماتا کبھی بھی خوش نہیں ہو سکتی۔ بھارت ماتا کی جئے دراصل عوام کی جئے ہے لیکن عوام کے پاس پینے کیلئے پانی نہیں ہے۔ مویشی مر رہے ہیں اور کھیت قبرستان بنتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا یہ بھارت ماتا کے خوابوں کا مہاراشٹر نہیں ہے وزیر اعلیٰ میدان چھوڑ کر بھاگنے کے بجائے) اپنی کرسی پر براجمان رہئے مگر ہر گھر میں پانی) پہنچایئے۔ کیا ادھو ٹھاکرے نہیں جانتے کہ جب حکومتیں اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں تو اس طرح کے گمراہ کن نعرے لگاتی ہیں۔

اس موقع پر ڈیڑھ سال قبل ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۴ کے دن دیا جانے والا سپریم کورٹ کا تبصرہ یاد آتا ہے جبکہ اس نے نئی دہلی مرکزی حکومت کی لاپرواہی سے

ناراض ہو کر بے حد تلخ لہجے میں سرکار کو رامائن میں روان کے بھائی کمبھکرن اور ۱۹ ویں صدی میں لکھی گئی اروِن واشنگٹن کی مشہور کہانی رپ وین ونکل کے کام چور کردار سے تشبیہ دی تھی۔ ماحولیاتی معاملات میں لاپرواہیوں سے ناراض سپریم کورٹ کی بنچ کے جسٹس دیپک مشرا اور آر ایف نریمن وزارت ماحولیات پر جم کر برسے تھے۔ عدالتِ عالیہ نے کہا تھا ''مرکزی حکومت کمبھ کرن کی نیند میں سوئی ہوئی ہے اور رِپ وین ونکل کا طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہے''۔اتراکھنڈ کی الکنندہ اور بھگیرتھی ندیوں پر پن بجلی گھروں کی تعمیر کا معاملہ زیر سماعت تھا۔ عدالت نے کہا تھا کہ ہمیں بجلی کی ۲۴ ضرورت ہے لیکن اس کا ماحولیاتی عناصر یعنی مچھلیوں اور دیگر آبی مخلوقات کے ساتھ توازن قائم ہونا لازمی ہے۔

عدالت نے مذکورہ تعمیراتی منصوبے پر روک لگا کر ایک ۱۳ رکنی تکنیکی ماہرین کی کمیٹی تشکیل دی اور حکومت کو دو ماہ کے اندر رپورٹ جمع کرنے کی تلقین کی لیکن حکومت حسب روایت مذکورہ رپورٹ جمع کرنے میں ناکام رہی۔ اس کمیٹی میں دو سرکاری افسران سمیت باقی ۱۱ ارکان کی متفقہ رائے تھی کہ یہ منصوبہ ناقص اور نقصان دہ ہے۔ سرکاری ادارہ این ٹی پی سی نقشہ بدلنے کیلئے تیار تھا اس کے باوجود حکومت ۳ ماہ تک اپنی رپورٹ مرتب کرکے کوئی فیصلہ نہ کرسکی اور یومیہ ۹ کروڑ کے حساب سے امبانی کی ایل اینڈ ٹی کو بغیر کسی کام کے ادائیگی

کرتی رہی ہے۔ اس موقع پر جج صاحبان نے اعتراف کیا تھا کہ یہ معاملات حکومت کی دائرۂ کار میں آتے ہیں اور عدالت اس ناپسندیدہ مداخلت سے خوش نہیں ہے۔

اس یادگار فیصلے میں عدالت عالیہ نے راون کے بھائی کمبھ کرن کا ذکر کیا تھا جو کم از کم ۶ ماہ سونے بعد جاگ جاتا تھا لیکن یہ حکومت نے اپنے دوسال مکمل کرنے جارہی۔ عدالت کی تمام تر کوشش کے باوجود ہنوز خواب غفلت میں پڑی ہوئی اور لگتا ہے شاید آئندہ انتخابی نتائج ہی اسے نیند سے بیدار کریں گے۔ سپریم کورٹ نے حکومت کا موازنہ ۱۹ ویں صدی کی جس لازوال کہانی کے کاہل اور نااہل کردار رِپ وان ونکل سے بھی کیا تھا۔ موجودہ حکومت تو گویا اس کا پونر جنم ہے۔ رِپ وین ونکل خواب آور کہانیاں سنانے کے سبب بچوں میں بہت مقبول تھا لیکن چونکہ اپنے کھیت اور گھر کی دیکھ ریکھ پر توجہ نہیں دیتا تھا اس لئے بیوی کی لعنت ملامت کا شکار رہتا تھا۔

ایک دن اس مصیبت سے بچنے کیلئے وہ دور پہاڑوں پر چلا گیا جیسا کہ آج کل ہمارے سیاسی رہنما غیر ملکی دوروں پر نکل جاتے ہیں۔ اور وہاں اس نے ایک بزرگ کو دیکھا جو موسیقی بجا رہے تھے۔ وہ اس میں کھوگیا اور سوگیا۔ رپ وین جب نیند سے بیدار ہوا تو اس کی داڑھی کئی فٹ طویل ہو چکی تھی۔ وہ جب واپس اپنے گھر آیا تو اس کے سارے ہمعصر دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔ اس کا نوازئیدہ بیٹا

ادھیڑ ہو چکا تھا اور امریکہ کے اندر انقلاب برپا ہو چکا تھا کنگ جارج ۳ کے بجائے جارج واشنگٹن اقتدار پر فائز ہو چکے ہیں۔ ویسے تو سپریم کورٹ نے ''ہونہار بروان کے چکنے چکنے پات'' دیکھ کر عصر حاضر کے وِنکل کی نشاندہی ڈیڑھ سال پہلے ہی کردی تھی لیکن اگر وہ ایسا نہ بھی کرتا تب بھی وقت کے ساتھ ملک کے باشعور عوام اس کو پہچان جاتے کہ وہ کون پائیڈ پائیپر ہے جو اپنی جادوئی شہنائی کے سحر میں گرفتار کرکے اپنے وفادار چوہوں کو تباہی کے دہانے پر لئے جارہا ہے؟

کشمیر جل رہا ہے، شعلے اگل رہا ہے

کشمیر میں نئی حکومت کے قائم ہوتے ہی تشدد پھوٹ پڑا۔ کئی بے قصور شہری زخمی اور پانچ جاں بحق ہو چکے ہیں۔ مرحومین کے سوگواروں کا غم بانٹنے اور زخمیوں کے گھاو پر مرہم رکھنے کیلئے مرکزی وزراء تو کجا ریاستی وزیر اعلیٰ اور ان کا نائب تک نہیں گیا۔ ویسے بی جے پی کے صوبائی صدر اور رکن اسمبلی ست شرما نے اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے ایک ایسے تشدد کا الزام علٰحیدگی پسندوں پر لگا دیا جس میں عام شہری حفاظتی دستوں کی گولی کا نشانہ بنے ہیں۔ انہوں نے حالیہ تشدد کو فوج کو بدنام کرنے کی سازش بھی قرار دیا لیکن سوال یہ ہے اس سازش پر عمل درآمد کس نے کیا؟ حفاظتی دستوں سے کس نے کہا کہ وہ بے دریغ گولیاں چلائیں اور آنسو گیس کے ڈبے اس زور سے پھینکیں کہ اس سے نوجوان ہلاک ہو جائے؟

اس طرح کی الزام تراشی کے بعد تحقیقات کا مطالبہ از خود بے معنی ہو جاتا ہے۔ کیا کشمیر کے علاوہ ملک کے کسی اور صوبے میں حفاظتی دستوں کے ظلم و جبر کے بعد اربابِ اقتدار اپنی ریاست کے اکثریتی طبقے کے خلاف اس طرح کا بیان دے سکتے ہیں؟ اس بیان کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے عام لوگوں کے نہیں فوج کہ ووٹ سے منتخب ہوئی ہے ویسے جہاں تک وادی کا سوال ہے جہاں ساری نشستوں پر اس

کی ضمانت ضبط ہو گئی عوام نے اسے ووٹ بھی تو نہیں دیا خیر۔ جموں کشمیر بی جے پی کے سربراہ ست شرما جو عوام کے خون ناحق کے بجائے حفاظتی دستوں کی بدنامی کو لے کر پریشان ہیں انہیں چاہئے کہ ہریانہ میں منظر عام پر آنے والی پرکاش سنگھ پینل کی رپورٹ دیکھ لیں۔

پرکاش سنگھ سابق پولس سربراہ ہیں اور انہیں جاٹ مظاہروں کے دوران پولس بغاوت کی تفتیش کا کام سونپا گیا تھا۔ اس پینل کے مطابق تشدد کے دوران بی جے پی کے زیر اقتدار ہریانہ کی ہر ضلع میں اوسطاً ۶۰ سے ۷۰ پولس والوں نے اپنے افسران کے احکامات کی بجاآوری سے انکار کردیا تھا۔ ان میں سے کئی نازک ترین حالات میں رخصت پر چلے گئے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود لوگ بھی خاموش تماشائی بنے دوکانوں، گھروں بلکہ پولس تھانوں تک کو لٹتا اور جلتا ہوا دیکھتے رہے تھے۔ عام پولس کانسٹبل تو درکنار ڈی جی پی وائی پی سنگھل نے بھی دورانِ فساد شورش زدہ علاقوں کا ایک بھی دورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ امن کی بحالی کے بعد وہ صرف ایک بار وزیر اعلیٰ منوہر لال کھٹر کے ساتھ روہتک آئے تھے۔ اب اس رپورٹ پر سخت کارروائی کی تیاری چل رہی ہے کیا ایسا کرنے سے حفاظتی دستوں کے حوصلے پست نہ ہوں گے؟ اور اس کارِ خیر کو کون انجام دے گا؟

کشمیر کا تشدد ابھی ختم بھی نہیں ہوا کہ گجرات میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ پٹیلوں کی ۷ رکنی کمیٹی وزیراعلیٰ سے ملاقات کرتی مہسانہ ضلع میں پاٹیدار انامت آندولن سمیتی نے ہاردک پٹیل کی رہائی کو لے احتجاج کرنے کا اعلان کیا۔ ضلعی انتظامیہ نے مظاہرے کی اجازت نہیں دیا اس کے باوجود سرکاری احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے زبردست جلوس نکالا گیا، جلسہ عام بھیہوا اور مجمع نے پولس پر پتھراو کیا۔ اس تشدد میں ایک ایکزیکیوٹیو مجسٹریٹ کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی پانچ پولس اہلکار اور دو عہدیدار زخمی ہوئے جبکہ ۲۵ مظاہرین کو بھی معمولی چوٹ آئی۔ مشتعل مظاہرین نے وزیر داخلہ رجنی پٹیل کے گھر کو آگ لگادی اس کے باوجود انتظامیہ نے کمال صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف لاٹھی چارج اور آنسو گیس پر اکتفاء کیا۔ اس کے برعکس ہندوارہ میں تو مظاہرین نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ وہاں پر سنگ باری کیلئے پتھر بھی نہیں تھے کسی پولس والے کو خراش تک نہیں آئی کوئی آگ زنی نہیں ہوئی پھر بھی گولی چلی اور ہلاکتیں ہوئیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیاایک راشٹر میں ایک ودھان اور ایک نشان کا نعرہ لگانے والوں کو یہ تفریق و امتیاز زیب دیتا ہے؟ ویسے اقتدار کی خاطر محبوبہ مفتی کے ساتھ الحاق کرکے بی جے پی نے شیاماپرشاد مکرجی کے نام نہاد بلیدان پر بھی خاک ڈال دی ہے۔

نائب وزیراعلیٰ ڈاکٹر نرمل سنگھ تو خیر مظلومین سے ملنے کیا جاتے کشمیریوں

کو نام نہاد غمگسار محبوبہ مفتی بھی سرینگر سے ۶۹ کلومیٹر دور ہندوارہ جانے کے بجائے دہلی پہنچ گئیں۔ وہاں پر انھوں نے کشمیریوں کیلئے چاول کا مطالبہ کیا، ملازمین کی تنخواہ کیلئے مالی معاونت کی یقین دہانی کرائی اور وزیر دفاع سے مل کر تحقیقات کے وعدے سمیت لوٹ آئیں۔ گزشتہ سال مارچ تک اس طرح کی ۳۵ تحقیقات جاری تھیں ان میں مزید کتنا اضافہ ہوا ہے کون جانے؟ ماہرین کا خیال ہے کہ ان تحقیقات کی رپورٹ تک مکمل نہیں ہوتی اس بنیاد پر کسی ملزم کو سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کشمیر میں تازہ احتجاج کی وجہ ایک طالبہ پر فوجی کے ذریعہ دست درازی کا الزام تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا اس شکایت کے آتے ہی پولس ایف آئی آر درج کرتی اور تفتیش شروع کردیتی۔ اس میں اگر صداقت پائی جاتی تو ملزم کو گرفتار کیا جاتا نیز طالبہ کو حقوق انسانی کے کارکنان کے سامنے اپنا موقف واضح کرنے کا موقع دیا جاتا۔ جب یہ تفصیلات ذرائع ابلاغ میں آتیں تو اپنے آپ افواہوں کا دروازہ بند ہو جاتا لیکن ہوا یہ کہ طالبہ اور اس کے والد کو بلا جواز حراست میں لے لیا گیا اور لڑکی کو ماں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں دی گئی جس سے شکوک و شبہات نے جنم لیا اور وہ پریس میں پہنچ گئی۔

یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک ماہ قبل راجستھان کے چتوڑ گڈھ میں واقع میواڑ یونیورسٹی میں چار کشمیری طلباء کو اپنے گھر میں بفک بنا کر کھانے کے الزام

میں ہندو طلباء نے پیٹ دیا۔ وہ طلباء اس قدر متشدد تھے کہ انہوں نے خوب جم کر نعرے بازی کی اور کیمپس کے باہر ایک گوشت کی دوکان بھی جلادی لیکن انہیں گرفتار کرنے کے بجائے انتظامیہ نے مظلوم طلباء کو حراست میں لے لیا۔ پولس افسر کو یقین تھا کہ یہ بیف نہیں ہے پھر بھی اس کا نمونہ جانچ کیلئے بھیج دیا گیا۔ راجستھان میں گوشت خوری کی اجازت ہے لیکن میواڑ یونیورسٹی کے احاطے میں وہ ممنوع ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کینٹین میں تو صرف سبزی ہی فراہم ہوتی ہوگی۔ اب جو طلباء گوشت کھانا چاہیں ان کیلئے گھر میں کھانا بنانے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ چونکہ صوبے میں گئو کشی پر پابندی ہے اس لئے لامحالہ وہ بیف نہیں کھا سکتے۔ لیکن انتظامیہ کی سرپرستی میں غنڈہ گردی گھروں میں داخل ہوجائے تو اس پر کس کا زور چلتا ہے؟ نظامیہ اگر کشمیری طلباء کے بجائے حملہ آوروں کو حراست میں لیتا تو ان کی حوصلہ شکنی ہوتی لیکن بی جے پی والے چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتے۔

کشمیر میں جب طالبہ اور اس کے والد کو غیر قانونی حراست میں لے لیا گیا تو افواہوں کے پر لگ گئے۔ الزام چونکہ فوج پر تھا اس لئے لوگ چھاونی کے سامنے احتجاج کرنے کیلئے پہنچ گئے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان کی غلط فہمی دور کی جاتی یا بحالتِ مجبوری لاٹھی چارج کرکے منتشر کردیا جاتا لیکن ان کی بات سن کر انہیں اعتماد میں لینے کے بجائے ان پر گولیاں برسائی گئیں۔ اس

سانحہ میں دو لوگ تو جائے حادثہ پر ہلاک ہوگئے جن میں ایک ابھرتا ہوا کرکٹ کھلاڑی نعیم بٹ تھا اور ایک خاتون بھی تھی جو دور کھیت میں کام کر رہی تھی دیگر تین نوجوانوں کا انتقال اسپتال میں ہوا۔ اس ظلم کی پردہ پوشی کیلئے انتظامیہ نے نہایت بچکانہ اور بھونڈا طریقہ اختیار کیا۔

فوج نے اپنی صفائی میں ایک ویڈیو پیش کی جس میں طالبہ کا یہ اعتراف موجود تھا کہ اس کے ساتھ فوجی نے نہیں بلکہ دو نا معلوم مقامی طلبہ نے بدسلوکی کی۔ ویڈیو کی بابت یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ اعتراف ذرائع ابلاغ کے سامنے ہوا ہے جبکہ اس میں طالبہ اپنے مخاطب کو پولس انکل کہہ کر پکارتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ بیان پولس کی حراست لیا گیا ہے اور ایسی حراست میں جو غیر قانونی تھی اس لئے اس کی بھلا کیا حیثیت؟ اس ویڈیو کا فوج کے ہاتھ لگ جانا اور سوشل میڈیا میں پھیل جانا بے شمار شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے۔ عدالت میں جج نے پولس کی غیر قانونی حراست کیلئے سرزنش کی اور فوراً طالبہ کو اس کے والد سمیت حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جج کے سامنے بھی طالبہ نے فوجی کے بجائے دوسرے طالب علم پر دست درازی کا الزام لگایا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کام میں مجرمانہ تاخیر کے سبب جو ۵ بے قصور لوگوں کی جان گئی اس کیلئے کون ذمہ دار ہے؟ صرف دو پولس کانسٹبل کو معطل کردینے سے نہ مرنے والے زندہ ہوں گے اور نہ پسماندگان کے زخم بھریں گے۔

ہندوارہ میں جب سنگ باری کا الزام بھی کمزور ہوگیا تو یہ کہا گیا کہ وہ ہجوم فوجی چھاونی کو آگ لگانے جارہا تھا حالانکہ اس کے حق میں بھی کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکی۔ کشمیر میں ہر احتجاج کو شدت پسندی سے جوڑ دیا جاتا حالانکہ حفاظتی دستوں کے خلاف تشدد کے واقعات کشمیر سے کہیں زیادہ شمال مشرقی صوبوں اور نکسلواد سے متاثر قبائلی علاقوں میں رونما ہوتے ہیں۔ ابھی حال میں ۳۰ مارچ کو چھتیس گڈھ میں نکسلوادیوں نے ایک فوجی ٹرک کو بارودی سرنگ سے اڑا کر سی آر پی ایف کے ۷ جوانوں کو ہلاک کردیا۔ ۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۴ء کے اندر اس ایک ریاست میں ۵۳ حفاظتی دستے کے اہلکار نکسلواڑوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے جبکہ صرف ۴۰ نکسلی اسلحہ بردار مارے گئے۔ چھتیس گڈھ میں اسلحہ برداروں کے سامنے بے دست و پا حفاظتی دستے کشمیر کے نہتے مظاہرین کے سامنے اپنی بہادری کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ بقول شاعر

ظلم و ستم کی زد میں کشمیر کی ہے وادی، مفقود زندگی کے آثار ہو چکے ہیں
تیور بتا رہے ہیں بدلے ہوئے فلک کے، فتح مبیں کے ظاہر آثار ہو چکے ہیں

کشمیری تشدد کو بلادریغ علٰحیدگی پسندی سے منسوب کردینا درست نہیں ہے بلکہ اکثر و بیشتر مواقع پر حقوق انسانی کی پامالی کے خلاف احتجاج کرنے والے سرکاری دہشت گردی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس کی سب سے واضح مثال ۲۰۱۰ء کا

تشدد تھا جس میں ۱۰۰ سے زیادہ لوگوں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ یہ احتجاج کسی غیر ملکی یا علٰحیدگی پسند تنظیم کے اکسانے پر نہیں ہوا تھابلکہ اس سال ۳۰ اپریل کو شہزاد احمد، شفیع لون اور ریاض احمد نامی سوپور کے تین نوجوانوں کو اچھی مزدوری کا لالچ دے کر فوج میں حمال کی ملازمت پر رکھا گیا اور پھر انہیں ہلاک کر کے دہشت گرد قرار دے دیا گیا۔ یہ ہوائی الزامات نہیں ہیں بلکہ ۵ سال بعد فوج نے اس سنگین جرم میں اپنے ۵ اہلکاروں کو تاعمر قید کی سزا سنادی۔ اس لئے ہر سرکاری تشدد کو علٰحیدگی پسندی کے قلع قمع کے نام پر جائز قرار دے دینا غلط ہے۔ سچ تو یہ ہے یہی رویہ علٰحیدگی پسندی کے رجحان کو پروان چڑھاتا ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف سابق فوجی سربراہ جنرل وی کے سنگھ نے مذکورہ سانحہ کے بعد جون ۲۰۱۰ میں کیا تھا۔انہوں نے وادی میں تشدد اور احتجاجی مظاہروں کے دوران غیر مسلح نوجوانوں پر فائرنگ کے واقعات کے تناظر میں کشمیر مسئلے کے سیاسی حل کی وکالت کی تھی۔ روزنامہ 'ٹائمز آف انڈیا' کے ساتھ ایک انٹرویو میں جنرل وی کے سنگھ نے کہا تھا ''میرے خیال میں اب مختلف سیاسی نظریات کے حامل لوگوں کو اکٹھا کر کے اُن کے ساتھ جامع بات چیت کی ضرورت ہے۔ بھارتی فوج نے کشمیر میں داخلی سلامتی کی مجموعی صورتحال پر قابو تو پالیا ہے لیکن اب مسائل کو سیاسی لحاظ سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔'' یہ حسن اتفاق ہے کہ جنرل

وی کے سنگھ فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد فی الحال سیاست کی دنیا میں اپنے قدم جما چکے ہیں اور نائب وزیر خارجہ ہیں۔ ان کیلئے سیاسی حل نکالنے کے بھرپور مواقع موجود ہیں لیکن شاید قومی مفاد پر ذاتی فائدے کی فوقیت نے انہیں اپنا سابقہ بیان بھلا دیا ہے۔ آج کل تو وہ سوائے متنازع بیان دینے کے خود وزارتِ خارجہ کا بھی کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ یقیناً صحبت کا اثر ہے۔

ہندوارہ سانحہ کے بعد مزید ۳۶۰۰ فوجیوں کو روانہ کروانے والے مسٹر سنگھ کو یاد نہیں کہ انہوں نے کہا تھا ” ریاستی پولس کو اب مزید سرگرم ہونے کی ضرورت ہے تاکہ کشمیر میں تعینات تقریباً پانچ لاکھ فوجیوں کی تعداد میں کمی کی جاسکے“۔ٹی وی کو انٹرویو میں جنرل وی کے سنگھ یہ کہہ چکے ہیں کہ سیکورٹی فورسز کشمیر کیبگڑتی ہوئی صورتحال پر قابو پانے کیلئے کافی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کشمیر میں امن وامان کی صورتحال انتہائی کشیدہ ہے جس کے پیچھے بہت سے محرکات ہیں اوران میں سے ایک مقامی لوگوں کے اندر اعتماد بحالی میں ناکامی ہے۔ انہوں نے قیامِ امن کی خاطر فوج کی تعیناتی کے علاوہ سول اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا ہے۔

جنرل وی کے سنگھ جس مسئلۂ کشمیر کی پر تشویش کا اظہار کر رہے تھے اس کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے حقوق انسانی کی متعدد تنظیموں

کے مطابق کشمیر میں گزشتہ اکیس برسوں سے جاری مسلح کشمکش کے نتیجے میں ۸۰ ہزار سے زائد کشمیری جاں بحق ہوئے ہیں۔ اس بابت علیٰحدگی پسندوں کا دعویٰ ہے کہ مرنے والے شہریوں کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کرتی ہے جبکہ حکام بھی ۴۷ ہزار کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس صورتحال کی بہترین عکاسی اعجاز رحمانی نے اس طرح کی ہے۔

آج اس وادی کے بیٹے بیٹیاں
نوجواں بے جرم پاتے ہیں صدا
دل دکھاتی ہے یتیموں کی صدا
حشر ہے وادی میں ہر جانب بپا
،بے اماں اب وادیٔ کشمیر ہے
خون میں ڈوبی ہوئی تصویر ہے

مسئلۂ کشمیر کو حل کرنے کیلئے کشمیریوں کی نفسیات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ نومبر ۲۰۱۴ میں فوج کی گولی سے دو نوجوان شہید ہو گئے تھے۔ فوج نے مرحومین کے ورثاء کو ۱۰ لاکھ معاوضہ دینے کا اعلان کیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے فیصل یوسف کے والد یوسف بٹ اور معراج الدین ڈار کے والد غلام محمد ڈار نے رقم لینے سے انکار کردیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ قاتلوں کو ہمارے حوالے کیا جائے یا ان شناخت بتائی جائے۔ دراصل مطالبہ یہ تھا کہ روپیہ دے کر بہلانے

پھسلانے کے بجائے قاتلوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ بڈگام کا یہ واقعہ ریاست کی انتخابی مہم کے دوران پیش آیا تھا۔

وزیراعظم نریندر مودی نے مذکورہ سانحہ کے بعد سرینگر کا دورہ کیا تھا اور انتخابی جلسے میں وعدہ کیا تھا کہ وہ قاتلوں کو سزا بحال کریں گے۔ گزشتہ ۳۰ سالوں کے اندر کسی ہندوستانی وزیراعظم کا یہ پہلا جرأتمندانہ اعتراف تھا جس سے بہت ساری امیدیں وابستہ کی گئی تھیں۔ اس بیان نے یہ پیغام دیا تھا کہ وہقاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر کشمیری عوام کا دل جیتنا چاہتے ہیں لیکن ہندوارہ کے معاملے میں ان کی معنی خیز خاموشی اس حقیقت کی غماز ہے کہ وہ تو صرف انتخاب جیتنا چاہتے تھے۔ اہل اقتدار کی سمجھ میں جب تک یہ بات نہیں آتی کہ کشمیری عوام کا اعتماد حاصل کئے بغیر کشمیر کو ساتھ نہیں رکھا جاسکتا اس وقت تک وادیٔ کشمیر میں امنوامان قائم نہیں ہو سکتا۔

یمن میں امن : خزاں رسیدہ چمن میں بہار مشکل ہے

شمالی اور جنوبی کوریا آج بھی ایک دوسرے کے کٹر دشمن ہیں لیکن شمالی اور جنوبی یمن نے ۱۹۷۹ء کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ انضمام کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اتفاق سے وہ تاریخی اتحاد جس کویت میں قرار پایا تھا وہیں پھر ایک بار محارب یمنی گروہ مفاہمت کیلئے ۳۷ سال بعد پھر جمع ہوئے۔ اولین معاہدے کی تکمیل میں کویت کے جس وزیر خارجہ شیخ صباح الاحمد الصباح نے اہم ترین کردار ادا کیا تھا وہ آج کل سربراہ مملکت ہیں۔ اس معاہدے کے بعد علی عبداللہ صالح یمن کے صدر بنے تھے جن کو حوثیوں نے ۲۰۰۴ء میں زخمی کرکے سعودی عرب بھگا دیا۔ صالح نے موجودہ حوثی رہنما عبدالمالک کے بھائی حسین کو ہلاک کردیا تھا لیکن فی الحال علی صالح حوثیوں کے ساتھ ہیں۔

موجودہ صدر عبدوالربوہ منصور ہادی کو بھی صنعاء سے بے دخل کرکے سعودی عرب فرار ہونے پر مجبور کردیا گیا تھا لیکن وہ آج کل عدن سے حکومت کررہے ہیں۔ اس طرح گویا عملاً یمن پھر ایک بار دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے جہاں دو حکومتیں ہیں جن میں سے ایک کو سعودی عرب کی سرپرستی اور دوسرے کو ایران کی حمایت حاصل ہے۔

سعودی اور ایران مخالف فریقین کی ہمنوائی کے باوجود کویت میں یمن مذاکرات

کے حامی تھے۔ امن مذاکرات کا مقصد ۱۳ ماہ سے جاری کشیدگی اور خانہ جنگی کا خاتمہتھا۔ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ان مذاکرات میں سیکریٹری جنرل کے نمائندے اسماعیل ولد الشیخ احمد نے یمن میں جاری حملوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے، دونوں فریقوں سے درخواست کی تھی کہ تشدد کے خاتمے کے لئے پائیدار اور جامع سمجھوتے کے حصول میں تعاون کریں۔ ویسے امریکی محکمۂ خارجہ کے ترجمان، جان کربی اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہیمن میں حالیہ جنگ بہت حد تک رک چکی ہے۔ اس کے باوجود امریکہ سمجھتا ہے کہ یہ مذاکرات یمن کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے فوجی تنازعہ ختم کرکےپُرامن سیاسی عمل کی امید ظاہر کی تھی۔

یمن کے لیے اقوام متحدہ کے ایلچی، اسماعیل شیخ احمد کے مطابق یہ مذاکرات مندرجہ ذیل ۵ نکات پر مشتمل تھے :

سلامتی کے عبوری اقدامات ○

، مسلح گروہوں کے انخلا ○

، بھاری ہتھیاروں کو حکومت کے حوالے کرنا ○

سرکاری اداروں کی بحالی کیلئے سیاسی گفت و شنید ○

قیدیوں اور زیر حراست افراد کے بارے میں ایک خصوصی کمیٹی کی تشکیل ○

ماضی کے تجرباتکی روشنی میں توقع کی گئی تھی کہ دونوں فریق رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے موجودہ بحران کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ لیکن یہ
گفتگو بھیتعطل کا شکار ہوگئی۔ حوثیوں کا کہنا تھا کہ وہ مصالحت کیلئے تیار ہیں مگر چونکہ فی الحال ان کا پلہّ بھاری ہے اس لئے حکومت سازی میں ان کی بالادستی ہو۔ اس کے برعکس حکومت کا موقف ہے چونکہ حوثیوں نے بزور قوت قبضہ جمایا ہے اس لئے ان کو (نقص امن) کاخطاکار قرار دیا جائے نیز حوثیوں کو ہتھیار ڈال کراہم شہروں کے اقتدار سے بے دخل ہوجانا چاہیۓ۔ مذاکرات سے قبل حوثی کہہ چکے تھے کہ وہ اپنا اسلحہ اور مقدر دشمنوں یعنی حکومت کے حوالے نہیں کریں گے۔ حوثی چاہتے تھے عرب اتحادی فوج کے ہوائی حملے فوراً بند ہوں۔ سرکار کی شرط ہے کہ جنگ بندی کے دوران مقبوضہ علاقوں کیلئے محفوظ راستوں کا تعین، قیدیوں و محصورین کی رہائی اور اعتماد بحالی کی کوششوں کو مذاکرات کے ایجنڈے میں شامل ہونا چاہیۓ۔اس طرح شکوک شبہات کے ماحول بات چیت کو ناکام ہونا تھا سو ہو گئی۔

یہ مذاکرات ایسے وقت میں ہورہے ہیں جب کہ مشرق وسطیٰ سے امریکہ کے تعلقات ایک نئے موڑ پر پہنچ چکے ہیں۔ امریکہ کا سب سے قدیم اور قابلِ اعتماد حلیف سعودی عرب اس سے شاکی اور ناراض ہے نیز ماضی قریب کا سب سے بڑا دشمن ایران اس سے خوش اور مطمئن ہے۔ عام طور ایران کے جن اقدامات پر امریکہ آسمان سر

پر اٹھا لیا کرتا تھا ان پر خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے مثلاً بیلسٹک میزائلوں کے تجرباتکو امریکہ نے نظر انداز کردیا۔ سعودی عرب کے سفارت خانے کو جلائے جانے کااس نے نوٹس نہیں لیا۔ ایران کوروس سے ملنے والے ایس۔۳۰۰ میزائلوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا۔ بشار اور حوثیوں کی مدد سے بھی صرفِ نظر کیا گیا۔ امریکی رویہ میں یہ تبدیلی سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کیلئے باعث تشویش ہے۔

صدر اوبامہ نے جی سی سی ممالک کی کانفرنس میں شرکت کیلئے اس بار جب سعودی عرب کا دورہ کیاتوہوائی اڈے پر ان کا استقبال کرنے کیلئے شاہ سلمان تو کجا ان کا ولیعہد بلکہ نائب ولیعہد بھی نہیں آئے تعلقات کی سرد مہری کا شاخسانہ ہے۔ ریاض شہر کے گورنر جنہوں نے مودی جی کا خیر مقدم کیا تھا وہی آئے۔ گزشتہ تین سالوں میں یہ اوبامہ کا تیسرا دورہ ہے۔ مارچ ۲۰۱۳ میں جب وہ سعودی عرب آئے تھے تو اس وقت شاہ عبداللہ حیات تھے اور خام تیل کا بھاو تقریباً ۱۰۰ڈالر فی بیرل تھا۔ اوبامہ نے سعودی عرب سے ڈاکٹر محمد مورسی حکومت کی حمایت کا مطالبہ کیا تھا۔ اس بات نے دونوں ملکوں کے تعلقات یں تلخی پیدا کردی تھی۔ امریکہ نے شام میں بشارالاسد کی حکومت کو کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال پر سزا دینے سے متعلق اپنے سابقہ اعلان پر یوٹرن لے کر سعودی حکمرانوں کو مایوس کیا تھا۔ اسی زمانے یں امریکی انتظامیہ ایران کے ساتھ

گفت و شنید کا آغاز کرچکی تھی۔ جنوری ۲۰۱۵ء میں شاہ عبداللہ کی موت کے موقع پر جب اوبامہ نے تعزیتی دورہ کیا توسعودی عرب کے سامنے اقتدار کی نئی نسل میں منتقلی کا مسئلہ درپیش تھا۔

اوبامہ کے حالیہ دورے تک شاہ سلمان کے تخت پر فائز ہو چکے ہیں ۔انہوں نے اپنے فرزند محمد بن سلمان کو نائب ولیعہد وزیر دفاع اور اقتصادی اور ترقیاتی امور کی کونسل کے سربراہ بنا کر قوم کی باگ ڈور اگلی نسل کو سونپ دی ہے۔ سعودی عرب میں دیگر اصلاحات کا عمل بھی جاری ہے پہلی مرتبہ خواتین کو نہ صرف بلدیاتی انتخابات میں ووٹ ڈالنے بلکہ بطور امیدوار حصہ لینے کا حق دیا گیا ہے۔ شوریٰ کونسل خواتین کی ڈرائیونگ پر عائد پابندی کو ختم کرنے پر غور کررہی ہے۔ حصص بازار غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے کھول دی گئی نیز آرامکوتک میں سرمایہ کاری کے مواقع پیدا کیے جارہے ہیں ۔مگر سب سے زیادہ پریشانی کی بات خام تیل کی قیمت ہے جو پچھلے ۳ سالوں نصف سے کم ہوچکی ہے۔ مندرجہ بالا اصلاحات کا مطالبہ امریکی انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ کرتا رہا ہے لیکن اب ان کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ دنیا کا یہی اصول ہے کہ جو نہیں مانتا اسے منایا جاتا ہے اور جو راضی ہوجائے اس سے بے نیازی برتی جاتی ہے۔

صدر اوبامہ نے حال میں برطانیہ کے اندر اعتراف کیا کہ شام میں اگر بشار الاسد کو اقتدار سے بے دخل کرنے کیلئے بڑے پیمانے پر فوج کشی کی جاتی تو وہ

بہت بڑی غلطی ہوتی۔اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بشار الاسد کو ہٹانے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔داعش کا خطرہ دو سال قبل کی بہ نسبت بڑھ گیا ہے مگر اوبامہ نے اپنے دور اقتدار کے خاتمہ تک اس پر قابو پانے میں معذوری کا اظہار کر دیا ہے۔امریکہ کو افغانستان اور عراق میں جو سبق مجاہدین نے سکھایا ہے اس کے نتیجے میں اس نے لیبیا اور شام میں براہ راست فوج کشی سے گریز کیا۔سعودی عرب کو احساس ہو گیا تھا کہ یمن میں حوثیوں کے خلاف امریکہ کوئی مدد نہیں کرے گا اس لئے اپنی روایت کے خلاف اس کو بتائے بغیر سعودی عرب نے اپنے حواریوں کی مدد سے جنگ چھیڑ دی اس لئے کہ صدر عبدوالربو منصور ہادی کو عدن بھیج کر علی عبداللہ صالح اور حوثیوں نے صنعا میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔یمن میں یکطرفہ کارروائی کے بعد سعودی عرب نے امریکہ پر انحصار کم کرنے کی خاطر ۳۰ سے زیادہ ممالک پر مشتمل فوجی اتحاد قائم کرکے اس کی فوجی مشقوں کا انعقاد کیا اور دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے باہمی تعاون کا عزم کیا۔اس دوران ترکی کے ساتھ مل کر شام پر فوجی کارروائی کا منصوبہ بھی بنا تھا لیکن اس پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔

یمن کے معاملے عرب اتحادیوں کو چاہئے کہ اپنے دوست نما دشمن امریکہ سے سبق سیکھیں اور بلاوجہ کی فوج کشی سے گریز کریں۔قیام امن کے معاملے میں مغرب کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ اپنے مخالف کو ڈرانے دھمکانے کی خاطر پہلے

چڑھائی کرتا ہے۔ اگر وہ زیر ہو جائے تو اس کا خوب استحصال کرتا ہے ۔ اس حکمراں سیاسی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جب اپنے مقاصد میں ناکامی ہو جاتی ہے تو مصالحت کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ امریکہ نے ایران کے ساتھ یہی کیا۔برسوں تک لڑائی کے بعد بالآخر مفاہمت کرلی لیکن یہ تباہ کن حکمت عملی ہے جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں لاکھوں بے خانماں ہوجاتے ہیں اور دشمن کے علاوہ خود اپنا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اختلاف کی صورت میں اسلام طاقت کا استعمال کرنے سے قبل صلح صفائی پر زور دیتا ہے اور ناکامی کے بعد ہی اگر ضروری ہو تو جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ”اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کریں تو اُن کے درمیان صلح کرا دیا کرو“۔ آیت کے اس حصے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آپسی جنگ کا امکان موجود ہے ورنہ اس ہدایت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی لیکن یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے ورنہ یہ نہ فرمایا گیا ہوتا کہ ”اور اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی صبر سے کام لو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔ اس آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے انحراف ہی باہمی تصادم کا سبب بنتا ہے۔اس کا لازمی نتیجہ ’ ہوا کا اکھڑ جانا‘ اظہر من الشمس ہے۔

مذکورہ آیت میں جنگ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دونوں متحارب گروہوں کو مسلمان کہہ کر پکارا ہے۔آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے مخالفین کو بے دریغ اسلام کے دائرے سے خارج کردیتے ہیں۔کافریا کم از کم گمراہ توقرار دے ہی دیتے ہیں۔ مصالحتکے بعد اگر من مثاو ہوجائے تومسئلہ ختم ہوجاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ایک فریق سر تسلیم خم کرنے سے انکار کردے۔ یہ آزمائش ایسے طاقتور گروہ کیلئے ہے جس کے خلاف فیصلہ ہوجائے ایسی صورتحال کیلئے رہنمائی آیت کے اگلے حصے میں موجود ہے فرمایا'' پھر اگر ان میں سے ایک (گروہ) دوسرے پر زیادتی اور سرکشی کرے تواس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، ''۔جنگ کا یہ حکم صلح کے بعد سر کشی سے مشروط ہے۔

اس جنگ کے بعد اگر وہ گروہ جس نے اپنی طاقت کے زعم میں ظلم کا ارتکاب کردیا تھا رجوع کرلینے پر آمادہ ہوجائے تو اصلاح کرنے والے احتیاط کے نازک مرحلے میں داخل ہوجاتے ہں ۔اس لئے انہیں درگذر کرتے ہوئے زیادتی کرنے سے گریز کرنے کی تلقین کی گئی اور پھر سے موقع دینے کا حکم دیا گیا فرمانِ الٰہی ہے ''پھر اگر وہ رجوع کرلے تو دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف سے کام لو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو بہت پسند فرماتا ہے، ''۔ یہاں

پر یہ وعید موجود ہے کہ اس مرحلے میں انصاف کے دامن کا چھوٹ جانا اللہ کی ناراضگی کو دعوت دیتا ہے۔ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس نسخۂ کیمیا سے نوازہ کہ جس کے استعمال سے مذکورہ ہدایت پر عملدرآمد آسان ہو جائے۔آگے کی آیت ہے بات یہی ہے کہ (سب) اہلِ ایمان (آپس میں) بھائی ہیں۔ سو تم اپنے دو بھائیوں کے" درمیان صلح کرایا کرو"۔ یہ آیت پیغام دے رہی ہے کہ اخوت و محبت کے بغیر صلح جوئی ناممکن ہے۔

مصلحین کرام اگر دونوں فریقوں کو اپنا بھائی سمجھیں تو جذبۂ خیر خواہی ان سے عدل کے ساتھ صلح کرواتا رہے گا۔ ملت کا حال یہ ہے کہ وہ صلح کرانے سے قبل کسی ایک فریق کو اپنا رفیق اور دوسرے کو رقیب بنا بیٹھتی ہے۔ اس صورتحال سے بچنے کیلئے تقویٰ ضروری ہے اس لئے آگے ارشاد ہوا ہے" اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے وہی انصاف کر سکتا ہے جو بندوں سے ڈرتا ہو اس سے عدل کی توقع فضول ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو انصاف نہیں کرتا وہ لامحالہ ظلم و جبر کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے لوگ اللہ کے رحم و کرم سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے اگر ہم اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا مستحق بنانا چاہتے ہیں تو عدل و انصاف کا پاس و لحاظ لازمی ہے۔

پاکستان کو جب سعودی عرب نے یمن کے تنازع میں شمولیت کی دعوت دی تھی تو اس کیلئے اپنے آپ کو اس سے الگ رکھنا بہت مشکل تھا لیکن اس کے باوجود کمال حکمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نواز شریف نے اپنا دامن بچا لیا۔ ترکی پر دباو آیا تو اس نے عملاً جنگ میں حصہ لینے کے بجائے غیر فوجی تعاون پر اکتفاء کیا۔ اس مرحلے میں یہ احتیاط ضروری تھا اس لئے کہ امت کے سارے ممالک اگر ابتداء ہی میں کسی نہ کسی ایک فریق کے طرفدار بن جائیں تو مجبوراً ہمیں اپنے آپس کے تنازعات چکانے کیلئے غیروں کی چوکھٹ پر جانا پڑتا ہے چونکہ وہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں اس لئے وہ موقع غنیمت جان کر صلح صفائی کی آڑ میں آگ میں تیل ڈال کر اس پر اپنے مفاد کی روٹیاں سینکنے لگتے ہیں۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا اسلحہ بیچتے ہیں اور دوسرے سے ہمارے آپسی اختلاف کو ہوا دے کر ہم میں سے ایک ذریعہ دوسرے کو دفع کرتے ہیں۔

حالیہ مذاکرات کے دوران عرب اتحادی فوجوں نے مکلّا کے مقام ایک زبردست ہوائی حملہ بول دیا لیکن وہ حوثیوں کے بجائے پر القاعدہ کے خلاف تھا۔ اس حملے میں ۸۰۰ سے زائد جنگجو ہلاک ہوئے اسی کے ساتھ بری فوج نے پیش قدمی کرکے مکلّا کی آزادی کا اعلان کردیا۔ یہ نہایت سوچا سمجھا اقدام تھا جو حوثیوں کے خلاف نہیں تھا ورنہ مذاکرات کا سلسلہ فوراً ٹوٹ جاتا۔ یہ حملہ حوثیوں کو خبردار کرنے کیلئے تھا کہ اگر وہ اپنے موقف پر اڑے رہے تو انہیں بھی اس طرح

کی بمباری کا شکار ہونا پڑے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح کے دباو میں صالح اور حوثی آئیں گے؟ اور اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوگا؟ اتفاق ان دونوں سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ یہ بمباری ایک سال سے چل رہی ہے۔ اس میں ۷۰۰۰ لوگ مارے جاچکے ہیں اس کے باوجود صنعاء میں عرب اتحادی فوج داخل نہ ہو سکی۔ صدر عبدوالربوہ منصور ہادی دارالخلافہ کے بجائے عدن میں محصور ہیں اس لئے گفت و شنید و مصالحت کے بجائے دھونس دھمکی سے سوائے تباہی و بربادی کے کچھ اور ہاتھ نہیں آئے گا۔ حالیہ مذاکرات کا واحد فائدہ جنگ بندی کی خاطر قائم کی جانے والی مشترکہ کمیٹی کی تشکیل ہے اگر اس نے اخلاص کے ساتھ کام کیا تب بھی امن و سلامتی کیلئے کسی نہ کسی حد تک کارگر ہوگی۔

یکم مئی: مہاراشٹر کی تشکیل یا تقسیم کا دن

عالمی سطح پر یکم مئی مزدوروں کا دن ہے۔ ایک زمانے میں جب ممبئی کے اندر ٹریڈ یونین کا زور تھا جفاکشوں کا یہ دن بڑے زور و شور سے منایا جاتا تھا لیکن اب وہ ماضی کا ایک بھیانک خواب بن گیا ہے۔ ملک میں جب لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تنظیم نو کا کام شروع ہوا تو مہاراشٹر نام کی کسی ریاست کا وجود نہیں تھا۔ مرکزی صوبے یعنی سینٹرل پروونس سے ۸، نظام کی ریاست سے ۵، ممبئی اسٹیٹ سے گوا اور دمن کے درمیان کا علاقہ اور کچھ دیگر غیر منسلک راجواڑوں کو جوڑ کر مراٹھی زبان بولنے کا ایک صوبہ بنایا گیا لیکن ممبئی کو لے کر تنازعہ پیدا ہوگیا۔ پنڈت نہرو چاہتے تھے کہ ممبئی چونکہ ملک کی معاشی راجدھانی ہے اس لئے اسے مہاراشٹر میں شامل کرنے کے بجائے مرکز کے تحت یونین ٹیریٹری میں رکھا جائے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ نہرو جی کی رائے سے اختلاف کسی اور نہیں بلکہ ان کے وزیر خزانہ سی ڈی دیشمکھ نے کیا۔ وہ نہ صرف معروف ماہر معاشیات تھے بلکہ انگریزوں کے زمانے میں ریزرو بنک کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ دیشمکھ صاحب کا احتجاج اس قدر شدید تھا کہ انہوں نے اپنے اہم ترین عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ دیشمکھ کا استعفیٰ بھی ممبئ مہاراشٹر کا حصہ نہیں بنا سکا اور ممبئ کے باشندوں کو ۱۹۵۶ء سے لے آگے چار سالوں تک ایک زبردست عوامی تحریک چلانی پڑی جس میں ۱۰۰ سے زائد لوگوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور بالآخریکم مئی ۱۹۶۰ء کو پنڈت جی نے ممبئ سمیت مہاراشٹر کی تشکیل کرکے اس کا اقتدار یشونت راو چوہان کو سونپ دیا۔ وہیں سے یومِ مہاراشٹر کی داغ بیل پڑی۔ اب تو یہ حال ہے کہ ممبئ میں نہ کپڑا ملیں ہیں اور نہ اس میں کام کرنے والے مزدور۔ ٹریڈ یونین کے ساتھ ساتھ عوام نے مزدوروں کے دن کو بھی بھلا دیا ہے لیکن اسمیں شک نہیں کہ متحدہ مہاراشٹر کے قیام کی تحریک میں مزدوروں، ان کی یونین اور اس کے رہنماوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور انہیں کی قربانیوں سے اس ریاست کا دارالخلافہ ممبئ بنا جس میں اب مزدوروں کا دن نہیں بلکہ صرف یوم مہاراشٹر منایا جاتا ہے۔

اس سال مہاراشٹر دن جس جماعت کی سرپرستی میں منایا جائیگا اس سنگھ پریوار نے ریاست کی تشکیل میں ادنیٰ کردار بھی ادا نہیں کیا۔ سنگھ پریوار کا قیام ودربھ میں ہوا اس نے ناگپور کو اپنا صدر مقام بنایا اور پونے میں سب سے زیادہ زہر پھیلایا لیکن ممبئ عرصۂ دراز تک بائیں بازو کے جماعتوں کی ہمنوا بنی رہی۔ کانگریس نے شیوسینا کی مدد سے سرخ پرچم کو اتارا اور بی جے پی نے سینا کے ساتھ الحاق کرکے ممبئ پر قبضہ جمایا۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے

پی کے وزیراعلیٰ دیویندر فردنویس اور معمر مرکزی وزیر نتن گڈکری کا تعلق نہ صرف برہمن سماج سے بلکہ ناگپور شہر سے ہے نیز دونوں مہاراشٹر کی تقسیم کے حامی ہیں۔ اس سال جبکہ ممبئی میں وزیراعلیٰ فردنویس یوم مہاراشٹر کی سرکاری تقریب میں بلند بانگ دعویٰ کریں گے ان کے اپنے علاقہ میں دوربھ راجیہ پریشد ہر ضلع میں بی جے پی کا مینی فیسٹو جلائے گی۔ اس لئے کہ بی جے پی پارلیمانی انتخاب سے قبل ودربھ کو الگ کرنے کا وعدہ کرنے کے بعد اپنے وعدے سے مکر گئی ہے اس لئے پریشد بی جے پی کے خلاف ہوگئی ہے۔ یکم مئی کے دن مہاراشٹر کی تقسیم کا مطالبہ وزیراعلیٰ اور سنگھ پریوار دونوں کے لئے باعث شرم ہے لیکن موجودہ سیاست میں شرم وحیا جیسی چیزیں نہیں پائی جاتیں۔ دوسال قبل جب بی جے پی کو مرکز میں کامیابی حاصل ہوگئی تو ودربھ کی تقسیم کے حامیوں کا حوصلہ بہت بلند ہوگیا۔ ان بیچاروں نے سوچا کہ اب ہمارے اچھے دن آنے ہی والے ہیں اور جلد ہی ہم آزاد ہوجائیں گے۔ ۲۰۱۴ء میں بھی ودربھ کے ہر ضلع میں یکم مئی کو زور و شور کے ساتھ آزاد ودربھ کا دن منایا گیا اور ان لوگوں نے ہر ضلع کے صدر مقام پر اپنا پرچم لہرایا۔ بی جے پی والے اس کام میں پیش پیش تھے انہوں نے عوامی جذبات کا خوب جی بھر کے استحصال کیا اور پانچ ماہ بعد ہونے والے ریاستی انتخابات میں پہلی بار شیوسینا کی مدد کے بغیر سب سے زیادہ نشستوں پر کامیابی درج کرائی لیکن پھر اس کے بعد جب پوری

ریاست کا اقتدار ہاتھ آگیا تو یہ ابن الوقت ودربھ کی آزادی کا نعرہ بھول گئے۔ گزشتہ سال سرمائی اجلاس سے قبل جب قحط سالی اور پانی جیسے مسائل میں فردنویس.بری طرح گھر گئے تو انھوں نے اپنے خاص معتمد اٹارنی جنرل شری ہری انے کے توسط سے اس مطالبے کو زندہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یہ دراصل حزب اختلاف اور اپنی حلیف سینا کی الجھانے کی سازش تھی تاکہ حکومت کی ناکامیوں کی پردہ پوشی ہوسکے اور جنوری میں ہونے والے نگر پالیکا کے دوسرے مرحلے کے انتخاب پر سرکار کی نااہلی کے منفی اثرات مرتب نہ ہوں لیکن ایسا نہ ہوسکا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی گزشتہ سال نومبر جب اپنی ریاستی سرکار اپنی پہلی سالگرہ منانے کی تیاری میں تھی ان ضلعی بلدیاتی انتخابابت نے رنگ میں بھنگ ڈال رکھا ہے۔ بلدیاتی انتخابات کا آغاز وزیر اعلیٰ دیویندر فردنویس نے.بڑی چالاکی سے اپنے اور آرایس ایس کے گڑھ ناگپور سے کیا لیکن انہیں وہاں بھی منہ کی کھانی پڑی۔ مجموعی اعتبار سے وہ کانگریس اور بی جے پی.برابری پر چھوٹے مگر کچھ علاقوں کے نتائج چونکانے والے تھے مثلاًناگپور ضلع کے ہنگنا تعلقہ میں این سی پی نے ۱۱ تو بی جے پی نے صرف ۶ نشستوں پر کامیابی درج کرائی۔ کارنجا میں کانگریس نے ۱۷ میں سے ۱۵ نشستیں جیت لیں اور بی جے پی کو پر اکتفاء کرناپڑا۔ اسی طرح موہادی میں کانگریس نے ۱۷ میں ۱۲ پر قبضہ ۲

کرلیا اور بی جے پی ۳ پر سمٹ گئی۔ زعفرانیوں کی خود اپنے اور وزیر علیٰ کے قلعہ میں ایسی درگت بنے گی یہ کسی نے نہیں سوچا تھا؟

اس انتخاب کے دو ماہ بعد یعنی آج سے دو ماہ قبل ۱۹ نگر پنچایتوں کی ۳۴۵ نشستوں پر مقابلہ ہوا تو اس وقت تک کانگریس کی مقبولت میں مزید اضافہ ہوچکا تھا۔ اس نے ۱۰۵ مقامات پر کامیابی درج کرائی تھی۔ این سی پی بھی ۸۰ تک پہنچ گئی تھی مگر بی جے پی کو کانگریس کی بہ نسبت نصف سے بھی کم یعنی ۳۹ پر اکتفاء کرنا پڑا۔ ۱۹ میں سے ۹ مقامات پر کانگریس کو واضح اکثریت مل گئی اور باقی ۱۰ میں کسی ایک جماعت کو اکثریت نہیں مل سکی ۔ اس کے مزید دو ماہ بعد بی جے پی کانگریس کے مقابلے ایک چوتھائی سے بھی کم نشستوں پر کامیاب ہو سکی گویا نومبر میں جو برابری تھی وہ فروری میں نصف سے کم اور اپریل میں ایک چوتھائی سے نیچے پہنچ گئی۔ اس طرح کی پھسلن تو شاید ہی کسی جماعت کے مقدر میں آئی ہو۔

بی جے پی کی حکمت عملی یہ ہے کہ جب تک پوری ریاست پر حکمرانی کا موقع ہے متحدہ مہاراشٹر کا نعرہ لگا کرحکومت کرو اور جب عوام لات مار کر بھگا دیں تو پھر سے ودربھ کی آزادی کا مطالبہ شروع کردو لیکن کیا اس کھیل میں بی جے پی کامیاب ہوسکے گی؟ اس کا امکان کم ہے۔ بی جے پی والوں نے اسی حکمت عملی کے تحت اتراکھنڈ کو اترپردیش سے الگ کیا لیکن وہاں کے عوام نے انہیں اقتدار

سے بے دخل کردیا اوراب وہ چور دروازے سے سرکار بنانے کی کوشش میں عدالت کے اندر جوتیاں کھارہی ہے۔ مہاراشٹر میں ان کی منافقانہ پالیسی منہ میں رام بغل میں چھری کی مصداق ہے۔زبان پر مہاراشٹر دل میں ودربھ کا پاکھنڈ اب نہیں چلے گا۔ لوگ سوال کریں گے کہ جب اقتدار تمہارے ہاتھوں میں تھا تو تم نے دغا بازی کیوں کی؟اس یوم مہاراشٹر کا یہی پیغام ہے کہ بی جے پی اس موقع پرستی کے سبب ناگپور کے ریشم باغ میں بھی جہاں آرایس ایس کا صدر دفتر ہے بی جے پی کی ضمانت ضبط ہوجائیگی

۔

مغربی بنگال انتخاب: کھلونے ٹوٹ بھی جاتے ہیں آزماتے ہوئے

قومی سطح پر کمیونسٹوں نے کئی مرتبہ کانگریس کی حمایت کی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اشتراکیوں کے باہمی انتشار کی بنیادی وجہ کانگریس کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں۔ ایک زمانے میں کمیونسٹ پارٹی ملک میں سب سے بڑی حزب اختلاف تھی مگر جب پنڈت نہرو نے سوویت یونین سے دوستی کرلی تو کچھ اشتراکی کانگریس کے تئیں نرم پڑ گئے۔ اس نرمی کے جواب میں گرم دل نے سی پی ایم قائم کرلی جو چین نواز تھی۔ اس میں سے مسلح جدوجہد کے حامی نکسلباری الگ ہوگئے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ان تین دھڑوں میں سے سب سے زیادہ انتخابی کامیابی سی پی ایم کو ملی لیکن اس نے بنگال، منی پور اور کیرالہ میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی خاطر تمام اشتراکی جماعتوں کو ایک پرچم تلے جمع کیا اور کانگریس کے خلاف برسرِپیکار رہی۔ بی جے پی کو اقتدار سے دور رکھنے کی خاطر قومی سطح پر کمیونسٹوں نے کانگریس کی باہر سے حمایت تو کی لیکن نہ حکومت میں شامل ہوئے اور نہ ساتھ مل کر انتخاب لڑا۔

انتخابی عمل میں ان کا سب سے بڑا دشمن کانگریس پارٹی ہی رہی۔ کیرالہ میں آج بھی یہ صورتحال ہے لیکن مغربی بنگال میں ترنمول کے برسرِاقتدار آنے سے سیاسی منظر نامہ بدل گیا۔ اب بنگال کی حدتک کانگریس پارٹی کمیونسٹوں کی

حریف نہیں ہے۔ اس لئے ترنمول کے خلاف کمیونسٹ اور کانگریس اتحاد ممکن ہوسکا۔ مغربی بنگال میں مقابلہ ترنمول اور بائیں بازو کی جماعتوں کے درمیان ہے جس میں ابتداء کے اندر ترنمول کا پلہّ بھاری تھالیکن اب موسم بدل گیا ہے اس لئے کہ کانگریس نے ممتا کے خلاف کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد کرلیااور سہ رخی مقابلے کی صورت بن گئی۔۔ بی جے پی نے گوکہ گزشتہ پارلیمانی انتخاب میں سب سے بڑی چھلانگ لگاتے ہوئے اپنے رائے دہندگان کی تعداد کو ۴ سے ۱۷ فیصد تک پہنچادیا تھااس کے باوجود وہ بالکل اچھوت بن کر رہ گئی۔ پچھلے صوبائی انتخاب سے قبل مغربی بنگال میں کمیونسٹ برسر اقتدار تھے۔ ان کو ہٹانے کیلئے کانگریس نے ترنمول کے ساتھ اتحاد کیا تھااس بار ترنمول کو اقتدار سے بے دخل کرنے کیلئے کانگریس نے کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد کرلیا ہے۔ بنگال کے سیاسی نشیب وفراز پر نظرڈالیں تو یہ صاف نظرآتا ہے کہ جیسے جیسے ترنمول کا اثرورسوخ بڑھتا گیاکانگریس کے اثرات زائل ہوتے چلے گئے۔ یہی معکوس تعلق بی جے پی اور کمیونسٹ پارٹی کے اندر بھی دکھائی دیتا ہے کہ کمیونسٹ اتحادکے زوال اور بی جے پی کے عروج کی رفتار یکساں رہی ہے۔ ایسے میں کانگریس کمیونسٹ اتحادکے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ترنمول کانگریس آگے بڑھ کر بی جے پی کے ساتھ الحاق کرلیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر کوئی یہ

چاہتا تھا۔ڈوبتی بی جے پی کو تنکے کا کیا جہاز کا سہارہ مل جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ناراض امیت شاہ نے بگڑ کر یہاں تک کہہ دیا کہ ممتا کے پانچ سال کمیونسٹوں کے ۳۴ سالوں سے بدتر تھے۔ کانگریس بھی یہی چاہتی تھی کہ ترنمول بی جے پی کے ساتھ چلی جائے تاکہ مسلمان ووٹرس ترنمول سے ناراض ہو کر اس کی جھولی میں لوٹ آئیں ۔ ممتا کے دل میں بھی ارمان رہا ہوگا کہ صوبے میں بی جے پی کے دوچار لوگوں کو وزیر بنا کر مرکز میں ایک آدھ وزارت پر ہاتھ صاف کرلیا جائے ویسے بھی وہ خود اٹل جی کی سرکار میں وزیر ریلوے رہ چکی ہیں ۔ ہندوستانی سیاست میں اصول و نظریہ کی موت ہو چکی ہے اور سارا کاروبار ابن الوقتی و مفاد پرستی کی بنیاد پر پھل پھول رہا ہے لیکن ترنمول کے پتے اور بی جے پی کا پھول ایک ساتھ نہیں کھلا آخر کیوں ؟

اس سوال کا جواب مغربی بنگال میں مسلمان رائے دہندگان کی کثیر تعداد ہے۔ ریاست میں ویسے تو اوسطاً مسلمانوں کی آبادی ۲۷ فیصد ہے لیکن وہ پوری ریاست میں بکھرے ہوئے نہیں ہیں۔ وسطی بنگال کی ۴۰ نشستوں میں ان کی تعداد ۵۰ فیصد ہے۔اس کے علاوہ کولکاتہ اور اس کے گردنواح میں بھی بڑی تعداد میں مسلمان بستے ہیں مجموعی حیثیت سے ۱۴۰ نشستوں میں مسلمان ۲۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہیں۔ وسطی بنگال یعنی مالدہ اور مرشدآباد کے مسلمان بڑے پیانے پر کانگریس کے حامی ہیں لیکن کولکاتا کے گردونواح کے مسلمان ترنمول کے ساتھ

ہیں۔ یہی علاقہ ممتا بنرجی کا گڑھ ہے۔ ۲۱۰۴ کے قومی انتخاب میں اس علاقے سے ۱۵ فیصد رائے دہندگان ممتا کو چھوڑ کر بی جے پی کی جھولی میں چلے گئے تھے لیکن چونکہ ۵۶ فیصد میں سے یہ کمی واقع ہوئی تھی اس لئے نتائج پر اس کا اثر نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ممتا کو چھوڑ کر جانے والے یہ سارے رائے دہندگان ہندو تھے اس لئے کہ مودی جی اگر بابا رام دیو سے شیرش آسن سیکھ کر سر کے بل کھڑے ہو جائیں تب بھی عام مسلمان ان کی قیادت میں بی جے پی کی جانب راغب نہیں ہوں گے۔ حقیقت یہی ہے کہ ترنمول کو خود اپنے گڑھ میں مسلمان رائے دہندگان کی ناراضگی کے خوف نے بی جے پی کے ساتھ جانے سے باز رکھا۔

ممتا بنرجی نے یقیناً بی جے پی کے سبب ہونے والے فائدے اور مسلمانوں کے چلے جانے سے متوقع نقصان کا اندازہ کرنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ کم از کم انتخاب تک تو بی جے پی سے دور رہنے میں بھلائی ہے بعد میں اگر کمی رہ گئی اور بی جے پی کچھ مقامات پر کامیاب ہو گئی تو اس کے ساتھ سودے بازی ہو جائیگی۔ بنگال کی بابت اس بات پر خاصہ اختلاف ہے کہ اس بار کامیابی ممتا کو ملے گی یا کمیونسٹ پھر سے اقتدار میں آجائیں گے۔ ٹیلی گراف اور اے بی پی چینل تو ممتا کی شکست کا اعلان کرچکا ہے مگر این ڈی ٹی وی ہنوز پر امید ہے۔ ویسے ممتا بنرجی کی جھنجلاہٹ اے بی پی کی تائید کرتی ہے۔ کبھی تو وہ

پولس اور الیکشن کمیشن پر بگڑتی ہیں اور کبھی کانگریس کے پاگل ہو جانے یا کمیونسٹوں کے خود کشی کر لینے کا اعلان کرتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو انہیں اپنے مخالفین کی اس حالت پر خوش ہونا چاہئے۔ کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی نے یہ کیوں کیا؟ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید وہ سمجھنا نہیں چاہتیں اس لئے کہ اگر وہ اپنے آپ سے پوچھیں کہ انہوں نے کانگریس سے اتحاد کیوں کیا تھا؟ ور این ڈی اے میں شامل کیوں ہوئی تھیں؟ تو سب سمجھ میں آجائیگا۔

ملک کے سارے مبصرین کا اتفاق ہے کہ بی جے پی ۲۰۱۴ء کے اپنے ۱۷ فیصد کو برقرار نہیں رکھ پائیگی۔ خود امیت شاہ اور مودی جی مقابلے کے درمیان ہی ناک آوٹ ہو کر رِنگ سے باہر آچکے ہیں۔ اب گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ بی جے پی جو ووٹ گنوائے گی وہ کہاں جائیں گے؟ ممتا کو امید ہے کہ بی جے پی سے اتحاد کئے بغیر بھی ان ووٹرس کی گھر واپسی ہو جائیگی اور ان نیا پار لگ جائیگی۔ فی الحال مغربی بنگال کے انتخابی نتائج کا فیصلہ اتفاق سے انہیں بیزار رائے دہندگان کے ہاتھوں میں چلا گیا جو پچھلی مرتبہ مودی لہر کے جھانسے میں آگئے تھے مگر اب اچھے دنوں سے مایوس ہو کر سوچ رہے ہیں ''میں اِدھر جاوں یا اُدھر جاوں۔ بڑی مشکل میں ہوں میں کدھر جاوں'' ۔ کولکاتہ اور اس کے گردونواح کے یہ ووٹرس اگر لوٹ کر ترنمول میں آجاتے ہیں تو ممتا اکثریت میں آجائیں گی۔ بنگال کے دیگر علاقوں میں جو کمیونسٹ رائے دہندگان بی جے پی کے

ساتھ ہو گئے تھے وہ بھی واپسی کیلئے پر تول رہے ہیں۔ اگر ان ۱۲ فیصد رائے دہندگان میں سے چند فیصد بھی ترنمول کی جانب جھکاؤ محسوس کریں تو اس کا اقتدار میں آنا یقینی ہوجائیگا اور وہ ۲۰۰ سے زیادہ نشستوں پر کامیاب ہوجائیگی لیکن بصورت دیگر اگر یہ دیہاتی ووٹرس پھر سے سرخ پرچم تھام لیں نیز شہری رائے دہندگان بھی ترنمول پر کانگریس یا کمیونسٹ پارٹی کو ترجیح دیں تو تختہ پلٹ جائیگا۔ این ڈی ٹی وی کے مطابق ۲ سے ۳ فیصد کی سوئنگ نتائج کو الٹ پلٹ کر رکھ دے گی۔ فی الحال اس کا اندازہ ہے کہ ترنمول کے امکانات ۶۰ فیصد اور کمیونسٹ پارٹی کے ۴۰ فیصد ہیں لیکن کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

آسام کا انتخاب: کہانی ختم ہوئی اور ایسی ختم ہوئی

بہار مشرقی ہند کا دروازہ ہے اس کے آگے مشرق کا گہوارہ بنگال ہے اور پچھواڑہ آسام ہے۔ اتفاق سے ان تینوں ریاستوں میں ایک کے بعد ایک انتخابات کا انعقاد ہو رہا ہے۔ کانگریس کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو تینوں مقامات پر اس نے مختلف حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے جس سے نہ صرف عوام بلکہ سیاسی مبصرین تک حیرت زدہ ہیں۔ سیاسی جماعتوں کی گوں ناگوں مجبوریوں تو وہی جانتے ہیں اس لئے کہ جس کے جوتے میں کیل دھنسی ہوتی ہے، اسی کو درد کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود کبھی وہ کیل کی مصیبت سے نجات پانے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور کبھی نہیں ہوپاتا۔ یہ فطری امر ہے کہ کسی دوڑ میں سارے لوگ کامیاب نہیں ہوسکتے۔ سیاست کی مسابقت میں تو چاندی اور کانسہ پانے والے بھی ناکام قرار دیئے جاتے ہیں ۔ اس دنیا کا زرین اصول ہے کہ سونا لاو یا گھر جاو۔

بہار میں کانگریس ایک دوسرے کے جانی دشمن لالو اور نتیش کو یکجا کرکے مہا گھٹ بندھن شامل ہو گئی لیکن بنگال میں دائیں بازو کی جماعتوں اور ترنمول کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ صرف اشتراکیوں کے ساتھ اشتراک عمل پر اکتفاء کیا گیا۔ آسام میں کانگریس سے توقع کی جارہی تھی کہ وہ مولانا اجمل کی اے یو ڈی ایف کے ساتھ متحد ہو کر انتخاب لڑے گی تاکہ بی

جے پی کے طوفان بلاخیز کا مقابلہ کیا جاسکے لیکن اس نے تنہا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ بہار کے کامیاب تجربے کے بعد بظاہر یہ حکمت عملی تعجب خیز ہے لیکن اگر گہرائی میں جاکر دیکھا جائے یہی درست ہے۔ بہار میں صورتحال یہ تھی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو پارلیمانی انتخابات میں زبردست کامیابی ملی تھی اس سے زعفرانیوں کے حوصلے بلند تھے ۔ بی جے پی کو خشواہا کی راشٹریہ لوک سمتا پارٹی اور اور پاسوان کی لوک جن شکتی پارٹی کی حمایت پہلے ہی حاصل تھی ۔ اس میں تازہ اضافہ سابق وزیراعلیٰ جیتن کمار مانجھی کی نوزائیدہ ہندوستانی عوام مورچہ کا تھا جس کے بارے میں یہ خوش فہمی پائی جاتی تھی کہ سارے مہادلت ان کے ساتھ این ڈی اے میں آجائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ذرائع ابلاغ میں بی جے پی کی کامیابی کا شور سنائی دینے لگا تھا اور سشیل مودی کو ہر روز وزارت اعلیٰ کے خواب دکھائی دینے لگے تھے۔

سشیل مودی سے بڑا مسئلہ وزیراعظم نریندر مودی کا تھا۔ اول تو وہ نتیش کمار کو ان کی نامزدگی کے سبب این ڈی اے سے الگ ہونے کی قرار واقعی سزا دینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ دہلی کی شکست کو استثنائی صورتحال قرار دے کر پھر ایک بار اپنے ناقابلِ تسخیر ہونے کا بھرم باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بہار میں خطرہ سنگین تھا اور اگر تکونہ یا چوکور انتخاب ہوتا تو بی جے پی بڑے آرام سے کامیاب ہوجاتی۔ اسے ہرانے کیلئے دو قطبی مقابلہ ناگزیر

تھا۔ مغربی بنگال میں صورتحال ایسی نہیں ہے۔ وہاں فی الحال کوئی بڑا سے بڑا مودی بھکت بھی بی جے پی کے اقتدار کا سپنا نہیں دیکھتا۔ آسام میں مسلمانوں کی تعداد مغربی بنگال سے زیادہ ہے بلکہ کشمیر کے بعد تناسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ مسلمان اسی ریاست میں ہے۔ وہاں پر مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت آل انڈیا یونائیٹیڈ ڈیموکریٹک فرنٹ بھی ہے۔ آسام میں بی جے پی نے اے جی پی اور بوڈو فرنٹ سے اتحاد کر رکھا ہے اس لئے اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہوگئے ہیں اس کے باوجود کانگریس نے مولانا اجمل کی جماعت کے ساتھ الحاق کیوں نہیں کیا؟

اس سوال کا جواب زمینی حقائق میں پوشیدہ ہے؟ فرض کیجئے کہ کانگریس اے یو ڈی ایف کے ساتھ معاہدہ کرلیتی تو کیا ہوتا؟ کانگریس کو اندیشہ ہے ایسا کرنے سے اس کا ہندو ووٹ بی جے پی کی جھولی میں چلا جاتا۔ اس طرح بی جے پی کیلئے اے یو ڈی ایف اور کانگریسی امیدوار کو ہرانا آسان تر ہوجاتا۔ جن علاقوں میں اے یو ڈی ایف مضبوط ہے وہاں کانگریس بی جے پی کے ہندو ووٹ کاٹے گی اور جہاں اے یو ڈی ایف کی حالت پتلی ہے وہاں کے مسلمان کانگریس کو ووٹ دیں گے ایسے میں دیگر ہندووں کو ساتھ لے کر کانگریس کیلئے بی جے پی کو ہرانا سہل ہوجائیگا۔ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کرنے کے بجائے خلاف انتخاب لڑنے میں فی الحال فائدہ ہے اگر کمی رہ جائے تو بعد از انتخاب اتحاد کا دروازہ کھلا ہی

ہے۔

اس جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ بنگال میں جو مجبوری برسر اقتدار ترنمول کانگریس کو بی جے پی کے ساتھ جانے روک رہی ہے آسام میں وہی رکاوٹ برسر اقتدار کانگریس کواے یو ڈی ایف سے ہاتھ ملانے سے منع کررہی ہے۔ بنگال میں ترنمول مسلمانوں کی ناراضگی سے بچنے کیلئے بی جے پی سے عارضی دوری بنائے ہوئے ہے اور آسام میں کانگریس پارٹی ہندو رائے دہندگان کی خوشنودی کی خاطر یونائیٹڈ فرنٹ سے کنارہ کشی اختیار کئے ہوئے ہے لیکن جس طرح بنگال کے اندر انتخابات کے بعد ترنمول اور بی جے پی کا اتحاد ممکن ہے اسی طرح آسام میں کانگریس اور اے یو ڈی ایف بھی یکجا ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اب توآسام میں جموں کشمیر کے طرز پر بی جے پی اور اے یو ڈی ایف اتحادکے بھی چرچے ہونے لگے ہیں۔ ایک خبر کے مطابق بی جے پی کی حلیف اے جی پی کانگریس کے ساتھ پینگیں بڑھا رہی ہے ت۔بحالت مجبوری یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کانگریس باہر سے اے جی پی ، اے یو ڈی ایف اور بوڈو فرنٹ کے اتحاد کی حمایت کرے اور بی جے پی ہاتھ ملتی رہ جائے۔ سیاسی بازار میں چونکہ ہر شے بکاو ہے اس لئے کوئی ےچمتکار ناممکن نہیں۔بقول شاعر

خریدنا ہے تو فوراًخریدیئے صاحب

(کھلونے ٹوٹ بھی جاتے ہیں آزماتے ہوئے (ترمیم شدہ

اقتدار کو حاصل کرنے یا جاری و ساری رکھنے کیلئے مختلف سیاسی جماعتوں کو مختلف مقامات پر طرح طرح کی حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ کہیں پر یہ لوگ ہندوتوا کے خلاف سیکولرزم کے نام پر متحد ہوجاتے ہیں۔ کہیں پر ظلم وجبر کو ختم کرنے کا بہانہ بنا کر جزوی اتحاد قائم کرلیتے ہیں اور کہیں تنہا انتخاب لڑتے ہیں۔ عوام کو بے وقوف بنا نے کیلئے کوئی اچھے دنوں کے خواب دکھاتا ہے کبھی سب کا ساتھ سب کا وکاس کا نعرہ لگاتا ہے تو کوئی سیکولرزم کی دہائی دیتا ہے۔ کوئی ترقی پسندی اور رواداری کا راگ الاپتا ہے ۔کوئی بدعنوانی کے خاتمہ کا عہد کرتا ہے تو کوئی ہندوتوا کولاحق خطرات کا رونا روتا ہے لیکن ان انتخابی نعروں اور قسموں وعدوں کی حیثیت ہاتھی کے دکھانے والے دانتوں سے زیادہ نہیں ہے۔ عوام ہاتھی کے ان خوبصورت دانتوں سے بار بار دھوکہ کھاتے ہیں اور جھانسے میں آجاتے ہیں اس لئے اس جمہوری نظام میں ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نظام میں نہ صرف عوام بلکہ سیاسی جماعتیں بھی مجبور ہیں لیکن سیاسی جماعتوں کی مجبوری عارضی ہوتی ہے۔ انہیں کبھی نہ کبھی ،کیسے کیسے نہ کیسے، کلی یا جزوی اقتدار نصیب ہوجاتا ہے لیکن عوام الناس کا یہ حال ہے کہ ان کے حصے میں خالی خوابوں اور کھوکھلے وعدوں کے سوا کچھ نہیں آتا پھر بھی وہ جمہوریت کے نشے میں بدمست جھومتے رہتے ہیں۔

تمل ناڈو کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں ابھی تک سخت گرمی کے سبب جے للیتا کے جلسوں میں ۵ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ حزب اختلاف کی شکایت پر انسانی حقوق کے قومی کمیشن نے ریاست کے چیف سکریٹری سے وضاحت طلب کی ہے کہ جہاں گرمی کے سبب ضلعی انتظامیہ نے عوام پر دوپہر گیارہ سے چار کے درمیان باہر نکلنے پر پابندی لگا رکھی ہے اس طرح کے عوامی جلسے کی اجازت کیوں دی گئی ؟ لیکن اندھے بہرے عوام کو اور ان کے بے حس رہنماوں کو اس کی فکر کب ہے؟ وزیر اعلیٰ جے للیتا کا ہیلی کاپٹر رات میں جلسہ گاہ تک نہیں پہنچ سکتا وہ اپنی صحت کے باعث گاڑی سے آنہیں سکتیں اس لئے بھری دوپہر میں خطاب رکھا جاتا ہے۔ عوام جوق درجوق اپنی جان پر کھیل کر ان جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور بیمار ہو کر گھر جاتے ہیں بلکہ کبھی کبھار ان کی لاشیں ہی گھر پہنچتی ہیں۔ اس انتخاب کے کھیل نے پوری قوم کا دماغ ماؤف کر رکھا ہے صرف سیاستدان اور ان کے سرپرست سرمایہ دار ہیں کہ جن کے وارے نیارے ہیں۔ عوام کی اندھی عقیدت اور جے للیتا کے جلسوں ہونی والی واردات رحمٰن فارس کے اس شعر کی مصداق ہے کہ ؎

کہانی ختم ہوئی اور ایسی ختم ہوئی
کے لوگ رونے لگے تالیاں بجاتے ہوئے

اتحادِ امت : ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں

مولانا توقیر رضا خاں صاحب نے دارالعلوم دیوبند کا دورہ فرما کر مسلمانانِ ہند کا دل جیت لیا۔ یہ دورہ ایک ایسے موقع پر ہوا تھا جب کہ وزیراعظم امت مسلمہ کے اندر مسلکی اختلاف کو ہوا دینے میں ناکام کوشش کرچکے تھے۔ اس کے بعد حسب عادت انتظامیہ نے جھوٹ موٹ دہشت گردی کے الزام میں دہلی اور دیوبند س ۱۳ بے قصور نوجوان کو گرفتار کرلیا تھا۔ مولانا نے گرفتار نوجوان شاکر کے اہل خانہ سے بھی ملاقات کی اوران کا حوصلہ بندھایا۔ اب یہ خوشخبری بھی آچکی ہے کہ جیش محمد کے نام پر جن نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں سے ۱۰ نام نہاد خطرناک دہشت گرد رہا ہوچکے ہیں۔ وہ بے چارے تبلیغی جماعت کے بے قصور نوجوانوں تھے جنہیں بلا ثبوت گرفتار کرلیا گیا تھا۔ ایک ہفتہ کے اندران کی رہائی خوش بختی ہے ورنہ ہماری جمہوری روایت کا تقاضہ تھا کہ کئی سال تک اس معاملے کو کھاچتا جاتا اور پھر سیکولر اقدار کے تحت باعزت بری کردیا جاتا۔

نوجوانوں کے اس قدر جلد رہا ہوجانے سے ان کے اہل خانہ کا تو بہت فائدہ ہوا لیکن ان پولس والوں کا جو رشوت خوری کا زرین موقع گنوا بیٹھے۔ ان سرکاری و

عدالتی ملازمین کا جن کی جیب گرم نہ ہو سکی اور ان اخباری چینلس کا جو ایک پلنگ توڑ خبر سے محروم کردیئے گئے بہت بڑا نقصان ہوا۔ عصر حاضر کا صحافی خبر رسانی سے ترقی کرکے خبر فروشی کے مقام بلند پر فائز ہوگیا ہے۔ آج کل خبروں کو دبانے کیلئے بھی خبریں بنائی جاتی ہیں ۔ اپنے سیاسی آقاوں کے اشارے انتظامیہ خبر گھڑتا ہے اور خبروں کے دلال نکڑ پر کھڑے بھیل پانی پوری والے کی طرح اسے نمک مرچ لگا کرٹی وی چینل یا اخبار سے اسے فروخت کرتے ہیں۔ خبر سازی کا یہ بیوپار اس مثل کی مانند ہے کہ کسی لکیر کو چھوٹا کرنا ہو تو اس کے بغل میں ایک اتنی بڑی سی لکیر کھینچو کہ لوگ اس خیالی خط کی بلندی میں الجھ کر دوسرے ننھے سے خط کو موجود ہونے کے باوجود نہیں دیکھ پائیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی خبر تھی جس کو دبانے کیلئے ان نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ دراصل ڈاکٹر جلیس انصاری اور ابرارحمت کے باعزت بری ہونے کی خبر تھی ۔ ان دونوں کی رہائی خفیہ ایجنسیوں کے منہ پر زوردار طمانچہ تھا۔ اس بدنامی سے بچنے کیلئے ۱۳ بے قصور نوجوانوں کو گرفتار کرنے کا ڈرامہ کیا گیا اسے ذرائع ابلاغ میں کچھ اس طرح اچھالا گیا کہ ڈاکٹر جلیس انصاری اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی پردہ پوشی ہو گئی ۔ جب یہ کام بحسن و خوبی انجام پاگیا تو پھر دو قسطوں میں ۱۰ لوگ رہا ہو گئے ۔ جو ہنوز حراست میں ہیں ان کا سرغنہ ساجد ہے وہ بقول پولس ڈانسر بننا چاہتا تھا اور

دہشت گردی کی تربیت کیلئے پاکستان بھی جانا چاہتا تھا حالانکہ نہ اس کے خط کا مسعود اظہر کے بھائی طلحہ نے جواب دیا اور نہ اس کے پاس پاسپورٹ ہے۔ اب پولس کے اس اوٹ پٹانگ الزام کو اگر عدالت مسترد نہ کرے تو کیا کرے؟ اسکی بھی تو مجبوری ہے۔

سوال یہ بھی ہے کہ آخر ڈاکٹر جلیس انصاری کے بری ہو جانے سے انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ کو کیا پریشانی ہے؟اس کا اندازہ تو وہی کرسکتا ہے جس نے ۲۳ سال قبل جلیس انصاری سمیت ٦ لوگوں پر یہ جھوٹا لزام لگایا کہ ان لوگوں نے بابری مسجد کی شہادت کا بدلہ لینے کیلئے اس کی پہلی بر سی کے موقع پر دھماکے کئے۔ پھر ان کا تعلق لشکر اور جیش سے جوڑ دیا۔ انہیں ڈاکٹر بم کے نام سے بدنام کیا۔ ان کو راجستھان کی پوٹا عدالت سے سال کی سزا سنوادی اور ان کے تعلق سے نت نئی افواہیں اڑاتے رہے۔ اس خبر پر ۲۰ اگر قومی بحث چھڑ جاتی تو یہ سوال پیدا ہوجاتا کہ اگر وہ دھماکے ان حضرات نے نہیں کئے تو کس نے کئے اس لئے کہ دھماکے تو ہوئے اور جو معصوم لوگ مارے گئے ان کا قاتل کون ہے؟

ویسے اس جرم کا اعتراف سنگھ پریوار کے حامی اور آئی بی کے سابق جوائنٹ ڈائرکٹر ملئے کرشن دھر اپنی کتاب ’اوپن سیکرٹ‘ میں کرچکے ہیں۔ انہوں نے بے قصور مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرنے کی حکمتِ عملی کو نہایت کامیاب تجربہ

قرار دے کر اپنے منہ میاں مودی بننے کی کوشش کی ہے۔اس نازک موقع پر توقیر رضا خان صاحب کا یہ اقدام یقیناً قابل صد ستائش ہے مگر امت کے اندر صحیح معنی میں اتحادہزار اخلاص کے باوجود اس طرح کی سطحی کوششوں سے ممکن نہیں ہے۔ انتشار امت کا تعلق چونکہ فکر و عمل دونوں سے ہے اس لئے اس مسائلہ کا حل بھی ٹھوس فکری و عملی تدابیر کا متقاضی ہے ۔ اتحاد امت کی عملی تدابیر پر غور کرنے سے پہلے اتحاد و اختلاف کا تعلق اور اختلاف وانتشارکےفرق کو سمجھنا ضروری ہے ورنہ بعید نہیں کہ اتحاد کی مخلصانہ کوششوں کے دوران ہی افتراق کا نادانستہ بیج پڑ جائے ۔

سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اختلاف ایک ناگزیر حقیقت ہی نہیں ضرورت بھی ہے۔اس کی بدولت پیدا ہونے والے تنوع کواگریکسانیت سے بدل دیا جائے تو کائنات ہستی کا حسن ختم ہوجائے گا اور انسانی تہذیب کا ارتقاء رک جائیگا۔ انفرادی جبلت سے لے کر اجتماعی معاملات تک اختلاف ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ دوستوں کے درمیان، افراد خانہ کے اندر، دفتر و بازار کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں یہ موجود نہ ہو لیکن اس کے باوجود بہ سببِ اختلاف نہ رفاقت ختم ہوتیہے نہ خاندان منتشر ہوتے ہیں۔ اختلاف کے باعث نہ کوئی ملازمت ترک کرتا ہےاور نہ خرید وفروخت کا سلسلہ بند ہوتا ہے۔ جماعتوں کے اندر اور گروہوں کے درمیان بھی اختلاف کا پایا جانا فطری امر ہے لیکن اس سے انتشار و خلفشار

پیدا کرنے سے فتنہ برپا ہوتا ہے۔

اختلاف، اتحاد اور انتشار کے فرق و تعلق کو دنیوی زندگی اور جنت و دوزخ کے موازنہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جس طرح دنیوی زندگی ایک ناگزیر حقیقت آزمائش ہے اسی طرح باہمی اختلاف بھی لوازم فطرت میں سے ایک ہے۔ اگر اختلاف نہ ہو تو نہ ہی اتحاد کی ضرورت پیش آئے اور نہ انتشار کا امکان ہو۔ اختلاف کے تئیں اختیار کیا جانے والا رویہ دراصل وہ آزمائش ہے جو کامیابی و ناکامی کا سبب بنتا ہے۔ افراد و یا جماعتوں کا اختلافات کے باوجود متحد ہو کر ایک دوسرے کا تعاون کرنا کامیابی وکامرانی ہے اور اختلاف کے سببغض و عناد کا شکار ہو کر منتشر ہو جانا ناکامی و نامرادی ہے۔ اختلاف کی بیخ کنی چونکہ ناممکن ہے اس لئے اس سعی لاحاصل میں اپنی توانائی صرف کرنا دانشمندی نہیں ہے بلکہ اختلاف کے باوجود تعاون اعلی البر و تقویٰ کی بنیاد پر مل جل کر کام کرنا مطلوب و مقصود ہے۔

بیرونی خطرات یعنی اسلام دشمن طاقتوں کے خوف کی بنیاد پر قائم ہونے والا اتحاد پائیدار نہیں ہو سکتا۔ یہ نسخہ اس وقت تک تو کارگر ثابت ہوتا ہے جبتک کہ خطرہ شدید ہو مثلاً کسی جنگ یا فساد کے دوران یا اس کے فوراً بعد لیکن حالات کے معمول پر آتے ہی یہ بنیاد کمزور پڑ جاتی ہے۔ جیسے جیسے خوف و ہراس

کا زور ٹوٹتا جاتا ہے اتحاد اتفاق کی ضرورت واہمیت کا بھی خاتمہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ لوگ قرآن مجید کی ایک آیات بلکہ آیت کے ایک ٹکڑے کو سیاق و سباق سے الگ کرکے اس کے سہارے اتحاد قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو جزوی کامیابی سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اتحاد بین المسلمین کی خاطر صرف ایک آیت نہیں بلکہ پورا رکوع نازل فرمایا ہے جس کے قلب میں ''واعتصمو بحبل اللہ'' والی آیت ہے۔ اس ٹکڑے کے حوالے سے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان جس طرح دل کی دھڑکن کے بند ہوجانے پر زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح اگر دل کو باقی جسم سے الگ کردیا جائے تب بھی نتیجہ ہلاکت خیز ہوتا ہے۔

مذکورہ آیت سے قبل ارشاد ربانی ہے ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہا سکا حق ہے تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔ اس آیت میں خطاب اہل ایمان سے ہے اور اتحاد بین المسلمین کی تلقین سے پہلے اس کا سیاق غماز ہے۔ تقویٰ ایک انفرادی (pre requisite) ہے کہ تقویٰ اتحاد کی ناگزیر ضرورت صفت ہے۔ جو لوگ اتحاد کے خواہش مند ہیں ان کے لئے اپنے آپ کو اس سے متصف نہ کرنا لازمی ہے ورنہ لاکھ خواہش یا کوشش کے باوجود وہ متحد نہیں ہوسکتے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''مومن (دوسرے) مومن کے لیے دیوار کے مثل ہے جس کی ایک اینٹ سے دوسرے اینٹ کو مضبوط بناتی ہے۔'' اللہ کی محبت اور اللہ کا ڈر ہی ان اینٹوں کو خوشنما اور مضبوط بناتا ہے۔

اگر اینٹیں کمزور اور بد نما ہوں تو ان کی مدد سے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی تعمیر غیر ممکن ہے؟اس آیت مبارکہ میں موت تک تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین مستقل مزاجی کی علامت ہے اور یہی استقلال دیوار کو پائیداری بخشتا ہے اور اس کی عدم موجودگی اتحاد کو عارضی اور ناپائیدار بنا دیتی ہے۔

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد متقیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سب اللہ کی رسی یعنی اللہ کی کتاب قرآن مجید کو مل کر تھام لیں۔ ان سب کا ایک کتاب سے وابستہ ہو جانا از خود باہم منسلک کر دینے والا عمل ہے۔ اتحاد کی بنیاد یہی اعتصام باللہ ہے۔ اگر کسی دیوار کی بنیاد ناہموار ہو تو اس میں لگنے والی اینٹوں کا معیار جو بھی ہو۔ اس کا نقشہ چاہے جتنا اعلیٰ درجہ کا ہو۔ اس کو تعمیر کرنے والوں کی مہارت جیسی بھی ہو دیوار جیسے جیسے بلند ہوگی اس کا ٹیڑھا پن واضح تر ہوتا چلا جائیگا اور کسی دشمن کی زحمت کے بغیر وہ اپنے ہی بوجھ سے ڈھے جائیگی۔ کتاب اللہ ہی اہل ایمان کے درمیان قدر مشترک ہے اور اسی کے توسط سے باہمی اختلافات کو بخیر و خوبی نمٹایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے بجائے طاقت و قوت یا سازش و فریب کے مدد سے تفرقہ تو پھیلایا جا سکتا ہے مگر اتحاد قائم نہیں ہو سکتا اسی لئے درمیان میں تفرقہ سے اجتناب کی تاکید آئی ہے۔

آگے چل کر اس آیت کریمہ میں اتحاد کو اللہ کا احسان قرار دیا گیا گویا

اتحاد قائم کرنے والوں کا رجوع اللہ سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف اپنی ذہانت وذکاوت پر انحصار کر لینا امت کو خلفشار کی آگ سے نہیں بچا سکتا۔ انتشار کے سبب نہ صرف یہ دنیا جہنم زار بن جاتی ہے بلکہ دوزخ کی آگ کا ایندھن بھی فراہم ہو جاتا ہے۔اللہ کا فضل و کرم مومنین کے دلوں کو جوڑ کر انہیں بھائی بھائی بناتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ یہ نشانیاں ہمارے سامنے اس لئے بیان فرماتا ہے کہ ہم ان کی مدد سے سیدھے راستے کی معرفت حاصل کریں فرمایا''اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے''۔ یہاں پر سیدھے راستے پر پیش قدمی کی تلقین کی گئی ہے۔

اتحاد امت کی اہم ترین عملی تدبیر اس حدیث پر صدق دل سے عملدرآمد ہے کہ '' اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کروجو اپنے لیے پسند کرتے ہو''۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنی پسند دوسروں پر تھوپو بلکہ جس طرح ہم اپنے اوپر زور زبردستی نہیں پسند کرتے اسی طرح دوسروں پر جبر نہ کریں۔ جیسے ہر شخص اپنی عزت نفس کا خیال کرتا ہے اسی طرح وہ دوسروں کا بھی احترام کیا جائے بلکہ فرمایا یہ بھی فرمایا'' اپنی ذات پر دوسروں کوترجیح دو''۔ صحابہ نے اس حدیث پر میدان جنگ میں عمل کیا اور اپنے بھائی سے قبل پانی کا گھونٹ پینا گوارہ نہیں کیا یہاں تک کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اتحاد امت کا

یہ یہ

لازمی تقاضہ ہے ہم اس آیت پر عملی نمونہ ہوں کہ ہم ''کفار پر سخت اور آپس میں رحم وکرم کا پیکر بن جائیں۔'' بقول حکیم الامت اقبال

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ان تقاضوں کی اہمیت کو دیوار اور اینٹوں کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔دیوار میں اینٹوں کے درمیان اگر سیمنٹ موجود نہ ہو تو ہوا کا ایک معمولی سا جھونکا بھی اسے زمین بوس کرنے کیلئے کافی ہے۔ امت کی بنیان المرصوص میں سیمنٹ کی تفصیل حدیثِ رسولؐ میں دیکھیں ''مومنوں کی مثال آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے، ایک دوسرے پر رحم کھانے اور شفقت کرنے میں ایک جسم کے مانند ہے کہ جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' اس نسخۂ کیمیا یعنی باہم محبت، شفقت، ہمدردی و غم گساری کے بغیر اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

اتحاد بجائے خود مقصود ہے نیز ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ بھی ہے اسی لئے اس کے بعد والی آیت میں فرمایا ''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔'' اس آیت کا اتحاد امت

سے گہرا تعلق ہے۔ اگر اتحاد میں شامل تمام گروہ اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں منہمک ہوں تو ان کے درمیان تعاون واشتراک کے مواقع پیدا ہوتے رہیں گے اور اتحاد واتفاق کی فضا پیدا ہوگی۔ ایسے میں قرآن کے اوامر و نواہی ''نیکی اور خداترسی کے کام میں تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں میں تعاون کرنے سے اجتناب کرو۔'' پر عملدرآمد کے مواقع ہاتھ آتے رہیں گے۔

ممبئی کے کرلا علاقہ میں جماعت اسلامی نے گزشتہ دنوں منشیات کی روک تھام کیلئے مختلف مکاتب فکر کی جماعتوں کے تعاون سے ایک مہم چلائی۔ اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ایک معاشرتی برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد میں امت نے اتحاد کا عملی مظاہرہ کیا۔ اس مہم کے دوران امت کی مختلف تنظیموں سے تعارف کے مواقع پیدا ہوئے، فاصلوں میں کمی آئی۔ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا اور باہمی اعتماد بحال ہوا۔ اس طرح کے عملی اقدامات ہی آگے چل کر اتحاد کی راہ استوار کرتے ہیں۔ رکوع کے اختتام پر رب کائنات نے انتشار کے عبرتناک انجام سے خبردار کیا ہے۔ فرمانِ ربانی ہے ''کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر فرقہ بندی کا شکار ہو کر اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اُس روز سخت سزا پائیں گے۔'' معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کی

سخت سزا کا خوف ہی انسان کو انتشار و خلفشار پھیلانے سے روک سکتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ اتحاد کی تمام تر احتیاط اور دانشمندی کے باوجود ایک ساتھ کام کرنے والوں کے درمیان ناچاقی کا امکان باقی رہتا ہے۔ ایسی صورتحال میں الہامی ہدایت یہ ہے کہ ''اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ'' ۔ ممکن ہے دونوں فریق اس صلح صفائی پر راضی ہو جائیں بصورتِ دیگر ''اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والوں سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔'' اس آیت میں عدل و نصاف قائم کرتے وقت انسانوں کی پسند و ناپسند کا خیال کرنے کے بجائے اللہ کی خوشنودی ملحوظ خاطر رکھنے کی نصیحت بہت اہم ہے ۔

امت کے اندر صلح و آشتی اس قدر اہمیت ہے کہ اس کی خاطر جنگ بھی مباح ہے ۔ اتحاد و اتفاق کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کیا (میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتلا دوں جس کا مقام روزہ، صدقہ اور نماز سے بڑھا ہوا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ضرور بتایئے ۔ آپ نے فرمایا کہ وہ چیز آپس کی لڑائی میں صلح کرانا ہے اور باہمی تعلقات کی خرابی نیکیوں کو مٹانے والی ہے۔'' اخلاص نیت اور حکمت و

دانائی کے ساتھ اگر باہمی صلح صفائی کا کام اسی طرح جاری و ساری رہے جیسا کہ توقیر رضا خاں صاحب نے کیا ہے تو انتشار کی خرابی اپنے آپ مٹ جائیگی اور ملت اسلامیہ امت واحدہ بن جائیگی بقول ابوالمجاہد زاہد

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا کام بنے۔

انتخابی نتائج: ہار کو جیت کے امکان سے باندھے ہوئے رکھ

اولمپک مقابلوں میں چونکہ کئی کھیل ہوتے ہیں اس لئے مختلف ممالک کو کسی نہ کسی میدان میں کوئی نہ کوئی تمغہ مل ہی جاتا ہے ایسا ہی کچھ حالیہ اسمبلی انتخاب میں بھی ہوا سبھی جماعتوں کے حصے میں کچھ نہ کچھ آہی گیا۔ سیاست میں چونکہ خوشی کا تعلق اپنی فتح سے زیادہ حریف کی شکست سے ہوتا ہے اس لئے ہر کوئی اپنی کسی نہ کسی کامیابی یا دشمن کی کسی نہ کسی ناکامی پر بغلیں بجا رہا ہے مثلاً بی جے پی بہت خوش ہے کہ آسام میں کامیابی مل گئی اسے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ کانگریس کو آسام کے ساتھ ساتھ کیرالہ میں بھی اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ کانگریس کو اس بات کی خوشی ہے کہ وہ پدوچیری میں کامیاب ہو گئی اور پارلیمانی انتخاب کے مقابلے بی جے پی کے رائے دہندگان کے تناسب میں ہر جگہ کمی واقع ہوئی۔ سی پی ایم کو خوشی ہے کہ بنگال میں ہزیمت اٹھانے کے باوجود اسے کیرالہ میں اسے اقتدار حاصل ہوگیا۔

یہ انتخابات مشرقی اور جنوبی ہند میں ہوئے تھے۔ مشرق میں ایک بی جے پی اور ایک علاقائی جماعت نے کامیابی درج کرائی جبکہ جنوب میں کانگریس، کمیونسٹ

اور ایک علاقائی جماعت نے کامیابی درج کرائی اس طرح علاقائی جماعتواں کے علاوہ کسی کو دوہری کامیابی نہیں ملی۔ جئے للیتا اس بات سے پر مسرت ہیں کہ ماضی کی بہ نسبت نشستوں میں کمی کے باوجود وہ دوبارہ کسی طرح اکثریت میں آہی گئیں اور ممتا کے کیا کہنے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے رائے دہندگان اور ووٹ تناسب دونوں میں بھی اضافہ کرکے زبردست کامیابی درج کروائی۔ اس بار مسلمانوں کو نہ صرف آسام کے باہر بی جے پی کی ناکامی کی خوشی ہے بلکہ وہ اس بات سے خوش ہیں کہ منتخب شدہ مسلم امیدواروں کی تعداد بی جے پی کے منتخب ارکان اسمبلی سے تقریباً دوگنا ہے حالانکہ مولانا بدرالدین اجمل خود انتخاب ہار گئے۔

آسام میں بی جے پی کی کامیابی کی اہم ترین وجوہات میں سے ایک اس کے حلیف ہیں بلکہ دوسری اہم وجہ ایک نہایت تیز طرار سابق کانگریسی وزیر ہیمنتا بسوا سرما کی پارٹی میں شمولیت بھی ہے۔ بی جے پی نے اپنے حلیفوں کو بہت کم نشستوں پر لڑنے کا موقع دیا اس کے باوجود اے جی پی اور بوڈو فرنٹ نے مجموعی طور پر ۲۶ نشستوں پر کامیابی حاصل کرکے دکھا دیا کہ علاقائی جماعتوں میں کتنا دم خم ہے۔ بی جے پی خود ۱۲۶ میں ۶۰ نشستوں پر تاریخی کامیابی درج کرائی جبکہ اس کے ووٹ کا تناسب کانگریس سے ڈیڑھ فیصد کم ہے۔ کانگریس زیادہ ووٹ کے باوجود بی جے پی کے مقابلے نصف امیدوار بھی کامیاب نہ کرسکی۔ اس کے

معنی ہیں کہ بی جے پی کی حامی جماعتوں کا اس کو فائدہ ملا اور وہ مشرق ہند میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئی ۔ کانگریس کی اس ناکامی میں اس کیلئے عبرت کا بہت بڑا سامان ہے ۔ اول تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرلینا کافی نہیں ہے بلکہ انتخاب میں کامیابی کیلئے علاقائی جماعتوں سے تال میل بہت ضروری ہے۔ کانگریس اگر اے جی پی یا بوڈوفرنٹ کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہوجاتی تو اس کی حالت ایسی خستہ نہیں ہوتی جیسی کہ اب ہے۔

کانگریس کی دوسری غلطی ۸۱ سالہ ترون گوگوئی کو تبدیل نہیں کرنا تھا۔ کانگریس کی قومی لیڈرشپ توعملاً راہل گاندھی کے ہاتھ میں ہے لیکن ریاست کے عوام جانتے ہیں وہ وزیراعلیٰ نہیں بنیں گے اس لئے ایک موثر علاقائی رہنما کے بغیر صوبائی انتخاب میں کامیابی ناممکن ہے۔ بی جے پی کا سابق کانگریسی وزیر سرما کو اپنے ساتھ لے لینا بہت بڑے فائدے کا سودہ تھا۔ سرما ایک زمانے تک ترون گوگوئی کے دست راست رہے ہیں لیکن جب سے ترون گوگوئی نے اپنے بیٹے گورو گوگوئی کو سیاست میں آگے بڑھایا ہیمنتا سرما بددل ہوگئے اور بالآخر بی جے پی کا رخ کیا۔ اگر کانگریس ایک سال قبل سرما یا ان جیسے کسی نوجوان کو وزیراعلیٰ کے عہدے پر فائز کردیتی تب بھی عوام کو بے وقوف بنایا جاسکتا تھا لیکن کانگریسی لیڈرشپ کے اندر پائی جانے والی خوداعتمادی کی کمی اس کے قوت فیصلہ پر اثرانداز ہو رہی ہے۔

اس انتخاب میں کانگریس ہی کی مانند دوسرا بڑا نقصان مولانا بدرالدین اجمل کی اے یو ڈی ایف کا ہوا۔ ان کے ارکان اسمبلی کی تعداد ۱۸ سے گھٹ کر ۱۵ پر آگئی اور وہ خود بھی الیکشن ہار گئے اس طرح کنگ میکر کا خواب دیکھنے والا بے تاج بادشاہ دو ٹکے کا فقیر ہوگیا ۔آسام جیسی ریاست میں جہاں مسلم رائے دہندگان کی ۳۰ فیصد ہے اگر ان کی سیاسی جماعت کا یہ حال ہے تو جہاں وہ ۱۰ یا ۱۵ فیصد ہیں ان کی اپنی سیاسی جماعت کا مستقبل کیا ہوگا؟ بی جے پی کو حاصل ہونے والی واضح اکثریت اے یو ڈی ایف کیلئے نعمت غیر مرتقبہ ہے ۔ ایسی علاقائی جماعتیں جو کسی فرد واحد کے نام پر چلتی ہیں اس کے رہنما کا انتخاب ہار جانا بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔ اسی لئے یوپی میں اگر سماجوادی پارٹی کا صفایہ ہوجائے تب بھی ملائم سنگھ یادو اور ان کا خاندان کسی طرح اپنے آپ کو کامیاب کرلیتا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کانگریس بھی ہار گئی ورنہ اے یو ڈی ایف کے ارکان کی بڑی تعداد مولانا اجمل کی شکست کے بعد کانگریس میں کی جانب نکل جاتی بلکہ اگر بی جے پی کو حکومت سازی میں ان کی ضرورت ہوتی تو اس کے ساتھ ہوجاتی۔ دراصل یہ مفاد پرست سیاستداں مولانا اجمل کے ساتھ آئے ہی اس لئے ہیں کہ ان کی مدد سے اپنی سیاست چمکائیں جب انہیں محسوس ہوگا کہ مولانا کی اپنی نیا ڈوب رہی ہے تو وہ سب سے پہلے کشتی سے باہر چھلانگ لگائیں گے اور ان ڈوبتے تنکے کا سہارہ زعفرانی ہو یا سبز، سرخ ہو زرد اس سے کوئی فرق

نہیں پڑتا۔ اس کا ہدف تو کسی طرح تیر کر اقتدار کے ساحل پر آنا ہوتا ہے۔

مغربی بنگال میں اس بار کانگریس پارٹی نے دائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ الحاق کرکے انتخاب لڑا۔ کانگریس کو اس کا دوہرا فائدہ ہوا یعنی نہ صرف اس کے ووٹ کا تناسب بڑھا بلکہ اس کے ارکان اسمبلی کی تعداد میں بھی اضافہ ہوااور اب وہ مغربی بنگال کی سب سے بڑی حزب اختلاف ہے۔ کمیونسٹ بیچارے خسارے میں رہے اس لئے کہ ان کے نظم و ضبط کے پابند رائے دہندگان نے تو کانگریس کو ووٹ دے دیا مگر کانگریس کے شتر بے مہار ممتا بنرجی کی جانب مڑ گئے۔ ممتا بنرجی نے مغربی بنگال کے سب سے بڑے اخبار آنند بازار پتریکا، ٹیلیگراف اور اے بی پی چینل کی رائے کو غلط ثابت کرتے ہوئے غیر معمولی کامیابی درج کرائی۔ ان نتائج کا موازنہ اگر ۲۰۱۱ کے اسمبلی انتخاب سے کیا جائے تو بی جے پی ہر دو طرح سے بہتر حالت میں ہے۔ اس کے ووٹ کا تناسب ۴ سے ۱۰ فیصد تک پہنچ گیااور ارکان کی تعداد بھی ایک سے ۳ تک جا پہنچی مگر ۲۰۱۴ کے قومی انتخاب کے مقابلےاس کا نہ صرف ووٹ تناسب کم ہوا بلکہ متوقع ارکان کی تعداد میں بھی زبردست کمی واقع ہوئی۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ بنگال میں جہاں دونوں کانگریس پارٹیاں ترقی کی جانب مائل ہیں وہیں بی جے پی اور کمیونسٹ تنزل کا شکار ہیں۔

ممتا بنرجی کا یکے بعد دیگرے بدعنوانی میں ملوث ہونے کے الزامات اور ویڈیو کے ذرائع ابلاغ میں آنے کے باوجود اس قدر زبردست طریقے پر کامیاب ہوجانا اس بات کی دلیل ہے کہ عوام بدعنوانی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے ۔ اس انتخاب سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اگر مرکزی حکومت کسی علاقائی جماعت کا کان مروڑنے کی کوشش کرے جیسا کہ بی جے پی نے ترنمول کے ساتھ کیا تھا تو عوام کی ہمدردیاں علاقائی جماعت کو حاصل ہوجاتی ہیں ۔ اس لئے بی جے پی کو آئندہ اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اس طرح کا مصنوعی دباو فائدے کے بجائے نقصان کا سبب بنتا ہے۔ بنگال یں بی جے پی کی ناکامی کے دو اسباب ہیں ایک تو مودی جی کے طلسم کا ٹوٹ کر پاش پاش ہوچکا ہے اور دوسرے بنگال میں بی جے پی کو آسام جیسے حلیف میسر نہیں آئے ۔ اگر ترنمل بی جے پی کے ساتھ جانے کی غلطی کرتی تو کانگریس کی مانند بی جے پی کا توزبردست فائدہ ہوجاتا لیکن کمیونسٹوں کی طرح وہ بڑے خسارے میں رہتی ۔ جس طرح کمیونسٹوں کی قربت کا کانگریس کو فائدہ ملا اسی طرح بی جے پی سے دوری ترنمل کیلئے مفید ثابت ہوئی۔

مغربی بنگال کی طرح تمل ناڈو میں کانگریس نے ڈی ایم کے کے ساتھ الحاق کیا ۔ یہاں پر اتحاد کا فائدہ دونوں کو ملا اور ماضی کے قومی و ریاستی انتخابات کے مقابلے ان کی حالت بہتر ہوئی لیکن یہ بڑھوتری اس قدر نہیں تھی کہ جئے للیتا کو اقتدار سے بے دخل کرسکے۔ تمل ناڈو میں ڈی ایم کے سے وہی غلطی سرزد ہوئی جو کانگریس نے آسام میں کی ۔ آج بھی ڈی ایم کے کا چہرہ ضعیف و نحیف کرونا

ندھی ہیں۔ ان کی جگہ عملی کام کرنے کیلئے اسٹالن کو آگے بڑھایا گیا جو کروناندھی کے چشم وچراغ ہیں اس لئے غالباً عوام نے اپنی روایت کے خلاف پھر ایک بار جئے للیتا کے گلے میں جئے مالا ڈال دی ۔ جئے للیتا کی بھی صحت اچھی نہیں ہے لیکن کروناندھی کے مقابلے وہ اب بھی جوان ہیں ۔ بی جے پی کے ووٹ شئیر میں گوکہ معمولی یعنی عشاریہ فیصد اضافہ ہوا ہے لیکن تمام کی تمام ۲۳۴ نشستوں پر ناکامی ایک شرمناک شکست ہے ٦ ۔ بی جے پی کی یہ حالت اس لئے بھی ہوئی کہ آسام کے برخلاف تمل ناڈو میں اس کے سارے اتحادی بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ بنگال کی مانند بالکل اچھوت بن کر رہ گئی۔ کیرالہ سے اس بار بی جے پی کو بڑی امیدیں تھیں اس لئے وہاں کا انتخاب بڑے زور و شور سے لڑا گیا۔ اس دوران بد قسمتی ایک مندر میں آگ لگ گئی ۔ مودی جی اس سے پریشان ہو کر بذات خود دورہ کیا اس کے بعد مرکز کی جانب سے ایسی گرجوشی کا مظاہرہ ہوا گویا سارا کام دہلی کی بی جے پی سرکار کررہی ہے۔ ہندوستان کی ۱۰ ریاستیں قحط سالی کا شکار ہیں ۔ کئی مقامات پر لگاتار دوسرے اور تیسرے سال یہ صورتحال ہے ۔

وزیراعظم کو ان میں سے کسی علاقہ میں جانے کی توفیق نہیں ہوئی اس لئے کہ وہاں نہ انتخاب ہورہے ہیں اور نہ وہ سرحد پار ہیں لیکن کیرالہ کے انتخابات نے وہاں کی آگ کو اہم بنا دیا۔ اس کے بعد بی جے پی نے کانگریس پر بدعنوانی کا الزام لگاتے ہوئے سری سنت نامی کھلاڑی کو

اپنا امیدوار بنادیا جس پر جوئے میں ملوث ہونے کے سبب آئی پی ایل میں پابندی لگادی گئی ۔جب اس سے بھی کام نہیں چلا تو مودی جی نے کیرالہ جیسی ترقی یافتہ ریاست کو صومالیہ سے بدتر قرار دے دیا۔دلیکن انتخابی نتائج نے ثابت کردیا کہ بی جے پی کیلئے کیرالہ صومالیہ سے بدتر ہے ۔اس لئے کہ ساری مشقت کے باوجود اسے صرف ایک رکن اسمبلی کی کامیابی پر صبر کرنا پڑا جبکہ مسلم لیگ کو ۱۸ نشستوں پر کامیابی ملی ۔مرکز میں برسرِ اقتدار جماعت کی یہ کارکردگی باعثِ شرم ہے۔

کیرالہ کے نتائج حسب توقع آئے وہاں ہر پانچ سال بعد بیزار عوام نئے حکمرانوں کو سبق سکھا کر پرانی جماعت کو لے آتے ہیں۔اس طرح انتخابی عمل گویا پریشان حال لوگوں کی وقتی تسکین کا سامان بن گیا ہے۔کمیونسٹ بے چارے گزشتہ قومی انتخاب کے بعد راندۂ درگاہ بنے ہوئے ہیں ۔ان کا سب سے مضبوط قلعہ مغربی بنگال کب کا مسمار ہوچکا ہے ۔اس کو بچانے کیلئے کانگریس کا ہاتھ بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکا لیکن کم ازکم کیرالہ میں انہوں نے کامیابی درج کرواکر اپنے وجود کا احساس دلادیا۔اس بار اگر سرخ ستارہ کیرالہ میں بھی غروب ہوجاتا تو پھر اس سیاسی جماعت کی تقریباً موت ہوجاتی لیکن مشیت نے ہندوستانی سیاست کی قوس وقزح میں اسے کچھ اور دن پنپنے کا موقع عنایت کردیا جس سے کمیونسٹ رہنماؤں کے چہرے پر عرصۂ دراز کے بعد مسکراہٹ اور امید

کی ایک مدھم کرن نظر آئی۔

اس انتخاب کے بعد جس طرح مسلمان اس بات سے خوش ہو رہے ہیں کہ بی جے پی کی بہ نسبت نو منتخب شدہ مسلم ارکان اسمبلی تعداد بہت زیادہ ہے اسی طرح کانگریسی بھی اپنی ہار کے باوجود اپنے کامیاب ارکان کی تعداد پر بغلیں بجا رہے ہیں جو بی جے پی کے مقابلے دوگنی ہے۔ کانگریس کیلئے ایک خوشخبری دہلی کے بلدیاتی ضمنی انتخاب کے نتائج سے بھی آئی۔ دہلی کی میونسپلٹی میں بی جے پی کو اکثریت حاصل ہے۔ اس بار اروند کیجریوال کی عآپ نے پہلی مرتبہ ان انتخابات میں حصہ لیا تھا اور ابتدائی رائے شماری میں ایسا لگ رہا تھا کہ پھر ایک جھاڑو سارا سپڑا صاف کرجائیگا اس لئے کہ ۱۳ میں سے ۱۲ پر وہ آگے چل رہی تھی لیکن شام تک منظر بدل گیا۔ عآپ کو صرف ۵ پر کامیابی ملی اور ۴ کانگریس کی جھولی میں چلی گئی جبکہ ایک آزاد امیدوار تومر بھی کانگریس کا باغی تھا اور اس کی گھر واپسی سے کانگریس اور عآپ برابر ہو گئے۔

بی جے پی کو دہلی میں صرف ۳ پر اکتفاء کرنا پڑا جو شرمناک ہے لیکن ایسا تو مختلف بلدیاتی اور پنچایت انتخابات میں ہوتا رہا ہے۔ اس سال ضمنی انتخابات میں بی جے پی کی کارکردگی مایوس کن رہی ہے۔ تلنگانہ میں ایک نشست پر انتخاب ہوا جس پر ٹی آر ایس کامیاب رہی اس پر دوسرے نمبر پر کانگریس تھی بی جے پی

کو انتخاب کا بائیکاٹ کرنے والے ۶ء ا فیصد ووٹ بھی نہیں ملے۔ اتر پردیش میں دونوں نشستیں سماجوادی نے جیت لیں جبکہ آئندہ انتخابی مہابھارت کا کروکشیتر وہی ہے۔

جھارکھنڈ میں دو میں سے ایک پر کانگریس اور ایک پر بی جے پی کامیاب ہوئی۔ گجرات میں بی جے پی کامیاب ضرور ہوئی لیکن کانگریس اور اس کے ووٹ کا فرق ۲ فیصد سے کم تھا۔ اس کے باوجود اگر بی جے پی کانگریس مکت بھارت کا خواب دیکھ رہی ہے تو کسی کو خیالی احمقوں کی جنت میں رہنے سے کون روک سکتا ہے؟ اس انتخاب کے نتائج ساری سیاسی جماعتوں سے یہی کہتے ہیں کہ

ہار کو جیت کے امکان سے باندھے ہوئے رکھ

(خواب کو دیدۂ حیران سے باندھے ہوئے رکھ (ازلان شاہ

فقہاء کی نماز اور ہے غازی کی نماز اور

نماز دینی کتب کا ایک صدابہار موضوع ہے۔ اسلام کا ستون ہونے کے سبب نماز کی ترغیب وترہیب پر سب سے زیادہ تقریر و تحریر کا کام ہوتا ہے۔ نماز کی اہمیت وافادیت اور غرض و غایت پر بھی کتابیں لکھی جاتی ہیں تاکہ لوگوں کی زندگی پر اس عظیم عبادت کے مطلوبہ اثرات پڑیں۔ اس مرحلے میں کچھ لوگ نماز کے مقصد اور ذریعہ ہونے کی بحث میں الجھ جاتے ہیں۔ اذکارِ نماز کے معنی اور مفہوم سمجھانے کا مقصد یہ ہوتا اسے عادتاً نہیں بلکہ شعوری طور پر ادا کیا جائے۔ نماز کی روح یعنی خشوع خضوع پر کم توجہ کے باوجود کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے۔ طریقۂ نماز سب سے مقبول و معروف موضوع ہے جس کے تحت فضائل کے ساتھ ساتھ مسائل بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ مسئلہ ایک ذو معنی لفظ ہے اس لئے اگر اس مرحلے میں خود پسندی، تنگ نظری، اصرار و شدت اور تنقید و تنقیص دامن گیر ہو جائے تو مسائل حل نہیں ہوتے ہاں اختلافات ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین غازی نے اپنی کتاب ” نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل “میں ان مسائل کو رفع دفع کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

غازی صاحب کے واقف کار توان کی وسیع العلمی کے قائل ہیں لیکن جو لوگ ان کو

نہیں جانتے اب وہ بھی اس کتاب کے توسط سے ان کے علم و فضل کا لوہا مان لیں گے۔ واٹس اپ اور فیس بک کے دور میں جبکہ لوگوں کا مطالعہ اختصار کی بھینٹ چڑھ گیا کسی موضوع پر گہرائی میں جانے کی محنت و عرق ریزی عنقاء ہو گئی ہے۔ غازی صاحب نے ایک نہایت خشک موضوع پر اپنی تحقیق کو اس قدر دلنشین انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ کتاب بہ آسانی ایک ہی نشست میں ختم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی دلیل یہ ہے کہ روایات کے بجائے عملی تواتر زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ فقہاء نے نماز کو معاشرے میں جاری و ساری عملی تواتر سے سیکھا اور سکھایا تھا اس لئے ان کے پیروکاروں کو بھی یہی کرنا چاہئے۔ فقہائے عظام کے اندر پائی جانے والی غیر معمولی رواداری بھی ان کے ماننے والوں سے کشادہ دلی کی طلبگار ہے۔

یہ نہایت معقول دلیل ہے نماز کے رائج تمام ہی طریقوں کو درست تسلیم کر لینے سے بہت سارے جھگڑے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں لیکن پھر اس کے بعد نماز کی بابت تدوین فقہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ نماز کی بابت چونکہ سارے طریقے درست ہیں اس لئے اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اپنے آس پاس رائج طریقہ کے مطابق نماز پڑھیں اور اگر کوئی استفسار ہو تو اپنے مسلک سے قطع نظر جو بھی عالم دین میسر ہو جائے اس سے استفادہ کر لیا کریں۔ یہ نہایت دانشمندی کا موقف ہے۔ اس لئے اگر فقہ کی تدوین کا کام توقیفی مسائل کے بجائے صرف اجتہادی مسائل تک

محدود کر دیا جائے تو بہت سارے نئے مسائل حل ہو سکیں گے اور پرانے مسائل کا پونر جنم بھی نہیں ہوگا۔

میدانِ عمل میں دلچسپی رکھنے والے مجتہدین نے اپنا وقت اور توانائی فروعی اختلافات پر صرف نہیں کیا بلکہ اپنے دور کے جدید مسائل اور فتنوں کی جانب توجہ فرمائی۔ مولانا مودودی یا حسن البناء شہید کے نزدیک عظیم تر مقاصد کے حصول کی خاطر اختلافی امور سے گریز نظر آتا ہے۔ مشہور داعی اسلام احمد دیدات سے بھی لوگ جب دنیا بھر کے لوگ فقہی مسائل پوچھا کرتے تو وہ انہیں ان کی مقامی مسجد کے امام سے رجوع کروادیتے تھے۔ معروف عالم دین اور فرانسیسی زبان میں قرآن کریم کے مترجم ڈاکٹر حمید اللہ کے بارے میں بھی سنا ہے کہ پیرس میں قیام کے دوران ان کے ہاتھ پر اکثر الجزائر کے باشندے ایمان لاتے تھے۔ کلمۂ شہادت کے بعد جب وہ نماز کا طریقہ پوچھتے تو ڈاکٹر صاحب انہیں کسی الجزائری عالم دین سے استفادہ کی تلقین کرتے تا کہ وہ نو مسلمین اپنے وطن میں رائج مالکی فقہ کے مطابق نماز سیکھ کر معاشرے کے مسلمانوں میں گھل مل جائیں۔ یہی معقول رویہ غازی صاحب جیسے لوگوں کا شیوہ رہا ہے جن کو مسائل کھڑے کرنے کے بجائے انہیں حل کرنے میں دلچسپی ہوتی ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے نماز سے متعلق اختلاف کی بابت اپنی کم علمی کا

شدید احساس ہوا اور ساتھ ہی اس موضوع پر میری معلومات میں بیش بہا اضافہ بھی ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ اذان سے لے کر سلام پھیرنے تک ان گنت اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات اگر علمی نوعیت کے ہوتے تو مجھ جیسے کم علم کے لئے ان سے لاعلمی معقول ہوتی لیکن یہ تو عملی اختلافات ہیں اس کے باوجود ان کا مشاہدہ کیوں نہیں کیا؟ جب یہ سوال میں نے اپنے آپ سے پوچھا تو پتہ چلا کہ نماز کو میں اپنے اور رب کے درمیان کا معاملہ سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی دوسرے لوگ کیسے نماز پڑھتے ہیں اور کیوں؟ اس لئے کہ وہ ان کا اور ان کے رب کے درمیان کا معاملہ ہے۔
انفرادی نماز کی حد تک تو یہ رویہ صد فیصد درست ہے لیکن نماز باجماعت کے سلسلے یں مجھ جیسے صلح جو لوگ اکرام مسلم کے پیش نظر جب کسی مسجد میں دیکھتے ہیں کہ لوگ اقامت کے شروع میں اٹھ جاتے ہیں تو وہ بھی ابتداء میں کھڑے ہو جاتے ہیں یا پھر قد قامت الصلاۃ کی صداتک بیٹھے رہتے ہیں تاکہ کسیکی دلآزاری نہ ہو۔ اس طرح کی رواداری کا مظاہرہ چونکہ ہم لوگ گھر اور دفتر میں کرتے ہیں اس لئے مسجد کے اندر اس کو ترک کر دینا چہ معنیٰ دارد؟
رواداری کی مطلوبہ فضا اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب علمائے کرام تعلیم و تعلم کے منصب بلند سے نیچے اتر کر عوام سے بھی کچھ سیکھنے کی زحمت فرمائیں۔ اسلاف کی مانند وہ عام لوگوں کے مسائل و مشکلات کا اندازہ کرکے اس میں

اضافہ کرنے کے بجائے ان کو حل کرنے کی سعیٔ جمیل فرمائیں ۔اس کتاب کے مطالعہ سے میرا یقین اس امر میں پختہ ہوگیا کہ مومن کو دین اور نماز اپنے گھر و اطراف سے سیکھنا چاہیۓ۔ سیکھنے اور سکھانے کے دوران انسان کو اپنے طریقۂ کار میں از خود حذف و اضافہ بھی کرتے رہنا چاہیۓ تاکہ چین کی زندگی گزار سکے۔ یہ رویہ آدمی کو دوسروں کا امن و سکون غارت کرنے سے بھی روک دیتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ اپنی ذات اور آخرت کی فکر کرے۔ نماز کے دوران مومن کے دل کی یہ کیفیت ہو کہ گویا وہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے سرگوشی کر رہا ہے۔ وہ اپنے رب کا دیدار کر رہا ہے یا اگر ایسا نہیں ہو سکے تو کم از کم یہ کیفیت لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔ احسان کی اس منزل میں فروعی اختلافات اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں اور ملت اسلامیہ اپنے آپ امت واحدہ بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین غازی کی نماز سے متعلق کتاب کا غالباً یہی پیغام حقیقی ہے۔

آسام انتخابات : تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

سربانند سونوال یعنی سونے والا سراپا آنند طلائی تمغہ جیت کر وزیراعلیٰ بن گئے اور اسی کے ساتھ آسام میں کمل کھل گیا۔ کیوں نہ کھلتا ؟ کانگریس کے ۱۵ سالوں سے چلے آرہے وزیراعلیٰ کا نام ترون یعنی نوجوان تھا مگر ان کی عمر ۸۱ سال تھی ۔ پانچ سال قبل انتخاب سے قبل ان کو دل کا دورہ پڑا اور تین آپریشن ہوئے۔ اس وقت گوگوئی کے اہل خانہ نے کانگریسی صدر سونیا گاندھی سے گزارش کی کہ برائے کرم ترون گوگوئی کو سیاست سے سبکدوش کر دیا جائے لیکن اس مشورے پر نہ کانگریس نے کان دھرا اور نہ ترون گوگوئی نے قابل التفات سمجھا۔ بستر مرگ سے اٹھ انتخابی دنگل میں قدم رکھنے والے والے سابق وزیراعلیٰ نے ۵ سال قبل حزب اختلاف آسام گن پریشد کو جڑ سے اکھاڑ کر اپنی زندہ دلی کا ثبوت پیش کیا۔ پرفل کمار مہنتا کے ہاتھی موت کی نیند سلا کر چوتھے نمبر پہنچا دیا۔ اسے بوڈو فرنٹ کے ۱۲ سے بھی ۳ نشستیں کم ملیں اور اس کی پارٹنر بی جے پی کے ارکان کی تعداد ۱۰ سے گھٹ کر ۵ پر پہنچ گئی تھی۔ سربانند جو انتخاب سے قبل آسام گن پریشد چھوڑ کر بی جے پی میں شامل ہوئے تھے خود الیکشن ہار گئے۔ ترون گوگوئی کی زوردار واپسی کے ساتھ ہی آسام کے سیاسی افق پر ایک نیا تالہ آل انڈیا یونائیٹیڈ ڈیموکریٹک فورم اور اس کی کنجی مولانا بدرالدین اجمل کی بھی نمودار ہوئے۔ اے آئی یو ڈی

ایف کو کانگریس کے بعد سب سے زیادہ ۱۸ نشستوں پر کامیابی ملی اور اب وہ آسام کی سب سے بڑی حزب اختلاف تھی۔

آسام کی سیاسی بساط پر ایک زمانے تک کانگریس پارٹی ترپ کا اکا ہوا کرتی تھی لیکن جب آسام اسٹوڈنٹس یونین (آسو) نے اپنی سیاسی جماعت اے جی پی بنا کر انتخاب میں حصہ لیا تو وہ غلام بنادی گئی اور بی جے پی نئے صاحب کی بی بی بن جانے پر راضی ہو گئی۔ پرفل کمار یونیورسٹی ہاسٹل سے نکل کر سیدھے وزیراعلیٰ کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ صاحب بی بی اور غلام کی اس کہانی میں دوسرا موڑ اس وقت آیا جب ۲۰۰۱ء میں کانگریس اچھے دن لوٹ آئے اور وہ بادشاہ بن گئی اور اقتدار سے محروم اے جی پی کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا۔ ۲۰۰۶ء میں کانگریس کی حالت پتلی تھی لیکن پھر بھی سب سے بڑی پارٹی ہونے کے سبب اس نے بوڈو فرنٹ کو اپنی بی بی بنا کر حکومت قائم کر لی لیکن اسی کے ساتھ پہلی بار میں ۹ نشستوں پر کامیابی درج کروا کر مولانا بدرالدین اجمل کی اے یو ڈی ایف غلام کے تیسرے مقام پر فائز ہو گئی۔ اس وقت انتخابی سیاست پر مٹنے والے مسلمان مولانا اجمل کی کامیابی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ آگے چل کر قفل کنجی والی یہ جماعت اقتدار کا دروازہ کھول دے گی۔

۲۰۱۱ء کے انتخابات میں مولانا بدرالدین اجمل نے بڑی چھلانگ لگائی اور اپنے

ارکان کی تعداد میں صد فیصد اضافہ کرلیا لیکن جہاں مولانا کا اضافہ ۹ نشستوں کا تھا وہیں کانگریس کا فائدہ ۲۲ نشستوں کا تھا اس طرح ۷۸ نشستیں جیت کر کانگریس خود کفیل ہوچکی تھی اور اس کو کسی بی بی کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ کانگریس کی اس کامیابی سے اے یو ڈی ایف کے ''دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے''۔ ۲۰۱۴ کے قومی انتخاب میں جب مودی جی کی آندھی آئی تو کانگریس کا خیمہ اکھڑ گیا مگر مولانا نے آسام کی ۱۴ میں سے ۴ نشستوں پر کامیابی درج کرواکر اپنی قوت کا لوہا منوایا۔ کانگریس کی اس کسمپرسی کی حالت میں اے یو ڈی ایف کو یقین تھا کہ وہ ان کے دروازے پر دستک دے گی لیکن ترون گوگوئی نے ایسا نہیں کیا۔ مولانا نے سونیا گاندھی کی مدد سے بھی کانگریس کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن دال نہیں گلی۔

کانگریس سے مایوس ہونے کے بعد مولانا اجمل نے از خود کنگ میکر ہونے کا دعویٰ کردیا۔ وہ بولے اگر ایک چائے بیچنے والا ملک وزیراعظم بن سکتا ہے تو عطر بیچنے والا جس کا کاروبار ۳۰ ملکوں میں پھیلا ہوا ہے کنگ میکر کیوں نہیں بن سکتا؟ مولانا بدرالدین اجمل نے انتخاب سے قبل یہ دعویٰ بھی کردیا تھا کہ آسام کی اگلی حکومت جو بھی بنائے ان کی مدد کے بغیر نہیں بنا سکے گا۔ اس شاطرانہ بیان میں کانگریس کے علاوہ بی جے پی کی حمایت کا اشارہ موجود تھا۔ کانگریس نے اس کا فائدہ اٹھا کر اے یو ڈی ایف کو بی جے پی کا درپردہ حامی

قرار دیا اور بی جے پی نے تشہیر کردی کہ مولانا گوگوئی سے ملے ہوئے ہیں اور انتخاب کے بعد اے یوڈی ایف کے تالے کی چابی کانگریس کے ہاتھ میں ہوگی۔ مولانا بدرالدین اجمل اگر نائب وزیراعلیٰ نہ سہی تو کم از کم وزیرداخلہ ضرور بن جائیں گے لیکن ہائے کم بختی بی جے پی اور اس کے حلیفوں کو دوتہائی اکثریت مل گئی اور گوگوئی کے ساتھ ساتھ مولانا بھی ہاتھ ملتے رہ گئے۔

ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو بی جے پی کی کامیابی سے زیادہ دکھ مولانا کی ناکامی پر ہے لیکن شاید آسام کے مسلمان اے یوڈی ایف کی ناکامی پر غمزدہ نہیں ہیں اس لئے کہ اے یو ڈی ایف کو بی جے پی نے نہیں بلکہ خود مسلمانوں نے ہرایا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود مولانا بدرالدین اجمل کی جنوبی سلمارہ میں شکست ہے جہاں سے پانچ سال قبل ان کا بیٹا عبدالرحمٰن اجمل کامیاب ہوا تھا۔ یہ نشست ڈبری پارلیمانی حلقہ کا حصہ ہے جہاں سے کامیاب ہوکر دوسال قبل مولانا اجمل خود ایوانِ پارلیمان میں پہنچے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سلمارہ میں کیا انہیں بی جے پی کے امیدوار نے ہرایا؟ جی نہیں ایسا نہیں ہوا وہاں پر بی جے پی کا میدوار بھی شکست کھاگیا۔ اچھا تو کیا کانگریس کے ہندو امیدوار نے مولانا کو شکست فاش سے دوچار کردیا؟ جی نہیں ایسا بھی نہیں ہوا بلکہ کانگریس کے ایک مسلمان امیدوار واجد علی چودھری نے مولانا کو ۱۶ہزار سے زیادہ ووٹ سے ہرادیا۔

اس کے معنی یہی ہیں کہ مولانا کو مسلمانوں نے ہی مسترد کردیا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ اول تو مسلمانوں کو یہ محسوس ہوا ہوگا کہ بی جے پی کو ہرانے کیلئے صرف مسلمان ووٹ کافی نہیں ہیں اس لئے کانگریس کے مسلمان امیدوار کو کامیاب کردو۔ یہ وجہ بظاہر معقول ہے اس لئے کہ آسام کے مسلمانوں نے پارٹی کے بجائے مذہب کی بنیاد پر ووٹ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے پی کی لہر کے باوجود کامیاب مسلم امیدواروں کی تعداد میں ۲ کا اضافہ ہوگیا۔ اے یو ڈی ایف کے ۱۳، کانگریس کے ۱۵ اور بی جے پی کے ۲ مسلم امیدوار کامیاب ہوگئے۔ بی جے پی کے مسلم امیدوار کی کامیابی پر کسی حیرت نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ ۲۰۱۱ میں بھی جبکہ بی جے پی کے صرف ۵ امیدوار جیتے تھے ان میں سے بھی ایک مسلمان تھا۔ اس طرح بی جے پی کے آنے سے مولانا تو ضرور خسارے میں رہے لیکن مسلمانوں کی جملہ نمائندگی میں اضافہ ہی ہوا۔

مولانا بدرالدین اجمل کی ناکامی کی اور بھی وجوہات ہیں مثلاً اگر ان کا فرزندار جمند عبدالرحمٰن اپنے علاقہ کے رائے دہندگان کی فلاح و بہبود کا کام کرتا تو انہیں اس کا فائدہ ضرور ہوتا۔ عوام کی یہ رائے ہے کہ خود مولانا کو بھی اپنے رائے دہندگان کے مسائل کی بہ نسبت اپنا کاروبار بڑھانے میں زیادہ

دلچسپی ہے اس لئے وہ بھی مودی جی کی طرح اکثر غیر ملکی دورے پر رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ اپنی تجارت کے فروغ کیلئے سیاسی رسوخ کا استعمال کرتے ہیں۔ مولانا کی یہ روش آئندہ ڈبری کے پارلیمانی حلقہ سے بھی ان کی کامیابی مشکوک کردے گی۔ مولانا کو چھوٹا بیٹا عبدالرحیم اس بار جمنا مکھ سے کامیاب ہوگیا ہے لیکن اگر وہ اپنے بڑے بھائی کے نقشہ قدم پر چل کر رائے دہندگان سے بے اعتنائی برتے گا تو اس کا حشر بھی والد جیسا ہوگا۔

مولانا کا چھوٹا بیٹا تو رکن اسمبلی بن گیا لیکن بڑے کی سیاست سے دوری کیوں؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال میں پوشیدہ ہے کہ مولانا نے رکن پارلیمان ہونے کے باوجود اسمبلی کا انتخاب لڑنے کی زحمت کیوں کی؟ گمانِ غالب تو یہ ہے چونکہ مولانا کو اس بار ح یقین تھا کہ اسمبلی معلق ہوگی اور ان کی قسمت کا ستارہ چمکے گا۔ انہیں کسی مخصوص جماعت سے پرہیز بھی نہیں تھا اس لئے وہ وزارت کی امید میں اسمبلی کا الیکشن لڑنے کیلئے میدان میں اتر گئے۔ مگر مہاراشٹر میں جو شرد پوار کے ساتھ ہوا وہی آسام میں مولانا بدرالدین اجمل کے ساتھ بھی ہوگیا۔ مولانا اگر انتخاب میں کامیاب ہو کر وزیر بن جاتے تو انہیں پارلیمانی نشست خالی کرنی پڑتی اور اس صورت میں ان کا لائق و فائق وارث فرزند ارجمند عبدالرحمٰن کے سوا کون ہو سکتا تھا؟ اقرباء پروری کی بابت ملائم سنگھ یا پرکاش سنگھ بادل، لالو یادو، کرونا ندھی اور مولانا اجمل میں

۔کوئی فرق نظر نہیں آتا اس لئے وہ کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں

جس طرح مولانا اجمل کو مسلمانوں نے ہرایا اسی طرح ترون گوگوئی کی رعونت پر خود ان کے اپنے اہوم سماج نے خاک ڈال دی ۔اپنے اہوم ہونے پر ناز کرنے والے ترون گوگوئی کو اس بار اوپری آسام میں ۲۲ کے مقابلے صرف ۳ نشستوں پر کامیابی ملی ۔ اگر ترون گوگوئی خود اپنا قلعہ محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوجاتے تب بھی ان کا ایسا برا حال نہیں ہوتا۔ گوگوئی کو سادہ لوح مسلمان آر ایس ایس کا آدمی کہتے ہیں جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سربانند سونوال بھی آر ایس ایس سے نہیں آیا۔ گوگوئی پر یہ الزام اس لئے لگتا ہے کہ انہوں نے نہ تو دس سال قبل مولانا بدرالدین اجمل کو اپنی حکومت میں شامل کیا اور نہ اس بار اتحاد کیا۔ وہ دراصل دوہرے خوف کا شکار تھے ۔آسام کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی کانگریس کے ساتھ ہے یہی وجہ ہے کہ ۲۶ کانگریسی ارکان اسمبلی میں سے ۱۵ مسلمان ہیں ۔ ان کو ایک ڈر تو یہ تھا کہ مسلم ووٹر اگر مولانا کے ساتھ جائیں تو ہوسکتا ہے لوٹ کر دوبارہ کانگریس میں کبھی نہ آئیں جیسا کہ اے جی پی کا ہندو ووٹر بی جے پی میں گئےتو وہیں کے ہو رہے۔ گوگوئی کو خوف تھا کہ مولانا کے ساتھ اتحاد کے نتیجے میں ان کا ہندو ووٹ ناراض ہوکر بی جے پی کی جانب نہ چلا جائے۔ ہندو ووٹر کو تو گوگوئی کی کبر سنی اور متبادل کی غیر موجودگی بی جے پی میں لے گئی۔ گوگوئی کو خدشہ تھا کہ اگر

بی جے پی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھرآے تو ممکن ہے مولانا کانگریس کا پینجہ مروڑ کر بی جے پی کا کمل تھام لیں گے ۔ اس طرح کے اندیشۂ لولاک کا شکار کانگریسی رہنما کا عبرتناک سیاسی انجام شکیب جلالی کے مشہور شعر کی مصداق ہے ؀

آ کر گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر

تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

آسام کے سیاسی افق سے ترون گوگوئی کا سورج ہمیشہ کیلئے غروب ہوچکا ہے۔ اب اگر کبھی کانگریس کا ستارہ چمکے گا تب بھی اس جھرمٹ میں ترون گوگوئی نہیں ہوگا۔ بہت سارے لوگ ملائم اور لالو کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ مسلم پارٹی وہ کیوں نہیں کر سکتی جو سماجوادی یا آر جے ڈی کرلیتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں اول تو یہ کہ ان جماعتوں سے دوسرے ہندو خوف نہیں کھاتے اور مسلمان تو بے خوف ہو کر ان کے ساتھ ہوجاتے ہیں ۔ مسلم جماعتوں کے ساتھ یہ نہیں ہوتا نیز ہندو سماج کو بڑی آسانی سے مسلم جماعت کے خلاف ورغلایا جاسکتا ہے۔ اس لئے جیسے مسلمانوں کے دور ہوجانے سے سماجوادی یا بی ایس پی ہار جاتی ہے اسی طرح ہندووں کے ساتھ نہ آنے سے مسلمان پارٹی جیت نہیں پاتی۔

مسلم جماعتوں کی ناکامی کو دو اور وجوہات ہیں اول تو امت کے اندر پایا جانے

والا احساسِ عدم تحفظ دوسرا ملت اسلامیہ ہند کی حقیقت پسندی ۔ مسلمان بیشتر مواقع پر خود جیتنے کیلئے نہیں بلکہ بی جے پی کو ہرانے کیلئے ووٹ دیتے ہیں ۔ بی جے پی کے سبب جان و مال کے نقصان کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے سبق سکھانا چاہتے ہیں اور اس کی جانب سے کی جانے والی دلآزاری کا بدلہ لے کر خوش ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفاداریاں بدلتی رہتی ہیں ۔ جو کوئی بھی بی جے پی کو ذک پہنچانے کی پوزیشن میں ہوتا ہے وہ اس کے ساتھ ہوجاتے ہیں اور اپنے پرائے میں تفریق نہیں کرتے۔ اس موقع پر عام مسلمان کی حقیقت پسندی اس کے کام آتی ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ ان سیاسی جماعتوں میں کوئی بھی ان کا اپنا نہیں ہے۔ ہر کسی کے نزدیک اس کا اور اس کے اہل خانہ کا مفاد مقدم ہے پارٹی کا نمبر بعد میں آتا ہے اور امت کا نمبر تو آتا ہی نہیں ہے۔ ساری سیاسی جماعتیں بشمول مسلم جماعتوں کے (اّلا ماشاء اللہ) اقرباء پروری کے مرض کا شکار ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر رہنما جب اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر دیکھتا ہے تو اسے اپنا کا والی و وارث سوائے قریبی رشتے دار کے کوئی اور نہیں نظر آتا۔

مسلمان اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ سیاست فی الحال اپنا خاندانی بزنس یا ذاتی تجارت میں بن چکی ہے ۔ کہیں گاندھی خاندان کی سربلندی کیلئے تو کہیں مودی جی خدمت میں ساری پارٹی جٹی ہوئی ہے۔ اس لئے ان سے کوئی توقع

کرنا فضول ہے۔ انتخاب صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک موقع ہے۔ مسلمان ہی نہیں ہندو بھی یہی سمجھتے ہیں۔ کیرالہ میں وہ ہر ۵ سال میں اہل اقتدار کو سبق سکھاتے ہیں۔ تمل ناڈو میں بھی یہی کرتے تھے لیکن اس بار متبادل کی عدم موجودگی میں انہوں نے گریز کیا۔ دوسرے علاقوں میں بھی یہ عمل ہوتا رہتا ہے فرق یہ ہے کہ کبھی انہیں متبادل نہیں ملتا اور کہیں ان کے صبر کا پیمانہ پانچ سال کے بجائے دس پندرہ سال بعد لبریز ہوتا ہے۔

ملک میں آج کل علاقائیت کا بول بالا ہے اس لئے صوبائی انتخاب میں جہاں دو مضبوط علاقائی جماعتیں ہوتی ہیں قومی جماعتیں بے دست وپا ہوجاتی ہیں۔ جہاں ایک جانب قومی اور دوسری طرف علاقائی جماعت ہوتی ہے ریاستی وقار کا مسئلہ اچھال دیا جاتا ہے اور لوگ قومی جماعت کے مقابلے علاقائی پارٹی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ملک کے کئی صوبوں میں یہ ہوچکا ہے۔ آسام میں بی جے پی نے بڑی چالاکی سے اے یو ڈی ایف کو پردیسی مہاجرین کی جماعت اور خود کو آسامی وقار کا محافظ بنا کر پیش کیا۔ ہندووں کو ڈرایا کہ اگر مولانا بدرالدین اجمل یا کانگریس اقتدار میں آگئی تو بہت جلد آسام میں بنگلہ دیشی مسلمان اکثریت میں ہو جائیں گے۔ اس طرح گویا اے جی پی کے ساتھ بی جے پی نے خود کو بھی علاقائیت کا علمبردار بنادیا۔ مولانا بدرالدین علاقائیت کے بجائے فسطائیت کا کارڈ کھیلتے رہے اس لئے اسے زیر نہ کرسکے۔ جب تک ان کی جماعت اے جی پی

کی مانند علاقائی جماعت نہیں بن جاتی وہ فسطائیت کی بنیاد پر ہندووں کو اپنے ساتھ نہیں کر سکتے اس لئے کہ مسلمانوں کی طرح عام ہندو فسطائیت کو اپنے لئے خطرہ نہیں سمجھتا۔ انتخابی سیاست میں اصول و ضوابط کے علاوہ انسانی نفسیات کا بہت کردار ہوتا ہے۔ اس کا پاس و لحاظ کئے بغیر کوئی فرد یا جماعت اس کھیل میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آسام کے انتخابی نتائج اس بات ثبوت ہیں کہ مولانا بدرالدین اجمل اس بار کانگریس اور بی جے پی تو درکنار مسلم اور ہندو رائے دہندگان کی نفسیات کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ مولانا کی پارٹی کا نشان قفل اور کنجی ہے۔ ایک زمانے تک ایک تالے کی ایک یا زیادہ سے زیادہ دو چابیاں ہوا کرتی تھیں اور جب وہ کھو جاتی تھی تو نئی چابی بنانے کیلئے اچھی خاصی زحمت اٹھانی پڑتی تھی لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ جدید تالے دروازوں سے نہیں لٹکتے ۔ ان کو بند کرنے کیلئے چابی کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ دروازے کے بند ہوتے ہی وہ اپنے آپ بند ہوجاتے ہیں اور کارڈ نما الیکٹرونک چابی کی مدد سے مس کرتے ہی کھل جاتے ہیں۔ ان چابیوں کو بنانے میں کوئی محنت لگتی۔ کمپیوٹر کی مدد سے کوڈ نمبر ڈالتے ہی انگنت چابیاں ''کلون'' کی مانند بن کر تیار ہوجاتی ہیں۔ مولانا کو اپنے تالے اور چابی کی جدید کاری کا کام اولین فرصت میں کرنا ہوگا ورنہ وہ بن تالے کی چابی لے کر مارے مارے پھرتے رہیں گے اور ان

ے کی حالت اس شعر کی مانند ہو جائیگی کہ

اپنے آپ کو کوس رہا ہوں، گھور رہا ہوں تالے کو
الماری میں بھول گیا ہوں پھر چابی الماری کی

ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

مشیت کے آگے کسی کی نہیں چلتی ۔ اس حقیقت کا انکشاف سیاست کی دنیا میں بہت عام ہے اس لئے کہ سیاست کھیل ہی اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ بااختیار اور دوسروں کو بے اختیار کرنے کا ہے ۔اس کے باوجود نام نہاد اصحابِ اقتدار کی نظروں کے سامنے بہت کچھ ایسا ہوتا رہتا ہے جو وہ نہیں چاہتے بلکہ خود انہیں بھی ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جو ان پر بارِ گراں ہوتے ہیں ۔ مثلاً ایک ایسے موقع پر جبکہ حکومت ایک ہزار کروڑ روپیوں کے خطیر خرچ سے اپنا دوسالہ جشن منانے جارہی تھی گجرات کے فسادات پر رعنا ایوب کی کتاب کا منصۂ شہود پر آئی اور ذرائع ابلاغ پر چھا گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ ۱۴ سالوں میں یہ کتاب کسی بھی وقت شائع ہو سکتی تھی ۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ کتاب گزشتہ انتخاب سے قبل شائع ہوتی اور نئی حکومت اس پر پابندی لگا دیتی لیکن اس کے بالکل برعکس ہوا۔ قسمت کے لکھے میں تاخیر یا تعجیل کیسے ممکن ہے ؟ مکافاتِ عمل پر کسی کا اختیار کب ہے ؟ گجرات فائیلس کی پذیرائی حکومت کی مقبولیت کو منہ چڑھا رہی ہے اقتدارِ وقت بے دست و پا۔ رعنا ایوب کی تعریف و ستائش اور مودی و شاہ پر لعنت ملامت ہو رہی ہے ۔ کیا زخموں کے ہرا ہونے کا یہی وقت تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وقت کسی کا نہیں ہوتا گھڑی کے کانٹوں کسی کے قابو میں نہیں آتے نہ رعنا اور نہ مودی کے۔

رعنا ایوب اور رویش کمار جیسے لوگ زعفرانی سیاست کے پرانے دشمن ہیں لیکن کون سوچ سکتا ہے کہ گوا آر ایس ایس کا سربراہ سبھاش ویلنگر نے ان سرکاری تقریبات کے بائیکاٹ کا اعلان کرسکتا ہے جس میں بی جے پی کے سیاستدان اور گوا کے رہنے والے وزیر دفاع پریکر شریک ہوں؟ فی الحال ملک انہیں شکایت ہے کہ حکومت انتخاب سے پہلے کئے گئے وعدوں کی پاسداری میں ناکام رہی ہے یہ شکا کس کو نہیں ہے۔ سبھاش جی کا کہنا ہے کہ حکومت انگریزی میڈیم کے اسکولوں کو اعانت دے کر علاقائی زبان کو قتل کررہی ہے۔ چونکہ ہر وزیر اپنے بچوں کو آر ایس ایس کے سرسوتی ودیا لیہ کے بجائے انگریزی اسکول میں داخل کرنا چاہتا اس لئے دھرم سنکٹ میں ہے کہ آر ایس ایس کی مانے یا انگریزی میڈیم اسکولوں کی سرپرستی کرے؟

قوم پرست آرایس ایس کو دوہری شہریت کا مسئلہ نمٹانے والا محکمہ قائم کرنے کے سبب وزیر داخلہ (مملکت) کرن رجیجو سے بھی شکوہ ہے۔ گوا ۴۵۰ سالوں تک پرتگالیوں کی نوآبادی رہا ہے ۱۹۶۱ میں جب وہ ہندوستان میں شامل ہوا تو سارے باشندوں کو ہندوستانی شہریت مل گئی لیکن جاتے ہوئے پرتگالیوں نے اعلان کردیا کہ ان کی حکومت کے دوران پیدا ہونے والے سارے لوگ پرتگالی شہریت کے حقدار ہیں اور وہ اپنا پیدائشی سرٹیفکیٹ جمع کرکے پرتگال کی شہریت اور

آمد ورفت کے دستاویز یعنی پاسپورٹ حاصل کرسکتے ہیں۔آگے چل کر پرتگال حکومت نے اس سہولت کو دونسلوں تک بڑھادیا۔زعفرانیوں کے نزدیک اس طرح کاشرک بھارت ماتا کی توہین ہے لیکن خود ان کے وزیر کرن رجیجو اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔چین کی سرحد پر واقع اروناچل پردیش کے رہنے والے کرن رجیجو کیا جانیں کہ راشٹر بھکتی کیا ہوتی ہے مگر گوا کے وزیراعلیٰ لکشمی کانت پرسیکر کا کیا کہ جنھوں نے جنوری میں پرتگال کے نومنتخب وزیراعظم انٹونیو کوسٹاکے مارگو سے تعلق کی بناء پر ایوان اسمبلی کے اندر مبارکباد دی اور جلد ہی گوا بلاکر پذیرائی کرنے کا اعلان کردیا۔

وزیراعلیٰ کے اعلان پر صوبائی وزیر رام کرشن دھولکر نے آگ بگولا ہوکر کہا پرتگالی وزیراعظم کو ماضی کے مظالم کی معافی مانگنی چاہیے۔آرایس ایس بھی بی جے پی کے بجائے ایم جی پی کی حمایت میں کھڑی ہوگئی اور کہا ہم گوا کی سرزمین پر انٹونیو کی عزت افزائی کے مخالف ہیں۔پرتگالیوں کے مظالم ناقابل معافی ہیں اس لئے اگر وہ آئیں تو انہیں معافی مانگنی ہوگی۔اب ان احمقوں کو سمجھائے کہ ناقابلِ معافی جرم کی معافی مانگنا چہ معنی دارد؟ سنگھ پریوار کے جڑ لاینفک بی جے پی کی کھوکھلی دیش بھکتی ماہ اپریل میں ساری دنیا کے سامنے آگئی جب کوہ نور ہیرے کی واپسی سے متعلق عدالت عالیہ میں مودی حکومت کے سالیسٹر جنرل رنجیت کمار نے سپریم کورٹ کو بتایا کو زارت ثقافت کا

موقف ہے کہ یہ ہیرا برطانیہ کو تحفے میں دیا گیا تھا، اسے چرایا نہیں گیا۔ عدالت کا کہنا ہے کہ حکومت اگر اپنے موقف پر قائم رہتی ہے تو مستقبل میں کوہ نور کی واپسی کا راستہ بند ہو جائیگا۔اس طرح راشٹر بھکتوں کی حکومت نے واضح الفاظ میں یہ اعتراف کرلیا کہ کوہ نور کو واپس لانے میں اس کی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس رویہ سے سنگھ پریوار بلکہ ہندوتواوادیوں کی برطانوی غلامی کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ اٹل جی پر مخبری کا الزام لگ چکا ہے۔ جسٹس کاٹجو نے ساورکر کو کھلے عام انگریزوں کا دلال قرار دیا ہے۔ اب جو حکومت ساورکر کی عزت افزائی کررہی ہو اس سے یہ توقع کیوں کر کی جائے کہ وہ برطانوی سرکار سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے گی۔

سرکاری موقف کے برعکس ایک نظریہ یہ ہے کہ کوہ نور ہیرا ایسٹ انڈیا کمپنی نے لاہور میں رنجیت سنگھ کے پوتے دلیپ سنگھ سے چھین کر برطانیہ بھجوا کر ملکہ وکٹوریہ کو تحفے کے میں دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ریاست نہیں بلکہ ایک تجارتی کمپنی تھی اور اس کو ایسا کرنے کا قانونی اختیار نہیں تھا۔ کوہ نور ہیرا ایک ریاست نے دوسری ریاست کو دیا جانے والا تحفہ ہی نہیں تھا اس لئے ملکہ کا اس پر قانونی حق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوپاک میں بہت سے لوگ اسے قومی وراثت کا حصہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے اسے واپس لایا جانا چاہیے۔ یہاں تک کہ کچھ بھارتی نژاد برطانوی اراکین پارلیمان بھی یہ مطالبہ کر چکے ہیں

کہ کوہ نور ہندوستان کو لوٹا دیا جائے کیونکہ ان کے مطابق۔برطانوی حکومت نے اسے غیر قانونی طور پر حاصل کیا تھا۔ قربان جائیے دیش بھکت مودی سرکار پر جو سبھاش چندر بوس پر تو خوب سیاست کرتی ہے لیکن قومی وقار کی علامت کوہ نور ہیرے کو واپس لانے کی جرأت نہیں کرپاتی۔

بی جے پی والے اٹھتے بیٹھتے ہندوستانی عوام کو یہ یاد دلاتے ہیں کہ سونیاگاندھی اطالوی ہیں اوران کی ہمدردیاں بیرون ملک ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان راشٹر بھکتوں کی حکومت نے کیرالہ میں اپنے ہی ماہی گیروں کے اطالوی قاتلوں کی رہائی میں مدد کرکے انہیں اپنے وطن واپس بھیج دیا۔ ایک طرف پاکستان سے مولانا اظہر مسعود کو واپس لینے کا دعویٰ اور دوسری طرف خود اپنی قید سے قاتلوں کو رہا کرنے کرتوت دوغلے زعفرانیوں کا خاصہ ہے۔ بظاہر ان قاتلوں کو عدالت نے رہا کیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ حکومت کے وکیل نے سنجیدہ کوشش نہیں کی اور پرگیہ ٹھاکر یا ونجارہ کی مانند کیس کو کمزور کرکے انہیں رہا کروادیا۔ اس دوران اسلحہ کے۔برطانوی دلال کرسچین مائیکل نے عالمی عدالت میں الزام لگایا کہ آگسٹاویسٹ لینڈ کی ہیلی کاپٹر بدعنوانی کے معاملے میں مودی سرکار نے سونیاکے خلاف شواہد کے عوض قاتلوں کو رہا کرنے کی سودے بازی کی ۔ ہیلی کاپٹر بدعنوانی میں سونیا تو نہیں بی جے پی پھنس گئی۔ ٹینڈر میں تبدیلی کا فیصلہ کانگریس نے نہیں اٹل جی کے مشیر خاص۔برجیش مشرا نے کیا۔ یو

پی اے نے آگسٹا کو بلیک لسٹ کیا مگر بی جے پی نے اس پر سے پابندی اٹھائی۔ کانگریس نے اس کے خلاف تحقیقات کا آغاز کیا جسے بی جے پی نے ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا۔ جب کوتوال کو ڈانٹنے والا الٹا چور چہار جانب سے گھر گیا تو اطالوی قاتلوں کو بھی رہا کرنا پڑا ورنہ سازش کے کھل جانے کی دھمکی مل رہی تھی۔ اس طرح نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم بحالت مجبوری دیش واسیوں کے جن قاتلوں کو کانگریس نے گرفتار کیا تھا اسے دیش بھکتوں کی سرکار کو رہا کرنا پڑا۔

مودی جی نے جب سمرتی ایرانی کو انسانی وسائل کا وزیر بنایا تو یہ اقدام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن ان دوسالوں میں سمرتی نے ثابت کردیا ہے کہ مودی جی کے بعد عوام کے لئے سب سے زیادہ تفریح کا سامان وہی مہیا کرتی ہیں۔ وہ جب بھی منہ کھولتی ہیں نئے گل کھلاتی ہیں۔ ابھی حال میں انہوں نے کہہ دیا کہ راہل گاندھی کا کانگریس کی کمان سنبھالنا بی جے پی لئے اچھے دن لائیگا۔ اس ایک فقرے کے کئی معنیٰ ہیں اول تو یہ کہ ابھی بی جے پی کے اچھے دن نہیں آئے اگر ایسا ہے تو جن کے اپنے اچھے دن نہیں آئے وہ دوسروں کے اچھے دن کیا لائیں گے؟ دوسرے یہ کہ بی جے پی کے اچھے دن حکومت کی اچھی کارکردگی کے باعث نہیں بلکہ راہل کی نااہلی کے سبب آئیں گے۔ سچ یہی ہے کہ بی جے پی کو اقتدار مودی جی کی مہارت کی وجہ سے نہیں بلکہ کانگریس کے تئیں

عوامی بیزاری کے سبب ملا ہے لیکن سمرتی کو یاد رکھنا چاہئے کہ راہل لاکھ نااہل سہی لیکن امیٹھی یں اس نے سمرتی ایرانی کو شکست فاش سے دوچار کیا ہے اس لئے عوام کی نظروں میں تو راہل ہی اہل تر ہے۔

راہل کے سبب بی جے پی کے اچھے دن آئیں گے یا رہیں گے یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن اگر شاہ جینے سمرتی کو اترپردیش کی متوقع وزیراعلیٰ نامزد کردیا تو بی جے پی کے برے دن ضرور آجائیں گے۔ بی جے پی بجا طور پر کانگریس پر موروثیت کا الزام لگاتی ہے لیکن کیا یہ مودی جی کی اقرباء پروری نہیں ہے کہ انہوں سنگھ کے قدیم وفاداروں کو دروازہ دکھا کر اپنے چمچوں کو پارٹی کے تمام اہم عہدوں پر فائز کردیا۔ کیا بی جے پی کے پاس تڑی پار امیت شاہ سے بہتر صدر نہیں تھا۔ کیا وزیرانسانی وسائل کی اہم ذمہ داری پر فائز کرنے کیلئے سمرتی ایرانی کے علاوہ کوئی اور نہیں ملا تھا۔ کیابرسوں سے دانشوروں میں کام کرنے والا سنگھ پریوار وزیر مالیات کے اہم عہدے کیلئے کوئی ماہر معاشیات نہیں دے سکا جوایک وکیل کو اس ذمہ داری پر فائز کرنا پڑا؟ اوراب اترپردیش سے راجیہ سبھاکے لئے نامزد کرنے کی خاطر گجرات کی کروڑ پتی پریتی مہاپاترا مل گئیں ۔ ان ساروں کے پاس اپنے عہدے کا جواز مودی کی قربت کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے ورنہ اترپردیش کی بی جے پی کے پاس ایوان بالا میں نامزد کرنے کیلئے لائق و فائق لوگوں کی کمی نہیں ہے۔

سونیا گاندھی کو گالی گلوچ کرنے اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کا انعام سبرامنیم سوامی کو راجیہ سبھا کی رکنیت کے طور پر ملا۔ وزارت کی ہوس میں گرفتار اس شخص نے ریزرو بنک کے گورنر رگھوراج رامن کے خلاف محاذ کھول دیا۔ وہ انہیں نااہل قرار دے کر واپس امریکہ بھیج دینا چاہتا ہے۔ اس معاملے میں بالآخر مودی جی نے خود مداخلت کی اور ساری قیاس آرائیوں کو مسترد کردیا۔ اسی کے ساتھ یہ خبر بھی آئی کہ وزیراعظم نے رامن کو آئندہ میقات کی پیش کش بھی کردی لیکن رامن نے اس پیشکش کو ٹھکرا کر ازخود امریکہ نکل جانے کا اشارہ کردیا۔ رامن کا یہ انکار مودی سرکار کے منہ پر طمانچہ ہے۔ ایک طرف مودی بھکت وزارت کے لئے تلوے چاٹ رہے ہیں اور دوسری طرف ایک خوددار افسر اشارے کنائے میں یہ کہہ رہا ہے کہ جس کے پاس عزت نفس ہو وہ ان اجڑ جاہلوں کے ساتھ کام نہیں کرسکتا۔ رگھوراج رامن کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے سبکدوشی کی قیاس آرائی سے ڈالر کے مقابلے ہندوستانی روپے کی قیمت گھٹنے لگی اور چند گھنٹوں میں عشاریہ ۳ فیصد کم ہوگیا۔

ایوان بالا سے بہت جلد ۵۸ ارکان سبکدوش ہورہے ہیں جن میں سے ۶ مسلمان ہیں۔ یہ حضرات مختلف سیاسی جماعتوں سے آتے ہیں یعنی ۲ کانگریس، ۲ بی جے پی اور ایک ایک ٦ بی ایس پی و جنتادل (یو) سے۔ ان میں سے بی جے پی کے علاوہ ساری

جماعتوں کو مسلمان اپنا بہی خواہ سمجھتے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی تک سوائے دشمن سمجھی جانے والی بی جے پی کے کسی ایک نے بھی ہندو ارکان کی جگہ مسلمان تو درکنار مسلمانوں کی جگہ مسلمان بھیجنے کا ارادہ بھی نہیں کیا ہے۔ کانگریس کی طول طویل فہرست میں کوئی مسلمان نظر نہیں آتا جبکہ راجیہ سبھا میں اس کے رہنما غلام نبی آزاد ہیں ۔ مایاوتی اس بار مسلمانوں کی جگہ براہمنوں کو دے کر ان کی دلجوئی کرنا چاہتی ہیں ۔ جنتادل (یو) کو اپنے سابق صدر شرد یادو کی فکر ستا رہی ہے اس لئے وہ غلام رسول بلیاوی کی نشست ان کی دینا چاہتی ہے۔

مسلم یادو سیاست کے ماہر لالو یادو فی الحال اپنی بیٹی میسا بھارتی اور وکیل رام جیٹھ ملانی کو راجیہ سبھا کیلئے نامزد کرنا چاہتے ہیں۔ سماجوادی پارٹی نے جو آئندہ سال مسلمانوں کی مدد سے انتخاب جیتنا چاہتی ہے اس موقع پر مسلمانوں کو فراموش کر رکھا ہے ۔ اس کو دو ارکان نامزد کرنے کا موقع ہے اسے بھی کوئی مسلمان نہیں ملا۔ اب لے دے کہ بی جے پی بچ جاتی ہے جس نے اپنے دونوں ارکان ایم جے اکبر اور مختار عباس نقوی کو دوبارہ ایوانِ بالا کیلئے نامزد کیا ہے۔ بی جے پی نے یہ فیصلہ مسلمانوں سے ہمدردی میں نہیں بلکہ مجبوری میں کیا ہے۔ اسے نام کیلئے نقوی جیسا وزیر چاہئے اور کام کیلئے اکبر جیسا صحافی ۔ اس طرح جب سارے نام نہاد ہمدردوں نے امت کو بھلا دیا تو ایک

دشمن کو قدرت نے مجبور کردیا۔

اسی بیچ ایک حیرت انگیز اور دلچسپ خبر گوہاٹی سے آئی جہاں سرفراز حسین نے ایس ایس سی بورڈ امتحان کے اندر پوری ریاست میں اول پوزیشن حاصل کی۔ یہ وہی ریاست ہے جہاں حال میں پہلی بار بی جے پی کو اقتدار ملا اور پہلی بار ایک مسلم طالب نے ۳ لاکھ ہزار طلباء کو ہرا کر اول مقام حاصل کیا۔ سرفراز کی خاص بات یہ نہیں ہے کہ وہ ۸۰ پہلے نمبر پر آیا اس سے قبل کئی مسلم طلباء یہ اعزاز حاصل کر چکے ہیں لیکن ان میں سے شاید ہی کسی نے آر ایس ایس کے زیر انتظام چلنے والے اسکول میں تعلیم حاصل کی ہو۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ جس وقت ہندوستان کی گدی پر ایک ظالم ترین حکمراں براجمان ہے یکے بعد دیگرے چار ایسے ملزم رہا ہوگئے جن کو پھانسی کا حقدار سمجھ لیا گیا تھا۔ نثار احمد، ابر رحمت اور ڈاکٹر جلیس انصاری کو جس وقت گرفتار کیا گیا مرکز سے لے کر صوبوں تک میں کانگریس کی حکومت تھی۔ اس کے بعد جنتا دل کی حکومت آئی پھر مسلمانوں کے تئیں ہمدرد سمجھے جانے والے اٹل جی نے زمام کار سنبھالی۔ وہ گئے تو سادھو سنت سمجھے جانے والے منموہن آئے لیکن ان بے قصور ملزمین کی رہائی کیلئے مشیت نے مودی کا زمانہ منتخب کیا۔ اس مودی کا کہ جو چاہتا ہے سارے مسلمان سلاخوں کے پیچھے پہنچ جائیں لیکن جن کو اللہ رکھے ان کو کون چکھے۔

مشیت ایزدی تاریک راتوں کے اندر امید کے چراغ روشن کرکے دکھاتی رہتی ہے کہ دنیا کس کی مرضی سے چلتی ہے؟ اب حالت یہ ہے داؤد کو واپس لانے کا دعویٰ کرنے والے چھوٹا راجن کی حفاظت کررہے ہیں۔ بی جے پی کے وزیر ایکناتھ کھڑسے کا نام داؤد ابراہیم کے ساتھ رابطہ کرنے والوں میں سرفہرست ہے اور وہ بھی بدعنوانی میں ملوث ہو کر اپنے پیش رو چھگن بھجبل کی طرح جیل جانے کی تیاری کررہے ہیں۔ یہ قدرت کا انتقام ہے جو آخرت میں تو سارے ظالموں کا مقدر ہے مگر دنیا میں بھی کچھ لوگوں کے حصے میں آجاتا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس طرح کے حیرت انگیز واقعات کارونما ہونا اہلِ دانش کیلئے سامانِ عبرت ہے۔ مشیت ایزدی کا یہ کھیل بہت پرانا ہے انہیں کو دیکھ کر سرکار دربار کے احاطے میں پلنے بڑھنے والے چچا غالب نے کہا تھا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

ایکناتھ یا گوپی ناتھ : مہاجن کے دربار میں بھوجن اناتھ

مہاراشٹر میں وزیر محصول ایکناتھ کھڑسے سے استعفیٰ لے لیا گیا بظاہر یہ معمولی واقعہ ہے لیکن اس کے ذریعہ یرقانی سیاست کے حامل سنگھ پریوار کی ذہنیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بی جے پی کا اصلی رنگ مہاراشٹر میں دیکھنے کو ملتا ہے اس لئے کہ اسی صوبے میں آرایس ایس اور ہندو مہاسبھا کا جنم ہوا ہے۔ کہنے کو بی جے پی والے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے بدعنوانی کے سبب کھڑسے کی چھٹی کی ہے لیکن یہ تو ''چت میں جیتا پٹ تم ہارے'' والی بات ہوئی۔ پہلے تو یہ بلند بانگ دعویٰ کہ ہم بدعنوان نہیں ہیں۔ بتاو بدعنوانی کہاں ہے؟ اب جبکہ وہ سامنے آگئی تو کہہ رہے ہیں ہم اسے برداشت نہیں کرتے اور اس پر سخت کارروائی کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا صرف ایکناتھ کھڑسے بدعنوان ہیں اور باقی سارے دودھ کے دھلے ہوئے ہیں ؟ اس مفروضے کی تائید سیاست کی ابجد سے واقف شخص بھی نہیں کرسکتا اگر ایسا ہے تو ایکناتھ ہی کو سیاسی طور پر اناتھ کیوں کیا گیا؟ اس سوال میں براہمنی کینہ توزی کا راز اور اس کا جواب چانکیہ نیتی کا پردہ فاش کرتا ہے۔

سیاست کے گندے تالاب میں ساری مچھلیاں بدعنوان ہیں لیکن جب سے دیویندر فردنویس نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی جن لوگوں کے خلاف بدعنوانی کے

الزامات منظر عام پر آئے وہ ہیں پنکجا منڈے، ونود تاوڑے اور ایکناتھ کھڑسے۔کیا یہ محض اتفاق ہے کہ یہی تین لوگ وزیراعلیٰ کی کرسی کے دعویدار تھے اور ان تینوں کا تعلق براہمن سماج سے نہیں ہے۔ایکناتھ کھڑسے لیوا پاٹل سماج سے تعلق رکھنے والے نہایت دبنگحزب اختلاف کے رہنما تھے اور انہوں نے بی جے پی کی کامیابی میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا اس لئے وہ بجا طور پر وزارت اعلیٰ کے حقدار تھے۔جب مرکزی رہنماوں نے دیویندر فردنویس کا نام آگے کیا تو وہ ناراض ہو کر گھر میں بیٹھ گئے تھے اس لئے انہیں سمجھا منا کر ارکان اسمبلی کے اجلاس میں لایا گیا اور سب سے اہم وزارت یعنی محصول سمیت ایک درجن محکمہ دیئے گئے۔اس کے باوجود وہ بولے وزیراعلیٰ جو بھی سب سے زیادہ طاقتور اور معمر رہنما میں ہی ہوں۔

ایکناتھ کھڑسے کے علاوہ پنکجا منڈے بھی وزارت اعلیٰ کی دعویدار تھیں اس لئے کہ ان کے والد گوپی ناتھ منڈے کو مہاراشٹر بی جے پی کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ گوپی ناتھ منڈے کی موت کے بعد پنکجا نے کئی بی جے پی رہنماوں سے ملنا تک گوارہ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد جب گوپی ناتھ کی نشست پر پنکجا کو ٹکٹ دیا گیا تو وہ مودی جی سے بھی زیادہ ووٹ کے فرق سے کامیاب ہوئیں اور تبھی سے وزارت اعلیٰ کی گدیّ کے خواب دیکھنے لگیں۔انتخابی نتائج کے بعد دیویندر فردنویس کے نام کا اعلان کیا گیا تو ناراض ہو کر پنکجا نے کہا تھا سرکاری

وزیراعلیٰ جو بھی ہو عوامی وزیراعلیٰ میں ہوں ۔ ان دونوں کے علاوہ ونود تاوڑے کا نام زیر غور تھا جن کا تعلق مراٹھا سماج سے ہے۔وہ ماضی میں ودھان پریشد کے اندر بی جے پی رہنما کی ذمہ داری ادا کرچکے تھے لیکن ان تینوں کو کنارے کرکے سنگھ کے منظور نظر براہمن دیویندر کا انتخاب ہوا۔ جنھوں نے اقتدار سنبھالتے ہی مخالفین کے بخیے ادھیڑنا شروع کردیا۔

بی جے پی کی مہاراشٹر میں جو صورتحال وہی مرکز میں بھی ہے اتفاق سے اس ریاست سے تعلق رکھنے والے تینوں وزراء کا تعلق براہمن سماج سے ہے۔ ابتداء میں نتن گڈکری اور پرکاش جاوڈیکر کے علاوہ گوپی ناتھ منڈے کو بھی وزیر بنایا گیا تھا لیکن منڈے کے حادثاتی انتقال کے بعد ان کی جگہ شیوسینا سے لاکر رمیش پربھو کو وزیر ریلوے بنایا گیا جن کا تعلق گوڑ سارسوت براہمن سماج سے ہے ۔اس طرح گویا مہاراشٹر کی حدتک تو پیشوائی لوٹ آئی ہے پیشوائی میں براہمن مراٹھوں کو اپنی فوج میں شامل کرکے لڑاتے رہے ہیں اور فتوحات کا سہرہ اپنے سر باندھ کر حکومت کرتے رہے ہیں ۔ آزادی کے بعد یہ ہوا کہ مراٹھوں نے کانگریس کی مدد سے اپنے آپ کو خود کفیل بنالیا اور دیہی علاقوں میں شکر کے کارخانوں کی جال بچھا کر حکومت کرنے لگے۔ اس زمانے یں مدیہاتوں اور چھوٹے شہروں کے اندر دیگر پسماندہ ذاتوں کے

لوگ پی ڈبلیو پی کے جھنڈے تلے منظم ہو گئے تھے مگر ممبئی اور پونا جیسے بڑے شہروں میں سی پی آئی کا زور تھا۔ ریپبلکن پارٹی کے نام پر دلت بھی منظم تھے مگر براہمن اور مسلمان تقسیم تھے۔ کچھ براہمن آر ایس ایس کی جن سنگھ اور کچھ سی پی آئی کے ساتھ تھے ۔مسلمان کہیں کانگریس تو کہیں پی ڈبلیو پی کے ساتھ تھے۔ براہمنوں کی تقسیم نظریات کی بنیاد پر تھی مگر مسلمان چونکہ ان سارے نظریات کو اسلام کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے ان کی وفاداری افراد کے اخلاق و کردار کی بنیاد پر تھی ۔ فسطائی جماعتوں کے طاقتور ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے ایسے بدکردار رہنماوں کی بھی حمایت شروع کردی جو بی جے پی یا شیوسینا کو ہرانے کی سکت رکھتے تھے۔

اس زمانے میں بائیں بازو کی جماعتیں سب سے بڑی حزب اختلاف تھیں اور سنگھ پریوار کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ مہاراشٹر کانگریس کا گڑھ تھا اور ایمرجنسی کے بعد جبکہ کانگریس کی حالت خستہ ہو گئی تھی مہاراشٹر کا قلعہ محفوظ تھا۔ یہ صورتحال ۱۹۹۰ء میں بدلی جب شیوسینا اور بی جے پی کے اتحاد نے پہلی بار ۹۴ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ اس گئی گزری حالت میں بھی بائیں بازو کی جماعتوں نے ترقی پذیر محاذ کے نام پر ۳۸ نشستوں پر کامیابی درج کرائی تھی اور اس کا ووٹ تناسب ۲۰ فیصد تھا لیکن ۲۰ سال بعد میں یہ ہو گیا کہ یہ محاذ سکڑ کر ۸ پر پہنچ گیا اور اس کے ووٹ کا تناسب گھٹ کر ۵ ۲۰۰۹ء فیصد ہو گیا۔

۲۰۱۴ء کے انتخاب سے قبل بھارتیہ ریپبلکن کے رہنما پرکاش امبیڈکر نے ایک تاریخی جملہ کہا اس بار ترقی پذیر محاذ اپنا آخری انتخاب لڑ رہا ہے اور وہ صد فیصد درست نکلا۔ پی ڈبلیوپی کو ایک فیصد ووٹ اور ۳ نشستیں ملیں، ریپبلکن کے دونوں دھڑوں کو بالترتیب ۶ء۰ اور ۹ء۰ فیصد ووٹ اور جملہ ۴ نشستوں پر کامیابی ملی۔کمیونسٹ پارٹی نے ۴ء۰ فیصد ووٹ حاصل کرکے ایک امیدوار کو کامیاب کیا۔ان تمام جماعتوں کے کل ووٹ ۳ فیصد سے کم ہوگئے تھے۔اس انحطاط کے خلاء میں سے بی جے پی کی کامیابی کی نمودار ہوئی ہے اس لئے اس کی وجہ اہم ہے۔

۱۹۹۶ء کے قومی انتخاب میں شیوسینا بی جے پی اتحاد نے لوک سبھا کی ۳۲ نشستوں پر کامیابی حاصل کرکے بھونچال مچادیا۔دوسال بعد دوبارہ انتخابات ہوئے تو ریپبلکن پارٹی کے چاروں دھڑے اور پی ڈبلیوپی نے کانگریس کے ساتھ اتحاد کرلیا نیز ۳۸ نشستوں پر کامیابی حاصل کرلی۔اس کے بعد ۱۹۹۹ء میں ان جماعتوں نے پھر پینترا بدلا اور کانگریس اور بی جے پی کو ایک ہی سکے کے دو پہلو بتا کر الگ سے انتخاب لڑا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ایک بار بی جے پی سینا اتحاد کو ۲۸ نشستیں مل گئیں۔اس ابن الوقتی کے نتیجے میں ان جماعتوں کے اوپر سے عوام کا اعتماد ختم ہوگیا اور وہ بی جے پی و سینا کی گود میں چلے گئے۔ اس دوران ریپبلکن پارٹی ۴۰ دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اور ایک کے بعد ایک پرکاش امبیڈکر

وآٹھولے نے بھی بی جے پی کے اتحاد میں شامل ہو کر اپنی مٹی پلید کرائی۔رام داس آٹھولے آج بھی یرقانی جماعتوں کے ساتھ ہیں لیکن ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

مہاراشٹر کی سیاست میں سب سے بڑا انقلاب اس وقت آیا جب کانگریس نے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا اثر زائل کرنے کی خاطر شیوسینا کی سرپرستی کی۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا شہروں کے مزدور سی پی آئی سے کٹ کر اور دیہاتوں کی پسماندہ ذاتیں پی ڈبلیو پی سے دور ہو کر شیوسینا کی جانب راغب ہونے لگیں۔ اس دوران اتفاق سے شیوسینا کو چھگن بھجبل کی جیسا پسماندہ مالی سماج کا تیز طرار رہنما میسر آگیا جو سینا کو کوکن اور ممبئی سے نکال کر ناسک و دیگر علاقوں میں لے گیا۔اس وقت ایسے مراٹھا رہنما جو کانگریس کا ٹکٹ حاصل کرنے میں ناکام ہوجاتے تھے وہ بھی شیوسینا کا رخ کرتے تھے اور سینا بانہیں کھول کر ان کا استقبال کرتی تھی۔

بی جے پی نے اسی دور میں شیوسینا کے ساتھ اتحاد کیا لیکن صرف سینا پر انحصار کرنے کے بجائے ایک نئی حکمت عملی وضع کی ۔ اس نے اپنے براہمنی چہرے پر پسماندہ مکھوٹا چڑھا لیا۔ تینوں اہم عہدوں صوبائی صدر، ودھان سبھا اور ودھان پریشد کی رہنمائی مختلف پسماندہ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے انا

ڈانگے، این ایس پھراندے اور گوپی ناتھ منڈے کے حوالے کردی۔ اتفاق سے دلت سماج سے تعلق رکھنے والے پانڈورنگ پھنڈکر بھی اس پریوار میں شامل ہوگئے اوراس طرح بی جے پی بہوجن سماج میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگی۔ سنگھ پریوار نے نظریہ کو بالائے طاق رکھ کر ذات پات کی سیاست کا آغاز کیا۔ جس زمانے میں بی جے پی ایک مخصوص حکمت عملی کے تحت سماج میں پیرپسار رہی تھی دوسری جماعتیں آپسی سر پھٹول یا وراثت کی جنگ میں ملوث تھیں۔ نئے خون کو پارٹی میں شامل کرنے کے بجائے بزرگ حضرات اپنی بوسیدہ سیاست پر تکیہ کئے بیٹھے تھے۔ مراٹھے گو کہ دوجماعتوں میں منقسم تھے مگر وہ دونوں جماعتیں اقتدار کی خاطر متحد ہو گئی تھیں لیکن ۲۰۱۴ء کے انتخاب میں بی جے پی نے این سی پی کو بلیک میل کرکے کانگریس سے الگ کرلیا اور خود شیوسینا سے دامن جھٹک کر اپنے بل بوتے پر انتخاب لڑا۔

۲۰۱۴ء کے صوبائی انتخاب میں جب بی جے پی نے شیوسینا کے بغیر تقریباً اکثریت حاصل کرلی تو این سی پی کی مدد سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرکے دکھا دیا کہ اب وہ شیوسینا سے بے نیاز ہوچکی ہے۔ اس لئے وہ اپنے اصلی رنگ میں آگئی اور پسماندہ سماج کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر ایک براہمن کو وزیراعلیٰ بنادیا بعد میں شیوسینا کو رسوا کرکے اپنی حکومت میں شامل کیا۔ کھڑسے، منڈے اور تاوڑے کو بے اثر کرنے کا جو عمل شروع ہوا تھا وہ اب جاری و ساری ہے اس حکمت

عملی میں دیویندر فردنویس کو پہلی کامیابی مل چکی ہے ایکناتھ کھڑسے ابھی تو گھر گئے ہیں ممکن آگے چل کر جیل بھی جائیں۔۔ بی جے پی مہاراشٹر کی جو تاریخ ویب سائٹ پر رقم ہے اس میں پھراندے اور ڈانگے کا نام ونشان نہیں ہے انہیں کاغذی رومال کی طرح استعمال کرکے پھینک دیا گیا اسی طرح ممکن ہے آگے چل کر تاوڑے اور منڈے کو بھی بھلا دیا جائے۔

مہاراشٹر بی جے پی کا صدر اب بھی پسماندہ ذات کے راؤ صاحب دانوے ہیں جن کی ہمدردی کھڑسے کے ساتھ ہے۔ کھڑسے کے جبری استعفیٰ سے قبل جالنہ کے میں دانوے نے صاف کہا تھا کہ کھڑسے نے کوئی غلطی نہیں ان سے کوئی بے اعتدالی سرزد نہیں ہوئی ۔ ان کے خلاف سارے الزامات بے بنیاد ہیں۔ جماعت (یعنی بی جے پی کی صوبائی اکائی) ان کے ساتھ ہے اگر حکومت یا پارٹی کی اعلیٰ کمان تحقیقات کرنا چاہتی ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس میں کھڑسے کا کوئی خسارہ نہیں ہوگا۔ یہ محض قیاس آرائی کہ رپورٹ (جو وزیراعلیٰ کے پاس ہے وہ) کھڑسے کے خلاف ہے وہ ان کے حق میں مثبت بھی ہوسکتی ہے۔ دانوے کی لمبی چوڑی حمایت کے برعکس فردنویس نے بس یہ کہا کہ میں حقائق پر مبنی رپورٹ امیت شاہ کو دے چکا ہوں ۔ وہ دستاویز ایکناتھ کھڑسے کے حق میں مثبت تھی یا نہیں اس کا فیصلہ ان پر ہونے والے اقدام نے کردیا۔ اس حکومت کو کلین چٹ دینے میں مہارت حاصل ہے برقانی دہشت گرد تو درکنار وہ پٹھانکوٹ حملے میں پاکستان

تک کو کلین چٹ دے چکی ہے لیکن بیچارے کھڑے محروم رہے۔

حکومت کے نشے میں بدمست بی جے پی رہنما اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ ان کو یہ اقتدار نہ تو اپنی صلاحیت کی بنیاد پر حاصل ہوا ہے اور نہ ہی عام رائے دہندگان ان کے نظریات سے اتفاق کرتے ہیں بلکہ یہ تو ایک ذات پات کا توڑ جوڑ تھا جس نے سرکار کا پھل ان کی گود میں لاکر ڈال دیا۔ جس پیڑ سے یہ پھل ٹوٹ کر گرا ہے اس کی شجرکاری پسماندہ طبقات کے رہنماوں نے کی ہے۔ جن باغبانوں کو کل یہ لوگ بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لایا گیا تھا اگر انہیں ذلیل کرکے بھگا دیا گیا تو آگے چل کر یہ درخت سوکھ جائیگا اور اقتدار کے پھل میں کیڑے پڑ جائیں گے۔ بی جے پی کے براہمنوں میں اگر ذرہ برابر بھی دوراندیشی ہوگی تو کم ازکم وہ اس شاخ کو کاٹنے سے احتراز کریں گے جس پر بیٹھ کر وہ وزارتوں کا پھل نوش فرمارہے ہیں۔ جس دن یہ شاخ ٹوٹ کر گرے گی وہ خود بھی دھڑام سے زمین پر آجائیں گے۔

مہاراشٹر میں حکومت سازی کے بعد براہمنوں کی آنکھ پر پردہ پڑ گیا ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں براہمن اور مسلمان ہی دو ایسی اقلیتیں ہیں جو آنکھ کھول کر انتخاب لڑتی ہیں باقی سب تو بھیڑ بکریوں کی مانند آنکھ بند کرکے اپنے رہنما کی پیروی کرتے ہیں۔ براہمن اور مسلمان اپنا موقف اور حکمت عملی وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ براہمن کبھی کانگریس

کے ساتھ ہوا کرتا تھا، وہ بی جے پی میں بھی پیش پیش رہا اور وقت ضرورت کمیونسٹوں کے علاوہ بہوجن سماج کے ساتھ بھی ہوجاتا ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے وہ کبھی کانگریس تو کبھی سماجوادی، کبھی کمیونسٹ تو کبھی بہوجن سماج کے ساتھ ہولیتا ہے لیکن ان دونوں میں ایک فرق ہے۔۔براہمن اقتدار میں حصہ داری کیلئے پارٹی تبدیل کرتا اور مسلمان بی جے پی کو شکست دینے کیلئے پالے بدلتا ہے۔ دونوں اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب تو کبھی ناکام ہوجاتے ہیں مثلاً اترپردیش کے پچھلے صوبائی انتخاب میں مسلمان کامیاب رہے اور پارلیمانی انتخاب میں.براہمنوں کو کامیابی ملی۔یہ شطرنج کا کھیل ہے جس میں شہ اور مات ہوتی رہتی ہے۔

موجودہ سیاست میں مسلمان اقتدار سے اس لئے محروم رہتے ہیں کہ ان کے خلاف منفی رجحانات کے سبب نہ وہ ہندتووادیوں کے ساتھ جاسکتے ہیں اور نہ ہندوتوادی ان کے ساتھ آسکتے ہیں۔ جہاں ان کی موجودگی ٹھیک ٹھاک ہے اکثر و بیشتر وہ اپنے ہمنوا کو کامیاب کردیتے ہیں مثلاً اترپردیش میں بہوجن سماج پارٹی یا سماجوادی پارٹی۔

.براہمنوں کا یہ ہے کہ ان کی اپنی پارٹی تو بی جے پی ہے لیکن جب اس کا اقتدار میں آنا مشکل ہوتا ہے تو وہ اپنے مفاد کیلئے کانگریس سے لے کر بہوجن سماج پارٹی تک کسی سے بھی ہاتھ ملالیتے ہیں۔ بی جے پی پسماندہ ذاتوں کو کھڑسے یا منڈے جیسے رہنماوں کی مدد سے جھانسہ دے کر

اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے لیکن مسلمان دھوکہ نہیں کھاتے اس لئے وہ مسلمانوں سے خار کھاتی ہے۔

ایکناتھ کھڑسے کے ساتھ جو کچھ بی جے پی نے کیا وہی سلو کچھگن بھجبل کے ساتھ شیوسینا اور این سی پی کر چکی ہے۔ چھگن بھجبل پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے رہنما تھے انہوں نے شیوسینا کو ریاست گیر جماعت بنایا لیکن جب وزیر اعلیٰ بنانے کا موقع آیا تو بال ٹھاکرے نے منوہر جوشی جیسے براہمن کو ان پر فوقیت دی ۔ وہ ناراض ہو کر این سی پی میں چلے گئے۔ جب این سی پی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری تو چھگن بھجبل کیلئے وزیر اعلیٰ بننے کا موقع تھا لیکن شرد پوار نے پر کانگریس سے سودے بازی کرکے دو مرکزی وزارتوں کے بدلے مہاراشٹر میں وزارت اعلیٰ کی گدی بیچ دی۔ بالآخر جب بدعنوانی کے الزام میں جیل جانے کا وقت آیا تواجیت پوار کے عوض بھجبل کی بلی چڑھا دی گئی۔ بی جے پی نے جب نتین گڈکری کو قومی صدر بنایا اور انہوں نے گوپی ناتھ منڈے کی جڑیں کاٹنا شروع کیں تو منڈے نے بیزار ہو کر بھجبل کے ساتھ مل پسماندہ طبقات کا اتحاد قائم کرنے پر غور کیا تھا ان کا خیال تھا کہ جب تک پسماندہ طبقات دیگر جماعتوں کے چنگل سے نکل کر اپنا محاذ نہیں بناتے اس وقت تک انہیں دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی لعنت سے نجات نہیں ملے گی ۔ کسی زمانے میں جو منڈے نے سوچا تھا آج وہی کھڑسے بھی وہی سوچ رہے ہوں گے ۔ ویسے مثل مشہور

ہے اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت بقول شاعر

زیست کے ترازو میں

اک طرف سیاست ہے

اور دوسری جانب عمر بھر کا پچھتاوا

امریکی دورہ: اڑتا پی ایم ، گرتا دم خم

ہولی کے رنگ میں بھنگ کے نشہ کی آمیزش سارا مزہ کرکرا کردیتی ہے۔ رنگ میں بھنگ کے عملی مظاہر وزیراعظم مودی کے امریکی کے دوروں میں نظر آتے ہیں ۔ جس طرح ایک گجراتی چائے فروش کو جلد از جلد امیر بن جانے کے فراق میں امریکہ پہنچ جاتا ہے اسی طرح پلک جھپکتے ساری دنیا میں مشہور ہوجانے کی تڑپ مودی جی کو بار بار امریکہ اڑا کرلے جاتی ہے۔ مودی جی کے اعصاب پر سوار شہرت کی ہوس امریکہ بہادر کے طفیل اپنی بھوک مٹانا چاہتی ہے ورنہ دو سالوں میں چار دورےاور صدر اوبامہ سے سات ملاقاتیں کیا معنیٰ ؟ مغرب سے مرعوبیت ہندوتواپریوار کی کمزوری رہی ہے ۔ یہی مرض ڈاکٹر مونجے کواٹلی کے آمر مسولینی کے چرنوں میں لے گیا۔ اسی نے گروگولوالکر اور بال ٹھاکرے سے ہٹلر کی تعریف کرائی۔ ہندو سینا نے گزشتہ دنوں دہلی میں امریکہ کے ممکنہ صدر ڈونالڈ ٹرمپ کی جشن سالگرہ کا اہتمام کرکے پھر ایک بار یہ ثابت کردیا کہ ہندوتواوادی حکومت کے قیام کے باوجود مغربی مرعوبیت کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ امریکہ میں فی الحال انتخابی سرگرمیاں بامِ عروج پر ہیں اس کے باوجود امریکہ کے مودی ڈونالڈ ٹرمپ کے حامیوں کواس جوش وخروش کے ساتھ اس کی سالگرہ منانے کا خیال نہیں آیا۔اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہندوسنیاکے من میں آج تک ہندو

ہر دیہ سمراٹ نریندر مودی کا جنم دن منانے وچار نہیں آیا۔

ہندو سینا کے نزدیک مسلمانوں کے خلاف ٹرمپ کو مودی پر فضیلت کیوں حاصل ہے؟شاید اس لئے کہ مودی جی آئے دن کسی نہ کسی مسلم حکمراں سے جھک کر کوئی تمغہ یا کوئی اعزاز لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ افغانستان اور سعودی عرب تو کجا بنگلہ دیشتک سے تمغہ لانے کو جو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہو اسے ہندو شدت پسند کیسے پسند کر سکتا ہے؟ مودی جی نے ساری دنیا گھوم کر خوب کھیل تماشے کئے لیکن ان سے کوئی انگریز حکمراں متاثر نہیں ہوا۔ کسی نے انہیں قومی اعزاز سے نوازنے کی غلطی نہیں کی لیکن مودی جی بھی مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔ انہیں کسی صلاح کار نے بتایاایسا کرو اپنے لئے نہ سہی تو کم از کم اٹل جی کیلئے بنگلہ دیش جیسے مسکین پڑوسی ملک سے کوئی اعزاز لے آو۔ یہ تجربہ کامیاب رہابنگلہ دیش کی شیخ حسینہ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنگلہ دیش کے قیام میں اٹل جی کا کوئی کردادر نہیں تھا ان کا اعزاز مودی جی کو تھما دیا جس سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔

مودی بھکتوں نے اب مسلم حکمرانوں پر ڈورے ڈالنے شروع کردیئے۔ جن لوگوں کو نہ اپنی قومی اقدار کا خیال ہے اور جو نہ خود اپنی عوام کے جذبات واحساسات کا پاس و لحاظ کرتے ہیں ان سے یہ توقع کرنا محال تھا کہ وہ کسی اور ملک میں

رہنے والے اپنے بھائیوں کے درد کو محسوس کریں گے۔ جب ایسے حکمرانوں کے سامنے سفارتی ذرائع سے یہ پیشکش آئی ہوگی تو انہوں نے سوچا ہوگا اپنا کیا جاتا ہے؟ کیوں اپنے دروازے سے کسی سوالی کو خالی ہاتھ لوٹایا جائے ؟اس لئے آو دیکھا نہ تاؤ مودی جی کو قومی اعزاز سے نواز دیااور مودی جی کسی اسکولی بچے کی مانند اسے لٹکا کر خوشی خوشی لوٹ آئے ۔ان کی اس حرکت نے انہیں ہندو کٹر پنتھیوں کی نگاہ میں گرا دیا۔ اسی لئے بیچاری ہندو سینا ابلہ ناری کے سمان مودی کے بجائے ٹرمپ سے امید لگائے بیٹھی ہے۔ ہندو سینا کے چوڑی دھاری سینانیوں سے دلیر تو ہیلری کلنٹن ہے جو ایک خاتون ہو کر بھی ٹرمپ کے مقابلے میں ڈٹی ہوئی ہے۔

دوسال قبل جب مودی جی نے پہلی بار امریکہ کیلئے رخت سفر باندھا تو بشمول ان کے ہر کوئی حیرت زدہ تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ وہ ایک ہفتہ کا طویل دورہ تھا جس میں سب سے اہم میڈیسن اسکوائر کا جشن تھا۔ اس ناچ رنگ کی محفل میں مودی جی نے اپنے آپ کو راک اسٹار کے طور پر پیش کیا لیکن گجرات کے فساد کو لے سکھوں کی ایک تنظیم نے عدالت سے رجوع کرلیا اور ایسے حالات بن گئے کہ مبادہ انہیں امریکہ کی سرزمین پر گرفتار نہ کرلیا جائے ۔ خیر گرفتاری تو نہیں ہوئی لیکن احتجاج نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا ۔دوسرے دورے میں مودی جی نے اپنی توجہ عوام سے ہٹا کر سرمایہ داروں کی جانب مبذول کی تاکہ ''میک ان انڈیا'' کے

خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جاسکے۔ اس کیلئے انہوں نے سیلیکون ویلی اور سین جوسجانے کا فیصلہ کیا تاکہ سافٹ ویئر صنعت اور ٹیسلا کارگوالوں کو ہندوستان بلایا جائے لیکن برا ہو عالمی کساد بازاری کا کوئی نہیں پھٹکا ہاں ٹیسلا نے ہندوستان پر چین کو ترجیح دی۔ اس پر گوگل کے سربراہ ہندی نژاد ستیہ ناڈیلا کا مودی سے مصافحہ کے فوراً بعد معنی خیز انداز میں ہاتھ پونچھنا اور فیس بک کے مارک زکر برگ کو کنارے ڈھکیل کر مودی جی کا اپنی تصویر کھنچوانا عوامی بحث کا مرکز بن گئی۔ اس بار مودی جی کو راک اسٹار بنانے والی پٹیل برادری سڑکوں پر اتر کر احتجاج کر رہی تھی اور اپنے پیسے واپس مانگ رہی تھی۔ وزیراعظم کا سحر ٹوٹ کر بکھر چکا تھا جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دے رہے تھے۔

مودی جی کا تیسرا دورہ خالص سفارتی نوعیت کا تھا۔ دو دنوں کے مختصر قیام میں چونکہ کوئی ڈرامہ بازی نہیں تھی اس لئے احتجاج بھی نہیں تھا لیکن مودی جی نے اپنے طور پر ایک احمقانہ ہدف طے کرلیا کہ مولانا مسعود اظہر کو دہشت گرد ٹھہرا کر دم لیں گے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ چین نے ان کے تمام عزائم پر ویٹو پھیر دیا اور وہ اپنا غم غلط کرنے کیلئے ریاض پہنچ گئے۔ اوبامہ کے ساتھ اپنے قائم کردہ تعلقات کا آخری فائدہ اٹھانے کیلئے چوتھی مرتبہ مودی

جی نے امریکہ کا قصد کیا اور اس بار انہیں امریکی پارلیمان کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرنا تھا۔ مودی جی کے پاس امریکہ اور ہندوستان کی تعریف و توصیف نیز پاکستان پر طنز تشنیع کے علاوہ کوئی نکتہ تو ہوتا نہیں ہے۔ امریکہ کو امن کا گہوارہ بتانے والی تقریر کا ریہرسل جاری تھا کہ ایک ہندی نژاد آئی آئی ٹی کے سابق طالبعلم مانک سرکار نے کیلیفورنیا یونیورسٹی میں اپنے پروفیسر ولیم کلگ کو گولی مار کر اپنی قوم کا نام روشن کردیا۔ خودکشی کرنے والے مانک سرکار نے اپنے رہائشی علاقے منی سوٹا میں ساتھ رہنے والی ایک امریکی خاتون کو بھی قتل کیا تھا اور اس کی ہٹ لسٹ میں ایک اور پروفیسر کا نام تھا جو قسمت سے بچ گیا۔ اس طرح گویا دورے کا مہورت ہی غلط نکلا۔ اس کے بعد جب مودی جی افغانستان پہنچے تو متھرا کے جواہر باغ کی واردات نے امن کے گہوارہ سرزمین ہند کے افق پر چار چاند لگا دیئے۔

متھرا کے جواہر باغ کی ۲۷۰ ایکڑ زمین پر نہ تو القاعدہ کے مجاہدین کا قبضہ تھا اور نہ وہاں نکسلوادی.براجمان تھے بلکہ جئے گرودیو کا شیشیہ رام ورکش یادو اس میں اپنے ۵ ہزار بھکتوں کے ساتھ ۲۰۱۴ سے قابض تھا۔ دوسال قبل یہ لوگ دہلی جاکر احتجاج کرنے والے تھے لیکن پھر ارادہ بدل کر جواہر باغ میں دھرنا دینے کی اجازت طلب کی اور ایسے مالک بن بیٹھے کہ متوازی حکومت چلانے لگے ۔آس پاس رہنے اور آنے جانے والے لوگ ان کے تشدد کا شکار ہونے لگے ۔

ان کا مطالبہ تھا کہآزاد ہند فوج کے بنائے گئے سارے قوانین نافذ کئے جائیں ۔اسی فوج کی سرکار ملک میں حکومت کرے اور پٹرول ایک روپیہ لیٹر بیچا جائے۔ مودی جی نے سبھاش چندر بوس کے نام کی سیاست تو خوب کی ان کے رشتے دار کو بی جے پی ٹکٹ پر بنگال کا انتخاب بھی لڑایا گیا لیکن جب آزاد ہند فوج کو دیکھا تو پسینہ چھوٹ گیا۔ پولس نے جب قبضہ ہٹانے کی کوشش کی تو اس پر تلواروں، رائفلوں اور گرینیڈ سے حملہ ہوگیا نیز ۲ پولس افسر سمیت ۲۰ لوگ ہلاک ہوگئے۔ یہ دلچسپ اتفاق ہے کہ جس وقت مودی جی افغانستان میں دہشت گردی کے خاتمے کی دہائی دے رہے تھے متھرا میں یہ واردات رونما ہورہی تھی اور مقامی بی جے پی رکن پارلیمان ہیما مالنی اپنی نئی فلم کی تصاویر ٹویٹر پر اپنے شائقین کے ساتھ شئیر کررہی تھیں ۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ افغانستان سے لے کر امریکہ تک امن قائم کرکے وزیراعظم ابھی لوٹے ہی تھے کہ ایک افغانی نسل کے امریکی شہری نے اورلینڈو میں فائرنگ کرکے ۴۹ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔
اس دورے کے دوران ویسے اور بھی بہت کچھ ہوا۔ وزیراعظم نے امریکی پارلیمان کو یقین دلایا کہ ان کے نزدیک دستور ہند ہی سب سے مقدس کتاب ہے اور وہ اس کی روشنی میں تمام مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ انصاف کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔
جس وقت وزیراعظم یہ بلند بانگ دعویٰ کررہے تھے ان کی پارٹی عدالتی

حکم امتناعی کو پامال کرتے ہوئے دادری کے بساہڑہ گاؤں میں مہا پنچایت منعقد کررہی تھی ۔ اس غیر دستوری پنچایت میں دھمکی دی جارہی تھی کہ ۲۰ دن کے اندر محمد اخلاق کے پورے خاندان کے خلاف گئو کشی کے معاملے کی ایف آئی آر درج کی جائے۔ ان کو دی جانے والی سرکاری امداد کو واپس لیا جائے ورنہ حالات کی خرابی کیلئے انتظامیہ ذمہ دار ہوگا۔ امریکی ارکان پارلیمان پریشان تھے کہ کیا یہی دستور کی پاسداری ہے۔ جس وزیراعظم کی بات پر خود ان کی پارٹی کے رہنما کان نہیں دھرتے اس کی ہم کیوں سنیں؟ دادری کی مہا پنچایت میں کوئی کہہ رہا تھا اخلاق احمد بیمار تھا اور اس کی موت بیماری سے ہوئی ہے۔ ہمارے لڑکے بے قصور ہیں انہیں رہا کیا جائے۔ مرکزی وزیر ثقافت سنجیو بالن تو بہت دور کی کوڑی لے کر آئے تھے ان کے مطابق ایک گائے کا ۱۵۰ کلو گوشت صرف ایک خاندان نہیں کھا سکتا اس لئے جس جس نے گوشت کھایا ہے اس پتہ لگا کر ان سب کو سزا دی جائے۔ ان واقعات کے پس منظر میں اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دنیا کی آنکھوں دھول جھونکنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اسی لئے امریکی پارلیمان کے دونوں جماعتوں سے تعلق رکھنے والے ۳۴ ارکان نے مودی اور اوبامہ ملاقات سے قبل ایک کھلا خط لکھ کر مودی جی کی توجہ ان نازک مسائل کی جانب مبذول کرائی اور کہا کہ ’’اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہناؤ کم از کم اس تشدد کی کھلے عام مذمت تو کرو‘‘۔ ان خط میں عیسائیوں اور مسلمانوں پر تشدد کے واقعات کے علاوہ سکھ مت کے علٰحیدہ تشخص کو تسلیم نہ کرنے پر

بھی تاسف کا اظہار کیا گیا۔اس کے اندر ڈھکے چھپے انداز میں نہیں بلکہ کھل کر سنگھ پریوار سے تعلق رکھنے والی وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کو تشدد کیلئے موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ اپنے آپ کو فخر سے پردھان سیوک کہنے والے والے وزیر اعظم کی سٹی ّ ایک ایسے خط نے گم کردی جس میں جواب کی توقع کی گئی تھی۔

اس خط کے مطابق ۱۷ جون سے یعنی مودی جی حلف برداری کے ایک ماہ کے اندر بستر ضلع کے اندر ۵۰ گاوں میں غیر ہندو مذہبی عبادت ، تبلیغ و تقریر پر پابندی عائد کردی گئی۔ اس طرح وہاں بسنے والے ۳۰۰ عیسائی خاندانوں کا اپنی مذہبی رسومات ادا کرنا مجرمانہ سرگرمی قرار پایااور وی ایچ پی کے غنڈوں نے تشدد کا راستہ اختیار کرکے اس کو عملی جامہ پہنایا۔ وہاں رہنے والے عیسائیوں کو سرکاری سہولتوں اور کھانے پانی تک سے محروم کردیا گیا تاکہ وہ دوبارہ ہندو مذہب اختیار کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ اس کے علاوہ گئو کشی کے نام پر مشتعل بھیڑ کے ذریعہ ہلاک کئے جانے والے ۴ مسلمانوں کا بھی نام بہ نام ذکر کیا گیا۔ پنجاب میں گرو گرنتھ صاحب کی بے حرمتی کے خلاف احتجاج کرنے والے دو سکھ نوجوانوں کی موت پر بھی غم وغصے کا اظہار موجود ہے۔ اس خط میں غالباً پہلی بار آرایس ایس کا نام لے کر وزیر اعظم سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ اس کی سرگرمیوں کو قابو میں رکھا جائے اور حفاظتی دستوں کو اقلیتوں کے تحفظ کی

تلقین کی جائے۔ اپنی مادر تنظیم کے متعلق یہ سب پڑھ کر مودی جی کے من کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

مودی جی کی مصیبت صرف ایک خط تک محدود نہیں تھی کہ جس کو نظر انداز کردیا جاتا بلکہ جس وقت اوبامہ مودی ملاقات ختم ہورہی تھی اسی وقت امریکی پارلیمان میں حقوق انسانی کے کمیشن کی سماعت کا آغاز "ہندوستان میں حقوق انسانی کی تازہ صورتحال، بنیادی آزادیوں کو درپیش چیلنجس اور بہتری کے مواقع" کے موضوع پر ہورہا تھا۔ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے اس قضیہ کی سماعت کیلئے اس سے برا کوئی اور وقت نہیں ہوسکتا تھا۔ کاش مودی جی اسے ایک آدھ ہفتے کیلئے مؤخر ہی کروانے میں کامیاب ہوجاتے لیکن اس کیلئے جو سفارتکاری درکار ہے اس کی توقع کم از کم ان سے مشکل ہے۔ اس سماعت کے دوران کمیشن کے مشترکہ چیرمین جیمس مک گورن نے کہا کہ دستوری تحفظات کے باوجود مذہبی اقلیتیں بشمول سکھ، ہندو قوم پرست گروہوں کے ہاتھوں سے دہشت اور تشدد کا شکار ہوتی رہتی ہیں اور مجرمین کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ ریاستی سطح کے تبدیلیٔ مذہب مخالف قوانین سرکاری ملازمین کو یہ طے کرنے کا اختیار دیتے ہیں کہ ہندومت سے مذہب کی تبدیلی قانونی ہے یا نہیں جبکہ مذہب کا انتخاب انفرادی معاملہ ہے اور اس کو سرکاری ضابطے کا پابند نہیں ہونا چاہئے۔ اس کمیشن کے سامنے گواہی دیتے ہوئے امریکن مسلم کونسل کے مصدق تھانگے نے کہا کہ

جو وزیراعظم اہم لوگوں کی سالگرہ پر ٹویٹ کرنے سے نہیں چوکتا اسے عیسائی اسکولوں اور چرچوں پر حملے کی مذمت میں ایک ماہ کا وقت لگا اس کے باوجود بیان کے الفاظ واضح مذمت سے قاصر رہے۔ وشوہندوپریشد کے ذریعہ بزور قوت چلائی جانے والی تبدیلیٔ مذہب کی تحریک پر وزیراعظم کے موقف میں بھی حزب اختلاف کو چیلنج کیا گیا تھا کہ وہ تبدیلیٔ مذہب کے قانون کی حمایت کرے جبکہ یہ قانون ہندومت سے مذہب کی تبدیلی میں رکاوٹ ہے۔

امریکہ میں ایک بین الاقوامی مذہبی آزادی کا کمیشن بھی ہے۔ اتفاق سے ۲۰۱۵ کی صورتحال پر اس کی رپورٹ بھی حال میں سامنے آئی اور اس میں تسلیم کیا گیا اس سال حالات پہلے سے بدتر ہوئے ہیں ۔اس رپورٹ میں ہندو تنظیموں کے علاوہ انتظامیہ کے جانبدارانہ رویہ اور عدلیہ کے بے اثر ہوجانے سے رونما ہونے والی صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ رپورٹ میں اویدیہ ناتھ اور ساکشی مہاراج کے علاوہ بی جے پی کے صدر امیت شاہ کو بھی نام لے کر جبر وتشدد کیلئے ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔اس رپورٹ میں تبدیلیٔ مذہب کے قانون کی مدد سے ۶ ریاستوں میں مرتکب ہونے والے مظالم کی شدید مذمت کی گئی اور اعتراف کیا گیا سنگھ پریوار کے نفوذ کے باعث مسلمان اپنی شکایت تک درج کرانے سے گریز کرنے لگے ہیں۔ ایک طرف مودی جی کے امریکی دوروں کے سبب یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ ہند امریکی تعلقات میں ایسی گرمجوشی پہلے کبھی بھی نہیں تھی دوسری

جانب امریکہ سے یکے بعد دیگرے جو نیک نامی کے تمغے حاصل ہو رہے ہیں اس کی بھی کوئی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔

اس بار مودی جی نے امریکہ سمیت سوئزرلینڈ و میکسیکو کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ این پی ٹی پر دستخط کئے بغیر ہندوستان کو این ایس جی ممالک کے کلب میں شامل کرنے کی حمایت کریں لیکن اس تجویز کو چین نے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ کچھ اور ممالک کا اس پر اعتراض ہے نیز اگر ہندوستان کو شامل کیا جاتا ہے تو پاکستان کی درخواست پر بھی غور کیا جائے اس طرح ویانا میں ہونے والے حالیہ اجلاس میں تو ہندوستان کی درخواست پر مثبت فیصلہ نہ ہوسکا اور معاملہ ۲۳ جون تک ٹل گیا۔ ہندوستان کو اس سے پہلے ۲۰۰۸ کے اندر منموہن سنگھ کے زمانے میں استثناء مل چکا ہے لیکن اس وقت چین اور امریکہ کے تعلقات بہت اچھے تھے ۔اس بار نہ صرف چین اور مریکی تعلقات سرد مہری کا شکار ہیں بلکہ مودی جی کی امریکہ بھکتی کے سبب ہند چینی تعلقات بھی بہت خراب ہیں۔ چین ایک منظم حکمت عملی کے ساتھ نیپال کے اندر گھس آیا ہے لیکن مودی جی ہیں کہ امریکی خمار سے باہر آنے کا نام نہیں لیتے۔

مودی جی کی پارلیمانی تقریر کے بعد ریپبلکن پارٹی کے میک کین نے قومی دفاعی اختیاری قوانین میں کئی ترمیمات پیش کیں جس میں سے ایک ہندوستان کو

اسٹر ٹیجک پارٹنر قرار دے کر بہت ساری مراعات بحال کرنے کی تجویز بھی تھی لیکن امریکی پارلیمان نے اسے مسترد کردیا۔اسی امریکی پارلیمان نے پاکستان کیلئے نہ صرف ۸۰ کروڑ ڈالر امداد کا اعلان کیا بلکہ حقانی نیٹ ورک سے مقابلے کیلئے دی جانے والی رقم ۴۵ کروڑ ڈالر کو بڑھا کر ۹۰ کروڑ کردیا اور یہ سب بغیر کسی ڈرامہ بازی کے ہوگیا۔این ایس جی کے بعد اس دوسری ناکامی کے آئینے میں ایک نابینا بھی وزیراعظم کے امریکی دورے کی کامیابی کا پرہول بھیانک چہرہ ازخود دیکھ سکتا ہے۔امریکہ کے چوتھے ناکام دورے کے بعد ایک بات صاف ہوگئی ہے کہ وزیراعظم نریندر مودی تاریخ میں ایک ایسے رہنما کے طور پر جانے جائیں گے جو کرنا تو بہت کچھ چاہتا تھا لیکن کرکچھ بھی نہیں پایا ۔اس کی پے درپے ناکامی کیلئے کبھی تو اس کا گھناونا ماضی وجہ بنا تو کبھی اس کی حماقتیں آڑے آگئیں۔ کبھی بیجا توقعات نے بیڑہ غرق کردیا تو کبھی ناسازگار حالات نے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ایک ایسا وزیراعظم جس نے چراغ تو بے شمار جلائے لیکن ہر چراغ تلے صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور وہی تاریکی بالآخر اسے لے ڈوبی۔

غلامی سے نکل کر قید آزادی میں عورت ہے

ہاتھی کے دانت کی مانند انسانی مسائل بھی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک حقیقی جو اکثر عوام کی نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں یا رکھے جاتے ہیں اور دوسرے نمائشی جو نظر تو آتے ہیں لیکن کسی کام کے نہیں ہوتے۔ ان کے تعلق سے رویہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے بہت سارے لوگ خود اپنے ذاتی مسائل کے اندر اس قدر الجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں سماجی مسائل میں کوئی سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہوتی لیکن سارے لوگ ایسے نہیں ہوتے کچھ لوگ انسانیت کا درد محسوس کرتے ہیں اور ان کی جانب توجہ فرماتے ہیں ۔ ان دلچسپی لینے والوں کی دو قسمیں بادلوں کی مانند ہوتی ہیں ایک تو گرجنے والے اور دوسرے برسنے والے۔ یعنی ایک طبقہ صرف ان مسائل کو اچھالنے پر اکتفاء کرتا ہے لیکن دوسرا انہیں حل کرنے کیلئے سنجیدہ اقدامات کرنے میں یقین رکھتا ہے ۔ خواتین چونکہ انسانی سماج کا نصف بہتر ہیں اس لئے حقوق نسواں کے حوالے سے بھی یہی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

خواتین کے مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کرنے والوں کی بھی دو اقسام ہوتی ہیں ایک اس کا استیصال کرنے والے اور دوسرے استحصال کرنے والے۔ ان دونوں طبقات میں بہت نازک سا فرق اخلاص نیت کا ہوتا ہے۔ اول الذکر بے لوث انداز میں

مظلوم و مقہور طبقات کے مسائل حل کرنا چاہتا ہے اور موخرالذکر مسائل کی آگ میں اپنی روٹیاں سینکنے کا نادر موقع مل جاتا ہے۔ بظاہر دونوں طرح کے لوگوں کا دعویٰ اور عمل یکساں ہوتا ہے وہ مسائل میں گھرے لوگوں کے شریک کار بن کر ان کو ظلم و جبر سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مطمح نظر مختلف ہوتا ہے۔ نیتوں کا حال تو صرف خدا جانتا ہے مگر ان گروہوں کے دیگر اقدامات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کون مخلص اور کون منافق؟

اخلاص کے مزاج میں خاموشی کا عنصر پنہاں ہوتا ہے وہ جس قدر کرتا ہے اس سے بہت کم بولتا ہے اس کے برعکس نفاق شور شرابے کا محتاج ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر محترمہ ماروی سرمد اور سنیٹر حمداللہ کا قضیہ دیکھ لیجئے۔ ماروی سرمد کے مطابق حمداللہ نے ان کو گالیاں دیں اور کہا کہ وہ ان کی اور ان کی ماں کی شلوار پھاڑ دیں گے۔ یہ ایک یکطرفہ الزام ہے جس کی تصدیق ویڈیو سے نہیں ہوتی لیکن ماروی کے مطابق وہ ویڈیو کے اندر فلمبند ہے جو نشر نہیں کی گئی۔ اگر یہ درست ہے تو قابلِ مذمت ہے اس لئے کہ کسی خاتون سے اس طرح کے لب و لہجے میں بات کرنے کی اجازت امریکہ کا لبرل سماج اپنے صدارتی امیدوار ڈونالڈ ٹرمپ کو تو دیتا ہے مگر اسلام اپنے ہمنواوں کو ہرگز نہیں دیتا۔ حمداللہ اگر جمیعتہ العمائے پاکستان کے سنیٹر نہیں بلکہ پی پی یا ایم کیوایم کے ہوتے تو ان کیلئے یہ جائز تھا لیکن جمیعت میں ہوتے یہ ہرگز مناسب نہیں۔ اگر

حمداللہ نے ایسی زبان استعمال کی ہے تو انہیں جمیعت اور عدالت دونوں کی جانب سے قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔ خیر ماروی سرمد کی شکایت پولس درج کرلی ہے اور خفیہ شواہد بہت جلد عدالت میں پیش ہو جائیں گے۔ عدالت کے فیصلے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائیگا۔ حمداللہ قصوروار ہے تو انہیں سزا ہوگی اور ماروی سے زیادہ خوشی ہمیں ہوگی۔

اس ویڈیو میں جو کچھ موجود نہیں ہے اس پر تو خوب ہنگامہ ہوچکا لیکن ان شور مچانے والے لوگوں اور حمداللہ کے ساتھ سارے اسلام پسندوں کو کٹھہرے میں کھڑے کرنے والوں سے ایک مؤدبانہ گزارش یہ بھی ہے کہ وہ ٹھنڈے دماغ سے ویڈیو میں جو شواہد موجود ہیں انکو بھی دیکھنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ ویڈیو کے اندر دیکھا جاسکتا ہے کہ بیرسٹر مسرور نے اسلامی نظریاتی کونسل کو شدید تنقید کا نشانہ بنانے کے بعد مولانا شیرانی کو چرسی کے خطاب سے نواز دیا۔ بیرسٹر مسرور چونکہ ایک روشن خیال خاتون ہیں اس لئے ان کی یہ اہانت آمیز بہتان طرازی ایک نامعلوم شلوار کی آڑ میں چھپ گئی۔ کسی لبرل دانشور نے اس پر گرفت کرنے کی زحمت نہیں کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سنیٹر حمداللہ کی بدزبانی قابل مذمت ہے تو کیا بیرسٹر مسرور کا اپنے مخالف کو چرسی کہہ کر پکارنا قابلِ ستائش ہے؟

اس پروگرام میں پہلے خواجہ آصف کے ذریعہ شیریں مزاری کے خلاف نازیبا الفاظ کی مذمت کی جاچکی تھی اسی اصول کے مطابق حمداللہ نے مولانا شیرانی کیلئے استعمال کئے جانے والے تضحیک آمیز لہجے کے مذمت کا بھی مطالبہ کیا۔ کیا یہ کوئی ناجائز مطالبہ تھا کہ جس پر ماروی نے طیش میں آکر تین بار اصرار کے ساتھ کہا کہ میں مسرور کی حمایت کرتی ہوں، کرتی ہوں کرتی ہوں۔ ماروی سرمد کے بہتان طرازی کے برسرِ عام حمایت پر بھی کوئی تنقید نہیں ہوئی اس لئے کہ وہ خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ روشن خیال ہیں۔ اس پر حمداللہ نے کہا اگر یہی بات میں آپ کو اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت نہیں دوں گا۔ اور ہنگامہ ہوگیا اور بقول ماروی کے حمداللہ گالی گلوچ کی پراترآئے نیز شلوار والی دھمکی دے کر پروگرام سے چلے گئے۔ جسے نشر نہیں کیا گیا۔

حمداللہ کی دھمکی اورگالی گلوچ یقیناً قابلِ مذمت ہے لیکن اسی الزام میں ماروی اعتراف کرتی ہیں کہ انھوں نے بھی حمداللہ کی گالیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا گویا گالیوں کا حساب تو بے باق ہوگیا۔ جہاں تک شلوار والی دھمکی کا سوال ہے وہ تو ویڈیو پر موجود نہیں ہے لیکن ماروی سرمد کے یہ چیلنج ضرور موجود ہے کہ ”تو اکھاڑ لے جو اکھاڑنا ہے“۔ اگر ایک سنیٹر کیلئے شلوار کا ذکر نامناسب ہے تو کیا ایک معزز دانشور کو اکھاڑنے پچھاڑنے کے لہجے میں للکارنا چاہئے جبکہ یہ الفاظ بھی گالی کے طور پر معروف ہیں۔ اگر کوئی

کہتا ہے کہ ماروی سرمد کا یہ رد عمل حمداللہ کی بدتمیزی کے خلاف تھا اور ابتداء حمداللہ کی جانب سے ہوئی تھی تو یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ چنگاری تو بیرسٹر مسرور کے چڑ سی والے فقرے نے لگائی۔ اس کو ہوا دینے کا کام ماروی نے کیا اس لئے رد عمل کا اظہار حمداللہ کی جانب سے ہوا لیکن اسلام کے خلاف آگ پھیلانے والوں کو چنگاری دکھانے والی اور ہوا دینے والی کیسے نظر آسکتی ہیں؟

اس تنازعہ سے ہٹ کر محترمہ ماروی سرمد کے خیالات اور لب و لہجے کا بھی تجزیہ ہونا چاہئے۔ ایک انٹرویو میں وہ فرماتی ہیں کہ قائدا عظم دو قومی نظریہ کے حامل نہیں تھے۔ یہ آدھا سچ ہے ایک زمانے تک جب وہ کانگریس میں تھے ایسا تھا لیکن آگے چل انہوں نے مسلم لیگ بنا کر قیام پاکستان کی تحریک چلائی۔ ان کے اس کارنامہ کی لال کرشن اڈوانی تک نے پذیرائی کی اور اس کی بہت بڑی قیمت چکائی لیکن ماروی اس کو تسلیم نہیں کرتیں بلکہ نصف سچ پر اصرار کرتی ہیں۔ دو قومی نظریات کی مخالف ماروی بلوچستان کی آزادی کی درپردہ حمایت کرتی ہیں اور مشرقی اور مغربی پنجاب کے تہذیبی اشتراک میں انضمام کا پہلو تلاش کرتی ہیں۔ اگر بلوچستان اور پنجاب پاکستان کے نقشے سے غائب ہو جائیں تو صوبہ پختون خواہ کو افغانستان اور صوبہ سندھ کو گجرات و راجستھان میں شامل ہونے سے کون روک پائے گا؟ دونوں علاقوں سرحدی گاندھی کے وارث اور جیو

سندھ کے اسلام دشمن حامی پاکستان سے بیزار بیٹھے ہیں ۔اس طرح پاکستان نام کا ملک دنیاکے نقشے سے اپنے آپ غائب ہوجائیگا۔

سیکولر حضرات جمہوریت اور دستور کی بالادستی کا بہت.بڑے وکیل بنتے ہیں ایک ٹی وی مذاکرے میں جب ماروی صاحبہ سے پاکستانی دستور کی دفعات ٦١ سے ٦۵ کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ دلیل یا منطق کی بنیاد پر ان کی خامیاں بیان کرکے اصلاح کی تجاویز پیش کرنے کے بجائے انہیں خرافات قرار دے کر مسترد فرمادیتی ہیں ۔کیا یہ رویہ درست ہے؟اور اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ دلائل کی عدم موجودگی رعونت کا بھیس بدل لیتی ہے؟ اس صورتحال میں روشن خیالی کی کسوٹی یہ ہے کہ معزز خاتون کی خرافاتکامدلل جواب دینے کے بجائے اس کی دلیری پر تالیاں پیٹی جائیں۔ان خیالات کا بے باکانہ اظہار پاکستان جیسے بنیادپرست مذہبی ملک میں ہی ہوسکتا ہے ورنہ اگر کوئی ہندوستان جیسی عظیم جمہوریت میں ان اظہار کرے توپتہ چلے گا کہ اس پر بغاوت کے کتنے الزامات لگتے ہیں ؟جے این یو کا معاملہ بہت پرانا نہیں ہوا ہے اور مقدمات کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔

مملکت پاکستان کے ان روشن خیال دانشوروں کوملالہ یوسف زئی کا تو بہت ملال ہے لیکن انہیں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی یاد شاذو نادر ہی آتی ہے۔ڈاکٹر عافیہ

صدیقی کسی مدرسے کی طالبہ نہیں تھیں کہ انہیں کٹھ ملا کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔
انہوں نے اعلیٰ تعلیم امریکہ کے ہوسٹن یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ ان کے والد بھی
برطانیہ سے طب کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ عافیہ کے امریکہ میں آرکیٹیکٹ ہیں اور
بہن فوزیہ دماغی امراض (نیورولوجی) کی ماہر ہیں۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی نے امریکہ کے
میں اپنی زندگی کے (MIT) عالمی شہرت یافتہ میساچوسیٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی
دس بہترین برس گزارنے کے بعد برینڈیز میں نیورولوجیکل سائنسز میں پی ایچ ڈی کی
ڈگری لی اور سائنس دان کے طور پر معذور بچوں پر تحقیق کا کام انجام دیا۔
ان زبردست کامیابیوں کے باوجود ڈاکٹر عافیہ صدیقی روشن خیال طبقہ کی نظر سے
اوجھل ہیں کیونکہ انہوں نے اعلیٰ سائنسی تعلیم کے ساتھ ساتھ دین اور فقہ کا علم حاصل
کیا۔ اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے موضوع پر تقابلی جائزہ اور تحقیق کی۔ امریکہ میں
میں دورانِ تعلیم وہ اپنے ہم MIT قیام کے دوران عافیہ نے اسلام کی دعوت کا کام کیا۔
جماعت طلباء بلکہ جیل کے قیدیوں تک میں قرآن مجید کے تراجم اور اسلامی کتب تقسیم کئے
۔ عافیہ نے مقامی مسلم بچوں کے درجنوں گروپ ترتیب دے کر اختتام ہفتہ قرآنی قاعدہ
پڑھانے کا اہتمام کیا۔ عافیہ نے بوسنین یتیم بچوں اور بیواؤں کے لیے فنڈ ریزنگ بھی
کی۔ قیام امریکہ کے دوران ایک مرتبہ اسٹڈی سرکل میں پرامید عافیہ نے کہا تھا ”ہم

خلوص اور تحمل سے اللہ کے دین کا کام کریں تو کیا عجب یہی امریکہ کل کو ایک اسلامی ریاست بن جائے''۔

حریت اور آزادی کا علمبردار امریکہ عافیہ کے حق تبلیغ کا احترام نہیں کرسکا۔ ان کے خاوند کو اور انہیں حراساں کیا جانے لگا بالآخر وہ مادر وطن لوٹ آئیں۔ ۳۰ جون ۲۰۰۳ کو کراچی سے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو اغواء کیا گیا اور ۳ اگست ۲۰۰۸ کو بی بی سی نے رپورٹ دی کہ وہ زخمی حالت میں افغانستان کی جیل میں ہے۔ مگر ان کے زخمی ہونے یا افغانستان پہنچنے کی تفصیل نہیں بتائی گئی۔ اس کے بعد یہ کہانی سنائی گئی کہ جب ایف بی آئی کے دو سپیشل ایجنٹ' ایک آرمی وارنٹ آفیسر' ایک آرمی کیپٹن اور ایک بلیک واٹر کا ملٹری کمانڈو ڈاکٹر عافیہ سے تفتیش کرنے کیلئے غزنی محل میں پہنچے تو نہتی عافیہ موقع غنیمت جان کر امریکی وارنٹ افسر کی گن اٹھا کر ان پر فائر کرنے لگی۔ اس پر امریکی بلیک واٹر اہل کار نے عافیہ کو فوراً دھکا دے کر نیچے گرا دیا اور وارنٹ آفیسر نے سروس پستول سے عافیہ کو زخمی کر دیا۔ سیکولر جمہوریت کے سرخیل امریکہ کی عدالت نے یہ دریافت نہیں کیا کہ عافیہ کی گولی باری سے کون زخمی ہوا؟ عافیہ کو کراچی سے اغواء کس نے اور کیوں کیا؟ امریکہ نے پانچ سالوں تک انہیں اپنی غیر قانونی حراست میں کیوں رکھا؟ بلکہ ان سوالات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عافیہ کو ۸۶ سال کی سزا سنا دی۔ اس پر عافیہ نے کمال

صبر و تحمل اور استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اس عدالت کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے اور آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے خود کلامی کے عالم میں کہا اے اللہ میں آپ کی رضا پر راضی ہوں اور سر تسلیم خم کر لیا مگر۔

کتاب سادہ رہے گی کب تک کبھی تو آغاز باب ہو گا
جنھوں نے بستی اجاڑ ڈالی کبھی تو ان کا حساب ہو گا
سحر کی خوشیاں منانے والو سحر کے تیور بتا رہے ہیں
ابھی تو اتنی گھٹن بڑھے گی کہ سانس لینا محال ہوگا

ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی اس اسلام پسندی نے امریکہ کے چہرے سے حقوق انسانی کی نقاب نوچ کر پھینک دی اور یہی اسلام نوازی حقوق نسواں کے سیکولر حواریوں کے راہ کی رکاوٹ بن گئی۔ عافیہ صدیقی کو امریکہ کے ہاتھوں فروخت کرنے والا معتدل اسلام کا حامل پرویز مشرف تھا اور ان پر جھوٹے الزامات لگا کر انہیں سزا دینے والی حکومت دنیا کی سب سے عظیم جمہوریت امریکہ تھی اس لئے ان دونوں کے خلاف آواز اٹھا کر اسلام کی بلاواسطہ حمایت کرنے کی غلطی یہ لوگ کیسے کر سکتے تھے؟ ان کو ڈاکٹر عافیہ اس لئے اچھی نہیں لگتیں کیونکہ ان کا آئیڈیل حضرت محمد ﷺ ہیں مگر ملالہ اس لئے پسند آتی ہیں کیونکہ اس کا آئیڈیل اوبامہ ہے باوجود اس کے اسی کے اشارے پر چلنے والے ڈرون سے معصوم لوگ ہلاک ہوتے ہیں۔ ملالہ حجاب اور داڑھی کی مخالفت کرتی ہیں انہیں برقعہ دیکھ کر

پتھر کا زمانہ یاد آتا ہے اس لئے وہ امن کی فاختہ بنی ہوئی ہیں ۔ مملکت خداداکی دونوں بیٹیاں فی الحال امریکہ میں ہیں۔ ایک اپنی اسلام پسندی کے باعث قید میں ہے اور دوسری اقوام متحدہ کے فورم تاکہ اسلامی شعائر کی خلاف اسے استعمال کیا جاسکے۔ اسلام کے خلاف زہر افشانی کیلئے مغرب اور اہل مغرب کے پاس سب سے بڑا مسلم ہتھیار مسلم خواتین کی حالتِ زار ہے بقول شاعر

غلامی سے نکل کر قید آزادی میں عورت ہے

نئی تہذیب کے ہاتھوں میں تیغ بے ملامت ہے

ملالہ یوسف زئی کے ان خود پسند ہمدردوں کو اسماء خطیب بھی نظر نہیں آتیں جن کو مصر کی عدالت نے پھانسی کی سزا سنا دی۔ ایسا اس لئے ہے کہ ان روشن خیال دانشوروں کو ملالہ کی آڑ میں اسلام کو بدنام کرنے کا جو نادر موقع حاصل ہوتا ہے وہ عافیہ یا اسماء کے ساتھ یکجہتی میں نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اسماء اور عافیہ کے معاملے میں سیکولر طبقہ ظالم بن کر سامنے آتا ہے اور اسلام پسند مظلوم نظر آتے ہیں ۔ اس حقیقت کی عکاسی چونکہ گوں ناگوں مقاصد کے خلاف پڑتی ہے اس لئے اس بابت خاموشی اختیار کرلی جاتی ہے ۔ اس کی ایک اور وجہ مغرب کی فکری غلامی ہے ۔ ہمارے مغرب نواز صحافی یوروپ اور امریکہ سے آنے والی ہوا کے رخ پر بہنے کے عادی ہوگئے ہیں اس لئے جن افراد و مسائل کو مغرب اپنے مفاد کے پیش نظر اہمیت دیتا ہے وہ ان حضرات کیلئے بھی

اہم ہو جاتے ہیں اور جن سے وہ صرف نظر کرتا ہے وہ یہاں بھی نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ اہل مغرب سے مرعوبیت آزادیٔ نسواں کے نام پر چلنے والی تحریک کے منافقانہ دعووں کا پول کھولتی ہے۔ ورنہ بقول فضا اعظمی صورتحال تو یہ ہے کہ

اب اس دورِ ترقی میں زبوں ہے حال عورت کا
نہ وہ رسمِ کہن بدلی، نہ وہ طرزِ سخن بدلا
نئی تہذیب لائی ہے نئے انداز سطوت کے
وہی دکھ ہیں وہی ہے دورِ استحصال جو کل تھا
حقوقِ بنتِ حوّا کا نیا عنوان نکلا ہے
حکومت کی ہوس ہے اور آزادی کا دھوکا ہے

عیدی کا جوتا

اساتذہ کے ایک اہم اجلاس میں طلبہ کی حوصلہ افزائی کیلئے عیدی کے انتخاب پر غور و خوض ہو رہا تھا۔ بچوں کیلئے مختلف قسم کی ٹوپیوں پر تبادلہ خیال جاری تھا اردو کی استانی دو پلیّ ٹوپی کے حق میں دلائل دے رہی تھیں تو جغرافیہ کے ٹیچر جناح کیپ کی تعریف میں پل باندھ رہے تھے۔ تاریخ کی استانی کو ترکی ٹوپی میں خلافت عثمانیہ کی شان نظر آتی تھی تو ہندی کے استاد گاندھی ٹوپی کے ذریعہ قومی یکجہتی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی کے استاد شکاری ہیٹ کے حق میں دلائل دے رہے تھے تو ریاضی کی استانی جالی دار گول ٹوپی کی جیومیٹری سمجھا رہی تھیں۔ جب جلاد نما سائنس پڑھانے والے صدر مدرس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انہوں نے قلندرانہ بے نیازی سے اعلان کر دیا میں تو کہتا ہوں ٹوپی کے بجائے جوتا دیا جائے؟ اچانک اس عجیب و غریب تجویز کے وارد ہوتے ہی پہلے تو سناٹا چھا گیا اس لئے کہ کسی شریک مجلس میں اسے مسترد کرنے کی جرأت نہیں تھی۔

صدر مدرس نے خاموشی کا پردہ چاک کرتے ہوئے پوچھا کیا افادیت کے لحاظ سے جوتے کو ٹوپی پر فوقیت حاصل نہیں ہے؟ اس پر جغرافیہ کے استاد نے تائید میں کہا بالکل اس میں کیا شک ہے؟ ویسے بھی اس نئی نسل سر آسمان میں رہتا ہے اس

لئے ٹوپی کے بغیر بھی گذارہ ہو جاتا ہے لیکن پیر ہمیشہ زمین پر رہتے ہیں اس لئے جوتوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔انگریزی کے استاد نے فوراً اپنی حمایت پیش کر دی اور بولے جی ہاں اسی لئے ٹوپی کے بجائے جوتا اسکول کے یونیفارم میں شامل کیا گیا ہے۔ ریاضی کی استانی نے حساب کتاب لگا کر بتایا کہ سر سچ تو یہ ہے کہ کپڑوں کے پھٹنے سے پہلے جوتے گھس جاتے ہیں۔ اردو کی استانی بولیں یہ تو فطری بات ہے ایک کے اوپر ہوا اور دھوپ ہوتی ہے اور دوسرے کے سر پر خود اس کا مالک سوار رہتا ہے۔اس سے قبل کے ہندی اور انگریزی کے استاد کوئی اوٹ پٹانگ منطق پیش کرتے صدر مدرس نے بگڑ کر کہا اب بس۔ اتفاق رائے سے فیصلہ ہوگیا ہر جماعت کے سب سے ذہین طالب علم کو عیدی سے نوازہ جائیگا اور اس کا تعین کلاس ٹیچر اپنے صوابدید سے کرے گا یا کرے گی۔

نویں جماعت کی کلاس ٹیچر زیب النساء اردو پڑھاتی تھیں اس لئے انہوں نے ذہین ترین طالب علم کا پتہ لگانے کیلئے ایک نہایت نادر طریقہ ایجاد کیا۔ اپنی کلاس میں آکر انہوں نے بچوں سے سوال کیا ہاں تو بچوّ یہ بتاو تو تم لوگوں میں سے کس کس نے عید کا جوتا خرید لیا ہے۔

سلیم کا چچازاد بھائی شمیم جو اس کا ہم جماعت بھی تھا فوراً کھڑا ہوگیا اور بولا میڈم ابھی سے کہاں۔ ہم لوگ تو جوتا، ٹوپی اور بنیان وغیرہ چاند

رات کو ہی خریدتے ہیں۔ ابھی تو بڑی رات بھی نہیں آئی۔

استانی نے کہا کیوں چاندرات کو سستا ملتا ہے کیا؟

سلیم بولا ممکن ہے آخری رات سڑک کے دوکاندار اونے پونے اپنا مال بیچ دیتے ہوں کون جانے ؟

زیب النساء مسکرا کر بولی لیکن جب سارے گاہک اسی رات کو آتے ہوں تو وہ ایسا کیوں کریں؟

وہ تو ٹھیک ہے میڈم لیکن آج آپ یہ سوال کیوں کر رہی ہوں ؟ شمیم بولا۔

یہ ایک معمہ ہے جو چاندرات کے دن کھلنے والا ہے؟

چاند رات نہیں نہیں میڈم سلیم بولا ہم لوگ روزے کے باوجود اتنا طویل صبر نہیں کر سکتے اب آپ نے سوال کر ہی دیا ہے تو جواب بھی دینا پڑے گا۔

زیب النساء نے کہا اچھا چلو بتائے دیتی ہوں۔ اس سال ہر جماعت کے ذہین ترین طالبعلم کو عیدی کے طور پر جوتی انعام میں ملے گی۔

سار طلباء خوشی سے جھوم اٹھے حالانکہ عیدی تو ان میں سے صرف ایک کو ملنے والی تھی

۔

زیب النساء جانتی تھی کہ اس کلاس میں انعام کے حقدار سلیم یا شمیم کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے لیکن فیصلہ نہیں کرپارہی تھیں کہ جوتے کسے دیئے جائیں۔اس کے بس میں ہوتا تو ایک ایک دونوں میں تقسیم کر دیتیں لیکن یہ بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ بولیں ہاں تو بچو تمہارے درمیان ذہانت کا مقابلہ ہوگا اور اس میں

جو بھی کامیاب ہوگا اسے اسکول کی جانب سے نائی کا جوتا انعام میں ملے گا۔
شمیم بولا ایسی بات ہے تب تو اس سال میرے والدین کو جوتے خریدنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔
استانی نے کہا جلد بازی نہ کرو۔ ہاں تو سلیم تم اپنی کتاب کی آخری نظم کا پہلا شعر پڑھو اور خود موبائیل کے پیغامات میں کھو ہو گئیں۔ سلیم نے خوش ہو کر بلند آواز میں پڑھا۔
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا
سلیم جیسے ہی میں شعر خوانی کرکے بیٹھا تو شمیم پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا اور سوال کر دیا
میڈم یہ ڈاسن کون ہے؟
اس بے ہنگم سوال کو سن کر استانی چکرا گئیں ؟ فوراً اپنا موبائیل بند کیا اور پوچھا کون ؟ کون ڈائن ؟ میں کسی ڈائن کو نہیں جانتی۔
سلیم نے کہا میڈم یہ ڈائن کے بارے میں نہیں ڈاسن کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔
ڈاسن ؟ یہ ڈاسن کہاں سے آگئی ؟
شمیم نے جواب دیا میڈم وہ پھٹا پوسٹر نکلا ہیرو کی مانند ہماری درسی کتاب سے نکل کر باہر آگئی۔
کتاب میں سے ڈائن میں نہیں سمجھی؟
سلیم بولا یہ غلط بولتا ہے۔ وہ دراصل اشعر میں سے نکلی ہے جسے آپ نے پڑھنے

کا حکم دیا تھا؟

اب استانی سمجھ میں آیا کہ ماجرا کیا ہے؟ وہ بولیں تمہیں اس سے کیا مطلب؟ ہوگی کوئی ڈائن، تمہاری رشتے دار لگتی ہے کیا؟

شمیم ہنس کر بولا اگر میری رشتے دار ہوتی تو میں آپ سے پوچھنے کے بجائے ازخود بتاتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کا تعلق آپ کے خاندان سے ہے۔

استانی بولی ہائے اللہ میرے خاندان سے کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یہ شعر جس کا ہے اسی خاندان میں کوئی رہی ہوگی۔ میں اسے نہیں جانتی۔

سلیم نے کہا کوئی بات نہیں چونکہ اس کا جاننا بہت ضروری ہے اس لئے آپ ایسا کریں ہمیں ان سے پوچھ کر بتادیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مودی جی کے ہاتھوں چائے پینے والے گاہکوں یا ان کے ساتھ کالج میں پڑھنے والے طلباء کی طرح نایاب نہیں ہوں گے۔

استانی نے ڈانٹا بدتمیز وزیراعظم کی توہین کرتا ہے اور مجھے جان سے مارنا چاہتا ہے؟

سلیم نے معصومیت سے پوچھا میڈم مریں آپ کے دشمن۔ میں بھلا یہ جرأت کیسے کرسکتا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ جییں ہزاروں سال۔

اس پر کلاس کے سارے طلباء ایک زبان ہو کر بولے ”سال کے دن ہوں پچاس ہزار“۔

یہ دیکھ کر استانی جھینپ کر بولیں تم سب بہت فلمی ہوگئے ہو۔ اگر میں اکبر

الہ بادی کے پاس پوچھنے کیلیے چلی گئی آئی تو واپس نہ آسکوں گی؟

میڈم! شمیم نے سوال کیا آپ کو الہٰ باد سے ایسی انسیت کیوں ہے؟

استانی بولیں فی الحال اکبر الہ بادی وہاں نہیں رہتے۔

اچھا تو کہاں رہتے ہیں؟ یہ سلیم کا سوال تھا۔

استانی نے کہا عدم آباد میں۔

عدم آباد ؟؟؟ یہ کہاں ہے اس کا نام تو ہم نے نہیں سنا؟ شمیم نے سوال کیا

استانی ہنس کر بولی بیٹے ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور تم نے سنا ہی کیا ہے؟ ایسا کرو میرے جانے کے بعد جب جغرافیہ کی کلاس لگے تو عالم گیر سر سے پوچھ لینا۔ وہ گوگل میپ میں دیکھ کر اس کا محل و وقوع بتا دیں گے۔

ارے چھوڑیئے میڈم ہم نے ان سے مودی جی کی چائے کی دوکان کا محل و وقوع ایک ہفتہ قبل پوچھا تھا ابھی تک نہیں بتا سکے تو وہ اکبر عدم آبادی میرا مطلب ہے الہٰ بادی کے عدم آباد کا ٹھور ٹھانہ کیا بتا سکیں گے۔ شمیم کے اس تبصرے کے ساتھ ہی کلاس کی گھنٹی بج گئی۔ استانی کے چہرے پر یک گونہ سکون چھاگیا اور وہ اگلے دن ڈاسن کے بارے میں بتانے کا وعدہ کرکے رفو چکر ہوگئیں۔

اگلے دن اردو کی کلاس میں زیب النساء نہیں آئیں بلکہ ان کی جگہ بڑے میاں یعنی اسکول کے سب سے بزرگ استاد مخفف جاہ لاٹھی کو ٹیکتے تشریف لے آئے۔ بچے ان سے جس قدر محبت کرتے تھے ان کی لاٹھی سے اسی قدر خوف کھاتے تھے اس

لئے کہ وہ بھی مودی جی کی مانند کبھی بھی کہیں بھی چل پڑتی تھی اور مودی جی کی ڈگری کی مانند نت نئے انمٹ نشان چھوڑ جاتی تھی۔ کبھی نام غلط ہو جاتا تو کبھی ٹائپنگ یا فونٹ میں اختلاف ہو جاتا۔ کرسی پر بیٹھ کر بڑے میاں بولے تمہاری میڈم آج نہ جانے کہاں چلی گئیں اس لئے مجھے آنا پڑا۔ اب میں کیا پڑھاوں؟ اگر کوئی سوال ہو تو پوچھو حاضر ہوں ۔

شمیم بولا سر یہ بتایئے کہ عدم آباد کہاں ہے؟

بڑے میاں بگڑ کر بولے بدتمیز میری عمر کا مذاق اڑاتا ہے تجھے شرم نہیں آتی؟

اس سے پہلے کہ ان چھڑی حرکت میں آتی سلیم بیچ میں بول پڑا سر بات دراصل یہ ہے کہ اسے پتہ ہے میڈم کیوں نہیں آئیں اسی لئے پوچھ رہا ہے؟بڑے میاں چکرا گئے۔ یہ عدم آباد کا میڈم کے نہیں آنے سے کیا تعلق ؟ وہ بولے اسے کیسے پتہ کہ وہ کیوں نہیں آئیں ؟

شمیم سنبھل چکا تھا وہ بولا۔جی ہاں بڑے میاں مجھے پتہ ہے۔ وہ دراصل عدم آباد گئی ہوئی ہیں اسی لئے آج نہیں آسکیں۔

عدم آباد ! پھر عدم آباد ؟ وہ اتنی جلدی عدم آباد کیسے چلی گئیں ؟

شمیم بولا کیوں عدم آباد کیا ان کا میکہ ہے اور اگر ہے بھی تو آپ اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں؟

میں ! میں اس کا خسر ہوں ۔ میں نہیں تو کون اعتراض کرے گا؟ اگر وہ واقعی

عدم آباد چلی گئی تو مجھے اپنے لئے ایک نئی بہو تلاش کرنی ہوگی اور آج کے زمانے زیب النساء جیسی اطاعت گذار فرمانبردار بہو کہاں ملے گی؟

شمیم نے سوال کیا نئی بہو میں نہیں سمجھا؟

اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ نئی بہو یعنی نئی بہو؟

لیکن ہم نے تو سنا ہے۰۰۰۰۰۰۰؟ سلیم کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

بڑے میاں بولے جی ہاں تم نے درست سنا ہے۔ میری کوئی حقیقی اولاد نہیں ہے لیکن مرغوب میاں کو میں نے پڑھایا تھا۔ وہ چونکہ یتیم تھا اس لئے مجھے اپنا باپ مانتا تھا۔ اس کے بعد میں نے ہی اس کی شادی کروائی اور اس کی بیوی کو اپنی اسکول میں ٹیچر بنوا دیا۔ میری بہو زیب النساء بھی سونیا گاندھی کی مانند نہایت سعادتمند نکلی اور روز میرے لئے دو وقت کا کھانا بنا کر لانے لگی۔ اب اگر وہ عدم آباد چلی گئی تو میں اس عمر میں بے موت مرجاوں گا۔

شمیم بولا جناب دل چھوٹا نہیں کیجئے۔ دو چار دن ہم لوگ آپ کیلئے کھانا بنوا کر لے آئیں گے۔ تب تک وہ آجائیں گی اور آپ کا کام بن جائیگا۔

نہیں بیٹا نہیں۔ عدم آباد جانے والے لوٹ کر تھوڑی نا آتے ہیں؟

سلیم روہانسہ ہو کر بولا کیوں عدم آباد بہت دور ہے کیا جو وہاں جا کر آتے آتے عمر بیت جاتی ہے؟

نہیں بیٹا ویسے تو عدم آباد بے حد قریب ہے۔ وہاں آنے جانے میں وقت نہیں

لگتا بلکہ انسان پلک جھپکتے پہنچ جاتا ہے مگر ایک بار جو گیا تو واپس نہیں آیا۔ میں بولا او ہو تب تو وہ نہایت عمدہ مقام ہوگا۔ اسی لئے اکبر الہٰ بادی بھی اپنا وطن عزیز چھوڑ کر وہاں چلے گئے۔

.بڑے میاں نے کہا بیٹے وہ کیسا مقام ہے یہ تو کوئی نہیں جانتا اسلئے کہ وہاں کا حال احوال بتانے کیلئے کوئی فرد لوٹا ہی نہیں ۔ جہاں تک اکبر الہٰ بادی کا سوال ہے وہ تو مجبوراً اپنی طبعی عمر پوری کرکے وہاں چلے گئے لیکن تمہاری زیب النساء کو کیا سوجھی کہ بے وقت نکل گئیں۔

شمیم بولا بڑے میاں اس میں کیا پریشانی ہے اگر ایک نہیں تو دوسری بہو، سونیا نہیں تو مینکا سہی۔ مسئلہ کیا ہے۔

.بڑے میاں اپنی چھڑی کو ہوا میں لہرا کر بولے چپ بے وقوف کیا ضروری ہے کہ مرغوب میاں پھر سے اپنی غلطی کو دوہرانے کیلئے تیار ہوجائیں ؟

سلیم بولا کیوں نہیں ہوں گے ۔ ان کو بھی تو اپنی خدمت کیلئے زوجہ کی ضرورت ہے ۔

جی ہاں سو تو ہے لیکن پھر کیا ضروری ہے اس کی دوسری بیوی کو پڑھانے میں دلچسپی ہو؟

کیوں نہ ہوگی آج کل ہر کسی کو پیسے کی ضرورت ہے اور یہ کام بھی کون سا مشکل ہے؟

کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اسے پڑھانا ہی نہ آتا ہو؟

اگر ان کو پڑھانا نہ بھی آئے تو کیا فرق پڑتا امتحان انہیں نہیں ہمیں دنیا ہے۔ہم فیل ہو جائیں گے ان کا کیا بگڑے گا؟

جی ہاں یہ بھی درست ہے مگر کیا ضروری ہے کہ میں اسے پھر سے اسکول میں ملازمت پر رکھوانے میں کامیاب ہو جاوں؟

اس اسکول کے کرتا دھرتا تو آپ ہیں اس لئے کس کی مجال ہے کہ آپ کو روکے؟ اگر کسی نے اعتراض کیا تو آپ اس کو نکال دینا۔

جی ہاں یہ اچھی ترکیب ہے لیکن اگر میں کامیاب بھی ہو گیا تو کیا ضروری ہے کہ وہ احسانمند نکلے؟

سلیم بولا احسانمند نہ بھی ہو تو وہ جانے اور مرغوب میاں جانیں آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟

کیوں نہیں پڑتا۔ تم لوگ تو دو چار دن تک کھانا لاوگے اور پھر بند کر دوگے اس کے بعد میرا کیا ہوگا۔ میرا معدہ گھر کا اچھا کھانا کھاتے کھاتے اس قدر کمزور ہو چکا ہے ہوٹل کے کھانے سے فوراً بگڑ جاتا ہے۔ تم لوگوں نے آخر اپنی میڈم کو اکبر الہٰ بادی کے پاس بھیج کیوں دیا؟

سلیم اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا یہ دراصل شمیم کا کیا دھرا ہے۔اس نے میڈم سے اکبر الہٰ بادی کے شعر میں ڈاسن کا مطلب پوچھ لیا تو وہ اس مطلب پوچھنے کیلئے عدم آباد روانہ ہو گئیں۔

اوہو اتنی سی بات؟بڑے میاں بولے بے وقوف لڑکی مجھ سے پوچھ لیتی۔

یہ سنتے ہی شمیم کی آنکھوں میں چمک آگئی وہ بولا اچھا آپ کو پتہ ہے تو آپ ہی بتا دیجئے۔
اس لئے کہ اب میڈم تو واپس آنے سے رہیں؟
بڑے میاں نے دیکھا یہ بلا ان کی جانب آ رہی ہے تو بولے بے مطلب کے سوال نہ کیا کرو، یہ ڈاسن واسن کچھ نہیں ہے بس بے معنی الفاظ ہیں۔
سلیم نے استفسار کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اکبر الہ بادی جیسے بڑے شاعر بے معنی الفاظ کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟
بڑے میاں بولے اچھا انھوں نے استعمال کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ شعر سناؤ کہ جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے؟ شمیم نے فوراً شعر سنا دیا۔
ڈاسن؟ بڑے میاں سوچ میں پڑ گئے۔
شمیم یہ دیکھ کر بولا اگر آپ کو بھی نہیں معلوم تو کوئی بات نہیں آپ اکبر الہ بادی سے ملنے کیلئے ملکِ عدم کا قصد نہ کریں ورنہ ہم لوگ ایک ساتھ دو صدماتنہیں برداشت کر سکیں گے۔
بڑے میاں بگڑ کر بولے چپ بے وقوف کچھ بھی بکتا ہے۔ اتنی بھی عقل نہیں دھوبی کی دھوبن کی طرح ہے ڈاسن۔ دیکھ ردیف قافیہ بھی درست ہے سلیم بولا جناب آپ نے سیاست کی ہے اگر دھوبی کی بیوی دھوبن ہوتی ہے تو موچی کی جورو موچن ہوئی نہ کہ ڈاسن۔
یہ سن کر بڑے میاں مسکرائے اور بولے پروین شاکر نے درست ہی کہا ہے" بچے ہمارے دور کے ہوشیار ہو گئے"۔

یہ پروین شاکر کون ہے؟آپ کی دوسری بہو تو نہیں ؟
بڑے میاں بولے ارے نہیں اس کو تو میں اپنی بیٹی مانتا ہوں۔
اچھا تو وہ کہاں رہتی ہیں؟ سلیم نے سوال کیا۔
بڑے میاں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ وہ! وہ بھی ملک عدم جا چکی ہے۔
شمیم بولا یہ کیا چکر ہے ؟ پہلے تو آپ کے دوست اکبر الہٰ بادی۔ اور پھر آپ کی منہ بولی بہو اور اب منہ بولی بیٹی سب کے سب عدم آباد کوچ کر گئے۔
سلیم سرد آہ بھر کر بولا لگتا ہے آپ کو بھی جلد ہی•••••• اور رک گیا۔
بڑے میاں بولے بیٹے کیا میں اور کیا تم؟ ہم سب کو اپنے وقتِ مقرر پر جانا ہے اور یہ دیکھو گھنٹی بج رہی ہے۔ میرے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔خدا حافظ۔ شمیم بولا لگتا ہے اب بڑے میاں اپنی بہو اور بیٹی کے پاس جا کر ہی دم لیں گے۔
بڑے میاں نے اپنے عقب میں وہ جملہ سنا لیکن مڑ کر نہیں دیکھا اس لئے کہ حقیقت وہی تھی جو شمیم کہہ رہا تھا۔
سلیم نے گھر پر آکر اپنے ابو کو وہ شعر سنایا اور ڈاسن کا مطلب پوچھا
ابو بولے اس میں کون سی بڑی مشکل ہے ڈاسن کا مطلب ہے ناگن ہے۔
شمیم بولا چاچو آپ ہمیں کیوں احمق بنا رہے ہیں ؟ ڈاسن کہاں اور ناگن کہاں ان دونوں میں کیا مشترک ہے بھلا؟
یکسانیت کیوں نہیں؟دراصل سانپ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ عدم تشدد کی علمبردار

بے ضرر ناگن کہلاتے ہیں اور ڈسنے والے دہشت گرد ڈاسن۔

سلیم کے ابو کی اس منطق کو سن کر پاس بیٹھی نانی مسکرانے لگیں۔ سلیم سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے اس لئے ان کے پاس جاکر بولا کیوں نانی کہیں آپ کے داماد مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہیں ؟

نانی بولیں تم تو اس کی برکت سے پہلے ہی اچھے خاصے بے وقوف ہو اس لئے تمہیں احمق بنانے کی کیا ضرورت ؟

شمیم کی سمجھ میں یہ منطق نہیں آئی وہ مسکرا کر بولا اب اس کا مطلب سمجھنے کیلئے چاچی کے پاس جانا پڑے گا۔

سلیم کے ابو بولے بیٹے ہر ساس اپنے لئے ایک نہایت بے وقوف قسم کا داماد تلاش کرتی ہے تاکہ بیٹی کی اس کی خوب خدمت گذاری ہو اس لئے تم بھی جب دلہن دیکھنے کیلئے جانا تو دو چار حماقت کر دینا۔ یہ اداکاری تمہارے کام آئے گی۔

نانی ہنس کر بولی جی ہاں ایک بڑی حماقت کیلئے چھوٹی موٹی کئی حماقتیں کرنی ہی پڑتی ہیں۔

سلیم نے کہا نانی آپ نے مجھے بحث میں الجھا کر شعر والی بات ٹال دی۔ ہم لوگ کل ڈاسن کا مطلب جاننے کیلئے پریشان ہیں کوئی نہیں بتاتا۔

نانی مسکرا کر بولیں تو بھی بالکل اپنی امی کی مانند ضدی ہے خیر ڈاسن ایک جوتے بنانے والی مشہور کمپنی کا نام ہے جیسے کہ باٹا ہے۔

سلیم اور شمیم یک زبان ہو کر بولے باٹا کو تو سب جانتے ہیں لیکن ڈاسن کا نام کبھی نہیں سنا۔

نانی ہنس کر بولیں بیٹے ڈاسن بھی تمہارے نانا کی طرح ملک عدم کو سدھار گئی۔

پھر عدم آباد؟ تو کیا انسانوں کی طرح کمپنی بھی ...... ؟

جی ہاں بیٹے اس فانی انسان کی ہر تخلیق فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

شمیم نے سوال کیا لیکن اگر وہ مشہور کمپنی تھی تو بڑے میاں اس کو کیوں نہیں جانتے؟

نانی بولیں یہ بھی کوئی سوال ہے اچھا یہ بتاؤ کہ جھارکھنڈ کے وزیر اعلیٰ کا نام کیا ہے ؟

سلیم سمجھ گیا اب پھر نات کو گھمایا جا رہا ہے اس لئے بول پڑا لیکن اس سے ہمارے سوال کا کیا تعلق ہے ؟

وہ میں بعد میں بتاؤں گی پہلے یہ تسلیم کر لو کہ نہیں جانتے ؟

چلئے مان لیا۔ اچھا مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کا نام کیا ہے؟

سلیم خوش ہو کر بولا دیویندر فردنویس ۔

اچھا وزیر اعلیٰ تو دونوں ہیں لیکن ایک کا نام تم جانتے ہو دوسرے کا نہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟

نانی آپ ہمیں الجھا رہی ہیں ۔

جی نہیں ، تم جہاں رہتے ہو وہاں فردنویس کا جوتا چلتا ہے اس لئے اس کا نام

جانتے ہو داس کا جوتا نہیں چلتا اس لئے اس سے ناواقف ہو۔

شمیم نے سوال کیا تو کیا آپ کا مطلب ہے انسان جس کے جوتے کھاتا ہے اسی سے واقف ہوتا ہے ؟

سیاست کی حدتک یہ درست ہے چونکہ میرا بچپن الہ باد میں گزرا جہاں ڈاسن کا جوتا چلتا تھا اس لئے میں جانتی ہوں مگر بڑے میاں جو ممبئی میں رہتے تھے کیسے جان سکتے ہیں ؟

ٹھیک ہے سمجھ گیا لیکن اکبر الہ بادی کو کیا سوجھی کہ ڈاسن استعمال کردیا وہ باٹا بھی تو لکھ سکتے تھے۔ شعر کا وزن بھی برقرار رہتا اور عام فہم بھی ہوتا۔

شمیم بولا اور ہماری میڈم بھی عدم آباد نہیں جاتیں۔

نانی بولی باٹا اس وقت موجود ہی نہیں تھی تو وہ اس کا نام کیسے لکھتے۔

شمیم بولا یہ بھی درست اب میں اگر شاعری کروں گا تو باٹا بھی نہیں بلکہ نائیکی لکھوں گا۔

یہ نائی کی کیا ہے؟ نانی نے پوچھا

سلیم بولا آپ نہیں جانتیں؟ یہ نئے دور کا جوتا ہے امریکہ سے بن کر آتا ہے اور بہت جلد باٹا، ٹاٹا اور بٹاٹا سب کو کھاجائیگا میرا مطلب ہے ختم کردے گا۔

نانی ہنس کر بولیں بیٹے باٹا اور ٹاٹا کی حدتک تو ٹھیک ہے لیکن بٹاٹا انسانوں

کی نہیں قدرت کی تخلیق ہے۔اس کا کچھ نہیں بگڑے گا مگر نائی کی میں ایسی کیا بات ہے کہ وہ سارے بازار کو کھاجائیگا۔

سلیم بولا نانی ایک نہیں کئی باتیں ہیں ۔ اول تو وہ امریکہ سے آتا جس کا آج کل جوتا تو کیا سکہ بھی چلتا ہے۔ دوسرے اسے ایک نائی نے بنایا ہے ۔

نانی نے سوال کیا بیٹے نائی تو حجامت بناتے ہیں سر کی حجامت اور پیروں کے جوتے میں بھلا کیا مماثلت ہے ؟

آپ نے خود ہی اپنے سوال جواب دے دیا ۔ یہ جوتا نہ صرف پیروں کی حفاظت کرتا ہے بلکہ سروں کی حجامت بھی کرتا ہے ۔

نانی نے سوال کیا لیکن بیٹے اس شعر میں تمہاری غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی ۔

شمیم بولا نانی اس شعر کا مطلب جو بھی بتائے گا اسے اسکول کی طرف سے نائی کی کا جوتا عیدی ملے گی۔

نانی بولی لیکن اب تو تم دونوں کو اس کا مطلب معلوم ہوگیا اس لئے انعام کیسے ملے گا ؟

سلیم نے ہنس کر کہااس میں کون سی بڑی بات ہے ۔ مشترک عیدی دونوں میں تقسیم ہوجائیگی ۔

نانی ہنس کر بولیں تو کیا داہنے پیر میں اسے سلیم اور بائیں میں شمیم پہنے گا؟

شمیم نے کہاجی نہیں نانی آپ بھی کتنی سیدھی ہیں ۔ ایک دن اسے میں اور دوسرے دن سلیم پہنے گا۔

نانی ہنس کر بولیں :

پاوں نہ باندھا جوتے کا تسمہ باندھا
آج کا بچہ کتنا سیانا لگتا ہے

سلیم نے جواب دیا :

نانی بتا کیا تیری بات میں جادو ہے
بچہ بچہ تیرا دوانا لگتا ہے

عیدی کا جوتا

اساتذہ کے ایک اہم اجلاس میں طلبہ کی حوصلہ افزائی کیلئے عیدی کے انتخاب پر غور و خوض ہو رہا تھا۔ بچوں کیلئے مختلف قسم کی ٹوپیوں پر تبادلہ خیال جاری تھا اردو کی استانی دوپلیّ ٹوپی کے حق میں دلائل دے رہی تھیں تو جغرافیہ کے ٹیچر جناح کیپ کی تعریف میں پل باندھ رہے تھے۔ تاریخ کی استانی کو ترکی ٹوپی میں خلافت عثمانیہ کی شان نظر آتی تھی تو ہندی کے استاد گاندھی ٹوپی کے ذریعہ قومی یکجہتی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی کے استاد شکاری ہیٹ کے حق میں دلائل دے رہے تھے تو ریاضی کی استانی جالی دار گول ٹوپی کی جیومیٹری سمجھا رہی تھیں۔ جب جلاد نما سائنس پڑھانے والے صدر مدرس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انہوں نے قلندرانہ بے نیازی سے اعلان کر دیا میں تو کہتا ہوں ٹوپی کے بجائے جوتا دیا جائے؟ اچانک اس عجیب و غریب تجویز کے وارد ہوتے ہی پہلے تو سناٹا چھا گیا اس لئے کہ کسی شریک مجلس میں اسے مسترد کرنے کی جرأت نہیں تھی۔

صدر مدرس نے خاموشی کا پردہ چاک کرتے ہوئے پوچھا کیا افادیت کے لحاظ سے جوتے کو ٹوپی پر فوقیت حاصل نہیں ہے؟ اس پر جغرافیہ کے استاد نے تائید میں کہا بالکل اس میں کیا شک ہے؟ ویسے بھی اس نئی نسل سر آسمان میں رہتا ہے اس

لئے ٹوپی کے بغیر بھی گذارہ ہو جاتا ہے لیکن پیر ہمیشہ زمین پر رہتے ہیں اس لئے جوتوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔انگریزی کے استاد نے فوراً اپنی حمایت پیش کر دی اور بولے جی ہاں اسی لئے ٹوپی کے بجائے جوتا اسکول کے یونیفارم میں شامل کیا گیا ہے۔ ریاضی کی استانی نے حساب کتاب لگا کر بتایا کہ سر سچ تو یہ ہے کہ کپڑوں کے پھٹنے سے پہلے جوتے گھس جاتے ہیں۔ اردو کی استانی بولیں یہ تو فطری بات ہے ایک کے اوپر ہوا اور دھوپ ہوتی ہے اور دوسرے کے سر پر خود اس کا مالک سوار رہتا ہے۔اس سے قبل کے ہندی اور انگریزی کے استاد کوئی اوٹ پٹانگ منطق پیش کرتے صدر مدرس نے بگڑ کر کہا اب بس۔ اتفاق رائے سے فیصلہ ہو گیا ہر جماعت کے سب سے ذہین طالب علم کو عیدی سے نوازہ جائیگا اور اس کا تعین کلاس ٹیچر اپنے صوابدید سے کرے گا یا کرے گی۔

نویں جماعت کی کلاس ٹیچر زیب النساء اردو پڑھاتی تھیں اس لئے انہوں نے ذہین ترین طالب علم کا پتہ لگانے کیلئے ایک نہایت نادر طریقہ ایجاد کیا۔ اپنی کلاس میں آکر انہوں نے بچوں سے سوال کیا ہاں تو بچوّ یہ بتاؤ تو تم لوگوں میں سے کس کس نے عید کا جوتا خرید لیا ہے۔

سلیم کا چچازاد بھائی شمیم جو اس کا ہم جماعت بھی تھا فوراً کھڑا ہو گیا اور بولا میڈم ابھی سے کہاں۔ ہم لوگ تو جوتا، ٹوپی اور بنیان وغیرہ چاند

رات کو ہی خریدتے ہیں۔ ابھی تو ٹری رات بھی نہیں آئی۔
استانی نے کہا کیوں چاندرات کو سستا ملتا ہے کیا؟
سلیم بولا ممکن ہے آخری رات سڑک کے دوکاندار اونے پونے اپنا مال بیچ دیتے ہوں کون جانے ؟
زیب النساء مسکرا کر بولی لیکن جب سارے گاہک اسی رات کو آتے ہوں تو وہ ایسا کیوں کریں؟
وہ تو ٹھیک ہے میڈم لیکن آج آپ یہ سوال کیوں کررہی ہوں ؟ شمیم بولا۔
یہ ایک معمہ ہے جو چاندرات کے دن کھلنے والا ہے؟
چاند رات نہیں نہیں میڈم سلیم بولا ہم لوگ روزے کے باوجود اتنا طویل صبر نہیں کرسکتے اب آپ نے سوال کرہی دیا ہے تو جواب بھی دیناپڑے گا۔
زیب النساء نے کہا اچھا چلو بتائے دیتی ہوں ۔ اس سال ہر جماعت کے ذہین ترین طالبعلم کو عیدی کے طور پر جوتی انعام میں ملے گی ۔
سار طلباء خوشی سے جھوم اٹھے حالانکہ عیدی تو ان میں سے صرف ایک کو ملنے والی تھی

۔

زیب النساء جانتی تھی کہ اس کلاس میں انعام کے حقدار سلیم یا شمیم کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے لیکن فیصلہ نہیں کرپارہی تھیں کہ جوتے کسے دیئے جائیں۔ اس کے بس میں ہوتا تو ایک ایک دونوں میں تقسیم کردیتیں لیکن یہ بھی مناسب نہیں

تھا۔ وہ بولیں ہاں تو بچو تمہارے درمیان ذہانت کا مقابلہ ہوگا اور اس میں جو بھی کامیاب ہوگا اسے اسکول کی جانب سے نائی کا جوتا انعام میں ملے گا۔

شمیم بولا ایسی بات ہے تب تو اس سال میرے والدین کو جوتے خریدنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔

استانی نے کہا جلد بازی نہ کرو۔ ہاں تو سلیم تم اپنی کتاب کی آخری نظم کا پہلا شعر پڑھو اور خود موبائیل کے پیغامات میں کھو ہو گئیں۔ سلیم نے خوش ہو کر بلند آواز میں پڑھا۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا

ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

سلیم جیسے ہی میں شعر خوانی کرکے بیٹھا تو شمیم پنجوں کے بل کھڑا ہوگیا اور سوال کردیا

میڈم یہ ڈاسن کون ہے؟

اس بے ہنگم سوال کو سن کر استانی چکرا گئیں ؟ فوراً اپنا موبائیل بند کیا اور پوچھا کون ؟

کون ڈائن ؟ میں کسی ڈائن کو نہیں جانتی۔

سلیم نے کہا میڈم یہ ڈائن کے بارے میں نہیں ڈاسن کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔

ڈاسن ؟ یہ ڈاسن کہاں سے آ گئی ؟

شمیم نے جواب دیا میڈم وہ پھٹا پوسٹر نکلا ہیرو کی مانند ہماری درسی کتاب

سے نکل کر باہر آگئی۔
کتاب میں سے ڈائن میں نہیں سمجھی؟
سلیم بولا یہ غلط بولتا ہے۔ وہ دراصل اشعر میں سے نکلی ہے جسے آپ نے پڑھنے کا حکم دیا تھا؟
اب استانی سمجھ میں آیا کہ ماجرا کیا ہے؟ وہ بولیں تمہیں اس سے کیا مطلب ؟ ہوگی کوئی ڈائن، تمہاری رشتے دار لگتی ہے کیا؟
شمیم ہنس کر بولا اگر میری رشتے دار ہوتی تو میں آپ سے پوچھنے کے بجائے ازخود بتاتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کا تعلق آپ کے خاندان سے ہے۔
استانی بولی ہائے اللہ میرے خاندان سے کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یہ شعر جس کا ہے اسی خاندان میں کوئی رہی ہوگی۔ میں اسے نہیں جانتی۔
سلیم نے کہا کوئی بات نہیں چونکہ اس کا جاننا بہت ضروری ہے اس لئے آپ ایسا کریں ہمیں ان سے پوچھ کر بتادیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مودی جی کے ہاتھوں چائے پینے والے گاہکوں یا ان کے ساتھ کالج میں پڑھنے والے طلباء کی طرح نایاب نہیں ہوں گے۔
استانی نے ڈانٹا بدتمیز وزیر اعظم کی توہین کرتا ہے اور مجھے جان سے مارنا چاہتا ہے؟
سلیم نے معصومیت سے پوچھا میڈم مریں آپ کے دشمن۔ میں بھلا یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ جییں ہزاروں سال۔

اس پر کلاس کے سارے طلباء ایک زبان ہو کر بولے ''سال کے دن ہوں پچاس ہزار''۔
یہ دیکھ کر استانی جھینپ کر بولیں تم سب بہت فلمی ہو گئے ہو۔ اگر میں اکبر الہ بادی کے پاس پوچھنے کیلئے چلی گئی آئی تو واپس نہ آسکوں گی؟
میڈم! شمیم نے سوال کیا آپ کو الہٰ باد سے ایسی انسیت کیوں ہے؟
استانی بولیں فی الحال اکبر الہ بادی وہاں نہیں رہتے۔
اچھا تو کہاں رہتے ہیں؟ یہ سلیم کا سوال تھا۔
استانی نے کہا عدم آباد میں۔
عدم آباد؟؟؟ یہ کہاں ہے اس کا نام تو ہم نے نہیں سنا؟ شمیم نے سوال کیا
استانی ہنس کر بولی بیٹے ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور تم نے سنا ہی کیا ہے؟ ایسا کرو میرے جانے کے بعد جب جغرافیہ کی کلاس لگے تو عالم گیر سر سے پوچھ لینا۔ وہ گوگل میپ میں دیکھ کر اس کا محل و وقوع بتا دیں گے۔
ارے چھوڑیئے میڈم ہم نے ان سے مودی جی کی چائے کی دوکان کا محل و وقوع ایک ہفتہ قبل پوچھا تھا ابھی تک نہیں بتا سکے تو وہ اکبر عدم آبادی میرا مطلب ہے الہٰ بادی کے عدم آباد کا ٹھور ٹھانہ کیا بتا سکیں گے۔ شمیم کے اس تبصرے کے ساتھ ہی کلاس کی گھنٹی بج گئی۔ استانی کے چہرے پر یک گونہ سکون چھاگیا اور وہ اگلے دن ڈاسن کے بارے میں بتانے کا وعدہ کرکے رفو چکر ہو گئیں

اگلے دن اردو کی کلاس میں زیب النساء نہیں آئیں بلکہ ان کی جگہ بڑے میاں یعنی اسکول کے سب سے بزرگ استاد مخفف جاہ لاٹھی کوٹیکتے تشریف لے آئے ۔ بچے ان سے جس قدر محبت کرتے تھے ان کی لاٹھی سے اسی قدر خوف کھاتے تھے اس لئے کہ وہ بھی مودی جی کی مانند کبھی بھی کہیں بھی چل پڑتی تھی اور مودی جی کی ڈگری کی مانند نت نئے انمٹ نشان چھوڑ جاتی تھی۔ کبھی نام غلط ہوجاتا تو کبھی ٹائپنگ یا فونٹ میں اختلاف ہوجاتا۔ کرسی پر بیٹھ کر بڑے میاں بولے تمہاری میڈم آج نہ جانے کہاں چلی گئیں اس لئے مجھے آناپڑا۔ اب میں کیاپڑھاوں ؟ اگر کوئی سوال ہو توپوچھو حاضر ہوں ۔

شمیم بولا سر یہ بتایئے کہ عدم آباد کہاں ہے ؟

بڑے میاں بگڑ کر بولے بدتمیز میری عمر کامذاق اڑاتا ہے تجھے شرم نہیں آتی ؟

اس سے پہلے کہ ان چھڑی حرکت میں آتی سلیم بیچ میں بول پڑا سر بات دراصل یہ ہے کہ اسے پتہ ہے میڈم کیوں نہیں آئیں اسی لئے پوچھ رہا ہے ؟ بڑے میاں چکرا گئے ۔ یہ عدم آباد کامیڈم کے نہیں آنے سے کیا تعلق ؟ وہ بولے اسے کیسے پتہ کہ وہ کیوں نہیں آئیں ؟

شمیم سنبھل چکا تھا وہ بولا ۔جی ہاں بڑے میاں مجھے پتہ ہے ۔ وہ دراصل عدم

آباد گئی ہوئی ہیں اسی لئے آج نہیں آسکیں۔

عدم آباد ! پھر عدم آباد ؟ وہ اتنی جلدی عدم آباد کیسے چلی گئیں ؟

شمیم بولا کیوں عدم آباد کیا ان کا میکہ ہے اور اگر ہے بھی تو آپ اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں؟

میں ! میں اس کا خسر ہوں۔ میں نہیں تو کون اعتراض کرے گا؟ اگر وہ واقعی عدم آباد چلی گئی تو مجھے اپنے لئے ایک نئی بہو تلاش کرنی ہوگی اور آج کے زمانے زیب النساء جیسی اطاعت گذار فرمانبردار بہو کہاں ملے گی؟

شمیم نے سوال کیا نئی بہو میں نہیں سمجھا ؟

اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ نئی بہو یعنی نئی بہو؟

لیکن ہم نے تو سنا ہے۰۰۰۰۰۰۰؟ سلیم کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

بڑے میاں بولے جی ہاں تم نے درست سنا ہے۔ میری کوئی حقیقی اولاد نہیں ہے لیکن مرغوب میاں کو میں نے پڑھایا تھا۔ وہ چونکہ یتیم تھا اس لئے مجھے اپنا باپ مانتا تھا۔ اس کے بعد میں نے ہی اس کی شادی کروائی اور اس کی بیوی کو اپنی اسکول میں ٹیچر بنوا دیا۔ میری بہو زیب النساء بھی سونیا گاندھی کی مانند نہایت سعادتمند نکلی اور روز میرے لئے دو وقت کا کھانا بنا کر لانے لگی۔ اب اگر وہ عدم آباد چلی گئی تو میں اس عمر میں بے موت مرجاوں گا۔

شمیم بولا جناب دل چھوٹا نہیں کیجئے۔ دوچار دن ہم لوگ آپ کیلئے کھانا

بنوا کر لے آئیں گے ۔ تب تک وہ آجائیں گی اور آپ کا کام بن جائیگا۔
نہیں بیٹا نہیں۔ عدم آباد جانے والے لوٹ کر تھوڑی نا آتے ہیں ؟
سلیم روہانسہ ہو کر بولا کیوں عدم آباد بہت دور ہے کیا جو وہاں جا کر آتے آتے عمر بیت جاتی ہے ؟
نہیں بیٹا ویسے تو عدم آباد بے حد قریب ہے۔ وہاں آنے جانے میں وقت نہیں لگتا بلکہ انسان پلک جھپکتے پہنچ جاتا ہے مگر ایک بار جو گیا تو واپس نہیں آیا۔ میں بولا اوہو تب تو وہ نہایت عمدہ مقام ہوگا۔ اسی لئے اکبر الہٰ بادی بھی اپنا وطن عزیز چھوڑ کر وہاں چلے گئے ۔
بڑے میاں نے کہا بیٹے وہ کیسا مقام ہے یہ تو کوئی نہیں جانتا اسلئے کہ وہاں کا حال احوال بتانے کیلئے کوئی فرد لوٹا ہی نہیں ۔ جہاں تک اکبر الہٰ بادی کا سوال ہے وہ تو مجبوراً اپنی طبعی عمر پوری کرکے وہاں چلے گئے لیکن تمہاری زیب النساء کو کیا سوجھی کہ بے وقت نکل گئیں۔
شمیم بولا بڑے میاں اس میں کیا پریشانی ہے اگر ایک نہیں تو دوسری بہو، سونیا نہیں تو مینکا سہی۔ مسئلہ کیا ہے ۔
بڑے میاں اپنی چھڑی کو ہوا میں لہرا کر بولے چپ بے وقوف کیا ضروری ہے کہ مرغوب میاں پھر سے اپنی غلطی کو دوہرانے کیلئے تیار ہو جائیں ؟
سلیم بولا کیوں نہیں ہوں گے ۔ ان کو بھی تو اپنی خدمت کیلئے زوجہ کی ضرورت ہے ۔

جی ہاں سو تو ہے لیکن پھر کیا ضروری ہے اس کی دوسری بیوی کو پڑھانے میں دلچسپی ہو؟
کیوں نہ ہوگی آج کل ہر کسی کو پیسے کی ضرورت ہے اور یہ کام بھی کون سا مشکل ہے؟
کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے پڑھانا ہی نہ آتا ہو؟
اگر ان کو پڑھانا نہ بھی آئے تو کیا فرق پڑتا امتحان انہیں نہیں ہمیں دینا ہے۔ ہم فیل ہو جائیں گے ان کا کیا بگڑے گا؟
جی ہاں یہ بھی درست ہے مگر کیا ضروری ہے کہ میں اسے پھر سے اسکول میں ملازمت پر رکھوانے میں کامیاب ہو جاؤں؟
اس اسکول کے کرتا دھرتا تو آپ ہیں اس لئے کس کی مجال ہے کہ آپ کو روکے؟ اگر کسی نے اعتراض کیا تو آپ اس کو نکال دینا۔
جی ہاں یہ اچھی ترکیب ہے لیکن اگر میں کامیاب بھی ہو گیا تو کیا ضروری ہے کہ وہ احسانمند نکلے؟
سلیم بولا احسانمند نہ بھی ہو تو وہ جانے اور مرغوب میاں جانیں آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟

کیوں نہیں پڑتا۔ تم لوگ تو دو چار دن تک کھانا لاوگے اور پھر بند کر دوگے اس کے بعد میرا کیا ہوگا۔ میرا معدہ گھر کا اچھا کھانا کھاتے کھاتے اس قدر کمزور ہو چکا ہے ہوٹل کے کھانے سے فوراً بگڑ جاتا ہے۔ تم لوگوں نے آخر

اپنی میڈم کو اکبر الہ بادی کے پاس بھیج کیوں دیا؟

سلیم اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا یہ دراصل شمیم کا کیا دھرا ہے۔ اس نے میڈم سے اکبر الہٰ بادی کے شعر میں ڈاسن کا مطلب پوچھ لیا تو وہ اس مطلب پوچھنے کیلئے عدم آباد روانہ ہو گئیں۔

اوہو اتنی سی بات ؟ بڑے میاں بولے بے وقوف لڑکی مجھ سے پوچھ لیتی ۔

یہ سنتے ہی شمیم کی آنکھوں میں چمک آگئی وہ بولا اچھا آپ کو پتہ ہے تو آپ ہی بتا دیجئے۔

اس لئے کہ اب میڈم تو واپس آنے سے رہیں؟

بڑے میاں نے دیکھا یہ بلا ان کی جانب آرہی ہے تو بولے بے مطلب کے سوال نہ کیا کرو، یہ ڈاسن واسن کچھ نہیں ہے بس بے معنی الفاظ ہیں ۔

سلیم نے استفسار کیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اکبر الہٰ بادی جیسے بڑے شاعر بے معنی الفاظ کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟

بڑے میاں بولے اچھا انہوں نے استعمال کیا ہے ؟ اگر ایسا ہے تو وہ شعر سناو کہ جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے؟ شمیم نے فوراً شعر سنا دیا۔

ڈاسن ؟ بڑے میاں سوچ میں پڑ گئے ۔

شمیم یہ دیکھ کر بولا اگر آپ کو بھی نہیں معلوم تو کوئی بات نہیں آپ اکبر الہٰ بادی سے ملنے کیلئے ملکِ عدم کا قصد نہ کریں ورنہ ہم لوگ ایک ساتھ دو صدمات نہیں برداشت کر سکیں گے۔

بڑے میاں بگڑ کر بولے چپ بے وقوف کچھ بھی بکتا ہے ۔ اتنی بھی عقل نہیں دھوبی

کی دھوبن کی طرح ہے ڈاسن ۔ دیکھ ردیف قافیہ بھی درست ہے سلیم بولا جناب آپ نے سیاست کی ہے اگر دھوبی کی بیوی دھوبن ہوتی ہے تو موچی کی جورو موچن ہوئی نہ کہ ڈاسن۔

یہ سن کر بڑے میاں مسکرائے اور بولے پروین شاکر نے درست ہی کہا ہے" بچے ہمارے دور کے ہوشیار ہوگئے"۔

یہ پروین شاکر کون ہے؟آپ کی دوسری بہو تو نہیں ؟

بڑے میاں بولے ارے نہیں اس کو تو میں اپنی بیٹی مانتا ہوں ۔

اچھا تو وہ کہاں رہتی ہیں؟ سلیم نے سوال کیا۔

بڑے میاں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے ۔ وہ ! وہ بھی ملک عدم جا چکی ہے ۔

شمیم بولا یہ کیا چکر ہے ؟ پہلے تو آپ کے دوست اکبر الہ بادی ۔ اور پھر آپ کی منہ بولی بہو اور اب منہ بولی بیٹی سب کے سب عدم آباد کوچ کر گئے۔

سلیم سرد آہ بھر کر بولا لگتا ہے آپ کو بھی جلد ہی ۰۰۰۰۰۰۰ اور رک گیا۔

بڑے میاں بولے بیٹے کیا میں اور کیا تم ؟ ہم سب کو اپنے وقتِ مقرر پر جانا ہے اور یہ دیکھو گھنٹی بج رہی ہے۔ میرے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔خدا حافظ۔ شمیم بولا لگتا ہے اب بڑے میاں اپنی بہو اور بیٹی کے پاس جا کر ہی دم لیں گے۔

بڑے میاں نے اپنے عقب میں وہ جملہ سنا لیکن مڑ کر نہیں دیکھا اس لئے کہ حقیقت وہی تھی جو شمیم کہہ رہا تھا۔

سلیم نے گھر پر آکر اپنے ابو کو وہ شعر سنایا اور ڈاسن کا مطلب پوچھا
ابو بولے اس میں کون سی بڑی مشکل ہے ڈاسن کا مطلب ہے ناگن ہے۔
شمیم بولا چاچو آپ ہمیں کیوں احمق بنا رہے ہیں ؟ ڈاسن کہاں اور ناگن کہاں ان دونوں میں کیا مشترک ہے بھلا؟
یکسانیت کیوں نہیں؟ دراصل سانپ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ عدم تشدد کی علمبردار بے ضرر ناگن کہلاتے ہیں اور ڈسنے والے دہشت گرد ڈاسن۔
سلیم کے ابو کی اس منطق کو سن کر پاس بیٹھی نانی مسکرانے لگیں۔ سلیم سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے اس لئے ان کے پاس جاکر بولا کیوں نانی کہیں آپ کے داماد مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہیں ؟
نانی بولیں تم تو اس کی برکت سے پہلے ہی اچھے خاصے بے وقوف ہو اس لئے تمہیں احمق بنانے کی کیا ضرورت ؟
شمیم کی سمجھ میں یہ منطق نہیں آئی وہ مسکرا کر بولا اب اس کا مطلب سمجھنے کیلئے چاچی کے پاس جانا پڑے گا۔
سلیم کے ابو بولے بیٹے ہر ساس اپنے لئے ایک نہایت بے وقوف قسم کا داماد تلاش کرتی ہے تاکہ بیٹی کی اس کی خوب خدمت گذاری ہو اس لئے تم بھی جب دلہن دیکھنے کیلئے جانا تو دوچار حماقت کردینا۔ یہ اداکاری تمہارے کام آئے گی۔
نانی ہنس کر بولی جی ہاں ایک بڑی حماقت کیلئے چھوٹی موٹی کئی حماقتیں کرنی

ہی پڑتی ہیں۔

سلیم نے کہا نانی آپ نے مجھے بحث میں الجھا کر شعر والی بات ٹال دی۔ ہم لوگ کل ڈاسن کا مطلب جاننے کیلئے پریشان ہیں کوئی نہیں بتاتا۔

نانی مسکرا کر بولیں تو بھی بالکل اپنی امی کی مانند ضدی ہے خیر ڈاسن ایک جوتے بنانے والی مشہور کمپنی کا نام ہے جیسے کہ باٹا ہے۔

سلیم اور شمیم یک زبان ہو کر بولے باٹا کو تو سب جانتے ہیں لیکن ڈاسن کا نام کبھی نہیں سنا۔

نانی ہنس کر بولیں بیٹے ڈاسن بھی تمہارے نانا کی طرح ملک عدم کو سدھار گئی۔

پھر عدم آباد؟ تو کیا انسانوں کی طرح کمپنی بھی ......؟

جی ہاں بیٹے اس فانی انسان کی ہر تخلیق فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

شمیم نے سوال کیا لیکن اگر وہ مشہور کمپنی تھی تو بڑے میاں اس کو کیوں نہیں جانتے؟

نانی بولیں یہ بھی کوئی سوال ہے اچھا یہ بتاو کہ جھارکھنڈ کے وزیر اعلیٰ کا نام کیا ہے؟

سلیم سمجھ گیا اب پھر نات کو گھمایا جارہا ہے اس لئے بول پڑا لیکن اس سے ہمارے سوال کا کیا تعلق ہے؟

وہ میں بعد میں بتاوں گی پہلے یہ تسلیم کرلو کہ نہیں جانتے؟

چلئے مان لیا۔ اچھا مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کا نام کیا ہے؟

سلیم خوش ہو کر بولا دیویندر فرد نویس ۔

اچھا وزیر اعلیٰ تو دونوں ہیں لیکن ایک کا نام تم جانتے ہو دوسرے کا نہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟

نانی آپ ہمیں الجھا رہی ہیں ۔

جی نہیں ، تم جہاں رہتے ہو وہاں فرد نویس کا جوتا چلتا ہے اس لئے اس کا نام جانتے ہو داس کا جوتا نہیں چلتا اس لئے اس سے ناواقف ہو۔

شمیم نے سوال کیا تو کیا آپ کا مطلب ہے انسان جس کے جوتے کھاتا ہے اسی سے واقف ہوتا ہے ؟

سیاست کی حد تک یہ درست ہے چونکہ میرا بچپن الہ باد میں گزرا جہاں ڈاسن کا جوتا چلتا تھا اس لئے میں جانتی ہوں مگر بڑے میاں جو ممبئی میں رہتے تھے کیسے جان سکتے ہیں ؟

ٹھیک ہے سمجھ گیا لیکن اکبر الہ بادی کو کیا سوجھی کہ ڈاسن استعمال کردیا وہ باٹا بھی تو لکھ سکتے تھے۔ شعر کا وزن بھی برقرار رہتا اور عام فہم بھی ہوتا۔

شمیم بولا اور ہماری میڈم بھی عدم آباد نہیں جاتیں ۔

نانی بولی باٹا اس وقت موجود ہی نہیں تھی تو وہ اس کا نام کیسے لکھتے۔

شمیم بولا یہ بھی درست اب اگر میں شاعری کروں گا تو باٹا بھی نہیں بلکہ نائیکی لکھوں گا۔ مثلاً

ڈاسن ، باٹا خواب پرانا لگتا ہے
نائیکی جوتا نیا زمانہ لگتا ہے
یہ نائی کی کیا ہے؟ نانی نے پوچھا
سلیم بولا آپ نہیں جانتیں؟ یہ نئے دور کا جوتا ہے امریکہ سے بن کر آتا ہے اور بہت جلد باٹا، ٹاٹا اور بٹاٹا سب کو کھا جائیگا میرا مطلب ہے ختم کردے گا۔
نانی ہنس کر بولیں بیٹے باٹا اور ٹاٹا کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن بٹاٹا انسانوں کی نہیں قدرت کی تخلیق ہے۔اس کا کچھ نہیں بگڑے گا مگر نائی کی میں ایسی کیا بات ہے کہ وہ سارے بازار کو کھا جائیگا۔
سلیم بولا نانی ایک نہیں کئی باتیں ہیں۔ اول تو وہ امریکہ سے آتا جس کا آج کل جوتا تو کیا سکہ بھی چلتا ہے۔ دوسرے اسے ایک نائی نے بنایا ہے۔
نانی نے سوال کیا بیٹے نائی تو حجامت بناتے ہیں سر کی حجامت اور پیروں کے جوتے میں بھلا کیا مماثلت ہے؟
آپ نے خود ہی اپنے سوال جواب دے دیا۔ یہ جوتا نہ صرف پیروں کی حفاظت کرتا ہے بلکہ سروں کی حجامت بھی کرتا ہے۔
نانی نے سوال کیا لیکن بیٹے اس شعر میں تمھاری غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔
شمیم بولا نانی اس شعر کا مطلب جو بھی بتائے گا اسے اسکول کی طرف سے نائی

کی کا جوتا عیدی ملے گی۔

نانی بولی لیکن اب تو تم دونوں کو اس کا مطلب معلوم ہوگیا اس لئے انعام کیسے ملے گا ؟

سلیم نے ہنس کر کہا اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ مشترک عیدی دونوں میں تقسیم ہو جائیگی۔

نانی ہنس کر بولیں تو کیا داہنے پیر میں اسے سلیم اور بائیں میں شمیم پہنے گا؟

شمیم نے کہا جی نہیں نانی آپ بھی کتنی سیدھی ہیں۔ ایک دن اسے میں اور دوسرے دن سلیم پہنے گا۔

: نانی ہنس کر بولیں

مل کر پہنا، لڑ کر نہ تقسیم کیا

آج کا بچہ کتنا سیانا لگتا ہے

: سلیم نے جواب دیا

نانی بتا کیا تیری بات میں جادو ہے

بچہ بچہ تیرا دِوانا لگتا ہے

بریگزٹ: دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

برطانیہ کے یوروپین یونین سے علٰحیدہ ہونے کے فیصلے نے مغرب میں ایک سیاسی زلزلہ برپا کردیا۔ اس استصواب رائے سے یوروپ میں خوشحالی، رواداری اور مساوات کے سرخیل برطانیہ کا چہرا بے نقاب ہوگیاہے۔ عظیم برطانیہ مختلف زاویوں سے ٹوٹا پھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ نوجوان، تعلیم یافتہ اور معاشی طور سے خوشحال طبقہ یونین میں شمولیت کا حامی تھا جبکہ کم پڑھے لکھے، بدحال عوام اور عمررسیدہ وظیفہ یافتہ لوگوں نے مخالفت کی، نتیجے نے واضح کردیا کہ اکثریت میں کون ہے؟ اس تفریق کی وجہ صاف ہے۔ یوروپی یونین میں شرکت سے اول الذکر طبقے کا فائدہ ہوا اور مؤخرالذکر خسارے میں رہا۔ خودغرضی کے دور میں ہر ایک نے اپنے مفادات کے پیش نظر فیصلہ کیا نہ تو نوجوانوں نے بزرگوں کی رائے کا احترام کیا اور نہ بزرگوں نے اپنی آئندہ نسل کے روشن مستقبل کیلئے قربانی دینے کی ضرورت محسوس کی۔

اس استصواب نے یہ بھی ظاہر کردیا کہ عوام کا اعتماد بڑی سیاسی جماعتوں کے اوپر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ شدید مایوسی کا شکار ہیں۔ ان کو اپنی ملازمت کا خوف ستا رہا ہے اسی لئے دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کی حمایت کے باوجود علٰحیدگی کو ترجیح دی گئی۔ اتحاد کی حمایت وزیراعظم سمیت سارے بڑے رہنما

کر رہے تھے جبکہ اس کی مخالفت کرنے والوں میں برطانیہ کے ڈونالڈ ٹرمپ کہلانے والے لندن شہر کے سابق میئر بورس جانسن اور انتہا پسند جماعت یو کے ایل پی پیش پیش تھی ۔ عوام کی اکثریت نے نام نہاد سلجھے ہوئے روایتی رہنماؤں کے دلائل کو مسترد کرکے عدم رواداری کو ترجیح دی۔

اس استصواب نے عظیم برطانیہ کی جغرافیائی تانے بانے کے بھی بخیے ادھیڑ دیئے۔ برطانیہ دراصل لندن، ویلش ، اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ کا دفاق ہے ۔ ان چار میں سے دو اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ کی اکثریت نے اتحاد کے حق میں رائے دی ۔ اسکاٹ لینڈ کے عوام اور رہنما یوروپی یونین کے ساتھ اتحاد کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ وہ اس کیلئے برطانیہ سے ناطہ توڑنے کیلئے تیار ہیں۔اس لئے اسکاٹ لینڈ کی علٰحیدگی کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ گزشتہ سال آئر لینڈ نے ایک نہایت مہین فرق کے ساتھ برطانیہ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن یوروپی یونین کے ساتھ تعلق کی بابت یہ فرق بہت واضح ہوگیا۔ یہ صورتحال خارج ازمکان نہیں ہے کہ اس فیصلے کے سبب برطانیہ نہ صرف یوروپی یونین کی رکنیت سے محروم ہوجائے گا اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

یوروپی ممالک صدیوں تک آپس میں برسرِپیکار رہے ہیں ۔ جس قدر خون خرابہ ان لوگوں نے کیا ہے اس کی مثال تاریخ کم ہی ملتی ہے۔ باہمی جنگوں کے خاتمے

کیلئے وقتاً فوقتاً اتحاد کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں لیکن وہ دیر پا ثابت نہیں ہوتیں ۱۹۱۰ء میں اس طرح کی ایک کوشش ہوئی تھی اور اس بات کی امید کی جا رہی تھی کہ اب جنگ نہیں ہوگی لیکن پھر یکے بعد دیگرے دو عظیم جنگوں میں لاکھوں جانیں تلف ہوئیں ۔اس کے بعد تھکے ہارے یوروپ نے ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کے ذریعہ امن قائم کرنے کی کوشش کی اور پھر آگے بڑھ کر یوروپی یونین بنا کر معاشی خوشحالی کا خواب دیکھا لیکن وہ شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

جنگ عظیم کے بعد یوروپ یہ ضرور ہوا کہ موروثی بادشاہوں کی جگہ جمہوری اشراف نے لے لی مگر عوام بدستور جبر استحصال کی چکی میں پستے رہے ۔عالمی کھلی منڈی نے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ میں اضافہ کیا اور نتیجہ یہ ہے کہ عوام کے غم وغصہ کا اظہار نہ صرف اس طرح کے استصواب بلکہ قومی انتخابات میں بھی ہو رہا ہے ۔جذباتی استحصال کرنے والے روشن خیال رہنماوں کی چکنی چپڑی باتوں سے عوام بیزار ہو چکے ہیں۔اس لئے سیاست اور سرمایہ داری کی سانٹھ گانٹھ نے ان کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔

مغرب کے علمبرداروں کا ہر بین الاقوامی اتحاد عدم مساوات کا شکار رہا۔ اقوام متحدہ میں مٹھی بھر ممالک ویٹو کی مدد سے اپنی من مانی کرتے ہیں ۔ یوروپی یونین میں جرمنی اور فرانس جیسے خوشحال ممالک اپنی مرضی کے مطابق ایسے معاشی اصلاحات دیگر ارکان ممالک پر تھوپتے رہے جس سے ان

کا فائدہ اور دوسروں کا نقصان ہوتا ہے۔ اس مسلط شدہ معاشی غلامی کی زد میں کمزور طبقات آئے اور انھوں نعرہ لگایا ''ہمیں اپنا ملک واپس چاہئے'' نیز کامیابی کے بعد اسے ''برطانیہ کی آزادی'' سے موسوم کیا۔

مغربی حکمرانوں کے ذریعہ بلند کئے جانے والے فلاح و بہبود اور مساوات و خوشحالی کے خوشنما نعرے اس لئے کھوکھلے ٹھہرتے ہیں کہ ان میں اخلاص کے بجائے مفاد پرستی ہوتی ہے۔ سیکولرزم کے ان حامیوں کے اندر خدا خوفی کا فقدان ہوتا ہے اس لئے یہ موقع پاتے ہی استحصال میں جٹ جاتے ہیں۔ ان کے پاس الہامی معیار حق نہیں ہوتا اس لئے ابن الوقتی کے تحت نت نئے ضابطے تشکیل وضع کرکے اپنے گھناونے مقاصد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ عوام کی حق تلفی روکنے والا آخرت کا عقیدہ معدوم ہونے کے سبب یہ بگٹ ٹٹ تباہی و بربادی کی راہ پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دوسرے ممالک کا استحصال کرتے کرتے خود اپنی عوام کو بھی نہیں بخشتے۔ بریکزٹ اس رویہ کے خلاف ظاہر ہونے والا ردعمل ہے۔

ماہ اپریل میں آسٹریا کے اندر صدارتی انتخابات کا انعقاد ہوا۔ اس کے پہلے دور میں انتہا پسند دائیں بازو کی جماعت فریڈم پارٹی کے امیدوار ہوفر نے زبردست کامیابی درج کراتے ہوئے سب سے زیادہ ۳۵ فیصد ووٹ حاصل کئے۔ دوسرے نمبر پر گرین نام کی نئی جماعت کے امیدوار بیلن کو ۲۱ فیصد ووٹ ملے۔ ایک

آزاد امیدوار گریس ۱۹ فیصد ووٹ حاصل کرکے تیسرے نمبر پر آیا اور گزشتہ ساٹھ سالوں سے ادل بدل کر اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے والے سوشیل ڈیموکریٹک اور پیوپلس پارٹی کے امیدواروں کو ۱۱ فیصد پر اکتفاء کرنا پڑا۔ آسٹریا کے دستور میں صدارتی امیدوار کیلئے ۵۰ فیصد سے زائد ووٹ لازمی ہوتے ہیں اس لئے دوسرے دور میں صرف پہلے دو امیدوار میدان میں تھے۔ مئی کے اندر ہونے والے دوسرے دور میں بھی پہلے ہوفر کو ۵۱٫۹ فیصد ووٹ ملے لیکن جب پوسٹل ووٹ شمار کئے گئے تو بیلن کے ۵۰٫۳ ہوگئے اور وہ ۰٫۶ فیصد کے فرق سے کامیاب ہوگئے۔ اس طرح یوروپ پہلے انتہا پسند دائیں بازو کے سربراہ سے بال بال بچ گیا۔

آسٹریا میں رائے دہندگان کی تقسیم بالکل برطانیہ کی مانند تھی۔ کم پڑھے لکھے، مفلوک الحال اور دیہات کے لوگ ہوفر کے ساتھ تھے اور شہروں میں رہنے والا آسودہ حال تعلیم یافتہ طبقہ بیلن کے ساتھ تھا۔ عوام کی معاشی محرومی کو فی الحال قوم پرست دائیں بازو کی جماعتیں اپنے حق میں استعمال کررہی ہیں اور انہیں کامیابی ملنے لگی ہے۔ ہوفر بھی یوروپی یونین سے متنفر ہے۔ وہ مہاجرین کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور اسلام کے خلاف زہر اگلتا ہے۔ وہ عوام کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی بیروزگاری کیلئے مسلم مہاجرین ذمہ دار ہیں۔ حالانکہ عالمی منڈی جب سے کھول دی گئی صنعت و حرفت کی پیداوار اچین اور کوریا جیسے ممالک کی جانب منتقل ہوگئی اس سے یوروپ اور امریکہ میں

بیروزگاری آئی ۔اس حقیقت کو تسلیم کرنا چونکہ سرمایہ دار سرپرستوں کے خلاف ہے اس لئے قومی تشخص کا شور مچا کر ایک فرضی دشمن کے خلاف عوام کو بھڑکایا اور گمراہ کیا جاتا ہے۔

فریڈم پارٹی جیسی جماعتیں یوروپ کے مختلف ممالک مثلاً جرمنی ، فرانس ، نیدرلینڈ وغیرہ میں بھی پیر پھیلانے لگی ہیں اور سبھی کے طریقۂ کار میں بلا کی یکسانیت ہے اس لئے ان کا مقصد و نظریہ مشترک ہے۔ ویسے امریکی انتخاب میں ڈونالڈ ٹرمپ کی روز افزوں مقبولت بھی اسی سبب سے ہے۔ وہ بھی پہلے امریکہ پھر عالمی مفادات کا نعرہ لگاتا ہے۔ مسلمانوں بلکہ میکسیکو کے مہاجرین کے خلاف بھی آئے دن عوام کے جذبات سے کھیلتا ہے لیکن چینی مصنوعات کے خلاف زبان نہیں کھولتا اس لئے کہ وہ خود سرمایہ دار ہے اور جانتا ہے کہ پانی کہاں مرتا ہے۔ اسی ہفتہ فلپائن کے اندر اقتدار پر فائز ہونے والے ڈیوٹرٹے کا بھی یہی حال ہے۔ ڈیوٹرٹے اس سے پہلے دوائے نامی شہر کا ۲۰ سالوں تک میئر تھا اور اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا اپنا نجی گروہ تھا جو اسمگلرس کو عدالتی فیصلے بغیر موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔ دیوٹرٹے نے اعلان کیا ہے کہ وہ نشیلی اشیاء کے اسمگلرس کی معلومات فراہم کریں یا اپنی بندوق سے خود انہیں ہلاک کردیں۔ جو اسمگلر کو مار کر آئیگا اس کو میری جانب سے تمغہ دیا جائیگا۔ اگر اس طرح کا اعلان کوئی مسلم سربراہ کرتا

تو اسلام کو بدنام کرنے کیلئے نہ جانے کیسا طوفان برپا کر دیا جاتا لیکن خوش قسمتی ڈیوٹرٹے جمہوریت نواز عیسائی ہے۔

مغربی جمہوریت کے تئیں عوامی بے چینی کا اظہار ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ بریکزیٹ کے بعد نیدر لینڈ کا نیکزٹ آرہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو بہت جلد یوروپی یونین میں ۲۸ کے بجائے ۸ ممالک باقی بچیں گے لیکن جب فرانس اور جرمنی پر پھر سے قوم پرستی کا آسیب سوار ہوگا تو سوویت یونین کی طرح یوروپی یونین کا جغرافیہ بھی ہوا میں تحلیل ہو جائیگا اور وہ تاریخ کا حصہ بن جائیگا۔ یوروپ کے مختلف ممالک میں قوم پرست جماعتوں کے اقتدار سنبھالنے کے بعد لازماً پھر ایک بار جنگ و جدال کا بازار گرم ہو جائیگا۔ خوشحالی کی امید میں قوم پرستوں کی حمایت کرنے والے بھولے بھالے عوام کو قتل و غارتگری کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ یوروپ کی سیاہ تاریخ کا اعادہ ہے۔

یہ ایک عریاں حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے جمہوری ممالک میں تمام تر خوش کن نعروں اور دعووں کے باوجود دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹتی جارہی ہے اور امیر و غریب طبقات کے درمیان تفاوت بڑھتا جارہا ہے۔ اس رجحان کا ردعمل مختلف انداز میں سامنے آرہا ہے لیکن مغرب اسے مروجہ سیاسی نظام کی ناکامی

کے طور پر تسلیم کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ عوام کو قوم پرستی کا افیون پلا کر ان کی توجہ نفسِ مسئلہ سے ہٹائی جارہی ہے۔ اسلام کے خلاف اس قدر نفرت پیدا کردی گئی ہے کہ عوام اسلام کے نظام رحمت کی جانب توجہ ہی نہیں دے پاتے۔ اس بابت مغربی دانشوروں کی نفرت انگیزی کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ کے معاندانہ کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس ماحول نے اسلام پسندوں کے حوصلے پست کردیئے ان کے اندر سرائیت کرنے والی خوداعتمادی کی کمی دین اسلام کو ایک متبادل نظام حیات کے طور پر پیش کرنے میں مانع ہورہی ہے۔

مغرب کے دانشور فی الحال دوحصوں میں منقسم ہیں۔ ایک کا رویہ ان کی جہالت کا شاخسانہ ہے اور دوسرے تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ اس کو مریض اور طبیب کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جب کوئی ڈاکٹر بیماری تشخیص کرنے میں ناکام ہوجاتا ہے تو وہ درد مٹانے والی ادویات کا سہارہ لیتا ہے۔ ایسا کرنے سے مرض کا علاج تو نہیں ہوتا لیکن مریض کو اپنی تکلیف کا احساس نہیں ہوپاتا۔ وہ اس خوش فہمی کا شکار ہوجاتا ہے کہ صحتیاب ہورہا ہے جبکہ حقیقت میں اندر ہی اندر بیماری اس کو کھوکھلا کررہی ہوتی ہے۔ جمہوری انتخاب سے فی الحال یہی کام لیا جارہا ہے۔ اس کے ذریعہ عوام کے غم غصے کا اظہار ہوجاتا ہے۔ عارضی طور پر وہ نئے خوابوں اور امیدوں کے سہارے اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں لیکن اچھے دنوں کے بلند بانگ دعووں کے باوجود حالات نہیں بدلتے

اور وہ بار بار مایوسی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جاہل ڈاکٹروں کے ہاتھوں بھولے بھالے مریضوں کی حالت زار کی داستانِ الم ہے۔

تجاہل عارفانہ کا شکار طبیب بیماری اور علاج دونوں سے واقف ہے لیکن اسلام کا سیدھا سادہ نسخۂ کیمیاء اس کے ذاتی مفادات سے ٹکراتا ہے۔ میڈیکل کی دنیا میں پائی جانے والی بدعنوانی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہر ٹسٹ پر کمیشن ہے۔ اس لئے غیر ضروری جانچ پڑتال بلکہ مہنگے مہنگے سی ٹی سکان وغیرہ بھی بلا ضرورت کرائے جاتے ہیں۔ اس میں مریض کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر جانچ پڑتال کرنے اور کرانے والے (طبیب) مریض کی جیب خالی کرلیتے ہیں۔ اسپتال اور ادویات بنانے والی بڑی بڑی کمپنیاں بھی یہی کرتی ہیں۔ طبّی انشورنس کا پھلتا پھولتا کاروبار اسی گورکھ دھندے کا حصہ ہے۔ اس سے مریض کے علاوہ ہر کسی کے وارے نیارے ہوتے ہیں۔ سیاسی سطح پر جب استحصال حدوں سے گذر جاتا تو عوام بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں تو قوم پرستی کی آگ بھڑکائی جاتی ہے اپنے ہی ملک کے اندر یا باہر کے خیالی دشمن سے خوفزدہ کرکے اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔

برطانیہ کے استصواب اور آسٹریا کے انتخابی نتائج میں یک گونہ مماثلت ہے۔ فلپائن اور ہندوستان میں آنے والی اقتدار کی تبدیلی بھی ایک دوسرے مشابہ

ہے اور امریکی انتخابی مہم بھی انہیں خطوط پر چل رہی ہے۔ ساری بڑی سیاسی جماعتوں کی حمایت کے باوجود برطانیہ کی عوام کا الگ ہونے کا فیصلہ کرنا یا آسٹریا کے صدارتی انتخاب میں برسوں تک حکومت کرنے والی جماعتوں کا چوتھے اور پانچویں مقام پہنچ جانا۔ امریکہ میں ڈونالڈ ٹرمپ جیسے غیر روایتی سیاسی شخصیت کا صدارتی امیدوار بن جانا اور فلپائن میں غیر دستوری قتل و غارتگری (انکاونٹر) کے حامی ڈیٹرائٹ کا صدر منتخب ہوجانا یا ہندوستان میں گجرات قتل عام کے سوتردھار نریندر مودی کا وزیراعظم بن جانا مشترک مرض کی مختلف علامتیں ہیں۔ ان میں سے کسی ملک میں اسلامی سیاسی بیداری کا شائبہ تک نہیں ہے اور یہ سب کی سب مغربی جمہوریت پر برسوں سے کاربند ہیں۔ ان تمام مقامات پر دائیں بازو کے انتہا پسندوں کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ان سارے ممالک میں عدم رواداری کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کی مخالفت صاف نظر آتی ہے۔

اس معاملے کو ماں اور بچہ کی مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ شیر خوار بچہ جب بھوکا ہوتا ہے تو روتا ہے۔ ماں جب اس کو اپنے سینے سے لگا کر اس کی بھوک مٹاتی ہے تو وہ سکون سے سوجاتا ہے لیکن اگر ماں نے مجبوری میں نہیں بلکہ ہوس دنیا کی خاطر اپنے اوپر غیر ضروری مصروفیات اوڑھ رکھی ہوں تو بچوں کو کھلونوں سے بہلایا جاتا ہے۔ غیر ضروری مشغولیات الجھی ماں اولاد کی

نگہداشت سے قاصر رہتی ہے۔ ایسے میں اولاد عدم توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں یا آیاوں کے حوالے کردیئے جاتے ہیں۔ آیا ایک حد تک خیال رکھتی ہے لیکن پھر تنگ آکر بچے کو دودھ کے ساتھ افیون پلا کر سلا دیتی ہے۔ مغرب کے دانشور اپنی عوام کو قوم پرستی کا افیون آب حیات کی مانند بتا کر پلاتے ہیں مگر مذہب کو افیون قرار دے کر مسترد کردیتے ہیں۔ دین اسلام کے ان مخالفین کے سامنے جب اسلام ایک متبادل نظام بن کر آتا ہے تو یہ مصر کی طرح چور دروازے سے فوج کی مدد لے کر منتخبہ حکومت کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ ترکی جیسے ملک اگر یہ ممکن نہیں ہو پاتا تو سیاحت کی اہم معیشت کو تباہ کرنے کیلئے ہوائی اڈوں پر دھماکے کرواتے ہیں۔ عالمی کھلی منڈی کے نام پر معاشی استحصال اور قوم پرستی کے ذریعہ سیاسی نفرت پھیلانے والوں کیلئے بریکزیٹ تازیانۂ عبرت ہے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ بنے گا آشیانہ ناپائیدار ہوگا

کہ ذاکر ذکر کرتا ہے خدا کے کارخانے میں

ایک سال قبل اگر یہ سوال کیا جاتا کہ کنھیا کمار کون ہے؟ تو جے این یو کے باہر شاید ہی کوئی اس سوال کا صحیح جواب دے پاتا لیکن آج حالت یہ ہے کہ نہ صرف ملک کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے بلکہ عالمی ذرائع ابلاغ میں بھی وہ اجنبی نام نہیں ہے۔ اس دوران کنھیا کمار نے کون سا ایسا کارنامہ انجام دے دیا کہ جس نے اسے اس غیر معمولی شہرت کا حقدار بنادیا؟ دراصل کنھیا کمار نے اپنے طور سے صرف یہ کیا کہ طلباء یونین کے صدر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے افضل گرو کی پھانسی کے خلاف منعقد ہونے والے ایک مظاہرے میں شرکت کی جس میں دو چار سو طلباء بھی شریک نہیں تھے۔ وہ احتجاج بھی کوئی نیا نہیں تھا بلکہ تیسری مرتبہ ہورہا تھا اور اس کی جانب کوئی توجہ دینے کی ضرورت تک محسوس نہیں کرتا تھا لیکن پھر یہ ہوا کہ سمرتی ایرانی کی پہ در پہ حماقتوں نے خود انہیں زیرو بنادیا اور کنھیا کمار کو ہیرو بن گئے۔
کنھیا کے ساتھ یہ کیا گیا کہ پہلے اس کی تقریر کے پیچھے کشمیر کے مظاہرے کے نعرے جوڑ دیئے گئے۔ اس کے بعد دو مرتبہ عدالت کے اندر پولس کی نگرانی میں سپریم کورٹ کے ہدایت کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اس کو سنگھ کے غنڈوں نے مارا

بیٹھا۔ تہاڑ جیل میں افضل گرو کے کمرے میں اسے قید کیا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ کنھیا کمار نوجوانوں کی آنکھوں کا تارہ بن گیا۔ کنھیا کو جس طرح غدارِ وطن قرار دیا گیا تھا اسی طرح ڈاکٹر ذاکر نائک کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر نائک ایک نہایت ذہین مبلغ اسلام ہیں۔ انگریزی داں حلقوں اور خاص طور پر نوجوانوں میں وہ بے حد مقبول ہیں۔۔بڑی محنت سے انھوں نے اپنا ٹیلی ویژن چینل قائم کیا جو دنیا کی کئی زبانوں میں اور مختلف ممالک میں دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائک کو اول تو بنگلا دیش کے حملہ آوروں سے جوڑ کر خطرناک دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی لیکن آگے چل کر ہر دھماکے سے انہیں اس طرح جوڑا جانے لگا اور اندیشہ لاحق ہوگیا کہ کہیں ان کی پیدائش سے قبل رونما ہونے والے تقسیم ہند کے تار وپود بھی ڈاکٹر صاحب سے نہیں جوڑ دیئے جائیں گے ۔ یہ الزامات اس قدر بودے تھے کہ ساری دنیا میں جگ ہنسائی کا سبب بنے رہے ۔ مثلاً بنگلا دیشی دہشت گرد کا فیس بک پر انہیں فولو کرنا۔ فیس بک پر تقلید کرنے والوں کی بنیاد پر اگر لوگوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جانے لگے تو شاید ہی کوئی اہم سیاسی رہنما یا مشہور شخصیت جیل کے باہر نظر آئے اس لئے کہ ہر دہشت گرد یا بدمعاش جس کو چاہے فیس بک پر پسند کر سکتا ہے اور اس معاملے میں کسی کا کسی پر کوئی اختیار نہیں ہے۔بنگلا دیش ہی کا ایک اور دہشت گرد

شردھا کپور کا دلدادہ بھی تھا اور اس سے ملاقات بھی کرچکا تھا تو کیا شردھا کی بھی تفتیش ہوگی بلکہ کشمیر میں حزب الجاہدین کمانڈر برہان وانی کے فیس بک پیج پر سہواگ کی تصویریں بھی ملتی ہیں تو کیا وریندر سہواگ کو گرفتار کیا جائیگا؟

ڈاکٹر ذاکر نائک پر ایک الزام یہ ہے حافظ سعید کی ویب سائٹ پر ان کے ادارے کی لنک موجود تھی۔ اگر آئی آر ایف کی سائٹ پر حافظ سعید کی لنک موجود ہوتی تب تو ذاکر نائک کو اس کیلئے ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک ویڈیو کی کلپ کو شرارتا سیاق وسباق سے کاٹ کر اس طرح پیش کیا جارہا ہے گویا وہ دہشت گردی کے حامی ہیں ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اسے مکمل دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف ہے اور یو ٹیوب پر دہشت گردی کی مذمت میں ڈاکٹر ذاکر نائک کے کئی ویڈیو موجود ہیں ۔ ڈاکٹر ذاکر نائک کا قصور تو صرف یہ ہے کہ ان کے آگے وزیر اعظم کے گرو سری سری روی شنکر اپنا آرٹ آف لیونگ بھول جاتے ہیں اور ایسا دیگر لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ان کے خلاف جو رپٹ لکھوائی جارہی ہے اس بابت اکبر الہ بادی نے کیا خوب کہا ہے

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جاجاکے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا اس زمانے میں

این ڈی ٹی وی پر شیکھر گپتا جیسے معروف صحافی کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر نائک کا واک دی ٹاک والا انٹرویو کس کو یاد نہیں۔ اس کے باوجود قومی ذرائع ابلاغ نے انہیں خطرناک دہشت گرد ثابت کرنے کی سپاری لے رکھی تھی۔ ذرائع ابلاغ میں جو آگ لگی ہوئی تھی اس میں راجناتھ سنگھ سے لے کرن رجیجو تک اور نائیڈو سے لے کر فردنویس تک تیل ڈال رہے تھے۔ اس طرح کی حماقت سے ڈاکٹر ذاکر نائک کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن ممکن ہے سمرتی ایرانی کی طرح ان میں سے کسی کی کرسی ڈانواں ڈول ہو جائے۔ بی جے پی والے بار بار یہ بھول جاتے ہیں کہ شیش محل میں رہنے والے دوسروں کی جانب پتھر نہیں اچھالتے۔ مہاراشٹر میں بی جے پی کے نہایت معمر سیاسی رہنما ایکناتھ کھڑسے پر داود ابراہیم کے ساتھ مسلسل رابطے کا الزام ممبئی پولس نے لگایا ہے۔ مہاراشٹر میں وزارت داخلہ کا قلمدان خود وزیراعلیٰ فردنویس کے پاس ہے۔ وہ اس الزام کی تفتیش کرواکر حقائق کو سامنے کیوں نہیں لاتے؟ حکومت ایکناتھ کھڑسے کی دھمکی سے کیوں ڈرجاتی ہے کہ اگر انھوں نے زبان کھولی تو سیاسی زلزلہ برپا ہوجائیگا؟ سنگھیوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ جن کی اپنی چڈی ڈھیلی ہوتی ہے وہ دوسروں کی دھوتی نہیں کھینچتے۔

مذکورہ دھمکی کے اندر جو باتیں راز میں ہیں ان سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر جو کچھ طشت ازبام آچکا ہے اسے بھی دیکھیں۔ سادھوی پرگیہ دہشت گردی کے

الزام میں ہنوز جیل کے اندر ہے اور انہیں ضمانت دینے سے عدالت نے انکار کردیا ہے۔ راجناتھ سے لے کر پرتھوی راج چوہان تک نہ جانے کس کس بی جے پی رہنما کے ساتھ پرگیہ کی تصاویر سے گوگل اٹا پڑا ہے۔ سمجھوتہ ایکسپریس کے دھماکوں کی ذمہ داری قبول کرنے والے اسیمانند کو مودی اور بھاگوت کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کرتے ہوئے ہر اخبار کی ویب سائٹ پر دیکھا جاسکتا ہے۔آرایس ایس کے رہنما اندریش کمار پر این آئی اے دہشت گردی میں ملوث ہونے کے سنگین الزامات لگا چکی ہے اور انہیں سنگھ پریوار نے مسلمانوں کی رجھانے کی ذمہ داری دے رکھی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو پھانسنے کیلئے سنگھ کو امت قتل و خون میں براہِ راست ملوث فرد کے علاوہ کوئی اور میسر نہیں آیا۔

گجرات کے فسادات کا اصلی مجرم ویسے تو اس دنیا کی عدالت سے ہنوز بچا ہوا ہے لیکن اس نسل کشی کیلئے جن لوگوں کو مختلف عدالتیں سزا سنا چکی ہیں ان کو دیکھیں۔ کیا ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو وزیراعظم کا منظور نظر نہ رہا ہو؟ جو کھلے عام ان کو اپنا آئیڈیل نہ قرار دیتا ہو؟ اور جو سنگھ کے گہوارے میں پرورش یافتہ نہ اور اسے یرقانی پناہ نہ حاصل ہو؟ یہ ساری باتیں کسی تفتیش کی محتاج نہیں ہیں۔آفاق و انفس میں بے شمار اخباری مضامین، عدالتی مباحث، گواہوں کے بیانات، ججوں کے فیصلے اور اسٹنگ آپریشن کے ویڈیو بکھرے

پڑے ہیں تاکہ ان کا مشاہدہ اہل دانش اپنی چشم بینا سے ان کا مشاہدہ کریں۔ بابو بجرنگی جیسے لوگ اعلیٰ الاعلان وزیر اعظم کو خراج عقیدت پیش کرنے میں بالکل نہیں ہچکچاتے۔نرودہ پاٹیا کے اندر قتل و غارتگری کے جرم میں عدالت سے عمر قید کی سزا پانے والی مایا کوندانی کو اس فساد کے بعد وزارت سے نوازنے والا اگر اس کے جرم میں شریک نہیں ہے تو کسی کا فیس بک پر کسی کو پسند کرلینا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

حکومت مہاراشٹر نے جب ڈاکٹر ذاکر نائک کی تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کو اس کام پر مختلف ٹیموں کو لگانا پڑا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سرکاری افسران کام بہت دھیمے ۹ کرتے ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ مواد بہت زیادہ تھا۔ روزنامہ ہندو کے مطابق چار دنوں کی محنت و مشقت کے بعد ریاست مہاراشٹر کی انٹلی جنس ڈیپارٹمنٹ نے فی الحال ڈاکٹر ذاکر نائک کو کلین چٹ دے دی ہے۔ یہ کلین چٹ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ عام طور یہ کام حکومت کے دباو میں کیا جاتا تھا اس بار دباو کے خلاف کیا گیا ہے۔ باوثوق ذرائع کے حوالے سے ہندو نے خبر دی ہے کہ ڈاکٹر نائک کی آمد پر ان کو نہ تو گرفتار کرنا قانوناً ممکن ہے اور نہ اس کا امکان ہے۔ ڈاکٹر نائک کے تمام لٹریچر اور ویڈیوز کو دیکھنے کے بعد یہ ثابتتو نہیں ہوسکا کہ اس میں دہشت گردی کا کوئی عنصر شامل ہے اس لئے اب دیکھا جارہا ہے کہ انہوں نے کسی کی دلآزاری تو نہیں کی؟ اور یہ پتہ

لگانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہونے والے کون کون سے نوجوان ڈاکٹر صاحب سے متاثر تھے حالانکہ اس تحقیق کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں ہے وہاں عوامی جذبات کے بجائے حقیقت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس سے قبل عدالت عالیہ حکومت کیاس طرح کے کئی معاملات میں سرزنش کرچکی ہے۔

بنگلادیشی دہشت گردوں سے تعلق پر سابق اٹارنی جنرل سولی سوراجی کا موقف ہے کہ پہلے معروضی تفتیش ہو اور اس کے بعد قوانین کا اطلاق کیا جائے نہ کہ پہلے ۔ایسا لگتا ہے کہ سوراب جی ذرائع ابلاغ کے معاندانہ رویہ پر تبصرہ فرمارہے تھے۔مذہبی منافرت کے سوال پر مہاراشٹر کے سابق ایڈوکیٹ جنرل نے واضح کیا کہ اپنے مذہب کی پیروی کرنا اور اس کی تبلیغ ہندوستان کے اندر انسان کا بنیادی حق ہے۔ ہر کوئی اپنے مذہب کو دوسرے سے بہتر کہہ سکتا ہےالّا یہ کہ اس کا ارادہ دوقوموں کے درمیان بدمزگی پیدا کرنے کا ہو۔ اسی صورت میں یہ بنیادی حق سلب ہوتا ہے۔ سینیر ماہر قانون امیت دیسائی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی بیان کو سیاق و سباق سے کاٹ کر نہیں بلکہ مجموعی طور پر دیکھنا چاہئے۔

وزیراعظم نے نفرت انگیز تقریر کے سماج کیلئے نقصان دہ قرار دیا۔اس بابت ماہرین کا کہنا ہے کہ عدالت میں تقریر کے ثابت شدہ الفاظ کے ساتھ ساتھ مقرر

کے ارادے کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اگر دلآزاری عمداً نہیں بلکہ سہواً ہوئی ہو اور توجہ دلانے پر مقرر رجوع کرلے تو عدالت اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتی ہے۔ جس زمانے ڈاکٹر ذاکر نائک کو لے کر ہنگامہ برپا تھا ۹ ماہ کے بعد ہاردک پٹیل کی ضمانت منظور ہوگئی اور ان کی رہائی کا راستہ صاف ہوگیا۔ ہاردک پٹیل نے تلوار ہاتھ میں لے کر جس طرح بزور قوت پورے نظام کو تہس نہس کرنے کا اعلان کیا تھا وہ سب کو یاد ہے۔ بعد میں بڑے پیانے پر تشدد پھوٹ پڑا تھا۔ اسی لئے اس پر بغاوت کا مقدمہ درج کیا گیا لیکن اب وہ بھی آزاد ہورہا ہے ایسے میں کسی ایسے شخص کو دہشت گرد قرار دینے کی کوشش جس کے قول و عمل سے کبھی بھی نقصِ امن کا خطرہ پیدا نہ ہوا ہو ایک حماقت سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔

ڈاکٹر نائک کا معاملہ ایک ایسے وقت میں اٹھایا گیا جب ذرائع ابلاغ کے پاس کوئی گرماگرم کہانی نہیں تھی۔ اس کے سامنے پہلی خبر تو وزیراعظم کے غیر ملکی دورے کی تھی۔ اب ملک کے لوگ ان تماشوں سے اس قدر اوب چکے ہیں کہ افریقہ تو درکنار امریکی دورے کو بھی قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے ۔ دوسرا بڑا الزام کانگریس نے یہ لگایا کہ حکومت ۵۰۰۰۴ہزار کروڑ کے ٹیلی کوم گھوٹالے پر پردہ ڈال رہی ہے۔ کانگریس کی یو پی اے سرکار نے ۶ ٹیلی فون کمپنیوں پر ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۹ء کے درمیان سرکاری بقایا جات ادا کرنے میں کوتاہی کیلئے

تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ بی جے پی نے حزب اختلاف کے طور پر اس کی وجہ سے سرکاری خزانے کے متوقع نقصان پر خوب ہنگامہ کیا تھا اور کانگریس کے اوپر بدعنوانی میں ملوث ہونے کا الزام جڑ دیا تھا۔ اس وقت یہ خبر تمام ذرائع ابلاغ پر چھائی ہوئی تھی۔

اس قضیہ پر اب آڈیٹر جنرل کی رپورٹ آچکی ہے اور اس نے مذکورہ چار سالوں میں ۱۲ ہزار کروڑ سے زیادہ کے بقایا جات کو تسلیم کرلیا ہے اگر ان بقایہ جات کا ۲۰۱۶ء تک کا تخمینہ لگایا جائے تو یہ رقم ۴۵۰۰۰ ہزار کروڈ بن جاتی ہے۔ اب جو لوگ سرکاری خزانے کے نقصان پر ماتم کناں تھے وہ خزانے کے مالک بنے ہوئے ہیں لیکن سرکار اس عوام کے حق کو جرمانہ سمیت وصول کرنے کے بجائے سرمایہ داروں کو سہولت دینے کی کوشش کررہے ہیں ۔ سرکار کا ایسا کرنا بدعنوانی کی بلاواسطہ سرپرستی کے مترادف ہے۔ کانگریس کا الزام یہ ہے کہ اور اس طرح حکومت نواز کمپنیوں کو سزا سے بچایا جارہا ہے اور ان کے جرائم کی پشت پناہی کی جارہی ہے۔ جب سے نئی سرکار اقتدار میں آئی ہے ذرائع ابلاغ کے اندراول تو بدعنوانی کے الزامات اچھالے نہیں جاتے اور جو سامنے آبھی جائیں تو انہیں دبا دیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے ڈاکٹر ذاکر نائک کے معاملے کو اس بدعنوانی کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے بڑی چالاکی سے استعمال کیا گیا لیکن جب کشمیر کے تشدد کی بڑی خبر سامنے آگئی تو وہ بھی کافور ہوگیا۔

ویسے یہ بھی ایکحسنِ اتفاق ہے کہ گزشتہ چند سالوں کے اندر ہندوستان کی حدتک ڈاکٹر نائک کی سرگرمیاں ماندپڑنے لگی تھیں ۔اس دوران کوئی بڑی کانفرنس ، مشہور مباحثہ یا مناظرہ منعقد نہیں ہوا تھا۔ خلیجی ممالک میں ملنے والے اعزازت کے علاوہ ان کے حوالے سے کوئی خبر ذرائع ابلاغ میں نہیں دکھائی دے رہی تھی لیکن میڈیا کی موجودہ شرارت اور حکومت کی حماقت نے ڈاکٹر ذاکر نائک کو پھر ایک بار شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ ان کے پیس چینل پر ہندوستان میں ویسے بھی پابندی تھی ۔ معدودے چند کیبل آپریٹرس کے علاوہ کوئی نیٹ ورک اس کو نشر نہیں کررہا تھااس لئے اس کی رسائی محدود تھی لیکن اب جو یہ ہنگامہ کھڑا کیا گیا اس کے بارے میں جاننے کے شائقین میں یقیناً غیر معمولی اضافہ ہوا ہوگا۔ یہ نئے لوگ انٹرنیٹ اوریوٹیوب پر جا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ آخر حقیقت کیا ہے؟ جب وہ لوگ ڈاکٹر نائک کے ویڈیو دیکھیں گے تو ان کے سامنے ایک مختلف شخصیت آئیگی اور ناظرین ان کے ذریعہ سے دین اسلام سے بھی واقف ہوں گے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ بالآخر یہ ہنگامہ آرائی بہت سوں کو دین اسلام سے قریب کرنے میں مددگار ثابت ہو لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اس دوران ملک میں ایک ممنوع چینل کا بانی و مالک سارے قومی چینلس پر موضوع بحث بنا رہا بلکہ چھایا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ان چار دنوں میں ہندی ذرائع ابلاغ پر مودی کا نہیں بلکہ

ناٹک کا راج تھا۔

گیلی پولی سے ۱۶ جولائی تک کے سو سال

انسانی یادداشت محدود ہوتی ہے اور پھر ایک صدی کا طویل عرصہ بھی کم نہیں ہوتا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کا جزیرہ نما گیلی پولی ایک تاریخی جنگ کا میدان تھا۔ گیلی پولی اسی استنبول کے جنوب میں واقع ہے جہاں ابھی حال میں ترکی عوام نے فوجی بغاوت کا سر کچل دیا۔ اپریل ۱۹۱۵ء سے جنوری ۱۹۱۶ء کے درمیان یہاں عثمانی ترکوں اور اتحادیوں یعنی سلطنت برطانیہ اور فرانس کے مابین پہلی جنگ عظیم کی ایک اہم معرکہ آرائی ہوئی۔ اس جنگ میں ترکوں نے فتح حاصل کی۔ اس جنگ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کو شکست دے کر جنگ سے علیحدہ کرنا تھا اس بار پھر ترکی کو مشرق وسطی میں اہم کردار ادا کرنے سے روکنا اور اپنا حلیف بنائے رکھنا تھا۔ اس جنگ میں ۷ لاکھ ترک اور ساڑھے ۵ لاکھ اتحادی فوجی مارے گئے تھے لیکن اتحادیوں کا حملہ ترکوں کی بے مثل مزاحمت اور شجاعت کی تاب نہ لاسکا تھا۔ ۹ جنوری ۱۹۱۶ء کو اتحادی فوجیں شکست فاش سے دوچار ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔ اس حملے کی منصوبہ بندی کرنے والے اتحادی کمانڈر ونسٹن چرچل کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا اور برطانوی وزیر اعظم ایسکویتھ کو بھی اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا تھا۔ اس فتح نے ترکوں کے حوصلے بلند کر دئے تھے اور اس بار پھر یہی ہوا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کی نہ تو ابتداء مسلمانوں نے کی تھی اور نہ ہی اس کا خاتمہ مسلمانوں کی مرضی سے ہوا۔ اس جنگ کا آغاز آسٹرو ہنگری شہنشاہیت میں ولیعہد شہزارہ فرناڈو کے قتل سے ہوا تھا جسے پڑوسی ملک سربیا کے ایک قوم پرست نے قتل کر دیا تھا۔ یہ دونوں عیسائی ممالک تھے ۔ اس کے بعد آسٹریا کے ساتھ جرمنی، ترکی اور اٹلی آگئے جبکہ سربیا کے ساتھ فرانس، برطانیہ، روس، بیلجیم، جاپان اور امریکہ نے دیا۔ جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے سے ترکی بھی شکست خوردہ اتحاد کا بن گیا تھا۔ اس خونخوار جنگ میں ۹۰ لاکھ فوجی مارے گئے اور دو کروڑ دس لاکھ فوجی زخمی ہوئے۔ شہریوں کی موت کا تخمینہ ایک کروڑ ہے جس میں سب سے زیادہ جرمنی اور فرانس کے لوگ تھے ۔ اس جنگ کے خاتمہ پر خلافت عثمانیہ کے علاوہ روسی، آسٹریا اور ہنگریائی نیز جرمنی کی شہنشایت کا سورج غروب ہوگیا۔ اس جنگ کے بعد خود ترکی تو مغرب کی غلامی سے محفوظ رہا لیکن خلافت عثمانیہ میں شامل دیگر ممالک کو فتحیاب اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ ان میں سے کچھ ممالک میں اپنے پٹھو مسلط کردیئے اور کچھ میں براہ راست حکومت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ پہلا متبادل کسی قدر کامیاب رہا لیکن جن ممالک میں برطانیہ اور فرانس نے اپنی نوآبادیات قائم کیں وہ یکے بعد دیگرے آزاد ہوتے چلے گئے۔

انگریزوں کی غلامی کے خلاف مسلم دنیا میں مذہبی طبقات نے مزاحمت کی اس لئے

وہ حکمرانوں کی نظر میں مشکوک و مقہور ٹھہرے۔ اس کے برعکس انگریزی داں روشن خیال لوگوں نے انگریزوں کی چاکری اختیار کرکے اپنا مستقبل روشن کرنا شروع کر دیا نتیجتاً وہ اپنے آقاوں کے منظور نظر بن گئے۔ فوج میں شامل ہو کر بھوہی لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور مغرب کے فکر و عمل کی مکمل غلامی اختیار کر لی ۔ انگریزوں کیلئے جب عوامی مزاحمت کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوگیا تو وہ اقتدار کی باگ ڈور اپنے غلاموں کے حوالے کرکے لوٹ گئے۔ آگے چل کر جب سرد جنگ کا زمانہ آیا تو یہ حالت ہوئی کہ مغرب نواز بادشاہ امریکی سامراج کے باجگذار بن گئے اور فوجی آمر سوویت یونین کی وفاداری کا دم بھرنے لگے ۔ اس طرح مسلم دنیا مغرب ہی کے دو غلام آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے اور ان کا مشترکہ دشمن اسلام پسند تحریکیں تھیں ۔ اسلام کے علمبردار چونکہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو چیلنج کرتے تھے اس لئے دونوں بڑی طاقتیں اپنے غلاموں کی مدد سے اسلام کی سرکوبی میں مصروفِ عمل تھیں ۔

ایرانی انقلاب کے بعد مسلم دنیا میں پہلی تبدیلی یہ آئی کہ نئے حکمرانوں نے امریکہ کے مہرے شاہ ایران کو بے دخل کرنے کے بعد سوویت یونین کے کیمپ میں شامل ہونے سے انکار کردیا۔ ایران کو عدم استحکام کا شکار کرنے کیلئے پہلی مرتبہ امریکہ اور سوویت یونین دونوں نے مل کر صدام حسین کی حمایت کی ۔ سرد جنگ کے زمانے یہ تصور محال تھا۔ مغرب کو دوسرا جھٹکا اس وقت لگا جب مجاہدین افغانستان نے سوویت یونین کو ملک سے نکالنے کے بعد امریکہ کو بھی

راستہ ناپنے کا حکم دے دیا۔ امریکہ بہادر کو یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس دوران ترکی اور غزہ میں اسلام پسندوں کو کامیابی ملی اور پھر عرب بہار نے اخوان المسلمون کو بر سرِ اقتدار کرکے مغرب کی نیند اڑا دی۔ مغرب کے سارے منصوبوں پر پانی پھیرنے والی یہ تبدیلیاں اسکے خواب و خیال سے پرے تھیں۔ اس لئے پھر ایک بار فوجی بغاوت والا فرسودہ حربہ آزمایا گیا۔ مصر کے اندر تو مغرب کامیاب ہوا لیکن ترکی میں یہ آزمودہ نسخہ بھی کارگر ثابت نہ ہوسکا۔

گیلی پولی کی شکست کے بعد یوروپ نے ترکی کو غلام بنانے کا خیال اپنے دل سے نکال دیا۔ اب یہ حکمتِ عملی اختیار کی گئی کہ جس مصطفیٰ کمال اتاترک نے اتحادی افواج کو میدانِ جنگ میں ناکوں چنے چبوا دیئے تھے اسی کو اپنا حلیف بنا لیا اور اس کے ذریعہ اسلام کی بیخ کنی میں لگ گئے۔ مغرب جانتا تھا کہ اصل مسئلہ رہنما کا نہیں دین کا ہے اگر عوام کو دینِ اسلام سے برگشتہ کردیا جائے تو سیاسی غلبہ کے بغیر بھی انہیں غلام بنایا جاسکتا ہے۔ اس لئے بیرونی حملے کے بجائے اندرونی فوجی بغاوت کا استعمال ہونے لگا۔ اس قابلِ مذمت سلسلہ کی بنیاد بدقسمتی سے جدید ترکی کے معمار سمجھے جانے والے مصطفیٰ کمال اتاترک سے ہوئی جس نے ۱۹۲۰ء میں خلافت عثمانیہ کے آخری تاجدار خلیفہ وحید الدین سریر آرائے کو ہٹا کر اقتدار سنبھالا تھا۔

اتاترک کی موت کے ۲۲ سال بعد ۱۹۶۰ء میں ایک اور خونی فوجی بغاوت کے ذریعے وزیر اعظم عدنان مینڈیرس کو معزول کردیا گیا۔ جنرل جمال گورسل ترکی نے اقتدار پر غاصبانہ قبضے کے بعد انہیں پھانسی دے دی ۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۰ء میں بھی اقتدار پر جابرانہ قبضے کی کوششیں کی گئیں اور جرنیلوں نے عوام کے نمائندوں کو ہٹا کر ملک کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ۱۹۹۸ء میں آخری بار جب وزیر اعظم نجم الدین اربکان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی مذموم حرکت کی گئی تھی تو اس وقت رجب طیب اردغان کو استنبول کے میئر کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا پڑا تھا لیکن ۱۶ جولائی ۲۰۱۶ء کو جب پھر سے اس کا اعادہ کیا گیا دلیر و بیدار مغز ترک عوام نے اسے ناکام بنا دیا۔

رجب طیب اردغان گزشتہ ۱۳ سالوں سے برسر اقتدار ہیں ۔اس سے قبل ان کی حکومت کو ہٹانے کے لیے چار سے پانچ بار کوششیں کی گئیں جنہیں ابتدائی مراحل ہی میں ناکام بنا دیا گیا۔ ایک مرتبہ تقسیم اسکوئر پر ہنگامہ اور احتجاج اس قدر بڑھ گیا تھا کہ عالمی ذرائع ابلاغ میں یوں لگنے لگا تھا گویا اے کے پی کی حکومت بس چند دنوں کی مہمان ہے۔ خود مجھے اس دوران استنبول جانے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ شہر کے حالات بالکل معمول پر ہیں ۔ لوگ اپنے روز مرہ کے کام کاج میں مصروف ہیں ۔ ایک میدان میں چند سواشترا کی مظاہرین ڈیرہ ڈال کر

بیٹھے ہوئے ہیں جسے بین الاقوامی سطح پر یوں پیش کیا جارہا ہے گویا کوئی عظیم سرخ انقلاب انگڑائیاں لے رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے استنبول کے دورے نے میری ساری تشویش دور کردی اس لئے کہ حقیقت وہ نہیں تھی جو اخبارات میں یا ٹیلی ویژن کے پردے پر دکھائی دیتی تھی۔ اس دوران ایک جلوس کا آنا اور تشدد برپا کردینا نیز حفاظتی دستوں کے ذریعہ آنسو گیس کے ذریعہ ان کا منتشر کردیا جانا بھی میں نے دیکھا اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ تحریک عوام کی بڑی حمایت سے محروم ہے۔ اس وقت دہلی میں بابا رام دیو اور انا ہزارے کے ذریعہ چلائی جانے والی تحریکیں بھی استنبول کی تحریک سے زیادہ مقبول تھیں۔

اس دوران دستور میں جائز ترمیم کے بعد اردغان عوام کی براہِ راست رائے سے صدر بن چکے تھے۔ اردغان پر الزام لگ رہا تھا کہ وہ ملک کو آمریت کی جانب لے جارہے ہیں ۔ یہ عجیب لطیفہ تھا کہ امریکی صدر کا براہ راست منتخب ہونا جمہوریت ہے اور اردغان کی اسی حرکت کو آمریت قرار دیا جارہا تھا۔ پچھلے سال کے انتخاب میں جب اے کے پی کو واضح اکثریت نہیں ملی تو اس نے حلیف جماعتوں کی مدد سے حکومت سازی کی اور سابق وزیر خارجہ داود اوغلو کو وزیراعظم بنایا گیا۔ یہ نئی حکومت بہت جلد حلیف جماعتوں کی حمایت واپس لے لینے کے سبب اقلیت میں آگئی۔ دنیا بھر کے اسلام دشمنوں کو امید تھی کہ ترکی میں اب یا تو ارکان پارلیمان کی خرید و فروخت ہوگی اور جوڑ توڑ سے نئی سرکار بنے گی

یا صدر اردغان اپنے اختیارات کا استعمال کرکے مارشل لگا دیں گے لیکن انہوں نے پھر اپنے مخالفین کو مایوس کیا اور خود اپنی پارٹی کی حکومت کو برخواست کرکے نئے سرے سے انتخاب کا اعلان کردیا۔

رجب طیب اردغان نے ایک زبردست خطرہ مول لیا تھا لیکن انتخابی نتائج نے اے کے پی کی مجبوری دور کردی۔ دیگر جماعتوں پر اس کا انحصار ختم ہوگیا اور وہ اپنے بل بوتے پر اکثریت میں آگئی۔ اے کے پی کے تنگ دل مخالفین نہ تو اردغان کے صدارتی انتخاب میں کامیابی کو اور نہ اس کے اکثریت کو سراہ سکے۔ اس بیچ کبھی تو سابق صدر محمد گل تو کبھی سابق وزیراعظم داود اوغلو کے ساتھ اردغان کے اختلاف کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا کہ گویا ترکی میں نہ جانے کون سا سیاسی آتش فشاں پھٹنے والا ہے لیکن ۱۶ جولائی کی شرانگیزی کے بعد ساری دنیا نے دیکھا کہ اے کے پی کی صفوں میں کوئی دراڑ تو دور مخالف سیاسی جماعتوں تک نے ایک آواز میں فوجی بغاوت کی مذمت کردی۔ اب تو کچھ دور کی کوڑی لانے والے اشتراکی اس فوجی بغاوت کو بھی اردغان کی اپنی سازش قرار دے رہے ہیں۔

حکومت ترکی نے ویسے داعش کی سرکوبی کیلئے قائم کی جانے والی امریکی ایئر بیس کو بند کرکے یہ اشارہ دے دیا ہے کہ اس کو کس پر شک بلکہ یقین ہے۔ گزشتہ سو

سالوں میں پانچ اور ٦٠ سالوں میں ۴ مرتبہ فوج کے ذریعہ تختہ الٹنے کی جو کوششیں ہوئیں اور اسبار جو کچھ ہوا اس میں فرق تھا کہ ترکی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عوام گھروں سے نکل کر ٹینکوں کے آگے سو گئے یا اس کے اوپر چڑھ گئے۔ عوام اور فوج کے درمیان برپا یہ کشمکش دراصل کفر اسلام کی جنگ ہے۔ اس لئے کہ مصطفیٰ کمال اتاترک سے لے کر اب تک ہر بغاوت اسلام پسندوں کے خلاف اور سیکولرزم و جمہوریت کے علمبردار روشن خیال فوجی جرنیلوں کے ذریعہ ہوئی ہے۔ سارے وردی پوش لادینی جمہوری اقدار کو قائم کرنے اور مذہب کے اثرات کو زائل کرکے اپنے مغربی آقاوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ مغرب نواز دانشوروں نے ہمیشہ ہی اسلام پسندوں کے بغض میں کبھی کھلے تو کبھی ڈھکے چھپے انداز فوجی ڈکٹیٹروں کی تائید و حمایت کی ہے۔

مغرب کی منافق حکومتیں اول تو معمولی زبانی جمع خرچ کرنے کا پاکھنڈ کرتی ہیں لیکن جب فوجی آمروں کے قدم جم جاتے ہیں تو ان کی حمایت میں کمربستہ ہوجاتی ہیں لیکن یہ حسن اتفاق ہے عوام کو جب بھی آزادانہ طور اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کا موقع ملتا ہے ان کی نظر انتخاب اسلام پسندوں پر جاکر ٹک جاتی ہے۔ لاکھ پروپگنڈہ کے باوجود وہ اسلام پسندوں کو منتخب کرکے اقتدار ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر موری کو سارا مغرب مصر کا واحد منتخبہ صدر کے لقب سے یاد کرتا ہے جبکہ مصر کے ہر سربراہ نے انتخاب

کا ڈھونگ رچایا ہے۔ اسی آزادانہ انتخاب کی آزادی کے نتیجے میں جب ارکان یااردغان آگے آتے ہیں تو وہ دشمنان اسلام کی آنکھوں میں کانٹے کی مانند کھٹکنے لگتے ہیں ۔ رابرٹ فسک جیسے عظیم روشن خیال دانشور کو بھی اس بار ترکی کی فوجی بغاوت کے ناکام ہوجانے پر افسوس ہوتاہے اور وہ بہت جلد ایک کامیاب فوجی بغاوت کی بشارت دیتے نظر آتے ہیں ۔

ایک مسلم دانشور نے حال میں ایک گروپ کے اندر یہ سوال کردیاکہ آخر اس طرح کا سیاسی خلفشار یوروپ اور امریکہ میں کیوں برپا نہیں ہوتا ؟ یہ نہایت سنجیدہ سوال ہے۔ عام طور پر جب اس طرح کا سوال ابھرتا ہے تو ہم لوگ یا تو اپنے آپ کو کوسنے میں لگ جاتے ہیں یا مسلکی اختلافی بنیاد پر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگتے ہیں ۔ حالانکہ اس سنجیدے کے ساتھ غوروخوض ہونا چاہئے۔ ویسے ترکی کی ناکام بغاوت کے پیش نظر اس سوال ایک جواب تو یہ ہے کہ ترکی سے لے کر تیونس تک جب بھی آزادانہ انتخاب کا انعقاد ہوتا ہے تو کہیں رجب طیب اردوان ، کہیں اسماعیل ہنیہ ، کہیں ڈاکٹر موری تو کہیں غنوشی جیسے صالح لوگ منتخب ہوجاتے ہیں جو مغرب کے استحصالی نظام کے آگے سپر نہیں ڈالتے اس لئے فوجی بغاوت کی مدد سے انہیں سازش کرکے.بزور قوت ہٹانے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔

جہاں تک مغرب کا سوال ہے وہاں تو جمہوری طریقہ پر جارج بش اور ٹونی بلئیر جیسے جنگی مجرم میسر آجاتے ہیں۔ چلکوٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس حقیقت کا اعتراف موجود ہے اور آگے بھی امریکہ کے اندر ڈونالڈ ٹرمپ جیسا بددماغ اقتدار سنبھالنے کیلئے پر تول رہا ہے۔ مغربی ممالک میں چونکہ استحصالی سرمایہ کاروں کا گھی سیدھی انگلی ہی سے نکل جاتا ہے اس لئے اسے ٹیڑھا کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی؟ مغرب کے یہ حکمراں اپنے عوام کا خون تو چوستے ہی ہیں لیکن اپنے سرمایہ دار آقاوں کے اشارے پر دنیا بھر میں بشمول مسلم کے بدامنی پھیلاتے ہیں۔ فوج سے ساز باز کرکے عوامی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی مذموم کوششیں کرتے ہیں۔ اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کیلئے کیش زمانے میں اشتراکیت کے پیچھے پڑے رہتے تھے آج کل اسلام کو بدنام کرنے میں لگے رہتے ہیں تاکہ عوام اس دین حنیف سے بدظن ہوجائیں اور ان کی مانند کفر والحاد میں بتملا رہیں

۔

مسلم عوام کی اکثریت کو مرعوب کرنے کا یہ حربہ پچھلے سو سالوں کے اندر تو کامیاب نہیں ہوسکا لیکن ایک محاذ ایسا ہے جس پر مغرب نے کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ گزشتہ صدی کی ابتداء میں مغرب نے جب اپنا موازنہ خلافت عثمانیہ سے کیا کہ یوروپ کا یہ مرد ضعیف ''اپنے تمام تر انحطاط کے باوجود گبرو جوان یوروپ سے بہتر حالت میں'' کیوں ہے؟ تو اس سوال کا جواب اسے یہ ملا کہ مسلمان ممالک

میں امن و امان ہے اس کے برعکس یورپ بدامنی کا شکار ہے۔ یوروپی ممالک مشترکہ مذہب کے باوجود منقسم ہیں جبکہ مسلمان آپس میں متحد ہیں۔ یوروپی دانشوروں نے اپنے انتشار اور مسلمانوں کے اتحاد کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ مغرب کی تقسیم وطن پرستی کی بنیاد پر ہے جبکہ توحید نے مسلمانوں کو متحد کر رکھا تھا۔ امریکہ نے مسلمانوں کی مانند اپنی ۵۰ ریاستوں کو خلافت عثمانیہ کے خطوط پر متحد کر لیا لیکن یوروپ کیلئے اپنے قومی تشخص کو بالائے طاق رکھنا ناممکن تھا اس لئے ان لوگوں نے قوم پرستی کے جراثیم مسلم ممالک میں پھیلا کر ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کی ابتداء جغرافیائی تقسیم سے کی گئی اور پھر عرب و عجم کا فرق آیا اور بالآخر مسلکی اختلافات کو اس قدر ہوا دی گئی کہ ہم غیروں کے حلیف اور ایک دوسرے کے حریف ہو گئے۔ دشمنوں کو دوست بنا لیا اور دوستوں کے دشمن بن گئے۔

گیلی پولی کی فتح کے باوجود مسلمانوں کے شکست ریخت کی بنیادی وجہ محاذِ جنگ میں عسکری فتح کے بعد ہمارے حکمرانوں اور دانشوروں کی فکری مرعوبیت ہے۔ افسوس کے امت نے بھی وطنیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے قومی مفادات کو دینی مفادات پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس لئے میدان عمل کی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ فکری محاذ پر بھی مغرب سے پنجہ آزمائی کر کے اسے زیر کرنا ضروری

ہے۔ اس امت کی پائیدار فتح مندی کیلئے یہ لازمی ہے کہ ہماری جدوجہد کا محور کوئی فرد نہیں بلکہ اسلامی فکر و عقیدہ ہو۔ اسلام پسندوں کو جب شکست ہوتی ہے تو اسے اسلامی نظام حیات سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ حال میں سبکدوش لیفٹنٹ کرنل پیٹرس نے فوکس ٹی وی پر کہا کہ اگر یہ بغاوت کامیاب ہوجاتی تو ہم جیت جاتے اور اسلام پسند ہار جاتے۔ بشارالاسد نے بھی ڈاکٹر مورسی کی برطرفی کے بعد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ہم تو یہی کہتے ہیں کہ اسلام قابل عمل نظریہ نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جب کوئی کامیابی ملے تب بھی اس کو اسلامی نظام حیات سے جوڑ کر پیش کیا جائے۔ اس کی توقع ہم اسلام دشمن مفکرین سے نہیں کرسکتے۔ یہ کام ہمیں خود کرنا ہوگا۔

جولائی کو جب میں نماز فجر کیلئے اٹھا تو واٹس اپ پر ترکی کے تختہ پلٹنے کی خبر تھی۔ نماز ۱۶ کے بعد دل پکار پکار کر کہتا تھا کہ اے مالک الملک تو اپنے دین کی اور اس کے علمبرداروں کی مدد و استعانت فرما۔ یہ کیفیت اس وقت تک باقی رہی جب تک کہ سب کچھ واضح نہیں تھا۔ پھر جیسے جیسے دن چڑھنے لگا اور فوجی بغاوت کی ناکامی یقینی ہوتی چلی گئی تو کبھی رجب طیب اردغان ، کبھی ان کا اعلان، عوام کا جوق درجوق نکلنا، ٹینکوں پر چڑھ جانا، حزب اختلاف کا متحد ہو کر فوج کی مخالفت کرنا اور عالمی برادری کا مذمت کرنا اہم سے اہم تر ہوتے چلے گئے۔ اب جبکہ یہ مضمون ختم ہورہا ہے ایک نیا واٹس

ایپ پیغام سامنے ہے جس میں اردغان کی دس سماجی و معاشی اصلاحات کو فوجی بغاوت کی ناکامی کیلئے ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ ان تمام چیزوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن میں سوچتا ہوں کہ کیا وہ علی الصبح کا رجوع الی اللہ بالکل بے مصرف تھا نعوذ باللہ۔ کیا اس نشیب و فراز میں مشیت الٰہی کا کوئی رول نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کس قدر احسان فراموش ہوں میں ؟ ایسے موقع پر مجھے وہ قرآنی تلقین کیوں یاد نہیں آتی کہ۔ ”جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ اور تو لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق آتا دیکھ لے تو اپنے رب کی تسبیح کرنے لگ حمد کے ساتھ اور اس سے مغفرت کی دعا مانگ، بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے (سورۃ النصر)۔

ابھمنیو! چکرویوہ میں پھنس رہا ہے تو

قدیم دیومالائی صحیفوں میں مہابھارت کا اپنا مقام ہے۔ اس کے کردار ایسے دلچسپ ہیں کہ ان کی مشابہت حالات حاضرہ کے مختلف واقعات سے بھی ہو جاتی ہے۔ مہابھارت میں ابھمنیو کو ارجن کا بیٹا اور کرشن کا بھانجا ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ وہ سب سے زیادہ بہادر اور باصلاحیت جنگجو ہے۔ اس کا بیٹا آگے چل کر ہستناپور کی سلطنت کا وارث قرار پاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ جنگ کے تیرہویں دن چکرویوہ میں پھنس کر مارا جاتا ہے۔ اس کے مارے جانے کی جو توجیہات پیش کی گئی ہیں وہ وزیر اعظم نریندر مودی پر صادق آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ چکرویوہ کو توڑنے کا علم اس کے پاس ادھورا تھا۔ جس وقت شری کرشن اپنی بہن سبھدرا کو یہ تعلیم دے رہے تھے وہ سو گئیں اس لئے وہ درمیان ہی میں خاموش ہو گئے۔ اس طرح مادرِ حمل میں گیان پراپت کرنے والے ابھمنیو کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اگر یہ سب آپ کو عجیب و غریب لگتا ہے تو مودی جی کی تعلیم کے بارے معلومات حاصل کریں۔ کسی انٹرویو میں وہ خود اعتراف کرتے نظر آئیں گے کہ اسکول کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔ کبھی وہ دہلی میں گریجویشن کرتے دکھائی دیں گے لیکن ڈگری چیخ چیخ کر کہہ رہی ہوگی کہ وہ نقلی ہے اور پھر گجرات سے پوسٹ گریجویشن کی ڈگری کا چمتکار بھی نظر آجائیگا گویا ہمارے وزیر اعظم بھی ست یگ کے لے کر کل یگ تک

جاری دیومالائی سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔حالات حاضرہ پر نظر ڈالی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ کل یگ کا ابھمنیو بھی بڑے آرام سے چکرویوہ میں پھنستا جارہا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ جب اس کا ہر تیر نشانے پر لگتا تھا اور اب سارے خطا ہو رہے ہیں۔

سیاسی جماعتوں کے نزدیک انتخابات سے زیادہ اہمیت کا حامل کوئی قومی یا انسانی مسئلہ نہیں ہوتا۔ فی الحال بی جے پی کیلئے سب سے بڑا چیلنج اترپردیش کا انتخاب ہے۔ اترپردیش میں بی جے پی نے پہلے تو مایاوتی کو اپنے ساتھ لینے کی بھرپور کوشش لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ملی تو بی ایس پی کو اندر سے کھوکھلا کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس حکمت عملی کے تحت اسمبلی میں بہوجن سماج پارٹی کے اہم رہنما سوامی پرساد موریہ کو توڑا گیا لیکن پھر یہ سلسلہ رکا نہیں ۔ موریہ کے بعد آر کے چودھری اور رویندر پرتاپ ترپاٹھی کو بی ایس پی سے الگ کیا گیا اور ان کے بعد قومی سکریٹری پرم دیو نکل گئے ۔ امیت شاہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس طرح کی حرکات سے مایاوتی کے تئیں دلت رائے دہندگان کی ہمدردی بڑھ سکتی ہے ۔ بہار میں اس کا مظاہرہ ہوچکا ہے سابق وزیراعلیٰ مانجھی کی غداری سے تتیشمار کے رائے دہندگان قریب تر ہوگئے اور خود مانجھی کی اپنی نیا ڈوب گئی ۔

اترپردیش میں دیاشنکر سنگھ کے ایک احمقانہ بیان نے بی ایس پی کو پھر

سے زندہ کر دیا۔ جتنے لوگ بی جے پی سے نکلے تھے ان سب نے مایا وتی پر ٹکٹ فروخت کرنے کا الزام لگایا تھا اور یہ بہت حد تک درست بھی ہے۔ مایاوتی ہی کیوں بی جے پی نے کیا وجئے ملیا سے کچھ لئے بغیر خیرات میں اپنے ارکان سے اس بدعنوان سرمایہ دار کو ووٹ دینے کیلئے کہا ہوگا؟ اور دہلی سے فرار ہونے میں مدد کی ہوگی؟ موجودہ سیاست کو تجارت کے علاوہ کچھ اور سمجھنے والا دراصل سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔ دیا شنکر سنگھ نے بھی کوئی نئی بات نہیں کہی بلکہ جو لوگ روپیوں کے عوض بک کر بی ایس پی کو خیرباد کہہ رہے ہیں ان کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ ان کے ایسا کرنے کی وجہ مایاوتی کے ذریعہ ٹکٹوں کی فروخت ہے لیکن ساتھ ہی دیا شنکر سنگھ نے مایا وتی کو طوائف سے بدتر کہہ دیا۔ دیا شنکر کی بدزبانی نے مایاوتی کے ستارے چمکا دیئے۔ دیا شنکر خود تو ڈوبے لیکن ان کے ساتھ بی جے پی کے شیڈول کاسٹ مورچے کے صدر دیپ چند رام نے استعفیٰ دے کر یرقانی خاندان کی ساری سوشیل انجنیئرنگ چوپٹ کر دی۔

دیا شنکر سنگھ نے جو کہا نہ وہ پہلی بار ہے اور نہ بی جے پی کا ہڑ بڑانا نیا ہے۔ اپریل کے اندر اترپردیش بی جے پی کے خواتین مورچہ کی صدر مدھو مشرا نے بھی کہا تھا کہ آج تمہارے سر پر بیٹھ کر دستور کے سہارے جو لوگ راج کر رہے ہیں یاد کرو وہ کبھی تمہارے جوتے صاف کیا کرتے تھے۔ ایک زمانے تک ہمیں جن کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارہ نہ تھا جلد ہی ہمارے بچے انہیں حضور کہہ کر

پکاریں گے۔ اس بیان کے سامنے آتے ہی بی جے پی نے مدھو مشرا کو ۶ سال کیلئے پارٹی سے نکال باہر کیا تھا دیا شنکر کے ساتھ بھی یہی کیا گیا لیکن اس طرح کے تضحیک آمیز رویہ کے بعد بھی اگر امیت شاہ اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ دلت سماج بی جے پی کو یا ان کے اکسانے پر مایاوتی سے الگ ہونے والوں کی حمایت کرے گا تو اس سے بڑی بے وقوفی کوئی اور نہیں ہے۔

اترپردیش میں سب سے پہلے انتخاب کا بگل بی جے پی نے جون کے اندر قومی اجلاس منعقد کرکے بجایا۔ اس سے قبل کئی لوگ وزیراعلیٰ کے عہدے کیلئے اپنی دعویٰ داری پیش کر چکے تھے۔ ورون گاندھی کو ڈانٹ دیا گیا۔ اویدیہ ناتھ کو نظر انداز کردیا گیا اور سمرتی ایرانی کا نام بھی مسترد ہوگیا۔ اس طرح راج ناتھ سنگھ کا نام سب سے ابھر کر سامنے آیا ۔اجلاس کے بعد ہونے والے خطاب عام میں راج ناتھ سنگھ کا عوام نے اسی جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا جیسا کہ کسی زمانے میں مودی جی کا ہوتا تھا۔ ان کی تقریر سے قبل نعرے لگانے والوں کا جوش اس قدر تھا کہ لوگ خاموش ہونے کا نام نہ لیتے تھے۔ مودی جی اس سے ٹھٹک گئے۔ اس کے بعد راج ناتھ کا نام کا اعلان تو درکنار دوسرے دن حکمت عملی طے کرنے کیلئے جو نشست رکھی گئی تھی اس میں راج ناتھ کو بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ مودی جی انہیں اپنے ساتھ لے کر دہلی آگئے۔اس کے بعد سے بی جے پی کو اترپردیش میں وزیراعلیٰ کا امیدوار نہیں ملا۔ راج ناتھ سنگھ

بہت طاقتور امیدوار ہے لیکن مودی اور شاہ کی جوڑی انہیں اپنے لئے خطرہ سمجھتی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ جہاں ۲۷ سال بعد مری پڑی کانگریس کی رتھ یاترا کا اترپردیش میں استقبال ہورہاہے وہیں بی جے پی کی نیاّ بیچ منجدھار میں ڈول رہی ہے۔

دلتوں پر مظالم کا معاملہ اترپردیش سے نکل کر گجرات، مہاراشٹر اور کرناٹک تک پھیل گیاہے۔ ابتداء گجرات سے ہوئی جہاں گئو بھکتی کے نشے میں چور رام بھکتوں نے مردہ گائے کی کھال نکالنے والے دلوں کیکھلے عام پٹائی کردی۔ ویسے جولوگ گائے کے پیشاب کو اپنے لئے امرت سمجھتے ہیں ان سے کیا توقع کی جائے؟ ان بے قصور دلتوں کو خودآدرش گجرات کی پولس نے بلوائیوں کے حوالے کیا۔ اس ظلم کے خلاف ملک بھر میں احتجاج ہوااورایوان پارلیمان میں اس کی گونج سنائی دی۔ وزیراعلیٰ آنندی بین پٹیل نے جب کچھ دے دلا کر معاملے کو ٹھنڈا کرنے کوشش کی تو مظلوموں نے جواب دیا ہمیں معاوضہ نہیں انصاف چاہئے۔ ان ظالموں کو ہمارے حوالے کروتاکہ ہم ان سے بدلہ لے سکیں۔ مودی جی اور شاہ جی کو خود اپنی ریاست میں ہونے والا یہ ظلم نظر نہیں آیا جبکہ اس کے خلاف کئی دلتوں نے خودسوزی کی کوشش کی اور ان میں سے ایک ہلاک بھی ہوگیا۔

اترپردیش میں اخلاق احمد کے اہل خانہ کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کے

بعد سنگھ پریوار کے حوصلے اس قدر بلند ہوگئے کہ ان لوگوں نے کرناٹک کے اندر ایک دلت خاندان پر بیف کھانے کا الزام لگا کر اس کی پٹائی کردی۔ بجرنگ دل کے ۴۰ لوگوں نے پہلے تو بلراج اور اسکے اہل خانہ کو ایک گھنٹے تک یرغمال بنائے رکھا اور پھر لاٹھی وہاکی سے ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس حملے میں بلراج کا ہاتھ ٹوٹ گیا اور اس کی اہلیہ و بیٹی بھی زخمی ہوئی۔ کرناٹک میں بیف پر پابندی نہیں ہے ۔ یہاں سے بڑے کا گوشت پڑوسی ریاستوں بلکہ دنیا بھر میں برآمد کیا جاتا ہے لیکن وہاں رہنے والے غریبوں کو اس سے محروم رکھا جارہا ہے۔ دلتوں پر مظالم کے خلاف قانون کے تحت جب ملزمین کے خلاف مقدمہ درج کرکے پولس نے ۷ افراد کو گرفتار کیا تو چوری کے بعد سینہ زوری دکھاتے ہوئے بجرنگ دل کے ساتھ بی جے پی کے رکن اسمبلی نے بھی احتجاجی مظاہرے میں شرکت کی۔

عدم رواداری اور نفرت کی یہ آگ مہاراشٹر میں بھی پھیل رہی ہے۔ بیڑ ضلع میں دو دلتنوجوانوں کو محض اس لئے ۳۰ لوگوں نے راستے میں روک کر زدوکوب کیا کہ ان کی موٹر سائیکل پر ڈاکٹر بابا صاحب کی تصویر آویزاں تھی۔ یہ بات اگر آپ کو حیرت زدہ کرتی ہے کہ آخر ڈاکٹر بابا صاحب کی تصویر میں کیا خرابی ہے تو آپ نہیں جانتے کہ احمد نگر کے پاس کوپرڈی کے مقام پر ایک نابالغ لڑکی کی عصمت دری اور قتل ہوگیا۔جائے واردات سے سیکڑوں میل دور جن موٹر سائیکل

سواروں کو مارا پیٹا گیا ان کا تعلق عصمت دری سے نہیں تھا بلکہ اس ذات سے تھا جس کے فرد نے یہ گھناونا جرم کیا تھا اور ان کو مارنے والے مراٹھا تھے جس سے مظلومہ کا تعلق تھا۔ عصمت دری اور قتل کی تمام تر مذمت کے باوجود کیا مراٹھوں کا یہ رویہ درست ہے ہر دلت پر اپنا غصہ اتاریں؟ لیکن انہیں کون سمجھائے؟ مرکزی وزیر برائے سماجی انصاف رام داس اٹھاولے تک کو خود ان کی حلیف جماعت بی جے پی کے وزیراعلیٰ نے کوپرڈی جانے سے روک دیا اور کہا ۸ دن بعد ہم وہاں جائیں گے۔

اٹھاولے تو خیر دلت ہیں لیکن خود براہمن فردنویس بھی ابھی تک کوپرڈی جانے کی ہمت نہیں جٹا سکے۔ دلت سماج کے دیگر دو رہنماوں ڈاکٹر پرکاش امبیڈکر اور یوگیندر کواڑے کو بھی پولس نے وہاں جانے سے روک دیا۔ کوپرڈی ہی کی طرح کا ایک واقعہ نئی ممبئی میں پیش آیا جہاں سوپنل سوناونے نام کے ایک دلت نوجوان کو محض اس لئے قتل کردیا کہ وہ ایک آگری سماج کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ سوپنل کو لڑکی کے بھائی زبردستی پولس تھانے لے گئے وہاں پر اس سے ڈرا دھمکا کر یہ لکھنے پر مجبور کیا گیا کہ وہ لڑکی سے رابطہ نہیں رکھے گا ساتھ ہی یہ بھی لکھوا لیا گیا کہ اگر اس کے ساتھ کوئی ناگہانی واردات ہو جائے تو اس کیلئے کوئی اور ذمہ دار نہیں ہوگا۔ اس وصیت کے بعد تو گویا اس کے قتل کا پروانہ مل گیا۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ ساری دنیا کوپرڈی تو جانا

چاہتی ہے لیکن کوئی سوناوونے خاندان کی غمگساری کیلئے نوی ممبئی نہیں جانا چاہتا ہے۔
طبقہ واری منافرت کے آتش فشاں اندر ہی اندر پک رہا ہے اور ہم سب اس کے دہانے پر کھڑے ہیں ۔ یہ چونکہ حکمراں جماعت کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے اس لئے وہ پوری طرح بے دست پا ہے۔ اس سنگین مسئلہ کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے کبھی ڈاکٹر ذاکر نائک کے آئی آر یف سے کسی کو گرفتار کرلیا جاتا تو کبھی کلیان یا پربھنی سے مسلم نوجوانوں کوداعش سے تعلق کا بے بنیاد الزام لگا کر اٹھا لیا جاتا ہے۔ داعش کے نام سے جو کھیل چل رہا اس کے بارے میں خود اے ٹی ایس نے محکمہ قانون سے مطالبہ کیا ہے کہ جعلی شکایت کرنے والوں کو سزا دی جائے۔ پچھلے ۸ ماہ میں اس قسم کی ۳۰۰ شکایتیں موصول ہوئی ہیں اور وہ سب کی سب جعلی تھیں ۔ ان میں سے ایک ۸۰ سالہ امام مسجد کے خلاف تھی جو گزشتہ ۲۰ سالوں سے امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔ تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ مسجد کے ٹرسٹ میں آپسی چپقلش رہی تھی ۔ جب ایک گروہ کو محسوس ہوا کہ امام صاحب دوسرے دھڑے کے طرفدار ہیں تو اس نے امام صاحب کو داعش کا طرفدار بنادیا۔
ممبئی کے علاقہ کرلا میں سڑک پر کباب بیچنے والے ایک شخص کے خلاف شکایت

آئی تو پتہ چلا کہ اس کی وجہ سے ایک سبزی فروش کے کاروبار پر پڑنے والے منفی اثرات تھے ۔ ایک دفتر کے اندر کوئی خاتون اپنے ساتھ کام کرنے والے کی کسی مرد میں دلچپسی رکھتی تھی جب اس نے دیکھا کہ وہ مرد کسی اور کی جانب متوجہ ہے تو اس پر داعش سے تعلق کا الزام لگا دیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک خاندان نے شادی کے رشتے کو منظور کرنے سے انکار کردیا تو اس کو پریشان کرنے کیلئے اس کا رشتہ داعش سے جوڑ دیا گیا۔ یہ تمام باتیں پولس کے محکمہ نے بتائی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان فرضی شکایتوں کے پس پشت کہیں ذاتی دشمنی ، کہیں کاروباری مسابقت، کہیں حسد یا ہمسائیگی کی مخاصمت جیسی وجوہات کارفرما ہیں ۔ یہ تو انفرادی معاملات ہیں لیکن جب اس سے سیاسی مفادات وابستہ ہو جائیں اور خود حکومت اس کا استعمال اپنے مخالفین کو ہراساں کرنے کیلئے یا اپنی ناکامیوں کی جانب سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے کرنے لگے تو معاملہ بہت زیادہ بگڑ جاتا ہے ۔

کیرالہ کے ایک شخص ایبن جیکب نے شکایت کی اس کی بہن میرین جیکب جس کا نیا نام مریم ہے اور اس کے شوہر بیکسٹن ونسنٹ جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام یحیٰ رکھ لیا غائب ہوگئے ہیں اس لئے وہ ضرور داعش سے جاکر مل گئے ہوں گے۔ اس اندیشے کی بنیاد پر وہ جس داعی کے ساتھ رابطے میں تھے اسے ممبئی آکر گرفتار کرلیا گیا یہ کس قدر احمقانہ منطق ہے، اس لئے کہ یہ دو سال قبل

کا واقعہ ہے۔ آئی آر ایف کے عرشی قریشی کو ان سے جوڑ کر داعش سے جوڑنے کی کوشش کرنا ایسی مذموم حرکت ہے کہ جس کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ شکایت کنندہ کا تعلق سنگھ پریوار تو درکنار ہندو سماج سے بھی نہیں ہے۔
کیرالہ پولس کی مدد سے یہ گندہ کھیل کھیلنے والی صوبائی حکومت بی جے پی یا کانگریس کی نہیں بلکہ کمیونسٹوں کی ہے اور ان سے سنگھ پریوار کی دشمنی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ قتل و غارتگری تک کی نوبت آتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود کیرالہ کی اشتراکی حکومت کا سنگھ کا آلۂ کار بن کر بے قصور لوگوں کو بلکہ اداروں اور مذہب کو بدنام کرنے کی سازش میں شامل ہوجانا ازحد قابل مذمت ہے۔ بی جے پی کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس طرح کے خواب آور انجکشن سے کام نہیں چلے گا جب یہ آتش فشاں پھٹے گا تو پورے سنگھ پریوار کو اپنے ساتھ بھسم کرلے گا۔ یہ بھسما سور ناچتے ناچتے جب اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر رکھے گا تو خود بھسم ہوجائیگا لیکن اس وقت یہ اپنے ساتھ کتنوں کو نگلے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس موقع مودی جی کو چاہئے کہ وہ نیرو کی مانند بنسی بجانے کے بجائے ابھمنیو کی کہانی سے درس عبرت لیں۔
ابھمنیو کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ چندر دیوتا کے فرزند ورچھا کا اوتار

تھا اور ساتھ ہی شری کرشن کا بھانجا بھی تھا اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماموں نے مدد کرکے اپنے بھانجے کو بچایا کیوں نہیں؟ اس کی بھی ایک نہایت دلچسپ حکایت ہے۔ ابھمنیو اپنے پچھلے جنم میں ابھقصورہ نام کا دانو (شیطان) تھا اور وہ کرشن کے ماما کنس کا دوست تھا۔ راجہ کنس اپنے بھانجے کرشن کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن ہوا یہ کہ کرشن نے کنس کو ٹھکانے لگا دیا۔ ابھقصورہ نے اپنے دوست کنس کے خون کا بدلا لینے کا ارادہ کیا تو شری کرشن نے اسے جادو سے کیڑا بنا کر ایک ڈبے میں بند کر دیا۔ کرشن کی بہن سبھدرا نے ارجن سے شادی کے بعد غلطی سے ڈبہ کھول دیا۔ وہ کیڑا رحم میں داخل ہوگیا اس طرح ابھمنیو کی پیدائش ہوئی۔ جب ارجن نے کرشن سے اپنے بیٹے کے موت کی شکایت کی تو اس نے بتایا کہ میں نے پچھلے جنم کا بدلا لیا ہے۔ مودی جی نے بھی وزیراعلیٰ کے دور میں جن لوگوں کو جینا دوبھر کردیا تھا اور اب بھی جس طرح راج ناتھ تو دور اپنی منظور نظر سمرتی ایرانی کو ناراض کررہے ہیں اس سے ان کے خلاف بھی کئی ابھقصورہ تیار ہوگئے ہیں۔ وہ سب انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں اور مودی جی کے چکرویوہ میں پھنسنے کا انتظار کررہے ہیں۔ مودی جی کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جب وہ پھنس جائیں گے تو ارجن کی مانند نہ سنگھ پریوار کچھ کرسکے گا اور نہ کرشن کی طرح امیت شاہ حمایت میں آئے گا۔

گئو ماتا کے رکشک یا بھارت ماتا کے بھکشک

اندیور نے ۱۹۷۱ میں فلم چھوٹی بہن کیلئے ایک بھجن لکھا جس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کو رفیع، کشور، لتا اور آشا سب نے گایا۔ اس بھجن کے بول ''ہے رے کنھیا کس کو کہے گا تو میّا، ایک نے تجھ کو جنم دیا اور ایک نے تجھ کو پالا'' پوری طرح سنگھ پریوار پر صادق آتے ہیں۔ سنگھ پریوار کی بھی کرشن کنھیا کی طرح دو مائیں ہیں۔ ایک بھارت ماتا اور دوسری گئو ماتا۔ ایک نے اس کو جنم دیا اور ایک نے اس کو پالا۔اس لئے یہ باہر سے شیر نظر آتا ہے اس لئے کھال تو ماں کی ہے لیکن اندر سے بیل ہیں اس لئے کہ پرورش شیر کے بجائے گائے کا دودھ پی کر ہوئی ہے۔ سنگھ پریوار کی سانڈوں والی حرکت کا یہی راز ہے۔ سانڈ چونکہ نہایت احمق جانور ہے اس لئے لوگ اس سے دور ہی رہتے ہیں۔ اندیور نے آخری بند میں لکھا تھا۔ ''ایک نے تجھ کو دی ہیں رے آنکھیں ایک نے دیا اجالا''۔ اب ان بیچاروں کو گائے کیا اجالا دیتی اس لئے یہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ عقل کا استعمال بالکل نہیں کرتے اور صرف لاٹھی کی زبان سمجھتے ہیں۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ عامر خان کے صرف یہ کہنے پر کہ ان کی اہلیہ نے ہندوستان چھوڑنے کا مشورہ دیا ہے ان دیش بھکتوں آسمان سر پر اٹھا لیا لیکن اروند کیجریوال کے یہ کہہ دینے پر بھی یہ لوگ مجھے مروا بھی سکتے ہیں سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

پہلے زمانے میں مویشی کسان کی جمع پونجی ہوا کرتے تھے۔ جب فصل اچھی ہوتی اور وہ خوشحال ہوجاتا تو گائے بیل خرید کر رکھ لیتا بعد میں جب بدحالی آتی تو انہیں بیچ کر اپنا گذارہ کرتا۔ اب حال یہ ہے کہ جن ریاستوں میں گئو کشی پر پابندی ہے گائے بیل کی کھپت ہی ختم ہو گئی ہے۔ خشک سالی کے دوران جب کسان خود دانے دانے محتاج ہو جاتا ہے اسے بلاوجہ اپنے مویشیوں کو بھی پالنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ بازار میں ان کا کوئی خریدار نہیں ہے۔ پہلے کچھ لوگ ان مویشیوں کو ہانک کر یا گاڑیوں میں سوار کرکے ان ریاستوں میں لے جاتے تھے جہاں گئو کشی کی اجازت ہے اب تو دہشت کا یہ عالم ہے مویشیوں کو بازار لے جانے والوں کی بھی جان کو خود ساختہ ہندو ملیشیا سے خطرہ لاحق ہے۔ اس لئے کوئی ان کے قریب نہیں پھٹکتا۔ ایسے میں کسان پریشان ہے کہ اپنے بچوں کا پیٹ پالے، اپنی اصلی ماں کی بھوک مٹائے یا اس نقلی ماں کا پیٹ بھرے۔ کسانوں کا بوجھ ڈھونے والے بیل کو اس حکومت نے کسانوں پر بوجھ بنا دیا ہے۔ کسان کو مجبور کردیا گیا ہے کہ دودھ دینا بند کردینے والی گائے کو آوارہ گھومنے کیلئے چھوڑ دیا جائے ۔

.بڑے جانور کا گوشت جب انسانوں کی غذا تھے تو شیر چیتے کافی محنت کرکے جنگلی جانوروں کا شکار کرکے ان پر گزارہ کرتے تھے۔ اب حال یہ ہے کہ گائے بیل ویسے ہی چلتے پھرتے مل جاتے ہیں بس فرق یہ ہے کہ اس کیلئے وحشی جانوروں کو

جنگل سے نکل شہروں میں آنا پڑتا ہے۔ ویسے فی زمانہ شہروں کے لوگ درندوں سے زیادہ گئو ماتا کے بھکتوں سے دہشت زدہ ہیں اس لئے کسی کو پریشانی نہیں ہوتی۔ درندہ تو بیچارہ بھوک کا مارا ڈرتے ڈرتے چوروں کی مانند شہروں میں منہ اندھیرے داخل ہوتا ہے اور چپ چاپ بے ضرر لاوارث جانوروں کو لے کر بھاگ جاتا ہے لیکن یہ خونخوار تونددمل بھکت تو بلا خوف وخطر کہیں بھی وقت منہ مارتے پھرتے ہیں۔

خواتین تک ان کے عتاب سے محفوظ نہیں ہیں۔مدھیہ پردیش کے مندسور ریلوے اسٹیشن پر کھلے عام سلمیٰ اسماعیل میواتی اور شمیم اختر حسین کو گالی گلوچ کے بعد زدوکوب کرنے والی شرمناک ویڈیو اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

اس سے قبل گجرات میں اونا کے مقام پر جہاں ۷ دلتوں کو گئو کشی کے الزام میں مارا پیٹا کیا گیا۔اونا کے ایک چشم دید گواہ دھیمنت راٹھور کے مطابق اس نے خود رات ساڑھے گیارہ بجے دیکھا کہ ناجا شیورہ اہیر کی گائے کا شکار کرکے ایک شیرنی اپنے تین بچوں کے ساتھ کھا رہی ہے۔ شیرنی کھلے عام دو گھنٹوں تک گئو ماتا کو نوش فرماتی رہی یقیناً راٹھور کی طرح اور لوگوں نے بھی اپنی چھت کے اوپر سے یہ منظر دیکھا ہوگا لیکن کوئی مائی کا لال اپنے بِل سے باہر نہیں آیا۔ شیرنی کی موجودگی میں کسی بیل کو گئو ماتا کی یاد نہیں آئی۔ دوسرے دن صبحبالو سرویہ کو بلا کر اسے ٹھکانے لگانے کیلئے کہا گیا اور جب

وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گائے کی کھال اور دیگر مفید باقیات نکال رہا تھا تو اچانک سارے چوہے شیر بن کر بے قصور لوگوں پر ٹوٹ پڑے۔ اب حال یہ ہے کہ دلتوں نے مردہ جانوروں کو ہاتھ لگانا ترک کر دیا ہے بلکہ ایک گائے کی لاش تو وہ ضلع کلکٹر کے دفتر کے سامنے لے جاکر پھینک آئے ہیں۔

اس دوران ضلع انتظامیہ کو مردہ جانوروں کی تدفین کا ایک نیا مشغلہ مل گیا ہے اور صرف اونا ضلع میں ایک ہفتہ میں سرکاری خرچ سے ۱۵۰ جانوروں کو دفنایا جاچکا ہے۔ اسے کہتے ہیں بیل کا دماغ کہ پہلے جب مویشیوں کی افادیت ختم ہوجاتی تھی تو ہندو کسان انہیں قصائی کو بیچ دیتا تھا دونوں کو دو پیسے مل جاتے تھے۔ اب ان جانوروں کو درندے کھارہے ہیں کسی کو کچھ نہیں ملتا۔جب یہ مویشی اپنی فطری موت مرجاتے تھے تو انہیں دلتوں کے حوالے کردیا جاتا تھا۔ وہ بلا قیمت اس کا کام تمام کردیا کرتے تھے۔ اس کی کھال اور سینگ وغیرہ سے دو پیسے کمالیتے تھے۔ اب وہ بھی نہیں ہوتا۔ کھالوں سے چمڑے کی صنعت اور چمڑے سے جوتے کی صنعت پھلتی پھولتی تھی اب وہ بھی جیتے جی دفن ہورہی۔ اسی کے ساتھ آستھا کے نام پر دیہی معیشت کے ایک اہم ستون کو مسمار کردیا گیا ہے جو عوامی فلاح و بہبود کا سبب تھا۔اس طرح اندرونِ ملک چمڑے کی صنعت جب اجڑ جائیگی تو جوتے بیرونِ ممالک سے درآمد کئے جائیں گے۔ ایسے میں عوام چینی جوتوں کے ساتھ انتخاب کا انتظار کریں گے تاکہ امپورٹیڈ جوتے سے اس حکومت

کی آرتی اتاری جائے۔

فی زمانہ گئو بھکتوں کے بلند حوصلوں کی بنیادی وجہ پولس کی ہمدردی یا خوفزدہ ہونا ہے۔ وہ ان کا بال بیکا نہیں کرتی بلکہ مظلوموں کو گرفتار کرکے ان کے خلاف مقدمہ درج کردیتی ہے۔ مندسور میں یہی ہوا جب پولس سے پوچھا گیا کہ ابھی تو فورنسک کی رپورٹ بھی نہیں آئی جو یہ ثابت کرے کہ وہ گائے گوشت تھا اور تم نے ملزم خواتین کو متعدد الزامات میں گرفتار بھی کرلیا تو اس نے جواب دیا جب رپورٹ آئیگی تو لگادی جائیگی ۔ انتظامیہ کا اعتماد بتاتا تھا کہ رپورٹ کیا آئیگی اور جب پولس سے یہ پوچھا گیا کہ بلوائیوں کو کیوں گرفتار نہیں کیا تو جواب تھا ہمیں کوئی شکایت نہیں ملی شکایت کے ملنے پر ان کے خلاف بھی کارروائی ہوگی ۔ یہ عجب انصاف ہے مظلوم کو بلا شکایت گرفتار کرلیا جائے لیکن ان ظالموں کو پکڑنے کیلئے جن کی ویڈیو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے آنکھیں موند کر شکایت کا انتظار جائے۔

اس معاملے میں ابتدائی فورنسک رپورٹ نے ثابت کیا کہ گوشت گائے کا نہیں بلکہ بھینس کا تھا اس لئے خواتین کو رہا ہوگئیں لیکن چونکہ اس واردات کی مذمت ایوان پارلیمان میں بھی ہوئی اس لئے مجبوراً ۴ مردوں کو بے دلی سے گرفتار کیا گیا۔ دراصل ویڈیو کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان نامردوں

کوملزم خواتین نے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ اس کے بعد بھارت ماتا کے ویر سپوت اپنی عورتوں کے پاس آئے اور درگا واہنی کے جم غفیر نے ایک زخمی اور دوسری خاتون پر یلغار کردی۔ حملہ آور مردوں کے ساتھ ساتھ زیادتی کرنے والی عورتوں بھی حراست میں لیا جایا ضروری ہے تاکہ دوبارہ وہ جھانسی کی رانیاں کسی بزدل کے جھانسے میں نہ آئیں۔ اس ویڈیو کی مدد سے خواتین کی شناخت بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن پولس ان خواتین کے خاکے جاری کرکے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ ویسے جن غنڈوں کو گرفتار کیا گیا ہے انہیں بھی یقین ہوگا کہ عدالت میں مقدمہ کمزور کردیا جائیگا اور ناکافی ثبوت کی بناء پر وہ باعزت رہا کردیئے جائیں گے۔

مندسور یں سلمیٰ اسماعیل اور شمیم اختر کے خلاف بہادری دکھانے والوں کا نفاق اسی سال جنوری کے اندر مدھیہ پردیش ہی میں دیواس سے ۳۰ کلومیٹر دور ٹون خورد نامی گاوں میں دیکھا جاسکتا ہے جہاں پولس نے ایک بی جے پی رہنما انور میو اور اس کے چار رشتے داروں کو گائے ذبح کرنے کے بعد گوشت کے ساتھ گرفتار کرلیا تھا۔ انور بی جے پی کے اقلیتی سیل کی ضلعی شاخ سے متعلق تھا۔ پولس کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق گوشت گائے کا تھا اور اس کا نمونہ تصدیق کیلئے متھرا روانہ کردیا گیا تھا لیکن پھر معاملہ دب گیا۔ اس واقعہ کے منظر عام پر آتے ہی بی جے پی نے انور کو پارٹی سے نکال باہر کیا لیکن یہ حقیقت

ہے کہ جس وقت انور نے اپنے گھر میں گائے ذبح کی وہ بی جے پی کے اندر تھا۔
اس واردات کے بعدجب علاقہ میں تناؤ پھیل گیا تو اضافی پولس بندوبست تعینات کر دیا گیاجو لازماً انور کی حفاظت کیلئے تھا۔ انتظامیہ نے فوراً امن کمیٹی کا اجلاس بلایا تاکہ کشیدگی قابو سے باہر نہ ہو جائے۔ اس دوران کسی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی گئی اور ملزمین پر کوئی دست درازی کی جرأت نہیں کرسکا اس لئے کہ وہ بارسوخ لوگ تھے۔ ان دلیروں گئو بھکتوں کا ہاتھ کمزور اور بے بس خواتین پر تو اٹھ جاتا ہے لیکن طاقتور کی جانب یہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔انور میو کے پاس جانور کے ذبیحہ کا لائسنس تھا لیکن برسوں سے اس کی تجدید نہیں ہوئی تھی اور اس میں بھی گائے ذبح کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بی جے پی کے دورِ اقتدار میں سنگھ کا آدمی اگر مسلمان ہو تب بھی حفظ و امان میں رہتا ہے۔
کیا یہ محض اتفاق ہے کہ جس روز سپریم کورٹ یں ویاپم گھوٹالا فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگیاتو اسی دن یہ واقعہ ذرائع ابلاغ کچھ اس طرح چھاگیا کہ عدالت عالیہ کی ڈانٹ پھٹکار اس کے شور شرابے میں پوری طرح دب گئی۔ عدالت نے ویاپم کوایک قومی سطح کی بدعنوانی قرار دیا اور کہا کہ یہ گھوٹالا ہمیں بے حد

چونکا رہا ہے۔ اس پر آنکھیں موند لینے سے یہ نہیں رکے گا۔ یہ سال در سال ہونے والی بدعنوانی ہے۔ یہ اجتماعی نقل کا نہیں بلکہ ایسا عظیم گھوٹالا ہے جس میں رول نمبر تک بدل دیئے گئے۔ کورٹ نے سنجیدہ اور محنتی طلباء کی حق تلفی کو تسلیم کیا۔ اپنے فیصلے میں عدالت عالیہ نے سی بی آئی کو تفتیش میں سست روی کیلئے آڑے ہاتھوں لیا اور پوچھا کہ اب تک کیا ہوا؟ اور جانچ کب تک مکمل ہوگی؟ دراصل ویاپم کا معاملہ صرف داخلے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف آواز اٹھانے والے کئی سماجی کارکن اور صحافیوں کو پراسرار انداز میں قتل کردیا گیا ہے۔ وہ تو خیر صوبے میں اور مرکز میں بی جے پی کی سرکار ہے ورنہ وزیراعلیٰ کب کے جیل کی چکی پیس رہے ہوتے لیکن پھر بھی بکرے کی ماں کب تک گئو ماتا کی شرن میں خیر منائے گی۔

گئو رکشا کو لے کر آج کل ایوان پارلیمان سے لے کر سڑک تک اور ذرائع ابلاغ سے عدالت تک ہر طرف ہنگامہ مچا ہوا ہے لیکن مودی جی خاموش ہیں۔ اس پر حیرت کا اظہار بھی کیا جارہا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ احمد آباد سے دہلی آنے کے بعد وہ اونچا سننے لگے ہیں۔ ان کو عوام کی فریاد یا عدالت کی پھٹکار تو نہیں مگر امریکہ کی ڈانٹ ضرور سنائی دیتی ہے۔ امریکی چمڑی بھی خاصی موٹی ہے اس لئے اس کو بہت تاخیر سے ہوش آتا ہے۔ گزشتہ سال گرجا گھروں کے خلاف سنگھ پریوار کے حملے جب بہت تیز ہوگئے تب کہیں جاکر براک اوبامہ نے اس کی مذمت کی

اور مودی جی پر بھی اس کا اثر ہوا۔اب بھوہ امریکی ڈنڈے کا انتظار کرتے رہے اور بالآخر مندسور سانحہ کے بعد امریکہ کا مذمتی بیان آہی گیا۔ وزارت خارجہ کے ترجمان جان کربی نے نہ صرف تشویش کا اظہار کیا بلکہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی دہائی دی۔ امید ہے چین میں اوبامہ کے ساتھ ملاقات سے قبل مودی جی اپنی چپیّ توڑیں گے۔
اس بابت بنیادی سوال یہ ہے کہ جو بے وقوف گئو رکشک معصوم لوگوں پر حملے کرتے پھرتے ہیں وہ ہندو ہردیہ سمراٹ سے یہ نہیں پوچھتے کہ یوپی اے کی حکومت میں جب بیف کی درآمد کے سبب ہندوستان میں گلابی انقلاب آیا توآپ کا سر شرم جھک گیا تھا ۔اس وقت ہندوستان.برازیل کے بعد دوسرے نمبرپر تھا اب پہلے نمبرپر آگیا ہے توآپ کا سینۂفخر سے پھولا ہوا کیوں ہے ؟آپ کی سرکار نے اپنے بجٹ میں نئے مذبح خانوں کی تعمیر اور تجدید کیلئے ۱۵ کروڑ کیوں مختص کئے؟ مذبح خانوں کے قیام پر دی جانے والی ۱۳ قسم کی سرکاری سہولتیں ہنوز کیوں جاری و ساری ہیں؟ مثلاًسرد خانوں پر ۵۰ سے ۱۰۰ فیصد تک کی چھوٹ ہے۔ پیکنگ پر ۳۰ فیصد کی اور اس کے لٹریچر کی اشاعت پر ۴۰ فیصد کی سہولت ہے۔ماہرین سے استفادہ اور عملہ کی تربیت پر بھی ۵۰ فیصد کی بچت ہے۔ عام لوگوں کے استعمال کی گھریلو گیس کی سبسڈی ختم کرنے پر تو خوب زور دیا جاتا ہے لیکن بیف کی.برآمد پرانکم ٹیکس کی دفع ۸۰ کے تحت جو چھوٹ ہے اس کو کیوں

ختم نہیں کیا جاتا؟

مودی سرکار بیف کاروبار کے فروغ میں اس قدر دلچسپی رکھتی ہے کہ اس نے نئے مذبح خانوں میں لگنے والی مشینوں اور کل پرزوں کی درآمد پر لگنے والے ۱۰ فیصد ٹیکس کو گھٹا کر ۴ فیصد کردیا اور یہ حقیقت ہے کہ مودی سرکار کے اقتدار میں آتے ہی پہلے ۶ ماہ میں بیف کی درآمد ۱۵ فیصد بڑھ گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سرکاری سہولتوں سے فائدہ کون اٹھا رہا ہے؟ کاش کے یہ احمق گئو رکشک جانتے کہ بیف برآمد کرنے والی ۶ بڑی کمپنیوں کے مالکین میں کئی ہندو ہیں ۔ اس کاروبار میں ملوث ۵۰ فیصد لوگ ہندو سماج سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مظفر نگر کے فساد میں ملوث بی جے پی رہنما سوم پال نے بھی علی گڑھ میں ایک مذبح خانہ کھول رکھا تھا۔ بی جے پی کو انتخاب سے قبل چندہ دینے والوں میں ایک بڑا نام الانا کا بھی ہے جو بیف برآمد کرنے والا معروف ادارہ ہے۔

ایک طرف عام لوگوں کو بیف کے ساتھ دیکھ کر زدوکوب کیا جاتا ہے دوسری طرف بیف بیچنے والی غیر ملکی کمپنیوں مثلاً کے ایف سی ، میک ڈونالڈ اور ڈومینوز کو لائسنس دیا جاتا ہے اور ان سے استفادہ کرنے والے گاہکوں کی بڑی تعداد غریب مسلمان نہیں بلکہ امیر ہندو ہے۔

ہندوستان جس وقت آزاد ہوا یہاں کوئی قومی گوکل مشن نہیں تھا جس پر ۵۰۰

کروڑ روپے خرچ کئے جاتے لیکن اس کے باوجود ملک میں گوونش یعنی گائے، بچھڑے بیل اور سانڈ کی تعداد ایک ارب اور ۲۱ کروڑ کے آس پاس تھی جبکہ ملک کی آبادی، صرف ۳۵ کروڑ تھی ۔ اب آبادی بڑھ کر اارب ۲۱ کروڑ کو پار کر گئی لیکن گوونش گھٹ کر ۱۰ کروڑ پر آگیا۔ گئو بھکتوں کو یہ سوال حکومت سے کرنا چاہئے کہ گائے کی نسل کو بچانے کے بے شمار قوانین کے باوجود یہ الٹ پھیر کیوں ہوگیا؟ کیا یہ اعداد و شمار ان دعوں کو مشکوک نہیں بناتے کے صرف بھینس کا گوشت برآمد کیا جاتا ہے؟ ایک جانب بڑے سرمایہ دار سرکاری خزانے کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں دوسری طرف کبھی آستھا تو کبھی میک ان انڈیا کا نعرہ لگا کر عوام کو جھنجھنا پکڑا دیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندو عوام پر کبھی گئو ماتا تو کبھی بھارت ماتا کا جنون سوار کرکے انہیں عام مسلمانوں اور دلتوں کے پیچھے لگا دیا جاتا ہےاوراس ہیجانی آڑ میں کچھ خاص سرمایہ دار اپنے سیاسی آقاوں کی مدد سے اپنی تجوری بھرتے رہے ایں ۔ عیش کوئی اور کرتا ہے اور اس کی قیمت کوئی اور چکاتا ہے۔

مودی جی: نہ تم سے رہبری ہوگی، نہ ہم سے پیروی ہوگی

دو سال دو ماہ قبل نئی حکومت کے جو نئے چہرے سیاسی افق پر نمودار ہوئے تھے ان میں سے تین کا تعلق گجرات سے تھا اور ایک کا دہلی سے باقی سارے وہی تھے جو برسوں سے ایوان پارلیمان اور ٹی وی کے پردے پر نظر آتے رہے تھے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے ان چاروں میں سے ایک مرد تھا اور تین وخواتین تھیں ۔اس عرصے میں تینوں خواتین کی نیاڈوب چکی ہے اور چوتھا ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ اسی کے ساتھ منجدھار میں ہچکولے کھاتیکشتی کا ناخدا سر پکڑ کر سوچ رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو گمنامی کے سمندر میں غرق ہونے سے کیسے بچائے؟ مسئلہ صرف گمنامیتک محدود نہیں بلکہ بدنامی کے دلدل تک جا پہنچا ہے۔ اسبدبو دار دلدل میں وزیراعظم ۳۶ انچ کے سینے تک دھنس چکے ہیں اور باہر نکلنے کیلئے جتنا ہاتھ پیر مارتے ہیں اتنا ہی نیچے اترتے جاتے ہیں۔ ایسے میں انہیں نہ گائے کے نام پر ہونے والے مظالم نظر آتے ہیں، نہ کشمیر میں چلنے والی گولیوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور نہ مہنگائی کے کوڑے محسوس ہوتے ہیں۔ انہیں تو صرف اور صرف اپنی کرسی دکھائی دیتی ہے جسے دیمک تیزی سے چاٹ رہی ہے اور جس کی ٹانگیں ایک ایک کرکے ٹوٹ رہی ہیں۔ ایسے میں اگر وہ گم سم مونی بابا بنے ہوئے ہیں تو حیرت کی کیا بات ہے۔ زوال پذیر وزیراعظم کی حالت زار ان آیات کی مصداق ہے:

رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے، تو انہیں ہم بتدریج ایسے ”طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہو گی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں، میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے“

وزیراعظم نریندر مودی نے اپنی کابینہ میں اہم وزارتیں جن کو سونپیں ان میں سے ایک ارون جیٹلی تھے جو پہلے راجیہ سبھا میں بی جے پی کے لیڈر تھے، سشما سوراج لوک سبھا میں پارٹی کی رہنما تھیں اور راجناتھ سنگھ پارٹی کے صدر تھے۔ اتفاق سے ان تینوں میں سے کوئی ۷۵ سال کا نہیں ہوا تھا اس لئے بادلِ ناخواستہ ان سب کو اہم ترین وزارتوں سے نوازنا پڑا۔ داخلہ، خارجہ، دفاع اور خزانہ کی تقسیم کے بعد سب سے اہم وزارت انسانی وسائل کے فروغ کی تھی۔ کسی زمانے میں یہ وزارت تعلیم کہلاتی تھی ۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ہندوستان کا پہلا وزیر تعلیم مسلمان تھا اور ۱۹۸۵ میں اس کا چہرہ بدلنے تک ۱۵ میں ۵ وزرائے تعلیم مسلمان تھے ۔اب یہ سلسہ بند ہوچکا ہے مگر مسلمان وزراء کی غیر موجودگی کو مثال بنا کرامت کی سیاسی بے وزنی کا ماتم کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ مسلم وزرائے تعلیم کے کارناموں کا اندازہ لگانے کیلئے سچرّ کمیٹی کی رپورٹ دیکھ لیں ساری قلعی کھل جائیگی ۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ وزارت انسانی وسائل کے قیام سے قبل یا بعد کسی خاتون کو یہ عہدہ نصیب نہیں ہوا لیکن وزیراعظم نریندر مودی نے پہلی بار بڑی جرأت کا

مظاہرہ کرتے ہوئے محترمہ سمرتی ایرانی کو اس کام کیلئے منتخب کیا۔ یہ مودی جی کی مجبوری نہیں بلکہ ان کی اپنی پسند تھی۔ سمرتی ایرانیبی جے پی کے بے شار شکست خوردہ امیدواروں میں سے ایک تھیں۔ ان کو شہرت اپنے علم و فضل یا کسی سیاسی و سماجی خدمت کیلئے نہیں بلکہ ساس بھی کبھی بہو تھی نامی سیریل میں اداکاری کے سبب ملی تھی ۔ اس کے باوجود چونکہ ان کا تعلق گجرات سے تھا اور وہ مودی جی کی منظور نظر تھیں اس لئے انہیں اس اہم ترین عہدے پر فائز ہونا نصیب ہوگیا۔

وقت کے ساتھ وہ سمرتی ایرانی سے منو سمرتی یر قانی میں تبدیل ہوگئیں ۔ نظام تعلیم پر زعفرانی رنگ چڑھانے کی سعی میں وہ وقتاً فوقتاً تنقید کا نشانہ بنتی رہیں۔ کبھی گیتا تو کبھی یوگا کو لازمی قرار دے کر انہوں نے سنگھی رہنماوں کو خوش کرنے کوشش کی لیکن پھر ان کا ستارہ گردش میں آگیا۔ جے این یو کے معاملے میں انہوں نے پہلے تو کنھیا کمار کی گھیرا بندی کی اور ایک نامور تعلیمی ادارے میں پولس کی چڑھائی کروادی ۔ صرف ہم دیش بھکت ہیں اور باقی سارے دیش دروہی ہیں کا نعرہ لگا کر عمر فاروق اور انیر بن بھٹا چاریہ کو بھی کنہیا کے ساتھ گرفتار کروادیا۔ کنھیا کمار کو بدنام کرنے کیلئے سمرتی کے اپنے دفتر میں ویڈیو سے چھیڑ چھاڑ کی گئی۔ جے این یو کے اندر ہونے والے مظاہرے کی تصاویر کے پیچھے کشمیری مظاہرے کی آواز کو چسپاں کرکے

زرخرید ذرائع ابلاغ کو تھما دیا گیا۔ اس معاملے میں طلباء کے بجائے سمرتی ایرانی کو جیل جانا چاہئے تھا لیکن وہ بچا لی گئیں۔

ملک کے ایک نہایت پر وقار تعلیمی ادارے کے خلاف دھرم یدھ چھیڑنے والی سمرتی ایرانی کی اپنی ڈگری کا معاملہ جب سامنے آیا تو اس کا سر پیر ہی نہیں تھا۔ مختلف حلف ناموں میں سمرتی ایرانی نے اپنی تعلیمی قابلیت کی بابت متضاد معلومات دے رکھی تھیں جن سے ظاہر تھا کہ وہ سب کی سب جھوٹی ہیں یا ان میں سے کچھ جعلی ضرور ہے۔ ایک نہایت شرمناک صورتحال میں قومی وزیرانسانی وسائل کی ڈگری تنازعات میں گھر گئی تھی اور معاملہ عدالت میں پہنچ گیا۔ اگر وزیر موصوف میں خودداری ہوتی تو وہ خود اخلاقی بنیاد پر استعفیٰ پیش کر دیتیں لیکن اقتدار کے بھوکے سنگھ پریوار سے ایسی توقع بے کار ہے۔ سنگھ پریوار کیلئے بھی یہ قابلِ شرم بات ہے کہ تقریباً ۱۰۰ سالوں کی جدوجہد کے بعد جب اقتدار نصیب ہوا تو وہ ایک قابل اور پڑھا لکھا وزیر تعلیم نہیں دے سکا۔ وہ لوگ قبلِ رحم ہیں جو اس کے باوجود سنگھ کی تعریف و توصیف میں آسمان اور زمین کے قلابے ملا کر مرعوبیت کا شکار رہنا چاہتے ہیں۔

سمرتی ایرانی نے جے این یو کے سانحہ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ حیدرآباد کے روہت ویمولا کو اپنی جماعت کے رکن پارلیمان کے دباو میں آکر خودکشی کیلئے

مجبور کیا۔ روہت کی بابت وہ ایک کے بعد ایک جھوٹ بولتی چلی گئیں ۔ ایوان پارلیمان کو انھوں نے اپنی کذب گوئی سے گمراہ کیا۔ وائس چانسلر جنہیں عارضی طور پر چھٹی پر روانہ کیا گیا تھا دوبارہ بال کر کے اپنی دبنگائی دکھائی۔ احتجاج اور مظاہرہ کرنے والے بے قصور نہتے طلباء کو گرفتار کرکے ان پر طرح طرح کے مظالم کئے لیکن جبر واستبداد کے یہ بادل وقت کے ساتھ چھٹ گئے ۔ جے این یو سے لے کر حیدرآباد تک جو نوجوان گرفتار ہوئے تھے وہ سب تو چھوٹ گئے لیکن سمرتی ایرانی دھر لی گئیں اور ان کے داغدار دامن کو وزارت پوشاک کے کفن سے ڈھانپ دیا گیا۔ اس طرح مودی جی کی پسند کا ایک تارہ ٹوٹ کر گر گیا۔ سمرتی ایرانی کے دردناک انجام پر قرآن مجید کی یہ آیات یاد آتی ہیں کہ :

"جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں، اُن کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انہیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر اُن کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔"

دہلی انتخاب سے قبل مودی جی کے دست راست امیت شاہ نے کرن بیدی کو وزیراعلیٰ کا امیدوار بنا کر ساری قوم کو چونکا دیا۔ اس وقت ان کی رعونت کا یہ عالم

تھا کہ ان میں سے ایک اپنے آپ کو چانکیہ اور دوسرا خود کو سمراٹ اشوک سمجھتا تھا۔
سمرتی کی مانند کرن بیدی بھی سیاست کے میدان میں نووارد تھیں لیکن ان کا پولسیا دماغ بالکل مودی شاہ کی جوڑی کی طرح چلتا تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ ان کی آمد سے بی جے پی کی دہلی یونٹ کو جو زخم لگا کرن بیدی نے اس پر زخم لگانے کی پے درپے کوششیں کیں جس کے نتیجے میں ساری پارٹی بددل ہو گئی ۔ مودی جی کا اوبامہ کے سہارے انتخاب میں کامیابی کا آخری حربہ بھی ناکام رہا۔ بی جے پی ۳۱ سے ۳ پر پہنچ گئی ۔ کرن بیدی خود اپنے حلقہ انتخاب میں ہار گئیں اس طرح مودی جی کے دوسرے حسنِ انتخاب پر عآپ کا جھاڑو پھر گیا۔ آج کل وہ گورنر کی حیثیت سے پدوچیری میں کالا پانی کی سزا بھگت رہی ہیں۔
وزیراعظم کے احمدآباد سے دہلی چلے جانے کے بعد سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوا کہ آخر گجرات کا وزیراعلیٰ کون بنے گا ؟ یہ اس قدر مشکل سوال تھا کہ اس کا درست جواب دے کرامیتابھ بچن کے ہاتھوں کروڑپتی بنا جا سکتا تھا۔ مودی جی اپنے ۱۲ سالہ دورِ اقتدار میں سارے مسابقین کا سپڑا صاف کر چکے تھے ۔ ان کے علاوہ صرف امیت شاہ کا نام کبھی کبھار اس لئے سنا جاتا تھا کہ وہ سہراب الدین انکاونٹر میں ماخوذ تھے۔ انہیں گجرات سے تڑی پار کیا جا چکا تھا اور وہ جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ اس کے باوجود مایا کوندنانی کی طرح مودی جی انہیں

وزیر اعلیٰ بنا سکتے تھے لیکن ان کا ماسٹر پلان کچھ اور تھا اس لئے آنندی بین کو یہ وراثت سونپی گئی۔ مودی جی کی یہ تیسری پسند تھی جس میں کسی کا عمل دخل نہیں تھا لیکن اب توآنندی بین کا آنند بھی چھن چکا ہے۔ انہوں نے پہلے تو فیس بک پر اپنا استعفیٰ امیت شاہ کے منھ پر دے مارا اور اس کے بعد لے جاکر گورنر کو سونپ دیا۔

آنندی بین نے استعفیٰ کیلئے عمر کو بہانہ بنایا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کی عمر اچانک ۷۴ سال کی ہو گئی۔ دوسال قبل ان کی عمر ۷۲ سال تھی اس وقت بھی وہ معذرت کر سکتی تھیں کہ اس عمر میں انہیں زحمت دینے کے بجائے کسی کم عمر کو وزیر اعلیٰ بنایا جائے جو آئندہ انتخاب جیت سکے لیکن وہ ایسا کیوں کہتیں اس وقت تو سارا ملک یہ سوچتا تھا کہ انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے مودی جی کا نام کافی ہے۔ ان کے ہوتے بھلا کسی اور کی کیا ضرورت؟ لیکن آنندی بین کا استعفیٰ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ مودی جی سارے ملک میں تو کجا خود اپنی کرم بھومی گجرات میں بھی اپنے بل بوتے پر انتخاب نہیں جیت سکتے۔ ویسے بیچاری آنندی بین کو اگر پتہ ہوتا کہ ان کے خلاف خود ان کی اپنی پٹیل برادری بغاوت کردے گی اور دلت سماج نہ صرف مری ہوئی گایوں کے کریا کرم بلکہ صاف صفائی کرنے سے بھی انکار کردے گا تو وہ یقیناً اس رسوا کن صورتحال سے بچنے کیلئے وزیر اعلیٰ نہیں بنتیں لیکن علم غیب تو صرف خالق و

کائنات کے پاس ہے۔ انسانوں کے اندازوں کا کیا کہ ان میں سے جتنے درست نکلتے ہیں ان سے کہیں زیادہ غلط ثابت ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آنندی بین کے استعفیٰ کی بنیادی وجہ ہاردک پٹیل کی تحریک اور اونا کے مظالم کے خلاف دلتوں کا غم و غصہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاٹیدار آندلن دلتوں کے احتجاج کی بہ نسبت زیادہ قوی تھا لیکن آنندی بین کو اس وقت نہیں ہٹایا گیا اور اب چلتا کردیا گیا۔ اس کی ٹھوس سیاسی وجوہات کا اندازہ گجرات کی سیاست کے اجزائے ترکیبی سے واقف لوگ ہی لگا سکتے ہیں۔ گجرات گاندھی جی کی جنم بھومی اور کرم بھومی ہے اس لئے وہاں کے عوام میں کانگریس سے محبت اور گاندھی کے قاتلوں سے نفرت ایک فطری چیز تھی جس کے سبب عرصۂ دراز تک گجرات میں کانگریس پارٹی بلا شرکت غیرے حکومت کرتی رہی۔ اس میں دراڑ ۱۹۷۳ء میں پڑی جب چمن بھائی پٹیل کے خلاف بدعنوانی کے نام پر نونرمان آندولن شروع ہوا۔ اس تحریک میں کانگریس (او) کے علاوہ جن سنگھ شریک تھی۔ پرانی کانگریس تو آگے چل کر مرکھپ گئی لیکن اس تحریک نے بی جے پی کی ماں جن سنگھ میں نئی روح پھونک دی۔ جن سنگھ نے نونرمان میں فرقہ پرستی کا زہر گھول کر پٹیل برادری کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔

گجرات کے اندر مودی جی کی کامیابیوں پر جو لوگ عش عش کرتے ہیں وہ نہیں جانتے

کہ نونرمان تحریک کے وقت اسمبلی میں کانگریس کے جملہ ۱۶۷ میں سے ۱۴۰ ارکان تھے اور جن سنگھ کے ارکان کی تعداد صرف ۳ تھی۔ اس تحریک کے بعد کانگریس کے مادھو سنگھ سولنکی نے ذات پات کی بنیاد پر ''کھام'' نام کا نسخۂ سیاست وضع کیا۔ اس میں راجپوت ، ہریجن، آدیباسی اور مسلمان شامل تھے۔ ان کی مجموعی تعداد چونکہ ۷۵ فیصد ہوجاتی ہے اس لئے کانگریس کا اقتدار جاری رہا۔ بی جے پی نے کھام کے اندر سے ہریجنوں کو الگ کرکے اپنے ساتھ ملایا اور دیگر پسماندہ ذاتوں پر توجہ کی۔ فرقہ وارانہ فسادات کرواکر ہریجنوں کو مسلمانوں کے خلاف میدان میں اتارا اور انہیں لوٹ پاٹ کا موقع دیا۔ اقتدار میں آنے کے بعد فسادیوں کو تحفظ فراہم کرکے اپنی گرفت مضبوط کی۔

موجودہ حالات میں اگر پٹیل اور ہریجن بی جے پی کو خیرباد کردیتے ہیں تو گجرات میں اس کی حالت دہلی سے بدتر ہوگی۔

اونا کی زیادتی کے بعد گجرات کے ہریجنوں کو پہلی مرتبہ اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہیں پتہ چل گیا کہ نام نہاد اونچی ذات والوں کے ساتھ لاکھ وفاداری کے باوجود ان کے مقام و مرتبہ میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ۔ وہ ہریجن کے ہریجن ہی رہتے ہیں۔ جب وہ بی جے پی کے خلاف میدان میں اترے تو مسلمانوں نے بھی پرانی چپقلش بھلا کر سیاسی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کا کھل کر ساتھ دیا۔ سابرمتی کے احتجاجی جلسہ میں دلت مسلم اتحاد کے بیانگ دہل نعرے

لگائے گئے۔ اس صورتحال نے مودی جی اور شاہ جی کی نیند اڑادی اس لئے کہ دلتوں نے اپنے دوست اور دشمن کو پہچان لیا ہے۔ سنگھ پریوار جانتا ہے کہ اگر دلت میدان میں نہ آئیں تو وہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے اس لئے کہ راجپوت تو ویسے بھی ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ گجرات میں کشتری سماج کا سب سے اہم رہنما شنکر سنگھ واگھیلا مودی جی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مودی جی کو اپنی دست راست آنندی بین کو سبکدوش کرکے گھر بھیجنا پڑا۔ آنندی بین جس طرح پہلے پٹیل اور پھر دلت بغاوت کا شکار ہوکر انجام کو پہنچیں یہ ان آیات کی مصداق ہے کہ :

پس اے نبیؐ، تم اِس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ہم ایسے طریقہ ”سے اِن کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ اِن کو خبر بھی نہ ہو گی۔ میں اِن کی رسی دراز کر رہا ہوں، میری چال بڑی زبردست ہے“۔

گجرات کی لڑائی صرف پٹیلوں اور دلتوں تک محدود نہیں ہے بلکہ بی جے پی کے اندر بھی ذات پات اور اختیارات کو لے کرایک مہابھارت چھڑا ہواہے۔ مودی جی نے گجرات میں اپنا وارث آنندی بین کو بنایا اور پارٹی کا صدر امیت شاہ کو لیکن آنندی بین کے سامنے امیت شاہ بیٹے کی عمر کے ہیں اور وہ ان کا کچا چٹھا جانتی ہیں اس لئے ان کے آگے شاہ کی کبھی نہیں چلی ۔ امیت شاہ کواس کا قلق تھا۔ آنندی بین نے استعفیٰ کے بعد اپنی برادری کے نتن شاہ کا نام پیش.

کیا اور وہ تقریباً منظور بھی ہوگیا۔ نتن نے نہ صرف مٹھائی تقسیم کردی بلکہ پوجا پاٹ کرکے اپنے منصوبے بھی صحافیوں کو بتانے لگے لیکن نتن پٹیل کے وزیراعلیٰ بن جانے کا مطلب یہ تھا کہ گجرات میں امیت شاہ کے بجائے آنندی بین کی مرضی چلے گی ۔ اس لئے شاہ صاحب نے اپنی ذات یعنی جین سماج کے وجئے روپانی کو آنندی بین سے لڑ جھگڑ کر وزیراعلیٰ بنوایا۔ یہ لڑائی اتنی بڑھی کہ مودی کو مداخلت کرنی پڑی ۔ فی الحال تو شاہ جی کا بول بالا ہوگیا اب دیکھنا یہ ہے کہ ہاردک پٹیل، نتن پٹیل ، آنندی بین پٹل اور کیشو بھائی پٹیل انتخابات میں کس طرح بی جے پی کا منہ کالا کرتے ہیں۔

مودی جی نے امیت شاہ کا ساتھ اس لئے دیا کہ ان کا کاچوتھا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد مہرہ شاہ ہی ہے۔ مودی جی اگر ملک کے وزیراعظم ہیں تو ان کا وزیراعظم امیت شاہ ہے۔ راجناتھ کو چیک میٹ کرنے کیلئے وزیراعظم نے اپنے فرمانبردار غلام امیت شاہ کو نہ صرف پارٹی کا صدر بلکہ اترپردیش کا نگراں بنا رکھا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ امیت شاہ کے ستارے بھی اپنے آقا کی مانند گردش میں آگئے ہیں ۔ اترپردیش میں دلتوں کو رام کرنے کے سارے حربے ناکام ہوچکے ہیں ۔ متھرا کے اندر دلتوں کو رجھانے کیلئے ایک بہت بڑے اجلاس کا اہتمام کیا گیا ۔ اس جلسہ میں امیت شاہ خطاب کرنے والے تھے نیز ۴۰ ہزار دلتوں کی شرکت متوقع تھی لیکن عین وقت پر بارش کا بہانہ بنا کر پروگرام کو

ایک اسکول کے ہال میں منتقل کردیا گیا اور امیت شاہ نے کنی کاٹ لی۔

جولائی کے اواخر میں بارش بے موسم تو نہیں ہوتی جو بی جے پی والوں کو اس کا اندازہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اترپردیش کے دلتوں نے مایاوتی طوائف کی فقرہ کشی اور اونا کی بدسلوکی کے خلاف احتجاج کیلئے کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس لئے منتظمین گھبرا گئے ورنہ واٹر پروف پنڈال بنا کر جلسہ کرنا بی جے پی کیلئے کیا مشکل تھا۔ یہ عجب تماشا ہے کہ امیت شاہ کبھی یوپی کے دلتوں کے ساتھ بھوجن کرتے ہیں تو کبھی ان کو خطاب عام کی دعوت دیتے ہیں لیکن خود اپنی ریاست گجرات میں اونا کے دلتوں کی جانب توجہ نہیں فرماتے۔ یہ تو ایسا ہے کہ آگ لوک سبھا میں لگی ہوئی اور آب پاشی راجیہ سبھا میں کی جائے۔

گجرات میں وزیراعلیٰ کے طور پر امیت شاہ کا نام آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جلد ہی ان کی پارٹی صدر کے عہدے سے چھٹی ہونے والی ہے۔ اندازہ تو یہی ہے کہ اترپردیش انتخاب کے بعد مودی جی کے کرسیٔ اقتدار کی یہ چوتھی ٹانگ بھی ٹوٹ جائیگی۔ اس کے بعد مودی جی زمین پر آنے سے قبل کب تک ہوا میں معلق رہیں گے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ویسے مودی جی اگر شاعر کے اس مشورے پر عمل کریں تو اس میں ان کی بھلائی ہے

ؔ

یہ بے مقصد سفر اب ختم ہوجائے تو اچھا ہے
نہ تم سے رہبری ہوگی، نہ ہم سے پیروی ہوگی

کشمیر : اچھل رہا ہے زمانے میں نام آزادی

اس سال جب سارا ملک یوم آزادی منائے گا وادیٔ کشمیر کے لوگ آزادی کے چہلم کا اہتمام کررہے ہوں گے۔ اگر کشمیر کا کرفیو جاری رہا تو تقریباً چالیس دن ہوچکے ہوں گے ۔ سابق وزیراعلیٰ مفتی محمد سعید کے جنازے میں سرکاردربار کے باوجود نہایت قلیل تعداد میں عوام کی شرکت نے ظاہر کردیا تھا کہ کشمیری عوام پی ڈی پی کے بی جے پی سے ہاتھ ملا لینے کو اپنی پیٹھ میں چھرا گھونپ دینے کے مترادف سمجھتے ہیں ۔ پی ڈی پی کو چاہئے تھا کہ اس ایک اشارے کو تازیانۂ عبرت سمجھتی اور بی جے پی سے دامن جھٹک کر کسی اور کے ساتھ حکومت بناتی یا انتخاب کروادیتی لیکن محبوبہ مفتی نے طویل پس و پیش کے بعد بی جے پی کے ساتھ پھر سے حکومت بنالی۔ پی ڈی پی کے ایک وزیر کے مطابق بی جے پی نے محبوبہ مفتی کو اعتماد میں لئے بغیر ایک ایسی فاش غلطی کردی کہ جس نے خود اس کا اپنا اور ساتھ ہی پی ڈی پی کا بیڑہ غرق کردیا۔

وزیراعلیٰ محبوبہ مفتی کی اب یہ حالت ہے کہ انہیں اپنے گھر میں دبکے ہوئے ارکان اسمبلی سے کہنا پڑرہا ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکلیں لیکن جب وہ بادلِ ناخواستہ عوام میں جاتے ہیں تو ان کو دیکھ کر وہ لوگ مشتعل ہوجاتے ہیں ۔ پی

ڈی پی رہنماؤں پر حملے کی خبریں آچکی ہیں۔ اس کی شریک کار بی جے پی کے رہنما تو خیر وادی کی عوام میں جاکر ان کا اعتماد بحال کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ حکومت میں ہونے کے باوجود یہ معذوری اور مجبوری قابل شرم ہے۔ وزیراعظم مودی سری نگر تو دور ایوان پارلیمان سے بھی چھپتے پھر رہے ہیں۔ مانسون کے حالیہ اجلاس میں دو مرتبہ کشمیر پر بحث ہوئی لیکن دونوں مرتبہ انہوں نے ڈنڈی مار کر اپنے آپ کو خول میں بند کرلیا۔ جو رہنما اپنے ارکان پارلیمان کو اعتماد میں لے کر حزب اختلاف کو مطمئن نہیں کرسکتا وہ بھلا عوام کو کیسے مطمئن کرکے اعتماد میں لے گا۔

وزیراعظم نریندر مودی یہ بھول گئے ہیں کہ انہیں قوم نے پارلیمان میں حکومت کرنے کیلئے منتخب کیا ہے۔ ان کی ذمہ داری محض بی جے پی کو مختلف ریاستی انتخابات میں کامیابی سے ہمکنار کرنے کی نہیں ہے یہ تو پارٹی کے صدر اور صوبائی رہنماؤں کا کام ہے۔ اگر وہ لوگ اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے سے قاصر ہیں تو انہیں تبدیل کریں یا اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر پارٹی کی کمان سنبھالیں۔ وزیراعظم کا فرض منصبی ساری دنیا کی سیر کرنا، رٹی رٹائی تقریریں کرکے فوٹو کھنچوانا نہیں بلکہ قوم کو درپیش سنگین مسائل حل کرنا ہے۔ اس کے بغیر یوم آزادی کے دن لال قلعہ سے پرچم کشائی اور اس کے بعد کہی جانے والی چکنی چپڑی باتیں بے معنیٰ ہیں۔ کشمیر کے مسئلہ ۳۳ بعد اپنے خیالات کا اظہار کرنے کیلئے مودی جی نے مدھیہ پردیش کے ایک عوامی جلسہ کا

انتخاب کیا جو مضحکہ خیز ہے۔ یہ کام یا تو لوک سبھا میں ہوتا یا کم از کم جلسۂ عام کو سرینگر میں ہونا چاہئے تھا۔

کشمیر پر مجرمانہ تاخیر کے بعد جو بیان دیا گیا وہ بھی نہایت ناعاقبت اندیشی تھا۔

وزیراعظم کو اس بات پر افسوس نہیں ہے کہ ۵۶ مظاہرین جان بحق ہو چکے ہیں۔ ۱۰۰ سے زیادہ اپنی بینائی سے محروم ہو چکے ہیں۔ زخمیوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ذرائع ابلاغ کے مطابق ۸ ہزار میں سے ۵ ہزار حفاظتی دستے کے لوگ زخمی ہیں۔ کئی فوجی چھاونیاں نذرِ آتش کی جاچکی ہیں۔ اس طویل کرفیو نے عوام کا جینا دوبرق کردیا ہے۔ پاکستان کو ہمیں بدنام کرنے کا نادر موقع ہاتھ آگیا ہے۔ ساری دنیا اس پر تشویش کا ظہار کررہی ہے۔ اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پھر سے زندہ ہوگیا ہے۔ ان مسائل پر اظہار خیال کرنے کے بجائے وزیراعظم نے کشمیری بچوں کے ہاتھوں کتاب یا کمپیوٹر کے بجائے پتھر پر افسوس کیا۔ دراصل مودی جی کو کشمیری بچوں کے ہاتھ میں پتھر تو نظر آتے ہیں لیکن حفاظتی کے ہاتھوں میں چھرے والی بندوق نظر نہیں آتی۔ انہیں چاہئے تھا کہ حفاظتی دستوں کو ہدایت دیتے۔ بقول سیتارام یچوری جس چھرے والی بندوق سے دنیا کی سفاک ترین اسرائیلی فوج تک گریز کرتی ہے وہ کشمیر کے اندر دھڑلے سے استعمال ہو رہی ہے۔

مودی جی نے فرمایا سارا ہندوستان کشمیر سے محبت کرتا ہے تو کیا محبت کے اظہار کا یہی طریقہ ہے؟

سارے ملک میں مظاہرین کو منتشر کرنے کیلئے لاٹھی یا پانی کی دھار کا استعمال ہوتا ہے کشمیر میں پتھر کے جواب میں گولی کی پالیسی اظہار محبت ہے یا نفرت ۔ مودی جی نے یہ بھی فرمایا کہ ہم اٹل جی کے بتائے ہوئے کشمیریت اور انسانیت کی راہ پر گامزن ہیں لیکن سپریم کورٹ نے یہ کہہ دیا کہ انتظامیہ یعنی حفاظتی دستوں کے اندر انسانیت کا فقدان ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک جلسۂ عام میں کہے جانے والے جملہ پر یقین کریں یا عدالت کی کرسی پر براجمان جج کی بات مانیں ۔ حفاظتی دستوں کا کہنا ہے کہ ہمیں جو اسلحہ دیا جاتا ہے ہم اس کو استعمال کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ اسلحہ اور اس کو استعمال کرنے کا حکم کون دیتا ہے؟ ایک ماہ سے وزیرِاداخلہ چھرے والی بندوق کا متبادل تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ سی آر پی ایف کے سربراہ کے مطابق ان کے پاس صرف دو ہی متبادل ہیں ایک چھرے والی بندوق اور دوسرے اے کے ۴۷۔ اس لئے چھرے والی بندوق بہتر متبادل ہے۔ کیا دنیا میں آج تک کسی انسانیت نواز حکومت کے اہلکار کو اپنے ہی باشندوں کے خلاف اے کے ۴۷ استعمال کرنے کا خیال آیا ہے؟

مودی جی نے کشمیر میں جس افسوس کا اظہار کیا ہے وہ دراصل الزام تراشی ہے ۔

انھوں کشمیری بچوں کی حفاظتی دستوں کے ہاتھوں ہلاکت کیلئے بلاواسطہ ان لوگوں کو ذمہ دار ٹھہرادیا جنھوں نے پتھر تھمایا ہے حالانکہ پتھر اٹھانے کیلئے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ ظلم کے خلاف احتجاج اور تحفظ یہ انسانی فطرت ہے اور بچوں سے زیادہ فطرت سے قریب کون ہے؟ مودی جی نے اس سے قبل ایوانپارلیمان میں گئورکشا کی بحث سے بھی فرار کا راستہ اختیار کیا تھا لیکن جب گجرات کے اندر پانی سر سے اونچا ہوگیا توآندھرا میں جاکر ایک اوٹ پٹانگ بیان دے دیا۔ بیان یہ تھا کہ اگر گولی مارنا ہو تو دلتوں کے بجائے مجھے گولی مارو۔ پہلی بات تو یہ مکالمہ کسی سربراہ مملکت کو زیب نہیں دیتا۔ اس کا کام تو یہ ہے لوگوں کو تشدد سے روکے اس کے بجائے زیڈ پلس سیکیورٹی کے اندمحصور ہوکر اپنے آپ پر تشدد کی دعوت دینا بتاتا ہے کہ یہ محض جملہ بازی ہے۔

کشمیر کے پس منظر میں اگر یہ بیان ہوتا تو اس کی معنویت بھی ہوتی اس لئے کہ گولیاں کشمیر میں چل رہی ہیں اور اس کا شکار دلت نہیں بلکہ کشمیری مسلم ہورہے ہیں۔ دلتوں کی بابت تو یہ بالکل بے معنیٰ بیان ہے اس لئے کہ کسی دلت پر گولی کا کوئی واقعی پیش ہی نہیں آیا۔ ہاں گالی کا معاملہ ہوا ہے اگر مودی جی کہتے کہ گالی دینا ہے تو مجھے دوتب بھی کام چل جاتا لیکن ان کے بھکت تنہائی میں جو بھی کہیں کم از کم کھلے عام ان کو گالی دینے کی جرأت

نہیں کر سکتے۔ جہاں تک دوسرے لوگوں کا سوال ہے وہ تو یہ کارِ خیر کر رہی رہے ہیں اس لئے شاید وزیر اعظم نے اس کام کی ترغیب نہیں دی۔ دلتوں پر لاٹھیوں سے، چاقو اور ترشول سے حملے ہو رہے ہیں اس لئے گولی کے بجائے ان چیزوں کا ذکر ہونا چاہئے تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کشمیری بچوں کے ہاتھ میں پتھر دینے والے مجرم ہیں تو کیا گئو رکشکوں کے حوصلے بلند کرنے والے مجرم نہیں ہیں؟ گئو رکشک مافیا کب، کیسے اور کس کی سرپرستی کے اندر وجود میں آیا ہے یہ اظہر من الشمس ہے۔

گئو رکشا کو لے کر تشدد کے واقعات پہلے شمالی ہندوستان کی ان ریاستوں تک محدود تھے جہاں بی جے پی برسرِ اقتدار ہے۔ مودی جی اس معاملے کو جنوبِ ہند میں لے گئے ۔آندھرا پردیش کے گولی والے بیان کی تعریف و توصیف کی سیاہی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسی صوبے میں دلتوں کی پٹائی کا دل دہلا دینے والا واقعہ رونما ہوگیا۔ مری ہوئی گائے کی کھال اتارنے والے دو دلت بھائیوں کو ۱۰۰ لوگوں کے ہجوم نے برہنہ کرکے پیڑ سے باندھ کر زدوکوب کیا۔ لوگوں نے سوچا ہوگا کہ اگر ہمیں وزیر اعظم کو گولی مارنے کی اجازت ہے تو یہ دلت کیا چیز ہیں ؟اس کے بعد اور بھی صوبوں میں ایسے واقعات رونما ہوئے جس سے پتہ چلتا ہے کہ خود گئو رکشک بھی وزیر اعظم کے پروچن پر کان نہیں دھرتے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی ان کی کوئی نہیں سنتا۔ وزیر اعظم کے گولی

والے بیان کے بعد پہلے تو پنجاب میں آر ایس ایس کے نائب صدر پر گولی چلائی گئی اور پھر دہلی ہریانہ کی سرحد پر بی جے پی رہنما کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اتفاق سے ان تمام ریاستوں میں بی جے پی برسر اقتدار ہے۔ دہلی میں اگر نہیں بھی ہے تو پولس عاپ کی تابع نہیں ہے۔ اس طرح جو گولی باری جو نکسلیوں اور کشمیر تک محدود تھی وہ پنجاب کے راستے دہلی تک پہنچ گئی۔

کشمیر میں موجودہ خلفشار کیلئے برہان وانی کے انکاونٹر سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے لیکن دراصل اس کی ابتداء ۲۵ جون کو ہوئی جب کشمیری عسکریت پسندوں نے پلواما ضلع میں پمپور مقام پر سی آر پی ایف کے دستے پر گھات لگا کر حملہ کیا۔ اس حملے میں ۸ جوان ہلاک اور ۲۲ زخمی ہوئے۔ دو عسکریت پسند بھی مارے گئے اور ایک فرار ہوگیا۔ اس حملے کی بابت وزیر دفاع منوہر پریکر نے یہ تسلیم کیا کہ ان کے خیال میں کام کرنے کا معیاری پر عملدرآمد میں کوتاہی ہوئی۔ وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ نے دو نفری (SOP) طریقہ کار تفتیشی وفد پمپور روانہ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ رپورٹ کے بعد صورتحال واضح ہوجائے گی۔ حملے کے خطرات کے باوجود بس بغیر اسکارٹ کے جارہی تھی اور سڑک صاف کرنے والا ہراول دستہ عسکریت پسندوں کی شناخت میں ناکام رہا تھا۔ ایک ماہ کے اندر حفاظتی دستوں پر وہ چوتھا حملہ تھا گزشتہ ۳ حملوں میں ۱۷ جوان ہلاک اور کئی زخمی ہوچکے تھے۔

اس سے قبل مرکز اور صوبے میں کانگریس کی حکومت کے دوران جب اس طرح کی وارداتیں رونما ہوتی تھیں تو بی جے پی والے خوب شور مچاتے تھے اور نہ صرف جموں کے ہندو رائے دہندگان بلکہ سارے ملک کے عوام سے یہ کہتے پھرتے تھے کہ اگر حکومت کی زمام کار ہمارے ہاتھوں میں ہوتی تو ایسا ہر گز نہ ہوتا۔ اس بار اتفاق سے نہ صرف مرکزی حکومت بی جے پی کی ہے بلکہ صوبے کی حکومت میں بھی وہ برابر کی شریک ہے ۔اس کے باوجود وادیٔ کشمیر کی یہ دگر گوں صورتحال بی جے پی کے رائے دہندگان کو مایوس کررہی تھی۔ ان لوگوں نے بی جے پی سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ ان کو کانگریس کی جھولی میں جانے بچانے کی کوشش کا کوئی نہ کوئی تعلق برہان وانی کے انکاونٹر سے ضرور ہے۔

غالب گمان یہ ہے کہ اپنے حامیوں کی خوشنودی کیلئے برہان وانی کے انکاونٹر کا فیصلہ کیا گیا تاکہ اپنی دلیری کا ڈنکا بجایا جاسکے حالانکہ لاکھوں فوجیوں کی موجودگی میں تین نوجوانوں کو گھیر کر ماردینے میں کوئی بہادری نہیں ہے ۔۔برہان وانی ایک ۲۲ سالہ نوجوان تھا جس پر ۱۵۰ نوجوانوں کو حزب المجاہدین میں شامل کرنے اور دہشت گردی کے چند واقعات میں ملوث ہونے کا الزام تھا۔ کیا ان الزامات کو عدالت میں ثابت کرنا ممکن نہیں تھا؟ کیاآزادی کے ۷۰ سال بعد بھی کسی عسکریت پسند باغی گرفتار کرکے اس کو قرار واقعی سزا دینے سے ہمارا دستور قاصر ہے؟ اگر نہیں تو آئینی طریقۂ کار

کو پامال کیوں کیا گیا؟ گجرات میں ہاردک پٹیل نے بھی تلوار اٹھا کر بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ اس پر بغاوت کا الزام بھی لگا۔ وہ گرفتار بھی کیا گیا اور اب ضمانت بھی ہو گئی۔ اس کے انکاونٹر کا خیال کسی کو کیوں نہیں آیا جبکہ گجرات کی پولس عشرت جہاں سے لے کر سہراب الدین اور پرجاپتی کے انکاونٹر کے سبب بدنام ہے۔

حکومت کے اہلکار برہان وانی کی عسکریت پسندی کے پس پشت عوامل کا مطالعہ کرتے تو یہ اقدام ہرگز نہیں کرتے۔۔برہان کے والد صدر مدرس اور والدہ پوسٹ گریجویٹ استانی ہیں۔۔برہان اپنی جماعت کا ذہین ترین طالبعلم تھا۔ اس کے ہاتھ میں پتھر نہیں کتاب تھی۔ لیکن جب اس کے بے قصور بھائی خالد وانی کو آج سے ۷ سال قبل فوجیوں نے بلاوجہ ہلاک کردیا تو اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کی خاطر برہان نے کتاب پھینک کر بندوق اٹھائی ۔ اگر خالد پر ظلم نہیں ہوتا یا اس کے قاتلوں کو حکومت پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتی تو برہان کمپیوٹر پر عسکریت کو ترغیب نہ دیتا۔برہان کی عسکریت پسندی نے یہ خوش فہمی بھی دور کردی کہ وادی کشمیر کے سارے باشندے علحیدگی کے خلاف ہیں اور عسکریت پسند صرف اور صرف پاکستان سے درآمد ہوتے ہیں ۔ ایک جائزے کے مطابق وادی میں کل ۱۴۵ متحرک عسکریت پسند ہیں جن میں ۹۱ کا تعلق وادی سے ۵۴ پاکستان سے آئے ہیں ۔ کیا ان ۱۴۵ عسکریت پسندوں پر قابو پانے کیلئے لاکھوں

کی تعداد میں حفاظتی دستے ناکافی ہیں جو انکاونٹر کی ضرورت پیش آئی؟

.برہان وانی کی ہلاکت نے اسے راتوں رات کشمیر کا ہیرو بنادیا اور بی جے پی کی سخت گیری نے اسے زیرو کرکے رکھ دیا۔.برہان کے تئیں یہ جو زبردست ہمدردی کا طوفان برپا ہوا ہے اس کا سہرہ صرف اور صرف حکومت کے سر بندھتا ہے۔.برہان کو مار کر حکومت نے علحیدگی پسند تحریک کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔.برہان کی ویڈیو کے پس منظر میں چلنے والے ترانہ '' ہم نے رسمِ محبت کو زندہ کیا، زخمِ دل جیت کر نقدِ جاں ہار کر'' کی عملی تعبیر کا سامان خود حکومت نے کیا۔.برہان اگر سو سال بھی زندہ رہتا تو سوشیل میڈیا سے وہ نہ کرسکتا تو پلک جھپکتے ہوگیا اسی لئے عمر عبداللہ نے کہا قبر کے اندر.برہان وانی کی موجودگی ذرائع ابلاغ کی بہ نسبت کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ ان مظاہروں پر طاقت کا بیجا استعمال نے ہوا کو مخالف سمت میں موڑ دیا ہے۔اس سے بے قصوروں کی ہلاکت اور ساری دنیا میں بدنامی کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

.برہان وانی کے انکاونٹر کی ایک اور وجہ کشمیری نوجوانوں کے اندر خوف و دہشت پیدا کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ جہاں تک کشمیریوں کو خوفزدہ کرنے کا سوال تھا اس واقعہ سے ان کا خوف دور ہوگیا بلکہ وزیراعلیٰ محبوبہ مفتی کے ارکان اسمبلی گھر میں دبک کر بیٹھ گئے ۔ یعنی ڈرانے والے خود ڈر گئے ۔ امن کے قیام کیلئے

حریت کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑا جن کو کل تک سارے فساد کی جڑ کہا جاتا تھا۔ اخبارات اور ٹی وی نشریات پر پابندی۔ وزیر داخلہ کے امریکی دورے کی منسوخی اور پاکستان کا بے فائدہ دورہ حکومت کی نااہلی کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ ایوان پارلیمان میں غلام نبی آزاد سے کھری کھوٹی سننے کے بعد وزیر داخلہ ۱۶ دن بعد سرینگر پہنچے تو حریت اور کانگریس نے ملاقات سے انکار کردیا۔ اس معاملے کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ فرانس اور جرمنی کے حملوں پر افسوس جتانے والے وزیراعظم نریندر مودی عرصۂ دراز تک خاموش رہے اور بولے بھی تو کشمیریوں کے زخموں پر نمک پاشی ہی کی۔

کشمیر کی حالت نہایت سنگین ہوچکی ہے۔ اس بابت حزب اختلاف کے رہنما فاروق عبداللہ نے چشم کشا بیان دیا ہے۔ان کے مطابق افسوس برہان نہ تو بندوق اٹھانے والا پہلا (کشمیری) اور نہ آخری۔ مودی سرکار کو جو اٹل جی کے نقش قدم پر چلنے کا دم بھرتی ہے ندیم خان کے ذریعہ ڈی این اے اخبار کے حوالے سے پیش کردہ انکشاف پر غور کرنا چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں اٹل جی کی این ڈی اے نے تو ۲۰۰۳ء میں کشمیری نوجوانوں کو عسکریت پسندی سے روکنے کیلئے ڈاکٹر ذاکر نائک کی خدمات حاصل کی تھیں۔ موجودہ این ڈی اے نے ذاکر نائک کو جعلی میڈیا ٹرائل کے ذریعہ تقریباً دہشت گرد قرار دے دیا۔ ایک زمانے تک سنگھ پریوار کے لوگ آئے دن یہ نعرہ لگاتے ہوئے کشمیر پہنچ جاتے تھے کہ ”جہاں ہوئے بلیدان

مکھرجی، وہ کشمیر ہمارا ہے'' کیا اس سال بھی وہ ۱۵ اگست کے دن سرینگر کے لال چوک پر جا کر قومی پرچم لہرانے کی جرأت کریں گے ؟

کشمیر : فقط احساس آزادی سے آزادی عبارت ہے

اس سال جب سارے ملک میں یوم آزادی منایا گیا وادیٔ کشمیر کے لوگ آزادی کے چہلم کا اہتمام ہوا۔ کشمیر میں پھر سے کرفیو نافذ کردیا گیا جسے تقریباً چالیس دن ہو چکے ہیں۔ سابق وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید کے جنازے میں سرکار دربار کے باوجود نہایت قلیل تعداد میں عوام کی شرکت نے ظاہر کردیا تھا کہ کشمیری عوام پی ڈی پی کے بی جے پی سے ہاتھ ملا لینے کو اپنی پیٹھ میں چھرا گھونپ دینے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ پی ڈی پی کو چاہئے تھا کہ اس ایک اشارے کو تازیانۂ عبرت سمجھتی اور بی جے پی سے دامن جھٹک کر کسی اور کے ساتھ حکومت بناتی یا انتخاب کروادیتی لیکن محبوبہ مفتی نے طویل پس و پیش کے بعد بی جے پی کے ساتھ پھر سے حکومت بنالی۔ پی ڈی پی کے ایک وزیر کے مطابق بی جے پی نے محبوبہ مفتی کو اعتماد میں لئے بغیر ایک ایسی فاش غلطی کردی کہ جس نے خود اس کا اپنا اور ساتھ ہی پی ڈی پی کا بیڑہ غرق کردیا۔

وزیر اعلیٰ محبوبہ مفتی کی اب یہ حالت ہے کہ انہیں اپنے گھر میں دبکے ہوئے ارکان اسمبلی سے کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکلیں لیکن جب وہ بادلِ ناخواستہ عوام میں جاتے ہیں تو ان کو دیکھ کر وہ لوگ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ پی

ڈی پی رہنماؤں پر حملے کی خبریں آچکی ہیں۔ اس کی شریک کار بی جے پی کے رہنما تو خیر وادی کی عوام میں جاکر ان کا اعتماد بحال کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ حکومت میں ہونے کے باوجود یہ معذوری اور مجبوری قابل شرم ہے۔ وزیراعظم مودی سری نگر تو دور ایوان پارلیمان سے بھی چھپتے پھر رہے ہیں۔ پارلیمان کے مانسون کے اجلاس میں دو مرتبہ کشمیر پر بحث ہوئی لیکن دونوں مرتبہ وزیراعظم نے ڈنڈی مار کر اپنے آپ کو خول میں بند کرلیا۔ جو رہنما اپنے ارکان پارلیمان کو اعتماد میں لے کر حزب اختلاف کو مطمئن نہیں کرسکتا وہ بھلا عوام کو کیسے مطمئن کرکے اعتماد میں لے گا۔

وزیراعظم نریندر مودی یہ بھول گئے ہیں کہ انہیں قوم نے پارلیمان میں حکومت کرنے کیلئے منتخب کیا ہے۔ ان کی ذمہ داری محض بی جے پی کو مختلف ریاستی انتخابات میں کامیابی سے ہمکنار کرنے کی نہیں ہے یہ تو پارٹی کے صدر اور صوبائی رہنماؤں کا کام ہے۔ وزیراعظم کا فرض منصبی ساری دنیا کی سیر کرنا، رٹی رٹائی تقریریں کرکے فوٹو کھنچوانا نہیں بلکہ قوم کو درپیش سنگین مسائل حل کرنا ہے۔ اس کے بغیر یوم آزادی کو لال قلعہ سے پرچم کشائی اور اس کے بعد کہی جانے والی چکنی چپڑی باتیں بے معنی ہیں۔ کشمیر کے مسئلہ پر ۳۳ کے بعد خیالات کا اظہار کرنے کیلئے مودی جی نے مدھیہ پردیش کے ایک عوامی جلسہ کا انتخاب کیا جو مضحکہ خیز ہے۔ یہ کام یا تو لوک سبھا میں ہوتا یا کم از کم

جلسۂ عام کو سرینگر میں ہونا چاہئے تھا۔

کشمیر پر مجرمانہ تاخیر کے بعد جو بیان دیا گیا وہ بھی نہایت ناعاقبت اندیشں تھا۔

وزیراعظم کو اس بات پر افسوس نہیں ہے کہ ۵۶ مظاہرین جان بحق ہوچکے ہیں۔ ۱۰۰ سے زیادہ اپنی بینائی سے محروم ہوچکے ہیں۔ زخمیوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ذرائع ابلاغ کے مطابق ۸ ہزار میں سے ۵ ہزار حفاظتی دستے کے لوگ زخمی ہیں۔ کئی فوجی چھاونیاں نذرِ آتش کی جاچکی ہیں۔ اس طویل کرفیو نے عوام کا جینا دوبھر کردیا ہے۔ پاکستان کو ہمیں بدنام کرنے کا نادر موقع ہاتھ آگیا ہے۔ ساری دنیا اس پر تشویش کا ظہار کررہی ہے۔ اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پھر سے زندہ ہوگیا ہے۔ ان مسائل پر اظہار خیال کرنے کے بجائے وزیراعظم نے کشمیری بچوں کے ہاتھوں کتاب یا کمپیوٹر کے بجائے پتھر پر افسوس کیا۔ دراصل مودی جی کو کشمیری بچوں کے ہاتھ میں پتھر تو نظر آتے ہیں لیکن حفاظتی کے ہاتھوں میں چھرے والی بندوق نظر نہیں آتی۔ انہیں چاہئے تھا کہ حفاظتی دستوں کو ہدایت دیتے۔ بقول سیتارام یچوری جس چھرے والی بندوق سے دنیا کی سفاک ترین اسرائیلی فوج تک گریز کرتی ہے وہ کشمیر کے اندر دھڑلے سے استعمال ہورہی ہے۔

مودی جی نے فرمایا سارا ہندوستان کشمیر سے محبت کرتا ہے تو کیا محبت کے

اظہار کا یہی طریقہ ہے؟ سارے ملک میں مظاہرین کو منتشر کرنے کیلئے لاٹھی یا پانی کی دھار کا استعمال ہوتا ہے کشمیر میں پتھر کے جواب میں گولی کی پالیسی اظہار محبت ہے یا نفرت ۔ مودی جی نے یہ بھی فرمایا کہ ہم اٹل جی کے بتائے ہوئے کشمیریت اور انسانیت کی راہ پر گامزن ہیں لیکن سپریم کورٹ نے یہ کہہ دیا کہ انتظامیہ یعنی حفاظتی دستوں کے اندر انسانیت کا فقدان ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک جلسۂ عام میں کہے جانے والے جملہ پر یقین کریں یا عدالت کی کرسی پر براجمان جج کی بات مانیں ۔ حفاظتی دستوں کا کہنا ہے کہ ہمیں جو اسلحہ دیا جاتا ہے ہم اس کو استعمال کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ اسلحہ اور اس کو استعمال کرنے کا حکم کون دیتا ہے؟ ایک ماہ سے وزیرداخلہ چھرے والی بندوق کا متبادل تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ سی آرپی ایف کے سربراہ کے مطابق ان کے پاس صرف دو ہی متبادل ہیں ایک چھرے والی بندوق اور دوسرے اے کے ۴۷۔ اس لئے چھرے والی بندوق بہتر متبادل ہے۔ کیا دنیا میں آج تک کسی انسانیت نواز حکومت کے اہلکار کو اپنے ہی باشندوں کے خلاف اے کے ۴۷ استعمال کرنے کا خیال آیا ہے؟

مودی جی نے کشمیر میں جس افسوس کا اظہار کیا ہے وہ دراصل الزام تراشی ہے ۔ انہوں کشمیری بچوں کی حفاظتی دستوں کے ہاتھوں ہلاکت کیلئے بلا واسطہ ان لوگوں کو ذمہ دار ٹھہرا دیا جنھوں نے پتھر تھمایا ہے حالانکہ پتھر اٹھانے

کیلئے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ ظلم کے خلاف احتجاج اور تحفظ یہ انسانی فطرت ہے اور بچوں سے زیادہ فطرت سے قریب کون ہے؟ کشمیر میں موجودہ خلفشار کیلئے برہان وانی کے انکاونٹر سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے لیکن دراصل اس کی ابتداء ۲۵ جون کو ہوئی جب کشمیری عسکریت پسندوں نے پلواما ضلع میں پمپور مقام پر سی آر پی ایف کے دستے پر گھات لگا کر حملہ کیا۔ اس حملے میں ۸ جوان ہلاک اور ۲۲ زخمی ہوئے۔ دو عسکریت پسند بھی مارے گئے اور ایک فرار ہوگیا۔ اس حملے کی بابت وزیر دفاع منوہر پریکر نے یہ تسلیم کیا کہ ان کے خیال میں کام کرنے کا معیاری طریقۂ کار (SOP) پر عملدرآمد میں کوتاہی ہوئی ۔ وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ نے دو نفری تفتیشی وفد پمپور روانہ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ رپورٹ کے بعد صورتحال واضح ہوجائے گی ۔ حملے کے خطرات کے باوجود بس بغیر اسکارٹ کے جارہی تھی اور سڑک صاف کرنے والا ہراول دستہ عسکریت پسندوں کی شناخت میں ناکام رہا تھا۔ ایک ماہ کے اندر حفاظتی دستوں پر وہ چوتھا حملہ تھا گزشتہ ۳ حملوں میں ۱۷ جوان ہلاک اور کئی زخمی ہوچکے تھے ۔

اس سے قبل مرکز اور صوبے میں کانگریس کی حکومت کے دوران جب اس طرح کی وارداتیں رونما ہوتی تھیں تو بی جے پی والے خوب شور مچاتے تھے اور نہ صرف جموں کے ہندو رائے دہندگان بلکہ سارے ملک کے عوام سے یہ کہتے پھرتے تھے کہ

اگر حکومت کی زمام کار ہمارے ہاتھوں میں ہوتی تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ اس بار اتفاق سے نہ صرف مرکزی حکومت بی جے پی کی ہے بلکہ صوبے کی حکومت میں بھی وہ برابر کی شریک ہے۔ اس کے باوجود وادیٔ کشمیر کی یہ دگرگوں صورتحال بی جے پی کے رائے دہندگان کو مایوس کررہی تھی۔ ان لوگوں نے بی جے پی سے بڑی توقعات وابستہ کررکھی ہیں۔ ان کو کانگریس کی جھولی میں جانے بچانے کی کوشش کا کوئی نہ کوئی تعلق برہان وانی کے انکاونٹر سے ضرور ہے۔

غالب گمان یہ ہے کہ اپنے حامیوں کی خوشنودی کیلئے برہان وانی کے انکاونٹر کا فیصلہ کیا گیا تاکہ اپنی دلیری کا ڈنکا بجایا جاسکے حالانکہ لاکھوں فوجیوں کی موجودگی میں تین نوجوانوں کو گھیر کر ماردینے میں کوئی بہادری نہیں ہے۔۔ برہان وانی ایک ۲۲ سالہ نوجوان تھا جس پر ۱۵۰ نوجوانوں کو حزب المجاہدین میں شامل کرنے اور دہشت گردی کے چند واقعات میں ملوث ہونے کا الزام تھا۔ کیا ان الزامات کو عدالت میں ثابت کرنا ممکن نہیں تھا؟ کیاآزادی کے ۷۰ سال بعد بھی کسی عسکریت پسند باغی گرفتار کرکے اس کو قرار واقعی سزا دینے سے ہمارا دستور قاصر ہے؟ اگر نہیں تو آئینی طریقۂ کار کو پامال کیوں کیا گیا؟ گجرات میں ہاردک پٹیل نے بھی تلوار اٹھا کر بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ اس پر بغاوت کا الزام بھی لگا۔ وہ گرفتار بھی کیا گیا اور اب ضمانت بھی ہوگئی۔ اس کے انکاونٹر کا خیال کسی کو کیوں نہیں آیا جبکہ گجرات کی پولس عشرت جہاں سے لے کر سہراب الدین اور پرجاپتی کے

انکاونٹر کے سبب بدنام ہے۔

حکومت کے اہلکار برہان وانی کی عسکریت پسندی کے پس پشت عوامل کا مطالعہ کرتے تو یہ اقدام ہرگز نہیں کرتے۔ برہان کے والد صدر مدرس اور والدہ پوسٹ گریجویٹ استانی ہیں۔ برہان اپنی جماعت کا ذہین ترین طالبعلم تھا۔ اس کے ہاتھ میں پتھر نہیں کتاب تھی۔ لیکن جب اس کے بے قصور بھائی خالد وانی کو آج سے ۷ سال قبل فوجیوں نے بلاوجہ ہلاک کردیا تو اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کی خاطر برہان نے کتاب پھینک کر بندوق اٹھائی۔ اگر خالد پر ظلم نہیں ہوتا یا اس کے قاتلوں کو حکومت پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتی تو برہان کمپیوٹر پر عسکریت کو ترغیب نہ دیتا۔ برہان کی عسکریت پسندی نے یہ خوش فہمی بھی دور کردی کہ وادی کشمیر کے سارے باشندے علحیدگی کے خلاف ہیں اور عسکریت پسند صرف اور صرف پاکستان سے درآمد ہوتے ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق وادی میں کل ۱۴۵ متحرک عسکریت پسند ہیں جن میں ۹۱ کا تعلق وادی سے ۵۴ پاکستان سے آئے ہیں۔ کیا ان ۱۴۵ عسکریت پسندوں پر قابو پانے کیلئے لاکھوں کی تعداد میں حفاظتی دستے ناکافی ہیں جو انکاونٹر کی ضرورت پیش آئی؟

برہان وانی کی ہلاکت نے اسے راتوں رات کشمیر کا ہیرو بنادیا اور بی جے پی کی سخت گیری نے اسے زیرو کرکے رکھ دیا۔ برہان کے تئیں یہ جو زبردست ہمدردی

کا طوفان برپا ہوا ہے اس کا سہرہ صرف اور صرف حکومت کے سر بندھتا ہے۔ برہان کو مار کر حکومت نے علٰحیدگی پسند تحریک کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ برہان کی ویڈیو کے پس منظر میں چلنے والے ترانہ "ہم نے رسمِ محبت کو زندہ کیا، زخمِ دل جیت کر نقدِ جاں ہار کر" کی عملی تعبیر کا سامان خود حکومت نے کیا۔ برہان اگر سو سال بھی زندہ رہتا تو سوشیل میڈیا سے وہ نہ کرسکتا تو پلک جھپکتے ہوگیا اسی لئے عمر عبداللہ نے کہا قبر کے اندر برہان وانی کی موجودگی ذرائع ابلاغ کی بہ نسبت کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ ان مظاہروں پر طاقت کا بیجا استعمال نے ہوا کو مخالف سمت میں موڑ دیا ہے۔ اس سے بے قصوروں کی ہلاکت اور ساری دنیا میں بدنامی کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

برہان وانی کے انکاونٹر کی ایک اور وجہ کشمیری نوجوانوں کے اندر خوف و دہشت پیدا کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ جہاں تک کشمیریوں کو خوفزدہ کرنے کا سوال تھا اس واقعہ سے ان کا خوف دور ہوگیا بلکہ وزیر اعلیٰ محبوبہ مفتی کے ارکان اسمبلی گھر میں دبک کر بیٹھ گئے۔ یعنی ڈرانے والے خود ڈر گئے۔ امن کے قیام کیلئے حریت کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑا جن کو کل تک سارے فساد کی جڑ کہا جاتا تھا۔ اخبارات اور ٹی وی نشریات پر پابندی۔ وزیر داخلہ کے امریکی دورے کی منسوخی اور پاکستان کا بے فائدہ دورہ حکومت کی نااہلی کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ ایوان پارلیمان میں غلام نبی آزاد سے کھری کھوٹی سننے کے بعد وزیر داخلہ ۱۶

دن بعد سرینگر پہنچے تو حریت اور کانگریس نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ اس معاملے کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ فرانس اور جرمنی کے حملوں پر افسوس جتانے والے وزیر اعظم نریندر مودی عرصۂ دراز تک خاموش رہے اور بولے بھی تو کشمیریوں کے زخموں پر نمک پاشی ہی کی۔

کشمیر کی صورتحال پر آج کل نیشنل کانفرنس کے رہنما عمر عبداللہ بہت کھری کھوٹی سنا رہے ہیں۔ محبوبہ مفتی کا یہی حال تھا جب وہ اقتدار سے محروم تھیں خیر عمر عبداللہ نے ایک بیان میں کہا کہ کشمیری نوجوانوں میں بڑھنے والے جوش وجذبات کا داعش سے کوئی لینا دینا نہیں ہے اور جو نوجوان جنگجوؤں کی صفوں میں شامل ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں، اُن کا تعلق مدرسوں سے نہیں ہے۔ عمر عبداللہ کو اس بات کا قلق ہے کہ کشمیر کے حالات پر دہلی یں منعقد ہوئی کل جماعتی اجلاس میں تمل ناڈو ڈی ایم کے کو تو بلایا گیا لیکن انہیں نظر انداز کیا گیا جبکہ وہ زمینی حقائق سے واقف ہیں۔ کل جماعتی میٹنگ کو انہوں نے کشمیر کی عوام کے لئے ایک ظالمانہ اور بھونڈا مذاق قرار دیا۔ پی ڈی پی ممبر پارلیمان مظفر حسین بیگ کے بیان کو عمر عبداللہ نے کشمیر مخالف اور مسلمانوں کی بدنامی سے منسوب کیا۔ بیگ نے کشمیر میں مظاہرین پر ہو رہے بے تحاشہ اور بے جا طاقت پیلٹ گن)کے استعمال کے خلاف احتجاج نہیں کرنے کی تلقین کی تھی۔ عبداللہ کے) مطابق مظفر بیگ کا یہ کہنا کہ نوجوان 'دو سیٹ قمیض

اور پاجامہ کے لئے جنگجو بن رہے ہیں' پی ڈی پی کی گندی ذہنیت کی غماز اور نوجوانوں کی تحقیر ہے اس لئے کہ بیشتر مظاہرین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آسودہ حال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

نیشنل کانفرنس کے سابق وزیراعلیٰ عمر عبداللہ نے الزام عائد کیا کہ کشمیر میں بڑھتے ہوئے غم وغصے کی بنیادی اور واحد وجہ نئی دلی کی طرف سے مسئلہ کشمیر کی حقیقت سے فرار ہے۔ اپنی ناکامی کی پردہ پوشی کیلئے بی جے پی نے ملک بھر میں ترنگا یاترا کے اہتمام کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ بی جے پی کا بہت پرانا حربہ ہے۔ ۱۹۹۲ء میں مرلی منوہر جوشی نے ملک بھر سے ایکتا یاترا کا اہتمام کیا تھا لیکن لال چوک میں ترنگا لہرانے میں ناکام رہے ۲۰۱۱ء میں پھر سے یہ کوشش کی گئی دوسری مرتبہ بھی اس کے حصے میں ناکامی ہی آئی بلکہ ہر بار علٰحیدگی پسندوں کی طاقت میں اضافہ ہی ہوا۔ اس بار پھر سارے ملک میں اس کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ وزیر اعظم کے دفتر میں جموں سے تعلق رکھنے والے مرکزی وزیر جتندر سنگھ نے بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ اگلے سال پاکستان کے مقبوضہ کشمیر میں ترنگا لہرائیں گے۔ جموں کے کٹھوعہ میں ترنگا یاترا شروع کرنے کے موقع پر مرکزی وزیر مملکت جتندر سنگھ نے کہا کہ اس ترنگا یاترا کا صحیح اختتام پاکستان مقبوضہ کشمیر میں ہونا چاہئے۔ مقبوضہ کشمیر کے مظفر نگر میں ترنگا لہرانے کیلئے تو خیر جتندر سنگھ نے ایک سال وقت مانگ

لیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ سرینگر میں وہ مبارک دن کب آئیگا؟
اس سال حریت کانفرنس نے ۱۴اگست یعنی قیام پاکستان کے دن استصواب جلوس کا اعلان کیا تھا۔ اس ریلی کو ناکام کرنے کی خاطر سخت ترین کرفیو لگایا گیا اس کے باوجود کشمیر کے مختلف علاقوں میں پاکستان کا پرچم لہرایا۔ اس کے برعکس لال چوک پر ترنگا لہرانے کا عزم اور علاحدگی پسندوں کو روکنے کا چیلنج کرنے والی لدھیانہ کی ۱۵ سالہ طالبہ جانوی کو سرینگر ہوائی اڈے سے انتظامیہ نے واپس بھیج دیا۔ایک پولیس افسر نے بتایا کہ ۳۰ دیگر لوگوں کے ساتھ جانوی بہل ہوائی اڈے پر پہنچی تھیں ۔ جانوی نے ۲۳ جولائی کو کہا تھا کہ ۱۵اگست کو وہ سرینگر کے لال چوک پر ترنگا لہرائیں گی ، کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر قومی پرچم کی توہین کی گئی ہے ۔ جانوی بہل کی ناکامی نے بی جے پی کے بلند بانگ دعووں کی پول کھول کر رکھ دی اور واضح کردیا کہ برہان نہ تو بندوق اٹھانے والا پہلا (کشمیری) اور نہ آخری ۔ مودی سرکار کو جو اٹل جی کی این ڈی اے سے سبق سیکھنا چاہئے جس نے ۲۰۰۳ میں کشمیری نوجوانوں کو عسکریت پسندی سے روکنے کیلئے ڈاکٹر ذاکر نائک کی خدمات حاصل کی تھیں ۔ ان لوگوں نے تو ذاکر نائک کو جعلی میڈیا ٹرائل کے ذریعہ تقریباً دہشت گرد قرار دے دیا۔ وزیراعظم کے انسانیت اور کشمیریت والے بیان کا جواب محسن نقوی کے اس شعر میں ہے کہ

تم منصف و عادل ہی شہر میں لیکن
کیوں خون کے چھینٹے سر دستار بہت ہیں

اہل قلم کو جرأتمندی کی ضرورت ہے

ناولوں کا آنا سماجی طور پر بھی اور سیاسی طور پر بھی، ہمارے ملک کے لیے تو ضروری ہے ہی، لیکن اردو ادب اور اردو زبان کے رول کو تاریخی مقام دینے کے لیے، جس طرح کا رول اس نے آزادی کے زمانے میں ادا کیا، اس طرح کی کتابیں شائع کرنا انتہائی ضروری ہے۔ یہاں صاحب کتاب کو مشورہ دیا گیا کہ ادیب کو ایسا ہونا چاہئے، ادیب کو یوں لکھنا چاہئے، میں اس مجلس کی صدارت کر رہا ہوں، نہیں تو جانتے میں کیا کہتا؟! میں کہتا کہ ادیب کو ہجڑا نہیں ہونا چاہئے۔ ادیب کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے۔ اس وقت سارے لوگ ناکام ہو چکے ہیں، کوئی سماج کے لیے آگے آنے کو یا تو تیار نہیں ہوتا، اور اگر تیار ہوتا ہے تو کامیاب نہیں ہوتا۔ ہمیں ذہنوں کو بدلنے کے لیے تلوار کی دھار، نشتر کی طرح، اسٹیل کی طرح تیز ہونا چاہئے۔ اور سماج کے لیے یہ جذبہ اور یہ تڑپ، ادیب کے لیے بہت ضروری ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ سے، جو ہندی اور انگریزی کے ادیب تھے، اس سے متعلق آج سے بیس سال پہلے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ بہت ہی نرم و نازک اور ڈھکے چھپے الفاظ میں لکھنا چاہئے، یا صاف صاف کہہ دینا چاہئے۔ کچھ دیر تک اسی طرح وہ مجھے دیکھتے رہے، اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اسٹیل کے چاقو کی طرح چیر دینا چاہئے، جو سچائی

ہے اس کو دکھادینا چاہئے۔

آپ ادیب بننے کے لیے لکھتے ہیں؟ کیا میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے ادیب کہا جائے؟ سو سال بعد ہم زندہ رہیں گے؟ سو سال کے بعد ہمارا نام زندہ رہے گا؟ اس سے ہمیں کیا ملے گا، وہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ اس لیے کہ یہ پریشان ہیں۔ اس لیے لکھ رہے ہیں کہ قدرت نے ان کو صلاحیت دی ہے، اور اس صلاحیت کا حق ان کو ادا کرنا ہے، یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ اگر ٹرین میں آپ جا رہے ہیں ، اور ایک ڈاکٹر وہاں بیٹھا ہوا ہے، اور کسی کے ہاتھ میں کوئی پرابلم ہونے لگی، تو اس ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ جاکر اس مریض کو دیکھے۔ اگر ہم ادیب ایک بڑی تصویر پورے ملک کی، اس کے کرداروں کی، اس کے مسائل کی، اس کی سازشوں کی، اگر اس طرح قوم کے سامنے پیش کرسکیں کہ وہ موجودہ صورتحال کو سمجھ سکیں کہ یہاں کیا ہورہا ہے، اور کیوں ہورہا ہے، اور لوگوں کا سوچنے سمجھنے کا انداز کیا ہے، تو یہ ہماری ذمہ داری ہے۔

بدلتی ہوئی صورتحال میں ، ابھی جو معاشرہ بدلا ہوا ہے، اس کے اندر ہزاروں طرح کی طاقتیں کام کررہی ہیں، اس کو محسوس تو ہر آدمی کرتا ہے، لیکن اس کو آرگنائز نہیں کرپاتا، پس منظر میں نہیں جاپاتا، پیچھے کون لوگ یہ سب انجام دے رہے ہیں، اس کو نہیں سمجھ پاتا۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ ایسی جگہ اس کو

یہ سب کچھ دکھادے۔ ایک بار اگر ہم نے ایسا شہری پیدا کردیا، اور یہ کتاب اگر اس کو ہندوستان کا ہر شہری ایک بار پڑھ لے تو وہ ان باتوں سے واقف ہو جائے گا، ان باتوں سے اس کے واقف ہونے کے بعد اس کی دنیا تبدیل ہو جائے گی، ملک بدل جائے گا، ملک کے شہری کو، اس کے ذہن کو مضبوط کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ جب آپ اس مقصد کے لیے لکھیں گے، تو کوئی دوسرا کون ہوتا ہے املاء کرانے والا کہ ایسا کیوں لکھ رہے ہیں، کیا لکھ رہے ہیں، ایسا لکھئے ، وغیرہ وغیرہ۔ ایسا کرتے کرتے ادب کو رکھ دیا گیا کنارے، نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کی سماج میں وہ اہمیت نہیں، ناولوں کی وہ اہمیت نہیں، جو اس کی ہونی چاہئے۔

ناول دنیا میں مسلسل جو انقلاب آتے ہیں، ان کو پکڑنے کے لیے، اور جن جن انقلابات کی ضرورت ہے اس کو پیدا کرنے کے لیے ہتھیار ہے۔ ہندوستان میں ناولوں کی ضرورت ہے، اس طرح کی ناولوں کی ضرورت ہے، جس طرح ہم پڑھتے لکھتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ضرورت ہے۔ یہ واحد وہ طریقہ ہے، جس میں بکھرے ہوئے سماج کو ایک ساتھ پیش کرکے سچے وژن کے ساتھ ، پوری سچائی کے ساتھ آرگنائز طریقے سے سارے کرداروں کو پیش کردیا جائے گا۔ خود بخود جس دن آپ فیصلہ کرتے ہیں، ووٹوں کے ذریعے سے اس دن آپ کا فیصلہ صحیح ہوگا۔ اور اگر فیصلہ غلط بھی ہوگیا، تو دوسرے دن سماج میں آپ ری ایکٹ کرنا جان رہے ہوں گے کہ اب آپ کو کیا کرنا ہے۔ اس لیے آپ کسی کے کہنے پر مت جایئے گا کہ کیسے

لکھنا ہے، کیا لکھنا ہے، فلاں کا نام لکھنا ہے یا نہیں لکھنا ہے۔

جس دن آپ یہ سوچ لیجئے گا کہ نہیں لکھنا ہے، اس لیے کہ وہ برا مان جائیں گے، ان کی دل آزاری ہو جائے گی، جو کروڑوں کی دل آزاری کیا، کروڑوں لاکھوں کا خون چوستے اور بہاتے ہیں، ان کی دل آزاری؟! اور اگر نام کے ساتھ آپ کسی کو لکھ دیتے ہیں، تو کوئی بات نہیں، یہ ڈھکا چھپا ہے کیا کہ کس ملک میں کون سے لوگ حکومت کرتے ہیں، کہاں پر کون لوگ حکومت کرتے ہیں، اور وہاں کس کے ساتھ کیا ہوا۔ صحافی بکے ہوئے ہیں، معاف کیجئے گا! اخبار بیچنا ہوتا ہے، اور ٹی وی پر دکھانا ہوتا ہے، اگر کوئی ایسی چیز دکھاتے ہیں جس کو پیسے والے پسند نہیں کریں گے، تو ایڈ نہیں ملے گا۔ صحافت کو مارکیٹ میں جانا ہے، ٹیلی ویژن کو مارکیٹ میں جانا ہے، سیاست داں اس لیے بکا ہوا ہے کہ اس کو مارکیٹ میں جا کر ووٹ لینا ہے۔ تنہا جو آدمی تبدیلی لا سکتا ہے سماج میں، وہ ایک ادیب ہے، کیوں کہ وہ ایک کتاب لکھ سکتا ہے، اپنی طرف سے شائع کرا سکتا ہے، اور اس کو تقسیم کرا سکتا ہے۔

اہل قلم کو کسی بھی قسم کے مصالح سے صرف نظر کرتے ہوئے جرأتمندی کے ساتھ اپنے کردار کو ادا کرنا چاہئے، یہی اہل قلم کی شان ہوا کرتی ہے، آج اسی جرأتمندی کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ادب اپنی معنویت اور اثرانگیزی کھوتا

جارہا ہے۔ ہندوستان میں قدیم اور جدید ناولوں میں کم ہی ایسے ناول ملیں گے جن میں سیاسی گلیاروں اور اہل اقتدار کے ذہن ودماغ کی عکاسی کی گئی ہوئی، اس قسم کے ناول اعلی مقام رکھتے ہیں۔

زمان و مکاں کی زناری سے آزاد پیغام آفاقی کا ناول پلیتہ

پیغام آفاقی دہلی کے اپنے 'مکان' سے نکلے تو سیدھے انڈمان پہنچ گئے۔ اس دور دراز کے سفر سے واپس آنے میں انہیں ۲۶ سال کا طویل عرصہ لگا لیکن جب لوٹے تو ان کے بغل میں پلیتہ تھا۔ جس کے بارے میں ناول کا ہیرو خالد سہیل کا دعویٰ ہے " ایٹمی توانائی سے بھرپور ایک گولا اس کتاب میں بند جو اس کی تحریر میں میز پر پڑی تھی اور جو خالد کے ذہن کا مکمل عکس تھی۔ اور اس گولے کا پلیتہ دلوں کے نہاں خانوں میں تھا۔" اس کتاب کا دھماکہ اس قدر زبردست تھا کہ ناول کا ہیرو اقبال سہیل بھی اس کی زد میں آ کر دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اردو ادب میں ان دھماکوں کا ارتعاش تا دیر محسوس کیا جائے گا اور مکان ہی کی طرح اس کے تراجم ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں دستیاب ہوں گے اس لئے کہ ہر لحاظ سے اس تصنیف کو مکان پر فوقیت حاصل ہے

۔

مکان عہد حاضر کا ناول ہے اس میں زمانہ نہیں بدلتا۔ اس کے برعکس پلیتہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو ماضی ہے جس کی نمائندگی شیر علی کرتا ہے اور دوسرا حال ہے جس کا نمائندہ خالد سہیل ہے اس کے علاوہ مستقبل کا ہیرو جیلانی ہے ۔ان تینوں زمانوں کا فرق ہی دراصل ان تینوں حصوں کے اسلوب

بیان میں محسوس ہوتا ہے۔ ماضی دراصل ٹھوس مادہ ہے جس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ جو ہوچکا سو وقت کے قرطاس پر ثبت ہوگیا اب وہ ایسی پتھر کی لکیر ہے ہذف و اضافہ کی صلاحیت سے محروم ہے۔ پیغام آفاقی جس وقت انڈمان کے بارے میں بتلاتے ہیں تو اس کی بنیاد ٹھوس تحقیق و تفتیش اور حوالہ جات پر ہوتی ہے۔

حال کا معاملہ یہ ہے کہ وہ سیال مادہ ہے جو جس برتن میں جاتا ہے اس کا روپ دھارن کرلیتا ہے۔ یہ اس ندی کی مانند ہے جس ہر قطرہ ہر لمحہ اپنی جگہ بدل دیتا ہے۔ کالا پانی جانے سے قبل اور بعد ناول کے ہیرو خالد سہیل کے حالاتِ زندگی میں غیر متوقع تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا عم زاد بھائی جمشید بھی عدالت کے اندر اسی طرح کی آزمائشوں کا شکار ہوجاتا جس طرح کے مشکلات امیر علی کو انڈمان جانے سے قبل پیش آئی تھیں۔ خالد کی ایک ملاقاتی خاتون کے ساتھ بنک کے اہلکار وہی سلوک کرتے ہیں جو کالا پانی میں سنہری کے ساتھ کیا گیا تھا۔ جس کیلئے وہ لوگ بالکل بھی تیار نہیں ہوتے۔ وہ سب وقت کے تیز دھارے میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی نت نئے رنگ بدلتی چلی جاتی ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو ہمارے سماج کے مختلف تلخ و شیریں گوشے اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

وقت کا دھارا تو لوٹ کر پیچھے نہیں جاتا لیکن مستقبل کا معاملہ اس سے مختلف ہے وہ مادے کی تیسری نہایت لطیف ہیٔت ہے جس کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن دیاھع ممکن نہیں ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے ہوا کو نہیں مگر اس سے اڑنے والے تنکوں کو دیکھ کر اس کی سمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ پانی اور ہوا کے بہاؤ میں جہاں یہ مشترک ہے کہ وہ اپنی رفتار بدلتے ہیں وہیں یہ اختلاف بھی ہے کہ پانی صرف ایک رخ میں بہتا ہے جب کہ ہوا اپنی سمت بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے کسی انسان کیلئے ممکن نہیں ہے کہ وہ ہوا کہ بارے میں کوئی متعین پیشن گوئی کرسکے۔ ناول نگار امروز سے فردا میں جانے کیلئے پروازِ تخیل کا سہارہ لیناپڑتا ہے۔ خالد سہیل کی موت کے بعد ناول زمانۂ حال سے نکل کر مستقبل میں قدم رنجا فرماتا ہے۔ پیغام آفاقی نے اس حصے کو بیان کرنے کیلئے بجاطور پر شاعری کی مدد لی ہے اس لئے اس میں بات تہہ دار ہوتی ہے۔ معنی و مفاہیم کے امکانات وسیع تر ہوجاتے ہیں۔

خالد سہیل کی زندگی اور موت کا اگر ہم اس دنیاوی زندگی اور اخروی حیات سے موازنہ کریں تو ایک دلچسپ مماثلت نظر آتی ہے۔ اول تو یہ کہ اس دنیا کی ہر شۓ بشمول عرصۂ حیات محدود اور فانی ہے۔ ہر لمحہ ہماری زندگی ایک ساعت حال سے نکل کر ماضی کے تا ہے کہ جب یہ سلسلہ تھمتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مستقبل کا خزانہ خالی ہوگیا۔ اس لئے کہ

انسان کو بعد از موت جو زندگی ملنے والی ہے وہ لا محدود ہے۔ یہاں زندگی کا موت سے سابقہ پیش آتا ہے وہاں موت کو موت آجائیگی اور انسان کبھی نہیں مرے گا۔ خالد سہیل کی موت سے ناول کا ایک باب بند ہوتا ہے لیکن ناول ختم نہیں ہوتا اس لئے زندگی کا تسلسل بھی انسان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ جاری و ساری رہتا ہے۔ اس کا تعلق چونکہ ابدی مستقبل سے ہے اس لئے وہ نظر تو نہیں آتا لیکن اسے محسوس کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ انسان بصارت کے ساتھ ساتھ ایمانی بصیرت بھی رکھتا ہو۔

ماضی کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک ماضی قریب اور دوسرا ماضی بعید۔ قریب و بعید کی مدت پر قرۃ العین حیدر اور مشرف عالم ذوقی کے درمیان یقیناً اختلاف ہوگا اس لئے اسے زندہ اور مردہ ماضی میں تقسیم کیا جائے۔ زندہ ماضی سے مراد وہ زمانہ جس میں وہی سیاسی و معاشی نظام نافذ تھا جس میں ہم جی رہے ہیں اس کے برعکس وہ زمانہ جس کا نظام داستان پارینہ بن گیا۔ مثلاً ملوکیت کا یا آمریت دور جو کم از کم ہندوستان کی حدتک ختم ہوگیا اور جمہوریت کا زمانہ جو جاری و ساری ہے۔ اس لحاظ سے کالاپانی کا زمانہ زندہ ماضی میں شمار ہوگا اس لئے کہ اسے جس برطانوی حکومت نے قائم کیا تھا وہ جمہوریت کی علمبردار تھی اور ہم لوگ آزادی کے بعد بھی اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو شیر علی ، خالد سہیل اور جیلانی

ایک ہی چکی میں پسنے والے دانے بن جاتے ہیں، ان کے مصائب وآلام مشترک ہوجاتے ہیں۔ شیر علی کا انطباق خالد سہیل اپنے حالات پر کرکے اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ جیلانی اور اس کا میزو ساتھی خالد کی رہنمائی میں مستقبل کی حکمت عملی طے کرتے ہیں۔ اگر ہم لوٹ کر مکان اور پلیتہ کا موازنہ کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان امن وسکون کی خاطر اپنے مکان میں پناہ لیتا ہے لیکن جب کوئی فاسد نظام اس کو بے مکان کر کے کالا پانی پر روانہ کردے تو وہ وہاں جاکر بارود کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے آتا ہے تاکہ ظلم واستحصال کی علمبردار استبدادی قوتوں کو نیست نابود کرکے عدل وانصاف قائم کرسکے۔ مکان کے اندر پیغام آفاقی نے اپنا زیادہ وقت کرداروں کے قلب وذہن کی تجزیے پر صرف کیا لیکن پلیتہ میں وہ باہر کی دنیا میں نکل گئے اور معاشرے کے اندر کارفرما سیاسی عناصر کی حکمت عملی اور معاشی طرز فکر کو اجاگر کرنے میں مصروف عمل ہوگئے۔ اس طرح گویا پیغام آفاقی مکان سے نکل کر زمان میں آگئے۔ انسان بزعم خود زمان و مکان کے حصار میں گرفتار رہتا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے عقل وخرد کو ے زمان و مکاں کی زناری سے آزاد کرنے کیلئے ضرب لا الہ کا استعمال کیا اور فرمایا

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری

نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الہ الا اللہ

پیغام آفاقی نے اس کام کیلئے دو ناول لکھے 'مکان' اور 'پلیتہ'۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ قلب و ذہن کے اندر موجود مضبوط صنم کدوں کو مسمار کرنے کیلئے۔براہیمی نظر کی ضرورت ہوتی ہے جس کی بابت خود علامہ فرماتے ہیں

براہیمی نظر پیدا مگر مُشکل سے ہوتی ہے

ہوس چھُپ چھُپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

پیغام آفاقی جیسے مردِ حق سے چونکہ یہ نکتہ پوشیدہ نہیں ہوتا کہ اس کی اولین یہی ذمہ داری 'حکمِ اذاں ہے' اس لئے وہ بے خطر آتش نمرود میں بھی کودپڑنے سے بھی پس و پیش نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نمرودِ وقت کے ساتھ ساتھ رائج الوقت نظام سے بغاوت کا علم بلند کیا تھا اور عقائد سے لے کر سیاست تمام ہی شعبہ ہائے حیات میں پائے جانے والے بتوں کو مصلحت کوشی کی سرحدوں کو عبور کرکے پاش پاش کردیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے منصب و مقام سے واقف تھا۔پلیتہ کے خالد سہیل پر بھی اپنا فرضِ منصبی آشکارہ ہوجاتا ہے تو اپنی کتاب کا آخری صفحہ اس طرح تحریر کرتا ہے۔

لوگو، تمہارے یہ ظالم آقا آسمان سے نہیں آتے۔

یہ کوئی اور نہیں یہ تم خود ہو۔

یہ جو اونچے اونچے پیڑ تم دیکھتے ہو ان کا بیج تم خود ہو۔

یہ ویسے ہی ہیں جیسے تم ہو۔

اگر تم اندر سے بدلتے تو یہ بدل گئے ہوتے۔ ....

خالد سہیل آگے لکھتا ہے

بتا کہ میری زندگی سنگین خطروں اور اندھیروں میں گھری ہوئی ہے اور میں اس کو بچانا چاہتا ہوں اور دشمن بڑا ہے اور اس کو ختم کرنا ہے اور یہ کام مجھ سے اکیلے نہیں ہو گا۔

بتا۔

بتا۔

بتا۔

تو خاموش کیوں ہے ؟

تو خاموش کیوں ہے ؟؟؟

تو نہیں بتائے گا۔

تو نہیں بتائے گا۔

تو نہیں بتائے گا۔

نہیں بتائے گا۔

نہیں۔

تو بتائے گا۔

بتائے گا۔

بتاؤ۔

نہیں بتائے گا۔

لا الاہ ال لاہ

لا الاہ

لا

اس کے منہ سے خون آ گیا۔ اور فرش پر جمع ہونے لگا۔

وقت آخر خالد کی زبان پر یہی کلمہَ لاالہ ہوتا ہے۔اس دنیا سے شاداں وفرحاں رخصت ہوتے ہوئے اپنے والد سے کہتا ہے کہ جو صلاحیت اسے ودیعت کی گئی تھی اس کا بھرپور استعمال کرکے اس نے کتاب لکھ دی۔ یہی اس کی ذمہ داری تھی اور اسی کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا۔ جو خود شناس لوگ اس نکتے کو پا لیتے ہیں وہی سنت ابراہیمی کو ادا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل

یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لَااِلٰہ میں ہے

واں یوم آزادی: تمہاری شہرتوں کی دھوم بے نام و نشاں ہوگی ۷۰

یوم آزادی سے قبل وزیراعظم نے اپنے خطاب سے متعلق عوام سے مشورے طلب کئے۔ سنا ہے اس کے جواب میں ہزاروں لوگوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔ ان میں سے ایک مشورہ ذرائع ابلاغ میں سب سے زیادہ مقبول عام ہوا۔ ارون تریویدی نام کے ایک شخص نے یہ تجویز بھیجی کہ آپ اپنی تقریر ۳۰ منٹ میں سمیٹ دیں۔ یہ مشورہ عوامی بیزاری کی علامت اور تیزی سے بدلتے رجحان کا ترجمان ہے۔ اس کے اندر یہ درد پوشیدہ ہے کہ مودی جی ہم آپ کی طول طویل تقاریر سے اوب چکے ہیں۔ اب بولئے کم اور کچھ کرکے دکھایئے۔ جہاں تک اس حکومت کی کارکردگی کا سوال ہے وہ بھی ریواولمپک میں جانے والے ہندوستانی جتھے کی طرح ہے۔ جس کے ساتھ بڑے بڑے نام ہیں۔ جس کی تشہیر پر بے شمار دولت خرچ ہوئی ہے لیکن نتیجہ ایک کانسے کا تمغہ اور چاندی کے تمغہ کا یقین یا طلائی تمغہ کی امید ہے بس۔

لال قلعہ جاتے ہوئے مودی جی نے آخری سوال یہی کیا ہوگا کہ اولمپک میں کچھ ملا کیا؟ اگر مل گیا ہوتا تو وہ حساب لگا کر بتاتے کہ کتنے سالوں میں پہلی بار فلاں کھیل میں میری قیادت کے اندر یہ تمغہ حاصل ہوا ہے۔ اس بابت جب مایوسی ہوئی تو انہوں نے سوچا کیوں نہ میں خود ہی کوئی ریکارڈ قائم کردوں۔

اب وہ بیچارے طول طویل تقریر کے علاوہ کر بھی سکتے ہیں کیونکہ ان کا سینہ صرف ۵۶ انچ کا ضرور ہے مگر زبان ۵۶ میل کی ہے۔ مودی جی نے یہ معلوم کیا کہ آج تک لال قلعہ سے کی جانے والی سب سے لمبی تقریر کس کی ہے؟ انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ ریکارڈ تو خود انہیں کے نام ہے۔ گذشتہ سال پنڈت نہرو کا ریکارڈ انہوں نے ہی توڑا تھا۔ اوراس سے پریشان ہو کر ترویدی جی کو ۳۰ منٹ کا مشورہ دینا پڑا۔ لیکن مودی جی کسی کی کب سنتے ہیں؟ انہوں نے اپنے سابقہ ریکارڈ میں ۸ منٹ کا اضافہ کرکے ۹۴ منٹ تک خطاب کیا۔ امید ہے آئندہ سال ۱۵ اگست تک اگر وہ وزیراعظم رہے تو کسی طرح مرتے پڑتے اپنی سینچری مکمل کرلیں گے۔ مودی جی کی موہ مایا پر مصحف اقبال توصیفی کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؎

انہیں دنیا کا ایسا موہ سوچو تو ہنسی آئے
وہ ستر سال کے ہوں گے مگر بچے لگے ہم کو

مودی جی نے اپنے بھاشن میں جنگ آزادی کو یاد کرتے ہوئے تین رہنماوں کے نام لئے اتفاق سے وہ تینوں گاندھی جی، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور پنڈت نہرو کانگریسی تھے۔ یہ سنگھ پریوار کی بدقسمتی ہے اس کے کسی رہنما نے ملک کی آزادی میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اس صورتحال کا دفاع کرتے ہوئے مودی جی نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے ہر کسی کو قربانی دینے کی یا جیل

جانے کی سعادت نہیں ملی ہو لیکن ہر ہندوستانی کا ایک خواب تھا جس کے سبب یہ آزادی ملی۔ افسوس کے آزادی کے ۷۰ سال بعد خواب دیکھنے والے مسند حکومت پر براجمان ہیں اور جعلی دیش بھکتی میں مدہوش آزادی کی جنگ میں اپنا خون پسینہ بہانے والوں کو غدارِ وطن ٹھہرا رہے ہیں۔

مودی جی لال قلعہ سے قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ ۶۹ سال قبل حاصل شدہ خودمختاری بمعنی سوراج کو سُوراج یعنی اچھی حکومت (فلاحی ریاست) میں تبدیل کرنا سو کروڑ عوام کا عزم ہے۔ انہوں نے یاددلایا کہ فلاحی ریاست کیلئے پنچایت سے پارلیمان تک، گرام پردھان سے پردھان منتری تک سب کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی ہوگی۔ اس موقع پر مودی جی کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ ایوان پارلیمانمیں جس ذمہ داری کو ادا کرنے کیلئے انہیں وزیراعظم بنایا گیا ہے کیا وہ اسے ادا کررہے ہیں؟ یا ہر اہم بحث کے وقت اسی طرح راہِ فرار اختیار کرلیتے ہیں جیسے کہ ایمرجنسی کے دوران اپنے آپ کو گرفتاری سے بچانے کیلئے کیا تھا۔ سنگھ پریوار کے رہنماوں نے آزادی کی جنگ میں کنی کاٹ کر اپنیذات کو انگریزوں مظالم سے محفوظ کرلیا لیکن اندراجی کے عتاب خود کو نہیں بچاسکے اور انہیں جیل جانا پڑا۔ مودی جی نے وہ موقع بھی گنوادیا اور بھیس بدل کر سادھو بن گئے۔ ان کے شاگرد خاص امیت شاہ کو جیل جانے کی سعادت تو حاصل ہوئی لیکن وہ بھی قتل کے الزام میں جس سے اقتدار کے

بل بوتے جان چھڑائی گئی۔

مودی جی کو چونکہ ۹۰ منٹ تک حکومت کی کارکردگی بیان کرنی تھی اس لئے انہیں بہت زیادہ دروغ گوئی کا سہارا لینا پڑا۔ ان کی نگاہ چونکہ اترپردیش کے آئندہ انتخاب پر ہے اس لئے انہوں نے دہلی سے ۳۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ناگلا فتیلا نامی گاوں کا ذکر کیا کہ وہاں جانے میں ویسے تو صرف ۳ گھنٹے لگتے ہیں لیکن بجلی کو وہاں پہونچنے میں ۷۰ سال لگے۔ ہندوستان کے اندر کس سڑک پر ۳۰۰ کلومیٹر کا سفر ۳ گھنٹے کے اندر طے ہوتا ہے یہ تو صرف مودی جی جانتے ہیں جو ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر سے نیچے قدم نہیں رکھتے اور اگر سڑک پر چلنا ہو تو ٹرافک ہٹا دیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ دین دیال گرام جیوتی یوجنا کے تحت گاوں میں بجلی کے کھمبے اور تار لگ گئے ہیں یعنی ٹھیکیداروں نے اپنے وارے نیارے کرلئے ہیں لیکن عوام کو بجلی نہیں ملی ۔ یہی مودی سرکار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دکھاوے کے کام خوب ہوتے ہیں ۔ سرمایہ داروں کی تجوریاں بھی بھرتی ہیں لیکن عوام کے ہاتھ انتخاب سے قبل جھوٹے وعدوں اورانتخاب کے بعد کھوٹے دعوں کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس کی وجہ ہمارے سیاستدانوں کی بدکرداری کا یہ عالم ہے کہ

ہم نے کردار کو کپڑوں کی طرح پہنا ہے
ہم نے کپڑوں ہی کو کردار سمجھ رکھا ہے

ویسے مودی جی کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ اس گاوں میں ۷۰ سال بعد ان کی قیادت میں بجلی پہنچی ہے۔ حقیقت یہ ہے ٹیوب ویل چلانے کیلیے اس گاوں میں بجلی ۱۹۸۵ء ہی میں پہنچ چکی ہے۔ ناگلا فتیلا میں جملہ ۶۰۰ مکانات ہیں جن میں سے ۱۵۰ گھر جو ٹیوپ ویل کیلیے لگائے جانے والے ٹرانسفر سے حاصل شدہ بجلی سے روشن ہیں۔ اس کے عوض ہر دو ماہ میں ۳۹۵ روپیے ادا کئے جاتے ہیں۔ باقی لوگ غربت کے سبب سے اس سہولت سے فیضیاب نہیں ہو پاتے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر گاوں میں لگے تاروں اور کھمبوں سے بجلی پہونچے گی تو اسے کون خریدے گا۔ نئے کنکشن سے ملنے والی بجلی اگر لوگوں کو مہنگی پڑے گی تو اس کی جانب کیوں کر آئیں گے ؟ اب جھوٹ پر جھوٹ یہ کہ وزیراعظم کے دفتر سے تصاویر اس دعویٰ کے ساتھ نشر ہو گئیں کہ ناگلا کے لوگ وزیراعظم کی تقریر سن رہے ہیں ۔ ناگلا فتیلا کے سابق پردھان دیویندر سنگھ نے ان کے متعلق بتایا کہ ان میں سے غباروں والی تصویر ناگلا سیندھی کی ہو سکتی ہے اس طرح وزیراعظم کے غبارے کی ہوا خود ان کے دفتر والوں نے نکال دی۔

وزیراعظم نے لال قلعہ سے فرمایا کہ ان کی کوششوں سے ۳۵۰ روپیے والا ایل ای ڈی بلب ۵۰ روپیے میں بکنے لگا ہے۔ آج تک چینل کے صحافی جب اس دعویٰ کی تصدیق کیلیے ، بازار میں پہنچے تو بہت سوں نے اس کے وجود سے انکار کر دیا

کچھ دوکانداروں نے بتایا وہ چین کا تھرڈ کلاس بلب ہے جو دوچار دن بعد بجھ جاتا ہے۔ اس تبصرے کو سنتے یہ کنفیوژن ہو رہا تھا کہ وہ بلب کے بارے میں ہے یا موجودہ سرکار پر ہے۔ اس بلب کے معاملے میں ایک نہایت خوبصورت کارٹوں سوشیل میڈیا کے اندر نظروں سے گزرا جس میں ایک عورت جب دوکاندار سے پچاس روپے والا بلب طلب کرتی ہے تو جواب میں دوکاندار مسکرا کر کہتا ہے بہن جی آپ کس کی باتوں میں آگئیں۔ ویسے یہ ذو معنی جملہ بلب اور سرکار دونوں پر صادق آتا تھا۔

یوم آزادی کی تقریر میں تیسرا بڑا جھوٹ گنا کسانوں سے متعلق تھا۔ کہا گیا ایک زمانے میں اترپردیش کے اخبارات کسانوں کے بھگتان کا رونا روتے تھے لیکن مرکزی کی حکومت نے ۹۵ فیصد کسانوں کو اپنی فصل کی رقم دلوادی ہے۔ اس دعویٰ کی تفتیش میں پتہ چلا کہ اترپردیش کے اندر اب بھی چینی ملوں پر کسانوں کا ۲۷۰۰ کروڑ کی رقم بقایا ہے جبکہ پورے ملک میں اس کا تخمینہ ۱۰۰۰۰ہزار کروڑ ہے۔ اس طرح کسانوں کی بقایا رقم کے بجائے ان کے زخموں پر نمک پاشی ہو گئی۔ اس دروغ گوئی سے معمارِ لال قلعہ شاہجہاں کی روح کو کس قدر صدمہ ہوا ہوگا۔ مغلیہ شہنشاہ کو اگر علم ہوتا کہ لال قلعہ کے چبوترے سے آگے چل جمہوری رہنما ایسے سفید جھوٹ بولیں گے تو شاید وہ قلعہ تعمیر ہی نہ کرتے یا اس کو کالے پتھر سے بنوا کر نام سفید قلعہ رکھ دیتے۔ کذب بیانی کے بل بوتے پر جھوٹی شہرت حاصل کرنے والوں کا انجام بشیر بدر کے اس شعر میں ملاحظہ فرمائیں ؎

ہماری شہرتوں کی موت بے نام نشاں ہوگی
نہ کوئی تذکرہ ہوگا نہ کوئی داستاں ہوگی

بنیادی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے وزیراعظم نے یوم آزادی کی تقریر میں مقبوضہ کشمیر اور بلوچستان کا ذکر کرکے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا جو ملک کی برسوں سے قائم شدہ خارجی پالیسی سے انحراف تھا۔ کشمیر کے معاملے میں پاکستان اور ہندوستان کے موقف میں ایک واضح فرق ہے۔ پاکستان اسے بین الاقوامی مسئلہ قرار دیتا ہے اور جب بھی اس کو اقوام متحدہ میں اٹھاتا ہے تو ہندوستان شملہ معاہدے کی روُ سے اس کو باہمی تنازعہ کے زمرے میں دال کر مسترد کردیتا ہے۔ پاکستان جب آپسی بات چیت کی پیشکش کرتا ہے جیسا کہ اس نے ابھی کی ہے تو ہندوستان اس کو داخلی معاملہ کہہ کر خارجاز بحث کردیتا ہے۔

وزیراعظم نے اب اپنے طے شدہ موقف پر کلہاڑی چلاتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کے ساتھ بلوچستان کے لوگوں کا شکریہ ادا کردیا اور سنا ہے جلاوطن بلوچستان کے رہنماوں سے بات چیت بھی زیر غور ہے۔ اگر یہ ہوجائے تو ہمارا پرانا موقف کمزور ہوجائیگا اور پاکستان کو وادیٔ کشمیر میں مداخلت کا جواز مل جائیگا۔ بلوچی رہنماوں سے ملنے کے بعد حریت کانفرنس کے لوگوں کو پاکستان جانے سے روکنے کا یا صلاح الدین کو واپس مانگنے کی بنیاد ہی متزلزل ہوجائیگی۔ یہ

وہی صورتحال ہے جو پوکھرن دھماکوں کے بعد رونما ہوئی تھی۔ پہل چونکہ ہماری جانب سے ہوئی تھی اس کی آڑ میں پاکستانی دھماکے اپنے آپ جائز ہو گئے۔ اس ایک بیان سے پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بہتری میں دوسالہ پیش رفت پر پانی پھر گیا۔ پاکستان نے نہ صرف کشمیر کے مسئلہ پر اقوام متحدہ کو خط لکھ دیا بلکہ ہندوستان کو بھی باہم گفت و شنید کی تحریری پیشکش کردی۔ اسی کے ساتھ حافظ سعید جیسے سخت گیر لوگوں کے اوپر سے پابندیختم کردی۔ اب وہ کھلے عام ہمارے خلاف ذرائع ابلاغ میں زہر افشانی کرنے لگے ہیں۔ مودی جی نے اس ایک بیان سے خود اپنے ہی کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

ہندپاک تعلقات فی الحال بے حد کشیدہ ہوگئے ہیں۔ راجناتھ سنگھ کا پاکستانی دورہ بری طرح ناکام رہا۔ وزارت داخلہ کی سارک کانفرنس میں کسی سکریٹری کو روانہ کرکے کام چلایا جاسکتا تھا لیکن پاکستان کے اندر اس کوڈانٹ پلانے کا جوش مہنگا پڑا۔ پاکستانی انتظامیہ نے انتہائی محفوظ علاقہ میں صلاح الدین کی موجودگی میں مظاہرہ کرواکر اپنے ارادے واضح کردیئے یہاں تک کہ راجناتھ سنگھ کو درمیان سے عشائیہ منسوخ کرکے واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد ارون جیٹلی نے عبرت پکڑتے ہوئے پاکستان جانے سے انکار کردیا ہے۔ وزیر دفاع منوہر پاریکر نے پاکستان جانے کو جہنم میں جانے سے مشابہ قرار دے دیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چند ماہ قبل وزیراعظم روس سے واپسی میں بن بلائے

اس جہنم میں کیوں چلے گئے تھے ؟ اور اگر اس وقت وہ جنت نشان تھا تو اسے جہنم میں کس نے تبدیل دیا؟

ہندوستان کی جانب سے بلوچستان کا ذکر پہلی بار شرم الشیخ میں سابق وزرائے اعظم منموہن سنگھ اور یوسف رضا گیلانی کے مشترکہ اعلامیہ میں ہوا تھا۔ اس وقت بی جے پی نے پہلے تو ایوان کے باہر آسمان سر پر اٹھا لیا اور پھر اس کے بعد پارلیمان کے اندر اس کے تمام ہی بڑے رہنماوں نے اس کی جم کر تنقید کی ۔ اڈوانی جی اور سشما سواروج نے اسے ایوان زیریں میں قابل شرم بتایا۔ ارون جیٹلی اور سابق وزیر خارجہ یشونت سنہا نے ایوانِ بالا میں اس کی بھرپور مخالفت کی ۔ یشونت سنہا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کلنک کو دھونے کیلئے سات سمندروں کا پانی بھی ناکافی ہے۔ مودی جی تو خیر ان دنوں گجرات کے اندر فرضی انکاونٹر میں مصروف تھے اس لئے انہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلا ہوگا لیکن اب کی بار اگر وہ اپنی تقریر رٹنے سے قبل اسے کسی پڑھے لکھے ساتھی کو دکھا دیتے تو ممکن ہے اصلاح ہو جاتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مودی جی کو بلوچستان اور مقبوضہ کشمیر کے عوام کی فکر تو ہے لیکن خود اپنے کشمیر میں ہلاک ہونے والے ۶۰ نوجوان ، ۸۰۰۰ سے زیادہ زخمیوں اور ۴۰ دنوں سے طویل کرفیو سے پریشانی نہیں ہے۔اس بے حسی اور ہٹ دھرمی کے سبب حزب اختلاف کو صدر مملکت سے ملاقات کیلئے مجبور ہونا پڑا ہے۔

لال قلعہ سے یہ مودی جی کی یہ تیسرا خطاب تھا۔ ان کی تینوں تقریروں ایک بات مشترک تھی کہ پہلے والی سرکاریں آکشیپوں (اعتراضات) میں گھری رہتی تھیں اب یہ حکومت اپیکشوں (توقعات) سے گھری ہوئی ہے۔ یہ جملہ کانوں کو بہت بھلا لگتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مودی سرکار سے لوگ کس قسم کی توقعات وابستہ کررہے ہیں ۔ کیا انہیں امید ہے کہ کالا دھن واپس آیگا؟ خواتین کا احترام اور تحفظ بڑھے گا؟ بیروزگاروں کو روزگار ملے گا؟ دلتوں اور پسماندہ طبقات کی ترقی ہوگی؟ اقلیتوں کو انصاف ملے گا؟ مہنگائی میں کمی آئیگی؟ کشمیر میں امن و امان ہوگا؟ سب کا ساتھ اور سب وکاس ہوگا؟ جی نہیں دوسال قبل جن دھن یوجنا کا اعلان ہوا۔ کروڈوں کھاتے کھلوائے گئے جن میں دھن تو نہیں ہے ہاں انہیں جاری رکھنے کیلئے قومی معیشت کے کروڑوں روپئے خرچ ہورہے ہیں۔ دوسرے سال اسٹینڈاینڈ اسٹارٹ اپ انڈیا (اٹھو اور دوڑو) کا نعرہ لگایا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بھکت جعلی گئو رکشک بن کر عام شہریوں کے پیچھے بھاگنے لگے۔ پہلے شمالی ہند کے مسلمان پھر گجرات اور آندھرا کے دلت اور اب کرناٹک میں خود بی جے پی کے کارکنان کو ان لوگوں نے مارڈالا۔ یہ عجیب گئو بھکت ہیں کہ جو اپنی ماں کا دودھ پینے کے بجائے اس کے نام پر بلا تفریق مذہب ملت انسانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے لگے ہیں۔

زیڈ پلس سیکیورٹی سے

گھرے ان کے چہیتے وزیراعظم اپنا ۵۶ انچ کا سینہ کھول کر اپنی چھاتی پر گولی مارنے کی دعوت دے رہے ہیں ۔ کاش کہ یہ سرخ اعلان بھی ۱۵ اگست کو لال قلعہ سے دوہرایا جاتا تاکہ یہ یادگار تقریر ماحول سے ہم رنگ ہوجاتی اور راجستھان کے گئو بھکت وزیراعظم کی تصویر کو گئو موتر سے پوتر کرنے کے ارادے ترک کردیتے۔ گئو رکشا کے چکرویوہ میں چھٹپٹاتے وزیراعظم کی حالت زار پر یہ ترمیم شدہ شعر صادق آتا ہے کہ

ووٹ تھے گائے کے پیالے میں

اور پیالہ الٹ گیا مجھ سے •••••

ڈھونگی دیش بھکتی اور پاکھنڈی سوریہ نمسکار

وارانسی ایک تاریخی شہر ہے۔ فی الحال وہ وزیر اعظم کے حلقۂ انتخاب کی حیثیت سے معروف ہے لیکن صدیوں سے اپنے گھاٹ اور مرگھٹ کیلئے مشہور ہے۔ یہاں موجود منی کارنکا نامی شمسان گھاٹ پر ۲۴ گھنٹے ارتھی جلتی ہے۔ رکشا بندھن کے دن جب گنگا میں طغیانی آئی تو وارانسی کی سطح آب میں ہر ایک گھنٹے میں تین سے چار سینٹی میٹر کا اضافہ ہونے لگا۔ رات ۱۲ بجے تک گنگا میا خطرے کے نشان یعنی ۲۶ء۷۱ کو پھلانگ کر ۴۸ء۷۱ پر پہنچ گئی۔ سیلاب نے سارے گھاٹ غرقاب کردیئے۔ لاشوں کو گلیوں پر نذرِ آتش کیا جانے لگا اور گنگا آرتی چھتوں پر ہونے لگی۔ سیلاب زدگان کو نکالنے کیلئے کشتیوں کا استعمال ہو رہا تھا۔ ۱۰ ہزار لوگ متاثر ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی کو اپنے رکن پارلیمان وزیر اعظم کا خیال نہیں آیا۔ ان میں سے کسی نے راکھی بھیج کر رکشا کی گہار نہیں لگائی۔ اس لئے کہ اپنے رائے دہندگان کے دکھ درد سے غافل وزیر اعظم نے کوئی بیان تو کجا ٹویٹ تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔

کرناٹک میں رکشا بندھن ہی کے دن ہندو جاگرن ویدیکا کے ہاتھوں بیل کی اسمگلنگ کے شک میں مارے جانے والے بی جے پی کے کارکن پروین پجاری کے

پسماندگان کو ہندو ہردیہ سمراٹ کے آگے دامن پھیلانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ پروین کے ساتھ شدید زخمی ہونے والے اس کے نائب اکشے دیودیگا یا اس کی بہن نے بھی رکشا بندھن کے دن اپنے بھائی کی سورکشا کی بھیک نہیں مانگی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنی ہی پارٹی کے وزیراعظم سے گئورکشکوں سے سورکشا طلب کرتی لیکن یہ نہیں ہوا ۔کرناٹک تو دور وزیراعظم کی اپنی ریاست گجرات میں رکشا بندھن سے تین دن قبل یوم آزادی کا جشن مناکر واپس جاتے ہوئے زدوکوب ہونے والے اونا کے دلتوں نے بھی وزیراعظم کو راکھی بھیج کر سورکشا کی دہائی نہیں دی۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ لال قلعہ کی تقریر میں وزیراعظم نے بلوچستان ، پاک مقبوضہ کشمیر اور گلگت کے غیروں کو تو یادرکھا مگر اپنوں کو بھول گئے۔ اس موقع پر ساحر لدھیانوی کا نغمہ بے ساختہ یاد آتا ہے

غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم، اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر
رہنے دے ابھی تھوڑا سا بھرم، اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر
ہم چاہنے والے ہیں تیرے،یوں ہمکو جلانا ٹھیک نہیں
محفل میں تماشا بن جائیں، اس درجہ ستانا ٹھیک نہیں مرجائیں گے مٹ جائیں گے ہم
اے جانِ وفا یہ ****،

وزیراعظم اکیلے پاکستانیوں کے ہمدرد و بہی خواہ نہیں ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی پر پاکستان فوبیا سوار ہو گیا ہے۔ جب بھی وہ کسی مشکل

میں مبتلا ہوتے ہیں نہ جانے کیوں انہیں پاکستان یاد آنے لگتا ہے۔ قومی انتخاب سے قبل جب نتیش کمار نے نریندر مودی کی امیدواری کے خلاف علم بلند کیا تو بہار کے سابق وزیر گری راج سنگھ نے کہا تھا جو لوگ مودی کے مخالف ہیں وہ پاکستان چلے جائیں۔ انہوں نے ایک جلسہ عام میں یہ اعلان کیا تھا بہت جلد یہ سارے مخالفین بھارت میں نہیں پاکستان میں ہوں گے۔ اس بیان کے عوض وہ وزیر بنا دیئے گئے لیکن ان کی حلف برداری کی تقریب میں پاکستانی وزیراعظم بذاتِ خود موجود تھے۔ گویا دوسروں کو پاکستان بھیجنے والوں نے اقتدار ملتے ہی پاکستان کو اپنے گھر میں بلا کر گلے لگا لیا تھا۔

گری راج سنگھ کی پچھلے دنوں ایک اور متنازع ویڈیو سوشل میڈیا میں آئی تھی جس میں انہوں مسلمانوں کے بجائے ہندووں پر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ کوبرا ڈاٹ کام کے ذریعہ جاری کردہ ویڈیو میں گری راج برملا کہتے ہیں کہ ہندو جیسا ہیجڑا کوئی قوم نہیں ہے۔ اگر ہندو ہوتا تو کیا پٹنہ میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگتا۔ سب ایک ایک ڈھیلا پھینک دیتے۔ اس کے معنی ہوئے گری راج نے اپنے ہمنواوں کو سنگسار کرنے ترغیب دی۔ وہ آگے بولے ہندووں کے جذبات ختم ہو رہے ہیں۔ ویسے اگر مقدس والا بیان گری راج کے بجائے اعظم خان کا ہوتا تو انہیں کب کا بنا پاسپورٹ اور ویزا پاکستان روانہ کر دیا جاتا۔ گری راج تو کجا بہار کے صوبائی انتخاب میں بی جے پی کے قومی صدر کو جب یقین ہو گیا کہ اب

یہاں دال نہیں گلے گی تو انہوں نے اعلان کردیا کہ اگر انتخاب میں بی جے پی ہار گئی تو پاکستان میں پٹاخے پھوٹیں گے۔ بہار کے لوگوں نے سوچا پاکستان میں پٹاخے چھوٹیں یا بم پھوٹیں اپنی بلا سے۔ ہمیں اس سے کیا مطلب؟ ہم تو اپنی ریاست کے اندر لالٹین کی روشنی میں تیر چلا کر کمل کی پنکھڑیاں بکھیر دیں گے۔ اس طرح دہلی کی مانند گاندھی سوچھ ابھیان کا جھاڑو کمل پر چل گیا۔

بی جے پی نے بہار کی عبرتناک شکست سے سبق نہیں یکھا۔ اترپردیش کے گری راج سنگھ یعنی سنگیت سوم نے اب اترپردیش کے صوبائی انتخاب کو ہند پاک جنگ قرار دے دیا ۔سنگیت سوم ایک زمانے تک سماجوادی پارٹی میں تھے اور اس وقت انہوں نے ایک بیف برآمد کمپنی میں شراکت داری بھی کی تھی لیکن اب وہ بہت بڑے گئو بھکت بنے ہوئے ۔ایکطرف تو وہ بی جے پی کے رکن اسمبلی ہیں لیکن اسی کے ساتھ مظفر نگر فساد کے نامزد ملزم بھی ہیں ۔ انہوں نے میرٹھ کے اندر اپنی ایک تقریر میں صوبائی انتخاب کے حوالے سے کہا ’’یہاں لڑائی ہندوستان اور پاکستان کی ہے۔ یہ دھیان میں رکھنا کہ ایک طرف ہندوستان ہے اور دوسری طرف پاکستان ہے۔ تمہیں کیا کرنا ہے سوچ لو! کرنا کیا ہے یکطرفہ کرلو معاملے کو۔‘‘ اترپردیش بی جے پی کے صدر کیشو پرشاد موریہ نے اس بیان کو مسترد کرکے کہا ’’یہ نہ بی جے پی کا بیان ہے اور نہ ہم اس کی حمایت کرتے ہیں لیکن ہم اس کا

جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے‘‘۔اس طرح کے بیانات بی جے پی شدید جھنجھلاہٹ کا ثبوت ہیں۔ قومی انتخاب سے قبل بی جے پی کو اس طرح کا ہیجان پیدا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن بہار میں اپنی ڈوبتی نیا کو پار لگانے کیلئے پاکستان کو یاد کیا گیااور اب اترپردیش میں یہ ہو رہا ہے۔

دہلی کے اندر حلف.برداری کی تقریب شریک ہونے کیلئے توخیرپاکستان کے وزیراعظم نواز شریف مودی جی کی دعوت پرآئے تھے لیکن ہمارے وزیراعظم تو بن بلائے لاہور پہنچ گئے نیزامن وآشتی کے ایک نئے دور کاآغاز کرکے لوٹے لیکن اب وہ موسم بدل گیا ہے۔وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ کے ناکام پاکستانی دورے کے بعد وزیرخزانہ ارون جیٹلی نے پاکستان جانے سے توبہ کرلی ہے۔ وزیردفاع منوہرپریکر نے توپاکستان جانے کو جہنم میں جانے جیسا قرار دے دیا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وزیردفاع کو یہ بیان دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی اس لئے انہیں تو نہ کسی نے بلایا ہے اور نہ وہ بن بلائے جانے والوں میں سے ہیں۔وزیردفاع کو چاہئے کہ وہ اپنا وقت فضول کی بیان بازی میں صرف کرنے کے بجائےآرمی چیف دلبیر سنگھ سہاگ اور ساتھی وزیروی کے سنگھ کے درمیان چھڑی ہوئی مہابھارت کی صلح صفائی میں لگائیں۔ سچ تو یہ ہے اگر بحریہ کی آبدوز سے متعلق خفیہ کاغذات کے منظر عام پرآنے کا جو شرمناک واقعہ رونما ہوا ہے اس پر وزیردفاع منوہرپریکر کو مستعفی ہوجانا چاہئے۔

وزیر دفاع یوں تو پڑھے لکھے آدمی ہیں لیکن سنگھ پریوار کی تربیت نے انہیں خاصہ بدزبان بنا دیا ہے۔اس سے قبل انہوں نے چینیوں پر چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا آج کل میں دیکھ رہا ہوں کی گنیش کے مجسمہ کی آنکھ چھوٹی ہوتی جارہی ہے۔اس کی وجہ ان کا چین سے بن کر آنا ہے ۔اس کے بعد کہہ دیا تھا کہ دہشت گردوں کا مقابلہ دہشت گردوں کے ذریعہ کیا جائیگا۔جب پاکستان نے اس غیر ذمہ دارانہ بیان کی مذمت کی تو آندھرا کی مرچی لگنے والا سڑک چھاپ بیان دے دیا اوراب پاکستان کے جہنم زار ہونے کا اعلان فرمادیا۔

وزیر دفاع نے تو خیر کبھی پاکستان کی شکل ہی نہیں دیکھی لیکن حال میں پاکستان سے لوٹ کرآنے والی کانگریس کی سابق رکن پارلیمان رمیا نے کہہ دیا پاکستان جہنم نہیں ہے۔ رمیا کی تائید پاکستان کا دورہ کرنے والے ایک وفدکے سربراہ کیلاش نارائن سنگھ دیونے کردی اور بولے پاکستانی سیاستداں نرم خو ہیں اور انہوں نے ضابطے سے ہٹ کر ہمارے عیش آرام کا خیال رکھا بلکہ ایک نشست میں جب کشمیر اور بلوچستان پر سوالات کئے گئے تو کنونیر نے متنازع موضوعات کو چھیڑنے سے منع کردیا ا۔س وفد میں بی جے پی کے رکن پارلیمان دیوجی پٹیل بھی موجود تھے اور انہوں نے اس بیان کی تردید نہیں کی ۔

کرناٹک میں بی جے پی کے نقطۂ نظر سے اس کے اپنے کارکن پروین پجاری کی گئو

رکشکوں کے ہاتھوں ہلاکت اور اکشے دیو دیگا کا شدید زخمی ہونا بڑی رسوائی کا سبب بنا ہوا ہے۔ اس کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے بی جے پی والوں نے ایمنسٹی کے دفتر پر ہلہ بول دیا اور توا ور ایمنسٹی پر بغاوت کا الزاجڑ دیا۔ ایک معروف بین الاقوامی ادارے کا غالباً پہلی مرتبہ ایسے مہان دیش بھکتوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ اس حرکت میں نیک نامی کم اور بدنامی زیادہ تھی اس لئے پردہ پوشی کی خاطر رمیا کے خلاف ایک وکیل وٹھل گوڑا نے نجی پٹیشن داخل کرکے پولس سے رمیا کے خلاف بغاوت کا مقدمہ درج کرنے کی گزارش کی۔ رمیا کا قصور تو صرف یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا پاکستان جہنم نہیں ہے وہاں بھی ہمارے جیسے لوگ رہتے ہیں لیکن وزیراعظم تو اپنے دورے کے بعد پاکستان اور نواز شریف کی دل کھول کے تعریف کرچکے ہیں۔ اڈوانی جی نے یہاں تک کہہ دیا تھا ہر پاکستانی میں چھوٹا سا ہندوستان اور ہندوستانی میں ننھا سا پاکستان رہتا ہے۔ کوئی بعید نہیں گوڑا جیسا کوئی سرپھرا گاندھی جی کے خلاف بھی مقدمہ دائر کردے جنہوں نے ۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کہا تھا نہ ہندوستان جہنم ہے اور نہ پاکستان۔ ویسے سپریم کے مطابق جب تک کہ کوئی عملاً تشدد میں ملوث نہ ہو اس پر بغاوت کا الزام درست نہیں ہے۔

بی جے پی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ گئو رکشک دن بہ دن بے قابو ہوتے جارہے ہیں۔ یہ لوگ نہ ان کے خلاف کارروائی کرسکتے ہیں اور نہ حمایت۔ اس لئے نت

نئے طریقوں سے عوام کے ذہنوں کو پراگندہ کر رہے ہیں۔ گئو بھکتوں کا یہ عالم ہے کہ پہلے تو گوشت دیکھتے ہی انہیں پتہ چل جاتا تھا کہ یہ کس مویشی کا گوشت ہے اور وہ لیباریٹری کی رپورٹ آنے سے قبل ہی ملزم کو دستور ہند کے بجائے منوسمرتی کے مطابق قرار واقعی سزا دے دیتے تھے۔ اس کے بعد وہ لوگ گائے کی کھال اتارنے والوں کو دیکھ کر پتہ لگانے لگے کہ یہ گائے فطری موت مری ہے یا اس کو ذبح کیا گیا ہے اور وہ اپنی خودساختہ شناخت کی بنیاد پر سزا نافذ کرنے لگے۔ ان کی مہارت مزید اضافہ ہوا تو ان ٹرک میں موجود بیل یہ بتانے لگے کہ انہیں بیچنے کیلئے لے جایا جارہا ہے یا ذبح کرنے کیلئے ۔ معاملہ یہاں بھی نہیں رکا اور اب تو یہ حال ہے کہ چرمی بیگ کو سونگھ کر معلوم کرلیا جاتا ہے کہ وہ گائے کے چمڑے سے بنا ہوا ہے یا کسی اور جانور کی کھال سے۔ ایسے ماہرین مویشیات تو شاید افریقہ کے جنگلوں میں بھی نہیں پائے جاتے۔

مؤخرالذکر واقعہ کسی دیہات کا نہیں ممبئی شہر کا ہے جہاں دن کے گیارہ بجے ایک آٹو رکشا ڈرائیور نے اپنے پیچھے بیٹھے مسافر سے سوال کیا تمہارے جھولے سے بو آرہی ہے۔ مسافر نے بتایا یہ چمڑے کا بیگ ہے۔ بس کیا تھا وہ ڈرائیور آگ بگولا ہوگیا تم گائے کا چمڑہ استعمال کرتے ہو اور پھر ایک مندر سے قریب اپنے دو دوستوں کے پاس لے گیا۔ ان لوگوں کی غیر قانونی تفتیش پر مسافر نے

بتایا کہ وہ آسام کا رہنے والا ورون کشیپ بھیان ہے۔ یہ سن کر سوال کیا گیا وہی آسام جو بنگلادیش کے پاس ہے؟ اس بیچ وہ بیگ کو ٹٹول کر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا چکے تھے ۔اس کے بعد انہوں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا جانے دو۔ براہمن ہے۔ اس دوران مسافر رکشا کا نمبر لکھ چکا تھا اب اس نے ڈرائیور اس کا فون نمبر پوچھا تو ڈرائیور نے ڈانٹ کر کہا آج بچ کر جارہے ہو اس کو غنیمت جانو۔ کشیپ نے پولس میں شکایت لکھوانے کی کوشش کی تو این سی لکھ کر ٹرخا دیا گیا۔

یہ عجیب تماشہ ہے وزیر اعظم تو گئو رکشکوں کا ڈوسئیر تیار کرنے کا حکم دیتے ہیں اور انتظامیہ ایف آئی آر تک درج نہیں کرتا۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرکے تفتیش کی جائے تو وزیر اعظم کے اس بیان کی تصدیق ہوجائیگی جس میں انہوں نے کہا تھا ان گئو رکشکوں میں سے ۸۰ فیصد جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ وزیر اعظم کی بات ممبئی پولس نے تو نہیں سنی لیکن پنجاب کی پولس نے اس پر عملدارآمد کرتے ہوئے گئو رکشا دل کے سربراہ ستیش کمار کو گرفتار کرلیا۔ وہ گرفتاری کے خوف سے ورنداون میں روپوش تھا۔ کمار پر نقصان پہونچانے کی نیت سے اغواء اور غیر قانونی تحویل میں رکھنے کے الزامات ہیں۔ تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۷ کے تحت اس پر لوطیت یا بدفعلی کا بھی الزام ہے۔ یہ سنگین شکایت ایک اغواء شدہ فرد نے ستیش کمار کے ساتھیوں پر لگایا تھا۔
اگر ستیش کمار گئو

ماتا کے بجائے مدر انڈیا کی رادھا کا بیٹا ہوتا تو وہ اسے زندہ نہ چھوڑتی۔
مہاراشٹر کی بی جے پی سرکار نے گزشتہ سال دعویٰ کیا تھا کہ عثمان آباد میں ایک بھی کسان کو خودکشی پر مجبور نہیں ہونے دیں گے لیکن ایک سال بعد پتہ چلتا ہے کہ خودکشی کرنے والے کسانوں کی تعداد میں ۲۵ فیصد کا اضافہ ہوگیا اور یہ تعداد ۱۳۶ سے بڑھ کر تک پہنچ گئی۔ مراٹھواڑہ میں پر بھی ۵۷۴ کے مقابلے ۶۸۳ کسانوں نے خودکشی ۱۷۲ لیکن سرکار کو اس پر کوئی ندامت نہیں ہے وہ تو سوریہ نمسکار کے چکر میں پڑی ہوئی ہے۔
ممبئی بلدیہ کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر بی جے پی والوں نے سوریہ نمسکار کے نام پر ایک نیا پاکھنڈ رچا۔ گزشتہ ایک سال سے میونسپل کارپوریشن میں شیوسینا اور بی جے پی کے درمیان نورا کشتی چل رہی ہے۔ بی جے پی والوں کی ہر قرارداد کو شیوسینا ناکام کردیتی ہے اس لئے اب کی بار بی جے پی کی کاونسلر سمیتا کامبلے نے سرکاری اسکولوں میں سوریہ نمسکار کو لازمی قرار دینے کی تجویز کردی۔
بی جے پی کو یقین تھا کہ مسلمان سڑکوں پر اتر آئیں گے اور شیوسینا حسب روایت اس کی مخالفت کردے گی اس طرح ہندو رائے دہندگان کو ورغلانے کا نادر موقع ہاتھ آجائیگا۔
شیوسینا بحث کے دوران خاموش رہی مگر آخر میں تائید

کردی۔ مسلمانوں نے سڑک پر آنے کے بجائے میمورنڈم اور عدالت پر اکتفا کیا جس سے بی جے پی کا داوں ناکام ہوگیا۔ اصلی سوریہ نمسکار تو سورج کے طلوع ہوتے وقت کیا جاتا اس وقت اسکول میں کوئی طالب علم ہی نہیں ہوتا۔ ویسے جن اسکولوں لازمی درسی کتابیں تک ٹھیک سے پڑھائی نہیں جاتیں ان میں نقلی سوریہ نمسکار کون کرائے گا یہ جاننا بہت مشکل نہیں ہے۔

بی جے پی اور شیوسینا کے درمیان ریاست بھر میں جاری نورا کشتی ریو اولمپک میں طلائی تمغہ جیتنے والی جاپانی خاتون پہلوان ریسا کو کوائی کی یاد دلاتی ہے۔ ریسا نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد مبارکباد دینے کیلئے آنے والے اپنے کوچ کاجو ہیتو ساکائی کو دو مرتبہ سب کے سامنے پٹخنی دی اور پھر اسے کندھے پر اٹھا کر دوڑ لگائی۔ بی جے پی اور شیوسینا کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ہر جیت کے بعد بھرے بازار میں ایک دوسرے کو دھوبی پچھاڑ دیتے ہیں۔ اپنی حرکت کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے ریسا کو کوئی نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ میں نے پہلے ہی اپنے مربی کو مطلع کردیا تھا کہ اگر وہ کامیابی کے بعد مبارکباد دینے کیلئے رنگ میں آئیں گے تو وہ ان کے ساتھ یہ سلوک ہوگا۔ ممکن ہے شیوسینا کی مانند کوچ کاجو ہیتو نے اسے کو مذاق سمجھا ہو؟ لیکن چرخ نیلی فام نے یہ منظر دیکھ چکا ہے کہ جب بی جے پی نے این سی پی کی بلاواسطہ مدد سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا تو شیوسینا والے کہہ رہے تھے۔

ہم بھی تھے تیرے منظورِ نظر، جی چاہے تو اب اقرار نہ کر
سو تیر چلا سینے پہ مگر، بیگانوں سے مِل کر وار نا کر
بے موت کہیں مر جائیں نا ہم، اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر

نئے مداری نے دو ہی دن میں تماشے کیا کیا دکھا دیئے ہیں

مداری بیچارہ ہر روز کنواں کھودتا ہے اور پانی پیتا ہے۔ مجمع لگانا اس کی مجبوری ہے۔ نئے زمانے کا متمول انسان سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر تماشہ نہیں دیکھتا بلکہ اپنے دیوان خانے میں بیٹھ کر ٹیلوژن کے پردے پر تفریح کی پیاس بجھاتا ہے۔ ہر کوئی اپنے ذوق کے مطابق چینل کا انتخاب کرتا ہے۔ سیاست میں دلچسپی رکھنے والوں کا دل بہلانے کیلئے ٹائمز کی ہچکولے کھاتی ناو، آج تک کی تاک جھانک اور زی ٹی وی کی نوٹنکی جیسے کئی متبادل موجود ہیں ۔چونکہ ارنب جیسے مداریوں کا پیٹ اسی سے بھرتا ہے اس لئے ہر روز نیا مباحثہ لگانا ان بیچاروں کی مجبوری ہے ۔مداری کو جگہ بدل کر مجمع لگانے کیلئے آزاد ہوتا ہے ۔ایسا کرنے سے اس کے شائقین تبدیل جاتے ہیں اور وہ ایک ہی تماشہ بار بار دوہراتا رہتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے اینکر کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ اس کے ناظرین نہیں بدلتے اس لئے اسے ہر روز تماشہ بدلنا پڑتا ہے ورنہ ناظرین انگلی کے اشارے سے چینل بدل دیتے ہیں۔نئے زمانے کے ان مداریوں پر اقبال ساجد کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؎

تماشہ ختم ہوا دھوپ کے مداری کا
سنہری سانپ چھپے شام کے پٹارے میں

پرانے زمانے میں مداریوں کے پاس بے ضرر سانپ ہوا کرتے تھے جو دن کے اجالے میں شائقین کا دل بہلاتے اور شام ڈھلے اپنے پٹارے میں بند ہو جاتے لیکن عصرِ جدید کے زہریلے سانپ دن بھر ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر نت نئی سازشیں رچتے ہیں اور شام ڈھلے اپنے اپنے پٹاروں سے نکل کر مختلف چینلز پر نمودار ہو جاتے ہیں ۔
زیادہ سے زیادہ ناظرین کو اپنے ساتھ بنائے رکھنے کیلئے تماشے کو نہ صرف چٹپٹا بنایا جاتا ہے بلکہ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں اپنے چہیتے ناظرین کی دلآزاری نہ ہو جائے۔ یہ مداری اور اینکر کی مشترک مجبوری ہے۔ پاپی پیٹ کی خاطر ان لاچاروں کو چاہے نہ چاہے یہ سب کرنا ہی پڑتا ہے ورنہ ناظرین خالی ہاتھ لوٹ جاتے ہیں اور مشتہر سکۂ نہیں اچھالتے۔
اس پس منظر میں حاجی علی درگاہ کے اندر خواتین کے داخلے کی بحث کو ساتھ چاہئے ۔ حاجی علی درگاہ میں خواتین کے داخل ہونے پر مکمل پابندی نہیں ہے۔ اس کے کچھ مخصوص حصے میں تحفظ کے پیش نظر انتظامیہ نے خواتین کا داخلہ ممنوع کردیا۔ اس پر ترپتی دیسائی کی قیادت میں تحریک شروع ہو گئی کہ یہ مساواتِ مرد وزن کی خلاف ورزی ہے ۔ خواتین کو درگاہ کے ہر حصے میں جانے کی اجازت ہونی چاہئے۔ کسی بھی عمارت میں انتظامیہ کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ مختلف لوگوں کیلئے مختلف حصے مختص کرے مثلاً ریلوے اسٹیشن پر اول درجہ کے مسافروں

کیلئے انتظار گاہ میں دوسرے درجہ کے مسافروں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی ۔ اسے تفریق امتیاز کے زمرے میں نہیں ڈالا جاتا۔ ریلوے اسٹیشن کے کمپیوٹر والے کمرے ہر ریلوے ملازم کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی یہ تحفظ کے نکتۂ نظر سے ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس پر احتجاج تو کجا کسی کو حیرت تک نہیں ہوتی ۔

درگاہوں کی بابت امت کے اندر اختلاف ہے مگر اس کے باوجود سارے مکتب فکر کے علماء ومشائخ اس امر پر اتفاق کرتے ہیں کہ درگاہ کی زیارت فرض نہیں ہے۔ اس کے ساتھ تمام ہی مکتب فکر کے عوام و خواص کا اس پر بھی صد فیصد اتفاق ہے کہ نماز باجماعت فرض ہے ۔ حاجی علی میں داخلے کی خاطر چلائی جانے والی تحریک کی خصووصیت یہ ہے کہ اس کے چلانے والے فرائض دین سے اجتناب کرتے ہیں اور مستحبات پر زور دیتے ہیں ۔ دن میں پانچ مرتبہ انہیں مسجد میں اذان دے کر بلایا جاتا ہے لیکن وہ جمعہ یا عیدین پر اکتفاء کرلیتے ہیں ۔ یہ تو ایسا ہی کہ کوئی طالب علم تمام لازمی مضامین کی کلاس سے غائب رہے اور جسمانی ورزش کی غیر لازمی کلاس کے بارش یا کسی اور مجبوری کے تحت منسوخ ہو جانے پر بگڑ جائے بلکہ یہ اصرار کرنے لگے کہ میدان میں نہ سہی تو اسٹاف روم میں یہ کلاس لگا دی جائے۔ اسکول کا انتظامیہ ایسے طلباء کے خلاف کیا جانے والا سلوک کیا وہ بھید بھاو کہلائے گا ؟

حاجی علی کی تحریک شنی شنگنا پور کے مندر میں خواتین کے داخلے کی خاطر چلنے والی تحریک کا ضمیمہ ہے۔ احمد نگر ضلع میں واقع اس مندر میں داخل ہونے کی خاطر ترپتی دیسائی کی قیادت میں طویل احتجاج ہوا۔ خواتین راستوں میں لیٹ گئیں پولس کے ساتھ جھڑپ ہوئی۔ معاملہ عدالت میں گیا اور ہائی کورٹ نے خواتین کو مندر کے اندرونی حصے میں جانے سے روکنے کو حقوق نسواں کی خلاف ورزی قرار دیا۔ اس فیصلے کے بعد انتظامیہ نے تمام عقید تمندوں کا مندر کے مرکزی حصے میں داخل ہونا ممنوع قرار دے دیا۔ اس طرح مرد وزن کے درمیان تفریق و امتیاز کا معاملہ از خود ختم ہوگیا۔ انتظامیہ نے یہ بھی طے کیا کہ مورتی کے قریب آرتی کیلئے صرف عہدیداران ہی جاسکیں گے ۔ظاہر ہے ان عہدیداران میں کوئی خاتون نہیں ہوگی اس طرح بلاواسطہ خواتین کا داخلہ ممنوع ہوگیا۔ ویسے بھی جج صاحبان کے چیمبرس میں عوام تو کجا وکلاء تک کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی ۔ وہاں جانے کی اجازت کس کو دی جائے اور کس کو نہیں اس کا فیصلہ عوام کریں گے یا عدلیہ کے ذمہ دار؟ اس سوال کا جواب ہر کوئی جانتا ہے۔

حاجی علی کے معاملے میں ہائی کورٹ کا جوفیصلہ آیا ہے اس کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جاسکتا ہے اس کے باوجود درگاہ کے انتظامیہ نے قانون کی پاسداری کرتے ہوئے ترپتی دیسائی سمیت دیگر خواتین کو درگاہ میں داخلے سے نہیں روکا اور نہ مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا اس کے باوجود ارنب گوسوامی کو دلچسپی

پیدا ہو گئی اس لئے اس طرح کے ہیجانی مسائل کو اچھالنے سے ناظرین کی تعداد بڑھتی ہے اور اشتہارات بھی بڑھتے ہیں۔ حاجی علی سے ایک ہفتہ قبل گوکل اشٹمی کا تہوار کا سارے مہاراشٹر میں دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس تہوار کے میں اونچائی پر بندھی دہی کی ہنڈی کو انسانی احرام بناکر سرعام پھوڑا جاتا ہے۔ اس کھیل میں ہر سال سیکڑوں نوعمر نوجوان زخمی ہوتے ہیں اس لئے معاملہ عدالت میں لے جایا گیا۔

مقدمہ کی سماعت کے دوران جج صاحب نے کہا تھا کیا یہ دہی ہنڈی کے کھلاڑی ملک کیلئے تمغہ جیت کر لائیں گے؟ کاش کہ اس کھیل کو اولمپک میں شامل کرلیا جاتا تو کم از کم ایک طلائی تمغہ ہندوستان آہی جاتا۔ اس ڈھائی سال کی حکومت نے ہندوستانی تمغوں کی تعداد دو تہائی گھٹادی ہے۔ چار سال قبل ۶ تمغہ جیتے گئے تھے اب کی بار صرف ۲ ملے۔

اگرخدانخواستہ این ڈی اے کی سرکار مزید چار سال رہ جائے تو شاید پرانے تمغہ بھی واپس کرنے کی نوبت آجائیگی۔ ہائی کورٹ نے چند شرائط کے ساتھ گوپال کلا کھیلنے کی اجازت دے دی۔ پابندی یہ تھی کہ ۱۸ سال سے کم عمر نوجوان اس میں حصہ نہ لیں اور دہی ہنڈی کی بلندی ۲۰ میٹر سے زائد نہ ہو۔ اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ سے رجوع کیا گیا اور عدالت عالیہ نے بھی ہائی کورٹ کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے پابندی اٹھانے سے انکار کردیا۔

دہی ہنڈی کے معاملے میں سپریم کورٹ کی سب سے پہلی علی الاعلان مخالفت راج ٹھاکرے نے کی۔ راج ٹھاکرے تو خیر اپنی غیر ذمہ داری کیلئے مشہور ہے لیکن برسراقتدار بی جے پی نے بھی خوب ابہام پھیلایا۔ بی جے پی ممبئی کے صدر اشیش شیلار نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ عدالت کی جانب سے کوئی قید ہی نہیں ہے۔ پولس افسران کے حکمنامہ ٹھیک سے نہ پڑھنے کے سبب خلط مبحث ہوگیا۔ انہوں مہتم حضرات کو یقین دلایا کہ پولس انہیں ہراساں نہیں کرے گی حکومت نے اسے کھیل میں شمار کیا ہے اور اس لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ وزیر تعلیم و ثقافت ونود تاوڑے نے اعلان کردیا گووندا کیلئے بنایا جانے والا انسانی احرام کھیل میں شمار کیا جائیگا ہم خود تمام تر تحفظ کے ساتھ شہر میں پانچ مقامات پر اس کا اہتمام کریں گے اور ایک لاکھ گووندا کی تقریبات کو یقینی بنایا جائیگا۔

وزیر اعلیٰ دیویندر فردنویس سے جب اخبار نویسوں نے رابطہ کیا تو انہوں نے اونچائی سے متعلق خاموشی اختیار کرلی۔ یہ وہی وزیر اعلیٰ ہیں جنھوں نے آئی آریف کے متعلق رپورٹ کی تکمیل سے قبل یہ کہہ دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو ڈاکٹر ذاکر نائک کو زبردستی ہندوستان منگوایا جائیگا۔ بی جے پی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرشن بھکتوں نے کھلے عام عدالتی احکامات کو

پامال کیا۔ اس سر عام قانون شکنی کو نظر انداز کر دینا انتظامیہ کیلئے ناممکن تھا اس لئے ممبئی کے ۲۹ اور اس سے متصل ضلع تھانے کے ۲۰ منڈل کے خلاف مختلف تعزیرات کے تحت فوجداری مقدمات درج کئے گئے ۔ ان میں دفعہ ۳۰۸ یعنی قتل کے ارتکاب کی کوشش کا جرم بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ دفعہ ۳۳۶ یعنی جان کو خطرہ یا ذاتی و دوسروں کے تحفظ کو خطرہ بھی ہے۔ ۱۸۸ کے تحت حکومت کے احکام کی نافرمانی کا الزام بھی لگایا گیا ہے ۔ اب انصاف کا تقاضہ تو احمد فراز کے اس (ترمیم شدہ) شعر کی مصداق تھا کہ

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کروگے
مجرم ہیں اگر وہ تو سزا کیوں نہیں دیتے

ان مجرمین کو سزا تو درکنار بی جے پی رہنما ان کے حق میں دست بستہ میدان میں اتر آئے۔ ممبئی میونسپل کارپوریشن کے انتخابات سے فکرمند اشیش شیلار نے وزیر اعلیٰ کو ایک خط لکھ کر تعاون کی گہار لگاتے ہوئے مطالبہ کیا کہ انسانی ہمدردی کی بنیاد دفع ۳۰۸ کو ہٹا دیا جائے۔ شیلار نے زور دے کر گذارش کی کہ گووندا کھیل میں حصہ لینے والے نوجوان ہیں ۔ اس طرح کی دفعات کا اطلاق ان کے مستقبل پر منفی اثرات ڈال سکتا ہے اور ان کی ترقی کے امکانات میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ جناب اشیش شیلار کو ان لوگوں کے مستقبل کی اس قدر فکر ستا رہی ہے کہ جنہوں نے بہانگ دہل سپریم کورٹ کے احکامات کو پامال کیا ہے اس کے

برعکس جب سے آئی آریف کا معاملہ گرم کیا گیا ہے ریاست بھر میں داعش کا ہوا کھڑا کرکے بے قصور مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے سنگین الزام میں گرفتار کیا جارہا ہے۔ کیا ان نوجوانوں کا مستقبل اس بے بنیاد الزام کے سبب برباد نہیں ہوگا ؟ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ برسرِ اقتدار جماعت کے رہنما اشیش شیلار کو قانون شکن نوجوانوں کے مقابلے میں بے قصور نوجوانوں کا بہی خواہ ہونا چاہیے۔

گوکل اشٹمی سے متعلق واضح عدالتی احکامات کے باوجود کرشن بھکتوں نے اس سال اسپین کے اندر سب اونچے انسانی احرام ۱۲ء۳۹ میٹر کا ریکارڈ توڑتے ہوئے ۹۷ء۴۳ میٹر بلندی کو پھلانگ کر گینس بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام نام درج کروالیا۔ قانون شکنی کی ایسی مثال ہندوستان تو کجا دنیا بھر میں نہیں مل سکتی۔ عدالتی احکامات کے ساتھ برسرِ عام اس بڑے پیمانے پر ہونے والے کھلواڑ کے باوجود ارنب جیسے مداریوں کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آئی۔ انہوں نے قانون اور دستور کی بالادستی کا راگ نہیں الاپا ۔ کسی کو قوم دشمن اور باغی نہیں قرار دیا اس لئے وہ سب ان کے اپنے تھے۔ اسی تفریق وامتیاز کے رویئے سے ٹیلیویژن پر ہونے والے مباحث کا وقار اس قدر مجروح ہوا ہے کہ یہ بے جان سامانِ تفریح بن کر رہ گئے ہیں۔ شوق بہرائچی کا مندرجہ ذیل شعر ان نئے مداریوں کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی آقاوں پر بھی صادق آتا ہے

خیالی غنچے کھلا دیے ہیں، خیالی گلشن سجا دیے ہیں
نئے مداری نے دو ہی دن میں تماشے کیا کیا دکھا دیے ہیں

سوریہ نمسکار: سیاست کی گہار اور عدالت کی پھٹکار

یوگا یا سوریہ نمسکار مذہبی ہے یا نہیں؟ ثقافتی ہے یا تہذیبی؟ جسمانی ورزش ہے یا روحانی سکون کا ذریعہ ہے؟ ان بے شمار سوالات سے قطع نظر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آیا لازمی ہے یا اختیاری؟ اگر یہ اختیاری ہے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہوجاتا ہے لیکن اگر لازمی قرار دے دیا جائے تو تنازع کھڑا ہوجاتا ہے۔ ممبئی میونسپل کارپوریشن نے سرکاری اسکولوں پر سوریہ نمسکار تھوپ کریہی شوشہ چھوڑا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح نمازِاشراق مسلمانوں کی عبادت ہے اسی طرح سوریہ نمسکار بھی ایک مشرکانہ پرارتھنا ہے۔ اس لئے جس طرح غیر مسلم طلباء کو نماز کا پابند کرنا غلط ہے اسی طرح غیر ہندو طلباء پر سوریہ نمسکار کو لازمی قرار دینا بھی درست نہیں ہے۔ سوریہ نمسکار کی تلخی کو کم کرنے کیلئے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب یا جسمانی ورزش سے ہے اور ہر طالب علم کو اپنی تہذیبی اقدار نیز صحت کا خیال رکھتے ہوئے سوریہ نمسکار کرنا چاہئے۔ ایسے میں سوریہ نمسکار کی حقیقت اور مسلمانوں کے اس سے اختلاف کی وجوہات کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔

سوریہ نمسکار ہزار ملمع سازی کے باوجود بنیادی طور پر وہ سورج دیوتا کے

آگے سجدہ ہے۔ سناتن دھرم یعنی ہندو مذہب کی مقدس کتابیں اس کے اعتراف سے بھری پڑی ہیں اور موجودہ دور کے نرم خو مذہبی رہنما سری روی شنکر تک اس کا ببانگ دہل اعتراف کرتے ہیں لیکن چونکہ اس شرکیہ عبادت کو علی الاعلان مسلط کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے کو مختلف گمراہ کن حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو بغیر سوچ سمجھے اپنی پرمپراوں (روایتوں) کا پالن کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو غور و فکر کرکے کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ مسلمان دوسری طرح کا گروہ ہے اس کیلئے کسی بات کو تسلیم کرنے کیلئے اس کا مقبول و مفید ہونا یا تہذیب و ثقافت کا حصہ ہونا کافی نہیں ہے بلکہ وہ ہر مطالبے کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر جانچتا پرکھتا ہے اور پھر اسے قبول یا مسترد کرتا ہے۔

اس دور پر فتن میں مذکورہ صفت عالیہ کو بنیاد پرستی اور ابن الوقتی کو خوبی شمار کیا جاتا ہے لیکن خود فسطائیوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ اگر لوگ بغیر سوچے سمجھے کانگریس کے بھکت بنے رہتے اور اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کے خلاف بغاوت نہ کرتے تو انہیں اقتدار میں شریک ہونے کا موقع نہ ملتا۔ ملک کے عوام اگر نرسمھا راو کو بابری مسجد کے تحفظ میں ناکامی سزا دینے کا فیصلہ نہ کرتے تو انہیں اٹل جی کو پہلی مرتبہ ۱۳ دنوں کیلئے وزیراعظم بنانے کی سعاد بھی نہیں ملتی اور اگر جنتا دل کی سرپھٹول سے بیزار نہیں ہوتے تو دوسری مرتبہ اٹل جی حلف نہیں لیتے۔ اسی طرح یو پی اے سرکار کی بے لگام بدعنوانی اور

مہنگائی کے خلاف غم وغصہ کا اظہار نہیں ہوتا تو مودی جی کے ہاتھوں میں اقتدار نہیں آتا۔ یہ تبدیلیاں عوام کے روایتی بھیڑ چال سے انحراف کی مرہونِ منت ہیں ۔ ملک کی عوام اگر غور وفکر کرکے کسی حکومت کو مسترد کر سکتے ہیں تو کسی طریقۂ ورزش سے انکار کیوں نہیں کر سکتے ؟

سورج توانائی کا منبع ہونے کے سبب ایک عظیم نعمت ہے ۔اس کا اعتراف اور اس سے استفادہ مسلمان بھی کرتے ہیں لیکن وہ اس کی عبادت نہیں کرتے۔ اس لئے کہ یہ غیر عقلی فعل ہے ۔ اس کی وجہ مندرجہ ذیل مثالوں میں ملاحظہ فرمائیں۔ اگر کوئی بھی خواہ آپ کوڈاک سے تحفہ بھیجے توآپ کس کے احسانمند ہوں گے ؟ڈاکیہ کا یا تحفہ روانہ کرنے والے کا؟ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ جس نے تحفہ بھیجا ہے اس کا شکریہ ادا کیا جائے ۔

مسلمانوں کے نزدیک سورج کی حیثیت کوریئر بردار کی ہےاس لئے وہ سورج کی نہیں بلکہ سورج کے خالق خدائے واحدکے آگے سربسجود ہوتے ہیں ۔ ارشاد ربانی ہے: ’’ یہ رات اور دن اور سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ (اس لئے) سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر فی الواقع تم اُسی کی عبادت کرنے والے ہو‘‘۔

اس بات کو ایک اور مثال سے سمجھیں ۔ ایک بادشاہ نے شاندار محل تعمیر کیااور

اپنے بندوں کی سہولت کے لئے راستے میں نشانی کے طور پر مینارۂ نور بھی کھڑا کر دیا تاکہ وہ باآسانی اس تک پہنچ سکیں۔ تاریکی میں روشن مینارۂ نور سے کچھ لوگ اس قدر مرعوب ہوئے کہ اسی کے آگے سجدہ ریز ہوگئے۔ وہاں موجود چوکیدار کے ہاتھ چومنے چاٹنے لگے لیکن دوسرے گروہ نے اس کی روشنی میں اپنا سفر جاری رکھا اور بالآخر اپنے آقا و مالک کے حضور پہنچ کر سربسجدہ ہوئے۔ آگے جانے والوں نے سورج پجاریوں سمجھایا کہ وہ مخلوق کے آگے جھکنے کے بجائے خالق کی عبادت کریں لیکن جب وہ نہیں مانے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اس لئے کہ رب کائنات کا حکم ہے ''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں'' ۔اب اگر سورج کو دیوتا ماننے والوں کی اکثریت ہوجائے انہیں اقتدار بھی حاصل ہوجائے جس کے بل بوتے پر وہ سورج کے خالق کی عبادت کرنے والوں پر زور زبردستی کرنے لگیں اور انہیں بزور قوت یا فریب سورج کو نمسکار کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کریں تو کیا یہ رویہ درست ہوگا؟

سوریہ نمسکار کے دعویداروں کی منطق یہ ہے کہ اس کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ قومی تہذیب سے ہے اس لئے کوئی شہری اس پر اعتراض کرنے میں حق بجانب نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی بھی شئے کو ہندوستانی تہذیب کا جزو قرار دے کر اسے بزور قوت نافذ کرنا درست ہے؟ ہندوستان کی تہذیب کے کئی رنگ ہیں ۔ مثلاً جین منی کا بلا لباس رہنا بھی ہندی تہذیب کا حصہ ہے ۔ ہریانہ

کی اسمبلی اجلاس کا برہنہ منی ترون ساگر سے افتتاح کروا کر اسے تسلیم کیا گیا ہے۔ اب اگر کل کوئی سرپھرا سربراہ اس تہذیب کو بزور قوت نافذ کرنے پر مُصر ہو جائے تو کیا اس کا ایسا کرنا قابل تسلیم ہوگا؟ یا لوگوں کی سہولت کرتے ہوئے وہ اسے مستقل کرنے بجائے جین منی کے احترام میں اسمبلی کے اندر پروچن کے وقت ارکان اسمبلی سے بے لباسی اوڑھنے پر اسرار کرے تو کیا وہ حق بجانب ہوگا؟ اور سارے ارکان اس کے احکامات کی بجاآوری کریں گے؟

اندھی تقلید کرنے والے زعفرانی رہنما ممکن ہے جین سماج کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اس کیلئے بھی تیار ہو جائیں لیکن اگر کوئی خاتون رکن اسمبلی اس سے معذوری ظاہر کردے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ کیا اس کی معذرت قبول کی جائیگی؟ یا اس کی رکنیت معطل کردی جائیگی؟ یا اس کو پاکستان بھیج دیا جائیگا؟ عقل یہ کہتی ہے کہ اس کی معذوری قبول کی جانی چاہئے۔ اگر کسی حلف بردار رکن اسمبلی کی معذرت قبول ہو سکتی ہے ان مسلم طالب علموں کی کیوں نہیں کہ سوریہ نمسکار کا نام نہاد تہذیبی مطالبہ ان کے عقائد کے خلاف سے ٹکراتا ہے۔ یوگا اور سوریہ نمسکار کو جسمانی ورزش کا حصہ قرار دیا جارہا ہے۔ اب اگر کوئی طالبعلم جسمانی ورزش نہیں کرسکتا تو کیا اس کو تعلیم کے بنیادی حق سے محروم کرکے اسے اسکول سے نکال دیا جائیگا؟ ہندوستان نہ صرف کثیر المذاہب ملک ہے بلکہ یہ مختلف تہذیبوں کا گھوارہ ہے اس لئے یہاں ہر شہری پر کسی ایک

مذہب کا یا کسی مخصوص تہذیب کو بزور قوت مسلط کرنا عدل وانصاف کی روح کے منافی ہے۔

ہندوستانی عوام کے تعلیم وصحت کا خیال کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن اسی کے ساتھ شہریوں کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جس زبان میں چاہیں تعلیم حاصل کریں۔ حکومت اگر یہ فرمان جاری کردے کہ سرکاری اسکولوں میں صرف سنسکرت زبان میں تعلیم دی جائیگی اور جسے وہ ناقابل قبول ہو وہ ان اسکولوں سے نکل کر اپنا الگ سے انتظام کرے یا ناخواندہ رہے تو کیا مناسبِ حال فیصلہ ہوگا؟ تعلیم کے حصو کی خاطر اگر زبان کا انتخاب طلباء یا اس کے والدین کرسکتے ہیں تو ورزش کا انتخاب کیوں نہیں کرسکتے ہیں۔ کیا صحت بنانے کیلئے یوگا کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے۔ حکومت کا کسی مخصوص ورزش پر اصرار کرنا ایسا ہی جیسے سرکاری دواخانوں میں صرف ایک طریقہَ علاج کو رائج کردیا جائے۔ عوام سے کہا جائے کہ یہاں پر آیورویدکے چورن کھائیں اور اپنی صحت بنائیں ورنہ راستہ ناپیں۔ عوام کو یہ اختیار حاصل نہ ہو کہ وہ ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، یونانی یا آیوروید میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری اسپتال میں ہونے والا علاج یا سرکاری اسکول میں دی جانے والی تعلیم کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ کوئی خیرات

ہے جو کسی صاحب حیثیت جیب سے اس کی شرائط پر تقسیم ہوتی ہے یا ایک امانت ہے؟ سرکار کے خزانے میں روپیہ عوام کے ٹیکس سے آتا ہے۔ بلواسطہ یا بلاواسطہ ٹیکس ادا کرنے والوں کا تعلق ہر مذہب اور تہذیب کے ماننے والوں سے ہے اور اس کے مستحق بلا تفریق مذہب وملت سارے شہری ہیں ۔ سرکار ان پر کوئی احسان نہیں کرتی بلکہ ان کا حق انہیں لوٹاتی ہے اس لئے اس کو عوام کی مرضی کے خلاف اپنی شرائط پر دینا سراسر خیانت ہے۔

ممبئی میونسپلٹی کے تعلیمی کمشنر جو مرکز کی وضع کردہ تعلیمی پالیسی بزور قوت نافذ کرنے پر تلے ہوئے ہیں شاید نہیں جانتے کہ اس بابت مرکزی وزیر آیوش شری پدنائک کا کا نقطہَ نظر کیا ہے؟ شری پد نائک نے عالمی یوگا پروگرام کے دوران ''اوم'' کہنے کے مسئلہ پر پیدا شدہ تنازعہ کو ختم کرتے ہوئے کہا تھا کہ یوگا کے دوران اوم کہنالازم نہیں ہے۔

شری پدنائک نے اخباری نمائندوں کو بتایا تھا کہ ''اوم ایک آفاقی لفظ ہے۔ اس کا کوئی مذہبی مفہوم و وابستگی نہیں ہے۔ گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی یہ یوم یوگا پروگرام کا ایک حصہ ہے لیکن اس کا کوئی لزوم نہیں ہے۔ جو اوم کہنا چاہتے ہیں ایسا کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے جو اوم کہنا نہیں چاہتے اپنی مرضی کے مطابق کچھ اور کہہ سکتے ہیں''۔ شری پد نائک نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ ''سوریہ نمسکار ایک مشکل مشق ہے کیونکہ اس میں ۱۲ آسن ہیں''۔ کمشنر صاحب کو چاہئے کہ چائے سے گرم کیتلی نہ

بنیں۔

اس سے قبل جنوری ۲۰۰۷ء کے اندر مدھیہ پردیش کی ریاستی حکومت نے 'سوریہ نمسکار' کا فرمان جاری کردیا جس کی شدید مخالفت ہوئی یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے اپنے بچے کو سکول نہ بھیجنے کا فیصلہ تک کرلیا۔ مدھیہ پردیش کے مشہور صحافی اور سماجی کارکن لجا شنکر ہردینیا اور بابو سالومن نے اس کے لازمی قرار دیئے جانے کو افسوس ناک قرار دے کر سابق گورنر بلرام جھاکھڑ سے ملاقات کی اور اس پر عملدرآمد کو روکنے کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح بھوپال کے آرچ بشپ پاسکل ٹوپنو نے بھی اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ کوئی حکومت اسے لازمی قرار نہیں دے سکتی ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، مدھیہ پردیش کے کنوینر مولانا شمس الدین آفریدی کی قیادت میں اہل حدیث، جماعت اسلامی اور مجلس علوم کے قاضیان مفتیانِ شہر نیز سیاسی و سماجی کارکنوں نے بھی تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۶ اور دفعہ ۲۷ کا حوالہ دیتے سوریہ نمسکار کے خلاف احتجاج کیا۔ علماء کا یہ موقف تھا کہ ہندوستان کثیر المذہبی ملک ہے اور یہاں ہر شخص کو مذہبی آزادی ہے۔

اس کے بعد جبل پور ہائی کورٹ رجوع کیا گیا اور عدالت نے ایک عبوری حکم میں کہا کہ ریاستی حکومت کسی بھی طالب علم کو ایسا کرنے کے لیے مجبور نہیں کر

سکتی۔ سوریہ نمسکار میں طلباء کی شمولیت لازمی نہیں اختیاری ہوگی۔ چیف جسٹس اے کے پٹنائک اور ایس کے جھا کی بنچ نے یہ فیصلہ دیا تھا۔ اس فیصلے میں یہ وضاحت موجود تھی کہ نہ تو بچوں کو سوریہ نمسکار کرنے مجبور کیا جائیگا اور نہ اسکول یا بچوں کے خلاف کوئی کارروائی کی جائیگی۔ ۲۰۰۹ء میں پھر سے مدھیہ پردیش میں یہ شرارت کی گئی تو ہائی کورٹ نے صوبائی حکومت کو سوریہ نمسکار لازمی قرار دیئے جانے کے خلاف نوٹس دیا۔ اس بار چیف جسٹس پٹنائک کے ساتھ جسٹس اجیت سنگھ نے کیتھولک چرچ کے سربراہ فادر آنند متونگل کے ذریعہ اقلیتوں کے مذہبی حقوق کی دستوری دفع ۲۵ اور ۳۰ کے تحت کی گئی شکایت پر کارروائی کی تھی۔

راجستھان کے اندر ۲۰۱۵ء میں جسٹس اے کے سنگھ اور جسٹس گریوال کی بنچ نے تسلیم کیا تھا کہ کوئی قوم یا طالبعلم اگر سوریہ نمسکار نہیں کرنا چاہتا تو اسے اس کا اختیار ہوگا اس لئے کہ یہ لازمی نہیں بلکہ اختیاری ہے۔ ان تمام وضاحتوں کے بعد بھی اگر کوئی عدالت میں جاکر اپنی رسوائی کا سامان کرنا چاہتا ہو تو کوئی اس کی مدد نہیں کرسکتا۔ مدھیہ پردیش کے اندر اسکولی تعلیم کی وزیر ارچنا چٹنس صاف طور پر کہہ چکی ہیں کہ اجتماعی سورج نمسکار میں شمولیت رضاکارانہ ہے۔ سورج نہ تو بھگوان ہے اور نہ ہی اس کا مذہب یا مذہبی رسم یا رواج سے کوئی لینا دینا ہے۔ سورج نمسکار صحت کے حصول کیلئے

ایک یوگا آسن ہے اور ہم اسے تھوپ نہیں رہے ہیں۔ تمام لوگ اس کیلئے مجبور نہیں ہیں جو لوگ اس میں حصہ نہیں لینا چاہتے، وہ خوشی سے اسے چھوڑ سکتے ہیں۔،

اس معاملے میں مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا موقف نہایت واضح ہے۔ بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا محمد ولی رحمانی کے مطابق سوریہ نمسکار سورج کی پوجا ہے اور یوگا بھی ہندووں کا طرز عبادت ہے۔ مولانا ولی رحمانی فرماتے ہیں جو چیزیں انسانوں کیلئے بنائی گئی ہیں ان کے سامنے جھکنا یعنی نمسکار کرنا یا بندگی بجا لانا یا ان سے کچھ مانگنا انسانیت کی توہین ہے۔انہوں نے کہا تھا ہمارے ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مسلمانوں اور ان کی نسلوں سے توحید کا عقیدہ چھین لینا چاہتے ہیں اور کسی نہ کسی ترکیب سے ان کو اپنے مشرکانہ.برہمنی رنگ میں رنگ لینا چاہتے ہیں۔ اسی ترکیب کا ایک حصہ سوریہ نمسکار، یوگا اور وندے ماترم ہیں جن کا تعلق.برہمنی دھرم اور ویدک کلچر سے ہے۔ مسلمان اللہ کی وحدانیت کے قائل ہیں اور انہیں سوریہ نمسکار یوگا اور وندے ماترم سے الگ رہنا چاہئے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ پر سارے فرقوں کا اعتماد ہے۔ ابھی حال میں سپریم کورٹ کے اندر پرسنل لاء بورڈ کے دائر کردہ مقدمہ کی تائید سارے مکاتب فکر کے علماء و مشائخین نے کی ہے اس لئے یہی موقف امت کیلئے قابل قبول ہے اور وہ اس بابت نہ کسی فریب کاری کا

شکار ہوگی اور نہ کسی دباو میں آئیگی۔

اہل اسلام کا نقطۂ نظر واضح ہے وہ سارے انسانوں کو خدائے واحد کا کنبہ مانتے ہیں اور ان کو اللہ کی جنت میں ایک ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ہمارے لئے اسوہ حسنہ تو یہی ہے کہ لوگ پتنگوں کی مانند آگ پر گرے جارہے ہیں اور نبیٔ کریم کمر پکڑ پکڑ ان کو بچارہے ہیں۔ایک خالق حقیقی کی عبادت جہاں ساری مخلوق سے محبت پیدا کرتی ہے وہیں کسی ایک مخلوق کی پرستش انسانوں کے اندر تفریق و انتشار کا سبب بنتی ہے اس لئے کہ بہت سے لوگ مخلوق کے آگے سربسجود ہونے سے انکار کردیتے ہیں جن میں مؤحد اور ملحد دونوں شامل ہیں ۔اس کے علاوہ جو مشرک مخلوق کی عبادت کے قائل ہوتے ہیں وہ بھی کسی ایک پر اتفاق نہیں کرتے بلکہ ہر گروہ اپنے لئے الگ معبود تراش لیتا ہے۔آگے چل کر معبودانِ باطل کی عبادت نفرت کا سرچشمہ بھی بن جاتی ہے۔ ممبئی سے قریب کلیان میں گنپتی کے جلوس میں شامل بھکتوں کی اپنے ہم مذہب پولس حوالدار کوتالاب ڈبونے کی کوشش اور پھر سرِعام پٹائی اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے ۔اس طرح کی شدت پسندی اور عدم رواداری کا رجحان سوریہ نمسکار کے بزور نفاذ سے پروان چڑھے گا۔ ان معاملات سیاسی مفاد پرستی کے بجائے عدالتی احکامات کو ملحوظِ خاطر رکھاجانا چاہئے۔

دادری سے میوات تک ظلم و ستم کی داستانِ الم

ظلم اگر کسی معاشرے میں پھیل جائے تو ظلمت کہلاتا ہے۔ ظلم کا اندھیرا صرف اور صرف عدل کے روشنی سے دور ہوتا ہے اور اگر کسی ملک میں عدل وانصاف کا جنازہ اٹھ جائے تو جبر و قہر کے گدھ منڈلانے لگتے ہیں ۔ اس کی ایک مثال تو دادری میں ابھری تھی اوردوسری ہریانہ کے ڈنگرہیڈا میں سامنے آئی ہے ۔ میوات کا بھیانک واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ گئو بھکتی کے نام پر لگائی گئی آگ دن بدن پھیلتی ہی جارہی ہے۔ وزیراعظم کے گئو رکشکوں اور گئو سیوکوں کا فرق صرف لفاظی ہے۔ گئو رکشکوں کی مجرمانہ کارروائیوں میں اضافہ اور شدت دونوں پیدا ہورہی ہے۔ میوات کے اندر وقوع پذیر ہونے والا یہ بہیمانہ قتل و عصمت دری چیخ چیخ کر اس کا اعلان کررہی ہے۔ ابتداء میں اسے ایک عام سی ڈکیتی اور عصمت دری کا واقعہ قرار دے کر اس کی پردہ پوشی کی گئی جبکہ سارے شواہد اس کے خلاف تھے ۔

۲۴ اگست کی رات کو نصف درجن لوگوں نے ابراہیم اور رشیدن کے گھرپر حملہ کیا اور انہیں گھسیٹتے ہوئے رشیدن کی بہن کے گھرلے گئے اور اس کے شوہر ظفیر سمیت سارے گھروالوں کو باندھ کر ان کی لڑکیوں کی عصمت دری کی نیز جاتے ہوئے والدین کو قتل کردیا۔ سوال یہ ہے کہ حملہ آور اگر ڈکیت تھے تو انہیں

کھیت کی رکھوالی کرنے والوں کے یہاں کس مال و متاع کی توقع تھی ؟اور اگر ان کا مقصد صرف عصمت دری تھا تو رات بھر سارے خاندان کو زدو کوب و گالی گلوچ کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اگر وہ عام مجرم ہوتے تو سارے گاوں میں دوہرے قتل اور عصمت دری کی خبر کے پھیل جانے کے بعد پولس جائے واردات پر ضرور آتی۔ اس واقعہ کی ایف آئی آر درج کرنے میں اسپتال کے ڈاکٹر شاہد حسین کے اصرار کے باوجود ۹ گھنٹوں کا وقت نہیں لگتا۔

حد تو یہ ہے کہ شکایت کے درج ہو جانے کے باوجود پولس نے مجرمین کو گرفتار کرنے کے بجائے مظلوم بچیوں کو ڈی این اے ٹسٹ کا بہانہ بناکر حراست میں لے لیا جبکہ ان کے والدین زندگی اور موت کی جنگ لڑرہے تھے اور ماموں اور ممانی آنکھوں کے سامنے قتل کئے جاچکے تھے۔ انتظامیہ کے اس جانبدارانہ رویہ سے صاف ظاہر ہے کہ قاتل درندوں کو سرکاری تحفظ حاصل تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا گائے کی رکشا کیلئے وچن بدھ کھٹر سرکار اگر گئو رکشک بھیڑیوں کی رکشا نہیں کرے گی تو کیا انسانوں کا تحفظ کرے گی؟ عوام کے زبردست احتجاج کے بعد معصوم بچیاں رہا ہوئیں اور پانچ دنوں کے بعد چار مجرمین کو بادلِ ناخواستہ حراست میں لیا گیا۔

اس واقعہ کے ۱۰ دن بعد صوبائی وزیر کرشن لال پنور نے گاوں کا دورہ کرکے

متاثرین سے ملاقات کرنے کی زحمت گوارہ کی مرنے والوں کے پسماندگان کیلئے ۵ لاکھ روپئے کا معاوضہ اور سرکاری ملازمت کا وعدہ کیا۔ اس سے قبل یکم ستمبر کو وزیراعلیٰ نے لاکھ کی مدد اور سرکاری نوکری کا اعلان کرتے ہوئے اعداد و شمار کا سہارا لیتے ہوئے کہا ۳ تھا صوبے میں جرائم کی شرح میں کمی آئی ہے لیکن وہ بھول گئے ایسا بھیانک ظلم تو آج تک ہریانہ کی تاریخ میں نہیں ہوا۔ ایک اہم ترین فرق یہ بھی ہے کہ پہلے جرائم پیشہ لوگ شرمندگی کے ساتھ لوٹ مار کرتے تھے اب یہ کام پونیہ سمجھ کر دیش بھکت کرنے لگے ہیں۔

اس معاملے میں پولس نے جن چار درندوں کو گرفتار کیا ہے ان کے نام سندیپ، امرجیت، کرم جیت اور راہل ہیں۔ وہ عام قسم کے مجرم نہیں ہے اس لئے کہ ان کے خلاف کوئی پولس ریکارڈ نہیں پایا جاتا ہاں وہ لوگ گاوں والوں سے گائے کے تحفظ کی خاطر چندہ جمع کرنے کیلئے معروف ہیں۔ ان کے فیس بک اکاونٹ کی تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ایک راہل سینی پور کے آر ایس ایس کیمپ میں شریک ہونے کے بعد اس تحریک میں شامل ہوا ہے۔ اور دوسرا بی جے پی سے تعلق رکھنے والا مودی بھکت ہے جس نے یکم فروری کو نریندر مودی کی تصویر کے ساتھ ’’ مودی آیا مسلمان گئے‘‘ یہ پیغام لکھا تھا۔ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے مجرم بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ اس اس بقر عید کو تم لوگ گائے ذبح نہیں کرسکوگے۔ اس گھناونی حرکت کے بعد ان میں سے ایک کا اپنے خفیہ سرغنہ کو

فون پر یہ اطلاع دینا کہ چاروں مر چکے ہیں کسی گہری سازش کی نشاندہی کرتا ہے۔
حکومت کی بے حسی اور انتظامیہ کی سفاکی کا یہ اثر ہوا کہ جب جماعت اسلامی کے وفد نے متاثرہ علاقہ کا دورہ کیا اور اس کے سربراہ نے میڈیکل کالج کے اسپتال کے اندر نوجوان چشم دید گواہ سے ملاقات کی تو خوف کے مارے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ معروف سماجی کارکن شبنم ہاشمی نے جب مظلوم بچیوں سے ان کی روداد دریافت کی تو ان کے پاس الفاظ کے بجائے آنسو تھے۔ اس کے باوجود ظلم کے خلاف احتجاج کی آواز نہیں دبی۔ یکم ستمبر کو ڈنگر ہیڑی میں ۳۲ ذاتوں کی ایک مہاپنچایت کا اہتمام کیا گیا۔ بارش کی وجہ سے اسے پاس کے تاوڑو منڈی میں منتقل کرنا پڑا اس کے باوجود اس میں ۸۰۰۰ لوگ شریک ہوئے۔ اس اجتماع سے پنچایت کے سربراہ راج بالا سانگوان، نریندر ٹوکس، یوگیندر یادو، ذاکر علی اور سلیم انجنیر نے خطاب کیا۔ اس مہاپنچایت میں سی بی آئی کی جانچ، مظلومین کیلئے ۵۰ لاکھ کا معاوضہ، پولس افسران کا تبادلہ اور ان پر لاپرواہی دکھانے کے الزام میں مقدمہ درج کرنے کا پرزور مطالبہ کیا گیا۔
ان سارے مطالبات میں سب سے اہم آخری بات ہے۔ دادری کے معاملے میں بہت کچھ ہوا۔ قومی سطح پر غیر معمولی احتجاج ہوا۔ قومی اعزاز لوٹائے گئے۔ مظاہرے

ہوئے جلوس نکلے ایوان کے اندر باہر بے شمار مباحث ہوئے اور بھرپور معاوضہ بھی دیا گیا لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ خاطی پولس افسران تو درکنار اخلاق کے قتل میں ملوث نوجوانوں کو بھی ان کی حرکت کی قرار واقعی سزا نہیں ہوئی ۔ اس کے برعکس پہلے تو بی جے پی اس سانحہ کا کھل کر سیاسی استحصال کیا اور اپنا ووٹ بنک بڑھانے کی مذموم کوشش کی ۔ اس کے بعد اچانک فورنسک لیباریٹری کی رپورٹ سامنے آئی کہ اخلاق کے گھر سے گائے کا گوشت برآمد ہوا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس لیباریٹری نے پہلے گائے کے گوشت کی تردید کی تھی اسی نے اپنی رائے بدل دی ۔

اتر پردیش میں چونکہ بی جے پی کے بجائے سماجوادی پارٹی برسراقتدار ہے اس لئے معاملہ کو سنبھالنے کیلئے پولس کی جانب سے یہ صفائی پیش کی گئی کہ جو گوشت کا ٹکڑا لیباریٹری میں جانچ کیلئے روانہ کیا گیا تھا وہ اخلاق کے گھر میں نہیں بلکہ باہر ملا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس گوشت کے ٹکڑے کو جو باہر ٹرانسفر کے پاس پڑا تھا کس نے پھینکا؟ نیز جس نے بھی پھینکا اس کو لیباریٹری میں جانچ کیلئے کیوں روانہ کیا گیا؟ اور اس کی رپورٹ کس کے دباو میں تبدیل کی گئی؟ اس بابت پولس افسر کا بیان بہت ہی واضح تھا۔ اس نے کہا ہم لوگ اخلاق کے قتل کی تفتیش کر رہے ہیں گوشت کی نہیں۔ اس سے قطع نظر کہ گوشت کس مویشی کا تھا کسی شہری کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا حق نہیں ہے۔ ویسے

بھی گائے کا گوشت رکھنے کیلئے سزائے موت تو دنیا کا کوئی دستور نہیں دیتا اور جو سزا عدالت نہیں دے سکتی اس کو نافذ کرنے کا حق عوام کی بھیڑ کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس رپورٹ کے بعد محمد اخلاق کے پسماندگان کے خلاف ایف آئی آر بھی درج کی گئی اوران کا میڈیا ٹرائل شروع ہوگیا۔اخلاق کے قاتلوں کو اگر ابھی تک پھانسی پھندے پر لٹکا دیا گیا ہوتا۔ ساتھ ہی پولس کو اس کی تساہلی کی سزا دی گئی ہوتی تو ممکن ہے میوات کا واقعہ رونما نہیں ہوتا۔

دادری کے بعد گئو بھکتوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ پیغام دیا گیا کہ انتظامیہ اور حکومت ان کی ہمدرد ہے اور ان کا بال بیکا نہیں ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ دادری کے سانحہ کی تمامتر مخالفت کے بعد بھی ملک میں کئی مقامات پر گائے کے نام پر قتل و غارتگری کا بازار گرم رہا کئی لوگ غنڈوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور کئی تعذیب و تشدد کا شکار ہوئے لیکن ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو یا تو سزا نہیں ہوئی یا اس کی خبر ذرائع ابلاغ کی زینت نہیں بنی تاکہ دیگر لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو اور وہ اس سے عبرت پکڑیں۔ وزیر اعظم نے ایک نوٹنکی بیان دیا جس کو فی الحال دنیا میں کوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا اس لئے کہ ان اعتباریت صفر ہو چکی ہے۔

اس کے برعکس ہریانہ کے وزیر تعلیم رام بلاس شرما بڑے فخر کے ساتھ ان قابلِ شرم پر تشدد واقعات کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ہریانہ گائے سے محبت کرنے والوں اور گیتا کی سرزمین ہے۔ ہندوسماج میں گائے کا بڑا تقدس ہے۔ کاش کے شرماجی انسانی جان اور عزت وآبرو کے تقدس کی بابت بھی کچھ تعلیم دیتے یا شاید گیتا کے اندر ان کو اس بابت کوئی ہدایت ہی نہیں ملی۔ وزیر تعلیم کے اس تبصرے کا تعلق اس سے دو ہفتہ قبل پیش آنے والے ایک بھیانک واقعہ سے ہے جس میں دو لوگوں کو غنڈوں نے پکڑا۔ ان پر گائے کی اسمگلنگ کا الزام لگایا اور انہیں گوبر کھانے پر مجبور کیا۔ ان جنونیوں کے پاگل پن کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے خود اس کی ویڈیو بنا کر پھیلائی جو شرما جیسے لوگوں کی حوصلہ افزائی اور تحفظ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

عقل کا تقاضہ تو یہ ہے کہ گائے کو مقدس ماتا ماننے والے اس کا گوبر کھائیں لیکن یہ تو الٹی منطق ہے کہ یہ گوبر دوسروں کو کھلاتے ہیں۔ سوال یہ بھی ہے کہ پوتر گائے مرتے ہی غیر مقدس کیوں کر ہوجاتی ہے؟اس کا انتم سنسکار کرنے کیلئے اچھوتوں کو کیوں بلایا جاتاہے۔ ایسے وفا شعار سپوت تو دنیا نے کبھی نہیں دیکھے۔ وزیر تعلیم نے اس تبدیلی کا سہرہ اپنی سرکار کے سرباندھتے ہوئے کہاکہ صوبائی حکومت کے وضع کردہ نئے قوانین کے سبب لوگوں فکر میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور مقدس جانور کے تقدس میں اضافہ ہوا ہے۔ وزیر تعلیم

کا یہ دعویٰ صد فیصد درست ہے اس کا ایک نتیجہ تو گوہر والا واقعہ ہے اس کے بعد کرنال میں ایک شخص کو گائے کی اسمگلنگ کا الزام میں قتل کردیا گیا۔ آگے چل گئو رکشک پولس سے بھی بھڑ گئے اور دونوں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ میوات کا بہیمانہ قتل اور عصمت دری اسی سلسلے کی کڑی ہے جس پر وزیر تعلیم ناز فرماتے ہیں۔ یہ گئو بھکت اگر گائے کا دودھ پینے کے سبب اپنے آپ کو گائے کا بیٹا کہتے ہیں تو جن لڑکیوں کی انہوں نے عصمت دری کی ہے وہ بھی گائے کا دودھ پیتی تھیں اس حوالے سے وہ ان کی بہنیں ہیں۔ گیتا کا گیان رکھنے والے وزیر تعلیم رام بلاس شرما یہ بتائیں کہ کیا بھگوت گیتا میں اپنی بہنوں کی عزت لوٹنے کی بھی ترغیب دی گئی ہے؟

۲۵ اگست کی صبح کو یہ گھناونا واقعہ منظر عام پر آیا اور ۲۶ اگست کو اس پر پردہ ڈالنے کی خاطر اور اپنے آپ کو اہنسا کا علمبردار ثابت کرنے کیلئے ہریانہ سرکار نے اسمبلی کے اجلاس کا افتتاح برہنہ جین منی ترون ساگر سے کروایا۔ اپنے کڑوے پروچن کیلئے مشہور جین منی نے اس واقعہ کے حوالے سے وزیراعلیٰ اور انتظامیہ پر تنقید کرنے کے بجائے وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کی تعریف و توصیف سے تقریر کا آغاز کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کل یگ کا سنیاسی بھی کس قدر سیاسی ہوگیا۔ اہنسا کا دم بھرنے والوں کو ایسا واضح ظلم بھی نظر نہیں آتا یا وہ اس پر لب کشائی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے۔

جین منی نے مودی جی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ان کی بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ تحریک کا اثر یہ ہے کہ اولمپک میں قوم کی بیٹیوں نے ملک کی عزت بچائی۔ بیٹیاں نے تو خیر قوم کی عزت بچارہی ہیں لیکن افسوس کے جو قوم ان بیٹیوں کی عزت لوٹ رہی ہے ان کی بابت ترون ساگر کی زبان سے ایک لفظ نہیں چھوٹا۔ ترون ساگر اگر بھارت ماتاکے ان سپوتوں کو بھی کوئی نصیحت کرتے کہ جو ہر بار بار بہو بیٹیوں کی آبرو ریزی کرتے پھرتے ہیں تو اچھا تھا۔ قوم کی بیٹیوں نے تو خیر ملک کا نام روشن کیا حالانکہ اس کا بیٹی بچاو اور بیٹی پڑھاو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے یہ ناموری تعلیم کے نہیں بلکہ کھیل کے میدان میں حاصل کی گئی ہے۔ ممکن ہے سرکار کی طرح جین منی کیلئے بھی تعلیم اور کھیل تماشہ میں کوئی فرق نہ ہو۔

جین منی نے ہریانہ میں مردوں کی بہ نسبت کم ہوتی خواتین کی تعداد پر تشویش کا ظہار کرتے ہوئے کئی نادر اور ناقابلِ عمل مشورے دیئے نیز وزیراعلیٰ اور کھیل منتری کی چٹکی لی کہ انہوں نے شادی ہی نہیں کی وہ لڑکیاں کیسے پیدا کریں گے۔ کاش کے منی جی یہ بھی بتاتے کہ خود انہوں نے کتنے بچے پیدا کئے ہیں ۔ اپنی اولاد سے محروم یہ غیر فطری زندگی گزارنے والے لوگ بھلا دوسروں کی اولاد کا دکھ درد کیوں کر محسوس کر سکتے ہیں؟ اپنی تقریر پر تالیاں پٹوانے

کیلئے جین منی نے پاکستان کے حوالے سے کہا جو انجانے میں غلطی کرے وہ جہالت اگیان) ہے۔ جو انجانے اپنی غلطی کو دوہرائے وہ نادان ہے اور جو دو سے زیادہ بار) وہی غلطی کرے وہ شیطان ہے اور ایسا کرنے والا پاکستان ہے اور جو اس کو معاف کرتا رہتا ہے وہ ہندوستان ہے۔ منی جی ہندوستان صرف پاکستان کو معاف نہیں کرتا بلکہ اپنے ملک کے شیطانوں کی عزت افزائی بھی کرتا ہے اور ان کو مسندِ اقتدار پر بھی فائز کرتا ہے۔ اسی لئے آپ جیسے لوگوں اسمبلی میں آکر پروچن سنانے کا نیزان کی حمایت کرنے کا موقع ملتا ہے اور میوات جیسے سنگین مظالم وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

گجرات کی بدبو: رانی اور اکےّ نے بادشاہ کو غلام بنادیا

رائج الوقت نظام سیاست میں حکومت کرنا وزیر اعظم کا کام ہے اور پارٹی چلانا صدر کی ذمہ داری ہے لیکن بدقسمتی سے فی الحال وزیر اعظم کو نہ تو حکمرانی کے فن سے واقف ہیں اور نہ انہیں اس میں دلچسپی ہے۔اس لئے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کیلئے وہ پارٹی چلاتے ہیں اور جب اس خشک کام سے اوب جاتے ہیں تو برائے تفریح غیر ملکی دورے پر نکل جاتے ہیں۔۔برسرِ اقتدار جماعت کے صدر کو چونکہ وزیر اعظم نے عملاً بے دست وپا کر رکھا ہے اس لئے وہ کوئی سنجیدہ ذمہ داری ادا کرنے کے بجائے جملہ بازیکرتے ہیں ۔انہوں نے لفظِ جملہ کو نئے قالب میں ڈھال کرفرہنگِ زعفرانیہ میں ایک نئے محاورے کا اضافہ کیا ہے۔ پہلے تو شاہ جی نے ۱۵ لاکھ اور اچھے دنوں کو محض ایک سیاسی جملہ قرار دے دیا جیسے تقریر میں وزن پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا گیا تھا۔اب مرکزی وزیر نتن گڈکری نے یہ انکشاف کیا کہ وہ اچھے دن والا مکالمہ بھی چوری کا تھا جسے اول تو سابق وزیر اعظم منموہن سنگھ نے استعمال کیا اور مگر لوگ اسے بھول بھال گئے۔ مودی جی نے اس کا استعمال اس کثرت سے کیا کہ گڈکری کے مطابق وہ ان کے گلے کی ہڈی بن چکا ہے۔ایسے میں لازم ہے کہ اس ہڈی کو نکال کر تفتیش کیلئے تجربہ گاہ میں تصدیق کیلئے روانہ کیا جائے کہیں وہ ہڈی گئو ونش کے کسی مویشی کی تو نہیں ہے؟

مودی جی کے جب اچھے دن آگئے تو انہیں احمد آباد کو خیرباد کہہ کر دہلی جانا پڑا۔ اپنی تاجپوشی کے بعد انہوں نے ۷۲ سالہ آنندی بین کو گجرات کی مہارانی بنایا جن کا تعلق پٹیل برادری سے ہے۔ ایک سال کے اندر ہی آنندی بین کے اپنے خیمہ میں ہاردک پٹیل نے الم بغاوت بلند کرکے ان کی نیند حرام کردی۔ گجرات کے اندر دوسرا زلزلہ اونا میں برپا ہوا جہاں چار دلت نوجوانوں کو ایک مری ہوئی گائے کی کھال نکالتے ہوئے دیکھ کر گئو بھکتوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ ان پر ایسے پل پڑے کہ مار مار کر ادھ مرا کردیا۔ اونا کا فائدہ اٹھا کر امیت شاہ نے آنندی بین کو چلتا کیا اور اپنے ہم ذات وجئے روپانی کو وزیراعلیٰ بنادیا۔ گجرات کی رانی آنندی بین یہ زہر کا پیالہ تو کسی طرح پی لیا مگر بدلہ لینے کا انتظار کرنے لگیں جس کا موقع انہیں بہت جلد میسر آگیا۔
وجئے روپانی نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کیلئے سورت میں ایک جلسۂ عام کا اہتمام کروایا اور اس میں اپنے محسنِ اعظم امیت شاہ کو بلایا۔ شاہ بصد شوق سورت تو پہنچ گئے لیکن نہیں جانتے تھے کہ کون سی رسوائی ان کی منتظر ہے۔ سرکاری سرمایہ داروں کی جانب سے منعقدہ تقریب کا مقصد پٹیل برادری کے ارکان اسمبلی کی وزیراعلیٰ اور پارٹی کے صدر کے ہاتھوں پذیرائی تھا۔ اس دوران

پاٹیداروں کی جانب سے احتجاج کے پیش نظر حفاظتی انتظامات سخت کردیے گئے نیز اسٹیج کے سامنے جوتوں سے تحفظ کی خاطر جالی لگانے کا نادر طریقہ اپنایا گیا۔ منتظمین کو توقع تھی کہ لاکھوں پٹیل شریک ہوں گے لیکن بی جے پی کے باغی رکن اسمبلی نلن کوٹاڈیہ نے اپنے ۵۰۰ ہمنواوں کی مدد سے یہ خواب چکنا چور کردیا اور بہ مشکل تمام دس ہزار لوگ جلسہ گاہ تک پہنچ سکے۔ اس کے باوجود چہار جانب خوشی کا ماحول تھا۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وجئے روپانی نے بازی مارلی ہے لیکن یہ قبل از طوفان کی خاموشی تھی۔

پاٹیدار سماج کے لوگ اپنے سروں پر زعفرانی ٹوپیاں سجائے امیت شاہ کے منتظر تھے۔ ان کے مائک پر آتے ہی نعرے بازی کی سونامی پھوٹ پڑی اور دیکھتے دیکھتے کرسیاں ہوا میں اچھلنے لگیں۔ امیت شاہ نے شوروغل کے درمیان صرف چار منٹ تک خطاب کیا اور وجئے روپانی تو دو منٹ سے زیادہ نہیں بول پائے۔۔ پولس کی لاکھ کوشش کے باوجود طوفان بدتمیزی تو نہیں تھما ہاں امیت شاہ کا خطاب درمیان میں تھم گیا اور وہ منہ لٹکائے سورت سے ''بڑے بے آبرو ہوکر'' لوٹ گئے۔ اس طرح یہ ثابت ہوگیا کہ گجرات کا آقا فی الحال نریندر مودی نہیں بلکہ ہاردک پٹیل ہے۔ وہ چاہے تو کسی کے تاج سجا کر اسے بادشاہ بنادے یا دھتکار کر غلام بنادے۔

امیت شاہ نے سورت میں اعلان کیا کہ ''پاٹیدار گجرات کی اور بی جے پی ترقی

وتوسیع میں ریڑھ کی ہڈی تھے''۔ یعنی انہوں نے بلاواسطہ تسلیم کرلیا کہاب ایسانہیں ہے۔ اپنے آقا و مالکسمراٹ نریندر کے چرنوں میں بیٹھ شاہ نے سورت کی ذلت کا الزام آنندی کے سر منڈھ کر سرزنش کی التجا کی ۔ مودی جیکو چاہیۓ تھا کہ اپنے داس امیت شاہ سے کہتے کہ سورت کی تقریب غیر سرکاری تھی ۔ اس کا تعلق مرکزی حکومت سے نہیں پارٹی سے تھا چونکہ تم صدر ہو یہ تمہاراسر درد ہے مجھے اس بکھیڑے میں مت گھسیٹو میرے پاس دیگر اہم و ضروری کام ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سمراٹ مودی میں اگر ایسے سمجھدار ہوتے توامیت شاہ کے ہاتھوں میں پارٹی کمان کیوں تھماتے ۔

سورت کے فلاپ شو کی اولین ذمہ داری ہاردک پٹیل پر ہے جس نے پاٹیداروں کو بی جے پی کا اصلی چہرہ دکھلا کرانہیں برگشتہ کردیا۔ پٹیل سماج کو پھر سے اعتماد میں لینا وزیراعلیٰ روپانی کی ذمہ داری ہے جس میں وہ ناکام رہے اس لئے وہ دہلی طلب کئے جانے کا سزاوار تھے کیونکہ وہ پہلے گجراتکے صدر بھی رہ چکے ہیں ۔روپانی کو اگر دہلی بلا کر ڈانٹ پلائی جاتی توالزام ہاردک پٹیل تک محدود رہتا لیکن مودی جی نے آنندی بین کو دہلی طلب کرکے خود اپنے پیر پر کلہاڑی چلادی اور سورت کی ہنگامہ آرائی کو پارٹی کیداخلی مہابھارت میں تبدیل کردیا۔ آنندی بین دہلی آکر لوٹ گئیں لیکن بی جے پی کا آنند پلٹ کر نہیں آیا۔ امیت شاہ کے کانوں میں اب بھی'' امیت شاہ گو بیک'' کے نعرے

گونجتے ہیں اور خوابوں میں کرسیاں اور بوتلیں اچھلتی ہیں۔

وزیراعلیٰ وجئے روپانی کے خوف کا یہ عالم ہے کہ خود اپنے علاقہ میں ایک اسپتال کا سنگ بنیاد رکھنے کیلئے منعقدہ تقریب سے قبل ۲۵ مشتبہ لوگوں کو حراست میں لے لیا اور زیادہ تر شرکاء کیلئے زمین پر بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تاکہ نہ رہیں کرسیاں اور نہ اڑیں کرسیاں۔ چند لوگوں کیلئے تو کرسیاں بچھائیں تو انہیں آپس میں اس طرح باندھ دیا گیا کہ اٹھا کر پھینکا نہ جاسکے۔ ان انتظامات کے بعد بھی وزیراعلیٰ کا خوف نہیں گیا تو انہوں نے نہایت مختصر خطاب علاقہ کی ترقی میں نریندر بھائی کی طرح خصوصی دلچسپی لینے کا وعدہ تو کیا مگر اپنے گرو امیت شاہ کا نام تک لب پر لانے کی جرأت نہ کرسکے۔ اس پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے سوراشٹر میں پٹیل ریزرویشن تحریک کے رہنما نلیش اروڈیہ نے کہا گجرات میں ہٹلر راج چل رہا ہے۔ پولس نے ان کے کارکنان کو جلسہ گاہ میں جانے سے روک دیا۔ ظاہر ہے جس تحریک رہنما کو باغی قرار دے کر ریاست بدر کردیا گیا ہے اس کے کارکنان کو احتجاج کرنے کا بجا طور پر حق ہے اور اس کو جس قدر سختی کے ساتھ کچلا جائیگا عوام کے غم و غصہ میں اسی قدر شدت آئیگی۔

امیت شاہ کی یہ حالت زار صرف گجرات تک محدود نہیں ہے۔ اترپردیش میں امیت

شاہ نے متھرا کے اندر ۴۰۰۰۰ ہزار دلتوں کے ساتھ بودھ بھکشوؤں کے استقبال کا منصوبہ بنایا تھا لیکن مایا وتی کے خلاف ایک بیان سے بی جے پی کے خلاف کچھ ایسی ہوا بنی کہ دلت بھی جمع نہیں ہوپائے نتیجہ یہ نکلا کہ ریلی منسوخ کرنی پڑی لیکن اب یہ فتنہ بی ۴۰ جے پی کے حدود سے نکل کر آرایس ایس کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ گوا کے اندر امیت شاہ کی آمد کے موقع پر آرایس ایس کے لوگوں نے سیاہ پرچم لہرا کر احتجاج کیا۔ گوا کے اندر آرایس ایس کے سنگھ چالک سبھاش ویلنگکر کا صوبائی حکومت کے انگریزی میڈیم اسکول کی سرپرستی کو لے کر پرانا اختلاف ہے۔ ان کا موقف ہے کہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جانی چاہیے اس لئے انگریزی میڈیم اسکولوں کی سرکاری مدد بند کی جائے۔

گوا کے اندر اقتدار میں بنے رہنے کیلئے بی جے پی اس مطالبے کو قبول نہیں کرسکتی۔ وہاں تو اس نے گئوکشی کی بابت بھی مصالحت کر رکھی ہے اور نہ صرف یہ کہ گوا کے اندر بیف پر پابندی نہیں ہے بلکہ اضافی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے کرناٹک سے بڑے جانور کا گوشت کھلے عام درآمد کیا جاتا ہے۔ وہ تو خیر ویلنگکر نے بیف کے بجائے اپنی تحریک کو زبان تک محدود کر رکھا ہے ورنہ وہاں کے مقامی لوگ اسی کو تندور میں جھونک دیں گے ۔ امیت شاہ کو اپنے خلاف کالی جھنڈیاں دیکھ کر اس قدر غصہ آیا کہ اس نے آرایس ایس پر دباو ڈال کر سبھاش

ویلنکر کی بھی وہی حشر کیا جو کہ گجرات میں آنندی بین کا کیا تھا۔ آنندی بین تو خیر امیت شاہ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں لیکن سبھاش ویلنکر نے بغاوت کر دی اور ان کے ساتھ ۴۵۰ سوئم سیوکوں نے سنگھ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر اسے لہو لہان کر دیا۔

اس ایک واقعہ نے کئی غلط فہمیاں دور کر دیں ۔ اول تو یہ کہ بی جے پی آر ایس ایس کے اشارے پر چلتی ہے ۔ اب تو یہ صورتحال یہ ہے کہ آر ایس ایس بی جے پی کو ساشٹانگ نمسکار کرتی ہے ۔ اسے کہتے ہیں اقتدار کا چمتکار ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ویلنکر کی چھٹی نہیں ہوتی اور سنگھ کو ۴۵۰ سوئم سیوکوں کا صدمہ نہ برداشت کرنا پڑتا۔ ایک اور غلط فہمی یہ تھی کہ سنگھ نہایت منظم تحریک ہے ۔ اس کے کارکنان بڑے نظم و ضبط کے پابند ہیں لیکن سیاست کی ہوا کھانے والے سویم سیوک بارہا بغاوت کر چکے ہیں۔ جن سنگھ کے صدر بلراج مدھوک نے الگ ہو کر اپنی جماعت بنالی تھی ۔ اس کے بعد اوما بھارتی ، واگھیلا، کیشو بھائی پٹیل، کلیان سنگھ ، شترو گھن سنہا، کیرتی آزاد اور یدو رپا جیسے نہ جانے کتنے لوگ بی جے پی کو چھوڑ کر باہر گئے بھی اور واپس بھی آگئے لیکن آر ایس ایس میں یہ نہیں ہوا تھا سو امیت شاہ کی مہربانی سے یہ بھی ہوگیا۔ اس کارنامہ کو انجام دینے کے لئے امیت شاہ صاحب خاص مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

سبھاش ویلنگکر نے صاف طور پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہیں وزیر دفاع منوہر پریکر اور امیت شاہ پر تنقید کرنے منع کیا گیا۔ مہیش نے سوال کیا کہ اس طرح کی پابندیوں کے ساتھ کوئی سماجی کام کیسے کر سکتا ہے ؟ اس سوال کے بطن سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو سنگھ پریوار خود اپنے ارکان اور رہنماوں پر زبان بندی کی قدغن لگاتا ہے وہ بھلا غیروں کے اختلاف کو کیسے برداشت کرے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام ترچکنی چپڑی باتوں کے باوجود عدم رواداری ان لوگوں کے رگ وپے میں بسی ہوئی ہے جس کے سبب سے یہ اول تو قوم کو نقصان پہنچاتے ہیں اور پھر خود اس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ویلنگکر کی جگہ اب لکشمن بہرے کو آرایس ایس کی کمان تھمائی گئی ہے۔

مودی اور امیت شاہ کے راج میں یہی ہوگا کہ بہرے اور گونگوں کو ذمہ داریاں سونپی جائینگی تاکہ وہ صدائے احتجاج نہ بلند کر سکیں لیکن خلاف توقع لکشمن بہرے نے بھی امیت شاہ کے رویہ کو غلط ٹھہرا کر اپنے پیش رو سبھاش ویلنگکر کے موقف کی تائید کردی ۔ انہوں نے کہا کہ امیت شاہ کو مظاہرین سے مل کر ان کی شکایت کو سننا چاہئے تھا۔ امیت شاہ کا ملاقات سے انکار اس تنازع کا سبب ہے۔ ممکن ہے یہ باغی سویم سیوکوں کا غصہ ٹھنڈا کرکے انہیں دوبارہ سنگھ میں لانے کی ایک چال ہو لیکن اس سازش کو سوئم سیوکوں سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے ؟آرایس ایس جس طرح والے ویلنگکر کے ہمنواوں کو رجھانے کیلئے اپنا جال

ڈال رہی ہے اسی طرح ویلنگکر بھی اپنی مورچہ بندی میں مصروف ہیں ۔وہ اپنے آپ کو آرایس ایس کے نظریہ سے توالگ نہیں کرتے لیکن اس کے رہنماوں کو تنقید کانشانہ بنا رہے ہیں۔ پہلے انہوں نے شاہ اور پریکر کو موردِ الزام ٹھہرایا اور پھر کہہ دیا کہ سر سنگھ چالک تو غلط ہو سکتے ہیں لیکن سنگھ غلط نہیں ہو سکتا۔

بھاگوت نے چونکہ ویلنگکر کو نکال باہر کیا اس لئے بھاگوت پر نشانہ سادھنا ان کی ضرورت تھی مگر ایسا کرتے ہوئے آرایس ایس پر تنقید نہ کرنے انہیں بڑا فائدہ ہوا ۔بغاوت کے بعد ویلنگکر کے متوازی اجلاس میں ریاست بھر کے ۲۰۰۰ سوئم سیوک شریک ہوئے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے نیز شئے اور مات کے اس کھیل میں بازیکون مارتا ہے؟ سنگھ کے مبہم بیانات سے سنگھ اس کا بھاری نقصان ہوگا اور اگر ویلنگکر اپنا سیاسی محاذ بنا کر انتخاب کے میدان میں اترتے ہیں تو سنگھ کیلئے اپنے کارکنان سے بی جے پی کی حمایت کروانا مشکل ہو جائیگا۔

ویسے بی جے پی کے ایک دشمن نما دوست شیوسینا تو ابھی سے ویلنگکر کی حمایت کا اعلان کردیا ہے ۔اس بار کیجریوال بھی گوا کے انتخاب میں خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ ویلنگکر اور کیجریوال کے درمیان کیا کھچڑی پکتی ہے؟ لیکن یہ طے ہے کہ گوا میں بی جے پی الیکشن کے بعد بیف کباب بیچے گی۔

گوا تو خیر ایک ننھی سی ریاست ہے اور اس کے انتخاب کا قومی سطح پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا لیکن چونکہ وزیراعظم اور بی جے پی صدر دونوں کا تعلق گجرات سے ہے اس لئے وہاں پر ہزیمت بی جے پی کو ضرورت مہنگی پڑے گی۔ گجرات کے اندر بی جے پی دوہرے عذاب کا شکار ہے۔ ایک طرف پٹیل برادری کی آگ ہے اور دوسری جانب دلت سماج کی کھائی ہے۔ گجرات کو خوشنما بنا کر پیش کرنے کیلئے گجرات حکومت کے سیاحتی محکمہ نے امیتابھ بچن کی مدد سے ''گجرات کی خوشبو'' نامی مہم چلائی تھی ۔ اس کے جواب میں گجرات کے دلت ''بدبودار گجرات'' کے عنوان سے ایک پوسٹ کارڈ مہم شروع کرنے جارہے ہیں ۔ جس کے تحت وزیراعظم اور امیتابھ بچن سمیت ہزاروں لوگوں کو پوسٹ کارڈ لکھ گجرات آنے کی دعوت دی جائیگی تاکہ وہ گجرات میں مرے ہوئے مویشیوں سے اٹھنے والے تعفن کو محسوس کرسکیں۔

گجرات کی بدبو نامی مہم کے آغاز کی خاطر دلتوں نے مودی جی کے جنم دن کا شبھ مہورت نکالا ہے۔ اپنی ٦٦ ویں سالگرہ پر مودی جی کیلئے اس بدبودار پوسٹ کارڈ سے اچھا تحفہ اور کون سا ہو سکتا ہے؟ اونا کے دلت رہنما جگنیش میوانی کے مطابق گجرات میں دلتوں نے مرے ہوئے جانوروں کو ٹھکانے لگانا بند کردیا ہے۔ صوبے میں سیکڑوں گائیں ادھر اُدھر مری پڑی ہیں ۔ اسی طرح دلت بھی مارے جارہے ہیں

۔ میوانی نے مزید بتایا کہ ۱۴ ستمبر کو وہ احمد آباد میں ایک جلسۂ عام کا انعقاد کرکے ریل روکو تحریک کی منصوبہ بندی کرنے والے ہیں۔ گجرات کے اندر بی جے پی کی مشکلات میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے اگر یہ سلسلہ نہیں رکا تو وہ دن دور نہیں اس پارٹی کی سیاسی لاش بھی ایک ایسےحالات میں کسی سڑک کے کنارے پڑی نظر آئے کہ سنگھ بھی اس کا پرسانِ حال نہ ہو۔

اڑی حملہ: قاتل ترا حساب بھی مجھ پر ادھار ہے

پٹھانکوٹ، پمپور اور اڑی کے بعد قوم کا بچہ بچہ وزیراعظم نریندر مودی سے وہی سوال کررہا ہے جو وزیراعلیٰ گجرات نریندر مودی نے ۴ مئی ۲۰۰۹ء کو سابق وزیراعظم منموہن سنگھ سے کیا تھا ’’میں وزیراعظم سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا آپ کمزور نہیں ہیں؟ اگرآپ واقعی طاقتور حکومت ہیں، تو ملک اس کا ثبوت مانگتا ہے۔‘‘ ملک کی عوام مودی بھکت گری راج سنگھ کو تلاش کررہی ہے کہ کہیں وہ پاکستان تو نہیں پہنچ گئے اس لئے کہ میں انہوں نے سرحد پر ہونے والے ایک حملے کے بعد کہا تھا اگرآج مودی جی ۲۰۱۳ء وزیراعظم ہوتے تو ہم لاہور میں ہوتے ۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ پٹھانکوٹ حملے کے بعد وزیراعظم دہلی سے میسور پہنچ گئے تھے اور جبکہ پٹھانکوٹ سے مزید شمال اڑی میں حملہ ہوگیا ہے وزیراعظم مزید جنوب کالی کٹ جا کر للکار رہے ہیں ۔ غربت اور بیروزگاری کے خلاف جنگ چھیڑ رہے ہیں ۔ اس کی توقع تو گری راج کو بھی نہیں رہی ہوگی ۔
ویسے اب نہ کوئی حملہ کشمیر سے مزید شمال میں ہوسکتا ہے اور نہ مودی جی کیرالہ سے نیچے جاسکتے ۔ دہشت گردانہ حملے اور وزیراعظم دونوں اپنی انتہاؤں پر پہنچ چکے ہیں ۔
وزیراعظم گزشتہ سال کے اواخر میں لاہور ہوآئے۔ وہاں انہوں نے نواز شریف کی ماتا جی کے چرن بھی چھوئے اور سالگرہ کا کیک بھی نوش فرمایا۔ اس کو

سنگھ پریوار نے ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا لیکن اس کے ایک ہفتہ بعد ہی پٹھانکوٹ ہوائی چھاونی پر حملہ ہوگیا۔پاکستان نے پہلی بار پٹھانکوٹ میں دہشت گردانہ واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ہم دل کی گہرائیوں سے حکومت ، ہندوستان کی عوام اور متاثرہ خاندانوں کی تعزیت کرتے ہیں نیز زخمیوں جلدازجلد شفایابی کی امید کرتے ہیں ۔اعلیٰ سطحی روابط کی خیر سگالی کے سبب پاکستان اس خطے میں دہشت گردی کے آسیب کی مکمل بیخ کنی میں ہندوستان اور دیگر ممالک کا بھروسے مند شراکت دار ہے۔پاکستان کی اس مذمت کو سفارتکاری کی عظیم کامیابی قرار دے کرپٹھانکوٹ کے زخموں پر مرہم رکھا گیا۔ پاکستان نے جب اپنے تعاون کا یقین دلایا تواس سے مودی سرکار پھولی نہیں سمائی ۔اعتدال پسندوں نے حکومت کی تعریف کی اور شدت پسندوں نے اس کے یہ معنیٰ پہنائے کہ پاکستان کی حکومت مودی جی سے ڈر گئی ہے۔

پاکستان نے آگے چل کر اپنے تعاون کیلئے تفتیش کی شرط لگائی توحکومت ہند نے اس کا استقبال کیا اور پاکستانی وفد کو دل کھول کر دعوت دے دی۔ حزب اختلاف نے حکومت کو یاد دلایا کہ فوجی چھاونی کے اندر کسی غیر ملکیوں کو تفتیش کی اجازتکیا معنیٰ ؟اس سے پہلے حکومت ہند کوئی جواز تلاش کرتی پاکستان نے اپنے وفد کے ارکان کا اعلان کردیا جس میں ایک بدنام زمانہ آئی ایس آئی کا افسر بھی تھا۔پاکستان کی اس حرکت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔اس کو یقین

تھا کہ اس وفد کو روک دیا جائیگا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ائیر بیس کو دو حصوں میں تقسیم کرکے نازک تنصیبات کے علاوہ دیگر مقامات پر پاکستانی وفد کو لیجایا گیا اور اس کی خوب خاطر تواضع اس امید میں کی گئی کہ اس بار پاکستانی حملہ آوروں کے ملوث ہونے کی تصدیق ہو جائیگی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پاکستانی وفد نے صاف انکار کرکے ساری توقعات پر پانی پھیر دیا۔اس طرح سفارتکاری کے بجائے صرف بدنامی ہاتھ آئی۔

پٹھانکوٹ حملے کے ۸ ماہ بعد جب اڑی کی فوجی چھاونی پر پہلے سے بھیانک حملہ ہوا۔ ۸ کے بجائے ۱۸ جانیں ضائع ہوئیں اس کے باوجود پاکستان کا ردعمل یکسر مختلف تھا۔

پاکستانی فوج کے ترجمان نے کہا کہ وہ قبل ازوقت اور غیر مفقود الزامات کی تردید کرتا ہے اور قابل عمل انٹلی جنس پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ پاکستانی وزیراعظم کے مشیر خارجی امور سرتاج عزیز نے کہا کہ یہ ہندوستان کی جانب انسانی حقوق کی تیزی کے ساتھ بگڑتی ہوئی صورتحال سے توجہ ہٹانے کی کوشش ہے۔ ویسے حملے کے چار دن بعد وزارت خارجہ نے پاکستانی سفرتکار کو طلب کرکے ثبوت فراہم کئے ہیں لیکن کوئی بعید نہیں کہ حسب روایت پاکستان ان سب کو مسترد کردے اور سارا معاملہ پھر ٹائیں ٹائیں فش ہوجائے۔ اگر پٹھانکوٹ حملے کے بعد پاکستان کا ردعمل سفارتی کامیابی تھا تو یہ کیا اس کے برعکس حالیہ صورتحال ناکامی نہیں ہے ؟ غور طلب یہ امر ہے کہ دونوں حملے

فوجی تنصیبات پر تھے اور اس دوران دونوں میں سے کسی ملک میں حکمراں بھی نہیں بدلے تھے تو آخر یہ تبدیلی کیوں کر واقع ہو گئی؟

اس تبدیلی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پٹھانکوٹ حملے کی پشت میں وزیر اعظم ہند کا ایک خیر سگالی دورہ تھا اور اڑی حملے کے پس پشت کشمیر کا خلفشار ہے۔ کشمیر کے حالیہ بحران کو تین مہینے ہونے والے ہیں۔ ۲۵ جون کو کشمیر میں عسکریت پسندوں نے پلوا ما ضلع میں پمپور مقام پر سی آر پی ایف کے دستے پر گھات لگا کر حملہ کیا تھا جس میں ۸ جوان ہلاک اور ۲۲ زخمی ہوئے تھے۔ پمپور میں دو عسکریت پسند بھی مارے گئے اور ایک فرار ہو گیا تھا۔ ایک ماہ کے اندر حفاظتی دستوں پر وہ چوتھا حملہ تھا اس سے قبل ۳ حملوں میں ۱۷ جوان ہلاک اور کئی زخمی ہو چکے تھے۔ یہ کارروائی ایک ایسے وقت میں ہو رہی تھی جبکہ مرکز اور صوبے میں بی جے پی برسر اقتدار ہے۔ اس سے جموں میں بی جے پی کے رائے دہندگان مایوس ہو رہے تھے اس لئے کہ ان کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ ایسے میں غالباً اپنے حامیوں کی خوشنودی اور کشمیری نوجوانوں کو خوفزدہ کرنے کی خاطر برہان وانی کے انکاونٹر کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اڑی حملے کے سبب عالمی رائے عامہ کا جھکاو اچانک ہندوستان کی جانب ہو گیا ہے لیکن اندرون مودی جی کی دبنگ شبیہ بہت متاثر

ہوئی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے اندر حکومت پر تنقید ہو رہی ہے اور سوشیل میڈیا میں نت نئے لطیفے بنائے جارہے ہیں۔ مخالفین مودی جی کی پرانی ویڈیوز کو پھیلا کر انہیں آئینہ دکھلا رہے ہیں ۔چہار جانب سے بدلہ بدلہ کی گہار ہے اور اس درمیان وزیر اعظم اپنا پتہ بدل رہے ہیں (ریس کورس روڈکے بجائے جب کلیان مارگ) ۔حکومت کے تئیں شدید ناراضگی تو پورے پریوار میں ہے لیکن مصلحت کے باعث اس کا اظہار نہیں ہو رہا ہے۔ شیوسینا چونکہ ہندوتوادی ہونے باوجود سنگھ قبیلے سے باہر اس لئے ادھو ٹھاکرے نے اپنے دلی جذبات کا برملا اظہار کر دیا۔ انہوں نے کہااب وقت آگیاہے کہ وہ پارلیمانی انتخاب سے قبل عوام سے کئے گئے وعدوں کو پورا کریں ، ہم پاکستان کو اس کی اپنی زبان میں کب جواب دیں گے ؟جب اس طرح کے حملے ہوتے ہیں ہم کچھ روز اس کی مذمت کرکے انہیں بھول جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا اگر جنگ ہونی ہے تو اسے قوم کیلئے ہونا چاہئے نہ کہ ووٹ کیلئے۔ ہم کب پاکستان کی زبان سمجھیں گے ؟ ادھو ٹھاکرے کھری کھوٹی سناتے ہوئے بولے اگر آپ وہی کرتے رہیں گے جو پرانی حکومت کرتی رہی تھی تو یہ دعویٰ کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ ملک کا موحول بدل گیا ہے؟ایسا لگتا ہے کہ حکومت کا خیال ہے جن کو آنسو بہانا ہے بہاتے رہیں ہم تو پاکستان جاکر چائے پیتے رہیں گے وہاں کے فنکاروں اور کھلاڑیوں کا استقبال بھی کرتے رہیں۔ این ڈی اے میں شامل ادھو ٹھاکرے کے بیان کا ترجمان اسلم غازی کا یہ شعر ہے کہ

جتنے بھی زخم کھائے ہیں ان کا شمار ہے
قاتل ترا حساب بھی مجھ پر ادھار ہے

بی جے پی کے سابق وزیر خارجہ اور وزیر خزانہ یشونت سنہا نے بھی نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور فوجی کارروائی سے قبل چند مشورے دیئے مثلاً سندھ ندی کی تقسیم کا معاہدہ ختم کردیا جائے۔ یشونت سنہا نہیں جانتے کاویری کا مسئلہ تو کرناٹک اور تمل ناڈو کے درمیان الجھا ہوا ہے اور سپریم کورٹ کی فیصلوں پر تک عملدرآمد نہیں ہوپارہا ہے جبکہ یہ ہمارا داخلی معاملہ ہے۔ ایسے میں اگر کوئی بین الاقوامی تنازع کھڑا کردیا جائے تو اس کے کیا اثرات ہوں اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے؟ یشونت سنہا کا دوسرا مشورہ قابل عمل ہے۔ ہندوستان نے پاکستان کو سب سے پسندیدہ ممالک کا درجہ دے رکھا ہے جبکہ پاکستان نے ہندوستان کو اپنی اس فہرست میں شامل نہیں کیا اس لئے اسے فوراً ترجیحی مقام سے معزول کردیا جائے۔ یشونت سنہا نے جنگ سے گریز کرنے کی رائے دینے کے بعد یہ بھی لکھا کہ ہم سب پاکستان کے ساتھ امن چاہتے ہیں مگر یاد رکھنا چاہئے کہ کبھی کبھار امن کا راستہ جنگ سے ہو کر گزرتا ہے۔ اگر یشونت سنہا جیسا سنجیدہ شخص ان خطوط پر سوچ رہا تو باقیماندہ لوگوں کے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

کشمیریت، جمہوریت اور انسانیت

اڑی میں ہونے والا حملہ کو کشمیر کے حالیہ احتجاج و تشدد کے واقعات اور برہان وانی کے انکاونٹر سے کاٹ کر دیکھنا ممکن نہیں ہے اس لئے کہ یہ ایک سلسلے کی کڑی ہے۔ برہان وانی ایک ۲۲ سالہ نوجوان تھا جس پر ۱۵۰ نوجوانوں کو حزب المجاہدین میں شامل کرنے اور دہشت گردی کے چند واقعات میں ملوث ہونے کا الزام تھا لیکن ۸ جولائی کو ایک مڈ بھیڑ میں اسے ڈھیر کردیا گیا۔ اگر برہان کو گرفتار کرکے عدالت میں پیش کردیا جاتا اور اس کے جرائم کی اسے دستور کے مطابق قرار واقعی سزا سنائی جاتی اور ''کشمیریت، جمہوریت اور انسانیت'' کا پاس و لحاظ رکھا جاتا تو شاید یہ خلفشار رونما نہیں ہوتا۔

برہان وانی کی عسکریت پسندی کے پسِ پشت عوامل کا پتہ لگا کر اس کا سدِ باب ضروری تھا۔ برہان کے والد صدر مدرس اور والدہ پوسٹ گریجویٹ استانی ہیں۔ برہان اپنی جماعت کا ذہین ترین طالبعلم تھا لیکن اس کے بے قصور بھائی خالد وانی کو آج سے ۷ سال قبل فوجیوں نے بلاوجہ ہلاک کردیا۔ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کی خاطر برہان عسکریت پسندی کی جانب راغب ہوا۔ اگر خالد پر ظلم نہیں ہوتا یا اس کے قاتلوں کو حکومت پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتی تو

.برہان حکومت کا احسانمند ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ایک جائزے کے مطابق وادی میں کل ۱۴۵ متحرک عسکریت پسند ہیں جن میں ۹۱ کا تعلق وادی سے ۵۴ پاکستان سے آئے ہیں۔ ان عسکریت پسندوں پر قابو پانے کیلئے لاکھوں کی تعداد میں موجود حفاظتی دستے کافی ہیں لیکن .برہان وانی کی ہلاکت نے اس کو راتوں رات کشمیر کا ہیرو بنادیا اور بی جے پی کی سخت گیری نے اسے زیرو کرکے رکھ دیا ۔عمر عبداللہ کا بیان درست ہے کہ قبر کے اندر .برہان وانی کی موجودگی ذرائع ابلاغ کی بہ نسبت کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ مظاہروں کو سختی سے نمٹنے کی حکمت عملی نے کشمیریوں کو بے خوف کردیا۔ اب یہ حالت ہے کہ صوبے کی وزیراعلیٰ بے دست وپا ہوگئی ہیں۔ ان کے ارکان اسمبلی وپارلیمان اپنے گھروں دبکے بیٹھے ہیں۔ کسی کے گھر پر حملہ ہوتا ہے اور مظاہرین حفاظتی دستوں سے اے کے ۴۷ چھین کرلے جاتے ہیں۔ کسی کا گھر جلادیا جاتا ہے اور کوئی استعفیٰ دے دیتا ہے۔ پہلے تو حکومت حریت سے ملاقات کیلئے تیارنہیں تیو مگر اب توحریت کل جماعتی پارلیمانی وفد تک سے ملاقات کرنا گوارہ کرنے پر راضی نہیں ہے۔

.برہان وانی انکاونٹر سے شروع ہونے والے احتجاج کی بابت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ڈھائی ماہ چلے گا۔ اس دوران دو مرتبہ وزیرداخلہ راجناتھ سنگھ کو اپنا امریکہ کا دورہ منسوخ کرنا پڑا اور ممکن ہے اسی سبب سے

خود وزیر اعظم نے بھی اقوام متحدہ کے سالانہ اجلاس سے دور رہنے کا فیصلہ کیا ہو جو حیرت انگیز ہے۔ گزشتہ ڈھائی سالوں کے اندر وزیر اعظم نریندر مودی براک اوبامہ سے ۸ بار مل چکے ہیں۔ صدر کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے اجلاس کو خطاب کرنے کے آخری موقع پر مودی جی کا وہاں نہ ہونا حیرت انگیز ہے لیکن غالباً کی کشمیر کی دگرگوں صورتحال ان کے پیروں کی زنجیر بن گئی۔

براک اوبامہ نے اپنے آخری خطاب میں نہ کشمیر کا ذکر کرکے ہندوستان کو ناراض کیا اور نہ اڑی کی مذمت کرکے پاکستان ناراضگی مول لی لیکن یہ ضرور کہا کہ بلاواسطہ جنگ سے مسائل حل نہیں ہوں گے اس کا اطلاق دونوں ممالک پریکساں طور سے ہوتا ہے۔ جس طرح کا حملہ اڑی میں ہوا ایسے حملے ہندوپاک دونوں ممالک میں ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں یکسانیت یہ ہے کہ ہر مقام پر حملہ آور سارے شواہد ساتھ لے کر جاتے ہیں اور انہیں محفوظ رکھتے ہیں۔ پاکستان میں ہونے والے حملوں کیلئے ہندوستان کو اور بھارت میں ہونے والے دہشت گردی کا الزام فوراًپاکستان پر لگا دیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری جانب سے انکار بھی ہوجاتا ہے۔ پاکستان کہتا ہے کہ یہ حکومت ہند از خود کروارہی ہے اور بھارت کے مطابق یہ آئی ایس آئی کے آغوش میں پلنے والے دہشت گردوں کا کارنامہ ہوتا ہے لیکن ان الزام تراشیوں سے قطع نظر اس کی بھاری قیمت عوام اور فوجی چکاتے ہیں۔

اڑی حملے کی بابت بھی یہی ہوا۔ حکومت ہند کا موقف ہے کہ سرحد پار سے آنے والے دہشت گردوں نے انجام دیا جبکہ پاکستان کا الزام ہے کہ کشمیر کی تحریک آزادی اور وہاں انسانی حقوق کی پامالی کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے یہ حملہ کروایا گیا ہے۔ ہندوستان کی جانب سے دہشت گردوں کے پاس ملنے والے سازوسامان کا حوالہ دیا جارہاہےاوران کے جی پی ایس کا ریکارڈ پیش کیا جارہا ہے جبکہ پاکستان یہ کہتا ہے فوجی چھاونی کے حفاظتی شکنجہ کو توڑ کر کسی کا اندر داخل ہوجانا تقریباً ناممکن ہے یا کشمیری عسکریت پسندوں کا ردعمل ہوسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اڑی حملے کے بعد ساری دنیا کی توجہ کشمیر کے مسئلہ سے ہٹ گئی اور پاکستان الگ تھلگ سا پڑ گیا ہے لیکن ان حالات میں بھی روس کے ساتھ پاکستان کی مشترکہ فوجی مشقیں سرکاری دعویٰ کا منہ چڑھاتی ہیں۔ پہلے تو یہ خبر آئی تھی کہ روس نے فوجی مشق منسوخ کردی ہے لیکن اب یہ کہہ کر ہم اپنے آپ کو بہلا رہے ہیں کہ اس کے افتتاح کو گلگت سے منتقل کردیا گیا ہے۔ روس اور ہندوستان کی دوستی بہت قدیم ہے۔ ہند اور امریکہ کے قریبی تعلقات کی استواری کے بعد بھی روس سے قربت باقی رہی لیکن مودی جی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد یہ توازن بگڑ گیا۔اس کا فائدہ اٹھا پاکستان نے اپنے قدیم دشمن کو

دوست بنالیا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ پاک روس مشترکہ فوجی مشق پہلی بار ہو رہی ہے۔

بین الاقوامی سفارتکاری ہو یا روس و پاکستان کی مشترکہ فوجی مشق اس کا کشمیر کے حالات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن اڑی حملے کے ۴ دن بعد جموں کشمیر ہائی کورٹ کا پیلٹ گن کے استعمال پر پابندی لگانے کی درخواست مسترد کردینا یقیناً اس پر اثر انداز ہوگا ۔ کورٹ سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ پیلٹ گن استعمال کرنے والے افسران کو سزا دی جائے ۔ اس درخواست کو بھی یہ کہہ کر نامنظور کردیا گیا کہ تفتیش کرنے والے حکام کو طاقت کے بیجا استعمال کے شواہد ہی نہیں ملے۔ عدالت نے کہا کس قسم کے ہتھیار استعمال کئے جائیں اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار وہاں موجود افسر کو ہے یعنی کل کو کوئی اے کے ۴۷ استعمال کرے تب بھی عدالت کی نظر میں وہ جائز ہوگا۔

جموں کشمیر کی بار ایسو سی ایشن نے ۳۰ جولائی کو یہ مقدمہ دائر کیا تھا جس پر ۲۱ ستمبر کو فیصلہ آیا ہے کہ وزارت داخلہ نے پیلٹ گن کا متبادل تلاش کرنے کیلئے جو ماہرین کی کمیٹی نامزد کی ہے اس کی رپورٹ کے بغیر کورٹ کوئی فیصلہ ممکن نہیں ہے ۔ عدالت کم از کم یہ تو پوچھ سکتی تھی کہ رپورٹ کب آئیگی یا اس کی پیشکش کیلئے کوئی مدت مقرر کردیتی اس لئے کہ ۷ ہفتے گزر

چکے ہیں۔ اگر اپنے ہی عوام کے تئیں اس طرح کی بے حسی برتی جائیگی تو غیروں کا اس کا فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہی رہے گا۔ یہ مسئلہ جبر وجنگ سے نہیں بلکہ مذاکرات سے حل ہوگا۔ وادیٔ کشمیر میں گفت و شنید کیلئے سازگار ماحول تیار کرنا حکومت کی اولین ترجیح ہونی چاہیئے۔ اس کے بغیر پاکستان کو اسے بین الاقوامی فورم میں اٹھانے سے روکنا عملاً ناممکن ہوگا۔ جموں کشمیر کے اندر پائیدار اور مستحکم امن و امان ہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔ بدلہ بدلہ کا شور یا اس کے جواب میں سرکاری پتہ کے ریس کورس روڈ کا نام جن کلیان روڈ سے بدل دیا جانا کشمیر کی جنتا کا کلیان نہیں کرے گا۔ اس کیلئے کشمیریت، جمہوریت اور انسانیت کے اصولوں پر اخلاص کے ساتھ عملدرآمد کرنا ہوگا۔

عصر حاضر کی ایک بے مثال مراٹھا تحریک

مراٹھا تحریک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قیادت کسی ایک جماعت کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ سارے مراٹھا اس بار متحد ہیں ۔ ایک مراٹھا کا مطلب ہے سارا مراٹھا سماج ایک جٹ ہے اور لاکھ مراٹھا کا مظاہرہ ہر مقام پر ہو رہا ہے۔ اس احتجاج میں شریک مظاہرین کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے ۲ یا ۵ یا ۱۰، لاکھ اس میں مخفف ہے۔ نندوربار جیسے علاقہ میں بھی جو کہ گجرات کی سرحد پر واقع ہے ۲ لاکھ لوگ شریک تھے اور احمد نگر میں تو دس لاکھ لوگ شامل ہوئے تھے ۔ اس سلسلے کی آخری کڑی ممبئی میں ۱۸ اکتوبر کو ہوگی جہاں ۲۰ لاکھ مراٹھوں کی شرکت متوقع ہے اور اس کے بعد ممکن ہے دیویندر فردنویس کو بھی آنندی بین کی طرح بلی کا بکرہ بنا کر سیاست کے مرگھٹ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ بی جے پی والے اگر مراٹھوں کو اپنے ساتھ لے کر چلتے تو ممکن ہے یہ درگت اتنی جلدی نہیں بنتی لیکن جن کے دماغ میں کبر و غرور کا خناس گھس جائے ان کی عقل ایسے ہی ماری جاتی ہے۔

مراٹھا سماج کے اندر احساس محرومی کا جو لاوہ پک رہا تھا وہ کوپرڈی کی عصمت دری سے پھٹ پڑا۔ مراٹھوں کے لئے اس بات کا تصور محال تھا کہ کوئی دلت نوجوان مراٹھا لڑکی کی عزت لوٹ کر اس کا قتل کردے گا۔ اپنی شدید سیاسی و سماجی بے

وزنی نے انہیں بے چین کردیا اور اسی کے بطن سے یہ احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا۔
مراٹھوں کا اولین مطالبہ ہے ۱۴ سالہ نابالغ لڑکی کی عصمت دری کرنے والے درندوں کو سرِ عام پھانسی دی جائے۔ اس مطالبے کی حمایت ہر ذی ہوش انسان کرے گا۔ ملت اسلامیہ اس معاملے میں کسی پس و پیش کا شکار نہیں ہے اس لئے کہ دین اسلام بھی اسی طرح کی کڑی سزا کا علمبردار ہے۔ مظاہروں کی کامیابی مراٹھا رہنماوں کی توقع سے زیادہ تھی اس لئے انہوں نے اپنے مطالبات میں یکے بعد دیگرے اضافہ کرنا شروع کردیا۔ پہلے تو ریزرویشن کی بات آئی اور اس کے بعد دلت اور پسماندہ ذاتوں پر مظالم کے خلاف وضع کردہ قانون کی منسوخی کا مطالبہ بھی سامنے آیا۔ اس میں تازہ اضافہ شیوسینا کے اخبار سامنا کا تضحیک آمیز کارٹون ہے۔
ریزرویشن کا مطالبہ آج کل ایک فیشن بن گیا ہے۔ ہریانہ کے جاٹ، راجستھان کے گوجر، گجرات کے پٹیل اور مہاراشٹر کے مراٹھے وہ لوگ ہیں جو برسوں اقتدار میں رہے لیکن اب ریزرویشن کی تحریک چلارہے ہیں۔ حکومت پہلے تو اسے نظر انداز کرتی ہے پھر قانون بنادیتی ہے جسے دستور کا حوالہ دے کر عدالتیں مسترد کردیتی ہیں۔
مہاراشٹر میں مراٹھوں اور مسلمانوں کے ریزرویشن کا یہی حشر ہوچکاہے۔ دستور میں فیصد کی قید کے چلتے اضافی ریزرویشن ممکن نہیں ہے۔ ترمیم کے بغیر کسی طبقہ کو ۵۰ شامل کرنے کے سبب پہلے سے مستفید ہونے والوں کی

حق تلفی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شردپوار ان لوگوں کو متاثر کئے بغیر ریزرویشن کی بات کرتے ہیں۔ سماجی انصاف کے مرکزی وزیر مملکت رام داس اٹھاولے بھی دستوری ترمیم کے ذریعہ مذکورہ قید کو ۵۰ سے ۷۵ فیصد کرکے براہمن سمیت دیگر طبقات کو ریزرویشن دینے کے حق میں ہیں لیکن بی جے پی تو دور کانگریس کیلئے بھی اس تجویز پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ منڈل کمیشن کے بعد وی پی سنگھ کا عبرت ناک انجام ساری دنیا کے سامنے ہے اور بی جے پی تو ویسے ہی شہروں کی پارٹی ہے۔

مراٹھوں کا تیسرا مطالبہ دلتوں اور دیگر پسماندہ ذاتوں کے خلاف مظالم کے خاتمہ کا قانون کی منسوخی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے سبب بے گناہ مراٹھوں کے خلاف شکایت درج کرواکرانہیں پریشان کیا جاتا ہے۔ یہ الزام اگر درست بھی ہو تو اس کا علاج غلط استعمال کو روکنے کی تدابیر ہے نہ کہ قانون کو مسترد کردینا۔ اس طرح کی دلیل تو ہر قانون کے خلاف دی جاسکتی ہے لیکن اس کا بہانہ بناکر اسے منسوخ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اول الذکر دو مطالبات کی حمایت جس طرح امت کرسکتی ہے اسی طرح اس تیسرے تقاضے کی حمایت مناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ احساسِ جرم آڑے نہ آئے کہ اس موقف کا مراٹھا سماج سے ہمارے باہمی خوشگوار تعلقات پر کیا اثر پڑے گا۔ اگر کوئی کسی کے ۴ میں سے ۳ مطالبات کی حمایت کرے اور ایک کی نہ کرے تو اس میں کوئی

قباحت نہیں ہونی چاہئے۔

دلتسماج کے جولوگ ان مظاہروں سے اور ہماری حمایت سے پریشان ہیں ان کو بھی ہمیں بتانا چاہئے کہ مراٹھوں کے مطالبات میں سے صرف ایک ایسا ہے جو ان کے خلاف ہے اور ہم اس کی حمایت نہیں کرتے۔ ہماری حمایت یا مخالفت اصولی ہے۔ امت مسلمہ جس چیز کو حق سمجھتی ہے اس کی حمایت اور جسے ناحق سمجھتی ہے اس کی مخالفت کرتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس کو نہ تو کسی کی بیجا خوشنودی کا خیال آتا ہے اور نہ کسی کی ملامت کا خوف ستاتا ہے۔ دلت اور دیگر پسماندہ طبقات پر مظالم سے تحفظ کا قانون (پی او اے) خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔آزادی سے قبلگول میز کانفرنس کے دوران گاندھی جی کھلے طور چھواچھوت کے خلاف ہو گئے تھے۔ گاندھی جی نے کہا تھاہمارے پاس کوئی باثر قانون ہونا چاہئے جو ہمارے ملک کے لوگوں کو نام نہاد اعلیٰ ذات کے ذریعہ کئے جانے والے ظلم وستم سے بچائے اور نسلی امتیاز کو جرم قرار دے۔ گاندھی جی کو خدشہ تھا'' کہ کہیں چھواچھوت برقرار رہنے کی صورت میں ہندومذہب ختم نہ ہو جائے''۔

دستور ہند کی شق ۱۷ نے چھوت چھات کا خاتمہ کردیا اور کسی بھی صورت میں اس پر عملدرآمد اور اس پابندی کو نافذالعمل کرنے میں کوتاہی کو پی سی آر ایکٹ (۱۹۵۵) کے تحت جرم قرار دیا۔۱۹۸۹ء میں یہ محسوس کیا گیا کہ قانون کی

موجودگی کے باوجود نسلی تفاوت کی بنیاد پر ظلم و ستم کا سلسلہ رکا نہیں ہے اس لئے خصوصی قانون بنایا گیا جس کے ذریعہ ان جرائم سے نمٹنے کی خاطر خصوصی عدالتوں کا قیام اور مظلومین کی بازآبادکاری کیلئے تفصیلی مراعات بیان کی گئیں۔ ان دستوری تحفظات کے باوجود یہ محسوس کیا گیا کہ پسماندہ ذاتوں اور قبائل کے خلاف ہونے والے جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۲۰۱۳ء کے دوران پسماندہ ذاتوں کے مظالم کی تعداد ۳۹۴۰۸ تھی اور جو ۲۰۱۴ء میں بڑھ کر ۴۷۰۶۴ تک پہنچ گئی۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن پر شکایت درج کرائی جا سکی۔ جن لوگوں کو ڈرا دھمکا کر روک دیا گیا ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔ اس صورتحال میں گزشتہ یو پی اے سرکار نے مزید اصلاحات پیش کیں جسے این ڈی اے حکومت نے اپریل ۲۰۱۶ء میں منظوری دی تاکہ کوئی مجرم قانونی موشگافی کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور مظلومین کی قرار واقعی مدد کی جائے۔۔ پہلے یہ جرائم ڈھکے چھپے انداز میں ہوتے تھے لیکن اونا گواہ ہے کہ اب کھلے عام ہونے لگے ہیں، گئو بھکت ویڈیو بنا کر اسے فخریہ پھیلاتے ہیں۔

ایک طرف تو قومی سطح پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اس قانون کے نفاذ میں کوتاہی ہے اور مظالم بڑھ رہے ہیں دوسری جانب اس کے غلط استعمال کا نعرہ بلند کرکے اس کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ غلط استعمال کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس کے تحت درج مقدمات میں صرف ۵ فیصد

لوگوں پر جرم ثابت ہوتا ہے لیکن مہاراشٹر میں تو ۲۰۱۱ء کے اندر دیگر مقدمات میں بھی ۵ء۴ فیدص لوگوں کو سزا ملی ہے۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۳ء میں بھی سزا یافتہ ۳ء۶ فیصد سے کم ہیں تو کیا اس منطق سے تعزیرات ہند کو ہی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا جائیگا۔ کسی بھی چیز کے غلط استعمال کو روکنے کا طریقہ اس پر پابندی نہیں ہے اس طرح تو دستور کا بیشتر حصہ منسوخ ہو کر رہ جائیگا۔ اس بابت ۱۰ سال قبل رونما ہونے والے مشہور زمانہ کھیرالانجی مقدمہ کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جس میں چار دلتوں کو دن دہاڑے ایک مجمع نے قتل کر دیا ۔اس سانحہ پر ملک بھر میں احتجاج ہوا۔ ۵۰ ملزمین پر خصوصی عدالت میں مقدمہ درج کیا گیا۔ سماعت کے دوران ملزمین کی تعداد گھٹ کر ۱۱ ہو گئی ان میں سے ۸ کو سزائے موت سنائی ۔

خصوصی عدالت نے یہ فیصلہ دو سال کے اندر کر دیا مگر پھر اس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی ۔ ہائی کورٹ نے اسے پی او اے کے بجائے عام قانون کی خلاف ورزی قرار دیا۔ عالمی سطح پر اس قدر مشہور مقدمہ کے ساتھ اگر یہ ہو سکتا ہے تو دیگر معاملات میں کیا ہوتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ خیر ہائی کورٹ نے اس بہیمانہ قتل کے مجرمین کو سزائے موت کے بجائے ۲۵ سال قید بامشقت کی سزا سنائی ۔ اب یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے ۔ ایک مجرم کا انتقال ہو چکا ہے کوئی نہیں جانتا کہ آخری فیصلہ آنے تک کتنے زندہ بچیں

گے۔ اس مثال شاہد ہے کہ تمام تر ترمیمات کے باوجود یہ قانون کس قدر غیر موثر ہے اور اس کے غلط استعمال کا دعویٰ کتنا کمزور ہے۔ ویسے چونکہ یہ مرکزی حکومت کا وضع کردہ قانون ہے کوئی ریاستی حکومت اس کو منسوخ تو درکنار اس سے سرمو انحراف بھی نہیں کر سکتی۔ مہاراشٹر کی بی جے پی حکومت اس طرح کا قانون اقلیتوں کے تحفظ کیلئے بھی وضع کر رہی ہے امکان یہ ہے آئندہ اسمبلی اجلاس میں وہ پیش ہوجائے اور دیگر جماعتوں کی مخالفت کے سبب ناکام ہوجائے۔ حکومت اس کے ذریعہ خود کو مسلمانوں کا بہی خواہ اور دیگر جماعتوں کو ان کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کرے گی لیکن مسلمان ایسے احمق بھی نہیں کہ ان کھلونوں سے بہل جائیں۔ وہ بی جے پی کی چال، چرتر اور چہرے سے خوب واقف ہیں۔

ایک مراٹھا، لاکھ مراٹھا

شیواجی سے شروع ہونے والی مہاراشٹر کی تاریخ آگے بڑھ کر پیشوائی میں بدل جاتی ہے ۔ شیواجی کا تعلق مراٹھا سماج سے تھا اور پیشوا براہمن تھے ۔ آزادی کے بعد مہاراشٹر کے مراٹھوں نے کانگریس کا رخ کیا اور براہمن دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ۔

ہندوتوا وادی حصہ ہندو مہاسبھا و آر ایس ایس کا کل پرزہ بن گیا اور اشتراکی فکر کے لوگ کمیونسٹ اور کسان مزدور پارٹی میں شامل ہو گئے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ گاندھی جی کا وطن ثانی سیوا گرام (جہاں ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک مقیم رہے) مہاراشٹر میں ہے اور وہی ان کے قاتل ناتھو رام گوڈسے کا وطن بھی ہے۔گاندھی جی کے قاتل این آر گوڈسے کی طرح اسے شناخت کرنے والے این آر گاڈگل بھی براہمن ہی تھے۔ گاندھی قتل کے بعد مہاراشٹر کے اندر ہونے والے نسلی فساد میں کالی ٹوپی والے سنگھیوں کو سفید ٹوپی والے مراٹھوں کے تشدد کا سامنا کرنا پڑا اور اسی کے ساتھ مراٹھے صوبہ مہاراشٹر کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔

کانگریسی اقتدار کے دوران مہاراشٹر کے ۱۸ میں سے ۱۲ وزرائے اعلیٰ کا تعلقمراٹھا سماج سے تھا لیکن جب دیگر ذاتوں کے افراد یا ایک مسلمان کو بھی وزیر اعلیٰ بنایا گیا تب بھی اقتدار کی ڈور عملاً انہیں کے ہاتھوں میں رہی ۔

اس دوران مراٹھوں نے خاص طور پر براہمنوں کو اقتدار سے دور رکھا۔ مہاراشٹر کو پہلا براہمن وزیراعلیٰ شیوسینا کے اقتدار میں ملا۔ اس زمانے میں سینا پرمکھ بال ٹھاکرے ہندو ہردیہ سمراٹ کہلاتے تھے اور اقتدار کا ریموٹ کنٹرول اصلاً ان کے پاس تھا۔ بال ٹھاکرے نے اپنے سب سے وفادار شاگرد منوہر جوشی کو نام کا وزیراعلیٰ تو بنادیا مگر حلف برداری کے موقع پر جلسۂ عام میں یہ اعلانکردیا کہ اگر یہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے میں کوتاہی برتے گا تو میں اس کی کمر پر لات مار کر اسے بھگا دوں گا۔ آگے چل بال ٹھاکرے نے تو نہیں مگر ان کے فرزند ادھو ٹھاکرے نے ضرور اپنے والد کے یار غار کو رسوا کرکے پارٹی سے چلتا کردیا۔

منوہر جوشی کی ساری چاپلوسی اور مکاری وعیاری کے باوجود بال ٹھاکرے کو انتخاب سے ماہ قبل منوہر جوشی کی رخصت دے کر ایک غیر معروف مراٹھا رہنما نارائن رانے کو ۹ وزیراعلیٰ بنانا پڑا اس لئے کہ مہاراشٹر میں کسی براہمن وزیراعلیٰ کے بل بوتے پر انتخابی کامیابی ناممکن اور شکست یقینی تھی ۔ شیوسینا کو یہ تبدیلی بھی راس نہیں آئی اور وہ بی جے پی سمیت ڈھیر ہوگئی ۔ اس کے بعد کانگریس دوبارہ اقتدار میں آگئی اور مراٹھا سردار ولاس راو دیشمکھ کو وزیراعلیٰ بنادیا گیا۔ سینا پرمکھ بال ٹھاکرے کے بعد نئے ہندو ہردیہ سمراٹ وزیراعظم نریندر مودی نے قومی انتخاب میں مقبولیت کی لہر سے

اپنی پارٹی کو مہاراشٹر کی سب سے بڑی سیاسی جماعت بنادیا۔ رعونت کا یہ عالم تھا اقلیت میں ہونے باوجود شیوسینا کے بجائے این سی پی کی بلاواسطہ مدد سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا گیا اور ایک نامعلوم براہمن کو وزارت اعلیٰ کی کرسی پر فائز کردیا گیا۔

مہاراشٹر میں جس وقت شیوسینا کا براہمن وزیراعلیٰ تھا اس وقت بی جے پی نے نائب وزیراعلیٰ کا عہدہ پسماندہ ذات کے گوپی ناتھ منڈے کو دیا تھا۔ اس وقت پارٹی کی صدارت اور دیگر اہم عہدوں پر بھی پسماندہ طبقات کے لوگوں کو فائز کرکے انہیں جھانسے میں لیاجارہا تھا لیکن اس بار کی کامیابی کے بعد خون پسینہ ایک کرکے پارٹی کو اس مقام پر پہنچانے والوں کو ذلیل کرکے کنارے کردیا گیا۔ فی الحال مہاراشٹرا اسمبلی میں ۱۴۵ امراٹھے، اوبی سی ۴۴ ،براہمن ۱۴ اور مسلمان ۱۰ ہیں لیکن وزیراعلیٰ براہمن ہے جو وزیرداخلہ بھی ہے۔اس کے علاوہ وزیر خزانہ، وزیر صنعت، وزیر خوراک، آبی وسائل کے وزیراور اسپیکر براہمن ہیں ۔ مرکزی وزراء میں وزیر مواصلات و سڑک نتن گڈکری اور وزیر ریلوے سریش پربھو دونوں ہی براہمن ہیں ۔

وزیراعلیٰ چونکہ کمزور ہے اور انہیں ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے اس لئے وہ اپنے حریفوں کے خلاف سازش میں مصروف رہتے ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنے طاقتورترین حلیف ایکناتھ کھڑسے کو ٹھکانے لگایا۔ بدعنوانی کے الزامات کے

علاوہ داؤد کے فون کا ناٹک رچا کر ہٹایا اور پھر کلین چٹ دے دی۔ مراٹھا رہنما ونود تاوڑے اور ونجارہ سماج کی پنکجا منڈے نشانے پر ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ پنکجا نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چھگن بھجبل سے جیل میں جا کر ملاقات کی تا کہ پسماندہ ذاتوں کے اتحاد کا امکان پیر غور ہو سکے ۔ این سی پی بھجبل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہے جو بی جے پی نے منڈے کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہے۔ بی جے پی کے براہمنوں نے اقتدار کی ہوس میں مراٹھوں کے ساتھ ساتھ دیگر پسماندہ اقوام کو بھی ناراض کر دیا ہے۔

مراٹھوں کی شکست کی ایک وجہ تو ان کا دو سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہونا ہے ۔ اس بار این سی پی کی کمزوری و لاچاری کے سبب انتخاب کے وقت قائم ہونے والا عارضی اتحاد عمل میں نہیں آیا۔ سنا ہے بی جے پی نے بدعنوانی کے الزامات میں جیل بھیجنے کا خوف دلا کر این سی پی کو بلیک میل کیا تھا ۔ اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر بی جے پی نے دو مراٹھا تنظیموں کو اپنا حلیف بنایا اور بڑے پیانے پر مراٹھوں کو ٹکٹ دیا۔ ایک اندازے کے مطابق بی جے پی کو ۵۰ فیصد سے زیادہ مراٹھا ووٹ ملے۔ 'سب کا ساتھ، سب کا وکاس' کا فریب مراٹھا سماج کے سامنے انتخاب کے بعد کھلا ۔ اس پس منظر کے بغیر 'ایک مراٹھا لاکھ مراٹھا' کے جھنڈے تلے ہونے احتجاج کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

مراٹھا تحریک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قیادت کسی ایک جماعت کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ سارے مراٹھا اس بار متحد ہیں ۔ ایک مراٹھا کا مطلب ہے سارا مراٹھا سماج ایک جٹ ہے اور لاکھ مراٹھا کا مظاہرہ ہر مقام پر ہو رہا ہے۔ اس احتجاج میں شریک مظاہرین کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے ۲ یا ۵ یا ۱۰، لاکھ اس میں مخفف ہے۔ نندوربار جیسے علاقہ میں بھی جو کہ گجرات کی سرحد پر واقع ہے ۲ لاکھ لوگ شریک تھے اور احمد نگر میں تو دس لاکھ لوگ شامل ہوئے تھے ۔ اس سلسلے کی آخری کڑی ممبئی میں ۸ اکتوبر کو ہو گی جہاں ۲۰ لاکھ مراٹھوں کی شرکت متوقع ہے اور اس کے بعد ممکن ہے دیویندر فردنویس کو بھی آنندی بین کی طرح بلی کا بکرہ بنا کر سیاست کے مرگھٹ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ بی جے پی والے اگر مراٹھوں کو اپنے ساتھ لے کر چلتے تو ممکن ہے یہ درگت اتنی جلدی نہیں بنتی لیکن جن کے دماغ میں کبرو غرور کا خناس گھس جائے ان کی عقل ایسے ہی ماری جاتی ہے۔

مراٹھا سماج کے اندر احساس محرومی کا جو لاوہ پک رہا تھا وہ کوپرڈی کی عصمت دری سے پھٹ پڑا۔ مراٹھوں کے لئے اس بات کا تصور محال تھا کہ کوئی دلت نوجوان مراٹھا لڑکی کی عزت لوٹ کر اس کا قتل کر دے گا۔ اپنی شدید سیاسی و سماجی بے وزنی نے انہیں بے چین کر دیا اور اسی کے بطن سے یہ احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا۔ مراٹھوں کا اولین مطالبہ ہے ۱۴ سالہ نابالغ لڑکی کی عصمت دری کرنے

والے درندوں کو سرِ عام پھانسی دی جائے۔ اس مطالبے کی حمایت ہر ذی ہوش انسان کرے گا۔ ملت اسلامیہ اس معاملے میں کسی پس و پیش کا شکار نہیں ہے اس لئے کہ دین اسلام بھی اسی طرح کی کڑی سزا کا علمبردار ہے۔ مظاہروں کی کامیابی مراٹھا رہنماوں کی توقع سے زیادہ تھی اس لئے انہوں نے اپنے مطالبات میں یکے بعد دیگرے اضافہ کرنا شروع کردیا۔ پہلے تو ریزرویشن کی بات آئی اور اس کے بعد دلت اور پسماندہ ذاتوں پر مظالم کے خلاف وضع کردہ قانون کی منسوخی کا مطالبہ بھی سامنے آیا۔ اس میں تازہ اضافہ شیوسینا کے اخبار سامنا کا تضحیک آمیز کارٹون ہے۔

ریزرویشن کا مطالبہ آج کل ایک فیشن بن گیا ہے۔ ہریانہ کے جاٹ، راجستھان کے گوجر، گجرات کے پٹیل اور مہاراشٹر کے مراٹھے وہ لوگ ہیں جو برسوں اقتدار میں رہے لیکن اب ریزرویشن کی تحریک چلارہے ہیں۔ حکومت پہلے تو اسے نظر انداز کرتی ہے پھر قانون بنادیتی ہے جسے دستور کا حوالہ دے کر عدالتیں مسترد کردیتی ہیں۔

مہاراشٹر میں مراٹھوں اور مسلمانوں کے ریزرویشن کا یہی حشر ہوچکاہے۔ دستور میں ۵۰ فیصد کی قید کے چلتے اضافی ریزرویشن ممکن نہیں ہے۔ ترمیم کے بغیر کسی طبقہ کو شامل کرنے کے سبب پہلے سے مستفید ہونے والوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شردپوار ان لوگوں کو متاثر کئے بغیر ریزرویشن کی بات کرتے ہیں۔ سماجی انصاف کے مرکزی وزیر مملکت رام داس

اٹھاولے بھی دستوری ترمیم کے ذریعہ مذکورہ قید کو ۵۰ سے ۷۵ فیصد کرکے براہمن سمیت دیگر طبقات کو ریزرویشن دینے کے حق میں ہیں لیکن بی جے پی تو دور کانگریس کیلئے بھی اس تجویز پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ منڈل کمیشن کے بعد وی پی سنگھ کا عبرت ناک انجام ساری دنیا کے سامنے ہے اور بی جے پی تو ویسے ہی شہروں کی پارٹی ہے۔

مراٹھوں کا تیسرا مطالبہ دلتوں اور دیگر پسماندہ ذاتوں کے خلاف مظالم کے خاتمہ کا قانون کی منسوخی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے سبب بے گناہ مراٹھوں کے خلاف شکایت درج کرواکر انہیں پریشان کیا جاتا ہے۔ یہ الزام اگر درست بھی ہو تو اس کا علاج غلط استعمال کو روکنے کی تدابیر ہے نہ کہ قانون کو مسترد کردینا۔ اس طرح کی دلیل تو ہر قانون کے خلاف دی جاسکتی ہے لیکن اس کا بہانہ بنا کر اسے منسوخ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اول الذکر دو مطالبات کی حمایت جس طرح امت کرسکتی ہے اسی طرح اس تیسرے تقاضے کی حمایت مناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ احساسِ جرم آڑے نہ آئے کہ اس موقف کا مراٹھا سماج سے ہمارے باہمی خوشگوار تعلقات پر کیا اثر پڑے گا۔ اگر کوئی کسی کے ۴ میں سے ۳ مطالبات کی حمایت کرے اور ایک کی نہ کرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔

دلت سماج کے جو لوگ ان مظاہروں سے اور ہماری حمایت سے پریشان ہیں ان کو بھی

ہمیں بتانا چاہئے کہ مراٹھوں کے مطالبات میں سے صرف ایک ایسا ہے جو ان کے خلاف ہے اور ہم اس کی حمایت نہیں کرتے ۔ ہماری حمایت یا مخالفت اصولی ہے۔ امت مسلمہ جس چیز کو حق سمجھتی ہے اس کی حمایت اور جسے ناحق سمجھتی ہے اس کی مخالفت کرتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس کو نہ تو کسی کی بیجا خوشنودی کا خیال آتا ہے اور نہ کسی کی ملامت کا خوف ستاتا ہے۔ دلت اور دیگر پسماندہ طبقات پر مظالم سے تحفظ کا قانون (پی او اے) خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔آزادی سے قبلگول میز کانفرنس کے دوران گاندھی جی کھلے طور چھوا چھوت کے خلاف ہو گئے تھے۔ گاندھی جی نے کہا تھا ہمارے پاس کوئی باا ثر قانون ہونا چاہئے جو ہمارے ملک کے لوگوں کو نام نہاد اعلیٰ ذات کے ذریعہ کئے جانے والے ظلم و ستم سے بچائے اور نسلی امتیاز کو جرم قرار دے۔ گاندھی جی کو خدشہ تھا'' کہ کہیں چھوا چھوت برقرار رہنے کی صورت میں ہندو مذہب ختم نہ ہو جائے''۔

دستور ہند کی شق ۱۷ نے چھوت چھات کا خاتمہ کردیا اور کسی بھی صورت میں اس پر عملدرآمد اور اس پابندی کو نافذالعمل کرنے میں کوتاہی کو پی سی آر ایکٹ (۱۹۵۵) کے تحت جرم قرار دیا۔ ۱۹۸۹ء میں یہ محسوس کیا گیا کہ قانون کی موجودگی کے باوجود نسلی تفاوت کی بنیاد پر ظلم و ستم کا سلسلہ رکا نہیں ہے اس لئے خصوصی قانون بنایا گیا جس کے ذریعہ ان جرائم سے نمٹنے کی خاطر خصوصی عدالتوں کا قیام اور مظلومین کی بازآبادکاری کیلئے تفصیلی مراعات بیان کی

گئیں۔ ان دستوری تحفظات کے باوجود یہ محسوس کیا گیا کہ پسماندہ ذاتوں اور قبائل کے خلاف ہونے والے جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۲۰۱۳ء کے دوران پسماندہ ذاتوں کے مظالم کی تعداد ۳۹۴۰۸ تھی اور جو ۲۰۱۴ء میں بڑھ کر ۴۷۰۶۴ تک پہنچ گئی۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن پر شکایت درج کرائی جا سکی۔ جن لوگوں کو ڈرا دھمکا کر روک دیا گیا ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔ اس صورتحال میں گزشتہ یو پی اے سرکار نے مزید اصلاحات پیش کیں جسے این ڈی اے حکومت نے اپریل ۲۰۱۶ء میں منظوری دی تاکہ کوئی مجرم قانونی موشگافی کا فائدہ نہ اٹھاسکے اور مظلومین کی قرار واقعی مدد کی جائے۔۔ پہلے یہ جرائم ڈھکے چھپے انداز میں ہوتے تھے لیکن اونا گواہ ہے کہ اب کھلے عام ہونے لگے ہیں، گئو بھکت ویڈیو بنا کر اسے فخریہ پھیلاتے ہیں۔

ایک طرف تو قومی سطح پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اس قانون کے نفاذ میں کوتاہی ہے اور مظالم بڑھ رہے ہیں دوسری جانب اس کے غلط استعمال کا نعرہ بلند کرکے اس کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ غلط استعمال کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس کے تحت درج مقدمات میں صرف ۵ فیصد لوگوں پر جرم ثابت ہوتا ہے لیکن مہاراشٹر میں تو ۲۰۱۱ء کے اندر دیگر مقدمات میں بھی ۵.۴ فیدس لوگوں کو سزا ملی ہے اور ۲۰۱۳ء میں بھی سزا یافتہ ۶.۳ فیصد سے کم ہیں تو کیا اس منطق سے تعزیرات ۲۰۱۲ء ہند کو ہی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا جائیگا۔ کسی بھی چیز کے غلط استعمال کو روکنے کا طریقہ اس پر پابندی

نہیں ہے اس طرح تو دستور کا بیشتر حصہ منسوخ ہو کر رہ جائیگا۔ اس بابت ۱۰ سال قبل رونما ہونے والے مشہور زمانہ کھیرالانجی مقدمہ کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جس میں چار دلتوں کو دن دہاڑے ایک مجمع نے قتل کردیا۔ اس سانحہ پر ملک بھر میں احتجاج ہوا۔ ۵۰ ملزمین پر خصوصی عدالت میں مقدمہ درج کیا گیا۔ سماعت کے دوران ملزمین کی تعداد گھٹ کر ۱۱ ہو گئی ان میں سے ۸ کو سزائے موت سنائی۔

خصوصی عدالت نے یہ فیصلہ دوسال کے اندر کردیا مگر پھر اس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ ہائی کورٹ نے اسے پی او اے کے بجائے عام قانون کی خلاف ورزی قرار دیا۔ عالمی سطح پر اس قدر مشہور مقدمہ کے ساتھ اگر یہ ہوسکتا ہے تو دیگر معاملات میں کیا ہوتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ خیر ہائی کورٹ نے اس بہیمانہ قتل کے مجرمین کو سزائے موت کے بجائے ۲۵ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ اب یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ ایک مجرم کا انتقال ہوچکا ہے کوئی نہیں جانتا کہ آخری فیصلہ آنے تک کتنے زندہ بچیں گے۔ اس مثال شاہد ہے کہ تمام تر ترمیمات کے باوجود یہ قانون کس قدر غیر موثر ہے اور اس کے غلط استعمال کا دعویٰ کتنا کمزور ہے۔ ویسے چونکہ یہ مرکزی حکومت کا وضع کردہ قانون ہے کوئی ریاستی حکومت اس کو منسوخ تو درکنار اس سے سرموانحراف بھی نہیں کرسکتی۔ مہاراشٹر کی بی جے پی حکومت اس طرح کا

قانون اقلیتوں کے تحفظ کیلئے بھی وضع کر رہی ہے امکان یہ ہے آئندہ اسمبلی اجلاس میں وہ پیش ہو جائے اور دیگر جماعتوں کی مخالفت کے سبب ناکام ہو جائے۔ حکومت اس کے ذریعہ خود کو مسلمانوں کا بہی خواہ اور دیگر جماعتوں کو ان کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کرے گی لیکن مسلمان ایسے احمق بھی نہیں کہ ان کھلونوں سے بہل جائیں۔ وہ بی جے پی کی چال، چرترا اور چہرے سے خوب واقف ہیں۔

مراٹھا تحریک کے دوران سب سے دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب شیوسینا کے اخبار سامنا نے اس پر تمسخر آمیز کارٹون بنا دیا۔ مراٹھی زبان میں خاموش کو موک کہتے ہیں اور بوسے کو موکا۔ کارٹونسٹ پر بھودیسائی نے ایک نوجوان جوڑے کو بوسہ لیتے ہوئے دکھلا کر یہ لکھ دیا کہ کچھ پرجوش شرکاء نے مظاہرے کا غلط مطلب لے لیا۔ یہ توہین دراصل کوپرڈی سے کم نہیں تھی اس لئے اس میں ان لاکھوں خواتین کی کردار کشی کی گئی تھی جو ان مظاہروں میں شریک ہوتی ہیں۔ مراٹھا مظاہرے اپنے نظم و ضبط کے لحاظ سے نہایت منفرد ہیں۔ اس میں لاکھوں لوگ صبح سویرے طے شدہ مقامات پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر ایک خاص اجتماع گاہ کی جانب پیدل یا موٹر سائیکلوں پر چل پڑتے ہیں۔ نہ کوئی شور، نہ نعرے بازی اور نہ اشتعال انگیز تقاریر۔ اپنا میمورنڈم دے کر یہ لوگ جیجا بائی کی وندنا کرتے ہیں اور پروقار خاموشی سے لوٹ جاتے ہیں۔ نوجوانوں اور خواتین کی کثیر تعداد کے باوجود ان سے آج تک کوئی نازیبا حرکت سرزد نہیں ہوئی اس کے

باوجود سامنا کا تمسخر قابل شرم ہے لیکن شیو سینا کو شرم و حیا کا پاس و لحاظ کب ہے؟

اس کارٹون نے احتجاج میں نئی جان ڈال دی ۔ سمبھاجی بریگیڈ کے نوجوانوں نے سامنا کے نوی ممبئی دفتر پر حملہ کرکے ۳۰ ہزار کا نقصان کردیا اور شیو سینا کے ایک ایم پی اور ۳ ایم ایل اے نے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ دراصل سماجی دباو ہے جس کے سبب وہ اس اقدام پر مجبور ہوگئے ۔ دونوں کانگریس نے اس کی بھرپور مذمت کی اور ادھو ٹھاکرے سے عام معافی کا مطالبہ کیا۔ بی جے پی کو بھی موقع مل گیا اس نے سامنا کے ایڈیٹر اور رکن پارلیمان سنجے راوت کی برخواستگی کا مطالبہ کیا۔ دو مقامات پر مقدمات درج ہوئے اور کئی جگہوں پر سامنا کی کاپیاں جلائی گئیں ۔ اب سامنا پ (جس کے معنیٰ مقابلہ کے ہوتے ہیں) کی آگ کہاں تک پھیلے گی کوئی نہیں جانتا؟ سینا نے پہلے استعفیٰ کا انکار کیا پھر اسے مخالفین کی سازش قرار دے کر مسترد کیا۔ جب بات نہیں بنی توسامنا کی جانب سے دل آزاری پر افسوس کا اظہار کیاگیا۔ اس سے بھی غم و غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تو کارٹونسٹ پر بھودیسائی سے معافی منگوالی لیکن ادھو ٹھاکرے کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ بھی جلد از جلد معافی مانگ لیں ورنہ ان کا جو بھگوا جھنڈا مراٹھوں نے چھین لیا ہے وہ اسی کے ڈنڈے دماغ درست کردیں گے۔ ادھو ٹھاکرے مراٹھوں کے آگے تو بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں مگر مسلمانوں

کے مجوزہ مظاہروں کے خلاف شیر بن کر چنگھاڑ رہے ہیں۔ عوام اب اس کاغذی شیر کی حقیقت جان چکی ہے اور جلد ہی ' ایک مرا اٹھا لاکھ مرا اٹھا' کا شکاری اس کو پنجرے میں محصور کر دے گا۔

فرقہ وارانہ فسادات کی وجوہات

فرقہ وارانہ فساد کا مربع چار عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں اولیت فسادی کو حاصل ہے جو اس کی ابتداء کرتا ہے اور انجام تک بھی پہنچاتا ہے۔ دوسرا نمبر انتظامیہ کا ہے جس کی ذمہ داری فساد روکنا ہے۔ فساد اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام ہوجاتا ہے یا فسادیوں کا ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔ فساد کا تیسرا اجزو لاینفک وہ سیاستداں ہے جو کبھی تو فسادزدگان کے آنسو پونچھ کر ان کی ہمدردی بٹورتے ہیں، کبھی فسادیوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں، انتظامیہ پر دباو ڈال کر اس کی راہ میں رخنہ کھڑا کرتے ہیں اور بوقتِ ضرورت شروع سے لے کر آخر تک فساد کی سرپرستی اور رہنمائی کرتے ہیں تاکہ عوام کا جذباتی استحصال کرکے اپنی سیاسی دوکان چمکائی جائے۔اس زنجیر کی آخری کڑی مظلوم و مقہور فسادزدگان تو بیچارے ظلم و جبر کا شکار ہوتے ہیں۔ سارے لوگوں کی ہمدردی بجا طور پر آخری طبقہ سے ہوتی ہےاور ہونی بھی چاہئے لیکن کیا اس کی مدد یا بازآبادکاری سے فساد کی روک تھام ممکن ہے؟اس سوال کا جواب ایک حقیقی واقعہ میں پوشیدہ ہے جو حال میں مدھیہ پردیش کے اندر وقوع پذیر ہوا۔

۲۵ ستمبر کو بالاگھاٹ میں آرایس ایس پرچارک یادو نے سوشیل میڈیا میں ایک

اسلام مخالف پیغام لکھا۔ اس کے بعد سنگھیوں کا الزام ہے کہ بیھر پولس تھانے کے تھانیدار ضیاء الحق نے اپنی ٹیم کے ساتھ پر چارک سریش یادو کے دفتر پر ہلہ بول دیا۔ یادو کا الزام ہے کہ اس کو اس قدر زدو کوب کیا گیا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ سوشیل میڈیا میں نہ تو اسلام کی مخالفت کوئی نئی چیز ہے اور نہ انتظامیہ پر زیادتی کا الزام نیا ہے۔ سریش یادو تو خیر زندہ ہے ورنہ پولس والے تو فرضی انکاونٹر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے جس کی سب سے بڑی مثال عشرت جہاں کا معاملہ ہے۔ اس کی فائیل تک غائب کردی گئی اس لئے کہ اس میں بی جے پی صدر امیت شاہ کا نام ہے لیکن بالاگھاٹ میں پولس والوں کے خلاف جو اقدامات کئے گئے ہیں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد ایڈیشنل ایس پی راجیش شرما، تھانیدار ضیاء الحق۔ سب انسپکٹر انل اجمیریہ، نائب سب انسپکٹراور ۳ عدد حوالداروں کے خلاف چار گھنٹوں میں دو عدد ایف آئی آر درج کی گئی جس میں ان پر قتل کی کوشش، ڈکیتی، دنگا فساد، دلآزاری، بدمعاشی بلااجازت کسی کے گھر میں داخل ہونے کے الزامات لگائے گئے۔ حد تو یہ ہے کہ یادو کا موبائیل فون تفتیش کیلئے ضبط کرنے پر چوری کا الزام بھی جڑ دیا گیا۔ اس کے بعد خوف ودہشت کا یہ عالم ہے کہ وہ سارے ملزم پولس اہلکار جن سے عوام تھر تھر کانپتی تھی مفرور ہیں۔آرایس ایس کا غصہ اس پر بھی کم نہ ہوا اس نے ۲۹ ستمبر کو پورے ضلع میں بند کا

اعلان کردیا اوراپنے میمورنڈرم میں یادو کے خلاف شکایت کرنے والوں کو غیر سماجی عناصر قرار دے کر الزام لگایا کہ وہ یادو کی پٹائی میں پولس کے ساتھ شریک تھے اگر ایسا ہوتا شکایت کنندہ نواب خان پولس میں شکایت درج کرانے کے بجائے سنگھی غنڈوں کی طرح خود حساب چکتا کردیتا۔

ان غیر معمولی اقدامات کی کئی وجوہات ہیں اول تو سریش یادو آرایس ایس کا پرچارک ہے اگر وہ اسلام کا مبلغ ہوتا تو اس کا تعلق داعش سے جوڑ کر پولس والوں کو انعام و اکرام سے نوازہ جاتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت مدھیہ پردیش میں بی جے پی کی حکومت ہے۔ اگر کوئی اور پارٹی برسرِ اقتدار ہوتی تو تھوڑا بہت شور شرابہ ضرور ہوتا لیکن پولس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی مجال کوئی نہ کرتا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ اسی دوران بی جے پی کی ریاستی مجلس عاملہ کا اجلاس گوالیار میں منعقد ہورہا تھا اس لئے وزیراعلیٰ کے مخالفین نے اس مسئلہ کے ذریعہ شیوراج سنگھ چوہان کو گھیرنے کی سعی کرڈالی۔ اس کارِ خیر میں بی جے پی کے قومی جنرل سکریٹری کیلاش وجئے ورگیہ پیش پیش تھے۔انھوں نے کہا ہماری اپنی حکومت کے دوران انتظامیہ کسی پرچارک کو آرایس ایس کے دفتر میں کوئی کیسے مار کرسکتا ہے ؟ یعنی اگر ہماری حکومت نہ ہو یا پٹنے والا آریس کا پرچارک نہ ہو تو کوئی مذائقہ نہیں ۔اس مہابھارت میں ایک دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب تینڈوکھیڑا کے بی جے پی رکن اسمبلی سنجے شرما نے الزام

لگایا کہ بالاگھاٹ کے رہنے والے وزیرزراعت گوری شنکر بیسن کو یادو کے گرفتاری کاپہلے سے علم تھااس لئے انہیں استعفیٰدے دینا چاہئے۔ وہ ایک پرچارک کی حفاظت میں ناکام جو رہے ہیں گویا وزراء کی اولین ذمہ داری سنگھ پرچارکوں کا تحفظ ہے۔چوہان نے پلٹ وار کرتے ہوئے شرما کو وجہ بتاو نوٹس دے دیا مگراس کے اگلے دن ایک اور رکن اسمبلی ظالم سنگھ پٹیل نے یہ الزام دوہرادیا اوراسے بھی وجہ بتاو نوٹس تھمادیا گیا۔ اس کے باوجود صوبائی وزیرداخلہ بھوپندر سنگھ نے صفائی پیش کی پولس چونکہ پرچارک کو پہچان نہیں سکی اس لئے ہرعلاقہ کے پرچارکوں کا پولس سے تعارف کروایا جائیگا تاکہبد معاشیوں کو نظر اندازکیا جائے) جب اس بیان پر ہنگامہ ہوا توانہوں نے پینترا) بدلتے ہوئے کہا میری مراد یہ تھی کہ پولس اہلکاروں کو سنگھ کے سماجی کام سے متعارف کیا جائیگا۔

پولیس کے مطابق یادو نے چندروز قبل ہندو دیوتاوں اور ہندومت سے متعلق واٹس ایپ پرایک پیغام بھیجاجس میں گودھرا، میرٹھ اور مظفرنگر کے فسادات کی یاددلائی گئی تھی۔ اس میں اویسی برادران کو دھمکی دی گئی تھی اور سیکولرعناصر کو ہیجڑا کہا گیا تھا۔ یادو کی اس قسم کی حرکت کرتا رہتا تھا لیکن اس کے خلاف مسلمانوں نے اونا یادادری کے گئورکشکوں کی طرح قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا بلکہ پولس تھانے میں جاکر مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے

کا اور نفرت پھیلانے کی شکایت درج کرائی ۔ اس کے بعد پولس محکمہ کیلئے لازم تھا کہ تحقیق کرنے کیلئے سریش یادو سے رابطہ کیا جاتا لیکن جب وہ لوگ یادو کے دفتر میں پہنچے تو بقول پولس یادو نے ان کے ساتھ بد تمیزی کی ۔ انہیں وہاں سے بھگا دیا اور ساتھ آنے سے انکار کردیا۔ ہیڈ کانسٹبل کے مطابق پولس تھانے کے اندر یادو ایک افسر کو لات مار کر بھاگ کھڑا ہوا اور قریب کے اساتی میڈیکل اسٹور میں جا کر چھپ گیا جہاں سے اسے گرفتار کرلیا گیا۔

سیاستدانوں سے ان کی مجبوریاں بہت کچھ کرواتی ہیں لیکن بالاگھاٹ میں موجود دولت کے پجاری صحافیوں کا کردار بھی کم قابلِ مذمت نہیں تھا۔ ایک مقامی اخبار بلٹز ٹوڈے نے شاہ سرخی بنائی مدھیہ پردیش کا ایک پولس افسر پاکستان کا حامی بن گیا اور یہ بے بنیاد افواہ اڑا دی کہ یادو کا واٹس ایپ پیغام پاکستان کے خلاف تھا حالانکہ اس میں پاکستان کا کوئی تذکرہ ہی نہیں تھا اس کے باوجود لکھا گیا پولس افسر نے ثابت کردیا کہ وہ دشمن ملک کا خیر خواہ ہے۔ راج ایکسپریس نامی مقامی اخبار نے انسپکٹر ضیاء الحق کو طالبانی قرار دے کر فوری برخواستگی کا مطالبہ کرڈالا جبکہ ۳۷ سالہ ضیاء الحق نہایت ہونہار اور ایماندار افسر ہے اور تربیت کے دوران شیوراج سنگھ چوہان کے ہاتھوں تمغۂ امتیاز حاصل کرچکا ہے۔ بہترین کارکردگی کے سبب انہیں بہت جلد سب انسپکٹر اور تھانے کا انچارج بنادیا گیا۔

یہ واقعات بتاتے ہیں فسادات کا خاتمہ کیوں نہیں ہوتا؟ اگر فسادیوں کو سرکاری تحفظ حاصل ہوجائے۔ نفرت پھیلانے سے روکنے والوں کے خلاف کارروائی ہونے لگے ۔ شکایت کرنے والوں کو غیر سماجی عناصر قرار دے دیا جائے۔ کارروائی کرنے والے پولس افسران کے خلاف سنگین الزامات عائد کردیئے جائیں ۔ انسپکٹر کے مذہب اور مجرم کی تنظیم کی دشمنی کا سیاسی فائدہ اٹھایا جائے۔ تفتیش کرنے والے افسران کا تبادلہ کرواکے اپنی بہادری کا ڈنکا پیٹا جائے ۔ اپنی ہی جماعت کے وزیراعلیٰ کو معزول کرکے اقتدار پر قبضہ کرنے کی خاطر فرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑکائی جائے تو فسادات رکیں گے یا بڑھیں گے؟ بالا گھاٹ کا پوسٹ مارٹم گواہ ہے کہ جب تک اس فکر و نظر کی بیخ کنی نہیں ہوجاتی اس وقت تک یہ ملک سنگھ مکت یا کانگریس مکت تو ہوسکتا ہے مگر فساد مکت نہیں ہوسکتا ۔ وزیراعظم نے غربت اور بیروزگاری کے خلاف جس جنگ کا اعلان کیا ہے اس کا مقابلہ فرانس سے خریدے جانے والے رفالے جنگی جہازوں سے نہیں بلکہ فرقہ پرستی کے خاتمہ سے کرنا ضروری ہے ۔

بالا گھاٹ کے سرجیکل اسٹرائیک کا پوسٹ مارٹم

بالا گھاٹ کا علاقہ سرحد اُس پار نہیں اِس پار ہے۔ آج کل کوئی تو دور دیس کے حملوں پر سینہ پھلا رہا ہے تو کوئی ثبوت مانگ رہا لیکن اپنے دیس کے اندر جاری جارحیت سے ہر کوئی غافل ہے۔ بالا گھاٹ میں وقوع پذیر ہونے والا واقعہ ایک ایسے رجحان کا غماز ہے جس کے نتیجے میں جنم لینے والی خانہ جنگی کسی بھی روایتی جنگ سے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے اس لئے فرقہ پرستی کا پوسٹ مارٹم ضروری ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کا مربع چار عناصر پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں اولیت فسادی کو حاصل ہے جو اس کی ابتداء کرتا ہے اور انجام تک بھی پہنچاتا ہے ۔ دوسرا نمبر انتظامیہ کا ہے جس کی ذمہ داری فساد روکنا ہے ۔ فساد اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام ہوجاتا ہے یا فسادیوں کا ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔

فساد کا تیسرا جزولاینفک وہ سیاستداں ہے جو کبھی تو فسادزدگان کے آنسو پونچھ کر ان کی ہمدردی بٹورتے ہیں ، کبھی فسادیوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں ، انتظامیہ پر دباو ڈال کر اس کی راہ میں رخنہ کھڑا کرتے ہیں اور بوقتِ ضرورت شروع سے لے کر آخر تک فساد کی سرپرستی اور رہنمائی کرتے ہیں تاکہ عوام کا

جذباتی استحصال کرکے اپنی سیاسی دوکان چمکائی جائے۔اس زنجیر کی آخری کڑی مظلوم و مقہور فسادزدگان تو بیچارے ظلم و جبر کا شکار ہوتے ہیں ۔ سارے لوگوں کی ہمدردی بجا طور پر آخری طبقہ سے ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہئے لیکن کیا اس کی مدد یا بازآبادکاری سے فساد کی روک تھام ممکن ہے؟اس سوال کا جواب ایک حقیقی واقعہ میں پوشیدہ ہے جو حال میں مدھیہ پردیش کے اندر وقوع پذیر ہوا۔

۲۵ ستمبر کو بالاگھاٹ میں آرایس ایس پرچارک یادو نے سوشیل میڈیا میں ایک اسلام مخالف پیغام لکھا۔ اس کے بعد سنگھیوں کا الزام ہے کہ بیھر پولس تھانے کے تھانیدار ضیاء الحق نے اپنی ٹیم کے ساتھ پرچارک سریش یادو کے دفتر پر ہلہ بول دیا ۔ یادو کا الزام ہے کہ اس کو اس قدر زدوکوب کیا گیا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ سوشیل میڈیا میں نہ تو اسلام کی مخالفت کوئی نئی چیز ہے اور نہ انتظامیہ پر زیادتی کاالزام نیا ہے۔ سریش یادو تو خیر زندہ ہے ورنہ پولس والے تو فرضی انکاونٹر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے جس کی سب سے بڑی مثال عشرت جہاں کا معاملہ ہے۔ اس کی فائیل تک غائب کردی گئی اس لئے کہ اس میں بی جے پی صدر امیت شاہ کا نام ہے لیکن بالاگھاٹ میں پولس والوں کے خلاف جو اقدامات کئے گئے ہیں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد ایڈیشنل ایس پی راجیش شرما، تھانیدار ضیاء الحق ۔ سب

انسپکٹر انل اجمیریہ، نائب سب انسپکٹر اور ۳ عدد حوالداروں کے خلاف چار گھنٹوں میں دو عدد ایف آئی آر درج کی گئی جس میں ان پر قتل کی کوشش، ڈکیتی، دنگا فساد، دلآزاری، بدمعاشی بلااجازت کسی کے گھر میں داخل ہونے کے الزامات لگائے گئے۔ حد تو یہ ہے کہ یادو کا موبائیل فون تفتیش کیلئے ضبط کرنے پر چوری کا الزام بھی جڑ دیا گیا ۔اس کے بعد خوف ودہشت کا یہ عالم ہے کہ وہ سارے ملزم پولس اہلکار جن سے عوام تھر تھر کانپتی تھی مفرور ہیں ۔آرایس ایس کا غصہ اس پر بھی کم نہ ہوااس نے ۲۹ ستمبر کو پورے ضلع میں بند کا اعلان کردیا اوراپنے میمورنڈرم میں یادو کے خلاف شکایت کرنے والوں کو غیر سماجی عناصر قرار دے کر الزام لگایا کہ وہ یادو کی پٹائی میں پولس کے ساتھ شریک تھے اگر ایسا ہوتا شکایت کنندہ نواب خان پولس میں شکایت درج کرانے کے بجائے سنگھی غنڈوں کی طرح خود حساب چکتا کردیتا۔

ان غیر معمولی اقدامات کی کئی وجوہات ہیں اول تو سریش یادو آرایس ایس کا پرچارک ہے اگر وہ اسلام کا مبلغ ہوتا تو اس کا تعلق داعش سے جوڑ کر پولس والوں کو انعام و اکرام سے نوازہ جاتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت مدھیہ پردیش میں بی جے پی کی حکومت ہے۔ اگر کوئی اور پارٹی برسرِ اقتدار ہوتی تو تھوڑا بہت شور شرابہ ضرور ہوتا لیکن پولس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی مجال کوئی نہ کرتا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ اسی دوران بی جے پی کی ریاستی مجلس

عاملہ کا اجلاس گوالیار میں منعقد ہو رہا تھا اس لئے وزیراعلیٰ کے مخالفین نے اس مسئلہ کے ذریعہ شیوراج سنگھ چوہان کو گھیرنے کی سعی کرڈالی۔ اس کارِ خیر میں بی جے پی کے قومی جنرل سکریٹری کیلاش وجئے ورگیہ پیش پیش تھے۔انھوں نے کہا ہماری اپنی حکومت کے دوران انتظامیہ کسی پرچارک کو آرایس ایس کے دفتر میں کوئی کیسے مار کرسکتا ہے ؟ یعنی اگر ہماری حکومت نہ ہو یا پٹنے والا آرایس کا پرچارک نہ ہو تو کوئی مذائقہ نہیں ۔

شیوراج سنگھ چوہان عرصہ ٔدراز سے مودی اور شاہ کی آنکھوں کا کانٹا بنے ہوئے ہیں اور وجئے ورگیا کی مدد سے ان کے شکار کی کوشش کی جارہی ہے لیکن چوہان ہر بار مچھلی کی مانند پھسل کر نکل جاتے ہیں ۔ اسی سیاسی دباو نے چوہان کو پولس کے خلاف یہ ایسا کڑا قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔

اس مہابھارت میں ایک دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب تینڈو لکھیڑا کے بی جے پی رکن اسمبلی سنجے شرما نے الزام لگایا کہ بالاگھاٹ کے رہنے والے وزیرزراعت گوری شنکر بیسن کو یادو کے گرفتاری کا پہلے سے علم تھا اس لئے انہیں استعفیدے دینا چاہئے۔ وہ ایک پرچارک کی حفاظت میں ناکام جو رہے ہیں گویا وزراء کی اولین ذمہ داری سنگھ پرچارکوں کا تحفظ ہے۔چوہان نے پلٹ وار کرتے ہوئے شرما کو وجہ بتاو نوٹس دے دیا مگراس کے اگلے دن ایک اور رکن اسمبلی ظالم سنگھ پٹیل نے یہ الزام دوہرا دیا اوراسے بھی وجہ بتاو نوٹس تھما دیا گیا۔ اس کے باوجود

صوبائی وزیر داخلہ بھوپندر سنگھ نے صفائی پیش کی پولس چونکہ پرچارک کو پہچان نہیں سکی اس لئے ہر علاقہ کے پرچارکوں کا پولس سے تعارف کروایا جائیگا (تاکہ بد معاشیوں کو نظر انداز کیا جائے) جب اس بیان پر ہنگامہ ہوا تو انہوں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا میری مراد یہ تھی کہ پولس اہلکاروں کو سنگھ کے سماجی کام سے متعارف کیا جائیگا۔

اس معاملے میں،اگر سریش بے قصور ہوتا اور اس پر زیادتی ہوئی ہوتی تو پولس کے خلاف اقدامات درست ٹھہرتے۔اس طرح کی ٹھوس کارروائی کے ذریعہ پولس کو ظلم وجبر سے روکنا ضروری ہے لیکن اس کا اطلاق صرف سنگھیوں تک محدود کیوں ہو؟ انتظامیہ اگر دلت ،آدیباسی یا مسلمان کے ساتھ بھی یہ کرے تو اس کو سزا ملنی چاہئے ورنہ تفریق وامتیاز برتنے سے ظلم وانصافی خاتمہ کے بجائے اضافہ ہوگا۔ لیکن تمام شواہد چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ سریش یادو مفسد ہے اس لئے اسے بچانے کی خاطر پولس اہلکاروں کی حوصلہ شکنی انہیں اپنے فرض منصبی کی ادائیگی سے روک دے گی ۔

انسپکٹر جنرل ساگر یہ کہہ چکے تھے کہ معاملہ کی تفتیش کیلئے ایک خصوصی دستہ تشکیل دیا گیا ہے لیکن افسوس کہ تفتیش کی ابتداء سے قبل آئی جی کا تبادلہ ہوگیا۔

پولیس کے مطابق یادو نے چندروز قبل ہندو دیوتاوں اور ہندومت سے متعلق واٹس

ایپ پر ایک پیغام بھیجا جس میں گودھرا، میرٹھ اور مظفر نگر کے فسادات کی یاد دلائی گئی تھی۔ اس میں اویسی برادران کو دھمکی دی گئی تھی اور سیکولر عناصر کو ہیجڑا کہا گیا تھا۔ یادو کی اس قسم کی حرکت کرتا رہتا تھا لیکن اس کے خلاف مسلمانوں نے اونا یا دادری کے گئو رکشکوں کی طرح قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا بلکہ پولس تھانے میں جاکر مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا اور نفرت پھیلانے کی شکایت درج کرائی۔ اس کے بعد پولس محکمہ کیلئے لازم تھا کہ تحقیق کرنے کیلئے سریش یادو سے رابطہ کیا جاتا لیکن جب وہ لوگ یادو کے دفتر میں پہنچے تو بقول پولس یادو نے ان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ انہیں وہاں سے بھگا دیا اور ساتھ آنے سے انکار کردیا۔ ہیڈ کانسٹبل کے مطابق پولس تھانے کے اندر یادو ایک افسر کو لات مار کر بھاگ کھڑا ہوا اور قریب کے اساتی میڈیکل اسٹور میں جاکر چھپ گیا جہاں سے اسے گرفتار کرلیا گیا۔

پولس کا کہنا ہے کہ اگر کوئی ملزم تعاون کے بجائے رعونت دکھائے تو وہ کیا کرسکتی ہے؟ یادو کی گرفتاری کے چند گھنٹوں میں اس کی ضمانت ہوگئی مگر اس نے اپنے ہمنواوں کو پولس تھانے میں بلا ہنگامہ کھڑا کردیا۔ اس وقت کی ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق یادو کو کچھ خراشیں آئی تھیں مگر اس کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی یہ اور بات ہے کہ اب وہ پلاسٹر لگا کر گھومتا ہے۔ اپنی روپوشی سے قبل تھانیدار ضیاء الحق نے اخبار نویسوں کو بتایا تھا کہ اس نے اپنے سینئرس کو اعتماد میں لینے کے بعد ہی گنیش چتور تھی اور نوراتری کے تہواروں میں حالات

کو قابو میں رکھنے کی خاطر یہ گرفتاری کی تھی۔ اضافی ایس پی کارروائی کے دوران اس کے ساتھ تھے۔ ان حقائق کے منظر عام پر آنے کے بعد سنگھ کو چاہئے تھا کہ وہ اپنے پرچارک کو نظم و ضبط کی تلقین کرتا اور قانون کی پاسداری کا درس دیتا لیکن وہ الٹا چور کوتوال کی مصداق انتظامیہ پر چڑھ دوڑا۔

سیاستدانوں سے ان کی مجبوریاں بہت کچھ کرواتی ہیں لیکن بالا گھاٹ میں موجود دولت کے پجاری صحافیوں کا کردار بھی کم قابلِ مذمت نہیں تھا۔ ایک مقامی اخبار بلٹز ٹوڈے نے شاہ سرخی بنائی مدھیہ پردیش کا ایک پولس افسر پاکستان کا حامی بن گیا اور یہ بے بنیاد افواہ اڑا دی کہ یادو کا واٹس ایپ پیغام پاکستان کے خلاف تھا حالانکہ اس میں پاکستان کا کوئی تذکرہ ہی نہیں تھا اس کے باوجود لکھا گیا پولس افسر نے ثابت کردیا کہ وہ دشمن ملک کا خیر خواہ ہے۔ راج ایکسپریس نامی مقامی اخبار نے انسپکٹر ضیاء الحق کو طالبانی قرار دے کر فوری برخواستگی کا مطالبہ کرڈالا جبکہ ۳۷ سالہ ضیاء الحق نہایت ہونہار اور ایماندار افسر ہے اور تربیت کے دوران شیوراج سنگھ چوہان کے ہاتھوں تمغۂ امتیاز حاصل کرچکا ہے۔ بہترین کارکردگی کے سبب انہیں بہت جلد سب انسپکٹر اور تھانے کا انچارج بنادیا گیا۔

اس واقعات کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے اس ملک سے فسادات کا خاتمہ کیوں نہیں

ہوتا؟ اگر کسی معاشرے میں فسادیوں کو سرکاری تحفظ حاصل ہوجائے۔ ان کو نفرت پھیلانے سے روکنے والوں کے خلاف کارروائی ہونے لگے ۔ قانونی طور شکایت کرنے والوں کو غیر سماجی عناصر قرار دے دیا جائے۔ کارروائی کرنے والے پولس افسران کی حوصلہ شکنی کیلئے ان کے خلاف سنگین الزامات عائد کرکے انہیں روپوش ہونے پر مجبور کردیا جائے۔ قانون اور ضابطہ کے سیدھے سادے معاملہ کو انسپکٹر کے مذہب اور مجرم کی تنظیم کی دشمنی کا رنگ دے دیا جائے۔ تفتیش کرنے والے افسران کا تبادلہ کرواکے اپنی بہادری کا ڈنکا پیٹا جائے اور اس ہنگامہ آرائی کی آنچ پر اپنی سیاسی روٹیاں سینکی جائیں ۔ اپنی ہی جماعت کے وزیر اعلیٰ کو معزول کرکے اقتدار پر قبضہ کرنے کی خاطر فرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑکائی جائے تو فسادات رکیں گے یا بڑھیں گے ؟

ایک طرف تو سنگھ کے پرچارک سوشیل میڈیا کی مدد سے نفرت پھیلانے کے سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور دوسری طرف مدھیہ پردیش کے اندر سپریم کورٹ کی جانب سے ایک منسوخ شدہ قانون (۶۶ الف) کی بنیاد پر موہن بھاگوت کی تصویر شائع کرنے والے محمد دانش کو کوٹہ سے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ اس سے قبل دو نوجوانوں کو گرفتار کرکے کھرگون کی عدالت میں پیش کیا جاچکا تھا جو ضمانت پر رہا ہوگئے۔ دستور کی دفع ۶۶ کے اندر ۲۰۰۸ میں ترمیم کرکے سوشیل میڈیا میں اہانت آمیز تبصرے پر ملزم کو ۳ سال تک کی سزا تجویز کی گئی تھی لیکن اس

ترمیم کو سپریم کورٹ نے حقوق انسانی کی خلاف ورزی قرار دے کر کالعدم کر دیا۔ اس طرح گویا ایک منسوخ شدہ قانون کی مدد بے قصور لوگوں کو سزا دلوانے والے اپنے قصوروار لوگوں کو نہ صرف چھڑانے کے درپہ ہیں بلکہ انہیں پابہ زنجیر کرنے والے افسران کی جان کے دشمن بن گئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں پتھروں کو باندھ کر کتوں کو آزاد چھوڑ دینے والی منووادی حکمتِ عملی کا کمال۔

مدھیہ پردیش کے اندر ایک پرچارک کی پٹائی پر بی جے پی کی ریاستی حکومت نے بونڈر کھڑا کر دیا لیکن ہریانہ میں اسی پارٹی کے وزیراعلیٰ سے جب میوات کے اندر دو بہنوں کی عصمت دری یا ہریانی کی غیر قانونی تفتیش کے متعلق سوال کیا گیا تو ان کا جواب تھا یہ معمولی مسائل ہیں اور ایسا ملک کے کسی بھی حصے میں ہو سکتا ہے۔ کیا سب کا ساتھ اور سب کا وکاس کی یہی عملی تعبیر ہے ؟ صحافیوں کے اصرار پر موہن لال کھٹر نے بانگِ دہل کہا کہ اان معمولی مسائل پر میں توجہ نہیں دیتا آج ہمیں صوبے کے طلائی جشن پر گفتگو کرنی چاہئے۔ اقلیتوں کے معاملے میں ایسی بے حسی اور درندگی اور ایک نام نہاد پرچارکوں سے حد درجہ ہمدردی ہی دراصل ملک میں فسادات کی بنیادی وجہ ہے۔

بالاگھاٹ کا پوسٹ مارٹم گواہ ہے کہ جب تک اس فکر و نظر کی بیخ کنی نہیں ہو جاتی اس وقت تک یہ ملک سنگھ مکت یا کانگریس مکت تو ہو سکتا ہے مگر فساد مکت نہیں ہو سکتا نیز اندرونِ ملک امن و امان کا قیام سرحدی امن و سلامتی

سے کم اہم نہیں ہے۔ وزیراعظم نے غربت اور بیروزگاری کے خلاف جس جنگ کا اعلان کیرالا میں کیا ہے اس کا مقابلہ فرانس سے خریدے جانے والے رفالے جنگی جہازوں سے نہیں بلکہ فرقہ پرستی کے خاتمہ سے کرنا ضروری ہے۔

عروس البلاد ممبئی سے صدائے اتحاد

ملت اسلامیہ ہند کو اتحاد کی جیسی ضرورت آج ہے شاید پہلے کبھی نہیں تھی ۔ ایسے میں عروس البلاد ممبئی کے آل انڈیا مسلم مجلس کی قومی مجلس عاملہ کا اجلاس اور اس کے اندر صدائے اتحاد" کے عنوان کے تحت خطاب عام کا اہتمام ملت کے دل کی آواز ہے۔"

اتحاد امت کی ضرورت واہمیت سے ہر کوئی واقف ہے اب وقت آگیا ہے کہ اس کی عملی تدابیر پر غور کیا جائے اور اس راہ کے روڑے ہٹائے جائیں تاکہ پائیدار اتحاد قائم ہوسکے ۔اتحادکے قیام کی خاطر دنیا دار لوگ بیرونی خطرات کو بنیاد بناتے ہیں ۔ اسلام دشمن طاقتوں کا خوف دلا کر اتحاد قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ نسخہ اس وقت تک توکارگر ثابت ہوتا ہے جبتک کہ خطرہ شدید ہو مثلاً کسی جنگ یا فسادکے دوران یا اس کے فوراً بعد لیکن جیسے ہی حالات معمول پر آنے لگتے ہیں یہ بنیاد کمزور پڑنے لگتی ہے اور جب خوف وہراس کا ماحول ختم ہوجاتا ہےتو اتحاد اتفاق کی ضرورت واہمیت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دیندار حضرات قرآن مجید کی ایک آیات بلکہ آیت کے ایک ٹکڑے کو سیاق و سباق سے الگ کرکے اس کے سہارے اتحاد قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو نامکمل ہوتی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتحاد بین المسلمین کی خاطر صرف ایک آیت

نہیں بلکہ پورا رکوع نازل فرمایا ہے جس کے قلب میں واعتصمو بحبل اللہ والی آیت ہے۔ انسان جس طرح دل کی دھڑکن کے بند ہو جانے پر زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح اگر دل کو باقی جسم سے الگ کر دیا جائے تب بھی وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ مذکورہ آیت سے قبل ارشاد ربانی ہے ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہا سکا حق ہے تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔ اس آیت میں خطاب اہل ایمان سے ہے اور اتحاد بین المسلمین کی تلقین سے پہلے اس کا سیاق غماز ہے کہ تقویٰ کی حیثیت اتحاد کے ناگزیر (pre requisite) جیسی ہے۔

تقویٰ ایک انفرادی صفت ہے۔ جو لوگ اتحاد کے خواہش مند ہیں ان کے لئے اپنے آپ کو اس سے متصف نہ کرنا لازمی ہے ورنہ لاکھ خواہش یا کوشش کے باوجود وہ متحد نہیں ہو سکتے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''مومن (دوسرے) مومن کے لیے دیوار کے مثل ہے جس کی ایک اینٹ سے دوسرے اینٹ کو مضبوط بناتی ہے۔'' اللہ کی محبت اور اللہ کا ڈر ہی ان اینٹوں کو خوشنما اور مضبوط بناتا ہے۔ اگر اینٹیں کمزور اور بدنما ہوں تو ان کی مدد سے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی تعمیر غیر ممکن ہے؟ اس آیت مبارکہ میں موت تک تقویٰ مستقل مزاجی کی علامت ہے اور یہی استقلال دیوار کو پائیداری بخشتا ہے اور اس کی عدم موجودگی اتحاد کو عارضی اور ناپائیدار بنا دیتی ہے۔

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد متقیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سب اللہ کی رسی یعنی کو مل کر تھام لیں۔ ان سب کا ایک کتاب سے وابستہ ہو جانا از خود باہم منسلک کر دیتا ہے۔ اتحاد کی بنیاد یہی اعتصام باللہ ہے۔ اگر کسی دیوار کی بنیاد ناہموار ہو تو اس میں لگنے والی اینٹوں کا معیار جو بھی ہو۔ اس کا نقشہ چاہے جتنا اعلیٰ درجہ کا ہو۔ اس کو تعمیر کرنے والوں کی مہارت جیسی بھی ہو۔ اس سے قطع نظر دیوار جیسے جیسے بلند ہوگی اس کا ٹیڑھا پن واضح تر ہوتا چلا جائیگا اور دشمن کی زحمت کے بغیر وہ اپنے ہی بوجھ سے ڈھے جائیگی۔ کتاب اللہ ہی اہل ایمان کے درمیان قدر مشترک ہے اور اسی کے توسط سے باہمی اختلافات کو بخیر و خوبی نمٹایا جاسکتا ہے۔ اگر اس کتاب کے بجائے طاقت و قوت یا سازش وفریب کے مدد سے تفرقہ تو پھیلایا جاسکتا ہے مگر اتحاد قائم نہیں ہو سکتا اس لئے درمیان میں تفرقہ سے اجتناب کی تاکید آجاتی ہے۔

آگے چل کر اس آیت کریمہ میں اتحاد کو اللہ کا احسان قرار دیا گیا گویا اتحاد قائم کرنے والوں کا رجوع اللہ سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف اپنی ذہانت وذکاوت پر انحصار کرلینا امت کو خلفشار کی آگ سے نہیں بچا سکتا۔ انتشار کے سبب نہ صرف یہ دنیا جہنم زار بن جاتی ہے بلکہ دوزخ کی آگ کا ایندھن بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ اللہ کا فضل و کرم مومنین کے دلوں کو جوڑ کر انہیں بھائی

بھائی بنا سکتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ یہ نشانیاں ہمارے سامنے اس لئے بیان فرماتا ہے کہ ہم ان کی مدد سے سیدھے راستے کی معرفت حاصل کریں فرمایا ''اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے''۔ یہاں پر سیدھے راستے پر پیش قدمی کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ کام عملاً کیسے ہو تو فرمایا'' اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو''۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنی پسند دوسروں پر تھوپو بلکہ جس طرح کوئی نہیں چاہتا کہ اس پر زور زبردستی کی جائے اسی طرح کوئی دوسروں پر جبر نہ کرے۔ جیسے ہر شخص اپنی عزت نفس کا خیال کرتا ہے اسی طرح وہ دوسروں کا بھی احترام کرے بلکہ فرمایا '' اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دو''۔ صحابہ کی مانند '' کفار پر سخت اور آپس میں رحم و کرم کا پیکر بن جاو۔'' بقول اقبال

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ان تقاضوں کو پورا کرنا خاصہ مشکل ہے۔ دیوار اور اینٹوں کی مثال کو یاد کیجئے۔ دیوار میں اینٹوں کے درمیان اگر سیمنٹ موجود نہ ہو تو ہوا کا ایک معمولی سا جھونکا اسے زمین بوس کرنے کیلئے کافی ہے۔ امت کی بنیان المرصوص کے سیمنٹ کا بیان حدیثِ رسولؐ میں دیکھیں ''مومنوں کی مثال آپس میں ایک

دوسرے سے محبت کرنے، ایک دوسرے پر رحم کھانے اور شفقت کرنے میں ایک جسم کے مانند ہے کہ جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" اس نسخۂ کیمیا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ باہم محبت، شفقت، ہمدردی و غم گساری کے بغیر اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اتحاد بجائے خود بھی مقصود ہے نیز ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ بھی ہے اسی لئے اس کے بعد والی آیت میں فرمایا "تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔" اس آیت کا اتحاد امت سے گہرہ تعلق ہے۔ اگر اتحاد میں شامل تمام گروہ اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں منہمک ہوں تو ان کے درمیان تعاون واشتراک کے مواقع پیدا ہوتے رہیں گے اور اتحاد و اتفاق کی فضا عمل کی دنیا میں چلتی پھرتی نظر آئیگی۔ ایسے میں قرآن کے حکم "نیکی اور خدا ترسی کے کام میں تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں میں تعاون کرنے سے اجتناب کرو۔" پر عملدرآمد کے مواقع ہاتھ آتے رہیں گے۔

ممبئی کے کرلا علاقہ میں جماعت اسلامی نے گزشتہ دنوں منشیات کی روک تھام کیلئے مختلف مکاتب فکر کی جماعتوں کے تعاون سے ایک مہم چلائی۔ اپنے

اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ایک معاشرتی برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی جد و جہد میں امت نے اتحاد کا عملی مظاہرہ کیا۔ اس مہم کے دوران امت کی مختلف تنظیموں سے تعارف کے مواقع پیدا ہوئے، فاصلوں میں کمی آئی ۔ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا اور باہمی اعتماد بحال ہوا۔ اس طرح کے عملی اقدامات ہی آگے چل کر اتحاد کی راہ استوار کرتے ہیں۔

رکوع کا اختتام پر اللہ تعالیٰ نے انتشار کے عبرتناک انجام سے خبردار کیا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے ''کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر فرقہ بندی کا شکار ہو کر اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اُس روز سخت سزا پائیں گے۔'' اللہ تعالیٰ کی سخت سزا کا خوف ہی انسان کو انتشار و خلفشار پھیلانے سے روک سکتا ہے۔

امت کے اندر اتحاد و اتفاق کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کیا (میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتلادوں جس کا مقام روزہ، صدقہ اور نماز سے بڑھا ہوا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ضرور بتایئے ۔آپ نے فرمایا کہ وہ چیز آپس کی لڑائی میں صلح کرانا ہے اور باہمی تعلقات کی خرابی نیکیوں کو مٹانے والی ہے۔'' اخلاص نیت اور حکمت و دانائی کے ساتھ اگر باہمی صلح صفائی کا کام ہوتا رہے تو انتشار کی خرابی اپنے آپ مٹ جائیگی اور ملت اسلامیہ امت واحدہ بن جائیگی ۔ اہلیان ممبئی کو یقین ہے کہ آل انڈیا مسلم مجلس کا حالیہ اجلاس اتحاد بین المسلمین کے قیام میں ایک سنگ

میل ثابت ہوگا۔

امریکی جمہوری تماشہ : منظر پس منظر

حکیم الامت علامہ اقبال نے بادشاہی کی جلالی صفتاور جمہوریت کی تماشہ گری کا ذکر فرما کر دونوں کا فرق واضح کردیا۔اس کے بعد ان کے درمیان قدر مشترک دین بیزاری کے سبب جنم لینے والی چنگیزی کی جانب بھی اشارہ فرمادیا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اقبال کے بعد کسی سنجیدہ شاعرنے الیکشن کے موضوع کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھابلکہ اس پر ہزل گو شعراء نے طبع آزمائی کی اور مذاق اڑا کر اپنے لئے داد و تحسین و سامعین کیلئے تفریح طبع کا سامان کیا۔ انتخاب کے ساتھ یہ معاملہ ہندو پاک تک مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت امریکہ کی انتخابی مہم کا جائزہ بھی اسی حقیقت کا عکاس ہے۔ ہیلری کلنٹن اور ڈونالڈ ٹرمپ سے قبل نائب صدارت کی انتخابی دوڑ میں شامل امیدواروں نے ڈونالڈ ٹرمپ کو 'بیوقوف اور خبطی' جبکہ ہلری کلنٹن کو 'کمزور اور لاچار' کے خطابات سے نوازا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ کلنٹن لاچار ہیں اور نہ ٹرمپ بیوقوف بلکہ وہ دونوں مل کر امریکہ کی لاچار عوام کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ ٹیلیویژن کے سامنے بیٹھے مباحثہ دیکھنے والے رائے دہندگان کی حالت پر یہ شعر صادق آتا ہے

الیکشن کے ٹی وی پہ بحث و مباحث\
تماشائے جوروستم دیکھتے ہیں

تماشے کی قدو قامت کا اندازہ تماشہ گر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ دنیا کی عظیم ترین جمہوریت کے تماشے کا عظیم تر ہونا فطری ہے اس لئے اس کے مباحثوں کو دنیا بھر کے ۱۰ کروڑ ناظرین ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ امریکہ میں الیکشن کا ہفتہ یا مہینہ نہیں بلکہ سال ہوتا ہے اور یہ سال ہر چار سال بعد وارد ہوجاتا ہے۔امیدواروں کی نامزدگی کے مقابلے سے چڑھنے والا یہ میعادی بخار نئے سربراہ کی حلف برداری تک باقی رہتا ہے۔ اس تماشے کا اختتامی اور فیصلہ کن مرحلہ چار عدد مباحثے ہیں جن میں صدارت و نائب کے امیدوار اپنی توجہات ان رائے دہندگان کی جانب مرکوز کرتے ہیں جو کسی جماعت سے وابستہ نہیں ہیں تاکہ ان کو ہمنوا بنا کر اقتدار کی کاغذی ناو میں سوار ہو سکیں جس کی کم از کم مدت عمل چار سال اور زیادہ سے زیادہ عمر دراز آٹھ سال ہے۔

امریکہ میں فی الحال اسی کھیل کا ڈنکا بج رہا ہے دو مباحثے ہو چکے ہیں اور دو باقی ہیں ۔ یعنی دو آرزوئیں پوری ہوچکی ہیں اور دو کا انتظار ہے ۔ سیماب اکبرآبادی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ بہادر شاہ ظفر کی آپ بیتی کے طور پر مشہور یہ شعر امریکہ کی انتخابی مہم پر اس طرح منطبق ہوجائیگا۔ ۱۹۶۰ سے ٹیلی وژن پر مباحثوں کی ابتداء ہوئی۔ امریکی تاریخ کے پہلے صدارتی مباحثے میں ری پبلیکن پارٹی کے نائب صدر رچرڈ نکسن اور میسا چوسٹس سے ڈیموکریٹک

پارٹی کے سینیٹر جان کینیڈی نے حصہ لیا تھا۔ اس پہلے موقع پر نوجوان کینیڈی نے قوم کو آگاہ کیا تھا کہ وہ صدر آئزن ہاور کے بعد ملک میں کیا تبدیلیاں لا سکتے ہیں ؟ انتخابی مہم کے دوران چوٹ لگ جانے کے باعثان کے مدمقابل نکسن بیمار اور کمزور نظر آئے۔ کینیڈی کی کارگردگی نے ٹیلی وژن ناظرین کو متاثر کیا اس طرح امریکی انتخابی مہم میں ٹی وی ٹیلی وژن ایک اہم عنصر کے طور پر داخل ہوگیا۔

رچرڈ نکسن کے خیال تھا کہ ۱۹۶۰ کے اندر کینیڈی کے ہاتھوں ان کی شکست میں صدارتی مباحثوں کا ہاتھ تھا اس لئے وہ ٹیلی وژن سے گریز کرتے تھے اور اس کے بعد ۱۶ سالوں تک منعقد ہونے والے چار انتخابات میں ٹیلی وژن مباحثوں کا اہتمام نہیں ہوا۔ ۱۹۸۷ میں کمشنا آن پریڈینشل ڈیبٹس کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد انتخابی مہم کے دوران صدراتی مباحثے کو یقینی بنانا تھا۔ ۱۹۸۸ کے بعد سے ہر الیکشن کے موقع پر یہ کمیشنمباحثوں کا انتظام وانصرام کرتا ہے۔ ان مباحثوں سے امیدواروں کی حاضر جوابی اور طرز فکر کے علاوہ امریکی جمہوریت کا انحطاط بھی ناظرین کے سامنے آجاتا ہے۔ اس امریکی انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار ایک خاتون امیدوار میدان میں ہے۔ امریکہ میں خواتین کے حقوق کی بابت مرعوب حضرات کو ٹھہر کر سوچنا چاہئے کہ امریکی جمہوریت نے ابھی تک خواتین پر اعتماد کیوں نہیں کیا؟ مختلف ممالک کو اس معاملے میں

امریکہ پر فوقیت حاصل ہے یہ حقیقت ہے کہ دیگر ممالک میں سابق حکمراں کی بیوی یا بیٹی کو یہ شرف حاصل ہوا ہے لیکن ہیلری بھی تو سابق صدر بل کلنٹن کی زوجہ ہیں۔ ہیلری کا مقابلہ اس بار ایک بڑے سرمایہ دار سے ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس بار خواتین کی ساتھ بدسلوکی اور معاشی بدعنوانی سب سے بڑا انتخابی مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔

دوسرے مباحثہ سے دو دن قبل اچانک ڈونالڈ ٹرمپ کی ایک ۱۱ سال پرانی آڈیو ٹیپ منظر عام پر آ گئی جس میں ان کو خواتین کے خلاف نازیبا کلمات کہتے ہوئے سنایا گیا۔ موقر امریکی اخبار "دی واشنگٹن پوسٹ" نے جو ویڈیو جاری کی اس میں ڈونالڈ "ایکسس ہالی ووڈ" پروگرام کے میزبان بلی بش سے کہتا ہے "میں حسن کی جانب خود بخود کھنچتا چلا جاتا ہوں میں بوس و کنار کرنے لگتا ہوں۔ یہ مقناطیس کی طرح ہے۔" وہ اس پر بس نہیں کرتا بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ "اور اگر آپ سٹار ہوں تو وہ آپ کو یہ (سب) کرنے دیتی ہیں، آپ کچھ بھی کچھ کر سکتے ہیں"۔اس ویڈیو میں ڈونالڈ ٹرمپ کو ایک شادی شدہ خاتون کے ساتھ مدست درازی، بوس و کنار، چھونے اور پکڑنے کے بارے میں ڈینگیں مارتے ہوئے سنا جا سکتا ہے۔ ٹرمپ یہ بھی کہتا ہے کہ "میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ شادی شدہ تھی اور میں نے اس پر کافی زور آزمائی کی۔"ٹرمپ نے اس بابت یہ صفائی پیش کی کہ یہ معاملہ ۲۰۰۵ کا ہے، اور یہ

بند کمرے کی گپ شپ تھی، جس پر وہ فخر نہیں کر سکتا۔ ''میں اس پر شرمندہ ہوں اور جو کچھ کہا گیا اُس سے نفرت کرتا ہوں''۔ٹرمپ نے الزام لگایا کہ اس ریکارڈنگ کی تشہیر کے صدارتی انتخاب سے توجہ ہٹانے کیلئے کی گئی ہے۔

ٹرمپ پر مقابلۂ حسن کے دوران جب خواتین برہنہ یا نیم برہنہ حالت میں لباس تبدیل کررہی تھیں وہاں جاپہنچنے کے شواہد بھی سامنے آئے ہیں۔ اپنے بچاو کی خاطر ٹرمپ نے اپنے حریف ڈیموکریٹک امیدوار ہلرتی کلنٹن کے شوہر سابق صدر بل کلنٹن پر ہلہ بول دیا اور کہا کہ بل کلنٹن نے گولف کورس پر اس سے کہیں زیادہ خراب گفتگو کی تھی اور خواتین کے ساتھ اس سے "بدتر افعال" کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ڈونالڈ نے اپنے ذریعہ کسی بھی خاتون سے جسمانی زیادتی کی تردید کی اور بِل کلنٹن پر وائٹ ہاؤس کے اندر خواتین کے ساتھ زیادتی کا الزام لگایا۔ ٹرمپ کے مطابق ہلری نے مظلوم عورتوں کو ڈرایا، دھمکایا، (ان پر) حملہ کیا اور انہیں شرمندگی سے دوچار کیا۔ ویسے ڈونالڈ کی تیسری اہلیہ میلانیا نے بھی ہیلری کی مانند اپنے خاوند کی طرف سے ووٹرس کو معذرت کو قبول کرنے کی گذارش کی اور بولیں "ویڈیو کے الفاظ کو نا قابل قبول اور نازیبا ہیں مگر یہ اس شخص کی عکاسی نہیں کرتی ہے جس کو میں جانتی ہوں۔ وہ ایک راہنما کا حوصلہ اور شعور رکھتے ہیں۔" اس طرح گویا امریکہ کے ترقی یافتہ معاشرے میں بھی دونوں بیویوں نے اپنے شوہروں کی پردہ پوشی کرکے ثابت کردیا کہ مشرق ہو یا

مغرب ناری دھرم یکساں ہے۔

دوسرے مباحثے سے قبل پیش بندی کے طور پر ٹرمپ نے ان چار خواتین کے ساتھ پریس کانفرنس کرکے فیس بک پر براہِ راست نشر کی جنھوں نے کلنٹن خاندان پر دست درازی کا الزام لگایا تھا۔ ان میں سے تین نے بل کلنٹن پر یہ الزام لگایا کہ سابق صدر نے انھیں جنسی طور پر ہراساں کیا اور ایک چوتھی خاتون وہ ہیں جن کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے والے شخص کا ہلرای کلنٹن نے دفاع کیا تھا۔ ویسے ہیلری نے ٹرمپ اور میلانیا کے معذرت نامہ کو قبول نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ ''ٹرمپ نے اقلیتوں، مسلمانوں اور جنگی قیدیوں کا بھی مذاق اڑایا ہے''۔ اپنے دعویٰ کی تصدیق میں ہیلری نے ملکۂ حسن آلیسیا ماچالو کو پیش کیا جن کا تھوڑا وزن بڑھ جانے پر ٹرمپنے انھیں 'مسیگی'

کہہکر پکارا تھا۔ آلیسیا ماچالو نے کے مطابق ٹرمپنے انکے لاطینینژاد ہونے کیوجہسے انھیں مسہاؤسکیپنگ' بھیکہا تھا۔ ہیلری کا الزام ہے کہ یہ شخص عورتوں کو سور، گنوار اور کتا' کہتا رہا ہے۔

خواتین کی بے حرمتی کے علاوہ دوسرا بڑا تنازع معاشی بدعنوانی کا ہے۔ اس کو ایک جملے میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ٹرمپ نے اپنے ٹیکس گوشواروں کے بارے میں کہا کہ جس دن ہلری اپنی تیس ہزار سے زیادہ ای میلز سامنے لائیں گی وہ اپنا گوشوارے ظاہر کردیں گے۔ ڈونلڈٹرمپنے ۱۹۹۵ کے ٹیکس ریٹرن ۹۰ کروڑ ڈالر کا خسارہ دکھایا تھا اس سے ٹرمپ کو ممکنہ طور پر اگلے ۱۸ سال تک قانونی

طور پر ٹیکس ادا نہ کرنے کی چھوٹ مل گئی۔ اس طرح گویا اس سرمایہ دار نے پچھلے کئی سالوں میں کروڑوں کمائے مگر ٹیکس کی ادائیگی سے بچ نکلا اور اب یہ کہتا ہے کہ میں ٹیکس کم کروں گا جبکہ ہیلری اس میں اضافہ کی خواہاں ہے۔ کلنٹن نے کہنا ہے کہ ٹرمپ پر ۶۵۰ ملین ڈالر کا ٹیکس واجب الادا ہے اس لئے وہ گوشوارہ چھپا رہے ہیں ۔ اس پر بغیر کسی ندامت کے ٹرمپ کا کہنا ہے ''چونکہ میں سمارٹ ہوں''؛ (اس لئے میں یہ ٹیکس چوری کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں)۔ٹرمپ کے مطابق ایک ایسے وقت میں جب امریکہ بیس ٹریلین ڈالر کا مقروض ہے ایک کاروباری شخص کو ہی صدر بننا چاہیے۔ وہ نئے اسکول نئے ائرپورٹ، نئے اسپتال اور نئی سڑکوں کی تعمیر پر زور دیتا ہے اور کلنٹن پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اپنے ملازمین کو پورا معاوضہ تک نہیں دیتیں جبکہ خود ٹیکس چراتا ہے۔

وکی لیکز' کے مطابق ہیلری کلنٹن نے تجارت اور 'وال اسٹریٹ' کے ساتھ معاملات' پر پردہ ڈالنے کیلئے ۳۳ ہزار ای میلز ضائع کردیئے۔ ہلرٹری کلنٹن ذاتی ای میلز کے استعمال کو 'غلطی' تسلیم کرتی ہیں مگر یہ بھی کہتی ہیں کہ ایسے کوئی شواہد نہیں جن کے ذریعے یہ ثابت ہو کہ خفیہ معلومات غلط ہاتھوں تک پہنچ گئی تھیں۔وکی لیکس کو روس کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے ہیلری کہتی ہیں سائبر حملوں کی بابت ہمیں دو قسم کے دشمنوں کا سامنا ہے ایک وہ جو پیسہ بنانے کے لیے ایسا کرتے ہیں اور دوسرے جو ریاستیں کرتی ہیں جیسا کہ روس جو ہمارے اداروں

کی معلومات چرا رہا ہے اور ڈونلڈ ٹرمپ روس کے صدر پوٹن کو اچھا لیڈر کہتے ہیں۔ٹرمپ نے اسے عمداً کیا جانے والا فعل قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اس معاملے کی چھان بین کے لیے خصوصی استغاثہ تشکیل دیں گے اور صدر بن گئے تو ہیلری کلنٹن کو جیل بھیجیں گے۔ جمہوریت کی ستم ظریفی ہے کہ صدارتی امیدواروں کی ان گھٹیا بازیوں سے واقف ہونے کے باوجود ہر امریکی ان میں سے ایک سربراہ بنانے پر مجبور ہے۔

اس انتخاب میں تیسرا مسئلہ نسلی منافرت ہے کلنٹنکاالزام ہے کہ ٹرمپ نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہی اس نسل پرستانہ جھوٹ سے کیا کہ ہمارا پہلا سیاہ فام صدر امریکی شہری نہیں ہے۔ بغیر کسی ثبوت کے وہ سالہا سال اس پر قائم رہا اور پیدائشی سرٹیفیکیٹ کو جعلی قرار دیتے رہا۔اس کے علاوہ ٹرمپ نے ۱۹۷۳ میں سیاہ فاموں کو اپنی رہائشی عمارت میں جگہ دینے سے انکار بھی کیا تھا جس کے باعث محکمہ انصاف نے ان پر مقدمہ دائر کردیا تھا۔ جنوبی امریکہ کے تارکین وطن کے خلاف زہر اگلنے والا ٹرمپ ابکہتا ہے کہ سیاست دانوں نے افریقی امریکیوں کو استعمال کیا ہے اور انہیں صرف ووٹ کے وقت یاد کیا جاتا ہے۔ٹرمپ کے مطابق وہ قانون کی بالادستی چاہتا ہے لیکن وہ اس کیلئے صدر اوباماکے آبائی شہر شکاگو کا حوالہ دیتا ہے کہ جہاں ایک سال میں سڑکوں پر ہونے والے جرائم میں تین ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے اور کہتا ہے تارکین

وطن اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔
ہیلری کلنٹن نے ٹرمپ پر الزام لگایا ہے کہ وہ افریقی امریکنوں، ہسپانوی لوگوں اور مسلمانوں کے خلاف ناشائستہ زبان استعمال کرتا ہے۔ان کا موقف ہے کہ امریکہ کی جنگ اسلام سے نہیں بلکہ ، داعش اور دیگر شدت پسندوں کے خلاف ہے، جو اکثریتی معتدل مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ ان کے مطابق مسلمان امریکہ میں جارج واشنگٹن کے زمانے سے موجود ہیں؛ اور ان میں سے اکثر پُر امن، باصلاحیت اور بہت ہی کامیاب ہیں۔ اس ضمن میں، ٹرمپ کے مبینہ طور پر کیپٹن ہمایوں کے خاندان کے خلاف دیئے گئے بیان کا حوالہ دیا جاتا ہے جو ایک قومی ہیرو ہے اور انھوں نے ملک کے لیے عراق میں جان نثار کردی تھی۔
ڈونالڈ ٹرمپ کا کہنا ہے کہ کیپٹن ہمایوں حکومت کی ناقص پالیسی کا شکار ہوئے اگر وہ صدر ہوتا تو کیپٹن نہیں مرتا۔ صدر منتخب ہو جانے پر ٹرمپ مسلمانوں کے داخلے کی بابت سخت پوچھ گچھ کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا عزم رکھتا ہے تاکہ ایسے افراد کو امریکہ آنے سے روکا جائے جو امریکی اقدار سے متصادم ''سخت گیر اسلامی نظریات'' میں یقین رکھتے ہیں۔یہودیوں کی خوشنودی کیلئے ٹرمپ نے ایران سے متعلق امریکی پالیسی پر تنقید ہوئے کہہ دیا کہ اس سے نتن یاہو تک ناراض ہے حالانکہ کہ نتن یاہو جیسے اسلام دشمن نے بھی ڈونالڈ ٹرمپ

کو دورانِ مہم اسرائیل کا دورہ کرنے سے منع کردیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نتن یاہو سے بھی بڑا اسلام اور مسلمانوں کا دشمن کون ہے؟اس سے قبل ساری مساجد کو بند کرنے کی وکالت کرچکا ہے۔ڈونالڈ ٹرمپ کی زبان سے مسلمانوں کے متعلق یہسن کر حیرت زدہ ہونے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام پسندوں کے ساتھ چین کی اشتراکیت ہو یا مغرب کی جمہوریت، جزیرۃ العرب کی ملوکیت ہو افریقہ کی آمریت، اسرائیل صہیونیت ہو یا ہند کی فسطائیت سب کا سلوک یکساں ہیں۔ ظلم و جبر کے یہ سارے علمبردار عدل و انصاف کے چراغ کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں اور منھ کی پھونک سے اسے بجھا دینا چاہتے ہیں۔

جمہوری نظام سیاست کے بارے میں ایک خوش فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ قوم کی زمامِ کار بہترین افراد کے ہاتھوں میں منتقل ہوجاتی ہے اس لئے عصرِ حاضر میں اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ اس دعویٰ کی روشنی میں اگر امریکہ میں برسرپیکار صدارتی امیدواروں کے اخلاق و کردار جائزہ لیاجائے تو ساری قلعی کھل جاتی ہے۔ان امیدواروں کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، انسانی ،نسائی اور اقلیتی افکار و عمل کا معروضی جائزہ بتاتا ہے کہ اس نظام سیاست کا بلند بانگ دعویٰ اکھو کھلاہے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہورہاہے لیکن لوگ جمہوریت کی نیلم پری پر ایسے فریفتہ ہیں اس کی ساری بے وفائیوں کو فوراً بھلا دیتے ہیں۔ جارج ڈبلیو بش جیسے احمق کا دو مرتبہ انتخاب اور ہندوستان

کے اندر نریندر مودی اور فلپائن دیو تیرتے کا منتخب ہو جانا ثابت کرتا ہے جمہوریت کی مہربانی سے ہر کوئی اقتدار اعلیٰ پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کیلئے اخلاق و کردار یا صلاحیت و قابلیت کی کوئی قید نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ اس بار ۵۰ فیصد ارکان پارلیمان کی مذمت اور ۱۰ فیصد کی جانب سے ٹرمپ کو امیدواری واپس لینے کے مطالبے کے باوجود عوام اس کے سر پر حکومت کا تاج رکھ دے۔

امریکی انتخاب کی مہم کے مجسم منفی ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ امیدوار اپنے اوپر لگائے جانے والے سوالات کا اطمینان بخش جواب دینے کے بجائے اپنے مخالف پر نت نئے الزام لگا دیتے ہیں۔اس دگر گوں صورتحال میں عوام کو یہ طے کرنا ہے کہ ان میں کم خرابیاں کس میں ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امریکہ کے سارے لوگ ان سے بھی گئے گزرے ہیں اور اگر نہیں تو وہاں رائج نظام ان بہتر لوگوں کو اقتدار پر فائز کیوں نہیں کرتا ؟ اس سوال کا جواب یہ ہے سرمایہ دارانہ جمہوریت کی نیلم پری کے نزدیک انتخاب کا معیار صرف اور صرف دھن دولت ہے۔ وہ انہیں لوگوں کو اقتدار میں آنے کی اجازت دیتی ہے جو سرمایہ داروں کے مفادات کے وفادار ماحفظ ہوتے ہیں اور انہیں استحصال کا بھرپور موقع فراہم کرتے ہیں ۔ علامہ اقبال نے بلاوجہ تو نہیں کہا تھا

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

سرجیکل اسٹرائیک: خود اپنے داغ دکھانے کو روشنی کی ہے

سرجیکل اسٹرائیک کا خمار وقت کے ساتھ چڑھتا جارہا ہے۔گاہے بہ گاہے اس کا ذکر براہ راست یا بالواسطہ کردیا جاتا ہے لیکن کشمیر کی بات کوئی نہیں کرتا حالانکہ وہاں پر برہان وانی کے انکاونٹر سے شروع ہونے والی کشیدگی کو ۱۰۰ دن سے زیادہ بیت چکے ہیں اور حکومت اس محاذ پر چاروں شانے چت ہوچکی ہے۔کشمیر کے حالیہ بحران میں ابھی تک ۹۰ سے زیادہ مظاہرین ہلاک کئے جاچکے ہیں ، ۱۳۰۰۰ ہزار لوگ زخمی ہوئے ہیں جن میں ۱۰۰۰ نوجوانوں کی بینائی جزوی یا کلی طور پر متاثر ہوئی ہے۔ ۷۰۰۰ سے زیادہ لوگوں کو حراست میں لیا گیا اور تجارتی خسارہ تقریباً دس ہزار کروڑ کا ہے۔
اخبارات، موبائیل فون وغیرہ پر آئے دن پابندیاں لگتی رہتی ہیں اور عوام کی روزمرہ کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔سرجیکل اسٹرائیک کے ذریعہ دشمن کو جو نقصان پہنچایا گیا اس کے مقابلے خود اپنی عوام کا یہ خسارہ کہیں زیادہ ہے لیکن سارہ قوم کو پہلے تواڑی کی فوجی چھاونی پر ہونے والے حملے کا رونا روتی رہی اور اب سرجیکل اسٹرائیک پر بغلیں بجارہی ہے حالانکہ اس گورکھ دھندے کے الجھاو تو بس امر پریم نامی فلم کے عجیب و غریب نغمہ جیسا ہے

یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ کیوں ہوا؟

جب ہوا، تب ہوا، چھوڑو یہ نہ سوچو۰۰۰۰ یہ ۰۰۰ کیا ہوا!

ملک کی عوام اب یہ بھی سوچ رہی ہے کہ آخر سرجیکل اسٹرائیک کا یہ معمہ اس قدر پیچیدہ کیوں ہے کہ اس پر ہر روز نت نئے شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں ؟اس راز کو فاش کرنے کا کام وزیردفاع منوہر پاریکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ حملہ آرایس ایس کے اندر ان کی اور وزیراعظم کی تربیت کا نتیجہ ہے۔آرایس ایس نے تحریک آزادی میں حصہ نہیں لیا لیکن سب سے بڑی دیش بھکت بن گئی ۔ یہ جعلی دیش بھکت سرحدوں کے بجائے بستیوں میں دھونس جماکر اپنی بہادری کے ڈنکے بجاتے ہیں۔ اس لئے جب انہوں نے سرجیکل اسٹرائیک کا شور مچاکر اپنی سیاسی دوکان چمکانے کی کوشش کی تو عوام کے ذہنوں میں شک پیدا ہوگیا۔ وزیر اعلی اروند کیجریوال کے ویڈیو فوٹیج جاری کرنے کے مطالبہ کو بی جے پی کے ترجمان روی شنکر پرساد نے بدبختی قراردے دیا حالانکہ پاکستان کے انکار کی تردید کا یہ سب سے مؤثر طریقہ ہے۔پرساد نے کیجریوالپر فوج کے حوصلے کو پست کرنے اوراس کی قابلیت پر شک کرنے کاالزام لگایااور مودی بھکتوں نے چراغ پا ہو کر کیجریوال کو غدار قراردے دیا۔ اس چور کی داڑھی میں تنکہ کی سی کیفیت پر مشتاق عاجز کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

یہ رازِ عشق ہے افشا تو ہو گا، گلی کوچوں میں ُتو رُسوا تو ہوگا
اُٹھیں گی انگلیاں جب اس پہ عاجزؔ، تمہارا شہر میں ، چرچا تو ہوگا

سرجیکل اسٹرائیک کو لے کر پریشانی کا یہ عالم ہے کہ سابق مرکزی وزیر پی چدمبرم کا این ڈی ٹی وی پر نشر ہونے والے انٹرویو کو تشہیر کے بعد رکوادیا گیا حالانکہ چدمبرم نے سرجیکل اسٹرائیک پر حکومت کی تنقید نہیں تائید کی تھی ۔ لگتا ہے کہ اس مسئلہ پر بولنے کا حق اب سنگھ پریوار کیلئے مختص کر دیا گیا ہے یا ان لوگوں کو اندیشہ ہے کہ کسی اور کی حمایت سے بھی ان کیلئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے یوم آزادی کے موقع پر بڑے طمطراق سے مقبوضہ کشمیر سمیت گلگت اور بلتستان کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ بتا کر خوب دادِ تحسین حاصل کی تھی لیکن سرجیکل اسٹرائیک نے اس کی نادانستہ تردید کردی ۔ اگر وہ خطہ ہندوستان کا حصہ ہیں تو وہاں اتنی خاموشی اور رازداری کے ساتھ نصف شب میں جانا اور صبح پو پھٹنے سے قبل لوٹ آنا کیا معنی رکھتا ہے؟ وزیر اعظم نے فوج کو واپس کیوں بلایا وہیں خیمہ زن رہنے کا حکم کیوں نہیں دیا؟ اس حملے پر اس قدر سیاست ہوئی کہ حزب اختلاف کے رہنما راہل گاندھی کو کہنا پڑا وزیر اعظم فوجیوں کے خون کی دلالی نہ کریں ۔ راہل کے اس بیان پر ان کے خلاف دہلی کی ایک عدالت میں ہتک عزت کا دعویٰ ٹھونک دیا گیا۔ دراصل یہ مقدمہ تو وزیر دفاع منوہر پاریکر کے خلاف ہونا چاہئے جنھوں نے یکے بعد دیگرے دو احمقانہ بیان دیئے ۔ اول فوج کا ہنومان سے موازنہ کردیا۔ بی جے پی والے خود کو تو رام سیتا قرار دیتے ہیں اور ملک کی فوج کو ہنومان بنادیتے ہیں ۔

منوہر پریکر نے یہ بھی کہا اس سرجیکل اسٹرئیک سے قبل ہندوستان کی فوج کو اپنی شجاعت و دلیری کا علم نہیں تھا۔ یہ تو سراسر فوج کی توہین ہے جس پر انہیں نہ صرف فوج بلکہ قوم سے معافی مانگنی چاہئے۔

ہونہار وزیر دفاع منوہر پاریکر نے گزشتہ دنوں یہ انکشاف بھی کیا کہ سرجیکل اسٹرئیک پہلی بار ہوا ہے جبکہ اس سے قبل کانگریس دو مرتبہ اس طرح کا محدود حملہ کرنے کا دعویٰ کرچکی ہے اور بی جے پی اس کی تردید نہیں کر سکی ۔ ہندو اخبار نے ۲۰۱۱ میں ہونے والے حملے "آپریشن جنجر" کی تفصیلات بھی شائع کردیں۔ اب سنگھ کے دانشور پرانے اور نئے حملے کا فرق بتانے میں جٹ گئے ہیں۔ آپریشن خنجر کو بدلے کی کارروائی کہہ کٹ ہلکا کیا جارہا ہے حالانکہ یہ حملہ بھی تو اڑی کا انتقام تھا۔ سرحد پر اس طرح کی کارروائی پہلے بھی ہوئی مگر ایسا شور غل پہلی بار ہورہا ہے۔ منوہر پریکر کے دعویٰ کی سب سے طاقتور تردید خارجہ سکریٹری شیو شنکر کی جانب سے آئی۔ انہوں نے پارلیمان کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے سامنے اعتراف کیا کہ اس طرح کے کامیاب حملے پہلے بھی ہوئے ہیں مگر ان کا اعلان پہلی بار ہوا ہے۔ شیو شنکر کو چونکہ انتخاب نہیں لڑنا ہے، انہوں نے یہ بیان عوام میں نہیں بلکہ ایک نہایت ذمہ دار فورم میں دیا ہے جہاں کذب گوئی سے ان کی ملازمت خطرے میں پڑ سکتی ہے اور ان کا تعلق سنگھ پریوار سے نہیں ہے اس لئے وہ وزیر دفاع سے کہیں زیادہ قابلِ اعتبار ہیں

۔ منوہر پاریکر تو آئندہ سال اپنی ریاست گوا میں انتخاب کے پیش نظر ایک وجئے یاترا بھی نکالنے جارہے تھے مگر ان کو اس سے روک دیا گیا ہے۔ کشمیر کی آگ پر اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ غریب کی کٹیا میں لگائی جانے والی آگ سے حکمرانوں کے محل روشن ہونے کے بجائے خاکستر بھی ہوجاتے ہیں بقول شاعر

اسی لہو میں تمھارا سفینہ ڈوبے گا
یہ قتل عام نہیں، تم نے خودکشی کی ہے

اس سرجیکل اسٹرائیک پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بہت سارے لوگوں نے کہہ دیا کہ کاش اس طرح کا حملہ کئی سال قبل ہوا ہوتا تو کشمیر میں شورش پیدا ہی نہ ہوتی حالانکہ بعد میں پتہ چلا کہ کانگریس کے زمانے میں بھی یہ سب ہوچکا ہے اور اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ سرجیکل اسٹرائیک کے بعد جو خوش فہمی پیدا ہوئی تھی اب مظاہرے اور حملے کافور ہوجائیں گے وہ بہت جلد دور ہوگئی۔ پمپور کے ایک سرکاری ادارے پر فروری میں حملہ کیا گیا تھا جہاں سے حملہ آوروں کو نکالنے میں ۴۸ گھنٹے لگے تھے ۔ سرجیکل اسٹرائیک کے بعد پھر سے اسی ادارے کو نشانہ بنایا گیا اور ۲ حریت پسندوں پر قابو پانے میں فوج کو ۵۲ گھنٹے لگے ۔ گزشتہ ۱۰۰ دنوں کے اندر فوجی تنصیبات میں ہونے والے حملوں اچھا خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی خبر ذرائع ابلاغ

میں آجاتی ہے۔آئے دن عسکریت پسند حفاظتی دستوں سے بندوق چھین کر لے جاتے ہیں۔ پاکستان اگر خوفزدہ ہو گیا ہے تو اس نے گزشتہ ۱۹ دنوں میں ۲۹ مرتبہ سرحد پر جنگ بندی کی خلاف ورزی کیوں کی؟

کشمیر کی اس دگرگوں صورتحال کا اعتراف بی جے پی کے نائب صدر اور کشمیر کے نگراں اویناش کھنہ نے بھی کیا ہے مگر وہ اپنی پیٹھ تھپتھپانے کیلئے کہتے ہیں کہ اگر ہم اقتدار میں نہیں ہوتے تو جموں میں اس کا شدید رد عمل ہوتا۔ظاہر ہے بی جے پی اگر اقتدار میں نہیں ہوتی تو وہ آئے دن جموں میں مظاہرے اور احتجاج کرتی اب چونکہ صوبے اور مرکز دونوں مقامات پر اس کی اپنی حکومت ہے احتجاج کس کے خلاف کیا جائے؟ ایک سینئر پولس افسر کا کہنا ہے کہ وادی میں جملہ ۲۴۰تا۲۶۰ کے درمیان عسکریت پسند ہیں جن میں سے ۸۵ غیر ملکی ہیں۔ ان اعدادو شمار سے یہ راز فاش ہوجاتا ہے کہ پاکستان سے آنے والے دہشت گردوں کا جو ہوئڈر کھڑا کیا جاتا ہے اس کی حقیقت کل ۱۰۰ بھی نہیں ہے۔

قومی انتخاب سے قبل امیت شاہ نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ اگر نریندر مودی وزیراعظم بن گئے تو کوئی دہشت گرد ہندوستان میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستانی دہشت گردوں کو یہ پتہ ہی نہ چلا ہو کہ مودی جی اپنی نصف سے زیادہ میعاد ختم کرچکے ہیں۔ ویسے وزیر دفاع نے بھی کچھ روز

قبل سینہ ٹھونک کر کہا تھا اب کوئی میری اجازت کے بغیر سرحد پار نہیں کر سکتا۔ ایسا لگتا ہے ان کی یہ دھمکی بھی صدا بہ صحرا ہو گئی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر وادی میں عسکریت پسندوں کی کل تعداد صرف ۲۶۰ سے یا اس سے کم ہے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں ہماری فوج کے قابو میں کیوں نہیں آتے اور اس کام کیلئے دنیا بھر کو ساتھ لینے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے ؟ ان سوالات کا جواب شاید اس شعر میں ہے ۔

زندگی کا رنگ ایسا تو نہ تھا، روشنی کم تھی اندھیرا تو نہ تھا
عکس تک اپنا نہ پہچانا گیا، آئنہ ایسا بھی دھندلا تو نہ تھا

اترپردیش کا انتخاب اور سرجیکل اسٹرائیک

مایاوتی نے وزیراعظم کے حلقۂ انتخاب وارانسی میں ایک زبردست ریلی کرکے بی جے پی کے ذریعہ سرجیکل اسٹرائیک کا سیاسی فائدہ اٹھانے کی مذمت کی۔ مایاوتی نے اپنی تقریر میں کہا ایک طرف اڑی میں ہلاک ہونے فوجیوں کے اہل خانہ سوگ منارہے ہیں اور دوسری جانب وزیراعظم دسہرہ کا جشن منا رہے ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ فوجیوں کے پسماندگان کی ہمدردی میں اس سال دیوالی اور دسہرہ سادگی سے منائیں ہے۔مایاوتی شاید نہیں جانتیں کہ امیت شاہ پہلے ہی یہ اعتراف کرچکے ہیں کہ سرجیکل اسٹرائیک انتخابی مدعا تو بن ہی جائیگا۔ امیت شاہ کی یہ بات درست ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس بابت کئے جانے والے سارے وعدے انتخاب کے بعد ''جملہ'' کہہ کر بھلا دیئے جائیں گے۔

اترپردیش کے حوالے سے امیت شاہ کی منصوبہ بندی بہت موثر ہے۔ پہلے تو دہلی کے وگیان بھون میں پنڈت دین دیال کی کتابوں اجراء کرتے ہوئے وزیراعظمماشاروں کنایوں میں کہتے ہیں کہ بہت جلد ہم وجئے دشمی منانے والے ہیں اور اس سال کا دسہرہ بہت خاص ہوگٹ اس کے ساتھ سارا ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھتا ہے لوگٹ اشارہ سمجھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وزیراعظم دسہرہ منانے کیلئے لکھنو

کے رام لیلا میدان میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں ان کی خدمت میں ہنومان کی گدا پیش کی جاتی ہے۔ یہ وہی ہنومان ہے جس کا ذکر منوہر پریکر نے کیا تھا۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر کی ابتداء اور اختتام جئے شری رام سے کرتے ہیں لیکن سرجیکل سٹرائیک کے ذکر سے گریز کیا جاتا ہے اور پھر ہماچل پردیش کے اندر اس کا ذکر سفاک اسرائیل سے جوڑ کر اس طرح کیا جاتا ہے کہ پہلے یہ اسرائیل کرتا تھا اب یہ ثابت ہوگیا کہ ہندوستانی فوج بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ ان تمام واقعات کو جوڑ کر دیکھا جائے تو کیا ایسا نہیں لگتا کہ ان سب کا سوتردھار ایک ہی ہے ؟

لکھنو کی دسہرہ ریلی کے بعد ایودھیا میں رامائن میوزیم کی تعمیر اس بات کا اشارہ ہے کہ بی جے پی اس بار رام رتھ پر سوار ہو کر اترپردیش کا انتخاب جیتنا چاہتی ہے حالانکہ اکھلیش بھی ایودھیا میں رام تھیم پارک بنا کر ہندوتواوادیوں کو رام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ رام کے نام پر سنگھ پریوار کے اندر مہابھارت چھڑی ہوئی ہے۔ وزیر سیاحت مہیش شرما جب رامائن میوزم کی تیاری کیلئے ایودھیا کیلئے نکلے تو وہ ایودھیا سے راجیہ سبھا کے ایم پی ونئے کٹیار کو اپنے ساتھ لے جانا بھول گئے۔ اس پر کٹیار نے اپنی بھڑاس اس طرح نکالی کہ وہ تو اچھا ہی ہوا جو وہ ایودھیا میں نہیں تھے ورنہ لوگ سوال کرتے کہ رام مندر کب بنے گا؟ کٹیار کے مطابق جب بھی وہ ایودھیا جاتے ہیں

سنت مہنت ان سے سوال کرتے ہیں کہ رام مندر کی تعمیر کا کام کب شروع ہوگا؟ اب لوگ اس طرح کے لالی پاپ سے بہلنے والے نہیں ہیں انہیں رام جنم استھان پر مندر چاہیۓ نہ کہ ۱۵ کلومیٹر دور میوزیم۔

رام مندر کے نام پر راس لیلا کرنے والی بی جے پی کو چاہیۓ کہ وہ ایک نظر انڈیا ٹوڈے اور ایکسس کے انتخابی جائزے پر ڈال لے ۔ اس جائزے کے مطابق گزشتہ مرتبہ ۸۰ میں ۷۱ سیٹ جیتنے والی بی جے پی اب بھی سب سے آگے چل رہی لیکن واضح اکثریت میں ہنوز تقریباً ۳۰ کی کمی ہے۔ اسی کمی کو پورا کرنے کیلئے کبھی جۓ شری رام کا تو کبھی پاکستان کا شور بلند کیا جاتا ہے۔ انڈیا ٹوڈے کے مطابق بی جے پی کے صرف ۳ فیصد رائے دہندگان رام مندر کو اہم سیاسی مدعا مانتے ہیں اور گائے کے حق میں تو صرف ایک فیصد ہیں ۔ وزیر اعظم کی کارکردگی ۹ فیصد لوگوں کے نزدیک اہم ہے جبکہ ۸۸ فیصد اب بھی ترقی کو اہمیت دیتے ہیں ۔ بی جے پی والوں نے اگر ترقی کے بجائے رام مندر کا راگ الاپنا شروع کردیا تو یہ ۳۰ والی کھائی مزید گہری ہو سکتی ہے۔

سرجیکل اسٹرائیک جیسا معاملہ بھی ماضی میں اترپردیش کے ووٹرس کو بہت متاثر نہیں کرسکا ہے۔ جولائی ۱۹۹۹ میں کارگل کی جنگ ہوئی اس سے قبل ۱۹۹۸ میں اترپردیش میں بی جے پی کے ۵۹ ارکان پارلیمان منتخب ہوئے تھے مگر جنگ کے ۳

ماہ بعد ہونے والے قومی انتخاب میں یہ تعداد گھٹ کر ۲۹ پر پہنچ گئی اور کانگریس صفر سے بڑھ کر ۱۰ پر آ گئی ۔ بی ایس پی کو بھی ۱۰ کا اور سماجوادی کو ۶ کا فائدہ ہوا۔ ۲۰۰۶ میں وارانسی کے اندر کئی دھماکے ہوئے جس میں ۲۸ لوگ ہلاک اور ۱۰۱ زخمی ہوئے ۔ اس کے بعد بی جے پی نے پاکستان اور کانگریس کے خلاف زبردست تحریک چلائی مگر ۲۰۰۷ کے اندر ہونے والے صوبائی انتخابات میں بی جے پی کے ارکان اسمبلی کی تعداد ۸۸ سے گھٹ کر ۵۱ پر پہنچ گئی جبکہ بہوجن سماج پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہو گئی اور ایس پی اقتدار سے محروم ہو گئی۔ بی جے پی نے اگر ماضی سے سبق نہیں سیکھا تو تاریخ اپنے آپ کو دوہرا سکتی ہے۔

وزیر داخلہ راجناتھ نے لکھنو کے جلسۂ عام میں وزیر اعظم کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ان کی قیادت میں دنیا کو معلوم ہوگیا ہے کہ اب ہندوستان کی فوج کمزور نہیں ہے گویا پہلے دنیا بھر کے لوگ ہندوستان کی فوج کو کمزور سمجھتے تھے ۔ ہندوستان کی فوج آزادی کے بعد چین کے ساتھ ایک اور پاکستان کے ساتھ چار جنگوں میں اپنی دلیری کا مظاہرہ کر چکی ہے ۔ کیا اس وقت فوج کو اپنی بہادری کا علم نہیں تھا یا ساری دنیا نے اس کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ ملک کے وزیر داخلہ کو اس طرح کا بیان زیب دیتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان جنگوں کے باوجود مسئلۂ کشمیر جوں کا توں رہا ایسے میں سابق وزیر اعلیٰ فاروق

عبداللہ کی بات درست لگتی ہے ”وادی کا بحران اور تنازعہ دب تو سکتا ہے لیکن یہ چنگاری بجھ نہیں سکتی۔ یہ پھر سے اٹھے گی اور ہماری تباہی کا باعث بنے گی دونوں بڑے ممالک سے ہم اپیل کرتے ہیں کہ جنگ کسی مسئلہ کا حل نہیں مسئلہ کا حل بات چیت ہے ۔ بات چیت سے ہر مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے“۔ اس لئے بی جے پی کی بھلائی اسی میں ہے کہ اترپردیش کا انتخاب جیتنے کیلئے کشمیر اور پاکستان کے مسائل اچھالنے کے بجائے عوام کی ترقی اور فلاح و بہبود کی بات کرے اس میں قوم کا اور اس کا اپنا فائدہ ہے۔

میم ناگ : کوئی زیر زمیں سویا پڑا ہے، کہانی کا کوئی کردار گم ہے

میم ناگ کی کہانی میں چوتھی سیٹ کا مسافر جب اچانک اپنی سیٹ سے کھڑا ہو جاتا ہے تو تیسرا مسافر دھڑام سے زمین پر آجاتا ہے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آخر یہ کیسے ہوگیا اور پھر ایک نئے مسافر کے اس سیٹ پر بیٹھ جانے سے کشمکش حیات کا سفر حسبِ معمول جاری و ساری ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بار چپ چاپ چوتھی سیٹ سے اٹھ کر میم ناگ دنیا کی چلتی گاڑی سے اترا اور ایک لامتناہی سفر پر روانہ ہوگیا۔ لمحہ بھر کیلئے وقت کا پہیہ ٹھہر سا گیا ہے اور اس کے ساتھ سفر کرنے والے بے حس و حرکت مسافر کھڑکی سے نکل ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ اس کے بعد فضا میں صرف ناگ کی سرسراہٹ تھی۔ زمان و مکان کے قید و بند سے آزاد ایک بے ربط کہانی کی آہٹ میں سمندر پار ابوظبی میں سن رہا تھا ۔

بہت بے ربط ہوتی جارہی ہے ، کہانی کا کوئی کردار گم ہے
کوئی زیر زمیں سویا پڑا ہے ، کوئی ساتھی سمندر پار گم ہے

مختار سید ناگوری کو جب محسوس ہوا کہ ان کا نام بہت طویل ہے تو اس قناعت پسند فنکار نے اپنی آرزووں اور تمناؤں کی طرح اسے بھی مختصر کرکے صرف میم ناگ پر اکتفاء کرلیا۔ سادگی اور پرکاری ان کی فطرت میں رچی بسی تھی ۔

ممبئی کی ادبی فضا میں وہ گوندیا سے ان کے ساتھ آئی اور انہیں کے ہمراہ رخصت ہو گئی۔ ناگ کا میم نہ ان کی موجودگی میں کوئی اور تھا اور نہ بعد میں ہوگا۔ یہ ایک ایسا ناگ تھا جو ٦٦ سال انسانوں کے درمیان رہا لیکن کسی نے اس کی پھنکار نہیں دیکھی۔اس ناگ کا زہر میم کی کہانیوں سے نکل کر قاری کے قلب و ذہن میں سرائیت کرجاتا تھا۔ ناگ گزیدہ زہر کے عادی قارئین کے قلب کی کیفیت پر یہ شعر صادق آتا ہے

آج کچھ لطف و کرم حد سے سوا ہے دل پر
جیسے اک کوہِ گراں ٹوٹ پڑا ہے دل پر

چوتھی سیٹ کا مسافر وہی لکھ سکتا ہے کہ جسے تین افراد کی بنی سیٹ پر مزید ایک شخص کی گنجائش کا علم ہو۔ ایک ایسے فرد کی گنجائش جو کہیں بھی اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلیتا ہے۔ جس کا مطمح نظر سفر سے لطف اندوز ہونا نہ ہو بلکہ جس کی نگاہ منزل پر مرکوز ہو۔ ایسے مسافر کو کبھی فرصت میسر نہیں آتی کہ گرانٹ روڈ سے الٹا چرچ گیٹ کی طرف جائے اور پھر وہاں سے بوریولی کی جانب لوٹے۔ وہ چوتھی سیٹ پر گذارہ کرلیتا ہے۔ چوتھی سیٹ پر زندگی گذارنے والے ہم جیسے لوگ ہر رات مرتے ہیں اور پھر صبح میں جی اٹھتے ہیں ۔بقول شاعر

عمر کی ساری تھکن لاد کے گھر جاتے ہیں
رات بستر پہ جو سوتے ہیں تو مر جاتے ہیں

گردش ایام نے برسوں تک میم ناگ کو اس سونے اور جاگنے کے سحر میں مبتلا رکھا لیکن پھر ایک دن آزاد کیا تو کچھ ایسے کہ ہمیشہ کیلئے سلا دیا۔ پچھلے دنوں صحافت کے مدیر جاوید جمال الدین سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے میم ناگ کی خیریت دریافت کی۔ جاوید بولے وہ ہمیں چھوڑ کر 'ہم آپ' میں چلے گئے۔ میں نے سوال کیا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارا اپنا میم ناگ تو ہم اور آپ کا فرق ہی نہیں جانتا۔ جاوید بھائی کہا میری مراد ہم آپ' اخبار سے ہے۔ میم ناگ نے اپنی طویل صحافتی زندگی میں کئی اخبار بدلے لیکن' یہ تبدیلیاں انہیں بدلنے سے قاصر رہیں اور نہ اس کے حالات کو تبدیل کر سکیں۔ گردشِ زمانہ سے بے نیاز ان کے قلم کی دھار بھی نہیں بدلی اور وہ کیوں کر بدلتی کہ کسی ناگ کو اپنے زہر پر اختیار ہی کب ہوتا ہے؟ وہ تو بے اختیار چلتا ہے اور چلتا ہی چلا جاتا ہے ۔ میم ناگ کا قلمی سفر اس شعر کی مصداق ہے کہ

تھا شوق سفر ایسا اک عمر سے یاروں نے
منزل بھی نہیں پائی رستہ بھی نہیں بدلا

مجھے یاد پڑتا ہے ایک روز وہ میرا انٹرویو لینے کیلئے وہ آئے بہت دیر تک ہم لوگ بات چیت کرتے رہے۔ جاتے ہوئے انہوں نے ہنس کر کہا یار تم نے تو مجھے کچھ پوچھنے ہی نہیں دیا اب ایسا کرو کہ میرا انٹرویو لکھ بھجوادو۔ دورانِ

گفتگو میم ناگ کا ایک زہریلا سوال آج بھی مجھے یاد ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہ ایوارڈ کیسے ملتا ہے؟ میں نے کہا ایوارڈ ہم جیسے چوتھی سیٹ والوں کیلئے نہیں ہوتے۔ اس کیلئے فنکاری کے علاوہ عیاری درکار ہوتی ہے۔ دوڑ کر چلتی ٹرین میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ جھپٹ کر کھڑکی والی سیٹ پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ بڑی معصومیت سے بولے تب تو یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ اور پھر یہ ہوا کہ شاید کسی نے انہیں حامد اقبال صدیقی کے یہ اشعار سنا دیئے

ے

کیا ضروری ہے جہاں میں نام کر، سر جھکا چپ چاپ اپنا کام کر
دوڑ کر لوگوں کے پیچھے کیا ملا، تھک چکا ہے یار اب آرام کر

اس سال کی ابتداء سے اردو ادب پر پت جھڑ کا سا سماں ہے۔ میم ناگ سے میری آخری ملاقات ایک ایسی تعزیتی نشست میں ہوئی تھی جس میں ندا فاضلی،
محسنانصاری، زبیر رضوی، عابد سہیل، محمود الحسن اور انتظار حسین جیسے مشاہر ادب کو خراج تعزیت پیش کرنے کیلئے منعقد کیا گیا تھا لیکن نشست سے دو چار روز قبل انور سدید کے وفات کی خبر بھی آچکی تھی۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہر ماہ ایک نہ ایک اندوہناک خبر سنائی دیتی ہے اور اب تو میم ناگ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی بن گئے۔ اس نشست میں میم ناگ کو عابد سہیل پر مضمون پڑھا اور جاتے ہوئے مجھے ایک لفافہ پکڑا کر کہا اس میں ''چوتھی سیٹ کا مسافر'' ہے۔ میں سمجھ گیا کسی ریل گاڑی کو مسافروں سمیت لفافہ کے اندر بند کرنے کا فن کون جانتا ہے۔

اس کے بعد بتایا میری ایک اور زیرِ ترتیب کتاب جس نام ''چھٹی کتاب'' ہے جلد ہی آجائیگی۔ کون جانتا تھا کہ اس کتاب کے آنے سے قبل کہ میم ناگ ہمارے درمیان سے اٹھ کر چلے جائیں گے اور ہم اپنی نمناک آنکھوں سے ایک کٹی ڈور کو جوڑنے کی سعی لاحاصل اس شعر کے ساتھ کر رہے ہوں گے۔

ذرا کھل کر بھی رو لینے دو ہم کو
کہ دل کی آگ تک، پانی تو جائے

میم ناگ تو بڑی پھرتی سے کارِ جہاں نمٹا گئے مگر مجھ سے کاہلی سرزد ہوئی۔ میرے ناول آتش صلیب کی پشت پر میم ناگ کے تبصرے کا اقتباس ہے۔ اس کتاب کے اجراء کا حق انہیں کو تھا اور یہ میری خواہش بھی تھی لیکن تاخیر ہو گئی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ انہیں جانے کی جلدی ہے، انہیں بھی نہیں پتہ تھا اور کسی بھی کو پتہ نہیں ہوتا۔ کون جانے یہ خراج تعزیت مکمل ہوگا بھی کہ نہیں اور اگر تکمیل کے مراحل سے گذر جائے تب بھی شائع ہوسکے گا یا نہیں،اور شائع بھی ہوجائے تو یہ اگلا چوتھی سیٹ کا مسافر اسے پڑھ سکے گا یا نہیں ؟ کوئی نہیں جانتا ! کوئی بھی نہیں جانتا ! ! اور جان بھی کیسے سکتا ہے ! ! ! عالم الغیب تو وہی یکہ و تنہا ذاتِ باری تعالیٰ ہے کہ جو اپنی مرضی سے اپنے بندوں کو دنیا کی ریل میں سوار کرتا اور جب چاہتا ہے اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ اس پر کسی مختار کا کوئی اختیار نہیں۔ ہم بے اختیار لوگ اپنی محرومی پر اس شکوہ

ے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں

غمِ جسم و جاں، غمِ دوستاں، غمِ رفتگاں بھی بجا مگر
وہ جو غم کدے کا نکھار تھا، غمِ یار تھا، وہ نہیں رہا

سائیکل ہے پنچر، انجن دھواں ••• یہ ہے ٹاٹا، یہ ہے بھاجپ، یہ ہے بھارت میری جاں

کرن جوہر چاہتے تھے کہ اس دیوالی پر ان کی فلم اے دل ہے مشکل ریلیز ہو لیکن ممبئی کے نئے ڈان راج ٹھاکرے نے انہیں دیش دروہی قرار دے کر ان کا دیوالیہ نکالنے کا فرمان نکال دیا۔ دیش بھکتوں کی سرکار میں دیش دروہ کا لقب کوڑیوں کے مول بک رہا ہے ہندوتواوادیوں سے اختلاف کرنے والا ہر شخص ملک کا غدار کہلاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایمنسٹی انٹر نیشنل کو بھی نہیں بخشا جاتا جبکہ وہ ہندوستان کی تنظیم نہیں بلکہ ایک عالمی ادارہ ہے اور اس کی وفاداری کسی خاص ملک کے بجائے انسانی حقوق سے ہے۔ بیچارے کرن جوہر کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے وزیراعظم کے لاہوردورے سے متاثر ہو کر پاکستانی فلمی اداکار فواد خان کو اپنی فلم میں لے لیا۔ اس بیچارے کو کیا پتہ تھا کہ مودی جی کی اداکاری بینڈ باجا اور باراتی میں فلاپ ہو جائیگی اور وہ بہت جلد فیملی ڈرامہ چھوڑ کر ایکشن فلموں کا رخ کریں گے۔ ویسے مودی جی کا ناک نقشہ لواسٹوری میں سجتا نہیں ہے حالانکہ اس میدان میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے انہوں نے اپنی دھرم پتنی جسودھا بین کو تین تو دور ایک بھی طلاق دیئے بغیر اپنی زندگی سے نکال دیا لیکن پھر بھی بات نہیں بنی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے ساتھ تو دنگا فساد اور انکاونٹر کے اسپیشلسٹ امیت شاہ کی ہی بنتی ہے۔

کرن جوہر کے مطابق ان کے دل میں اس مشکل کا خیال ۲۰۱۴ میں آیا۔ نواز شریف کو اپنی حلف برداری میں جب مودی جی نے بلایا تو اچھے اچھوں کو غلط فہمی ہو گئی۔ اس نے فلم کی شوٹنگ گزشتہ سال اس وقت شروع کی کہ جب مودی جی لاہور میں نواز شریف کے گھر بن بلائے تشریف لے گئے تھے اور ان کی والدہ کے چرن چھو رہے تھے۔ ایسے میں اگر کرن جوہر کسی خوش فہمی کا شکار ہوگیا تو اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کرن جوہر س غلطی یہ نہیں ہوئی کہ اس نے فواد خان کو اس فلم میں ایک معمولی کردار ادا کرنے کیلئے سائن کرلیا بلکہ رنبیر کپور کو لے کر فلم بنانا ایک پہاڑ جیسی چوک تھی جس میں سے نہر نکالنے کیلئے راج جیسے فرہاد سے تیشہ چلوایا گیا۔ ۲۰۱۳ میں ریلیز ہونے والی یہ جوانی ہے دیوانی'' کے بعد سے رنبیر کی ہر فلم باکس آفس فلاپ ہوئی ہے۔ ''

اے دل ہے مشکل'' کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی اس لئے اس فلم کو چرچے میں '' آنے کیلئے تنازع درکار تھا اور بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا کے طرز پر یہ ٹھیکہ غالباً راج ٹھاکرے کو دیا گیا اور اس نے اپنا کردار خوب نبھایا۔ ایسی پبلسٹی کرن جوہر کی کسی فلم کو نصیب نہیں ہوئی اس کیلئے راج صاحب کو فلم فیئر کا لائف ٹائم ایوارڈ دیا جانا چاہیے۔ ویسے کچھ کچھ ہوتا ہے اور کبھی خوشی کبھی غم جیسی فلمیں بنانے والے کرن جوہر کو پہلے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اب اگر فلم میں تھوڑا بہت بھی دم ہوگا تو وزیر اعلیٰ

دیویندر فردنویس کے آشیرواد سے کرن جوہر کے پیسے تو نکل ہی آئیں گے۔ وزیراعلیٰ فردنویس اور راج ٹھاکرے کی جوڑی ۱۹۷۵ کی فلم دھرم ویر کی طرح ہے۔ جس طرح دھرمیندر اور بچن کی جوڑی پردۂ سیمیں پر ہٹ ہوتی تھی اسی طرح دیویندر اور راج کی سیاست بھی خوب چلتی ہے۔ راج ٹھاکرے گزشتہ دو مرتبہ انتخابات کے موقع پر اپنا سیاسی دیوالیہ پیٹ کر بی جے پی کے وارے نیارے کرچکے ہیں اور اب ممبئی کے بلدیاتی انتخاب میں بھی یہی کرنے جارہے ہیں۔ اس بار تو ان کو پورا معاوضہ پیشگی مل چکا ہے۔

دیویندر فردنویس کو پتہ ہے کہ اس بار میونسپل انتخاب میں کامیابی گزشتہ مرتبہ کی طرح آسان نہیں ہے۔ اچھے دنوں کے خواب چکناچور ہوچکے ہیں۔ اورنگ آباد جیسے شہر میں بی جے پی کو ایم آئی ایم سے کم نشستوں پر کامیابی ملی اور اب تو مراٹھا سماج بھی ان کے خلاف سڑکوں پر اترا ہوا ہے۔ ایسے میں شیوسینا کی کمان توڑنے کیلئے مہاراشٹر نونرمان سینا کے انجن سے اسے روندنے کی کوشش کی گئی۔ ادھو ٹھاکرے آئے دن وزیراعظم کو ان کے کمزور موقف پر طعنے دیتے رہتے تھے ایسے میں اچانک راج ٹھاکرے نے میدان میں اتر کر ان سے دیش بھکتی کے تیر چھین لئے۔ راج نے جب یہ اعلان کیا کہ ہم فلم بینوں کے ہاتھ پیر توڑ دیں گے تو ادھو کے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اب پاکستان دشمنی کی بنیاد انتخاب لڑنے والے چچازاد بھائی مہابھارت کے کرن ارجن کی مانند ایک دوسرے کے مدمقابل ڈٹے ہوئے ہیں اور وزیراعلیٰ فردنویس گرو درونا

چاریہ بن کر راج دھرم نبھارہے ہیں۔

دیویندرفردنویس کا سیاسی تیر تونشانے پر لگا لیکن دیوالی کے رنگ میں بھنگ اس پانچ کروڑکے کفارے نےڈال دیا جو ٹیبل کے اوپر ادا کی گئی۔اس سے طرح طرح کے شکوک و شبہات کو پیدا ہوگئے۔لوگ سوال کرنے لگے اگر اوپر اتنا ہے تواندر کتنا ہوگا؟ کانگریس کے سنجے نروپم نے فردنویس کو دلال قرار دے کر خفیہ میٹنگ کی تفصیلات منظر عام پرلانے کا مطالبہ کیا بصورتِ دیگر عدالت میں جانے کی دھمکی دی۔ادھو نے کہا کہ جو لوگ پردہ پھاڑنے کی دھمکی دے رہے تھے وہ پردہ اوڑھ کر (وزیراعلیٰ کی ضمانت پر) فرار ہوگئے۔فوج نے جب اس دلالی کی رقم لینے سے انکار کرکے راج کے منہ پر زوردار طمانچہ توفردنویس اپنے گال سہلاتے ہوئے شریر بچے کی طرح کہنے لگے میں توپہلے ہی مخالف تھا اگر ایسا ہے توپہلے اعتراض کیوں نہیں کیا؟

وزیراعلیٰ نے راج ٹھاکرے کے ساتھ اپنی گفتگو کے مدافعت میں کہا اگر حریت کانفرنس اور نکسلوادیوں سے گفت و شنید ہو سکتی ہے تو راج ٹھاکرے سے کیوں نہیں؟ وزیراعلیٰ کے علاوہ کوئی اور اگرراج ٹھاکرے کا موازنہ حریت سے کرتا تو ہنگامہ ہوجاتا۔راج اپنے چچازاد بھائی ادھوپر تو خوب غراتے ہیں لیکن دیویندر کی بات کا برانہیں مانتے اس لئے کہ مثل مشہور ہے چور چور موسیرے

بھائی۔ اس دوران جہاں ممبئی میں وزیراعلیٰ سے استعفیٰ طلب کیا جارہا تھا فلمساز انوراگ کشیپ اس لڑائی کو دہلی لے گئے اور وزیراعظم سے لاہور دورے کیلئے معافی کا مطالبہ کردیا۔ اس معاملے میں سب سے اچھا بیان لالو یادو نے دیا کہ گائے اور رام کے نام پر پیٹ نہیں بھرا اس لئے کوئی فوج کے نام پر ووٹ مانگ رہا ہے تو کوئی نوٹ مانگ رہا ہے کچھ تو شرم کرو۔

ممبئی کے سیاسی پردے پر جب دھرم ویر کی کہانی چل رہی تھی اس وقت لکھنو میں کی ہی فلم چچا بھتیجا کی کہانی دوہرائی جارہی تھی۔ ویسے ان سیاسی ڈراموں کو اپنے ۱۹۷۷ زمانے کامیاب ترین ہدایتکار منموہن دیسائی بھی دیکھتے تو سر پیٹ لیتے۔ عربی میں مثل مشہور ہے اقرب عقرب یعنی جو قریب ہے وہی بچھو ہے۔ چچا بھتیجے میں عام طور پر نہیں بنتی۔ اس رشتے کے بگڑنے کا سواری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سائیکل والے اکھلیش یادو اور شیوپال یادو کے درمیان جو رشتہ ہے وہی تعلق انجن والے راج ٹھاکرے اور بال ٹھاکرے کے درمیان بھی ہے۔ یہ سارے علاقائی سیاسی دنگل کے سلطان ہیں۔ ان میں سے ایک ہندوتوا کا علمبردار ہے تو دوسرا سماجوادی نظریات کا حامل ہے اس کے باوجود شیوپال کی سائیکل پنچر ہوتی ہے تو ملائم سنگھ کی ہوا نکل جاتی ہے اورایم این ایس کے انجن کا دھواں ادھو کا منہ پر کالک پوت دیتا ہے۔ مذہب و مسلک کا فرق بھی اس رشتے پر اثر انداز نہیں ہوتا مولانا کلب صادق اور مولانا کلب جواد ہوں یا مولانا ارشد

مدنی اور مولانا محمود مدنی ان سب کے دلوں کی یہی مشکل ہے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ جس طرح فواد خان کرن جوہر کیلئے مشکل بن گیا اسی طرح اکھلیش اور لیش پال کے رشتوں کی دراڑ بھی مختار انصاری کے قومی ایکتا دل کو ایس پی میں ضم کئے جانے کے بعد سامنے آیا۔ اکھلیش نے لیش پال کے اس فیصلے کی یہ کہہ کر مخالفت کی کہ مختار کا شمار اترپردیش کے دبنگ سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ عوام کا خیال تو یہ ہے کہ ایس پی کا انتخابی نشان اگر سائیکل نہ ہوتا تو لاٹھی ہوتا۔ جس قدر غنڈے بدمعاش اس پارٹی میں ہیں شاید ہی کسی اور جماعت میں ہوں اس کے باوجود اکھلیش کے ذریعہ مختار انصاری کی مخالفت دراصل لیش پال کے خلاف دھرم یدھ تھا۔ اس کے بعد ملائم کے یار امر سنگھ کی پارٹی میں آمد کو لے کر امر پریم کی داستانِ الف لیلیٰ کچھ ایسے شروع ہوئی ہے کہ کمبخت شیطان کی آنت ختم ہی نہیں ہوتی۔

اس مہابھارت کو دلچسپ بنانے کیلئے اس میں رامائن کو بھی شامل کردیا گیا۔ پہلے تو یہ خبر آئی کہ اکھلیش کی سوتیلی ماں سادھنا اور بیوی ڈمپل میں کچھ کہا سنی ہوگئی اور پھر یہ ساس بہو کی توتو میں میں سے ایک ریاست گیر سیاسی زلزلہ آگیا۔ اس کے بعد منظرنامہ لکھنے والوں نے ایک کہانی میں یہ ٹوِسٹ دیا کہ سوتیلی ماں اکھلیش یادو کو رام کی مانند بن باس پر بھیج کر اپنے

بیٹے پرتیک کو سنگھاسن پر بٹھانا چاہتی ہیں۔ کل یگ میں تو یہ نہیں ممکن نہیں ہے کہ رام کے کھڑاوں تخت پر رکھ کر بھرت کی طرح کوئی ۱۴ سال راج کرے اور پھر شرافت سے اقتدار اپنے سوتیلے بھائی کو سونپ دے۔ آج کا بھرت تو راون سے مل کر اپنے بھائی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے میں بھی نہیں ہچکچائے گا۔

یہ خبر بھی آئی ہے کہ سوتیلی ماں سادھنا نے اپنے سالے شیوپال سے مل کر اکھلیش پر کالا جادو کردیا ہے۔ اس کے بعد کسی تانترک نے انکشاف کیا کہ چچا شیوپال نے انکل امر سنگھ نے مل کر اکھلیش کے خلاف پوجا اور ہون کروایا۔ امر سنگھ بھی اے کے ہنگل کی طرح نہایت جذباتی انٹرویو دیتے پھر رہے ہیں۔ اکھلیش کو اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں جب سارا خاندان ان کی شادی کے خلاف تھا تو وہ اس کے حامی تھے اگر وہ دلال ہیں تو ان کی شادی کی البم میں ہر تصویر کے اندر وہ موجود کیوں ہیں؟ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر اس شاہجہاں اور اورنگ زیب کی جنگ میں میری بلی سے صلح ہوجاتی ہے تو میرا بلیدان کردو۔ چونکہ یہ فیملی ڈرامہ ہے اس لئے اس میں کبھی کردار چیختے چلاتے ہیں تو کبھی روتے دھوتے ہیں لیکن کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ ناظرین کیلئے سماجوادی پارٹی کا تنازع اب چبائے ہوئے بدذائقہ چیونگم کی طرح ہوگیا جو باٹا کے جوتے کی مانند گھستا تو جاتا ہے مگر پھٹنے کا نام نہیں لیتا۔ گھسے پٹے ساز کا یہ بے سرا نغمہ اب رائے دہندگان کی سماعت پر بار بن

چکا ہے اور اگر یہ تار جلد نہ ٹوٹے تو ان کا دماغ پھٹ جائے گے۔

اس درمیان عمرو عیار کے طلسمی زنبیل سے ایک خبر یہ بھی نکل کر آئی کہ یہ ناٹک ایک مہاگٹھ بندھن کی تیاری ہے۔ اترپردیش میں مہاگٹھ بندھن کے سب سے بڑے دشمن ڈاکٹر رام گوپال یادو کو پارٹی سے نکالا جاچکا ہے۔ اب اکھلیش ایک نئی پارٹی بناکر اپنی بوامایاوتی کے ساتھ الحاق کرنے والے ہیں۔ کانگریس ویسے ہی اکھلیش کی ہمنوا ہے اس لئے اسے شامل ہونے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس طرح بہار جیسی صورتحال اترپردیش میں بھی بن جائیگی۔ اس خبر کی تصدیق خود شیوپال یادو نے کی اور اپنے بچوں کی قسم کھا کر اور گنگا جل کو ہاتھ میں لے کر یہ کہنے کی پیشکش کی کہ جب وہ وزیراعلیٰ سے ملنے کیلئے گئے تو انہوں نے نئی پارٹی بناکر کسی جماعت کے ساتھ انتخاب لڑنے کی بات کہی۔ شیوپال کی تقریر کے دوران شور مچانے والے کارکنان سے ملائم نے ڈانٹ کر کہا چاپلوسی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس کے باوجود وزیر مواصلات گلتری پرجاپتی بولے ملائم سنگھ بھگوان شنکر میں (ان کی سواری) نندی بیل اور سی ایم گنیش جی ہیں۔ میں ان کی ساری باتیں مانوں گا نیتاجی کے بتائے ہوئے راستے پر چلوں گا چچا بھتیجے میں کوئی لڑائی نہیں ہے۔ جس جماعت میں ایسے نابینا ابن الوقت لوگ بھرے پڑے ہوں تو ان سے عوام فلاح و بہبود کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟

ہمارے ملک کی سیاست جس طرح معیشت پر انحصار کرتی ہے اسی طرح معیشت میں بھی خوب سیاست کھیلی جاتی ہے۔ ٹاٹا گروپ ۱۴۸ سال پرانا ہے اس کے سابق سربراہ رتن ٹاٹا نے ۲۳ اکتوبر کو کہا کہ عدم رواداری ایک ناسور ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ کدھر سے آرہی ہے ؟ رتن ٹاٹا کے ان الفاظ کو سنتے ہوئے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ عدم رواداری کا زہر خود ان کے اندر کس حدتک سرائیت کرچکا ہے۔ دوسرے دن ٹاٹا سنس کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ ہوئی جس کے اندر ۸ میں ۶ ارکان نے شرکت کی اور اپنے چیرمین سائرس مستری کو برخواست کردیا۔ ۴۸ سالہ سائرس مستری کو چار سال قبل نوعمر اکھلیش یادو کی مانند دریافت کرکے سربراہ بنادیا گیا تھا اور پھر چانک انہیں ہٹا کر ۷۸ سالہ رتن ٹاٹا کو ۳ ماہ کیلئے کارگذار اقتدار سونپ دیا گیا۔ تین سال کی تلاش کے بعد چیرمین بننے والے سائرس کو ہٹانے میں ۳ منٹ بھی نہیں لگے۔

اس میں شک نہیں کہ اس عرصے میں سائرس نے ٹاٹا گروپ کے املاک کو دوگنا کردیا لیکن ان پر کئی سنگین قسم کے الزامات لگا کر بے آبرو کیا گیا اور پھر گھر کا راستہ دکھایا گیا جو بالکل سڑک چھاپ سیاست کا سا عمل تھا۔ ان الزامات میں سے ایک تو یہ ہے وہ صرف منافع کمانے والے اداروں پر توجہ دیتے ہیں یہ تو بالکل فطری امر ہے۔ان کے دور میں ٹاٹا کمپنی کو کئی مقامات پر جرمانہ

بھرنا پڑا جس میں خاص طور امریکہ میں لگنے والا ہرجانہ شامل ہے لیکن اس میں کون سی نئی بات ہے۔ دودھ کا دھلا تو کوئی نہیں ہے اور جب کسی ادارے سے کوتاہی سرزد ہوتی ہے تو اسے سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ٹاٹا گروپ کی ۲۷ میں سے ۹ کمپنی نقصان میں ہیں لیکن ۱۸ فائدے میں بھی تو ہیں۔ وہ سرمایہ کاروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے ۔ سوال یہ ہے کہ کون سرمایہ دار ایسا کرتا ہے؟ اور کیوں کرے؟اور وہ سیکھتے رہتے ہیں یہ تو خوبی ہے ۔اچھاانسان لحد سے مہد تک تک طالب علم ہوتا ہے۔

سائرس مستری پر یہ الزام بھی ہے کہ وہ کمپنی کاڈھانچہ درست نہیں کرسکے، ان میں قوت فیصلہ کی کمی ہے اور ان کے پاس ترقی وتوسیع کا واضح منصوبہ موجود نہیں ہے وغیرہ۔

مستری نے ان تمام الزامات کو مسترد کرتے ہوئے عدالت کا رخ کیا ہے۔ انھوں نے بورڈ کو ای میل لکھ کر اپنے اوپر لگائے جانے والے ہر الزام سے انکار کیا ہے۔ دستور کے لحاظ سے انہیں جو ۱۵ دنوں کا نوٹس ملنا چاہئے تھا اس کے نہ ملنے پر اعتراض کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کمپنی کا جو ناقص ڈھانچہ انہیں وراشت میں ملا اسے وہ مجبوراً ڈھوتے رہے کیونکہ اصلاح کی حوصلہ شکنی کی گئی ۔ ان کو پوری آزادی کے ساتھ کام کرنے کی یقین دہانی کی گئی تھی لیکن ضابطہ میں تبدیلی کرکے اس پر قدغن لگائی گئی اور ان کے اختیارات کو سلب کرکے رتن ٹاٹا کو سونپے گئے نیز ان کو ایک کٹھ پتلی سربراہ

بنادیا گیا۔ جس کو اپنی مرضی سے فیصلے کرنے کا اختیار ہی نہ ہو اس پر قوت فیصلہ میں کمی کا الزام بے معنی ہے۔ جہاں تک منصوبہ بندی کا سوال ہے وہ ۲۰۲۵ تک کا منصوبہ بورڈ کے حوالے کرچکے ہیں اب اگر ارکان بورڈ اسے قبلِ التفات نہ سمجھیں تو اس میں ان کیا قصور؟

ملائم سنگھ یادو، بالا صاحب ٹھاکرے، اندرا گاندھی، اروند کیجریوال، نریندر مودی اور رتن ٹاٹا سب کا مسئلہ اپنے فیملی بزنس کا تحفظ ہے۔ عام آدمی پارٹی کو بنانے اور چلانے میں جس قدر محنت اروند کیجریوال نے کی تھی اس سے کم مشقت یوگیندر یادو اور پرشانت بھوشن نے نہیں اٹھائی تھی لیکن جس طرح ان دونوں کو ذلیل کرکے پارٹی سے نکالا گیا ویسا ہی سلوک سائرس مستری کے ساتھ ہوا۔ رتن اور اروند جیسے اصول پسند سمجھے جانے والے لوگوں نے سارے اصول و ضابطے پامال کئے۔ یہ سب بال بچے والے لوگ ہیں اس لئے اقتدار کے ہاتھ آتے ہی اقرباء پروری میں لگ جاتے ہیں آر ایس ایس نے اس کا یہ حل نکالا کہ اپنے پرچارکوں پر برہماچاریہ کا قانون نافذ کردیا۔ سنگھ کے کئی پرچارکوں نے اس اصول پر عملدرآمد کرنے سے انکار کردیا مثلاً اڈوانی جی نے شادی رچالی لیکن کچھ نے اپنی دھرم پتنی کو تیاگ دیا جیسے نریندر مودی۔ سنگھ کو امید تھی ان جیسے لوگ اقتدار میں آنے کے بعد سنگھ پریوار کا خیال رکھیں گے لیکن وہ حربہ بھی کامیاب نہیں ہوسکا۔

اپنے آپ کو راشٹر سیوک یا سنگھ سیوک کہنے والے نریندر مودی نے بھی سب سے پہلے اپنے محسن لال کرشن اڈوانی کو رسوا کرکے سیاسی بن باس پر بھیج دیااور گجرات سے آنے والے قتل کے ملزم امیت شاہ کو پارٹی کی کمان سونپ دی۔وزیر خزانہ بنانے کیلئے انہیں ناگپور میں کوئی نہیں ملا تو گجرات سے راجیہ سبھا رکن ارون جیٹلی کو بنادیا۔پہلے گجرات کی نا تجربہ کار سمرتی ایرانی کو انسانی وسائل کی وزارت سے نوازہ اور اب ریزرو بنک کی سربراہی کیلئے بھی ۹۰ سالہ سنگھ پریوار بنجر نظر آیا تو اپنے گجرات کے ارجت پٹیل کا انتخاب کیا۔ ہر اہم عہدے کیلئے گجرات نے ناگپور پر فوقیت پائی ۔اس عدم اعتماد کی جڑیں اقتدار کے تحفظ میں پیوست جو اولاد سے اپنے لئے ہوتاہے۔ ٹاٹا گروپ میں بھی یہی ہوا کہ اس کی تاریخ میں دوسری بار ٹاٹا خاندان کے باہر کے کسی فرد کو مسند نشین کیاگیااور ذلیل کرکے ہٹا دیاگیا۔ سیاست اور معیشت کی دنیاکے ان دل والوں کی رنگین مشکل فلم والے کرن جوہر سے سنگین ہے۔

یادو خاندان کیخانہ جنگی اور ٹاٹا گروپ کی مہابھارت

اکھلیش اور لیش پال کے درمیان مہابھارت کا شنکھ مختار انصاری کے قومی ایکتا دل کو ایس پی میں ضم کئے جانے کے بعد پھونکا گیا۔ اکھلیش نے لیش پال کے اس فیصلے کی یہ کہہ کر مخالفت کی کہ مختار کا شمار اترپردیش کے دبنگ سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ عوام کا خیال تو یہ ہے کہ ایس پی کا انتخابی نشان اگر سائیکل نہ ہوتا تو لاٹھی ہوتا۔ جس قدر غنڈے بدمعاش اس پارٹی میں ہیں شاید ہی کسی اور جماعت میں ہوں اس کے باوجود اکھلیش کے ذریعہ مختار انصاری کی مخالفت دراصل لیش پال کے خلاف دھرم یدھ تھا۔ اس کے بعد ملائم کے یار امر سنگھ کی پارٹی میں آمد کو لے کر امرپریم کی داستانِ الف لیلیٰ کچھ ایسے شروع ہوئی ہے کہ کمبخت شیطان کی آنت ختم ہی نہیں ہوتی۔

اس مہابھارت کو دلچسپ بنانے کیلئے اس میں رامائن کو بھی شامل کردیا گیا۔ پہلے تو یہ خبر آئی کہ اکھلیش کی سوتیلی ماں سادھنا اور بیوی ڈمپل میں کچھ کہا سنی ہو گئی اور پھر یہ ساس بہو کی توتو میں میں سے ایک ریاست گیر سیاسی زلزلہ آگیا۔ اس کے بعد منظرنامہ لکھنے والوں نے ایک کہانی میں یہ ٹوِسٹ دیا کہ سوتیلی ماں اکھلیش یادو کو رام کی مانند بن باس پر بھیج کر اپنے

بیٹے پرتیک کو سنگھاسن پر بٹھانا چاہتی ہیں۔ کل یگ میں تو یہ نہیں ممکن نہیں ہے کہ رام کے کھڑاوں تخت پر رکھ کر بھرت کی طرح کوئی ۱۴ سال راج کرے اور پھر شرافت سے اقتدار اپنے سوتیلے بھائی کو سونپ دے۔ آج کا بھرت تو راون سے مل کر اپنے بھائی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے میں بھی نہیں ہچکچائے گا۔

یہ خبر بھی آئی ہے کہ سوتیلی ماں سادھنا نے اپنے سالے شیوپال سے مل کر اکھلیش پر کالا جادو کردیا ہے۔ اس کے بعد کسی تانترک نے انکشاف کیا کہ چچا شیوپال نے انکل امر سنگھ نے مل کر اکھلیش کے خلاف پوجا اور ہون کروایا۔ امر سنگھ بھی اے کے ہنگل کی طرح نہایت جذباتی انٹرویو دیتے پھر رہے ہیں۔ اکھلیش کو اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں جب سارا خاندان ان کی شادی کے خلاف تھا تو وہ اس کے حامی تھے اگر وہ دلال ہیں تو ان کی شادی کی البم میں ہر تصویر کے اندر وہ موجود کیوں ہیں؟ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر اس شاہجہاں اور اورنگ زیب کی جنگ میں میری بلی سے صلح ہوجاتی ہے تو میرا بلیدان کردو۔ چونکہ یہ فیملی ڈرامہ ہے اس لئے اس میں کبھی کردار چیختے چلاتے ہیں تو کبھی روتے دھوتے ہیں لیکن کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ ناظرین کیلئے سماجوادی پارٹی کا تنازع اب چبائے ہوئے بدذائقہ چیونگم کی طرح ہوگیا جو باٹا کے جوتے کی مانند گھستا تو جاتا ہے مگر پھٹنے کا نام نہیں لیتا۔ گھسے پٹے ساز کا یہ بے سرا نغمہ اب رائے دہندگان کی سماعت پر بار بن

چکا ہے اور اگر یہ تار جلد نہ ٹوٹے تو ان کا دماغ پھٹ جائے گے ۔
اس درمیان عمرو عیار کے طلسمی زنبیل سے ایک خبر یہ بھی نکل کر آئی کہ یہ ناٹک ایک مہاگٹھ بندھن کی تیاری ہے۔ اتر پردیش میں مہاگٹھ بندھن کے سب سے بڑے دشمن ڈاکٹر رام گوپال یادو کو پارٹی سے نکالا جاچکا ہے۔ اب اکھلیش ایک نئی پارٹی بناکر اپنی بوامایاوتی کے ساتھ الحاق کرنے والے ہیں ۔ کانگریس ویسے ہی اکھلیش کی ہمنوا ہے اس لئے اسے شامل ہونے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس طرح بہار جیسی صورتحال اتر پردیش میں بھی بن جائیگی ۔ اس خبر کی تصدیق خود شیوپال یادو نے کی اور اپنے بچوں کی قسم کھاکر اور گنگا جل کو ہاتھ میں لے کر یہ کہنے کی پیشکش کی کہ جب وہ وزیراعلیٰ سے ملنے کیلئے گئے تو انہوں نے نئی پارٹی بناکر کسی جماعت کے ساتھ انتخاب لڑنے کی بات کہی۔ شیوپال کی تقریر کے دوران شور مچانے والے کارکنان سے ملائم نے ڈانٹ کر کہا چاپلوسی کے سوا کچھ نہیں آتا ۔ اس کے باوجود وزیر مواصلات گلتری پرجاپتی بولے ملائم سنگھ بھگوان شنکر میں (ان کی سواری) نندی بیل اور سی ایم گنیش جی ہیں ۔ میں ان کی ساری باتیں مانوں گا نیتاجی کے بتائے ہوئے راستے پر چلوں گا چچا بھتیجے میں کوئی لڑائی نہیں ہے۔ جس جماعت میں ایسے نابینا ابن الوقت لوگ بھرے پڑے ہوں تو ان سے عوام فلاح و بہبود کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟

ہمارے ملک کی سیاست جس طرح معیشت پر انحصار کرتی ہے اسی طرح معیشت میں بھی خوب سیاست کھیلی جاتی ہے۔ ٹاٹا گروپ ۱۴۸ سال پرانا ہے اس کے سابق سربراہ رتن ٹاٹا نے ۲۳ اکتوبر کو کہا کہ عدم رواداری ایک ناسور ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ کدھر سے آرہی ہے ؟ رتن ٹاٹا کے ان الفاظ کو سنتے ہوئے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ عدم رواداری کا زہر خود ان کے اندر کس حدتک سرائیت کرچکا ہے۔ دوسرے دن ٹاٹا سنس کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ ہوئی جس کے اندر ۸ میں ۶ ارکان نے شرکت کی اور اپنے چیرمین سائرس مستری کو برخواست کردیا۔ ۴۸ سالہ سائرس مستری کو چار سال قبل نوعمرا کھلیش یادو کی مانند دریافت کرکے سربراہ بنادیا گیا تھا اور پھر چانک انہیں ہٹا کر ۷۸ سالہ رتن ٹاٹا کو ۳ ماہ کیلئے کارگذار اقتدار سونپ دیا گیا۔ تین سال کی تلاش کے بعد چیرمین بننے والے سائرس کو ہٹانے میں ۳ منٹ بھی نہیں لگے۔

اس میں شک نہیں کہ اس عرصے میں سائرس نے ٹاٹا گروپ کے املاک کو دوگنا کردیا لیکن ان پر کئی سنگین قسم کے الزامات لگا کر بے آبرو کیا گیا اور پھر گھر کا راستہ دکھایا گیا جو بالکل سڑک چھاپ سیاست کا سا عمل تھا۔ ان الزامات میں سے ایک تو یہ ہے وہ صرف منافع کمانے والے اداروں پر توجہ دیتے ہیں یہ تو بالکل فطری امر ہے۔ان کے دور میں ٹاٹا کمپنی کو کئی مقامات پر جرمانہ

بھرنا پڑا جس میں خاص طور امریکہ میں لگنے والا ہرجانہ شامل ہے لیکن اس میں کون سی نئی بات ہے۔ دودھ کا دھلا تو کوئی نہیں ہے اور جب کسی ادارے سے کوتاہی سرزد ہوتی ہے تو اسے سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ ٹاٹا گروپ کی ۲۷ میں سے ۹ کمپنی نقصان میں ہیں لیکن ۱۸ فائدے میں بھی تو ہیں۔ وہ سرمایہ کاروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ کون سرمایہ دار ایسا کرتا ہے؟ اور کیوں کرے؟ اور وہ سیکھتے رہتے ہیں یہ تو خوبی ہے۔ اچھا انسان لحد سے مہد تک تک طالب علم ہوتا ہے۔

سائرس مستری پر یہ الزام بھی ہے کہ وہ کمپنی کا ڈھانچہ درست نہیں کرسکے، ان میں قوت فیصلہ کی کمی ہے اور ان کے پاس ترقی و توسیع کا واضح منصوبہ موجود نہیں ہے وغیرہ۔

مستری نے ان تمام الزامات کو مسترد کرتے ہوئے عدالت کا رخ کیا ہے۔ انہوں نے بورڈ کو ای میل لکھ کر اپنے اوپر لگائے جانے والے ہر الزام سے انکار کیا ہے۔ دستور کے لحاظ سے انہیں جو ۱۵ دنوں کا نوٹس ملنا چاہئے تھا اس کے نہ ملنے پر اعتراض کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کمپنی کا جو ناقص ڈھانچہ انہیں وراثت میں ملا اسے وہ مجبوراً ڈھوتے رہے کیونکہ اصلاح کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ ان کو پوری آزادی کے ساتھ کام کرنے کی یقین دہانی کی گئی تھی لیکن ضابطہ میں تبدیلی کرکے اس پر قدغن لگائی گئی اور ان کے اختیارات کو سلب کرکے رتن ٹاٹا کو سونپے گئے نیز ان کو ایک کٹھ پتلی سربراہ

بنادیا گیا۔ جس کو اپنی مرضی سے فیصلے کرنے کا اختیار ہی نہ ہو اس پر قوت فیصلہ میں کمی کا الزام بے معنیٰ ہے۔ جہاں تک منصوبہ بندی کا سوال ہے وہ ۲۰۲۵ تک کا منصوبہ بورڈ کے حوالے کرچکے ہیں اب اگر ارکان بورڈ اسے قبلِ التفات نہ سمجھیں تو اس میں ان کیا قصور؟

ملائم سنگھ یادو، بالا صاحب ٹھاکرے، اندرا گاندھی ،اروند کیجریوال ، نریندر مودی اور رتن ٹاٹا سب کا مسئلہ اپنے فیملی بزنس کا تحفظ ہے۔ عام آدمی پارٹی کو بنانے اور چلانے میں جس قدر محنت اروند کیجریوال نے کی تھی اس سے کم مشقت یوگیندر یادو اور پرشانت بھوشن نے نہیں اٹھائی تھی لیکن جس طرح ان دونوں کو ذلیل کرکے پارٹی سے نکالا گیا ویسا ہی سلوک سائرس مستری کے ساتھ ہوا۔ رتن اور اروند جیسے اصول پسند سمجھے جانے والے لوگوں نے سارے اصول و ضابطے پامال کئے۔ یہ سب بال بچے والے لوگ ہیں اس لئے اقتدار کے ہاتھ آتے ہی اقرباء پروری میں لگ جاتے ہیں آر ایس ایس نے اس کا یہ حل نکالا کہ اپنے پرچارکوں پر برہما چاریہ کا قانون نافذ کردیا۔ سنگھ کے کئی پرچارکوں نے اس اصول پر عملدرآمد کرنے سے انکار کردیا مثلاً اڈوانی جی نے شادی رچالی لیکن کچھ نے اپنی دھرم پتنی کو تیاگ دیا جیسے نریندر مودی۔ سنگھ کو امید تھی ان جیسے لوگ اقتدار میں آنے کے بعد سنگھ پریوار کا خیال رکھیں گے لیکن وہ حربہ بھی کامیاب نہیں ہوسکا۔

اپنے آپ کو راشٹر سیوک یا سنگھ سیوک کہنے والے نریندر مودی نے بھی سب سے پہلے اپنے محسن لال کرشن اڈوانی کو رسوا کرکے سیاسی بن باس پر بھیج دیااور گجرات سے آنے والے قتل کے ملزم امیت شاہ کو پارٹی کی کمان سونپ دی۔ وزیر خزانہ بنانے کیلئے انہیں ناگپور میں کوئی نہیں ملا تو گجرات سے راجیہ سبھا رکن ارون جیٹلی کو بنادیا۔ پہلے گجرات کی نا تجربہ کار سمرتی ایرانی کو انسانی وسائل کی وزارت سے نوازہ اور اب ریزرو بنک کی سربراہی کیلئے بھی ۹۰ سالہ سنگھ پریوار بنجر نظر آیا تو اپنے گجرات کے ارجت پٹیل کا انتخاب کیا۔ ہر اہم عہدے کیلئے گجرات نے ناگپور پر فوقیت پائی ۔اس عدم اعتماد کی جڑیں اقتدار کے تحفظ میں پیوست جو اولاد سے اپنے لئے ہوتا ہے۔ ٹاٹا گروپ میں بھی یہی ہوا کہ اس کی تاریخ میں دوسری بار ٹاٹا خاندان کے باہر کے کسی فرد کو مسند نشین کیاگیااور ذلیل کرکے ہٹا دیاگیا۔ سیاست اور معیشت کی دنیاکے ان دل والوں کی رنگین مشکل فلم والے کرن جوہر سے سنگین ہے۔

بھوپال سے دہلی: سنو کہ دھرتی اجاڑنے والے مجرموں کا حساب ہوگا

بھوپال انکاونٹر اس قدر بھونڈے انداز میں کیا گیا کہ پہلے تو سوشل میڈیا پر وہ جھوٹ کھلا اور پھر اس کے الٹرانک میڈیا سمیت پرنٹ میڈیا میں بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا اور اب سے یہ خبر بھی آگئی کہ جیل کی حفاظت کرنے والے نصف اہلکار وزراء اور افسران کی خدمت میں تعینات ہیں۔ بھوپال انکاونٹر اپنی تمام تر بہیمیت کے باوجود ساری دنیا میں ملک و قوم کی جگ ہنسائی کا سامان بنا ہوا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ نے حیرت سے سوال کیا کہ کسی خطرناک جیل میں قیدی رکابی سے چوکیدار کو کیسے قتل کر سکتے ہیں ؟ ۳۲ فٹ اونچی دیوار کو چادر کی مدد سے پھلانگ کر قیدی دو بیگ سمیت کیسے فرار ہو سکتے ہیں ؟ جیل سے نکلتے ہی قیدیوں کو اسلحہ ، جوتے اور کپڑے کیسے فراہم ہوجاتے ہیں؟ وہ ایک گنجان آبادی والے شہر میں بہ آسانی روپوش ہونے کے بجائے ویران جنگل کا رخ کرنے کیوں کرتے ہیں؟ اور ایک دوسرے کا ساتھ کیوں نہیں چھوڑتے؟ بی بی سی پریشان ہے کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں لوہے کے تالوں کو لکڑی کی چابی سے کیسے کھولا جاسکتا ہے؟ دروازوں کے نقلی چابی سے کھلنے پر الارم نہیں بجتا؟رات کے دوبجے چوکیدار کی ڈیوٹی بدلتی ہے؟نگرانی کرنے والے کیمرے اچانک بند ہوجاتے ہیں ؟ انکاونٹر کی ویڈیو میں ظالموں اور

مظلوموں کے جوتے تو ایک جیسے نظر آتے ہیں مگر ان کا انجام یکساں نہیں ہوگا اس لئے کہ بقول شاعر ؎

اک روز یہ منظر بدلے گا، یہ دورِ خزاں مٹ جائے گا
اک دن یہ نظامِ ظلم وستم خود ظالم کو رُلوائے گا

سیاسی منظر نامہ کی یکایک تبدیلی دیکھیں کہ بی جے پی اس ظلم کو اپنے حق میں بھنوا کر سیاسی روٹیاں سینکنے سے فارغ بھی نہیں ہوئی تھی کہ دہلی میں ایک سبکدوش فوجی رام کشن نے خودکشی کرکے زعفرانیوں کی دیش بھکتی کو بے نقاب کرکے فوجیوں کے ساتھ دیوالی کی مٹھائی کھانے والے پاکھنڈی وزیراعظم کے چہرے کا مکھوٹا نوچ کر پھینک دیا۔ سابق صوبیدار رام کشن گریوال کی خودکشی سے اوروپ پر عملدرآمد کے کھوکھلے دعویٰ کی قلعی کھل گئی۔ دادری جاکر ایک قتل کے ملزم کی ارتھی کو ترنگے میں لپیٹنے والے مرکزی وزیر کو توفیق نہیں ہوئی کہ دہلی میں رام کشن کے پسماندگان کی تعزیت کرے بلکہ ان سفاکوں نے تو وہاں جانے والوں راہل گاندھی، مہیش سسودیہ اور اروند کیجریوال تک کو حراست میں لے لیا۔ مرحوم کے اہل خانہ کو گرفتار کرکے مارپیٹ اور گالم گلوچ کی گئی ۔ کیا ایسے ینازک موقعہ پر ایک سابق فوجی کے اہل خانہ کے ساتھ یہ سلوک دیش بھکتی ہے؟

ایک ایسے وقت میں جبکہ فسطائی حکومت اپنی دیش بھکتی کا ڈھول پیٹ رہی تھی یہ واقعہ ان پر عذاب کا کوڑا بن کر برس پڑا۔ مشیت کی ایک چال نے ان کے مکرو فریب کا جال تار تار کردیا۔ ساری دنیا کو پتہ چل گیا کہ سرجیکل اسٹرائیک کی سیاست کرنے والوں نے اس کے اگلے ہی دن فوجیوں کو معذوری پر ملنے والی پنشن میں بھاری کٹوتی کردی ۔سول سروس کے مقابلہ ان کا عہدہ گھٹا دیا۔اس ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان دینے والے فوجی کے غمگین پسماندگان کے زخموں پر پہلے تو وزیرداخلہ راج ناتھ سنگھ نے یہ کہہ کر نمک چھڑکا کہ جو ضروری تھا پولس نے وہی کیااور پھر نائب وزیر خارجہ اور سابق فوجی سربراہ وی کے سنگھ نے فیس بک پر اپنے تاثرات لکھ کر انسانی ہمدردی کی ساری حدود قیود کو ایک ایک کرکے ایسے پامال کیا کہ فوج سمیت سارے شہریوں کا سر شرم سے جھک گیا۔ وی کے سنگھ نے جو کچھ لکھا اس کا بھوپال انکاونٹر سے موازنہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بھوپال کے معاملے میں بی جے پی رہنماوں کو شکایت ہے کہ ہر معاملے پر سوالات نہیں اٹھائے جانے چاہئیں۔انکاونٹر کی تفتیش کا مطالبہ نامعقول ہے لیکن وہ رام کشن گریوال کی خودکشی کی تحقیقات کرنے کے حق میں ہے۔ موت سے قبل رام کشن نے اپنے بیٹے جسونت سے فون پر بات کی جس کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ میں جواہر بھون (یعنی وزارت دفاع کے دفتر) میں ہوں اور میں

نے زہر کھالیا ہے۔ میں اپنے جوانوں اور دیش کیلئے بلیدان دے رہا ہوں ۔ جوانوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے جو افسوسناک ہے۔ اس واضح بیان کے بعد شکوک و تحقیق کیا معنی؟ وی کے سنگھ نے گھڑیالی آنسو کے بعد لکھا ۹۰ فیصد خود کشی کے پس پشت نفسیاتی عوامل ہوتے ہیں جسے ڈپریشن کہتے ہیں۔ یہ خود کشی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔اس طرح وی کے سنگھ نے رام کشن کی دماغی حالت کو مشکوک بنا دیا حالانکہ اس شخص کو ایک مرتبہ فوجی جنرل کے ہاتھوں اور دو مرتبہ صدر مملکت کے دست مبارک سے تمغۂ امتیاز مل چکا ہے ۔ ان میں سے ایک فوج کی ملازمت کے دوران اور دوسرا سبکدوش ہونے کے بعد بہترین سرپنچ کا انعام ہے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ کس کی فریب کاری نے رام کشن کو خود کشی پر مجبور کیا ؟ لیکن وی کے سنگھ اس سوال سے راہِ فرار اختیار کرکے یہپتہ لگانا چاہتے ہیں کہ ان کی نفسیاتی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر کس نے انہیں خود کشی کیلئے آمادہ کیا یا اکسایا ؟ یہی سوال تو انکاونٹر کرنے والے پولس والوں کے متعلق بھی کیا جاسکتا ہے کہ آخر کس نے انہیں گرفتار کرنے کے بجائے گولی چلانے پر آمادہ کیا اور اس کا حکم دیا؟ وی کے سنگھ اپنے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں اس کا جواب نفسیات میں نہیں بلکہ سیاست میں پوشیدہ ہے۔ انکاونٹر پر سیاست سے پرہیز کا درس دینے والے اور خود کشی پر سیاست کرنے والوں کا یہ دوغلا

رویہ حیرت انگیز ہے۔ وی کے سنگھ کو معلوم کرنا چاہئے کہ وہ کون سی شیطانی نفسیات ہے جو معصوموں کے خون کی ہولی کھیل کر اس پر خوشیاں مناتی ہے۔

وی کے سنگھ نے اپنی دلچسپ تحریر میں لکھا ہے کہ ''ہمارے دیش کی سیاست کچھ سیاسی گِدھوں کو راس آرہی ہے'' اس جملے کا اطلاق رام کش کی خودکشی پر نہیں بلکہ سیدھے سیدھے بھوپال انکاونٹر پر ہوتا ہے جہاں نام نہاد دیش بھکت لاشوں کا بیوپار کر رہے ہیں۔ وی کے سنگھ کو سرکار پر الزام تراشی کا ملال تو ہے لیکن اس سرکاری دہشت گردی پر افسوس نہیں کہ جس میں ایسے ان نوجوانوں کو موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے جن پر ہنوز کوئی الزام ثابت نہیں ہوا۔ سنگھ کے مطابق تفتیش کو گمراہ کیا جاتا ہے تو کیا وزیر اعلیٰ چوہان کا انکاونٹر کے بجائے فرار کی تحقیق پر اصرار گمراہی نہیں ہے؟ بی جے پی تحقیق سے اس لئے خوفزدہ ہے کہ اس قدر واضح ویڈیوز تحقیق کے بجائے ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ کاش کہ اوچھی سیاست سے پرہیز کی تلقین کرنے والے وزیر مملکت وی کے سنگھ کو بھوپال جیل میں مرنے والے حوالدار رما شنکر یادو کے گھر پر سستی شہرت کا کھلواڑ بھی نظر آجاتا۔

بھوپال انکاونٹر میں ۸ نہیں بلکہ ۹ لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ حوالدار رما شنکر یادو اس قتل عام کا پہلا شکار تھا دیگر ۸ بے قصور مسلم

نوجوانوں کے وکیل تہور خان کا دعویٰ ہے کہ وہ عنقریب رہا ہونے والے تھے ۔ تہور خان انکاونٹر کے خلاف عدالت سے انصاف کی گہار لگا کر قاتلوں کو سزا دلانے کا عزم و ارادہ رکھتے ہیں۔ جسٹس کاٹجو نے انکاونٹر میں ملوث لوگوں کیلئے سزائے موت کا مطالبہ کیا ہے۔ حولدار ما شنکر یادو کی عمر ۵۸ سال تھی اور وہ دل کا مریض تھا اس کے باوجود اس کو رات کی ڈیوٹی پر تعینات کیا گیا تھا۔ رما شنکر کے بڑے بیٹے پر بھو شنکر نے الزام لگایا کہ جیل کی ڈیوٹی پیسے لے کر لگائی جاتی ہے۔ مریض ہونے کے باوجود ان کے والد کو بار بار رات کی ڈیوٹی دی جاتی تھی جس کی وہ شکایت بھی کر چکے تھے۔ ایک ماہ بعد چھوٹی بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف حوالدار پر کسی کو رحم نہیں آیا جو بلی چڑھا دیا۔ اب وزیر اعلیٰ ان کے گھر جا کر ٹی وی کیمرے کے آگے دکھاوے کے ٹسوے بہا رہے ہیں ۔ رما شنکر کے گھر والوں کو انعام و اکرام سے نوازہ جارہا ہے مگر رام کشن کے پسماندگان کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اس لئے کہ بقول وی کے سنگھ وہ کانگریسی تھے۔ خود اپنی قوم کی پولس اور فوجیوں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کرنے والی سرکار سے بھلا کوئی غیر کیا توقع کر سکتا ہے؟

ملیانہ سے بھوپال تک کے انکاونٹرس اور ان کا حل

بھوپال انکاونٹر کا جعلی ہونا تو اظہر من الشمس ہے لیکن اس کے روک تھام کی تدابیر پر گفتگو بہت کم ہوئی ہے۔ ملیانہ سے لے جامعہ تک اس طرح کے واقعات کانگریسی حکومت میں بھی ہوئے اس لئے اسے صرف بی جے پی تک محدود کردینا مناسب نہیں ہے۔ اس طرح کے سانحات کی بنیادی وجہ سیاستدانوں کا پولس فورس پر مکمل تسلط ہے ۔ جامعہ انکاونٹر کی طرح بھوپال میں بھی پولس کا استعمال قاتل اور مقتول دونوں حیثیتوں سے ہوا ہے۔ اردو کے ایک مشہور شاعر آنند نرائن ملا نے جو الہ باد ہائی کورٹ میں جج بھی تھے اپنے ایک تاریخی فیصلے میں لکھا تھا" ملک میں کوئی ایک بھی غیر قانونی گروہ ایسا نہیں جس کے جرائم کا ریکارڈ انڈین پولس فورس نامی منظم اکائی کے قریب تک پھٹکتا ہو ۰۰۰۰ اترپردیش کی پولس فورس مجرموں کا ایک منظم گروہ ہے"۔ آنند نرائن نے نصف صدی قبل جو بات اترپردیش کی پولس کی بابت کہی تھی وہ آج ملک بھر میں لاگو ہوتی ہے۔

آنند نرائن ملا کے اس تبصرے سے مقننہ اور انتظامیہ میں بھونچال آگیا تھا مگر اعتراضات کو مسترد کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا"جہاں تک اس شکایت کا سوال

ہے کہ یہ تبصرہ بہت عمومی نوعیت کا ہے، اس کے پس پشت یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ یہ برائی اسی قدر عام نہیں ہے۔ ان دونوں کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ تبصرے کی بہ نسبت برائی زیادہ پھیلی ہوئی اور عام ہے۔'' آنند نرائن ملا کے دلیرانہ موقف کی روشنی میں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ پولس جن سیاستدانوں کی خوشنودی کے حصول کیلئے یا جن کے اشارے پر جرائم کا ارتکاب کرتی ہے وہی اس گروہ کے حقیقی سرغنہ ہیں۔ بھوپال انکاونٹر کا موازنہ ہر انصاف پسند مبصر نے سہراب الدین، پرجاپتی اور عشرت جہاں انکاونٹر سے کیا جس کے کرتا دھرتا امیت شاہ اور مودی جی ہیں۔ عوام کے ووٹ لے کر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ان سیاستدانوں کا ظالمانہ سلوک خود آنند نرائن ملا اس شعر کی مصداق ہے۔

اب بن کے فلک زاد دکھاتے ہیں ہمیں آنکھ
ذرے وہی کل جن کو اچھالا تھا ہمیں نے

عدالتوں نے مسلسل اس جانب توجہ دہانی کا کام کیا ہے۔ ۱۹۸۰ میں ایک عدالتی فیصلے کے اندر جسٹس کرشنا ایئر اور پریم شنکر شکلا نے کہا تھا کہ '' اگر آج ایک فرد کی آزادی کسی ایک مقام پر پولس کی زیادتی کی زد میں آتی ہے تو کل کسی اور مقام پر کئی لوگوں کی آزادی سلب ہو جائیگی اور کوئی اف تک نہیں کرے گا الّا یہ کہ عدالت بروقت بیدار ہو اور پولس کی نگرانی کرے اس سے

پہلے بہت دیر ہو جائے''۔ جسٹس ائیر نے تو صرف عوامی بے حسی کا ذکر کیا تھا کہ وہ خاموش تماشائی بنے رہیں گے لیکن اب معاملہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ نام نہاد دیش بھکت اس طرح کے ظلم جبر پر علی الاعلان بغلیں بجاتے ہیں۔ اس فیصلے میں درج 'پولس کی پولسنگ' ضرب الشلت تو بن گئی مگر افسوس کہ اس جانب کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۱ کے اندر نڈیاد میں پولس نے چیف جوڈیشیل افسر کو گرفتار کرکے زدو کوب کیا۔ اس مقدمہ کے فیصلے میں تسلیم کیا گیا کہ '' امن وامان کی بحالی میں پولس افسران اور فورس کی زیادتی کے خلاف تنقیدی عدالتی مشاہدات بے اثر ہوتے جارہے ہیں''۔

جسٹس فیضان الدین نے ۱۹۹۵ میں ایک فیصلے میں رقمطراز ہیں ''یہ سب جانتے ہیں کہ فی الحال انتظامیہ ایک نہایت عملی دور سے گذر رہا ہے۔ خاص طور پر پولس کا محکمہ ویسا موئثر نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہئے''۔ انہوں نے خبردار کیا تھا کہ ''اگر عملی اصلاحی اقدامات فوراً نہیں کئے گئے تو پورے مہذب سماج کا نظم و نسق خطرے میں پڑ جائے گا۔ عوام میں اگر یہ تاثر عام ہو جائے کہ پولس سماج کے فائدے کیلئے نہیں بلکہ اپنے مفاد میں کام کرتی ہے تو وہ بہت ہی افسوسناک دن ہوگا۔ اس تاثر کے عام ہونے کے نتائج نہایت تباہ کن ہوں گے۔'' فیصلے میں آگے یہ بھی کہا گیا کہ ''ہر صبح اخبارات میں پولس کے ذریعہ حراست کے اندر عصمت دری، موت، اغواء، جعلی انکاونٹر اور دیگر جرائم کی مثالیں

پڑھ کر غصہ بھی آتا ہے اور مایوسی بھی ہوتی ہے''۔

ہمارے ملک میں پولس محکمہ کے حقوق اور ذمہ داریاں اب بھی انگریزوں کے ترتیب دیئے گئے پولس ایکٹ ۱۸۶۱ کے مطابق ہیں۔ اس سلسلے میں دس سال قبل سپریم کورٹ نے پولس فورس کو سیاسی مداخلت سے پاک کرنے کیلئے اور اس کی کارکردگی میں بہتری لانے کیلئے جو ہدایات دی تھیں وہ اب بھی نافذالعمل ہونے کی منتظر ہیں۔ اس فیصلے میں نامور اور آزاد ارکان پر مشتمل ایک صوبائی امن و سلامتی کے کمیشن کی تجویز پیش کی گئی تھی جس میں حزب اختلاف کا رہنما بھی شامل ہو۔ کمیشن کی ذمہ داری پولس کی کام کاج کی نگرانی اور جائزہ تھی۔ اسی کے ساتھ پولس فورس کی رہنمائی اور پولس افسران کے کیریئر کو وزیر کے بجائے اپنے ہاتھ میں لے کر انہیں ریاستی حکومت دباو سے محفوظ کرنے کاکام بھی اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے میں کہا گیا تھا کہ اس کمیشن کا سربراہ وسیع النظر، زیرک اور تجربہ کار دانشور ہو جو آزادانہ فیصلے کرے اور جس کا تعلق پولس کے محکمہ سے نہ ہو۔ ملک کی موجودہ صورتحال کے اندر اس طرح کے انکاونٹرس پر قابو پانے میں اس فیصلے پر عملدآمد بڑی حد تک کارآمد ہو سکتا ہے لیکن اس بات کا امکان کم ہے کہ ہمارے حکمراں اپنے اختیارات میں کمی برداشت کرکے مفادِ عامہ میں اس پر راضی ہو جائیں۔

اس طرح کی قتل و غارتگری کئی بار انتخابی سیاست کی ضرورت بن جاتی ہے۔ شیوراج چوہان اس سے قبل تین مرتبہ انتخاب جیت چکے ہیں ۔پہلے وقت ان کی مقبولیت اتنی زیادہ تھے کی انہیں اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن طویل عرصہ اقتدار میں رہنے کے سبب ان کے تئیں عوامی مایوسی فطری ہے ۔ اسی کے ساتھ ویاپم گھوٹالے نے انہیں خوب بدنام کیا ہے۔ اس بدعنوانی کی بدنامی سے بچنے کیلئے انھوں نے کئی سماجی کارکنان اور صحافیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتروایا۔ اس رویہ نے انہیں ایک خونخوار سیاستداں بنادیا ہے۔ اب بے قصور مسلم نوجوانوں کو دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف سفاکی کا مظاہرہ کرکے وہ اپنے بدظن ہندو رائے دہندگان کی خوشنودی کا سامان کررہے ہیں ۔

شیوراج چوہان کو یہ خوش فہمی ہوسکتی ہے کہ اس طرح کی سفاکی انہیں اپنی جماعت میں مودی ثانی بنادے گی اور اگر کسی سبب سے مودی جی کی درمیان ہی میں چھٹی ہوجائے تو ان کے بھاگ کھل جائیں گے لیکن سیاست کی دنیا میں سب کچھ توقع کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ دیکھتے دیکھتے بازی الٹ جاتی ہے۔ چین سے شکست کے باوجود کانگریس اقتدار سے محروم نہیں ہوئی مگر پاکستان کو توڑ کر بنگلہ دیش کے بنا دینے کے باوجود ایمرجنسی لگانے کی حماقت نے اندراجی الیکشن میں شکست سے دوچار کردیا۔ گولڈن ٹمپل پر چڑھائی کی قیمت انہیں جان دے کر چکانی پڑتی ہے۔ رام رتھ یاترا نکال کر وزیراعظم بننے کا خواب دیکھنے والے اڈوانی

جی فی الحال سیاسی حاشیہ پر بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں اور گجرات فساد کا سوتر دھار وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھ کر آئے دن ہاتھ آنے والی ذلت و رسوائی کے ذریعہ اپنے قرار واقعی انجام کی جانب رواں دواں ہے۔ شیوراج سنگھ چوہان جیسے چیونٹی صفت ظالموں کو یاد رکھنا چاہئے کہ

کٹا ہے جب بھی شہیدانِ معرفت کا گلا
مِٹی ہے قیصر و افراسیاب کی تاریخ
لہو میں ڈوب چکا ہے قلم مورخ کا
لکھے گا وقت پھر اک انقلاب کی تاریخ

خود اپنی آگ میں اہلِ فساد جلتے ہیں اجل جب آتی ہے چیونٹی کے پر نکلتے ہیں

کالے چوہے کھا کر سفید بلی حج کو چلی ۹۰۰

ساری دنیا کی نگاہیں جس وقت امریکی انتخاب پر لگی ہوئی تھیں اور تشویش تھی کہ کہیں امریکہ کی عظیم ترین جمہوریت بھی ہندوستان کے مودی اور فلپائن کے بدنام زمانہ ڈیٹرائیٹ کی طرح ٹرمپ کو اقتدار سے نہ نواز دے بھارت میں ایک ایسا

دھماکہ رونما ہوا کہ جس نے ٹرمپ کی کامیابی کو مات دے دی ۔ چہار جانب سے مسائل میں گھری ہوئی ناکام و نامراد مودی سرکار کے کالے دھن کے خلاف چھیڑے گئے دھرم یدھ نے ہر خاص و عام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۰۰۰اور ۵۰۰ کے نوٹوں پر پابندی نے پہلے تو دنیا بھر کے مغالطوں سے عوام کی نیند حرام کی اور اس کے بعد بے انتہا بد نظمی کے مظاہرے نے جینا دوبھر کر دیا۔پابندی کے بعد اے ٹی ایماور بنکوں پر لگے قفل سرکار کی عقل پر پڑے ہوئے تالوں کے غماز تھے جن کو لکڑی کی کنجی سے بھی نہیں کھولا جاسکتا۔ ایسے میں عوام کا غم غلط کرنے کی خوشگوار ذمہ داری کسی حدتک سوشیل میڈیاکے لطیفوں نے ادا کی۔

اس معاملے میں میرے اپنے تجربات بھی لطائف سے کم دلچسپ نہیں تھے۔ مجھے دہلی کے اندر ایک ہاسٹل میں غمخوار پڑوسی نے جب یہ اطلاع دی تومیں یہ مضمون لکھ رہا تھا۔ اس نے کہا ۱۲ بجنے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں چلو کسی اے ٹی ایم

کے کچھ رقم نکال کرلاتے ہیں ورنہ کل بغیر سحر و افطار کے روزہ رکھنا پڑے گا۔ میں نے جواب دیا کہ اس سردی میں میرے لئے باہر جانا مشکل ہے اس لئے میرے لئے بھی دوچار سو نکال کرلے آو تو نوازش ہوگی۔ موسم تو بس بہانہ تھا اصل رکاٹ سستی تھی خیر دو گھنٹے بعد جب وہ دوست تھکاماندہ لوٹا تو میں نے بڑی امید سے سوال کیا بھائی کچھ ب ہوا کیا؟ وہ خالص بہیا انداز میں بولا کھایا پیا کچھ نہیں گلاس پھوڑا بارہ آنہ ۔ مودی جی کے فیصلے کی طرح یہ معمہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میرے استفسار پر اس نے اپنی داستانِ الم یوں بیان کی کہ پہلے تو طویل قطاروں سے سابقہ پڑااور اس کٹھن مرحلے سے گزرنے کے بعد جب مشین کو دو ہزار روپئے دینے کا حکم دیا تو اندر سے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکل آئے ۔ میں نے کہا میرے دوست ہو کر بھی آخر تم بے وقوف ہی نکلے۔ چار سو روپئے نکالتے تو مشین ۱۰۰ کے نوٹ دینے پر مجبور ہوجاتی ۳۰۰ تم رکھ لیتے اور ۱۰۰ مجھے دے دیتے دونوں کا کام چل جاتا۔ وہ بولا میں نے کئی مشینوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر ہر کسی نے معذوری کا اظہار کر دیا اس لئے کہ مجھ سے پہلے ہی اور تیز طرار لوگ ان پر ہاتھ صاف کرچکے تھے۔

اپنے ہمسائے کی ناکامی سے میں اسی طرح خوش ہوا جیسے کہ پڑوسی ملک کے خسارے سے ہر بھارت واسی باغ باغ ہوجاتا ہے۔ میں مودی سرکار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی نااہلی اور

کابلی کو دانشمندی قرار دیتے ہوئے بولا مجھے پتہ تھا یہی ہوگا حالانکہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ یہ تو ایسا ہی انکشاف ہے کہ جیسے اچانک بھارت واسیوں کو اچانک پتہ چل گیا کہ ڈونالڈ ٹرمپ کی کامیابی کا سوتردھار ہندوستان کا رہنے والا اویناش ہے۔ جس نے اب کی بار ٹرمپ سرکار کے جادوئی نعرے سے ہیلری کی کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا۔
اس زلزلے کا دوسرا جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب ٹیکسی والے نے ۵۰۰ کا نوٹ لے کر مجھے ہوائی اڈے لے جانے سے انکار کردیا حالانکہ ہاسٹل سے ایئرپورٹ کا واجبی کرایہ صرف ۴۰۰ تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا جب میں نے ہوائی اڈے تک ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنے کا ارادہ کیا تو ایک اور دوست کو مجھ پر رحم آگیا اور اسنے بتایا کہ شام میں کسی صاحب کو لانے کیلئے ایک گاڑی ہاسٹل سے ہوائی اڈہ جارہی ہے اس لئے اگر ڈرائیور کے ساتھ میں نکل جاوں تو ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ آجائیگا چوکھا جیسے کہ نوٹوں کی پابندی سے آرہا ہے۔ راستے میں مجھے ایک صاحب نے ترکیب سجھائی کہ ہوائی اڈے پر نوٹوں کا تبادلہ ہوجاتا ہے اس لئے میں وہاں سے سعودی ریال یا ڈالر خرید لوں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مودی جی کرپا سے ایئرپورٹ کے اندر اپنے گیٹ تک جتنے بھی ایکسچینج مجھے ملے سب کے سب اے ٹی ایم مشینوں کی مانند ویران پڑے تھے۔ بقول افتخار راغب ترمیم میں معذرت کیساتھ ؎

آپ کی نظر کرم کا شکریہ ،اے ٹی ایم سنسان ہو کر رہ گئے
کی نوٹ والے سارے لوگ ، بے سروسامان ہو کر رہ گئے ۵۰۰
میری کاہلی و قنوطیت میرے پیروں کی زنجیر بن گئی اور اس سے پہلے کہ میں تھک کر بیٹھتا مجھے ہوائی اڈے کی عمارت میں ہلدی رام کی ایک شاندار مٹھائی کی دوکان نظر آگئی۔
میں مودی جی کی طرح اپنی پیٹھ تھپتھپا کر ہلدی رام کی دوکان میں یہ سوچ کر داخل ہوگیا کہ اس مرتبہ خلاف عادت اپنے دوست احباب کیلئے ان بیکار کے نوٹوں سے مٹھائی خرید لوں گا تاکہ ان کی خاطر مدارات کا کچھ تو کفارہ ادا ہوسکے۔ مٹھائی کے چار ڈبے اٹھا کر جب میں ادائیگی کیلئے کاونٹر پر پہنچا تو وہاں موجود ملازم نے مجھ سے کہا صاحب ہم قانون کے پابند ہیں اس لئے پابندی لگے نوٹ نہیں لے ت ۔ میں نے یاد دلایا بھائی تم ہوائی اڈے پر ہو جسے بذاتِ خود راجہ جی نے مستثنیٰ قرار دیا ہے اگر انکار کروگے تو میں چغلی کروں گا۔ اس نے ڈھٹائی سے کہا صاحب مجھے ہلدی رام جی تنخواہ دیتے ہیں مودی جی نہیں اس لئے میں اپنے مالک کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ آپ جس سے چاہیں میری شکایت کریں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
وزیراعظم کی کھلے عام توہین میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی میں بولا بھائی یہ تو گزٹ میں بھی لکھا ہے پردھان سیوک کی نہ سہی تو کم از کم دستوری احکامات کا

تو احترام کرو۔ وہ بولا صاحب آپ نے شاید گزٹ کو نہیں پڑھا یہ اجازت صرف سرکاری ہوائی کمپنی کے لئے ہے ہمارے لئے نہیں ۔ میں نے کہا وہاں تو کوئی موجود ہی نہیں ہے تو اس نے مسکرا کر جواب دیا جناب سرکار بھی ہر جگہ موجود تو ہے لیکن کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ ان کا نہیں آپ کی اپنی نظر کا قصور ہے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا میں جھنجھلا کر کہا تو اب میں اس مٹھائی کا کیا کروں ؟ وہ بولا آپ اس کی ادائیگی کریڈٹ کارڈ سے کردیں میں بولا بھائی ہم جیسے غریب کی کوئی کریڈٹ نہیں ہوتی اس لئے ہمیں کوئی بنک کریڈٹ کارڈ نہیں دیتا۔ وہ بولا کوئی بات نہیں صاحب آپ باہر جارہے ہیں آپ کے پاس غیر ملکی کرنسی تو ضرور ہوگی اسی سے ادائیگی کردیں۔ یہ تجویز سن کر میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ میں نے کہا بھائی میں ایک محب وطن شہری ہوں ۔ میرے پاس ہندوستانی کرنسی ہے اب ایسے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں کسی دوسرے ہندوستانی کو بھارت ماتا کی پاون دھرتی پر ودیشی کرنسی میں ادائیگی کروں ۔ وہ پھر مسکرایا اور بولا جناب دیش بدل رہا ہے آگے نکل رہا ہے اس لئے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

میں جدہ جانے والی فلائیٹ کے انتظار میں سوچ رہا تھا کہ کالا دھن اور نقلی نوٹ جس کے خاتمہ کیلئے ہماری سرکار مشقت کررہی ہے وہ سعودی عرب اور امارات میں کیوں نہیں ہوتے جبکہ ہمارے ملک میں دنیا کا سب اچھا جمہوی نظام نافذ ہے

اور ہماری تہذیب و ثقافت پر فخر جتانے سے ہم کبھی نہیں تھکتے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کا ۹۰ فیصد کالا دھن غیر ملکی بنکوں میں ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ کے نوٹوں کی شکل میں نہیں بلکہ ڈالر کی کرنسی میں جمع ہے جو دس فیصد ہندوستان کے اندر ہے اس کے صرف ۳ فیصد کی لاگت کے ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ کے نوٹ ہیں۔ یعنی اگر سارے نوٹ بلیک مان لئے جائیں تب بھی یہ ۳ فیصد ہی ہوتے ہیں حالانکہ یہ ناممکن ہے اس لئے اس مشقت کے نتیجے میں جملہ کالے دھن کا صرف ایک فیصد باہر آئے گا باقی سب یونہی چھپا کا چھپا رہ جائیگا۔

حکومت کے اس قدم سے چونکہ روپے کے مقابلے ڈالر کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے اس لئے اس کالے دھن کی قدرو قیمتبھی اپنے آپ بڑھ گئی ۔ حوالہ والوں کے بھی وارے نیارے ہوگئے۔ انتخاب سے قبل سوئزرلینڈ سے کالے دھن کی واپسی کے خواب دکھلائے گئے تھے لیکن اب وہ انتخابی جملہ بازی میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ جرمن حکومت نے توپیشکش کی تھی کہ اگر حکومت ہند گزارش کرے تو وہ ان سرمایہ داروں معلومات فراہم کرسکتی ہے جن کی دولتباہر جمع ہے لیکن حکومت اپنے ہی خواہوں کو ناراض کرنے کی غلطی کیسے کرسکتی تھی اس لئے ایک معمولی خط تک نہیں لکھا گیا۔ اب کالے دھن کو چھوڑیئے اس فیصلے کے صادر ہوتے ہیں شئیر بازار ۱۵۰۰ پوائنٹ گرا اور یہ گراوٹ جمعہ تک جاری رہی جس سے ہزاروں کروڑ کا سفید دھن ہوا ہوگیا۔

منموہن سنگھ نے گزشتہ ۱۵ سالوں میں کالے دھن کو بغیر کسی شور شرابے کے ملک

کی جملہ معیشت کے ۴۰ فیصد سے ۲۰ فیصد تک پہنچا دیا لیکن اس نئے تماشے سے نہ ان سرمایہ داروں کا کوئی نقصان ہوگا جنھوں نے بیرون ملک کالے دھن کو چھپا رکھا ہے اور ان لوگوں کے مفادات پر کوئی آنچ آئے گی جو سرکاری بنکوں کے ۶ لاکھ کروڑ روپیہ قرض دبائے بیٹھے ہیں۔ ان غاصبوں سے دھن واپسی کی خاطر عدالت عالیہ نے مداخلت کی پھر بھی جب سنیاں (یعنی سرکار) بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا کی مصداق وہ محفوظ و مامون ہیں۔ سرکار کے اس احمقانہ اقدام سے تو ان ۸۷ فیصد لوگوں کی دقتوں میں اضافہ ہوا ہے جو مہنگائی کے اس دور میں ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ کے نوٹ کو لے کر بازار جاتے ہیں اور خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جن کے دلوں میں کالا ہو وہ کالے دھن کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے ہیں۔

کالے دھن کے نام پر کھڑا کئے گئے بونڈر کے پیچھے بھوپال کے جعلی انکاونٹر کی بدنامی، جے این یو کے نجیب نامی طالب علم کا اغواء اور این ڈی ٹی وی پر ایک دن کی پابندی کے نافذالعمل ہونے سے قبل اٹھانے کی خفت پوشیدہ ہے۔ اس چینل پر پابندی کا مقصد اپنے دشمن نقصان پہنچانا تھا مگر رویش کمار کے باغوں میں بہار کی بے پناہ مقبولیت اور اس کے دوسرے ہی دن پرائم ٹائم پر جے این یو کے اغواء طالب علم مجیب پر خصوصی پرائم ٹائم نے مودی سرکار کے ہوش اڑا دیئے۔ مجیب کو نظر انداز کرنے والی مفلر والی دہلی سرکار ہوش میں آگئی۔

کمبھ کرن کی نیند سونے والے دہلی کے گورنر جنرل نے نجیب کے اہل خانہ سے ملاقات کی اور تعاون کا یقین دلایا۔احتجاج کرنے والے طلباء کی حوصلہ شکن پولس کو بھی خوف لاحق ہوگیا۔این ڈی ٹی وی کی دلیری اور جرأت مندی کے مظاہرے کے بعد بزدل حکومت نے اپنی عزت بچانے کیلئے چینل والوں کو بلایا اور پابندی اٹھا کر یہ کہہ دیا کہ فریق ثانی کی گذارش پر ایسا کیا گیا جبکہ چینل کی جانب سے اس کی تردید کی گئی۔ سوال یہ نہیں ہے کہ گزارش کی گئی یا نہیں بلکہ پابندی لگائی کیوں گئی اور لگا ہی دی تھی تو اٹھائی کیوں گئی ؟اس سوال کا صرف اور صرف ایک جواب یہ ہے کہ سرکار خوفزدہ ہو گئی یعنی ڈرانے والے خود ڈر گئے۔

مودی سرکار کے بزدل اور دغاباز حامی چینل زی ٹی وی کے سربراہنے بھی اس معاملے میں نہایت شرمناک بیان دیا۔ ایسے میں جبکہ میڈیا کے سارے لوگ اپنی مسابقت اور اختلافات کو بھلا کر اس جبر کی مخالفت کررہے تھے زی ٹی وی کے کم ظرف مالک سبھاش چندرا نے کہا یہ پابندی عارضی نہیں بلکہ دائمی ہونی چاہئے۔ جن کے اندر لڑ کر جیتنے کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ چاہتے ہیں مخالف کے ہاتھ پیر باندھ کر کامیابی کا پرچم لہرائیں ۔ اس طرح گویاظاہر ہوگیا کہ جس بیساکھی کے سہارے یہ حکومت چل رہی ہے وہ کس قدر کمزور ہے ۔ دونوں کے اندر ہمت اور جرأت نہیں ہے کہ اپنے مدمقابل کو برابر کا موقع دے کر اس کو شکست دے

سکیں اسی لئے بزدلانہ حربے استعمال کئے جاتے ہیں جو بالآخر ناکامی و رسوائی پر منتج ہوتے ہیں۔

مودی جی میڈیا کی اہمیت خوب جانتے ہیں گجرات فساد کے متعلق جب ان سے پوچھا گیا تھا کہ کیا انہیں اس پر افسوس ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں میڈیا کو مینیج نہیں کرسکا اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اپنے جرائم پر عار نہیں بلکہ پردہ پوشی میں ناکامی کا قلق ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے مودی جی کی نقاب کشائی میں این ڈی ٹی وی اور راجدیپ سردیسائی نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا جس کا بغض اب بھی ان کے دل میں ہے۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد اکثر دھام، جعلی دھماکوں اور انکاونٹرس کا انہوں نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی خاطر بھرپور استعمال کیا۔ گجرات کے اندر وہ جو کچھ ۱۲ سالوں تک کرتے رہے وہی سب انہوں نے قومی انتخاب میں بھی کیا اور اب بھی کر رہے ہیں لیکن بین الاقوامی سطح پر سرجیکل اسٹرائیک کی کہانی بیچنے میں ب وہ کامیاب نہیں ہوسکے۔ مودی سرکار اس لئے ناکام ہوئی کہ اقوام متحدہ نے سب سے پہلے تردید کردی اس کے بعد پاکستان دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کو سرحد کے ان علاقوں میں لے گیا جہاں حملے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں ظاہر ہونے والے شکوک و شبہات قومی میڈیا کو متاثر کرنے لگے۔ آگے چل کر بی بی سی کے ایک صحافی کا دورہ کرکے

دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا۔ اس موقع پر مودی جی نے اعتراف کیا کہ ہمارے پاس عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے والا میڈیا نہیں ہے اور اسی کے ساتھ ایک عالمی سطح کا میڈیا ہاوس قائم کرنے کی کھچڑی پکنے لگی۔ مودی جی نے محسوس کرلیا ہے کہ قومی سطح پر ذرائع ابلاغ کی مدد سے عوام کو اپنے سحر میں گرفتار کرنے میں انہیں جو کامیابی انہیں ملتی ہے عالمی سطح پر وہ جادو نہیں چل پاتا۔

اس کام کیلئے مودی سرکار کی نظرانتخاب اپنے سب سے وفادار مہرے ارنب گوسوامی پر پڑی اور پھر ارنب کے استعفیٰ کی خبر سامنے آگئی۔ عالمی سطح پر ایک باوقار میڈیا ہاوس قائم کرنے کی ذمہ داری سنگھ پریوار کے علاوہ کوئی اور ارنب جیسے نااہل کو نہیں سونپ سکتا۔ ٹائمز ناؤ کے شروع ہونے سے بہت پہلے ٹائمز آف انڈیا ملک کے ایک نہایت معتبر اخبار تھا۔ ارنب نے اس کا فائدہ کراپنی دوکان چمکائی مگر شور وپکار اور جانبداری سے ٹائمز کے برسوں پرانی ساکھ کو خاک میں ملادیا لیکن چونکہ ٹائمز بھی ایک بنیا اخبار ہے اور اس کو اپنی عزت سے زیادہ دولت عزیز ہے اس لئے ارنب برداشت کیا گیا۔ جس فرد نے ایک اچھے بھلے میڈیا ہاوس کی اعتباریت کو مشکوک بنادیا اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ عالمی رائے عامہ کا اعتماد حاصل کرسکے گا خوش فہمی نہیں تو کیا ہے؟

کالے دھن کی ہی مثال لیں۔ ارنب کا اگر اپنا دیش بھکت چینل ہوتا تو وہ ساری دنیا کو دکھلاتا سرکار نے اس فیصلے سے کئی ہزار کروڑ روپے عوام کی جیب سے نکال کر خزانے میں داخل کرلئے ہیں۔ عالمی سطح کے نامہ نگار تو صرف اتنے پر مطمئن نہیں ہوتے بلکہ سرمایہ کا استعمال سے، تعلق پوچھتے کہ کیا یہ روپیہ عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوگا؟ اس سوال کا جواب مودی سرکار کے پاس نہیں ہے۔ ملک کے لوگ سوچتے تھے کہ اگر کوئی شخص چائے بیچتے بیچتے وزیراعظم بن جائے تو ملک کی نہ جانے کون کون سے مصنوعات کو دنیا بھر میں بیچ آئے گا لیکن گزشتہ ڈھائی سالوں میں ساری دنیا نے یہی دیکھا کہ یہ صاحب جہاں بھی جاتے ہیں کچھ بیچنے کے بجائے خرید کر ہی لوٹتے ہیں۔ ویسے اگر یہ کوئی ایسی ٹکنالوجی خرید کرلاتے کہ جس سے عوام کو روزگار ملتا اور ملک میں خوشحالی آتی تب بھی ٹھیک تھا لیکن یہ تو بیشتر سرمایہ اسلحہ خریدنے پر صرف کردیتے ہیں جس سے عوام کا براہِ راست کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہتھیاروں کے ان سودوں سے دلالوں کا مفاد ضرور وابستہ ہے لیکن ان کے مٹھی بھر ووٹ سے سرکار دوبارہ اقتدار میں نہیں آسکتی۔ اس لئے اسلحہ کی دلالی سے حاصل شدہ کالے دھن کو میڈیا پر خرچ کے اپنا رنگ اجلا کرنے کی سعی کی جاتی ہے ایسے سفید پوش بھکتوں پر کبیر کا یہ دوہا صادق آتا ہے۔

تن اجلا من سانولا، بگلا کپٹی بھیک

یا سو تو کاگا بھلا، باہر بھیتر ایک

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ کالے دھن کا شور و غل کرنے والی سرکار نے ہندوستان سے باہر روپیہ بھیجنے میں دوبار سہولت عطا کی جس کے نتیجے میں بھارت سے باہر بھیجی جانے والی رقوم میں تین گنا کا اضافہ ہوا اور گزشتہ ۱۱ ماہ میں ۳۰ ہزار کروڑ روپے ملک سے باہر روانہ کئے گئے۔ یعنی غیر ملکی سرمایہ کاری بھارت کے اندر تو نہیں ہو سکی الٹا خود ہندوستانیوں نے بیرونی ممالک میں اپنا قیمتی سرمایہ لے جا کر لگایا یا چھپایا۔ اس طرح آنکھیں موند کر ۹۰۰ کالے چوہے کھانے والی ایک سفید بلی اب حج کیلئے نکل کھڑی ہوئی ہے تاکہ پارسائی کا ڈھونگ رچا سکے۔ باہر سے بڑی مچھلیوں کا کالا دھن واپس لا کر ملک میں خوشحالی بڑھانے کے بجائے اندر ہی کے ۱۰ فیصد کالے دھن کی دھول عوام کے آنکھوں میں جھونک کر وہ اپنے سیاسی حریفوں کیلئے مشکلات کھڑی کرنے میں مصروف ہے لیکن اس طرح کے کھیل میں ممکن ہے جو گڑھا اس حکومت نے دوسروں کی خاطر کھودا ہے وہ خود اسی کی قبر بن جائے۔

نوٹ کے بدل کر ووٹ نہ مانگو، ووٹ کے بدلے چوٹ ملے گی

منموہن سنگھ نے گزشتہ ۱۵ سالوں میں کالے دھن کو بغیر کسی شور شرابے کے ملک کی جملہ معیشت کے ۴۰ فیصد سے گھٹا کر ۲۰ فیصد تک پہنچا دیا لیکن مودی جی کے نئے تماشے سے نہ ان سرمایہ داروں کا کوئی نقصان ہوگا جنھوں نے بیرون ملک کالے دھن کو چھپا رکھا ہے اور ان لوگوں کے مفادات پر کوئی آنچ آئے گی جو سرکاری بنکوں کے ۶ لاکھ کروڑ روپیہ قرض دبائے بیٹھے ہیں۔ ان غاصبوں سے دھن واپسی کی خاطر عدالت عالیہ نے مداخلت کی پھر بھی جب سنیاں (یعنی سرکار) بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا کی مصداق وہ محفوظ و مامون ہیں۔ سرکار کے اس احمقانہ اقدام سے تو ان ۸۷ فیصد لوگوں کی دقتوں میں اضافہ ہوا ہے جو مہنگائی کے اس دور میں ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ کے نوٹ کو لے کر بازار جاتے ہیں اور خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جن کے دلوں میں کالا ہو وہ کالے دھن کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کا ۹۰ فیصد کالا دھن غیر ملکی بنکوں میں ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ کے نوٹوں کی شکل میں نہیں بلکہ ڈالر کی کرنسی میں جمع ہے جو دس فیصد ہندوستان کے اندر ہے اس کے صرف ۳ فیصد کی لاگت کے ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ کے نوٹ ہیں۔ یعنی اگر سارے نوٹ بلیک مان لئے جائیں تب بھی یہ ۳ فیصد ہی ہوتے ہیں

حالانکہ یہ ناممکن ہے اس لئے اس مشقت کے نتیجے میں جملہ کالے دھن کا صرف ایک فیصد باہر آئے گا باقی سب یونہی چھپا کا چھپا رہ جائیگا۔ حکومت کے اس قدم سے چونکہ روپئے کے مقابلے ڈالر کی قیمت میں اضافہ ہوا ہےاس لئے اس کالے دھن کی قدرو قیمتبھی اپنے آپ بڑھ گئی ۔ حوالہ والوں کے بھی وارے نیارے ہوگئے۔انتخاب سے قبل سوئزرلینڈ سے کالے دھن کی واپسی کے خواب دکھلائے گئے تھے لیکن اب وہ انتخابی جملہ بازی میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ جرمن حکومت نے توپیشکش کی تھی کہ اگر حکومت ہند گزارش کرے تو وہ ان سرمایہ داروں معلومات فراہم کرسکتی ہے جن کی دولتباہر جمع ہے لیکن حکومت اپنے ہی خواہوں کو ناراض کرنے کی غلطی کیسے کرسکتی تھی اس لئے ایک معمولی خط تک نہیں لکھاگیا۔کالا دھن تو درکنار اس فیصلے کے صادر ہوتے ہیں شئیر بازار ۱۵۰۰پوائنٹ گرااور یہ گراوٹ جمعہ تک جاری رہی جس سے ہزاروں کروڑکا سفید دھن ہوا ہوگیا۔

کالے دھن کے نام پر کھڑا کئے گئے بونڈر کے پیچھے بھوپال کے جعلی انکاونٹر کی بدنامی ، جے این یو کے نجیب نامی طالب علم کا اغواء اوراین ڈی ٹی وی پر ایک دن کی پابندی کے نافذالعمل ہونے سے قبل اٹھانے کی خفت پوشیدہ ہے ۔اس چینل پرپابندی کا مقصد اپنے دشمن نقصان پہنچانا تھامگر رویش کمار کے باغوں میں بہار کی بے پناہ مقبولیت اور اس کے دوسرے ہی دن پرائم ٹائم پر جے این یو کے اغواء طالب علم مجیب پر خصوصی پرائم ٹائم نے مودی سرکار کے ہوش اڑا

دیئے۔ مجیب کو نظر انداز کرنے والی مظلر والی دہلی سرکار ہوش میں آگئی۔ کمبھ کرن کی نیند سونے والے دہلی کے گورنر جنرل نے نجیب کے اہل خانہ سے ملاقات کی اور تعاون کا یقین دلایا۔احتجاج کرنے والے طلباء کی حوصلہ شکن پولس کو بھی خوف لاحق ہوگیا۔

این ڈی ٹی وی کی پابندی اٹھا کر سرکار نے کہہ دیا کہ اس کی گذارش پر ایسا کیا گیا جبکہ چینل کی جانب سے اس کی تردید کی گئی۔ سوال یہ نہیں ہے کہ گزارش کی گئی یا نہیں بلکہ پابندی لگائی کیوں گئی اور لگا ہی دی تھی تو اٹھائی کیوں گئی ؟اس سوال کا سیدھا جواب یہ ہے کہ سرکار ڈر گئی۔

مودی سرکار کے بزدل اور دغاباز حامی چینل زی ٹی وی کے سربراہ نے بھی اس معاملے میں نہایت شرمناک بیان دیا۔ ایسے میں جبکہ میڈیا کے سارے لوگ اپنی مسابقت اور اختلافات کو بھلا کر اس جبر کی مخالفت کررہے تھے زی ٹی وی کے کم ظرف مالک سبھاش چندرا نے کہا یہ پابندی عارضی نہیں بلکمدائی ہونی چاہئے۔ جن کے اندر لڑ کر جیتنے کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ چاہتے ہیں مخالف کے ہاتھ پیر باندھ کر کامیابی کا پرچم لہرائیں۔ اس طرح گویا ظاہر ہوگیا کہ جس بیساکھی کے سہارے یہ حکومت چل رہی ہے وہ کس قدر کمزور ہے۔ دونوں کے اندر ہمت اور جرأت نہیں ہے کہ اپنے مدمقابل کو برابر کا موقع دے کر اس کو شکست دے سکیں اسی لئے بزدلانہ حربے استعمال کئے جاتے ہیں جو بالآخر ناکامی و

رسوائی پر منتج ہوتے ہیں۔

مودی جی میڈیا کی اہمیت خوب جانتے ہیں گجرات فساد کے متعلق جب ان سے پوچھا گیا تھا کہ کیا انہیں اس پر افسوس ہے ؟ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں میڈیا کو مینیج نہیں کرسکا اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انہیں اپنے جرائم پر عار نہیں بلکہ پردہ پوشی میں ناکامی کا قلق ہے۔ مودی جی کی نقاب کشائی میں این ڈی ٹی وی نے اہم کردار ادا کیا تھا جس کا بغض اب بھی ان کے دل میں ہے۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد اکشر دھام ، جعلی دھماکوں اور انکاونٹرس کا انہوں نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی خاطر بھرپور استعمال کیا۔ گجرات کے اندر وہ جو کچھ ۱۲ سالوں تک کرتے رہے وہی سب انہوں نے قومی انتخاب میں بھی کیا اور اب بھی کررہے ہیں لیکن بین الاقوامی سطح پر سرجیکل اسٹرائیک کی کہانی بیچنے میں وہ کامیاب نہیں ہوسکے۔

مودی سرکار اس لئے ناکام ہوئی کہ اقوام متحدہ نے سب سے پہلے تردید کردی اس کے بعد پاکستان دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کو سرحد کے ان علاقوں میں لے گیا جہاں حملے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں ظاہر ہونے والے شکوک و شبہات قومی میڈیا کو متاثر کرنے لگے۔ آگے چل کر بی بی سی کے ایک صحافی کا دورہ کرکے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا۔ اس

موقع پر مودی جی نے اعتراف کیا کہ ہمارے پاس عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے والا میڈیا نہیں ہے اور اسی کے ساتھ ایک عالمی سطح کا میڈیا ہاوس قائم کرنے کی کھچڑی پکنے لگی۔ مودی جی نے محسوس کرلیا ہے کہ قومی سطح پر ذرائع ابلاغ کی مدد سے عوام کو اپنے سحر میں گرفتار کرنے میں انہیں جو کامیابی انہیں ملتی ہے عالمی سطح پر وہ جادو نہیں چل پاتا۔

اس کام کیلئے مودی سرکار کی نظر انتخاب اپنے سب سے وفادار مہرے ارنب گوسوامی پر پڑی اور پھر ارنب کے استعفٰی کی خبر سامنے آگئی۔ عالمی سطح پر ایک باوقار میڈیا ہاوس قائم کرنے کی ذمہ داری سنگھ پریوار کے علاوہ کوئی اور ارنب جیسے نااہل کو نہیں سونپ سکتا۔ ٹائمز ناؤکے شروع ہونے سے بہت پہلے ٹائمز آف انڈیا ملک کے ایک نہایت معتبر اخبار تھا۔ ارنب نے اس کا فائدہ کر اپنی دوکان چمکائی مگر شور وپکار اور جانبداری سے ٹائمز کے برسوں پرانی ساکھ کو خاک میں ملادیا لیکن چونکہ ٹائمز بھی ایک بنیا اخبار ہے اور اس کو اپنی عزت سے زیادہ دولت عزیز ہے اس لئے ارنب برداشت کیا گیا۔ جس فرد نے ایک اچھے بھلے میڈیا ہاوس کی اعتباریت کو مشکوک بنادیا اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ عالمی رائے عامہ کا اعتماد حاصل کرسکے گا خوش فہمی نہیں تو کیا ہے؟

ارنب جیسے زرخرید صحافی چاہے جو دعویٰ کریں لیکن یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ کالے دھن کا شوروغل کرنے والی سرکار نے ہندوستان سے باہر روپیہ بھیجنے میں دوبار سہولت عطا کی جس کے نتیجے میں بھارت سے باہر بھیجی جانے والی رقوم میں تین گنا کا اضافہ ہوااور گزشتہ ۱۱ماہ میں ۳۰ہزار کروڈ روپے ملک سے باہر روانہ کئے گئے۔یعنی غیر ملکی سرمایہ کاری بھارت کے اندر تو نہیں ہوسکی الٹا خود ہندوستانیوں نے بیرونی ممالک میں اپنا قیمتی سرمایہ لے جاکر لگایا یا چھپایا۔اس طرح آنکھیں موند کر ۹۰۰ کالے چوہے کھانے والی ایک سفید بلی اب حج کیلئے نکل کھڑی ہوئی ہے تاکہ پارسائی کا ڈھونگ رچاسکے۔ باہر سے بڑی مچھلیوں کا کالا دھن واپس لاکر ملک میں خوشحالی بڑھانے کے بجائے اندر ہی کے ۱۰فیصد کالے دھن کی دھول عوام کے آنکھوں میں جھونک کر وہ اپنے سیاسی حریفوں کیلئے مشکلات کھڑی کرنے میں مصروف ہے لیکن اس طرح نوٹ بدل کر ووٹوں کی کھیتی نہیں اگائی جاتی بلکہ اس کھیل ووٹ کے بجائے چوٹ بھی لگ سکتی اس لئے کہ بعید نہیں جو گڑھا حکومت نے دوسروں کی خاطر کھودا ہے وہ خود اس کی اپنی قبر بن جائے۔

اب تک شکست فاش کی خفت نہیں مٹی

موجودہ حکومت کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ جب مسئلہ میں الجھ جاتی ہے تو اس پر قابو پانے کے بجائے کوئی نیا مسئلہ کھڑا کرکے اس کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس حکمت عملی کو کسی لکیر کو چھوٹا کرنے کی خاطر اس کے بغل میں اس سے بڑا خط کھینچ دینا کہتے ہیں لیکن اس دوران نت نئی لکیروں کی تعداد اتنی کثیر اور اونچائی اس قدر زیادہ ہوگئی ہے کہ ان کے بیچ سرکار نظر ہی نہیں آتی۔ ۱۰۰۰ اور ۵۰۰ کی نوٹ میں چنگاری لگا کر وزیراعظم جاپان کی جانب اس خیال سے نکل گئے تھے کہ لوگوں کا غم ان کی یاترا سے غلط ہوجائیگا اور جب وہ لوٹ کر آئیں گے تو سارا کچھ معمول پر آچکا ہوگا لیکن ہوا یہ کہ ملک کا بچہ بچہ وزیراعظم کو ایک زبان میں برا بھلا کہنے لگا۔ اب تو عوام کا یہ حال ہے کہ اگر انہیں نوٹ کے ساتھ وزیراعظم کو بدلنے کا موقع میسر آجائے تو وہ نوٹ بدلوانے سے قبل پہلے مودی جی کی چھٹی کردیں گے ۔ اس مرتبہ پہلی بار بی جے پی کی حلیف شیوسینا نے بھی ممتا بنرجی کے زیر قیادت صدرِ مملکت سے ملاقات کرکے اپنی ہی حکومت کے خلاف شکایت کرائی اور زیر قانی قلعہ کے اندر پائے جانے والی بے چینی پر مہر لگا دی۔

مودی جی نے اس بار نفسِ مسئلہ سے توجہ سے ہٹانے کی خاطر ڈاکٹر ذاکر نائک کے

اسلامک ریسرچ فاونڈیشن پر پابندی لگا دی ۔انہیں یہ خوش فہمی تھی کہ اس سے برپا ہونے والے سیلاب میں ان کے سارے پاپ بہہ جائیں گے لیکن عوام کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ کسی نے اس جانب پھٹک کر دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا۔ کسی اردو یا انگریزی اخبار اس خبر کو شاہ سرخی میں جگہ نہیں دی ۔ بہت سوں نے تو اسے نظر انداز ہی کر دیا ۔جس وقت آئی آر ایف پر اوٹ پٹانگ الزامات لگا کر پابندی لگائی جا رہی تھی مودی جی کی ناک کے نیچے دہلی میں اروند کیجریوال ان پر برلا گروپ سے ۲۵ کروڑ رشوت لینے کے شواہد پیش کر رہے تھے ۔ سہارا گروپ سے رشوت لینے کا سنگین الزام بھی مودی پر لگایا گیا اور اس کے ثبوت جلد ہی طشت ازبام کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

مغربی جمہوریت میں رشوت ستانی سیاستدانوں کی مجبوری ہے لیکن ایک ایسے وقت میں جبکہ وزیر اعظم نے کالے دھن کے خلاف دھرم یدھ چھیڑ رکھا ہے اور عوام کو بلی کا بکرہ بنایا جا رہا ہے یہ الزامات غیر معمولی اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں ۔ انڈین ایکسپریس کے مطابق نوٹ تبدیلی فیصلے کے بعد ۳۳ لوگ ایک ہفتہ کے اندر اس کے سبب ہلاک ہو چکے ہیں۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے۔ اخبار نے مہلوکین کے نام اور علاقہ کے علاوہ موت کی تفصیل بھی درج کر دی ہے کہ کس کی موت حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب ہوئی ، کس نے مایوسی کے عالم میں خودکشی کر لی اور کون قطار میں کھڑے کھڑے پر لوک سدھار گیا۔ ہندوستان جیسے وسیع و

عریض ملک میں ذرائع ابلاغ کی رسائی بڑے شہروں اور ان کے قرب وجوار تک محدود ہے اور یہ لوگ انہیں علاقوں میں ہلاک ہوئے ہیں جبکہ دوردراز کے علاقوں میں غربت اور سہولیات کی کمی کے باعث حالات بہت خراب ہیں۔ دیہاتوں میں اس فتنے کا شکار ہونے والوں کی کمیت اور کیفیت کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ بقول شاعر

نوٹ کھو دینے کا احساس تو کم باقی ہے
جو ہوا وہ نہ ہوا ہوتا، یہ غم باقی ہے

جے این یو کے طالبعلم نجیب احمد کے اغواء کو سنگھ پریوار نے دبا دیا۔ اب سنا ہے پولس نے کسی آٹو رکشا ڈرائیور کا سراغ لگا لیا ہے جو اسے جامعہ کی جانب لے کر آیا تھا۔

بھوپال کے اندر جعلی انکاونٹر میں ۶ معصوموں کو شہید کرکے اس معاملے کو گھما دیا گیا اب یہ پتہ لگانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ جیل کے حفاظتی انتظامات میں کیا کمی ہے لیکن نوٹ کی خاطر ہلاک ہونے والوں کا الزام تو مودی جی کو اپنے سر لینا ہی ہوگا۔ گوا کے اندر وزیراعظم کی جذباتی تقریر اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں اپنی حماقت کا احساس ہوگیا ہے اسی لئے اپنے بچپن کی کڑک چائے یاد آگئی مگر کمال ڈھٹائی سے اس بیہودہ فیصلے کو انہوں نے کڑک فیصلہ قرار دے دیا۔ اس مماثلت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مودی جی کڑک چائے کس قدر بدمزہ رہی ہوگی اور کیوں انہیں اپنی چائے کی دوکان

بند کرکے سنگھ پریوار کا رخ کرنا پڑا ہوگا؟ لیکن اب وہ دن دور نہیں جب انہیں چھٹی کا دودھ یاد آجائیگا اور سیاسی دوکان بھی بند ہوجائیگی ۔ گوا کے اندر وزیر اعظم کا گھڑیالی آنسوؤں کے ساتھ ۵۰ دن کا وقت مانگنا اور حالات نہ سدھرنے کی صورت میں کسی بھی چوراہے پر سزا کیلئے اپنے آپ کو پیش کرنا دراصل شکست فاش کیکھلی علامت ہے ۔ دن بعد مودی جی کتنی ہلاکتوں کی سزا بھگتیں گے اور جو گجرات میں مارے گئے کیا ۵۰ ان کا حساب کتاب نہیں ہوگا؟ مودی جی کی موجودہ حالت زار پر مشتاق عاجز کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ؂

اب تک شکست فاش کی خفت نہیں مٹی
اک جنگ اپنے آپ سے ہارا تھا میں کبھی

مودی جی کی گوا والی تقریر کے بارے میں راہل گاندھی نے کہا کہ کل تک جو صاحب ہنستے تھے آج وہ رو رہے ہیں ۔ مودی جی کے رونے پر کسی کو افسوس نہیں ہے اس لئے کہ یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے لیکن فی الحال تو سارا ملک رو رہا ہے ۔ عام لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور بڑے سرمایہ داروں کے ہونٹوں پر ہنسی ہے جن کا ۷ ہزار کروڑ کا قرض اسٹیٹ بنک آف انڈیا نے چپکے سے معاف کردیا۔ ان خوش نصیب لوگوں میں وجئے ملیا بھی شامل ہے جس کا ایک ہزار ۲۰ کروڑ کا بھلا ہوگیا۔ یہ وہی وجئے ملیا ہے جو بی جے پی کی مدد سے راجیہ سبھا کا رکن بنا۔ جو وارنٹ کے باوجود دن دہاڑے دہلی سے لندن فرار ہوگیا اور

کھلے عام عدالت کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے لیکن سرکار اسے واپس لاکر ملزمین کی قطار میں کھڑا کرنے کی جرأت نہیں رکھتی ۔ سرمایہ داروں پر نظر کرم کا یہ سلسلہ پرانا ہے ۲۰۱۳ سے ۲۰۱۵ کے درمیان ۲۹ سرکاری بنکوں نے ایک لاکھ ۱۴ ہزار کروڈ عمداً واپس نہ ہونے والوں کے قرضہ جات معاف کردیئے۔ اس اقدام کو سپریم کورٹ نے بہت بڑا فراڈ قرار دیا اس کے باوجود کسی کا بال بیکا نہیں ہوا۔

ایک طرف نوٹوں کی تبدیلی سے عوام پریشان ہیں دوسری جانب کالے دھن پر قابو پانے کا دعویٰ کرنے والی بی جے پی کے رہنما جناردھن ریڈی کی بیٹی کی شادی اس دعویٰ کو منہ چڑھا رہی ہے۔ اس شادی پر خرچ کا تخمینہ ۵۵۰ کروڈ روپے ہے جس میں سے ۵ کروڈ تو صرف دعوت دینے پر خرچ کئے گئے ۔ کیا یہ ساری رقم ٹیکس ادا کرنے بعد بچائی گئی ہے ؟ اگر یہ کالا دھن ہے تو اس کے خلاف لڑنے والی سرکار کے دیش بھکت جماعت کے سابق وزرائے اعلیٰ یدورپاّ اور شطاران ۵۰ ہزار مہمانوں میں کیوں شامل ہیں جن کی تفریح کیلئے برازیل سے ناچنے گانے والیوں کو بلایا گیا ہے۔ سی بی آئی نے غیر قانونی کان کنی کرنے والے سابق بی جے پی ایم ایل اے کے کالے دھن کا اندازہ ۵ ہزار کروڈ لگایا تھا۔ اس کی زیادہ تر املاک کو ضبط کرلیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ۴۰ ماہ جیل میں رہنے کے باوجود اس کے پاس اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کرنے کیلئے ایسی خطیر رقم کہاں سے

آگئ؟ کیا ریڈی کے گھر کا چکر لگانے والے وزیر خزانہ ارون جیٹلی ان سے یہ سوال کر سکتے ہیں؟ یا ان کی خاص معتمد سشما سوراج اس کا جواب دے سکتی ہیں؟ کالا دھن ختم کرنے والی سرکار کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے؟ بی جے پی کے مرکزی وزیر سدانند گوڑا بھی اپنے بیٹے کی شادی پر ایک کروڑ ۳۰ لاکھ خرچ کر چکے ہیں کیا وہ جائز کمائی تھی؟

نوٹوں کی تبدیلی سے رشوت خوری میں کمی کا دعویٰ بھی کیا جارہا ہے اس کی حقیقت مودی جی کی اپنی کرم بھومی احمدآباد کے اندر منظر عام پر آنے والے ایک واقعہ کی روشنی میں دیکھیں۔ کانڈلا پورٹ کے ایک افسر نے کسی کمپنی سے بجلی کے بل کی ادائیگی کے عوض ۴ لاکھ ۴ ہزار روپئے رشوت طلب کی۔ اس میں سے ۲ لاکھ ۹۰ ہزار کی رقم ۲ ہزار کے نوٹوں کی شکل میں ادا کی گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک کھاتے سے ایک ہفتہ کے اندر صرف ۲۴ ہزار نکالے جاسکتے ہیں تو رشوت دینے کیلئے یہ رقم کیسے مہیا ہو گئی ؟ اس کا مطلب صاف ہے بنکوں کے دروازے پر عوام لائن لگا کر کھڑے ہوئے ہیں اور ان کیلئے وقتاً فوقتاً نئے نوٹ ختم ہوجاتے ہیں مگر پچھلے دروازے سے یہ ۲۰۰۰ کے نوٹ رشوت دینے والوں کے ذریعہ لینے والوں تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ کیا یہی وہ بدعنوانی کا خاتمہ ہے جس کیلئے عوام کو قربانی دینے پر ابھارا جارہا ہے؟ پہلے رشوت لینے والوں کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں یہ نوٹ نقلی نہ ہوں

لیکن چونکہ ۲۰۰۰ نوٹوں کی نقل اتارنا مشکل ہے اس لئے وہ بلا خوف وخطر اطمینان کے ساتھ رشوت کا لین دین کرتے ہیں۔

اروند کیجریوال نے دہلی اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں یہاں تک کہہ دیا کہ مودی جی نے اپنی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب ۸۰ سالہ ماں ہیرا بین کو لائن میں لگوادیا اورانہیں اپنے خوشحال ہونے کا احساس دلا دیا۔ آج کل کی حکومت حقیقت میں کچھ نہیں کرتی صرف لوگوں کو خالی خولی احساس دلاتی ہیں مثلاً اچھے دنوں کے آنے کا نقلی گمان اور مہنگائی کے کم ہونے کی جعلی اشتہار بازی وغیرہ۔ مودی جی پر ماں کی ممتا کے استحصال کا الزام کئی بار لگ چکا ہے۔ وہ اپنی سالگرہ کے دن جب گاوں میں والدہ کا آشیرواد لینے کیلئے جاتے ہیں تو کیمرے کی جانب زیادہ دیکھتے ہیں۔ کیجریوال نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر مودی کی جگہ وہ خود ہوتے تو اپنی ماں کے قطار میں جانے سے قبل خود جاکر کھڑے ہوجاتے۔

ہیرا بین کو نوٹ بدلوانے کی خاطر بنک میں لے جاکر اوران کی تصاویر کی تشہیر کے ذریعہ جو دیش بھکتی کا تمغہ دینے کی اوچھی حرکت کی گئی اس پر سب اچھا تبصرہ راہل گاندھی نے کیا۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ جو بات مودی جی نے میری ماں کے بارے میں کہی میں ان کی والدہ کے بارے میں نہیں کہوں گا۔ اس

طرح گویا راہل نے کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا۔ مودی جی نے راہل پر چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اپنی ماں کی کالی دولت کو سفید بنانے کیلئے وہ بنک کی قطار میں کھڑے ہیں ۔ مودی جی نہیں جانتے تھے کل جب خود ان کی اپنی ماں قطار میں کھڑی ہوگی تو یہ جملہ ان کے گلے کی ہڈی بن جائیگا اس لئے کہ ماں کی دولت کیلئے بیٹے کے لائن میں لگنے سے بدتر یہ ہے کہ بیٹے کی خاطر خود ماں کو قطار میں کھڑا ہونا پڑے اور اس ماں کو جس کا بیٹا گائے کو تک ماں کا درجہ دیتا ہے اور دھرتی کو ماتا کہتا ہے ۔ منور رانا نے شاید یہ شعر ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے

سرپھرے لوگ ہمیں دشمن جاں کہتے ہیں
ہم جو اس ملک کی مٹی کو بھی ماں کہتے ہیں

اس سے قبل مودی جی نے عوام کی توجہات کو ہٹانے کیلئے مختلف طریقے اختیار کئے مثلاً کشمیر کا احتجاج اڑی حملے میں دب گیا اور جب اس پر سوال اٹھے تو سرجیکل اسٹرائیک کا ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ سرحد پار سرجیکل اسٹرائیک کی حدتک تو معاملہ ٹھیک تھا لیکن اپنے ہی ملک کی عوام کے جیب پر جو حملہ ہوا اس کو تو عدالت عالیہ نے کارپیٹ بامبنگ سے تشبیہ دے کر ظاہر کردیا کہ یہ کس قدر ہولناک کارروائی تھی۔ مودی جی نے اس کی جانب سے توجہ ہٹانے کیلئے آئی آر ایف پر پابندی لگا کر بھول کی اس لئے کہ وہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت

ہوا۔ مودی جی اگر سناتن سنستھا پر پابندی لگوادیتے تو اس دہشت گرد تنظیم کے لوگ ایسا بڑا ہنگامہ کھڑا کرتے کہ ذرائع ابلاغ کو اس کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور ہونا پڑتا اور سرکار کی مصیبت کسی حدتک کم ہوجاتی۔

سناتن سنستھا اور آئی آریف میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائک صرف زبانی دعوت و تبلیغ میں یقین رکھتے ہیں جبکہ سناتن پر تھانے اور گوا میں بم دھماکوں کے الزامات ہیں ۔ گوا کے اندر تو اس کا ایک کارکن بم لے جاتے ہوئے ہلاک بھی ہوچکا ہے۔اس کے علاوہ سناتن سنستھا کے ایک کارکن کی گووند پانسرے کے قتل میں گرفتاری عمل میں آچکی ہے۔ نریندر دابھولکر نے قتل سے قبل سناتن کے ذریعہ دھمکی کی شکایت کی تھی اور اب نکھل واگلے کو شکوہ ہے ۔ اس کے باوجود سناتن جیسی خطرناک تنظیم کو امیت شاہ کی مانند کلین چٹ دے دی گئی ہے۔ ۲۰۱۱ میں اس تنظیم پر پابندی لگانے کیلئے پرتھوی راج چوہان نے ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل تجویز اپنی ہی جماعت کی مرکزی حکومت کو روانہ کی تھی ۔ اس وقت مہاراشٹر ہی کے سشیل کمار شندے وزیر داخلہ تھے اس کے باوجود کوئی کارروائی نہیں ہوئی ۔ سابق وزیر اعلیٰ چوہان کا خیال ہے کہ اگر ان کی تجویز پر پابندی لگا دی جاتی تو دابھولکر، پانسرے اور کالبرگی کا قتل ٹل سکتا تھا۔

ہندو رائے دہندگان کی ناراضگی کے خوف سے جس تنظیم پر کانگریس ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ کرسکی اس کے اچھے دن بی جے پی کے برسرِ اقتدار میں آنے کے بعد آگئے۔ ماہِ اکتوبر کی ابتداء میں گووند پانسرے کے قتل میں سناتن سنستھا کا کارکن سمیر گائیکواڑ گرفتار ہوا اور اس کے بعد وزیر اعلیٰ فردنویس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ سناتن پر پابندی لگائیں گے تو ان کا جواب تھا۔ اس سے قبل کانگریس کی مرکزی حکومت نے پابندی لگانے سے انکار کیا تھا اس لئے کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ یہ گمراہ کن بیان تھا کانگریس نے انتخاب کے پیش نظر پابندی لگانے سے احتراز کیا تھا لیکن یہ نہیں کہا کہ ثبوت نہیں ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے کہا اگر اب بھی سنستھا کے خلاف ثبوت نکل آئے تو وہ بلا خوف و خطر پابندی لگائیں گے بصورتِ دیگر کسی دباو میں نہیں آئیں گے۔

اس بیان کے ۲۶ دن بعد ہی وزیر اعلیٰ کے بیان کی قلعی کھل گئی جب ان کی پولس نے عدالت سے کہہ دیا کہ اس کے پاس سناتن کے خلاف شواہد نہیں ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے جس پولس کو سناتن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا اس کو آئی آر ایف کے خلاف بے شمار شواہد مل گئے اور جو مرکزی حکومتیں ۵ سالوں تک سناتن پر پابندی نہیں لگا سکیں اس نے پلک جھپکتے آئی آر ایف کو ممنوع قرار دے دیا۔ جمہوری تماشے میں بلا تفریق نظریہ و جماعت اکثریت پر ہاتھ ڈالنے سے قبل ۱۰۰ بار سوچا جاتا ہے مگر اقلیت کی بابت بلا توقف فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔ اس طرح

کے بھید بھاو کا فائدہ تو ہوتا ہے لیکن نوٹ تبدیلی کے فیصلے نے اقلیت و اکثریت کے فرق کو مٹا کر سوادِ اعظم کو حکومت سے متنفر کر دیا ہے۔ اس کے باوجود عوام الناس کے تئیں وزیر اعظم کی بے حسی ندا فاضلی کے اس شعر کی مصداق ہے

خود کشی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی سب میں
اور کچھ دن یونہی اوروں کو ستایا جائے

نوٹ کھو دینے کا احساس تو کم باقی ہے

مغربی جمہوریت میں رشوت ستانی سیاستدانوں کی مجبوری ہے لیکن ایک ایسے وقت میں جبکہ وزیر اعظم نے کالے دھن کے خلاف دھرم یدھ چھیڑ رکھا ہے۔ مودی جی کی ناک کے نیچے دہلی میں اروند کیجریوال ان پر برلا گروپ سے ۲۵ کروڑ رشوت لینے کے شواہد پیش کر رہے تھے۔ سہارا گروپ سے رشوت لینے کا سنگین الزام بھی مودی پر لگایا گیا اور اس کے ثبوت جلد ہی طشت ازبام کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ یہ الزامات موجودہ ماحول میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوگئے ہیں اس لئے کہ فی زمانہ دیش بھکتی کے مرگھٹ پر عوام کو بلی کا بکرہ بنایا جارہا ہے۔ انڈین ایکسپریس کے مطابق نوٹ تبدیلی فیصلے کے بعد ۳۳ لوگ ایک ہفتہ کے اندر اس کے سبب ہلاک ہوچکے ہیں۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے۔ اخبار نے مہلوکین کے نام اور علاقہ کے علاوہ موت کی تفصیل بھی درج کردی ہے کہ کس کی موت حرکت قلب بند ہوجانے کے سبب ہوئی، کس نے مایوسی کے عالم میں خودکشی کرلی اور کون قطار میں کھڑے کھڑے پرلوک سدھار گیا۔

ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں ذرائع ابلاغ کی رسائی بڑے شہروں اور ان کے قرب و جوار تک محدود ہے اور یہ لوگ انہیں علاقوں میں ہلاک ہوئے ہیں جبکہ دوردراز کے علاقوں میں غربت اور سہولیات کی کمی کے باعث حالات بہت خراب ہیں

۔ دیہاتوں میں اس فتنے کا شکار ہونے والوں کی کمیت اور کیفیت کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے لیکن ہمارے سیاستدانوں کو عوام کے مسائل کی نہیں بلکہ اپنی کرسی کی پڑی ہوئی ہے۔ بقول شاعر

نوٹ کھو دینے کا احساس تو کم باقی ہے
ووٹ کھو دینے کا افسوس و غم باقی ہے

مودی جی کی گوا والی ہیجانی تقریر کے بارے میں راہل گاندھی نے کہا کہ کل تک جو صاحب ہنستے تھے آج وہ رو رہے ہیں۔ مودی جی کے رونے پر کسی کو افسوس نہیں ہے اس لئے کہ یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے لیکن فی الحال تو سارا ملک رو رہا ہے۔ عام لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور بڑے سرمایہ داروں کے ہونٹوں پر ہنسی ہے جن کا ۷ ہزار کروڑ کا قرض اسٹیٹ بنک آف انڈیا نے چپکے سے معاف کردیا۔ ان خوش نصیب لوگوں میں وجئے ملیا بھی شامل ہے جس کا ایک ہزار ۲۰ کروڑ کا بھلا ہوگیا۔ یہ وہی وجئے ملیا ہے جو بی جے پی کی مدد سے راجیہ سبھا کا رکن بنا۔ جو وارنٹ کے باوجود دن دہاڑے دہلی سے لندن فرار ہوگیا اور کھلے عام عدالت کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے لیکن سرکار اسے واپس لاکر ملزمین کی قطار میں کھڑا کرنے کی جرأت نہیں رکھتی ۔ سرمایہ داروں پر نظر کرم کا یہ سلسلہ پرانا ہے ۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۵ کے درمیان ۲۹ سرکاری بنکوں نے ایک لاکھ ۱۴ ہزار کروڑ عمداً واپس نہ ہونے والوں کے قرضہ جات معاف کردیئے۔

اس اقدام کو سپریم کورٹ نے بہت بڑا فراڈ قرار دیا اس کے باوجود کسی کا بال بیکا نہیں ہوا۔

ایک طرف نوٹوں کی تبدیلی سے عوام پریشان ہیں دوسری جانب کالے دھن پر قابو پانے کا دعویٰ کرنے والی بی جے پی کے رہنما جنار دھن ریڈی کی بیٹی کی شادی اس دعویٰ کو منہ چڑھا رہی ہے۔ اس شادی پر خرچ کا تخمینہ ۵۵۰ کروڑ روپے ہے جس میں سے ۵ کروڑ تو صرف دعوت دینے پر خرچ کئے گئے۔ کیا یہ ساری رقم ٹیکس ادا کرنے بعد بچائی گئی ہے ؟ اگر یہ کالا دھن ہے تو اس کے خلاف لڑنے والی سرکار کے دیش بھکت جماعت کے سابق وزارائے اعلیٰ یدورپا اور شطاران ۵۰ ہزار مہمانوں میں کیوں شامل ہیں جن کی تفریح کیلئے برازیل سے ناچنے گانے والیوں کو بلایا گیا ہے۔ سی بی آئی نے غیر قانونی کان کنی کرنے والے سابق بی جے پی ایم ایل اے کے کالے دھن کا اندازہ ۵ ہزار کروڑ لگایا تھا۔ اس کی زیادہ تر املاک کو ضبط کرلیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ۴۰ ماہ جیل میں رہنے کے باوجود اس کے پاس اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کرنے کیلئے ایسی خطیر رقم کہاں سے آگئی؟ کیا ریڈی کے گھر کا چکر لگانے والے وزیر خزانہ ارون جیٹلی ان سے یہ سوال کر سکتے ہیں؟ یا ان کی خاص معتمد سشما سوراج اس کا جواب دے سکتی ہیں؟ کالا دھن ختم کرنے والی سرکار کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے؟ بی جے پی کے مرکزی وزیر سدانند گوڑا بھی اپنے بیٹے کی شادی پر ایک کروڑ ۳۰ لاکھ خرچ

کر چکے ہیں کیا وہ جائز کمائی تھی؟

نوٹوں کی تبدیلی سے رشوت خوری میں کمی کا دعویٰ بھی کیا جارہا ہے اس کی حقیقت مودی جی کی اپنی کرم بھومی احمدآباد کے اندر منظر عام پر آنے والے ایک واقعہ کی روشنی میں دیکھیں۔ کانڈلا پورٹ کے ایک افسر نے کسی کمپنی سے بجلی کے بل کی ادائیگی کے عوض ۴ لاکھ ۴ ہزار روپئے رشوت طلب کی۔ اس میں سے ۲ لاکھ ۹۰ ہزار کی رقم ۲ ہزار کے نوٹوں کی شکل میں ادا کی گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک کھاتے سے ایک ہفتہ کے اندر صرف ۲۴ ہزار نکالے جاسکتے ہیں تو رشوت دینے کیلئے یہ رقم کیسے مہیا ہو گئی؟ اس کا مطلب صاف ہے بنکوں کے دروازے پر عوام لائن لگا کر کھڑے ہوئے ہیں اور ان کیلئے وقتاً فوقتاً نئے نوٹ ختم ہو جاتے ہیں مگر پچھلے دروازے سے یہ ۲۰۰۰ کے نوٹ رشوت دینے والوں کے ذریعہ لینے والوں تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ کیا یہی وہ بدعنوانی کا خاتمہ ہے جس کیلئے عوام کو قربانی دینے پر ابھارا جارہا ہے؟ پہلے رشوت لینے والوں کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں یہ نوٹ نقلی نہ ہوں لیکن چونکہ ۲۰۰۰ نوٹوں کی نقل اتارنا مشکل ہے اس لئے وہ بلا خوف وخطر اطمینان کے ساتھ رشوت کا لین دین کرتے ہیں۔

اروند کیجریوال نے دہلی اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں یہاں تک کہہ دیا کہ مودی

جی نے اپنی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب ۸۰ سالہ ماں ہیرا بین کو لائن میں لگوادیا اور انہیں اپنے خوشحال ہونے کا احساس دلا دیا۔ آج کل کی حکومت حقیقت میں کچھ نہیں کرتی صرف لوگوں کو خالی خولی احساس دلاتی ہیں مثلاً اچھے دنوں کے آنے کا نقلی گمان اور مہنگائی کے کم ہونے کی جعلی اشتہار بازی وغیرہ۔ مودی جی پر ماں کی ممتا کے استحصال کا الزام کئی بار لگ چکا ہے۔ وہ اپنی سالگرہ کے دن جب گاوں میں والدہ کا آشیرواد لینے کیلئے جاتے ہیں تو کیمرے کی جانب زیادہ دیکھتے ہیں۔ کیجریوال نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر مودی کی جگہ وہ خود ہوتے تو اپنی ماں کے قطار میں جانے سے قبل خود جاکر کھڑے ہوجاتے۔

ہیرا بین کو نوٹ بدلوانے کی خاطر بنک میں لے جاکر اور ان کی تصاویر کی تشہیر کے ذریعہ جو دیش بھکتی کا تمغہ دینے کی اوچھی حرکت کی گئی اس پر سب اچھا تبصرہ راہل گاندھی نے کیا۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ جو بات مودی جی نے میری ماں کے بارے میں کہی میں ان کی والدہ کے بارے میں نہیں کہوں گا۔ اس طرح گویا راہل نے کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا۔ مودی جی نے راہل پر چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اپنی ماں کی کالی دولت کو سفید بنانے کیلئے وہ بنک کی قطار میں کھڑے ہیں۔ مودی جی نہیں جانتے تھے کل جب خود ان کی اپنی ماں قطار میں کھڑی ہوگی تو یہ جملہ ان کے گلے کی ہڈی بن جائیگا اس لئے کہ

ماں کی دولت کیلئے بیٹے کے لائن میں لگنے سے بدتر یہ ہے کہ بیٹے کی خاطر خود ماں کو قطار میں کھڑا ہونا پڑے اور اس ماں کو جس کا بیٹا گائے کو تک ماں کا درجہ دیتا ہے اور دھرتی کو ماتا کہتا ہے۔ منور رانا نے شاید یہ شعر ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے

؂

سر پھرے لوگ ہمیں دشمن جاں کہتے ہیں
ہم جو اس ملک کی مٹی کو بھی ماں کہتے ہیں

ضمنی انتخاب کے نتائج اور اترپردیش کا انتخاب

نوٹ بندی کے بعد ۶ ریاستوں کے ۴ پارلیمانی اور ۱۰ اسمبلی حلقوں میں ضمنی انتخابات ہوئے۔ جہاں تک پارلیمانی انتخابات کا سوال ہے اس میں سے ۲ پر بی جے پی اور ۲ پر ٹی ایم سی کا قبضہ تھا اس صورتحال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اس طرح کسی کا کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہوا۔ اسمبلی کے جن ۱۰ مقامات پر انتخابات ہوئے ان میں سے ۴ حلقہ ہائے انتخاب میں اس سے قبل کانگریس کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے ، ۲ پر اے آئی ڈی ایم کے کے امیدواروں کو کامیابی ملی تھی اور ایک ایک پر بی جے پی ، سی پی ایم ، ڈی ایم کے اور ٹی ایم سی کے ارکان اسمبلی کو فتح حاصل ہوئی تھی ۔ یہاں پر صاف طور پر کانگریس اور اس کی حلیف ڈی ایم کے خسارے میں رہے اور انہیں چار نشستیں گنوانی پڑی۔ ان چار میں سے ایک ایک پر اے آئی ڈی ایم کے، بی جے پی ، اے پی پی اور سی پی ایم نے قبضہ کرلیا۔ اس طرح تمام علاقائی جماعتوں کے ساتھ بی جے پی کو بھی ایک نشست کا فائدہ ہوا۔

نوٹ بندی کی افراتفری کے باوجود ایسی کامیابی کی امید خود بی جے پی کو نہیں رہی ہوگی اور نہ کانگریس کو یہ توقع تھی کہ اسے اس کا کوئی فائدہ نہیں ملے گا لیکن ہاتھ کنگن کو آرسی کیا فی الحال انتخابی نتائج سب کے سامنے ہیں ۔ اس

بار اسمبلی کی ۶ سیٹیں مشرقی ہندوستان کی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک سیٹ مدھیہ پردیش اور ۱۳ اسمبلی کے حلقے تمل ناڈو میں تھے۔ مدھیہ پردیش میں تو خیر کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن تمل ناڈو میں ایک سیٹ ڈی ایم کے کے جھولے سے نکل کر اے آئی ڈی ایم کے حصے میں چلی گئی اس کیلئے ممکن ہے جے للیتا کی علالت کے سبب ان کے تئیں ابھرنے والی ہمدردی کی لہر ذمہ دار ہو۔

تمل ناڈو کے عوام ویسے بھی انتخابات کے وقت دماغ کی بہ نسبت دل کی زیادہ سنتے ہیں نیز کروناندھی کی گرتی ہوئی صحت و ساکھ کو سنبھالنے کیلئے ڈی ایم کے پاس کوئی طاقتور متبادل رہنما موجود نہیں ہے۔ عوام کا اعتماد ہنوز کرناندھی کے بیٹے اسٹالن پر بحال نہیں ہو سکا ہے اور کرناندھی اپنے نااہل بیٹے کے علاوہ کسی اور اعتماد کرکے اپنی سیاسی وراثت اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ اسٹالن کی حالت کم و بیش ادھو ٹھاکرے کی طرح ہے کہ بال ٹھاکرے کی موت کے بعد ابھی تک وہ اپنے والد مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ گروناندھی تو خیر بقیدِ حیات ہیں مگر عمر کے اس ڈھلتے پڑاو میں بیٹے کی محبت ان کی اور ڈی ایم کے کے پیر کی زنجیر بن گئی ہے۔

مشرقی ریاستوں میں سے مغربی بنگال میں ٹی ایم سی نے اپنا دبدبہ برقرار رکھا اور حوصلہ مند بی جے پی کو کسی قدر مایوس کیا۔ سی پی ایم مغربی بنگال میں تو

کوئی کامیابی درج نہیں کرا سکی مگر تریپورہ میں اس نے نہ صرف اپنی سیٹ کو محفوظ رکھا بلکہ کانگریس سے ایک سیٹ چھین لی حالانکہ بی جے پی کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور اس نے کانگریس کو تیسرے نمبر کھدیڑنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی فتح سے محروم رہی۔ آسام وہ ریاست ہے جہاں بی جے پی نے نہ صرف وزیر اعلیٰ کی خالی کئے جانے والے اسمبلی حلقہ میں کامیابی درج کرائی بلکہ کانگریس سے ایک سیٹ چھین لینے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ اروناچل پردیش میں بھی یہ ہوا کہ کانگریس کی باغی اروناچل پردیش پیپلس پارٹی نے اس کی سیٹ پر قبضہ کرلیا۔

شمال مشرقی ہندوستان کے انتخاب میں امیدواروں کا مشاہدہ نہایت دلچسپ انکشاف کرتا ہے۔ تریپورہ میں چند سال قبل سی پی ایم کے ایک معمر رہنما جیتندر سرکار اپنی جماعت کو چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہوگئے۔ سی پی ایم حکومت میں وہ دو مرتبہ اسپیکر کے اہم عہدے پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ عام طور پر سیاستداں ٹکٹ نہ ملنے پر اپنا ایمان اور پارٹی بدل دیتے ہیں اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ جیتندر سرکار نے بھی اسی مقصد کے تحت پارٹی تبدیل کی ہوگی۔ کانگریس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ٹکٹ سے نوازدیا۔ سنہ ۲۰۱۴ میں وہ برجالا سے کامیاب بھی ہوگئے لیکن سنہ ۲۰۱۶ کے آتے آتے کانگریس کا سارا ووٹ بنک ترنمول کانگریس اور بی جے پی کی جانب کھسک گیا تھا اس لئے وہ پھر ایک بار سیاسی

چولہ بدل کر سی پی ایم میں لوٹ آئے اور اسمبلی کی رکنیت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس بار سی پی ایم نے ان کی مدد سے جھمو سرکار کو کامیاب کرکے برجالا سیٹ پر اپنا سرخ پرچم لہرا دیا۔

تریپورہ میں جو کام سی پی ایم نے کیا آسام میں وہی کچھ بی جے پی نے اور بھی بھونڈے طریقہ سے کیا۔ بیتھلانگسو میں اس بار کانگریس کے بجائے بی جے پی کو کامیابی ملی لیکن امیدوار وہی پرانے کانگریسی رکن اسمبلی ڈاکٹر مان سنگھ رونگپی ہیں فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ان کے ہاتھ کا پنجہ کانگریسی اقتدار کے ساتھ تھا اب نئی سرکار کے اقتدار سنبھالنے کے بعد رونگپی کے ہاتھ میں بی جے پی کا کمل ہے۔ بی جے پی کو اپنے نظریہ اور اقتدار کے باوجود ایک ایسا امیدوار نہیں مل سکا جو اس حلقۂ انتخاب میں کمل کا پھول کھلا سکے۔ مجبوراً اس نے کانگریس کا پنجہ مروڑ کر اپنا کام نکال لیا۔

اروناچل پردیش کا حال تو اور عبرت انگیز ہے۔ وہاں پر کامیاب ہونے والی امیدوار داسانگلوپل دراصل سابق کانگریسی رکن اسمبلی کالیکھوپل کی تیسری اور سب سے کم عمر زوجہ ہے۔ کانگریس سے بغاوت کے بعد بننے والی اروناچل پردیش پیپلس پارٹی کے ٹکٹ پر وہ کامیاب ہوئی ہیں اس طرح موروثی سیاست کی مخالفت کرنے والی بی جے پی کے قومی مشرقی محاذ نے بھی وہی کیا جو کانگریس

اور دیگر علاقائی جماعتیں کرتی ہیں کہ جب کوئی رہنما فوت ہو جائے تو اس کے اہل خانہ کو ٹکٹ دے کر ہمدردیوں کی آنچ پر اپنی سیاسی روٹی سینک لی جائیں۔ مہاراشٹر میں گوپی ناتھ منڈے کے ساتھ یہی ہوا۔ کانگریس کو زبردست اکثریت والی حکومت کو بی جے پی کی مدد سے گرانے کا کام کالیکھوپل نے کیا تھا لیکن جب سپریم نے اس دھاندلی کو مسترد کرتے ہوئے نابام تکی کی حکومت بحال کردی تو اس سے بددل ہو کر کالیکھوپل نے وزیراعلیٰ کی کوٹھی خالی کرنے کے بجائے اسی میں خودکشی کرکے اقتدار سے محبت کی نئی مثال قائم کردی۔

کانگریس نے اپنا اقتدار جاری رکھنے کیلئے بزرگ نابام تکی کو نوجوان پیما کھانڈو سے بدل دیا لیکن نئے وزیراعلیٰ نے چند ماہ کے اندر بی جے پی سے ساز باز کرکے پوری پارٹی کے ساتھ بغاوت کرکے نئی جماعت اروناچل پردیش پیپلس پارٹی بنالی۔ اس نئی جماعت کو اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل تھی اس کے باوجود اس نے بی جے پی سے الحاق کرکے اس کو حکومت میں شامل کیا حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اس دوسری بغاوت کے بعد کانگریس میں صرف ہٹائے جانے والے نابام تکی رہ گئے تھے۔ کانگریس نے اس بار سانگلو کے خلاف کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا اور ایک آزاد امیدوار کی حمایت کی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ اس طرح اے پی پی کی اس کامیابی کو بی جے پی نے زبردستی اپنے نام کرلیا۔ اروناچل میں بی جے پی کی حمایت اے پی پی

نہیں کرتی بلکہ بی جے پی اس کی بلاضرورت حمایت کرکے اپنا رسوخ بڑھانے کوشش کررہی ہے۔ ان نتائج کا ایک سبق تو یہ ہے کہ کانگریس کو ہرانے کیلئے اس کے اپنے امیدوار کو توڑنا اوراس صوبے میں مخالف حکومت کا ہونا ضروری ہے ورنہ پدوچیری جیسی صورتحال میں جہاں کانگریس بغاوت سے پاک ہو اور صوبے میں اس کی اپنی حکومت بھی ہو تو اس کے امیدوار نارائن سامی کی کامیابی سہل الحصول ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی دراصل ایک نظریاتی تحریک آریس ایس کی ترجمان ہے اس لئے اس کے مضبوط ہونے سے نظریاتی سیاست پروان چڑھنی چاہئے تھی لیکن اقتدار کے ہوس میں وہ بھی نظریات کو بالائے طاق رکھ کر موقع پرستی کو فروغ دے رہی ہے۔ اس کے بالمقابل سی پی ایم کی بھی اپنی منفرد سیاسی فکر و نظر ہے مگر وہ بھی بی جے پی کی مانند منافقت کی سیاست کا سہارا لے رہی ہے۔ جہاں تک کانگریس اور دیگر علاقائی جماعتوں کا تعلق ہے انہوں نے تو کب کا اصول و نظریات کو گنگا میں بہا کر خالص ابن الوقتی کو اپنا شعار بنا رکھا۔ شمال مشرقی ہندوستان میں فی الحال جس بے مثال موقع پرستی کا مظاہرہ ہوا ہے جو قومی سیاست کیلئے نہایت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

آسام میں مہاجرین کے خلاف آل آسام اسٹوڈینٹس یونین (آسو) نے اسیّ کی دہائی میں ایک زبردست تحریک چلائی تھی جو بنیادی طور پر بنگالیوں کے خلاف تھی اور

اس کا غم غصہ بنیادی طور پر مغربی بنگال سے آکر سرکاری دفاتر پر چھا جانے والے افسران کے خلاف تھا لیکن سنگھ پریوار نے کمال چالاکی سے آسو میں شامل ہو کر اس کا رخ مسلمانوں کی جانب موڑ دیا گیا اور آسامی مسلمانوں کو بھی بنگلا دیشی قرار دے کر نیلی کا بدنام زمانہ قتل عام انجام دے دیا جس میں گجرات سے زیادہ ڈھائی ہزار بے قصور لوگوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ اس تحریک کے بطن سے آسام گن پریشد نے جنم لیا اور اس کی حکومت بھی بنی لیکن آگے چل کر بی جے پی کی دوستی اس کو مہنگی پڑی۔ اس کا ووٹ بنک بی جے پی کی جھولی میں چلا گیا۔ اے جی پی سے دل بدل کر بی جے پی میں آنے والے سربانند سونووال فی الحال آسام کے وزیر اعلیٰ ہیں۔

آسامی باشندوں کے اندر مہاجرین کے خلاف نفرت کے جذبات ہنوز باقی ہیں۔ بنگلا دیش سے آنے والی مہاجرین کی بڑی تعداد ظاہر ہے ہندووں کی ہے اور وہ بھی اس کی زد میں آنے کے سبب خوفزدہ ہے اس لئے بی جے پی والے ایک نیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے جو ہندو بنگلا دیش سے آئے ہیں وہ تو مجبور ہیں اس لئے ان کو واپس نہیں بھیجا جائیگا بلکہ صرف مسلمانوں کو واپس کیا جائیگا۔ اس حکمت عملی کا ایک سیاسی فائدہ بی جے پی کو یہ ہوا کہ یہ غیر محفوظ ہندو بنگلا دیشی بڑے پیمانے پر بی جے پی کے حامی بن گئے۔ آسام اور تریپورہ کے اندر بی جے پی کی کامیابی کے عوامل میں یہ سب سے اہم ہے۔

اس سیاسی جوڑ توڑ سے علی الرغم آسو سے نکل کر قائم ہونے والی ایک مسلح علٰحیدگی پسند تنظیم یونائیٹیڈ لبریشن فرنٹ آف آسام یعنی الفا بھی ہنوز سرگرم عمل ہے۔ جس وقت اروناچل پردیش اور آسام میں انتخاب کی گہما گہمی زوروں پر تھی الفا نے تیل کیلئے مشہور شہر ڈگبوئی کے قریب حملہ کرکے کماوں رجمنٹ کے تین جوانوں کو ہلاک اور تین کو زخمی کردیا۔ اس سے ایک ہفتہ قبل ان لوگوں نے پنگیری چائے کے باغات میں مزدوروں کی تنخواہ لے جانے والی گاڑی پر حملہ کردیا تھا۔ آسام کے اندر بی جے پی کی صوبائی حکومت کے قائم ہوجانے سے کچھ لوگ اس خوش فہمی کا شکار ہوگئے تھے کہ بی جے پی کے اقتدار میں آتے ہی علٰحیدگی پسندی جسے حکومت دہشت گردی قرار دیتی ہے کافور ہوجائیگی ۔ مذکورہ بالا مفروضہ کشمیر کے علاوہ آسام میں بھی غلط ثابت ہوگیا ہے۔ وزیراعلیٰ کے بلند بانگ دعووں کے باوجود حملہ آوروں کے خلاف کوئی ٹھوس کارروائی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔

اترپردیش اور پنجاب میں چند ماہ کے اندر صوبائی انتخابات منعقد ہونے والے ہیں ۔ اس الیکشن کا ان انتخابات پر ممکنہ اثرات اور رائے دہندگان کے رحجان کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جو حیرت انگیز شئے سارے نتائج پر محیط ہے وہ یہ کہ کسی بھی ریاست کے عوام نے اپنی ریاستی حکومت کے خلاف غم وغصے کا اظہار نہیں کا۔ اترپردیش اور پنجاب میں سے ایک میں بی جے پی کی حامی اکالی

دل کی حکومت ہے اور اترپردیش میں سماجوادی پارٹی برسرِ اقتدار ہے اس لئے بی جے پی کیلئے ایک جگہ خوشخبری اور دوسری ریاست میں بری خبر ہے۔ اگر یہی رجحان قائم رہتا ہے تو پنجاب میں اکالی دل کو پھر سے کامیاب ہوجانا چاہئے لیکن مرکزی اور ہریانہ سرکار کی حماقتوں نے پنجاب کی ناکامی پر مہرثبت کردی ہے۔ اکثروبیشتر سیاسی مبصر اکالی دل اور بی جے پی کی مشترکہ حکومت پر فاتحہ پڑھ چکے ہیں۔ بحث اس سوال پر مرکوز ہے کہ اس غیر مقبول حکومت کی جگہ کانگریس لے سکے گی یا اروند کیجریوال دہلی سے باہر اپنی اولین حکومت بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

بی جے پی نے اترپردیش کے انتخاب کو اپنی انا مسئلہ بنا رکھا ہے اور پارٹی کا صدر خود پریورتن یاترا کی باگ ڈور تھامے ہوئے ہے دربدر بھٹک رہا ہے حالانکہ یہ صوبائی رہنماوں کے کرنے کا کام ہے۔ اترپردیش کے اندر امیت شاہ بہار میں اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتے۔ یہی جنون ان کا اور ان کی جماعت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ بہار میں بی جے پی نے کسی امیدوار کووزیراعلیٰ کی حیثیت سے پیش کئے بغیر مہم چلائی اور ناکام رہی اس کے برعکس آسام کے اندر ایک واضح مقامی امیدوار تھا جس نے رائے دہندگان کا اعتماد حاصل کرنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا۔ اترپردیش میں بی جے پی نے گوناگوں مجبوریوں کے سبب بہار کی حکمت

عملی اختیار کر رکھی ہے۔ اترپردیش میں بی جے پی کے پاس کئی ممکنہ امیدوار ہیں جنہیں وزیراعلیٰ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن ان سب کو امیت شاہ اور نریندر مودی کی جوڑی نے برگشتہ کر رکھا ہے۔

اترپردیش کے انتخاب میں کامیابی کیلئے سب سے مناسب نام وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ کا ہے۔ انہیں صوبے میں وزیراعلیٰ بننے کا اور قومی و ریاستی سطح پر کام کرنے کا طویل تجربہ ہے۔ قومی سطح پر ان کا شبیہ وزیراعظم سے بھی بہتر ہے۔ انتخابی مہم کے آغاز پر ہی الہ باد کی ریلی میں عوام نے ان کا استقبال وزیراعظم کی بہ نسبت زیادہ پرجوش طریقے پر کیا جو ان کی زبردست مقبولیت کا غماز تھا لیکن چونکہ اس سے وزیراعظم کو خطرہ بڑھ گیا تھا اس لئے انہیں دور رکھا جارہا ہے۔ راجناتھ سنگھ جیسے آرزومند رہنما کیلئے اترپردیش میں باہر والے امیت شاہ کا اس قدر عمل دخل کے کسی کو پوچھا ہی نہ جائے سراسر توہین ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید وزیر داخلہ بھی اپنے عظیم تر مفاد کے پیشِ نظر چاہتے ہیں کہ بی جے پی اترپردیش میں ہار جائے تاکہ اس کا بہانہ بناکر پہلے مرحلے میں امیت شاہ سے نجات حاصل کی جاسکے اور پھر وزارت عظمیٰ کی کرسی کا راستہ ہموار کیا جائے۔

راجناتھ سنگھ کے علاوہ ادتیہ ناتھ، سمرتی ایرانی اور ورون گاندھی کے نام پر

غور کیا جاسکتا ہے۔ ابتداء میں راجناتھ کے خلاف امیت شاہ نے ادتیہ ناتھ کو آگے بڑھایا لیکن آگے چل کر انہیں احساس ہوگیا کہ اس سرپھرے سادھو کو قابو میں رکھنا بے حد مشکل ہے۔اس کی شدت پسندی اور بدزبانی قومی سطح پر نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہیں ۔ سمرتی ایرانی ایک زمانے تک وزیراعظم کی منظور نظر تھیں لیکن روہت ویمولا کے معاملے میں انہوں کچھ ایسے مایوس کیا کہ وہ اعلیٰ کمان کی نظر سے گرگئیں ۔ ویسے ان کا وزیراعلیٰ کا امیدوار بن جانا حزب اختلاف کیلئے کرن بیدی کی مانند وردان ثابت ہوسکتا تھا لیکن شاید بی جے پی کے ستارے ابھی پوری طرح گردش میں نہیں آئے۔

اکھلیش یادو کے مقابلے بی جے پی کے پاس سب سے زیادہ دبنگ رہنما ورون گاندھی ہے لیکن نہرو گاندھی خاندان سے اس کا تعلق سب بڑی رکاوٹ ہے ۔ ورون گاندھی ایک خوددار شخصیت کے مالک ہیں اور وہ امیت شاہ کی چاپلوسی نہیں کرسکتے اس لئے ان کو کنارے کردیا گیا ہے۔ ایسے میں امیت شاہ کی انانیت پسندی اور احساس خوف مودی جی کے سہارے اپنے بل بوتے پر بی جے پی کا بیڑہ پار لگانے پر مجبور کررہی ہے جو بظاہر ناممکن ہدف ہے۔ انتخابی مہم میں اکھلیش کی وکاس یاترا کا رتھ فی الحال بی جے پی کے پریورتن رتھ سے بہت آگے چل رہا ہے۔حالیہ ضمنی انتخابات کے نتائج میں اکھلیش کیلئے یہ خوشخبری ہے کہ اگر وہ کوئی بڑی حماقت نہیں کرتے تو پھر ایک بار عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں

کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اب وقت ہی بتائے گا کہ بی جے پی کے کمل کو آگے چل کر سماجوادی کی سائیکل کچلتی ہے یا مایاوتی کا ہاتھی اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اترپردیش کے انتخابی نتائج کا دارومدار کھلیش یادو کی مہارت اور امیت شاہ کی حماقت پر موقوف ہے۔ جس وقت یہ مضمون تکمیل کے مراحل میں تھا لکھنو کے ۴۰ سالہ سیلیش کمار نے خودکشی کرتے ہوئے وزیراعلیٰ سے استدعا کی اس کی موت کے بعد اہل خانہ کا خیال رکھا جائے اور وزیراعظم کو لکھا کہ آپ کے اچھے دن کی حقیقت دیکھنے کیلئے میں زندہ نہیں رہوں گا۔ وکاس اور پریورتن کی چکی میں پسنے والے عام آدمی کے مایوسی حکمرانوں کیلئے تازیانۂ عبرت ہے۔